نئی کتابیں

منٹو — فن اور شخصیت

ناشر: ماڈرن پبلشنگ ہاؤس گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۲۔
ترتیب وانتخاب: پریم گوپال مِتّل
قیمت: چالیس روپے

منٹو عہد ساز افسانہ نگار تھا۔ اس کے لہجے کا منفرد آہنگ، اس کی کردار نگاری کی بے پناہ قوت اور نفسی تجزیہ کی بے مثال صلاحیت کے ساتھ جزیات نگاری پر قدرت کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ بلاشبہ منٹو جیسا دھڑلّے دار افسانہ نگار اُردو کے افسانوی اُفق پر دوسرا نظر نہیں آتا۔ وہ سامنے کی بات کو انتہائی بے باک انداز میں کہتا ہے لیکن اس انداز کو سپاٹ نہیں ہونے دیتا۔ عورت کے جسمانی استحصال اور روحانی قتل کو موضوعِ فکر بنا کر افسانہ لکھنا اور اپنی تحریر میں اس افسوسناک صورت حال کے تئیں تمام تر انسانی ہمدردی کو جگا کر رکھ دینا منٹو کا کمال تھا۔ ہتک، سڑک کے کنارے ٹھنڈا گوشت، سو کینڈل پاور کا بلب اور دیگر افسانے منٹو کے فنی معراج کا عکس و آئینہ ہیں۔ عورت کے اپنی جسمانی اور معاشی استحصال کو خاموشی سے برداشت کرتے رہنے اور ایک جھٹکے میں اپنے روحانی قتل پر بیدار ہو کر بپھر اُٹھنے کی کہانی ہتک، سڑک کے کنارے والی عورت کی ایک خاص لمحے میں خود سپردگی اور اس کے نتیجے میں برآمد ہونے والی بچّی کے متعلق نفسیاتی فشار کا تند و تیز سیلاب، ٹھنڈے گوشت، والے ایشر سنگھ کے گناہ کا اس کی مردانہ حِس کو نامردی میں تبدیل کر دینے والے ٹھنڈے احساس کا بوجھ اور خوشیا دلال کا اپنی جبلّت کے زیرِ اثر دلال سے گاہک بن جانے والے فطری واقعہ کی افسانوی شکل میں قلمبندی منٹو کا عظیم کارنامہ ہے۔ ایسی ہی دوسری مثالوں کی کمی نہیں۔

لیکن منٹو پر ایک بھرپور اور جامع کتاب کی ضرورت پوری کرنے والے کسی ادارے کی کمی مدت سے محسوس کی جا رہی تھی، اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ضرورت موڈرن پبلشنگ ہاؤس دریا گنج نے منفرد انداز میں پوری کی ہے۔ اس منٹو کے فن اور شخصیت پر بہترین مواد کو یکجا کرنے کا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔

منٹو کو سمجھنے اور جاننے اور اس کے فن کی رُوح کو چھو لینے کے شائقین لوگوں کے لیے یہ کتاب ایک نعمت مترقبہ سے کم نہیں۔ اس میں منٹو کی شخصیت اور فن پر سیر حاصل مضامین اور منٹو کے بہترین اکیس افسانوں کے ساتھ ساتھ منٹو کے نرگس، اشوک کمار، میراجی اور دوسری ہستیوں پر خاکے بھی ہیں۔ منٹو کے زرخیز ذہن کی بلا خیزی مع یہ ایک دستاویز ہے۔ کتاب نہایت اعلیٰ شائع ہوئی ہے۔

انتظار حسین کے ستّرہ افسانے

ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۲۔
قیمت: اٹھارہ روپے

آج اُردو افسانے کی دُنیا میں جو مرتبہ انتظار حسین کو میسّر ہے، وہ شاید کسی دوسرے افسانہ نگار کو نہیں۔ اس کی وجہ ایک نہیں ہے۔ انتظار حسین نے مراجعت ہجرت کی خواہش اور المیے کو اپنی فکر کی اساس بنا کر افسانوی فن کو ایک عجیب کیفیت سے معمور کیا ہے اور یہ بات بڑے واضح انداز میں کہنے کی جسارت کی ہے کہ داستانوں، دیومالائی کتھاؤں اور اسطوری قصّوں کی پناہ میں جانا افسانہ نگار کا دھرم ہے۔ آیا موجودہ صورتِ حال کی اضطرابی اور اضطراری کیفیات کو قدیم قصّوں، کہانیوں اور کتھاؤں کے حوالوں سے صفحۂ قرطاس پر پوری شدّت سے اُتارا جا سکتا ہے یا نہیں، یہ ایک سوال ہے۔ اپنے ستّرہ افسانوں میں انتظار حسین نے اس صورتِ حال کے تذبذب اور خوف کو فکر و فن کے شیشے میں اُتارنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ مجھے ان افسانوں میں ایک بے چینی، ایک اندیشہ اور ایک ہراس جملہ جملہ نظر آیا ہے۔ انتظار حسین کو کسی پہلو قرار نہیں۔ وہ آج کی تہذیبی اقدار سے خائف ہیں اور آج کے انسان اور معاشرے کے کردار کی ہیبت کے زیرِ اثر لگاتار سِسکتے رہنے پر مجبور ہیں۔ ایک بھی افسانہ زندگی کی آنکھ میں آنکھ ڈالنے کا حوصلہ نہیں دیتا۔ گریز اور فرار کے لیے مجبور ضرور کرتا ہے۔ انسانی فکر اور اس کے ارتقا پر افسانہ نگار کو رتّی بھر اعتبار نہیں اور یہ بے چین اور ہراساں بے اعتباری ایک ایسی بے زاری کا روپ دھارن کر لیتی ہے جس کی گرفت قاری پر مضبوط تر ہوتی جاتی ہے۔ شہرِ افسوس کے افسانے پڑھتے وقت لگتا ہے کوئی خبیث رُوح ہمارا پیچھا کر رہی ہے۔ اس کے قدموں کی آہٹ ہمارے اندر عجیب دہشت بن کر سرایت کرتی جا رہی ہے اور ہم اگلے ہی لمحے اس کے خونخوار جبڑوں میں پھنسنے والے ہیں۔ ان افسانوں میں رجائیت کے عنصر کا مکمل فقدان ہے اور اُن بے اطمینانی کا عنصر غالب ہے جس سے چھٹکارا پانے کا وسیلہ ہمارے پاس نہیں ہے۔

انتظار حسین کی خصوصیت ان کا پُر اعتماد اندازِ تحریر ہے جو ان کی مریضانہ سوچ کو فنی اساس اور جواز بخشتا ہے۔ موڈرن پبلشنگ ہاؤس نے یہ افسانے بھارت میں پہلی بار کتابی صورت میں شائع کر کے ہمیں انتظار حسین کی شخصیت اور فکر و فن سے متعارف کرایا ہے۔ کتاب کی قیمت واجبی ہے کہ یہ ایک بڑے افسانہ نگار کے تخلیقی سفر کی داستان ہے۔

کنور سین

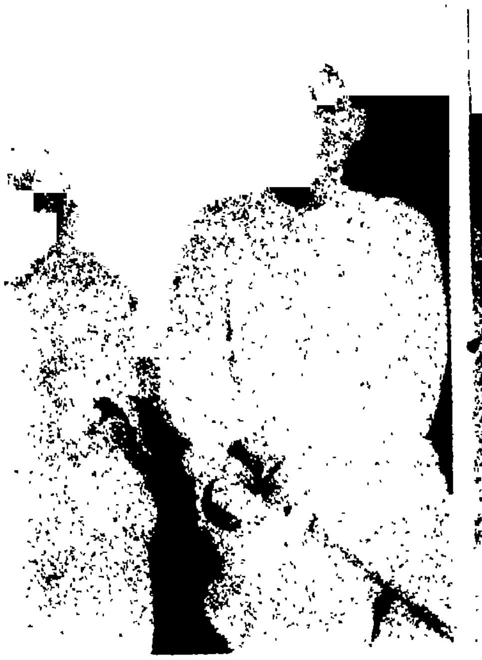

پریم چند اور ان کی دھرم پتنی شیورا

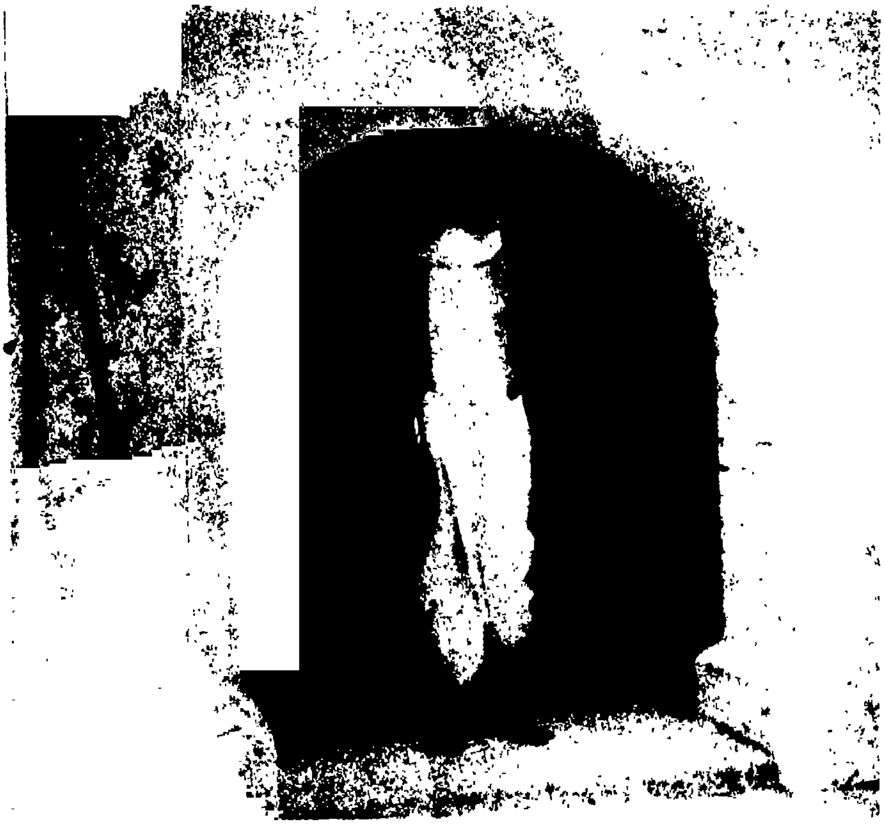

پریم چند کا آبائی مکان - جہاں وہ پیدا ہوئے تھے

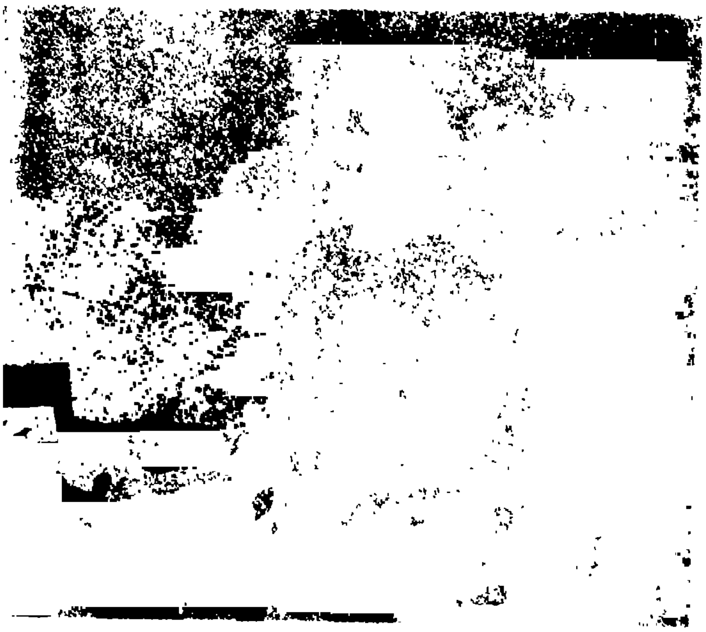

پریم چند — ابتدائی زمانے کی تصویر

ندی کے مشہور ادیب و شاعر جے شنکر پرشاد کے ساتھ

پریم چند
بستر
مرگ پر

02220

اب

آپ کی بچتوں پر اور بھی زیادہ سود

صرف چھ برسوں میں اپنی رقم کو دوگنی سے بھی زیادہ کیجئے

قومی بچت سرٹیفکیٹ (چھٹے اجراء) میں لگا کر

اس نئے سیریز میں ۱۰۰ روپے ۶ برسوں میں ۲۰۱٫۵۰ روپے ہوجاتے ہیں جس میں ۱۲ فیصد سالانہ کی شرح سے ششماہی مرکب سود بھی شامل ہے۔

ایک نیا ساتواں اجراء بھی ہے

جس میں ۱۲ فیصد سالانہ سود ششماہی قابل ادا ہوگا اور اصل زر ۶ سال کے بعد واپس کیا جائے گا۔

دونوں سیریز کو ۳ سال کے بعد بھنایا جا سکتا ہے۔ رقم لگانے کی کوئی حد نہیں۔ نامزدگی، شناختی پرچی اور منتقلی کی سہولیات۔ انکم ٹیکس کے مقاصد کے لئے سرٹیفکیٹ ڈاک گھروں سے بلا معاوضہ جاری کئے جاتے ہیں۔ ایک لاکھ ۵۰ ہزار روپے تک دولت ٹیکس سے چھوٹ۔ ۳۰۰۰ روپے سالانہ سود بمعہ دیگر متعینہ سرمایہ کاریوں پر سود کے انکم ٹیکس سے مستثنیٰ۔ یہ سرٹیفکیٹ ڈاک گھروں سے انفرادی یا مشترکہ طور پر یکم مئی ۱۹۸۱ء سے خرید سکیں گے۔

مزید تفصیلات کے لئے ان سے رجوع کیجئے

- ڈسٹرکٹ سیونگز افسر معرفت ڈسٹرکٹ کلکٹریٹ
- مجاز ایجنٹ
- نزدیکی ڈاک گھر
- ریجنل آفیسر، نیشنل سیونگز آرگنائزیشن (ریاستی/مرکزی سرکار)

یا لکھئے

قومی بچت ادارہ

۱۲- سیمینری ہلز ناگپور ۴۴۰۰۰۶

devp 81/30

اردو کا مقبول عام مصور ماہنامہ

آجکل

نئی دہلی

ایڈیٹر
شہباز حسین
اسسٹنٹ ایڈیٹر
محمد عادل صدیقی
سب ایڈیٹر
شونا تھ سکّہ

جلد ۳۹ شمارہ ۱

اگست ۱۹۸۰ء

شراون بھادوں شک سمت ۱۹۰۲

فون نمبر ۶۹ ۷۰ ۳۸

شرح چندہ

	ہندوستان	پاکستان	دیگر ممالک
سالانہ	۱۰ روپے	۱۶ روپے	۳ ڈالر ۱٫۵۰ پونڈ
دو سالہ	۱۷ روپے	۲۷ روپے	۵ ڈالر ۲٫۵۵ پونڈ
سہ سالہ	۲۴ روپے	۳۷ روپے	۷ ڈالر ۳٫۶۰ پونڈ
فی کاپی	ایک روپیہ	ڈیڑھ روپیہ	۳۰ سینٹ ۱۵ پنی

DELHI

ترتیب

اس خصوصی شمارے میں ۳۲ صفحات پر مشتمل
ایک ضمیمہ بھی شامل ہے جو بلا قیمت ہے۔

ملاحظات ―――― ۲
پریم چند ― حالاتِ زندگی ―― نندکشور وکرم ―― ۳
پریم چند، زمانہ، ذہن اور آرٹ ―― محمد حسن ―― ۵
پریم چند کی تخلیقات کا جمالیاتی پہلو ―― اصغر علی انجینیر ―― ۱۱
پریم چند اور طبقاتی جد و جہد ―― عظیم الشان صدیقی ―― ۱۶
محبِ وطن پریم چند ―― شمس الحق عثمانی ―― ۲۰
فلموں میں پریم چند ―― پریم پال اشک ―― ۳۰
پریم چند اور اچھوتوں کے مسائل ―― محمد عصیم ―― ۳۳
پریم چند کی ڈائری کا مطالعہ ―― کمل کشور گوینکا ―― ۳۸
کفن کے حوالے سے پریم چند کی پہچان ―― ابوالکلام قاسمی ―― ۴۱
میدانِ عمل ― دیہی تحریکات کی روشنی میں ―― سعید عارفی ―― ۴۹
پریم چند کی تاریخ پیدائش؟ ―― کمل کشور گوینکا ―― ۵۳
پریم چند بحیثیت سیرت نگار ―― آصف واسع ―― ۵۴
گئو دان تصنیف ہے یا ترجمہ ―― محمد یونس ―― ۵۶
پریم چند کی کہانیاں ―― شیلیش زیدی ―― ۵۹

سرورق: پریم چند
عمل: گورچرن لدوڑہ

ڈائرکٹر پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر "آج کل" اردو، پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترسیلِ زر کا پتہ
بزنس منیجر، پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

[illegible] آل انڈیا [illegible] مسلم [illegible] کانفرنس [illegible] جناب جگن ناتھ مشرا وزیر اعلیٰ بہار، جناب وشوناتھ پرتاپ سنگھ، وزیر اعلیٰ اتر پردیش، پرنس انجم قدر، جناب [illegible]، جناب [illegible]، جناب [illegible] قربان، جناب حیات اللہ انصاری (کھڑے ہوئے) سید سبط رضی (ممبر راجیہ سبھا)

پریم چند سیمینار: پریم چند کے صاحبزادے شری امرت رائے ڈاکٹر قمر رئیس کی کتاب "پریم چند۔ فکر و فن" کا اجرا کر رہے ہیں۔ یہ کتاب پبلی کیشنز ڈویژن وزارت اطلاعات و نشریات نے شائع کی ہے۔
(بیٹھے ہوئے۔ شری اندر کمار گجرال اور شری جنیندر کمار۔

ملاحظات

Accession numbers
.. 82220
Date....7..8
SV02

آزادی اور پریم چند

پریم چند ہمارے ان فنکاروں میں ہیں جنھوں نے اپنی ادبی زندگی کے آغاز سے ہی حبِ وطن اور ملک کی آزادی کے نغمے گائے۔ ان کا پہلا مجموعہ "سوزِ وطن" ضبط کرلیا گیا۔ اور ان کی آواز دبا دی گئی۔ مگر دل میں آزادی کی جو چنگاری جل اٹھی تھی وہ کبھی نہیں بلکہ وہ شعلہ بنتی گئی حتیٰ کہ ۱۹۲۰ء میں وہ سرکاری ملازمت سے مستعفی ہوگئے۔ اور پوری طرح جنگِ آزادی میں شریک ہوگئے۔

پریم چند سیاسی رہنما نہ تھے۔ فن کار تھے۔ انھوں نے اپنی کہانیوں، ناول اور اخبارات کے ذریعے ان تمام مسائل کو ابھارا جن کی وجہ سے ملک پسماندگی، غربت اور غلامی کا شکار تھا۔ انھوں نے ہماری دیہی زندگی کے بارے میں جتنا لکھا ہے اور جس دردمندی کے ساتھ لکھا ہے وہ کسی دوسرے ادیب کے حصے میں نہیں آیا۔ لوگوں میں سیاسی شعور پیدا کرنے، ملک کے بنیادی مسائل کو سمجھنے پسماندہ، غریب اور کچلے ہوئے طبقے کے تئیں ہمدردی پیدا کرانے میں پریم چند کی تحریروں نے نمایاں حصہ لیا ہے۔ آج سے ۳۳ سال پہلے ہمیں جو آزادی نصیب ہوئی ہے اس میں پریم چند ایسے ادیبوں کا خونِ جگر بھی شامل ہے۔

ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آزادی کے بعد ان تمام مسائل کی طرف توجہ دی گئی ہے جن کا پریم چند نے بار بار اپنی تحریروں میں ذکر کیا ہے۔ ان مسائل کی سنگینی اور شدت میں بہت کمی آئی ہے جن سے پریم چند کے وقت کے کسان، مزدور اور ہریجن دوچار تھے۔ چھوت چھات اب جرم ہے۔ گاؤں گاؤں میں اسکول اور کالج کھل گئے طبی سہولتوں میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ زرعی اور صنعتی پیداوار میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ زرعی اصلاح کے لیے بہت سے قدم اٹھائے گئے ہیں جن سے کسانوں کو فائدہ پہنچا ہے۔ زمینداری کا خاتمہ کر دیا گیا ہے۔ روزگار کے مواقع بڑھے ہیں۔ منظم حلقے کے مزدوروں کو وہ مراعات حاصل ہیں جن کا آج سے ۴۰، ۵۰ سال پہلے تصور بھی نہیں کیا سکتا ہے۔ غرض کہ ہر شعبۂ زندگی میں نمایاں بہتری آئی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ابھی بہت کچھ ہونا باقی ہے لیکن اگر ہم یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ ۳۳ سال کی مختصر مدت میں سینکڑوں برسوں کی پسماندگی توہمات اور جہالت کو ختم نہیں کیا جا سکتا تو یقیناً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آزادی کے بعد ہندوستان نے غیر معمولی ترقی کی ہے جس کا اعتراف ساری دنیا نے کی ہے۔

پریم چند نے اپنی تحریروں میں ایثار، قربانی، دیانت اور اصول پرستی پر زور دیا ہے۔ انھوں نے ہر اس قدر کو اجاگر کیا ہے جن سے انسان کو عزت و شرف حاصل ہے۔ پریم چند صدی کے موقع پر اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم دلوں کو ٹٹولیں اور دیکھیں ہم کس خانے میں ہیں۔ کیا ہم ان لوگوں کے ساتھ ہیں جن کی پریم چند نے مذمت کی ہے یا ہم ان کے ساتھ ہیں جنھیں پریم چند کی ہمدردیاں حاصل تھیں۔ ہم دوسروں کی زندگیوں کو بہتر بنانے اور سنوارنے، ملک کو اوپر اٹھانے اور معاشرے کو صالح بنانے میں کس حد تک ہاتھ بٹا رہے ہیں؟ سماج افراد پر مشتمل ہوتا ہے۔ وہی سماج ترقی کرتا ہے جو استحصال، خود غرضی اور تنگ نظری سے پاک ہو۔ لہٰذا پریم چند کو خراجِ عقیدت ہم اس طرح پیش کر سکتے ہیں کہ ان کے آدرشوں کو اپنائیں اور اپنے کو ان سانچوں میں ڈھالیں جو پریم چند ہمارے لیے چھوڑ گئے ہیں۔

اس خصوصی شمارے میں پریم چند کے فکر و فن سے متعلق متعدد مضامین شامل ہیں۔

یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا ہمیں ضرور لکھیں۔ ضخامت میں اضافے کے باوجود چند کتابت شدہ مضامین شریکِ اشاعت نہ ہو سکے۔ ہم ان مضامین کو عام شماروں میں شائع کرتے رہیں گے۔

خدمات کا اعتراف

پروفیسر سید ضامن علی کے جشنِ صد سالہ کے موقع پر ایک یادگاری ٹکٹ جاری کر کے حکومتِ ہند نے ضامن علی کی خدمات کا بجا طور سے اعتراف کیا ہے۔ شمالی ہندوستان میں اردو کی اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں انھوں نے جو خدمات انجام دی ہیں اس کا تقاضہ ہے کہ ہم ان کی خدمات کا اعتراف کریں اور انھیں اردو کے محسنوں میں شمار کریں۔

ضامن علی ۲۵ جون ۱۸۸۰ء کو مصطفیٰ آباد ضلع رائے بریلی میں پیدا ہوئے ان کے والد کا نام سید واجد علی تھا ضامن علی کم عمری میں شعر کہنے لگے۔ شاعری

پروفیسر ضامن علی

(فوٹو بشکریہ ہفتہ وار بلٹز، بمبئی)

میں ان کے استاد میر علی جید نیساں تھے۔

بقیہ ص ۱۱ پر

منڈ کشور کرم

پریم چند — حالاتِ زندگی

(ایک نظر میں)

جولائی ۱۸۸۰۔ بنارس (وارانسی) سے چار پانچ میل کے فاصلے پر واقع گاؤں لمہی متصل پانڈے پور میں پیدا ہوئے۔ والدین نے دھنپت رائے نام رکھا لیکن چچا نواب رائے کے نام سے پکارتے تھے۔

۱۸۸ — پڑوس کے ایک گاؤں کے مولوی صاحب کے مکتب میں اُردو فارسی پڑھنے کے لیے بٹھائے گئے۔

۱۸۸ — ان کی والدہ آنندی دیوی چھ مہینے تک بیمار رہ کر انتقال کر گئیں۔

— والد منشی عجائب لال کا تبادلہ جمن پور ہو گیا یہاں آنے کے کچھ دنوں بعد انھوں نے دوسری شادی کر لی۔ پریم چند سوتیلی ماں کو چاچی کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔

— منشی عجائب لال کا تبادلہ گورکھپور ہو گیا۔ وہاں مشن اسکول میں ان کا نام چھٹے درجے میں لکھوا دیا گیا۔

۱۸ — کوئنس کالج بنارس میں نویں جماعت میں داخلہ لیا۔

— موضع رام پور ضلع بستی کے ایک زمیندار گھرانے میں شادی ہو گئی۔ یہ شادی ان کے سوتیلے نانا نے کرائی تھی۔

۱۸ — چند ماہ بیمار رہ کر والد انتقال کر گئے۔

۱۸ — میٹرک کا امتحان سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔

— ایک با اثر ٹھاکر صاحب کی سفارش لے کر کالج پہنچے لیکن ریاضی میں کمزور ہونے کی وجہ سے داخل نہ ہو پائے۔

— پانچ روپے ماہوار پر ایک وکیل کے بچوں کو ٹیوشن پڑھانے پر مامور ہوئے۔

۱۸ — ایک پرائمری اسکول میں اٹھارہ روپے ماہوار پر اسسٹنٹ ماسٹر مقرر ہوئے۔

۱۹ — پہلی ملازمت چھوڑ کر بیس روپے ماہوار تنخواہ پر بہرائچ کے گورنمنٹ اسکول میں اسسٹنٹ ٹیچر ہو گئے۔ دو مہینے بعد ان کا تبادلہ پرتاپ گڈھ ہو گیا

۱۹ — بہرائچ سے ٹریننگ کے لیے ٹریننگ کالج الہ آباد بھیجے گئے۔ پرنسپل نے انھیں ٹریننگ کالج ماڈل اسکول کا ہیڈ ماسٹر مقرر کیا۔

۱۹ — اکتوبر میں ان کا پہلا ناول "اسرارِ محبت" بنارس کے ایک غیر معروف ہفتہ وار "آوازِ خلق" میں شائع ہونا شروع ہوا اکتوبر ۱۹۰۵ تک شائع ہوتا رہا۔

۱۹۰۴ — اپریل میں جونیئر انگلش ٹیچر سرٹیفکیٹ کا امتحان درجہ اوّل میں پاس کیا۔

— الہ آباد یونی ورسٹی سے ہندی اور اُردو میں اسپیشل ورنیکلر فائنل کا امتحان پاس کیا۔

— پرتاب گڈھ گورنمنٹ ہائی اسکول میں تقرر۔

— پریم چند کا ناول ہم خرما و ہم ثواب لکھنؤ کے ناول پریس سے بابو مہادیو پرشاد لکھنوی نے شائع کیا۔

۱۹۰۵ — مئی میں ان کا تبادلہ گورنمنٹ ہائی اسکول کانپور میں ہو گیا۔ ابتداً ان کا قیام منشی دیا نرائن نگم ایڈیٹر "زمانہ" کے یہاں رہا۔ پہلی بیوی میکے چلی گئی۔

— جون میں پہلی بار "زمانہ" کان پور میں ان کا مضمون "دیسی اشیا کو کیوں کر فروغ ہو سکتا ہے" شائع ہوا۔

۱۹۰۶ — ضلع فتح پور کے موضع سیلم پور کی ایک بال ودھوا شیو رانی دیوی سے دوسری شادی کی۔

۱۹۰۷ — اُردو ناول ہم خرما و ہم ثواب کا ہندی ایڈیشن پریما کے نام سے انڈین پریس الہ آباد سے شائع ہوا۔

— اُردو ناول "کشنا" شائع ہوا۔

— سب سے پہلی کہانی دُنیا کا انمول موتی شائع ہوئی۔

۱۹۰۸ — اگست میں زمانہ کان پور کے شمارے میں پہلی بار "سوزِ وطن" کا اشتہار شائع ہوا۔

— سب ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو کر مہوبہ ضلع ہمیر پور گئے۔

۱۹۰۹ — زمانہ پریس کان پور سے ان کی کہانیوں کا مجموعہ "سوزِ وطن" "نواب رائے" کے نام سے شائع ہوا جسے حکومت نے ضبط کر لیا۔

۱۹۱۰ — سوزِ وطن کی ضبطی کے بعد پریم چند کے قلمی نام سے لکھنا شروع کیا۔

— انٹر کا امتحان سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔

— "زمانہ" کان پور کے دسمبر کے شمارے میں پریم چند کے نام سے پہلی کہانی

"بڑے گھر کی بیٹی" منظر عام پر آئی۔
۱۹۱۲ — جلوۂ ایثار کا پہلا ایڈیشن انڈین پریس الہ آباد سے شائع ہوا۔ بعد ازیں یہی ناول "وردان" کے نام سے ہندی میں اشاعت پذیر ہوا۔
۱۹۱۴ — خرابیٔ صحت کی بنا پر مہوبہ سے تبادلہ کی درخواست دی لیکن امید کے خلاف تبادلہ روہیل کھنڈ کے بجائے ضلع بستی میں ہو گیا اور نیپال کی ترائی کا علاقہ ان کے سپرد ہوا۔ یہاں ہاضمہ خراب رہنے لگا اور پیچش کی شکایت شروع ہو گئی۔
— اپنے سسر کے بلاوے پر علاج کے لیے الہ آباد گئے اور ایک ماہ علاج کرانے کے بعد واپس بستی چلے گئے۔
— نصف تنخواہ پچیس روپے پر چند ماہ کی رخصت لے کر علاج کے لیے کان پور میں قیام پذیر رہے۔
۱۹۱۵ — جولائی میں بستی کے نارمل اسکول میں بطور ماسٹر تقرر ہوا۔
۱۹۱۶ — ۱۸ اگست کو بستی سے تبدیل ہو کر بحیثیت اسسٹنٹ ٹیچر نارمل اسکول گورکھپور پہنچے۔
۱۹۱۸ — بڑے بیٹے شری پت رائے کی ولادت۔
۱۹۱۹ — گورکھپور ہی میں ایک اور لڑکے کی پیدائش۔ جو چیچک ہو جانے سے جولائی ۱۹۲۰ میں انتقال کر گیا۔
— انگریزی تاریخ اور فارسی کے ساتھ بی اے کا امتحان پاس کیا۔
۱۹۲۰ — جلیاں والہ باغ کے خونیں حادثہ کے بعد جب گاندھی جی گورکھپور تشریف لائے تو ان کی تقریر سے متاثر ہو کر نوکری سے مستعفی ہونے کا فیصلہ کر لیا اس وقت تنخواہ ۱۲۵ روپے ماہوار تھی۔
— ۱۶ فروری کو ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔
۱۹۲۱ — ۱۸ مارچ کو گورکھپور سے بنارس کے لیے روانہ ہوئے۔
— جولائی میں گنیش شنکر ودیارتھی کی وساطت سے کان پور کے مارواڑی مہا ودیالیہ میں ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔
— اگست میں چھوٹے لڑکے امرت رائے کی ولادت۔
۱۹۲۲ — ۱۶ فروری کو مارواڑی اسکول کان پور سے مستعفی۔
— کان پور سے بنارس کے لیے روانگی۔
— ۱۵۰ روپے ماہوار پر "مریادا" کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ کاشی ودیا پیٹھ کے اسکول کے شعبے کا چارج لیا۔
— دارالاشاعت لاہور سے "بازارِ حسن" کی اشاعت ہوئی۔
— یکم اکتوبر سے اپنے ناول رنگ بھومی پر کام شروع کیا اور یکم اپریل ۱۹۲۴ کو اس کا مسودہ مکمل کیا۔
۱۹۲۳ — رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری اور ایک عزیز کے اشتراک سے سرسوتی پریس قائم کیا بعد میں حصے دار الگ ہو گئے۔
۱۹۲۴ — ۱۰ اپریل کو ناول "کایا کلپ" پر کام شروع کیا۔
— ۱۲ نومبر کو کایا کلپ کا دوسرا حصہ لکھنا شروع کیا۔

۱۹۲۵ — لکھنؤ چلے گئے اور گنگا پستک مالا میں ملازمت کر لی۔
— نومبر میں ان کا ناول "نرملا" "چاند" میں قسط وار شائع ہونا شروع ہوا اور نومبر ۱۹۲۶ تک شائع ہوتا رہا۔
۱۹۲۶ — اپریل میں بنارس چلے گئے اور دو سال تک پریس چلاتے رہے۔
۱۹۲۷ — جنوری سے ان کے پرانے ناول "پریما" (ہم خرما و ہم ثواب) کا ترمیم شدہ ایڈیشن "پرتگیا" کے نام سے "چاند" میں قسط وار شائع ہونا شروع ہوا۔ آخری قسط نومبر ۱۹۲۷ میں اشاعت پذیر ہوئی۔
— چوگان ہستی کا پہلا ایڈیشن دارالاشاعت لاہور سے شائع ہوا اس سے تین سال پیشتر یہی ناول ہندی میں "رنگ بھومی" کے نام سے گنگا پستک مالا کے ادارے سے چھپا تھا۔
۱۹۲۸ — مادھوری کے جنوری کے شمارے میں ان کی ایک مزاحیہ کہانی "موٹے رام شاستری" شائع ہوئی۔ لکھنؤ کے ایک وید کو کسی نے بہکایا کہ یہ ان پر طنز ہے۔ اس پر وید نے مادھوری پر مقدمہ دائر کر دیا۔
— اکلوتی بیٹی کی شادی کے فرائض انجام دیئے۔
۱۹۲۹ — جولائی میں دوبارہ ملازمت کے لیے لکھنؤ چلے گئے اور نول کشور پریس کے ہندی ماہنامہ مادھوری کی ادارت کے فرائض انجام دینے لگے۔
— گیلانی الیکٹرک پریس بک ڈپو لاہور سے نرملا ناول کی اشاعت۔ یہ ناول اس سے چھ برس پیشتر ۱۹۲۳ء میں چاند پریس الہ آباد سے ہندی میں شائع ہو چکا تھا۔
۱۹۳۰ — مارچ میں سرسوتی پریس بنارس سے اپنا نجی رسالہ "ہنس" جاری کیا۔
— جون میں پہلی بار "ہنس" سے ضمانت مانگی گئی۔
۱۹۳۱ — سال کے اوائل میں مشہور ناول "غبن" شروع کیا۔
— ۱۶ اپریل کو ہندی میں ناول "کرم بھومی" لکھنا شروع جو اگست ۱۹۳۲ میں شائع ہوا۔
— ۲۲ اگست کو ان کی ادارت میں ہفتہ وار "جاگرن" جاری ہوا۔
— ۱۱ نومبر کو نمک قانون توڑنے پر ان کی اہلیہ شورانی دیوی کی گرفتاری اور دو مہینے کی سزا۔
— پردۂ مجاز کی اشاعت۔
۱۹۳۲ — "میدان عمل" کو اپنے نجی ادارے "سرسوتی پریس" سے شائع کیا۔
— گئودان شروع کیا۔
— جون میں گئودان کی اشاعت۔
— ساہتیہ سبھا کی میٹنگ کے سلسلے میں پہلی بار دہلی آئے۔
۱۹۳۳ — فروری میں پریس کے مزدوروں نے ہڑتال کر دی۔
— مارچ میں بنارس ہندو یونی ورسٹی کے اجلاس میں شرکت کی۔
— اگست میں جاگرن کی ذمہ داری سنبھالی۔
۱۹۳۴ — مئی میں جاگرن بند ہو گیا۔

(بقیہ صـ۱۱ـ پر)

محمد حسن

پریم چند — زمانہ، ذہن اور آرٹ

یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ پچھلے چند سال ہمیں بعض نہایت اہم مفکروں، شاعروں اور نثر نگاروں کے سو سالہ جشن منانے گزرے ہیں۔ اقبال، محمد علی جوہر، فانی، حسرت، آغا حشر کشمیری اور اب پریم چند۔ ظاہر ہوتا ہے کہ سو سال قبل ہمارے سماج کے سامنے کوئی ایسی للکار تھی جس نے نئے سوالوں کے نئے جواب ڈھونڈھنے پر ملک کو مجبور کر دیا تھا اور انہی بنیادی سوالوں کے جواب ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے بعض بڑے ذہن اور بڑے ہو گئے اور ان کی آواز ہمارے دور کی آواز بن گئی۔

جب ماضی کے سایے لمبے ہونے لگیں اور تذلیل و تحقیر وقت کا دستور بن جائے تو افراد اور قوم اپنے تشخص کی تلاش کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں ہمارے ان نابغہ قبیلے کو بھی یہی صورت حال درپیش تھی غلامی کا زمانہ تھا اور یہ غلامی محض سیاسی نہیں تھی ذہنی اور تہذیبی بھی تھی اور ہمارے مغربی آقا اور ان کے ہم نوا اور ان کے آلۂ کار بار بار ہمیں یاد دلاتے تھے کہ ترقی کی دوڑ میں ایشیا اور خاص کر ہندوستان بہت پیچھے رہ گیا ہے اور اب سوا اس کے چارہ نہیں کہ مغرب کے سانچے میں خود کو ڈھالیں اور اپنی گزشتہ گمراہیوں سے توبہ کر کے نئی منزل کی طرف گامزن ہوں۔ یورپ ہندوستان کے لیے غلامی کی لعنت اور صنعتی انقلاب سے پیدا شدہ تہذیبی ترقی کی نعمت دونوں ایک ساتھ لے کر آیا تھا پریم چند کے دور تک اردو ناول اس دوراہے سے آگے نہیں گیا تھا یہاں صاف کھٹک تھی تو تبدیلی کی ناگزیریت اور لامقدر ہو چکا تھا اور ماضی سے لگاؤ کے باوجود اس کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے بار بار پلٹ کر دیکھنے کے باوجود مغرب ہماری تقدیر بن چکا تھا یہ کیفیت نذیر احمد کے ناولوں میں ——— خصوصاً ابن الوقت میں اور سرشار کے فسانۂ آزاد میں نمایاں تھی۔ ہاں شرر کے تاریخی ناول ماضی میں اعتماد کا سہارا ڈھونڈ رہے تھے اور رسوا کی امراؤ جان گویا اس قدیم لکھنوی تہذیب کی تمثیل تھی جو ایک معصوم مگر اغوا شدہ طوائف کی طرح بک چکی تھی اور دلاور خاں والا انجام تک پہنچنا باقی تھا البتہ "شریف زادہ" نے مغربی نظام کے لائے ہوئے امکانات سے سمجھوتہ کر چکا تھا۔

پریم چند نے اس دوراہے سے اپنا سفر شروع کیا۔ پریم چند کے سامنے مرکزی سوال نذیر احمد، سرشار، شرر اور رسوا سے مختلف تھا۔ پریم چند اسی مرحلے پر ۱۹۱۲ء میں دیا نرائن نگم کو لکھتے ہیں۔

"مجھے ابھی تک اطمینان نہیں ہوا کہ کون سا طرز تحریر اختیار کروں کبھی تو بنکم کی نقل کرتا ہوں کبھی آزاد کے پیچھے چلتا ہوں آج کل کاؤنٹ ٹالسٹائی کے قصے پڑھ چکا ہوں تب سے کچھ اس رنگ کی طرف طبیعت مائل ہے۔"

جی ہاں، بنکم چندر چٹرجی اور سرت چند اس سفر پر کبھی کے روانہ ہو چکے تھے ان کے ہاں اس نئی عصری حسیت کی گونج بھی تھی جو پریم چند کی نظروں کے سامنے بکھر رہی تھی اور ایک جذباتیت سے بھرا ہوا اسلوب بھی جس کے بارے میں پریم چند نے جینندر کمار کو لکھا تھا۔

"میں بنگالی نہیں ہوں وہ لوگ بھاوک (جذباتی) ہیں بھاوکتا (جذباتیت) سے جہاں پہنچ سکتے ہیں وہاں میری پہنچ نہیں۔ مجھ میں اتنی دین کہاں۔ گیان سے جہاں نہیں پہنچا جاتا وہاں بھی (بھاونا) جذبے سے ہی پہنچا جاتا ہے لیکن، جینندر، میں سوچتا ہوں کا ٹھنیہ (دشواری) بھی چاہیئے ... رابندر اور شرت دونوں مہان ہیں پر ہندی کے لیے کیا وہی راستہ ہے۔ شاید نہیں۔" [1]

فن کار پریم چند کے سامنے مرکزی سوال شاید صرف انسانی مسرت کی سرحدیں دریافت کرنے کا تھا ——— ظاہر ہے مسرت صرف مادی آسودگی کا نام نہیں انسان شخصیت کی تکمیل کو مسرت کا نام دیتا ہے انسان کی آرزو اور تکمیل کے درمیان پورے دور کی سبھی دیواریں، بندشیں، رکاوٹیں اور پیچیدگیاں اقتدار کی شکل میں کھڑی نظر آتی ہیں۔

پریم چند کا سماج نذیر احمد کے دور سے آگے قدم بڑھا چکا تھا جو فرد کی تکمیل اپنے نظام میں نوکری پانے کے بجائے سماجی فلاح کی شکل میں دیکھ رہا تھا۔ اپنے ہر ناول میں پریم چند نے جا بجا فرد کا یہی روپ سامنے رکھا ہے جس میں ہوس کی جگہ ایثار اور استحصال کی جگہ قربانی کو تکمیل اور انبساط کا راز قرار دیا گیا ہے۔ گئو دان میں مالتی اور مہتا کی محبت میں یہی پہلو جلوہ گر ہے میدان عمل میں سکھدا اور سکینہ دونوں ہی امرکانت کی شیدائی ہیں لیکن امرکانت کا رخ سکینہ کی طرف ہے۔ سکھدا کہتی ہے۔

"میرے دل میں تو کبھی تسلیم کی یہ کیفیت پیدا ہی نہیں ہوئی۔ میں ان سے ہنس کر بولنے اور اپنے حسن و شباب کی نمائش ہی میں پڑی رہ گئی۔ نہ کبھی پریم کیا نہ کبھی پریم پایا مجھے برسوں میں جو چیز نہ ملی وہ اسے منٹوں میں مل گئی۔"

میدان عمل ص ۲۳۲

اور یہ تسلیم و رضا، یہ قربانی اور ایثار کچھ عورتوں ہی کے لیے مخصوص نہیں ہے پریم چند نے اسے انسانی کردار کی کسوٹی، انسانی شخصیت کی تکمیل کا وسیلہ اور انسانی مسرت کی معراج مانا ہے ان کے سارے اہم کردار ذات اور غیر ذات کے اسی موڑ پر آ کر رفعت حاصل کرتے ہیں

---

[1] گولڈن بک آف سرت چندر کلکتہ صفحہ ۶۱

سورداس سے ہوری تک بسکینڈ سے مالتی تک۔ امرت رائے سے دیوکمار تک۔ فرد کو سماج سے ہم آہنگی کے ذریعے اپنی جس تکمیل کی خواہش یہاں نظر آتی ہے وہ اقبال کے تصور بے خودی کی یاد دلاتی ہے جس میں خودی کی تکمیل کے لیے صرف انفرادی خواہش اور آرزو کا آتش فشاں سینے میں پنہاں رکھنا اسی وقت سود مند ہوتا ہے جب اس کی گرمی اور تڑپ کو سماج یا ملت کی خواہشات اور بہبودی کا تابع کر دیا جائے خودی ابلیس ہے اور بے خودی سے پیوند ہو کر مرد کامل ہو جاتی ہے پریم چند اپنی رومانی خودی سے فرد کی تکمیل کے خواہش مند ہیں کہ پریم چند اور اقبال دونوں کے سامنے زمانے نے فرد کی تکمیل اور فرد کے سماج آفریں منصب کا سوال یکساں طور پر لا کھڑا کیا تھا۔

اقبال اور پریم چند کے درمیان مماثلتیں یہیں ختم نہیں ہوتیں دونوں فن کی مقصدیت کے قائل ہیں دونوں مغرب کی صنعت زدہ تہذیب میں روح انسانی کو گم ہوتے محسوس کرتے ہیں اور سورداس تو زمین کو فیکٹری کے لیے دینے کے بجائے جان دے دینا زیادہ پسند کرتا ہے دونوں فن میں کا ٹھینہ (سختی اور درشتی) کے قائل ہیں اقبال نے کوئلے کے ہیرا ہو جانے کا سبب ہی اسی سختی کو قرار دیا تھا دونوں ہندستان کی طرف دیکھتے ہیں روحانیت کی طرف بھی دیکھتے ہیں اور مذہب کی نئی توجیہہ کی طرف بھی کسی نہ کسی حد تک متوجہ ہوتے ہیں۔ اقبال رومی کے ذریعے اور پریم چند کچھ دنوں آریہ سماجی اثر اور کچھ دن بعد گاندھی جی کے اثر کے ذریعے دونوں آرزو کے قائل اور ربط ملت کے حامی ہیں اور دونوں اشتراکی نظام کو تقریباً یکساں طور پر لبیک کہتے ہیں۔

اور یہ مماثلتیں محض انہی دونوں فن کاروں کے درمیان نہیں ہیں آغا حشر اور غالب کے درمیان ایک طور پر اور محمد علی اور حسرت سے دوسری جہت سے موجود ہیں ان مماثلتوں پر نظر کیجیے تو جرمن مارکسی نقاد والٹیر بنجمن اور فرانسیسی نقاد پیرے شے رے Pierre Macherey کی یہ بات سچی معلوم ہونے لگتی ہے کہ تخلیقی فن کار خالق نہیں عصری حسیت کے اجزا اور عناصر کو نئی شکلوں میں متشکل کر کے پیش کرنے والا ہے۔

The author is essentially a producer who works up certain given materials into a new product .... process of transformation of a determinate given raw material into a determinate product, a transformation effected by a determinate human labour, using determinate means(of production..) The artist uses certain means of production_ the specialised techniques of his art to transform the materials of language and experience into a determinate product_ as quoted by Terry Eagleton: Marxism and Literary Criticism, London P 69

آغا حشر کے ڈراموں میں تقریباً انہی مسائل کی گونج ہے جو پریم چند کے ابتدائی ناولوں میں موضوع بحث بنے ہیں مثلاً بیوہ کی شادی۔ طوائفوں کا مسئلہ۔ مذہب کے خود ساختہ اجارہ داروں

کی تفرقہ پردازیاں (اسرار معابد اور یہودی کی لڑکی دونوں کی مماثلت) محمد علی کی حیثیت کو سیاسی ہے مگر آزادی کی تڑپ اور مغربی استحصال اور استبداد کے خلاف فرد کے اعلان جنگ کی جرأت مندی اور اس کی سماج آفرینی ان کے مضامین اور اشعار دونوں میں یکساں طور پر نمایاں ہے جو پریم چند کی مجموعے سوز وطن سے لے کر میدان عمل تک کو جگمگاتی ہے حسرت موہانی کی سیاست بھی انھیں اپنی عصری حسیت سے ملاتی ہے۔ اشتراکیت کی طرف ان کا رخ اور روحانیت کی طرف ان کا رویہ اور غزل میں ایک خاص انفرادی آرزو مندی اور نشاط درد مندی کی فضا رہنے خودی کی اسی سرشاری کی یاد دلاتی ہے جو خود پرستی سے نہیں ایثار پرستی سے ابھرتی ہے پھر فانی ہیں جو فرد کے اس کرب کے راز داں ہیں جس کی تکمیل آرزو کے راستے سماج نے روک رکھے ہیں اور جو اپنے تشخص کی جدوجہد میں ٹوٹ تو سکتا ہے جھک نہیں سکتا۔

گویا پریم چند کے دور کی حسیت بار بار فرد اور اس کی تکمیل کے درمیان حائل عناصر کی طرف اشارہ کر رہی تھی یہ عناصر کون تھے جنھوں نے انسان سے جینے کا حق اور مسرت کا قرینہ چھین لیا تھا جنھوں نے اس کی شخصیت کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس کی شخصیت کے ایک حصے کو دوسرے حصے سے برسرپیکار کر دیا تھا اس کے پورے وجود کو مسخ کر ڈالا تھا اور اسے جنگلی جانور میں تبدیل کر دیا تھا ـــــ اور یقین مانیے یہ محض استعارے نہیں ہیں [مرنال سین نے پریم چند کی کہانی 'کفن' پر اپنی فلم میں گھیسو اور مادھو کی جانوروں سے مماثلت پر خاصہ زور دیا ہے دونوں اشرف المخلوقات کے بجائے معمولی جانوروں کی حیوانی سطح پر زندہ رہنے کے لیے مجبور تھے انھوں نے جان لیا تھا کہ محنت انھیں آسودگی نہیں دے سکتی محنت کا پھل دوسرے چھین لے جاتے ہیں اس لیے محنت کرنا ہی حماقت ہے زمین سے نکال کر چرائے ہوئے آلو ان کی غذا، سستی اور نکمے پن میں پڑے رہنا ان کی عادت اور مستی اور حیوانی نشاط ان کا مقصد حیات۔] فرد اور اس کے سماج سے عدم مطابقت گویا پیداواری نظام اور پیداواری رشتوں کے درمیان اس تضاد کی نشان دہی کر رہے ہیں جو سماج میں انقلاب کا پیش خیمہ ہوتے ہیں۔ پریم چند اسی عصری حسیت کی آواز ہیں۔

یہ عصری حسیت سماجی استحصال کی اسی جبر سے تڑپتی ہوئی حسیت ہے جو اپنی تکمیل کے لیے مضطرب ہے اس اضطراب نے ہمارے سماج اور اس کی اقدار ہی کو نہیں ہماری شخصیتوں کو، ہمارے اندرون کو، ہماری ذاتی زندگی کو پارہ پارہ کر دیا۔ اس کا ایک مرکزی سبب تھا سیاسی غلامی اور اس سے پیدا ہونے والا نوآبادیاتی نظام۔ پروفیسر بپن چندر نے اپنے جبل پور کی انڈین ہسٹری کانگرس کے خطبۂ صدارت ۱۹۷۰ء میں بجا طور پر اشارہ کیا تھا کہ نوآبادیاتی نظام نے ثقافتی سطح پر سارے رشتوں اور اقدار کو منقلب کر دیا[1]

Colonial modernisation involved not only the Indian economy but also the patterns of social political, administrative, and cultural life. A whole world was lost, and entire social fabric was dissolved and new social framework came into being that was stagnant and decaying even as it was being born. To turn around a

[1] (فٹ نوٹس مضمون کے آخیر میں دیے گئے ہیں۔)

well_known phrase, India underwent a through going colonical ' cultural revolution.'
P. 8

آگے چل کر اس کے بعض مظاہر کی نشان دہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

.... the emergence of a new status system or hiearchical ladder of success; the structuring into the administrative machinery of corruption and an attitude of neglect, hostility, and appression towards the common people, breakdown of old loyalties and value systems leading to increasing social atomisation and anomic(or normlessness); the emergence of an intelligensia which on the one hand, accepted the role of an intellectual satellite of the materopolis even when struggling against it in the realm of economy and politics. p.9

ظاہر ہے اس صورت حال میں شخصی اور انفرادی تکمیل ذات کا راستہ جو سماج سے ہم آہنگی کی راہ ہے سماج کے موجودہ نظام کے ساتھ آویزش سے ہو کر گزرتا تھا ٹکرانے کے بغیر چارہ نہ تھا اور یہی تکمیل ذات اور عرفان ذات کا وسیلہ تھا۔

فرد سماجی تبدیلی کے قانون پر نظر رکھے بغیر سادہ دلی اور خلوص کے ساتھ اس سماجی شکنجوں سے ٹکرا جائے تو فانی کی قنوطیت ابھرتی ہے جس میں درد کی دل دوز نغمگی ہے مگر کائنات آفرینی کی قوت نہیں پریم چند اس ہفت خوان میں مختلف نرلوں سے گزرے ہیں۔ نرملا فانی ہی کی طرح سماج سے ٹکرائی اور ٹکرا کر پاش پاش ہو گئی شروع کے ناولوں کے کردار سماجی اصلاح کے دائرے سے گزرتے ہیں اور فرد کی باطنی اور روحانی تطہیر کے ذریعے تکمیل کی تلاش کرتے ہیں اور ناکام رہتے ہیں آہستہ آہستہ آسان اور آدرش وادی حل اپنی کشش کھونے لگتے ہیں۔

اس ضمن میں پریم چند کے ناولوں کے اختتام اور ان کے موضوعات پر غور کرنا نامناسب نہ ہوگا۔

۱۔ ہم خرما و ہم ثواب ۱۹۰۵۔ امرت رائے ایک بیوہ پورنا سے شادی کر لیتا ہے مگر اس کی پہلی محبوبہ پریما کا شوہر دان ناتھ جب امرت رائے کو قتل کرنے آتا ہے تو اسے بچانے میں پورنا جان دے دیتی ہے اور پریما اور امرت رائے کی شادی ہو جاتی ہے۔ سن اشاعت ۱۹۰۳ء

۲۔ جلوۂ ایثار ۱۹۰۶-۱۹۰۲۔ برجن شاعری اور بھگتی میں کھو جاتی ہے۔

۳۔ بیوہ — پورنا بیوہ ہو جاتی ہے اور بدری پرشاد کا آوارہ مزاج لڑکا اس کی عصمت پر حملہ کرتا ہے امرت رائے کے ودھوا آشرم میں اسے عزت کی زندگی حاصل ہوتی ہے۔

۴۔ بازار حسن ۱۹۱۷ — پدم سنگھ سمن کو گھر سے نکالنے پر پچھتاتے ہیں اور سمن کے لیے جو بیسوا ہو گئی ہے گجادھر جو سادھو ہو گیا تھا بیسواؤں کے لیے سیوا سدن قایم کرتا ہے اور سمن اس کی نگراں مقرر ہوتی ہے۔

۵۔ گوشۂ عافیت ۱۹۲۲۔ گیان شنکر مکاری سے گلستری کی ساری دیہی جائیداد پر اپنے بیٹے مایا کے لیے قبضہ کر لیتا ہے اور مایا اسے کسانوں میں بانٹ دیتا ہے۔

۶۔ نرملا ۱۹۲۷ — نرملا جہیز نہ ہونے کی وجہ سے ایک ادھیڑ عمر کے شوہر سے شادی کرنے پر مجبور ہوتی ہے اور آخر کار خانگی مصیبتوں سے تنگ آ کر خودکشی کر لیتی ہے۔

۷۔ غبن ۱۹۲۸ — جالپا اپنے شوہر کو جس نے اس کے لیے زیورات خریدنے کے واسطے بینک میں غبن کیا تھا غبن کی رقم بینک میں جمع کراتی ہے اور پولیس کے چنگل سے نجات دلواتی ہے۔

۸۔ چوگان ہستی ۱۹۲۴ — ونے اور صوفیا جو پانڈے پور کے مظلوم کسانوں کے ہمدرد ہیں خودکشی کر لیتے ہیں سورداس اپنی زمین کو فیکٹری کے لیے خریدے جانے کی جدوجہد میں زخمی ہو کر دم توڑ دیتا ہے۔

۹۔ پردۂ مجاز ۱۹۲۶ — چکر دھر سادھو ہو کر بستی بستی گھومنے لگتا ہے اور مہیندر چکر دھر کے بیٹے شنکھ دھر کی شکل میں دوبارہ جنم لیتا ہے اور نفس کی خواہشوں کی بنا پر تشنہ کام آرزوؤں کے ساتھ ایک بار پھر دنیا سے ناکام رخصت ہوتا ہے۔

۱۰۔ میدان عمل ۱۹۳۲ — امر کانت، سکھدا، منی اور افسر سلیم سب کسانوں کی تحریک میں شریک ہو جاتے ہیں اور امر کانت کے حامی بن کر جیل کاٹتے ہیں سکینہ کی شادی سلیم سے ہو جاتی ہے۔

۱۱۔ گئودان ۱۹۳۵ — ہوری اپنی چھوٹی سی آخری خواہش پوری نہیں کر پاتا دنیا سے ناکام رخصت ہوتا ہے اور دھنیا کہتی ہے گھر میں گیارہ آنے ہیں یہی ان کا گئودان ہے۔

ان خاتموں کے مطالعے سے پریم چند کے فکر و فن کے تاریخ وار ارتقا کا تجزیہ بھی ممکن ہے جو سر دست ہمارے موضوع سے خارج ہے مگر مختلف مسائل کے ان کے تجویز کردہ حل پر نظر ڈالی جائے تو ودھوا آشرم اور سیوا سدن قایم کر دینا یا کسی پرسکون گوشے میں سماجی فلاح کے کام شروع کرنا۔ سادھو ہو جانا یا بھگتی اور شاعری میں کھو جانا یا بہت آگے بڑھے تو زمین کسانوں میں تقسیم کر دینا ہی کم سے کم فوری طور پر کافی معلوم ہوتا ہے لیکن جیسے جیسے پریم چند کا ذہن زیادہ بالیدہ ہوتا جاتا ہے وہ حقیقتوں کی سنگینی کے زیادہ قائل ہوتے جاتے ہیں اور جب سورداس پانڈے پور کی لڑائی میں ہار مانتا ہے تو اس کے ہونٹوں سے یہ دردناک جملے بھی ٹپک پڑتے ہیں۔

"بس بس۔ اب مجھے کیوں مارتے ہو۔ تم جیتے اور میں ہارا۔ یہ بازی تمہارے ہاتھ رہی۔ مجھ سے کھیلتے نہیں بنا۔ تم ملے ہوئے کھلاڑی ہو۔ دم نہیں اکھڑتا۔ کھلاڑیوں کو ملا کھیلتے ہو اور تمہیں حوصلہ بھی اچھا ہے۔ ہمارا دم اکھڑ جاتا ہے۔ ہم ہانپنے لگتے ہیں ہم کھلاڑیوں کو ملا کر نہیں کھیلتے۔" صفحہ ۴۹۱

یہ احساس دھیرے دھیرے پنپتا جاتا ہے کہ مسائل کا حل نہ افراد کی قلب ماہیت

میں پوشیدہ ہے: سماجی اصلاح کے عارضی اقدامات ہیں ـــــ اس نظام کے اکھاڑ پھینکے بغیر کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے جس نے انسانوں کو حیوان بنا دیا ہے اور اس کو بھوکے شکاری کے خون آلود پنجوں اور دانتوں میں تبدیل کر رکھا ہے یا پھر مجبور اور بے بس شکار کے پیچ و تاب کی شکل دے دی ہے اور نظام کا اکھاڑ پھینکنا کوئی ہنسی کھیل نہیں۔ ہزاروں لڑائیاں ہاری جائیں گی ہزاروں لاکھوں انسان اپنی جان سے گزریں گے تب کہیں یہ نظام انسان کو آزادی کا ایک سانس لینے دے گا۔ سنگین احساس پوری قوت کے ساتھ پریم چند کی کہانی 'کفن' میں ظاہر ہوا ہے جو بقول ڈاکٹر قاضی عبدالستار، "جدید کہانی کا نقطۂ آغاز ہے اور جس نے انسانی خط و خال پر منڈھے ہوئے آتشیں حسن کے نقلی چہرے توڑ دیئے اور انسان کو اس کے حقیقی روپ میں دیکھنے کی کوشش کی اس کے داغوں اور زخموں کے مرہم کا خواب دیکھا۔

دراصل کفن داغ اور زخم کے مرہم کا خواب دیکھتا نہیں دکھاتا ہے اور اس اعتبار سے اس کا مختصر سا تجزیہ بے محل نہ ہوگا۔ 'کفن' میں پہلی بار پریم چند سماج کی تھوڑی بہت اصلاح کی جگہ اس کے مسلمات پر براہ راست اور دو ٹوک حملہ کرتے ہیں اور وہ بھی اس طرح کہ مذہبی رسوم یا مولوی پنڈت مہنت اور صوفیوں ہی کے اجارہ داری پر ضرب نہ پڑے پورا سماج بلبلا اٹھے آخر مردے کو کفن دینا کیا ضرور ہے خاص طور پر اسے جسے زندگی میں پہننے اوڑھنے کو معمولی کپڑے بھی میسر نہ آئے ہوں یہ وہی پریم چند ہیں جو مرنے کے بعد ہوری کے گئودان کے ارمان پر پورا ناول لکھ چکے ہیں۔ وہ اچانک پلٹ کر پوچھتے ہیں کہ آخر مردے کے کفن پر پیسہ ضائع کرنے کے بجائے مظلوم انسانوں کو جن کی زندگی جانوروں سے بدتر ہے اس رقم سے دو لمحے نشاط اور خوش وقتی کے میسر آجائیں تو کیا یہ کفن دینے سے کہیں بہتر کار ثواب نہیں ہے اور اس خیال کے لیے تکنیک کی جو بساط انھوں نے جمائی ہے اس کی بلاغت قابل غور ہے۔

کہانی کے پہلے جملے میں باپ اور بیٹا 'ایک بجھے ہوئے الاؤ کے سامنے خاموش بیٹھے بتائے گئے' ہیں یہ بجھا ہوا الاؤ گویا وہ پورا سماجی نظام ہے جس کے اندر اب کوئی نئی چنگاری کوئی نوائے سینہ تاب باقی نہیں جو اپنے امکانات ختم کر چکا اور اب شخصیتوں کو کچلنے والا بوجھ بن چکا ہے "جاڑوں کی رات ہے۔ فضا سناٹے میں غرق۔ سارا گاؤں تاریکی میں جذب ہوگیا ہے۔" گویا دو افراد اور ان کے سامنے کا یہ الاؤ پوری کائنات سے کٹا ہوا ایک تنہا منظر ہے جس کے سارے رشتے اور سبھی کڑیاں اور رابطے ٹوٹ چکے ہیں۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ ٹوٹے ہوئے رابطوں اور رشتوں کے منظرنامے میں باپ اور بیٹے (اور دور سے آتی ہوئی بیٹے کی بیوی کی درد میں ڈوبی کراہ) ہی کا رشتہ باقی ہے۔ جو انسانی استحصال کے نسلاً بعد نسلاً چلے آتے ہوئے سلسلوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور یہ سلسلہ اس بچے تک پھیلتا نظر آتا ہے جو ابھی پیدا نہیں ہوا ہے اور جس کی پیدائش ماں کو دردِ زہ میں مبتلا کیے ہوئے ہے۔

باپ اور بیٹا دونوں حیوان ہو چکے ہیں دونوں گویا قبائلی دور کے جانور نما انسانوں کی طرح زندہ ہیں زمین کے اندر سے آلو کھود کھود کر کھاتے ہیں اور مٹر اکھاڑ لاتے یا دس پانچ گنے توڑ لاتے پانی پیتے اور "وہیں الاؤ کے سامنے دونوں اپنی دھوتیاں اوڑھ کر پاؤں پیٹ میں ڈالے سو جاتے جیسے دو بڑے اژدر کنڈلیاں مارے پڑے ہوں۔" ان میں سے کوئی بھی چیختی ہوئی مرتی ہوئی عورت کی خدمت نہیں کرتا اور ان کی یہ بے دردی اور شقاوت محض اس وجہ سے ہے کہ بقول مادھو ان سے "اس کا تڑپنا اور ہاتھ پاؤں پٹکنا نہیں دیکھا جاتا" اور وہ اسے دیکھنے کے علاوہ اور کچھ کر بھی نہیں سکتے کہ "یہاں تو دھیلا بھی ایک روپیہ مانگتا ہے۔ کس کے گھر سے آئے۔" یہ دونوں پیدائشی طور پر ایسے نہ تھے جس نے انھیں انسان سے حیوان بنا دیا وہ یہ احساس تھا کہ وہ کام کریں تو بھی ان کی حالت جانوروں سے بہتر نہیں ہوگی اور فارغ البال وہی لوگ ہوتے ہیں "جو کسانوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا جانتے ہیں" پھر آخر تکلیف کام کرنے اور نہ کرنے دونوں میں ہے تو پھر کام چور اور نکھٹو ہونا ہی کیا برا ہے۔ ان میں سے کوئی اپنی حالت بہتر کرنے کی کوشش نہیں کرتا کیونکہ وہ شکنجہ جو انھیں کچل کچل کر حیوان بنا چکا ہے آخر ان کے توڑے ٹوٹ تو نہیں سکتا۔

اس شکنجے کی گرفت ایسی سخت اور اس کے پنجے اس قدر پھیلے ہوئے ہیں کہ اس سے نکلنا گویا فولاد کی دیوار سے سر ٹکرانے کے برابر ہے اور راستہ صرف یہ ہے کہ اس سے چرا کر دو سانسیں سکھ چین کی لے لی جائیں۔ سماجی نظام کے شکنجے پر اب پریم چند کی نظریں ایسی گڑی ہیں کہ زمیندار اس شکنجے کا ایک حصہ ہی نظر آتا ہے اور جسے وہ ہر ناول اور ہر کہانی میں ظالم اور بے درد دکھاتے آئے تھے یہاں طنز سے اس کی تصویر کشی بڑی کلبیت اور واقعیت سے کرتے ہیں۔

> "زمیندار صاحب رحم دل آدمی تھے مگر گھیسو پر رحم کرنا کالے کمبل پر رنگ چڑھانا تھا۔ ۔ ۔ مگر یہ غصہ یا انتقام کا موقع نہ تھا۔ طوعاً و کرہاً دو روپے نکال کر پھینک دیئے مگر تشفی کا ایک کلمہ بھی زبان سے نہ نکالا۔ اس کی طرف تاکا تک نہیں گویا سر کا بوجھ اتارا ہو۔"

کیسی سنگین تصویر ہے جیسے فولاد کا کوئی مجسمہ کسی کمزور انسان پر گر پڑا ہو اور وہ اس کے بوجھ کے نیچے مر رہا ہو یا جیسے Laocoon کے مجسمے کا اژدہا چاروں طرف سے کسی انسان کے گرد اپنی گرفت سخت سے سخت تر کرتا جا رہا ہو اور اس کی ہڈی ہڈی پسی جا رہی ہو۔

اور پھر شراب خانہ ـــــ جہاں قدم رکھتے ہی دونوں باپ بیٹے بغاوت کا علم بلند کرنے کا فیصلہ کر بیٹھتے ہیں کہ آخر لاش کو کفن دینا کیا ضرور ہے اور کفن پر روپیہ ضایع کرنے کے بجائے ان سے دو لمحے لذت اور نشاط دینے والی شراب کیوں نہ پی جائے کہ اصل شے تو انسانی مسرت ہی ہے۔

"ہاں بیٹا بیکنٹھ میں جائے گی کسی کو ستایا نہیں کسی کو دبایا نہیں۔ مرتے وقت ہماری زندگی کی سب سے بڑی لالسا پوری کر گئی۔ وہ بیکنٹھ میں نہ جائے گی تو کیا یہ موٹے موٹے لوگ جائیں گے جو گریبوں کو دونوں ہاتھوں سے لوٹتے ہیں اور اپنے پاپ دھونے کے لیے گنگا جاتے ہیں اور مندر میں جل چڑھاتے ہیں۔"

اور پھر گھیسو کا یہ جملہ جس کے بعد کہنے کو کچھ نہیں رہ جاتا اور گانا اور ناچ کہانی کی معراج فراہم کرتے ہیں۔

> "گھیسو نے سمجھایا "کیوں روتا ہے بیٹا۔ خوش ہو کہ وہ مایا جال سے مکت ہوگئی جنجال سے چھوٹ گئی۔ بڑی بھاگوان تھی جو اتنی جلدی مایا موہ کے بندھن توڑ دیئے۔"
>
> اور دونوں وہیں کھڑے ہو کر گانے لگے۔ ٹھگنی کیوں نینا جھمکاوے ٹھگنی۔

سارا مے خانہ محو تماشا تھا اور یہ دونوں میکش محویت کے عالم میں گائے جاتے تھے

پھر دونوں ناچنے لگے اچھلے۔ تی کودے بھی، گرے بھی، مٹکے بھی، بھاؤ بھی بتائے اور آخر نشہ سے بدمست ہوکر وہیں گر پڑے۔"

درد کی انتہا یہ ہے کہ نشاط میں ڈھل جائے آنسو کی انتہا یہ ہے کہ زہر خند بن جائے۔ اور اس درد، غصہ، بے بسی اور کرب نے انتہائی شکل ناچ اور گانے ۔۔۔ چھنی کیوں زینا جھمکا دے چھنی۔ کی شکل اختیار کرلی ہے اور یہ گویا اس آنے والے نشاط کے اشارے ہیں جو ہنوز پردۂ تقدیر میں ہے۔ یہ بھی محض اتفاق نہیں ہے کہ دونوں مرتے نہیں ہیں صرف نشے میں بدمست ہوکر گر پڑتے ہیں نشہ ٹوٹے گا پھر بدمستی ختم ہوگی اور درد کا پھر وہی سلسلہ جو موت سے بھی عظیم تر ہے۔

یہاں پریم چند اصلاح پسندی کے دائرے سے مکمل طور پر باہر نکل چکے ہیں یہ کہانی جرأت فکر ہی کی دلیل نہیں تکنیک کی بلاغت اور بلوغت کا بھی ثبوت ہے۔ اس کی تمثیلی تہہ داری۔ آغاز معراج اور اختتام کے بلیغ اشارے ۔۔۔ یوں تو ان کے ناولوں میں بھی ہیں (مثلاً میدان عمل اور گئودان کے ابتدائی پیراگراف پورے ناول کی فضا اور مرکزی فکر کے غماز ہیں) مگر اس کہانی میں تکنیک کی یہ فن کارانہ ترتیب اور واقعات، کردار اور جملوں کی مدد سے کہانی کا ہنر اپنے کمال پر ہے۔ یہ پریم چند وہی ہیں جو اس قسم کے فرحت بخش اور کیف آور منظر نامے لکھنے پر قادر تھے جو ان کے جمالیاتی شعور اور فن کارانہ چابک دستی کا تابناک ثبوت ہیں۔

"شمال کے کوہستانی سلسلوں کے بیچ میں ایک چھوٹا سا ہرا بھرا گاؤں ہے سامنے گنگا کسی دوشیزہ کی طرح ہنستی اچھلتی گاتی اور ناچتی نکلی جا رہی ہے۔ گاؤں کے پیچھے ایک اونچا پہاڑ کسی بوڑھے جوگی کی طرح جٹا بڑھائے سیاہ متین خیال میں محو کھڑا ہے"۔ یہ موضع گویا اس کی طفلی کی یاد ہے خوشیوں اور دلچسپیوں سے پُر۔ (میدان عمل ۱۹۳۲)

یا پھر جیون پر بھات کا یہ ٹکڑا۔

"دوپہر کی تمازت ہوا کے جھونکوں کے ساتھ گزر جاتی اچانک جھیل کے کنارے جامن کے درخت کے گھنے پتوں میں کوئل کی کوک سنائی دی مایا اپنے بچپن کی باتیں سنانے لگی ماں باپ اور بچپن کے ساتھیوں کا ذکر کرتے ہوئے اس کی پیشانی سے آنچل سرک گیا ۔۔۔ عہد طفلی کی یاد نے اس کے دل کو برما دیا ۔۔۔ راحت بخش ماں کی طرح (وہ) مہر مادری کے جذبے سے معمور تھی"۔ (اقتباس ۔ ڈاکٹر قمر رئیس پریم چند کا تنقیدی مطالعہ)

پریم چند بنیادی طور پر فن کار تھا اپنے سارے شعور اور عصری حسیت کو وہ کس طرح اپنے پڑھنے والوں کے لیے جمالیاتی تجربے میں ڈھال کر پیش کرسکے ہیں یہی ان کی پرکھ ہے جمالیاتی تجربہ دراصل پڑھنے والے میں اچانک اہتزاز کی سطح تک پہنچنے کا نام ہے جس کا احساس ممکن ہے اور بیان تقریباً ناممکن۔ ہر فن کار اس لمحۂ اہتزاز کو حاصل کرنے کے لیے اپنی تکنیک رکھتا ہے اور اسی کے ذریعہ پڑھنے والوں کو انوکھی کیفیت بخش دیتا ہے پریم چند ابتدائی دور میں واقعات کے ڈرامائی موڑ سے اور بعد کے ادوار میں کرداروں کے ڈرامائی ارتقا سے اہتزاز کی یہ کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آج کے کردار داستانوں کی طرح جامع کمالات تو نہیں ہیں سماجی طبقات کے نمائندہ اور بڑی حد تک Typical ہیں لیکن باطنی کشمکش سے ٹکراتی اندرونی شخصیتوں کی پکار سے آزاد ہیں یہ نفسیاتی پیچیدگیاں اردو کے افسانوی ادب میں پریم چند کے بعد آئیں۔ لیکن پریم چند کے کردار فنی ارتقا کی ایک اہم کڑی ہیں وہ نذیر احمد کے کرداروں کی طرح محض تمثیلی نہیں ہے بلکہ ان کی واضح انفرادی شخصیت ہے سرشار کی طرح وہ محض علامت نہیں ہیں جس کی بنا پر صلاح الدین احمد نے کہا تھا کہ سرشار نے فردوس بریں جیسا اعلیٰ ناول اردو کو دیا لیکن اردو ادب کو کوئی یادگار کردار نہ دے سکے سرشار کا خوجی سقا ہر دار بیگ اور کلیم یادگار کردار ہیں امراؤ جان ادا ان سب سے آگے ہے کہ اس کی محض انفرادی شخصیت ہی نہیں ہے تھوڑی بہت باطنی زندگی بھی ہے جو کشمکش سے یکسر خالی بھی نہیں ہے لیکن پریم چند کے کرداروں کی شخصیت ان سب سے زیادہ ہے گوبر۔ دھنیا۔ جھنیا۔ مالتی۔ مہتا۔ منوہر۔ غوث خاں۔ گایتری غرض یہ لوگ اپنے اپنے نام ہی نہیں رکھتے اپنے نام کے ساتھ پوری خصوصیات لے کر سامنے آتے ہیں یہ لوگ Abnormal نہیں ہیں محض Type بھی نہیں ہیں مگر نارمل انسان کی ساری عمومیت کو سمیٹ لینے کے بعد بھی اپنی باطنی زندگی اور فکر و احساس کے تانے بانے کے ساتھ اپنی انفرادیت کا انوکھا پن باقی رکھتے ہیں جو گوبر ہے وہ سورداس نہیں ہے اور گاؤں کا ہر نوجوان یا ہر سادھو منش بوڑھا نہیں ہوسکتا یقیناً ان کے کردار تہہ داری اور گہرائی سے بڑی حد تک محروم ہیں لیکن اس کے علاوہ وہ اپنے دور کے افسانوی ادب کے ارتقا کی اعلیٰ ترین مرحلے پر نظر آتے ہیں۔

پریم چند اپنے آرٹ کا تانا بانا کرداروں کے Juxta position سے تیار کرتے ہیں جان سیوک اور صوفیا چوگان ہستی میں دو مختلف نظام ہائے اقدار دو مختلف مزاجوں کے ساتھ ایک دوسرے کے مقابل ہیں سکھدا اور سکینہ کے کرداروں کا تضاد 'میدان عمل' کا مرکزی تضاد ہے۔ امر کانت اور سلیم اسی طرح ایک دوسرے کے مقابل ہیں پریم چند کے ناولوں اور افسانوں میں جمالیاتی کیفیت کا لمحۂ اہتزاز کرداروں کے ڈرامائی ارتقا کے ذریعے پیدا کرتے ہیں ارتفاع کی وہ سطح جب اچانک انسان کو واقعات کا نیا ادراک حاصل ہوتا ہے اور وہ خود غرضی لالچ اور استحصال کی دلدل سے ابھر کر اچانک ایثار کے معنی سیکھتا ہے اور دوسروں کے لیے جینے کے سکھ سے دوچار ہوتا ہے یہ لمحہ اس کو نہیں ناول کے پڑھنے والوں کو بھی زندگی کی نئی پہچان اور جمالیاتی سرشتی کے نئے کیف سے دوچار کردیتا ہے۔

پریم چند واقعات اور کردار کا وہ توازن قائم رکھتے ہیں جسے ٹالسٹائی کے سلسلے میں لوکاچ نے ہیگل سے اصطلاح مستعار لے کر کلیت سے تعبیر کیا ہے واقعہ سیدھا سادا نہیں ہے بلکہ ہر اہم واقعے سے کردار کی نشوونما یا اس میں تبدیلی کے نئے موڑ پیدا ہوتے ہیں یا سامنے آتے ہیں مثلاً 'میدان عمل' میں 'ستیہ نراین کتھا' کی محفل محض ایک مذہبی یا تہذیبی رواج کی تصویر کشی نہیں ہے بلکہ اسی کتھا سے ہریجنوں کے اخراج سے وہ کشمکش پیدا ہوتی ہے جو آخرکار سکھدا کو ایک مغرور اور خود پرست عورت سے ایثار پسند مجاہد میں تبدیل کردیتی ہے۔ واقعات اور مناظر اس اعتبار سے افسانوی کلیت کا حصہ بن جاتے ہیں اور ایک وسیع تر منظر نامہ فراہم کرتے ہیں پھر کردار میں تبدیلی لانے والے یہ واقعات کرداروں کے دلوں میں جو ہلچل پیدا کرتے ہیں خیالات کی جو سلسلہ در سلسلہ لہریں ابھارتے ہیں انھیں پریم چند اپنے لفظوں میں اور اپنے احساسات و جذبات کے آئینے میں نہیں اسی کردار کی بساط اور ماحول کے مطابق بیان کرتے جاتے ہیں مثلاً منوہر جب غوث خاں کے مظالم سے بچنے کے لیے اسے قتل کردیتا ہے اور پولیس گاؤں کے سبھی نوجوانوں کو اس قتل کے الزام

میں گرفتار کرلیتی ہے بے گناہ ملزم منوہر کو کوستے اور ملامت کرتے ہیں وہ دکھ سے نڈھال ہو کر ایک رات جیل کی تیرہ و تار کوٹھری میں تنہا پڑا سوچتا ہے۔

"ابھی تو اگہن کی فصل کی وجہ سے گھر میں کھانے کو ہوگا مگر کھیت تو بوئے نہ گئے ہوں گے۔ چیت میں جب ایک دانہ بھی پیدا نہ ہوگا اور بال بچے دانے دانے کو روئیں گے تب ان کی کیا حالت ہوگی معلوم ہوتا ہے کہ اس کھیل میں کھنڈل ہوگئے ہیں نوچے ڈالتے ہیں اور یہ رونا سال دو سال کا نہیں۔ کہیں سب کالے پانی بھیج دیئے گئے تو جنم بھر کا رونا ہے" گوشۂ عافیت صفحہ ۱۴۴ بحوالہ قمر رئیس، پریم چند کا تنقیدی مطالعہ صفحہ ۲۴۴۔

خیالات کی رو جیسے قدرتی ڈھنگ سے کردار کے ذہن اور مزاج کے مطابق بہتی ہے یہاں پریم چند نہیں بولتے منوہر بول رہا ہے۔ پریم چند کردار اور واقعات کے ذریعے ذہنی تبدیلیوں کے ذریعے آرٹ کی بنیاد اٹھاتے ہیں اور اپنے ناولوں میں جمالیاتی کیف اور عرفان اور ادراک کا جادو جگاتے ہیں۔

پریم چند محض پرانی تاریخ کا ورق نہیں ہیں انھیں صرف بیتے دنوں کی پرچھائیوں کی تلاش میں نہیں پڑھا جانا چاہیئے یہ الگ بات ہے کہ یہ پرچھائیاں بھی ان کے ہاتھ میں اور یہ دور کا اعلیٰ ادب اس دور کی مستند تاریخ اور معتبر عکس بھی ہوتا ہے مگر اس کی معنویت محض عکاسی میں مضمر نہیں اس کیف زائی اور کیفیت آفرینی میں مضمر ہوتی ہے جس کے ذریعے وہ اپنے علاقے کے باہر اور اپنے زمانے کے بہت دن بعد بھی اپنے پڑھنے والوں کو مسرت اور بصیرت کے لمحۂ اہتزاز بخش سکتا ہے اور نئی حسیت اور نیا فکری ارتعاش عطا کر سکتا ہے پریم چند کے ناولوں کے صفحات جگہ جگہ سے فرسودہ ہو گئے ہیں مگر ان کے بیشتر حصوں میں یہ قوت اور توانائی موجود ہے حق تو یہ ہے کہ اقبال اور پریم چند ذہنی توانائی کے ایسے دو مستقر ہیں جن سے اردو کا تخلیقی ادب آگے کی اڑانیں بھرنے کے لیے روانہ ہوا ہے۔

بعض نقادوں کو پریم چند کے فرد جرم بڑی طویل نظر آتی ہے جرم یہ ہے کہ پریم چند کی کہانیوں اور ناولوں میں پلاٹ اور قصے کی اہمیت ہے جرم یہ ہے کہ وہ واقعات بیان کرتے ہیں پھر ان کے ہاں کردار ہیں اور کردار بھی ایسے جو سیدھی سادی زندگی کے معمولی کردار ہیں ان کے ہاں نہ مجرم، نہ جیب کترے، نہ خبطی اور دیوانے نہ نفسیاتی الجھنوں کے مریض جرم یہ بھی ہے کہ ان کے کرداروں کی اندرونی زندگی ایسی بٹی ہوئی نہیں ہے کہ ان کی مجموعی شخصیت یا کردار کی پہچان مشکل ہو جائے جرم یہ بھی ہے کہ پریم چند اپنے اردگرد کی زندگی کی عکاسی کو اہمیت دیتے ہیں پھر یہ قصور تو بالکل ہی ناقابل معافی ہے کہ پریم چند فن کو محض اپنی ذات کی پہچان کا ذریعہ نہیں سمجھتے۔

اس فرد جرم میں کچھ باتیں صحیح ہیں کچھ میں نیم صداقت ہے اور کچھ یکسر حریفانہ انداز نظر۔ ظاہر ہے پریم چند اردو میں افسانوی ادب کا حرف تکمیل نہیں ہے زمانہ ان کے بعد بھی گرم سفر رہا ہے اور رہے گا فکر و نظر کی نئی راہیں نکلیں گی اور تکنیک اور فنکاری کے نئے اسلوب دریافت ہوں گے مگر بعد کی آنے والی جدتوں کی ذمہ داری پریم چند کی نہیں ہے دوسروں کی ہیں اور دوسرے بھی وہ جو ابھی تک استناد اور اعتبار حاصل نہیں کر سکے ہیں لیکن پریم چند محض سماجی عکاس نہیں تھے وہ اپنے دور کے اہم سوالوں سے دوچار تھے اور یہ سوال تھا فرد کی شخصیت اور اس کے امکانات کی سرحدوں کے تعین اور ان سرحدوں کی پہچان کا سوال۔ ان کے ہمعصروں میں کوئی اس کا جواب مرد کامل میں تلاش کر رہا تھا کوئی بلوا منگل میں (آغا حشر) کوئی غزل کے پیرائے میں (حسرت) تو کوئی تصور مرگ میں (فانی) پریم چند نے اپنے تخلیقی سفر کے اختتام پر یہ راز پایا کہ فرد اور اس کی ذات کی تکمیل کے درمیان جو عناصر حائل ہیں فرد کی تکمیل انھی عناصر کو مٹانے کی جدوجہد میں شرکت اور براہ راست شمولیت ہی کے ذریعے ممکن ہے فرد اپنی تکمیل تک پہنچ سکتا ہے تو اس کائناتی اور سماجی شمولیت کے ذریعے ہی عرفان کا تنہا سرچشمہ اور نجات کا واحد وسیلہ ہے۔

لیکن فرد کی شخصیت کو مسخ کرنے والے یہ عناصر محض چند روشن خیال افراد کے احساس شمولیت سے دور نہیں کیے جا سکتے۔

پریم چند اپنے ہمعصروں سے اپنے تاریخی شعور کے اعتبار سے آگے ہیں وہ کھلی آنکھوں دیکھتے ہیں کہ شخصیت کو مسخ کرنے والے عناصر کو دور کرنے والی قوتیں وہی ہوں گی جو سماج کے اکثریتی طبقے یعنی محنت کشوں کی قوت ہوگی اور اسی وجہ سے انھوں نے اپنا رشتہ فکری اور فنی اعتبار سے کسانوں اور محنت کشوں سے جوڑا جو سماجی تبدیلی ہی کے لیے فرد کی تکمیل کا واحد وسیلہ ہے۔ اینگلز نے اسی لیے کہا تھا کہ فرد کو حسن سے لطف حاصل کرنے کے لیے اور اس کو احساسِ فن کی منزل تک پہنچنے کے لیے اس انقلاب کے عمل سے گزرنا ضروری ہے اور اقبال۔ محمد علی جوہر۔ فانی۔ حسرت اور آغا حشر کے دور کی یہ آواز پریم چند کے الفاظ میں اس طرح اظہار پاتی ہے۔

"انسان فطرتاً دیوتاؤں کی طرح ہے۔ زمانے کے جال و فریب یا حالات سے مجبور ہو کر وہ اپنا تقدس کھو بیٹھتا ہے ادب اسی تقدس کو اپنی جگہ مستحکم کرنے کی کوشش کرتا ہے ــــ اپدیشوں سے نہیں، نصیحت سے نہیں ــــ جذبات کو متحرک کر کے دل کے نازک تاروں پر چوٹ لگا کر، نیچر سے ہم آہنگی پیدا کر کے" پریم چند: کچھ وچار ص۷

بحوالہ جعفر رضا: پریم چند کہانی کار ص ۱۵۱

انسان کے گم شدہ تقدس کی بازیافت کی یہی کوشش پریم چند کا کرشمہ بھی ہے اور کارنامہ بھی۔

---

۱. P. 1

۲. ملاحظہ ہو میدان عمل کا پہلا پیراگراف۔ ہماری تعلیم گاہوں میں جتنی سختی سے فیس وصول کی جاتی ہے اتنی سختی سے شاید کاشتکاروں سے مال گزاری بھی وصول نہیں کی جاتی . . . ایسے جابرانہ قواعد کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ غریبوں کے لیے مدرسے کے دروازے بند کر دیئے جائیں وہی ناہمدرد حکومت جو دوسرے صیغوں میں نظر آتی ہے ہمارے مدرسوں میں بھی ہے وہ کسی کے ساتھ رعایت نہیں کرتی کوئی عذر نہیں سنتی۔ ص ۵

ملاحظہ ہو گئودان میں رائے صاحب کا کردار۔ پچھلی ستیہ گرہ کی لڑائی میں رائے صاحب نے بڑا نام کمایا تھا کونسل کی ممبری چھوڑ کر جیل گئے تھے جبھی سے ان کے علاقے کے اسامیوں کو ان سے بڑی عقیدت ہو گئی تھی یہ نہیں کہ ان کے علاقہ میں اسامیوں کے ساتھ کوئی رعایت کی جاتی ہو یا تاوان بیگار کی سختی کچھ کم ہو مگر یہ ساری بدنامی مختاروں کے سر تھی . . . قوم پرست ہونے پر بھی (رائے صاحب)

حاکموں سے میل جول قائم رکھتے تھے۔ گئودان ص ۱۷۔

۳ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ ٹالسٹائی کا ناول Resurrection ۱۸۹۹/۱۹۰۰ میں رنگ بھومی شائع ہوا تھا اس کا قصہ کچھ اس طرح تھا کہ شہزادہ نحملودوف اپنی ڈرانی کتوشا کو حاملہ بنا تا ہے۔ اس بے گناہ دوشیزہ کو قتل کے الزام میں سزا ہو گئی ہے وہ تلافی کے طور پہ اپنے تمام جائیداد کسانوں میں بانٹ دیتا ہے اور کتوشا سے شادی کرنے کے لیے سائبریا تک جاتا ہے مگر کتوشا یہ سمجھ کر شادی سے انکار کر دیتی ہے کہ شہزادہ اس سے محبت کی وجہ سے نہیں بلکہ ہمدردی اور رحم کی بنا پر شادی کر رہا ہے۔

گوشۂ عافیت پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک ہندی نقاد نے اسے ریزرکشن کا ترجمہ قرار دیتے ہوئے کرداروں میں یہ مساواتیں اور مماثلتیں ظاہر کی ہیں۔

نخلوروف : (گیان شنکر + پریم شنکر + مایا شنکر) × $\frac{1}{2}$

پر نتوادھک تر نخلوروف کا کچھ حصہ : گیان شنکر

گیان شنکر : نخلوروف + کی +

پریم شنکر : نخلوروف + کرداف + نواقف)

مایا شنکر : نخلوروف + ایک دیارگی) × $\frac{1}{2}$ -

امرت رائے : قلم کا سپاہی، ص ۲۴-۲۲۳۔ بحوالہ ڈاکٹر جعفر رضا : پریم چند فن اور تعمیر فن، کتابستان الہ آباد، ۱۹۷۷، ص ۱۸۸۔

۴ جدیدیت اور ادب۔ ص ۱۸۰۔

۵ پریم چند نے ایک جگہ لکھا ہے " میں حقیقت پسند نہیں ہوں۔ کہانی میں چیزیں جوں کی توں رکھی جائے تو سوانح عمری ہو جائے گی دستکار کی طرح ادیب کا حقیقت پسند ہونا ضروری نہیں وہ ہو بھی نہیں سکتا ادب کی تخلیق گروہ انسانی کو آگے بڑھانے اٹھانے کے لیے ہوتی ہے ۔۔۔ مثالیت مفید ہو لیکن حقیقت پسندی اور فطری انداز کے برعکس نہ ہو۔ اس طرح حقیقت پسند بھی مثالیت کو نہ بھولے تو بہتر ہے۔ بحوالہ کاشری شری نواسل بھارئیہ مضمون۔ سوریہ آتما کی سمرتی ہیں۔ پریم چند سمرتی انک مئی ۱۹۳۷۔ بحوالہ جعفر رضا، پریم چند کہانی کار ص ۱۹۴

۶ یہاں بھگت سنگھ اور گاندھی جی کے تصور فرد اور اس کے امکانات کے تصور کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے۔

بقیہ حالاتِ زندگی

۱۹۳۴ — ۳۱ مئی کو اجنتا سنے ٹون کے لیے 'مل مزدور' کی کہانی لکھنے کے سلسلے میں بمبئی پہنچے۔

— ۲۳ جولائی کو اہلیہ کو بمبئی لانے کے لیے بنارس آئے۔

— ۳۱ جولائی کو واپس بمبئی پہنچ گئے۔

— ۲۸ دسمبر کو جنوبی ہند کی سیر کرتے ہوئے مدراس پہونچے۔

۱۹۳۵ — ۲۵ مارچ کو بمبئی کی فلمی دنیا' کو خیرباد کہہ کر واپس بنارس چلے آئے۔

— اکتوبر میں 'ہنس' ہندی ساہتیہ سمیلن کے حوالے کر دیا۔

۱۹۳۶ — ہنس کی ادارت بھی پریشد نے سنبھال لی۔

— آخری ناول 'غبن' کی نئی ادارے سرسوتی پریس سے اشاعت۔ اُردو میں یہ ناول ایک سال بعد مکتبہ جامعہ' دہلی سے شائع ہوا۔

— ۹-۱۰ اپریل کو لکھنؤ میں ترقی پسند مصنفین کے پہلے اجلاس کی صدارت کی۔

— لکھنؤ سے لاہور تشریف لے گئے جہاں آریہ پرتی ندھی سبھا اور دیگر انجمنوں نے شاندار استقبال کیا۔

— اپریل میں ساہتیہ پریشد کے اجلاس میں شرکت کے لیے ناگپور گئے۔ اجلاس میں مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو بھی شریک ہوئے تھے۔

— ۱۶ جون کو کئی بار قے ہوئی اور خون کے دست آئے۔

— ۱۹ جون کو 'آج' کے دفتر میں مشہور روسی ادیب میکسم گورکی کے انتقال پر بیماری کے باوجود تعزیتی جلسے میں شامل ہوئے۔ اور اس کے لیے خطبہ بھی لکھا۔

— ۲۵ جون کو خون کی قے ہوئی اور بیماری نے شدید صورت اختیار کر لی۔

— جون ۱۹۳۶ کے ہنس میں سیٹھ گووند داس کے مضمون کو حکومت نے قابلِ اعتراض ٹھہرا کر ضمانت مانگی۔ اس پر ہنس بند کر دینے کا اعلان کر دیا۔

— ۲۵ جولائی کی رات کو ڈھائی بجے پھر خون کی قے۔

— ۲ اگست کو اپنے بڑے بیٹے شری پت کے ساتھ ایکسرے کرانے لکھنؤ گئے۔

— ۷ اکتوبر رات تین بجے تک ہندی ادیب جینندر کمار سے گفتگو کرتے رہے۔

— ۸ اکتوبر کو صبح ساڑھے سات بجے ۵۶ برس کی عمر میں انتقال کر گئے۔

بقیہ ملاحظات

ضامن صاحب نے میور کالج الہ آباد سے فارسی میں ایم۔ اے کی ڈگری لی اور الہ آباد یونیورسٹی کے شعبہ فارسی و عربی میں لکچرار مقرر ہوئے۔ سر گنگا ناتھ جھا کی وائس چانسلری کے زمانے میں اردو کے لیے ایک علیحدہ شعبہ قائم کرنے کی تجویز منظور ہوئی اور ۱۹۲۴ء میں پہلی بار بی۔ اے میں اردو کی کلاسیں شروع ہوئیں۔ دو سال بعد پوسٹ گریجویٹ تعلیم کا انتظام ہو گیا۔ وہ پہلے شعبۂ اردو میں لکچرار مقرر ہوئے اور بعد میں صدر شعبہ کے عہدے تک پہنچے۔ پہلے علومِ شرقیہ کے نام سے فارسی اور عربی کے شعبے قائم تھے اور اردو کو ثانوی حیثیت حاصل تھی۔ ضامن علی نے جو راستہ دکھایا اس سے دور رس نتیجے نکلے اور رفتہ رفتہ اردو کے علیحدہ شعبے قائم ہونے لگے۔

ضامن صاحب کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی وقیع تصنیف "اردو زبان و ادب" کو بے حد پسند کیا گیا۔ دوسری تصانیف میں اردو شاعری، خریدۃ الفوائد، اور خط شکست بھی قابلِ ذکر ہیں۔

وہ ہندوستان اکیڈمی الہ آباد کے ابتدا سے ہی ممبر تھے۔ اور اس کے ترجمان ہندوستانی کے اردو سکشن کے مدیر کئی برسوں تک رہے۔

ان کی غزلیں اور مراثی بھی ادبی قدر و قیمت کے حامل ہیں۔ افسوس ہے کہ اپنی زندگی میں وہ ان کی تدوین نہ کر سکے اور ۲۵ اپریل ۱۹۵۵ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ جواہر لال نہرو کے الفاظ میں وہ اردو کے "عظیم مجاہد" تھے۔ اس عظیم مجاہد سے متعلق تفصیلی مضمون شائع کر کے ہمیں بڑی خوشی ہوگی۔

اصغر علی انجینیر

پریم چند کی تخلیقات کا جمالیاتی پہلو

پریم چند اردو اور ہندی میں جدید افسانے کے بانی مبانی ہیں اور اپنے طور پر ایک بڑے فنکار بھی۔ پریم چند کے فن کے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے اور لکھا بھی جاتے گا۔ میں یہاں ان کی تخلیقات کے جمالیاتی پہلو سے بحث کروں گا۔ ظاہر ہے کسی بھی تخلیقی فنکار کی تخلیقات کا جائزہ جمالیاتی احتساب کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ اردو تنقید میں اور چیزوں کے علاوہ جمالیاتی احتساب (Aesthetic Evaluation) کے عنصر کی بھی خاص کمی محسوس ہوتی ہے۔ آج کل کی تنقید کا محور جدیدیت اور ترقی پسندی کی بے معنی بحث بن کر رہ گیا ہے۔ اس تنازع میں الجھ کر نقاد اکثر فنی احتساب کے اہم تقاضوں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اگر نقاد کا تعلق جدیدیت سے ہے تو اس کا سارا زور اس بات پر صرف ہوتا ہے کہ فن میں کمٹ منٹ اور ابلاغ قطعاً غیر ضروری ہے اور اگر وہ ترقی پسند ہے تو وہ کمٹ منٹ اور ابلاغ کی اہمیت جتاتے نہیں تھکتا۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو تنقید کو اس غیر ضروری بحث کے دائرے سے باہر نکالا جائے تاکہ وہ فنی تقاضوں کے اہم اجزا، جن میں جمالیاتی عنصر بھی شامل ہے، کا بخوبی احتساب کر سکے۔

اس بات پر تقریباً سبھی نقادوں کا اتفاق ہے کہ پریم چند ایک بڑے فنکار ہیں۔ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ کسی صنف یا شئے کا بانی اس صنف کی تاریخ میں اس حیثیت سے اہم مقام پاتا ہے مگر یہ بہت کم ہوتا ہے کہ وہ اس صنف کو نقطۂ عروج پر بھی پہنچا دے۔ میرے نزدیک پریم چند کی عظمت اسی بات میں پنہاں ہے کہ انھوں نے اردو افسانے اور ناول کو اپنے ابتدائی دور میں ہی اس قابل بنا دیا کہ وہ اس صنف کے اہم فنی تقاضوں کو پورا کرنے کے قابل ہو جائے۔ اردو ادب میں پریم چند کے سامنے محض داستانی اور رومانوی نمونے (اس میں سارا زور شہزادے اور شہزادیوں کے حسن و عشق پر ہوتا تھا۔) موجود تھے جن میں حقیقت نگاری سے زیادہ فنطاسیہ پر زور ہوتا تھا۔ پریم چند کی دورِ اوّل کی کہانیوں (جن میں سوزِ وطن کی بھی بعض کہانیاں شامل ہیں) میں بھی کہیں ایسا ہی اسٹائل نظر آتا ہے۔ لیکن پریم چند اس مرحلے سے بہت جلد گذر گئے اور اردو کہانی کو جدید دور کے تقاضوں سے روشناس کرنے کی طرف متوجہ ہو گئے۔

جمالیاتی اعتبار سے پریم چند کا یہ فنی موڑ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ افلاطونی جمالیات میں انعکاس کا نظریہ (Theory of Reflection) کی بڑی اہمیت ہے۔ افلاطون کہتا ہے کہ فنکار کی تخلیق خارجی دنیا کے حالات کو منعکس کرتی ہے۔ اس نظریے کی باریکیوں اور تفصیلات میں ہم یہاں نہیں جانا چاہتے مگر یہ کہنا شاید کافی ہوگا کہ کئی صدیاں گذر جانے کے بعد بھی اس نظریے کی سچائی میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ پریم چند نے بھی جمالیات کے اس پہلو کی صداقت کو سمجھا اور اپنے فن کو خارجی حقیقتوں کے انعکاس کے لیے وقف کر دیا۔ جمالیات میں اس بات پر بھی خاصی بحث ہوتی رہی ہے کہ اس انعکاس کا مقصد کیا ہے؟ ایک فنکار اپنے تخیل کے ذریعے خارجی حقیقت کو کیوں منعکس کرتا ہے؟ بہتر افہام و تفہیم (Comprehension) کے خاطر یا تفریح طبع (Pleasure) کے خاطر۔ لانگیر (Langer) اور اس کے ہم خیال اس بات پر زور دیتے ہیں کہ آرٹ کا بنیادی مقصد بہتر افہام و تفہیم ہے اور اس طرح ان کے نزدیک فن عقلیتی کردار (Intellectual Character) رکھتا ہے۔ اس کے برخلاف بعض ماہر فن جمالیات فنی کو تفریح کا ذریعہ قرار دیتے ہیں اور اس کے علمی اور عقلی (Cognitive) رول کی نفی کرتے ہیں۔

اگر اس روشنی میں دیکھا جائے تو پریم چند ایک حد تک لانگیر سے زیادہ قریب نظر آتے ہیں۔ انھوں نے اپنی کہانیوں اور ناولوں کے ذریعے اپنے دور کے ہندوستان کی سماجی حقیقتوں کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہے کہ پریم چند اپنی کہانیوں یا ناولوں کو بنیادی طور پر کسی خاص فلسفۂ حیات کا پرچار کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں اور باقی تمام باتیں محض ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ کم از کم پریم چند کے یہاں ایسا ہرگز نہیں ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی تخلیقات کے ذریعے اپنے دور کی سچائیوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور فن کو محض تفریح طبع کے لیے استعمال نہیں کرتے۔ وہ بعض جدیدیت کے حامیوں کی طرح فن کو محض اپنے ذاتی کرب یا Alienation کے

اظہار کا ذریعہ بھی نہیں سمجھتے یوں کہ ذاتی کرب خارجی حالات سے پیدا ہونے والی مختلف گذران کیفیتوں کا ایک پہلو ہے۔ پریم چند نے ونود شنکر ویاس کے نام ایک خط میں ادب اور جمالیات کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے:

"میرے خیال سے۔ اور ہم سب کے خیال سے۔ ادب کے تین مقاصد ہیں یعنی کہ جذبات کی تطہیر (Catharsis)، تفریح اور کشف (Revelation)۔ لیکن ایک طرح سے تفریح اور کشف Catharsis کے عمل میں ہی شامل ہیں کیونکہ ادیب جس طرح کی تفریح مہیا کرتا ہے وہ قلابازوں اور نقالوں یا بھانڈوں کی تفریح سے مختلف ہوتی ہے۔ (ادب سے حاصل ہونے والی) تفریح میں جذبات کی تطہیر کی کیفیت موجود ہوتی ہے۔ اگر تطہیر کا مقصد سامنے رکھا جائے تو کشف کی کیفیت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ ہم داخلی ذہنی کیفیت دکھاتے ہیں اس لیے نہیں کہ ہمیں کوئی فلسفہ پیش کرنا ہوتا ہے بلکہ اس لیے کہ ہم خوبصورت کو اور خوبصورت اور بدصورت کو اور بدصورت بنا سکیں۔"

اس خط کے ذریعے پریم چند کے جمالیاتی نظریات پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ ارسطو کی طرح ادب سے جذبات کی تطہیر کا کام لینا چاہتے ہیں لیکن اسی تطہیر کے عمل میں وہ تفریح اور کشف کے عمل کو بھی شامل سمجھتے ہیں اور یہ بڑی اہم بات ہے۔ ادب کو وہ نودولتیوں کی طرح سستی تفریح کا ذریعہ نہیں بنانا چاہتے (سرمایہ دارانہ نظام میں اکثر ڈرامہ، ادب حتیٰ کہ شاعری کو بھی سستی تفریح کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور دوسری اشیاء کی طرح ادب بھی جنس بازار بنا جاتا ہے)۔ پریم چند کے نزدیک لانگیر کی طرح جس کا اوپر ذکر کیا گیا' ادب عقلی کردار بھی ہے جسے وہ کشف کا نام دیتے ہیں یعنی تخلیقی ادب نئی حقیقتوں کے کشف کا ذریعہ بنتا ہے اور اہم بات یہ ہے کہ یہ پیچیدہ عمل جذبات تطہیر کی کیفیت میں ہی شامل ہے۔ پریم چند نے اپنے جمالیاتی نظریے کی وضاحت کرتے ہوئے ایک اور اہم بات یہ کہی ہے ایک فنکار کا کام خوبصورت کو زیادہ خوبصورت اور بدصورت کو زیادہ بدصورت بنا کر پیش کرنا ہے (پڑھنے والوں کو خوبصورتی (زندگی کی اچھائیوں) سے زیادہ لگاؤ پیدا ہو اور بدصورتی (سماج اور زندگی کی خرابیوں) سے زیادہ نفرت۔ یہاں یہ بات جتانے کی ضرورت نہیں کہ پریم چند کی مراد خوبصورتی اور بدصورتی سے ہیئت کی خوبصورتی یا بدصورتی نہیں ہے بلکہ یہ جمالیات کا بڑا ہمہ گیر تصور ہے جس میں جذباتی کیفیات بھی شامل ہیں اور زندگی کی مثبت اور منفی قدریں اور ادیب کے آدرش بھی۔ یہاں اس کی تھوڑی سی وضاحت بےجا نہ ہوگی۔

امکان (Possible) اور حقیقت (Actual) میں ہمیشہ ایک تناؤ کی کیفیت ہوتی ہے۔ ادیب امکان کا تعین ہمیشہ اپنے آدرشوں سے کرتا ہے اور موجودہ حقیقت (Actual) اسے اپنے آدرشوں سے دور زندگی کی خوبصورتیوں کا تضاد نظر آتی ہے جن کے امکان کا تعین وہ کرتا ہے۔ موجودہ حقیقت (افلاس، جہالت، اونچ نیچ، لوٹ کھسوٹ، دولت کی غلط تقسیم وغیرہ وغیرہ)، سماج کو بدصورت بناتی ہے اور (ادیب ایک امکانی دنیا کی خوبصورتی (جہاں یہ سب کچھ نہیں ہوگا جو آج کے سماج کو بدنما بنائے ہوئے ہے) کو کچھ غلو کے ساتھ (خوبصورت کو اور خوبصورت بنا کر) پیش کرتا ہے اور اپنے قلم کے زور سے لیکھک امکان اور حقیقت کے درمیان پائے جانے والے تناؤ کو اپنے تخلیقی فن پارے کا حصہ بنا دیتا ہے۔ فن پارے میں پایا جانے والا یہ تناؤ جتنا شدید ہوگا' اس کی جمالیاتی کیفیت میں اتنا ہی اضافہ ہوگا۔ کانٹ بھی ادب سے متعلق اپنے جمالیاتی نظریے میں اس تناؤ کو ضروری قرار دیتا ہے۔ پریم چند نے اسی بات کو مندرجہ بالا خط میں بہت ہی آسان لفظوں میں پیش کر دیا ہے۔

بالزاک نے اسٹینڈھال کی تخلیقات پر تبصرہ کرتے ہوئے بڑے معرکے کی بات لکھی ہے۔ بالزاک لکھتا ہے:

" A writer does not know his craft if he chooses for his subject the external glitter of great historical events instead of the internal riches found in the characteristic development of social elements."

بالزاک نے یہاں جمالیات کے ایک بہت ہی اہم پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کسی بھی فن پارے میں خوبصورتی اور قوت (قاری کو متاثر کرنے کی قوت)، تاریخ کے عظیم الشان واقعات کی خارجی چمک دمک بیان کر دینے سے نہیں ہوتی، بلکہ اصل قوت اور خوبصورتی کا سرچشمہ اس داخلی ثروت میں ہوتا ہے جو سماجی عناصر کے مخصوص طور پر ہونے والے ارتقائی عمل میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ یہ بات ہمارے عام مشاہدے کی ہے کہ اگر چھوٹا فن کار کسی عظیم تاریخی واقعے پر کہانی یا ناول لکھتا ہے تو وہ اس کے External Glitter میں الجھ کر رہ جاتا ہے اور اپنے فن پارے میں قوت پیدا کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ اس کے برعکس ایک بڑا فنکار اس خارجی چمک دمک میں نہیں الجھتا بلکہ ان داخلی سرچشموں کی تلاش کرتا ہے جو اس تاریخی واقعے کے تمام تضادات اور اُن سماجی عناصر کی نشاندہی کر سکے جن سے اس عظیم تاریخی واقعے کے تانے بانے بنتے ہیں۔ وہ فرانسیسی انقلاب ہو یا روسی انقلاب یا ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد ان پر عظیم ناول اسی صورت میں لکھا جا سکتا ہے جب یہ شرائط پوری ہوں جن کی طرف بالزاک اشارہ کر رہا ہے۔

پریم چند نے ایسے دور میں لکھنا شروع کیا جب ہندوستان ایک

زبردست بحرانی دور سے گذر رہا تھا۔ برطانوی حکومت نے صدیوں پرانے ہندوستانی سماج میں نئے پیداواری رشتے اور ایک حد تک نئی پیداواری طاقتوں کو جنم دیکر حرکت پیدا کر دی تھی۔ یہ محض ماضی کی طرح حکمرانوں کی تبدیلی ہی نہیں تھی، برطانوی حکومت نے ایک نئے سماجی نظام کو بھی جنم دیا تھا۔ پریم چند نے اپنی دوربیں نگاہوں سے اس فرق کو محسوس کر لیا تھا۔ اُن کی آنکھیں کبھی خارجی چمک دمک پر مرکوز نہیں رہیں۔ ان کی تیز بیں نگاہیں اس کے پیچھے دیہاتی ہندوستان میں پائے جانے والے تضادات اور یہاں کے مفلس عوام کی داخلی زندگی میں خام مواد تلاش کرتی ہیں اور وہ اپنی کہانیوں اور ناولوں کے ذریعے امکانی اور حقیقی کے درمیان پائے جانے والے تناؤ کو پورے شدت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ہندوستان کی اصل طاقت کا سرچشمہ انھیں دیہات کے ان مفلس عوام میں نظر آیا جو اپنی زندگی میں معمولی سی خوشگواری پیدا کرنے کے لیے سخت سے سخت مشقتوں کا سامنا کرتے رہتے ہیں اور اس معمولی سی خوشگواری کی تمنا اپنے سینوں سے لگائے آخر موت کی آغوش میں سو جاتے ہیں۔ گؤدان میں ہوری ایک ایسا کردار ہے ہوری کی ایک چھوٹی سی تمنا ہے جو روایتی معاشرے میں ہر ہندوستانی کسان کی ہوتی ہے یعنی کہ ایک گائے حاصل کرنے کی تمنا۔ یہ تمنا ہوری کی زندگی کی جدوجہد کا محور ہے اور پریم چند اس ناول میں دیہاتی زندگی کے تمام تضادات اور تلخیوں کو بھرپور طریقے سے اس میں اُجاگر کر دیتے ہیں۔

برطانوی حکومت نے اپنے استحصالی مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک ایسی تبدیلی کا عمل ہندوستان کے روایتی معاشرے میں پیدا کر دیا تھا جس پر اُن کا بھی قابو پانا مشکل تھا۔ تبدیلی کے اس عمل نے ہندوستانی عوام میں نہ صرف آزادی کا جذبہ پیدا کیا بلکہ ایک نیا سماجی شعور بھی بخشا۔ ہندوستان کی تاریخ کا یہ دور ایک سے زیادہ معنی میں بڑا ہی اہم دور تھا۔ بالزاک نے فرانس کے روایتی معاشرے اور اس کے اشرافیہ طبقے کو ٹوٹتے بکھرتے ہوئے دیکھا اور تاریخ کے اس عمل کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا۔ حالانکہ اس کی ہمدردیاں فرانس کے اشرافیہ کے ساتھ تھیں لیکن ایک عظیم فنکار ہونے کی حیثیت سے وہ اس تاریخی عمل کے داخلی سرچشموں تک پہنچ کر اپنی تخلیقات میں ایک زبردست تاثر پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پریم چند کی ہمدردیاں تو ہندوستان کے بدلتے ہوئے روایتی معاشرے میں اشرافیہ کے ساتھ نہیں بلکہ ان کے مظالم اور استحصال کے شکار مفلس و نادار کسانوں کے ساتھ تھیں اس لیے ان کی شاہکار تخلیقات جیسے کہ گؤدان اور کفن میں بڑا زبردست تاثر پیدا ہو جاتا ہے اور ہم پریم چند کی فنکارانہ عظمت کو خراج تحسین پیش کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ کئی افسانہ نگار جن کی واقعات اور ان کے پیچھے رو بہ عمل پیچیدہ طاقتوں پر گرفت نہیں ہوتی، زبان کا سہارا لیتے ہیں اور سارا زور اسی پر صرف کرتے ہیں۔ پریم چند کی زبان بہت ہی سادہ ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کے افسانوں اور ناولوں کے زیادہ تر کردار دیہات سے تعلق رکھتے ہیں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ زبان کے نوک پلک درست کرنے پر وقت صرف کرنے کے بجائے ظاہری واقعات کے پیچھے ان قوتوں کی تلاش پر صرف کرتے ہیں جو ان واقعات کو زیادہ حقیقی اور زندگی سے قریب لانے میں مدد دیتی ہیں۔ جمالیات کے کئی اہم اجزا ہیں اور اس کی حرکی اور بدلتے ہوئے سماج کے مختلف مسائل کو جب تخلیقی ادب کا موضوع بنایا جاتا ہے تو یہ بات خاصی اہمیت اختیار کر لیتی ہے کہ جمالیات کے کن پہلوؤں پر زور دیا جائے۔

اگر زبان پر قدرت حاصل ہو تو ایک خوبصورت فطری منظر کو بڑی ہی خوبصورتی اور تاثر کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے۔ اکثر کم صلاحیت والے افسانہ نگار اور شاعر بھی ایک جامد منظر کو اپنی تخلیقات میں خوبی کے ساتھ پیش کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن یہ تو جمالیات کا ایک پہلو ہے۔ جب ایک سماج تبدیلی کے عمل سے دوچار ہوتا ہے تو کئی انسان اس عمل سے مختلف طریقوں سے متأثر ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر جب برطانوی حکومت ہندوستان میں قائم ہوئی اور نئی معاشی اور سماجی قوتیں وجود میں آئیں تو ان سے کروڑوں عوام متأثر ہوئے۔ شہروں میں برطانوی کارخانوں کا مال درآمد ہونے لگا اور لاکھوں چھوٹے بڑے دستکار اس سے تباہ ہو گئے۔ اپنی جڑوں سے اکھڑ گئے۔ دیہاتوں میں برطانوی رعیت واری نظام نے دیہات کے قدیم خودمختار کردار کو تباہ کر کے جاگیردارانہ نظام کو ایک نئی شکل دی جس سے غریب کسانوں کے استحصال میں اور اضافہ ہو گیا۔ ان تبدیلیوں سے پرانے سماجی اور انسانی رشتے بھی متأثر ہوئے ظاہر ہے لاکھوں عوام کو اس عمل نے اپنے زد میں لیا اور پرانے نظامِ حیات اور انسانی رشتوں کے ٹوٹنے بکھرنے نے اس دور کے متأثر عوام میں کرب اور بے چینی کی کیفیت پیدا کی۔ پریم چند کے کردار انہی متأثر طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے افسانوں اور ناولوں میں تبدیلی کے اس عمل سے پیدا ہونے والے کرب کو بڑی کامیابی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ دراصل جمالیات کا یہ بڑا ہی مشکل اور پیچیدہ پہلو ہے اور اس سے وہی پوری ذمے داری کے ساتھ عہدہ برآ ہو سکتا ہے جس کی سماجی تبدیلیوں کی تہ در تہ پیچیدگیوں پر پوری گرفت ہو۔ بالزاک کو مارکس نے عظیم فنکار اسی لیے قرار دیا ہے کہ وہ انقلاب فرانس سے پیدا شدہ پیچیدہ سماجی حالات اور مختلف افراد کی سیچویشن، ان کی خوشیوں اور ان کے غم، اشرافیہ طبقے کے غرور اور حالات سے سمجھوتا نہ کرنے کا غیر تاریخی موقف وغیرہ چیزوں کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ اپنے ناولوں اور ان کے کرداروں کے ذریعے پیش کرتا ہے۔ کوئی بھی فنکار ان باتوں کو نظرانداز کر کے عظیم فنکار نہیں بن سکتا۔ ٹالسٹائی کی عظمت کا بھی یہی راز ہے۔

جمالیات کا اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ فن کار اپنے کردار کے کرب یا مسرت کا کس طرح زیادہ سے زیادہ پُراثر طریقے سے اظہار کرے؟ دوسرے لفظوں

میں اظہار کا مسئلہ خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ کیا علامتوں سے اس کا اظہار کیا جائے یا فنطاسیہ کے ذریعہ؟ بیانیہ طریقہ اپنایا جائے یا شعور کی رو جیسی تکنیک؟ دراصل مؤثر اظہار کا کوئی واحد ذریعہ نہیں ہو سکتا اور صرف زبان پر قدرت بھی اس کا نعم البدل نہیں ہو سکتی۔ آئی۔ اے۔ رچرڈس جو جمالیات کے نوشوتیتی اسکول سے تعلق رکھتا ہے کہتا ہے کہ فن کار کا کمال یہ ہے کہ اظہار کے لیے اپنی زبان میں جذباتی شدت پیدا کرے۔ لیکن مسئلہ اتنا آسان نہیں ہے جتنا کہ بظاہر نظر آتا ہے۔ بعض مراحل اظہار کے ایسے ہوتے ہیں کہ محض جذبات کی شدت اور اس کے لسانی اظہار سے کام نہیں چل تا۔ یہی وجہ ہے کہ ادب میں علامت، استعارے، فنطاسیہ وغیرہ سے بھی کام لینا پڑتا ہے کیونکہ بعض وقت کربناکی کو عام بول چال کی زبان کے الفاظ برداشت نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد یورپ میں جب شدید سماجی اور سیاسی بحران پیدا ہوا تو ادیبوں اور فنکاروں کے سامنے اظہار کا مسئلہ پیدا ہوا کہ اس بحران سے پیدا ہونے والے شدید انسانی کرب کو تخلیقی ادب کے ذریعے کس طرح پیش کیا جائے۔ اسی ادبی بحران کے پیش نظر دادا ازم (Dadaism)، سرریلزم، شعور کی رو، جیسی تحریکوں اور تکنیکوں کی ابتدا ہوئی۔ ہمیں یہاں اس بات سے بحث نہیں ہے کہ بعض ادیبوں نے زندگی اور سماج کی طرف منفی رویہ اختیار کرتے ہوئے ان تکنیکوں کو اپنایا۔ بہر حال بنیادی مسئلہ تو اظہار کا ہی تھا۔ تکنیک بذات خود اچھی یا بری قدروں کی نمائندہ نہیں ہوتی وہ تو محض اظہار کا ذریعہ ہے۔

پریم چند کے دور میں ہندوستان میں سیاسی اور سماجی بحران ضرور پایا جاتا تھا مگر اس کا مقابلہ یورپ میں جنگ عظیم سے ہونے والی ہلاکت خیز لوں اور اس کے سماجی بحران سے نہیں کیا جا سکتا۔ یورپ کے لیے تو وہ سرمایہ داری کے زوال اور اس کے اصلی کردار اور اس کی سفاکیوں کی بے نقابی کا دور تھا۔ سپر بلسٹ طاقتیں آپس میں لڑ رہی تھیں اور تمام انسانی قدروں کو تباہ کر رہی تھیں۔ ہندوستان اپنی آزادی کی جنگ لڑ رہا تھا۔ ہندوستان کے دیہی علاقوں میں زمینداروں کی لوٹ کھسوٹ جاری تھی اور نئی معاشی قوتوں کے تحت اس کے معاشرے میں دھیرے دھیرے تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ لیکن یورپ کی طرح ہندوستان جنگ کی تباہ کاریوں کا بلا واسطہ شکار نہیں تھا۔ اسی لیے پریم چند کے سامنے اظہار کا مسئلہ اپنی پوری سفاکی اور شدت کے ساتھ پیش نہیں آیا اور انھوں نے حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے یورپی اسالیب کے برخلاف سیدھا بیانیہ انداز اختیار کیا لیکن چونکہ خارجی حالات اور سماجی تبدیلی کی پوشیدہ اور پیچیدہ طاقتوں پر ان کی گرفت تھی۔ اس بیانیہ انداز کے باوجود انھوں نے ہمیں بعض ایسی تخلیقات دیں جن کو عالمی ادب میں مقام دیا جا سکتا ہے۔ ہندوستان کے دیہاتوں کا اصل مسئلہ افلاس کی شدت انسانوں میں زندگی، اخلاقیات اور مذہب کی طرف ایک ایسا رویہ پیدا کرتی ہے جو مقبولِ عام رویے سے بالکل مختلف بلکہ چونکا دینے والا ہوتا ہے۔ اس کا بہترین نمونہ ہمیں پریم چند کے افسانے "کفن" میں ملتا ہے۔ کفن ہندوستان کے دیہاتوں کے افلاس کی عریاں حقیقت کو اس کی پوری سفاکی کے ساتھ پیش کرتا ہے اور ان حالات میں انسانی برتاؤ کا بغیر کسی اخلاقی رو و رعایت کے ایماندارانہ مطالعہ ہے۔ یہاں اظہار سے زیادہ اخلاقی بحران کا مسئلہ درپیش ہے اور اس میں شک نہیں کہ پریم چند نے سیدھے سادے الفاظ میں انتہائی افلاس سے پیدا شدہ اخلاقی بحران کو بڑی کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

گئودان چونکہ ناول ہے اس کا کنوس بہت وسیع ہے۔ اس ناول میں پریم چند نے اسی جمالیاتی مسئلے کو کامیابی کے ساتھ حل کیا ہے۔ دیہی ہندوستان کے معاشی اور سماجی بحران کے پس منظر میں پریم چند نے بڑے جاندار کردار پیش کیے ہیں۔ ہوری ایک Typical کردار ہے اور دیہی زندگی کی جد و جہد کی نمایندگی کرتا ہے۔ اس ناول کے تانے بانے میں وہ تمام سماجی، سیاسی اور معاشی قوتیں گتھی ہوئی ہیں جن کے (sum total) اس میں ان کے تضادات اور ٹکراؤ بھی شامل ہیں) کا نام ہندوستانی دیہات ہے۔ کوئی عظیم فنکار ان طاقتوں اور ان کے تضادات اور ٹکراؤ سے پیدا ہونے والے پیچیدہ مسائل کو نظر انداز کر کے بڑا ناول نہیں لکھ سکتا۔ اگر ہم ایک طرف پریم چند کے گئودان کو اپنے سامنے رکھیں۔ اور دوسری طرف بالزاک کے اس مبسوط تبصرے کو جو اس نے اپنے ہم عصر عظیم فنکار استنڈھال کے فن پر لکھا تھا تو ہمیں پریم چند کی فنکارانہ عظمت کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔ پریم چند ایک معنیٰ میں چارلس ڈکنس کے بھی قریب آجاتے ہیں کیونکہ ڈکنس کی طرح ان کا رویہ بھی ناقدانہ حقیقت نگاری (Critical Realism) کا ہے۔ پریم چند اپنے دور کے سماجی حقائق کو جوں کا توں قبول نہیں کرتے بلکہ اس پر ایک ناقدانہ نگاہ ڈالتے ہیں۔ ان کا رویہ زندگی کی طرف مثبت ہے اور وہ مبنی بر انصاف سماجی معاشرے کا قیام چاہتے ہیں اور اپنے تخلیقی ادب کے ذریعے ایسے ہی معاشرے کا اپنے قارئین کو احساس دلانا چاہتے ہیں۔ وہ سماجی تبدیلی کے خلوصِ دل سے خواہاں تھے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے وہ اصلاح پسندانہ رویے سے انقلابی رویے تک آتے ہیں

پریم چند ادب کو سماجی تبدیلی کے مشن کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ یہ رویہ ان کے یہاں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ پروپیگنڈا کے الزام کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔ جو بات بھی ان کے دل کو لگتی ہے۔ اور داخلی تحریک کا باعث ہوتی ہے وہ اسے موضوع بنا کر افسانہ یا ناول لکھتے ہیں۔ فنکار فلسفیانہ رویہ ہی اس کی جمالیاتی قدروں کا بھی تعین کرتا ہے۔ چونکہ وہ زندگی کی مثبت قدروں کے حامی ہیں۔ ادب کو بھی انھیں قدروں کو قارئین تک پہنچانے کا آلہ سمجھتے ہیں، اور ۔۔ جیسا کہ اپنے دوستوں کو لکھے ہوئے خطوط سے ثابت ہوتا ہے ۔۔ اس میں غلط نہیں

سمجھتے۔ لاہور کے ایک ہندی رسالے کی طرف سے کیے گئے سوال کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے لکھا تھا:

”میں کہانی کو کسی فلسفیانہ یا نظریاتی سچائی کو پیش کرنے کا ذریعہ سمجھتا ہوں۔ جب تک مجھے ایسی کوئی بنیاد نظر نہ آئے میں اپنا قلم نہیں اٹھاتا۔“

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ پریم چند ادب کو پروپگنڈا کی سطح پر لے آتے ہیں اور فن کی اپنی خود مختاری کی اسپرٹ کو مجروح کرتے ہیں۔ سماجی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے باوجود پریم چند کا آرٹ محض پروپگنڈا نہیں ہے۔ پروپگنڈا محض خارجی حقائق کو الفاظ کے ذریعے پیش کر دیتا ہے۔ انسان کی داخلی کیفیات سے اس کا کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ پریم چند کے یہاں ہمیں بے معنی داخلیت جسے ہم نفسیاتیت (Psychologism) کہہ سکتے ہیں نہیں ملتی (یہ جدیدیت کا مریضانہ رجحان ہے)، لیکن داخلیت کو وہ نظرانداز بھی نہیں کرتے اور ایک بڑا فنکار کر بھی کیسے سکتا ہے۔ پریم چند حقیقت پسند کی حیثیت سے اسی بات سے بخوبی واقف تھے۔ اور جمالیاتی نظریئے میں یہ بات بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ کہ خارجی حالات اور انسان کی داخلی کیفیات میں جدلیاتی رشتہ ہے۔ مجنوں گورکھپوری اس جدلیاتی رشتے پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

”ادب بھی ایک جدلیاتی حرکت ہے اور اس کے بھی دو متضاد رُخ ہیں ایک تو خارجی یا عملی یا افادی، دوسرا داخلی یا تخیلی یا جمالیاتی۔ حسن کار یا ادیب کا کام یہ ہے کہ وہ اِن دو بظاہر متضاد میلانات کے درمیان توازن اور ہم آہنگی قائم کیے رہے ورنہ ان میں جہاں ایک کا پلہ بھاری ہوا وہیں فساد و انتشار پیدا ہونے لگے گا۔“

پریم چند کا کم دبیش ادب کی طرف ایسا ہی صحت مند رویّہ ہے۔ ان کے کرداروں میں ہمیں خارجی اثرات کے تحت پیدا ہونے والی داخلی کیفیات کا بہت ہی خوبصورت بیان ملتا ہے۔ اینگلز نے المیے سے بحث کرتے ہوئے ایک بڑی ہی اہم بات کہی ہے کہ المیہ اس وقت جنم لیتا ہے جب تاریخی طور پر ضروری بات عملی طور پر حاصل کرنا ناممکن ہو۔ ہندوستان پریم چند کے دور میں جو تاریخی ضرورت محسوس کر رہا تھا (آزادی، غربت کا خاتمہ، توہمات کا استیصال وغیرہ وغیرہ)، وہ برٹش سامراج واد اور فیوڈل طبقے کے مفادات کی وجہ سے عملی طور پر وجود میں لانا مشکل نظر آرہا تھا۔ پریم چند کے کرداروں کا بھی یہی المیہ ہے وہ گئودان کا ہوری ہو یا کفن کا مادھو اور گھیسو۔ پریم چند کی تخلیقات کا یہ جمالیاتی پہلو سب سے اہم ہے۔

پریم چند کی تحریر

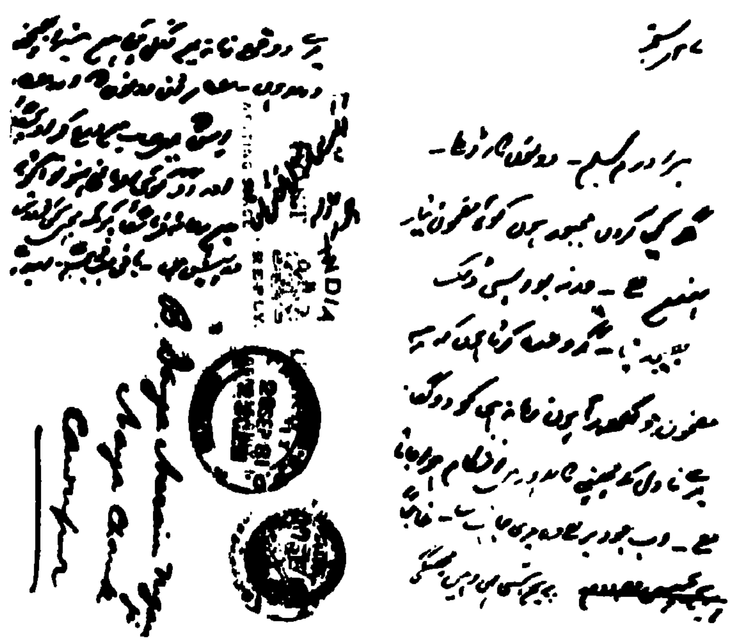

عظیم الشان صدیقی

پریم چند اور طبقاتی جدوجہد

زندگی اگرچہ تصادم و تضاد سے عبارت ہے لیکن انسانی سماج میں اس کی سمت و رفتار کا تعین وہ قوتیں کرتی ہیں جنھیں پیداواری وسائل اور تقسیم زر کے نظام میں مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ جاگیردارانہ سماج میں معیشت کا انحصار اگرچہ زراعت پر تھا لیکن تصادم کی نوعیت چونکہ مادی اور عسکری تھی اور طاقت کے مراکز نیز تقسیم زر کے نظام پر طبقۂ اعلیٰ کو اقتدار حاصل تھا اس لیے واقعات کا تانا بانا بھی انھیں کے گرد بُنا جاتا تھا لیکن ۱۸۵۷ء میں سیاسی ڈھانچے اور طاقت کے مراکز میں تبدیلی کے باعث نئے متوسط طبقہ کو یہ مواقع حاصل ہو گئے کہ وہ سماجی زندگی اور معاشی نظام میں مرکزی کردار ادا کر سکے۔ ناول اسی متوسط طبقہ کی جذباتی اور ذہنی زندگی کا آئینہ دار ہے۔ پریم چند کے ابتدائی دور کے ناول اسرار معابد، ہم خرما و ہم ثواب، جلوہ ایثار، بیوہ، غبن اور بازار حسن کے واقعات کردار اسی نئے متوسط طبقہ کی ترجمانی کرتے ہیں جہاں وہ اصلاح پسندانہ رجحانات کے ساتھ ماحول، خارجی محرکات، انسانی فطرت اور نفسیات کے پس منظر میں نئی سماجی حقیقتوں اور تہذیبی اقدار کو تلاش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لیکن پریم چند کے ناولوں میں یہ فضا زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتی اور سیاسی شعور کی بیداری نئی ابھرتی ہوئی سماجی قوتوں کو توجہ کا مرکز بنا دیتی ہے۔

ہندوستان کی تحریک آزادی اپنے ابتدائی دور میں اگرچہ طبقۂ اعلیٰ کے حقوق، مراعات اور مفادات کی جدوجہد تک محدود تھی لیکن تصادم کی نوعیت میں تبدیلی کے باعث اس طرح کی سیاسی تحریکات چونکہ ترقی پسندانہ رجحانات، اجتماعی مفادات اور ان عوامی قوتوں کے تعاون کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی تھیں جنھیں صدیوں سے نظرانداز کیا جاتا رہا تھا چنانچہ بیسویں صدی عیسوی کی ہندوستانی تاریخ کی امتیازی خصوصیت ان ہی عوامی قوتوں کی بیداری سے عبارت ہے۔ لیکن پریم چند کی فنی عظمت کا راز صرف اس عمل میں مضمر نہیں ہے کہ ان کا سیاسی شعور ان قوتوں کی اہمیت اور افادیت تسلیم کر لیتا ہے اور پہلی مرتبہ انھیں ناول کا موضوع بناتا ہے بلکہ اس فنی بصیرت، تعمیری شعور اور انسان دوستی میں پوشیدہ نظر آتا ہے جو طبقاتی کشمکش، تہذیبی و سماجی اقدار کے بحران میں تصادم و تضاد کی نوعیت ان کے مراکز اور قوت کے ایسے سرچشموں کو تلاش کر لیتا ہے جن کی بے پناہ قوت عمل، ہمدردی و ایثار، ضبط و تحمل اور کردار کے کھرے پن سے نئے اور مستحکم سماج کی تعمیر کی جا سکتی ہے۔ پریم چند کے اس تعمیری شعور کو ممکن ہے کہ ان کے دور میں آدرش وادی اور مثالیت پسندی کے مماثل قرار دیا گیا ہو لیکن طبقاتی کشمکش اور معاشی بحران کے دور میں یہ قوت تخیل اور دانشمندانہ جرأت مندی کی ایسی دلیل بھی ہے۔ جس کے نتائج کا اندازہ آزادی کے بعد بہ آسانی لگایا جا سکتا ہے۔ البتہ پریم چند نے اپنے ناولوں کے ذریعہ جس آزاد، جمہوری، سیکولر، استحصال سے پاک اور مساوات پر مبنی معاشرہ کا تصور پیش کیا تھا وہ اگرچہ ابھی تک پوری طرح ظہور میں نہیں آسکا ہے۔ لیکن اس کی داغ بیل یقیناً پڑ چکی ہے۔

اوائل بیسویں صدی کے ہندوستان میں اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ نئے زرعی نظام تصادم کی نوعیت میں تبدیلی کے باعث زراعت پیشہ طبقہ تحفظات کے نام جاگیردارانہ دور کی آمریت اور شاطرانہ چالوں کے بوجھ سے خود کو نہ صرف آزاد کرانا چاہتا ہے بلکہ اس کی نظر میں اس طبقہ کی حیثیت اب ایسے دلال کی سی رہ گئی تھی جو انسانی ہمدردی سے بے نیاز کمیشن پر سرکاری لگان وصول کرتا ہے وہ عیاشی، شہرت، مذہب اور یورپی مصنوعات کی شہروں میں بھرمار سے پیدا ہونے والے معاشی بحران کے لیے بھی کسی ذمہ داری کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس لیے مقررہ لگان کے علاوہ رواج، دستوری، نذرانہ، بے گار، کم قیمت پر اشیاء کی فروخت، اضافہ لگان، قرقی اور بے دخلی وغیرہ اسے اپنی حق تلفی اور استحصال ہی کی مختلف صورتیں نظر آتی ہیں۔ مزید اس کے یہاں فرائض کے ساتھ اپنے حقوق اور مطالبات کا احساس بھی بیدار ہونے لگا ہے۔ پریم چند کے نمائندہ ناول گوشۂ عافیت، چوگان ہستی، میدان عمل اور گئو دان اسی طبقاتی کشمکش اور سماجی حقیقت کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں جس کے ابتدائی نقوش بازار حسن ہی میں نظر آنے لگتے ہیں۔ اس ناول کا موضوع اگرچہ طوائف ہے لیکن یہ متوسط طبقہ کے تہذیبی اور معاشی بحران نیز ذہنی اور جذباتی انتشار

کا ایسا المیہ ہے جس کو استحصال پسندانہ رجحانات، ظلم و تشدد کی روایات اور منافقانہ رویوں سے ان کا تصادم بنیادیں فراہم کرتا ہے۔ بڈھا چیتو کسان اسی احتجاج اور تصادم کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ پریم چند کے الفاظ ہیں۔

"مندر کے سامنے اس پر مار پڑنے لگی چیتو بھی بگڑا ہاتھوں
سے تو معذور تھا پر زبان سے لات گھونسوں کا جواب دیتا رہا
اور اس وقت تک باز نہ آیا جب تک کہ زبان بند نہ ہو گئی۔"

(بازار حسن ص ۷)

مہنت رام داس جاگیردار کی ناانصافی کے خلاف چیتو کے احتجاج کو اگرچہ طاقت کے ذریعہ دبا دیا جاتا ہے لیکن وہ مرتا نہیں ہے بلکہ پہلے سے بھی زیادہ قوت اور شان کے ساتھ وہ گوشۂ عافیت میں منوہر، بلراج، دکھرن بھگت، قادر خاں، سکھو اور بلاسی کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ یہ ناول چونکہ انقلاب روس ۱۹۱۷ء کے فوراً بعد لکھا گیا ہے اس لیے یہاں اشتراکی تحریک کی کامیابی، عوامی قوتوں کی فتح، مشترکہ کھیتی کا تصور، محنت اور سرمایہ کے مابین توازن اور انسانی مساوات کی گونج سنائی دیتی ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ ناول طبقاتی کشمکش کا رزمیہ اور اس تصادم کا نقطۂ آغاز ہے جہاں ہوس زر پرستی، استحصال، مجبوری، مدافعت اور عزتِ نفس کا احساس تشدد کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور حقوق کی حفاظت اور ظلم کے خلاف بلند ہونے والی آواز کو دبانے کی کوشش سماجی انتشار میں بدل جاتی ہے۔ دکھرن بھگت تو بے گار سے انکار کرنے کی صورت میں مار اور بے عزتی کو برداشت کر لیتا ہے لیکن طاعون اور قحط زدہ گاؤں میں زمین دار کی طرف سے تالاب اور چراگاہوں پر پابندی اور بلاسی کی بے عزتی کے نتائج غوث خاں کارندے کے قتل کی صورت میں اس طرح برآمد ہوتے ہیں کہ سارا گاؤں ہی اس کی زد میں آجاتا ہے اور ترقی پسند ذہن رکھنے والے افراد کمزور طبقہ کی اعانت کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں منوہر کی خودکشی گیشنر شاہ ساہوکار کے بیداریٔ ضمیر کا ایسا محرک بن جاتی ہے کہ وہ نہ صرف اپیل کے لیے روپیہ دیتا ہے بلکہ سرکاری گواہ کی حیثیت سے اپنے سابق بیان سے بھی منحرف ہو جاتا ہے۔

پریم چند کے یہاں کردار اپنی فطری نہج اور خارجی محرکات کے مطابق ارتقائی منازل طے کرتے ہیں لیکن جہاں ان کا ارتقا رک جاتا ہے وہ منظر نامہ سے ہٹ جاتے ہیں یا سادھو بن کر کچھ دیر کے لیے غائب ہو جاتے ہیں یا پھر وہ ضمیر کی بیداری یا کسی دوسرے بڑے مقصد کے حصول کے لیے قربان کر دیئے جاتے ہیں گوشۂ عافیت میں منوہر کی خودکشی کو بھی ایسے ہی مقاصد کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ تشدد چونکہ تشدد کو جنم دیتا ہے اور ضمیر کی بیداری میں اصلاح اور مصالحت کے امکانات پوشیدہ ہوتے ہیں۔ منوہر کی خودکشی کا واقعہ بھی ایسے ہی امکانات کی تلاش، طبقاتی کشمکش اور سیاسی تحریک نیز دیگر قوتوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی خواہش سے خالی نہیں ہے لیکن اتحاد چونکہ یک طرفہ عمل نہیں ہوتا ہے اس لیے پریم چند عوامی قوتوں کی زبوں حالی کے ساتھ جاگیردار طبقہ کے مسائل و مصائب کو بھی ان کے تہذیبی، سماجی اور معاشی تناظر میں پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

جاگیردار طبقہ کو سماج میں اگرچہ ہر طرح سبقت و بالادستی حاصل تھی لیکن آمدنی کے متبادل رشتوں کے فقدان محدود آمدنی اور لامحدود اخراجات رسم و رواج کی پابندی اور جھوٹے وقار نے اسے ایسے انتشار میں مبتلا کر دیا تھا کہ وہ غریب اور کمزور کسان کو ایسی گائے تصور کرنے لگا جو دانہ اور چارے کے بغیر ہی ہر ضرورت کے وقت خواہش کے مطابق دودھ دے سکتی ہے لیکن سرکار، حکام اور اہلکاروں کی جھوٹی خوشامد، نذر، حاضری، ڈالی اور رشوت کے بعد بھی جب اس غیر فطری مطالبہ کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا تو گھٹن کا احساس ذہنی اور معاشی انتشار اور بھی شدت اختیار کر لیتا ہے اور یہ طبقاتی کشمکش شہروں اور گاؤں میں ساہوکار، مہاجن اور رشوت خور اہلکاروں پر مشتمل ایسے طبقہ کو ابھرنے کے مواقع فراہم کر دیتی ہے جن کی ثروت اور دولت مندی کا انحصار ان دونوں طبقوں کے استحصال پر ہے۔ جس کا انسداد ان دونوں طبقوں کے اتحاد اور کسانوں کو زمین کے مالکانہ حقوق کے حصول کے ذریعہ ہی ممکن ہو سکتا ہے چنانچہ گوشۂ عافیت کا اختتام بھی ان ہی مقاصد کے تابع ہے لیکن اس طرح کی مصالحت میں جن خطرات کے امکانات پوشیدہ ہوتے ہیں پریم چند ان سے بھی واقف تھے۔ زمین سے مالکانہ رشتہ جہاں حب الوطنی خوشحالی اور سماجی استحکام کے لیے بنیادیں فراہم کرتا ہے وہاں استحصال کے نئے دروازے بھی کھولتا ہے۔ اس لیے مایا شنکر کی فیاضی ایسی توقعات اور شرائط سے عبارت ہے جس میں خطرات کے انسداد کے امکانات موجود ہیں۔

وہ ان الفاظ کے ساتھ زمین کے مالکانہ حقوق کسانوں کے سپرد کرتا ہے۔

"مجھے امید ہے کہ میرے سبھی بھائی آپس میں مل جل کر رہیں گے۔
اور ذرا ذرا سی باتوں کے لیے عدالت کا سہارا نہ لیں گے۔ ایشور
آپ کے دلوں میں ضبط و تحمل، محبت و ہمدردی پیدا کرے
اور آپ کو اپنے نئے فرائض کی انجام دہی کے لیے توفیق نیک
عطا فرمائے۔ ہاں میں یہ بتلا دینا چاہتا ہوں کہ آپ اپنی آراضی
کو آسامیوں کے ہاتھوں نفع پر نہ اٹھا سکیں گے۔"

(گوشۂ عافیت۔ ص ۷۱۴)

چنانچہ اس فیاضی کے نتیجہ میں جس اتحاد کی توقع کی جا سکتی ہے اس کا اظہار چوگان ہستی اور میدان عمل میں اس طرح نظر آتا ہے کہ یہاں طبقاتی کشمکش مہاجنی اور آمرانہ قوتوں کے استحصال کے خلاف مشترکہ جدوجہد اور عام تحریک کی شکل اختیار کر لیتی ہے جس کی قیادت کی باگ ڈور بھی اسی طبقہ کے افراد کے ہاتھوں میں ہے۔ راجستھان کی دیسی ریاستوں میں حکام اور راجہ کے ظلم و ناانصافی کے خلاف بغاوت کی جو تحریک فروغ پاتی ہے اس کی قیادت کی ذمہ داری بھی ایک جاگیردار کے بیٹے کنور ونے سنگھ کے ہی سپرد ہے۔ سگریٹ کے کارخانہ اور اس کے ملازمین کے لیے مکانات بنانے کے لیے سورداس کی

زمین اور پانڈے پور کے باسیوں کے مکانوں پر زبردستی قبضہ کے خلاف
یک فروغ پاتی ہے اس میں استحصال کے علمبردار جان سیوک اور میونسپل
کے چیرمین راجہ مہندر کمار سنگھ سے تعلق رکھنے والے افراد ہی اس تحریک
عاونت کرتے ہیں۔ لیکن طبقاتی اتحاد کی اس آرزومندی کے باوجود پریم چند
بے ریا حقیقت نگاری طبقاتی مفادات، تضاد اور فطرت کی ان روایتی
دِل کو نہیں توڑ پاتی جن کے حلقے صدیوں سے ہندوستانی سماج میں دیوبیت
دنے اور صوفیہ کے کردار اپنی توانائی کے باوجود روایتی وطبقاتی رومان
دی اور تضاد کا شکار ہو جاتے ہیں رانی اندو تذبذب میں مبتلا ہیں پربھو سیوک
، پرست فراری ذہن رکھنے والا نوجوان ثابت ہوتا ہے راجہ کمار کو اپنا
ب اور کنور بھرت سنگھ کو اپنی جاگیر اتنی عزیز ہے کہ وہ کھل کر ان تحریکات
ایت نہیں کر سکتے پانڈے پور کے نواسی بھی انفرادی مفادات اور نفاق
مبتلا ہیں۔ یہ تمام افراد اگرچہ ان تحریکوں سے جذباتی اعتبار سے وابستہ
لیکن ان کے سامنے چونکہ اعلیٰ مقاصد نہیں تھے اس لیے یہ دونوں تحریکیں
م ہو جاتی ہیں لیکن اس ناکامی کے باوجود سورداس چمار اپنی شخصیت کے
ے نقوش چھوڑ جاتا ہے۔ وہ اندھا ہے بھکاری ہے۔ ان پڑھ ہے اور
ات سے تعلق رکھتا ہے لیکن اس میں ایک سچے ستیہ گرہی اور قائد ہونے
وہ تمام اوصاف ضبط وتحمل، ہمدردی وایثار، عفو و بے غرضی، جرأت
بے باکی اور کردار کا کھرا پن وغیرہ موجود ہیں جو کسی تحریک کو اس کی منزل
قریب تر لانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اس کی زبان میں حقیقت
ی اور نرمی کا ایسا امتزاج ہے کہ ظالم بھی اس کی جادو بیانی سے خوف کھاتے
وہ عدم تشدد کا حامی ہے لیکن اپنی کٹیا سے اس وقت تک نہیں ہٹتا
نک طاقت کے ذریعہ وہاں سے ہٹا نہیں دیا جاتا اس کی یہی جرأت،
تقلال اور اعتماد ہی ظلم کے خلاف اس کا سب سے بڑا ہتھیار ہے وہ ایسا
ئی بھی ہے کہ بسترِ مرگ پر بھی شکست قبول نہیں کرتا۔ اس کی درج ذیل
تگو میں اس کی شخصیت اور بصیرت کا راز پنہاں ہے۔ وہ جان سیوک
کہتا ہے:

> "یہ بازی تمھارے ہاتھ رہی۔ مجھے کھیلتے نہیں بنا۔ تم منجھے ہوئے
> کھلاڑی ہو۔ دم نہیں اکھڑتا۔ کھلاڑیوں کو ملا کر کھیلتے ہو اور
> تمھارا حوصلہ بھی اچھا ہے۔ ہمارا دم اکھڑ جاتا ہے۔ ہم ہانپنے
> لگتے ہیں۔ ہم کھلاڑیوں کو ملا کر نہیں کھیلتے۔ آپس میں جھگڑتے
> ہیں۔ گالی گلوج مار پیٹ کرتے ہیں۔ کوئی کسی کو نہیں مانتا۔"

(چوگان ہستی باب ۴۶)

رداس کی عظمت کا راز جہاں اس کی خودشناسی، دھرتی سے بے پناہ
ت اور نیکی پر غیر معمولی یقین میں مضمر ہے وہاں اس کی موجودگی اس
بقت کا واضح ثبوت بھی ہے کہ سچے فن اور فن کار کی طرح سچا رہبر بھی حالات
لوکھ سے جنم لیتا ہے جس کے لیے شخصی وجاہت، شہرت، طبقاتی تفریق،
ذات پات اور روایتی تعلیم کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ زندگی کا وسیع تجربہ، واقعات
اور معاملات سے ذہنی وجذباتی لگاؤ اور غیر معمولی شمولیت واعتماد ہی اس کی
سب سے بڑی دولت ہوتی ہے۔

چوگان ہستی میں ابتدائی عہد کے صنعتی فروغ کے خلاف بے چینی کے آثار اور متضاد نظریے بھی سامنے آتے ہیں۔ سرمایہ دار طبقہ اسے ملکی معیشت وخوشحالی کے لیے ضروری خیال کرتا ہے جب کہ مخالفین اسے معاشی استحصال ہی کی ایک بدلی ہوئی شکل اور سماجی استحکام کے لیے خطرہ سمجھتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ صنعتی ترقی کسی بھی ملک کی معیشت کے لیے ناگزیر ہے۔ اس کے ذریعہ جہاں خام مال اور فالتو محنت کا بہتر استعمال، تکنیکی علم کی بدولت ذہنی تبدیلی، تبادلہ معاشی رشتے اور طبقاتی جدوجہد کے ایسے مواقع فراہم ہوتے ہیں کہ انفرادی شعور اجتماعی شعور میں ڈھلنے لگتا ہے وہاں ان برکات کے کچھ تاریک پہلو بھی ہیں۔ نجی آزاد، غیر منظم وغیر متوازن صنعتی ترقی تقسیم زر کے نظام پر قادر ہو جانے کے باعث استحصال کا ایسا ذریعہ بن جاتی ہے کہ سارا سماج معاشی بحران میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور اس کے ذریعہ جو بستیاں آباد ہوتی ہیں وہ سرمایہ دارانہ ذہنیت اقدار اور جذباتی رشتوں کے فقدان کے باعث گھٹن، تنہائی اور انتشار کا شکار ہو جاتی ہیں۔ چوگان ہستی چونکہ ۱۹۲۲ء میں تصنیف کیا گیا تھا۔ اس وقت غیر ملکی سامراج کی سرپرستی میں غیر فطری انداز میں غیر ملکی مہارت اور سرمایہ کے اشتراک سے جن صنعتوں کی داغ بیل ڈالی جا رہی تھی اس کی حیثیت سامراجی اور جاگیردارانہ عہد کے استحصال کی ایسی بدلی ہوئی شکل ہی ہو سکتی تھی جس میں تحریکِ آزادی کے لیے نئے خطرات کے امکانات پوشیدہ تھے۔ ان حالات میں اگر پریم چند جان سیوک مقابلہ میں سورداس کی حمایت کرتے ہیں تو اسے ان کی رجعت پسندی پر محمول کرنے کے بجائے سرمایہ دار اور عوامی طاقتوں کے مابین کشمکش کا دیباچہ تصور کرنا چاہیے۔ جس کا ثبوت ان کا ناول میدانِ عمل فراہم کرتا ہے۔ اس ناول میں قحط زدہ گاؤں میں ادائیگی لگان اور سرکاری زمین پر سرمایہ داروں کے تصرف کے خلاف جو تحریکیں فروغ پاتی ہیں ان کی حیثیت طبقاتی کشمکش سے زیادہ عوامی تحریک کی ہے لیکن ان کی کامیابی کا انحصار صرف عوامی اتحاد اور جوش پر مبنی نہیں ہے بلکہ اس زہر کا تریاق اسی زہر سے تیار کیا گیا ہے۔ امرکانت، سلیم، سکھدا اور نینا کا تعلق اسی سرمایہ دار اور حاکم طبقہ سے ہے جنھیں زندگی کے تجربے۔ جدید تعلیم کے اثرات اور خدمت خلق کے شوق نے ان تحریکوں کا روحِ رواں بنا دیا ہے ان ہی کی بدولت یہ تحریکیں اپنی منزل سے ہم کنار ہوتی ہیں۔

پریم چند ایسے فنکار ہیں جو طبقاتی کشمکش اور سماجی مسائل کے حل اور مصالحت کے امکانات کو یکسر اور فوری طور پر رد نہیں کرتے ہیں بلکہ ان کا بنظرِ غائر جائزہ لیتے ہیں مختلف پہلوؤں اور امکانات کا تجزیہ کرتے ہیں۔ غور وفکر کا یہی عمل ان کے فن کو اساس پلاٹ کو پھلنے پھولنے اور کرداروں کو اپنی پرتیں کھولنے کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ تجزیہ وتلاش کا یہی عمل انھیں ایسی منزل

پر پہنچا دیتا ہے جہاں جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام اور حاکم ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں معلوم ہوتی ہیں جو اپنے مفادات کے لیے مختلف روپ بدل سکتے ہیں۔ انھیں متوسط طبقہ اپنی اقدار کے عدم تعین کے باعث اسی موقع پرستی اور تضاد کے بحران میں مبتلا نظر آتا ہے۔ ان حالات میں عوام تک ان تحریکات کا فائدہ، استحصال سے نجات مساویانہ قوت وقیادت کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گئودان میں ایک معمولی مزدور تحریک کے علاوہ کوئی طبقاتی کشمکش یا تحریک فروغ نہیں پاتی۔ یہ احتساب، خودشناسی، اعتماد اور قوت کی ایسی منزل ہے جس کے بعد استحصال کے تمام دروازے خودبخود بند ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ قوت اور ذہنی تبدیلی فرسودہ وغیر حقیقی رسم ورواج اور روایتوں کے بندھنوں سے نجات پانے کی صورت ہی ممکن ہے۔ لاکھوں کسانوں کی طرح ہوری بھی مکڑی کے ان ہی جالوں میں پھنسا ہوا ہے۔ اس کی غربت وافلاس، زبوں حالی اور پستی کا سبب دوسری قوتوں کا استحصال ہی نہیں ہے بلکہ وہ اپنا مجرم آپ ہے اس کی تمام زندگی ان ہی روایات کو نبھانے اور جھوٹے وقار کو بحال رکھنے کی جدوجہد میں گزر جاتی ہے اس کی اسی کمزوری کا دوسرے لوگ بھی فائدہ اٹھاتے ہیں۔

گائے زرعی نظام کا اگرچہ لازمی جز ہے لیکن مناسب زرعی وسائل کی موجودگی میں ہی وہ زرعی معیشت کا حصہ بن پاتی ہے۔ اور ان کے فقدان کی صورت میں گائے جھوٹے وقار اور معاشی بوجھ کی ایسی علامت بن جاتی ہے جو اپنے ساتھ مسائل ومصائب لے کر آتی ہے۔ ہوری ماحول اور پیشہ کے ان ہی فطری تقاضوں اور مادی وسائل کی محرومی کے تصادم وتضاد کا شکار ہے۔ وہ بھولا کو دھوکا دے کر بنا قیمت دیئے گائے تو لے آتا ہے۔ لیکن جھوٹے وقار کی نمود ونمائش اس کے لیے مشکلات کا پیش خیمہ بن جاتی ہیں۔ دروازے پر گائے باندھتے وقت بھولا سوچتا ہے۔

> "ہوری سچ مچ آپے میں نہ تھا۔ گائے اس کے لیے صرف بھگتی
> کی چیز نہ تھی بلکہ زندہ دولت تھی وہ اس سے اپنے دروازے
> کی رونق اور گھر کی عظمت بڑھانا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ
> لوگ گائے کو دروازے پر بندھی دیکھ کر پوچھیں کہ یہ کس کا
> گھر ہے؟۔ لوگ کہیں ہوری مہتو کا۔۔۔۔ جبھی لڑکی والوں پر بھی
> اس کا اثر پڑے گا۔" (گئودان ص ۶۶)

چنانچہ جھوٹے وقار کا یہ اظہار ہیرا کے حاسدانہ جذبات کو اس حد تک مشتعل کر دیتا ہے کہ وہ رات کی تاریکی میں گائے کو زہر دیکر بھاگ جاتا ہے اور نام ونمود کی یہ خواہش ہوری کو اتنی مہنگی پڑتی ہے کہ گائے بھی جاتی ہے اور جھوٹی مرجادا کو بنھانے کے لیے ساہوکار سے روپیہ قرض لے کر گائے کا پرائشچت بھی اسے ہی کرنا پڑتا ہے۔ انسانی ہمدردی وایثار حدود کے دائرے میں رہ کر ہی رحمت کا سبب بن پاتے ہیں لیکن ہوری روایتی مرجاد کو نبھانے کی خاطر ان حدود سے اس حد تک آگے نکل جاتا ہے کہ ہیرا کے کھیت پہلے بونے کی خواہش اس کو اپنے کھیت کی فصل سے محروم رکھتی ہے۔ اور جب بھولا گائے کی قیمت کے بدلے میں ہوری کے دونوں بیل ہی کھول کر لیجاتا ہے تب بھی اس کی مرجاد پیداواری وسائل کے اس اہم ذریعہ کو کھو دینے کے باوجود تماشہ دیکھتی رہتی ہے۔ اسی طرح جب گوبر رسم ورواج کی پابندیوں کو توڑ کر جھنیا کو بیوی بنا کر گھر چھوڑ جاتا ہے تو سماج کے قوانین کے مطابق اسے اپنی مرجاد نبھانے کے لیے کھیت کا تمام اناج ہی سماج کے ٹھیکیداروں کے سپرد کرنا پڑتا ہے۔ اور خود کو اور بال بچوں کو بھوکا رکھتا ہے۔ گاؤں کے چمار سلیا سے پنڈت ماتادین کے تعلقات جب اس کے دھرم کو بھرشٹ کر دیتے ہیں تو وہ گنگا اشنان اور روپیہ خرچ کر کے نیا دھرم اور مرجاد خرید لاتا ہے۔ لیکن غریب ہوری انسانی ہمدردی اور مرجاد کے نام پر سلیا کو اپنے یہاں پناہ دیتا ہے تو سارا گاؤں اس کے خلاف ہو جاتا ہے۔ اس خود استحصالی اور جھوٹے مرجاد واد کی اس وقت کوئی انتہا نہیں رہتی جب وہ پرکھوں کی نشانی، مرجاد کی علامت فصل سے محروم تین بیگھہ زمین کو بچانے کے لیے اپنی ہی جوان لڑکی کو چند سو روپیہ کے عوض بوڑھے کسان کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے۔ اس غربت اور مجبوری کے باوجود مرجاد کی علامت گائے پالنے کی خواہش دن رات اسے اس طرح کام میں مصروف رکھتی ہے کہ محنت اور بھوک کا مارا ہوری دم توڑ دیتا ہے۔

اس میں شک نہیں تین بیگھہ زمین، گائے اور مرجاد اس کی سب بڑی طاقت ہے جو تمام زندگی اسے مصروفِ عمل رکھتے ہیں لیکن یہ غیر حقیقی طاقت اس کی سب سے بڑی کمزوری بھی ہے جس کے باعث وہ استحصالی قوتوں کے دائروں، روایتوں کو توڑ نہیں پاتا ہے۔ یہی کمزوری اور روایتوں کا بندھن اس کی ذہنی تبدیلی اور خود اعتمادی کی راہ میں حائل ہیں۔

انسانی سماج میں ذہنی تبدیلی دراصل معاشی رشتوں کی تبدیلی کا نتیجہ ہوتی ہے ان ہی رشتوں کی تبدیلی کے باعث توہمات، روایتوں اور جھوٹی مرجاد کے بندھن ٹوٹتے ہیں۔ ہوری اپنے عہد میں متبادل معاشی رشتوں کے فقدان کے باعث اس طرح فرسودہ رشتوں میں جکڑا ہوا ہے کہ ان حصاروں اور کھنڈروں کو توڑنا تو درکنار تھوڑی دیر کے لیے ان کو پھلانگنا بھی اسے مرجاد کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ یہاں پریم چند دھرتی سے اس قوی رشتے کو بھی اس کے غیر حقیقی اور غیر صحت مند ہونے کی صورت میں مشکوک بنا دیتے ہیں جس کے لیے وہ ساری زندگی وکالت کرتے رہے تھے۔ کھیتی وزمین جو کسان کی سب سے بڑی دولت ہے وہ ہی غیر حقیقی ہونے اور کفالت کا بوجھ نہ اٹھا سکنے نیز متبادل معاشی رشتوں اور صنعتی شعور کے فقدان کے باعث اس کی سب سے بڑی کمزوری بھی بن جاتی ہے۔ گوبر میں یہ ذہنی تبدیلی، روایت شکنی کی جرأت، دنیا سازی، باغیانہ تیور اور خود اعتمادی ان ہی معاشی رشتوں کی تبدیلی اور نئے ترقی پذیر معاشی رشتوں سے رابطہ استوار ہونے کی صورت میں ہی آئی ہے اس اعتبار سے پریم چند غیر شعوری طور پر صنعتی

(بقیہ ص۳۰ پر)

شمس الحق عثمانی

محبِّ وطن پریم چند

ہر فن کار اپنے مزاج، اپنے اندازِ فکر اور اپنی شخصیت کے مطابق اپنی سرزمین کی بو باس، اس کی تہذیب، اس تہذیب کے نشیب و فراز اور اپنے عہد کے اثرات قبول کرتا ہے ـــ اور ان ہی اثرات کا لسانی اظہار اس کی فنی شخصیت کے عناصرِ ترکیبی کو اجاگر کرتا ہے ـــ منشی پریم چند کی فنی شخصیت، جن عناصر سے مرکب ہے ان میں تہذیبی عرفان اور معاصر قومی شعور کو نمایاں ترین حیثیت حاصل ہے۔ پریم چند کی ذہنی ساخت اور فنی رویّے کے بارے میں پروفیسر احتشام حسین مرحوم نے لکھا تھا:

"پریم چند کو بیسویں صدی کے ابتدائی اور انیسویں صدی کے آخری دَور کا انسان سمجھنا چاہیے۔ ان کے شعور کی تکمیل میں ان اصلاحی تحریکوں کا ہاتھ تھا جن کی ابتدا غدر کے بعد سے ہو چکی تھی اور جو بیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں پھل پھول رہی تھیں ۔ ۔ ۔ یہ دور ہندوستان کی ذہنی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے ۔ ۔ ۔ پریم چند نے ہندوستان کی اسی الجھی ہوئی دنیا کو اپنی ذہانت، ہمدردی، خلوص اور وسیع النظری سے سمجھنے کی کوشش کی اور ایک اچھے ادیب کی طرح انتشار میں تنظیم، بدحالی میں حسن اور الجھنوں میں سلجھاؤ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ کارزارِ حیات میں کود کر طوفانوں کو دیکھا اور زندگی کے تجربوں سے اپنی جھولیاں بھر لیں اور انھیں تجربوں کو بنا سنوار کر اپنے ناولوں اور افسانوں میں پیش کیا۔"

(تنقید اور عملی تنقید۔ ص: ۱۶۸ تا ۱۶۹)

پریم چند کے افسانوں کے اولین مجموعے "سوزِ وطن" کے زمانۂ اشاعت کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر مسعود حسین خاں نے اپنے مضمون "پریم چند کی افسانہ نگاری کے دور" میں لکھا ہے:

"یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ملک میں تقسیم بنگال کی وجہ سے شورش بپا تھی، کانگریس میں "گرم دل" کی بنیاد پڑ چکی تھی اور آزادی کے ترانے پنجم سُروں میں گائے جاتے تھے۔ پریم چند نے ان ہی واقعات سے متاثر ہو کر سوزِ وطن کے افسانے تصنیف کیے۔" (منشی پریم چند، شخصیت اور کارنامے۔ مرتبہ ڈاکٹر قمر رئیس۔ ص: ۴۲۲)

یعنی پریم چند کا پہلا ہی مجموعہ ان کی حب الوطنی کا اساسی ثبوت فراہم کرتا ہے۔ انھوں نے اس کے دیباچے میں اپنا نقطۂ نظر واضح کرتے ہوئے لکھا تھا: "ہمارے ملک کو ایسی کتابوں کی اشد ضرورت ہے جو نئی نسل کے جگر پر حُبِّ وطن کی عظمت کا نقش جمائیں۔"

اس مجموعے کا پہلا افسانہ: "دنیا کا سب سے انمول رتن" ہے۔ یہ ایک ایسے نوجوان (دل فگار) کی کہانی ہے جو ایک ملکہ (دل فریب) کے عشق میں گرفتار ہے۔ نوجوان جب ملکہ سے شادی کی خواہش کا اظہار کرتا ہے تو ملکہ اس شرط پر اس کی آرزو پوری کرنے پر تیار ہوتی ہے کہ وہ دنیا کی سب سے بیش بہا شے لا کر ملکہ کی نذر کرے۔ کہانی سنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ سبھی جانتے ہیں کہ دل فگار جب محبِّ وطن کے خون کا قطرہ لے کر اپنے محبوب کے دربار میں پہنچا اور اپنی کہانی سنائی تو ابھی داستان ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ ملکہ زرنگار پردہ اٹھا کر باہر آگئی اور بولی:

"اے عاشقِ جاں نثار! آج سے تو میرا آقا ہے اور میں تیری کنیز ناچیز۔"

یہ کہہ کر ایک مرصّع صندوقچہ منگایا اور اس میں سے ایک لوح نکالی۔ لوح پر آبِ زر سے لکھا ہوا تھا:

"وہ آخری قطرۂ خوں جو وطن کی حفاظت میں گرے، دنیا کی سب سے بیش قیمت شے ہے۔"

دل فگار کے پُرجہد اور صبر آزما عشق کی کہانی میں پریم چند نے وطن پرستی اور حریت خواہی کا جو رنگ بھرا ہے وہ ان کے اپنے ذہن اور دل کی آواز ہے۔ اس آواز کی ترسیل کے لیے پریم چند نے قدم قدم پر جو جذبات سے مملو اور رقت آمیز لب و لہجہ اختیار کیا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ افسانے کا قاری بھی ان کے وطن پرست جذبات میں اسی طرح شریک ہو جائے جس طرح سے وہ خود ہیں۔

ابتدا سے انتہا تک داستانی رنگ میں ڈوبی ہوئی اس کہانی کا ہیرو، دراصل اس زمانے کا وہ سادہ لوح فرد ہے جو اپنے انفرادی جذبات کی رو میں یہ حقیقت فراموش کر چکا ہے کہ وقت کا اصل تقاضا کیا ہے اور وطن کے تئیں اس پر کیا فرض عائد ہوتا ہے۔

مصنّف کا اندازِ تحریر یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنے قاری پر یہ بات واضح کرنا چاہتا ہے کہ ۱۹۰۸ء کے زمانے میں مذکورہ بالا روایتی بیش بہا اشیا اپنی قدر و قیمت کھو چکی ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ مصنف کی نیت یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ وہ اس زمانے کے عام ذہن کی غیر واضح فکر کو اجاگر کرنا چاہتا ہے۔ عام آدمی کے غیر واضح ذہن اور عدم آگہی کا اندازہ کہانی میں اور آگے چل کر بھی ہوتا

ہے ـــــ پھانسی پانے والے چور کی آنکھ سے بچے کو پیار کرتے وقت گرنے والے آنسو اور شوہر کے ساتھ ستی ہو جانے والی عورت کی خاک کو دل فگار کا دنیا کی سب سے انمول شے سمجھنا' نہ صرف دل فگار کی عدم آگہی ہے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف اس کردار کے ذریعے عام لوگوں کی ناواقفیت کا بھی اظہار کرنا چاہتا ہے۔ چور کے آنسو اور ستی کی خاک کو دل فریب کی جانب سے ٹھکرا دینے کا ایک مفہوم یہ بھی ممکن ہے کہ کہانی کار ۱۹۰۸ء میں افراد کے نجی ردیوں اور مذہبی رسوم کی پابندی کو اس درجہ اہم اور قابلِ عزت تسلیم نہیں کرتا جتنا کہ حصولِ آزادی اور تحفظِ وطن کو۔ ان دونوں چیزوں کے ٹھکرا دینے میں ایک رمز یہ بھی ہے کہ ملکہ دل فریب کے پاس موجود لوح پر دنیا کی سب سے بیش قیمت شے کی تعریف درج ہے۔ گویا پریم چند، ملکہ دل فریب کو ایک ایسے کردار کی شکل میں سامنے لاتے ہیں جو اس راز کو جانتا ہے جس سے عام لوگ واقف نہیں ہیں۔

سوزِ وطن کا دوسرا افسانہ "شیخ مخمور" بھی اسی مقصد کے پیشِ نظر لکھا گیا کہ قاری میں حُبِّ وطن کا پُرجوش جذبہ بیدار ہو سکے۔ اس جذبے کی بیداری کے لیے پریم چند نے شیخ مخمور کے مرکزی کردار کے لیے ایک جری و جنگ جو نوجوان کا انتخاب کیا ہے۔

عام کتابی سائز کے ۲۴ صفحات میں پریم چند نے ایک معزول بادشاہ کے بیٹے کی کہانی بیان کی ہے۔

افسانے میں واقعات کا تفصیلی بیان اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب شاہ کشور کشا ثانی کے خلاف بغاوت شروع ہوتی ہے اور مسعود اس میں شریک ہوتا ہے ـــــ یعنی مصنف نے ان مواقع کو تفصیل سے بیان کیا ہے جہاں مسعود ایک جد و جہد اور معرکے میں شریک ہے۔ اس معرکے میں مسعود کی شرکت شروع میں ایک معمولی سپاہی کی حیثیت سے ہے لیکن اس کی بہادری اور جنگ جوئی اس کو دھیرے دھیرے باغی فوج میں ایک مقام دلا دیتی ہے اور مسعود اس درجہ اہم ہو جاتا ہے کہ اپنے ساتھیوں کو ایک سپہ سالار کی طرح خطاب کرنے لگتا ہے۔

اپنے ساتھیوں کے سامنے مسعود کی تقاریر کے مفہوم پر غور کرنے سے قبل مسعود کے تئیں مصنف کے رویے پر غور کرتے ہیں:۔

پریم چند نے جس طرح مسعود کو ایک بے یار و مددگار ماں باپ کا بیٹا دکھایا اور پھر اس کو جنگ جوئی و دلیری کی خصوصیات کا حامل بتایا ہے اس سے پریم چند کا مقصد یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ قاری کے دل و دماغ میں یہ بات بٹھانا چاہتے ہیں کہ بے کسی اور بے بسی میں پیدا ہونے والی نسلیں بھی ہمت و جرأت کی حامل ہو سکتی ہیں ـــــ یعنی اگر غلام ہندوستان میں سانس لینے والے والدین اپنی اولاد کو اس طرح تربیت دیں کہ وہ سن بلوغ کو پہنچ کر اپنے کھوئے ہوئے اقتدار کے حصول کے لیے جنگ کر سکیں۔ تو یہ بھی وطن کے لیے ایک قربانی ہوگی۔ شاہ بامراد کا مسعود کو تاج سونپنے کا عمل ـــــ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پریم چند اپنے عہد کے بزرگوں کے ہاتھوں سے کمسنوں کو ماضی کے تابندہ و درخشاں ورثے منتقل کرانا چاہتے ہیں۔ غالباً اس انتقالِ وراثت ہی کی تاثیر تھی کہ مسعود نے غلامی کی بے عملی کے بجائے بغاوت کا پر خطر راستہ اختیار کیا۔ اس راہ پر چلنے کے دوران اس کا روز بروز عروج اور مقبولیت: یہ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں کہ کہانی کا مصنف کہیں اپنے قاری کو حکومتِ وقت کے مقابل صف آرا ہونے کا درس تو نہیں دے رہا ہے؟ ـــــ اور پھر مسعود کی وہ تقریریں جو اس نے سردار نمک خوار کے سپاہیوں یعنی اپنے ساتھیوں کے سامنے کیں:

ایک موقع پر شاہ کشور کشا کی فوجوں سے مقابلہ آرائی کے بجائے سردار نمک خوار نے قلعہ بند ہونے کا قصد کیا تو مسعود نے اپنی تقریر میں کہا:

"نہیں ہم قلعہ بند نہ ہوں گے۔ ہم میدان میں رہیں گے اور دست بدست دشمن کا مقابلہ کریں گے۔ ہمارے سینوں میں ہڈیاں ایسی کمزور نہیں ہیں کہ تیر و تفنگ کے نشانے نہ برداشت کر سکیں . . . کیا آپ لوگ جو شاہ بامراد کے نام لیوا ہیں یہ بھول گئے کہ اسی ملک پر اس نے اپنے خاندان کے تین لاکھ سپوتوں کو پھول کی طرح نثار کر دیا۔"

اور پھر جب یہ معلوم ہوا کہ شاہ کشور کشا کے بوڑھے چچا نے فوج کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لی ہے تو سردار نمک خوار کی ہمت پھر جواب دے گئی۔ اس موقع پر شیخ مخمور بنے ہوئے مسعود نے تقریر کرتے ہوئے کہا:

"ہم نے یہ جنگ توسیع سلطنت کے کمینے ارادے سے نہیں چھیڑی۔ تم حق اور انصاف کی لڑائی لڑ رہے ہو۔ کیا تمھارا جوش اتنی جلدی ٹھنڈا ہو گیا؟ کیا تمھاری تیغ انصاف کی پیاس اتنی جلدی بجھ گئی؟ تم جانتے ہو کہ انصاف اور حق کی فتح ضرور ہوگی۔ اگر امیر پر تدبیر کی تلوار لوہے کی ہے تو تمھاری تیغ فولاد کی ہے۔ اگر اس کے سپاہی جاں باز ہیں تو تمھارے سپاہی بھی سرفروش ہیں۔ ہاتھوں میں تیغ مضبوط پکڑو اور نامِ خدا لے کر دشمن پر ٹوٹ پڑو۔

تمھارے تیور کہے دیتے ہیں کہ میداں تمھارا ہے۔"

براہِ راست مقابلے اور سرفروشی پر آمادہ کرنے والے جذبات کا یہ اظہار بہ ظاہر تو مسعود کی زبانی ہے لیکن کیا اس میں پریم چند کے جذبۂ حبِّ وطن اور خواہشِ آزادی کو دخل نہیں ہے؟ یہ درست ہے کہ اس زمانے میں پریم چند کے ذہن اور قلم پر داستانی طرزِ اظہار اور ماحول کی گہری چھاپ تھی اور وہ ہیرو پرستی پر مائل نظر آتے ہیں لیکن ہمیں اس پہلو پر بھی غور کرنا چاہیے کہ اس زمانے کا ہندوستان اور ہندوستانی کیسے جذبات اور ارادوں کے زیرِ سایہ سانس لے رہے تھے ـــــ ۱۹۰۸ء کے ہندوستان کا ماحول پیشِ نظر رکھا جائے تو یہی خیال ہوتا ہے کہ پریم چند نے مسعود کے حالات و کوائف میں غلام ہندوستان کے باشندوں کی بے بسی و لاچاری سمونے کی کوشش کی ہے اور اس کی مجاہدانہ زندگی کے وسیلے سے اپنے قاری کو جہدِ آزادی کی تلقین کرنی چاہی ہے۔

"یعنی: دنیا کا سب سے انمول رتن" کا دل فگار اور "شیخ مخمور" کا مسعود ـــــ پریم چند کے "تلقینی کردار" ہیں۔ جن کے وسیلے سے وہ اپنے قاری کو وطن کی محبت اور آزادی کے لیے جد و جہد کا درس دینا چاہتے ہیں۔ دونوں افسانوں میں پریم چند کی وطن دوستی کی مہک یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ

پریم چند نے جب افسانہ نگاری کا آغاز کیا تھا تو ان کا ذہن اپنے ملک کے داستانی ادب کے ورثے سے تو یقیناً متاثر تھا لیکن ان کی بچی فکر مزور ایسی تھی کہ جس نے داستانوں کے خواب انگیز ورثے میں ذہنی و عملی تحریک کی آمیزش کا فریضہ انجام دیا۔ پریم چند کا ذہن، داستانی ادب کے زیر سایہ پرورش پانے کے باوجود جس طرح اپنی سرزمین اور اپنے عہد کے وسیلے سے سوچنے کی صلاحیت رکھتا تھا، اس کے کچھ "قدرے مختلف" شواہد سوزِ وطن کے تیسرے افسانے: "یہی میرا وطن ہے" میں نظر آتے ہیں۔

یہ افسانہ ایک ایسے ہندوستانی کی کہانی ہے جو ساٹھ سال سے امریکہ میں رہ رہا تھا لیکن وہاں پر باثروت زندگی گزارنے کے دوران بھی بار بار اپنے وطن کو یاد کرتا تھا اور آرزو مند تھا کہ اس کی زندگی کا خاتمہ ہندوستان میں ہو تاکہ وہ اس کی خاک کا پیوند بن سکے۔

اس افسانے میں بھی پریم چند کا جذبۂ حبِ وطن ہی کارفرما ہے لیکن گذشتہ دو افسانوں کے مقابلے میں اس افسانے کا طرزِ اظہار نہایت مختلف ہے —— لیکن اس اختلاف کی ایک وجہ ہے: غور کیا جائے تو واضح ہوگا کہ یہ افسانہ سوز کا تیسرا افسانہ ہے۔ پہلے دو افسانوں میں پریم چند نے ماضی کے تصوراتی پس منظر کی مدد سے قاری کو حصولِ آزادی کے لیے عمل پیرا ہونے کی تلقین کی تھی؛ لیکن اگر "دنیا کا سب سے انمول رتن" اور "شیخ مخمور" کے تسلسل میں ہی "یہی میرا وطن ہے" پڑھا جائے تو واضح طور پر محسوس ہوگا کہ پریم چند کا لب و لہجہ اچانک تبدیل ہو گیا ہے۔ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ یہ تبدیلی کیوں؟

جواب یہ ہے کہ پریم چند کا قاری پہلے دو افسانوں میں عہدِ ماضی کی جھلکیاں دیکھ چکا ہے اور مصنف نے کوشش کی ہے کہ افسانوں میں درج واقعاتِ جد و جہد سے اس کا قاری اس کے مقصد کو سمجھ لے —— لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ماضی کے تاریخ نما واقعات سے پریم چند کے زمانے کا قاری وہی مفہوم اخذ کرے جو پریم چند کا مقصد ہے۔ کسی نہ کسی کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ یہ افسانے (دنیا کا سب سے انمول رتن اور شیخ مخمور) تو بھولے بسرے ماضی کی بے معنی جد و جہد اور جنگ کے واقعات دہرا رہے ہیں —— ان کا زمانۂ حال سے کیا تعلق ہے؟ —— ہمارا خیال ہے کہ تیسرا افسانہ پہلے دو افسانوں کے داستانی طرز کا جواز ہے۔ اور وہ اس طرح:

امریکہ سے واپس ہندوستان آنے والا شخص پانچ مواقع پر ہندوستان کے بارے میں کہتا ہے کہ یہ میرا وطن نہیں ہے۔ ان پانچ مواقع میں سے تین مواقع ایسے ہیں جہاں اس شخص کو اپنے وطن کا "زندگی کا مغربی انداز"، "بندوق بردار انگریز" اور "لال پگڑی والوں کا تشدد" نظر آیا ہے۔ تین مناظر کا مفہوم نہایت واضح ہے۔ پریم چند نے ان پر کوئی پردہ ڈالنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ آنے والے شخص کے جملوں کی مدد سے وہ کہتے ہیں اس سرزمین پر ایسے واقعات ہوتے ہوں وہ ہندوستان کی سرزمین نہیں تھی۔ یہ تو ایک آزاد دھرتی تھی۔ یہاں کسی پر ظلم نہیں ہوتا تھا اور یہ ملک —— بجائے خود ایک عظیم تہذیب کا حامل ہے —— ہندوستان کو اپنا وطن تسلیم نہ کرنے کے آخری دو مواقع وہ ہیں جہاں وہ شخص اپنے ملک کی اخلاقی اقدار کو ملیامیٹ ہوتے ہوئے دیکھتا ہے —— اقدار معاشرے کی باطنی زندگی اور موت کا پیمانہ تسلیم کی گئی ہیں۔ آنے والے نے واقعہ نمبر چار اور پانچ میں اخلاقی اقدار کا زوال دیکھا۔ وہ پہلے تین مواقع پر اپنے وطن کی ظاہری زندگی پر انگریز کی گہری اور شدید ہوتی ہوئی چھاپ کو دیکھ چکا ہے۔ گویا امریکہ سے آنے والے نے جان لیا کہ اس ملک کے ظاہر اور بڑی حد تک باطن پر بھی مغرب کا تسلط ہو چکا ہے۔

گوکھلے، تلک، راناڈے اور لالہ لاجپت رائے وغیرہ کی طرح —— پریم چند نے بھی ہندوستانی عوام کو ان کے ماضی کی عظمت یاد دلائی اور اس بازآفرینی میں انھوں نے ملک کے دونوں بڑے طبقوں کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ اس عمل کے دوران وہ اپنے کرداروں کو ہندو نام بھی دیتے ہیں اور مسلم نام بھی —— لیکن ان کے ایسے تمام افسانوں میں ایک قدرِ مشترک ہے؛ اور وہ یہ ہے کہ ان افسانوں کو پڑھ کر قاری میں عزتِ نفس کا احساس بیدار ہوتا ہے۔ اور جب عزتِ نفس کی حدیں پھیلتی ہیں تو حبِ وطن اور خواہشِ آزادی سے جا ملتی ہیں —— "شیخ مخمور" کا مسعود، اس امر سے آگاہ ہے کہ کسی فرد کا وجود اسی وقت بامعنی کہا جا سکتا ہے کہ جب وہ حقوق کی حفاظت کے لیے سینہ سپر ہونا چاہتا ہو —— "رانی سارندھا" میں پریم چند نے رانی کے کردار کی اساس یہی قرار دی ہے کہ وہ اپنے شوہر کو ہر اس موقع پر ٹوکتی ہے جہاں وہ عزتِ نفس کو فراموش کر کے بے عملی کا شکار ہونے لگتا ہے۔ وہ ہر اس موقع پر اداس و دل گرفتہ ہو جاتی ہے جہاں جہاں اس کا شوہر راجہ چمپت رائے، برائے نام ہی کسی حکمراں کی اطاعت قبول کرتا ہے۔ اس افسانے میں: جب راجہ چمپت رائے، شاہ جہاں کی عطا کردہ کالپی کی بیش بہا جاگیر قبول کرنے کے بعد عیش و عشرت کی محفلیں سجاتا ہے تو سارندھا ان دنوں بہت مغموم اور پژمردہ خاطر رہنے لگتی ہے۔

پورے افسانے میں رانی سارندھا کے کردار کی وہ خصوصیت کارفرما ہے جسے ہم عزتِ نفس ہی کہہ سکتے ہیں۔ اس افسانے کے دوران کئی مواقع ایسے آتے ہیں جہاں رانی سارندھا اپنے شوہر کو ہر طرح سربلند رہنے کی تلقین کرتی ہے۔ افسانے کے چوتھے حصے میں پریم چند نے وہ واقعہ درج کیا ہے جس میں ولی بہادر خاں کنور چھتر سال سے وہ اپنا گھوڑا چھین لیتا ہے جو دریائے چمبل کے کنارے والے معرکے میں اس کے ہاتھ سے جاتا رہا تھا۔ کنور کی زبانی گھوڑا چھین جانے کی بات سن کر سارندھا اس سے کہتی ہے:

"... مجھے اس بات کا غم نہیں کہ گھوڑا ہاتھ سے گیا۔ بلکہ غم اس بات کا ہے کہ تو اسے کھو کر زندہ کیوں لوٹا؟"

اور پھر گھوڑا واپس لینے کے لیے، اپنے سپاہیوں کے ساتھ، عالمگیر کے دربار تک جا پہنچتی ہے۔ دربار میں ولی بہادر خاں سے ہونے والی تکرار کا سلسلہ

کشت وخون تک پہنچنے ہی والا ہوتا ہے:

"... عالم گیر نے بیچ میں آکر فرمایا: " رانی صاحبہ! آپ اپنے سپاہیوں کو روکیں۔ گھوڑا آپ کو مل جائے گا۔ مگر اس کی قیمت بہت گراں ہوگی۔"

رانی: "میں اس کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہوں۔"

عالمگیر: جاگیر اور منصب بھی؟

رانی: جاگیر اور منصب کوئی چیز نہیں۔

عالمگیر: اپنا راج بھی؟

رانی: اس کی بھی میرے نزدیک کوئی ہستی نہیں۔

عالمگیر: ایک گھوڑے کے مقابلے میں!؟

رانی: جی نہیں —— اُس چیز کے مقابلے میں جو دنیا میں سب سے پیاری ہے۔

عالمگیر: وہ کیا ہے؟

رانی: اپنی آن۔"

یہ آن —— یا عزّتِ نفس —— پریم چند کی حُبّ الوطنی کی اساس ہے۔ تاریخ کے صفحات میں عالمگیر اور سارندھا کا یہ مکالمہ بھی (راجہ چمپت رائے کو سارندھا کے جواب کی طرح) جوں کا توں یقیناً نہیں ہوگا بلکہ اس کی تخلیق میں پریم چند کا جذبہ اور خیال کارفرما ہے۔ پریم چند نے اس جذبے اور خیال کو اپنے کئی افسانوں میں مختلف طریقوں سے پیش کیا ہے۔

پریم چند کے ایک افسانہ "سرِپُرغرور" کے محوری کردار، کنور رتن سنگھ میں۔ پریم چند نے کچھ ایسی خصوصیات کا رنگ بھرا ہے جو ان کے نزدیک کسی فرد کو ایک "شخصیت" میں تبدیل کرتی ہیں۔

اس افسانے میں ایسے کئی مواقع کا ذکر ہے کہ جب لوگوں کی بہت بڑی تعداد نے اپنی خود داری کا پاس نہیں کیا۔ لیکن ان ہی لوگوں جیسی صورتِ حال سے دوچار ہونے کے باوجود کنور رتن سنگھ نے اپنی آن کو برقرار رکھا۔ اس طرح کے واقعات سے گزرنے کے نتیجے میں، مسٹر واگلے کے ذہن و دل پر کنور رتن سنگھ کی شخصیت کا نقش مزید گہرا ہوتا چلا گیا۔

اس افسانے میں کنور کی خصوصیات بیان کرنے میں جو جذباتی لب و لہجہ اختیار کیا گیا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ مسٹر واگلے کے پردے میں پریم چند اپنی رائے اور خیالات کا اظہار کر رہے ہیں۔ اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ پریم چند اپنے افسانے میں، عزّتِ نفس، حمیّت، خود داری اور آن جیسی انسانی خصوصیات کا ذکر کرکے، ایک طرح سے تمنّا کرتے ہیں کہ یہ خصوصیت ان کے ملک کے عوام میں بھی پیدا ہو جائے۔ اس تمنّا اور خواہش کی وجہ ان کے زمانے کے غلام ہندوستان کے ماحول میں پوشیدہ ہے۔ واضح الفاظ میں اس بات کو یوں کہا جا سکتا ہے کہ پریم چند نے جس طرح اپنے افسانوں میں اس خصوصیت کے حامل کرداروں کے گرد کہانی کا تانا بانا بنا ہے اُس سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان کی جدّوجہد آزادی کی کامیابی کے لیے ضروری سمجھتے ہیں کہ قوم کے افراد میں حمیّت اور غیرت بیدار ہو اور وہ اپنی عزّتِ نفس اور خود داری کو بحال کرنے پر آمادہ ہوں۔

تاریخی اور نیم تاریخی پس منظر رکھنے والے افسانوں میں پیش کردہ واقعات سے پریم چند کے اس اندازِ فکر کا ثبوت مل جاتا ہے —— سماجیات اور نفسیات کے تقریباً تمام عالم اس امر پر متفق ہیں کہ آدمی اپنے اسلاف کا ذکر نہایت رغبت کے ساتھ سنتا ہے اور یہ رغبت اس وقت محبت اور جذبے میں تبدیل ہو جاتی ہے جب اس کے اسلاف نے برتری اور سربلندی کا زمانہ گزارا ہو —— پریم چند نے ارضِ وطن پر سانس لینے والے ہندوؤں اور مسلمانوں کے پُرجوش تاریخی و نیم تاریخی واقعات کا سہارا لے کر جس طرح ان میں جذبۂ حبِّ وطن پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اس سے، ان کی وطن پرستی کے ساتھ ساتھ، اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ انسانی مزاج کے اسلاف پرست رخ کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنے کا فن اچھی طرح جانتے تھے۔

پریم چند نے افراد میں دلیری اور حمیّت پیدا کرنے کے مقصد کو کچھ اور طریقوں سے بھی اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ ان کا افسانہ "بانکا زمیندار" اس ضمن میں ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔

ٹھاکر صاحب بد دماغی اور تندخوئی کا مظاہرہ کرتے ہیں تو ہری داس اور اس کے ساتھیوں کی تیوریوں پر بل پڑ جاتے ہیں۔ ہری داس کہتا ہے:

"ہم آپ کی رعیت ہیں، لیکن ہم کو اپنی آبرو پیاری ہے۔ اور چاہے اپنے زمیندار کو اپنا سر دیدیں، آبرو نہیں دے سکتے۔"

بات بڑھ گئی۔ ٹھاکر نے اپنے رسالے دار کو حکم دیدیا کہ ان لوگوں کو گاؤں سے نکال دو۔ رسالے کے ساتھ گاؤں والوں نے مقابلہ کیا اور ٹھاکر کے متعدد کارندوں کو زخمی کر ڈالا۔ اگلی صبح ٹھاکر نے گاؤں کے لوگوں کو چوپال پر طلب کیا۔ لوگ اکٹھے ہوگئے تو ٹھاکر صاحب ایک ایک کرکے سب سے بغل گیر ہوئے اور کہا:

"... میں ایشور کا بہت مشکور ہوں کہ مجھے اس گاؤں کے لیے جن آدمیوں کی تلاش تھی وہ لوگ مجھے مل گئے۔ آپ کو معلوم ہے یہ گاؤں کتنی بار اجڑا اور کتنی بار بسا۔ اس کا سبب یہی تھا کہ وہ لوگ میرے معیار پر پورے نہ اترتے تھے۔ میں ان کا دشمن نہیں تھا۔ لیکن میری دلی آرزو یہ تھی کہ اس گاؤں میں وہ لوگ آباد ہوں جو ظلم و ستم کا مردوں کی طرح سامنا کریں۔ جو اپنے حقوق اور رعایتوں کی مردوں کی طرح حفاظت کریں۔ جو حکومت کے غلام نہ ہوں۔ جو رعب اور اختیار کی نگاہِ تیز دیکھ کر بچوں کی طرح خوف سے سہم نہ جائیں۔ مجھے اطمینان ہے کہ بہت نقصان اور ندامت اور بدنامی کے بعد میری تمنائیں پوری ہوگئی ہیں۔ مجھے اطمینان ہے کہ آپ ناموافق ہواؤں اور تلاطم موجوں کا کامیابی سے مقابلہ کریں گے۔ میں آج اس گاؤں سے دست بردار ہوتا ہوں۔ آج سے یہ آپ کی ملکیت ہے۔ آپ ہی اس کے زمیندار اور مختار ہیں..."

سچ پوچھیے تو یہ گاؤں ٹھاکر پودھن سنگھ کے نہیں بلکہ پریم چند کے خیالوں کا ہندوستان ہے۔ پریم چند کے قلم سے نکلنے والی ٹھاکر کی مذکورہ بالا

تقریر میں پریم چند کے خیالوں کا عکس واضح طور پر جھلک رہا ہے۔ ٹھاکر نے اپنی جس دلی آرزو کا بیان کیا ہے۔ وہ آرزو دراصل خود پریم چند کے دل میں پنپی ہے۔ حکومت کی غلامی اور رعب و اختیار کے خلاف استعمال ہونے والے الفاظ کی روح بتاتی ہے کہ یہ برطانوی حکومت کے جبر و اختیار کے خلاف ہندوستانیوں کو صف آرا کرنے کے لیے کہے گئے ہیں۔

انسانی غیرت و حمیت کو مہمیز کر کے ابنائے وطن کو جد وجہد آزادی میں شامل کرنے کے لیے پریم چند نے ایک اور لطیف حربہ استعمال کیا ہے۔ اور وہ لطیف حربہ یہ ہے کہ وہ اپنے افسانے میں ایسی عورتوں کو محوری کردار بناتے ہیں جو عزم و ہمت اور جرأت و دلیری کی خصوصیات سے متصف ہوتی ہیں۔ اس طرح پریم چند ایک تیر سے دو شکار کرتے ہیں۔ افسانے میں ایسے کردار سے متعارف ہو کر افسانے کا مرد' قاری یہ سوچ سکتا ہے کہ جب ایک عورت اپنے وطن یا عزتِ نفس کے لیے اتنے دلیرانہ قدم اٹھا سکتی ہے تو وہ مرد ہوتے ہوئے ایسا کیوں نہیں کر سکتا؟ اس سوچ کا فوری جواب پریم چند کے مقصد کے حق میں جاتا ہے۔ کسی عورت کو افسانے میں باعمل اور غیرت مند دکھانے کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ افسانہ پڑھنے والی عورت اپنے اندر ویسے ہی جذبے اور قوتِ عمل محسوس کر سکتی ہے جیسی افسانے کی ہیروئن میں پریم چند دکھاتے ہیں۔

پریم چند نے اپنے اس حربے کا استعمال افسانہ: "رانی سارندھا" میں تو کیا ہی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے افسانہ: "ستی" میں بھی بندیل کھنڈ کی تاریخ میں اہم مقام رکھنے والی ایک خاتون چنتا دیوی کو مرکزی کردار بنایا ہے۔ چنتا دیوی ایک بہادر بندیلے کی لڑکی تھی۔ اس کی ماں بچپن ہی میں مر چکی تھی اس لیے اس کی پرورش باپ نے کی۔ وہ کیونکہ لڑائیوں کا زمانہ تھا اس لیے چنتا کا بچپن اپنے باپ کے ساتھ میدان جنگ میں گزرا۔

"... اس کا باپ اسے کسی غار میں یا کسی درخت کے آڑ میں چھپا کر میدان میں چلا جاتا۔ وہ بلا کسی خوف کے اطمینان سے بیٹھی ہوئی مٹی کے قلعے بناتی اور بگاڑتی۔ اس کے گھروندے قلعے ہوتے تھے۔ اس کی گڑیاں اوڑھنی نہ اوڑھتی تھیں۔ وہ سپاہیوں کے گڈے بناتی اور انھیں لڑائی کے میدان میں کھڑا کرتی ...."

جب اس ذہنی ساخت کے تحت پلنے والی چنتا کا باپ ایک معرکے میں کام آگیا وہ روئی پیٹی نہیں بلکہ اسلحہ لگا کر سپاہیوں میں شامل ہو گئی اور ایسی جرأت و دلیری کے کارنامے انجام دیئے کہ پانچ سال کے اندر اندر سارے صوبے میں چنتا دیوی کی دھاک بیٹھ گئی اور وہ اپنی فوج کی سردار بن گئی۔ اس کے حسن اور بہادری کے بہت سے شیدائی تھے لیکن رتن سنگھ نامی ایک سپاہی ان سب سے مختلف تھا۔ اس کی محبت میں بے غرضی اور جانثاری تھی۔ ایک رات رتن سنگھ چنتا دیوی کی حفاظت کرتا ہوا شدید زخمی ہو گیا تو چنتا نے نہ صرف اس کے جسم کے زخموں کے اندمال کے لیے مرہم پٹی اور تیمارداری کی بلکہ صحت یاب ہو جانے پر اس کے زخمِ دل پر بھی مرہم رکھا۔ شادی کی رات معلوم ہوا کہ دشمن کی فوج قلعے کی طرف بڑھتی آرہی ہے۔ رتن سنگھ اپنی فوج لے کر مقابلے کے لیے چلا لیکن اچانک پیش آنے والا فراقِ یار کا جاں کاہ واقعہ اس پر اثر انداز ہوا اور وہ دشمن پر حملے کے دوران اپنی فوج کی قیادت کے لیے موجود نہ رہ سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے تمام سپاہی عدم قیادت کے باعث مرہٹوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ مرہٹے قلعے کی طرف بڑھے تو چنتا دیوی نے مقابلے کے بجائے چتا تیار کرنے کا حکم دیا۔ جیسے ہی چتا میں آگ لگی رتن سنگھ وہاں پہنچ گیا۔ اس نے چنتا دیوی کو چتا سے نکالنا چاہا مگر چنتا دیوی نے یہ کہہ کر اس کو ہٹا دیا:

"... تم میرے رتن سنگھ نہیں۔ میرا رتن سنگھ سچا سورما تھا۔ وہ اپنی حفاظت کے لیے، اپنے نکمے جسم کو بچانے کے لیے اپنے دھرم کو ترک نہ کر سکتا تھا۔ میں جس جوان مرد کے قدموں پر نثار ہو چکی تھی وہ دیوتاؤں کی بہشت میں رونق افروز ہے۔ رتن سنگھ کو بدنام مت کرو۔ وہ بہادر راجپوت تھا، میدانِ جنگ سے بھاگنے والا بزدل نہیں۔"

آخری الفاظ نکلتے ہی آگ کی لپٹ چنتا کے سر کے اوپر جا پہنچی۔ پھر ایک لمحے میں وہ حسن کی مورت، وہ اعلیٰ بہادری کی پجارن، وہ سچی ستی آگ میں جل کر بھسم ہو گئی۔

رتن سنگھ خاموشی سے مبہوت کھڑا ہوا، یہ دردناک نظارہ دیکھتا رہا۔ پھر یکایک آہِ سرد بھر کر اسی چتا میں کود پڑا۔"

اس طرح پریم چند نے ایک ہی افسانے میں نہ صرف عورتوں بلکہ مردوں کے سینے بھی دلیری اور جرأت و ہمت کا جذبہ پیدا کر دیا ہے؛ اور بالواسطہ طور پر ہندوستان کے مردوں اور عورتوں میں، جنگِ آزادی میں شمولیت کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کی ـــــ یہ کوششیں تو بالواسطہ کہی جا سکتی ہیں۔ ان کے علاوہ پریم چند نے ایسے بھی متعدد افسانے لکھے ہیں جو واضح طور پر ہندوستانی کے عوام کو اس جنگِ آزادی کی حمایت اور اس میں شرکت پر آمادہ کرتے ہیں۔ جس کی قیادت مہاتما گاندھی کر رہے تھے۔

تحریکِ عدم تعاون سے متعلق پریم چند کا افسانہ: "لال فیتہ" خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ یہ افسانہ اپنے قاری کو وہ روشنی مہیا کرتا ہے۔ جس کی مدد سے دیکھا جا سکتا ہے کہ جد وجہد آزادی کے دوران چلنے والی تحریکِ عدم اعتماد سے متاثر ہو کر ہندوستان کے باضمیر سرکاری ملازم، اپنی ملازمتوں سے کیوں مستعفی ہو رہے تھے۔

آبائی کسان رام بلاس نے اپنی کچھ اراضی بیچ کر کے، کچھ رہن رکھ کر اور کچھ قرض کی علت میں نیلام پر چڑھا کر اپنے ذہین بیٹے ہری بلاس کو ایم۔ اے کرایا۔ ہری بلاس مقابلے کے امتحان میں شریک ہو کر ڈپٹی مجسٹریٹ کے عہدے پر فائز ہوئے۔ نہایت ایمان داری اور انصاف کے ساتھ خدمات انجام دیں۔ جنگِ یورپ کے زمانے میں وفاداری کا ثبوت دینے کے صلے میں

رائے بہادری کے اعزاز سے سرفراز ہوئے۔ چند دنوں کے دن تھے۔ رات ہری بلاس اپنے بڑے بیٹے شیو بلاس اور دو تین زمینداروں کے ساتھ باتیں کر رہے تھے کہ ڈاکیے نے خطوط لاکر دیے جس میں ایک سرکاری لفافہ بھی تھا۔ اس میں سے سرخ فیتے میں بندھا ہوا ایک سرکاری مراسلہ نکلا۔ وہ اسے غور سے پڑھنے لگے۔

"آدھی رات گزر گئی تھی۔ مگر مسٹر ہری بلاس ابھی تک کروٹیں بدل رہے تھے۔ سامنے میز پر ایک لیمپ جل رہا تھا۔ وہ اسی سرخ فیتے والے مراسلے پر بار بار نگاہیں ڈالتے اور پھر خیال میں ڈوب جاتے۔ وہ سرخ فیتہ انھیں حق اور راستی کے خون میں رنگا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ وہ کسی قاتل کی خون بار آنکھیں تھیں جو ان کی طرف گھور رہی تھیں یا ایک سرخ شعلہ تھا جو ان کے ضمیر اور احساس حق کو نگل جانے کے لیے ان کی طرف لپکا آتا تھا۔ وہ سوچ رہے تھے: اب تک میں سمجھتا تھا کہ میرا کام انصاف کرنا ہے۔ اب معلوم ہو رہا ہے کہ میں غلطی پر تھا میرا کام انصاف کرنا نہیں انصاف کا خون کرنا ہے۔ میرا فرض ہے کہ تلک یہاتوں میں اخبار بیں لوگوں پر نگاہ رکھوں۔ جو لوگ کسانوں کی حمایت پہ آمادہ نظر آئیں، جو لوگ انھیں رسد اور بیگار دینے سے اعلانیہ یا اشارتاً روکیں ان کو تنبیہ کروں۔ ان سادھو سنیاسیوں سے باز پرس کروں جو عوام میں دھرم اپدیش کرتے پھرتے ہیں۔ جن لوگوں کو چرخے اور کرگھے کے استعمال کی ترغیب دیتے ہوئے دیکھوں، جسے گاڑھے اور کھدر کے کپڑے پہنے ہوئے پاؤں اس کا نام بھی روز نامچے میں درج کر دوں۔ جو لوگ قومی مدارس کی امداد کریں، جو قومی مجلسوں میں شریک ہوں، نہیں بلکہ ان پاک نفسوں کو بھی جو اپنی جان خطرے میں ڈال کر وبا اور طاعون میں رعایا کی جان بچاتے ہیں اور مفت دوائیں تقسیم کرتے پھرتے ہیں، سرکشوں میں شمار کروں اور مسکرات کے معاملے میں چون وچرا کرنے والوں کو فوراً شکنجے میں کس دوں۔ خلاصہ یہ کہ مجھے قوم کے دوستوں اور قوم کے خادموں کا دشمن بننا چاہیے۔"

مراسلے میں درج ان احکامات کو پڑھ کر ہری بلاس کے ضمیر میں "انسانی اور منصبی فرائض" کے مابین کشاکش ہوتی ہے ان کے ذہن میں اپنے کنبے کے حالات بھی ہیں کہ لڑکوں کی تعلیم ادھوری ہے، لڑکیوں کی شادیاں نہیں ہوئی ہیں وغیرہ وغیرہ ایک ہفتے تک وہ افسردہ خاطر رہے، اجلاس پھر بھی برائے نام گئے۔

ہری بلاس نے ... لکھنا شروع کیا۔

جناب من! میرا عقیدہ ہے کہ نظام سلطنت مشیت ایزدی کی ظاہری صورت ہے۔ اور اس کے قوانین بھی رحم، حق اور انصاف پر قائم ہیں۔ میں نے پندرہ سال تک سرکار کی خدمت کی اور حتی الامکان اپنے فرائض کو دیانت داری سے انجام دیا۔ ممکن ہے حکام بعض موقعوں پر مجھ سے خوش نہ رہے ہوں۔ اس لیے کہ میں نے شخصی احکام کی اطاعت کو کبھی اپنا فرض نہ سمجھا۔ جب کبھی میرے احساس قانون اور حکم حاکم میں تناقض ہوا، میں نے قانون کی پیروی کی۔ میں ہمیشہ سرکاری ملازمت کو خدمت ملک کا بہترین ذریعہ سمجھتا رہا۔ لیکن مراسلہ نمبر... مورخہ... میں جو احکام نافذ کیے گئے ہیں وہ میرے ضمیر اور اصول کے مخالف ہیں اور میرے خیال میں ان میں نا حق پروری کا اتنا دخل ہے کہ میں اپنے سینے ان کی تعمیل کے لیے کسی کو بھی آمادہ نہیں کر سکتا۔ وہ احکام رعایا کی جائز آزادی میں مخل اور ان کی سیاسی بیداری کے قاتل ہیں۔

ان حالات پر نظر کر کے میرا اس نظام حکومت سے تعلق رکھنا ملک اور قوم کی حق کشی کرنی ہے۔

دیگر حقوق کے ساتھ رعایا کو سیاسی جدوجہد کا حق بھی حاصل ہے اور چونکہ گورنمنٹ اس حق کو پامال کرنے کے درپے ہے۔ لہٰذا میں ہندوستانی ہونے کے اعتبار سے یہ خدمت انجام دینے سے معذور ہوں اور استدعا کرتا ہوں کہ مجھے بلا تاخیر اس عہدے سے سبکدوش کیا جائے۔"

ان طویل طویل اقتباسات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ پریم چند نے اپنے افسانے کے ذریعے اپنے قاری کو ممکن حد تک وہ تمام وجوہ بتانے کی کوشش کی ہے جن کی بنا پر باضمیر ہندوستانی عہدیداروں نے اپنے عہدے چھوڑ دینے کے فیصلے کیے تھے۔ برطانوی حکومت نے ہندوستانی عوام کو جن انسانی اور ملکی حقوق سے محروم کرنے کا تہیہ کیا ہوا تھا اس کی وضاحت میں بھی یہ اقتباسات کارآمد ہیں۔ یعنی پریم چند نے اس ایک افسانے کے ذریعے ہندوستان کے سرکاری ملازمین کو جاری ہونے والے سرکاری احکامات کی نوعیت، ہندوستانی ملازمین کے ضمیر کی بیداری اور انگریز کی قائم کردہ عدالتوں کی اصلیت سے اپنے قاری کو آگاہ کرنا چاہا ہے۔ اس آگہی کے پردے میں پریم چند کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ ہندوستانیوں میں ہمت اور حوصلہ پیدا ہو کہ جب ایک اعلا عہدیدار ابنائے وطن کے تئیں اپنے فرائض کا احساس کر کے تحریک عدم تعاون کی پیروی کر سکتا ہے اور ایک معمولی کاشتکار کی زندگی اختیار کر سکتا ہے تو اور لوگ بھی اس تحریک کو دیگر طریقوں سے اختیار کر کے غاصبانِ وطن کے خلاف صف آرا ہو سکتے ہیں۔

"لال فیتہ" کے اختتامی حصے میں پریم چند نے لکھا ہے کہ ہری بلاس نے واپس گاؤں جا کر اپنا آبائی گھر آباد کیا۔ ملازمت سے ان کے استعفے کی خبر اخبار میں پڑھ کر اس نواح کا سب سے بڑا زمیندار کرن سنگھ ان کے گھر پہونچا اور ان کے اقدام پر آفریں کرنے کے بعد درخواست کی کہ ہری بلاس نو قائم شدہ پنچایت کا سرپنچ بننا قبول کریں۔ ہری بلاس کو یہ اعزاز قبول کرنا پڑا۔ اس کے بعد کرن سنگھ نے نہایت عزت و احترام کے ساتھ ایک لفافہ ان کی خدمت میں پیش کیا جس پر لکھا۔ پنچ نامہ ور ہو تا مہ رام بلاس کو گا موضع بدو گھر" اور پھر اس لفافے کے پرزے کر دیئے۔ گویا ملازمت کے استعفے سے خوش ہو کر کرن سنگھ نے وہ تمام زمین جائیداد آزاد کر دی جو ہری بلاس کے باپ نے ان کی تعلیم کے لیے گروی رکھی تھی پریم چند یہ کہنا چاہتے ہیں کہ وطن کی آزادی کے لیے قربانیاں دینے والوں کو حکومت کی عطا کردہ آسائشوں سے بھلے ہی محروم ہونا پڑے عوام وفور شوق سے ان کو گلے لگاتے ہیں محکمہ تعاون سے بھی نہیں رہ سکتے۔ اس طرح پریم چند اپنے درس اور تلقین کو قبول کرنے کے لیے افسانے کے قاری کو مزید آمادہ کرتے ہیں۔

افسانہ "آخری تحفہ" میں ایک نوجوان امرناتھ کی محبوبہ مالتی اس سے ایک ولایتی ساڑی کی فرمائش کرتی ہے۔ امرناتھ رضا کاروں کی آنکھ بچا کر جیسے تیسے ساڑی خرید کر دکان سے باہر نکلتا ہے تو "زعفرانی کپڑوں والی ایک" دیوی جی" امرناتھ کو ساڑی خریدنے پر شرمندہ کرتی ہے

اور یہ کہہ کر ساڑی لے لیتی ہے کہ میں کل چل کر خود مالتی سے بات کروں گی۔ "دیوی جی" سے ملاقات کا امرناتھ پر جو اثر ہوا، اس کا ذکر پریم چند نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

"۔۔۔اس معصوم چہرے کی بے لوث سرگرمی ان (امرناتھ) کے دل میں ایک ہیجان پیدا کر رہی تھی۔ اُن آنکھوں میں متانت تھی۔ کتنا سچا جذبہ درد، کتنا خلوص! اس کے سیدھے سادے الفاظ میں کوئی ایسی تحریک عمل تھی کہ امرناتھ کو اپنی نفس پرورانہ زندگی پہ شرم آ رہی تھی۔ اب تک کانچ کے ایک ٹکڑے کو ہیرا سمجھ کر سینے سے لگائے ہوئے تھے۔ آج انھیں معلوم ہوا، ہیرا کسے کہتے ہیں۔ اس کے سامنے وہ ٹکڑا حقیر معلوم ہو رہا تھا۔ مالتی کی جادو بھری چتون، اس کی وہ شیریں ادائیں، اس کی شوخیاں اور سحر طرازیاں، سب گویا ملمع اڑ جانے کے بعد اپنی اصلی صورت میں نظر آ رہی تھیں اور امرناتھ کے دل میں نفرت پیدا کر رہی تھیں۔ وہ مالتی کی طرف جا رہے تھے۔ اس کے دیدار کے لیے نہیں، بلکہ اس کے ہاتھوں سے اپنا دل چھیننے کے لیے۔ ۔ ۔"

امرناتھ کی یہ قلب ماہیت، پریم چند اس لیے نہیں کرتے ہیں کہ وہ افسانے کے ایک کردار کو سودیشی تحریک کی جانب مائل ہوتا دکھانا چاہتے ہیں۔ بلکہ ایک محبوبہ کی جانب سے عاشق کی بددلی بیان کرنے سے ان کا مقصد یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ولایتی کپڑوں کی نمائش کرنے یا کر سکنے والی عورتوں کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو کہ گھروں سے باہر نکلنے والے مردوں کے ذہن و دل پر ملکی و قومی تحریکات کا اثر قائم ہو سکتا ہے اور جس کے نتیجے میں ان کے اور مرد کے درمیان قائم محبت کا رشتہ شکست ہو سکتا ہے ——— دوسری جانب یہی افسانہ "دیوی جی" کے کردار کے وسیلے سے، خواتین کو بھی ملکی و قومی تحریکات میں عملی حصہ لینے پر آمادہ کرتا ہے۔

ان نیم گھریلو نوعیت کے کرداروں کے ذریعے سے پریم چند نے جوان مردوں اور عورتوں میں حب الوطنی کے جذبات پیدا کرنا چاہتے ہیں ——— افسانہ "جیل" میں دو نوجوان لڑکوں۔ وشومبھر اور آنند اور ایک نوجوان لڑکی روپ متی کے کرداروں کی مدد سے پریم چند نے کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں پڑھنے والے نوجوانوں کو جدوجہد آزادی میں حصہ لینے پر آمادہ کرنا چاہا ہے ——— یا پھر یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ پریم چند نے اپنے زمانے کے طلبہ میں پائے جانے قومی جذبات کی عکاسی کی ہے۔

آنند اور وشومبھر ایم۔ اے میں ہم جماعت ہیں اور روپ متی ان کی سابق ہم جماعت۔ آنند دولت مند اور ذہین ہے۔ لیکن وشومبھر غریب اور قدرے کند ذہن۔ دونوں کا روپ متی کے یہاں آنا جانا ہے۔ آنند روپ متی کو دل ہی دل میں چاہتا ہے۔ جب آنند کالج پہونچا تو اسے وشومبھر کا یہ خط ملا۔

"پیارے آنند

مجھے بخوبی علم ہے کہ میں جو کچھ کرنے والا ہوں وہ میرے لیے فائدہ بخش نہیں لیکن نہ جانے کون سی طاقت مجھے کھینچے لیے جا رہی ہے۔ میں جانا نہیں چاہتا، لیکن جاتا ہوں۔ جب وہ سبھی لوگ، جن کی ہمارے دلوں میں عزت ہے، ادکھلی میں سر ڈال چکے تو میرے لیے بھی اب کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ میں اب اور اپنے دل کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ یونی ورسٹی کی ڈگری اچھی شے ہے۔ لیکن یہ میری عزت کا سوال ہے۔ اور عزت کسی قسم کا سمجھوتا نہیں کر سکتی۔

تمہارا وشومبھر"

آنند یہ خط لے کر روپ متی کے پاس پہنچا۔ خط پڑھ کر روپ متی کے دل میں ایثار کے جذبات پیدا ہوئے اور جب آنند اس کے پاس سے اٹھ کر چلا گیا تو روپ متی سوراج بھون پہنچی وہاں اس کو معلوم ہوا کہ وشومبھر نے دیہات میں کام کرنے کی ذمے داری لی ہے اور سات بجے کی گاڑی سے مندرہ کے مقام پر جا رہا ہے۔ وہ اسٹیشن پہنچی اور وشومبھر سے مل کر اس کو مشورہ دیا کہ وہ اپنا ارادہ ترک کر دے کیونکہ اگر پکڑا گیا تو دو سال سے کم کی سزا نہیں ہوگی۔ روپ متی کی بات سن کر وشومبھر نے کہا۔

"یہ دوست کا مشورہ نہیں ہے روپ متی، مجھے یقین ہے یہ بات تم دل سے نہیں کہہ رہی ہو۔ ذرا سوچو۔ میری جان کی قیمت کیا ہے؟ ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد بھی سو روپے کی ملازمت! بہت بڑھا تو تین چار سو تک پہونچ جاؤں گا۔ اس کے بدلے یہاں کیا ملے گا؟ جانتی ہو، سارے ملک کے لیے سوراج! اتنے عظیم الشان مقصد کے لیے مر جانا بھی اس زندگی سے کہیں اچھا ہے۔ اب جاؤ۔ گاڑی آ رہی ہے۔ آنند بابو سے کہنا مجھ سے ناراض نہ ہوں۔"

روپ متی کے دل میں وشومبھر کے لیے عقیدت پیدا ہوئی اور اس نے کہا۔ "مجھے بھی ساتھ لے چلو" لیکن کافی بحث کے باوجود بھی وشومبھر اس کو ساتھ لے جانے پر آمادہ نہیں ہوا۔

اس افسانے میں پریم چند نے ایک نوجوان لڑکی کے دل پر ایک خادم قوم نوجوان کی محبت کا نقش قائم کرنے میں انسانی نفسیات کو بھی پوری طرح ملحوظ رکھا ہے۔ عورتیں، اور خاص طور پر نوجوان لڑکیاں مردوں کے مقابلے میں زیادہ آدرش وادی ہوتی ہیں روپ متی ابتدا میں آنند کو پسند کرتی ہے۔ اس کی میز پر آنند کا فوٹو فریم رکھا ہوا ہے۔ لیکن جب وہ وشومبھر کے قومی جذبے کے بارے میں سنتی ہے تو اس کی نگاہیں آسمان کی جانب اٹھ جاتی ہیں۔ بلندی کی جانب اٹھتی ہوئی نگاہ میں، عام طور پر، بلند ارادوں کی روشنی اور قوت ہوتی ہے۔ آسمان کی جانب اٹھتی ہوئی روپ متی کی نگاہیں دل میں پیدا ہونے والے بلند ارادے کی شہادت ہیں۔ پریم چند نے اس ایک اشارے سے روپ متی کی ذہنی کیفیت کو منقش کر دیا ہے۔ وہ کسی تفصیل سے کام نہیں لیتے لیکن پھر بھی روپ متی کے ذہن میں پیدا ہونے والی تبدیلی کو اجاگر کر دیتے ہیں۔

اس ضمن میں ان کے دو افسانوں: "قاتل" اور "قاتل کی ماں"[1] کا خاص طور پر ذکر کیا جا سکتا ہے۔ یہ دونوں افسانے بالترتیب ۱۹۳۴ء اور ۱۹۳۶ء کے لگ بھگ پہلی بار شائع ہوئے تھے۔

"قاتل"، کا مرکزی کردار دھرم ویر رات ——— کو کافی دیر سے گھر پہنچتا ہے جو اس کی بیوہ ماں کے لیے تشویش ناک ہے دھرم ویر نے ماں سے کہا ہوا ہے کہ وہ ایک سبھا کا ممبر بن گیا ہے جب کہ اس سے قبل وہ بھی ماں کے ساتھ قومی تحریک میں رضا کار کی حیثیت سے کام کیا کرتا تھا۔ دھرم ویر کی ماں اس "نئی سبھا" کے بارے میں پوچھتی ہے تو وہ گول مول جواب دے کر بات اڑانا چاہتا ہے لیکن ایک روز جب ماں کا تقاضا شدید ہو جاتا ہے تو وہ اس سے کہتا ہے:

"۔۔۔ دیکھو اماں! کسی سے کہنا مت۔ ورنہ سب سے پہلے میری جان پر آفت

---

[1]۔ یہ کہانی شیو رانی ادیبہ پریم چند کی بھی کہی جاتی ہے۔ (ادارہ)

آئے گی۔ مجھے امید نہیں کہ پکٹنگ اور جلوسوں سے ہمیں آزادی حاصل ہو سکے۔ یہ تو اپنی کمزوری اور معذوری کا صریح اعلان ہے۔ جھنڈیاں نکال کر اور گیت گا کر قومیں نہیں آزاد ہوا کرتیں۔ یہاں کے لوگ اپنی عقل سے کام نہیں لیتے۔ ایک آدمی نے کہا: یوں سوراجیہ مل جائے گا۔ بس آنکھیں بند کر کے اس کے پیچھے ہو لیے۔ وہ آدمی گمراہ ہے اور دوسروں کو بھی گمراہ کر رہا ہے۔ یہ لوگ دل میں اس خیال سے خوش ہو لیں کہ ہم آزادی کے قریب آتے جاتے ہیں مگر مجھے تو یہ طرزِ عمل بالکل بچوں کا کھیل معلوم ہوتا ہے ....."

—— ماں کے ایک جواب کی تردید کرتے ہوئے دھرم ویر کہتا ہے:

"... وہ [انگریز] ہندوستان اسی وقت چھوڑیں گے جب انھیں یقین ہو جائے گا کہ اب وہ ایک لمحہ بھر بھی نہیں رہ سکتے۔ اگر آج ہندوستان کے ایک ہزار انگریز قتل کر دیے جائیں گے تو آج ہی سوراجیہ مل جائے ... ایک گورے افسر کے قتل کر دینے سے حکومت پر جتنا خوف طاری ہو جاتا ہے اتنا ایک ہزار جلوسوں سے ممکن نہیں۔"

یہ باتیں سن کر دھرم ویر کی ماں کو اس کی زندگی خطرے میں دکھائی دینے لگی ہے۔ وہ بیٹے سے کافی بحث کرتی ہے۔ لیکن وہ اس سبھا سے الگ ہونے پر تیار نہیں ہوتا۔ آخر کار وہ بھی دھرم ویر کے ساتھ اس سبھا میں شریک ہونے کا فیصلہ کر لیتی ہے۔ اور دہشت پسندوں سے ریوالور چلانا سیکھتی ہے۔ دو ہی روز بعد پولیس کے افسرِ اعلیٰ کے نام موت کا پروانہ نکلا اور یہ خدمت دھرم ویر کے سپرد ہوئی۔ لیکن ماں کے دل سے وہ خوف نہیں نکلا جو اس کی زندگی کو درپیش آسکنے والے خطرے کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا۔ اسی باعث ماں نے سائلانہ انداز میں دھرم ویر سے کہا کہ وہ اس سبھا سے الگ ہو جائے۔ لیکن بیٹے نے کہا اگر میں یہاں سے بھاگ بھی جاؤں تو سبھا کے ممبر مجھے جان سے مار دیں گے۔

"... تم نے مجھے یہ زندگی عطا کی ہے۔ اسے تمھارے قدموں پر نثار کر سکتا ہوں۔ لیکن مادرِ وطن نے تمھیں اور مجھے دونوں ہی کو زندگی عطا کی ہے اور اس کا حق افضل ہے۔ اگر کوئی ایسا موقع ہاتھ آ جائے کہ مجھے مادرِ وطن کی حمایت کے لیے تمھیں قتل کرنا پڑے تو میں اس ناگوار فرض سے بھی منھ نہ موڑ سکوں گا۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہوں گے لیکن تلوار تمھاری گردن پر ہوگی۔ ہمارے مذہب میں قوم کے مقابلے میں کسی چیز کی حقیقت نہیں اس لیے سبھا کو چھوڑنے کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ ہاں تمھیں خوف ہو تو میرے ساتھ نہ جاؤ ....."

ماں نے یہ سب کچھ سنا لیکن اس پر تیار نہیں ہوئی کہ پولیس آفیسر کے قتل کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اس کے ساتھ نہ جائے۔ منصوبے کے مطابق دونوں مقررہ جگہ پر پہنچے۔ آفیسر کی کار کمین گاہ کے سامنے سے گزری دھرم ویر نے گولی چلانی چاہی لیکن ماں نے ہاتھ پکڑ لیا کیونکہ آفیسر کے ساتھ اس کی بیوی بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس پر دھرم ویر برہم ہوا اور ماں کو سخت جواب دیے جن سے "اس کی مامتا ریزہ ریزہ ہو گئی۔ کچھ ہی دیر بعد آفیسر کی موٹر دوسری جانب سے آئی اور دھرم ویر نے نشانہ لگانا چاہا۔

"ماں نے لپک کر دھرم ویر کا ہاتھ پکڑ لیا اور مجنونانہ تندی کے ساتھ اس کا ریوالور چھیننے لگی۔ دھرم ویر نے اس کو دھکا دے کر گرا دیا اور ایک قدم ہٹ کر ریوالور سادھا۔ ایک سیکنڈ میں ماں اٹھی۔ اسی وقت گولی چلی۔ موٹر آگے نکل گئی۔ مگر ماں زمین پر پڑی تڑپ رہی تھی۔"

کیونکہ جیسے ہی گولی چلی تھی ماں اس کے سامنے کھڑی ہو گئی تھی۔

"ایک لمحے کے بعد اس تاریک سناٹے میں دھرم ویر اپنی عزیز ماں کے تن نیم جاں کو گود میں لیے گھر چلا۔ تو اس کے ٹھنڈے تلووں سے اپنی آنسو بھری آنکھیں رگڑ رگڑ کر، روحانی مسرت سے بھری ہوئی خلش محسوس کر رہا تھا۔"

اس افسانے کے لگ بھگ دو سال بعد پریم چند کا افسانہ "قاتل کی ماں" شائع ہوا تھا۔

"قاتل کی ماں" کا محوری کردار ونود ایک دہشت پسند انقلابی ہے۔ ونود کی ماں رامیشوری نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ ونود کسی آفیسر کو قتل کر کے روپوش ہو گیا اور پولیس اس کی تلاش میں بے گناہوں کو زدوکوب کر رہی ہے۔ صبح ہونے پر ونود کو اپنا خواب سنا کر:

"ماں نے کہا:" میں تو چاہتی ہوں کہ تم ایسے کاموں کے نزدیک ہی نہ جاؤ... ہمارا دھرم ہے کہ خود جئیں اور دوسرے کو بھی جینے دیں۔ دوسروں کو مار کر خود جینا دھرم کے خلاف ہے۔"

ونود : " دھرم اور نیتی کا زمانہ نہیں ہے۔"

ماں : " دھرم اور نیتی کو ہمیشہ فتح حاصل ہوئی ہے۔ اور آئندہ بھی ہوگی سوراجیہ قتل اور خون سے نہیں ملتا۔ تیاگ، تپ اور آتم شدھی سے ملتا ہے۔ لالچ چھوڑتے نہیں، بری خواہشات چھوڑتے نہیں، اپنی برائیاں دیکھتے نہیں، اس پر دعویٰ ہے سوراجیہ لینے کا! یہ سمجھ لو جو سوراجیہ قتل و خون سے ملے گا وہ قتل و خون پر ہی قائم رہے گا۔ عوام کی کوشش سے جو سوراجیہ ملے گا وہ ملک کی چیز ہوگی.... ہم عوام کا سوراجیہ چاہتے ہیں۔ قتل و خون کی طاقت رکھنے والے گروہ کا نہیں۔"

ونود نے رامیشوری کی باتیں سنیں اور مذاق میں ٹال کر باہر چلا گیا اور سارے دن گھر سے غائب رہا۔ ماں اس کو تلاش کرتی ہوئی کانگریس کے دفتر پہنچی تو وہاں کہ ونود آج وہاں آیا ہی نہیں —— نصف شب گزر جانے کے بعد ونود ایک سیاہ کمبل اوڑھے ہوئے گھر پہنچا اور ماں سے بولا کہ صرف تم سے یہ کہنے آیا ہوں کہ اب دو چار مہینے میں یہاں نہ رہ سکوں گا کیونکہ جان کی حفاظت کی خاطر بھاگ جانا ضروری ہے۔ ونود نے ماں کو بتایا کہ اس نے آج چھاؤنی میں ایک آفیسر کو مار ڈالا ہے۔ پولیس نے کئی لوگوں کو پکڑ لیا ہے۔ "میں تو صاف بچ نکلا۔" یہ سن کر رامیشوری بولی، "میں اسے پنا نہیں کہتی کہ مجرم تو منھ چھپا کر بھاگ جائے اور بے گناہوں کو سزا ملے ..... اگر مرد ہے تو جا کر عدالت میں اپنا قصور تسلیم کر لے ورنہ ان بے گناہوں کا خون بھی تیرے سر ہوگا۔" یہ پھٹکار سن کر ونود کو غصہ آگیا۔ اس نے ماں کو کئی باتیں کہنے کے بعد، جانے کے لیے کمبل اٹھا لیا اور بولا:

"... تم میری ماں نہ ہوتیں تو اسی وقت تمھارے ہاتھ تمھارا کام بھی تمام کر دیتا۔ جیتے جی پھر تمھارا منھ نہ دیکھوں گا۔

یہ کہتا ہوا وہ جوش میں گھر سے نکل پڑا۔"

دم بھر بعد رامیشوری بھی اسی جوش میں گھر سے نکلی کہ بیٹا ہے تو کیا، وہ یہ ناانصافی برداشت نہیں کر سکتی۔ وہ کوتوالی کی طرف چلی لیکن کچھ ہی دیر میں ماں کے جذبات حاوی آئے اور وہ گھر واپس لوٹ پڑی۔ لیکن اسے بار بار خیال آتا کہ ان بیچاروں کی مائیں بھی بیٹوں ہوں گی جو بے گناہ پھانسی پائیں گے۔ اس ذہنی کش مکش کے دوران اس نے خودکشی کرنے کا بھی فیصلہ کیا لیکن آخر میں طے کیا:

"... خواہ ہو میں بے گناہوں کا خون نہ ہونے دوں گی ..."

ایک ہفتہ گزر گیا۔ پولیس نے سازش کا پتہ لگایا۔ اور شہر کے دس نوجوان گرفتار کر لیے گئے۔ انھیں میں سے ایک سرکاری گواہ بھی بن گیا۔ عدالت میں مقدمہ دائر ہو گیا۔ ایک روز حسب عادت رامیشوری، ونود کا پتہ لینے کانگریس کے دفتر پہنچی سڑک پر اس نے نو دس جوانوں کو ہتھکڑیاں پہنے، پولیس کے نرغے میں دیکھا۔ جن کے پیچھے پیچھے کچھ مرد، عورت سر جھکائے رنج و یاس کی تصویر بنے چلے جا رہے تھے۔

"رامیشوری نے دوڑ کر ایک سپاہی سے پوچھا: "کیا یہ کانگریس کے آدمی ہیں؟"

سپاہی نے کہا: "کانگریس والوں کے سوا انگریزوں کو کون مارے گا؟"

"کون مارا گیا؟"

"ایک پولیس کے سارجنٹ کو ان سب نے قتل کر دیا۔ آج آٹھواں دن ہے"

"کانگریس کے آدمی ہتیا نہیں کرتے۔"

"قصور نہ ثابت ہوگا تو آپ چھوٹ جائیں گے۔"

رامیشوری ان لوگوں کے پیچھے پیچھے کچہری پہنچ گئی اور جب عدالت میں مقدمہ پیش ہوا تو رامیشوری نے کچھ کہنے کے لیے عدالت سے اجازت مانگی اور بولی:

"... میں اس لیے آپ کے سامنے آئی ہوں کہ اس مقدمے کا سچا حال بیان کر دوں۔ سارجنٹ کا خون کرنے والا میرا بیٹا ہے۔ یہ تمام ملزم بے گناہ ہیں۔"

صاحب نے متحیر ہو کر پوچھا: "تم اپنے ہوش میں ہو یا نہیں؟"

رامیشوری نے کہا: "میں اپنے ہوش میں ہوں اور بالکل سچ کہتی ہوں۔ سارجنٹ کو میرے بیٹے نے مارا ہے۔ اس کا نام ونود بہاری ہے۔ میرے گھر میں اس کا فوٹو رکھا ہوا ہے۔ وہ اسی دن سے لاپتہ ہو گیا ہے۔ میں اپنے ہوش میں ہوں۔ اپنے بیٹے سے مجھے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ میں اسے اسی طرح پیار کرتی ہوں جیسے ہر ایک بیوہ اپنے اکلوتے بیٹے کو۔ ایک ہفتے پیشتر وہی میرا سب کچھ تھا لیکن جب میرے ہر چند منع کرنے پر بھی اس نے یہ خون کیا تو میں نے سمجھ لیا کہ میرا کوئی بیٹا نہ تھا۔ اس کی جان بچانے کے لیے میں اتنے گھر برباد ہونے دوں گی۔ میری ان بہنوں کو بھی تو اپنی اولاد اتنی ہی پیاری ہے۔ انھیں بے اولاد بنا کر میں اولاد والی نہیں رہنا چاہتی۔ میں نے اصل واقعہ بیان کر دیا انصاف آپ کے ہاتھ ہے۔"

کمرے میں ہل چل مچ گئی۔ مرد عورت سب نے رامیشوری کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ کئی عورتیں اس کے قدموں پر سر رکھ کر رونے لگیں۔ اپنی خوشی میں کسی کو اس بات کا خیال نہ رہا کہ اس بدنصیب کے دل پر کیا گزر رہی ہے۔ وہ بے حس و حرکت درمیان میں کھڑی تھی۔ نہ کچھ سوجھتا تھا، نہ سنائی دیتا تھا۔ بس ونود کی صورت آنکھوں کے سامنے تھی۔

یکایک مجمع میں سے ایک آدمی نکل کر رامیشوری کے سامنے آیا اور اس کے سینے میں خنجر اتار دیا۔ رامیشوری چیخ مار کر گر پڑی اور حملہ آور کے چہرے کی طرف دیکھ کر چونک پڑی۔ اس کے منھ سے بے اختیار نکل گیا۔ "ارے تو ہے ونود!"

اس کی آنکھوں سے آنسو کے دو قطرے نکلے اور آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہو گئیں۔"

پے در پے افسانوں کی تلخیص پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ان دونوں کے کچھ مشترک اور کچھ مختلف عناصر کی نشاندہی کے ذریعے پریم چند کے کچھ رویوں کو سمجھا جا سکے۔ ان افسانوں میں جو امور مشترک ہیں وہ یہ ہیں: دونوں کے محوری کردار دہشت پسند انقلابی ہیں، دونوں انقلابیوں کی مائیں بیوہ ہیں اور دونوں اپنی ماؤں کی اکلوتی اولاد ہیں۔

ایک نظر میں محسوس ہوتا ہے کہ پریم چند نے افسانہ "قاتل" کے ہی پلاٹ کو دو سال کے بعد ایک مختلف تکنیک میں دوبارہ لکھا ہے اور اس طرح اپنے گاندھیائی نقطۂ نظر کی حمایت اور تشدد پسندی کی مخالفت کا ایک اور ثبوت پیش کیا ہے۔ لیکن، میرے خیال کے مطابق، "قاتل" سے "قاتل کی ماں" تک آتے آتے پریم چند کو ملکی سیاست کی ان دو خاص جہتوں سے مزید آگہی حاصل ہو گئی تھی اور انھوں نے ان جہات کے بارے میں زیادہ گہرائی اور گیرائی کے ساتھ سوچنا شروع کر دیا تھا۔

ان کی فکری گہرائی و گیرائی کی جانب ذہن کو لبھانے والا ایک پہلو تو یہ ہے کہ "قاتل" کی ماں اپنے بیٹے کے تحفظ کی خاطر دہشت پسندوں کے ساتھ شامل ہونا منظور کر لیتی ہے اور ریوالور چلانے کی مشق کر کے نشانہ لگا سکنے لگ جاتی ہے جب کہ وہ اس سے قبل کانگریس کے رضاکاروں میں شامل تھی۔ اس کے برخلاف "قاتل کی ماں" کی رامیشوری حالانکہ کسی گروہ کے ساتھ باقاعدہ وابستہ نہیں ہے، پھر بھی وہ اپنے بیٹے کے نقش قدم پر نہیں چلتی۔ یعنی اس کے خیالات میں ایک پختگی ہے۔ اسی پختگی کا ثبوت ہے کہ وہ بیٹے کے اعمال میں شریک نہیں ہوتی اور اس کو حصول آزادی کے لیے دہشت پسندی کے بجائے "تیاگ، تپ اور آتم شدھی" کی راہ پر ڈالنا چاہتی ہے۔

دھرم ویر اور ونود کے تشدد پسند خیالات کو ٹٹولا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دھرم ویر کے ذہن و دل پر یہ خیالات اثر انداز تو ہوتے ہیں اور اس نے ان کو عملی شکل میں ڈھالنا بھی شروع کر دیا ہے لیکن اس میں ابھی یہ پختگی

موجود ہے کہ وہ ماں کی باتوں کا جواب بھرپور لفاظی سے دیتا ہے۔

دنیا کے ایسے متعدد ممالک کی طرح کہ جہاں آریا نسل کے، یا اس سے متاثر لوگ آباد ہیں؛ ہندوستانی روایات اور اساطیر میں بھی دھرتی کو "ماں" کہا گیا ہے۔ کیونکہ زمین اور اپنی کوکھ سے اولاد کو جنم دینے والی عورت اپنی قوتِ افزائش، پرورش کی صلاحیت، شفقت اور عفو و کرم وغیرہ کے لحاظ سے ایک دوسرے کے مماثل ہیں۔ علاوہ ازیں عورت کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اسے دھرتی کی ہر شئے سے بے پناہ انس بھی ہوتا ہے۔ "عورت پودے کی طرح زمین سے وابستہ ہے اور اس کی جڑیں زمین کے اندر بہت دور تک اتر گئی ہوتی ہیں"[1] ـــــ عورت اور دھرتی کی نہایت پیچیدہ اور پراسرار مماثلتوں کے اس انتہائی تشنہ اور سرسری ذکر کے پیشِ نظر ہی غور کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ پریم چند نے ان دونوں افسانوں میں "ماں" کو ایسے کردار کے طور پر پیش کیا ہے جو دھرم ویر اور ونود کو قتل و غارت گیری سے بچانا چاہتا ہے۔ یہ کردار ایک سطح پر تو دھرم ویر اور ونود کو جنم دینے والی مائیں ہیں۔ لیکن دوسری سطح پر یہ دونوں زمانی فصل کے باوجود اپنے اپنے بیٹوں کو دوسروں کا خون بہانے سے روکتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے یہ دونوں دھرم ویر اور ونود کو تو تباہی کے راستے سے روک ہی رہی ہیں؛ ساتھ ہی ساتھ ان کے ذہن و دل میں دیگر لوگوں کے لیے بھی محبت و شفقت کا جذبہ ابل رہا ہے۔ اور وہ اپنے اس جذبے کے تحت دیگر افراد کو اپنے بیٹوں کی گولیوں سے بچانا چاہتی ہیں۔ اور کیونکہ ان کے اختیار کی کمزور حدود صرف اپنے بیٹوں تک ہیں اس لیے وہ انھیں سے کہہ سن سکتی ہیں۔ یعنی اس طرح دھرم ویر اور ونود کی ماؤں نے وسعت اور ترفع حاصل کر کے دھرتی ماں سے مماثلت اختیار کر لی۔ دھرتی کا کام اور خصوصیت پرورش اور تحفظ ہے۔ دھرم ویر کی ماں نے، اپنی جانب سے دھرم ویر کو اس طرح تحفظ عطا کیا کہ اگر وہ گولی پولیس آفیسر تک پہنچ جاتی تو جلد یا بدیر دھرم ویر کا گرفتار ہو کر پھانسی پا جانا یقینی تھا؛ اس لیے اس نے دھرم ویر کے ریوالور کی گولی اپنے سینے پر روک لی۔ (وطنیت کے دائرے سے نکل کر دیکھیں تو یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ دھرم ویر کی ماں نے اس انگریز پولیس آفیسر کو اسی لیے بچانا چاہا کہ وہ بھی تو کسی ماں کی کوکھ سے اگا ہوا پودا تھا۔ اس بات کا ثبوت یہ ہے کہ وہ اس سے قبل کار میں بیٹھی ہوئی آفیسر کی بیوی کو ممکنہ موت سے بچا لیتی ہے) رامیشوری کو یہ موقع نصیب نہیں تھا کہ وہ ونود کے ہاتھوں چھاؤنی میں مارے جانے والے سارجنٹ کے بجائے خود گولی کھاتی یا اس سارجنٹ کی جان بچانے کی کوشش کر سکتی۔ لیکن اس نے گرفتار شدہ جوانوں کی جان بچانے کے لیے بھری عدالت میں اپنے بیٹے کے جرم کا انکشاف کر دیا۔

اس طرح ـــــ پریم چند ان دونوں عورتوں اور دھرتی کو ایک دوسرے سے مماثل قرار دیتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

زمین کو ماں کہنے ہی کے تصور نے وطن کی سرزمین کو "مادرِ وطن" کہلوایا ہے۔ "مادرِ وطن" اور دھرم ویر اور ونود کی ماؤں کے رویے کو ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ رکھ کر دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پریم چند ان دونوں ماؤں کی جانب سے دہشت پسندی کی مخالفت کے پردے میں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ، یہ دونوں مائیں جو کچھ کہہ رہی ہیں وہ صرف ان دونوں کی آواز نہیں ہے بلکہ یہ دھرتی ماں یعنی مادرِ وطن کی آواز ہے ـــــ اس موقع پر ماہرینِ تہذیب و ثقافت کی بیان کردہ یہ حقیقت یاد آتی ہے کہ ہندوستان کا مزاج بنیادی طور پر امن پسند ہے ـــــ اور اگر ایک غاصب قوم کو اقتدار سے ہٹانے کے لیے ایسے طریقے اختیار کیے گئے جو ہندوستانی مزاجِ عامّہ کے برخلاف ہوتے تو اس کا مطلب اس مزاج یعنی مادرِ وطن کے قتل کے مساوی ہوگا۔ گویا جب دھرم ویر اور ونود کے ہاتھوں ان کے ماؤں کی زندگی کو گزند پہنچا تو اس کی وجہ ان کے غیر امن پسند رویے تھے اور جب ہندوستانی روایت میں دھرتی اور ماں ایک دوسرے کے مساوی ہیں تو ماؤں کو پہنچنے والا نقصان، مادرِ وطن کے نقصان اور تباہی کا اشاریہ۔

پریم چند کے افسانوں کے اولین مجموعے: سوزِ وطن (اشاعت ۱۹۰۸ء) میں شامل افسانوں سے، افسانہ: "قاتل کی ماں" (اشاعت: ۱۹۳۶ء) تک کے متعدد افسانوں کی تفہیم سے یہ بات آئینہ ہو جاتی ہے کہ پریم چند نے جذبۂ حبِّ وطن کو اپنے پورے فن میں ایک تخلیقی توانائی کے طور پر برتا ہے۔ یعنی جناب فراق گورکھپوری کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ:

"جب کبھی ہم ان [پریم چند] کی کوئی کہانی پڑھتے ہیں تو ہم کو یہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ ہندوستان کے متعلق ہی نہیں بلکہ خود ہندوستان ہے۔"

(رسالہ زمانہ - پریم چند نمبر، ص: ۴۶)

ـــــ بقیہ: پریم چند اور طبقاتی جد و جہد ـــــ

ترقی کے حامی تھے۔ لیکن اس وقت یہ نئے رشتے اس قدر کمزور تھے کہ اس قوت کے باوجود گوبر سماج میں مثبت اور اہم کردار ادا نہیں کر پاتا۔ اس ناول کے دوسرے بیشتر کردار بھی ان ہی روایت اور زندگی کے تقاضوں و تبدیلی کے مابین کشمکش میں مبتلا ہیں۔ اور ایسی گھٹن، بے سمتی اور ذہنی انتشار کا شکار ہیں جن سے نجات پانا سیاسی و سماجی نظام میں کسی بڑی تبدیلی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ یہی وہ منزل بھی ہے جس کے لیے پریم چند زندگی بھر جد و جہد کرتے رہے تھے۔

---

[1] "اردو شاعری کا مزاج" از ڈاکٹر وزیر آغا۔ مطبوعہ جدید ناشرین۔ لاہور۔ ص: ۱۸۔

پریم پال اشک

فلموں میں پریم چند

ہر ادیب اور فنکار کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کی آواز زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچے۔ اس کی تخلیقات سے زیادہ سے زیادہ لوگ مستفیض ہوں۔ مالی مفاد کو ہمارے ادیبوں نے کبھی فوقیت نہیں دی۔ فلم ہی ایک ایسا طاقتور اور معتمد میڈیا ہے جس کے ذریعہ ادیب اور عوام کے درمیان رشتے استوار ہوتے ہیں۔ پریم چند نے بمبئی جانے سے قبل اپنی اہلیہ شیو رانی دیوی کو ان الفاظ میں سمجھایا تھا۔

"وہاں جانے میں خاص فائدہ ہوگا۔ وہ یہ کہ ناول اور کہانیاں لکھنے میں جو نہیں ہو رہا ہے۔ اس سے کہیں زیادہ فلم دکھا کر ہو سکے گا۔ کہانیوں اور ناولوں سے تو جو لوگ پڑھتے ہیں۔ وہی فائدہ اٹھا سکیں گے۔ فلم سے ہر جگہ کے لوگ فائدہ اٹھا سکیں گے۔"

غالباً اس مقصد کے پیش نظر انھوں نے جون ۱۹۳۴ء میں فلمی دنیا میں قدم رکھا۔ اور اجنتا سنے ٹون کے ڈائریکٹر ایم بھونانی نے انھیں ۸ ہزار روپے سالانہ معاوضہ پر بمبئی بلالیا۔ بمبئی میں ان کا قیام ایک سال سے بھی کم مدت تک رہا۔ یعنی ۲۴ر اپریل ۱۹۳۵ء کو وہ بنارس لوٹ گئے۔ اس مختصر سے قیام کے دوران انھوں نے جو دو فلمیں لکھیں وہ تھیں "مل یا غریب مزدور" اور "نوجیون"۔ یہ دونوں فلمیں اجنتا سنے ٹون کے جھنڈے تلے تیار ہوئیں اور مہالکشمی سنے ٹون نے ان کے ناول سیوا سدن عرف بازار حسن کو بھی فلمایا۔

پریم چند نے سب سے پہلے ایم۔ بھونانی کے لیے اجنتا سینے ٹون کے جھنڈے تلے فلم مل عرف غریب مزدور کی کہانی اور مکالمے لکھے۔ اس میں جے راج نیام پلی۔ تارا بائی اور بِبّو نے کام کیا تھا۔ یہ پوری فلم پرچھائی ہوئی تھی۔ علاوہ ازیں پریم چند نے اس میں مزدور یونین کے صدر کا ایک مختصر رول بھی کیا تھا۔ اس فلم میں مل مزدور کی زبوں حالی۔ پریشانی اور ان کے سرعام استحصال کو بڑی بے خوفی کے ساتھ پیش کیا گیا تھا۔ لیکن فلم کے ڈائریکٹر نے حقیقی کہانی کو یکسر بدل دیا۔ اس فلم کی پبلسٹی گاندھی جی کے آدرشوں والی فلم کے طور پر کی گئی۔ جب فلم تیار ہوئی تو ملوں کے مالکوں نے اس کی ریلیز میں کافی اڑچنیں پیدا کیں اور اور حکومت پر بھی دباؤ ڈالا۔ اس فلم کو دیکھ کر سنسر بورڈ بوکھلا اٹھا اور فلم کو پاس کرنے سے انکار ہی نہیں کیا بلکہ اس پر پابندی بھی لگادی۔ آخر ڈائریکٹر کو فلم میں ترمیم اور تنسیخ کرنی پڑی اور فلم کا نام بدل کر غریب مزدور رکھ دیا اور اس میں چند مناظر شامل کرنے پڑے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فلم تو ریلیز ہو گئی مگر کامیاب نہ ہوئی۔ ایک دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ اس فلم کو خود پریم چند نے بنارس میں پورے ڈیڑھ سال بعد دیکھا تھا۔ انھوں نے خود ہی ہنس کے قدیم قلمی معاون جناب بھنور لال سنگھ سے کہا تھا۔ "یہ پریم چند کی ہتیا ہے۔ یہ پریم چند کی کہانی نہیں فلم کے ڈائریکٹر اور مالک کی کہانی ہے۔"

پریم چند کی اس پہلی فلم کا جس طرح تیا پانچہ ہوا اس کا ذکر انھوں نے شری جینیندر رکمار سے ۲۸ نومبر ۱۹۳۴ء کو بمبئی سے تحریر کردہ خط میں یوں کیا تھا۔

"فلمی حال کیا لکھوں۔ مل یہاں پاس نہ ہوا۔ لاہور میں پاس ہوگیا۔ اور دکھایا جا رہا ہے۔ میں جن ارادوں سے یہاں آیا تھا ان میں سے ایک بھی پورا ہوتا نظر نہیں آتا۔ یہ پروڈیوسر جس ڈھنگ سے کہانیاں بناتے آئے ہیں اس کی لیک سے ذرا بھر بھی نہیں ہٹ سکتے۔ ولگیریٹی کو یہ لوگ انٹرٹینمنٹ ویلو کہتے ہیں۔ ادبھت پن میں ان کا وشواس ہے۔ راجہ رانی۔ ان کے منتریوں کے شڑینتر۔ نقلی لڑائی اور بوسے بازی ہی ان کے مکھیہ سادھن ہیں۔ میں نے ایسی سماجک کہانیاں لکھی ہیں جنھیں شکشت سماج بھی دیکھنا چاہے۔ لیکن اس فلم کو کرنے سے ان لوگوں کو سندیہہ ہوتا ہے کہ چلے یا نہ چلے۔"

اس فلم میں پریم چند کے چند مکالموں کے سوا اور جو کچھ تھا اس کی صرف قسم ہی کھائی جاسکتی ہے۔

اس کے بعد انھوں نے اجنتا سینے ٹون کے لیے ایک اور کہانی شیر دل عرف نوجیون لکھی۔ یہ ایک آدرش وادی عشقیہ فلم تھی۔ اس فلم میں بھی پریم چند کے ارمانوں کا خون کیا گیا تھا۔

ان فلموں کے ڈائریکٹر نے جس پست ذہنیت کا ثبوت دیا اس سے پریم چند بد دل ہو گئے۔ دراصل ڈائریکٹر جس عامیانہ مذاق کی بے مقصد کہانیاں لکھوانے کے خواہاں تھے۔ پریم چند اس پست سطح تک آنے کے لیے ہرگز تیار نہ تھے۔ ان کے سہانے خواب جس طرح یکے بعد دیگرے چکنا چور ہوئے اس کا ذکر انھوں نے ۱۹ر مارچ ۱۹۳۵ء کو بمبئی سے حسام الدین غوری کے نام تحریر کردہ ایک خط میں یوں کیا۔

"سینما میں کسی اصلاح کی توقع کرنا بے کار ہے۔ یہ صنعت بھی اسی طرح سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہے جیسے شراب

فروشی۔ انھیں اس سے بحث نہیں کہ پبلک کے مذاق پر کیا اثر پڑتا ہے۔ انھیں تو اپنے پیسے سے مطلب ہے۔ برہنہ رقص۔ بوسے بازی اور مردوں کا عورتوں پر حملہ۔ یہ بس ان کی نظروں میں جائز ہے۔ پبلک کا مذاق اتنا گر گیا ہے کہ جب تک مخرب اور حیا سوز نظارے نہ ہوں اس تصویر میں مزا نہیں آتا۔ مذاق کی اصلاح کا بیڑا کون اٹھائے۔ سینما کے ذریعہ ساری بے ہودگیاں ہمارے اندر داخل کی جا رہی ہیں اور ہم بے بس ہیں۔ پبلک میں تنظیم ہے نہ نیک و بد کا امتیاز۔ آپ اخباروں میں کتنی ہی فریاد کیجیے وہ بےکار ہے۔ اخبار والے بھی تو صاف گوئی سے کام نہیں لیتے۔ جب ایکٹریسوں اور ایکٹروں کی تصویریں دھڑا دھڑ چھپیں اور ان کے کمال کے قصیدے گائے جائیں تو کیوں نہ ہمارے نوجوانوں پر اس کا اثر ہو۔ سینما سائنس کی ایک برکت ایزدی ہے۔ مگر نااہلوں کے ہاتھوں میں پڑ کر لعنت ہو رہی ہے۔ میں نے خوب سوچ لیا ہے۔ اس دائرے سے نکل جانا ہی مناسب سمجھتا ہوں۔"

پریم چند کو فلمی دنیا سے جو تلخ تجربہ ہوا اس کا اعتراف انھوں نے ڈاکٹر اندر ناتھ مدان کو ۲۶ر دسمبر ۱۹۳۴ء کو تحریر کردہ ایک خط میں یوں کیا ہے۔

"ایک ادیب کے لیے سینما مناسب جگہ نہیں۔ میں اس لائن میں اس لیے آیا تھا کہ شاید مالی اعتبار سے کچھ مطمئن ہو سکوں۔ مگر اب اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ میری خام خیالی تھی۔ اس لیے میں پھر ادبی خدمت میں لگ رہا ہوں۔"

مہالکشمی سینےٹون کے شری نانو بھائی وکیل نے ادبی دنیا میں پریم چند کی شہرت سے متاثر ہو کر ان کے ناول بازار حسن عرف سیوا سدن کو فلمانے کے حقوق صرف ساڑھے سات سو روپے میں خریدے تھے۔ اس میں زبیدہ جدن بائی۔ ساہو مودک اور فاطمہ بائی نے کام کیا تھا۔ اس فلم کے مہورت پر مہالکشمی سینےٹون کے زیر اہتمام شریمتی لیلاوتی منشی کی زیر صدارت منعقدہ مہورت کی تقریب میں پریم چند جی نے فرمایا تھا" اگر میرے اس ناول سے سماج کا کوئی بھی بھلا ہو سکے تو میں اپنے آپ کو کرتارتھ مانوں گا۔"

پریم چند کا یہ ناول کئی اعتبار سے اہم ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ سماج کے فرسودہ رسم و رواج کی وجہ سے ایک شریف خاندان کی معصوم اور الہڑ لڑکی کس طرح عصمت فروشی پر مجبور ہو جاتی ہے۔ اس میں ڈرامائی عناصر کی اس درجہ فراوانی ہے کہ ایک کامیاب فلم بن سکتی تھی۔

مگر مذکورہ فلمی ادارے کے ہدایت کار اور فلمساز نے پورے ناول کا کچومر ہی نکال دیا۔ پلاٹ اور کرداروں میں اپنی بے جا مداخلت کمزور ڈائریکشن اور بے جا اسکرین پلے اور پھسپھسی اداکاری نے سنہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم والی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ اس فلم کو حسام الدین فوری نے بھی دیکھا تھا۔ انھوں نے اپنی کتاب پریم سوگ میں یوں لکھا ہے۔

"خیال تھا کہ یہ فلم تاریخ فلم سازی میں ایک نئے دور کا آغاز کرے گی۔ لیکن فلم دیکھ کر ساری امیدوں پر پانی پھر گیا۔ کیونکہ ڈائریکٹر کی ترمیم و تنسیخ کے باعث کہانی کی مٹی پلید ہو گئی اور فلم میں وہ بات نہیں رہی تھی کہ جو افسانے میں پائی جاتی تھی۔"

پریم چند کی زندگی میں ان کی مذکورہ تین فلمیں ہی آئیں اور ان تینوں فلموں میں پریم چند کے عقائد اور نظریات کا خون ہو گیا۔ پریم چند کے ساتھ ایک دقت یہ بھی تھی کہ وہ اسکریٹ ہندی یا اردو میں لکھتے تھے لیکن ان کے پروڈیوسر ڈائریکٹر ہندی یا اردو نہیں جانتے تھے۔ لہٰذا انھیں ہر سین کا خلاصہ انگریزی میں تیار کر کے سنانا پڑتا تھا۔

اس سے ایک نتیجہ تو یہ نکلتا ہے کہ اگر پریم چند کو سنگین مالی حالات سے دوچار نہ ہونا پڑتا تو غالباً ادبی تخلیقات کو فلمانے کے سلسلے میں ہندی فلمسازی کی تاریخ میں اولیت کا سہرا ان کے سر نہ بندھتا۔ کہتے ہیں مشہور زمانہ فلمساز ہمانشو رائے نے بھی موقع کی نزاکت محسوس کرتے ہوئے انھوں نے یہاں تک پیشکش کر دی تھی کہ وہ اگر چاہیں تو کہانیاں بنارس سے تیار کر کے بھی بھیج سکتے ہیں۔ لیکن پریم چند وہاں کے ماحول اور فلم پروڈیوسروں اور ڈائریکٹروں کے ہتھکنڈوں سے بخوبی واقف ہو گئے تھے۔ اس لیے وہ اس کے لیے بھی آمادہ نہ ہوئے۔

بمبئی سے وہ ایک تحفہ ضرور لائے۔ انھوں نے ہندی، اردو کے علاوہ مختلف ہندوستانی قومی زبانوں کے تال میل سے قومی یکجہتی کا تصور نمایاں کرنے کا احساس کیا اور مختلف قومی زبانوں کو ہندی کے ذریعہ ایک پلیٹ فارم پر لانے کی کوشش کی۔

لیکن اس کے باوجود پریم چند عوام کے مذاق اور شعور سے مایوس نہ تھے۔ بمبئی سے لوٹنے کے بعد انھوں نے سینما اور جیون کے عنوان سے ہندی میں ایک مضمون تحریر فرمایا اور اس میں یوں لکھا۔

"جس زمانے میں بمبئی میں کانگرس کا اجلاس تھا۔ بیشتر سینما ہال خالی رہتے تھے۔ ان دنوں جو تصویریں دکھائی گئیں ان میں نقصان رہا۔ اس کا سبب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ عوام کے بارے میں جو خیال ہے کہ وہ مار کاٹ اور سنسنی پیدا کرنے والی تصویروں ہی کو پسند کرتے ہیں۔ محض وہم ہے۔ عوام محبت۔ ایثار۔ اخوت اور انسانی ہمدردی کے جذبات سے بھرپور فلمیں زیادہ شوق سے دیکھنا چاہتے ہیں۔"

اس بات کا احساس ہمارے فلمسازوں اور ہدایت کاروں کو بھی ہوا لیکن پریم چند کی وفات کے بعد۔ پریم چند کے مرنے کے بعد ان کی کہانیوں اور ناولوں پر مبنی گیارہ فلمیں آئیں۔ ان میں دو بچوں کے لیے تھیں اور ایک ایک فلم تامل اور تیلگو زبان میں آئی اور باقی سات فلمیں ہندی میں آئیں۔

چلڈرن فلم سوسائٹی نے ۱۹۶۰ء میں پریم چند کی ایک کہانی "عید مبارک" پر "عید مبارک" کے اور ۱۹۶۵ء میں ان کی کہانی "موتی" پر "ایک کتے کی کہانی" کے زیر عنوان فلمیں بنائیں۔ یہ دونوں فلمیں اچھی تھیں۔ عید مبارک میں ہندو مسلم اتحاد اور ایثار کے جذبے کو نہایت خوبصورت انداز سے پیش کیا گیا تھا۔ جب کہ فلم کتے کی کہانی میں موتی نامی ایک پلے کی دلچسپ حرکتوں اور بچوں کے ساتھ اس کی محبت کو بڑے دلچسپ ڈھنگ سے فلمایا گیا تھا۔

ہندی کے علاوہ پریم چند کے ناول سیوا سدن کو ۱۹۳۸ء میں تامل زبان میں بھی فلمایا گیا۔ اسے چندر پربھا سینے ٹون مدراس نے تیار کیا تھا۔ علاوہ ازیں شہرہ آفاق ڈائریکٹر مرنال سین نے ۱۹۷۸ء میں پریم چند کی کہانی کفن پر مبنی تیلگو زبان میں ایک فلم آکا اوری کتھا" ایک گاؤں کی کہانی" کے نام سے ایک فلم بنائی۔ یہ فلم بہت خوبصورت تھی اور پریم چند کے کرداروں اور ماحول کے ساتھ پورا انصاف کیا گیا تھا۔ اس فلم کو حکومت نے اعزاز سے بھی نوازا تھا اور کئی بین الاقوامی فلمی میلوں میں بھی یہ فلم دکھائی گئی تھی۔

ہندی فلموں میں پریم چند کے جن ناولوں اور کہانیوں پر مبنی فلمیں آئیں ان میں ۱۹۴۱ء میں کاردار نے سرکو پروڈکشن کے جھنڈے تلے فلم سوامی بنائی۔ یہ پریم چند کی کہانی عورت کی فطرت (اردو) عرف تریا چرتر (ہندی) پر مبنی تھی۔ اس میں ستارہ جے راج۔ ہتو۔ یعقوب۔ جیون۔ بدری پرشاد اور ایس نذیر نے کام کیا تھا۔ فلم پریم چند کی پچھلی فلموں سے بہتر تھی۔ اس کے بعد ۱۹۴۶ میں بھونانی پروڈکشنز کے جھنڈے تلے موہن بھونانی نے پریم چند کے ناول رنگ بھومی عرف گوشۂ عافیت کو فلمایا۔ اس میں جگدیش سیٹھی۔ کے۔ این۔ سنگھ۔ لوین یالنک۔ گوپ۔ سلوچنا اور لیلا مصرا نے کام کیا تھا۔ اگرچہ یہ فلم کافی موثر تھی لیکن پھر بھی انتہائی ڈرامائی ہونے کی وجہ سے غیر فطری ہو گئی تھی۔ مگر پریم چند کی پچھلی فلموں سے بہتر تھی۔

اس کے بعد ۱۹۵۸ء میں نیکو راج بھاکڑی نے تصویرستان کے جھنڈے تلے پریم چند کی کہانی پنچ پرمیشور کو فلم پنچایت کے نام سے فلمایا۔ اس فلم میں چالو مصالحہ اور ٹھکے بازی زیادہ۔ مگر پریم چند کی مٹی کی مہک کم تھی۔ اس فلم میں راج کمار۔ منوج کمار۔ کلدیپ کور۔ کنہیا لال اور نذیر حسین نے کام کیا تھا۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پریم چند کی روح تک پہنچنے، ان کے کرداروں کو سمجھنے اور ماحول کو اجاگر کرنے میں کرشن چوپڑہ کی کیفیت ایک مسیحا سے کم نہیں۔ انھوں نے ۱۹۵۹ء میں پریم چند کی کہانی دو بیلوں کی کتھا پر مبنی فلم ہیرا موتی بنائی۔ اس میں بے زبان جانوروں کے ساتھ انسانی رشتوں کو بڑے حسین انداز سے استوار کیا گیا تھا۔ اس فلم میں پریم چند ہی کے مکالمے پیش کیے گئے تھے۔ موسیقار سلیل چودھری نے لوک دھنوں کے ذریعہ حقیقی ماحول کی عکاسی کر دی تھی۔ علاوہ ازیں نروپا رائے اور بلراج ساہنی کی لاثانی اداکاری نے سونے پر سہاگے کا کام کیا تھا۔ فلم کیا تھی گویا پریم چند کو خراج عقیدت پیش کیا گیا تھا۔ اور یہ فلم پریم چند کے حسین خواب کی صحیح تعبیر بھی تھی۔

اس کے بعد ۱۹۶۳ء میں ترلوک جیٹلی نے پریم چند کے ناول گؤدان کو پردۂ سیمیں پر پیش کیا۔ مگر وہ اس ناول سے انصاف نہ کر سکے۔ فلم کا سارا ماحول مصنوعی تھا۔ راج کمار کی عمدہ اداکاری کے باوجود فلم ڈوبنے سے نہ بچ سکی۔ یہی نہیں بلکہ کامنی کوشل دھنیا کے کردار سے انصاف نہ کر سکی۔ روی شنکر کی موسیقی میں لوک دھنوں کے ٹچ کے بجائے کلاسیکی ٹچ تھا اس فلم کی کمزوری اس کے کمزور اسکرین پلے پر تھی۔

۱۹۶۶ء میں کرشن چوپڑہ اور رشی کیش مکھرجی کی فلم غبن آئی۔ کرشن چوپڑہ کی اچانک موت سے یہ فلم ادھوری رہ گئی۔ اسے رشی کیش مکھرجی نے مکمل کیا۔ اس فلم میں بھی پریم چند کے ناول غبن کے ساتھ واقعی انصاف کیا گیا تھا۔ کرشن چوپڑہ نے بھانو پرتاپ کے اشتراک سے اس فلم کا اسکرپٹ تیار کیا تھا۔ فلم ہر اعتبار سے جاندار تھی۔ اس میں جہاں کرشن چوپڑہ کے جامع اسکرین پلے کو دخل تھا وہاں رشی کیش مکھرجی کی چست ایڈیٹنگ اور چابک دست ہدایت بھی قابل داد تھی۔ علاوہ ازیں سلیل چودھری کی روح پرور موسیقی نے کانوں میں امرت رس گھول دیا تھا۔ اور اداکاری کے میدان میں سنیل دت۔ سادھنا۔ کنہیا لال اور لیلا مصرا نے اپنے فن کے جوہر دکھائے تھے مختصر یہ کہ کرشن چوپڑہ نے پریم چند کو صحیح معنوں میں سمجھا تھا۔

۱۹۷۸ء میں ستیہ جیت رے نے پریم چند کی کہانی شطرنج کی بازی پر مبنی شطرنج کی کھلاڑی پیش کی۔ اس فلم میں اس سے زیادہ خصوصیت نہ تھی کہ ایک بین الاقوامی شہرت یافتہ فلم ڈائریکٹر نے پہلی بار ہندی فلم بنائی اور کہانی کا انتخاب پریم چند کی کہانیوں میں سے کیا۔ لیکن افسوس ہے کہ ستیہ جیت رے جیسے جہاں دیدہ اور قابل فلم ڈائریکٹر بھی پریم چند کے ساتھ انصاف نہ کر سکے۔ البتہ اداکاری کے میدان میں سعید جعفری نے قابل تعریف کام کیا ہے۔

محمد عصیم

پریم چند اور اچھوتوں کے مسائل

پریم چند کے ادب میں اچھوتوں کے مسائل کی بازیافت کرنے سے پیشتر یہ جان لینا ضروری ہے کہ چھوت چھات کی تفریق صرف پریم چند کے عہد اور ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ زمانہ قدیم سے ہی نسلی امتیاز اور احساس برتری کی شکل میں تمام دنیا کی سرشت میں موجود تھی مگر جس سخت گیری سے ہندوستان میں اس پر عمل کیا گیا تمام دنیا میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ ذاتوں کی ابتداء کچھ اس طرح ہوئی کہ آریا جب فاتح کی حیثیت سے ہندوستان میں آئے تو ان کا سماج پیشوں کے اعتبار سے تین طبقوں میں منقسم تھا۔ ایک طبقہ حکمرانوں کا جو جنگ جو لوگوں کا تھا دوسرا مذہبی مبلغوں اور زاہدوں اور تیسرا زراعت و تجارت پیشہ لوگوں کا تھا۔ عام ہندوستانیوں کو انھوں نے شودر کا نام دیا لیکن رگ وید کے عہد میں ان سماجی طبقوں کی تقسیم میں شدت نہیں پیدا ہوئی تھی مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ برہمنوں نے سماج میں اپنے لیے مراعات حاصل کر لیں اور ویدک دور کے اواخر میں شودر کا فرق زیادہ نمایاں ہو لمان کے لیے مقدس آگ کی عبادت ویدوں کی قرأت و سماعت کو ممنوع قرار دیا گیا ان سے رشتہ ازدواج قائم کرنے کو معیوب سمجھا جانے لگا اور ان کے ساتھ دیگر طبقہ کے لوگوں نے راہ و رسم بھی ترک کر دیئے اسی زمانہ میں ایسا سماج مرتب ہوا جس میں ذات پات کی تمام تر خصوصیات رچی بسی ہوئی تھیں۔ سماجی طبقات میں شدت پیدا ہوئی اور ذاتیں پیشے وراثتہ ملنے لگے۔ براہمنوں نے اپنے سماجی اور مذہبی منصب سے فائدہ اٹھا کر شودر (اچھوتوں) کو عام سماجی زندگی سے مذہبی طور پر منقطع کر دیا۔ کیونکہ اچھوتوں کو نجس و ناپاک قرار دیکر عام زندگی کے دھارے سے الگ کر دیا گیا تھا اس لیے ان کی زندگی میں سیاسی و سماجی انقلابات کے اثرات نظر نہیں آتے۔ ذاتوں کی تقسیم کی سخت گیری و انتہا پسندی سے اچھوتوں کی محنت کا استحصال ہوا اور ان کی خدمتوں سے فیضیاب ہونے کو بلند قوم والوں کا حق قرار دیا گیا اس حیوانی رویہ کو صدیوں تک مذہبی سرپرستی حاصل رہی۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کی ابتدا سے اچھوتوں کے استحصال کے خلاف سوامی شردھانند، مدن موہن مالویہ، مہاتما گاندھی وغیرہ کی قیادت میں کئی تحریکیں رونما ہوئیں ان سماجی مصلحین نے چھوت چھات کو ہندو مذہب کا کلنک قرار دیا اور اچھوتوں کو سماج میں ہندوؤں کی طرح مراعات دلانے کی کوششیں کیں ان رہنماؤں نے اچھوتوں کے مسائل کو خالص سیاسی و سماجی نقطۂ نظر سے دیکھا تھا مگر پریم چند کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ ہندوستانی تاریخ اور سماج میں اس کی جڑیں اتنی دور تک پھیلی ہوئی ہیں کہ صرف قانون سازی یا عام اصلاحی اقدامات سے یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکتا وہ جانتے تھے کہ موجودہ طبقاتی نظام میں جس کی بنیاد کمزور اور پسماندہ طبقوں کے استحصال پر قائم ہے اس مسئلہ نے اور بھی سنگین صورت اختیار کر لی ہے اونچی ذات کے لوگ قومی ملکیت اور زمینوں پر قابض ہیں ایسی صورتِ حال میں محنت کش اور پسماندہ طبقے استحصال کا شکار ہوں گے نیز محنت اور اجرت میں بھی کافی تفاوت قائم رہے گا پریم چند کے خیال میں اس مسئلہ کا دائمی حل یہی تھا کہ ملک میں معاشی بنیاد پر ایک غیر طبقاتی معاشرہ وجود میں آئے اور قومی دولت، زمین اور ملکیت سے اعلیٰ طبقوں کی اجارہ داری ختم ہو۔

پریم چند ایک انسان دوست فنکار تھے اس لیے انھوں نے اپنے ناولوں میں مختلف پہلوؤں سے اچھوتوں کے مسائل پر روشنی ڈالی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے اصلاح کی غرض سے ان مسائل سے متعارف کرایا ہے پریم چند ہندوستانی سماج کے اس کم نصیب طبقہ کو نفرت کے بجائے ہمدردی اور انسانیت کی نظر سے دیکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ لعنت ہمارے ماحول اور سماج کی پروردہ ہے وہ اسے انسانیت اور سماج کا زخم سمجھتے ہیں اور اس صدیوں پرانے زخم کو جو ناسور بن چکا ہے صرف دوا ہی نہیں لگاتے بلکہ گیرائی و گہرائی کے ساتھ اس کے بنیادی اسباب کو پیش کرتے ہیں جس کی جڑیں رسم و رواج ہی میں نہیں ملک کے معاشی اور معاشرتی نظام میں بھی پیوست ہیں۔ پریم چند نے اچھوتوں کے مسائل کا ہمدردانہ تجزیہ کر کے اس کی بنیادیں مادی وسائل پر رکھی ہیں جن کی شہادتیں ہمیں ان کے ادب کے علاوہ ہفتہ وار جاگرن میں بھی واضح طور پر دکھائی دیتی ہیں۔ پریم چند کے افسانوی ادب کا مطالعہ کرتے ہوئے ان کا مادی رویہ صاف طور پر جھلکتا ہے، ان کی ہمدردیاں فطری طور پر پسماندہ طبقوں کی طرف ہوتی ہیں انھوں نے اپنی تخلیقات میں اچھوتوں کی معاشی بدحالی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے بیگار کے مسئلہ کو بہت خوبی سے پیش کیا ہے۔ بیگار لینے کا طریقہ قدیم زمانہ سے لے کر پریم چند کے عہد تک جاری تھا بیگار کو قدیم زمانہ

کی اصطلاح میں "وسٹی" کہا جاتا تھا قدیم کتبوں میں اس قسم کے اشارے ملتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ بیگار لینے کا رواج عام تھا۔ پریم چند کے عہد میں زمیندار اور جاگیردار اچھوتوں سے بیگار لینے کو اپنا پیدائشی حق سمجھتے تھے سخت محنت لینے کے بعد بھی ان کو پیٹ بھر کھانا نہیں دیا جاتا تھا۔ "پردہ مجاز" میں پریم چند نے بیگار کے مسئلہ کو بہت خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ زمیندار کا کارکار منشی بجر دھر علاقہ کے حالات بتاتے ہوئے کہتا ہے کہ:۔

"روز جگدیش پور سے سولہ آدمی پالکی اٹھانے کے لیے بیگار پکڑ کر آتے ہیں دس بارہ چار روز گھاس چھیلنے کے لیے پکڑ لیے جاتے ہیں۔"

زمیندار اور ان کے کارندوں کے ظلم سے اچھوت اس قدر خوف زدہ تھے کہ کھائے پیئے بغیر مسلسل کئی دنوں تک کام کرتے رہتے مگر مزدوری کا مطالبہ نہیں کرتے تھے اگر کبھی کسی نے مزدوری مانگی یا بیگار سے انکار کیا تو اسے گاؤں سے نکال دیا جاتا تھا اس کا جھونپڑا نذرِ آتش کر دیا جاتا اور اسے طرح طرح کی جسمانی اذیتیں پہنچائی جاتیں بھوک و پیاس سے تڑپتے ہوئے لاغر چماروں سے تیزی سے کام بھی نہیں ہوتا تھا مگر دیوان صاحب کو (پردہ مجاز میں) اپنے گھوڑوں کے لیے وقت پر گھاس چاہیے انھیں اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں کہ بھوکے پیاسے انسانوں سے تیزی سے کام نہیں ہو سکتا اگر گھاس وقت پر نہ ملتی یا کم ہوتی تو انھیں سزائیں دی جاتی تھیں:۔

"یکایک مزدوروں کے باڑے سے گریہ وزاری کی صدائیں آنے لگیں کسی کیمپ میں گھاس نہیں تھی اور دیوان صاحب ہنٹر لیے چماروں کو پیٹ رہے تھے۔۔۔ ایک چمار بولا مالک آپ کو اختیار ہے مار ڈالیے۔ پیٹ باندھ کر کام نہیں ہوتا۔۔۔ ایک نوجوان نے کہا ہم لوگ بنا گھاس کھائے آٹھ دن سے گھاس دے رہے ہیں کیا گھوڑے بنا کھائے ایک دن بھی نہ دوڑیں گے۔۔۔۔ دیوان صاحب نے جھپٹ کر اسے چار پانچ ہنٹر لگا دیئے برہنہ جسم کی جلد کٹ گئی اور خون بہہ نکلا۔۔۔ وہی ہنٹر تان کر چودھری کو مارا یا بوڑھا آدمی تھا اس پر کئی دن کا بھوکا ہنٹر پڑتے ہی گر پڑا۔"

"پردہ مجاز" میں مصنف نے بیگار کے مسئلہ کی سچی اور بے لاگ مصوری کرتے ہوئے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ اچھوتوں کی جان سے زیادہ اعلیٰ طبقہ کے گھوڑوں کی اہمیت تھی اچھوتوں کو صرف زمیندار یا جاگیردار کا ہی بیگار نہیں کرنا ہوتا تھا بلکہ سرکاری حکام بھی ان سے بیگار لیتے تھے "گوشہ عافیت" میں ضلع حکام کا لشکر گاؤں والوں کی پریشانیوں اور مصیبتوں کی جانچ کر کے انھیں خوشحال زندگی کے مواقع فراہم کرانے کی غرض سے آتا ہے مگر یہ لوگ بھی اچھوتوں پر ظلم کرتے اور بیگار لیتے ہیں بقول مصنف "بیگار کا مسئلہ اس اس سے بھی زیادہ مشکل تھا" اچھوت لشکر والوں کی جان توڑ خدمت کرتے ان کے گھوڑوں کے لیے گھاس کا انتظام کرتے، پانی بھرتے اور ان کی ہر طرح کی غلامی کرتے باوجود اس کے لشکر والوں کو ان کی بھوک، پیاس سے کوئی غرض نہ ہوتی۔ افلاس زدہ اچھوت سخت محنت کرنے کے بعد مزدوری مانگتے ہیں تو تحصیلدار نے غصہ بھری آواز میں چپڑاسیوں کو حکم دیتا ہے:۔

"ان چماروں کی اچھی طرح خبر لیں یہی ان کی مزدوری ہے چپڑاسیوں نے بیگاریوں کو گھیرنا شروع کیا کانسٹیبلوں نے بھی بندوقوں کے کندے لگانا شروع کیے۔ کئی آدمی مضروب ہو گئے۔"

اچھوتوں کو جاگیردار، زمیندار، اس کے کارندے، سرکاری حکام کے علاوہ پروہتوں کی بھی بیگار کرنی پڑتی تھی۔ طبقہ وارانہ تقسیم کی وجہ سے مذہب کی گرفت زیادہ مضبوط ہو گئی تھی پریم چند کے عہد میں برہمن کی سیاسی گرفت تو کم ہو گئی تھی مگر مذہبی اعتبار سے اسے سماج کا بلند ترین منصب حاصل تھا۔ وہ اپنی حیثیت سے فائدہ اٹھا کر پسماندہ اور غریب اچھوتوں کے استحصال کا سبب بنتا تھا پریم چند کے افسانہ نجات کا ایک کردار پروہت کی بیگار سے متعلق کہتا ہے کہ:۔

"زمیندار بھی کچھ کھانے کو دیتا ہے حاکم بیگار لیتا ہے تو تھوڑی بہت مزدوری دے دیتا ہے یہ ان سے بھی بڑھ گئے۔"

"نجات" میں دکھی چمار علی الصباح نہار منہ پنڈت جی کی بیگار میں لگ جاتا ہے تمام دن بغیر کھائے پیئے سخت محنت کرنے کی وجہ سے دکھی لکڑی پھاڑتا ہوا چکر کھا کر گر جاتا ہے بقول مصنف "پنڈت جی نے پکارا اٹھ کر دو چار ہاتھ اور لگا دیئے" مگر دکھی مر چکا تھا پنڈت جی کو اس کے مرنے کے بعد بھی اس پر رحم نہیں آیا ساری زندگی اس سے بیگار لینے کے باوجود پنڈت جی اس کی لاش کو رسی سے باندھ کر گھسیٹتے ہوئے گاؤں سے باہر پھینک آتے بقول مصنف

"دکھی کی لاش کو کھیت میں گیدڑ، گدھ اور کوے نوچ رہے تھے یہی اس کی تمام زندگی کی بھگتی اور خدمت کا انعام تھا۔"

مسلسل بیگار کی وجہ سے اچھوتوں کا معیارِ زندگی بہت کمتر درجہ کا ہو گیا تھا یہ لوگ تنگ و تاریک جھونپڑیوں میں صدیوں سے زندگی بسر کر رہے تھے ان جھونپڑیوں میں عام ضروریاتِ زندگی کی چیزوں کے فقدان کے ساتھ ساتھ گرہستی نام کی بھی کوئی چیز نہیں رہتی تھی اچھوتوں کی بستی اور رہائش کے مسئلہ کو پریم چند نے "میدانِ عمل" میں امر کانت کی زبانی اس طرح بیان کیا ہے:۔

"پتھر کے ناہموار ٹکڑوں کو اوپر نیچے رکھ کر دیواریں بنائی گئی ہیں ان میں چھپر ڈال دیئے گئے ہیں دروازوں پر بانکٹ کی ٹٹیاں ہیں انھیں کابکوں میں اس گاؤں کی مخلوق اپنے گلہ بیل، بھیڑ اور بکریوں کو لیے خدا جانے کب سے آباد ہے۔۔۔ بڑھیا کے ساتھ جھونپڑے میں گیا تو اس کا دل کانپ اٹھا گویا افلاس چھاتی پیٹ پیٹ کر رو رہا ہو۔"

ان ریداسوں کی بستی میں کوئی ایسا گھر نہیں جہاں زندگی کی کرن یا خوشحالی نظر آتی ہو بغیر کھائے پیئے محنت کرنے کی وجہ سے ان کی صحت خراب رہتی تھی اچھوت خاندان کے تمام افراد محنت و مشقت کرتے ہیں ان کے معصوم بچے بھی کڑکتی لو، دھوپ میں تپتے رہتے ہیں اسی لیے ان کے بچوں کے چہروں پر جوانی کا شباب نظر نہیں آتا۔ اچھوتوں کی صحت اکثر و بیشتر خراب رہتی تھی اور جسم پر ہڈیوں کے علاوہ گوشت دکھائی نہیں دیتا۔ "گوشۂ عافیت" میں تیز دھوپ اور جھلسا دینے والی لو، میں پریم شنکر نے دیکھا کہ :-

"دو بوڑھی عورتیں سر پر لکڑی کا گٹھر رکھے ہوئے آئیں...
.. ان عورتوں کے پیچھے پیچھے کئی لڑکے بھی لکڑیوں کے بوجھ
لئے ہوئے تھے سبھوں کے کپڑے تار تار ہو رہے تھے سینہ
اور پسلی کی ہڈیاں نکلی ہوئی نظر آتی تھیں۔"

معاشی بدحالی اور افلاس کا یہ منظر ہندوستان کے تمام اچھوتوں کی خستہ حالی کی نمائندگی کرتا ہے "میدان عمل" میں امر کانت سلوتی کے جھونپڑے میں آرام کر رہا تھا اس نے چند لڑکوں کو آتے ہوئے دیکھا" دو تین لڑکوں کے سوا کسی اور کے جسم پر ثابت کپڑے نہ تھے۔" معاشی بدحالی کی وجہ سے یہ لوگ ایک ہی کپڑے پر پیوند لگا کر کئی سال تک استعمال کرتے۔ کپڑوں کی کمی کی وجہ سے ستر پوشی بھی مشکل سے ہی کرتے تھے دوسرا جوڑا نہ ہونے کی وجہ سے کافی دِن تک بغیر دھوئے کپڑوں کو پہنے رہتے جس کی وجہ سے اس میں بدبو بھی آتی اور ریاں بھی پھیلتی رہتی تھیں کپڑوں کی تنگی کے سبب ان لوگوں میں گندہ رہنے کی عادت ہو گئی تھی "میدانِ عمل" میں اچھوت ٹھاکر دوارے میں کتھا سننے جاتے ہیں۔ ان کے لباس اور گندگی کو مصنف اس طرح بیان کرتا ہے کہ :-

"زیادہ تر لوگ ننگے بدن تھے خال خال پھٹے پرانے کپڑے
پہنے نظر آتے تھے ان کے جسم سے تمباکو اور کثافت کی بو
آ رہی تھی مردوں سے زیادہ عورتیں تھیں میلی بدسلیقہ۔"

معاشی بدحالی کی وجہ سے اچھوتوں کو ذائقہ دار کھانا مدتوں تک نصیب نہیں ہوتا تھا اس لیے ان لوگوں میں مردہ جانوروں کے گوشت کھانے کی عادت ہو گئی تھی۔ ان کی زندگی میں مردہ گائے کو شکار کی حیثیت حاصل تھی اسے حاصل کرنے کے لیے ہر طرف نگاہیں جمائے رہتے اور اس کے حاصل ہونے پر بے حد خوشیاں منائی جاتیں برادری کے لوگوں کی دعوت کی جاتی۔ پریم چند نے اچھوتوں کی زندگی کے مسائل کو پیش کرتے ہوئے اس پہلو کو بھی تشنہ نہیں چھوڑا ہے۔ سماج سے منقطع رہنے کی وجہ سے ان میں کئی گندی عادتیں جڑ پکڑ چکی تھیں شراب نوشی نے بھی کافی اہمیت اختیار کر لی تھی مردہ کی روح کو تسکین پہنچانے کے لیے برادری کو شراب پلانا ضروری سمجھا جاتا اور اس عقیدہ نے سماجی رسم و نیم مذہبی رسم کی شکل اختیار کر لی تھی "میدانِ عمل" میں شراب نوشی اور مردہ گائے کے گوشت کے مسئلہ کی حقیقی تصویر پیش کی گئی ہے اور "چوگانِ ہستی" میں مردہ کی روح کو تسکین پہنچانے کے لیے شراب کی اہمیت کو بھی واضح طور پر دکھایا گیا ہے۔

رہائش کا مسئلہ صرف گاؤں تک محدود نہ تھا بلکہ شہروں میں بھی اچھوت اسی طرح گندگی میں زندگی گزار رہے تھے "میدانِ عمل" میں شہر کی زندگی پیش کرتے ہوئے دولت مند سیٹھوں اور امیروں کی فلک بوس کشادہ عمارتوں اور وسیع دھرم شالاؤں کے ساتھ ساتھ اچھوتوں کی تاریک کوٹھریوں اور گندے محلوں کو بھی پیش کیا ہے۔ ان کے محلوں اور بستیوں میں ہر طرف کوڑے کے ڈھیر نظر آتے ہیں نالیوں کا کیچڑ سڑکوں پر بہہ کر آ جاتا ہے جس سے طرح طرح کی مہلک بیماریوں کے ساتھ ساتھ ہر طرف بدبو سے فضا پراگندہ رہتی۔ تنگ کوٹھریوں میں زیادہ آدمیوں کے رہنے کی وجہ سے اکثر ایک ہی مرض کے تمام لوگ شکار ہو جاتے تھے۔ رہائش کے مسئلہ کا پریم چند کو شدید احساس تھا اسی لیے ۲۴ جنوری ۱۹۳۴ء کے "جاگرن" میں اچھوتوں کے رہائشی مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا تھا کہ "انھیں گھر بنانے کے لیے کافی زمین دے کر ان کی پریشانیاں دور کر سکتے ہیں"۔ "میدانِ عمل" میں ڈاکٹر شانتی کمار اور سکھدا اچھوتوں کے رہائشی مسئلہ کو حل کرنے کے لیے ہڑتال کرا دیتے ہیں بقول مصنف :-

"دوسرے دن شہر میں اچھی خاصی ہڑتال تھی مہتر تو ایک
بھی کام کرتا نظر نہ آتا تھا یکے بانوں اور گاڑی بانوں نے
بھی کام بند کر دیا تھا۔"

ہڑتال کرنے پر اعلیٰ طبقہ کے لوگ ان بدحال مظلوموں پر ظلم کرتے ہیں حکومت کی مدد سے گولیاں چلوا کر ان کی آواز کو دبانا چاہتے ہیں۔ انھیں خوف زدہ کرنے کے لیے گرفتاریاں کی جاتی ہیں مگر اچھوت ظالم اور مکاروں کی ہر چال کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہیں۔ بے خوف ہو کر گرفتاریاں پیش کرتے ہیں اپنی ہڑتال کو کسی طرح بھی ختم نہیں کرتے بالآخر سماج کے ٹھیکیداروں کو مجبور ہو کر ان مظلوموں کو مکان بنانے کے لیے آراضی دینے کا اعلان کرنا پڑتا ہے۔

اچھوتوں کی زندگی میں صرف معاشی بدحالی کا مسئلہ ہی نہیں تھا بلکہ انھیں باعزت زندگی گزارنے کے حق سے بھی محروم کر دیا گیا تھا جان و مال کے ساتھ ساتھ نوجوان لڑکیوں کی عصمت بھی محفوظ نہیں تھی۔ اعلیٰ طبقہ کے لوگوں کے مظالم، بربریت اور زندگی کو انھیں اپنی قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کرنا ہوتا تھا۔ زمیندار، اس کے کارندے، سرکاری حکام اور پروہت سبھی ان کی عصمت دری کرتے مگر ان کی فریاد سننے والا کوئی نہیں تھا۔ "میدانِ عمل" میں ریداسوں کی بستی میں :-

"ایک عورت سر کے بال کھولے، پریشان، کپڑے خون
سے تر خوف زدہ ہرنی سی آ کر اس کے پیروں سے چمٹ گئی...
...حسینہ... جھوٹ بولتے ہو۔ تم نے میری بانہہ نہیں پکڑی تھی۔"

ظالم و جابر حکومت کے نمک خوار سپاہی اس کہار حسینہ کے گھر میں گھس کر اس کی عصمت سے کھیلنا چاہتے تھے کیونکہ یہ کھیل دکھانا مصنف کی اخلاقیات کے خلاف ہے اس لیے اس حسینہ نے حوصلہ مندی اور بے خوفی سے ان ہوس پرست ظالموں کو زخمی کر کے اپنی عصمت بچالی اور سلیم کے پاؤں سے لپٹ کر سسک سسک کر رونے لگی۔ حسینہ کا رونا، فریاد کرنا، خوف زدہ ہونا اس عہد کی اچھوت لڑکیوں کی بے کسی و بے بسی کو واضح کرتا ہے اس طرح عصمت ریزی کے واقعات اچھوت لڑکیوں کے ساتھ اکثر ہوا کرتے تھے۔

پروہتوں نے مذہبی بندشیں لگا کر اچھوتوں کو سماجی زندگی سے منقطع کر دیا تھا اور ان کے ساتھ دیگر طبقہ کے لوگوں کو رشتہ ازدواج قائم کرنے کو مذہبی گناہ قرار دیا تھا تاہم خود پروہت اچھوت لڑکیوں سے جنسی تعلقات قائم کرنے کے خواہاں رہتے تھے۔ یہ اچھوت لڑکیوں کو سبز باغ دکھا کر اور مذہب کا واسطہ دے کر ان کی عصمت سے کھیلتے اور ان کے حسن و شباب سے لطف اندوز ہوتے۔ اس کی مثال ہم کو "گئودان" میں دکھائی دیتی ہے جھنیا ایک چمار بیوہ ہے وہ ایک پنڈت کے گھر روزانہ دودھ دینے جاتی تھی ایک دن جھنیا اس کے گھر گئی تو بقول جھنیا پنڈت جی :۔

"باہر کے کواڑ بند کیے چلے آ رہے تھے . . . . جھونا رانی روج
روج کلیجے پر چھری چلا کر بھاگ جاتی ہو . . . . ایک چاہنے
والے کا من رکھ لو تمھارا کیا بگڑے گا . . . . بھگوان پوچھیں گے
میں نے تمھیں اتنا روپ دھن دیا تھا تم نے اس سے ایک برہمن
کا اپکار بھی نہیں کیا تو کیا جواب دو گی ؟"

برہمن اپنے سماجی منصب سے فائدہ اٹھا کر انھیں بہکاتے اور ان کی مذہبی لاعلمی کی وجہ سے اپنا الو سیدھا کرتے تھے اچھوت ان کے قہر سے خوف زدہ تھے کیونکہ مذہبی عقیدہ کے مطابق آخرت میں ان کے ذریعہ بہت کچھ حاصل ہونے کی امیدیں وابستہ تھیں اور موجودہ زندگی میں بھی ان کی بددعا سے ڈرتے تھے اس کی بنیادی وجہ اچھوتوں کی لاعلمی اور ضعیف الاعتقادی تھی جس میں برہمن کو دیوتاؤں کا درجہ حاصل تھا "نجات" میں مصنف لکھتا ہے :۔

"برہمن کے روپے بھلا کوئی مار تو لے گھر بھر کا ستیاناس
ہو جاتے ۔ ہاتھ پاؤں گل کر گرنے لگیں"

اچھوت اسی خوف کی وجہ سے ان کے تمام مظالم خاموشی سے برداشت کر لیتے تھے "گئودان" میں ماتا دین ایک برہمن ہے اس نے سلیا چمارن سے جنسی تعلقات قائم کیے ہوئے ہیں ماتا دین سے ایک بچہ بھی تولد ہو چکا ہے اس راز سے تمام گاؤں والے واقف ہیں مگر برہمن کے خوف سے کوئی بھی حرفِ شکایت زبان پر نہیں لاتا۔ ماتا دین سلیا کے حسن و شباب سے شب و روز لطف اندوز ہونے کے باوجود اس سے مزدوروں کی طرح کھیتوں پر سخت محنت کرواتا ہے اس کے ساتھ اچھوتوں کا برتاؤ کرتا ہے اور اسے دو مٹھی اناج پر بھی اختیار نہیں ہوتا سلیا نے اپنی مرضی سے تھوڑا سا اناج دیدیا تو ماتا دین آنکھیں نکال کر بولا :۔

"نہیں تیرا کوئی اختیار نہیں کام کرتی ہے کھاتی ہے . . . .
اگر تجھے یہاں پرتہ نہ کھاتا ہو تو کہیں اور جا مجوروں کی کمی
نہیں"

اسی طرح افسانہ "دودھ کی قیمت" میں ٹھاکر صاحب کا لڑکا سریش بھنگی کا دودھ پی کر پرورش پاتا ہے بھنگی کے خود چھوٹا لڑکا منگل ہے مگر ٹھاکر صاحب کو خوش کرنے کے لیے وہ اپنے لڑکے کو بازار کا دودھ پلاتی ہے جس کی وجہ سے منگل کی صحت دن بدن خراب ہوتی جاتی ہے۔ بھنگی کی اس خاندان میں عزت ہوتی ہے اس لیے یہ امید کرتی ہے کہ میرے لڑکے کو تھوڑا بہت سامان حاصل ہو جائے گا اور اس کا مستقبل بھی سنبھل جائے گا مگر جب سریش کا دودھ چھڑا دیا جاتا ہے تو بھنگی کے ساتھ پھر وہی اچھوتوں کا برتاؤ ہوتا ہے اور بیماری کی حالت میں انھیں ٹھاکر صاحب کی نالیوں کی غلاظت صاف کرتے ہوئے اس کی موت ہو جاتی ہے اور اس کا لڑکا آوارہ کتوں کی غذا پر زندگی بسر کرتا ہے :۔

ہندو مذہب کے انھیں گندم نما جو فروشوں اور مطلب پرستوں نے اچھوتوں کے زندگی بسر کرنے پر مختلف قسم کی پابندیاں عائد کر دی تھیں۔ ہندو مذہب پر ایمان رکھنے کے باوجود مفاد پرست برہمنوں نے انھیں ہندو مذہب سے منقطع کر دیا اور مذہب کے نام پر اونچ نیچ کی تفریق قائم کر کے انسانوں کے درمیان نفرت کی دیواریں حائل کر دیں۔ اچھوت اعلیٰ طبقہ کے کنوؤں سے پانی نہیں بھر سکتے تھے "گئودان" میں جھنیا کیونکہ نچلے طبقہ سے تعلق رکھتی ہے اس لیے کنویں پر جانے کے لیے گاؤں والے پابندی لگا دیتے ہیں۔ افسانہ "ٹھاکر کا کنواں" میں جوکھو چمار کو بیماری کی حالت میں رات کے وقت پیاس لگتی ہے کیونکہ ٹھاکر کا کنواں قریب تھا اس لیے اس کی بیوی اپنے بیمار شوہر کے لیے اسی کنویں سے پانی بھرنے آتی ہے اتفاق سے اس کے پہنچتے ہی ٹھاکر کا دروازہ کھل جاتا ہے تو یہ خوف زدہ ہو کر بغیر پانی لیے بھاگ جاتی ہے اس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ اچھوت اور چماروں کو اونچی ذات والوں کے کنوؤں سے پانی لینے کا اختیار نہیں تھا اور ایسا کرنے پر انھیں سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ اس لیے خوف زدہ ہو کر جوکھو چمار کی بیوی بھاگ جاتی ہے۔

پریم چند نے زمیندار، سرکاری حکام اور برہمنوں کے علاوہ جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کے تعصبی برتاؤ کو بھی کامیابی سے پیش کیا ہے ان کے خیال میں جدید تعلیم کے زیور سے آراستہ ہونے کے بعد بھی نوجوانوں کے دلوں میں اچھوتوں کے لیے وہی نفرت موجود رہتی ہے اور ان سے انھیں کوئی دلچسپی یا ہمدردی نہیں ہوتی پریم چند نے "منتر" میں جدید تعلیم یافتہ ڈاکٹر چڈھا کے کردار کے ذریعہ پیش کیا ہے۔ بھگت کہار کا لڑکا سخت بیمار ہو جاتا ہے بھگت موت و زندگی کی کش مکش میں پڑے ہوئے اپنے لڑکے کو امیدوں

لے ساتھ ڈاکٹر چڈھا کے پاس علاج کی غرض سے لاتا ہے۔ شام کے وقت میں ڈاکٹر صاحب تفریح کے مشاغل میں مصروف رہتے ہیں اس لیے بھگت ان کی بہت منت وسماجت کرتا ہے مگر چڈھا صاحب پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا مجبوراً یہ اپنے لڑکے کو بغیر علاج کے گھر واپس لے آتا ہے اور چند گھنٹوں کے بعد اس کا لڑکا اپنے ماں باپ کو تڑپتا چھوڑ کر اس جہانِ فانی سے رخصت ہو جاتا ہے۔ یہاں پر مصنف نے واضح کر دیا ہے کہ اچھوت خاندان کے لختِ جگر کی ڈاکٹر صاحب کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔

اچھوتوں کو راہ چلتے ہوئے یہ ظاہر کرنا ضروری تھا کہ وہ اچھوت ہیں کیونکہ ان کے سائے سے اعلیٰ طبقہ کے لوگوں کا دھرم نشٹ ہو جاتا اور انھیں غسل کرنا پڑتا۔ پریم چند ہمیشہ سے چھوت چھات کے مخالف تھے انھوں نے گاندھی جی کی اچھوت ادھار تحریک کی حمایت کی اور اسے فروغ دینے کے لیے ہفتہ واری "جاگرن" میں اداریہ بھی لکھتے رہے۔ اچھوتوں کے مندروں میں داخلہ پر سخت پابندیاں عائد کر دی گئی تھیں انھیں عبادت کرنے اور اپنے بھگوان کے درشن کا بھی حق نہیں تھا اس لیے گاندھی جی نے یرودا جیل میں "ان شن" بھی کیا تھا۔ پریم چند نے اس مسئلہ کا ہمدردانہ تجزیہ کر کے اپنے ناول میں ان کے لیے مندر کے دروازے کھول ڈالے ہیں۔ "میدانِ عمل" میں مصنف نے مندر کے داخلے کے مسئلہ کو بہت خوبصورتی سے پیش کیا ہے اور ان تمام نہاد مذہبی رہنماؤں کی سخت مخالفت کی ہے۔ "میدانِ عمل" میں ٹھاکر دوارے میں ایک ماہ سے کتھا ہو رہی تھی ایک دن پچھلی صفوں میں کھلبلی مچ گئی معلوم ہوا کہ اچھوت جوتوں کے پاس بیٹھ کر کتھا سن رہے ہیں برہمچاری جی نے یہ سنا تو :۔

> "اپنا سر پیٹ لیا، یہ بدمعاش روز یہاں آتے تھے اور
> سب کو چھوتے تھے۔ ان کا چھوا ہوا پرشاد روز لوگ کھاتے
> تھے۔ اس سے بڑھ کر اندھیر اور کیا ہو سکتا ہے.... کئی آدمی
> جوتے لے کر ان غریبوں پر پل پڑے۔"

مذہب کے دقیانوسی رہنماؤں کا یہ خیال ہے کہ اچھوتوں کے دیکھنے سے بھگوان ناپاک ہو جاتے ہیں۔ پریم چند ڈاکٹر شانتی کمار اور دیگر رہنماؤں کی قیادت میں اچھوتوں سے مندر میں داخلہ کے لیے مظاہرہ کرواتے ہیں مذہب کے ٹھیکیدار لالہ سمر کانت پولس کے ذریعہ مظلوم اچھوتوں پر گولیوں کی بارش کروا دیتے ہیں مگر اچھوت اپنی جانوں کی قربانیاں دے کر مندر میں داخلہ کا حق حاصل کر لیتے ہیں۔ اچھوتوں کے مندر میں داخلہ کی مصوری کرتے ہوئے مصنف نے واضح کر دیا ہے کہ پروہتوں اور سیٹھ لوگوں کے نظریات آسانی سے نہیں بدل سکتے اس کے لیے منظم تحریک چلا کر قربانیاں دینی ہوں گی۔

اعلیٰ طبقہ کے لوگوں نے اچھوتوں پر اپنی حکمرانی قائم رکھنے اور انھیں غلام بنائے رکھنے کی غرض سے ان کے بچوں کے تعلیم حاصل کرنے پر پابندیاں لگا دی تھیں اچھوت بچوں کو اسکول میں اس لیے داخل نہیں کیا جاتا تھا کیونکہ یہاں دوسرے طبقے کے بچے تعلیم حاصل کرتے تھے اور اچھوتوں کے سائے سے اعلیٰ طبقہ کے بچوں کا دھرم تباہ ہو جاتا تھا اچھوتوں کا الگ کوئی اسکول نہ تھا۔ اچھوتوں کی تعلیم پر پابندی لگانے کا بڑا سبب یہ بھی تھا کہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد یہ مذہب کے حقیقی روپ کو پہچان لیں گے اور سماج کے دیگر انسانوں کی طرح زندہ رہنے کا حق حاصل کر لیں گے تعلیم کے زیور سے آراستہ ہونے کے بعد ان لوگوں کا معاشی استحصال بھی ممکن نہ تھا۔ ان خیالات کے پیشِ نظر انھیں تعلیم سے دور رکھا جاتا تھا۔ پریم چند اس خیال سے بخوبی واقف تھے اسی لیے انھوں نے امرکانت کے ذریعہ اچھوتوں کی تعلیم کے لیے مدرسہ قائم کرایا اور بچوں کے ساتھ ساتھ بزرگوں میں بھی تعلیم حاصل کرنے کا جذبہ دکھایا ہے۔ اچھوتوں کی ترقی اور خوشحالی کے لیے تعلیم نہایت ضروری ہے علم کی روشنی حاصل کرنے کے بعد ان کی تاریک زندگی منور ہو جائے گی اور اعلیٰ طبقہ کے لوگوں اور مذہبی رہنماؤں کے مکر و فریب کی نقاب کشائی آسانی سے کر سکیں گے۔

پریم چند نے ہندوستانی سماج کے اس رِستے ہوئے ناسور یعنی اچھوتوں کی زندگی کے مسائل کی اہمیت کو شدت سے محسوس کر لیا تھا اس لیے انھوں نے اپنے ناولوں اور افسانوں میں اچھوتوں کی زندگی کے حالات ان کے لیے اونچی ذات والوں کے برتاؤ، بیگار اور بیگار سے انکار کرنے پر ہونے والے مظالم، ان کی زندگی پر لگائی گئی مختلف پابندیاں، معاشی بدحالی کے اسباب، رہائش کا مسئلہ اور سماجی و نفسیاتی پیچیدگیاں بہت گیرائی و گہرائی سے پیش کی ہیں ان تمام مسائل کو پیش کرتے ہوئے پریم چند نے یہ ظاہر کر دیا ہے کہ سماج میں چند مطلب پرست عناصر اور مذہب کے ٹھیکیداروں کی بربریت نے کس طرح اچھوت طبقہ کو کسمپرسی کی حالت میں زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا ہے۔ ان مسائل کو پیش کرتے ہوئے مصنف کی تمام تر ہمدردیاں اچھوتوں کے لیے ہیں اس لیے انھوں نے مسائل کو حل کرنے کے لیے سچے ہمدردوں اور رہنماؤں کی کمی کو بھی ظاہر کر دیا ہے۔

آج کل کی کہانیاں

آج کل میں شایع شدہ بیس کہانیوں کا انتخاب جس میں ملک کے ممتاز افسانہ نگاروں کی کہانیاں شامل ہیں۔

قیمت:- ۱۱ روپئے
آج کل کے خریداروں کو ۲۰ فی صد رعایت۔

کمل کشور گوینکا

پریم چند کی ڈائری کا مطالعہ

شری امرت رائے کے ذریعہ تحریر شدہ پریم چند کے سوانح حیات "پریم چند قلم کا سپاہی" سے قبل قارئین کو یہ معلوم نہ تھا کہ پریم چند اپنی روزمرہ کی زندگی میں ڈائری لکھا کرتے تھے۔ ان کے دوستوں نے اپنی یادداشتوں میں بھی ان کے ڈائری لکھنے کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ امرت رائے نے پہلی بار قارئین کو بتایا کہ ۱۱ر فروری سے ۲۴ر فروری ۱۹۲۸ء تک کے ڈائری کے اوراق ملے ہیں جن میں پریم چند نے "مادھوری" کے دفتر میں کام کرتے ہوئے روزمرّہ کا مختصر تذکرہ کیا ہے۔ انھوں نے ۱۹۳۶ء کی ڈائری کا بھی کتاب کے کچھ مقامات پر ذکر کرتے ان تفصیلاتی معلومات کو پیش کیا ہے۔ "پریم چند ساہتیہ کوش" کے اپنے منصوبہ پر کام کرتے ہوتے میرے لیے اس ڈائری کا مطالعہ ناگزیر تھا۔ اس لیے جب میں مواد فراہم کرنے کے لیے الہ آباد میں امرت جی سے ملا، اپنا منصوبہ بیان کیا تو انھوں نے بڑی خوش اخلاقی سے پریم چند پر دستیاب مواد میرے سامنے رکھ دیا۔ اس میں مجھے پریم چند کی لکھی ۱۹۳۶ء کی ڈائری ملی جسے الہ آباد کے پبلشر رام نرائن لال نے "دی وکٹری ڈائری ۱۹۳۶ء" کے نام سے چھاپا ہے۔ پریم چند ادب کے قارئین کے لیے اس ڈائری کا مطالعہ نہایت اہم ہوگا کیونکہ اس میں تحریری مواد اور معلومات کی ہمیں کوئی واقفیت نہیں تھی، یا ان کا جزوی علم تھا۔

پریم چند کی یہ ڈائری تین زبانوں میں لکھی گئی ہے، انگریزی، ہندی اور اردو، ڈائری میں صرف ۶۴ صفحات استعمال کیے گیے ہیں، جن میں ۵۸ صفحات انگریزی میں، ایک صفحہ ہندی میں اور تین صفحے اردو میں لکھے گئے ہیں۔ اس سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ پریم چند روزمرّہ کے کاموں کی تفصیل لکھنے میں انگریزی زبان کو زیادہ کاروباری اور آسان سمجھتے تھے۔ انھوں نے "رنگ بھومی"، "کایا کلپ" اور "گئودان" وغیرہ ناولوں کے خاکے بھی انگریزی زبان میں لکھے۔ ڈائری میں تین زبانوں کا استعمال ان کی شخصیت کے ایک بڑے رجحان کا اظہار کرتا ہے۔ انھوں نے ناولوں اور کہانیوں کے خاکے انگریزی میں لکھے اور ہندی اور اردو دونوں میں ادب پیش کیا۔ اور دونوں میں اپنے ادب کا ترجمہ کے پیش کرتے رہے۔ جہاں تک تاریخ وار ڈائری لکھنے کا تعلق ہے پریم چند نے ۲۵ر جنوری ۱۹۳۶ء سے ۱۱ر مارچ ۱۹۳۶ء تک (۲۹-۲۸ر فروری کو چھوڑ کر)، ڈائری کو باقاعدہ لکھا ہے۔ ڈائری کے ابتدائی دس صفحے (یکم جنوری سے ۱۰ر جنوری تک) اور ۱۲ر مارچ سے ۱۸ر مارچ تک کے سات صفحوں میں دوسری تفصیلات درج ہیں۔ ڈائری کے باقی صفحات خالی ہیں۔ ڈائری کے لکھے ۶۴ صفحوں سے ان کی زندگی کے روزانہ کاموں اور نفسیاتی دنیا کی ایک انوکھی جھلک ملتی ہے۔ یہ ایک ایسی مستند دستاویز ہے جو ان کی شخصیت اور نفسیات کے کچھ خاص پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہے۔ آیئے! اب دیکھیں کہ یہ ڈائری انھیں کس طرح اور کن صورتوں میں ظاہر کرتی ہے۔

"ہنس" کے لیے ادارتی موضوع:

پریم چند "ہنس" کے اڈیٹر تھے اور اس میں باقاعدہ ادارتی کالم "ہنس وانی" کے عنوان سے لکھتے تھے۔ ان کے پاس ہر طرح کے کام تھے۔ پریس چلانا خامہ فرسائی کرنا، خانہ داری کا انتظام کرنا، سفر کرنا وغیرہ ایسی حالت میں ہنس کے لیے ادارتی شذرات لکھتے وقت موضوعات کا ایک دم سوجھ جانا ناممکن بھی تھا۔ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے پریم چند نے ڈائری کا استعمال کیا اور جیسے ہی ادارتی شذرات کے مناسب موضوعات خیال میں آتے انھوں نے فوراً انھیں ڈائری میں نوٹ کر لیا اور ساتھ ہی حوالہ دے دیا کہ کس مہینے کے شمارہ میں ان کا استعمال ہونا ہے۔ ڈائری کے یکم جنوری ۱۹۳۶ء کے صفحہ پر ان موضوعات کا ذکر اس طرح ہوا ہے:

مارچ کے لیے موضوع:

۱۔ پورنیا کا صوبجاتی ہندی اجتماع (× × اور منورنجن پرشاد کی تقاریر)

۲۔ مسٹر عبدالقادر کا ہندوستانی اکیڈمی میں صدارتی خطبہ۔

۳۔ جناب راشد الخیری کی وفات۔

۴۔ مہلا ودیا پیٹھ کی اپیل۔

۵۔ شانتی نیکتن میں چندر گپت کی تقریر۔

۶۔ زمانہ حالی نمبر پر تبصرہ۔

"ہنس" کا مارچ ۱۹۳۶ء کا شمارہ دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ اس میں پہلے تیسرے اور چوتھے موضوع پر شذرات لکھے گئے ہیں۔ اور باقی موضوعات کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ ۱۲ر جنوری کے صفحہ پر بھی TOPICS FOR EDITORIAL عنوان سے

لکھے دو موضوعات میں "گورکی کی وفات" کا بھی ذکر ہے۔ لیکن "ہنس" کے شماروں میں گورکی کی وفات پر کوئی بھی ادارتی شذرہ نہیں ملتا۔ شری امرت رائے نے "قلم کا سپاہی" میں لکھا ہے کہ ۲۱ جون ۱۹۳۶ء کو "آج" کے دفتر میں گورکی کو ہدیۂ عقیدت پیش کرنے کے لیے منعقدہ اجلاس میں پریم چند نے ایک مضمون بڑھا تھا لیکن افسوس ہے کہ وہ مضمون ابھی تک دستیاب نہیں ہوا ہے۔ "آج" کے اس دور کے شماروں میں گورکی کے انتقال کی خبر تو چھپی ہے لیکن نہ تو تعزیتی جلسہ کی اطلاع چھاپی گئی ہے اور نہ پریم چند کا مضمون ہی۔

گئودان سے متعلق اطلاعات:

ڈائری میں گئودان سے متعلق تین چھوٹی موٹی اطلاعیں حاصل ہوتی ہیں۔ یہ چھوٹی ہونے پر بھی اہم ہیں۔ ۲ر جنوری کے صفحہ پر مختلف اشخاص کے قرضہ کی تفصیل اس طرح دی گئی ہے:

ابتدا میں ہوری پر قرضہ۔

منگرو شاہ — ۶۰ روپے، بڑھ گیا ۳۰۰ روپے

دُلاری — ۱۰۰ روپے۔

داتا دین — ۱۰۰ روپے۔

لگان — ۲۵ روپے۔

مبہم نام — ۸۰ × ۲۵

اس تفصیل کو تحریر کرتے وقت پریم چند گئودان کے آخری صفحے لکھ رہے تھے۔ اس سے ممکن ہے وہ ہوری کے کل قرضے کا حساب، معاشی دباؤ اور مہاجنی استحصال کی کیفیت کا جائزہ لینا چاہتے ہیں۔ جس سے ناول کے آخر میں اس کی صحیح تصویر دی جا سکے۔ ڈائری کے مطابق ۱۱ر مارچ ۱۹۳۶ء کو گئودان کا مسودہ پریس کو دیا گیا۔ اور اسی دن پریم چند نے اس کے کچھ پروف دیکھے۔ گئودان کے چھپنے کے بعد ۱۱ر جنوری کے صفحہ کے مطابق پریم چند نے شری جے شنکر جی، رام داس گوڑ جی، کے۔ڈی۔ پرشاد گرو جی، واچسپتی پاٹھک جی اور رادھا کرشن جی کو اس کے نسخے نذر کیے۔

بینک کھاتوں اور آمدنی کی تفصیل:۔

ڈائری میں پریم چند کی آمد و خرچ کی بڑی مستند تفصیل درج ہے۔ ڈائری میں ان کے ذاتی اور "ہنس" کے بینک کھاتے کی الگ الگ تفصیل جمع و اخراج رقم کے ساتھ لکھی ہوئی ہے۔ ڈائری کے صفحہ ۷ پر ان کے کھاتے کا حساب اس طرح سے لکھا ہوا ہے:۔

ذاتی حساب۔

	جمع	اخراج رقم
۶/۲/۳۶	۲۱۰/۰۰	۴۶/۰۰
	۱۰۰/۰۰	..

	جمع	اخراج رقم
۱۷/۲/۳۶	۲۵/۸	۱۴۷/۷
۱۹/۲/۳۶	..	۱۸/۰
۲۶/۲/۳۶	..	۳۲/۹/۰
۳/۳/۳۶	۴۰/۰	۵۰/۰
۱۹/۳/۳۶	..	۲۳۵/۱۳/۰
ایضاً	۵۶/۰	۴۶/۰/۰
۲۳/۳/۳۶	۶۸/۰ (چاند پریس)	۱۰۰/۰/۰
ایضاً	۷۲/۰ (ڈی۔آر پریس)	..
۴/۴/۳۶	۴۴/۰	۵۰/۰
۶/۴/۳۶	۱۶/۰	۱۰۰/۰

۹ر اپریل کو کریڈٹ بیلنس ۳۰۲/۰ روپیہ

اس تفصیل کے مطابق فروری ۱۹۳۶ء میں ان کی ذاتی آمدنی ۳۳۵/۰ روپے تھی اور خرچ ۲۴۴/۰ روپے اور مارچ ۱۹۳۶ء میں آمدنی ۲۳۶/۰ روپے تھی اور خرچ ۴۳۱/۰ روپے۔ ڈائری کے ۹ر جنوری والے صفحے پر آمدنی ۱۹۳۶ء عنوان سے ایک دوسری تفصیل درج ہے:۔

آمدنی ۱۹۳۶ء

۸۰/۰ روپے ریڈیو براڈکاسٹنگ

۶۸/۰ روپے چاند

۱۸/۰ روپے چاند

۵۰/۰ روپے لاجپت رائے (اردو پبلشرز مصنف)

اس تفصیل سے یہ غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ یہ آمدنی ۱۹۳۶ء کے کئی مہینوں کی ہے لیکن یہ رقم انھیں مارچ اور اپریل میں ہی مل گئی تھی۔ دہلی کے ریڈیو اسٹیشن سے ان کی دو کہانیاں ۵ر مارچ اور ۷ر مارچ کو نشر ہوئی تھیں۔ اور پریم چند بذاتِ خود ان تاریخوں کو ریڈیو اسٹیشن گئے تھے۔ چاند پریس سے ۶۸/۰ روپے ۲۳ر مارچ ۱۹۳۶ء کو ملے تھے۔ اور باقی رقم انھیں اپریل میں ملی تھی۔ اس طرح ڈائری کے یہ صفحات پریم چند کی زندگی کے اس پہلو کو ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں جو ہمیں ابھی تک معلوم نہ تھا۔

کہانی کے پلاٹ:۔

پریم چند نے اپنے ناولوں کی تخلیق سے پہلے ان کا مختصر خاکہ تیار کیا تھا۔ اس کے ثبوت آج دستیاب ہیں۔ لیکن انھوں نے یہی طریقہ کہانیوں کے ساتھ بھی اپنایا تھا۔ اس کے ثبوت کی عدم موجودگی کی وجہ سے کہانیوں کا جائزہ لیتے وقت اس کا ذکر نہ ہو سکا۔ اب یہ ڈائری بتاتی ہے کہ جب ان کے ذہن میں کہانی جنم لیتی تھی تو وہ اس کا پلاٹ چند الفاظ میں لکھ کر رکھ لیتے تھے۔ اور وقت ملنے پر اسے کہانی کا روپ دید یتے تھے۔ ڈائری کے ۱۰، ۱۱ر فروری اور ۹ر اپریل

Accession numbers
..62272..
Date. 7..4..82

کے صفحوں پر انگریزی میں کہانیوں کے پلاٹ لکھے ہوتے ہیں۔ جن پر وہ نامعلوم وجوہ سے کہانی نہ لکھ پاتے۔ یہ پلاٹ ان کے تخلیقی ردِ عمل کے ایک اہم عنصر کی نقاب کشائی کرتے ہیں۔ ۱۰ر فروری کے صفحہ پر لکھا ہوا پلاٹ قارئین کی معلومات کے لیے پیش کیا جاتا ہے:

"ایک معزز سماجی کارکن کا ایک مطلقہ خاتون سے تعلق ہو جاتا ہے، جو ایک لڑکیوں کا اسکول چلاتی ہے۔ وہ ایک دوسرے پر مائل ہوتے ہیں۔ ایک بار جب وہ خاتون سے ملنے آتا ہے تو اس کا خاوند اسے آڑے ہاتھوں لیتا ہے۔ وہ اپنی توہین محسوس کرتا ہے اور کبھی خاتون کے پاس نہیں آتا۔

کئی سال گزر جاتے ہیں تب وہ اس خاتون کے ذریعہ مدعو کیا جاتا ہے تب وہ خاتون دنیا کے بطلان پر تقریر کرتی ہے۔"

سفر کی تفصیل :-

پریم چند کی یہ ڈائری ۲۵ر فروری سے ۱۱ر مارچ تک کی سبھی سیاحتوں کی تفصیل پیش کرتی ہے۔ اپنی زندگی کے آخری سال میں شہرت کے بام عروج پر پہنچنے کی وجہ سے دیس میں چاروں طرف سے انھیں دعوت نامے موصول ہو رہے تھے۔ ان کے لیے سبھی کو ٹھکرانا ممکن نہ تھا۔ اس باعث لگ بھگ پچاس دنوں میں انھیں الہ آباد، آگرہ، پورنیا، اور دہلی کا سفر کرنا پڑا۔ انھیں دوبارہ الہ آباد مدعو کیا۔ ۲۶ جنوری کو "مہلا گلپ سمیلن" میں اور ۲۰ر فروری کو ینگ کرسچین کالج میں۔ ہری ہر ناتھ ٹنڈن ودیج کی دعوت پر وہ پہلی فروری کو صبح آگرہ پہنچے اور سینٹ جانس کالج میں ان کا احترام کیا گیا۔ اس کے بعد وہ پورنیا کے صوبائی ادبی اجتماع کا افتتاح کرنے کے لیے ۲۳ر فروری کو پورنیا پہنچے۔ اسٹیشن پر نوجوان جنار دن پرشاد ودیج نے ان کا خیر مقدم کیا۔ پورنیا سے لوٹنے کے بعد جینندر کمار کے بار بار اصرار پر وہ مع اہلیہ ۴ر مارچ کو دہلی کے لیے چل پڑے۔ پریم چند نے اپنے دہلی کے سفر کی تفصیل ڈائری میں درج ذیل انداز میں لکھی ہے:-

۴ر مارچ ۱۹۳۶ء بدھ — دہلی کے لیے ۴۵-۲ پر سیالدہ ایکسپریس سے روانہ۔ تیسرے درجہ کا آنے جانے کا کرایہ آٹھ روپے تین آنے۔

۵ر مارچ ۱۹۳۶ء جمعرات — صبح کے وقت دہلی پہنچے۔ اسٹیشن پر جینندر کمار ہمیں لینے آئے۔ ان کے گھر پر جاکر ٹھہرے۔ شام کو ریڈیو سے میری کہانی نشر ہوئی۔ لال قلعہ دیکھا۔

۶ر مارچ ۱۹۳۶ء جمعہ — قطب مینار، ہمایوں کا مقبرہ، صفدر جنگ وغیرہ دیکھنے گئے۔ ۳۰-۱ پر لوٹے۔ جامعہ جاکر جوش وغیرہ سے ملا۔

۷ر مارچ ۱۹۳۶ء ہفتہ — ریڈیو سے دوسری کہانی نشر ہوئی۔

۸ر مارچ ۱۹۳۶ء اتوار — ہولی۔ شام کو جامعہ میں ہندوستانی سبھا کا افتتاح۔ ایک اچھی پارٹی ہوئی۔

۹ر مارچ ۱۹۳۶ء سوموار — (غیر واضح نام) کے گھر شام کو کھانا کھایا۔ ہندو کالج دہلی کے طلبہ کے روبرو تقریر کی۔ اور رات کو ۳۰-۱۰ پر الہ آباد کے لیے روانہ۔

سفر کی ساری تفصیلات کئی نقطۂ نظر سے اہم ہیں۔ ان تفصیلات سے ان کے ۱۹۳۶ء کے معمولات حیات کو ترتیب دینا آسان ہو گیا۔ ساتھ ہی ان سے واضح ہے کہ پریم چند نے شہرت کے بام عروج پر پہنچنے کے باوصف نئے نئے نوجوان مصنفین سے رابطہ قائم رکھا۔ اور ان کے دعوت نامے منظور کر کے حوصلہ افزائی کرنے کے ساتھ اپنے قرب کی عزت بخشی۔ ہری ہر ناتھ ٹنڈن ودیج، جینندر کمار اور سجاد ظہیر وغیرہ سبھی ایسے نوجوان تھے جنھیں ادبی دنیا نے پہچاننا بھی شروع نہیں کیا تھا۔ لیکن پریم چند نے ان کی صلاحیت و استعداد کو دیکھ کر انھیں آگے بڑھانے میں کوئی کسر نہیں رکھی۔ آج کے بلند مقام مصنفین کو دیکھتے ہوئے ان کا یہ کام انھیں اور بھی عظیم بنا دیتا ہے۔

دوستوں اور معزز اشخاص کے پتے اور ملاقات کی تفصیل :-

ڈائری کے ۱۳ر مارچ کے صفحہ پر ۸ محترم نیتاؤں، بیوپاریوں، ادیبوں وغیرہ کے نام لکھے ہوتے ہیں جن میں سیٹھ جمنالال بجاج، رائے گوبند چند، پنڈت گوبند بلبھ پنت، راجندر پرشاد، جگل لال کملاپت، ڈاکٹر سمپور نانند، کے ایم منشی، جسٹس بسیشور ناتھ، سپرو وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان کے لکھنے سے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ پریم چند نے ۸ر جنوری کے صفحہ پر چندر گپت ودیا النکار، سجاد ظہیر اور بھگوتی چرن ورما کے پتے درج کیے ہیں۔ چندر گپت ودیا النکار ان دنوں ایک اشاعتی ادارہ سے وابستہ تھے اور انھوں نے پریم چند کی کہانیوں کا مجموعہ شائع کیا تھا۔ سجاد ظہیر انجمن ترقی پسند مصنفین کے مہتمم تھے۔ اور بھگوتی چرن ورما کے ایک ناول کا مقدمہ پریم چند نے لکھا تھا۔ پریم چند کی نوجوانوں سے یہ محبت ان میں گھل مل جانے کی آرزو کے باعث تھی۔ انھوں نے ان کے دروازہ تک جانے میں بھی کبھی تکلف نہ کیا۔ وہ جب بھی الہ آباد جاتے تو مہادیوی ورما، رام کمار ورما، گلاب رائے وغیرہ نوجوان مصنفوں کے گھر جاکر ان سے ملنا نہ بھولتے۔ ۳ر فروری کے ڈائری کے صفحہ پر مہادیوی ورما سے ملاقات اور اس کا تاثر اس طرح تحریر کیا ہے — "مہادیوی ورما سے ملا اور ان کی پُر لطف گفتگو سے لطف اندوز ہوا۔ ان کا اخلاق شیریں اور بے دغا (پُرخلوص)، ہنسی بڑی دلکش ہے۔"

ان تفصیلات کے علاوہ پریم چند نے ڈائری میں کئی طرح کے چھوٹے موٹے کاموں کے کرنے اور دیگر اطلاعات کو مندرج کیا ہے: بچوں کے لیے ریڈرس لکھنا، مانسرور، کے پروف دیکھنا، اخبار و رسائل پڑھنا، خط اور کہانی لکھنا، پبلشر سے روپے طلب کرنا، کہانیوں کے مجموعہ کے لیے کہانیوں کی فہرست تیار کرنا، پرواسی لال ورما سے متعلق مباحثہ کا حل کرنے کے لیے پراڈکر درگا پرشاد اور ورما کا گھر آنا، جیون بیمہ کی پالیسی کھو جانے کی یادداشت نقل کرنا، ہندی رسائل

(بقیہ صفحہ ۴۸ پر)

ابوالکلام قاسمی

کفن کے حوالے سے پریم چند کی پہچان

"کفن" پریم چند کے آخری دور کے دو اہم افسانوں میں سے ایک ہے۔ اِس دور کے افسانوں میں ایک اور افسانہ جو کسی حد تک "کفن" کی فنی قدر و قیمت کے قریب پہنچتا ہے وہ "پوس کی رات" ہے دنیا کا سب سے انمول رتن سے لے کر "پوس کی رات" اور "کفن" تک کا سفر پریم چند کی فنی اور تخلیقی شخصیت کے کئی روپ اور مختصر افسانے کے فن کے تدریجی ارتقا کے کئی نشیب و فراز سامنے لاتا ہے۔ عہدِ طفولیت میں کسی پڑوسی کے گھر جا کر داستانیں اور حکایتیں سننے والا مستقبل کا قصہ گو، اپنے ادبی سفر کا آغاز قصہ گوئی کے قدیم فن کے تتبع سے کرتا ہے، وہ اپنے گرد و پیش، بکھری زندگی سے خام مواد حاصل کر کے اُسے اِس طرح کہانی کا روپ دیتا ہے کہ اس کی ابتدائی کہانیاں اظہار کی سطح پر داستانوں کی ماورائی فضا سے مختلف ہوتے ہوئے بھی داستانوں کی روایت کا تسلسل اور کبھی اس کی توسیع دکھائی دیتی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ جہاں اِس افسانہ نگار کی ابتدائی کہانیاں ہم جیسے ہی انسانوں کی واردات بن کر سامنے آتی ہیں وہیں مثالیت اور کرداروں کے سپاٹ پن کے عناصر کے سبب یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ ہمارا کہانی کار قصہ گوئی کے ماضی میں پھیلے ہوئے طویل سلسلے سے ابھی اپنا دامن نہیں چھڑا سکا ہے۔ ان کہانیوں میں فوق فطری اور فوق بشری عناصر اس طرح تو نہیں جیسے داستانوں میں پائے جاتے ہیں۔ مگر کبھی توہم پرست اور غیر ترقی یافتہ سماج، اور کبھی راسخ العقیدہ افراد کی زندگی سے موضوعات کے انتخاب کے سبب جگہ جگہ فوق فطریت اور فوق بشریت (Super Naturalism & Super Humanism) کی چھوٹ پڑتی ہوئی ضرور دکھائی دیتی ہے۔ افسانہ نگار اپنے افسانوں سے کبھی حب الوطنیت کے جذبات ابھارتا ہے، کبھی سماج میں رائج، غلط رسوم و رواج کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرتا ہے، اور کبھی اصلاحی، اخلاقی اور قومی اغراض و مقاصد کا گراں بار فریضہ، فن پارہ کو سونپ کر اسے محض ایک وسیلے کے طور پر استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اس طرح ایک دو کے علاوہ اس کے سارے ہی افسانے اشخاصِ قصہ کی زندگی کو پیش کرنے کے بجائے خود کہانی کار کی پند و نصائح کے ترجمان بن کر رہ جاتے ہیں مگر یہ اثرات وقت کے ساتھ کم ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور افسانہ نگار اپنا سفر اس طرح جاری رکھتا ہے کہ "پوس کی رات" اور "کفن" تک آتے آتے اُس کی کہانیوں سے فکر اور فن کی ثنویت معدوم ہوتی نظر آتی ہے۔ اور اس طرح دو ایک ایسے فن پارے وجود میں آتے ہیں جو فنی نقطۂ نظر سے ایک ایسی اکائی میں تبدیل ہو چکے ہیں جو اسلوب بیان، موضوع، مواد اور زندگی کے زاویۂ نظر کو اپنی وحدت میں تحلیل کئے ہوئے ہیں۔ اگر آپ مجھے پریم چند کے تمام افسانوں میں سے کسی ایک افسانے کے انتخاب کا اختیار دیں جو مختصر افسانے کی تاریخ کا سنگِ میل اور پریم چند کی کہانیوں میں غیر معمولی قدر و قیمت کا حامل ہے تو میری نگاہِ انتخاب "کفن" پر جا کر رک جائے گی۔ اس موقع پر آپ کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ بھلا اس قدر بدیہی حقیقت کو میں اپنی دریافت بنا کر کیوں پیش کر رہا ہوں۔ تو میں اس سلسلے میں صرف یہ واضح کرنا چاہوں گا کہ اس بات پر میرے زور دینے کا مطلب محض یہ ہے کہ میں "کفن" کو پریم چند کی صرف اس کہانی کی حیثیت سے نہیں دیکھتا جو پریم چند کی سب سے بہتر کہانی ہے بلکہ میرے نزدیک اِس کہانی کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ یہی کہانی اردو کی وہ کہانی ہے جس نے پریم چند کی روایت کو آج تک زندہ رکھا اور آگے بڑھایا ہے۔ "کفن" ہی وہ کہانی ہے جو ۱۹۳۶ء سے آج تک کے چوالیس سال کے عرصے پر پھیلی ہوئی افسانہ نگاری کو وہ بنیاد فراہم کرتی ہے جس سے پریم چند کے بعد کے افسانہ نگاروں نے حقیقت نگاری کا سلیقہ سیکھا اور یہی افسانہ ترقی پسند افسانہ نگاری کے لیے ایک اساس بن کر سامنے آیا۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم صرف اپنی معاشرتی اور تہذیبی صورت حال سے مماثل ہونے کی وجہ کو کفن کی روایت سے خود کو جڑا ہوا محسوس نہیں کرتے بلکہ "کفن" کی شکل میں پریم چند نے فن کا وہ نادر نمونہ چھوڑا کہ آج ہی نہیں بلکہ آنے والے زمانوں کے مسافر بھی اپنی فنی منزل کی تعین کے لیے اسے ایک سنگِ میل سمجھتے رہیں گے اور امتدادِ زمانہ بھی صرف فنی قدر و قیمت کی بنا پر ہی اس کی عظمت میں بہ آسانی کوئی تخفیف پیدا نہ کر سکے گا ـــــ ان حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے اگر میں یہ کہوں تو کچھ غلط نہ ہوگا کہ ہمارے عہد میں پریم چند کی معنویت اور قدر و قیمت کی شناخت میں "کفن" کا بڑا اہم رول رہا ہے

اور فن کی مطلق اقدار کی بنا پر آئندہ بھی یہی افسانہ پریم چند کو عرصۂ دراز تک ایک قابلِ قدر افسانہ نگار ثابت کرتا رہے گا۔

پریم چند کے آخری زمانے کی افسانہ نگاری اور "کفن" کے بارے میں چند تمہیدی باتوں کے بعد آیئے اب ہم اپنے نظر افسانہ کا تجزیاتی جائزہ لیں اور دیکھیں کہ عملی تنقید کے نتیجے میں اس افسانے کے بارے میں کیا حقائق سامنے آتے ہیں۔ اس سلسلے میں قبل اس کے کہ میں پوری کہانی کو پیشِ نظر رکھ کر بحیثیت مجموعی اِس کا تجزیاتی مطالعہ کروں، مناسب سمجھتا ہوں کہ مختصرًا "کفن" کی کہانی کی تلخیص آپ کے سامنے پیش کر کے اپنے اظہار مدعا کے لیے ایک ٹھوس بنیاد فراہم کر لوں۔ کہانی یہ ہے —— کسانوں کے ایک گاؤں میں چماروں کا ایک کنبہ آباد ہے۔ اس گاؤں میں جہاں مزدوروں کی خاصی بڑی تعداد موجود ہے چند تن پرور، کاہل اور کام چور مزدور بھی رہتے ہیں۔ گھیسو اور مادھو بھی اسی نوع کے نکمے مزدور ہیں، گھیسو ساٹھ سال کی عمر کا کاہل الوجود کردار ہے؛ مادھو عمر کے اعتبار سے نوجوان ہے مگر باپ کی دیکھا دیکھی مفت خوری اور تن پروری کے سبب باپ سے کسی طرح کم نہیں۔ مادھو کی شادی صرف ایک سال قبل ہوئی ہے، اس کی بیوی بدھیا نے اپنی عادات و اطوار سے پچھلے ایک برس میں خود کو اپنے شوہر اور خسر سے مزاجًا مختلف اور جفاکش ثابت کیا ہے۔ اس نے اس گھر میں آنے کے بعد گھریلو ماحول میں خاصی تبدیلی پیدا کی ہے۔ اُس سے جس حد تک ممکن ہوا محنت اور مزدوری کر کے دونوں نکموں کے پیٹ پالتی رہی ہے —— آج وہی عورت دردِ زِہ میں مبتلا گھر کے اندر پچھاڑیں کھا رہی ہے، باہر چوکھٹ کے پاس گھیسو اور مادھو ایک بجھے ہوئے الاؤ کے سامنے بیٹھے بھنے ہوئے آلوؤں سے پیٹ کی آگ بجھا رہے ہیں۔ عورت کی چیخ کی لرزہ خیز آواز ان کے رونگٹے کھڑے کر دیتی ہے مگر ان میں سے کوئی اس تڑپتی ہوئی عورت کو صرف اس خود غرضی کے سبب دیکھنے تک نہیں جاتا کہ کہیں اس کے حصّے کے آلو دوسرا نہ کھا جائے۔ بدھیا کی کراہ اور چیخ و پکار اب بھی ان کے کانوں میں گونج رہی ہے مگر دونوں باپ بیٹے آلو ختم کر کے وہیں بے فکری سے سو جاتے ہیں۔ صبح جب ان کی آنکھ کھلتی ہے تو وہ بدھیا کو مرا ہوا پاتے ہیں۔ اس کی لاش دیکھ کر دونوں ایک طرح کی مصنوعی آہ و بکاء اور غم کا اظہار کرتے ہیں۔ پھر انھیں لاش کے لیے کفن کی فکر لاحق ہوتی ہے اور دونوں گاؤں کے زمیندار اور دوسرے لوگوں کے پاس جا کر چندہ سے پانچ روپے کی رقم جمع کرتے ہیں۔ ان کے لیے پانچ روپے کی حیثیت ایک ایسی بڑی رقم کی ہے جو شاید زندگی میں پہلی بار ان کو حاصل ہوئی ہے۔ دونوں اپنی بے ضمیری اور دوسروں کی رحم دلی پر اعتماد کا ثبوت دیتے ہوئے ایک شراب خانے میں چلے جاتے ہیں اور جی بھر کر شراب و کباب اور لذیذ پوریوں سے شوق کرتے ہیں —— نشے میں دھت ہو کر اعلیٰ اصولوں اور قدروں پر گفتگو کرتے ہیں، مرنے والی کی خوبیاں بیان کرتے ہیں خوشحال لوگوں پر طنز کرتے اور سماج کا تمسخر اڑاتے ہیں اور آخر کار نشہ میں بدمست ہو کر وہیں بے ہوشی کے عالم میں ڈھیر ہو جاتے ہیں . . . .

"کفن" کی کہانی کو پریم چند نے تین الگ حصّوں میں بیان کیا ہے۔ پہلے حصّہ میں ہم کہانی کے کرداروں سے متعارف ہوتے ہیں اور اس تعارف کے ساتھ پس منظر کے طور پر وہ پوری صورت حال ہمارے سامنے آتی ہے جس میں یہ کردار نہ صرف یہ کہ اپنی شناخت کراتے ہیں بلکہ ہر جگہ ان کی حرکات و سکنات کا جواز بھی فراہم ہوتا ہے۔ دوسرے حصّہ میں مادھو کی بیوی کی موت سے گھیسو اور مادھو پر مرتب ہونے والے حقیقی یا غیر حقیقی اثرات اور کفن کے لیے چندہ کی وصولیابی اور تگ و دو کا ذکر کیا گیا ہے —— اور تیسرے حصّہ میں غربت و افلاس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بے حسی اور بے ضمیری کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ اِس حصّہ میں ہمارا مکمل ارتکاز گھیسو اور مادھو کے عمل اور دونوں کے مابین ہونے والی گفتگو پر ہوتا ہے۔ اور اس حصّہ کے اختتام پر راوی ہمیں ایک ایسے موڑ پر لے جا کر یکّہ و تنہا چھوڑ دیتا ہے جہاں بظاہر کہانی ختم ہو جاتی ہے مگر ہم اپنے آپ کو ایک ایسے سناٹے میں پاتے ہیں جہاں بے ضمیری کا مظاہرہ کرنے والے دو کرداروں کا سامنا کرنے کے بعد ردعمل میں ہمیں سوائے اپنے ضمیر کی آواز کے کچھ اور سنائی نہیں دیتا —— کہانی ان جملوں سے شروع ہوتی ہے۔

> "جھونپڑے کے دروازے پر باپ اور بیٹا دونوں ایک بجھے ہوئے الاؤ کے سامنے خاموش بیٹھے ہوئے تھے اور اندر بیٹے کی نوجوان بیوی بدھیا دردِ زِہ سے پچھاڑیں کھا رہی تھی، اور رہ رہ کر اس کے منھ سے ایسی دل خراش صدا نکلتی تھی کہ دونوں کلیجہ تھام لیتے تھے — جاڑوں کی رات تھی، فضا سناٹے میں غرق، سارا گاؤں تاریکی میں جذب ہو گیا تھا۔"

کوئی ناپختہ کار افسانہ نگار ہوتا تو وہ اپنی کہانی کا آغاز اِس اقتباس کے آخری جملے یعنی "جاڑوں کی رات تھی، فضا سناٹے میں غرق، سارا گاؤں تاریکی میں جذب ہو گیا تھا" جیسے منظر نگاری کے الفاظ سے کرتا۔ مگر پریم چند اِس راز سے واقف ہیں کہ کہانی صرف منظر نگاری کا نام نہیں۔ انھیں معلوم ہے کہ کہانی کا سارا انحصار اُس انسان یا ان انسانوں پر ہوتا ہے جو کردار کی شکل میں جیتے جاگتے اور اپنے اعمال سے اپنی شناخت کراتے ہوئے کسی کہانی میں نمودار ہوتے ہیں۔ پریم چند کہانی کے پہلے ہی جملے میں ہماری ملاقات کہانی کے کرداروں سے کرا دیتے ہیں اور بنیادی طور پر اپنی توجہ کرداروں پر مرکوز رکھتے ہیں۔ پس منظر کے طور پر اپنے منظر ناموں اور تبصروں سے کردار نگاری کو استحکام بخشتے ہیں —— اور کہانی کو آگے بڑھانے کے ساتھ ساتھ اس آہنگ کو آگے بڑھاتے چلے جاتے ہیں —— پہلے پیراگراف کے بعد باپ اور بیٹے کے درمیان ہونے والے مکالمات آتے ہیں جن سے ہمیں ان کی ذہنیت سے تھوڑی سی واقفیت حاصل ہوتی ہے اور بعد کے جملوں سے معلوم ہوتا ہے۔

بدھیا کی یہ تکلیف دو چار لمحوں کی بات نہیں بلکہ اس اذیت میں وہ سارے دن مبتلا رہی ہے۔ اس موقع پر جہاں ہمیں باپ اور بیٹے کی بے دردی اور شقاوت کا حال معلوم ہوتا ہے اسی تناسب سے بدھیا کے ساتھ ہماری ہمدردی میں کچھ اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس طرح کہانی کا لمحہ بہ لمحہ اپنے تقابلی بیان سے ایک طرح کا اضافی تناظر فراہم کرتا اور تاثر میں اضافہ کرتا چلا جاتا ہے۔ پوری کہانی میں اس بات کا التزام رکھا گیا ہے کہ کرداروں کو مرکزی حیثیت دی جائے اور ان کے ساتھ وقفہ وقفہ سے ضروری پس منظر کو سامنے لایا جائے۔ ایک آدھ جگہ کبھی ذہنی انسلاکات کے انداز میں اور کبھی یادداشت کے حوالے سے کرداروں کے ماضی کی بعض خوشگوار یادوں اور بظاہر دو ایک غیر متعلق باتوں کا ذکر بھی آتا ہے مگر پوری کہانی کے سیاق و سباق میں یہ سب باتیں اپنی الگ معنویت بھی رکھتی ہیں۔ آگے مناسب موقعوں پر میں اس معنویت کا ذکر کروں گا۔

کہانی کا مرکزی خیال انسان کی بے ضمیری اور بے حسی ہے۔ غربت و افلاس ابتدا میں ایک آزمائش اور ابتلا بن کر آئی ہے مگر مسلسل تنگ دستی اور فاقہ کشی کا نتیجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہوتا کہ آدمی جائز یا ناجائز کسی بھی طریقے سے اپنی بھوک اور معاشی ضروریات سے نجات حاصل کرے ابتدا میں اختیار کیے جانے والے ناجائز اور مذموم وسائل رفتہ رفتہ زندگی کا معمول بن جاتے ہیں۔ شروع میں وہ ہر گناہ اور غلطی پر احساسِ گناہ سے دوچار ہوتا ہے اور اس احساس کی دیوار پھلانگنے کی کوشش کرتا ہے مگر ایک ایسی منزل بھی بہت جلد آجاتی ہے جہاں احساس اور ضمیر کی یہ دیوار پست ہوتے ہوتے زمین بوس ہو چکی ہوتی ہے۔ اِس منزل پر پہنچ کر ایسے لوگوں کا نظامِ اقدار سماج کے عام نظامِ اقدار سے خاصا مختلف ہو جاتا ہے۔ یہی وہ منزل ہے جہاں پہنچ کر اپنے اخلاق سوز اعمال کے لیے جواز تراشا جاتا ہے اور اس کو عقلی رنگ دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس منزل پر احساس، احتجاج کی صفت سے عاری اور ضمیر بیداری کے نام سے نابلد ہوتا ہے۔ اس لیے اخلاقی انحطاط کے باوجود آدمی کے لیے سکون و اطمینان سے زندگی گزارنے کا عادی ہونا کوئی غیر فطری بات نہیں رہ جاتی۔ اور اس طرح مادی ضروریات سے شروع ہونے والا بحران ایک اخلاقی بحران میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

جس وقت پریم چند ہم سے اس سماج کو متعارف کراتے ہیں جس میں مادھو اور گھیسو جیسے لوگ اپنی مذموم عادتوں کے ساتھ مطمئن ہیں اسی وقت ہم کسی حد تک ان غیر انسانی رویوں کا سامنا کرنے کے لیے خود کو آمادہ کرنا شروع کر دیتے ہیں جن سے کہانی میں ہمارا سابقہ ہوتا ہے۔ گھیسو کا ایک دن کام کرنا اور تین دن آرام کرنا، مادھو کا جتنی دیر محنت کرنا اتنی ہی دیر تک چلم پینے میں وقت ضائع کرنا، قرض سے لدے ہونے کے باوجود اطمینان اور لوگوں کی گالیاں کھا کر بھی خوشی سے شب و روز گزارے جانا، یہ سب ایسی باتیں ہیں جن کے بعد ان دونوں سے کسی بھی طرح کی بے حسی کے مظاہرے کی توقع بجا طور کی جا سکتی ہے۔ اگر یہ دونوں کردار اس طرح کے تعارف کے بغیر اپنی حرکات و سکنات کے ساتھ سامنے آتے تو شاید یہ کہانی ہماری نظر میں ایک غیر فطری اور ناقابل قبول کہانی بن کر رہ جاتی۔ پریم چند کفن کو اس کی ضروری تفصیلات اور ناگزیر جزئیات کے بیان سے نہ صرف یہ کہ ہمارے لیے قابلِ قبول اور فطری کہانی بنا دیتے ہیں بلکہ اس کے ہر موڑ پر ہمیں اپنا ہم خیال بنائے رکھتے ہیں۔ ہمیں اس کہانی کی ہر صورت حال فطرت سے قریب اور ہر اگلا عمل منطقی معلوم ہوتا ہے — کرداروں کا ارتقا دو سطحوں پر ہمارے سامنے آتا ہے۔ ایک سطح تو وہ ہے جس پر ہم ایک عورت کو درد سے تڑپتے اور اس کے قریب ترین عزیزوں کو نہایت آرام سے آلو کھاتے ہوئے دیکھتے ہیں، جو کہانی کے اختتام پر ان دونوں کے شراب پینے اور اس عورت کی موت کو مایا جال سے آزاد ہونے سے تعبیر کرنے کے ساتھ ہمارے سامنے آتی ہے۔ مگر دوسری سطح وہ ہے جس پر ہمارے ظاہری اعمال کے لیے ذہن کی طرف سے جواز اور ہوشیاری کی طرف سے دلیلیں فراہم ہو رہی ہیں۔ باپ اور بیٹا، دونوں بظاہر کفن کی خریداری کی غرض سے ایک دوکان سے دوسری دوکان میں جا رہے ہیں مگر درحقیقت ان کے دل میں کیا ہے وہ ہمیں کہانی کار بتلاتا ہے کہ" دونوں ایک دوسرے کے دل کا ماجرا معنوی طور پر سمجھ رہے ہیں" یا پھر ایک جگہ دونوں کفن کے پیسے سے شراب پی رہے ہیں مگر گھیسو کو یہ اعتماد بھی ہے کہ اگر ایک بار یہ پیسے اڑا بھی دیئے جائیں تب بھی دوسری اور تیسری بار لوگوں سے بہانہ کر کے یا خود کو قابلِ رحم ثابت کر کے کفن کے لیے پیسے فراہم کیے جا سکتے ہیں — کرداروں کی یہ داخلی دنیا جس میں ہم ان کے دلوں کی کیفیتوں سے روشناس ہوتے اور نفسیاتی گرہوں کو کھلتے ہوئے دیکھتے ہیں پریم چند کی کردار نگاری میں تہ داری اور پیچیدگی کے اس عنصر کا اضافہ کرتی ہے جو ان کے ابتدائی دور کی مثالیت پسندی اور اکہری کردار نگاری سے یکسر مختلف اور فکشن کے فن کے نقطۂ نظر سے بہت بلند ہے۔ کردار نگاری کا یہ انداز پریم چند کی اس کہانی کو ان کی دوسری کہانیوں کے مقابلے میں غیر معمولی اہمیت سے مالا مال کرتا ہے — کرداروں کی بات چل پڑی ہے تو ذرا ایک نظر بدھیا کے کردار پر بھی ڈالتے چلیں۔ یہ بدھیا کا کردار افسانے کا وہ کردار ہے جو اپنی انفرادیت کے ساتھ گھیسو اور مادھو کے رویوں کی قدر و قیمت کا بھی تعین کرتا ہے اور پوری کہانی کی تنظیم کا محور بھی بن کر سامنے آتا ہے — ایک طرف تو اس کردار کے بارے میں ہمیں افسانہ نگار سے یہ اطلاع ملتی ہے کہ "مادھو کی شادی پچھلے سال ہوئی تھی۔ جب سے یہ عورت آئی تھی اس نے اس خاندان میں تمدن کی بنیاد ڈالی تھی۔ پسائی کر کے، گھاس چھیل کر وہ سیر بھر آٹے کا بھی انتظام کر لیتی اور ان دونوں بے غیرتوں کا دوزخ بھرتی رہتی تھی" تو دوسری طرف اسی نیک سیرت عورت کے معاملے میں خود اس کے شوہر اور

نسر کا یہ غیر انسانی برتاؤ بھی ہمارے سامنے آتا ہے "وہی عورت آج صبح سے دردِ زہ سے مر رہی تھی اور یہ دونوں شاید اسی انتظار میں تھے کہ یہ مر جائے تو آرام سے سو جائیں" ــــ زندگی کی عام منطق اور اخلاقیات کے مروج اصول وضوابط کے برخلاف ہم یہاں دیکھتے ہیں کہ وہ عورت جو دوسرے افرادِ خانہ کی زندگی کے لیے معاون اور ان کی تن پروری کے لیے آلۂ کار اور معاشی مسائل کو آسان بنانے کا ذریعہ بن کر نمودار ہوتی ہے، اسی عورت کے ساتھ جب اِن افراد کے برتاؤ اور انسانی اور اخلاقی رشتوں کی شکست کے مظاہر سامنے آتے ہیں تو اخلاقیات کے سارے اصول ہمیں پاش پاش ہوتے نظر آتے ہیں۔ یہاں رشتوں کی شکست وریخت اور مروت وہمدردی کے فقدان کا واحد سبب اپنے وجود کی بقا اور تحفظ کی وہ لرزہ خیز خود غرضی ہے جو اِن دونوں کو غیر ذات کی کسی بھی اذیت اور بحران سے چشم پوشی پر مجبور کرتی ہے۔ گھیسو اور مادھو کا غیر انسانی برتاؤ ایک لمحے کے لیے ہمیں جھنجھوڑتا اور چونکاتا ہے مگر حیرت کی کیفیت دوسرے ہی لمحے اس جملہ پر آکر اپنی شدت کم کر دیتی ہے جب ہم یہ سنتے ہیں کہ" مادھو کو اندیشہ تھا کہ وہ کوٹھری میں گیا تو گھیسو آلوؤں کا بڑا حصہ صاف کر دے گا" یہاں بنیادی مسئلہ وہ آلو ہیں جنھیں بھون بھون کر دونوں اپنی بھوک مٹا رہے ہیں۔ کہانی کار ہمیں یہ احساس دلاتا ہے کہ بدھیا سے گھیسو اور مادھو کے انسانی رشتے کی کمزوری کا سبب اپنے وجود کی ہولناکی کے سوا اور کچھ نہیں۔ بدھیا کے کردار کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس سے ہمارا تعارف افسانہ نگار کے تعارفی بیان سے ہوتا ہے ورنہ کہانی میں وہ اپنے وجود کا احساس اپنی چیخ اور کراہ کے علاوہ کسی عمل یا مکالمے سے نہیں دلاتی۔ افسانہ نگار نہ کہیں اس کی زبان سے کوئی لفظ ادا ہوتے ہوئے دکھلاتا ہے اور نہ اس کی شخصیت متحرک اور فعال انداز میں کہیں اپنی شناخت کراتی ہے مگر اس کردار کی پیش کش کا طلسم ہماری ساری ہمدردی اس کے ساتھ ہر مرحلے پر وابستہ رکھتا ہے اور یہ کردار ایک کردار نہ رہ کر رشتوں کی شکست وریخت اور وجود کی قیامت خیز ہولناکی کی علامت بن کر نمودار ہوتا ہے ــــ بدھیا کا کردار کہانی میں مرکزی حیثیت کا حامل ہے۔ اُس کی موت کا ردِ عمل، کفن کے لیے چندہ کی فراہمی، کفن کے پیسے سے شراب وکباب سے شوق کرنا اور نشہ کے عالم میں کبھی فطرت اور کبھی سماج کے کھوکھلے پن کا مذاق اڑانا، یہ ساری باتیں بلکہ یوں کہیے کہ کہانی کے بڑے حصے کا تانا بانا بدھیا کی لاش کے گرد بُنا گیا ہے ــــ "کفن" کے کرداروں کی تفہیم اور پہچان میں اس کے مکالمات سے بھی ہمیں بہت مدد ملتی ہے۔ مادھو کی خاموشی اور گفتگو کے مواقع کی نشاندہی اس سلسلے میں ہماری زیادہ مدد کر سکتی ہے۔ مادھو اکثر وبیشتر ہمیں کچھ اس طرح خاموش دکھائی دیتا ہے گویا اسے کوئی بہت بڑی فکر لاحق ہو۔ مکالموں میں گفتگو کا آغاز عموماً اس کا باپ گھیسو کرتا ہے، بدھیا کی حالتِ زار کی طرف بھی گھیسو اس کی توجہ مبذول کراتا ہے، مادھو کبھی خاموش ہے، کبھی دو ایک جملے میں جواب دے کر کسی گہری سوچ میں ڈوب جاتا ہے۔ وہ گھیسو کے ساتھ پیٹ کی آگ بجھانے کے عمل میں شریک ضرور ہے مگر بدھیا کے معاملے میں وہ خود کو گھیسو سے کہیں زیادہ ذمہ دار محسوس کر رہا ہے، اسے آگے کی فکر نے ذہنی طور پر کسی حد تک الجھن میں بتلا کر رکھا ہے۔ مادھو کی خاموشی یا گفتگو میں دلچسپی نہ لینے سے اس کی تشویش اور تردد کی جو تصویر ابھرتی ہے وہ مادھو کی اس عاقبت اندیشی کی نشان دہی کرتی ہے جس کا تعلق میاں بیوی کے درمیان قائم رہنے والی ماضی کے ایک سال کی ہم رنگی اور محبت سے بھی ہے اور اپنی مفلوک الحالی اور تنگ دستی کو دیکھتے ہوئے اپنے پیدا ہونے والے بچے کی پرورش وپرداخت اور نئی ذمہ داریوں کے احساس سے بھی ــــ مادھو کا صرف خیالی اور فکری حد تک ہی سہی مگر انسانی رشتوں کا کسی حد تک احساس رکھنا اور متفکر ہونا اس کے کردار کو گھیسو کی کھوکھلی ہمدردانہ باتوں اور عیارانہ شخصیت سے الگ کر دیتا ہے۔ گھیسو کی عمر، تجربہ کی پختگی اور تن آسانی کی وہ عادتیں جو اس کے لیے فطرتِ ثانیہ بن چکی ہیں، یہ وہ باتیں ہیں جن تک ابھی مادھو کم عمری اور گھیسو کی سی عادات واطوار کے راسخ نہ ہونے کے سبب نہیں پہنچ سکا ہے، یہی وجہ ہے کہ ذہنی سطح پر ہی سہی وہ کچھ آگے کی بھی سوچتا ہے ــــ وہ کہتا ہے "میں سوچتا ہوں کہ کوئی بال بچہ ہو گیا تو کیا ہوگا، سونٹھ، گڑ، تیل کچھ تو نہیں ہے گھر میں" ــــ مگر گھیسو اپنے جہاں دیدہ اور تجربہ کار ہونے کے ناطے نہایت سیانے پن کا جواب دیتا ہے۔ "سب کچھ آئے گا بھگوان بچہ تو دیں تو ــــ جو لوگ ابھی پیسہ نہیں دے رہے ہیں وہی تب بلا کر دیں گے۔ میرے نو لڑکے ہوئے، گھر میں کبھی کچھ نہ تھا مگر اسی طرح ہر بار کام چل گیا" ہر بار کام چل جانے کی بات سے پلاٹ کی تعمیر میں پریم چند اس موقع پر بھی کام لیتے ہیں جہاں گھیسو اور مادھو کفن کے لیے جمع کیے ہوئے پیسوں سے شراب پی رہے ہیں مگر اس امید پر مطمئن ہیں کہ کسی نہ کسی بہانے دوسری بار بھی کفن کے لیے چندہ جمع کیا جا سکتا ہے۔ بے حسی کے اِن مظاہر اور اعصاب میں اختلال پیدا کرنے والے مکالمات کے بعد صورتِ حال کی شدّت کو اعتدال پر لانے کے لیے پریم چند دو طریقے اختیار کرتے ہیں۔ ایک تو وہ گھیسو جیسے بے ضمیر آدمی کے ایسے کسی عمل یا رویے کے منطقی اسباب بتلا کر اس کے غیر انسانی اور مذموم رویوں کی شدّت کو کم کرتے ہیں، دوسرے یہ کہ کہانی بیان کرتے ہوئے وہ واقعات اور صورتِ حال (Situation) کو گھناؤنے پن سے بچانے کے لیے کہیں معاشرے کی جزئیات کا سہارا لیتے ہیں اور کہیں ٹھاکر کی برات کے ساتھ وابستہ گھیسو کی خوشگوار یادوں کا حوالہ دیتے ہیں۔ اگر پریم چند تھوڑے تھوڑے وقفے سے اس طرح کے جملہ ہائے معترضہ کا اہتمام نہ کرتے تو کہانی دو اعتبارات سے کمزور ہو سکتی تھی ــــ پہلی چیز تو یہ کہ بادی النظر میں غیر ضروری نظر آنے والا ٹھاکر کی برات اور دعوت کا واقعہ کرداروں کے گھناؤنے رویوں کے درمیان ہمیں ایک

کھلی فضا میں، سانس لینے کا موقع فراہم کرتا ہے، ایسا نہ کرنے سے بہت ممکن تھا ہمارا ردِ عمل افراط و تفریط کا شکار ہوتا اور کہانی میں ہم ایک طرح کی گھٹن و اکتاہٹ کی فضا سے دوچار ہوتے، دوسرے یہ کہ ضروری وقفوں کے بعد سماجی صورتِ حال کی عکاسی اور اشخاص قصّہ کی زندگی کے سیاق و سباق کے طور پر اس معاشرے کو تصویر کشی جس میں وہ زندگی گزار رہے ہیں، ہمارے لیے ان اشخاص کی حرکات و سکنات کے مکمل تناظر کو سامنے لاتی ہے اور یہ تناظر اِن کرداروں سے سرزد ہونے والے اعمال کو بے معنی اور غیر فطری ہونے سے بچاتا ہے ـــــ اِن حقائق کو سامنے رکھئے تو اندازہ ہوتا ہے کہ پریم چند اپنے کسی بھی تخلیقی تجربے کو قاری تک اسی شدّت سے منتقل کرنے کی استعداد رکھتے ہیں جس شدّت سے وہ تجربہ خود ان پر وارد ہوا ہے۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ردِ عمل اور شدّت احساس کا تسلسل قاری میں بے زاری اور اکتاہٹ کے احساس کو بھی جنم دے سکتا ہے۔ اسی لیے وہ ایسے طریقے بھی اختیار کرتے ہیں جن سے کہانی میں توازن اور اعتدال برقرار رکھ سکیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ فنی اقدار کا یہ احساس پریم چند کو اس وقت ہوا جب انھیں جو کچھ لکھنا تھا لکھ چکے تھے۔

"کفن" میں شروع سے آخر تک اس بات کا بھی خیال رکھا گیا ہے کہ سرّیت (Mystery) کے عنصر کو ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔ کہانی کے آغاز کے ساتھ ہی ہمارے اندر تجسس کی کیفیت پیدا ہونا شروع ہوتی ہے اور فنی سطح پر ہم افسانہ نگار سے بہت سی توقعات وابستہ کر لیتے ہیں۔ اور کہانی جیسے جیسے آگے بڑھتی ہے ہمارے اندر تجسس کی کیفیت کبھی زیادہ اور کبھی کم تو ضرور ہوتی رہتی ہے مگر پورے طور پر کہیں ختم نہیں ہونے پاتی ـــــ سرّیت اور تجسس کے ملے جلے عناصر کے علاوہ طنز کا عنصر بھی اس کہانی میں بہت نمایاں اور حاوی ہے۔ یہ طنز کہیں راوی کے بیانات میں ہے اور کہیں مکالمات میں۔ اس طنز کا رخ کبھی ساہوکاروں اور دولت مند لوگوں کی طرف ہوتا ہے۔ اور کبھی اس کا نشانہ ہمارا معاشرتی نظام ہے جس میں طبقات کی تقسیم ذات پات اور معاشی بنیادوں پر کی گئی ہے ـــــ یوں تو یہ پورا افسانہ ہی سماج پر ایک طنز کی حیثیت رکھتا ہے کہ اِس افسانہ میں سامنے آنے والے افراد کی بے حسی اور بے ضمیری ہمارے سماجی ڈھانچے کے بطن سے پیدا ہوئی ہے۔ مگر اِس کے ساتھ افسانے کے مختلف حصوں میں بھی طنزِ ملیح کی زیریں لہریں (Under current) جگہ جگہ موجود ہیں چند نمونے آپ بھی ملاحظہ کیجیے۔

"دونوں اس وقت اِس شان سے بیٹھے ہوئے پوریاں کھا رہے تھے جیسے جنگل میں کوئی شیر اپنا شکار اڑا رہا ہو۔ نہ جواب دہی کا خوف تھا نہ بدنامی کی فکر ـــــ ضعف کے ان مراحل کو انھوں نے پہلے طے کر لیا تھا۔

یا یہ جملے کہ:۔

"گھیسو نے اِسی زاہدانہ انداز سے ساٹھ سال کی عمر کاٹ دی اور مادھو بھی سعادت مند بیٹے کی طرح باپ کے نقشِ قدم پر چل رہا تھا بلکہ اس کا نام اور بھی روشن کر رہا تھا۔"

یا پھر گھیسو کی یہ باتیں کہ:۔

"وہ جمانا دوسرا تھا، اب تو سب کو کپھایت سوجھتی ہے، سادی بیاہ میں مت کھرچ کرو، کریا کرم میں مت کھرچ کرو۔ پوچھو، گریبوں کا مال بٹور بٹور کر کہاں رکھو گے، مگر بٹورنے میں تو کمی نہیں ہے، ہاں کھرچ میں کپھایت سوجھتی ہے۔"

اسی طرح یہ مکالمہ دیکھیے کہ:۔

"کیسا برا رواج ہے جس کو جیتے جی تن ڈھانکنے کو چیتھڑا نہ ملے اسے مرنے پر نیا کپھن چاہیے۔"

"کپھن لاس کے ساتھ جل ہی تو جاتا ہے۔"

"اور کیا رکھا ہے، یہی پانچ روپے ہوتے تو کچھ دوا دارو کرتے۔"

ذرا غور کیجیے یہ گفتگو ان لوگوں کی ہے جنھوں نے گذشتہ رات ہی بدھیا کو تڑپ تڑپ کر مر جانے دیا ہے مگر اس کے قریب بھی نہ گئے۔ یہی لوگ جب زمین دار کے پاس کفن کے چندہ کی غرض سے جاتے ہیں تو گھیسو زمیندار سے بھی اسی طرح کی بات کہتا ہے کہ:۔

"مادھو کی گھروالی گجر گئی، دن بھر تڑپتی رہی، سرکار، آدھی رات تک ہم دونوں اس کے سرہانے بیٹھے رہے، دوا دارو جو کچھ ہو سکا سب کیا مگر وہ ہمیں دگا دے گئی۔"

قول و فعل کا یہ تضاد ان اشخاص کو سمجھنے میں ہماری خاصی مدد کرتا ہے اور اسی تضاد سے کہانی کی پوری فضا میں ایک طرح کی المناکی اور حزن کی کیفیت بھی پیدا ہوتی ہے ان کرداروں کے ظاہر و باطن کے شفاف طور پر سامنے آنے سے زندگی کی بعض ایسی حقیقتیں منکشف ہوتی ہیں جو تصویر کے دونوں رخوں کو سامنے لائے بغیر کھل کر سامنے نہ آپاتیں۔ یہاں میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ جو افسانہ نگار کرداروں کو شفاف بنا کر انہیں دکھلانے میں کامیاب ہو اس کی کردار نگاری کی عظمت کے بارے میں کوئی دو رائے نہیں ہو سکتی۔

ابھی پچھلی سطروں میں، میں نے زمین دار کا ذکر کیا تھا۔ اس حصے جہاں پریم چند کفن کے انتظام کے سلسلے میں باپ اور بیٹے کی تگ و دو کا ذکر کرتے ہیں وہاں ہمارا سامنا نچلے طبقے کے ان دو آدمیوں کے علاوہ اوسط اور اعلیٰ طبقے کے چند اور افراد سے بھی ہوتا ہے اور ہم یہ آسانی اس کا اندازہ لگاتے ہیں کہ خوشحال لوگ جو غریبوں کی زندگی میں ہزاروں رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں اور سخت ترین حالات میں بھی ان کے ساتھ تعاون کرنے پر آمادہ نظر نہیں آتے وہ موت کے بعد ان کے لیے مدد و معاون دکھائی دیتے ہیں۔ اس سے کہانی میں ایک کشمکش

ابھرتی ہے۔ یہ کشمکش زندگی اور موت کے بارے میں مختلف رویوں کے علاوہ زندہ افراد سے نفرت اور مردہ پرستی میں برابر کا شریک ہونے کے سماج کے نام نہاد باعزت لوگوں کے کردار کے خدوخال سامنے لاتی ہے ـــ کفن میں کئی اور مقامات پر بھی ہمیں کشمکش سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ کشمکش کہیں قول و فعل کے تضاد کی صورت میں سامنے آتی ہے، کہیں مختلف رویوں کے اظہار کی شکل میں، اور کہیں وقت اور حالات کے اعتبار سے ایک ہی انسان کے کبھی انسانی اور کبھی غیر انسانی برتاؤ کے آئینے میں ـــ بدھیا سے ہم اس طرح متعارف ہوتے ہیں کہ جیسے وہ صرف اوصاف حمیدہ کی ہی مالک نہ تھی بلکہ گھیسو کے خاندان میں رحمت و برکت بن کر آئی تھی، مگر اس کے ساتھ خود اس کے شوہر اور خسر کا برتاؤ نہایت سفاکانہ اور غیر انسانی ہے۔ حد یہ ہے کہ گھیسو اور مادھو کے مابین گفتگو میں جب کبھی بدھیا کا ذکر آتا ہے تو وہ بھی اس کی نیک نفسی، مظلومیت اور تعریفی الفاظ پر مبنی ہوتا ہے مگر ایسی ساری باتیں بدھیا کی موت کے بعد ہوتی ہیں، زندگی اور موت کی کشمکش سے گزرنے کے درمیان اس کی ساری خوبیاں فراموش کردہ ہیں اور اس کے معاملے میں ہر طرح کی بے حسی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے ـــ یہاں میں راوی کا یہ بیان ایک سوال کے طور پر نقل کروں گا اور آپ کو سوچنے کی دعوت دینا چاہوں گا کہ اس موقع پر گھیسو اور مادھو کی بے اعتنائی مجھے غیر فطری اور غیر منطقی معلوم ہوتی ہے۔ راوی کے الفاظ ہیں کہ :-

> "آلو کھا کر دونوں نے پانی پیا اور وہیں الاؤ کے سامنے اپنی
> دھوتیاں اوڑھ کر پاؤں پیٹ میں ڈالے سو رہے تھے جیسے
> دو بڑے اژدر گنڈلیاں مارے پڑے ہوں اور بدھیا ابھی
> تک کراہ رہی تھی۔"

آلو کھانے کے درمیان بدھیا کی طرف سے چشم پوشی کرنے کا جواز ان دونوں کی بھوک اور بھوک کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بے ضمیری سے تو ضرور فراہم ہوتا ہے مگر آلو کھا کر وہیں آرام سے سو جانے کی کوئی منطقی وجہ پلاٹ کی تنظیم سے سامنے نہیں آتی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان دونوں کا اپنے گرد و پیش کے سنگین حالات سے بے خبر ہو کر سو جانا ان کی غیر معمولی بے حسی اور بے ضمیری کو سامنے لاتا ہے مگر اس حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ گھیسو اور مادھو کی بے حسی کا بنیادی سبب بھوک کی شدّت کے علاوہ اور کچھ نہیں، اس موقع پر "دونوں" کی غفلت افسانہ نگار سے کسی منطقی محرک کا مطالبہ کرتی نظر آتی ہے۔

"کفن" کے مطالعہ کے دوران ہم بیک وقت کئی حقیقتوں سے آنکھیں چار کرتے ہیں ہمیں اُس معاشرے کے نقائص سے واقفیت حاصل ہوتی ہے جس میں گھیسو اور مادھو جیسے لوگ زندگی گزار رہے ہیں، ہم ایسے کرداروں سے متعارف ہوتے ہیں جو اپنی ذلیل ترین حرکات و سکنات کے باوجود اپنے ہر عمل کا جواز بھی پیش کر سکتے ہیں اور ہم اس نقطۂ نظر تک بھی رسائی حاصل کر لیتے ہیں جو کہانی کار اپنی کہانی کے وسیلے سے ہم تک منتقل کرنا چاہتا ہے ـــ مگر جو چیز اس کہانی کو ایک بڑی کہانی بناتی ہے وہ نہ صرف معاشرے کی تصویر کشی ہے اور نہ صرف غیر انسانی سطح پر زندگی گزارنے والے چند کردار ہیں بلکہ کہانی کی وہ اکائی ہے جس میں یہ سب عناصر (تکنیک، اسلوب، منظر نامے اور کردار) اس طرح حل ہو گئے ہیں کہ ان میں سے کسی عنصر کو الگ کر کے کہانی کو ایک عضویاتی کُل کی شکل میں دیکھا ہی نہیں جا سکتا ـــ پلاٹ میں بالعموم تنظیم اور منطقیت کا خیال رکھا گیا ہے، اور درمیانی وقفوں میں راوی کے بعض بیانات یا تو مختلف واقعات کے درمیان ربط پیدا کرنے کا فریضہ انجام دیتے ہیں یا یہ کسی مخصوص صورتِ حال پر ایسے تبصرہ کی صورت میں سامنے آتے ہیں جس سے صورتِ حال زیادہ واضح شکل اختیار کر لیتی ہے۔ سوائے ان دو مقامات کے جن میں سے ایک کا ذکر ابھی پچھلے پیراگراف میں کیا گیا ہے اور دوسرا مقام وہ جہاں باتوں باتوں میں ٹھاکر برات کا ذکر بالکل اسی طرح شروع ہو جاتا ہے جس طرح کسی داستان میں ایک کہانی کے بطن سے دوسری اور دوسری سے تیسری کہانی پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہ بات ہر چند کہ پلاٹ کے مروجہ نقطۂ نظر سے مستحسن نہیں سمجھی جا سکتی مگر جیسا کہ میں نے پہلے کہیں اس کی وضاحت کر دی ہے کہ اس کا جواز سوائے اس کے اور کوئی نہیں کہ تلازمۂ خیال کے اس انداز سے قاری کے ذہنی تناؤ (Tension) میں کمی آتی ہے اور کہانی کار کہانی پڑھنے کے دوران ہمیں مختلف نشیب و فراز سے گزار کر کبھی نفرت یا اکتاہٹ کی شدّت سے محفوظ رکھتا ہے۔

"کفن" پہلی بار رسالہ جامعہ کے دسمبر ۱۹۳۵ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالباً "یہ افسانہ ۱۹۳۵ء کے ابتدائی مہینوں میں لکھا گیا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس وقت ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ ویسے پریم چند عالمی سطح پر پیدا ہونے والی طبقاتی کشمکش کی صورتِ حال سے واقف تھے مگر اس واقفیت سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ پریم چند کو بذات خود بچپن سے عسرت اور تحریک معاشی مشکلات کا سامنا رہا تھا۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ روس کے انقلاب یا اس انقلاب کے نتیجے میں عالمی سطح پر پس ماندہ طبقے کے سر ابھارنے کے رجحان سے پریم چند نے کوئی تحریک حاصل کی تھی یا نہیں۔ اس لیے کہ عالمی سطح پر جدلیاتی مادیت کے تصور کے عام ہوئے بغیر بھی پریم چند خود اپنے تجربات اور مشاہدات کی بنیاد پر کفن جیسی کوئی کہانی تخلیق کر سکتے تھے ـــ میں یہاں جس بات پر زور دینا چاہتا ہوں وہ یہ کہ جس زمانے میں یہ کہانی لکھی گئی تھی اس زمانے میں ہمارے یہاں دور دور تک اس پائے کی کوئی اور کہانی دکھائی نہیں دیتی۔ کفن میں فنی اعتبار سے جو مثبت اور اہم نکات ہمارے سامنے آتے ہیں پریم چند کے ذاتی عسرت و تنگ دستی کے براہ راست تجربہ کے علاوہ تیس پینتیس سال

کے عرصے پر پھیلی ہوئی اپنی افسانہ نگاری اور اسی فن میں مشق و مہارت کا بہم پہنچانا بہت اہمیت رکھتا ہے۔ پریم چند نے اپنے تخلیقی ارتقا کے محاسبہ اور حقیقت نگاری کے جدید تصور کے عام ہونے کے سبب یہ بات بہت اچھی طرح محسوس کر لی تھی کہ نصیحت، خطابت، اصلاحی اقدار بیان اور مثالیت سے دامن چھڑائے بغیر کوئی شاہکار تخلیق نہیں کیا جا سکتا۔

"کفن" کے آخری صفحات میں جہاں گھیسو اور مادھو ایک شراب خانے میں بیٹھے شراب پیتے ہوئے سماجی نظام اور اخلاقی اقدار پر تبصرہ کر رہے ہیں، وہاں وہ اپنے اعمال کے ساتھ عذاب و ثواب، اور دنیا کے ساتھ آخرت کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان مکالمات میں پورے افسانے کی روح سمٹ کر آگئی ہے۔ یہ مکالمات صحیح معنوں میں اتنخابِ قصہ کی اصلیت کو بے نقاب تو کرتے ہی ہیں مگر نشے کے عالم میں اُن کے زبان سے نکلے ہوتے کلمات اس سماج کے چہرے سے بھی نقاب اٹھا دیتے ہیں جو گھیسو اور مادھو جیسے لوگوں کا استحصال کرتا رہا ہے۔ اس استحصال کے نتیجے میں ان کرداروں کی پیش کش سے جو بات بہت نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے وہ ماورائے ذات سے صرفِ نظر کرنے اور اپنے وجود کو ساری اقدار کا پیمانہ قرار دینے سے عبارت ہے۔ یہ رویہ پریم چند کو وجودیت پسند فلسفیوں (Philosopher) کے قریب کر دیتا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ دونوں کبھی کفن کے پیسے سے اپنی آتما کے خوش ہونے کو مرنے والی کی روح کی تسکین کا باعث قرار دیتے ہیں اور کبھی اپنی موت کو یاد کر کے ایسے Paradox کی کیفیت پیدا کرتے ہیں جس میں مثبت اور منفی لہریں ایک ساتھ چل رہی ہیں۔ افسانہ نگار کرداروں کی گفتگو میں یوں تو جزا و سزا کے مسائل چھیڑتا ہے مگر مابین السطور میں اس حقیقت سے بھی ہمیں باخبر کرنا چاہتا ہے کہ نشہ کے عالم میں اپنی دنیا کو بھول کر دوسری دنیا کی باتیں کرنے والے گھیسو اور مادھو کے خود اپنے اعمال آخرت کے مطالبات سے قطعاً "منافی ہیں۔ از خود رفتگی کے عالم میں بچی ہوئی پوریوں کو بھکاری کو دینا اور پہلی بار کسی کو کچھ دینے کی لذت سے آشنا ہونا اُن کی دبی ہوئی خواہشات کا وہ روپ سامنے لاتا ہے جس کے اظہار کا انھیں پوری زندگی میں ایک بار بھی موقع نہ مل سکا تھا۔ دبی ہوئی خواہشات اور نفسیات کی گرہوں کو اس انداز میں کھولنے کے ہنر سے کفن میں بعض ایسی جہات پیدا ہو گئی ہیں جو پریم چند کے اس سے پہلے کے افسانوں میں ناپید ہیں۔

کفن کے آخری مکالمات میں نشہ کی انتہا پر پہنچ کر مادھو کی اس گفتگو سے کہ:

"مگر دادا بچاری نے جندگی میں بڑا دکھ جھیلا، مری بھی تو کتنا دکھ جھیل کر" وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ رونے لگا — گھیسو نے سمجھایا "کیوں روتا ہے بیٹا خوش ہو کہ مایا جال سے مکت ہو گئی، جنجال سے چھوٹ گئی۔ بڑی بھاگوان تھی جو اتنی جلدی مایا موہ کے بندھن توڑ دیئے"۔ میری اس بات کے لیے ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ پوری کہانی میں مادھو کے کردار میں فکر اور اندیشے کی کیفیات اس کے وجود کے نہاں خانے میں بدھیا سے غیر معمولی محبت اور تعلق کی غمازی کرتی رہی ہیں۔ نشہ اور از خود رفتگی کے نقطۂ عروج پر پہنچ کر اس کے سامنے اپنے وجود کا پردہ ہٹ جاتا ہے اور داخلی شخصیت بے ساختہ اس کی زبان سے اپنا اظہار کرنے لگتی ہے۔ مگر مادھو کے مقابلے میں گھیسو اب بھی اپنی عیاری اور حیلہ بازی سے ماورا نہیں ہو سکا ہے۔ عمر، تجربہ اور مادی آلودگیوں میں ملوث ہونے کے فرقِ مراتب کے تناسب سے ان دونوں کرداروں میں بھی بے حسی کی الگ الگ سطحیں سامنے آتی ہیں۔

"کفن" کے تجزیاتی مطالعہ کے نتیجے کے طور پر ہمیں ایک بار پھر اس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہیے کہ کہانی کہنے کے سلیقے، پلاٹ کی تعمیر و تشکیل کی ہنرمندی اور کرداروں کو زندہ جاوید بنا کر پیش کرنے کے فن کے سبب پریم چند اس کہانی کو قریب قریب ایک شاہکار بنا دیا ہے۔ یہ کہانی دو ایک کمزوریوں کے باوجود مصنف کی دوسری تمام کہانیوں سے بہتر کہی جا سکتی ہے اور مختلف بھی، کہ اس میں پہلی بار مصنف نے تکنیک کا ایک بالکل نیا تجربہ بھی کیا ہے۔ اس میں بنیادی طور پر فوٹوگرافی کی تکنیک استعمال کی گئی ہے مگر اس کے ساتھ ہی حکائی انداز کی آمیزش نے اصوات میں زندگی اور مناظر میں متحرک امیجز (Images) کی شان پیدا کر دی ہے۔ اس طرح "کفن" کئی اعتبار سے ایک قابلِ قدر کہانی قرار پاتی ہے اور ہم اردو افسانے میں پریم چند کی روایت کو درحقیقت "کفن" کی روایت سمجھتے ہیں۔

—— بقیہ: پریم چند کی ڈائری کا مطالعہ ——

کا مضمون کے لیے اصرار وغیرہ بہت سے افعال و کیفیات و واقعات کی معلومات ڈائری سے حاصل ہوتی ہیں۔ ان کے لیے ڈائری صرف خیالات کو احاطۂ تحریر میں لانے کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ وہ اپنی اور اپنے آس پاس کی دنیا کی ہلچلوں میں اتنے گھرے ہیں کہ وہ ہر رام کہانی کو اس کے صفحات پر اتارتے چلتے ہیں۔ ایک ایڈیٹر پبلشر اور مصنف کی حیثیت سے وہ اپنے آمد و خرچ کا حساب اور بینک کی بقایہ رقم پر نظر رکھتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنی دوسری ذمہ داریوں کو نظر انداز نہیں کرتے۔ ہوری کے قرضہ کا حساب دیکھنا بھی انھیں اسی قدر اہم لگتا ہے۔ اسی لیے ہوری کے کل قرضے کا حساب بھی ڈائری میں درج کر لیتے ہیں۔ پریم چند کی یہ ڈائری ایک ایسی مستند دستاویز ہے جو ان کی زندگی کی ایک صحیح تصویر پیش کرتی ہے۔ افسوس یہ ہے کہ دوسرے سالوں کی ڈائریاں آج ہمدست نہیں ہیں ورنہ ان کی زندگی کی جدوجہد، کشمکش اور نفسیاتی دنیا کے مدوجزر اور تخلیقی دنیا کے بارے میں اور بھی زیادہ قرب اور مصدقہ واقفیت حاصل کی جا سکتی تھی۔

ہندی سے ترجمہ۔ مترجم ڈاکٹر جاوید وششٹ

سعید اختر

میدان عمل ۔ دیہی تحریکات کی روشنی میں

"میدان عمل" پریم چند کے مشہور ترین ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کو دیہی تحریکات کی روشنی میں دیکھنے پر متعدد نتیجہ خیز پہلوؤں کی نقاب کشائی ہوتی ہے۔ جس پر از سر نو غور و فکر کی ضرورت ہے۔ "میدان عمل" کے اصل دستیاب شدہ مسودے پر تصنیف کی تاریخ ۱۶ اپریل ۱۹۳۱ء تحریر ہے[1] امرت رائے نے اس کی پہلی اشاعت اگست ۱۹۳۲ء میں بیان کی ہے[2] لیکن ان کے بیان سے واضح نہیں ہوتا کہ یہ اشاعت اردو میں ہوئی یا ہندی میں۔ منشی دیانرائن نگم نے "زمانہ" کے پریم چند نمبر میں پریم چند کی اردو تصانیف کی فہرست میں اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔ البتہ ہندی تصانیف کی فہرست میں "کرم بھومی" کو "میدان عمل" کا ہندی ترجمہ قرار دے دیا ہے[3] انھوں نے بھی مقام اشاعت اور تاریخ اشاعت کا ذکر نہیں کیا ہے لیکن ڈاکٹر جعفر رضا کے خیال کے مطابق "کرم بھومی" پہلی بار ۱۹۳۲ء میں سرسوتی پریس بنارس سے شایع ہوا۔ اس کا اردو ایڈیشن "میدان عمل" مکتبہ جامعہ دہلی سے ۱۹۳۴ء میں منصۂ شہود پر آیا[4] انھوں نے مدلل طور پر تحریر کیا ہے کہ پریم چند کے دیگر ناولوں کی طرح یہ ناول بھی لکھا اردو میں گیا لیکن اس کی اشاعت ہندی میں اردو سے پہلے ہو گئی[5] اردو ناول "میدانِ عمل" اور ہندی ناول "کرم بھومی" دونوں ایک ہی ناول کے نام ہیں۔

ڈاکٹر سید محمد عقیل نے "میدان عمل" میں لوگوں کی محرومیوں پر زور دیا ہے[6] یہ محرومیاں اسے بغاوت کے جذبات عطا کرنے کی صلاحیت کی حامل ہو سکتی ہیں۔ ہمارے نزدیک اس ناول کا پس منظر مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں ۱۹۳۰ء کی تحریکِ آزادی ہے۔ جس میں ملک کے مختلف طبقوں اور فرقوں کے لوگ ایک دوسرے کے دوش بدوش شریک تھے۔ اسی زمانے میں اتر پردیش کے کسانوں نے لگان بندی کی تحریک چلائی تھی جس نے طاقت اور انقلابی رجحانات پیدا کیے۔ لیکن مہاتما گاندھی نے عین عالم شباب میں تحریک ملتوی کر دی جس سے لوگوں میں سیاسی طور پر مایوسی پھیل گئی بعد میں انھوں نے یہ تحریک دوبارہ شروع کی اور لوگوں نے دوبارہ نئے ولولے، جوش اور جذبے کے ساتھ اس میں شرکت کی۔ ڈاکٹر سید محمد عقیل کا خیال درست ہے کہ پریم چند نے "میدانِ عمل" میں قومی تحریکات اور وطنی مسائل کو موضوع بنایا ہے[7] اس کے پس منظر میں چھوت اچھوت کا اہم معاشرتی مسئلہ ہے۔ اس ناول میں پریم چند نے عورتوں کی سماجی اور سیاسی زندگی پر خصوصی توجہ کی ہے۔ چونکہ پریم چند اپنے ناولوں میں سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں اس لیے ان کے ناول اپنے عہد کی مخصوص زندگی، معاشرت اور سیاست وغیرہ کی جیتی جاگتی تصویر بن جاتے ہیں[8]

ہندوستان میں چھوت اچھوت کا مسئلہ صدیوں کے پروردہ ہندو معاشرے کی نابرابری اور تفریق کی علامت ہے۔ حالانکہ مختلف ادوار میں معاشرتی مصلحین نے اس مسئلہ کی جانب توجہ کی تھی مگر ان میں کسی نے چھوت اچھوت کے مسئلہ کا حل پیش نہیں کیا تھا۔ زیرِ نظر ناول میں پریم چند نے اسے ایک تحریک کی شکل میں دیہاتی اور شہری زندگی کے مرکزوں میں تقسیم کرنے کی کوشش کی ہے، حالانکہ شہری زندگی میں چھوت اچھوت مخالف تحریک کا دائرۂ عمل پریم چند نے مندروں میں داخلے، مکانوں کی تعمیر اور میونسپل بورڈ کی حدود تک محدود رکھا مگر دیہاتی زندگی میں اسے بنیادی اہمیت حاصل ہو گئی۔ دیہی زندگی کی ترجمانی پریم چند نے اپنی نگارشات میں ذاتی مشاہدات و تجربات کی بنیادوں پر کی ہے، اس سے ان میں فن کاری صداقت سے ہم آہنگ رہتی ہے۔ انھوں نے مسائل اور دکھ درد کو ذاتی طور پر شدت سے محسوس کیا تھا[9] دیہی زندگی میں چھوت اچھوت کا مسئلہ استحصال سے وابستہ ہے۔ پریم چند کا خیال ہے کہ چھوت اچھوت کے مسائل صرف شراب بندی، مردہ جانوروں کا گوشت نہ کھانے اور تعلیم کے فروغ سے حل نہیں کیے جا سکتے کیوں کہ ان کی اساس سماجی و اقتصادی ہے، اس لیے جب تک پسماندہ طبقہ کی اقتصادی حالت نہیں سدھرتی چھوت اچھوت کا مسئلہ معاشرتی زندگی کو تباہ کرتا رہے گا، کسانوں، مزدوروں اور کمزور طبقے کا استحصال ہوتا رہے گا اور اعلا طبقے، نوکر شاہی اور افسر شاہی کا۔ بول

---

1. امرت رائے : پریم چند قلم کا سپاہی ص ۴۵۶
2. امرت رائے : پریم چند قلم کا سپاہی ص ۴۵۶
3. دیانرائن نگم (مرتبہ) "زمانہ" کانپور پریم چند نمبر ص ۵۲-۲۵۱
4. ڈاکٹر جعفر رضا : پریم چند : فن اور تعمیر فن ص ۲۴۲
5. ڈاکٹر جعفر رضا : پریم چند : فن اور تعمیر فن ص ۲۴۰
6. ڈاکٹر سید محمد عقیل : تنقید اور عصری آگہی ص ۲۶
7. ڈاکٹر سید محمد عقیل : تنقید اور عصری آگہی ص ۲۹۵
8. سید وقار عظیم : داستان سے افسانے تک ص ۹۴
9. سید وقار عظیم : داستان سے افسانے تک ص ۹۴

لا رہے گا۔

پریم چند چھوت اچھوت کے مسئلے کے تجزیے میں اس کا موازنہ شہری زندگی سے کرتے ہیں یہاں اگر مدھوسودن جی کی کتھا میں کچھ اچھوت شامل ہوتے ہیں اور اس مقام پر جہاں جوتے چپل رکھے جاتے ہیں بیٹھ جاتے ہیں تو اعلا طبقے کے لوگ ہنگامہ کھڑا کر دیتے ہیں۔ بھنگی، چمار کہے جانے والے اچھوت بھی خدا کی مخلوق ہیں، انسان ہیں مگر انھیں خدا کے گھر مندر میں جانے کی اجازت نہیں ان کے جانے سے دھرم بھرشٹ ہو جاتا ہے۔

"یہاں لوگ بھگوان کی کتھا سننے آتے ہیں کہ اپنا دھرم بھرشٹ کرنے آتے ہیں۔ بھنگی چمار جسے دیکھو گھسا چلا آتا ہے۔ ٹھاکر جی کا مندر نہ ہوا سرائے ہوئی"[4]

نام نہاد اعلا طبقے کے دین دار لوگ ان غریب اچھوتوں کو مندروں میں داخل ہونے کی سزا دیتے ہیں۔ اچھوتوں کو خدا کے دروازے سے اپنی عقیدت اور بھگتی کا پھل جوتوں اور چپلوں کی شکل میں ملتا ہے۔

"دین داروں کے سر پر جنون سوار ہو گیا۔ کئی آدمی جوتے لے لے کر ان غریبوں پر پل پڑے۔ بھگوان کے مندر میں بھگوان کے بھگتوں کے ہاتھوں بھگوان کے بھگتوں پر جوتوں کی بارش ہونے لگی"[5]

پریم چند اپنے ترقی پسندانہ اور حقیقت پسندانہ نظریات کے سہارے اچھوتوں کے مسائل کی گہرائیوں تک پہونچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ مذہب کے نام پر ہونے والے غیر مذہبی، غیر انسانی غلط افعال کو فروغ دینے میں سیٹھ ساہوکاروں اور سرمایہ دار طبقے کا زبردست تعاون ہے۔ جو عوام کو دھوکا دینے، جعل سازی کرنے، چور بازاری کرنے، ڈنڈی مارنے، رشوتوں کو بڑھاوا دینے اور افسروں کی خوشامد کرنے میں بے نظیر ہیں، مذہب ان کے استحصالی رویے کی پشت پناہی کرتا ہے اور سچائی و ایمانداری کی جانب لے جانے سے روکتا ہے۔ اس کا علاج جہدِ مسلسل ہی ہے۔ اس کشمکش میں بہت سے لوگ لاٹھی اور گولی کے شکار ہوتے ہیں اور اچھوتوں کے لیے مندروں کے دروازے کھل جاتے ہیں، مذہبی لوگوں اور اعلا طبقہ کے لوگوں کی جانب سے ان کے داخلے پر سے پابندی ہٹالی جاتی ہے۔ یہاں پریم چند اس بات کو محسوس کرتے ہیں کہ اس طرح اچھوتوں کے مسائل نہیں حل ہو سکتے کیونکہ مندروں میں داخلے کا حق پانے سے معاشرتی برابری کے حقوق نہیں حاصل ہو جاتے، اعلا طبقہ کا ہندو اسی طرح ہے جیسا کہ پہلے تھا وہ ناک سکوڑ کر جسم بچا کر دور سے نکلنے کی کوشش کرے گا۔ یہ مسئلہ اسی وقت حل ہوگا جب اچھوتوں کو اقتصادی اور معاشرتی استحصال سے نجات حاصل ہوگی اور ان کی زندگی معاشرتی اور اقتصادی طور پر بلند ہوگی۔

اس میں شک نہیں کہ مندروں میں اچھوتوں کے داخلے کا مسئلہ استحصال کے یک رخے رویے تک محدود ہے اور ان کے ساتھ برابری کا جذبہ حاصل کرنے کی علامت ہے۔ مہاتما گاندھی ہریجنوں کے مندروں میں داخلے پر زور دیتے تھے کیونکہ ان کے خیال میں مندر ہندو مذہب اور تہذیب کا اہم مرکز ہے، وہ ہریجنوں کے مندروں میں داخلے پر پابندی کو معاشرتی نا انصافی اور ظلم قرار دیتے تھے، جو صدیوں سے ہندوستانی معاشرے میں مذہبی برتری کا سبب قرار دیا جا رہا ہے۔ مہاتما گاندھی کا خیال ہے کہ ہریجنوں کو نہ صرف مندروں میں داخلے کی آزادی ہونا چاہیے بلکہ عوامی مقامات، اسکولوں، بازاروں، دوکانوں، کنوؤں، ریلوں، موٹروں، دھرم شالاؤں، عوامی میلوں، جلسوں جلوسوں وغیرہ میں بھی برابری کا درجہ ملنا چاہیے اور ان کے ساتھ مساویانہ سلوک ہونا چاہیے[1] لیکن صرف مندروں میں داخلے کی اجازت سے ان کی اقتصادی اور سیاسی ترقی کے مسائل نہیں حل ہوتے[2]

زیرِ نظر ناول میں پریم چند نے اچھوتوں کے مندروں میں داخلے کے بعض غیر اہم اور معمولی امور کو بھی تحریک کی شکل دے دی ہے مگر یہ تحریک رفتہ رفتہ اپنا دائرۂ عمل وسیع کر لیتی ہے اور شہری پسماندہ اور پست اقوام اور استحصال شدہ عوام کی تحریک کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ جس سے عوام میں ایک نئی بیداری اور زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ سرمایہ داروں کی پشت پناہی میں چلنے والا میونسپل بورڈ شہر کے غریب پست اور پسماندہ عوام کے لیے چھوٹے اور ہوادار مکانوں کی تعمیر کے مطالبے ٹھکراتا ہے مگر اب عوام کو اپنی منظم طاقت کا احساس ہو چکا ہے اور ان میں بیداری کی لہر دوڑ چکی ہے، انھیں اس بات کا علم ہے کہ شہر میں جتنا ایک سرمایہ دار کو حق حاصل ہے اتنا ہی ایک اچھوت، چمار اور مہتر کو ہے وہ اب کسی ظلم اور نا انصافی کو خاموشی سے برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ عوام میں اب جو ولولہ، امنگ اور جذبہ نظر آ رہا ہے وہ اچھوتوں کے مندروں میں داخلے کی تحریک کی کامیابی کی بدولت ہے۔

اچھوتوں کی عوامی تحریک کی ابتدا امر کانت سے ہوتی ہے جو اپنا گھر بار چھوڑ کر گنگا کے کنارے چماروں کے بیس پچیس گھروں کے گاؤں میں قیام کرتا ہے۔ ایک اعلا خاندان کے باعزت نوجوان کا چماروں کی بستی میں رہنا، سلونی کاکی کو حیرت میں ڈال دیتا ہے لیکن پریم چند کا قاری مہاتما گاندھی کی مثالیت کو مدِنظر رکھنے کی بنا پر کسی الجھن میں گرفتار نہیں ہوتا کیونکہ ان مسائل میں پریم چند کا مطمحِ نظر مہاتما گاندھی سے مختلف نہیں تھا۔ ان کے نزدیک چھوٹے بڑے کا فرق ذات برادری پر مبنی نہیں ہے بلکہ عمل، ایمانداری اور سچائی پر ہے۔ جس کے پاس سچائی، ایمانداری اور اچھا عمل ہے وہ اچھا اور بڑا ہے۔

"میں ذات پات نہیں مانتا ماتا جی، جو سچا ہو وہ چمار بھی ہو تو عزت کے لائق ہے۔ جو دغا باز، جھوٹا اور مکار ہو وہ برہمن بھی ہو تو عزت کے لائق نہیں"[3]

مہاتما گاندھی نے اچھوتوں کی اصلاح اور ان کے مسائل کے حل کے لیے اپنے پروگرام کو دو حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ ایک حصے میں اعلا طبقے کے ہندوؤں کے درمیان چھوٹے بڑے اور چھوت اچھوت کی تفریق ختم کرنا تھا اور دوسرے حصے میں پست اور پسماندہ

---

۴ پریم چند : میدان عمل ص ۲۳۵

۵ پریم چند : میدان عمل ص ۲۳۵

---

۱ کشورلال مشروالا : گاندھی وچار دوہن ص ۴۴

۲ ہریجن، ۱۹۳۲-۴-۸

۳ پریم چند : میدان عمل ص ۱۴۷

طبقے کے اچھوتوں اور ہریجنوں میں بیداری اور اعتماد پیدا کر کے برائیوں کو ختم کرنے کے متمنی تھے۔ مہاتما گاندھی کا خیال تھا کہ اچھوتوں کے مسائل کا اطمینان بخش اور دیرپا حل اسی وقت ممکن ہے جب اچھوت اپنے ماحول اور معاشرے کی برائیوں اور رسم و رواج میں اصلاح کر لیں۔ زیرِ نظر ناول میں پریم چند اور مہاتما گاندھی کے اندازِ فکر و عمل میں متعدد موقعوں پر یکسانیت نظر آتی ہے۔ پریم چند مہاتما گاندھی کی طرح اچھوتوں کے مردہ جانوروں کا گوشت کھانے، شراب پینے اور ان کے معاشرے کی فرسودہ رسم و روایت کے مخالف اور اصلاح کے خواہاں ہیں۔ پریم چند نے اپنے طور پر ان مسائل کا حل پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ سب کچھ اسی وقت ممکن ہے جب پست اور پسماندہ اقوام میں تعلیم کا فروغ ہو، ان کے اس خیال کی تصویر امرکانت کے ذریعہ چماروں کے گاؤں میں مدرسہ کھولنے اور گاؤں والوں کو تعلیم کی جانب راغب کرنے میں نظر آتی ہے، جس سے چماروں میں ایک نئی زندگی، نئی امنگ اور بیداری پیدا ہوتی ہے، بچے تو کیا جوان اور بوڑھے بھی پڑھنا چاہتے ہیں۔

امرکانت کے مدرسے کی تعلیم کا گاؤں والوں پر اثر ہوتا ہے کہ اب ان کے بچے صاف ستھرے نظر آتے ہیں، جھوٹ نہیں بولتے، بہانے نہیں کرتے، چوری نہیں کرتے اور گالیاں نہیں بکتے، ہر ایک کام شوق اور لگن سے کرتے ہیں اور گاؤں کا نقشہ ہی تبدیل ہو جاتا ہے۔ امرکانت کے ذریعہ پریم چند گاؤں میں جس تعلیمی انقلاب کی روح پھونکتے ہیں، وہ پریم چند پر مہاتما گاندھی کے اثرات کی واضح نشاندہی کرتا ہے کیونکہ مہاتما گاندھی بھی بنیادی طور پر ہریجنوں کی زندگی میں اسی طرح کے انقلاب کے خواہاں تھے۔ پریم چند اس انقلاب کی تصویر ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔

"تھوڑے سے دنوں میں ہی تعلیم کا کچھ کچھ اثر بھی نظر آنے لگا ہے، بچے
اب صاف رہتے ہیں، جھوٹ کم بولتے ہیں، جھوٹے بہانے نہیں کرتے
گالیاں نہیں بکتے اور گھر سے کوئی چیز چرا کر نہیں لے جاتے، نہ اتنی
ضد ہی کرتے ہیں، گھر کے معمولی کام شوق سے کرتے ہیں۔"[1]

اس زمانے کے اچھوتوں اور چماروں کے معاشرے میں مردہ جانوروں کا گوشت کھانے کا قابلِ نفرین رواج تھا۔ مہاتما گاندھی اس رسم کے مخالف تھے، ان کا خیال تھا کہ جب تک ہریجن مردہ جانوروں کا گوشت کھانا ترک نہیں کرتے، ان کی اصلاحِ نفس ممکن نہیں[2] اس کا اقتصادی سبب تھا[3] چونکہ ہریجن اقتصادی طور پر پسماندہ تھے اسی لیے مہاتما گاندھی اچھوتوں اور ہریجنوں کی زندگی سے مذموم رسم و رواج کو ختم کرنے کے لیے ان کی اقتصادی حالت کی اصلاح کے حامی تھے، کیونکہ انسان اپنے برے اعمال اور فاسد خیالات کی بنا پر گمراہ ہوتا ہے نہ کہ برا کھانے پینے سے۔ مہاتما گاندھی بُرے عمل کرنے والوں اور برے خیالات رکھنے والوں کو برا اور اچھوت تصور کرتے تھے۔[4]

اسی لیے چماروں کے مردہ گوشت کھانے کے باوجود ان سے نفرت نہیں کرتے، حالانکہ ہریجنوں کے مردہ گوشت کھانے کے رویے کے سخت مخالف تھے۔ پریم چند نے زیرِ نظر ناول میں امرکانت کو مہاتما گاندھی کے انھیں انسانی اور روادارانہ خیالات کا پیکر بنا کر پیش کیا ہے جو اعلا طبقے کے ہندو گھرانے کا فرد ہونے کے باوجود مردہ گوشت کھانے والے چماروں کے ساتھ رہتا ہے، ان سے نفرت کرنے کے بجائے محبت اور ہمدردی کرتا ہے۔

اس ناول میں شہر سے اچھوتوں کے مسائل کی بنا پر اصلاحی تحریک کی ابتدا ہوتی ہے جو رفتہ رفتہ اپنا دائرۂ عمل وسیع کر کے دیہاتی زندگی تک پہنچ جاتی ہے۔ دیہات میں اچھوتوں کے مسائل، ان میں تعلیم کے فروغ، ان کے معاشرے کی فرسودہ مراسم اور مذموم روایات کے خاتمہ کی جد و جہد ہوتی ہے۔ اس طرح ایک چھوٹی سی کوشش ایک بڑی عوامی تحریک کا روپ دھارن کر لیتی ہے آخر میں کسانوں کی لگان بندی کی تحریک اور کسانوں و زمینداروں کی باہمی کشمکش کی اقتصادی تحریک میں مل جاتی ہے۔

"میدان عمل" لگان بندی کی تحریک اور ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۰ء تک کے عالمی اقتصادی بحران کی کامیاب تصویر پیش کرتا ہے۔ اس سے کسانوں کا طبقہ زیادہ متاثر تھا۔ پریم چند نے لگان بندی کی اس تحریک کی ابتدا چماروں کے جس گاؤں سے کی ہے وہ ایک مہنت زمیندار کے زیرِ اقتدار تھا، جہاں مختار اور کارندوں کی شکل میں مہنت کے شاگرد حکومت کرتے تھے۔ مذہب کے نام پر گاؤں کے غریب عوام کا طرح طرح سے استحصال کیا جاتا مگر کسی کو زمیندار اور اس کے مختار اور کارندوں کے غیر انسانی افعال کے خلاف زبان کھولنے کی جرأت نہ تھی کیونکہ اس لب کشائی میں مذہب کی دیوار راہ میں حائل تھی، پسماندہ طبقہ کے ان کاشتکاروں کی کم علمی اور جہالت کا فائدہ اٹھا کر مہنت جس وقت جتنا چاہتا لگان میں اضافہ کر دیتا، جب چاہتا بے دخل کر دیتا، جس سے غریب کاشتکار روز بروز قرض کے بوجھ کے نیچے دبتے جا رہے تھے۔ انھیں اپنی پیداوار سے زیادہ لگان دینا پڑتا تھا اور مذہب کے زیرِ سایہ مہنت جی کی سرمایہ دارانہ ذہنیت پروان پاتی رہی۔ پریم چند نے مذہبی استحصال کے خلاف واضح خیالات پیش کیے ہیں ان کا خیال ہے کہ ہر دور میں مذہب نے دولت اور سرمائے کا ساتھ دیا ہے اور استحصال کے فروغ میں معاون بنا ہے۔ ملک میں اقتصادی بحران کی وجہ سے غلے کی قیمتیں گرنے لگ گئیں اور اس قدر گر گئیں کہ چالیس سال پہلے کے زمانے میں پہونچ گئیں مگر زمیندار نے لگان میں کوئی کمی نہیں کی۔ غریب کاشتکار اپنی ساری پیداوار فروخت کرنے کے باوجود مکمل لگان نہ ادا کر پائے۔ یہ صرف ایک گاؤں کی حالت نہیں تھی بلکہ اس وقت پورا صوبہ اور ملک اس کا شکار تھا۔ اس اقتصادی بحران نے کسانوں کو دستوری، لگان اور قرض وغیرہ کے روپے نہ دینے پر مجبور کیا۔ زمینداروں کے مظالم، کاشتکاروں اور کسانوں کی زبوں حالی اور لگان کے مسائل پر غور کرنے کے لیے گنگا کے کنارے ایک جلسہ منعقد ہوتا ہے، جس کی صدارت سوامی آتمانند کرتے ہیں۔ امرکانت جلسے میں شریک ہوتا ہے۔ یہ دونوں پریم چند کے خیالات کے ترجمان ہیں۔ آتمانند کے پیکر میں ان کے

---

[1] پریم چند : میدان عمل ص ۱۹۷
[2] ہریجن، ۱۸-۳-۱۹۳۳
[3] کشور لال مشرووالا : گاندھی وچار دوہن ص ۴۵
[4] مہاتما گاندھی : باپو کے ہریجن ص ۷۰-۶۸

آریہ سماجی سنسکار بھی نظر آتے ہیں۔ آتما نند کا خیال ہے کہ زمیندار مہنت کو عوام کی خوش حالی اور بدحالی سے کوئی غرض نہیں، اسے جشن منانے اور عیش و طرب کی محفلیں سجانے کے لیے روپے درکار ہیں۔ یہی حال افسروں کا ہے، وہ غریبوں اور کسانوں کی مصیبتیں کیوں سننے لگے۔ انھیں اپنی موٹی تنخواہوں سے غرض ہے۔ آتما نند کے خیال میں لگان معاف ہونے کی صرف ایک راہ ہے کہ زمیندار کے گھر اور ٹھاکر دوارے کو گھیر لیا جائے اور اس وقت تک گھیرے رکھا جائے جب تک لگان معاف نہیں ہوتا۔

پریم چند امرکانت کو گاندھیائی عدم تشدد کے نظریے سے، جو کسانوں کی لگان بندی تحریک کی فعالیت کی علامت ہے، جد وجہد کے بجائے بات چیت اور گفت گو کے ذریعہ طے کرنے کی راہ پر ڈال دیتے ہیں تاکہ اس طرح عوام کا اعتماد بحال رہے، لیکن کسانوں کی یہ تحریک امرکانت کے عدم تشدد کے ذریعہ کامیابی کی علامت بن جاتی ہے، امرکانت لگان کا مسئلہ مہنت زمیندار آشارام کے تعاون سے گفتگو کے ذریعہ حل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ لگان کی تخفیف کے لیے رضامند ہو جاتا ہے اور لگان کی معافی کے لیے سرکار کو لکھنے کا وعدہ کرتا ہے۔ یہی گاندھیائی طریقۂ کار تھا کہ مسائل بات چیت سے حل کیے جائیں کیونکہ انھیں خوف تھا کہ تشدد کی راہ اختیار کرکے تباہی و بربادی پھیل جائے گی۔ پریم چند کے یہ الفاظ گاندھیائی اثرات کی مکمل نشاندہی کرتے ہیں، جو عدم تشدد کی فتح اور تشدد کی شکست کی تصویر پیش کرتے ہیں۔

"سارے علاقے میں خبر پھیل گئی کہ مہنت جی نے سرکار سے نصف لگان معاف کر دینے کی اجازت مانگی ہے ....
اور اگرچہ عوام پر ان کا اثر باقی نہ رہا تھا لیکن کچھ نہ کچھ لوگ ان کی تقریریں سننے کے لیے جمع ہو ہی جاتے تھے، ہاں اس کان سن کر اس کان اڑا دیتے تھے۔"[1]

پریم چند نے کسانوں کی لگان بندی تحریک میں امرکانت کے رویے اور عمل میں اس دور کے کانگریسی رہنماؤں کی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ تحریک کے ابتدائی مراحل میں ایک طرح کی بے عملی اور بے تعلقی کے رویے کا اظہار کرتے ہیں کیونکہ اس طرح گاندھی اروِن معاہدے کی خلاف ورزی کا امکان پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن وہی لوگ جب دیکھتے ہیں کہ کسانوں کی عوامی تحریک ان کی حمایت اور رہنمائی کے بغیر انقلابی اور باغیانہ رویہ اختیار کرکے آگے بڑھتی ہے تو اس میں شریک ہو جاتے ہیں، مگر ان کا یہ رویہ اس عالمی اقتصادی بحران میں کسانوں کی زبوں حالی کا حل پیش کرنے سے قاصر ہو جاتا ہے حالانکہ زمینداروں و تعلقداروں کا طرزِ عمل مصالحانہ تھا۔ اس لیے انھوں نے میانہ روی کی راہ اختیار کرلی اور زمیندارانہ و تعلقدارانہ استحصال کی مخالفت میں نرمی پیدا کر دی[2]

امرکانت لگان بندی کی تحریک میں گرفتار ہو کر جیل جاتے ہوئے کسانوں کے مشتعل ہجوم کو عدم تشدد کی راہ پر چلنے کا سبق دیتا ہے کہ ان کو اشتعال اور تشدد کے ساتھ اپنی تحریک کو آگے نہیں بڑھانا چاہیے، یہی مہاتما گاندھی کا خیال تھا کہ غلامی، استحصال اور ظلم کے خلاف عدم تشدد اور سچائی کے ہتھیاروں سے جنگ ہو جس سے ہم کو فتح حاصل ہوگی۔ مہاتما گاندھی اس مفروضہ حق و انصاف کی راہ کو دھرم کی راہ کہتے تھے۔ لالہ سمرکانت حق اور ظلم میں امتیاز نہیں کرتا۔ وہ ظلم کو حق کا مترادف سمجھتا ہے، استحصال کے ظلم کو حق تصور کرتا ہے، حق و انصاف اور ظلم کو موضوع قرار دے کر مہاتما گاندھی کے عدم تشدد کے اصولوں کا مظاہرہ کرتا ہے۔ سمرکانت کی یہ باتیں پریم چند کے اپنے خیالات ہیں۔ مہاتما گاندھی جھوٹ پر سچائی سے، ظلم پر محبت سے، تشدد پر عدم تشدد سے اور جنگ پر امن کے ذریعہ فتح حاصل کرنے کے نسخے آزماتے ہیں۔

"آپ سنیاسی ہو کر ایسا کہتے ہیں، سوامی جی آپ کو اپنی روحانیت سے اپنے حاکموں کو راہ راست پر لانا ہے۔ اگر وہ حق پر ہوتے تو آپ کو یہ تپسیا کیوں کرنی پڑتی۔ آپ ظلم پر ظلم سے نہیں پریم سے فتح پا سکتے ہیں۔"[3]

سلیم سرکاری نوکری چھوڑ کر کسانوں کی تحریک میں شامل ہوتا ہے اور اس میں مسائل کا حل تلاش کرنا چاہتا تھا اور تشدد کی راہ اختیار کرتا ہے۔ جیل میں آنے کے بعد بھی اپنے تشدد آمیز نظریے کا اظہار کرتا ہے۔ وہ اصلاح کے لیے خودداری کی قربانی پیش کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ سلیم کا خیال ہے کہ جو نظام ظلم، خود غرضی اور ناانصافی پر مبنی ہو، اس میں سچائی، ایمانداری، عدم تشدد اور محبت سے فتح نہیں حاصل ہو سکتی لیکن پریم چند مہاتما گاندھی کے عدم تشدد کی راہ پر چلنے کی تلقین کرتے ہیں اور جابر و ظالم لوگوں کو بھی محبت، ہمدردی، ایثار، قربانی اور خدمت کے جذبے سے متاثر کرنے کا سبق دیتے ہیں۔ ان کے صواب دید پر تشکیک غالب ہے۔ اسی لیے تذبذب کے عالم میں رائے دیتے ہیں کہ اس طریقہ میں وقت درکار ہوگا جو مہاتما گاندھی کے خیالات کی باز دید ہے۔ سلیم، امرکانت کے عدم تشدد کے گاندھیائی نظریے کو اصولی طور پر قبول کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے مگر اسے اعتراض ہے کہ کیا عدم تشدد، محبت، انسانیت، ہمدردی، ایثار اور قربانی کے جذبات کے سہارے فتح حاصل ہو سکتی ہے۔ امرکانت اپنے عدم تشدد کے نظریے پر قائم رہتا ہے اور سلیم کو سمجھاتا ہے کہ ظلم پر ظلم سے، تشدد پر تشدد سے اور جھوٹ پر جھوٹ سے فتح حاصل نہیں کر سکتے، اس کے خیال میں انسان کو حق کے دامن سے وابستہ ہونا ہوتا ہے اور وہ سچائی و ایمانداری کے ساتھ عدم تشدد کی راہ پر چل کر منزل تک پہونچتا ہے۔ غریبوں کے پاس اس سے زیادہ طاقتور اسلحہ کوئی نہیں ہے۔

"میدان عمل" کو پریم چند کے کامیاب ترین ناولوں میں شمار کیا جاتا ہے جس کی اپنی تاریخی اہمیت ہے، اس میں ان کا تجزیاتی ذہن نئی منزلوں کی طرف گامزن نظر آتا ہے۔ حالانکہ اس ناول میں ان پر گاندھیائی اثرات تلاش کیے جا سکتے ہیں لیکن اس میں متعدد موقعوں پر گاندھیت سے شدید اختلاف کے نشانات بھی نظر آتے ہیں۔ اس ناول کو گاندھیت سے پریم چند کے گریز کی پہلی منزل قرار دیا جا سکتا ہے ••

---

[1] پریم چند : میدان عمل ص ۳۴۳ - ۳۴۲

[2] M.K.Gandhi: Towards Non violent Socialism, P. 177 . 79

[3] آج کل نئی دہلی

کمل کشور گوینکا

پریم چند کی تاریخِ پیدائش؟

پریم چند کی تاریخِ پیدائش کے بارے میں کسی قسم کی اختلافی بحث اس مقالہ کا مقصد نہیں ہے، بلکہ قارئین کرام کو ان کی تاریخ پیدائش سے متعلق ہم دست حقائق سے روشناس کرانا ہی ہے۔ پریم چند ادب کے قارئین مختلف کتابوں میں یہ پڑھتے رہے ہیں کہ ان کی پیدائش ۳۱ رجولائی ۱۸۸۰ء مطابق ساون بدی دسویں اسنیچر، بکرمی سمت ۱۹۳۷ء کو ہوئی تھی۔ لیکن پریم چند پر تحقیقی کام کرتے ہوتے مجھے دو ایسے ثبوت ملے ہیں جنھوں نے مروجہ تاریخ پیدائش پر ایک سوالیہ نشان لگا دیا ہے۔

سب سے پہلے میرے لیے یہ ضروری ہوگیا کہ میں اس ثبوت کی کھوج کروں جس کی بنیاد پر ۳۱ رجولائی ۱۸۸۰ء کو پریم چند کی تاریخ پیدائش کے طور پر تسلیم کیا گیا۔ اپنی اس کوشش میں مجھے پریم چند کا لکھا ہوا ۱۷ رجولائی ۱۹۲۶ء کا ایک مراسلہ ملا جو انھوں نے اپنے دوست دیانرائن نگم کو تحریر کیا تھا۔ پریم چند نے اپنے متعلق نگم کو لکھا — "میرے حالات نوٹ کرلیں۔ تاریخ پیدائش سمت ۱۹۳۷ بکرمی۔ باپ کا نام منشی عجائب لال۔ سکونت موضع مڈھواں، لمہی متصل پانڈے پور، بنارس۔" (چٹھی پتری حصہ ۱، صفحہ ۱۶۱) اس خط میں بھی انھوں نے صرف سال کا ذکر کیا ہے جس سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ پریم چند کا جنم ۱۸۸۰ء میں ہوا تھا۔

پریم چند کے جنم کے بعد ان کے والد منشی عجائب لال نے ہندو روایت کے مطابق ان کی جنم کنڈلی بنوائی تھی۔ پریم چند کی وفات کے بعد وارنسی کے مشہور سوشل ورکر مراری لال کیڈیا، ان کی جنم کنڈلی، ان کی اہلیہ شریمتی شورانی دیوی سے لے گئے تھے۔ کیڈیا جی نے مجھے بتایا کہ پریم چند کی جنم کنڈلی ان کے پاس تھی۔ لیکن وہ تلاش بسیار کے بعد بھی اسے فراہم نہ کرسکے۔ پریم چند کے خاندان والوں سے بھی ان کی جنم کنڈلی کی نقل حاصل نہ ہوسکی۔ ان کے بڑے بیٹے شری پت رائے جی نے مجھے فرددر ۲۶ ردسمبر ۱۹۷۷ء کے مراسلہ میں ۳۱ رجولائی ۱۸۸۰ء کی تاریخ کو ہی مستند لکھا ہے (۳۱ رجولائی کی تاریخ جنم کنڈلی سے ہی لی گئی ہے اس لیے یہی مستند تاریخ پیدائش ہے) حقیقت میں یہ بات معقول نہ ہوگی کہ ہم جنم کنڈلی کو دیکھے بغیر تاریخ پیدائش کو نزاعی قرار دے دیں۔ لیکن مجھے دو ایسے تحریری ثبوت دستیاب ہوتے ہیں جن کے باعث اس کے استناد پر سوالیہ کا نشان ضرور لگ جاتا ہے۔

پریم چند کے معاصرین نے ان کی جن چیزوں کو تلف ہونے سے بچالیا ہے ان میں ان کا انٹرنس کا سرٹیفکٹ اور سروس بک بھی شامل ہیں۔ پریم چند کا انٹرنس سرٹیفکٹ ان کے چھوٹے بھائی مہتاب رائے کے بڑے بیٹے ڈاکٹر رام کمار رائے کے پاس ابھی محفوظ ہے۔ اور ان کی سروس بک گورکھپور کے نارمل اسکول میں رکھی ہوئی ہے۔ ان کا انٹرنس سرٹیفکٹ دھنپت رائے کے نام سے ہے۔ اور اس پر یونیورسٹی آف الہ آباد انٹرنس ایگزامیشن ۱۸۹۹ء چھپا ہوا ہے۔ اس سرٹیفکٹ پر لکھا ہوا ہے کہ دھنپت رائے نے جنوری ۱۸۹۹ء میں ۱۷ برس ۴ ماہ کی عمر میں انٹرنس امتحان پاس کیا۔ ساتھ ہی سرٹیفکٹ پر رجسٹرار کے دستخط ہیں۔ اور سرٹیفکٹ دینے کی تاریخ ۲۰ رفروری ۱۸۹۹ء چھپی ہوئی ہے۔ اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ یونیورسٹی نے ۲۰ رفروری ۱۸۹۹ء کو سرٹیفکٹ دیتے وقت ان کی عمر کا شمار کرکے ان کی عمر ۱۷ برس ۴ ماہ مان لی تھی تب ان کی تاریخ پیدائش ۲۰ راکتوبر ۱۸۸۱ء ہونی چاہیے

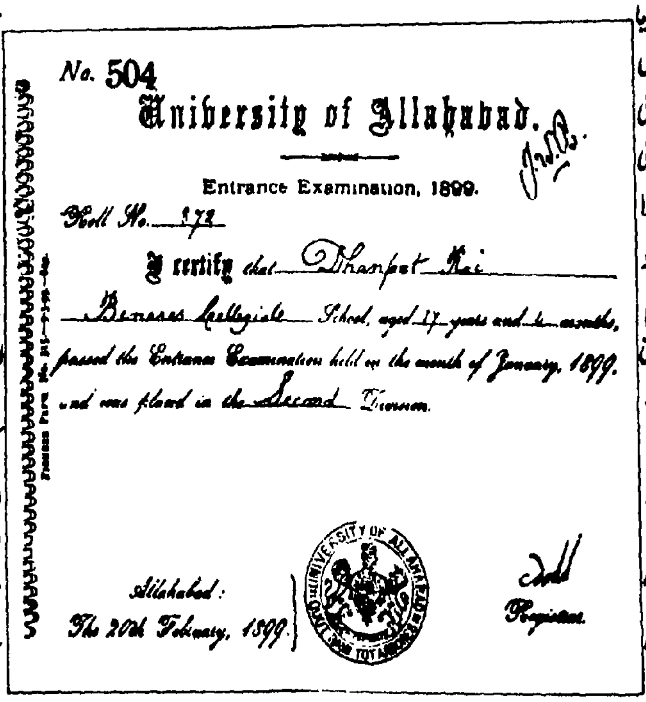
No. 504
University of Allahabad.
Entrance Examination, 1899.
Roll No. 172
I certify that Dhanpat Rai
Benares Collegiate School, aged 17 years and 4 months,
passed the Entrance Examination held in the month of January, 1899.
and was placed in the Second Division.
Allahabad:
The 20th February, 1899.
Registrar.

(بقیہ صفحہ ۶۴ پر)

آصف واسع

پریم چند بہ حیثیت سیرت نگار

پریم چند کی ادبی زندگی کا آغاز بیسویں صدی کی ابتدا کے ساتھ ہوا جب کہ ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت کو طویل عرصہ گزر چکا تھا۔ انگریز ہندوستان اور ہندوستانیوں پر روز بروز حاوی ہوتے جا رہے تھے۔ یہاں کی سماجی، معاشرتی اور اقتصادی زندگی تباہ ہو رہی تھی۔ غریب، مزدور اور کسانوں کی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ زمانہ بدل رہا تھا۔ نئے اصول زندگی، نیا اقتصادی ڈھانچہ اور ایک نیا فکر و شعور جنم لے رہا تھا۔ قومی تحریکیں زور پکڑ رہی تھیں۔ عوام میں بیداری کا جذبہ کروٹیں لینے لگا تھا۔ انگریزی حکومت کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہو رہی تھی اور پرانے رسم و رواج و اقدارِ حیات کو توڑنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

پریم چند نے جب اردو ناول نگاری کی دنیا میں قدم رکھا تو اپنے ارد گرد کے ماحول سے متاثر ہوتے بغیر نہ رہ سکے۔ لہٰذا فن کے ذریعے معاشرے میں پھیلی ہوئی برائیوں کو دور کرنا چاہا۔ ابتدائی دور کے ناولوں میں بیوہ کی شادی کے مسئلے پر روشنی ڈالی اور اس کی اہمیت واضح کرتے ہوئے پنڈتوں اور مندر کے مہنتوں کی زندگی کو بے نقاب کیا ہے۔ دوسرے دور کے ناول بازارِ حسن اور نرملا میں بے جوڑ شادی کے نتائج پیش کیے ہیں۔ نرملا اور سمن سماج کی نمائندہ کردار ہیں جن کا المیہ سماج کا المیہ ہے۔ دونوں میں معاشرت کی پراگندگی اور اوسط ہندو گھرانے کے مسائل ہیں۔ نرملا میں جو بے جوڑ شادی کا اثر گھر کے افراد تک محدود رہتا ہے لیکن بازارِ حسن میں اس کا اثر معاشرہ پر دکھایا گیا ہے۔ پریم چند نے دونوں کرداروں کی زندگی کو بے نقاب کر کے سماج کا آئینہ پیش کیا ہے۔ پیش کش میں بڑی ہنرمندی اور فنکاری ہے۔ مصنف کی کامیابی کا راز ان کی کامیاب سیرت نگاری میں پوشیدہ ہے۔

پریم چند ایک کامیاب فنکار تھے۔ وہ اپنے کرداروں کو زندہ اور جاندار بنانے کی ہنرمندی سے واقف تھے۔ ان کی کامیاب سیرت نگاری کے نمونے تو بہت ہیں لیکن سب کا تجزیہ ممکن نہیں۔ یہاں صرف بازارِ حسن اور نرملا کا جائزہ لیا جا رہا ہے کیوں کہ دونوں میں جہیز نہ دینے کے سبب بے جوڑ شادی کا مسئلہ اور اس کے نتائج پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ سمن اور نرملا کی تباہی و بربادی کی کہانی ہے۔ لیکن پریم چند نے دونوں کی سیرتوں کو اس فنکاری سے نکھارا ہے کہ ہم انھیں ان کی منفرد خصوصیات سے پہچان لیتے ہیں۔ بازارِ حسن ایک معاشرتی ناول ہے۔ سمن اس کی مرکزی کردار ہے۔

قصے کے تمام واقعات اس کے گرد گردش کرتے ہیں جس پر سماج اور معاشرہ کی برائیوں کا اثر کچھ ایسے انداز میں ہوتا ہے کہ اس میں بھلے اور برے کے درمیان امتیاز کرنے کی صلاحیت نہیں رہتی۔ سمن خوبیوں اور خامیوں کا مجموعہ ہے۔ پریم چند نذیر احمد کی طرح اپنے کرداروں کو نہ فرشتہ بناتے ہیں نہ شیطان۔ بلکہ یہ صحیح معنوں میں انسان ہیں جو حالات کے تحت بدلتے ہیں، غلطیاں کرتے ہیں، غلطیوں پر پشیمان ہوتے ہیں۔ ان کے ذہن میں خیر و شر کا تصادم ہوتا ہے جس میں کبھی خیر کی فتح ہوتی ہے کبھی شر کی۔ بازارِ حسن کے کرشن چندر ایک دیانت دار داروغہ تھے۔ بڑے خلیق، خوش مذاق اور نفاست پسند۔ اپنے ماتحتوں کے ساتھ بھی برابری اور دوستی کا برتاؤ رکھتے تھے لیکن ان کی نظر میں داروغہ جی کا سب سے بڑا عیب یہ تھا کہ نہ وہ خود رشوت لیتے ہیں نہ ماتحتوں کے پیٹ بھرتے ہیں۔ افسر اور حکام بھی ان سے خوش نہ رہتے تھے۔ کرشن چندر سمجھتے تھے کہ ان کی ایمانداری وہ صفت ہے، جس سے وہ معاشرہ میں عزت حاصل کر سکتے ہیں لیکن ان کا یہ خیال اس وقت غلط ثابت ہوا جب انھیں سمن کے لیے مناسب لڑکا بغیر جہیز کے نہیں ملتا ہے۔ انھیں اپنی دیانت گناہ معلوم ہونے لگی۔ اب وہ پچھتا رہے تھے۔ انھیں اپنی بیٹی کے جہیز کے لیے پانچ ہزار روپیے کی ضرورت تھی۔ وہ ذہنی الجھن میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ پریم چند نے ان کے ذہنی کشمکش کی عکاسی بڑی ہنرمندی سے کی ہے۔ کرشن چندر نے اپنے ضمیر کا خون کر کے رشوت لینے پر خود کو آمادہ کرتے ہیں۔ اپنی بیوی گنگا جلی سے کہتے ہیں۔

" پرماتما بھی دیانت کا دشمن ہے۔ اب دو ہی باتیں ممکن ہیں یا تو لڑکی کو کسی کنگلے کے گلے مڑھ دوں یا سونے کی چڑیا کی فکر کرتا ہوں۔ دیانت کا مزہ چکھ لیا اب لوگوں کے گلے دباؤں گا، رشوتیں لوں گا۔ اس کے بغیر چارہ نہیں۔ دنیا یہی چاہتی ہے۔ اور غالباً ایشور بھی یہی چاہتا ہے۔ میں بے گناہ ہوں مجھے بے ایمان بننے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔"

پریم چند یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ انسان حالات کے تحت بدلتا ہے اور کبھی کبھی وہ فطری خصوصیات کے خلاف بھی کام کر جاتا ہے۔ جس کی فطرت میں نیکی ہو کر مجبوراً بدی کی طرف راغب ہوتا ہے تو ضمیر کی آواز اسے بےچین کر دیتی ہے۔ برائی کا احساس نشتر کی طرح چبھنے لگتا ہے۔ کرشن چندر کے نام جب گرفتاری کا وارنٹ آتا ہے تو انھیں مطلق خوف نہیں ہوتا بلکہ ندامت ہوتی ہے۔ ان کا نفس کہتا ہے " اپنے اعمال کا خمیازہ اٹھاؤ۔ میں کہتا تھا کہ اس آگ میں نہ کودو۔ تم نے میرا کہنا نہ مانا۔"

کرشن چندر کا کردار ناول میں ثانوی ہے لیکن پریم چند نے ان کی سیرت کو بھی نمایاں کیا ہے اور نفسیاتی تجزیہ کرکے انفرادیت بخشی ہے۔ سمن اہم ترین کردار ہے۔ اس لیے مصنف نے اس کے تمام سیرتی پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ اس کی طبیعت میں ابتدا سے ہی غرور اور رعونت ہے جس کے سبب وہ تباہی کے غار میں گر جاتی ہے۔ جو عیش و آرام سکھ اور آسائش اپنے گھر میں دیکھ چکی تھی وہی سسرال میں دیکھنے کی متمنی تھی۔ لیکن حالات کے تحت اس ناز و نعم کی پلی حسین و جمیل دوشیزہ کی شادی پندرہ روپیے ماہانہ تنخواہ والے ایک کارخانہ کے بابو گجادھر سے ہوتی ہے جو سن رسیدہ بھی ہے اور جاہل بھی۔ سمن کے مزاج میں نفاست اور لطافت ہے۔ پندارِ حسن کے سبب پاس پڑوس کی عورتوں کو ذلیل سمجھتی تھی۔ گجادھر کی قلیل آمدنی نے اس کا سارا خواب مٹی میں ملا دیا۔ تنگدستی کے سبب وہ غیر مطمئن تھی۔ پھر بھی آہستہ آہستہ گھر کا کام کاج کرنے لگی اور جب اُسے کام کی عادت ہوگئی تو اسی میں زندگی کا لطف حاصل ہونے لگا۔ لیکن یہ لطف و لذّت زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکی۔ امورِ خانہ داری سے مطلق واقف نہ تھی۔ گجادھر کی تنخواہ بیس دنوں میں ہی ختم ہوگئی۔ جیسے جیسے پیسے کی تنگی ہوتی سمن کی ناآسودگی بڑھتی گئی۔ گجادھر سمن سے بدظن رہنے لگا۔ اس کے چال چلن پر بھی شک کرنے لگا۔ یہاں تک کہ ایک رات جب وہ اپنی سہیلی سبھدرا کے گھر سے رات گئے لوٹتی ہے تو گجادھر اسے گھر سے نکال دیتا ہے۔ سمن اب دوراہے پر ہے وہ کیا کرے کدھر جائے ایک اہم سوال کھڑا ہوتا ہے۔

پریم چند نے سمن کی زندگی کے نشیب و فراز اور پیچ و خم سے ناول کا پلاٹ تیار کیا ہے۔ اس کے اعمال و افعال سے قصّے کا ارتقاء بھی ہوتا ہے اور اس کی سیرت بھی نمایاں ہوتی جاتی ہے۔ مصنف سمن کی خارجی خصوصیتوں کی عکاسی کے ساتھ داخلی دنیا کی تصویرکشی بھی کرتے ہیں۔ ابتدا میں سمن بھولی بائی کی جو اس کے گھر کے سامنے رہتی ہے، شان و شوکت اور اقتصادی برتری سے مرعوب ہوتی ہے لیکن جب اس کا شوہر گجادھر اُسے مذہب کی عظمت بتاتا ہے تو وہ مذہب کی دنیا میں ڈوب کر اپنی ذہنی تسکین کا راستہ ڈھونڈ لیتی ہے اور خود کو بھی بائی سے زیادہ بلند تصور کرنے لگتی ہے۔ لیکن ایک وقت ایسا آتا ہے جب وہ تھک ہار کر اس کے گھر پناہ لینے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ گرچہ اس اقدام میں اس کی طبیعت کو بھی دخل ہے۔ اس میں قناعت، صبر، توکل اور کفایت شعاری بالکل نہیں ہے۔ اچھا کھانے اور پہننے کی عادت کے سبب اس کی ناآسودگی بڑھتی ہے۔ اس تشنگی نے ہی بھولی بائی کی طرف اس کی رہبری کی لیکن وہاں بھی زیادہ دنوں تک وہ اطمینان کی زندگی بسر نہ کر سکی۔ ماحول کا گھناؤنا پن اسے موجودہ حالت سے متنفر کرتا رہا۔ ظاہری چمک دمک دیکھ کر وہ غلط فہمی میں مبتلا ہوگئی تھی اور اب اس گناہ آلود ماحول سے نجات حاصل کرنا چاہتی تھی جس کے سبب وہ بازارِ حسن کو خیرباد کہہ کر ودھوا آشرم چلی جاتی ہے۔

سمن کی سیرت کو پیش کرنے میں پریم چند کی مثالیت پرستی نمایاں ہوتی ہے۔ اس کی خرابیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے اُسے ودھوا آشرم میں پناہ دیتے ہیں اور اس طرح ان کا مقصد واضح ہو جاتا ہے۔ وہ جہیز کی لعنت سے نالاں تھے۔ اس سے پیدا ہونے والے بُرے نتائج پر ان کی گہری نظر تھی۔ سمن کی بربادی پیش کرکے انھوں نے سماجی اصلاح کی کوشش کی ہے۔ اس کے کردار کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ اسے جانداری بخشی ہے۔ مصنف اس کا ہاتھ تھام کر نہیں چلاتے وہ خود اپنی مرضی سے آگے بڑھتی ہے۔ اپنی بنیادی خصوصیتوں کے مطابق ہی ارتقاء کی منزل طے کرتی ہے۔ ماحول کے ساتھ اس میں تبدیلی بھی آتی ہے۔ کبھی نرمی سے کام لیتی ہے کبھی سختی سے۔ ناسازگار حالات میں کچھ دیر کے لیے مطمئن رہنے کی کوشش کرتی ہے اور پھر جلد ہی اکتا جاتی ہے۔ اس کے اعمال عام انسان کی طرح ہیں۔ عمل اور ردِ عمل دونوں فطری ہیں۔ پریم چند نے اس کی صحیح تصویرکشی کی ہے۔ جب تک مصنف کا اصلاحی جذبہ غالب نہیں آتا۔ سمن کا کردار زندہ متحرک چونچال اور حقیقی معلوم ہوتا ہے۔ پیش کش میں ہنرمندی اور فنکاری ہے۔

"بازارِ حسن" کے بعد "نرملا" میں بھی پریم چند نے بے جوڑ شادی کے اسباب اور نتائج پر روشنی ڈالی ہے۔ نرملا اس ناول کی ہیروئن ہے۔ جس کی سیرت نگاری میں پریم چند کی فنی مہارت اور ہنرمندی پوشیدہ ہے۔ اس ناول کے اکثر کرداروں کو انفرادیت حاصل ہوئی ہے۔ پلاٹ کی ترتیب تین گھرانوں سے ہوتی ہے۔ پہلا گھرانا اودے بھان وکیل کا ہے جن کی دو لڑکیاں نرملا اور کرشنا ہیں۔ دوسرا گھر منشی طوطارام کا ہے جن کے تین لڑکے ہیں اور نرملا کی شادی منشی طوطارام سے ہوتی ہے اور تیسرا خاندان بھال چند سنہا کا ہے جن کا لڑکا نرملا کا منگیتر تھا لیکن اودے بھان وکیل کی بے وقت اور اچانک موت کے سبب نرملا کی شادی طوطارام سے ہوتی ہے جس کی عمر چالیس سال ہے۔ نرملا کمسن خوبصورت اور معصوم لڑکی ہے۔ عمر کی اس تفاوت کے سبب نرملا کے دل میں شوہر کے لیے وہ جذبات و احساسات بیدار نہیں ہوتے جو ایک بیوی کے دل میں ہوتے ہیں۔ وہ ان کی عزّت اور احترام کرتی ہے۔ ان کے پاس ہنسنے بولنے میں اسے جھجھک محسوس ہوتی ہے۔ کپڑوں اور زیوروں سے سنگار کرکے جب آئینے کے سامنے کھڑی ہوتی ہے تو حسرت و مایوسی کی تصویر بن جاتی ہے۔ سینے میں آگ سی جلتی محسوس ہوتی۔ کبھی خود پر غصّہ آتا کبھی طوطارام پر۔ اس کے ذہن میں آندھی چلنے لگتی۔ سمجھ میں نہ آتا وہ کیا کرے کیا نہ کرے۔ طوطارام کا بڑا لڑکا منسارام اس کا ہم عمر ہے۔ اس کے لیے کبھی ممتا کے جذبات بیدار ہوتے کبھی رفاقت کے۔ وہ عجیب ذہنی کرب میں مبتلا رہتی ہے۔

پریم چند نے نرملا کی سیرت اس طرح پیش کی ہے کہ پورے ناول میں وہ دلچسپی کا محور بنی رہتی ہے۔ اس دلکشی کا سبب اس کی سیرت کے خد و خال نہیں نفسی کیفیت ہے۔ مصنف نے اس کے دل میں ڈوب کر اس کی نفسیاتی گتھیوں اور الجھنوں کا تجزیہ کیا ہے۔ بے جوڑ شادی کے سبب اس کے جذبات پامال ہوتے ہیں۔ احساسات سرد ہو جاتے ہیں۔ وہ کس طرح ذہنی کشمکش میں گرفتار رہتی ہے۔ پریم چند نے ان تمام چیزوں کی عکاسی بڑی عمدگی کے ساتھ کی ہے۔ منشی طوطارام بھی سکون کی زندگی نہیں گزارتے۔ جوان اور خوبصورت بیوی جذبات کی آسودگی کے لیے طرح طرح کے طریقے اپناتے ہیں تفریح کے سامان مہیا کرتے ہیں۔ لیکن وہ مطمئن اور آسودہ نہیں ہوتی۔ اس کی توجہ منسارام کی طرف زیادہ ہے۔ جس کے سبب طوطارام بدگمانی کے شکار ہو جاتے ہیں اور منسارام کو ہوسٹل بھیج دیتے ہیں۔ اپنی عمر خود ان کی نظر میں کھٹکتی ہے

(بقیہ صفحہ ۶۴ پر)

محمد یونس

گئو دان تصنیف ہے یا ترجمہ

اردو گئودان کے سلسلے میں ایک گرم بحث چل رہی ہے کہ یہ تصنیف ہے یا ترجمہ۔ اس موضوع پر ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے کئی مضامین لکھے ہیں "اردو کا المیہ" جو ڈاکٹر صاحب کی تصنیف ہے اس میں اس موضوع سے متعلق تین مضامین ہیں اس کے علاوہ فکر و نظر علی گڑھ جلد ۱۱ شمارہ ۲ میں بھی اس موضوع سے متعلق ایک مضمون ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے ہی انکشاف پر فہمیدہ بیگم اور ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی نے اس موضوع پر کسی قدر لکھا ہے لیکن صاف طور پر اس کا کوئی فیصلہ نہ کر پائے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اقبال ورما سحر کی خود نوشت سے یہ ثابت کیا ہے کہ اردو گئودان ہندی گئودان کا ترجمہ ہے۔ جسے اقبال ورما سحر نے ترجمہ کیا ہے۔ ترجمہ کوئی بری چیز نہیں۔ اقبال ورما سحر نے ہندی سے اردو میں ترجمہ کر کے اردو پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ ترجمہ آخر کار ترجمہ ہی ہے۔ وہ انگریزی سے ہو یا فرانسیسی سے، روسی زبان سے ہو یا جرمنی سے ہندی سے ہو یا فارسی سے اسے تصنیف نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن گئودان کے ساتھ کچھ اور ہی انصاف کرنا ہوگا۔ گئودان کے سلسلے میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں فرماتے ہیں!۔ "اگر اس ترجمہ میں سحر کا ہاتھ زیادہ ہے اور سحر کی شہادتوں کے مطابق پریم چند نے صرف نظر ثانی کی ہے تو اردو گئودان کو پریم چند کی تصنیف نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اس کی حیثیت صرف ہندی "گئودان" کے ترجمے کی ہے اور کسی دوسری زبان کے ترجمے کو اردو کی اصل تصنیف شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے گئودان اردو تصنیف نہیں اور نتیجتاً اردو کا بہترین ناول بھی نہیں کہا جا سکتا۔"

منشی پریم چند نے اپنی ادبی زندگی دراصل اردو سے شروع کی اور اس میں آخر دم تک لکھا لیکن درمیان میں ایک عرصہ تک ہندی میں مشق کرتے رہے اور ہندی ہی میں ان کی ناولیں اور کہانیاں شائع ہوتی رہیں۔ اس کی خالص وجہ یہ تھی کہ اردو رسائل سے جو معاوضے ملتے تھے اس سے وہ مطمئن نہ تھے۔ وہ ۲۲ رمئی ۱۹۱۴ء کو منشی دیانرائن نگم کو لکھتے ہیں:۔ "اردو کی ہوا آجکل بگڑی ہوئی ہے۔ اخبار نویسی بہت مشکل ہوگئی ہے جتنے موجودہ رسالے ہیں اس میں کسی کو فروغ نہیں ہے۔ سب کتے کی زندگی جیتے ہیں۔" امرت رائے ان کے خیالات کی ترجمانی ان الفاظ میں کرتے ہیں۔ "اپنی اس دماغی پریشانی اور جھٹ پٹاہٹ کی حالت میں منشی جی کا دھیان پہلی بار بہت زوروں کے ساتھ ہندی کی طرف گیا۔ اردو اخباروں کی آمدنی کچھ نہ تھی۔ کتابوں کا حال برا تھا، جلوۂ ایثار سے سال بھر میں تیس روپے ملتے تھے اور پریم پچیسی چھپ کر تیار ہوتے ہوتے جنگ عظیم شروع ہوگئی جب کہ منشی جی کے لفظوں میں "جنگ کی دھن میں شاید ہی کسی کو قصے کہانی کا شوق ہو"

منشی پریم چند دراصل اردو کے لیے پیدا ہوئے تھے ان کا رجحان ہندی کی طرف نہ تھا لیکن حالات نے انھیں ہندی سیکھنے پر مجبور کیا۔ ۴ر ستمبر ۱۹۱۴ء کو منشی دیانرائن نگم کو لکھتے ہیں: "پرتاپ کے اصرار سے مجبور ہو کر ایک مختصر سا قصہ ہندی میں اس کے دسہرے دشمی نمبر کے لیے لکھا ہے۔ ہندی لکھنی تو آتی نہیں مگر کچھ قلم توڑ موڑ دیا ہے۔" پھر آگے چل کر ہندی کے مشاقی کے سلسلے میں یکم ستمبر ۱۹۱۵ء کو منشی دیانرائن کو لکھتے ہیں۔ "ہندی کے ترجمے کے لیے کئی جگہ سے اصرار ہوا ہے اور میں خود ہی اس کام کو ہاتھ میں لے لوں گا۔ اب ہندی لکھنے کی مشق کر رہا ہوں۔ اردو میں اب گزر نہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ بال مکند گپت مرحوم کی طرح میں بھی ہندی لکھنے میں زندگی صرف کر دوں گا۔ اردو نویسی میں کسی ہندو کو فیض ہوا ہے۔ جو مجھے ہو جائے گا۔" لیکن منشی پریم چند نے ایک خط جو منشی دیانرائن نگم کے نام ۱۹۱۲ء میں لکھا تھا اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ اس سے قبل ہی ہندی میں مہارت حاصل کر چکے تھے۔ اس لیے کہ ہندی اخبار کا اڈیٹر ہونا ہی ہندی سے بہادر ہونے کی دلیل ہے لکھتے ہیں:۔

"آپ مجھے ہندی ڈپارٹمنٹ کا اڈیٹر سمجھیے۔ میں اخبارات اور رسالوں سے مناسب اور دلچسپ ترجمے کر دیا کروں گا۔ کہیں ان پر نوٹ اور تنقیدیں لکھوں گا۔"

ڈاکٹر جعفر رضا نے جو انکشاف کئے ہیں اسے ذیل میں پیش کرتا ہوں:۔

(۱) ۱۹۱۴ء کے قبل پریم چند کی کسی کہانی کے ہندی میں شائع ہونے کا سراغ نہیں ملتا اس وقت تک ان کی کہانیاں صرف اردو میں چھپتی تھیں۔

(۲) بعد کے دور میں جب پریم چند کی کہانیاں ہندی میں شائع ہونے لگیں۔ اس وقت بھی ان کی کہانیاں اردو میں شائع ہوتی رہیں۔

(۳) اسی زمانہ میں ان کی کچھ کہانیاں اردو کے قبل ہندی رسائل میں شائع ہوئیں۔

(۴) پریم چند کی کہانیاں ایسی بھی ہیں جو اب تک صرف ہندی میں شائع ہوتی رہی ہیں اور ان کا اردو روپ کبھی سامنے نہ آسکا۔

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں : "اکثر لوگ قیاس کر لیتے ہیں کہ پریم چند نے ہندی میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کرنے کے بعد زیادہ تر اسی کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا حالانکہ ان کے فرزند امرت رائے کی تحقیق نے اب یہ راز منکشف کر دیا ہے کہ ان کے زیادہ تر ناول جن کی اشاعت اردو کے قبل ہندی میں ہوئی ابتدًا اردو میں لکھے گئے ہیں۔ مثلاً بازارِ حسن، گوشۂ عافیت، چوگانِ ہستی وغیرہ"

ترجمہ کے سلسلے میں منشی پریم چند نے مولانا عاقل سے کہا تھا کہ: "کبھی میں اردو میں پہلے لکھتا ہوں اور اس کا ہندی میں ترجمہ کرتا ہوں اور کبھی ہندی میں لکھتا ہوں اور بعد میں اس کا اردو میں ترجمہ کرتا ہوں"

منشی پریم چند اردو کے سلسلے میں ۲۲ر اپریل ۱۹۲۳ء کو منشی دیانرائن نگم کو لکھتے ہیں "اِدھر میں نے اردو لکھنا بند سا کر رکھا ہوں، فرصت ہی نہیں ملتی، لیکن ملکان شدھی' پر ایک مختصر سا مضمون بھیج رہا ہوں"

منشی منظور الحق کلیم جو منشی پریم چند کے عزیز شاگردوں میں سے تھے ان کا کہنا ہے کہ: "جولائی ۱۹۱۷ء سے مئی ۱۹۱۸ء تک کی تمام کہانیاں جو مختلف رسائل کو بھیجی گئیں تقریبًا کل کی کل ان کے ہاتھ کی صاف کی ہوئی تھیں"

پریم چند کے دوسرے شاگرد جن کا ذکر ڈاکٹر جعفر رضا نے کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ منشی منیر حیدر بیباک اہلی نے جو پریم چند کے رفیق کار بھی رہ چکے تھے پروفیسر احتشام حسین سے بیان کیا کہ انھوں نے پریم چند کی کئی ایسی اردو کہانیوں کے ترجمے ہندی میں کیے تھے جو بعد میں پریم چند کی ہندی تخلیق کی حیثیت سے ہندی رسائل میں شائع ہوئیں" اس کے علاوہ منشی پریم چند منشی اقبال ورما سحر سے بھی اجرت پر ترجمے کرایا کرتے تھے۔ منشی پریم چند اگست ۱۹۲۵ء میں منشی دیانرائن نگم کو لکھتے ہیں (ڈاکٹر مسعود حسن خاں نے خط کا سنہ تصنیف ۱۹۳۱ء لکھا ہے اور ڈاکٹر جعفر رضا نے ۱۹۲۵ء) "حضرت سحر کو میں نے دو سو روپے دینا طے کر لیا ہے۔ وہ راضی بھی ہو گئے ـــ اگر وہ راضی ہوں تو گوشۂ عافیت بھی ان سے پورا کراؤنگا۔ اور کچھ نئی کہانیوں کا ترجمہ بھی" پھر ۳۱ر مارچ ۱۹۲۶ء کو لکھتے ہیں "منشی اقبال ورما صاحب مارے تقاضوں کے ناک میں دم کیے ہوتے ہیں حالانکہ ایک سو پچاس دے چکا ہوں لیکن ابھی انھیں اتنا ہی اور دینا ہے" اسی طرح کا ایک خط ۱۲ر فروری ۱۹۳۰ء کا بھی ہے۔ "آپ نے پچھلے مہینے اقبال ورما سحر صاحب کی مدد کی۔ میری جانب سے مدد کی تھی ابھی ان کے قرض سے سبکدوش نہیں ہوا ہوں۔ میرے کتابوں کا پچھلا حساب تو صاف ہو گیا لیکن نئے سال کا حساب باقی ہے" ۲۵ر جون ۱۹۳۴ء کو منشی دیانرائن نگم کو پھر لکھتے ہیں "میں نے منیجر ہنس کو تاکید کر دی ہے کہ جب میرا افسانہ چھپے وہ اس کا پروف زمانہ کو بھیج دیا کریں اور "ہنس" میں لکھ دیا کریں۔ اور ترجمہ کا حق "زمانہ" کے لیے محفوظ ہے سال میں پانچ چھ سے زائد نہیں لکھتا۔ ہاں سحر صاحب اس کام کے لیے بہت موزوں ہیں" مدن گوپال نے جو "پریم چند کے خطوط" کے دیباچے میں لکھا ہے ان ہی کی زبانی سنیے۔

"یہی لکھنؤ میں پریم چند نے اپنا اگلا ناول شروع کیا یہ اولاً ہندی میں لکھا گیا۔ اس کا نام تھا "کایا کلپ" کچھ سال بعد یہ اردو میں "پردۂ مجاز" کے نام سے شائع ہوا اس کا ترجمہ پریم چند نے خود ہندی سے اردو میں کیا مگر "رنگ بھومی" اور "چوگان ہستی" میں اتنا اختلاف تھا کہ "چوگان ہستی" کا دوسرا مسودہ ہندی ناول سے ترجمہ کرانا پڑا اسے پریم چند نے اقبال ورما سحر ہنگامی سے کروایا"

اب اردو گئودان کی تصنیف کے سلسلے میں چند باتیں عرض کرنی ضروری سمجھتا ہوں اس کے متعلق دیانرائن نگم لکھتے ہیں "۱۹۳۶ء میں آپ کا آخری ناول "گئودان" (گودان) بھی سرسوتی پریس بنارس سے شائع ہوا۔ اس کی دو ہزار جلدیں بک چکی ہیں اور پہلا ایڈیشن قریب اختتام ہے اس کا اردو ترجمہ بھی سحر صاحب کی امداد سے جلد ہی شائع ہوگا"

اردو گئودان کے ترجمے کی شہادت اقبال ورما سحر کی خود نوشت سے ملتی ہے وہ لکھتے ہیں "منشی پریم چند آنجہانی کے متعدد قصے اور کئی ناول مثلاً "رنگ بھوم"، "کرم بھوم"، "پریم آشرم"، نرملا وغیرہ ہندی سے اردو میں لکھے جا چکے ہیں ان کا آخری ہندی ناول "گئودان" بھی جامعہ ملیہ سے شائع ہو چکا ہے جن کا اردو ترجمہ میرا ہی کیا ہوا ہے"

ان تمام حقائق کی روشنی میں یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ "اردو گئودان" اقبال ورما سحر کا "ہندی گئودان" سے ترجمہ ہے اور اس کی شہادت منشی پریم چند کے دیگر مصروفیات، بمبئی کی سیر و سیاحت، مستقل علالت اور ان کے عزیز دوست دیانرائن نگم کے بیان سے ملتی ہے لیکن ان تمام بیانات کی روشنی میں منشی پریم چند کی اردو دانی پر کوئی حرف نہیں آتا۔ چونکہ اُردو میں وہ تمام عمر تک لکھتے رہے۔ ان کا بیان ہے کہ "کبھی میں اردو میں پہلے لکھتا ہوں اور اس کا ہندی میں ترجمہ کرتا ہوں اور کبھی ہندی میں لکھتا ہوں اور اس کا اردو میں ترجمہ کرتا ہوں"۔ منظور الحق کلیم، منشی منیر حیدر بیباک کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ پروفیسر فراق صاحب ان کے متعلق کہتے ہیں کہ "انھوں نے ہندی ترجمے کی زبان پر اعتراضات کیے تو پریم چند نے مسکراتے ہوئے کہا کہ جب ان کی زبان اردو میں مستند ہو چکی ہے تو پھر انھیں کسی کی پروا نہیں رہ جاتی" گنگا پرشاد دل ان کی زبان کے بارے میں لکھتے ہیں "پریم چند کی کہانیوں کے ہندی میں ترجمہ ہونے کے داخلی ثبوت بھی ہیں۔ ان کی زبان کا تانا بانا اور مزاج اردو ہوتا ہے" اول اور آخر بیان سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ان کی زبان اردو میں مستند ہو چکی تھی۔ وہ اگر ہندی میں لکھتے تھے تو بھی اس کی زبان و بیان عملًا اور مزاجًا اردو ہوتا تھا جیسا کہ ڈاکٹر جعفر رضا نے لکھا ہے اور پریم چند کی تحریر سے پتہ چلتا ہے اس کے علاوہ اقبال ورما سحر کی اردو دانی اور ان کے

ترجمے پر پریم چند کلی طور پر اعتماد رکھتے تھے اگر یہ اعتماد منشی پریم چند کو نہ ہوتا تو کبھی ان سے ترجمہ نہ کراتے اس پر ڈاکٹر صاحب کا یہ کہنا کہ "اردو گئودان کی زبان جا بجا غمازی کرتی ہے کہ اس کے گوہر آبدار تخلیقی عمل کی لہر پر بر آمد نہیں ہوئے ہیں بلکہ ایک مترجم کی کاوش خواہی کے آوردہ ہیں، اور پھر لسانی شہادت کے لیے گئودان کا اکیسواں باب پیش کرنا میرے خیال میں درست نہیں جب کہ پریم چند کو سحر کے ترجمہ پر پورا اعتماد تھا اس کے علاوہ منشی پریم چند کا آخری خط جسے موت سے سات ماہ قبل یعنی ۲۸ر فروری ۱۹۳۶ء کو اختر حسین رائے پوری کے نام لکھا تھا کہ "میرا ناول گئودان' ابھی حال میں نکلا ہے اس کی ایک جلد بھیج رہا ہوں اردو میں ریویو کرنا "میدانِ عمل"، کا نسخہ تو تمھارے یہاں پہنچا ہی ہوگا" گئودان کے لیے بھی ایک پبلشر تلاش کر رہا ہوں مگر اردو میں تو حالت جیسی ہے تم جانتے ہو بہت ہوا ایک کر وپیہ صفحہ کوئی دیدیگا۔ اور سب خیریت ہے۔"

ہندی گئودان کی اشاعت کا ذکر دیا نرائن نگم نے کیا ہے یہاں پریم چند اپنے ہندی گئودان کے ساتھ اردو گئودان کا بھی ذکر "گئودان کے لیے بھی ایک پبلشر تلاش کر رہا ہوں مگر اردو میں حالت جیسی ہے تم جانتے ہو" کرتے ہیں اس بیان سے یہ شہادت مل جاتی ہے کہ منشی پریم چند نے نظرِ ثانی کے بعد ہی پبلشر کی تلاش شروع کی ہوگی چونکہ یہ فطری بات ہے کہ کوئی بھی خالق جب اپنے خونِ جگر سے کسی چیز کی نمود کرتا ہے یعنی تخلیق کرتا ہے تو وہ اپنے تخلیقات و شاہکار کو اچھی طرح پرکھ لیتا ہے تب ہی اسے منظرِ عام پر لاتا ہے۔ اسی طرح منشی پریم چند چونکہ اس ناول کے خالق ہیں اقبال ورما سحر پر کلی اعتماد کے باوجود بھی انھوں نے اس ترجمہ کو ضرور دیکھا ہوگا۔ ویسے اقبال ورما سحر نے منشی پریم چند کے دوسرے تخلیقات بھی اس ناول سے قبل اردو میں ترجمہ کر چکے ہیں اور منشی پریم چند نے نظرِ ثانی کے بعد ہی اس کی اشاعت کی ہے اس لیے پورے اعتماد کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ منشی پریم چند سحر کے ترجمہ پر کلی اعتماد رکھتے تھے۔

ترجمہ کے سلسلے میں جمیل جالبی "ایلیٹ کے مضامین" کے پیشِ لفظ میں لکھتے ہیں کہ "مترجم کا فرض یہ ہے کہ وہ مصنف کے لہجے اور طرزِ ادا کا خیال رکھے ___ ایسے ترجمے سے آخر کیا فائدہ جو سلاست تو پیدا کر دے لیکن مصنف کی روح اس کے لہجے اور تیور کو ہم سے دور کر دے . . . . عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مترجم میں کام کرنے کا محرک یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے دماغ پہ زور ڈالے بغیر کسی دوسرے کے پھلوں کو اپنی زبان کے خوان میں رکھ کر پیش کر دے۔ اگر کتاب کا مصنف مشہور ہوا تو اس کے سہارے مترجم کو بھی شہرت کے پر لگ گئے حالانکہ دیکھا جائے تو معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ ایک طرف مترجم کی ذات مصنف کی ذات سے ہمیشہ کم تر رہتی ہے برخلاف اس کے مصنف کی شخصیت ترجمہ کے ذریعہ پھیل کر اور بڑی ہو جاتی ہے۔ اپنی بات ہو تو آدمی جس طرح چاہے اس کا اظہار کر دے لیکن ترجمہ میں آدمی بندھ کر رہ جاتا ہے۔ مصنف کے ہاتھ میں اس کی باگ ڈور ہوتی ہے۔ اگر اس نے گرفت سے نکلنے کی کوشش کی تو اصل سے دور ہو جاتا ہے" اور منشی پریم چند کا یہ بیان کہ "کبھی میں اردو میں پہلے لکھتا ہوں اور اس کا ہندی میں ترجمہ کرتا ہوں اور کبھی ہندی میں پہلے لکھتا ہوں اور بعد میں اس کا اردو میں ترجمہ کرتا ہوں۔" اور امرت رائے کا یہ بیان کہ "زیادہ تر ناول جن کی اشاعت اردو کے قبل ہندی میں ہوئی ابتدا اردو ہی لکھے گئے ہیں" اس سے بات واضح ہو جاتی ہے کہ اقبال ورما سحر کی باگ ڈور پریم چند کے ہاتھ میں تھی اور کبھی ان کی گرفت سے نکل نہیں سکتے تھے اس لیے اردو گئودان کی نظرِ ثانی منشی پریم چند نے اگر علالت کی وجہ سے بھی کر پائے ہوں تو بھی ان ہی کی تخلیق کہی جائے گی۔ منشی پریم چند کی اردو اور ان کے جذبے کی ہر طرح سے قدر کرنی ہوگی۔ چونکہ بستر علالت پر ہوتے ہوئے بھی ان کا یہ جذبہ کہ "میں اب ہر سال چھ کہانیاں اور ہر دو سال میں ایک ناول مکمل کرنا چاہتا ہوں میرے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ مجھ میں اس سے زیادہ صلاحیت نہیں۔" اور پروفیسر محمد انیس صاحب کا یہ بیان کہ "منگل سوتر" پریم چند کا آخری اور ادھورا ناول ہے جو انھوں نے "اردو گئودان" پر پوری توجہ دی ہوگی۔ جب کہ ان کی وفات ۸ر اکتوبر ۱۹۳۶ء کو ہوئی اور وفات سے کئی ماہ قبل یعنی ۲۸ر فروری ۱۹۳۶ء کو اس کے لیے پبلیشر تلاش کرتے ہیں۔ اب شک کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اردو گئودان سحر کا ترجمہ ہوتے ہوئے بھی منشی پریم چند کی تصنیف ہے اور وہ اس کے خالق ہیں، اردو گئودان کو ترجمہ میں شمار نہیں کرنا چاہیے۔ یہ اردو کا سب سے عمدہ ناول ہے۔

بچّوں کے لیے دلچسپ تحفے

۱۔ پہیلیاں۔ ۵ سو سے زائد پہیلیوں کا مجموعہ بچّوں کے لیے دلچسپ تفریحی مشغلہ۔

قیمت : آٹھ روپے

۲۔ رنگے برنگے پھول۔ بچّوں کے لیے لکھی گئی ستر سے زائد نظموں کا مجموعہ۔

قیمت : دس روپے

۳۔ کون جیتا کون ہارا۔ ...زمانہ قدیم کی ایک دلچسپ کہانی باتصویر

قیمت : دس روپے

(آج کل کے خریداروں کے لیے ۲۰ فی صد کی رعایت)

شیلیش زیدی

پریم چند کی کہانیاں

پہلا دور ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۶ء تک

"میں نے ۱۹۰۷ء میں کہانیاں لکھنا شروع کیا۔ سب سے پہلے ۱۹۰۸ء میں میرا سوزِ وطن جو پانچ کہانیوں کا مجموعہ ہے زمانہ پریس سے نکلا تھا۔"
(پریم چند۔ چٹھی پتری۔ جلد ۲ صفحہ ۷۵)

۱۹۰۷ء

اس زمانہ میں شائع ہونے والی ایک بھی کہانی ابھی تک دریافت نہ ہوسکی۔

۱۹۰۸ء

۱۔	عشقِ دنیا و حبِّ وطن	زمانہ اپریل
۲۔	دنیا کا سب سے انمول رتن	سوزِ وطن اگست
۳۔	شیخ مخمور	" " "
۴۔	صلۂ ماتم	" " "
۵۔	یہی میرا وطن ہے	" " "

نوٹ:۔ ڈاکٹر جعفر رضا نے پریم چند فن اور تعمیر فن میں ۱۹۰۸ء میں شائع ہونے والی ایک اور کہانی "داراشکوہ کا دربار" کا ذکر کیا ہے جو ماہنامہ آزاد لاہور میں ستمبر میں چھپی تھی لیکن یہ پریم چند کا ایک انشائیہ ہے اور اسے کہانی کی فہرست میں نہیں رکھا جاسکتا۔

۱۹۰۹ء

کسی کہانی کے شائع ہونے کا پتہ نہیں چلتا۔

۱۹۱۰ء

۱۔	گناہ کا اگن کنڈ	زمانہ مارچ
۲۔	سیرِ درویش	" اپریل تا جون
۳۔	شکار	" جون
۴۔	رانی سارندھا	" ستمبر
۵۔	بے غرض محسن	ادیب، ستمبر
۶۔	بڑے گھر کی بیٹی	زمانہ، دسمبر

۱۹۱۱ء

۱۔	وکرما دتیہ کا تیغہ	زمانہ، جنوری
۲۔	کرشمۂ انتقام	" فروری
۳۔	دونوں طرف سے	" مارچ
۴۔	راجہ ہردول	" اپریل
۵۔	منزلِ مقصود	" اگست۔ ستمبر
۶۔	بڑی بہن	ادیب، جولائی
۷۔	خوفِ رسوائی	" ستمبر
۸۔	آہِ بیکس	زمانہ، اکتوبر

۱۹۱۲ء

۱۔	آلہا	زمانہ، جنوری
۲۔	ممتا	" فروری
۳۔	عالمِ بے عمل	" جون
۴۔	کیفرِ کردار	ادیب، جولائی
۵۔	مناون	زمانہ، جولائی
۶۔	دھوکے کی ٹٹی	ادیب، نومبر
۷۔	راج ہٹ	زمانہ، دسمبر

۱۹۱۳ء

۱۔	تریا چرتر	زمانہ جنوری
۲۔	موت اور زندگی (امرت)	" مارچ
۳۔	اماوس کی رات	" اپریل
۴۔	نگاہِ ناز	" مئی
۵۔	ملاپ	" جون
۶۔	داروئے تلخ	ہمدرد[1]، جولائی

۱؎ یہ خیال درست نہیں ہے کہ دھنپت رائے نے ابتدائی دور کی کہانیوں میں پریم چند نام زمانہ کے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔ ہمدرد میں شائع ہونے والی ان کی تمام کہانیاں پریم چند کے ہی نام سے ملتی ہیں (زیدی)۔

۷۔	اندھیر	زمانہ جولائی
۸۔	صرف ایک آواز	″ اگست۔ ستمبر
۹۔	نالکا زمیندار	″ اکتوبر
۱۰۔	نمک کا داروغہ	ہمدرد اکتوبر

۱۹۱۴ء

۱۔	اناتھ لڑکی	زمانہ، جون
۲۔	خون سفید	″ جولائی
۳۔	سودائے خام	ہمدرد اگست
۴۔	شکاری راجکمار	زمانہ اگست
۵۔	شامت اعمال	″ ستمبر۔ اکتوبر
۶۔	پچھتاوا	″ نومبر
۷۔	حسنِ انتخاب	العصر۔ دسمبر

۱۹۱۵ء

۱۔	مرہم	زمانہ جنوری
۲۔	غیرت کی کٹار	″ جولائی
۳۔	کرموں کا پھل	خطیب ۷۔ اگست
۴۔	بیٹی کا دھن	زمانہ نومبر
۵۔	شوت[1]	سرسوتی دسمبر

۱۹۱۶ء

۱۔	دو بھائی	زمانہ جنوری
۲۔	نیکی کی سزا	سرسوتی مارچ
۳۔	پنچایت	زمانہ مئی۔ جون
۴۔	سرِ پُرغرور	زمانہ اگست
۵۔	جگنو کی چمک	″ اکتوبر
۶۔	دھوکا	″ نومبر

نوٹ: پہلے دور کی کہانیوں کی مجموعی تعداد ۵۴ ہے۔

دوسرا دور ۱۹۱۷ء سے ۱۹۲۶ء تک

۱۹۱۷ء

۱۔	راجپوت کی بیٹی	زمانہ جنوری
۲۔	دروازہ	الناظر جنوری
۳۔	شبۂ حسن	زمانہ مارچ
۴۔	مشعلِ ہدایت	″ مئی
۵۔	ایمان کا فیصلہ	آزاد جولائی
۶۔	درد اور دوا	زمانہ ستمبر
۷۔	درگا کا مندر	ذخیرہ نومبر
۸۔	کپتان	زمانہ دسمبر

۱۹۱۸ء

۱۔	بازیافت	تہذیب نسواں ۲۰ مئی۔ اپریل
۲۔	فتح	زمانہ اپریل
۳۔	بوڑھی کاکی	تہذیب نسواں ۲۵ مئی
۴۔	قربانی	سرسوتی۔ مئی
۵۔	راہِ خدمت	زمانہ جون
۶۔	جنجال	تہذیب نسواں ۳ و ۱۰ اگست
۷۔	زنجیرِ ہوس	کہکشاں۔ ستمبر۔ اکتوبر
۸۔	حج اکبر	″ نومبر
۹۔	خنجرِ وفا	زمانہ نومبر

۱۹۱۹ء

۱۔	بینک کا دیوالہ	کہکشاں۔ فروری
۲۔	سوتیلی ماں	″ جون
۳۔	خواب پریشاں	″ اگست
۴۔	خون حرمت	صبح امید۔ ستمبر
۵۔	دفتری	کہکشاں۔ اکتوبر
۶۔	عبرت	پریم پورنیا

۱۹۲۰ء

۱۔	بانسری	کہکشاں۔ جنوری (؟)
۲۔	آتما رام	زمانہ جنوری
۳۔	انسان کا مقدّم فرض	سودیش مارچ
۴۔	اصلاح	کہکشاں اپریل
۵۔	مہرِ پدر	زمانہ جولائی
۶۔	بعد از مرگ	صبح امید۔ ستمبر
۷۔	روئے سیاہ	″ ″ ۔ نومبر
۸۔	نوک جھونک	زمانہ دسمبر
۹۔	مرض مبارک	پریم بتیسی حصہ اول
۱۰۔	بانگ سحر	″ ″ ″ ″

۱۹۲۱ء

۱۔	روحِ حیات	زمانہ جنوری
۲۔	عجیب ہولی	سودیش مارچ
۳۔	معمہ	زمانہ مارچ
۴۔	دستِ غیب	″ اپریل

---

[1] کہانی میں مصنف کا نام لالہ پریم چند ملتا ہے۔ (زیدی)

۵۔	لال فیتہ	زمانہ جولائی
۶۔	لاگ ڈانٹ	، جولائی
۷۔	فلسفی کی محبت	ہزار داستان۔ نومبر

۱۹۲۲ء

۱۔	موٹھ	زمانہ جنوری
۲۔	تحریک خیر [دو دھونس]	ہمایوں اپریل
۳۔	شکست کی فتح	مریادا۔ مئی
۴۔	بزم پریشاں	زمانہ جون
۵۔	تحفظ حقوق	مادھوری جولائی
۶۔	سانپ کی معشوقہ	ہزار داستاں۔ اگست
۷۔	فکر دنیا (ناکام آرزو)	مادھوری اگست
۸۔	تالیف قلب	تہذیب نسواں ۲۳۔ ستمبر
۹۔	دعوت شیراز	ہزار داستاں اکتوبر
۱۰۔	حسن ظن	زمانہ اکتوبر
۱۱۔	چکمہ (۱)	نومبر (؟)
۱۲۔	پورو سنسکار	مادھوری دسمبر
۱۳۔	دفینہ	ہزار داستاں

۱۹۲۳ء

۱۔	امتحان	چاند جنوری
۲۔	راجیہ بھکت	مادھوری فروری
۳۔	بیر کا انت	سرسوتی اپریل
۴۔	مجبوری	چاند اپریل
۵۔	گرو وراہ	، جون
۶۔	آپ بیتی	مادھوری جولائی
۷۔	چکمہ (۲)	چاند اگست
۸۔	آبھوشن	مادھوری اگست
۹۔	انتقام	زمانہ اکتوبر
۱۰۔	ستیہ گرہ	مادھوری دسمبر
۱۱۔	یوڑم	ہندی پریم پچیسی

۱۹۲۴ء

۱۔	سیلانی بندر	مادھوری فروری
۲۔	نزول برق	مادھوری مارچ
۳۔	بنی کا نیتی سردار دکنا، [نیاہ]	سرسوتی اپریل
۴۔	راہ نجات	مادھوری اپریل
۵۔	مکتی دھن	مادھوری مئی
۶۔	عفو	مادھوری جون
۷۔	ابھاگن	چاند جون
۸۔	نیراشیہ	چاند جولائی
۹۔	بھوت	مادھوری اگست
۱۰۔	ادھار	چاند ستمبر
۱۱۔	توبہ	مادھوری ستمبر
۱۲۔	شطرنج کے کھلاڑی	مادھوری اکتوبر
۱۳۔	مایۂ تفریح	مادھوری نومبر
۱۴۔	سوا سیر گیہوں	چاند۔ نومبر
۱۵۔	تینتر	چاند۔ دسمبر

۱۹۲۵ء

۱۔	ڈگری کے روپے	مادھوری جنوری
۲۔	دھکار	چاند۔ فروری
۳۔	تہذیب کا راز	مادھوری مارچ
۴۔	حسرت	چاند مارچ
۵۔	دیر و حرم	مادھوری اپریل
۶۔	وشواس	چاند اپریل
۷۔	ماں کا دل	چاند جولائی
۸۔	بھاڑے کا ٹٹو	مادھوری جولائی
۹۔	جنت کی دیوی	چاند ستمبر
۱۰۔	چوری	مادھوری ستمبر
۱۱۔	سزا	چاند اکتوبر

۱۹۲۶ء

۱۔	لیلیٰ	سرسوتی جنوری
۲۔	نیچ ذات کی لڑکی	چاند جنوری
۳۔	تالیف	مادھوری فروری
۴۔	پریم سوتر	سرسوتی۔ اپریل
۵۔	قزاقی	مادھوری اپریل
۶۔	الزام	مادھوری اگست
۷۔	سمپادک موٹے رام شاستری	مادھوری۔ ستمبر
۸۔	رام لیلا	مادھوری۔ اکتوبر
۹۔	دعوت	سرسوتی نومبر
۱۰۔	بھشکار	چاند دسمبر
۱۱۔	دینداری	مادھوری دسمبر

نوٹ: دوسرے دور کی کہانیوں کی مجموعی تعداد ۱۰۲ ہے۔

تیسرا دور ۱۹۲۷ء سے ۱۹۳۶ء تک

۱۹۲۷ء

۱۔	بڑے بابو	بہارستان فروری
۲۔	ستی	مادھوری مارچ
۳۔	نغمۂ روح	نیرنگ خیال۔ مارچ۔ اپریل
۴۔	نخلِ امید	مادھوری اپریل
۵۔	مندر	چاند مئی
۶۔	سبحان بھگت	مادھوری مئی
۷۔	مستعار گھڑی	مادھوری جولائی
۸۔	ایکٹریس	مادھوری اکتوبر

۱۹۲۸ء

۱۔	مزارِ عاشق	مرقع جنوری
۲۔	موٹے رام جی شاستری	مادھوری جنوری
۳۔	پن ہاری کا کنواں	مادھوری جنوری
۴۔	منتر	زمانہ فروری
۵۔	دو سکھیاں	مادھوری مئی
۶۔	شدھی	خواب وخیال۔ اپریل
۷۔	خودی	خاک پروانہ
۸۔	نادان دوست	، ،
۹۔	سہاگ کا جنازہ	مادھوری جولائی
۱۰۔	داروغہ کی سرگزشت	مادھوری اگست
۱۱۔	ابھلاشا	مادھوری اگست
۱۲۔	خانہ برباد	مادھوری، نومبر
۱۳۔	بہتی	نیرنگ خیال۔ دسمبر
۱۴۔	کشمکش	مادھوری دسمبر
۱۵۔	استعفیٰ	بھارت بیندو، دسمبر

۱۹۲۹ء

۱۔	کفارہ	سرسوتی جنوری
۲۔	ذلت (دکھڑا)	مادھوری فروری
۳۔	گلی ڈنڈا	ہنس فروری
۴۔	نیایہ	مادھوری مارچ
۵۔	فاتحہ	وشال بھارت، مارچ
۶۔	پروت یاترا	مادھوری اپریل
۷۔	مان	مادھوری جولائی
۸۔	قانونی کمار	مادھوری اگست
۹۔	منی	متوالہ ۳۱۔ اگست
۱۰۔	علیحدگی	مادھوری اکتوبر
۱۱۔	خانہ داماد	مادھوری نومبر
۱۲۔	بھزجان	وشال بھارت، دسمبر
۱۳۔	گھاس والی	مادھوری دسمبر
۱۴۔	آنسوؤں کی ہولی	پریم تیرتھ
۱۵۔	جہاد	پانچ پھول

۱۹۳۰ء

۱۔	مزارِ الفت	مایا جنوری
۲۔	دھکار	مادھوری فروری
۳۔	جلوس	ہنس مارچ
۴۔	سبھاگی	مادھوری مارچ
۵۔	بیوی سے شوہر	مادھوری اپریل
۶۔	سمر یاترا	ہنس اپریل
۷۔	شراب کی دکان	ہنس مئی
۸۔	پوس کی رات	مادھوری مئی
۹۔	سہاگ کی ساڑی	اوشا مئی
۱۰۔	میکو	ہنس جون
۱۱۔	سوپن	وینا جولائی
۱۲۔	ترسول	پریم چالیسی
۱۳۔	بند دروازہ	پریم چالیسی
۱۴۔	دیوی	پریم چالیسی
۱۵۔	قوم کا خادم	پریم چالیسی
۱۶۔	جیل (آہوتی)	ہنس نومبر

۱۹۳۱ء

۱۔	وطن کی قیمت	نیرنگ جنوری
۲۔	ایثار	مادھوری جنوری
۳۔	آشیاں برباد	ہنس فروری
۴۔	غریب	مادھوری فروری
۵۔	ڈھپور سنگھ	ہنس مارچ
۶۔	آخری جلسہ	ہنس اپریل
۷۔	ہولی کا اپہار	مادھوری اپریل
۸۔	ڈیمانسٹریشن	پریا۔ اپریل
۹۔	تحریک	وشال بھارت مئی
۱۰۔	طلوعِ محبت	ہنس جون
۱۱۔	آخری تحفہ	چندن اگست

- تاوان	ہنس ستمبر
- دوسری شادی	چندن ستمبر
- مالکن	وشال بھارت
- دو بیل	ہنس اکتوبر
- نجات	وشال بھارت اکتوبر
- ادیب کی عزت	ہنس نومبر
- سوت	وشال بھارت۔ دسمبر

۱۹۳۲ء

زیور کا ڈبہ	مادھوری مارچ
شکوہ شکایت	ہنس اپریل
- کتنا	جاگرن، جولائی
- جھانکی	" اگست
ٹھاکر کا کنواں	" "
کسم	عصمت سالگرہ نمبر
ڈامل کا قیدی	ہنس نومبر
بدنصیب ماں	چاند نومبر
روشنی	ادبی دنیا۔ نوروز نمبر
زاد راہ	پریرنا اور انیہ کہانیاں
نگاوا	" " " "

۱۹۳۳ء

کایر	وشال بھارت جنوری
نیوٗر	ہنس جنوری
ویشیا	چاند فروری
رسیک سمپادک	جاگرن مارچ
معصوم بچہ	ہنس اپریل
نئی بیوی	افسانہ مئی
اکسیر	چاند مئی
قیدی	ہنس جولائی
عیدگاہ	عصمت سالگرہ نمبر
دل کی رانی	چاند نومبر

۱۹۳۴ء

نشہ	رہنمائے تعلیم۔ جنوری
سکونِ قلب	بھارتی فروری
منوورت	ہنس مارچ
جادو	ہنس مئی
ریاست کا دیوان	ہنس مئی
۶- دودھ کی قیمت	ہنس جولائی
۷- پنڈت موٹے رام کی ڈائری	جاگرن۔ جولائی
۸- مفت کرم داشتن	ہنس اگست
۹- قہر خدا کا	ہنس اکتوبر
۱۰- انصاف کی پولس	چاند نومبر
۱۱- بڑے بھائی صاحب	ہنس نومبر
۱۲- ستی	آخری تحفہ
۱۳- قاتل	" "
۱۴- وفا کی دیوی (۱)	" "

۱۹۳۵ء

۱- سوانگ	جامعہ۔ جنوری
۲- وفا کی دیوی (۲)	چاند اپریل
۳- وفا کا دیوتا	ہنس اپریل
۴- لعنت	ہنس جون
۵- زاویہ نگاہ	چاند اگست
۶- پیر جی	مادھوری اکتوبر
۷- لاٹری	ہنس اکتوبر
۸- کفن	جامعہ دسمبر
۹- حقیقت	ادبی دنیا۔ دسمبر

۱۹۳۶ء

۱- مس پدما	زاد راہ مئی
۲- ہولی کی چھٹی	" "
۳- دو بہنیں	مادھوری اگست
۴- رہسیہ	ہنس۔ ستمبر
۵- کشمیری سیب	ہنس اکتوبر

پریم چند کی مندرجہ ذیل دو کہانیاں ایسی ہیں جو پہلی مرتبہ ان کی وفات کے بعد ۱۹۳۷ء میں شائع ہوئیں۔

۱- کرکٹ میچ	زمانہ۔ جولائی
۲- غم نہ داری بز بخر	واردات نومبر

مندرجہ ذیل افسانوں کی پہلی اشاعت کی تاریخ کا تعین ہونا ابھی باقی ہے

۱- الوکھو	مان سروور ۱
۲- بابا جی کا بھوج	" " ۳
۳- ایک آنچ کی کسر	" " ۳
۴- پریم کی ہولی	کفن
۵- جرمانہ	"
۶- سچائی کا اپہار	مان سروور

(بقیہ صفحہ پر)

۷۔	موٹر کی چھینٹیں	مان سرودر ۲
۸۔	یہ بھی نشہ وہ بھی نشہ	کفن
۹۔	ویراگیہ	سوادھیشا

پریم چند نے مندرجہ ذیل کہانیوں کے انگریزی اور بنگلہ زبانوں سے ترجمے کیے تھے اس لیے انھیں طبعزاد نہیں کہا جا سکتا۔

۱۔	اشک ندامت	کہکشاں۔ جنوری ۱۹۲۰ء
۲۔	آب حیات	صبح امید۔ مارچ ۱۹۲۰ء
۳۔	سگ لیلیٰ	ادیب ۔ اپریل ۱۹۱۳ء
۴۔	اپنے فن کا استاد	زمانہ ۔ ستمبر ۱۹۱۶ء

"میں نے جو کچھ لکھا حسب ضرورت پہلے اردو میں لکھا یا پہلے ہندی میں لکھا مگر سب کچھ دونوں زبانوں میں لکھا اور آج ایسی ایک لائن بھی نہیں ہے جو اردو اور ہندی دونوں میں نہ ہو۔"

(پریم چند شاہکار۔ لاہور۔ مئی ۱۹۳۶ء

نوٹ۔

پریم چند کی دریافت شدہ طبعزاد کہانیوں کی مجموعی تعداد کسی اعتبار سے بھی ۲۸۰ سے زائد نہیں ہو سکتی۔ اس میں "برات" اور "قاتل کی ماں" کو شامل نہیں کیا گیا ہے۔ یہ شورانی پریم چند کی ہی کہانیاں ہیں جو غلطی سے پریم چند کے مجموعہ میں شامل کر لی گئی ہیں۔ "برات" شورانی کے نام سے جون ۱۹۳۲ء کے "نیرنگ خیال" میں شائع بھی ہو چکی ہے۔

(بقیہ: پریم چند کی تاریخ پیدائش)

لیکن یہ جنم کنڈلی کی تاریخ سے مختلف ہے۔ اگر ہم یہ بھی تسلیم کر لیں کہ الہ آباد یونیورسٹی نے امتحان دینے کے مہینے سے عمر کا حساب لگایا تب بھی سرٹیفکٹ اور جنم کنڈلی کی تاریخوں میں بڑا اختلاف رہتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی حیرت کی بات ہے کہ پریم چند کی سروس بک میں تحریر شدہ تاریخ پیدائش نہ تو جنم کنڈلی سے ملتی ہے اور نہ انٹرنس سرٹیفکٹ سے۔ سروس بک میں ان کی تاریخ پیدائش ۱۰ اگست ۱۸۸۱ء ہے۔ اس طرح پریم چند کی تاریخ پیدائش کے سلسلے میں تین تاریخیں ہم دست ہوتی ہیں۔ ان کی جنم کنڈلی والی مروجہ تاریخ کی دو حاصل شدہ ثبوتوں سے تائید نہیں ہوتی۔ اس لیے اس کی صداقت کا مشکوک ہونا فطری ہے۔

آخر میں پریم چند ساہتیہ کے مطالعہ کرنے والوں کو چاہیے کہ ان کی جنم کنڈلی کو تلاش کریں جس سے یہ شک رفع کیا جا سکے۔ پھر صرف انٹرنس سرٹیفکٹ اور سروس بک میں الگ الگ تاریخوں کا راز معلوم کرنا باقی رہ جائے گا۔ پریم چند نے ان دونوں پر اپنی اصل تاریخ کیوں نہیں درج کرائی اور کیوں دو الگ الگ غیر حقیقی تاریخیں لکھوانا مناسب سمجھا؟ اس کا ٹھیک ٹھیک جواب دینا ممکن نہیں ہے۔ اب صرف قیاس کی بنیاد پر ہی کہا جا سکتا ہے کہ پریم چند نے طویل مدت تک سرکاری نوکری کرنے کی آرزو میں اپنی عمر کم لکھا دی ہوگی۔ پھر بھی انٹرنس سرٹیفکٹ اور سروس بک میں تاریخ پیدائش کے اختلاف کا سبب سمجھ پانا مشکل ہی ہے۔

پریم چند کے چھوٹے بھائی شری مہتاب رائے کے بیٹے ڈاکٹر رام کمار رائے سے حاصل شدہ میٹرک سرٹیفکٹ۔ اس میں واضح طور پر لکھا ہوا ہے کہ دھنپت رائے نے ۱۷ برس ۴ ماہ کی عمر میں جنوری ۱۸۹۹ء میں سیکنڈ ڈویژن میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔

(بقیہ: پریم چند بہ حیثیت سیرت نگار)

اور وہ بھی کرب میں مبتلا رہتے ہیں۔ پریم چند نے ان کی نفسیات کو بھی بڑی فنکاری سے بے نقاب کیا ہے۔ گھر کی تباہی و بربادی طوطا رام کی ذہنی پراگندگی کے سبب رونما ہوتی ہے۔ ایک گناہ دوسرے گناہ کو جنم دیتا ہے جس کا اثر پورے معاشرہ پر پڑتا ہے۔

پریم چند ایک کامیاب صناع تھے خصوصاً سیرت نگاری میں انھیں مہارت حاصل تھی۔ متوسط گھرانے کی زندگی اور اس کے مسائل کا بہت گہرائی سے مطالعہ کیا تھا اس لیے تمام کردار مختلف رنگ و انداز میں نظر آتے ہیں۔ ان کے کردار ایک دوسرے سے مماثل نہیں ہیں۔ بازار حسن کی سمن میں خود داری خود سری خود نمائی اور غرور ہے۔ وہ ظلم اور بے انصافی کے خلاف آواز اٹھانے کی جرأت رکھتی ہے جب اس کا شوہر اسے گھر سے نکال دیتا ہے تو اپنی طبیعت کے مطابق ایک راستہ ڈھونڈ لیتی ہے۔ نرملا میں یہ خصوصیات نہیں ہیں۔ اس میں تحمل، بردباری انکساری، صبر اور نیکی ہے۔ وہ ظلم و جبر خاموشی کے ساتھ برداشت کرتی جاتی ہے۔ سسرال آکر اس کے سارے خواب چکنا چور ہو جاتے ہیں لیکن حرف شکایت زبان پر نہیں لاتی۔ منسا رام سے میل ملاپ جب اس کا شوہر شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے تو وہ ملنے سے گریز کرتی ہے۔ سمن شوہر کے ساتھ بدزبانی پر اتر آتی ہے۔ اس کی باتوں کا منہ توڑ جواب دیتی ہے۔ یہ دونوں کردار سیرت کے اعتبار سے بالکل مختلف ہیں ان کا انفرادی رنگ بہت گہرا ہے۔ چونکہ پریم چند نے ان کی داخلیت کی تصویر کشی کی ہے، جذبات کا تجزیہ کیا ہے اور نفسیاتی گتھیوں کے اسباب ظاہر کیے ہیں۔ اس لیے یہ زندہ جاندار حقیقت اور واقعیت سے بہت قریب نظر آتے ہیں۔ مصنف کی یہ بہت بڑی کامیابی ہے کہ ایک ہی طبقے کے کرداروں کو انفرادی رنگ میں پیش کیا ہے۔

نرملا کا المیہ سماجی ہے۔ مرتے وقت اپنی بچی کو اپنی نند رکمنی کے حوالے کرتے ہوتے نرملا کا یہ کہنا کہ "چاہے کنواری رکھیے گا چاہے زہر دے کر مار ڈالیے گا مگر نااہل کے گلے نہ باندھیے گا۔ اتنی ہی آپ سے میری بنتی ہے"۔ اس کے نفسیاتی کشمکش کی غمازی کرتا ہے۔ اس لیے ناول میں پریم چند کی حقیقت نگاری مقام عروج پر ہے ان کا فن مثالیت سے ہم آہنگ نہیں ہوتا۔ نرملا کے سارے کردار حقیقی اور زندہ

س تھا وہ فسانہ نگار تھا
اس کا تخییل شکار تھا
۔نے دل سے کہانی عوام کی
وورد کے ماروں سے پیار تھا
پھول چنتا تھا وشتِ حیات میں
س کے غم کا چمن لالہ زار تھا
یں ذات کے مشعل بکف تھا وہ
لیات کا آئینہ دار تھا
یر تند ہوائے فرنگ میں
۔بان جوئے بے کنار تھا
بلے تھی اس کی کشتِ فن
زر سے سلا کا نکھار تھا
ی شگفتگی اس کے نفس میں تھی
شہر تھا، گاؤں کا یار تھا

منظر شہاب

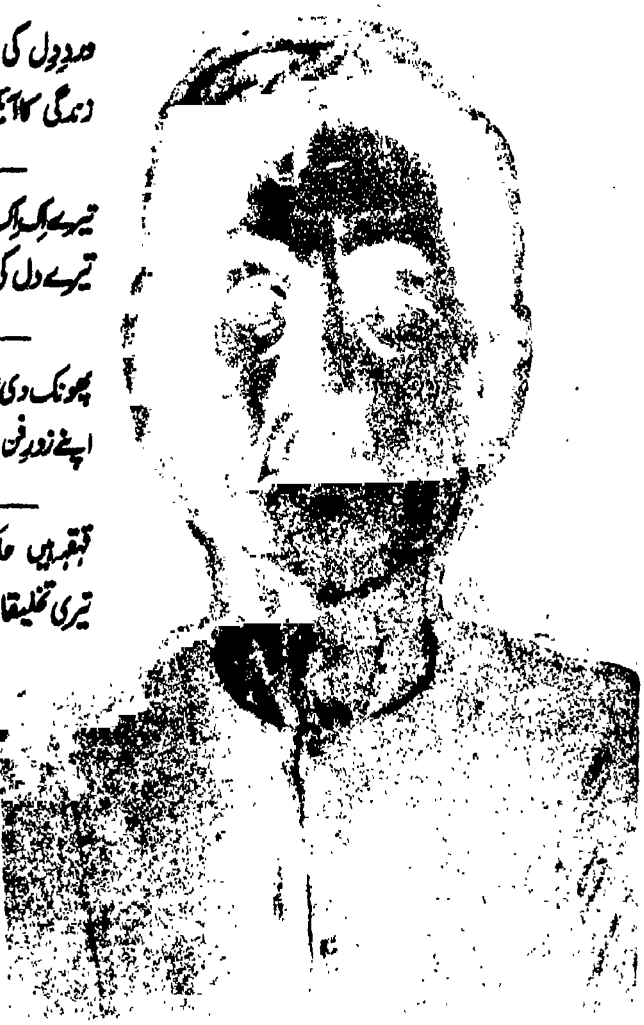

دردِ دل کی ترجمانی کی تجھے
حق نے دی توفیق منشی پریم چند!
زندگی کا آئینہ ہے اصل میں
تیری ہر تخلیق منشی پریم چند!

تیرے اِک اِک لفظ اِک اِک بات پر
جھومتا مستی سے سر دُھنتا رہا
تیرے دل کی دھڑکنوں میں یہ سماج
اپنے دل کی دھڑکنیں سنتا رہا

پھونک دی ناول میں تازہ زندگی
زندگی سے بھر دیا بے جان جسم
اپنے زورِ فن سے منشی پریم چند
تو نے عیاری کا توڑا تھا طلسم

قہقہے ہیں حاکمانِ وقت کا
اور محکوموں کی دل کی چیخ ہیں
تیری تخلیقات کی کیا بات ہے
درحقیقت وقت کی تاریخ ہیں

دانا گنوری

وہ پروانہ تھا سوزِ زندگی کی بات کہتا تھا
جلا کر شمعِ محفل روشنی کی بات کہتا تھا
ہر اک انسان سے زندہ دلی کی بات کہتا تھا
مجاہد تھا، جہادِ زندگی کی بات کہتا تھا
وہ ہر مسلک کا حامی تھا، وہ ہر مذہب کا شیدائی
وہ سب سے اتحادِ باہمی کی بات کہتا تھا
قلم اس کا وقارِ مشعلِ راہِ حقیقت تھا
منازل آشنا تھا، رہبری کی بات کہتا تھا
فسردہ غنچہ و گل دیکھ کر دل اس کا روتا تھا
وہ مرجھائی ہوئی اک اک کلی کی بات کہتا تھا
چمن والو! اسے دورِ خزاں سے سخت نفرت تھی
وہ دیوانہ بہارِ زندگی کی بات کہتا تھا
حقیر و ناتواں دل میں سمجھتی تھی جسے دنیا
وہ ذرہ کہکشاں سے ہمسری کی بات کہتا تھا
جگر میں ٹیس تھی جس کے لبوں پر مہرِ خاموشی
وہ ایسے زخم خوردہ آدمی کی بات کہتا تھا
عظیم المرتبت ہوتے ہوئے یہ انکساری تھی
کہ دشمن سے بھی اپنے دوستی کی بات کہتا تھا
تعصب کے اندھیرے ڈس رہے تھے نوعِ انساں کو
محبت سے وہ اس دم روشنی کی بات کہتا تھا
ذرا سی دیر میں چہروں کا نقلی روپ اڑ جائے
رنگیلوں میں وہ ایسی سادگی کی بات کہتا تھا
نہ جانے کون سے عالم میں لایا تھا جنوں اس کو
وہ مستانہ رموزِ آگہی کی بات کہتا تھا
لہو سے گلشنِ اردو ادب کو اس نے سینچا تھا
وہ مالی تھا بہارِ دائمی کی بات کہتا تھا

ہمیں اپنے ہی افسانے کا ہوتا تھا گماں اکثر
کسی سے رازؔ جب بھی وہ کسی کی بات کہتا تھا

شفیع اللہ خاں راز

T Regd. No. D(D-103)

948/57

Licensed U(D)-50 to post without pre-payme
at Civil Lines Post Office, Delhi.

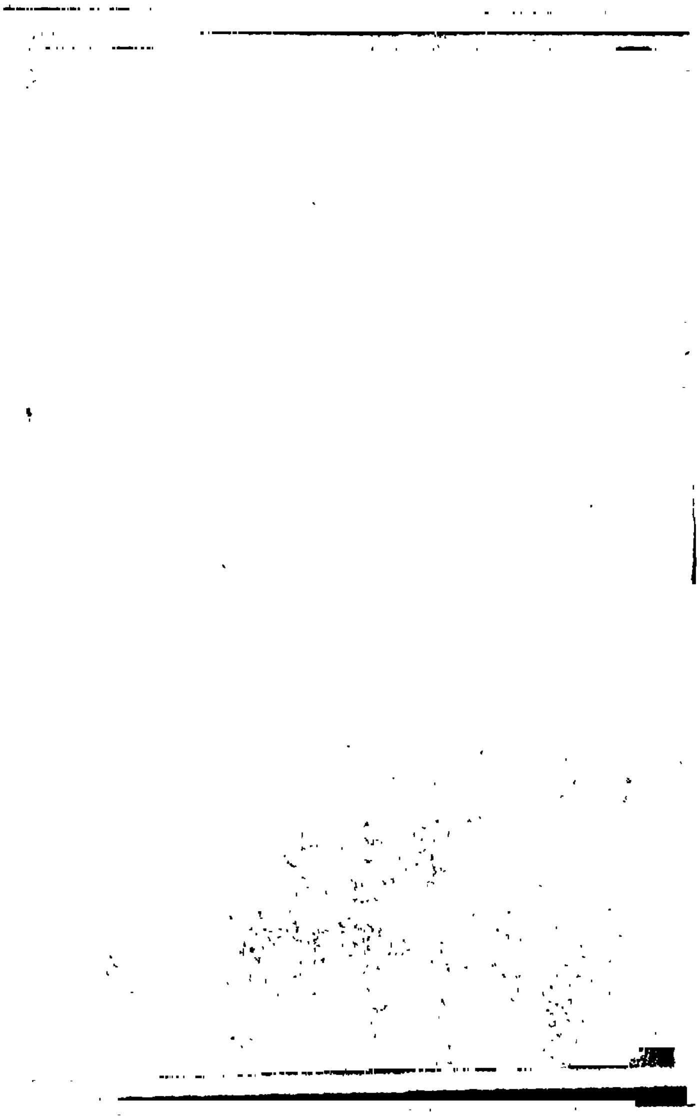

عظیم زندگی کا خاتمہ

۲۴ جون ۱۹۸۰ء کو سابق صدر جمہوریہ ہند شری وی۔ وی۔ گری کا انتقال ہوگیا۔ شری گری نے ہندوستان کی جنگ آزادی میں نمایاں حصہ لیا تھا خصوصاً مزدوروں کو منظم کرنے اور اس تحریک کو مضبوط بنانے میں ان کی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔

سانحۂ عظیم

۲۳ جون ۱۹۸۰ء کو نوجوان رہنما اور ممبر پارلیامنٹ شری سنجے ایک ہوائی حادثے میں ہلاک ہوگئے۔ ان کی اچانک اور نا وقت موت سے ایک ایسا خلا پیدا ہوگیا ہے جو پُر نہ ہو سکے گا۔

shed by the Director. Publications

آجکل

ترتیب

ہماری آزادی — قسیم الحق گیاوی — ۲
دلہن کیسے ملی — کرشن چیتنیہ — ۳
لطیفے — ۶
تھرمامیٹر کی کہانی — محمد خلیل — ۷
بارش (نظم) — خسرو متین خسرو — ۸
بے وقوف پپّو — سرجیت — ۹
سرسید اور ان کی والدہ — محمد معصوم — ۱۱
سر آئزک نیوٹن — ۱۳
کیا تم جانتے ہو؟ — کرشن کوشل — ۱۵
بھولے ناتھ — ڈی۔ کے۔ کنول — ۱۶
خلال — وسیم چشتی — ۱۷
شاڈشرب بڑشڑ بڑشوں — فیضان نادر — ۱۸
ایک تھیلی کے چٹے بٹے — محمد عدیل احمد — ۱۹
ظلم کا نتیجہ — شاہد آرزو — ۲۰
ڈاک ٹکٹ کی کہانی — فضل امام ملک — ۲۱
عجیب و غریب سائنسداں — محمد عارف غازی — ۲۲
ٹرام (نظمیں) — کوثر سہروردی — ۲۵
ہیلی کوپٹر (نظمیں) — ناوک حمزہ پوری — ۲۵
ملا نصر الدین — شیوناتھ سکّہ — ۲۶
وطن میرا گلستاں ہے — نثار احمد صدیقی — ۲۸
غزل — مسعود علی — ۲۸
دلچسپ پہیلیاں — عزیز مراد آبادی — ۲۹
احساس — مظلوم مضطر — ۳۰
کارٹون — ۳۱

ایڈیٹر
شہباز حسین
اسسٹنٹ ایڈیٹر
محمد عادل صدیقی
سب ایڈیٹر
شیوناتھ سکّہ

ہماری آزادی

قسیم الحق گیاوی

مری نگاہ میں ہیں واقعاتِ آزادی
تمام عزم و عمل حادثاتِ آزادی
ہوئی جو یورشِ آفات ہنس کے ٹال
مصیبتوں کو مسرت میں ہم نے ڈھال
یہ وہ چمن ہے جسے ہم نے خون سے سینچا
ثبوت ہے یہ ہمارے خلوص و محنت کا
نثار اس کے لیے جان و تن ہمارے
فدائیانِ وطن مرد و زن ہمارے
نگاہ جب بھی اٹھی ہے کسی کی للچائی
ہماری جان ہمارے وطن کے کام آئی
شہید ہو گئے اپنے وطن کی عزت پر
نہ آنچ آنے دی بھارت کی سالمیت پر
یہی نہیں کہ یہ اک داستانِ ماضی ہے
یہ جوش اور یہ جذبہ تو غیر فانی ہے
ہماری جہدِ مسلسل برائے آزادی
کہ ہم ہیں قدر شناسِ فضائے آزادی
سدا بلند رکھیں گے لوائے آزادی
قسیم ہم کو ہے فکرِ بقائے آزادی

LAKSHMI NARAIN LIBRARY ... NEW DELHI-110

کرشن چیتنیہ

دلہن کیسے ملی؟

پاٹلی پتر میں نندا نام کا ایک امیر سوداگر تھا۔ یوں تو اس کی عزت
تھی لیکن اس کے کوئی لڑکا نہ تھا۔ اس لیے وہ اداس رہتا تھا۔
کے ایک بیٹی تھی جس کا نام سنندا تھا۔ نندا نے چاہا کہ اس کی
ی کسی ایسے نوجوان سے کر دے جو اس کے بڑے کاروبار
نبھال سکے۔ نندا نے اس کی شادی ایک خوبصورت نوجوان آنند
نا چاہی مگر اس کا تعلق کسی بڑے گھرانے سے نہ تھا اس لیے
نے مشورہ دیا کہ اس کی شادی جیوکا سے کر دی جائے کیوں کہ
تعلق بیوپاری گھرانے سے تھا۔ نندا سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے
ر جیوکا دونوں کو روپیہ دیا کہ وہ پانچ پانچ سو گاڑیوں کا قافلہ
بارت کے لیے نکلیں۔ اس نے کہا کہ جو بھی زیادہ منافع کما کر
ا اس سے سنندا کی شادی کر دی جائے گی۔

جیوکا چالاک آدمی تھا، وہ اپنے قافلے کو لے کر پہلے ہی تجارت
کے لیے نکل گیا۔ تاکہ آنند کے جانے سے پہلے ہی لوگوں کے پاس
پہنچ کر اپنا سامان فروخت کر ڈالے۔ لیکن جلدی میں وہ اپنے سارے
انتظامات ٹھیک ڈھنگ سے نہ کر سکا۔ لہٰذا جب وہ پانچ سو گاڑیوں
کو لے کر روانہ ہوا تو سارا کارواں بے ترتیب ہو گیا۔ اونٹ اور
بیل ایک ساتھ نہیں چل سکے۔ اناج کے بورے ٹھیک طرح سے
نہیں باندھے گئے تھے اور اناج کے دانے راستہ میں بکھرنے
لگے۔ لوگوں کو راستہ میں بڑی مشکلیں اٹھانی پڑیں۔

کئی ہفتے چلنے کے بعد اس کارواں کو ایک ریگستان سے
گزرنا پڑا۔ جس راستے سے جیوکا گزر رہا تھا۔ اس سے کچھ دور فاصلے
پر ایک نخلستان تھا۔ یہاں ایک تالاب تھا۔ یہاں ایک ڈاکو نے
اپنے دس ساتھیوں کی مدد سے قافلہ کو لوٹنے کی اسکیم بنائی۔ اس

نے اپنے گھوڑوں کو کیچڑ میں لت پت کر دیا اور پھر جیوکا کے پاس
آئے اور کہا کہ ہم یہاں کے بادشاہ کی طرف سے بھیجے گئے ہیں۔ جیوکا
گھوڑوں کو پانی میں بھرا دیکھ کر خوش ہوا اور اس نے ڈاکوؤں کے
سردار سے پوچھا کہ کیا قریب میں کوئی تالاب ہے۔ سردار نے بتایا کہ
جی ہاں۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے انھیں ادھر جانے کو کہا جدھر
تالاب نہیں تھا۔ سردار نے کہا کہ ادھر پانی بہت ہے۔ آپ اپنا پانی

گرا دیں اور پھر جلدی سے وہاں پہنچ کر تازہ پانی وہاں بھر لیں۔ جیوکا ڈاکوؤں کی باتوں میں آ گیا۔ جب قافلہ ادھر روانہ ہوا جدھر جانے کے لیے ڈاکوؤں کے سردار نے کہا تھا تو وہاں سوائے ریت کے اور کچھ نہیں دکھائی دیا۔ آخر کار چلتے چلتے یہ لوگ تھک گئے اپنا پانی یہ لوگ پہلے ہی گرا چکے تھے، اس لیے پیاس میں آگے بڑھنا دشوار ہو رہا تھا۔ اس موقع پر ڈاکوؤں نے اس قافلے پر حملہ کر دیا اور انھیں لوٹ لیا۔ جیوکا کے بہت سے آدمی مارے گئے۔ جو باقی بچے وہ شرم کے مارے وطن نہیں لوٹ سکے اور ادھر ادھر بھاگ گئے اور مانگ کر یا مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالتے رہے۔

لوگ اپنے پروگرام سے لوگوں کا دل بہلا سکیں۔ اس نے سوچا کہ ایسے بھی یہ لوگ آس پاس کے علاقوں میں جا کر اپنا پروگرام دکھا کر پیسہ کما سکیں گے اور ہمارے آنے کا اعلان کر سکیں گے۔ اس کے قافلے میں ایک شخص وکرم نامی بھی تھا جو کافی علاقوں کی سیر کر چکا تھا۔ اور جسے جڑی بوٹیوں وغیرہ کا کافی علم تھا۔ آنند نے سوچا کہ قافلہ میں زیادہ لوگ شامل ہیں اس لیے جھگڑے بھی ہو سکتے ہیں لہٰذا ایک ایسا سادھو رہنا چاہیے جو انھیں میل ملاپ کے ساتھ رہنا سکھاتا رہے۔ لہٰذا اس نے بدھا داس نامی شخص کو بھی اس قافلے میں لے لیا۔

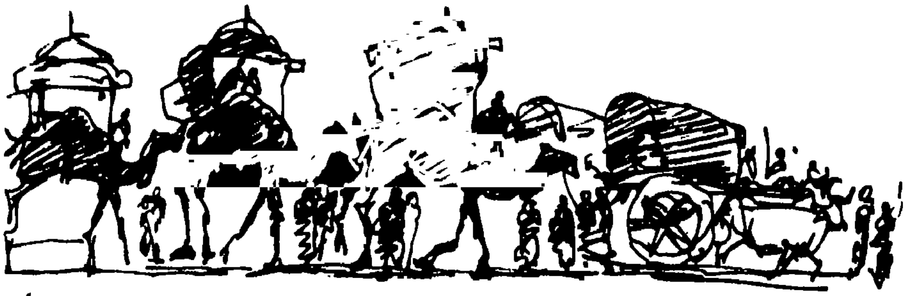

جیوکا کے چلے جانے کے بعد آنند نے بھی اپنا قافلہ تیار کیا۔ اس نے پہلے تجربہ کار لوگوں سے بات کی اور راستہ کی مشکلات کو سمجھ لیا۔ اس نے گاڑیوں کے پہیوں کو مضبوط بنایا۔ ان کے چاروں طرف لوہے کے گھیرے لگوا دیئے۔ کچھ گاڑیوں کو مریضوں کے خیال سے بہت آرام دہ بنوایا۔ تاکہ اگر راستہ میں کسی کو تکلیف ہو تو اسے آرام سے اس میں لٹا دیا جائے۔ اس نے اپنے قافلے میں تھوڑی سی بکریاں بھی لیں تاکہ راستہ سے ہٹ کر ادھر اُدھر کے جو قصبے ہوتے ہیں ان تک ان بکریوں پر سامان لاد کر پہنچایا جا سکے۔ اس نے اپنے قافلے میں ایسا سامان زیادہ لیا جو وزن میں کم اور قیمت میں زیادہ تھا۔ مثلاً یہ کہ کپڑا، خوشبویات، ہیرے، صندل کی لکڑی وغیرہ وغیرہ۔ اس کے قافلے میں دو ایسے لڑکے بھی شامل ہو گئے جو پودوں کا علم جاننے کے لیے سفر کرنا چاہتے تھے۔ اس نے اپنے قافلے میں ایک مداری نٹ اور ایک گانا گانے والے کو بھی شامل کر لیا تاکہ شام کو جب قافلہ کے لوگ تھک جائیں تو یہ

آخر کار یہ قافلہ پاٹلی پتر سے روانہ ہوا۔ کچھ دنوں چلنے کے بعد یہ قافلہ راستہ میں دریا کے کنارے ٹھہرا۔ اس نے دیکھا کہ اس آبادی کے کچھ لوگ دریا پار کر کے جاتے ہیں اور وہاں سامان بیچتے ہیں۔ دریا پار کرانے کے لیے ایک کشتی تھی، اس کا چلانے والا خوش مزاج اور سیدھا سادہ آدمی تھا۔ کئی بار آدمی دریا پار کر کے اسے پیسہ دیئے بغیر ہی چل پڑتے۔ آنند نے اسے مشورہ دیا کہ وہ آدمی سے پہلے ہی پیسہ لے لیا کرے۔ ایسا کرنے سے اس شخص کی آمدنی میں کافی اضافہ ہوا۔ وہ آنند سے خوش ہوا اور اس نے چاہا کہ آنند کا کچھ فائدہ کرا دے۔ اس نے آنند کی ملاقات ایک ایسے آدمی سے کرائی جو ہاتھی دانت کا کاروبار کرتا تھا۔ بھارت کا ہاتھی دانت کام پوری دنیا میں پہلے ہی سے مشہور رہا ہے۔ جب کشتی والے نے آنند کو ہاتھی دانت کا کاروبار کرنے والے سے ملایا۔ تو پہلے تو وہ آنند کو ہاتھی دانت دینے پر راضی نہ ہوا لیکن جب آنند نے اس کی قیمت اس سے کہیں زیادہ لگائی جو اسے دوسرے بیوپاری دے رہے تھے

ں ہوگیا۔ یہ سامان وزن میں ہلکا تھا اور اس سے اسے بعد میں فائدہ ہوا۔

یہ قافلہ آگے بڑھا۔ آنند نے چھ آدمیوں کی ایک ٹولی بنائی جو ے پر سوار ہو کر ایک دن پہلے اس راستہ کو جا کر دیکھتے جس ں کے قافلے کو جانا ہوتا تھا۔ رات کو یہ قافلہ جہاں کہیں آرام کرتا وگ جاگ کر پہرہ دیتے تاکہ جانوروں اور چوروں سے حفاظت سکے۔

ایک جگہ دو آدمیوں نے بغیر جانے دو بیر کھا لیے ھا کر وہ بیمار پڑ گئے۔ ان کی بیماری کے لیے کوئی دوا پاس لیکن وکرم کا تجربہ کام آیا اور وہ دوڑ کر کوئی جڑی بوٹی لے آیا سے انھیں فائدہ ہو گیا۔

ریگستانی علاقے کو پار کرتے وقت ایک دفعہ ایسا ہوا کہ استہ بہت خراب تھا جہاں چلنے میں بڑی پریشانی آ رہی تھی۔ جہ سے یہاں سفر کرنے میں اندازے سے زیادہ دن لگ رہے ڈر یہ تھا کہ کہیں پانی ختم نہ ہو جائے۔ آخرکار یہ قافلہ ایسی جگہ پہنچ

ہاں ریت کے ڈھیر تھے۔ اور جہاں سے ان کی منزل صرف دو دن ۔ اس قافلے کے آگے سینیا نام کا آدمی رہتا تھا۔ یہ بوڑھا اور کار آدمی تھا۔ اس کی گاڑی آگے رہتی تھی اور اس میں کوئی ی سامان نہ رہتا تھا۔ بلکہ پانی کے برتن رکھے رہتے تھے تاکہ یہ

گاڑی قافلے سے پیچھے نہ رہ جائے۔ ریگستان میں پانی کا ساتھ رکھنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ جب قافلے کو پتہ چلا کہ اب صرف دو دن کا سفر باقی رہ گیا ہے تو اسے بڑی خوشی ہوئی۔ سینیا تھکا ماندہ تو تھا ہی اس نے سوچا کہ پانی گرا کر گاڑی کو ہلکا کر لیا جائے اور جلدی سے منزل پر پہنچ جائے۔ باقی قافلہ جلدی جلدی آجائے گا۔ اگر نہ آسکا تو میں لوٹ کر پھر اپنے قافلے میں آ جاؤں گا۔ یہ سوچ کر اس نے پانی گرا دیا اور گاڑی میں لیٹ کر سو گیا۔ گاڑی آگے بڑھی لیکن آگے ریت کا ڈھیر تھا۔ اس لیے اس سے آگے کی طرف نہ جا کر جس راستے سے چلی تھی، اسی طرف کو لوٹ گئی۔ اس طرح یہ قافلہ صبح کو پھر وہیں تھا جہاں سے کہ چلا تھا۔ افسوس یہ تھا کہ پانی کا ذخیرہ پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ اس طرح یہ قافلہ مصیبت میں گھر گیا۔ مگر آنند نے مصیبت میں بھی ہمت نہیں ہاری۔ اس نے چاروں طرف آدمی بھیجے تاکہ کہیں پانی کا پتہ چل جائے۔ اسے اچانک ایک ایسی جگہ ملی جہاں ہلکی سی گھاس تھی۔ اس نے سوچا کہ یہاں پانی کی کمی نہ ہوتی تو گھاس کیسے آگئی، اس نے پھاوڑے سے چٹان کاٹی اور اس طرح کوشش کر کے اسے ایک چشمہ مل گیا۔ اس نے اس چشمے سے اپنے برتن بھر لیے۔ اس طرح یہ مصیبت ان کے سر سے ٹل گئی۔ اس نے نصیحت کی کہ آئندہ جب تک ہمیں پانی نہ ملے ہمیں اپنا پانی نہیں پھینکنا چاہیے چاہے وہ خراب ہی ہو گیا ہو۔

اتفاق سے یہ قافلہ بھی وہیں پہنچ گیا جہاں کہ جیوکا نے دھوکا کھایا تھا۔ اس قافلے کے پاس بھی ڈاکوؤں کا سردار آیا اور ایسے ہی دھوکہ دینا چاہا جس طرح جیوکا کو دیا تھا۔ آنند سمجھدار تھا۔ اس نے اس کی باتوں پر شبہہ کیا۔ اس نے سوچا کہ یہ آدمی خود کو بادشاہ کے فوجی کہتے ہیں جب کہ ان کے پاس کوئی یونی فارم نہیں۔ پھر ان کے بولنے کا انداز بھی ایسا نہیں جیسا کہ بادشاہ کے ملازموں کا ہوتا ہے۔ آنند نے کہا کہ آپ ہمیں جس طرف جانے کے لیے کہہ رہے ہیں ہم ادھر جائیں گے۔ آپ کا شکریہ آپ جائیں۔ ہم خود چلے جائیں گے۔ یہ کہہ کر اس نے انھیں وہاں سے چلتا کر دیا۔ اس کے بعد آنند نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ ان کی باتوں میں نہ آنا چاہیے۔ یہ لوگ اپنے گھوڑے جدھر سے لا رہے تھے۔ یہاں آکر انھوں نے گھوم کر اپنا رخ بدلا اور پھر دوسری طرف سے آئے اور ہمیں بھی اسی طرف چلنے کو کہہ رہے تھے۔ لہٰذا ہمیں اس طرف جانا چاہیے جدھر سے ہم نے انھیں آتے ہوئے شروع میں دیکھا تھا۔ چنانچہ آنند کے کہنے کے مطابق قافلہ روانہ ہوا۔ ادھر تھوڑی دور پر یہ قافلہ ایسی جگہ پہنچا جہاں سلیٹ کی طرح کے پتھر رکھے ہوئے تھے یہ پتھر ایسے تھے جیسا کہ کسی غار کا ڈھکن ہوں۔ چار آدمیوں کی مدد سے یہ پتھر سرکائے گئے۔ اس کے نیچے واقعی ایک احاطہ تھا، وہاں بڑے صندوقوں میں سونے چاندی کے سکے بھرے تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ جیوکا کے بہت سے آدمی جو سامان لے کر چلے تھے، وہ بھی وہیں پڑا ہے۔ انھوں نے وہ سب سامان لے لیا۔ پھر یہ لوگ وہاں سے چلے۔ ڈاکوؤں کی ہمت نہ ہوئی کہ ان سے لڑائی مول لیں۔ یہ لوگ تازہ دم تھے۔ اس طرح یہ قافلہ بہت سے ملکوں سے ہوتا ہوا پاٹلی پتر لوٹ آیا۔ ان لوگوں کو بہت زیادہ منافع ہوا۔ لہٰذا آنند کی شادی سنندا سے کر دی گئی۔ شہر کے لوگوں نے بڑی خوشی سے اس میں شرکت کی۔ اس طرح اس مقابلے میں جیوکا ہار گیا اور آنند کی مراد بر آئی۔ جو لوگ سوجھ بوجھ سے کام لیتے ہیں اور بڑوں کے تجربے سے فائدہ اٹھاتے ہیں، وہ زندگی میں کامیاب ہوتے ہیں۔

لطیفے

مسجٹریٹ : حاضرین میں سے اگر کسی نے شور مچایا تو ہم اسے باہر نکال دیں گے۔

چور : لیجیے۔ میں شور مچاتا ہوں، مجھے باہر نکال دیجیے۔

بچّہ : پتاجی! مجھے ایک ڈھول خرید دیجیے۔

باپ : نہیں بیٹا! تم ہر وقت شور مچایا کرو گے، مجھے کوئی کام نہ کرنے دو گے۔

بچّہ : ہرگز نہیں۔ میں اس وقت بجایا کروں گا جب آپ گہری نیند سو جایا کریں گے۔

استاد : رشید، کوئی دو واقعات ایسے بتاؤ جو ایک وقت میں ہوئے ہوں۔

رشید : میرے ابّا اور میری امّاں کی شادی ایک ہی وقت میں ہوئی تھی۔

استاد : (ہنس کر) کوئی اور

رشید : جس وقت آپ مریں گے اس وقت آپ کی بیوی بیوہ ہو جائے گی۔

د خلیل

تھرمامیٹر کی کہانی

بچو! تم نے تھرمامیٹر ضرور دیکھا ہو گا خاص طور پر اس وقت جب کسی کی طبیعت خراب ہوتی ہے اس کے ذریعے حرارت معلوم ہو جاتی ہے۔ پیمائش کے تمام سائنسی آلات میں جو مقبولیت تھرمامیٹر (تپش پیما) کو ملی ہے اس قدر کسی اور آلے کو اب تک نہیں مل سکی ہے۔ جبکہ تھرمامیٹر کی ایجاد کو تقریباً تین صدی سے زیادہ عرصہ نہیں ہوا ہے۔

پرانے زمانے میں بھی ہمارے
نے بعض عجیب و غریب شکل کے آلے تیار کر لیے تھے۔
سے اچھی طرح کام بھی نکال لیتے تھے لیکن یہ ایک حقیقت
بات کہ مشہور سائنسداں گیلیلو نے حرارت کی پیمائش
پہلا صحیح طور پر کام کرنے والا تھرمامیٹر ایجاد کیا۔ اس
یں اس وقت ایک نلکی تھی اور اس کے اوپری حصے میں
ب لگا ہوا تھا اور شیشے کے برتن میں پانی لے کر بلب کو
بوتے تھے۔ جب بلب پر گرمی پہنچائی جاتی تھی تو اس کی
ہوا پھیل جاتی تھی اور بھاپ کے پانی کو نیچے کی جانب
تی۔ اس کے بعد اس میں کچھ تبدیلی بھی کی گئی لیکن بلب
کھا گیا تھا۔ اصل میں گیلیلو کے آلے صرف تھرمامیٹر نہیں تھے
د پیما بھی تھے۔ گیلیلو کے بعد کافی عرصے تک اس جانب
توجہ نہ کی۔ آخر کار ۱۶۵۷ء میں فلورنس کی سائنسی اکیڈمی

میں کسی نامعلوم شخص کے دماغ میں یہ اہم بات آئی کہ سیال کو نلکی کے اندر بھر کر اس کو ناپنا چاہیے۔ یہی ہماری جدید تھرمامیٹر کی ابتدا تھی اور ہمارے تمام سیال پھیلانے والے آلے اسی کی بنیاد پر تیار کیے گئے ہیں۔

موجودہ استعمال ہونے والے تھرمامیٹروں میں تم حرارت کو ناپنے کے مختلف نشانات کو دیکھتے ہو یہ پہلے تھرمامیٹروں میں نہیں تھے اور نہ کوئی درجہ تقسیم تھی جس کے ذریعے حرارت کا بالکل صحیح اندازہ کیا جا سکتا۔ مشہور سائنسداں سر آئزک نیوٹن نے سب سے پہلے تھرمامیٹر کی نلکی کا قطر معلوم کیا اسے دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس نے پانی کا نقطہ انجماد اور نقطہ تبخیر کے نشانات قائم کیے لیکن اس کے باوجود اس پر عمل نہ ہو سکا۔ مشہور ماہر فلکیات رومر نے ۱۷۰۹ء میں سب سے پہلے پارہ بھرا ہوا تھرمامیٹر تیار کیا اور ڈینیل فارن ہائیٹ نے تھرمامیٹر کو ایک معمولی آلے سے بدل کر ایک مفید آلہ بنا دیا۔ فارن ہائیٹ پہلے شخص تھے جنھوں نے عمدہ قسم کے تھرمامیٹر ہی تیار نہیں کیے بلکہ اس آلے میں معینہ فاصلوں پر پیمائش کے نشان بھی لگائے اور اس آلے کو برف اور نمک کی ایک مقررہ محدود مقدار میں ڈالا اور اس کے ساتھ ہی جس نقطہ پر پارہ سب سے نیچے پہنچ گیا وہاں پر صفر کا نشان قائم کیا۔ اس کے بعد اس نے جسم کی حرارت کو ناپا اور ۹۶ پیمانہ حرارت کی اکائیاں قائم کیں۔ اس کے بعد تجربات سے یہ بات سامنے آئی کہ جن آلوں پر یہ علامتیں قائم کی گئی ہیں جب ان کو پگھلتے ہوئے برف میں ڈالتے ہیں تو درجہ حرارت ۳۲ ظاہر کرتا ہے۔ اور جب یہ آلے اُبلتے ہوئے پانی میں ڈالے جاتے ہیں تو ۲۱۲ درجہ حرارت ظاہر کرتے ہیں اس طرح ہمارے موجودہ تھرمامیٹر میں درجہ کی ترتیب دی گئی۔

آج بھی فارن ہائیٹ کے ترتیب والے تھرمامیٹر ہمارے روزمرہ کے استعمال میں ہیں لیکن سنٹی گریڈ درجہ ترتیب والا تھرمامیٹر جس کو سلسیس نے اٹھارویں صدی کے آخر میں رائج کیا تھا بہت

زیادہ بہتر پایا گیا اور اس کا استعمال تمام دنیا میں ہو رہا ہے۔ اسس سنٹی گریڈ تھرمامیٹر میں پانی کا نقطۂ انجماد صفر درجۂ حرارت سے ظاہر ہوتا ہے اور پانی کا نقطۂ تبخیر ۱۰۰ درجۂ حرارت سے ظاہر ہوتا ہے۔

پارے سے بھرے ہوئے تھرمامیٹر کی عمدگی پر فارن ہائیٹ کا یقین مکمل ہوا کیونکہ اس وقت تک جو بھی تھرمامیٹر بنائے گئے وہ سب اس تھرمامیٹر کی پیروی کرتے تھے دوسری جانب اسپرٹ سے بھرے ہوئے تھرمامیٹر، رنگین اسپرٹ سے تیار شدہ تھرمامیٹر کی عمدگی سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ آج بجلی کے تھرمامیٹر زیادہ تیز حرارت کو ناپنے کے لیے بہت عام ہیں۔ اور اب الیکٹرانک طبی تھرمامیٹر ہندوستان میں بنایا گیا ہے اس تھرمامیٹر کو استعمال کرنے کے دوران عام تھرمامیٹر کی طرح جھٹکا نہیں دینا ہوتا۔ اس آلہ کے ذریعے کمرے کی حرارت صفر سے پچاس ڈگری سینٹی گریڈ تک معلوم کی جاسکتی ہے یہ تپش پیما نہایت کارگر ہے اور جیسے ہی مریض کا درجۂ حرارت خطرے کے نشان کو چھوتا ہے اس وقت تیمارداری کرنے والے لوگوں کو یہ تھرمامیٹر خبردار کرتا ہے اسس تھرمامیٹر کو ہم "تھرمالرٹ" کے نام سے پکارتے ہیں اس تھرمامیٹر کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اسس کی پن کو بدن کے جس حصّے میں رکھ دیں وہاں کی حرارت کو فوراً معلوم کرسکتے ہیں۔ جب کہ عام تھرمامیٹر میں حرارت کو معلوم کرنے میں کم سے کم تین منٹ لگتے ہیں۔

لیکن ان تمام تھرمامیٹروں کی ایجاد کے باوجود یہ کم قیمت کا درجہ حرارت بتانے والا فارن ہائیٹ تھرمامیٹر سب سے آگے ہے اور اس سے کوئی آگے نہ جاسکا۔ یہی وجہ ہے کہ اسے سب سے زیادہ شہرت ملی ہے۔

خسرو متین خسرو

بارش

دیکھو بارش کے دن آئے
کالے کالے بادل چھائے

کالی گھٹا لہرانے لگی ہے
بجلی بھی مسکانے لگی ہے
گرمی بھی اب جانے لگی ہے
ہر شے فرحت پانے لگی ہے

سب کو ایسے دن ہیں بھاتے
دیکھو بارش کے دن آئے

گلشن سارے مہک رہے ہیں
غنچے پیارے چٹک رہے ہیں
ہر سو طائر چہک رہے ہیں
بچے بالے لہک رہے ہیں

سب کو ساون کی یاد آئے
ہر شے چہکے، مہکے، گائے
دیکھو بارش کے دن آئے
کالے کالے بادل چھائے

رجیت

بیوقوف پپّو

دہلی کی رام نگر کالونی میں ایک لڑکا رہتا تھا۔ نام تھا اس کا ۔ وہ بہت گھمنڈی، شریر اور احمق تھا۔

ایک روز وہ سڑک پر گھوم رہا تھا۔ راستہ میں ایک لڑکی نا ہوئی ملی۔ پپو نے لڑکی سے پوچھا "تم کیوں رو رہی ہو؟"

لڑکی نے لبسورتے ہوئے کہا "ہماری بھینس مرگئی ہے۔ اب دودھ کہاں سے پئیں گے۔ اسی لیے میں رو رہی ہوں"

پپو نے چلا کر کہا "اری احمق! بھینس پر انحصار کرتی ہے۔ میں تو ۔انور پر انحصار نہیں کرتا۔ خواہ دنیا کی تمام بھینس مرجائیں۔ مجھے ۔ اور پپو آگے بڑھ گیا۔

لڑکی نے حیرت سے پپو کی طرف دیکھا اور بولی "خدا کرے۔ بھی کوئی بھینس کچھ بھی نہ دے"

چند قدم چلنے کے بعد پپو کی ایک بڑھیا سے ملاقات ہوئی۔ ۔ھیا بھی رو رہی تھی۔ پپو نے اشتیاق سے پوچھا "اری بڑھیا ۔ں رو رہی ہو؟"

بڑھیا نے جواب دیا۔ "میری بھیڑ چھت سے گر کر مرگئی ہے۔ میں کس کا اُون بنوں گی۔ ہماری تو روزی ہی بھیڑ تھی۔

پپو نے حقارت سے کہا "ہونہہ! تم بھیڑ پر انحصار کرتی ہو۔ ۔ کسی جانور پر انحصار نہیں کرتا۔ میری بلا سے خواہ دنیا کی تمام ۔یاں مرجائیں۔ اور پپو آگے بڑھ گیا۔ بڑھیا نے حیرت سے پپو ۔انب دیکھا اور کہا "ارے بیوقوف لڑکے! تم کچھ نہیں جانتے ۔رے۔ کوئی بھیڑ تجھے کوئی شئے نہ دے"۔

س (ضمیمہ)

کچھ دیر مزید چلنے کے بعد پپو کو ایک کسان ملا۔ وہ کسان بھی رو رہا تھا۔ پپو نے اس سے پوچھا "تم کیوں رو رہے ہو؟"

کسان نے کہا "میرا بیل مرگیا ہے۔ اب کھیت پر کس سے ہل چلاؤں گا؟ میں کس طرح شہر کو اناج لے جاؤں گا؟ بیل کے بغیر میں اب بھوکا مرجاؤں گا؟"

"تم بھی بیل پر منحصر ہو۔ میں تو کسی جانور پر انحصار نہیں کرتا۔ یہ جانور مجھے کچھ نہیں دے سکتے۔" پپو نے کہا۔

کسان نے بے حد حیرانی سے اسے تاکا اور بولا "ارے احمق لڑکے! تم یہ بات نہیں سمجھ سکتے۔ خدا کرے۔ تمام جانور تم کو آج رات چھوڑ جائیں۔ تب تم کو کچھ عقل آئے گی۔" لیکن پپو کے کانوں پر جوں نہ رینگی اور وہ ٹہلتا ہوا گھر لوٹ آیا۔

اس رات عجیب و غریب واقعہ رونما ہوا۔ تمام جانوروں نے پپو کو سبق دینے کا فیصلہ کیا۔ وہ رات کو گہری نیند میں سو رہا تھا کہ اچانک وہ چونک کر جاگ اٹھا۔ اس نے دیکھا۔ اس کا کمبل غائب ہوگیا۔ اس کا اونی سویٹر روپوش ہوگیا۔ اس کے تمام کپڑے بھی غائب ہوگئے تھے۔ وہ سردی سے کانپ رہا تھا۔ اس نے اپنے سوتی کپڑے پہنے لیکن پھر بھی اس کا بدن سردی سے

کانپ رہا تھا۔ اس نے حیرت سے دیکھا۔ اس کے جوتے، جرابیں، ریشمی ٹائی۔ بھی غائب ہو گئیں۔

پپّو نے سوچا کہ وہ کوٹ پہن کر سو جائے گا لیکن اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس کا کوٹ بھی غائب ہو چکا ہے۔ اس لیے وہ اپنے سوتی کپڑوں میں سکڑ کر پلنگ پر لیٹ گیا اور صبح کا انتظار کرنے لگا۔

وہ سردی میں رات بھر ٹھٹھرتا رہا۔ صبح ہوئی، وہ بھاگ کر باورچی خانہ میں گیا۔ وہاں نہ انڈے تھے۔ نہ دودھ اور مکھن۔ اس نے سوچا۔ کوئی بات نہیں۔ میں دودھ، انڈے۔ گوشت۔ مکھن اور پنیر سے گزارہ کر لوں گا۔ میں پھل اور سبزیاں کھا کر گزارہ کر لوں گا۔

پھل اور سبزیاں کھانے کے بعد وہ باغ کی طرف چل دیا۔ وہ کچھ پھل اور سبزیاں خرید نا چاہتا تھا۔ لیکن اس کو بہت مایوسی ہوئی جب مالی نے کہا "میری تمام سبزیاں اور پھلوں کو پالا مار گیا ہے۔ تم تو ان پر منحصر نہیں ہو۔؟" مالی نے پوچھا۔

"بالکل نہیں۔ میں سبزیوں کے بغیر جی سکتا ہوں۔ اگر پالا تمام سبزیوں کو ختم کر دے تو بھی مجھے پروا نہیں۔" پپّو نے کہا۔ لیکن دل میں وہ سردی سے تھوڑا خوفزدہ تھا۔

وہ اپنے دل میں یہ کہتے ہوئے آگے بڑھا۔ "چلو سردیوں کے لیے لکڑی خرید لو۔" لیکن جب وہ جنگل کے قریب پہنچا تو اس نے جنگل میں آگ لگی ہوئی دیکھی۔ جنگل کا مالک گھبرایا ہوا آگ بجھانے کے لیے اِدھر اُدھر بھاگ رہا تھا۔ اس لیے پپّو اس سے جنگل میں آگ لگنے کا سبب بھی نہ جان پایا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا گھر لوٹ آیا۔ ابھی ابھی اس نے خوف یا گھبراہٹ ظاہر نہ کی۔ اس نے سوچا "بیوقوف لوگ لکڑی پر انحصار کرتے ہیں۔ میں کوئلہ خرید لوں گا۔ اگر تمام درخت اور پودے بھی مجھے چھوڑ دیں۔ تب بھی مجھے کوئی فکر نہیں۔" یہ سوچتے ہوئے وہ سو گیا۔

اب اس رات کو بھی ایک عجیب و غریب واقعہ رونما ہوا۔ تمام درختوں اور پودوں نے پپّو کی حقارت کو محسوس کیا اور اسے دینے کا فیصلہ کیا۔

پپّو سوتی کپڑوں کو اپنے گرد لپیٹ کر سویا ہوا تھا کہ اس نے محسوس کیا کہ اس کے تمام سوتی کپڑے خود بخود اس کے جسم سے غائب ہو گئے۔ وہ سردی سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ خوفزدہ ہوا تھا۔ اس نے آگ جلانا چاہی۔ لیکن جلانے کے نہ کوئلہ ملا اور نہ لکڑی۔ وہ حیران و پریشان تھا کہ اب کیا کرے۔ سردی سے اس کا بُرا حال ہو رہا تھا۔ اب اس کو احساس ہوا کہ پودے بھی اس کو چھوڑ کر چل دیئے ہیں۔ اس نے سوچا۔ اب وہ سردی سے ٹھٹھر کے اور بھوک سے تڑپ کر مر جائے گا۔ وہ جانوروں اور درختوں و پودوں کے بغیر انسان زندہ نہیں۔ اور پپّو پچھتانے لگا۔ اس کو جانوروں اور پودوں اور درختوں کو نظر انداز کرنے اور ان کو حقارت سے دیکھنے پر سخت افسوس ہوا۔

اچانک اس نے محسوس کیا کہ اس کے تمام کپڑے لوٹ آئے ہیں۔ سوتی کپڑے اور گرم کپڑے بھی۔ کمبل بھی لوٹ آئے۔ صبح وہ جب اٹھا تو وہ خوش تھا۔ اب اس نے جانور اور درختوں و پودوں کی اہمیت جان لی تھی۔ اس لیے اس نے گھر کے باہر کھڑی بھینس کو پیار کیا۔ کتے کو پچکارا۔

اس رات پپّو کو خوب نیند آئی۔

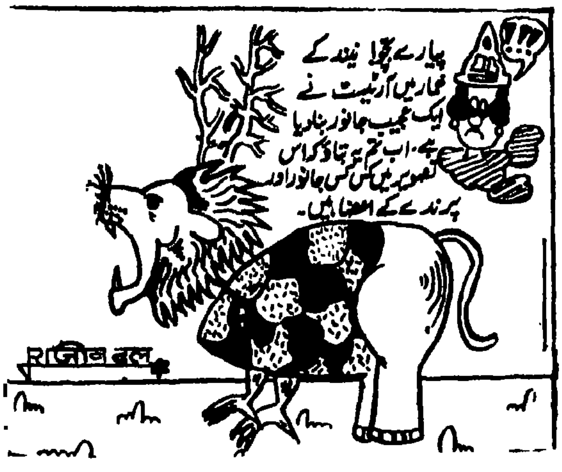

معصوم

سرسیّد اور اُن کی والدہ

سرسید احمد خاں کی ذات گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ہر
چھوٹا اور بڑا ان کے کارناموں سے بخوبی واقف ہے۔ ہر شخص
، کے فضل وکمالات کا اعتراف ہے۔ مسلم یونیورسٹی کا قیام ان
ر کردگی کا بہترین شاہکار ہے۔ سرسید کے کمالات کا اظہار
ج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ وہ علم وفضل کے ایک
ننده ستارے ہی نہیں بلکہ مہر تاباں کی حیثیت رکھتے ہیں۔
سرسیّد کی والدہ محترمہ عزیز النسار نہایت ذی ہوش نیک
ت اور عالی دماغ خاتون تھیں۔ وہ زیادہ تعلیم یافتہ تو نہ تھیں۔
، بڑی روشن خیال تھیں۔ اور بچوں کی تعلیم وتربیت کا پورا پورا
، رکھتی تھیں۔ سرسید نے انھیں کے زیر سایہ تعلیم وتربیت
۔ سرسید کے اوصاف وکمالات انھیں کی بہترین تربیت
بہ تھے۔

یہاں ان کی تربیت جو ان کی والدہ محترمہ نے کی اس کے
تی خود سرسید کی زبانی چند واقعات پیش کر رہا ہوں تاکہ اندازہ
جاسکے کہ وہ کون سی تربیت تھی جس نے کوٹ کوٹ کر ان کے
یں قوم کا درد بھر دیا تھا وہ اختلافات اور مشکلات کے
ہ د اپنے مقصد کے حصول کے لیے اپنی جگہ اٹل رہے۔ اسی قوم
بس کے لیے انھوں نے اس قدر قربانی پیش کی "جس کا چشمہ
، آج تک جاری ہے اور انشاء اللہ ہمیشہ جاری رہے گا۔" انھیں
نک کہا۔ لیکن وہ آخری دم تک قوم کی فلاح وبہبود کا کام کرتے
ہے۔

سرسید احمد خاں لکھتے ہیں:-

"میری والدہ شہر کی لاوارث بوڑھیوں کی خصوصی دیکھ بھال کرتی تھیں۔ ان کی وسیع وعریض حویلی مستحق عورتوں کی پناہ گاہ تھی۔ زیبا نام کی ایک ضعیف خاتون انھیں مستحق عورتوں میں سے تھیں۔ اتفاق سے میری والدہ اور زیبا ایک نوعیت کی بیماری میں مبتلا تھیں۔ جن حکیم صاحب سے میری والدہ کا علاج ہوا زیبا بھی انھیں کے زیر علاج رہیں۔ صحت ہو گئی تو حکیم صاحب کی تجویز پر والدہ کے لیے ایک قیمتی معجون تیار ہوئی۔ یہ معجون صرف ایک مریض کے لائق تھی۔"

"میں اس زمانے میں دہلی میں منصف تھا میں وہ دوا تیار کرا کے لے گیا اور کہا کہ اتنے دنوں کی خوراک ہے اس کو استعمال فرمائیے۔ انھوں نے دوا لے لی اور اس خیال سے کہ یہ معجون زیبا کے لیے بھی ایسی ہی مفید ہو گی جیسی مجھ کو ہے۔ ان کو یقین نہیں تھا کہ زیبا کے لیے بھی ایسی معجون تیار کر دی جائے گی۔ اس لیے خود انھوں نے وہ معجون نہیں کھائی اور خفیہ خفیہ زیبا کو کھلا دی۔ اس معجون سے زیبا کی صحت میں کافی ترقی ہوئی۔ چند روز بعد میں نے کہا کہ اس معجون سے آپ کو بہت فائدہ ہوا۔ وہ ہنسیں اور کہا "تمھارے نزدیک بغیر دوا خدا صحت نہیں دیتا۔" میں متعجب ہوا معلوم ہوا وہ معجون ان کے عوض زیبا نے کھائی ہے۔ اور خدا نے دونوں کو صحت عطا کی۔ ایک کو یہ صد دوا سے اور ایک کو محض اپنے فضل وکرم سے۔"

"میں دہلی میں منصف تھا تو میری والدہ مجھ کو نصیحت کرتی تھیں کہ جہاں جہاں جانا تم لازم سمجھتے ہو اور ہر حالت میں تم کو وہاں جانا لازمی ہو گا۔ تو کبھی تم سواری پر جایا کرو اور کبھی پیادہ پا۔ زمانے کا کچھ اعتبار نہیں کبھی کچھ ہے تو کبھی کچھ۔ پس ایسی حالت رکھو کہ ہر حالت میں اسے نباہ سکو۔ چنانچہ میں نے جامع مسجد اور حضرت شاہ غلام علی صاحب کی خانقاہ میں جانے کا یہی طریقہ اختیار کیا تھا کہ اکثر دونوں جگہ پیدل جایا کرتا تھا یا کبھی سواری پر۔"

اسی زمانے میں میں اپنی منصفی کی کل تنخواہ والدہ کو دیتا تھا۔ وہ اس میں سے صرف پانچ روپے ماہانہ اوپر کے خرچ کے لیے مجھ کو

دے دیتی تھیں باقی میرے تمام اخراجات انھیں کے ذمہ تھے۔ جو کپڑا بنا دیتی تھیں پہن لیتا تھا اور جیسا کھانا وہ کھلا دیتی تھیں کھا لیتا۔

ایک مرتبہ بچپن میں میں نے ناراض ہو کر اپنے ایک نوکر کے تھپڑ مار دیا والدہ کو پتہ چلا تو انھوں نے مجھے گھر سے نکلوا دیا۔ اور کہا کہ یہ گھر میں رکھنے کے قابل نہیں ہے جہاں اس کا دل چاہے چلا جائے۔ اس کے بعد مجھ سے کہا کہ جب تک تم نوکر سے معافی نہیں مانگو گے تب تک میں معاف نہیں کرونگی۔ چنانچہ مجھے نوکر سے معافی مانگنی پڑی۔ بلاشبہ ایک اچھی ماں ہزار استادوں سے بہتر ہے۔

" ایک امر جو نہایت ہی صبر و استقلال کا ان سے ظہور میں آیا وہ نہایت ہی عجیب ہے" سید محمد خاں ان کے بڑے بیٹے کا ۲۷-۲۸ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا سب لوگ گریہ وزاری کرنے لگے۔ جو رنج وغم ان کو ہوا ہوگا۔ ظاہر ہے بے اختیار ان کی آنکھوں سے آنسو نکلتے تھے۔ لیکن اس حالت میں بھی انھوں نے کہا کہ خدا کی مرضی" اور وضو کر کے صبح کی نماز پڑھنے لگیں۔ اور اشراق تک مصلّے سے نہیں اٹھیں۔ میں اس زمانے میں فتحپور سیکری میں منصف تھا اس واقعہ کے بعد میں نے دہلی میں اپنی تبدیلی کرائی۔ "

" ان کی تعلیم اور ان کی نصیحتیں نہایت ہی حکیمانہ اور دل پر اثر کرنے والی تھیں۔ مجھ کو یاد ہے کہ ایک شخص نے جس کے ساتھ میں نے نیکی کی تھی۔ میرے ساتھ نہایت بدی کی۔ اور تمام وجوہات ثبوت جس سے اس کو فوجی عدالت سے کافی سزا مل سکتی تھی۔ میرے ہاتھ آ گئے۔ میرے نفس نے مجھ کو بہکایا اور انتقام لینے پر آمادہ کیا۔ میری والدہ نے یہ خبر سن کر مجھ سے کہا۔ اگر تم اس کو معاف کر دو تو اس سے عمدہ کوئی بات نہیں اگر تم کو اس کی بدی کی سزا حاکم سے دلوانی ہے تو نہایت نادانی ہے کہ اس قوی اور زبردست حاکم الحاکمین کے چنگل سے جو ہر ایک کے اعمال کی سزا دینے والا ہے۔ اپنے دشمن کو چھڑا کر ضعیف اور ناتواں دنیا کے حاکموں کے ہاتھ ڈالنا چاہو۔ پس اگر دشمنی اور انتقام ہی منظور ہے تو قوی حاکم کے ہاتھ میں اس کو رہنے دو۔ اس نصیحت کا میرے دل پر ایسا اثر ہوا کہ کبھی دور نہ ہوا۔ اور جب سے میرے دل میں کسی شخص سے گو اس نے میرے ساتھ کیسی ہی دشمنی کی ہو انتقام لینے کا خیال تک نہیں آیا بلکہ ان کی نصیحت پر غور کرنے سے میرے دل میں یہ بات پیدا ہوگئی کہ اب میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ آخرت میں خدا بھی اس سے میرا بدلہ لے۔

وہ مجھ کو نصیحت کرتی تھیں کہ کسی نے اگر ایک دفعہ تمھارے ساتھ نیکی کی ہو اور پھر برائی کرے یا دو دفعہ نیکی کی ہو اور دو دفعہ برائی کرے تو تم کو آزردہ نہ ہونا چاہیے کیونکہ ایک یا دو دفعہ کی نیکی کرنے والا کیسی ہی برائی کرے اس کی نیکی کے احسان کو بھلایا نہیں جا سکتا۔"

اگر لوگ ان باتوں پر غور کریں تو سمجھ سکتے ہیں کہ میری والدہ کیسی عالی خیال اور نیک صفات، خلیق اور دانشمند نیز دوراندیش و فرشتہ صفت بی بی تھیں اور ایک ایسی ماں کا ایک بیٹے پر جس نے اس کی تربیت کی ہو کیا اثر پڑتا ہے۔

سر آئزک نیوٹن

نیوٹن ایک مشہور نام ہے۔ سائنس کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ نیوٹن نے علم طبیعیات کی کس قدر خدمت کی ہے۔

سائنس کی کتابوں میں نیوٹن کی کششِ زمین کی دریافت کے سلسلے میں باغ اور سیب کا واقعہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔

نیوٹن ایک دن اپنے باغ میں چہل قدمی کر رہا تھا اس نے دیکھا کہ سیب کے ایک درخت سے ایک سیب ٹوٹ کر گرا۔ یہ دیکھ کر نیوٹن کو خیال آیا کہ کیا وجہ ہے کہ سیب زمین کی طرف ہی گرا۔ ؟ کسی اور طرف نہیں گیا۔ ؟

لنکا شائر میں وولز تھروپ Woolsthrope کے مقام پر دسمبر ۱۶۴۲ء میں ہانا نیوٹن کے بطن سے آئزک نے جنم لیا۔ پیدائش کے چند سالوں کے بعد ہی مسٹر نیوٹن کا انتقال ہو گیا۔ اور ہانا نے دوسری شادی کر لی۔ نیوٹن اب اپنی نانی کی آغوش میں پرورش پانے لگا۔

آئزک چونکہ برطانیہ کے ایک زمیندار کا لڑکا تھا اس وجہ سے اس کا بچپن لاڈ و پیار میں گذرا۔ اس کی ہر خواہش کا احترام کیا جاتا۔ لاڈ و پیار سے پلنے کے باعث وہ کچھ بگڑ بھی گیا۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ اسکول میں پچھڑا رہا۔ اور خاص کامیابی حاصل نہیں کر سکا۔ ایک دن کسی بات پر اپنے اسکول کے ایک ساتھی سے اس کی لڑائی ہو گئی۔ اتفاق سے آئزک جیت گیا۔ اس جیت سے اسے احساس ہوا کہ وہ بھی کچھ ہے، اس کی ایک منفرد شخصیت ہے اس خیال نے اسے اتنی تقویت بخشی کہ کچھ ہی عرصے بعد وہ ایک کامیاب اور اسکول کا مایۂ ناز طالب علم تھا۔ وہ ریاضی میں ہمیشہ ناکام رہا تھا۔ مگر اب ریاضی اس کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل تھی۔

آئزک جب صرف ۱۴ سال کا ہی تھا کہ اس کے سوتیلے باپ کا انتقال ہو گیا۔ زمین کی دیکھ بھال اب اس کی ماں کے کمزور کاندھوں پر آپڑی جس کو وہ اچھی طرح سے نہیں نبھا سکتی تھی۔ اس وجہ سے اس نے آئزک کو اسکول سے بلوا لیا۔ اور اس طرح اس کی تعلیم ادھوری رہ گئی۔ کھیتی باڑی اس کے لیے ایک عجیب چیز تھی اب تک وہ قلم سے کام کرتا رہا تھا۔ اب اس کے سامنے ہل تھا۔ یہ نئی صورتِ حال اسے ایک آنکھ نہ بھائی اور اپنے کام کو اچھے طریقے سے انجام نہ دے سکا۔ مگر چار سال کا طویل عرصہ اس نے جیسے تیسے کاٹ ہی دیا۔ ۱۶۶۰ء میں اپنے ماموں کی مدد سے وہ ایک بار پھر اسکول پہنچ گیا۔

۵/ جون ۱۶۶۰ء کو ٹرنٹی کالج کیمرج میں اس کا داخلہ ہوا۔

۸/ جولائی ۱۶۶۱ء کو اس نے میٹرک پاس کیا۔

اور جنوری ۱۶۶۵ء میں اس کے ہاتھوں میں (بی۔اے) کی ڈگری تھی۔

امتحانات میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد آئزک اپنی جاگیر پر واپس آ گیا اور اس کے بعد ہی وولز تھروپ کے باغ میں سیب گرنے کا واقعہ ہوا۔

اس واقعے نے نیوٹن کے لیے ایک نئی راہ کھول دی اب وہ اس فکر میں لگ گیا کہ وہ کسی طرح یہ ثابت کر دے کہ زمین میں کشش ہے۔ کیونکہ اس کے لیے واضح ثبوت سیب گرنے کا واقعہ تھا اس نے سوچا کہ کیا وجہ ہے جو سیب کسی اور سمت میں نہ جا کر زمین کی طرف ہی آیا۔ نیوٹن نے اپنے خیالات کی مضبوطی کے لیے سائنس کا مطالعہ کیا۔ کائنات پر غور کیا۔ اس کا خیال تھا کہ کائنات کے اجسام میں بھی کشش ہے۔

اس نے رات دن محنت کی اور آخر کار اپنے تجربات کی مدد سے ثابت کر دیا کہ ہماری زمین، چاند، سورج، تارے اور تمام اجسامِ فلکی میں ایک ایسی قوت موجود ہے جو دوسری چیز کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔

۱۶۶۷ء میں کیمرج واپس آنے پر اسے اپنے کالج کا فیلو[1] Fellow مقرر کیا گیا۔ یہاں اس کے لیے ایک نیا میدان موجود تھا۔ اور یہاں پر بھی کائنات کے ایک بڑے راز سے اس نے پردہ اٹھا دیا۔ یہاں اس نے روشنی پر غور کیا کہ روشنی کیا ہے۔

اس نے دنیا کو بتایا کہ روشنی اصل میں بہت سے رنگوں کے شعاعوں کا مجموعہ ہوتی ہے جو منشور سے گذرنے کے بعد مختلف طور پر منعطف ہوتی ہے۔

اسی درمیان اس نے دوربین کو بہتر بنانے پہ کام کیا۔ اور ایک کامیاب دوربین بنائی جو کہ روشنی کو منعکس کرتی تھی۔ یہ دوربین بہت مختصر تھی یعنی صرف چھ انچ لمبی۔ اسی دوربین کی مدد سے وہ اس قابل ہوا کہ مشتری کے چاند دریافت کر سکے۔

علم افلاک اور علم نجوم کے مطالعے کے لیے بعد میں اسی قاعدے پر دوربین بنائی گئی۔ جو کہ نیوٹن کا ایجاد کردہ تھا۔

۱۶۶۹ء میں نیوٹن اپنے کالج ہی کا پروفیسر مقرر ہو گیا۔ اور ۱۶۷۱ء میں رائل سوسائٹی کا ممبر منتخب ہو گیا۔

۱۶۶۸ء میں اس کی کتاب پرمیپیا Principe شائع ہوئی جس میں اس نے اپنے نظریات کی وضاحت کی تھی۔

۱۶۷۵ء میں وہ رائل سوسائٹی کا فیلو مقرر ہوا۔

۱۶۹۲ء سے ۱۶۹۴ء تک کا زمانہ نیوٹن کے لیے انتہائی خراب رہا۔ اس درمیان وہ بہت بیمار ہو گیا۔ اعصابی ہیجان میں مبتلا ہو گیا اور بعض لوگ سمجھتے تھے وہ پاگل ہو گیا ہے۔

۱۶۹۵ء میں اسے وارڈن آف منٹ Warden Of Mint مقرر کیا گیا۔

۱۶۹۶ء میں اسے ماسٹر آف منٹ Master Of Mint مقرر کیا گیا۔

۱۷۰۱ء میں اسے یونیورسٹی پارلیمنٹ کے لیے منتخب کیا گیا۔

۱۷۰۳ء میں وہ رائل سوسائٹی کا صدر منتخب کیا گیا اور دو سال بعد ہی ۱۷۰۵ء میں اسے نائٹ کا خطاب ملکہ این کے ہاتھوں اس وقت ملا جب وہ کیمبرج آئی تھیں۔

ان مصروفیات میں اسے بالکل بھی وقت نہیں ملتا تھا کہ وہ سائنسی تحقیقات کر سکے اسی وجہ سے ۱۶۹۲ء کے بعد اپنی موت تک اس نے کوئی قابل قدر کام انجام نہیں دیا۔ ۱۷۰۳ء میں اسے رائل سوسائٹی کا صدر مقرر کیا گیا تھا۔ اس عہدے پر وہ ۲۵ سال تک مقرر رہا۔ کسی بھی شخص کے لیے یہ ایک بہت بڑا اعزاز ہے کہ وہ رائل سوسائٹی کے صدر کے عہدے پر ۲۵ سال تک رہے۔

اس کے علاوہ اسے نائٹ Knight کا گراں قدر خطاب ملا جو کہ ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔

۱۷۲۷ء میں نیوٹن دوبارہ بیمار ہوا۔ اس بار اس کو پتھری کی شکایت ہو گئی تھی۔ یہ مرض، مرض الموت ثابت ہوا اور ۲۰ مارچ ۱۷۲۷ء کو نیوٹن کا انتقال ہو گیا۔

۱۶۴۲ء کو پیدا ہونے والے آئزک کو مشہور عالم سائنسداں رائل سوسائٹی کے صدر، سر آئزک نیوٹن کی حیثیت سے ۲۸ مارچ ۱۷۲۷ء کو ویسٹ منسٹر ایبے کے قبرستان میں دفنا دیا گیا۔

اس کی ساری ہی ایجادات ایک خاص اہمیت کی حامل ہیں مگر کشش اور روشنی کا نظریہ ایسا ہے جو کہ ایک گراں قدر دریافت ہے۔

صفحہ دس پر دی گئی تصویر کے جوابات :-

دھڑ	ہاتھی اور کچھوے کا
منھ	شیر
سینگ	بارہ سنگھا
دم	بندر
پنجے	چیل

۱؎ ۔ ایسا شخص جو کہ کالج سے امتیازی وظیفہ پائے۔

کرشن کوشل

کیا تم جانتے ہو.....؟

تقریباً دنیا کے تمام بڑے لوگوں کے سوچنے کا انداز بہت ں نرالا اور انوکھا رہا ہے۔ آئیے میں ان لوگوں کے متعلق کچھ بتاؤں۔

ڈاکٹر اقبالؔ جو ہندوپاک کے بہت بڑے شاعر گزرے ہیں، ب ان پر شعر کی آمد ہوتی تھی تو وہ کسی کونے میں تنہا بیٹھ جاتے تھے اور کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا تھا کہ کئی کئی دنوں تک کسی سے ت بھی نہیں کرتے تھے۔

مجیدؔ لاہوری نے لکھنے کے لیے خاص طور پر ایک پلنگ وایا تھا۔ وہ جب لکھتے تھے تو اسی پلنگ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ اتے اور گود میں دو تین تکئے رکھ لیتے اور پھر لکھنا شروع کر دیتے۔

اردو کے مشہور افسانہ نگار سعادت حسین منٹوؔ ہمیشہ صوفے اکڑوں بیٹھ کر افسانہ لکھتے تھے۔ اپنے متعلق وہ لکھتے ہیں: "مجھ پر ب افسانہ لکھنے کی دھن سوار ہوتی ہے تو میری حالت اس مرغی یسی ہو جاتی ہے جو انڈے دینے کے لیے جگہ تلاش کرتی پھرتی ہے۔"

اُردو کے مایہ ناز افسانہ نویس جناب کرشن چندر مرحوم لکھنے سے پہلے سخت مضطرب ہوتے تھے۔ ان کی بہن سرلا دیوی نے لکھا ہے کہ "کرشن چندر بڑی دیر تک گم صم کمرے میں ٹہلتا رہتا تھا۔ پھر ب افسانے کا پلاٹ اس کے ذہن میں آجاتا تھا تو وہ ہمیشہ نفیس کاغذ ور قلم لے کر لکھنے بیٹھتا تھا۔"

برطانیہ کے وزیر اعظم ہیرالڈ ولسن کے متعلق ان کی بیوی لکھتی ہے کہ "جب میرے شوہر کسی مسئلے میں الجھے ہوتے ہیں تو وہ کمرے میں داخل ہوتے ہیں اور گنگنانا شروع کر دیتے ہیں، وہ سوچ بچار میں اتنا مگن ہو جاتے ہیں کہ میری کسی بات کا جواب نہیں دیتے، پھر میرے جھنجلانے پر وہ چونکتے ہیں، ان کا گنگنانا بند ہو جاتا ہے اور حسب معمول مسکرانے لگتے ہیں۔"

مشہور فلسفی افلاطون سوچتے وقت بت کی طرح گم صم بیٹھا آسمان کی طرف دیکھتا رہتا تھا۔ ارسطو کے ذہن میں جب کوئی نیا خیال آتا تھا تو وہ پسینے پسینے ہو جاتا تھا اور بے چینی سے کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیتا تھا۔

فرانسیسی فلسفی ڈیکارٹز سوچنے سے پہلے آگ کے سامنے بیٹھ جاتا تھا۔

سینٹ آگسٹائن بستر پر مضطرب اور کروٹیں بدل کر سوچتا تھا۔

مشہور ماہر نباتات البرٹس میگنس سوچتے ہوئے اپنے سر پر آہستہ آہستہ ہتھوڑے کی ضربیں لگاتا تھا۔

یونانی ماہر فلکیات تھالس ستاروں کو دیکھتے وقت اپنے جسم کے مختلف حصّوں پر سوئیاں چبھوتا تھا۔

امریکی مضمون نگار رالف والڈو ایمرسن مضمون سے پہلے اپنے گھر کے قریب ایک جھیل میں ننگا نہاتا تھا۔

جارج سائمنن کا کہنا ہے کہ اگر میں کسی بوڑھے شخص کے بارے میں کچھ لکھنا چاہتا ہوں تو خود پر بڑھاپا طاری کر لیتا ہوں اس صورت میں میری کمر جھک جاتی ہے اور میں اسے سیدھا نہیں کر سکتا۔ سائمنن کی بیوی کے مطابق "جب میرے شوہر پر کوئی کتاب لکھنے کی دھن سوار ہوتی ہے تو مجھے ان کے رویے سے ہی اس کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ چونکہ وہ اپنے سارے پروگرام یک لخت ملتوی کر دیتے ہیں، ان کی دلچسپیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ کسی سے بات نہیں کرتے فوراً ڈاکٹر کے مشورے سے کوئی اچھا سا ٹانک خرید تے ہیں اور اُسے اس وقت تک استعمال کرتے ہیں جب تک کے کتاب مکمل نہیں ہو جاتی۔"

ڈی۔ کے۔ کنول

بھولے ناتھ

برسوں پہلے کی بات ہے بچو۔ بھولے ناتھ نام کا ایک آدمی تھا جو ہریانہ کے ایک گاؤں میں رہتا تھا۔ بھولے ناتھ اپنے نام ہی کی طرح بہت ہی بھولا، بہت ہی سیدھا سادھا آدمی تھا۔ وہ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتا تھا اور شہر جا کر ان کو بیچتا تھا۔ یہی اس کی آمدنی کا ذریعہ تھا۔

ایک دن کیا ہوا بچو کہ بھولے ناتھ ایک پیڑ کی ٹہنی پر بیٹھا اسے ہی اپنی کلہاڑی سے کاٹ رہا تھا کہ اُدھر سے ایک برہمن گذرا۔ اس کی نظر جب بھولے ناتھ پر پڑی تو وہ چلایا۔

"یہ کیا کر رہے ہو بیوقوف۔ اسی ٹہنی کو کاٹ رہے ہو جس پر خود بیٹھے ہو۔"

اگلے لمحے ٹہنی ٹوٹ گئی اور بھولے ناتھ نیچے گر گیا۔ شکر ہے کہ زیادہ اونچائی سے نہیں گرا نہیں تو ہڈی پسلی برابر ہو جاتی۔ بھولے ناتھ آہستہ آہستہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور برہمن کے پاؤں پر گر کر بولا۔

"آپ دھنیہ ہیں مہاراج۔ آپ تو سب کچھ جانتے ہیں۔ آپ نے جہاں اتنا بتا دیا وہاں یہ بھی بتا دیجیے کہ میں کب مروں گا۔؟"

برہمن ہنس کر بولا۔

"ارے پاگل میں کوئی جیوتشی نہیں۔ میں کیسے بتا سکتا ہوں کہ تم کب مرو گے۔"!

بھولے ناتھ کہاں ماننے والا تھا۔ وہ بھی سر ہو گیا۔ برہمن کے پاؤں پکڑ کر بڑی عاجزی سے بولا۔

"مہاراج بتائیے نا۔"

برہمن نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"ارے بھائی کیسے آدمی ہو تم۔! میں کیسے بتا سکتا ہوں کہ تم کب مرو گے۔"

بھولے ناتھ بھی ڈھٹائی سے بولا۔

"جب تک آپ مجھے نہیں بتائیں گے کہ میں کب مروں گا تب تک میں آپ کو جانے نہیں دوں گا۔"

برہمن پریشان ہو اٹھا۔ آخر اس آدمی سے پیچھا چھوٹے تو کیسے اچانک اُسے ایک ترکیب سوجھی۔ اس نے جیب سے ایک کالا دھاگا نکالا اور دھاگا بھولے ناتھ کی طرف بڑھا کر بولا۔

"یہ دھاگا گلے میں ڈال لو جس دن یہ دھاگا ٹوٹ جائے گا اس دن تم مر جاؤ گے۔"

بھولے ناتھ بہت خوش ہوا۔ اس نے چٹ پٹ دھاگا گلے میں ڈالا اور برہمن سے آشیرواد لے کر گھر کی طرف چل پڑا۔ برہمن نے اطمینان کا سانس لیا کہ اس بلا سے پیچھا چھوٹا۔

بھولے ناتھ کالے دھاگے کو جان کی طرح عزیز رکھتا تھا۔ اس کی بیوی، اس کی بیوقوفی پر اندر ہی اندر کھولتی رہتی تھی مگر ظاہر ہونے نہیں دیتی تھی۔ ایک رات اس نے چپکے سے بھولے ناتھ کے گلے میں پڑا دھاگا توڑ دیا۔

صبح جب بھولے ناتھ نیند سے جاگا تو یہ دیکھ کر اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ وہ دوبارہ بستر پر لیٹ گیا۔ جب دن بھی چڑھ گیا اور بھولے ناتھ بستر سے نہیں اٹھا تو اس کی بیوی کو بے حد غصہ آگیا وہ ٹھنڈے پانی کی بالٹی لیکر دوڑی اور پوری بالٹی بھولے ناتھ پر انڈیلی۔ بھولے ناتھ ٹس سے مس نہ ہوا۔ اس کی بیوی گھبرائی۔ منہ کے پاس ہاتھ لے گئی۔ دیکھا سانس چل رہی ہے تو جان میں جان آگئی۔ غصے سے اسے ہلا ہلا کر بولی۔

"یہ کیا تماشہ ہے۔ آخر تم اٹھتے کیوں نہیں۔؟"

"مُردے بھی کبھی اٹھتے ہیں جی۔ میں تو مردہ ہوں۔ جلدی پڑوسیوں کو خبر کر دو اور میری ارتھی سجا کر مجھے شمشان گھاٹ کی طرف بھجوا دو۔"

"مگر تم تو ابھی زندہ ہو۔!" بیوی نے کہا۔

"نہیں میں زندہ نہیں ہوں۔ میں تو اسی وقت مرگیا جب یہ باھدھا گا ٹوٹ گیا۔ جلدی سے پڑوسیوں کو بلا کر لے آؤ۔!"

جب بیوی نے دیکھا کہ یہ ماننے والا نہیں ہے لاکھ سمجھانے بھی تو اُس نے چار کہاروں کو جمع کر دیا اور بھولے ناتھ کو ارتھی سوار کرا کے شمشان کی طرف بھیج دیا۔ چاروں کہار اس گاؤں کے ستوں سے واقف نہیں تھے۔ ایک جگہ چوراہا آتا تھا۔ ان چار ستوں میں سے کون سا راستہ شمشان کی طرف جاتا تھا۔ یہ اُنھیں لوم نہیں تھا۔ وہ ایک دوسرے سے پوچھ ہی رہے تھے کہ بھولے تھ اوپر سے بول پڑا۔

"یہ بیچ والا راستہ شمشان کی طرف جاتا ہے۔"

چاروں کہاروں نے جب دیکھا کہ یہ آواز اوپر سے آگئی تو سمجھے کہ مُردہ بھوت بن گیا۔ انھوں نے خوفزدہ ہو کر ارتھی وہیں ڑدی اور سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگے۔

اب بھولے ناتھ کرے تو کیا کرے۔ کون اسے شمشان گھاٹ ےئے۔ یہی سوچ کر وہ، واپس گھر لوٹ گیا۔ اس کی بیوی نے ب اسے دیکھا تو وہ کھکھلا کر ہنس پڑی۔ بھولے ناتھ غصّے سے بولا۔

"اس وقت میری جان پر بنی ہے اور تم کھی کھی کر رہی ہو۔"

بیوی نے اسے بہت پیار سے سمجھایا کہ جو مر جاتے ہیں وہ پھر تے پھرتے نظر نہیں آتے۔ وہ تو بے سدھ اور بے جان پڑے ہتے ہیں۔ پھر چاہے کوئی انھیں چیرے، پھاڑے کاٹے انھیں کچھ ق نہیں پڑتا، کہتے کہتے اس نے بھولے ناتھ کی پیٹھ میں سوئی چبھو دی ولے ناتھ چیخ پڑا۔ بیوی بولی۔

"اب یقین آیا نا کہ تم ابھی زندہ ہو۔ مر گئے ہوتے تو پھر س طرح چیخ نہ پڑتے۔"

بڑی مشکل سے یہ بات بھولے ناتھ کی موٹی کھوپڑی میں آگئی ور اس طرح وہ دوبارہ جینے پر آمادہ ہوا۔

خلال

وسیم چشتی

ایک دفعہ کا ذکر ہے کسی گاؤں میں کلّو نام کا ایک کسان رہتا تھا۔ ایک دن اس نے نئے داروغہ صاحب کی جو شہر سے نئے نئے آئے تھے۔ دعوت کرنی چاہی۔ گاؤں کے لوگوں نے اسے سمجھایا کہ دیکھ وہ شہر کے رہنے والے ہیں ان کی دعوت نہ کرو۔ ہوسکتا ہے کہ تم سے کوئی بات ایسی ہو جائے جو اُن کو ناگوار گزرے۔ لیکن اس کسان نے کسی کی کوئی بات نہ سُنی اور اس نے داروغہ صاحب کو دعوت پر مدعو کیا اور بیوی کو ہدایت کر دی کہ خوب اچھے اچھے کھانے تیار کرے۔ داروغہ صاحب جب آئے اور کھانا کھا چکے تو انھوں نے ایک خِلال مانگا۔ کسان نے سمجھا یہ بھی کوئی کھانے کی چیز ہے گھر میں گیا اور بیوی سے کہا۔ تم نے خِلال پکایا ہے۔ جلدی سے دو داروغہ صاحب مانگ رہے ہیں۔ کسان کی بیوی نے کہا۔ میں نے یہ چیز تو پکائی نہیں ہے۔ یہ سنتے ہی کسان اپنی بیوی پر بہت ناراض ہوا۔ اور اس نے کہا کہ میں نے کہا تھا کہ سب چیزیں پکا کر رکھنا۔ وہ باہر آیا اور داروغہ صاحب کے سامنے کھڑا ہو کر عاجزی سے کہنے لگا۔ داروغہ صاحب خلال تو ہمارے یہاں پکا نہیں ہے۔ یہ سنتے ہی داروغہ صاحب نے ایک زور دار قہقہہ لگایا اور کافی دیر تک ہنستے رہے۔ جب ان کی ہنسی رکی تو وہ بولے ارے بھائی خِلال کوئی کھانے کی چیز نہیں ہے وہ تو دانت کریدنے کے تنکے کو کہتے ہیں یہ سن کر کسان بہت شرمندہ ہوا۔ اس نے داروغہ صاحب کی فرمائش کو فوراً پورا کر دیا۔

فیضان نادر

شاڑ شڑب بڑ شڑ بڑ شوں

غدر سے پہلے کی بات ہے۔ تم کو معلوم ہے بچو! غدر کب ہوا تھا اور یہ کیا چیز تھی؟ غدر ۱۸۵۷ء میں ہوا تھا۔ اس کو غدر اس لیے کہتے ہیں کہ انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ کر لیا تھا وہ ہندوستانیوں پر ظلم و ستم کرنے لگے تھے۔ ان کے خلاف ہندوستانیوں نے بغاوت کر دی تھی مگر ہندوستانی ہار گئے۔ اور پھر پورے نوّے (۹۰) سال بعد ہم سب نے ایک ہو کر ان کو مار بھگایا۔ اس طرح ہم ۱۹۴۷ء میں پورے طور سے آزاد ہو گئے۔

بات تھی غدر سے بھی پہلے کی یعنی تقریباً دو ڈھائی سو برس پہلے کی۔ دہلی کے قریب ایک دیہات کی مسجد میں ایک ملّا جی نماز پڑھایا کرتے تھے۔ یہ اندھوں میں کانا راجہ تھے۔ دیہات میں کوئی بھی نیا آدمی آتا تھا تو کچھ لوگ اس سے کہتے کہ پہلے ہمارے ملّاجی کے پاس چل کر ان کی بات کا جواب دو تو ہم تمھیں گاؤں میں ٹھہرنے دیں گے۔

جو بھی مسافر آتا اس سے ملّاجی پوچھتے کہ شاڑ شڑب بڑ شڑ بڑ شوں کا کیا جواب ہے؟ مسافر بے چارہ حیران رہ جاتا اور اس کی سمجھ میں شاڑ شڑب بڑ شڑ بڑ شوں کا کوئی جواب نہ آتا تو یہاں کے لوگ اس کو دیہات سے باہر نکال دیتے۔

ایک دفعہ اسی دیہات میں حضرت امیر خسروؒ دہلوی بھی کسی طرح پہنچ گئے۔ آپ کو معلوم ہو گا بچو!! کہ امیر خسروؒ کون تھے؟ واہ بھئی واہ! انھوں نے تو بڑی پیاری پیاری پہیلیاں بچوں کی ذہنی ورزش کے لیے لکھی ہیں، بات نکلی ہے تو ایک پہیلی سنا ہی دیتے ہیں:

اندر چلمن باہر چلمن اندر کو دل دھڑکے
امیر خسرو یوں کہے وہ دو دو انگل سرکے

ذرا بوجھیے تو یہ پہیلی۔ اگر آپ نے ہار مان لی تو ہم آخر میں آپ کو جواب بتائیں گے۔

تو بات تھی امیر خسروؒ کے دیہات میں پہنچنے کی۔ بس کیا تھا پھر لوگوں نے ان کے ساتھ بھی وہی شرط رکھی کہ ہمارے ملّاجی کے پاس چل کر ان کی بات کا جواب دو تو تمھیں روٹی پانی ملے گا ورنہ الٹے پاؤں رخصت ہونا پڑے گا۔

امیر خسروؒ کو اللہ تعالیٰ نے خوب عقل اور ذہن دیا تھا۔ ویسے ہی عقل و ذہن کے مالک تو تم بھی ہوتے ہو بچو! مگر اس کا تم لوگ صحیح استعمال نہ کر کے بڑے ہونے پر بدھو بن جاتے ہو۔ کتنے افسوس کی بات ہے۔ امیر خسروؒ راضی ہو گئے۔ اور کچھ لوگوں کے ساتھ ملّاجی کے پاس مسجد پہنچے۔ بس کیا تھا پھر ملّاجی نے کہا۔ شاڑ شڑب بڑ شڑ بڑ شوں کا جواب دو۔

امیر خسرو نے کہا۔ "ملّاجی! یہ پہلے ہی شاڑ شڑب بڑ شڑ بڑ شوں کیسی؟ اس طرح کہو:۔

دھان دھما کا دھمک دوں
چھاج پچھوڑا چھڑ بڑ شوں
ہانڈی ڈوئی کھٹر بڑ کھوں
پھر شاڑ شڑب بڑ شڑ بڑ شوں

یعنی پہلے دھان کو کوٹو۔ پھر چھاج (سوپ) میں پچھوڑ کر، چاول نکالو اور ہنڈیا میں ڈال کر کھاؤ۔ پھر شاڑ شڑب بڑ شڑ بڑ شوں" کرو یعنی دودھ ڈال کر چاول کھاؤ۔ تو آواز بالکل شاڑ شڑب بڑ شڑ بڑ شوں کی طرح نکلے گی۔"

ملّاجی نے جو یہ جواب سنا تو ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اور تمام حاضر لوگوں نے خوشی میں آکر تالیاں بجائیں اور کہا کہ آج ملّاجی ہار گئے۔ اب یہ ہمارے کام کے نہیں رہے" لوگوں نے ملّاجی کو دیہات سے نکال دیا اور حضرت امیر خسروؒ کی بڑی

بقیہ صفحہ ۲۴ پر

ایک تھیلی کے چٹے بٹے

کہا جاتا ہے کہ کسی زمانے میں دو آدمی پیدل سفر پر نکلے، ایک مشرق سے مغرب کی طرف اور دوسرا مغرب سے مشرق کی جانب، دونوں کی مڈبھیڑ کسی تالاب پر ایک سایہ دار درخت کے نیچے ہوئی۔ دوپہر کا وقت تھا، چلچلاتی دھوپ تھی، دونوں نے درخت کے گھنے اور ٹھنڈے سایہ میں کچھ دیر آرام کیا۔ دوپہر ہوگئی دونوں کو سخت بھوک لگی تھی۔ توشہ دونوں کے پاس تھا۔ مگر کھانے کی نوبت نہیں رہی تھی۔ ہر ایک شخص اس انتظار میں تھا کہ دوسرا توشہ دان کھولے اور دسترخوان بچھائے تو اس میں شریک ہو جاؤں۔ اس انتظار میں کھانے کا وقت نکل گیا۔

بڑی دیر کے بعد بادل ناخواستہ ایک نے تالاب سے گلاس بھر پانی لیا اور توشہ دان میں سے روٹی نکال کر توڑی روٹی کے ٹکڑے کو بڑی پھرتی اور جلدی سے پانی میں ڈبو کر روٹی کا ٹکڑا تو توشہ دان میں رکھ لیا۔ البتہ پانی غٹاغٹ پی گیا۔ پھر سو رہا۔

اب دوسرے مائی کے لال کی باری تھی۔ اس نے بھی برتن میں پانی لیا، روٹی نکالی اور اس انداز سے روٹی برتن کے اوپر پکڑی کہ دھوپ میں اس کا عکس برتن کے پانی پر پڑے۔ پانی کو روٹی کی پرچھائیں دکھا کر اس شخص نے پانی پی لیا۔ اور روٹی توشہ دان میں محفوظ کر دی۔

دونوں ایک دوسرے کا رویہ دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ ہمارے خیالات میں اتنی یکسانیت موجود ہے۔ جتنی دو بخیلوں کے خیالات میں ہو سکتی ہے۔ آپس میں تعارف ہوا، پھر سفر کا مقصد یہ نکل آیا کہ دونوں رشتہ کے تلاش میں نکلے ہیں، ایک اپنے بیٹے کے لیے اور دوسرا اپنی بیٹی کی خاطر۔ دونوں نے خود بخود فیصلہ کر لیا کہ خیالات کی یکسانیت اور طبیعتوں کی ہم آہنگی کے اعتبار سے ہم دونوں کے درمیان رشتہ بڑا مثالی رہے گا۔ چنانچہ ان میں سے ایک کنجوس کے بیٹے کی شادی ایک مکھی چوس کی بیٹی سے ہوگئی۔

(بقیہ دلچسپ پہیلیاں)

گورے گورے رنگ والا　　جیسے روئی کا گالا
پیٹ کرو جو اس کا چاک　　تو ہو جاتا ہے وہ خاک

۲۔ پتّہ ہے، پر ہرا نہیں ہے　　چلتا ہے تو رُکتا نہیں ہے
لیکن رک جاتا ہے وہ جب　　ساتھ میں اس کے رک جاتے سب
دل میں اپنے پہلے سوچو!　　کیا ہے وہ؟ بتلاؤ، ہم کو؟

جوابات :-

پہیلیاں ع۱

۱۔ علم (۲)، قلم (۳)، دوات (۴) پنسل (۵)، کتاب (۶)، لفافہ ڈاک کا۔

پہیلیاں ع۲

(۱)، مانجھا نہ تھا (۲)، کھُلا نہ تھا (۳)، جانا نہ تھا (۴)، گھڑی نہ تھی (۵)، پکانا نہ تھا (۶)، گاڑھا نہ تھا (۷)، چابی نہ تھی (۸)، پہنچی نہ تھی۔

پہیلیاں ع۳

(۱)، چاک　　(۲)، دِل

شاہد اشرف

ظلم کا نتیجہ

پرانے زمانے کی بات ہے۔ کسی ملک میں ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا بادشاہ بہت ہی ظالم اور بے رحم تھا۔ رعایا اس کے ظلم وستم سے بے حد پریشان تھی۔ بادشاہ کی سواری جب شاہراہِ عام پر نکلتی تو لوگ خوف و دہشت کے مارے اپنے گھروں میں دبک پڑتے۔ بھرے پرے بازار گلیوں میں سنسان ہو جاتے اور ایسا لگتا جیسے شہر کی تمام رنگینیاں زمین کے پھٹ جانے سے اس کے اندر سما گئی ہوں۔ رعایا بادشاہ کے ظلم وتشدد کی وجہ سے اسے قہر کا دیوتا سمجھتی تھی۔

ایک دن بادشاہ اپنے وزیر کے ساتھ جنگل میں شکار کھیلنے گیا۔ شکار کی تلاش میں وہ لوگ بہت دور نکل گئے۔ تاہم شکار نہیں ملا۔ تھکاوٹ اور پریشانی کے سبب بادشاہ نڈھال ہوتا جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر آرام کی غرض سے وہ ایک سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھنا ہی چاہتا تھا کہ اسے کچھ فاصلے پر ایک شیر دھاڑیں مارتا ہوا دکھائی دیا۔ اتفاقاً اسی جانب سے ایک خوبصورت ہرنی بھی گذر رہی تھی۔ شیر نے جب اپنے قریب سے ہرنی کو گذرتے دیکھا تو

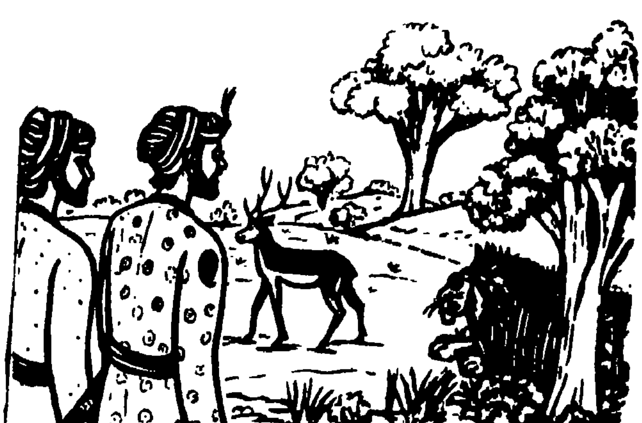

گڑگڑا گڑگڑا کر کہنے لگا "ہرنی بہن! میرے پاؤں میں چبھے کانٹے نکال دو۔ میں تمہارا احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا"

ہرنی شیر کی باتیں سن کر خوف زدہ ہو گئی تاہم شیر کے بار بار اصرار کرنے پر اسے اس پر رحم آ ہی گیا۔ اور ہرنی اس شرط پر کانٹے نکالنے کے لیے تیار ہو گئی کہ وہ اس کے کانٹے نکال دینے کے بعد اسے کھائے گا نہیں۔ شیر نے وعدہ کر لیا۔ مگر کانٹا نکلتے ہی شیر اپنا وعدہ بھول گیا۔ غرّایا اور بھاگتی ہوئی ہرنی پر ایک لمبی جست لگائی۔ مگر ہرنی تک پہنچتے پہنچتے اچانک گر پڑا اور مر گیا۔ کیونکہ سایہ دار درخت کی سب سے نچلی شاخ سے لٹکی ہوئی سیاہ ناگن نے اسے ڈس لیا تھا۔

یہ تمام ماجرا دیکھ کر بادشاہ حیران رہ گیا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ اس نے پریشان ہو کر اپنے وزیر سے دریافت کیا کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ وزیر بے انتہا چالاک اور دور اندیش تھا، اس نے حکمت عملی سے اور اعلیٰ تدبیر سے کام لیتے ہوئے کہا "حضور! یہ ظلم کا نتیجہ ہے۔ ساری دنیا جانتی ہے شیر جنگل کا بادشاہ ہوتا ہے۔ بادشاہ نے اپنی رعایا پر ظلم کیا۔ اس نے احسان کا بدلہ برائی سے دینا چاہا۔ مگر خدائے واحد سے؟ ساری کائنات کا خالق اور حاکم ہے۔ اس غریب ہرنی کی مدد کی اور اپنی قدرت کے بل بوتے پر سانپ کے توسط سے ڈسوا کر ظلم وتشدد اور بربریت سے جنگلی رعایا کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے

بقیہ صفحہ ۲۴ پر

فضل امام ملک

ڈاک ٹکٹ کی کہانی

'پوسٹ مین .....'

پوسٹ مین کی آواز سنتے ہی محمد میاں باہر کی طرف لپکے۔ ھی ممی نے آواز دی "کس کا خط ہے محمد؟"

"آپی کا خط آیا ہے ممی کنا ڈا سے .... دیکھو نا کتنا بصورت ٹکٹ ہے لفافے پر چپکا ہوا" اور ٹکٹ لفافے سے پھاڑ کر کمرے کی طرف چل پڑا۔ بکس سے اپنا اسٹیمپ البم لا اور اس نئے ٹکٹ کو البم میں چپکا کر باہر کی جانب مڑا۔ تبھی رے میں ایک آواز گونجی "محمد میاں ..."

"کون ...." محمد ڈر کر بولا۔

"ڈرو مت محمد میاں .... میں ڈاک ٹکٹ تم سے مخاطب ں۔"

محمد نے گھور کر دیکھا ڈاک ٹکٹ کو۔ سچ مچ یہ تو بات کر رہا ہے۔

"تمھیں ڈاک ٹکٹ جمع کرنے کا شوق ہے نا ....؟"

"ہاں!" محمد میاں نے جواب دیا۔

"تم نے کبھی جاننے کی کوشش کی ہے ڈاک ٹکٹ کب بنا رکس ملک نے سب سے پہلے ڈاک ٹکٹ کا استعمال شروع یا... نہیں نا....؟ تو آج میں تمھیں اپنی کہانی سناتا ہوں۔ رے جنم سے پہلے ڈاک خرچ خط پانے والے سے وصول کیا تا تھا۔ جو خط کے وزن، دوری وغیرہ کو دیکھتے ہوئے لیا جاتا ا۔ لیکن یہ کافی مشکل اور پریشانی کا سبب بنا۔

میرے جنم کا سہرا انگلینڈ کے رولینڈ ہل کے سر ہے۔ میری پیدائش کی کہانی بھی بہت مزیدار ہے۔ جب رولینڈ ہل بارہ سال کا تھا۔ تب ہی اس کے یہاں کام کرنے والی نوکرانی کو اس کے بیٹے نے خط لکھا۔ اس کا بیٹا کسی دوسرے ملک میں نوکری کرتا تھا۔ ڈاکیہ نے نوکرانی سے دو شلنگ کی مانگ کی لیکن وہ بے چاری غریب نوکرانی دو شلنگ نہیں دے سکی اور تب ڈاکیہ بنا خط دیئے چلا گیا۔ اس واقعہ نے ہل کے دماغ پر گہرا اثر ڈالا۔ بڑے ہونے پر اس کی نوکری اسکاٹ لینڈ میں ہو گئی۔ ایک دن وہ جب گھومنے نکلا تو اس نے دیکھا کہ ایک غریب مزدور اور ڈاکیہ میں خط کی قیمت کو لے کر کافی بحث چھڑی ہوئی ہے۔ ہل کو بچپن کا وہ واقعہ یاد آگیا اور اس نے مزدور کی جانب سے خط کی قیمت چکا دی۔

وہ ڈاک کے اس عجیب و غریب سسٹم کے بارے میں کافی غور و فکر کرنے لگا۔ اس کے دماغ میں یہ سوال بار بار چکر لگانے لگا کہ ڈاک خرچ اگر خط بھیجنے والے سے وصول کیا جائے تو کیسا رہے؟۔ ایک دن وہ اپنی اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے اس وقت کے وزیر اعظم لارڈ میلبورن سے ملا۔ لیکن میلبورن صاحب نے اس اسکیم کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ یہ اسکیم برٹش حکومت کا سارا خزانہ خالی کر دے گی اور اس سے کچھ فائدہ نہیں۔ لیکن ہل بھی پکا ارادہ کر چکا تھا۔ اس نے اس معاملہ کو عوام میں مقبول کیا۔ اور ۱۸۳۷ء میں "نظام ڈاک میں سدھار لاؤ" نام کا ایک اخبار بھی نکالا اور تب عوام بھی ہل کی حمایت کرنے لگی۔ اس سے متاثر ہو کر مہارانی وکٹوریہ نے رولینڈ ہل کو اپنے پاس اس اسکیم کی تفصیلی جانکاری کے لیے بلایا۔ رولینڈ ہل نے مہارانی کو اپنے اسکیم کے بارے میں پوری جان کاری دی۔ وہ نمونے کے طور پر کاغذ کا ایک ٹکڑا بھی لے گیا تھا۔ جس پر ایک طرف مہارانی کی تصویر تھی اور دوسری طرف گوند لگا تھا۔ مہارانی نے ہل کی اسکیم کو پسند کیا اور سراہا اور اسے انھوں نے ۱۷ اگست ۱۸۳۱ء کو ہاؤس آف کامنز میں رکھا۔ اسکیم پاس ہو گئی۔ ۱۸۳۹ء کو میرا ایک ابتدائی ڈیزائن بنایا گیا۔ اور تب ۱۸۴۰ کو پہلا ڈاک ٹکٹ چھپا اور پہلے

محمد عارف غازی

عجیب و غریب سائنسداں

رات میں جب آپ پڑھنا چاہتے ہیں تو بڑی آسانی سے سوئچ آن کرتے ہیں اور آپ کا کمرہ جگمگا اٹھتا ہے۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ یہ کارنامہ کس نے انجام دیا۔ وہ تھا امریکہ کا عظیم سائنسداں "تھامس ایلوا ایڈیسن" "Thomas Alva Edison" کمسنی سے ہی ایڈیسن تجربات کا شوقین تھا۔ وہ سوالات پوچھا کرتا تھا اور صحیح جواب حاصل کرنے تک مطمئن نہ ہوتا تھا۔ اس کی کمسنی کی مختلف دلچسپ کہانیاں ہیں جن میں سے کچھ درج ذیل ہیں۔

ایک روز اسکول میں استانی صاحبہ پرندوں کی کہانی سنا رہی تھیں۔ ایڈیسن اٹھا اور بولا "میڈم! انسان پرندوں کی طرح کیوں نہیں اڑ سکتا۔" "انسان کے پنکھ نہیں ہوتے۔" استانی کا جواب تھا۔ کمسن بچہ نے یک لحظہ سوچا اور پھر بولا۔ لیکن پتنگ کے بھی پنکھ نہیں ہوتے، پھر بھی ہم اسے اڑا سکتے ہیں۔"

تمام طالب علم ہنس پڑے اور استانی صاحبہ خشمناک ہو گئیں۔ اس نے سمجھا کہ لڑکا بیوقوف اور شیطان ہے، چنانچہ اس کے والدین کو بلایا گیا اور اسے اسکول سے خارج کر دیا گیا۔ بچے کے والدین جانتے تھے کہ لڑکا غبی نہیں ہے۔ یہ واقعہ صرف آٹھ سال کی عمر میں پیش آیا۔

کمسن ایڈیسن کی سب سے بہترین رہنما اس کی ماں ثابت ہوئی جو نہایت تحمل کے ساتھ اس کے سوالات سنتی اور جوابات دیا کرتی تھی۔ جس کی مدد اور رہنمائی سے اس نے اعلیٰ ترقی حاصل کی۔ وہ ہر چیز کو گہری نظر سے دیکھتا اور تجربات کیا کرتا تھا۔ اس کے کچھ تجربات احمقانہ بھی تھے۔ لیکن ان سے اس نے بہت کچھ سیکھا۔

ایک دن صبح کے وقت وہ ایک پرندہ دیکھ رہا تھا۔ پرندہ زمین پر اترتا، اپنی چونچ میں کچھ کیڑے پکڑتا اور اڑ جاتا۔ یہ دیکھ کر ایڈیسن کو خیال آیا کہ پرندے کیڑے کھانے کی وجہ سے ہی اڑ پاتے ہیں۔ اس لیے اگر انسان بھی کیڑے کھاتے تو وہ بھی اڑ سکتا ہے۔ اس نے کچھ کیڑے لیے، پانی میں ان کا محلول بنایا اور اپنی نوکرانی کی لڑکی کے پاس لے جا کر بولا، "یہ جادو کا شربت ہے، اگر تم اسے پی لو تو پرندوں کی طرح اڑنے لگو۔" "آؤ پیو، اور دیکھو۔"

غریب لڑکی کو یقین آگیا اور اس نے وہ محلول پی لیا۔ بیچاری اڑ تو نہ سکی ہاں بیمار ضرور پڑ گئی۔ ایڈیسن کی ماں نے مستقبل میں ایسے احمقانہ تجربات نہ کرنے کی ہدایت کی۔

ایک مرتبہ وہ اپنی ماں کے ساتھ مرغی خانہ میں گیا۔ اس نے ایک مرغی دیکھی جو انڈوں پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اپنی عادت کے مطابق اس نے مرغی کے بارے میں اپنی ماں سے سوالات کیے۔ ماں نے بتایا کہ مرغی انڈے سے رہی ہے تھوڑے دنوں بعد انڈوں سے چوزے نکلیں گے۔" اب ایڈیسن کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ میں انڈے کیوں نہیں سے سکتا۔ چنانچہ اگلی صبح ہی اس نے درجن بھر انڈے لیے اور ان پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے دیکھا کہ چوزہ تو کوئی نہیں نکلا ہاں انڈے پھوٹ گئے ہیں اور اس کا نیکر خراب ہو گیا ہے۔ غریب ایڈیسن چوزہ تو پیدا نہ کر سکا لیکن اس حماقت پر اپنی ماں سے مار ضرور کھائی۔ اگرچہ وہ اپنے ان تمام تجربات میں ناکام رہا لیکن ان سے اس نے بہت کچھ سیکھا۔ اسے معلوم ہو گیا کہ اس کے خیالات غلط تھے۔ وہ کتابوں کا شوقین تھا۔ اور مطالعہ کیا کرتا تھا۔ اس کے والد اسے ہر کتاب ختم کرنے کے عوض پچیس ۲۵ سینٹ (Cent) دیا کرتے تھے۔ اس نے وسیع مطالعہ کیا اپنے جیب خرچ سے بھی کتابیں خریدیں اور ایک چھوٹی سی لیبوریٹری بھی قائم کر لی۔ اس کی ماں اس کی حوصلہ افزائی اور تجربات میں اس کی مدد کیا کرتی تھی۔

کچھ عرصے بعد ایڈیسن نے محسوس کیا کہ تجربات کے لیے اسے مزید روپیہ درکار ہے۔ کیونکہ وہ گھر پر موجود تمام کتب کا مطالعہ کر چکا تھا اس لیے اسے اور کتابوں کی ضرورت تھی۔ اب وہ باہر جانا، نئے نئے لوگوں سے ملنا اور نئے نئے مقامات کی سیر کرنا چاہتا تھا۔ وہ نئی نئی کتب کا مطالعہ کرنا چاہتا تھا اور اپنے علم میں اضافہ کا طالب تھا۔ اس نے ریلوے میں ملازمت کرنے کا فیصلہ کیا۔ پہلے تو والدین اس کی رائے سے متفق نہ ہوئے کیونکہ اس وقت ایڈیسن کی عمر صرف بارہ سال تھی۔ لیکن جب انھوں نے نوکری کے متعلق ایڈیسن کے دلائل سنے تو راضی ہو گئے اور اسے ملازمت کرنے کی اجازت دے دی۔ ایڈیسن نے اخبار فروخت کرنے شروع کر دیے اور ریل سے "ڈیٹرائٹ" تک سفر کرنے لگا۔ پہلے ہی دن اس نے اخبار، مٹھائیاں اور پھل بیچ کر دو ڈالر کمائے۔ اس رات کھانے پر اس نے اپنی ماں کو ایک ڈالر دیا اور وعدہ کیا کہ ہر رات وہ اسے ایک ڈالر دیا کریگا۔

ایک دو سال بعد ایڈیسن نے اپنا نجی اخبار شائع کرنے کی بات سوچی۔ اور ایک پرانی چھپائی مشین خرید لی۔ اس نے اپنے ریلوے ویگن میں ہی ایک "لیبوریٹری" قائم کر لی۔ پندرہ سال کی عمر میں اسے ایک بھیانک حادثہ کا سامنا کرنا پڑا۔ جس نے اس کے مستقبل پر گہرا اثر ڈالا۔ جب وہ اپنے ویگن میں تجربہ کر رہا تھا تو اچانک گاڑی کو جھٹکا لگا اور تھوڑا سا فاسفورس "ڈبہ" میں گر گیا۔ اس میں آگ لگ گئی۔ اور اس کے قابو پانے سے قبل قریب کے اخباروں میں بھی آگ پھیل گئی۔ اب ایڈیسن مدد کے لیے چلّایا اور گارڈ کی مدد سے اس نے آگ پر قابو پالیا۔ لیکن اس حادثہ نے اس کی ملازمت کا خاتمہ کر دیا اگلے ہی اسٹیشن پر اسے نوکری سے برخواست کر دیا گیا۔

لیکن ایڈیسن بیکار نہ بیٹھا رہا اس نے مختلف شہروں میں ملازمتیں کیں۔ ورکشاپ اور فیکٹریوں میں جاکر ماہرین سے ملاقاتیں کیں۔ ان سے سوالات کیے اور بہت کچھ حاصل کیا۔ اور مزید محنت کے ساتھ تجربات کرتا رہا۔

اس دوران وہ اپنے ایک دوست کے مکان پر رہتا رہا۔ اس کا دوست ایک کمپنی میں کام کرتا تھا۔ کمپنی میں ایک خاص قسم کی مشین تھی۔ ایک دن اچانک مشین نے کام کرنا بند کر دیا۔ حسن اتفاق سے ایڈیسن وہاں موجود تھا۔ اس نے مشین کا معائنہ کیا اور بہت جلد اسے درست کر دیا۔ کمپنی کے منیجر نے ایڈیسن کی ہوشیاری کی قدر کی اور اسی کمپنی میں اسے ایک اہم عہدہ پر مامور کر دیا۔ اب ایڈیسن نے اپنا قرض چکایا اور اپنی لیبوریٹری کو ترقی دی۔ آئندہ چھ سال تک کے لیے ایڈیسن نے تجربات کی ایک فہرست تیار کی اور یکے بعد دیگرے تجربات کرتا رہا۔ جن کے ذریعہ اسے دولت و شہرت حاصل ہوئی۔

۱۸۷۷ء میں اس نے ایسی مشین کے لیے تجربات کیے جو انسانی آواز پیدا کر سکتی تھی اور ایک سال کے دوران اس نے ایسی مشین تیار کر لی۔ اس وقت اسے "بات کرنے والی مشین" کے نام سے موسوم کیا گیا۔ جس کو آج ہم "گراموفون" کہتے ہیں۔ اسی سال اسے "وہائٹ ہاؤس" (White House) واشنگٹن میں مدعو کیا گیا۔ یہ اس عمارت کا نام ہے جہاں امریکہ کے صدر قیام کرتے ہیں، اپنی نئی مشین دکھانے کے لیے ایڈیسن صدر امریکہ کی خدمت میں پہنچا جس سے اسے تمام امریکہ میں شہرت نصیب ہوئی۔ اب وہ کامیاب اور دولت مند بن چکا تھا۔ اور اس کامیابی کا سہرا اس کی ماں کی مدد، ہمت افزائی اور اس کی اپنی ذاتی محنت کے سر تھا۔

مارچ ۱۸۷۸ء میں اس نے بجلی کے لیمپ پر تجربات شروع کیے۔ اُن دنوں موم بتی اور تیل کے چراغ یعنی دیپک روشن کر کے اجالا کیا جاتا تھا۔ انھیں بجلی کی روشنی حاصل نہیں تھی۔ ایڈیسن نے اپنے ہموطنوں سے وعدہ کیا کہ وہ انھیں دو سال کے اندر اندر روشنی مہیا کر دیگا۔ اس وقت کے سائنسدانوں نے اس کی باتوں کو مضحکہ خیز بتایا۔ اور کہا کہ "یہ ناممکن ہے"۔ لیکن ایڈیسن نے ان کی باتوں کی پرواہ نہ کی اور وہ سخت محنت کرتا رہا۔ ایک ہزار تجربات کرنے کے بعد بھی اسے کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ پھر بھی اس نے ہمت نہیں

ہار س۔ اس نے سوچا کہ مجھے اپنے ہموطنوں سے کیے گئے وعدے کو پورا کرنا چاہیے۔ اس نے مزید محنت کی۔ آخر کار ایک ہزار دو سو تجربات کے بعد وہ کامیاب ہوگیا۔ ۱۸۸۰ء میں اس کی لیبورٹیری بجلی کی روشنی سے جگمگا اٹھی۔ تمام امریکی لوگ اس کے اس عظیم الشان کارنامہ کو دیکھنے کے لیے آئے اور اس نے عوام سے کیے گئے وعدہ کو وفا کر دیا۔ بعد ازاں ۴ ستمبر ۱۸۸۲ء کو تمام امریکہ بجلی کی روشنی سے جگمگا رہا تھا۔

پہلی جنگ عظیم میں ایڈیسن نے اپنے ملک کی بڑی خدمت انجام دی۔ اس نے جنگ کے دوران قریب چالیس ایجادات کیں اور بطور انعام میڈل حاصل کیا۔ ۱۹۲۹ء میں نہایت پرشکوہ انداز میں بجلی کی سلور جوبلی منائی گئی۔ امریکہ کے صدر نے ایک عظیم الشان جلسہ میں اسے خوش آمدید کہا۔ ایڈیسن صدر کا شکریہ ادا کرنے کے لیے اٹھا۔ لیکن اچانک بیمار ہوگیا۔ اس کی حالت بگڑ گئی اور ۱۸ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو اس نے اس عالم فانی کو خیرباد کہا۔ اسنے کہا تھا "میں کبھی ایسی چیزیں ایجاد نہیں کروں گا جو انسانی زندگی کو تباہ کرے۔ میں لوگوں کو خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔" اس نے یہ بھی کہا تھا کہ " دنیا عرصۂ دراز سے اندھیروں میں گھری ہوئی ہے میں اس دنیا کو مزید مسرتیں اور روشنی دوں گا۔ اس نے اپنے وعدہ پورے کر دکھائے گراموفون کی شکل میں انسانی مسرت میں اضافہ کیا اور بجلی کے ذریعہ مزید روشنی عطا کی۔

آج ہمیں اور ہمارے ملک کو ایڈیسن جیسے لوگوں کی ضرورت ہے۔ ہر لڑکے اور لڑکی کو ایڈیسن کی مثالی زندگی سے سبق لینا چاہیے اور اس پر عمل کرنا چاہیے۔

——(بقیہ: شاعر شکر بر شاعر ہر شوں)——

خاطر تواضع کی وہ وہاں کئی دن مہمان رہے۔

اسی طرح ایک وقت امیر خسروؒ کسی گاؤں میں جا رہے تھے۔ پیاس لگی تو ایک کنویں پر کچھ پانی بھرنے والیوں کو دیکھ ان کے پاس جا کر پانی طلب کیا۔ ان میں سے ایک نے آپ کو پہچان لیا اور سب کو بتا دیا کہ یہ پہیلی کہنے والے امیر خسروؒ ہیں۔ پھر کیا تھا؛ ایک بولی پانی پینا ہے تو پہلے ایک ایسا دوہا سنائیے جس میں پانی مانگنے کا ذکر ہو۔" دوسری بولی۔" دوہے میں چرخہ کا بھی ذکر ہونا چاہیے۔" تیسری بولی۔" اور چرخہ کے ساتھ کتے کا بھی۔" چوتھی نے اور شرط لگا دی کہ" کھیر اور ڈھول کا بھی ذکر ہوگا تو پانی ملے گا۔"

امیر خسروؒ تو حاضر جواب تھے ہی، برجستہ کہا۔

کھیر پکائی جتن سے چرخا دیا جلا
آیا کتا کھا گیا تو بیٹھی ڈھول بجا
اب لا پانی پلا۔"

پانی بھرنے والیاں سب کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ اور حضرت کو تازہ تازہ ٹھنڈا پانی پلا کر رخصت کیا۔ اور حضرت بھی دعائیں دیتے آگے بڑھ گئے۔

(پہیلی کا جواب - قینچی)

——(بقیہ: ظلم کا نتیجہ)——

چھٹکارا دلوا دیا— سچ ہے ظلم کی آگ جتنی تیزی سے بڑھتی ہے اتنی ہی تیزی سے بجھ بھی جاتی ہے—"

یہ سن کر بادشاہ کا تاریک ذہن روشن ہوگیا۔ وہ بہت شرمندہ ہوا۔ اور اس نے ہمیشہ کے لیے عہد کر لیا کہ اب وہ اپنی رعایا کو خوش رکھے گا۔

اس طرح سارے ملک میں خوشی اور مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ اور بادشاہ کی عزت رعایا کی نگاہوں میں دن بدن بڑھتی ہی چلی گئی۔ ہر طرف خوشی و انبساط کے دیپ جل اٹھے—!!

"ٹرام"

کوثر سہروردی

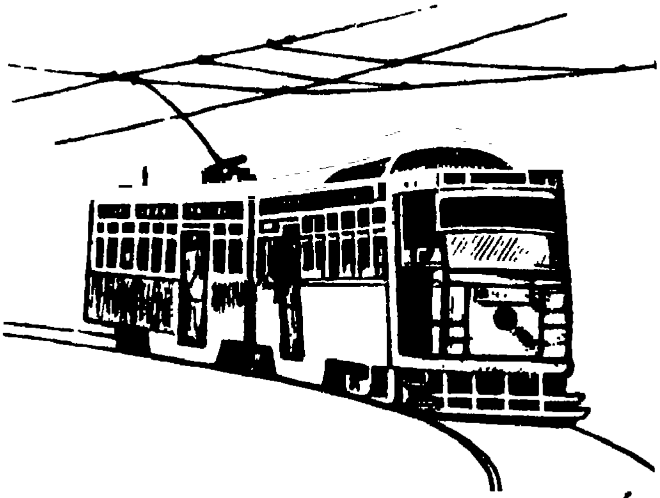

دو ڈبوں کی ریل یہ دیکھو دو ڈبوں کی ریل
کوئلہ نہ مانگے پانی نہ مانگے اور نہ مانگے تیل
دو ڈبوں کی ریل ہے بھائی دو ڈبوں کی ریل
چمک چمک کرتی دھک دھک کرتی چلتی پٹری پر
ٹن ٹن گھنٹی دیتی دوڑے پتھر سی دھرتی پر
دو ڈبوں کی ریل ہے بھائی دو ڈبوں کی ریل
ہندوستان میں بس کلکتہ میں ریل ایسی چلتی ہے
بجلی کے تاروں سے لے کر طاقت آگے بڑھتی ہے
دو ڈبوں کی ریل ہے بھائی دو ڈبوں کی ریل
پہلا دوسرا بس دو درجے ہی ہوتے ہیں اس میں
چڑھ جاتے ہیں لوگ جگہ مل جائے جس کو جس میں
دو ڈبوں کی ریل ہے بھائی دو ڈبوں کی ریل
ایک ہے چالک، دو کنڈکٹر بقیہ سب ہیں پسنجر
بھیڑ میں سیٹ ملے جس کو وہ قسمت کا ہے سکندر
دو ڈبوں کی ریل ہے بھائی دو ڈبوں کی ریل
دو ڈبوں کی ریل یہ کوثر ہم کو بہت ہے بھائی
دو ڈبوں کی ریل نہیں یہ ٹرام ہے میرے بھائی
دو ڈبوں کی ریل ہے بھائی دو ڈبوں کی ریل

ہیلی کاپٹر

ناوک حمزہ پوری

اڑ گیا دیکھو ہوا کے دوش پر
اے سبحان اللہ ! ہیلی کاپٹر

یوں اڑا جاتا ہے ہیلی کاپٹر
ہو پرندہ جیسے سرگرمِ سفر

بیضوی دھڑ اور دم لمبی سی ایک
سر کے اوپر اس کے ہے چرخی بھی ایک

جیسے کل پرزوں کی چڑیا ہو کوئی
جیسے بچوں کا کھلونا ہو کوئی

گھر گھر گھر کر کے اڑ جاتا ہے یہ
منٹوں میں منزل پہ پہنچاتا ہے یہ

عقلِ انسانی پہ حیرت کیجیے
شکرِ انعاماتِ قدرت کیجیے

شِو ناتھ سِکّہ

مُلّا نصر الدّین

بادل کا ٹکڑا

ایک دن مُلّا نصر الدین اپنی نظریں جُھکائے کسی کھوج میں لگے ہوئے تھے۔ لوگوں نے ان سے پوچھا کہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ مُلّا نے جواب دیا کچھ روز پہلے میں نے یہیں کہیں زمین میں تھوڑے سے روپے گاڑے تھے۔ اب انھیں نکالنا چاہتا ہوں، مگر وہ جگہ نہیں مل رہی۔" لوگوں نے کہا کہ اس جگہ کی شناخت کے لیے آپ نے کوئی نشانی وغیرہ نہیں رکھی تھی کیا؟ مُلّا بولے" واہ! کیوں نہیں، اس وقت ایک بادل کا ٹکڑا اس جگہ پر اپنا سایہ ڈال رہا تھا۔

سب سے بڑا احمق

کچھ لوگوں نے مُلّا سے سوال کیا کہ آپ نے سب سے بڑا احمق کسے پایا۔ جواب میں مُلّا نے یہ واقعہ بیان کیا:-

"جب میں اپنا مکان بنوا رہا تھا تو اس کا دروازہ بنانے کے لیے میں نے ایک بڑھئی کو بلوایا تاکہ دروازے کی لمبائی چوڑائی ناپ لے۔ اتفاق سے وہ اپنا پیمائشی فیتہ بھول آیا۔ چنانچہ اس نے اپنی باہیں پھیلا کر ناپ لے لیا اور اسی طرح باہوں کو پھیلائے ہوئے روانہ ہو گیا تاکہ ناپ میں فرق نہ آ جائے۔ راستے میں وہ ٹھوکر کھا کر ایک گڈھے میں جا گرا۔ لوگ جمع ہو گئے اور بڑھئی سے کہنے لگے کہ اپنے ہاتھ پکڑاؤ تاکہ تمھیں باہر نکالیں۔ بڑھئی نے جواب دیا:- "ہاتھ تو میں پکڑاؤں گا نہیں، کہیں ناپ میں کمی بیشی نہ ہو جائے البتہ میری داڑھی پکڑ کر مجھے باہر نکال لو۔"

دل کی مُراد

مُلّا کے پاس ایک موٹا تازہ سانڈ تھا۔ جس کے سینگ بہت لمبے اور سڈول تھے۔ کئی بار مُلّا کے جی میں آیا کہ سینگوں کے درمیان بیٹھ کر سانڈ کی سواری کرے۔ ایک دن وہ ہمت کر کے سینگوں کے درمیان بیٹھ ہی گئے۔ سانڈ نے جھنجھلا کر مُلّا کو تڑاق سے زمین پر پٹخ دیا۔ ملّا لہولہان ہو کر بے ہوش ہو گئے۔ بیوی کو پتہ چلا وہ آئیں اور ملّا کو ایسے پڑا دیکھ کر یہ سمجھیں کہ وہ چل بسے۔ لگیں رونے پیٹنے۔ کچھ دیر میں مُلّا ہوش میں آئے اور فرمانے لگے:-" چوٹ تو واقعی سخت لگی، مگر دل کی مُراد پوری ہو گئی۔"

مُلّا کا جھانسا

ایک شخص بازار میں کھڑا شیخی بگھار رہا تھا کہ میں بڑا کائیاں آدمی ہوں اور آج تک کوئی مجھے جھانسا نہیں دے سکا۔ ملّا نے کہا: "تمھیں جھانسا دینا تو کچھ مشکل نہیں ہے، مگر کیا کروں مجھے ضروری کام ہے۔ رک نہیں سکتا۔" اس شخص نے کہا: "کہنا آسان ہے کرنا مشکل ہے۔" ملّا نے جواب دیا:-" اچھا، تو ذرا یہیں ٹھہرو، میں ابھی کام کر کے لوٹتا ہوں اور تمھیں جھانسا دے کر دکھاتا ہوں۔"

وہ شخص دیر تک راہ دیکھتا رہا۔ ملّا نہ آئے۔ دو گھنٹے گذر گئے تو چلّا چلّا کر کہنے لگا:-" بڑے آئے تھے جھانسا دینے والے۔ دے سکتے تو لوٹتے نا؟ ..."

ایک راہ گیر نے پوچھا:" کیا بات ہے بھائی؟ اتنا کیوں بگڑ رہے ہو؟" اس شخص نے ماجرا کہہ سنایا۔ راہ گیر نے کہا:" ارے احمق، اور کیا جھانسا دیتا تمھیں۔ دو گھنٹے تمھیں انتظار کرایا اور خود اس کا پتہ نہیں۔ یہ جھانسا نہیں تو اور کیا ہے؟"

مُلّا کا عمامہ

ایک ان پڑھ ارمنی ملّا کے پاس آیا اور ایک خط دے کر کہا:" ذرا

اسے پڑھ دیجیے؟" خط ارمنی زبان میں تھا۔ ملّا نے کہا: "میں ارمنی نہیں جانتا۔" ارمنی نے ملّا کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور تعجب سے کہا: "جب ایک خط تک نہیں پڑھ سکتے ہو تو اتنا بڑا عمامہ کیوں باندھ رکھا ہے؟" ملّا نے فوراً اپنا عمامہ اتار کر اس کے سر پر رکھ دیا اور کہا: "اگر ارمنی پڑھنا عمامے پر منحصر ہے تو آپ ہی پڑھ دیجیے۔"

بھاپ کی قیمت

ایک بھکاری نانبائی کی دوکان کے پاس سے گزر رہا تھا۔ قسم قسم کے کھانوں کی لپٹیں جو اس کے دماغ میں پہنچیں تو اس کے منھ میں پانی بھر آیا۔ اس نے نانبائی سے تھوڑا سا سالن مانگا۔ نانبائی نے دھتکار دیا۔ بھکاری نے اپنے تھیلے میں سے سوکھی روٹی کے ٹکڑے نکالے اور انھیں تھوڑی دیر دیگوں کی بھاپ کے اوپر رکھ کر کھانے لگا۔ نانبائی اس کی یہ حرکت حیرت سے دیکھتا رہا۔ بھکاری روٹی کھا کر جانے لگا تو نانبائی نے اسے روکا اور کہا: "ارے سالن کے دام تو دیتے جاؤ۔" بھکاری بولا: "سالن تو دیا نہیں۔" نانبائی نے کہا کہ بھاپ بھی تو سالن کا حصّہ ہے۔

یہ جھگڑا ہو ہی رہا تھا کہ ملّا اُس طرف سے آنکلے۔ دونوں نے ملّا کو فیصلہ دینے کے لیے مانا۔ ساری بات سن کر ملّا نے اپنی جیب سے چند دینار نکالے اور سڑک پر دے مارے۔ نانبائی دینار اٹھانے کو لپکا۔ ملّا نے کہا: "دینار نہیں، ان کی آواز لے لو۔ نانبائی نے حیرت سے کہا: "یہ کیسے دام ہیں بھلا؟" ملّا نے جواب دیا: "جیسے بھاپ کے۔"

بقیہ: احساس

"بیٹی نسرین! یہ رہا تمھارا نتیجہ۔ تمھاری کامیابی یقیناً قابلِ داد ہے۔ تمھیں بہت بہت مبارک ہو۔ نسرین! تم نے یہ ثابت کر دیا انسان اگر سچّے دل سے محنت کرے تو وہ کامیابی کی منزل سے ضرور ہمکنار ہو سکتا ہے۔" استانی صاحبہ نے نسرین کو داد دیتے ہوئے کہا۔

نسرین کے نازک لبوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

اس کے بعد یکے بعد دیگرے سبھی طالبات کو نتیجہ دے دیا گیا۔ نسرین اپنے درجہ میں اوّل آئی تھی۔ وہ اس کامیابی پر پھولے نہیں سما رہی تھی۔ لیکن صبیحہ کو اپنی غرور و تکبر کا نتیجہ آج اسے ناکامی کی شکل میں ملا تھا۔ اس لیے صبیحہ کی چھوٹی چھوٹی خوبصورت آنکھوں میں آنسو کے موتی جھلملا رہے تھے۔

"ارے صبّو! تو رو رہی ہے۔ یہ تو بزدلوں کا کام ہے۔ ناکامی کے آنسو اچھی لڑکیوں کو زیب نہیں دیتی۔ دراصل ناکامی ہی کامیابی کی پہلی منزل ہے۔ محنت و مشقت کے دامن سے چمٹ جاؤ۔ کامیابی قدم بوس ہوگی۔" نسرین نے صبیحہ کی آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

اور صبیحہ احساس و ندامت کا طوفان سینے میں لیے نسرین کے ساتھ چل پڑی۔

بقیہ: ڈاک ٹکٹ

ڈاک ٹکٹ چھاپنے کا سہرا برطانیہ کے سر ہے۔ اور اس کے بعد سارے یورپ میں یہ پھیل گیا۔

ایشیا میں پہلا ڈاک ٹکٹ ۱۸۵۲ء میں چھپا۔ صوبہ سندھ میں جاری ہونے کے وجہ سے یہ سندھ ڈاک کے نام سے جانے جانا لگا۔ ہندستان میں ۱۸۵۴ء میں چار ڈاک ٹکٹ جاری کیے گئے۔ جن میں تین ٹکٹ ایک رنگ کے تھے اور ایک دو رنگوں کا۔ ان سبھی ڈاک ٹکٹوں پر مہارانی وکٹوریہ کی تصویر چھپی تھی۔ چار آنے والے اس دو رنگے ڈاک ٹکٹ پر مہارانی کی تصویر الٹی چھپ گئی تھی۔ .... اور جانتے ہیں آپ محمد میاں کہ آج ان اُلٹے چھپی تصویر والی ڈاک ٹکٹ کی قیمت لگ بھگ تیس ہزار روپے ہے... تو محمد میاں یہی تھی میرے پیدائش کی کہانی۔ ...." اور اس کے ساتھ ہی ڈاک ٹکٹ چپ ہو گیا۔

نثار احمد صدیقی

وطن میرا گلستاں ہے

زمینِ ہند پر رونق ہے گویا باغِ رضواں ہے
وطن کے پھول ہیں ہم سب وطن میرا گلستاں ہے

خوشی کے گیت مل کر ہم سب گائیں اور مسکائیں
ترنگا ہند کا مل کر گلی کوچے میں لہرائیں
نہ چڑھنے دیں گے دشمن کو یہ میرا باغِ رضواں ہے
وطن کے پھول ہیں ہم سب وطن میرا گلستاں ہے

وطن کے رہنما ہیں وہ، وطن کے باغباں ہیں وہ
وطن کے پھول ہیں وہ اور وطن کے گلستاں ہیں وہ
بنائیں گے سجائیں گے گلستانِ وطن ہم سب
سبھی دیشوں سے اچھا کر کے چھوڑیں گے چمن ہم سب
کریں سب کام مل کر تو یہ مشکل کام آساں ہے
وطن کے پھول ہیں ہم سب وطن میرا گلستاں ہے

زمینِ ہند پر رونق ہے گویا باغِ رضواں ہے
وطن کے پھول ہیں ہم سب وطن میرا گلستاں ہے

مسعود علی

غزل

آؤ! ایسے کام کریں
جگ میں اپنا نام کریں

کام کے بِن آرام غلط
کام کریں، آرام کریں

سچائی سے اچھائی
سچائی کو عام کریں

جن کو غم کی فکر نہیں
پیش انہیں انعام کریں

اب تو اے مسعود میاں
فکر صبح و شام کریں

عزیز مراد آبادی

دلچسپ پہیلیاں

پہیلیاں ۱

چیز بتاؤ کیا ہے ایسی — کوئی اور نہیں اس جیسی
چور لٹیرا لے نہ پائے — خرچ کرو تو بڑھتی جائے

ایک ٹانگ کا گھوڑا ہے — قد بھی اس کا تھوڑا ہے
چلتا ہے جب ڈلکی چال — موتیوں جیسے بکھرے بال

گھر ہے جس کا ایک ہے دوار — دیواریں ہیں اس کی چار
بند رہتا ہے اس کے اندر — رنگ برنگا ایک سمندر
پنچھی چپکے سے اک آئے — چونچ میں جل بھر بھر لیجائے

لمبی ہوں پر کھمبا نہیں — ڈبلی ہوں پر دھاگا نہیں
سارے پیٹ میں بھید میرے — وقتِ ضرورت جو نکلے
جوں جوں وہ چلتی جائے — گل بوٹے سے پھیلائے

اوپر نیچے تختے دو — کھول کے اندر جو دیکھو
تو جگ سارا ہی دیکھے — جگ سب کچھ اس سے سیکھے

جسم ذرا سا جیب بڑی — جیب میں ہر اک بات پڑی
آج یہاں تو کل ہے وہاں — سب خوش ہوں وہ پہنچے جہاں

پہیلیاں ۲

۱۔ دیگ میں چاول کیوں نہ پکائے
پیچ پتنگ کے کیوں نہ لڑائے ؟

۲۔ خط کیوں نہ پڑھا
بازار کیوں نہ گیا ؟

۳۔ ٹکٹ کیوں نہ لیا
جواب کیوں نہ دیا ؟

۴۔ مرض کیوں نہ کٹا
وقت کیوں نہ پتا ؟

۵۔ پھل کیوں نہ کھایا
گھر کیوں نہ بھایا ؟

۶۔ کپڑا کیوں نہ لیا
دودھ کیوں نہ پیا ؟

۷۔ تالا کیوں نہ کھلا
گڈا کیوں نہ چلا ؟

۸۔ چٹھی کیوں نہ ملی
دلہن کیوں نہ سجی ؟

پہیلیاں ۳

۱۔ لمبا ہے پر ڈنڈا نہیں — گول بھی ہے پر انڈا نہیں

بقیہ صفحہ ۱۹ پر

مظلوم مضطر

احساس

صبیحہ اور نسرین ایک ہی کلاس کی دو طالبہ تھیں۔ صبیحہ کافی ذہین لیکن نسرین کند ذہن تھی۔ صبیحہ کو اپنی ذہانت پر بہت غرور تھا۔ وہ ہمیشہ کلاس کی ہر طالبہ سے تلخ باتیں کرتی تھی۔ اسے خدا نے دولت مند باپ عطا کیا تھا۔ اس لیے وہ دولت کے سائے میں بڑی ناز و نعم سے پل رہی تھی۔

نسرین کو اپنی حالت پر بہت افسوس تھا۔ کیونکہ وہ کند ذہن بھی، مگر غریب باپ کی غریب بیٹی تھی۔ البتہ وہ ان حالات سے مایوس نہ تھی۔ وہ کامیابی سے ہمکنار ہونے کے لیے محنت و مشقت اور عزم و استقلال کی راہوں پر مستعدی کے ساتھ چل پڑی تھی۔

کلاس کی گھنٹی بجنے کے بعد ہر طالبہ نے اپنی اپنی کاپی استانی صاحبہ کے پاس جمع کر دی۔ نسرین نے بھی اپنی کاپی جمع کر دی۔ لیکن وہ اپنی جگہ پر بڑی اُداس اور غمگین بیٹھی تھی۔ کیونکہ آج وہ ایک سوال کو حل نہیں کر پائی تھی۔ اسے یقین تھا کہ آج بھی وہ کلاس میں بیٹھی لڑکیوں کے سامنے ضرور مار کھائے گی۔ اس منظر کا تصور کر کے وہ بڑی شرمندگی اور ندامت محسوس کر رہی تھی۔

”کیوں رے نسری! تیری یہ اداسی کیسی ہے؟ کل کی طرح آج بھی مار کھائے گی کیا؟“ صبیحہ نے حسب عادت نسرین کو چھیڑا۔

”اگر میں نے غلط جواب لکھا ہوگا۔ تو ضرور مار کھاؤں گی۔ لیکن تو اپنی ذہانت پر ناز مت کر صبو۔“ نسرین اپنا منہ بسورتے ہوئے بولی۔

آخر وہ گھڑی آئی جب کہ نسرین کو ایک سوال کا جواب نہ لکھنے کے جرم میں استانی جی سے مار کھانا پڑی۔ نسرین کی پٹائی پر صبیحہ نے دل ہی دل میں استانی جی کو خوب داد دی۔ اور صبیحہ کو بھی استانی جی نے خوب داد دی۔ کیونکہ صبیحہ ہر سوال کا جواب ٹھیک ٹھیک لکھ کر لائی۔ صبیحہ نے شاباشی ملنے کی خوشی کا اظہار لبوں پر مسکراہٹ بکھیر کر کیا اور نسرین کے اُداس چہرہ کو حقارت کی نظروں سے دیکھا۔ جذباتِ مسرت میں مچلتے ہوئے صبیحہ کے دل نے کہہ ہی ڈالا ”اے صبو! ارے تو تو اتنی ذہین ہے۔ بھلا تجھے محنت کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔“

صبیحہ نے دل کی آواز پر لبیک کہا۔ یقیناً ایسا ہی ہوگا“ اور صبیحہ کا دل پڑھائی کی جانب سے دور ہٹتا چلا گیا۔

لیکن نسرین کو روز روز کی پٹائی نے اسے کامیابی کی منزلوں پہنچنے کے لیے مجبور کر دیا۔

نسرین کی اداسی پر اس کا سینے میں دھڑکتا ہوا نازک دل تڑپ اٹھا۔ ”ارے نسری! خبردار مایوس مت ہو۔ محنت و مشقت اور عزم و استقلال کا دامن مت چھوڑ۔ کامیابی تمھارے استقبال کے لیے کھڑی ہے۔“ نسرین نے اس انجانے سہارے کا شکریہ ادا کیا اور ایک نئے عزم کے ساتھ وہاں سے اٹھی۔

اب نسرین اپنا ایک ایک پل پڑھائی میں صرف کرنے لگی۔ آخر وہ وقت بھی آگیا جب کہ ہر طالب علم کتابوں کا کیڑا بن جاتا۔ یعنی امتحان کا وقت۔ صبیحہ اپنی ذہانت اور فہم و ادراک پر تکیہ کر رہی اور نسرین محنت و مشقت کے سائے میں سانس لیتی رہی۔

امتحان ختم ہو چکا تھا۔ ہر طالبہ کا چہرہ پھول کی طرح کھل رہا تھا۔ نسرین کا چہرہ تو گلاب کو بھی شرمندہ کر رہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ چاند رشک کر رہا تھا۔ لیکن صبیحہ مایوس تھی۔ غمگین تھی۔ اس کے ہونٹوں پر تیرتی ہوئی مسکراہٹ کوسوں دور تھی۔ نہ جانے کیوں۔

دسمبر کی ۲۳ تاریخ تھی۔ ہر طالبہ نتیجہ کا انتظار بڑی بے چینی کر رہی تھی۔ کہ اچانک استانی صاحبہ نے طالبات کو اپنی طرف مخاطب کیا۔ ہر طالبہ کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ نہ جانے کس کے خرمن پر بجلی گرے گی۔

”میری بیٹیو! آج تمھیں سال بھر کی محنت کا پھل دیا جار

بقیہ صفحہ ۲۷ پر

کارٹون

بابو جی کنگھا لے لیجیے۔
اور تم اپنے گاہک کو نہیں پہچانتے۔
?

جان کی سلامتی چاہتے ہو تو
بغیر پیچھے دیکھے، ناک کی سیدھ
میں چلتے جاؤ، ورنہ گولی چلادوں گا
Sindhu-Bharti

(۱) (۲)

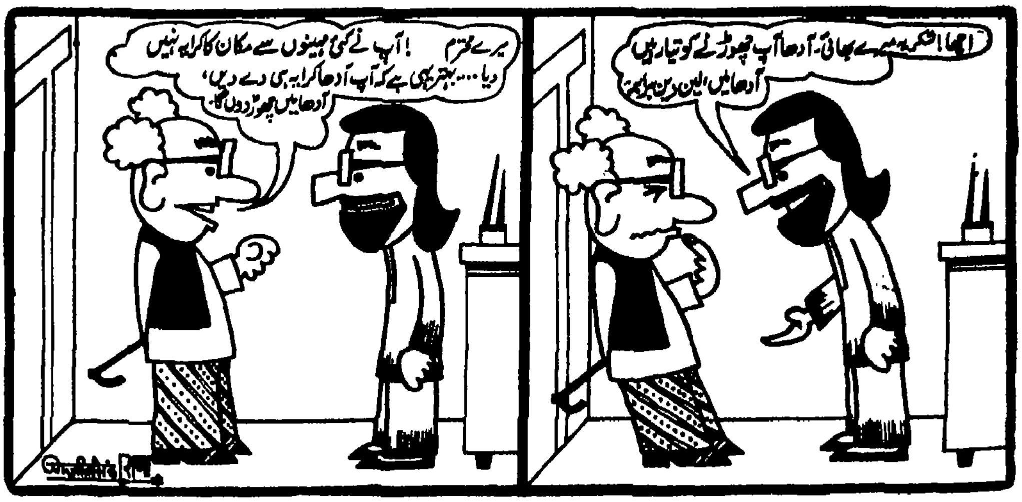

میرے محترم! آپ نے کئی مہینوں سے مکان کا کرایہ نہیں دیا... بہتر یہی ہے کہ آپ آدھا کرایہ ہی دے دیں، آدھا میں چھوڑ دوں گا۔
اچھا! شکریہ میرے بھائی۔ آدھا آپ چھوڑنے کو تیار ہیں آدھا میں، لین دین برابر۔

Rgd. No. D(D-103)

R.No.948/57
Licensed U(D)-50 to post without pre-payment at Civil Lines post Office, Delhi

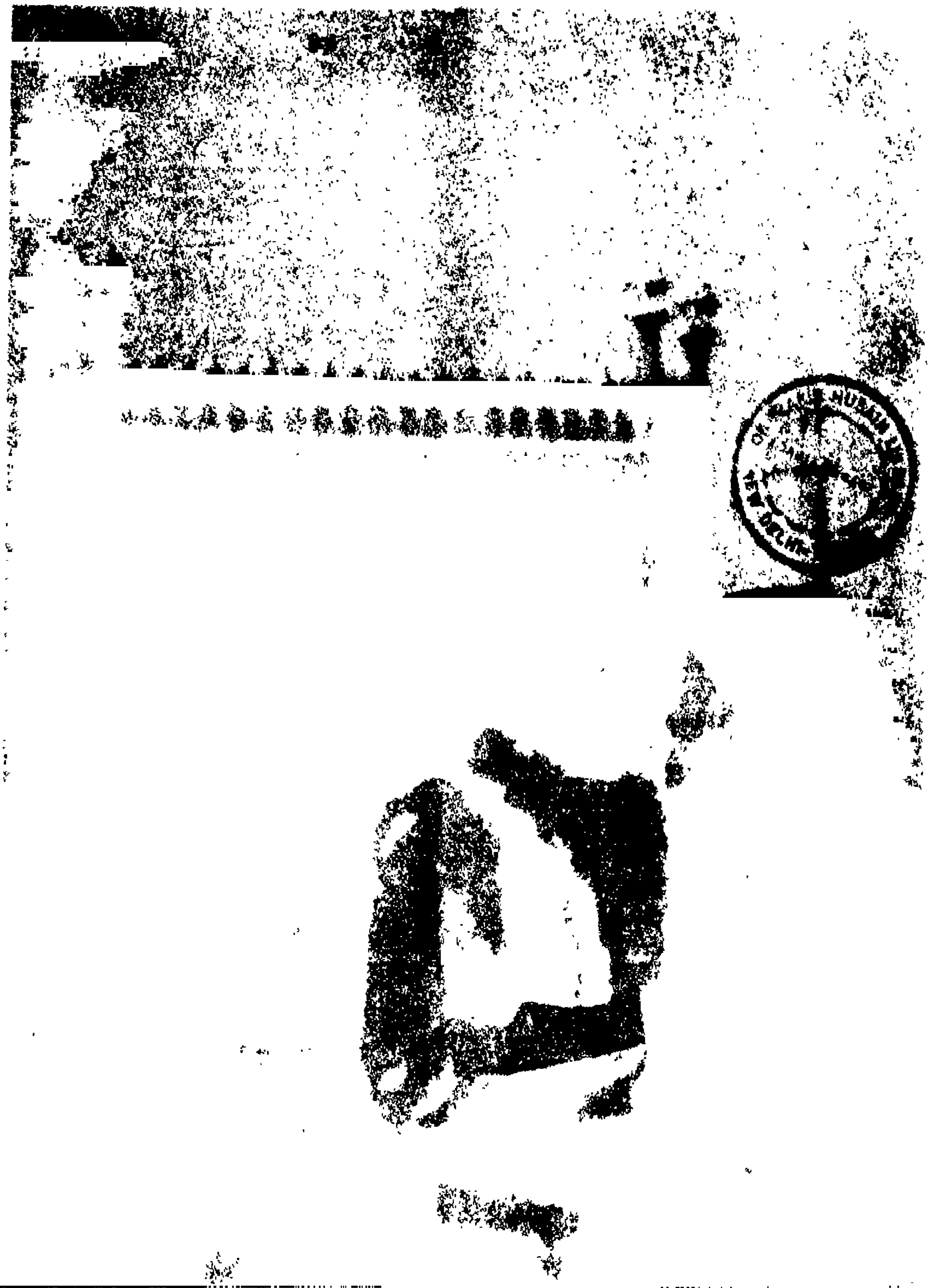

عید مبارک

Vol. 39 No. 1 AJKAL(URDU) SUPPLEMENT August 1980

Published bythe Director, Publications Division, Patiala House, N.Delhi.

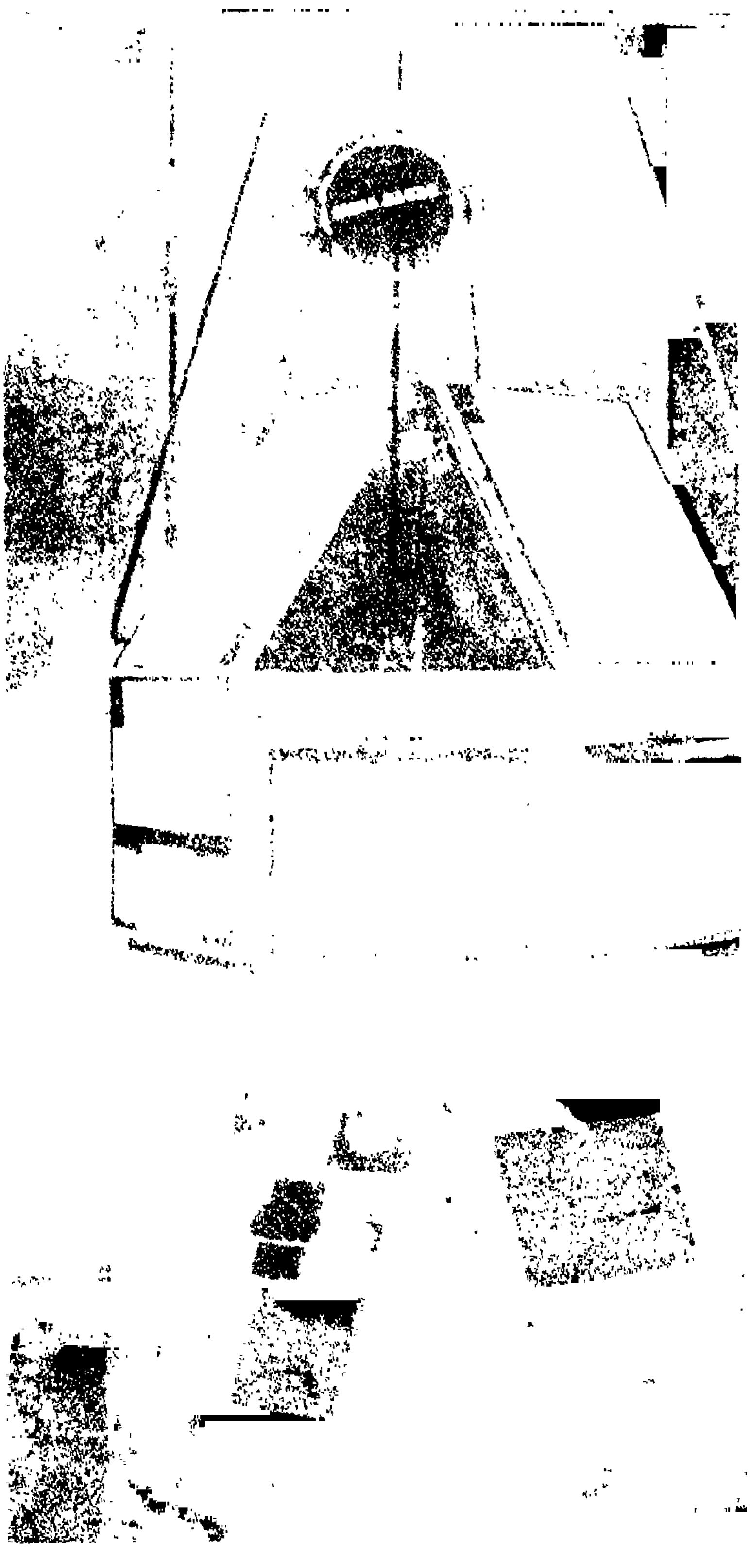

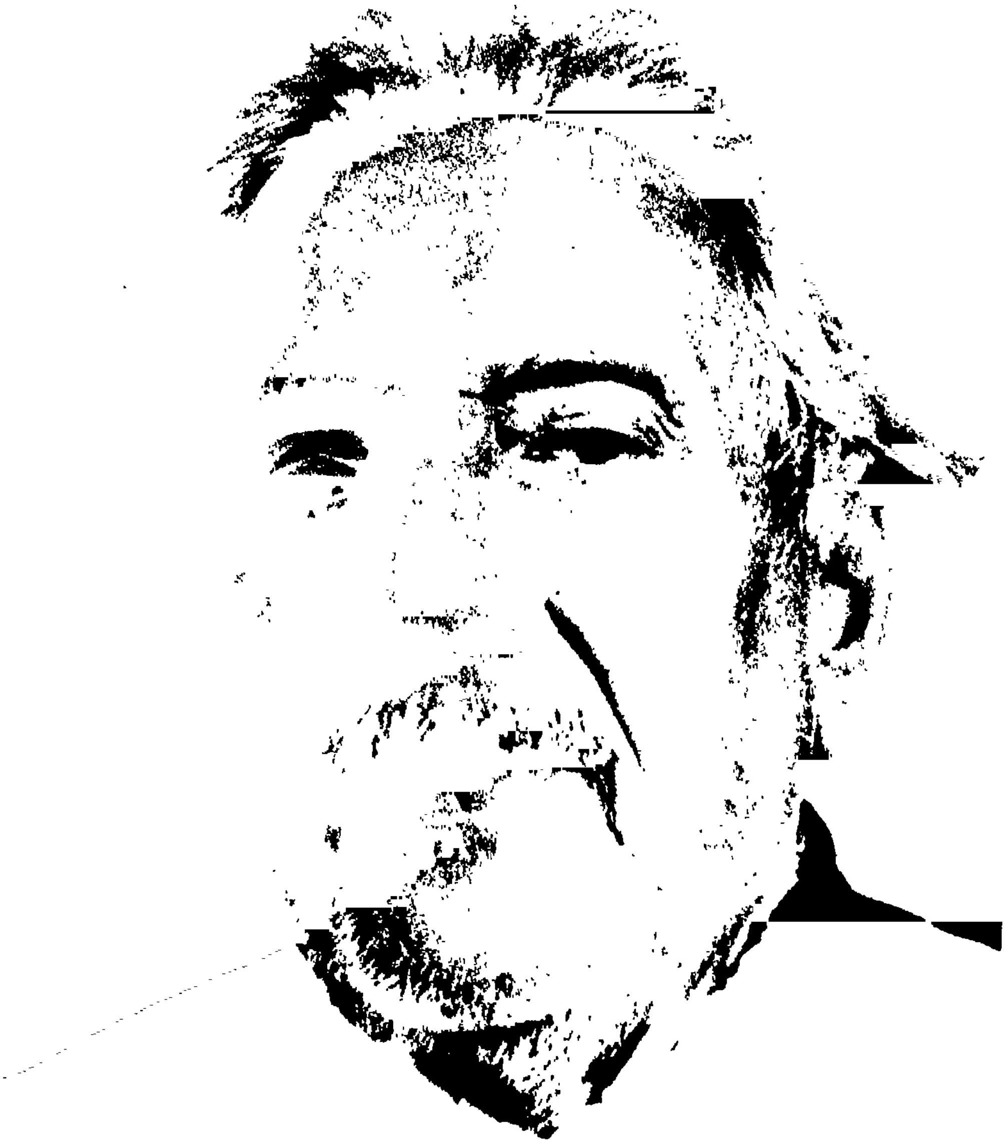

علامہ جمیل مظہری

۱۹۰۵ء ـــــ ۲۳ جولائی ۱۹۸۰ء

اردو کا مقبول عام مصور ماہنامہ

آجکل (اردو)

نئی دہلی

ایڈیٹر
شہباز حسین
اسسٹنٹ ایڈیٹر
محمد عادل صدیقی
سب ایڈیٹر
وشوناتھ سکہ

جلد ۳۹ شمارہ ۲

ستمبر ۱۹۸۰ء

بھادرو آشون شک سمت ۱۹۰۲

فون نمبر ۳۸۷۰۶۹

شرح چندہ

	ہندوستان	پاکستان	دیگر ممالک	
سالانہ	۱۰ روپے	۱۶ روپے	۳ ڈالر	۱/۵۰ پونڈ
دوسالہ	۱۷ روپے	۲۷ روپے	۵ ڈالر	۲/۵۵ پونڈ
سہ سالہ	۲۴ روپے	۳۷ روپے	۷ ڈالر	۳/۶۰ پونڈ
فی کاپی	ایک روپیہ	ڈیڑھ روپیہ	۳۰ سینٹ	۱۵ پنی

ترتیب

ملاحظات ——— ۲
اردو کے عظیم المرتبت شاعر اور ادیب علامہ جمیل مظہری (مرحوم) ——— ساغر نظامی ——— ۳
صفی کی جغرافیائی شاعری ——— جمیل مظہری ——— ۹
گور رسیدہ ——— (نظم) ——— جمیل مظہری ——— ۱۰
امیر خسرو — اپنے مرشد کی بارگاہ میں ——— نثار احمد فاروقی ——— ۱۱
شری کرشن ——— (نظم) ——— شاداں گوالیاری ——— ۱۷
قم باذن اللہ ——— (کہانی) ——— جوگندر پال ——— ۱۸
غزل ——— مظہر امام ——— ۲۰
انکشاف ——— (نظم) ——— سلیمان آصف ——— ۲۱
سفر یورپ ——— نریندر لوتھر ——— ۲۲
شکار کے نادر مناظر ——— اشتیاق علوی ——— ۲۵
غزل ——— وشوناتھ درد ——— ۲۶
چاندی کے ہاتھ ——— (کہانی) ——— ذکیہ مشہدی ——— ۲۷
غزل ——— تشنہ بلگرامی ——— ۳۰
غزلیں ——— ملک تاسے، عبدالمجید شمس، حمید عظیم آبادی، رونق دکنی سیمابی، محمود رائے بریلوی ——— ۳۱
سائے کا تعاقب ——— (کہانی) ——— فضل امام ملک ——— ۳۳
سنت سور داس ——— (نظم) ——— عبدالقادر ادیب ——— ۳۷
گوسوامی تلسی داس ——— (نظم) ——— بسنت کمار بسنت ——— ۳۷
استدراک ——— محمد عبدالحلیم ——— ۳۸
غزل ——— پروین کمار اشک ——— ۴۰
غزلیں ——— روشن پٹیالوی، عابد مناوری، وحید شادانی بتیاوی، صابر ابوہری ——— ۴۱
غزلیں ——— آمر صدیقی، شہپر رسول، ستیہ نند جاوا، ناز قادری، بدر نظیری، رئیس الدین رئیس ——— ۴۳
نئی کتابیں ——— ۴۴
آپ کا خط ——— ۴۸

سرورق: روبنی اور ایس ایل وی ۳
عمل گورچرن اروڑہ

ڈائرکٹر پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر "آج کل" معرفت پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترسیل زر کا پتہ
بزنس منیجر، پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ملاحظات

خلائی میدان میں کارنمایاں

۱۸ جولائی ۱۹۸۰ء کی صبح کو ہندوستان کا خلائی پروگرام کامیابی کی ایک نئی منزل میں داخل ہوا۔ ملک میں تیار شدہ ایس ایل وی۔۳ (۲۲ میٹر لمبا اور ۱۷ ٹن وزنی) راکٹ فضا میں چھوڑا گیا۔ اس راکٹ کے سرے پر ۳۵ کلوگرام وزنی سیارہ روہنی رکھا ہوا تھا جو مدار میں گردش کر رہا ہے۔

ہندوستان کی خلائی تاریخ کا یہ وہ مبارک دن تھا جس کے لیے گزشتہ سات برسوں سے انتھک محنت کی جا رہی تھی۔ اس کامیاب کوشش کے لیے ہندوستانی خلائی تحقیق کے مرکز کے ڈائریکٹر سری ستیش دھون، پروجیکٹ ڈائریکٹر جناب ابو الکلام، ڈپٹی پروجکٹ ڈائریکٹر سری سری نواسن اور وکرم سارا بھائی اسپیس سنٹر کے ڈائریکٹر سری وسنت گواریکر اور ان کے ساتھ کام کرنے والے سینکڑوں ہندوستانی سائنس داں ہماری مبارک باد کے مستحق ہیں۔

راکٹ بالکل صحیح طریقے پر چھوڑا گیا اس کا اندازہ ۱۱۲ منٹ کے بعد ہی ہو گیا جبکہ سگنل ملنے لگے۔

اندازہ کیا گیا تھا کہ روہنی تقریباً سو دن تک خلا میں پرواز کرتا رہے گا۔ اور اس کی رفتار ۲۸ ہزار کلومیٹر فی گھنٹہ ہوگی۔ زمین سے اس کا نزدیک ترین فاصلہ ۲۸۵ کلومیٹر اور دور ترین فاصلہ ۶۰۰ کلومیٹر ہوگا۔ مگر اب سائنس دانوں کا اندازہ ہے کہ یہ نو سو دنوں تک خلا میں رہ سکتا ہے۔

ہندوستان کے لیے یہ ایک غیر معمولی کامیابی ہے۔ خلائی تحقیق میں کامیابی حاصل کرنے والے ممالک میں ہندوستان اب چھٹے نمبر پر ہے۔

یہ کامیابی تجرباتی ہے مگر اس کی وجہ سے مستقبل میں بہت سے ایسے امکانات پیدا ہو گئے ہیں جو ملک کی تعمیر و ترقی کے لیے بے حد مفید ثابت ہوں گے۔

ایک عظیم ادبی سانحہ

علامہ جمیل مظہری کی موت سے اردو شاعری ایک بڑے اور سچے فن کار سے محروم ہو گئی ہے۔ ہندوستان میں اب چند ہی شاعر رہ گئے ہیں جو جمیل مظہری کی طرح کلاسیکی روایات کے امین اور فکری بصیرت کے حامل ہیں۔ ان کا لہجہ منفرد اور اندازِ بیاں بڑا دل نشین تھا۔ ان کی موت صحیح معنوں میں ایک بڑا ادبی سانحہ ہے۔

جمیل صاحب نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز صحافت سے کیا۔ ۱۹۳۲/۳۳ء میں کلکتے کے اردو اخبارات میں کالم لکھنے لگے تھے۔ بعد میں فلمی دنیا سے وابستہ ہوئے، پھر سرکاری ملازمت کی، جنگ آزادی کی جد و جہد میں استعفا دیا۔ اور آزادی کے بعد اعلا سرکاری عہدیدار بنے۔ مگر یہ ملازمت میلان طبع کے مطابق نہ تھی اس لیے ۵۱-۱۹۵۰ء میں بہار ایجوکیشنل سروس میں تبادلہ کرا کے پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں استاد کی حیثیت سے آ گئے اور پٹنہ یونیورسٹی سے یہ تعلق ۱۹۷۰ء تک قائم رہا۔

اس کے بعد ان کا زیادہ تر وقت کلکتہ میں گزرا جہاں وہ اپنے چھوٹے بھائی رضا مظہری کے ساتھ رہتے تھے۔ اس زمانے میں جمیل صاحب تقریباً گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ ویسے بھی وہ مشاعروں اور اجتماعوں میں بہت کم شریک ہوتے تھے۔ رضا مظہری صاحب اپنے ایک حالیہ خط میں لکھتے ہیں:

"غالباً اخبارات یا ریڈیو سے آپ کو یہ غم انگیز خبر مل چکی ہوگی کہ آپ کے محترم استاد اور میرے بھیا ۲۳ر جولائی کو سوا گیارہ بجے شب کو اپنے وطن ثانی موضع بھیکن پور ضلع مظفر پور میں راہیِ جنت ہوئے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ۔

میں انھیں ۱۷ر جون کو بھیکن پور (مظفر پور، آبائی وطن) میں چھوڑ آیا تھا۔ اس وقت طبیعت ان کی کچھ زیادہ خراب نہ تھی۔ گھر میں چند قدم چل لیتے تھے۔ علاج ہو رہا تھا۔ دفعتاً ۱۷ر جولائی کو یہ خبر ملی کہ ان کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی ہے اور بے حد کمزور ہو چکے ہیں۔ میں بھاگا بھاگا ۲۰ر کو سہ پہر کے وقت پہونچا۔ اس وقت تک اتنا ہوش تھا کہ مجھے پہچان لیا، دو ایک بات بھی کی۔ مگر اسی شب سے طبیعت اور خراب ہوئی اور ۲۳ر کو آخر وہ بڑے سکون سے راہیِ جنت ہوئے۔ نبض میرے ہاتھ میں تھی اور روح مائل پرواز۔ نہ ہچکی نہ نزع کی تکلیف ہوئی ۲۴ر جولائی ساڑھے چار بجے سہ پہر کو وہیں والدہ مرحومہ کے پہلو میں ان کی آخری آرام گاہ بنی۔"

جمیل صاحب کی مثنوی آب و سراب کو ادبی حلقوں میں بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ انھوں نے افسانے اور ناول بھی لکھے ہیں، مرثیے قطعات اور رباعیات کے علاوہ ان کے مجموعے "نقش جمیل" میں فلمی گیت بھی شامل ہیں۔ مگر اس کے باوصف جمیل صاحب کو وہ شہرت اور مقبولیت حاصل نہیں ہوئی جس کے وہ مستحق تھے۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی ہو کہ اب زمانہ "خدائے بخشندہ" کی بخشش سے زیادہ "زور بازو" کا ہے۔ اور جمیل صاحب کا مسلک بھی تھا۔

جس در پہ محبت جھکتی ہو اس در پہ ہمیں لے چل اے جمیل
جس در پہ ضرورت جھکتی ہو اس در پہ سجدہ کون کرے

آہ صفدر آہ

ڈاکٹر صفدر آہ کا ۲۹ر جولائی ۱۹۸۰ء کو انتقال ہو گیا۔ ڈاکٹر آہ ان لوگوں میں سے تھے جو نہایت خاموشی اور صبر کے ساتھ ادبی خدمت میں لگے رہتے ہیں۔ ہندوستانی ڈراموں پر ان کی بڑی گہری نظر تھی۔ پبلی کیشنز ڈویژن نے ان کی کتاب "ہندوستانی ڈراما" کئی سال پہلے شائع کی تھی جسے بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ انکی حالیہ کتاب تلسی داس اور رام چرتر مانس مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سینٹر بمبئی نے شائع کی ہے جو ان کے وسعت مطالعہ اور تحقیقی کاوش کی ایک عمدہ مثال ہے۔ ہمیں امید ہے کہ مہاراشٹر اردو اکادمی ڈاکٹر آہ کی خدمات کو منظر عام پر لائے گی تاکہ ان کی خدمات کا بجا طور پر اعتراف کیا جا سکے۔

بسا اوقات ادب سے کچھ ایسے مخلص کارکن اٹھتے جاتے ہیں جو صلے اور ستائش کی تمنا سے بے پروا ہو کر خلوص اور لگن کے ساتھ ادبی کاموں میں لگے رہتے ہیں۔ ان کی موت سے اردو ایک مخلص اور سنجیدہ ادیب سے محروم ہو گئی ہے۔

(بقیہ ص ۶۲ پر)

ساغر نظامی

اردو کے عظیم المرتبت شاعر و ادیب

علامہ جمیل مظہری مرحوم

سہیل عظیم آبادی کے بعد علامہ جمیل مظہری کی رحلت اردو دنیا کے جسم پر گہرا زخم ہے جو جلد بھرتا نظر نہیں آتا۔ ان کی موت سے جو خلاء پیدا ہوا ہے اس کا پُر ہونا آسان نہیں، وہ محض شاعر و ادیب ہی نہیں تھے بلکہ علم و فضل اور انسانیت کی اعلیٰ قدروں کے مظہر تھے۔ شاعری جس کی اَنا کے زہر سے شاعروں کو مشکل سے بچتے دیکھا ہے۔ اس زہرِ اَنا کو جمیل مظہری کے استغنا نے جام شیریں کی طرح پی لیا تھا۔ انھیں عرفان ہو گیا تھا کہ نہ صرف فنِ شعر بلکہ دین اور نکات دین بھی بحرِ ناپیدا کنار کی حیثیت رکھتے ہیں جنھیں عبور کرنا انسان کے بس کی بات نہیں ان مسائل پر جمیل مظہری نے اپنے سوانح حیات "غبار کارواں" میں جو آج کل دہلی کے مئی ۱۹۷۰ء کے شمارے میں شائع ہوئے ہیں، نہایت عالمانہ اور مفکرانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے جس سے ان کی وہبی اور اکتسابی قوتوں اور اہلیتوں کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جمیل مظہری نے غزالیؔ، غالبؔ ابوالکلام آزادؔ، نیاز فتحپوری، اقبالؔ، رومیؔ، عرفیؔ، کبیرؔ، ورڈز ورتھ، روسو، کانٹ، نطشے، شپن ہار، شیلی اور مذاہب عالم میں اسلام کے علاوہ بدھ ازم، زرتشت، قادیانیت، مسیحیت، گاندھی واد، اشتراکیت ان تمام شریعتوں کا گہری نگاہ سے مطالعہ کیا تھا۔ اور مفکرینِ عالم کی تعلیمات پر کھلے ذہن سے سوچا تھا، ان کے افکار، نظام اور مذاہب و مشارب کا ذکر کرتے ہوئے جمیل مظہری نے لکھا تھا:-

"اشتراکی بھی ہوا اور کارل مارکس کا مرید بھی لیکن میرے ذہن کو سو فیصدی اتفاق کسی نظریے سے نہ ہو سکا، کارل مارکس کی تعلیمات سے میں پوری طرح مطمئن ہو جاتا لیکن اس کے پاس انسانی نفس کی تربیت کا کوئی نسخہ نہ تھا۔ اس کے متبعین جو انقلاب لانا چاہتے ہیں وہ طاقت کے بل پر اور عیسیٰ کے تبسم نے مجھے بتلایا کہ جو تلوار سے اٹھتا ہے وہ تلوار سے گر بھی سکتا ہے۔ ایک مستقل انقلاب انسان کے نفس و ذہن کی تربیت ہی سے ممکن ہے۔"

انھوں نے یہ بھی لکھا تھا:-

"گاندھی کے فلسفۂ عدم تشدد پر میرا پورا ایمان ہے۔ اور میں پورے یقین کے ساتھ سمجھتا ہوں کہ تشدد کا استیصال تشدد سے ممکن نہیں اور تشدد ہی کیا کسی بُرائی کو بُرائی سے ختم نہیں کیا جا سکتا لیکن جب معاشرے کے عدمِ مساوات کا علاج میں نے باپو سے پوچھا تو انھوں نے جواب دیا کہ دولت مند دولت کا مالک نہیں، دولت کا امین ہے کاش مجھے ان سے یہ پوچھنے کا موقع مل جاتا کہ دولت کا امین جب حق داروں تک کسی عہد میں بھی یہ امانت نہ پہنچا سکا تو ایسے خائن امین خائن سے امانت چھین کیوں نہ لی جائے۔ لیکن سوچتا ہوں کہ شاید وہ یہ جواب دیتے کہ چھینی کس طرح جائے۔ کیا تلوار سے؟ اس کی کیا ضمانت ہے کہ جو تلوار آج ہمارے ہاتھ میں ہے کل اس کے ہاتھ نہ آئے گی۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس، اگر اس اصول کو مانا جائے تو یہ سلسلہ دنیا کی عمر طبعی تک دراز ہوتا رہے گا۔"

(آج کل مئی ۱۹۷۰ء دہلی صفحہ ۳)

غرض دنیا کے اکثر مفکرین، فلاسفر، مذاہب و مشارب کو ان کے تفکر نے پرکھا تھا لیکن کوئی ان کی پیاس نہیں بجھا سکا تھا۔ اس سے دوسروں کو اختلاف ہو سکتا ہے لیکن ان کے تجسس سے انکار ممکن نہیں۔

اس موضوع کے علاوہ جب بھی کسی موضوع پر جمیل مظہری سے تبادلۂ خیال ہو تو مظہری نے علم و فضل کے دریا بہا دیے۔ ان کا حافظہ بھی تیز تھا اور قوت تقریر بھی قدرت سے خاص طور پر ودیعت ہوئی تھی۔ ان کی فضیلت علم اور ان کے گہرے تفکر کی چھاپ ان کی غزل پر بھی ہے اتنی گہرائی میں اتر کر سوچنے والا، سماج کے عام مفروضات، قید و بند، اور طور طریق کس طرح اختیار کر سکتا تھا۔ جو اس مقام فقیر پر پہنچ جاتا ہے، اونچا سے اونچا مقام اس کا فرش قدم بن جاتا ہے۔

افسوس بے حس سماج اور بانوفی قوم نے ان کے جوہر قابل کا کوئی احساس نہیں کیا، کوئی صلہ نہیں دیا۔

(۱)

آج سے ۵۶ برس پہلے مجھے جمیل مظہری سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا

متوسط قامت، بیضوی چہرہ، چہرے پر علم کی روشنی، ستواں ناک، سر پر گاندھی ٹوپی، کجکلاہی کی شان لیے، کھدر کی شیروانی، اوپر کے چند بٹن کھلے ہوئے۔ ڈھیلا پاجامہ، کمر قدرتی طور پر کچھ جھکی ہوئی، ہر وقت ہنستے ہر وقت مسکراتے جیسے غم دوراں کی ہلکی سی پرچھائیں بھی ان پر نہیں پڑی ہو مگر ساتھ ہی ساتھ کچھ لجاتے ہوئے بھی۔ وہ شعری نشستوں میں شریک ہوتے اچھے شعر پر تڑپ جاتے اور بے ساختہ بلند آواز سے داد دیتے کہ ساری محفل ان کی ہم نوا ہو جاتی، یہ ایک ہی شعر پر نہیں ہوتا جتنے اچھے شعر ہوتے وہ سب پر اسی طرح داد کے پھول برساتے اور جب ان کے کلام سنانے کی باری آتی تو پہلے تو وہ خاصدان سے پان اٹھاتے پھر نفی میں گردن ہلا دیتے "بھئی ہم شعر سنتے ہیں سناتے نہیں" شعری نشستوں میں تو کبھی مان بھی جاتے مگر مشاعروں میں تو میں نے انھیں اکثر انکار کرتے ہی دیکھا۔ یہ احساس کمتری نہیں تھا، یہ ان کا حیرت ناک استغنا تھا جو شاعری ہی نہیں پوری زندگی پر چھایا ہوا تھا۔ شاعری، مشاعرہ، داد اور شہرت، جاہ و عظمت سب ان کے نزدیک اضافی حیثیت رکھتے تھے۔

۵۶ برس کے طویل سفر کی کس کس منزل اور کس کس رہ گزر کا ذکر کروں، غزلوں کے بعد وطنی اور قومی شاعری کا دور شروع ہوا۔ میں اور وہ تو اس رنگ میں بہت پہلے سے رنگ چکے تھے۔ غزلوں کے بجائے مشاعروں میں قومی شاعری کا عروج ہوا۔ وہ جب اپنی شاہکار نظم "ماں" سناتے (ایسی نظموں کا سنانا وہ اپنا قومی فرض سمجھتے تھے۔) تو مجمع تڑپ اٹھتا۔

جمیل مظہری حضرت وحشت کلکتوی کے شاگرد تھے۔ وحشت صاحب سے بھی میں ۵۶ برس پہلے ہی ملا تھا اور پھر ۱۹۴۰ء میں کلکتے میں ایک یادگار موقع پر ان سے بہت تفصیلی ملاقات ہوئی تھی۔ فضلی فلمز کلکتہ نے ۱۴ ہزار فیٹ طویل فلم "لال قلعے کا آخری مشاعرہ" بنائی تھی جس میں بابائے اردو مولوی عبدالحق نے مولانا حالی وحشت صاحب نے مرزا غالب خواجہ حسن نظامی صاحب نے نظیر اکبر آبادی، قاضی نذرالاسلام نے میر تقی میر، جگر مرادآبادی نے مرزا داغ، اور میں (ساغر نظامی) نے حکیم مومن خاں مومن کا رول کیا تھا۔ اس موقع پر شوٹنگ دیکھنے والوں میں جمیل مظہری ان کے بھائی اور دوسرے دوست بھی شامل تھے۔ یہ تاریخی فلم فضلی فلمز کے بمبئی منتقل مکانی کے وقت فیمس لیبارٹری بمبئی میں محفوظ کر دی گئی۔ یہ اتنی طویل ہو گئی تھی کہ دوسری فلموں کی معروفیت میں فضلی فلمز کے مالکان حسنین فضلی اور ان کے بھائی سبطین فضلی یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ کس طرح اسے ریلیز کریں اور اس کے تجارتی نتائج کیا برآمد ہوں گے۔ اگر وہ نتائج سے بے نیاز ہو جاتے تو یہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے لیے نہایت ہی دلچسپ اور مفید فلم ثابت ہوتی مگر لیبارٹری میں آگ لگی اور دو فلموں کے ساتھ یہ فلم بھی جل کر خاک ہو گئی۔ اور اس کا اسکرپٹ لکھنے والے مسٹر فضل کریم فضلی کراچی میں دل مسوس کر رہ گئے۔ اس فلم میں عہد حاضر کے شعراء اور ادیبوں نے متقدمین اور متاخرین شعراء کا کلام ان کا روپ بدل کر سنایا تھا گویا اردو شاعری کا حال و ماضی زندہ ہو گیا تھا۔

وحشت صاحب کا ذکر آیا تو یہ واقعہ بھی میرے قلم سے نکل گیا۔ جمیل مظہری نے خود نوشت سوانح میں وحشت صاحب کے متعلق لکھا ہے:-

"استادِ محترم مولانا رضا علی وحشت کی صحبت نے میرے ذوق شعری کو بھٹکنے نہ دیا میری جدت پسندی کو دائرۂ اعتدال میں رکھا اور مجھے فنی بصیرت عطا کی"

(آج کل دہلی مئی ۱۹۷۰ء صفحہ ۹)

لیکن وہ متاثر تھے مرزا غالب کے کلام سے۔ اپنے سوانح حیات میں وضاحت کے ساتھ تحریر فرماتے ہیں:-

اس میں شک نہیں کہ میرا دماغ جو گھریلو اور معاشرتی روایات سے بت خانۂ روایات تھا۔ اس کے بہت سے بت غالب ہی نے توڑے اور یہ کہنا سو فیصدی صحیح ہے کہ اگرچہ میری شاعری غالب، اقبال، انیس اور شاد کی مشترکہ مخلوق ہے لیکن اس تخلیق میں غالب کا حصہ سب سے زیادہ ہے (اقتباس)

جمیل مظہری ایک وسیع المطالعہ ہستی تھے، انھوں نے مشرقی اور مغربی زبانوں کے اکثر شعراء کو پڑھا تھا مگر تقلید کسی کی نہیں کی، ان کی غزل کا منفرد رنگ ہے۔ بعض اوقات شاعر ذوقِ انکسار میں معتقدات کا ذکر کر دیتا ہے۔ لیکن اس کی اپنی شاعرانہ انفرادیت اس ذوقِ انکسار سے دبتی نہیں۔ یہی حال جمیل مظہری کا تھا۔ مظہری نے کبھی اپنی شاعری کے کیف و کم کا بھی اندازہ نہیں کیا انھیں تو قلندرانہ استغنیٰ نے زندگی کی تنگ دامانی اور اندھی فیاضی کا اندازہ کرنے کی بھی فرصت نہیں دی۔ اپنے سوانح میں مسئلہ دوستی کے بارے میں لکھتے ہیں:-

"دوستی کے معاملے میں میں خاصا خوش فہم ہوں یہی خوش فہمی مجھ سے جوش ملیح آبادی کے بارے میں سرزد ہوئی"

اگر آپ غور کریں تو اس فقرہ کا غیر معمولی شریفانہ اور محتاط انداز بیان ہے لیکن اس فقرے کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ جمیل نے کوئی بات اس میں چھپا دی ہے۔ جی ہاں، اس کے بعد ایک عظیم پراسرار سراب پھیلا ہوا ہے۔ یہ سراب اپنی آغوش میں ایک تلمیح چھپائے ہوئے ہے جس کا یہاں لکھ دینا جمیل مظہری مفکر حیات کی زندگی کا المیہ بھی ہے اور تہنیت نامہ بھی۔

فروری ۱۹۴۳ء میں میرا اور جوش ملیح آبادی کا ترک وطن کر کے شالیمار پکچرز جوائن کرنا تاریخ ادب کا ایک یادگار باب ہے۔ اس ترکِ وطن کے اسباب شالیمار پکچرز کی پوری تصویر اور پھر وہاں کے حوادث تو میں اپنی خود نوشت سوانح حیات میں بشرط زندگی لکھوں گا یہاں صرف اتنا

ہ دینا موضوع کے تسلسل کو باقی رکھنے کے لیے کافی ہوگا۔ کہ ہمارے فلم لائن جوائن رنے کے بڑے دوررس نتائج نکلے یہ نتائج پریم چندجی کے بعد نہیں نکل سکے تھے۔ شالیمار پکچرز چند من چلے نوجوانوں نے قائم کی تھی۔ جن کے پاس سرمایہ نہیں تھا روڈیوسر ڈائرکٹر مسٹر زیڈ احمد تھے۔ اتفاق سے میں اور جوش بنگلور کی ایک دو کانفرنس سے واپسی پر بمبئی رکے ایک استقبالیہ جلسے میں احمد صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ جلسہ شعر وشاعری کا تھا۔ اس ذہین نوجوان کو الہام ہوا کہ ساغر و جوش کو کمپنی میں رکھنا چاہیے۔ یہ ایک انوکھا قدم ہوگا اور مارکیٹ سے سرمایہ ل سکے گا۔ تفصیل سے قطع نظر "دونوں کبوتر" پر سمیٹے پنجرے میں داخل ہونے کے لیے خود بےتاب تھے۔ احمد شکار میں کامیاب ہوئے۔ ہمارے پونا پہنچنے کے بعد شاعر وادیب دوست آنے شروع ہوئے۔ انھیں دوستوں میں جمیل مظہری بھی تھے۔ (جو ملازمت چھوڑ چکے تھے اور جیل کاٹ چکے تھے) وہ جوش صاحب کے مہمان ہوئے۔ جوش صاحب بعض دوستوں کو مہینے ڈیڑھ مہینے مہمان رکھتے۔ راشن بندی کا زمانہ تھا خاطر خواہ مہمان نوازی بھی نہیں کر سکتے تھے۔ مگر امیدوار کو یقین دلا دیتے تھے کہ "ہاں صاحب ہم سے احمد صاحب نے وعدہ کر لیا ہے کہ آپ کو سینوریو ڈپارٹمنٹ میں ضرور ملازمت دے دیں گے۔ ہم دونوں کمپنی میں رہتے۔ امیدوار بےچارہ تنہا پڑا ہوا مستقبل کا تانا بانا بنتا رہتا۔ اور ایک دن اسے جواب مل جاتا تو وہ اپنے گھر چلا جاتا۔ بہرکیف یہ روز کا معمول تھا۔ شام کو اکل وشرب کی محفل برپا ہوتی تو اس میں اکثر سنجیدہ مسائل بھی چھڑ جاتے۔ جمیل مظہری حیرت ناک علم وفضل اور زندہ حافظے کے مالک تھے۔ ایک دن اس محفل میں یکایک بھگوان بدھ تشریف لے آئے۔ بات جو چھڑی تو مظہری نے بدھ مت کے سارے چراغ روشن کر دیے۔ محفل رنگ پر آگئی، مجھ میں "فریب" کے رخ سے پردہ اٹھانے کی قوت پیدا ہوگئی۔ میں نے دیکھا کہ کسی نے میرے ہاتھ میں کلید تھما دی ہے کہ لے، اس سے جمیل مظہری کے ملازمت کا دروازہ کھول دے۔ محفل کا نقطۂ عروج ابھرا اور میں نے ایک قہقہہ لگایا۔ (جواب تصور میں بھی نہیں لگایا جا سکتا) اور جوش نے کہا یار، کیوں اس غریب کو ستا رہے ہو، احمد سینوریو ڈپارٹمنٹ میں کتنے آدمی رکھ سکتے ہیں۔ جرأت کے ساتھ میں نے کہا کہ تم کیا دلاؤگے میں جمیل مظہری کو کل ہی ملازمت دلائے دیتا ہوں۔ کل میری طرف سے نہایت پرتکلف ڈنر ہوگا۔ پروڈیوسر شرما بھی آئیں گے۔ جنھوں نے کبیر فلم بنائی ہے۔ ارے بھئی وہی جن سے میں نے تمھیں آج صبح ملایا تھا۔

مگر وہ تو ابھی فلم نہیں بنا رہے ہیں ؟

نہیں بنا رہے ہیں مگر بھگوان بدھ کے پجاری تو ہیں۔

سنو یار جمیل صاحب! تمھارا کام صرف یہ ہوگا کہ محفل جب رنگ پر آجائے اور میں اشارہ کر دوں، بدھ ازم پر شروع ہو جانا۔ اور اس وقت بدھ ازم پر جتنی نصدار تقریر کی ہے اسے دہرا دینا۔

جمیل مظہری ہنس پڑے۔

(۲)

دوسرے دن شرما ڈنر پر آئے۔ اور پھر اک نقطۂ عروج ابھرا، میں نے مظہری کو اشارہ کیا، مظہری نے بدھ ازم کے دریا بہا دیے۔

شرما نے متاثر ہو کر پوچھا۔

آپ کیا کرتے ہیں۔

لڑکوں کو پڑھاتا تھا اب کچھ نہیں۔

کل اسٹوڈیو آئیے۔ میرے ساتھ کام کیجیے، فی الحال ۴۰۰ ماہانہ پیش کروں گا۔

اور پروڈیوسر شرما جمیل کے سامنے سر نیاز خم کر کے ان کے گیت گاتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

(۳)

کوئی چار برس کے بعد کلکتے سے جمیل مظہری کا ایک خط ملا جس میں درج تھا۔

پیارے ساغر۔

چار سال ہو گئے ابھی تک شرما جی کہانی کا موضوع طے نہیں کر سکے ہیں۔ ہم دونوں بیٹھے مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے رہتے ہیں

(افسوس یہ دونوں خدا کو پیارے ہو گئے)

اور زندگی پر ماہ وسال کے دبیز خاردار (پھول دار پردے گرتے رہے آوارگی اور خوش بختی کا دور ختم ہوا، عہد غلامی شروع ہوا۔ ریڈیو کی ملازمت کے دوران ایک دن ان کے بڑے صاحبزادے آئے ان کا ایک خط لائے ڈی سی ایم میں ان کا انٹرویو تھا۔ اسی کے متعلق لکھا تھا۔ خیر وہ سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔ اس کے شاید کچھ ہی دنوں بعد میں اپنے مکان کے قریب شہریار مرحوم کے مکان 60-A پنڈارا روڈ میں بیٹھا ہوا تھا گھنٹی بجی، دروازہ کھلا، مسکراتی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں نظر آئیں، یہ آنکھیں جمیل مظہری کی تھیں، ارے! ہم دونوں لپٹ گئے اور پھر جو سینے الگ ہوئے تو ایک سینہ قبر میں چلا گیا۔ ایک قبر سے باہر خاک ہو گیا۔

جمیل مظہری اس عہد کے عظیم مفکر، نقاد اور شاعر تھے حکمت میں رچے بسے ہوئے تھے۔ ع

فلک سو سال چکر کھائے تب ایسا سخنور ہو

مگر افسوس نہ انھوں نے اپنی قدر کی، نہ زمانے نے ان کو پہچانا۔ سنتے تھے ہندوستان مردہ پرست ہے۔ کیا یہ کہاوت بھی اب غلط ہو چکی ہے، اس کے متعدد اسباب ہیں۔ ہم زندوں کو اپنا وجود سنبھالنا مشکل ہو رہا ہے۔ جو گزر گئے ان کا خیال کون کرے۔

پھر بھی میں بہار اردو اکیڈیمی کو توجہ دلاؤں گا کہ جمیل مظہری نے جتنا غزل اور نظم کا اثاثہ چھوڑا ہے اسے حاصل کرے، ترتیب دے اور شائع کرے

جمیل مظہری

صفی کی جغرافیائی شاعری

ایک تقریظی مقالہ

عنوان چونکا دینے والا ضرور ہے لیکن چونکیے نہیں۔ جب موجودہ دور میں تنقید کی درجنوں قسمیں، ہیئتی تنقید، عملی تنقید، سفلی تنقید وغیرہ وغیرہ جنم لے رہی ہیں اور پروان چڑھ رہی ہیں۔ تو اصنافِ سخن میں بھی اگر ایک جغرافیائی شاعری کا اضافہ ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جغرافیائی شاعری ہے کیا؟

اگر کوئی ناظم پانچویں یا چھٹی جماعت کی درسی کتابِ جغرافیہ کو نثر سے نظم میں منتقل کر دے۔ تو ہم اسے جغرافیائی شاعری نہیں کہیں گے۔ کیونکہ شاعری نام ہے حسن کاری کا حسن آفرینی کا اور حسن افروزی کا۔ حسن صرف چہروں میں ہی نہیں ہوتا۔ عمل میں بھی ہوتا ہے۔ اور خیال میں بھی کردار میں بھی، گفتار میں بھی ہوتا ہے۔ موسیقی الحان و اصوات کی حسن کاری ہے۔ اور شاعری معنیٰ و الفاظ کی حسن آفرینی ہے۔ مضمون اور موضوع کیسے ہی ثقیل اور کڈھب کیوں نہ ہو۔ لیکن اگر وہ حسن کارانہ سلیقے سے بیان ہو تو کیا ہم اسے شاعری کہیں گے؟ مشہور ناول نگار مرزا محمد ہادی رسوا نے اپنی مثنوی "امید و بیم" میں پہلی مرتبہ اردو زبان میں خشک سائنٹیفک مضامین کو نظم میں بیان کرنے کا تجربہ کیا۔ اور شاعرانہ حسنِ بیان کو باقی رکھا۔ مثنوی کی سلاست و روانی میں کہیں ثقالت سرزد نہیں ہونے دی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

چھوٹے تارے جنھیں کہتے ہیں سحاب\
ٹوٹتے رہتے ہیں جو مثلِ حباب

راہ میں دورِ زمیں کے آکر\
جب وہ کھاتے ہیں ہوا سے ٹکر

فوراً آجاتی ہے شامت ان کی\
یہی ٹکر ہے قیامت ان کی

اسی طرح غالب نے غزل میں پہلی مرتبہ سائنٹیفک حقائق کو لفظی جامہ پہنایا لیکن ان کے اشعار میں زورِ بیان تو ہے لیکن حسنِ بیان مفقود ہے ؎

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی\
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام\
مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگزر بادیاں

اگرچہ حقیقت یہ ہے کہ زورِ کلام خود اک حسنِ کلام ہے۔ اور حسنِ کلام خود اک زورِ بیان ہے۔ آپ سمجھنے اور سمجھانے کے لیے اس کے دو نام رکھ لیجیے۔ جمالی اور جلالی۔ تفریقِ لفظی کا بھی کم و بیش یہی حال ہے۔ بہر حال دونوں جب ایک جگہ جمع ہو جاتی ہیں۔ تو اک طلسماتِ الفاظ و معانی بن جاتی ہیں۔ جیسے محسن کاکوروی کی معراجیہ مثنوی میں شبِ معراج کے نزول کی یہ درخشاں آیات ؎

بھیگی ہوئی ہے رات آبرو سے — داخل ہوئی کعبے میں وضو سے\
گویا کہ نہا کے آئی فی الحال — جھک جھک کے نچوڑتی ہوئی بال\
اوڑھے ہوئے لیلیٰ دلآرام — شبنم کی ردا بہ قصد احرام

اسی حسنِ کلام اور زورِ بیان کا اختلاط اسی جمالی و جلالی کیفیات کا اجماع اور یہی سلیقۂ حسن آفرینی ہمیں صفی کی جغرافیائی شاعری میں ملتا ہے۔ مولانا صفی شیعہ کانفرنس کے شاعرِ خاص تھے۔ جس شہر میں شیعہ کانفرنس منعقد ہوتی تھی صفی اپنی قومی نظموں میں اس شہر کی تاریخی و جغرافیائی حالات بڑی خوش اسلوبی سے بیان کرتے رہے۔ آج اس مقالے میں مجملاً میں ان کے جغرافیائی سلیقۂ حسن کاری کا تعارف کرانا چاہتا ہوں لیکن اس سے پہلے میں یہ بھی عرض کر دوں کہ صبح و شام کی منظر کشی دشت ہولناک کی مصوری کو ہم منظری شاعری تو کہہ سکتے ہیں لیکن جغرافیائی شاعری اس سے کچھ الگ چیز ہے۔ ہم انیس کے اس شعر کو ؎۔

وہ گرمیوں کے دن وہ پہاڑوں کی راہ سخت\
پانی نہ منزلوں نہ کہیں سایۂ درخت

منظری شاعری کا بہترین مرقع تو کہہ سکتے ہیں۔ لیکن جغرافیائی شاعری کا اس پر اطلاق نہیں کیا جا سکتا۔ جغرافیائی شاعری کے اصل نمونے ہمیں اردو میں صفی ہی کے یہاں پہلی مرتبہ ملتے ہیں۔ مثلاً پٹنہ (عظیم آباد) کے متعلق جب وہ یہ کہتے ہیں ؎

کہتے ہیں پٹنہ جسے وہ خطۂ مینو نشاں\
داہنے بازو پہ گنگا کے ہے مثلِ حرزِ جاں

غالباً نو میل تک طولاً لبِ آبِ رواں\
ملتے ہیں آباد حلقے صورتِ زلفِ بتاں

تو جغرافیہ نویسی کے ساتھ شاعرانہ افسوں نگاری کا پورا پورا حق ادا کرتے ہیں۔

جس نے پٹنے کی چودہ میل لمبی آبادی کو خم کھا کے سلسلہ وار پھیلتے ہوتے ہوائی جہاز سے دیکھا ہوگا وہی صفی کے اس حسن تمثیل کی داد دے سکتا ہے۔

ملتے ہیں آباد حلقے صورتِ زلفِ بتاں

اس بند کی غیر مردّف ٹیپ کو دیکھیے جو حسن کاری کا سحر کار مرقع ہے۔

خود یہ سرمستِ ادا مثلِ حسین شوخ و سنگ
شانہ سورج کی شعاعیں، آئینہ دریائے گنگ

پٹنے کی اسی نظم میں جب وہ عہدِ اشوک کی تاریخی داستان دہراتے ہیں تو اپنے سننے والے کی آنکھوں میں عبرت کے آنسو لے آتے ہیں

دیکھیے اس دورِ گردوں کی ورق گردانیاں
ہے زمیں اپنی جگہ، اپنی جگہ پر آسماں
ہو گئے اوجھل ستارے کارواں در کارواں

ریگِ دریا نے چڑھائیں سطحِ اصلی پر تہیں
کتنی گہرائی میں تعمیریں ہیں اس کی کیا کہیں

اور پھر ان تاثراتی کیفیتوں میں اپنے جغرافیائی فرض کو نظر انداز نہیں کرتے۔ اسے بھی شاعرانہ رنگ دے کر ہماری آنکھوں کو حیران کر دیتے ہیں

گھاگرا اور سون کا گنگا سے ہے سنگم یہاں
معنیٔ تثلیث فی التوحید ہوتے ہیں عیاں

طولِ آبادی کا بھی سُن لیجیے مجمل بیاں
یہ زمیں اس طرح ہے جیسے فلک پر کہکشاں

اس مضمون کو اپنی الہ آباد والی نظم میں اس حسن بندش کے ساتھ باندھتے ہیں

اے الہ آباد اے جولانگہ گنگ و جمن
تیرا دامن تین تربینی کی ہے اک انجمن

سیکھتے ہیں تجھ سے فرقے میل ملت کے چلن
اتحادِ باہمی سنگم سے تیرے موجزن

جونپور ایک تاریخی شہر ہے۔ اس تاریخی شہر کا جغرافیائی بیان ملاحظہ ہو۔

جون پور اے مولدِ سلطانِ عادل شیر شاہ
تیرے آثارِ قدیمہ تیری عظمت کے گواہ

وہ شمالی حصے میں اک پر فضا بارہ دری
خوشنما فیروز شہ کے وقت کی صنعت گری
دیتی ہے رو کار سے یوں دادِ معنی گستری
میں نے دیکھے ہیں بہت سے دورِ چرخِ چنبری

دُھس بتاتا ہے کہ چوٹوں سے بدن سب چور ہے
قلعہ کہتا ہے کنواں دل کا میرے ناسور ہے

قلعۂ سنگیں بنا دکھلا رہا ہے شانِ طور
ہر جگہ ہے قدرتِ حق کے کرشموں کا ظہور

جب نگاہِ شوق کر جاتی ہے خندق سے عبور
بہ رہی ہے گومتی دکھن کی جانب تھوڑی دور

آج تک جب اک ذرا چڑھتا ہے آبِ گومتی
قلعے کے پابوس کو بڑھتا ہے آبِ گومتی

جون پور اور لکھنؤ اودھ کے دو شہر ہیں جو دریائے گومتی کے کنارے آباد ہیں۔ اس جغرافیائی حقیقت کی شاعرانہ مرقع نگاری دیکھیے

جونپور اے شاہدِ پہلو نشینِ گومتی
خوب ہی تو نے چُنی ہے آستینِ گومتی

اس شاہد پہلو نشیں گومتی کی ہمنشینی کی اب حسن کارانہ تخئیلیں بھی ملاحظہ ہوں جو حسن بیانی کا اک معجزہ نظر آتی ہیں۔

منتخب دو سبزہ زاروں میں رواں اک آبجو
بادہ کش دو ایک ساغر میں زلالِ آرزو
اک شفاف آئینہ دو مہوشوں کے روبرو
دیکھیے نقشے میں شہرِ جونپور و لکھنؤ

ایک دریا پر بسے ہیں شانِ ساحل ایک ہے
دل بظاہر ہیں جدا لیکن رگِ دل ایک ہے

یہ بھی صفی کی معجزہ بیانی ہے کہ وہ اکثر ایک شعر یا ایک مصرعہ میں کسی جغرافیائی یا تاریخی واقعیت کی طرف ایک ایسا تمثیلی اشارہ کر دیتے ہیں کہ تشبیہہ کاری کا سلیقہ بے ساختہ قلم کا منہ چوم لیتا ہے۔ جیسے دہلی کے قطب مینار کے متعلق

شاہ قطب الدین ایبک کا منارہ ہے یہی
ہے خدا برتر اس انگلی کا اشارہ ہے یہی

یا جیسے بنارس میں گنگا پر جو آہنی پُل ہے اس کی سنگینی میں بیان کی رنگینی دیکھیے

روئے گنگا جسرِ کاشی خوشنما تعمیر ہے
خطِ قوسی میں سرِ جدول یہی تحریر ہے
پُل ہلالِ عید، گنگا صاف جوئے شیر ہے
یا بتوں کے ابروئے پیوستہ کی تصویر ہے

آسماں کھا فتنہ بازی میں جو مشہورِ جہاں
سرزمینِ حسن نے کھینچی ہے غمزے کی کماں

ہے حصارِ عافیت کی پشتیاں اس پُل کی نیو
سینہ تانے یا ہے مستِ خوابِ راحت کوئی دیو
پیکرِ کاشی پہ ہے کیا خوشنما آڑا جنیو
ہے کہیں "ہر ہر" لبِ ساحل کہیں پر "شیو شیو"

تیسرے مصرعے کی آخری تشبیہہ کی لذت پر ذوقِ سخن فہمی کے لیے سوائے سر دھننے کے اور کیا چارہ ہے۔

الغرض مولانا صفی تفصیلی اور جزوی جغرافیائی بیان کے ساتھ کانفرنس کے شرکاء

ے لیے ایک گائیڈ کا بھی فرض انجام دیتے ہیں۔ اور جغرافیائی حالات کے ساتھ تاریخی حالات
ہا بیان کرتے جاتے ہیں۔ انھوں نے ہر تاریخی شہر کے تاریخی حالات کے بیان کو شعریت
سے کہیں دور ہونے نہیں دیا۔ یہی ان کا شعور سخنوری ہے۔ اس کی مثالوں کے لیے
ں مختصر مقالے میں گنجائش نہیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ صفی کی تاریخی شاعری پر
ب اور مقالہ لکھا جائے یہاں صرف نمونے کے طور پر ایک مثال الہ آباد کے خسرو
غ کی تاریخی عمارات کا جائزہ لیتے ہوئے صفی ایک مورخ کا فرض اس شاعرانہ انداز
سے ادا کرتے ہیں ؎

دور بیں سے ہمکو دکھلاتی ہے تاریخ قدیم
اکبر غازی ہوا جب راہیِ دار النعیم
تخت پر بیٹھا تلوّن طبع نور الدیں سلیم
عمر بھر ہوتی رہی بیٹوں سے اک جنگِ عظیم

اس کا فرزندِ معظم خسروِ زرّیں کلاہ
باپ سے لاہور میں لڑکر ہوا تھا جو تباہ
آنکھیں سِلوائی گئیں ہر چند تھا نورِ نگاہ
گلکدہ ہے یہ اسی شہزادۂ ذیجاہ کا
سچ ہے فانی سب ہیں باقی نام ہے اللہ کا

اس خسرو باغ کی تعریف میں انھوں نے جہاں تخیلاتی طلسم کاری دکھلائی ہے۔ وہاں انھوں نے المیہ شاعری کی تاثراتی کیفیت بھی اپنے سامعین کے دل پر طاری کردی ہے جسے پڑھ کر گرے کی شہرہ آفاق نظم Elegy کی المیہ کیفیت ہمارے ذہنوں پر چھا جاتی ہے ؎

مقبرے دو اور ہیں اس مقبرے کے آس پاس
خوشنما و مرتفع سنگیں بنا محکم اساس
عاشقوں کے دل کی صورت جن کی ہر منزل اداس
پہلوؤں میں حوضِ سنگیں خشک مثلِ چشمِ یاس
چار جانب پاسباں ہیں سرو سر کھولے ہوئے
بیٹھے ہیں آکے طائر بھی تو پر تولے ہوئے

کیوں؟ لحد کے سونے والو کچھ تمھیں بھی ہے خبر
رات کب ہوتی ہے کب ہوتی ہے دنیا میں سحر
کہتے ہیں آئینۂ عبرت جنھیں اہلِ نظر
ان مناظر سے دلوں پر تم بھی لیتے ہو اثر؟
کس مسرت میں ہو کچھ بتلاؤ تو کس غم میں ہو
ہم ہیں جس عالم میں کیا تم بھی اسی عالم میں ہو

اس سلسلے میں ان کا آگرہ والا مسدس یاد آرہا ہے۔ جس میں انھوں نے آگرے کی تاریخی عمارات اور خصوصیت کے ساتھ تاج کی تعریف کی ہے۔ اگرچہ حسنِ تعمیر کے تفصیلی بیان کے سلسلے میں صفی بھی ہمیں اسی طرح مایوس کرتے ہیں جس طرح اقبال مسجد قرطبہ کی تصویر کشی میں۔ تاہم خاتمے کے آخری بند میں انھوں نے ایک تاثراتی کیفیت پیش کی ہے جو ٹھنڈے سے ٹھنڈے آدمی کی آنکھوں میں عبرت کے گرم گرم آنسو لے آتی ہے ؎

روز مرّہ یہاں وقت غروب و آفتاب
چومنے قبروں کو ہوتی ہیں شعاعیں باریاب
کیا خبر اس کی مگر ان کو جو ہیں سرمستِ خواب
گل فشانی کس نے کی کس نے صفی چھڑکا گلاب
کی نسیمِ صبح نے دم بھر جو دلجوئی تو کیا
رات بھر شبنم سر گنبد اگر روئی تو کیا

خیر یہ گفتگو ایک جملۂ معترضہ تھی جو سلسلۂ بیان میں آگئی ورنہ میں تو آپ سے صفی کی جغرافیائی شاعری کی قدرتِ قلم کاری کا تعارف کرا رہا تھا۔ الفاظ و معانی کی یہ طلسم بندی ہمیں ان کی ملتان، سندھ، لاہور، دہلی، کلکتہ، بمبئی کے جغرافیائی بیان میں ملتی ہے۔ چند مثالیں اور سنیے — بمبئی کے جغرافیائی مرقعے ملاحظہ ہوں ؎

بمبئی ہندوستاں کا صدر دروازہ ہے تو
بلکہ رخسارِ عروس ہند کا غازہ ہے تو
اپنی آب و تاب سے ہر دم تر و تازہ ہے تو
ایک رنگا رنگ مجموعے کا شیرازہ ہے تو
آکے جو صحبت میں بیٹھا کام کا جی ہو گیا...
تیری چوکھٹ جس نے چھولی نصف حاجی ہو گیا

ہر دو جانب کوہساروں کا تسلسل تا بہ دور
اور ان کے بیچ میں تو صورتِ بین السطور
اپنے سنگیں بازوؤں پر تجھکو ہے زیبا غرور
روک دیتے ہیں جو طوفانی تموّج کا عبور
دل ہے لبریزِ محبت آگیا جب جوش میں
لے لیا بحرِ عرب کو حلقۂ آغوش میں

جا بجا مضبوط چٹانوں کی پتھریلی فصیل
زیبِ ساحل صف بصف اشجار انجیر و نخیل
بادِ صرصر تانہ آبادی میں آکر ہو دخیل
گولہ باری کرتے رہتے ہیں درختِ نارجیل
جاذبِ بادِ سموم و سایہ افگن بارور
خوانِ نعمت ہر مسافر کے لیے اک اک شجر

دامنِ ساحل پہ صدہا رنگ کے نقش و نگار
کوٹھیاں کچھ کچھ تلے اوپر منازل حنا نہ دار
جن کی پستی اور بلندی یوں دکھاتی ہے بہار
جیسے زینوں پر لگا دیں بیچ کے گملوں کی قطار

خیر مقدم کو مسرت بڑھتی ہے دل کی طرف
اک نظر ڈالو سمندر سے جو ساحل کی طرف

لیجیے اب کلکتہ کے جغرافیائی مناظر کی تفصیل بھی بہ انداز شاعرانہ ملاحظے کے لیے حاضرِ خدمت ہے ؎

ہے برہم پترا اور گنگا کا جہاں سنگم حضور...
وہ مقام دلکشا بھی ہے یہاں سے تھوڑی دور
دونوں سے نکلی ہیں شاخیں صورتِ بین السطور
بے سفینے کر نہیں سکتا کوئی جن کو عبور

پُر ہے دندانوں سے دریا کا دہانہ دیکھیے
کیا ہی زلفِ موج میں الجھا ہے شانہ دیکھیے

چڑھ کے اسٹیمر پہ کیجیے سیر، تازہ ہوں قلوب
یہ سمندر سے گھرا ہے جانبِ شرقی و غروب
بحر ہی سے بحر کا منظر نظر آتا ہے خوب
دامنِ ساحل میں بنسواڑی کہیں پر سبز دوب

کھڈ کہیں، ٹیلے کہیں، صحرا کہیں، جنگل کہیں
جا بجا ریتی کہیں پر دور تک دلدل کہیں

جغرافیہ جہاں ہمیں شہروں کی آبادی دکھلاتا ہے۔ وہاں شہر کے ممتاز لوگوں سے بھی ہمیں متعارف کراتا ہے۔ صفی کی جغرافیائی شاعری بھی اس فرض سے غافل نہیں۔ چنانچہ الہ آباد کے متعلق کہتے ہیں کہ ؎

"حضرتِ اکبر لسان العصر کا مسکن ہے تو"

اور پھر ؎

ہے مثلِ راجہ کے گھر میں موتیوں کی کیا کمی
زیبِ معدن ہیں جواہر لال، موتی لال جی

کلکتے کے سلسلے میں۔

کون کلکتہ جہاں سے تھا طلوعِ الہلال
کون کلکتہ نظرگاہ خیالؔ، خوش مقال

کون کلکتہ جہاں ہے شاعرِ نامی ٹیگور
جس کے میدانِ تخیل کا نہیں کچھ اُور چھور

کون کلکتہ جہاں ہے وحشتِ معجز بیاں
شاعرِ کامل، سخن سنج و ادیب نکتہ داں
ابر دریا بار جس کا خامۂ گوہر فشاں
پیروِ غالبؔ معانی گستر شیوا زباں

جغرافیہ ہمیں شہروں کی تجارت اور صنعت و حرفت سے بھی مطلع کرتا ہے۔ صفی اپنی شاعری میں یہ جغرافیائی فرض بھی جا بجا ادا کرتے ہیں۔ الہ آباد سے کہتے ہیں ؎

میوۂ جنت کی لذت تیرے امرودوں میں ہے

ملتان سے کہتے ہیں ؎

تیری پیداوار کیا ہیں تیل، روئی، نیشکر
تیرے مصنوعات اونی ریشمی کپڑے مگر
گھوڑے بکتے رہتے ہیں سالانہ میلے میں ترے
تازی و ترکی بندھے ہیں سب طویلے میں ترے

جغرافیائی شاعری معنوی حیثیت سے منظری شاعری کی رشتہ دار ہے۔ صفی نے اپنے قومی مسدسوں میں جا بجا اپنی منظر پرستی کا ثبوت دیا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ بنارس والی نظم میں حسنِ بنارس کا منظر اور حسینانِ شہر کے اشنان کا مرقع جس دلکشی کے ساتھ کھینچا ہے اس کی مثال اردو شاعری میں شاید اس سے بہتر نہیں۔

ڈوب کر کیسے نکلتے ہیں ستارے دیکھ لو
یہ تماشا آ کے گنگا کے کنارے دیکھ لو

ہے ہلالی خط میں آبادی بنارس کی تمام
گھاٹ مندر سب لبِ دریا بحسنِ انتظام
ناؤ پر چڑھ کر انھیں دیکھو جو نامی ہیں مقام
ماہ رویوں کا ملے گا ہر جگہ پر ازدہام

صدقے اتنی سی زمیں پر سو گلستاں کی بہار
آگ پانی میں لگاتی ہے چراغاں کی بہار

وہ دھندلکا صبح کا وہ دور تک گنگا کا پاٹ
وہ کگاروں سے نمایاں جا بجا پانی کی کاٹ
وہ پریزادوں کے جمگھٹ سے پرستاں لاج گھاٹ
دل بہل جاتے جو انساں کی طبیعت ہو اچاٹ

اتریں پانی میں گجر دم روز کا معمول ہے
ہر حسیں نازک بدن گویا کنول کا پھول ہے

دیکھو لو آبِ رواں میں حسنِ دلکش کی بہار
صاف سینوں سے جوانی کی امنگیں آشکار
جال پھیلائے ہوتے پانی پہ زلفِ تابدار
بال کا باندھا چلا آتا ہے جس میں خود شکار

جھوم کر اٹھی جہاں گھنگھور متوالی گھٹا
دیکھنا برسائے گی موتی یہی کالی گھٹا

زعفرانی ہے کسی ماتھے پہ ٹیکا صندلی
دل سے نازک تر لیے ہاتھوں میں اک گنگاجلی
لب پہ یوں موجِ تبسم جیسے کھلتی ہو کلی
دل جہاں پھسلا لبِ توبہ سے نکلا یا علی

جھومتے نکلو بنارس میں جدھر بھی سیر کو
چھیڑ کر کلمہ پڑھاؤ ان بتانِ دیر کو

ہے غدیرِ خم کے متوالوں کا گنگا پر جماؤ
دھن یہ ہے کوثر سے کا تو نہر گنگا میں ملاؤ

میرے ساقی تیری جے اور تیرے میخانے کی جے
یہ طرب خانہ ترا کاشی نہیں کا شان ہے
گھاٹ ہی پر خوب پیکے رات پڑکر سوئیں گے
رختِ مئے آلود گنگا میں سویرے دھوئیں گے

صفی کے ایک اور بہاریہ مسدس میں جو بحرِ رمل مثمن محذوف میں ہے۔ برسات کی منظر کشی کا لطفِ قوافی ملاحظہ ہو۔

اب کے بارش میں ذرا سیر کو ریتی پہ تو جاؤ
پہلے خشکی تھی جہاں اب وہیں چلتی ہے ناؤ
دور تک پاٹ کا وہ پھیر وہ چکر وہ گھماؤ
سینہ تانے ہوئے مستانہ وہ دریا کا چڑھاؤ

رمل مثمن لے گیا جب لبِ دریا دلِ بیتاب مجھے
دور سے آنکھ دکھانے لگے گرداب مجھے

آپ نے صفی کے حسنِ بیان اور زورِ سخنوری کی طلسم آفرینیاں دیکھیں۔ آپ اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ انھوں نے اپنی قومی شاعری میں تاثرات و تخیلات کے کیسے طوفان اٹھاتے ہوں گے۔ اگر ان کی یہ تلاطم خیزیاں ایک فرقے کے مفاد تک محدود نہ ہوتیں اور وہ اپنی قومی شاعری کے دائیروں کو تھوڑی سی وسعت دے سکتے تو ان کا شمار حالی و اقبال جیسے ناخدایانِ فن میں ہوتا جنھوں نے دلوں کی ڈوبتی ہوئی کشتیوں کو تیرایا۔ ویسے صفی اس حیثیت سے اپنے تمام ہم عصروں میں ممتاز ہیں کہ انھوں نے اردو کے تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی اور کسی میں وہ کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ انھوں نے قصیدہ لکھا تو اس شدّت کے ساتھ کہ اردو میں غالباً پہلی مرتبہ قصیدے کی زبان سے عرفی کی روح بولی ؎

پیچ در پیچ ہے سررشتۂ آثار و عِلل ...
رازِ ہستی ہے عجب عقدہ مالاینحل

اور غزل لکھی تو اس طرح کہ اس کا ایک مطلع آج تک ہمارے ذہن کے تاروں کو جھنجھنا رہا ہے ؎

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

● جولائی ۱۹۸۰ء کے شمارے میں جن کتابوں پر تبصرہ شائع ہوا ہے ان کے مبصر جناب کنور سین ہیں۔

"گورِ رسیدہ"

(حضرت علامہ جمیل مظہری مرحوم کی وہ نظم جو انھوں نے اپنی وفات سے تقریباً دو ماہ پہلے کہی تھی۔)

کب سے ہے شوقِ سفر ذہن پہ طاری اے دوست
چار کاندھوں کی کب آئے گی عماری اے دوست
کیا سوال اپنے جنازے کے سبک ہونے کا
زندگی ہی میں مری لاش ہے بھاری اے دوست

جذبۂ رحمتِ خاموش سے ان کے پوچھو
جو اٹھائے ہیں اسے دوش سے ان کے پوچھو
وہی بتلائیں گے کتنی ہے گرانی میری
ذہن طفلانہ طبیعت خفقانی میری
مختصر یہ ہے کہ بچپن تو پلٹ کر آیا
اور پلٹی نہ گھڑی بھر کو جوانی میری

اپنی حالت سے دیدہ و شنیدہ ہوں میں
قبر بستر ہے مرا۔ گور رسیدہ ہوں میں
وقت وہ ہے کہ عناصر کا گھروندا ٹوٹے
وقت وہ ہے کہ خدا کا یہ کھلونا ٹوٹے
وقت اب وہ ہے کہ بکھرے یہ طلسماتِ خودی
وقت اب وہ ہے کہ ہر خوابِ تمنّا ٹوٹے

بسکہ ہر سلسلۂ بیم و رجا ختم ہوا
فطرتِ شعبدہ گر کھیل ترا ختم ہوا
اب کھلا یہ کہ تماشائے نظر کچھ بھی نہیں
رنگ و بو کچھ بھی نہیں برق و شرر کچھ بھی نہیں
ظلمت و نور کی ہر شعبدگی جھوٹی تھی
حلقۂ معتبرِ شام و سحر کچھ بھی نہیں

عرصۂ جہد میں ٹھہرے تھے کہ بھاگے تھے ہم
حرکتیں خواب کی تھیں خواب میں جاگے تھے ہم

کیوں ڈروں موت سے یہ سرِّ نہاں کیا ہے جمیلؔ
آگ دوزخ کی پئے سوختہ جاں کیا ہے جمیلؔ
جو بلندی کا مسافر ہو نظر میں اس کی
اک خیاباں ہے سرِ راہ جناں کیا ہے جمیلؔ
چن کے کچھ پھول نکل آئیں گے اس گلشن سے
کیا مسافر کو تعلق ہو کسی مسکن سے

(مرسلہ رضا مظہری)

نثار احمد فاروقی

امیر خسرو اپنے مرشد کی بارگاہ میں

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کو اپنے چہیتے مرید حضرت امیر خسرو سے کتنا گہرا قلبی تعلق تھا اس کے شواہد جمع کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ اب ضرب المثل بن چکا ہے حضرت نے فرمایا کہ بعض لمحے ایسے ہوتے ہیں کہ میں سب سے تنگ آجاتا ہوں، حتیٰ کہ خود اپنے وجود سے بھی۔ مگر اس "ترک" سے تنگ نہیں آتا۔[1] آپ نے حضرت امیر خسرو کو "ترک اللہ" کا لقب بھی مرحمت فرمایا۔[2] قدیم شاعری میں ترک کا لفظ کنایتہً محبوب کے معنوں میں آتا ہے اس لیے ترک اللہ کا بھی وہی مفہوم سمجھنا چاہیے جو "محبوب الٰہی" کا ہے۔

سیر الاولیا یا فوائد الفواد جیسی قدیم کتابوں سے یہ اندازہ تو نہیں ہوتا کہ حضرت امیر خسرو کو اپنے پیر و مرشد سے خلافت بھی حاصل تھی لیکن اس میں شک نہیں کہ امیر خسرو آپ کے سب سے چہیتے مرید تھے۔ خلافت اس لیے نہ دی ہوگی کہ وہ دربار سے متعلق رہے اور حضرت نے انھیں کبھی اس تعلق سے روکا بھی نہیں۔ لیکن "لطائف اشرفی" میں امیر خسرو کو "از خلّصِ خلفاء و مخصوصِ ندماء" لکھا گیا ہے۔[3]

حضرت محبوب الٰہی اور حضرت امیر خسرو کا تعارف کب ہوا اور اس کے اسباب کیا تھے اور امیر خسرو نے کس زمانے میں بیعت کی ان سب امور پر ابھی تک فیصلہ کن مواد نہیں ملا ہے۔ حضرت نظام الدین نے اپنی والدہ ماجدہ کی نگرانی میں ابتدائی تعلیم اپنے وطن بدایوں میں حاصل اور پھر مزید تعلیم کے لیے دہلی تشریف لائے تھے۔ دہلی کا پہلا سفر تنہا کیا تھا تاکہ یہاں حالات کا جائزہ لے سکیں۔ پھر دوسرے سفر میں اپنی والدہ ماجدہ، بیوہ بڑی بہن اور ان کے بچوں کو ساتھ لے کر آئے۔ اس وقت آپ کی عمر ۱۸ اور ۲۰ سال کے درمیان رہی ہوگی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسی زمانے میں حضرت امیر خسرو کے والد سے تعارف حاصل ہوا۔

دیباچہ غرۃ الکمال کی رو سے امیر خسرو کی ولادت ۶۵۱ھ میں ہوئی اور اسی سنہ کی تائید ان کی دوسری تصانیف سے بھی ہوتی ہے۔ جب امیر خسرو کے والد سیف الدین محمود کا انتقال ہوا تو ان کی عمر آٹھ سال سے زیادہ نہیں تھی۔[4] اس کا مطلب یہ ہے کہ امیر سیف الدین محمود نے ۶۵۹ھ یا ۶۶۰ھ میں انتقال کیا۔ بعض روایات میں جن کا مصدر مجھے ابھی تک نہیں ملا ہے، یہ کہا گیا ہے کہ جب امیر خسرو اپنے والد کے ساتھ پہلی بار حضرت نظام الدین کی خدمت میں پہنچے تو دروازے ہی پر ٹھہر گئے اور والد کے ساتھ اندر نہیں گئے بلکہ ایک رباعی فی البدیہہ لکھ کر بھیج دی۔

تو آں شاہی کہ بر ایوانِ قصرت   کبوتر گر نشیند، باز گردد
فقیرے مستمندے بر در آمد   بیاید اندروں، یا باز گردد؟

حضرت نظام الدین نے بھی اس کا جواب فی البدیہہ رباعی کی شکل میں دیا اور ایک پرچے پر یہ لکھ کر بھیج دیا۔

بیاید اندروں مرد حقیقت   کہ با ما یک نفس ہمراز گردد
اگر ابلہ بود آں مرد ناداں   ازاں راہے کہ آمد باز گردد

سیر الاولیا میں ہے کہ حدِ بلوغ کو پہنچنے کے بعد حضرت امیر خسرو نے سلطان المشائخ سے بیعت کی۔[5] اگر یہ رباعی والا قصہ صحیح ہے تو یہ ۶۶۰ھ سے قبل کا واقعہ ہوگا اور اس وقت امیر خسرو ۸۔۹ سال سے زیادہ کے نہیں تھے جب کہ انھوں نے خود دیباچہ دیوان غرۃ الکمال میں لکھا ہے کہ بارہ سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی شعر گوئی کا آغاز والد کے انتقال کے بعد ۶۶۳ھ کے آس پاس اور سلطان بلبن کی تخت نشینی سے قبل ہوا تھا۔ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کا سال وفات عام طور پر ۶۶۴ھ بیان کیا جاتا ہے۔ سیر الاولیاء میں جو خلافت نامہ درج ہوا ہے[6] اس کی تاریخ کتابت ۶۶۹ھ بیان ہوئی ہے۔ بعض حضرات نے یہ بھی ثابت کرنا چاہا ہے کہ بابا صاحب کا انتقال ۶۷۰ھ میں ہوا۔ نیشنل میوزیم دہلی میں محفوظ ایک قلمی نسخے کے آغاز میں کچھ مادہ ہائے تاریخ درج ہیں۔ ان میں حضرت بابا فریدؒ کے انتقال کی تاریخ "کلید گنج شکر" سے برآمد کی گئی ہے جو ۶۵۰ھ ہوتی ہے۔[7]

بہر حال ہمیں اتنا معلوم ہے کہ حضرت بابا فرید نے اپنی زندگی کے آخر سال میں خلافت مرحمت فرمائی تھی۔ اپنے پیر و مرشد کی زندگی میں، اور ان سے اجازت بیعت حاصل کیے بغیر تو کسی کو مرید کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حضرت نظام الدین اولیاء کے بارے میں تو یہ بھی روایت ہے کہ جب تک سید بدر الدین اسحٰق دہلوی بقید حیات میں رہے، حضرت نظام الدین نے ازراہ ادب کسی کو مرید نہیں کیا۔ اور بدر اسحٰق اپنے پیر و مرشد کے بعد ۶۔۷ سال تک ضرور زندہ رہے۔ ان سب باتوں سے یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ حضرت امیر خسرو نے حدِ بلوغ کو پہنچ کر یعنی ۶۷۰ھ کے بعد ہی حضرت نظام الدین سے بیعت کی ہوگی۔ ڈاکٹر وحید مرزا نے بھی ۶۷۱ھ میں بیعت ہونا تسلیم کیا ہے۔ اس صورت میں یہ روایت غلط ہو جاتی ہے کہ امیر خسرو کے والد بھی حضرت نظام الدینؒ کے

فٹ نوٹ مضمون کے آخیر میں دیئے گئے ہیں۔

مرید تھے۔

حضرت امیر خسرو کے دو بھائی اور تھے، حسام الدین قتلغ خاں جنھوں نے ۶۹۸ھ میں اسی ہفتے میں انتقال کیا جس میں ان کی والدہ ماجدہ نے رحلت کی تھی، اور عزالدین علی شاہ جو فوائد الفواد کی ۱۳ رمضان ۷۰۸ھ کی مجلس میں موجود ہیں[۵] امیر حسن دہلوی نے لکھا ہے "عزالدین علی شاہ سلمہ اللہ تعالیٰ کہ یکے از مریدانِ خاص بود"۔ سیر العارفین مولفہ جمالی دہلوی کی رو سے یہ امیر خسرو کے بڑے بھائی تھے[۶] اور وحید مرزا نے امیر خسرو کو منجھلا بھائی بتایا ہے۔[۷]

امیر خسرو کی اولاد میں ہمیں چار بیٹوں اور دو بیٹیوں کے نام ملتے ہیں۔ غیاث الدین ملک احمد، محمد[۸]، خضر اور مبارک ان کے بیٹے ہیں۔ عفیفہ اور میمونہ دو صاحبزادیاں ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ سب بھی سلسلہ نظامیہ میں بیعت تھے۔ امیر خسرو کے ایک پوتے ہمیں حضرت نصیر الدین چراغ دہلی[۹] کی مجلسوں میں نظر آتے ہیں۔ انھیں "خسروِ ثانی" کہا جاتا تھا۔ اس سے گمان ہے کہ شعر کہتے ہوں گے۔ حضرت سید محمد حسینی گیسو دراز سے ان کی بڑی دوستی ہوگئی تھی۔ ایک دن چراغ دہلی کے مریدوں نے آپس میں یہ گفتگو کی کہ صوفیا کا قاعدہ ہے وہ زرد رنگ کی جوتی پہنتے ہیں۔ مگر ہمارے شیخ (حضرت چراغ دہلی) لال رنگ کی پاپوش پہنتے ہیں۔ اس کا کیا سبب ہے؟ چنانچہ بعض نے ایک عمدہ اور نفیس بنادٹ کی زرد کفش خرید کر شیخ کو نذر کردی۔ حضرت چراغ دہلی نے ایک پانو سجادے پہ رکھا اور دوسرے پانوں میں وہ جوتی پہن کر دیکھی پھر اسی وقت وہ زرد جوتی "خسرو ثانی" یعنی امیر خسرو کے پوتے کو مرحمت فرمادی کیونکہ حضرت چراغ دہلی اپنے شیخ کے اتباع میں ہمیشہ لال رنگ کی جوتی پہنا کرتے تھے۔ "خسرو ثانی" مجلس سے باہر نکلے اور خواجہ گیسو دراز سے خوش ہوکر کہا کہ آج مجھے خدمت شیخ سے ایک کفش زرد مرحمت ہوئی ہے۔ حضرت گیسو دراز نے فرمایا کہ مشائخ سے کفش کا عطیہ ہونا دو باتوں میں ایک کی علامت ہوتا ہے یا تو تمھیں سیر و سلوک میں مراتب اعلیٰ نصیب ہوں گے یا خود اس جہاں سے سفر کروگے۔ ابھی اُن جوتیوں کا رنگ میلا بھی نہ ہوا تھا کہ خسرو ثانی اچانک بیمار ہوئے اور چند روز علالت کے بعد سفر آخرت پر روانہ ہوگئے[۱۰] یہ چراغ دہلی کی حیات کا واقعہ ہے یعنی خسرو ثانی کا انتقال ۷۵۷ھ سے قبل ہوا ہوگا۔

حضرت امیر خسرو کے نانا عماد الملک راوت عرض تھے جن کا انتقال ۶۷۱ھ میں ہوا۔ یہ بڑے کرّوفر کے امیر تھے ان کی آن بان کا کچھ نقشہ برنی کی فیروز شاہی سے معلوم ہوتا ہے[۱۱] دہلی میں مندہ دروازے کے پُل کے پاس ہی ان کی بڑی حویلی تھی جس کے ایک حصے میں حضرت نظام الدین اولیا بھی کچھ عرصے تک رہے تھے۔ غیاث پور میں تشریف آوری سے پہلے آپ نے دہلی چھوڑ کر پٹیالی میں رہنے کا ارادہ بھی کیا تھا کیوں کہ اس زمانے میں امیر خسرو وہیں تھے[۱۲]

امیر خورد کرمانی مولف سیر الاولیا، کا بیان ہے کہ یہ امیر خسرو کی شعر گوئی کے آغاز کا زمانہ تھا۔ جو کچھ وہ کہتے تھے اسے بنظر اصلاح حضرت نظام الدین اولیا کے ملاحظے میں پیش کرنے لگے۔ ایک دن حضرت نے فرمایا کہ "تم صفاہانی طرز پر شعر کہا کرو یعنی عشق انگیز و زلف و خال آمیز"[۱۳] اس نصیحت کو امیر خسرو نے گرہ میں باندھ لیا اور خال و خط کی تعریف میں ایسی ایسی موشگافیاں کیں کہ اس فن کو حد کمال تک پہنچا دیا۔ اس مشورے سے خود حضرت نظام الدین اولیا، کے اعلیٰ تنقیدی شعور اور گہرے رچے ہوئے شعری ذوق کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ آپ نے امیر خسرو کی صلاحیتوں کو ابتدا ہی میں صحیح راستے پر لگادیا۔ انھوں نے اپنے دواوین غرۃ الکمال، وسط الحیاۃ اور نہایت الکمال شیخ کی خدمت میں پیش کیے۔ اپنی بیشتر تصانیف میں امیر خسرو نے حمد و نعت کے بعد پہلے اپنے پیر و مرشد کی مدح کی ہے پھر بادشاہ وقت کی تعریف لکھی ہے۔ دیباچۂ دیوان غرۃ الکمال میں لکھتے ہیں :-

"بعد از توحیدِ احد، و محامد محمد صلی اللہ علیہ وسلم آنچہ بر بندہ فرض است خواندن دعائے شیخ کامل و مکمل و مقتدائے واصلِ مُوصل، و عنوان توقیع عنایت الٰہی، و مضمون نامہ اسرار نامتناہی است سُبحان شیخی کہ آیتے ست از مصحفِ مجید بلکہ نسخہ ایست صحیح از منشورِ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْهُدٰى۔ شیخ عالم بلکہ شیخ الشیوخ عالم نظام الحق والدین کہ نظمِ کارِ عالم بجواہر منظومِ سُبحہ او بر بستہ است۔ زہے بینائے صادق نظر کہ مکنونات اَرِنِیْ اَنْظُرْ اِلَیْکَ را در سوادِ عینِ کَاَنَّکَ تَرَاهُ تضمین فرمودہ است و زہے دانائے رموزِ خداوند اکبر کہ مُغلقاتِ وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا اِلَّا هُوَ را در سبقِ ازل حل کردہ۔ دلِ رحیمش بہ صنعتِ تقریب اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ مشغول۔ درود لطیفش بطرفِ ربانی وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ مخصوص۔ شاعر برائے او چہ بیت سازد کہ بیت اللہ بیت او ست اَلْمَسْجِدُ بَيْتُ كُلِّ تَقِيٍّ وَبَرٍّ۔ دراں روز کہ ہمہ گفتارہا را بسنجند وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ ِالْحَقُّ۔ امید وارم کہ در میزان اقوالِ رکیکِ مارا اگر وزنے باشد از مدائح و محامد او باشد"[۱۴]

ان کی تصانیف میں مثنوی قران السعدین اور مثنوی تغلق نامہ میں منقبت شیخ کے اشعار نہیں ہیں۔ تغلق نامہ تو نامکمل رہ گیا تھا، قران السعدین کے بارے میں، جو ۶۸۸ھ کی تصنیف ہے، یہ غور کرنا چاہیے کہ وہ منقبت شیخ سے کیوں خالی ہے؟

مثنوی شیریں و خسرو ۶۹۸ھ میں تمام ہوئی تھی، اس میں منقبت کے ۱۴ اشعار ہیں، چند یہ ہیں :

بسقفش کردہ جبریل آشیانہ	ملک در صحنِ او کنجشک خانہ
دل از نورِ حضورش باد معمور	جز ایں نورِ حضور از ہمتش دور

مثنوی لیلیٰ مجنوں بھی ۶۹۸ھ کی تالیف ہے اور یہ وہ زمانہ ہے جب حضرت نظام الدین اولیا کا روحانی مشن اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ چکا تھا اور اس نے سارے معاشرے میں نئی روح پھونک دی تھی۔ اس مثنوی میں منقبت کے ۱۵ اشعار اس عنوان کے ساتھ دیئے ہیں :

مدح شیخ الطریقہ نظام الحق والحقیقۃ محمدی کہ عیسیٰ اخر الزمانش فرستادند تادم جاں بخشِ او اسلامِ محمدی از سر زندہ گرداند و عمرِ جاوید بخشید متّع اللّٰہ المسلمین بطولِ بقائہ

چوں گو ہر مدح خواجہ سفتم	از غیب شنیدم آنچہ گفتم
اکنوں قدرے در معانی	ریزم بسرِ جنید ثانی

قطب زمن و پناہ ایماں　　سر جملۂ جملۂ کریماں
در شرع نظام دین احمد　　یعنی کہ نظام دین محمد
در حجرۂ فقر پادشاہے　　در عالم دل جہاں پناہے
بر خاک ز رحمت آسمانے　　بر چرخ ز دولت آستانے
شاہنشہ بے سریر و بے تاج　　شاہانش بخاک پائے محتاج
... بینا ترِ جملہ پاک بیناں　　بیدار ترین شب نشیناں
... مسند ز سپہر بر ترش باد　　خسرو چو ستارہ چاکرش باد

اس طرح مثنوی مطلع الانوار بھی ۶۹۸ھ کی تصنیف ہے اس میں امیر خسرو نے شاہ وقت کی مدح سے پہلے ۴۸ اشعار اپنے پیر و مرشد کی منقبت میں لکھے ہیں۔

شیخ امم قطبِ حقیقت نظام　　خضر و مسیح ازدم یحیی العظام
عصمتیانِ حرم آسمان　　جلوہ کناں در نظرش ہر زماں
چوں بہوا بردہ دو دستِ دعا　　گشتہ ہر انگشت کلید سما
سکۂ کارش بفروع واصول　　تابع قال اللہ و قال الرسول
زیر فلک قطب زمانہ ہمو ست　　قطب دو گوئید یگانہ ہمو ست
بر در او ہر کہ ارادت نمود　　زندۂ جاوید شمار مردہ بود
از پئے گمراہی جانہا رقیب　　وز پئے بیماری دلہا طبیب
راہروے کو بطریق صفا　　رفتہ قدم بر قدم مصطفیٰ
چوں دم الہام زدہ کامِ او　　نائب وحی آمدہ الہامِ او
سر کہ بزیر قدمش گشت خاک　　موے بمو از سر سوداست پاک

مفتخر از وے بہ غلامی منم
خواجہ نظام است و نظامی منم

اگلے سال ۶۹۹ھ میں انھوں نے مثنوی آئینۂ اسکندری لکھی۔ اس میں بھی ۲۷ اشعار منقبت کے ہیں۔ چند یہ ہیں:

پناہِ جہاں، دینِ حق را نظام　　رہ قدس را پیشوائے تمام
جہاں زندہ از جانِ بیدارِ او　　زمیں روشن از روز بازارِ او
قدم گاہش از پایۂ عرش بیش　　کفِ پائیش از بوسۂ خلق ریش
زمیں و فلک در ولایت حدش　　و لے گوشۂ بوریا مسندش
گرہ مفلس و توشہ داں پُر ز دُر　　شکم خالی و دل ز گنجینہ پُر
دم خلق، او چوں صبا جاں نواز　　نوالش ہمہ وقت مہماں نواز
ز نظارۂ روے آں آفتاب　　ہمہ پاک چشماں دو دیدہ پُر آب
بَرد بادِ خلق ارچہ بسیار تر　　کسے نیست از وے سبکبار تر

جہاں زو ہمہ وقت پُر نور باد
زمیں را درش بیت معمور باد

مثنوی دولرانی خضر خاں ۷۱۵ھ میں لکھی گئی۔ اس میں شاہ وقت کی مدح سے پہلے حضرت شیخ کی منقبت کے ۲۴۔۱ اشعار ہیں اور حسب معمول امیر خسرو نے قلب و روح کی گہرائی سے عقیدت کے موتی نچھاور کیے ہیں یہ حضرت امیر کے بھی بڑھاپے کا زمانہ ہے اس لیے اپنے حسنِ خاتمہ کی دعا کرتے ہیں۔

نظام الدین حق فرخندہ نامے　　کہ دینِ حق گرفت از وے نظامے
ز علمش در دو عالم روشنائی　　دو عالم، علم کسبی و عطائی
حدیثش چوں خبر در امر و در نہی　　بیک پایہ فرود از پایۂ وحی
بصدر خضر و عیسیٰ مسند آرای　　خضر بوسیدہ دستش خضر خاں پائے
بہر سو کز دمش بادے رسیدہ　　ہزاراں کوہِ رنج از جا پریدہ
کلاہش را نیارم نام گیرم　　زہے بخت ار تہِ کفشش بمیرم
خدایا آں گزیدہ بندۂ خاص　　کہ ہست الحمد للہ جفت اخلاص

بہ قربت ہم نشیں مصطفیٰ باد
دراں قرب ایستادش بہر ما باد

بعض منقبتی اشعار سے حضرت نظام الدین اولیا کے بارے میں دلچسپ سوانحی اشارے بھی ملتے ہیں۔ مثلاً ایک شعر سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت کی انگوٹھی پر آیہ رَبِّ هَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ کندہ کیا ہوا تھا یہ وہ قرآنی دعا ہے جو حضرت سلیمان علیہ السلام نے مانگی تھی۔

زیر نگیں عرصۂ ملکِ جمش　　آیہ "هَبْ لِيْ" رقم خاتمش

ایک اور شعر سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ چہار ترکی چوگوشیہ کلاہ جو حضرت اپنے مریدوں کو مرحمت فرماتے تھے اس کے بیچ میں ایک گول گھنڈی بھی لگی ہوتی تھی۔

تا فسر شاہان گلہ او فسرہ　　بر کلہش ہائے هُوَ اللہ گرہ

اسی طرح ایک شعر میں آپ کے عصا کی طرف بھی اشارہ ہے کہ آپ بالکل سیدھی چھڑی استعمال فرماتے تھے یعنی اس کا سرا خمدار نہیں ہوتا تھا۔

راست عصایش چو شہابے بروز　　دیو کُش و بلکہ عزازیل سوز

ان چند کے علاوہ بھی ان منقبتی اشعار میں ایسے سوانحی اشارے موجود ہیں جن سے حضرت نظام الدین اولیاء کے تذکرہ نگار کو مدد مل سکتی ہے۔

امیر خسرو کبھی کبھی منقبت کے اشعار لکھ کر اپنے مرشد کو سنایا بھی کرتے تھے۔ ایک دن آپ نے مدح کے کچھ اشعار اپنے شیخ کو سنائے تو انھوں نے از راہ لطف و قدر دانی فرمایا۔ "بولو کیا صلہ چاہتے ہو؟" ان کے مرشد حضرت بابا فرید گنج شکر نے بھی اپنی مدح میں شمس دبیر کا قصیدہ سنا تھا اور اس میں ایک جگہ اصلاح بھی دی تھی۔ آخر میں از راہ مرحمت پوچھا تھا کہ تمھاری حاجت کیا ہے؟ شمس دبیر نے اپنی تنگی معاش دور ہونے کے لیے دعا کی درخواست کی۔ بابا صاحب نے دعا دی تھی اور اسی کا یہ ثمرہ تھا کہ شمس دبیر بادشاہ کے بیٹوں کا اتالیق مقرر ہوا اور بلبن کے دربار میں بڑا رسوخ حاصل کیا۔ اسی طرح حضرت نظام الدین نے بھی امیر خسرو سے پوچھا کہ کیا چاہتے ہو؟ انھوں نے برجستہ کہا کہ "شیرینی سخن چاہتا ہوں۔ میرے کلام میں رس پیدا ہو جائے" حضرت نے مسکرا کر فرمایا، "جاؤ اندر میرے پلنگ کے نیچے ایک طشت میں کچھ شکر رکھی ہے وہ اٹھا لاؤ" یہ اٹھا کر لائے تو حضرت نے حکم دیا کہ اسے اپنے اوپر نثار کرو اور کچھ اس میں سے چکھ لو۔ امیر خسرو نے ایسا ہی کیا چنانچہ شیرینی کلام آج تک ہمارے کام و دہن کو لطف دے رہی ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ ان کے انتقال کی تاریخ بھی "طوطیِ شکر مقال"

سے برآمد ہوتی ہے۔

بعد میں امیر خسرو پشیمانی کے طور پر کہا کرتے تھے کہ اس وقت میں نے شیخ سے کوئی اور بڑی نعمت کیوں نہ طلب کی۔ ایک بار حضرت شیخ نے اپنے دہن مبارک کا لعاب بھی امیر خسرو کو ذائقہ کرایا تھا۔ یہ شیخ کی کرامت ہی ہے کہ امیر نے اپنی ۷۵ سالہ زندگی میں اتنا لکھا کہ اس سے اچھا خاصا چھوٹا موٹا کتب خانہ جمع ہو سکتا ہے۔ نظم و نثر دونوں میں طبیعت کے جوہر دکھاتے ہیں۔ غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی، قطعہ ــــ ان کے علاوہ ہندی، فارسی، ترکی، عربی زبانوں میں شعر کہے۔ موسیقی کے بول باندھے، کہہ مکرنیاں، پہیلیاں، دو سخنے، چوبولے کہے۔ خمسۂ نظامی گنجوی حضرت شیخ کو بہت پسند تھا اور وہ اسے پڑھوا کر سنا کرتے تھے۔ امیر خسرو نے خمسہ نظامی کا جواب، حضرت ہی کی فرمائش پر لکھا تھا۔

مولف سیر الاولیاء کا بیان ہے کہ آپ نے قاضی معز الدین پانچہ کے ساتھ صنائع و بدائع اور قواعدِ شعر میں کوئی رسالہ بھی حضرت نظام الدین اولیاء سے سبقاً سبقاً پڑھا تھا اور اس کی تائید لطائف اشرفی (ملفوظات حضرت سید اشرف جہاں گیر سمنانی) سے بھی ہوتی ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ خود امیر خسرو نے دیباچہ غرۃ الکمال میں، اور دوسرے منقبتی اشعار میں اس کا اظہار کیا ہے کہ وہ فن شعر میں بھی حضرت نظام الدین اولیا کے شاگرد ہیں۔

جب وہ کوئی نئی کتاب تصنیف کرتے تو سب سے پہلے اس کا نسخہ حضرت کی خدمت میں لے جاتے۔ آپ اُسے دست مبارک میں لے کر فرماتے کہ "آؤ فاتحہ پڑھیں"، پھر سورۃ الحمد پڑھ کر کتاب کی قبولیت و برکت کی دعا مانگتے۔ کبھی اِدھر اُدھر سے دو چار ورق اُلٹ پلٹ کر اسی وقت کچھ ملاحظہ بھی فرماتے اور یہ شیخ کی دعاؤں کا اثر ہی ہے کہ اس عہد کی ہزاروں لاکھوں کتابیں ضائع ہو گئیں اور انقلابات و حوادث نے بڑے بڑے کتب خانے تباہ کر دیے مگر امیر خسرو کی تصانیف آج تک بڑی تعداد میں محفوظ ہیں۔

شیخ یہ ضرور چاہتے تھے کہ امیر خسرو صرف شعر و شاعری کے مفتون ہو کر نہ رہ جائیں اس سے بھی بہتر اور اعلیٰ مقصد پر ان کی نظر رہے۔ چنانچہ فکر و نظم و نثر کے انہماک، دربار شاہی میں حاضری کے التزام اور لاؤ لشکر کے ساتھ دور دراز کے علاقوں تک سیر و سیاحت کے باوجود امیر خسرو کبھی اپنی روحانی ترقی سے غافل نہ رہتے تھے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے صحیح لکھا ہے کہ ہر چند وہ ملوک و امراء سے تعلق رکھتے تھے مگر ان کا دل دوسری طرف ہی متوجہ تھا اور اس کا ثبوت ان کی تصانیف کی برکات سے ملتا ہے۔ کیونکہ اہل معصیت کے آثار میں برکت کم ہوتی ہے اور انھیں قبول خاطر نصیب نہیں ہوتا۔

امیر کے بے تکلف دوست ضیاء الدین برنی نے بھی گواہی دی ہے کہ "اس تمام فضل و کمال اور فصاحت و بلاغت کے باوجود وہ مستقیم الحال صوفی بھی تھے۔ ان کی عمر کا بیشتر حصہ صوم و صلوٰۃ اور قرآن خوانی میں گذرا، وہ متعدی اور لازمی عبادات میں یکتا تھے اور ہمیشہ روزہ رکھتے تھے۔ وہ شیخ کے خاص مریدوں میں تھے اور میں نے اتنا عقیدت مند کوئی اور مرید نہیں دیکھا۔ عشق و محبت الٰہی سے ان کو پورا حصہ ملا تھا۔ صاحب سماع اور صاحب وجد و حال تھے گانے اور راگ وغیرہ ایجاد کرنے کے فن میں کمال رکھتے تھے موزوں اور لطیف طبیعت سے جس فن کو بھی نسبت ہے اس میں ان کو اللہ تعالیٰ نے سرآمد روزگار پیدا کیا تھا۔ ان کا وجود عدیم المثال تھا اور آخر زمانے میں ان کی شخصیت نوادر روزگار میں سے تھی۔"

امیر خورد کا بیان ہے کہ امیر خسرو ہر شب نماز تہجد پڑھنے کے بعد قرآن شریف کے سات پارے پڑھا کرتے تھے۔ ایک دن حضرت شیخ نے دریافت فرمایا: "کہو ترک، مشغولی کا کیا حال ہے؟" انھوں نے عرض کیا: "حضرت کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آخرِ شب میں رونا بہت آتا ہے۔" حضرت نے فرمایا: "الحمدللہ۔ اب کچھ آثار ظاہر ہو رہے ہیں!"

امیر خسرو دہلی سے باہر بھی لشکر کے ساتھ جاتے تھے۔ پہلے وہ شہزادہ محمد خاں خلف سلطان غیاث الدین بلبن کے ساتھ ملتان گئے تھے اور وہاں پانچ سال تک رہے۔ اس وقت امیر حسن علاء سجزی دہلوی (جامع فوائد الفواد) بھی سلطان محمد خاں سے وابستہ تھے۔ یہاں ۹ ذی الحجہ ۶۸۳ھ کو منگولوں کے لشکر سے مقابلہ ہوا اور ناگاہ شہزادہ محمد خاں شہید ہو گیا۔ یہ بڑا باکمال، علم دوست، معارف پرور، شایستہ اور مکارم اخلاق سے آراستہ انسان تھا۔ امیر حسن دہلوی، امیر خسرو، ضیاء الدین برنی اور دوسرے مورخین نے اس کی مرگِ ناگہاں پر گہرے جذبات رنج و غم کا اظہار کیا ہے اور نظم و نثر میں مرثیے لکھے ہیں۔ امیر خسرو کو منگول سپاہیوں نے گرفتار کر لیا اور اپنے علاقے کی طرف لے کر چلے۔ یہ شدید گرمی کا موسم تھا۔ لُو کے جھکڑ چل رہے تھے۔ ملتان کے صحرا میں کیسا موسم ہوگا اس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ نمونہ دوزخ بنا ہوا ہوگا۔ امیر خسرو اور ان سپاہیوں کو شدید پیاس لگ رہی تھی۔ بہت دیر کے بعد کہیں پانی نظر آیا یہاں امیر خسرو نے اپنی خداداد ذہانت سے کام لیا اور سمجھ لیا کہ اب یہ سپاہی جھک کر پانی پییں گے اور اس سے اپھر جائیں اس لیے انھوں نے صرف ۲۔۴ گھونٹ پی کر اپنا حلق تر کر لیا اور منگول سپاہیوں نے ڈگڈگا کر پیا۔ وہ وہیں بے ہوش ہو کر گر پڑے امیر خسرو خود کو ان کی قید سے چھڑا کر فرار ہو گئے۔ مجمل فصیحی میں اس گرفتاری کا ذکر ہے مگر یہ لکھا ہے کہ انھیں منگول گرفتار کر کے لے گئے تھے پھر ان کا کچھ پتا نہیں چلا کہ کیا انجام ہوا۔ ۶۸۴ھ میں امیر خسرو دہلی واپس آ چکے تھے۔

جب امیر خسرو دہلی سے باہر جاتے تھے تو حضرت نظام الدین اولیا انھیں محبت آمیز اور اشتیاق انگیز خطوط لکھتے تھے جن میں انھیں "ترک اللہ" کے نام سے ہی یاد فرماتے تھے۔ امیر خسرو نے ان خطوط کو بہت احتیاط سے رکھا تھا اور ان کی خواہش تھی کہ انھیں میرے ساتھ دفن کیا جائے، ہو سکتا ہے کہ قیامت کے دن خدا ان متبرک کاغذ کے پُرزوں کے صدقے میں، ہی مجھے بخش دے۔ اس لیے قیاس ہوتا ہے کہ یہ خطوط حضرت امیر خسرو کے ساتھ، ہی مدفون ہوئے ہوں گے۔ مگر ان میں سے بعض خطوط کے مطالب سیر الاولیاء میں بھی جا بجا آ گئے ہیں۔ ایک خط جو حضرت نے امیر خسرو کے نام بھیجا تھا اس میں یہ الفاظ تھے:

> بعد از محافظتِ جوارح، از امور نامرضیہ شرع اجتناب نماید و در مراعات اوقات ہم کوشد و عمر عزیز کہ سببِ تحصیلِ کلی مرادات است غنیمت شمرد، و روزگار را ببطالت مصروف نگرداند و اگر در ضمیر انشراح یابد بر پئے انشراح رود کہ آں در طریقتِ اصلی معتبر است۔ در کل کارہا استخارہ را تقدیم نماید۔

اعضائے بدن کی حفاظت کے بعد شریعت کے ناپسندیدہ کاموں سے پرہیز کرو، اوقات کی پابندی کا خیال رکھو اور عمر عزیز کو جو تمام مرادوں

کے حصول کا وسیلہ ہے غنیمت جانو اور اپنا وقت فضول نہ گنواؤ ۔
اگر ضمیر میں انشراح پاؤ تو اس کی پیروی کرو کہ اصلی طریقت میں یہی معتبر ہے ۔ اور تمام کاموں میں استخارہ کو مقدم رکھو۔

حضرت محبوب الٰہی کی خانقاہ میں امیر خسرو کی حاضری اکثر ان اوقات کو ہوتی تھی اور نماز عشا کے بعد جب حضرت استراحت فرماتے اور بستر میں لیٹ جاتے تو امیر خسرو پلنگ کی پٹی پکڑ کر بیٹھ جاتے ۔ اس وقت صرف مخصوص ترین حضرات، خاص خدّام اور حضرت کے قرابت دار ہی حجرے میں جا سکتے تھے ۔ یہ بے تکلف گفتگو کا وقت ہوتا تھا ۔ لطیفے، چٹکلے، حکایتیں، دربار کے قصے، نئی تازی خبریں اور ان پر تبصرے اس مجلس کے موضوعات ہوتے ۔ امیر خسرو کی ساری عمر درباروں میں گذری تھی ۔ علم مجلسی، آدابِ محفل اور فنِ گفتگو کے بادشاہ تھے ۔ معمولی سی بات بھی کرتے تو اسے غیر معمولی بنا دیتے تھے ۔ وہ جو حالی نے غالب کے لیے کہا ہے:

لاکھ مضمون اور اس کا ایک ٹھٹھول
سو تکلف اور اس کی سیدھی بات
دل میں کُھبتی تھی وہ اگر یہ مثل
دن کو دن کہتا اور رات کو رات

یہی حال حضرت امیر خسرو کی شیریں گفتار کا تھا ۔ حضرت بھی پورے انبساط خاطر کے ساتھ ان کی باتوں میں دلچسپی لیتے اور بار بار اکساتے " ہاں ترک، پھر کیا ہوا؟"

امیر خسرو نے متعدد بادشاہوں کے دربار سے تعلق رکھا اور ان میں سے بیشتر اپنے پیشرو بادشاہوں کو قتل کر کے تخت نشین ہوئے تھے ۔ مگر امیر کا دامن ہر طرح کی تہمت اور آلائش اور سازش سے پاک رہا ۔ یہی سبب ہے کہ ان کی سب سے نبھ گئی ۔ اسی طرح خانقاہ میں بھی حضرت کے کسی خادم یا مرید کو حضرت امیر خسرو سے کبھی شکایت پیدا نہیں ہوئی بلکہ امیر اپنے پیر بھائیوں کی سفارش کرتے اور ان کے کام آتے تھے ۔

ایک دن عشا کے وقت خانقاہ میں آئے تو دیکھا کہ جماعت خانے میں علی بن محمود جاندار بیٹھے ہیں ۔ ان سے علیک سلیک کے بعد ازراہ خوش طبعی کہنے لگے "تم تو شطرنج کے بڑے رسیا تھے رات دن بساط بچھائے بیٹھے رہتے تھے، اب کیا حال ہے ؟" علی بن محمود نے کہا "سچ ہے بھائی ۔ شطرنج سے میرے عشق کا یہ حال تھا کہ اگر میں سفر حج میں بھی ہوتا تو شاید اسے ترک نہ کرتا ۔ مگر جب سے مرید ہوا ہوں اب اس کا دھیان بھی نہیں آتا ۔"[۵۲]

امیر نے خدمت شیخ میں پہنچ کر یہ مکالمہ سنایا ۔ حضرت کے پاس ایک انار رکھا تھا وہ امیر خسرو کو مرحمت کیا اور فرمایا جاؤ نیچے جا کر علی بن محمود کے ساتھ بیٹھ کر اسے کھا لو ۔

حضرت کے خلفاء اور مریدین میں سے اگر کسی کو کچھ معروضہ پیش کرنا ہوتا تھا اور خود گزارش کرنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی تو امیر خسرو کا توسط اختیار کیا جاتا تھا ۔ اس سلسلے میں دو واقعات معلوم و مشہور ہیں ۔ حضرت برہان الدین غریب ہانسوی (متوفی ۷۴۱ھ) خانقاہ میں مطبخ کے انچارج تھے چونکہ دبلے پتلے تھے جسم پر گوشت کم تھا عمر بھی ستر سال سے تجاوز کر چکی تھی زمین میں بوریے پر بیٹھتے تھے تو ہڈیوں کو زمین کی سختی ناگوار ہوتی تھی اس لیے اپنا کمبل چوہرا کر کے گدی سی بنا لیتے تھے اور اس پر بیٹھے رہتے تھے ۔ ایک دن علی زنبیلی اور ملک نصرت نے، جو علاء الدین خلجی کے درباریوں میں سے تھے اور حضرت نظام الدین کے مرید ہو گئے تھے، حضرت برہان الدین غریب کی چغلی کھائی کہ وہ مشائخ کی طرح گدی پر بیٹھتے ہیں ۔ حضرت کو یہ جان کر بہت دکھ ہوا اور اسی وقت خواجہ اقبال سے فرمایا "جاؤ برہان الدین غریب سے کہہ دو کہ وہ ابھی اپنے گھر واپس چلے جائیں ۔" یہ فرمان سن کر حضرت غریب کا رنگ فق ہو گیا ۔ تعمیل حکم میں وہاں سے نکلے اور مولانا ابراہیم طشت دار کے گھر پر آ گئے ۔ یہاں دو دن تک رہے مگر شیخ کے معتوب کو کون پناہ دے سکتا تھا؟ انھوں نے بھی حضرت غریب سے معذرت کر لی کہ اگر شیخ کو یہ معلوم ہوا کہ میں نے تمھیں پناہ دے رکھی ہے تو وہ کیا سوچیں گے ۔ مناسب ہے کہ آپ شہر کو واپس چلے جائیں ۔ اب یہ نہایت غمزدہ و رنجیدہ اپنے گھر آ کر بیٹھ گئے ۔ آٹھ آٹھ آنسو روتے تھے ۔ دوست احباب جو تسلی و تعزیت کے لیے آتے تھے وہ ان کا بلکنا دیکھ کر رونے لگتے تھے ۔ امیر خسرو، حضرت غریب اور چراغ دہلی میں بڑے مخلصانہ اور دوستانہ تعلقات تھے ۔ امیر خسرو مولانا غریب کے پاس گئے اور پھر خدمت شیخ میں جا کر ان کی طرف سے معذرت پیش کی مگر شیخ کی بے رضائی کا وہی عالم رہا ۔ آخر دوستوں نے مل کر یہ طے کیا کہ امیر خسرو دستار گردن میں ڈال کر عذر تقصیر کے لیے خدمت شیخ میں جائیں ۔ یہ مجرموں کی عذر خواہی کی علامت تھی ۔ امیر خسرو کو اس طرح عذر خواہ دیکھ کر شیخ نے پوچھا "ترک یہ کیا ہے ؟" تب انھوں نے مولانا غریب کے جرائم معاف کیے جانے کی درخواست پیش کی ۔ آپ نے تبسم فرمایا اور پوچھا کہ وہ کہاں ہیں ؟ انھیں فوراً گھر سے بلوایا گیا ۔ وہ آئے تو امیر خسرو اور مولانا غریب دونوں پھر گردن میں دستار ڈال کر صف نعال میں کھڑے ہو گئے ۔ شیخ نے مولانا غریب کو معاف کر دیا اور انھیں تجدید بیعت سے مشرف کیا ۔[۵۳] یہ سختی اس تربیت کے لیے تھی کہ خود ساختہ سجادہ نشیں بننے کی نقل اور شائبے سے بھی اچھی طرح ڈرا دیا جائے ۔ آج ہمیں اس آئینے میں اپنا حال دیکھنا چاہیے کہ ہم کیسی بے غیرتی اور دیدہ دلیری کے ساتھ خود کو سجادہ نشین بنا کر بیٹھ جاتے ہیں !

دوسرا واقعہ حضرت نصیر الدین محمود چراغ دہلی کا ہے ۔ انھوں نے حضرت امیر خسرو سے کہا کہ خدمت شیخ میں تمہارا اثر و رسوخ بہت ہے کوئی مناسب وقت دیکھ میرا ایک معروضہ پیش کر دو کہ میں اودھ (موجودہ فیض آباد) میں رہتا ہوں اور خلق خدا کی آمد و رفت کی وجہ سے مجھے مشغولی باطن کا پورا موقع نصیب نہیں ہوتا ۔ اگر شیخ کی اجازت ہو تو میں کسی پہاڑ یا جنگل کی طرف نکل جاؤں اور پھر فراغ باطن کے ساتھ اللہ اللہ کروں ۔ امیر خسرو نے ایک دن نماز عشا کے بعد خدمت شیخ میں یہ درخواست پیش کر دی ۔ شیخ نے فرمایا:

اورا بگو ترا در میان خلق می باید بود و جفا و قفائے خلق می باید کشید و مکافات اں بہ بذل و ایثار و عطامی باید کرد ۔"[۵۴]

ان سے کہہ دو کہ تمھیں عوام کے درمیان رہنا چاہیے اور ان کی جفائیں اور کڑوی کسیلی جھیلنی چاہیے اور اس کے بدلے میں بذل و ایثار اور بخشش کرنا چاہیے ۔

پھر فرمایا کہ یہ نفس دھوکا دے رہا ہے ۔ فراغ خاطر سے کسی کھوہ میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے کے بہانے سے آرام اور سکون کی طرف لے جانا چاہتا ہے ۔ صحرا نشین ہونے کے بعد

شہرت بھی ہو جاتی ہے پھر خلق کا وہاں جگمٹ ہوتا ہے حضرت نظام الدین اولیا کا مشن تو عوام کی اخلاقی زندگی کی اصلاح کرنا تھا۔ انفرادی نجات مطلوب نہیں تھی اس لیے حضرت چراغ دہلی کو اس خطرے پر اتنی تنبیہ کی گئی۔

امیر خسرو کے بارے میں حضرت شیخ نے وقتاً فوقتاً جو کلمات فرمائے یا لطف و رحمت خاص کے جو واقعات پیش آئے وہ سب امیر نے قلمبند کر لیے تھے۔ یہ اچھا خاصا رسالہ بن گیا ہوگا۔ اس میں سے کچھ اقتباسات سیر الاولیا میں آگئے ہیں لیکن وہ رسالہ اب نہیں ملتا بہت ممکن ہے وہ بھی تبرکات کے ساتھ امیر خسرو کی قبر میں دفن کر دیا گیا ہو۔

ایک بار کسی نے حضرت نظام الدین سے عرض کیا کہ امیر خسرو کے حال پر آپ کی جو عنایات ہیں ان میں سے ایک شمہ نظر عنایت میرے حال پر بھی ہو جائے۔ حضرت کا کمال اخلاق یہ تھا کہ اس کی دل شکنی کے خیال سے کوئی جواب نہیں دیا البتہ اس شخص کے محفل سے چلے جانے پر حاضرین سے فرمایا "اس وقت میرے دل میں آئی کہ اس شخص سے کہوں کہ پہلے وہ قابلیت بھی تو پیدا کر لو۔"[28]

آپ اکثر امیر خسرو سے فرماتے تھے کہ میری زندگی کی دعا مانگا کرو کیونکہ تمھاری زندگی میری بقا پر موقوف ہے اور یہ بھی فرماتے تھے کہ تمھیں میرے پہلو میں دفن کیا جانا چاہیے اور انشاءاللہ ایسا ہی ہوگا۔ میں نے خدا سے عہد کیا ہے کہ جب مجھے جنت کی طرف لے جائیں گے تو تمھیں بھی اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔

ایک بار شیخ نے خواب دیکھا کہ منڈہ پل کے نیچے اور شیخ نجیب الدین متوکل کے دروازے کے سامنے ایک نہر جاری ہے بہت صاف اور شفاف۔ میں ایک اونچی سی دکان پر بیٹھا ہوں، بہت اچھا پُرکیف سماں ہے اور اس وقت دل میں ایک امید بڑی پیدا ہوئی اچانک تم مجھے یاد آئے۔ میں نے تمھارے لیے خدا سے ایک ایسی نعمت طلب کی جو ہمیں مطلوب ہے۔ پھر مجھے یہ بھی محسوس ہوا کہ وہ دعا مستجاب ہو گئی۔ انشاءاللہ تمھارے اندر وہ حال پیدا ہوگا۔"[29]

ایک دن حضرت نے فرمایا کہ آج رات کو مجھے یہ القا ہوا کہ خسرو درویشوں کا نام نہیں ہوا کرتا۔ آج سے خسرو کو "محمد کاسہ لیس" کہا جائے۔ امیر خسرو لکھتے ہیں کہ یہ خطاب غیب سے عطا ہوا ہے اور مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نام کی خبر دی ہے۔ اس خطاب کی بدولت بندہ بہت سی نعمتوں کا امیدوار ہے۔[30]

ایک دن حضرت شیخ، امیر خسرو سے فرمانے لگے: "میں نے کل جمعہ کی شب میں ایک خواب دیکھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ شیخ صدرالدین عارف فرزند شیخ بہاءالدین زکریا ملتانی تشریف لائے ہیں۔ میں ان سے بہت ادب و احترام سے پیش آیا ہوں۔ خود انھوں نے بھی اتنی تواضع اور احترام کا اظہار کیا جس کا بیان نہیں ہو سکتا۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ دور سے تم چلے آتے ہو ہمارے پاس آکر تم نے معرفت کا بیان شروع کر دیا ہے۔ اسی اثنا میں صالح موذن نے فجر کی اذان دی اور میری آنکھ کھل گئی۔" یہ خواب سنا کر آپ نے امیر خسرو سے کہا "بتاؤ یہ کیا مرتبہ ہے؟" امیر خسرو نے عاجزی اور نیازمندی سے عرض کیا "میں آستان مبارک کا ایک خاکروب ہوں، میں اس مرتبے کا کیا اندازہ کر سکتا ہوں۔ سب کچھ آپ ہی کا عطا کیا ہوا ہے۔" یہ جواب سن کر حضرت شیخ باآواز بلند رونے لگے اور ان کے ساتھ ہی امیر خسرو کی بھی چیخیں نکل گئیں۔ جب گریہ تھما تو حضرت نے خاص اپنی کلاہ عطا فرمائی اور اپنا لباس امیر خسرو کو اپنے ہاتھ سے پہنایا۔ پھر وصیت فرمائی کہ "مشائخ کے ملفوظات کا اکثر مطالعہ کیا کرو۔"[31]

حضرت شیخ نے نظم میں بھی امیر خسرو کی مدح لکھی ہے۔ آپ کی ایک رباعی سیر الاولیا میں نقل کی ہے۔

خسرو کہ بنظم و نثر مثلش کم خاست   ملکیتِ ملک سخن آن خسرو راست
آن خسروِ ماست، ناصرِ خسرو نیست   زیرا کہ خدائے ناصرِ خسروِ ماست

سماع کی محفلوں میں بھی امیر خسرو کے دم سے بڑی شورش اور گرمی رہتی تھی اگر شیخ کو کیفیت ہو جاتی تو کبھی خسرو خود بھی گانا شروع کر دیتے تھے۔ ایک دن غیاث پور میں سید محمد کرمانی کے مکان پر امیر خسرو نے کچھ دوستوں کی دعوت کی۔ حضرت شیخ کے علاوہ شہر کے دوسرے مشائخ بھی مدعو تھے۔ بہلول قوال نے امیر حسن دہلوی کی یہ غزل شروع کی۔

زہے تُرکے کہ از غمہائے ابرو   کماں پیدا کند پنہاں ز تدبیر
بگوشش مدعی کے جائے گیرد   مزامیرے کہ ہست اندر مزامیر

سماع ختم ہوا تو امیر خسرو نے اپنی غزل شروع کر دی مگر مطلع ہی پڑھ کر رہ گئے آگے نہیں بڑھا گیا۔ اپنی غزل چھوڑ کر سعدی کا کلام سنانے لگے۔

معلمت ہمہ شوخی و دلبری آموخت
جفا و ناز و عتاب و ستمگری آموخت

اس وقت ساری محفل پر خاص کیفیت طاری تھی۔ بعد میں کسی نے امیر خسرو سے پوچھا کہ آپ سے آج اپنی غزل کیوں نہ پڑھی گئی؟ کہنے لگے۔ کیا کروں، جب پڑھنے لگتا تھا تو معانی کا ایسا ہجوم ہوتا تھا جسے میں روک نہیں سکتا تھا۔[32]

سنہ ۷۲۴ھ میں امیر خسرو تیسری بار اودھ اور بنگال کے سفر پر روانہ ہوئے۔ غیاث الدین تغلق نے وہاں کی بغاوتوں کو فرو کرنے کے لیے بھاری لاؤ لشکر کے ساتھ چڑھائی کی تھی اور دہلی میں اُلغ خاں کو چھوڑ گیا تھا۔ آخر لکھنوتی کے گورنر ناصر الدین نے ترہٹ میں حاضر ہو کر اظہار اطاعت کیا۔ وہاں کے انتظامات ٹھیک کر کے غیاث الدین تغلق لشکر سے جدا ہو کر بھاگم بھاگ دہلی کی طرف آیا مگر شہر میں داخل ہونے سے پہلے ہی افغان پور کے چوبیں محل میں دب کر مر گیا۔ یہ ربیع الاول ۷۲۵ھ کا واقعہ ہے۔

امیر خسرو نے سفر پر جاتے وقت شیخ کو بیماری اور شدید ضعف کے عالم میں دیکھا تھا وہ ان کی خیر و عافیت کی اطلاع برابر منگاتے رہے ہوں گے۔ اچانک انھیں شیخ کے وصال کی خبر ملی تو نہایت سراسیمہ ہوئے اور دھاوے پر دھاوے مارتے ہوئے دہلی پہنچے۔ سیاہ لباس پہنے ہوئے تھے، گریبان چاک تھا، بال گرد آلود اور پریشان۔ درگاہ شریف میں آکر قبر سے لپٹ کر خوب روئے بہت دیر کے بعد کچھ سنبھلے اور کہنے لگے "بھلا میں اس بادشاہ وقت کا کیا ماتم کر سکتا ہوں، میں تو اپنے آپ کو رو رہا ہوں کہ اب سلطان المشائخ کے بعد میں بھی زیادہ دنوں زندہ نہیں رہوں گا۔ اسی زمانے میں انھوں نے ایک طویل اور پُردرد مرثیہ ترکیب بند کی صورت میں لکھا جو دیوان نہایۃ الکمال کے بعض قلمی نسخوں میں شامل ہے۔" شاعری اور ساحری سب بھول گئے وہ زندہ دلی سرد پڑ گئی بزم آرائیاں نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں اور ساری محفل میں جان ڈال دینے والے خسرو اب یاس و حرماں کا پیکر نظر آتے تھے۔ شیخ کی قبر کے

بجا در بن کر بیٹھ گئے اور دنیا بھر سے دل سرد ہو گیا تھا۔ آخر چھ ماہ بعد ۱۸ شوال ۷۲۵ھ مطابق ۲۷ ستمبر ۱۳۲۵ء بدھ کے دن انھوں نے بھی انتقال فرمایا اور شیخ کے پائین چبوترے پر دفن کیے گئے۔ جمالی دہلوی نے ان کا انتقال شیخ سے تین ماہ بعد بتایا ہے[۳۳] اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ رجب ۷۲۵ھ میں فوت ہوئے۔ فرشتہ نے اپنا ماخذ ظاہر کیے بغیر تاریخ وفات جمعہ ۲۹ ذی قعدہ ۷۲۵ھ لکھی ہے اس حساب سے وہ اپنے شیخ کے بعد تقریباً سات ماہ بقید حیات رہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فرشتہ کو کچھ مغالطہ ہوا ہے۔ سیر الاولیا کی روایت چھ ماہ بعد کی ہے[۳۵] اور یہی سب سے زیادہ لائق اعتماد ہے۔

---

۱ سیر الاولیاء (امیر خورد کرمانی) مطبع محب ہند دہلی۔ ص ۳۱۲ -

۲ سیر الاولیاء ص ۳۱۳ - ۳ لطائف اشرفی۔ جلد ۱/۳۶۰ و جلد ۲/۳۷۰ -

۴ ڈاکٹر وحید مرزا : لائف اینڈ ورکس آف امیر خسرو۔ ص ۱۶ -

۵ سیر الاولیاء۔ ص ۳۱۱ - ۶ سیر الاولیاء۔ ص ۱۲۶ -

۷ تفصیل کے لیے دیکھیے "امیر خسرو : احوال و آثار" (مرتبہ ڈاکٹر نور الحسن انصاری) میں میرا مضمون بہ عنوان افضل الفوائد ۳۴۵ - ۳۶۹۔ ۸ فوائد الفواد (مرتبہ لطیف ملک) طبع لاہور ص ۹ -

۹ جمالی دہلوی : سیر العارفین (اردو ترجمہ : محمد ایوب قادری) ص ۸۷۔ (اس میں نام اعز الدین علی شاہ لکھا ہے لیکن عز الدین صحیح ہے)۔ ۱۰ وحید مرزا : لائف اینڈ ورکس۔ ص ۱۷ -

۱۱ ان کے بیٹے محمد کا انتقال امیر خسرو کی زندگی ہی میں ہو گیا تھا۔ محمد کا مرثیہ دیوان غرۃ الکمال میں موجود ہے۔ اسی طرح ایک بیٹے حاجی نام کے تھے ان کا مرثیہ دیوان نہایۃ الکمال میں ملتا ہے -

۱۲ جوامع الکلم (ملفوظات حضرت گیسو دراز) انتظامی پریس حیدر آباد -

۱۳ برنی ، تاریخ فیروز شاہی (اردو ترجمہ : ڈاکٹر معین الحق) طبع لاہور -

۱۴ فوائد الفواد (مرتبہ لطیف ملک) طبع لاہور۔ ص ۲۴۲ - ۱۵ سیر الاولیاء۔ ص ۳۱۱ -

۱۶ دیباچہ دیوان غرۃ الکمال۔ ص ۴ - ۵ - ۱۷ سیر الاولیا (فارسی) ص ۳۱۱ - ۳۱۲ -

۱۸ مثنوی نہ سپہر میں ہے : می از دے لعاب دہاں یافتم ٭ کہ زین گونہ آب دہاں یافتم

۱۹ سیر الاولیاء ص ۳۱۱ - ۲۰ اخبار الاخیار۔ ص ۹۹ (مطبع مجتبائی دہلی) -

۲۱ برنی ؛ تاریخ فیروز شاہی۔ ص ۵۲۲ (اردو ترجمہ)۔ ۲۲ سیر الاولیا ص ۳۱۲ -

۲۳ مجمل فصیحی (طبع تہران) - ۲۴ اخبار الاخیار۔ ص ۹۹ - ۲۵ دُرر نظامی (اردو ترجمہ) ص ۱۳۳ -

۲۶ سیر الاولیا (فارسی) ص ۲۸۹ - ۲۹۰ - ۲۷ سیر الاولیاء ص ۲۴۷ -

۲۸ سیر الاولیاء۔ ص ۳۱۲ - ۲۹ سیر الاولیاء ص ۳۱۳ - ۳۰ سیر الاولیا ص ۳۱۳ -

۳۱ سیر الاولیاء ص ۳۱۴ - ۳۲ سیر الاولیاء ص ۳۱۴ -

۳۳ نہایۃ الکمال کا ایک قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے کتب خانے میں محفوظ ہے اس میں یہ طویل مرثیہ شامل ہے اور اسے ڈاکٹر آفتاب اصغر نے اپنے مقالہ "امیر خسرو کی مرثیہ نگاری اور مرثیہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء" میں مکمل درج کر دیا ہے۔ دیکھو : مجلہ تحقیق (جلد ۱ شمارہ ۳، ۴)۔ (کلیہ علوم اسلامیہ و ادبیات شرقیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور) ۱۹۷۹ء -

۳۴ سیر العارفین (اردو ترجمہ) ص ۱۲۴ (اس میں ہے کہ امیر خسرو سلطان کی اجازت کے بغیر بنگالے سے روانہ ہو گئے تھے لیکن میرا خیال ہے کہ سلطان غیاث الدین تغلق امیر خسرو سے پہلے ہی روانہ ہو چکا تھا اور حضرت نظام الدین اولیا کے انتقال سے پہلے وہ افغان پور کے محل میں دب کر مر گیا تھا۔

۳۵ سیر الاولیاء ص ۳۱۵ -

شاداں گوالیاری

شری کرشن

اے بِنائے بزمِ عالم، اے جمالِ دل نواز
حاصلِ حسنِ حقیقت، کا لِ عشقِ مجاز
دھن تری بنسی کی ہے ایسی نوائے سوز و ساز
جس کے کانوں میں پڑے ہو جائے خود سے بے نیاز

تیرے دستِ ناز میں عالم سمٹ آئے ابھی
تو اگر چاہے نظامِ شمس رک جائے ابھی

رہبرِ علم و ادب ہیں تیرے قدموں کے نشاں
ایک مینارِ حقیقت، اک مکمل داستاں
تو اگر چاہے۔ اتر آئے زمیں پر کہکشاں
تیرا پیکر ہے جمال کار سازِ دو جہاں

آدمی کیسا بھی ہو، یہ بات پا سکتا نہیں
ایک ہی انگلی پہ گوور دھن، اٹھا سکتا نہیں

عالمِ فانی میں جس ساعت ہوا تیرا ظہور
خود بخود شہنائیاں سی بج رہی تھیں دور دور
ہر طرف اک زندگی تھی، ہر طرف پیغامِ نور
ہو گیا زنجیر کی کڑیوں کا نشہ چور چور

اپنی ہستی تیرے قدموں میں سمونے کے لیے
چل اُٹھیں جمنا کی لہریں پاؤں دھونے کے لیے

کرم کیا ہے، کرم کا انجام کس کے ہاتھ ہے
زندگی کا نامہ و پیغام کس کے ہاتھ ہے
کیا سکوں ہے، گردشِ ایام کس کے ہاتھ ہے
صبح کس کی داستاں ہے، شام کس کے ہاتھ ہے

فرض کو آئینۂ شیخ و برہمن کر دیا
آپ کی 'گیتا' نے ہر پہلو کو روشن کر دیا

آج کتنے کنس، پیدا ہو رہے ہیں در بدر
دروپدی کے چیر پر ہے 'دوشاسن' کی نظر
اب نہ ارجن ہے نہ ارجن کی کمانوں کا اثر
ہٹ نہ جائیں اپنے محور سے کہیں شام و سحر

پھر اندھیرے بڑھ رہے ہیں، روشنی فرمائیے
"رادھکا رانی" کے صدقے۔ سامنے آجائیے

جوگندر پال

قُم بِاذنِ اللّٰہ

میں نے اسے دور سے قبرستان کے گیٹ سے تیز تیز اندر آتے ہوئے دیکھا ہے اور مسکرانے لگا ہوں ——— کیسے لوگ ہیں؟ قبرستان میں تو اتنے آرام اور اطمینان سے آنا چاہیے کہ آتے آتے عمر بیت جائے۔

میں؟ ——— ہاں، میں ہی اِس قبرستان کا رکھوالا ہوں۔ سننے والے اکثر ہنس دیتے ہیں۔ جن کا باقی کچھ رہا ہی نہ ہو اُن کی رکھوالی کیا؟ مگر رکھوالی تو میں کرتا ہی ہوں۔ ان کا کچھ نہ کچھ ہوگا ہی، جو کرتا ہوں ——— سچ پوچھیں تو میری اپنی بڑی خواہش ہے کہ یہاں سے بھلی ہو گر کیسے ہو؟ مُردے ذرا ہمت سے کام لے کے قبرستان سے باہر نکل جائیں تو ہو۔ ایک ایک کے کان میں کئی بار پھونک چکا ہوں، اٹھو بابا، باہر نکل کے دیکھو، سنو، چھوؤ، سونگھو اور کرو ——— جو بھی من میں آئے، کرو ——— مگر کسی کی سن لیں تو مُردے کیوں کہلوائیں؟ کچھ اس طرح ماضی میں ڈوبے ہوتے ہیں کہ کیا مجال، آنکھ کھول لیں؟ ان کی ایک ذرا سی جھلک پانا ہو تو چپکے سے ان کے خوابوں میں اتر جاؤ، نہیں، چپکے سے کیوں، کھٹ کھٹ بھی اترتے چلے جاؤ تو کوئی حرج نہیں۔ وہ تو جیسے اور جہاں بھی ڈوبے ڈوبے پڑے ہوں گے، ویسے ہی پڑے رہیں گے۔ بیتے دنوں میں کچھ ایسے کھوئے ہوتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے اپنے خوابوں میں کہیں موجود نہیں، ہمارے ہی خیالوں کی آڑی ترچھی لکیروں میں سے ابھر آئے ہیں۔

وہ آدمی کدھر چلا گیا ہے؟ ——— ابھی ابھی تو وارد ہوا تھا، کہاں گم ہو گیا؟ ——— بڑی مصیبت ہے۔ جسے بھی دیکھنے کا جتن کرو وہ نظر سے باہر ہی کہیں ٹکا ہوتا ہے۔ نظر میں ٹکے بھی کیسے؟ قدم آگے اٹھ رہے ہوتے ہیں مگر جا پیچھے رہا ہوتا ہے۔ کیا پتہ، جان کہاں کن یادوں میں اٹکی ہوتی ہے؟ ———

خدا کا شکر ہے کہ میری یادداشت کھو چکی ہے، نہیں تو میں بھی اِس وقت اپنی قبر بن کے دکھ رہا ہوتا ——— نہیں، نہیں! مُردے مرے ہوئے نہیں ہوتے بلکہ ان کا آگے کا جینا رکا ہوتا ہے۔ کیا بوڑھے، کیا جوان، کیا بچے، سبھی کا یہی حال ہے۔ مر جائیں تو قصہ ختم ہو مگر وہ زندہ ہوتے ہیں ——— میری بات کو ہنسی میں مت ٹالئے، وہ واقعی زندہ ہوتے ہیں بس صرف بڑھے نہیں ہو رہے ہوتے ——— وہ چھوٹی سی قبر ہے نا ——— وہ دائیں طرف پیچھے سے چوتھی ——— یہاں دو پونے دو سال کا ایک بچہ سپردِ خاک کیا گیا تھا۔ اپنی ماں کی گود میں پڑے پڑے اس کا دم نکل گیا تھا۔ اس کا دم نکلے کئی برس ہو لیے ہیں مگر وہ ابھی تک جوں کا توں ماں کی گود میں انگوٹھا چوستا رہتا ہے ——— بڑا ہو گیا ہوتا تو آج پورا جوان ہوتا اور میں اس کی شادی اس خوب صورت لڑکی سے کر دیتا ——— وہ سامنے کی پکی پکی قبر اسی لڑکی کی ہے۔ چند ہی روز پہلے اسے یہاں لایا گیا تھا ——— دونوں کی جوڑی کتنی پیاری ہوتی! ——— اس میں حرج ہی کیا ہے؟ دونوں کا گھر بس جاتا اور ان کے تندرست گول مٹول بچوں کی دن رات کی کھیل کود سے موت کے نگر میں بھی آئندہ زندگی کی بھیڑ کی چاپ سنائی دینے لگتی۔ ہاں، ہاں، ریڑھ کی ہڈی پیچھے ہی ہوتی ہے مگر آنکھیں تو آگے ہوتی ہیں۔ مڑ کے بھی دیکھو تو آگے ہی دیکھنا ہوتا ہے۔

ہاں، بھیڑ تو یہاں اب بھی بہت ہے، لیکن مُردوں کو ایک ساتھ رہنا نصیب نہیں۔ سبھی اپنی الگ الگ منزلوں میں اوپر نیچے رہتے ہیں ——— کیسے؟ ——— دیکھیے، کتنی تنگ قبروں میں رہ رہے ہیں۔ ان تعمیروں کو اوپر سے نہ دیکھیے۔ ان میں سے ہر اونچائی نیچے ہی نیچے سیکڑوں منزلوں میں پاتال تک چلی جاتی ہے ——— ہاں، جیسے باہری تعمیروں کی اونچائی آسمان تک ——— ہاں، ہر زمین دوز منزل میں ایک مُردہ الگ تھلگ رہتا ہے۔ مُردوں کو اپنی ذاتی زندگی بڑی عزیز ہوتی ہے۔ ایک کا دوسرے سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ سبھی کا اپنی اپنی ذات کی تلاش میں دم رکا ہوتا ہے۔

وہ پکی قبر؟ ——— وہ ایک مجذوب کے قبضے میں ہے۔ بے چارہ اپنی اسی کھوج میں دنیا سے باہر نکل گیا کہ پیدا ہونے سے پہلے میں کیا تھا ——— ارے بھئی، تم ہو ہی کیا، جو کچھ ہوتے؟ وہ تو شکر کرو کہ تمہارے باپ نے تمہاری ماں کو چوم چاٹ کر تمہیں بنا دیا ——— مگر باؤلا اپنی چھوٹی سی سمجھ بوجھ کو نہ چھوڑے ہوتا تو اتنی بڑی دنیا کیوں چھوڑتا؟ تُل گیا کہ اپنی تلاش میں وہیں جانا ہے جہاں سے آیا ہوں ——— عین وہیں پہنچا ہوا ہے اور اپنی قبر کی پکی دیواروں کے اندر ہی اندر پکی مٹی ہو چکا ہے۔ ذرے کو جان کیا ملی کہ پاگل نے مٹی سے کھیلنے سے انکار کر دیا، مگر مٹی تو اپنے ذرے ذرے سے کھیلتی ہے، اُس سے بھی، جو اس سے خواہ مخواہ الگ ہونے پر تُلا ہوا ہو ——— چند روز ہوئے میں نے اس کی قبر سے ایک کالا ناگ نکلتے ہوئے دیکھا۔ میری باچھیں کھل گئیں اور اس سے پہلے کہ میں منہ کھولتا، کہے حضرت ———، ناگ نے میرے خیال کی بھنک پا کر میری طرف اپنا پورا پھن پھیلا دیا، کون حضرت! میں تمہارا کوئی خیال نہیں ہوں۔ سچ مچ کا ناگ ہوں اور زندگی کا زہر چوس چوس کر لہراتا رہتا ہوں ——— چلو، راستہ دو!

نہیں، میں نے کبھی کسی کا راستہ نہیں روکا۔ بڑا نرم دل آدمی ہوں، ذرا سختی برت کر کسی کو روک ہی نہیں پاتا۔ اسی وجہ سے اپنے آپ سے ناراض رہتا ہوں، ورنہ موت کے راستے پر بیٹھا ہوں، کچھ کروں تو دس میں سے کم سے کم ایک تو بچا رہے۔

ہاں، اُنہی حضرات کا یہاں ہر سال عرس منایا جاتا ہے۔ وہ آپ تو اپنی ذات کی

تلاش میں دنیا چھوڑ گئے مگر لوگ بانگ ان کی تلاش میں یہاں دوڑے چلے آتے ہیں کہ وہ انھیں گھر بار دلوا دیں، اولاد دلوا دیں، عورت کا سکھ دلوا دیں، دنیا دلوا دیں ——— اور کالا ناگ لوگوں کی فریاد سن کر قبر کے اندر خوابناک خلا کو ڈنک مار مار کے کہتا ہوگا، جاؤ، جو مانگ رہے ہیں دلواؤ، جاؤ! ——— مگر حضرت عمر بھر اپنی قبر سے باہر نہ آئے، اب کیسے آئیں؟ کوئی جواب دینے کے لیے منھ کہاں سے لائیں جو انھیں اللہ پاک نے دیا تھا مگر جسے سنبھال کر رکھنا انھیں نصیب نہ ہوا۔

عجیب قصہ ہے! آخر وہ کھو کہاں گیا ہے؟ ابھی ابھی تو میں نے اُسے ان آنکھوں سے قبرستان میں داخل ہوتے دیکھا۔ اتنا تیز تیز آ رہا تھا، گویا اس کے لیے کوئی قبر تیار ہو اور وہ آتے ہی اُنہی کپڑوں سے اس میں لیٹ جائے گا۔ بہت تھکا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

خدا کا شکر ہے کہ میرے قوا بہت مضبوط ہیں۔ یہ بدن کا ورثہ تو ہے جو آخری دم تک ہمارا ساتھ دیتا ہے ——— نہیں، بتا تو چکا ہوں کہ میری یادداشت کھو چکی ہے مجھے قطعاً خبر نہیں کہ میرے ماں باپ کون تھے ——— اپنی اس بے خبری کا مجھے صدمہ بھی نہیں، کیونکہ میں انھیں اپنے وجود میں محسوس کرتا رہتا ہوں۔ جوں جوں وہ اپنے آپ میں بوڑھے ہوتے چلے گئے مجھ میں توں توں وہ جوان نکلتے آئے۔ ہاں، اس سے پہلے کہ میں بوڑھا ہو کر کھپ جاؤں، میری بڑی خواہش ہے کہ میں اپنے ماں باپ کو اپنی عورت کی کوکھ میں منتقل کر جاؤں۔ اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ ہماری جنسی محبتیں اسی لیے برحق ہوتی ہیں کہ ہمارا بیج ضائع ہونے سے بچا رہے، ہمارے معصوم ماں باپ پھلتے پھولتے رہیں۔

نہیں، آپ نے کیسے سمجھ لیا کہ مجھے محبت سے کوئی واسطہ نہیں۔ میں تو محبت ہی محبت کرتا ہوں۔ اپنی عورت کو پہلی بار میں نے یہیں مرے پڑے دیکھا تھا۔ میری والہانہ محبت نے اس میں دوبارہ روح پھونک دی اور وہ آنکھیں کھول کر بیٹھ گئی اور میں اسے سہارا دے کر گھر لے آیا ——— آپ کو یقین نہیں آ رہا؟ ——— نہ کیجیے ——— معجزے اسی لیے تو رونما ہوتے رہتے ہیں کہ ایمان کا دور دورہ رہے۔ آپ کی محبت میں دم ہو تو اسی دم مُردوں کی جان میں جان پڑ جاتی ہے اور اس کے بعد آپ کا مرنا بھی ہو جائے وہ آپ کو مرنے سے بچائے رکھتے ہیں۔

میری یادداشت کام تو نہیں کرتی لیکن میرا خیال ہے میری موت بھی واقع ہو گئی تھی مگر چونکہ میں نے اپنا دم اپنی عورت کو سونپ رکھا تھا اس لیے بچا رہا۔ ہاں، اپنی عورت مجھے جنم جنم کی ساتھی معلوم ہوتی ہے۔ وہ ہنس رہی ہوتی ہے تو اسے دیکھ دیکھ کر مجھے لگتا ہے کہ میری یادداشت لوٹ رہی ہے لیکن بھلا ہو اس نیک خاتون کا، عین اسوقت مجھے یاد دلا دیتی ہے کہ گھر میں آٹا ختم ہے۔ اسی طرح پڑے رہے تو کھاؤ گے کیا؟ اندر ہی اندر کھنچ کر رہ جاؤ گے اور ہزار ڈھونڈنے پر بھی نہ ملو گے ——— اٹھو! ——— نہیں! اٹھو!

عورت کا پیار گاڑھا ہو تو وہ تھوڑا تھوڑا جھگڑا بھی لیتی ہے مگر جو عورتیں جھگڑا ہی جھگڑا کرتی رہتی ہیں ان سے خدا بچائے! ——— حضرت مرحوم کے نیچے کی منزل میں ایک ایسی ہی جھگڑالو عورت کی رہائش ہے۔ مرتے دم تک بڑی موٹی تازی رہی۔ کیڑے بے چارے اسے کھانے کو بے تحاشہ لپکے مگر کھاتے کھاتے وہی بن گئے جیسے کھا رہے تھے اور آپس میں بے سبب گھمسان کی جنگ لے بیٹھے اور لڑتے بھڑتے ہر مردے کی

منزل پر جا پہنچے۔ وہ تو شکر ہے مُردوں کے سُدھ بُدھ نہیں ہوتی، مگر اس کا کیا کیا جائے کہ اسی زمین دوز عمارت کی کسی منزل میں ایک پاگل بھی تھا۔ پاگل کو کون سمجھائے کہ موت آ جائے تو پاگل بھی سُدھ بُدھ گنوا دیتے ہیں۔ کیڑوں کے گتھم گتھا لشکر کی آمد پر پہلے تو وہ مرا مرا اُچھل پڑا اور پھر ہنس ہنس کر اپنے آپ کو سمجھانے لگا کہ قیامت آن پہنچی ہے ——— کیڑوں کو اس کی ہڈی بوٹی چٹ کیے ایک مدت بیت چکی ہے مگر وہ مزے سے اپنے اسی خیال میں لیٹا پڑا ہے کہ قیامت تو آ ہی گئی ہے، اب اپنے آپ اٹھنا ہو جائے گا، اپنے آپ سب کچھ راہ پر آ جائے گا ——— باؤلے کا باؤلہ!

کیا ———؟ ہاں، میں یہاں ہر مُردے سے بخوبی واقف ہوں۔ انھیں جانے بغیر ان کی رکھوالی کیونکر کر سکتا ہوں؟ ——— ہاں، بھائی، مر تو چکے ہیں ——— آپ کو کیسے سمجھاؤں؟ ——— اسی لیے تو رکھوالی کرتا ہوں کہ مرے پڑے ہیں ——— ذرا ہوش میں آ کر قبرستان کے باہر ہو لیں تو اور کیا چاہیے ——— ہاں میں بھی کیسا رکھوالا ہوں؟ جن کی رکھوالی کرتا ہوں انھیں کھو دینے کی خواہش سے سرشار رہتا ہے، پر کھوئے ہوئے تو وہ یہاں بھی ہیں۔ کوئی ایک مرد کا بچہ تو ہو جو سینہ تان کر کھڑا ہو جائے اور یہاں سے نکل کر بھری پُری دنیا میں اپنے آپ کو ڈھونڈ نکالے۔ وہیں کہیں اپنے آپ کو گنوا دیتے ہیں مگر ڈھونڈنے کے لیے دوسروں کے کندھوں پر جھول جھول کر ادھر کا رخ کر لیتے ہیں۔

مگر وہ بھلا آدمی تو آپ ہی آپ چلا آ رہا تھا۔ کہاں کھو گیا ہے؟ ——— خیر، آ گیا ہے تو کہاں جائے گا؟ یہ مقام تو سارے کا سارے یہیں ہے۔ ساری جگہیں بدلتی رہتی ہیں مگر ایک قبرستان ہی اپنی جگہ سے نہیں سرکتا۔ کیسے سرکے؟ جہاں سب کے سب لمبی تان کر پڑے رہیں وہاں بھونچال بھی آئے تو وہ جگہ کیونکر سرکے؟ میں تو اکثر اللہ پاک سے یہی دعا مانگتا ہوں کہ یہ سوئی ہوئی مخلوق تو جاگنے سے رہی، بھونچال سے یہ قبرستان ہی اچھل کر کسی جیتے جاگتے جہاں میں جا گرے۔

یہ چیخیں ہی اس لیے ہے کہ سونے والے آنکھیں کھول لیں مگر نیند میں سانس ہی نہ ہو تو سفید کالے اندھیرے میں اڑ اڑ کر کہاں سے آئیں؟ ——— وہ ——— ہاں ——— وہیں ——— وہ کسی نواب کا مدفن ہے۔ دن رات نشے میں دھت سویا رہتا۔ نیند کوئی لوہے کی بنی ہوئی تھوڑا ہی تھی۔ جتنا ساتھ دے سکتی تھی، دیا مگر آخر ٹوٹ پھوٹ گئی ——— لو بھائی سو لو اب، مگر نیند میں کوئی سانس بچا ہو تو آئے۔ آخر وہ نیند کی دو، دس، پندرہ ——— نہ جانے کتنی گولیاں حلق سے اتار کر چت ہو گیا۔ اپنی دانست میں سویا پڑا ہے ——— پر مرا بھی تو نہیں۔ بڑی پکی قبر تھی مگر پہلو بدل بدل کر دنوں میں ہی توڑ پھوڑ کر رکھ دی ہے۔ نیند آتی نہیں، آنکھ کھلتی نہیں ——— زندہ ہوتا تو مرتا!

ایک راز کی بات بتاؤں؟ ——— ساری کی ساری باتیں منھ میں چلی آ رہی ہیں۔ اسے کیوں واپس نگل جاؤں؟ ——— میں یہاں ایک قبر پر بیٹھا ہوا ہوں ——— نہیں، راز کی بات یہ نہیں کہ میں یہاں بیٹھا ہوں ——— میں یہ بتانے جا رہا تھا کہ یہ قبر خالی ہے ——— ہاں، میں سچ کہہ رہا ہوں اس میں کوئی مردہ نہیں ——— ارے رے! آپ سہم کیوں گئے ہیں؟ کیا میں آپ کو کوئی مردہ دکھائی دیتا ہوں؟ پورے کا پورا آپ کے سامنے ہوں۔ یہ دیکھیے، یہ اٹھا، یہ بیٹھا ——— کیا مردہ ہوں؟ ——— نہیں یہ مت پوچھیے، میں کون ہوں۔ کئی بار بتا چکا ہوں کہ میری یادداشت کام نہیں کرتی ——— ہاں،

کام کرتی تو یہاں باہر بیٹھنے کی بجائے خالی قبر کے اندر پڑا ہوتا ـــــ ارے! ٹھہرو!
ـــــ کیا ـــــ کیا ـــــ؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ـــــ نہیں ـــــ تم وہی تو ہو! ـــــ سچ بتاؤ، کیا تم ہی تو نہیں جو ابھی ابھی قبرستان کے دروازے سے داخل ہوا؟ ـــــ گھبراؤ نہیں، بتاؤ!

لیکن اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے اس سے کوئی جواب نہیں بن پا رہا۔

میری موت ہوگی تو میری باتوں کے باعث ہی ہوگی۔ ایک بار شروع ہو جاتا ہوں تو اور کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ اتنی دیر سے وہ میرے ساتھ ہی بیٹھا ہے۔ میں اسی سے باتیں کر رہا ہوں کہ وہ کہاں کھو گیا ہے۔

سچ بتاؤ، تم ہی ہو نا، جو ـــــ

ہاں۔

اتنی سی بات کا جواب دینے کے لیے اس نے ذہن پر اس قدر زور ڈال کر جواب دیا ہے کہ میرے منہ سے ہنسی کا فوارہ چھوٹ پڑا ہے۔

وہ خوف زدہ ہو کر شاید بھاگنا چاہ رہا ہے لیکن اس کے پاؤں اس کا ساتھ نہیں دے رہے۔

بھاگنا چاہتے ہو تو بھاگ جاؤ۔

میں بدستور ہنسے جا رہا ہوں۔

نہیں، مـ ـــــ میں ـــــ

ہاں، ہاں، بولو! ـــــ کون ہو تم؟

بات یہ ہے کہ ـــــ کہ مجھے مرے ہوئے ایک عرصہ بیت چکا ہے مگر میرے مرنے کی کسی کو خبر ہی نہیں۔

میری ہنسی رکنے میں آ رہی تھی مگر اسے سن کر میرا فوارہ پھر چھوٹ پڑا ہے۔

تم ہنس کیوں رہے ہو؟

مجھے چھوڑو اور بتاؤ، تمہیں اپنے مرنے کی خبر کیسے ہوئی؟

میں اپنی موت کو محسوس جو کرتا ہوں۔

مگر جو محسوس کرتا ہے وہ ابھی زندہ ہوتا ہے۔

تو ـــــ

تو کیا؟ تم یقیناً ابھی زندہ ہو۔

مرا نہیں ہوں، تمہیں کیا پتہ، میں زندہ ہوں؟

مجھے شبہ ہوا ہے کہ وہ واقعی سانس نہیں لے رہا ہے۔

ٹھیک ہے۔ بولو، میں تمہاری کیا مدد کروں؟

میں اپنی قبر کہاں کھودوں؟

میرے سر میں! ـــــ مردہ آپ ہی چل کر قبرستان آ پہنچا ہے آپ ہی اپنی قبر کھودنے کے درپے ہے اور سب سے بڑھ کر یہ، کہ ابھی زندہ ہے۔

چاہو تو میری اس خالی قبر میں ہی پڑ جاؤ۔

ہماری نظریں ٹکرائی ہیں اور میں نے محسوس کیا ہے کہ خوف کی شدت سے اس کے وجود میں سانس ہی سانس بھر آئے ہیں اور اچانک چیخ مار کر وہ قبرستان کے دروازے کی طرف دوڑا ہے اور میرے قہقہوں کے آگے آگے دوڑتے ہوئے دروازے کے باہر واپس زندگی میں کھو گیا ہے۔

میں بہت خوش ہوں اور خالی قبر کی مٹی اڑانے لگا ہوں ••

غزل

مظہر امام

آمادہ رقابت پر مرا دل ہی نہیں تھا
یا پھر، کوئی اس بار مقابل ہی نہیں تھا!

اک تیغِ انا تھی جسے سب چوم رہے تھے
اب کے سرِ مقتل کوئی قاتل ہی نہیں تھا

تنہائی کے مہتاب سے روشن تھی شبِ غم
یوں اُس کا بھی آنا کوئی مشکل ہی نہیں تھا

کب ڈوب کے مرنے کی خوشی تھی ہمیں لیکن
کشتی کو کہاں لاتے، کہ ساحل ہی نہیں تھا

یا تجھے تری راہوں میں بھی کانٹوں کے بگولے
یا میں سفرِ لطف کے قابل ہی نہیں تھا

اب کے جو وہ بچھڑا تو کوئی شاخ نہ سوکھی
اب کے مرے پہلو میں مرا دل ہی نہیں تھا

کچھ اپنی کہیں رسمِ محبت کے شناسا
میں تو ہنرِ شوق میں کامل ہی نہیں تھا

اب نام کسی موڑ پہ آتا نہیں اُن کا
اچھا ہے، میں اس بھیڑ میں شامل ہی نہیں تھا

سلیمان آصف

انکشاف

تجلّیات کا پَرتو ہوں آئینا ہوں میں
ہزار پَردوں میں لیکن چھپا ہوا ہوں میں

اَبد کی سَمت ازل ہی سے بڑھ رہا ہوں میں
زوال یہ ہے کہ مائل بہ ارتقا ہوں میں

کبھی یقین کہ پتّھر کا دیوتا ہوں میں
کبھی یہ وہم کہ اک اک کو پوجتا ہوں میں

کبھی یہ ناز کہ ہوں مظہرِ جمالِ سکوت
کبھی یہ فکر کہ خود اپنی ہی صدا ہوں میں

کبھی یہ ڈر کہ نہ شبنم کہیں ڈبو دے مجھے
کبھی یہ زعم کہ طوفاں سے آشنا ہوں میں

برنگِ شعلۂ وہم و گماں کبھی بھڑکا
کبھی یقین کا گلزار بن گیا ہوں میں

کبھی خود انگلیاں اپنی تراش لیں میں نے
کبھی خود اپنے ہی زخموں پہ ہنس پڑا ہوں میں

کبھی یہ شوق کہ دنیا کرے مجھے سجدہ
کبھی یہ خوف کہ اک بندۂ خدا ہوں میں

مرے غضب کی ہے شاہد فضائے وادیٔ نیلؔ
ندائے ضربِ کلیمی کا مدّعا ہوں میں

کبھی تو بخش دی مُردوں کو زندگی میں نے
کبھی صلیب پہ ہنس ہنس کے چڑھ گیا ہوں میں

کبھی ملال کہ ہوں بو لَہَب کی بے خبری
کبھی یہ فخر کہ عرفانِ مصطفےٰ ہوں میں

کبھی یہ ناز کہ صدیقؓ ہے لقب میرا
کبھی یہ لطف کہ فاروقؓ بن گیا ہوں میں

کبھی جمالِ محبّت کا راز داں ٹھہرا
کبھی جلال کے رستے پہ چل پڑا ہوں میں

مرے وجود میں پنہاں ہے رازِ استغنا
ز فرق تا بقدم پیکرِ حیا ہوں میں

کبھی تمدّن ہو زرہِ آہنی میری
کبھی شہنشہِ خیبر کہا گیا ہوں میں

کبھی خوشی کہ سراپا ہوں اجتہادِ جمیل
کبھی یہ غم کہ بہت بے خبر رہا ہوں میں

کبھی تو کوثر و تسنیم بن کے لہرایا
کبھی دو بوند کی خاطر ترس گیا ہوں میں

جلا دیا کبھی میں نے ہوا کے رُخ پہ چراغ
کبھی خود اپنے اندھیروں میں کھو گیا ہوں میں

کبھی تو برق و بخارات پر کیا قبضہ
بہر قدم کبھی رشتہ بپا رہا ہوں میں

کبھی خلاؤں کے اس پار جا کے دی آواز
کبھی خود اپنی ہی دھرتی پہ سو گیا ہوں میں

کبھی یہ زعم کہ ہوں کائنات کا رہبر
کبھی اک اک سے اپنے کو پوچھتا ہوں میں

میری نمود میں پنہاں ہے جلوۂ صد رنگ
بتاؤں کیسے یہ آصفؔ کہ اور کیا ہوں میں

مرا وجود ہے تخلیق کائنات کا راز
غرورِ عشق ہوں مقصودِ ارتقا ہوں میں

نریندر لوتھر

سفر گو یورپ

آج کل اردو میں سیاحت نامے لکھنے کا بہت فیشن ہوگیا ہے۔ ایک رسالے میں رام لعل کے یورپ کے سفر کی سرگذشت قسط وار چھپ رہی ہے۔ ادھر پاکستان سے کرنل محمد خان کی بہم یورپ "شگوفہ" میں چل رہی ہے۔ یوسف ناظم نے ایک سفرنامہ پونہ کا لکھ مارا ہے۔ بھارت چند کھنہ اب دوسری بار امریکہ گئے ہیں۔ اگر انھیں واپس آنے دیا گیا اور ان کی اہلیہ محترمہ کچھ مزید عرصے کے لیے رک گئیں تو ان سے بھی ایک عدد سفرنامے کا خطرہ ہے۔ ویسے سنا ہے کہ شگوفہ شریف کے شہریوں نے ان کے لیے گرین کارڈ کی سفارش کی ہے۔ تاکہ ہندوستان کے لوگ ان کے سفرنامے سے بچ سکیں۔

ان تمام حضرات میں مشترک بات یہ ہے کہ یہ ریٹائرڈ لوگ ہیں۔ کئی دلچسپ تفصیلات انھوں نے یونہی چھوڑ دی ہیں۔ خاص کر کرنل صاحب کے سفرنامہ میں جہاں کوئی دلچسپ پہلو نکلنے لگا انھوں نے گویا "باقی پردۂ سیمیں پر" کہہ کر سین بدل دیا۔ شگوفہ کے مدیر کو بہت سے خطوط موصول ہوئے ہیں۔ جن میں سنسر شدہ مضمون کو بھی چھاپنے کی فرمائش کی گئی ہے۔ اس لیے اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ کوئی ایسا ادیب بھی اپنی سرگذشت یورپ لکھے جو یہ دعویٰ کر سکے کہ "ابھی تو میں جوان ہوں"۔

اس صورت حال میں ہم اپنے آپ کو پچھڑا ہوا محسوس کرنے لگے۔ بھلا ایسا بھی کیا کہ کوئی چیلنج ہو اور ہم خاموش بیٹھے رہیں۔ ہم نے حکومت سے درخواست کی کہ ہمیں بھی ایک غیر بار بار بھیجا جائے تاکہ ہم بھی اردو داں طبقے کی معلومات میں اضافہ کر سکیں۔ حکومت سے جواب ملا کہ تم کافی بار فارن جا چکے ہو۔ ابھی پچھلے سال بھی ایک چکر لگایا تھا۔ اس پر بھی کچھ لکھ سکتے ہو۔ ہم نے گذارش کی کہ یورپ میں حالات اتنی تیزی سے بدل رہے ہیں کہ پچھلے سال کے تاثرات لکھے جائیں تو لوگ سمجھیں گے کہ قرون وسطیٰ کی بات ہو رہی ہے۔ اور پچھلے سال اردو میں ابھی تک یہ وبا نہیں پھیلی تھی۔ اس لیے ہمیں یہ آئیڈیا بھی نہیں آیا تھا۔ اس بار ہم خاص طور پر اس کام کے لیے جائیں گے۔ ہم نے یہ بھی واضح کیا کہ ہم اندھا دھند تقلید کرنے والوں میں سے نہیں۔ ہم کوئی روایتی سفرنامہ نہیں لکھیں گے۔ اپنی عادت کے مطابق بالکل ماڈرن طریقے کی[1] Travelogue یعنی سفر گو لکھیں گے جو اردو میں یقیناً ایک نئی بات ہوگی۔

آج کل حکومت اردو کے بارے میں اتنا ہمدردانہ رویہ رکھتی ہے کہ ہماری تجویز منظور کرلی گئی اور ہمیں فوراً سے پیشتر سفر بند ہونے کا حکم صادر ہوگیا۔ مندرجہ ذیل مطور اس رپورٹ کی کاپی ہیں جو ہم نے دورے سے واپس آنے پر حکومت کو پیش کی تھی۔ اس میں کہیں کہیں پچھلے سال کے سفر کے بارے میں بھی ذکر ملے گا۔ جو ناظرین ابھی ابھی یورپ سے واپس آئے ہوں انھیں شاید متذکرہ ممالک کو پہچاننے میں مشکل ہو۔ ان کے لیے یہ حلفیہ بیان دیا جاتا ہے کہ تمام واقعات اور باتیں مغربی یورپ کے بارے میں ہیں اور صحیح ہیں۔

مغربی یورپ کے اہم ممالک ہیں فرانس، اٹلی، جرمنی، سوئٹزرلینڈ اور انگلینڈ۔ ویسے تو اور بھی ملک ہیں لیکن وہ اتنے چھوٹے ہیں کہ جب تک ان کے نام گنوائے جائیں تب تک ہوائی جہاز تو کیا گاڑی بھی ایک ملک سے دوسرے ملک میں پہنچ جاتی ہے۔

پچھلے سال والے سفر میں ہم تین لوگ تھے۔ اس سال کے سفر میں دو۔ امید ہے اگلے سال والے سفر میں ہم اکیلے ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ اس سفر کے بارے میں سچ سچ تفصیلات بتانا ذرا مشکل ہوگا (ملاحظہ ہو کرنل محمد خاں کا سفرنامہ) اس لیے یہ آپ کا آخری چانس ہے۔ (ہمارا آخری چانس اگلی بار ہوگا۔)

پچھلی بار ہمارے ساتھیوں میں سے ایک زمیندار ریڈی صاحب تھے جن کو دوران سفر ہم ڈیوک آف عادل آباد کہہ کر پکارتے تھے۔ وہ پہلی بار یورپ گئے تھے۔ ہر چیز کو اور ہر شخص کو بڑے غور سے دیکھتے اور اکثر کہتے "نہیں صاحب، ہمارے ملک والی بات نہیں"۔ یہ دو دھاری تبصرہ ہر سچویشن پر ٹھیک لاگو ہوتا۔ صرف ہمیں یہ سمجھ میں نہ آتا کہ اس ریمارک میں اپنے ملک کی تعریف مضمر ہے یا بدگوئی۔

اٹلی بہت خوب صورت ملک ہے۔ ہندوستان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ایک امیر ملک ہے جہاں غریب لوگ بستے ہیں۔ اٹلی ایک ایسا خوب صورت ملک ہے جہاں خوب صورت لوگ ہی بستے ہیں۔ اس ملک میں ایک قانون ہے کہ صرف خوب صورت لوگوں کو ہی وہاں رہنے کی اجازت ہے۔ بدصورت لوگوں کو حکومت انگلستان یا جرمنی بھیج دیتی ہے۔ اٹلی میں ہم نے نسوانی خوب صورتی کے بہت سے نمونے دیکھنے کے بعد ڈیوک سے کہا "دیکھا آپ نے۔ یہاں ایک بھی بھدی صورت دیکھنے کو نہیں ملتی"۔ ریڈی صاحب نے جواب دیا "کیا صاحب؟ بہت سی عورتیں بہت موٹی اور بدصورت ہیں"۔ ہم نے کہا "اچھا ریڈی صاحب اب سے اگر آپ کو کوئی بھدی عورت دکھائی دے تو مجھے بتائیے۔ مجھے اپنے وطن کی یاد بہت ستا رہی ہے"۔ اس معاہدے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ریڈی صاحب موٹی اور بھدی عورتوں کی تلاش میں گم ہو گئے۔ اور ہم بے فکری سے خوب صورت اور نازک اندام خواتین کے جلوے دیکھتے رہے۔ چار دن کے بعد ریڈی صاحب کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ ایک بار پھر سے ہمارے رقیب بن گئے۔

اطالوی لوگ جسم کے اعضا اور خاص طور پر شانے اور بازو ہلا ہلا کر بات کرتے ہیں دراصل وہ اپنے اعضا زیادہ اور زبان مقابلتاً کم استعمال کرتے ہیں۔ قتیل شفائی نے ایک اطالوی غزل کا ترجمہ کرکے یہ مصرع لکھا تھا۔

لحد میں بھی مرے شانے ہلائے جاتے ہیں

ہم نے ایک بار روم میں دیکھا کہ چند لوگ ایک شخص کے بازو اور کندھے باندھ رہے تھے۔ پتہ چلا کہ وہ شخص بہت زیادہ بول رہا تھا۔ واقعی جونہی اس کے اعضا باندھے گئے

---

[1] جیسے Travel اور Dialogue کو ملا کر انگریزی میں بنایا گیا ہے اسی طرح "سفر" اور "گفتگو" کو ملا کر یہ اختراع کی گئی ہے۔

وہ بالکل خاموش ہوگیا۔ سنتا ہے وہ شہزادوں اور خاندانی ہیروں کو ایسے ہی چپ کراتے ہیں۔

فرانسیسی لوگ بھی اطالویوں کی طرح بہت باتونی واقع ہوئے ہیں۔ انھیں کی طرح وہ اپنے جسم کے انگ ہلاتے ہیں۔ بلکہ وہ اطالویوں سے بھی ایک قدم آگے ہیں اور سنا گیا ہے کہ وہ تعداداً اپنے جسم کے زیادہ انگ ہلاتے ہیں۔

فرانسیسی لوگ لکھتے وقت بھی حروف کا بہت فراخدلانہ بلکہ فضول استعمال کرتے ہیں۔ لیکن شاید اپنی کثرت گوئی کا لحاظ رکھتے ہوئے انھوں نے اکثر حروف کو خاموش کر دیا ہے۔ قانوناً ہر لفظ کا آخری حرف خاموش ہوتا ہے۔ بیچ کے کئی حروف بھی خاموش رہتے ہیں۔ باقی حروف بھی صرف بڑبڑاتے ہیں۔ جو لفظ یا نام لکھنے میں بہت لمبے ہوتے ہیں۔ وہ تلفظ میں اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ اہل زبان کی فضول خرچی پر افسوس اور غصہ اور کئی بار ندامت بھی ہوتی ہے۔ مثلاً ہم نے ایک صاحب سے پوچھا کہ PONT DE NUEILLY کیا ہے۔ اس نے ہماری طرف ایسے دیکھا گویا ہم جہنم کا راستہ پوچھ رہے ہیں۔ ہم نے نقشے پر لکھا ہوا نام جو دکھایا تو ہنس کر بولا۔ او ہو۔ پوندی نوئی PONDI NUI اب دیکھیے اس نام کے تیرہ حروف میں سے پانچ فضول ہیں۔

ایسے ہی ان کی سب سے فیشن ایبل مال روڈ کو لکھا Champ DE Elysiees چامپس ڈی ایلیزیز اور بولا جاتا ہے Shenz Ruze یعنی یہاں بھی پچاس فیصدی انفلیشن۔ یہ فضول خرچی اور انفلیشن ان کی زندگی کے ہر شعبے میں ملتا ہے۔ متذکرہ بالا مال روڈ اتنی بڑی اور چوڑی ہے کہ دہلی کی جن پتھ اور حیدرآباد کا پتھر گھٹی اس کے فٹ پاتھ ہی سمجھا جائے (اور شہروں میں اتنی کشادہ سڑک ہے ہی نہیں کہ جس کے ساتھ موازنہ کیا جا سکے)۔ وہ سارے پیرس کے حسن کی جلوہ گاہ ہے۔ شہر کے تمام عشاق وہاں بے وفائی کرتے ہوئے دیکھے جا سکتے ہیں۔ بے وفائی کی ترغیب کے لیے ہر قسم کے لوگ دکانیں اور سامان یہاں ملتے ہیں۔ یہاں دنیا کے مشہور کیبرے اسٹرپ ٹیز اور سینما گھر ہیں۔ فرانسیسی فلموں میں سب کچھ دیکھنے کو ملتا ہے۔ سوائے کپڑوں کے۔ کپڑے دیکھنے کے لیے آپ کو فیشن شو جانا پڑتا ہے۔ وہاں سیاح لوگ مولان روج Molin Rough کریزی ہاؤس Crazy House وغیرہ ضرور دیکھتے ہیں۔ ہم نے بھی دیکھا۔ بہت مایوسی ہوئی۔ اونچی دکان اور پھیکا پکوان یا یہ کہنا بہتر ہوگا کہ کھودا پہاڑ اور پھر بھی چوہا ہی نکلا۔ ہماری صلاح ہے آپ ان رنگینوں پر پیسہ مت ضائع کیجیے۔ ہم نے بھی صرف اس لیے دیکھا کہ یہ ہمارے لیے شرط سفر تھی کہ اپنے ہم وطنوں کو بتا سکیں اور پھر ہمیں تو کسی میزبان نے یہ شو مفت دکھائے۔ لیکن پھر بھی ہمیں اپنے میزبان کے تئیں افسوس ہوا۔ سنا ہے اس سے بہتر شو بمبئی کلکتہ اور حیدرآباد میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ ہم سے یہ مت پوچھیے کہ یہاں ہم نے جو بات سنی وہ آپ کو بتا رہے ہیں۔

ستمبر کے مہینے میں ہر سال پیرس میں چمڑے کا بین اقوامی میلہ ہوتا ہے۔ اس میں ہر ملک سے آئی ہوئی چیزیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ اس سال اس میلہ کے ساتھ ہی عورتوں کے سوٹوں کے، بچوں کے کپڑوں کے، فیشن کے گہنے اور سنگار اور جواہرات کے اور گھریلو ضروریات کی نمائش ہو رہی تھیں۔ ان چھ کی چھ نمائشوں میں صرف پیشہ ور لوگوں کو داخلے کی اجازت تھی چنانچہ ہم نے تین دن میں چھ پیشے بدلے۔ زبان نہ آنے کا یہ بھی ایک فائدہ ہوتا ہے۔ مشتظمین سوال پوچھتے ہیں مناسب جواب نہ ملنے پر تنگ کر کہتے ہیں اچھا جائیے صاحب اگر آپ اتنی دور سے آئے ہیں۔ ہر ایک نمائش حیدرآباد کی نمائش سے کہیں بڑی تھی۔ بس چلتے چلتے کمر ٹوٹ گئی۔ شکر کیا کہ بیگم ساتھ نہیں تھیں۔ ورنہ یقیناً طور پر بھی کمر ٹوٹ جاتی۔

ستمبر میں پیرس جانے والے لوگ ایک سال پہلے سے ہوٹلوں میں بکنگ کروا لیتے ہیں۔ چونکہ ہم نے فیصلہ بہت دیر میں کیا تھا اس لیے جگہ ملنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ وہ تو خیر ہوئی کہ ہمارے سفارت خانے کے توسط سے ہمیں ایک نہایت ہی بوسیدہ ہوٹل میں جگہ مل گئی۔ وہاں پہونچے تو "دشت کو دیکھ کر گھر یاد آیا"۔ ہمیں کبھی گمان بھی نہ ہو سکتا تھا کہ پیرس میں بھی ایسے ہوٹل ہو سکتے ہیں۔ ہوٹل کا مالک ایک خوبرو مسلمان تھا۔ ہم نے سلام کیا اس نے ایڈوانس مانگا۔ ہم نے کہا دنیا کا کوئی ہوٹل کسی باعزت مسافر سے ایڈوانس نہیں مانگتا۔ یہ ہماری عزت پر حملہ ہے۔ ظاہر ہے اس ہوٹل اور اس شخص کو باعزت مسافروں سے پالا نہیں پڑا تھا۔ خیر مان گیا۔ اس نے کہا آپ دونوں حضرات کے لیے ایک کمرہ خاص طور پر رکھا ہوا ہے۔ ہم نے اعتراض کیا کہ ہم آج تک کسی پرائے مرد کے ساتھ ایک کمرے میں نہیں سوئے یہ ہمارے اخلاقی اصولوں کے خلاف ہے۔ اس نے ہمیں اور ہمارے ساتھی کو بغور دیکھا اور پھر علیحدہ علیحدہ کمرہ دے دیا۔ کمرے میں دیکھا تو نہانے کے لیے تولیہ ندارد۔ ہم نے مالک کو بلایا۔ اس نے ایک پتلے سے نیپکن کی طرف اشارہ کیا اور کہا یہ رہا تولیہ۔ ہم نے کہا۔ اس سے بہتر تو ہمارا رومال ہے۔ اسے تولیہ کون کہہ سکتا ہے۔ اس نے بڑے فخر سے جواب دیا کہ پچھلے چار برس سے میں اسی کے ساتھ بدن پونچھتا آ رہا ہوں۔ ہم نے کہا بے شک اگر ہم بھی چار سال تک اس کپڑے سے بدن پونچھتے رہیں تو ہمارا جسم بھی سوکھ جائے گا۔ لیکن ہم تو صرف تین دن رکنے والے ہیں اور تین دن میں تو اس سے صرف منھ ہی پوچھا جا سکے گا۔ یا جسم کا اس سے بھی چھوٹا کوئی حصہ۔ اس بات پر اس نے ہمیں ایک اور چار گز کا کپڑا لا کے دیا جسے وہ تولیہ کہنے پر مصر تھا۔ خیر تین دن اسی سے بدن پونچھنے میں ہم کامیاب ہو گئے۔

یورپ میں پھل بڑے تازہ اور میٹھے ہوتے ہیں کیونکہ اکثر وہ بحیرۂ روم کے نواحی ملکوں سے آتے ہیں۔ فرانس کے اپنے پھل بھی بڑے اچھے ہوتے ہیں۔ ایک بار ہم نے ایک بڑا سا خوب صورت سا سیب خریدا۔ کھانے لگے تو معلوم ہوا کہ وہ آلوچہ ہے۔ ان کا تربوز سرخ اور میٹھا ہوتا ہے۔ ایک دکان پر ہم نے تربوز کی پھانک دیکھ کر پوچھا "کیا یہ میٹھا ہوگا؟" دکاندار نے بڑی حیرانی سے ہماری طرف دیکھا اور پھر پوچھا "کیا کہیں پھیکا تربوز بھی ملتا ہے؟" ہم نے اسے فوراً ہندوستان آنے کی دعوت دی تاکہ وہ خود دیکھ لے کہ ہمارے ملک میں ہر قسم کی پھیکی چیز ملتی ہے۔ یہاں آکر اگر اس نے وہی سوال پوچھا تو جواب ملے گا۔ حضور ہم نے تربوز کے اندر گھس کر تو دیکھا نہیں قدرت کی پیداوار ہے۔ اب انسان کو ہی دیکھیے کوئی چھوٹا کوئی موٹا کوئی اچھا کوئی برا۔ ایک بار ہم نے ایک تربوز فروش سے یہی سوال پوچھا تو اس نے جواب دیا۔ دیکھتے نہیں اس پر کتنی مکھیاں بیٹھی ہیں۔ اگر میٹھا نہ ہوتا تو کیا یہ مکھیاں پاگل ہیں جو یہاں آکر بیٹھتیں۔ ایسے موقعوں پر ریڈی صاحب کا قول یاد آتا ہے۔ "نہیں صاحب۔ ہمارے ملک والی بات نہیں" کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

ع: سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا۔

یورپ کے ٹیکسی ڈرائیور بھی اپنی قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ہماری ٹیکسیاں اور ڈرائیور دونوں ہی کھٹیچر ہوتے ہیں۔ وہاں ٹیکسی ڈرائیور مسافر سے زیادہ سمارٹ ہوتا ہے۔ ہر ٹیکسی میں

وائرلیس لگا ہوتا ہے۔ ہمارے ڈرائیور اور وہاں کے ڈرائیور کی ایک خصلت مشترکہ ہے۔ دونوں مسافروں کو حتی الامکان لوٹنے سے احتراز نہیں کرتے۔ جرمنی میں عورتیں ٹیکسی چلاتی ہیں لیکن اپنی حفاظت کے لیے عموماً ایک خونخوار قسم کا کتا اپنے ساتھ رکھتی ہیں۔ وہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھا اپنی زبان باہر لٹکائے ہا ہا کرتا رہتا ہے۔ اس لحاظ سے دنیا کے تمام کتے ایک جیسے ہوتے ہیں۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ہماری نظر اگر کبھی بھی ڈرائیور پر پڑ جاتی تو کتا فوراً غرانے لگتا اور وہ ڈرائیور شیشے سے ہماری طرف دیکھ کر بغیر منہ پلٹے مسکرانے لگتی۔ ہم بہت کنفیوزڈ ہو جاتے کہ کس کا اشارہ سمجھیں۔ عافیت اس میں نظر آتی کہ غیر جانبدارانہ پالیسی اپنا کر اپنی ناک کی سیدھ میں دیکھیں۔

جرمنی میں سب لوگ جرمن بولتے ہیں۔ اٹلی میں اطالوی اور فرانس میں فرینچ ہندوستان کے باہر یورپ میں صرف انگلستان ہی ایسا ملک ہے جہاں لوگوں کو انگریزی آتی ہے۔ انگلستان میں تو بچے بچے کو انگریزی آتی ہے۔ اور ایسا لگتا ہے کہ ہم اپنے ملک میں پہنچ گئے۔ وہاں ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ وہاں پولیس میں بھی اب ہند و پاک کے لوگوں کو بھرتی کیا جاتا ہے۔ براڈ فورڈ میں اتنے پاکستانی ہیں کہ اس کو پاکستان کا دوسرا دارالخلافہ مانا جاتا ہے۔

ساؤتھ ہال انگلینڈ کا جالندھر ہے۔ وہاں ہم نے چھولے بھٹورے کھائے اور لسی پی وہاں ہم نے یہ بھی معلومات حاصل کیں کہ ایسی چیزیں ہندوستان میں کہاں کہاں ملتی ہیں۔

ہم نے ایک بار چڑھتی جوانی میں فرینچ سیکھی تھی۔ اب جب ڈھلتی جوانی میں فرانس پہنچے تو جب بھی فرینچ بولنے کی کوشش کی اس کی بجائے تیلگو الفاظ امڈ کر آتے۔ آندھرا میں ہم بمشکل تیلگو میں بات کر پاتے ہیں لیکن فرانس میں ایسا محسوس ہوا کہ ہم تیلگو پنڈت ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ آندھرا میں فرینچ اور فرانس میں ہمیں تیلگو آتی ہے نتیجتاً ہم اہل فرانس کو تیلگو کے چند الفاظ سکھا آئے (جواب ہم مستقلاً بھول گئے ہیں) اس طرح ہم کلچرل ایکسچینج کا کام بھی کر آئے۔ اب جب کبھی کوئی آندھرا کا دوست ہم سے تیلگو میں بات کرتا ہے تو ہم اس کو کہتے ہیں بھئی یہاں نہیں ہمیں پیرس میں ملئے۔

پیرس میں دو ہوائی اڈے ہیں۔ ہر ایک ایر پورٹ کے پاس ہولی ڈے ان نام کا ایک ہوٹل ہے۔ یہ ہوٹل ایر پورٹ پر ان مسافروں کے لیے جو وہاں ٹھہرنے والے ہوں ایک وین بھیجتا ہے۔ ہماری ریزرویشن بھی ہولی ڈے ان میں تھی۔ جب ہم وہاں پہونچے تو معلوم ہوا کہ ہم غلط ہوٹل میں آگئے ہیں۔ ہمیں دوسرے ایر پورٹ کے قریب والے اسی نام کے ہوٹل میں جانا تھا۔ اس ہوٹل کی وین ہمیں واپس ایر پورٹ چھوڑنے آئی۔ ہم نے بطور ٹپ وین ڈرائیور کو پانچ فرانک جو تقریباً دس روپئے کے برابر ہوتے ہیں دیئے اور ساتھ ہی اس کا شکریہ وصول کرنے کی تیاری میں اپنے چہرے پر ایک مسکراہٹ بھی بکھیر دی۔ بجائے شکریہ کہنے کے اس نے نہایت حقارت اور غصے سے ہماری طرف دیکھا۔ ہماری دی ہوئی رقم واپس کر دی اور اپنی جیب سے دس فرانک کا نوٹ نکال کر ہمارے کھلے ہوئے ہاتھ میں تھما دیا اور ساتھ ہی تیز اور گرم آواز میں کچھ آشیرواد بھی دے گیا۔ ہمارے ساتھی نے کہا بھئی کمال ہے یہاں کے ڈرائیوروں کو بھی احساس ہے کہ ہمارے پاس فارن ایکسچینج کی کمی ہے۔ اس نے ہمیں یہ رائے دی کہ اگر ہم ہر جگہ ایسا ہی کریں یعنی کم ٹپ دیں تو ہمارے پاس فارن ایکسچینج کافی جمع ہو سکتا ہے۔ ہم نے فرانسیسی ڈرائیور کو تیلگو میں دھنیہ وادم کہہ کر وہ نوٹ جیب میں ڈال دیا۔ سرزمین فرانس پر ہماری یہ پہلی کمائی تھی۔

یورپ کے ہر ایر پورٹ پر تفریح کے سامان مہیا کیے جاتے ہیں۔ بیشتر ہوائی اڈوں پر سیکس شاپ ہیں جہاں جنس سے متعلق ہر چیز مل جاتی ہے۔ پچھلے چند برسوں سے ایک معصوم تفریح یہ بھی مہیا کی گئی ہے کہ بچوں کے کھلونے کی طرح کی ٹرالیز بکثرت ملتی ہیں۔ بڑے بوڑھے ہر قسم کے لوگ ان میں اپنا سامان لاد کر ادھر ادھر گھومتے پھرتے ہیں۔ لیکن یہ ٹرالیز چلاتے وقت بجائے کسی تفریح کے احساس کے وہ لوگ عموماً فکر مند نظر آتے ہیں۔

واپسی پر ہم اٹلی کے اس شہر میں نو دن کے لیے رکے جہاں حال ہی میں ہماری بیٹی اعلیٰ تعلیم کے لیے گئی تھی۔ وہاں ہم نے ایک اتنا خوب صورت نوجوان دیکھا کہ ہم سمجھے یہ دنیا کا خوب صورت ترین شخص ہوگا۔ ہم نے جب اپنی بیٹی سے پوچھا تو اس نے کہا کہ وہ دنیا کا دوسرا خوب صورت ترین شخص ہے۔ ہم نے پوچھا کہ پہلا نمبر کس کا ہے۔ وہ ہمیں آئینے کے سامنے لے گئی اور کہنے لگی۔ لو دیکھو لو۔ وہاں دیکھا تو ہمیں وہی شبیہ دکھائی دی جو روز شیو کرتے وقت دکھائی دیتی ہے۔ سمجھ گئے کس باپ کی بیٹی ہے۔ (آپ سے پوچھ نہیں رہا۔ مجھے معلوم ہے۔ آپ کو بتا رہا ہوں)

ہماری بیٹی کی لینڈ لیڈی ایک طلاق یافتہ لیڈی ڈاکٹر ہے۔ جس کی عمر ابھی پینتیس برس کی نہیں ہوئی۔ اس کی دو بچیاں ہیں جو اسی کے پاس رہتی ہیں۔ اس کا خاوند اکثر شام کو آتا ہے بچوں کو باہر لے جاتا ہے۔ پھر سب لوگ کھانا کھاتے ہیں۔ اس کے بعد وہ گڈ نائٹ کہہ کر کہیں چلا جاتا ہے۔ طلاق کا یہ مہذب سسٹم ہمیں بہت پسند آیا۔ لینڈ لیڈی کو جب پتہ چلا کہ ہم آ رہے ہیں تو اس نے ہماری بیٹی سے کہا کہ تمہارے والد یہاں ٹھہر سکتے ہیں۔ شام کو جب ہم وہاں پہونچے تو اس نے ہماری بیٹی کو اطالوی میں بتایا کہ تمہارے والد میرے بیڈ روم میں سوئیں گے۔ ہماری بیٹی نے یہ بات ایک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ ترجمہ کر دی۔ ہم قدرتی طور پر جھینپ گئے۔ افسوس ہوا کہ ہم نے اگر فرینچ کی بجائے اطالوی زبان سیکھی ہوتی تو ایسے نازک معاملے میں بیٹی سے ترجمہ کروانے کی بجائے راست ہی بات کر سکتے۔ اُس دن ہمیں پہلی بار اطالوی مہمان نوازی کا احساس ہوا۔ ہم نے معذرت چاہی کہ ہم بیٹی کے کمرے میں ہی سو جائیں گے یا پھر بیٹھک میں صوفے پر یا زمین پر ہی۔ لیکن وہ مصر تھی۔ پھر اس نے یہ وضاحت کی کہ ہم اس کے بیڈ روم میں سوئیں گے اور وہ بیٹھک میں۔ اس نے بتایا کہ وہ رات کو پڑھتی ہے اور اسے بیٹھک میں ہی سونا زیادہ پسند ہے۔ وہ اکثر ایسا کرتی تھی۔ تب ہمیں کچھ سمجھ میں آنے لگا کہ اس کے خاوند نے اس کو طلاق کیوں دی ہوگی۔ اس رات ہمیں رات بھر نیند نہیں آئی۔ مچھروں نے خوب ستایا۔

پھر کوچ کا وقت آگیا۔ اس بار ہمارا دل یورپ چھوڑنے کو بالکل نہیں کر رہا تھا۔ بار بار بیٹی کا وہ اداس چہرہ آنکھوں کے سامنے آتا رہا جو ہم نے بولونیا ایرپورٹ پر دیکھا تھا ایسا لگتا تھا کہ اپنے دل کا ایک حصہ وہیں چھوٹ گیا ہے۔ اور تھا بھی سچ۔ زندگی میں پہلی بار محسوس ہوا کہ بیٹی کتنی عزیز ہوتی ہے۔ اب اس کی وہی تصویر آنکھوں کے سامنے گھومتی ہے اور ہم اس انتظار میں ہیں کہ اس سے دوبارہ کب مل سکیں گے۔ اب ہم یورپ نہیں جانا چاہتے۔ بس اس خطۂ زمین پر جانا چاہتے ہیں جہاں ہماری آنکھوں کا نور اور ہمارے جگر کا ایک ٹکڑا رہ گیا ہے ••

اشتیاق علوی

شکار کے نادر منظر

دن ڈھل چکا تھا۔ اونچی نیچی پہاڑیوں کے بیچ پتھر کی چٹیل سلیں ٹیلوں کی بلندیوں پر بکھری ہوئی تھیں۔ پہاڑی کا ایک سلسلہ ختم ہوتا تو گھاٹیاں اور گہرے غاروں سے ہو کر بل کھاتے راستے اور نالے دوسری پہاڑی کے سلسلے کو ملا دیتے۔ تا حد نظر گھنی جھاڑیوں سے یہ گھاٹیاں بھری تھیں جانوروں کے چلنے کی لیکیں بے شک صاف جھلکتی تھیں مگر وہ ایسی ٹیڑھی میڑھی تھیں کہ ان پر چل کر فاصلہ طے ہوتا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ ٹیلے کی ایک ٹکر پر بڑے شاہانہ انداز میں پیچھے لٹکائے ایک تیندوہ نیچے سے گذرنے والی لیکوں کی نگرانی عقابی نظروں سے کر رہا تھا کیوں کہ انہی لیکوں سے ہو کر پالتو مویشی روزانہ گذرتے تھے۔ مویشیوں کی ایک ٹولی ابھی گذر چکی تھی اور دوسری ٹولی بکری اور بھیڑوں کی اسی راستے سے گذرنے کے لیے بڑھ رہی تھی جس کے ساتھ تین چرواہے اور دو کتے تیز قدم چل رہے تھے۔ کبھی کبھی ہلکی سی گرد اٹھتی اور بکری اور بھیڑوں کی آوازیں بلند ہوتیں۔ جس ٹیلے پر سے ہم دیکھ رہے تھے اس پر نیچی جھاڑیاں تھیں اور وہ بھی تیندوے والے ٹیلے کے لیول میں تقریباً چار سو گز پر تھا۔ شکاریوں کی سدھی ہوئی نظریں تو ویسے ہی جم گئیں مگر دوربین نے بال کی کھال تک ابھار کر دی۔ بیس پچیس بکریوں کا غول سہمی ہوئی تیز چال سے گذر رہا تھا اور مٹکتے ہوئے تیندوے کا انہماک اور موڈ ظاہر کر رہا تھا کہ وہ شکار کرنے کی ٹھان چکا ہے۔ تیندوے کے شکار تو بہتوں نے کھیلے مگر تیندوہ کس طرح جانور کا شکار کرتا ہے۔ کس طرح گھات لگاتا ہے۔ کس طرح جھپٹتا ہے کس طرح جانور جانور کو پکڑتا ہے یہ ایسے اتفاقیہ دیکھنے کو ملنے والے نادر سین ہوتے ہیں کہ شکاری زندگی کی انمول گھڑیاں سمجھنا چاہیے یہ شاذ و نادر ہی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ پڑھا تو سب ہی نے ہے کہ شیر و تیندوے گھات لگا کر جانور پر صرف اس وقت حملہ کرتے ہیں جب جانور صرف چند گز دور رہ جائے۔ یہ خیال غلط ہے کہ وہ جانور سے ریس کر کے یا اس کو دور سے ریپا کراتے ہیں اور چھاپ لیتے ہیں۔ دوڑا کر پکڑنے کی عادت اور مہارت تو صرف چیتے میں ہوتی ہے۔ جس کے ناخون کتے کی طرح ہر وقت باہر ہی کو نکلے رہتے ہیں۔ افسوس کہ چیتے ہمارے جنگلوں میں ناپید ہو چکے ہیں۔ شیر عام طور پر اکیلا شکار مارتا ہے مگر تیندوے کا چونکہ مستقل جوڑا ہوتا ہے اور وہ دونوں مل کر باقاعدہ پلان بنا کر شکار مارتے ہیں۔ جھاڑیوں کی آڑ میں راستوں کے ناکوں پر۔ درختوں کی ڈالوں پر بیٹھ کر یا بالکل کھلے میدانوں میں مردہ سے پڑے گھنٹوں تاک میں رہا کرتے ہیں اور جب کوئی جانور دس پانچ گز کے اندر آگیا تو اس پر جھپٹ کر گردن پکڑ لیتے ہیں اور پنجوں سے سہارا لیکر گرا دیتے ہیں۔ پنجو کے شکنجے میں دبوچے رکھ کر گردن میں اوپر سے دانت اس طرح پیوست کر دیتے کہ جانور کا دم چند منٹ میں گھٹ جاتا ہے۔ پھر قریبی آڑ میں گھسیٹ لے جاتے ہیں کھاتے ہیں۔ مگر تیندوہ اپنے شکار کو کسی اونچی جگہ پر بیٹھ کر کھانا پسند کرتا جبکہ بقول تجربہ کاروں کے شیر اپنے شکار کو نشیب کی طرف لیجا کر کھانا زیادہ پسند کرتا ہے۔ ویسے تیندوہ بڑے سائز کے جانوروں مثلاً بیل۔ بھینس۔ نیل گائے سانبھر کے شکار کرنے سے بچتا ہے۔ یہ تو اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ کسی بڑی کا نیل گائے کے اوپر تیندوہ سوار ہو گیا مگر اس کو گرا نہ سکا نہ اس کی موٹی گردن کا حلق کو دبا سکا۔ نیل گائے اس کو پیٹھ پر لیے لیے بھاگی اور کسی گھنی جھاڑی میں اتنے زور سے رگڑا کہ تیندوہ زمین میں گر پڑا اور شرمندہ ہو کر کتے کی طرح پچھلے کولھوں پر پھین پھین کی آوازیں نکالتا رہا۔

ہم سب لوگ تیندوے میں ہمہ تن مشغول ہو چکے تھے۔ دوربینیں سیدھی گئیں اور نگاہیں اسی طرف گاڑ دی گئیں۔ تیندوہ اپنی دم کو بار بار ادھر ادھر پٹختا۔ کو پھیلا کر کاہلی دور کرتا۔ کنوتیاں بدل بدل کر آہٹ لیتا مگر نظریں بکریوں پر جمائے رہتا۔ بکریوں کی لیک چونکہ بہت گہرائی سے گذرتی تھی تو وہاں سے کے لٹکتے پنجے اور آدھا سر نظر آتا تھا پھر بھی وہ اتنی احتیاط کر رہا تھا کہ بدن کو ہلاتا تھا نہ سر کو گھما کر دیکھتا تھا۔ مگر اس کے انداز میں کسی کے انتظار کی جھلک ہم کو بھی یہ عجیب لگتا تھا کہ وہ اکیلا کیوں ہے۔ اتنے میں بہت دور بکریوں کے سے بھی دور مگر انہی کے پیچھے پیچھے جھاڑیوں اور ٹیلوں کی آڑ لیتا ہوا ایک دوسرا تیندوہ نظر آیا۔ گویا جنگل کرافٹ کے فن کا ماہر اپنے ساتھی تیندوے کے شکار مارنے کے شکار کو پھیر کر گھات پر لا رہا تھا۔ ہم لوگ دم بخود ماہر فن شکاریوں کی شطرنج بساط کا پھیلا ہوا نقشہ دیکھ رہے تھے۔ پیچھے آنے والے تیندوے کی بابت چرواہوں کو علم تھا نہ بکریوں کو آہٹ ملی۔ شکار کی گھات پر بیٹھے تیندوے کو ہماری موجودگی کا علم نہیں تھا۔ جنگل اور پہاڑیوں کا نقشہ ہم کو ایسا لگتا تھا کہ گویا کسی اسٹیڈیم بالائی منزل سے ہم کھیل کا پورا میدان دیکھ رہے ہوں۔ بکریوں کا غول قدرے کھلی ہوئی جگہ پر پہونچ چکا تھا اس کے آگے راستہ زیادہ گھنا اور تنگ تھا۔

سے ہو کر گذرنے کے لیے دو دو بکریاں ایک ساتھ چل سکتی تھیں اور اس لیے بکریوں کو لمبی قطار بنانا تھی۔ ایک چرواہا آگے ہو لیا اور دو پیچھے۔ پیچھے لگ کر آنے والا تیندوہ کسی چھوٹے راستے سے ہو کر غول کے پیچھے پہونچ گیا۔ اگلا چرواہا اس تنگ راستے میں گھسر چکا تھا ساتھ میں دو چار بکریاں بھی اس میں گھسی تھیں۔ شکار کرنے والا تیندوہ بجلی جیسی لپک کی طرح ٹیلے سے نیچے لپکا اور آڑ پکڑ کر اس راستے کے داہنے یعنی کھلی ہوئی جگہ سے ملی آخری آڑ پکڑ کر رک گیا۔ پیچھے آنے والے تیندوے نے غول میں پھاند کر ادھر ادھر دو چار بکریوں کے ہاتھ مارے تھے کہ غول میں افراتفری مچ گئی۔ بھگدڑ مچ گئی۔ بکریاں اِدھر اودھر بھاگنے لگیں۔ چرواہے جب تک ماجرا سمجھیں سمجھیں شکاری تیندوہ سمٹا۔ سنبھلا اور اپنے پچھلے پیروں پر زور دے کر قریب والی بکری پر اس طرح جھپٹا کہ بجلی کی لپک بھی اس تیزی کے آگے مات تھی۔ یہ فاصلہ ہم سے صرف پچاس گز ہوگا مگر ہم نے حملہ کرنے سے پہلے کی ہر کیفیت تو صاف دیکھی کہ تیندوے نے کان گردن اور سر کو جھکایا۔ بدن کو سمیٹا۔ بکری پر نظریں گاڑ دیں۔ آخری لپک اتنی تیز تھی کہ تیندوے کے بدن کی حالت پر ہماری نگاہیں نہ جم سکیں کہ حملے کے وقت اس کے پچھلے پیروں کی کیا کیفیت تھی۔ کب اور کس طرح پورا بدن اپنی سمٹن کھول سکا۔ جب تیندوے کے اگلے پنجے بکری کے اگلے پھوڑوں کو اپنی گرفت میں لے چکے تو دیکھا کہ تیندوے نے اپنے دانت بکری کی گردن میں اوپر سے گاڑ دیئے۔ تیندوے کے پچھلے پنجے ابھی زمین پر تھے کہ زوردار جھٹکے سے بکری کو اس نے اپنی طرف گھسیٹ لیا۔ اب بکری کے چاروں پیر مخالف سمت تھے اور پیٹھ اور گدّی کی طرف سے تیندوہ دبائے پڑا تھا۔ بکری کی آواز نہ نکل سکی وہ پیر زمین میں مارتی رہی۔ بکری کی سانس گھٹ گئی۔ بقیہ غول تتر بتر ہو چکا تھا۔ چرواہے چلا رہے تھے۔ کتے بھونک رہے تھے۔ کسی کو کچھ نہیں معلوم تھا کہ غول کے کس بازو پر حملہ ہوا تھا اور کیا نتیجہ ہوا۔ تیندوے کی چالاکی تو دیکھیے کہ پھیر کر لانے والا تیندوہ جھٹ پٹ چکر کاٹ کے بھاگتے غول کے آگے ایک اونچے ٹیلے پر جا کھڑا ہوا۔ اس کو دیکھ کر بکریاں پھر بھاگیں اور چرواہے ڈنڈے لیکر اس کی طرف دوڑے اور وہ اسی سیدھ میں اور آگے بھاگا۔ اس طرح شکاری تیندوے سے چرواہے اور دور ہوتے گئے۔ مگر شکاری تیندوے کو یقین تھا کہ چرواہے دیر سویر بکری کو تلاش کرنے آتے ہی ہوں گے اس لیے اس نے بکری کی لاش کو سمیٹا عین اسی وقت دوسرا تیندوہ بھی وہاں پہونچ گیا مگر وہ بہت چوکنا تھا۔ شکاری تیندوے نے گدّی کی طرف سے گردن پکڑ کر بکری کو تولتے ہوئے اوپر کی طرف جھٹکے سے اٹھایا۔ بکری کی اگلی ٹانگیں لٹکتی رہیں اور پچھلی ٹانگیں تیندوے کے بائیں طرف زمین پر گھسٹنے لگیں۔ تیندوہ لاش کو اسی انداز میں گھسیٹنے لگا مگر اس کی رفتار مدھم تھی۔ اب چرواہوں کی آوازیں اس طرف بڑھتی معلوم ہوئیں۔ خالی والا تیندوہ بار بار چاروں طرف کی آہٹ لینے کے لیے رک جاتا تھا۔ شاید راستہ جلدی طے کرنے کی نیت سے تیندوے نے بکری کی گردن کو اتنی زور سے جھٹکا دیا کہ بکری اُچھل کر دس بارہ گز دور گری۔ وہاں سے پھر گھسیٹنا شروع کیا۔ یہاں قدرے سکون محسوس کر کے تیندوے نے اگلا پنجہ لاش کے پیٹ پر مار کے پیٹ پھاڑ دیا۔ آلائش نکال کے کچھ خود کھائی اور لاش کو پھر گھسیٹتا ہوا اونچے ٹیلے کی طرف چل دیا۔ پیچھے آنے والا تیندوہ بقیہ آلائش کھا کر چکر کاٹ اسی ٹیلے کی طرف چلدیا۔ یہ ٹیلا ہمارے ٹیلے سے قدرے نیچا تھا اس کی سایہ دار جھاڑی میں دو طرف سے گھنی آڑ تھی اور ہماری طرف سے کھلی تھی۔ پہلے پیٹ کا گوشت نوچ نوچ کر ایک نے کھایا اور دوسرا تیندوہ پیٹ کی بقیہ آلائش نکال کر کھاتا رہا۔ چرواہے بکریاں چھوڑ کر کیسے ہٹتے۔ تھوڑی دور تلاش کر کے تیز قدم گاؤں کی طرف چلدیئے۔ جب تیندوے نے بکری پر حملہ کیا تو وہ حملے کے مقام تک پہونچنے کے لیے ایک آڑ چھوڑتا تو جھپٹ کر دوسری آڑ پکڑ کر چھپ جاتا تھا۔ جب بکری پانچ گز آگئی تھی تب اس نے حملہ کیا تھا۔ تیندوے نے پنجوں کا استعمال صرف بکری کو پکڑنے اور گرفت کو قائم رکھنے کے لیے کیا تھا۔ بکری کے نہ تو خون جاری تھا نہ کہیں زخم آیا تھا۔ لاش کو گھسیٹنے میں تیندوہ گردن کو دبائے دبائے اپنے سر کو اتنا اونچا اٹھا لیتا تھا کہ بکری کے کھر ہی زمین پر گھسٹتے تھے جن سے پہچان کا کوئی نشان یا گھسیٹنے کی لائن نہیں بنتی تھی۔

اکثر یہ بھی دیکھا ہے کہ تیندوے نے بکری کو کمر پر سے پکڑ کر اونچا اٹھایا اور دور تک لے گیا۔ ایسا ہی آدمیوں کی لاش کے ساتھ بھی وہ کرتا ہے۔ یہ بات واقعی بہت اہم ہے کہ اس کے قدموں سے کوئی آواز نہیں نکلتی کہ آہٹ مل سکے نہ وہ حملہ کرتے وقت بولتا ہے جیسی کہ شیر کی عادت ہوتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ تیندوے کے جوڑے میں اپسی محبت اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ اگر ایک ساتھی دکھ بھری آواز نکال دے تو دوسرا بغیر سمجھے بوجھے حملہ کر دیتا ہے۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے دونوں تیندوؤں نے خوب گوشت کھایا اور نیچے جا کر گڑھے سے پانی پیا اور جہاں ہڈیاں پڑی تھیں اسی کے پاس لیٹ کر آرام کرنے لگے۔ یہ نایاب سین اتنی تفصیل اور آرام سے ہم کو دیکھنے کو ملے کہ شاذ و نادر ہی کسی کو دیکھنے کو ملیں گے۔

وشوا ناتھ درد

غزل

کیوں بجھ کے رہ گئے کہ چراغ سحر نہ تھے
دامن میں تھے کسی کے سرِ رہ گزر نہ تھے
مرے لیے تھی منتظر منزل بھی راہ بھی
چلنا تھا جن کے ساتھ وہی ہم سفر نہ تھے
تھے باخبر وفا کے بھی انجام سے مگر
ہوتا تھا جس قدر ہمیں، ہم اس قدر نہ تھے
کس بات کا گلہ ہو کہ ہم کس لیے لُٹے
رہزن تھے اپنے ساتھ کوئی راہبر نہ تھے
تیرے بغیر جی تو لیے ہم جی کو چھوڑ کر
تھی جیل اک طرح کی کوئی بام و در نہ تھے

ذکیہ مشہدی

چاندی کے ہاتھ

ایمپلائمنٹ ایکسچینج کی طرف سے بھیجی گئی وہ قدرے ٹھگنی، گٹھے ہوئے بدن اور رُدکھے چہرے والی ادھیڑ عمر عورت ایک ٹک نگہت کی طرف دیکھے جارہی تھی۔ نگہت کے ذہن میں وہ مختصر سا وقفہ ایک طویل مدت میں تبدیل ہوگیا۔ جسم میں چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ ایک پل میں نہ جانے کیسے کیسے خیالات دماغ میں آندھی طوفان کی طرح گھس پڑے۔ اخباروں میں اکثر ٹھگ اور بدمعاش عورتوں کی داستانیں آتی رہتی ہیں۔ کہیں یہ بھی ان میں سے ایک تو نہیں؟ شاید اس نے سن رکھا ہو کہ نگہت کو ملازمہ کی سخت ضرورت ہے اور اس نے ایکسچینج کو فون بھی کر رکھا ہے۔

اور شاید...

"آپ نے پہچانا نہیں بٹیا؟" اس نے ہولے سے مدھم آواز میں کہا اور اس کی آواز کے ساتھ نگہت کے سارے وسوسے صابن کی جھاگ کی طرح بیٹھ گئے۔ اتنی ملائم، اتنی مہذب آواز۔ بٹیا کہنے کا وہ یگانگت بھرا شفیق انداز۔ یہ عورت چور، اچکی، ٹھگ تو قطعی نہیں ہوسکتی۔ نگہت کی خود اعتمادی گھر سے بھٹکے مرد کی طرح پھر واپس آگئی۔

"نہیں تو —" اس نے ذرا حیرت سے کہا۔

بٹیا — شاید آپ پہلے نخاس کے آس پاس کہیں رہتی تھیں۔ منصور نگر کی گلی سے کبھی کبھی کتابیں اٹھائے گزرا کرتی تھیں۔ تب شاید پڑھنے جاتی تھیں کہیں۔

نگہت نے ایک طویل سانس لی۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس عورت کو چاروں طرف سے دیکھا۔ دماغ میں اچانک کوئی چیز زور زور سے پھڑپھڑانے لگی۔ دھول کا بگولا سا اٹھا۔ اس کے پیچھے سے کچھ دکھائی دیا اور پھر اچانک جیسے کسی نے پھاوڑا لے کر ساری مٹی ہٹادی۔ ملائم پروں والی جھاڑو لے کر دھول کی تہیں پونچھ ڈالیں اور وہ سارے لوگ، ان کے ساتھ جڑے ہوئے وہ سارے الفاظ اس کی آنکھوں کے سامنے ہوا میں تیرنے لگے۔ سامنے کھڑی بلڈنگ کی طرح ٹھوس اور مجسم اور صبح کی پہلی کرنوں کی طرح روشن اور شفاف۔

بارہ آنے۔

نہیں ایک روپیہ۔

بارہ آنے۔

نہیں ایک روپیہ۔

اتنا گمان کرتی ہے تو جا۔ ایک تو ہی تھوڑی ہے۔ یہاں تو لین لگی ہے لین۔

اچھا تو جیتا ہیں ہاری۔ آجا۔ بارہ آنے سہی۔ چولہے میں آگ تو جلے گی۔

شام کے دھندلکے میں لپٹی اس سنسان گلی میں وہ سرگوشیاں کسی سانپ کی پھنکار کی طرح گونج رہی تھیں۔ جلدی جلدی قدم بڑھاتی نگہت پل کے پل ٹھٹھک کر پلٹ کر اس نے ان لوگوں کے چہروں پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی۔ ڈھلی عمر کی ایک عورت اور اس کے قریب، بے حد قریب کھڑا ہوا وہ مرد — ایک مدھم روشنی والی اداس اسٹریٹ لائٹ ابھی جلنا نہیں شروع ہوئی تھی۔ دھندلکا بس پھیلا تھا لیکن چونکہ گلی کی ایک جانب اونچا ٹیلہ چلا گیا تھا اور دوسری طرف بڑے بڑے پرانے مکانوں اور حویلیوں کی پشت تھی اس لیے گلی میں مکمل سناٹا تھا اور کچھ بازار کے مقابلے میں کہیں زیادہ اندھیرا۔ گلی کا اختتام ایک چوڑی شاہراہ اور بھرے بازار میں ہوتا تھا جیسے سنسان میدانوں میں خاموشی سے بہنے والی پتلی سی ندی یک لخت سمندر میں داخل ہو جائے۔ حواسوں پر اچانک حملہ کرنے والی روشنیوں، آوازوں سے بچنے کے لیے نگہت نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ بغیر کسی وجہ کے اس کے جسم میں ایسی کپکپاہٹ تھی جو شدید خوف کسی بے نام سی توقع اور ایکسائٹمنٹ کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس کا جسم پہلے سن سن گرم ہوا اور پھر ایک دم ٹھنڈا پڑ گیا۔ گلے میں کوئی چیز اٹکی اور وہ بے حد نروس ہو کر پرس میں رومال تلاش کرنے لگی۔

"اسی لیے تو امی کہتی ہیں کہ شریف لڑکیوں کو اس گلی سے نہیں نکلنا چاہیے نہ جانے کیسی کیسی باتیں کانوں میں پڑتی ہیں۔" ساتھ چلتی سلمیٰ نے مدھم آواز میں کہا۔ اور زمردی بوا کہتی ہیں.... مگر نگہت زمردی بوا کے سنہرے اقوال سننے سے پہلے کہیں گم ہو چکی تھی۔ ایک "ٹین ایج" لڑکی کے لیے وہ جملے بڑے ہی انوکھے تھے۔ انھیں سنتا کسی شجرِ ممنوعہ کا پھل توڑنے کی طرح پُرخطر تھا۔ پُرخطر، گناہ کا احساس دلانے والے، ایک انوکھا سا خوف بیدار کرنے والے وہ جملے، وہ لوگ وہ عورتیں — وہ قابلِ رحم نفرت انگیز عورتیں۔

منصور نگر کی چڑھائی کو نخاس سے ملانے والی اس گلی میں دو رویہ کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں۔ ننھی ننھی، سیلی ہوئی نیم پختہ کوٹھریاں جو سزائے موت پانے والے قیدیوں کی کوٹھریوں جیسی معلوم ہوتی تھیں۔ ان کے سامنے اکثر وہ بے ڈھنگی سی پھوہڑ عورتیں بیٹھی دن میں دال چاول چنتی رہتی تھیں یا ایک دوسرے کے بالوں سے جوئیں نکالتی نظر آتی تھیں۔ ان میں سے اکثر پہاڑی معلوم ہوتی تھیں۔ زرد رنگت، سیاہ آنکھیں، ابھرے ہوئے گال، چھوٹے قد۔ چہرے پر انتہائی سستا اور بھونڈا میک اپ۔ دن کے وقت عموماً صرف بلاوز اور پیٹی کوٹ پہنے رہتی تھیں۔ کبھی کبھی کوئی زیادہ بیباک اور من چلی عورت اسی لباس میں گلی کے دہانے تک بھی چلی آتی تھی۔ جہاں سے بازار شروع ہوتا تھا اور رکشے تانگے والوں کا جمگھٹ رہا کرتا تھا۔ اس کے آتے ہی بہت سے مذاق اور اشارے شروع ہو جاتے۔ ان کے جواب میں وہ ننگی گالیاں سناتی اور سارے رکشے، تانگے اور پھلوں کے ریڑھے والے قہقہہ لگا کر سر پر اٹھا لیتے۔ مگر دن کے وقت گلی کے اندر زیادہ تر سناٹا ہی رہا کرتا تھا۔ راہگیر چلتے یا بڑے مکانوں اور حویلیوں سے نکلنے والی برقع پوش ملازمائیں یا

کبھار نگہت اور سلمیٰ جیسی لڑکیاں جنھیں کالج جانے کے لیے مکان کے پچھواڑے سے نکل کر شارٹ کٹ لینا ہوتا۔ یونیورسٹی کی بس پکڑنے میں اکثر نگہت کو دیر ہو جاتی تھی۔ اب وہ لاکھ زمردی بُوا کی نظروں سے بچنا چاہتی مگر وہ کسی جن کی طرح کہیں نہ کہیں سے برآمد ہو جاتیں اور اپنی موٹی بھرّائی ہوئی آواز میں کہتیں۔ "بٹیا جا تو رہی ہو ادھر سے پر آنکھ اٹھا کر دائیں بائیں مت دیکھنا۔" اُن پر نظریں پڑ جائیں تو گناہ ہوتا ہے۔"

"کن پر بُوا؟" سلمیٰ ہمیشہ زمردی بُوا کو اُدبدا کر چھیڑتی تھی۔

ارے انھیں پچھل پیریوں پر۔ گھر اجاڑ ـــ یہ بُوا کی خاص ذاتی اصطلاح تھی۔

گھر اجاڑ ـــ بقول خود بُوا صورت نہ شکل بھاڑ میں سے نکل۔ پھر بھلا یہ کسی کا گھر کیا اجاڑیں گی۔ خود ان کے گھر نہ جانے کس نے اجاڑ دیئے تھے۔ نگہت بڑے دکھ سے سوچتی تھی۔ اس وقت اس کی دنیا بڑی محدود تھی۔ اس چھوٹی سی صاف ستھری دنیا میں نہ طوائفیں تھیں نہ چور اچکے۔ نہ رشوت خور تھے نہ زانی۔ اس کے چاروں طرف جیسے کسی نے لکشمن ریکھا کھینچ دی تھی جس کے اندر آفتوں کا گزر نہیں تھا۔ وہاں صرف آبا تھے جو کسی بینک میں کلرک تھے۔ ایک سیدھی سادی اماں تھیں جو کولھو کے بیل کی طرح دن بھر کام کرتی رہتی تھیں، دو چھوٹے بھائی تھے اور ایک کم سن شرمیلی بہن۔ باقی سارے لوگ، ساری چیزیں، سارے واقعات کتابوں میں پائے جاتے تھے یا اخباروں میں۔ اسی لیے جب بی۔ اے کرنے کے لیے اسے چچا ابا کے گھر لکھنؤ بھیجا گیا اور ان کے گھر کے پیچھے یہ انوکھی مخلوق نظر آئی تو پہلے تو وہ اسے سمجھ ہی نہ سکی اور اس دن ـــ اس دن جب اس نے اپنے کانوں سے وہ کریہہ الفاظ سنے تو اس کا سارا جسم سَن سَن کر کے پہلے گرم ہوا اور پھر ٹھنڈا ہوا تھا۔ یہ کسبیاں، یہ طوائفیں کتابوں کی دنیا سے نکل کر یہاں کیسے آ بیٹھیں۔ نگہت کو یہ سیکھنے میں کئی برس لگ گئے کہ لوگ کتابوں سے نکل کر دنیا میں نہیں آ بیٹھتے بلکہ کتابیں انھیں سمیٹتی ہیں جو اس دنیا میں پائے جاتے ہیں۔

"اچھی خاندانی طوائفیں تو چوک کے بالا خانوں میں بیٹھتی ہیں۔ صورتیں بھی پیاری اور زبان ایسی نفیس کہ کانوں میں رس گھلے۔ یہ نیچے گلی میں بیٹھنے والی تو تھکا تیاں ہیں تھکا تیاں۔ صورت نہ شکل بھاڑ میں سے نکل۔ میں کہوں تکے بھی کون دے رہتا ہے کمبختوں کو ـــ" زمردی بُوا ایک دن بڑبڑا رہی تھیں۔ گلی سے گزرتے ہوئے ان کی ٹکر کسی گلی والی عورت سے ہو گئی تھی۔ انھیں "ناوقت" نہانا پڑ گیا تھا اور قصبے کے گورنمنٹ انٹر کالج سے انٹرمیڈیٹ پاس کر کے آنے والی سخت پردے میں پلی ہوئی ناپختہ لیکن حساس ذہن والی سترہ سالہ نگہت نے سوچا تھا کہ ان کم بختوں کے بخت میں اتنی کمی کس نے کر دی تھی بھلا۔ سستے چونے جیسے پاوڈر کی تہوں کے پیچھے چھپے ہوئے ان بے رونق اداس چہروں اور صرف دال چاول اور آلو پر بسر کرنے والے موقوف جسموں کو دیکھ کر اس کا ذہن مکڑی کے جالوں میں الجھا الجھ کر رہ جاتا تھا۔ بارہ آنے میں جسم بیچنے والی یہ عورتیں ایک کوٹھری میں عشرت زدہ زندگی گزارنے والی یہ عورتیں، یہ کس کی بیٹیاں ہیں؟ ایسے ویسے مرد انھیں دیکھ کر ہنستے شریف مرد لاحول پڑھتے، عورتیں توبہ توبہ کرتیں، لڑکیاں بالیاں نظریں چرا کر گزر جاتیں۔

"پچھل پائیاں ـــ گھر اجاڑ ـــ" پندرہ برس بعد زمردی بُوا نے اپنی قبر میں سے سرگوشی کی ـــ تو یہ انھیں میں سے ایک تھی۔

تم ـــ تم ـــ نگہت ہکلانے لگی۔

ہاں بٹیا۔ میں کوئی دس پندرہ برس پہلے اس گلی کی ایک کوٹھری میں رہا کرتی تھی۔ وہاں سے ویسے تو کئی لڑکیاں گزرتی تھیں۔ وہ سب سر جھکائے نکلی چلی جاتی تھیں۔ مگر آپ سر گھما گھما کر اکثر ہم لوگوں کو دیکھتی رہتی تھیں۔ ہم سب آپ کے بارے میں بات کرتے تھے۔ پھر بھی آپ کے لیے پہچاننا کہاں ممکن ہوگا۔

لیکن تم یہاں کیسے؟ نگہت بوکھلاہٹ میں اس کو بیٹھنے کے لیے کہنا بھی بھول گئی تھی۔

جواب دینے سے پہلے وہ ہاتھ میں پکڑی چھوٹی سی گٹھری گود میں رکھ کر آرام سے خود ہی آلتی پالتی مار کر فرش پر بیٹھ گئی اور اسی دھیمی سی آواز میں بولی۔

"آپ کو یاد نہیں بٹیا ہم لوگوں کو سرکاری ہوم بھجوا دیا گیا تھا؟"

چچا ابا کے مکان کی چھت سے بہت سے تماشے دکھائی دیا کرتے تھے۔ تنگ سی گندی سی گلی جس کے دہانے پر کوچۂ میر انیس کا پتھر لگا ہوا تھا۔ چند گز آگے جا کر میر انیس کی قبر تھی جس کے آس پاس کچھ ٹوٹے پھوٹے مکان تھے اور چند اداس صورت بکریاں بیٹھی جگالی کرتی رہتی تھیں۔ چوڑی سُرمئی سڑک کے اس پار بڑا سا ٹیلہ، ٹیلے پر بنے گوالوں کے گھر، گوری موٹی، ناک میں چوڑی چوڑی سونے کی کیلیں اور گھیر دار لہنگے پہنے خوش حال گوالنیں۔ آسمان پر اڑتی تار ابی پتنگیں۔ سامنے شمس الدین عرف شمسو پان والے کی دوکان اور کلّے میں پان کی پیک بھرے وہ گورا سا نازک لڑکا جس کے بارے میں سلمیٰ کہتی تھی کہ وہ شمس الدین کی محبوبہ ہے اور رہنس مبلس کر لوٹ جاتی تھی۔ جاڑوں کی سرد اندھیری راتوں میں اکثر وہ لڑکا بانسری پر کسی مقبول فلمی گانے کی دھن نکالتا اور لحاف میں دبکی لڑکیوں بالیوں کے دل کھنچ کھنچ جاتے۔

اور پھر ایک دن وہ تماشا بھی دیکھا۔

نگہت اکتوبر کی گلابی دھوپ میں سوئٹر بنتی اوپر ہی بیٹھی تھی کہ اچانک بڑی سی ٹرک دنادَین آ کر رکی اس میں سے کچھ سفید پوش اترے اور کچھ باوردی پولیس والے۔ اچانک ہنگامہ ہو گیا۔ وہ ساری عورتیں بکریوں کی طرح ہنکا کر چھپا جھپ ٹرک میں بھری گئیں۔ سب کچھ بڑی خاموشی سے ہوا تھا لیکن نہ جانے کیسے لوگوں کو خبر ہو گئی۔ ان سارے مکانوں کی چھتوں پر جن کی پشت گلیارے میں کھلتی تھی، دو دو چار چار عورتیں اکٹھی ہو گئیں۔

"بڑا اچھا ہوا" شام کو زمردی بُوا حسب معمول چپاتیاں بیلتی بڑبڑا تی جا رہی تھیں۔

کم بختوں نے گلی سے شریفوں کا نکلنا دشوار کر دیا تھا۔ پھر ہر گھر میں جوان کنواری لڑکیاں موجود۔ کوئی کہاں تک ان کے کان بند کرے اور آنکھوں پر پٹیاں باندھے۔

ہمارا زمانہ تھوڑا ہی ہے کہ غیر مرد کو انگلی دکھائی پڑ گئی تو انگلی ہی کاٹ کے پھینک دی۔ چودہ برس کی ہوئیں اور بیاہ دی گئیں۔ اللہ رکھے پڑھنے جاتی ہیں ـــــ پھر وہ چولہے میں پھونکیں مارتی مارتی اچانک سر اٹھا کر نگہت کو یوں دیکھنے لگیں جیسے پہلے کبھی نہ دیکھا ہو ـــــ " اے بی تم یہاں کیا کر رہی ہو۔ مُوا دھواں آنکھوں میں گھستا ہے۔ جاؤ پڑھو جا کے۔" نگہت بُوا کی پاٹ دار آواز سے بہت گھبراتی تھی۔ ہڑبڑا کر باہر نکل آتی۔

باہر چچی اماں کہہ رہی تھیں۔ اجی ڈھونگ ہے سب کچھ۔ دیکھنا ان میں سے آدھی تو ہوم سے نکل کر بھاگ کھڑی ہوں گی۔ بقیہ میں سے کچھ ہوم کے بدمعاشوں کے ہتھے لگیں گی۔ وہی دھندہ ذرا نفاست کے ساتھ پھر چالو ہو جائے گا۔ سیکھ چکیں یہ دستکاری اور ہو چکی ان کی اصلاح۔ بس دو چار بڑھیاں ٹھریاں کسی کام پہ لگ جائیں گی۔ اللہ اللہ خیر صلّا۔

اب ایسا بھی اندھیر نہیں ہے۔ چچا ابّا رسان سے بولے۔ بعض عورتیں مجبور بھی ہوتی ہیں۔ ان کی خواہش ہوتی ہے کہ کوئی انھیں دلدل سے نکالے۔ کم از کم ان کا تو بھلا ہو گا۔

خیر جو بھی ہو۔ بھاڑ میں جائیں۔ ہماری گلی تو پاک ہوئی اور پھر۔۔ چچی اماں آگے بھی کچھ کہنے جا رہی تھیں نگہت کو دیکھ کر رک گئیں۔ " اری نگہت، ذرا بُوا سے کہنا پان لائی تھیں بالٹی میں ڈالے یا نہیں ؟" نگہت کو معلوم تھا کہ چچی اماں کو خوب معلوم ہے کہ پان بالٹی میں پڑ چکے ہیں۔ وہ جھنجھلا کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ باہر ہوا بہت سرد تھی۔ اس نے دوپٹہ کانوں کے گرد لپیٹا اور بستر میں گھس کر کوئی کتاب پڑھنے کی کوشش کرنے لگی۔ حرف پہلے ترمرے بن کر ناچے پھر بڑی سی وین بن گئے جس کے چاروں طرف جالی لگی ہوئی تھی۔ جالی کے اندر سے طرح طرح کے چہرے جھانک رہے تھے۔ جوان چہرے، ادھیڑ چہرے، گورے چہرے، کالے چہرے، چیچک زدہ مہاسوں بھرے جالدار چہرے۔ کسی پر تمسخر تھا کسی پر افسردگی، کوئی شکوک نظر آ رہا تھا۔ کچھ جوان سی عورتیں قہقہے لگا رہی تھیں جیسے اس اچانک تبدیلی کا ان پر کوئی اثر نہ ہوا ہو۔ ایک مرتبہ نگہت کے محلے میں آوارہ جانور پکڑنے والی گاڑی آئی تھی۔ اس کی جالیوں سے جھانکنے والے کتے اور موٹے تازے بندر بھی کچھ ایسے ہی نظر آ رہے تھے ـــــ نگہت نے زبان دانتوں تلے دبالی۔ جیتی جاگتی عورتوں کو آوارہ جانوروں سے تشبیہ دینا کہاں کی بھلمنساہٹ ہے مگر ذہنی رَو بہکے تو اس کا کیا علاج۔

اس نے ذہن پر زور دیکر یہ یاد کرنے کی کوشش کی کہ سامنے بیٹھی عورت کا چہرہ اس گاڑی میں کدھر تھا اور اس پر کیسا تاثر تھا۔

" بٹیا میں کوئی چار برس ہوم میں رہی۔ وہاں سلائی سکھائی گئی ـــــ اس کے الفاظ جیسے کہرے میں سے چھن چھن کر نگہت کے کانوں میں پڑ رہے تھے۔ اس میں اللہ مارا جی نہیں لگتا تھا۔ آخر انھیں لوگوں کی معرفت ایک جگہ کھانا پکانے کی نوکری کی۔ کچھ عرصے تک ہوم کے لوگ آکر خیر خبر لیتے رہے جیسے پیرول پر چھوٹے قیدی کی لی جاتی ہے۔ صاحبِ خانہ کی بوڑھی ماں زندہ تھیں۔ انھیں معلوم ہوا کہ میں کون ہوں تو آفت مچادی اور گھر سے نکلوا دیا۔ ایک اور صاحب کے یہاں رہی۔ انھوں نے اچھی طرح رکھا مگر چار پانچ برس بعد ریٹائر ہو گئے تو معذرت کر لی۔ پھر ایک مدراسی کے یہاں رہی۔ مگر وہاں جی نہ لگا۔ نہ زبان سمجھ میں آئی نہ کھانا۔ اللہ مارا ہر چیز میں ناریل، سالن میں املی۔ اس لیے ہوم لوٹ گئی۔ ایمپلائمنٹ ایکسچینج میں نام لکھوایا۔ سو آج آپ کے یہاں بھیج دیا گیا۔

اس نے گٹھری کھول کر ڈبیا نکالی اور ڈلی تمبا کو پھانکنے لگی ـــــ الائچی لیں گی بٹیا ؟ واحد ننھی سی مریل الائچی اس نے بڑی بے تکلفی سے نگہت کی طرف بڑھادی۔

تمہارا کوئی عزیز نہیں ہے۔ نگہت نے الائچی لیتے ہوئے پوچھا۔

عزیز کہاں سے آئے گا بٹیا ـــــ جنھوں نے پیدا کیا تھا انھیں کا پتہ نہیں ہے۔ مردوں تو رونے والا نہ ملے۔ ایک بیٹی تھی۔ آپ ہی کی عمر کی ہوگی یا کوئی برس دو برس چھوٹی جس وقت آپ پڑھتی تھیں وہ بھی ہم لوگوں کے ساتھ رہتی تھی۔

مگر میں نے تو وہاں کسی کم عمر لڑکی کو نہیں دیکھا۔ اتنا تو یاد ہی ہے۔

بٹیا۔ اب آپ سے کیا چھپاؤں آپ شادی شدہ، ماشاء اللہ صاحب اولاد ہیں۔ لڑکی نِک سُک سے درست تھی۔ میرا خیال تھا کہ چوک کی منی بائی کے حوالے کر دوں تو وہاں ماحول ذرا اچھا مل جائے گا۔ ناچ گانا سیکھ لے گی۔ خبر اڑ رہی تھی کہ سرکار نے ہم لوگوں پر پابندی لگا دی ہے۔ دوڑ آنے والی ہے۔ میں جانتی تھی منی بائی ان موئے ہوم والوں کی زد سے باہر ہیں۔ ان کے یہاں کون پہنچے گا۔ پیسہ تو ان کے یہاں برستا تھا۔ اختری کو انھیں کے گھر بھجوا دیا۔ کہا نا بٹیا کہ نِک سُک سے درست تھی۔ ہاتھوں ہاتھ لی گئی۔ پھر بٹیا۔ ایک تو طوائف کی اولاد اس پر سے تربیت۔ منی بائی نے طرہ یہ کیا کہ اس کو انگریزی تعلیم بھی دلوا اس کے چہرے پر ایک سایہ سا آکر گزر گیا ـــــ میں جب ہوم سے نکل کر کام پر لگی تو ایک روز چپکے سے اس کو دیکھنے گئی تھی۔ بٹیا خون کا رشتہ کبھی نہ کبھی زور ضرور کرتا ہے۔ حالانکہ ڈر لگتا تھا کہ ہوم والوں کو پتہ لگ گیا یا مالک کو ہی معلوم ہو گیا تو کچھ ہنگامہ ضرور ہو گا۔ وہ بھی ناحق تنگ کی جائے گی۔

ناحق ؟ نگہت نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ تمھیں خود چاہیے تھا اسے اپنے ساتھ لے آتیں۔ آخر تمھاری اصلاح ہوئی نا ؟ کیا بُری بات ہوئی ؟

" میری اصلاح تو ہوئی ہی تھی بٹیا۔ صورت شکل آپ کے سامنے ہے چڑیلوں جیسی۔ پھر ناچنے گانے سے ہم لوگوں کو مطلب نہیں تھا۔ ایک ہی کرم آتا تھا سو اس کی عمر ہوتی ہے۔ جتنے پیسے اس گندی گلی میں ملتے تھے ان سے دو وقت پیٹ بھرنا مشکل تھا۔ پھر آپ لوگ ۔ ۔ ۔ اس نے زبان روک لی۔ اس کے چہرے پر وہی مانوس سایہ لہرایا۔ ایک سیاہ پرچھائیں جو شدید بے بسی، ذلت، خوف، رنج اور باقی بچے ہر تکلیف دہ جذبے کے امتزاج سے پیدا ہوتی ہے اور لمحے بھر کو کوڑا مارتی ہوئی گزر جاتی ہے۔

نگہت اس پرچھائیں کو سمجھتی تھی۔ اس نے یہ بھی سمجھ لیا تھا کہ وہ آپ لوگ ـــ کہتے کہتے کیوں رک گئی تھی۔

چچا ابا کے گھر کے سامنے والی چوڑی سڑک کے اس پار ٹیلے والے گوالوں نے کوڑے کا جو پہاڑ کھڑا کیا تھا اس کو وہاں سے ہٹوانے کے لیے جتنی درخواستیں بھیجی جاتی تھیں۔ اس سے کچھ زیادہ درخواستیں ان لوگوں کو گلی سے ہٹانے کے

لیے بھیجی جاتی تھیں۔

ہوم میں میں کبھی بھوکی نہیں رہی بٹیا۔ صاف کپڑے، صاف بستر وہ تازگی ہیں لیسے گندے مکروہ، ڈراونے چہرے پھر کبھی نہیں دیکھے۔ میں انھیں دیکھنا بھی نہیں چاہتی تھی، مگر اختری کی بات دوسری تھی۔ وہ بڑے آدمیوں کے بیچ چلی گئی تھی۔ اچھے کپڑے، اچھی صورت، اچھے گاہک۔ صاف ستھرا ماحول، وہ ہوم میں آتی تو پھر بھاگ جاتی۔ جو کچھ میرے لیے نعمت تھا اس کے لیے دوزخ بن جاتا۔ وہ عیش و عشرت کی زندگی وہاں کہاں۔ دوسروں کے جھوٹے برتن دھونا اور کھانا پکاکر بسر کرنا اس کے بس کی بات نہیں رہ گئی تھی۔ چوک کے اونچے بالاخانوں کی کوئی طوائف ہوم میں نہیں رہی علاوہ دو چار سن سے اتری ہوئی عورتوں کے۔ یہ بھی نشہ ہے بٹیا۔ دوڑ وہاں گئی ضرور مگر کبھی منہ بھرائی ہوگئی کبھی کچھ خانہ پری کے لیے پکڑ کر آئیں تو پھر بھاگ نکلیں کسی عنوان۔ کچھ نے چولا بدل لیا ناچ گانے کے اسکول کھول لیے۔

آپ مجھے رکھیں گی بٹیا؟ اس نے گٹھری کھول کر دو مڑے تڑے کاغذ نگہت کی طرف بڑھائے۔ ایک ہوم سے ملا ہوا نیک چلنی کا سرٹیفکٹ تھا اور دوسرا اس کے پہلے مالک کا سرٹیفکٹ۔ نگہت نے سرسری نظریں ڈالیں اور قطعی بے تکا سوال پوچھا۔

اختری کہاں ہے اب؟

اختری بمبئی چلی گئی۔ منی بائی ان جھگڑوں سے گھبرا کر حج کو چلی گئی تھیں پھر تائب ہوگئیں۔ انھوں نے اتنا کما لیا تھا کہ تائب ہو جانے میں کوئی نقصان نہیں تھا۔ وہ ذرا سارکی۔ بٹیا میں کوئی عالم مولانا نہیں ہوں مگر اتنا جانتی ہوں کہ اس دنیا میں جو کچھ بھگت لیا وہ آخرت کے عذاب سے کم نہیں تھا۔ اب میں عذاب ثواب سے بری ہوں اس لیے کچھ عرصہ پہلے میں نے سوچا کہ اختری کے پاس چلی جاؤں اور باقی دن ایک کونے میں بیٹھ کر اس کا گھر در دیکھ کر کاٹ دوں۔ شاید اللہ قسمت اچھی کرے اور کوئی دیوانہ اس سے شادی کرلے اور اس کے بال بچے ہوں ــــ میں اکثر اختری کے بچوں کا خواب دیکھتی تھی ــــ مجھے بچوں سے بڑی محبت ہے ــــ مگر بٹیا میں بمبئی پہنچی تو دوسرا کارخانہ دیکھا۔ اختری کو دیکھ کر لگا کہ پہلے لاکھ شکل کی اچھی رہی ہو مگر پہلے ناتراشیدہ ہیرا تھی۔ منی بائی کی تربیت نے اس میں اتنی چمک پیدا کردی تھی کہ دیکھے سے آنکھیں چندھیائیں۔ گھر کے اندر گھسو تو جنت کا سماں۔ گدگدا قالین جس میں گھٹنے دھنسیں۔ لمبا سا صوفہ ــــ لمبی سی گاڑی ــــ وہ اللہ مارا فرج پہاڑ جیسا۔ جگ مگ کرتے کپڑے گہنے، خوشبوئیں اور اس کے پاس کیسے کیسے لوگ آتے ہیں کہ یقین نہ آئے۔ میں لکھنؤ جیسے شہر میں رہی۔ ہزار اچھے چہرے دیکھے مگر ان لوگوں کو دیکھ کر آنکھیں پھیل گئیں۔ مجھے اپنے وجود سے نفرت ہونے لگی۔ کیسی غلاظت میں زندگی بسر کی تھی میں نے۔ موری کے کیڑے کی طرح۔ اسی لیے جب اختری نے مجھ سے کہا کہ اماں تم یہاں سے چلی جاؤ تو بہتر ہے۔ میں تمھیں گزارا بھیج دیا کروں گی۔ تو مجھے قطعی برا نہیں لگا ــــ اس کے چہرے پر وہ جانی پہچانی سی پرچھائیں پھر رینگی۔ سیاہ چہرہ پل بھر کو اور سیاہ ہوگیا ــــ میں نے پھر خدا کا شکر ادا کیا کہ میں ہوم میں لے جائی گئی تھی اور میں نے صاف ستھرے طریقے سے پیٹ پالنے کا طریقہ سیکھ لیا تھا۔ دوسرے ہی دن میں واپس آگئی۔ اختری کو

غزل

تشنہ بلگرامی

پھر عرصۂ حیات ہوا جا رہا ہے تنگ
ہر گام زندگی کی کشاکش ہے ایک جنگ

ہیں ساکنانِ شیش محل خود سے بے خبر
میرے لیے جو پھرتے ہیں ہاتھوں میں لیکے سنگ

شعلہ تھے کل جو آج وہی سرد ہو گئے
میں کیا کہوں شباب میں کیسے تھے شوخ و شنگ

اک عمر انتظار میں جن کے گزار دی
کیوں آج کر رہے ہیں وہی مجھ سے عذرِ لنگ

اِک لمحہ بھی قرار نہیں اس حسین کو
سیماب کی طرح سے تھرکتا ہے انگ انگ

وہ شوخیوں کے ساتھ لڑکپن کا ساز باز
یہ کمسنی اور اس پہ یہ اٹھتی ہوئی اُمنگ

میں شاعرِ غریب ہوں مختارِ شہر وہ
مجھ سا حقیرِ راز کہاں اور وہ دبنگ

تشنہ وہ میرے حال پہ جب مہرباں ہوئے
نکھرا جہاں میں اور مری شاعری کا رنگ

میں نے اپنا پتہ نہیں بتایا۔ وہ دوسری دنیا کی باسی ہے جہاں رہے خوش رہے۔ قدرے توقف کے بعد وہ بولی ــــ میں نے اسے خوش دیکھ لیا میں بھی خوش ہوں۔ میں نے جسم بیچ کر فاقے کیے تھے۔ وہ بھی جسم بیچتی ہے مگر اسے سارے عیش حاصل ہیں۔ چار لوگوں میں عزت بھی ہے۔ اسے دیکھ کر کوئی ناک بھوں نہیں چڑھاتا۔ مائیں اپنی بیٹیوں کو اس سے بچ کر گزر جانے کی نصیحت نہیں کرتی ہوں گی۔ اس نے ذرا فخر سے کہا۔ کس کی مجال اس کے گھر پر چھاپہ مارے۔ . . . یہ چھاپے تو ہمیں لوگوں پر پڑتے تھے بٹیا ــــ اس کو چھونے کی ہمت کس کو ہے؟ منی بائی کو کس نے پکڑا تھا! چاندی کے ہاتھ بٹیا کبھی کبھی سماج اور قانون دونوں کے ہاتھوں سے لمبے ہو جاتے ہیں۔ اس نے نظریں جھکا لیں۔

پتہ نہیں آپ مجھے رکھیں گی بھی یا نہیں؟ سائیں سائیں کرتی خاموشی اسی نے توڑی۔

پندرہ برس پہلے نگہت کا جی چاہا تھا کہ وہ گندی اَستے میک اپ میں لپٹی ہوئی بارہ آنے میں جسم بیچنے والی ایک پھٹکار ماری عورت کو گلے سے لگا کر رو پڑے۔ وہ عورت جس سے ٹکر ہو جانے پر زمرد بوا آکر نہائی تھیں ــــ اس کے گلے میں کچھ اٹکنے لگا۔ آج وہ عورت نہا دھو کر اس کے در پر آئی تھی۔

”آؤ تمھیں ننھے سے ملاؤں۔ دوسرے کمرے میں ہے۔ تمھیں اس کی دیکھ بھال کرنی ہے۔“ وہ اٹھتی ہوئی بولی۔

نویدِ سحر

ملک تاسے

فسردہ شام، سیاہی، مہیب سناٹے
یوں جیسے آج زمانہ نقیبِ حسرت ہو
زمیں سے تابفلک ماتمی نظارے سے
کسی کے سوگ میں گویا نگارِ فطرت ہو

وہ دور حدِ نگاہ ارغواں سی لہروں میں
ہوا ہے مہرِ درخشاں کا خوں افق کے قریں
وہ جس نے کی تھی اِک عالم پہ زر نگاری سی
اس آفتابِ جہاں تاب کا نشاں بھی نہیں

فضا کے سینے پہ لرزاں کہر کا آنچل سا
شفق کے گال سے غازہ اترتا جاتا ہے
سمٹ رہے ہیں اُجالے کے سیمگوں شہپر
اندھیری رات کا چہرہ اُبھرتا جاتا ہے

قبائیں تن گئیں آسیب کی نہالوں پر
لچیلی بیل سیہ ناگ بن کے لہرائی
گھٹا نے بڑھ کے بجھا دیں فلک کی قندیلیں
سبوئے تیرہ سے شب نے سیاہی چھلکائی

حزیں نہ ہو دلِ شوریدہ! اس نظارے سے
کہ اس میں پرتوِ تعمیرِ صبح پنہاں ہے ...
لپک کے پھوٹ پڑیگی جو بامِ گردوں سے
وہ شوخ و شنگ کرن بھی اسی میں رقصاں ہے

یقین رکھ کہ اندھیرا ابھی شب کا پگھلیگا
یہیں سے ایک نیا آفتاب نکلیگا

غزلیں

عبدالمجید شمس

زعم میں جس نے سر اُٹھایا ہے
آسماں نے اُسے گرایا ہے

جب بھی دستِ دعا اٹھایا ہے
جو بھی مانگا ہے میں نے پایا ہے

دل رہے ہوس سے بیگانہ
کم ہی چاہا ہے، کم ہی پایا ہے

جب بھی دھیمی پڑی ہے شمع کی لو
ہر پروانہ کام آیا ہے

فکرِ سود و زیاں سے اکتا کر
مایۂ عقل کو لٹایا ہے

ہوکے پامال ان کے قدموں میں
آج دل نے قرار پایا ہے

جب بنایا نہ اپنا آئینہ
مجھکو کیوں آدمی بنایا ہے

یہیں بنتی، بگڑتی ہیں شکلیں
جگ سے کوئی گیا نہ آیا ہے

موت کو جان کر حیاتِ نو
زندگی کا سراغ پایا ہے

شمس اس کاروبارِ اُلفت میں
جس نے کھویا ہے اس نے پایا ہے

حمید عظیم آبادی

پتھر ملے کسی سے تو پتھر ہی لے چلیں
دستِ کرم سے جو ملے ہنس کر ہی لے چلیں

پھینکی کسی نے خاک جو سر پر نہ ہے نصیب
در کی یہ اس کے خاک ہے سر پر ہی لے چلیے

آتا نہیں قرار دلِ ناصبور کو
آؤ اب اس کو کوچۂ دلبر ہی لے چلیں

در سے ۔ ۔ کے جائیں تو خالی ہی جائیں کیوں
تھوڑی سی بوئے زلفِ معنبر ہی لے چلیے

غمہائے جاں گداز وہ دیکھے بچشمِ خود
جانِ حزیں کو نزدِ ستمگر ہی لے چلیں

تصویرِ درد، خاک بسر، چشم اشکبار
در پر ہم اس کے آج یہ منظر ہی لے چلیے

احساسِ بے رخی تو ہو یار کو کسی طرح
شکووں کا اس کے سامنے دفتر ہی لے چلیں

آئے بھی تو وفا کا کس طرح اعتبار
وہ سر جو مانگتے ہیں تو پھر سر ہی لے چلیے

ہوگا حمید اب نہیں شاید علاجِ غم
آؤ غمِ حیات کو دل پر ہی لے چلیں

رونق دکنی سیمابی

"کوئی کام آئے گا" یہ روگ نہ پالو لوگو
اپنے بل آپ مقام اپنا بنا لو لوگو

یہ الگ بات ہے، دے عمر اگر وقت کا ساتھ
وقت کو عمر کے سانچے میں نہ ڈھالو لوگو

جامہ زیبی نہ کہیں اپنی ملوث ہو جائے
دیکھو کیچڑ ہے، مناوروں پہ اچھالو لوگو

خیر مقدم ہے اجالوں کا سیہ خانے میں
درِ خوش آب سے پلکوں کو سجالو لوگو

دیر پا ہوتے ہیں یہ داغ! ذرا یاد رہے
دامنِ تر کو جو اشکوں میں کھنگالو لوگو

وہ جمے موسمِ سفاک کا خطرہ ہے بہت
بھری برسات میں اس کو نہ نکالو لوگو

درجۂ آگہی دیتا ہے جنوں کو رونق
اس کی آشفتہ طبیعت کو سنبھالو لوگو

محمود رائے بریلوی

کوئی تو حادثہ گزرا ہے دل پر
شبِ غم آج نورانی بہت ہے

اِدھر ہی تشنۂ دیدار کم ہیں
اُدھر تو جلوہ سامانی بہت ہے

کسے راس آئے سودائے محبت
منافع کم پریشانی بہت ہے

زباں ہے رہنِ ذکرِ حور و غلماں
خیالِ پاکدامانی بہت ہے

خود اپنے آپ کو پہچان جائے
یہیں تک فکرِ انسانی بہت ہے

دلوں پر تہ بہ تہ ظلمت کے پردے
جبیں پر نورِ ایمانی بہت ہے

کرو محمود قسمت پر قناعت
جو مل جائے بآسانی بہت ہے

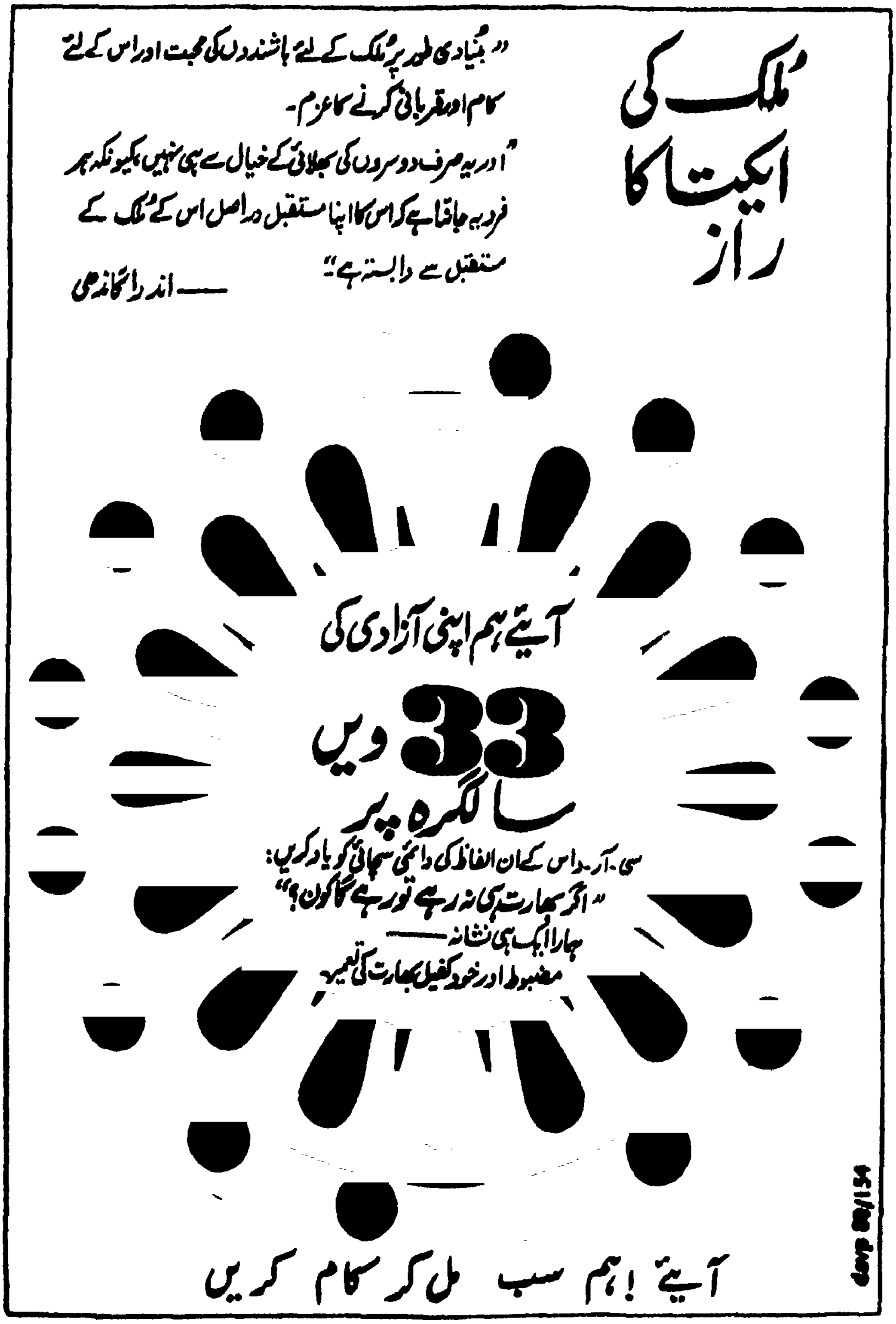
ملک کی ایکتا کا راز
"بنیادی طور پر ملک کے لئے باشندوں کی محبت اور اس کے لئے کام اور قربانی کرنے کا عزم۔
اور یہ صرف دوسروں کی بھلائی کے خیال سے ہی نہیں بلکہ ہر فرد یہ جانتا ہے کہ اس کا اپنا مستقبل دراصل اس کے ملک کے مستقبل سے وابستہ ہے۔"
—— اندرا گاندھی
آیئے ہم اپنی آزادی کی
33 ویں
سالگرہ پر
سی۔آر۔داس کے ان الفاظ کی دائمی سچائی کو یاد کریں:
"اگر بھارت ہی نہ رہے تو رہے گا کون؟"
ہمارا ایک ہی نشانہ ——
مضبوط اور خود کفیل بھارت کی تعمیر
آیئے! ہم سب مل کر کام کریں
davp 80/154

فضل امام ملک

سائے کا تعاقب

میں کوئی شہری بابو نہیں تھا۔ میری نسوں میں تو جوار اور مکّا کی روٹیوں سے بنا خون دوڑ رہا تھا۔ میرے جسم سے آج بھی دیہات کی مٹّی کی سوندھی سوندھی مہک اٹھتی ہے۔ بچپن کے وہ سہانے دن اب بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑ رہے تھے۔ بندھے ٹکے سنسکار جس میں جکڑے ہم اور ہمارا سماج۔ سنسکاروں سے پیچھا چھڑانا ہی مشکل ہے چاہے وہ گاؤں کا ہو، محبت کا ہو یا مذہب کا۔

مجھے بچپن میں اپنی پیاری دادی امّاں سے سنی کہانی یاد آگئی۔ جب ایک راجکمار نے بھکارن سے شادی کرا سے محل میں راجکماری بنا کر بیٹھا دیا پر بھکارن لڑکی کی مانگنے کی عادت نہ چھوٹی وہ روز راجکماری بن کر بھی "طاق بی بی ایک نوالہ" کہہ کر طاق سے بھیک مانگ کر کھایا کرتی تھی۔ نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا راجکمار نے اسے محل سے نکال دیا اور وہ پھر بھکارن بن کر در در کی بھیک مانگنے لگی۔ لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ایک جگہ ٹک کر نہیں بیٹھتے۔ جیسے کہ میں۔

اپنے جیون کے ساڑھے چار سال میں نے اس خوبصورت بھاگلپور میڈیکل کالج میں گزارے اور تب ہی یہ خیال آیا کہ "گیدڑ کی جب موت آتی ہے تب وہ شہر کی طرف بھاگتا ہے۔" میں بھی اس زمرے میں خود کو شامل کرلوں تو غلط نہ ہوگا۔ راما دھین کالج سے آئی۔ایس۔سی کرنے کے بعد میں نے اس میڈیکل کالج میں داخلہ لے لیا۔ کسی سفارش کے بل بوتے نہیں بلکہ اپنی محنت سے میں نے میڈیکل لسٹ میں کافی اچھے نمبر لائے تھے۔ اپنے اکیڈمک کیریئر پر مجھے فخر تھا اور کیوں نہ ہوتا۔ مڈل سے لے کر ہائی اسکول پھر آئی ایس سی۔ بچپن سے لے کر اب تک میں نے ہر امتحان اچھے نمبر سے پاس کیے۔ میں نے آج تک صرف ڈھیروں نمبر ہی تو کمائے تھے۔ اپنی محنت سے اس لیے کہ میں جانتا تھا کہ مجھے ان نمبروں کے سہارے ہی زندگی گزارنی ہے۔ اپنی حیثیت سے بڑھ کر میں نے زندگی جینے کی کوشش کی تھی۔ قسمت مہربان تھی ہر قدم پر اس نے میرا ساتھ دیا میں کامیابی کی منزلیں طے کرتا آگے بڑھتا رہا۔ وہ میرے سپنے دیکھنے کے دن تھے۔ زندگی میرے سامنے ایک خوشنما صبح کی طرح تھی۔ میں نے اپنی شخصیت کو ایک کنجوس کی طرح تجوری میں قید کر دیا تھا۔ کالج میں ہونے والی پارٹیوں سے غائب ہونے پر مجھے طنز کا نشانہ بنایا جاتا۔ مجھے جاہل، گنوار، دیہاتی کے خطاب سے نوازا جاتا۔ پسند نہ کرتے ہوئے بھی مجھے ناپسند نہ کرتے یوں سمجھئے میں بخار میں دی جانے والی کونین کی گولی تھا۔ جس کی کڑواہٹ صحت مند ہونے کے بعد

بھلی معلوم پڑتی۔ ناٹک ہو یا ڈبیٹ (Debate)، کوی سمیلن ہو یا مشاعرہ، شرام کا ہونا ضروری ہوتا۔ منتیں کر کے کھردری شخصیت کو سامنے لایا جاتا اور پھر "وشرام" یعنی میں گنوار کہلانے والا دیہاتی نوجوان شہری تہذیب پر عمل کرنے والوں کا نیتا بن جاتا۔ ایسا نہیں کہ میں نے مات نہیں کھائی ہو لیکن امّاں کی ممتا اور پیار، باپو کے بتائے ہوئے اصولوں نے ہر قدم پر میرا ساتھ دیا۔ ہر ہار کے بعد میں کامیاب انسان کی مانند دھول جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوتا۔ باپو کے وہ سپنے جو بڑے بھیّا نے پورے نہیں کیے تھے مجھے ہی تو پورے کرنے تھے۔

مجھے مشکلات کا سامنا تب کرنا پڑا جب گھر سے روپئے آنے کم ہوگئے۔ میڈیکل کی پڑھائی کا خرچ آسان تو نہیں۔ بھٹّے کے چھلکے کی طرح میرے اصولوں کے چھلکے اترنے شروع ہوگئے۔ کچھ ہی دنوں میں میں ننگا ہوگیا۔ مجھ پر میس کا چارج اتنا چڑھ گیا کہ اتارنا مشکل۔ دوستوں کے سامنے ہاتھ پھیلائے لیکن کوئی حل نہ نکلا۔ بات دھیرے دھیرے ڈین کے کان تک پہنچی اور تب مجھے ان سے سودا کرنا ہی پڑا۔ اپنے سپنے جو میں نے سجائے تھے اسے پورا کرنے کے لیے مجھے اپنے ضمیر کو گروی رکھنا پڑا۔ ڈین نے میرے ذمہ کا تمام قرض اپنی جیب سے ادا کردیا بدلے میں مجھے "ٹیوشن کم ناز و نخرہ اٹھانے" کی نوکری کرنی پڑی ان کی بدشکل اور بدنام بیٹی سپنا کی اکثر میں اب اپنی تصویر میں ایک دیو کو منھ پھاڑے دیکھتا جو مجھے نگلنے کے لیے بے تاب رہتا۔ میرے تن پر کرتے پائجامے کی جگہ بیل باٹم اور شرٹ نظر آنے لگی۔ سلیپر کی جگہ ہائی ہیل کے جوتوں نے لے لی تھی۔ میرے تن پر نئے فیشن کے کپڑے ہوتے۔ ہاتوں میں سپنا کا ہاتھ رنگین شام ہوتی اور دماغ میں گھوڑے دوڑتے رہتے ایک بڑا ڈاکٹر بننے کا باپو کے سپنے کو پورا کرنے کا۔

ساتھیوں میں میری عزّت اب دوگنی تھی اب میں شیشے کا ٹکڑا نہیں بلکہ تراشا ہوا ہیرا تھا۔ یہ میری اس شاگرد بلکہ اگر سچ پوچھا جائے تو گرو کا احسان تھا کہ میں آج ڈاکٹر بن گیا تھا۔ آج کالج میں میرا آخری دن تھا۔ ہاسٹل میں مجھے آخری رات کاٹنی تھی میں یہاں سے جلد سے جلد بھاگ جانا چاہتا تھا۔ مجھے تنہائی کی ضرورت تھی۔ شہری سماج کی بیماریوں سے دور جہاں نفرت کے تھپیڑے نہ تھے، جہاں لوگ اپنے محور پر نہیں گھومتے، جہاں کے لوگوں کے من میں نفرت کی جونک نہیں چمٹی رہتی بلکہ مجھے پیار کی ٹھنڈک چاہیے تھی۔ جس کے سائے تلے میں نے اپنے بچپن کے پل بتائے تھے۔

دوست اور ساتھی مجھے آج سی آف کرنے آئے تھے۔ وہ میرے مضبوط دیہاتی جسم اور سیدھے سادے اصولوں سے متاثر تھے۔ ہاتھ ہلے، بردوان گیا فاسٹ پسنجر نے ایک تیز سسکاری بھری اور گاڑی نے بھاگلپور اسٹیشن کو چھوڑنے کے لیے اپنے قدم بڑھائے۔ چھک .... چھک ..... چھک ...... دیکھتے ہی دیکھتے گاڑی نے پلیٹ فارم چھوڑا اور تھوڑی دیر کے بعد شہر کے حدود سے بھی باہر نکل گئی وہ شہر جہاں میں نے زندگی کے پانچ سنہرے سال بتائے تھے۔ اب دور دور تک ہرے بھرے کھیت، درخت، گاڑی کے ساتھ بھاگتے نظر آرہے تھے۔ میرے نس نس میں ایک انجانی مسرت سما گئی تھی۔ گاؤں کی سوندھی سوندھی مہک ابھی سے میرے نتھنوں سے میرے نس نس میں سرائیت کر رہی تھی۔ بچپن کے ساتھی بنّے آرزو، پرہلاد کیلاش ، شیام سندر سبھی یاد آرہے تھے۔ جن کے ساتھ گاؤں کی گلی میں گلی ڈنڈا کھیلتا تھا، لٹو اور گولیوں سے دل بھی بہلاتا تھا۔ آم کے باغ سے آم چراتا تھا اور تو اور اپنی شرارت سے پنڈت جی کو بھی نہ بخشتا تھا۔ آج کتنے سالوں کے بعد گاؤں جا رہا ہوں میں .....

پہلی بار آنے کے بعد پھر نہیں گیا تھا۔ جب بھی چھٹیوں میں گھر جانے کی سوچا باپو نے مناہٹ لکھ بھیجتی تھی۔ "کیا فائدہ یہاں آنے کا اور خرچ ہی ہوگا" ان کی باتوں کو ٹالنے کی ہمت نہ کر سکا تھا۔ آج میں جب گاؤں جا رہا ہوں تو گاؤں کی دھرتی پکارتی سی لگ رہی ہے۔ ماں کی طرح یہ ہری بھری دھرتی کتنی اپنی ہے تب ہی تو میں نے فیصلہ کیا تھا کہ پریکٹس اپنے گاؤں میں ہی شروع کروں گا۔ غریب لوگوں کے دکھ درد کو بانٹ کر ان سے محبت اور خلوص پاؤں گا۔ پتہ نہیں کیوں باپو نے ایک بار لکھا تھا "یہاں کا حال ٹھیک نہیں وشو۔ وہیں کہیں نوکری کرلے ہم بھی تیرے ساتھ ہی رہیں گے۔ ڈین کی سفارش سے نوکری ملنا مشکل نہ تھا لیکن سپنا کے ساتھ نباہ وہ سپنے میں بھی نہیں کر سکتا تھا۔ شہر میں رہ کر اس سے پیچھا چھڑانا مشکل تھا۔ وہ جونک کی طرح چپٹی رہتی تھی۔ پھر دیکھو کر سکتی کون نکلتا ہے؟ وہ گاؤں میں ہی پریکٹس کرے گا۔ اپنا گاؤں۔ اپنی دکان۔ شان سے رہے گا وہ۔ پھر اماں شادی کے لیے زور دے گی ہی شاید کوئی لڑکی کو اس بیچ دیکھ بھی لیا ہو اس نے۔ تبھی سامنے کی سیٹ پر شرارت کرتے ہوئے بچوں نے کچھ گرا دیا۔ اس کے ذہن کے پردے پر بڑے بھیا کے بچوں کی تصویر ابھر آئی۔ کیسے ہوں گے وہ کتنے بڑے ہو گئے ہوں گے؟ اس نے اس کے لیے کچھ کھلونے خریدے تھے۔ پونم بھی تو بڑی ہو گئی ہوگی۔ شہر آتے وقت تو وہ پورے گیارہ سال کی تھی۔ آتے وقت باہوں میں جھول کر کہا تھا "بھیا! کتنا بڑا ہوگا کالج تمھارا؟ تمھارے ساتھ تو لڑکیاں بھی پڑھیں گی نا" پھر اپنے ہی جواب دیا تھا "ہائے دیا سرم نہیں لگے گی انھیں" پگلی اب تو وہ شادی کے قابل ہو گئی ہوگی بھابی کیسی ہوں گی۔ وہ سب کے بارے میں سوچتے سوچتے اس کی آنکھیں جھپکنے لگی تھیں تھوڑی دیر کے بعد ہی وہ نیند کی گود میں تھا۔ دوسری صبح جب آنکھ کھلی تو گاڑی کیول اسٹیشن پر کھڑی تھی۔ اب اپنا اسٹیشن کچھ ہی دور رہ گیا ہے۔ ہلکی تازی ہوا میں اپنے پن کی خوشبو تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ گاؤں کے اسٹیشن پر تھا۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا سب ویسے کا ویسا ہی تھا جیسے چھوڑ کر گیا تھا۔ پیٹھ پر ایر بیگ لٹکایا ہاتھ میں ٹرنک اور اسٹیشن سے باہر آگیا۔ گاؤں کی سونی پگڈنڈی نے ہنس کر اس کا سواگت کیا۔ شہر کی بھیڑ بھاڑ کے بعد یہ سکون اچھا لگا۔ گھر پہنچنے میں اب زیادہ دیر نہیں لگے گی کتنا مزہ آئے گا ..... جب .... سب کے سامنے اچانک پہنچ کر کھڑا ہو جاؤں گا۔ اماں اپنی بوڑھی نگاہوں سے میری بلائیں لیں گی۔ پونم تو پہچانے گی بھی نہیں اور راجو تو اب میٹرک میں آگیا ہوگا۔ تعجب ہوا اسے آخر کیوں ابھی تک چھوٹے بھائی کی یاد کیوں نہیں آئی بازار میں ایک بار یاد آئی تھی اور اس نے ایک فاؤنٹین پن خرید بھی لیا تھا۔ اسے دینے کے لیے لیکن من میں پیار کا ساگر نہیں امنڈا تھا۔ باپو نے لکھا تھا بگڑ گیا ہے۔ چھ ماہی امتحان میں فیل ہو گیا ہے۔ پچھلے سال بھی تو فیل ہو گیا نہیں تو اس بار کالج میں ہوتا۔ دیکھوں گا اب کیسے نہیں پڑھتا بس کچھ ہی فرلانگ تو بچے ہیں۔ یہ نالی ندی ہے جس کا پانی گاؤں کے لوگوں کو جیون دیتا ہے اور یہ شاہ انور کا تکیہ ہے۔ باپو کہتے ہیں، بہت بڑے پیر تھے یہ۔ اور یہ بیچ کھیا آم کا باغیچہ جہاں سے آم چرایا کرتے تھے۔ سندر بھی تو ساتھ رہتا تھا۔ دینو کاکا کا لڑکا۔ جانے اب کہاں ہو؟ کیسا ہوگا؟ اسی آم کے باغیچہ میں تو گلی ڈنڈا کھیلا کرتے تھے، گولیاں بھی کھیلتے تھے۔ اسکول سے دوپہر میں آتا تو یہیں چوکڑی جمتی لیکن باپ رے باپ کیا مجال جو رات کو کبھی ادھر آئے ہوں۔ لوگوں کا کہنا تھا اس پر بھوت رہتے ہیں۔ کیا پتہ ابھی بھی رہتا ہو ..... اور یہ پاٹھ شالا ہے جس میں بچپن کے پل بیتے ہیں۔ چڑیوں کی چہچہاہٹ فضا میں ایک مدھر راگ چھیڑ رہی تھی مانو وہ بھی میرا سواگت کر رہی ہو۔ گلی میں پہنچتے ہی کئی دروازوں کے پیچھے سے جھانکتی آنکھوں کی چبھن محسوس ہوئی مگر پلٹ کر دیکھتے ہی دروازے بند ہو گئے تھے۔ مجھے احساس ہوا کہ اب میں شہری زیادہ لگنے لگا ہوں۔ جسم پر بیل باٹم گردن تک بڑھے ہوئے بال، ہائی ہیل کا جوتا۔ اور ہلکی چال نے لوگوں کے لیے مجھے اجنبی بنا دیا تھا۔ دور سے ہی کنوئیں پر داتن کرتے باپو دکھائی دیئے۔ جوتوں کی آہٹ پر انھوں نے گھور کر دیکھا۔ جلدی سے کلی کیا انگوچھا سے ہاتھ پونچھا تب تک میں ان کے پاس پہنچ گیا تھا:

"ارے وشوا تو۔ چٹھی بھی نہیں دی کب چلا ......"

میں نے پیر چھوتے ہوئے انھیں غور سے نہارا۔ ان کا پیر کانپ رہا تھا۔ کھڑے ہونے کے لیے لاٹھی کا سہارا لیے ہوئے تھے۔ آواز میں بھی وہ کھنک نہ تھی جو برسوں پہلے تھی جس سے ہم لوگ تھرّا جاتے تھے۔ اپنے عمر سے کہیں زیادہ دکھائی دیئے وہ مجھے۔ تبھی انھوں نے ایک زور کی ہانگ لگائی۔ "را..... ج .... و"

میں نے دیکھا راجو دھیرے دھیرے آرہا ہے اس کے ہونٹوں کے اوپر سبزی چھا گئی تھی۔ اپنی لال لال آنکھوں سے اس نے مجھے تاکا شاید ابھی سو کر اٹھا تھا۔ پھر میرے پاؤں چھو کر ٹرنک ہاتھ سے لے لیا۔ دہلیز پر اماں ملیں۔ کئی بار پلکیں جھپکا کر پوچھا "کون؟"

"پہچانا نہیں اماں میں وشو ہوں" پیر چھونے جھکا تو بیچ میں ہی روک لیا اماں نے۔

"ٹھہر وشو تیرے کپڑے خراب ہو جائیں گے"

وہ جلدی سے اٹھ کر کمرے کے اندر چلی گئیں۔ میں نے صاف دیکھا تھا ان کی

دھندلی دھندلی آنکھوں میں ایک انوکھی چمک۔ میں نے آنگن سے آواز دی۔

"پونم کدھر ہے امّاں؟"

میری پکار پر جو لڑکی میرے سامنے آئی وہ میرے تصوّر میں بسی پونم کی طرح نہیں لگی۔ میلی پھٹی ساڑی میں سمٹی یوں لگ رہی تھی جیسے ہریالی چھائی ہوئے کھیتوں پر بجلی گر پڑے۔ پیلا بے رونق چہرہ۔ گڈھوں میں دھنسی آنکھیں جن کے چاروں طرف کالا پن صاف نظر آرہا تھا۔ میری سمجھ میں نہ آرہا تھا۔ باہر سے اپنے پن کی بو دیتی ہوئی دھرتی گھر میں آکر غیریت میں کیسے بدل گئی تھی۔ میں نے چلّانا چاہا۔ پوچھنا چاہا "یہ کیا ہو گیا ہے سارے گھر کو۔۔۔۔۔۔" لیکن لگا کسی نے میری زبان کو کاٹ ڈالا ہو۔ اب صرف بھیّا اور بھابی کو دیکھنا باقی تھا۔ بچّوں سے ملنے کا ارمان ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ میری خواہش دھیرے دھیرے دم توڑ رہی تھی۔ امّاں سے پوچھنے پر پتہ چلا کہ بھیّا ابھی دیر سے سوکر اٹھیں گے۔ مجھے یاد آگیا تبھی ہو نہ ہو افیم کی پنک میں پڑے ہوں گے۔ بچپن میں بھنگ کھانے کی عادت تھی دھیرے دھیرے باپو نے ہی ہار مان لی۔ نظر گھما کر دیکھا چھپّر کے نیچے دو مریل سے بیل اور ایک بوڑھی گائے نادوں کو نہار رہے تھے تبھی باپو آئے ناد میں تھوڑا چارہ ڈالا اور دودھ دوہنے بیٹھ گئے۔

"وشو ادھر آ کھاٹ پر بیٹھ" امّاں نے بلایا تو یاد آیا میں ابھی تک کھڑا تھا۔ بیگ رادھا کو تھما کر اور مٹھائی نکالنے کو کہہ میں جھلنگی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ میرے بیٹھتے ہی کھاٹ چر۔۔۔ مر۔۔۔ چر۔۔۔ مر۔۔ کہہ چرمرا اٹھی مانو درد سے کراہ اٹھی ہو۔

"امّاں ایسا کب سے ہے؟ مجھے خبر تک نہیں کی باپو نے۔"

"کیا ہوتا لکھ کر بیٹا۔ تو پھر کیا کر لیتا آکر کے پھر وہ کب سنتے ہیں کسی کی۔"

اپنی بوڑھی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو کو انھوں نے تار تار ہوئے میلے آنچل سے پونچھ لیا۔ مجھے یوں لگا تھا کہ میرے آنے سے امّاں کے سوا کسی کو کوئی خوشی نہ ہوئی تبھی پونم ایک سوکھے مریل سے بچّے کو اٹھا کر لے آئی "شبّو! دیکھ چاچا ہیں نمستے کر۔"

شبّو جس کے ہاتھوں میں میری لائی مٹھائی کا ٹکڑا تھا پونم کے کلیجے سے اور چپک گیا تھا۔ چاہ کر بھی میں اس کو گود نہ لے سکا۔ ایک دہشت میرے اندر سرسرانے لگی۔ امّاں نے کھلونے نکال کر اسے تھمائے تو میں نے ساڑیاں بھی نکال دی۔ امّاں نے اِدھر اُدھر تاکا پھر ایک نظر ساڑیوں پر ڈالی اور چپکے سے ٹرنک میں رکھ دیا۔ میں حیرت زدہ رہ گیا پر کچھ بولا نہیں۔ میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آرہا تھا۔ گھر کے اس عجیب و غریب ماحول میں میں اپنے آپ کو ایک اجنبی سا محسوس کر رہا تھا۔ گھر کے ماحول نے میرے اندر سمائی وحشت کسی جونک کی مانند چپٹ گئی تھی جسے میں نے چاہ کر بھی نہ چھڑا پایا تھا۔ چائے تک امّاں ہی اِدھر اُدھر کی گپیں ہانکتی رہیں۔ باپو لڑکھڑاتے ہوئے کھیتوں کی اُور چلے گئے تھے۔ ان کی لاٹھی کی آواز دیر تک میرے ذہن میں گونجتی رہی۔ لاٹھی کی کھٹکھٹاہٹ میرے دماغ سے ابھی بھی ٹکرا رہی تھی ٹھیک اسی طرح جس طرح لوہار کے ہتھوڑوں کی چوٹ لوہے پر پڑتی تھی۔ بہت دیر بعد بھائی صاحب نظر آئے، پاؤں چھونے پر انھوں نے کچھ نہیں کہا۔ پونم نے منجن کی ڈبیا اور انگوچھا لاکر تھما دیا انھیں اور وہ باہر کنوئیں پر چلے گئے۔ وہاں کا پھیلا سنّاٹا اندر ہی اندر مجھے کھاتے جا رہا تھا اپنے آپ میں نگلتا جا رہا تھا۔۔۔

کرنے اور کہنے کو اب کچھ بھی نہ بچا تھا شاید۔ راجو اور بھائی صاحب اسکول چلے گئے۔ جس اسکول میں راجو پڑھتا تھا بھائی صاحب اسی اسکول میں ٹیچر تھے۔ بھابی انھیں کھانا کھلانے کے بعد بچّوں کی دنیا میں گم ہو گئی تھیں۔ بچّے ابھی بھی اتنے ہی گندے تھے ان کے رونے چلانے اور پٹنے کی آوازیں بھی آرہی تھیں برابر شاید وہ کھلونے اور مٹھائی کے لیے آپس میں لڑ رہے تھے۔ انھیں مجھ سے کوئی مطلب نہیں تھا۔ بارہ بجے کے قریب جب کھانا کھانے بیٹھا تو انھیں دیکھا۔ پہلے کی بھابی اور ابھی کی بھابی میں زمین و آسمان کا فرق آگیا تھا۔ ابھی تو انھوں نے پچیس سال بھی پورے نہیں کیے تھے۔ لیکن آج مجھے وہ اپنے عمر سے دوگنی نظر آئیں۔ ان کے ہونٹوں کی ہنسی بھی اب نہ جانے کہاں غائب ہو گئی تھی چڑچڑاہٹ اور بے بسی ان کے ہر انداز سے صاف نظر آتی تھی۔ انھوں نے تھالی میرے آگے رکھ دی چپ چاپ۔ میں بھی چپ ہی رہا بولنے کی ہمّت نہ کر سکا۔ میں سوچ رہا تھا اس گھر کو کیا ہو گیا۔ گھر کی بھیانک شانتی میں بھی مجھے آشانتی نظر آرہی تھی۔

کھانا کھانے کے بعد میں اوپر اپنے کمرے میں ایک لمبی مدّت کے بعد گیا تھا۔ جیسے ہی کمرے کے پاس پہنچا تو لگا کوئی اندر دھیمے دھیمے سروں میں بول رہا ہے۔ پھسپھسا رہا ہے۔ دروازے پر دستک دی اندر سے بند تھا۔ کسی نے کہا "وشرام ہوگا" پھر آواز پھٹا پھٹ۔۔۔ چر۔۔۔ مر۔۔۔ چر۔۔۔ پھر چوں۔۔۔ چوں۔۔۔ جیسے کوئی کھڑکی بند کر کے دوڑ کر کے کھاٹ پر بیٹا ہو۔ "کون ہے۔۔۔ پونم۔۔۔؟" میں نے دروازے پہ ہاتھ ڈالے۔ کافی دیر بعد ساڑی سنبھالتی پونم نے دروازہ کھولا "کیا کر رہی تھی؟"

"کچھ نہیں بھیّا۔۔۔ سوگئی تھی ذرا۔۔۔"

"تجھ سے باتیں کون کر رہا تھا۔۔۔؟"

"کوئی تو نہیں۔۔۔" اس کی آواز کانپ اٹھی

"جھوٹ!" میں نے بھڑاک سے کھڑکی کھول دیا۔ سامنے سیتا کاکی کی چھت پر سے سندر نیچے اترتا دکھائی دیا۔

"پونم! سچ بتا سندر رہا تھا یہاں؟" میں ابل پڑا۔ اسے جھنجھوڑ کر ایک زور کا طمانچہ جڑ دیا اس کے گال پر۔ وہ بلک بلک کر رونے لگی۔ میں نے چوٹی پکڑ کر سر اٹھایا "پونم۔۔۔"

مجھے معاف کر دو بھیّا۔۔۔ بھیّا۔۔۔"

اس کی آواز میں چھپے درد نے مجھے اندر سے ہلا ڈالا۔ پیار کا ساگر پھر من میں ہلکورے مارنے لگا تھا۔ چوٹی کو چھوڑ کر میں اس کے سر کو سہلانے لگا۔ پونم تجھے پتہ ہے تو کیا کر رہی تھی؟ باپو کو پتہ چلا تو وہ تیری کھال کھینچ لیں گے۔۔۔"

اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ دھیرے سے اس نے کہا "ان سے کچھ نہ ہوگا بھیّا تمھیں پتا نہیں ہے میری منگنی باپو نے سندر سے کر دی ہے۔"

"کیا۔۔۔؟" میں حیرت زدہ رہ گیا۔

"ہاں" اس نے اقرار میں سر ہلایا۔

"کب۔۔۔؟"

"دو سال ہونے کو آئے۔ تمھیں خرچہ یونہی نہیں بھیج پا رہے تھے۔ سوچا پڑھائی کا نقصان ہوگا۔ اسی کارن تمھیں خبر نہیں کی۔"

"پھر اب ....؟"

وہ لوگ بنا جہیز لیے شادی کو تیار نہیں ... وہ ایک بار پھر سسکنے لگی۔

"سندر کیا کہتا ہے؟"

"تم سے بات کرنے کو کہہ رہے تھے۔"

"پر یہاں اکیلے میں کیوں آیا ... اور پہلے بھی کبھی آتا تھا؟" اس کا چہرہ خوف سے اور بھی پیلا پڑ گیا تھا۔ "غلط بات ہے پونم۔ میں اس سے بات کروں گا۔ شادی سے پہلے ایسے نہیں ملتے۔" میرے سر پر سے ہاتھ ہٹاتے ہی وہ بندوق کی گولی کی طرح نیچے کی جانب بھاگ گئی۔ دہشت کا جونک پھر سرسرانے لگا میرے بدن میں۔ چادر تان کر سو گیا میں۔ سانجھ ڈھلے میری نیند ایک انجانے شور سے ٹوٹ گئی۔ نیچے پورے آنگن میں دھما چوکڑی مچی تھی۔ جھانک کر دیکھا۔ بھیّا بھابی کے سینے پر چڑھے گھونسے برسا رہے تھے۔ دونوں بچے خوف سے اماں کی گود میں چمٹے رو رہے تھے۔ پونم رسوئی گھر میں کچھ ادھر اُدھر کر رہی تھی اور راجو زخمی ناگ سا پھنکار رہا تھا۔ "بڈھے! ذرا اپنے لاڈلے ڈاکٹر بیٹے کو یہ سین تو دکھا دو اوپر سے بلا کر اسے تو پتہ چلا کہ کتنے جانوں پر کھیل کر وہ ڈاکٹر بنا ہے نہ جانے کتنے ارمانوں کے مزار پر اپنی ڈاکٹری کا محل تعمیر کیا ہے۔"

"بکواس مت کر راجو .... ورنہ ......"

"کیا کر لوگے؟"

باپو کی آنکھوں میں بے بسی اور مایوسی سے آنسو آ گئے۔ ایک نظر انھوں نے اوپر ڈالی۔ "اسے تو میں نے کئی سال سے روپیہ بھی نہ بھیجا تھا نہ جانے کیسے پڑھا ہے بے چارہ۔"

"او.... ہ.... بے چارہ۔ لاٹ صاحب کے کپڑے دیکھ رہے ہو" راجو نے پھر ایک ہنکار بھری۔

"تو تو کیوں جلا جا رہا ہے .... آوارہ .... بدمعاش ...."

باپو ہانپتے ہوئے بڑبڑاتے جا رہے تھے۔ نیچے آنگن میں بھابی بین کر کے رو رہی تھی۔ اوپر چھت پر رہنا میرے لیے اب مشکل ہو گیا تو میں دھیرے سے نیچے چلا آیا۔ مجھے دیکھتے ہی بھیّا غصّہ میں تمتماتے ہوئے اندر چلے گئے۔ بھابی نے بھی چوٹ کی۔ "لے چھیلا دیکھ لے اپنے بھیّا کے کرتوت کمینہ مار ڈالے تو اچھا ہو۔ ایچی اپنے بھائی بہن کو نہیں روکتا۔ دیکھوں گی تو ہزار بار کہوں گی۔ تیری بہن چھنال .... تیرا بھائی شرابی .... موا کل کا آج ہی مر جائے۔ مجھ پر دھونس جماتا ہے۔ میں کونسی سکھی ہوں۔"

"چپ رہ بہو! شام کے وقت منہ سے ایسی بات نہیں نکالتے ...."

"چپ رہ بڑھیا۔ کیسی بھولی بن رہی ہے۔ میں نے تیرے سارے کرتوت دیکھ لیے ہیں۔ کیا ساری ساڑیاں چھپا کر رکھ دی ہے۔ دے دے میری ساڑی ورنہ اچھا نہیں ہوگا ...."

بھیّا پھر مارنے دوڑے۔ بھابی بھاگ کر کمرے میں بند ہو گئیں۔ "تو کیوں مری جا رہی ہے ان ساڑیوں کے لیے ... نیچ .... کمینی ...."

میرے کانوں میں گرم لوہا بہہ رہا تھا۔ میری شخصیت ہی پگھل پگھل کر بہنے لگی۔ ... بے بس ہو کر میں گھر کے باہر نکل گیا۔ دیر تک گلیوں میں گھومتا رہا۔ گھومنے کے بعد بہت زوروں کی پیاس کا احساس ہوا تھا۔ میری نظروں کے سامنے ہی نہیں میرے دل و دماغ میں بھی ہزاروں جگنو ایک ساتھ جگمگا رہے تھے۔ لیکن اندھیرا بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ پانی کی تلاش میں جس دوکان پر مدھم سی روشنی دیکھ کر گیا تھا وہاں راجو پہلے سے ہی بیٹھا پلاسٹک کے گلاس میں کچھ پی رہا تھا۔ اسے دیکھ کر وحشت کی جونک پھر سرسرانے لگی تھی اور دل اندر سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا۔

"آؤ وشرام بھیّا آؤ۔ گھر میں تو بات کرنی ہی مشکل ہے۔" میں نے اس کی چڑھی آنکھ دیکھ کر کہا۔

"پانی ملے گا؟ ...."

"ماں ... ہاں ... کیوں نہیں۔ ارے پانی تو دے ذرا" اس نے اپنے لمبے اور بے ترتیب بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے ہانک لگائی۔ ایک بھدی سی عورت پانی لے کر آئی تو وہ زور سے ہنسا "دیکھو یہ ہمارے وشرام بھائی ہیں ... ڈاکٹر .... صاحب .... کیوں ٹھرا چلے گا بھائی جان ... بس ایک پاؤ زیادہ نہیں ...."

مجھے معلوم تھا وہ بدتمیز ہو گیا۔ باپو کی سنتا ہی نہیں تو پھر میری کہاں سنے گا اور پھر اس وقت وہ ہوش میں تھا بھی نہیں۔ میں نے پانی پی کر گلاس کو زمین پر رکھا اور جھٹکے سے جانے کے لیے مڑ گیا لیکن میری باہیں راجو کے مضبوط شکنجے میں تھیں۔ "ایک سین اور دیکھتے جاؤ وشرام بھائی" اس نے کہا اور جھٹکے سے مجھے پیچھے کھینچ لیا اور اندر اس اندھیری کوٹھری میں لے چلا۔ اندر سے بڑے بھیّا کی تیز ہنسنے کی آواز میرے کانوں میں گرم گرم شیشہ ڈال رہی تھی۔

"راجو چھوڑ دے مجھے" میں نے پورا زور لگایا۔

"بس ... ڈر گئے ڈاکٹر .... ابھی تو پونم ناک کٹائے گی تب دیکھنا .. لیکن فکر کس بات کی تیری ڈاکٹری کام آئے گی ..." وہ زور سے ہنس پڑا۔

مجھے لگ رہا تھا کہ اگر کچھ دیر اس ماحول میں اور رہا تو پاگل ہو جاؤں گا۔ میں اسے دھکا دیا اور سارے راستے کو دوڑتے ہوئے پار کیا۔ گاؤں میں پریکٹس کرنے کے سارے سپنے چور چور ہو چکے تھے ذہن سے بس صرف ایک ہی بات ہوئی تھی جلد سے جلد واپس بھاگلپور چلا جاؤں اور جو بھی نوکری ملے کر لوں۔

رات آنکھوں میں کٹ گئی۔ صبح چار بجے کی گاڑی پکڑنے کے لیے میں بجے گھر سے چل پڑا۔ بیگ اور ٹرنک لیے میں دوڑتا چلا جا رہا تھا تبھی بیچ کھمیا آ باغیچہ میں درختوں کے گھنے سائے کے نیچے ایک سایہ رینگتا نظر آیا۔ ایک ڈر پھر میری نس نس میں سما گئی .... بھوت .....

چاند کی دھندلی روشنی میں وہ سایہ میرا تعاقب کرتا چلا آ رہا تھا۔ میں رکتا وہ بھی رکتا .... میں چلتا .... وہ بھی چلتا ..... اور پھر اسٹیشن آ کر گاڑی پکڑی بھاگلپور کے لیے۔ یہاں بھی میں نے اپنے تعاقب میں ایک سایہ دیکھا۔ اب میں سوچ رہا تھا .... کہیں .... یہ میرا .... اپنا .... سایہ تو نہیں ••

عبدالقادر ادیب

سنت سورداس

اے! خدائے شعر و عرفاں اے خدائے نغمگی
اے متاعِ روشنی، اے چشمۂ خود آگہی
جس کے قدموں پر جھکا تھا ہند کا تاجِ شہی
جس سے قائم ہے جہاں میں صوفیوں کی برتری
بزمِ عرفاں میں اُجالا سُور کی کرنوں سے ہے
ذہن و دل پر اک نشہ سا سُور کے نغموں سے ہے

دی خدا نے تم کو نغماتِ حسیں کی سروری
خوش نصیبی سے ملی تم کو متاعِ سرمدی
تم کو نغموں کے جہاں کی مل گئی پیغمبری
دی بشکلِ "سور ساگر" نغمگی ہی نغمگی
پیار نے ہر گیت گایا زندگی کے ساز پر
زمزموں نے پیار پایا زندگی کے ساز پر

"سور ساگر" مصحفِ بھگتی کی اک تفسیر ہے
یہ حقیقت ہے کہ بھگتی مُکت کی تقدیر ہے
گوپیوں کے عشق کی یہ دلربا تصویر ہے
روح پرور، جانفزا خوابوں کی اک تعبیر ہے
آج بھی ہے "سور ساگر" نور ساگر دوستو!
جس کا چرچا ہو رہا ہے آج گھر گھر دوستو!

اے مسیحائے غمِ دل، درد کا تھا تم کو پاس
اے صدائے بربطِ دل بجھتی ہے ہر دل کی پیاس
اے نگاہِ دور بیں تم حق نگر تھے حق شناس
تم چھلکتا جام ہو کہ سور ساگر سُور داس
دل مرا بھی کہہ رہا ہے جھوم کر یہ بار بار
پیش کر دوں تم کو میں اشعار کے پھولوں کا ہار

کس قدر معصوم ہے عشقِ حقیقی سُور کا
موہنی بچپن کی صورت میں کنہیا ڈھل گیا
سُور نے بھگوان کو ہی دوستی کا رنگ دیا
سچ تو یہ ہے سُور کا انداز ہے سب سے جدا
جس کو دیکھو سُور کے پد گنگناتا ہے ادیب
جس نے سمجھا سُور کو وہ ہے بڑا ہی خوش نصیب

بسنت کمار بسنت

گوسوامی تلسی داس

وہ جس نے آدمیت کا سبق ہم کو سکھایا ہے
وہ جس نے راستہ ہم کو صداقت کا دکھایا ہے
وہ جس نے فرض کیا ہے اور کیا حق ہے بتایا ہے
وہ جس نے تیرگی میں روشنی کا گیت گایا ہے
اسی نے لکھ کے راماین ہماری رہبری کی ہے
اُسے کہتے ہیں سب تلسی اسی کا نام تلسی ہے

وہ جس نے ہم کو بتلایا بشر کی زندگی کیا ہے
ہے کیا ایثار و قربانی خوشی کیا آگہی کیا ہے
یہ رشتہ رُوح و جسم و جاں کا کیا ہے آدمی کیا ہے
ہمارا دھرم کیا ہے رنج و غم کیا ہے خوشی کیا ہے
وہی تلسی ہے جس نے درسِ عبرت کا دیا ہم کو
وہی تلسی ہے جس نے آشنا حق سے کیا ہم کو

دکھایا ہے اسی تلسی نے ہم کو گیان کا رستہ
بتایا ہے ہمیں بھگتی کا اور نروان کا رستہ
کدھر ہے کفر کا رستہ کدھر ایمان کا رستہ
بشر پاتا ہے کیسے نور کا عرفان کا رستہ
وہی تلسی ہے جس کا نام روشن ہے زمانے میں
وہی تلسی ہے جس کا تذکرہ ہے ہر فسانے میں

وہ تلسی جس کی راماین کا دنیا بھر میں چرچا ہے
وہ تلسی جس کی راماین نہیں انمول ہیرا ہے
وہ تلسی جس کی راماین میں ذکرِ رام و سیتا ہے
وہ تلسی جس کی راماین سے ہر گھر میں اُجالا ہے
اسی تلسی نے اپنے گیان کی دی روشنی ہم کو
اسی تلسی نے دی سچی حقیقی زندگی ہم کو

محمد عبدالحلیم

استدراک

ناگپور میں اردو، ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل کا تحقیقی مقالہ ہے، جس پر ناگپور یونیورسٹی نے انھیں پی، ایچ، ڈی کی سند دی ہے۔ موصوف نے اصل مقالہ کو تخلیص ترمیم و تنسیخ کے بعد مضمون کی شکل میں ماہنامہ "آج کل" (دہلی) کے مارچ ۱۹۸۰ کے شمارہ میں شائع کرایا ہے۔ اس موضوع پر یہ پہلا مضمون ہے جو ایک سند یافتہ شخص کے قلم سے نکلا ہے اور ملک کے ایک موقر جریدہ میں شائع ہوا ہے۔ اس لیے امید ہے کہ اربابِ ادب نے اسے دلچسپی کے ساتھ پڑھا ہوگا۔ لیکن مضمون میں کئی غلطیاں راہ پا گئی ہیں۔ نیز بعض واقعات و حقائق کو صحیح طور سے پیش نہیں کیا گیا ہے۔ جن کا ازالہ ضروری ہے تاکہ قارئین اور اس موضوع پر کام کرنے والے ریسرچ اسکالرس کے لیے یہ فروگذاشتیں اور لغزشیں باعثِ استناد نہ بن جائیں۔ ان ہی وجوہ کے پیشِ نظر کچھ امور پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔

(۱) مضمون نگار فرماتے ہیں، "ناگپور کی بنیاد (۱۷۰۲ء) کے ساتھ یہاں اردو زبان و ادب نے اپنے قدم جمائے تھے۔"

اس ضمن میں عرض ہے کہ ناگپور شہر کا وجود ۱۷۰۲ء کے قبل بھی تھا۔ بات دراصل یہ ہے کہ یہاں کے گونڈ خاندان کے پہلے مسلم حکمراں، بخت بلند شاہ نے اورنگ زیب کے دورِ حکومت (۱۶۵۷ء – ۱۷۰۶ء) میں ناگپور کو جدید طریقے سے آباد کیا اور مغل طرز کی تعمیرات سے آراستہ کر کے پُر رونق بنایا۔ بعد ازاں ۱۷۰۲ء میں اسے اپنا دارالسلطنت بنایا۔ چونکہ ۱۷۰۲ء میں ناگپور کو حکومت کی راجدھانی بننے کا درجہ ملا اور پھر ڈھائی سو سال (۱۹۵۶ء تک) اسے مسلسل یہ اعزاز حاصل رہا، اس لیے ناگپور کی تاریخ میں ۱۷۰۲ء کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ ناگپور کی بنیاد ۱۷۰۲ء میں پڑی درست نہیں۔

چونکہ اردو زبان اور اس کے شعر و ادب کی تاریخ نیز شعرائے اردو کے تذکرے ناگپور کے ذکر سے یکسر خالی ہیں۔ اس لیے جب تک مستند شواہد یا کسی مستند کتاب کا حوالہ پیش نہیں کیا جاتا یہ بات مشتبہ سمجھی جائے گی کہ ۱۷۰۲ء میں ناگپور میں اردو زبان و ادب نے اپنے قدم جمائے تھے۔

(۲) اس کے بعد تحریر ہے کہ "یہ (۱۷۰۲ء) وہ زمانہ تھا جب کہ اردو... .. دکن میں عادل شاہی اور قطب شاہی بادشاہوں کی سرپرستی میں شعر و ادب کی زلفیں سنوار رہی تھی۔"

یہ غلط ہے۔ بیجاپور کی عادل شاہی اور گولکنڈہ کی قطب شاہی، دونوں سلطنتیں ۱۶۹۰ء کے قبل ہی ختم ہو چکی تھیں۔ نیز یہ کہ "اردو، شعر و ادب کی زلفیں سنوار رہی تھی۔" یا شعر و ادب، اردو کی زلفیں سنوار رہے تھے۔

(۳) "ٹھیک اسی دور میں ناگپور بھی ادبا و شعرا کا ایک اچھا خاصا مرکز تھا۔"

دو سطر اوپر مضمون نگار نے لکھا ہے کہ اردو زبان و ادب نے ۱۷۰۲ء میں اپنے قدم جمائے تھے۔ اب فرماتے ہیں کہ اسی دور میں ناگپور بھی ادبا و شعرا کا مرکز تھا۔ اور وہ بھی "ایک اچھا خاصا" ع بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است۔ یہ بات صحیح ہے کہ سرزمینِ ناگپور نے چند ایسے باکمال شاعر کو جنم دیا ہے، جن پر کوئی بھی شہر فخر کر سکتا ہے۔ منجملہ ان میں ایک حکیم الطاف احمد آزاد انصاری (۱۸۷۱ء – ۱۹۴۲ء) بھی تھے۔ جن کا سارے فسانے میں کہیں ذکر تک نہیں۔

(۴) "لیکن افسوس کہ اس زمانے کے تمام قلمی نسخے ضائع ہو چکے ہیں۔"

یہ امر محتاجِ ثبوت ہے۔ اگر ضائع شدہ "تمام قلمی نسخے" نہ سہی صرف دو چار کے اور ان کے مصنفین کے نام بھی بتا دیئے جاتے تو ہماری معلومات میں اضافہ کا باعث ہوتا۔

(۵) "صرف برہان شاہ کے درباری شاعر لالہ بھیم چند کا نسخہ کا ایک قلمی نسخہ . . . . . میں محفوظ ہے۔"

برہان شاہ کون تھا، کہاں کا حکمراں تھا اور اس کا دورِ حکومت کیا تھا اس کی وضاحت ضروری تھی کہ ناگپور کے بھی بہت کم لوگ اس حکمراں سے واقف ہیں۔

(۶) "مصنف نے اس کی (ترجمہ شاہنامہ) ابتدا ۱۲۰۷ھ (۱۷۹۲ء) میں کی تھی۔"

اس بیان کا ماخذ نہیں بتایا گیا ہے۔ غالباً مضمون نگار کی ذاتی تحقیق ہو جو صراحتاً غلط ہے۔ اس جملے کے بعد مصنف کا جو شعر لکھا گیا ہے، اس میں بتایا گیا ہے کہ کتاب کا اختتام پانچ سال میں ہوا۔ کتاب کا جو ترقیمہ پیش کیا گیا ہے اس پر تحریر ہے کہ ۱۲۱۴ھ میں کتاب مکمل ہوئی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مصنف نے کتاب کی ابتدا ۱۲۰۹ھ (مطابق ۱۷۹۴ء) میں کی۔

(۷) غمگین کے قطعہ ارتحال کا آخری مصرعہ "نہفت زیر زمیں مہرِ اوج کمال" خارج از وزن ہے[ل] نیز اس سے ۱۲۰۵ (۱۲۸۸ نہیں) نکلتے ہیں۔ چونکہ قطعہ ایک قلمی نسخہ سے نقل کیا گیا ہے اور وہ قلمی نسخہ یہاں کی لائبریری سے غائب ہے، اس لیے اصل مصرعہ کی تصدیق نہ ہو سکی۔ گمان غالب ہے کہ یہ مصرعہ اس طرح ہوگا۔ "نہفت زیر زمیں مہرِ اوجِ عز و کمال۔" اب مصرعہ بحر میں بھی ہوگیا ہے اور تاریخ کے ۱۲۸۸ بھی برآمد ہو جاتے ہیں۔

(۸) مضمون نگار نے فیض محمد فیضؔ کی وفات کے قطعہ میں چوتھے مصرعہ "بدل دردِ غم" آہ گردید ملحق" سے ۲ کا تخرجہ جس طرح بتا کر ۱۲۸۲ نکالا ہے، وہ درست نہیں۔ غالباً انھوں نے مصرعہ کے دو لفظ "آہ گردید" کی طرف توجہ نہیں دی۔ یا پھر ان لفظوں کو انھوں نے حشو سمجھ لیا۔ حالانکہ شاعر نے صاف طور سے اشارہ کیا ہے کہ "بدل دردِ غم" میں "آہ" گردید (الٹا) ملحق ہے۔ "آہ" کے ۶ ہوتے ہیں اور ۶ الٹا ہو کر ۲ بن جاتا ہے۔ "ب" کے دو نہیں (جیسا کہ مصرعہ میں مضمون نگار نے بتایا ہے)

(۹) یہ درست نہیں کہ عادل سید عباس علی شہرتؔ کے شاگرد تھے بلکہ عادلؔ نے اپنی تصنیفات میں خود کو حاجی رسول غمگینؔ کا شاگرد لکھا ہے۔ شہرتؔ، عادلؔ سے عمر میں چھوٹے تھے۔

(۱۰) عادلؔ کے "بے شمار" شاگرد تھے۔ یہ بات مبالغہ آمیز ہے۔

(۱۱) عادلؔ کے کئی قلمی نسخوں کا ذکر مضمون میں موجود ہے، مگر اُن کی ایک مطبوعہ تصنیف "ہشت گلزار رنگیں" طباعت ۱۲۹۹ھ (۱۸۸۲ء) کا کوئی ذکر نہیں۔ یہ کتاب آٹھ فارسی قصائد کا مجموعہ ہے۔ ابتدائی تین قصیدے حمد و نعت میں ہیں۔ اور باقی پانچ قصائد میں عادلؔ نے اپنے استاد حاجی رسول غمگینؔ کی مدح سرائی کی ہے۔

(۱۲) مضمون نگار نے صفحہ ۲۹ کے ابتدائی پانچ سطور میں دو ایسے اصحاب اور ان کے غیر ضروری قلمی نسخوں کا بڑی شد و مد کے ساتھ ذکر کیا ہے جنھیں یہاں کے ادبی حلقوں میں کوئی نہیں جانتا، مگر یہاں کے شعرا کے غیر مطبوعہ مسودوں اور ان غیر مطبوعہ تحقیقی مقالوں کا جن پر ناگپور یونیورسٹی نے ڈاکٹریٹ اور ایم، اے کی ڈگریاں دی ہیں، ان کا نام تک نہیں۔

(۱۳) "انھوں نے (مولانا ناطق گلاؤٹھوی) 'فروغ دیوبندی' کے فرضی نام سے خیال ہاپوڑ مارچ ۱۹۱۶ء کے شمارے میں آتش پرست کے عنوان سے اپنا پہلا مضمون شائع کروایا۔"

یہ بات صحیح نہیں۔ مولانا ناطقؔ نے، یگانہؔ چنگیزی کے مضمون "آتش و غالب" کا جواب سب سے پہلے "یاسؔ و غالبؔ" کے عنوان سے دیا تھا۔ "آتش پرست" کے عنوان سے نہیں۔ مولانا کا یہ مضمون فراغ دیوبندی (فروغ دیوبندی نہیں) کے نام سے ماہنامہ "خیال" (ہاپوڑ) کے جنوری ۱۹۱۶ء (مارچ نہیں) کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ فراغؔ دیوبندی کوئی فرضی نام نہیں تھا۔ فراغؔ کا نام محمد اسمٰعیل تھا۔ وہ دیوبند کے رہنے والے تھے۔ مولانا غریب سہارنپوری کے شاگرد تھے ناگپور کے محکمۂ تعمیرات میں سب ڈویژنل آفیسر کے عہدہ پر فائز تھے۔ ان کا کلام جریدہ "خیال" (ہاپوڑ)، اور گلدستہ "جلوۂ یار" (میرٹھ) میں شائع ہوتا رہا ہے۔

مولانا ناطقؔ کا مضمون "آتش پرست" جو خیال کے مارچ ۱۹۱۶ء کے شمارہ میں شائع ہوا تھا اور جس کا ذکر "آج کل" کے مضمون میں ہے، وہی مضمون مولانا کی تصنیف "سبع سیارہ" میں بھی شامل ہے۔ یہ مضمون یگانہ کی کتاب "چراغ سخن" کے اس جزو کے خلاف میں ہے جس میں یگانہ نے مرزا غالب کے خلاف زہر افشانی اور خواجہ آتشؔ کی شان میں مدح سرائی کی ہے۔ یہ مضمون خیال کے مذکورہ شمارے میں ایک دوسرے صاحب محمد حنیف، حنیف دیوبندی کے نام سے شائع ہوا تھا۔ حنیف دیوبندی بھی کوئی فرضی نام نہیں تھا۔ یگانہ کے خلاف سلسلۂ غالب سے متعلق، مولانا ناطقؔ کا یہ مضمون (آتش پرست)، تیسرا مضمون تھا، پہلا نہیں۔

مولانا کے پہلے اور تیسرے مضمون کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ ان کا دوسرا مضمون جریدہ "خیال" ہی میں فروری ۱۹۱۶ء کے شمارہ میں شائع ہوا تھا۔ یہی مضمون دوبارہ جریدہ "جلترنگ" (مدراس) کے تین شماروں میں (جنوری تا اپریل ۱۹۲۲ء) چھپ چکا ہے۔

(۱۴) ہفتہ وار "الفاروق" (کامٹی) کے متعلق لکھا گیا ہے کہ ۲۷ سال تک "پابندیِ وقت" کے ساتھ شائع ہوتا رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ جریدہ تقسیم ہند کے بعد بڑی بے قاعدگی سے نکلتا رہا۔ بند ہونے کے چند سال قبل تو پرچہ کی حالت ایسی ہو گئی تھی کہ کسی ماہ دو شمارے شائع ہوئے تو کسی ماہ صرف ایک اور کسی ماہ وہ بھی نہیں۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ یہ دو دو، تین تین ماہ تک شائع نہیں ہوا۔

(۱۵) یہاں کی کارپوریشن نے ہمیشہ اردو کے ساتھ انصاف کیا ہے۔"

مضمون نگار تقسیم ہند کے قبل اور بعد کے ابتدائی آٹھ دس سال کے حالات سے باخبر نہیں اور نہ وہ یہاں کی ودیا مندر اسکیم کے نام سے واقف ہیں، جس کے خلاف اردو صحافتی دنیا نے ملک بھر میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اس اسکیم میں ضروری ترامیم کرانے کی غرض سے ناگپور کو اپنا مستقر بنا لیا تھا۔ اس سلسلے میں ناگپور کے حکیم اسرار احمد کریوی اور محمد ابراہیم فناؔ کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

(۱۶) "ناگپور ہمیشہ ادبی تحریکوں کا مرکز رہا ہے۔"

اس عبارت کے بعد کل ہند علمی، ادبی اور تعلیمی اداروں کے ناگپور میں منعقد سالانہ اجلاس کا ذکر کیا گیا ہے۔ کیا اس قسم کے اداروں کے سالانہ اجلاس کسی شہر میں صرف ایک بار منعقد ہو جانے سے اس شہر کو ان اداروں کی تحریکوں یا "ادبی تحریکوں" کا مرکز کہنا درست ہے!۔

(۱۷) "یہاں کل ہند اور اعلیٰ پیمانے پر جس کثرت سے مشاعرے ہوتے ہیں اس کی مثال دوسرے شہروں میں مشکل سے ملے گی۔"

اس کے متعلق صرف یہی عرض کرنا ہے کہ ۔ ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے۔

ل۔ یہ کتابت کی غلطی ہے۔

(۱۸) مولانا ناطق گلاؤٹھوی کی تاریخ پیدائش ۱۶ دسمبر ۱۸۸۶ء لکھی گئی ہے، جو غلط ہے۔ صحیح تاریخ گیارہ نومبر ۱۸۸۶ء ہے۔ اس کو کتابت کی غلطی بھی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ مضمون نگار نے اپنے دو اور مضامین میں بھی یہی تاریخ لکھی ہے۔

(۱۹) مرزا ظفر ناگپوری کے متعلق تحریر کیا گیا ہے کہ وہ ادبی حلقوں میں بہت مقبول تھے۔ موصوف آج بھی بفضلِ خدا بقیدِ حیات ہیں۔ ناگپور ہی میں سکونت پذیر ہیں اور یہاں کے ادبی حلقوں میں ہنوز مقبول ہیں۔

(۲۰) طرفہ قریشی کا نام عبدالوحید ہے۔ عبدالرحمٰن نہیں۔

(۲۱) پروفیسر شور علیگ کا نام منظور حسین ہے مگر مضمون میں منظور حسن لکھا ہے۔

(۲۲) شاطر حکیمی کامٹوی کے مجموعۂ کلام "موت و حیات" کا سنِ اشاعت ۱۹۶۳ء بتایا گیا ہے جو غلط ہے۔ مذکورہ مجموعہ ۱۹۴۴ء میں شائع ہوا ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن آج تک شائع نہیں ہو سکا۔

(۲۳) پروفیسر منشاء الرحمٰن خاں منشآ کی تصنیف کا پورا نام "آہنگِ حیات" ہے۔ صرف آہنگ نہیں۔

(۲۴) مولانا عبدالکریم پاریکھ کی تصنیف کا اصل نام "لغات القرآن" ہے۔ لغت قرآن نہیں۔

(۲۵) ناگپور کے دو ماہناموں "چاند" اور "کرنیں" کو ادبی جریدہ لکھا گیا ہے، حالانکہ یہ دونوں پرچے بچوں کے لیے تھے۔ موخر الذکر میں کبھی کبھی عورتوں کے لیے بھی مضامین چھپ جاتے تھے۔

(۲۶) مرزا یاس یگانہ چنگیزی کا سالِ وفات ۱۹۵۹ء تحریر کیا گیا ہے جو صحیح نہیں۔ اُن کا انتقال ۹ فروری ۱۹۵۶ء کو ہوا ہے۔

آخر میں مجھے یہ لکھنا ہے کہ مضمون نگار نے شہر کامٹی کے ادبی حالات و شخصیات کو ناگپور کے ساتھ گڈمڈ کر کے جو پیش کیا ہے۔ اس کا ان کے پاس کیا جواز ہے۔

کامٹی، شہر ناگپور سے قریب سولہ کلومیٹر دُور، ناگپور کلکتہ ریلوے لائن پر ایک علیٰحدہ شہر ہے۔ وہاں کا سرکاری انتظامیہ الگ ہے، بلدیہ الگ ہے۔ اس شہر کی اپنی ایک علیٰحدہ علمی، ادبی، تہذیبی و ثقافتی تاریخ ہے۔ اس کے باوجود وہاں کے حالات کو شہر ناگپور کے حالات کے ساتھ اس طرح لکھا گیا ہے جیسے کامٹی کوئی علیٰحدہ شہر نہیں بلکہ ناگپور کے ایک علاقہ یا محلہ کا نام ہے۔

(۲)

ماہنامہ آج کل بابت مارچ ۱۹۸۰ء میں شرف الدین ساحلؔ صاحب کا ایک تحقیقی مضمون بعنوان "ناگپور میں اردو" نظر سے گزرا۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ محترم ساحلؔ صاحب نے اس موضوع پر پہلی بار قلم اٹھایا ہے۔ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ وہ موضوع کے ساتھ پوری طرح انصاف نہیں کر سکے ہیں۔

اس تحقیقی مقالہ میں زبان و بیان کی خامیوں سے قطع نظر حقائق و واقعات کی ایسی غلطیاں ہیں جن کا ازالہ ضروری ہے۔

غزل

پروین کمار اشکؔ

فصیلِ وقت کو اک روز پھاند جاؤں گا!
تماشا یہ بھی تمھیں دوستو دکھاؤں گا!

میں ایک پیڑ ہوں چندن کا تو جلا مجھ کو
سبھی دشاؤں میں خوشبو بکھیر جاؤں گا!

نئے سرے سے میں قائم کروں گا سب رشتے
نیا لباس پہن کر میں جب بھی آؤں گا!

جگوں جگوں سے میں ٹکرا رہا ہوں سر اپنا
کہ ٹوٹ جائے گی دیوار بھاگ جاؤں گا!

جو چھاؤں دیتے رہیں دھوپ کے سفیروں کو
کچھ ایسے پیڑ بھی رستے میں میں لگاؤں گا!

میں کالے گہرے سمندر میں کب ڈوب چکا
تو لاکھ ڈھونڈ مجھے اب نہ ہاتھ آؤں گا!

تمام بستی طرف دار ہے اسی کی اشکؔ
جو میرے ساتھ ہوا وہ کسے سناؤں گا!

---

(۱) ساحلؔ صاحب نے مولانا ناطق گلاؤٹھوی مرحوم کی تاریخ پیدائش ۱۶ دسمبر ۱۸۸۶ء تحریر کی ہے۔ جب کہ صحیح تاریخ ۱۱ نومبر ۱۸۸۶ء ہے (دیکھیے مولانا ناطق مرحوم کی خود نوشت مطبوعہ جریدہ نگار جنوری ۱۹۴۱ء)

(۲) ہندوستان کے مشہور و معروف شاعر جناب طرفہ قریشی کا پورا نام ساحلؔ صاحب نے عبدالرحمٰن طرفہ لکھا ہے۔ طرفہ قریشی صاحب بفضلِ ربی ابھی حیات ہیں اور خود اپنا نام عبدالوحید لکھتے ہیں اور بتاتے ہیں۔ (عبدالرحمٰن طرفہ اگر کوئی دوسرے شاعر ہیں تو اہلِ ناگپور ان سے ابھی تک بے خبر کیوں ہیں اس کی وضاحت مطلوب ہے۔)

(۳) شاطر حکیمی کے مجموعہ کلام "موت و حیات" کا سن اشاعت ۱۹۶۳ء تحریر کیا گیا ہے۔ جب کہ "موت و حیات" پر سن اشاعت ۱۹۴۴ء درج ہے۔ (۱۹۶۳ء کا سن ساحلؔ صاحب نے کہاں سے لیا ہے؟)

(۴) محترم منشاء الرحمٰن خاں منشآ کے مجموعہ کلام "آہنگ" کا ذکر فاضل مضمون نگار نے کیا ہے۔ منشآ صاحب کا ایک مجموعہ کلام "آہنگِ حیات" کے نام سے ملتا ہے لیکن "آہنگ" کے نام سے موصوف کا کوئی مجموعہ نہیں ہے۔

(۵) اسی طرح محترم مرزا ظفر حسین ظفر ناگپوری کے متعلق ایک جملہ سے دھوکہ ہوتا ہے کہ وہ اس وقت بقیدِ حیات نہیں ہیں۔ حالانکہ محترم ظفر صاحب ابھی بفضلِ تعالیٰ زندہ ہیں۔ اور ان کی ہستی شہرِ ناگپور کے ادبی حلقوں میں اپنی خدمات و ادبی کاوشوں کی بنا پر ابھی تک مقبول و معروف ہے۔ موصوف مولانا ناطق مرحوم کے شاگردِ رشید اور جانشین ہیں۔ (مظہر حیات)

روشن بٹیالوی

عزمِ سفر

دل میں ہیں ولولے، عزم بھی ہے جواں اور ہمت بھی ہے ہم سفر دوستو
لاکھ خطرات ہوں شوق کی راہ میں ہم گزر جائیں گے بے خطر دوستو
جان قرباں کریں گے وطن کے لیے ہم عاشقِ وطن کے وفادار ہیں
ہم کو پروا نہیں کچھ بھی انجام کی ہم ہیں انجام سے بے خبر دوستو
قوم کا باغ بن جائے رشکِ جناں اور مٹ جائیں سارے خزاں کے نشاں
بختِ خفتہ وطن کا ہو بیدار پھر مل کے کوشش کریں ہم اگر دوستو
کام ہیں سب ادھورے وطن کے ابھی، جوشِ عزم و عمل کے سہارے بڑھو
شک نہیں اس میں یہ امتحاں ہے کڑا، آزمائش ہے یہ سخت تر دوستو
آشیانے کی بنیاد مضبوط ہے، اس کو نقصان پہنچے یہ ممکن نہیں
آئیں طوفان گو سینکڑوں سخت تر، لاکھ منڈلائیں برقِ دِشرر دوستو
یہ صداقت کے سچے پرستار ہیں، ان کے دل میں رواں ہے وفا کا لہو
ہیں محبت کی تصویر اہلِ وطن، پیکرِ صدق ہیں سر بسر دوستو
امتیازات کافور ہو جائیں گے، ہم کریں گے نہ نفرت کسی سے کبھی
یہ یقیں بلکہ عین الیقیں ہے ہمیں ہند ہوگا محبت کا گھر دوستو
ہم نہ چھوڑیں گے راہِ وفا کو کبھی، ہم نہ گمراہ ہوں گے کسی طور سے
ہم ہیں نبضِ زمانہ سے بھی آشنا، ہم ہیں حالات سے باخبر دوستو
پھر روشن کریں گے چراغِ وفا، ہر طرف نور راحت کا پھیلائیں گے
گلشنِ ہند میں لہلہائیں گے پھر مہر و الفت کے گلہائے تر دوستو

غزلیں

عابد مناوری

ہے وہ تپش کہ قہرِ خدا ہے زمیں پر
سورج پگھل کے پھیل گیا ہے زمیں پر

اے آسماں کو پاٹنے والے! ابھی یہ سوچ
کیوں کر وہ ہوگا پُر جو خلا ہے زمیں پر

کس راستے سے بھاگ کر آخر یہ جائے گا
انسان سمندروں میں گھرا ہے زمیں پر

تھے اک خدا کے سامنے جنت میں سجدہ ریز
اب تو ہر ایک شخص خدا ہے زمیں پر

عنقا ہوا ہے مہر و محبت ہے اِن دِنوں
چاروں طرف خلا ہی خلا ہے زمیں پر

صرف اپنے آپ سے نہیں واقف زمیں کے لوگ
ہر عقدہ کائنات کا وا ہے زمیں پر

عابد ہوا ہے اور بھی تنہا ہر آدمی
جتنا ہجوم بڑھتا گیا ہے زمیں پر

صابر ابوہری

ہر کس و ناکس پہ بخشش ہے اک میرے لیے ہی جام نہیں
یہ میرا مقدر ہے ساقی، کچھ تجھ پر تو الزام نہیں
میری ہستی کا لے صابر، آغاز نہیں انجام نہیں
جو بادِ سحر سے بجھ جائے، میں ایسا چراغِ شام نہیں
ہم رازِ حقیقت کس سے کہیں، سمجھے گا اس کو کون یہاں
بستی بستی فرزانے ہیں، دیوانوں کا کہیں نام نہیں
یہ گیسو بزمِ ہستی کے کیا تم سے سنوارے جائیں گے
پیروں میں جب زنجیر نہیں، جب ہاتھ میں زہر کا جام نہیں
یہ عالم ہے بیداری کا، کچھ ہوش رہے اے نغمہ گرو
اب دار و رسن کی بات چلے، یہ دورِ گل و گلفام نہیں
اے جذبِ محبت، تو ہی بتا، یہ عالم کونسا عالم ہے
اب دل میں کسی کی یاد نہیں، اب لب پہ کسی کا نام نہیں
وہ بلبل ہو یا پروانہ، وہ شاعر ہو یا صورت گر
سب اپنا رونا روتے ہیں، انسان کے غم سے کام نہیں
کوئی لاکھ کرے تعریف اس کی، کوئی لاکھ کہے الہام اُسے
وہ شعر ہے باعثِ ننگِ سخن، جو الفت کا پیغام نہیں
حق بات کی خاطر اڑ جانا، حق بات کی خاطر کٹ جانا
یہ کام جنوں کر سکتا ہے، یہ عقل کے بس کا کام نہیں

دوستو!

وحید شادانی بتیاوی

کاش ہوتی ہمیں پہلے اس کی خبر کاٹ دی جائے گی یہ زباں دوستو!
کیوں بتاتے کسی شخص کو رازِ دل، کیوں سناتے انھیں داستاں دوستو!

برقِ گلشن کا اعلان کل ہی چکا، تنکا تنکا نشیمن کا جل بھی چکا
اب یہ جاری ہے پھر بھی ہر اک سانس پر، آشیاں آشیاں آشیاں دوستو!

بے خودی میں بھلا دوں انھیں کس طرح، کیسے شمعِ محبت بجھا دوں بھلا
یادگارِ اسیری ہیں میرے لیے جیب و داماں کی یہ دھجیاں دوستو!

کیا ملائیں گے مجھ سے مصائب نظر، میں وہ راہی ہوں جس کو نہیں کوئی ڈر
ایک دن میری منزل ملے گی مجھے، دل میں رکھتا ہوں عزمِ جواں دوستو!

شوقِ جلوہ کشی جنوں ساماں سہی، پھر بھی کوئی طلب اور تقاضا نہیں
بے نیازی ہماری سلامت رہے، خود پلائے گا پیرِ مغاں دوستو!

خونِ دل سے اپنے سینچا ہے ہم نے چمن، فخر کے ساتھ کہتے ہیں اپنا وطن
اہلِ گلشن کو توفیق دے اب خدا، یہ گلستاں رہے بے خزاں دوستو!

حادثہ عشق کا وقت کی بات تھی، جرم اس میں وحید حزیں کا نہیں
بحرِ غم میں اسے ڈوبتا دیکھ کر، آپ کیوں آ گئے درمیاں دوستو!

ڈاک گھر بچت بنک

دیتا ہے

سب سے زیادہ اور ٹیکس سے مستثنیٰ سود

اور اس کے علاوہ 11 ہزار سے زیادہ نقد انعامات۔ پہلا انعام ۱،۰۰،۰۰۰ روپے

ڈاک گھر بچت بنک ملک کا سب سے پرانا اور سب سے بڑا بچت بنک ہے۔ تقریباً 4.26 کروڑ افراد اس پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ اس میں 1695 کروڑ روپے سے زیادہ رقم جمع ہے۔

آپ بھی 200 روپے کم از کم 6 مہینوں کے لیے جمع رکھ کر ششماہی ڈرا میں نکلنے والا کوئی انعام جیت سکتے ہیں۔ اب تک ایک لاکھ سے زیادہ لوگ انعام جیت چکے ہیں۔

دلکش خصوصیات

صرف پانچ روپے سے کھاتہ کھولا جا سکتا ہے۔

5½ فیصد سالانہ ٹیکس سے بالکل مستثنیٰ سود۔

ایک لاکھ 29 ہزار ڈاک گھر اور ان کے علاوہ کئی چلتے پھرتے ڈاک گھر آپ کی خدمت کے لیے موجود ہیں۔ کھاتے ایک ڈاک گھر سے دوسرے ڈاک گھر میں منتقل کیے جا سکتے ہیں۔

اپنے گاؤں کے ڈاک گھر میں رقم جمع کرانے اور شہر کے بڑے یا چھوٹے ڈاک گھر میں سے رقم نکلوانے اور اس کے برعکس شہر کے بڑے یا چھوٹے ڈاک گھر میں رقم جمع کرانے اور گاؤں کے ڈاک گھر سے رقم نکلوانے کی سہولت۔

آپ اپنی مرضی کے مطابق آسانی سے رقم نکلوا سکتے ہیں۔

لگ بھگ 23 ہزار ڈاک گھروں میں چیک کی سہولت کا انتظام ہے اور باہر کے ڈاک گھر بچت بنک چیکوں پر کوئی "کولیکشن چارج" نہیں لیا جاتا۔

شناختی کارڈوں کے ذریعے فوراً شناخت کا انتظام۔

کھاتے کو ضمانت کے طور پر رکھا جا سکتا ہے۔

کسی کو بھی نامزد کرنے کی سہولت۔

آج ہی کسی بھی ڈاک گھر میں اپنا کھاتہ کھول لیجیے۔

قومی بچت ادارہ

پوسٹ بکس نمبر 96، ناگپور۔ 440001

davp-80/107

غزلیں

آمر صدیقی

بے کیف ساعتوں کے مسافر بنے رہے
ہم خود نظر تھے، خود ہی مناظر بنے رہے

تھے قید کچھ عجیب حصارِ طلسم میں
مسحور ہو کے بھی ہمیں ساحر بنے رہے

اس سادگی پہ طنز ہوا بار ہا مگر
باطن میں تھے جو ہم وہ بظاہر بنے رہے

گزری حیات جن کی لہو تھوکتے ہوئے
ایسے بھی لوگ موت کے منکر بنے رہے

سمجھا کسی نے بھی نہ ہماری ہنسی کا راز
ہم غمزدوں کی بھیڑ میں کافر بنے رہے

تھا جو بھی کارواں میں وہ تھا میرِ کارواں
یہ طرف تھا کہ ہم ہی مسافر بنے رہے

بہروپیوں کی بھیڑ میں تنہا لگے مگر
آمر ہر ایک حال میں آمر بنے رہے

شہپر رسول

غبارِ "نا" ہے نظر میں کہ غبار میں ہے
مگر یہ دل کہ نئی "ہاں" کے انتظار میں ہے

پُرانے وقتوں کے پتھر بھی رُک نہیں پائے
عجب بہاؤ نئے پانیوں کی دھار میں ہے

پرند خوف زدہ سے شجر پہ بیٹھے ہیں
صدائے زرد کوئی نغمۂ بہار میں ہے

نگاہِ خفتہ سے گنتی نہ گِن زبانِ اجل
ہر ایک شخص کو ڈر ہے کہ وہ شمار میں ہے

بکھرتے وقت نے یکجا کیا ہمیں شہپر
کہ جمع ہونے کا جادو بھی انتشار میں ہے

ناز قادری

برگِ گل شاخِ صنوبر جاگے
پھر ذرا وقت کا تیور جاگے

فہم و ادراک کے دفتر جاگے
کتنے الفاظ کے پیکر جاگے

کوئی سایہ کوئی پیکر جاگے
آرزو یہ ہے مرا گھر جاگے

حسن وہ محشرِ خوابیدہ ہے
عشق کا نام جو لے کر جاگے

سنگِ تہذیب سے سورج کی نمود
آج پھر تیشۂ آذر جاگے

ناز کیا ناز کی باتیں کیجیے
نت نئے خواب کے منظر جاگے

ستیہ نند جاوا

دوست اک سارے زمانے سے جدا تھا اپنا
ہم نے پتھر اُسے جانا وہ خدا تھا اپنا

اس کے کوچے میں گئے جا کے وہاں کھو سے گئے
رات اِک شخص پتا پوچھ رہا تھا اپنا

بوئے گُل بن کے اڑی ایک حسین راز کی بات
اس نے بھولے سے کہیں نام لکھا تھا اپنا

موتیوں کو کبھی پلکوں سے بکھرنے نہ دیا
چند اشکوں کے سوا دھر میں کیا تھا اپنا

ایک لمحہ کئی بھولی ہوئی یادوں کا امین
زندگی بھر ہمیں محسوس ہوا تھا اپنا

بدر نظری

دل میں خواہش کی نہ چنگاریاں سلگاؤں گا
ورنہ یہ آگ جو بھڑکے گی تو جل جاؤں گا

عقل کی بھیڑ سے بچ بچ کے گزر جانے دو
خود میں کھو جاؤں گا تو خود کو نہیں پاؤں گا

میں نے چاہا تھا کہ لمحوں کو مقید کر لوں
کیا خبر تھی کہ میں حالات میں گھر جاؤں گا

ہوں گا آواز کے پتھر سے اگر چکنا چور
شیشۂ دل سے بھی چپ چاپ نکل جاؤں گا

مجھ سے توڑا نہ گیا گر یہ حصارِ شب و روز
اپنے ہر رنگ سے میں ٹوٹ کے رہ جاؤں گا

بحرِ افکار میں میں ڈوب کر ابھروں تو سہی
گوہرِ فن لیے اے بدر نظر آؤں گا

[illegible]

ابھی شجر ابھی سایہ دکھائی دیتا ہے
بیک نگاہ وہ کیا کیا دکھائی دیتا ہے

ہر ایک چہرے پہ وحشت برس رہی ہے یہاں
ہر ایک آنکھ میں صحرا دکھائی دیتا ہے

نہ جانے کون تعاقب میں ہے قدم بہ قدم
جو مڑ کے دیکھوں تو سایہ دکھائی دیتا ہے

بچھڑنے والے کی یادیں ہیں بدگماں مجھ سے
کہ اس کا غم بھی بچھڑتا دکھائی دیتا ہے

وہ دیکھو شب کی فصیلوں کا انہدام ہوا
بہت قریب اجالا دکھائی دیتا ہے

بکھر گیا ہے یہاں کون روشنی بن کر
کہ ذرّہ ذرّہ چمکتا دکھائی دیتا ہے

نہ سرخوشی، نہ تمنا، نہ آرزو کوئی
بس ایک درد ہی اپنا دکھائی دیتا ہے

نئی کتابیں

اردو میں دستوئیفسکی پر پہلی کتاب

مصنف : ظ۔ انصاری
ناشر : ترقی اردو بیورو وزارت تعلیم حکومت ہند، نئی دہلی ۲۲
قیمت : ساڑھے آٹھ روپے۔

ڈاکٹر ظ۔ انصاری کی تازہ ترین تصنیف "دستوئیفسکی" ترقی اردو بیورو (نئی دہلی ۲۲) کے توسط سے شائع ہوئی ہے۔

اس سے پہلے ڈاکٹر ظ۔ انصاری جارج برنارڈ شا (۱۹۵۱ء)، پوشکن (۱۹۷۵ء) اور چیخوف (۱۹۷۵ء) کو اردو دنیا سے متعارف کروا چکے ہیں میفیودر دستوئیفسکی" اس سلسلے کی چوتھی کتاب ہے۔ 'دستوئیفسکی' دنیا کے ان اہم ادیبوں میں سے ہے جس کے خیالات کی چھاپ اس کے بعد کے ادیبوں پر آسانی سے دیکھی جاسکتی ہے۔ اس نے اپنے بعد آنے والی نسلوں کو براہ راست متاثر کیا ہے۔ بقول ظ۔ انصاری "وہ جرنلسٹ تھا، تنقید نگار، تبصرہ نگار، طنز نگار اور ناول نگار تھا۔ نفسیاتی اور فلسفیانہ ناولوں کا موجد تھا، اخلاقی اصولوں کا پرچارک تھا"

دستوئیفسکی کی دور اندیش نگاہوں نے آج سے سو سال پیشتر ہی دنیا کی سیاسی بساط پر روس کی اہمیت اور حیثیت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ وہ دیباچے میں لکھتے ہیں:-

"دستوئیفسکی یورپ سے نظر بچا کر قسطنطنیہ اور یروشلم کو ترسی ہوئی نظروں سے دیکھتا تھا، یورپ کو بار بار جتاتا ہے کہ ہمارا مشرق کی طرف سرکنا صرف ایشیا کے حق میں مفید ہوگا بلکہ یورپ کے نقشے میں بھی مفید

تبدیلیاں لائے گا۔ ترکی میں جب روسی فوجیں بڑھنے لگیں اور قسطنطنیہ کی فصیل تلے پہنچ گئیں تو دستوئیفسکی نے سجدہ شکر ادا کیا اور کہا کہ ہماری فتوحات کی خبریں دبے کچلے ہندوستان تک پھیلنی چاہئیں تاکہ وہ ملک بھی ہمیں امیدگاہ سمجھے۔"

بعض قومی رجحانات اور خصوصیات جو اپنے منفی پہلوؤں کی وجہ سے اچھی نہیں سمجھی جاتیں مگر نفسیات، تجربات اور روشن نظری نے ان کے بہت سے مثبت اور کارآمد پہلوؤں کو بھی جا لیا ہے۔ مثلاً "قومی عصبیت" جس کی اہمیت اور افادیت پر دستوئیفسکی نے بہت پہلے اشارہ کر دیا تھا۔

فی زمانہ جاپان، جرمنی اور چین کی صنعتی ترقی میں جس قومی عصبیت کا اہم کردار رہا ہے۔ اس کی اہمیت سے بھلا کون انکار کر سکتا ہے۔

دراصل بڑے فن کاروں اور بڑی شخصیات پر قلم اٹھانے کے لیے جس وسیع النظری اور بڑے ذہنی کینواس کی ضرورت ہوتی ہے وہ ڈاکٹر صاحب میں بدرجہ اتم موجود ہے۔

ڈاکٹر ظ۔ انصاری کا انداز تحریر اتنا شگفتہ اور رواں ہے کہ خشک سے خشک موضوعات کو بھی ان کا قلم بوجھل ہونے نہیں دیتا۔

پوری کتاب روایتی سوانحی انداز کی بجائے دستوئیفسکی کی زندگی، فن اور فکر کی ملی جلی آمیزش کے مختلف رنگوں سے سجائی گئی ہے۔ اردو میں غالباً یہ اپنے طرز کی پہلی کتاب ہے، جو طرز نیا بھی ہے اور اچھوتا بھی۔ ویسے تو پوری کتاب بڑی محنت اور توجہ سے لکھی گئی ہے مگر "دستوئیفسکی" کا ۴۶ صفحات پر مشتمل دیباچہ (یعنی) کتاب کا سرنامہ ہے۔ جو برسوں کی دماغی مشقت کا نتیجہ اور ڈاکٹر صاحب کی اعلا صلاحیت کا بھرپور نمونہ ہے۔ اس کا شمار اردو کے چند گنے چنے اچھے دیباچوں میں کیا جاسکتا ہے۔

کتاب کی کتابت، طباعت اور گٹ اپ ویسا ہی ہے جس کی توقع ترقی اردو بورڈ کے اراکین سے کی جاسکتی ہے۔ اور قیمت صرف آٹھ روپے پچاس پیسے ہے۔

(شاہد ندیم)۔

سخاروف نے کہا...

مترجم : ستیہ پرکاش
ناشر : نیشنل اکاڈمی دریا گنج نئی دہلی
قیمت : ساتھ روپے
سائز : ۲۰×۳۰/۱۶

پیش نظر کتاب نوبل انعام یافتہ روسی سائنسداں آندرئی ڈی سخاروف کی تحریروں اور بیانات پر مشتمل ہے۔ الفریڈ اے۔ نوف کی مرتبہ اس کتاب کا ترجمہ جناب ستیہ پرکاش صاحب کی کدوکاوش کا نتیجہ ہے۔ سیلس بری کے تحریر کردہ پیش لفظ میں سخاروف کے سوانح کی سیر حاصل تفصیل ملتی ہے۔

سخاروف نے اس کتاب میں اپنے ان خیالات اور تجربات کے محرکات پر روشنی ڈالی ہے۔ جس میں اس نے انسانی زندگی کی فلاح و بہبود کے متعلق سوچا اور عمل کیا ہے۔ کتاب تیرہ ابواب پر مشتمل ہے۔ پیش لفظ میں اپنا تعارف خود سخاروف نے لکھا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے سائنسی تجربات کو اپنے ملک کے علاوہ بھی عالمی طور پر طاقت کے توازن کے طور پر عملی شکل دی ہے۔

انسانیت کی تفریق سخاروف کے نقطۂ نظر سے اس کی تباہی کا باعث ہے اور تہذیب بھی اس سے مجروح ہوتی ہے۔ ایک دانشور کی حیثیت سے سخاروف نے ملکی اور غیر ملکی ہر مسئلے پر آزادانہ اور ہمدردانہ طور پر رائے قائم کی ہے، جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ایک سائنسداں کو ان پہلوؤں پر بھی نظر رکھنا ضروری ہے جو عوامی فلاح و بہبود میں عملی حصہ لے سکتا ہو۔

مترجم نے ترجمہ کافی رواں اور بامحاورہ کیا ہے۔ طباعت اچھی ہے اور کتابت اغلاط سے پاک ہے۔

(باذل عباسی)

زیر بار (شعری مجموعہ)

مصنف : شاہد کلیم
ناشر : شبستان ادب، گیا۔
قیمت : دس روپے۔

عصری اردو شاعری کی بسیط فضا کا جو گوشہ بہار سے منسوب ہے وہ قابل ذکر ی ہے اور قابل غور بھی، خاص کر جب ہم شاہد کلیم جیسے ابھرتے ہوئے شاعر کی تخلیقات ظر ملاتے ہیں۔ شاہد نے نظم اور غزل دونوں پر طبع آزمائی کی ہے۔ اس کی غزلیات کا رادی لب و لہجہ ہمیں سب سے پہلے ہمیں متوجہ کرتا ہے۔ اس بنیادی تنوع کو برقرار رکھنے ، لیے موصوف کے، یہاں نئی لفظیات کے تانے بانے کہیں سے کہیں چلے گئے ہیں اس سے ہری طور پر ایک طویل و عریض سی فضا تو بن جاتی ہے لیکن شعری منطق اور تخیلی پرواز لی معنویت کے خدوخال کو رو پذیر نہیں ہونے دیتی۔ گویا لفظیات کے نئے نویلے دروبست علامت، تجربہ یا ابہام کے وہ رشتے شاذ ہی ہاتھ لگتے ہیں جن سے شعر کے نفس مضمون کا ہ چل سکے البتہ کچھ امتیازی گرہیں کہیں کہیں سراغ و سبیل کا کام دے جاتی ہیں اور ایسے ر مل جاتے ہیں جن میں غرض و غایت، جبر مشیت، کرب تنہائی، آسیب آگہی، اجنبیت ن، تناؤ اور ایسی کئی تلخیوں سے بھرپور عصری زندگی کی پرچھائیاں دکھائی دیتی ہیں ثلاً ؎

اپنا ہی حال کہتے مری عمر کٹ گئی
میں دوسروں سے حال کبھی پوچھتا بھی کیا

میں سنگ میل پیاس پہ تھک کر ٹھہر گیا
اس کے سوا مجھے کوئی منزل نہ مل سکی

کلک سحر لکھے گی شکن کی کہانیاں
ہمراہ کالی رات کے بستر سمیٹ لوں

شاہد کلیم کے یہاں نظموں کی فضا زیادہ متاثر کرتی ہے۔ ان چھوٹی چھوٹی نظموں میں شاعر مرکزی خیال کو بروئے کار لانے میں کامیاب رہا ہے۔ علامت تجرید اور پیکریت کے ساتھ سچے مشاہدات اور تلخ تجربات کے کیف و کم کا حق ادا کرنا اور فنی تعقل اور منظریت کے سہارے مرکزی خیال کے خدوخال اجاگر کرنا موصوف کے تخلیقی رویے کے خصوصی پہلو ہیں۔ اس نقطۂ نگاہ سے "ڈرائنگ روم کا منظر" "توسین ملتے ہیں" "انجام کار" "گزیدگی" جیسی نظمیں قابل مطالعہ ہیں۔

زندگی کے دل فریب تعریفی پہلو، پیراڈاکس، اور ناگزیر حقائق پر کلیم کی گہری نظر ہے اور ان کا انعکاس ان نظموں میں بڑے اہتمام کے ساتھ موجود ہے: "فیصلہ کے بعد"، "زہر پھیلنے کے بعد"، "مطلق ذات کی ٹوٹ پھوٹ"، "تواتر اور یہ کائنات" وغیرہ۔

مجموعی طور پر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ مجموعہ شاہد کلیم کے تخلیقی سفر اور فنی اجتہاد میں ارتقائی صورت حال کا آئینہ دار ہے اور قارئین کے لیے گویا کھلتے ہوئے پھولوں کی طرح دعوت نظارہ بھی لیے ہوئے ہے۔

چھپائی صاف اور اغلاط سے بری ہے۔ گیٹ اپ اور سرورق خوشنما اور قیمت مناسب ہے۔

نقوش افکار (مجموعہ مضامین)

مصنف : ظہیر ناشاد دربھنگوی
ناشر : مہ جبیں کتاب گھر، سرجاپور ضلع دربھنگہ۔
قیمت : پندرہ روپے

مختلف موضوعات پر گیارہ مضامین کا یہ مجموعہ مصنف کے ادبی ذوق کا تو کسی حد تک آئینہ دار ہے لیکن موصوف کے ادبی افکار و شعور کے ارتقا کو سمجھنے کا سلسلہ واضح طور پر، خود بہ خود سامنے نہیں آتا کیونکہ ترتیب میں تاریخی یا عصری تدریج کو مد نظر نہیں رکھا گیا۔ امیر خسرو، غالب، میر درد اور اقبال پامال موضوعات ہیں اور ان سے متعلق مضامین میں مصنف کسی نئی بات کا اضافہ نہیں کر سکا بلکہ غالب اور اقبال کی شاعری پر عالمی اہمیت کا لبادہ بھی ایک انتہا پسند سوچ کے مترادف نظر آتا ہے۔ جدید شعر و ادب کا رجحان "مغربی بنگال کے نمائندہ نثر نگار" "سجاد ظہیر" پر اس کی تحریریں مختصر تعارف یا رپورتاژ کی حدود سے باہر نہیں جا سکیں۔ "جاں نثار اختر کی شاعری" ایک ایسا مضمون ہے جو نقد و نظر کی باریکی اور باخبری کی بجائے جذبۂ خلوص کے اعتبار سے بہت قریب ہے۔ اختر کی نظمیہ اور غزلیہ شاعری کے درمیان حد فاصل کی صحیح شناخت کی بنا پر اس کی غزلیہ شاعری کے روایتی اور جدید پہلوؤں پر خاص تشدید کی ضرورت تھی کیونکہ جاں نثار اختر اپنی غزلیہ شاعری کے بل بوتے پر ہی دوسرے ترقی پسند شاعروں سے مختلف، ممتاز اور کہیں آگے ہے۔ گھر آنگن کی رباعیات جو اس کی غزلیہ لب و لہجہ اور فنی رویے کی Direct off shoot کا امتیاز رکھتی ہیں اس کے لیے لافانی نام و نمود کی ضامن ہیں۔

باقی مضامین واقعی مصنف کی انفرادی تگ و دو کے بین ثبوت ہیں اور یہی مضامین ہیں جہاں اس کی طرز نگارش اس کے نجی افکار اور نظریات کے ساتھ خاطر خواہ انصاف کرتی ہے اور خوشی محسوس ہوتی ہے کہ بہار کی دھرتی کا ایک لال وہاں کے ادبی مشاہیر کے ذکر خیر کو ہندوستان کے کونے کونے تک پہنچانے کا ذوق سلیم بھی رکھتا ہے اور بے پایاں خلوص بھی۔ پروفیسر اختر قادری، علامہ جمیل مظہری اور سید اعجاز احمد رضوی پر ناشاد کی تحریریں نہ محض معلومات سے پر ہیں بلکہ ان حضرات کے تخلیقی، فنی اور ادبی قد و قامت کو صحیح معیار پر پرکھنے اور بے لوث اور دانشورانہ انداز میں پیش کرنے کی کامیاب کوششیں ہیں۔ ایسے مضامین اردو ادب کے ان گوشوں کے بے تکلف تعارف ہیں جنھیں محض مرکزی دبستانوں سے دوری کی بنا پر ہی نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور ادب شناس قاری بعض اوقات عظیم شعری ودیعتوں سے خواہ مخواہ محروم رہ جاتا ہے۔

مجموعی طور پر یہ مضامین بہار میں اردو کی خدمات کے آئینہ دار ہیں اور جب اچھی طباعت اور دیدہ زیب گیٹ اپ کے ساتھ یہ کتاب منظر عام پر آئی اس کے مد نظر قیمت کا عنصر گراں نہیں گزرتا۔

صنم تراش (مجموعہ کلام)

مصنف : صلاح الدین نیر

ناشر : نیشنل بکڈپو مچھلی کمان حیدرآباد۔

قیمت : بارہ روپے

زخموں کے گلاب کے بعد صنم تراش کا منظرِعام پر آنا نانگ بھگ چھ سال کے شعری سفر کا معاملہ ہے جس میں ایک برائے نام مجموعی اقدام سے مزید کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا گویا شاعر اپنے تخلیقی ضمیر اور فنی ریاض میں کسی قابلِ ذکر ارتقا یا اکتساب کی صورت حال پیدا نہیں کرسکا۔ تمام غزلیات روایت کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں اور اس بنیاد پر بھی مصرعوں میں باہمی ربط کی کمی شعری منطق کی معنی انگیز فضا کو تعمیر نہیں ہونے دیتی۔ ظاہر ہے کہ قاری فصاحت آمیز لب و لہجہ کے ساتھ ساتھ تغزل اور بے ساختگی کے اس سیر حاصل تسلسل سے دوچار نہیں ہوتا جو موصوف کے ذیل جیسے اشعار کی کثرت سے پیدا ہوسکتا تھا۔

نظریں ملیں تو اور بھی نزدیک ہو گئے
دل کے معاملے میں کسے اختیار تھا

کچھ مصلحت تھی ایسی کہ خاموش ہم رہے
سچ پوچھیے تو آپ کی آنکھوں میں کیا نہ تھا

تم خود بھی ابتدا سے تو ہم شکار تھے
ورنہ قلندروں کی دعاؤں میں کیا نہ تھا

کیا بات ہے نظروں کی تشفی نہیں ہوتی
حالانکہ میں برسوں سے تمھیں دیکھ رہا ہوں

پھر بت کئی شبوں کے ہیں سر پر کھڑے ہوئے
سورج ابھی ڈھلا ہے ابھی پہلی شام ہے

دستِ درازِ ظلم کی تاریخ بن نہ جائیں
خاموش حادثے ابھی ان خنجروں میں ہیں

شہیدِ آرزو اس گھر میں اب بھی رہتا ہے
رہے گا حشر تلک یہ مزار پائندہ

ان اشعار کی مجملہ ماہیت سے پتہ چلتا ہے کہ نیّر کے یہاں مشاہدات و تجربات، سچے جذبات اور احساسات کی کمی نہیں۔ لہٰذا عصری تقاضے جس تخیلی اجتہاد اور اسلوبی تنوع کے خواہاں ہیں اس کے امکانات موصوف کے تخلیقی سفر سے جس قدر وابستہ ہیں اس قدر متوقع بھی ہونے چاہئیں۔

کتاب کی چھپائی صاف، گیٹ اپ سادہ اور قیمت مناسب ہے۔

نگارِ سحر (غزلیات کا مجموعہ)

مصنف : جوہر ہاشمی

ملنے کا پتہ : آندھرا پردیش اردو اکیڈمی حیدرآباد

قیمت : بارہ روپے

یہ مجموعہ مصنف کی پہلی شعری پیش کش ہے۔ مقامی اور نواحی مشاعروں میں جوہر کی پذیرائی کے بعد سیہ بر سفید کا یہ سلسلہ دور دراز کے قارئین کے لیے ایک تعارف ہے اور وسیلۂ شناخت بھی۔ یہ غزلیات قدیم رنگ سے بہت قریب ہیں اور جانے پہچانے موضوعات پر مانوس العام کیفیات کی حامل ہیں۔ البتہ کچھ ایسے اچھے اشعار ضرور مل جاتے ہیں جو جدیدیت کی طرف ایک شعوری آغاز کا پتہ دیتے ہیں لیکن صحیح معنوں میں کسی قابلِ ذکر امتزاجی صورت حال کا دم نہیں بھرتے۔ ان شعری کاوشوں کی تہہ میں سچے مشاہدات اور تلخ تجربات کی آنچ کے باوجود شاعر کا تخلیقی رویہ احساس اور خیال کے منطقی ربط کو قائم رکھنے سے قاصر ہے۔ نئی زمینوں کے اختراع کی خوبیاں بھی "سچ بولنا پڑا"، "بہت تیز دھوپ ہے" یا "یہ کیا تبصرہ کریں" جیسی بوجھل ردیفوں کی زد میں آکر مفہوم کے تناسب اور تخیل کے تواتر کا اپنا حصہ نہیں بنا سکیں۔

لب و لہجہ اور رنگ و آہنگ میں ایک انفرادی دھمک کا احساس جابجا ہوتا ہے اور مندرجہ ذیل شعروں کے تغزل، بے ساختگی اور غنائی مزاج سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

زندگی سے پیار ہوتا ہے جسے
موت سے وہ شخص گھبراتا نہیں

افسانہ در افسانہ ہے روداد محبت
ہر قصے کا عنوان تری پہلی نظر ہے

دامِ فریب وقت میں ساقی بھی آگیا
جو زہر تھا فضا میں وہی ساغروں میں ہے

شبِ فراق، شبِ تار کیا، شبِ غم کیا
نمودِ صبح سے ہر شب نے مات کھائی ہے

عصری فضاؤں کی دھوپ چھاؤں کے بیچوں بیچ جوہر کا شعری سفر جاری ہے جو نئے آفاق کا متلاشی ہونے کے ناطے ان کا مستحق بھی ہے۔

کتابت میں تناسب کی کمی چھپائی کا کمزور پہلو ہے۔ سرورق جاذب نظر ہے۔ سرکاری اور نیم سرکاری اعانت کی روشنی میں قیمت زیادہ ہے۔

در بہ در (مجموعۂ غزلیات)

مصنف : پروین کمار اشک

ناشر : سمیک پرکاش، کرشنا سٹریٹ، پٹھان کوٹ (پنجاب)

قیمت : بارہ روپے

زیرِ نظر کتاب مصنف کا پہلا مجموعۂ کلام ہے۔ کتاب کی دلکشی جہاں بیرونی طور پر عمدہ طباعت کی مظہر ہے۔ وہاں اندرونی طور پر ہمیں ایک ایسے ابھرتے ہوئے نوجوان شاعر سے بھی متعارف کراتی ہے۔ جس کے یہاں غزل کی فضا میں ایک طرح کے بنتے سنورتے لب و لہجہ اور شعری اسلوب کا سلسلہ انفرادیت اور تنوع کی طرف بڑے اعتماد کے ساتھ بڑھتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

اشک کے یہاں سب سے پہلے جو چیزیں ہمیں متوجہ کرتی ہیں وہ ہیں الفاظ کی سادگی، تراکیب کی بے ساختگی بیان کی رواتی اور خیال کی کچی کلیاں جو احساس کی ہوا سے دوچار ہو رہی ہیں۔ گویا نمو کا ایک سفر ہے جو اپنی اچھی ابتدا کے بل بوتے پر ارتقا کے خوشگوار مرحلے طے کرنے کے درپے ہے۔

یہ اشعار جہاں اس صورتِ حال پر روشنی ڈالتے ہیں۔ وہاں اشک کے

یہاں عصری حسیت اور نئی غزل کے مزاج سے بڑھتی ہوئی وابستگی کے دھنک رنگ نقوش بھی فراہم کرتے ہیں ؎

پھول چھونے سے بھی کٹ جاتی تھی جس کی انگلی
آج اس شخص کے ہاتھوں میں بھی پتھر دیکھا

جی میں آتا ہے کہ شبنم کی طرح ہم روئیں
اپنے ہاتھوں میں ترا پھول سا چہرہ لے کر

جانے کیا سوچ کر رہے خاموش
ہم بھی کر سکتے تھے سوال بہت

اشک کے یہاں تجربات اور مشاہدات کا سرمایہ محدود ہے لیکن یہ سلسلہ اس کی عمر کے متوازی ضرور چل رہا ہے۔ لگتا ہے ایک کامیاب سماجی اور ازدواجی زندگی اور حلقۂ احباب کی مانوس اور پر خلوص محبت اس کے تخلیقی سفر میں صحت مند رویوں کے سنگ میل ہیں۔

یہ دیدہ زیب کتاب پنجاب سرکار کے مالی تعاون سے منظر عام پر آئی ہے۔ اور قیمت بالکل مناسب ہے۔ بڑی توقع ہے کہ ایک حوصلہ افزا گوشے سے ابھرنے والی اشک کی آواز ادب شناس حلقوں کی کھلی ہوا میں بھی خلوص کے ساتھ قبول کی جائے گی۔ (رام پرکاش راہی)

عرفانِ نظر (تنقیدی مضامین کا مجموعہ)

مصنف : ڈاکٹر یوسف سرمست
ناشر : مینار بکڈپو، حیدرآباد۔
قیمت : بارہ روپے
سائز : ۲۰×۳۰/۱۶

ڈاکٹر یوسف سرمست اردو ادب کی تنقیدی تفہیم اور ناول کی خصوصی بصیرت کے سلسلے میں اپنی تصانیف "بیسویں صدی میں اردو ناول" اور "پریم چند کی ناول نگاری" سے پہچانے جاتے ہیں۔ پیش نظر کتاب ان کی تصنیفات میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں ان کے وہ مضامین شامل ہیں، جو ۱۹۶۰ء سے لے کر ۱۹۷۰ء تک ہندو پاک کے مختلف رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ شعری حصہ تنقید میں میر اور مصحفی کی شخصیت اور شاعری پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ ان مضامین میں ان کے نظریات پر اختلاف کی گنجائش ہے لیکن مجموعی طور پر انھوں نے ان کی شاعری اور شخصیت پر ناقدانہ ذمہ داریوں کو ادا کیا ہے۔ میر کی شاعری "جی ہلکا کرنے والی" شاعری ضرور ہے لیکن وہ اندرونی حزن جو میر کی شخصیت میں رچ بس گیا ہے دراصل خود ترحمی کی دلیل ہے۔ وہ زمانہ سے برگشتہ تو ہو سکتے ہیں لیکن زمانے پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ ان کی "بد دماغی" یا "بے دماغی" نہیں بلکہ خود پسندی اور ان کی انا کے طفیل ہے۔ ان کے یہاں جو نشاطیہ غزلیں ہیں یا "بغاوت پسند" والی جو بات ہے وہ ان کی شخصیت کے منفی پہلوؤں کو بھی پیش کرتی ہے اور قاری کے لیے غمگین بوجھل فضا چھوڑتی ہے۔ مصحفی زندگی میں جد و جہد کے قائل تھے، ان کی شاعری اور معاملات سے بھی یہ پتہ چلتا ہے۔ انھوں نے اپنے ذاتی تجربات کو شعر کا موضوع بنایا تھا۔ اسی لیے ان کی شاعری ایک متوازن مزاج انسان کی شاعری ہے۔ وہ فن کارانہ زعم میں نہیں بلکہ داخلی امنگ سے شعر کہنے کے لیے مجبور تھے۔ اسی لیے ان کے یہاں خارج کے اثرات بھی داخلی کرب بن کر ظاہر ہوتے ہیں۔ شخصیت کا یہ پہلو شاید مصنف نے نظر انداز کر دیا ہے۔ لیکن مصحفی پر ان کا مضمون واضح طور پر کچھ سوچنے کے لیے مجبور کرتا ہے۔ "مومن کی عشقیہ شاعری" میں عشق کی نفسیات اور مومن کے مزاج کا جو احاطہ کیا گیا ہے وہ دل فریب بھی ہے اور لائق داد بھی۔ "اقبال کے فلسفہ و شعر کی آفاقیت" اور "فیض کی شاعری" تفہیم کے نئے گوشوں کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ اس میں مصنف کا انداز متوازن ہے۔ اور مطالعے کی ہمہ گیری کا پتہ ملتا ہے۔ "انشائیہ" پر لکھا گیا مضمون مکتبی تنقید کی واضح مثال ہے۔ انشائیہ کی شناخت اور اس کے حوالے پر سیر حاصل بحث کے ساتھ ساتھ انشائیہ کے اجزائے ترکیبی جس طرح بھی اجاگر کیا گیا ہے وہ طالب علمانہ ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور نیاز فتح پوری کی مزاح نگاری، جیسے مضامین اچھوتے ہیں، ان پر قلم اٹھا کر مصنف نے ان شخصیتوں کے ایک نئے گوشے کی طرف متوجہ کیا ہے۔

ناول مصنف کا خاص موضوع ہے اس لیے وسعت نظر کے ساتھ انھوں نے نذیر احمد اور مرزا رسوا کی ناولوں پر بحث کی ہے۔ ناول نگاری پر جو مبسوط انداز نظر مصنف نے قائم کیا ہے وہ قابل قدر ہے۔ "سماجی ناول کی اصلاح"، "داستان گو اور ناول نگار کا تخیل"، "جدید نفسیاتی ناول یا شعور کی رو کے ناول" ان کے تخلیقی پہلوؤں اور انداز نظر کا پتہ دیتے ہیں۔ ان ناولوں کے اجزا اور ان کا علمی جواز بھی انھوں نے بہت سلجھے ہوئے انداز میں پیش کیا ہے۔ (باذل عباسی)

---(بقیہ ملاحظات)---

ممتاز مغنی کا انتقال

شہرہ آفاق پلے بیک سنگر محمد رفیع کا ۳۱ جولائی ۱۹۸۰ء کو بمبئی میں انتقال ہو گیا وہ ۵۴ برس کے تھے۔ ان کی اچانک موت سے شعر و نغمہ کی دنیا کی ایک بڑی ہی دلکش اور محبوب آواز خاموش ہو گئی ہے۔ مرحوم نے اپنی زندگی کا آغاز ۱۹۴۱ء میں ایک پنجابی فلم سے کیا اور گذشتہ چالیس سال تک فلمی دنیا میں ایک سدا بہار پلے بیک سنگر کی طرح چھائے رہے۔ انھوں نے پچیس ہزار سے زائد فلمی نغمے گائے جن میں مختلف زبانوں کے گیت شامل ہیں۔۔

آپ کا خط

عصمت آپا کے 'کاغذی ہے پیرہن' کی اقساط پڑھ کر بہت متاثر ہوا۔ آپا کا فن اپنی شبیہ کامل رکھتا ہے۔ اُس میں تناقص کا شائبہ ڈھونڈنا محال ہے۔ اس کی وجہ شاید آپا کی حقیقت نگاری ہے۔ وہ کردار کردار معاشرے میں زندگی کرتی دکھائی دیتی ہیں جس پر اُن کی تحریر کی بنیاد ہے۔ ہر واردات کا باریک ترین مشاہدہ کیے بنا ایسی توانا اور صحت مند عبارت ممکن نہیں۔ آپا کے قلم میں شدت ہے۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتی ہیں وہ اُن کی دسترس میں ہے حقیقت کو شفاف منظر کی طرح پیش کرنے اور اُس منظر کا نقش نقش قاری کے دل پر ثبت کر دینے میں آپا کو کمال حاصل ہے۔ بات دراصل واردات کو سمجھنے اور اُسے اپنے اوپر مسلط کر لینے کی ہے۔ آپا جانتی ہیں کہ فن کار کو اپنی شخصیت کو بھول کر معاشرے، کردار اور واقع و واردات کو اوڑھنا چاہیے۔ ایسا کیے بغیر نہ الفاظ فن کا کاسہ دیتے ہیں نہ احساس ہی ضروری شدت اختیار کرتا ہے اور نہ ہی اظہار میں سچی تابانی آتی ہے۔ آپا دُھند نہیں بکھیرتیں۔ وہ ٹھوس بات کو ٹھوس پیرائے میں کہتی ہیں لیکن جس مصور نامے کو وہ تشکیل دیتی ہیں وہ دھند بن کر قاری کے دل و دماغ پر چھا جاتا ہے۔ زبان و بیان اور اسلوب و تکنیک سب آپا کے ہیں یہی بات انھیں اردو فکشن میں منفرد اور ممتاز بناتی ہیں۔

کنور سین۔ نئی دہلی

"آج کل" بابت ماہ جون ۱۹۸۰ء میں محترمہ بیگم صالحہ عابد حسین کا مضمون اُن کے مرحوم شوہر نامدار سید عابد حسین مرحوم و مغفور کے متعلق پڑھا۔ مجھ پر اس گھرانے کے بڑے حقوق ہیں، خواجہ غلام السیدین صاحب مرحوم جب یہاں ناظم تعلیمات تھے، تو یہ ناچیز بھی اُن کا لٹریری اسسٹنٹ تھا۔ اردو جو کچھ لکھنا یا پڑھنا آئی، وہ انہی کی فیض صحبت کا نتیجہ ہے۔ انہی کی وساطت سے میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم اور سید عابد حسین صاحب مغفور سے متعارف ہوا تھا۔ اور دونوں بزرگوں کا کرم میرے شامل حال رہا لیکن چونکہ محترمہ صالحہ عابد حسین سے براہ راست متعارف نہ تھا۔ ان کو سیدین صاحب و عابد صاحب کی وفات پر لکھنا مناسب نہ سمجھا۔

بیگم صاحبہ نے مضمون کے آخر میں لکھا ہے "عابد صاحب کے گذرنے کے بعد کوئی ایسا نظر نہیں آتا جو اُن کی تاریخ وفات اسی پائے کی کہہ سکتا جیسی وہ خود کہتے تھے۔ مادۂ تاریخ نکالنے میں یہ خاکسار بھی طبع آزمائیاں کرتا ہے۔ چنانچہ عابد صاحب کی تاریخ وفات بھی یوں ہوئی ہے۔

سانحۂ رحلتِ عابد حسین — روضۂ رضواں زقدومش شگفت
درادب و فلسفہ و فنِ شعر — بیش بہا گوہر نایاب سفت
ملہم غیب از پئے سالِ وصال — "ضم شدن عابد و معبود" گفت

۹۹ ۱۳ ۲

میر غلام رسول نازکی

۴۷۔ کاٹھی دروازہ، سرینگر۔

جولائی کا "آج کل" بہت اچھا لگا خاص طور پر اس کے مشتملات کا علمی اور تحقیقی حصہ اس نوع کی شگفتہ ادبی تحقیقات کو آج کل جیسے سنجیدہ اور معیاری پرچے میں جگہ ملتی رہنی چاہیے۔ یوں بھی اردو میں اب تحقیقی رسائل نہیں رہے "تحریر" بند ہو گیا۔ نوائے ادب کو شش ماہی کر دیا گیا۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر کا مضمون دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔ مزید تحقیق سے ممکن ہے بھاگ متی کے مقبرہ کا حتمی تعین ہو جائے۔

اس میں پچھلی صدی عیسوی کے گزیٹرز سے بھی مدد لی جا سکتی ہے۔ اس علاقہ کی جاگیر و جائداد کے متعلق قدیم کاغذات میں بھی ہو سکتا ہے اس کے بارے میں کوئی ذکر و فکر ہو۔ مزید تلاش کے نتیجے میں یہ ممکن ہے۔ اور کہیں سنگ سیاہ پر کندہ ان تحریروں کی نقلیں بھی مل جائیں زمانہ کی دستبرد کے ہاتھوں جن کے نقوش مٹ گئے۔ ویسے موضع چچلم میں اس مقبرہ کی موجودگی اور اس سے متعلق زبانی روایت جو عرصہ سے چلی آ رہی ہے اپنی جگہ پر کافی اہم بات ہے۔

سہاگ متی کا مقبرہ اگر شاہی مقابر سے الگ بھی بنایا گیا ہو تو یہ کوئی مستبعد بات نہیں۔ مقبرے کے طرز تعمیر کا تحقیقی جائزہ ہی شاید اس مسئلہ کو حل کر دے۔ سیاہ پتھر کی سلوں پر جو نقش باقی ہیں ان کو پڑھنے کی کوشش بھی جاری رہنا چاہیے۔

یہ کام ڈاکٹر سیدہ جعفر خود بھی کر سکتی ہیں اور ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب ڈاکٹر حسینی شاہد، ڈاکٹر اکبر الدین صدیقی اور ڈاکٹر گیان چند جین جیسے اسکالرس سے بھی مدد لی جا سکتی ہے۔

جس طرح حالی کے فائل کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے اسی طرح بعض دوسرے ادیبوں عالموں اور شاعروں کے بارے میں اوریجنل معلومات بہم پہنچائی جا سکتی ہیں۔ جن کا حیدرآباد سے بہت گہرا ادبی اور علمی رشتہ رہا ہے۔

میری جانب سے ان مقالہ نگاروں کو مبارک باد دیجیے۔

تنویر احمد علوی

ریڈر شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی

ہماری کتابیں

۱۔ مشعلِ آزادی (ساغر نظامی) قیمت ۳۰ روپے
ہندوستان کی جنگِ آزادی کی منظوم داستان (حصۂ اوّل) ۴۲۰ صفحات پر مشتمل جس میں ۱۸۵۷ء تک کے واقعات شامل ہیں۔ دیدہ زیب کتابت وطباعت عمدہ مجلّد مع گرد پوش۔

۲۔ بھارت خلائی دَور میں قیمت بارہ روپے
خلائی سائنس کی دلچسپ داستان۔ سری ہری کوٹہ کی سیر، رازہائے سربستہ کا انکشاف، نہایت آسان زبان، خلائی کوششوں کا ہلکے پھلکے انداز میں بیان۔ ۱۴۰ صفحات کی کتاب۔ کاغذ عمدہ، تصاویر سے مزین۔

۳۔ پہیلیاں قیمت آٹھ روپے
پانچ سو سے زیادہ پہیلیوں کا مجموعہ جن سے بچّے اور بڑے یکساں طور پر لطف اُٹھا سکتے ہیں۔

۴۔ رنگ برنگے پھول قیمت دس روپے
بچوں کے شاعر شفیع الدین نیّر، سیفی سیوہاروی، افسر میرٹھی، اسمٰعیل میرٹھی، تلوک چند محروم اور دیگر بہت سے شعرا کی آسان زبان میں لکھی ہوئی نظمیں۔

۵۔ آج کل کی کہانیاں قیمت گیارہ روپے
۱۹۶۴ء سے ۱۹۷۸ء تک رسالہ "آج کل" میں شائع شدہ مشہور کہانیوں کا مجموعہ جس میں واجدہ تبسم، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر اور دیگر افسانہ نگاروں کے شہ پارے شامل ہیں۔

۶۔ کون جیتا کون ہارا قیمت ۹ روپے
بچوں کے لیے آسان زبان میں لکھی ہوئی دو دلچسپ کہانیاں۔ کتاب شروع کرنے کے بعد ایک ہی نشست میں ختم کرنے کو جی چاہتا ہے۔ عمدہ کتابت۔

۷۔ ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر (ڈاکٹر محمد عمر) قیمت ۲۰ روپے
ڈاکٹر تارا چند نے اپنی مشہور تصنیف میں ہندوستانی تہذیب پر مسلمانوں کے اثرات کا جائزہ لیا تھا۔ ڈاکٹر محمد عمر نے اپنی اس محققانہ کاوش میں یہ دکھایا ہے کہ ہندوستانی تہذیب مسلمانوں کی زندگی میں سرایت کیے ہوئے ہے۔

۸۔ مرقعِ اقبال (جگن ناتھ آزاد) قیمت ۵۰ روپے
علامہ اقبال کی زندگی کے اہم واقعات، شجرۂ نسب اور نادر تصاویر اور تحریروں کا البم۔

۹۔ یہ ہندوستان (شیلادھر) قیمت ۱۰ روپے
اس باتصویر کتاب میں سادہ اور سہل زبان میں بچوں کو ہندوستانی تہذیب وتمدن کے ساتھ ساتھ تاریخی معاشی اور سماجی حالات سے آگاہ کیا گیا ہے۔ رنگین تصاویر۔

۱۰۔ سر سید احمد خاں (پروفیسر خلیق احمد نظامی) قیمت ۵ روپے
ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی، ثقافتی اور سیاسی زندگی پر سر سید کے کارناموں کا زبردست اثر پڑا ہے۔ اس بات کو بڑے عالمانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

۱۱۔ ابوالکلام آزاد (عرش ملسیانی) قیمت پانچ روپے
ابوالکلام آزاد جدید ہندوستان کے معماروں میں ہیں۔ ان کی خدمات کا حسین و دلکش انداز میں بیان۔

۱۲۔ جواہر لال کی کہانی تصویروں کی زبانی قیمت ۳ روپے ۵۰ پیسے
محبوب رہنما اور ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم شری جواہر لال کی زندگی کے دلچسپ واقعات رنگین تصاویر میں۔ بچوں اور طالب علموں کے لیے بہترین تحفہ۔

۱۳۔ ہم ایک ہیں (عرش ملسیانی) قیمت ۱۰ روپے
ہندوستان کی ثقافتی وسماجی گوناگونی اور یک رنگی کا دلچسپ بیان۔ قومی زندگی کی توانائی کی داستان۔

۱۴۔ پھلوں اور سبزیوں کو محفوظ رکھنے کے طریقے قیمت دو روپے ۵۰ پیسے
گھریلو عورتوں کے جام جیلی، مارملیڈ، چٹنی مربّے اور اچار وغیرہ بنانے کے متعدد طریقے تصویروں کے ذریعے بتلائے گئے ہیں جن سے بڑی آسانی سے آپ گھر بیٹھے اپنی من پسند چیزیں بنا سکتے ہیں۔

"آجکل" کے خریداروں کو ۲۰ فی صد رعایت۔ محصول ڈاک ہمارے ذمے
دس روپے سے کم قیمت کی کتابیں بذریعہ وی۔ پی نہیں بھیجی جائیں گی۔ پوسٹل آرڈر بھیجیے یا وی۔ پی طلب کیجیے۔

ملنے کا پتہ: بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

Regd. No. D(D-103)
R. N. 948/57

Licensed U(D) - 50 to post withour pre-paymen
at Civil Lines post office, Delhi.

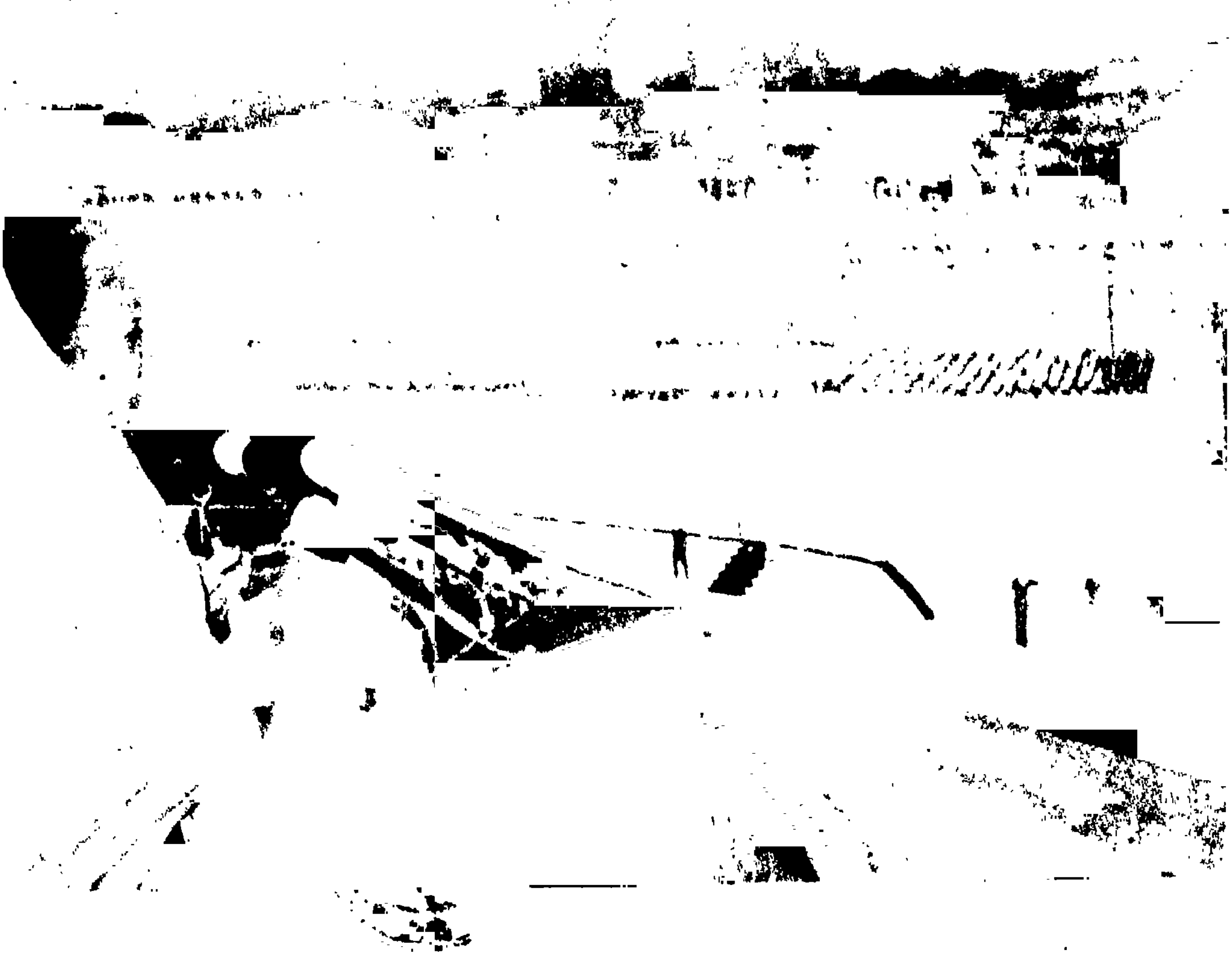

آزادی کی تینتیسویں سالگرہ (۱۵ اگست ۱۹۸۰ء) کے موقع پر وزیر اعظم ہند شریمتی
اندرا گاندھی نے لال قلعہ کی فصیل پر قومی پرچم لہرایا۔ اس تاریخی موقع پر قوم سے خطاب
کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ فرقہ پرستی، علاقہ پرستی اور علیحدگی پسندی کے رجحانات کو ہر ممکن
طریقے سے ختم کیا جائے گا کیونکہ اتحاد کے بغیر ملک کی ترقی ممکن نہ ہوگی۔

Vol. 39 No.2 AJKAL (URDU) September 1980
Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi.

اوراق

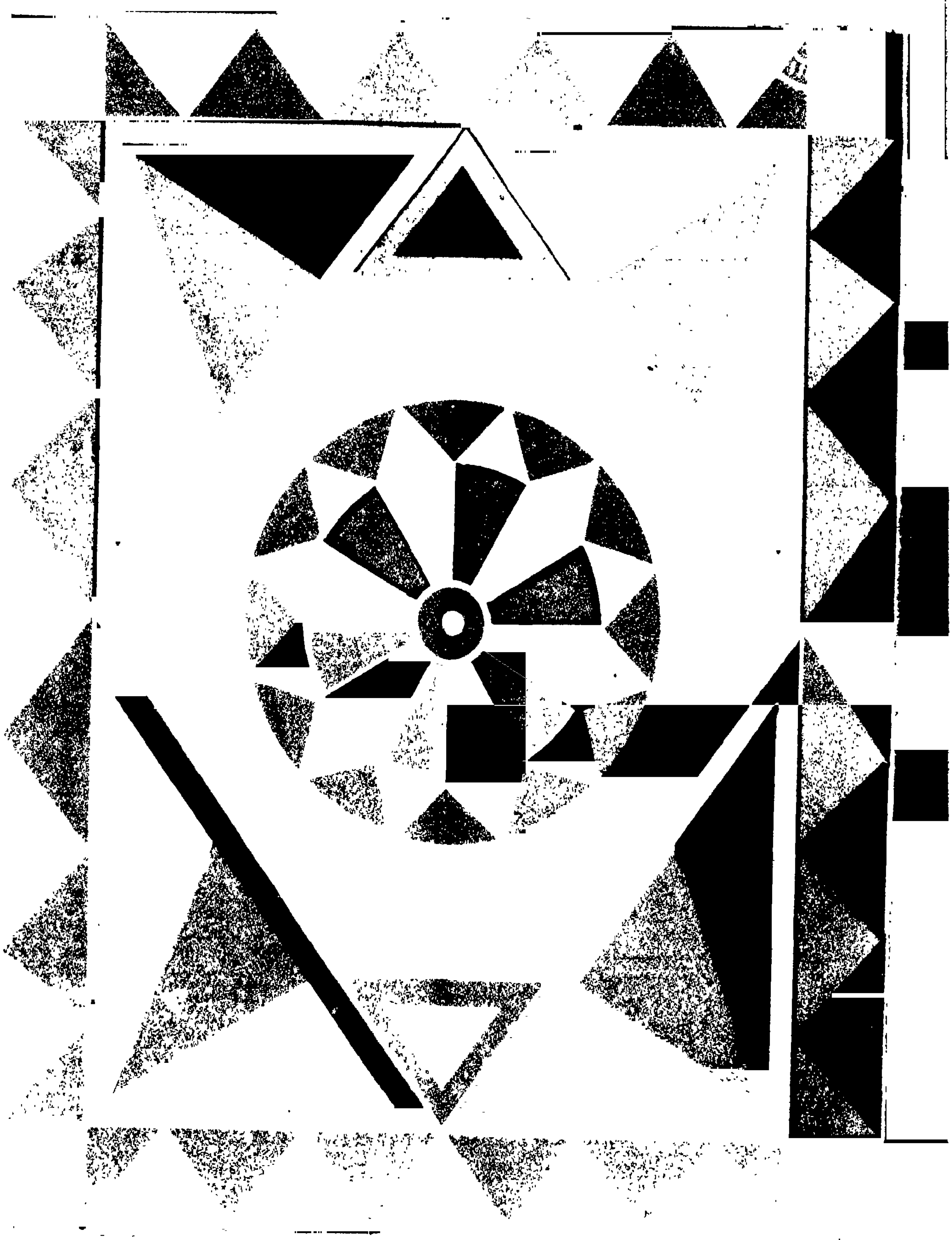

باپو نے کہا...

نہ دیکھی گئی تجھ سے لوگوں کی پستی، نہ دیکھی گئی تجھ سے فرقہ پرستی
ہوئی جب گراں زندگی، موت سستی کیا تو نے اپنے لہو سے ازالہ

- خدا کے حکم کے بموجب ہم سب ایک ہی کنبے کے افراد ہیں اور ہم سبھی کو ایک دوسرے کے لیے زندہ رہنا ہے۔

- سچ تو یہ ہے کہ جتنے آدمی ہیں اُتنے ہی مذہب ہیں۔ لیکن اپنے مذہب کی تہہ تک پہنچنے پر ہر آدمی یہ دیکھے گا کہ تمام مذہب دراصل ایک ہی ہیں۔

- اپنے مذہب کے لیے جان دینا اچھا ہے۔ مگر اس کا جنونی بن کر نہ مرنا اچھا ہے، نہ جینا۔

- ایک انسان خدا کی تو عبادت کرے، پر اُس کے بندوں سے نفرت۔ یہ بات روا نہیں ہے۔

- جب خدا نے خود فرمایا ہے کہ وہ ہر ایک جاندار میں موجود ہے، تو پھر ہم کیوں کسی سے بیر رکھیں۔

اُردو کا مقبولِ عام مصوّر ماہنامہ

آجکل

نئی دہلی

ایڈیٹر
شہباز حسین
اسسٹنٹ ایڈیٹر
محمد عادل صدیقی
سب ایڈیٹر
شوناتھ سکّہ

جلد ۳۹ شمارہ ۳
اکتوبر ۱۹۸۰ء
آشون کارتک شک سمت ۱۹۰۲
فون نمبر ۳۸۷۰۶۹

شرح چندہ

	ہندوستان	پاکستان	دیگر ممالک
سالانہ	۱۰ روپے	۱۶ روپے	۳ ڈالر ۱٫۵۰ پونڈ
دوسالہ	۱۷ روپے	۲۷ روپے	۵ ڈالر ۲٫۵۵ پونڈ
سہ سالہ	۲۴ روپے	۳۷ روپے	۷ ڈالر ۳٫۶۰ پونڈ
فی کاپی	ایک روپیہ	ڈیڑھ روپیہ	۳۰ سینٹ ۱۵ پنی

سرورق عمل: گورچرن اروڑہ

ترتیب

ملاحظات ―― ۲
نگین ہی عجیب ہیں (نظم) ―― ظہیر صدیقی ―― ۳
پنڈت گووند بلبھ پنت ―― شوناتھ سکّہ ―― ۴
غزل ―― محسن زیدی ―― ۶
نکسیر (کہانی) ―― حیات اللہ انصاری ―― ۷
لا ―― جاوید وششٹ ―― ۱۰
ریحانہ طیب جی ―― آصف مجیب ―― ۱۲
غزلیں ―― اسعد بدایونی، سیفی سرونجی، ابوالکلام قاسمی، نشاط انصاری، جعفر عسکری، منظور ہاشمی ―― ۱۷
مکاشفات الاسرار ―― میکش اکبرآبادی ―― ۱۸
جوالامکھی (کہانی) ―― عطیہ پروین ―― ۲۱
غزلیں ―― کمار پاشی، سیماب سلطان پوری ―― ۲۳
عبید زاکانی ―― محمد ہادی حیدر طباطبائی ―― ۲۴
زہر (کہانی) ―― محمد طاہر ―― ۲۵
داغ کے شاگردانِ دکن ―― ابراہیم اختر ―― ۲۸
ایک اور مذہب (کہانی) ―― بالا دوبے ―― ۳۰
لرزاں مینار ―― صابر کمال ―― ۳۳
باز آئے بے تکلف دوستوں سے ―― انیس نصرت ―― ۳۴
شاد عارفی شخصیت اور شاعری ―― دور آفریدی ―― ۳۶
پریم چند اور بچّے ―― ایس کے آڈکر ―― ۳۸
انسانیت کا خون ―― ثمر ماپخوی ―― ۴۰
غزل ―― منیر سیفی ―― ۴۰
پریس کی علت ― زندگی کی بڑی غلطی ―― نریندر رسنہا ―― ۴۱
نئی کتابیں ―― ۴۲

ڈائرکٹر پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر "آج کل" اردو، پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترسیلِ زر کا پتہ
بزنس منیجر، پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ملاحظات

مہاتما گاندھی کی مقدس یاد ہمارا قیمتی ورثہ ہے۔ لیکن یہ یاد اب شاید ایک رسم بن کر رہ گئی ہے۔ ورنہ اس کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ ہماری قومی زندگی دن بہ دن تشدد، تنگ نظری، خود غرضی اور منافرت کا شکار کیوں ہوتی جا رہی ہے۔ گاندھی جی جن آدرشوں کے پیچھے جیے اور مرے وہ ایسے ہیں جو کسی بھی قوم کے لیے سرمایۂ افتخار ہیں۔ اور ان پر عمل پیرا ہو کر ہی کوئی قوم عظیم بن سکتی ہے۔

اخلاقی قدروں کو فروغ دیے بغیر کوئی معاشرہ ترقی نہیں کر سکتا۔ معاشی اور صنعتی ترقی بلاشبہ اہمیت رکھتی ہے۔ لیکن جہاں پڑوسی ایک دوسرے پر اعتبار نہ کریں اور خوف کھائیں، جہاں طاقت ور کمزوروں کا استحصال کریں اور جہاں تنگ نظری اور خود غرضی کا بول بالا ہو وہاں خوشی اور مسرت کا راج نہیں ہو سکتا۔

مہاتما گاندھی ہر آنکھ سے آنسو پونچھنا چاہتے تھے، وہ اپنے دروازے ہر قسم کی ہواؤں کے لیے کھلا رکھنا چاہتے تھے۔ اور عالمی امن اور بھائی چارے کے خواہاں تھے۔ وہ ہر مذہب کی یکساں عزت کرتے تھے اور ان کی نظروں میں کوئی نیچ اور بُرا نہیں تھا۔ انھوں نے صرف دعویٰ نہیں کیا بلکہ ثابت کر دکھایا کہ ایک خوش حال اور صحت مند معاشرے کے قیام کے لیے ایسے اقدار بے حد ضروری ہیں۔

اگر مہاتما گاندھی کی تحریروں اور تقریروں اور ان کی زندگی کو سامنے رکھا جائے تو ان کی تہہ میں اتھاہ پریم، بے غرض خدمت اور سچی انسان دوستی کے جذبات کارفرما نظر آئیں گے۔ انھیں معلوم تھا کہ محبت کی طاقت نفرت کی طاقت سے کہیں برتر اور ارفع ہے اور اس جذبے کو ابھار کر ہی انسانیت کی خدمت کی جا سکتی ہے۔ تشدد نفرت اور بے اعتمادی کی اس فضا میں ان کا پیغام محبت وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔

محترمہ اندرا گاندھی نے اپنے ایک مضمون میں مہاتما گاندھی کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے: "ان کی ایک اور قابل فخر روایت سیکولرازم کا اصول ہے۔ جس کے لیے انھوں نے اپنی زندگی قربان کر دی۔ سیکولرازم کا مطلب نہ تو مذہب سے انحراف ہے اور نہ مذہب سے بے توجہی اس کا مطلب تمام مذاہب کے لیے مساوی جذبۂ احترام، صرف رواداری کی حد تک نہیں بلکہ حقیقی جذبۂ احترام ہے۔ سیکولرازم کی کامیابی کے لیے مسلسل احتسابِ نفس کی ضرورت ہے۔ اشوک اعظم نے اس سچائی کو چٹانوں پر اس طرح کندہ کرایا تھا، کوئی شخص اپنے مذہب کا احترام اس وقت تک نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ دوسروں کے مذاہب کا احترام نہ کرے، جب حکمراں اس سچائی پر عمل کرتے تھے تو بھارت عظیم تھا۔ اور ترقی کی بلندیوں پر پہونچ گیا تھا۔ ہمارے زمانے میں گاندھی جی اور جواہرلال نہرو نے ان اصولوں کو زندہ حقیقت کے روپ میں پیش کیا۔"

جواہرلال نہرو کے الفاظ میں: "ہم اپنے آپ کو سچائی اور ان زرّیں اصولوں کے لیے وقف کرنے کا عہد کریں جن کے لیے ہمارے ملک کا یہ عظیم سپوت جیا اور مرا۔"

ڈاکٹر انصاری نمبر

ڈاکٹر مختار الدین انصاری کے صد سالہ یوم پیدائش کے موقع پر ہم آج کل کا ایک خصوصی شمارہ "ڈاکٹر انصاری نمبر" شائع کریں گے۔ یہ شمارہ دسمبر ۱۹۸۰ء کا شمارہ ہوگا۔

ڈاکٹر انصاری کی شخصیت، ان کی پیشہ ورانہ مہارت اور ان کی سیاسی اور ملی خدمات سے متعلق مضامین کی ضرورت ہے۔ تصاویر اور خطوط کی بھی ضرورت ہے۔ ۳۰؍اکتوبر تک روانہ فرمائیں تاکہ خصوصی شمارے میں شامل کیا جا سکے۔

ڈاکٹر صفدر آہ سیتاپوری

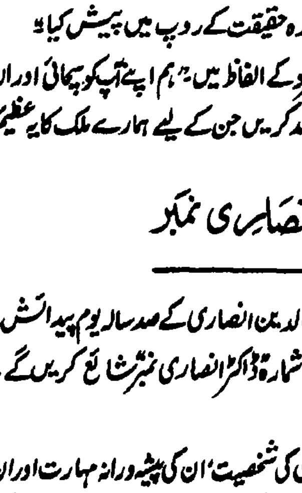

۲۸؍اگست ۱۹۰۵ء - ۲۹؍جولائی ۱۹۸۰ء

ستمبر کے شمارے میں ہم ڈاکٹر صفدر آہ کے انتقال کی خبر شائع کر چکے ہیں۔ ہم دیوان موہن صاحب فوٹو گرافر کے شکر گزار ہیں جنھوں نے ہمیں ڈاکٹر آہ کی تصویر بھیجی ہے۔

ظہیر صدیقی

مکین ہی عجیب ہیں

یہ گھر بہت عظیم تھا
یہ گھر بہت حسین تھا
کہ اس کے ارد گرد ـــــ دور دور تک
کوئی مکان اس سے بڑھ کے تھا نہیں
مگر یہاں کا کچھ عجب رواج تھا
تھے بن بلائے اجنبی
کہ جن کا گھر پہ راج تھا
سجے سجائے کمرے ان کے شب کدے تھے
سبز لان، پھول کی کیاریاں
وسیع صحن و سائبان
ان کے واسطے تھے
اور اپنے گھر میں، اجنبی، مکین
سرد و سخت چوکھٹوں پہ
رات اپنی کاٹتے تھے

دن کی دھوپ میں
سڑک گلی کی خاک چھانتے تھے
بدنصیب
ساری رات اک چراغ کو ترستے رہتے
اور بن بلائے اجنبی
گدیلے بستروں پہ
سیر چشم روشنی میں
لذت شب و سحر میں مست مست تھے

●

اسی طرح نہ جانے کتنی عمر کاٹنے کے بعد
رفتہ رفتہ
سخت و سرد چوکھٹوں نے
نرم و گرم بستروں کی گدگدی کا ذائقہ بھر لیا
دماغ و دل خشک وادیوں میں
آرزو کے آبشار گنگنا اٹھے
سیاہ بخت رات میں
شعور کے ـــ جنون شوق کے چراغ جل گئے
چراغ سے کئی چراغ جل گئے
بہ یک زبان
چوکھٹوں سے یہ مطالبہ ہوا
کہ اجنبی ہمارے گھر کو چھوڑ دیں
یہ گھر ہمارے خون
اور ہماری ہڈیوں سے ہے

●

یہ بات سن کے
شب کدے لرز گئے
تھی چونکنے کی بات ہی
کہ سال خوردہ اندھی چوکھٹوں پہ روشنی کہاں سے آگئی
گلی کی خاک آسماں پہ ابر بن کے چھا گئی
کہاں سے ذہن نارسا میں بات ایسی آگئی

وہ اجنبی
نوازشوں، عنایتوں سے
ان کا جوش سرد جب نہ کر سکے
تو نت نئی سزاؤں اور دھمکیوں کا سلسلہ چلا دیا
گلی گلی، لہو لہو
سڑک سڑک، دھواں دھواں
مگر جنون شوق کی صدا
زمیں سے آسماں
سزائیں سخت تھیں ـــــ مگر
مطالبہ عزیز تھا
نوازشیں، عنایتیں
سزائیں اور دھمکیاں
صدائے حق، جنون شوق، دامنوں کی دھجیاں
مقابلہ بھی خوب تھا
کہاں زمین حرص
اور کہاں جنوں کا آسماں
مآل کشمکش وہی ہوا ـــ جو ہونا چاہیے
وہ اجنبی چلے گئے
مکین اپنے گھر کو پا کے ـــ اپنے گھر میں آ گئے

●

وہ گھر کہ جس کے واسطے لگا دی اپنی جان بھی
جو مل گیا تو یوں ہوا
کہ جیسے کچھ نہیں ہوا
عجیب ماجرا ہوا
جنون عشق نے چراغ آرزو جلائے تھے
اسی کی تیز لو سے ـــــ یہ مکین
اپنے خون اور ہڈیوں میں ڈھالے
اپنے گھر کو شوق سے جلا رہے ہیں
سبز لان میں کیاریوں کے پھول
اپنے پاؤں سے کچل رہے ہیں
سائبان کے ستون ڈھا رہے ہیں
یعنی اپنے جسم
اپنے ناخنوں سے نوچ کر چبا رہے ہیں ۔
. . . .

. . . . ؟!

آج بھی یہ گھر بہت عظیم ہے
یہ گھر بہت حسین ہے
مکین ہی عجیب ہیں
بڑے ہی بدنصیب ہیں

شِوناتھ سِنگھ

پنڈت گووند بلّبھ پنت

ہندوستان کی جنگ آزادی کا ذکر ہو یا گنگا جمنا کو اپنے دامن میں سمیٹنے والی ہندوستان کی عظیم ریاست اتر پردیش کی ترقی کا پنڈت گووند بلبھ پنت کا ذکر ناگزیر ہے۔ ان کی سرگرم سیاسی زندگی کا آغاز ۱۹۱۲ء سے ہوا، جب وہ پہلے پہل اتر پردیش کی قانون ساز اسمبلی کے رکن بنے۔ یہیں ان کی قابلیت کے جوہر کھلے۔ پہلے وہ حزب مخالف کے رکن رہے۔ اس کے بعد تقریباً ۳۵ برس تک سرکار میں شامل رہے۔

گووند بلبھ ۱۰ر ستمبر، ۱۸۸۶ء کو الموڑہ میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق پنت خاندان سے تھا۔ یہ خاندان ابتداً مہاراشٹر سے تعلق رکھتا تھا۔ دسویں صدی میں اس نے اتر پردیش کے کمایوں ضلع میں سکونت اختیار کی۔ ان کے والد کا نام پنڈت منورتھ پنت تھا۔ وہ متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ گووند بلبھ پنت شروع ہی سے ذہین، زیرک اور طباع تھے۔ الموڑہ میں انھوں نے مڈل اسکول اور میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ انھوں نے میٹرک میں وظیفہ پایا۔ اس کے بعد وہ میور کالج الہ آباد میں داخل ہوئے۔ ان کے زمانہ طالب علمی ہی میں ان کی ذہانت کی وجہ سے بڑی عزت ہوتی تھی۔ بی۔ اے کے امتحان کے لیے انھوں نے انگریزی ادب، سیاست اور ریاضی کا انتخاب کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں گوپال کرشن گوکھلے کی تقاریر عوام کے دلوں میں حب الوطنی کے جذبات ابھار رہی تھیں۔ ۱۹۰۷ء میں جب پنڈت گووند بلبھ پنت نے ان کی مسحور کن تقریر سنی تو ان کے دل میں مادر وطن کی محبت کا شعلہ بھڑک اٹھا اور وہ مادر وطن کی آزادی کا خواب دیکھنے لگے۔ ملازمت کا خیال ترک کر کے انھوں نے قانون کے امتحان کے لیے تیاری شروع کی۔ دو سال بعد انھوں نے الہ آباد یونیورسٹی سے قانون کا امتحان پاس کیا۔ اس میں ان کا نام سرفہرست تھا اور انھوں نے طلائی تمغہ حاصل کیا۔

اس زمانے میں وہ پنڈت مدن موہن مالویہ سے بھی متاثر ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ الہ آباد میں دو عظیم رہنماؤں نے پنڈت مدن موہن مالویہ اس عظیم شخصیت کی جملہ میراث کو اپنے اندر بانٹ لیا۔ ان میں سے ایک تھے پنڈت گووند بلبھ پنت اور دوسرے راج رشی پرشوتم داس ٹنڈن۔ پنڈت مدن موہن مالویہ کی شعلہ بیانی، زور بیان، تقریر کی فصاحت اور بلاغت پنڈت پنت کے حصے میں آئی اور ان کا ذہن راج رشی ٹنڈن کو ملا۔ پنڈت پنت خود اس بارے میں رقم طراز ہیں "پنڈت مدن موہن مالویہ اپنے وقت کے عظیم ترین رہنما تھے اور میں نے انھیں کے قدموں میں عوامی زندگی کا پہلا سبق سیکھا۔" اس طرح پنڈت مدن موہن مالویہ کے زیر اثر ایک اعتدال پسند، خاموش طبع اور سادگی پسند انسان سرگرم سیاست میں شامل ہو گیا۔ پنڈت گووند بلبھ پنت جن مصنفین کی تحریروں سے متاثر ہوئے اور جن تحریروں نے ان میں آزادی کا جذبہ پیدا کیا ان میں بنکم چندر، ڈگبی، دادا بھائی نوروجی، رمیش چندر دت، رانا ڈے، ہنری جارج، اسپنسر، مل، ڈکنز، تھیکرے، اسکاٹ، والیٹر، ونڈل ولکائی۔ اور بہت سے دیگر مصنفین بھی شامل ہیں۔

ان کی وسعت مطالعہ کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ روایت پسند اور کٹر پنتھی کنبے سے تعلق رکھنے کے باوجود انتہائی ترقی پسند خیالات کے حامل تھے۔ وہ سماجی اصلاحات، انسانی مساوات اور سائنسی مزاج کے زبردست حامی تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کی ترقی کا راز اس میں ہے کہ یہاں کے رہنے والے بلا امتیاز مذہب و ملت ترقی کی راہ پر گامزن ہوں۔ سب لوگ اس دیش کو اپنا دیش سمجھیں اور تن من دھن سے اس کی خدمت کریں۔ وہ پسماندہ ذاتوں اور پچھڑے ہوئے طبقوں نیز معاشی بدحالی کا شکار طبقوں کو اوپر اٹھانا چاہتے تھے۔ وہ مکمل مذہبی آزادی میں یقین رکھتے تھے۔ وہ تعصب اور تنگ نظری سے کوسوں دور تھے۔ مذہب کے نام پر تنگ نظری ان کو چھو تک نہ گئی تھی۔ وہ ہر مسئلہ کو مذہب کی عینک سے نہیں بلکہ روشن خیالی اور معقولیت پسندی کی آنکھ سے دیکھتے اور سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ مغربی تعلیم حاصل کرنے کو ضروری خیال کرتے تھے۔ البتہ وہ مغرب کی اندھا دھند تقلید کے

مخالف تھے اور اسے ہندوستانی پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ مغربی طریقوں اور انداز فکر کو مقامی ضرورتوں اور ماحول کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا چاہتے تھے۔ وہ ہندوستان کے اتحاد کو ہر لحاظ سے اہم ترین اور اشد ضروری خیال کرتے تھے۔ قوم پرور اور وطن دوست رہنما کی حیثیت سے انھیں ہندوستان کا اتحاد جان سے زیادہ عزیز تھا۔ ان کا خیال تھا کہ ہندوستان اور برطانیہ کے درمیان صرف سیاسی معاملات ہی طے ہونے چاہئیں اور فرقہ وارانہ اختلافات کی کوئی بھی بات ان سے نہیں کہنی چاہیے۔ ہندوستان اپنی گوناگونی، بوقلمونی نیز رنگارنگی کے باوجود کثرت میں وحدت کا جلوہ پیش کرتا ہے اور وہ انھیں بے حد عزیز تھا۔ اس حقیقت کو پامال کرنے کی غرض سے بوئے جانے والے فرقہ وارانہ اور مذہبی اختلافات کے بیج انھیں دل گرفتہ بنا دیتے تھے۔

ہندوستان کی جنگ آزادی کے حصول میں جن رہنماؤں نے صف اوّل میں مقام پایا ہے پنڈت گووند بلبھ پنت کا شمار بھی انھیں میں ہوتا ہے تیس برس سے زیادہ عرصے تک وہ انڈین نیشنل کانگریس میں کلیدی اہمیت کے حامل رہے۔ اس طرح ان کا رول بے حد اہم رہا ہے۔ خواہ یہ پٹا بھی کی لکھی ہوئی انڈین نیشنل کانگریس کی تاریخ ہو، نہرو کی خود نوشت سوانح حیات ہو، یا مہاتما گاندھی کی تحریریں ہوں، غرضیکہ کوئی بھی کتاب جو اس موضوع سے متعلق ہے اس میں پنڈت گووند بلبھ پنت کی خدمات کا بجا طور سے اعتراف کیا گیا ہے۔

پنڈت گووند بلبھ پنت ہندوستان کی جنگ آزادی کی تاریخ میں صف اول کے رہنما رہے ہیں۔ وہ برسوں اتر پردیش کانگریس کے سربراہ رہے۔ وہ ہندوستان کی اس سب سے بڑی ریاست کے وزیر اعلیٰ بھی رہے۔ کاشی پور میں وکالت کے زمانے میں وہ میونسپل بورڈ کے رکن رہ چکے تھے۔ نومبر ۱۹۱۸ء میں انھوں نے اتر پردیش کے ممتاز کانگریسی رہنما کی حیثیت سے حق شہریت کمیٹی کے سامنے شہادت دی تھی اور کمایوں خطے کا مقدمہ لڑا تھا۔ یہ خطہ پسماندہ خطہ سمجھا جاتا تھا اور اس لیے اسے مانٹیگو۔چیمسفورڈ اصلاحات کے عمل درآمد کے دائرے سے خارج کیا جا رہا تھا۔ لارڈ ساؤتھ بورو اس کے چیرمین تھے۔ انھوں نے بالآخر مقدمہ جیتا اور کمایوں خطے کو پسماندہ خطوں کی فہرست سے خارج کرایا۔ لکھنؤ میں جب سائمن کمیشن آیا تو پنڈت گووند بلبھ پنت نے جواہر لال نہرو کے ساتھ اس کے خلاف مظاہرہ کیا۔ وہ لاٹھی چارج کی وجہ سے زخمی ہوئے۔ اس چوٹ کا اثر آخری دم تک رہا۔ عدم تعاون کی تحریک اور سول نافرمانی کی تحریک میں انھوں نے عملی طور پر حصہ لیا۔ ۱۹۳۷ء کے انتخابات کے بعد انھیں اتر پردیش میں کانگریس پارٹی کا متفقہ طور پر رہنما تسلیم کر لیا گیا۔ ۴۶-۱۹۳۵ء کے دوران ہندوستان میں شری بھولا بھائی ڈیسائی کی زیر قیادت پہلی سنٹرل اسمبلی نے کام کیا۔ اس میں صف اول کے رہنما سردار پٹیل، راجندر پرشاد اور سی۔ راج گوپال آچاریہ بھی شامل تھے۔ شری بھولا بھائی ڈیسائی نے شعلہ بیانی سے سنٹرل اسمبلی میں اپنی دھاک جمالی۔ ان کی یادداشت ایسی تھی کہ وہ کسی بھی نازک موقع پر، کسی بھی موضوع پر، بغیر کسی کتاب کی مدد کے گھنٹوں بول سکتے تھے وہ اپنی تقریر سے سامعین کو مسحور کر لیتے تھے۔ حزب مخالف کے وزرا جواب دینے سے اکثر قاصر رہتے تھے۔ ان کی تقریروں کے بعد اکثر مسٹر جناح کا نمبر آ[تا] تھا۔ وہ بھی اپنی باتیں پُر اثر انداز میں کہتے۔ چوں کہ وہ بالعموم سرکار کی مخا[لفت] میں تقریر کرتے تھے۔ لہذا ان کی تقریروں سے بہت سے لوگ محظوظ ہو[تے] شری گووند بلبھ پنت اس اسمبلی میں کانگریس پارٹی کے ڈپٹی لیڈر رہے۔ بج[ٹ] اور مالی امور سے متعلق ان کی تقریروں کو بے حد پسند کیا گیا۔ ان کے بع[د] جو بھی وزیر مالیات آئے ان پر پنڈت پنت کی شخصیت کا کافی رعب چھا[یا] رہا۔ پنڈت پنت کی تقریروں میں گنگا کی روانی تھی جو سامعین پر گہرا اثر چھو[ڑتی]۔ پنڈت پنت اپنے ساتھیوں کی بڑی ہمت افزائی کرتے تھے۔

۱۹۴۶ء میں موسم گرما کا آغاز ہو چکا تھا۔ کیبنٹ مشن کی ہندوستا[ن] میں آمد آمد تھی۔ اس مشن کے آنے سے ایک دن پہلے لال بہادر شاستری جیل سے رہا کیا گیا۔ ان کے ساتھ دیگر رہنماؤں کو بھی جیل سے رہا کر دیا گیا ملک ایک انقلاب سے گزر رہا تھا۔ مرکز میں ایک عبوری سرکار قائم کی رہی تھی اور صوبوں میں انتخابات کرائے گئے تھے۔ اتر پردیش میں حسب توقع کانگریس کو اکثریت ملی اور پنڈت گووند بلبھ پنت اس عوامی سرکار سربراہ بنائے گئے۔ وہ انسانوں کے اچھے پارکھ تھے۔ انھوں نے نوجوانوں اپنے ساتھ ملانے اور انھیں اوپر اٹھانے کی سوچی۔ ایک صبح کو لال بہادر شاستری نے اپنی بیوی شریمتی للتا شاستری سے کہا کہ پنت جی نے انھیں لکھنؤ بلایا ہے۔ ان کی بیوی نے سوچا کہ یہ دورہ کسی مختصر کام کے ہوگا۔ یوں بھی لال بہادر شاستری لکھنؤ پارٹی کے کام کے سلسلے میں جاتے ہی رہتے تھے۔ تاہم لال بہادر شاستری نے کہا کہ پنت جی نے ا[نھیں] کنبے سمیت لکھنؤ آنے کے لیے کہا ہے۔ تو ان کی بیوی پریشان ہو گئیں کہنے لگیں کہ خرچ یہاں رہ کر پورا نہیں ہوتا، لکھنؤ رہ کر کیسے کام چل سکے لیکن شاستری جی نے کہا کہ وہاں پنت جی نے مناسب تنخواہ دینے کے لیے کہا ہے۔ اس بات کو سن کر ان کی بیوی تیار ہو گئیں۔ بالآخر یہ لکھنؤ چ[لے] گئے۔ جہاں پنت جی نے انھیں اپنا پارلیمنٹری سکریٹری بنایا۔

اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے پنڈت پنت نے زبردس[ت] انتظامی صلاحیتوں کا ثبوت دیا۔ انھوں نے ریاست میں دور رس اور وقت کی متقاضی بہت سی اصلاحات رائج کیں۔ وہ اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کے با[عث] نہ صرف عوام میں مقبول ہوئے بلکہ گورنر کی نگاہوں میں بھی بے حد وقیع [تھے]۔ تمام سرکاری افسران کی انتظامی صلاحیتوں اور کردار کے مداح تھے۔

۱۹۳۹ء میں ہندوستان کو بغیر اس کی مرضی کے دوسری جنگ عظیم میں ڈھکیل دیا گیا۔ اس وقت کانگریس نے کانگریسی وزرا کو کہا کہ وہ استعفیٰ دے دیں۔ گووند بلبھ پنت نے بھی اس موقع پر اپنا استعفیٰ بلا تامل پیش

ر دیا اور مہاتما گاندھی کی طرف سے چلائی گئی ستیہ گرہ تحریک میں شامل ہو گئے۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے الہ آباد سیشن میں عدم تشدد کے اصولوں پر مبنی عدم تعاون کی تحریک سے متعلق قرارداد گووند بلبھ پنت کی طرف سے ہی پیش کی گئی تھی۔ جس کی تائید ڈاکٹر راجندر پرشاد نے کی تھی۔ وہ صحیح معنوں میں قوم پرور ہندوستانی تھے۔ ان کی عمر کا بیشتر حصہ جیلوں میں گزرا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد صوبائی قانون ساز اسمبلیوں کے انتخابات ہوئے اس وقت بھی پنڈت پنت کو اتر پردیش اسمبلی میں کانگریس پارٹی کا سربراہ چنا گیا تھا۔ چنانچہ اب ریاست کے وزیر اعلیٰ پنڈت پنت ہی بنے۔ اس موقع پر ان کی خدمات کو اس ریاست کے لیے زیادہ دن تک کے لیے وقف نہیں کیا جا سکا۔ سردار پٹیل کی بے وقت موت سے مرکز میں جو خلا واقع ہوا اُسے پُر کرنے کے لیے پنڈت گووند بلبھ پنت کا نام ہی سامنے آیا۔ چنانچہ انھیں مرکز میں لے لیا گیا اور اہم ترین منصب عطا کیا گیا یعنی وزیر داخلہ بنائے گئے۔ اس منصب پر رہ کر انھوں نے بیماری اور کمزور صحت کے باوجود انتہائی شاندار خدمات انجام دیں۔ وہ فرائض منصبی ادا کرتے ہوئے ۷ر مارچ ۱۹۶۱ء کو ۷۴ سال کی عمر میں اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔

وہ محض ایک سیاست داں یا وکیل ہی نہ تھے بلکہ وہ ایک صحافی بھی تھے۔ کاشی پور میں رہتے ہوئے بحیثیت وکیل انھوں نے کافی شہرت پائی تھی۔ اس موقع پر انھوں نے پنڈت بدری ناتھ پانڈے کے ساتھ مل کر ایک ہفتہ وار اخبار بھی نکالا تھا جس کا نام "شکتی" تھا۔ اس میں کمایوں خطے کے خصوصی مسائل پر بحث ہوتی تھی۔ اس اخبار کے ذریعہ انھوں نے بیگار لیے جانے کے خلاف آواز اٹھائی تھی۔ اس بات پر زمیندار طبقہ ان سے ناراض بھی ہو گیا تھا لیکن وہ اپنے مشن پر قائم رہے اور ان سے خوف زدہ نہ ہوئے۔ بالآخر اس لعنت کو بڑی حد تک دور کرانے میں کامیابی بھی حاصل کی۔

وہ مدلل تقریر کرتے اور اپنی سحر بیانی سے سامعین کو مسحور کر دیتے تھے۔ عرصہ تک وہ نہ صرف اتر پردیش کانگریس کے سربراہ رہے بلکہ وہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے رکن بھی ہوئے۔ وہ ورکنگ کمیٹی کے رکن بھی تھے۔ ۱۹۳۰ء کے بعد کے عرصے میں کانگریس پارٹی میں ان کا مقام اہم تھا۔ اور وہ مہاتما گاندھی سے بہت قریب تھے۔ بائیں بازو کے گروپ کی قیادت سبھاش چندر بوس کر رہے تھے۔ چنانچہ مہاتما گاندھی اور اس گروپ کے ارکان کے درمیان جب بھی اختلافات رونما ہوئے تو وہ انھیں سلجھانے کی کوشش کرتے اور ہمیشہ ہی مہاتما کے خیالات سے متفق ہوئے۔ سردار پٹیل کی طرح پنڈت گووند بلبھ پنت بھی ایک عملی انسان تھے۔ آج بھی ہمیں ان کے بتلائے ہوئے راستے اور اصولوں کو سامنے رکھ کر بہت کچھ حاصل کرنا ہے تاکہ سسکتی ہوئی انسانیت اور دکھتے دل ان کی تعلیمات اور منصف مزاجی سے سکون پا سکیں۔ ؎

مت سہل اسے جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

محسن زیدی

غزل

ہندو سے کہوں گا نہ مسلماں سے کہوں گا
انساں پہ جو گزری ہے وہ انساں سے کہوں گا

اُس نے جو ستم ڈھائے ہیں وہ سب پہ عیاں ہیں
کہنے کو میں کیا قاتلِ دوراں سے کہوں گا

باندھوں گا نئے ڈھنگ سے مضمونِ وفا میں
پھر قصۂ دل اِک نئے عنواں سے کہوں گا

کیوں چھوڑ کہاں آئے تم آنکھوں کی بصارت؟
پوچھے گی تو کیا شامِ چراغاں سے کہوں گا

آجائے اگر جی میں برس جائے یہاں بھی
میں خود تو نہ کچھ ابرِ گریزاں سے کہوں گا

مجھ سے تو نہ اُٹھ پائے گا یہ بارِ ندامت
کشتی کی حفاظت کو نہ طوفاں سے کہوں گا

دیکھا ہے ہر اِک گل کو لہو رنگ قبا میں
یہ خواب پریشاں نہ بہاراں سے کہوں گا

تا حدِ نظر بجھتے چراغوں کا دھواں ہے
رودادِ سحر شامِ غریباں سے کہوں گا

اب ٹوٹتے ہوتے دل کو میں بہلاؤں گا کیونکر
سمجھانے کو کیا دیدۂ گریاں سے کہوں گا

دیوار پہ تحریر بہت صاف لکھی ہے
منہ سے نہ میں کچھ خسروِ دوراں سے کہوں گا

زخمی جو ہیں اب ہاتھ گریباں بھی ہیں صد چاک
اب تو ہوں جدا دست و گریباں سے کہوں گا

ٹکرا کے سر آواز پلٹ آئے گی محسن
چلّا کے بھی کیا شہرِ خموشاں سے کہوں گا

حیات اللہ انصاری

نکسیر

(۱)

ڈاکٹر مریضوں کو دیکھتے دیکھتے ایک نظر ان مریضوں پر بھی ڈال لیتا تھا جو ہال میں بیٹھے یا کھڑے ہوئے اپنی باری کے منتظر رہتے تھے۔ یوں تو اسپتال میں ایک ہفتے سے مریض بہت آ رہے تھے۔ لیکن آج ان کا ریلا بہت تھا۔ ڈاکٹر نے دو چار مریضوں سے فارغ ہو کر مجھ پر نظر ڈالی اور کہا۔

"نرس۔ وہ لڑکی جو باپ کی گود میں ہے اُس کو معائنے کی میز پر لٹا دو۔"

یہ کہہ کر وہ نئے مریض کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میں نے لڑکی کے پاس جا کر دیکھا تو اس کی ناک سے خون رس رہا تھا جسے ماں پاس کھڑی ایک چیتھڑے سے بار بار پونچھ رہی تھی لڑکی کے کرتے پر بھی خون کے بہت سے چھوٹے بڑے دھبے تھے۔

میں لڑکی کو اس کے ماں باپ کے ساتھ معائنے کے کمرہ میں لے گئی۔

باپ کہنے لگا "مودہ کی نکسیر دس روز سے ہلکی ہلکی چل رہی تھی۔ لیکن جھنڈا نگر سے اکے پر جو آئے تو جھٹکے کھا کر خون زیادہ آنے لگا۔"

میں ایک مرتبہ جھنڈا نگر کی سڑک پر اکے سے سفر کر چکی تھی اس لیے سمجھ گئی کہ مودہ کیسے دکھوں سے گذر کر آئی ہے۔ لڑکی کا رنگ دھلے کپڑے کی طرح سفید ہو رہا تھا اور آنکھیں بے رونق تھیں۔ میز پر لیٹتے ہی اس کے چہرے پر سکون سا آگیا۔ باپ کی گود میں شاید اسے پوری راحت نہیں مل رہی تھی۔ لٹاتے ہی مجھے پتہ چل گیا کہ اتنی کمزور ہو چکی ہے کہ ذرا سی بھی حرکت گراں گزرتی ہے۔

باپ نے بتایا: "میں ایک پرائمری اسکول میں ٹیچر ہوں۔ تین بچے ہیں جن میں سب سے بڑی مودہ ہے۔ باقی دونوں کو میں ان کی پھوپھی کے پاس چھوڑ کر آیا ہوں۔"

ماں اور باپ دونوں میں تہذیب نظر آتی تھی۔ بات چیت میں سلیقہ تھا۔ بیوی کا برقعہ تو میلا اور ذرا پھٹا ہوا تھا لیکن نیچے دھلا ہوا صاف کرتا تھا جس پر بیل کڑھی تھی جو اس نے خود ہی کاڑھی ہو گی۔ کانوں میں مصنوعی سونے کی خوبصورت سی انتیاں تھیں، باپ شیروانی میں تھا، جس کی آستینوں کے کنارے بتا رہے تھے کہ ان کو پھٹنے کے بعد سلیقے سے سیا گیا تھا، لیکن دھلنے کے بعد سیون کے اندر سے ریشے جھانکنے لگے۔ عورت صورت شکل کی اچھی تھی اور سن بھی زیادہ نہ تھا لیکن ناطاقتی اور غیر متوازن غذا نے اسے مرجھا دیا تھا۔ مودہ کا ناک و نقشہ سبک تھا اور چہرے پر ایسا بھولا پن کہ گڑیا سی معلوم ہوتی تھی۔ میں نے اندازہ کیا کہ ہو گی تین سال کی لیکن ماں نے بتایا کہ چار کی ہے۔

میں نے مرض کی تفصیل اور ہسٹری پوچھ پوچھ کر لکھی تھی کہ ڈاکٹر آ گئے۔ انھوں نے ایک نظر میری تحریر پر اور دوسری لڑکی پر۔ پھر اس کا پیٹ دیکھا۔ جب تلی بار بار ٹٹول کر گردن اس طرح ہلائی گویا اس نے مرض سمجھ لیا ہے تو میرے دل میں اندیشے جھانکنے لگے۔

ڈاکٹر نے باپ سے کہا۔

"لانے میں دیر کیوں کر دی؟"

"کیا بتاؤں ڈاکٹر صاحب وہاں سے لانا آسان کام نہیں تھا۔"

ڈاکٹر نے ذرا سوچا اور پھر باپ کو الگ لے جا کر کہا۔

"آپریشن کرنا ہوگا۔ بڑا آپریشن۔"

باپ نے ٹھنڈی سانس بھری اور کہنے لگا۔

"جو خدا کو منظور ہو۔ جھنڈا نگر کے ڈاکٹر پہلے دن سے یہی کہتے رہے۔"

ماں جو اس گفتگو میں شریک ہونے کے لیے قریب آ گئی تھی، اندیشے بھری آواز سے پوچھنے لگی۔

"ڈاکٹر صاحب اچھی تو ہو جائے گی؟"

"امید ہے جبھی تو آپریشن کی بات کر رہا ہوں۔ اور یوں تو سب کچھ بھگوان کے ہاتھ میں ہے۔"

میں نے ڈھارس دینے کے لیے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب بہت بڑے سرجن ہیں۔"

باپ۔ "سب یہی کہتے ہیں۔"

ماں۔ "میں نے بھی ایسا ہی سنا ہے۔ دور دور شہرت ہے ڈاکٹر صاحب کی۔"

اتنے میں لڑکی کراہ کر بولی۔

"اماں۔ پانی۔"

ڈاکٹر نے میری طرف دیکھا اور کہا۔

"آپریشن کے لیے ضروری ٹسٹ کروا لو۔"

مودہ کی ماں المونیم کا گلاس لے کر پانی تلاش کرنے لگی۔ میں نے اسے روک دیا اور خود جا کر معائنے کے کمرے کی کنارے والی الماری سے فیڈنگ کپ نکالا، اس میں پانی لے کر آئی اور لڑکی کو لیٹے لیٹے پلانے لگی۔ لڑکی کے لیے ذرا سی بھی حرکت مضر تھی۔

لڑکی پانی پیتے پیتے ذرا مچل کر الماری کی طرف منھ سے اشارہ کر کے کہنے لگی۔

"اماں وہ گڑیا۔"

میں نے دیکھا تو الماری کے اندر سے گڑیا جھانک رہی تھی۔ وہی گڑیا جو ایک ٹریجڈی کی نشانی تھی۔ ایک لڑکی کالرا میں مبتلا ہو کر آئی تھی۔ اس کے ساتھ یہ گڑیا تھی۔ لڑکی اسی رات ختم ہو گئی۔ اس کی ماں نے لڑکی کا سارا سامان یہ کہہ کر میرے سپرد کر دیا کہ اس کو مستحقوں میں تقسیم کر دینا۔ میں نے بستر اور کپڑے تو تقسیم کر دیئے تھے لیکن یہ گڑیا بچ رہی تھی۔ کیونکہ اس وقت کوئی مستحق نہیں ملا تھا اور پھر گڑیا میرے ذہن سے اتر گئی۔ گڑیا پرانی ضرور تھی لیکن اس کی کوئی چیز بگڑی ہوئی نہیں تھی۔ میں نے مودہ کی طرف دیکھا اور پیار سے پوچھا۔

"لوگی یہ گڑیا؟"

مودہ کی آنکھیں جو بالکل بجھی ہوئی تھیں اچانک چمک اٹھیں، اس نے ماں کی طرف دیکھا اور کہا "اماں؟" یعنی اجازت مانگی۔ مگر اجازت سے پہلے ہی ایک ہاتھ کانپتا ہوا گڑیا کی سمت بڑھ گیا۔ میں نے الماری سے گڑیا نکال کر مودہ کو دیدی اور اور پھر ماں سے کہا۔

"لے لینے دو اس کو گڑیا، میں دے ہی جوں۔"

مودہ گڑیا کو ہاتھ میں لے کر بالکل خلاف توقع کھل کھلا کر ہنسنے لگی اور ہنستی چلی گئی یا تو اسے فیڈنگ کپ سنبھالنے میں دشواری ہو رہی تھی یا گڑیا کو چمٹا کر پیار کرنے لگی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی دکھیاری ماں کو اس کا بچھڑا ہوا بچہ مل گیا ہو۔

مودہ نے گڑیا کو اپنے سینے پر لٹا کر اٹھایا تو اس میں سے آواز نکلی "ماں"

اب تو وہ اور زور سے ہنسی۔ یہ گڑیا وہ تھی جس کے اندر ایسی سیٹی ہوتی ہے کہ جب اس کو بٹھا کر اٹھاؤ تو ایسی آواز نکلتی ہے کہ بچے سمجھتے ہیں کہ وہ کہہ رہی ہے "اماں"۔ مودہ، ہنستی ہوئی بولی۔

"اماں یہ بالکل ویسی ہی ہے۔"

ماں لڑکی کی خوشی سے اتنی خوش ہوئی کہ آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ان کو پونچھ کر مجھ سے کہنے لگی۔

"بڑے ماسٹر کی لڑکی بملا کے پاس بالکل ایسی ہی گڑیا ہے۔ مودہ کی جانے کب سے آرزو تھی کہ اس کی گڑیا سے کھیلوں۔"

مودہ ہنس کر کہنے لگی۔

"بملا بہت بری لڑکی ہے۔ اس نے ایک بار بھی مجھے اپنی گڑیا کو پیار کرنے نہیں دیا۔"

پھر مودہ مجھ سے پوچھنے لگی: "گڑیا کب تک میرے پاس رہے گی؟"

یہ سوال اس نے ایسی حسرت سے کیا کہ میرا دل ہل گیا۔ میں نے چمکار کر کہا۔

"یہ گڑیا اب تمہاری ہی ہے۔ تمہارے ہی پاس رہے گی۔"

"میلی۔ بالکل میلی؟"

"ہاں۔ ہاں۔"

مودہ پھر اسی طرح کھل کھلا کر ہنسنے لگی جیسے پہلے ہنسی تھی۔ اور گڑیا کو چمٹا کر بولی۔

"میلی گڑیا۔ میلی بٹیا۔"

میری طرف محبت سے دیکھ کر کہنے لگی۔

"آپ بہت اچھی ہیں۔ اماں۔ میں ان کو کیا کہوں؟"

"موسی"

"موسی آپ بہت اچھی ہیں۔"

مودہ کی خوشی دیکھ کر باپ کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے۔ میری طرف احسانمند نظروں سے دیکھ کر بولا۔

"آج مودہ کی بہت بڑی آرزو پوری ہوگئی۔ اس کے پاس دو مٹی کی اور ایک کپڑے کی گڑیا ہے۔ لیکن مودہ تو اسی طرح کی گڑیا کے لیے مری جاتی تھی۔"

ماں نے مودہ کی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔

"بچہ ہے۔ جب بملا کے پاس ایسی گڑیا دیکھتی تھی تو ضد کرتی تھی۔"

باپ بولا "میری بہنیں جب چھوٹی تھیں تو ان کے پاس کپڑے کی گڑیائیں تھیں وہ ان ہی سے کھیلا کرتی تھیں اور بہت خوش رہتی تھیں۔"

ماں مجھے جج بنا کر کہنے لگی۔

"بتاؤ بہن پہلے زمانے میں ایسی گڑیا، جیسی تم نے دی ہے، ہوتی کب تھی؟ بملا اپنی گڑیا کا منہ دھلا کر پونچھتی ہے۔ کنگھی کر کے اس کی چوٹی گوندھتی ہے۔ مودہ چاہتی تھی کہ اپنی گڑیا کے ساتھ میں بھی یہ سب کچھ کروں۔ مگر کپڑے کی گڑیا کے ساتھ یہ سب کچھ کہاں کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے وہ للچاتی تھی۔"

اب باپ نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔

"بہن، ایسی گڑیا ملتی ہے ڈیڑھ روپیہ کی۔ بھلا بتاؤ تو کہ اتنا پیسہ کون خرچ کر سکتا ہے۔ ان کو چاہیئے تھا کہ اپنی بیٹی کو سمجھائیں۔"

ماں بولی "اسے بہتیرا سمجھایا۔ مارا پیٹا بھی۔ وہ چپ تو ہو گئی لیکن اندر کی للک نہیں گئی۔ اس کے لیے میں کیا کر سکتی تھی۔"

ان باتوں سے مجھے پتہ چلا کہ گڑیا کا جھگڑا اس گھرانے میں کچھ دنوں سے چل رہا تھا۔ میں سوچنے لگی کہ مجھے ایک رات کی ڈیوٹی کے بارہ روپے ملتے ہیں۔ اور ان بے چاروں کے لیے ڈیڑھ روپیہ کتنا مہنگا ہے۔

مودہ کی خوشی کی کوئی تھاہ نہیں تھی، اب وہ چاہتی کہ بیٹھ کر اپنی گڑیا کو اٹھاؤں بٹھاؤں۔ میں اس بات کی اجازت کیوں کر دے سکتی تھی۔ میں نے تو اسے پانی پینے تک کے لیے اٹھنے نہیں دیا تھا۔ میرا تذبذب دیکھ کر ماں کہنے لگی۔

"نہیں بیٹی، موسی منع کر رہے ہیں کہ ابھی نہ اٹھو اچھی ہو جاؤ پھر اس سے خوب کھیلنا۔"

اتنے میں ڈاکٹر صاحب آگئے اور پوچھنے لگے "کیا ہو رہا ہے؟"

مودہ نے جواب دینے میں سبقت کی۔

"ڈاکٹر صاحب دیکھئے مجھے موسی نے یہ گڑیا دی ہے۔ میں ذرا دیر بیٹھ کر اس سے کھیلوں؟"

ڈاکٹر کی نظریں بتا رہی تھیں کہ وہ محسوس کر رہا ہے کہ مودہ یا تو اتنی کمزور تھی کہ پانی تک پینا مشکل تھا یا اب ایسی باتیں کر رہی ہے۔ ڈاکٹر نے ہنس کر کہا۔

"ضرور کھیلو اس گڑیا سے۔ لیکن لیٹے لیٹے۔"

"ذرا دیر کیلیے بیٹھ جاؤں؟"

"میں تمہارے پیٹ سے بیماری نکال دوں، پھر بیٹھ کر کھیلنا۔"

لیکن مودہ مانی نہیں وہ ضد کرنے اور رونے لگی۔ ڈاکٹر نے بہلانے کے لیے کہا۔

"منی تمہاری اس گڑیا کا نام کیا ہے؟ پہلے نام تو رکھ لو۔"

یہ سن کر مودہ کا رونا ختم ہوگیا۔

"نام؟ ہاں نام بھی تو کچھ ہونا چاہیے۔ کیا نام رکھوں؟ آپ ہی بتا دیجئے ڈاکٹر صاحب۔ کوئی اچھا سا، چھوٹا سا نام۔"

"مینا رکھ دو۔ مینا کی طرح یہ چہکتی ہے نا۔"

اب تو مودہ خوش ہو کر کہنے لگی۔

"یہ تو بڑا پیارا نام ہے۔ مینا۔ مینا۔ مینا"

ڈاکٹر نے کہا۔

"مینا کا ذرا سا خون لینا ہے۔ لے لوں؟"

"مینا کا خون ڈاکٹر صاحب؟ میرا خون تو نہیں؟"

"دونوں کا"

"لے لیجیے، مگر میں میٹھوں گی"

ڈاکٹر نے مجھے اشارہ دیا پھر ہم دونوں نے مودہ کو بستر پر تکیہ سے ٹیک لگا کر بٹھا دیا، اور وہ خوش ہو کر گڑیا سے کھیلنے لگی۔ جب سوئی اس کے بدن میں خون لینے کے لیے اتاری گئی تو اس نے ایک چھوٹی سی چیخ ماری اور پھر چپ ہو گئی۔ وہ برابر ایک ہاتھ سے گڑیا کو سہلاتی رہی۔ جب خون لیا جا چکا تو اس نے ڈاکٹر سے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب مینا کا خون ابھی نہ لیجیے۔ ابھی میں نے اسے دودھ نہیں پلایا ہے"

پھر مودہ لیٹ کر گڑیا کو اسی طرح دودھ پلانے لگی جیسے مائیں پلاتی ہیں۔

(۲)

آپریشن کی تیاری کے سلسلے میں مودہ کو عمل دیا گیا اور طرح طرح سے اٹھایا بٹھایا گیا۔ لیکن وہ اپنی گڑیا میں ایسی لگی رہی کہ کسی قسم کی تکلیف کا اظہار نہیں کیا۔ ماں کہنے لگی۔

"مودہ کی آدھی بیماری تو گڑیا سے چلی گئی۔ کیا چیز دیدی ہے بہن تم نے، کل مودہ مجھ سے کہہ رہی تھی کہ اماں جب میں اچھی ہو جاؤں گی تو بڑی دھوم دھام سے مینا کی شادی کروں گی اور اس میں موسی کو بھی بلاؤں گی۔ آئیں گی نا وہ؟"

میں نے ماں سے کہا۔

"بھگوان کرے کی مودہ جلدی اچھی ہو جائے پھر میں کروں گی بہت دھوم دھام سے گڑیا کی شادی"

"تمھارے منہ میں گھی شکر۔ خدا کرے ایسا ہی ہو"

پھر ماں نے میری طرف غور سے دیکھا اور کہا۔

"خدا کرے تم کو بہت اچھا دولہا ملے اور گڑیا کی طرح کے پیارے پیارے بچے ہوں"

میں سوچنے لگی کہ اس عورت نے میرے بارے میں کچھ پوچھ گچھ ضرور کی ہوگی"

تبھی تو اس طرح کی دعائیں دے رہی ہے۔ ایسی دعائیں مجھے میرے گھر والے دیا ہی کرتے تھے اور میں ان کی عادی ہو گئی تھی۔ لیکن اس عورت کی دعا میں کچھ ایسا خلوص تھا کہ میں اندر سے پگھل گئی۔ اور محبت میں مجھے جو جو ناکامیاں ہوئیں تھیں وہ سب یاد آگئیں۔ میں مودہ کو دیکھنے لگی اور سوچنے لگی کہ اگر یہ بچ گئی تو میں ہمیشہ اسے اپنی بچی سمجھوں گی۔

دوسرے دن صبح جب میں مودہ کو آپریشن کے لیے لینے گئی تو وہ کہنے لگی کہ۔

"میں ذرا تیار ہو لوں تو پھر چلوں گی"

مودہ نے لیٹے لیٹے ہاتھ بھگو کر اپنی گڑیا کا منہ دھویا، تولیہ سے پونچھا، اس کے بال درست کیے۔ اس طرح اسے سجا بنا کر کہنے لگی۔

"اب لے چلئے مجھے"

آپریشن تھیٹر میں پہونچ کر وہ ڈاکٹر سے کہنے لگی۔

"یہ نہ سمجھئے گا کہ آپریشن دیکھ کر مینا ڈر جائے گی۔ میری مینا تو بڑی بہادر۔ (مینا کے سر پر ہاتھ پھیر کر)۔ کیوں نہ مینا، تو ہے نہ بہادر؟ ڈاکٹر صاحب یہ تو بتایئے کہ آپریشن میں خون بھی نکلتا ہے؟"

"خون تو کل میں نے نکال لیا۔ اب نہیں نکلے گا"

آپریشن کی میز پر جب مودہ کو لٹایا گیا تو اسسٹنٹ نے گڑیا اٹھا کر دور کی ایک پر رکھدی اس پر مودہ بڑی زور سے چلائی۔

"ارے مینا کے چوٹ لگ گئی اور وہ رو رہی ہے"

یہ کہہ کر مودہ رونے لگی۔ میں سمجھ گئی کہ جس خوف اور جن تکلیفوں کو ابھی تک دبا ہوئی تھی وہ سب اسسٹنٹ کی غلطی سے ابھر آئی ہیں۔ ڈاکٹر نے مجھے حکم دیا۔

"مینا کے پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔ اسے سوئی لگا دو"

میں نے لپک کر اپنے ایک ہیئر پن سے انجکشن لگا دیا اور پھر مودہ سے کہا۔

"بیٹی اب مینا بہت خوش ہے دیکھو ماں ماں پکارتی ہے۔ میں نے ڈا کے اشارے پر مینا کو لٹا کر بٹھایا تو اس کے اندر سے ماں ماں کی آواز آئی۔ جس وقت میں یہ تھی اس وقت ڈاکٹر مودہ کو بے ہوشی دے رہا تھا۔ ادھر مودہ کے ہونٹوں پر مینا ماں ماں سن کر ہنسی آئی اور ادھر وہ بے ہوش ہو گئی"

جب میں آپریشن تھیٹر سے بے ہوش مودہ کو لے کر واپس آ رہی تھی تو ماں باپ اور دونو نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میرے منھ سے بے اختیار ٹھنڈی آہ نکل اور میں نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔

"بھگوان کی جو مرضی ہو"

(۳)

جس وقت مودہ کو ہوش آیا اس وقت اس کے اردگرد ماں باپ کے علاوہ د عزیز تھے جو تانگوں پر لد پھند کر دیہات سے آگئے تھے۔ بوڑھے، جوان اور بچے۔ مرد، عورتیں لڑکیاں۔ لیکن سب بے چارے مودہ کے ماں باپ کی طرح صاف ستھرے نہ تھے۔ پھٹے اور کپڑے، گندے ہاتھ اور پاؤں، پان سے رنگین منہ اور دانت۔ ساتھ چھوٹی بڑی پوٹلیاں تھیں جو ایک کونے میں ڈھیر کر دی گئی تھیں۔ ان کے اندر جانے کیا کیا تھا بھنک رہی تھیں۔ ایسی بھیڑ کو عام حالات میں اندر آنے کی اجازت نہیں ملتی ہے۔

یہ سب مودہ کو اس طرح تک رہے تھے کہ لگتا تھا کہ ان کے دل آنکھوں کے اند ہیں ـــــ چچا اور چچی اپنی دو لڑکیوں کو ساتھ لے کر آئے تھے جو بارہ اور چودہ سا تھیں اور جنھوں نے مودہ کو گود دوں کھلایا تھا۔ دونوں کے چہروں پر غم پھٹا پڑ رہا دوپٹے سے آنسو برابر پونچھ رہی تھیں۔ چچی تو مودہ کی ماں سے لپٹ کر رونے لگی۔ ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر رہے تھے اور صبر کی تلقین اور اللہ اللہ کر رہے تھے۔

جس وقت مودہ کو ہوش آیا اس کے پاس میرے علاوہ ڈاکٹر بھی تھے ڈیوٹیوں کو بھول کر آگئے تھے۔ مودہ نے اپنے سامنے کے ہر شخص کو بھی طرح دیکھا ماں کو پکارا۔

"اماں"

"بیٹی"

(بقیہ صفحہ ۱۱)

جاوید دششٹ

لا

"لا" لانا مصدر سے امر کا صیغہ نہیں ہے بلکہ یہ عربی کا "لا" ہے یعنی نہیں۔ نہیں کے معنی تو نہیں ہیں ہی۔ لیکن اگر ہم "نہیں" کو حرف حرف کر کے لکھیں تو اس کی شکل یہ ہوگی۔ ن ہ ی ں یعنی ن ہے ں، تو معلوم ہوگا کہ "نہیں" کے عین وسط میں "ہے" موجود ہے۔

ریاضی کی علامتوں میں "نہیں" کی صورت یہ ہوگی — + — یعنی منفی مثبت منفی۔ گویا منفی کے چھلکے میں مثبت کا مغز موجود ہے۔

"نہیں" کا تجزیہ ہم اس طرح بھی کر سکتے ہیں۔ انکار + اقرار + انکار یعنی نہ، ہاں، نہ۔ گویا نہیں میں ہاں۔ انکار میں اقرار پوشیدہ ہے۔

ریاضی میں دو نفی مل کر جمع ہو جاتی ہیں یعنی اگر دو بار کوئی نہ کرے تو ہاں سمجھو۔

کلمۂ طیبہ کا آغاز "لا" یعنی "نہیں" سے ہوتا ہے۔ لا الٰہ الا اللہ یہ کلمہ کا پہلا جزو ہے۔ مطلب، خدا کے سوا کوئی بھی عبادت کے لائق نہیں ہے۔ اس میں خدا کی وحدانیت کی طرف اشارہ ہے۔ "یوگ وشِشٹ" میں بھی "ایکم برہم دُتیہ ناستی" برہم (اللہ) ایک ہے دوسرا کوئی نہیں، موجود ہے۔

بہت دنوں تک کلمۂ طیبہ کا "لا" حیران و پریشان کرتا رہا کہ جو "ہے" اس کا ذکر "نہیں" سے کیوں ہوا؟ لیکن جب ہم نے لا یعنی نہیں کے قلب کو چیرا تو اس سے "ہے" کی صدا بلند ہوئی۔ اس سے ثابت ہوا کہ "نہیں" کے دونوں نون کثرت کی علامت ہیں اور ان دونوں کے قلب میں "ہے" ایسے ہی موجود ہے جیسے کثرت میں چھپی وحدت۔

"لا" سے کلمہ کا آغاز سمجھ میں آیا کہ کوئی نہیں ہے کے بیچ میں ہی "ہے" براجمان ہے۔ یہ "نہیں" بیک وقت فانی بھی ہے غیر فانی بھی۔ فانی اس لیے کہ اس کا اپنا کوئی وجود نہیں۔ فنا یا عدم محض وجود کا پردہ ہے۔ اور غیر فانی اس لیے کہ "نہیں" کے دونوں نون، دونوں طرف سے "ہے" سے اس طرح چمٹے ہیں کہ ان کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ گویا لا بھی اللہ کے وجود کا جزو لاینفک ہے۔

وحدت یعنی ایک۔ کثرت یعنی انیک کا محور ہے۔ تضادات کے مابین رشتہ وحدت ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم "نہیں" کو مجاز اور "ہے" کو حقیقت کہہ سکتے ہیں۔

جس طرح مجاز کے رنگین پردوں میں حقیقت روپوش ہے اسی طرح نہیں کے نونین کے درمیان "ہے" کا وجود ہے جو باہر سے نہیں نظر آتا۔ تو ثابت ہوا کہ "نہیں" کے پردے میں "ہے" موجود ہے۔

جس نے "نہیں" میں چھپے "ہے" کو جان لیا وہی گیانی ہے۔ اس "ہے" تک پہنچنے کے لیے "نہیں" کی بھول بھلیاں سے گزرنا پڑتا ہے جس میں اکثر و بیشتر سالک کھو کر رہ جاتے ہیں، ناستک بھی ہو جاتے ہیں۔ اور اس کا سبب یہی ہے کہ وہ نون کی اوگھٹ گھاٹی کو پار نہ کر سکے۔ نون کے گرداب میں چکر کھانے لگے تو ان کا دماغ بھی گھوم گیا۔ نہیں کے سوا اب انھیں کچھ نہیں دکھائی دیتا۔ ہاں اگر کوئی مرشد کامل ان کی دستگیری کرے تو وہ "ہے" کی منزل تک پہنچ سکتے ہیں۔

نہیں کے دونوں طرف کے نون "بیترنی" کی طرح ہیں، پُل صراط کے مانند ہیں۔ نہیں پردۂ مجاز بھی ہے، مایا بھی۔

اور اگر غائر نظر سے دیکھا جائے تو محسوس ہوگا کہ انکار اصل میں اقرار کا ہی پس منظر ہے۔ "نہیں" اور "ہے" بظاہر ایک دوسرے کی ضد نظر آتے ہیں اور اس لیے بھی کہ بغیر تضاد کے تخلیق ممکن بھی نہیں۔ لہٰذا تضاد کی ضرورت پیش آئی کیوں کہ تضاد، منظر، پس منظر اور پیش منظر ہر ایک کے لیے لازمی ہے۔ لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ اس تضاد میں بھی وحدت موجود ہے بالکل ایسے ہی جیسے دو "نون" کے درمیان "ہے"۔

یہ "ہے" پوری کائنات میں جاری و ساری ہے۔ جملہ تضادات کے اندر بھی اور باہر بھی۔

ایک ناستک یا منکر جب وجود الٰہی سے انکار کرتا ہے کہ "وہ نہیں ہے" تو کیا آپ کا خیال ہے وہ ایسا ہی کر رہا ہے؟ حقیقت میں منکر ہی سب سے زیادہ شدت کے ساتھ اس کے وجود کا اقرار کرتا ہے۔ کیونکہ وہ تو نہیں میں بھی ہے۔ تو اب منکر کے انکار سے بھی کیا بنتا ہے وہ محض اس کی ایک ادا ہے یعنی وہ اس کے وجود کا اقرار منفی انداز سے کرتا ہے۔

"نہیں" نواہی کا زینہ ہے۔ یہ نہ کرو۔ وہ نہ کرو۔ جھوٹ نہ بولو۔ چوری نہ کرو۔ نواہی میں "نہیں" کی واضح جھنکار موجود ہے۔ مگر اس کا نفسیاتی پہلو اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے یعنی جس کام کو کرنے کی شدید خواہش پیدا ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ چین کے مشہور درویش و دانشور کنفیوشس کی جملہ تعلیم 'اوامر' کی شکل میں ہے۔ یعنی وہ کہے گا، سچ بولو، ایمان ثابت رکھو۔ نہیں کی ترغیب سے بچنے کا ایک یہی ذریعہ ہے کہ مثبت رویّہ اختیار کیا جائے۔

نہیں کی اہمیت سے بھی انکار نہیں۔ "نہیں" ایک ڈرج ہے جس میں "ہے" کا گوہر آبدار حفاظت سے رکھا گیا ہے۔

"ہے" حسن مطلق ہے جس پر "نہیں" یعنی مجاز کا پردہ پڑا ہے۔ "نہیں" پیراہن ہے تو "ہے" بدن۔ "نہیں" جسم ہے تو "ہے" جان۔ "نہیں" آگ ہے تو "ہے" سمندر۔ "نہیں" پانی ہے تو "ہے" بجلی۔ "نہیں" مادہ،

"ہے" روح۔ "نہیں" صورت، "ہے" سیرت۔ "نہیں" نیستی "ہے" ہستی "نہیں" عدم "ہے" وجود۔

"نہیں" کا وجود روزِ ازل سے ہے۔ جب اللہ میاں نے آدم کے پتلے میں روح پھونکی اور فرشتوں کو سجدے کا حکم دیا تو ابلیس نے جس لمحے سجدے سے انکار کیا تھا "نہیں" کا جنم ہو گیا تھا۔

اس "نہیں" نے ابلیس کو جنت سے نکلوا دیا اور پھر آدم و حوا کو بھی۔ نہ دانۂ گندم کھاتے نہ یہ دن دیکھتے۔ گویا انھوں نے بھی فرمانِ الٰہی کا خیر مقدم "نہیں" سے کیا۔

کوہِ طور پر موسیٰؑ کو بھی "نہیں" سے واسطہ پڑا تھا۔ جب کلیم اللہ نے "ارنی" کہا تھا تو جواب ملا تھا "لن ترانی" وہی "نہیں"۔ لیکن ارنی گو کے اصرار نے طور میں آگ لگوا دی اور خود بھی بے ہوش ہو گئے۔ اس بے ہوشی میں ہوش اسی طرح چھپا ہے جیسے "نہیں" میں "ہے"۔

ایک دن جب جبریلؑ و ابلیس کی اچانک ملاقات ہو گئی تو جبریلؑ نے ابلیس سے شکایت کے لہجہ میں کہا ؎

کھو دیے انکار سے تو نے مقاماتِ بلند
چشمِ یزداں میں فرشتوں کی رہی کیا آبرو؟

تو ابلیس نے جواب دیا ؎

جب کبھی خلوت میسّر ہو تو پوچھ اللہ سے
قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو؟
میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط اللہ ہو، اللہ ہو، اللہ ہو!

یہاں جبریلؑ مثبت، ابلیس منفی اور یزداں مثبت و منفی کا سنگم وحدت تضاد ہے۔

عرفان اصل میں "نہیں" میں چھپے "ہے" کو پہچاننے کا نام ہے۔ خود شناسی کو خدا شناسی کا زینہ کہا گیا ہے۔ خود شناسی انکار سے اقرار کی طرف پیہم سفر ہے۔ جہاں انکار کی سرحد ختم ہوتی ہے وہیں خود شناسی کی منزل آ جاتی ہے۔ اگلا قدم خدا شناسی کے دائرہ میں رہتا ہے۔

غرض "لا" یعنی "نہیں" بھی ایک اشارہ ہے جیسے پانے کے لیے بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ ہندی کہاوت ہے "گرو بن ملے نہ گیان" اور وہ گرو بھی "لا" ہے ؎

زباں کو تاب کہاں ہے جو کہہ سکے جاوید
ہوئی ہیں راز کی باتیں سدا اشاروں میں

بقیہ: نکسیر

ماں کی آنکھوں میں جو آنسو تھے وہ اس نے جانے کس طرح پی لیے۔ مودہ نے ایک نظر سب عزیزوں پر ڈالی اور سلام کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کا ہاتھ نہ اٹھ سکا۔ اس نے ماں کی طرف دیکھا اور تھرتھراتی ہوئی آواز میں کہا۔

"میلی گڑیا مینا"

یہ کہہ کر اس نے پھر سب کی طرف اس طرح دیکھا گویا کہہ رہی ہو کہ دیکھو میرے پاس کیسی نایاب چیز ہے۔ ماں نے گڑیا کو جو بستر پر تھی اٹھا کر مودہ کے سینے پر لٹا دیا۔ اس نے دھیمی اور مرجھائی ہوئی آواز میں بہنوں سے کہا۔

"دیکھو.."

مودہ نے چاہا کہ گڑیا کو اپنے ہاتھوں سے اٹھاؤں تاکہ اس کے منھ سے ماں نکلے لیکن ہاتھوں نے ساتھ نہیں دیا۔ ماں سمجھ گئی اور اس نے گڑیا کو اٹھا کر اپنے ہاتھ پر اس طرح لٹایا کہ سب کو نظر آ جائے۔ اور پھر اس کو بٹھا دیا۔ گڑیا بڑے پیار سے بولی۔ ماں۔

مودہ ہنسنے لگی لیکن اس کی ہنسی اتنی دبی ہوئی تھی کہ اس کو ہنسی مشکل ہی سے کہا جا سکتا تھا۔ وہ سانس سے اٹکتی ہوئی اس طرح نکل رہی تھی کہ لگتا تھا کہ حلق شگفتہ کرنے کو آمادہ نہیں ہے۔ مودہ نے ماں کی طرف دیکھا اور بڑی مشکل سے اپنے جبڑوں کو سنبھال کر آواز نکالی۔

"اماں۔ پھل"

بہادر ماں نے آنسو پی کر کہا: "اے مالک" اور پھر پہلے کی طرح گڑیا کو اپنے پھیلے ہوئے ہاتھ پر لٹا دیا۔ لیکن ابھی وہ اسے اٹھا نہیں پائی تھی کہ چچا نے تھرتھراتے ہوئے صبر سے کہا۔

"دلہن گڑیا کو تھپک تھپک کر اللہ اللہ کرو"

ماں سمجھ گئی ان کا مطلب۔ اس نے داہنے ہاتھ سے گڑیا کو تھپک تھپک اللہ اللہ کہا اور پھر اسے بٹھا دیا۔ گڑیا نے بڑے درد سے پکارا۔

"اماں آں"

مودہ کے منھ سے پھر ہنسی نکلی۔ ہنسی کیا، ہنسی کی طرح کا نیچے سروں میں کوئی نغمہ نکلا جو ہچکی میں الجھ کر اوپر چلا گیا اور سانس بند ہو گئی۔ لیکن نظریں اب بھی گڑیا پر جمی ہوئی تھیں۔ اور لبوں پر تبسم کھیل رہا تھا ٭٭

بچوں کے لیے تین خوبصورت تحفے

۱۔ پہیلیاں۔ ، قیمت: آٹھ روپے
۲۔ رنگ برنگے پھول۔ دبچوں کے لیے آسان اور دلکش نظموں کا مجموعہ۔
قیمت: دس روپے
۳۔ کون جیتا کون ہارا۔ دو دلچسپ اور معلوماتی کہانیاں۔
قیمت: نو روپے

آصفہ مجیب

ریحانہ طیب جی

ریحانہ طیب جی
بشکریہ: ہندوستانی پرچار سبھا، واردھا

زمانے کے کتنے چکر لگائے اور شام و سحر دیکھے تب میری زندگی میں آج ایک نئی صبح طلوع ہوئی نیا سورج نکلا۔ دو پہر ڈھلے ایک جلسہ میں غیر متوقع طور پر برسوں بعد مجھے ریحانہ بہن ملیں۔ یاد آتا ہے ۱۹۵۶ء میں حمیدہ سلطان صاحبہ کے مکان علی منزل میں ان کی والدہ مرحومہ کا چالیسواں تھا۔ میں مجیب صاحب کے ساتھ وہاں شرکت کے لیے گئی تھی۔ کافی مجمع تھا دالان میں فرش پر نشست تھی اور صحن میں بھی۔

ایک انجانی سی کشش سے میں نے پیچھے دیکھا۔ میرے قریب ریحانہ بہن موٹے کھدر کے لباس میں دوپٹے سے سر ڈھانکے بیٹھی تھیں۔ میری نظر پڑتے ہی انھوں نے ایک نگاہ مجھ پر ڈالی اور خفیف سے تبسم کے ساتھ ایک للک سے دونوں ہاتھ میری جانب بڑھا دیئے۔ میں نے بھی شوق و احترام سے ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔

جلسہ کی کارروائی شروع ہو چکی تھی۔ انھیں بھی تقریر کرنا تھی۔ وہ صحن میں بیچ در سے متصل چوکی پر ایک کنارے جا کر بیٹھ گئیں۔ وہ بول رہی تھیں میں انھیں دیکھ رہی تھی۔ ماضی کے دریچے کھل گئے۔ یادوں کی شبنمی پھوار سی پڑ رہی تھی۔

نہ جانے وہ کون سی گھڑی، نیک ساعت تھی کہ بظاہر سرسری سی ملاقات میں کوئی معنوی گہرائی اور جاذبیت شامل تھی جس کا مجھ پر عجیب ہی اثر ہوا۔ جیسے میں نے کچھ پالیا ہو۔ شاید میری روح کو اسی کی تلاش تھی۔ ایک روشن کرن کی طرح دل میں ان کی تصویر اتر آئی۔

ایک زمانہ گزرا جب سے ہمارے خاندان اور ریحانہ بہن کے خاندان سے بہت پرانے عزیزانہ تعلقات قائم تھے۔ میرے خالو جان شیخ مقبول حسین قدوائی ۱۵-۱۹۱۴ء[1] میں کشمیر میں جب ہیلتھ منسٹر تھے، عباس طیب جی بڑودہ سے مع اپنی فیملی کے کشمیر جنت نظیر کی سیر کو آئے اور آپس میں گہرا ربط ضبط ہوا۔ ریحانہ بہن عباس طیب جی کی منجھلی صاحبزادی تھیں۔

میں ان سے ۱۹۳۴ء میں مسوری میں پہلی بار ملی جب ان کی چھوٹی ہمشیرہ سہیلہ بیگم سے پروفیسر محمد حبیب کی شادی ہو چکی تھی اور ایک زیادہ گہرا رشتہ قائم ہو گیا تھا۔ میں وسیم بھائی (مجیب صاحب کے بڑے بھائی) کے گھر راکفورڈ میں ٹھہری تھی اور ریحانہ بہن اپنے والدین کے ساتھ ساوتھ ووڈ میں۔ بھابی سہیلہ بھی وہاں تھیں۔ ان کے والدین سے بھی شرف نیاز حاصل ہوا۔ ریحانہ بہن دبلی پتلی، درمیانہ قد، گیہواں رنگ، سادی سی ساڑی پہنتیں۔ ایک دن راکفورڈ میں ان کا گانا سنا۔ بھجن گا رہی تھیں، مدھر لے اور لحن سے، ان کی سریلی پرسوز آواز فضا میں گونج رہی تھی۔ وہ ذہین اور خوش طبع تھیں ان کی شخصیت میں خاص کشش امتیاز اور انفرادیت معلوم ہوتی تھی۔ وہاں طیب جی جن کی طبیعت پہلے سے کچھ ناساز تھی، انتقال کا سانحۂ عظیم پیش آیا۔ صدمہ تو قدرتی امر ہے لیکن ریحانہ بہن جس صبر و ضبط سے برداشت کر رہی تھیں، بڑا کام ہے، ان سے میری واقفیت بس مسوری کے اس مختصر دور تک محدود رہی۔ جیسے ایک خواب دیکھا۔ اور ایک پرچھائیں سی لگتی جب کبھی خیال آتا۔

وہ دن اور آج کا دن تھا جب ملی ہوں جب زندگی کی شام ہو رہی تھی مگر آج مجھے وہ ریحانہ بہن نہیں کوئی اور لگ رہی تھی ان میں کچھ بات ہی اور تھی جس کا احساس اس وقت ہو رہا تھا۔

اس درمیانی طویل مدت میں کچھ حالات گوش گذار ہوتے رہے۔ کبھی مجیب صاحب سے کبھی سہیلہ بھابی سے سنا کہ مجیب صاحب یورپ سے آکر عباس طیب جی سے ملنے بڑودہ گئے تھے وہ تعریف کرتے کہ ان کی بڑی ممتاز شخصیت تھی ۲۲-۱۹۲۰ء میں انھوں نے کانگریس میں بہت کارہائے نمایاں انجام دیے تھے۔ مسز امینہ طیب جی بدرالدین طیب جی کی بڑی صاحبزادی تھیں۔ جنھوں نے ۱۸۸۷ء میں مدراس میں ایک کانگریس سشن کی صدارت کی تھی۔ وہ خاموشی اور لگن سے پسماندہ بہنوں اور بچیوں کو لکھنا پڑھنا اور سلائی سکھانے میں محنت کیا کرتیں۔

---

[1] ۱۹۰۱ء۔۱۹۷۵ء

آخر وقت تک بچوں کو گھر پہ پڑھاتی رہیں اور ایک چھوٹا سا مکتب جو انھوں نے کھولا تھا اب وہ بہت بڑا اسکول ہے۔ ریحانہ بہن نے ایسے ماں باپ کی گود میں آنکھیں کھولیں اور ایسے ماحول میں پرورش پائی۔ مبدء فیض سے ان کی فطرت کو بہت سی صلاحیتیں عطا ہوئی تھیں۔ ان کے مختلف حسین رنگ جھلکتے کہیں شوخ کہیں ہلکے ابھرتے ہوئے قوس قزح کے مانند آسمانی بلندیوں کو چھوتی ہوئی شعاعیں سی پھوٹتی ہوئیں

زمانۂ طالب علمی میں سولہ برس کی عمر تھی جب گھوڑے کی سواری میں وہ مشاق تھیں۔ بیڈمنٹن بہت اچھا کھیلتی تھیں۔ قرآن شریف قرأت سے پڑھتیں۔ سورۂ رحمان اکثر سناتیں۔ بھگوت گیتا کا مطالعہ کرتیں۔ سب مذہبوں سے دلچسپی تھی نعت اور بھجن گاتیں۔ سہیل بھائی سے معلوم ہوا کہ گجرات میں ان کے گانے کی دھوم تھی۔ گھر میں جو خاص ملنے والے ڈاکٹر ٹیگور وغیرہ تشریف لاتے عباس طیب جی سے فرمائش کرتے "اس لڑکی کو بلائیے گانا سنائے" وہ گانا جس کے سُر دل کے سوز و ساز سے ہم آہنگ و مربوط ہو جائیں کچھ اور ہی وجد آفریں اثر رکھتا ہے۔ مگر بعد میں سنا انھوں نے گانا چھوڑ دیا تھا۔ بڑودہ کالج میں انھوں نے بی اے تک تعلیم حاصل کی تھی۔

مجیب صاحب کی کئی مرتبہ دہلی اور مسوری میں ان سے ملاقات ہوئی انھوں نے ایک واقعہ بتایا کہ ایک مرتبہ مسوری میں ریحانہ بہن نے اپنے گھر میں کرشن اور گوپی کی شبیہ پیش کی مجیب صاحب کو کرشن کے روپ میں کھڑا کیا ان کے ہاتھ میں بانسری دی اور خود گوپی بن گانا گایا۔ مذہب کی طرف قدرتی میلان طبع کے سبب وہ گہری حقیقت کی تلاش اور جستجو میں لگ گئیں اس کے بارے میں حال ہی میں سہیل بھائی سے جب میں نے دریافت کیا تو انھوں نے اپنے کچھ چشم دید واقعات سنا کر ان کی کیفیت پر روشنی ڈالی، انھوں نے کہا۔

"باوجود تمام دنیاوی مشاغل اور دلچسپیوں میں شوق سے حصہ لینے ہنسنے بولنے تاش وغیرہ کھیلنے کے باوجود بعض وقت ان پر ایک خاص کیفیت کا غلبہ ہوتا اور وہ سب چھوڑ چھاڑ کر سب سے الگ تھلگ ہو جاتیں کسی سے کچھ مطلب نہ رہتا۔ گھنٹے دو گھنٹے اسی طرح غور و فکر میں گذر جاتے ان کی یہ کیفیت دیکھ کر بابا جان (والد صاحب) کہتے "بھئی ہمارے خاندان میں یہ لڑکی کہاں سے آئی ..... اور ہم تو دنیادار آدمی ہیں!"

ایک مرتبہ میں اپنے عزیزوں سے ملنے بڑودہ آئی سب ملے مگر آپا نظر نہیں آئیں۔ میں نے پوچھا "آپا کہاں ہیں؟" بابا جان نے کہا "ارے بیٹی اس کی کیا پوچھتی ہو۔ خود جا کر دیکھ لو اس کا کیا حال ہے؟" میں اپنی ایک بہن حمیدہ کے ساتھ گئی کمرے میں جھانکا تو کمرے کی شکل ہی بدلی ہوئی تھی۔ زمین پر گدا بچھائے کھادی کی گاؤن پہنے وہ بالکل غرق بیٹھی تھیں۔ میں چپکے سے دروازے کا پردہ چھوڑ کر واپس آئی۔ بابا جان نے بتایا کہ "سال چھ مہینے سے یہی حال ہے" یہ شاید ۱۹۳۳ء تھا۔ اور آپا کچھ ایسی باتیں بتایا کرتیں جن کا علم کسی کو نہ ہوتا اور جب وہ صحیح نکلتیں تو گھر والے اور دوست سب حیران رہ جاتے۔

اس کی ایک مثال بھی بھائی نے بتائی وہ یہ کہ بڑودہ کالج کے انگریزی کے پروفیسر سارسیس صاحب کا کم عمری میں انتقال ہوگیا۔ بیوی بچے تھے۔ سب کو ان سے ہمدردی تھی۔ ان کے انشورنش کے کاغذات نہیں مل رہے تھے۔ دوستوں میں ذکر ہو رہا تھا کہ سب جگہ تلاش کر لیا ساری درازیں دیکھ ڈالیں کاغذات کہیں نہیں ملے۔ ان کے گجراتی دوست نے جو بینک کے معاملات میں مسز سارسیس کے مددگار تھے ریحانہ بہن سے ذکر کیا۔ ریحانہ بہن کو معلوم بھی نہیں تھا انھوں نے کچھ دیر سوچا اور کہا "فلاں جگہ جو ہے وہ دیکھ لو" وہیں کاغذات مل گئے۔

ہندو دھرم سے بھی لگاؤ تھا۔ کچھ دوست ایسے ملے جینڈر کرتے تھے۔ کرشن جی سے بھی عقیدت تھی اسی کے زیر اثر ایک کتاب تصنیف کی۔

"The Heart of a Gopi"

عباس طیب جی نے اسے شائع کرایا۔ ہاتھوں ہاتھ لی گئی اور مختلف زبانوں میں ترجمے ہوئے۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد جب ۱۹۳۶ء میں ان کی والدہ کا بھی انتقال ہوگیا تو وہ گاندھی آشرم آگئیں۔ وہ کاکا کلیلکر اور سروجنی ناناوتی وہاں خاص طور سے ہندی ہندوستانی زبان کا پرچار اور تعلیم بالغان کا کام کرتی تھیں۔ قومی تحریک میں حصہ لیا ۱۹۴۰-۴۴ء کے درمیان کوئٹ انڈیا اور سول نافرمانی کی تحریک میں آشرم کے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ دو مرتبہ جیل گئیں۔ وہ با (کستوربا گاندھی) کے ساتھ قید میں شریک تھیں۔ تقسیم ملک کے بعد گاندھی جی دہلی تشریف لائے اور شاید ۱۹۴۸ء میں وہ امتہ السلام، راج کماری امرت کور، کاکا صاحب اور سروجنی ناناوتی کے ساتھ دہلی آگئیں ہندی ہندوستانی پرچار سبھا ہی۔ گاندھی کی شہادت کے بعد میوزیم کے احاطہ میں گاندھی سمارک ندھی میں ان کا قیام تھا۔ مکان میں ایک کمرہ مخصوص ان کی رہائش کے لیے تعمیر ہوا تھا۔ اپنا خرچ آپ اٹھاتیں اور کام کے سلسلہ میں بھی روپیہ دیتی تھیں۔

اور ہماری یہ بے خبری کہ کبھی بھولے سے بھی ادھر دھیان نہ جاتا۔ عام طور سے وہ کہیں نکلتی نہیں تھیں۔ وہ تو حسن اتفاق ہی تھا کہ اس دن جلسے میں مل گئیں۔ تب سے میرا دل ان کی یاد سے معمور رہتا تصور میں دیکھا کرتی کہ وہ میری طرف مصافحہ کا ہاتھ بڑھا رہی ہیں۔ یہ خالی دکھاوے کا ہاتھ نہیں دلی توجہ اور لگاؤ کا ہاتھ ہے۔ جس میں میرے لیے تشفی ہے۔ پھر بھی واماندگی شوق کے عالم میں یاد نہیں کتنے دن کٹ گئے۔

ان دنوں میرا یہ حال تھا کہ ڈیڑھ دو سال پہلے میرا یوسف ثانی ہونہار بڑا لڑکا معین خدا کو پیارا ہو گیا تھا۔ کہتے ہیں غم آہستہ آہستہ کم ہوتا ہے۔ میرا غم دن بدن بڑھتا تھا۔ میں چور چور تھی۔ دنیا سے بیزار۔ جان سے بیزار۔ طرح طرح کے عارضے بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ درد سر۔ بلڈ پریشر۔ اور کیا کیا۔ میری بڑی نند شاکرہ بہن لکھنؤ سے علی گڑھ حبیب بھائی جان کے یہاں ہو کے ہم سے ملنے آئیں۔ انھوں نے کہا "چلو ریحانہ بہن سے مل آئیں" انھوں نے میرے دل کی لگی کہہ دی۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ مجیب صاحب نے جامعہ دفتر سے ٹیلیفون پر ملنے کا وقت طے کر دیا۔ آپا جان (بڑی ہمشیرہ) بھی تیار ہو گئیں۔

ہم صبح دس بجے کے قریب موتی رنگ روڈ گئے۔ کوٹھی پہنچ کر برآمدے میں گھنٹی بجا کر اطلاع کی اور گیلری سے ہو کر بائیں ہاتھ کے کمرے میں داخل ہوئے یہ وقت ہماری ملاقات کا وقت تھا۔ اور کوئی نہیں تھا۔ چھوٹے سے کمرے میں کھڑکی کی طرف ریحانہ بہن کا پلنگ تھا۔ پلنگ کے پاس داہنے ہاتھ پہ پرانی سی بید کی الماری پر قلم پنسل نوٹ بک کتابیں فوری ضرورت کی متفرق چیزیں نیچے اوپر خانوں میں لگی تھیں۔ اس

کے قریب غسل خانہ کا دروازہ اور اسی طرف لکڑی کی بڑی الماری کھڑی تھی۔ دوسری سمت اس کے مقابل پتلا سا پلنگ دیوار سے لگا بچھا تھا جو صوفے کا کام بھی دے سکتا تھا۔ بیچ کے حصہ میں دو ایک مونڈھے اور مونڈھے نما کرسیاں بچھی تھیں جن پر کشن لگے تھے۔ زندگی کے لوازمات تھے مگر نمود و نمائش سے مبرا ماحول میں استغنا آسودگی اور آنند کی کیفیت۔

ریحانہ بہن ہم کو دیکھتے ہی پھرتی سے پلنگ سے اٹھ کھڑی ہوئیں سادہ سا گاؤن پہنے تھیں خندہ پیشانی اور تپاک سے گلے ملیں بات چیت ہونے لگی۔ وہ لمحات میں کبھی بھول نہیں سکتی۔

مجھے اور تو کچھ یاد نہیں بس جس خاص توجہ اور خلوص دل سے انھوں نے ہمدردانہ کلمات زبان مبارک سے کہے وہ یاد ہیں۔ میری کرسی پلنگ کے پاس تھی وہ میرے رو برو تھیں اور مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ بس یہاں میں ہوں اور ریحانہ بہن۔ اور خداوند کریم کی طرف سے ایک مسیحا نفس فرشتہ کی طرح وہ میرے سوز دروں پر لطف و کرم کی برکھا سی کر رہی ہیں تسلی و تشفی کی روح پھونک رہی ہیں۔ میرے غم کا انھیں بھرپور احساس ہے اور شکستگی کی پوری کیفیت شرح شرح ان پر آشکارا۔

انھوں نے فرمایا[1] خدا جو دیتا ہے اس میں بھی برکت ہے اور جو وہ ..... لیتا ہے ..... اس میں بھی برکت ہے ....

[2] خدا کی ڈوری مضبوط پکڑ لو ..... اس سے بڑا سہارا کیا ہے ..... پھر کیا غم ہے۔

[3] صبح کو جاگو تو یہ سمجھو کہ ۲۴ گھنٹے تم کو گذارنے کو ملے ہیں۔ وہ اچھی طرح گذار دینے چاہئیں۔ شاید ان جملوں میں ایک آدھ لفظ کا فرق ہو۔ اور ایسی ہی باتیں جن میں میرے لیے پیغام تلقین زخموں پر مرہم کی تاثیر و تسکین تھی۔

آج بھی وہ نقشہ آنکھوں میں پھر رہا ہے کہ وہ سامنے بیٹھی بول رہی ہیں، ان کی آواز سامعہ نواز ہے۔ یہ سب باتیں ہم خوب سمجھتے بوجھتے ہیں سنتے بھی ہیں لیکن اتنا اثر نہیں ہوتا آج جیسے سب دل میں اترتی چلی جا رہی تھیں، جیسے کوئی نیند کے ماتے کو خواب گراں سے جگائے اور روشنی دکھائے۔ وقت کافی ہو گیا تھا۔ چلتے وقت انھوں نے مجھے خوب سینہ سے لگایا۔ رات کو روزانہ کچھ مدت تک سورۂ مزمل پڑھنے کو بتایا، موٹر تک ہم کو رخصت کرنے آئیں کہا "مجیب صاحب سے میرا سلام کہہ دینا۔"

مجھے اپنے عزیزوں اور دوستوں کی بے پایاں ہمدردیاں حاصل تھیں پھر بھی ہو تم ہی جانگداز تو غم خوار کیا کریں۔

مگر آج معلوم ہوتا تھا جیسے کسی عظیم طاقت نے گرتے گرتے میرے ڈگمگاتے قدموں کو سہارا دے کر سنبھال لیا ہو۔ شعلوں کی لپک دھیمی تھی آگ کے بجائے ٹھنڈک تھی۔

اس دن سے مجھے وہاں جانے کی لو لگی رہتی۔ آٹھویں دسویں پندرھویں جب موقع ملتا اور موقع نکال کے صبح شام دوپہر کسی وقت بغیر اطلاع پہونچ جاتی۔ وہ بڑی خوشی سے ملتیں زیادہ لوگ ہوتے تو مجھے پلنگ پر اپنے پاس بٹھاتیں۔ کھڑکی کی طرف گاؤ تکیہ رکھ دیتیں۔ میں بے سر چڑھ کر بڑے آرام و سکون سے بیٹھ جاتی۔ ان کی صحبت بھی اور قربت بھی۔ جس میں دوا دعا کی اکسیر تھی۔ کبھی کبھی عمر رواں کے وہ چند لمحات جن کا نہ کوئی پیمانہ ہے نہ وزن کر سکتے ہیں اور نہ ناپ سکتے ہیں وہ وسعت اور پہنائیوں کے حدود سے پرے ماورا اور جاوداں ہو جاتے ہیں۔

ان کے پاس ہر مذہب ہر فرقے کے لوگ آتے امیر غریب مرد عورتیں۔ صوفی سنت، بزرگان دین۔ ایک نیا جہاں آباد نظر آتا اس رنگا رنگی میں بھی وحدت تھی جیسا کہ ریحانہ بہن کا عقیدہ تھا کہ سب مذاہب اصل میں ایک ہیں۔ اور سب کا راستہ خدا ہی کی طرف جاتا ہے۔ جو دلوں کو ملاتا ہے جدا نہیں کرتا۔ انسان سب ایک ہیں۔ ان میں کوئی تفرقہ نہیں موتیوں کی لڑی کی طرح جو ایک ہی دھاگے میں پرو دئے ہیں۔ یہی ان کا مسلک تھا۔

ع: میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

ان کے حلقۂ عقیدت میں بہت سے لوگ تھے اور بہت سے دکھی جن کے دنیاوی مسائل نفسیاتی اور ذہنی الجھنیں ہوتیں ان سے نجات پانے کے لیے پہنچتے۔ وہ ایک ماتا کی سی شفقت کے ساتھ ان کا دکھ درد سینہ میں سمیٹ لیتیں پریشانیاں دور کرنے کی اپنے طریقے سے تدبیریں بتاتیں مشورے دیتیں۔ ضرورت پڑتی تو روپے پیسے سے بھی مدد کرتیں اور روحانی دولت لٹایا کرتیں۔

مجھے وہ قرآن شریف کی آیات اور اسمائے حسنیٰ میں سے کچھ نام پڑھنے کو بتایا کرتیں میں نے اب تک قرآن اور حدیث ہی سے سہارا لیا تھا مگر وہ جو بتا دیتیں ضرور پڑھتی اس کے بغیر چین نہ آتا۔ ایک دن انھوں نے مجھ سے پوچھا۔

"قرآن شریف میں تمھیں سب سے زیادہ پڑھنے کے لیے کیا چیز پسند ہے؟"

میں نے کچھ سوچ کر جواب دیا "مجھے سب سے زیادہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ پسند ہے"

فرمایا "بس تم اس کو سب سے زیادہ پڑھا کرو۔"

میں نے ان سے کبھی اپنے کسی دکھ اور پریشانی کا اظہار نہیں کیا۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا کہ میرا سب حال ان پر روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ بنی بگڑی سب جانتی ہیں میں کیا کہوں۔ رگ رگ پہچانتی ہیں۔ ہاں جب میرا چھوٹا لڑکا امین بغرض تعلیم جرمن سدھارا تو کبھی گھبرا کے اس کے متعلق کچھ کہہ بیٹھتی۔ وہ اس کی سلامتی اور کامیابی کے لیے اسماء الحسنیٰ میں سے کچھ پڑھنے کی ہدایت کرتیں۔ کبھی خود ہی سوچ کر امین اور مجیب صاحب کے لیے قرآن شریف پڑھوانے کو بتاتیں۔ تین۔ پانچ یا سات میں اس کا انتظام کرتی۔ بعض دفعہ کسی مقصد سے وہ جو اللہ کا نام پڑھنے کو کہتیں حالانکہ مجھے اس کی خبر نہ ہوتی اور جب اشارتاً اس کے اثر کے بارے میں استفسار کر بیٹھتیں "سب ٹھیک ہے نا؟" تو اس کا میں اقبال کرتی "جی ..... بالکل ....." اور پھر سوچ میں پڑ جاتی کہ میں نے تو اس کا کوئی ذکر ہی نہیں کیا تھا۔

ایک بار نہیں متعدد بار ان کے کشف کے مشاہدہ کا موقع ملا۔

امین نے شادی کے لیے جرمنی میں ایک لڑکی پسند کی۔

میں نے تصویر لا کر دکھائی بڑی خوش ہوئیں بولیں "بڑا شریف چہرہ ہے۔"

شادی کی اطلاع پر تھوڑی دیر آنکھیں بند کر کے خاموشی کے بعد فرمایا "آصفہ یہ لڑکی تمھارے

کسی پچھلے جنم میں تمہاری بیٹی ہوگی۔" بعد میں اسے میں نے لاکر ملایا بھی۔ اور جب وہ میرے ساتھ رہی بھی تو بعض خصائل پسند ناپسند میں خود سے اتنی مماثلت پائی کہ خدا کی قدرت معلوم ہوتی۔

کبھی تو میرے قیافہ ہی سے حقیقت حال جان لیتی تھیں۔ خود میرے مافی الضمیر سے آگاہ کرکے ایسا روشن ثبوت دیتیں کہ میں محو حیرت ہو جاتی۔ ان کے نور باطنی کا پرتو اس طرح دل پر منعکس ہونے لگتا جیسے چاند کی نکھری نکھری شعاعوں سے اجالا پھوٹ پڑے۔

ایک دفعہ میں نے ذکر کیا کہ رات کو سوتے وقت بلڈ پریشر بڑھ گیا تھا۔ دوائیں تو میں کھاتی ہی رہتی ہوں۔

یہ سن کر فرمایا "جب بلڈ پریشر بڑھے درود تاج پڑھا کرو۔ ایک بار۔ دو بار۔ تین بار پڑھتی رہو۔" اور جب ایسا محسوس ہوا تو درود تاج زبانی پڑھ کے سکون سے سو گئی۔

اکثر وہاں میری عصر و مغرب کی نماز کا وقت ہو جاتا میں کہتی "نماز پڑھوں گی" بعض اوقات خود بھی اٹھ پڑتیں ایک جائے نماز روشؔ صدیقی صاحب (مشہور شاعر) کی دوسرے پلنگ کے پاس کھڑکی پر رکھی رہتی وہ دیتیں اور نماز میں میرے ساتھ کھڑی ہو جاتیں۔ جب تک میں پڑھتی وہ بالکل غرق کھڑی رہتیں۔

میں جانے لگتی تو دیر تک مجھے سینہ سے لگائے رہتیں۔ کچھ شیرینی از قسم لمن ٹوطب جس پر وہ دعا پڑھ کے تقسیم کیا کرتیں مجھے دیتیں۔ لو تم بھی کھاؤ اور مجیب بھائی کو بھی کھلانا۔ کبھی موٹر تک پہنچانے آجاتیں۔ میرے ڈرائیور سلیم سے کچھ باتیں ہوتیں وہ اپنی لڑکیوں کی شادی کی فکر میں تھے۔ مٹھی میں تھوڑی شیرینی ان کے لیے بھی لے آتیں وہ پکڑا دیتیں۔

ریحانہ بہن کی چال ایسی تھی جیسے زمین میں نہیں ہوا میں پیر پڑ رہے ہوں۔ ہلکی پھلکی رواں دواں ہیں جب بھی گھر میں ہوتی گویا وہ میرے پاس ہوتیں۔ انھوں نے جذب و محبت کے آنچل سے میرے آنسو پونچھے تھے۔ ایک روز جب میں ان کے پاس پلنگ پر بیٹھی تھی انھوں نے اپنے ہاتھ کی پشت پر انگلی رکھ کے مجھے متوجہ کیا۔

"دیکھو جس طرح انسان کے اوپر کی کھال بدلتی رہتی ہے۔ اسی طرح اس کے اندر بھی تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔"

میں اپنے اندر تبدیلی محسوس کر رہی تھی۔ مجھ میں جینے کی سکت آگئی تھی۔

کئی مرتبہ زبان مبارک سے فرمایا "آمنہ مجھ سے تم سے روحانی رشتہ ہوگیا ہے۔ جلدی جلدی آیا کرو۔" اکثر مجھے جانے میں دیر ہوتی سواری وغیرہ کا عذر پیش کرتی تو ارشاد ہوتا "اچھا تو رات کو آیا کرو، عبادت کرو۔" افسوس مجھے کبھی اس کی توفیق نہیں ہوئی۔

میں نے انھیں تنہا بہت کم دیکھا صبح سے آٹھ نو بجے رات تک ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہتا۔ رات عبادت و ریاضت میں گذارتیں۔ معلوم نہیں آرام کس وقت کرتی تھیں۔ اس کے باوجود بھی تھکا ہوا کسلمند نہیں پایا نہ کبھی بستر پر استراحت کرتے دیکھا۔ کچھ لوگ خاص وقت مقرر کرکے آتے۔

ایک دن میں گئی تو ایک صاحبہ تنہائی میں ہاتھ دکھا رہی تھیں۔ میں نے کبھی دکھایا نہیں اور اس کے متعلق مجھے معلوم نہیں کہ ان کا طریقہ کیا تھا۔ اسی زمانہ میں ایک واقعہ پیش آیا ان کی ایک خاص عزیزہ نے اپنے یہاں بچے کی پیدائش کی ریحانہ بہن کو خط سے اطلاع دی۔ انھوں نے جواب میں لکھا کہ "تم نے بچے کی پیدائش کا جو دن بتایا ستاروں کے حساب سے مجھے پریشانی ہوئی۔ شگون اچھا نہیں ہے۔" کچھ دعائیں پڑھنے کی تاکید کی اور شیرینی پر دعا پڑھ کے بھیجی کہ تھوڑی تھوڑی دودھ میں ملاکر بچے کو روزانہ دیں۔

شروع میں تو کسی کو کچھ پتہ نہیں چلا جب پچھے مہینہ کا ہوا تو اندازہ ہوا کہ وہ سنتا نہیں۔ بعد میں ڈاکٹری معائنہ وغیرہ ہوا تو معلوم ہوا کہ وہ قدرتاً سماعت سے محروم ہے۔ اس کا کوئی علاج نہیں۔ ہونی تو ہو کر رہتی ہے۔

ایک دفعہ دیوالی اور جامعہ ملیہ میں چار روز کا تعلیمی میلہ ساتھ پڑا۔ رات کو میرے گھر میں دو چور گھس آئے۔ وہ لے بخیر گذشت۔ میں نے آکر ریحانہ بہن سے سرگذشت بیان کی کہ پورا موقع فراہم تھا۔ کمبخت کچھ بھی کر سکتے تھے۔ آدھی رات سے زیادہ گذر چکی تھی میں ڈرامہ دیکھ کر میلے سے تھکی آئی تھی۔ سونے کے کڑے دراز میں پڑے تھے۔ پرس وہیں تھا جس میں الماری کی کنجی تھی مگر کھٹ پٹ کی آواز سن کر جیسے ہی میں نے روشنی جلائی ایک نے بستر سے رضائی دوسرے نے گرم چادر معمولی سی اٹھائی اور بھاگ گئے۔" بس بال بال بچی بچھے۔

پوری روداد سن کر انھوں نے کہا "چوروں کا بھی ایمان ہوتا ہے۔"

روشؔ صدیقی صاحب ان کے گہرے معتقد تھے وہ ان کو اپنا بیٹا کہتیں اور ماں والا سلوک کرتیں۔ وہی لگاؤ ان کی بیوی بچوں سے تھا۔ روشؔ صاحب اکثر ان کے یہاں قیام کرتے انھیں قرآن شریف اور تفسیر سنایا کرتے۔ کبھی کبھی ہمارے یہاں آتے مجیب صاحب سے دوستی تھی مجیب صاحب کو ان کا کلام بہت پسند تھا۔ مزے مزے کے اشعار سناتے جو ہم بڑے شوق سے سنا کرتے۔ ریحانہ بہن کا ذکر بڑی تعظیم و تکریم سے کرتے ان کا بیان تھا کہ بعض اسلامی عقائد میں انھیں جو شکوک تھے وہ ان کی وجہ سے رفع ہوگئے ہیں۔ مثلاً انتقال کے بعد اسلامی آخری رسوم کے طریقہ پر اب ان کا عقیدہ پختہ ہوگیا ہے۔

ایک دن پہنچی تو دیکھا روشؔ صاحب مثنوی مولانا روم سنا رہے ہیں پلنگ پر دونوں کے بیچ میں رحل کی طرح ایک چھوٹی سی میز پر مثنوی کھلی ہوئی ہے ریحانہ بہن والہانہ شوق اور انہماک سے سن رہی ہیں مجھے دیکھ کر پرمسرت تبسم کے ساتھ کہا "دیکھو کیا کلام ہے ......

روشؔ صاحب نے قرآن شریف کی کسی آیت سے چند اشعار کے معنی اخذ کرکے بتائے جیسا کہ کہا گیا ہے "ہست قرآن در زبان پہلوی"

۱۹۶۴ء میں حج کے لیے جانے سے پہلے میں ریحانہ بہن سے رخصت ہونے گئی تو انھوں نے کہا "جب تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ مبارک پر جاؤ تو میرا سلام پہنچا دینا۔" یہ کہتے ہوئے آواز میں رقت تھی لہجہ میں ایک لجاجت۔ اور آنکھوں میں آنسوؤں کے موتی جن میں حب خدا و رسول کا جلوہ۔ یہ پیغام محبت پہنچانا میں نے اپنے

ایک مقدس فرض کی طرح جانا اور جب روضۂ مبارک پر حاضری نصیب ہوئی تو حضور اقدس میں ان کا سلام پہنچایا۔

کن کن باتوں کو یاد کروں اور بہت سی باتیں تو میں بھول بھی گئی ہوں۔ کبھی کبھی میں نے دیکھا شام ہو جاتی تو وہ کہتیں "اب تھوڑی دیر آنکھیں بند کر کے ہم یادِ الٰہی کریں گے۔" روشنی گل کر دی جاتی وہ خدا کی یاد میں ڈوب جاتیں اور ان کے ساتھ جو لوگ بیٹھے ہوتے وہ سب۔

طبیعت کچھ خراب ہوتی تو یونانی علاج کرتیں کہتیں ڈاکٹری دواؤں میں اکثر شراب کی آمیزش ہوتی ہے۔ اس لئے ڈاکٹری علاج نہیں کرتی ایک مرتبہ جب وہ علیل ہوئیں ہمدرد نرسنگ ہوم میں داخل تھیں میں وہاں عیادت کو گئی۔

اس درمیان میرے ترکی اور ایران وغیرہ کے سفر کے دوران ملنے میں کئی مہینہ کا خاصا وقفہ ہوتا رہا یا کبھی اپنی طبیعت خراب رہی تب۔ ایک دن انھوں نے ایک نووارد سے تعارف کرایا۔ نام تھا شمشیر سنگھ۔ نوعمر خوش شکل بھرا بھرا توانا بدن گورا رنگ۔ لمبا کرتا اور دھوتی پہنے ان کے جو حالات بتائے ان کا خلاصہ یہ کہ بعض ناگوار تلخ واقعات پیش آنے سے وہ فوج کی نوکری چھوڑ آئے۔ گویا اس سے پیچھا چھڑا کے اس گوشۂ عافیت میں پناہ ڈھونڈھی ہے۔ اور ذہنی طور پر بیحد متاثر ہیں۔ ان کے چہرے بشرے اور بڑی بڑی آنکھوں سے آہوئے رمیدہ کی سی وحشت برس رہی تھی۔ اب ریحانہ بہن دل و جان سے ان کی ذہنی اور باطنی گتھیوں کو سلجھانے میں لگی تھیں۔ کہتیں ان کی حالت میں کچھ سدھار ہوا ہے۔ سدھار تو خیر ہوا ہوگا مگر وہ ان کے معاملات اور معمولات میں کافی دخیل نظر آئے۔ کہتیں یہ میرا بیٹا ہے اور وہ پاس ہی رہنے لگے۔ تھوڑے دن بعد کافی تبدیلیاں رونما ہوئیں اول تو وہ دروازہ بند پایا جہاں سے کمرہ میں داخل ہوتے اطلاع کرا کے پہنچی تو دیکھا کمرہ چاروں طرف سے تایا ہوا ہے اور کہیں سے تازہ ہوا کا گذر نہیں۔ ریحانہ بہن کے پلنگ کے گرد خوب موٹے موٹے پردے لگے ہیں اگرچہ اس وقت الٹے ہوئے تھے۔ دوسرا دھچکا یہ لگا کہ دوسرے پلنگ پر جہاں زیادہ آدمی کمرے میں نہ ہوتے تو ہمیشہ میں بیٹھتی اور ریحانہ بہن خود مجھ سے فرماتیں "وہاں آرام سے بیٹھ جاؤ۔" آج جیسے میں نے بیٹھنے کا قصد کیا انھوں نے مجھے منع کیا۔ کئی سوال میرے دماغ میں ابھرے جو دل ہی دل میں لیے میں خاموشی سے ان کے پاس کرسی پر جا بیٹھی اور حیرانی سے پوچھا "یہ سب اتنا بند کیوں ہے" فرمایا "ہاں دیکھو شمشیر سنگھ نے میرے لیے کیا اچھا انتظام کیا ہے دروازوں کی دراڑوں میں ربڑ لگا دی ہے۔" میں بولی پھر تازہ ہوا کہاں سے آئے گی ؟ بے پروائی سے جواب دیا "ارے وہ تو کہیں نہ کہیں سے آ ہی جائے گی۔"

تو شمشیر سنگھ کا مقام کیا ہے اور ان کا کتنا مان اور پاس ہے ان کو، یہ صاف ظاہر ہو رہا تھا۔ وہ مجھے آج سست اور مضمحل لگ رہی تھیں۔ ان کی صحت دن بدن زیادہ خراب رہنے لگی۔ دوبارہ نرسنگ ہوم میں داخل ہوئیں ملنے جلنے پر پابندیاں لگ گئیں۔ یہ شاید ۱۹۷۰-۷۱ء تھا گھر کا نقشہ بدل گیا۔ دروازے کے باہر لکڑی کے تختے جڑے تھے۔ میں نے بہت چاہا کہ ذرا ایک نظر دیکھ لوں کھڑے کھڑے مزاج پوچھ لوں وہ بھی نہ ہو سکا۔ شمشیر سنگھ نے بتایا کہ ملنا جلنا بالکل بند ہے۔ دل کی حالت ٹھیک نہیں رہتی۔ کسی کا دکھ درد برداشت نہیں کر پاتیں ان پر بڑا اثر ہوتا ہے ذرا سا کھٹکا ہوتا ہے تو پریشان ہو جاتی ہیں اسی لیے دروازے کے سامنے تختے لگا دیے کہ کان میں آواز نہ جائے۔ مجھے بڑی مایوسی ہوئی ان کی صحت کی فکر پڑ گئی وہ الگ۔ ایک مرتبہ بھابی کے ساتھ گئی تب بھی دونوں شکستہ دل واپس آئے۔ پھر جب اس تمنا میں قسمت آزمائی کی تو کاکا صاحب کے کمرے میں سروجنی بہن ملیں انھوں نے ریحانہ بہن کی طرف سے ایک تحریر دکھائی ان کی ہدایت کے مطابق کہ جو میرے ملنے والے آئیں انھیں یہ دکھا دی جائے۔ اور بتایا کہ اسی مضمون کی ایک ایک نقل انھوں نے اپنے سب عزیزوں کو بھجوا دی ہے۔ نفسِ مضمون یہ تھا کہ "اب دنیا سے میرا رشتہ ٹوٹ چکا ہے میں کسی سے مل نہیں سکتی۔ لیکن اپنے سب چاہنے والوں کے لیے میرے دل میں ویسا ہی پیار ہے میں سب کے لیے دعا کرتی ہوں۔"

پھر ایک مرتبہ سہیلہ بھابی کے ساتھ جا کے ہم ناکام واپس آئے۔ جیتے جی چھوڑ دینا کڑی آزمائش تھی جو بار بار ہو رہی تھی۔

دسمبر ۱۹۷۲ء میں جب مجیب صاحب کا برین آپریشن ہوا بھابی ہمارے پاس آ گئی تھیں۔ مجیب صاحب کی طبیعت سنبھلنے کے بعد بھابی اور میں امید کا دیا جلائے رات ہوتے ریحانہ بہن کے یہاں پہنچے۔ اس دن قسمت نے یاوری کی کاکا صاحب کے کمرے میں ایک لڑکی بیٹھی کچھ لکھ پڑھ رہی تھی اس کی ہمدردی اور مدد سے ہم کچھ عجیب بھول بھلیوں کے سے راستوں اور چکروں سے گذر کر اندر پہونچ گئے۔ کمرہ اب اسے کہہ نہیں سکتے دو گھوپے سے بنے تھے۔ بیچ میں پردہ پڑا تھا۔ پہلے حصہ میں چند خواتین عبادت میں مستغرق تھیں پردہ ہٹایا تو ریحانہ بہن کا دیدار ہوا۔ ان کے پلنگ کے پاس ایک ذرا سی پٹی پر زمین میں فرش بچھا تھا ہم دونوں اسی پر بیٹھ گئے بہت مدھم سی خوابیدہ روشنی تھی۔ ریحانہ بہن اوڑھے لپیٹے بیٹھی تھیں دھیمے لہجہ میں بات کر رہی تھیں وہ بہت کمزور لگ رہی تھیں۔ ان کی بڑی ہمشیرہ شریفہ حامد حسین کا کچھ عرصہ قبل انتقال ہوا تھا۔ بھابی سے زیادہ تر اسی سلسلہ میں بات کی اور مشورہ لیا۔ اور وہاں تھوڑا ہی وقت غنیمت جان کر ہم ان سے رخصت ہوئے۔ وہ بستر سے نہیں اٹھیں چلتے وقت مجھ سے ارشاد ہوا "آصفہ اگر تم چاہو تو رات کو یہاں عبادت کرنے آ جایا کرو۔ اور بیویاں بھی آتی ہیں یہ میں کیا کہتی مجیب صاحب تو ایسے پڑے تھے، میں محروم ہی رہی۔ اور ریحانہ بہن سے میری یہ آخری ملاقات تھی۔ وہ لمحات جو ان کی فیضِ صحبت میں گذرے حاصلِ حیات میں شمار کرتی ہوں۔

عہدِ گزشتہ کے صوفیائے کرام کے کچھ حالات تاریخ میں جن میں خواتین بھی شامل ہیں پڑھے ہیں، ریحانہ بہن کو آنکھوں سے دیکھا۔ وہ عشقِ الٰہی میں بالکل سرشار تھیں۔

کفر کافر را و دیں دیندار را ذرۂ دردت دلِ عطار را

۱۹۷۵ء میں اللہ کی یہ عاشق زار بندی اپنے اللہ سے جا ملی۔ مزار شریف جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قبرستان میں ہے • •

غزلیں

اسعد بدایونی

دل ایک ہی رات کا دیا ہے
بازی میں جسے لگا دیا ہے
ہر بار سفر پسندیوں نے
رستوں میں ہمیں پھنسا دیا ہے
ہر بار لکھا سفر کا قصہ
ہر بار مگر مٹا دیا ہے
اس بار مسافروں نے شاید
صحراؤں کا دل ہلا دیا ہے
بجھنے جو لگا یقیں کا شعلہ
تب ہم نے گماں جلا دیا ہے
تھک ہار کے دشتِ مصلحت میں
اب خیمۂ جاں لگا دیا ہے
جز نقدِ سخن بچا ہی کیا ہے
نیلام پہ سب لگا دیا ہے

سیفی سرونجی

کسی کے پیار کا تحفہ جناب لے آئے
سکوں نہ مل سکا تو اضطراب لے آئے
چمن میں یوں تو کئی پھول تھے حسیں لیکن
ہم آج چن کے وہاں سے گلاب لے آئے
جنھیں سمجھتے تھے بیکار یہ جہاں والے
وہی زمانے میں اب انقلاب لے آئے
نہیں ہے خوف ہمیں ظلمتوں کا اے لوگو
"بجھے چراغ تو ہم آفتاب لے آئے"
گئے تھے لوگ تمنا میں وصل کی لیکن
شبِ فراق کے سارے عذاب لے آئے
نظر ملاتے ہی دیوانہ کہہ دیا اس نے
لگی نہ دیر کہ اس سے خطاب لے آئے
اسی خیال میں رہتا ہے خوش ترا سیفیؔ
پلانے کب کوئی جامِ شراب لے آئے

ابوالکلام قاسمی

شکستِ شام سے منظر جو آبجو کا تھا
وہ عکس تیرے لبوں کا مرے لہو کا تھا
دعا کے نخل پہ لمحوں میں برگ و بار آئے
کہ تخمِ اشک میں جوش اس قدر نمو کا تھا
تری تلاش مجھے تیرے انگ انگ میں تھی
کہ جیسے طرز کوئی یہ بھی جستجو کا تھا
وہ شخص جس کی رفاقت سے راہ روشن تھی
مرا رفیق نہ تھا آدمی عدو کا تھا
دیا تھا نام جسے سب نے خود کلامی کا
وہ سلسلہ بھی عجب تجھ سے گفتگو کا تھا
وہ تیز دھوپ کے ڈر سے نہ مجھ سے مل پایا
مجھے بھی گھر سے نکلنے میں خوف لو کا تھا

نشاط انصاری

خود ہی اپنے آپ کو میں ڈھونڈھتا ہوں کو بہ کو
پر کسی کو دیکھ پاتا ہوں نہ اپنے رو برو
ایسا مجھ کو لگ رہا ہے وہ نہیں ہوں کل جو تھا
دیکھتا ہوں جب میں اپنے آپ کو ہی دو بدو
میں کہاں پہنچا کہاں کھویا ہوں اپنے آپ کو
کون وہ انسان ہے جس کی ہے مجھ کو جستجو
چہرہ کب آئینے بولو میرا بدلا یا گیا
اب کے میں لگتا نہیں ہوں آپ اپنے ہو بہو
دوڑتے پھرتے ہیں میرے پیچھے پیچھے رات دن
سائے سب تشکیک کے ہر گام پر اور سو بہ سو
چھوڑ دے پانی کی باتیں خواب ہے پانی نشاطؔ
جو پہاڑوں آبشاروں سے ٹپکتا ہے لہو

جعفر عسکری

اہلِ ثروت سے ملے کب شہریاروں میں رہے
عمر بھر ہم تنگ دستوں، دل فگاروں میں رہے
وادیوں میں شوق کی ہے ایک ہنگامہ بپا
کون تنہا، بے نوائی کے حصاروں میں رہے
راس آیا کب اُنھیں بحرِ تمنا کا سفر
دائمی جن کے سفینے ریگزاروں میں رہے
اب ہوئے آباد شہروں میں وہ ابنائے وحوش
ماضیوں میں جن کے آبا بند غاروں میں رہے
دیوِ غم سے ہیں جہاں لڑتے سفیرانِ امید
ہم اُسی میداں کے بانکے شہسواروں میں رہے
فائدہ بس یہ ہوا لالہ رخوں کے قرب سے
ہم جہاں دیدہ ہوئے اور کم خساروں میں رہے
ساعتوں کے سرد طوفانوں میں جعفرؔ سر بہ سر
اک تپشِ قائم تمنا کے شراروں میں رہے

منظور ہاشمی

ہوا کے دوش پہ اڑنا تو اک بہانہ تھا
کہ وقت کم تھا بہت دور ہم کو جانا تھا
یہ چاہتے تھے، کہ یہ بات جھوٹ ہو جائے
یہ جانتے تھے کہ رشتوں کو ٹوٹ جانا تھا!!
کڑی کمان کے تیروں کو دیکھ کر خوش تھا
مجھے خبر ہی نہیں تھی کہ میں نشانہ تھا!
دمکتے سونے سے دن تھے مہکتے پھول سی رات
ہمارے پچھلے جنم میں بھی کیا زمانہ تھا!!
لباس بھیگ نہ جائے بدن نہ گیلا ہو
یہ شرط اور سمندر کے پار جانا تھا
یہ سوچتا تھا وفا کا صلہ وفا ہوگا
مرا خیال مگر کتنا احمقانہ تھا؟

میکشؔ اکبر آبادی

مکاشفات الاسرار

حضرت جی سید علی غمگینؔ[1] دہلوی رحمۃ اللہ علیہ متاخرین صوفیا میں شاعرانہ اور صوفیانہ دونوں اعتبار سے ایک بلند درجہ رکھتے ہیں۔ اس دوران میں حضرت کے حالات اکثر ادبی رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ اور مزید تعارف کی احتیاج نہیں ہے۔

مکاشفات الاسرار حضرت کی رباعیات کا مجموعہ ہے جو تقریباً ۱۸۰۰ رباعیات پر مشتمل ہے ان رباعیات کی شرح خود حضرت نے فرمائی جس کا نام مرآۃ الحقیقت ہے۔

حضرت جی غمگینؒ سے پہلے بھی اردو کے ایسے شعرا گزرے ہیں جن کا کلام ادبی اعتبار سے اور حقائق و معارف کے بیان کے اعتبار سے بہت بلند ہے مگر حضرت غمگین پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اردو رباعیات کے ذریعے تصوف کے تمام ضروری مسائل بیان کر دیے ہیں۔

کوئی علم اور کوئی زبان بہ ذات خود نہ اچھی ہے نہ بری۔ طریق استعمال اور نیت و مقصد ہر شے کو اچھا اور برا کر دیتے ہیں۔ یہی حال فلسفے اور تصوف کا ہے۔ مسلمان جب فلسفۂ یونان سے آشنا ہوئے اور ایک طبقے نے ہر نئی چیز کی طرح اس کی بھی مخالفت کی اور دوسرے طبقے نے اس کا مطالعہ اور اس سے واقفیت حاصل کرنا ضروری سمجھا یہ نفرت اور توجہ تقریباً اہل علم کے ہر طبقے میں رہی چنانچہ بعض صوفیا نے بھی ان جدید علوم کا مطالعہ کیا اور ان کی اصطلاحات اور نظریوں کو اپنے اصول اور مسلک کی تائید میں استعمال کیا۔ جب کہ بعض صوفیا نے ان علوم سے احتراز کیا۔ اس طرح کی دونوں مثالیں حسن اتفاق سے ہمیں ایک ہی زمانے کے دو بڑے مشائخ میں ملتی ہیں۔ حضرت شیخ الشیوخ شیخ شہاب الدین سہروردی کی مشہور کتاب عوارف المعارف کا پورا انداز ایک مستند حدیث کی کتاب کا سا ہے لیکن آپ ہی کے ہم عصر حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی مشہور تصنیف فصوص الحکم اس زمانے کے فلسفیانہ رجحان کی پوری نمائندگی کرتی ہے حالانکہ دونوں کتابیں تصوف ہی پر لکھی گئی ہیں اور دونوں کتابیں عام صوفیوں میں مقبول اور مستند سمجھی جاتی ہیں اور عجیب بات یہ ہے کہ یہ دونوں بزرگ ایک ایک واسطے سے حضرت غوث اعظم میراں محی الدین عبد القادر جیلانی رضی اللہ عنہ سے فیض یاب ہیں۔ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ اپنے چچا ابو النجیب عبد القاہر سہروردی کے خلیفہ اور تعلیم یافتہ ہیں اور شیخ ابن عربی کی تعلیم و تربیت حضرت ابو مدین مغربی نے فرمائی ہے۔ اور شیخ ابو النجیب اور شیخ ابو مدین مغربی دونوں حضرت غوث اعظم کے اجل خلفا میں سے ہیں۔

تصانیف اور انداز بیان کا یہ اختلاف ہر عہد میں برقرار رہا ہے چنانچہ ہندوستان میں اکثر صوفی مصنف حضرت ابن عربی سے متاثر رہے ہیں اور مولانا جامیؒ کی معرفت ابن عربی کے تصوف کا اثر ہندوستان کے تمام ہی صوفی مصنفین پر پڑا ہے۔ البتہ حضرت شیخ کلیم اللہ جہان آبادیؒ سے پہلے صوفیائے چشت کی تصانیف میں یہ اثر نہیں ملتا۔

مکاشفات الاسرار کی رباعیات میں جو تصوف بیان کیا گیا ہے وہ وہی ہے جو متاخرین صوفیا میں عام تھا اور جس میں ابن عربیؒ کے فلسفے کی آمیزش تھی چنانچہ ان رباعیوں میں جہاں ایک طرف قدیم تصوف کے اصول تو بہ، پاکیزگیِ نفس، عشق، فقر، ذکر و فکر، وغیرہ بیان کیے گئے ہیں تو دوسری طرف احاطۂ ذہنی، اعیان ثابتہ، اعیان خارجہ۔ بحث مجعولیت، وجود عینی، وجود علمی وغیرہ پر بہت سی رباعیاں ملتی ہیں اور شاید تصوف کا کوئی اہم مسئلہ ایسا نہیں ہے جس پر کوئی رباعی نہ ہو۔ اس موقع پر وحدۃ الوجود کا شمار فلسفیانہ تصوف کے ضمن میں میں نے قصداً نہیں کیا کیوں کہ یہ اصطلاح اگرچہ فلسفیانہ ہے اور یہی وہ مسئلہ ہے جو خصوصیت سے صوفیا اور مخالفین صوفیا میں مختلف فیہ ہے لیکن یہ لفظی اعتبار ہی سے فلسفیانہ اصطلاح ہے ورنہ فلسفی صوفی اور غیر فلسفی صوفی سب ہی اس مسئلے پر متفق ہیں جیسا کہ علامہ اقبال نے کہا ہے۔

تو اے ناداں دلِ آگاہ دریاب　　　بخود مثلِ نیاگاں راہ دریاب
چساں مومن کند پوشیدہ را فاش　　　زلاموجود الا اللہ دریاب

---

[1] ولادت ۱۱۶۷ھ/۱۷۵۳ء دہلی۔ وفات ۱۲۶۸ھ/۱۸۵۱ء گوالیار۔

[2] یہ تمام تصانیف غیر مطبوعہ ہیں اور حضرت جی سردار غنی صاحب و حضرت جی رضا محمد صاحب کے کتب خانہ واقع گوالیار میں موجود ہیں جو حضرت جی کے سجادہ اور وارث ہیں۔

علامہ اقبالؒ کی یہ رباعی قدیم اور سادہ تصوف کی مثال میں پیش کی جا سکتی ہے۔

اس کے ساتھ ہی حضرت غمگینؒ کی رباعی سنیے اور اندازہ کیجیے کہ اردو فارسی کے فرق کے باوجود حضرت غمگین کی رباعی کتنی فلسفہ آمیز ہے۔

ممکن کو قیام صرف ہے غیر کے ساتھ　　از خود ہو اگر تو پھر عدم سے ہو نجات
موجود نہیں ہے بجز وجودِ واجب　　اُس کا ہے وجود جو ہے قائم بالذات

مکاشفات الاسرار کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ دیوان شاہ غمگین نے مرزا غالب کے لیے لکھا تھا چنانچہ دیباچے میں اپنے حالات اور نسب وغیرہ بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

"پہلے میں نے ایک دیوان ریختہ میں لکھا تھا اسے دور کر دیا اب کہ میری عمر ساٹھ سال کی ہونے آئی جو واردات اور ذوق شوق عشق حقیقی اور مجازی کے تھے وہ میں نے ترتیب دیے اور بعض خاص غزلیں پہلے دیوان کی دوسرے دیوان میں شامل کر لیں جب نیا دیوان مکمل ہو گیا تو چونکہ ابھی واردات اور کیفیات کا میرے دل پر غلبہ باقی تھا۔ میں نے چاہا کہ برادر دینی عزیز از جان اسد اللہ خاں عرف میرزا نوشہ متخلص بہ غالب و اسد کے واسطے جو اس زمانے میں نظم و نثر میں اپنا نظیر نہیں رکھتے ہیں رباعیات کے پیرائے میں تصوف کا رسالہ ترتیب دوں اس لیے تمام مضامین اعلیٰ سے ادنیٰ تک جو لوگوں کو معلوم ہیں یا نہیں رباعیات میں درج کر دوں جس سے مبتدی اور منتہی دونوں فائدہ اٹھالیں...."　(ترجمہ)

اسی سلسلے میں حضرت نے تحریر فرمایا کہ:۔

"اگر یہ دیوان رباعیات کسی بزرگ کے ہاتھ لگے تو مجھے امید ہے کہ وہ اس کو مقلدوں، ملحدوں اور خلاف شرع لوگوں سے پوشیدہ رکھیں گے۔ ہر چند کہ مقلد اور ملحد غیر حق نہیں ہیں بلکہ عین حق ہیں لیکن بزرگانِ متقدمین و متاخرین کا طریقہ اسی طرح چلا آتا ہے کہ اسرارِ باطنی کو ظاہر بینوں سے پوشیدہ کرتے آئے ہیں اس لیے ہمیں بھی اُن کا اتباع واجب ہے"　(ترجمہ)

یہی بات حضرت جی نے مرزا غالب کو ایک خط میں لکھی مرزا نے اس کے جواب میں جو خط حضرت جی کو لکھا ہے اس کی نقل یہاں غیر مناسب نہ ہوگی۔ اس خط کا ترجمہ دانستہ نہیں کیا جا رہا ہے بلکہ مرزا صاحب کا اصل خط ہی پیش کیا جا رہا ہے۔

قبلۂ حاجات۔ انچہ نخست دل را بہ نشاط توانگر کرد دیدن روئے سید امانت علی بود سلمہ اللہ تعالیٰ کہ دیدہ را فروغ دیگر بخشید۔ چوں از باز یافتگانِ قدسی انجمن اند گرد سرشاں گردیدم و کف پائے شاں بوسیدم مشاہدۂ منشورِ آگہی کہ عبارت از والا نامہ است نورے دیگر افزود غزل ہم بہ ذریعہ سید صاحب و فقیر صاحب فرستادہ آمد مقارنِ آں آدم دیگر رسید و پروانۂ دیگر رسانید شادماں شدم و عنوانِ دیوانِ رباعیات شادماں تر ساخت سرمایہ آنم کو کہ آں ہمہ گیر بہ رشتۂ نگارش از بہر من کشیدہ آید و آں گاہ ایں مایہ مکرمت کہ خود از بندۂ خود می پرسند کہ اگر دستوری دہی دیباچہ را بنام تو نگارندم۔ ایں پرسش خود ادائے نوازش دیگر است کہ زباں اندازۂ سپاس آں بر نتابد۔ قبلہ گاہا فضولی می کنم و چوں فرمان چنیں است می گویم کہ گنجیدن نام من کہ در آں نامہ نہ تنہا از بہر من بلکہ از بہر آبائے من سرمایۂ نازش جاودانی است لیکن ہمہ آں خواہم کہ مرید خود را بیش از اندازہ دراں نگارش نہ ستایند و کم ترین بندۂ خود وا نمایند کہ ہر آئینہ اندریں صورت ہم مدعائے خدام حاصل می شود و ہم خواہش ایں تنگ آفرینش روائی می پزیرد بالجملہ چشم بدراہم کہ دیوانِ رباعیات کے می رسد و من بداں کہ رسم فرمان چناں است کہ آں نوشتہ را از نظرِ اغیار نہاں دارم ہم چنیں خواہم کرد اما کو غیر پس از گذارش ایں بذلہ کہ البتہ خلاف رائے دانش آرائے نخواہد بود سخنے دیگر می گویم تا حضرت را ذوق و مرا اعتبار افزاید بیتے از بیت ہائے نفیر داخل صیفہ منتخب است۔

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

من خود فرماں پزیرفتم لیکن فرمانِ خرد اندریں باب آں ست کہ ہر نگرندہ آدیدن آں الفاظ بہ کنہ معنی نہ تواند رسید و ہر کہ معنی را نیک تواند فہمید ہر آئینہ غیر نیست چہ دریں عالم تفرقہ کعبہ و دیر نیست سخن ہائے دل آویز کہ گستاخانہ گزاردہ شد خاطر نشین و دل نشین باد زیادہ حد ادب۔

عریضہ نگار اسد اللہ

روز نگارش نامہ دہم ذالحجہ ہنگام شام کہ مشفقی سید حیدر علی صاحب و اکبر جیاں کہ با من گفتند اگر رسیدہ باشند و بہ سید پیر علی صاحب نیز سلام ہائے مشتاقانہ خوانند و مشتاق دانند"

اور اس خط کے بعد جواب اور جواب الجواب کا سلسلہ شروع ہو گیا جس میں اہم مسائل تصوف موضوع بحث بنے رہے یہاں تک کہ حضرت جی نے مرزا غالب کو لکھ دیا کہ آئندہ خطوں میں تصوف کا ذکر نہ ہو۔ حضرت جی نے مرزا صاحب کو جو اخفا کے لیے تاکید کی تھی وہ بے جا نہ تھی مثال میں حضرت جی کی ایک رباعی ملاحظہ فرمائیے۔

ایک عمر رہی ہے میری اللہ کی جنگ　　دنیا میں رہا شکست سو سو فرسنگ
غمگیں مغلوب اب ہوا ہوں ایسا　　نہ فوج رہی نہ میں نہ وہ نام و ننگ

یہ رباعی کتنی وجہ اعتراض بن سکتی ہے اس کے بیان کی ضرورت نہیں ہے۔ ایسی ہی بہت سی وجوہ ہیں جن کی وجہ سے تصوف ہدف ملامت بنتا رہا ہے۔ لیکن اس کی شرح خود حضرت جی کی زبان مبارک سے سنیے اس کے بعد رباعی کا مفہوم قابل اعتراض نہ ٹھہرے گا۔ اور حضرت جی کی اخفا کی تاکید کی اہمیت بھی روشن ہو جائے گی خود پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے۔ تکلموا الناس علی قدر عقولھم (او کما قال) لوگوں سے ان کی عقل کے مطابق بات کرو۔

شرح ملاحظہ ہو۔

"جس وقت کہ تم حق سبحانہٗ تعالیٰ سے صلح کر لوگے اور توبہ کر لوگے اور اپنے گناہوں پر پشیمان اور شریعت و طریقت نبوی کی اطاعت کر لوگے، خدا کی محبت تم میں پیدا ہو جائے گی اور ذکر و مراقبہ کرنے لگو گے تو اس وقت تم میں اور خدا میں جنگ عظیم واقع ہو جائے گی اور ہنگامہ دار و گیر واقع ہو جائے گا کیونکہ تم اس وقت اپنی خودی کے علم کے سلطان ہو گے اور تمہارے ساتھ تعینات اور خطرات اور دوسری صفاتِ ظاہری و باطنی کا ایک عظیم لشکر ہوگا اور یہ جنگ ایک مدت جاری رہے گی اور اکثر غلبہ اور فتح تمھیں کو حاصل ہوگی حالانکہ وہ غلبہ اور فتح تمھاری شکست ہے۔ پس اس وقت لازم ہے کہ اپنے آپ کو کسی صاحب نسبتِ جذبی کی خدمت میں حاضر کر دتا کہ تمھیں جلد شکست ہو جائے اور یہی شکست تمھارے لیے فتح یاب ہو جائے گی اور تھوڑے دن بعد تمھارے لشکر کو شکستِ فاش ہو جائے گی اور تعینات و خطرات کا لشکر برباد ہو جائے گا تمھاری سلطنت پر زوال آجائے گا۔ اور تمھاری خودی مٹ جائے گی پھر اس شکست کے بعد صلح کا دروازہ تم پر کھل جائے گا۔ تم فنا ہو جاؤ گے اور اپنی اصل تک پہنچ جاؤ گے۔" (ترجمہ)

اب تصوف کے مختلف مسائل پر مشتمل کچھ رباعیاں پیش کی جاتی ہیں جن سے مکاشفات الاسرار کی ادبی اور علمی حیثیت کا اندازہ ہو سکے گا۔ رباعیات کے عنوان اصل کتاب میں جس طرح ہیں اسی طرح نقل کیے جاتے ہیں۔

در وحدۃِ وجود

جو کہتے ہیں لوگ سب یہ کثرت کثرت   آتی ہے سخن پہ اُن کے مجھ کو حیرت
غمگیں نہیں قال و حال پر موقوف   کثرت کو وجود ہی نہیں جُز وحدت

در احاطۂ ذاتی گوید

غمگین گر تری اس دوئی سے ہو نجات   جو دید میں آئے عین ہے اس کی ذات
بالذّات نہ ہو یہاں اگر وہ موجود   کس طرح سے اُس کے پھر ہوں اسما و صفات

در حقیقت تنزیہہ

بے فائدہ کر نہ اس کی تو گفت و شنود   جس کا نہ مشاہدہ نہ جس کی ہو دید
توحید پر اعتقاد رکھنا نہ کبھی   بس اس کے سوا نہیں ہے غمگیں توحید

در بیان توحید ایمانی کہ اول است

توحید کے چار مرتبے ہیں اے یار   اول ایمانی جس میں ہیں سب دیندار
وہ یہ ہے کہ حق کی واحدیت کا تو   باصدق کرے زبان و دل سے اقرار

در بیان حقیقت ایمان کامل

مشکل ہے لانا مد خدا پر ایمان   میں رکن بتاؤں جس میں سب ہوں ارکان
وہ یہ ہے خودی نہ رہوے اپنی غمگین   بن اس کے نہ ہو گی تیری مشکل آسان

در تعریف صوفی گوید

غمگیں صوفی غرض لقب اُس کا ہے   جس کو کہ وجود ہی نہیں ہوتا ہے
صوفی کی نہ پوچھ تو حقیقت مجھ سے   صوفی نہیں پوچھتا کہ صوفی کیا ہے

در معنی تصوف

سب صوفی کہیں ہیں ہے یہ غمگین اعلا   جز اس کے نہیں ہے کچھ تصوف بخدا
اُس شغل میں بسر کرے وقت عزیز   جو دونوں جہاں میں ہو سب سے اعلیٰ

در معنی تصوف و حقیقتِ فقر

غمگیں کوئی پوچھے گر تصوف کیا ہے   کہہ بے خودی اپنی میں شہود اُس کا ہے
جو پوچھے فقیر کس کو کہتے ہیں تو کہہ   مفلس آپے سے اپنے جو ہوتا ہے

در حقیقتِ کفر

غمگیں ہے کفر ظاہری تو ظاہر   پر کفر حقیقی سے نہیں تو ماہر
وہ یہ ہے کہ محو حق میں تیرا ہو وجود   بن اس کے نہ کفر سے تو ہوگا طاہر

در بیان اعیان ثابتہ

اعیان ثابتہ کا سن مجھ سے بیاں   موجود قدیم علمِ حق میں ہے نہاں
معدوم وہ ہوئے نہ ہوں گے غمگیں   یہ صورتیں کوئی سب ہوئیں اُن سے عیاں

یعنی ممکنات خارجیہ را ہم عیان گویند

کہتے ہیں ممکنات کو بھی عیاں   عارف سے نہیں ہے یہ راز کچھ پنہاں
سونگھی ہی نہیں انھوں نے بوئے وجود   معدوم ہیں یہ ہمیشہ اے غمگیں جان

اعیانِ ثابتہ را با وحدت ہماں نسبت است کہ برف را با آب و ہم چنیں اعمال صالحہ را با جنت

اعیانِ ثابتہ میں یوں ہے وحدت   ہے برف میں جیسے آب بالعینیت
ایسے ہی سمجھ لے سب مثالیں جیسے   اعمالِ صالحہ ہیں عینِ جنت

در بیاں آنکہ اولیت و آخریت اعتبار اند

تو جس کو سمجھ لے ابتدا ہے غمگین   اور جان لے جس کو انتہا ہے غمگیں
یہ دونوں تعین خیالی ہیں ترے   اُس کو تو نہ حد نہ منتہا ہے غمگیں

در ترغیب شرع شریف کہ اہم مقامات اولیا است

غمگیں اس سے اگر تجھے ہے کچھ کام   عرفان کو اپنے رکھو تو بالائے بام
منظور تجھے اگر خوشی ہے میری   جاری اپنے پہ شرع کے کر احکام

در رضیت آدم علیہ السلام

غمگیں مرضی ہے اور، اور امر ہے اور   اس میرے سخن کو تو سمجھ خوب بغور
آدم کو کہا کہ تو نہ کھا نا گندم   اور مرضی یہ تھی کہ اس کو کھاوے ہر طور

در ترغیب خدمتِ خلق

خدمت سے خلق کی نہ رہنا محروم   اور ہو نہ سکے تو چاہیے ہو مغموم
ممکن نہیں جو جہاں میں غمگیں کوئی   بے خدمتِ خلق یار ہووے مخدوم

موتو قبل ان تموتو

ہرچند بلائے ناگہانی ہے موت   اک روز نہ اک روز تو آنی ہے موت
مرنے سے پہلے ہی جو مرے اے غمگیں   واللہ کہ اُس کی زندگانی ہے موت

در اختتام گوید

کب تک کروں درد عشق کا اپنے بیاں   کب تک کروں اپنے پوشیدہ عیاں
غمگین ہے آہ کم بہت فرصتِ عمر   اور قصۂ حال ہے میرا بے پایاں

عطیہ پروین

جوالا مکھی

غسل کے بعد ہلکے آسمانی رنگ کی ساڑھی اور سفید بلاؤز پہن کر وہ آئینے کے سامنے اپنے بھیگے بال سلجھانے کھڑی ہوئیں تو اپنے عکس کو حیران سی ہو کر تکنے لگیں۔ ارے کیا یہ وہی ہیں۔ اسرار صاحب کی بیوی۔ چار شادی شدہ اور ایک غیر شادی شدہ لڑکے کی ماں۔ ایک بڑے بھاری گھر اور بھاری خاندان کی باوقار اچھی بہو، اچھی اماں، اچھی امی، اچھی ممانی اچھی چچی۔ وہ اچھی ہی اچھی نظر آرہی تھیں اماں امی ممانی چچی کہیں پرے سے بھی نہیں دکھائی دے رہی تھیں۔ انھوں نے پلکیں جھپکائیں تب بھی وہی صورت رہی۔ ساڑھی کے آنچل سے شیشہ صاف کیا تب بھی وہی صورت رہی گال پر چٹکی بھری مبادا خواب دیکھ رہی ہوں تب بھی وہی صورت رہی ہاں یہ ستم اور ہوا کہ چٹکی بھرنے سے رخسار پر نشان جو پڑا اس نے صورت کو اور پیارا اور لبھاؤنا بنا دیا۔ تب انھوں نے لمبے لمبے گھنے سیاہ بال ادھر ادھر سے اٹھا اٹھا کے دیکھے شاید سفیدی جھلک اٹھے اور ان کے اچھی اماں اچھی امی ہونے کی گواہی دے سکے۔ بال کمبخت وہی ساون کی گھنگھور گھٹائیں بنے ہاتھوں میں جھومتے رہے کسی بھی سفید بال نے بجلی نہ گرائی۔

پھر انھوں نے بازو دیکھے۔ بھرے بھرے سڈول سفید بازو۔ مخروطی کلائیاں ان میں چھنکتی فالسئی چوڑیاں۔ گردن دیکھی شاید کوئی سلوٹ عمر کی چغلی کھاتی ہو شیشے کی جگ مگ کرتی صراحی دھری تھی۔ رخسار تھپکے شاید ڈھل ڈھل ہل رہے ہوں ایسا لگا قندھاری اناروں کو چھو لیا ہو۔ آنکھوں میں اب بھی موتی کٹے بھرے تھے لبوں میں وہی سرخی اور گداز تھا۔

اللہ توبہ! وہ تھکے تھکے انداز میں اسٹول پر بیٹھ گئیں۔ جیسے اس حسن اس جوانی کے بوجھ نے تھکا دیا ہو۔ ۱۶ سال سن سناتے ہوئے گزر گئے تھے انھوں نے اپنے آپ کو کیسا کیسا تھکایا تھا توڑا مروڑا تھا لیکن، پھر بھی جوں کی توں رہی تھیں۔ ویسی جگمگاتی چمکتی اور لودیتی اب تو چہرے پر جو وقار اور ٹھہراؤ آیا تھا اس نے ایک نئی کشش عطا کر دی تھی۔

جانے کہاں آج وہ بھولی بھٹکی آئینے کے سامنے آ رہی تھیں۔ انھوں نے تو ڈر کے مارے آئینہ دیکھنا ہی چھوڑ دیا تھا کنگھی چوٹی کرتیں تو مانگ کی سیدھائی انگلی سے ٹٹول لیا کرتیں یا پھر لڑکیوں سے پوچھ لیا کرتیں آج اتفاق سے کوئی سامنے نظر نہیں آئی وہ نہ جانے کس جھونک میں کمرے میں آئیں اور رات کی دعوت میں پکنے والے سالنوں کے بارے میں سوچتی ہوئی آئینے کے سامنے آ کھڑی ہوئیں۔ برسوں کے بعد آئینے میں اپنے عکس کو دیکھا تھا۔ خدا کی قسم گلاب کا وہ تر و تازہ پھول جس کو ابھی ابھی ڈالی سے توڑا گیا ہو۔

گھبرائی گھبرائی سی وہ الجھے بالوں کو کنگھے سے کھسوٹنے لگیں۔ آئینے سے یوں منھ پھیرے تھیں جیسے کوئی بھوت آ چھپا ہو۔ ۱۴ برسوں میں پہلی بار اپنی صورت سے ڈر محسوس ہوا تھا۔ کمبخت مٹائے نہیں مٹ چکتی۔ یہ جسم انھوں نے بڑے غصّے سے اپنے جسم پر نظر دوڑائی۔ کیا ضرورت تھی اللہ میاں کو اتنا سڈول جسم بنانے کی۔ کمبخت جیسے فرج میں رکھ کر محفوظ کر لیا گیا تھا کیا مجال جو کہیں سلوٹ ابھری ہو ڈھیلا پن آیا ہو۔ آخر خاندان میں اور بھی تو بیبیاں تھیں دن بہ دن ڈھلتی پھیلتی جا رہی تھیں اور اپنے اس ڈھلنے پھیلنے کا انھیں غم بھی تھا جب وہ سب اچھی بہو کے جسم کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتیں تو اچھی بہو ہنس دیتیں لیکن، اس وقت ان کو رونا آ رہا تھا غصّہ آ رہا تھا ان کی تپسیا کام نہ آئی ان کا تانبے کی طرح چمکتا اور پیتل کی طرح پھسلتا جگمگاتا جسم ذرا بھی نہ ڈھلا تھا نہ پھیلا تھا۔ کاش ایسا ہوتا کچھ کہ یہ جسم توڑ مروڑ کے نچوڑ کے کوئی آم کی چوسی گٹھلی بنا دیتا۔ ہائے مگر نہیں! وہ لرز اٹھیں۔ یہ کیسا خیال آیا تھا انھیں۔ انھوں نے تڑاتڑ کئی ہاتھ۔ توبہ توبہ کہتے ہوئے رخساروں پر مارے اور ساتھ ہی جانے کسی شیطان نے ورغلایا کہ آئینہ دیکھ لو رخسار تمتا اٹھے ہوں گے۔ وہ جھپاک سے اٹھیں اور باہر نکل آئیں۔ مجن کے آنے کا وقت ہو رہا تھا۔ کل ہی تار آیا تھا۔ ۴ بجے پہونچ رہا ہوں منگل کو۔ اور آج منگل تھا۔ ۴ بجنے والے تھے اسرار میاں بیٹے کو لینے اسٹیشن گئے ہوئے تھے اور ان کو رات کی دعوت کا اہتمام کرنا تھا۔ آئے دن وہ دعوتیں کیا کرتیں۔ کبھی کوئی بہانہ کبھی کوئی بہانہ۔ آج مجن کے آنے کی خوشی میں انھوں نے رات کو خاندان بھر کی دعوت کر دی تھی کچھ یہ بھی مقصد تھا کہ مجن خاندان کی کسی پیاری سی لڑکی کو پسند کرے اور وہ اس کی شادی سے بھی نپٹ جائیں۔ ۳ لڑکوں نے صرف ان کی مرضی اور پسند کو کافی سمجھ کر سر جھکا دیئے تھے بڑی پیاری پیاری بہوئیں لائی تھیں وہ تینوں لڑکے خوش تھے۔ لڑکی کی شادی بھی چراغ لیکر تلاش کرنے کے بعد انھوں نے ہیرا جیسے لڑکے سے کی تھی آج وہ بھی شاد و آباد تھی لیکن یہ مجن، جانے کیسا سر پھرا نکلا کہ شادی کے نام کانوں پر ہاتھ دھرتا۔ ماشاء اللہ نوکر چاکر ہوئے ۲ سال گزر گئے تھے پھر بھی نا کیے جا رہا تھا جبکہ بیوی کا بوجھ بڑے مزے میں اٹھا سکتا تھا اب آج وہ سہارن پور سے جہاں وہ سروس کرتا تھا گھر آ رہا تھا اور انھوں نے خاندان کی ساری لڑکیوں کو یعنی شادی کے قابل لڑکیوں اور ان کی ماؤں کو دعوت دے دی تھی۔ خدا جانے کس لڑکی کی قسمت کھلنے والی تھی۔ ان کے مجن میں روا تنا نہیں حقیقتاً ہیرے جڑے تھے۔ خوب صورت اونچا مضبوط نوجوان۔ ہنس مکھ خوش مزاج۔ ۷-۸ سو ماہوار پاتا تھا سرکاری کوارٹر ملا ہوا تھا ترقی کی بہت سی امیدیں اور راستے تھے۔ گھر سے بھی کھاتے پیتے لوگ تھے باپ کی کمائی کی صورت میں ۶-۷ مکانات اور گاؤں میں کھیت و باغات تھے پھر کیوں نہ ہیرے جڑے ہوتے ہاں یہ ضرور تھا کہ اگر اچھی بہو کے ہاتھوں ان بچوں کی پرورش و تربیت نہ ہوتی تو اتنے ہیرے نہ جڑے ہوتے اچھی بہو نے ان بچوں کے لیے اپنے آپ کو مٹا ڈالا تھا۔ گھلا ڈالا تھا اپنی ساری آرزوؤں اور ارمانوں کا گلا اپنے ہاتھوں گھونٹ دیا تھا۔ ان کی آرزوئیں اور ارمان تو کچھ اس وقت بھی دم توڑ گئے تھے جس وقت اس کی سہیلیوں نے برات دیکھنے کے بعد اس پر دھاوا بول دیا تھا۔ ہنسی، قہقہے، طنز، مذاق۔

"ہائے صوفیہ تیرا دولہا تو تیرا دادا لگتا ہے۔"

"ارے کہیں بھولے سے بیٹے کی جگہ ابا میاں سہرا باندھ کے تو نہیں آگئے!"

"قسم سے سونیہ کافور کی بو یہاں تک چلی آ رہی ہے!"

صوفیہ نے یہ ضرور سنا تھا کہ اس کا ہونے والا دولہا ذرا بڑی عمر کا ہے لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ ۵ بچوں کا باپ بھی ہے۔ اماں ابا نے اس پیغام کو اتنی جلدی قبول کیا تھا کہ وہ ہکا بکا رہ گئی تھی۔ اس نے طاق بھر کے گڑیاں چھوڑیں اور اپنی سی دوگنی نہیں تگنی عمر کے مرد کی خلوت میں پہونچ گئی —— میاں نے گھونگھٹ الٹا تو وہ ٹکر ٹکر ان کو تکتی رہ گئی —— ارے ان سے زیادہ تو اس کے ابا جوان لگتے تھے۔ سوکھے مریل سے اسرار میاں جنھیں دمے کی شکایت بھی تھی گھونگھٹ اٹھا کے پہلے تو انھوں نے اس کی جوانی اور بھولپن پر فاتحہ پڑھا پھر گھر کا دکھڑا رونے لگے۔ بیوی ۲ برس پہلے فوت ہو گئی تھیں بچے بگڑے جا رہے تھے رشتہ دار لوٹ لوٹ کر گھر بھرے لے رہے تھے ان کا ساتھی کوئی نہ تھا کوئی ان کی بیماری سمیٹنے والا نہیں رہ گیا تھا کیا کرتے ایک یہی ترکیب سمجھ میں آئی کہ شادی کر لی جائے گھر میں ایک عورت آ جائے تو سب کے دکھ دور ہو جائیں۔

"تمھیں کوئی کمی نہیں ہوگی بیگم۔ میں زیور سے تمھیں لاد دوں گا، روپے سے آنچل بھر دوں گا ملکہ بنکے رہو گی!"

صوفیہ زخمی دل لیے سنتی رہی۔

پھر میاں پر کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ اللہ اتنا شدید جیسے دم ہی نکل جائیگا۔ اف! کس قدر کرب تھا ان کے چہرے پر —— وہ کانپ اٹھی۔ گڑیاں کھیلنے والی صوفیہ کے ننھے سے دل میں کسی دردمند حساس عورت کا دل دھڑک اٹھا —— وہ اٹھی اور منے منے حنائی ہاتھوں سے میاں کی پشت سہلانے لگی۔ دورہ تھما تو دوا پلائی وہ بے دم ہو گئے تھے ٹھنڈے پڑ رہے تھے اس نے بستر پر لٹا کے ان کے تلوے سہلائے گرم کیے چادر اڑھائی تب تک سینہ سہلاتی رہی جب تک ان کو نیند نہ آ گئی۔

صبح اس کی آنکھ کھلی تو پانچوں لڑکوں لڑکی میں جوتّان کی لڑائی پڑی تھی ایک دوسرے کو رگیدے ڈال رہے تھے گھر کی کوئی چیز اپنی جگہ پر نہیں تھی۔ وہ بچوں کے بیچ جا کھڑی ہوئی ہائے کیسا جی چاہا تھا پانچ گھونس کر خود بھی اس جنگ میں کود پڑے مگر بڑے میاں نے رات میں یہ احساس بری طرح دلا دیا تھا کہ "تم ان بچوں کی اچھی اماں ہو!"

"بری بات بچو۔ یوں نہیں لڑتے!" اس نے بالکل اماؤں والے انداز میں کہا۔ ایک کا سر سہلایا دوسرے کا گال تھپکا۔ تیسرے کی پیٹھ سہلائی چوتھے کی ٹھڈی چھوئی اور لڑکی کو سینے سے لگا لیا —— بچے اس دن سے جو اس کے گرویدہ ہوئے تو یہ وقت آیا۔ اچھی اماں کے بغیر لقمہ نہ ٹوٹتا —— اب بھی یہی عالم تھا اور اب وہ بھی بس ان سب کے لیے ہی جیتی تھیں۔ انھوں نے صوفیہ کو مدتوں سے بھلا دیا تھا نری کھری اچھی اماں ہو گئی تھیں۔ بچے اپنی سگی ماں کو بھول کے نہ یاد کرتے ان کے لیے سب کچھ بس اچھی اماں تھیں۔ یوں تو سب لڑکے اور لڑکی ان پر جان دیتے تھے لیکن مجاور عرف مجن کچھ زیادہ ہی فدا تھا۔ ان کو فخر تھا انکا مجن ان کے بغیر ایک مہینہ بھی نہیں رہ پاتا ہر ماہ تنخواہ ملتے ہی وہ بھاگ کے آتا اور ساری جیب ان کی گود میں الٹ کے گھٹنوں پر سر رکھ کے لیٹ جاتا۔ وہ اس دلار پر ہنستے ہنستے دوہری ہو جاتیں۔

اور ۱۶ برس نکل گئے تھے —— ان کو یاد بھی نہ آیا تھا کہ وہ آج بھی کسی پاکیزہ کلی کے مانند معصوم ہیں۔ ان کو ایسا لگتا سوکن کے یہ بچے ان کی اپنی کوکھ سے پیدا ہوئے تھے —— لیکن آج۔

ہائے یہ کون ساجذبہ تھا جو آئینے سے جھانک کے ان کو بیکل بنا گیا تھا۔ انھوں نے الٹی سیدھی چوٹی باندھی وضو کیا اور نماز پڑھنے لگیں۔ دل کو کچھ سکون ملا تو اٹھیں فرج سے پانی کی بوتل نکال کے پوری دو بوتلیں غٹا غٹ پی گئیں —— مجن کے آنے میں بس ذرا دیر تھی۔ گھر میں چہل پہل جاگ اٹھی تھی وہ نوکرانی کے ساتھ کچن میں مصروف ہو گئیں۔ چونکیں اس وقت جب مجن نے پکارا۔

"ارے میرا مجو آ گیا!" وہ لپک کے بڑھیں۔

شام کے اترتے سایوں میں وہ کچھ اور بھی اونچا لگ رہا تھا۔ بھرے بھرے شانے چوڑا سینہ۔ دمکتا ہوا چہرہ —— ایک عجیب سی جھجک ان کے اندر پیدا ہوئی۔ اپنا عکس پھر سامنے آ کھڑا ہوا۔ ہائے کیا وہ اس لمبے چوڑے نوجوان کی ماں لگتی ہیں۔

"بڑی دیر لگا دی مجو؟" وہ جلدی سے بولیں۔

"کہاں اچھی!" یہ مجو کا بچپن ہمیشہ اماں چبا جاتا اچھی ہی کہتا ان گنت بار وہ ٹوک چکی تھیں اس کو یاد ہی نہ رہتا۔

"میرا جی چاہتا تھا آپ کے پاس اڑ کے پہونچ جاؤں مگر کیا کروں اوہ! آپ تو پسینے میں شرابور ہیں!"

"کچن میں تھی نا!" وہ اس کو لیے ہوئے برآمدے میں آئیں اور سیلنگ فین چلا کے مرکری ٹیوب آن کر دیا۔ دودھیا روشنی میں مجن اور بھی نکھر اٹھا۔ اور بھی نمایاں ہو گیا ان کے عکس نے چپکے سے ان کے کان میں کہا۔

"مجن کا اور انکا سن ایک ہوگا!"

وہ بوکھلا کے بولیں۔

"شربت بناؤں یا چائے!"

"ابھی کچھ بھی نہیں بس آپ میرے پاس بیٹھیے!" اس نے اپنی قمیص اتار کے ایک طرف اچھال دی۔ اس کے گھنے بال ہوا سے اڑ رہے تھے۔

"تمہارے ابا کہاں رہ گئے؟" انھوں نے پوچھا۔

"باہر ہی ان کے کوئی دوست مل گیے ہیں۔ آج کسی کی دعوت ہے کیا؟" مجن نے کچن سے آتی خوشبوؤں کو ناک اٹھا کے سونگھا۔ وہ ہنس پڑیں۔

"ہاں۔ آج کچھ لڑکیوں کو بلایا ہے!"

"لڑکیوں کو؟" اس نے غور سے ان کو دیکھا۔

"اب آج کسی نہ کسی کو پسند کرنا پڑے گا تمھیں۔ آخر کب تک ٹالو گے!"

"میں شادی نہیں کروں گا اچھی!"

"لولو سنو۔ دماغ خراب ہوا ہے!"

"جو پسند میری ہے وہ مجھے کبھی مل سکتی اس لیے میں شادی ہی نہیں کروں گا!"

"کس کو پسند کیا ہے تم نے۔ انھوں نے مسکرا کے پوچھا۔ مجھے بتاؤ میں اسی کو بیاہ لاؤں گی!"

"آپ اس کو نہیں لا پائیں گی!" مجن خطرناک حد تک سنجیدہ ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھیں اچھی بہو پر گڑی تھیں ——— !

یہ آنکھیں۔ اچھی بہو گھبرا اٹھیں۔ بوکھلا اٹھیں۔ لرز اٹھیں۔ تلملا اٹھیں۔ سہم اٹھیں۔

یہ آنکھیں مجن کی تو نہیں تھیں۔

کچھ کہتی ہوئی آنکھیں۔ کچھ مانگتی ہوئی آنکھیں۔ اجنبی آنکھیں، باغی آنکھیں۔ سرخ ڈوروں میں جکڑی آنکھیں۔ وحشت زدہ سی آنکھیں۔

"کون ہے وہ؟" اچھی بہو نے اپنے کو سنبھالا۔

"م ..... م ..... مجھے .... آپ کی ایسی لڑکی چاہیے اچھی ... اور وہ مجھے ملے گی نہیں!"

وہ چند لمحوں کے لیے ساکت ہو گئیں ——— ! پھر، جانے کہاں سے کدھر سے ایک زبردست ابال آیا اور کسی شیرنی کی طرح غرّا کے اٹھیں جھپٹیں اور تڑا تڑ کئی طمانچے مجن کے رخساروں پر جڑ دیئے۔

اسرار میاں ہانپتے کانپتے لکڑی تھامے اندر آئے تو انھوں نے دیکھا اچھی بہو اپنی ساری نرمی، ساری شگفتگی ساری مٹھاس بھلا کر چنگھاڑ رہی تھیں۔

"یہی صلہ دیا تم نے مجھے میرے ریاض کا۔ مجھے کبھی ماں کہہ کر نہیں پکارا۔ کمینے، بدبخت گستاخ لڑکے میں تیری ماں ہوں، ماں۔ ماں۔ ماں ....."

اور پھر جو وہ اسرار میاں کی لکڑی تھام کر بلک بلک کر روئی ہیں تو جل تھل بھر دیئے۔ ●●●

آج کل کے چندے میں معمولی اضافہ

کاغذ اور چھپائی کی گرانی کے باوجود آج کل کی قیمت میں کوئی اضافہ نہیں کیا گیا ہے۔ سالانہ چندہ بدستور دس روپے ہے۔ البتہ دو سال کا چندہ اب ۱۸ روپے اور تین سال کا ۲۵ روپے کر دیا گیا ہے۔

یہ اضافہ نومبر ۱۹۸۰ء سے کیا گیا ہے۔

کمار پاشی

اپنے گرد و پیش کا بھی کچھ پتا رکھ
لیکن اپنے ذہن کی دنیا جُدا رکھ

لکھ بیاضِ مرگ میں ہر جا انا لحق
اور کتابِ زیست میں بابِ خدا رکھ

ان کی رنگت اور نکھرے گی خزاں میں
یہ غموں کے پھول ہیں ان کو ہرا رکھ

آج آئے گی اداسی بال کھولے
آج اپنے دل کا دروازہ کھُلا رکھ

یوں بھی بہہ جائے گا سیلِ بلا میں
اپنے گھر کے سب در و دیوار ڈھا رکھ

نامرادی کا انھیں بھی تجربہ ہو
ان کے رستے میں بھی کوئی سانحہ رکھ

سنسناتی رات کے آنے سے پہلے
دل میں جاتی دھوپ کا ٹکڑا سجا رکھ

بیش قیمت ہیں یہ دل کے زخم پاشی
اِن چراغوں کو ہواؤں سے بچا رکھ

غزلیں

سیماب سلطان پوری

شہر کی دھوپ میں جلتے ہوئے چلنا ہوگا
پیڑ ہوں گے بھی تو سایا نہ کسی کا ہوگا

ان ستاروں سے تو کیا دور اندھیرا ہوگا
چاند نکلے گا تو ہر سمت اجالا ہوگا

میں یہی سوچ کے ہو جاتا ہوں کچھ اور اداس
اس بھرے شہر میں تو بھی تو اکیلا ہوگا

آؤ بازار سے اک آئینہ ہی لے آئیں
گھر میں آنے پہ کوئی اِک تو شناسا ہوگا

کیسے کہہ دوں کہ جوانی کی سنہری رُت میں
میری آنکھوں نے کوئی خواب نہ دیکھا ہوگا

تب تو خوش تھا مرے چہرے سے بدل کر چہرہ
آئینہ دیکھ کے اب اور وہ روتا ہوگا

زخم ہوتے ہی نہیں دل سے الگ اے سیماب
ہو نہ ہو ان میں کوئی خون کا رشتا ہوگا

محمد ھادی حیدر طباطبائی

عبید زاکانی

عبید زاکانی ایران کا مشہور ترین طنز نگار، ہزل گو شاعر اور ادیب، قزوین کے ایک قصبے زاکان میں پیدا ہوا۔ ہزل اور طنز کی طرف مائل ہونے کی وجہ سے ایرانی تذکرہ نویسوں نے اس کے حالاتِ زندگی کی طرف توجہ نہیں دی۔ دولت شاہ نے اس کے متعلق چند صفحات لکھے ہیں لیکن ان پر بھی معلومات بہت کم ہے۔ دولت کے بیان کا بیشتر حصہ ہفت اقلیم میں درج کر دیا گیا ہے اور ساتھ اس کی بعض نظموں کے اقتباس بھی دیئے ہیں۔ آتش کدہ میں اس کا بہت معمولی سا ذکر آیا ہے۔ مجمل فصیحی اور مجمع الفصحا میں اُسے بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ البتہ براؤن کے تذکرۃ الشعرا میں زاکانی کا حال تفصیل سے لکھا ہے۔

عبید زاکانی کی ایک طنزیہ مثنوی "موش وگربہ" بمبئی میں طبع ہوئی کل صفحات ۱۲۸ ہیں لیکن کوئی تاریخ درج نہیں ہے نہ پریس نہ کاتب کا نام درج ہے۔ صرف چاپ ہند در شہر بمبئی لکھا ہے۔ ۱۸۸۵ء سے ۱۸۸۶ء میں اس کی مزاحیہ نظموں کا انتخاب چاپخانہ عبدالضیا توفیق بے قسطنطنیہ میں چھپا۔ اس کے ساتھ ایک دیباچہ حبیب اصفہانی کا اور دوسرا ایم۔ فرٹے کا شامل ہے (ہر دو فارسی زبان میں ہیں) ان دیباچوں میں عبید زاکانی کے متعلق مندرجۂ ذیل معلومات درج ہیں۔

مشہور مزاح نگار شاعر عبید زاکانی قزوین کے قریب زاکان کا رہنے والا تھا اس کا شمار وہاں کے آٹھویں صدی ہجری (چودھویں صدی عیسوی) کے شرفا میں ہوتا تھا۔ وہ ایک باصلاحیت اور صاحبِ طرز شاعر اور ادیب تھا۔ اگرچہ بعض اسے محض ہزل گو شاعر سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ہجو و ہزل اس کی شاعری کا جزو تو ضرور ہیں۔ تاہم اس کا اپنا مقام ہجو گو اور طنز نگار سے بہت بلند ہے۔ شعرائے قدیم میں وہ بیان کی رعنائی اور اعلیٰ ظرافت کے اعتبار سے بہت ممتاز ہے۔ اس نے جو سنجیدہ نظمیں لکھی ہیں وہ بیان کی روانی زیبائی شیرینی اور نزہت کے اعتبار سے امتیازی حیثیت رکھتی ہیں۔

عبید زاکانی نے شیراز آکر اپنی تعلیم جاری رکھی، جہاں اس وقت ابواسحٰق انجو کی حکومت تھی۔ یہاں اس نے اپنی ذہانت کی بدولت علمی مقام حاصل کیا۔ ہر فن میں دسترس پیدا کی اور کتابیں اور رسالے بھی لکھے۔

حمداللہ المستوفی زاکانیوں کے متعلق بتایا ہے کہ وہ قزوین کے مشہور قبائل میں سے تھے۔ جن کا پیش رو خفاجہ کا ایک عرب قبیلہ تھا۔ اسی مصنف نے آخر میں یہ ذکر کیا ہے کہ ان میں سے ایک معزز آدمی خواجہ نظام الدین عبیداللہ (عبید زاکانی) بھی ہے۔ جس کی نظم و نثر بے مثال ہیں۔ (تاریخ گزیدہ، سلسلۂ یادگار گب)

جو لوگ اس بات پر مصر رہے کہ عبید ایک پھکڑ ہجو گو تھا انھوں نے بھی یہ اعتراف کیا ہے کہ اس نے علم معانی و بیان پر ایک کتاب تالیف کی اور اُسے دربارِ شاہی میں رسائی پانے کا وسیلہ بنانا چاہا، لیکن بادشاہ کے ندیموں اور مصاحبوں نے یہ کتاب دیکھ کر کہا کہ بادشاہ کو اتنی فرصت کہاں کہ اس قسم کی لایعنی کتاب دیکھیں۔ دوسری مرتبہ وہ بادشاہ کا ایک قصیدہ لکھ کر لے گیا، لیکن مقربین نے اُسے یہ کہہ کر لوٹا دیا کہ بادشاہ اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ جھوٹ اور مبالغوں کی وجہ سے وہ جگ ہنسائی کرائے۔

عبید پریشان حال تو تھا۔ یہ سن کر بہت مایوس ہوا اور خیال کیا کہ جب بادشاہوں کے درباروں میں علم و فضل کی یہ ناقدری ہے تو پھر راتوں کو جاگنے اور خونِ جگر پینے سے کیا حاصل، چنانچہ وہاں سے ناامید ہو کر لوٹ آیا۔ شیخ ابواسحٰق انجو کے عہد میں تُرک رؤسا ہر قسم کی بے قاعدگی اپنے لیے جائز سمجھتے تھے، ایرانی امرا کی حالت بھی غیر تھی اور شرفا کی اخلاقی قدریں بدل گئی تھیں، عبید زاکانی اس صورتِ حال سے بہت متاثر تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ملک جس اخلاقی پستی میں گر رہا ہے اس سے لوگوں کو آگاہ کیا جائے۔ اب اس کی فطری ذہانت نے رخ بدلا تو اس نے طنز نگاری کو معاشرے کی اصلاح کے ذریعہ بنایا۔ اس کی ہجوؤں کا چرچا دور دور ہونے لگا۔ امرا اور رؤسا خاص طور سے اس کا نشانہ بنتے تھے اور اس کی ہجوؤں سے خائف رہتے تھے۔ ایک مرتبہ سلمان ساوجی نے اس کی ہجو کہہ ڈالی تو عبید نے انتقام لینے کے لیے ایک شدید تر ہجو کہی اور خود اسے سنانے کے لیے بغداد گیا۔ جب عبید وہاں پہنچا تو سلمان اپنے مصاحبین کے ساتھ دریائے دجلہ کے کنارے بیٹھا تھا اس نے یہ اپنی ہجو اسے سنائی اور سلمان کو ندامت کا سامنا کرنا پڑا۔

عبید زاکانی نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں جنھیں اخلاق الاشراف بہت مشہور ہے جو اس زمانہ کے اخلاق و اداب پر تلخ ترین طنز ہے۔ ریش نامہ نظم و نثر کی ایک مخلوط کتاب ہے جس میں عبید زاکانی اور داڑھی کے مابین ایک طویل اور دلچسپ مکالمہ بصورتِ طنز لکھا گیا ہے۔ "صد پند" مختصر کتاب ہے جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے یہ ایک سو نصیحتوں پر مشتمل ہے۔ دو ایک نصیحتیں اس طرح ہیں: "آج کی خوشی کو کل پر مت

(بقیہ صفحہ ۲۷)

محمد طاہر

زہر

ڈاکیہ سے تار لے کر کانپتے ہاتھوں سے کھول کر پڑھتے ہی میرے پیروں کی ساری طاقت ایک عجیب سی تھرتھراہٹ کے ساتھ جواب دے گئی اور میں دروازے کا سہارا لے کر کانپتا ہوا کھڑا رہ گیا۔ کمرے کے اندر سے میری بیوی میرے پاس آگئی تو میری زبان سے صرف اتنا نکلا "ابا!" میری بیوی کے رونے کی آواز سے پڑوس کے دو ایک لوگ آگئے اور مجھے سہارا دے کر اندر لے گئے۔ "بیمار تھے کیا؟" "اس سے پہلے کوئی خبر نہیں آئی تھی کیا؟" ان سوالوں کا جواب میں نفی میں سر ہلا کر دیتا رہا۔ پڑوس کی کچھ عورتوں نے میری بیوی کو فوراً گھر جانے کی تیاری کرنے کی صلاح دی اور وہ روتی ہوئی جلدی جلدی کچھ کپڑے سوٹ کیس میں ڈالنے لگی۔

ہم دس بجے کی بس پر سوار ہوئے جو ہمیں چار بجے اپنے گھر پہونچا دیتی۔ بس میں بیٹھنے کے بعد مجھے یکا یک میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس سے پہلے جب بھی گھر جاتا تھا تو دل میں ایک جوش ہوتا تھا۔ اپنے گھر پہونچنے کا، اماں، ابا سے ملنے کا، انھیں دیکھنے کا۔ لیکن آج ویسا کچھ بھی نہیں تھا۔ ابا کے بارے میں سوچ کر اندر سے ایک چبھن سی محسوس ہو رہی تھی۔ ابا کے بغیر گھر کیسا لگے گا۔ ابھی کچھ ہفتوں پہلے ہی تو پندرہ دن کی چھٹیاں وہاں گزار کر آیا تھا۔ ابا بالکل تندرست تھے۔ سویرے میرے ساتھ ناشتہ کرتے، پھر اخبار پڑھتے رہتے اور آٹھ بجے چابیوں کا گچھا لے کر دوکان چل دیتے شام نو بجے تک گھر واپس آتے۔ کھانا کھا کر کچھ دیر ٹہلنے کے لیے جاتے۔ لوٹ کر کچھ دیر تک مجھ سے باتیں کرنے کے بعد اپنے کمرے میں سونے کے لیے چلے جاتے تھے۔ اتنی جلدی گزر جانے کی کہیں کوئی علامت نہیں تھی۔ شاید ہارٹ اٹیک ہوا ہو۔ پہلے بھی ایک بار ہارٹ اٹیک ہو چکا تھا۔ تقریباً ایک مہینہ وہ اسپتال میں رہے تھے۔ جو بھی ہو، ابا کسی نہ کسی وجہ سے اس دنیا سے کوچ کر چکے تھے۔

راستے میں ہمیں لیٹ ہو گئی۔ بس اسٹیشن سے رکشے میں ہم دونوں بیٹھے تو شام کا اندھیرا گھر آیا تھا۔ گھر کے قریب پہونچنے پر دیکھا دروازے پر لگے نیم کے درخت کے نیچے دو تین گیس بتیاں جل رہی تھیں اور کافی بھیڑ تھی۔ زمین پر بچھی دری پر کفن کا کپڑا بے ترتیبی سے پھیلا ہوا تھا۔ دل میں بے حد اداسی اور غم بھر دینے والا منظر آج میرے دروازے پر بھی تھا۔ میرے گھر کے اندر داخل ہوتے ہی جیسے کہرام سا مچ گیا۔ میری ماں اور بہن مجھ سے لپٹ گئیں۔ ماں تو کچھ لمحوں بعد ہی بے ہوش ہو گئی۔ سامنے پلنگ پر پڑے ابا کے جسم کے قریب گیا تو بڑی بہن نے ان کے چہرے پر سے چادر ہٹا دی اور بلکنے لگیں۔ سامنے ابا کا بے جان چہرہ دیکھ کر میں بھی پھوٹ پڑا۔ میرے بہنوئی اکرم مجھے سہارا دے کر کمرے کے باہر لے آئے۔ وہ بھی رونے کی کوشش کر رہے تھے۔ گھر کے باہر آ کر میں نے ان کا بازو پکڑ لیا اور گیس کی روشنی کے دوسری طرف اندھیرے کی طرف بڑھنے لگا۔ اس درمیان اکرم سب کچھ بتاتے رہے "کل رات شاید ایک بجے ابا پیشاب کرنے اٹھے تھے تو یکا یک سینے میں درد شروع ہوا تھا۔ ان کے ہینڈ بیگ میں کچھ ٹکیاں رکھی ہی رہتی تھیں۔ وہی انھیں دی گئی۔ لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اس کے بعد ڈاکٹر صدیقی اور ڈاکٹر جھا بلائے گئے۔ انجکشن وغیرہ دیئے گئے۔ لیکن سب بے سود ہوا۔ تین بجے سویرے ابا چل بسے تھے۔ آپ کے بڑے بھائی صاحب کو ٹیلیفون پر اطلاع دے دی گئی تھی۔ وہ ابھی آٹھ بجے کی گاڑی سے وہ بھی آجائیں گے۔ ان کے آنے کے بعد ہی جنازہ اٹھانے کا ارادہ ہے۔"

بھائی صاحب کے ذکر سے مجھے تسلی محسوس ہوئی۔ اکرم آگے کہہ رہے تھے۔ "پرسوں تمہارے ابا میرے گھر آئے تھے۔ پچاس ہزار روپیہ میرے یہاں چھوڑ آئے تھے۔ ان کو انکم ٹیکس کا چھاپہ پڑنے کا اندیشہ تھا۔ میں نے سنا ہے کہ اور باقی روپیہ اور زیورات کسی دوسرے کے یہاں رکھ آئے ہیں۔ بھئی آج کل زمانہ بہت خراب ہے۔ تم روپیہ پیسہ کا حساب ذرا قاعدہ سے کرنا۔"

ان کی باتیں مجھے بالکل بے موقعہ کی معلوم ہوئیں۔ وہ آگے بولے "اپنے بڑے بھائی کے ساتھ ہی ساتھ رہنا۔" ان کی آواز کچھ دھیمی ہو گئی تھی۔ "زیادہ حصہ وہ خود سمیٹنا چاہیں گے۔ اپنی بھابی کو تم تو جانتے ہی ہو۔"

"چلیے چلیں اسی طرف!" میں نے گیس کی روشنی کی طرف اشارہ کیا۔

انھوں نے میرا ہاتھ دھیمے سے پکڑ لیا۔ بولے "اگر کہو تو میں اپنے پاس پچاس ہزار ہونے کی بات گول کر جاؤں۔ کسی کو بھی معلوم نہ ہوگا۔"

میں نے ان کے چہرے کی طرف دیکھنے کی کوشش کی۔ اندھیرے میں ان کا چہرہ صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ لیکن اندھیرے میں ہی ان کا غیر متواضع چہرہ مجھے گھناؤنا سا معلوم ہونے لگا۔ میں آہستہ آہستہ روشنی کی طرف بڑھنے لگا۔

بھیا اور بھابی اپنے بچوں سمیت آئے۔ بھیا ٹیکسی سے اترتے ہی روتے روتے گر پڑے۔ میں ان کے سامنے پہونچ گیا۔ بھیا کی شکل میں مجھے ابا نظر آئے اور میں ان سے لپٹ گیا۔ وہ میری پیٹھ پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے "صبر کرو۔ اللہ تعالیٰ کو یہی منظور تھا۔" میں نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "میرے لیے تو اب ابا کی جگہ آپ ہی ہیں۔" بھیا ویسے ہی لگ بھی رہے تھے۔ پڑوسیوں یا رشتہ داروں کے یہاں غمی یا شادی کے موقعوں پر چودھری سے بنے ہوئے ابا جیسے سارے انتظامات کی دیکھ بھال کرتے تھے اور صلاح مشورہ دیتے تھے۔ ویسے ہی بھیا آج ہر انتظامات کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔

ابا کے جنازہ کے ساتھ ایک بڑا سا ہجوم چل رہا تھا۔ یہ ابا کے وسیع تعلقات کا ثبوت ہو سکتا تھا۔ اس ہجوم میں وہ لوگ بھی تھے جن کے مکان ابا نے رہن پر رکھ کر اور وقت پر روپیے کی ادائیگی نہ ہونے پر اپنے نام یا ماں کے نام کروا لیے تھے یا بیچ دیے تھے۔ اس میں وہ لوگ بھی تھے جن کے ہاتھ ابا نے، ان کی ضرورت پر پچیس تیس

روپیہ زیادہ دے کر بنا سیتی کا ٹین بیچا تھا۔ وہ حلوائی اور ہوٹل والے بھی تھے جنھیں ابا ہر مہینے ایک مقررہ مقدار میں شکر اور میدہ دے دیتے تھے اور وہ راشن کارڈ کے مالک بھی تھے جنھیں ابا "ابھی شکر نہیں آئی۔ کل آنا" کہہ کر اکثر ٹال دیا کرتے تھے۔

ابا کو جب قبر کے اندر لٹا دیا گیا تو آخری بار ان کا چہرہ دیکھنے کے لیے بھیا نے اور میں نے قبر کے اندر جھانکا۔ وہاں سے ہٹ کر اس احساس نے مجھے گھیر لیا کہ چند گز کفن کے کپڑوں کے علاوہ ابا کے ساتھ گیا بھی کیا ہے؟ اپنی ساری زندگی انھوں نے روپیہ پیدا کرنے کی کوششوں میں صرف کی تھی اور ان کوششوں میں وہ صحیح غلط کا فرق بھول چکے تھے۔ قبر میں مٹی بھری جاتی رہی اور میرے ذہن میں ابا سے وابستہ بچپن سے اب تک کی یادیں تازہ ہوتی رہیں۔ ساتھ ہی ساتھ آنکھوں میں آنسو تیرتے رہے۔ ابا نام کا سایہ اور شفقت اب ہمیشہ کے لیے مٹی کے نیچے دب چکا تھا۔

گھر پہونچے تو گھر باہر کی عورتوں سے خالی ہو چکا تھا۔ غمی کے گھر سے لوگ جلد سے جلد ہٹ کر چین کی سانس لینا چاہتے ہیں۔ کمرے میں خاندان کے ہی لوگ تھے۔ اماں اب بھی تھوڑی تھوڑی دیر کے وقفے پر سسک اٹھتی تھیں۔ ان کے پاس ہی بڑی بہن بیٹھی تھی۔ سامنے میری بیوی اور بھابی تھیں۔ بھابی نے سیاہ قمیص اور شلوار پہن رکھی تھی۔ بھیا ایک پرائیویٹ فرم میں منیجر ہیں۔ بھابی انھیں کی طرح "سوسائٹی" کے رواجوں سے واقف ہونے کی وجہ سے جانتی ہیں کہ کہیں موقع پر کیسا لباس پہننا چاہیے۔

"پرسوں فاتحہ ہے نا"، بھیا نے کمرے کی خاموشی توڑی۔

میں نے ہاں میں سر ہلا دیا۔

"ہم پرسوں رات واپس چلے جائیں گے"، بھیا بولے۔ انھوں نے جیب سے سگریٹ نکال لی۔ میرا دل بھی سگریٹ پینے کو ہو رہا تھا۔ لیکن میں نے ابھی تک اماں اور بھیا کے سامنے سگریٹ پینا نہیں شروع کیا تھا۔ سگریٹ کا ایک لمبا کش کھینچ کر بھیا بولے "اس درمیان اگر حساب وغیرہ درست ہو جائے تو بہتر ہے"۔

"حساب؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں۔ ابا کیا چھوڑ کر گئے ہیں یہ سب مجھے بھی تو معلوم ہونا چاہیے"۔

اماں یکایک سسکنے لگیں۔ ان کو روتا دیکھ کر میری بڑی بہن بھی رونے لگی۔

"امی جان اس وقت پریشان ہیں۔ بعد میں بات کر لیجے گا"۔ بھابی بولیں۔ کمرے میں ایک لمبی خاموشی تیر گئی۔ پھر "جھن" سے کوئی چیز بھیا کے سامنے گری اور اماں کا بھرآیا ہوا لہجہ سنائی دیا "چابیوں کا یہ گچھا لے لو۔ سب کچھ تمھیں لوگوں کا ہے۔ میری چیز تو اب ....."

بھیا وہاں سے باہر نکل آئے۔ میں اماں کے پاس بیٹھ گیا۔

دوسرے دن سویرے ہی اکرم کو بھیا نے بلوا لیا۔ میں بیٹھک کے کمرے میں پہونچا تو اکرم بھیا کو بتا رہے تھے "آپ کے ابا نے مجھ سے تین لاکھ روپئے بتایا تھا اور ڈیڑھ کلو کے قریب سونے چاندی کے زیورات"۔

"بالکل ٹھیک۔ عید پر میں یہاں آیا تھا تو مجھ سے بھی انھوں نے یہی بتایا تھا۔ میں نے انھیں صلاح دی تھی کہ بینک کے لاکر میں صرف مکانوں کے کاغذات رہنے دیں اور روپیہ اور زیورات سب نکال لیں"۔

اکرم عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

"آپ کل مجھ سے کیا کہہ رہے تھے اکرم بھائی"، میں نے پوچھا۔

"کیا؟" وہ مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگے۔

"آپ کے پاس بھی ابا نے کچھ روپئے رکھے ہیں نہ"۔

"ہاں۔ ہاں۔ پچاس ہزار روپئے آپ کے ابا نے میرے پاس رکھے ہیں۔ وہ تو آپ کی بہن کو بھی معلوم ہے۔ آپ لوگوں سے کیا چھپانا"۔

"تو ڈھائی لاکھ کی رقم بچتی ہے۔ اور ڈیڑھ کلو کے زیورات"۔ بھیا نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ میں نے ہاں میں سر ہلا دیا۔

اس رات میں بستر پر لیٹا تو مجھے خود اپنے اندر ایک عجیب سی تبدیلی محسوس ہوتی رہی۔ اس کی وجہ تھی ابا کے ذریعہ چھوڑی گئی دولت اور اس کا ایک حصہ پانے کی امید۔ ایک لاکھ روپئے سے بھی زیادہ پا جانے کی امید کے مقابلے میں ابا کے بے موقع ہمیشہ کے لیے چل بسنے کا غم اسی رات کافی ہلکا اور دھندلا پڑنے لگا۔ ایک کثیر رقم اور اسے اپنے من موافق خرچ کرنے کی آزادی۔ ہماری بہت سی دقتیں دور ہو جائیں گی۔ ہم اپنے پسند کا مکان بنوا لیں گے اور اس میں اپنے آسائش کے ذرائع مہیا کر لیں گے۔ سوچ کر دل میں آسودگی بھر گئی۔

فاتحہ کے دن سویرے آٹھ بجے تک محلے کے لوگوں، ابا کے دوستوں اور کسی مدرسہ کے لڑکوں نے قرآن شریف کی تلاوت کر کے ثواب ابا کے نام بخش دیا۔ کچھ لوگوں کے جاتے وقت بھیا نے ان سے الگ باتیں بھی کیں۔ بھیا کے چہرے پر برابر جھنجھلاہٹ کے آثار بنے رہے۔ میں نے بیٹھک میں بچھی دری اور چادریں اٹھا کر صوفہ سیٹ پھر سے لگا دیا۔ بھیا سگریٹ کا کش کھینچتے ہوئے آئے اور صوفہ پر بیٹھ گئے۔ مجھے بھی اشارہ سے اپنی بغل میں بیٹھنے کو کہا۔

"روپیوں کا کچھ پتہ نہیں چل رہا ہے"، وہ بے چینی سے بولے۔

"کیسے روپئے؟"

"بیوقوف!" وہ اپنے غصہ پر قابو نہیں کر سکے "ابا کے جمع کیے ہوئے روپئے۔ تقریباً ڈھائی لاکھ روپئے اور زیورات!"

"گھر میں نہیں ہیں کیا؟"

"اب یہی معلوم کرنا ہے"، وہ بولے "اماں سے میں نے کل ہی پوچھا تھا، انھوں نے بتایا کہ چھاپوں کے ڈر سے ابا سارے روپئے اور زیورات کسی دوسرے کے یہاں رکھ دیتے تھے"۔ وہ کچھ لمحے رک کر بولے "ممکن ہے اماں جھوٹ بول رہی ہوں۔ آؤ اماں کے پاس چلیں۔ مجھے سب کچھ آج ہی طے کرنا ہے"۔

بھیا کو دیکھ کر اماں کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار نمودار ہو گئے۔ بھیا ان کے پاس بیٹھ کے بڑے شیریں لہجے میں بولے "اماں، ابا تو اب رہے نہیں۔ محلے پڑوس والوں کو تو جانتی ہی ہو۔ ہمیشہ سے جلتے رہے ہیں۔ میں آج شام چلا جاؤں گا۔ ایسی حالت میں روپیہ وغیرہ گھر میں رکھنا ٹھیک نہیں رہے گا۔ تمھیں تو ابھی چالیس دن

یہیں رہنا ہے۔ اس کے بعد میرے ساتھ ہی چل کر رہنا۔"

"بیٹا، تجوری میں تو کچھ ہے نہیں۔ میرے بکس میں پانچ سات سو روپئے پڑے ہوں گے۔ اگر وہ میری قسمت کے ہوں گے تو انھیں کوئی کیسے لے جائے گا۔"

بھیا کی آنکھیں سکڑ سی گئیں۔

"عید پر میں آیا تھا تو ابا تقریباً تین لاکھ بتا رہے تھے۔"

"میں تم سے کل جھوٹ تھوڑی ہی بولی تھی۔" اماں نے کہا۔ "جس دن گلی کے سرے والے رادھے لال کے یہاں چھاپہ پڑا تھا اسی دن چاول کی بوری میں بھر کر وہ سب کچھ لے گئے تھے۔ گھنٹے بھر بعد لوٹ کر چاول کی بوری کونے میں پھینک دی تھی۔ میں نے دو ایک بار پوچھا تھا کہ کس کے یہاں سب کچھ چھوڑ آئے تو ہنس کر ٹال گئے تھے۔ انھوں نے بتایا نہیں کچھ بھی۔ انھیں خود کیا معلوم تھا کہ وہ اتنی جلدی ..." کہتے کہتے اماں کا گلا بھر آیا۔

بھیا کا چہرہ ایک دم سفید پڑ گیا۔ میرے دل کی دھڑکن بھی بڑھ گئی۔

اماں! میں نے ان کے سبھی دوستوں، احمد چچا، حامد میاں، بنے خاں، ترلوکی دادا سے پوچھ لیا ہے۔ رشتہ داروں میں عباس خالو، رحمان ماموں، اور جمیل صاحب سے بھی پوچھ لیا۔ سب لوگ قسمیں کھا رہے ہیں کہ ابا نے ان کے پاس کچھ بھی نہیں رکھا۔ ان کے علاوہ ابا کے اعتماد کا اور کوئی آدمی مجھے نہیں معلوم ہوتا جس کے اوپر اتنی بڑی رقم کا اعتبار کر سکتے۔

"کیا کہہ رہے ہو۔" اماں بوکھلا کر بولیں "کوئی بتانے کو تیار نہیں ہے"

"کوئی نہیں۔ صرف اکرم نے پچاس ہزار روپئے بتائے ہیں۔

"باقی رقم وہ کہاں رکھ آئے؟ اکرم کے پاس تو انھوں نے پچھلے ہفتہ میں روپئے رکھے تھے۔"

"اماں، بنو مت، تمہیں سب معلوم ہے۔" بھیا کے لہجے میں ترشی تھی۔

"تم لوگوں کی قسم بیٹے۔"

"قسم وسم سب بکواس ہے۔" بھیا نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "سچ سچ بتا دو روپئے کہاں ہیں۔"

اماں کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ وہ خوف زدہ نظروں سے بھیا کی طرف دیکھنے لگیں۔ میرے دل میں لاکھوں روپیہ کا مالک بن جانے کے جو خوب صورت تصورات ایک دن قبل جنم لے چکے تھے وہ جیسے ایک جھٹکے سے منتشر ہونے لگے۔ شاید اسی وجہ سے اماں کے خوف زدہ چہرے کو دیکھ میرے دل میں ان کے لیے کوئی خاص ہمدردی نہیں پیدا ہوئی۔

"بیٹا! کوئی ہم لوگوں کے ساتھ دغا کر رہا ہے۔ جس طرح تم رقم کے بارے میں جاننا چاہتے ہو، اسی طرح میں بھی ...."

"بیٹا کی بچی ...." کہتے ہوئے اگلے لمحے ہی بھیا اماں کے اوپر ٹوٹ پڑے۔ ان کے ہاتھوں میں اماں کی گردن آ گئی۔ "بولو رقم کہاں ہے۔ میرے باپ کا سارا مال ہڑپنا چاہتی ہو۔"

اماں کی آنکھیں جب پھیلنے لگیں تو میں جیسے کسی خواب سے چونک کر حقیقت کی دنیا میں واپس آ گیا۔ اماں کے کھلے منہ سے گھرگھراہٹ کی آواز نکل رہی تھی۔ میں نے لپک کر اپنی باہیں بھیا کے گلے میں پھنسا دیں۔ اور پوری طاقت سے انھیں اپنی طرف کھینچ لیا۔ اماں پیٹھ کے بل پیچھے جا گریں۔

میری طرف دیکھ کر بھیا ہانپتے ہوئے بولے "میں سمجھ گیا۔ تم بھی اس سازش کے شریک ہو۔ تم دونوں ساری دولت ہڑپنا چاہتے ہو۔ میں سب سمجھ لوں گا۔" کہتے ہوئے وہ کمرے سے باہر ہو گئے۔

میں سکتے کے عالم میں کھڑا رہ گیا۔ مجھے لگا کہ بھیا کا ہاتھ کچھ لمحوں پہلے اماں کی گردن پر نہیں تھا بلکہ ماں بیٹے کے ان تعلقات پر تھا جن کو کوئی نام نہیں دیا جا سکتا اور جو ماں بیٹے کے درمیان کائنات کی شروعات سے چلے آ رہے ہیں۔ میں بڑے دکھ کے ساتھ سوچنے لگا کہ ابا کے ذریعہ جمع کی گئی دولت تو کسی دوسرے کے پاس چلی گئی تھی لیکن اس کا زہر ہمارے درمیان رہ گیا تھا۔●

بقیہ عبید زاکانی

ڈالو" "موجودہ وقت میں لطف اٹھاؤ، یہ وقت لوٹ کر نہیں آنے کا"، "حتی الوسع جھوٹ بولنے سے پرہیز کرو تاکہ دوسروں کے لیے پریشانی پیدا نہ ہو۔" ایک کتاب "تعارفات یا دہ فصل" ہے یہ کتاب نثر میں ہے اس کے چند تعارف اس طرح ہیں: "جہان۔ وہ جگہ جہاں کسی کو سکون میسر نہ ہو۔" "عالم وہ شخص ہے جسے روزی کمانے کا ڈھنگ نہ آئے۔" "جاہل تقدیر کا چہیتا" "مصنف جسے سب لوگ بددعا دیں"۔ غرض کے عبید زاکانی کی بہت سی کتابیں ہیں جن کے نئے ایڈیشن آج کل ایرانی انتشارات شائع کر رہے ہیں۔ برادن نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اُسے بغداد یا تبریز یا دونوں مقامات پر سلطان اویس کی سرپرستی حاصل ہوئی۔ شیخ ابو اسحٰق انجو کی مدح میں بھی اس نے قصیدے لکھے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُسے کوئی معقول اور مستقل ذریعۂ معاش نہ مل سکا۔ چنانچہ اس کی زندگی عسرت میں گزری، جیسا کہ ذیل کے شعر سے ظاہر ہوتا ہے ؎

"قرض خدا و قرض خلائق بہ گردنم
آیا ادائے قرض کنم یا ادائے قرض"

مشعلِ آزادی (حصہ اوّل)

ممتاز شاعر ساغر نظامی کی طویل نظم جو جنگِ آزادی کی کہانی سناتی اور دلوں کو گرماتی ہے

دیدہ زیب کتابت و طباعت۔

قیمت : ۴۰ روپے

پبلی کیشنز ڈویژن سے طلب کیجیے

ابراہیم اختر

داغ کے شاگردانِ دکن

غدر ۱۸۵۷ء کی سیاسی افراتفری کے بعد داغ بڑی غیر یقینی صورتِ حال سے دوچار ہوئے۔ بڑی کدوکاوش کے باوجود انھیں معاشی استقلال نصیب نہ ہوسکا۔ بگڑتی ہوئی معاشی صورتِ حال نے انھیں مستقبل کے تعلق سے سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور کردیا لے دے کر نواب رام پور کا ایک سہارا تھا وہ بھی جاتا رہا۔ اس وقت سرزمین دکن بڑی سرسبز و شاداب تھی۔ اور اس شادابی نے داغ کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ ویسے بھی اب ان کے لیے کوئی ٹھکانا نہ رہا تھا۔ اس عالمِ زیر و زبر میں داغ کو ریاست حیدرآباد دارالاماں دکھائی دے رہا تھا۔ چنانچہ انھوں نے حیدرآباد میں سکونت اختیار کرنے کا ارادہ کرلیا اور اور اسی ارادہ سے وہ ۷ر اپریل ۱۸۸۸ء کو حیدرآباد پہنچے۔ دکن میں ان کے بہت سے بہی خواہ موجود تھے۔ اس لیے ان کو حیدرآباد کے معزز اور اعلیٰ طبقہ سے متعارف ہونے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ اہلِ حیدرآباد نے داغ کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا۔ داغ بھی اپنی آؤ بھگت پر بہت مسرور ہوئے۔ کچھ دنوں تک انھیں روٹی روزگار کی بالکل فکر نہ رہی۔ لیکن داغ جو توقع لے کر حیدرآباد آئے تھے وہ پوری نہ ہوسکی۔ باوجود کوشش کے دربارِ شاہی میں باریابی نہ پاسکے۔ مستقل انتظام تو تھا نہیں۔ اس لیے کچھ عرصہ بعد پھر معاشی پریشانیوں نے آگھیرا۔ مایوس ہوکر وہ حیدرآباد سے دہلی چلے گیے۔ لیکن دلی ان کو کہاں سہارا دے سکتی تھی۔ جب تک وہ دلی میں رہے پریشان ہی رہے۔ مجبور ہوکر پھر انھوں نے حیدرآباد کا رخ کیا اور اپریل ۱۸۹۰ء میں دوبارہ حیدرآباد پہنچے۔ پہلی بار ان کا قیام ۷ر اپریل ۱۸۸۸ء تا جولائی ۱۸۹۰ء تک رہا۔ حیدرآباد پہنچکر دربار میں رسائی پانے کے لیے انھوں نے از سرِ نو کوشش شروع کردی۔ لیکن پھر بھی ان کو کامیابی نہ ملی۔ لیکن وہ مایوس نہیں ہوئے۔ بہت کوششوں کے بعد وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئے۔ حکومت کی طرف سے ماہِ اکتوبر ۱۸۹۱ء میں ان کے لیے چار سو پچاس روپیے ماہانہ وظیفہ مقرر ہوگیا۔ اور ان کو معاشی پریشانیوں سے نجات مل گئی۔

داغ کو حیدرآباد سے دلی لگاؤ تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اہلِ حیدرآباد نے ان کو سرآنکھوں پر بٹھایا تھا۔ دوسری یہ کہ یہاں ان کے روزگار کا مسئلہ بھی حل ہوگیا تھا۔ حیدرآباد سے انھیں وہ سب کچھ ملا جس کے وہ متمنی تھے۔ چنانچہ وہ اپنی مسرت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں ؎

ہے لاکھ لاکھ شکر کہ اے داغ آج کل
آرام سے گزرتی ہے شاہِ دکن کے پاس

شاہ میرا قدرداں احباب میرے مہرباں
میں دکن میں جب سے ہوں اے داغ جنت میں ہوں

دلی میں پھول والوں کی ہے ایک سیر داغ
بلوہ میں ہم نے دیکھ لی سارے جہاں کی سیر

شہر ہے گلزار یوں خلق ہے گل رنگ یوں
جیسے چمن در چمن باغ میں پھولے گلاب

کھل جائیں آنکھیں دیکھتے ہی اس چمن کے پھول
رضواں کو جو ہم دکھائیں جو باغِ دکن کے پھول

جس طرح داغ کو اہلِ حیدرآباد سے خلوص و محبت اور انعام و اکرام ملے اسی طرح دکن نے انھیں بے شمار شاگرد بھی دیئے۔ اس زمانہ میں کسی شاعر کے شاگردوں کی کثرت کو بھی اس کی بزرگی و برتری کا ایک پیمانہ سمجھا جاتا تھا۔ ہندوستان بھر میں داغ کے شاگردوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی تھی۔ ان میں کچھ ایسے شاعر گزرے ہیں جنھوں نے اردو شاعری میں بڑا نام پیدا کیا ہے۔ مثلاً علامہ اقبال، بیخود دہلوی، نوح ناروی، ظفر علی خاں، احسن مارہروی اور سائل دہلوی وغیرہ۔ حیدرآباد میں ان کے سیکڑوں شاگرد ہوئے ہیں۔ لیکن ان میں سے چند ہی شاگردوں نے اہمیت تسلیم کروائی ہے۔ جیسے آصف، عثمان، شاد، زعم، رسا، تجلی، سجاد اور ک... وغیرہ۔ آصف نظام ششم کے فرزند تھے۔ ۱۸۶۶ء میں پیدا ہوئے۔ تخت نشینی کے آپ نے ریاست کی سرکاری زبان اردو قرار دی۔ آپ کی دریا دلی ضرب المثل۔ اردو اور فارسی شعرا کی سرپرستی کرتے تھے۔ داغ پر خاص نظرِ عنایت تھی اور ان بڑی عزت کرتے تھے۔ آپ کا انتقال ۲۸ر اگست ۱۹۱۱ء کو ہوا۔ شعر خوب کہتے تھے۔ شاعری ملاحظہ کیجیے ؎

دعویٰ ہے غلط ہے شیخ و برہمن یہ تمہارا
مسجد ہی کسی کی ہے نہ بت خانہ کسی کا

سوزِ دل سے نالۂ پرسوز آتش ناک تھا
بجھ گئی جب آگ پھر کچھ بھی نہ تھا کیا خاک تھا

منصفی شرط ہے شایانِ کرم غیر ہی تھے

میں ترے جور و ستم کے بھی سزاوار نہ تھا

کبھی نہ دب کے ملیں گے ہم ان سے اے آصف

وہ شاہِ حسن سہی شہریار ہم بھی ہیں

نواب میر عثمان علی خاں آخری فرمانروائے دکن۔ آپ ۵ر اپریل ۱۸۸۶ء کو پیدا ہوئے۔ عثمان تخلص کرتے تھے۔ شعر گوئی کا ذوق فطری تھا۔ استاد سے حسن سلوک روا رکھتے تھے۔ جولانی طبع کا اظہار شاعری میں کھل کر کرتے تھے۔ رنگِ سخن دیکھئے ؎

چمن دہر عنادل سے کب آباد ہوا

جو نو ہوا قیدی صیاد ہوا

سراغ آخر کو مل ہی جائے گا یارانِ رفتہ کا

غنیمت ہے جواب تک ہے نشانِ کارواں باقی

دیکھ اے قیس اسے جامہ دری کہتے ہیں

تار باقی نہ رہا جیب و گریباں کی قسم

اسیر کا اصلی نام میر حسن علی خاں تھا۔ امرائے دکن سے آپکا تعلق تھا۔ آپ کا زیادہ تر وقت فکرِ سخن میں گزرتا تھا۔ آپ کا شمار نہ صرف داغ کے اہم شاگردوں میں ہوتا تھا بلکہ آپ داغ کے بڑے گہرے دوست تھے۔ نمونہ کلام درج ذیل ہے ؎

کعبے کی جو عظمت ہے مرے دل کی وہی ہے

اس گھر کا مکیں اور نہ اس گھر کا مکیں اور

جوشِ مستی میں محتسب سے ہم

پوچھتے ہیں کدھر ہے میخانہ

دن گزرتا ہے بیقراری میں

رات کو کب قرار آتا ہے

داغ کے اہم شاگردوں میں ایک اور نام بھی ملتا ہے۔ مہاراجہ کشن پرشاد کا شمار ان کے کرم فرماؤں میں بھی ہوتا ہے۔ تخلص شاد تھا اور آپ ۲۸ر جنوری ۱۸۶۴ء کو پیدا ہوئے تھے۔ شاعروں اور ادیبوں کی بڑی فراغ دلی سے سرپرستی کرتے تھے۔ آپ کی زیرِ نگرانی اور سرپرستی میں حیدرآباد سے بہت سے رسائل جاری ہوئے۔ کئی کتابیں تصنیف و تالیف کی ہیں۔ آصفیہ حکومت میں آپ صدرِ اعظم بابِ حکومت تھے۔ شعر و شاعری سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔ ذیل کے اشعار دیکھئے ؎

مضمر ہے بقا ہستیٔ عالم کی فنا میں

اک جلوۂ وحدت بھی ہے کثرت کی فضا میں

انقلابِ دہر نے الٹا زمانہ کا ورق

اہلِ محفل وہ نہیں وہ رونقِ محفل نہیں

نیرنگیٔ اندازِ نظر دیکھ رہا ہوں

ڈوبی ہوئی ہے شوخ نظر شرم و حیا میں

رزم کا پیدائشی نام سید غلام محمد تھا۔ حضرت سید علی سانگڑے سلطان کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ نہایت دیندار بزرگ تھے۔ تبلیغ اسلام سے گہرا لگاؤ تھا

آپ کی شرافت، نیک نفسی اور پاک بازی ضرب المثل تھی۔ دینی اور تبلیغی امور میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیتے تھے۔ نمونہ کلام دیکھئے ؎

یا میرے گھر میں وعدہ فراموش آ کبھی

یا اپنی بزمِ ناز میں مجھ کو بلا کبھی

واقف نہیں رقیبوں کی عیاریوں سے آپ

یہ جو فروش ہیں کبھی گندم نما کبھی

ممنون چارہ گر نہ ہوا درد شکر ہے

اچھا ہوا کہ میں جو نہ اچھا ہوا کبھی

کیا ہے چاک وحشت نے ہمارے جیب و داماں کو

ملایا آرزو نے خاک میں عشرت کے ساماں کو

داغ کے ایک اور شاگرد مرزا غلام مصطفیٰ تھے۔ رسا تخلص کرتے تھے۔ آپ نے کم عمری ہی سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ نہایت وضع دار قسم کے آدمی تھے۔ ریاست کے ایک اہم عہدہ پر فائز تھے۔ نظم و ضبط کے پابند اور خوش اخلاق انسان تھے۔ آپ میں شعر کہنے کی بھرپور صلاحیت تھی۔ حسب ذیل اشعار دیکھئے ؎

میں وصل کا خواہاں وہ مری مرگ کے طالب

اب دیکھئے ہوتا ہے اثر کس کی دعا میں

ان تک تو رسائی نہیں کہنے کو رسا ہے

کم بخت نے یہ نام بھی بدنام کیا ہے

وصل کی کوئی تو تدبیر نکالی ہوتی

میں ہوں مجبور مگر آپ تو مجبور نہیں

ناامیدی سے تباہی خانۂ دل کی ہوئی

ورنہ ارمانوں سے کیا آباد یہ ویرانہ تھا

تجلی کا شمار بھی داغ کے اہم شاگردوں میں ہوتا تھا۔ نام منتجب الدین اور والد کا نام میر سیادت علی خاں تھا۔ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے۔ لیکن اردو شاعری سے گہرا لگاؤ تھا۔ آپ کی شاعری کا اثاثہ بڑا وقیع اور کافی ضخیم ہے مگر تاحیات کوئی مجموعہ شائع نہ ہو سکا۔ نمونہ کلام درج ذیل ہے ؎

عدو سے بزم میں سرگوشیاں دیکھی نہیں جاتیں

تمہارے گھر سے ہم اشکوں سے منہ دھو کر نکلتے ہیں

وہ جاتے جاتے کہتے ہیں مشتاق دید کو

ہم عید کے ہیں چاند پھر آئیں گے عید کو

ولولہ وحشتِ خاک نکالے اپنا

یاں گریباں ہی گلے میں نہیں دامن کیسا

داغ کے شاگردوں میں بادشاہ، امراء اور اعلیٰ طبقہ کے لوگ ہی نہیں تھے بلکہ بعض ایسے بھی تھے جن کی دینداری اور پرہیزگاری ضرب المثل تھی۔ شاہ زین العابدین ایک ایسی ہی بزرگ ہستی تھی۔ آپ سجاد تخلص فرماتے تھے۔ سلسلۂ نسب بیدر کے بزرگانِ دین سے ملتا تھا۔ بچپن سے مزاج شاعرانہ پایا تھا۔ حدیث و فقہ پر بڑا عبور

(بقیہ صفحہ ۳۲)

بالا دوبے

ایک اور مذہب

بڑے بازار کے نکڑ پر ہی انھیں پکڑ لیا گیا تھا۔ جس شخص کی جیب کٹی تھی وہ زور زور سے چلا رہا تھا۔ ویسے تو وہاں پولیس کا کوئی آدمی دکھائی نہیں پڑ رہا تھا۔ پر شور ہوتے ہی نہ جانے کہاں سے ایک پولیس حوالدار اور ایک کانسٹیبل ہاتھوں میں ڈنڈے لیے وہاں آدھمکے۔

ادریس اور بانکے دونوں ہی پکڑ میں آگئے تھے۔ بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی۔ حوالدار نے اپنا ڈنڈا گھماتے ہوئے، بڑی بڑی آنکھیں نکال کر انتہائی غصے میں ان کا اتہ پتہ پوچھنا شروع کیا۔ "دیوان جی اس کے تھیلے کی تلاشی لے کر بھی دیکھو لو" بھیڑ میں سے کسی نے مشورہ اُچھالا۔ حوالدار نے ابتک تھیلے کی طرف دھیان نہیں دیا تھا۔ تھیلے میں ٹین کا ایک ٹیکا ہوا ڈبہ رکھا تھا۔ "کیوں بے، تیرا ہے یہ تھیلا؟" حوالدار نے پُررعب آواز میں ادریس سے پوچھا۔ ادریس نے ایک مری سی "ہاں" کی۔ اور پھر ہڑبڑا کر کہا، "روٹی کا ڈبہ ہے، ہجور" حوالدار ڈبے کو کھولنے لگا۔ "ابے، میں تیری روٹی تھوڑے ہی کھا لوں گا" حوالدار نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ ادریس گڑگڑا کر بولا، "ہجور، دال پھیل جائے گی" یہ سن کر حوالدار کا شک اور بھی بڑھ گیا۔ "ڈبہ کھول کر دیکھیے، دیوان جی۔ کون جانے روٹی کی جگہ ڈبل روٹی نکل آئے" بھیڑ میں سے پھر کوئی بولا۔ یہ سن کر کچھ تماشائی کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ جب ڈبے کے اندر سے کیمرہ نکلا تو بھیڑ سے ایک آواز اُٹھی اور فوراً ہی دب گئی۔ "لو پہلوان، دیکھا فوٹو کھینچنے کا کیمرہ نکلا ہے۔ کسی ٹورسٹ کا اُڑایا ہوا معلوم ہوتا ہے" رادھے پٹواری بھیا پہلوان سے بولا۔ "اجی، یہ سالے دونوں ہی پہنچے ہوئے خلیفہ ہیں۔ شکل سے بھی خالہ زاد بھائی لگ رہے ہیں"

اسی اثنا میں، سامنے سے بابو شیام لال سابقہ ممبر اسمبلی۔ گھومتے پھرتے اُدھر آنکلے۔ حوالدار نے انھیں رسماً سلام کرتے ہوئے کہا "نمستے بابو صاحب"

بابو شیام لال رکتے ہو بولے، "کیا جھمیلا ہو گیا حوالدار صاحب؟" "اجی، ایک جیب کترے اور ایک اٹھائی گیر کی جگل جوڑی پکڑی گئی ہے" حوالدار نے جواب دیا۔ بابو شیام لال قریب آکر شاید بانکے کو پہچان گئے تھے۔ "یہ تو پنا پنڈت کا چھورا ہے" وہ بولے "کیا آپ اسے جانتے ہیں بابو صاحب؟" حوالدار نے پوچھا۔ "اجی، اسے کون نہیں جانتا! پچھلے ہفتے کیداری کی لڑکی کی کان کی بالیاں اسی نے تو اتاری تھیں" بانکے فوراً بھڑک کر بول اُٹھا "خواہ مخواہ تہمت لگا رہے ہو بابو جی کیا آپ نے مجھے اس کی بالیاں اُتارتے ہوئے دیکھا تھا؟ گنگا جلی اٹھا کر کہہ دو گے یہ بات؟" حوالدار نے تڑسے اس کے گال پر ایک طمانچہ جڑ دیا۔

"سالا حرامی کہیں کا، آنکھیں نکالتا ہے" اس کی دیکھا دیکھی کانسٹیبل نے ایک ڈنڈا اس کی پیٹھ پر جما دیا۔ "اس کو بھی پہچانتے ہو بابو صاحب؟" حوالدار نے ادریس کو گریبان سے گھسیٹتے ہوئے بابو شیام لال سے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ بابو شیام لال کچھ کہیں ایک ڈاڑھی والے مولوی صاحب بول اٹھے "یہ بھی انہی کے مذہب کے ہیں" ہجوم سے قہقہہ ابھرا۔ حوالدار نے مولوی صاحب سے مخاطب ہو کر سوال کیا "آپ اسے پہچانتے ہیں کیا؟" مولوی صاحب نے جواب دیا: "صابن کٹرے کے قاسم کشمیرے کا لڑکا ہے۔ قدرت کے کھیل بھی کتنے عجیب ہیں۔ باپ تو ایسا شریف کہ جیسے فرشتہ ہو۔ لیکن اس کے لخت جگر کے کہنے ہی کیا! بس جیب تراشی، چکاری اور اٹھائی گیری ہی آپ کی کمائی ہے!"

بات صاف ہو گئی تھی۔ کوتوالی تک تماش بینوں کی بھیڑ ساتھ ساتھ گئی۔ ادریس اور بانکے کے ہونٹوں پر پپڑی جم گئی تھی۔ ابھی تک انھوں نے جیل نہیں دیکھی تھی۔ آج شاید اس بات کا بھی بندوبست ہو گیا تھا۔

کمرے کا بلب بہت ہی ہلکا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی روشنی کا گلا گھونٹنے کی کوشش کر رہا ہو۔ ریگزین کے صوفے پر وہ چاروں منہ لٹکائے بیٹھے تھے "کمال ہے بھائی جان!" ایک ترکی ٹوپی والے صاحب بولے "یہ نہیں معلوم تھا کہ ایسی ذلت آمیز شکست کھانی پڑے گی" بغل میں بیٹھے سفید ٹوپی پہنے لالہ جی بولے "اجی حد ہو گئی قریشی صاحب ضمانت تک ضبط ہو گئی۔ خیر، ہوا تو ہماری خراب چل ہی رہی تھی پر ایسی بھی امید نہیں تھی کہ روند کر رکھ دیئے جائیں گے" گہرے کالے رنگ کا چشمہ لگائے بابو برجموہن ایک لمبی سانس چھوڑتے ہوئے بولے "خیر، جو ہوا سو ہوا۔ اب تو آگے کی سوچو میرے بھائی۔ میرے وارڈ سے چودھری منگت رام جیتا ہے۔ ہے نا یہ انہونی بات؟ یہ چودھری پانچ سال پہلے لکڑی کے ٹال پر کھری کھاٹ پر پڑا گڑگڑی گڑگڑایا کرتا تھا۔ آج اس وارڈ کا نیتا بن بیٹھا ہے"

میاں روشن علی خلال سے دانت میں پھنسے سپاری کے ریزوں کو نکالتے ہوئے بولے "اجی وہ تو رمضان علی کا چمچہ ہے۔ وہی ذات شریف اس کے سرپرست ہیں ورنہ کیا پدی اور کیا پدی کا شوربا!" بابو برجموہن نے بات کو سمیٹتے ہوئے کہا

لوگوں کو کچھ اور بھی خبر ہے یا نہیں۔ چودھری منگت رام بسنت کے روز رادھارمن کے مندر کے سامنے شامیانے لگوا کر باقاعدہ اپنی فتح کا جشن منا رہے ہیں۔ میاں رمضان علی کرسیٔ صدارت سنبھالیں گے۔ بات سمجھ میں آئی؟ ہمارے وقت میں جو ہندو مسلمان فساد ہوا تھا اس کے جواب میں ہندو مسلم اتحاد کی یہ نوٹنکی ہو رہی ہے۔ اگر یہ جلسہ کامیاب ہو گیا تو چودھری کا بول بالا ہو جائے گا۔ اور وہ بازی مار لے گا۔ خواہ کچھ ہو یہ جلسہ کامیاب نہیں ہونا چاہیئے۔"

تبھی تار کے چنڈول میں پانچ چھ کانچ کے گلاسوں میں چائے لے کر ڈھابے کا لڑکا آگیا۔ چائے سُڑکتے ہوئے آپس میں صلاح مشورے شروع ہو گئے۔ "پنڈت رام بھروسے لال ابھی تک نہیں آئے؟" روشن علی نے پوچھا "بس آتے ہی ہوں گے۔ وہ ان دونوں چھوروں کو لینے گئے ہیں۔ ابھی پچھلے ہفتے ہی دونوں شہر میں لوٹے ہیں۔ اب کے تو بھیا پیسہ بھلے ہی کتنا خرچ ہو جائے، پر کام بننا چاہیئے۔" لالہ مصدی مل بولے۔ تھوڑی دیر میں پنڈت جی اپنے ساتھ ادریس اور بانکے کو لے کر آ ہی گئے۔ چائے کا دور پھر سے دوہرایا گیا۔ لچھے دار باتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جب سو سو کے دس نوٹ ادریس میاں اور بانکے پنڈت کو پیش کئے گئے تو ان کی آنکھوں میں چمک دوڑ گئی۔ کام وہ سمجھ چکے تھے۔ کام کی تکمیل کے بعد انعام کا لالچ بھی دے دیا گیا تھا۔

بسنت پنچمی پر رادھارمن کے مندر پر بڑے زوروں سے جشن کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ سامنے کے میدان میں شامیانے لگ گئے تھے۔ جابجا "ہندو مسلم اتحاد — زندہ باد" کے بینر ٹانگے جا چکے تھے۔ شامیانے کے ایک گوشے میں چائے پانی کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔

بسنت سے پہلے ادریس اور بانکے موقع کا جائزہ لینے کی نیت سے نکل پڑے۔ سامنے والے چوک کی مسجد کے اونچے مینار بادلوں کو چومنے کی کوشش کر رہے تھے۔ دُور سے رادھارمن کے مندر کا کلس بھی آسمان کی طرف لپک رہا تھا۔ ادریس نے ایک طویل سانس بھر کر کہا "دیکھ رہے ہو بانکے پنڈت۔ یہ مسجد، یہ مندر سب کیا ہیں؟ کمزور انسان کے ٹوٹتے ہوئے اعتقاد کی بیساکھیاں ہیں پیارے۔ ان کے جھوٹے سہاروں کا خواب دیکھ کر ہی وہ اپنی تلخ زندگی کے غم غلط کرتا رہتا ہے۔"

بانکے پنڈت نے کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "تم ٹھیک کہتے ہو بھائی۔ سچ تو یہ ہے کہ نہ تو خدا نام کی کوئی چیز دنیا میں ہے اور نہ بھگوان نام کی۔ یہ تو فقط دھندے کا ذریعہ ہے، گورو۔ ہمیں کو دیکھو لو۔ مسجد مندر کا کھیل کروانے کے لیے دو ہزار کا دھندہ پکا ہو گیا نا۔ اور بھلا تو تجربہ یہ ہے کہ ہم نے کبھی بھڑکانے والوں کو مرتے نہیں دیکھا۔ مارا تو وہی گیا جسے مذہب کے بارے میں سوچنے تک کی بھی کبھی فرصت نہیں ملی۔ ارے بھیا، اس مہنگائی کے زمانے میں تو ہر ایک کا مذہب یہی ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح سے اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ بھرے۔"

ادریس بہت دیر تک آسمان کی طرف دیکھتا رہا۔

رادھارمن کے مندر میں پہنچ کر ہی انھوں نے اپنا پلان بنایا۔ بانکے بولا "ادریس بھائی، تم اس جگہ سے ہڈی پھینکنا۔ ہڈی مورتی کے پاس گرنی چاہیئے۔ سامنے والی لوہاروں کی گلی سے بھاگ کر تم مزے سے چوک میں پہونچ جاؤ گے۔ باقی کی بات میں سنبھال لوں گا۔"

شام چار بجے رادھارمن کے مندر میں کیرتن ہو رہا تھا۔ جب آرتی شروع ہوئی تو ایک بڑی ہڈی بڑے زور سے آرتی کے تھال میں آگری۔ ہڈی کے گرتے ہی بانکے چلّایا "ہرے رام، ہرے رام۔ مندر میں گائے کی ہڈی پھینکی ہے میاں نے۔ میں نے اُسے بھاگتے ہوئے دیکھا ہے۔" پاس کھڑے بھگت لوگوں کی آنکھوں میں خون اتر آیا

"پکڑو، پکڑو۔ مارو"

ایک طوفان سا اٹھ کھڑا ہوا۔

اُدھر ادریس چوک بازار پہنچ کر اپنے پٹھوں کو پہلے ہی سے تیار کر آیا تھا۔

اب دنگا خوفناک شکل اختیار کر چکا تھا۔ بازار کی دکانوں کے شٹر دھڑا دھڑ گرائے جا رہے تھے۔ باہر بے ترتیب پڑا جتنا بھی سامان دُکان کے اندر دھکیلا جا سکتا تھا دھکیل دیا گیا۔ بھگدڑ اور شور و غل سے کان پھٹے جا رہے تھے۔ تبھی پولیس کے آنسو گیس کے گولے دھڑا دھڑ پھٹنے لگے۔ بانکے چوک بازار کے اگلے کونے پر کھڑا اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ ہندو چیخ ہو کر سڑک پر خالی ڈرموں اور بنچوں سے روک لگا رہے تھے۔ پولیس کے اُدھر بڑھتے ہی وہ بھی اندر کی گلیوں میں بھاگنے لگے۔ تبھی بابو شیام لال گھبرائے ہوئے "کیا ہوا، کیا ہوا؟" کہتے ہوئے گلی سے نکلے۔ بانکے کے چہرے پر یکایک شیطان کا سایہ اترنے لگا۔

"اس کی بدولت ہی سات لاکھ کی حویلی گیا تھا تو بانکے؟" اس نے خود ہی اپنے کو یاد دلایا۔ پھر وہ بلی کی چال سے آگے بڑھا۔ اور موقع پا کر اس نے بابو شیام لال کے پیٹ میں چھرا گھونپ دیا۔

"آہ! —" بس اتنا ہی کہہ پائے تھے بابو شیام لال۔ بانکے نے خون آلودہ خنجر پاس پڑے کاغذ سے پونچھا اور تھوڑا آگے بڑھ کر چلایا "مار ڈالا، مار ڈالا۔ بابو صاحب کے چھرا گھونپ کر وہ میاں اس طرف بھاگ گیا ہے۔" بھیڑ اسی طرف بڑھنے لگی۔ بابو شیام لال ہمیشہ کے لیے خاموش ہو چکے تھے۔

"کدھر گیا، کدھر گیا" "پکڑ لو، جانے نہ پائے —" بھیڑ ایک عجیب ہیجان کی گرفت میں آ کر بے مطلب چلا رہی تھی۔ کچھ جوشیلے نوجوان چنگھاڑ اٹھے "بابو شیام لال ایک فرشتہ سیرت انسان تھے۔ ان کے قتل کا بدلہ لیا جائے گا۔ ان کی موت کا بدلہ لیا جائے گا۔"

شام تک کوئی بیس بے گناہ لوگ مار ڈالے گئے۔ لگ بھگ پچاس زخمیوں کو ہسپتال پہنچایا گیا۔ درجنوں مکان اور دکانیں جل کر خاکستر ہو گئیں۔ تمام شہر مضطرب ہو اٹھا۔ بیسیوں کو لوٹ لیا گیا۔ دو چار مسجدیں اور مندر بھی نذرِ آتش ہو گئے۔ وہ تباہی مچی کہ الاماں!

جنتی کی بانچگی کے پیچھے ادریس بیٹھا انتظار کر رہا تھا۔ کتنی کالی تھی رات۔ جیسے قدرت نے ماحول کو گہرے کاجل سے رنگ دیا ہو۔

بانکے لگ بھگ نو بجے رات کو وہاں پہنچا۔ تھیلے میں سے اس نے کباب اور تکین کے پڑے باہر نکالے اور پھر بوتل اور گلاس جما دیئے۔

ادریس ہنس کر بولا "آج تو ولایتی لائے ہو گے گورو؟" بانکے بولا "اتنا بڑا کام شہر میں کر ڈالا ہے تو کیا ٹھرے سے کامیابی منائیں گے؟"

لگ بھگ آدھی بوتل ختم ہونے پر ان کی زبان بے لگام ہو گئی۔

بانکے ہاتھ سے پنجہ بناتے ہوئے بولا "اس حرامی شیام لال کو میں نے جہنم رسید کر دیا۔ اسی سالے نے ہمیں اندر کروایا تھا۔"

اپنی آستین سے منہ پونچھتے ہوئے ادریس بولا "میں نے بھی اس مولوی صاحب کو اوپر پہنچا دیا ہے۔ اس کے گرتے ہی میں خود چلایا۔ مار ڈالا مولوی صاحب کو ایک ہندو کافر نے۔"

دونوں نشے میں کھلکھلا کر ہنس دیئے۔

بانکے نے ایک موٹی دھار دونوں گلاسوں میں چھوڑی۔ اپنی جیب سے اس نے ایک گڈی نکالی اور آدھی آدھی کر کے ادریس سے بولا "لو پہلوان، پانچ سو ہیں۔ اس پٹے ہوئے مُہرے سے یہ بھی لیتا آیا تھا۔ اس نے کہلوایا ہے کہ اگر ہم پاس کی بستی میں جا کر بھی یہی کام انجام دے سکیں تو اتنے ہی اور مل جائیں گے۔ کیا ارادہ ہے؟ یہ تو اپنا بزنس ہے پیارے۔" ادریس کی باچھیں کھل گئیں۔

"ہاں ہاں۔ وہاں تو کیا، ہم تو جہنم میں بھی جانے کو تیار ہیں۔ پیسہ ملنا چاہیئے۔"

بانکے نے ایک لمبا گھونٹ لیا۔

"پھر پیشگی لے کر کل چل پڑیں گے۔"

دونوں کافی پی چکے تھے۔ خالی بوتل پھینک کر وہ ڈگمگاتے ہوئے اٹھے۔

بانکے بولا "ادریس بھائی۔ وہ شعر گنگناؤ یار۔ ارے وہ ہی، لکھنؤ کے نواب والا۔"

ادریس سمجھ گیا تھا "اچھا وہ والا۔"

"ہم عشق کے بندے ہیں مذہب سے نہیں واقف
کعبہ ہوا تو کیا، بت خانہ ہوا تو کیا"

بانکے ہنستے ہوئے بولا "ہاں، یہی۔ ہمارا بھی تو کوئی مذہب نہیں ہے پیارے۔ کعبہ ہو، بت خانہ ہو ہمیں کیا لینا دینا۔ ہمیں تو "یہ" چاہیئے "یہ"۔"

وہ اپنی انگلیوں کی روپیہ کھنکانے والی صورت بنا کر بولا۔

پھر یکایک اسے خیال آیا "ارے ہاں، یہ تو بتلانا میں بھول ہی گیا۔ یہ بات جیبوڑہی ہے گورو۔ ستیدن کنجڑن کا اکلوتا بیٹا مارا گیا۔" ادریس نے سر کو دوبارہ ہلایا۔ اور پھر ہاتھ کو جھٹکے سے نیچے گرا کر بولا "بہت اچھا ہوا۔ وہ سالا نکھٹو تھا۔ کام کا نہ کاج کا۔ دشمن اناج کا۔ الٹا بڑھیا ہی اس کو کھلاتی تھی۔ اماں، بڑھیا کو معاوضے میں پانچ ہزار روپے ملیں گے۔ ذرا سوچو۔ پانچ ہزار۔ نصیب جاگ گئے بڑھیا کے تو۔ یار، پہلے خیال نہیں آیا ورنہ میں بھی اپنے افیونی چچا کو مار کر پانچ ہزار وصول کر لیتا۔"

دونوں گلے میں بانہیں ڈالے چلے جا رہے تھے۔ ادریس پھٹے گلے سے گا رہا تھا "کعبہ ہوا تو کیا، بت خانہ ہوا تو کیا۔"

(ہندی سے ترجمہ: مترجم شیو ناتھ سکّہ)

بقیہ: داغ کے شاگردانِ دکن

رکھتے تھے۔ ۱۲۹۹ء میں تولد ہوئے اور ۱۹۵۷ء میں انتقال فرمایا۔ آپ کی شاعری میں حسین امتزاج ملتا ہے۔

سر پہ قرآن گلے میں زنار رہا
زاہد دیکھ مجھے میں ہوں مسلمان ایسا

آنکھوں آنکھوں میں وہ دیوانہ بنا دیتے ہیں
کچھ نئی طرز سے وہ جلوہ دکھا دیتے ہیں

ڈھٹائی دیکھئے ان کی مرا دل لے کے کہتے ہیں
سوا اس لو تھڑے کے آپ نے مجھ کو دیا کیا تھا

اس کو خنداں دیکھ کر خنداں ہوا جام شراب
شیشۂ گریاں مرے گریہ پہ گریاں رہ گیا

سید رضی الدین حسن کیفی داغ کے ناز برداروں میں سے تھے۔ اور آپ کا شمار ان کے پسندیدہ شاگردوں میں ہوتا تھا۔ آپ کے والد کا نام مولوی نظام الدین احمد تھا۔ ۲۵ مارچ ۱۹۲۰ء کو اجمیر میں انتقال ہوا۔ شعر خوب کہتے تھے اور ڈوب کر کہتے تھے۔ لیکن طبیعت میں مستقل مزاجی نہیں تھی بے اعتنائی زیادہ تھی۔ آپ صفی اورنگ آبادی کے استاد رہ چکے ہیں۔ بڑے پر گو قسم کے آدمی تھے اور بے پناہ صلاحیتوں کے حامل تھے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی کوششوں سے ایک انتخاب کلام زیورِ طباعت سے آراستہ ہوا ہے۔

میں ہوں کہیں خیال کہیں ہے نظر کہیں
ہر چیز رکھ کے بھول گیا ہوں مگر کہیں

دل آیا ہے ہمارا جب کسی پر ٹوٹ کر آیا
طبیعت جب کسی پر آئی ہے بے اختیار آئی

رقیب کیوں مری ذلت کی فکر کرتے ہیں
ذلیل ہونے میں کچھ مجھ کو عار بھی تو نہیں

اتنی سی بات کے لیے یہ دار و گیر کیوں
میں کیا مرے گناہوں کا یارب شمار کیا

دیارِ الفت کے رہنے والوں کا حال کیا پوچھتے ہو ہم سے
کسی کو خانہ بدوش دیکھا کسی کو خانہ خراب پایا

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے دکن میں بھی داغ کے سیکڑوں شاگرد ہوئے ہیں۔ مگر ان میں سے چند ہی ایسے ہوئے ہیں جو اپنی شاعری کی وجہ سے آج بھی زندہ ہیں جن پر سرزمین دکن فخر کر سکتی ہے۔ اس مختصر مضمون میں داغ کے جن شاگردوں کا تذکرہ کیا گیا ہے انھوں نے صحیح معنوں میں اپنے استاد سے کسب فیض کیا ہے اور ان کی شاعری نے داغ کی شخصیت سے جلا پائی ہے ●●

لرزاں مینار

صابر کمال

حیدرآباد سے اسّی میل دور جانب شمال مغرب، ضلع نظام آباد میں ایک بہت ہی خوبصورت چھوٹا سا گاؤں "لنگم پیٹ" واقع ہے۔ جو کاماریڈی سے ۱۶ میل جانب مغرب نظام ساگر روڈ پر آباد ہے۔ جس کی آبادی دس ہزار سے زاید نفوس پر مشتمل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ زمانہ قدیم میں یہاں کثرت سے لنگایت فرقے کے لوگ آباد تھے یہاں تقریبًا چھوٹے بڑے دوسو دو سو کے قریب منادر موجود ہیں۔ اور ہر مندر میں لارڈ شنکر کی نشانی لنگ اور گائے موجود ہے اور اس بات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہاں کے لوگ کثرت سے شیو کی پوجا کرتے تھے۔ اور بہت ممکن ہے اسی وجہ سے اس گاؤں کا نام لنگم پیٹ پڑ گیا ہو۔ اور اب بھی اس گاؤں میں لنگایت فرقے کے لوگ کثرت سے آباد ہیں۔ ایک اور کہاوت یہ بھی ہے کہ۔ پانیا پیٹ کی ایک رانی صاحبہ لنگما نامی تھیں چونکہ یہ مقام پانیا پیٹ سمنان کا علاقہ ہے شاید اسی وجہ سے اس کا نام لنگم پیٹ ہو گیا ہو۔

یہ گاؤں چاروں طرف سے فصیل سے گھرا ہوا ہے۔ جس میں چار برج اور چلہ دروازہ ہیں اس گاؤں کے اطراف دو ندیاں بہتی ہیں۔ ایک بہری ندی جو گندھاری سے نکل کر پوچارم تک تقریبًا ۵ میل کا فاصلہ طے کرتی ہوئی پوچارم تالاب کی شکل میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہ ندی اس گاؤں کو شمال، مغرب، جنوب تینوں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ دوسری ندی پام لاگ' جو شمال میں بہتی ہے۔ اس ندی کی وجہ سے گاؤں کی خوبصورتی کے ساتھ ساتھ زراعت میں بھی کافی مدد ملتی ہے۔ یوں تو اس گاؤں میں چھوٹے بڑے دوسو کے قریب منادر ہیں۔ لیکن ناگیشور مندر، ہنومان مندر، جوگی ناتھ مندر، پربھو سوامی مندر، قابل ذکر ہیں۔ گاؤں کے جانب مغرب ایک بہت بڑا مندر ہے۔ جس میں بہت بڑی خانقاہ بسی ہوئی ہے اور اس میں بہت ہی خوبصورت اور کافی کشادہ باؤلی ہے۔ نہ جانے اس میں کونسی مورتیاں بٹھائی جانے والی تھیں۔ لیکن نہ بٹھائی جا سکیں اور آبادی میں ایک ہنومان مندر ہے جو الورہ آرٹ پر مشتمل ہے۔ اور اس کے قریب ہی ناگیشور مندر ہے اس کے آگے ایک ہشت پہلو مینار بنا ہوا ہے۔ جو ستائیس فٹ بلند ہے۔ اگر اس مینار کو اوپر چڑھ کر ہلایا جائے تو یہ بالکل سرو کے درخت کے مانند ہلتا ہے۔ ہوا کے تیز جھونکے بھی اسے جھومنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ صدیوں پرانے اس مینار کو لوگوں نے یہ جاننے کے لیے کہ آخر یہ کس چیز کا بنا ہوا ہے۔ اس کے نچلے حصّہ کو کھرچ کر دیکھنا شروع کیا۔ اور یہ سلسلہ نہ جانے کب سے جاری تھا جس کی وجہ سے ایک فٹ گہرے مینار میں گڑھا پڑ گیا۔ لیکن محققین کو اس کے سوا کوئی اور چیز ہاتھ نہ آئی کہ مینار گچی اور اینٹ کا بنا ہوا ہے۔ مینار سے صرف چار فٹ جانب مغرب ایک دیوا گنیر (پھول) کا درخت ہے جو تقریبًا ۳۵، ۴۰ فٹ بلند ہے، وہاں کے قدیم لوگوں کا کہنا ہے کہ ان کے بزرگوں نے بھی یہ درخت بچپن ہی سے دیکھا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ درخت اس وقت ۱۵۰ ڈیڑھ سو سال سے کم کا نہیں ہے اور اس مینار کے جانب مشرق چار فٹ کے فاصلے پر ایک قدیم باولی ہے جو تقریبًا تیس فٹ گہری ہے۔ جس میں ہمیشہ پانی رہتا ہے یہ دونوں چیزیں بھی اسی میں جو مینار کے لیے قطرہ ثابت ہو سکتی ہیں۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے باوجود یہ مینار کس طرح ہلتا ہے۔ اور اس مینار کا باولی سے کیا تعلق ہے بہر حال یہ مینار نہ صرف اندھرا پردیش کے لیے بلکہ ہندوستان کے لیے باعث فخر ہے۔

(بقیہ صفحہ ۳۵)

انیس نصرت

باز آئے بے تکلف دوستوں سے

ایک بہت بڑے سیاسی لیڈر کے سامنے ایک بے روزگار نوجوان جو اُن کو اُن دنوں سے جانتا تھا جب وہ اتنے بڑے آدمی نہیں تھے اپنی رام کہانی سنے بیٹھا۔ انھوں نے پریشانیوں بھری کہانی سنی اور بولے۔

"وقت کی ایک بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ گزر جاتا ہے"۔ایک منٹ بعد انھوں نے اپنا جملہ پھر دہرایا

"وقت کی ایک بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ گزر جاتا ہے"

دوسری بار یہ جملہ سن کر نوجوان اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور بولا" یہ تو آپ نے ٹھیک فرمایا لیکن جس پر گزرتا ہے وہی جانتا ہے"

کچھ یہی حال بے تکلف دوستوں کا ہے جن کے منھ سے آپ کو مشہور شاعر ذوقؔ کا یہ شعر اکثر سننے میں ملے گا!

"اے ذوقؔ تکلف میں ہے تکلیف سراسر"

حالانکہ تکلف کرنے میں سراسر تکلیف ہے لیکن آپ کی اس بے تکلفی کا جو شخص نشانہ بنتا ہے اس پر جو گزرتی ہے اسے کچھ وہی جانتا ہے۔ویسے تکلف کی باتیں اب بہت پرانی ہوچکی ہیں اب آج کل تو "تکلف برطرف" والا معاملہ ہے یعنی اگر کسی نے تکلف کیا تو وہ گویا غیریت برت رہا ہے۔اپنا پن اور محبت تو بس اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کتنے بے تکلف ہو سکتے ہیں۔چاہے اس سے دوسرے کو کتنی ہی تکلیف کیوں نہ ہو۔اگر آپ نے دوسرے کی تکلیف کے بارے میں سوچ لیا تو آپ تکلف کرنے لگے۔

ہمارے شوہر کے بچپن کے ایک دوست۔وہ جس دن گھر آجاتے تو گھر کے سارے کام گویا رک جاتے۔ان کے آنے پر بچے پڑھائی چھوڑ کر ان کے اردگرد جمع ہو جاتے۔میرے شوہر کے بھی سارے کام رک جاتے۔اور میں بھی سارے کام بھول جاتی۔بس ذرا ذرا سی دیر پر چائے اور پان کی فرمائش پوری کرتی رہتی۔لاکھ ان سے کہو کہ بچوں کا ٹسٹ ہے۔مجھے بہت سے کام کرنے ہیں۔بس ان کا ایک ہی جواب رہتا کہ" چھوڑئیے بھی" ہٹائیے بھی" آپ بھی کہاں کی باتیں لے بیٹھیں۔اس کے آگے ہم لوگ بے بس ہو جاتے۔سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کو کس طرح سمجھائیں۔آخر میں نے ایک ترکیب سوچی اور ان کی بے تکلفی کی عادت کو میں نے بھی کچھ دنوں کے لیے اپنایا اور کہا۔" بھیا ذرا بچوں کو کچھ دیر پڑھا دیا کرو۔اب ان کے آتے ہی بچے اپنے بیگ لے کر ان کے گرد جمع ہو جاتے اور ان کو سانس لینے کی بھی مہلت نہ ملتی۔پھر دھیرے دھیرے ان کا آنا جانا کم ہوگیا۔اب آتے تو تھوڑی دیر کے لیے۔بچوں کو دیکھتے تو فوراً" کہتے "تم لوگوں کو پڑھنا نہیں ہے۔چلو اپنے کمرے میں۔بچے بڑوں کی باتیں نہیں سنا کرتے۔انھوں نے بے تکلفی کی عادت ختم کی تو میں نے "تکلف" شروع کردئے۔

میرے شوہر کے ایک اور دوست ہیں۔جن کا آنے کا وقت اس وقت شروع ہوتا ہے جب رات کے دس بجے ہوں۔یعنی ہم لوگ سونے کی تیاری کر رہے ہیں کہ معلوم ہوا کہ رشید صاحب مع بیگم کے تشریف لائے ہیں۔پھر انھوں نے باتیں شروع کیں۔ادب سیاست اور اس کے بعد میں مہنگائی تک کی باتیں کرکے بارہ بجے رات میں رخصت ہوتے۔

ایک بار میرے شوہر نے مجھے سوتے سے جگایا اور کہا کہ چائے بنا۔ میں نے جواب دیا کہ" کیا بیڈ ٹی کا ٹائم ہوگیا" تو انھوں نے جواب دیا ار۔ نہیں بھئی رشید صاحب اور ان کی بیگم آئے ہیں اور وہ لوگ چائے پی کر ہی جائیں گے۔

ایسی ہی ایک صاحبہ ہیں جن سے ہمارے خاندان کے بہت پرانے تعلقات تھے۔اچانک ان کے شوہر کا انتقال ہوگیا۔ہم لوگ جب ان کے یہاں گئے تو میں نے ان سے وہی جملے کہے جو ایسے موقعوں پر کہے جاتے ہیں" صبر سے کام لیں۔ ہم لوگوں کو غیر نہ سمجھیے گا۔ہمارے گھر کو اپنا ہی گھر سمجھئے وغیرہ وغیرہ۔

ایک دن وہ اپنے بچوں سمیت مختصر سے سامان کے ساتھ میرے گھر کو اپنا گھر سمجھ کر آگئیں۔انھوں نے میرے گھر میں کچھ اس طرح رہنا شروع کیا کہ میرے بچوں کو اپنے بچے اور حد یہ ہے کہ میرے شوہر کو اپنا شوہر سمجھنے کی تیاری کرنے لگیں۔اب آپ ہی اندازہ لگائیں کہ ان کی اس بے تکلفی سے میں نے کس طرح چھٹکارہ حاصل کیا ہوگا۔

کسی نے کہا ہے کہ جو کتابیں ادھار دیتا ہے وہ بے وقوف ہے جو انھیں واپس کر دیتا ہے وہ ان سے بڑا بے وقوف۔ہم لوگ اپنی کتابوں کے معاملے میں بے وقوف اور دوسروں کی کتابوں کے معاملے میں بے وقوف ثابت ہوتے ہیں۔

آجکل کتابیں مانگ کر پڑھنا اور انھیں واپس نہ کرنا بڑی اپنائیت

ں بات بن گئی ہے۔ اور اگر بھولے سے اپنی کتاب کسی ضرورت کے وقت مانگ ں تو سمجھ لیجئے بڑی غیریت برتی۔ دوست کو اپنا دوست اور ان کے گھر کو پنا گھر سمجھ کر کتاب انھیں کے پاس رہنے دیجیے ورنہ آپ کی دوستی پر آنچ جائے گی۔ بدقسمتی سے مجھے اور میرے شوہر کو کتابیں خرید کر پڑھنے کا شوق ہے۔ اس شوق نے ایسے ایسے زخم دیئے ہیں کہ بعض کتابوں کو دیکھ کر دل پر دھکا سا لگتا ہے اور ہم اس خوشگوار لمحہ کو یاد کرنے لگتے ہیں جب وہ کتاب ہمارے پاس تھی۔ کبھی تو ایسا بھی ہوا کہ ہم کوئی کتاب بڑے شوق سے خرید کر لائے۔ ابھی گھر پہنچے ہی تھے کہ کوئی دوست آگئے۔ انھوں نے بڑی بے تکلفی سے وہ کتاب اٹھا لی۔ ہمارے لاکھ کہنے پر کہ ابھی خرید کر لائے ہیں۔ ابھی الٹ پلٹ کر بھی نہیں دیکھی۔ وہ بڑی بے تکلفی سے بولے۔ آپ اطمینان سے پڑھیے گا میں کل ہی واپس کر دوں گا ـــــ اور وہ کل پرسوں گزر جانے کے بعد بھی نہیں آیا۔

میرے شوہر کے ایک عزیز دوست Borrow, buy or steal کے مقولے پر اس ترتیب سے عمل کرتے ہیں۔ سب سے پہلے تو وہ کتاب پڑھنے کے لیے ادھار مانگتے ہیں۔ اگر اس طرح کتاب حاصل نہ ہو سکے تو خریدنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن پسند آنے والی ہر کتاب تو خریدی نہیں جا سکتی چنانچہ وہ چرانے سے بھی باز نہیں آتے۔ وہ ہم سے ایک مشہور ناول کی پانچ جلدوں میں سے تین جلدیں مانگ کر لے گئے۔ اور کئی تقاضوں کے باوجود انھوں نے یہ کتابیں واپس نہیں کیں۔ آخر میں ان کی بیوی ان کی رخصتی کرا کے اپنے گھر لے گئیں۔ چند دن قبل ہم لوگ اس ناول کے مصنف کے یہاں گئے۔ باتوں باتوں میں انھوں نے کہا کہ میں نے اپنی کتاب آپ کو پیش کی تھی آپ کے پاس ہے نا میری کتاب۔ میرے شوہر کچھ الجھن میں پڑ گئے اور انھوں نے اس ناول کی تین جلدوں کا حشر سنا دیا۔ اس پر انھوں نے زوردار قہقہہ لگایا اور بولے "چلیے ان کا سٹ تو پورا ہو گیا پہلی اور دوسری جلدیں مجھ سے مانگ کر لے گئے تھے" یہ دوسری بات ہے کہ انھوں نے دو سیٹ بیکار کر دیے"

ہم لوگوں کے ایک جاننے والے بہت عمدہ اور مہنگی سگریٹ پینے کے عادی ہیں۔ اپنی مالی حیثیت سے کہیں زیادہ مہنگی۔ اس شوق کے لیے انھوں نے بڑی قربانیاں کی ہیں۔ نہ زیادہ گھومنے پھرنے جاتے ہیں۔ نہ کھانے پینے کا کوئی خاص شوق کرتے۔ نہ کپڑے بہت اچھے پہنتے ہیں۔ ان کے ایک دوست ان کے یہاں آتے اور گھنٹوں بیٹھتے۔ ظاہر ہے بے تکلف دوست تھے۔ ان کی سگریٹ سے اپنا پھیپھڑا اور ان کا دل جلاتے اور وہ بیچارے تکلف میں کچھ کہہ بھی نہ پاتے۔ آخر انھوں نے ایک ترکیب سوچی۔ وہ آئے تو تھوڑی دیر بعد انھوں نے ایک سگرٹ اپنے دوست کو پیش کی دوسری خود سلگائی اور ڈبیہ ردی کی ٹوکری میں پھینک دی یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ جیسے ڈبیہ خالی ہو گئی ہے۔

ان کے دوست کافی دیر تک بیٹھے رہے اور چلتے وقت انھوں نے بے تکلفی سے سگرٹ کی ڈبیہ اٹھالی اور یہ کہتے ہوئے کہ میرے بچے کو سگرٹ کی خالی ڈبیاں جمع کرنے کا شوق ہے اپنی جیب میں رکھ لی۔ ان صاحب نے بعد میں بتایا کہ اس ڈبیہ میں سے انھوں نے صرف دو سگرٹیں ہی نکالی تھیں۔

بقیہ : لرزاں مینار

جس طرح چاند کے اطراف ستارے جگمگاتے رہتے ہیں اسی طرح اس گاؤں میں اور بھی کئی خوبیاں موجود ہیں۔ اس گاؤں کی ایک فصیل نایک دروازہ میں ارغوانی نیلم کثرت سے پایا جاتا ہے۔ اور اس گاؤں کے جانب میں ایک بہت بڑا پہاڑ ہے اور اس پہاڑ پر کثرت سے خام لوہا موجود ہے جس کی وجہ سے اس پہاڑ کو ایرا پہاڑ (کالا پہاڑ) کہا جاتا ہے۔ اس گاؤں میں پیتل کی صنعت بھی اتنی عروج پر تھی کہ پہلے کی تواریخ میں اس کا ذکر نصابی کتابوں میں موجود ہے اور پیتل کی صنعت کے تعلق سے پروفیسر ڈاکٹر یوسف خان صاحب نے اپنی خود نوشت سوانح حیات "یادوں کی دنیا" میں اس کا ذکر کیا ہے۔ اب بھی یہاں کے پیتل کے کاریگر اپنا جواب نہیں رکھتے لیکن وقت کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ بھی دوسرے پیشے اختیار کرتے جا رہے ہیں۔

ان سب خوبیوں کو پیش نظر رکھ کر اگر اس جانب خاطر خواہ توجہ کی گئی تو نہ صرف اس سے وہاں کے عوام کو ہی بلکہ قوم اور ملک کو بھی فائدہ ہوگا۔

دور آفریدی

شاد عارفی شخصیت اور شاعری

ہندوستان میں اتر پردیش کے شمالی مغربی پہاڑی علاقے کا ایک حصہ کمایوں کہلاتا ہے۔ اس کی ترائی کے میدان میں نینی تال کے نیچے، ایک چھوٹی سی ریاست ریاست رام پور کے نام سے مشہور تھی۔ اس کوہسار کے دامن میں بسنے والے، اپنے مزاج کی بہ دولت سارے ملک میں پہچانے جاتے ہیں۔ بہادری اور شجاعت، حق گوئی اور بے باکی، انسانیت اور بھائی چارہ اور مہمان نوازی، ان کا خاصہ رہا ہے۔

اس انانیت بھرے ماحول میں، شاد عارفی پیدا ہوئے۔ اور ہوش سنبھالا شاعری شروع کی۔ البتہ وہ ایک دانشور کی طرح، اپنے ماحول کا تجزیہ نہیں کر سکے، جو ریاستی نظام کی دین تھا۔ بلکہ اس کے دباؤ میں الجھے رہے، اور متاثر رہے۔ اور ساری عمر گزاری۔ اس سے سمجھوتا نہیں کر سکے۔ اس سے خود کو بلند بھی نہیں کیا۔ اس وجہ سے ان کی زندگی میں الجھنیں پیدا ہو گئیں۔ بعد کو یہی الجھنیں اور تلخیاں، ان کی شاعری روح بن گئیں۔

اس موقع پر شاد عارفی کے متعلق، رشید احمد صدیقی کا خیال نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ اس میں قدرے تشریح و وضاحت اور قدرے اختلاف کی گنجائش ہے وہ کہتے ہیں: "شاد مرحوم فن شاعری اور زبان کے کتنے ہی ماہر رہے ہوں، وہ اس پائے کے شاعر یا نثر نگار نہ تھے۔ ان کے کلام میں بڑی نا آسودگی، شکست خوردگی اور بیزاری ملتی ہے۔ شاعروں کے ساتھ زندگی اور معاشرے نے، اکثر اچھا سلوک نہیں کیا ہے۔ لیکن جو اچھے اور بڑے شاعر تھے، وہ ناموافق حالات سے اونچے ہو گئے۔ اور زندگی اور شعر و ادب کو بہت کچھ دے گئے۔ لیکن جو معمولی تھے۔ وہ صیدِ زبوں ہو کر رہ گئے۔ شاد طنز کی آڑ پکڑتے تھے، اس کا حوالہ یا واسطہ دلاتے، بار بار اسے پکارتے تھے۔ لیکن وہ ان سے دور رہی۔ طنز و ظرافت کو اس طرح نہیں اپناتے۔ ساتھیوں میں بڑا ماننے اور پوچھے جانے کی بے پناہ خواہش نے، جو پوری نہ ہوئی۔ ان کو زندگی کی اعلیٰ ذمہ داریوں سے عہدہ برآ اور نبرد آزما ہونے کے شرف سے محروم رکھا۔ شاد الفاظ و عبارت کی ہزار شیوگی سے واقف نہ تھے۔ اس لیے برت نہیں سکتے تھے۔ ان کے پاس کہنے کو کوئی ایسی بات نہ تھی، جس سے ذوق اور ذہن دونوں حرکت میں آئیں۔ اچھے اور بڑے شاعر کا یہ مخصوص امتیاز ہے۔ شاد صرف کہہ دینے کو کافی سمجھتے تھے۔ یہ بھی کوئی معمولی درجہ نہیں ہے۔ لیکن اس پر (بھی)، ہر شاعر کا پہنچنا آسان نہیں ہے۔"

(ص ۱۱۱ "شاد عارفی شخصیت اور فن"، مصنف: ڈاکٹر مظفر حنفی، مطبوعہ: ۱۹۷۷ء، جمال پرنٹنگ پریس دہلی۔)

دراصل شاد عارفی کی شاعری، عوام کی پسندِ خاطر ہے۔ عوام کو متاثر کرتی ہے۔ اور اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اس میں اواسط، خواص یا کسی انسانِ اعلیٰ کو اپنی طرف مقناطیسی کشش میں رکھنے کا جوہر کچھ کم ہی ہے۔ بلکہ ان کو بیزار کر دینے کے جذبات زیادہ ہیں۔ اسی وجہ سے شاد صاحب کی زندگی اور شاعری متنازع صورت میں رہی۔ وہ خود کوئی بلند و بالا، بہتر زندگی نہیں گزارتے تھے۔ عام زندگی تھی۔ دراصل وہ صرف ایک شاعر تھے۔ ان سے اور کوئی توقع فضول تھی۔ وہ قدرے ذہین تھے، مگر یہ ذہانت کسی ایک شکل یا فارم میں نہیں تھی۔ صرف شعرگوئی پر صرف ہوئی۔ ان کی ذہانت بگڑی ہوئی تھی۔ کچلی ہوئی تھی؟ اس وجہ سے، وہ بے ترتیب باتیں کرتے تھے۔ یہی لاقانونیت، بدنظمی، بے ترتیبی اور بکھراؤ ان کی شاعری میں ہے۔

شاد عارفی شروع میں ایک معمولی شاعر تھے۔ جیسے جیسے ان کی عمر بڑھی، وہ ایک بہتر شاعر ہوتے گئے۔ ابتدا میں انھوں نے عشقیہ شاعری کی۔ تغزل اور حسنِ تغزل کا جا جگایا۔ دل و نظر کی جوت جگائی۔ جی بھر کر جذباتی زندگی گزاری۔ اور گل کھلائے۔ ایک روما جہاں آباد کیا۔ اس میں ان کی محبوبہ تھی۔ اور وہ تھے۔ وہ ان سے مانوس تھی، یا اس پر فدا تھے۔ پھر بھی حُسن کی حُسن کاری سے ہزار رنگ جھلکے۔ باوفائی تھی۔ بے وفائی ہوتی۔ حُسن تھا، دلکشی تھی، ربط تھا۔ ترکِ تعلق ہوا۔ دل خانہ خراب پھر بھی ڈھٹائی سے کام لیتا رہا۔ مثلاً:

نہ یہ دیر ہے نہ یہ مدرسہ، نہ یہ خانقاہ نہ میکدہ
تری انجمن میں جو آ گیا، تری انجمن سے کہاں اٹھا!

ابتدا میں شاد عارفی کی شاعری ہلکی پھلکی سی تھی۔ اس میں آسان طرزِ گفتگو زیادہ تھا۔ بلکہ یہاں یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ شاد صاحب زبان و بیان کے لحاظ سے صاف ستھرے اور ہلکے پھلکے انداز میں شاعری کرتے تھے۔ ان کی ساری شاعری سامنے گفتگو لگتی ہے۔ شہرت بخاری نے اپنے مضمون "شاد عارفی" میں اس بات کو قدرے مختلف انداز میں کہا ہے۔ وہ کہتے ہیں: "میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ شاد عارفی کی شاعری اخباری قسم کی شاعری ہے۔ یہ اصطلاح "اخباری شاعری" ممکن ہے، بہت لوگوں کو گمراہ کر دے ...... کسی قوم یا ملت کی، جس قدر براہِ راست خدمت اخبار شاعری کر سکتی ہے، فلسفیانہ شاعری نہیں کر سکتی۔ یہ الگ بات ہے کہ ہماری صحافت

کی تاریخ صرف دو شاعر پیدا کر سکی۔ ایک خوش نصیب جسے اپنا راستہ مل گیا، اور اس نے اپنی صلاحیتوں کو صحیح طریقے سے استعمال کیا۔ ظفر علی خاں ـــ اور دوسرا بدنصیب جسے راستہ ہی نہ ملا اور ٹامک ٹوئیے مارتا رہ گیا ـــ شاد عارفی۔ (ہفت روزہ "نصرت" لاہور۔ ماہانہ ایڈیشن۔ مارچ ۱۹۶۴ء) البتہ اس شاعری میں کچھ عرصے بعد، کہیں کہیں تیزی آئی۔ اور کہیں انتہائی تیزی بھی۔

اپنے اطراف سے بے خبری اور اس کا دباؤ، تہی دستی اور محرومی، ادھوری تعلیم اور عشق میں ناکامی اور ایسی ہی ہر دوسری مشکل، شاد عارفی کے لیے زہر خند ثابت ہوئی۔ اُن کے دل پر گزرے ہوئے تکلیف دہ واقعات نے، ان کی شاعری میں طنز کا اضافہ کیا۔ ان کے یہاں طنز کی یہ لہر، بڑی غیر متوقع صورت میں نمودار ہوئی۔ اور رفتہ رفتہ ایک خطرناک بیماری کی حد تک پھیل گئی۔ وہ جس کی طرف سے ذرا بدگمان ہوئے، جس کو پسند کی نظر سے نہ دیکھا، طنز کا وار کیا۔ پھر اس میں اور زیادہ شدت پیدا ہوئی۔ ہر کوئی ان کی طنز کے تیر کا نشانہ بنتا گیا۔ حتیٰ کہ ان کی محبوبہ بھی۔ مثلاً:

نگاہِ آرزو سے بدگمان ہیں تو آپ ہیں

شباب ہے تو آپ پر، جوان ہیں تو آپ ہیں

پھر وہ امیر ہو یا امیر زادہ ہو، دولت مند ہو یا اُس کی دانشوری ہو، ہندوستانی سیاست ہو یا کوئی سیاست دان ہو۔ یا کوئی رہنما ہو یا شیخ ہو، وہ ناقد ہو یا شاعر اس کی استادی شاگردی کی فضا ہو، اپنے چمن کی خوشبو ہو، یا جدید شاعری ہو یا خود ان کی اپنی غریبی ہی کیوں نہ ہو! شاد صاحب کے یہاں کسی کو معافی نہیں۔ مثلاً:

ہے تو احمق چونکہ عالیشان کاشانے میں ہے

اس لیے جھک مارنا بھی اس کا فرمانے میں ہے

ہمارے ہاں کی سیاست کا حال مت پوچھو

گھری ہوئی ہے طوائف تماش بینوں میں

غالبؔ کے شعر نام سے میرے سنا کے دیکھو

پھر اعتراض ناقدِ فن آزما کے دیکھو

چمن سے آج کل یوں نکہتِ معلوم غائب ہے

کہ جیسے فی زمانہ شعر سے مفہوم غائب ہے

اس طنز گوئی سے بھی شاد عارفی مطمئن نہیں ہوئے۔ پھر یہی طنز گوئی کا جذبہ، تلخی اور ترشی میں تبدیل ہو گیا۔ انا کی دل آزاری، بے باکی، بے پروائی، ان کی شاعری میں گونجنے لگی۔ مثلاً:

ہمارے محلے کی یہ اپسرائیں

نہ کوٹھے پہ بیٹھیں نہ ناچیں نہ گائیں

اسی بارے میں، سید احتشام حسین کہتے ہیں: "مجھے ذاتی طور پر شاد عارفی کی شاعری نے متاثر کیا۔ وہ جو تھے، وہی ان کی شاعری تھی۔ زندگی نے انھیں جھنجھوڑ دیا۔ وہ ان کے کلام میں کبھی غم و غصہ بن کر، کبھی طنز اور زہر خند بن کر اور کبھی دُکھے دل کی پکار بن کر محفوظ ہو گیا۔ (ص ۱۴۱، ماہنامہ "شاہکار" الہ آباد۔ جولائی ۱۹۶۹ء، تبصرہ: "نثر و غزل دستہ")

شاد کی شاعری کا دوسرا پہلو ان کی رومانی شاعری کا ہے۔ یہ لطیف ہے۔ اور اکثر جگہ لطیف تر ہے۔ مثلاً:

جذبۂ محبت کو تیرِ بے خطا پایا!

میں نے اس کو جب دیکھا، دیکھتا ہوا پایا

تیسرا اور سب سے کم حصہ طنزیہ شاعری کا ہے۔ البتہ شاد عارفی ایک طنز گو شاعر کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہوئے۔

شاد عارفی کی شاعری، عوامی زبان میں ہے۔ عوامی احساسات کی ترجمان ہے۔ عوامی عنوانات رکھتی ہے۔ کہیں کہیں غریب عوام کی ہم آواز بھی ہے۔ اس وجہ سے کلام میں، بعض جگہ نہایت سطحیت آگئی ہے۔ لیکن یہ اپنی طرف متوجہ رکھتی ہے۔ دراصل شاد صاحب کے عہد میں، اردو شاعری اپنی قدیم اقدار کی حقیقت نگاری، رواداری اور تصنع میں گرفتار تھی۔ اس میں ذاتی اور انفرادی عناصر زیادہ تھے۔

شاد عارفی کی شاعری میں چند الفاظ کی کثرت ہے۔ ان میں ایک لفظ "رہبر" ہے۔ دوسرا "رہزن" ہے۔ دونوں کی بار بار تکرار ہے۔ وہ ان لفظوں کی شخصیتوں کو مشکوک نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ اپنے ماحول اور فضا سے غیر مطمئن ہیں۔ ان کی نظر میں معاشرے کی اعلیٰ و ادنیٰ اقدار تکلف دہ ہیں۔ وہ اس فضا میں، اکثر خود سے بھی اکتاہٹ محسوس کرتے ہیں۔ مثلاً:

یہ صورت یہ حالات ہیں آج کل — کہاں کی رباعی، کہاں کی غزل

شاد عارفی کی شاعری میں صنفِ نازک کے تصور کی بہتات ہے۔ وہ اس معاشرے میں، اُس کی مختلف حیثیتوں کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ اور جہاں متاثر ہوتے ہیں۔ اپنے فکر و فن میں جگہ دیتے ہیں۔ مہترانی، سالی، بھکارن، ساس بہو، ملازمہ، مرید کی بیوی، نصف بہتر، دادی پوتی، مندر جانے والی، گوالن، بیوہ، رخصت، موٹی سہیلی، اور عورت وغیرہ نظمیں اس خیال کی آئینہ دار ہیں۔

شاد عارفی کے یہاں، سماج کے گندے، گھناؤنے، غیر مہذب، آوارہ، بدچلن اور جنس زدہ، مرد عورتوں کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔ اور نمایاں صورت میں ملتا ہے۔ کسی نہ کسی طرح، کسی بھی نظم میں، اُن کا برہنہ پن یا نیم برہنہ پن آ ہی جاتا ہے۔

میں سوچتا ہوں، شاد عارفی کی شاعری میں، یہ جنسیت کی بہتات کیوں ہے؟! ....

شاد عارفی کی شاعری میں گفتگو اور مکالماتی عنصر کا بڑا حسن ہے۔ جلدی جلدی باتیں کرنے کا موڈ بھی۔ شاد صاحب جو بات کہنا چاہتے ہیں، اس کو مکالمے کی صورت میں بڑے خوبصورت انداز میں کہہ جاتے ہیں۔ اُن کا یہ طریقہ غزلوں میں کم ہے۔ نظموں میں زیادہ ہے۔ بعض وقت یہی ڈرامائی طریقہ، منظر کشی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ پھر یہی منظر کشی، قدرے مظاہرہ پرستی میں تبدیل ہو جاتی ہے، اور فطری عناصر کی ترجمانی کرتی ہے۔ البتہ یہ فطری اور قدرتی فضا کی دلچسپی، شاد صاحب کے یہاں کچھ کم ہی ہے۔ وہ تو وقت اور زندگی سے کچھ زیادہ ہی دست و گریباں رہے۔

اُن کے پاس الفاظ کا ذخیرہ کچھ کم ہے۔ اس وجہ سے، اُن کے افکار قدرے

(بقیہ صفحہ ۵۰)

ایس۔ کے۔ آڈکو

پریم چند اور بچّے

بچے "قوم کا سرمایہ ہوتے ہیں۔ کیوں کہ بچوں کی اچھی تعلیم، اچھی تربیت، اچھی پرورش، اچھی نگہداشت اور اچھی دیکھ بھال سے والدین اور استاد بچوں کو ترقی یافتہ، تعلیم یافتہ اور تہذیب یافتہ شہری بنا سکتے ہیں جو تعلیم کے بنیادی مقاصد میں سے ایک ہے۔ اس طرح بچوں کو اچھا، نیک اور مفید شہری بنانے سے اس قوم کی ترقی کی امید کی جا سکتی ہے۔ اس کے لیے ماں باپ اور استادوں کو علم نفسیات کے بنیادی اصولوں سے واقف ہونا نہایت ضروری ہے۔ دور حاضر میں اس علم نے زندگی کے مختلف شعبوں کا احاطہ کر لیا ہے۔ ذہن انسانی کی پیچیدہ گتھیاں سلجھانے کے لیے اس سے واقفیت ضروری ہے۔ یہاں بخوف طوالت اختصار سے کام لیکر پریم چند کے منتخب افسانوں پر ہی اکتفا کیا جائے گا۔

معصوم اور بھولے بھالے بچے سب کو پیارے لگتے ہیں۔ پریم چند بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھے۔ اپنی ادبی زندگی کے آغاز ہی سے انکا دھیان بچوں پر مرکوز رہا۔ ان کی شروع کی کہانیوں میں گھریلو اور سماجی مسائل کے علاوہ بچوں کے رجحانات، ان کے امتحانات، ان کی پڑھائی، کھیلوں سے ان کی گہری دلچسپی اور ان کی متلون مزاجی کی عکاسی ہوئی ہے۔ اس سے اُس ماحول کا (جو ان کے اردگرد پھیلا ہوا تھا) پتہ چلتا ہے نیز اس ماحول کا بچوں پر جو اثر پڑتا ہے اُس سے بھی ہم بخوبی واقف ہو جاتے ہیں۔ "پنچ پرمیشور" ان کی ایک مشہور کہانی ہے۔ پنچایت کی تیاریاں شروع ہوتی ہیں۔ پنچایت کی کاروائی شروع ہونے میں ابھی تھوڑی دیر ہے۔ اس وقت کا سماں ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں، ــــــــ

"لڑکے اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے۔ آپس میں گالی گلوج کر رہے تھے اور کوئی روتے تھے۔" ان دو جملوں میں بچوں کی فطرت کے متعلق بہت کچھ کہہ دیا گیا ہے۔ کھیلوں سے تو ان کو بڑی دلچسپی ہوتی ہے۔ میلے، ٹھیلے، عرس، سکول کے جلسے اور طرح طرح کی تقاریب ان کے لیے خاص طور پر جاذب توجہ ہوتے ہیں۔ اطراف و اکناف کے ماحول کے زیر اثر ان میں ایک قسم کی پھرتی، ایک قسم کا جوش پیدا ہوتا ہے۔ ان میں جو زائد توانائی ہوتی ہے وہ ایک Outlet ڈھونڈتی ہے۔ دوڑ، دھوپ کے ذریعہ اس کو راہ ملتی ہے۔ یہ بچوں کی فطرت کے عین مطابق ہے۔ اس کہانی میں بچے محض فضا آفرینی کے لیے آئے ہیں وہ کہانی کے جز لاینفک نہیں ہیں۔ اس میں بچوں کے اجتماعی رجحان اور طرح طرح کے جشن اور تقریبوں سے ان کے میلان طبع کا پر لطف بیان ہوا ہے۔

دوسرے دور کی کہانیوں میں پریم چند بچوں کو مرکزی کردار کا درجہ دینے لگے۔ 'وماتا' (سوتیلی ماں) میں اس کے مرکزی کردار منّو کے ذریعہ سوتیلی ماں اور اس کے پریم کا حال بیان کیا گیا ہے۔ ویسے بیچاری سوتیلی ماں کب سے بدنام ہے؟ پر یہاں پریم چند نے بڑی ہمدردی کے ساتھ اس کے جذبات کی تصویر اتاری ہے دراصل بات یہ ہے کہ وہ گاندھی جی کے "پاپ سے نفرت کرو پاپی سے نہیں" والے نظریہ سے صددرجہ متاثر ہیں۔ منو کہتا ہے ـــــ "میری ماں مجھے بہت پیار کرتی تھی۔ وہ مجھے اکیلا چھوڑ کر چلی گئی۔ یہ ماں مجھے پہلی ماں سے بڑھ کر پیار کرتی ہے کہیں یہ بھی مجھے چھوڑ کر چلی نہ جائے۔" اس کہانی سے ہمیں بچوں کے کتنے ہی خصوصی اوصاف کا جیسے ان کی حساس طبیعت، نتیجہ اخذ کرنے کا انکا فطری رجحان اور حالات کا جائزہ لینے کا انکا طبعی مادّہ وغیرہ کا پتہ چلتا ہے۔

ماں کی ممتا اور اس کی موت کا اندیشہ آنسو بن کر اس کی حساس طبیعت کی غمازی کرتا ہے۔ پر دوسروں پر وہ اپنے دل کا حال ظاہر کرے تو کیسے کرے؟ آنسوؤں کی لڑی کو کیسے روکے؟ لہٰذا وہ بات بناتا ہے۔ وہ کہتا ہے ـــ "میں روتا نہیں ہوں آنکھوں میں دھواں لگ گیا ہے۔" یہاں منو کہانی کار کی تکنک کا جزو بن گیا ہے۔ منو کے کردار کے مفہوم اور کہانی کے مفہوم میں کچھ فرق ہے۔ کہانی کا مرکزی خیال یہ ہے کہ بچوں کی نفسیات کے تقاضوں کے مطابق منو کے مدلل طریق استدلال، اس کی شدید حسیت Sensitivity اور اس کی چالاکی پر روشنی ڈالنے کے علاوہ 'وماتا' (سوتیلی ماں) کے کردار کو نہایت آب و تاب کے ساتھ پیش کرنے کی اس کی آرزو بھی ہے۔ اس جذبہ محبت کو پرکھنے کے لیے منو محض ایک کسوٹی ہے اسی لیے اس کو اس روپ میں پیش کیا گیا ہے۔ وہ 'وماتا' کے پریم کو سمجھنے کے پہلے ایک غلط فہمی کا مرتکب ہوتا ہے اور بعد میں اس کو دور بھی کرتا ہے جس سے یہ پریم جگمگا اٹھتا ہے۔

"بوڑھی کاکی" کی لاڈلی اپنے نیک اوصاف کی وجہ سے منو کی بہ نسبت جلد ہی ہماری توجہ اپنی طرف مبذول کرا لیتی ہے۔ اس لڑکی یعنی لاڈلی کے آنے سے پہلے بوڑھی کاکی بچوں کی شرارتوں سے تنگ آ گئی تھی۔ کہانی کار نے اس کی بے بسی کی تصویر اس طرح کھینچی ہے "لڑکوں کو قدرتی طور پر بڑوں اور بوڑھوں سے مخالفت ہوتی ہے۔ وہ ان کا مذاق بھی اڑاتے ہیں۔ جب ماں کا یہ رنگ دیکھتے تو بوڑھی کاکی کی شامت آتی۔ کوئی چٹکی کاٹ کر بھاگتا ہے اور کوئی اُن پر پانی کی کلی کر دیتا۔" چھوٹی لاڈلی اپنے بھائیوں سے بہت گھبراتی تھی۔ وہ بوڑھی کاکی کے کمرے کو جائے امن خیال کر وہاں پناہ لیتی تھی کیونکہ وہاں پہنچ کر اسے کوئی دق نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے وہ اپنے حصے کی مٹھائی اور چنا چبینا بوڑھی کاکی کے پاس بیٹھ کر کھایا کرتی۔ آتی وہ اُس سے ہل گئی تھی۔ اس کے ماں باپ بوڑھی کاکی کے ساتھ جس طرح پیش آتے تھے اسے دیکھ کر وہ بہت بے چین ہو جایا کرتی تھی۔ اس نے اپنے حصے کی پوریاں نہیں کھائیں اور رات کو چوری چوری سب کے سو جانے پر وہ کاکی کو کھلانے گئی۔ یہ لڑکی بڑوں اور بوڑھوں کا لحاظ رکھتی ہے۔ اس کے دل میں ان کے لیے محبت اور ہمدردی ہے۔ افسانہ نویس نے اس کے نفسیاتی تجزیہ کے ذریعے اس کے

زدہ اور درد منددل کا نیز اس کے ذاتی اور تربیت یافتہ اوصاف کا خاکہ قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔

دوسری نوع کی کہانیوں میں "دو بھائی" اور "درگا کا مندر" جیسی دو کہانیاں ہیں جن سے بچوں کے فطری میلان کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ "دو بھائی" میں دونوں کی اچھل کود کی کیسی پیاری تصویر اتاری گئی ہے: —— کلاوتی دونو بیٹوں کو جانگھوں پر بٹھا دودھ پلا اور روٹی کھلا رہی تھی، دونوں منھ میں روٹی کا کور لیے کئی بگ اچھل کر جانگھوں پر آ بیٹھے اور اپنی توتلی بولی میں بتیلانے لگے۔ دونو میں بہت پریم تھا۔

"درگا کا مندر" میں بچوں کی شرارتوں اور نٹ کھٹی کا کیسا دلکش سین دکھایا ہے —— "بابو برج ناتھ قانون پڑھنے میں غرق تھے اور ان کے دونوں بچے لڑائی میں۔ شیلا چلاتی تھی کہ منو میری گڑیا نہیں دیتا اور منو روتا تھا کہ شیلا نے میری مٹھائی کھالی" ان دو کہانیوں میں بچے گھر ہی میں اودھم مچاتے دکھائے گئے ہیں۔ وہ کہانی کے اہم جز نہیں بلکہ نمائش کے طور پر لائے گئے ہیں۔

"منو" میں منو کسوٹی کے طور پر ضروری تھا۔ "سنکھ ناد" میں بھی بالک تحریک کا پیغام لیکر آیا ہے۔ "مہا تیرتھ" نامی کہانی کی تو وہ روح رواں ہے۔ کہانی کے مفہوم اس میں مضمر جذبۂ محبت کو جِلا دینے میں وہ صیقل کا کام دیتا ہے۔ "بیچاری ابھاگ" (تحفہ) میں تو بچوں ہی کا راج ہے۔ اتفاق سے کچھ بڑے آدمی اس میں آگئے ہیں۔ یہ اس لیے کہ بچوں کی نشو و نما میں ممد و معاون ثابت ہوسکیں۔ "شنکھ ناد" میں گھر اور بچوں کے آپسی تعلقات اور مٹھائی سے ان کی رغبت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

بال ہٹ (بچوں کی ضد) تو مشہور ہے۔ پریم چند بچوں کی نفسیات سے واقف تھے۔ انھوں نے ذہن اطفال کی بڑی چابک دستی سے عکاسی کی ہے۔ بچوں کو مٹھائی بہت مرغوب ہوتی ہے۔ ان کو چڑانے اور للچانے سے اُکسایا جا سکتا ہے۔ ان کی انفرادیت کی تشکیل میں ان دو عنصروں کو بڑا دخل ہے۔ دوسروں کو چڑانے میں ان کو بڑا مزا آتا ہے لیکن ان کو جب دق کیا جاتا ہے تو وہ بہت پریشان ہوتے ہیں۔ جھنجھلاتے ہیں اور کبھی کبھی آگ بگولہ بھی ہو جاتے ہیں تب ان کو منانا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ اپنی مانگوں یعنی مطالبات کو منوانے کا ان کے پاس واحد حربہ ہوتا ہے، وہ ہے رونا۔ جب معمولی رونے دھونے سے کام نہیں چلتا تو ان کا یہ رونا ایک بھیانک روپ اختیار کر لیتا ہے۔ وہ زمین پر لوٹنے لگتے ہیں، چیخنے چلانے لگتے ہیں۔ اس سے بھی اگر ہار جیت کا فیصلہ نہ ہو سکا تو آخر میں کرودھ (غصہ) غضب ڈھاتا ہے۔

اُدھر "مہا شنکھ" میں بھی بالک ہیں۔ لیکن وہ کہانی کے اہم جز نہیں ہیں۔ بلکہ دوسروں کو پریشان کرنے کے لیے ہیں۔ اپنی شخصیت کو ابھارنے کے لیے نہیں۔ ایک بالک اپنی دایہ کو بہت چاہتا ہے۔ جب اس کو گھر سے نکال دیا جاتا ہے تب وہ اس کے لیے سارا گھر سر پر اٹھا لیتا ہے۔

سبھی بچوں کی دلچسپیاں ایک جیسی نہیں ہوتیں۔ گھر کی تربیت اور طبقاتی فکر کو اس میں بڑا دخل ہوتا ہے۔ "نیڈر" نامی کہانی میں بچے نیڈر کو کاکی کے مرنے کی خبر دیتے ہیں —— "لڑکوں نے دوڑ کر، اچھل کود کر، اس کی لکڑی ہاتھ سے چھین کر اس کا استقبال کیا۔" بہت دنوں سے بچھڑے نیڈر کے لیے بچوں کی یہ بے پناہ اپنائیت کتنی بے ساختہ ہے، کتنی سچی ہے۔ ساتھ ہی اتنی اثر پذیر کہ کاکی کے سورگ باس کی خبر ملنے پر جب وہ بے ہوش ہو گیا اور دوبارہ گھر کی طرف بڑھا تو "بچوں کا گروہ بھی اس کے پیچھے دوڑا۔ مگر ان کی شرارت اور شوخی کبھی کی غائب ہو چکی تھی۔"

"دو بیلوں کی کتھا" پریم چند جی کی مشہور کہانی ہے۔ اس میں ایک لڑکی کی تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے جس کو ان ستم رسیدہ بیلوں کے ساتھ ہمدردی ہو جاتی ہے۔ وہ چپ چاپ اُن کو ایک ایک روٹی کھلا جاتی ہے۔ اس کی اس ہمدردی کے ذریعہ کہانی کار کہانی کی رفتار میں تیزی لا سکا ہے۔ اس کہانی میں بھی بچے آئے ہیں۔ ہڑ لونگ مچانے میں بچوں کو بڑا مزہ آتا ہے۔ اُن کا ایک گروہ ان بہادر بیلوں کا استقبال کرنے کے لیے اکٹھا ہو گیا ہے اور تالی بجا بجا کر ان کا استقبال کر رہا ہے۔ اس طرح کہانی کے نفسیاتی حقائق Psychological Truth پر روشنی ڈالنے اور اسے آگے بڑھانے میں بچے ہاتھ بٹاتے ہیں۔

اس طرح کہانی کی رفتار کے ساتھ ساتھ اس کے نفسیاتی عنصر کو واضح کرنے میں بچوں نے اپنا رول خوب نبھایا ہے۔ "لانچھن" کی شاردا یہی کام انجام دیتی ہے شاردا کے آدھار پر کھیل کر ہی مہتر میاں بیوی کے درمیان کی کھائی کو بڑھاتا ہے، اس کو کھلونے دینا۔ اس کی ماتم پرستی کرنے آنا نہ صرف کہانی کے واقعات کی رو یعنی بہاؤ کو آگے بڑھاتے ہیں بلکہ کہانی کے لیے نفسیاتی پس منظر تیار کرنے میں مدد پہنچاتے ہیں۔

بچوں کی فطرت میں یہ بات پائی جاتی ہے کہ وہ اپنے گرد و پیش کے واقعات اور مشاہدات سے اثر پذیر ہوتے ہیں۔ نفسیاتی سطح پر ہی نہیں بلکہ ایک قسم کی جذباتی کیفیت پیدا کرنے میں اور کہانی میں کرون رس کی تخلیق میں بھی انھوں نے اپنی بھومکا نبھائی ہے جیسے "مرتک بھوج" میں۔ اس کہانی میں بچوں کے توسط سے ہی یتیموں کے اندرونی کرب اور ان کے مظالم کا حقیقی روپ سامنے آتا ہے۔ کہیں کہیں بچے تمہید کے طور پر آکر کہانی کا پس منظر کھڑا کرتے ہیں۔ جیسے "سو بھاگیہ کے کیڑے" میں۔

ان کہانیوں کے علاوہ ایک اور کہانی ہے "تحریک" جو ہمارا دھیان اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ یہ ایک بارہ تیرہ سال کے شریر اور بدمعاش لڑکے سورج پرکاش کی کہانی ہے جو اپنے ٹیچر کے لیے دردِ سر بنا ہوا ہے۔ وہ ایک Problem Child ہے۔ اپنے ماموں زاد بھائی موہن کی صحبت میں آنے پر اس کی کایا پلٹ ہوئی۔ موہن سے اُسے اُنس ہو گیا تھا۔ موہن نے سورج پرکاش کو اپنا مطمح نظر Ideal بنایا تھا۔ اس کی رہنمائی میں اس نے ترقی کی سبھی منزلیں طے کیں۔ بچوں میں پیار کی جو ایک بھوک ہوتی ہے (دودھ، مٹھائی اور کھلونوں سے بھی مرغوب) جو ماں کی گود کے سامنے دنیا کی کسی چیز کو، ہستی کو خیال میں نہیں لاتی۔ موہن میں اس بھوک نے کبھی سیری کا منھ نہ دیکھا۔ اس کی وفات کا قصہ بھی بڑا دردناک ہے۔ ٹیچر کے یہ دریافت کرنے پر کہ تمہاری یہ کایا پلٹ کیسے ہوئی؟ سورج پرکاش نے کہا —— "اس کی زندگی کے خواب ایک جان سے پیارے عزیز کی وصیت بن کر مجھے تحریک عمل کرنے لگے۔ اور یہ اسی کا اثر ہے کہ آج آپ مجھے اس حالت میں (ڈپٹی کمشنر کے عہدے پر) دیکھ رہے ہیں۔ موہن نے زندگی کا جو خیالی معیار قائم کیا تھا اس پر عمل کر کے مجھے یہ مسرت ہوتی ہے کہ شاید اس کی

معصوم سورج مجھے دیکھ کر خوش ہوتی ہو۔ یہی تحریک تھی جس نے ایم۔ اے۔ سول سروس کی آزمائشوں میں مجھے کامیاب بنایا ورنہ میں آج بھی وہی نالائق، گستاخ اور غبی سورج پرکاش ہوتا جس کی صورت سے آپ بیزار تھے۔

ان کے علاوہ پریم چند کی اور دو کہانیاں ہیں — "رام لیلا" اور "عید گاہ" جن کا تعلق سکول سے کم اور گھر اور سماجی حالات سے زیادہ ہے۔

عام طور پر بچوں کے سامنے کوئی نہ کوئی آئیڈیل یا آدرش ہوتا ہے۔ ماں باپ کو چاہیے کہ وہ اس آدرش کی تکمیل میں ان کی حوصلہ افزائی کریں۔ آج کے والدین کو ہر طرح کے حالات میں بچوں کی نشوونما اور پرورش میں پوری گرم جوشی، شفقت اور نگہبانی کرنی چاہیے اور ہر عمل اور حرکت میں نفسیاتی ڈھنگ اختیار کرنا چاہیے۔ بچوں کی فلاح و بہبود، ترقی، تعمیر اور آئیڈیل کی تکمیل میں ماں باپ کا بھی ہاتھ رہے تو بھارت کا مستقبل روشن ہوگا ●●

بقیہ شاد عارفی

محدود ہو گئے ہیں۔ جوشؔ، فراقؔ، یا جگرؔ کی طرح لامحدود الفاظ کی تصوریت نہیں رکھتے۔ ظاہر ہے، ایک ادیب یا شاعر کے پاس، الفاظ کا جتنا زیادہ ذخیرہ ہوگا، وہ اتنا ہی بڑا ادیب یا شاعر ہوگا۔ چونکہ الفاظ ہی انسانی خیالات کے اظہار کا سب سے بڑا اور جامع ذریعہ ہیں۔ اس کے باوجود، شاد عارفی عوامی زبان کے ایک اچھے شاعر ہیں۔

شاد عارفی کی شاعری ایک محدود فضا میں رہتی ہے۔ اور کبھی محدود سے محدود تر کی طرف مائل ہے۔ اس میں اکثر جگہ، صرف مقامی تحرکات ہی نمایاں ہیں۔ مثلاً: نمائش نمبر ۱، نمائش نمبر ۲، نمائش نمبر ۳، نمائش نمبر ۴، نمبر ۵ میرے پڑوس میں کچی شراب بکتی ہے۔ نمبر ۶ میرے محلے کے دو گھرانوں سے ہے گنا ہوں کا فیض جاری نمبر ۷ ان اونچے اونچے محلوں میں ..... وغیرہ وغیرہ۔ صرف رام پور سے متعلق ہیں۔

شاد عارفی نے بڑی بحروں میں شاعری کی ہے۔ اس سے انھیں اپنا خیال پیش کرنے میں، آسانی ہوئی۔ وہ جو بات کہنا چاہتے ہیں، زبان و بیان کی مدد سے، اپنی انتخاب کردہ طویل بحریں، پوری طرح کہہ جاتے ہیں۔ ان کی طویل بحروں کی شاعری میں صوتی ترنم محسوس ہوتا ہے۔ انھوں نے دانستہ بھی بعض مترنم بحریں انتخاب کی ہیں۔

ان کے یہاں صوتی صورت میں، الفاظ کا انتخاب جاندار ہے۔ البتہ شادؔ عارفی نے بعض جگہ، نہایت سستے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ انھیں اردو ادب میں غیر معیاری سمجھا گیا ہے۔ دراصل یہ الفاظ عوام کی بول چال میں ملتے ہیں۔ اس وجہ سے کچھ جگہوں پر، ان کی شاعری صرف "عوامی زبان" کی ہو کر رہ گئی ہے ●●

ثمر رابچوری

انسانیت کا خون

جلتا ہوا چراغ بجھانے سے کیا ملا
انسانیت کا خون بہانے سے کیا ملا
اے شر پسند سوچ یہ تنہائیوں میں سوچ
آپس میں دو دلوں کو لڑانے سے کیا ملا
کتنی جوان بہنوں کا لوٹا گیا سہاگ
بہنوں کے دل پہ داغ لگانے سے کیا ملا
ہندو کا خون ہو کہ مسلماں کا خون ہو
اس دیش کا تھا خون بہانے سے کیا ملا
طاقت ہے ملک و قوم کی آپس کا اتحاد
آپس کا اتحاد مٹانے سے کیا ملا
فتنہ فساد سے ہوئی تاریخ داغدار
تاریخ پہ یہ داغ لگانے سے کیا ملا

غزل

منیر سیفی

میں ہواؤں سے خوف کھاتا ہوں
شاخِ خرگاں پہ تھر تھراتا ہوں

آنے والا ہے ایک سیلِ آب
ناؤ کاغذ کی میں بناتا ہوں

خوف کا ایک خشک پتا ہوں
کوئی چھوتا ہے ٹوٹ جاتا ہوں

میں زمیں پر منیر سیفی ہوں
آسمانوں کو گدگداتا ہوں

نریندر سنہا

پریس کی علت — زندگی کی بڑی غلطی

اپنی آمدنی بڑھانے کے خیال سے شروع ہی سے پریم چند کی یہ خواہش رہی کہ ان کا اپنا پریس ہو۔ جہاں وہ اپنی کتابوں کی اشاعت کے ساتھ ساتھ دوسرا اشاعتی کام کر سکیں۔ اس کے لیے انھوں نے بہت ہاتھ پیر مارے۔ پہلے دیا نرائن نگم کے اشتراک سے پریس لگانا چاہا۔ پھر اپنے سوتیلے بھائی مہتاب رائے کی شرکت میں۔ نگم نے ان کی ناتجربہ کاری اور اس کام کو ان کی فطرت کے خلاف سمجھ کر ان کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ مہتاب رائے اور رگھوپتی سہائے فراق وغیرہ کی شرکت میں بنارس میں پریس کھولا تو وہ سال بھر کے اندر ہی ناکام ہو گیا۔ بعد میں پریم چند نے اس پریس کو اپنا بنا لیا جو ان کی ناتجربہ کاری کے باعث لگاتار گھاٹے میں چلا۔ بعد میں ۱۹۳۰ء میں جب انھوں نے "ہنس" اور اس کے بعد "جاگرن" نکالنا شروع کیا تب وہ پریس اور دونوں اخبار ان کے لیے جنجال بن گئے جنھیں وہ پوری زندگی چلاتے رہے تو صرف اس لیے کہ اگر بند کر دیا تو لوگ کیا کہیں گے۔ واقعی پریس اور دو اخبار ان کے وقار کا سوال بن گئے تھے۔ جنندر کمار کو ۱۴ فروری ۱۹۳۴ء کے اپنے خط میں اپنی اس پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"..... ساری وپتی (آفت) کی جڑ تو یہ پریس ہے۔ نہ جانے کس بری ساعت میں اس کی بنیاد پڑی تھی۔ دس ہزار روپے، گیارہ سال کی محنت اور پریشانی اکارت ہو گئی۔ اس پریس کے پیچھے کتنے دوستوں سے برا بنا، کتنوں سے وعدہ خلافی کی۔ کتنا بھومو یہ سمے (قیمتی وقت) جو لکھنے پڑھنے میں کٹتا، بے کار پروف دیکھنے میں کٹا، میری زندگی کی یہ سب سے بڑی غلطی ہے۔"

پریس سے اخباروں کو شائع کیا بازار سے کام لے کر اسے اجرت پر کیا، اپنی کتابیں چھاپیں اور دیگر لوگوں کی کتابیں چھاپ کر وہ خود ناشر بن گئے۔

ایک تو پریم چند مزاجی کیفیت کے لحاظ سے فراخ دل اور سادہ تھے۔ بعد میں وہ ناشر بھی بن گئے۔ جو بھی ہو مصنف ہونے کے باوجود

ناشروں کے تئیں ان میں کوئی تلخی نہیں پائی جاتی تھی۔ بلکہ ان کا رویہ ناشروں کے تئیں ہمدردانہ ہی رہا۔ اس نقطۂ نظر سے لیکھک سنگھ (انجمن مصنفین) کے قیام کے سلسلہ میں انھوں نے دسمبر ۱۹۳۴ء کے ہنس میں جو لکھا وہ بہت اہم ہے۔

"سنگھ لیکھکوں کے سوتو (حقوق) کی رکشا (حفاظت) کرے گا۔ لیکن کیسے؟ کچھ سجنوں کا وچار ہے کہ لیکھک سنگھ اس طرح لیکھکوں کے ہتوں (مفاد) اور ادھیکاروں کی رکشا کرے گا جیسے دوسرے مزدور سنگھ اپنے سدسیوں کی رکشا کرتے ہیں۔ کیونکہ لیکھک بھی مجور ہیں۔ وہ ہتھوڑے اور بسولے سے کام نہ کر کے قلم سے کام کرتے ہیں۔ لیکھک مجور ہیں تو پرکاشک پونجی پتی ہوئے۔ اس طرح یہ سنگھ لیکھکوں کو پرکاشکوں کی لوٹ سے بچائے گا۔ اور یہی اس کا مکھیہ کام ہوگا۔ کچھ دیگر لوگوں کی رائے ہے کہ لیکھک سنگھ کو پونجی کھڑی کر کے ایک وشال سہکاری سنستھا بنائی چاہیے جس سے وہ لیکھکوں کو ان کی مزدوری کی زیادہ سے زیادہ اجرت دے سکیں —"

"موجودہ حالت ایسی نہیں ہے کہ پرکاشکوں کو لیکھکوں کے ساتھ زیادہ نیائے سنگت ویوہار کرنے پر مجبور کیا جا سکے ...... اس سمے ایک بھی ایسا ساہتیہ گرنتھ پرکاشک نہیں ہے جو نفع سے کام کر رہا ہو۔ جو پرکاشک دھرم گرنتھوں یا پاٹھ پستکوں کا ویوپار کرتے ہیں ان کی دشا اتنی بری نہیں ہے کچھ تو خاصا لابھ اٹھا رہے ہیں۔ لیکن جو لوگ مکھیہ ساہتیہ گرنتھ نکال رہے ہیں وہ بڑی مشکل سے اپنی لاگت نکال رہے ہیں۔ کارن ہے سادھارن جنتا کی ساہتک روچی۔ پرکاشکوں کو یہ وشواس نہیں ہے کہ کسی پستک کی چھپائی کی لاگت بھی نکلے گی یا نہیں وہ لیکھکوں کو پرسکار یا رائلٹی کہاں سے دے سکتا ہے۔ ......"

امرت رائے نے تو پریم چند کی مذکورہ بالا باتوں کو "کافی پتے کی" "ویوہارک" اور "دور درشی" بتایا ہے۔ لیکن کیا یہ سچ نہیں کہ تصویر کا ایک ہی رخ ہے۔ اس لیے تو لیکھک سنگھ میں ان کے رفیق رام چندر ٹنڈن نے اپنے رد عمل کو ان کی "بھاؤ دھارا، بحیثیت پرکاشکوں کی بھاؤ دھارا" بتایا اور ان پر تیکھی چوٹ کرتے ہوئے لکھا کہ "وہ لیکھک و پرکاشک بھی بن گئے ہیں۔ اپنے پرانے ہمعصروں کے تئیں ہمدردی کا جذبہ کھو بیٹھے ہیں — کیا آپ نہیں مانتے کہ ناشروں میں بڑے بڑے مگرمچھ ہوئے ہیں۔ میں آپ سے مدد پانے کی آس لگائے ہوئے ہوں۔ یہ نہیں کہ آپ ناشروں کے وکیل بن کر سامنے آئیں۔"

(ہندی سے ترجمہ: عادل صدیقی)

نئی کتابیں

میر غلام علی عشرت بریلوی

مصنف : ڈاکٹر احمد سجاد
ناشر : تاج بکڈپو، مین روڈ، رانچی
قیمت : پچیس روپے

احمد سجاد رانچی یونیورسٹی میں اردو کے استاد ہیں۔ پیش نظر کتاب ان کا تحقیقی مقالہ ہے جس پر انھیں ڈاکٹریٹ تفویض ہوئی ہے۔ اس مقالے میں عشرت بریلوی کے عہد اور ان کے سوانح حیات کا بالتفصیل ذکر کرنے کے بعد موصوف کی علمی اور ادبی تصانیف کی نشاندہی کی ہے اور بعد ازاں ان کی شاہکار نثری تصنیف "داستان سحر البیان" کا تنقیدی اور لسانی تجزیہ کیا گیا ہے۔ مقالے کے آغاز میں اصول تحقیق کو پیش نظر رکھتے ہوئے عشرت کی حیات اور ان کی اولاد کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ پھر قدیم تذکرہ نگاروں کے اقتباسات پیش کر کے اس عہد میں عشرت کی ادبی اہمیت کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ان کے شاگردوں (امیرالدین آزاد، احمد حسین راحت اور رائل) کے حالات اور ادبی کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے پھر ان کے معاصرین کا ذکر کیا گیا ہے اور بعد ازاں عشرت کی تصانیف "بغاوت"، "مثنوی ریاض الحسینی"، "دیوان غزلیات" اور "داستان سحر البیان" پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ جن میں سے موخر الذکر پر خصوصی توجہ صرف کی گئی ہے چنانچہ اس داستان کی صحیح قدر و قیمت کو اجاگر کرنے کے لیے پہلے عصری خصوصیات واضح کی گئی ہیں اور اس عہد کے سیاسی حالات نیز دہلوی اور لکھنوی پس منظر پیش کرنے کے بعد روہیل کھنڈ کے سیاسی اور معاشرتی اور ادبی رجحانات کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے اور روہیلکھنڈ کے اہم قلم کاروں، نواب محبت خاں محبت، خواجہ حسن محمد یار خاں امیر اور نیلا محمد نیاز کے حالات اور ادبی کارناموں کو منظر عام پر لایا گیا ہے اس کے بعد مقالہ نگار نے داستان سحر البیان' کے ان تین نسخوں کا تعارف کرایا ہے جو رضا لائبریری رامپور، خدا بخش لائبریری پٹنہ اور پروفیسر ذکی الحق کی ذاتی ملکیت میں نیز ان نسخوں کے اختلافات و مماثلوں پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ پھر قصے کی تلخیص پیش کر کے اس کے اسلوب کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور اسکی لسانیاتی انفرادیت واضح کی گئی اور بالآخر اس داستان کی ادبی قدر و قیمت بیان کرتے ہوئے اُسے اردو کے داستانی ادب کا قیمتی سرمایہ قرار دیا ہے۔

کتاب کے ہر صفحے سے مصنف کی محنت، ذہانت اور ادبی بصیرت کا ثبوت ملتا ہے اور پتہ چلتا ہے جدید اصول تحقیق ہر قدم پر مصنف کے پیش نظر رہے ہیں۔ البتہ ایک آدھ جگہ ایسے ثانوی حوالوں سے کام چلایا گیا جن کے اولین ماخذ نایاب یا اتنے کمیاب نہیں ہیں کہ اصل حوالوں سے اجتناب کی گنجائش نکل سکے۔ استنباط نتائج میں معروضی انداز اختیار کیا گیا ہے جو محقق کے لیے شرط اولین ہوا کرتی ہے۔ زبان واضح اور عام فہم نیز اسلوب دلکش ہے۔ بحیثیت مجموعی اس مقالے کے توسط سے ڈاکٹر احمد سجاد نے نئے محققین میں اپنے لیے جگہ ضرور بنالی ہے۔ کتاب اپنی اہمیت اور افادیت کے اعتبار سے اس لائق ہے کہ ہر اچھی لائبریری کی زینت بنے۔

تنقید و تحریک

مصنف : ڈاکٹر احمد سجاد
ناشر : تاج بکڈپو، مین روڈ، رانچی
قیمت : پچیس روپے

ڈاکٹر احمد سجاد کے تیرہ مختصر تنقیدی اور تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے جسے تین حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ نظریاتی مسائل کے لیے مختص ہے جس میں چار مضامین شامل ہیں (۱) ادب کی بنیادی قدریں اور موجودہ رجحان (۲) تخلیق و تحریک (۳) احتشام حسین کے تنقیدی نظریات (۴) جدیدیت — ایک مطالعہ۔ ان مضامین میں پیش کردہ کئی نکات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن مصنف نے جس مدلل انداز اور متوازن لہجے میں اپنے خیالات پیش کیے ہیں اس کی داد دی جانی چاہیے اکثر متنازعہ امور میں احمد سجاد نے جو معروضی طرزِ بیان اختیار کیا ہے ہماری ہم عصر تنقید میں اس کی بہت کمی ہے۔ کتاب کا دوسرا باب شخصیات کے لیے وقف ہے جس میں عشرت بریلوی، غالب، اقبال، جمیل مظہری اور عروج زیدی کی ادبی حیثیتوں کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے اور فرداً فرداً ہر فنکار پر ایک مضمون اس حصے میں شریک کیا گیا ہے یہاں مصنف نے دیانت داری اور بیباکی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے جن۔ بعض مقامات پر اختلاف ممکن ہے لیکن مقالہ نگار کی نیت پر شبہ کرنے کی گنجائش کہیں نہیں نکلتی ہے۔ آخری حصہ ہم عصر ادبی مسائل پر بحثوں کے لیے وقف کیا گیا جس کے پہلے مضمون میں اردو افسانے کے حال کا اس کے ماضی سے موازنہ کر کے موجود افسانوی صورتِ حال کی وضاحت کی گئی ہے۔ کتاب کے آخری تین مضامین تعلیم و تدریس کے مسائل سے متعلق ہیں اور اردو پڑھنے والے طلبہ کے لیے نئی درسیات کی ضرورت انھیں ادب کی بنیادی قدروں سے متعارف کرانے کی اہمیت اور نثری داستانوں کی تدریس میں پیش آنے والی دشواریوں کے بارے میں سنجیدگی سے اظہار خیال کیا گیا ہے۔

احمد سجاد نے عشرت بریلوی پر اپنے مقالے کے ذریعے بحیثیت محقق جگہ بنائی پیش نظر کتاب کے مضامین ان کی تنقیدی بصیرتوں کے غماز ہیں جس سنجیدہ انداز سے وہ پیچیدہ ادبی نکات پر وضاحت کے ساتھ اظہار خیال کرتے ہیں اس سے توقع

ہے کہ نئی اردو تنقید کو ایک غیر جانبدار نقاد اور مل جائے گا۔ اس مجموعۂ مضامین کا پیش لفظ
پروفیسر گوپی چند نارنگ نے لکھا ہے اور میں ان کے اس خیال سے متفق ہوں کہ:
"ڈاکٹر احمد سجاد نے جو کچھ لکھا ہے تحقیق و تجربے کی روشنی میں لکھا ہے اور محنت اور دلسوزی سے لکھا ہے، انھوں نے خود بھی سوچا ہے اور دوسروں کو بھی سوچنے کی دعوت دی ہے اور ادبیات کے مطالعے میں یہ دعوت ایک نعمت سے کم نہیں۔" (ص ۹)

اس ۱۲۸ صفحات کی قیمت پچیس روپے زیادہ معلوم ہوتی ہے ایسی کتابیں اپنی افادیت اور اہمیت اسی وقت مستحکم کرا سکتی ہیں جب وہ مناسب قیمت کے ذریعے زیادہ سے زیادہ قارئین تک پہنچیں۔

(ڈاکٹر مظفر حنفی)

لب و لہجہ

مصنف: جگدیش بھٹناگر حیات
ناشر: بزمِ سیماب راجوڑی گارڈن نئی دہلی
قیمت: بارہ روپے۔

اپنے شعری سفر کی چوتھی دہائی کو عبور کرتے ہوئے بھی حیات کے یہاں لب و لہجہ کی تازگی کے ساتھ ساتھ تخلیقی رفتار کی پُر شکوہ جولانیاں قاری کو رہ رہ کر متاثر کرتی ہیں۔

علامہ منور لکھنوی کے سایۂ تبرک میں اپنے فنی کردار کی بنیادیں استوار کرنے والا یہ شاعر، رفعتیں، اشک و آہ کے بعد زیر نظر مجموعے کی شکل میں خالص غزل گوئی کے رنگ و آہنگ کا طرۂ امتیاز لے کر منظر عام پر آیا ہے۔ مجموعے میں شروع سے آخر تک ایک ایسی غزلیہ فضا موجود ہے جہاں اچھے اشعار فوراً نظر آجاتے ہیں اور جس طرح وہ خود غزل کا رطب اللسان ہے، اس کی غزلوں کی داد دینے کو جی کرتا ہے۔ فی زمانہ جب کہ غزل کی سکّے بند نوعیت عنقا ہوتی جارہی ہے۔ حیات کے یہاں ان اشعار کی زود اثر شعریت، تغزل آمیز بے ساختگی اور غنائی شیرینی ہر سطح کے ظرف سماعت کی تسکین کے انداز لیے ہوئے ہے ۔

درد دل میں تو اشک آنکھوں میں
بس یہی اختیار ہے اپنا

حیات نے غزل کے بنیادی خدوخال کو، زبان کے رکھ رکھاؤ، سادگی، برجستگی اور بے ساختگی کے ساتھ برقرار رکھا ہے۔ مضامین کے الجھاؤ سے بچ کر، آپ بیتی اور جگ بیتی کے بے تکلف ترجمان کی حیثیت سے حیات نے وہ نرم و نازک شعر کہے ہیں کہ موصوف کا یہ مجموعہ سنجیدہ شعری ادب میں ایک دیرپا اضافے کی ماہیت کا حامل ہوگیا ہے۔

نیلے پیپر بیک میں صاف اور درست چھپائی اس کتاب کی قیمت کا ایک جواز ہے تو شمولات کی ترو تازہ نوعیت دوسرا۔ جو قارئین غزل کے لب و لہجہ کے ہیں ان کے لیے سر دست اس کتاب کی مقبولیت ناگزیر ہے۔

(وشوناتھ سنگھ)

سِلسلہ

مصنف: صادق
قیمت: دس روپے
ناشر: امیج پبلی کیشنز، منظور پورہ، اورنگ آباد۔

سلسلہ صادق کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ جس میں لگ بھگ ۳۱ نظمیں اور ۱۱ غزلیں شامل ہیں۔ پہلا مجموعہ دستخط کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ دستخط سے سلسلہ تک کا یہ سفر کافی ہوشربا اور طلسم انگیز سفر رہا ہے۔ صادق نے عصری شعری جہان میں اپنی ایک الگ سے شناخت قائم کی ہے۔ گو اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی جڑوں نے ماضی میں دور تک پھیل کر روایت سے بھی اپنا رشتہ استوار رکھا ہے اور یہ وہ زندہ و تابندہ روایت ہے جو میر تقی میر، ناصر کاظمی اور میراجی کے راستے سے ہم تک پہنچتی ہے اور یہ روایت بھی زیریں سطح پر اسلوبیاتی رَو کے ذریعہ کبھی کبھی ظاہر ہو جاتی ہے ورنہ صادق اپنے شعری رویے میں بے حد سفاک واقع ہوا ہے۔ صادق کا اسلوب اپنے معاصرین سے نہ صرف یہ کہ منفرد ہے بلکہ سب سے جداگانہ بھی ہے۔

وہ قارئین جنھوں نے صادق کے پہلے شعری مجموعے دستخط کا مطالعہ کیا ہے سلسلہ پڑھ کر ان پر یہ اچھی طرح واضح ہوگیا ہوگا گو اس وقت میرا مقصد دستخط اور سلسلہ کا موازنہ نہیں ہے۔ مگر یہ بتانا ضروری ہے کہ دستخط اور سلسلہ کے شعری رویے میں ایک واضح تبدیلی نظر آتی ہے۔ اور ایسا ہونا ضروری بھی تھا سلسلہ کی تمام نظموں اور غزلوں کو پڑھنے کے بعد یہ محسوس کیا کہ بنیادی طور پر صادق موجودہ عہد کی قدروں سے بیزار ہے سیاست کی ریشہ دوانیاں، اقتصادی بدحالی، سماجی نظام میں بے ڈھنگا پن، مذہب کی آڑ میں وحشیانہ مقاصد کی برآری اور بنیادی طور پر انسان کی بے چہرگی یہ سب باتیں مل کر جس شدید المیے کو جنم دیتی ہیں اس کا اظہار صادق کی بیشتر نظموں میں کافی جرأت کے ساتھ ہوا ہے۔ مثلاً

صادق کا مسئلہ حال سے بیزاری کا ہی نہیں ہے بلکہ حال سے بیزار ہو کر ماضی میں پایہ کہیے کہ ماضی کی اعلا قدروں میں پناہ تلاش کرنے کا بھی ہے۔ صادق کے یہاں ماضی سے قرب کی مثالیں اس کے اسطوری عمل میں عیاں و پنہاں ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ صادق کا اپنے عہد سے ایمان اٹھ گیا ہے بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ جب صادق اسطور سازی کے ذریعہ اپنی قدیم تہذیبی قدروں کی چھان پھٹک کرتا ہے تو وہ در پردہ اپنے موجودہ منظر نامے سے غیر مطمئن ہو کر احتجاجی رویے کو جنم دیتا ہے۔ احتجاج کی بھی مختلف سطحیں ہوتی ہیں ایک احتجاج کی شکل تو ہمارے سامنے وہ ہے جو عام طور پر ہمیں اس عہد کے خصوصاً نوجوان شعرا کے یہاں نظر آتی ہے یعنی براہ راست کسی سیاسی، سماجی، معاشی یا مذہبی رویے کی مذمت کرکے اپنے احتجاجی مزاج کی تشفی کرنا۔ مگر صادق کے یہاں ہمیں احتجاج کی ایک دوسری ہی شکل ملتی ہے۔ وہ حال سے ماضی میں مراجعت کرکے اپنی احتجاجی انا کو برقرار رکھتا ہے کہ یہ بھی ایک احتجاج کی شکل ہے۔ صادق کی غزلوں میں بھی احتجاج کی یہی رمق دکھائی دیتی ہے۔

کتابت اور طباعت دونوں خوب صورت ہیں سر ورق دیدہ زیب ہے۔ کتاب کی قیمت دس روپے ہے۔

آج کل نئی دہلی

اکتوبر ۱۹۸۰ء

حرف تمنا

معین کوثر

قیمت : دس روپے

ناشر : اردو سوسائٹی (بہار) پٹنہ، ۸

'حرف تمنا' معین کوثر کا پہلا شعری مجموعہ ہے جس کی اشاعت میں بہار اردو اکاڈمی کا مالی تعاون بھی شامل ہے۔ یہ مجموعہ تقریباً ۵۱ غزلوں پر مشتمل ہے۔ ابتدا میں "کچھ اپنے بارے میں" عنوان کے تحت معین کوثر نے اپنی تعلیمی اور معاشی پریشانیوں کے ساتھ اپنے شعری سفر کی بابت لکھا ہے اور ان رسائل کی بھی ایک لمبی چوڑی فہرست لکھدی ہے جن میں گاہ گاہ ان کا کلام شایع ہوتا رہا ہے۔ عرض مرتب میں ارشاد علی ارشد کا موقف یہ ہے کہ جو لوگ مسلسل جد و جہد، کشمکش، تگ و دو، محرومی، مایوسی اور شکستگی دل سے دوچار ہوں انھیں شاعری کرنا چاہیے اور اگر وہ شاعری نہیں کرتے تو موصوف کو حیرت ہوتی ہے۔ پتہ نہیں ارشد صاحب نے یہ مفروضہ کیسے قائم کر لیا ممکن ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ آج شاعری ہی سب سے زیادہ آسان فن رہ گئی ہے ورنہ وہ چاہتے تو اظہار و بیان کے سلسلے میں نثری اصناف کی طرف بھی رجوع کر سکتے تھے۔ عرض مرتب کے بعد معین کوثر کی شاعری کے تعلق سے ڈاکٹر عنوان چشتی کا ایک مختصر سا مضمون ہے جس کی حیثیت مشاعرے کی داد سے زیادہ کچھ نہیں۔

حرف تمنا کی تمام غزلیں پڑھنے کے بعد مجھ پر جو پہلا تاثر قائم ہوا وہ یہ ہے کہ معین کوثر مشاعرے کا شاعر ہے اور مشاعرے کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس نے یہ تمام غزلیں کہی ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان اشعار میں کہیں کہیں تازگی کا بھی احساس ہوتا ہے کیونکہ آج کل مشاعروں کی فضا بھی بشیر بدر اور ندا فاضلی جیسے شعرا کی بنا پر کافی بدل گئی ہے اور اب مشاعروں میں ترنم کے علاوہ اچھے اشعار بھی سننے کو مل جاتے ہیں۔ بنیادی طور پر معین کوثر ایک روایتی شاعر ہے۔ حرف تمنا کی غزلوں کا اسلوب بھی نیا نہیں وہی پرانی باتیں۔ وہی پرانی علامتیں اور استعارے استعمال گئے ہیں جس سے ایک مشاعرے کے شوقین کے کان پہلے ہی سے آشنا ہوتے ہیں۔ زود گوئی کی انتہا یہ ہے کہ ہر غزل میں بارہ تیرہ اشعار ہوتے ہیں اتفاق سے ہی کوئی غزل ایسی ہو جس میں چار یا پانچ اشعار ہوں۔ جو اشعار مجھے اچھے لگے ان میں سے چند درج ذیل ہیں۔

اب چہروں سے ڈر لگتا ہے — جانے ان میں کون چھپا ہے

حوصلہ کوئی مری طرح سے کر کے دیکھے — خود اندھیرے میں رہے خواب سحر کے دیکھے

وہ پرچہ جس میں تھی تصویر میری — وہ اب ردی کے بھاؤ بک رہا ہے

اپنے احساس کے آئینے کو اندھا کر کے — ورنہ دنیا کو جو دیکھے گا تو مر جائے گا

کتابت اور طباعت غنیمت ہے اور قیمت بھی کوئی زیادہ نہیں صرف دس روپے۔

الفاف

مصنف : محسن جلگانوی

قیمت : بارہ روپے

ملنے کے پتے : اردو اکیڈمی اے، سی گارڈ حیدرآباد۔ ۴

مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی، بمبئی اور علی گڑھ

'الفاف' محسن جلگانوی کا پہلا شعری مجموعہ ہے جسے آندھرا پردیش اردو اکـ کی مالی اعانت بھی حاصل ہے۔ الفاف کئی حیثیتوں سے انفرادیت کا حامل ہے۔ اس مجمو میں تقریباً پچاس نظمیں اور لگ بھگ اکیاون غزلیں شامل ہیں۔ ان نظموں اور غزلو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ محسن نے ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کے صحت مند دونوں ہی سے اکتساب حاصل کیا ہے، اس لیے ان نظموں اور غزلوں کو باقاعدہ کسی آ رویے یا رجحان سے منسوب کرنا فن اور فن کار دونوں کے ساتھ ہی زیادتی ہوگی۔ کا مقام یہ ہے کہ آج کی نئی نسل ان دونوں رویوں کے جھوٹے آسیب سے چھٹکارا پا ہے اور اس نے اپنے تخلیقی اظہار کے لیے ایک تیسرا ہی راستہ اختیار کیا ہے جو نہ جد کی راہ سے گذرتا ہے اور نہ ترقی پسند تحریک کے راستے سے ہو کر جاتا ہے۔ آج کی نسل نہ تو انفرادیت کا پرچار کرتی ہے اور نہ ہی سماج کے جماعتی وجود سے انکار کرتی اس کے سامنے صرف اپنی ہی بقا کا تصور نہیں بلکہ جس معاشرے میں سانس لے رہ یا جس گروہ یا سماج سے اس کا رشتہ ہے اس کے دفاع کا تصور بھی اس کے پیش نظ بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ آج کا نیا لکھنے والا فن کار نہ صرف اپنے تعلق سے بلکہ پورے معاشرہ کے تعلق سے سوچتا ہے اور پورے معاشرے کو ایک اکائی کی حیثیت سے دیکھتا ہے تو نہ ہوگا۔

محسن جلگانوی کی شاعری میرے اسی نقطۂ نظر کی وضاحت ہے۔ الفاف بیشتر نظمیں عصری آگہی کے اس کرب کو پیش کرتی ہیں جو ہم سب کا مشترک مقدر رہ گیا ہے۔ مثلاً محسن کی یہ نظمیں جیسے زہرہ مہرہ، صلیبوں کی آستینوں پر، منگل سوتر وغیرہ۔

محسن کی شاعری ایک جھنجھلائے ہوئے باغی نوجوان کی شاعری ہے۔ شاعری ہمیں سلاتی نہیں بلکہ چوکنا کرتی ہے۔ عصری سیاست اور عصری سماج کی خبا کو فن بصیرت کے ساتھ محسن نے پیش کیا ہے وہ اپنے آپ میں ایک کارنامہ ہے مثلاً غزل کے یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

تمام رات کی سچائیاں تو لکھ ڈالیں
یہ دن کا جھوٹ کیوں سہے قلم نہ رکے

زاب سے بستر لے آئے تھے ہم ورنہ
اس شہر میں ہر لمحہ زہرایا گیا ہم کو

آستینوں میں لیے پھرتے ہیں کچھ لوگ
ملنے والوں کو گلے اپنے لگایا نہ کرو

فقیہہ شہر سیاست کے اک ہمارے سوا
ہر ایک شخص کو اہل کمال لکھا تھا

ان اشعار کے علاوہ بھی الفاف میں آپ کو جا بجا ایسے اشعار وافر تعداد میں جائیں گے جن سے محسن کی فکر اور سوچ کا پتہ چلتا ہے۔ الفاف، جاگتا آئینہ، سنگم، نجات، منگل سوتر، صلیبوں کی آستینوں پر ایسی نظمیں ہیں جو قاری کو اپنے ساتھ شر

یتی ہیں۔ اگر محسن نے اپنے شعری سفر کو اس آگہی کے ساتھ جاری رکھا تو ممکن ہے آگے بل کر وہ اپنی ایک مخصوص شناخت قائم کرالیں۔ الفاف میں محسن کا لہجہ دھیما ضرور ہے مگر کاٹ سے خالی نہیں۔ محسن نے ابھی چنگاریوں کو جنم دیا ہے اور یہ چنگاریاں ابھی شعلہ نہیں بن پائی ہیں کہ یہ بھی کوئی عیب نہیں کیونکہ الفاف تخلیق کی پہلی جست ہے آخری نہیں۔

قدر شناسی

مصنف : عتیق اللہ

قیمت : بیس روپے

ملنے کے پتے : مکتبۂ جامعہ اردو بازار دہلی
جی ۷ ۱۶/۲۷، راجوڑی گارڈن نئی دہلی ۲۷

آج جب کہ تنقید اپنے اصل مذہب سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ جملے بازی اور لاگ لپیٹ بس کا وطیرہ ہو گیا ہے ایسے عالم میں قدر شناسی تنقید کے تئیں ایک حوصلہ مند رویے کو جنم دیتی ہے اور تنقیدی کاوشوں پر اعتماد بحال کرتی ہے۔ قدر شناسی ڈاکٹر عتیق اللہ کے چھ تنقیدی مضامین پر مشتمل ایک مختصر مگر بھرپور اور جامع کتاب ہے "معروض" کے تحت عتیق اللہ رقم طراز ہیں ــــ

"تنقید میرا پیشہ ہے نہ میں نقاد بننے یا کہلانے کا دعوے دار ہوں میری تنقید محض ان لمحوں کی زائیدہ ہے۔ جب میرا ذہن تخلیق کے علاوہ ایک اور ہی میدان کرب و بلا کے انتخاب پر زور دیتا ہے"

یہاں ہمیں یہ فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ بنیادی طور پر ڈاکٹر عتیق اللہ صرف فن کار ہیں۔ قدر شناسی سے پیشتر ان کا ایک شعری مجموعہ "ایک سو غزلیں" کے نام سے شائع ہو چکا ہے جس میں انھوں نے غزل کے مروجہ عام اسلوب کو توڑ کر اور جرأت سے کام لے کر پہلی مرتبہ ایک نئے شعری منطقے کی بنیاد رکھی۔ اظہار و اسلوب کے لحاظ سے آج بھی یہ غزلیں نئے لکھنے والوں کے لیئے ایک چیلنج کا حکم رکھتی ہیں۔ قدر شناسی میں ہمیں اسی تازگی اور انفرادیت کا احساس ہوتا ہے جو "ایک سو غزلیں" کا خاصہ تھا۔ اسے اتفاق ہی کہیے کہ اردو میں حالی سے لے کر آج تک تخلیقی بصیرت رکھنے والوں نے جب بھی تنقیدی صلاحیتوں کا استعمال کیا تنقید کو ایک نئی جہت اور نئی بساط سے روشناس کرایا سردار جعفری، محمد حسن، ڈاکٹر قمر رئیس، شمس الرحمن فاروقی اور بذات خود عتیق اللہ اس کی واضح مثال ہیں۔ میری نظر میں قدر شناسی غالباً وہ پہلی تنقیدی کتاب ہے جو ترقی پسندوں اور جدیدیت کے علمبرداروں کے درمیانی بعد کو کم سے کم کرتی ہے۔

قدر شناسی کے دو مضمون اردو افسانہ رفت و دیش رفت اور اردو نظم نئے دستخط قابل ذکر ہیں۔ اردو افسانے پر ڈاکٹر عتیق اللہ کا یہ مضمون کافی وسیع اور نظری اور عملی تنقید کی ایک عمدہ مثال پیش کرتا ہے۔ شاعری اور افسانے میں بعد المشرقین ہے۔ عام طور پر اردو میں شاعری کے ناقد تو بہت مل جاتے ہیں یا دیگر لفظوں میں اسے یوں کہیے کہ ہمارے یہاں شاعری کی تنقید تو وافر تعداد میں مل جاتی ہے مگر افسانے کی تنقید نہیں ملتی۔ اس مضمون کو پڑھنے کے بعد محسوس ہوا کہ عتیق اللہ نے اس صنف پر بھی سنجیدگی سے وقت صرف کیا ہے۔ ترقی پسندوں سے لے کر موجودہ عہد کے افسانہ نگاروں کے فن سے متعلق ان کی رائے کافی اہمیت رکھتی ہے۔ آخری مضمون "اردو نظم نئے دستخط ۱۹۶۰ء کے بعد جو نئی نسل ابھر کر سامنے آئی ہے اس کی شعری کاوشوں کے جائزے پر مبنی ہے اور یہ مضمون اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ یہ پہلی کوشش ہے جس کے ذریعہ نئی نسل کے شعرا کو اتنی سنجیدگی سے سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے اور ان کے یہاں امکانات تلاش کیے گئے ہیں ورنہ اب تک بزرگ ناقدین کا رویہ تو یہ رہا ہے کہ انھوں نے یا تو اپنے پیشرؤوں پر وقت صرف کیا یا پھر معاصرین کی آواز میں آواز ملائی اپنے سے بعد والی نسل کو کبھی اہمیت نہیں دی۔ تاہم میں یہ کہوں کہ یہ مضمون اور زیادہ اہمیت کا حامل ہو جاتا اگر ان تمام شعرا کی نظموں سے مثالیں فراہم کی جاتیں جن کا ذکر اس مضمون میں کیا گیا ہے شعری مثالوں کی کمی کی وجہ سے مضمون تشنہ لگتا ہے۔ آخر میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ قدر شناسی نظری اور عملی تنقید کی ایک اچھی مثال ہے۔

بے محاورہ (افسانوں کا مجموعہ)

مصنف : جوگندر پال

قیمت : بیس روپے

کرشن چندر، منٹو، بیدی اور عصمت چغتائی کے بعد جن لوگوں نے افسانے کو سنجیدگی اور فن کارانہ دیانت داری سے اپنایا ہے ان میں جوگندر پال کا نام سب سے اہم ہے۔ "بے محاورہ" سے قبل بھی ان کے کئی افسانوی مجموعے اور ناولٹ منظر عام پر آچکے ہیں۔ غالباً جوگندر پال کا یہ آٹھواں یا نواں افسانوی مجموعہ ہے۔ مگر خوشی کا مقام یہ ہے کہ اس طویل افسانوی سفر میں پال نے اپنے آپ کو کہیں دہرایا نہیں۔

"بے محاورہ" کی کہانیوں کے تعلق سے آج بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ پال نے اپنی کہانیوں کو کسی خاص منطقی جواز کے تابع نہیں کیا۔ اس مجموعے کی بیشتر کہانیوں کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جوگندر پال کے یہاں کوئی ایک لفظ، کوئی ایک جذبہ یا کوئی ایک خیال ذہنی سطح پر روشن ہوتا ہے اور ضبط تحریر میں آتے آتے وہی لفظ، وہی جذبہ اور وہی خیال پھیل کر ایک کہانی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانی کہیں سے بھی شروع ہو جاتی ہے اور کہیں پر بھی ختم ہو جاتی ہے۔ اس لیے ان کہانیوں میں بعض اوقات فکر اور فلسفے کی گہری بصیرت کا احساس ہوتا ہے اور وہ کہانی جوگندر پال کے انفرادی اسلوب یا خود ان کی اپنی شخصیت کا ایک حصہ نظر آتی ہے۔

کرداروں کے تعلق سے صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ جوگندر پال کے یہاں عام طور پر کردار اپنی الگ سے کوئی پہچان قائم نہیں کر پاتے در اصل بات یہ ہے کہ جوگندر پال اپنے تخلیقی موڈ سے مجبور ہیں۔ بعض اوقات وہ اپنے تخلیقی عمل میں اس قدر جذباتی اور حساس ہو جاتے ہیں کہ کردار کی زبان سے وہ خود بولنے لگتے ہیں اور ان کا کردار کہیں دور دھند میں کھو جاتا ہے۔ شاید یہ ہر بڑے فن کار کی تخلیقی مجبوری ہے۔ مگر اتفاق سے "بے محاورہ" میں انھوں نے اپنے کرداروں کو کہیں کہیں آزاد بھی چھوڑ دیا ہے۔

اسلوبیاتی سطح پر اپنے معاصرین میں جوگندر پال وہ واحد افسانہ نگار ہیں جو کسی نئے اخذ و قبول کے بغیر اپنی الگ سے شناخت قائم کرتے ہیں۔ عام طور پر اردو افسانوی ادب میں ذہن کی آزادانہ رو کا ذکر بڑی شد و مد سے ہوتا ہے اور فیشن کے طور پر ہر افسانہ نگار

کے یہاں اس "رَو" کی تلاش کرنے کی ناکام جسارت کی جاتی ہے۔ گو اس کے یہاں ذہن کی آزادانہ رو کا کہیں دور تک پتہ نہیں ہوتا۔ اردو فکشن میں ذہن کی آزادانہ رو کا تخلیقی اور فنکارانہ استعمال سب سے پہلے سجاد ظہیر کے ناولٹ "لندن کی ایک رات" کرشن چندر کا "مٹی کے صنم" قرۃ العین حیدر کا "آگ کا دریا" اور ان کے بیشتر افسانوں میں ہوا ہے۔ موجودہ عہد میں ذہن کی آزاد رو کا تخلیقی اظہار صرف جوگندر پال کے یہاں ملتا ہے اس حیثیت سے ان کے معاصرین کو ان سے کوئی نسبت نہیں۔

جوگندر پال کے افسانوں میں ہمیں اکثر نوسٹلجیا کا عمل نظر آتا ہے۔ دراصل انھوں نے اپنے افسانوں کے ذریعہ ماضی کی زندہ اور درخشاں قدروں کی بازیافت کی ہے۔ حال سے ان کے یہاں انحراف ملتا ہے۔ بے چینی ملتی ہے۔ وہ موجودہ تہذیبی قدروں کے ٹوٹنے اور بکھرنے کے المیے سے پوری طرح باخبر ہیں اس لیے ان کے افسانوں میں ہمیں عصری آگہی کا کرب اپنی تمام شدت کے ساتھ ملتا ہے۔ "بے محاورہ" کی چند کہانیاں مثلاً "ہرا بھرا"، رلائن بستیاں، پھول، جڑیں اور شاخیں، دریاؤں پیاسے، رتیں، نہ رکیں اور "بے محاورہ" ایسی کہانیاں ہیں جو قاری کو اپنے ساتھ شریک کر لیتی ہیں۔ غالباً یہ ایسی کہانیاں ہیں جنھیں آسانی سے فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ بے محاورہ میں ایک تین سطروں کی کہانی "بے درد" بھی شامل ہے۔ جسے کہانی کہتے ہوئے ذرا سوچنا پڑتا ہے۔ سرورق اور کتابت وطباعت اوسط درجے کی ہیں کتاب کی بیس روپے قیمت کچھ زیادہ ہی ہے۔ (شکیب نیازی)

کنور —— ایک عظیم بنگالی شاعر

تنقید و تجزیہ —— ابوبکر جیلانی
صفحات —— پانچ سو
قیمت —— بیس روپے
ملنے کا پتہ —— اقدار کتاب گھر ۲۵/ اے
شمس الہدیٰ روڈ کلکتہ ۱۷

کنور جن کا اصل نام مہاراجہ آپور بو کرشن بہادر ہے آخری مغل تاجدار ابوظفر بہادر شاہ ظفر کے دربار سے بھی وابستہ رہے ہیں۔ اور خاقانی ہند ملک الشعراء شیخ محمد ابراہیم ذوق اور حکیم مومن خان مومن کے معاصر بھی رہ چکے ہیں۔ اس کتاب میں انھیں گمنامی کے غاروں سے نکال کر ابوبکر جیلانی نے حلقۂ شعر و ادب میں روشناس کرانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ کتابت وطباعت دونوں خوب سے خوب تر ہیں لیکن افسوس پروف نہیں دیکھے گئے ہیں اس لیے کتابت کی غلطیاں بہت زیادہ ہیں قیمت بھی مناسب نہیں ہے۔ تاہم یہ بہت بڑی ادبی خدمت ہے کہ اردو کے ایک عظیم بنگالی شاعر کو جنھیں زمانہ نے فراموش کیا تھا اسے ابوبکر جیلانی نے زندۂ جاوید کر دیا ہے۔ کنور کے کلام میں ہر مضمون کے بے شمار منتخب اشعار موجود ہیں۔ ان میں سے کچھ اشعار کو میں نے بھی آویزۂ گوش بنایا ہے اور کچھ کو دل و دماغ کے اوراق کی زینت کیا ہے۔ بطور نمونہ چند اشعار سماعت فرمائیے۔ اور لطف اندوز ہوئیے۔

جس کا نام و نشاں نہیں معلوم ہم سے اور اس سے آشنائی ہے

عالم رویا میں، میں رویا بہت ہم نشیں بتلا تو کیا تعبیر ہے

زلفوں میں تری جب سے گرفتار ہوئے ہم ہر ایک کی نظروں میں گنہگار ہوئے ہم

آزردہ بات بات پہ ہوتے ہو کس لیے آپس میں ایسی ہوتی ہے اکثر ہزار بات

نشان ہے عاشق مغموم کا یہ نظر کرتا ہے ادھر اُدھر چپ

نقطے اور لکیریں (امین تابش کا شعری مجموعہ)

صفحات —— ۱۱۴ ایک سو چودہ
قیمت: —— آٹھ روپے
ملنے کا پتہ: —— ۱۷۸ جی بی روڈ باندرا بمبئی ۵۰

"نقطے اور لکیریں" کے شروع میں "کچھ اپنی باتیں" کے عنوان سے تابش نے اپنے تعارف کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ "ایک شاعر کا بہترین تعارف اس کا کلام ہی ہو سکتا ہے۔ اس لیے ان کے کلام کے کچھ نمونے درج کیے جاتے ہیں ملاحظہ ہوں ؎

بدلتی قدروں کے اسباب پر نظر رکھنا بہت ضروری ہے حالات کی خبر رکھنا
اسے تو آج کی دنیا غلط سمجھتی ہے کوئی اصول کوئی نقطۂ نظر رکھنا

بچ بچ کے گذرنا بھی اک خام خیالی ہے پتھر کہیں برسے ہیں شیشوں کے مکاں
الزام جو رکھنا ہے پھر شوق سے تم رکھنا کچھ دیکھ لو آنکھوں سے کچھ سن بھی لو کان
یہ مصلحت اندیشی مانا کہ بڑی شئے ہے چلتا نہیں دنیا میں کیا کام بہانوں

امین تابش کا یہ مجموعہ کلام۔ ولولوں، ہنگاموں اور شراب و کباب سے بالکل خشک ہے اور "تقسیم وطن" کے بعد کے حالات سے متاثر شاعری کا بہترین شاہکار ہے۔ اس لیے وہ "غم زدہ ہیں میر تقی میر کی طرح" اور چشم پر آب کہتے ہیں ؎

لفظوں کے وار جملوں کے تیور تو دیکھیے
چلنے لگی زبان بھی شمشیر کی طرح
پہچانتے ہوئے بھی وہ پہچانتے نہیں
گذرے میرے قریب سے رہ گیر کی طرح

لیکن اس کے باوجود ؎

رندان خوش مزاج کی محفل رہے گی گرم
تابش سا بادہ خوار نہیں تو نہیں سہی

نغمے اور نکیریں' کا نام اگر کتاب حیات تابش ہوتا تو زیادہ دلکش ہوتا۔ بہرحال اس عہد حاضر کے 'غم زدہ شاعر' جناب امین تابش کے کلام کا مطالعہ لطف سے خالی نہیں ہے۔

نوائے اُردو ــــــ معروف شریفی کا مجموعۂ کلام

صفحات ــــــ ۹۶
ملنے کا پتہ ــــــ نوائے اردو تقریب کمیٹی بمبئی ۳

بنارس یا وارانسی جسے 'علی حزیں' نے 'معبد عام' کے نام سے یاد کیا ہے معروف شریفی اسی معبد کے پجاری ہیں۔ اور ان کے کلام میں جہاں 'شام اودھ' (لکھنؤ) کا سلونا پن ہے وہاں 'صبح بنارس' کی صباحتیں بھی ہیں اور حسین و جمیل گھاٹوں کے دلکش مناظر کی عکاسی بھی ہے۔ نظمیں تمام کی تمام قومی اور حب الوطنی کے جذبات کی حامل ہیں۔ بعض نظموں میں مصلحتوں کے تحت مشاہیر وطن اور شعر و ادب کی قصیدہ گوئی بھی ہے۔ لیکن مجموعی حیثیت سے تمام نظمیں ایسی ہیں کہ انھیں 'نوائے اردو' کی بجائے بقول سردار جعفری 'نوائے دل' کہنا چاہیے۔ معروف شریفی بمبئی کے 'نمک خواروں' میں ہیں لیکن اسے اس انداز سے خراج تحسین پیش کرتے ہیں ؎

کوئی عشرت کا ہے بندہ کوئی عسرت کا شکار
کوئی صید آرزو ہے کوئی غم سے بے قرار
چین کی صورت بہ ہر صورت کہیں ملتی نہیں
شہر تو اچھا ہے لیکن دل ہیں سب کے داغدار
کیا بتاؤں ہم نشیں کیا ہے دیار بمبئی

غزلوں کے بھی چند منتخب اشعار ملاحظہ ہوں ؎

نظارے پر لگائی ہیں پابندیاں مگر
جلوے ہوں بے حجاب تو پھر کوئی کیا کرے؟

سر زلف تمنا رہی اک مدت سے
کبھی تو دل کو میسر ہو اس سے آزادی

راہ وفا میں اب بھی غزل خواں ہے زندگی
ترے حسیں خیال سے شاداں ہے زندگی

معروف شریفی کا یہ مجموعہ کلام "نوائے اردو" قومی نظموں اور غزلوں کا ایک دلکش مرقع ہے اور اس قابل ہے کہ اس کا پر شوق نگاہوں سے مطالعہ کیا جائے اور معروف شریفی کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

رخان غازی کابلی،

تلاشِ دبیر

مصنف : کاظم علی خاں
ناشر : مصنف (تقسیم کار : نصرت پبلشرز، حیدری مارکیٹ، امین آباد لکھنؤ ۱)
صفحات : چار سو (تقطیع $\frac{18 \times 22}{8}$) مجلد
قیمت : تیس روپے
سنہ اشاعت : دسمبر ۱۹۷۹ء

اردو ادب خصوصاً مرثیے کی گفتگو ہوتی ہے تو عموماً مرزا دبیر اور میر انیس کا نام ساتھ لیا جاتا ہے۔ ابتدا میں دونوں باکمالوں کا مرتبہ قریب قریب برابر کا تھا بلکہ دبیر کو انیس سے کچھ افضل ہی سمجھا جاتا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ انیس کی مقبولیت بڑھتی گئی اور اسی تناسب سے مرزا دبیر کی طرف اہلِ ادب کی توجہ کم ہوتی گئی۔ دونوں اساتذہ پر ہونے والے تحقیقی کام کا موازنہ اس بتدریج بدلتی ہوئی صورتِ حال کی بعینہٖ عکاسی کر سکتا ہے۔ مرزا دبیر کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ اردو کے غالباً پہلے شاعر ہیں جن کی زندگی ہی میں ان کی حیات اور شاعری پر ایک مستقل کتاب ("شمس الضحیٰ" از صفدر حسین) تالیف کی گئی تھی، بلکہ ان سے پہلے شاید اردو کے کسی مرحوم شاعر پر بھی کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی گئی تھی۔ لیکن اس کے بعد سے میر انیس پر تحریروں کی تعداد بڑھتی گئی اور آج اقبال اور غالب کے بعد سب سے زیادہ کتابیں اور دوسری تحریریں میر انیس ہی کے بارے میں ملتی ہیں۔ اُن کے مقابلے میں مرزا دبیر پر بہت کم کام ہوا، درحالے کہ وہ اس سے زیادہ کے مستحق تھے۔ خوشی کی بات ہے کہ حالیہ چند برسوں میں ہمارے بعض لکھنے والوں کو اس کمی کا احساس ہوا ہے اور انھوں نے کسی حد تک اس کی تلافی کی کوشش کی ہے۔ ان لکھنے والوں میں کاظم علی خاں کا نام بہت نمایاں ہے۔ وہ مرزا دبیر سے متعلق مختلف پہلوؤں پر بڑی محنت سے تحقیقی کام کرتے رہے ہیں۔ ان کی تازہ ترین کتاب "تلاشِ دبیر" ان کی اسی محنت کا ثمرہ ہے۔ یہ کتاب ایک طرف عام پڑھنے والوں کو مرزا دبیر کے وزن و وقار کا اندازہ کراتی ہے۔ دوسری طرف مرزا دبیر پر کام کرنے والوں کی طرح طرح سے رونمائی کرتی ہے۔ مثلاً مضمون "دبیر نما" میں سولہ سو ایسی کتابوں اور متفرق تحریروں کی نشان دہی کی گئی ہے جن میں مرزا دبیر کی شخصیت اور فن سے متعلق مواد موجود ہے۔ دبیر کا مطبوعہ کلام بھی اب غیر مطبوعہ کا حکم رکھتا ہے، خصوصاً ان کے مرثیوں اور دوسرے منظومات کے مجموعے "دفترِ ماتم" کی بیسوں جلدیں شاید کہیں بھی یکجا نہ ملیں گی۔ اس کلیات کے مشتملات کے بارے میں طرح طرح کے غلط مبحث اور غلط فہمیاں تھیں۔ کاظم علی خاں نے "دفترِ ماتم" کی بیسوں جلدوں کے متعلق مستند معلومات فراہم کر دی ہے۔ انھوں نے مرزا دبیر کی غزلوں اور مثنویوں کا تحقیقی جائزہ بھی لیا ہے، ان کے نادر کلام کی بازیافت بھی کی ہے اور ان کے کئی مرثیوں کے زمانۂ تصنیف کا سراغ بھی لگایا ہے، اور ایک بہت مفید کام یہ کیا ہے کہ مرزا دبیر کے مطبوعہ مرثیوں کے مطلعوں اور مقطعوں کے جامع اشاریے مرتب کر دیے ہیں۔ مطلعوں کے اشاریے سے ہمیں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ دبیر کا کون مرثیہ کہاں کہاں چھپا اور اس میں کتنے بند ہیں۔ یہی التزام مقطعوں کے اشاریے میں بھی ہے اور ہر مقطعے کے ساتھ یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ جس مرثیے کا یہ مقطع ہے اس کا مطلع کیا ہے اور وہ مرثیہ کس کے حال میں ہے۔

کتاب میں مرزا دبیر کے ہاتھ کی تحریروں اور بعض اور دستاویزی تحریروں کے متعدد عکس بھی شامل ہیں جن سے اس کتاب کی افادیت میں مزید اضافہ ہوا ہے۔

"تلاشِ دبیر" کو بلا تامل سلسلۂ دبیریات کی اہم ترین کتابوں کے ساتھ رکھا جاسکتا ہے اور کاظم علی خاں ہمارے شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ہماری زبان کے ایک بڑے شاعر پر تحقیق کا حق ادا کرتے ہوئے اس کے متعلق ہماری معلومات کو بہت آگے بڑھا دیا ہے۔ (نیر مسعود)

تناظر ۲

ترتیب وادارت :- بلراج ورما ، کرشن موہن

پبلشر :- تناظر پبلیکیشنز ۔ نئی دہلی

قیمت :- چالیس روپے

بلراج ورما کو نجم سے لگاؤ ہے اور کرشن موہن کو بسیار نویسی سے محبت لیکن دونوں سلیقہ پسند اور ہوش مند ادیب اور شاعر ہیں۔ تناظر ۱ بھی ضخیم کتاب تھی اور ہر لحاظ سے مختلف النوع اصناف ادب کی حامل بھی ۔ تناظر ۲ بھی ۴۹۶ صفحات پر پھیلا ہوا ہے لیکن اس پھیلاؤ میں کسی طرح کی بے ترتیبی اور انتشار ڈھونڈنا ممکن نہیں۔

جریدہ بلراج ورما کی طرز ترتیب و تزئین اور کرشن موہن کی شعر شناسی کی منھ بولتی تصویر ہے۔ اس میں شامل شاعروں کو خانوں میں نہیں بانٹا جاسکتا۔ یہ سلسلہ ہے پہاڑیوں اور پہاڑوں کا جو ایک کے بعد ایک اپنا منظر پیش کرکے دیکھنے والے کو دعوت نظارہ دیتے ہیں۔

مرتب اور مدیر خوش اطوار، خوش ذہن اور خوش فکر قلندر صفت لوگ ہیں۔ انھیں تو خوشی بانٹنی ہے اور ہر کسی کو بانٹنے کی کوشش کرنی ہے۔ شاعروں میں بانی سے لے کر انوار رضوی تک شاملِ کتاب ہیں۔ اپنی آب و تاب اور ماند چمک کے ساتھ۔ یہ کام قاری کا ہے کہ وہ 'اعلیٰ' اور 'ادنیٰ' شاعری میں تمیز کرے۔ ایک بار رسالے کی پوری ضخامت پر نظر ڈالنے کے بعد شعر اور شاعر کا انتخاب کرے۔ جو اسے ارفع لگتا ہے اس پر نشان لگائے اور جو 'ادنیٰ' نظر آتا ہے اسے نشان زد کردے۔

لوگ کہتے ہیں کہ تناظر بھی گروہ بندی کا شکار ہے۔ یہ بات صرف وہی کہتے ہیں جو کسی وجہ سے تناظر میں جگہ نہیں پا سکے ورنہ بلراج ورما اور کرشن موہن جیسے انسان گروہ بندی کے پھندے میں آ ہی نہیں سکتے۔ اسی لیے وہ ناموں کے پیچھے نہیں بھاگے۔ انھوں نے تو کسر نفسی میں مبتلا شاعروں کا بھی حوصلہ بڑھایا ہے اور انھیں اپنے فن کے بارے میں غور کرنے کا موقع فراہم کیا ہے۔

تناظر ۲ شاعری کی تمام متعلقہ اصناف سے مزین ہے۔ نظمیں، غزلیں، رباعیاں، قطعات، دوہے اور منظوم ترجمے شاملِ شمارہ ہیں۔ اچھی چیزوں کی کمی نہیں۔ باقی، راج نرائن راز اور اندر سروپ دت ناداں کی گراں قدر شاعری کے شانہ بشانہ کرشن مُرارِی کے دوہے اپنی لوچ اور سوچ کے ساتھ ہماری توجہ کو اپنے پر مرکوز کرتے ہیں۔

آج کل علامہ اقبال کا طوطی بول رہا ہے۔ اس لیے اقبالیات پر بہترین پر مغز مضامین شامل کرکے مرتب اور مدیر نے تناظر ۲ کو زیادہ پر وقار بنا دیا ہے۔

کنور سین

مسدس عالی

مصنف : سریر کابری صفحات: ۹۶

مرتب : داؤد اختر قیمت : ۵ روپے

سریر کابری کی شخصیت اور شاعری محتاج تعارف نہیں "شاہنامہ ہند" ان کی وہ معرکتہ الآرا تصنیف ہے جس نے ابوالکلام آزاد سے بھی داد تحسین پائی تھی۔

سریر کابری فطری شاعر تھے کسبی نہیں۔ ان کو تمام مروجہ اصناف سخن پر یکساں عبور حاصل تھا۔ ان کی شاعری میں فکر و فن کی اعلیٰ قدریں ملتی ہیں۔ حیرت ہے کہ سریر جیسے عدیم العصر شاعر کی کماحقہ قدر نہ کی گئی۔

مسدس عالی سریر کابری کے غیر مطبوعہ کلام کا مجموعہ ہے جسے ان کے صاحبزادے نے مرتب کیا ہے۔ ادیب حسن ادیب نے "عرض حال" اور "مقام سریر" میں سریر کی ادبی حیثیت اور ان کی شاعرانہ ہمہ جہتی پر اجمالی روشنی ڈالی ہے۔

مسدس عالی، مسدس حالی کے طرز پر لکھی ہوئی ایک لطیف طنز یہ مسدس ہے جو ۱۰۱ بندوں پر مشتمل ہے۔ سریر نے بڑے لطیف پیرائے میں ان تمام خرابیوں کا ذکر کیا ہے جو ہمارے معاشرے میں راہ پا گئی ہیں۔ آزادی کے بعد بھی ہماری عادتیں نہیں بدلیں اور ہم ذہنی پستی اور اخلاقی زوال کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں۔ اور ہم میں جمہوری مزاج پیدا نہیں ہوسکا ہے۔ سریر نے بڑے دلکش انداز میں ہمیں آئینہ دکھایا ہے۔

نصیبوں سے بارے یہ ساعت بھی آئی   کہ آزاد ہونے کی نوبت بھی آئی
گئے غیر اپنی حکومت بھی آئی   جسے کھو چکے تھے وہ دولت بھی آئی
مقدر کے آئین محکم نہ بدلے
زمانہ تو بدلا مگر ہم نہ بدلے

اس طویل نظم کے علاوہ اس مجموعہ میں ۱ نظمیں اور غزلیں ۴ رباعیاں اور ۸ قطعات شامل ہیں جنھیں پہلی بار شرف اشاعت حاصل ہوا ہے۔ ان نظموں غزلوں، قطعات، رباعیات میں سریر کا مخصوص انداز طرز اور زبان و بیان کی ساری خوبیاں موجود ہیں۔

بحیثیت مجموعی "مسدس عالی" ایک بزرگ شاعر کا کلام ہے۔ کتابت طباعت اچھی ہے۔ قیمت بھی زیادہ نہیں۔ داؤد اختر لائق مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اسے شائع کرکے اس سے مستفید ہونے کا موقع بخشا۔ امید ہے ادبی حلقوں میں اس کی پذیرائی کی جائے گی۔

محفوظ الحق

وطن میں آج شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

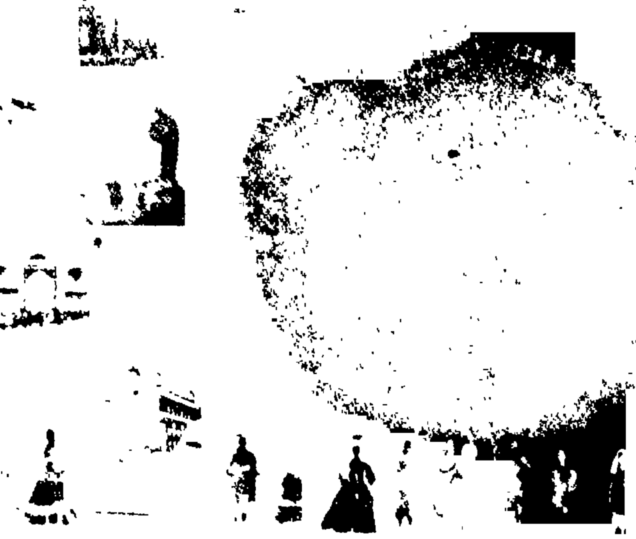

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

ہم ایک ہیں

بچوں کو کسی بھی زبان میں تعلیم دیں، کچھ بھی سکھائیں۔ پیار و محبت ضرور سکھائیں اور ان کو سکھانے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ آپ خود ایسے بنیں جیسا بچوں کو بنانا چاہتے ہیں۔

Regd. no. A(D-103) — Licensed U(D) - 50 to post without pre-payment
R. N. 948/57 at Civil Lines Post Office, Delhi

ZAKIR HUSAIN LIBRARY JAMIA NAGAR NEW DELHI

ہماری کتابیں

۱۔ **مشعلِ آزادی** (ساغر نظامی) قیمت ۴ روپے
ہندوستان کی جنگِ آزادی کی منظوم داستان (حصہ اول) ۲۴۰ صفحات پر مشتمل جس میں ۱۸۵۷ء تک کے واقعات شامل ہیں۔ دیدہ زیب کتابت وطباعت عمدہ مجلد مع گرد پوش۔

۲۔ **بھارت خلائی دور میں** قیمت بارہ روپے
خلائی سائنس کی دلچسپ داستان۔ سری ہری کوٹہ کی سیر، رازہائے سربستہ کا انکشاف نہایت آسان زبان، خلائی کوششوں کا ہلکے پھلکے انداز میں بیان۔ ۱۴۰ صفحات کی کتاب۔ کاغذ عمدہ، تصاویر سے مزین۔

۳۔ **پہیلیاں** قیمت آٹھ روپے
پانچ سو سے زیادہ پہیلیوں کا مجموعہ جن سے بچے اور بڑے یکساں طور پر لطف اٹھا سکتے ہیں۔

۴۔ **رنگ برنگے پھول** قیمت دس روپے
بچوں کے شاعر شفیع الدین نیر، شفیق سیوہاروی، افسر میرٹھی، اسمٰعیل میرٹھی، تلوک چند محروم اور دیگر بہت سے شعرا کی آسان زبان میں لکھی ہوئی نظمیں۔

۵۔ **آج کل کی کہانیاں** قیمت گیارہ روپے
۱۹۶۴ء سے ۱۹۷۸ء تک رسالہ "آج کل" میں شائع شدہ مشہور کہانیوں کا مجموعہ جس میں واجدہ تبسم، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر اور دیگر افسانہ نگاروں کے شہ پارے شامل ہیں۔

۶۔ **کون جیتا کون ہارا** قیمت ۹ روپے
بچوں کے لیے آسان زبان میں لکھی ہوئی دو دلچسپ کہانیاں۔ کتاب شروع کرنے کے بعد ایک ہی نشست میں ختم کرنے کو جی چاہتا ہے۔ عمدہ کتابت۔

۷۔ **ہندوستانی تہذیب [illegible]مانوں پر اثر** (ڈاکٹر محمد عمر) قیمت ۲۰ روپے
ڈاکٹر تاراچند نے اپنی مشہور تصنیف میں ہندوستانی تہذیب پر مسلمانوں کے اثرات کا جائزہ لیا تھا۔ ڈاکٹر محمد عمر نے اپنی اس محققانہ کاوش میں یہ دکھایا ہے کہ ہندوستانی تہذیب مسلمانوں کی زندگی میں سرایت کئے ہوئے ہے۔

۸۔ **مرقعِ اقبال** (جگن ناتھ آزاد) قیمت ۵۰ روپے
علامہ اقبال کی زندگی کے اہم واقعات، شجرۂ نسب اور نادر تصاویر اور تحریروں کا البم۔

۹۔ **یہ ہندوستان** (شیلا دھر) قیمت ۱۰ روپے
اس باتصویر کتاب میں سادہ اور سہل زبان میں بچوں کو ہندوستانی تہذیب وتمدن کے ساتھ ساتھ تاریخی معاشی اور سماجی حالات سے آگاہ کیا گیا ہے۔ رنگین تصاویر۔

۱۰۔ **سرسید احمد خاں** (پروفیسر خلیق احمد نظامی) قیمت ۵ روپے
ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی، ثقافتی اور سیاسی زندگی پر ان کے کارناموں کا زبردست اثر پڑا ہے۔ اس بات کو بڑے عالمانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

۱۱۔ **ابوالکلام آزاد** (عرش ملسیانی) قیمت پانچ روپے
ابوالکلام آزاد جدید ہندوستان کے معماروں میں ہیں۔ ان کی زندگی کا حسین و دلکش انداز میں بیان۔

۱۲۔ **جواہر لال کی کہانی تصویروں کی زبانی** قیمت ۳ روپے ۵۰
محبوب رہنما اور ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم شری جواہر لال کی زندگی کے دلچسپ واقعات رنگین تصاویر میں۔ بچوں طالب علموں کے لیے بہترین تحفہ۔

۱۳۔ **ہم ایک ہیں** (عرش ملسیانی) قیمت ۱ روپے
ہندوستان کی ثقافتی وسماجی گوناگونی اور یک رنگی کا دلچسپ بیان۔ قومی زندگی کی توانائی کی داستان۔

۱۴۔ **پھلوں اور سبزیوں کو محفوظ رکھنے کے طریقے** قیمت دو روپے ۵۰ پیسے
گھریلو عورتوں کے جام جیلی، مارملیڈ، چٹنی مربے اور اچار بنانے کے متعدد طریقے تصویروں کے ذریعے بتائے گئے ہیں۔ بڑی آسانی سے آپ گھر بیٹھے اپنی من پسند چیزیں بنا سکتے ہیں۔

"آجکل" کے خریداروں کو ۲۰ فی صد رعایت۔ محصول ڈاک ہمارے ذمے
دس روپے سے کم قیمت کی کتابیں بذریعہ وی۔ پی نہیں بھیجی جائیں گی۔ پوسٹل آرڈر بھیجئے یا وی۔ پی طلب کیجئے۔

ملنے کا پتہ: بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

آجکل

بر ۱۹۸۰ء

ا روپیہ

4/Ag. 75

11.11.80

ZAKIR HUSAIN LIBRARY
JAMIA NAGAR
NEW DELHI-11002.

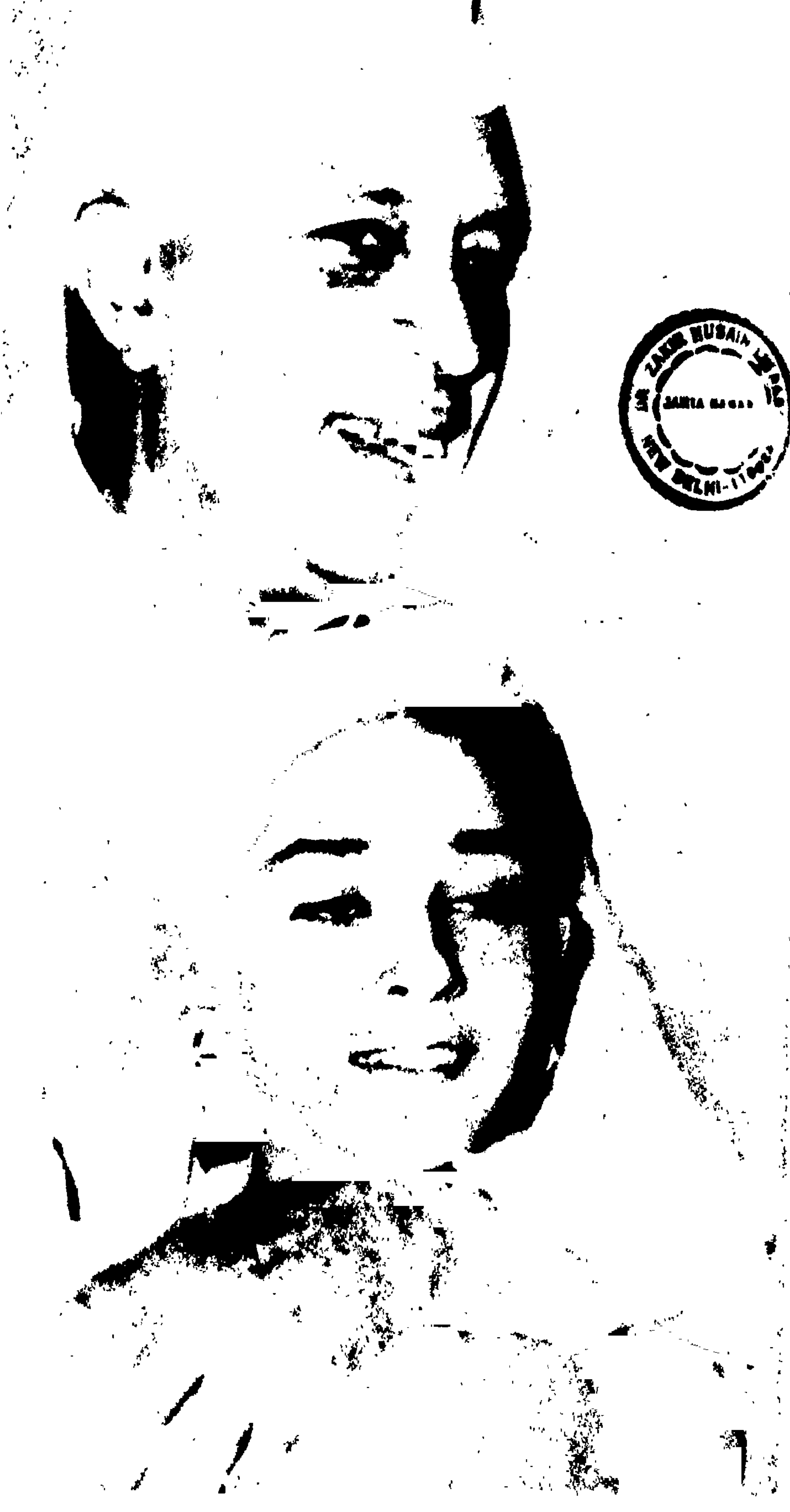

شری جے پرکاش نرائن کی یادیں

عظیم قومی رہنما شری جے پرکاش نرائن کی پہلی برسی کے موقع پہ محکمۂ ڈاک و تار کی جانب سے ایک یادگاری ٹکٹ جاری کیا گیا۔ ۸ر اکتوبر ۱۹۸۰ء کو وزیرِ مواصلات شری سی۔ ایم۔ اسٹیفن نے اس یادگاری ٹکٹ کا ایک البم نائب صدرِ جمہوریۂ ہند شری ہدایت اللہ کو پیش کیا۔

امر شہید سکھ دیو

آزادی کے لیے جان دینے والوں میں سکھ د
کی قربانیاں ہمیشہ یاد رہیں گی۔ سکھ دیو کے بڑے بھا
شری متھرا داس تھاپڑ نے "امر شہید سکھ دیو" کے نام
ان کے بارے میں ایک کتاب لکھی ہے جس کا اجرا وزیر
ہند نے نئی دہلی میں ۷ر اکتوبر ۱۹۸۰ء کو کیا۔ وزیر اعظ
شری تھاپڑ سے مصروفِ گفتگو ہیں۔

پھول والوں کی سیر میل ملاپ کا تہوار

دہلی میں پھول والوں کی سیر کا میلہ صدیوں سے لگتا ہے اس سال یہ میلہ ۹ر سے ۱۱ر اکتوبر تک منایا گیا۔

۶ر اکتوبر ۱۹۸۰ء کو وزیرِ اعظم ہند کو "پنکھا" پیش کیا گیا ہے جو قومی یکجہتی کی علامت ہے۔ (بائیں)

اردو کا مقبولِ عام مصور ماہنامہ

آجکل (اردو)

نئی دہلی

ایڈیٹر
شہباز حسین

اسسٹنٹ ایڈیٹر
محمد عادل صدیقی

سب ایڈیٹر
شوناتھ سکہ

جلد ۳۹ شمارہ ۴

نومبر ۱۹۸۰ء

کارتک اگرہائن شک سمت ۱۹۰۲

فون: ۳۸۷۰۶۹۱

شرح چندہ

	ہندوستان	پاکستان	دیگر ممالک	
سالانہ	۱۰ روپے	۱۶ روپے	۳ ڈالر	۱/۵۰ پونڈ
دوسالہ	۱۸ روپے	۲۸ روپے	۵/۴۰ ڈالر	۲/۷۰ پونڈ
سہ سالہ	۲۵ روپے	۳۸ روپے	۷/۵۰ ڈالر	۳/۷۵ پونڈ
فی کاپی	ایک روپیہ	ڈیڑھ روپیہ	۴۵ سینٹ	۱۵ پنی

DR. ZAKIR ... NEW DELHI-11...

ترتیب

ملاحظات ———— ۲
جواہر لال نہرو کی عظمت کا راز ———— سردار احمد ———— ۳
غزل ———— سکندر علی وجد ———— ۵
وہ آنکھ (نظم) ———— اندر سروپ دت نادان ———— ۵
مہاراجہ رنجیت سنگھ ———— کے، کے کھلر ———— ۶
اقبال سے اقبال جا گا تمثیل ناٹک ———— سلیم تمنائی ———— ۱۰
فسانہ کہیں جسے (کہانی) ———— رفعت نواز ———— ۱۶
حافظ محمود خاں شیرانی ———— نند کشور وکرم ———— ۱۹
غزلیں ———— رحمٰن مین پوری، مسعود شمس، منظور ندیم، شاہد ساگری، مظہر مجیدی، پرکاش تیواری ———— ۲۲
مندا کنی (کہانی) ———— کنور سین ———— ۲۳
شمس بلگرامی ———— عادل صدیقی ———— ۲۷
غزلیں ———— خاطر حافظی، کفیل الرحمٰن نشاط، نشاط سعید، اثر انصاری، سیفی سرونجی ———— ۲۹
تکون کا کرب (کہانی) ———— کشوری منچندہ ———— ۳۰
دیوانِ حافظ کا شاہی نسخہ اور دلچسپ فالیں ———— ریحان غنی ———— ۳۲
وقت وقت (کہانی) ———— ویریندر پٹواری ———— ۳۴
فکر وفن کی معراج "کفن" ———— صغیر ابراہیم ———— ۳۶
غزلیں ———— شان فخری، شبیر آصف ———— ۳۸
علامہ اقبال کی مختصر کتابیات ہندوستان میں۔ محمد اقبال ———— ۳۹
نئی کتابیں۔ ———— ۴۱

سرورق عکس: گورچرن اروڑہ

ڈائرکٹر پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

مضامین سے متعلق خط وکتابت کا پتہ
ایڈیٹر "آج کل" معرفت پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترسیلِ زر کا پتہ
بزنس منیجر، پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ملاحظات

جواہر لال نہرو

پنڈت جواہر لال نہرو کی شخصیت کے انیک پہلو ہیں۔ اور ہر پہلو اتنا اہم ہے کہ ان کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ لیکن اس وقت ہمیں جس پہلو کو سب سے زیادہ نمایاں کرنے کی ضرورت ہے وہ ان کی انسان دوستی ہے۔ مذہب، رنگ و نسل، ذات پات وہ ہر قسم کے بھید بھاؤ سے بلند تھے۔ اسی لیے جدید ہندوستان اسی راہ پر گامزن ہے جو نہرو اور گاندھی کی راہ ہے۔

جواہر لال نہرو نے لوگوں کے دلوں پر حکومت کی ہے۔ اس لیے کہ انھوں نے اپنے کو عوام کی امیدوں اور آرزؤں کا مظہر بنا لیا تھا۔ ہندوستان کو آگے بڑھانے اور ملک سے غریبی، بے روزگاری اور جہالت کو دور کرنے میں انھوں نے جو زبردست خدمات انجام دی ہیں وہ ہمیشہ یاد رہیں گی۔ ہندوستانی عوام کی بے پناہ محبت کا اعتراف انھوں نے اپنی وصیت میں بھی کیا ہے۔ لکھتے ہیں: "مجھے ہندوستان کی جنتا سے اتنا پیار ملا ہے کہ میں چاہے کچھ بھی کروں اس پیار اور محبت کے چھوٹے سے حصے کا بھی بدلا ادا نہیں ہو سکتا۔ بلاشبہ پیار جیسی چیز کی کوئی قیمت بھی ادا نہیں کی جا سکتی۔ بہت سے لوگ ایسے گزرے ہیں جن کی قدر و منزلت کی گئی ہے۔ کچھ ایسے بھی ہیں جن کے ساتھ نہایت عزت و احترام کا سلوک کیا گیا ہے۔ لیکن مجھے ہندوستان کے ہر طبقے کے لوگوں سے اس قدر پیار ملا ہے کہ میں اس کے بوجھ سے دب گیا ہوں۔"

جواہر لال نہرو کا یوم پیدائش ہر سال ہمیں ان آدرشوں کی یاد دلاتا ہے جو زندگی بھر ان کے لیے مشعلِ بنے رہے۔ ضرورت ہے کہ ہم سب مل کر اس راستے پر آگے بڑھیں جو وہ ہمارے لیے متعین کر گئے ہیں۔

منشی پریم چند پر قومی مذاکرہ

جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے ہندوستانی زبانوں کے مرکز کی طرف سے نئی دہلی میں ۴ سے ۷ اکتوبر ۱۹۸۰ء تک ایک قومی مذاکرہ ہوا جس میں اردو اور ہندی کے عالموں نے شرکت کی۔ مذاکرے کے عنوانات یہ تھے۔

آخری دن کا آخری اجلاس۔ (تصویر میں بائیں سے دائیں) ڈاکٹر محمد حسن، اجلاس کے صدر قاضی عبدالستار اور اشفاق حسین صاحب

(۱) پریم چند اور آزادی کی جدوجہد، (۲) پریم چند اور حقیقت نگاری کی روایت۔ (۳) پریم چند کا فن، اور (۴) ناول اور افسانے میں پریم چند کی دین۔

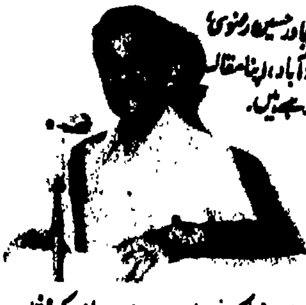

ڈاکٹر مجاور حسین رضوی (حیدرآباد) اپنا مقالہ سنا رہے ہیں۔

اس مذاکرے میں ہندوستان کی مختلف دانش گاہوں کے عالموں کے علاوہ پاکستان سے جناب سید سبط حسن اور مشہور ناول نگار جناب عبداللہ حسین نے شرکت کی۔

اس مذاکرے کا سب سے قابلِ ذکر پہلو یہ تھا کہ اس میں ہندی اور اردو دونوں زبانوں کے ماہرین نے شرکت کی اور پہلی بار دونوں زبانوں کو پریم چند کی دین کا ایک مجموعی تاثر ابھر کر سامنے آیا۔

ڈاکٹر محمد حسن صدر شعبۂ اردو جواہر لال نہرو یونیورسٹی اور ان کے رفقا ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں کہ ان کی کوششوں سے پریم چند کے فکر و فن پر ایک اچھا مذاکرہ منعقد ہو سکا۔

راج کوی میلا رام وفا کی رحلت

اردو کے مشہور صحافی، جنگِ آزادی کے مجاہد اور نغزگو شاعر جناب میلا رام وفا ۲۸ ستمبر ۱۹۸۰ء کو جالندھر میں انتقال کر گئے۔

وفا صاحب ۱۸۹۶ء میں گجرانوالہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۲۲ء سے ان کی صحافتی زندگی کا آغاز ہوا اور انھوں نے پنجاب کے روزناموں "جے ہند"، "پربھات"، "ویر بھارت" اور "بندے ماترم" میں کام کیا۔ اور اپنی جوشیلی تحریروں کی وجہ سے متعدد بار جیل گئے۔

تقسیمِ ہند کے بعد جالندھر چلے گئے اور متعدد اردو روزناموں سے منسلک رہے۔ حکومتِ پنجاب نے ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں راج کوی کا اعزاز عطا کیا تھا۔

ان کے دو مجموعے "سوزِ وطن" اور "سنگِ میل" شائع ہو چکے ہیں۔ جوش ملسیانی اور میلا رام وفا پنجاب میں اردو کے دو عظیم ستون تھے۔ افسوس ہے کہ اب یہ آخری ستون بھی باقی نہ رہا۔

رنگون کے ایک اردو دوست کا انتقال

غالب اکیڈمی رنگون (برما) کے جنرل سکریٹری احمد عبداللہ شاکر ۱۷ ستمبر ۱۹۸۰ء کو رنگون میں اچانک انتقال کر گئے۔

ان کی موت ایک اردو دوست اور ادب نواز کی موت ہے۔ جس سے نہ صرف رنگون کے ادیبوں بلکہ ہر اردو دوست کو دکھ پہنچا ہے۔ خداوند تعالیٰ موصوف کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

سردار احمد

جواہر لال نہرو کی عظمت کا راز

بڑی شخصیات کی عظمت کا راز کسی ایک بات یا ایک پہلو میں پوشیدہ نہیں ہوتا بلکہ ان کے اپنے افکار و خیالات، تجربات و مشاہدات اور اخلاق و عمل کے تمام نظام اور عوامل ایک دوسرے میں مل جل کر اسے اپنے وقت کے انسانوں سے بلند اور عظیم بننے میں مدد دیتے ہیں پھر بھی کسی شخصیت اور ذات کے دروں خانہ کے محرم ہونے کے دعویٰ کا صحیح ہونا ایک حد تک ناممکن ہے۔ جواہر لال نہرو نئے ہندوستان کے ولولوں، امنگوں، آرزوؤں اور جستجوؤں کے مظہر ہونے کے ساتھ ساتھ گاندھی جی کے آدرشوں کے بہت بڑے رکھوالے تھے۔ انھوں نے نئے ہندوستان میں جمہوریت، سیکولرزم اور عدم تشدد کے جذبہ کو فروغ دینے کے لیے اپنی زندگی کی ساری توانائیاں صرف کر دیں۔

جواہر لال دنیا کو بہتر جگہ اور انسانوں کو بہتر انسان بنانا چاہتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ جواہر لال نہرو کی عظمت کا راز ان کے درد مند دل، پُر خلوص انسانیت اور بے لوث خدمت میں پوشیدہ ہے۔

عام ہندوستانی کے نقطۂ نظر کو جاننے اور سمجھنے کے لیے جواہر لال نہرو ہمیشہ ان کی باتیں اور ان کی رائیں بڑے غور سے سنتے تھے۔ نہرو جی کے بدن کی مالش کرنے کے لیے مسٹر ایچ۔ کچھوایا صبح وزیر اعظم کی رہائش گاہ پر آتے تھے۔ ان کا بھی بیان ہے کہ تیس منٹ تک مالش کے وقفہ میں نہرو جی سنتے زیادہ تھے اور خود انتہائی کم بولتے تھے۔ نہرو جی عوام کا ردِ عمل سرکاری پالیسیوں کے متعلق دریافت کرتے تھے۔ کبھی کبھی مسٹر کچھوایا بتاتے ہوئے ہچکچاتے تھے لیکن جواہر لال نہرو اپنے تئیں بہت سے سوالات کا روزانہ جواب معلوم کرنے کے متمنی رہتے تھے۔ مسٹر کچھوایا نے ایک انٹرویو میں بتایا کہ صبح وہ پانچ بج کر تیس منٹ پر آجاتے تھے کیونکہ وقت کی پابندی نہرو کی زندگی میں ایک قدرِ اوّل تھی۔ وہ نہرو جی کو ہمیشہ پہلے سلام کرنے کی کوشش کرتے تھے لیکن کبھی ایسا موقع نہ مل سکا کیونکہ نہرو جی ہی سلام میں سبقت لے جاتے تھے۔ ایک دن مالش کے دوران نہرو جی پر کچھ غنودگی طاری ہو گئی اور وہ سو گئے۔ دس منٹ کے اندر وہ نیند سے اچانک بیدار ہو کر اٹھ بیٹھے اور وقت دریافت کیا۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ وہ دس منٹ لیٹ ہو چکے ہیں تو انھیں اس قدر افسوس ہو رہا تھا جیسے ان کی کوئی نہایت قیمتی شے گم ہو گئی ہو۔ فرمانے لگے "کچھوایا! تم نے مجھے کیوں نہیں جگایا؟ اب آج دن بھر میرے ہر کام میں دس منٹ کی تاخیر ہو جائے گی۔"

جواہر لال سے قربت رکھنے والے خواہ غریب ہوں یا امیر، ہمیشہ اس بات کے خواہش مند ہوتے کہ ان کے گھروں کی تقریبات میں نہرو جی ضرور موجود ہوں۔ وزیر اعظم کے لیے وقت نکالنا بہت مشکل کام ہوتا ہے۔ پھر بھی جواہر لال جی دوسروں کا دل رکھنے کی خاطر ان کی اس خواہش کو ضرور پوری کرتے تھے۔ اسی قسم کی ایک تقریب جس میں نہرو جی شریک تھے، کا حال میرے علم میں ہے۔ مسلم گھرانہ تھا۔ اندر پردہ نشیں عورتوں کا اصرار ہوا کہ جواہر لال جی اندر ان کے درمیان بھی تشریف لائیں۔ نہرو جی سفید شیروانی جس میں گلاب کا پھول کھلا ہوا تھا اور چوڑی دار پاجامہ میں اپنی شخصیت کی تابانی کے ساتھ چند بزرگ خاندان کے ہمراہ جب اندر جانے لگے تو گھر کے بہت سے نوجوان لڑکے بھی آگے چل پڑے۔ نور السّلام نامی ایک طالب علم جو اندرونی دالان کے ستون کے پاس کھڑا تھا، اپنے کرتے میں آستین کے پاس کا پھٹا ہوا حصّہ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا کہ نہرو جی کی نگاہ اس پر پڑی۔ نہرو جی اچانک ٹھہرتے ہوئے اس نوجوان طالب علم کے پاس پہنچے اور کرتے کی اس چیر کو اپنی انگلی سے ذرا سے اور پھاڑ دیا اور بولے "صاحبزادے طالب علمی کے دور میں پھٹے کپڑوں سے شرمایا نہیں کرتے۔"

جواہر لال جی کا دل درد کا خزانہ تھا۔ وہ کسی کی موت، کسی کے غم، کسی کے دکھ کی تاب نہ لا پاتے تھے اور رو پڑتے تھے۔ میں بارہ بنکی میں انٹر کا طالب علم تھا جب رفیع احمد قدوائی صاحب کے گھر بغرضِ تعزیت جواہر لال جی مسولی تشریف لائے۔ قدوائی صاحب کے انتقال کے وقت نہرو جی چین کے دورہ پر تھے۔ وہیں انھوں نے اپنے عزیز ترین ساتھی کی وفات کی خبر سنی اور اخبارات کی رپورٹ کے مطابق ان پر کئی منٹ تک سکتہ سا ہو گیا اور وہ غم کی شدّت سے کچھ بول نہ سکے۔ چین سے واپسی پر وہ مسولی (ضلع بارہ بنکی) بیگم قدوائی صاحبہ کے پاس تعزیت کو پہنچے۔ وہ منظر مجھے اب تک یاد ہے کہ جس طرح نہرو جی، قدوائی صاحب مرحوم کی قبر کو دیکھ کر رو پڑے تھے اور آبدیدہ و غمگین حالت میں گھر کے اندر لے جائے گئے جہاں قدوائی صاحب مرحوم کی بیگم نے انھیں ان کے مرحوم دوست کا ایک فاؤنٹین پن بطور یادگار دیا تھا۔ نہرو جی نے جن کلمات میں قدوائی صاحب کے متعلقین کو تعزیت پیش کی اور جس طرح تسلی دی، اس کی تفصیل کی اس مختصر مقالہ میں گنجائش نہیں لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ انھوں نے جو کچھ کہا تھا وہ سب کا سب عملی طور پر پورا کر دکھایا اور قدوائی صاحب کی بیگم صاحبہ کا بعد میں ہر طرح کا خیال رکھا۔ اسی کے ساتھ یہ بھی بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ جواہر لال جی کو ان حضرات کا بھی بہت خیال رہتا تھا جو ان کے والد محترم پنڈت موتی لال نہرو سے کسی نہ کسی طرح قریب رہ چکے تھے۔ اخلاق کی

یہ خاص صفت بہت بڑی شخصیات میں ہی پائی جاتی ہے۔

جواہر لال نہرو کے بارے میں یہ سبھی کو معلوم ہے کہ وہ بڑے نظم و ضبط کے انسان تھے اپنے اسٹاف کے لوگوں سے ان کی سختی سے تاکید تھی کہ وہ لوگ کوئی کھیل تماشہ سرکس یا سینما میں پاس نہ منگوائیں اور بغیر ٹکٹ خریدے ہوئے نہ جائیں۔

جواہر لال نہرو جب بھی ملکی یا غیر ملکی دورے سے واپس ہوتے، ان کے ساتھ تحائف اور کھانے پینے کی چیزیں کافی آتی تھیں لیکن وہ انھیں اپنے اسٹاف میں تقسیم کر دینے کے عادی تھے۔ ان کے ریسپشنسٹ مسٹر مدن موہن نے بتایا کہ ایک بار ایسے ہی موقع پر ان کے حصے میں دو انگور آئے تھے۔

نہرو جی نے ایک مفکر کا دماغ ایک سنت کا دل پایا تھا۔ میرے نزدیک سیاست میں ان کو حالات اور ملکی تقاضے کھینچ لاتے تھے لیکن وہ اپنی فطرت کی معصومیت اور بھولے پن سے بعض اوقات ان سیاسی جھمیلوں سے دور رہنا پسند کرتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ضرورت مند غریب کا کام فوراً ہو جائے۔ اس سلسلے میں بہت سی مثالیں اور واقعات مختلف اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔ انھیں لال فیتہ شاہی نظام سے سخت نفرت تھی۔ ان کی دلی تمنا تھی کہ گاندھی جی کی یہ آرزو پوری ہو کہ کسی ہندوستانی کی آنکھوں میں دکھ کے آنسو نہ نظر آئیں۔ بعض اوقات وہ اپنے اہم اور ضروری کاموں کو چھوڑ کر غریب کی بات سنتے اور اس پر اپنا فوری حکم دیتے تھے۔ مسٹر مکرجی جو ایسے لوگوں کو نہرو جی سے ملوانے پر مامور تھے، بتلاتے ہیں کہ ایک بار ایک بوڑھی غریب عورت اپنی بپتا نہرو جی کو سنا رہی تھی۔ اس کی بات اتنی طویل ہوئی کہ بیچ میں ایک افسر نے نہرو جی کو یاد دلایا کہ انھیں کسی جگہ پہنچنا ہے کہیں دیر نہ ہو جائے۔ نہرو جی فوراً بولے "تمھیں غریب کا احساس نہیں ہے۔" انھوں نے پوری توجہ سے اس بوڑھی عورت کی بات سنی۔ اسے تسلی دی، اور وعدہ کیا کہ اس کی شکایت دور کی جائے گی۔

کان پور میں ایک بار نہرو جی کے ایک جلسے میں میں بھی موجود تھا جس میں دوران تقریر انھوں نے دو ایسی باتیں بھی کہی تھیں جو میرے ذہن میں اب بھی محفوظ ہیں اور جن سے نہرو جی کا مزاج سمجھا جا سکتا ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ آج کل ہندوستان میں مذہبی فرقوں میں لڑائی کا سبب روحانیت کا فقدان ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کان پور چھاؤنی میدان کے اس جلسۂ عام میں جب نہرو جی نے "روحانیت" کا لفظ اپنی زبان سے ادا کیا تو انھیں احساس ہوا کہ اس کے معنی شاید حاضرین جلسہ نہ سمجھ سکے ہوں اس لیے انھوں نے ڈائس پر پیچھے بیٹھے ہوئے حضرات سے اس کی ہندی دریافت کی کسی نے کچھ بتایا جسے سن کر نہرو جی نے فوراً مائک پر کہا کہ روحانیت کے معنی سب سمجھتے ہیں اس کے لیے بہت مشکل لفظ کی ضرورت نہیں ہے۔ اسی تقریر میں نہرو جی نے کہا تھا کہ جہاں پیسہ کی فراوانی ہوتی ہے وہاں فنون اور اقدار کا زوال ہو جاتا ہے۔

نہرو جی کے باورچی مسٹر جیمس نے نہرو جی کے انتقال کے بعد انکشاف کیا کہ جواہر لال جی کو سادہ غذائیں بہت پسند تھیں۔ باجرہ جوار اور جو کی روٹی میں گڑ ملا کر کھانا ان کی محبوب چیز تھی۔ وہ اپنے غیر ملکی مہمانوں کے سامنے بھی یہ چیزیں کھاتے اور انھیں بھی ان کا مزہ چکھنے کے لیے کہتے تھے۔ صبح کے ناشتہ میں وہ صرف ایک سلائس، ایک انڈہ اور ایک پیالی کافی ہی پر اکتفا کرتے تھے۔ وہ اپنے کھانے کے اوقات کے سختی سے پابند تھے۔ اگر کسی وجہ سے کسی کھانے کا وقت ٹل جاتا تو نہرو جی بے وقت کھانے پر نہ کھانے کو ترجیح دیتے تھے۔ جیمس کا بیان ہے کہ جب وہ بازار سے کوئی سامان لے کر واپس ہو رہا ہوتا تھا اور جواہر لال جی اپنی کار سے اسے دیکھ لیتے تھے تو فوراً کار رکوا کر جیمس کو بٹھا ضرور لیتے تھے۔ ایک بار جیمس کو دل کے دورہ میں مبتلا ہونے پر رخصت لینی پڑی۔ جب وہ اپنی رخصت کے خاتمہ پر واپس آیا تو نہرو جی نے اس کی بیماری کے پیش نظر زینہ چڑھنے کی ممانعت کر دی اور کہا کہ وہ اب آئندہ سے اس لفٹ کا استعمال اوپر جانے کے لیے کرے جو نہرو جی کے لیے مخصوص تھی۔ جیمس نے یہ بھی بتایا کہ نہرو جی نے کبھی اس کا نام لے کر نہ پکارا بلکہ ہمیشہ اسے بھائی کہتے تھے اور اس کی ماں کو ماں جی کہہ کر مخاطب ہوتے تھے۔ اس کے بچوں سے نہرو جی کھیلتے بھی تھے۔ چھوٹے چھوٹے بچوں سے ان کو بے پناہ محبت تھی۔ ان کے لیے وہ بچوں کی سائیکل چلاتے اور انھیں کبھی اپنی پیٹھ پر بٹھا کر ان کے لیے گھوڑا بن کر چلتے۔ تین مورتی کا اسٹاف اپنی آنکھوں سے یہ مناظر دیکھتا کہ بچوں کے درمیان کتنا بڑا انسان بچہ بنا ہوا ہے۔

نہرو جی کے ڈرائیور رانا سنگھ چوہان اور دوسرے اسٹاف ممبر جو مختلف سفروں اور دوروں میں وزیر اعظم کے ہمراہ ہوتے تھے، کا کہنا ہے کہ نہرو جی اپنے ناشتہ اور کھانا سے قبل یہ معلوم کر لیتے تھے کہ ان کے نوکروں اور اسٹاف ممبران کو بھی کھانا مل چکا ہے یا نہیں۔ بعض افسران جو اپنے نوکروں سے ترشی اور سختی سے پیش آیا کرتے تھے اور انھیں کمتر مخلوق ہی سمجھتے تھے، نہرو جی کا یہ طرز عمل دیکھ کر حیران ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے رویے میں بھی تبدیلی کے لیے آمادہ ہوتے تھے۔

(بقیہ: اقبال سے اقبال جاگا تمل ناڈ کا)

نے چپکے سے شام کے پانچ بجا دیے۔ کار حضرت اقبال کو لیے طلبا کی خوشی و مسرت کے نعروں میں آگے بڑھی، زراعتی فارم کے معائنہ کی دید معائنہ کے بعد گوکھلے ہال پہنچی جہاں معزز مہمان کو اپنا آخری خطبہ سنانا تھا۔

اہل مدراس علامہ اقبال کو لینے ۵ جنوری ۱۹۲۹ء ہفتے کی صبح شاداں و فرحاں آئے تھے اور ۸ جنوری ۱۹۲۹ء منگل کی شب بادیدۂ تر انھیں خدا حافظ کہہ رخصت کیا۔

کتابیات: (۱) تازیانہ لاہور ۱۹۲۹ء (۲) روزنامہ الکلام ۱۹۲۹ء (۳) سفینہ ۱۹۲۹ء (۴) انقلاب ۱۹۲۹ء (خطبات مدراس (۶) سوراجیہ، ہندو مدراس میل، (اخبار) (۷) خطوط بنام راقم۔ غلام رسول مہر۔ فقیر وحید الدین۔ پروفیسر حیدر علی خاں۔ پروفیسر بخاری۔ شخصیات جمال احمد فرزند جمال محمد، پروفیسر محبوب پاشا۔ کاوش بدری۔ محمود شریف ایڈووکیٹ سیلم

ڈاکٹر انصاری نمبر

ڈاکٹر انصاری سے متعلق خصوصی شمارہ دسمبر کے بجائے جنوری ۱۹۸۱ء میں شائع کیا جائے گا۔

(ادارہ)

سکندر علی وجد

غزل

رکھا گلوں کی یاد کو دل نے جتن کے ساتھ
خوشبوئے دلبری ہے شمیمِ سمن کے ساتھ

بوس و کنارِ یارِ جواں سال دمبدم
اک شغلِ جانفزا ہے شرابِ کہن کے ساتھ

پرسانِ حال یہ نہ سمجھ لیں کہ اُنس ہے
وہ حال پوچھتے ہیں تو بیگانہ پن کے ساتھ

حسنِ وفا شعار نے ذوقِ جنوں دیا
چشمک رہی ہے ہر نگہِ تیغ زن کے ساتھ

اللہ رے، تیرے چاہنے والے کا مرتبہ
سُولی پہ سر بلند ہے کس بانکپن کے ساتھ

اہلِ کمال، اہلِ زبان، اہلِ دل گئے
اپنا معاملہ ہے اب اہلِ وطن کے ساتھ

صیّاد کو تمیز نہیں خوب و زِشت کی
شاہیں بھی زیرِ دام ہے زاغ و زغن کے ساتھ

مدّت ہوئی کہ طوق و سلاسل پگھل گئے
اب صرف چھیڑ چھاڑ ہے دار و رسن کے ساتھ

ظاہر میں وجدؔ کوئی تعلق نہیں تو کیا
دل کو ہے ربط حیدر آبادِ دکن کے ساتھ

اندر سروپ دت نادآں

وہ آنکھ

(مہاراجہ رنجیت سنگھ کی یاد میں)

ترے مورّخ
تری حکومت کے روز و شب کو
ہزار آنکھوں سے دیکھ بیٹھے
مگر شکستِ نظر کا ماتم
پڑا ہوا ہے صفوں میں ان کی
یہ بھید اب تک کھلا نہیں ہے
کہ تیری تنویر کس ستارے کی آبرو تھی !

وہ آنکھ کیا تھی !
کہ جس کے بل پر
شکست دی تو نے مہر و مہ کو
کہ جس کے حلقے میں تاجِ شاہی
فقیر کا دل بنا ہوا تھا
جو کورے کاغذ میں جذب تحریر پڑھ رہی تھی
جو آنے والے سمے کی چالوں کو دیکھتی تھی
جو اپنی آوارگی پہ پہرے بٹھا کے [illegible] ادھو گئی تھی
جو جسمِ دہقاں میں تیرے آ[illegible]ں کا تیرتھ بنی ہوئی تھی
جو ناچتی تھی
جو کھیلتی تھی
شریر بچوں کی طرح بارش کے پانیوں میں
یہ بھید اِن پر کہاں کھُلے گا
کہ کرم خوردہ کتاب سے کیا نشاندہی ہوگی زندگی کی
مگر میں شاعر ہوں، تیرے دل کی
ہر ایک دھڑکن کو سُن رہا ہوں
میں جانتا ہوں
کہ تیری تنویر کس ستارے کی آبرو تھی
مجھے تو اتنا ہی پوچھنا ہے
کہ میرے وقتوں کی تیرگی میں
اُس آنکھ کا کب ظہور ہوگا
کہ جس کے بل پر
شکست دی تو نے مہر و مہ کو !

کے۔ کے۔ کھلر

مہاراجہ رنجیت سنگھ

مہاراجہ رنجیت سنگھ اور ہیرا سنگھ (بیٹھے ہوئے) وزیر اعظم دھیان سنگھ کاڈکابو کھڑے ہوئے ہیں۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ جن کا اصلی نام بدھ سنگھ تھا، ۲ر نومبر ۱۷۸۰ء گوجرانوالہ (جو اب پاکستان میں ہے) میں پیدا ہوئے۔ اس وقت ان کے والد مہاں سنگھ دریائے جہلم کے کنارے چٹھوں کے ساتھ برسرِ پیکار تھے۔ چٹھوں پر فتح پانے کی خوشی میں انھوں نے اپنے بیٹے کا نام، گرو گوبند جی کے ایک نقارے کے نام پر رنجیت سنگھ رکھ دیا۔ پنجابی مآخذ اور لوک کہانیاں شاہد ہیں کہ رنجیت سنگھ کی باقاعدہ تعلیم سال بھر سے زیادہ نہ ہوئی۔ جو کچھ بھی تعلیم حاصل کی وہ معمولی حساب و کتاب اور نقشہ نویسی سے متعلق تھی۔ البتہ زراعت اور دستکاری سے انھیں فطری لگاؤ تھا۔

مہاں سنگھ نے بھی اپنے مہان بیٹے کو کھیلنے کے لیے کوئی کھلونا نہیں دیا بلکہ اس کے ننھے ہاتھوں میں تلوار پکڑا دی جس سے اس نے گیارہ برس کی عمر میں ایک شیرنی کا شکار کیا۔ بہادری کے ساتھ ساتھ رنجیت سنگھ کے دل میں رحم کا جذبہ بھی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ جب مردہ شیرنی کا بچہ اپنی ماں کے لیے بے چین ہونے لگا تو رنجیت سنگھ نے اسے آزاد کر دیا۔ سوہن لال سے لے کر محمد لطیف تک سبھی تاریخ دانوں نے الیگزینڈر کننگھم اور سر لیپل گریفن کے توسط سے اس حقیقت کی تصدیق کی ہے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کچھ زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے۔ جیک مونٹ سے لے کر ایملی تک سبھی سیلانیوں اور سیاحوں کے سفرناموں میں اس کا اعتراف موجود ہے کہ پنجاب کا یہ حکمراں، جس نے ۴۰ سال تک حکومت کی اور جس کی سلطنت کے حدود ایک طرف درہ خیبر اور چین کو چھوتے تھے اور دوسری طرف دریائے سندھ اور ستلج سے ہمکنار تھے، پڑھائی لکھائی میں تقریباً کورا تھا۔

اپنی عمر کے سبھی پنجابی لڑکوں کی طرح رنجیت سنگھ بھی گھوڑے پر سوار ہو کر قدرتی مناظر، سیلِ رواں اور طلوعِ آفتاب کا نظارہ کرنے کا دلدادہ تھا۔ موسم سرما میں برکھا کی ہلکی ہلکی پھوہار اس کے قلب و ذہن کو جھنجھوڑ دیتی اور خیر ملکی عمل داری میں واقع گہرے اور نیلگوں آبی ذخیروں پر جمع خوش الحان طیور کے درد بھرے نغمات اسے اپنی جانب کشاں کشاں لے جاتے۔ اور جب لکہ ہائے ابر موسم گرما کے بھاگتے ہوئے چاند کی پیشانی کو بوسہ دیتے تو رنجیت سنگھ اپنے پیارے پنجاب کے حسین مناظر کو سلامی دینے کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا۔ ایک حکمراں کی حیثیت میں بھی وہ رویت ہلال کے احترام میں اکثر سارا سرکاری کام کاج چھوڑ کر اکیس توپوں کی سلامی کا حکم دیتا۔ بسنت اور لوہڑی کے تہوار اسے بہت پسند تھے۔ وہ طوطوں کے کاٹے ہوئے آم زمین پر سے اٹھا کر بڑی رغبت سے چوستا تھا۔ زخمی پرندوں کی مرہم پٹی کرنے اور کبوتروں کو دانہ چگانے میں اسے خاص تسکین ملتی تھی۔ کیپٹن مرے نے ایک جگہ لکھا ہے کہ مہاراجہ رنجیت کے سینے میں ایک نرم و نازک اور حساس دل دھڑکتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے وقت کا ایک ایسا جری اور قابل ترین ہندوستانی فوجی جرنیل تھا جس نے سب سے پہلے آٹھ سو سال کے عرصے میں اپنے روایتی افغان فاتحین کو ہرایا۔ اس کے ہتھیار بند ڈوگرہ سپاہی چین کی سرحد تک جا دھمکے تھے، دوسری طرف اس کے مسلمان جاں بازوں نے کابل میں منعقدہ فتح مندی کے جلوس میں حصہ لیا تھا۔

بارہ سال کی عمر میں رنجیت سنگھ کے سر سے باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ گجرات کے نزدیک سودھرا کے قلعے کے محاصرے کے دوران ان کے والد مہاں سنگھ کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی اور انھیں فوراً گوجرانوالہ پہنچایا گیا۔ رنجیت سنگھ اپنے دشمن کو ہرا کر عین وقت پر اپنے والد کے جنازے میں شریک ہو سکا۔ ان بارہ سالوں میں رنجیت سنگھ کے بارے میں کچھ زیادہ معلومات دستیاب نہیں ہیں۔ ماسوائے اس بات کے کہ چیچک کی وجہ سے ان کی بائیں آنکھ جاتی رہی تھی اور ان کا چہرہ داغدار ہو گیا تھا۔ لالہ سوہن لال سوری رقم طراز ہے "تیز بخار کی وجہ سے شہزادے کی علالت نے نازک صورت اختیار کر لی۔ ان پر ہیجانی کیفیت طاری تھی اور ان کے جسم، بالخصوص داہنی آنکھ سے کافی تعداد میں کثیف رطوبت کا اخراج ہو رہا تھا جس کے کم ہونے کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔"

کئی سال بعد جب شملہ میں گورنر جنرل نے یہ سوال کیا کہ مہاراجہ کی کون سی آنکھ ٹھیک ہے اور کون سی نہیں تو فقیر عزیزالدین نے جنھیں اپنے آقا پر بہت ناز تھا

فقیر عزیزالدین

بولے۔ "عزت مآب! سورج کی طرح مہاراجہ کے بھی ایک ہی آنکھ ہے۔ ہندوستانی دیومالا کے مطابق سورج دیوتا کی فقط ایک آنکھ ہے، اگر ان کی دو آنکھیں ہوتیں تو وہ اس جہان کو جلا کر راکھ کر دیتے۔ جیسے کسی کی مجال نہیں کہ سورج کو آنکھ بھر کر دیکھ سکے۔ بالکل اسی طرح میں نے بھی مہاراجہ کے چہرے پر نظر ڈالنے کی کبھی ہمت نہیں کی۔ میری نظریں ہمیشہ ان کے قدموں پر جھکی رہتی ہیں۔ اگر ان کے قدموں کے بارے میں آپ کو کچھ دریافت کرنا ہو تو ہو سکتا ہے کہ میں آپ کو کچھ بتا سکوں۔" یہ جواب سُن کر لارڈ ولیم بینٹنگ اس قدر خوش ہوا کہ اس نے اپنی جیب سے طلائی گھڑی نکالی اور مہاراجہ کے وزیر خارجہ (فقیر عزیزالدین) کو تحفتاً دے دی۔ گورنر جنرل نے کہا، "جب تک مہاراجہ کے خدمت میں آپ جیسے لوگ موجود ہیں، ان کا کوئی بال بیکا نہیں کر سکتا"

مہاراجہ رنجیت سنگھ ایک روایت بن چکے ہیں۔ وہ آج بھی اہل پنجاب کے دلوں میں زندہ اور تابندہ ہیں۔

۱۹۶۵ء میں پاکستان میں چھپی اپنی کتاب The Real Ranjit Singh میں فقیر سید وحیدالدین نے لکھا ہے، "رنجیت سنگھ آج بھی لوگوں کے خیالوں میں اسی طرح بسے ہوئے ہیں جیسے وہ آج بھی زندہ ہیں۔ یہ جذبہ صرف ان علاقوں میں نہیں ہے جہاں کہ آج سکھ آباد ہیں۔ بلکہ وہاں بھی ہے جہاں وہ پہلے کبھی آباد تھے۔ مسلم دیہی عوام بھی سکھوں کی طرح انھیں ایک افسانوی شخصیت تسلیم کرتے ہیں اور انھوں نے سکھوں کے ساتھ مہاراجہ کی یاد کو الوداع نہیں کہا ہے۔ آج بھی لوگوں کے دل و دماغ میں یہ بات بسی ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ وہ ایک ہر دلعزیز راجا تھا۔ وہ ہر وقت رعایا کی فریاد سننے کو تیار رہتا تھا اور فوراً ان کی دادرسی کرتا تھا۔ وہ اپنی رعایا کو بلا امتیاز مذہب و ملت ایک آنکھ سے دیکھتا تھا۔ ایک آنکھ والی بات اس کے ضمن میں لفظاً و معناً درست اور اس کا ذکر اکثر ہنسی مذاق میں ہوتا رہتا تھا۔ کہتے ہیں کہ نہ صرف مہاراجہ دوسروں سے ایسے لطیفے بیان کرنے کو کہتا تھا بلکہ خود بھی ان میں پوری طرح حصہ لیتا تھا۔ کچھ ایسے قصے بھی مشہور ہیں جن میں لوگوں نے اپنی شکایات کا اس کی طرف سے ازالہ نہ ہونے پر اس کے اس جسمانی عیب کا اُسے حقارت آمیز انداز میں طعنہ بھی دیا۔ یہ قصے غلط ہوں یا صحیح، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہو سکتا ہے یہ اس لیے زبان زد عام ہو گئے ہوں کیونکہ یہ مہاراجہ کی شہرت کے ساتھ جڑے ہیں۔"

ان کی عمر تیرہ سال ہی کی تھی جب انھوں نے حشمت خاں کا سر قلم کر کے اپنے نیزے کی انی پر رکھ کر اپنے ساتھیوں کو پیش کیا تھا۔ حشمت خاں جو کہ مہاں سنگھ کے ہاتھوں متعدد بار ذلتیں اٹھا چکا تھا، بدلہ لینے کی غرض سے ایک شکار کی مہم کے دوران تلوار لے کر رنجیت سنگھ پر جھپٹ پڑا۔ لیکن پیشتر اس کے کہ وہ کوئی چرکہ لگائے، رنجیت سنگھ نے اپنی تلوار کے بھرپور وار سے اس کا سر اڑا دیا اور اسی یادگار نشانی کو لے کر گھوڑے پر سوار ہو وہ اپنے ساتھیوں کے پاس واپس آیا۔ اٹھارہ سال کے سِن میں جب کہ بیشتر سکھ مثل دلو افغان حملہ آور زمان شاہ کے آگے ہتھیار ڈال چکے تھے، رنجیت نے اُس کے اقتدار کو للکارا اور لاہور پر قبضہ کر لیا۔ یہ کارنامہ صاحب سنگھ بیدی کی جوشیلی تقریر اور مٹھی بھر جاں نثار سپاہیوں، جن میں اکثریت مسلمانوں کی تھی، کی بدولت عمل میں آیا۔ چونکہ زماں خاں کی سپاہ نے رعایا پر جن کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل تھی، ظلم و ستم کا بازار گرم کر رکھا تھا، اس لیے مسلمان رنجیت سنگھ کی طرفداری کر رہے تھے۔ یہ مسلمانوں کی امداد و اعانت کا نتیجہ تھا کہ رنجیت سنگھ نے دریائے جہلم تک تعاقب کر کے زماں شاہ کو ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ ایک اہل اور تجربہ کار انسان کی طرح لاہور پر قبضہ کو ممکن بنانے میں اپنے مسلمان فوجیوں کی خدمات کو رنجیت سنگھ نے ہمیشہ یاد رکھا۔ ان کی خدمات کے صلے میں رنجیت سنگھ نے مسلمانوں کو وزیر خارجہ، وزیر داخلہ اور وزیر مال جیسے بڑے بڑے

عہدوں پر فائز کیا۔ رنجیت سنگھ نے محافظِ پنجاب، صاحب سنگھ بیدی کی بطورِ خاص عزت افزائی کی اور اس مقصد کے لیے ۱۲ اپریل ۱۸۰۱ء کو منعقد کیے گئے خصوصی دربار میں اس کی تصویر آویزاں کروائی، اپنی فراخ دلی کے ثبوت میں رنجیت سنگھ نے اپنے قدیم دشمنوں تک کو بھی اپنے ہاں پناہ دی اور مفتوح حکمرانوں اور ان کے کنبوں کے تئیں بہت اچھا سلوک کیا۔

روایت ہے کہ جب رنجیت سنگھ لاہور کے قلعے میں داخل ہوا تو اسے برج کے اندر سے ایک پُراسرار آواز قلعے کے اندر بلاتی سنائی دی۔ "رنجیت سنگھ ڈرو مت۔ بے کھٹکے اندر چلے آؤ۔" اندر داخل ہوتے ہی اسے ایک ٹھگنے قد کے نحیف و نزار اور معمر درویش دکھائی پڑے جو اسے اپنے قریب آنے کو کہہ رہے تھے۔ رفتہ رفتہ وہ آواز تحکمانہ ہوتی گئی۔ لگتا تھا وہ آواز زمین کی گہرائیوں سے ابھر کر یہ کہہ رہی ہے بہت جلد تم ایک آزاد حکومت قائم کروگے اور تمھاری حکومت کی شہرت اور خوش حالی روز بروز بڑھے گی۔ لیکن تم ہمیشہ ان باتوں پر عمل کرنا۔

(۱) بلاناغہ ہر صبح اپنے مالک کے آگے سر جھکانا۔

(۲) مغل شہنشاہوں کے تخت پر بیٹھ کر اپنا دربار نہ کرنا۔

(۳) اپنی رعایا کو اولاد کی طرح سمجھنا اور ذات پات کی بنیاد پر کوئی امتیاز نہ کرنا۔

(۴) لاہور کے فقیر سید غلام محی الدین کو بلانا اور انھیں اپنا روحانی پیشوا سمجھنا۔

رنجیت سنگھ نے اس واقعے کا ذکر عوض خاں کے سوا کسی سے نہ کیا۔ عوض خاں شاہی فیل خانے کے نگراں تھے جنھیں ایک درویش نے رنجیت سنگھ کے پاس یہ پوچھنے کے لیے بھیجا کہ کیا وہ ان اصولوں پر کاربند ہیں جو لاہور کے قلعے میں ان کو بتائے گئے تھے۔ مہاراجہ نے عوض خاں کو یہ راز فاش نہ کرنے کی تاکید کی اور کہا کہ تادمِ حیات یہ بات کسی سے نہ کہی جائے۔ اس واقعے کی اہمیت یہ ہے کہ رنجیت سنگھ کا اس میں عقیدہ تھا کہ ان کی کامیابی کا راز ان چار اصولوں پر عمل پیرا ہونے میں مضمر ہے۔ چنانچہ مہاراجہ ہر روز دن شروع ہونے سے پہلے عبادت میں سرِ نیاز خم کرتے۔ غسل وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد وہ اپنا لباس زیبِ تن کرتے، ہتھیار سجاتے اور عبادت گاہ جاتے اور گرو گرنتھ صاحب کا پاٹھ سنتے۔ اس کے بعد وہ گرو گوبند سنگھ کی کلغی کو آنکھوں سے لگاتے۔ اس کے بعد وہ دانشوروں اور صوفیوں کی صحبت میں بیٹھتے اور ان کی عالمانہ باتوں اور نصیحتوں کو سنتے بالکل اسی طرح جیسا کہ اکبر اپنے نورتنوں میں بیٹھ کر ان کی گفتگو سے استفادہ کیا کرتا تھا۔ مسجدوں، مندروں، اور گرودواروں میں وہ عبادت گزاروں کے پیروں کی خاک اپنی لمبی داڑھی کے سفید بالوں سے صاف کرتے۔ اپنی نشست، روحانی پیشواؤں کی نشست سے ہمیشہ نیچی رکھتے۔ ایک روز جب کہ وہ فقیر نورالدین کے مقابل بیٹھے تھے اور دونوں ہی تسبیح پڑھ رہے تھے، ایک دلچسپ واقعہ ظہور میں آیا۔ رنجیت سنگھ اپنے روایات کے مطابق تسبیح کے دانے زیریں جانب گھماتے تھے۔ مگر فقیر نورالدین تسبیح کے دانوں کو بالائی جانب گھماتے تھے۔ مہاراجہ نے اچانک پوچھا کہ تسبیح کے دانے کس سمت میں گھمانے چاہئیں۔ فقیر نے جواب دیا کہ تسبیح کے دانوں پر خدا کا نام لیا جاتا ہے۔ اگر خدا کی عظمت اور جلال کا خیال دل میں ہو تو دانے اندرونی طرف اور اگر ردِّ بلا مقصود ہو تو باہر کی طرف گھمانے چاہئیں۔ اس جواب سے مہاراجہ بہت خوش ہوئے اور انھوں نے سنگِ سلیمانی کی تسبیح انھیں پیش کی۔ ایک اور موقع پر جب کچھ نہنگوں نے اس بات پر اعتراض کیا کہ مہاراج عیدالفطر کے روز مسجد میں کیوں گئے تو انھوں نے یہ کہہ کر انھیں مطمئن کیا کہ منزل سبھوں کی ایک ہی ہے البتہ وہاں پہنچنے کے راستے جدا جدا ہیں۔ ان کی سیکولر پالیسی کا نتیجہ یہ تھا کہ جب کبھی بھی وہ کسی مہم پر روانہ ہوتے یا کوئی مشکل انھیں پیش آتی، یا کسی مصیبت سے بال بال بچتے یا بیمار پڑتے یا بیماری سے شفایاب ہوتے تو مسلمان مسجدوں میں ان کے لیے نمازِ شکرانہ ادا کرتے۔ ہندو مندروں میں اور سکھ گرودواروں میں ان کے لیے پرارتھنا کرتے۔ وہ حاجیوں کی دل کھول کر امداد کرتے۔ اسی طرح سنسکرت کے ودوانوں اور عالموں کی فراخ دلی کے ساتھ امداد کرتے۔ وہ شیعہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر محرم کی تقریبات میں حصہ لیتے اور نیاز کراتے۔ اس دور کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ تاثر مرتب ہوتا ہے کہ پنجاب ایک ایسی ریاست تھی جہاں انسانی اقدار کی اعلیٰ قدر و منزلت کی جاتی تھی اور طاقت کے ساتھ انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹتا تھا نیز غریب اپنے آپ کو محفوظ تصور کرتے تھے۔ اقلیتوں کا پورا پورا احترام کیا جاتا اور علم کی قدر کی جاتی تھی۔ رنجیت سنگھ نہ تو کبھی تخت پر بیٹھے نہ ہی تاج پہنا۔ بہت سے مشل داروں کی طرف سے یہ مشورے برابر آتے رہے کہ مہاراجہ کو مغل بادشاہوں کی طرح سے ہی دربار لگانا چاہیے اور انھیں کی طرح شان و شوکت سے دربار سجانا چاہیے۔ لیکن انھوں نے اس طرح کے تمام مشورے نامنظور کر دیے۔ وہ کرسی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھتے۔ یہ وہی کرسی تھی جس پر فوجی سردار کی حیثیت سے براجمان ہوا کرتے تھے۔ کبھی کبھی وہ درخت کے نیچے اپنا دربار لگاتے یا کبھی کبھی وہ گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے ہی دربار جما لیتے تھے کبھی وہ فرش پر دری بچھا کر ایک معمولی سے گدے سے ٹیک لگا کر بیٹھتے اور وہیں دربار لگا لیتے۔ وہ کہتے میں ایک کسان اور ایک سپاہی ہوں۔ مجھے ظاہری آرائش اور زیب و زینت کی پروا نہیں ہے۔ مجھے جس قدر اعزازات درکار ہیں۔ میری تلوار انھیں حاصل کرنے کے لیے کافی ہے۔" وہ پنجابی کسانوں کی طرح سے معمولی پگڑی باندھتے، سادہ کرتا جو کشمیری سلک کا ہوتا تھا، ان کے جسم پر ہوتا۔ وہ کوہ نور ہیرا اس وقت پہنتے جب کوئی غیر ملکی مہمان ان سے ملاقات کرنے آجاتا تھا لیکن مہاراجہ کو حسن اور دلکشی مرغوب تھی۔ انھوں نے انتہائی حسین سرداروں کو شہری اور فوجی خدمات کے لیے مامور کیا تھا۔ انھوں نے گلے میں ہیروں کی مالا لٹکانے کے لیے شام سنگھ اٹاری والا کو پچاس ہزار روپے کی جس انداز پر منظوری دی اس سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ اگرچہ وہ خود زیادہ خوبصورت نہ تھے لیکن خوبصورتی کے دلدادہ ضرور تھے۔ جسمانی معذوری کی وجہ سے کبھی آزردہ نہ ہوتے بلکہ ہنسی مذاق کے ذریعے اس کمزوری پر قابو رکھتے۔ یہ خوش دلی ان کے ذہن کی رسائی میں معاون ثابت ہوتی اور اسی لیے انھوں نے بڑے بڑے معرکے سرانجام دیے ساں کی

ذات ایسی پرستش تھی اور وہ روحانی عظمت کا ایسا پیکر تھی کہ انتہائی خوبصورت، جری اور عالم ہستی بھی مہاراجہ کی خدمت کرنے کو اور ان کے پاس رہنے کو باعث سعادت سمجھتی اور ان کے پاس آکر اس کا احساس تفاخر ختم ہو جاتا۔ وہ نہ صرف دیوان موکھم چند اور ہری سنگھ نلوہ ایسے قابل جرنیلوں کو ہدایات دے سکتے تھے بلکہ اپنے دور کے اعلیٰ ترین محرروں کی تحریریں بھی درست کر سکتے تھے اور اس کے ساتھ ہی وہ شہسواروں کو شہسواری کے گر بھی سکھا سکتے تھے اور اگر وہ کہیں غلطی پر ہو تو اس کی اصلاح کر سکتے تھے۔ وہ لاہور کے گلی کوچوں اور سڑکوں پر سے گزرتے ہوئے عوام کی درخواستیں، شکایتیں اور عرض داشتیں بھی سنا کرتے۔ لاہور فتح کرنے کے بعد انھوں نے ابتدائی جو چند کام کیے، ان میں سے چند ایک یہ ہیں۔ انھوں نے مفتی اور قاضی کے عہدوں کی تجدید کی جو مسلمانوں میں طلاق اور شادی نیز غیر منقولہ جائدادوں کے قضیے چکاتے۔ تمام شکایتیں جس بکس میں ڈالی جاتیں، اس کی چابی مہاراجہ کے پاس ہوتی تھی۔ ان کے یہاں سزائے موت کا رواج نہ تھا۔ اہل قلم مہاراجہ کے دائیں جانب اور اہل سیف ان کے بائیں جانب بیٹھتے۔ مہاراجہ کو ازراہ محبت 'بھائی' کہہ کر پکارا جاتا۔ کوئی انھیں مہاراجہ کہہ کر پکارتا تو انھیں غصہ آجاتا۔ اس قدر عظیم انسان ہی ایسا حکم جاری کر سکتا ہے جس کا اقتباس درج ذیل ہے:-

"مخلص بہی خواہ فقیر نورالدین جی، خدا آپ کو خوش رکھے۔ عالی جاہ کا فرمان ہے کہ شہر میں کوئی شخص کسی عوام پر دراز دستی اور جور و ستم نہ کرے۔ حتیٰ کہ اگر عالی جاہ کی طرف سے بھی لاہور کے کسی باشندے کے خلاف کوئی ناواجب حکم جاری ہو جائے تو اسے اعلیٰ حضرت کے علم میں لایا جائے تاکہ اس کی ترمیم ہو سکے۔ شجاعت کے محافظ مالوہ سنگھ کو ہمیشہ انصاف سے کام لینا چاہیے اور حق و ناحق کا خیال رکھنا چاہیے اور زور زبردستی کا شائبہ بھی نہ ہونا چاہیے۔ اسے شہر کے پنچوں اور ججوں سے مشورے کے بعد شاستروں اور قرآن کے حکم کی روشنی میں احکامات جاری کرنے چاہئیں جو متعلقہ فریق کے عقیدے کے مطابق ہوں۔ یہی ہماری خوشی ہے۔ اگر کوئی شخص آپ کے مشورے یا ہدایات کے مطابق عمل نہ کرے تو اسے ایک رسمی خط بھیج دیجیے تاکہ یہ اس بات کا ثبوت ہو کہ آپ نے اسے آگاہ کر دیا تھا۔ اس ثبوت کی بنیاد پر عالی جاہ اس سے حکم عدولی کے لیے باز پرس کر سکیں گے۔"

اگرچہ پنجاب کے بادشاہ مہاراج تھے لیکن اصل حکومت شہر کے معزز اصحاب سیف و قلم کے پاس تھی۔ یہ حکومت صحیح معنوں میں سیکولر تھی اگرچہ اس کی بنیاد مذہبی بنیادوں پر قائم تھی۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ مہاراجہ کے دور میں کم تر سے کم کسان بھی سرکار کے کاموں میں خود کو شریک سمجھتا تھا اور جس طرح دربار کے امرا انتظامیہ لاہور میں خود کو شریک سمجھتے، اسی طرح یہ کسان بھی خود کو شریک سمجھتے۔ خواتین، بچوں اور ضعیف لوگوں کے تئیں مہاراجہ کا رویہ انتہائی ہمدردانہ تھا۔ دربار میں دو تین بچے ہمیشہ گھٹنوں کے بل چلتے نظر آتے۔ ان کی ہمدردی، نرم دلی اور جذبۂ ترحم کے بارے میں متعدد روایات مشہور ہیں۔ وہ بیواؤں اور جسمانی طور پر معذور افراد پر خاص طور سے رحم کھاتے۔ لوگ راستہ میں ان کے جسم کو چھونے کی کوشش کرتے۔ کچھ گاؤں والوں کا عقیدہ تھا کہ مہاراجہ کسی معمولی دھات کو بھی چھو دیں تو وہ سونا بن جائے گا۔ ایک قصہ مشہور ہے کہ ایک اندھی عورت نے مہاراجہ کا راستہ روک لیا۔ مہاراجہ کے سپاہی اسے ایسا کرنے سے ابھی روکنے ہی والے تھے کہ اس نے اپنی پتیلی کی پتیلی بادشاہ کے کپڑوں سے مل دی جس سے ان کے کپڑے کالے ہو گئے۔ غالباً وہ اس پتیلی میں کچھ پکا رہی تھی کہ اچانک اس نے شاہی ہاتھیوں کی گھنٹیوں کی آواز سنی۔ وہ اس پتیلی کو اٹھا کر باہر بھاگی اور صاف تک نہ کر سکی۔ مہاراجہ نے اس اندھی عورت اور اپنے کپڑوں کی طرف نظر ڈالی اور کہا کہ "بوڑھی ماتا۔ آپ نے ہمارے کپڑے کیوں خراب کیے؟" عورت گڑگڑا کر بولی "مہاراجہ۔ میں نے آپ کے کپڑے خراب کیے ہیں، آپ میرا سر قلم کر دیجیے لیکن اپنے سپاہیوں کو میری پتیلی نہ لے جانے دیجیے۔"

"آپ ایسا کیوں کہتی ہیں" بوڑھی ماتا۔

"کیونکہ اب یہ سونے کی ہو گئی ہے۔"

"ہاں بوڑھی ماتا۔ یہ سونے کی ہو گئی ہے۔ اور اسے آپ سے کوئی نہیں چھینے گا۔ رنجیت سنگھ نے اس بوڑھی عورت کی پتیلی میں سونے کے سکے بھروا دیے اور اسے سپاہیوں کی حفاظت میں گھر بھجوا دیا۔ یہ غریب بیوہ عورت تھی جس کا ایک ہی بیٹا تھا جو جنگ میں کام آگیا تھا۔ رنجیت سنگھ کو بعد میں جب ان تفاصیل کا علم ہوا تو انھیں خوشی ہوئی کہ انھوں نے اس کے لیے کچھ کام کیا۔ اس طرح وہ عوام کے دلوں میں بے حد عزت و احترام حاصل کر چکے تھے۔ ان کی زندگی میں ہی اس طرح کے بہت سے قصے مشہور تھے۔ وہ جس سرزمین سے تعلق رکھتے تھے، وہ کسانوں کی بستی تھی۔ انھوں نے کسانوں کو استحصال سے بچانے کے لیے متعدد خصوصی قدم اٹھائے۔ وہ نہ صرف انسانوں پر بلکہ جانوروں پر بھی رحم کرتے۔ قدرت نے انھیں بہت سی صفات سے نوازا تھا۔ ان کا شمار ان ذہین اور طباع شخصیتوں میں ہوتا ہے جو دنیا پر اثر انداز ہوئی ہیں۔ وہ تخلیقی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ اس طرح ان کا مقام وہی ہے جو شیواجی کا ہے یا حیدر علی کا ہے۔ وہ صاحب بصیرت انسان تھے۔ اس لحاظ سے وہ اکبر اور اشوک کے ہم پلہ کیے جا سکتے ہیں۔

عام خیال ہے کہ وہ پنجابی زبان کے شاعر تھے۔ یہ زبان انھیں بہت پیاری تھی۔ درباری گفتگو پنجابی میں ہوتی، ویسے عدالت کی زبان فارسی تھی۔ مہاراجہ کو اردو اور ملتانی زبانوں سے بھی رغبت تھی۔ اس کے علاوہ انھیں کشمیری اور سندھی زبانوں کے بہت سے الفاظ یاد تھے۔ انھوں نے زراعت، تجارت، بہی کھاتہ کی تعلیم اسکولوں میں لازمی کرا دی۔ متعدد علوم ترجمے کرائے اور تعلیم کے لیے کثیر رقمیں خرچ کیں۔ وہ اسکولوں کے نصاب میں کھیلوں کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ انھوں نے دربار میں ایسے آدمیوں کی ہمت افزائی کی جو اگرچہ رسمی معنوں میں تعلیم یافتہ تھے لیکن جنھیں قدرت نے سوجھ بوجھ اور عقل و دانش سے سرفراز کیا تھا۔ وہ اس طرح کے سوجھ بوجھ رکھنے والے افراد کی عقلی برتری کو اہمیت دیتے۔ وہ اس حقیقت سے آشنا تھے کہ رسمی تعلیم کا رواج کم ہو رہا ہے اور یہاں

(بقیہ صفحہ ۱۸ پر)

سلیم تمنائی

اقبال سے اقبال جاگا تمل ناڈو کا

صبح حسین

۵ جنوری ۱۹۲۹ء کی صبح کچھ زیادہ ہی حسین تھی۔ مدراس کے عوام اپنے محبوب شاعر کو دیکھنے ریل گھر پر جمع ہو رہے تھے۔ ہندو، مسلمان 'مدراس میل اور سوراجیہ کے اخباری نمائندے کاغذ قلم لیے منتظر دید اور فوٹو گرافرس کے کیمرے اپنی اپنی آنکھ صاف کیے بیٹھے تھے۔ ادھر اشارے پر پلک جھپکی کہ اُدھر تصویر یار دل میں بنالی۔ کھینچ لی۔

عوام کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ آگے بڑھ رہا تھا۔ جذبات، شوق کے ہاتھوں یوں مچل رہے تھے جیسے سمندر کے سینے پر موجیں بے چین ہوں۔ انسانی موجیں عجیب و غریب طریقوں سے اٹھ بیٹھ اور اچھل کود کر اپنا وقت بتا رہی تھیں۔ وقت شکوہ میں صبا رفتار اور دکھ اور انتظار میں پہاڑ نظر آتا ہے۔ آخر پہاڑ سا وقت بیتا اور ڈاکٹر اقبال اپنے دونوں رفیقوں پروفیسر عبداللہ چغتائی اور چودھری محمد حسین کے ساتھ آہستہ آہستہ ریل سے اترے۔ مہکتے لہکتے عقیدت و محبت کے پھول ہار کی صورت میں مہمانوں کے گلے کا ہار تھے۔

اب عقیدت مندوں کے ہونٹ پھڑک کے ہی نہیں بول اٹھے خدائے بزرگ و برتر کی تعریف و توصیف کے بعد اس کے ایک اقبال مند بندے کی ثنا خوانی میں عقیدت مند، سپاسناموں کی صورت میں سراپا سپاس تھے۔

معزز و محترم مہمانوں کو مدراس کے مشہور برسٹو Bristo ہوٹل میں ٹھہرایا گیا۔ مسافر نے کروٹ بدلی اور صبح دس بجے شہزادے ارکاٹ نے اپنی آنکھیں بچھائیں۔ خاطر و مدارات میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔

شام کو چار بجے حاجی جمال محمد کے جمالیہ ہوسٹل میں مہمانوں کو چائے اور چاہ دونوں ملی اور آگے قدم گوکھلے ہال میں تھا۔ صدر جلسہ شری سبرائن (وزیر تعلیم) نے خیر مقدم کیا اور جلسے کی کارروائی سے پہلے ایک سوال اٹھ کھڑا ہوا کہ جلسے میں ہندو اہلِ وطن کی تعداد زیادہ ہے لہذا جلسے کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہو یا کسی قومی گیت سے۔ تقریر کا موضوع دنیائے اسلام سے متعلق تھا اس لیے جلسے کے ارباب حل و عقد نے طے کیا کہ جلسے کا آغاز تلاوتِ قرآن مجید سے ہو۔

اللہ کے کلام کا اثر ابھی باقی ہی تھا کہ اے حمید حسن سیٹھ نے معزز مہمان کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا:۔

"یہ امر نہایت مسرت کا باعث ہے کہ سر محمد اقبال جیسی مایہ ناز ہستی کی تقریر ایک وزیر تعلیمات کی صدارت میں ہو رہی ہے۔ ہم سر محمد اقبال کا بہ حیثیت سفیر اسلامی تہذیب اور ماہر علم الہیات کے قلبی مسرت کے ساتھ خیر مقدم کرتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ سر محمد اقبال مغربی اور اسلامی تہذیب کے متعلق بعض ایسی باتیں بیان کریں گے جو کل مسلمانوں میں عنقا ہیں اور جس کی وجہ سے مسلمان اسلامی تہذیب کو اچھی طرح سمجھے نہیں ہیں۔"

وزیر تعلیم شری سبرائن نے خطاب فرماتے ہوئے کہا:۔

"اس سرزمین میں ہندو اور مسلمان دونوں آباد ہیں اگر وہ خود اختیاری حکومت حاصل کرنا اور اسے قائم رکھنا چاہتے ہیں تو ان میں اتحاد ضروری ہے۔ ہندوؤں کا فرض ہے کہ وہ مسلم اقلیت کو اطمینان دلادیں کہ وہ اس سرزمین میں بھائیوں کی طرح رہیں گے۔ (چیرز)

میرے لیے باعث عزت ہے کہ میں اگرچہ ہندو ہوں لیکن اسلامی فلسفہ پر لیکچر کی صدارت کے لیے منتخب کیا گیا ہوں۔ میں خوش ہوں کہ اس صوبے کے مسلمانوں کا زاویہ نگاہ صحیح ہے۔ اسلام نے مشرق کو بلکہ ساری دنیا کو اخوت کا سبق دیا۔ ہم ہندو ذات پات اور قومی امتیازات میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ہمیں بھی اسلامی تہذیب اور اسلامی کلچر سے اخوت کا سبق سیکھنا ہے۔ میں یہاں غیر برہمن کی حیثیت سے تقریر نہیں کر رہا اور نہ اس نقطہ خیال سے ذات پات کے خلاف کہہ رہا ہوں بلکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو یکجا کرنے اور تمام ہندوستانی اقوام میں اتحاد پیدا کرنے کے لیے ہمیں اسلامی اخوت کو دلیل راہ بنانا ہے۔"

وزیر تعلیم کی تقریر ختم ہوئی۔ تالیوں کے روپ میں اظہار مسرت ہوا، پھر گورنر کا پیغام تہنیت پڑھ کر سنایا گیا اور وزیر تعلیم نے ڈاکٹر اقبال سے درخواست کی کہ اپنا مقالہ پڑھیں۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن جیسے فلسفی سنبھل بیٹھے۔ تمام حضرات کے کان تیز ہوئے اور معتقدین کی آنکھیں ڈاکٹر اقبال پر لگی ہوئی تھیں۔

علامہ موصوف نے اہل مدراس کے پرجوش خیر مقدم کا شکریہ ادا کیا اور اپنا خطبہ[1] سنایا۔

۱؎ تازیانہ ۱۹۲۹ء ۱؎ خطبات مدراس بعنوان Eeconstruction of religious thought in Islam تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، چھپ چکے ہیں۔ اقبال نے مدراس میں تین خطبات سنائے تھے پہلا ۵ جنوری، دوسرا ۶ جنوری، تیسرا ۸ جنوری ۱۹۲۹ء کو گوکھلے ہال میں سنایا۔

ایک دریا تھا کہ بہا جا رہا تھا۔ بہتا اور گہرا دریا۔ جس کی گہرائی کا احساس ہر کسی کو تھا مگر علم نہیں تھا کہ کتنا عمیق ہے۔

اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں سے موہ لیتا ہے

۷ جنوری ۱۹۲۹ء صبح دس بجے گوکھلے ہال مدراس پھر سے سج دھج گیا۔ انجمن ترقی اردو اور ہندی پرچار سبھا مدراس کے ملے جلے اجلاس میں دونوں نے اپنے اپنے سپاس نامے پیش کیے۔

ڈاکٹر اقبال نے فرمایا :-

"جس تلطف آمیز انداز میں آپ نے ایڈریس میں میری خدمات کا ذکر فرمایا ہے میں اس کے لیے آپ حضرات کا دل سے ممنون ہوں۔ اگرچہ مجھے یہ قدرت حاصل ہے کہ میں الفاظ کا طلسم باندھ سکتا ہوں تاہم مجھے یہ احساس بھی ہے کہ باوجود اس قدرت کے تشکر و امتنان کا جو جذبہ میرے دل میں موجزن ہے اس کو کما حقہ ظاہر نہ کر سکوں گا۔ اس لیے اس کوشش کو فی الحال نظر انداز کرتا ہوں اور اس امر کو ترجیح دیتا ہوں کہ جن باتوں کا آپ نے ایڈریس میں ذکر فرمایا ہے۔ ان کے متعلق کچھ کہوں۔ آپ نے میری ادبی خدمات کا ذکر کیا ہے لیکن ان معمولی خدمات کا اعتراف حقیقت میں آپ کی فیاضی کا نتیجہ ہے۔ میں ان تعریفی الفاظ کا مستحق نہیں جو آپ نے میرے متعلق استعمال کیے ہیں۔ جو کچھ مجھ سے ہو سکا اس کے اصل محرک آپ ہی ہیں ؎

ہمہ مضمونِ من از تست چہ در دل چہ بلب
گوہر از بحر برآری نہ برآری از تست

حضرات! مجھے یہ دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی ہے کہ آپ اردو (ہندوستانی) زبان کی اشاعت و ترقی کے لیے سرگرم سعی ہیں اور آپ کو یہ احساس ہو چکا ہے کہ زبان اردو کو فروغ دیے بغیر جنوبی ہند کی سوشل، تعلیمی اور تمدنی مشکلات حل نہیں ہو سکتیں مگر میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ زبان کا مسئلہ ایک ٹیڑھا مسئلہ ہے۔ زبان احساسِ زندگی کی معنوی حقیقت کی مظہر ہے۔ جس طرح زندگی میں پیہم کشمکش ہے، اسی طرح انسانی خیالات و افکار میں ہر گھڑی کشمکش کا سلسلہ جاری ہے۔ زبان ہماری زندگی کے معنویت کی عکسی تصویر ہے۔ الفاظ کو دیکھیے تراکیب پر غور فرمائیے۔ کئی الفاظ متروک ہو جاتے ہیں ان کی جگہ نئے الفاظ مروج ہو جاتے ہیں۔ ہر زندہ زبان میں الفاظ و تراکیب کی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ زندگی کی پوری تصویر الفاظ کی کشمکش میں موجود ہے۔ زندگی کی حقیقت اور اس کی مسلسل کشمکش پر غور کرتے ہوئے رومی نے عجیب و غریب استدلال سے کام لیا ہے۔ دنیا میں ہر چیز یا آکل ہے یا ماکول، یا وہ کسی کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے یا کوئی دوسری چیز اسے اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔ یہی کیفیت خیالات و افکار کی دنیا میں پیدا ہے۔ جن کے اظہار کا نام زبان ہے۔ مولانا روم فرماتے ہیں ؎

ہر خیالے را خیالے می خورد
فکر ایں بر فکر آں دیگر برد

ایک خیال کو دوسرا خیال کھا جاتا ہے۔ ایک فکر انسانی دوسرے فکر انسانی پر حملہ کر کے اس پر غالب آ جاتی ہے۔ یہی کیفیت لفظ زبان کی دنیا میں جاری ہے۔ جس طرح افکار میں پیہم پیکار جاری ہے اسی طرح الفاظ میں بھی جنگ رہتی ہے۔ ایک زندگی دوسری زندگی سے پرورش پاتی ہے۔ ایک خیال دوسرے خیال سے پرورش پاتا ہے۔ ایک لفظ دوسرے لفظ سے پرورش پاتا ہے۔ جس زبان میں نئے خیالات کو اپنے اندر جذب کرنے کی قدرت ہے، وہی زبان دنیا میں زندہ رہ سکتی ہے۔ تو یہ زبان اس بات پر منحصر ہے کہ بولنے والے کیا افکار و خیالات کیسے ہیں۔ کن الفاظ و تراکیب میں ظاہر ہوتے ہیں پس وہی زبان زندہ رہے گی جس کو بولنے والی قوم ایسے افراد پیدا کرتی رہے جو نئے خیالات پیدا کرتے رہیں۔ اور ان خیالات کے اظہار کے لیے نئے طریق زبان میں مروج کرتے رہیں۔ پرانے خیالات کو بھی نئے الفاظ میں ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ اگر نئے الفاظ و تراکیب پیدا نہ ہوں تو زبان میں نئے خیالات کے اظہار کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ اگر آپ ایشیا کی تمام زبانوں پر دقیق نظر ڈالیں گے تو آپ پر خود واضح ہو جائے گا کہ تمام غیر یوروپین زندہ زبانوں میں فقط عربی ایک ایسی زبان ہے جس کا کوئی مستقبل ہے۔ یہ زبان باوجود اتنی پرانی ہونے کے اس لیے زندہ ہے کہ اپنے اندر نئے خیالات و افکار کو جذب کرنے کی طاقت رکھتی ہے۔ اگر ہم کو جدید طرز پر سوچنے اور موجودہ زمانے کے افکار و خیالات کو دل میں جگہ دینے اور بذریعہ زبان اس کو ظاہر کرنے کی ضرورت ہے تو ہمیں خود عربی زبان کے بیشتر الفاظ کو اختیار کرنا پڑے گا۔ عہد حاضر کے افکار کو پوری خوبی کے ساتھ ظاہر کرنے کی خوبی بجز زندہ یورپین زبانوں میں ہی ہے۔ میں اسے ایک دو مثالیں دے کر سمجھاؤں گا۔ دیکھیے ہمارے ملک میں جب بائسکل پہلے پہل آیا اور لوگوں نے اسے استعمال کرنا شروع کیا تو ہماری زبان میں یا ہندوستان کی کسی زبان میں اس کو پکارنے یا نام لینے کے لیے کوئی لفظ نہ تھا۔ اسی لفظ بائسکل کو ہمیں اختیار کرنا پڑا۔ لیکن جب یہی بائسکل مصر میں پہنچا تو مصریوں کے پاس جو عربی زبان بولتے ہیں۔ پہلے ہی اس مشین کا نام وضع کرنے کے لیے ایک مادہ موجود تھا۔ عربی میں ایک لفظ درج ہے۔ جس کے معنی تیز رفتاری کے ہیں اور دراج اس کے مبالغے کا صیغہ کا ہے۔ مصریوں نے لفظ درآج کو بائسکل کے معنوں میں استعمال کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ وہ بائسکل کو درآج ہی کہتے ہیں۔ اسی طرح سٹیشن کے لیے ہماری زبان میں کوئی لفظ نہیں اور ہم سٹیشن ہی بولتے ہیں۔ لیکن مصریوں یا عرب سٹیشن کو "محطہ" کہیں گے۔ اسی طرح مصریوں اور عربوں نے یورپین اصطلاحات اور نئے اسماء کے لیے سینکڑوں عربی لفظ وضع کر لیے ہیں۔ عربی خاص قسم کی زبان ہے اور ان زبانوں میں سے ہے جس کو Synthetic زبانیں کہتے ہیں۔ اسی طرح سنسکرت بھی Synthetic زبان ہے۔ ان زبانوں میں یہ طاقت ہوتی ہے کہ وہ خود اپنے اندر نئے الفاظ وضع کر لیتی ہیں۔ اردو زبان نئے خیالات و افکار کی خاطر تراکیب و اصطلاحات عربی سے مستعار لیتی ہے۔ اس لیے کہ خود اردو Synthetic زبان نہیں۔ مغرب میں بھی غالباً جرمنی زبان کے سوا اور کوئی زبان Synthetic نہیں اور اس لیے یورپ کی زبانوں نے بیشتر الفاظ و تراکیب Latin سے مستعار لیے جو Synthetic ہے، عربی زندہ زبان ہے اور ان زبانوں میں ہے جن

میں ہمیشہ زندہ رہنے کی خصوصیتیں موجود ہیں۔ باقی زبانوں میں ایسی زبانوں کے لیے زندہ رہنے کا زیادہ موقع ہے جو Synthetic زبانوں سے الفاظ مستعار لیتی ہیں۔ کسی زبان کو قومی زبان اختیار کرنے سے پہلے یہ سوچنا پڑے گا کہ زبان کا انحصار کن باتوں پر ہے۔ جنوبی ہند کے لیے اس امر پر سوچنا اور بھی ضروری ہے کیونکہ آپ کے ہاں کئی مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اردو زبان ہندوستان میں اب ترقی کی اس منزل پر پہنچ چکی ہے کہ اس میں موجودہ زمانے کے علوم کا بہت سا ذخیرہ جمع ہوگیا ہے۔

میں اراکین ہندی پرچار سبھا کا ممنون ہوں کہ انھوں نے مجھے ایڈریس دیا ہے۔ ان کا ایڈریس سن کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ حقیقت میں شاید انھیں مجھ کو علاحدہ ایڈریس دینے کی ضرورت ہی نہ تھی، خود ان کا ایڈریس اس بات کا ثبوت ہے کہ اردو اور ہندی میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں ایڈریسوں کی زبانوں کو دیکھیے۔ میں تو ان زبانوں میں کوئی خاص فرق نہیں دیکھتا اور تاریخی اعتبار سے بھی دونوں میں کوئی خاص فرق نہیں۔ اردو زبان میں مرور زمانہ سے کچھ الفاظ داخل ہو گئے ہیں۔ مسلمانوں نے قدرتاً عربی اور فارسی زبان کو اردو میں داخل کیا۔ اسی طرح ہندو عالموں نے سنسکرت کے الفاظ کو، اردو زبان میں۔ نہ عربی کے غیر مانوس الفاظ کو شامل کرنا چاہیے اور نہ سنسکرت کے غیر مانوس الفاظ کو ہندی میں شامل کرنا چاہیے۔ سیدھی سادی زبان لکھنی چاہیے۔ اردو اور ہندی کا یہ جھگڑا محض تعصب اور تنگ دلی کا نتیجہ ہے ورنہ دونوں زبانوں میں عام طور پر الفاظ وہی ہیں۔ اگر ہم بلا ضرورت عربی اور سنسکرت کے الفاظ اردو میں ٹھونسیں تو یہ مناسب نہیں، ہاں رسم الخط کی بات اور ہے۔ ہندی پر محض رسم الخط کی وجہ سے زور دینا ٹھیک نہیں اور نہ رسم الخط کا معاملہ اتنا تکلیف دہ ہے۔ رسم الخط محض لکھنے کے طریق کا نام ہے۔ اس پر بحثیں غیر ضروری ہیں اور وہ اس لیے بھی کہ نہ مسلمان عربی رسم الخط کو چھوڑنے کے لیے تیار ہیں اور نہ ہندو ہندی رسم الخط کو۔ کوئی ایک دوسرے پر اپنے رسم الخط کو جبراً عائد نہیں کرسکتا۔ لیکن بات تو یہ ہے کہ کسی طرح بھی لکھیں آخر الفاظ وہی ہیں۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ ؎

سخن کز بہر حق گوئی چہ عبرانی چہ سریانی
مکاں کز بہر حق جوئی چہ جابلسا چہ جابلقا

اگر نیت میں اخلاص ہے تو کیا عربی رسم الخط کیا ہندی رسم الخط، کیا شمالی ہند اور کیا جنوبی ہند، میں اپنے دوستوں سے کہوں گا کہ وہ ہندوستان کی اصلی مشکلات پر غور کریں۔ اگر ہندوستان زندہ قوموں میں شمار ہونا چاہتا ہے تو اسے ایک زندہ وسعت پذیر زبان پیدا کرنی ہوگی۔ الفاظ و تراکیب کے اختیار کرنے میں تنگ دلی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ ہمارے ہاں لاہور میں، کچھ عرصہ ہوا، جابجا انجمنیں قائم کرنے کا لوگوں کو شوق ہوا۔ ہندوؤں نے بھی متعدد انجمنیں قائم کیں مگر لفظِ انجمن ترک کر دیا اور بجائے انجمن سبھا کا لفظ استعمال کرنے لگے۔ میں نے ایک ہندو دوست سے سوال کیا کہ آخر لفظ انجمن کے ترک کا باعث کیا ہے، تو انھوں نے جواب دیا کہ ہم تو ہندی لفظ لکھنا چاہتے ہیں، ہم سبھا لکھیں گے۔ انجمن نہیں لکھیں گے۔ میں نے ان سے کہا کہ بھائی انجمن فارسی زبان کا لفظ ہے اور فارسی سنسکرت کی چھوٹی بہن ہے۔ پھر اس تنگ دلی کے کیا معنی کہ چونکہ مسلمان لفظ انجمن بولتے یا لکھتے ہیں، اس لیے ہندو اس کو ترک کردیں، خواہ وہ لفظ اپنی اصلیت کے اعتبار سے سنسکرت ہی سے کیوں نہ تعلق رکھتا ہو۔ پروفیسر میکس مُلر نے تو اس کے متعلق لمبی بحث کی ہے اور وہ لفظ انجمن اور انگریزی کے لفظ Assembly کا ماخذ بھی ایک ہی بتاتے ہیں۔ جہاں تک فارسی کا تعلق ہے، ہندوؤں کو اس زبان کے خلاف کسی تعصب سے کام نہیں لینا چاہیے۔ فارسی کے الفاظ کو محض اس لیے ترک کرنا کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ آئے ہیں محض تنگ دلی کا ثبوت دینا ہے۔ شاہنامہ میں فارسی کے بعض اشعار آپ کو ایسے ملیں گے جن کے تمام الفاظ ماخذ کے لحاظ سے سنسکرت سے تعلق رکھتے ہیں، محض تعصب کی وجہ سے فارسی کے الفاظ کا ترک کرنا مناسب نہیں۔ باقی رہی زبان عربی تو جب ایک Analytic زبان بغیر کسی Synthetic زبان کی مدد کے زندہ نہیں رہ سکتی تو اگر مسلمان عربی کے بعض ضروری الفاظ و تراکیب کو استعمال کرتے ہیں تو یہ کوئی وجہ نہیں کہ ان کو اس سے روکا جائے۔ بغیر ایک زندہ Synthetic زبان کی مدد کے ہندوستان کی موجودہ زبان ترقی نہیں کرسکتی اور کوئی وجہ نہیں کہ عربی جیسی زندہ Synthetic زبان کے الفاظ و تراکیب سے مدد نہ لی جائے۔ دوسری صورت صرف یہ ہوسکتی ہے کہ ایشیا کی اس زندہ Synthetic زبان کو چھوڑ کر یورپین زبانوں کی ترکیب و اصطلاحات اختیار کرلی جائیں۔ ایک زندہ ایشیائی Synthetic زبان سے اپنی علمی ضروریات میں مدد لینا نہایت ضروری ہے۔ ہاں غیر مانوس الفاظ کے استعمال کی مخالفت میں جو کچھ کہا جائے وہ حق بجانب ہے۔ غیر مانوس اور دقیق الفاظ کے لکھنے والوں کی غرض محض اپنی قابلیت کا اظہار ہوسکتا ہے ورنہ اس سے فائدہ کچھ نہیں۔ مجھے مسرت ہے کہ اردو والوں اور ہندی والوں میں باہم اتفاق ہے اور سچ تو یہ ہے کہ کوئی اختلاف کی وجہ بھی نہیں۔

اس کے علاوہ انجمن ترقی اردو نے اپنے ایڈریس میں موجودہ زمانہ میں مادیات کے اثرات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ اثرات اس وقت یورپ کو تباہ کرچکے ہیں اور اب ایشیا میں آرہے ہیں۔ مسلمان قوم یورپ اور ایشیا کے مابین ایک حد فاصل کا کام دے رہی ہے اور اسلام دونوں براعظموں میں اپنے سچے اور صحیح اصولوں کی وجہ سے عجیب و غریب اثرات پیدا کرتا رہا ہے۔ جن کی وجہ سے جو بنی نوع دنیا کے ان بڑے خطوں میں گم ہو رہے ہیں، گمراہیوں سے بچ جاتے ہیں جیسا کہ میں کل شام بھی اپنے ایک دوست سے کہہ رہا تھا کہ مسلمانوں کے سامنے دو فرض ہیں ایک تو اسلام کی حفاظت کرنا اور دوسرے نفس مذہب کو مادیت کے مخالفانہ حملوں سے محفوظ رکھنا۔ موجودہ وقت اسلام کے لیے بے حد نازک ہے۔ اسلام اپنی تاریخ میں ایک دفعہ نہیں کئی دفعہ مادیت کا مقابلہ کرچکا ہے۔ پہلے یہی صورت یونان کے مادی حملوں کے وقت پیش آئی تھی۔ اس وقت علماء نے کمرِ ہمت باندھی اور اس حملہ کا نہایت عمدگی اور کامیابی سے مقابلہ کیا، لیکن آج کے حالات اور ہیں۔ جہاں تک میں اندازہ کر سکا ہوں۔

حضرات! علماء کی موجودہ علوم و فنون سے غفلت میں محض ان کا قصور، اور نہ یہ الزام سارے کا سارا ان کو دیتا ہوں، حقیقت یہ ہے کہ گزشتہ دو ایک صدیوں میں اسلامی دنیا میں حالات ہی ایسے پیدا ہوگئے کہ جن پر قابو پانے کا قوم کو یارا نہ تھا۔ اگر آپ نفس مذہب کو بنی نوع کی خاطر محفوظ رکھنا چاہتے ہیں تو آپ ایسے

علما پیدا کریں جو مادیت کا مقابلہ کر سکیں۔ میں ممنون ہوں کہ جو ناچیز خدمت میں نے کی ہے اسے آپ نے قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ جو کچھ میں نے کیا ہے یا جو کچھ ابھی اور دس سال میں ہم کریں گے۔ وہ بہت ہی تھوڑا ہے۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ یورپ نے کیا کچھ کیا ہے اور کیا کچھ کر رہا ہے۔ اس بات کو وہی لوگ جانتے ہیں جو یورپ کے حالات سے اچھی طرح واقف ہیں۔ یہ نہایت خطرناک وقت ہے۔ اس وقت اپنی روایات اور اپنے علوم وفنون اور مذہب وتہذیب کو محفوظ رکھنا اور اپنی ہستی کو قائم رکھنا بڑا کام ہے، حاجی جمال محمد صاحب کی شخصیت نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ ایک شخص سادہ لباس میں ہے۔ کروڑوں کی تجارت کرتا ہے اور دقیق فلسفیانہ مسائل پر گفتگو کر سکتا ہے۔ اسلام نے اسی Plain living and high thinking کی تعلیم دی تھی۔ شکل دیکھو تو درویشوں کی اور دل دیکھو تو بادشاہوں کا۔ اسی زندگی کی سرورِ کائنات نے ہدایت کی تھی۔ جس وقت سے مسلمانوں نے یہ زندگی چھوڑ دی اسی دن سے زوال شروع ہو گیا۔ ہم سب کو چاہیے کہ اس معاملہ میں حاجی صاحب کی تقلید کریں۔

میں دونوں انجمنوں کا دوبارہ شکریہ ادا کرتا ہوں[1]۔

علامہ اقبال نے اردو ہندی زبان کے شیدائیوں کا من موہ لیا اور حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس کی صدارت فرمائی۔ آپ کو تقریر کے بعد حاضرین نے کلام شاعر بہ زبانِ شاعر پر معصوم بچوں کی طرح اصرار کیا۔ مانو مچل مچل گئے۔ جمید حسن سیٹھ نے لاکھ منع کرنے کی کوشش کی مگر بات نہ بنی تو ایک شرط سامنے رکھی[2]۔

"اگر پبلک اس یتیم خانے کی امداد واعانت فراخ دلی کے ساتھ کرے
جو انجمن حمایت اسلام کی زیرِ نگرانی یتامیٰ کی تعلیم وتربیت کا محافظ ہے"

ایک شور اٹھا کہ ہمیں منظور ہے۔ سات ہزار کی رقم جمع ہو گئی۔ اور علامہ اقبال نے ہنستے مسکراتے اپنا وعدہ پورا کیا اور زبورِ عجم سے وہ نظم سنا دی جس کا مطلع ہے ؎

از ہر کس کنارہ گیر صحبت آشنا طلب
ہم ز خدا خودی طلب ہم ز خودی خدا طلب

ہر شعر کے بعد اس کی تشریح بھی فرمائی مانو سونے پہ سہاگہ ہو جیسے۔ عوام شراب دواتشہ کے نشے سے سرشار سے کر دی۔ ورمن نے اسی زمین میں چند شعر کہہ کر آپ کی نذر کیے۔ مطلع ملاحظہ ہو ؎

اے کہ غنیستی زماست زما ہمہ طلب
شکر کنم کہ شکوہ است کردی عطا بما طلب

۴ بجے شام کرسنٹ سوسائٹی نے "دعوت ماحضر" کا انتظام کیا اور ساڑھے ۶ بجے شام کو کھلے ہال میں حضرت اقبال نے اپنا دوسرا خطبہ سنایا۔ اور شب کے ۸ بجے اپنے معزز مہمان حاجی جمال محمد کے ہاں خاصہ تناول فرمایا۔ اور تھکا ہارا جسم نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

شیریں سخن ونازک دہن خواتین کا اجلاس

بروز دوشنبہ ۷ر جنوری سوراجیہ نے خصوصی نمائندے نے اپنے "مذہب وسیاست کی یکجائی" پر تفصیلی گفتگو کی، اقبال نے فرمایا[1]:-

"میں اس امر کی ضرورت بڑی شدت سے محسوس کر رہا ہوں کہ ہماری درس گاہوں میں مذہبی تعلیم بھی ہونی چاہیے۔ میں بہ حیثیت ایک ہندوستانی، مذہب کو سوراج پر مقدم خیال کرتا ہوں۔ ذاتی طور پر مجھے ایسے سوراج سے کوئی واسطہ نہ ہو گا جو مذہب سے بے نیاز ہو۔ یورپ میں تعلیم کا خالصتاً دنیوی طریق بڑے تباہی آمیز نتائج پیدا کرنے کا موجب ہوا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میرا ملک بھی ان تلخ تجربات سے دوچار ہو۔ یہ امر صاف ظاہر ہے کہ باشندگان ایشیا۔ یورپ کے خالص مادی رویہ کو بھی فراموش نہیں کر سکتے۔ ہمارے سامنے یہ مسئلہ در پیش ہے کہ روحانی اور مادی امور کو کس طرح یکجا جمع کیا جائے۔ میرا عقیدہ ہے کہ باشندگانِ ہند اس کارِ عظیم کو انجام دینے کے اہل ثابت ہوں گے۔ کیونکہ ان کی مذہبی روایات۔ ان کے ادراک کی تیزی اور ان کے جذبات کی شدت اس کام کی اہلیت کا ثبوت دے رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نوعِ انسان کی عام بھلائی کے لیے میں یہاں کے مسلمانوں اور ہندوؤں کی مفاہمت کا متمنی رہتا ہوں۔ اور اسے اشد ضروری خیال کرتا ہوں۔ صرف باشندگان ہند ہی پرانی دنیا کے کھنڈروں پر نئے آدم کے لیے نئی دنیا تعمیر کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ ہمارے نوجوانوں کی باتیں کہ مذہب کو بالائے طاق رکھ کر تمام تر توجہ سیاست پر دینی چاہیے۔ یورپ کی غلامانہ تقلید کے سوا اور کچھ نہیں۔ جس کی مادہ پرستی یورپ کی روحانیت اور دوسری اقوام کی مادیت کے لیے پیامِ موت ثابت ہو چکی ہے[2]۔"

صبح دس بجے مع اپنے رفیقوں کے ڈاکٹر اقبال نے غضبناک سمندر، عجیب وغریب مچھلیوں کا عجائب گھر اور اینی بیسنٹ کی قائم کردہ تھیوسوفیکل سوسائٹی کے درشن کیے۔ ایک بجے صدر جلسہ کے گھر مدعو اور چار بجے میسرز اسلم گارڈن میں چائے پی۔ اور پانچ بجے شام انجمن خواتین اسلام مدراس کے اجلاس میں شرکت کی۔ پردے کا خاص انتظام تھا۔ ویسے چند ترقی پسند خواتین نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ "بے پردہ عورتوں کا ایک مجمع ہو۔ جہاں علامہ موصوف اپنے ساتھیوں کے ہمراہ تشریف لا کر تقریر فرمائیں۔ مگر اسلام کے اس غیور فرزند نے اس ناروا مطالبہ کو ٹھکرا دیا[3]۔"

عورتیں پردے میں تھیں۔ ترجمانِ حقیقت باہر تشریف فرما ہوئے۔ ایک خاتونِ محترم نے تلاوتِ قرآن شریف سے جلسے کا آغاز کیا۔ سپاس نامہ پڑھا گیا[4]۔

---

[1] سفینہ ۱۹۲۹ء [2] روزنامہ الکلام مطبوعہ ۴ر مارچ ۱۹۲۹ء

[1] انقلاب لاہور مطبوعہ ۱۹ر جنوری ۱۹۲۹ء۔ مذہب اور سیاست سے متعلق علامہ اقبال کے خیالات۔ از فوق۔ نیرنگ خیال۔ ۱۹۳۲ء [2] اس سلسلے میں ترکی کے ناکام تجربے، پردہ، پان اسلامزم وغیرہ پر بھی اقبال نے فرمایا۔ جس کی تفصیل اپنی زیر ترتیب کتاب "اقبال بارگاہ ٹیپو میں" دی ہے۔ [3] ہفتہ وار تازیانہ مطبوعہ ۴ر مارچ ۱۹۲۹ء۔ [4] تازیانہ

علامہ اقبال نے علم وعمل، تیزیِ طبع، جدت طرازی اور کلام کو سراہتے ہوئے عرض کردیا کہ:-

"آپ سے یہ عاجزانہ التماس کرنا غیر موزوں اور نامناسب نہ ہوگا کہ آپ ہم اسیرانِ قفس کے لیے بھی اپنے قیمتی اوقات سے کچھ وقت وقف فرمائیں۔ اور طبقۂ نسوانِ اسلام کی شرعی آزادی کے لیے نغمہ سنجی فرمائیں۔ ہم اسیرانِ قفس کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ اس کے انسداد کے لیے کوئی پرجوش نظم لکھ کر سوئے ہوئے جذبات بھڑکائیے ....

اسلام نے مساوات کی تعلیم دی ہے۔ ہمیں دکھ ہے کہ مردوں کی جانب سے عورتوں کے حقوق سے متعلق سخت بے پروائی برتی جاتی ہے۔ ہم آپ سے درخواست کرتی ہیں کہ آپ اس کی اصل وجوہ پر مفصل روشنی ڈالیں۔ ہم یہ کہنا نہیں چاہتیں کہ ہمارے بھائی جو ہماری ہی ماں سے پیدا ہوئے ہیں سخت ظالم وسفاک ہوتے ہیں بلکہ رنج اس بات کا ہے کہ فرقۂ اناث کے ساتھ بے انصافی کرنے اور ان کی حق تلفی کرنے کی بنیاد خود والدین کے گھروں میں ہی دی جاتی ہے۔ ماں باپ دونوں فریق میں افراط وتفریط وفرق کو ہمارے ساتھ ساتھ پرورش کرتے ہیں۔ لڑکی کو لڑکے کے مقابلے میں کھانے پینے کے علاوہ تقسیم املاک میں بھی محروم کر دیتے ہیں۔ لڑکی اگر بدقسمتی سے بیوہ ہوجاتی ہے تو ماں باپ اپنی خاندانی عزت وعظمت بچانے کے لیے اس کی شادی نہیں کرتے۔ ان کو بھائیوں اور چچاؤں کا دستِ نگر بنا کر تباہ کر دیتے ہیں عصرِ جدید میں ہر جگہ طبقۂ نسواں کی آزادی کی چیخ وپکار ہے۔ نئی تعلیم وروشنی کا فطرتی نتیجہ یہ ہے کہ اسلامی طبقۂ نسواں میں ان کی شرعی اور جائز آزادی اور مساوات ان کو حاصل ہو۔ اسلام کی سچی اور زندہ روح اسلامی مستورات میں ہی ہے اور اسلامی صنفِ نازک نے زندہ آگ میں جل جل کر، بھسم ہو ہو کر اپنے ایثار کا ثبوت دیا ہے۔

آپ سے امید قوی رکھتی ہیں کہ آپ زمانۂ قریب میں طبقۂ نسواں کی بہبودی وآزادی کی ترانہ سنجی فرمائیں گے۔ اور فرقۂ اناث اس کارِ خیر کا ہمیشہ ممنون وشکرگزار رہے گا۔[1]"

حضرت اقبال اٹھے، امیدوں کی ایک کرن جیسے جاگی۔ "دورِ حاضر کی مسلم خاتون" پر ایک مختصر، جامع اور حقائق سے بھری تلخ ترش وشیریں تقریر فرمائی۔[2]

انجمن ترقی اردو نے رات کے ساڑھے سات بجے حضرت اقبال کو خاصہ پر مدعو کیا۔ طعام وکلام کے بعد بلند مقاصد کا تعین ہوا عمل کے پر لگے۔ یہ سچ ہے کہ جہاں آدمی عرش سے فرش پر گر سکتا ہے وہاں فرش سے عرش تک پہنچ سکتا ہے۔ بلند مقاصد کے ساتھ خلوص اور عزمِ صمیم ہو تو بہتر پائی اور منزل آسان ہی ہوگی۔

نونہالانِ چمن کے ساتھ

ہاں آج ۸ رجنوری ہے اور دن منگل کا۔ جنگل میں منگل کی بات مشہور تھی۔ آج شہر ہی منگل کی حقیقت تھا۔

وقت کیا ٹھہرا ہے؟ گھڑی صبح نو بجے کی نیک گھڑی لائی۔ علامہ اقبال مدرسہ حاجی عیسیٰ ابا سیٹھ جارج گون تشریف لے گئے۔ تقسیم انعامات کے اس جلسے کی صدارت فرمائی۔ انعام پانے والے طلبا پھولے نہ سما رہے تھے۔ ماخوذہ انعام کے روپ میں اپنا اقبال، حضرت اقبال کے ہاتھوں پا رہے تھے۔

صبح گیارہ بجے شعرا کی جھرمٹ میں تھے۔ جیسے چاند، ستاروں کے بیچ روشن روشن ہو۔ ساڑھے تین بجے محمڈن کالج کے انگلش لکچر ہال میں مجلس جم گئی۔ پرنسپل مسٹر گرین (صدرِ جلسہ) اور افضل العلما مولوی عبدالحق صدرِ سوسائٹی نے ڈاکٹر اقبال کا استقبال فرمایا۔ سید کریم اللہ حسینی نے نہایت خوش الحانی سے حضرت اقبال کا ایک قطعہ[1] پڑھا جس کا شعر تھا ؎

کل ایک شوریدہ خوابگاہِ نبیؐ پہ رو رو کے کہہ رہا تھا
کہ مصر وہندوستاں کے مسلم بنائے ملت مٹا رہے ہیں

قطعہ[2] کے اختتام پر ایک اور نظم "خطاب بہ نوجوانانِ اسلام" سنائی۔ مسٹر گرین نے سر محمد اقبال کی ادبی وعلمی خدمات کا تذکرہ کیا۔ ان تصانیف کا ذکر بھی ہوا جن کا اثر ہندوستان سے گزر کر یوروپین ممالک تک پہنچ رہا ہے۔

"آج کے اس واقعہ کو میں اپنی زندگی کے ممتاز واقعات میں شمار کروں گا۔ کیونکہ آج مجھے ایک مشہور شاعر کے خیر مقدم کا موقع ملا ہے۔[3]"

آقا سید ہدایت اللہ شوستری رضوان (استاد فارسی)، نے چند شعر فی البدیہہ موزوں کر کے سنائے۔ جس کا مقطع تھا ؎

خیر مقدم چہ گویدت رضوان
کہ بہ وصف تو گشتہ ناطقہ لال

افضل العلماء مولوی عبدالحق نے ایک سپاس نامہ زریں فریم میں پیش کیا۔[4]

اے نیرِ اقبالِ ملت!

اس وقت جب ماہِ سیمایانِ ہند خوابِ غفلت میں سرشار تھے، اور جو چونکے تھے وہ محض رونے رلانے پر قانع تھے، تو نے سب سے پہلے صدا بلند کی کہ ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک۔ تو نے بطنِ گیتی سے پیدا ہونے والے آفتابِ تازہ کی طرح سب سے پہلے ہماری توجہ منعطف کرائی اور شپرہ چشمی کی نگاہوں کو چکاچوند کر دیا۔ صدیوں کے جمود اور تاریکی کی وجہ سے شب ہمہ سایہ کی ظلمت کی عادی آنکھیں تابِ نظارہ نہ لا سکیں۔ اور گوشۂ عزلت کی پناہ جویاں ہوئیں۔ لیکن تیری پرجوش صداؤں نے انھیں باہر نکالا۔ اور امید کی کرنوں کا تماشائی بنا دیا۔ گو وہ ہستیاں جنھیں ذوقِ تماشا تھا رخصت ہوگئی تھیں۔ لیکن اب بھی دیدارِ عام کے ایک وعدے پر فدا ہونے والوں کی تعداد خاصی تھی۔ تیری تابش کا اثر تھا کہ ذرے کے دل میں خورشید کی چمک پائی گئی اور سچ تو یہ ہے کہ تیری تیز تیز شعاعوں نے ذرے کو خورشید بنا چھوڑا کہ

---

[1] تازیانہ ۱۹۲۹ء۔ [2] علامہ ممدوح نے تقریباً انھیں خیالات کا اعادہ فرمایا جن کو آپ اپنی نظموں میں مجمل اور رموزِ بے خودی میں بہ وضاحت ظاہر کر چکے ہیں۔ (سہ ماہی سفینہ، محمڈن کالج مدراس ۱۹۲۹ء)

[1] [2] [3] [4] سفینہ ۱۹۲۹ء

اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے ادھر نکلے۔

اے پیمانہ بردارِ خمستانِ حجاز!

تیرے رند ایک مدت تک بے ہوش و مست رہے۔ مئے نو نے ان کے حال کو زبوں کر دیا تھا۔ اب ضرورت تھی اس آتش بہ جام ساقی کی جو اصلی معنوں میں شعلہ آشام پیدا کرتا۔ اب ضرورت تھی اس خانہ ساز شراب کی جو مئے مغرب کے اثر کو زائل کرتی اور دل کے خموش ہنگاموں کو بیدار کرتی۔ بادہ اغیار کے دیوانے نقد خودداری کو دے کر لینے پر تلے ہوئے تھے۔ لیکن تیرے عجمی خم کی مے حجازی نے ایک نئی حرارت پیدا کر دی۔ بادۂ کہن کے تیز نشے نے مئے نو کی حقیقت کھول دی اور وہ جن کے کام و زبان اس کہنہ شراب کی لذت سے واقف ہو چکے ہیں، شاید ہی اس مئے خانۂ مغرب کی طرف متوجہ ہوں۔ لیکن کیا یہ تعجب انگیز نہیں کہ آج محفل میں بادہ آشام بھی نئے ہیں اور بادہ بھی نیا ہے۔ ڈر ہے کہ کہیں میناگداز صہبا دلِ مسلم کو لختہ لختہ نہ کر دے۔

اے ساقیِ ملت!

اب محفل کا رنگ نرالا ہو رہا ہے۔ شدتِ خمار کی وجہ سے قویٰ میں تشتت و انتشار پیدا ہو رہا ہے۔ وہ جن کے ہنگاموں سے کبھی ویرانے آباد ہوا کرتے تھے آج آبادیوں کو بن کر رہے ہیں۔ جن کے لیے دریا ایک جرعۂ میکش سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا تھا۔ آج اندیشۂ طوفاں سے کانپ رہے ہیں اور اغیار تو حرم کے پرواں کی طرف خطاب کر کے کہتے ہیں۔

تھا جوش و خروش اتفاقی ساقی　　اب زندہ دلی کہاں ہے باقی ساقی
میخانے رنگ و روپ بدلا ایسا　　میکش میکش رہا، نہ ساقی ساقی

کیا آج ہم تجھ سے یہ توقع نہیں رکھ سکتے ؎

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے　　مزا تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

سپاس نامے کے بعد عبدالجبار نائب صدر اردو سوسائٹی محمڈن کالج نے ایک جرأت طلبا کی جانب سے تحریری درخواست کی صورت میں کی:۔

جناب عالی! غالباً آپ کو اپنی طالب العلمی کا زمانہ یاد ہوگا جب کہ زندگی مرادف تھی ان دو خواہشوں کے، ایک "جنت نگاہ" دوسرے "فردوس گوش"۔ سنتے ہیں کہ خدا نے آپ کو لحن داؤدی عطا فرمایا ہے۔ ہماری دلی آرزو یہی ہے کہ آپ ہمیں "فردوس گوش" کے حقیقی لذائذ سے متمتع ہونے کا موقع دیں۔ آپ کو اپنی طالب علمی کا واسطہ کہ آپ اپنا کلام اپنے خاص انداز میں سنائیں۔

ڈاکٹر اقبال اٹھے اور فرمایا:۔

اراکین سوسائٹی نے جو سپاس نامہ پیش کیا ہے فی الحقیقت وہ نثر نہیں ہے بلکہ ایک دل فریب نظم ہے۔ آج اس جلسے میں اتنے مسلم طلبہ کو دیکھ کر مجھے اپنی طالب علمی کا زمانہ تو نہیں البتہ اپنی پروفیسری کا زمانہ یاد آگیا، جب کہ میں اسی طرح کالج میں اپنے طلبہ سے مخاطب ہوا کرتا تھا۔ آج میں اپنے آپ کو حقیقی معنوں میں پندرہ سال پہلے کا سا پاتا ہوں۔ مجھے آپ کے خیالات سے بڑی خوشی ہوئی اور یہ آپ کی خوش قسمتی ہے کہ یہاں مسٹر گرین سا ہمدرد پرنسپل اور دیگر لائق اساتذہ موجود ہیں، جن سے آپ پورا پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

آج ہمارے لیے نہ تو کوئی راہ تلاش کرنے کی ضرورت ہے اور نہ واقعی کوئی جدید راستہ ہمارے پیش نظر ہے۔ البتہ قافلہ نیا ہے۔ اس وقت ضرورت ہے کہ اس جدید گروہ کو اسی قدیم راستے سے ان کے مذاق کے مطابق آشنا کیا جائے ؎

کہ راہ ہمان است و کارواں دگر است

میرا کلام جو کچھ ہے چھپ گیا ہے جو ممکن ہے آپ کی نظروں سے گزر چکا ہو۔ اور اس کا اعادہ تحصیل حاصل ہے، اور گزشتہ چند سال سے تو میں نے تقریباً شاعری ترک کر دی ہے۔ اس لیے آپ کو کوئی جدید شے نہیں سنا سکتا۔"

طلبا نے کب کسی کی مانی ہے۔ خدا کی نہ شیطان کی، معصومانہ لیکن ذوق و اشتیاق سے بھری درخواست و اصرار نے اقبال کو مجبور کر دیا۔

آپ نے اپنا فارسی کلام نہایت ہی سادہ طرز میں پڑھ کر سنایا اور اس کے بعد اصرار کی وجہ سے آپ نے "بانگ درا" سے ایک چھوٹا سا قطعہ پڑھ دیا۔[1]

جناب یوسف ذکریا سیٹھ سکریٹری اردو سوسائٹی نے خوش خبری دی کہ اردو سوسائٹی کی جانب سے ایک سہ ماہی رسالے کا اجرا ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب سے التماس ہے کہ سرورق کے لیے ایک شعر عنایت فرمائیں۔

ڈاکٹر صاحب کچھ سوچ کر یہ معنی خیز شعر تحریر فرمایا ؎

سفینہ برگ گل بنا لے گا قافلہ مورِ ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا کے پار ہوگا

سکریٹری نے مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا، ڈاکٹر صاحب نے شعر ہی عطا نہیں فرمایا بلکہ رسالے کا نام بھی تجویز کر دیا ہے۔ جریدے کا نام "سفینہ" ہوگا۔

مولوی محمد صاحب پروفیسر انگریزی نے انگریزی زبان میں معزز مہمان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا:۔

حضرتِ اقبال کے ساتھ ہم نشینی اور یکجائی آنے والی نسلوں میں ہمیں ما بہ الامتیاز درجے کا مستحق بنا دے گی۔ ہم مہمان محترم کا دلی شکریہ ادا کرتے ہیں کہ باوجود کثرتِ کار اور متعدد مصروفیتوں کے آپ نے محمڈن کالج میں اتنی دیر تک قیام گوارا فرمایا۔ جس کے لیے جملہ طلبا اور اساتذہ کالج ہمیشہ آپ کے ممنون رہیں گے۔[2]

اساتذہ اور طلبا نے اقبال کے ساتھ تصویر کھنچوائی[3] اور چائے نوشی کا دور شروع ہوا، سید کریم اللہ حسینی نے اپنی خاص لے میں ترانہ اقبال پڑھا۔ اب گھڑی

(بقیہ صفحہ ۴۳ پر)

---

[1] سفینہ ۱۹۲۹ء۔ [2] پروفیسر حیدر علی خاں صاحب مدراس یونیورسٹی کا ایک خط راقم کے نام۔ [3] سفینہ مدراس ۱۹۲۹ء۔ [4] میرے عزیز دوست پروفیسر سعید سہروردی نے جالیہ کالج کے میگزین میں اس تصویر کو شائع کر دیا ہے۔

رفعت نواز

فسانہ کہیں جسے

ابھرتے سورج کی کرنیں روشندان اور کھڑکی کی درزوں سے کمرے میں ہلکا ہلکا اجالا پھیلا رہی تھیں۔ وہ لحاف پھینک کر اٹھ کھڑا ہوا۔ دوسرے پلنگ پر آصف لحاف میں لپٹا خراٹے لے رہا تھا۔ رات میں جب اس کی آنکھ کھلی، آصف کے خراٹے سنائی دیئے۔ اس کی بے فکر نیند پر اسے رشک آ رہا تھا۔ وہ بھی کبھی ایسے ہی گہری نیند سویا کرتا تھا۔ تھک کر بستر پر پڑتے ہی نیند آ جاتی تھی۔ لیکن اب تو گھنٹوں نیند نہیں آتی، پڑھ پڑھ کر آنکھیں دکھنے لگتی ہیں تب ہلکی سی جھپکی آ جاتی ہے۔ رات میں بھی تین چار دفعہ نیند اچٹ جاتی ہے۔ کھڑکی کھول کر وہ باہر کا نظارہ کرنے لگا۔ میدان میں سبزے پر اوس کے قطرے چمک رہے تھے۔ دور پرانے محل کے کھنڈر کے ارد گرد کی جھونپڑیوں سے دھواں اٹھ رہا تھا، پیڑوں پر چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ ننگے پیر ہی وہ باہر نکل آیا اور سبزے پر چلنے لگا، پھر دوڑنے لگا۔ اوس میں بھیگے سبزے پر دوڑنا اچھا لگ رہا تھا، تلووں سے سر تک ٹھنڈی لہر سی دوڑ رہی تھی۔ تھوڑی دور تک دوڑتا گیا ہوگا کہ سانس پھولنے لگا اور تھکن کا احساس ہونے لگا۔ تھوڑی دیر سستا کر آہستہ آہستہ چلتا ریسٹ ہاؤس لوٹ آیا۔ آصف اب بھی سو رہا تھا۔ کمرے میں صبح کی نرم نرم دھوپ کا اجالا پھیل گیا تھا۔ ملازم کو چائے کا آرڈر دے کر اس نے بستر سمیٹا، سامان سوٹ کیس میں رکھا، آصف کو اٹھایا اور شیو کرنے لگا۔ چائے آنے تک آصف بھی تیار ہو گیا۔ چائے پی کر سوٹ کیس ہاتھوں میں تھامے وہ بس اسٹینڈ کی طرف چل پڑے۔ ڈیڑھ سو کلومیٹر بس کا سفر درپیش تھا۔ ریل کے ذریعے گیارہ سو کلومیٹر کا سفر طے کر کے وہ یہاں تک پہنچے تھے۔

سترہ سال بعد وہ گاؤں جا رہا تھا خالہ سے ملنے۔ سوچا تو کئی بار تھا لیکن بات ہر بار ٹلتی رہی تھی۔ کوئی نہ کوئی بہانہ مل ہی جاتا۔ خالہ کے خطوط آتے تو وہ بے چین ہو جاتا۔ ان سے ملنے کا پروگرام بناتا۔ پیسوں اور چھٹیوں کا حساب لگاتا پھر بات ٹل جاتی بہانوں بھرا معذرت نامہ خالہ کو بھجوا دیتا۔ ایک بار خالہ کو اس نے بڑا تفصیلی خط لکھا تھا۔ گاؤں میں کیا رکھا ہے۔ اکیلی وہاں کیوں پریشان رہتی ہو، زمین اور مکان بیچ کر یہیں آ جاؤ اور اللہ اللہ کرو۔ خالہ نے اس کے خط کا سال بھر تو جواب ہی نہیں دیا تھا، پھر ان کا خط آیا تو اس کے مشورے کا تذکرہ ہی نہیں تھا۔ وہ خالہ کے مزاج سے واقف تھا، وہ بھلا کیوں اس کی دست نگر رہتیں۔ گاؤں میں گیارہ ایکڑ زمین تھی، مکان تھا، اور وہ اپنے نواسے کے ساتھ وضع داری سے وہاں رہ رہی تھیں۔ ان کی پریشانیوں کا وہ اندازہ تو کر سکتا تھا لیکن خالہ کے خطوط میں ان کا ذکر تک نہ ہوتا بس دعاؤں سے بھرے خطوط ہی آتے تھے۔ خالہ کی زندگی دکھوں کا ایک سلسلہ تھی جوانی میں شوہر کا انتقال ہو گیا تھا، ایک لڑکی لے کر وہ بہن کے یہاں آگئی تھیں۔ بہن اکثر بیمار رہتی تھی اور گھر کا سارا انتظام خالہ سنبھالتی تھیں، گاؤں کے چکر بھی لگاتیں زمین کاشت پر اٹھاتیں اور اناج بہن کے یہاں لے آتیں۔ مکان بھی کرایہ پر اٹھا دیا تھا۔ تھوڑا سا کرایہ ان کے اپنے اخراجات کی پابجائی نہیں کر سکتا تھا، وہ کپڑے سیتیں، پاپڑ اچار بنا کر فروخت کرتیں ـــ بہن کے یہاں تو سب کچھ تھا لیکن وہ تو صرف آسرا چاہتی تھیں سر چھپانے کے لیے۔ چھوٹی بہن پر بار نہیں بننا چاہتی تھیں اس لیے اتنی اٹھا پٹک کرتی تھیں۔ اور جب بہن مر گئی اور بھانجے بھانجی کی شادیاں ہو گئیں تو وہ بھی گاؤں چلی گئیں۔ ان کی لڑکی بھی دور کے شہر میں بیاہی گئی تھی۔ وہ خود بھی مرکزی سرکار کا ملازم ہونے کے ناطے دور دور کے شہروں میں پھرتا رہا تھا۔ خالہ سے ملے سترہ سال ہو گئے تھے۔ اس بیچ خالہ کی لڑکی پروین بھی مر گئی تھی اور خالہ اپنے نواسے لطیف کو گاؤں لے آئی تھیں۔ اب کی بار ایک مہینے کی چھٹی لے کر اس نے گاؤں جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ آصف بھی ضد کرنے لگا تھا۔ بیوی نے اصرار کیا کہ آصف کو بھی ساتھ لے جائیے۔ دادی سے مل آئے گا، گاؤں بھی دیکھ آئے گا۔

بس اسٹینڈ پر بڑی بھیڑ تھی۔ اس قصبے سے بہت سے دیہات جڑے ہوئے تھے اس لیے مسافر یہیں سے سوار ہوتے تھے۔ سب سے زیادہ فاصلے پر اس کا گاؤں صفی پور ہی تھا، جب کنڈکٹر سے اس نے صفی پور جانا ہے کہا تو پہلے اسے ہی ٹکٹ دیا گیا۔ آصف لپک کر کھڑکی سے لگی ہوئی سیٹ پر بیٹھ گیا، وہ بازو بیٹھ گیا۔ ایک دیہاتی اس کے بازو سکڑ کر بیٹھ گیا۔ بھیڑ بکریوں کی طرح انسان بھر گئے تو بس چل پڑی۔ اس کے بازو بیٹھے دیہاتی نے جیب سے بٹوہ نکالا اور پان بنا کر اسے دیا۔ پہلے تو اس نے انکار کیا اصرار بڑھا تو پان منہ میں رکھ لیا۔ آصف نے گھور کر دیکھا۔ ریل کے سفر میں بھی آصف نے مسافروں کی دی ہوئی چیزیں کھانے پر اسے ٹوکا تھا۔ لیکن وہ محض دینے والے کا دل رکھنے کے لیے دی ہوئی چیز کھا لیتا تھا۔ آصف کو وہ کیسے سمجھاتا کہ یہ گاؤں کا پرانا طریقہ ہے اپنائیت جتانے کا، باتوں کا سلسلہ شروع کرنے کا۔ کہاں سے آ رہے ہو، کہاں جا رہے ہو، فصلوں کا کیا حال ہے، اور ایسی ہی بے ضرر باتیں ہوا کرتیں۔ وقت بھی آسانی سے گزر جاتا۔ خاموش بیٹھے بیٹھے تو ہول ہونے لگتی تھی۔ آصف کو ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی دیہاتی

بھلا فلموں کی، کھیل کود کی باتیں کیسے کریں۔ راستہ بھر آصف کھڑکی سے سر نکالے باہر کا نظارہ کرتا رہا۔ چار گھنٹے بعد صفی پور کا بس اسٹینڈ آگیا۔ گاؤں سے تین کلو میٹر دور شاہراہ پر بس اسٹینڈ بنایا گیا تھا۔ بس سے اتر کر آصف نے اِدھر اُدھر دیکھا رکشہ تانگہ کہیں نظر نہ آیا تو اس نے باپ کی طرف تشویش سے دیکھا اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"گاؤں کتنی دور ہے بابا"

"تین چار کیلو میٹر تو ہوگا ہی"

پیدل ہی جائیں گے ہم ؟"

"سواری یہاں کہاں۔ پہلے تو چھ سات میل پیدل چل کر بس کے اڈے تک پہنچتے تھے اب ذرا سہولت ہوگئی ہے"

آصف نے ایربیگ گلے میں لٹکا لیا اور سوٹ کیس ہاتھ میں لے کر تیز تیز چلنے لگا وہ بھی دونوں ہاتھوں میں سوٹ کیس لیے چلنے لگا۔ آصف کافی آگے نکل گیا تھا۔ بار بار پلٹ کر اس کی طرف دیکھتا اور تیز چلنے کا اشارہ کرتا اور آگے بڑھ جاتا۔ اس کا سانس پھول رہا تھا، بدن پسینے پسینے ہو رہا تھا۔ جاڑوں کی چمکیلی دھوپ جلنی لگ رہی تھی۔ تھک کر وہ نیم کے پیڑ کے نیچے کھڑا ہوگیا اور رومال سے پسینہ پوچھنے لگا، آصف بھی دوڑ کر وہیں آگیا۔

"تھک گئے بابا"

"نہیں تو ذرا سستا کر آگے بڑھیں گے"

آصف نے اس کا سوٹ کیس بھی لے لیا اور چلنے لگا۔ اب بوجھ کم ہوگیا تھا اور وہ بھی تیز تیز چل رہا تھا۔ اسے شدت سے احساس ہوا کہ وہ بوڑھا ہو رہا ہے۔ اور اس کی ساری پھرتی اور طاقت آصف کے بدن میں منتقل ہوگئی ہے۔ یہ سوچ کر رنج بھی ہوا اور خوشی بھی۔ آصف دونوں ہاتھوں میں سوٹ کیس تھامے، گلے میں ایربیگ لٹکائے تیز تیز چلا جا رہا تھا، اونچا، صحت مند، خوش پوش نوجوان ۔۔ وہ بھی ایک نئے جوش سے تقریباً دوڑنے لگا، آصف کو چھو لینے کی خواہش شدت اختیار کر گئی۔ سانس پھول رہا تھا پسینہ بہہ رہا تھا لیکن وہ دوڑے جا رہا تھا، تھکن سے بے نیاز ایک انجانی خوشی سے سرشار ہو کر یوں جیسے وہ پھر سے جوان ہوگیا ہو۔

گاؤں کافی بدل گیا تھا۔ پرانے کھنڈر نما مکانوں کی جگہ نئی عمارتیں بن گئی تھیں۔ خالہ کے مکان کی ہیئت بھی بدل گئی تھی۔ سڑک کے رخ پر دو دوکانیں نکالی گئی تھیں۔ بیچ میں گھر کا دروازہ تھا۔ ایک دوکان پر ناتھانی جنرل اسٹور کا بڑا سا بورڈ لگا تھا۔ دوسری دوکان میں گاؤں کی دودھ ڈیری تھی۔ دودھ کے بڑے بڑے کنستر خالی پڑے تھے۔ چبوترے پر دو بنچ ڈال دیئے گئے تھے۔ دفتر میں دو کارندے حساب کتاب میں مشغول تھے۔ چھ سات دودھ والے میز کے گرد کھڑے تھے۔ ناتھانی اسٹور کا مالک انھیں دیکھ کر لپکتا ہوا آیا۔

"ساجد صاحب؟ آپ آگئے ۔" بھوجی کا خط آیا تھا۔ ماں جی نے بتایا تھا ۔۔۔ للو ماں جی کو خبر دے آ۔" ناتھانی نے جھٹ دو کرسیاں چبوترے پر ڈال دیں۔ خالہ نے دروازہ کھولا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی ساجد نے جھک کر خالہ کو سلام کیا اور سر جھکائے ان کے سامنے کھڑا رہا۔ خالہ نے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا دعائیں دیں، پھر وہ لپک کر آصف کے پاس پہنچیں، آصف نے ذرا سا ہاتھ اٹھا کر سلام کیا۔ خالہ اسے لپٹا کر چومنے لگیں۔ آصف حیران سا کھڑا بڑھیا کو دیکھ رہا تھا۔ سفید جھریوں بھرا چہرہ، جھکی ہوئی کمر، لرزتے ہوئے ہاتھ۔ میلی سی سفید ساڑی میں ملبوس یہ بڑھیا خوشی سے پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ دور خالہ کا نواسہ لطیف کھڑا انھیں حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔ تیرہ چودہ سال کا دبلا پتلا لطیف سفید کرتا پاجامہ اور ربڑ کی چپلیں پہنے ہوئے تھا۔

"منہ ہاتھ دھو لو۔ گرم دودھ پی کر ذرا کمر سیدھی کر لو، پانی گرم کیے دیتی ہوں نہا کر کھانا کھا لینا تھک گئے ہوں گے" ۔۔۔ خالہ نے اشارہ اشارہ میں کچھ کہا اور وہ لوٹا لے کر باہر چلا گیا۔ آصف حیرانی سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا پرانی طرز کا کمرہ تھا۔ ایک کونے میں بڑا سا پلنگ پڑا تھا۔ بیچ میں تخت تھا سفید چادر اور گاؤ تکیوں سے آراستہ۔ چھت کھپریل کی تھی اور گھاس کی سیلنگ۔ گرم گرم دودھ پی کر باپ بیٹے لیٹے تو نیند آگئی۔ دو گھنٹے بعد خالہ نے انھیں جگایا۔ نہانے کے بعد تو بھوک بھی خوب چمک اٹھی تھی۔ آصف بھی نہا دھو کر تر و تازہ لگ رہا تھا۔ تخت پر دسترخوان بچھایا گیا۔ انڈوں کا سالن، بیگن کا بھرتہ، گھی سے تر تراتے نرم نرم پراٹھے۔ آم اور لیموں کا اچار، شکر پڑی بالائی اور جام کی جیلی، برسوں بعد ساجد نے خالہ کا پکایا ہوا کھانا کھایا، وہی مزہ تھا۔ پیٹ بھر جانے پر بھی کھانے کو جی چاہتا تھا۔ اس پر خالہ کا اصرار تھا کہ اور کھاؤ تم نے کچھ کھایا ہی نہیں۔ آصف کو تو وہ اپنے ہاتھوں سے کھلانے پر مصر تھیں۔ آصف کو دیکھ دیکھ کر وہ باؤلی ہوئی جا رہی تھیں سال بھر کا ہوگا جب اسے دیکھا تھا۔ اب تو پورا جوان ہوگیا تھا۔ خالہ کو آصف کے چہرے میں اس کے دادا، دادی، اور باپ کے چہروں کے نقوش نظر آ رہے تھے ۔۔۔ لطیف کو بار بار جتلا رہی تھیں یہ تیرے ماموں ہیں، اور یہ ماموں زاد بھائی، وہاں شہر میں اور بھی بھائی بہن ہیں۔ آصف سے دوستی کرلے، بڑا بھائی ہے تیرا۔ کل انھیں کھیتوں پر لے جانا۔ گاؤں کی سیر کروانا۔ اور ذرا تمیز سے بات کرنا۔ لطیف سہما سہما سا کھڑا تھا۔ کھانا بھی اس نے ڈرتے ڈرتے بڑے ادب سے کھایا تھا۔ گاؤں کے اسکول کی آٹھویں کلاس میں تھا۔ آصف نے جب اس کی پڑھائی کے بارے میں پوچھا تو بے چارہ اور بھی سہم گیا۔ دو دن میں ہی آصف اور لطیف پکے دوست بن گئے۔ وہ دن تمام کھیتوں میں گھومتے، ندی کنارے بیٹھ کر مچھلیاں پکڑتے اور غلیل سے چڑیوں کا شکار کرتے۔ ساجد اور خالہ گھر میں بیٹھے باتیں کیا کرتے۔ پرانی یادوں کے بخئے ادھیڑے جاتے باتوں باتوں میں ساجد جان گیا کہ خالہ کی مالی حالت کچھ ٹھیک نہیں، بنک کا پانچ ہزار قرض چڑھا ہوا، ناتھانی کے دو ہزار دینا ہیں۔ پچھلے دو سال سے فصلیں تباہ ہو رہی ہیں، قرض بڑھتا جا رہا ہے۔ لیکن خالہ نے کھل کر پریشانی کا اظہار نہیں کیا تھا سب ٹھیک ہے، خدا کا شکر ہے کہتی رہیں۔ انھیں تشویش تھی کہ شہر میں اتنی مہنگائی کے باوجود ساجد کیسے بچوں کو پڑھا رہا ہے اور وضع دار زندگی گزار رہا ہے

ساجد کو افسوس تھا کہ اتنے سال بعد آیا تو خالہ کے لیے ایک ساڑی بھی نہ لاسکا۔ لطیف کے لیے تو آصف کی پتلون والا کپڑا لے آیا تھا اس وعدے کے ساتھ کہ اگلے مہینے آصف کو گیبرڈین کی پتلون بنوا دی جائے گی ۔۔ لطیف پتلون کا کپڑا دیکھ کر کھل اٹھا تھا۔ قیمتی پتلون وہ پہلی بار پہنے گا۔ ساجد نے گاؤں کے سب سے

اچھے درزی کے یہاں لطیف کو ساتھ لے جاکر پتلون سلنے کے لیے دی تھی۔ خالہ نے کہا بھی کہ کپڑا کیوں ضایع کرتے ہو، لطیف تو پتلون پہنتا ہی نہیں۔

ساجد کو یہ احساس بھی کچوکے لگا رہا تھا کہ اس نے خالہ کے لیے کچھ بھی نہیں کیا۔ ہر ماہ کچھ نہ کچھ تو انھیں بھجوا ہی سکتا تھا۔ ان کے کتنے احسانات تھے۔ انھوں نے ہی دراصل اسے پالا تھا ماں تو سدا بیمار رہتی تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ خالہ پریشان رہتی ہیں، انھیں سہارے کی ضرورت ہے۔ اگر وہ سال دو سال میں ایک چکر گاؤں کا لگا لیتا تو خالہ سرشار ہو جاتیں، وہ خود کو بے سہارا نہ سمجھتیں۔ مالی امداد سے زیادہ انھیں اپنا کہنے والے کی ضرورت تھی۔ سترہ سال بعد وہ آیا بھی تو ایک مہمان کی طرح۔

پندرہ دن دیکھتے دیکھتے گزر گئے اور ساجد نے واپسی کا ذکر کیا تو خالہ اداس ہو گئیں۔ خالہ اور پندرہ دن ٹھہرنے کے لیے کہہ رہی تھیں لیکن آصف لوٹنے کے لیے بضد تھا۔ پندرہ دنوں میں دیہاتی زندگی سے اوب گیا تھا۔ ساجد کے لیے بھی یہاں کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی وہ جس بندھی ٹکی شہری زندگی کا عادی ہو چکا تھا وہ یہاں مفقود تھی اس لیے وہ بھی بے چین تھا۔ بیوی نے سو روپے الگ سے دیتے تھے کہ واپسی پر آصف کو ایلورا اجنتا کے غاروں کی سیر کرا لائے۔ آصف بھی دوبارہ یاد دہانی کرا چکا تھا۔ ساجد کچھ اور ہی سوچ رہا تھا سفر میں خرچ اس کے اندازے سے زیادہ ہو گیا تھا وہ چاہتا تھا کہ سو روپے خالہ کی ساڑی اور لطیف کے شرٹ کے لیے چلتے چلتے لطیف کو تھما دے۔ خالہ خوش ہو جائیں گی۔ آصف کو منانے اور بیوی کے طعنے سننے کے لیے وہ خود کو ذہنی طور پر تیار کر چکا تھا۔

واپسی کے دن وہ صبح پانچ بجے ہی اُٹھ گیا۔ سامان سمیٹ کر سوٹ کیس اور بیگ میں رکھا۔ آصف بھی نہا دھو کر تیار ہو گیا تھا۔ خالہ نہ جانے کب سے باورچی خانہ میں گھس بیٹھی تھیں۔ ساجد بھی ان کے پاس جاکر بیٹھ گیا۔ خالہ نے گرم گرم دو پراٹھے توے پر سے اتار کر رکابی اس کے آگے رکھ دی، دوسرے چولھے پر انھوں نے آملیٹ بھی بنا لیا، آصف کو بھی انھوں نے ناشتہ کے لیے بلا لیا اور پیٹ بھر کھانے کے لیے اصرار کرنے لگیں۔ صبح اٹھتے ہی اسے چائے کی عادت تھی۔ خالہ کے اصرار پر کھانا ہی پڑا۔ بچپن میں خالہ ایسے ہی چولھے کے پاس بٹھا کر اسے کھلاتی تھیں۔ بس اسٹینڈ جانے کے لیے خالہ نے دودھ ڈیری والوں کا تانگہ منگوا لیا تھا۔ بڑے سے توشہ دان میں انھوں نے نہ جانے کیا کیا بھر دیا تھا۔ "بچہ ساتھ ہے، لمبا سفر ہے، بازار کی چیزیں کھا کر بیمار ہو جاؤ گے" لطیف کا چہرہ اترا ہوا تھا نئے دوست سے بچھڑنے کا غم عیاں تھا۔ آصف خوب چہک رہا تھا اور لطیف کو شہر آنے کی دعوت دے چکا تھا۔ خالہ بھی کھوئی کھوئی سی تھیں۔ وہ بار بار کہہ رہی تھیں بہو اور بچوں کو جلدی لانا، مہینہ دو مہینہ یہاں رہیں گے تو گھر میں رونق آجائے گی۔ ساجد نے لطیف کو گلے سے لگایا، پیٹھ تھپتھپائی، سر پر ہاتھ پھیرا اور سو روپے کا نوٹ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ خالہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ آصف نے اس کی طرف گھور کر دیکھا ـــــ خالہ کو اس نے جھک کر سلام کیا تو انھوں نے کانپتے ہاتھوں سے اس کا جھکا سر تھام لیا اور سسکیاں لینے لگیں۔ اس کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ پھر خالہ نے آصف کو لپٹا کر پیار کیا۔ رندھے گلے سے دعائیں دیں اور ایک لفافہ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ "بیٹے اپنی پسند کے کپڑے بنا لینا اور بہن بھائیوں کے لیے مٹھائی لے جانا۔" خالہ کی آنسوؤں میں ڈوبی آواز تھی۔

تانگہ جب گاؤں سے باہر نکل گیا تو آصف نے لفافہ ساجد کے حوالے کر دیا ساجد نے بے تابی سے لفافہ کھولا ڈھائی سو روپے تھے ـــــ اسے یوں لگا جیسے پھر سے اس کا بچپن لوٹ آیا ہے اور خالہ گود میں لیے اسے مٹھائی کھلا رہی ہیں۔

(بقیہ رنجیت سنگھ)

کی مشترکہ تہذیب زیادہ تر ایسی روایات سے مرکب ہے جو سینہ بہ سینہ چلی آرہی ہے اور جنھوں نے ہماری اقدار کو عزت و شرف عطا کی ہے۔ ذہن میں یہ سوال بار بار پیدا ہوتا ہے کہ کیا وہ واقعی ناخواندہ تھے یا مؤرخوں نے بھی سنی سنائی باتوں سے کام لیا ہے۔ کم سے کم دو ایسے فرمان ضرور ہیں جن پر مہاراجہ کے دستخط ہیں۔

محمد لطیف کے قول کے مطابق "وہ رنجیت سنگھ، اہل علم کی بہت قدر کرتے تھے۔ ان کے پیش کار فارسی، پنجابی اور ہندی کے کاغذات پڑھ کر سناتے وہ اس بات پر نظر رکھتے تھے کہ احکامات صحیح طریقے اور ضابطے کے مطابق تحریر کیے جائیں اور جو مسودے ضبط تحریر میں لائے جائیں وہ ان کے مافی الضمیر کی عکاسی کریں۔ ان کی شباہت پرجلال تھی۔ ان کا انداز اور طرز گفتار دلکش تھا۔ ان کے خد و خال ان کی چستی، مستعدی اور سرگرمی کے غماز تھے۔ ان کی ایک آنکھ تھی لیکن بڑی تیز اور دوربیں تھی۔ اس آنکھ کی چمک اور شعلہ فشانی فوراً یہ محسوس کرا دیتی تھی کہ اس کا مالک بیدار مغز اور روشن ضمیر ہے۔"

(مصنف کی انگریزی کتاب "مہاراجہ رنجیت سنگھ" کے ایک باب کا ترجمہ)

بقیہ نئی کتابیں

زیر نظر شمارہ "سوہن داس نمبر" مشرق کے اس بڑے شاعر کی حیات اور شاعری سے متعلق مقالوں پر مشتمل ہے۔ مضمون نگار اردو اور ہندی کے کئی معروف اہل قلم ہیں۔

اردو کے نوجوان ادیب اور ماہر لسانیات ڈاکٹر عبدالستار دلوی اس رسالہ کے ایڈیٹر اور غالباً ہندوستانی پرچار سبھا کے ڈائرکٹر بھی ہیں۔ موصوف بین الاقوامی شہرت یافتہ ماہر لسانیات پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی کے شاگرد ہیں۔ اور ادبی تحقیقات اور اردو زبان و ادب سے انھیں بڑی دلچسپی ہے۔ ہر دانش گاہ کی لائبریری میں ہندوستانی زبان ایک اہم رسالہ ہوگا۔

(سید محمد حسنین)

نند کشور وکرم

حافظ محمود خاں شیرانی

حافظ محمود شیرانی کو ان کے تحقیقی کارنامے "پنجاب میں اردو" کے باعث غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی اور اس کی وجہ سے اہلِ اردو انھیں بحیثیت محقق ہی جانتے ہیں حالانکہ وہ صرف ایک ممتاز محقق ہی نہیں تھے بلکہ ایک ناقد، ماہر لسانیات و تاریخ، بلند پایہ شاعر اور ایک شفیق استاد کی حیثیت سے بھی ان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ انھوں نے اردو ادب کی جو خدمات انجام دی ہیں انھیں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔

حافظ صاحب کا تعلق سرحدی پٹھانوں کے شیرانی قبیلے سے تھا جس کا تعلق صوبہ سرحد کے جنوبی وزیرستان سے ہے۔ اُن کے اجداد یہاں سے نقلِ مکانی کر کے راجستھان چلے آئے۔ اور جودھپور (مارواڑ) میں آباد ہوگئے اور وہ علاقہ جہاں انھوں نے سکونت اختیار کی "شیرانیوں کی دھانی" کے نام سے معروف ہوگیا۔ بعد ازاں اس خاندان کے افراد دیگر شہروں میں بھی بس گئے۔

ان کی ولادت ریاست ٹونک میں اکتوبر ۱۸۸۰ء میں ہوئی۔ ان کے والد محمد اسمٰعیل خاں سید احمد بریلوی کے مریدانِ خاص میں تھے۔ انھیں ریاست ٹونک میں جاگیر ملی ہوئی تھی اور وہ وہیں کاروبار بھی کرتے تھے۔

محمود شیرانی نے اپنی ابتدائی زندگی کا زمانہ ٹونک میں گزرا۔ جب وہ پڑھنے لکھنے کی عمر کو پہنچے تو اس زمانے کے دستور کے مطابق انھیں قرآن حفظ کرایا گیا۔ اور پھر والد نے خود انھیں فارسی کی تعلیم دی۔

جب وہ تقریباً پندرہ برس کے تھے تو والد نے انھیں باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے لاہور بھیج دیا جو ان دنوں شمالی ہند میں علم و ادب کا اہم مرکز خیال کیا جاتا تھا۔ لاہور میں وہ سنٹرل ماڈل اسکول میں داخل کرائے گئے لیکن چونکہ انگریزی اور ریاضی دونوں مضامین کی جانب ان کا رجحان نہ تھا لہٰذا کچھ عرصہ بعد انھوں نے مذکورہ اسکول کو خیرباد کہہ کر فارسی کی مزید تعلیم پانے کے لیے مشہور تعلیمی ادارے اورینٹل کالج میں داخلہ لے لیا اور مولوی عبدالحکیم کلانوری سے استفادہ کرنے لگے۔ اور پھر چار برس بعد ۱۸۹۹ء میں انھوں نے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا اور اپنے وطن ٹونک چلے گئے۔

چار پانچ برس وہ ٹونک ہی میں مقیم رہے۔ اس کے بعد ان کے والد نے انھیں بیرسٹری کی تعلیم کے لیے انگلستان بھیج دیا کیونکہ ان دنوں رئیسوں اور جاگیرداروں میں اپنے بیٹوں کو بیرسٹر بنانے کا رواج عام تھا۔ انگلستان پہنچنے کے بعد انھوں نے انگریزی تعلیم میں مہارت حاصل کرنے کے لیے اس زبان کو سیکھنا شروع کیا کیونکہ اس سے پیشتر وہ اس زبان میں معمولی شدبد رکھتے تھے مگر افسوس ابھی انھوں نے انگریزی کے چند ابتدائی امتحانات ہی پاس کیے تھے کہ ۱۹۰۶ء میں ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ جس سے وہ معاشی دشواریوں کا شکار ہوگئے۔ اب ان کے سامنے دو ہی راستے تھے۔ ایک تو یہ کہ وہ واپس ٹونک چلے جائیں یا

نگلستان میں مزید قیام کے لیے کوئی ذریعۂ معاش تلاش کریں۔ انھوں نے دوسرے راستے کو ترجیح دی اور انگلستان میں ٹھہرنے کے مصمم ارادے سے وہ کام تلاش کرنے لگے۔ آخر بعض احباب کی کوششوں سے وہ سر ٹامس آرنلڈ کے تحقیقی کاموں میں اُن کے مددگار و معاون مقرر ہو گئے اور اس کے عوض انھیں ایک قلیل رقم بطور وظیفہ ملنے لگی۔ یہ رقم ان کے لیے انگلستان میں ٹھہرنے کے لیے "ڈوبتے کو تنکے کا سہارا" کے مصداق تھی مگر یہ اتنی معمولی تھی کہ اس سے بسر اوقات کرنے میں انتہائی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا تھا لہٰذا وہ عقیقی مددگار کی حیثیت سے کام کرنے کے ساتھ ساتھ کسی اور سلسلۂ روزگار کی تلاش میں بھی سرگرداں رہے۔ آخر انھیں لیوزک اینڈ کمپنی میں مشرقی مخطوطات اور نوادرات خریدنے کے سلسلے میں ملازمت مل گئی چونکہ اس کام میں مشاہرے کے علاوہ انھیں کمیشن بھی ملتا تھا اس لیے ان کی معاشی پریشانیاں بڑی حد تک کم ہو گئیں۔

انگلستان میں وہ لگ بھگ نو برس رہے۔ ۱۹۱۳ء میں وہ اپنے اعزا و اقارب سے ملنے اور اپنی موروثی جائداد کے تقسیم و تصفیے کے سلسلے میں وطن واپس آئے۔ ان کا ارادہ تھا کہ چند ماہ ہی میں وہ تمام معاملات کو نپٹا کر واپس چلے جائیں گے لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ ان کی آمد کے کچھ ہی عرصے بعد پہلی جنگ عظیم شروع ہو گئی جس سے ایک تو سمندری سفر پُرخطر ہو گیا دوسرے حکومت بھی مخصوص لوگوں کو ہی جانے کی اجازت دیتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ کی طوالت کی وجہ سے ان کا جانا نہ ہو سکا۔ اور جب چار سال بعد جنگ ختم ہوئی تب تک انھوں نے جانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔

انگلینڈ سے واپسی کے بعد وہ آٹھ برس ٹونک میں مقیم رہے اور اس طویل قیام کے دوران ان کے دو ہی مشغلے تھے۔ سیر و شکار یا تحقیق و تعلیم۔ بعد ازاں ۱۹۲۱ء میں وہ روزگار کی تلاش میں لاہور پہنچے جہاں اپنے دیرینہ رفیق ڈاکٹر سر محمد اقبال اور سر عبدالقادر کی وساطت سے ڈیڑھ صد روپیہ ماہانہ مشاہرہ پر اسلامیہ کالج میں اردو فارسی پڑھانے پر مامور کر دیا گیا۔ اس درسگاہ میں وہ سات برس تک پڑھاتے رہے اور پھر جب ۱۹۲۸ء میں ان کا معرکۃ الآرا تحقیقی کارنامہ "پنجاب میں اردو" منظرِ عام پر آیا تو پنجاب یونیورسٹی کی نظرِ انتخاب ان پر پڑی اور انھیں اورینٹل کالج میں لیکچرر مقرر کر دیا گیا۔ ۱۹۳۶ء میں ۵۵ برس کے ہو جانے پر ان کی سبکدوشی کا وقت آگیا مگر ان کی خدمات و کارکردگی کو مدِنظر رکھتے ہوئے ان کی ملازمت میں دوبار دو دو برس کی توسیع کی گئی۔ آخر ۵ا نومبر ۱۹۴۰ء کو طویل رخصت لے کر وہ وطن چلے گئے لیکن جانے سے پیشتر انھوں نے اپنی نادر و نایاب کتابوں کا گراں قدر سرمایہ معمولی سی رقم کے عوض پنجاب یونیورسٹی کو دیدیا۔

سبکدوشی کے بعد انھیں بابائے اردو مولوی عبدالحق نے تصنیف و تالیف میں امداد و تعاون کے لیے دہلی مدعو کیا۔ لیکن وہ زیادہ عرصہ تک یہ کام انجام نہ دے سکے اور چند ماہ کام کرنے کے بعد خرابیٔ صحت کی بنا پر واپس ٹونک چلے گئے۔

ان کے آخری چند برس پریشانی میں گزرے۔ ایک تو وہ ضیق النفس کے مرض سے پریشان تھے دوسرے ان کے بیٹے شاعرِ رومان اختر شیرانی ان کی پریشانی کا باعث بنے ہوتے تھے۔ آخر اسی عالمِ پریشانی میں وہ ۱۵ فروری ۱۹۴۶ء کو رحلت کر گئے اور ٹونک سے چند میل کی دوری پر لگراج گھاٹ میں واقع اپنے باغ میں سپرد خاک کیے گئے۔

شیرانی صاحب کو قیام لندن کے دوران جب وہ ٹامس آرنلڈ کے مددگار و معاون تھے تحقیق و جستجو کا شوق پیدا ہوا اور اس میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ وہ کسی بات کی گہرائی تک پہنچنے کے لیے دن رات ایک کر دیتے تھے انھوں نے کئی غیر معمولی تحقیقی انکشافات کیے جن سے ناقدین و محققین ان کی علمیت و عظمت کے قائل ہو گئے۔

اسلامیہ کالج میں قیام کے دوران ان کے تحقیقی مضامین منظرِ عام پر آنا شروع ہوئے۔ ان کے کچھ مضامین حیدر آباد دکن کے جریدے "اردو" میں شائع ہوئے علاوہ بریں ان کے مضامین اور نظمیں مشہور رسالے مخزن میں بھی اشاعت پذیر ہوئیں۔ ان کی مقبول و معروف نظم "شیرِ دکن" بھی اسی رسالے میں شائع ہوئی۔ ان اشاعتوں سے اہلِ ادب ان کی تحقیقانہ کاوشوں سے متعارف ہوئے۔ علاوہ ازیں انھوں نے ایک انگریز مصنف ڈاکٹر ہنری اسٹب کی کتاب کی اشاعت میں بڑی تگ و دو کی۔ اس کتاب میں عیسائیت کے عیوب اور اسلام کے محاسن بیان کیے گئے تھے اور حافظ شیرانی کی خواہش تھی کہ یہ کتاب منظرِ عام پر آئے تاکہ لوگوں پر اسلام کی خوبیاں اجاگر ہوں مگر ان کے پاس سرمایہ نہ تھا لہٰذا انھوں نے اسلامی ممالک تک سے چندہ جمع کیا اور یہ کتاب شائع کرائی۔ اس کتاب کی اشاعت پر بڑا شور و ہنگامہ ہوا بعض لوگوں کا خیال تھا کہ ہنری اسٹب ایک فرضی نام ہے اور حافظ شیرانی نے خود یہ کتاب لکھی ہے۔ بعد میں اس سلسلے میں انھوں نے ایک کتابچہ بھی تحریر کیا۔

اور پھر جب ۱۹۲۸ء میں ان کی کتاب "پنجاب میں اردو" اشاعت پذیر ہوئی تو ملک کے گوشے گوشے میں ان کی اس تحقیقی کاوش کی دھوم مچ گئی اور اہلِ پنجاب کا تو فخر سے سر بلند ہو گیا بقول غلام رسول مہر —

"بیرونِ پنجاب کے جن فضلا یا ادبا کے علمی احسانات سے اہلِ پنجاب کی گردنیں ہمیشہ خم رہیں گی ان میں علامہ حافظ محمود شیرانی مرحوم کا نام نہایت ممتاز ہے۔ "پنجاب میں اردو" حضرت علامہ کے آفتابِ تحقیق کی صرف ایک شعاع ہے لیکن اس ایک شعاع سے زبانِ اردو کے مآخذوں کا گوشہ گوشہ منور ہو گیا ہے اور جو محققین و طلبہ ایک صدی اسے اندھیرے میں ٹامک ٹوئیے مار رہے تھے ان کو ایسی روشنی مل گئی جو ہمیشہ ان کے لیے چراغِ راہ بنی رہے گی۔"

(پنجاب میں اردو صفحہ ۹)

"پنجاب میں اردو" ان کی ایسی تحقیقی کاوش ہے جس نے ان کی ذہانت و علمیت کا سکہ تمام اہلِ ادب پر جما دیا اور جس کا مطالعہ اردو محققین کے لیے ناگزیر سا ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے ثابت کیا کہ نقادوں کا یہ خیال غلط ہے کہ زبان اردو کی ابتدا مغل شہنشاہ اکبر یا شاہجہاں کے دور میں ہوئی۔ اور یہ کہ اس کا تعلق برج بھاشا سے ہے۔ انھوں نے شواہد و براہین سے ان دونوں نظریات کو غلط ثابت کرتے ہوئے انکشاف کیا کہ یہ زبان مغل فرماں رواؤں کے عہد سے بھی بڑی قدیم

ہے اور اس کا وجود اس وقت سے ہے جب کہ مسلمان ہندوستان میں وارد ہوئے تھے نیز یہ کہ اردو کا قدیم ترین رشتہ پنجاب سے ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ جب مسلمان ہندوستان میں وارد ہوئے تو انھوں نے پنجاب میں بولی جانے والی زبان ملتانی اور لہندا میں اپنی زبان کے الفاظ داخل کیے لہذا بنیادی طور پر اُردو زبان پنجابی ہی ہے جسے دہلی پہنچنے پر موجودہ شکل نصیب ہوئی۔

ایک محقق کی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ ایک نقاد کی حیثیت سے بھی ان کا مرتبہ بلند وارفع ہے اور اس سلسلے میں علامہ شبلی نعمانی کی مشہور کتاب "شعر العجم" پر ان کی تنقید اس کا بیّن ثبوت ہے۔ اگرچہ محمود شیرانی مولانا شبلی کے معترف اور مداح تھے۔ لیکن تاریخی اعتبار سے اس کتاب میں جو متعدد غلط واقعات درج ہوگئے تھے اس کی اصلاح حافظ صاحب نے ضروری سمجھی۔ جس سے اردو حلقوں میں تہلکہ مچ گیا۔ اور مولانا شبلی کے حامیوں نے تو ان کے خلاف ایک محاذ کھڑا کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس سلسلے میں ایک ادبی جنگ کا آغاز ہو گیا جس میں ملک کے بڑے بڑے ادبا، شعرا نے حصّہ لیا جیسا کہ ڈاکٹر سیّد عبد اللہ نے تحریر کیا ہے۔

"خیر حبیب صاحب سے تو ان کی یک طرفہ لڑائی تھی کیونکہ ادھر سے جواب کی شاید کوئی کوشش ہی نہیں ہوئی مگر دار المصنفین سے جو لڑائی ہوئی وہ بڑے معرکے کی لڑائی تھی۔ کیونکہ شبلی دبستانِ جدیات میں ماہر خیال کیے جاتے تھے اور سر سیّد کے زمانے سے ان کے تیروں تلواروں کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک سے ایک بڑھ کر نبرد آزما اور صف شکن۔ سیّد سلیمان مولانا شبلی کے خاص تربیت یافتہ بزرگ تھے ان کے ساتھ مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی ثالث بالخیر ہو کر بھی "شبلی والوں" کے ہی سالارِ قافلہ تھے۔ غرض پنجاب اور اعظم گڑھ کے درمیان پانی پت کی سی لڑائی ٹھن گئی۔ اگرچہ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ پانی پت کی کونسی لڑائی تھی مگر معرکہ بڑا سخت تھا۔ اس میں ڈاکٹر مولوی عبد الحق سے لے کر پروفیسر محمد اقبال (بلکہ خود سر محمد اقبال)، اور ڈاکٹر مولوی محمد شفیع تک سبھی شریک تھے اور سبھی نے اپنے جوہر دکھائے مگر بہادری کے سچے جوہر اگر کسی نے دکھا کر دنیا کو حیرت زدہ کیا تو وہ پروفیسر شیرانی تھے چنانچہ تنقید شعر العجم اسی جنگ و جدل کا نتیجہ ہے۔ ان علمی محاربات میں ہمیں پروفیسر شیرانی کی شخصیت کے علمی اور انسانی خصائص کے بڑے بڑے اسرار معلوم ہوئے۔" (نقوش شخصیات نمبر صفحہ ۱۰۷)

شعر العجم پر تنقید کے علاوہ انھوں نے فردوسی اور شاہنامہ کے بارے میں ایسے تحقیقی انکشافات کیے کہ بڑے بڑے عالم ان کی تحقیق و جستجو کے قائل ہو گئے۔ انھوں نے ثابت کیا کہ محمد غزنوی اور فردوسی کے بارے میں مشہور حکایت مفروضہ اور من گھڑت ہے اور اس میں کوئی صداقت نہیں نیز یہ کہ محمود غزنوی پر ناقدری اور وعدہ خلافی کے الزامات میں کوئی حقیقت نہیں۔ بلکہ ان کا کہنا تھا کہ فردوسی سے منسوب ہجو مصنوعی ہے اور اسے گھڑنے میں دوسرے شعرا کا ہاتھ ہے۔

علاوہ بریں انھوں نے آبِ حیات پر بھی تنقید سپردِ قلم کرنا شروع کیا تھا۔ مگر وہ اسے مکمل نہ کر پائے۔ اس نامکمل تنقیدی کتاب میں انھوں نے مولانا محمد حسین آزاد کے متعدد بیانات کو غیر مستند قرار دیتے ہوئے آبِ حیات کی تحریروں کو ساقط قرار دیا انھوں نے استدلال و تحقیق سے یہ بھی ثابت کیا کہ امیر خسرو سے منسوب "خالقِ باری" ان کی تخلیق نہیں کیونکہ لسانی اعتبار سے اس میں جو زبان استعمال کی گئی ہے وہ امیر خسرو کی نہیں ہو سکتی۔ ان کا خیال تھا کہ یہ کسی اور شاعر خسرو شاہ کی شعری کاوش ہے۔

انھوں نے ہندی کتاب پرتھوی راج راسو کے متعلق بھی تحقیق کی کہ چندر بردائی کا پرتھوی راج سے کوئی تعلق نہیں۔ اس طرح انھوں نے ہندی میں رائج روایات کو غلط ثابت کرنے میں ایسے دلائل پیش کیے جن کا کسی سے جواب نہ بن پڑا۔ تحقیق کے علاوہ انھیں مخطوطات و قدیم سکّے اور نوادر جمع کرنے کا شوق جنون کی حد تک تھا۔ وہ ان کی تلاش و جستجو میں ہزارہا روپیہ صرف کرتے تھے اور اس سلسلے میں دور دراز کا سفر کرنے سے بھی گریز نہ کرتے تھے۔ انھوں نے لگ بھگ ہزارہا عربی کے مخطوطات اور سکّے جمع کیے تھے۔ انھوں نے ڈیڑھ صد روپیہ ماہوار پر ملازمت کا آغاز کیا اور سبکدوشی کے وقت تقریباً چار سو روپے مشاہرہ پا رہے تھے۔ مگر وہ اپنی آمدنی کا بیشتر حصّہ انھیں مخطوطات اور نوادر پر صرف کرتے تھے جس کے کارن وہ ایک معمولی سے مکان میں سکونت پذیر رہے۔ جس کے کمرے زیادہ تر مخطوطات اور سکّوں سے بھرے پڑے تھے۔ حتیٰ کہ خود ان کے اٹھنے بیٹھنے کے لیے بھی جگہ باقی نہ رہی تھی اور وہ کسی کونے میں فرش پر بیٹھ کر تحریر و تصنیف میں منہمک رہتے تھے۔

شیرانی صاحب ایک ممتاز عالم اور محقق ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ اخلاقی قدروں کے مالک تھے وہ ایک وضع دار، منکسر مزاج اور سادگی پسند شخص تھے۔ انھیں تکلف اور تصنع سے نفرت تھی اور ان کی انسانیت اور شرافت نے ان کی شخصیت کو ایک ایسی مقناطیسی قوت بنا دیا تھا کہ جو بھی ان سے ملتا تھا ان کے درویشانہ مزاج سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا تھا اور ان کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ ان کے اکثر شاگرد ان کے احسان و علمیت سے مستفید ہوئے اور متعدد ان کی قربت و رہنمائی کی وجہ سے تحقیق و تنقید کے راستے پر گامزن ہوئے اور شہرت پائی۔

ضرورت ہے کہ ان کی صد سالہ یوم پیدائش کی رعایت سے ہندوستان میں ایک سیمینار منعقد کیا جائے اور ان کے علمی کارناموں کو اہلِ ملک کے سامنے لایا جائے۔

اردو ادب شیرانی صاحب کے احسانات سے گرانبار ہے۔ یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے بزرگوں اور محسنوں کے کارناموں کو یاد کریں تاکہ ان کی قائم کردہ روایات آگے بڑھیں اور ہمارا ادب صحیح خطوط پر پروان چڑھے۔

(بقیہ: دیوان حافظ کا شاہی نسخہ)

(ترجمہ) "یہ غزل خاص کر یہ بیت کئی بار فال ہمایوں میں نکلی" اب ہمایوں یہاں نام بھی ہو سکتا ہے اور اپنے معنوی استعمال میں بھی ہو سکتا ہے۔ وہ شعر یہ ہے

عزیز مصر بزعم برادرانِ غیور
زقعر چاہ برآمد باوج ماہ رسید

غزلیں

رحمٰن مین پوروی

یہ مہکتا جسم ہوگا اور معطر دھوپ میں — میرے کہنے سے ذرا بیٹھو تو جاکر دھوپ میں
چھاؤں آئی تو خدا جانے کہاں وہ چھپ گیا — ایک سایہ ساتھ رہتا تھا برابر دھوپ میں
چاہتا ہوں یہ بھی ہوجائیں حرارت آشنا — اس لیے پھولوں کو رکھا ہے سجا کر دھوپ میں
شب کی تاریکی میں تو گل تک فسردہ تھے مگر — کھل رہی ہے ہر کلی دیکھو نہا کر دھوپ میں
ہو نہ ہو اس میں زمیں کی کوئی گہری چال ہے — کیوں نظر آتے نہیں ہیں ماہ و اختر دھوپ میں
دور نظروں سے کیا تھا ظلمتِ شب نے جنھیں — سامنے آجائیں گے وہ سارے منظر دھوپ میں

صبح دریا کے کنارے ریت پہ چلتے ہوئے
کیا کہیں جو لطف ہوتا ہے میسر دھوپ میں

شاھد ساگری

شکستہ ہوگئی دیوار دل کے اندر کی
تہوں میں جا کے تو دیکھو ذرا سمندر کی
صداقتیں بھی تھیں جن پر امانتیں بھی نثار
اڑا رہے ہیں وہی لوگ آج بے پر کی
میں آسماں کی صورت خلا میں رہتا ہوں
صدائیں کوئی بھی سنتا نہیں مرے گھر کی
کوئی قطب تو نہیں ہے کوئی ولی تو نہیں
یہ کس کی لاش پڑی ہے زمیں پہ بے سر کی
یہ مانتا ہوں کہ آزاد ہے مگر شاہدؔ
زمین بھی قید میں رہتی ہے اپنے محور کی

مظہر مجیدی

ہر ایک زخمِ تمنا تہہِ نقاب رہے — کہ جیسے برق کا شعلہ پسِ سحاب رہے
ہلا سے دھوپ جھلس دے کلی کلی کا بدن — سدا سروں پہ تجسس کا آفتاب رہے
ہم اپنے گھر میں اندھیروں کو قید کرلیں گے — بہ شرط آپ کے آنگن میں ماہتاب رہے
کٹے نہ رات سویرا نہ ہو نہ پھوٹے کرن — ہماری آنکھوں میں رقصاں تمہارا خواب رہے
تو اپنے ظاہر و باطن کو پاک رکھ مظہرؔ — ہمیشہ تیرا سراپا کھلی کتاب رہے

پرکاش تیواری

طائرِ دل کو جلا کر، کوچہ کوچہ پر نہ پھینک
میں ہوں خود بسمل، نگاہِ مہر کا خنجر نہ پھینک
تنگ آکر درد سے امید کا نشتر نہ پھینک
ذہن کی اصلاح کرلے تیشۂ آذر نہ پھینک
ٹوٹ کر ہر سو بکھر جائے نہ میری زندگی
دل کے آئینے پہ سخت الفاظ کے پتھر نہ پھینک
عام ہوجائے نہ ذوقِ بے خودی اے محتسب!
ساغر و پیمانہ کو میخانے کے باہر نہ پھینک
حادثوں کی آندھیوں سے چہرے افسردہ ہیں مگر
دھرم اور مذہب کے پتھر خشک پتوں پر نہ پھینک

مسعود شمس

غم بن کے مرا مجھ سے وہ روز ہی ملتا ہے
تم بھول گئے کیسے، تم نے بھی تو دیکھا ہے
سانسیں ہیں رہن اپنی، پہرے ہیں خیالوں پر
جو لمحہ گزرتا ہے وہ غیر سا لگتا ہے
کب سے ہے یونہی ویراں خوابوں کا مکاں لیکن
نادیدہ خزانوں پہ امید کا پہرا ہے
یہ خشک زمینیں تھیں، ان میں یہ نمی کیسی
بادل کا کوئی ٹکڑا کیا آج ہی برسا ہے
جاتے ہو مگر اپنی پہچان نہ کھو دینا
وہ شہر ابھی تم نے کب غور سے دیکھا ہے

منظور ندیم

یوں نہ احساس کی سولی پہ چڑھائے رکھیے — دل کو اس دور میں پتھر سا بنائے رکھیے
اب اصولوں کا زمانہ ہی کہاں ہے صاحب — طاق میں اپنے اصولوں کو سجائے رکھیے
زخم کھا لینے سے ہوتا نہیں کوئی ممتاز — بات تو جب ہے کہ زخموں کو چھپائے رکھیے
کیجیے جامِ مسرت تو سبھی میں تقسیم — اور اشکوں کے سمندر کو بچائے رکھیے
زندگی بوجھ سہی، اپنی تو عادت ہے ندیمؔ — بوجھ اوروں کے لیے سر پہ اٹھائے رکھیے

کنور سین

مندا کنی

مندا کنی پُل کے ادھر کھڑی رہ گئی۔
شوالک اور سانجھی پار اتر گئے۔
انھیں موڑ کاٹتے دیکھ ان کے پیچھے لپکے بھیرو بابو۔

سات برس کی تھی مندا کنی۔
اُسے دُھندلے چتر نہیں بھولے۔
آج وہ اور بھی تیکھے ہو اٹھے۔

گرمیوں کی جلتی دوپہر۔
ماں کو چارپائی سے اتار کر فرش پر لٹا دیا گیا۔
سرہانے اناج ڈھیری کر کے اس پر دیا جلا دیا گیا۔

ڈاکٹر نے کینسر کا دوسری بار آپریشن کرتے ہی کہہ دیا تھا:
بی بی ! گیتا پڑھا کر !

دیکھتے ہی دیکھتے سگے سمبندھی آنے لگے۔
اڑوس پڑوس اکٹھا ہونے لگا۔
گلی کا کتا رونے لگا۔
مرد آنگن میں، عورتیں کمرے میں بیٹھنے لگیں۔

مندا کنی کمرے کے کونے میں بیٹھی واتاورن کو پل پل بوجھل ہوتے ہوئے دیکھنے لگی۔

لٹکے چہرے، اُداس آنکھیں، خاموش ہونٹ، جھکی گردنیں۔
معصوم لڑکی کی سمجھ میں زیادہ نہیں آیا۔ اتنا جان گئی کہ کچھ بہت بُرا ہونے والا ہے۔ اپنے ننھے وجود میں پھیلتے خوف سے بچنے کے لیے اس نے پاس بیٹھے اپنے سے چھوٹے کانتی کو پہلو میں سمیٹ لیا۔ خیال اس کا کانتی سے چھوٹے نند دکی طرف بھی گیا جو آنگن میں دادا کی گود میں لیٹا ہوا تھا۔

چتا کو آگ دکھاتے ہی باپ کی آنکھوں میں ہاری ہوئی آشا کا بھو لہرا اٹھا۔ اونچی اٹھتی لپٹوں کو ایک ٹک دیکھتا ہوا وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔
بنسی ! گھر چلو۔ یہاں کیا رکھا ہے ؟ مٹی تو کب کی مٹی . . .
محلے کی سیانی ایسری تائی نے مندا کنی کے باپ کو بازو سے پکڑ کر پکارا۔ وہ بیٹی کو ساتھ لیے روتے من سے گھر کو چل پڑا۔

بھاگو چاچی نے مندا کنی اور اس کے بھائیوں کو آخری سانس لیتی ماں کے پاس بٹھا دیا تھا۔ مرنے والی کے چہرے پر عجیب مایوسی اور لاچاری ابھر آئی۔ وہ سامنے بیٹھے چہروں پر نظریں گھمانے لگی۔ انت میں پتی اور پتروں کو نہارنا چھوڑ کر اس نے نگاہیں بیٹی پر جمادیں اور پران تیاگ دیئے۔
اس لاچاری میں آدیش بھی تھا پرارتھنا بھی۔
مندا کنی کو بات سمجھ میں آئی یا نہیں وہ اُن نگاہوں کو زندگی بھر نہیں بھولی۔ انھیں یاد کر کے . . .

ماں کی آنکھوں میں تیرتی گیلی آشا ماں تک رہتی تو کوئی بات نہ تھی۔ بات تو . . .

مندا کنی کو یاد ہے :
دادا دادی چھوٹے بیٹے کے ساتھ رہتے تھے۔ مندا کنی کی ماں زندہ تھی تو کبھی کبھار آتے۔ پوتی پوتوں سے لاڈ جتاتے۔ بہو بیٹے کو کھری کھوٹی سناتے۔ بیٹا ان کی بات ہنس کر ٹال دیتا۔ بہو انھیں چائے پانی پروس کر۔

بہو کے مرتے ہی وہ روز آنے لگے۔
بیٹے کو سمجھانے لگے :
روادار و کرنا آدمی کا کرم۔ گئی بیتی کے پیچھے مرنا پاپ اور ادھرم۔
رونا دھونا چھوڑ — کام کاج کا دھیان کر اپنا اور اولاد کا کلیان کر۔
ایک دن دادا دھیمے لہجے میں بولے۔
جیون نائی کئی بار آیا۔ لڑکی خاندانی ہے۔ گھر بڑا نہیں۔ میں نے حامی نہیں بھری۔ لیکن کب تک۔ آج نہیں تو کل . . .
دادی نے دادا کی بات بیچ میں کاٹ دی۔
لوگ ارتھی اٹھنے سے پہلے گھر میں دوسری ڈولی لے آتے ہیں۔ عورت کا مرنا بھی کوئی مرنا ہے۔ پاؤں کی جوتی ! پھٹ جائے تو دوسری لے آؤ۔ دیر کتنی لگتی ہے۔ تو تو نادان کی طرح . . .
وہ بیٹے کو کڑی نظر سے دیکھنے لگی۔
تو مجھے چابی دے۔ دیکھوں بہو کیا کچھ چھوڑ گئی۔ آنے والی کے لیے بھی کچھ۔
اس دن سے دادی بنسی کے یہاں رہنے لگی۔

بنسی — دھرم کرم کو ماننے والا۔ پوجا پاٹھ کا رسیا۔ بیوی زندہ تھی تو سانجھ سویرے مندر جاتا۔ بیوی کے چلے جانے کے بعد وہ مندر اور پوتھی کا ہو کر رہ گیا۔

منھ اندھیرے گھر سے نکل جاتا۔ مندر کا چبوترا او سیڑھیاں دھوتے ہوئے ہری گن گاتا۔ پجاری آرتی اتارتا تو وہ کھڑتال بجاتا۔ دیوتا کو بھوگ لگاتا۔ لوگوں کو ست کرم کا مارگ سمجھاتا۔ راستے میں رام نام کی رٹ لگاتا۔

باپ کو گیان دھیان میں لین دیکھ کر منداکنی کا وشواس لوٹ آتا — ماں نہیں مر سکتی۔

بھولی منداکنی نہیں جانتی تھی :

ماں باپ کی بات پہ جھلانے والا۔ دوسروں کے سمجھاؤ کو ٹھکرانے والا۔ مرنے والی کے ساتھ اپنے لگاؤ کی بات دہرانے والا بنسی ایک دن مسکرانے لگا۔ دل پر کھنچی لکیر مٹانے لگا۔ بیٹی بیٹوں سے شرمانے لگا۔ ان کی ماں کی تصویر کے آگے پھول رکھنے سے کترانے لگا۔ کسی دوسری عورت سے من رجھانے لگا۔

ماں کے فوٹو پر جمی دھول صاف کرتی منداکنی کبھی بھائیوں کو دیکھتی کبھی باپ کو، تھک ہار کر اپنے آپ کو۔

ایک دن صبح سویرے سگے سمبندھی اور اڑوس پڑوس پھر آنگن میں اکٹھا ہونے لگا۔ سجا سنورا، رنگ برنگ کپڑوں میں۔ چہروں پہ سرشاری ذرا مدھم اور ہمک کم۔ دوسری شادی پہلی جیسی نہیں ہوتی۔

باپ کو نئی پوشاک میں دیکھ کر نند دمچل اٹھا۔ وہ اس کی گود میں جانے کے لیے ضد کرنے لگا۔ بنسی نے بہت پچکارا۔ بیٹا نہ مانا۔ تھک ہار کر بنسی اپنے کو کھو بیٹھا۔ اس نے نادان پہ ہاتھ اٹھایا اُسے اپنا اصلی چہرہ دکھایا۔ گھڑکی دے کر ڈرایا۔ بچہ دادی کی گود میں دبک گیا۔ معصوم وجود سُبک گیا۔

منداکنی کو یاد ہے :

کانتی اس کے ساتھ کھڑا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ لوگ لاری میں بیٹھنے لگے تو اس سے رہا نہ گیا۔ باپ کو آواز دیتا ہوا بس کی طرف بھاگا۔ منداکنی اس کے پیچھے لپکی۔ بڑی مشکل سے اسے سنبھالا۔ اپنے پر بھی قابو ڈالا۔

بس چل پڑی۔

بھائی بہن دھول میں اٹے کھڑے رہ گئے۔ کانتی بازو پھیلائے، منداکنی کو اپنے سے چپٹائے۔

باپ کی شادی میں بچے نہیں جاتے — بچوں کو کون سمجھائے۔

نئی ماں کا نام تھا سمترا۔

اپاہج ماں اور نادار باپ کی ساتویں اولاد۔ بنسی سے عمر میں کہیں چھوٹی۔ بنسی پہلی شادی ذرا پہلے کرتا تو سمترا اس کی پہلوٹھی کی بیٹی ہوتی۔

سمترا میں ایک ہی گن تھا۔ بھرے گٹھے سڈول شریر پہ چھائی سدا بہار مسکان۔ بھولی بھالی نادان۔ وہ آئی۔ نہ بنسی کو دیکھ کر لجائی نہ ساس کو دیکھ کر شرمائی نہ منداکنی کانتی اور نند دکو دیکھ کر گھبرائی۔ وہ تو گھر میں آتے ہی مُکت من سے باتیں کرتی ہوئی ہر کسی کو پتہ نہیں کیا سمجھانے لگی۔ بارہ کمروں کی حویلی میں الہڑ قدموں سے گھومتی ہوئی اپنا راز بتانے لگی۔

نئی دلہن کی مسکان۔ محلے کے لیے وردان۔ پاس پڑوس حویلی میں گھس آیا۔

آج موہن دنی آئی تو کل سوہن دئی۔ جو آئے سیوا کراتے کچھ نہ کچھ ساتھ بھی لے جائے۔

ساس بولتی رہی۔ بہو بھنڈار کا منھ کھولتی رہی۔

بنسی کو دو دُکام — دن بھر دکان رات کو سمترا کا تام جھام۔

وہ ماں کی ممتا نہ اولاد کو پہچانتا۔

نئی بیوی نے پتہ نہیں اسے کیا پڑھا دیا۔ اپنے جوبن کا نشہ پلا دیا۔

وید شاستر، دیوی دیوتا تک کو بھلا دیا۔

سمترا من کی بُری نہ تھی۔ اس کے اندر دویش تھا نہ بیر۔ وہ ساس کو ستاتی نہ سوتیلی اولاد کو رُلاتی۔ کام کاج سے کبھی جی نہ چراتی۔ رسوئی بنانے سے لے کر برتن مانجنے تک سے نہ کتراتی۔ سب کو کھلانے کے بعد کھاتی۔ لیکن گھر لٹانے سے باز نہ آتی۔ پتہ نہیں کیوں اسے لگتا گھر بار سب بے کار — اسے سامنے پڑی چیز کو دیکھ کر گُھٹن سی ہوتی — کاش کوئی آئے اور مجھ سے اسے لے جائے۔

منداکنی نہیں بھولی :

شام کا وقت تھا۔ سمترا تیسری منزل سے نیچے اتری۔ آنگن میں آکر اس نے نل سے ہاتھ میں پکڑی بالٹی دھوئی۔ اور ڈیوڑھی میں بندھی بھینس دوہنے لگی۔

آدھا دودھ نکالا تھا کہ سامنے والے مکان کی پورنا موسی لوٹا لیے آدھمکی۔

پورنا کو دیکھتے ہی سمترا کھل اٹھی۔ بالٹی کے بجائے وہ لوٹے میں دودھ دوہنے لگی۔

دوسرے ہی پل بھونچکی رہ گئی۔ ڈیوڑھی کے دالان میں کھڑی تھی اس کی ساس — یہ کہاں سے آ ٹپکی یہ تو ابھی اپنے چھوٹے بیٹے کے گھر گئی تھی — سمترا کے ہاتھ سے لوٹا چھوٹ کر بالٹی میں گر گیا۔ بالٹی کا تھوڑا دودھ چھلک کر فرش پر بکھر گیا۔ پھر کیا تھا۔ ساس ابل پڑی۔ بہو کو جی بھر کر سنانے کے ساتھ اسے کنگال کی اولاد کہہ ڈالا۔ انت میں ایشور کی دہائی دیتے ہوئے شراپ دے ڈالا۔

کم ذات! لوگ دودھ پوت سات پردوں میں چھپا کر رکھتے ہیں۔ تو ان کی ناقدری کرتی ہے۔ سوتیلوں کا نہیں تو اپنی کوکھ سے جنوں کا ہی خیال کر۔ تو جو آج ہر چیز کا نرادر کرتی ہے کل دانے دانے کو ترستی پھرے . . .

دادی کا شراپ حویلی میں گونج اٹھا۔

منداکنی کانپ گئی۔ اسے لگا دادی نہیں بولی آنے والے دن بول اٹھے۔

اس رات نئی ماں سسکتی رہی۔ باپ دہاڑتا رہا۔ دادی ہاہاکار کرتی رہی۔

اس رات منداکنی نے بہت کچھ سوچ ڈالا۔ دونوں اپنے اور تینوں سوتیلے بھائیوں کو من میں بٹھا کر اس نے پرن کیا کہ وہ ایک پل کو بھی کتاب پر سے نظر نہ ہٹائے گی۔

دادی کا شراپ رنگ لاکر رہا۔

کہتے ہیں چوبیس گھنٹوں میں ایک پل ایسا آتا ہے جب کسی کی زبان سے نکلی بات سچ ثابت ہو کر رہتی ہے۔ وہ بات کوئی اور نہیں سرسوتی کہتی ہے۔

چند برسوں میں گھر بھنڈار خالی ہو گیا۔ بنسی کا کاروبار سوالی ہو گیا۔ وہ جو مال خریدتا مندا ہو جاتا۔ جو چیز بیچتا تیز ہونے لگتی۔ پوری منڈی خرید لینے والا چھوٹے چھوٹے سودے کرنے سے گھبرانے لگا۔ دکھ میں سمے بتانے لگا۔ زمین جائداد گھاٹے کی نذر ہونے لگی۔ بچا کھچا بیوی بچوں کے پیٹ میں سمانے لگا۔

بنسی کی ماں سے بربادی نہ دیکھی گئی۔ اس کے آدمی نے بڑے جتن سے پیدا کی تھی زمین جائداد۔ وہ اسے جاتا دیکھ کر سہہ نہ سکی۔ ایک بار بستر پکڑا تو اٹھ کر نہ دیکھا۔ روتی پیٹتی چل بسی۔

بہو کی رگ نہ بدلی۔ ساس نے آنکھ بند کی تو وہ کھل کھیلی۔ لٹتے لٹاتے وہ وقت آ گیا جب کمروں میں تالا ڈالنے کی ضرورت رہی نہ رات کو ڈیوڑھی کا دروازہ بند کرنے کی۔ گھر میں پڑے چھوٹے بڑے ٹرنک کنگال کے پیٹ کی طرح بجنے لگے۔

منداکنی حیران تھی۔ نہ نئی ماں بات سمجھتی نہ باپ اسے سمجھاتا۔ دونوں وہی کرتے جو ان کے جی میں آتا۔

سب کچھ لٹا کر بنسی پوجا پاٹھ کی طرف لوٹا۔ سب کچھ لٹانے کے بعد بھی اس نے بیوی کا پنڈ نہیں چھوڑا۔

منداکنی نے ایم اے پاس کیا تو اس کا نیا بھائی پیدا ہوا۔ بنسی کا بارہواں بچہ۔ بنسی اور سمترا کا نواں۔

اس دن منداکنی لرز گئی۔ اس کے جی میں آئی چیخ اٹھے لیکن اس نے آواز نہیں نکالی۔ باپ کی آنکھوں میں تیرتی ہاری ہوئی آشا کا لہو اس کی نظروں میں سموم گیا۔ ساتھ ہی ابھری آخری سانس لیتی ماں کی آنکھوں میں امڈتی لاچار پرارتھنا۔ اس کے علاوہ دماغ پر جال کی طرح تن گیا نئی ماں کا نشہ باپ اور نشہ کام پیار۔

کالج سے نکلتے ہی منداکنی کو نوکری نہ مل جاتی تو پتہ نہیں بنسی اور سمترا کو کیا کچھ کرنا پڑتا۔

منداکنی نوکری کرتی رہی۔ باپ کی اولاد کے لیے مرتی رہی۔

کانتی کالج میں جاتے ہی بگڑ گیا۔ اسے جوئے اور شراب کی لت پڑ گئی۔ وہ باپ کا سامنا کرنے لگا۔ اپنی موت آپ مرنے لگا۔ منداکنی کو ہوک اٹھتی لیکن کچھ نہ سکتی۔ کانتی کو دیکھتے ہی اسے اپنی ماں کی نگاہیں یاد آ جاتیں۔ ان میں تیرتا کرب اس کے منہ پر تالا ڈال دیتا۔ کانتی بھی بہن کے آگے آنکھ اونچی نہ کرتا اور کسی سے نہ ڈرتا۔

نند و شریف تھا لیکن دماغ کا غریب تھا۔ منداکنی چاہتی تھی پڑھ لکھ کر وہ بڑا آدمی بنے۔ ماں کی آتما کو کچھ تو شانتی ملے۔ بیٹی بنا شادی کیے گیارہ بچوں کی ماں بن گئی۔ بڑا بیٹا کسی کام کا نہ نکلا چھوٹا ہی کچھ کر دکھائے۔ . . منداکنی کو لگتا۔۔۔ ماں رونے لگی

اپنے بھائیوں سے نراش ہو کر وہ سمترا کے بچوں کی طرف جھکی۔ وہ پرائے نہ تھے۔ سمترا نے سوتیلے پن کا احساس پیدا نہ ہونے دیا تھا۔ منداکنی کو یاد کوئی دن یاد نہیں جب نئی ماں نے ان تینوں کو اپنی کوکھ سے نکلنے والوں سے بڑھ کر نہ مانا ہو۔

سمترا کے بچے آصیل تھے لائق نہیں۔ ان میں چستی نہ تھی۔ بات کو دیر سے سمجھتے۔ دھیمی چال چلتے۔ ایک دن کا فاصلہ ہفتے میں طے کرتے۔

سمے بیتتا گیا۔ اس کے ساتھ بیت چلی منداکنی۔

باپ پونجی کا ہو کر رہ گیا۔ سمترا گھر بار کی۔

بہن بھائی اپنے ٹھکانے لگتے گئے۔ منداکنی سے کٹتے گئے۔ آپس میں بٹتے گئے۔ وہ دیدی کو نمسکار کرنے اور اس کا آشیرواد لینے آنا تک بھول جاتے۔ کئی بار بلانے پر ایک بار آتے۔ دیدی کی نہ سنتے بس اپنی سناتے۔

ایک رات بنسی کی چھاتی میں درد اٹھا۔ صبح ہونے سے پہلے ہی وہ بھگوان کو پیارا ہو گیا۔

منداکنی نے دیکھا اس کی ماں کی طرح باپ نے بھی سمترا کو نہارتا چھوڑ کر نگاہیں اس پر گاڑ دیں۔ ۔ وہی لاچار پرارتھنا۔

لیکن سمترا پتی کا وچھوہ نہ سہہ سکی۔ اسے تقدیر سے گلہ بے شک رہا ہو اپنے آدمی سے شکایت نہ تھی۔ بنسی نے اچھے برے کسی وقت اس کا ہاتھ نہ روکا تھا۔ اسے کسی بات پر نہ ٹوکا تھا۔ وہ جلدی بنسی کے پیچھے چل دی۔

نئی ماں مری تو منداکنی چالیس پار کر چکی تھی۔

پتہ نہیں کتنا زندہ تھی کتنا مر چکی تھی۔

ایک پیڑ جو موسم کو اوڑھ سکتا تھا نہ چھوڑ سکتا تھا۔

بنسی اور سمترا کا نواں بچہ منداکنی کو بتائے بغیر بدیس چلا گیا تو اسے لگا جس ڈور سے بندھی تھی وہ ٹوٹ گئی۔ شاید وہ بے وقت بندھن سے چھوٹ گئی — لگاتے جیسے کھونٹے کے بغیر زندگی بے کار نظر آتے۔

منداکنی بسنت کے انتم دنوں کی طرح اداس رہنے لگی۔

پہلے وہ کبھی کبھار سوچتی :
اپنوں سے زیادہ ظالم کوئی نہیں ہوتا !
اب وہ اکثر کراہ اٹھتی ۔

انہی دنوں منداکنی کے دفتر میں آیا شوالک ۔ اس کا اسٹینو ۔
شوالک — پیارا نوجوان ۔ فرمانبردار، خوش اطوار، یاروں کا یار ۔
منداکنی کے سامنے بیٹھتا تو اسے لگتا وہ اس کے اشارے کا منتظر ہے ۔
وہ پہلے پہل گھبرائی لیکن جلد ہی لوٹ آئی — بہار کے آنے کا کوئی وقت نہیں ۔

اکثر وہ شوالک کو خط لکھواتے ہوئے الجھ جاتی ۔ اپنے کو اپنے سے باہر پاتی ۔ اندر ہی اندر کسمساتی ۔
وہ دیر تک دفتر میں بیٹھنے لگی ۔ شوالک کو اپنے گھر تک موٹر میں لے جانے لگی ۔ راستے میں ریستوراں میں بیٹھ کر جی بہلانے لگی ۔ اپنے کو کھونے شوالک کو پانے لگی ۔
ایک دن شوالک اس کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا دیواروں پر سجے چتر دیکھ رہا تھا ۔ ایک چتر پر وہ رک گیا اس میں صرف ایک پیڑ تھا جس پر لٹکتا ایک پھل ۔ پتے آب کھو چکے تھے جیسے اپنے کو رو چکے تھے ۔
منداکنی شوالک کے چہرے کو پڑھنے لگی :
کہاں کھو گئے ؟
شوالک نے پیڑ پر سے نظریں نہیں ہٹائیں ۔
میں اس کے کرب کو محسوس کر رہا ہوں ۔ یہ سمجھتا ہے اس کا وجود بے کار ہو گیا ۔ یہ نہیں جانتا جاتی ہوئی رُت کے آخری پھل کا اپنا ذائقہ ہوتا ہے ...

اس رات منداکنی نہیں سوئی ۔ من ہی من ڈولتی رہی ۔ آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر اپنے کو تولتی رہی ۔ اسے لگا اس کا انگ انگ اس سے اپنے کو وصول کرنے پر تل گیا ۔ اس کے وجود کا دوار کھل گیا ۔ مہمان کے سواگت کے لیے راستہ دھل گیا ۔

وہ دن آ گیا جب منداکنی کنوارپن کے رس کی بچی کھچی بوندیں دیوتا کی بھینٹ کرنے شوالک کو ساتھ لے کر بھوالی کے لیے چل پڑی ۔
سارا راستہ دونوں خاموش رہے ۔
انتظار کے نشے میں مدہوش رہے ۔
دوپہر کو بس بھوالی جا پہنچی ۔

ہوٹل میں داخل ہوتے ہی شوالک کو سکیٹنگ کا بھوت سوار ہو گیا ۔

منداکنی نے اسے نہیں روکا ۔ اسے تو رات کا انتظار تھا ۔

شوالک شام تک سکیٹنگ کرتا رہا ۔ منداکنی ہوٹل میں بیٹھی اپنے کو جانچتی رہی ۔ کپڑوں اور میک اپ کو آنکتی رہی ۔ جذبات کی سچائی، احساس کی گہرائی کو تاپتی ہوئی وہ اپنی نس نس کو پکارتے سننے لگی ۔ عجیب سپنا بننے لگی ۔
شام کی چائے انھوں نے بالکنی میں بیٹھ کر پی ۔ شوالک خوش تھا ۔ منداکنی مسرور ۔ آپس میں بات نہ کرتے ہوئے بھی وہ ایک دوسرے کو پا رہے تھے ۔ آنے والے لمحوں سے آنکھ ملا رہے تھے ۔

رات پڑ گئی ۔
منداکنی اور شوالک ڈنر کے لیے ہوٹل کے ہال میں آ گئے ۔
ہال جگمگا رہا تھا ۔ اپنے جوبن پر اترا رہا تھا ۔ گیت گا رہا تھا ۔ واتاورن کو بھر بار رہا تھا ۔
میز کے گرد بیٹھے تھے منداکنی اور شوالک کے علاوہ ادھیڑ بھیرو بابو اور جوان سانچی — پتی پتنی —
ڈنر آتے آتے چاروں آپس میں گھل گئے ۔
ڈنر ختم ہوتے ہی سیر کے لیے نکل پڑے ۔

سڑک پر سردی زیادہ تھی ۔
بھیرو بابو کے پاس تھا سانچی کا کوٹ اور شال ۔
سانچی کو اپنے بازو اپنے ہی شریر کے گرد کستے دیکھ کر شوالک مسکرایا ۔
دوسرے ہی پل اس نے بھیرو بابو سے شال پکڑ کر سانچی کو اوڑھا دی ۔
سانچی کی کنچن کایا اندر تک مسکرا دی ۔
پہاڑ، جنگل اور ندی گنگنا دی ۔

تھوڑا فاصلہ طے کرتے ہی شوالک اور سانچی آس پاس کو بھول گئے ۔
وہ باتیں کرتے ہوئے آگے آگے چلنے لگے ۔
منداکنی اور بھیرو بابو پیچھے رہ گئے ۔

بھیرو بابو کو لگاتار بولتے دیکھ منداکنی گھبرائی ۔ کچھ سوچ کر وہ اندر ہی اندر کسمسائی ۔ دور تک ہو کر لوٹ آئی ۔
سانچی اور بھیرو بابو ؟ — شوالک اور منداکنی ؟ — وہ مسکرائی ۔ بھیرو بابو کو دھیان سے دیکھتی ہوئی ان پر گھر آئی ۔

پُل آ گیا ۔
شوالک اور سانچی اپنے میں ڈوبے پار اتر گئے ۔ (بقیہ صفحہ ۳۵ پر)

عادل صدیقی

شمس بلگرامی

(جنگِ آزادی کا ایک گمنام سپاہی)

جب انیسویں صدی اپنی بساط لپیٹ رہی تھی اور بیسویں صدی کی آمد آمد تھی، اس وقت ہمارا ملک ایک ہیجانی دور سے گزر رہا تھا۔ عوام میں جذبۂ آزادی بیدار ہو رہا تھا اور وہ غیر ملکی تسلط سے خود کو آزاد کرانے کے جذبے سے سرشار ہو چلے تھے۔ ۱۹۱۴ء کی لڑائی میں ہندوستانی عوام نے برطانیہ کا ساتھ دیا تھا چنانچہ ۱۹۱۷ء میں برطانیہ حکومت کی طرف سے یہ اعلان کیا گیا تھا کہ ہز میجسٹی کی سرکار ہندوستان میں انتظامیہ کے سبھی شعبوں میں ہندوستانیوں کی شرکت چاہتی ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ ہندوستان میں خود مختار اداروں کا تدریجی طور پر فروغ ہو نیز وہ ہندوستان میں برطانوی سلطنت کے جزو لاینفک کے طور پر ذمہ دار سرکار بنائیں۔ ملک میں کانگریس کی بنیادیں مضبوط ہو چکی تھیں۔ عوام میں دیش بھگتی اور آزادی کی تڑپ بڑھتی جا رہی تھی۔ وطنی نظموں کے ذریعہ دلوں کو گرمایا جا رہا تھا اس سیاسی پس منظر میں مادرِ وطن نے بہت سے ایسے سپوت پیدا کیے جنھوں نے محض حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہو کر وطن عزیز کی آزادی کے لیے تن من کی بازی لگا دی۔ ایسے جیالوں کی فہرست طویل ہے۔ افسوس یہ ہے کہ ان میں بہت سے ایسے فرزند وطن بھی ہیں جن کے بارے ہمیں یا تو مطلق علم نہیں یا اگر ہے تو سرسری۔ سید شاہ وصی احمد شمس بلگرامی کا نام بھی اسی زمرے میں آتا ہے۔ موصوف ۱۲ر نومبر ۱۸۸۳ء کو اتر پردیش میں غازی پور کے مقام پر پیدا ہوئے۔ آپ نے ایک علمی گھرانے میں آنکھیں کھولیں۔ ابھی چھوٹے ہی تھے کہ والد سید شاہ تقی بلگرامی کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ ان کی پرورش ان کے نانا شاہ فتح محمد صاحب نے کی جو خود بھی ایک جید عالم تھے۔

سید وصی احمد نے سہسرام سے ۱۹۰۲ء میں ہائی اسکول پاس کیا۔ اعلیٰ تعلیم الہ آباد کرسچین کالج سے حاصل اور پٹنہ سے قانون کا امتحان پاس کیا۔

تعلیم مکمل کر لینے کے بعد وہ محکمہ پولیس سے وابستہ ہو گئے۔ اور گیا میں کوتوال شہر رہے مگر یہ کام ان کی طبیعت کے لیے موزوں نہ تھا اس لیے استعفیٰ دے کر رنگون چلے گئے جہاں دو سال تک میمن جماعت اکیڈیمی کے اسکول میں ہیڈ ماسٹر اور سپرنٹنڈنٹ رہے مگر آب و ہوا راس نہ آئی اور وطن کی طرف مراجعت کی۔ اس کے بعد سنٹرل کوآپریٹو بنک کے منیجر اور آڈیٹر کی حیثیت سے آٹھ سال تک فرائض منصبی انجام دیے مگر یہ کام بھی ان کی طبیعت کے لیے سازگار ثابت نہ ہوا اور وہ کلکتہ چلے گئے اور نجی تجارتی اداروں سے وابستہ رہے۔ مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

یہ دور نوجوانوں اور ملک کے دانشوروں میں آزادی کے جذبے کو لو دے رہا تھا۔ ۱۹۲۰ء میں مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کی تحریک خلافت مسلمانوں کو ایک خاص موڑ پر لے آئی تھی جہاں "جان بیٹا خلافت پہ دے دو" ہر نوجوان کا نعرہ بن چکا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایک حساس دل، صاحبِ علم، نغز گو شاعر سیاست کے میدان سے اور ملک میں پھیلی ہوئی ان چنگاریوں سے خود کو کیسے الگ رکھ سکتا تھا۔ وہ علی گڑھ کی تحریکات سے شروع ہی سے وابستہ تھے۔ آپ مولانا محمد علی اور مولانا حسرت موہانی دونوں سے بے حد متاثر تھے۔ پہلے تحریک خدام کعبہ میں شریک ہوئے پھر ۱۹۲۰ء کی تحریک خلافت میں بھرپور حصہ لیا اور ۱۹۲۱ء میں علی برادران کے مشہور تاریخی مقدمۂ کراچی میں کلکتہ خلافت کمیٹی نمائندہ کی حیثیت سے شرکت کی اس موقع پر آپ نے جو تقریر کی وہ ایک یادگار تقریر ہے۔

کراچی سے واپسی پر ۱۹ر دسمبر ۱۹۲۱ء کو تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۱۰ الف

کے تحت سہسرام میں گرفتار کر لیے گئے اور بکسر جیل بھیج دیے۔ اس کے بعد انھیں ہزاری باغ سنٹرل جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ یہاں انگریز جیلر اور سپرنٹنڈنٹ کے ہاتھوں ۷ار فروری ۱۹۲۲ء کو بے حرمتی قرآن کا مشہور واقعہ پیش آیا جس کی خبر ملک کے متعدد اخباروں میں شائع ہوئی۔ عوام کی طرف سے زبردست غم و غصہ کا اظہار کیا گیا۔ ملک کی تمام سیاسی جماعتوں نے اپنی برہمی ظاہر کی۔ نتیجتاً حکومت بہار کی جانب سے عدالتی تحقیقات کا حکم جاری ہوا۔ اس کے بعد حکومت کو مجبور ہو کر ۷ار جون ۱۹۲۲ء کو شاہ صاحب موصوف کو رہا کرنا پڑا قید سے رہائی کے بعد شاہ صاحب نے ملکی سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ۱۹۳۰ء میں مسلم تاجران ہند کے نمائندے کی حیثیت سے بلاد اسلامیہ ایران، عراق کا دورہ کیا اور حکومت ایران سے اہم تجارتی معاملات طے کیے۔ واپسی پر تحریک ترک موالات، تحریک سول نافرمانی وغیرہ سے منسلک ہو گئے۔

شاہ صاحب کے افکار و خیالات سے ان کی روشن خیالی، وسیع القلبی اور وطن دوستی کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ بنی نوع انسان کی خدمت کو زندگی کا مقصد سمجھتے تھے۔ وہ مسلمانوں کو تلقین کرتے تھے کہ اپنے وطنی بھائیوں کے ساتھ کاندھا سے کاندھا ملا کر غیر ملکی حکومت کے خلاف جنگ کریں اور اپنے کو کسی دوسرے فرقے سے کمتر اور کمزور نہ سمجھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر ہندوستان میں ہم اسلام کا وہ حشر دیکھنا نہیں چاہتے جو اسپین میں ہو چکا ہے تو ہمارے ملک کی آزادی ہمارا مقصد حیات ہونا چاہیے چاہے اس کے لیے سرفروشانہ جنگ ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔ بنی نوع انسان کے اصلی ہی خواہ وہ لوگ ہیں جو ظاہر بیں نگاہوں کے مطمح نظر سے الگ اور عوام کے نعرۂ تحسین سے بے پروا ہو کر ظلم و تعدی کی ناپاک بنیاد کو اکھاڑنے کے لیے تن من دھن کی بازی لگاتے ہیں۔ وقت عمل کا ہے، تقریروں کا نہیں۔

شاہ صاحب زندگی کا بڑا حصہ عملی سیاست میں گزارنے کے بعد ۲۸ر اکتوبر ۱۹۴۱ء کو ۶۰ سال کی عمر میں واصل بحق ہوئے۔

شاہ صاحب کی شخصیت انھیں سیاست کے حصار میں پابند نہ رکھ سکی۔ ان کی طبیعت کی شگفتگی اور جذبات کی شدت نے انھیں شعر گوئی کی طرف مائل کیا۔ شاہ صاحب کا کلام جذبات کی پاکیزگی اور خودداری کا مظہر ہے۔ ان کے اشعار ایثار و قربانی کا مرقع ہیں۔ وہ شمس تخلص کرتے تھے۔ حضرت شمس نے خود ایک جگہ لکھا ہے :-

"میرے اشعار کے متعلق کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ مغلق ہوتے ہیں، عام فہم نہیں ہوتے نفس الامر یہ ہے کہ میرے کلام کے مخاطب خواص ہیں کیوں کہ میں اپنا پیغام اول مرحلے میں خواص تک ہی محدود رکھنا چاہتا ہوں تاکہ وہ اسے بخوبی ذہن نشین کر لیں۔ اور اس کے بعد عوام تک پھیلائیں۔"

بہرحال شاہ صاحب کے قول سے کسی کو اتفاق ہو یا نہ ہو مگر یہ ضرور ہے کہ ان کی طبیعت مشکل پسند تھی۔ ۱۹۲۲ء میں جب وہ بکسر جیل میں تھے تو انھوں نے ترانۂ زنداں کے عنوان سے جو نظم کہی، وہ بہت مشہور ہوئی۔ اس کے چند شعر ہدیہ ناظرین ہیں :-

لائی ہے کھینچ کر مجھے تقدیر جیل میں — بنیاد حریت کی ہے تعمیر جیل میں
قابو ہو نفس پر تو پھر آساں سوراج ہے — ان چار حرف کی کرو تفسیر جیل میں
مانا کہ میرے پاس وہ تیر و تبر نہیں — کیا کم ہے میرا نالۂ شبگیر جیل میں
ہم قید ہوئے تو اور بھی آزاد ہو گئے — مدت کی بگڑی بن گئی تقدیر جیل میں
اے آسماں بتا دے بگڑتا ہے کیا ترا — جو ہم غریب کہتے ہیں تکبیر جیل میں

اے شمس شعر گوئی کا بھی مشغلہ نہیں
خاموش ہوں میں صورت تصویر جیل میں

آپ نے نظمیں ہی نہیں بلکہ غزلیں بھی کہی ہیں۔ آپ کی ایک غزل پٹنہ کے اخبار اتحاد مورخہ ۹ر فروری ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی جس کے چند اشعار درج ذیل ہیں :-

بوالہوس نفس کی پہلے ذرا تحلیل تو کر
عشق لیلیٰ میں انا لیلیٰ کی تکمیل تو کر
بندہ رسم ہے تو ضعف عمل تیری سرشت
مادیت سے الگ فکر کی تاویل تو کر
تجھ سے جاتی رہی مشکل طلبی جور کشی
مثل پروانہ تو جاں دینے میں تعجیل تو کر
فکر کر خواب براہیم کی تعبیروں پر
پختہ نیت سے ذرا حکم کی تعمیل تو کر
باپ اور بیٹے کی قربانی پر آمادہ ہو
یہ تھی تنظیم پھر اس نظم کی تشکیل تو کر
شمس ہے بندہ حق اور فقیر بے گلیم
جام جم ساغر غم میں ذرا تبدیل تو کر

شاہ محمد دمی نے ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں دل کھول کر حصہ لیا وہ اپنی انسان دوستی، حب الوطنی اور جذبۂ ایثار کی وجہ سے ہندوستان کے ان مایۂ ناز سپوتوں میں سے ایک ہیں جنھیں ہندوستان کی تاریخ آزادی میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ ان کی وفات پر محمد تقی قمر گیاوی نے درج ذیل قطعہ سپرد قلم کیا :-

یہ موجیں بحر فنا کی صدائیں دیتی ہیں
کہ ہے جہاں میں بشر صورت حباب آباد
ہزار حیف، ہوئی رحلت دمی احمد
دعا یہ ہے کہ رہیں خلد میں جناب آباد
قمر وہ خلد میں پہنچے تو ان سے رضواں نے
کہا کہ "پاک بہشتی ابو تراب آباد"

۱۳۶۰ھ

غزلیں

نشاط سعید

بھیک دن سے مانگیے یوں رات سے
نور پیدا کیجیے ظلمات سے

درد میں ڈوبی ہوئی اک لے ہوں میں
غم ٹپکتے ہیں مرے نغمات سے

وقت نے چھیڑا ہے پھر ذکرِ حیات!
بات پیدا ہو رہی ہے بات سے

دل کو بھی ان کی خبر ہونے نہ دی
ہم ہوئے دوچار جن حالات سے

آفتیں گلشن پہ آئیں جس قدر
سب ہوئیں منسوب میری ذات سے

خضرِ منزل اب بھٹک سکتا نہیں
روشنی لے آئے ہیں ظلمات سے

چاہیے جوشِ عمل بھی کچھ نشاطؔ
انقلاب آتے نہیں ہیں بات سے

خاطر حافظی

ول ساز کار نہیں ہے تو کیا کریں—؟
اس عشق کے سوا بھی بہت سی ہیں الجھنیں

اِس پُر فریب شہر سے اکتا گیا ہے جی
اونچی پہاڑیوں پہ کہیں دور جا بسیں!

یہ آسمان کیسا لگے ہے قریب سے؟
ایسا کریں کہ اڑ کے فضاؤں میں دیکھ لیں

پر بت کا آب و خاک انہیں اس کب ہوا!
ایسے بھی کچھ ہیں پھول جو آنگن میں ہی کھلیں

س کے بغیر جو ہے مرا حاصلِ حیات!
یسے کٹے گی یہ شبِ ہجراں سے پوچھ لیں

اب تک ہے انتظار کب آئے گا لوٹ کر
دیکھ چلا گیا ہے لوٹی در پہ دستکیں

لیوں کی خاک چھان کے خاطرؔ
دنے کہاں جو آپ کے تو وفا ہے تنہیں.

اثر انصاری

یں سانس لیتا نہیں اجنبی فضاؤں میں
مجھے تلاش کرو تم مری نواؤں میں

کہیں زمیں کی کشش ہے کہیں فلک کی کشش
قدم سنبھال کے رکھنا ذرا خلاؤں میں

بکھیر اپنے تبسم کی روشنی اے دوست!
ستارے ٹانک دے کچھ رات کی قباؤں میں

مہکتی رہتی ہیں تنہائیوں کی راتیں بھی
ترے بدن کی ہے خوشبو ابھی ہواؤں میں

وہ ایک شے، جسے ہم سب خلوص کہتے ہیں
نہ مل سکے گی کہیں شہر میں نہ گاؤں میں

مجھے نزاکتِ احساسِ غم دیا جس نے
ب س کی یاد بھی شاملِ مری دعاؤں میں

سیفی سرونجی

نا کہ میری بات ذرا بے اصول تھی
لیکن تجھے شکست بھلا کب قبول تھی

گزرا جو اس کے کوچے سے تنہا میں ایک دن
میں تھا ہو لہان مرے سر پہ دھول تھی

دیکھے تھے خواب سینکڑوں محلوں کے دوستو
لیکن مرے نصیب میں صحرا کی دھول تھی

لوگوں نے مجھ کو دار پہ تنہا چڑھا دیا
حق بات ہی زمانے میں یہ میری بھول بھی

کہنے کو کیسا نسبت نہیں مجھے
لیکن بچھڑ کے تجھ سے طبیعت ملول تھی

سیفیؔ کی لاش پہ کھڑے وہ کہہ رہے ہیں آج
دنیا میں اس کی زندگی بالکل فضول تھی

عقیل الرحمٰن نشاط

پھولوں کی طرح جسم کئی بار کھلے ہیں
کچھ نقش بہاروں کے صلیبوں پہ ملے ہیں

اب حال ہے یہ چشمِ ستمگر کے عوض بھی
نے حرفِ شکایت ہے نہ شکوے نہ گلے ہیں

آتی تو ہیں زخموں کی حکایات لبوں تک
"کہنے کو بہت کچھ ہے مگر ہونٹ سلے ہیں"

پھونکوں سے بجھی ہے کہیں الطاف کی مشعل
تنکوں کی صلابت سے کہیں سنگ ہلے ہیں

ملنے کو ہے کیا راہِ نشاطِ غمِ جاناں
صد شکر کہ اب پائے عنایات چھلے ہیں

کشوری منچندہ

تکون کا کرب

میں ایک بار جو کہہ چکا ہوں کہ میں کوئی بھی چھوٹا موٹا کام کرنے کے لیے تیار نہیں اور یہ بات کہنے کے جرم میں چاہے آپ مجھے گھر سے ہی کیوں نہ نکال دیں اور میں در در کی ٹھوکریں کھاتے ہوئے بھوک و پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر ہی کیوں نہ جاؤں، میں کسی بینک، انشورنس کمپنی یا کسی اعلیٰ درجہ کی فرم کے علاوہ اور کہیں بھی کام نہیں کروں گا۔ کتنی بڑی بے انصافی ہے کہ میرے وہ کلاس فیلو، جو تھرڈ ڈویژن میں رو رو کر پاس ہوئے تھے، آج بنکوں اور انشورنس کمپنیوں میں ٹھاٹھ سے ڈٹے ہیں اور ایک میں ہوں جو صرف آپ کی لاپرواہیوں اور غلطیوں کی وجہ سے جوتیاں چٹخاتا پھر رہا ہوں۔ اگر آپ کی کوئی پہنچ نہیں تھی تو آپ نے مجھے بی۔کام کروایا ہی کیوں ——؟ اس سے تو بہتر یہ تھا کہ آپ مجھے ان پڑھ ہی رہنے دیتے۔ اس صورت اگر آپ مجھے خوانچہ لگانے کے لیے کہتے تو میں اس کے لیے بھی تیار ہو جاتا —————— !!"

بیٹے کی بات سن کر راجیو انگاروں پہ لوٹنے لگا۔ پیار، محبت اور برسوں کی کڑی محنت و ریاضت کا کیا یہی پھل تھا جو اب اسے مل رہا تھا۔ بے اختیار اس کا جی چاہنے لگا کہ اس گستاخ بیٹے کو ابھی دو چار تھپڑ لگا ڈالے اور ابھی وہ اس بات کے لیے تیار ہو ہی رہا تھا کہ اس کا بیٹا راکیش حقارت بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا ہوا گھر سے باہر چلا گیا۔ راجیو نے اسے جاتے ہوئے دیکھا اور اسے پکڑنے کے لیے لپکا بھی، لیکن اس کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا ——

"نواب زادہ کہیں کا! بڑے بڑے لوگوں، سرمایہ داروں اور اونچے حلقوں میں رسائی رکھنے والے لوگوں کے بیٹوں کی "ریس" کرتا ہے۔ آخر اسے یہ بات سمجھ میں کیوں نہیں آتی کہ جتنی بھی اچھی اچھی اور اونچے درجے کی ملازمتیں ہیں، وہ سب بڑے بڑے اور خاص خاص لوگوں کے لیے مخصوص ہوتی ہیں۔ عام لوگوں کا تو ان پر سایہ بھی نہیں پڑنے دیا جاتا۔ اسے تو اس بات کا پوری طرح احساس ہونا چاہیے کہ وہ ایک معمولی کلرک کا بیٹا ہے، ایسے کلرک کا، جو صرف اپنے کام سے ہی کام رکھتا ہے، خوشامد اور چاپلوسی کے فن سے قطعاً ناواقف ہے۔ اس لیے ایسے کلرک کے بیٹے کی قابلیت اور رہائی سیکنڈ ڈویژن کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ ایسے حالات میں تو اس کا سب سے بڑا فرض یہی ہے کہ وہ اعلیٰ قسم کی ملازمت کا خیال ترک کر کے کوئی چھوٹی موٹی نوکری ہی کر لے تاکہ گھر کے خرچ میں کچھ سہولت ہو جائے، لیکن وہ میری سنتا ہی کہاں ہے —————— ؟!!"

یہ کہتے ہوئے اس کے منہ سے ایک ٹھنڈی آہ نکل گئی۔ سر جھک گیا اور وہ اپنے پھٹے ہوئے جوتوں کو گھورنے لگا۔ اس نے کئی بار یہ سوچا تھا کہ ان جوتوں کو اپنے پاؤں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے الگ کر دے اور ایک نیا چمچماتا ہوا جوتا خرید کر پاؤں کی زینت بنا لے لیکن حالات کی ستم ظریفی نے آج تک اس کی یہ معصوم سی خواہش بھی پوری نہ ہونے دی تھی۔ اس کے دل سے ایک آہ نکل گئی اور نگاہیں کچھ اس طرح اس پھٹے ہوئے جوتے میں الجھ کر رہ گئیں جیسے وہ نظروں کے تار سے ان کے چاک سی رہا ہو۔ لیکن اسے اس کام میں بھی کامیابی نہ مل سکی اور وہ جوتا پہلے کی طرح ہی اس کا منہ چڑاتے ہوئے اس کی طرف دیکھتا رہا ——

وہ زمانے کے ہاتھوں ستایا ہوا ایک صاف باطن اور صاف گو انسان تھا۔ چالاکی، ہیرا پھیری اور رات کو دن بنانا اسے بالکل آتا ہی نہیں تھا۔ یہ اس کی ذات کی بہت بڑی خامی تھی، جس کی وجہ سے وہ کبھی بھی دنیا سے اپنی اہمیت تسلیم نہ کرا سکا۔ زندگی کے ہر موڑ پر اسے لوٹ کھسوٹ کا شکار بنایا گیا تھا۔ اس پر ستم بالائے ستم یہ تھا کہ فطری شرافت، سادہ لوحی اور دبوپن کی وجہ سے اس نے اس ظلم کے خلاف کبھی آواز بلند نہ کی تھی۔ چوٹ کھانے کے بعد ہر بار وہ دل مسوس کر رہ جاتا اور ہر قسم کی ناقدری اور بے عزتی کو ماں کا دودھ سمجھ کر پی جاتا —— لیکن اس کی بیوی رجنی کا مزاج اس سے بالکل مختلف تھا۔ وہ ہر نا انصافی کے خلاف تن کر کھڑی ہو جاتی تھی اور راجیو کی طرف سے کسی بھی طرح کے ظلم و ستم کو خاموشی سے برداشت کرنے کے بجائے اپنے پر طوفان کھڑا کر دیتی اور جو بھی منہ میں آتا کہتی چلی جاتی۔ لیکن راجیو تو راجیو تھا۔ وہ شخص، جو دنیا کے ظلم و ستم کے خلاف آواز بلند کرنا نہیں چاہتا تھا، اپنی بیوی کے آگے کیسے بولتا! وہ اس عاشق کی طرح تھا جو بقول غالب "کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا" —— وہ رجنی کے پتلے پتلے ہونٹوں سے نکلتی ہوئی کڑوی کسیلی باتوں اور طنز و تشنیع کے تیروں کو کمال صبر و تحمل سے اپنے سینے پہ جھیلتا اور پھر انہیں بلند بانگ قہقہوں کی گونج میں اڑا کر نئے صدمے اٹھانے کے لیے تیار ہو جاتا —— مسلسل صدمات سے پیدا ہونے والی تلخی احساس کی شدت سے گھبرا کر کئی بار وہ زندگی سے فرار حاصل کرنے کے لیے بھی تیار ہو گیا، مگر ذمہ داریوں کا احساس ہر بار خود غرضی پہ غالب آ جاتا اور تب یہ سوچ کر کہ اگر اس نے خودکشی کر لی تو اس کی بیوی بچوں کا کیا ہو گا، وہ ہر قسم کی تلخی کو شیرِ مادر سمجھ کر پی جاتا۔

جوں جوں اس کے بچے بڑے ہوتے گئے اسے ایسا محسوس ہونے لگا

اب اس کی زندگی کی تمام تلخیاں حلاوتوں میں بدل جائیں گی اور وہ خوشیوں و مسرتوں بھری زندگی گذار سکے گا۔ صحت مند اور خوبصورت جوان بیٹے کو دیکھ کر کس باپ کے دل میں یہ امید نہیں بندھ جاتی کہ اب اس کے دکھوں کے دن ختم ہو گئے ہیں اور اب وہ بھی سر اٹھا کر اس دنیا میں جی سکے گا۔ لیکن آج اسی بیٹے نے نہ صرف اس کی تمام امیدوں پہ پانی پھیر دیا تھا بلکہ اس کی روح اور انا پہ وہ، وہ زخم لگائے تھے کہ درد و کرب کے مارے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے۔ وہ ایسے نافرمانبردار بیٹے سے اتنا دکھی ہو گیا تھا کہ آج پہلی بار اس کا جی چاہنے لگا تھا کہ وہ اسے بُری طرح پیٹ ڈالے اور تب تک پیٹتا چلا جائے کہ وہ اس کے قدموں پر گر کر اس کی ہر بات ماننے کا اقرار کر لے۔ لیکن یہ سب کرنا اس کے بس کی بات کہاں تھی۔ وہ اپنی فطری بزدلی اور دوسروں کو ناراض نہ کرنے کے جذبہ کی موجودگی میں راکیش کو ایسا کرنے کے لیے کبھی مجبور نہیں کر سکتا تھا۔

"آہ! وہ مجھ سے معافی کہاں مانگے گا، وہ تو میری پروا ہی نہیں کرتا۔ وہ میری کمزوریوں اور دَبّوپن کا احساس دلا دلا کر میرے وقار اور انا کو ہمیشہ زخمی کرتا رہتا ہے ——— !!" اس کے منہ سے بے اختیار نکل پڑا — پھر انتہائی پریشان ہو کر وہ جہاں کھڑا تھا وہیں فرش پہ بیٹھ گیا اور سر گھٹنوں میں دے کر نہ جانے کیا کیا سوچتا رہا۔ نہ جانے کتنے لمحے وقت کی شاخ سے ٹوٹ کر ماضی کے اندھیرے کنوئیں میں جا گرے تھے جب اس نے اچانک ہی سر اٹھایا اور اٹھ کر سیدھا کھڑا ہو گیا ——— "میں ...... میں بھی اسے سبق سکھا کر ہی چھوڑوں گا ——— !" یہ کہتے وہ تیزی سے چلتا ہوا دوسرے کمرے میں جا پہنچا اور جب وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں راکیش کی تصویر تھی۔ خوبصورت اور صحت مند راکیش کی پیاری سی تصویر — اس نے جوش میں آ کر اسے زمین پہ پٹک دیا لیکن شیشہ ٹوٹنے کی آواز نہیں آئی۔ وہ جھنجھلا اٹھا۔ اس نے جھک کر تصویر اٹھا لی اور اسے گھور گھور کر دیکھنے لگا، لیکن جوں ہی اس کی نگاہیں تصویر کی نظروں سے چار ہوئیں اس نے تصویر اپنے سینے سے لگا لی "ارے — یہ تو میں ہوں ...... میں ... آج سے بائیس سال پہلے میں بالکل ایسا ہی تھا ——— میں تو اب راکیش کو نہیں پیٹوں گا — بھلا کوئی خود کو بھی پیٹتا ہے ——— لیکن یہ راکیش ایسا کیوں نہیں سوچتا۔ میرے زخموں پہ نمک چھڑکتے ہوئے اسے ایسا خیال کیوں نہیں آتا ——— کیوں نہیں ——— ؟!!" اور تب سوچ کی چھُری چلتے ہی وہ تڑپ اٹھا۔ اس نے تصویر سینے سے الگ کر کے دیوار پہ لگے ہوئے کیل سے لٹکا دی اور اس کے چہرے پہ درد و کرب کی لہریں پھیلنے اور سمٹنے لگیں۔ ان درد و کرب کی لہروں نے اسے بری طرح بے چین کر دیا اور وہ جھنجھلا کر سر کے بالوں کو نوچنے لگا۔ مگر جونہی اس نے چاندی کی طرح سفید سفید تاروں کو اپنے ہاتھوں میں الجھے ہوئے دیکھا وہ سخت پریشان ہو گیا "کیا میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ کیا بالوں میں سفیدی آ جانے سے آدمی بوڑھا ہو جاتا ہے ——— نہیں، نہیں، میں ابھی بوڑھا کیسے ہو سکتا ہوں۔ چوالیس پینتالیس برس کی عمر میں تو بڑھاپے کا تصور ہی نہیں کرنا چاہیے۔ کچھ لوگ تو ساٹھ ساٹھ اور ستر ستر برس کی عمر میں بھی جوان ہی رہتے ہیں۔ سا ٹھا، پاٹھا کی مثل بھی اسی لیے ہی وجود میں آئی ہو گی لیکن جہاں تک آج کے لوگوں کا چلن ہے وہ تو سر کے سارے کے سارے بال سفید ہو جانے پر بھی بڑھاپے کو تسلیم نہیں کرتے اور طرح طرح کے خضابوں کا استعمال کر کے جوانوں کی صف میں شامل ہوتے رہتے ہیں۔ باقی رہی بات دل کی تو یہ ظالم دل تو مرتے دم تک بھی جوان ہی رہتا ہے۔ حضرت غالب نے شاید اسی لیے کہا تھا ؎

گو ہاتھوں میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا میرے آگے

یہ سب سوچتے ہوئے اس کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ کا ایک نقطہ ابھر آیا، جو پھیلتے پھیلتے قہقہے کی صورت میں پھوٹ پڑا اور وہ بے تحاشا قہقہے لگانے لگا۔

ابھی وہ قہقہوں کی پھلجھڑیاں چھوڑ ہی رہا تھا کہ اچانک ہی ایک تیز آواز نے اس کے قہقہوں کو بریک لگا دی۔ ہڑبڑا کر اس نے آواز کی سمت دیکھا۔ یہ اس کی بیوی رجنی تھی، جو ابھی ابھی باہر سے آئی تھی۔ وہ راکیش کی ملازمت کے لیے اپنی کلاس فیلو کسم کے پاس گئی تھی تاکہ اس کے شوہر ایک اعلا افسر کی سفارش کروا کر راکیش کو کسی بینک میں نوکر کروا دے لیکن اس کی سہیلی نے اسے یہ کہہ کر اندھے کنوئیں میں گرا دیا تھا کہ اس کے شوہر کبھی کسی کی سفارش نہیں کرتے، یہاں تک کہ انھوں نے اس کے چھوٹے بھائی کو نوکر کروانے کے لیے بھی کسی قسم کی کوئی سفارش نہ کی تھی۔ کسم کے اس جھوٹ نے اس کے دل پہ چھریاں چلا دی تھیں اور وہ تڑپ کر رہ گئی تھی۔ اس نے رجنی کی تمام آشاؤں، امیدوں کا خون کر ڈالا تھا۔ رجنی کو ایسا لگا تھا جیسے کوئی ظالم اس کے کلیجے کو دونوں ہاتھوں سے مسل رہا ہے۔ اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں اور وہ بغیر کچھ کہے دونوں ہاتھوں سے دل کو سنبھالے ہوئے گھر چلی آئی تھی۔

گھر آنے پر جب اس نے راجیو کو پاگلوں کی طرح ہنستے اور قہقہے لگاتے ہوئے دیکھا تو اسے ایسا لگا جیسے اس کے زخموں پہ نمک چھڑکا جا رہا ہے اور اس کے بیٹے کے تئیں اس کے دل میں موجود اتھاہ پیار محبت کا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔ اور تبھی اس کی روح کے زخم ایک دم بڑے زور سے چیخ اٹھے تھے اور اس چیخ کے فضا میں گونجتے ہی راجیو کے قہقہوں کی موت واقع ہو گئی تھی۔ ان قہقہوں کے مرتے ہی راجیو بجھ گیا اور کراہتے ہوئے کہنے لگا — "کیا تم سے میرا ہنسنا بھی سُنا نہیں جاتا، جو گھر آتے ہی چیخنے لگ پڑی ہو۔ یہ قہقہے، جنہیں تم نے خاموش کر دیا ہے خوشی و مسرت کی کلکاریاں نہیں، بلکہ ان زخموں کے چٹخنے کی آوازیں ہیں جو تمہارے لاڈلے نے میری روح و انا پہ لگائے ہیں — !!" یہ کہتے ہوتے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں اور وہ رحم طلب نگاہوں سے بیوی کی طرف دیکھنے لگا۔

رجنی جو کسم کے کھردرے برتاؤ سے پہلے ہی بھری بیٹھی تھی، راجیو کے منہ سے بیٹے کی برائی سُن کر چوٹ کھائی ہوئی ناگن کی طرح پھنکار اٹھی۔ وہ یہ چاہ ہی رہی تھی کہ سینے میں بھرا ہوا تمام زہر راجیو کے کانوں میں انڈیل دے اور وہ سبھی کچھ اسے سنا ڈالے جس سے اس کے کان ابھی تک ناآشنا تھے مگر جونہی اس کی نگاہ راجیو کے گالوں پہ لڑھکتے ہوئے آنسوؤں پہ پڑی اس کے ہونٹوں پہ خاموشی کی مہریں لگ گئیں۔ اس نے تمام غم و غصہ یوں پی لیا جیسے شنکر نے اوروں کو بچانے کے لیے زہر ہلاہل پی لیا تھا۔

ریحان غنی

دیوان حافظ کا شاہی نسخہ اور دلچسپ فالیں

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ میں دیوانِ حافظ کا ایک نادر نسخہ محفوظ ہے۔ یہ نسخہ اس زمانے کی یادگار ہے جب ہمایوں نے شیر شاہ سے شکست کھاکر ایران میں پناہ لی تھی اور اس کو غالباً اپنے ایران کے قیام کے دوران شاہ ایران یا کسی دوسرے سے یہ نسخہ تحفتاً یا قیمتاً ملا۔ خوبصورت ایرانی خط اور دو اعلیٰ درجے کی تصویروں سے مزین یہ نسخہ ہمایوں کے مطالعہ میں رہا اور اس کے بعد جہانگیر کے مطالعہ میں آیا۔ اور ان دونوں نے اس نسخے سے زندگی کے مختلف مرحلوں میں جو فالیں نکالی ہیں وہ ان کے اپنے خط میں اس دیوان کے حاشیوں پر محفوظ ہیں اور اسی لحاظ سے یہ دیوان حافظ کا نادر ترین نسخہ بن چکا ہے۔ خدابخش لائبریری نے اس قلمی نسخے کو فوٹو آفسٹ کے ذریعے جوں کا توں قارئین تک منتقل کرنے کا اہتمام کیا ہے جس سے مغل بادشاہوں کی اصل تحریریں اپنی تمام و کمال شکل میں اس مطبوعہ نسخے میں محفوظ ہوکر سامنے آگئی ہیں۔

یہ نسخہ چار سو صفحات پر مشتمل ہے اور رنگا رنگ ڈیزائن اور ایرانی مصوری کے دو اعلیٰ نمونوں کے ساتھ ایرانی نستعلیق خط کا ایک دلکش مرقع ہے اس کو گورکھپور کے رئیس سبحان اللہ خاں نے اپنی دوستی کی یادگار کے طور سے خدابخش خاں کو ۱۹۰۷ء میں بطور تحفہ دیا۔ سبحان اللہ خاں وہی ہیں جنھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی آزاد لائبریری کو مخطوطات کا نادر مجموعہ دیا تھا جو آج بھی کتب خانہ کی زینت ہے۔ دیوانِ حافظ کے اس نادر نسخے کی یہ خصوصیت ہے کہ عظیم مغلوں نے اس کو فال نکالنے کا ذریعہ بنایا اور اس پر اپنے ہاتھ سے جو فالیں نکالیں اس کو حاشیوں میں لکھ ہی دیا۔ دنیا کے کم قلمی نسخوں میں اس کی مثال مل سکے گی۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ مغل شہزادے دارا شکوہ نے اپنی ایک تصنیف میں اولیاء کرام کا جو تذکرہ کیا ہے اس میں حافظ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حافظ کے دیوان کا ایک نسخہ ہمارے کتب خانہ میں مدت دراز سے چلا آتا ہے جس سے ہمارے اجداد فالیں نکالا کرتے تھے۔

دیوان سے جو فالیں نکالی گئی ہیں وہ بے حد دلچسپ ہیں اور جہانگیر نے تو ان واقعات کا تذکرہ اپنی تزک میں بھی کر دیا ہے۔ تحریریں جو اس دیوان کے حواشی پر پائی جاتی ہیں ان میں جہانگیر کی تحریر بڑی آسانی سے پہچان میں آجاتی ہے کیونکہ اس کی بہت سی تحریریں دوسری قلمی کتابوں پر بھی محفوظ مل جاتی ہیں۔ لیکن سب سے بڑی اہمیت اس تحریر کی ہے جسے مورخوں اور محققوں نے بہ وجوہ ہمایوں کی تحریر قرار دیا ہے۔ اب یہ وجوہ سنیے۔ یہ تحریر اس دیوان کے صفحہ ۱۳۶ پر ثبت ہے۔ اوپر پیشانی پر "ھوا" لکھا ہے جو گویا "بسم اللہ" کی جگہ استعمال ہوا ہے۔ اس کے بعد جو کچھ لکھا ہے اس کی ابتدائی سطروں کا ترجمہ یہ ہے کہ "قرآن شریف سے فال نکالی تو "تبٰرک" نکلا، جب دیوانِ حافظ دیکھا تو یہ شعر نکلا"

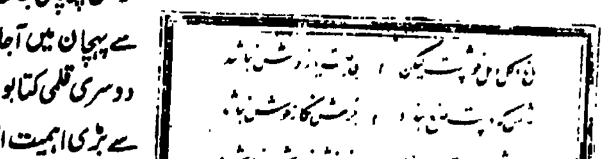

ستارۂ بدرخشید و ماہِ مجلس شد
دلِ رمیدۂ ما را انیس و مونس شد

(ترجمہ) ایک ستارہ چمکا، اور مجلس کا چاند بن گیا۔ ہمارے وحشی دل کے انیس و مونس ہوگیا۔

تحریر کے آخر میں تاریخ اور مقام اس طرح درج ہے "۱۸/ ذی الحجہ ۹۶۲ھ شہر دی پناہ"۔ اب چونکہ یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ ہمایوں ۹۶۲ھ مطابق ۱۵۵۵ء میں ہندوستان واپس آنے کے بعد یہاں کا حکمراں بن چکا تھا۔ اس کے ایک سال بعد ۹۶۳ھ میں اس کا انتقال ہوگیا، اور اس نے اپنے دار الحکومت کا نام دی پناہ رکھا تھا۔ ان دونوں سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ تحریر ہمایوں کی ہی ہے۔ لیکن بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی

ایک مضبوط تر دلیل اور ملتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس تحریر کے معاً نیچے جہانگیر کی ایک آٹھ سطری تحریر موجود ہے جس میں اس نے یہ لکھنے کے بعد کہ اسی غزل سے اس نے بھی فال نکالی، اپنے پورے دستخط نورالدین جہانگیر ابن اکبر بادشاہ لکھ کر فال نکالنے کا سال ۱۰۲۴ھ لکھا ہے۔ جہانگیر کی تحریر کی اس مقام پر موجودگی صاف بتاتی ہے کہ اس سے اوپر جو تحریر ہوگی وہ اس کے باپ دادا یا پردادا سے کم درجے کے شخص کی ہرگز نہیں ہوگی۔ سال تحریر اور شہر کے نام کا تذکرہ ہو چکا اس لیے اس طرح متعین ہو گیا کہ یہ ہمایوں کی تحریر ہے۔ اب اس دیوان سے کچھ دلچسپ فالیں پیش ہیں۔

راجا چتوڑ کے سلسلے میں ایک مہم پر اپنے بیٹے خرم (شاہ جہاں) کو بھیجتے وقت

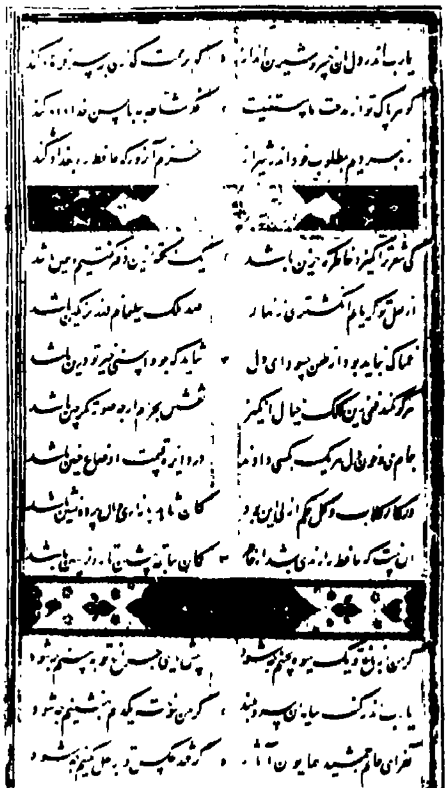

جہانگیر نے فال نکالی تو یہ شعر نکلا ؎

کنوں کہ در چمن آمد گل از عدم بوجود
بنفشہ در قدم او نہاد سر بسجود

(ترجمہ) اب جب کہ چمن میں پھول عدم سے وجود میں آیا۔ بنفشہ نے اس کے قدم پہ سجدہ میں سر دھرا۔

سر بسجود سے فال کا اشارہ صاف تھا کہ فتح ہوگی۔ ایک اور موقع پر کسی کو سفیر بنا کر بھیجنے کا ارادہ تھا۔ اس کے لیے جہانگیر نے فال نکالی تو یہ شعر سامنے آیا ؎

حافظ از بہر تو آمد سوئے اقلیم وجود
قدمے نہ بود اعش کہ رواں خواہد شد

(ترجمہ) حافظ تیری وجہ سے، وجود کی دنیا میں آیا ہے۔ اس کو رخصت کرنے کے لیے قدم اٹھا۔ وہ روانہ ہو جائے گا۔

اس شعر میں لفظ "وداع" سے گرین سگنل مل گیا اور شخص مذکور کو سفارت ملی۔

سب سے زیادہ دلچسپ ایک غزل ہے جو اس وقت فال میں نکلی جب جہانگیر اور اکبر کی کشمکش جاری تھی اور اکبر آگرہ میں تھا اور جہانگیر کے دشمن اس کو ملاقات سے باز رکھ رہے تھے۔ جہانگیر اس فال کے بموجب الٰہ آباد میں رجس کو الہاباس کہتا ہے، اس غزل سے فال نکالنے کے بعد باپ سے ملنے کے لیے روانہ ہو گیا اور غزل میں جو اشارے پائے جاتے تھے اس کے بموجب وہ بالآخر بادشاہ ہو گیا۔ غزل کے مطلع ثانی سے یہ فال شروع ہوتی ہے۔ جو اس طرح ہے ؎

غم غریبی و غربت چو بر نمی تابم
بشہر خود روم و شہریار خود باشم

(ترجمہ) جب بے وطنی اور مسافرت کے غم کی مجھے برداشت نہیں ہے۔ اپنے شہر جاؤں اور اپنا بادشاہ بنوں۔

اور اس غزل کا مطلع بھی آنے والی تقدیر کی طرف اشارہ کر رہا ہے ؎

چرا در پئے عزم دیارِ خود باشم
چرا نہ خاک کفِ پائے یارِ خود باشم

(ترجمہ) میں اپنے وطن کے ارادے کے درپے کیوں نہ ہوں۔ اپنے یار کے پیر کی خاک، کیوں نہ ہوں؟

ایک موقع پر جہانگیر کسی ملزم کو سزا دینا چاہتا تھا لیکن اس سے قبل اس نے حافظ شیرازی سے رائے لی۔ دیوان میں یہ شعر نکلا ؎

آنکہ پامال جفا کردہ چو خاک راہم
خاک می بوسم و عذر کرمش میخواہم

(ترجمہ) جس نے خاکِ راہ کی طرح، مجھے ظلم سے پامال کیا ہے۔ میں اس کی خاک بوسی کرتا ہوں اور اس کے کرم کا عذر چاہتا ہوں۔

اس شعر میں "عذر" کا لفظ جہانگیر کے لیے مکمل معذرت نامہ بن گیا اور اس نے لکھا ہے کہ حکیم ابوالفتح کے بیٹے فتح اللہ کے لیے یہ بیت خلاصی کا باعث بن گئی۔

اور آخر میں ایک دلچسپ تحریر کی طرف اشارہ کر کے اس مختصر مضمون کو ختم کرتا ہوں۔ یہ تحریر کس کی ہے یہ کہنا مشکل ہے لیکن ایسا لگتا ہے کہ یا تو خود ہمایوں نے لکھی ہے یا ہمایوں کے کہنے پر کسی دوسرے نے۔ اس میں دس لفظوں پر مشتمل فال کا نتیجہ درج کیا ہے۔ واقعات بالکل ہمایوں کے جیسے ہیں جو اس شعر میں نظم ہوئے ہیں۔ یعنی برادرانِ یوسف نے حضرت یوسف کے ساتھ جو کچھ کیا تھا وہ ہو بہو ہمایوں اور اس کے بھائیوں کا معاملہ تھا۔ پھر بالآخر جس طرح یوسف کنویں کی گہرائیوں سے نکل کر مصر کا حاکم بنا تھا اسی طرح ہمایوں ہندوستان کا حاکم بنا۔ یہ پوری داستان اس مختصر سے شعر میں سمٹ کر آگئی ہے جس کے آگے حاشیے پر مذکورہ بالا تحریر اس طرح ہے:-

(بقیہ صفحہ ۲۱ پر)

ویریندر پٹواری

وقت

گئی رات وجے نے کمرے میں جھانک کر دیکھا تو دیوار پر ایک لمبا سایہ اچھل رہا تھا اف!... دن ہو یا رات دادا یوں ہی کمرے میں ایک کولہو کے بیل کی طرح چکر لگاتا رہتا ہے۔ دادا کس مٹی کا بنا ہوا ہے۔ دادا کی نیند اُڑ گئی ہے یا وہ سونا نہیں چاہتا ہے۔ دادی اچھی تھی۔ مگر مر گئی بے چاری اور اس چغل خور کو پیچھے چھوڑ گئی۔ دادا میرے ڈیڈی کا ڈیڈی ہے۔ بوڑھے نے اگر مجھے آج پھر اس حالت میں دیکھ لیا تو توتے کی طرح ڈیڈی کو ستا دیں گے۔ اف! ۔او۔ ڈیڈی!؟ — ڈیڈی کا خیال آتے ہی وہ فرش پر یوں بیٹھ گیا جیسے زلزلہ آیا ہو۔ ایسا تو ہونا ہی تھا۔ وجے اپنے ڈیڈی کے قدموں کی آہٹ سے اتنا ہی واقف ہے جتنا انکے غصّے کے قہر سے۔ کمرے میں ڈیڈی کی ہی آواز گونج رہی تھی اور وہ یہ آواز یوں سنتا رہا جیسے ایک مجرم عدالت کا فیصلہ سن رہا ہو۔ آواز صاف صاف سنائی دے رہی تھی۔

• بابوجی! ۔ کئی بار کہہ چکا ہوں کہ آج کی سوسائٹی ایک ایسی کتاب نہیں جس کو حجابوں کے پیچھے چھپایا جائے۔ بلکہ یہ وہ تحریر ہے جو سرِ عام پڑھی جا سکتی ہے۔ یہ وہ آئینہ ہے جس میں ہم سب اپنا عکس دیکھ کر اپنا اپنا مقام ڈھونڈ سکتے ہیں یہ عکس خیالات کا عکس ہے یعنی رفلکشن آف تھاٹ Reflection of thought آپ کا خیال پرانا ہے۔ میرا خیال نیا ہے۔ بابوجی! ۔آپ کی داستان بھولی بسری یاد ہے جسے میں بھی دل سے لگائے رکھ سکتا ہوں۔ مگر فقط یادداشت کی خاطر۔ چلو پتھر کے انسان کی کہانی نہیں یاد رکھی آپ کی حکایتیں سن لیں۔ لیکن کب تک؟ رواج دستور۔ وقت کے ساتھ اپنا رنگ ڈھنگ بدلتے ہیں۔ ہاں۔ ہاں۔ ہاں بابوجی۔ آپ کا یقین کھوکھلا ہو چکا ہے۔ مگر اس میں میرا قصور نہیں۔ وقت کی نوک نے کریدا ہے اسے! ۔کون کہتا ہے شراب۔ شباب۔ جوا۔ پارٹیاں۔ محفلیں۔ شان شوکت۔ مغربی رسم و رواج کا اثر۔ ہمارے معاشرے کو گدھ کی طرح نوچ کر چھوڑ گئے ہے اور اب ہڈیوں کا ڈھانچہ۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ لیکن بابوجی ہمارا معاشرہ مرہی کب گیا جو اسے گدھ نوچ لیں۔ ہاں۔ ہاں۔ آپ کو ہر چیز مختلف نظر آ رہی ہے۔ آپ کا نظریہ جو مختلف ہے۔ بابوجی کل کی زندگی فرسودہ خیالات کے گھسے پٹے پہیوں پر رگڑ رگڑ کر چلتی تھی۔ ڈرتی ڈرتی۔ ڈگمگاتی ہوئی۔ لرزتی ہوئی۔ ہانپتی ہوئی۔ سسک سسک کر۔ سست رفتار پر۔ امنگوں و ارمانوں کو پیچھے ڈھکیل کر۔ بے بسی کو ہم سفر بنا کر۔ تبھی تو آپ کو ہماری ہر بات اُڑتی ہوئی نظر آ رہی ہے۔ تیزی سے بھاگتی ہوئی نظر آتی ہے۔ عجیب و غریب نظر آتی ہے بابوجی۔ 'کل' ہے نہیں وہ 'تھا'۔ اور 'آج' ہو گا نہیں۔ وہ ہے۔ اور آپ کے سامنے ہے۔ ایک دل کش بت کی طرح نہیں۔ بلکہ ایک نئے دور کی شکل میں۔ مشکل تو ہے کہ آپ آنکھیں کھول کر بھی سو رہے ہیں۔ وقت کروٹیں بدلتا رہتا ہے اور یہ آپ نہ دیکھ سکتے ہیں اور نہ ہی آواز سن سکتے ہیں۔ وجہ فقط آپ کی غلط سوچ ہے۔ سمندر کے کنارے بیٹھ کر جنم جنم سے وہی آتی جاتی پانی کی لہریں دیکھنا ہی اگر زندگی کا مقصد ہوتا تو ہم بار بار کیوں جنم لیتے۔ صدیوں کے ساتھ دور کیوں بدل جاتے۔ آپ کی سوچ جمود کا آغاز ہے۔ یعنی زندگی کی وہ منزل جہاں خواہشات کا دائرہ ایک نقطہ بن جاتا ہے۔ مطلب فل اسٹاپ یعنی کہانی ختم۔ بابوجی۔ سمندر میں کود کر پانی کی گہرائی کا اندازہ لگانا زندگی کا مقصد نہ ہوتا تو آپ کے بعد میں پیدا نہیں ہوتا اور میرے بعد میرا بیٹا پیدا نہیں ہوتا۔

جو آپ نے دیکھا ہے وہ ایک حد ہے۔ جو میں دیکھوں گا وہ دوسری حد ہے۔ اور جو وجے دیکھے گا وہ ایک نئی حد ہوگی۔ بابوجی۔ یہ فلسفہ نہیں ہے۔ نہ ہی اپنے اعمال کی وکالت ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے جسے میں نے قبول کیا ہے۔ آپ کو بھی قبول کرنا چاہیے۔ ورنہ۔ ورنہ۔ ہمارا کاروانِ زندگی بکھر کر ایک ہجوم بن جائے گا اور ہم اپنا وجود تلاش کرنے کے بجائے ایک دوسرے کو ڈھونڈتے رہیں گے۔

با۔بو۔ج۔جی! ۔اگر آپ اب بھی میری بات نہیں سمجھ لیتے تو یہ موٹی بات تو سمجھ لیجئے۔ کہ میں پنڈت دوارکا ناتھ یعنی آپ کا بیٹا ضرور ہوں۔ مگر کرشن لال بھی تو ہوں۔ ہاں۔ ہاں۔ میں منا۔ ۴۰ سال کا انسان ہوں جسے نہ انگلی پکڑ کر چلانے کی ضرورت ہے اور نہ ہی کان پکڑ کر سکھانے کی ضرورت ہے۔ جی ہاں پہلیاں سنا کر ڈرانے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ میں جو کچھ کر رہا ہوں۔ کر چکا ہوں۔ یا کروں گا وقت کے قدموں سے قدم ملا کر ہی کروں گا۔ مجھے اپنا راستہ صاف صاف نظر آ رہا ہے۔ دُور دُور تک۔ سمندر پار مغرب تک۔ آپ کا راستہ دھندلا ہے۔ یا پھر آپ کی نظر کمزور ہے۔ سوچ کمزور ہے جو بیمار بھی ہو سکتی ہے۔

وجے نے اپنے پھولتے ہوتے سانسوں پر قابو کر ہی لیا اور جب اسنے پھر جھانک کر کمرے میں دیکھا تو دیوار پر دو سائے اچھل رہے تھے۔ ہو بہو ایک جیسے۔ وہی ناک و نقشہ۔ لیکن جب دروازہ بند ہوا تو دیوار پر ایک ہی سایہ نظر آیا۔ ایک ہی جگہ کھڑا۔ بالکل ایک بے جان بت کی طرح۔ خاموش! واہ! ۔ واہ!! ۔ آج دادا کا بولنا بند ہو گیا۔ دادا گویا ملبے کے نیچے دب گیا۔ کھنڈر بن گیا۔ چغل خور کی چغلی اگر کوئی سنے ہی نہیں تو ڈر کس بات کا۔ ہا۔ ہا۔ خوشی مسرت کی حد کو

چھو گئی۔ ڈیڈی زندہ باد ڈیڈی کتنے آزاد خیال ثابت ہوئے ہیں۔ یہ سوچتے ہی اس کی ٹانگیں حرکت میں آگئیں۔ وہ ڈگمگاتے ہوئے۔ دیوار کے سہارے گرتے سنبھلتے اپنے کمرے کے دروازے تک تو پہنچ گیا مگر کسی چیز سے ٹکرا کر ایک گیند کی طرح دور جا گرا۔ وہ دروازے کے ساتھ نہیں بلکہ اپنے باپ کے سینے سے ٹکرا کر نیچے گر چکا تھا۔ کرشن لال اپنے بیٹے کو دیکھ کر آہستہ آہستہ یوں چلتا رہا جیسے ایک جلاد مجرم کے گلے میں پھندہ ڈالنے کے لیے پیش قدمی کر رہا ہو۔ وجے کا آدھا نشہ اتر گیا۔ تو کیا مسز کول نے ڈیڈی کو سب کچھ بتا دیا ہے۔ وہ لرزنے لگا۔

وجے کی حالت بری تھی۔ اپنی ہی الٹیوں سے اس کے سارے کپڑے گندے ہو چکے تھے۔ اور یہ بدنما داغ بار والوں کے علاوہ کرشن لال کے دوستوں نے بھی دیکھا تھا اور کرشن لال کی گرل فرینڈ مسز کول نے بھی۔ وجے کی پلکیں اب بھی نشے کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں تھیں۔ نشے اور ڈر کی وجہ سے اس کی زبان ایک ٹوٹے ریکارڈ کی طرح رک رک کر چل رہی تھی لیکن پھر بھی اس نے اپنے بچاؤ کے لیے کئی بہانے تراشے مگر اس کا ہر بہانہ غصّے کے شعلوں سے راکھ ہوتا گیا۔ اور آخر وجے مان گیا کہ وہ بھی روز شراب پیتا ہے۔ جوا بھی کھیلتا ہے۔ مسز کول کے گھر بھی جاتا ہے۔ اور کیبرے بھی دیکھتا ہے لیکن وہاں نہیں جہاں اس کا باپ دیکھتا ہے۔ اور — کرشن لال کے ہاتھ پاؤں یوں چلنے لگے جیسے کسی گھمسان کی جنگ میں گولیاں۔ بارود۔ بم۔ میزائلز چل رہے ہوں۔ وجے کی شراب نوشی کی اطلاع وجے کی ماں کرشن لال کو بہت پہلے دے چکی تھی مگر آج یہ سب دیکھ کر حیران تھی کہ ماجرا کیا ہے۔ بے بس ہو کر وہ روتی رہی۔ وجے کے بھائی بہن چیختے رہے اور دادا معنی خیز نظروں سے کرشن لال کو دیکھتا رہا۔ اچانک ایک دھماکہ ہوا۔ گویا کمرے میں بجلی گر گئی۔ وجے کی ماں چیخ پڑی۔ اور کرشن لال صوفے سے ٹکراتا ہوا فرش پر یوں گر گیا جیسے ریت کی دیوار۔ دوارکا ناتھ کے ہونٹ تھر کنے لگے اور وجے اپنی ناک سے بہتا ہوا خون الٹے ہاتھ سے صاف کرتے ہوئے ایک فلمی ویلن کی طرح بولنے لگا۔ پورے اعتماد کے ساتھ۔ اسی اعتماد کے ساتھ جو کرشن لال نے اس میں پیدا کیا تھا۔

"ڈیڈی! ۔ ڈیڈی میں سمجھ رہا تھا کہ آپ سمجھ دار ہیں۔ مگر آپ کی سمجھ ہی نا سمجھ ہے۔ بلکہ ایک چمکیلے خول کے اندر ایک زنگ آلودہ شئے ہے۔ وقت نے ایک اور کروٹ لی اور آپ نے آواز تک نہیں سنی۔ جو تھا اسے آپ داستان سمجھ رہے ہیں۔ جو ہے اسے ایک کہانی کی صورت میں قبول کر رہے ہیں اور جو ہونا ہے۔ یا ہو چکا ہے اسے آپ ایک حادثہ کہتے ہیں۔ ایک واقعہ ہیں۔ لمحات کی سوغات نہیں — ا۔ ڈیڈی آپ آج کی بات کر رہے ہیں۔ کل کی بات کیجیے۔ سنئے ڈیڈی میں شری کرشن لال کا بیٹا ضرور ہوں۔ لیکن وجے بھی تو ہوں۔ میری اپنی شخصیت ہے۔ انا ہے۔ آرزوئیں ہیں۔ امنگیں ہیں۔ اگر مسز کول آپ کی دوست اس لیے ہے کہ وہ آپ سے عمر میں چھوٹی ہے تو وہ میری دوست بھی ہو سکتی ہے۔ ہاں ڈیڈی اس لیے کہ وہ عمر میں مجھ سے بڑی ہے۔ مجھ سے زیادہ تجربہ کار۔ اور ڈیڈی میں ایک دودھ پیتا بچہ نہیں۔ ۱۸ سال کا نوجوان ہوں۔ میرا امریکن دوست مجھ سے دو سال چھوٹا ہے لیکن آپ سے زیادہ سمجھ دار ہے۔ کیوں ڈیڈی چونک گئے۔ میرا گھوڑا آپ کے گھوڑے کو مات کر گیا۔ ہا۔ ہا۔ گھوڑے کے یہ ڈھائی قدم ہی لمحے کی سوغات ہے۔ ڈیڈی میری رفتار بھی بہت تیز ہے اور مسز کول کو بھی سست رفتار والے گھوڑے پسند نہیں۔ اینی وے۔ Anyway
لٹ اس بی فری۔ فرینک اینڈ فیرلیس۔ Let's be frank and fearless
کم آن، ہیو اے سموک۔ Come on, have a smoke
ویسے ڈیڈی چوائس آپ کی بھی بُری نہیں۔ مسز کول واقعی گریٹ ہے۔ واہ!"

کرشن لال ہکا بکا رہ گیا۔ اس کے کانوں میں گھوڑے کے چلنے کی چاپ۔ موٹر کی آواز اور طیاروں کی گڑگڑاہٹ کی ملی جلی آواز کے ساتھ سائرن کی آواز سنائی دی اور وہ فرش سے اٹھتے ہوئے سامنے دیوار پر اپنا سایہ دیکھتا رہا جو بجلی بند ہوتے ہی غائب ہو گیا۔ ماں نے دروازہ بند کرنا چاہا مگر کرشن لال نے دروازہ کھلا رکھنے کا اشارہ کیا اور اپنے کمرے میں آہستہ آہستہ داخل ہوا۔ ایک شکست خوردہ سپاہی کی طرح۔ اور پنڈت دوارکا ناتھ دیوار پر آویزاں کلاک کی سوئیوں کو یوں دیکھتا رہا جیسے زنجیروں سے بندھا ہوا ایک قیدی اپنے سامنے رکھے ہوئے ٹائم بم کو دیکھ رہا ہو۔ اس کے کانوں میں قہقہوں اور سسکیوں کی ملی جلی آواز گونج رہی تھی۔ اس کے تھرتھراتے ہوئے ہونٹ اس کی آواز کو یوں روکنے کی کوشش کر رہے تھے جیسے ایک ٹوٹا و کمزور باندھ سیلاب کے پانی کو روکنے کی کوشش کر رہا ہو۔!

بقیہ منداکنی

منداکنی پل کے ادھر رک گئی۔ بھیرو بابو بھی ٹھٹک گئے۔ لیکن اسی پل موسم بدلنے لگا۔ آکاش بادلوں میں چھپ گیا۔ اس میں جھلملاتا ستاروں کا جھرمٹ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

اگلے ہی پل منداکنی نے دیکھا بھیرو بابو آنکھیں پھاڑے شوالک اور ساپخی کو موڑ کاٹتے دیکھنے لگے۔

وہ ہکلائے :

ہوا چل پڑی۔ سردی بڑھ گئی۔ ساپخی کا کوٹ ...!

انھوں نے بازو پر لٹکتا کوٹ کندھے پر ڈال لیا۔

کہیں ساپخی کو سردی نہ ...

سب کچھ بھول کر بھیرو بابو شوالک اور ساپخی کے پیچھے لپک چلے۔

صغیر ابراہیم

فکر و فن کی معراج "کفن"

پریم چند کا ہمارے افسانوی ادب میں ایک منفرد مقام ہے۔ اُن کے افسانوں کا محور دیہات ہے وہ شاید پہلے ہندوستانی ادیب ہیں اور ایک لحاظ سے آخری بھی کہ جن فضاؤں میں انھوں نے اپنے افسانوں کو جنم دیا پھر کسی دوسرے ادیب نے اِس جانب پوری توجہ نہ دی۔ ہر زمانے کے اپنے مسائل ہوتے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ انکی شکلیں بھی تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ پریم چند کے عہد کے دیہاتوں میں اور آج کے دیہاتوں میں نمایاں فرق آچکا ہے۔ مسائل اُس وقت بھی تھے اور آج بھی ہیں مگر آج اُن کی نوعیت اور تقاضے بدلے ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود جدید حالات میں بھی پریم چند کی تخلیقات کی اہمیت برقرار ہے۔ ہمارا افسانوی ادب جب کسی دوسرے پریم چند کی جستجو کرتا ہے تو پریم چند ہی اوّل اور آخر دکھائی دیتے ہیں جنھوں نے ایک افسانہ نگار و ادیب کی حیثیت سے، ایک مکمل ہندوستانی کے فرائض انجام دیے ہیں۔

پریم چند کے افسانوں میں 'کفن' ان کی آخری تخلیق ہے، اِس میں دیہاتی زندگی، قدیم روایات اور اُن سے پیدا شدہ حالات کو پیش کیا گیا ہے اور استعارے و کنایے کے سہارے قاری کے ذہن کو ماضی بعید کی طرف منتقل کیا گیا ہے۔

'کفن' کی کہانی بظاہر روزمرہ کے واقعات سے دور لیکن اُس کے حقائق سے بےحد قریب ہے۔ کہانی کا مرکزی خیال وہ استحصال ہے جو برسوں طبقہ وارانہ تقسیم اور جاگیردارانہ نظام میں کمزور طبقے کے ساتھ روا رکھا گیا اور جس کے نتیجے میں کمزور طبقہ عام بےحسی کا شکار ہوا۔ ظلم و جبر، اقتصادی اور تہذیبی استحصال کے نتیجے میں ایسے لوگ وجود میں آئے جن کے افعال و اعمال سے گھِن محسوس ہونے لگے۔ جن کی ظاہری شکل و صورت، عادات و اطوار قابلِ نفرین معلوم ہوتے۔ حالات کے شکار، یہ مجبور لوگ غلاموں کی سی زندگی بسر کرتے اور اچھوت یا شودر کہلاتے، جن کے سایے سے بھی لوگ پرہیز کرتے۔ وہ نہ تو مقدس کتابوں کو چھو سکتے اور نہ مندروں میں جا سکتے۔ مادّی اور معاشی ترقی کے تمام راستے اُن کے لیے مسدود کر دیے گئے۔ دو وقت کی روٹی بھی صحیح معنوں میں ان کو نہ ملتی۔ گھر کے سارے افراد محنت کرتے اس کے باوجود اگر پیٹ بھر گیا تو تن ڈھانکنے کے لیے کپڑا نہ ہوتا۔ کپڑا میسر ہوا تو پیٹ خالی رہتا۔ ان کی اپنی کوئی زمین نہ ہوتی اور نہ کوئی کھیت ہوتا۔ سال بھر بیگار کرتے فصل پر اتنا دیا جاتا کہ مشکل سے پیٹ بھر سکے۔ دعوتوں میں بچا جھوٹن اُن کو کھانے کے لیے دیا جاتا۔ سالہا سال جانوروں کی طرح اُن کے ساتھ سلوک روا رکھا گیا۔ انھیں اتنا کچلا گیا کہ اُن میں زندہ رہنے کی جدوجہد کا جذبہ ہی ختم ہو گیا۔ اس طبقے کا یہ احساس کہ محنت کا صلہ ملتا نہیں تو پھر وہ محنت کس لیے اور کس کے لیے کریں، عجب بےبسی میں مبتلا کرنے والا تھا۔ اس پس منظر میں وہ طبقہ نفسیاتی گتھیوں کا شکار ہوتا گیا جس کے نتیجے میں نسلاً بعد نسل شودروں کا ایک ایسا طبقہ اُبھر کر سامنے آیا جن کے نمائندہ افراد کو پریم چند نے اپنے 'کفن' میں مرکزی کرداروں کی جگہ دی ہے۔

'کفن' کا واقعاتی ڈھانچہ دو مردوں اور ایک عورت پر مشتمل ہے۔ مردوں میں ایک باپ اور دوسرا بیٹا ہے۔ تیسرا مختصر کردار بہو کا ہے۔ باپ کا نام گھیسو بیٹے کا نام مادھو اور بہو کا نام بُدھیا ہے۔ یہ لوگ ذات کے چمار ہیں۔ ان کی زندگی افلاس اور غربت سے پُر ہے۔ باپ بیٹے دونوں کاہل اور کام چور ہیں۔ دونوں اپنا پیٹ بھرنے کے لیے آلو، مٹر یا گنے وغیرہ چُرا لاتے یا پھر کسی درخت سے لکڑی کاٹ کر اُسے بیچتے اور اُس سے اپنا کام چلاتے ہیں۔ قرض مانگنے میں بھی اُنھیں شرم محسوس نہ ہوتی۔ محنت مزدوری سے ہمیشہ کتراتے ہیں۔ گاؤں کے سبھی لوگ اُن کی عادات سے واقف ہو چکے ہیں اور اُن سے نفرت کرتے ہیں۔ بہو کے گھر میں آ جانے کے بعد تو یہ لوگ اور بھی حرام خور ہو جاتے ہیں۔ بُدھیا ان دونوں سے مختلف ہے۔ وہ محنتی، جفاکش اور مخلص ہے۔ ایک سال تک برابر محنت مزدوری کر کے کسی نہ کسی طرح ان دونوں کا پیٹ بھرنے کا انتظام کرتی ہے۔ پسائی کرتی ہے۔ گھاس چھیلتی ہے۔ ہر جتن ان کے پیٹ بھرنے کا کرتی ہے لیکن جب وہ دردِ زہ سے کراہتی ہے تو ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا بلکہ اس کی دلخراش چیخوں سے بےپروا، الاؤ کے نزدیک بیٹھے، پیٹ بھر کر آلو کھاتے اور چین سے سو جاتے ہیں۔ اس کے مرنے کے بعد 'کفن' کے لیے چندے کے پانچ روپے جمع کرتے ہیں لیکن 'کفن' خریدنے کے بجائے شراب پیتے، لذیذ کھانوں سے اپنا پیٹ بھر اور بدمست ہو کر ناچنے لگتے ہیں۔

کہانی کا ابتدائی مطالعہ ہمیں خوف اور دہشت میں مبتلا کر دیتا ہے۔ انسانیت و شرافت دم توڑتی نظر آتی ہے محبت و مروّت کا کہیں پتا نہیں چلتا۔ باپ اور بیٹے پیٹ بھرنے کی فکر میں نظر آتے ہیں جب کہ بہو دم توڑ رہی ہوتی ہے۔ اس پس منظر میں ہمیں گھیسو اور مادھو سے نفرت محسوس ہوتی ہے۔ وہ لوگ بُدھیا کی تکلیف کو دور کرنے کا کوئی جتن نہیں کرتے اس لیے کہ وہ فطری طور پر کاہل، حرام خور اور بد اطوار ہیں۔ ان کی کاہلی اور حرام خوری اس سے ظاہر ہے :-

> گھیسو ایک دن کام کرتا تو تین دن آرام۔ مادھو اتنا کام چور تھا کہ گھنٹہ بھر کام کرتا تو گھنٹہ بھر چلم پیتا ...... گھر میں مٹھی بھر اناج ہو تو اُن کیلیے

کام کرنے کی قسم تھی۔"

ن کی آرام طلبی اور بے حسی اُس وقت عروج پر پہنچتی ہے جب بُدھیا مادھو کی بیوی ن کر اُن کے گھر آجاتی ہے۔ وہ دن رات محنت کرتی، ان کا پیٹ پالتی۔ دونوں باپ بیٹے بیٹھے کی روٹی کھاتے اور اکڑ دکھاتے۔ سبھی سے ان کا رویہ رعونت آمیز رہتا:۔

"جب سے وہ آئی یہ دونوں اور بھی آرام طلب اور آلسی ہوگئے تھے بلکہ کچھ اکڑنے بھی لگے تھے کوئی کام کرنے کو بلاتا تو بے نیازی کی شان سے دوگنی مزدوری مانگتے۔"

ن برائیوں کے علاوہ ان میں انسانی ہمدردی کے جذبے کا فقدان بھی نظر آتا ہے۔ بُدھیا یسی قریب ترین عزیز کے دکھ درد سے بھی وہ متاثر نہیں ہوتے اور نہ اس کی اذیت ناک کلیف میں اندر جاکر دیکھنے کی زحمت گوارا کرتے۔ دونوں کو دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہیں ں کی غیر موجودگی میں دوسرا سارے آلو چٹ نہ کر جائے۔

لیکن یہ ابتدائی تاثر دیر تک قائم نہیں رہ پاتا۔ سُسر اور شوہر دونوں کو اس ت کا احساس ہے کہ بُدھیا تکلیف میں مبتلا ہے پر اپنی تہی دستی اور مسلسل فاقہ کشی کی جہ سے یہ احساس ان پر غالب نہیں ہو پاتا۔ یہ بھوک کا ہی تو اثر تھا کہ جلتے ہوئے آلو حلق ں اندیلتے چلے گئے کیوں کہ "کل سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اتنا صبر نہ تھا کہ انھیں ٹھنڈا ونے دیں۔" ایک طرف بھوک کی شدت دوسری طرف کربناک چیخیں۔ عارضی طور پر بھوک مانے کا سامان موجود تھا لیکن بدھیا کو تکلیف سے نجات دلانے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ نھیں اُس کی تکلیف کا احساس ضرور ہے۔ گھیسو کہتا ہے "معلوم ہوتا ہے بچے گی نہیں۔ سارا دن تڑپتے ہو گیا۔" ان سیدھے اور سپاٹ الفاظ میں کتنی زبردست ذہنی اذیت ر قلبی تکلیف کا احساس پوشیدہ ہے۔ مادھو بُدھیا کی حالت پر دردناک لہجے میں کہتا ہے "مرنا ہے تو جلدی مر کیوں نہیں جاتی۔" کتنا تکلیف دہ اور مایوس کُن احساس ہے س کے ایک لفظ سے انتہائی بے کسی اور بے چارگی کا علم ہوتا ہے۔ بُدھیا کا ڑپنا اُس سے برداشت نہیں ہوتا اور مجبور ہو کر وہ کہتا ہے کہ اس سے تو بہتر ہے کہ اُسے وت آجائے تاکہ جان لیوا تکلیف سے اُسے نجات مل سکے۔ مادھو اس بات کو بھی جانتا ہے کہ اس تنگدستی اور مفلسی میں کفِ افسوس تو مَلنا ممکن ہے۔ مگر دوا دارو کا بندوبست ن نہیں۔ حالات سے فکرمند ہو کر وہ باپ سے کہتا ہے "میں سوچتا ہوں کوئی بال بچہ وگیا تو کیا ہوگا۔ سونٹھ، گڑ، تیل کچھ بھی تو نہیں ہے گھر میں ۔ ۔ ۔ یہاں تو ادھا بھی یک روپیہ مانگتا ہے کس کے گھر سے آئے؟" آخر میں بُدھیا کی موت پر اپنے خیالات کا ظہار وہ روتے ہوئے اس طرح کرتا ہے "بچاری نے جندگی میں بڑا دکھ بھوگا۔ مری بھی کتنا دکھ جھیل کر۔" اس ایک جملے میں کتنی بیچارگی، اپنائیت اور مجبوری کا احساس م توڑتا ہوا دکھائی دیتا ہے جو مادھو کے قلبی کرب کا پتا دیتا ہے۔

گھیسو سماج کی ظاہرداری اور اس کے رکھ رکھاؤ سے بخوبی واقف ہے۔ جب مادھو بُدھیا کے بارے میں فکرمند ہوتا ہے تو وہ اپنے تجربات کی بنا پر اس دسمجھاتے ہوئے کہتا ہے "سب کچھ آجائے گا۔ بھگوان کچھ دیں تو۔ جو لوگ ابھی ایک یسہ نہیں دے رہے ہیں وہی تب بلا کر دیں گے۔ میرے نو لڑکے ہوئے، گھر میں کبھی کچھ تھا مگر اسی طرح ہر بار کام چل گیا۔" اُس نے زمانے کی اونچ نیچ دیکھی تھی۔ انسانوں کی فطرت سے آگاہ تھا اور سماج کی ظاہرداری اور اس کے کھوکھلے پن کو جانتا تھا۔ شراب خانے میں بڑے فلسفیانہ انداز میں وہ اس کی نقاب کشائی کرتا ہے: "تو کیسے جانتا ہے اُسے کپھن نہ ملے گا۔ تو مجھے ایسا گدھا سمجھتا ہے۔ میں ساٹھ سال دنیا میں کیا گھاس کھودتا رہا ہوں۔ اُس کو کپھن ملے گا اور اس سے بہت اچھا ملے گا جو ہم دیتے ۔ ۔ ۔ وہی لوگ دیں گے جنھوں نے اب کی دیا۔ ہاں وہ روپے ہمارے ہاتھ نہ آئیں گے اور اگر کسی طرح آجائیں تو پھر ہم اسی طرح یہاں بیٹھے پئیں گے اور کپھن تیسری بار ملے گا۔"

'کفن' میں پریم چند نے سماج کے عقائد، توہمات اور رسم و رواج پر بڑے معنی خیز انداز میں کاری ضرب لگائی ہے اور گھیسو و مادھو کے ذریعے اس پورے معاشرے کا مضحکہ اڑایا ہے جو اس طرح کے لوگوں کو پیدا کرنے کا ذمہ دار ہے۔ بُدھیا کے مرنے پر گھیسو کہتا ہے: "کیسا بُرا رواج ہے کہ جسے جیتے جی تن ڈھانکنے کو چیتھڑا بھی نہ ملے اُسے مرنے پر نیا کپھن چاہیے ۔ ۔ ۔ یہی پانچ روپے ملتے تو کچھ دوا دارو کرتے ۔ ۔ ۔ کپھن لگانے سے کیا ملتا۔ آخر جل ہی تو جاتا۔ کچھ بہو کے ساتھ تو نہ جاتا۔" گھیسو اور مادھو کے یہاں فرائض و حقوق دم توڑتے نظر آتے ہیں لیکن اس کا احساس ختم نہیں ہوا ہے۔ وہ مجسم بے حس نہیں بن سکے ہیں۔ اُن کے ضمیر زندہ ہیں۔ نشے کی حالت میں گھیسو کہتا ہے "ہماری آتما پرسن ہو رہی ہے تو کیا اُسے پُن نہ ہوگا؟" وہ مادھو کو صبر و رضا کی تلقین کرتے ہوئے کہتا ہے "کیوں روتا ہے بیٹا۔ کھُس ہو کہ وہ مایا جال سے مکت ہو گئی۔ جنجال سے چھوٹ گئی۔ بڑی بھاگوان تھی جو اتنی جلدی مایا موہ کے بندھن توڑ دیے۔" مادھو بڑے معصومانہ انداز میں اپنے باپ سے پوچھتا ہے "بیکنٹھ میں جائے گی بیکنٹھ کی رانی بنے گی؟" گھیسو فخر و غرور کے ساتھ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے، مستحکم انداز میں جواب دیتا ہے "ہاں وہ بیکنٹھ میں جائے گی۔ کسی کو ستایا نہیں، کسی کو دبایا نہیں، مرتے وقت ہماری زندگی کی سب سے بڑی لالسا پوری کر گئی۔ وہ بے کنٹھ میں نہ جائے گی تو کیا موٹے موٹے لوگ جائیں گے جو گریبوں کو دونوں ہاتھوں سے لوٹتے ہیں اور اپنے پاپ کو دھونے کے لیے گنگا میں نہاتے ہیں اور مندر میں جل چڑھاتے ہیں۔"

گھیسو اور مادھو کے کردار، پریم چند کی بے پناہ قوتِ مشاہدہ کا نتیجہ ہیں۔ دونوں کرداروں کا وجود مسلسل ناکامی، حقارت، توہین اور تضحیک کا پتہ دیتا ہے۔ یہ دونوں اُس کچلے ہوئے پسماندہ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جو بیزاری، جذباتی بغاوت اور منفی ردِ عمل کے طور پر وجود میں آیا ہے۔ پریم چند نے رمز و کنایہ میں اُس پورے معاشرے پر طنز کیا ہے جو اس طبقہ کی پیداوار کا ذمہ دار ہے اور بظاہر گھیسو و مادھو کی دلجوئی کرتا ہے۔ ان کی تکلیف میں شریک ہوتا ہے۔ ان پر رحم دکھاتا اور اُس کے اظہار کے لیے مالی امداد کرتا ہے۔ یہ رحم کبھی مذہبی اجارہ داری برقرار رکھنے کے لیے، کبھی ظاہری شان و شوکت دکھانے کے لیے اور کبھی سماجی و اخلاقی قدروں کے پیشِ نظر کیا جاتا ہے۔ گو کہ یہی لوگ اس زنجیر کی کڑی ہوتے ہیں جس کے شکنجے میں جکڑ کر اس طبقے کا استحصال کیا گیا ہے۔ زمیندار تو اُن کا اعلیٰ ترین نمائندہ ہوتا ہے مگر وہ بھی دونوں باپ بیٹے کی امداد کے لیے مجبور ہے کیوں کہ اس کو سماج کے اندر اپنی برتری برقرار رکھنی ہے: "زمیندار صاحب رحم دل آدمی تھے مگر گھیسو پر رحم کرنا کالے کمبل پر رنگ چڑھانا تھا۔ جی میں تو آیا کہہ دیں، چل دور ہو یہاں سے لاش گھر میں رکھ کر سڑا، یوں تو بلانے سے بھی نہیں آتا۔ آج جب غرض پڑی تو آکر

خوشامد کر رہا ہے۔ حرام خور کہیں کا بدمعاش، مگر یہ غصّہ یا انتقام کا موقع نہیں تھا۔ طوعاً وکرہاً دو روپے نکال کر پھینک دے مگر تشفّی کا ایک کلمہ بھی منہ سے نہ نکالا۔ اس کی طرف تاکا تک نہیں، گویا سر کا بوجھ اُتارا ہو۔"

کہانی میں تحیر و تجسس، خوف دہشت، رقت اور اسرار کے تمام عناصر شامل ہیں۔ پڑھنے والے کی پوری توجہ آئندہ آنے والے واقعات پر مرکوز ہو جاتی ہے اور وہ انجام جاننے کے لیے بیتاب نظر آتا ہے۔ کہانی کا آغاز بہت مختصر لفظوں سے ہوا ہے ـــ "جھونپڑے کے دروازے پر باپ اور بیٹا دونوں ایک بجھے ہوئے الاؤ کے سامنے خاموش بیٹھے ہوتے تھے اور اندر بیٹے کی جوان بیوی بُدھیا دردِ زہ سے پچھاڑیں کھا رہی تھی۔ اور رہ رہ کر اُس کے منہ سے ایسی دل خراش صدا نکلتی تھی کہ دونوں کلیجہ تھام لیتے تھے۔ جاڑوں کی رات تھی، فضا سناٹے میں غرق، سارا گاؤں تاریکی میں جذب ہو گیا تھا۔" کہانی میں کشمکش کا آغاز ابتدائی سطروں سے ہو جاتا ہے جو لمحہ بہ لمحہ بڑھتا رہتا ہے اور جب رات ختم ہونے کے بعد بدھیا مری ہوئی پائی جاتی ہے تو اس کی بے کس موت دیکھ کر دہشت محسوس ہونے لگتی ہے۔ "صبح کو مادھو نے کوٹھری میں جاکر دیکھا تو اُس کی بیوی ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ اس کے منہ پر مکھیاں بھنک رہی تھیں، پتھرائی ہوئی آنکھیں اوپر ٹنگی ہوئی تھیں۔ سارا جسم خاک میں لت پت ہو رہا تھا۔ اس کے پیٹ میں بچہ مر گیا تھا۔" کہانی کا تناؤ اور کلائمکس اُس وقت اپنے انتہائی عروج پر پہنچتا ہے جب بدھیا کے مرنے کے بعد دونوں چندے کے پانچ روپے لے کر کفن خریدنے نکلتے ہیں اور کفن خریدنے کے بجائے شراب خانے کا رخ کرتے ہیں۔ وہاں مستی کی حالت میں سماجی قانونوں اور مذہبی واخلاقی اصولوں کا مضحکہ اُڑاتے ہیں۔ اُس کے کھوکھلے پن پر طنز کرتے ہیں۔ اس کی منافقت اور مصلحت پسندی کو بے نقاب کرتے ہیں۔

'کفن' پریم چند کی بڑی کامیاب فنی تخلیق ہے۔ اِس میں ان کی قوتِ مشاہدہ، زبان پر قدرت، الفاظ پر قابو اور فنی صلاحیتیں معراجِ کمال پر پہنچی ہوتی ہیں۔ کہانی کا اندازِ بیان ایسا ہے جیسے سارے واقعات از اوّل تا آخر حقیقی طور پر ڈرامائی انداز میں بہ تدریج رونما ہو رہے ہوں کہانی کے تمام ضروری اجزاء انتہائی سلیقہ سے گھتے ہوتے ہیں۔ زندگی کی کشمکش اور مسائل ابتدا ہی سے سامنے آجاتے ہیں اور اُن کا تذکرہ رفتہ رفتہ اس طرح آگے بڑھتا ہے کہ پڑھنے والے کی دلچسپی اور تجسس قائم رہتا ہے۔ افسانہ اپنے اختتام پر اپنا بھرپور اور مکمل تاثر چھوڑ جاتا ہے۔ یہ تاثر دماغ میں چنگاریاں سی پیدا کر دیتا ہے۔ تاریخ کی تاریک ترین حقیقت پر غور کرنے کے لیے مجبور کرتا ہے کہ کس طرح سماجی شکنجے میں ایک طبقے کو دبایا، کچلا اور پیسا گیا کہ ان کی ساری شخصیت ہی ٹوٹ پھوٹ کر گر گئی اور وہ سماج کے لیے ایک مسئلہ بن گئے۔ اس طویل، لرزہ خیز داستان کو پریم چند نے بڑے تمثیلی انداز سے چند سطروں میں قلم بند کر دیا ہے۔ پریم چند کا اپنا ایک اندازِ بیان ہے اُن کا اپنا لب ولہجہ جس کی خاص خوبی یہ ہے کہ وہ جس کردار کو بیان کرتے ہیں اس کی اپنی زبان اپنا لیتے ہیں اور یہ کہیں محسوس نہیں ہونے دیتے کہ انھوں نے اس ماحول سے ہٹ کر اپنے خیالات وتاثرات کہانی میں داخل کر دیے ہیں۔ 'کفن' اسکی بہترین مثال ہے اس کے کردار گھیسو اور مادھو کے لیے پریم چند نے جو لہجہ اختیار کیا وہ من وعن حقیقی معلوم ہوتا ہے یہ بات بآسانی کہی جاسکتی ہے کہ پریم چند کا یہ افسانہ فن کے اعلیٰ معیار پر ہر طرح سے پورا اترتا ہے۔

غزلیں

شان فخری

میں سوچتا ہی رہا اور عمر گھٹتی رہی
کتابِ زیست کے دنیا ورق الٹتی رہی

طلوعِ شب کا وہ منظر ہے یاد اب بھی مجھے
اندھیر بڑھتا رہا روشنی سمٹتی رہی

مفر ملا نہ کہیں مجھ کو یادِ ماضی سے
وہ ناگ بن کے مرے جسم سے لپٹتی رہی

بساطِ زیست پہ بازی نہ جیت پائے کبھی
ہر ایک چال ہماری طرف پلٹتی رہی

میں کائنات کی تسخیر کو اٹھا تھا مگر!
حصارِ ذات میں دنیا مری سمٹتی رہی

تصورات کی وادی میں ہو گیا محصور!
تخیلات کے زنداں میں عمر کٹتی رہی

حیات کرب کی سولی پہ چڑھ گئی فخری
اپاہجوں کی طرح زندگی گھسٹتی رہی

شبیر آصف

جتنے پیڑوں کے ٹھنڈے سائے ہیں
سب ہی دھوپوں کی زد میں آئے ہیں

کون سی راہ اختیار کریں
راستے سب بنے بنائے ہیں

بات کوئی کسی کی کیا سُنتا
سارے قصّے سنے سنائے ہیں

کیا ملا ڈوب کر بھی دریا میں
صرف پتھر ہی ہاتھ آئے ہیں

چیخ بھی گھُٹ کے رہ گئی آصف
شب کے کیسے مہیب سائے ہیں

علامہ اقبال کی مختصر کتابیات ہندوستان میں

محمد اقبال

۱	تنقید اقبال	ڈاکٹر عبد الحق	مسعود احمد - جونپور		
۲	سفرنامہ اقبال	حق نواز	اقبال مسعود پبلیکشنز نئی دہلی		۱۹۷۷
۳	سیرتِ اقبال	مولوی محمد طاہر فاروقی	اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی		۱۹۷۴
۴	اقبالِ کامل	مولانا عبد السلام ندوی	اعظم گڈھ یوپی		۱۹۶۴
۵	اقبال کی کہانی	ظہیر الدین احمد جامعی	اعجاز پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی		۱۹۴۸
۶	بکھرے خیالات اقبال کی ڈائری	ڈاکٹر عبد الحق	بزم احباب۔ دہلی		۱۹۷۵
۷	روحِ اقبال اسلام کی نظر میں	ڈاکٹر غلام عمر خاں	نیشنل بک ڈپو۔ حیدرآباد۔ طبع سوم		۱۹۷۳
۸	اقبال کا تصور زماں و مکاں	رضی الدین صدیقی	ادارہ اشاعت اردو۔ حیدرآباد		۱۹۴۳
۹	اقبال اور مغربی مفکرین	جگن ناتھ آزاد	مکتبہ جامعہ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی		۱۹۷۵
۱۰	اقبال اپنے آئینے میں	رئیس احمد جعفری	چمن بک ڈپو اردو بازار۔ دہلی		۱۹۷۸
۱۱	اقبال ایک تجزیاتی مطالعہ	سید معراج نیّر	اقبال صدی پبلیکشنز نئی دہلی		۱۹۷۷
۱۲	اقبال کی روشنی کے جمالیات	ڈاکٹر شکیل الرحمن	پنجابی پستک بھنڈار دریبہ کلاں		۱۹۷۷
۱۳	اقبال شاعر اور فلسفی	سید وقار عظیم	ایجوکیشنل بک ہاؤس۔ علی گڈھ		۱۹۷۵
۱۴	اقبال شخصیت اور شاعری	مرحوم رشید احمد صدیقی	اقبال صدی پبلیکشنز نئی دہلی		۱۹۷۷
۱۵	پیامِ اقبال	شیخ عبد الرحمن طارق بی۔اے	چمن بک ڈپو دہلی		
۱۶	یادِ اقبال	ڈاکٹر خواجہ عبد الحمید ایم۔اے	اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی		۱۹۷۴
۱۷	تعلیماتِ اقبال	یوسف سلیم چشتی	〃 〃 〃 〃		۱۹۷۴
۱۸	اقبال اور گوئٹے	وزیر زادہ محمد اشرف خاں	ادبی دنیا۔ دہلی		
۱۹	اصلاحاتِ اقبال	شبیر الحق عظیم آبادی	مکتبہ دین و دانش پٹنہ		۱۹۵۰
۲۰	اقبال کی کہانی	جگن ناتھ آزاد	ترقی اردو بورڈ۔ نئی دہلی		۱۹۷۶
۲۱	اقبال اور کشمیر	〃 〃 〃	علی محمد اینڈ سنس۔ سری نگر، کشمیر		۱۹۷۷
۲۲	اقبال اور جمالیات	نصیر احمد ناصر	اعتقاد پبلشنگ ہاؤس۔ دہلی	اپریل	۱۹۷۸
۲۳	اقبال اور عشقِ رسول	سید محمد عبد الرشید	〃 〃 〃 〃 〃		۱۹۷۸
۲۴	اقبال اور عبد الحق	ممتاز حسن	〃 〃 〃 〃 〃		۱۹۷۸
۲۵	نقوشِ اقبال	مولانا ابو الحسن علی ندوی	مجلسِ تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ		۱۹۷۰
۲۶	اقبال کا تصورِ عشق	ڈاکٹر غلام خاں	ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد		۱۹۶۴
۲۷	رمزِ اقبال	ڈاکٹر سید عبد اللہ	ہمالیہ بک ہاؤس۔ دہلی		۱۹۷۱

۲۸	اقبال اور دلی	عبدالقوی دسنوی	لبسن آواز جامعہ نگر، دہلی	جون ۱۹۷۸
۲۹	فکرِ اقبال	ڈاکٹر عالم خوندمیری	کل ہند اقبال تقاریب صدی۔ حیدرآباد	۱۹۷۷
۳۰	اقبال شناسی	علی سردار جعفری	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ دہلی	۱۹۷۷
۳۱	اقبال کی تلاش	ظ۔ انصاری	کالینا۔ بمبئی ۹۸	۱۹۷۷
۳۲	حافظ اور اقبال	یوسف حسین خاں	غالب اکیڈمی دہلی	۱۹۷۶
۳۳	روحِ اقبال	〃 〃 〃	〃 〃 〃	۱۹۷۶
۳۴	ذکرِ اقبال	عبدالمجید سالک	چمن بک ڈپو۔ دہلی	
۳۵	فکرِ اقبال	خلیفہ عبدالحکیم	ایجوکیشنل بک ہاؤس۔ علی گڑھ	۱۹۷۷
۳۶	"معاملاتِ مکاتیب علامہ اقبال"	سید اختر السلام	اعتقاد پبلشنگ ہاؤس۔ دہلی	۱۹۷۷
۳۷	"اقبال انیسویں صدی میں"	عبدالقوی دسنوی	نسیم بک ڈپو۔ لکھنؤ	۱۹۷۷
۳۸	اقبال کی ترجمانی	محمد جاوید اقبال	مرکزی مکتبہ اسلامی۔ دہلی ۶	اپریل ۱۹۷۸
۱	اقبالیات	مولا مودودی	مرکزی مکتبہ اسلامی۔ دہلی ۶	۱۹۱۹
۲	آثارِ اقبال	غلام دستگیر رشید ایم۔ اے	ادارہ اشاعت اردو۔ حیدرآباد	۱۹۴۴
۳	شاعر (ماہنامہ) اقبال نمبر			۱۹۷۹
۴	"ہما اردو ڈائجسٹ۔ اقبال نمبر"		نئی دہلی	اکتوبر ۱۹۷۶
۵	آج کل (اردو) اقبال نمبر		نئی دہلی	نومبر ۱۹۷۷

کیا آپ کی روزانہ کی خوراک سے آپ کے بدن کو
پوری قوت اور پورا فائدہ ملتا ہے؟

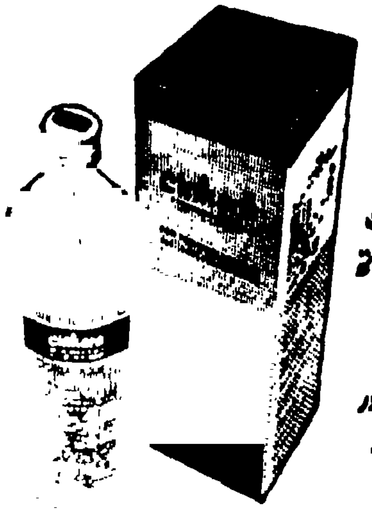

ہمدرد
سنکارا
ہر موسم اور ہر عمر میں
سب کے لیے بے مثال ٹانک

اپنی روزمرہ خوراک سے صحیح تغذیہ حاصل کرنا اس بات پر منحصر ہے کہ آپ کا نظام ہضم کتنا ٹھیک اور طاقتور ہے۔
سنکارا ہی ایک ایسا ٹانک ہے جس میں طاقت دینے والے ضروری وٹامنوں اور معدنی اجزا کے ساتھ چھوٹی الائچی، لونگ، دھنیا، دارچینی، تیزپات، تلسی وغیرہ جیسی چودہ جڑی بوٹیاں شامل ہیں۔
اس مرکب سے آپ کے نظام ہضم کو طاقت ملتی ہے اور آپ کا بدن اس کی مدد سے آپ کی روزمرہ خوراک سے صحیح تغذیہ اور بھرپور قوت حاصل کرتا ہے۔

نئی کتابیں

خاک انا

شاعر : راشد آذر
ناشر : نرشاد کتاب گھر، ۲۷/۳، اعظم پورہ، حیدر آباد
صفحات : ۱۰۴
قیمت : دس روپے

راشد آذر نے اپنے ایک مضمون "ایک شاعر، ایک نقطۂ نظر" (مطبوعہ، عصری ادب، شمارہ ۱۵-۱۶-۱۷، ۷۴ء) میں لکھا تھا:

"میرا نقطۂ نظر مارکسی ہے ... مارکسی فلسفہ میرے لیے اتنی ہی اہمیت رکھتا ہے جتنا کہ میرے لیے سانس لینا اہمیت رکھتا ہے۔ زندہ رہنے کے لیے ان دونوں باتوں کی ضرورت ہے۔ جس طرح سانس لیتے وقت میں ہر لمحہ تازہ ہوا کو قبول کرتا اور آلودہ ہوا کو رد کرتا ہوں، اسی طرح مارکسی فلسفہ بھی مجھے یہ سکھاتا ہے کہ نئی حقیقت سے تازہ نتائج اخذ کروں اور پرانے نتائج ترک کردوں۔"

راشد آذر اس دور کے ان خوش فکر شاعروں میں ہیں جنھوں نے اب تک مارکسی نقطۂ نظر اور ترقی پسندی سے اپنا رشتہ استوار رکھا ہے۔ ان کے نئے مجموعہ کلام "خاک انا" میں ایک شعر ہے:

یہ ہے مقام مرے غم کی آزمائش کا
جو میرے واسطے گھر بھی ہے اور دار بھی ہے

شاید اس شعر سے بھی ان کے ترقی پسندانہ طرز فکر کی شہادت مل سکے، لیکن عام طور پر ان کے زیر نظر مجموعے میں ایسی ہی نظمیں اور غزلیں شامل ہیں جو محض ان کے ذاتی اور نجی احساسات وجذبات کی آئینہ داری کرتی ہیں۔ ان میں کسی مخصوص نظریے کی تلاش تحصیل حاصل ہوگی۔ لب ولہجہ کے اعتبار سے یہ نظمیں اور غزلیں اس مزاج کی نشان دہی کرتی ہیں، جو ترقی پسندی کے زوال کے بعد اور جدیدیت کے فروغ سے پہلے ہماری شاعری پر حاوی تھا۔

"خاک انا" ۶۵ء، ۶۶ء اور ۶۸ء کے درمیان لکھی ہوئی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے۔ ایک نظم ۷۰ء کی بھی شامل ہے۔ تقریباً چالیس نظموں میں بمشکل تین چار آزاد نظمیں ہیں، ورنہ ساری نظمیں یا تو پابند ہیں یا معرّیٰ۔ میں ان لوگوں میں نہیں ہوں جو نظم کے کسی خاص فارم پر اصرار کریں، لیکن لب ولہجہ کی تازگی اور بھیڑ سے ذرا الگ ہوکر کچھ کہنے کی اہمیت کا قائل ہوں۔ راشد آذر کے یہاں لب ولہجہ بالکل الگ یا منفرد نہیں ہے، لیکن اسے روایتی یا تقلیدی بھی نہیں کہہ سکتے۔ ان کے پاس کہنے کے لیے کچھ باتیں ہیں اور ان کے پاس آراستہ وپیراستہ، فنی اسقام سے پاک طرز ادا ہے۔ وہ زبان وبیان کے رمز سے آشنا ہیں۔ ان کے یہاں احساس کی لے تیز ہے اور ایک شکستہ دل گداختہ سے نکلی ہوئی آوازیں ہیں جو پڑھنے والوں کو متاثر کرتی ہیں:

یہ تیرے چہرے پہ پرچھائیاں اُداسی کی
عجیب لگتی ہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں
کہ شام ہوتے ہی میرا خیال آتا ہے
غرور حسن ترا شرمسار ہے، اور تو
بچھڑ کے مجھ سے، مرے واسطے پریشاں ہے
اگر یہ سچ ہے تو الزام بے وفائی دے
میں جرم بے گنہی کی سزا بھگت لوں گا

(نظم: جرم بے گنہی)

"خاک انا" کی نظمیں پڑھنے کے بعد مجھے شاعر کی نفاست پسندی کا قائل ہونا پڑا۔ ایسی نفاست پسندی، جس پر حیدر آباد کی تہذیب کا نقش ہے۔ عدم کا مشہور شعر ہے:

شاید مجھے نکال کے پچھتا رہے ہوں آپ
محفل میں اس خیال سے پھر آگیا ہوں میں

اس میں ربودگی کے ساتھ ساتھ ایک اکھڑپن بھی ہے۔ راشد آذر جب اسی خیال کو نظم کی صورت میں پیش کرتے ہیں تو ان کی فطری تہذیب اور شائستگی عود کر آتی ہے:

میں اٹھ کے آتو چکا تیری بزم سے لیکن
اس ایک تشنۂ دیدار روح کی مانند
کہ تیرا درد جسے زندگی سے پیارا ہے
بھٹک رہا ہوں ترے گھر کے آس پاس کہیں
اس آس میں، کہ کبھی اتفاق سے تجھ کو
مری وفا کی، مرے پیار کی ضرورت ہو

(نظم: آس)

میں سمجھتا ہوں، راشد آذر بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں۔ ان کی نظموں میں ارتکاز خیال بھی ہے اور حسن تعبیر بھی۔ فکری اعتبار سے "خاک انا" کی نظمیں واردات دل اور ان سے پیدا شدہ کیفیات سے عبارت ہیں۔ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ شاعر کا دائرۂ فکر محدود ہے، لیکن اس محدود دائرے میں انھوں نے جس ضبط ونظم سے کام لیا ہے، اس کی داد دیے بغیر نہیں رہا جاتا۔

غزلیں اس رمز وکنایہ سے آشنا نہیں ہیں، جو غزل کے اشعار کو تہ داری بخشتی ہیں۔ لیکن صاف اور سیدھے لب ولہجہ میں کہے ہوئے اچھے اشعار کی یہ مثالیں قابل توجہ ہیں:

میں عزمِ ترکِ وفا کر ... ا پر
مجھے یہ ڈر ہے کہ ... ا راہ نہ ہو
تمہارے خال سیہ ... ا میں خوف یہ ہے
ہمارا نامۂ اعمال بھی سیاہ نہ ہو

اس کے ملنے کا بھلا راز کہوں کس کس سے
لوگ کیا جانیں کہ ایسا کبھی ہو جائے ہے
اس پہ تجدیدِ تمنا کا نہیں ہے الزام
دل کی عادت ہی دھڑکنا ہے دھڑک جائے ہے

ہم اپنی زندگی بھی تجھے سونپنے کو تھے
ہم کو خبر نہیں تھی کہ تو بے وفا بھی ہے

کتاب عمدہ چھپی ہے اور قیمت مناسب ہے۔

عکس

مولف : نثار احمد صدیقی
ناشر : کلچرل اکیڈمی، جگ جیون روڈ، گیا
صفحات : ۱۶۰
قیمت : دس روپے

انٹرویو کی اپنی افادیت ہے۔ اس کے ذریعہ ہم نہ صرف بعض مسائل اور موضوعات پر اس شخص کے خیالات جان سکتے ہیں، جس سے انٹرویو لیا جاتا ہے، بلکہ اس کی شخصیت کے ان نہاں خانوں تک بھی پہنچ سکتے ہیں، جہاں عام طور پر ہماری رسائی نہیں ہوتی۔ پہلے عموماً سیاسی شخصیتوں سے ہی انٹرویو لیے جاتے تھے۔ پھر فلمی شخصیتوں کی مقبولیت کے ساتھ ساتھ ان سے انٹرویو لینے کا رواج بڑھنے لگا۔ ادبی شخصیتوں سے انٹرویو لینے کی زحمت اس وقت تک نہیں کی جاتی تھی جب تک اسے کوئی بڑا انعام یا کوئی خاص اعزاز نہ بخشا گیا ہو۔ انٹرویو لینا عام طور پر صحافیوں کا کام رہا ہے۔ ادیب اور شاعر لائبریریوں، اکیڈمیوں اور تعلیمی اداروں میں خواہ جس اہمیت کے بھی حامل ہوں۔ لیکن وہ سماج کا ایک غیر ضروری حصّہ سمجھے جاتے رہے ہیں۔ ادیب اور شاعر کی ادبی اور شاعرانہ شخصیت ہی اہم ہے اور میرے نزدیک اسے سیاسی اور فلمی شخصیت کے بالمقابل لانے کی ضرورت بھی نہیں۔ لیکن یہ ادبی اور شاعرانہ شخصیتیں آج ماس میڈیا کے عروج کے زمانے میں اسی طرح سماجی زندگی میں دخیل ہو رہی ہیں جس طرح مثال کے طور پر سیاسی اور فلمی شخصیتیں۔

ادیبوں اور شاعروں سے انٹرویو کی ابتدا ہمارے یہاں شاید ریڈیو کے توسط سے ہوئی۔ پھر یہ سلسلہ اخباروں اور رسالوں تک پہنچا۔ آج کل ٹیلی ویژن پر بھی اس طرح کے انٹرویو لینے کا رواج ہے۔ نثار احمد صدیقی اردو کے باقاعدہ انٹرویور Interviewer ہیں۔ انھوں نے باقاعدگی کے ساتھ کچھ ناقدوں، شاعروں اور افسانہ نگاروں سے انٹرویو لیے۔ انھیں رسالوں میں چھ... اور اب انھیں کتابی صورت میں "عکس" کے نام سے شائع کرایا ہے۔

نثار احمد صدیقی نے اکثر اپنے سوالات مختلف لکھنے والوں سے دہرائے ہیں۔ بادی النظر میں ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے ایک ہی سوال نامہ کئی لکھنے والوں کو بھیج دیا۔ سوالات عمومی نوعیت کے ہیں جن سے لکھنے والوں کے خیالات اور نقطۂ نظر سے واقفیت ہوتی ہے لیکن ان کی اپنی ذات اور ان کے تخلیقی وجود پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ انٹرویو کے لیے ناقدوں کا انتخاب تو خیر غنیمت ہے لیکن افسانہ نگاروں اور شاعروں کا انتخاب افراط و تفریط کا شکار ہو گیا ہے۔

انٹرویوز میں سوال اور جواب کا ساتھ ساتھ ہونا ضروری ہے لیکن "عکس" میں کئی ایسے انٹرویوز شامل ہیں، جن میں سارے سوالات ایک جگہ دے دیے ہیں۔ اور ان کے بعد اُن کے جوابات نمبر وار ایک جگہ، حالانکہ کتابت کے وقت اس عیب کو دور کیا جا سکتا تھا۔ انٹرویوز چاہے تحریری ہوں، لیکن ان کو براہ راست اور "فی البدیہہ" ہونے کا دھوکا ضرور ہونا چاہیے ورنہ انٹرویو کا اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے۔

اپنے سوالوں کے دوران دوسروں کے حوالے دیتے ہوئے نثار احمد سے ایک آدھ جگہ چوک ہوئی ہے اور ان کی یادداشت نے ان کے ساتھ وفا نہیں کی ہے۔ مثلاً میرے ایک بیان کا حوالہ دیتے ہوئے بلراج کومل سے ان کے خیالات دریافت کیے گئے ہیں۔ اس کا پہلا جملہ یوں ہے:

مظہر امام نے ایک جگہ تحریر کیا ہے:

"نئی نسل کے ہر ادیب یا شاعر کے یہاں شہری زندگی کی گھٹن، ہجوم میں فرد کی تنہائی، خودکشی کی تمنا وغیرہ لازمی طور پر موجود ہے۔

حالانکہ میں نے اپنے مضمون "آتی جاتی لہریں" میں لکھا تھا:

"یہ ضروری نہیں ہے کہ نئی نسل کے ہر ادیب یا شاعر کے یہاں شہری زندگی کی گھٹن، ہجوم میں فرد کی تنہائی، خودکشی کی تمنا لازمی طور پر موجود ہو۔"

دونوں جملوں میں بیّن فرق ہے۔ بہ طور حوالہ دیے ہوئے جملے سے بلراج کومل نے جز... پر جزوی اختلاف کیا ہے۔ لیکن ان کے سامنے میرا اصل جملہ ہوتا تو شاید اختلاف کی... نہ ہوتی۔

"عکس" میں کتابت کی غلطیاں بہت ہیں۔ خاص طور پر غیر ملکی مصنفوں کے نام یا انگریزی رسم خط میں لکھے ہوئے الفاظ۔ مثلاً ٹینی سن کو ٹے سنین، انڈر ووڈ کو اندر بریس، اڈلر کو اڈر، Vulnerability umenlibity، Idiom کو Idion (دو دو جگہ) لکھا گیا ہے۔ ایک جگہ نشتر خانقاہی اکثر خانقاہی ہو گئے ہیں۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ ہر لکھنے والے نے اپنے خیالات کا اظہار صداقت اور ...

بغیر کیا ہے۔ پھر بھی ان انٹرویوز کے دوران بعض دلچسپ بیانات سامنے آئیں۔ مثلاً

" شاعر کو بحر العلوم ہونا چاہیے۔ ورنہ اس کی شاعری روح عصر کے تقاضوں کا ساتھ نہ دے سکے گی۔"

(جوش ملیح آبادی)

" نثر شاعری کے مقابلے میں زیادہ مشکل اور زیادہ ہمت شکن مشغلہ ہے۔"

(شمس الرحمٰن فاروقی)

" ترقی پسند ادب کے سامنے بہر حال ایک اعلیٰ مقصد تھا۔ اگرچہ وہ لوگ چیزوں اور مسائل کو یک رُخے ڈھنگ سے دیکھتے تھے اور انھیں کرتے تھے، لیکن ان کے خلوص اور بے باکی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔"

(شمس الرحمٰن فاروقی)

" بے ربطی اور ناہمواری کے باوجود دنیا میں شاہکار افسانوں اور ناولوں کا وجود ہے۔ ان کے خالق بے حد صحت مند لوگ رہے ہیں۔"

(وہاب اشرفی)

انٹرویوز سب کے سب دلچسپ ہیں، اور انھیں بے تکلفی سے ایک ہی نشست میں پڑھا جا سکتا ہے۔ ایک دو انٹرویوز بہت سرسری اور سطحی ہیں، اگر انھیں مجموعے میں شامل نہ کیا جاتا تو بہتر تھا۔ امید ہے نثار احمد صدیقی اپنی کوششیں جاری رکھیں گے۔

(مظہر امام)

چشمِ نم

مصنف : قمر زاہدی

ضخامت : ۱۴۴ صفحات (مجلد)

قیمت : بارہ روپے

ملنے کا پتہ : قمر زاہدی پی۔ڈبلیو۔ڈی، پٹنہ ڈویژن
نارتھ گاندھی میدان، پٹنہ ۱

قمر زاہدی کے مجموعۂ کلام کا مذکورہ بالا نام ان کی غزل کے ایک شعر سے ماخوذ ہے، جو یہ ہے۔

ہم تو غم سے بے نیازانہ گزر جاتے مگر
اُن کی چشمِ نم سے اپنے غم کا اندازہ ہوا

جس غزل میں یہ شعر واقع ہوا ہے اس کے دوسرے چند اشعار یہ ہیں:

پھینک دیتے ہیں شکستہ جب کوئی شیشا ہوا
ہم سنبھالے پھرتے ہیں اک آئینہ ٹوٹا ہوا
کیوں بناتے ہو تماشا یوں سرِ محفل مجھے
تم بھی کیا رسوا نہ ہوگے میں اگر رسوا ہوا

خیریت پوچھی اچانک آج اس نے اے قمر
مندمل جو ہو چکا تھا زخم پھر تازہ ہوا

زبان و بیان کے لحاظ سے یہ بہت صاف اور شوخ الفاظ ہیں اور معنی و مطلب کے اعتبار سے ان میں نہ صرف خیال انگیزی ہے بلکہ زندگی کا ایک خاص احساس بھی۔ اتنا سرمایۂ فن بھی آج کے ایک اردو غزل گو کے لیے کم نہیں اور اس کے باوجود کہ کثرتِ استعمال اور شدتِ اظہار سے اردو غزل کی زبان اتنی منجھ گئی ہے کہ اس میں قدرے مشقِ سخن کے بعد کوئی بھی شخص کچھ رواں اور سلیس اشعار نکال لے سکتا ہے، یہ حقیقت اپنی جگہ رہتی ہے کہ قمر زاہدی کے پاس چکی کی مشقت کے ساتھ مشقِ سخن کے علاوہ بھی کچھ پونجی ہے، ان کے کچھ اپنے تجربات و واردات ہیں اور ان پر مبنی احساسات و خیالات بھی۔

ان کے اشعار میں طرزِ ادا بھی ہے اور لطیف معنی بھی۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ قمر زاہدی رسمی شاعر نہیں بلکہ طبعی شاعر ہیں اور اپنے کلام میں اپنے ہی جذبات و احساسات کو پیش کرتے ہیں۔ گرچہ جا بجا گونج پیش رو اساتذۂ سخن کی بھی سنائی دیتی ہے۔ مگر یہ وضع تکلف نہیں ہے فطری ہم آہنگی ہے، احساسات مختلف فنکاروں کے درمیان تجربات ہی کی طرح مشترک ہو سکتے ہیں۔ قمر زاہدی کا منجھا ہوا شستہ و رفتہ اور پر معنی اندازِ سخن تقریباً تیس سال کی مشق، غور و فکر اور مشاہدہ و مطالعہ کا نتیجہ ہے اس میں ایک نفاست اور دبازت ہے۔

ان کے خیالات غزل تک محدود نہیں ہیں۔ انھوں نے کئی دلچسپ نظمیں بھی لکھی ہیں، جن میں خاص کر قابلِ ذکر " اردو" " تو میرے خواب کی تعبیر نہیں" " پھول کھل جائیں گے" اور " اندیشۂ شکست" ہیں۔ آخرالذکر نظم خاص الخاص ہے۔ اس میں تعمیر ہیئت بھی ہے اور ایک صورتحال نیز کیفیت ذہنی کا موثر اظہار بھی۔ آخری شعر نظم کا ایک ایسا نقطۂ عروج پیش کرتا ہے، جس میں ماضی کی شدید تلخیوں کے ساتھ مستقبل کی حسین تمنا بھی ہے۔

اب ہجومِ نامرادی سے ہے جی اپنا نڈھال
اے یقینِ حسنِ مستقبل مجھے بڑھ کر سنبھال

یہاں حسرت کے ساتھ ساتھ ایک بصیرت بھی ہے۔ یہی قمر زاہدی کے کلام کا اشاریہ ہے۔ اگر وہ پابند نظموں پر مزید توجہ دیں اور ترتیب ہیئت پر پہلے سے زیادہ محنت کریں تو آج کی اردو شاعری کو صحیح سمت میں لے جانے کی ایک اہم خدمت انجام دے سکتے ہیں۔

(عبدالمغنی)

بہار میں تذکرہ نگاری

مصنف : ڈاکٹر محمد منصور عالم

صفحات : ۲۰۳

قیمت : پچیس روپے

پبلشر : کتاب منزل، سبزی باغ پٹنہ

"بہار میں تذکرہ نگاری" ڈاکٹر منصور عالم کا تحقیقی مقالہ ہے۔ اس مقالہ کو چار ابواب

میں تقسیم کیا گیا ہے۔ باب اوّل اور دوم کو مقالہ کی تمہید خیال کرنا چاہیے۔ جس میں فن تذکرہ اور اردو میں تذکرہ نگاری پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس بحث کے دو فائدے ہیں ایک تو یہ کہ اصل موضوع پر آنے کے لیے پس منظر واضح ہو گیا اور دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ یہ موضوع خود وضاحت چاہتا تھا۔ تذکرہ کی افادیت اور اس کی ہمہ گیریت کا ابھی تک لوگوں کو صحیح اندازہ نہیں ہے۔ تنقید اور تحقیق کے اس عروج کے دور میں عام طور سے لوگوں نے یہ فراموش کر دیا کہ ان دونوں کا نقشِ اوّل یہی تذکرے ہیں۔ باب سوم اس کتاب کا بنیادی باب ہے۔ اس کو تین عہد میں تقسیم کیا ہے (۱) ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک (۲) ۱۸۵۷ سے ۱۹۴۷ء تک (۳) تقسیم ہند کے بعد

اس باب میں انھوں نے بہار کے اہم اور معروف تذکرہ نگاروں اور تذکروں کا احاطہ کیا ہے۔ آخری باب میں مصنف نے تمام تذکروں کا جائزہ لیتے ہوئے بہار کی تذکرہ نگاری کی خصوصیت اور مستقبل کے امکانات سے بحث کی ہے۔

منصور عالم صاحب نے بہار کی تذکرہ نگاری کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ اور تذکروں کے متبادل دوسرے نسخوں کو سامنے رکھ کر ان اختلافات کو بھی پیش کیا ہے جو دوسرے نسخوں میں پائے جاتے ہیں۔

بہار کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس نے اپنی سرزمین کے فن کاروں کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ اس رو میں یہ ضرور ہوا ہے کہ بعض غیر اہم اشخاص بھی سامنے آگئے جن کا ادبی مرتبہ مشکوک ہے مگر یہ شگون نیک ہے کہ ایسے موتی بھی برآمد ہو گئے جنھوں نے مدتوں ادب کو آب و تاب بخشی ہے مگر مرورِ زمانہ کے باعث نظر انداز کر دیے گئے۔ ڈاکٹر منصور عالم کی تصنیف 'بہار میں تذکرہ نگاری' ایسی روایت میں ایک اضافہ ہے۔

اگرچہ یہ کتاب بہار کے تذکرہ نگاروں کا تذکرہ ہے مگر اس کی خوبی یہ ہے کہ اس کے ذریعہ دوسرے تذکرہ نگاروں کے کارناموں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ منصور صاحب نے بے جا طرفداری نہیں کی ہے بلکہ ان تسامحات کی طرف بھی بڑی دیانت داری کے ساتھ اشارہ کر دیا ہے جو ان تذکروں میں پائے جاتے ہیں۔

عام طور سے تحقیق کی زبان خشک اور بے مزہ ہوتی ہے وہ ریاضی کے فارمولوں کی طرح صرف حقائق کے چٹیل میدان سے گزرتی ہے لیکن منصور عالم صاحب نے اپنی سادہ مگر شگفتہ زبان کے باعث مقالے کو خشکی سے بچا لیا ہے۔ البتہ اتنا ضرور افسوس ہے کہ اتنا پر مغز مقالہ طباعت کی خرابی کے باعث حسنِ صوری سے محروم رہ گیا ہے اسی طرح فاضل مصنف اشاریہ کا اضافہ کر دیتے تو کتاب کی افادیت میں اضافہ ہو جاتا۔

(ظہیر احمد صدیقی)

دھوپ چھاؤں

مصنف : چنی لال مڑیا
مترجم : پریتم لال
صفحات : ۳۱۴
قیمت : ۱۹ روپے
پبلشر : نیشنل بک ٹرسٹ۔ نئی دہلی

دھوپ چھاؤں چنی لال مڑیا کا گجراتی ناول ہے جس میں گجرات کی تہذیبی اور معاشرتی زندگی کو اس طرح پیش کیا ہے کہ اس کی خوبیاں اور کمزوریاں ایک نظر میں سامنے آجاتی ہیں۔ شری پریتم لال نے اس کو اردو کے جامہ میں منتقل کر کے اردو داں حضرات کے لیے آہ فراہم کر دی ہیں۔ اس ناول میں گجرات کی دیہاتی زندگی کی بڑی خوبصورت اور سچی تصویر کھینچی گئی ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل کے دیہات کی سادہ زندگی۔ ان کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں اور غم۔ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہونا۔ ہمدردیاں، رقابتیں۔ تعصبات، توہمات، معصومیت اور جہالت غرض دیہات کا ہر پہلو نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ جوں جوں آپ ناول کو پڑھتے جائیں گے ایسا محسوس ہو گا جیسے پردے پر تصویریں ہنستی، روتی، گاتی نظر آ رہی ہیں۔ یہ تصویر اس قدر جاندار اور دلچسپ ہیں کہ فاصلے کی حد سمٹ کر اس ایک حلقہ میں آجاتی ہیں۔ کہانی کا ماحول ہمیں پوری طرح مسحور کر لیتا۔ اس خصوصیت میں وہ راجندر سنگھ بیدی سے بہت قریب نظر آتے ہیں۔ لیکن بیدی اور مڑیا میں بنیادی فرق یہ ہے کہ بیدی ایک ماہر فن کار کی طرح صرف حقیقتوں کو بے نقاب کرنا کافی سمجھتے ہیں اس کے بارے میں اپنا کوئی نقطۂ نظر مسلط نہیں کرتے۔ اس کے برخلاف مڑیا اپنا ایک خاص اخلاقی نقطۂ نظر رکھتے ہیں اور ہر واقعہ کو اسی کی روشنی میں پیش کرتے ہیں۔ ان کے یہاں صرف مصور اور تصویر کشی نہیں بلکہ اصلاحی اور اخلاقی پہلو بھی ہر جگہ نمایاں رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ناول میں کہیں کہیں فنی کمزوری حقیقت سے دوری کا احساس ہونے لگتا ہے۔ حقائق کی سچی مصوری کے باوجود حقائق قدیم داستانوں یا ہندوستانی فلموں کے رنگ میں رنگے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ناول کا موضوع جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ زندگی کے انقلابات اور نشیب و فراز ہیں۔ مصنف نے ناول کے ذریعے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ دولت اور جاہ و جلال آنی جانی چیزیں ہیں اور اگرچہ سارا زمانہ چڑھتے سورج کی پوجا کرتا ہے۔ دولت کی دھوپ اترتے ہی نگاہیں پھیر لیتا ہے مگر کچھ مہاپرش ایسے بھی ہیں کہ جن کی نظر میں یہ انقلابات کوئی حیثیت نہیں رکھتے وہ ہر انقلاب کو "ہری کی مرضی" کہہ کر خوشی سے قبول کر لیتے ہیں۔ دولت کے نکل جانے کو وہ دیوالیہ ہونا نہیں جانتے بلکہ اخلاق کو اصل دیوالیہ پن جانتے ہیں۔ بڑے سے بڑا حادثہ بھی ان کے ایمان کو متزلزل نہیں کر سکتا آخر زمانہ کو ہی ان کے سامنے ہتھیار ڈالنا پڑتے ہیں۔ سیٹھ اتم چند۔ کیا ایسے ہی کردار ہیں۔

اس ناول کے کردار متنوع اور رنگا رنگ ہیں۔ اس میں دکو بھائی، دکو بہو بیوی، مکھن لال منیم اور من سکھ لال جیسے انسان کے بھیس میں شیطان بھی ہیں۔ چمپا اور جستی جیسے سادہ لوح، مشرقی اور دل کش نسوانی کردار بھی ہیں جو خلوص و محبت کے خزانے ہیں جو ہر حال میں شوہر کے اوپر جان نثار کرنے کو تیار ہیں۔ غرض نیکی اور بدی کی یہ آویزش ناول کی جان ہے۔ بہ حیثیت مجموعی یہ ایک دلچسپ معاشرتی ناول ہے۔ مترجم کی سعی بھی مشکور ہے کہ اس نے بڑی خوبی کے ساتھ ادا کیا ہے۔

(افتخار بیگم)

کلیات اعظم

اعظم جلال آبادی

مذکورہ بالا کلیات اردو کے کہنہ مشق شاعر حکیم ترلوک ناتھ اعظم جلال آبادی کی شعری تخلیقات پر مشتمل ہے جو عرصۂ دراز سے عروس شاعری کے گیسو سنوارنے میں معروف ہیں۔ زیر تبصرہ مجموعہ سے پیشتر بھی ان کی کتابیں اشاعت پذیر ہو چکی ہیں۔ انھوں نے گیتائے اعظم کے نام سے شریمد بھاگوت گیتا کا اردو نثر میں تفسیری ترجمہ کیا ہے اور شیخ سعدی کے 'کریما' کا منظوم ترجمہ "کریمائے اعظم" کے نام سے پیش کیا ہے۔ علاوہ بریں انھوں نے کچھ ڈرامے بھی قلم بند کیے ہیں۔

اعظم صاحب کے کلام میں تصوف کا رنگ غالب ہے۔ ان کی شاعری میں پند و نصائح اخلاقیات اور حب الوطنی کے جذبات موجزن ہیں۔ بعض نظمیں خالصتاً مذہبی ہیں لیکن ان میں مذہبی تعصب کا ذرہ بھر بھی شائبہ نہیں۔ انھوں نے قصائد بھی لکھے ہیں مگر ان میں بھی قدیم شعراء کی طرح مبالغہ آمیزی اور خوشامد سے کام لینے کی کوشش نہیں کی ہے۔

اگرچہ کلیات میں شاعری کی مختلف اصناف پر طبع آزمائی کی گئی ہے تاہم اس کا ایک بڑا حصہ غزلیات پر مشتمل ہے جن کے مطالعے سے ان کے مرتبۂ سخن کے تعین میں آسانی ہو جاتی ہے۔ بنیادی طور پر وہ روایت پرست شاعر ہیں لیکن انھوں نے جدید رنگ میں بھی کچھ کلام پیش کیا ہے۔ ان کے رنگ سخن کا کچھ اندازہ ان اشعار سے ہو سکتا ہے۔

کون قاتل، کون تھا مقتول کس سے پوچھیے
لوگ تو سب دیکھتے تھے رقص بسمل کی طرف

تنہائی کے عالم سے گھبرا کے مشیت نے
جب بن نہ سکا کچھ بھی انسان بنا ڈالا

خدا کے بندے ہی بندوں پہ ظلم کرتے ہیں
خدا کا شکر کہ بندہ کہیں خدا نہ ہوا

وہ جو کہتے ہیں قیامت میں ملیں گے تم سے
زندگی ہے تو قیامت بھی کوئی دور نہیں

شب غم کی پریشانی عیاں ہے اپنے چہرے سے
کس کے سامنے جا کر کلیجہ اپنا کیا چیریں

۲۹۲ صفحات پر مشتمل اعظم صاحب کے اس کلیات کی طباعت و کتابت اوسط درجے کی ہے اور یہ تیس روپے میں نول پبلیکیشنز ۱۲، ۱ دریبہ کلاں دہلی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

(سید کشور کرم)

تحریک خلافت

مصنف : قاضی محمد عدیل عباسی
صفحات : ۲۷۹
قیمت : ۱۲ روپے
ناشر : ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی

پہلی جنگ عظیم کے بعد جب دول یورپ نے ترکی کی سلطنت عثمانیہ کے حصے بخرے شروع کیے تو وہاں خلافت کا وجود بھی خطرے میں پڑ گیا۔ برصغیر کے مسلمان خلافت کو اسلام کی سطوت و عظمت کا نشان سمجھتے تھے ان کے نزدیک خلیفۃ المسلمین کا منصب مسلمانوں کی مرکزیت اور اقتدار کا مظہر تھا۔ اور خلافت عثمانیہ کا زوال مسیحی یورپ کی بدترین سازش تھی۔ اگرچہ ہندوستان کے مسلمان کسی دور میں بھی خلافت کے تابع نہیں رہے تاہم یہاں سلطنت مغلیہ کے زوال اور برطانوی تسلط کے بعد مسلمانوں کو خلافت عثمانیہ سے کچھ زیادہ ہی جذباتی لگاؤ تھا اور اس وقت یہی واحد مسلم سلطنت تھی جو مسیحی یورپ کی حریف تھی اور جس کے تحت مقامات مقدسہ بھی تھے۔ سلاطین عثمانی خلیفۃ المسلمین اور خادم حرمین بھی تھے لہٰذا ساری دنیا کے مسلمان خلافت کے مطیع و منقاد سمجھے جاتے تھے یہی وجہ تھی کہ ترکی پر مسیحی یورپ کی یلغار کو مسلمانوں نے مرکز اسلام پر حملہ تصور کیا۔ سارے ملک میں اضطراب و احتجاج کی لہر دوڑ گئی ۱۸۵۷ء کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ مسلمانوں نے اجتماعی طور پر برطانوی اقتدار کو چیلنج کیا اور اس کی استعماری پالیسیوں کے خلاف احتجاج کی ہمت کی۔ تحریک خلافت دو لحاظ سے اہمیت کی حامل ہے ایک تو اس نے ہندوستانیوں کو برطانوی پالیسیوں کے خلاف احتجاج پر ابھارا اور یہ احتجاج آزادی کی جد و جہد کا نقطۂ آغاز بن گیا۔ دوسرے اس نے فرقہ وارانہ اتحاد کے لیے سارے ملک میں فضا پیدا کی۔ مہاتما گاندھی اور ان کے ساتھ تقریباً سارے ہی مسلم اور غیر مسلم رہنما خلافت کے پلیٹ فارم پر یکجا تھے۔ اور ان کے پیچھے سارے ہی ہندوستانی بلا امتیاز مذہب و استعماریت کے خلاف جد و جہد میں ہم قدم تھے۔ اس تحریک کے نام پر مسلمانوں نے لاکھوں روپیہ چندہ دیا ہزارہا سرفروشوں نے ناموس خلافت کے لیے صعوبتیں برداشت کیں۔ لیکن یہ ساری جد و جہد اور قربانیاں استعماریت کے عزائم میں سد راہ نہ بن سکیں۔ ترکی سلطنت بکھر گئی۔ خلیفہ کیونکہ ترکی کی نئی نسل کے جذبات کا ساتھ نہ دے سکتا تھا لہٰذا مصطفیٰ کمال نے خلافت کا خاتمہ کر دیا۔ اور ہندوستانی مسلمان حیرت و حسرت کا مجسمہ بن کر رہ گئے۔ بیسویں صدی میں یہ سب سے بڑا ذہنی اور جذباتی صدمہ تھا۔ جس سے برصغیر کے مسلمانوں کو دوچار ہونا پڑا۔ اس کے بعد اپنی ذہنی اور جذباتی تسکین کے لیے انھوں نے ملک عبدالعزیز آل سعود سلطان حجاز کو خلیفۃ المسلمین کا منصب قبول کرنے پر آمادہ کرنا چاہا لیکن یہ بیل بھی منڈھے نہ چڑھ سکی اور خلافت کا چراغ ہمیشہ کے لیے گل ہو گیا۔ قوم پرور رہنماؤں نے مسلمانوں کی اس مایوسی اور ہیجان

کا رخ جدوجہد آزادی کی طرف موڑنے کی کامیاب سعی کی اور مسلمان مجاہدین آزادی کی صفوں میں شامل ہو گئے۔ مسلم لیگ کی ناعاقبت اندیش سیاست کے باوجود مسلمانو نے آزادی وطن کی راہ میں جو قربانیاں دیں انھیں کسی اعتبار سے کم مایہ نہیں کہا جا سکتا۔

قاضی محمد عدیل عباسی کہنہ مشق صحافی اور آزمودہ کار رہنما تھے خلافت اور آزادی وطن کی تحریک میں تماشائی نہیں بلکہ ایک سپاہی کی حیثیت سے شریک رہے۔ اس طوفانی دور کی داستان انھوں نے اپنی اس کتاب میں بیان کی ہے۔ کتاب اپنے موضوع پر بے حد دلچسپ جامع اور معلومات افزا ہے۔ ہندوستان کے ساتھ ترکی اور افغانستان کے انقلاب کی اجمالی تاریخ بھی اس میں شامل ہے۔ قاضی صاحب نے کتاب حقیقت پسندانہ اور جذباتی انداز میں لکھی ہے۔ وہ نیشلسٹ مسلمان تھے اور اسی ذہنی پس منظر کے ساتھ انھوں نے کتاب تصنیف کی رہنماؤں سے عقیدت کے باوصف ان کی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ لیکن کتاب پڑھ کر مصطفےٰ کمال کی یک رخی تصویر سامنے آتی ہے ورنہ عزل خلافت کے بعد ان کی آمریت اور ماضی دشمنی نے ترکی کو مغربی سیاست کا ذیلی سیارہ بنا ڈالا اور ترک عثمانی اپنا کھویا ہوا مقام حاصل نہ کر سکے۔ اگرچہ عزل خلافت کے بعد کا ترکی اس کتاب کا موضوع نہیں ہے تاہم اگر قاضی صاحب کمال پاشا کے کردار کے دوسرے رخ کی طرف بھی چند اشارے کر دیتے تو کتاب کی افادیت میں اضافہ ہوتا۔

بہرحال کتاب اپنے مدلل اور مبسوط انداز بیان کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے لیکن ایک سوال ذہن میں یہ ابھرتا ہے کہ جو ملت خلافت کی بقا کے لیے برصغیر میں اضطراب و احتجاج کا مجسمہ بنی رہی اور جس کی تحریک نے برطانوی اقتدار کو ہلا ڈالا اس تحریک کے بعد اپنا وجود بھی برقرار نہ رکھ سکی اور استعماری سازشوں کا شکار ہو کر رہ گئی ۔ مسلمانوں نے تحریک خلافت پر جتنا زور صرف کیا جس اتحاد و استقامت کا ثبوت دیا اگر آزادی وطن کی راہ میں بھی اسی اتحاد و استقامت اور عاقبت اندیشی کا ثبوت دیتے تو شاید ہندوستان کی تاریخ دوسری ہوتی۔

(سا نقد ۔ ۔ نقوی)

ارمغان حجاز (منظوم اردو ترجمہ)

مترجم : مضطر مجاز

صفحات : ۲۱۱

قیمت : پندرہ روپے

پتہ : مضطر مجاز 21-5-16 فرحت نگر، حیدرآباد (اے۔پی)

ادبی شہ پاروں کے ترجمہ کی روایت ہمارے ادب میں کافی پرانی ہے۔ فارسی اور عربی کی بہت سی اہم کتابوں کا ترجمہ ہوا ہے۔

اقبال ہمارے دور کے وہ آفاقی شاعر ہیں جن کے کلام کا ترجمہ دنیا کی متعدد زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اردو میں ان کے فارسی کلام کی شرح اور تفسیر بھی شائع ہو چکی ہے کچھ حوصلہ مند شعراء نے ان کے کلام کا منظوم ترجمہ کرنے کی "جرأت" بھی کی ہے۔

مضطر مجاز بھی ایسے ہی حوصلہ مند شاعر ہیں جنھوں نے اقبال کی "ارمغان حجاز" کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ "ارمغان حجاز" اقبال کے آخری دور کا کلام ہے اس میں سوز اور جذبہ کی فراوانی کے ساتھ اقبال کا والہانہ انداز بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ اقبال زیارت حرمین کے مشتاق تھے خود تو نہ جا سکے لیکن تصور میں انھوں نے سفر ضرور طے کیا۔ جادۂ شوق اور منزل دوست کی داستان انھوں نے اشعار میں بیان کی ہے۔ ظاہر ہے اقبال کے کلام میں جو پختگی ہے جذبہ میں جو سوز و درد ہے اسے ترجمہ میں منتقل کرنا ممکن نہیں ہے علاوہ ازیں آمد اور آورد میں جو فرق ہے اس سے ترجمہ میں وہ بات کہاں پیدا ہو سکتی ہے جو اقبال کے کلام میں ہے۔ اس کے لیے مترجم کو مورد الزام بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ترجمہ میں جذبہ اور کیفیت کو منتقل کرنا کس کے بس کی بات ہے۔

مضطر مجاز نے منظوم ترجمہ میں اپنی شاعرانہ صلاحیت کا مظاہرہ کیا ہے اکثر قطعات کا ترجمہ بہت سلیس اور رواں ہے اور اقبال کے آہنگ سے قریب تر ہے لیکن اس کے باوجود یہ بات کھٹکتی ہے کہ کتابت کی غلطیوں پر توجہ نہیں دی گئی ہے، کہیں کہیں تو ان غلطیوں سے مطلب ہی خبط ہو گیا ہے۔ کئی جگہ مترجم شاعر کا مافی الضمیر پوری طرح ظاہر کرنے میں ناکام رہا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مترجم نے ترجمہ پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ ذیل میں چند مثالیں پیش کی جا رہی ہیں طوالت کے خوف سے صرف دو مصرعے نقل کیے گئے ہیں جو محل نظر ہیں)۔

خرے را اسپ تازی گو "نگویم"

ترجمہ :- کہ خر کو اسپ تازی کہہ "نہ بولوں"

اقبال کے یہاں انکار کا جو انداز ہے سرکشی میں خودداری کی جو شان ہے ترجمہ میں اس کا رنگ تو کیا آتا 'نہ گویم'، کا ترجمہ 'نہ بولوں'، عجب مضحکہ خیز لگتا ہے۔

فشاندم دانہ من تو حاصلے گیر

ترجمہ :- گراؤں دانہ میں تو، توڑ حاصل

"حاصل توڑنا" شاید یہ محاورہ پہلی بار استعمال ہوا ہے۔

کشد خود را بہ عیسیٰ کرگسے چند

ترجمہ :- چبا جاتے ہیں جس کو چند کرگس

کرگس چباتے بھی ہیں یہ بھی ایک انکشاف ہے۔

مسلمانی غم دل را خریدن

ترجمہ :- مسلمانی غم دل کی خریدی

خریدن کا ترجمہ "خریدی" یہاں کتنا مضحکہ خیز ہے۔ محاورہ کے علاوہ ۔۔۔ قطعہ کا مطلب ہی خبط ہو کر رہ گیا ہے۔

سحر جاوید را در سجدہ دیدم بہ صبحش چہرۂ شام سیہ ۔۔۔

دوسرے مصرع کا ترجمہ ہو میری شام سے صبح اس کی ۔۔۔

فارسی مصرع کا الٹا مفہوم پیش کرتا ہے گویا اقبال کا مصرع یوں ہونا چاہیے۔
بشامم چہرہ صبحش بیارای۔ ظاہر ہے ترجمہ نے رباعی کا مطلب ہی بدل کر رکھ دیا ہے۔

کتابت کی غلطیوں کے علاوہ ترجمہ کی ان چند فرد گذاشتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اگر ترجمہ دقت نظر کے ساتھ کیا جاتا اور توجہ سے اس پر نظر ثانی کی جاتی تو بہت سی خامیوں اور کوتاہیوں کو دور کیا جاسکتا تھا اور ترجمہ زیادہ بہتر اور دلکش ہو سکتا تھا۔ تاہم مضطر مجاز کی کوشش ناکام نہیں ہے ان خامیوں کے باوجود ارمغان حجاز کا منظوم ترجمہ ایک ایسی کاوش ہے جس کی قدر کی جانی چاہیے۔

(عبدالقدوس نقوی)

تجلّیات (شعری مجموعہ)

مصنف : زآر علاّمی
ضخامت : ۱۵۹ صفحات (مجلد)
ناشر : اگروال کلینک لورمال پٹیالہ پنجاب
سال اشاعت : ۱۹۸۰ء

زآر علاّمی ابن لالہ رام چندر داس، علاّم سحرؔ عشق آبادی وآنجہانی کے شاگرد اور جانشین ہیں۔ اس مجموعہ سے علاّم سحرؔ عشق آبادی کا اس کے سوا اور کچھ پتہ نہیں ملتا کہ گرد پوش کے فولڈرس پر ان کی پاسپورٹ سائز کی ایک تصویر ہے اور ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے خط مورخہ ۱۶ر جنوری ۱۹۷۵ء کا بلاک ہے۔ اس خط میں یہ بیانات قابل توجہ ہیں :۔

(۱) "میں نے جیتے ہی جی لکھ دیا ہے کہ میرے صحیح جانشیں تم ہو۔"
(۲) "تم عروض میں اب ہندوستان اور ترکستان کے تمام عروضیوں سے آگے ہو چکے ہو۔"

مصنف اپنی فکر و فن کا اظہار ان اشعار میں ظاہر کرتے ہیں :۔

معنی کی کہکشاں ہے مری فکر کا چمن　　لفظوں کے جام میں ہے مئے کیف موجزن
مضمون جو بھی ہے وہ سراپا بہار ہے　　پھولوں کی انجمن ہے مرا گلشن سخن

زآر علاّمی ایک کہنہ مشق شاعر ہیں جنھیں اظہار اور بیان پر غیر معمولی قدرت حاصل ہے۔

ان کے مجموعے میں اچھے اور پسندیدہ اشعار کی کمی نہیں۔ امید ہے ان کا مجموعہ ادبی حلقوں میں مقبول ہوگا۔

سیر المنازل

تالیف : مرزا سنگین بیگ
مترجم : ڈاکٹر نعیم احمد
ضخامت : ۱۶۳ صفحات
قیمت : ۴۰ روپے
ناشران : ادبی اکادمی، آفتاب منزل، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ

"سیر المنازل" فارسی مخطوطہ کا اردو ترجمہ ہے جسے ڈاکٹر نعیم احمد ریڈر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے مقدمہ و حواشی کے ساتھ ۱۹۸۰ء میں شائع کیا۔ بقول مترجم "سیر المنازل" کے دو نسخے موجود ہیں۔ ایک لال قلعہ دہلی کے عجائب گھر میں ہے اور دوسرا نیشنل آرکائیوز نئی دہلی میں ہے۔ اس کے مصنف مرزا سنگین بیگ ہیں جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین میں تھے۔

"سیر المنازل" ایسا واحد مخطوطہ ہے جس میں ۱۸۵۷ء سے قبل کے دہلی شہر کی قلمی تصویر موجود ہے۔ یہ کتاب سرسید احمد خاں کی تالیف "آثار الصنادید" (پہلا ایڈیشن مطبوعہ ۱۸۴۷ء) سے ۲۵ سال قبل لکھی جا چکی تھی۔ اس کے مطالعے سے دہلی شہر کے بارے میں بہت سی ایسی معلومات حاصل ہوتی ہیں جو "آثار الصنادید" میں موجود نہیں۔"

ڈاکٹر نعیم احمد کا نام اردو تحقیقات میں نامعروف نہیں۔ ان کی تصنیفات "شہر آشوب کا تحقیقی مطالعہ" اور "کلیات میر جعفر زٹلی" ان کے ذوق تحقیق کا نمونہ ہیں۔ فاضل مصنف نے "سیر المنازل" کی تدوین و ترجمہ میں مقدمہ و حواشی کا اضافہ کر کے اسے زیادہ اہم بنا دیا ہے۔ احسن ہوتا اگر وہ مرزا سنگین بیگ کے عہد کی شہر دہلی کی اس قلمی تصویر کو نقشہ کے ساتھ پیش کرتے جو ۱۸۵۷ء سے قبل دہلی شہر کے مکانوں، دکانوں، بازاروں اور گلی کوچوں کا نہایت معتبر جغرافیائی نقشہ ہوتا۔ دہلی اور شہر دہلی کے دور گذشتہ کی سیر سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ کتاب مفید مطالعہ ہے۔

ہندوستانی زبان

سورداس نمبر۔ شمارہ ۳-۴ جولائی۔ اکتوبر ۱۹۷۹ء
ضخامت۔ ۱۴۰۔ اردو = ۹۶ ہندی
قیمت۔ ۲۰ روپے
سالانہ چندہ ۱۲ روپے
فی شمارہ ۲ روپے
طباعت ٹائپ

مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر، بمبئی کی "ہندوستانی پرچار سبھا" پچھلے گیارہ سال سے اس مقبول زبان کا پرچار کر رہی ہے جسے آنجہانی مہاتما گاندھی جی نے ملک کی قومی زبان قرار دیا تھا اور جو، ان کے شبد میں "ہندوستانی زبان" تھی اور اردو اور دیوناگری دونوں رسم الخط میں لکھی سمجھی جاتی ہے۔ سہ ماہی رسالہ "ہندوستانی زبان" گاندھی جی کے اس تصور کا عمل ہے جسے قائم رکھنے کو ہندوستانی پرچار سبھا اپنا فرض سمجھتی ہے۔ یہ رسالہ دیدہ زیب ٹائپ میں اردو اور ہندی زبان و ادب سے متعلق نہایت مفید مقالے دیوناگری اور اردو ہر دو رسم خط میں شائع کرتا ہے۔

(بقیہ: صفحہ ۱۸۱ پر)

ترقی اُردو بورڈ کی تازہ مطبوعات

تعلیم سماج اور کلچر	اے۔ کے۔ سی۔ اوٹاوے/ اختر انصاری	/۰۰
مغلیہ سلطنت کا عروج و زوال	آر۔ پی۔ ترپاٹھی / ریاض احمد خاں شیروانی	۰/۵۰
جنوبی ہند کی تاریخ	کے۔ ایل۔ نیل کنٹھ شاستری/ آر۔ کے۔ بھٹناگر	/۰۰
وادی سندھ اور اس کے بعد کی تہذیبیں	سرمورٹیمر وھیلر/ زبیر رضوی	۰۰'
خلجی خاندان	کے۔ ایس۔ لال/ محمد یٰسین مظہر صدیقی	/۵۰
تعلیم ہندوستان کے مسلم عہدِ حکومت میں	ایس۔ ایم۔ جعفر/ سعید انصاری	۲۵'
قدیم ہندی فلسفہ	رائے شیو موہن لال ماتھر	۵۰
نالاڈیار (کلاسیکی تامل شلوکوں کا مجموعہ)	غازی حمید اللہ خاں	۷۵
دفتری انتظامیہ	بشمبر سہائے/ محمد سعید	۰۰
مدرسۂ عمل	اڈولف فیریر/ شیخ غلام حسین	۷۵
سائنس کی تدریس	ڈی۔ این۔ شرما اور آر۔ سی۔ شرما/ غلام دستگیر	۰۰
شماریات اور کاروبار میں ان کا استعمال	اے۔ ایل۔ باڈنگٹن/ نجم الحسن	۷۵
ہندوستانی گاؤں	شیاما چرن دوبے/ محمد عبد القادر عمادی	۷۵
ہندوستانی صنعتوں میں انصرام عملہ	نجم الحسن	۷۵
پرندوں کی زندگی اور ان کی معاشی اہمیت	محشر عابدی	۰۰
ہندوستان کے سماجی مسائل (انٹرمیڈیٹ سال دوم)	محمد عبد القادر عمادی	۱۰
تاریخ فلسفۂ اسلام (دوسرا ایڈیشن)	ٹی۔ جے۔ بوئر/ سید عابد حسین	۰
لسانی مطالعے (دوسرا ایڈیشن)	گیان چند جین	۰
ہمارا قدیم سماج (دوسرا ایڈیشن)	سید سخی حسن نقوی	۰
دانتے	زیڈ۔ اے۔ عثمانی	
فیورد ستوئیفسکی	ظ۔ انصاری	۰

بچّوں کے لیے :

نورتن کہانیاں	مرتبہ شمیم احمد	۰
بھارت کی لوک کتھائیں (حصّہ اوّل)	محمد قاسم صدیقی	۰
بھارت کی لوک کتھائیں (حصّہ دوم)	محمد قاسم صدیقی	۰
بھارت کی لوک کتھائیں (حصّہ سوم)	محمد قاسم صدیقی	۰
فٹ بال کی کہانی	راج نرائن راز	۰
مولانا روم کی کہانیاں	مرتب: محمد حفیظ الدین	۰
نصوح کا خواب	مرتب: حفیظ عباسی	۰

کتابوں اور دیگر معلومات کے لیے لکھیں

شعبۂ فروخت و نمائش بیورو فار پروموشن آف اردو وزارت تعلیم و ثقافت

ویسٹ بلاک ۸، آر۔کے۔ پورم نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۲

تصویر میں دائیں سے بائیں

شری وسنت ساٹھے، وزیر اطلاعات
ونشریات حکومت ہند۔ نائب
صدر کا خیر مقدم کرتے ہوئے۔
(بیٹھے ہوئے) شری شنکر بھٹ
ڈائرکٹر پبلی کیشنز ڈویژن شریمتی
رام دلاری سنہا وزیر مملکت،
وزارت اطلاعات ونشریات،
جناب ہدایت اللہ اور پروفیسر
سوامی ناتھن۔ کلکٹڈ ورکس آف
مہاتما گاندھی کے چیف ایڈیٹر

یکم اکتوبر ۱۹۸۰ء کو نئی دہلی میں نائب صدر جمہوریہ ہند کے ہاتھوں Collected Works Of Mahatma Gandhi کی انگریزی کی ۷۹، اور ۸۰ ویں جلدوں اور ہند
اور ۳۰ ویں جلدوں کا اجرا عمل میں آیا۔ اس موقع پر پبلیکیشنز ڈویژن کی طرف سے کتابوں کی ایک نمائش کا بھی اہتمام کیا گیا۔ جس کا افتتاح بھی نائب صدر جمہوریہ ہند نے کیا۔
ش میں ہر زبان کی کتابیں رکھی گئی تھیں۔ اس نمائش میں قومی رہنماؤں کی سوانح عمریاں، معلوماتی کتابیں اور بچوں کے لیے خوشنما اور دیدہ زیب کتابیں خصوصیات کے ساتھ قابل
ہ تھیں۔

ائش کا معائنہ
تے ہوئے۔ جناب
یت اللہ، شری
نت ساٹھے اور
لرشیام سنگھ نشتی
ڈ لگائے ہوئے)
ٹنٹ ڈائرکٹر
کیشنز ڈویژن

Regd. No. A(D-103)
R.No. 948/57

Licensed U(D)-50 to post without pre-payment
at Civil Lines Post Office, Delhi.

DR ZAKIR HUSAIN LIBRARY
JAMIA
NEW DELHI-11

مہاراجہ رنجیت سنگھ

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی دوسو سالہ سالگرہ (۲ نومبر ۱۹۸۰ء) سارے ملک میں منائی گئی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ سے متعلق شری کے۔ کے۔ کھلر کا مضمون صفحہ ۶ پر ملاحظہ ہو۔

Vol. 39 No. 4 AJKAL (URDU) November, 1980.
Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi.

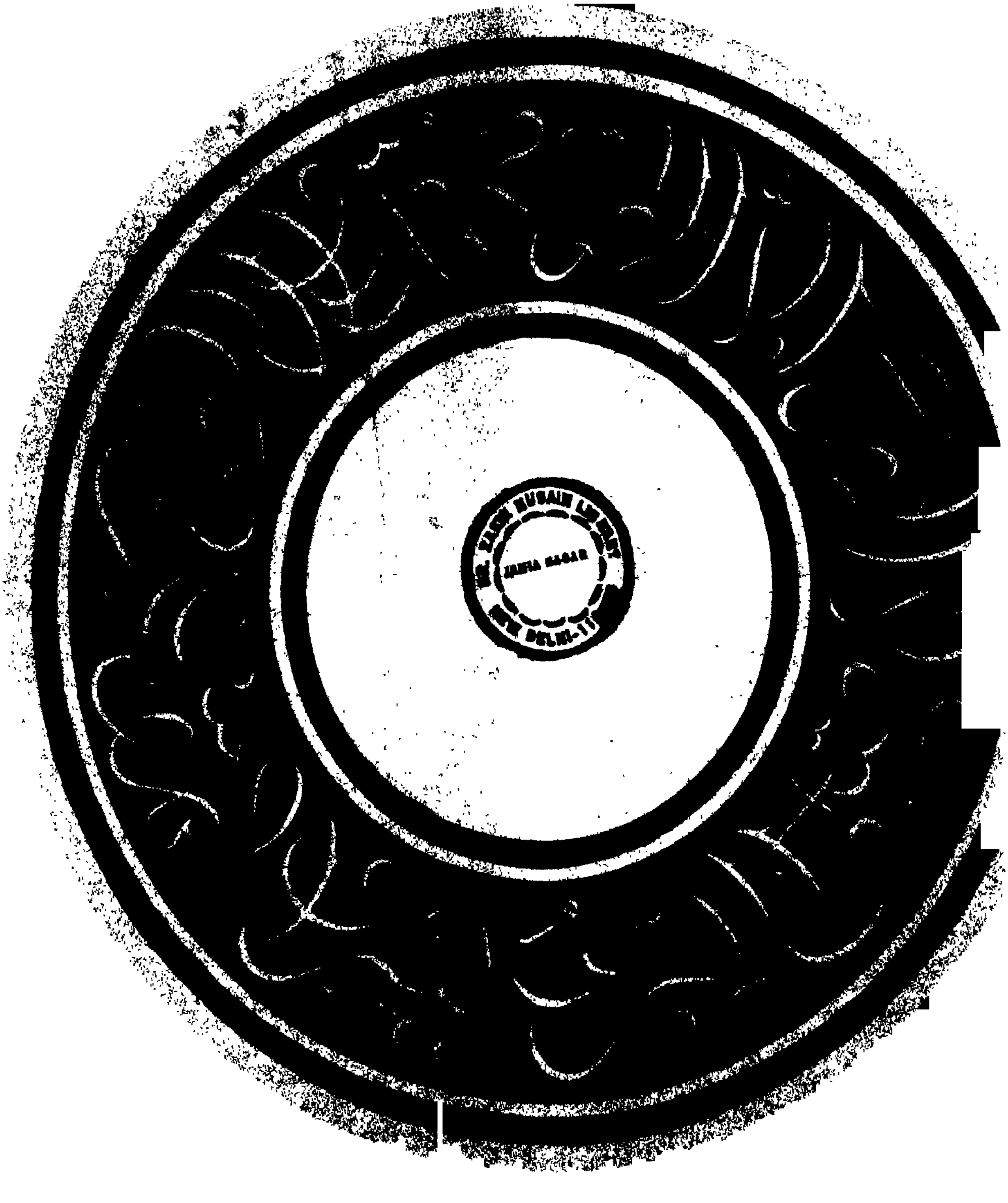

DR. ZAKIR HUSAIN LIBRARY
JAMIA NAGAR
NEW DELHI-11

ا رچ ۱۹۲۲ء — ۲۵ اکتوبر ۱۹۸۰ء) (تصویر: مرسلہ شکیل اعجاز۔ اکولہ)

تاریخِ وفات

ساحر لدھیانوی مرحوم ملعون

جس کے دم سے تھی فریدی گرمیِ بزمِ سخن — اب وہ ساحر، مُطرب اردو زباں خاموش ہے
ایک بلبل کے نہ ہونے سے چمن ہے سوگوار — لالہ وگل دم بخود ہیں گلستاں خاموش ہے
اشک بہتے ہیں مگر لب تک فغاں آتی نہیں — شدّتِ غم کا یہ عالم ہے زباں خاموش ہے

ہے زمانے کی زباں پر اس کی تاریخِ وفات
ساحرِ لدھیانوی شیریں بیاں خاموش ہے

۱۹۸۰ء — مغیث الدین فریدی

بلہ حسنی رسید

اردو کے ممتاز اور مقبول شاعر ساحر لدھیانوی کی ناوقت موت پر ادارہ اپنے دلی رنج وغم کا اظہار کرتا ہے۔

ساحر لدھیانوی

تاج، تیرے لیے اک مظہرِ الفت ہی سہی
تجھ کو اس وادیِ رنگیں سے عقیدت ہی سہی
میری محبوب! کہیں اور ملا کر مجھ سے
بزمِ شاہی میں غریبوں کا گزر کیا معنی
ثبت جس راہ پہ ہوں سطوتِ شاہی کے نشا
اس پہ اُلفت بھری روحوں کا سفر کیا معنی

میری محبوب! پسِ پردۂ تشہیرِ وفا
تو نے سطوت کے نشانوں کو تو دیکھا ہوتا
مُردہ شاہوں کے مقابر سے بہلنے والی
اپنے تاریک مکانوں کو تو دیکھا ہوتا

ان گنت لوگوں نے دنیا میں محبت کی
کون کہتا ہے کہ صادق نہ تھے جذبے ان
لیکن اُن کے لیے تشہیر کا سامان
کیوں کہ وہ لوگ بھی اپنی ہی طرح مفلس

یہ عمارات و مقابر، یہ فصیلیں، یہ حصار
مطلق الحکم شہنشاہوں کی عظمت کے ستوں
دامنِ دہر پہ اس رنگ کی گل کاری ہیں
جس میں شامل ہے ترے اور مرے اجداد کا خون

میری محبوب! انھیں بھی تو محبت
جن کی صناعی نے بخشی ہے اِسے شکلِ
ان کے پیاروں کے مقابر رہے بے نام
آج تک اُن پہ جلائی نہ کسی نے قند

یہ چمن زار، یہ جمنا کا کنارہ، یہ محل
یہ منقش در و دیوار، یہ محراب، یہ طاق
اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق
میری محبوب! کہیں اور ملا کر مجھ

مرحوم کی یہ شہرۂ آفاق نظم سب سے پہلے "تلخیاں" میں شا

DR. ZAKIR HUSAIN LIBRARY
JAMIA NAGAR
NEW DELHI-11

اردو کا تعلیمی عام مصور ماہنامہ

آجکل (اردو)

نئی دہلی

ایڈیٹر
شہباز حسین
اسسٹنٹ ایڈیٹر
محمد عادل صدیقی
سب ایڈیٹر
شوناتھ سکہ

جلد ۳۹ شمارہ ۵

دسمبر ۱۹۸۰ء

اگرہائن۔ پوس شک سمہ ۱۹۰۲

فون نمبر ۳۸۷۰۶۹

شرح چندہ

	ہندوستان	پاکستان	دیگر ممالک
سالانہ	۱۰ روپے	۱۶ روپے	۳ ڈالر ۱٫۵۰ پونڈ
دوسالہ	۱۸ روپے	۲۸ روپے	۵٫۴۰ ڈالر ۲٫۷۰ پونڈ
سہ سالہ	۲۵ روپے	۳۸ روپے	۷٫۵۰ ڈالر ۳٫۷۵ پونڈ
فی کاپی	ایک روپیہ	ڈیڑھ روپیہ	۵۰ سینٹ ۱۵ پنی

(اس شمارے کے ساتھ بچوں کے لیے ۳۲ صفحے کا ضمیمہ بھی شامل ہے، جو بلا قیمت ہے۔)

ترتیب

ملاحظات ــــــــ ۲
خاندانی منصوبہ بندی قومی ضرورت ـ اندرا گاندھی ــــــــ ۳
سال ختم ہوگیا ــــ (نظم) ــــ نازش پرتاپ گڑھی ــــــــ ۶
غزل ــــــــ مغیث الدین فریدی ــــــــ ۶
مولانا محمد علی ــــــــ خواجہ احمد فاروقی ــــــــ ۷
دل دل ــــ (کہانی) ــــ صالحہ عابد حسین ــــــــ ۱۰
جبر ایاں ــــ (نظم) ــــ کرشن موہن ــــــــ ۱۳
قطعات ــــــــ بلجیت سنگھ مطیر ــــــــ ۱۳
غالب اور عہد غالب ــــــــ محمد حسن ــــــــ ۱۴
خوبصورت ماں ــــ (نظم) ــــ بمل کرشن اشک ــــــــ ۱۸
غزلیں ــــ عابدی کاشمیری، منشاء الرحمن منشا ــــــــ ۱۸
مریادا ــــ (کہانی) ــــ ہنس راج رہبر ــــــــ ۱۹
غالب سے منسوب ایک شعر ــــ حنیف نقوی ــــــــ ۲۰
غزلیں ــــ شیدا رومانی، ایم۔ اے کاوش، مختار ٹونکی، مرسلین شیدا، منظور ہاشمی، رشید عارف ــــــــ ۲۴
میر کا مہدی مجروح ــــــــ امام مرتضیٰ نقوی ــــــــ ۲۵
ٹکڑا ٹکڑا آدمی ــــ (کہانی) ــــ شکیل پونم ــــــــ ۲۹
غزلیں ــــ شفیع اللہ خاں راز، ضمیر الحق ضمیر، حسرت شادانی، مبارک جونپوری، محشر رہبری، نعیم صبا ــــــــ ۳۳
غالب اور نیر رخشاں ــــــــ کاظم علی خاں ــــــــ ۳۴
نئی کتابیں ــــــــ ۴۱

سرورق : خطاطی اے، آر، امین ـ عمل : گورچرن اروڑہ

ڈائرکٹر پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر "آج کل" اردو، پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترسیل زر کا پتہ
بزنس منیجر، پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ملاحظات

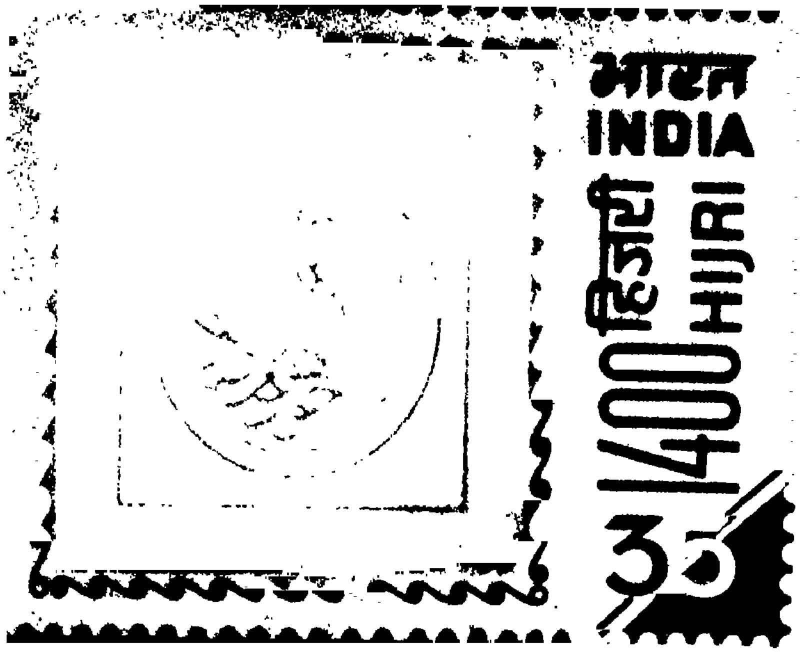

تقریبات چودھویں صدی ہجری

اسلامی سن ہجری کے چودہ سو سال پورے ہوئے۔

اس اہم موقع پر ساری اسلامی دنیا میں اور ان ممالک میں جہاں مسلمانوں کی قابلِ لحاظ آبادی ہے مختلف قسم کی تقریبات منائی جا رہی ہیں جن کا مقصد اسلام کی تعلیمات کو عام کرنا اور عالم انسان کی ذہنی اور روحانی ترقی میں اسلام کے رول کو اجاگر کرنا ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مذہب کی انقلابی روح پر روایت اور تقلید کا غلبہ بڑھ جاتا ہے۔ ہر زمانے میں مصلحین مذہب کی صحیح روح کو پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس اہم موقع پر یقیناً اس کی بھرپور کوشش کی جائے گی۔ کیونکہ مذہب کی مہیا کردہ اخلاقی بنیاد کے متزلزل ہونے کی وجہ سے معاشرے میں جو انتشار اور بے چینی پیدا ہو رہی ہے وہ ہمارے دور کا نہایت سنگین المیہ ہے۔

چودھویں صدی ہجری کے موقع پر مختلف ممالک میں جو تقریبات ہوں گی یقیناً ان میں اسلام کے تاریخی رول کو صحیح تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی جائے گی اور اس بات پر سب سے زیادہ زور دیا جائے گا کہ مذہب دنیا میں امن و شانتی پھیلانے، انسانوں کو اچھا اور بہتر انسان بنانے اور دنیا کو اشرف المخلوقات کا مسکن بنانے کے لیے آیا تھا۔ نفرت و عداوت، جنگ و جدل اور شک و شبہہ میں گرفتار ہماری دنیا کو مذہب کے اسی پیغام کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔

ہندوستان مسلم آبادی کے لحاظ سے دوسرا بڑا ملک ہے اس لیے یہاں بھی تقریبات کا شایانِ شان اہتمام کیا گیا اور ۱۹۸۰ء کو نئی دہلی میں وزیر اعظم ہند نے یادگاری ٹکٹ جاری کیا جس کا ڈیزائن (صاحب (جامعہ نگر نئی دہلی) نے تیار کیا اور خوشنویس محمد خلیق ٹونکی (استاد مرکز وزارت تعلیم، حکومت ہند) ہیں۔

یادگاری ٹکٹ جاری کرتے ہوئے وزیر اعظم نے فرمایا:

"اسلام ہمارے یہاں ایک چند سو سال پرانا مذہب ہے اور یہاں مسلم حکومتیں رہی تھیں۔ اسلام کا پیغام دنیا کے اس حصے میں مسلم حکمرانوں کی آمد سے بہت پہلے آ چکا تھا... پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ کا فوری اور انقلابی اثر ہوا کیونکہ وہ

مساوات اور بھاری چارہ کا پیغام لیے ہوئے تھیں۔"

شریمتی اندرا گاندھی نے مزید کہا: "اسلام کے پھیلانے میں حکمرانوں کی سیاسی قوت کے مقابلے میں صوفیوں اور خدا رسیدہ بزرگوں جیسے حضرت خواجہ معین الدین چشتی، حضرت نظام الدین اولیاء اور حضرت بابا فرید نے اہم پارٹ ادا کیا ہے۔"

تقریبات کمیٹی کے چیرمین جناب محمد ہدایت اللہ نائب صدر، جمہوریہ ہند نے اپنی تقریر میں سن ہجری کی ابتدا کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ یہ اسلامی تاریخ کا ایک اہم دور ہے اس لیے چودہ صدیاں پوری ہونے پر دنیا بھر میں تقریبات منائی جا رہی ہیں۔

قومی یکجہتی ۔ وقت کی اہم ترین ضرورت

یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ صدیوں کے اتحاد و اتفاق اور فرقہ وارانہ رواداری اور میل جول کے باوجود ملک میں اکثر ایسے واقعات ہو جاتے ہیں جس سے ہر محب وطن کا دل دکھ جاتا ہے۔ ایسے موقعوں پر ہر ذہن میں یہ سوال ہوتا ہے کہ بے اعتمادی اور نفرت کا یہ ماحول کب بدلے گا، اس کے اسباب کیا ہیں اور علاج کیا ہے۔ ان ہی باتوں پر غور کرنے کے لیے حکومت ہند نے ۱۲ر نومبر ۱۹۸۰ء کو نئی دہلی میں قومی یکجہتی کونسل کا اجلاس بلایا جس میں سیاسی پارٹیوں کے نمائندوں کے علاوہ ممتاز دانشوروں نے بھی شرکت کی۔

اس میٹنگ میں افتتاحی تقریر کرتے ہوئے وزیر اعظم ہند شریمتی اندرا گاندھی نے کہا۔

"ملک کے اس بنیادی سماجی ڈھانچے کو مستحکم بنانے اور اس کے تحفظ کے اقدامات کی ضرورت ہے جس کے ذریعے سے مختلف سماجی، سیاسی اور مذہبی طبقات کے درمیان توازن قائم رہے۔ اس کے ذریعے سے باہمی اعتماد اور ایک دوسرے کے لیے خیر سگالی اور عزت و احترام کا جذبہ پیدا ہوگا۔ یہ عمل سماجی تعلقات کو پائیدار بنانے میں معاون ہوگا۔ اب تک فرقہ وارانہ مسئلے کو صرف امن و قانون کا مسئلہ ہی سمجھا گیا ہے۔ لیکن اس اندازِ نظر کی اصلاح ضروری ہے اور دیگر پہلوؤں مثلاً تعلیم، روزگار، نیز اقتصادی ترقی کی اہمیت کو سامنے رکھنا ہوگا۔" آپ نے کہا کہ حال خطرات سے پُر ہے، اس لیے ہمارے سامنے جو عظیم ترین ذمہ داریاں ہیں، ان کی تکمیل کی ذمہ داری اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ ہم سب یہاں اسی لیے جمع ہیں کہ درپیش مسائل کے حل کے لیے مِل جُل کر کوشش کریں۔

شریمتی اندرا گاندھی نے فرمایا کہ میں نے یا مرکزی وزیر داخلہ نے مراد آباد اور علی گڑھ کے فسادات کے لیے غیر ملکی طاقتوں کو مورد الزام قرار نہیں دیا ہے۔ اگرچہ کچھ اخبارات بار بار یہی لکھتے رہے کہ میں نے ایسا کہا ہے۔ آپ نے مزید کہا کہ دنگا فساد زیادہ تر مٹھی بھر لوگ شروع کراتے ہیں لیکن بے اعتمادی، تعصب، ذات پات، مذہب یا زبان یا شخصی عداوت کی وجہ سے یہ فرقہ وارانہ رنگ اختیار کرتے ہیں۔ شریمتی اندرا گاندھی نے مزید کہا کہ ہم قومی یکجہتی کی بات کرتے ہیں یہ محض کوئی جملہ یا اصطلاح نہیں ہے بلکہ یہ ہمیں ان عظیم ذمہ داریوں کا احساس دلاتی ہے جو تاریخ نے ہمارے کاندھوں پر ڈالی ہیں۔ ہم سب پر خواہ ہمارا تعلق کسی بھی مکتبِ فکر یا پارٹی سے ہو، یہ فرض ہے کہ ہم ملک کی آزادی اور سالمیت کو ہر چیز سے مقدم سمجھیں لیکن آزادی اور اتحاد کی خاطر ہمیں ہر وقت چوکس اور چوکنا رہنا ہے۔

فرقہ واریت کے زہر کو ختم کرنے کے لیے قومی یکجہتی کونسل نے جو تجاویز منظور کی ہیں ان پر عمل درآمد ہونے سے یقیناً قومی یکجہتی کو فروغ حاصل ہوگا جو وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔

اطلاعات کا آزادانہ تبادلہ

دنیا کے ممالک میں بہتر مفاہمت پیدا کرنے کے لیے اور ایک دوسرے کے صحیح حالات جاننے کی غرض سے یہ بے حد ضروری ہے کہ دنیا کے ممالک میں اطلاعات کا آزادانہ تبادلہ ہو اور ان پر کسی طرح کی پابندیاں عاید نہ ہوں۔ مرکزی وزیرِ اطلاعات و نشریات شری وسنت ساٹھے نے بلگریڈ میں یونیسکو جنرل کانفرنس کے ۲۱ ویں اجلاس سے خطاب کرتے ہوتے ان ہی جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان کے قدیم رشی ایک انمول بات کہہ گئے ہیں کہ "پوری کائنات کے نیک خیالات کی ہم تک رسائی ہونے دو" گاندھی جی نے بھی تقریب یہی بات یوں کہی تھی کہ میں نہیں چاہتا کہ میرے مکان کے چاروں طرف دیواریں کھڑی کر دی جائیں اور میرے گھر کی کھڑکیاں بند کر دی جائیں۔ کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ ساری دنیا کے ثقافتی ورثے کی ہوا آزادانہ طور سے میرے گھر میں آئے۔ آج ہم جب عالمی برادری کی بات کرتے ہیں تو اس سے ہماری ہو بہو یہی مراد ہے۔

شری ساٹھے نے کہا ہندوستان کا نصب العین سماجی، اقتصادی اور سیاسی انصاف ہے اور ہم نے اپنے دستور میں اس کی ضمانت دی ہے۔ نیز ہندوستان بھی ان چند نو آزاد ممالک میں سے ایک ہے جنھوں نے منصوبہ بند ترقی کا راستہ اختیار کیا۔ اور صرف موثر پیغام رسانی کے ذریعہ ہی ہمارے سماج میں عوام ترقیاتی سرگرمیوں میں شرکت کر سکتے ہیں۔ انھوں نے اس بات پر مسرت ظاہر کی کہ ذرائع ابلاغ کے اداروں کے عملے کی تربیت اور ان اداروں کی ٹکنالوجی کے تبادلے نیز اہم معلوماتی پروگراموں کے تبادلہ کے معاملہ میں ترقی پذیر ممالک کے درمیان گہرے تعاون کا جذبہ ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے ناوابستہ ممالک کی پیش قدمی کا ذکر کیا۔ انھوں نے مسٹر میک برائڈ کی صدارت میں رسل و رسائل کے مسائل کے جائزے کے لیے بین الاقوامی کمیشن کے قیام کا خیر مقدم کیا جس نے ترقی پذیر ممالک میں رسل و رسائل کی موجودہ سہولتوں کا اور ان کے فروغ کی ضرورت کا جائزہ لیا۔

اندرا گاندھی

خاندانی منصوبہ بندی ــ قومی ضرورت

[وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی نے خاندانی منصوبہ بندی سے متعلق دوردرشن نئی دہلی کو ایک انٹرویو دیا تھا جو درج ذیل ہے۔ یہ انٹرویو ۲۴ ستمبر ۱۹۸۰ء کو ٹیلی کاسٹ کیا گیا]

سوال :- مادام پرائم منسٹر آپ کی حکومت خاندانی منصوبہ بندی پروگرام کو کتنی اہمیت دیتی ہے ؟

جواب :- ہماری سرکار نے اس پروگرام کو دنیا میں سب سے پہلے سرکاری حیثیت دی جو اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ ہم اسے کتنا اہم سمجھتے ہیں۔ آپ کو علم ہے کہ ہمارے ملک کی آبادی میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ ہر سال ہمارے ملک کی آبادی میں آسٹریلیا کی کل آبادی کے برابر کا اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

سوال :- شرح آبادی کو معقول حدود میں رکھنے کی کوشش میں ہم کامیاب نہ ہو سکے ہیں۔ اس کے پیشِ نظر ہم معاشی طور پر کس طریقے سے خود کفیل ہو سکتے ہیں ؟

جواب :- اس کا صحیح جواب تو یہ ہے کہ ترقی دو طرفہ ہو۔ یعنی ترقی کی پہلی منزل تو یہ ہو کہ لوگوں کو وہ سب کچھ مل جائے جس کی انھیں ضرورت ہے۔ نئی نئی راہیں کھلیں۔ دوسرے یہ کہ ترقی اور خوشحالی بذاتِ خود کنبوں کو محدود کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ یعنی وہ لوگ جو ایک خاص معیارِ زندگی تک پہنچ جاتے ہیں اپنے بچّوں کے تئیں اپنے فرائض کے بارے میں وہ زیادہ ذمّہ دار ہو جاتے ہیں۔ بچّوں کی مناسب پرورش و پرداخت کے لیے ان کی ضروریات پہلے کے بہ نسبت بڑھ جاتی ہیں اور اس لیے وہ خود یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ان کا کنبہ چھوٹا ہو۔ لیکن آبادی میں اضافے کے مسئلے کو انجام کار ہمیں صرف ترقی کے ذریعے سے نہیں بلکہ عوام کو سمجھا بجھا کر اس پروگرام پر عمل کرنے کے لیے راضی کر کے حل کرنا ہوگا۔

سوال :- لیکن اگر ہم اضافۂ آبادی کو معقول حدود کے اندر نہ رکھ سکے تو ترقی ممکن بھی ہوگی ؟

جواب :- تمام مسئلے ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر پنجاب ہی کو لیجیے جہاں زرعی ترقی ہوتی ہے یا صنعتی طور پر ترقی یافتہ علاقوں کو دیکھیے یا کیرالہ جیسی ریاستوں کو ذہن میں رکھیے جہاں کہ تعلیمی ترقی ہوئی ہے۔ ایسی تمام جگہوں میں شرح پیدائش گھٹ گئی ہے۔

سوال :- مسز گاندھی کیا آپ اس بات سے متفق ہیں کہ معاشی تناظر سے کہیں زیادہ اہم مسئلہ یہ ہے کہ خاندانی منصوبہ بندی کا براہِ راست تعلق بنیادی حقوق سے ہے یا یہ کہ عورت کی مرضی کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے اور بچّے کو ایسے حالات میں نہیں پیدا ہونا چاہیے، جہاں اسے کوئی پوچھنے والا نہ ہو۔

جواب :- باپ کو بھی کیوں نظر انداز کیا جاتے ؟ میں اس بات سے متفق ہوں کہ اس مسئلے میں انسانی حقوق کا پہلو بھی بہت اہم ہے بالخصوص عورتوں کے ضمن میں کیونکہ بچّے کی پیدائش اور پرورش کا بار عورت ہی اٹھاتی ہے اور اس کے باوجود اس بارے میں اس کی مرضی کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی اور نہ ہی اس کی صحت کا خیال کیا جاتا ہے۔ بدقسمتی سے اس کا خمیازہ بچّے بھگتنا پڑتا ہے۔ آج بچّوں کی پیدائش کے معاملے میں ماں باپ دونوں کی مرضی شامل ہونی چاہیے۔ جب والدین خواہش مند ہوں تبھی بچّے پیدا ہوں تاکہ، وہ بچّے کے بارے میں اپنی ذمّہ داری محسوس کریں اور اس کی اچھی طرح دیکھ بھال کریں۔

سوال :- لیکن اگر خاندانی منصوبہ بندی کے پروگرام کو اتنی اہمیت دی جتنی ملک کی سلامتی کو دی جاتی ہے اور اس کو ایک ایسا مسئلہ سمجھا جائے جو جماعتی سیاست سے بالاتر ہو اور یہ ایک پروگرام کا حصّہ ہو جس پر عام طور سے اتفاق رائے ہو تو؟ اس کی کوشش کرنی چاہیے کہ اس پروگرام کو ملک کے تمام لوگوں کی حمایت حاصل ہو۔

جواب :- ظاہر ہے کہ خاندانی منصوبہ بندی جیسے موضوع کو تنازعے

بالاتر ہونا چاہیے۔ لیکن جیسا کہ آپ نے گذشتہ برسوں میں دیکھا ہوگا کچھ پارٹیوں اور گروہوں نے اس پروگرام کے خلاف زبردست پروپگنڈہ کیا۔ انھوں نے ایک مذہب کے لوگوں کو تو یہ کہا کہ اس پروگرام پر عمل کرنے سے ان کا وجود باقی نہیں رہے گا۔ اور دوسروں کو یوں بہکایا کہ ان کی تعداد کم ہونے سے ان پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں گے۔ نس بندی کے خلاف جو پروپگنڈہ کیا گیا وہ اس سے الگ تھا۔ چونکہ اس معاملہ میں ہم زور زبردستی میں یقین نہیں رکھتے اس لیے ہمارے خیال میں عوام کو سمجھا بجھا کر ہی اس اقدام کے لیے مائل کرنا چاہیے۔ لیکن یہ اشد ضروری ہے کہ لوگوں کو سمجھانے بجھانے اور باخبر کرنے کا یہ کام بہت بڑے پیمانے پر کیا جائے کیونکہ جب تک کہ ہر شخص اس کی حمایت نہ کرے۔ اس میں کامیابی حاصل کرنے میں بڑا وقت لگ جائے گا جس سے ہمارا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔

سوال:- لیکن اس بات کو جانتے ہوئے کہ گذشتہ چند برسوں میں خاندانی منصوبہ بندی پروگرام میں کارکردگی بالکل غیر موثر رہی ہے۔ آپ کی سرکار اس پروگرام میں دوبارہ جان ڈالنے کے لیے کیا اقدام کر رہی ہے؟

جواب:- میری رائے میں اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ہمیں نہ صرف متعلقہ محکمے کو اس میں شامل کرنا ہوگا بلکہ کل آبادی کو شریک کرنا ہوگا۔ جن میں خاص طور پر اسکول، نوجوانوں کی تنظیمیں، خواتین کی تنظیمیں اور سماجی بھلائی کے سبھی ادارے شامل ہوں گے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ مناسب فضا پیدا کرنے کے لیے ہر شخص اس کام میں جٹ جائے۔ آپ دیکھیں گے کہ دیہاتی عورتیں بلکہ تمام عورتیں اس کے لیے تیار ہیں۔ لیکن یہ بہت ضروری ہے کہ ہم اچھی صحت کی یقین دہانی کرائیں کیونکہ اگر بچے زیادہ تعداد میں مرنے لگیں گے تو لوگ یہ خطرہ مول لینا نہیں چاہیں گے۔ لہٰذا ان کو اچھی صحت تعلیم اور یہاں تک کہ بعد ازاں ملازمت کا یقین دلانا بھی ضروری ہے۔ یہ مجموعی طور سے قومی منصوبہ بندی کے پروگرام کا ایک حصہ ہے۔

سوال:- مادام پرائم منسٹر! کیا آپ اس بات کی حمایت کریں گی کہ ایک ایسا باضابطہ نظام قائم کیا جائے جس کے تحت خاندانی منصوبہ بندی پر عمل کرنے والوں کو مختلف قسم کی ترغیبات دی جائیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ ملک کے ٹیکس کا ڈھانچہ کس طرح کا ہے اور ملک کے اجتماعی وسائل کیا ہیں۔ تو کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ریاست اور فرد کے درمیان باہمی ذمہ داری کا ایک ایسا رشتہ قائم ہو جائے کہ جہاں دونوں ایک دوسرے کی ضرورتوں کو سمجھیں۔

جواب:- یہ ایک خاصی پیچیدہ تجویز ہے اور اس پر بارہا بحث ہو چکی ہے ماضی میں ہم نے کچھ ترغیبات و مراعات دی تھیں اور کچھ واپس لے لی تھیں۔ مجھے نہیں معلوم یہ طریقہ کس حد تک کامیاب رہا۔ اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

سوال:- کیا آپ اس تجویز پر غور و خوض کے حق میں ہیں؟

جواب:- جی ہاں۔

سوال:- کیا آپ یہ بھی محسوس کرتی ہیں کہ ہمارے مروجہ قوانین پر اس خیال سے نظر ثانی کی ضرورت ہے کہ خاندانی منصوبہ بندی کے پروگراموں پر عمل درآمد میں مدد ملے۔ ہم ایک ایسا اخلاقی ڈھانچہ بنا سکتے ہیں جس کے اندر خاندانی منصوبہ بندی سے متعلق ترغیبات طے کی جا سکتی ہیں۔ بحران کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکے گا کہ یہ امتیاز پیدا کرتے ہیں اس لیے قانون کے خلاف ہیں۔

جواب:- میرے خیال میں اخلاقی فضا قانون کی مدد سے تخلیق نہیں کی جا سکتی۔ یہ مسئلہ تو زندگی کے بارے میں اپنا رویہ بدلنے کا ہے۔

سوال:- آخری سوال یہ ہے کہ تلاش اور جستجو کے بعد معلوم ہوا ہے کہ عورتوں کی تعلیم و روزگار اور ان کی سماجی حالت میں بہتری آنے کی وجہ سے ان کی بارآوری کمی آتی ہے۔ اس سے قطع نظر اس کی بھی سخت ضرورت ہے کہ عورتیں پڑھیں لکھیں کام کریں اور آگے بڑھیں۔ کیا آپ کی حکومت عورتوں کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے خاص اقدامات پر غور کر رہی ہے؟

جواب:- اس بارے میں ہم بہت کچھ کر رہے ہیں۔ شروعات ہمیں نچلی سطح یعنی لڑکیوں سے کرنا ہے۔ اس بات کی پوری کوشش کی جا رہی ہے کہ لڑکیاں اپنی تعلیم جاری رکھیں، ادھوری نہ چھوڑ دیں۔

> کنبہ اگر چھوٹا ہوگا تو کنبے کے ہر فرد کے لیے زیادہ خرچ کیا جا سکے گا۔ خاندانی منصوبہ بندی دراصل خواتین اور بچوں کی صحت کو بہتر بنانے کا ایک ذریعہ ہے۔ اس طرح قوم بحیثیت مجموعی زیادہ طاقتور اور فعال بن سکے گی۔
>
> ہمارا ہمیشہ سے یہ خیال رہا ہے اور میں پھر اس کا اعادہ کرتی ہوں کہ یہ پروگرام بالکل رضاکارانہ ہوگا۔ لوگوں کو سمجھایا جائے کہ وہ اپنے کنبوں کو محدود رکھیں۔ اگر اس کے لیے مناسب طریقے سے لوگوں سے رابطہ پیدا کیا جائے تو ان کو راضی کر لینا مشکل نہ ہوگا۔
>
> —— شریمتی اندرا گاندھی۔

سال ختم ہو گیا

ٹھہر و اے جاتے ہوئے سال کے بوجھل لمحو
اپنی بخشی ہوئی سوغات بھی لیتے جاؤ
جا رہے ہو تو یہ حالات بھی لیتے جاؤ
جن سے میں اور مرا سارا وطن گذرا ہے
روح گذری ہے کبھی اور کبھی تن گذرا ہے

سالہا سال سے، ہم بے بس و مجبور و ملول
دیکھتے آتے ہیں دنیا کو تماشے کی طرح
دیر سے مہر بہ لب ہیں کسی لاشے طرح
ایک بے گور و کفن زندہ جنازے کی طرح
دفن ہیں اپنے ہی ماضی کے سیہ خانے میں
اپنی تاریخ کے اوراقِ زبوں اوڑھے ہوئے
چہرے سے پانو تلک چادرِ خوں اوڑھے ہوئے

اپنی تاریخ کے یہ کالے، بھیانک اوراق
درج ہے جن میں کسی پر کوئی افسانۂ قہر
ہے کسی صفحے کا عنوان فقط زہر ہی زہر
وقف ہے کوئی ورق ذکرِ عداوت کے لیے
کوئی تلخی کے لیے، کوئی نفرت کے لیے
سر بہ زانو ہے ورق کوئی، کوئی خاک بسر
کہیں اعضائے بریدہ، کہیں جلتے ہوئے گھر
منجمد ہو گئی ہے چیخ کسی صفحے پر

باب ہے کوئی خود اپنوں کی ستم گاری کا
کوئی احوال سناتا ہے تبہ کاری کا
جھوٹ کا ذکر کہیں ہے، کہیں غداری کا
اپنی تاریخ کے یہ کالے، بھیانک اوراق
ارضِ بھارت کے تقدس کا اڑاتے ہیں مذاق

کون سوچے کہ اِن اوراق زبوں کے پیچھے
کتنی جاں سوز کراہوں کا جہاں ٹھہرا ہے
کتنی رسوائیاں قدموں سے لپٹ جاتی ہیں
ذلتیں ہیں کہ تعاقب میں چلی آتی ہیں
کہیں زخم اور کہیں دردِ نہاں ٹھہرا ہے
ہر ورق اپنے لیے دشمنِ جاں ٹھہرا ہے

ٹھہرو، اے جاتے ہوئے سال کے بوجھل لمحو!
جا رہے ہو تو یہ اوراق بھی لیتے جاؤ
کہ اِن اوراق سے اب ہم کو حیا آتی ہے
اور بھی بار ندامت کا اٹھانا نہ پڑے
صبحِ فردا پر اِن اوراق کا سایا نہ پڑے

عہدِ ماضی کے الم ناک سیہ خانے میں
میں ہوں محبوس مرا ذہن تو محبوس نہیں
اور یہ ذہن جو انسان سے مایوس نہیں
مجھ سے کہتا ہے کہ وہ جانِ وفا آتی ہے
تازہ دم، تیز قدم بادِ صبا آتی ہے
صبحِ نزدیک ہے، خوشبوئے ضیا آتی ہے

غزل

مغیث الدین فریدی

دل کا عجب انداز ہے گلشن بھی ہے صحرا بھی ہے
دیوانہ اپنے رنگ میں محفل بھی ہے تنہا بھی ہے

تم اُس کے فن کی داد دو جو بیچ کر اپنا ضمیر
دربار کی زینت بھی ہے بازار میں رسوا بھی ہے

ہم سے زبانِ خلق کی تائید ہو سکتی نہیں
ہم نے اُسے چاہا بھی ہے سمجھا بھی ہے برتا بھی ہے

رنگِ جہاں کا عکس ہے ایک ایک چہرے پر یہاں
جو اپنے دل کا عکس ہو ایسا کوئی چہرہ بھی ہے

سنگِ ملامت لے کے تم جس کو چلے ہو توڑنے
اے ناصحو! تم نے کبھی وہ آئینہ دیکھا بھی ہے

جلتے ہوئے غم کے کنول بجھتی ہوئی شمعِ وفا
شہرِ تمنا آج کل آباد بھی سُونا بھی ہے

وضعِ زمانہ سے کوئی شکوہ فریدی کو نہیں
دنیا میں وہ رہتا بھی ہے دنیا سے بے پروا بھی ہے

خواجہ احمد فاروقی

مولانا محمد علی

ذہنوں میں مولانا محمد علیؒ کا ذکر نہ ہونے کے برابر ہے ؎

ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

غلطی ہے بلکہ ناسپاسی اور حق ناشناسی بھی ہے۔ ہمارے تعلیم میں خاص طور پر ان امور کا خیال رکھے جن سے ہماری نا تیار ہوا ہے۔ وہ کثرت میں وحدت کو تلاش کرے اور سب ہی رنگوں کو اپنی آنکھوں میں جگہ دے۔ اپنے گزرے آنے والی نسلوں تک پہنچائے اور تعلیم کی بنیاد اپنے تمدن تاریخ صرف کتابوں میں لکھے رہنے سے یا ایک نکٹ کے سکتی۔ اس کی زندگی کی صرف یہ صورت ہے کہ وہ سماج کے ریشے ریشے میں ہو۔ اگر یہ نیا سماج جو بن رہا ہے، اس کی گرمی اور روح کی بیتابی، مولانا ابوالکلام آزاد کے رفیع احمد قدوائی کی شیفتگی اور فراغ دلی اور ڈاکٹر دہ دری شامل نہ ہوئی تو وہ تمدن کتنا بے رنگ اور ان صرف مسلمانوں ہی کا نہیں بلکہ پورے ہندوستانی نان اور پورے ملک کا ہوگا۔

اس خطبہ کا مقصد نہ مولانا محمد علیؒ کی زندگی بیان کرنا ہے اور نہ خلافت کی تحریک کی روداد پیش کرنا ہے بلکہ اس کا مقصد مولانا محمد علیؒ کے کام کی قدر و قیمت ہندوستان کے بڑے نقشے میں متعین کرنا ہے اور اس طرح خلافت کی تحریک کو ہندوستان کے برتر مفاد سے ہم آہنگ کرکے اس کی اہمیت اور معنویت کو جاننا ہے۔ اس کا مقصد ہم کلامی ہے اور اپنے خیالات اور شبہات میں آپ کو شریک کرنا ہے اور یہ سب از روئے استعداد نہیں بلکہ کسب شرف کے طور پر ہے۔

اس میں شک نہیں کہ مولانا محمد علیؒ اپنے عہد کی غیر معمولی شخصیتوں میں سے تھے۔ واقعی دیو پیکر اور جامع صفات، جنھیں قدرت نے ذہن بیدار کے ساتھ قلب، درد و روح کی بے تابی عنایت فرمائی تھی۔ انھوں نے ہماری قومی زندگی کے بہت سے اجارے توڑے اور بہت سے شیشہ گروں کی دکانیں درہم برہم کر دیں۔ انھوں نے بہت سے سہارے کو چھوڑ کر خود اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سکھایا اور یہ بتلایا کہ کوئی تحریک بغیر عوام کی شرکت کے کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اور اسی طرح بغیر ملکی آزادی کے ہماری بین الاقوامی ساکھ بھی قائم نہیں ہو سکتی۔ مولانا محمد علی نے برطانوی حکومت کے خلاف جو شور انگیز آواز بلند کی اس نے یہ ثابت کر دیا کہ ہندو مسلم اتحاد کے بغیر ہم کامیابی کا منھ نہیں دیکھ سکتے۔ انھوں نے یہ بھی اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ اس راستہ کے نشیب و فراز اس وقت تک طے نہیں ہو سکتے جب تک ہم احساس کی شدت کے ساتھ، لیلائے آزادی سے محبت نہ کریں اور اس راہ میں بڑی سے بڑی قربانی سے دریغ نہ کریں عراقی کے الفاظ میں ؎

بعالم ہر کجا درد و محن است بہم کردند و عشقش نام کردند

عشق کے اس راستے میں انھوں نے بہت سی صعوبتیں اٹھائیں، بڑی بڑی کڑیاں جھیلیں، لیکن برطانیہ کے خلاف جس کے اقتدار کا پرچم تا حدِّ نظر لہرا رہا تھا، انھوں نے دار و رسن اور قید و بند کی ہر منزل کو غزل خوانی کے ساتھ طے کیا حتیٰ کہ ان کی زندگی اور پھر موت، خود غزل بن گئی۔ ذیل کی غزل ان کی روحانی زندگی کی آئینہ دار ہے اور اسیری و نظر بندی کی "لطافتوں" کو پیش کرتی ہے:

تنہائی کے سب دن ہیں، تنہائی کی سب راتیں
اب ہونے لگیں ان سے خلوت کی ملاقاتیں
ہر آن تسلّی ہے، ہر لحظہ تشفی ہے
ہر وقت ہے دل جوئی، ہر دم میں مداراتیں
کوثر کے تقاضے ہیں، تسنیم کے وعدے ہیں
ہر روز یہی چرچے، ہر رات یہی باتیں
معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت
اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں

ؔ خطبہ صدارت جو مولانا محمد علی جوہر صد سالہ تقریبات سمپوزیم نئی دہلی میں پڑھا گیا۔

بے ا یہ سہی لیکن شاید وہ بلا بھیجیں
بھیجی ہیں درودوں کی کچھ ہم نے بھی سوغاتیں

اور ان کی موت پر تو خود زندگی کو رشک آیا ہوگا بیت المقدس میں اقبال کے ان اشعار کو پڑھ کر، جو مولانا محمد علی کی وفات پر لکھے گئے تھے۔ دل کی جو کیفیت ہوئی بیان سے باہر ہے ؎

اے خوشا مشتِ غبارِ اُو کہ در جذبِ حرم
از کنارِ اندلس و از ساحلِ بربر گذشت
خاکِ قدس اُو را بہ آغوشِ تمنا در گرفت
سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گذشت

مولانا محمد علی "عقیدوں کا وفاق" چاہتے تھے اور ان کا مقصد خود ان ہی کے الفاظ میں "ہندوستانی مسلمانوں کو کیتھولک عیسائیوں کی طرح، ایک طرف اپنی قومی ریاست کا وفادار شہری بنانا اور دوسری طرف ویٹی کن کی طرح ایک بین الاقوامی مذہبی تنظیم کا وفادار رکن بنانا تھا۔"

مولانا محمد علی کے لیے اسلامی ملکوں اور خصوصاً ترکوں کی حمایت کو، محض جذبات کا معاملہ نہیں کہا جا سکتا جیسا کہ وہ عام مسلمانوں کے لیے تھا۔ ان کا یہ سوچا سمجھا ہوا نظریہ تھا کہ اسلام کی بقا کے لیے ترکی خلافت کو قائم رکھنا اور ایک موثر عالمگیر مذہبی تنظیم بنانا ازبس ضروری ہے۔

بد قسمتی سے یہ نظریہ اسلامی ملکوں کے اندرونی حالات کی غیر حقیقت پسندانہ معلومات اور تشخیص پر مبنی تھا۔ مولانا محمد علی کے اخبار "کامریڈ" کے نمائندوں کے ذرائع معلومات بہت محدود اور ناقص تھے اور انھیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ عام طور پر مسلم ملکوں اور خاص طور پر ان عرب ملکوں میں سلطنت ترکی کے ماتحت ہیں، ان کے ہم خیال بہت کم ہیں۔ اور ان کو مجبور و محکوم ہندوستانی مسلمانوں کی حمایت سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ یہی غضب تھا کہ ترکی کی خلافت ختم ہونے کے بعد بھی یہ مہم شد و مد سے جاری رہی۔

تاہم ان مقاصد کے لیے مولانا محمد علی نے برطانوی حکومت کے مظالم کا جس بے جگری سے مقابلہ کیا اور جس طرح آزادی کی تحریک کو عوام کے اتحاد اور جوشِ عمل میں تبدیل کر دیا وہ ہماری تحریک آزادی کا زریں ورق ہے۔

مولانا محمد علی کے سامنے ہندوستان اور ہندوستانی مسلمانوں کے مستقبل کا کوئی صاف اور واضح نقشہ نہیں تھا۔ ہندوستان ایک برصغیر ہے۔ اس کا رقبہ روس کو چھوڑ کر پورے یورپ کے برابر ہے۔ اس کے مسائل بڑے پیچیدہ اور نازک ہیں۔ ان امور کو لمبی لمبی شرر فشاں تقریروں اور طویل طویل خطبوں سے طے نہیں کیا جا سکتا، چاہے وہ تحریریں اور تقریریں کتنی ہی اچھی اور دلکش انگریزی میں کیوں نہ ہوں۔ مولانا محمد علی کا وہ خطبہ جو انھوں نے کوکناڈا میں بہ حیثیت کانگریس کے صدر کے دیا تھا، کانگریس کی پوری تاریخ میں سب سے لمبا خطبہ ہے اور پورے ساڑھے چار گھنٹے میں ختم ہوا تھا۔ اس میں کا سرجوش زیادہ ہے اور ہم کی آواز مدھم ہے۔ انھوں نے بار بار اس بات پر زور دیا ہے کہ بہ یک وقت "مسلمان" اور "ہندوستانی" ہونا ممکن ہے لیکن کس طرح کا مسلمان ہونا؟ مولانا عبدالباری کی قسم کا؟ مولانا محمود الحسن کے انداز کا؟ یا جناح صاحب کی طرز و روش کا؟ اس کی طرف اشارہ نہیں کیا۔ خطبہ میں وہی جوش و خروش، وہی صحافی کا ساعاجلانہ انداز، وہی اضطراب کی فراوانی اور بصیرت کی کمی، وہی خواب و خیال کی غیر حقیقی فضا ہے جو ان کی زندگی اور شخصیت میں ملتی ہے اس میں فکر کی گہرائی اور جاوداں بن جانے والا جذبہ نہیں ہے۔

یہاں اس کے اعادے میں مضائقہ نہیں کہ ترکی کی حکومت نے ۱۹۲۲ء میں خلیفہ محمد ششم کو معزول کر کے سلطان عبدالمجید کو مسندِ خلافت پر بٹھا دیا تھا۔ اور اس کے اختیارات صرف روحانی دنیا تک محدود ہو گئے تھے۔ ٹھیک اس وقت جب مولانا محمد علی اپنا خطبہ پڑھ رہے تھے ترکی کی اسمبلی نے خلافت کو ختم کر دیا تھا اور سلطان عبدالمجید اور ان کے اعزا کو سوئٹزرلینڈ میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس طرح مولانا محمد علی کی "لطافت لسانی" بے محل اور ان کا جوش و خروش بے بنیاد تھا۔ اور اس غبارہ میں پہلے ہی چھید ہو چکا تھا۔ یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہوگا کہ مسلمان قوم کے آئندہ رہنما یعنی علامہ اقبال اور محمد علی جناح نے خلافت کے اختتام پر ایک آنسو بھی نہیں گرایا۔ لیکن مولانا محمد علی کی ساری کائنات لٹ گئی اور ان کے چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔

خلافت کے دوران جو ہندو مسلم اتحاد پیدا ہوا تھا اس کے متعلق بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ مصنوعی اور غیر حقیقی تھا۔ اس زمانہ میں جو فسادات برپا ہوئے یا جو فسادات انگریزوں نے کرائے، ان میں خاص طور سے قابلِ ذکر مالی گاؤں اور علی گڑھ کے بلوے ہیں جو ۱۹۲۱ء میں ہوئے اس کے بعد ۱۹۲۳ء میں سہارنپور کا ہولناک فساد ہوا موپلا کی بغاوت کی اقتصادی بنیاد تھی لیکن انھوں نے اپنا علیحدہ خلیفہ چن لیا تھا اور ہندو زمین داروں پر پے در پے حملے شروع کر دیے تھے۔

مولانا محمد علی نے اپنی کوکناڈا کی تقریر میں ہندو مسلم اختلافات، تنسیخ تقسیم بنگال، مسجد کانپور، شدھی اور سنگٹھن غرض تمام عصری مسائل کا احاطہ کیا ہے آج وہ کتنے غیر اہم معلوم ہوتے ہیں۔ خطابت کے جوش میں انھوں نے بعض باتیں ایسی بھی کہہ دیں جو آج عجیب و غریب معلوم ہوتی ہیں مثلاً یہ کہ اگر افغانستان کی فوج، انگریزوں کو نکالنے کے لیے ہندوستان پر حملہ کرے تو ہمیں افغانوں کی جان و مال سے مدد کرنا چاہیے بغیر یہ دیکھے ہوئے کہ امیر افغانستان کس درجہ اور کس مسلک کا آدمی ہے یا یہ فرمایا کہ مسلمانوں کو ہندو اکثریت بالکل گوارا ہے اگر کسی طرح خلیفۃ المسلمین اور امیر المومنین کو پورے پورے اختیارات مل جائیں۔

تحریک خلافت کی ناکامی کا سب سے بڑا سبب اس کی بے اعتدالی، جذباتیت اور اس کا رومانی پہلو ہے۔ اس کے بیشتر لیڈر خواب و خیال کی غیر حقیقی دنیا میں رہتے تھے۔ خلافت کا قلع قمع ہو چکا تھا اور ترکی میں سیکولر حکومت

خلافت ڈیلی گیشن برائے لندن ۱۹۲۰ء

(دائیں سے بائیں، مولانا محمد علی، حسن محمد میاں، ڈاکٹر سید حسن، مولانا سید سلیمان ندوی.

قائم ہو چکی تھی اور زمین، پیروں کے نیچے سے نکل چکی تھی لیکن پھر وہ خلافت پر جان دینے کے لیے تیار تھے۔

لیکن خلافت کی تحریک کا سب سے بڑا مثبت پہلو یہ ہے کہ اس نے نیشنلزم کا صور پھونکا اور ہمیں سر سید کی وفادارانہ پالیسی سے نجات دلائی۔ اور علمائے اسلام اور علی گڑھ کے طلبہ، اور متوسط طبقہ نے دل وجان سے تحریک آزادی میں شرکت کی۔ اس تحریک نے جنگ عظیم اوّل کے بعد اور مسلمانوں کو، ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد، پہلی دفعہ 'من حیث القوم' برطانیہ کے خلاف صف آرا کر دیا۔ سر سید کی مجبوریوں اور ان کے خیالات وافکار کو تاریخ کی روشنی میں دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ خلافت کی تحریک دراصل سر سید اور مولانا ابوالکلام آزاد کے گنگا جمنی نیشنلزم کے درمیان ایک ضروری کڑی تھی۔ بغیر اس عبوری منزل کے ہم منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اس لیے محمد علی کو سر سید کا مخالف سمجھنا بھی غلط ہے۔

خلافت نے علی گڑھ کے طلبہ اور اساتذہ کو تحریکِ عدم تعاون میں شریک ہونے کا موقع دیا اور ان ہی کی مدد سے ایک آزاد قومی یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام سے قائم ہوئی جس کا مقصد سچے مسلمان اور سچے ہندوستانی کا آمیزہ تیار کرنا تھا اور جو دراصل علی گڑھ اور دیوبند کے درمیان ایک پل کی حیثیت رکھتی ہے۔

مولانا محمد علی کو ہندو مسلم اتحاد کی اہمیت معلوم تھی اور وہ اس کے لیے ہر قسم کی قربانی اور ایثار کے لیے تیار رہتے تھے۔ بڑے بھائی مولانا شوکت علی قشقہ لگانے، دیر میں بیٹھنے اور عید الضحیٰ میں قربانی چھوڑنے پر آمادہ تھے۔ مولانا محمد علی کا خیال تھا کہ آزاد ہندوستان میں بکری کا گوشت اتنا سستا ہوگا کہ مسلمان گائے کھانا چھوڑ دیں گے۔ افسوس ہے کہ مولانا محمد علی نے مرض کے بجائے مرض کی علامت کو اصل مرض سمجھ لیا تھا۔

تاہم ہمیں اس کا کھلے دل سے اعتراف کرنا چاہیے کہ تحریک خلافت نے نیشنلزم کو فروغ دیا، مغرب کے خلاف صف بندی کی، آزادی کی بنیادوں کو وسیع تر کیا۔ اور جاگیردارانہ قیادت کو ختم کر دیا جو مسلم لیگ کی ولادت سے برابر مسلط تھی۔ اس نے متوسط طبقہ کو جو سر سید کے علی گڑھ کا پروردہ تھا۔ آگے بڑھایا اور اس کے دل میں آزادی کی چنگاریاں روشن کیں۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس تحریک نے ہمیں کوئی ایسا بصیرت افروز سماجی اور اقتصادی پروگرام نہیں دیا جس سے مضبوط بنیادوں پر مستقبل کی تعمیر ہو سکتی۔

مولانا محمد علی نے یہ بات پورے خلوص نیت سے کہی تھی کہ ہندوستان کے مسائل کا حل لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ اور عقیدوں اور مذہبوں کے وفاق میں پوشیدہ ہے جو ایک بلند سطح پر پہنچ کر سیاسی وفاق بن سکتا ہے اور جس پر مولانا آزاد نے وزارتی مشن مذاکرات کے درمیان اتنا زور دیا تھا اور جس کی تائید بہت پہلے ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم نے کاشی ودیاپیٹھ کے جلسہ میں فرمائی تھی۔ ان کے الفاظ یہ ہیں۔ میں اسی اقتباس پر اپنی تقریر کرتا ہوں اور یہی میرے خیال میں اس سمپوزیم کا ماحصل ہے:

"آپ مجھے معاف فرمائیں اگر اس معزز مجمع کے سامنے میں صفائی سے یہ بات پیش کروں کہ مسلمانوں جو چیز متحدہ قومیت سے بار بار الگ کھینچتی ہے اس میں جہاں شخصی خود غرضیاں، تنگ نظری اور دیس کے مستقبل کا صحیح تصور نہ قائم کر سکنے کو دخل ہے وہاں اس شدید شبہے کا بھی بڑا حصہ ہے کہ انھیں قومی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کی تمدنی ہستی کے فنا ہونے کا ڈر ہے۔ اور مسلمان کسی حال میں یہ قیمت ادا کرنے پر راضی نہیں۔ اور میں بہ حیثیت مسلمان ہی نہیں۔ سچے ہندوستانی کی حیثیت سے بھی اس پر خوش ہوں کہ مسلمان اس قیمت کو ادا کرنے پر تیار نہیں۔ اس لیے کہ اس سے مسلمانوں کا جو نقصان ہوگا سو ہوگا ہی۔ خود ہندوستان کا تمدن پستی میں کہاں سے کہاں پہنچ جائے گا۔"

صالحہ عابد حسین

دل دل

وہ انگاروں پر لوٹ رہی تھی !

کیا کرے ؟ کہا جائے ؟ آخر ہوگا کیا ؟ وہ کب تک — کب یہ سہہ سکے گی ؟ کس طرح اس جہنم سے پیچھا چھڑائے ؟ مار کھائی — برداشت کیا — فاقے کیے — کچھ نہ کہا — یہ ڈیڑھ سو روپلی کی گھٹیا نوکری کرائی — کرلی — دن بھر میں کتنی باتیں سننی پڑتی ہیں — کسی دوسرے کے بچے کھلانا اور رکھنا — پتھر کا کلیجہ چاہیے — اور پھر جب ہر وقت دل میں یہ آگ لگی ہو کر خود اپنے بچے — ہائے ایک ہی زندہ بچ جاتا — پورے ہی نہ ہوئے زندہ کیسے بچتے — یہ بھی اسی کے کارن — نہ وہ پہلا ابارشن کرایا جاتا — نہ آج وہ دنیا کی سب سے بڑی نعمت سے محروم ہوتی — بعض وقت کلیجے پر آرے چلنے لگتے ہیں جب وہ بچے اس کے پیار کو ٹھکرا کر کہتے ہیں — ہو پرے — تم ہماری ماں تھوڑی ہو — ممی آئیں گی تو — بڑی ممی کی بچی — دن بھر باہر رہتی ہے عیش کرتی ہے — بچوں کو بھولے بسرے دیکھ لیا تو دیکھ لیا — ساری خدمت بچاری آیا کرتی ہے — اور دن بھر وہ اپنے کاموں میں جان کھپاتی ہے — مگر وہ ممی ہیں — اور میں — اور میں آیا ؟ نہ سہی آیا — ایک درجہ اور بڑھا دو — گھٹیا گورنس ہنہ — گورنس !!

اور پھر شام کو گھر آؤ تو ہنڈیا چولہا کرو — رات کو اس کی ہوس کو پوری کرو — اس پر بھی منھ سیدھا نہیں — اب تک تو سب کچھ باہر ہی ہوتا تھا اب تو سینے پر مونگ دلنے وہ گھر بھی آنے لگی —— !

اس سے لیٹا نہ جا رہا تھا — گھبرا کر اٹھ بیٹھی اور چھوٹے سے صحن کے تین چار چکر لگائے، گھڑے سے ٹھنڈا پانی پیا — سر پر ڈالا — مگر اندر جلتی آگ کسی طرح ٹھنڈی نہیں پڑ رہی تھی

"سوت تو وہ بھی تھی — مگر خیر وہ اس کی قانونی شرعی بیوی ٹھیری — اس کے بچوں کی ماں — اس کے ہاتھوں بھی ذلت سہی تھی — مگر اس وقت یہ میرا تھا — اور آج — آج یہ الٹا مجھے ذلیل کر رہا ہے — اس بڑھیا نے تو خیر دھتکار ہی دیا ہے — باہر الگ جھک مارتا ہے — میری جان الگ کھاتا ہے اتنی عمر ہوئے مگر اس کی جوانی کم بخت خاک میں نہیں ملتی — جانے عورتیں اس میں کیا دیکھتی ہیں ؟"

وہ سوچ میں کھو گئی — اب سوا خودکشی کے اور کوئی چارہ نہیں — میں بھی آشی کی طرح اپنی جان ہی کیوں نہ دیدوں — نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔ ہا — آشی کیسی سوشیل، سندر، ہنس مکھ لڑکی تھی — تین سال تک وہ کیسے دکھ اٹھاتی رہی — ساس نندوں، سسر اور خود پتی کی بدسلوکیاں جھیلتی رہی — اس کا قصور یہی تھا نا کہ اس کے ماں باپ اتنا نہ دے سکے تھے جتنا یہ کم بخت لالچی لوگ چاہتے تھے۔ ان پہ جہیز کی لعنت — یہ لین دین کی مصیبت — یہ لڑکوں کا کال — اور یہ لڑکیوں کے بجائے ان کے ماں باپ کی دولت سے شادی کی ہوس۔ کتنی لڑکیاں جل جل کر، یا آتم ہتھیا کر کے — یا خود سسرال والوں کے ہاتھوں — ختم ہو جاتی ہیں اور اس کی نہ کہیں داد ہے نہ فریاد — اچھا ہوا آشی تم مرگئیں دن رات کی ذلت اور ظلم سے تو چھٹکارا مل گیا — بس میری مصیبت کا بھی یہی علاج ہے — یہی علاج — یوں مروں کہ اس کا دل دہل جائے — بلکہ خود الٹا وہ پھنس جائے کہ اسی نے مجھے پھانسی دی ہے — بچہ جی کو مزہ تو آجائے گا بدکاری کا ——"

اس نے ایک جھرجھری لی۔ آشی کی چھت کے پنکھے میں لٹکی بھیانک لاش اس کی نظروں میں پھر گئی — گردن لمبی ہو کر کھنچ گئی تھی، آنکھیں ابل پڑی تھیں اور زبان باہر نکل آئی تھی — اف وہ حسین لڑکی — اور پھر اس کی لاش کی کیا کیا درگت نہ ہوئی۔ لوگوں نے کیا کیا باتیں نہ بنائیں پوسٹ مارٹم — اور اس کا پتی کھینچا کھینچا پھرا۔ پہلے تو کم بخت نے یہی کہہ دیا کہ اس کا چال چلن خراب تھا — مگر اب — اب خمیازہ بھگت رہا ہے اپنے لالچ کا ..... میں بھی مرجاؤں ! پھانسی — نہیں نہیں — دریا میں چھلانگ لگا دی جائے — مگر دریا تو یہاں سے بہت دور ہے۔ کنویں تو ہیں — اُف لاش پھول کر کیسی بھیانک ہو جاتی ہے — نیند کی گولیاں۔ ہاں — یہ سب سے اچھی ترکیب ہے — مگر اتنی بہت سی گولیاں — کون دے گا — دو سے تو کہیں ذرا سی نیند آتی ہے —

پھر — مذہب — نہیں مذہب میں خودکشی حرام ہے — گناہ ہے —"

" "گناہ — حرام — تو اب تک جو کیا ہے وہ ثواب تھا۔ مذہب نے اس کی اجازت دی تھی — بولو — بولو نا —"

یہ اندر سے کون بول رہا ہے — کون ہے یہ — کون ہو تم ؟

" میں جس کا تم نے گلا گھونٹنا چاہا — مگر دیکھ لو میں اب بھی زندہ ہوں — تمہارے کرتوت — یہ کالے کرتوت —"

" کیا ہیں میرے کرتوت ؟ " وہ جھنجھلا رہی تھی۔ بچر رہی تھی — "کیا کیا ہے میں نے ؟ کون سا گناہ تھا یہ کہ اپنے لیے خود شوہر تلاش کر لیا — اتنی عمر ہو گئی تھی — کسی نے پرواہ نہ کی — باپ کو اپنے کاموں سے کہاں فرصت تھی — اور پھر یہ عذر کہ میرے پاس روپیہ کہاں ہے ؟ " ماں ٹھیری اپاہج اور بے پروا — بھائی —! ہنھ۔ اسے میرا خیال کیوں ہوتا — کیا میں اس کی سگی تھی — کوئی

پوچھتا کہتا جوان لڑکی ہے ــ بیاہ کردو ــ تو ہر ایک کا یہی جواب ، بَر کہاں
ہے ــ لوگ خوبصورت لڑکی چاہتے ہیں ــ تعلیم چاہتے ہیں ــ پیسہ
چاہتے ہیں ــ تو آخر بدصورت پیدا کرنے کی ذمہ داری کس کی ہے ؟ تعلیم
نہ دلانا کس کا قصور ہے ــ پیسہ اڑا دیا ــ یہ کس کا دوش تھا ــ بجو کی
شادی میں سب لگا دیا میرے لیے کچھ نہ بچا ــ ہنہ بجو میں سوا پیلی چمڑی کے
اور کیا حُسن تھا ؟ اور میر ذرا رنگ ہی تو دبتا ہے اور بس ذرا قد چھوٹا ــ
ورنہ ــ ورنہ ان سے ہزار درجہ اچھی ہوں ــ اچھی نہ ہوتی تو وہ ــ وہ
مجھ پر فدا کیسے ہوتا ــ لوگ لوگ کون ــ وہی کہتا تھا کہ تجھ میں وہ کیا
ہوتی ہے کم بخت کیسی اپیل ؟ ؟ وہ ہے ! مرد اسی پر مرتے ہیں ــ صورت
پر نہیں ــ تو کیا اب مجھ میں کچھ نہیں رہا ــ کیا چار پانچ سال میں میں
بڑھیا ہو گئی ــ کیا اس کی محبت ــ جھوٹی تھی ــ جھوٹی تھی کیا ــ"
وہ پھبک کر رو پڑیں۔ جس کے لیے ماں باپ ، بہن ، بھائی۔ کنبہ۔ گھر سب
چھوڑ دیا ــ سب چھوڑ دیا ــ وہ بھی اب اپنا نہیں ؟ ؟
اگر ماں نے یا باپ نے یا اور کسی بزرگ نے کوئی ڈھنگ کا لڑکا
ڈھونڈا ہوتا ــ مگر کیوں ڈھونڈتے ــ پھر اپاہج ماں کی خدمت کون کرتا
شرابی باپ کے لیے کھانا کون پکاتا ، چھوٹے بھائی کی ناز برداریاں
کون اٹھاتا ــ کوئی بھولا بھٹکا پیام آتا بھی تو اسی میں عیب نکال دیے جاتے ۔
ذات پات ٹھیک نہیں ــ چال چلن اچھا نہیں ــ دور بہت ہے ــ یا
پیسہ نہیں ــ تعلیم بہت کم ہے ــ ہُنہ ــ تعلیم ــ پیسہ ــ اور جوانی تھی
کہ اُسے پیسے ڈال رہی تھی ــ کچلے دے رہی تھی !
" یہ بے پروا و بے حس بزرگ ــ یہ جوان ــ یہ لالچی خود غرض نوجوان
وہ کس کی بھینٹ چڑھی ــ کس کی کس کی ــ کس کا قصور تھا ــ میرا یا اس
سماج کا ــ اسی رسم و رواج کا ــ اس ــ اُس ــ"
" سبھی قصوروار تھے ــ سماج بھی ــ بزرگ بھی ــ آج کے نوجوان
بھی ــ ان کے لالچی ماں باپ بھی ــ خاندان بھی ــ مگر ــ مگر ــ"
" مگر کیا ــ"
" مگر سب سے زیادہ قصور تمہارا تھا ــ جو اس بدمعاش بدکردار کے
جھانسہ میں آئیں ــ قبول دو ــ اب اتنی ذلت اور دکھ اٹھانے کے بعد
تو قبول دو ــ کہ تم اس کے ظاہر پر فدا ہو گئیں ــ تمھیں ایک مرد چاہیے تھا۔
اور وہ تمھیں مل رہا تھا ــ تم نے آنکھیں بند کرلیں۔ چہرے کی بھی ــ عقل
کی بھی ــ نہیں تو ــ کیا تم سے یہ چھپا تھا کہ اس کی بیوی ہے ــ بچے ہیں ۔
کیا تم نہیں دیکھتی تھیں کہ وہ ان سے کیا سلوک کرتا ہے ! ــ کیا اس
کے چال چلن کے افسانے مشہور نہ تھے ــ مگر تم تو پاگل ہو رہی تھیں اس
کے پیچھے ــ اور ــ اور تمہارے اندر چھپے انتقام کا جذبہ تھا ــ
ماں سے باپ سے ــ بہن بہنوئی سے ، سب سے انتقام لینے کا ــ
سماج سے ــ خاندان سے ــ ان لوگوں سے جنھوں نے تمھیں ٹھکرا
دیا تھا ــ"
" ہاں ہاں میں اندھی ہو گئی تھی ــ اس کی محبت میں اندھی ــ
مگر میں نے آخر کس سے انتقام لیا ــ سب اپنی اپنی جگہ مزے سے ہیں۔
دو چار مہینے لوگوں نے تانے تشنے دیے پھر سب چپ ہو گئے ــ ارے
وہ لوگ تو الٹے خوش ہوئے۔ آخر کم سے کم پانچ چار ہزار روپیہ بیاہ
میں خرچ ہوتا ــ اس سے بھی بچ گئے ــ اور اب تو ــ سب ملتے
ہیں ــ بلاتے ہیں۔ مجھ سے کیا اُس سے بھی۔ دنیا بکتی ہے تو بکا کرے ــ
" پھر رو کیوں رہی ہو ــ قسمت کو کیوں کوستی ہو ــ پھیری منھ پر
لُوئی تو کیا کرے گا کوئی ــ بے حیا کی بلا دور ــ"
" بکومت ــ میں نے کیا کیا ہے ــ نکاح کرنا کیا جرم ہے۔
گناہ ہے ــ"
" نکاح ؟ وہ فراڈ ؟ وہ دنیا کو دھوکا دینے کے لیے . . . خیر جانے
دو ــ اس کا خمیازہ بھی تمھیں بھگت رہی ہو ــ"
" خمیازہ ــ خمیازہ کیا ہوتا ہے ؟ ــ"
" ہُنہ اتنا بھی نہیں جانتی . . . جو کچھ کیا ــ جو کچھ سہا ــ اس
کا نتیجہ ــ کہ زندگی کی سب سے بڑی مسرت سے محروم ہو ــ کیا تم
ــ تم خوش ہو ــ ؟ "
" خوش ہے کون اس دنیا میں ــ اور بیاہ نہ کرتی تو کیا خوش
رہتی ؟ آخر میرا گھر ہے ــ میرا شوہر ہے ــ کیا ہی برا سہی مگر میری
حفاظت تو کرتا ہے ــ چاہتا تو ہے ــ اچھا اب نہ سہی ، پہلے تو
چاہتا تھا ــ سب کہتے تھے وہ مجھے بھی چھوڑ دے گا ــ مگر دیکھ لو . . "
" دیکھ میں کیا سبھی رہے ہیں ــ تنخواہ چھین لے جانا ــ روز کی مار
دھاڑ گالی گلوچ ــ اور یہ گل چھرّے ــ"
" سبھی مرد ــ"
" سب مردوں کو بدنام نہ کرو ــ تم نے جس اس پر جان دی اس
وقت یہ نہ سوچا کہ جو آج وہ تمہارے ساتھ کر رہا ہے پہلی کو جلا رہا ہے ــ
کل ۔ وہی ــ وہی ــ"
" وہ کبھی میرے ساتھ بے وفائی نہ کرتے ــ مگر وہ عورت وہ کم بخت
بے حیا حرافہ ــ دوسرے کے میاؤں پر ڈورے ڈالنے والی . . . کمینی ــ"
ایک طنزیہ قہقہہ کہیں سے اس کے کانوں سے ٹکرایا ــ " حرافہ ،
کمینی ــ یہی سب تم نے بھی تو سنا تھا ــ بھول گئیں ــ جب تم اپنی
پیاری اپیا کے پاس گئی تھیں اس کے ساتھ ــ ہاں اپیا اپیا کر کے ہی تو تم
نے اس کو پرچایا تھا ــ دھوکا دیا تھا ــ اس کے میاں پر ڈورے ڈالے
تھے ــ اس دن کیسی شبہ کی نظروں سے وہ تمھیں دیکھ رہی تھی ــ بچوں کو
تمہارے سامنے مارا تھا ــ کہتی رہی تھی دور ہو جاؤ میری نظروں سے ــ
کیسے کہہ رہی تھی ــ تمھیں ؟ یا بچوں کو ــ خیر تم نے تو بچوں ہی کو سمجھا ــ

اور وہ تمھارا چاہنے والا مسکرا کر — تمھیں چھیڑ کر، آنکھیں مار کر اسے جلا رہا تھا — اور پھر کئی بار جب ایسا ہوا تو ایک دن — ایک دن اس نے — یہی لفظ — ارے یہی جو ابھی تم اپنی غیر شرعی غیر قانونی سوت کو کہہ رہی تھیں — اس نے تمھیں نہیں کہے — نہیں کہے تھے ؟ '

" کہے تھے تو انھوں نے ایک جھانپڑ بھی تو مارا تھا اُسے —"

" شرم نہیں آتی — اس پر خوش ہو رہی ہو — پندرہ سالہ بیاہتا بیوی تین بچوں کی ماں کو اس نے مارا اور تم بیٹھی مسکراتی رہیں — تم نے اس وقت یہ نہ سوچا کہ وہ اسے ذلیل کر رہا ہے — تمھارے سامنے — اس کے بچوں کے سامنے تو ایک دن تمھیں — تمھیں بھی . . . . ."

" ہاں ہاں — میں احمق تھی — گدھی تھی — اندھی ہو گئی تھی اس کی محبت میں — پرسوں اس نے اس کمینی کے سامنے — میرے چھوٹے بھائی اور بھابی کے سامنے مجھے برا بھلا کہا — اس سے لاڈ پیار کرتے رہے، کھانا پکوا کر کھلوایا۔ ہاں اپیا نے کہا تھا — اس دن — اس دن کہا تھا — میری آہ تجھ پر پڑے گی —۔ تو بھی یوں ہی ذلیل ہوگی — اس وقت میں تڑپ کر رہ گئی تھی — اور آج — اور آج —"

" آج وہی سب دہرایا جا رہا ہے — پانچ سال کے اندر اندر تم پرانی جوتی ہو چکی ہو — بڑھیا چکی ہو —"

" اور وہ بڈھا نہیں ؟ "

" مرد کا دل جوان ہو تو وہ کبھی بڈھا نہیں ہوتا — ارے ایک سے ایک بڑے مشہور آدمی کو دیکھ لو — سیاست دانوں میں، فن کاروں میں، رئیسوں اُمیروں میں معمولی لوگوں میں — کہاں تمھیں ایسے مرد ملیں گے جو بڑھاپے میں جوان نہ بنتے ہوں ؟ تم جیسی بھولی بھالی — یا لالچی — یا آپے سے باہر لڑکیوں کو . . . یا فرسٹریٹڈ عورتوں کو دھوکا دے کر . . . !

" خدا کے لیے — خدا کے لیے چپ ہو جاؤ — میں یہ سب کیا جانتی تھی ؟"

" ہاں تم تو سمجھتی تھیں نکاح ہو گیا — وہ دیر میں سہی — راز داری کے گھر میں سہی ہو تو گیا — اب تم ستی ساوتری بن کر رہو گی — دوسروں پر فقرے کسو گی — دوسری عورتوں پر لعن طعن کرو گی — اوئی تو یہ کیا دھرا ہے آج کل کی لڑکیوں کا — ہے نا یہی بات . . . ."

وہ لرز رہی تھی — آج ہی ساری باتیں کیوں یاد آ رہی ہیں — وہ اپیا کا اسے نفرت بھری نظروں سے دیکھنا — میاں کو دیکھ کر تھوک دینا — اور پھر ایک دن وہ بچوں کو لے کر میکے چلی گئیں — پلٹ کر نہ آئیں — کھاتے پیتے گھر کی ہیں نا — وہ اس وقت کتنی خوش ہوئی تھی — اب گھر اس کا ہے — میاں بلا شرکتِ غیرے اس کا ہے — کوئی پشیمانی نہ تھی۔ کوئی احساسِ گناہ نہ تھا — ہر چیز سے بے نیاز — وہ تھی اس کا عاشقِ زار شوہر تھا — مگر — مگر پھر — اور بعد کے واقعات ذہن میں برمے کی طرح سوراخ کر رہے تھے . . . ." اس کی نظر میں پھرتی گئیں —

اور اب یہ چڑیا تک — چالاک عورت — ہو گی مجھ سے کوئی دس برس بڑی — گوری چٹی ہے تو کیا ہوا — صورت کیسی منحوس ہے — وہ اب اس پر فدا ہے — اتنا ہی نہیں اسے اب گھر پر لانے لگا ہے — اور — اور اف — پرسوں اس نے مجھے مارا — مارا مجھے — گالیاں دیں —"

" خدایا — خدایا — کیا کروں — کہاں جاؤں — کس سے فریاد کروں ؟ میکہ — مگر میکے میں دوسروں کی جوتیاں سیدھی کرنے کی جگہ تو جیسا بھی ہو اپنے گھر — اپنا میاں — مگر کے دن — اگر وہ کسی دن نکاح کر کے اسے لے آیا تو — تو —" نہیں بس اب خودکشی ہی اس کے درد کا درماں ہے —" اللہ تو اور گناہوں کے ساتھ یہ بھی معاف کر دیجو "

مگر پھر آشی کی بھیانک صورت نظروں میں پھرنے لگی —" نہیں نہیں — خودکشی نہیں — میں اس سے انتقام لوں گی — اسے مار ڈالوں گی۔ پھر مجھے خود ہی مار دیا جائے گا — آج فیصلہ ہونا ہے — یا وہ نہیں — یا میں نہیں —"

تین رات کی جاگی، دو دن کی بھوکی کمو کی آنکھ جھپک گئی۔

اچانک وہ جاگ پڑی۔ اس کا " عاشق زار " شوہر اس پر جھکا پکار رہا تھا: " کمو — کمو میری جان — سو گئیں کیا "

" ہنھ " اس نے نفرت سے کہا اور جھٹکے سے کروٹ بدل لی۔

" روٹھ گئیں میری رانی — لو اب تھوک دو غصہ — معاف کر دو ہمیں۔ وہ بڑھیا چڑیل — کہاں تم — کہاں وہ — ارے یہ تو ایسے ہی دل کا بہلاوا ہوتی ہیں . . . . بیوی کی سی عزت . . . "

یہی سب وہ اپیا سے کہا کرتا ہوگا — اس کے لیے۔

" لو اب مان جاؤ نا — معاف کر دو نا — دیکھو ہم کیا لائے ہیں تمھارے لیے — یہ گلاب جامنیں ہیں — اور بھئی یہ تمھاری پسند کے گرما گرم کباب اور خمیری روٹی — اور . . . "

اس کی بھوکی آنتیں ہر احتجاج کو ٹھکرا چکی تھیں۔ احساس بے بسی غیرت کو نگل رہا تھا — وہ ٹھٹکی " ہو پرے —" اندر والا چپکے سے پھر گہرے غار میں چلا گیا۔

" میری جان — لو کھاؤ — وہ نوالہ بنا کر اپنے ہاتھ سے کھلا رہا تھا — " دیکھو — ہم اور کیا لائے ہیں اپنی لاڈو کے لیے —" اس نے — مردوں کی سی شان کے ساتھ کہا اور ساتھ ہی ایک تھیلے میں سے کچھ نکالنے لگا۔

لائے ہوں گے جہیتی کا کلیجہ —"

اب وہ نخرے کر رہی تھی۔

" جہیتی کی ساڑھی " اس نے ایک جادوگر کے سے انداز میں پٹارے میں سے نکال کر جیسے کوئی کرشمہ دکھایا۔

(بقیہ صفحہ ۲۲ پر)

کرشن موہن

جبرِ ایماں

خوش ہوا شاہی پروہت
گھونپ کر خنجر دھڑکتا دل نکالا جسمِ انسانی سے اُس نے
اور چڑھایا اُس کو اپنے دیوتا پر۔
جو ہوا قربان اک مردِ جواں تھا
اُس کو سمجھایا گیا تھا
اپنی قربانی سے ہو جائے گا آخر جاوداں وہ۔
تھا قیامت جبرِ ایماں
کس قدر بھٹکا ہوا تھا ذہنِ انساں

.. ..

خوبصورت نوجواں عورت بھی شوہر کی چِتا میں جل گئی — بھولی جاتری
اُس جگہ اب ایک مندر بن گیا ہے۔
یاتری آنے لگے ہیں۔
جو ستی ہوتی تھی اُس کو
لوگ کہتے تھے ساوتری
ہے مگر اپنی جگہ سچ
کیا یہ تھا میلانِ فطری ؟

.. ..

گرچہ ستیوں کے سمارک بھی بنے ہیں۔
درحقیقت وہ ستی کی رسمِ سنگیں
نفسیاتی قتل ہی تھا۔
اور پھر دختر کشی بھی
تھی فسونِ شانِ باطل
حاصلِ ایمان قاتل
قلبِ انساں تھا رہینِ جبرِ ایماں

.. ..

لوگ بدروحوں، چڑیلوں اور بھوتوں کو بھی پہلے مانتے تھے
یوں بزعمِ خود بقا کی اصلیت پہچانتے تھے
اور ایسی عورتوں کو
جن کو بدروحیں سمجھتے تھے جلا دیتے تھے زندہ
حیف ایمانِ درندہ

.. ..

وہم پر مبنی تھا ایماں
کس قدر بھٹکا ہوا تھا ذہنِ انساں!

بلجیت سنگھ مطیر

قطعات

(۱)

داغِ سجدہ نہ ہوگا جس پہ کوئی
میں تجھے ایسی اک جبیں دوں گا
پھینک دے کاسہ تُو گدائی کا
میں تجھے دولتِ یقیں دوں گا

(۲)

جھوٹی انا کی بندشِ رعب و وقار پھینک
دل سے غم و نشاط کا گرد و غبار پھینک
آزاد رہ تو صورتِ بادِ صبا مطیر
زنجیریں جس قدر ہیں تو ان کو اتار پھینک

(۳)

دِل پر ذرا سا بوجھ ہے، کچھ انتشار ہے
تاروں بھرا سکون بھی کچھ بے قرار ہے
صورت سے آشنا، نہ ترے جنس و نام سے
تو کون ہے کہ جس کا مجھے انتظار ہے

(۴)

اک عجیب موڑ پہ وہ رشتے سبھی توڑ گیا
جب پڑی اس کی ضرورت تو وہ منہ موڑ گیا
ہم سفر اپنا رہا دن کے اجالے میں مگر
رات جب آئی تو خورشید ہمیں چھوڑ گیا

(۵)

شب کے سینے کو کھنگالیں تو کوئی بات بنے
نیا خورشید نکالیں تو کوئی بات بنے
وقت کے سانچے میں ڈھل جانا تو کچھ بات نہیں
وقت کو سانچے میں ڈھالیں تو کوئی بات بنے

محمد حسن

غالب اور عہد غالب

غالب کا زمانہ نظیر اکبرآبادی کے شہر آشوب سے شروع ہوتا ہے جس میں آگرے ہی کی نہیں، پورے شمالی ہند کی تباہی اور ہر پیشے اور طبقے کے لوگوں کی بربادی کا المیہ نظم ہوا ہے۔ یہ تباہی نتیجہ تھی ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتصادی استحصال کا جس نے ہندوستان کے صنعتی مراکز کے چراغ گل کر دیئے اور ہندوستانی معیشت کا شیرازہ درہم برہم کر ڈالا اور اس استحصال کا نتیجہ تھا وہ تمول جس نے برطانیہ عظمیٰ کے لیے صنعتی انقلاب کا راستہ ہموار کیا۔ سرمایہ فراہم ہوا، کارخانے کھلے نئی نوآبادیاں فراہم ہوئیں۔ فارغ البالی اعلیٰ ہی نہیں متوسط طبقوں تک بھی جا پہنچی۔ پھر اس فراغت نے رومانیت کو جنم دیا جو تخئیل کی ست رنگی دھنک کے پر لگا کر اڑی۔ کبھی جذبے کی توانائی کی شفق رنگ سرمستیوں سے رقص کرتی رہی۔ اس نے الفت کے دل نواز نغمے جگائے۔ ڈیلا کروا اور ٹرنر اور دوسرے قبل ریفائیلی مصوروں کی شاہکار تصویروں میں ہوش ربا رنگ بھرے Pugins اور رسکن کے فن تعمیر کو جلا دی، ترجنیف اور فلابیر کی لطافت اور ڈکنس، دستافسکی اور بالزاک کے سماجی رزمیوں کی صلابت کو نکھارا۔ آخر کسی مورخ کا یہ قول بے جا نہیں ہے کہ انیسویں صدی کی تاریخ کے ہر صفحے پر ترقی اور آزادی Progress & Liberty کے الفاظ کندہ ہیں۔ ترقی مفروضہ سہی، آزادی موہوم سہی مگر ان تصورات پر بے پناہ اعتماد اس صدی کے افراد اور قوم دونوں کے لیے حرز جان ہے اور آخر طبقاتی ناہمواری سے ٹکرانے والے انہی تصورات نے مارکس کی اشتراکیت کو پیدا کیا جس نے غالب ہی کے دور میں ایک فکری انقلاب کی داغ بیل ڈالی تھی۔

اس عالمی پس منظر سے ہوتے ہوئے ہندوستان پر نظر ڈالئے تو غالب کا دور عظیم شکست و ریخت کا دور دکھائی دیتا ہے۔ ایک صدیوں پرانا نظام جڑ سے اکھاڑ پھینکا جا رہا تھا اور اس کی جگہ ایک بالکل نئے ہی نہیں اجنبی نظام کی داغ بیل ڈالی جا رہی تھی پھر یہ نظام محض سیاسی نہیں تھا بلکہ سماجی، فکری اور تہذیبی اقدار کا ایک پورا سلسلہ تھا جو اندرونی تضاد اور بیرونی ٹکراؤ سے دوچار تھا۔ غالب کا دور نظیر اکبرآبادی کے شہر آشوب سے شروع ہو کر داغ کے اس شہر آشوب پر ختم ہوا جسے اقبال نے بغداد کی تباہی پر سعدی شیرازی کے مرثیے اور دولت غرناطہ کی بربادی پر ابن بدروں کی دردناک فریاد کی صف میں جگہ دی ہے۔ ایسے دل دوز مرثیے عہد نہیں تہذیبوں کے غروب پر وجود میں آتے ہیں اور تاریخ کے موڑ ہی پر سننے کو ملتے ہیں۔ غالب تاریخ کے ایسے ہی موڑ پر زندہ تھے۔

نظیر کے شہر آشوب سے داغ کے شہر آشوب تک ہندوستان پر بہت کچھ بیتی۔ سیاسی شکست اور سماجی ابتری صدیوں پرانی تہذیب اور اس کے نظام اقدار کو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر للکار رہی تھی اگر تمہارا نظام اقدار اپنی آستین میں بجلیاں رکھتا ہے تو آخر کیوں ہر لمحہ پسپائی کا شکار ہے۔ نئے حالات میں تمہاری تہذیب کون سے اسم اعظم کو کام میں لانا چاہتی ہے اگر کوئی عمل دفتر میں ہے تو اس کے پیش کرنے کا وقت آیا ہے۔

غالب کے دور نے اس للکار کا کس طرح جواب دیا، جواب ایک ہی نہیں تھا کئی جوابات تھے۔ گویا غالب کے دور کے سامنے فکری متبادلات کے پورے سلسلے کی تفہیم خود غالب کی تفہیم کے لیے ضروری قرار پائی ہے۔ غالب کی پیدائش سے پہلے شاہ ولی اللہ اپنے مکتوبات اور تصانیف میں اس مسئلے کا حل اسلام کے اصل اصول کی طرف واپسی کی شکل میں تلاش کر رہے تھے۔ شاہ ولی اللہ نے جہاں ایک طرف حجتہ اللہ بالغہ میں وحدت الوجودی اور وحدت الشہودی نظریات کے درمیان تطابق تلاش کر کے شریعت اور طریقت کے ملاپ کی راہ نکالی وہاں شیعہ اور سنی نظریات کے درمیان بھی اتفاق پیدا کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ انھوں نے شیعوں کے خلاف کفر کا فتویٰ دینے سے انکار کر دیا تھا (ذوق۔ سوانح اور انتقاد۔ صفحہ ۱۹) لیکن اسی کے ساتھ ساتھ شاہ ولی اللہ نے جہاں نچلے طبقوں پر سے مالی بوجھ کم کرنے اور بیت المال کے سرمائے کو قومیانے کا مشورہ دیا جو اس دور کے سماج میں نہایت ترقی پسند اقدامات تھے وہاں انھوں نے اسلام کے احیائی پہلو پر بھی بہت زور دیا جس کا رشتہ آگے چل کر وہابی تحریک سے جا ملا۔ یہی سلسلہ غالب کے دور میں شاہ عبد العزیز نے جاری رکھا۔ مختصر یہ کہ دینی احیا کو اس دور کے مسائل کے حل کے طور پر پیش کیا گیا۔ یعنی اگر اسلام کا قرن اول کا وہ روپ اختیار کر لیا جائے جو وہابی رہ نماؤں کے نزدیک درست تھا تو اس کی گنجائش تھی کہ سیاسی انحطاط ختم ہو جائے اور ہندوستان میں مسلم حکومت قائم رہے۔

اس طریق کار کے بعض مبارک پہلوؤں سے انکار ممکن نہیں۔ اس تحریک نے جہاں ایک طرف اجتہاد کا دروازہ کھولا اور اپنے زمانے کے تقاضوں

اور اپنے دور کے مسائل کے پیش نظر عقل کی روشنی میں اصول وضوابط کی تشریح و توجیہہ کا حق عام کر دیا، اوہام اور ضعیف الاعتقادی سے نجات کا سامان پیدا کیا اور پوری قوم میں عسکریت، نظم وضبط اور فعالیت کا جوش پیدا کر دیا۔ وہاں یہ بھی نہ بھولنا چاہیے کہ اس کا رخ دھارے کے خلاف تھا جو ہندوستان میں بلا لحاظ مذہب وملت ہر شعبۂ حیات میں مشترکہ گنگا جمنی کلچر کی طرح ابھر رہا تھا۔ اس تحریک میں ادعائیت تھی اور ایک ایسا علحدگی پسند احیا پرستی کا رنگ تھا جو ہمہ گیری اور ہمہ جہتی کے بجائے سخت گیری اور کٹھ ملائیت کی طرف لے جاتا تھا اور مصوری، موسیقی، ادب اور تہذیب کے اس تمام عظیم الشان ورثے سے ہمیں محروم کر سکتا تھا جو ہندوستان کے ہندو مسلم عوام کی صدیوں کی کمائی ہے۔

تصوف کی طرف وہابی تحریک کا عام رویہ اس کی محض ایک مثال ہے جسے اقبال کے لفظوں میں "مسلک گوسفندی" کہہ کر ٹالا نہیں جا سکتا کیونکہ اسلامی تصوف اور بھگتی تحریک نے باہمی میل سے ہندوستان کو ایسا مشترکہ کلچر دینے میں اہم حصہ لیا ہے جو مذہب اور علاقے کے اختلافات سے اوپر اٹھ کر لوگوں کو ایک مشترکہ رشتے میں پروتا ہے۔ یہ تحریک غالب کے ایک اہم ہم عصر مومن کو متاثر کرنے میں کامیاب ہوئی۔ گو سید احمد شہید کی دینی مساعی سے دلچسپی اور اپنے ذوق جہاد اور شوق شہادت کے وظیفۂ لب کے باوجود مومن بقول ظہیر احمد صدیقی سیرت کے تضاد سے خالی نہیں تھے۔ "اگر وہ ایک طرف رند شاہد باز اور صاحب جیسی بہت سی کافر اداؤں کی زلف گرہ گیر کے اسیر تھے تو دوسری طرف شاہ عبدالعزیز کے حلقۂ ارادت کے ایک سرگرم کارکن بھی تھے" بقول خواجہ احمد فاروقی ان کے ہاں نظارۂ جمال بھی تھا اور شوق وصال بھی، غرفہ و بلم بھی تھا اور کوچۂ رقیب بھی۔" تجدید دین کی تحریک کا یہ احیائی پہلو جو مشترکہ ہندوستانی تہذیب کے جلوۂ صد رنگ کے منافی تھا مومن کے دوسرے ہم عصر شاعروں کو متاثر نہ کر سکا۔ شاہ نصیر نے تو اس تحریک جہاد کا مذاق اڑایا جس پر حامیان تحریک ان کے مکان پر چڑھ آئے مگر کوتوال شہر کی بر وقت مداخلت پر ہنگامہ فرو ہو گیا۔ شاہ نصیر نے مجاہدین کے خلاف جو اشعار کہے تھے وہ یہ ہیں:

کلام اللہ کی صورت ہوا دل ان کا سی پارہ   نہ یاد آئی حدیث ان کو نہ کوئی نص قرآنی
ہرن کی طرح میدان وغا میں چوکڑی بھولے   اگرچہ تھے دم حملہ کے وہ شیر نیستانی

(بحوالہ آب حیات، ظہیر احمد صدیقی صفحہ ۳۰۴ صفحہ ۱۴۱)

لیکن جہاں تک اجتہاد اور اجتہاد میں عقل سے کام لینے کا سوال ہے اس تحریک کے اثرات ہم عصر شاعروں اور ادیبوں نے قبول کیے۔ ادیبوں میں سر سید احمد خاں کا نام سر فہرست ہے اور شاعروں میں ان اثرات کے ضمن میں مولانا الطاف حسین حالی کا یہ بیان یادگار غالب سے نقل کرنا بے جا نہ ہوگا۔

"مولانا فضل حق مرحوم مرزا کے بڑے گاڑھے دوست تھے چونکہ مولانا کو وہابیوں سے سخت مخالفت تھی، انھوں نے مرزا سے بہت اصرار کے ساتھ یہ فرمائش کی کہ فارسی میں وہابیوں کے خلاف ایک مثنوی لکھ دو جس میں بڑے بڑے اور مشہور عقیدوں کی تردید اور خاص کر امتناع نظیر خاتم النبیین کا مثل ممکن بالذات اور ممتنع بالغیر ہے، ممتنع بالذات نہیں ہے یعنی آنحضرت کا مثل اس لیے پیدا نہیں ہو سکتا کہ اس کا پیدا ہونا آپ کی خاصیت کے منافی ہے نہ اس لیے کہ خدا اس کے پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے، برخلاف اس کے مولانا فضل حق کی یہ رائے تھی کہ خاتم النبیین کا مثل ممتنع بالذات ہے اور جس طرح خدا اپنا مثل پیدا نہیں کر سکتا اسی طرح خاتم النبیین کا مثل بھی پیدا نہیں کر سکتا۔۔۔ مرزا اول بار مثنوی لکھ کر مولانا کے پاس لائے تو مولانا نے فرمایا کہ یہ تم نے کیا لکھا ہے کہ متعدد عالموں میں متعدد خاتم ہو سکتے ہیں نہیں بلکہ اگر لاکھ عالم خدا پیدا کرے تو بھی خاتم النبیین ایک ہی ہوگا۔۔۔ جس طرح میں کہتا ہوں اس طرح بیان کرو۔۔۔ انھوں نے مولانا کے حکم کی فوراً تعمیل کی اور چند شعر کا اضافہ کر کے کلام مربوط کر دیا۔۔۔ اور پھر مثنوی کو ان دو شعروں پر ختم کر دیا۔۔۔

منفرد اندر کمال ذاتی است   لاجرم مثلش محال ذاتی است
زیں عقیدت برنگردم والسلام   نامہ را درمی نوردم والسلام

حالی لکھتے ہیں، مرزا کی راست بیانی نے اس ٹیڑھی رائے کے تمام بل نکال ڈالے

(یادگار غالب ص ۸۲)

صاف ظاہر ہے کہ غالب، مومن کی طرح احیا پسندی کا حل قبول نہ کر سکے۔

دوسرا متبادل حل تھا اس دور کی مغلیہ سلطنت کے جاری رہنے اور اس کے مستحکم کرنے کا۔ اس سلسلے میں ایک نہایت دلچسپ بحث عابد علی عابد نے تنویر احمد علوی کی کتاب "ذوق سوانح اور انتقاد" کے دیباچے میں اٹھائی ہے نقطۂ آغاز خلیق احمد نظامی کی تاریخ مشائخ چشت کا یہ بیان ہے:

"سلطنت دم توڑ رہی تھی لیکن ذہنی شعور ابھی مردہ نہ ہوا تھا کچھ بیدار مغز انسان تجدید واحیا کے نئے راستے تلاش کر رہے تھے ان تمام کوششوں کے باوجود دہلی دھوپ اور چھاؤں کا شہر تھا۔ یہاں خانقاہیں بھی تھیں اور شراب خانے بھی۔ مدرسے بھی تھے اور قمار بازی کے اڈے بھی۔ لوگ بڑی عقیدت اور ارادت کے ساتھ خانقاہوں اور مزارات پر حاضر ہوتے تھے پھر اسی جوش اور ولولے کے ساتھ طوائفوں کی محفل میں بھی شرکت کرتے تھے۔ ان کی رندی اور مذہبیت ساتھ ساتھ چلتی تھی، نہ رندی مذہبیت پر غالب آئی نہ مذہبیت رندی پر"

صفحہ ۳۴

عابد علی عابد نے ٹائن بی کے "مقتدر اقلیتوں" والے نظریے اور اسپیر کی تہذیبی شہادتوں کو ملا کر یہ نتیجہ نکالا ہے۔

"بہادر شاہ کے زمانے کی دہلی کی ثقافتی سطح کے نیچے بھی ایک معنویت تھی"

صفحہ ۱۹

"انیسویں صدی کی دہلی میں خطرہ اندرونی نہ تھا، فشار بیرونی تھا۔ انگریز چاروں طرف چھا گئے تھے۔ ضرورت تھی کہ نہ صرف شیعوں اور سنیوں کو متحد کیا جائے بلکہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں بھی اتحاد کامل پیدا کیا جائے تاکہ ایک سیاسی انقلاب رونما ہو سکے۔ ہندو مسلمان مل جل کر جو میلوں ٹھیلوں میں شریک ہوتے تھے تو وہاں بلغیر خدشے کے ایک دوسرے کے دل کی بات کر سکتے تھے۔ میلوں کے ہجوم کے پردے میں جان پر کھیلنے والے چپاتیاں بھی تقسیم کر جاتے ہوں گے۔ راکھی، پنکھا، مہرولی کے جلسے اور دہلی شہر کی مختلف تقریبات چھپ کر کام کرنے والوں کے لیے نہایت اچھی آڑ مہیا کرتی تھیں اور میری نظر میں یہ بات معنی خیز ہے کہ بہادر شاہ بہ نفس نفیس تمام تقریبات میں شریک ہوتا تھا۔"

صفحہ ۲۲

شاید یہ نتیجہ بعض حضرات کو خوش عقیدگی پر مبنی نظر آئے گا۔ بہادر شاہ اور دہلی کی تقریبات کی رنگ رلیوں میں شریک ہونے والوں کا اس قدر منظم اور باضابطہ طور پر انقلابی قرار دینا شاید مناسب نہ ہو لیکن اس میں شبہ نہیں کہ دور کا دوسرا فکری متبادل یہی تہذیبی اشتراک تھا جس نے بہادر شاہ کے پرچم کے نیچے جنگ ۱۸۵۷ء میں لڑی 'دین دین' کے نعروں کے باوجود اس جنگ کی حیثیت مذہبی نہیں سیاسی اور تہذیبی تھی اور دونوں صورتوں میں اس کے پیچھے مغلیہ دور کے ہندوستان کا وہ گنگا جمنی کردار غالب تھا جس کے پاس تہذیبی وقار تو تھا مگر عسکری طاقت نہ تھی بقول اسپیر:

ان لوگوں کو جو مکافات نے آلیا تو اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ کمزور تھے بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں کی طاقت بے اصولی تھی۔
ان کے سامنے کوئی معیار نہ تھا صرف طاقت کی سیاست تھی۔"

(ترجمہ عابد علی عابد صفحہ ۱۷، اصل صفحہ ۵)

یعنی دوسرا متبادل وہ قدیم مشترکہ تہذیب کا نظام تھا جو مغلیہ سلطنت کی سربراہی میں پنپا تھا اور اب جس کے پاس کوئی نوائے سینہ تاب یا کوئی حیات آفریں خواب باقی نہیں رہ گیا تھا۔ ذوق اس متبادل راستے کے نمایندہ شاعر کہے جا سکتے ہیں۔ بقول عابد علی عابد:

کہا نہیں جا سکتا کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں ذوق اگر موجود ہوتا تو اس کا ردعمل کیا ہوتا۔ لیکن اتنی بات یقینی ہے کہ غالب سے مختلف ہوتا۔ ذوق کی نظر میں لال قلعہ دنیا بھر کی ثقافت اور تمدن کا محور تھا۔ اس کی عقیدت کا مرکز دودمان تیموری تھا۔ وہ، ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں زندہ رہتا تو اس کا ردعمل وہی ہوتا جو بہادر شاہ کا تھا۔"

اس نقطۂ نظر کا پوری بلاغت کے ساتھ اظہار اس بیان سے ہوتا ہے:۔

"تہذیبی لحاظ سے دہلی کی معاشرت اتنی منظم اور مضبوط ہو گئی تھی کہ اسے قریب قریب مذہب کا درجہ حاصل ہو چکا تھا۔ چنانچہ ملنے جلنے کے طریقے، آداب نشست و برخاست دید و وادید، معاملہ و مراسلہ اور اس نوع کے ہزاروں مراسم کے لحاظ سے دہلی کی معاشرت کو ایسی خصوصیت اور امتیاز حاصل ہو گیا تھا جو کسی اور بستی کو حاصل نہ تھا۔"

(اردو، جولائی بحوالہ تنویر احمد علوی ذوق صفحہ ۴)

اس متبادل کے پاس تابناکی تھی تو حال کی اور ماضی قریب کی مگر اس کے سامنے مستقبل کا کوئی خواب کوئی حوصلہ نہ تھا۔ اور اس سماج اور اس تہذیب کے سامنے بنیادی سوال یہی تھا کہ موجودہ نظام کس طرح اپنے کو نئے دور میں قائم رکھنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔

اس متبادل کی بھی اپنی توانائیاں اور کمزوریاں تھیں، خوبی یہ تھی کہ اس کی جڑیں مشترکہ کلچر کی اس زمین میں پیوست تھیں جس کی آبیاری اکبر اعظم کے دور سے ہو رہی تھی اور جسے بلا لحاظ مذہب و ملت ایک وسیع تر حلقے کی حمایت حاصل تھی۔ کمزوری یہ تھی کہ اس طبقے کے پاس نہ تصورات کی قوت تھی نہ فوجی تنظیم اور سیاسی استحکام کی طاقت جس کے بنا پر نئے سیاسی اور تہذیبی طوفان کا مقابلہ کیا جا سکتا۔

تیسرا متبادل وہ تھا جس کے آثار غالب کی اس تقریظ میں نظر آتے ہیں جو انھوں نے سرسید کی تصحیح کردہ کتاب آئین اکبری کے لیے لکھی تھی۔

مژدہ یاراں را کہ ایں دیریں کتاب	یافت از اقبال سید فتح یاب
دل بہ شغلے بست و خود را شاد کرد	خود مبارک بندۂ آزاد کرد
مردہ پروردن مبارک کار نیست	خود بگو کاں نیز جز گفتار نیست

حالی نے اس کی وجہ ابوالفضل کے اسلوب سے مرزا کی ذہنی مناسبت نہ ہونے کو قرار دیا ہے لیکن اس تقریظ سے ماضی کے بارے میں غالب کا رویہ ظاہر ہوتا ہے۔ غالب کے لیے نہ احیا پرستوں کی طرح ماضی بعید کی پرستاری ممکن تھی نہ ذوق کی طرح مغلیہ تہذیب کو حاصل کائنات سمجھ کر مثالی قرار دینا ممکن تھا وہ ایک نوائے سینہ تاب کا شاعر تھا جو ماضی کو بھی تراش خراش کر کے مستقبل کے لیے آئینہ تیار کرنے کا قایل تھا۔ مغلیہ سلطنت اور بہادر شاہ ظفر ہوں یا ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت، غالب کا رویہ دونوں کی طرف نہ مکمل طور پر فدویانہ ہے نہ مکمل طور پر مخاصمانہ اور بلکہ ایسا لگتا ہے جیسے غالب کا دور نئی للکار کا جواب نئی اقدار اور نئے انکشافات اور اکتشافات کو اپنے تہذیبی نظام میں سمو کر دینا چاہتا ہے۔ یوں نہ ہوتا تو آئین اکبری کی تقریظ میں نئے

دور کی ستائش اس طرح برملانہ شامل کی جاتی۔ غالب نے اسی لیے اپنے کو عندلیب گلشن ناآفریدہ، قرار دیا ہے کہ وہ نوائے سینہ تاب اور وہ حیات آفریں خواب جو مشترکہ کلچر نے لال قلعے کی دیواروں کے اندر محصور ہو کر کھو دیا تھا اسے ایک نئے تہذیبی سیاق میں غالب کے کلام نے دریافت کرلیا۔

آخر میں صرف ایک سوال باقی رہ جاتا ہے۔ آخر یہ متبادل راستے کیوں کامیاب نہیں ہوتے یا اگر کامیاب ہوئے تو کس حد تک؟ ظاہر ہے اس سوال کا تعلق ایک طرف سیاسی طاقتوں کے اتحاد یا اختلاف سے ہے اور دوسری طرف اقتصادی اور سماجی عناصر کے درمیان ان متبادل راستوں کے مقبول یا نامقبول ہونے سے ہے۔ مختصر یہ کہ ان متبادل راستوں کے پیچھے کونسے طبقے تھے۔

Rise and fall of E.I. CO. کے فاضل مصنف نے بجا طور پر اشارہ کیا ہے کہ اکبر کے زمانے ہی سے بادشاہ اور شاہزادے، شاہزادیاں تجارت میں شریک ہونے لگے تھے۔ شاہ جہاں شہزادگی کے زمانے سے نیل کے کاروبار پر قابض تھا آصف جاہ اور نور جہاں بھی کاروبار میں شامل تھے بعد کو بھی یہ صورت حال قائم رہی۔ مصنف نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہندوستان کی مغلیہ حکومت کے پاس بحری بیڑے کی کمی کو ایسٹ انڈیا کمپنی پورا کرتی تھی اور یہاں کے سامان کو اپنے بحریے کے ذریعے تجارت کے لیے دوسرے ممالک لے جانے میں معاون ثابت ہوتی تھی۔ اسی بنا پر شاہ جہاں اور اورنگ زیب نے بار بار انگریزوں کو ہرانے کے باوجود انھیں تجارتی مراعات سے محروم نہیں کیا اور انھیں ملک سے نہیں نکالا۔ دھیرے دھیرے انگریزوں نے اپنا تجارتی نظام اس طرح ملک میں جگہ جگہ پھیلا دیا کہ آخر کار وہ ملک کی اقتصادیات پر چھانے کے ساتھ ساتھ یہاں کے سیاسی اقتدار پر قبضہ کر بیٹھے۔ مگر اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ ہندوستان جاگیردارانہ نظام سے آگے قدم بڑھا کر صنعتی نظام قائم نہ کرسکا۔ قدیم جاگیردار طبقوں میں نہ اتنی تنظیمی صلاحیت تھی نہ نظریاتی توانائی کہ وہ یورپ کے صنعتی نظام کی پروردہ تجارتی کمپنی کا مقابلہ کرسکیں۔ اس لیے دوسرا متبادل راستہ جو بہادر شاہ کی رہنمائی میں قدیم جاگیردارانہ نظام کے قیام کا راستہ تھا اسی بنا پر کامیاب نہ ہو سکا کہ اس کے پیچھے محض انحطاط پذیر جاگیرداروں کی طاقت تھی وہ صرف اتنے عرصے پنپ سکی جب تک اسے کمپنی کی ہندوستانی فوجوں اور عوام کے کچھ حصوں کا تعاون ۱۸۵۷ء کی جنگ کے دوران حاصل رہا۔ اسے ان طبقوں کی سربراہی حاصل رہی جن کا جذباتی تعلق اور مفاد دونوں مائل بہ انحطاط جاگیردارانہ نظام سے وابستہ تھے جو نئی اقتصادی سرگرمی اور صنعتی طور پر ترقی یافتہ سامراج کی جارحیت کے سامنے پسپا ہو رہا تھا۔

اسی کے پہلو بہ پہلو ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجارتی اور سیاسی مقاصد کے سائے میں ایک تاجر اور عمال طبقہ پنپ رہا تھا جس کی دولت اور طاقت دونوں کا انحصار کمپنی پر تھا یہ طبقہ جسے اصطلاحاً یا دلال کہا جاسکتا ہے گو تاجرانہ منافعوں میں شریک نہ تھا مگر ملازمتوں یا تاجرانہ رعائتوں کی بنا پر اپنے کو برطانوی مفادات سے وابستہ کرنے لگا تھا یہی دراصل ایک طرف بندوبست استمراری کے بعد نئے زمیندار کی شکل میں ابھرا اور دوسری طرف اسی نے عمال اور افسر شاہی کی شکل اختیار کی اور بعد کے آنے والے متوسط طبقے کا پیش رو بن گیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ جارحانہ احیاپسندی سے تعلق رکھنے والے اشرافیہ اور مغلیہ بادشاہت اور اس کی تہذیبی بساط کو قائم رکھنے کے حامی جاگیردار طبقے کے ساتھ ساتھ ایک نیا گروہ ایسے لوگوں کا بھی ابھر رہا تھا جو ماضی سے لگاؤ بھی رکھتے تھے اور نئے تقاضوں سے بھی بے خبر نہ تھے جنھیں علم تھا کہ ماضی کیسا ہی حسین کیوں نہ ہو اب مٹنے والا ہے اور آنے والے دور کو آنکھ بھر کر دیکھنا اور اس کی برکتوں کو اپنانا چاہیئے اور اس آنے والے دور کا ہلکا سا عکس سیاسی غلامی ساتھ لے کر آئی تھی اور یہ دور وہی تھا جو یورپ میں ترقی اور آزادی، Progress Liberty کے نعروں کے ساتھ وجود میں آ رہا تھا جو تخیل اور جذبے کے جھولوں پر نئے درمیانی طبقے کو جھلا رہا تھا جو اسے جینے کے لیے نئے خواب اور بھرپور زندگی کے لیے نئے تصور دے رہا تھا جو ڈیلاکر دوا اور ٹرنر کی تصویروں بیتھوون کی موسیقی اور رسکن کا فن تعمیر دے رہا تھا۔

غالب آخری دونوں متبادلات کے درمیان میں تھے انھوں نے پرانے جاگیردار سے اپنا رشتہ نہیں توڑا تھا۔ مغلیہ تہذیب کی اس ٹمٹماتی شمع کی روشنی میں بھی انھیں اس عظیم الشان تہذیب کی ہر جھلک حسین نظر آ رہی تھی۔ ان کے ارمان اور ان کی کمزوریاں دہلی کے اس جاگیرداری سماج میں پل بڑھ کر جوان ہونے والے امیرزادے کے ارمان اور کمزوریاں تھیں۔ دربار میں کرسی ملے خطابات اور القاب نام کا جز بنیں، پنشن کی بازیافت ہو، ہم چشموں میں عزت حاصل ہو، ہوادار سے اتریں تو پیشوائی کو کوئی نہ کوئی حاضر ہو۔ مگر اس کے باوجود انھوں نے اپنا رشتہ ان طبقوں سے وابستہ کر رکھا تھا جو نئی تہذیب کی آمد آمد کے نقیب تھے۔ اس اعتبار سے وہ سرسید (تصحیح آئین اکبری اور آثار الصنادید کے سرسید نہیں) تہذیب الاخلاق اور ایم۔ اے۔ او کالج والے سرسید کے پیش رو تھے۔ امیرزادے کی حیثیت سے انھیں دکھ تھا کہ ایسی حسین تہذیب مٹ رہی ہے مگر اس طبقے سے رشتہ استوار رکھنے کی بنا پر جانتے تھے کہ یہ تاریخ کا فیصلہ ہے اور اسے ناگزیر جاننے کے بعد مستقبل کے ایسے خواب دیکھنے سے باز نہیں آئے تھے جن کی تعبیر میں شاید ان جیسے امیرزادوں کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ یہ نشاط آرزومندی اور یہ کرب آرزومندی غالب کے دور کا عطیہ ہے جسے غالب نے ہزار رنگ سے باندھا ہے اور ہزاروں انداز سے محسوس کیا ہے ان کی تصانیف کے ہر صفحے پر بھی ترقی اور آزادی کے الفاظ کندہ ہیں لیکن یہ ترقی محض آرزو ہے اور یہ آزادی محض آزاد خیالی ـــ اس اعتبار سے وہ اپنے دور کا حصہ بھی

بمل کرشن اشک

خوبصورت ماں

میں کہ میری ولدیت عرش بریں سے ہے مری ماں میری بینائی کی حد سے
کتنی متجاوز ہے میرا باپ شائد جانتا ہو۔
ورنہ ماؤں کے دلوں کی نیک فیاضی کی وسعت ایک لاینحل معمہ کی طرح ہے،
میری ماں کے تین بیٹے اور بھی تھے، مجھ کو مشرق بھا گیا تھا،
اب بھی جب ماں سانس لیتی ہے تو اس کے سانس کی خوشبو کچھ ایسے چار جانب پھیلتی ہے
جیسے میرے باپ کی چھوٹی بڑی آنکھوں کی کرنیں پھیلتی ہیں
گائے کی مانند میری پاک ماں کی چھاتیوں سے دودھ کی دھاریں ہمارے منہ میں
اک مقدار سے پڑتی ہیں، جڑواں بھائی ہیں ہم۔
دودھ سے بوجھل لکھو کھا چھاتیوں والی مری ماں دیوتاؤں، دانوؤں کو پالتی ہے،
گھی، دہی، مکھن، نمک، پانی کے، مے کے، رس کے، پرلذت سمندر کا لبادہ اوڑھتی ہے،
راس سے پیدا ہیں تو اس میں مل رہیں گے،

ماں مرا جب حافظہ کمزور ہو، نظروں ہی نظروں میں مجھے کہیو کہ میرے تین بھائی اور بھی ہیں
خوبصورت ماں میں اپنے ہاتھ اپنے باپ کی جانب اٹھا کر یہ دعا مانگوں گا
اُن کا بال بانکا ہو نہ پائے، اُن کے ماتھے ایک بھی تیوری نہ پہنیں،
کیونکہ جب جب بھائیوں کی تنگ آنکھوں میں کدورت پھیلتی ہے
ماں کا چہرہ نوچتے ہیں،
خوبصورت ماں ترے چہرے پہ معمولی خراشیں بھی ہماری بے وقوفی،
بے وفائی کا ثمر ہیں،
خوبصورت ماں ہمیں یہ بھولنے مت دے کہ تو ہم چار جڑواں بھائیوں کی ایک ماں ہے

غزلیں

حامدی کاشمیری

ہوا شعور حقیقت، یہ خواب کیسا ہے
صدا کا بحرِ رواں برق تاب کیسا ہے
نظر اٹھائیں تو آنکھیں جواب دیتی ہیں
کہے تو کون کہ آفتاب کیسا ہے
شب سیاہ میں دریائے نور بہتے ہیں
یہ میرے سینے میں لوگو، سراب کیسا ہے
ہوا درختوں کو جڑ سے اکھاڑ لیتی ہے
کنارِ بحر چٹانوں کا خواب کیسا ہے
دعا کرو کہ وہ ساعت قریب آجائے
نہ پوچھو قہر ہوا سے عذاب کیسا ہے
ہے کور چشم کوئی تو کوئی دیدہ لب
بتائے کون مرا انتخاب کیسا ہے

محمد منشاء الرحمٰن منشاء

زخموں کی وہ خوشبو بخدا ساتھ ہے میرے
لگتا ہے کہ اک موجِ صبا ساتھ ہے میرے
حاجت ہو مجھے کیا کسی سامانِ طرب کی
جب تیرا غم روح فزا ساتھ ہے میرے
احبابِ کرم فرما کی بیگانہ وشی کا
غم مجھ کو ہو کیوں میرا خدا ساتھ ہے میرے
آندھی میں بھی جلتی ہے مرے عزم کی مشعل
ہوتی رہے جو تیز ہوا ساتھ ہے میرے
مصلوبِ زمانہ میں اکیلا ہی نہیں ہوں
اک حلقۂ اربابِ وفا ساتھ ہے میرے
ہر گام رہِ زیست میں یوں ہوتا ہے محسوس
جیسے کوئی بھرپور دعا ساتھ ہے میرے
میں انجمنِ شوق کو گرماؤں گا منشاء
جب تک یہ میرا سوزِ نوا ساتھ ہے میرے

ہنس راج رہبر

مریادا

اندو نے جب اپنی تھالی سے دوسری روٹی پوچی کے آگے ڈالی تو وہ اس پر جھپٹا نہیں بلکہ اس نے ایک نظر روٹی پر ڈالی اور پھر عجیب ڈھنگ سے بڑھیا کی طرف دیکھنے لگا جیسے سوچ رہا ہو کہ اگر یہ دوسری روٹی بھی میں کھا گیا تو بڑھیا بے چاری کیا کھائے گی، کیا وہ میرے کارن بھوکی رہے گی؟ "کھا، کھا، پوچی کھا۔" بڑھیا نے اسے پچکارا اور کہا، "ادھر ادھر بھٹکنے سے اپنے ہی گھر میں پیٹ بھر کر کھا لینا کہیں اچھا ہے۔"

بات شاید پوچی کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے روٹی کھائی اور اطمینان سے بڑھیا کی طرف دیکھتے ہوئے وہیں فرش پر بیٹھ گیا۔

اندو کی جو عمر تھی وہ اس نے گذار لی تھی، اب وہ ایک اجنبی کی طرح اس دنیا میں جی رہی تھی اور اپنے ہی گھر میں مہمان بنی ہوئی تھی۔ گھر گرہستی کا انتظام چھوٹی بہو کرتی تھی، اندو کو اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ بیٹھی دیکھتی رہتی، بہو کسی معاملے میں صلاح مشورے کرتی تو وہ اپنی رائے ظاہر کر دیتی، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اب کچھ کرنے کی حسرت بھی نہیں تھی کیونکہ اس نے بہت کچھ کیا تھا اور اپنی کوکھ کو پھلتے پھولتے دیکھا تھا۔ اس کے تینوں لڑکوں نے اب اپنی گرہستی بسالی تھی۔ تینوں کا ستھرا پریوار تھا اور گزارا بخوبی چل رہا تھا۔ بخوبی اس معنی میں کہ گرہستی کی گاڑی اچھی طرح کھینچے لیے جا رہے تھے۔ اور بڑھیا دستور کے مطابق چھوٹے بیٹے اونکار کے ساتھ زندگی کے آخری دن گزار رہی تھی۔

بڑھیا کی اب کسی چیز میں، گھر کے کسی فرد میں دلچسپی نہیں تھی۔ بڑھاپے میں مکتی حاصل کرنے کی خواہش اکثر بڑھ جاتی ہے مگر اندو کو مکتی کی بھی خواہش نہیں تھی۔ اس کے دل میں سورگ کی تمنا اور نرک کا ڈر بھی نہیں تھا اس نے ایک بھرے پرے پریوار میں سہج ڈھنگ سے زندگی گزاری تھی اور وہ بغیر کسی تشویش اور رنج کے اس سہج ڈھنگ سے اس دنیا سے چلی جانا چاہتی تھی۔ انس دکھ کا باعث ہے اور انس لگاؤ سے پیدا ہوتا ہے اس لیے اس نے دنیا، پریوار اور اس کے مسائل کے بارے میں بے اطمینانی کا رویہ اختیار کر لیا تھا۔ لیکن ادھر کچھ دنوں سے پوچی نے اس کی اس بے اطمینانی کو ڈگمگا دیا، بے رخی اختیار کرنا اپنے میں ڈوبے رہنا ممکن نہیں رہا، اس بے زبان جانور کے لیے اس کے دل میں ترحم، ہمدردی اور شفقت کا جذبہ پھر جاگ اٹھا تھا۔

پوچی اس کے لیے پریوار ہی کا فرد تھا۔ اس کا پتی شمبھو ناتھ ایک دن اچانک اسے گھر میں اٹھا لایا تھا۔ تب وہ کوئی دو ڈھائی مہینے کا پلا ہوگا۔ اندو نے اسے اپنے ہاتھ سے کھلایا پلایا۔ اگرچہ پلا ہی تھا تاہم اس کی دوسری اولاد کی طرح وہ اس کے پیار اور شفقت سے کبھی محروم نہیں رہا۔ روٹی میں سے روٹی اور دودھ لسی میں سے دودھ لسی اسے اپنا حصہ ملتا رہا۔ اندو کے گھر میں کھانے پینے کی کمی کبھی نہیں رہی، اس لیے پوچی نے بھی کسی طرح کی تنگی نہیں دیکھی۔

گھر کے ماحول کا پوچی کے مزاج پر مناسب اثر پڑا۔ وہ آوارہ اور بھک مرے کتوں کی طرح کسی چیز پر جھپٹتا نہیں تھا جو کچھ مل جاتا اسی سے مطمئن رہتا۔ اتنا عرصہ اس گھر میں رہتے ہو گیا لیکن اس نے کبھی بھول کر بھی چوکے میں پاؤں نہیں رکھا، کبھی کسی برتن میں منہ نہیں ڈالا۔ پوچی جانور ہوتے ہوئے بھی سب کچھ سمجھتا تھا اور اس ویشنو پریوار کی پوترتا گھر کے دوسرے افراد کی طرح اسے بھی عزیز تھی۔ چھوٹے بڑے، بچے بوڑھے۔ گھر کے ہر فرد کی ایک شخصیت ہوتی ہے۔ عمر کے ساتھ جیسے جیسے اس شخصیت کی بھی نشو و نما ہوتی رہتی ہے، اس کے متعلق ہمارے جذبات میں بدلتے رہتے ہیں۔ بچے جب جوان ہو کر بالغ اور سمجھ دار بن جاتے ہیں تو ان جانے ہی اس کے لیے ہمارا پیار اور شفقت ادب اور احترام میں بدل جاتا ہے۔ لیکن بچپن سے بلوغت تک کی ساری زندگی ہمارے لاشعور میں محفوظ رہتی ہے اس زندگی کے معمولی اور غیر معمولی جو کچھ خاص خاص واقعات ہوتے ہیں وہ اس کا ان لکھا اتہاس ہوتے ہیں۔ یہی اتہاس ہر شخص کے کردار کا تعین کرتا ہے۔ اور اس اتہاس کو جاننے والا آدمی ہی اس سے بخوبی واقف ہوتا ہے۔ پوچی کی بھی ایک زندگی، ایک اتہاس، ایک کردار تھا جس سے اس گھر میں اندو۔ صرف اندو ہی بخوبی واقف تھی کیونکہ اس نے اسے پالا پوسا تھا۔ اور وہ اس کے ہاتھوں میں دو ڈھائی مہینے کے پلے سے اونچے ڈیل ڈول اور پکی عمر کا جانور بنا تھا۔ کتنی ہی باتیں ایسی تھیں جنھوں نے اسے اس گھر کا لازمی جزو بنا دیا تھا۔ پوچی کو بھی اس بات کا احساس تھا اور دوسرے افراد کی طرح وہ بھی اس گھر میں اس پریوار پر اپنا پورا حق سمجھتا تھا۔ کتے کی وفاداری ضرب المثل ہے۔ وہ جس کا کھاتا ہے اسی کا ہو جاتا ہے۔ لیکن پوچی کی تو زندگی ہی اس گھر میں گزری تھی اس کی وفاداری میں کیا شک ہو سکتا تھا۔ اس نے جی جان سے اس گھر کی چوکی داری کی تھی کیا مجال کہ کوئی

دوسرا کتا آس پاس بھی بھٹک جائے اور کوئی اجنبی بغیر مالک کی رضامندی کے دہلیز پر قدم بھی رکھ جائے۔

جب اندو کے پتی شمبھوناتھ کا انتقال ہوا تھا تو پوچی بھی ارتھی کے ساتھ ساتھ شمشان بھومی تک سب کے ساتھ گیا تھا۔ دستور کے مطابق داہ سنسکار کرنے کے بعد جب لوگ لوٹنے لگے تو پوچی وہیں ساکت و صامت کھڑا رہا۔ اندو کے بڑے بیٹے کیدار نے اسے بہتیرا دلارا پچکارا اور ساتھ چلنے کو کہا مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ وہ کھڑا چتا کے شعلوں کو تکتا رہا۔ بھوں بھوں کرکے ان پر لپکا۔ اگر کیدار اسے روک نہ لیتا تو ممکن ہے وہ ان شعلوں پر ٹوٹ پڑتا یا تو مالک کی ادھ جلی لاش کو چتا سے نکال لاتا یا خود اس میں بھسم ہو جاتا۔

جن لوگوں نے یہ منظر دیکھا ہے وہ کیا اسے کبھی بھلا سکتے ہیں۔ دیکھنے والوں کی تو بات ہی چھوڑیے جنھوں نے سنی ہے ان کے دل پر بھی یہ واقعہ گہری چھاپ چھوڑ گیا ہے۔

گھر گرہستی کا انتظام جب تک اندو کے ہاتھ میں رہا وہ پریم سے اسے کھلاتی پلاتی رہی۔ چھوٹی بہو کے دل میں بھی پوچی کے لیے کسی طرح کی نفرت یا حقارت نہیں تھی۔ اسے کھلانے میں کبھی تذبذب اور بخل سے کام نہیں لیا۔ اور اپنی دانست میں کبھی بھوکا نہیں رکھا۔ لیکن اندو کی طرح وہ اس کے کردار سے واقف نہیں تھی وہ اس کے نزدیک گھر کا ایک فرد، پریوار کا ایک رکن نہیں تھا۔ اس کے لیے محض وہ ایک کتا تھا۔ جس کے ساتھ کل کی مان مریادا کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

عام حالات میں پوچی کا گزارا اس طرح ہوتا رہا جس طرح اندو کے راج میں ہوتا تھا۔ لیکن جب سے گیہوں کا بھاؤ بڑھنا شروع ہوا اس کی خوراک میں کمی شروع ہو گئی تھی۔ اب اسے بندھی ٹکی دو روٹی صبح اور دو شام کو ملتی تھیں اور اتنے میں اس کی بھوک نہیں مٹتی تھی۔ بے زبان جانور زیادہ مانگ تو سکتا نہیں تھا جو کچھ مل جاتا اس پر صبر کر لینا پڑتا۔

مگر صبر کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ جو خوشحالی اور پیٹ بھر جانے سے محفوظ رہتی ہے۔ لیکن بھوک میں ٹوٹ جاتی ہے۔ بھوک انسان اور حیوان کی صدیوں پرانی عادت اور روایت کو بدل دیتی ہے۔ پوچی جو پہلے رسوئی میں قدم نہیں رکھتا تھا۔ اور برتن میں منھ نہیں ڈالتا تھا اب موقع ملتے ہی رسوئی میں گھس جاتا اور برتن جھوٹے کر ڈالتا۔ اس کے علاوہ اسے اب معلوم ہو گیا تھا کہ محلے کے کس گھر میں کھانا کس وقت بنتا ہے۔ اور وہ لقمہ دو لقمے پا جانے کی امید میں وہ ٹھیک اس وقت دم ہوا میں ہلاتا ہوا پہنچ جاتا۔ جب اس سے بھی پیٹ نہ بھرتا تو وہ روٹی کے ایک ایک کے لیے زمین سونگھتا پھرتا۔ اور کوڑے کرکٹ میں منھ مارتا۔

اندو نے پوچی کو جب یوں بھٹکتے دیکھا تو اس کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ اس نے اس بات کی چرچا بہو سے چھیڑی اور کہا "بہو، پوچی کا دھیان رکھا کرو۔ اس کا یوں در در گھومنا اچھا نہیں لگتا۔ بہو نے سنی ان سنی کر دی۔ اس کے بعد بھی پوچی کی خوراک میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔

بڑھیا بھی چپ ہو رہی، اس نے کچھ زیادہ کہنا مناسب نہیں سمجھا وہ بہو کو بھی کیا دوش دیتی۔ اناج واقعی بہت مہنگا تھا۔ گیہوں سوا روپے بک رہا تھا۔ دو عالمگیر جنگیں اندو کے سر سے گزر چکی تھیں، لیکن اتنی مہنگائی اس نے نہ کبھی دیکھی اور نہ سنی۔ جیوں جیوں اناج مہنگا ہوتا جا رہا تھا دوسری چیزوں کے دام بھی بڑھ رہے تھے۔ اور اسی تناسب سے عوام کی مشکلات بھی بڑھ رہی تھیں۔ لوگ باگ جیوں تیوں کرکے گرہستی کی گاڑی کھینچ رہے تھے۔ مثلاً بھاؤ جب دو روپے کیلو تھا دودھ اس گھر میں ڈیڑھ کیلو آتا تھا، بھاؤ جب بڑھ کر ڈھائی روپے کیلو ہوا تو سوا کیلو آنے لگا اور جب بھاؤ تین روپے تھا تو صرف کیلو بھر آتا تھا۔ اسی میں گزارا کرتے تھے۔ بچوں کو بھی دودھ کی بجائے چائے ملتی تھی۔

لیکن اناج کی مقدار کیسے کم ہو؟ روٹی تو پیٹ بھر کھانی پڑتی تھی بلکہ جب دودھ دہی اور پھل وغیرہ کم ہوتے ہیں تو اناج کی کھپت بڑھ جاتی ہے۔ جیوں جیوں مہنگائی بڑھ رہی تھی گرہست عورتیں زیادہ محتاط ہوتی جا رہی تھیں۔ کبھی ایک روٹی بھی فالتو بچ جائے تو دکھ ہوتا تھا۔ مانگنے والے دروازے سے خالی لوٹ جاتے تھے۔ جہاں پہلے مٹھی دو مٹھی آٹا آسانی سے مل جاتا وہاں ایک چٹکی دیتے جی جلتا تھا۔ پریوار کے افراد بھی اناج کا استعمال سوچ سمجھ کر کرتے۔ پوری خوراک سے ایک آدھ روٹی کم ہی کھاتے اور فالتو پھینکنے کا تو ذکر ہی کیا۔

جب مشترکہ خاندان تھا تینوں لڑکے ایک ساتھ رہتے تھے اور اندو کا پتی زندہ تھا تب گھر میں گائے بھینس بھی رہتی تھی اور پوچی کو دودھ لسّی بھی کافی مقدار میں مل جاتا تھا۔ مگر آج یہ حالت تھی کہ روٹی تک کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ نتیجہ یہ کہ اس نے در در گھومنا اور کوڑے کرکٹ میں منھ مارنا شروع کر دیا۔ اندو سے یہ سب کچھ برداشت نہیں ہو سکا۔ اسے گھر کی مریادا لوٹتی دکھائی دی کیونکہ پوچی اس کے نزدیک جانور نہیں پریوار ہی کا ایک رکن تھا۔ پریوار کا ایک رکن روٹی کے لیے در در بھٹکے، آوارہ گھومے، یہ اسے کسی طرح گوارا نہیں تھا۔

وہ اپنے دن پورے کر چکی تھی اور اپنے آپ کو اس دنیا میں اجنبی سمجھتی تھی۔ چار دن زیادہ گزارے تو کیا کم گزارے تو کیا۔ اس نے اپنی خوراک کی زیادہ تر مقدار پوچی کو کھلانا شروع کر دی۔ بہو جب تھال پروس کر لاتی تو پوچی بھی دم ہلاتا ہوا سامنے آ کھڑا ہوتا۔ بہو چلی جاتی تو اندو پہلے پوچی کو کھلاتی اور اس کے بعد جو بچ رہتا خود کھا لیتی اور صبر سے کھاٹ پر لیٹی رہتی۔

بچہ بوڑھا کوئی بھی ہو سب خوراک پر جیتے ہیں۔ خوراک کافی مقدار میں نہ ملے تو جسم کا لاغر اور نحیف ہو جانا لازمی ہے۔ چنانچہ اندو کا جسم بھی کمزور ہوتا چلا گیا۔ کمزوری اور ضعیفی کا میل ہے۔ اس لیے کسی نے اس طرف نہیں دی وہ بڑھ رہی کمزوری کی وجہ بڑھاپے کو سمجھتے تھے۔ اور اس بات میں اب کسی کو بھی شک نہیں رہ گیا کہ بڑھیا کے دن اب قریب آ چکے ہیں۔

کمزوری اتنی بڑھی کہ اندو کے لیے چلنا پھرنا ہلنا ڈولنا ناممکن ہو گیا اور وہ

(بقیہ صفحہ ۲۴ پر)

غالب سے منسوب ایک شعر

حنیف نقوی

اردو کے ان اشعار میں جو شہرت و مقبولیت کی حد کمال کو پہنچ کر زبان زدِ خاص و عام ہو چکے ہیں، یہ شعر بھی شامل ہے ؎

چند تصویرِ بتاں، چند حسینوں کے خطوط　　بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

بیشتر مشہور اور زباں زد اشعار کی طرح اس شعر کے بارے میں بھی آج تک یہ معلوم نہیں ہو سکا ہے، کہ یہ کس کی تصنیف ہے، البتہ بعض غیر محتاط حضرات اسے تحریر و تقریر میں غالب سے منسوب کرتے آئے ہیں۔ غالب کے متداول دیوان میں اس زمین میں چھ اشعار کی ایک غزل موجود ہے۔ نسخۂ حمیدیہ کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ چھ اشعار سات، سات اشعار کی دو غزلوں سے انتخاب کر کے اس دیوان میں شامل کیے گئے ہیں۔ ان غزلوں کے مقطعوں میں سے ایک میں اسد اور دوسرے میں غالب تخلص نظم ہوا ہے جو بظاہر اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ دونوں غزلیں مختلف اوقات میں کہی گئی تھیں۔ زیرِ بحث شعر نہ تو ان دونوں غزلوں میں سے کسی غزل میں موجود ہے اور نہ غالب کی زندگی میں شائع شدہ متداول دیوان کے کسی نسخے میں ملتا ہے۔ اب تک دریافت شدہ متعدد قلمی نسخوں میں سے بھی کسی نسخے میں اس کا سراغ نہیں ملتا۔ بعد کے مطبوعہ نسخوں میں سے جس نسخے میں اسے غالباً سب سے پہلے کلامِ غالب کی حیثیت سے جگہ دی گئی وہ نظامی پریس بدایوں سے شائع شدہ دیوانِ غالب کا چوتھا ایڈیشن ہے۔ نظامی پریس سے دیوانِ غالب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۱۵ء میں شائع ہوا تھا۔ ۱۹۱۵ء اور ۱۹۲۱ء کے درمیان اس کے مزید دو ایڈیشن شائع ہوئے۔ چوتھا ایڈیشن جس کا دیباچہ ۱۴؍ جولائی ۱۹۲۱ء کو لکھا جا چکا تھا، سرورق کے اندراج کے مطابق ۱۹۲۲ء میں شائع ہوا۔ اس ایڈیشن کے صفحہ ۲۵۵ پر "وہ اشعار جو دیوانِ مروجہ میں نہیں ہیں" کے زیرِ عنوان مندرج اشعار میں زیرِ بحث شعر بھی شامل ہے۔ نظامی صاحب نے ذیلی حاشیے میں اس شعر کے متعلق فرمایا ہے کہ

"یہ شعر اکثر لوگوں کی زبان پر ہے لیکن اس کے اصل مصنف کے نام سے لوگ ناآشنا ہیں۔ بعض اسے میر تقی میر کا شعر بتاتے ہیں بعض مرزا غالب کا لیکن کلیاتِ میر میں اس کا پتہ نہیں، نہ دیوانِ غالب میں ہے۔ لیکن حضرتِ شوکت بلگرامی نے اس شعر کی بابت اردوئے معلیٰ علی گڑھ مطبوعہ ستمبر ۱۹۱۰ء میں اپنے ایک بزرگ کے حوالے سے لکھا تھا کہ اپنی اس مشہور غزل "قیس تصویر کے پردہ میں بھی عریاں نکلا" میں بعد طبعِ دیوان مرزا نے اس شعر کا اضافہ کیا تھا عجب نہیں کہ حضرتِ شوکت کا یہ بیان صحیح ہو کیونکہ اس شعر کے تیور بھی یہی کہہ رہے ہیں کہ وہ مرزا جیسے قادر الکلام شاعر کے قلم سے نکلا ہے۔"

معلوم ہوتا ہے کہ اس ایڈیشن کے منظرِ عام پر آنے کے بعد جلد ہی نظامی صاحب پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ یہ شعر غالب کے بجائے کسی اور شخص کی تصنیف ہے چنانچہ ۱۹۲۳ء میں جب انھوں نے عام سائز اور پاکٹ سائز میں اس دیوان کے دو نئے ایڈیشن شائع کیے تو اس شعر کو متفرقات کے زمرے سے خارج کر دیا۔ لیکن دیکھا یہ گیا ہے کہ اس قسم کی غلطیاں جب ایک بار کسی کتاب میں راہ پا جاتی ہیں تو اصلاح و تصحیح کی کوششوں کے باوجود کسی نہ کسی گوشے سے برابر ان کا اعادہ ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ نسخۂ نظامی کے اگلے ایڈیشنوں سے اس شعر کے اخراج کے بعد بھی غالب سے اس کے انتساب کا سلسلہ بدستور قائم ہے۔ ۱۹۲۲ء سے اب تک تقریباً ساٹھ سال کی مدت میں دیوانِ غالب کے لاتعداد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اگر تلاش کی جائے تو ان میں دو چار اشاعتیں ایسی ضرور مل جائیں گی جن میں یہ شعر بھی موجود ہوگا۔ اس وقت ایوان کمپنی، ۱۰۶ نخاس کہنہ، الہ آباد کا شائع کردہ ایک خوبصورت ایڈیشن ہمارے پیشِ نظر ہے۔ اس میں کسی جگہ سالِ اشاعت درج نہیں لیکن آخری صفحے کی ایک تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ۱۹۶۹ء کی غالب صدی تقریبات کے بعد شائع ہوا ہے۔ صفحہ ۱۳ سے صفحہ ۲۱۵ تک اس کے تمام اندراجات متداول دیوان کے مطابق ہیں۔ صفحہ ۲۱۶ سے صفحہ ۲۲۸ تک "وہ اشعار و قطعات جو دیوانِ مروجہ میں نہیں ہیں" درج کیے گئے ہیں اور صفحہ ۲۲۹ سے ۲۸۰ تک "قدیم اور نو دریافت نسخوں کا منتخب کلام" پیش کیا گیا ہے۔ ان میں سے پہلے ضمیمے کے تحت صفحہ ۲۲۸ پر سب سے آخر میں زیرِ بحث شعر بھی موجود ہے۔ اس طرح ۱۹۲۲ء سے ماضی قریب تک غالب سے اس کے انتساب اور دیوانِ غالب میں اس کی شمولیت کا ایک سلسلہ قائم ہو جاتا ہے۔ اس روایت کو محض اس کے عدمِ استناد اور بے اعتباری کی بنا پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیونکہ غالب کی بے پناہ مقبولیت کے پیشِ نظر ہر قاری سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ ان کے دیوان کے کسی ایسے نسخے ہی کی طرف رجوع کرے جو ان کے تمام کلام کا جامع اور الحاق و تصرف سے پاک ہو۔ فی الحقیقت ایسا کوئی نسخہ اب تک شائع بھی نہیں ہوا ہے۔

اس حقیقت تک رسائی کے بعد کہ یہ شعر غالب کی تصنیف نہیں ہے، یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس کا مصنف کون ہے؟ اس سوال کا جواب پیش کرنے سے قبل اس امر کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ زبان زدگیٔ عام کی معراج تک پہنچنے کے لیے

بیشتر اشعار کو تحریف و تصرف کے ایک ناگزیر اور غیر محسوس عمل سے گزرنا پڑتا ہے حتیٰ کہ تحریر و تقریر میں آئے دن ان کا استعمال کرنے والوں کے لیے اس بات کی مطلق اہمیت باقی نہیں رہ جاتی کہ ان کا مصنف کون ہے اور اس نے اپنے تاثرات کے اظہار کی غرض سے جس پیرایۂ بیان یا مجموعۂ الفاظ و تراکیب کا انتخاب کیا تھا، اس میں کسی حد تک تبدیلی آ چکی ہے۔ اس قسم کے مشہور اشعار میں یہ چند شعر بطور نمونہ پیش کیے جا سکتے ہیں۔

بعد مرنے کے مری قبر پہ آیا وہ میرؔ — یاد آئی مرے عیسیٰ کو دوا میرے بعد
شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میرؔ — مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا
گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں — وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے
ہم نے سوچا تھا کہ حاکم سے کریں گے فریاد — وہ بھی کم بخت ترا چاہنے والا نکلا
پھول تو دو دن بہار جانفزا دکھلا گئے — حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

پہلا شعر اس مشہور مرصع غزل میں بطور مقطع شامل ہے جو منتخبات کے کئی مجموعوں میں میرؔ کے نام سے جگہ پا چکی ہے۔ لیکن فی الحقیقت مختلف شعرا کے منتخب اشعار پر مشتمل ہے۔ علامہ شبلی نے شعر العجم کی پہلی جلد میں فردوسی کی وفات کے بیان میں یہی شعر امیرؔ کے تخلص کے ساتھ نقل کیا ہے۔ لیکن یہ نہ میرؔ کا طبع زاد ہے، نہ امیرؔ کی تصنیف اس کے اصل مصنف میر صاحب کے فرزند اصغر میر کلو عرشؔ ہیں اور ان کے مطبوعہ دیوان کے مطابق اس کی اصل صورت حسب ذیل ہے ؎

زندگی بھر نہ ملا، قبر پہ آیا آخر
کی مرے درد کی عیسیٰ نے دوا میرے بعد

پہلے شعر کی طرح دوسرا شعر بھی جو مولانا ابو الکلام آزاد کے بقول "زبانوں پر چڑھ کر بہت پامال ہو چکا ہے" تخلص کی موجودگی کی وجہ سے عام طور پر میرؔ کی تصنیف سمجھا جاتا ہے۔ لیکن درحقیقت نواب محمد یار خاں امیرؔ رئیس ٹانڈہ ضلع رام پور کا نتیجۂ فکر ہے، امیرؔ نے اسے ان الفاظ میں نظم کیا تھا ؎

شکست و فتح میاں اتفاق ہے لیکن
مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا

تیسرا شعر مرزا عظیم بیگ عظیمؔ دہلوی کی تصنیف ہے۔ یہ اس مخمس کا جز ہے جو انھوں نے انشاؔ سے معارضے کے دوران کے بعض اعتراضات بالخصوص "بحر رجز میں ڈال کے بحر رمل چلے" کے جواب میں نظم کیا تھا۔ حکیم قدرت اللہ قاسمؔ نے 'مجموعۂ نغز' میں اسے اس طرح نقل کیا ہے ؎

گرتے ہیں اپنے زور میں شہ زور مثل برق
وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے

چوتھے شعر کے بارے میں بھی شاید کم ہی لوگوں کو یہ بات معلوم ہو کہ یہ نظیرؔ اکبر آبادی کا کلام ہے۔ ان کے مطبوعہ دیوان غزلیات میں یہ شعر جس صورت میں نقل ہوا ہے، وہ حسب ذیل ہے ؎

تھا ارادہ تری فریاد کریں حاکم سے
وہ بھی اے شوخ ترا چاہنے والا نکلا

پانچواں شعر استاد ذوقؔ کا ہے اور ان کے دیوان کے قدیم مطبوعہ اور غیر مطبوعہ نسخوں میں اس طور پر منقول ہے ؎

کھل کے گل کچھ تو بہار اپنی صبا دکھلا گئے
حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

مولانا محمد حسین آزادؔ نے جن کے بارے میں محققین کی عام طور پر یہ رائے ہے کہ انھوں نے استاد کے کلام میں دیدہ و دانستہ تحریف کی ہے، اپنے مرتبہ کلیاتِ ذوقؔ میں اسے اس طرح نقل کیا ہے ؎

گل بھلا کچھ تو بہاریں اے صبا دکھلا گئے
حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

ان مثالوں سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ زبان زد اشعار میں ترمیم و تصرف کے امکانات کتنے قوی ہیں اور ان کے زیر اثر کسی شعر کی ہیئتِ اصلی کس حد تک متغیر ہو سکتی ہے۔ راقم السطور کا خیال ہے کہ غالبؔ کے نام سے مشہور زیر بحث شعر بھی تحریف و ترمیم کے اسی غیر محسوس عمل سے گزر کر ہم تک پہنچا ہے۔ اگر یہ قیاس صحیح ہے اور بظاہر اس کے غلط ہونے کا امکان بہت کم ہے تو اس کی اصل صورت حسب ذیل ہے ؎

ایک تصویر کسی شوخ کی اور نامے چند
گھر سے عاشق کے پسِ مرگ یہ ساماں نکلا

یہ شعر منیرؔ شکوہ آبادی کے پوتے عاشق حسین بزمؔ اکبر آبادی کی تصنیف ہے، اور جس غزل سے متعلق ہے، وہ اگست ۱۹۱۰ء سے قبل کہی گئی تھی۔ راقم السطور کو یہ غزل ایک قدیم گلدستے "آئینۂ مشاعرہ" میں دستیاب ہوئی ہے۔ جو ۱۰ اگست ۱۹۱۰ء کو بھوپال میں مولانا محمد اسمٰعیل کے مکان پر منعقد ایک یادگار طرحی مشاعرے کی غزلوں پر مشتمل ہے، اور منشی عبد العزیز خاں کے زیر اہتمام عزیزی پریس آگرہ میں چھپ کر شائع ہوا ہے۔ منتظمین کی دعوت پر اس مشاعرے کے لیے باہر سے متعدد شعرا نے غزلیں کہہ کر بھیجی تھیں جو وقت مقررہ پر سر محفل پڑھ کر سنائی گئیں۔ مرتب گلدستہ سرورؔ قادری بدایونی نے ابتدا میں اختصار کے ساتھ ان بیرونی شعرا کا تعارف کرایا ہے۔ بزمؔ اکبر آبادی بھی شعرا کے اسی زمرے میں شامل تھے۔ ان کے متعلق جناب قادری نے لکھا ہے:

"مرزا عاشق حسین صاحب اکبر آبادی، نبیرۂ منیرؔ مرحوم۔ آپ کہنہ مشق شاعر اور صاحب دیوان ہیں۔ آپ کا کلام بہت پر مغز ہے۔ فی الحال ریاست رام پور میں درباری شاعر ہیں۔" (ص ۴)

قارئین کی دلچسپی کے لیے بزمؔ کی یہ مکمل غزل اس گلدستے سے سطور ذیل میں نقل کی جاتی ہے ؎

یوں تو دلچسپ بہت عالم امکاں نکلا — جب کیا غور تو اک خواب پریشاں نکلا
اشک آنکھوں سے، جگر سینے سے، نالے منھ سے — یہ تو سب ہجر میں نکلے پہ نہ ارماں نکلا
کسی کافر کا غم ہجر گیا جان کے ساتھ — تا دمِ مرگ نہ اس گھر سے یہ مہماں نکلا
غنچۂ دل میں ہزاروں نظر آئے گلِ داغ — جس کو اک پھول سمجھتے تھے گلستاں نکلا
ایک تصویر کسی شوخ کی اور نامے چند — گھر سے عاشق کے پسِ مرگ یہ ساماں نکلا
دل کی آنکھوں سے جو دیکھا تو یہ معلوم ہوا — جس کو ہم ڈھونڈتے تھے قرب رگ جاں نکلا

لا کے یاروں نے کفن دے کر مجھے دفنا یا — میں وہ مجنوں ہوں کہ پھر قبر سے عریاں نکلا
شیخ جو خلد کے باغوں کی ثنا کرتے تھے — ایک تو ان میں بھی کافر کا گلستاں نکلا

ہو کوئی تازہ ادا برترؔم کہ انداز نیا
جو بھی نکلا وہ مری جان کا خواہاں نکلا

اس غزل کی اشاعت کا زمانہ معلوم ہو جانے کے بعد بعض ذہنوں میں یہ سوال ابھر سکتا ہے کہ جو شعر ۱۰ اگست ۱۹۱۰ء کو کسی مشاعرے میں پڑھا گیا تھا اور اس کے بعد منظرِ عام پر آیا وہ ہیئت ظاہری کی اتنی نمایاں تبدیلی کے ساتھ اردوئے معلیٰ کے ستمبر ۱۹۱۰ء کے شمارے میں کس طرح غالبؔ سے منسوب کر دیا گیا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے اس امر کو ذہن نشین رکھنا ہوگا کہ کسی خاص مشاعرے میں کسی غزل کا پڑھا جانا ہرگز اس بات کے ثبوت کے لیے کافی نہیں کہ وہ غزل بطورِ خاص اسی مشاعرے کے لیے کہی گئی تھی۔ بہت ممکن ہے کہ برترؔم یہ غزل اس سے بہت پہلے کہہ چکے ہوں اور اس کا یہ شعر سننے والوں کے ذہنوں پر اپنا پائیدار نقش ثبت کر کے قبولِ عام حاصل کر چکا ہو۔ راقم السطور ثاقبؔ لکھنوی سے متعلق اپنے ایک مضمون میں جو ماہنامہ "نیا دور" لکھنؤ کے فروری ۱۹۸۰ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے، یہ ثابت کر چکا ہے کہ ان کی ایک غزل جو ۳ مئی ۱۹۲۳ء کو جانسٹھ ضلع مظفر نگر کے ایک طرحی مشاعرے میں فکرِ تازہ کے طور پر پیش کی گئی تھی اور اسی تاریخ کے حوالے کے ساتھ شاملِ دیوان ہے، اس کے بعض اشعار ۱۲ نومبر ۱۹۱۴ء سے قبل اور بعض مارچ ۱۹۱۵ء کے آخری دنوں میں کہے گئے تھے۔ یہ مثال کسی خاص غزل کے زمانۂ تصنیف کے سلسلے میں اس قسم کے تمام شبہات کے ازالے کے لیے کافی ہے۔

غالبؔ کی روز افزوں مقبولیت اور ان کی ذات یا کلام سے متعلق ہر نئی دریافت کی غیر معمولی پذیرائی کے باعث یہ بھی ہوتا رہا ہے کہ وقتاً فوقتاً کچھ لوگ کبھی بر بنائے تفنن و خوش طبعی اور کبھی جعل سازی کی نیت سے اپنے یا دوسروں کے نتائجِ طبع کو غالبؔ سے منسوب کر کے تماشائے اہلِ نظر دیکھنے اور دکھانے کا سامان کرتے رہے ہیں، اور غالبؔ شناسوں نے، گو وقتی طور پر ہی سہی ان کی ان کوششوں کو گراں قدر ادبی سوغات سمجھ کر والہانہ جوش و خروش کے ساتھ قبول بھی کیا ہے۔ اس لیے اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ کسی خوش مذاق نے اور یہ خود جنابِ شوکتؔ بلگرامی بھی ہو سکتے ہیں، بالارادہ برترؔم کے شعر میں تحریف کر کے اسے غالبؔ کے شعری مزاج سے ہم آہنگ کرنے اور ان کے کلام کے طور پر شہرت دینے کی کوشش کی ہو۔ بہر حال جب تک زیرِ بحث شعر کسی دوسرے شاعر کے کلام میں حرف بحرف اسی صورت میں دستیاب نہ ہو، اسے برترؔم کے شعر کی ترمیم یافتہ شکل سمجھنا چاہیے۔

(بقیہ: دل دل)

ایک خوبصورت کامدار ساڑھی۔
جب کوئی موٹی رقم کہیں سے ملتی تو وہ اس کے لیے ساڑھی لایا کرتا تھا۔
ضمیر تو پہلے ہی بک چکا تھا — غیرت نے آنکھیں چرالی تھیں۔
"آخر وہ میرا ہی تو ہے —"
وہ اس کی آغوش میں گر پڑی — اور اسے لگا —
وہ نیچے — نیچے — نیچے دھنستی چلی جا رہی ہے۔

(بقیہ: غالب اور عہدِ غالب)

رہیں اور اس کو نئی سمت دینے والے فن کار بھی۔ اس اعتبار سے مرزا کا یہ شعر غالباً ان کی اور ان کے عہد کے تعلق کی بہترین عکاسی کرتا ہے:

مرد آں کہ در ہجومِ تمنا شود ہلاک
چوں تشنہ کہ بر لبِ دریا شود ہلاک

یہاں غرض کامرانی یا ناکامرانی سے نہیں، ہجومِ تمنا سے ہے جس کا رشتہ ترقی اور آزادی کے انیسویں صدی والے انہی تصورات سے ملتا ہے جو انسان کے دل میں ارمانوں کی نئی شمعیں جلائے رکھتی تھیں اور اس پیاسے کو بھی تو جو تڑپ تڑپ کر ساحلِ دریا کے کنارے دم توڑتا ہے کم سے کم یہ تسلی ضرور میسر ہو جاتی تھی کہ شاید اس کے بعد آنے والے اپنی پیاس بجھا سکیں گے۔

غالبؔ کی حسِ مزاح، ان کے ہاں ان کی اپنی دو شخصیتوں کا ذکر اس طرح کے اشعار میں جیسے:

تھی خبر گرم کہ غالبؔ کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

یا خطوں میں "میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کر لیا ہے" والا خط۔ غالبؔ کا بقول عبد الرحمٰن بجنوری "برقی قہقہہ" بھرپور طنز جو کبھی کبھی خود اپنے پر ہوتا ہے یہ سب کچھ غالبؔ کی اندرونی کشمکش اور غالبؔ کے اندر کی دونوں شخصیتوں، امیر زادے غالبؔ اور نئے ابھرنے والے متوسط طبقے کے ارمانوں کے علمبردار غالبؔ کے درمیان کشمکش کے مظاہر ہیں۔

پہلی کیفیت آج کے ایک شاعر کے زبانی اس طرح ادا ہوتی ہے:

وہ کرب ہے کہ نہیں بنتا سانس بھی لیتے
مگر جو ملتی تو ایک اور زندگی لیتے

دوسری کیفیت کا بیان مجازؔ کے اس شعر کی مدد سے کرنے کی اجازت چاہتا ہوں:

اب اس کے بعد صبح ہے اور صبحِ نو مجازؔ
ہم پر ہے ختم شامِ غریبانِ لکھنؤ

(بقیہ: مریادا)

آخری دن بھی آپہنچا جس کا سب کو انتظار تھا۔ بڑھیا کی سانس مشکل سے چل رہی تھی اور گھر کے سب لوگ اس کے گرد جمع تھے۔ اندولے یکایک آنکھیں کھولیں اور بہو کی طرف یوں دیکھا جیسے کچھ کہنا چاہتی ہو۔

بہو نے ساس کا مطلب سمجھ لیا اور وہ اس کے نزدیک سرک گئی۔

"بہورانی!" وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے دھیرے دھیرے بولی۔ "میں اب چلی۔ پوچی کو بھوکا مت رکھنا۔ میرا بھوجن اسے ڈال دیا کرنا یہی میرا شرادھ ہوگا۔"

غزلیں

شیدا رومانی

تم پلٹ کر کبھی پتھر کی طرف مت دیکھو
ٹھوکریں لگتی ہیں ٹھوکر کی طرف مت دیکھو

صبح کی آس میں دل اپنا جلانے والو!
شام کے ڈوبتے منظر کی طرف مت دیکھو

مسکراتے ہوئے منزل کی طرف بڑھ جاؤ
تھک کے بیٹھے ہوئے رہبر کی طرف مت دیکھو

جال پھیلا ہے چمکتے ہوئے ارمانوں کا
گھر کے دروازے سے باہر کی طرف مت دیکھو

جان دیتے ہوئے انساں کو بچا لو پہلے
جان لیتے ہوئے خنجر کی طرف مت دیکھو

تم ابھی وسعت و گہرائی سے ناواقف ہو
تم ہو تالاب، سمندر کی طرف مت دیکھو

ہر سیہ رات کا انجام سحر ہے شیدا
اپنے تاریک مقدر کی طرف مت دیکھو

ایم۔اے۔ کاوش

وہ ظالم راہ پر آیا بہت ہے
جفائیں کر کے پچھتایا بہت ہے

کروں میں ترکِ مے یا ترکِ توبہ
مجھے واعظ نے سمجھایا بہت ہے

کہاں تابِ تصور اب، کہ دل نے
تری فرقت میں تڑپایا بہت ہے

کہیں کھل جائے نہ رازِ محبت
زباں پر اُن کا نام آیا بہت ہے

جو مل جاتے تو میں جی بھر کے دیکھوں
مجھے ظالم نے ترسایا بہت ہے

جگر میں ٹیس، آہیں، لب پہ نالے
محبت کا یہ سرمایا بہت ہے

نہ کیوں مایوس ہوں راہِ طلب میں
مجھے رہبر نے بہکایا بہت ہے

جفاؤں سے نہ باز آیا وہ کاوش
اسے گو ہم نے اپنایا بہت ہے

مختار ٹونکی

واسطہ ہے نہ دوا سے نہ دعا مانگے ہے
تیرا بیمار تو آنچل کی ہوا مانگے ہے

غنچہ غنچہ چمن دہر کا اللہ اللہ!
تیرے اندازِ تبسم کی ادا مانگے ہے

چاند کرتا ہے فلک سے ترا دیدار اگر
چاندنی بڑھ کے تجھی سے تو ضیا مانگے ہے

بجلیاں سی ترے عارض سے دمک اٹھتی ہیں
رنگ کاجل بھری آنکھوں سے گھٹا مانگے ہے

دل و جاں نذر کروں تجھ پہ لٹا دوں دنیا
مجھ سے کیا چیز ان آنکھوں کی حیا مانگے ہے

تیرے سانسوں کی مہکتی ملے اسے کاش فضا
زندہ رہنے کو یہ دل اب وہ ہوا مانگے ہے

اس کے کوچے میں چلیں خون بہا دیں مختار
آج دیوانوں سے وہ خونِ وفا مانگے ہے

محمد مرسلین شیدا

بگڑی جو کبھی محفلِ احباب کی صورت
تڑپا کیے ہم، ماہیٔ بے آب کی صورت

دل کے چمنستاں میں بہار آئی ہوئی ہے
ہر زخم کھلا ہے گلِ شاداب کی صورت

وہ عشق کہ در پردۂ دل رقص کناں ہے
ظاہر میں ہے پروانۂ بے تاب کی صورت

شبنم کی تڑپ، گل کی تمنا، بہ دمِ صبح
حیرت نگراں، دیدۂ خونناب کی صورت

ہے رخ پہ ترے سایہ فگن، حلقۂ گیسو
یا ابر کے پردے میں ہے مہتاب کی صورت

دزدیدہ نظر بن ہی گئی، وجہِ تسلی
کچھ اور تھی ورنہ دلِ بے تاب کی صورت

ہر تارِ رگِ جاں میں ہے اک جنبشِ پیہم
لطفِ نگہِ دوست ہے مضراب کی صورت

غربت میں تصور کا مزا آگیا شیدا
کیا کیا نظر آئی مجھے احباب کی صورت

منظور ہاشمی

دل بہلنے کے لیے کوئی بہانا دے گا
وہ اگر رنج بھی دے گا تو سہانا دے گا

آنکھ سے گر کے کہیں کے نہ رہیں گے آنسو
کون ان خانہ خرابوں کو ٹھکانا دے گا

کس طرح بند کواڑوں کی کھلیں گی آنکھیں
اور کب تک انھیں آواز دے گا

پھول کھل جائیں گے پڑتے ہی ترا عکسِ بدن
آئینہ گر کی خبر آئینہ خانا دے گا

تھیں پر و بال کے دم سے ہی یہ ساری باتیں
اب کوئی دام بچھائے گا نہ دانا دے گا

پھولتا پھلتا رہے گا تری یادوں کا شجر
لذتیں روز نئی درد پرانا دے گا

رشید عارف

حادثوں کا ہے سلسلہ مجھ میں
حشر ہر تا رہا بپا مجھ میں

اف غمِ روزگار کیا کہیے
ایک فن کار مر گیا مجھ میں

میری محرومیاں ہیں اور میں ہوں
جاگتی کیوں رہی انا مجھ میں

میں تو تنہا نہیں رہا جب سے
کوئی آباد ہو گیا مجھ میں

میں وہ آئینہ ہوں جو ٹوٹ چکا
اپنی صورت نہ دیکھنا مجھ میں

زخم کھا کھا کے مسکرا دینا
یہ سلیقہ بھی آگیا مجھ میں

دیکھ لیتا لحد کا سناٹا
کوئی عارف جو جھانکتا مجھ میں

امام مرتضیٰ نقوی

میر مہدی مجروح

اردوداں حلقہ میں میر مہدی مجروح کا نام کوئی غیر معروف، اجنبی یا چونکا دینے والا نہیں۔ اردو ادب کی تاریخ اس وقت تک تشنہ رہے گی جب تک مجروح کا ذکر نہ آئے۔ مگر زمانے کی ستم ظریفی کہیے یا خود کلام مجروح کی کم مائیگی کہ ان کو بحیثیت شاعر شہرت حاصل نہ ہو سکی۔ ان کی شہرت کا سبب صرف یہ ہے کہ وہ غالب کے چہیتے شاگرد تھے۔ غالب اور ان کے درمیان بے تکلف مراسلت کا سلسلہ تھا۔ غالب نے اپنے دل کی باتیں انھیں دل کھول کر لکھی ہیں۔ مجروح نے بھی انھیں اسی انداز اور اسی لب و لہجہ میں جواب دیے ہیں۔ غالب مجروح کی نثر کے قائل تھے انھیں مجروح کی طرز تحریر پسند تھی جس کا اظہار انھوں نے دو ایک جگہ خطوط میں کیا ہے۔ مثلاً:

"میر مہدی، جیتے رہو۔ آفریں صد ہزار آفریں۔ اردو عبارت لکھنے کا کیا اچھا ڈھنگ پیدا کیا ہے کہ مجھ کو رشک آنے لگا ہے۔ سنو دلی کی تمام مال و متاع و زر و گوہر کی لوٹ پنجاب کے احاطے میں گئی ہے۔ یہ طرز عبارت خاص میری دولت تھی سو ایک ظالم پانی پتی انصاریوں کے محلے کا رہنے والا لوٹ لے گیا۔ مگر میں نے اس کو بھی کہا اللہ برکت دے۔"

"بھائی تم اردو کے مرزا قتیل بن گئے۔ اردو بازار میں نہر کے کنارے رہتے رہتے رود نیل بن گئے۔"

غالب نے ویسے تو بہت سے لوگوں کو خطوط لکھے ہیں مگر ایسی چند ہی ہستیاں ہیں جن کے آگے کلیجہ نکال کر رکھ دیا ہے جن میں خلوص کی گرمی، محبت کی تپش اور رسم و راہ کا بے تکلف انداز پایا جاتا ہے مثلاً میر مہدی مجروح مرزا تفتہ اور حاتم علی مہر وغیرہ۔ یہ چند گنی چنی شخصیات ہیں جن کو غالب کے خطوط کی بدولت شہرت عام حاصل ہوئی۔

میر مہدی حسین مجروح ۱۸۳۳ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام میر حسین تھا۔ تگار تخلص رکھتے تھے۔ ان کے بزرگ مغلوں کے آخری عہد میں ایران سے ہندوستان آئے اور سپہ گری کا پیشہ اختیار کیا۔ یہاں تک کہ دربار شاہی میں تقرب حاصل کیا۔ مجروح کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ ان کا خاندان علم و فضل کا گہوارہ تھا۔ ان کے چچا میر حسن فارسی نثر لکھنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ بھائی میر سرفراز حسین جن کے نام غالب کے خطوط ہیں عربی کی اچھی استعداد کے مالک تھے۔ والد بھی جہاں ایک طرف شاعر تھے، وہاں دوسری طرف مروجہ علوم کے ماہر تھے۔ ایسے حالات میں نا ممکن تھا کہ مجروح اس علم و ادب کی روشنی سے محروم رہتے۔ شاعری کا ذوق تو فطری تھا۔ علمی ماحول نے اس میں اور جلا بخشی۔ دہلی میں اس وقت ذوق، غالب، مومن اور صہبائی کا طوطی بول رہا تھا۔ مجروح نے ان کی بزم آرائیاں دیکھیں اور رفتہ رفتہ اپنے آپ کو اس علمی اور ادبی حلقہ میں شامل کر لیا۔ غالب کی شاگردی اختیار کی بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ان کے مرید ہو گئے اور ہمیشہ کے لیے اپنے آپ کو ذہنی طور پر غالب کے سپرد کر دیا۔

مجروح چوبیس سال کے تھے کہ دہلی میں ۱۸۵۷ء کا فساد شروع ہوا۔ مجروح نے دہلی کو خیرباد کہا اور پانی پت کے محلے انصار میں سکونت اختیار کی۔ یہاں کافی عرصے قیام کیا۔ جب دہلی کے حالات سازگار ہوئے تو یہ پھر واپس آئے۔ مگر اب دہلی وہ دہلی نہ تھی۔ جب وہاں معاش کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکی تو باہر کا رخ کیا۔ ریاست الور اپنے بھائی کے پاس پہنچے وہاں مہاراجہ شیو دھیان سنگھ اہل علم اور صاحبان کمال کی قدر کرتے تھے۔ وہاں نائب تحصیل دار کے عہدے پر کام کرتے رہے پھر تحصیل دار ہو گئے۔ لیکن راجہ صاحب کے انتقال کے بعد یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ جے پور آئے۔ مگر یہاں زیادہ عرصہ نہیں رہے۔ بالآخر نواب حامد علی خاں والی رام پور تک رسائی ہو گئی۔ انھوں نے مجروح کی قدردانی کی۔ یہ زمانہ اطمینان کا گزرا۔ انتقال سے کچھ عرصہ قبل بینائی جاتی رہی۔ ۵ مئی ۱۹۰۳ء ستر سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ مرنے سے پہلے چند با اغفر لی الہٰی کہا اور یہی ان کی تاریخ وفات ہے جو نواب احمد سعید خاں صاحب طالب نے اپنے ایک قطعہ میں نکالی ہے۔ مجروح کی قبر درگاہ قدم شریف دہلی کے صدر دروازے کے باہر ہے اور طالب کا قطعہ تاریخ لوح مزار پر کندہ ہے۔

۱۸۹۹ء میں میرن صاحب نے مجروح کا دیوان "مظہر معانی" کے نام سے شائع کیا۔ اس کے علاوہ چند کتابیں نثر میں بھی لکھیں جن کی نشاندہی مالک رام نے "تلامذۂ غالب" میں کی ہے۔ مجروح کی یہ کتابیں مذہبی قسم کی ہیں۔ جیسے "انوار الاعجاز" جس میں رسول اللہؐ کے معجزات بیان ہوئے ہیں۔ "ہدیۃ الائمہ" جو ائمہ اثنا عشر کا تذکرہ ہے۔ ایک تذکرہ طلسم راز بھی لکھا تھا۔ یہ تینوں کتابیں

اب نایاب ہیں۔ ’طلسم راز‘ پہ تقریظ غالب نے فارسی میں کی ہے وہ ان کی کلیات میں موجود ہے۔ ’اردوئے معلیٰ‘ کا دیباچہ مجروح کی یادگار ہے۔

مجروح کے کلام میں مضامین کے اعتبار سے کوئی تنوع نہیں۔ وہی روایتی انداز ہے جو ان کے ہم عصر شعرا کا شیوہ تھا۔ تصوف اور عشق و عاشقی کے مضامین کو مختلف پیرایۂ بیان میں ادا کیا ہے۔ شراب ایک ہی ہے جو رنگا رنگ شیشوں میں انڈیل دی گئی ہے یا محمد حسین آزاد کی زبان میں یہ کہنا مناسب ہوگا کہ یہ لوگ ایک ہی طرح کے پھولوں سے مختلف طرح کے گلدستے بناتے تھے۔

مجروح نے اس بات کا التزام کیا ہے کہ جب اپنے دیوان میں کوئی نئی ردیف شروع کرتے ہیں تو اس کی ابتدا نعت یا منقبت سے کرتے ہیں۔ کہیں کہیں کئی کئی غزلیں اس قسم کے مضامین سے بھری ہوئی ہیں جن میں اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے ؎

رحمت خدا کی عام نبی شافع انام　　　پھر خوف کس لیے ہو حساب و کتاب کا

تو رحم غفار ہے تو مالک و مختار　　　کس در پہ بھلا جاؤں گا اس در کے سوا میں

یہ عقیدت محض نظریاتی یا تصوراتی نہیں ہے بلکہ ایک منزل وہ آتی ہے جب شاعر اپنی ذات کو بھول جاتا ہے اور مکمل طور پر اپنے آپ کو قادر مطلق کے سپرد کر دیتا ہے ؎

میں رضامند ہوں تو دوزخ و جنت جو دے
ایک ہے عدل ترا دوسرا احساں تیرا
مل جائے تو ہے شکر نہ مل جائے تو ہے صبر
ہوں راہ روِ مسلکِ تسلیم و رضا میں

عشق الٰہی میں تڑپ اور اضطرابی کیفیت سچے عاشق کو اپنی خودی چھوڑنے پر مجبور کر دیتی ہے پھر وہ اپنے مرجانے یا فنا ہو جانے کا غم نہیں کرتا اور بارگاہِ خداوندی میں خود بخود حاضر ہو جاتا ہے۔ اس کو وہاں بلانے یا طلب کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی ؎

طلب کیسی؟ بلانا کیا؟ وہاں خود جا پہنچتے ہیں
اگر عالم یہی چندے رہا بے اختیاری کا
ہوا قرب خدا چھوڑی خودی جب
کریں ہم اپنے مرجانے کا غم کیا

مضامین تصوف مجروح کے یہاں روائتی ہیں۔ ان کا کوئی خاص نقطۂ نظر نہیں تھا۔ وہ بنیادی طور پر صوفی شاعر نہ تھے اسی لیے وقتی جذبے کے تحت یا مروجہ روش کے پیش نظر انھوں نے طبع آزمائی کی ہے۔ ساتھ ساتھ عشق مجازی کی ترنگیں و رندی و مستی کی کیفیات بھی ان کے ہاں خوب پائی جاتی ہیں۔ اس تضاد کا اعتراف وہ خود ایک جگہ کرتے ہیں ؎

ہو کبھی صوفی و صافی کبھی رندِ بدمست
یہ تو باتیں تمھیں مجروح سزاوار نہیں

وہ صوفی و صافی اور رندِ بدمست یقیناً ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے ہم عصر مولانا حالیؔ کے بھی ہمنوا معلوم ہوتے ہیں کہ شاعر کو معلم الاخلاق ہونا چاہیے۔ شاعری محض تفریح طبع کا ہی ذریعہ نہیں بلکہ تزکیہ اخلاق کا وسیلہ بھی ہے۔ اس سلسلے میں مجروح اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں ؎

لکھو وہ مضمون جو ہو نفع رسانِ عالم
ورنہ کاغذ پہ لکیریں یونہی بے کار نہ کھینچ

میں سمجھتا ہوں کہ مجروح کا یہ نظریہ بالکل خیالی ہے اس میں ان کے عمل کو بالکل دخل نہیں۔ ان کے کلام میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی جو نفع رسان عالم ہو۔ ممکن ہے یہ شعر انھوں نے مولانا حالیؔ کے حالات سے متاثر ہو کر کہا ہو۔ مگر ان کے کلام کا بیشتر حصہ عشق و محبت کے مضامین سے بھرا پڑا ہے۔ اس موضوع میں اتنی وسعت ہے کہ اردو شاعری میں عاشق کبھی محبوب کے لیے آسمان کے تارے توڑ کر لاتا ہے اور کبھی وہ ہجر و فراق میں اتنا کمزور ہو جاتا ہے کہ بستر کی شکن معلوم ہونے لگتا ہے۔ ان باتوں سے مجروح بھی اپنا دامن نہ بچا سکے۔ اگرچہ وہ محبوب سے یہ توقع کرتے ہیں کہ وہ ان سے محبت کرے وہ اس سے برابری کا برتاؤ چاہتے ہیں ؎

یہ کیا کہ ہمیں مرتے ہیں ہاں لطف تو جب ہے
تاثیر محبت جو اِدھر ہو تو اُدھر بھی

یہ بات کہنے کے لیے تو بہت آسان ہے لیکن عموماً دیکھا یہی جاتا ہے کہ تاثیر محبت اِدھر تو ہوتی ہے مگر اُدھر نہیں۔ محبوب تو اپنے عاشق کو ہمیشہ ذلیل و خوار ہی سمجھتا ہے۔ میرؔ نے بھی اسی کا رونا رویا ہے ؎

میں جو بولا کہا کہ یہ آواز
اسی خانہ خراب کی سی ہے

مجروح بھی اسی کا شکوہ کرتے ہیں ؎

سن کر میری صدا وہ کہتا ہے　　　دیکھو در پر وہ کوئی کھڑا ہے فقیر
میری تصویر دیکھ کر بولے　　　ہے یہ کس سوگوار کی صورت

عاشق وصل کی راحت سے ہی لطف اندوز نہیں ہوتا بلکہ ہجر کی تڑپ بھی اس کے لیے تسکین کا باعث ہوتی ہے ؎

ہجر کے رنج وصل کی راحت
لطف ہر ایک کا جدا دیکھا

مجروح نے جگہ جگہ محبوب کے سراپا کا ذکر کیا ہے وہ اس کے نقش و نگار میں بھی حسن کا تماشہ دیکھتے ہیں۔ اس کی نیچی نگاہوں میں بھی انھیں حسن کا دیدار ہوتا ہے اس کی رفتار میں بھی انھیں حسن کی فتنہ خیزیاں نظر آتی ہیں جس کا ذکر انھوں نے جگہ جگہ کیا ہے ؎

دیکھ کر یار کے گل رخسار　　　ہم پہ معنی کھلے نزاکت کے
تم جو کہتا ہو تو آئینہ نہ دیکھو صاحب　　　نہ کہیں تم سے مقابل کوئی تم سا ہو جائے
یہی انداز تو ہے دل کو اڑا لینے کے　　　ان کی تم نیچی نگاہوں کے نہ جانا ہرگز

کچھ کچھ چلن ہے حشر ہیں رفتار یار کا
ہے وہ بھی فتنہ خیز مگر اس قدر کہاں

کہیں کہیں معاملہ بندی کی بھی ان کے کلام میں بہترین مثالیں ملتی ہیں شاہد پرستی کے مضامین جہاں بیان کیے جائیں وہاں معاملہ بندی کو بھی کسی طرح نظرانداز نہیں کر سکتے۔ محبوب سے چھیڑ چھاڑ اور نوک جھونک کام جوئی اور ہوس پرستی کا جزو اعظم ہے۔ اگر شاعر اس قسم کے مضامین بیان نہ کرے تو کبھی کبھی ایک تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ غالب مومن اور داغ کے کلام میں ایسی بہت مثالیں ملتی ہیں۔ مجروح کے یہاں اس کی رنگا رنگی دیکھیے ؎

ہائے وہ دن کہ شب وصل ہر اک کھٹکے پر
ان کا گھبرا کے یہ کہنا کہ بس اب کیا ہوگا

ان کو جانے سے جو روکوں تو یہ کہتے ہیں کہ ولہ
درد ہوتا ہے میرے ہاتھ کو ہر بار نہ کھینچ

میں نے کہا کہ بوسہ نہ دے بیٹھ تو سہی
بولا کچھ اعتبار تمھارا نہیں مجھے

امرد پرستی اس دور کا فیشن تھا۔ غالب بھی اس نہج سے نہ بچ سکے اور یہ کہہ ڈالا ؎

آمد خط سے ہوا ہے سرد جو بازار دوست
دود شمع کشتہ تھا شاید خط رخسار دوست

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرت حق سے یہی حوریں اگر واں ہوگئیں

البتہ مومن و مجروح کا کلام ہم جنسی کراہتوں سے پاک ہے۔ مجروح کا محبوب عورت ہے اور ہر جگہ مجروح کا مخاطبہ معشوقہ سے ہے معشوق سے نہیں۔ ان کے یہاں محبوب کا عورت ہونا صاف پتہ چلتا ہے مثلاً ؎

ہیں بشر کیا ملک بھی شرمائیں
اس کے سینے کا دیکھ لیں جو ابھار

کیوں منھ چھپا ہے کس لیے اتنا حجاب ہے
تری تو شرم ہی ترے رخ پر نقاب ہے

ذرا تم دیکھنا چلمن اٹھا کر
یہ جاتی نعش ہے کس نوجواں کی

کیا نازکی واہ کہ گجروں کے بوجھ سے
دکھتی رہی وہ نرم کلائی تمام رات

ہماری شاعری میں غم عشق کے ساتھ سیاسی اثرات نے بھی جگہ پائی ہے جس نے حقیقت اور واقعیت کی راہیں کھول دی ہیں۔ غم عشق اور روزگار دونوں اپنی جگہ اہم ہیں۔ شعر زندگی کی آئینہ داری اسی وقت کر سکتا ہے جب کہ اس میں تمدنی زندگی کے ہر پہلو کو اپنے اندر سمونے کی صلاحیت ہو۔ اپنے وقت کے حالات وکیفیات و واقعات کی عکاسی ہر باشعور شاعر کے یہاں ملتی ہے۔ کسی نے اس کو باقاعدہ شہر آشوب کی شکل دے دی ہے اور کسی نے اس کو غزل کے رمز و ایما کا جامہ پہنایا ہے۔ مجروح بھی ان شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے اپنی غزلوں میں اپنے عہد کے حالات اور تغیر پذیر سیاسی و سماجی کیفیات کا نقشہ کھینچا ہے ؎

نہ رہے یار و آشنا باقی
ہم کو غربت ہوئی وطن میں ہے

انھوں نے چند غزلیں دہلی کے حال میں لکھی ہیں اگر دیکھا جائے تو یہ غزلیں نہیں بلکہ دہلی کے مرثیے ہیں جن میں تاثیر، سوز و گداز اور بلا کی تڑپ پائی جاتی ہے۔ مثلاً

ذکر بربادیِ دہلی کا سنا کر ہمدم — نیشتر زخم کہیں پھر نہ لگانا ہرگز
آب رفتہ نہیں پھر بحر میں پھر کر آتا — دہلی آباد ہو یہ دھیان نہ لانا ہرگز
وہ تو باقی ہی نہیں جن سے کہ دہلی تھی مراد — دھوکہ اب نام پہ دہلی کے نہ کھانا ہرگز
اب تو یہ شہر ہے اک قالب بے جاں ہمدم — کچھ یہاں رہنے کی خوشیاں نہ منانا ہرگز
رہی یاران گذشتہ کی کہانی باقی — یہ تو بھولا ہے نہ بھولے گا زمانہ ہرگز

دوسری غزل کے چند شعر دیکھیے:-

وہ کہاں جلوۂ جاں بخش بتانِ دہلی — کیونکر جنت پہ کیا جائے گمانِ دہلی
ان کا بے وجہ نہیں ٹوٹ کے ہونا برباد — ڈھونڈتے ہے اپنے مکینوں کو مکانِ دہلی
کرکے برباد اسے کس کو بسائے گا فلک — کیا کوئی اور بھی ہے شہر بسانِ دہلی

دہلی کا ذکر اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک غالب کا ذکر نہ کیا جائے۔ غالب دہلی کی محفلوں کی شمع تھے۔ وہاں کی مجلسوں کے روح رواں تھے ان کے دم سے دہلی کی بہار قائم تھی۔ مجروح اپنی عقیدت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں ؎

یا خدا حضرت غالب کو سلامت رکھنا
اب اسی نام سے باقی ہے نشانِ دہلی

غزل میں ہر قسم کے مضامین بیان ہوتے چلے آتے ہیں۔ ہمارے شعرا نے غزل کو غم جاناں اور غم دوراں کے لیے مخصوص نہیں کیا ہے بلکہ ان کی بے پناہ وسعتوں سے استفادہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ انھوں نے اس بحر بیکراں میں غوطہ لگا کر بڑے آبدار موتی نکالے ہیں اور اپنے تجربات کو اس طرح بیان کیا ہے کہ وہ محض ایک انسان، ایک فرد، اور ایک شخصیت کا ہی تجربہ نہیں بلکہ کل معاشرے کا تجربہ بن گیا یا وہ ایک ایسی ٹھوس حقیقت ہے جس سے کوئی منکر نہیں ہو سکتا۔ ان آفاقی حقائق کا اظہار وہ اس طرح کرتے ہیں ؎

نہ کر مجروح کچھ کوشش کہ جب دن آئیں گے اچھے
تو بگڑے کام برسوں کے سنور جائیں گے دم بھر میں

شیر کے سامنے جاؤ مگر اس سے بھاگو
خصلتیں رکھے جو حیوان کی انساں ہو کر

خود وہ بد ہے جو کسی اور کو کہتا ہے بُرا
نیک وہ ہیں جو بُروں کو بھی بھلا جانتے ہیں

موضوع اور طرزِ ادا دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ اگر شاعر کے پاس موضوع تو ہو مگر طرزِ ادا نہ ہو تو اس کا فن ظہور پذیر نہیں ہو سکتا۔ یہ طرزِ ادا ہی وہ چیز ہے جسے حسرت نے 'شیوہ گفتار' سے تعبیر کیا ہے۔ موضوع اگر بے جان بھی ہو تو اسی شیوہ گفتار سے بے جان چیزوں میں جان پڑ سکتی ہے۔ یہی ایک شاعر کا فن بھی ہے اور اسی معجزۂ فن کی نمو خونِ جگر سے ہوتی ہے۔ ہر شاعر کا اپنا الگ رنگ ہوتا ہے کہ وہ بات کس طرح کہے کہ وہ دوسروں کو اپیل کر سکے۔ عظیم شاعر یوں ہی پسند کیے جاتے ہیں کیوں کہ ان کے پاس اپنے خیال کی انفرادیت کے ساتھ ساتھ اپنا منفرد اسلوب بھی ہوتا ہے۔ تقریباً ہر شاعر اپنے پیرایۂ بیان یا اسلوب سے ہی جانا جاتا ہے۔ اس لیے بنیادی چیز یہ ہے کہ شاعر نے بات کس ڈھنگ سے کہی ہے۔ مجروح کا کلام پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے طرز میں کوئی پیچیدگی نہیں خیال کو بہت سیدھے سادے اور عام فہم انداز میں پیش کیا ہے۔ کہیں کہیں اس قدر بے ساختگی پر اتر آئے ہیں کہ خالص بول چال کا انداز پیدا ہو گیا ہے۔ مثلاً۔

میں عاشق ہوں یہ تم بھی جانتے ہو = پھر اس کا ہر گھڑی ہے پوچھنا کیا
تو تو میں میں کرو نہ اس سے شیخ = رندِ مے خوار ہے بہت منھ پھٹ

مجروح نے روزمرہ کا استعمال بہت خوب کیا ہے۔ اس روزمرہ کے استعمال سے ان کے کلام میں اگر ایک طرف بے ساختگی پیدا ہوتی ہے وہاں دوسری طرف زبان کی چاشنی مزہ دے جاتی ہے۔ بعض جگہ روزمرہ کا تصرف انھیں داغ سے قریب لے آتا ہے۔ مثلاً

بھولے بھولے سے جو رہتے ہو کہو خبر تو ہے
یہ تو کچھ عشق کا انداز ہے پایا جاتا

ان سے مجروح کا جو پوچھا حال
ہنس کے بولے میری بلا جانے

مجھ پر تہمت صنم پرستی کی — شیخ صاحب خدا خدا کیجیے
لعل کو اس کے لب سے کیا نسبت — یہ بھی ایک بات ہے سنا کیجیے

مجروح کی زبان خالص دلی کی زبان ہے دلی کے محاورے ہیں ان کے یہاں جو چیز ہمیں سب سے نمایاں نظر آتی ہے وہ یہی ہے کہ انھوں نے محاورے سب استعمال کیے ہیں کہیں کہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ ان کی شعوری کوشش ہے اس سے آورد کا احساس تو ضرور ہوتا ہے لیکن ساتھ ساتھ زبان کا چٹخارہ بھی ملتا ہے ؎

رال ٹپکے گی شیخ صاحب کی — نہ دکھاؤ شراب کی صورت

اس کوچہ میں میرا در و دیوار ہے دشمن — لو آنکھ دکھاتا ہے مجھے روزنِ در بھی
رقیبوں سے تو کچھ دبتی ہے کم — غضب آلودہ رہتے ہو ہمیں پر
قصرِ حالی کے حوالی میں ذرا تم مجروح — اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد نہ بنانا ہرگز
یہ محل ذکرِ غیر کا کیا تھا — وہ مجھے جان کر جلاتے ہیں

مجروح غالب کے شاگرد تھے۔ غالب کی طبیعت میں مشکل پسندی تھی انھوں نے فارسی ترکیبیں استعمال کی ہیں۔ اس لیے حالات کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ بھی غالب کی پیروی کرتے مگر ایسا بالکل نہیں ہے اس کی ایک وجہ تو یہی ہے کہ غالب کی قادر الکلامی ان کی استعداد اور ان کی خداداد صلاحیت کی ہمسری کرنے کی کوئی جرأت ہی نہیں کر سکتا تھا۔ دوسرے خود مجروح کی طبیعت کا میلان سادگی اور سہل پسندی کی طرف تھا اس لیے وہ اپنی فطرت سے بغاوت نہ کر سکتے تھے انھوں نے اپنے رجحانِ طبع کے مطابق اپنی فطرت کے جوہر دکھائے ہیں ان کی بیشتر غزلیں ایسی ہیں جو سہلِ ممتنع کا بہترین نمونہ کہی جا سکتی ہیں۔ جس نے ان کے کلام میں ایک دلکشی دل نشینی اور برجستگی پیدا کر دی ہے۔ مثلاً

زندگانی کا کیا بھروسہ ہے — سارے جھگڑے بنیڑ تو جھٹ پٹ
اتنا ملنا بھی ترک کر دو گے؟ — یہ نہ پوچھو کہ مدعا کیا ہے
یہ جو چپکے سے آئے بیٹھے ہیں — لاکھ فتنے اٹھائے بیٹھے ہیں

مجروح کی بعض غزلوں میں ایسے شعر ملتے ہیں جن میں مکالمے کا رنگ پایا جاتا ہے کسی خیال کو سیدھی طرح بیان کر دینا تو آسان ہے لیکن ایک شعر میں دو آدمیوں کی گفتگو کو ادا کرنا یقیناً دشوار امر ہے۔ اس کے لیے قدرت اور ریاضت درکار ہے۔ مجروح کے کلام میں اس فن کا مظاہرہ دیکھیے ؎

میں نے کہا کہ میرے گھر آؤ۔ کہا کہاں! — تیرا تو نام پہلے ہی خانہ خراب ہے
میں نے کہا کہ بوسہ نہ دے بیٹھ تو یہی — بولا کچھ اعتبار تمھارا نہیں مجھے

مجروح کے کلام میں بیشتر غزلیں ایسی ہیں جو چھوٹی بحروں میں ہیں۔ ان کا کلام سرسری پڑھنے کے بعد بادی النظر میں اس پر نظر جاتی ہے کہ وہ چھوٹی بحریں استعمال کرتے ہیں اس سے ان کی طبیعت کو مناسبت ہے۔ اس سے آمد کا پتہ چلتا ہے اور بلا کی روانی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کی مختلف غزلوں کے ایسے شعر پیش کیے جاتے ہیں جو چھوٹی بحروں میں ہیں ؎

منھ چھپانے لگے حیا کر کے — ہوئے بیگانے آشنا کر کے
کوئی اس عہد میں نہیں ہے شفیق — آپ اپنے پہ مہرباں ہوں میں
یاں تو مطلب ہی کچھ نہیں رکھتے — جو کسی سے کہیں روا کیجیے
یہ شوخی سے اس کی نظر ہو گئی — کسی نے نہ جانا کدھر ہو گئی
یوں ہی گزرا بہار کا یہ برس — ہم اسی طرح ہیں اسیرِ قفس

مجروح نے اپنے استاد غالب کے اتباع میں اکثر ان ہی کی ردیفوں میں بھی غزلیں کہی ہیں حالانکہ مضامین کی ندرت اور طرزِ ادا کی جدت کی وجہ سے وہ غالب تک کہاں پہنچ سکتے ہیں اگر مجروح اور غالب کے ہم ردیف اشعار کو ملا بھی دیا جائے تو پڑھنے والا دونوں کے کلام میں بخوبی امتیاز کر سکتا ہے۔

شکیل پونم

ٹکڑا ٹکڑا آدمی

وہ اندر ہی اندر اس قدر ٹوٹ چکے ہیں کہ انھیں اب خود پر ذرا بھی بھروسہ نہیں رہا ہے۔ انھیں لگتا ہے کہ دھیرے دھیرے وہ اتنے کمزور ہوتے جارہے ہیں کہ شاید جلد ہی ان سے ایک چھوٹا سا کام بھی نہیں ہو پائے گا۔ لکھنے کے لیے میز پر پڑے قلم کو اٹھا کر کھول نہیں پائیں گے یا جیب میں پڑے سگریٹ کے پیکٹ سے سگریٹ نکال کر سُلگا بھی نہیں پائیں گے! تب جانے کتنی مضحکہ خیز ہوگی ان کی حالت۔ کبھی کبھی انھیں ایسا لگنے لگتا ہے جیسے کرسی پر بیٹھے بیٹھے ان کا جسم منجمد ہوتے ہوئے لجلجاہٹ کی حد تک بے جان ہو جاتا ہے۔ تب بے بسی اور نا امیدی سے بھری ہوئی زندگی کے بوجھ کے باوجود وہ سہم جاتے ہیں۔ خدانخواستہ انھیں کچھ ہوگیا تو ایک بھرے پُرے خاندان کا کیا ہوگا، جس کا وہ واحد سہارا ہیں؟ کالج میں پڑھنے والی ان کی دونوں لڑکیوں کا کیا ہوگا، جن کے جہیز کے انتظام میں خود کی پہچان تک کھو دی ہے، ہائی اسکول میں پڑھنے والی دونوں لڑکیوں کا کیا ہوگا جن کے لیے جانے کب تک انھیں اور تِل تِل کر کے جلنا ہے؟ مڈل اسکول میں پڑھنے والے دس سالہ بیٹے کا کیا ہوگا، جس کو لائق بنانے کے لیے انھیں جانے اور کتنا خون سکھانا ہے؟ اُس بالکل گھریلو عورت کی زندگی جینے والی بیوی کا کیا ہوگا جس کے ناٹکوں نے انھیں ذہنی سطح پر چوس لیا ہے؟ اور گاؤں میں پڑی ہر ماہ ان سے کچھ آس لگائے رکھنے والی بوڑھی ماں کا کیا ہوگا جو کسی ضدی جونک کی طرح ان سے کئی سالوں سے چپکی ہوئی ہے؟

جب بھی وہ اپنی اس قابلِ رحم حالت پر غور کرنا شروع کرتے ہیں ایک سہرن بھری دہشت ان کے دل و دماغ پہ چھا جاتی ہے۔ اور تب اس دہشت سے نجات پانے کے لیے وہ کسی بے کار سی بات پر غور کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ مثلاً۔ شہر دہلی کلکتہ اور کلکتہ دہلی کہلانے لگے تو وہاں کے رہنے والوں کی روز مرّے کی زندگی پر اس کا کیا اثر پڑے گا وغیرہ! لیکن تکلیف دہ بات یہ ہے کہ اس طرح کی بات ہمیشہ سوچی بھی نہیں جا سکتی — اور پھر جب انھیں احساس ہوتا ہے کہ منہ بائے، مسئلوں سے منہ چرانے کے لیے ہی وہ اپنے دھیان کو بھٹکا رہے ہیں تو اچانک ہی خود کو کچھ کر پانے سے لاچار اور شرمندہ پاتے ہیں۔

کبھی انھیں اپنی پہچان کی فکر تھی۔ ایک خاص طرح کا رنگ اوڑھے خود کو ہمیشہ دوسروں سے الگ تھلگ رکھا کرتے تھے۔ جیسے انسان نہ ہوں کوئی اور مخلوق ہوں لیکن دھیرے دھیرے زندگی کی تیکھے دار سچائیوں اور پریشانیوں نے ان پر چڑھے رنگ کو دھو ڈالا اور وہ اپنی خیالی حد سے باہر آگئے۔ لیکن تب انھوں نے خود کو اس قدر لاچار پایا کہ اپنی نظر میں اپنی ہی کی پہچان کھونے کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ ... دراصل ذہنی طور پر وہ اس قدر تھک چکے تھے کہ خود کو دہرانے کے علاوہ اور کچھ کر نہیں سکتے تھے......

آج کل وہ لکھ کیا رہے ہیں؟ ..... ان بازارو پرچوں میں چھپنا کس طرح کے سمجھوتے کے تحت لیا گیا فیصلہ نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ تخلیقی سطح پر بک چکے ہیں اور اپنے بنائے پلاٹ پریوں ہی کچھ لکھ کر کچھ پیسوں کی امید لگائے رکھنا بھی انھیں اب بڑی بات معلوم ہونے لگی ہے۔ انھیں فکر لگی رہتی ہے کہ کہیں یہ سلسلہ بھی ٹوٹ نہ جائے۔ حالانکہ ان گھٹیا پرچوں سے ملتے رہنے والے پچاس ساٹھ روپے بھی انھیں کافی مہنگے پڑے ہیں! وہ زہر جیسے نجی لمحوں میں تیار کر کے ان پرچوں کو بھیج دیتے ہیں، اس کے اثر سے خو ان کا گھر بھی نہیں بچ پا رہا ہے۔ اس کا احساس انھیں ہوگیا ہے اور اس اح نے انھیں کچھ اور زیادہ چڑچڑا بنا دیا ہے۔

ہر تھکی ہوئی اور بدرنگ شام کی طرح اُس شام کو بھی وہ دفتر سے تھکے گھر پہنچے تھے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی دوسری بیٹی پر ان کی نظر پڑی جو جنسی افسانوں کے ایک پرچے میں اس قدر ڈوبی ہوئی تھی کہ اسے دفتر سے باپ کے گھر پہنچنے کے وقت کا بھی ہوش نہیں رہا تھا — ایک جھٹکے سے ان کے جسم کا سارا خون سر کی طرف چڑھ گیا تھا اور ان کی کنپٹیاں گرم توے کی طرح تپ لگی تھیں۔ اچانک جب لڑکی نے انھیں سامنے کھڑا دیکھا تو اس کا چہرہ زرد ہوگیا تھا.....

'کیا ہو رہا ہے.....؟' وہ غصّے میں چیخ پڑے تھے۔ لڑکی نے م آواز میں بتایا تھا کہ وہ پرچہ اس نے اسٹال سے خرید لیا تھا کیونکہ اس ان کی ایک کہانی چھپی ہوئی تھی۔ لڑکی کی بات جیسے ایک زنّاٹے دار چانٹے کی طرح ان کے گالوں پر پڑی تھی اور ان کے دماغ پر چڑھا گرم خون دھیر

ڈھیر سے نیچے اترنے لگا تھا اور وہ کیچ سے بھرا ٹھے تھے ..... پہلے جب معیاری پرچوں میں چھپتے تھے تو خود ہی بیوی اور بچوں کو لاڈ سے بھر کر اپنی شائع شدہ تخلیقات دکھاتے پھرتے تھے ......!

ان کے زہریلے ادب کے ناگ نے اس لڑکی کو ڈس لیا ہے اور زہر پوری طرح سے اُسے اپنی گرفت میں لے چکا ہے۔ اور وہ کچھ بھی کر پانے کی حالت میں خود کو نہیں پا رہے ہیں۔ ان کبے اندیشے ان کے ذہن میں آندھیاں پیدا کرتے رہتے ہیں۔ پتا نہیں یہ لڑکی کیا کر بیٹھے! کہیں کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو پھر وہ کس طرح زندہ رہ پائیں گے؟ ان میں اتنی قوت نہیں ہے کہ وہ محلے، دفتر اور گلی کوچوں میں لوگوں کی طنز بھری نظروں کو برداشت کر پائیں گے .....! انھیں نگوڑیوں کے چلتے آج ان کی یہ درگت ہے۔ دفتر کی فائلوں میں اپنے سارے ٹیلنٹ کو انھوں نے خود کے لیے بند نہیں کر دیا ہے! انھیں لوگوں کے لیے انھوں نے دن رات کو لہو کے بیل کی طرح گھٹتے مرتے خود کو جسم سے دماغ تک کھوکھلا کر ڈالا ہے! کچھ ہو گیا انھیں تب معلوم ہوگا ان لوگوں کو .....! موت کا خیال آتے ہی ذہن میں چل رہی آندھیاں تھم سی جاتی ہیں۔ ایک غیر قطعیت کے باوجود پل پل مسئلوں کی بھٹی میں جلتے رہنے کے باوجود وہ زندہ رہنا چاہتے ہیں! انھیں لوگوں کے لیے۔ انھوں نے ایک بہت ہی جذباتی دل پایا ہے۔ یہ لوگ ان کی کمزوری ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ یہ بات ان لوگوں کی سمجھ میں بھی آگئی ہے۔ اور اس کا فائدہ اٹھا کر یہ انھیں زیادہ سدھے ہوئے ڈھنگ سے چھلنے لگے ہیں۔ پھر بھی وہ انھیں تکلیف میں دیکھ پانے کی ہمت نہیں جٹا پاتے ہیں۔ لیکن اب تو ایک غیر قطعیت کا دہشت ناک دور شروع ہو چکا ہے۔ پچھلے سال جاڑے سے ان کے دائیں کندھے میں ایک عجیب سا درد شروع ہوا ہے۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ مستقبل میں جسم کا دایاں حصّہ فالج کی زد میں آجائے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

○

بڑی بیٹی بی۔ اے۔ کے آخری سال میں ہے۔ پڑھنے میں بس یوں ہی سی ہے۔ پڑھ لکھ کر نوکری کر کے ان کا بوجھ کچھ ہلکا کرے گی اس کی کوئی امید انھیں نہیں ہے۔ شکل وصورت کی اچھی ہے۔ قبول صورت۔ بی۔ اے۔ پاس کر لے اور کوئی لڑکا اس کی ڈگری کو بطور جہیز قبول کر لے تو خدا کا شکر! ویسے چال چلن اور مزاج وغیرہ کی بھی اچھی ہے۔ دوسری جو انٹر میں پڑھتی ہے، اس نگوڑی کو ان سے جانے کس گھڑی کی دشمنی ہے۔ اگر وقت پر انھیں سب کچھ معلوم نہ ہو گیا ہوتا تو وہ کمینی ان کی عزّت کو خاک میں ملا چکی ہوتی۔ عشق لڑانے کا شوق اسے بڑے زور کا لگا تھا! ان کے اندر کچھ سلگنے لگتا ہے ..... وہ لمحے تیز روشنی کی طرح ان کی آنکھوں میں گڑنے لگتے ہیں .....

اس روز سویرے سویرے ناشتہ کے بعد وہ دفتر جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ محلہ کا ایک چھوکرا ایک پرزہ لیے ہوئے ان کے کمرے میں داخل ہوا۔ لڑکے کے ڈھنگ سے ہی انھیں کچھ شک ہو گیا تھا۔ انھوں نے اس سے پرزہ لے کر اس کے بارے میں پوچھا تو اس نے محلہ کے ہی ایک نئے شہدے کا نام لے کر بتایا تھا کہ اس نے وہ پرزہ ان کی منجھلی بیٹی کو دینے کے لیے کہا تھا۔ یہ سُن کر ان کا دماغ بھنّا اُٹھا۔ پہلے تو اس لونڈے کو ڈپٹ کر وہاں سے بھگایا تھا اور تب پرزہ کھولا تھا ..... پہلی سطر پڑھتے ہی ان کا خون کھولنے لگا تھا۔ پورا خط فحش تحریروں سے بھرا ہوا تھا اور اس بدمعاش نے لڑکی کو شام کو ایک جگہ بلایا بھی تھا۔ خط کی تحریر سے ظاہر تھا کہ دونوں کے بیچ پہلے سے ہی خط و کتابت تھی ..... غصّہ سے ان کا سر چکرانے لگا تھا۔ انھیں سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کریں۔ اب وہ اتنی چھوٹی نہیں ہے کہ مار پیٹ سے ڈرا دھمکا کر کام چلا لیا جائے ..... لیکن انھوں نے کچھ نہیں کیا تو یہ لڑکی ان کی عزّت سر بازار نیلام کر ڈالے گی۔ کمینی! کم بخت! اسے اس گھر میں رہتے ہوئے عشق لڑانے کی جرأت کیسے ہوئی! ان کے اندر خون اتنے زوروں سے اُبل رہا تھا کہ اب ان کے اندر بھاپ جیسی کوئی چیز تیار ہو گئی تھی اور باہر آنے کی کوشش میں تھی ..... نہیں اس کمینی کو راستے پر لانا ہی ہوگا!

میز پر موٹے ڈنڈے نما رول کو اٹھا کر وہ تیزی سے اندر آئے۔ کمرے میں بیٹھی وہ پڑھ رہی تھی۔ بڑی بیٹی بھی وہیں تھی۔ دوسرے بچے شاید باورچی خانے میں ماں کے پاس تھے۔ باپ کی آنکھوں میں خون، ایک ہاتھ میں کاغذ کا ایک پرزہ اور دوسرے میں رول دیکھ کر دونوں لڑکیاں سر پر سوار کسی آندھی کا انداز لگا کر سہم گئی تھیں اور ان کی آنکھوں میں جانے کتنے سوال ایک کے بعد دوسرے گزر گئے تھے۔ وہ منجھلی بیٹی کے قریب گئے تھے اور اسے پرزہ دکھا کر پوری کوشش کے ساتھ بے رحم آواز میں پوچھا تھا: "یہ خط کس کا ہے؟"

لڑکی ایک لمحے میں ہی سب کچھ سمجھ گئی تھی اور وہ لاجواب اور خوفزدہ انھیں ایک دم گھورے جا رہی تھی۔ انھیں اس کا یہ سلوک ڈھٹائی سے بھرا ہوا لگا۔ بس اس کے سر کے بالوں کو پکڑا اور پوری قوت سے اس پر رول برسانے لگے۔ بڑی بیٹی دم بخود ہو کر اپنی جگہ پہ بیٹھی ہوئی تھی۔ تکلیف کی وجہ سے لڑکی نے چیخنا شروع کر دیا تھا۔ اس کی آواز سن کر دوسرے بچے اور ان کی ماں بھی باورچی خانے سے گھبرا کر وہاں پہنچ گئے تھے اور سہمے ہوئے صورت حال سمجھنے کی کوشش کرنے لگے تھے۔ وہ اسے بے تحاشہ پیٹے جا رہے تھے۔ غصّے میں انھیں اس بات کی بھی فکر نہیں تھی کہ آنکھ، ناک پر گہری چوٹ پڑ جانے پر دہی خرچ اور مشکلات میں پڑیں گے۔ دوسرے ہاتھ کی مٹھی میں خط بھنچ گیا تھا۔ آخر ان کی بیوی نے ہی آگے بڑھ کر انھیں چھڑانے کی کوشش کی تھی۔ "آخر بات کیا ہے جو اس طرح جوان لڑکی کو پیٹ رہے ہیں۔ پیٹنے کی بھی حد ہوتی ہے، جان لے لیجیے گا کیا؟ شاید اسے ان دونوں کو الگ کرنے کے دوران کچھ چوٹ آگئی تھی۔

"ہاں، جان لے لوں گا۔ ہماری عزّت سے کھیلنے کے لیے اسے زندہ رہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے!" ان کا غصّہ ابھی بھی سرد نہیں ہوا تھا۔

لیکن اب وہ کافی تھک چکے تھے اور ہانپنے لگے تھے۔ انھیں سستانے کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی۔ ادھر دفتر بھی جانا تھا اور دن بھر کا جان لیوا کام پڑا ہوا تھا۔ بیوی کو وہیں چھوڑ کر وہ اپنے کمرے میں آکر چارپائی پر بیٹھ گئے۔ گرمی بے حد ستانے لگی تھی۔ اور پسینے سے بھیگا جسم بے طرح چپچپانے لگا تھا۔

بیوی پیچھے پیچھے سوالیہ انداز اپنائے ہوئے ان کے کمرے میں چلی آئی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ اٹھے تھے اور مڑے تڑے خط کو بیوی کو پکڑاتے ہوئے چیخے تھے "لو دیکھو، اس گھر میں اب کیا ہو رہا ہے۔ اور سب کچھ تمھاری وجہ سے ہو رہا ہے۔ معلوم نہیں تم لوگوں کو مجھ سے کون سی دشمنی ہے کہ میرا چین سے زندہ رہنا بھی گوارا نہیں !"

یہ خط پڑھ کر وہیں فرش پر کھڑی کھڑی جانے کیا سوچنے لگی تھی۔

انھوں نے ضروری سامان لیا اور دفتر کے لیے نکل پڑے۔ ان کے دماغ میں ابھی بھی خیالوں کی چکیاں چل رہی تھیں اور ایک سوال بُری طرح ان کے ذہن میں کوند رہا تھا: کیا واقعی صرف ان کی بیوی ہی اس سب کے لیے جوابدہ ہے؟

○

اپنے چاروں طرف پھیلے نا امیدی اور بکھراؤ کے اس اندھیرے میں اکثر ان کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ کہیں کوئی امید کی کرن بھی تو نظر نہیں آتی۔ کالج میں پڑھنے والی بیٹیوں کے بعد دو اور بیٹیاں تھیں جو دسویں اور نویں کلاس میں پڑھ رہی تھیں اور ان کے بعد ایک بیٹا چھٹی جماعت میں پڑھ رہا تھا..... نہیں ! اس سے امید کرنا خود کو دھوکا دینا ہوگا۔ وہ جب تک بڑا ہوگا کچھ کرنے کے لائق ہوگا، کون جانے ان کا کیا ہوگا .....؟ اور وہ بھی ابھی کیا کرے گا کیا نہیں کرے گا، کون جانتا ہے ! اس زہریلے ماحول میں اچھی ذہنیت کی فصل پیدا کر کے کھڑی کر لینا بہت ہی مشکل ہے ..... اور باقی دو بیوی اور ماں کا وہ واحد سہارا ہیں۔ گاؤں میں پڑی ہوئی ماں کو طے شدہ وقت پر بندھی ہوئی رقم پہنچ جانی چاہیے۔ ورنہ پھر وہاں سے فوراً ایک خط پہنچ جاتا ہے۔ جس میں خدا کا واسطہ ہوتا ہے، پیدا کرنے کی عظمت ہوتی ہے اور جانے کیا کیا ہوتا ہے .....! اس نے کبھی یہ سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ ان کے بال بچے ہیں، دس پریشانیاں ہیں، مسئلے ہیں۔ کبھی دیر ہو ہی جاتی ہے کبھی ناغہ بھی ہو سکتا ہے۔ بچے ہوئے سے ایک ماہ کام چلا لیا جائے۔ ہر ماہ جانے والی رقم میں سے وہ خوب اچھی طرح کچھ نہ کچھ بچا ضرور لیتی ہوگی۔ لیکن خط میں ہمیشہ یہی لکھے گی کہ فلاں وقت سے فاقہ ہے .....

اور دوسری عورت ان کی بیوی ہے جس کے منھ پر ہمیشہ ایک شکایت رہی ہے کہ اسے اس ازدواجی زندگی میں کوئی سکھ نصیب نہیں ہوا ہے۔ وہ سوچتے ہیں کہ واقعی انھوں نے اسے ایسا کیا سکھ دیا ہے جس کا وہ زور دے کر حوالہ دے سکیں۔ لیکن وہ یہ بھی سوچتے ہیں کہ شاید اس ازدواج میں وہ اپنے طور پر چاہتی تو بے شمار سکھ سے بھرے لمحے تلاش کر سکتی تھی۔ لیکن وہ جانتے ہیں کہ اُسے سکھ کا احساس ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ وہی عورت ہے جو اپنی پہلی شادی کے فوراً بعد بیوہ ہو گئی تھی۔ اور تب انھوں نے اس سے شادی کی تھی اور وہ بھی اپنے والد سے بغاوت کر کے ! اس شادی کے لیے ایک بڑی قیمت چکانی پڑی تھی انھیں۔ ہمیشہ کے لیے والد نے انھیں اپنی نظروں سے گرا دیا اور مرتے مرتے بھی انھیں معاف نہیں کیا۔ اور یہی عورت ہے جو اپنے پہلے شوہر کی یاد میں کھوئی رہتی ہے، جس کے ساتھ مشکل سے اس نے دس بارہ دن گذارے تھے ! وہ جانتے ہیں کہ ایسا کچھ نہیں ہے ..... اور دس بارہ دنوں میں دل میں کسی نے ایسی جگہ بنا بھی لی تھی تو وہ مر چکا تھا، ایک عورت کی زندگی کو لنگڑی اور اندھیری بنا کر قبر میں دفن ہو چکا تھا۔ ایسے حالات میں انھوں نے اس عورت کی طرف سہارے کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ اور یہی عورت اس مردہ شخص کی یاد کو سینے میں چھپائے پھرتی ہے۔ دراصل یہ ان کے احسان کی قیمت کو کم کر دینے کے لیے چلایا جانے والا ہتھیار ہے۔ یہ ایک فریب ہے جس نے انھیں ذہنی طور پر اپاہج بنا دیا ہے، ان کا جینا حرام کر دیا ہے !

○

" کمینے، تو پیدائشی باغی ہے ! میں تجھے جانتا تھا ! خبردار جو میرے جیتے جی اس گھر میں تو آیا اور اُس چڑیل کو لایا ! میں تیرے سائے سے بھی پناہ مانگتا ہوں ! آج سے بیس سال پہلے جب پوشیدہ طور پر نکاح کر کے بیوی کو ساتھ لے کر وہ گھر آئے تھے تو ان کے والد نے گھر نکالا دیا تھا !

بیوی کو ساتھ لے کر وہ خاموشی سے اپنی نوکری پر چلے آئے تھے شہر میں ایک سرکاری محکمے میں کلرک تھے۔ اُس وقت امنگ بھری نوجوانی تھی۔ اور شوق اور اصول کے لیے مر مٹنے کا جوش تھا۔ ایک خاص قسم کی آئیڈیلسٹک ذہنیت بنا رکھی تھی انھوں نے۔ تب انھوں نے سوچا تھا کہ گذرتے وقت کے ساتھ والد کا غصہ سرد ہو جائے گا اور آخر کار وہ بیٹے اور بہو کو اپنا لیں گے لیکن یہ ان کا خواب ہی رہ گیا۔ والد نے انھیں کبھی معاف نہیں کیا۔ شاید اس شادی نے والد کی انا اور اعتماد کو گہری ٹھیس لگائی تھی۔ پہلے بھی والد کے بہت قریب نہیں تھے۔ گھر کا رکھ رکھاؤ ایسا تھا کہ بڑے چھوٹوں سے ایک خاص قسم کا الگاؤ بنا کر رکھتے تھے۔ پھر بھی بغاوت جیسا کوئی خیال ان کے ذہن میں کبھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ بلکہ یہ حادثے تو کچھ عجیب حالات میں ہوتے گئے تھے، کچھ دوسرے قسم کے حالات میں ..... وہ ایک جوان ہوتی ہوئی خوبصورت لڑکی تھی جو ان کے دل میں کہیں گھر بیٹھ گئی تھی اور انھیں ہمت نہیں تھی کہ اس کے لیے گھر میں کسی سے کبھی کچھ کہیں۔ ان کے ہاں اس طرح کا رواج ہی نہیں تھا۔ بعد میں وہ نوکری پر شہر چلے آئے تھے تو انھیں معلوم ہوا تھا کہ وہ لڑکی بیاہ دی گئی ہے اور ایک درد بھری اُداسی اندر رینگ گئی تھی۔ شاید یہ اداسی آہستہ آہستہ چھٹ بھی جاتی لیکن تبھی انھیں معلوم ہوا تھا کہ اس لڑکی کا شوہر کسی حادثے میں مارا گیا۔ بس انھیں جانے کیسا لگا، جیسے یہ ایک موقع انھیں چنوتی کے روپ میں ملا ہے اور پھر کچھ ہی دنوں میں سب کچھ ہو گیا تھا۔ وہ گاؤں چلے آئے تھے۔ گھر والوں کی جانکاری میں لڑکی اور اس کے گھر والوں سے مل کر شادی کی رضامندی لی تھی اور نکاح۔ اور

بعد کو گھر نکالا ......!

تب والد کے خلاف بغاوت کی وجہ سے ان کے اندر کہیں کوئی غلط کام کرنے جیسا جذبہ بہت ہی ہلکے روپ میں پیدا ہوا ابھی تھا ان کے امنگ اور جوش کے سامنے سرد ہو گیا تھا۔ ... لیکن بعد میں انھوں نے پایا کہ بیوی کے خیالوں کی ایک الگ ہی دنیا ہے جس میں ان کا داخلہ اس نے ممنوع قرار دے دیا ہے .... بیوی کو اپنی سماجی اور مالی حد میں انھوں نے ایک دوست اور مددگار کے روپ میں دیکھنا چاہا تھا۔ لیکن یہاں تو وہ کئی سال ساتھ رہ کر، جانے کتنے قربت بھرے لمحوں کو ساتھ جی کر بھی ان کے لیے بالکل اجنبی رہ گئی تھی، بالکل اجنبی! اور تب وہ 'ہلکا احساس'، آہستہ آہستہ ان کے اندر گہرا ہونے لگا تھا .....

○

تین ساڑھے تین گھنٹوں سے روکھے فائلوں سے جوجھتے جوجھتے وہ کافی تھک گئے تھے اور اب سستانے کے موڈ میں کرسی کی پشت پر سر ٹکا کر آنکھیں بند کرنے ہی والے تھے کہ انھیں آفس کا چپراسی ڈاک لے کر آتا نظر آیا۔ اور انھوں نے سستانے کا خیال ترک کر دیا۔ انھیں کچھ جگہوں سے خطوط کی امید تھی۔ حالانکہ آج کل انھیں خطوط کا بہت تجسس بھرا انتظار نہیں ہوتا صرف یہ جان لینے کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ جو کچھ بھی لکھ رہے ہیں وہ شائع بھی ہو رہا ہے یا نہیں۔ وہ ایک وقت تھا جب اچھے پرچوں میں چھپتے تھے تو یا تو انھیں ایڈیٹروں کے خطوط کا انتظار رہتا تھا یا قارئین کے خطوط کا۔

چپراسی ان کی میز پر ایک لفافہ ڈال کر دوسرے کلرکوں کی میز کی طرف بڑھ گیا تھا۔ لفافہ دیکھ کر ہی وہ سمجھ گئے تھے کہ وہ کسی پرچے سے نہیں آیا پتے کی تحریر سے وہ پہچان گئے کہ وہ خط ان کے ایک ادیب دوست کا تھا جس کے ساتھ پہلے کافی خط و کتابت تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو اپنی ادبی سرگرمیوں کی جانکاری دیتے رہتے تھے۔ لیکن اب یہ عادتیں آہستہ آہستہ چھوٹتی جا رہی تھیں ..... انھوں نے خط کھولا۔ کچھ فارملیٹیز کے بعد نامہ نگار نے پوچھا تھا کہ وہ کافی وقت سے معیاری پرچوں میں نہیں آئے ہیں۔ ان کی یہ خاموشی کیا رنگ لائے گی؟

خط پڑھ کر ایک عجیب سی جھلاہٹ ان پر سوار ہو گئی۔ وہ خاموش ہیں تو کسی کو اس سے کیا مطلب؟ کوئی جانتا ہے ان کی زندگی میں کتنی پریشانیاں ہیں کتنی اَشانتی ہے! کوئی جاننا بھی نہیں چاہتا یہ سب۔ سبھی صرف یہ جاننا چاہتے ہیں کہ وہ اب اچھا کیوں نہیں لکھتے ......! چاہتے تو وہ بھی ہیں کہ اچھا ہی لکھیں .... اچانک انھیں لگتا ہے کہ لوگ ٹھیک ہی تو پوچھتے ہیں۔ آخر وہ یہ سب کیا کر رہے ہیں! ان چیزوں کو لکھنے میں بھی تو محنت لگتی ہے، سوچنا پڑتا ہے، خود کو تیار کرنا پڑتا پھر وہ ایسی چیزیں تخلیق کیوں نہیں کرتے جو زندہ رہنے والی ہوں! وہ خود سے آنکھ چرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ ان کی دکھتی رگ ہے۔ ایک وقت تھا جب اچھے معیاری پرچوں کے مدیران ان سے تخلیقات کی فرمائش کیا کرتے تھے ..... انھیں دنوں ان کی ایک خاص انداز کی تخلیقات کافی پسند کی گئیں۔ بس اڈیٹروں نے انھیں صرف اسی طرز پر لکھوانا شروع کیا۔ وہ کچھ مختلف قسم کی مختلف انداز کی تخلیقات بھیجتے تو انھیں نامنظور کر کے واپس کر دیا جاتا۔ پھر آہستہ آہستہ انھیں لگا کہ وہ اپنے قلم کی دھار کھوتے جا رہے ہیں ..... کبھی کبھی وہ سوچنے لگتے ہیں کہ زندگی کے تجربوں کو سمجھنے اور پکڑنے کے لیے جو نظر ہونی چاہیے وہ ان کے پاس نہیں ہے اور اگر ہے بھی تو بہت ہی کمزور .....

اچانک دیوار گھڑی نے بارہ بجاتے ہوئے ریسس کا اعلان کیا اور ان کا ذہن شانت ہو کر آفس میں چلا آیا اور وہ کھیج بھری اداسی کے ساتھ گھر جانے کی تیاری کرنے لگے۔

گھر میں داخل ہوئے تو بیوی کو عجیب ہی روپ بنائے ہوئے پایا۔ ایک ماتمی سناٹا اس کے چہرے پر ناچ رہا تھا جیسے گھر میں کچھ ایسا ہوا تھا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ایک ساتھ جانے کتنے اندیشوں سے ان کا دل دھڑکنے لگا تھا۔ پھر بھی اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بیوی سے خیریت پوچھی تو وہ رونے رونے کو ہو آئی۔ وہ کافی سہمی ہوئی بھی تھی۔ ان کے بار بار پوچھنے پر اس نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بتایا کہ بڑی بیٹی کو دو مہینے سے اوپر کا حمل ہے۔ ان کے سر پر جیسے ایک ساتھ ہزاروں ہتھوڑوں کی چوٹیں کی گئی ہوں۔ وہ سر پکڑ کر بستر پر بیٹھ گئے ...... کافی دیر وہ اسی طرح بیٹھے رہے .... ان کا سر بری طرح گھوم رہا تھا اور ذہن میں آندھیاں چل رہی تھیں..... اس پر تو انھیں کافی بھروسہ تھا ...... اب کیا ہوگا.....؟ اباِرشن تو کروانا ہی پڑے گا .... پھر بھی بات اچھی رہے گی.....؟ راہ چلتے گلی کوچوں میں طعنے تشنوں کی بوچھار کو برداشت کیسے کر پائیں گے وہ؟ اس لڑکی نے انھیں کہیں کا نہ چھوڑا! اس سے تو اچھا ہوتا کہ وہ انھیں زہر دے کر مار ڈالتی .....!

اچانک جیسے ان کے ذہن میں چل رہی آندھیاں ایک دم رک سی گئیں ..... وہ کافی نارمل ہو گئے ...... وہ سوچنے لگے کہ وہ اس خبر کو سن کر بیکار ہی دیوانے ہوئے جا رہے ہیں۔ بالکل صحیح سلامت روپ میں ان کے پاس ہے ہی کیا۔ سب کچھ تو فالج زدہ ہے اُن کا! ان کا ادبی کیریر، ان کی ازدواجی زندگی، ان کا مستقبل اور اب عزت بھی فالج زدہ ہو گئی۔ یہی نہ.....؟!

کانپتے ہاتھوں سے کپڑے بدلتے ہوئے انھوں نے بیوی کو کھانا لگانے کے لیے کہا۔

گزارش

مسودہ صاف اور خوش خط بھیجیں۔ پرچے نہ ملنے کی شکایت خریداری نمبر کے حوالے سے بزنس منیجر کے نام بھیجیں۔ منی آرڈر ملنے کے بعد پرچے کے اجرا میں تاخیر ہوتی ہے۔ مناسب انتظار کریں۔

(ادارہ)

غزلیں

حسرت شادانی

پرچمِ امن سے عالم کو سجایا جائے
نوعِ انساں کے مقدر کو جگایا جائے

بغض و نفرت کو ہر اک دل سے مٹایا جائے
پیار کے پھول سے ہر گھر کو سجایا جائے

دست و بازو نہ اب کام میں لایا جائے
حسنِ اخلاق سے دشمن کو جھکایا جائے

دوستوں کو تو بصد شوق لگاتے ہیں گلے
دشمنوں کو بھی کلیجے سے لگایا جائے

کسی مظلوم کا دل جیت کے حسرت صاحب
نغمۂ فتح و ظفر جھوم کے گایا جائے

شفیع اللہ خاں راز

غور سے دیکھو ذرا اجڑے گھروں کے درمیاں
آئینے ٹوٹے پڑے ہیں پتھروں کے درمیاں

آدمی مجبور ہو کر مورتیں تکتا رہا
زندگی بکتی رہی سوداگروں کے درمیاں

اللہ اللہ میگساروں کی وسیع المشربی
پارسا بیٹھے ہوئے ہیں ساغروں کے درمیاں

گردشِ ایام کی آنکھوں میں آنسو آ گئے
مسکرانے آئی تھی اجڑے گھروں کے درمیاں

قاتلوں نے جب محبت سے پکارا ہے ہمیں
ہم تڑپ کر آ گئے ہیں خنجروں کے درمیاں

غمزدہ کچھ لوگ دیوالی منانے آئے تھے
آنسوؤں کے دیپ روشن تھے گھروں کے درمیاں

راز دنیا کا تماشا دیکھنے آئے تھے لوگ
خود تماشا بن گئے بازی گروں کے درمیاں

مُبارک جونپوری

شگفتہ زخم ہوں، رعنائیِ چمن ہوں میں
مہکتے پھولوں کی اک تازہ انجمن ہوں میں

جلا نہ پائے گی، سُورج کی تیز دُھوپ مجھے
سراپا آگ ہوں، شعلوں کا پیرہن ہوں میں

فروغِ دَرد ہوں تفسیرِ نورِ ہستی ہوں
زبانِ شمع کی خاموشیِ سخن ہوں میں

شفق کی جھیل میں سورج یہ کہہ کے ڈوبا ہے
مجھے دو غسل کہ جھلسا ہوا بدن ہوں میں

تلاشِ غیر نہیں ہے تلاش اپنی ہے
خود اپنی زیست کے سائے میں گامزن ہوں میں

جہاں خلوص کا بادل نہ آج تک برسا
غمِ حیات کا تپتا ہوا وہ بَن ہوں میں

بگولے جُھک کے مُبارک سلام کہتے ہیں
وہ رَہ نورد ہوں صحرا کا بانکپن ہوں میں

محشر رہبری

جمع کرتا میں بھی کچھ سامانِ عیش
میرا دل تھا گھر نہ تھا زردار کا

میں حدیثِ حق زباں تک لا چکا
منتظر ہوں اب پیامِ دار کا

پھول کی نوکِ زباں پر صبح و شام
ذکر ہے ان کے لب و رخسار کا

مُہرِ لب پر آنکھوں آنکھوں میں پیام
یہ عجب انداز ہے اقرار کا

غم عطا کر دو مسرت کے عوض
حق نہ مارو تم کسی حقدار کا

سنگ کی بارش ہے دورِ ارتقا
شیشۂ دل چور ہر فن کار کا

میری جانب کم نگاہی سے نہ دیکھ
آگہی حاصل مرے اشعار کا

ضمیر الحق ضمیر

سرد گی کی یہ ظلمت مٹا کے دم لیں گے
شعور و عزم کی شمعیں جلا کے دم لیں گے

اُبھر سکا نہ کبھی حق کے سامنے باطل
جنونِ سطوتِ باطل مٹا کے دم لیں گے

بلا سے جان بھی جائے وطن کی عظمت پر
وطن کی شان کو لیکن بڑھا کے دم لیں گے

ملے نہ ہم کو محبت کا کچھ صلہ لیکن
دلوں پہ نقشِ محبت بٹھا کے دم لیں گے

ہو لفظ لفظ میں پیغامِ دوستی جس کے
زمانے بھر کو وہ نغمہ سنا کے دم لیں گے

محمد نعیم صبا

کس قدر شور و شر تھا کیا کہیے
سب بضد تھے ہمیں خدا کہیے

آپ کا بھید جب کوئی پوچھے
گل سے ہے بوئے گل جدا کہیے

ٹھیک ہے میں گناہگار سہی
آپ تو اپنا مدّعا کہیے

دم بدم سر سے جو گزرتی ہے
خواہشوں کی اسے ہوا کہیے

میری آنکھوں کے قطرۂ غم کو
میرے احساس کی سزا کہیے

پہلے تو نام لیجیے اس کا
پھر صبا رازِ دل ذرا کہیے

کاظم علی خاں

غالب اور نیّر رخشاں

غالب کے گرد و پیش عزیزوں، دوستوں اور شاگردوں کی ایک دنیا آباد تھی جسے "جہانِ غالب" کہنا نامناسب نہ ہوگا۔ جہانِ غالب میں آباد افراد کے حالات اور غالب کے ادبی آثار پر اِن اشخاص کے اثرات کا مطالعہ غالبیات کا ایک اہم موضوع ہے۔ تصورات و تخلیقات سے معمور غالب کے قلب و ذہن کی داخلی دنیا ان کے گرد و پیش آباد اِس خارجی دنیا سے کس حد تک متاثر ہوئی — ؟ یہ سوال غالبیات کا ایک دلچسپ موضوع ثابت ہو سکتا ہے۔ زیرِ نظر مضمون میں اسی سوال کی روشنی میں غالب اور نیّر کے تعلقات اور غالب کے ادبی آثار پر اِن تعلقات کے اثرات کا اجمالی جائزہ پیش ہے۔

نوّاب ضیاء الدین احمد خاں نیّر رخشاں بہ تفصیلِ ذیل تین رشتوں[۱] سے غالب کے سببی عزیز تھے:

(۱) غالب کے سگے چچا نصر اللہ بیگ خاں نوّاب ضیاء الدین احمد خاں نیّر کے سگے پھوپھا ہوتے تھے۔

(۲) نیّر ابلیۂ غالب کے سگے چچازاد بھائی تھے۔ صبحِ گلشن میں خلافِ واقعہ غالب کو نیّر کا چچازاد بھائی بتایا گیا ہے[۲]۔

(۳) نیّر اور غالب ایک دوسرے کے سمدھی بھی تھے۔ اس رشتے کی بنیاد یہ ہے کہ نیّر کی صاحبزادی معظم زمانی عرف بگّا بیگم کی شادی غالب کے متبنّٰی فرزند عارف کے بیٹے مرزا باقر علی خاں کامل سے ہوئی تھی[۳]۔ جنہیں عارف کی جوانا مرگی کے بعد غالب نے اپنی فرزندی[۴] میں لے لیا تھا۔ غالب نے اپنے ایک مکتوب میں اس شادی کے متعلق لکھا ہے: "باقر علی خاں کی شادی نوّاب ضیاء الدین خاں کے ہاں ہوئی[۵]..." مختلف بکھری ہوئی شہادتوں کو جمع کرنے پر میرا اندازہ ہے کہ دخترِ نیّر بگّا بیگم کے ساتھ غالب کے متبنّٰی فرزند باقر علی خاں کامل [متولد ۴۸ – ۱۸۴۷ء[۶]] کی یہ شادی ۱۷ سال کے سن [شاید ۶۵ – ۱۸۶۴ء] میں ہوئی ہوگی۔ گویا غالب اور نیّر ۶۵ – ۱۸۶۴ء کے آس پاس ایک دوسرے کے سمدھی بھی ہو گئے تھے۔

نیّر و غالب کے درمیان بے حد گہرے دوستانہ تعلقات کو ان تین رشتوں کا نتیجہ قرار دینا مناسب نہ ہوگا۔ نیّر نہ صرف غالب کے عزیز بلکہ دوست اور شاگرد بھی تھے۔ اپنے ایک خط میں غالب کا بیان ہے: "ضیاء الدین خاں [نیّر رخشاں] جاگیردار لوہارو میرے سببی بھائی اور میرے شاگردِ رشید ہیں[۷]...."

مختلف ماٰخذوں[۸] کی ورق گردانی کے بعد نوّاب ضیاء الدین احمد خاں نیّر کے جو حالات دستیاب ہوئے ہیں وہ اجمالاً پیش کیے جاتے ہیں۔ مرزا غالب کے سگے چچیا خسر نوّاب احمد بخش خاں (والیِ فیروزپور جھرکہ و جاگیردار لوہارو) کے فرزند نوّاب ضیاء الدین احمد خاں اکتوبر ۱۸۲۱ء میں بہ مقام فیروزپور جھرکہ پیدا ہوئے۔ چھ برس کے سن (اکتوبر ۱۸۲۷ء) میں یتیم ہو گئے۔ والد کی جاگیر پرگنہ لوہارو ضیاء الدین احمد خاں اور ان کے سگے بڑے بھائی نوّاب امین الدین احمد خاں کے حصے میں آئی۔ ضیاء الدین خاں چونکہ نابالغ تھے لہٰذا جاگیر کا انتظام بڑے بھائی کے ہاتھ میں رہا۔ بالغ ہونے پر نوّاب ضیاء الدین احمد خاں نے ریاست میں برابر کے حصے کا مطالبہ کیا مگر انگریزی حکومت نے ۱۸۴۸ء میں ان کو ریاست کے بجائے اٹھارہ ہزار روپے نقد سالانہ کا وظیفہ دینا منظور کیا۔ اس پر وہ لوہارو کو چھوڑ کر دہلی میں آ بسے۔

نوّاب ضیاء الدین نے مولوی کریم اللہ (شاگردِ رشید شاہ عبدالقادر ابنِ شاہ ولی اللہ دہلوی)، مفتی صدر الدین آزردہ، مولانا فضلِ حق خیرآبادی اور مرزا غالب جیسے صفِ اول کے استادوں سے تعلیم حاصل کی۔ ان اساتذہ کے فیض سے ضیاء الدین احمد خاں نے تفسیر، حدیث، ادب، فقہ، فلسفہ و منطق میں اچھی دستگاہ حاصل کی۔ وہ نجوم، ہیئت، تاریخ و جغرافیہ میں بھی کافی دخل رکھتے تھے اور اُردو کے علاوہ فارسی، عربی و ترکی بھی جانتے تھے۔ بڑے علم دوست اور علم پرور شخص تھے۔ مطالعۂ کتب ان کا خاص مشغلہ تھا۔ ایک عمدہ کتب خانے کے مالک تھے جس کی کتابیں غالب کے بھی مطالعے میں رہا کرتی تھیں[۹]۔ نوّاب ضیاء الدین احمد خاں کے اس کتب خانے کی مالیت غالب نے بہت کم کر کے بیس ہزار روپے بتائی ہے[۱۰]۔ ایک مرتبہ پنڈت جوالا ناتھ نے غالب سے فنِ مساحت و سیاق [مساحت: پیمائشِ زمین[۱۱]۔ سیاق: حساب کے قاعدے[۱۲]] سے متعلق بعض معلومات طلب کیں۔ غالب ان معلومات کو فراہم کرنے سے معذور تھے چنانچہ حقیر کے نام ایک خط میں غالب نے لکھا ہے:

> "... میں فنِ تاریخ و مساحت و سیاق سے اتنا بیگانہ ہوں کہ ان فنون کو سمجھ بھی نہیں سکتا ... میرے بھائیوں میں نوّاب ضیاء الدین احمد خاں خلفِ احمد بخش خاں مرحوم کہ وہ فنِ نظم و نثر میں میرے شاگرد ہیں اب جو ان کی طبیعت فنِ تاریخ کی طرف آئی ہے تو اس

میں وہ یگانۂ روزگار اور بڑے دانا و ہوشیار ہو گئے ہیں۔ میں نے ان سے چاہا تھا کہ کچھ دریافت کر کے لکھ بھیجوں۔ سو انھوں نے کہا کہ آئینِ اکبری کے سوا کسی کتاب میں کچھ پتا نہ پایا جائے گا۔ حالانکہ کوئی کتاب اس باب کی ایسی نہیں کہ ان کی نظر سے نہ گزری ہو اور خلاصہ اس کا حافظے میں موجود نہ ہو۔۔۔۔[۱۹]"

اس تراشے سے واضح ہوتا ہے کہ علمی مسائل میں نواب ضیاء الدین احمد خاں کبھی کبھی غالب کو معلومات فراہم کر کے مشورے اور مدد دیتے رہتے تھے اور ان کی تاریخ دانی کے غالب بھی معترف تھے۔ غالب کے علاوہ نساخ نے بھی معاصر شاہد کی حیثیت سے لکھا ہے کہ نواب ضیاء الدین احمد خاں "۔۔۔۔ علم تواریخ میں بہت دخل رکھتے ہیں[۲۰]۔" مولانا حالی اور لالہ سری رام کا بیان ہے کہ مسٹر ایلیٹ (سکریٹری حکومت ہند) کی کئی جلدوں پر مشتمل تاریخِ ہند کی کتاب کے لیے نواب ضیاء الدین احمد خاں نے تاریخی حالات فراہم کیے تھے[۲۱] جس کا اعتراف مسٹر ایلیٹ نے کتاب کے دیباچے میں کیا ہے۔ تاریخ کے موضوع پر غالب کی فارسی کتاب مہرِ نیم روز[۲۲] میں دوسرے افراد کے علاوہ نواب ضیاء الدین احمد خاں جیسے تاریخ داں کی بھی مدد شامل تھی یا نہیں ــــ یہ تحقیق طلب سوال غالب شناسوں کی توجہ کا مستحق ہے۔ یہ سوال غالبیات میں ایک نئے موضوع کا اضافہ ہے۔

نواب ضیاء الدین احمد خاں اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے شاعر تھے اردو میں ان کا تخلص رخشاں اور فارسی میں نیر تھا[۲۳]۔ بیشتر فارسی میں کہتے تھے[۲۴]۔ نیر کو غالب نے شعر و ادب میں اپنا جانشینِ اول مقرر کیا تھا[۲۵] اور سندِ جانشینی بزبانِ فارسی سنہ ۱۸۶۳ء میں تحریر کی تھی[۲۶]۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں نیر کا کلام ضائع ہو گیا جیسا کہ مکتوبِ غالب بنام نواب کلب علی خاں کے مندرجۂ ذیل تراشے سے ظاہر ہے:

"بھائی ضیاء الدین خاں کا مجموعۂ نثر و نظم فارسی و اردو، سراسر دیکھا ہوا میرا، جو ان کے کتاب خانے میں تھا، غدر [۱۸۵۷ء] میں لٹ گیا۔ بعدِ غدر ذوقِ شعر باطل اور دل افسردہ ہو گیا[۲۷]۔۔۔"

انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد نیر کا جو کلام جمع ہوا اس کا کچھ حصہ ان کے فرزند طالب[۲۸] نے "جلوۂ صحیفۂ زرّیں نیرِ رخشاں" کے نام سے ۱۹۲۶ء میں شائع کرا دیا۔ اس مطبوعہ دیوان میں قطعاتِ تاریخ، غزلیات اور مثنوی وغیرہ پر مشتمل نیر کا فارسی کلام ہے اور ان کے اردو کلام کا قلمی نسخہ غائب ہو گیا[۲۹]۔

نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر ۱۳۰۲ھ میں فوت ہوئے۔ میر مہدی مجروح دہلوی نے وفاتِ نیر پر جو قطعۂ تاریخ کہا تھا اس کے بعض جستہ جستہ اشعار پیش ہیں: ؎

شہرِ دہلی کو تفوق تھا انھیں باتوں سے
کہ نظر آتے تھے ہر فن کے یہاں اہلِ کمال
ان میں سے ایک یہ تھے حضرتِ نیر باقی
تو لو ان کے بھی لیے آ گیا پیغامِ زوال

اب وہ باقی نہ رہی رونقِ شہرِ دہلی
بہرِ تاریخ یہ کیا خوب ہے[۲] ہاتف کا مقال[۲۵]

وفاتِ نیر کے سلسلے میں مولوی رضی الدین خاں دہلوی کے فراہم کردہ مادۂ تاریخ پر مولانا حالی نے بھی مصرعے لگائے تھے [بہ حوالۂ خم خانۂ جاوید جلد سوم ص ۲۷۸]۔ اس مادۂ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ نیر نے شنبہ ۱۳ رمضان ۱۳۰۲ھ کو وفات پائی۔ شنبہ ۱۳ رمضان ۱۳۰۲ھ از روئے تقویم ۲۷ جون ۱۸۸۵ء کے مطابق ہے۔ لالہ سری رام[۲۶]، مولانا عرشی[۲۷] اور آفاق حسین آفاق[۲۸] نے نیر کا سنہ وفات خلافِ واقعہ و خلافِ تقویم ۱۸۸۳ء درج کیا ہے۔ نظامی بدایونی نے نیر کا سنہ وفات ایک جگہ ۱۸۸۳ء اور دوسری جگہ ۱۸۹۳ء/۱۳۱۲ھ تحریر کیا ہے[۲۹]۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام اندراج نظرِ ثانی کے محتاج ہیں۔ نیر کی وفات پر مولانا شبلی نے فارسی میں ایک مرثیہ لکھا تھا [بہ حوالۂ مالک رام]۔ تاریخِ لطیف سے معلوم ہوتا ہے کہ وفاتِ نیر پر مجروح و حالی کے علاوہ نساخ اور جلال لکھنوی نے بھی قطعاتِ تاریخ کہے تھے[۳۰]۔ نیر نے دہلی میں[۳۱] وفات پائی اور وہ دہلی میں ہی دفن ہوئے [بہ حوالۂ خم خانۂ جاوید جلد سوم ص ۲۷۸]۔ تلامذۂ غالب (طبع اول، صفحہ ۲۸۹ میں مدفنِ نیر کی تفصیل موجود ہے۔

نیر رخشاں کی بہ تفصیلِ ذیل تین اولادوں کا پتا چلتا ہے:

۱۔ معظم زمانی بیگم:۔

یہ نیر کی صاحبزادی تھیں۔ مرزا باقر علی خاں کامل سے منسوب ہوئیں اور ۱۰ مئی ۱۹۴۵ء کو فوت ہوئیں [بہ حوالۂ احوالِ غالب ص ۲۸۳]۔

۲۔ نواب مرزا شہاب الدین احمد خاں ثاقب:۔

یہ نیر کے خلفِ اکبر تھے[۳۱]۔ ثاقب نے اپنے والد کی زندگی میں بہ عالمِ شباب دوشنبہ ۶ محرم ۱۲۸۶ھ[۳۲] (از روئے تقویم مطابق ۱۹ اپریل ۱۸۶۹ء) کو انتقال کیا۔

۳۔ نواب مرزا احمد سعید خاں طالب:۔

نیر کے چھوٹے فرزند تھے۔ طالب کی تاریخِ وفات خم خانۂ جاوید میں یکم ستمبر ۱۹۲۵ء ملتی ہے[۳۳]۔ جو از روئے تقویم سہ شنبہ ۱۲ صفر ۱۳۴۴ھ کے مطابق ہے۔ مالک رام نے تاریخِ وفاتِ طالب کے لیے یکم ستمبر ۱۹۲۵ء کو قبول کیا ہے لیکن موصوف نے یکم ستمبر ۱۹۲۵ء کو خلافِ تقویم یک شنبہ ۴ ذی الحجہ ۱۳۲۷ھ کے مطابق رقم فرمایا ہے [تلامذۂ غالب: مالک رام طبع اول ص ۲۰۰]۔ عبد الرؤف عروج نے شاید مالک رام ہی کی تقلید میں طالب کی تاریخِ وفات خلافِ واقعہ یک شنبہ ۴ ذی الحجہ ۱۳۲۷ھ درج کی ہے۔ [بزمِ غالب: عروج کراچی ص ۲۴۹]۔ مجھے طالب کی تحریر کردہ ایک مطبوعہ اردو تقریظ بھی دستیاب ہوئی ہے[۳۴]۔ طالب کی اس مطبوعہ اردو تقریظ کے صفحۂ اول کا عکس طالب کی تصویر کے ساتھ زیرِ نظر مضمون میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

نیر رخشاں کا نمونۂ کلام متعدد مصادر[۳۵] میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ یہاں سرِ دست بہ خوفِ طوالت نمونۂ کلامِ نیر رخشاں پیش کرنا ممکن نہیں۔

غالب کے ادبی آثار کو جمع اور مرتب کرنے میں نیر نے ناقابلِ فراموش خدمات

سرانجام دی ہیں۔ مطبع دارالسلام، دہلی سے ۱۸۴۵ء میں غالب کا جو دیوانِ فارسی شائع ہوا تھا۔ اس کی تصحیح و ترتیب نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر نے ہی کی تھی جیسا کہ عکسِ لوحِ دیوانِ غالب (فارسی) سے ظاہر ہے۔[۳۸] کلیاتِ غالب (نظم فارسی) مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ طبع ۱۸۶۳ء بھی نواب ضیاء الدین نیر ہی کے جمع و فراہم کردہ قلمی نسخے پر مبنی ہے۔ اس کا ثبوت اودھ اخبار، لکھنؤ مورخہ ۱۳ مئی ۱۸۶۲ء (ص ۳۳۵) میں شائع شدہ اشتہار کے مندرجۂ ذیل اقتباس میں ملاحظہ فرمایا جا سکتا ہے:

"اشتہار کلیاتِ جناب میرزا غالب دہلوی ..... خدا کے فضل سے نسخہ بھی وہ صحیح و درست بڑے کتب خانے کا ہاتھ آیا ہے جس کو نواب ضیاء الدین احمد خاں صاحب بہادر دہلوی نے جد و جہد سے جمع فرمایا تھا۔[۳۹]"

ایک اردو خط میں غالب کے مندرجۂ ذیل بیان سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے:

"... فارسی کا دیوان بیس پچیس برس کا عرصہ ہوا جب چھپا تھا۔ پھر نہیں چھپا۔ مگر ہاں سالِ گذشتہ میں منشی نول کشور نے شہاب الدین خاں [ثاقب فرزندِ نیر] کو لکھ کر کلیات فارسی جو ضیاء الدین خاں نے غدر کے بعد بڑی محنت سے جمع کیا تھا، وہ منگا لیا اور چھاپنا شروع کیا۔ وہ پچاس جزو ہیں .... اب سنا ہے کہ وہ چھپ کر تمام ہو گیا ہے ...."

[اردوئے معلیٰ (حصہ اول)، طبع اول ص ۱۳۰]

نواب ضیاء الدین خاں نیر کے نام غالب نے ایک اردو خط میں اپنے اسی فارسی دیوان کے قلمی نسخے کو لکھنؤ میں طباعت کے لیے طلب کیا ہے [اردوئے معلیٰ (حصہ اول)، طبع اول مطبوعہ مارچ ۱۸۶۹ء ص ۲۸۹ تا ۲۹۰]۔ ان شواہد سے بہ خوبی ثابت ہوتا ہے کہ کلیاتِ غالب مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ طبع ۱۸۶۳ء نیر ہی کے جمع کردہ قلمی نسخے پر مبنی ہے۔ گویا کلیاتِ غالب طبع ۱۸۶۳ء غالب کے ادبی آثار کے لیے نیر ہی کا ایک گراں قدر عطیہ ہے۔ کلیاتِ غالب طبع ۱۸۶۳ء اب خاصا کم یاب ہے۔ اس کا ایک نسخہ راقم الحروف کی ملکیت میں موجود ہے۔

کلیاتِ نثرِ غالب۔ مطبع منشی نول کشور، کانپور طبع اپریل ۱۸۸۸ء (ص ۲۵۴) میں شامل خاتمۂ پنج آہنگ میں غالب کے بیان کا یہ اردو مفہوم بھی ملاحظہ ہو:

"برادرِ ہمایوں فر نواب ضیاء الدین خاں، آسمانِ عز و جاہ کے نیر رخشاں اور اوجِ سروری میں آفتاب ذرہ پرور ہیں .... منشی نول کشور میری نثر کا مجموعہ جس میں یہ صحیفہ [پنج آہنگ] بھی شامل ہے نواب ضیاء الدین خاں سے مستعار لے کر اپنے ساتھ لکھنؤ لے گئے تاکہ اس کلام نامطبوع کو زیورِ طباعت سے آراستہ کریں۔[۴۰]"

غالب کے اس بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ کلیاتِ نثرِ غالب شائع کردہ مطبع منشی نول کشور بھی نواب ضیاء الدین کے فراہم کردہ قلمی نسخے کی مدد سے طبع ہوا تھا۔ گویا کلیاتِ غالب (نظم فارسی) کی طرح کلیاتِ نثرِ غالب کی اشاعت بھی نیر ہی کی رہینِ منت ہے۔ فارسی میں غالب کی شہرت کے تعلیے کے لیے یہی دونوں کلیات دو اہم ستون ہیں اور ان دونوں ستونوں کی تعمیر میں نیر نے جو کلیدی رول ادا کیا ہے وہ غالبیات کی تاریخ میں سنہرے الفاظ سے لکھنے کے قابل ایک ناقابلِ فراموش باب کا دلچسپ موضوع ثابت ہو سکتا ہے۔

آرام کو غالب نے اردو خط میں لکھا ہے:

"... ضیاء الدین خاں جاگیر دار لوہارو میرے نسبی بھائی اور میرے شاگردِ رشید ہیں۔ جو نظم و نثر میں نے لکھا وہ انھوں نے لے لیا اور جمع کیا۔ چنانچہ کلیاتِ نظم فارسی ... پنج آہنگ اور مہرِ نیم روز اور دیوانِ ریختہ سب مل کر سو سوا سو جز مطلے [کذا؟ مطلاً] اور مذہب اور انگریزی ابری کی جلدیں الگ الگ کوئی ڈیر [؟ ڈیڑھ] سو دو سو روپے کے صرف میں بنوائی [بنوائیں]..."

[اردوئے معلیٰ ع ا طبع ۱۸۶۹ء ص ۳۶۳]

اس سے واضح ہوتا ہے کہ غالب کے ادبی آثار کو جمع کرنے اور محفوظ رکھنے میں نیر کس درجہ اہتمام و انہماک سے کام لیتے تھے۔ یہ تصویر کا ایک رُخ تھا اور اس کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ غالب بھی نیر کے کلام و حالات کو تذکروں اور بیاضوں میں شامل کرا کے محفوظ رکھنے کا خاص خیال رکھتے تھے جیسا کہ تفتہ کے نام ایک خط میں غالب کے اس بیان سے ظاہر ہے:

"..... ریٹیگن صاحب [قائم مقام ڈپٹی کلکٹر دہلی] .... تذکرہ شعرائے ہند کا انگریزی میں لکھتے ہیں۔ مجھ سے بھی انھوں نے مدد چاہی میں نے سات کتابیں بھائی ضیاء الدین خاں صاحب سے مستعار لے کر ان کے پاس بھیج دیں۔ پھر انھوں نے مجھ سے کہا کہ جن شعرا کو تو اچھی طرح جانتا ہے ان کا حال لکھ بھیج۔ میں نے ۱۶ آدمی لکھ بھیجے، بہ قید اس کے کہ اب زندہ موجود ہیں اور اس سواد کی صورت یہ ہے:
"نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر، رئیسِ لوہارو فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں فارسی میں نیر اور اردو میں رخشاں تخلص کرتے ہیں۔ اسد اللہ خاں غالب کے شاگرد"..."

... [اردوئے معلیٰ ع ا طبع مارچ ۱۸۶۹ء ص ۱۰۰]

والیِ رام پور نواب کلب علی خاں نے ایک زیرِ ترتیب بیاض کے لیے غالب سے خود ان کے اور ضیاء الدین خاں نیر رخشاں کے منتخب فارسی و اردو اشعار طلب کیے۔[۴۱] تعمیلِ حکم میں غالب نے نواب کلب علی خاں کو اپنے مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۸۶۶ء کے جس مکتوب کے ہمراہ ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں کا منتخب کلام ارسال کیا اس کا ایک تراشہ پیش ہے:

"... آج فارسی دیوان کا انتخاب بہ طریق پارسل اس عرضی کے ساتھ بھیجتا ہوں اور بھائی ضیاء الدین خاں بہادر [نیر] نے جو اوراق میرے پاس بھیجے ہیں، وہ بھی اسی پارسل میں رکھ دیے ہیں۔ حضرت، اس غریب [یعنی نیر] کا مجموعۂ نظم و نثر غدر میں لٹ گیا۔ بعد غدر جو کچھ کہا ہے وہ یہی ہے جو پہنچتا ہے۔ اس درویش [شاید

نیّر ؟] نے صرف غزلیں [؟ غزلوں] اور رباعیوں کا انتخاب بھیجا ہے۔
قصائد و قطعات و مثنویات کا انتخاب ابھی نہیں بھیجا۔ اگر حکم ہو تو وہ
بھی بھیجوں . . . " [مکاتیبِ غالب متن ص ۵۹]

نیّر کا بیشتر اردو کلام اب ناپید ہے لیکن رام پور کی رضا لائبریری میں شائد غالب ہی کا ارسال کردہ نیّر کا کچھ اردو کلام آج بھی محفوظ ملتا ہے [رک مکاتیب غالب متن ص ۵۹۔ حاشیہ نمبر ۲ بر صفحات ۱۶۶ تا ۱۷۰]۔ ان امور سے واضح ہوتا ہے کہ اگر نیّر نے غالب کے ادبی سرمایے کو محفوظ رکھا تو اس کے جواب میں غالب کی وجہ سے بھی نیّر کا کچھ نہ کچھ کلام ریاست رام پور کے کتب خانے میں ہمارے لیے محفوظ رہ گیا ہے۔

نوّاب ضیاء الدّین نیّر نہ صرف غالب کے ادبی آثار کو محفوظ رکھتے تھے بلکہ وہ غالب کو مشاعروں میں شرکت کرنے اور مشاعروں کے لیے تازہ کلام کہنے پر بھی مجبور کرتے تھے جیسا کہ شیفتہ کے نام ایک فارسی خط میں غالب کے بیان کے اس اردو مفہوم سے ثابت ہوتا ہے :

" جمعے کا دن گزرنے کے بعد رات کو بزمِ سخن آراستہ ہوئی . . . .
میرا ارادہ شریک ہونے کا نہیں تھا۔ مگر ضیاء الدّین خاں نے مجھ پر
دو فرشتے مقرر کر دیئے۔ چنانچہ زین العابدین خاں عارف اور غلام
حسن خاں محو شام ہی سے مسلّط ہو گئے اور مجھے ہاتھی پر بٹھا کر اس
طرح اپنے ساتھ لے گئے جیسے کوئی شیر کو پابستہ کر کے لے جاتے۔"
[پنج آہنگ۔ مترجمہ مہاجر ص ۱۱۹ خط نمبر ۱۰۴]

غالب نے نوّاب شیفتہ کے نام ایک فارسی مکتوب میں ایک مشاعرے کی کاروائی پر روشنی ڈالتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے اس کا اردو مفہوم بھی ملاحظہ ہو :

" ضیاء الدّین خاں بہادر [نیّر] نے عرفی کے مصرعے :
صد سال می تواں بہ تمنّا گریستن
پر طرح رکھی ہے۔ اس زمین میں پہلے ہی طالب آملی کا ایک قصیدہ
اور عرفی کی دو غزلیں موجود ہیں۔ پھر غالب بے نوا کس طرح زمزمہ
سرا ہوگا " [پنج آہنگ۔ مترجمہ مہاجر ص ۱۲۱ خط نمبر ۱۰۵]

لیکن کلیاتِ غالب کا دسواں قصیدہ اسی زمین میں نیّر کی نکالی ہوئی طرح میں موجود ہے ان حقائق کے پیشِ نظر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ غالب کا یہ قصیدہ نیّر ہی کی تحریک پر وجود میں آیا تھا۔ یہ مثال غالب کے ادبی آثار اور ادبی شعور پر نیّر کے اثرات کا واضح ثبوت ہے۔

غالب کے منظوم ادبی آثار سے منقول مندرجۂ ذیل اشعار بھی نیّر و غالب کے درمیان گہرے تعلقات کی دین ہیں : ؎

مجھ سے تمھیں نفرت سہی نیّر سے لڑائی
بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

دمِ صبحش ضیاء الدّین احمد | نسیمش ذوالفقار الدّین حیدر

بخواں چوں بخوانی ورق را تمام | ز نیّر سلام و ز عارف سلام

کلیاتِ غالب کا قصیدہ نمبر ۶۲ تمام کا تمام نیّر کی مدح میں ہے اور اسے بھی غالب کے ادبی سرمایے میں نیّر و غالب کے گہرے مراسم کا کرشمہ قرار دینا چاہیے۔ نیّر کی مدح میں غالب کا یہ قصیدہ غالب کے دیوانِ فارسی مطبع دار السلام، دہلی طبع ۱۸۴۵ء (ص ۲۲۷) میں بھی شامل ہے۔ گویا یہ ۱۸۴۵ء یا اس سے قبل کا کلام ہے۔

نیّر کے نام اردو و فارسی میں غالب کے تین مکاتیب غالب کے ادبی آثار میں نیّر کا عطیہ ہیں۔ ان میں سے ایک خط اردو میں ہے اور باقی دو مکاتیب فارسی میں ہیں۔ ان میں سے ایک فارسی خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ نیّر نے غالب سے تازہ کلام کی فرمائش کی تھی مگر غالب اپنی پژمردہ دلی کے باعث کلام تازہ ارسال کرنے سے معذور تھے [رک پنج آہنگ مترجمہ مہاجر مکتوب نمبر ۹۶ ص ۱۰۷ تا ۱۰۸]۔ اس سے بھی ثابت ہے کہ نیّر کی فرمائشیں غالب کے ادبی آثار اور ادبی شعور کے لیے محرکات کی حیثیت رکھتی تھیں۔

غالب کی متعدد اہم تصانیف میں نیّر کا نام کسی نہ کسی طرح شامل ملتا ہے۔ دیوانِ غالب (اردو)، مطبع سیّد الاخبار، دہلی (طبع اوّل)، مطبوعہ شعبان ۱۲۵۷ھ [اکتوبر ۱۸۴۱ء] اور دیوان غالب (اردو)، مطبع دار السلام، دہلی (طبع دوم)، مطبوعہ ۱۲۶۳ھ [مئی ۱۸۴۷ء] نیّر کی فارسی تقریظ سے مزین ہیں۔ نیّر کی یہ تقریظ ۱۲۵۴ھ [مطابق ۱۸۳۸ء/ ۱۸۳۹ء] میں تحریر کی گئی تھی۔ نیّر کی اس تقریظ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۵۴ھ [مطابق ۲۷ مارچ ۱۸۳۸ء تا ۱۶ مارچ ۱۸۳۹ء] میں غالب کے اردو دیوان میں شعروں کی تعداد ۱۰۷۰ [ایک ہزار ستر] تھی۔ لیکن جب دیوان تین برس بعد ۱۲۵۷ھ میں طبع ہوا تو اس میں ۱۰۹۵ [ایک ہزار پچانوے] شعر تھے۔ گویا ۱۲۵۴ھ سے ۱۲۵۷ھ تک تقریباً تین سال کے درمیانی زمانے کے دوران غالب نے اپنے اردو دیوان میں محض ۲۵ [پچیس] اشعار کا اضافہ کیا تھا۔ ان امور سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ۱۲۵۴ھ سے ۱۲۵۷ھ تک کا زمانہ غالب کی اردو شاعری کے لیے ایک ناسازگار دور تھا۔ یا اس مدّت میں غالب نے اردو کے بجائے فارسی شاعری کی جانب زیادہ توجہ دی ہوگی۔ غالب کے اردو دیوان کی اولیں اشاعت میں شامل نیّر کی یہ تقریظ غالب کے اردو کلام کی ارتقائی منزلوں کے نشیب و فراز کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ غالب کے ادبی شعور کے مطالعے میں بھی نیّر کی متذکرۂ بالا تقریظ کی اہمیت ظاہر ہے۔

غالب کے ادب پاروں میں شیفتہ کے نام نثرِ مرتجز میں ایک فارسی خط بھی شامل ہے جس کے متعلق غالب اپنے ایک اردو مکتوب میں یہ اطلاع دی ہے:

" . . . . زمانۂ گذشتہ میں بھائی ضیاء الدین خاں صاحب نیّر
ایک مختصر سا دیوان حضرت نظامی کا مجھ کو دکھانے لائے تھے۔
اس میں نثرِ مرتجز تھی۔ میں اس دن نوّاب . . . شیفتہ کو خط لکھا
چاہتا تھا۔ اسی وضع پر خط لکھا، اور وہ پنج آہنگ میں ہے . . . "

شیفتہ کے نام نثرِ مرتجز میں غالب کا یہ فارسی مکتوب عودِ ہندی (طبع اوّل)، میرٹھ مطبوعہ ۱۰ رجب ۱۲۸۵ھ (ص ۱۱ تا ۱۲) میں بھی شامل ہے اور اس میں بھی غالب نے اپنے اس مکتوب کے محرک نیّر کا ذکر کیا ہے :

"۔۔۔۔ دبردر [کذا؟ دیرِدز] سحرگاہاں، روشن گہرآں نیرؔ کش روح و رواں دانم، بل خوش ترازاں دانم، دیوانِ نظامی را، آورد بہ سوے من، زین گونہ نوا با بود، در پردۂ گفتارش، کز ذوق بہ ہنجار [؟ ہنجارش] 'ایں زمزمہ سرکردم" [عودِ ہندی طبع ۱۲۸۵ھ ص ۱۲]

غالبؔ کی اس مرجّز فارسی عبارت کا اسی طرز میں اردو مفہوم یہ ہے:

"ہاں آج [کذا؟ کل جو] صبح ہوتے، آئے جو ضیاء الدین، وہ جانِ میرؔ جاں کی، بل کہ ہے سوا اس سے، اک جلد نظامیؔ کے، دیوان کی لے آیا، اور لاکے وہ دی مجھ کو، اِس طرح کی تحریر ایک، دیوان میں جو دیکھی اس طرز پہ میں نے بھی، یہ زمزمہ لکھا ہے[۳۲]"

اِن امور سے ثابت ہوتا ہے کہ نثرِ مرجّز میں شیفتہؔ کے نام غالبؔ کا یادگار فارسی مکتوب بھی نیرؔ کا رہینِ منت ہے۔

برہانِ قاطع کی رد میں غالبؔ کی فارسی کتاب قاطع برہان[۳۳] پر مخالفینؔ کی جانب سے محرقِ قاطعِ برہان میں اعتراضات ہوئے تو محرقِ قاطع برہان کے جواب میں غالبؔ نے اپنے شاگرد میاں داد خاں سیاحؔ کے نام سے ایک اردو رسالہ بہ عنوان لطائف غیبی لکھا۔ علائیؔ کے نام غالب کے ایک اردو خط کے بافہم مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ لطائف غیبی کی تحریر میں نوّاب ضیاء الدین احمد خاں نیرؔ رخشاں کی بھی مدد شامل تھی[۳۴]۔ لطائفِ غیبی طبع اول کے سرورق کا عکس پیشِ نظر مضمون میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

ان حقائق و شواہد سے بہ خوبی ثابت ہوتا ہے کہ غالبؔ کے ادبی آثار اور ادبی شعور کو متاثر کرنے میں نیرؔ نے بھی اہم حصّہ لیا ہے۔

حواشی:

۱۔ رک مکاتیبِ غالبؔ: مرتبہ امتیاز علی خاں عرشیؔ۔ ناظم پریس، رام پور طبع ۱۹۴۶ء (دیباچہ)، ص ۲ مع حاشیہ ۲ نیز (متن)، ص ۱۶۵۔

۲۔ تذکرۂ صبح گلشن: تالیف سیّد علی حسن خان۔ تلخیص و ترجمہ عطا کاکوی پٹنہ طبع جنوری ۱۹۶۸ء ص ۶۰۔

۳۔ رک: (۱) آئینۂ غالبؔ۔ پبلیکیشنز ڈویژن، دہلی طبع ستمبر ۱۹۶۴ء ص ۵۔
(۲) احوالِ غالبؔ: مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین احمد۔ انجمن ترقیِ اردو (ہند)، علی گڑھ طبع ۱۹۵۳ء ص ۲۸۰ تا ۲۸۱۔
(۳) بزمِ غالبؔ: عبدالرؤف عروجؔ۔ ادارۂ یادگارِ غالبؔ، کراچی طبع مارچ ۱۹۶۹ء ص ۳۱۸۔

۴۔ دستنبو مشمولہ کلیاتِ نثرِ غالبؔ۔ مطبع منشی نول کشور، کانپور طبع اپریل ۱۸۸۸ء (ص ۳۹۳)، میں غالبؔ نے جن دو "بے مادر و بے پدر" بچّوں کو اپنی فرزندی میں لینے کا ذکر کیا ہے ان میں سے ایک باقر علی خاں بھی تھے۔

۵۔ مکاتیبِ غالبؔ (متن)، ص ۴۷ (خط نمبر ۵۳/۹۷)۔

۶۔ متعدد مصادر سے پتا چلتا ہے کہ عارفؔ کی وفات [اپریل ۱۸۵۲ء] کے وقت باقر علی خاں کا سن پانچ سال تھا گویا باقر علی خاں ۱۸۴۷ء کے آس پاس پیدا ہوئے ہوں گے۔ مولانا عرشیؔ ۱۸۶۲ء میں باقر علی خاں کا سن ۱۴ سال بتاتے ہیں۔ اس حساب سے باقر علی خاں کا سنہ ولادت ۱۸۴۸ء کے لگ بھگ نکلتا ہے۔ میں نے اسی لیے باقر علی خاں کا سنہ ولادت ۴۸-۱۸۴۷ء مانا ہے [رک: (۱) ذکرِ غالبؔ: مالک رام۔ مکتبہ جامعہ، دہلی طبع فروری ۱۹۷۶ء ص ۱۳۷ تا ۱۳۸ (۲) بزمِ غالبؔ ص ۳۱۷ (۳) نگار، رام پور فروری ۱۹۶۳ء ص ۳۱]۔

۷۔ رک: (۱) ذکرِ غالبؔ ص ۱۳۸ (۲) احوالِ غالبؔ ص ۲۸۰۔

۸۔ اردوے معلیٰ (حصہ اوّل): غالبؔ۔ اکمل المطابع، دہلی (طبع اوّل)، مطبوعہ مارچ ۱۸۶۹ء ص ۱۳۰ [مملوکہ کاظم علی خاں]۔

۹۔ نیرؔ کے حالات مندرجۂ ذیل مصادر میں موجود ہیں:
(۱) سخنِ شعرا: نسّاخ۔ مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ طبع اکتوبر ۱۸۷۴ء ص ۵۲۷۔
(۲) خم خانۂ جاوید (جلد سوم): لالہ سری رام۔ دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی طبع ۱۹۱۷ء ص ۳۷۷۔
(۳) تذکرۂ ریاض الفردوس: تالیف محمد حسین خاں۔ ترتیب و حواشی مرتضیٰ حسین فاضل۔ شائع کردہ شیخ مبارک علی، لاہور طبع اپریل ۱۹۶۸ء ص ۱۴۹ تا ۱۵۰۔
(۴) تلامذۂ غالبؔ: مالک رام۔ مرکزِ تصنیف و تالیف نکودر طبع اوّل ص ۲۸۵ تا ۲۹۳۔
(۵) مکاتیبِ غالبؔ: مرتبہ مولانا امتیاز علی عرشیؔ۔ رام پور ۱۹۴۶ء (متن)، ص ۵۸۔ (مع حاشیہ ۲) نیز ص ۵۹ (مع حاشیہ ۲)،
(۶) ادبی خطوطِ غالبؔ: مرتبہ مرزا محمد عسکری۔ ادارۂ فروغ اردو، لکھنؤ طبع ۱۹۷۰ء ص ۲۳۶۔
(۷) بزمِ غالبؔ: عبدالرؤف عروجؔ۔ ادارۂ یادگارِ غالبؔ، کراچی طبع مارچ ۱۹۶۹ء ص ۳۹۷۔
(۸) فیضانِ غالبؔ: عرشؔ ملسیانی۔ غالبؔ اکیڈمی، نئی دہلی طبع مارچ ۱۹۷۷ء ص ۲۸۷۔
(۹) تذکرۂ شمع انجمن: تالیف نوّاب صدیق حسن خاں، مترجمہ عطا کاکوی۔ عظیم الشان بک ڈپو، پٹنہ طبع اگست ۱۹۶۸ء ص ۳۷۔
(۱۰) تذکرۂ صبح گلشن: تالیف سیّد علی حسن خاں۔ تلخیص، ترجمہ و ترتیب عطا کاکوی۔ عظیم الشان بک ڈپو، پٹنہ طبع جنوری ۱۹۶۸ء ص ۶۰۔
(۱۱) خطوطِ غالبؔ: مرتبہ غلام رسول مہرؔ۔ غلام علی اینڈ سنز، لاہور طبع ۱۹۶۸ء ص ۴۱۔
(۱۲) نادراتِ غالبؔ: مرتبہ آفاق حسین آفاقؔ۔ مشہور پریس، کراچی طبع ۱۹۴۹ء (حصہ اوّل ص ۱۷۴)، نیز (حصہ دوم ص ۱۲۹)۔

(۱۳) غالب : مولانا غلام رسول مہر۔ تاج پبلشنگ ہاؤس، دہلی ص ۶۷ تا ۶۸۔
(۱۴) یادگارِ غالب : مولانا حالی۔ شائع کردہ رائے صاحب رام دیال پبلشنرز
الہ آباد طبع ۱۹۵۸ء ص ۱۰۰۔
(۱۵) تلخیص تاریخِ لطیف مشمولہ نگار، رام پور جولائی ۱۹۶۳ء ص ۵۹ [تلخیص
کار اکبر علی خاں عرشی زادہ]
(۱۶) جلوۂ صحیفۂ زریں نیرّ رخشاں۔ حقانی پریس، دہلی طبع ۱۹۱۶ء دیباچہ
[بہ حوالہ تلامذۂ غالب ص ۳۰۹]۔
(۱۷) قاموس المشاہیر (جلد دوم)، مرتبہ نظامی بدایونی طبع ۱۹۲۶ء ص ۴۴

۱۰۔ رک مکتوب غالب بہ نام تفتہ مشمولہ اردوے معلّیٰ (حصہ اوّل)، دہلی طبع مارچ
۱۸۶۹ء ص ۱۰۰۔
۱۱۔ عودِ ہندی : غالب۔ مطبع مجتبائی، میرٹھ (طبع اوّل، مطبوعہ ۱۰ رجب ۱۲۸۵ھ
[اکتوبر ۱۸۶۸ء] ص ۲۹ [مملوکۂ کاظم علی خاں]۔
۱۲۔ فرہنگِ آصفیہ (جلد چہارم)، مولوی سیّد احمد دہلوی۔ ترقی اردو بورڈ،
دہلی طبع ۱۹۷۴ء ص ۳۴۴۔
۱۳۔ فرہنگِ آصفیہ (جلد سوم)، مولوی سیّد احمد دہلوی۔ ترقی اردو بورڈ، دہلی
طبع ۱۹۷۴ء ص ۱۴۱۔
۱۴۔ خطوطِ غالب (۱)، مرتبہ مالک رام۔ انجمنِ ترقی اردو (ہند)، علی گڑھ طبع ۱۹۶۲ء
ص ۱۲۱/۱۲۰۔
۱۵۔ سخنِ شعرا : نسّاخ۔ لکھنؤ طبع اکتوبر ۱۸۷۴ء ص ۵۳۷۔
۱۶۔ رک : (۱) یادگارِ غالب ص ۱۰۰ (۲) تذکرۂ خم خانۂ جاوید (جلد سوم) ص ۳۴۸۔
۱۷۔ مہرِ نیم روز : غالب۔ فخر المطابع، دہلی (طبع اول، مطبوعہ ۲ ربیع الاوّل ۱۲۷۱ھ
[مطابق جمعہ ۲۳ نومبر ۱۸۵۴ء]۔ مہرِ نیم روز پر راقم الحروف کا ایک تحقیقی
مضمون منتظرِ اشاعت ہے۔
۱۸۔ بہ حوالہ اردوے معلّیٰ (حصہ اوّل)، دہلی طبع مارچ ۱۸۶۹ء ص ۱۰۰۔
۱۹۔ بہ حوالہ سخنِ شعرا طبع اکتوبر ۱۸۷۴ء ص ۵۳۷۔
۲۰۔ بہ حوالہ اردوے معلّیٰ (حصہ اوّل)، طبع مارچ ۱۸۶۹ء ص ۱۴۷۔
۲۱۔ بہ حوالہ اردوے معلّیٰ (صدی ایڈیشن)، حصہ اوّل جلد دوم : مرتبہ استادِ محترم
مولانا سیّد مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی (مقیم حال لاہور)، مجلسِ ترقی ادب،
لاہور طبع ۱۹۶۹ء ص ۷۷۳ تا ۷۷۴ (حاشیہ نمبر ۵)۔
۲۲۔ مکاتیبِ غالب (متن)، ص ۵۸۔
۲۳۔ بہ حوالہ نادراتِ غالب (حصہ دوم)، ص ۱۳۱۔
۲۴۔ ایضاً۔
۲۵۔ دیوانِ مجروح، میر مہدی حسین مجروح مطبع کریمی [لاہور؟] سنہ اشاعت
ندارد ص ۲۱۶۔ [مملوکۂ کاظم علی خاں]۔
۲۶۔ خم خانۂ جاوید (جلد سوم)، ص ۳۷۸۔
۲۷۔ مکاتیبِ غالب، مرتبہ مولانا عرشی طبع ۱۹۴۶ء (متن)، ص ۱۶۵۔

۲۸۔ نادراتِ غالب حصہ اوّل ۱۷۶۔
۲۹۔ قاموس المشاہیر (جلد دوم)، مرتبۂ نظامی بدایونی۔ نظامی پریس، بدایوں
طبع ۱۹۲۶ء ص ۴۴ نیز ص ۲۷۳۔
۳۰۔ تلخیصِ تاریخِ لطیف : تالیف مہدی علی خاں۔ تلخیص اکبر علی خاں عرشی
زادہ مشمولہ نگار، رام پور جولائی ۱۹۶۳ء ص ۵۹۔
۳۱۔ رک اخبار دبدبۂ سکندری، رام پور جلد ۲۰ شمارہ مورخہ ۶ جولائی ۱۸۸۵ء
[بہ حوالہ معاصر، پٹنہ (حصہ ۲)، ماہ جنوری ۱۹۵۲ء ص ۱۲۱]۔
۳۲۔ رک سخنِ شعرا طبع اکتوبر ۱۸۷۴ء ص ۹۵ نیز ص ۳۰۰۔
۳۳۔ بہ حوالہ خم خانۂ جاوید (جلد دوم) : لالہ سری رام۔ راے گلاب سنگھ پریس،
لاہور طبع ۱۹۱۱ء ص ۱۶۷۔
۳۴۔ خم خانۂ جاوید (جلد پنجم) : مولفہ لالہ سری رام۔ مرتبہ پنڈت برج موہن
دتاتریہ کیفی۔ دہلی طبع ۱۹۴۰ء ص ۴۱۵۔
۳۵۔ تقویمِ ہجری و عیسوی : مرتبہ ابو النصر محمد خالدی۔ انجمنِ ترقیِ اردو (ہند)،
دہلی طبع مارچ ۱۹۷۷ء۔
۳۶۔ مشمولہ دیوانِ معروف : نواب الٰہی بخش خاں معروف۔ نظامی پریس،
بدایوں طبع ۱۹۳۵ء ص ۲۲۱ تا ۲۲۶ [مملوکۂ کاظم علی خاں]۔
۳۷۔ نیرّ رخشاں کے حالات کے لیے حاشیہ نمبر ۹ کے ماتحت جن مصادر کی نشان
دہی کی گئی ہے ان میں سے متعدد مصادر میں نیرّ رخشاں کا کلام شامل ہے۔
۳۸۔ مشمولۂ کلیاتِ غالب فارسی (جلد اوّل) : مرتبہ مولانا مرتضیٰ حسین فاضل
لکھنوی۔ مجلس ترقیِ ادب، لاہور طبع جون ۱۹۶۷ء (مقابل صفحہ ۱۴۰)، سرورق
کا یہ عکس پیشِ نظر مضمون میں بہ شکریۂ ڈاکٹر نیرّ مسعود رضوی شامل کیا جارہا ہے۔
۳۹۔ بہ حوالہ مضمون از مولانا مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی : "غالب اور دو اخبار" مشمولہ رسالہ صحیفہ، لاہور (غالب نمبر حصہ اوّل، جنوری ۱۹۶۹ء ص ۱۴۹
تا ۱۵۰۔
۴۰۔ پنج آہنگ (آہنگ پنجم) : غالب۔ مترجمہ محمد عمر مہاجر۔ ادارۂ یادگارِ غالب،
کراچی طبع مارچ ۱۹۶۹ء ص ۱۸۸ تا ۱۸۹۔ [اس کتاب کے لیے جناب
قاضی عبدالودود صاحب، پٹنہ کا ممنون ہوں]۔
۴۱۔ رک انتخابِ غالب : مرتبہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی مطبع قیمہ، بمبئی طبع
۱۹۴۲ء (دیباچہ صفحہ "کا")۔
۴۲۔ کلیاتِ غالب۔ مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ طبع ۱۸۶۳ء ص ۲۰۳ [مملوکۂ
کاظم علی خاں] نیز کلیاتِ غالب۔ مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ طبع جنوری ۱۸۷۲ء
ص ۲۰۳ [مملوکۂ کاظم علی خاں]۔
۴۳۔ دیوانِ غالب (اردو)، مطبع صدر مجلس، لکھنؤ طبع اپریل ۱۸۸۲ء ص ۲۵
[مملوکۂ کاظم علی خاں]۔
۴۴۔ یہ شعر کلیاتِ غالب لکھنؤ طبع ۱۸۶۳ء (ص ۲۴) کے فارسی قطعے میں
موجود ہے۔ غالب کے فارسی دیوان کے نسخۂ قلمی مکتوبہ ۱۰ شعبان ۱۲۵۳ھ

[مخزونۂ کتب خانہ انجمن ترقیِ اردو، پاکستان] میں اس قطعے پر یہ عبارت درج ملتی ہے۔

"یہ مہر برادران سعادت توامان مرزِ [ا] ضیاء الدین احمد خاں و سیّد ذوالفقار الدین حیدر خاں دل و دیدہ راباہم آمیختن و مینوکدہ درفضائی خیال برانگیختن" [بہ حوالہ سہ ماہی اردو، کراچی جنوری ۱۹۶۸ء ص ۱۱۸]۔ غالب کی اس عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ اس قطعے کو وجود میں لانے میں ضیاء الدین احمد خاں نیّر کی ذات بھی بہ طور محرک شامل تھی اور غالب کا یہ فارسی قطعہ ۱۰ر شعبان ۱۲۵۳ھ [مطابق ۹ر نومبر ۱۸۳۷ء] تک معرضِ وجود میں آچکا تھا۔

۴۵۔ باغِ دودر : غالب۔ مرتبہ وزیر الحسن عابدی۔ پنجابی ادبی اکیڈیمی پریس لاہور طبع ۱۹۷۰ء (متن)، ص ۴۶ [اس کتاب کے لیے برادر مکرم پروفیسر ڈاکٹر آغا سہیل کا ممنون ہوں]۔

۴۶۔ کلیاتِ غالب لکھنؤ طبع ۱۸۶۳ء ص ۳۴۴ تا ۳۴۶۔

۴۷۔ بہ حوالہ کلیاتِ غالب : مرتبہ امیر حسن نورانی۔ راجارام کمار بک ڈپو لکھنؤ طبع فروری ۱۹۶۸ء ص ۶۵۷ (مع حاشیہ نمبر ۱)۔

۴۸۔ رک اردوے معلّیٰ (حصّہ اوّل)، دہلی طبع مارچ ۱۸۶۹ء ص ۲۸۹ تا ۲۹۰۔

۴۹۔ رک پنج آہنگ : غالب۔ مرتبہ وزیر الحسن عابدی۔ لاہور طبع ۱۹۶۹ء ص ۴۶۲ تا ۴۶۵ [اس کتاب کے لیے میں جناب ڈاکٹر نیّر مسعود رضوی کا متشکر ہوں]۔

۵۰۔ بہ حوالہ ذکرِ غالب : مالک رام (طبع پنجم)، ص ۱۶۵ تا ۱۶۶۔

۵۱۔ مشمولہ پنج آہنگ : غالب۔ مطبع دار السلام، دہلی طبع اپریل ۱۸۵۳ء ص ۳۹۱ تا ۳۹۲ [مملوکہ رضا لائبریری، رام پور]۔

۵۲۔ عودِ ہندی : غالب۔ مطبع مجتبائی میرٹھ (طبع اوّل)، مطبوعہ ۱۰ر رجب ۱۲۸۵ھ [مطابق ۲۷ر اکتوبر ۱۸۶۸ء] ص ۱۱ [مملوکہ کاظم علی خاں]۔

۵۳۔ نثر مرجز میں مکتوبِ غالب کا یہ اردو مفہوم مولانا عبد الباری آسی اور مولانا فاضل لکھنوی کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ ہے [رک عودِ ہندی : مرتبہ مولانا سیّد مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی۔ مجلس ترقیِ ادب، لاہور طبع جون ۱۹۶۷ء (متن)، ص ۲۸ تا ۲۹ (حاشیہ)۔ اس کتاب کا ایک نسخہ استادِ محترم مولانا فاضل لکھنوی نے مجھے عطا فرمایا ہے جس کے لیے موصوف کا شکر گزار ہوں]

۵۴۔ قاطعِ برہان : غالب۔ مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ طبع ۲۰ رمضان ۱۲۷۸ھ [مطابق شنبہ ۲۲ر مارچ ۱۸۶۲ء]۔ غالب کی زندگی ہی میں شائع ہونے والا قاطعِ برہان طبع اوّل کا یہ نادر نسخہ راقم الحروف کے ذخیرۂ کتب میں موجود ہے۔

۵۵۔ رک اردوے معلّیٰ (حصّہ اوّل)، اکمل المطابع، دہلی (طبع اوّل) مطبوعہ مارچ ۱۸۶۹ء ص ۴۴۷ تا ۴۴۸ [مملوکہ کاظم علی خاں]۔

(بقیہ : میر مہدی مجروح)

مجروح کی کوشش اس سلسلہ میں ملاحظہ ہو۔

غالب کی غزل ہے ؎

درد منت کشِ دوا نہ ہوا — میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

مجروح کہتے ہیں

ظلم بیجا ہیں اس کے سب لیکن — کون یہ کہہ سکے بجا نہ ہوا
کیا شکایت کریں رقیبوں کی — وہی جب ہم سے آشنا نہ ہوا

غالب کی غزل ہے۔

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی — میری وحشت تیری شہرت ہی سہی

مجروح کی غزل کا شعر ہے۔

ہر مکاں میں کوئی ہوتا ہے مکیں — میرے غم خانے میں وحشت ہی سہی

غالب کا شعر ہے

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

مجروح لکھتے ہیں

لائی اس دست و پا کو قابو میں — تیری تقدیر اے حنا کیا ہے

مجروح اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ انھوں نے غالب کا اتباع کیا اور اس پر انھیں فخر بھی ہے ؎

طرز کا حضرتِ غالب کی تتبع ہو اگر — وہ تو مجروح ہو سرمایۂ صد ناز مجھے
شعر میں بے مثال ہے مجروح — معنیٔ غالب و سلاستِ میر

لیکن یہ فیصلہ قاری ہی کر سکتا ہے کہ انھوں نے کس حد تک غالب کا اتباع کیا ہے اور وہ اس میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں ان کے پورے کلام کا مطالعہ کرنے کے بعد مجروح کے اس دعوے کو تسلیم کرنے میں ہمیں تامل ہے کہ غالب کا رنگ ان کے یہاں پایا جاتا ہے وہ نہ غالب کی طرز اپنا سکے نہ معنیِ غالب کو شعر کا جامہ پہنا سکے۔ البتہ سلاستِ میر کا جہاں تک تعلق ہے وہ ان کے یہاں کسی حد تک ضرور پائی جاتی ہے لیکن میر کا سوز و گداز اور میر کا لہجہ ان کو چھو کر بھی نہیں گیا۔

مجروح کی زبان یقیناً شستہ ہے۔ سادگی، دلکشی، دل نشینی اس کی جان ہے۔ محاورہ بندی، روزمرہ اور بول چال کا انداز ایک نیا لطف دے جاتا ہے۔ زبان کی شیرینی کے ساتھ کہیں کہیں طرزِ ادا کے بانکپن نے ان کے کلام میں حسن کا اضافہ کر دیا ہے۔ ان کی سب سے بڑی خدمت یہی ہے کہ انھوں نے زبان کو پاکیزگی اور شیرینی بخشی۔ اسی لیے وہ صاحبِ زبان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اور ہم ان کے دعوے کو بسر و چشم تسلیم بھی کرتے ہیں۔ ؎

ہے وہی ٹھیک جو کہو مجروح
کیوں نہ ہو صاحبِ زباں تم ہو

نئی کتابیں

میر شمس الدین فیض (حیات اور ادبی کارنامے)

مصنف : لئیق صلاح
ناشر : شگوفہ پبلی کیشنز ۳۱ بیچلرز کوارٹرس معظم جاہی مارکٹ۔ حیدرآباد
اشاعت : جنوری ۱۹۸۰ء
صفحات : ۳۶۸
قیمت : بیس روپیے

انیسویں صدی کا المیہ۔ مغلیہ سلطنت کا زوال اور اس کا روشن پہلو، اردو کا عروج وارتقاء ہے۔ اس دور میں اردو زبان میں وسعت، تنوع اور گہرائی آئی۔ نثر کی جڑیں مضبوط ہوئیں اور نظم، خصوصاً قصیدہ، مثنوی، مرثیہ اور غزل میں نت نئے تجربے ہوئے۔ اسی دور میں سرزمین دکن میں 'دکنی' نے 'اردوئے معلّٰی' کا قالب اختیار کیا۔ دلّی اور لکھنؤ کے اہل کمال حیدرآباد میں ہاتھوں ہاتھ لیے گئے۔ غالبؔ دلّی میں پچاس روپے کی نوکری کے لیے سرگرداں اور چند سو کی پنشن کو ترستے رہے اور حیدرآباد میں انھیں دنوں مہاراجہ چندو لال شاداں، اردو شعرا کو سو سوا سو روپیہ یومیہ تک وظیفے دیا کرتے تھے۔ شاہ نصیر (عرف کلو میاں، استاد ذوق وشاہ عالم) کی تنخواہ حیدرآباد میں بارہ سو روپیے ماہوار تھی۔ جب وہ دلی واپس آنے لگے تو مہاراجہ نے پندرہ ہزار روپیے بطور سفر خرچ پیش کیے۔ شیخ حفیظ دہلوی کی تنخواہ ایک ہزار روپیہ ماہانہ تھی اور ذوالفقار علی خاں صفا (شاگرد میر) پانچ سو روپیے ماہوار پاتے تھے۔ حیدرآباد وگولکنڈہ، لکھنؤ دلی سے کہیں پہلے اردو کا مرکز رہ چکا ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ اس مرکز نے بہ حیثیت مجموعی زمانہ قدیم سے اب تک اردو کی زیادہ گراں قدر خدمات انجام دی ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ اس حقیقت کو شمال ہند میں کم لوگوں نے سمجھا ہے۔ اس کا سبب تعصب نہیں، تساہل اور تغافل ہے۔ شمالی ہند میں دلی والے لکھنؤ اور رام پور سے اور یہ بھی، لاہور عظیم آباد اور اکبر آباد کے ادبی مراکز سے محض سُد بُد ہی واقف ہیں۔ حیدرآباد کے بارے میں ان کا علم اور بھی محدود ہے۔ آج جبکہ شمالی ہند میں اردو کے سورج کو گہن لگنے لگا ہے یہ اشد ضروری ہوگیا ہے کہ اردو داں اپنے سرمایے سے بخوبی واقف ہوں اور اپنی قوت کے سرچشموں کا سراغ لگا کر ان سے دوبارہ قوت اور تشویق حاصل کریں۔

لئیق صلاح نے اپنی کتاب "میر شمس الدین فیض" میں یہی خدمت انجام دی ہے۔ انھوں نے ایک شخصیت نہیں ایک دور کے رخ سے پردہ اٹھایا ہے۔ اردو کو ذریعہ تعلیم قرار دینے والی عثمانیہ یونیورسٹی بیسویں صدی میں قایم ہوئی۔ لیکن اس کی داغ بیل تقریباً ایک صدی قبل اُس وقت پڑ چکی تھی جبکہ شمس الامراء نواب فخر الدین خاں نے حیدرآباد میں ۱۸۲۰ میں دار الترجمہ اور چھاپہ خانے کی بنیاد ڈالی تھی جس میں فورٹ ولیم کالج کی طرح قصے کہانیاں نہیں بلکہ خالص علمی، سائنسی اور درسی کتابیں شائع ہوئیں۔ واضح ہو کہ یہ سائنسی کام سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی قایم ہونے سے قبل کا ہے۔

چنانچہ یہ تعجب کی بات نہیں کہ اُس دور کی سب سے زیادہ ہمہ جہت شخصیت، دلی، لکھنؤ یا رام پور میں نہیں بلکہ حیدرآباد میں پائی جاتی تھی۔ میر حافظ شمس الدین فیضؔ، آتشؔ، ناسخؔ، مومنؔ، ذوقؔ، غالبؔ وظفرؔ کے ہم عصر تھے۔ دکن میں ان کے ہم عصروں میں چندو لال شاداں، مہ لقا بائی چنداؔ، شاہ نصیر، شیخ حفیظ دہلوی وزیر علی حسرتؔ، مرزا علی لطفؔ اور ذوالفقار علی خاں صفاؔ تھے۔ خود فیض کے اتنے شاگرد تھے کہ وہ 'استادِ کُل' کہلائے۔ تلامذہ میں احمد علی عصرؔ، مشرف جنگ وفیاضؔ، معظم الدولہ تمیزؔ، بہاری لال ، محبوب نواز ونت باقیؔ، حبیب اللہ ذکاؔ (جن کی ایک کتاب کی غالبؔ نے بڑی فراخ دلی سے تعریف کی ہے)، مظفر الدین معزؔ اور حفیظ الدین یاسؔ زیادہ مشہور ہوئے۔

لیکن فیضؔ محض شاعر، مولوی اور صوفی نہ تھے۔ دینیات اور شاعری کے علاوہ انھوں نے ہندسہ، ہیئت، موسیقی، ریاضی، عروض اور جفر تک میں بھی مہارت حاصل کی، خوش خط ایسے تھے کہ خطِ طغرا بغیر کسی استاد کے سیکھا اور دوسروں کو سکھایا۔

فیض نے شمس الامرا کے دار الترجمہ کے لیے "شمس الہندسہ" کا نہایت خوبی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ اس کے علاوہ فارسی نثر میں "رسالۂ جدول نصف النہار" (جغرافیہ) "شرح میر شمس الدین" (عروض) "اعمال معمّا" (بلاغت) اردو نثر میں "فیض القرآن" اور "خواتین الامثال" اور اردو نظم میں "فیض جاری" (خالق باری طرز کی ایک لغت) فیض کی ہمہ جہت شخصیت کی شاہد ہیں۔ اردو اور فارسی کے دواوین اُن پر مستزاد۔

لئیق صلاح نے بڑی لیاقت اور محنت سے نہ صرف فیضؔ کی حیات وفن کا جائزہ لیا ہے بلکہ ان کے ہم عصروں اور شاگردوں کی شخصیت کو ابھار کر ایک صحیح پس منظر میں فیضؔ کے مقام کو متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر اس دکنی ماحول کے ساتھ ساتھ فیض کے شمالی ہند کے معاصرین کا بھی کچھ تفصیلی ذکر اور تقابلی مطالعہ ہوتا تو اس کتاب کی اہمیت اور بڑھ جاتی۔

مثال کے طور پر مصنف نے فیض کے جو اشعار نمونتاً درج کیے ہیں ان میں غالبؔ کے انداز فکر، تیور اور لہجے کی صاف گونج سنائی دیتی ہے۔

بیٹھا ہوں میں خیال میں اک چشم مست کے
پہلو سے میرے ساغر و صہبا اٹھائیے

منت اعجاز مسیحا کی کریں کس واسطے
موت کر لے گی علاج اپنے دل بیمار کا

بعد دفع سرکشاں رہتا ہے کچھ باقی نشاں
خار نکلا پاؤں سے پر یادِ ایذا رہ گئی

خدائی کا تماشا دل نے دیکھا
مرا جامِ سفالیں جامِ جم ہے

درِ مغاں ہے تکلف کا یہ مقام نہیں
پئیں گے اوک سے مئے غم نہیں جو جام نہیں

فیض امیر خسروؒ سے بھی مماثل تھے۔ بقول لئیق صلاح حضرت امیر خسرو نے گیارہ بادشاہوں کا زمانہ دیکھا اور سات کے دربار دار رہے۔ فیض نے چار بادشاہوں کا زمانہ دیکھا اور تین حکمرانوں کی دربار داری کی۔ لیکن وہ مولویوں اور محدثوں کے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی دادی کا شجرہ نسب حضرت سید محمد حسن الحسینی خواجہ گیسو دراز سے ملتا تھا لہٰذا تصوف اور سیادت بھی ورثے میں ملی اور وہ دربار میں رہ کر بھی دربار سے بہت دور تھے وہ اپنے پیر حضرت ابراہیم علی شاہ مجذوب کے ویسے ہی عقیدت مند مرید تھے جیسے کہ امیر خسرو، نظام الدین اولیاء کے۔ فیض کا صوفیانہ کلام ان کے غزلوں کی جان ہے۔ حیدرآباد کے قوال اب تک فیض کی یہ غزل بڑے ذوق سے گاتے ہیں۔

کریں ہم کس کی پوجا اور چڑھائیں کس کو چندن ہم
صنم ہم، دیر ہم، بتخانہ ہم، بت ہم، برہمن ہم
رہا کرتے ہیں پہروں محو نظارے میں اپنے ہم
سراپا ہو رہے ہیں اب تو اپنے آپ درپن ہم

اس رنگ کے چند اور شعر ملاحظہ ہوں:۔

کسی سے پوچھتے ہرگز نہ رفتگاں سراغ
رہِ فنا میں قدم کا اگر نشاں ہوتا

میں مر مٹا تلاش میں لیکن ملا نہ کھوج
یارب چلی گئی مری عمر رواں کہاں

چھوٹی بحروں میں فیض کے کلام میں غالب کی نہیں، میر و درد کے لہجے کی جھنکار سنائی دیتی ہے۔

غیر حق پر مری نگاہ نہیں
بت بھی پوجوں تو کوئی گناہ نہیں

نقش پائے بتاں پہ سر رکھیے
ایسے عالم میں سجدہ گاہ نہیں

مغفرت کی امید میں اے فیض
ہم سے چھوٹا کوئی گناہ نہیں

لئیق صلاح نے یہ کتاب عثمانیہ یونیورسٹی کی ایم فل ڈگری کے مقالے کے طور پر پیش کی تھی۔ انھوں نے قصیدہ نگاری سے دامن بچایا ہے اور تحقیقی اور معروضی رویّہ اپنایا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ وہ نہ صرف فیض پر ایک اور سیر حاصل کتاب لکھیں گی بلکہ فیض کے دوسرے دکنی ہم عصروں کو بھی اردو داں طبقے سے کماحقہ متعارف کرائیں گی۔

(مہدی عباس حسینی)

نفسیاتی زاویے (تنقیدی مضامین)

مصنف* : ڈاکٹر محمد محسن
ناشر : کتاب منزل، سبزی باغ، پٹنہ
صفحات : ۲۴۰۔
قیمت : پندرہ روپے

اردو میں اگرچہ تنقید کے نام سے بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ لیکن ایسے مضامین اور تصانیف کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے جن میں غیر جانب داری کے ساتھ علمی اور معروضی انداز میں کسی فن پارے یا ادبی شخصیت کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔ "نفسیاتی زاویے" کے مضامین اس قلیل ذخیرے خصوصاً نفسیاتی تنقید میں اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور ایسے صاحب علم کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں جس کی علمی شخصیت ابھری نہیں ہے وہ نہ صرف ایک شاعر، ادیب، افسانہ نگار اور معلم کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں بلکہ کئی زبانوں پر انھیں عبور حاصل ہے اور ادب، نفسیات اور فلسفہ وغیرہ علوم کا مطالعہ کیا ہے۔ نفسیات کے موضوع پر ان کے متعدد مضامین اور تصانیف انگریزی میں اندرون و بیرون ملک شائع ہو چکی ہیں۔ نفسیاتی زاویے اسی وسیع مطالعہ کا نتیجہ ہیں۔

اس مجموعہ میں چودہ نفسیاتی مقالے اور سات ریڈیائی تقاریر شامل ہیں۔ آخری مضمون "میں اور میری تخلیق" ان کی ذات سے تعلق رکھتا ہے اور اس لیے اہم ہے کہ یہ اس مجموعہ کے قارئین کے لیے ایسا آئینہ فراہم کرتا ہے جس کے ذریعہ ان مضامین کی گہرائی تک پہنچا جا سکتا ہے۔ اس میں ایسے اعترافات، وضاحت اور توجیہات بھی موجود ہیں جو ان مضامین کی حدود اور سمت و رفتار کا تعین بھی کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر ذیل کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔

"تنہائی پسندی نے مشاہدہ باطنی کے ذوق کو تیز کر دیا ہے۔ جس نے خود احتسابی کی خُو تو پیدا کر دی لیکن مشاہدے کی فطری ودیعت کو ماند کر دیا۔

یہی وجہ ہے کہ ان مضامین میں مشاہدہ باطنی اور اس کے داخلی محرکات کو زیر بحث لایا گیا ہے اور ان خارجی عوامل اور انسانی نفسیات پر ان کے اثرات کو نظر انداز کر دیا گیا ہے جو انسانی شخصیت اور ادب میں توازن اور ٹھہراؤ کی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ اسی مضمون میں انھوں نے اپنے پہلے افسانوں کے مجموعہ "انوکھی مسکراہٹ" کا تعارف کراتے ہوئے فرائڈ کے نظریات کے بارے میں اس عام غلط فہمی کا ازالہ کرنا ضروری سمجھا ہے۔ انھیں کے الفاظ میں:

" یہ سارے افسانے نفسیاتی عوامل اور خصوصاً لاشعوری گتھیوں کی نقاب کشائی کرتے ہیں۔ میرے افسانے اس بات کی بھی شہادت پیش کرتے ہیں کہ فرائڈی نفسیات اور جنسیات کا رشتہ اتنا قوی نہیں ہے۔ جتنا لوگ سمجھتے ہیں۔

نفسیاتی افسانوں کی امتیازی خصوصیات سے متعلق ایک مضمون "نفسیات ادب" اس مجموعہ میں شامل ہے اسی طرح ایک دوسرے مضمون میں فرائڈ کے نظریۂ خواب سے بھی

بحث کی ہے۔ شاعری کے بارے میں بھی ان کا نقطۂ نظر نہایت واضح ہے۔

"معاملات عشق کی ترجمانی اور ہجر و وصال کی حکایت سے دلچسپی کبھی نہ رہی۔ جس شعر میں حسن بیان کے علاوہ اگر کچھ کہنے کی بات نہ ہو تو وہ کوئی تادیر تاثیر پیدا نہیں کرتا۔ غم روزگار کا شکوہ، حسرت و یاس کی داستان اور قنوطیت کو مریضانہ شاعری کا مواد تصور کرتا ہوں جس سے بجائے لطف کے بیزاری پیدا ہوتی ہے۔ طبیعت کا فکری رجحان ہونے کی وجہ سے غزل میں بھی فکر کا متلاشی رہتا ہوں۔"

مذکورہ نظریات و خیالات صرف ان کی شاعری تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ ان کا عکس ان مضامین میں بھی نظر آتا ہے۔ اس مجموعے کے پہلے چار مضامین، خود آزادی، اخلاقی قدروں کی نفسیات، جبر و اختیار کے ارتقائی مراحل، نفرت کی گرم بازاری، ان نظریات کی ترجمانی کرتے ہیں جو سگمنڈ فرائڈ کی نفسیات کے آخری دور کی تصنیفات میں ملتے ہیں۔ فرائڈ نے اپنی اولین کی تصنیفات میں جنسی جبلت کو انسانی اعمال و کردار کا تنہا ماخذ تصور کیا تھا لیکن بعد کے تجربات و مشاہدات کی روشنی میں اسے محض ثانوی حیثیت دیدی تھی۔ جنسی ترغیب کو جبلت حیات کے ساتھ میلان اتصال کا ایک کرشمہ قرار دے کر اس نے اس کے بالمقابل میلان استہلاک کا تصور پیش کیا تھا" اس مجموعہ میں" غالب کی شاعری میں استہلاک ذات کا تصور" کی بنیاد بھی ان ہی نظریات پر ہے۔ اقبال کا نظریۂ خودی نفسیات کی روشنی میں" اس موضوع کے مختلف پہلوؤں پر نئے انداز سے احاطہ کرتا ہے۔ اصناف میں ظریفانہ ادب کی نفسیات اور غزل نیم وحشی صنف شاعری کے علاوہ دو مضمون" نفسیات کلیم" اور شخصیت کی تشکیل میں حافظے کی کرشمہ سازی" ادب کی دو مقتدر شخصیتوں کا دلچسپ مطالعہ پیش کرتے ہیں۔ ریڈیائی مضامین میں نفسیات کا مطالعہ، فرقہ پرستی ایک بیماری، قیادت یا لیڈر شپ کی نفسیات اس لیے اہم اور دلچسپ ہیں کہ ان میں صرف اصول نفسیات ہی بحث نہیں کی گئی ہے بلکہ یہ عصری زندگی سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔

اس مجموعے کے بیشتر مضامین اگرچہ اس سے پہلے مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں لیکن اب ان کی مجموعہ کی شکل میں اشاعت سے اردو داں حلقہ کو استفادہ کا زیادہ موقع مل سکے گا۔

آگ کے ہم سائے (۱۹۸۰ء)

مصنف	:	احمد یوسف
ناشر	:	کمرشیل ایمپوریم۔ صدر گلی۔ پٹنہ
صفحات	:	۱۳۸
قیمت	:	۱۵/ روپے

"آگ کے ہم سائے" احمد یوسف کے فنی سفر کی دوسری منزل ہے۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ روشنائی کی کشتیاں ۱۹۷۶ء میں شائع ہو چکا ہے۔ ان دونوں مجموعوں کے افسانوں کا اگر بالا ترتیب مطالعہ کیا جائے تو فن کار کے ذہنی اور فنی ارتقا کا بآسانی جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ پہلے مجموعہ کے زیادہ تر افسانے آزادی کے بعد کی ابتدائی دہائیوں سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے ان میں سیاسی، سماجی، معاشی، اور تہذیبی اُفق پر ہونے والی تبدیلیاں اور ان کے ردعمل کا عکس واضح طور پر نظر آتا ہے۔ اور کہیں کہیں ایسے رویے بھی ابھرتے ہیں جہاں تحفظ کی خواہش افراد کو اپنے خول میں سمٹنے کے لیے مجبور کر دیتی ہے اور سایوں کی تلاش خیالوں کی ایسی رنگین اور ناہموار وادیوں کی طرف لے جاتی ہے، جہاں معاشرتی زندگی کا جمود اور جاگیردارانہ تہذیب کی مدھم روشنی آنکھوں کو بھلی اور صنعتی تہذیب کی برق رفتاری ناگوار معلوم ہوتی ہے۔ احمد یوسف کے افسانے بنیادی طور پر آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد کے تجربے، مشاہدے، افکار اور اقتدار کی آویزش سے ظہور میں آتے ہیں اور یہ تصادم بعض اوقات ایسی شکل اختیار کر لیتا ہے کہ جذباتی اور ذہنی رویے اپنی سمت و رفتار اور شناخت کھو بیٹھتے ہیں۔ لیکن ان کے تازہ ترین افسانوں کے مجموعہ میں اس صورت حال میں کس قدر کمی آئی ہے اور وقت کے ہاتھوں نے یادوں کے زخموں پر کچھ اس طرح مرہم پاشی کی ہے کہ جذباتیت پر سنجیدہ فکر عنصر غالب نظر آنے لگا ہے اور وہ ماضی جو کبھی خوشحالی، سکون اور سماجی برتری کی علامت تھا اب ایسا آئینہ بن گیا ہے کہ اس میں ماضی کی مکروہ حقیقتیں بھی نظر آنے لگی ہیں ثبوت کے طور پر دیباچہ کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

"سچ پوچھیے تو حال بھی وہی قصے سنا رہا ہے جو ماضی نے سنائے تھے وہی خون کی پیاسی تلواریں، وہی غیظ و غضب میں ڈوبی آنکھیں، وہی گردن جو غرور و نخوت سے اکڑی ہے اور وہی گردن جو سیکڑوں سال کے بوجھ سے جھکی ستم کی تلوار سہنے کو تیار ہے۔" (دیباچہ)

ماضی اور حال کے مابین مماثلتوں کی یہ تلاش، خود شناسی اور خود احتسابی زندگی کے منفی رویوں سے حقیقت پسندی کی طرف ایسے گریز کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس کے بعد ماضی و حال اور مستقبل سے زیادہ گہرا، مربوط اور بامعنی رشتہ استوار کیا جا سکتا ہے چنانچہ زیر تبصرہ مجموعہ میں وہی افسانے زیادہ دل کش اور وحدت تاثیر کے اعتبار سے نمایاں نظر آتے ہیں جن میں عصری حسیت اور تاریخی اور سماجی شعور کے نقوش گہرے ہیں اس طرح کے افسانوں میں وہ جہاں زندگی کی حقیقتوں، مسائل و مصائب کی عکاسی کرتے ہیں۔ وہاں وہ اسباب و محرکات اور قوتیں بھی ابھر کر سامنے آتی ہیں جنھیں کسی بھی آزاد اور جمہوری معاشرے میں ناسور تصور کیا جاتا ہے۔ یہ قوتیں اگرچہ ماضی میں بھی سرگرم عمل تھیں لیکن موجودہ معاشرے میں ان کی شکلیں اور نام بدل گئے ہیں۔ رشوت، ذخیرہ اندوزی، منافع خوری، منافرت، قتل و غارت گری، استحصال اور مستحکم سماج کے خلاف جارحانہ عزائم وغیرہ ایسے ہی انسانیت سوز جرائم ہیں جن کو کسی بھی زمانے میں اور کسی بھی ملک میں پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھا گیا۔ احمد یوسف کے افسانوں میں بھی ان مستقل سماج دشمن قوتوں کے خلاف احتجاج اور نفرت کی آواز بلند ہوتی ہے اور یہ آواز اتنی شدید ہے کہ اس مجموعہ کا نام ہی" آگ کے ہم سائے" مظلومیت کا استعارہ بن گیا ہے جس میں صرف وہ لوگ ہی شامل نہیں ہیں جو تخریب کاری کے لامتناہی سلسلہ کے باعث سدا ہی آگ سے دوچار رہے ہیں بلکہ وہ عوام بھی شامل ہیں جو اس ترقی پذیر دنیا میں استحصالی قوتوں کے جبر و استبداد اور بے سرو سامانی کے باعث قرون اولیٰ کے انسانوں کی طرح آج بھی الاؤ کے گرد زندگی گزارنے کے لیے مجبور کر دیئے گئے ہیں۔ یا پھر جن کے جینے زندگی کی بنیادی ضرورتوں کی عدم تکمیل ناکامیوں اور نامرادیوں کے

باعث سدا ہی آگ کی بھٹیوں کی طرح روشن رہتے ہیں۔ اس مجموعہ کے بیشتر افسانے ظلمت کدہ میں، نقش ناتمام، اونچی اونچی عمارتیں، ایک منظر سامنے کا، ورثہ، دریا ایک رات کا، کاغذ آتش زدہ، روشنی روشنی اور آگ کے ہم سائے' وغیرہ ایسے ہی انسانوں کی ناکام زندگیوں اور جذباتی و ذہنی کشمکش کی عکاسی کرتے ہیں۔ مظلومیت کا یہی احساس فن کار کو حقیقتوں کے اعتراف اور استحصالی قوتوں کی نشاندہی کے لیے مجبور کرتا ہے۔

خیالات کی یہ رزم گاہ اگرچہ مختلف عوامل اور کیفیات سے عبارت ہے اور ہر حقیقت اپنے پیچھے ایک داستان رکھتی ہے جس کے باعث افسانے کا پیش منظر خاصا وسیع ہوگیا ہے لیکن یہاں فکر و عمل اور خواہش کا دائرہ وقتی مصالحتوں، دوسروں پر اعتماد اور سہل پسندی تک اس طرح محدود ہو کر رہ گیا ہے کہ اس ناگزیر اجتماعی قوت اور طبقاتی جدوجہد کے آثار دھندلے ہو کر رہ گئے ہیں جن سے گزر کر ہی روشن مستقبل کے خواب دیکھے جا سکتے ہیں۔ احمد یوسف کے افسانوں میں جدوجہد کی یہ منزل ہنوز نہیں آئی ہے۔ البتہ "بدلتے تیوروں کا سورج" میں اس خواہش کا احساس ضرور ملتا ہے۔

احمد یوسف کے افسانوں میں زندگی کی ناہمواریوں اور ناانصافیوں کے خلاف احتجاج کی آواز اور درد کا رشتہ کوئی نئی بات نہیں ہے ان کے افسانوں کے پہلے مجموعہ میں بھی" ایک سے آگے ایک"، "تین گھروں کی آبادی"، جیسے افسانے بھی شامل ہیں جو اجتماعی درد کی عکاسی کرتے ہیں اس مجموعہ میں ان کا دائرہ مزید اور توانا نظر آتا ہے۔" قصہ حجام کے ساتویں بھائی" کا اگر ۱۹۷۷ء کی سیاسی تبدیلیوں کے پس منظر میں مطالعہ کیا جائے تو یہ قصہ کسی ایک گھر تک محدود ہو کر نہیں رہ جاتا۔ اسی طرح " نقش ناتمام" کسی ایک فرد کی کہانی نہیں ہے بلکہ اس متحرک پیش منظر میں وہ تمام مظلومین شامل ہیں جنھیں سخت محنت کرنے کے بعد ایک وقت کی روٹی بھی میسر نہیں آتی۔ اس افسانے میں تکلے کے افراد خاندان اور کوڑا کرکٹ کے ڈھیر میں ایسی مشابہتیں بھی تلاش کی گئی ہیں کہ تاثیر میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ درد کے اسی توانا رشتے اور احتجاج کی بلند آواز کے بعد ہی خط منحنی [illegible] جیسی افسانے کا ظہور ممکن ہو سکا ہے۔ یہاں نہ تو عوام کا ہجوم ہے اور نہ ہی شور و غل کی اس آوازیں ہیں۔ بلکہ ساکت اور جامد فضا کے اس مختصر سے افسانے میں تجسس و تحیر کی کیفیت پر ختم ہوتی ہے۔ جب ایک ہاتھ بڑھ کر خط منحنی سے اس تصویر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ جو بہت ہی اونچے ٹموں میں چپ رہو کہلواتی ہے۔

احمد یوسف کا فن ہنوز ارتقائی منازل طے کر رہا ہے ان کے یہاں ٹھہراؤ کی وہ کیفیت ابھی پیدا نہیں ہوئی جسے فن کار کی انفرادیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن وہ منزل کچھ زیادہ دور بھی نہیں ہے جب ان کے افسانے موضوع و مواد اور تکنیک کی ہم آہنگی، ندرت خیال اور ندرت بیان کے باعث ممتاز نظر آئیں گے۔

میں نہیں کہہ سکتا (افسانوں کا مجموعہ)

مصنف : م۔ ق۔ خان
ناشر : شبستانِ ادب۔ گیا۔ صفحات ۔ ۱۴۴۔
قیمت : ۱۵/- روپیے

م۔ ق۔ خاں۔ نئی نسل کے ان ذہین افسانہ نگاروں سے تعلق رکھتے ہیں۔ جن کے یہاں اگرچہ ماضی میں رشتوں کی شکست و ریخت کا آہنگ سنائی نہیں دیتا لیکن وہ دھند ہنوز موجود ہے جو اس طرح کی تخریب کے بعد فضا کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ تنہائی، خوف، گھٹن وغیرہ اگر اس فضا کا لازمی نتیجہ ہیں تو تشکیک، تجسس و تلاش کی قوتیں بھی اسی تاریکی سے تقویت پاتی ہیں۔ خود اس مجموعہ کا نام جو ایک افسانہ کا عنوان بھی ہے میں نہیں کہہ سکتا نیز دیگر افسانے کنواں، تعاقب، ٹوٹا ہوا پل، بے سمت راستہ وصیت وغیرہ اس کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ آخر الذکر افسانہ کا آغاز ہی ان الفاظ سے ہوتا ہے۔

" میں اعتراف کرتا ہوں۔ اور یہ اعتراف دیدہ دانستہ ہے کہ اعتراف شکست کا دوسرا نام ہے۔ یہ اعتراف کلیسا کے پادری کے سامنے نہیں ہے۔ میں خود سپردگی کے لیے تیار نہیں ہوں۔ ہاں اعتراف کرتا ہوں کہ میری انگلیاں نباض و حساس ہونے کے باوجود اس راستے کے پیچ و خم، نشیب و فراز، حسن و قبح کا احاطہ کرنے سے مجبور ہیں۔ راستہ جو نہ جانے کتنی سمتوں کو جنم دیتا ہے۔" (بے سمت راستہ)

لیکن یہی اعتراف اور ذہنی عمل اپنے فطری ارتقا کی مختلف منازل طے کرتا ہوا اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ " راستہ تو راہ گیر سے ہیں ورنہ کچھ نہیں" تو وہ غبار ہٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے جس نے عصری زندگی کو اپنے دامن میں اسیر کر رکھا ہے۔ م۔ ق۔ خاں ذہنی عمل اور نفسیاتی کیفیات کی ہی عکاسی نہیں کرتے بلکہ لطیف جذبات کو بھی خوبی سے پیش کرتے ہیں تاریکی اور روشنی ایسا ہی افسانہ ہے جو مخالف جنسوں کے مابین فطری کشش کی تابناکی سے عبارت ہے۔ اسی طرح " خوابوں کے پرندے" میں اگر روحانیت اور محرومی کے احساس نے ایک ملی جلی فضا پیدا کی ہے تو " احساس آبلہ پائی" میں کچھ کھوتے جانے کا احساس اور ضمیر کی بیداری کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔

م۔ ق۔ خاں کے افسانوں میں ایسے متوسط طبقہ کا کردار بھی ابھرتا ہے جو سیاسی اور سماجی بحران، تضاد اور اس کی بوالعجبیوں پر اپنی ناپسندیدگی اظہار تو کرتا ہے اس کی ہمدردیاں بھی محنت کش عوام کے ساتھ ہیں لیکن اجارہ دارانہ معیشت اور استحصالی قوتوں کے بارے میں جس کے رویے پوری طرح واضح نہیں ہیں۔ اور ایسے دور میں جب کہ تحفظ و کفایت کے مسائل نے انسانی قوتوں اور تخلیقی صلاحیتوں کو مفلوج کر کے رکھ دیا ہے اس کے یہاں جنسی موضوعات ابھی تک کشش کا موضوع بنے ہوئے ہیں۔ " تبدیلی اگرچہ جنسی زندگی کے فطری زوال کا نتیجہ ہے تو "کھلتی آنکھوں کا المیہ" اور" کتا" اسی موضوع کے دو مختلف پہلوؤں کو پیش کرتے ہیں۔ جس میں حصول زر اور آسودگی دونوں شامل ہیں۔ البتہ ہمسایہ ان دونوں کے تصادم سے ظہور میں آتا ہے جہاں دولت کے آغوش میں پرورش پانیوالا خود رد پورا اپنی قوت کے گہرے نقوش چھوڑ جاتا ہے۔ یہ افسانہ اگرچہ م۔ ق۔ خاں کے اچھے افسانوں میں شامل کیا جا سکتا ہے لیکن اس کا انجام کچھ عجلت اور غیر فطری پن کا احساس دلاتا ہے۔ دیگر افسانوں میں خود ساختہ اور ٹوٹا ہوا پل اگر سیاسی تبدیلیوں کے بحران سے جنم لیتے ہیں تو " تماشا" اور " بازگرد" محنت کش طبقہ کی نفسیاتی کمزوریوں اور سرمایہ دار طاقتوں کے مکر و فریب سے عبارت ہیں۔ یہ قوتیں جب تک متحد اور سرگرم عمل رہتی ہیں تب تک آندھیاں انھیں کوئی نقصان نہیں پہنچا پاتی۔

میں نہیں کہہ سکتا جو اس مجموعہ کا پہلا افسانہ ہے۔ ایک ایسے فیکٹری منیجر کی انفرادی

اور غیر اضطراری عمل اور نفسیاتی کیفیتوں کا مظہر ہے جس کو ہڑتالی مزدوروں نے گھیر رکھا ہے۔ اس کی مجبوریاں اگرچہ واضح ہیں لیکن مزدوروں سے اس کی ہمدردی اور مظلومیت اسے اس حد تک متاثر کرتی ہے کہ وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے۔ اس مختصر سے افسانے میں اگرچہ متصادم قوتیں واضح طور پر سامنے نہیں آتی ہیں لیکن ایک حساس فرد اپنی بیدار قوتوں کے گہرے نقوش چھوڑ جاتا ہے۔

اس مجموعہ کی ایک امتیازی خصوصیت روایت سے انحراف بھی ہے۔ جو امیجز، تشبیہات اور استعاروں کے ذریعہ تاثیر پیدا کرنے کی کوشش میں اپنی حدود سے اس حد تک تجاوز کر جاتا ہے کہ افسانہ اپنا تاثر کھو بیٹھتا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ مذکورہ لوازمات افسانہ کے حسن و دلکشی میں اضافہ کرتے ہیں۔ لیکن اس کی افراط و تفریط اور غرابت ایسا عیب بھی ہے جس سے نہ صرف مشاہدہ و مطالعہ اور تجربے کے نقصان کا اظہار ہوتا ہے بلکہ تخلیقی قوتیں بھی اس کی زد میں آ کر مفلوج ہو جاتی ہیں۔ اس مجموعہ کا آخری افسانہ "کتا" ان عیوب سے پاک نظر آتا ہے۔ "کتا" کی طرح خوبصورت کتابت طباعت اور گیٹ اپ سے مرصع یہ مجموعہ اگر زبان کی غلطیوں سے بھی پاک ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ لیکن ان کمزوریوں کے باوجود مستقبل میں ان سے زیادہ بہتر افسانوں کی توقع کی جا سکتی ہے۔

اور کچھ بیاں اپنا (تنقیدی مضامین)

مصنف : داؤد اشرف

ناشر : شگوفہ پبلی کیشنز

صفحات : ۱۱۶

قیمت : ۱۰/- روپیے

"اور کچھ بیاں اپنا"۔ داؤد اشرف کے ان بارہ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جو اس سے پہلے مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی پہلی مبسوط تصنیف "مخدوم ایک مطالعہ" ہے جو ۱۹۶۷ء میں شائع ہو کر خراج تحسین وصول کر چکی ہے۔ اس مجموعہ میں بھی مخدوم سے متعلق تین مضامین شامل ہیں جن کی نوعیت تاثراتی ہے ان کے علاوہ مزید تین ریڈیائی مضامین اسداللہ وجہی، الطاف حسین حالی اور اسرار الحق مجاز بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔

اس مجموعہ میں پہلا مضمون محمد قلی قطب شاہ کی شخصیت اور شاعری سے متعلق ہے جو اردو کے اس پہلے صاحب دیوان شاعر کے عہد، شخصیت اور شعری خصوصیات سے بحث کرتا ہے اور ان امتیازات کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔ جس کے باعث قلی قطب شاہ کی شاعری زبان کی اجنبیت کے باوجود دلچسپی کا موضوع بنی رہی ہے۔ دوسرے مضمون میں فاضل نقاد نے غالب سے متعلق ایک اہم موضوع "غالب کا حسن طلب اور حسن اعتراف" سے بحث کی ہے۔ اور اس کو ظرافت، شگفتگی اور ذہانت کا ایسا نمونہ بتایا ہے جس میں مزاح کی ہلکی ہلکی آمیزش کے ساتھ جدت پسندی کا انوکھا امتزاج بھی موجود ہے۔ اپنے اس دعوی کو مستحکم بنانے کے لیے انھوں نے غالب کے خطوط سے بیشتر مثالیں بھی پیش کی ہیں۔

ترجمہ اور اس کی اہمیت سے متعلق مضمون اگرچہ مختصر ہے اور یہ ترجمہ کے فن اور اس کی دشواریوں سے بھی بحث نہیں کرتا البتہ اس سے ترجمہ کے مقاصد اور ضرورت کا احساس مزید پیدا ہوتا ہے۔ اقبال اور تصور وطنیت سے بحث کرتے ہوئے فاضل نقاد نے اس پہلو پر خصوصی توجہ صرف کی ہے کہ اگرچہ حرکت و عمل اقبال کے فلسفہ پیام کی بنیاد ہے اور انھوں نے اپنی شاعری میں فرد، جماعت اور زندگی کے اہم اور امتیازی مسائل پر حکیمانہ انداز سے اظہار خیال کیا ہے لیکن وطنیت جیسے اہم موضوع کو بھی انھوں نے نظر انداز نہیں کیا ہے اور ایک سچے محب وطن کی حیثیت سے آزادی وطن کو بنیادی اہمیت دی ہے۔ اقبال کا تصور وطنیت ایک متنازعہ مسئلہ رہا ہے جس کی حدود کا تعین اتنا آسان بھی نہیں ہے۔ لیکن اکثر ناقدین کی طرح فاضل نقاد نے یہ نتیجہ برآمد کیا ہے کہ اقبال کا تصور وطن محدود سے محدود کی طرف سفر کرتا ہے۔

اس مجموعہ میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے تخلیقی اور علمی کاموں پر بھی ناقدانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ لیکن اس جائزہ سے ڈاکٹر زور کے علمی و ادبی مرتبے کے تعین میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی کی شخصیت سے متعلق مضمون بھی اگرچہ تاثراتی ہے لیکن اردو زبان و ادب کی ترقی و توسیع کے سلسلہ میں دتاتریہ کیفی نے جو خدمات انجام دی ہیں اس مضمون میں نہ صرف ان کا اعتراف کیا گیا ہے بلکہ خراج عقیدت بھی پیش کیا گیا ہے۔

امید ہے کہ داؤد اشرف صاحب کی یہ کوشش ان کی پہلی تصنیف کی طرح بارآور ہوگی اور یہ تنقیدی مجموعہ بھی پسند کیا جائے گا۔

اسلحہ اور انسان

مترجم : ابو یوسف پیر بیگھوی

ناشر : اثر پبلی کیشنز، کریم گنج۔ گیا

صفحات : ۱۴۱۔

قیمت : ۱۲/- روپیے

انڈو یورپی زبانوں کے ڈراموں کے تراجم کی روایت کوئی نئی نہیں ہے، ۱۸۵۷ء سے اب تک متعدد ڈرامے ترجمہ ہو کر اردو ادب کا حصہ بن چکے ہیں۔ اس اخذ و قبول کا سبب صرف مغربی سامراج کی بالادستی ہی نہیں رہا ہے بلکہ یورپ میں جاگیردارانہ نظام کے زوال اور نئے صنعتی نظام کے آغاز کی صورت میں سماج جن تبدیلیوں اور تغیرات سے دوچار تھا انگریزی ادب نے انھیں نہایت دیانت داری کے ساتھ پیش کیا تھا۔ ہندوستانی سماج میں تصادم و تضاد کا یہ سلسلہ ۱۸۵۷ء کے بعد شروع ہوا اور آج تک اسی طرح جاری ہے کہ اس طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود انیسویں صدی عیسوی کا مغربی ادب ہماری توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ برنارڈ شا کے مذکورہ ڈرامہ آرمس اینڈ دی مین کا اردو ترجمہ اسی دلچسپی، جذباتی اور ذہنی کیفیات کی عکاسی کرتا ہے۔

نئے سماج نے جہاں پرانی قدروں کو کمزور کیا تھا وہاں انسان کو نئی قوت اور آزادی بھی عطا کی تھی اور نئے متوسط طبقہ کو ابھرنے کا موقع بھی دیا تھا۔ لیکن نئی اقدار کے عدم تعین کے باعث آزادی نے جہاں افراط و تفریط کی شکل اختیار کر لی ہے وہاں اس نئے نتائج سماج کے حق میں مضر ثابت ہوئے ہیں۔ اسی طرح اسلحہ کی ایجاد نے جہاں انسان کو پہلے سے کہیں زیادہ طاقتور بنا دیا ہے وہاں اخلاقی اعتبار سے اس کو

کمزور بھی کیا ہے۔ نفرت، فریب، گھمنڈ، ظلم، ناانصافی کے سایے بھی گہرے ہوگئے ہیں برناڈشا کا مذکورہ ڈرامہ ایسے ہی بحران، روایت پرستی، رومانویت اور حقیقت پسندی کے مابین تصادم و تضاد کی فضا سے ابھرتا ہے تاکہ ایسا ذہن بیدار ہوسکے جو تذبذب، دل شکستگی زوال پذیری سے پیدا ہونے والی ذہنیت سے نجات دلاکر حقیقت پسندانہ انداز میں اپنے عہد کے مسائل و مصائب پر غور کرنے کے لیے آمادہ کرسکے اور نئے تعمیری روایت کو تقویت پہنچا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ برناڈشا کا مذکورہ ڈرامہ اپنے عہد میں نہایت مقبول اور کامیاب رہا۔

ہندوستانی سماج بھی موجودہ دور میں کم و بیش اسی بحران میں گرفتار ہے۔ ایسی صورت میں ترجمہ کے لیے اس ڈرامہ کا انتخاب یقیناً اردو داں عوام کی خدمت سے کم نہیں ہے۔ جسے ابو یوسف صاحب نے نہایت محنت اور خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے کسی بھی تخلیقی فن پارے کا ترجمہ تخلیقی عمل سے کم نہیں ہوتا ابو یوسف صاحب نے بامحاورہ سلیس اور سادہ نثر میں اس کا ترجمہ کرکے ڈرامہ کی تخلیقی شان کو برقرار رکھا ہے۔ امید ہے کہ اردو داں حلقہ میں یہ ترجمہ پسند کیا جائے گا۔

(عظیم الشان صدیقی)

تہی دست (منظومات)

مصنف : بدنام نظر

ناشر : شبستان ادب، لاروڈ، بانم برج گیا (بہار)

قیمت : دس روپیے

تقریباً اٹھارہ سال کی مسلسل کاوشوں کا نتیجہ اس مجموعے کی نظمیں (صرف نظمیں) خیالات کی کشاکش کا ایک عجیب و غریب سلسلہ فراہم کرتی ہیں۔ بدنام نظر فن شناس ہے قدرداں ہے اور احترام کرتا ہے اپنے پیش رووں کا، اپنے ہم عصروں کا جیسے میراجی، ن۔ م۔ راشد، اختر الایمان، زاہدہ زیدی، عین رشید، لیثا المنظر، غیاث احمد گدی، کمال اختر، افتخار جالب جو اسے تخلیقی تحریک دیتے ہیں۔ اس کی اپنی پہچان اور قدر و قیمت کا مبتدا و منتہا انھیں نظموں کے تار و پود میں ہے۔ گویا تہی دست بدنام کسی ایسی نظر کا متلاشی ہے جو بدنام کو نام میں بدل سکے۔ خیالات کی اس ندی میں احساس کی لہریں جا بہ جا ابھرتی ہیں، الجھتی اور سر پٹکتی ہیں۔ کچھ ایسے کہ شور و غل بھی ایک خاص سُریلے پن کے ساتھ گوش گزیں ہوجاتا ہے۔

اس مجموعے کی چھوٹی نظمیں اپنی فضائی کیفیت کے اعتبار سے تاثرات سے چھلکتے ہوئے جام کی طرح ہیں جن میں کہیں نفسیاتی بحران، کہیں کرب آگہی اور کہیں احساس کی بوقلمونیت ہے اور جنہیں قدیم اسم بامسمیٰ کی حقیقت کی طرح دل و دماغ میں جذب کرلیتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے، سرمئی شام کی ایک نظم، بہتی ہوئی آنکھیں کا خواب، زندگی، دوسرا المیہ، سچائی غور طلب ہیں، بدنام کے یہاں طنز و تعریض کی گہرائیاں اگر سنکیت و قنوطیت کی دلدلوں کا احساس دلاتی ہیں تاہم ان میں بھی شاعر کی craftmanship اور پیکر تراشی کا فن ضرور متوجہ کرتا ہے اس سلسلے میں "آج کی رات" "لاترتیب" سمندر کتنا گہرا ہے۔ تجسیم قابل ذکر ہیں۔ لمبی نظموں کی مجموعی فضا تسلسل کی بوکھلاہٹ کے ذریعے غزل کے نیم وحشی مزاج کا بدلا مکمل وحشت کے روپ میں پیش کرتی ہے۔ اس حالت میں بھی خوشی کا احساس ہوتا ہے کہ بدنام جیسے شاعر کو تنگنائے غزل کے بند پانی اور اس کے فساد سے ہٹ کر اپنے تخلیقی شعور کو صحت مند رکھنے کا انداز آتا ہے۔

کتاب کی چھپائی میں ایک نئی ادا ہے لیکن وہ صفائی نہیں ہے جس سے مزید نکھار آسکتا تھا۔ دو تین گہری کالی تصویریں جو مشمولات کے مختلف حصوں کے آغاز میں دی گئی ہیں اگر نہ ہوتیں تو بہتر تھا کیوں کہ نظموں کی تندی و تیزی خود ہی تشبیہ کا فرض ادا کرتی ہے۔

نیم سرکاری اعانت کے باوجود قیمت مناسب ہے۔

گونگے دریچے (افسانوں کا مجموعہ)

مصنف : نعیم زبیری

ناشر : اردو اکیڈمی، آندھرا پردیش، بک ڈپو، حیدرآباد

قیمت : دس روپیے

اس مجموعے میں ۱۲ افسانے شامل ہیں جو مصنف کی ۲۵ سالہ کوششوں کے انتخاب پر مبنی ہیں۔ مصنف کی طرف سے کم لکھنے اور کم چھپنے کا اعتراف ایک ایسی تمکنت آمیز کسر نفسی کا آئینہ دار ہے کہ جس کی دوسری مثال ادبی فضا میں شاذ و نادر ہی میسر آتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ موصوف کا منظر عام پر آنا کسی گونگے دریچے کی جرأت گویائی بن گیا ہے جو اپنے زیر و بم میں قاری کے لیے کچھ ایسے تقاضے بھی لیے ہوئے ہے۔ ن میں التجا اور التماس کی حلاوت ہے۔

کسی ادیب کے کم لکھنے اور کم چھپنے کی خوبی اگر اسے خواہ مخواہ قسم کے دوہراؤ سے بچائے رکھتی ہے تو یہ دلیل بن جاتی ہے۔ اس کی زندگی کے گوناگوں پہلوؤں پر گہری نظر رکھنے کی اور اسے تکنیکی تنوع اور ہم آہنگی سے پیش کرنے کی۔ بالکل یہی صورت حال نعیم کے یہاں ہمیں متوجہ کرتی ہے۔ قریباً ہر کہانی ایک چھوٹے بڑے پلاٹ کے منظم خاکے پر استوار ہے جس کی خانہ پُری وہ ان رنگوں سے کرتا ہے۔ جنھیں کردار نگاری، پیکر تراشی، ماحول کشی اور تاثر انگیزی کا نام دیا جاسکتا ہے۔ نعیم زندگی کی سنجیدہ فضاؤں کا نقاش ہے لیکن بین السطور مواد طنز و تعریض کے ساتھ ساتھ کچھ لطیف مزاح کی جھلکیاں بھی لیے ہوتے ہے جو ان تخلیقات کو محض معتبر ہی نہیں بلکہ دلچسپ بھی بنا دیتی ہیں۔

ان تمام خوبیوں کے باوجود نعیم کے لیے ناصبور ہونے اور فنی اجتہاد اختیار کرنے کی ضرورت ہے ورنہ دنیائے ادب میں چڑھتے سورج کو بے ٹوک دیکھنا اور دیگر عصری تقاضوں سے قدم ملانا مشکل ہوجائے گا۔

کتاب کی دیکھ ریکھ اچھی ہے اور قیمت عین مناسب۔

ننھے ہاتھوں کا لمس (کہانیاں)

مصنف : ڈاکٹر نریش

ناشر : نوجوت پبلی کیشنز مالیر کوٹلہ (پنجاب)

قیمت : دس روپیے

نریش ہندی کے استاد ہیں مگر اردو میں بھی لکھتے ہیں. شاعری کے ساتھ ساتھ کہانی کے میدان میں بھی کچھ عرصے سے بقولِ خود وہ ایک خاص زادِ راہ کے ساتھ محوِ سفر ہیں. یہ زادِ راہ دراصل وہی ایک چیز ہے جو فکشن کے رگ وپے میں جانے کب سے کارفرما چلی آرہی ہے. بنیادی طور پر سادہ الفاظ میں اسے آپ بیتی اور جگ بیتی کے اس امتزاج کا نام دیا جاتا ہے جسے فن کار اپنی وارداتِ قلب کی صورت میں پیش کرتا ہے. نریش کے یہاں اس زادِ راہ کی نشاندہی نئے انداز اور پرانی تلمیحات کی مدد سے ہوتی ہے.

ان تیرہ کہانیوں میں ایک بے ساختہ آغاز اور ایک ایسے انجام سے دوچار ہونا پڑتا ہے جسے ہم خوبصورت موڑ یا کہیں کہیں غیر خوبصورت موڑ سے بھی تعبیر کرسکتے ہیں. ننھے ہاتھوں کا لمس ایک کامیاب کہانی ہے جس میں شدید غم کے احساس کو ننھے ہاتھوں کا لمس ایک ایسے احساس میں بدل دیتا ہے جس سے زندگی کے روشن پہلوؤں کی نشاندہی ہوتی ہے. صورت کی تلاش ایک نفسیاتی کی واردات بڑی خوبی سے پیش کرتی ہے اور خوبصورت موڑ کی کہانی ہے. گائتری بنام کلمہ میں نریش جی کہانی کو خاطر خواہ اختتام نہیں دے سکے اور ایک سیکولر موضوع سے پورا انصاف ہوتے ہوتے رہ گیا ہے. دنداسہ پلاٹ اور موضوع کے اعتبار سے مکمل کہانی ہے. خوشبو کا سفر یادوں کی پرچھائیوں سے شروع ہوتا ہے اور ایک ناگزیر صورتِ حال کی تاریکیوں میں ڈوب جاتا ہے. وقت کی تبدیلی کے دو منفرد پہلو بڑی خوبی سے پیش کیے گئے ہیں.

مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ نریش کا تخلیقی سفر جاری ہے اور خوب سے خوب تر کی طرف امید افزا اقدام کا آئینہ دار ہے. ڈاکٹر نریش اپنی اردو میں ہندی کی بے جوڑ ملاوٹ نہیں آنے دیتے ان کے یہاں بیان کی سادگی ہے جو اردو کی فصاحت کو مدِنظر رکھتی ہے اور اسی وجہ سے صاف اور ڈھلی ڈھلی سی ہے.

کتاب کی چھپائی اور گیٹ اپ اچھا ہے اور قیمت مناسب.

کلامِ انجم مانپوری

مرتب : معین شاہد

ناشر : مکتبہ آدرش، بنیاد گنج. گیا

قیمت : پندرہ روپیے

معین شاہد نے اپنی تخلیقی اور دیگر مصروفیتوں کے باوجود اس کتاب میں انجم مانپوری کے طنزیہ اور مزاحیہ کلام کو ترتیب دیا ہے. یہ کارِ خیر ایک مرحوم صحافی اور برگزیدہ طنز و مزاح نگار کے لیے جس قدر احترام و خلوص کے مترادف ہے. اسی قدر اس کی یاد کو اس کے فکر و فن کی روشنی میں ایک خاطر خواہ مقام دینے کی کامیاب کوشش بھی ہے مرتب اس کے لیے مبارک باد کا مستحق ہے.

اردو نثر میں طنز و مزاح کو وسیع پیمانے پر پیش کرنا سہل ہے لیکن طنز و مزاح کو مانوس و مرغوب شعری پیکر دینا جہاں فنی طور پر ٹیڑھی کھیر ہے. وہاں اسے تاثراتی برجستگی اور بے ساختگی دینا بھی آسان نہیں. انجم مانپوری نے غزل، قطعہ اور نظم کے پیرائے میں طنز و مزاح کی ایک ملی جلی شدید و لطیف فضا اپنے منفرد انداز میں اجاگر کی ہے. ماحول اور معاشرے کے بیشتر پہلوؤں پر انجم کی نظر بڑی گہری رہتی ہے اور اپنے مشاہدات و تجربات کو مکمل طور پر فنی گرفت میں لانا اس کی شعری صلاحیت کا بین ثبوت ہے. موضوعات و معروضات کی رنگا رنگی کا ایک اچھا خاصا سلسلہ انجم کے کلام میں قاری کے لیے تفریحِ طبع اور دلچسپی کا ساز و سامان فراہم کرتا ہے. اگرچہ نظموں کی مجموعی اثر انگیزی دعوتِ مطالعہ دیتی ہے پھر بھی اس نقطۂ نگاہ سے ذیل کے چند شعر بطور نمونہ قابلِ غور ہیں :-

دل کو تھاما، آہ کو روکا، فغاں کو چپ کیا
یاس کو تسکین دی، بہلایا دردِ جگر

کھرے کھوٹے کی دم بھر میں حقیقت کھولدیتی ہے
جو سچ پوچھو تو گویا اک کسوٹی ہے صداقت بھی

کھلا عقدہ نہ ٹائی کا کہ کیوں فیشن میں داخل ہے
بجز اس کے کہ اک تقلید کا پٹہ ہے گردن میں

سادہ گیٹ اپ اور اچھی چھپائی کے اعتبار سے کتاب کی قیمت مناسب ہے.

(رام پرکاش راہی)

ماہنامہ عصری آگہی (افسانہ نمبر)

ناشر : 1410/3 رام نگر، شانتی بلڈنگ دہلی ۳۲

قیمت : چھ روپیے

گزشتہ ایک سال میں 'عصری آگہی' نے، ادبی رسائل کی دنیا میں اپنے لیے ایک منفرد مقام بنالیا ہے اور دوسرے سال کی ابتدا اس افسانہ نمبر سے کی ہے جو ایک قیمتی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے. اس کے مشتملات میں زیادہ تر وہ مقالے اور افسانے ہیں جو 'پریم چند کی روایت اور جدید اردو افسانہ' کے تحت ۲۶ اور ۲۷ اپریل سنہ کو غالب اکیڈمی میں ہونے والے سیمینار میں پیش کیے گئے تھے: ابتدا میں سیمینار کی مختصر مگر جامع رپورٹ درج کی گئی ہے جسے ڈاکٹر عبدالحیٔ نے تیار کیا ہے. اس شمارہ کا اداریہ 'افسانے کی شناخت' عمدہ ہے اور غور و فکر کی دعوت دیتا ہے.

اس خصوصی شمارہ کے ساتھ عصری آگہی نے اپنی زندگی کے دوسرے سال میں قدم رکھا ہے. یہ ایک نیک شگون ہے اور امید ہے یہ رسالہ مستقبل میں زیادہ قیمتی دستاویزات پیش کرسکے گا. کتابت، طباعت اور گٹ اپ اچھا ہے، قیمت مناسب ہے. سیمینار کی تصاویر اس شمارہ کے حسن میں مزید اضافہ کرتی ہیں.

(محمد عرفان)

ہماری کتابیں

۱۔ **مشعلِ آزادی** (انور نظامی) قیمت ۴۰ روپے

ہندوستان کی جنگِ آزادی کی منظوم داستان (حصہ اوّل)، ۴۲۰ صفحات پر مشتمل جس میں ۱۸۵۷ء تک کے واقعات شامل ہیں۔ دیدہ زیب کتابت و طباعت عمدہ مجلّد مع گرد پوش۔

۲۔ **بھارت خلائی دور میں** قیمت بارہ روپے

خلائی سائنس کی دلچسپ داستان۔ سری ہری کوٹہ کی سیر، رازہائے سربستہ کا انکشاف، نہایت آسان زبان، خلائی کوششوں کا ہلکے پھلکے انداز میں بیان۔ ۱۴۸ صفحات کی کتاب، کاغذ عمدہ، تصاویر سے مزین۔

۳۔ **پہیلیاں** قیمت آٹھ روپے

تاریخ سے زیادہ پہیلیوں کا مجموعہ جن سے بچے اور بڑے یکساں طور پر لطف اٹھا سکتے ہیں۔

۴۔ **رنگ برنگے پھول** قیمت دس روپے

بچوں کے شاعر شفیع الدین نیر، سیفی سیوہاروی، افسر میرٹھی، اسمٰعیل میرٹھی، تلوک چند محروم اور دیگر بہت سے شعرا کی آسان زبان میں لکھی ہوئی نظمیں۔

۵۔ **آج کل کی کہانیاں** قیمت گیارہ روپے

۱۹۶۴ء سے ۱۹۷۰ء تک رسالہ "آج کل" میں شائع شدہ مشہور کہانیوں کا مجموعہ جس میں واجدہ تبسم، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر اور دیگر افسانہ نگاروں کے شہ پارے شامل ہیں۔

۶۔ **کون جیتا کون ہارا** قیمت ۹ روپے

بچوں کے لیے آسان زبان میں لکھی ہوئی دو دلچسپ کہانیاں۔ کتاب شروع کرنے کے بعد ایک ہی نشست میں ختم کرنے کو جی چاہتا ہے۔ عمدہ کتابت۔

۷۔ **ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر** (ڈاکٹر محمد عمر) قیمت ۲۰ روپے

ڈاکٹر تاراچند نے اپنی مشہور تصنیف میں ہندوستانی تہذیب پر مسلمانوں کے اثرات کا جائزہ لیا تھا۔ ڈاکٹر محمد عمر نے اپنی اس محققانہ کاوش میں یہ دکھایا ہے کہ ہندوستانی تہذیب مسلمانوں کی زندگی میں سرایت کیے ہوئے ہے۔

۸۔ **مرقعِ اقبال** (جگن ناتھ آزاد) قیمت ۵۰ روپے

علامہ اقبال کی زندگی کے اہم واقعات، شجرۂ نسب اور نادر تصاویر اور تحریروں کا البم۔

۹۔ **یہ ہندوستان** (شیلادھر) قیمت ۱۰ روپے

اس باتصویر کتاب میں سادہ اور سہل زبان میں بچوں کو ہندوستانی تہذیب و تمدن کے ساتھ ساتھ تاریخی معاشی اور سماجی حالات سے آگاہ کیا گیا ہے۔ رنگین تصاویر۔

۱۰۔ **سرسید احمد خاں** (پروفیسر خلیق احمد نظامی) قیمت ۵ روپے

ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی، ثقافتی اور سیاسی زندگی پر سرسید کے کارناموں کا زبردست اثر پڑا ہے۔ اس بات کو بڑے عالمانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

۱۱۔ **ابوالکلام آزاد** (عرش ملسیانی) قیمت پانچ روپے

ابوالکلام آزاد، جدید ہندوستان کے معماروں میں ہیں۔ ان کی خدمات کا حسین و دلکش انداز میں بیان۔

۱۲۔ **جواہر لال کی کہانی تصویروں کی زبانی** قیمت ۳ روپے ۵۰ پیسے

محبوب رہنما اور ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم شری جواہر لال نہرو کی زندگی کے دلچسپ واقعات رنگین تصاویر میں۔ بچوں اور طالب علموں کے لیے بہترین تحفہ۔

۱۳۔ **ہم ایک ہیں** (عرش ملسیانی) قیمت ۱۰ روپے

ہندوستان کی ثقافتی و سماجی گوناگونی اور یک رنگی کا دلچسپ بیان۔ قومی زندگی کی توانائی کی داستان۔

۱۴۔ **پھلوں اور سبزیوں کو محفوظ رکھنے کے طریقے** قیمت دو روپے ۵۰ پیسے

گھریلو ظروف کے جام جیلی، مارملیڈ، چٹنی مربّے اور اچار وغیرہ بنانے کے متعدد طریقے تصویروں کے ذریعے بتلائے گئے ہیں جن سے بڑی آسانی سے آپ گھر بیٹھے اپنی من پسند چیزیں بنا سکتے ہیں۔

"آجکل" کے خریداروں کو ۲۰ فی صد رعایت۔ محصول ڈاک ہمارے ذمے

دس روپے سے کم قیمت کی کتابیں بذریعہ وی۔ پی نہیں بھیجی جائیں گی۔ پوسٹل آرڈر بھیجیے یا وی۔ پی طلب کیجیے۔

ملنے کا پتہ: بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

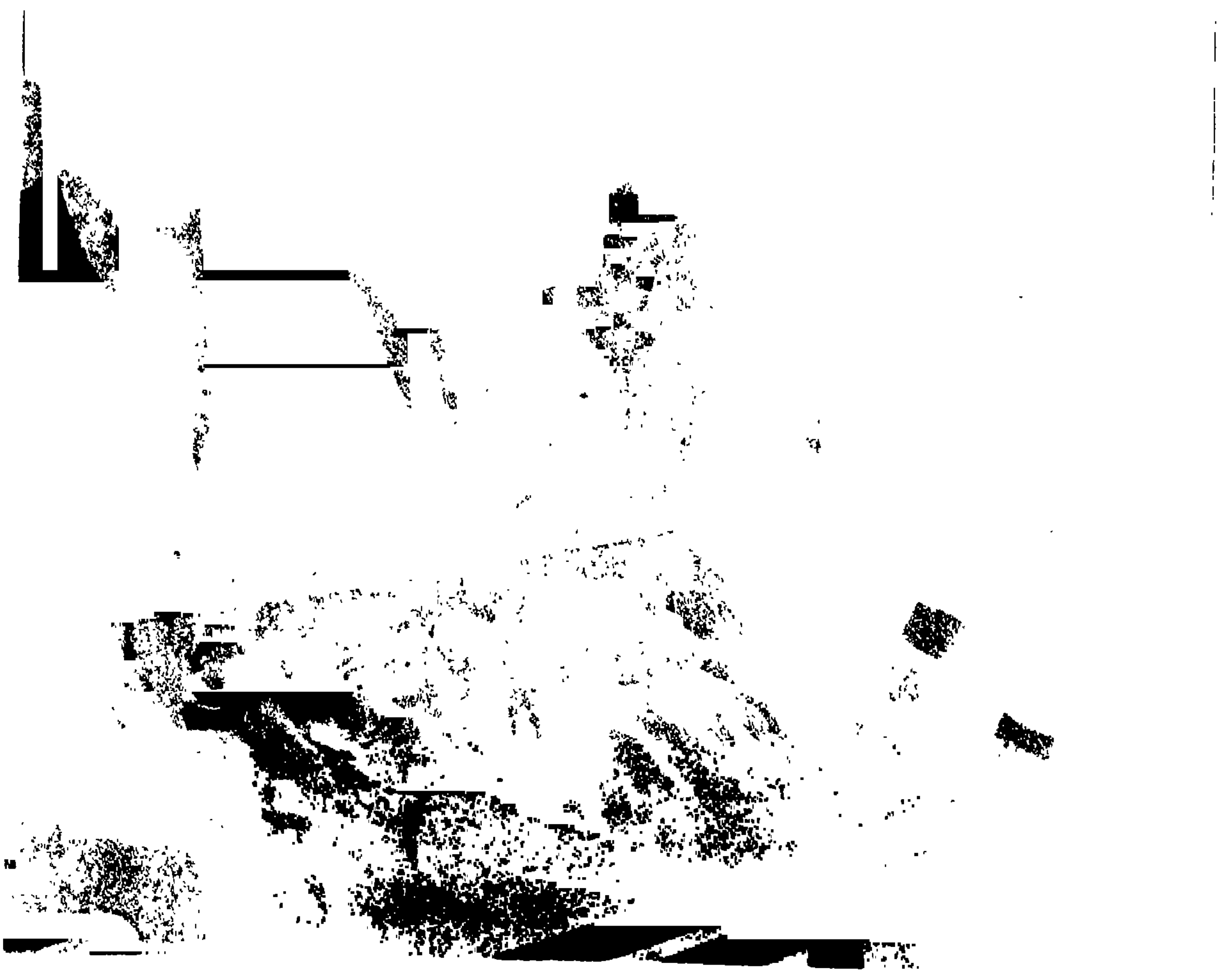

جناب کمال الدین محمد وزیر صحت اور لوکل گورنمنٹ حکومت تری نیداد اور ٹوبیگو نے ۶ نومبر ۱۹۸۰ء کو صدر جمہوریہ ہند شری نیلم سنجیوا ریڈی سے ملاقات کی۔ آپ نے اپنے ملک کے ایک مشہور مصوّر کی پینٹنگ "اِن دِی اسٹیپس آف فیوا" صدر جمہوریہ ہند کو تحفے میں دی۔ جناب کمال الدین محمد دبائیں سے دوسرے،

ڈنمارک کے وزیر اعظم مسٹر انکر جورگنسن ہندوستان کے دورے پر تشریف لائے اور ملک کے رہنماؤں سے باہمی دلچسپی کے مسائل پر تبادلہ خیال کیا۔
۳ نومبر ۱۹۸۰ء کو شری اے۔ کے۔ دت۔ سکریٹری وزارتِ اطلاعات و نشریات حکومتِ ہند نے انھیں "کلکٹڈ ورکس آف مہاتما گاندھی" کی ۸۷ جلدیں (شائع کردہ پبلی کیشنز ڈویژن، حکومتِ ہند) پیش کیں۔

صویر میں

یر اعظم ڈنمارک
ابیں لیے ہوتے،
ریا اے۔ کے۔ دت
ئیں سے دوسرے

Regd. No.D(D-103)
R.No.948/57

Licensed U(D)-50 to post without pre-payment
Civil Lines Post Office, Delhi

دہلی وق[redacted]اؤں اور غریب عورتوں کی مدد کے لیے مختلف اسکیموں پر عمل کرتا ہے۔
جس میں عورتوں کو سلائی کی مشینیں دینا بھی شامل ہے۔ اس پروگرام کے تحت ۱۲ نومبر ۱۹۸۰ء کو وزیر
قانون اور انصاف شری پی شیو شنکر نے مشینیں تقسیم کیں۔

Vol.39 No.5 AJKAL (URDU) DECEMBER, 1980
Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi.
Printed by Skylark Printers, 11355, Id-Gah Road, New Delhi-110055.

ضمیمہ آجکل بچّوں کے لیے

ترتیب

منشی پریم چند	فیضان نادر	۳
لطیفے		۴
تان سین	شو ناتھ سکّہ	۵
بِلّی اور شیرنی	ضیاء الرحمٰن ضیآء	۶
مُنّو کے کھلونے	بدر محمود	۷
کارٹون		۹
ہمّت کا بدلہ	ذکی طارق	۱۰
پاگل	فضل امام مالک	۱۱
چڑیا	سیف سہسرامی	۱۲
معلّم اور بھیڑیا	اقبال قدوائی	۱۳
اتر پردیش کے میلے	سفیر صدیقی	۱۶
پودے کے پنکھ	ششی پربھا شاستری	۱۸
دعائیں	محمد رضی الدین معظمؔ	۲۱
مجرم کون	عقیل قیس	۲۴
آنسو بنے کنول	خلیق انجم اشرفی	۲۶
چالاک کسان	عشرت امیر	۲۸
کیا آپ جانتے ہیں	سریند رکار	۳۰
بتائیے		۳۰
سونے کی اینٹ	عزیز اندوری	۳۱

ایڈیٹر
شہباز حسین
اسسٹنٹ ایڈیٹر
محمد عادل صدیقی
سب ایڈیٹر
شو ناتھ سِکّہ

تتلی

شوکت پردیسی

کھلی فضا میں اڑتی ہوں میں — تھکتی نہیں ہوں دن بھر
کبھی یہاں ہوں، کبھی وہاں ہوں — مجھے نہیں ہے کچھ بھی ڈر
نام ہے میرا تتلی

گلشن گلشن پھرتی ہوں میں — پھولوں پر منڈلاتی
ہلکا پھلکا جسم ہے میرا — تتلی ہوں کہلاتی
نام ہے میرا تتلی

پر پھیلا کر اُڑتی ہوں میں — بیٹھی ہوں پر جوڑے
سائے میں آئی ہوں اُڑ کر — سورج سے منھ موڑے
نام ہے میرا تتلی

بچّے میرے پیچھے دوڑیں — میں سب کو بہلاؤں
اِدھر اُدھر اڑ اڑ کر اپنا — کرتب میں دکھلاؤں
نام ہے میرا تتلی

گھومتے پھرتے رہنا ہر سو — میری ہے اک عادت
دیکھو میں مرجھا جاؤں گی — مجھ کو نہ پکڑو شوکتؔ!
نام ہے میرا تتلی

ZAKIR HUSAIN LIBRARY
JAMIA NAGAR

فیضان نادر

منشی پریم چند

ورانسی (بنارس) کے پاس ایک لمہی نامی گاؤں ہے۔ اسی گاؤں میں ایک غریب کائستھ خاندان میں آج سے سو برس قبل ۱۸۸۰ء میں دھنپت رائے کی پیدائش ہوئی۔ دھنپت رائے کے والد منشی عجائب لال ڈاک خانہ میں کام کرتے تھے۔ ان کی یافت کم اور کنبہ بڑا تھا۔ اس تنگ دستی میں دھنپت رائے کی تعلیم ہوتی۔ جب وہ آٹھ برس کے ہوئے تو ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ گویا دھنپت رائے کی ساری خوشیاں لٹ گئیں۔

ان کے والد نے دوسری شادی رچالی۔ گھر میں سوتیلی ماں کے آنے سے وہی کچھ ہوا جو روزِ ازل سے سنتے اور دیکھتے آئے ہیں۔ بچوں کا سکون و چین ختم ہوگیا۔ اس زمانہ میں دھنپت رائے کی شادی بھی ہوئی۔ جب کہ وہ سنِ شعور کو بھی نہ پہنچے تھے۔

دھنپت رائے اور ان کی بیوی کے مزاج میں بڑا تضاد تھا۔ روزانہ خانہ جنگی ہوتی تھی۔ کچھ برسوں کے بعد ان کے والد کا بھی انتقال ہوگیا۔ اب دھنپت رائے کی یافت پر سارے خاندان کی گزر بسر تھی۔ دھنپت رائے نے پڑھائی کو ادھورا ہی چھوڑ دیا اور ٹیوشن کرنے لگے۔ کسی نہ کسی طرح پندرہ روپے ماہانہ مل جایا کرتے تھے۔ جن کا تصور آج کے زمانہ میں سوائے خواب کے اور کچھ نہیں ہے۔ آٹھ روپے گھر کے لیے بھیجتے تھے اور سات روپے خود رکھ کر زندگی بسر کرتے تھے۔ اپنے مصمم ارادوں کی وجہ سے انھوں نے کالج کی تعلیم بھی حاصل کی۔ پھر بھی خانہ جنگیوں میں اضافہ ہوتا ہی رہا۔ بیوی کے روز برا بھلا کہنے سے تنگ آگئے تھے۔ ایک دن ان کی بیوی نے آخر کہہ دیا" میں اس تنگ حالی میں زندگی بسر نہیں کرسکتی۔"

یہ سننا تھا کہ دھنپت رائے نے کہا" تم اپنے میکے جاکر عیش وعشرت میں رہو" پھر کیا تھا۔ ان کی بیوی سچ مچ دھنپت رائے کو چھوڑ کر میکے ہمیشہ کے لیے چلی گئیں۔ بعد میں انھوں نے دوسری شادی شیورانی دیوی سے کی۔ انھوں نے ہر قسم کا سکھ چین ان کو پہنچایا۔

اور اس سکھ چین میں انھوں نے افسانوں کا مجموعہ "زادِ راہ" شائع کرایا۔ تو ان کے خیالات سے انگریز حکمرانوں میں آگ لگ گئی۔ اور وہ ضبط کرلیا گیا۔ مقامی کلکٹر نے دھنپت رائے کو بلاکر خوب ڈانٹا۔ مگر دھنپت رائے نے یہ سب اس لیے برداشت کرلیا کہ وہ سرکاری نوکر تھے۔

اس کے بعد دھنپت رائے نے اپنا نام بدل کر پریم چند رکھ لیا۔ اور اس نام سے وہ آسمانِ ادب پر ایک درخشاں ستارہ بن کر نمودار ہوئے۔ ڈپٹی انسپکٹر کے عہدے پر بھی فائز ہوتے مگر اس عہدے میں ان کو دورے کرنے پڑتے تھے جس سے ادبی زندگی میں خلل آجاتا تھا۔ اس لیے انھوں نے نوکری چھوڑ دی

اور ایک ٹیچر بن گئے۔

اس زمانہ میں گاندھی جی کی تقاریر نے سارے ہندوستان میں کھلبلی مچا رکھی تھی۔ پریم چند بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔ نوکری چھوڑ دینے کو جی چاہتا تھا مگر گھر بار کا خیال تھا۔ آخر بیوی نے ڈھارس بندھائی۔ اور کہا۔

"آپ جو بھی لائیں گے میں اس پر قناعت کروں گی آپ بے شک نوکری چھوڑ دیں" اور ہوا بھی ایسے ہی۔ اب پریم چند مکمل ماہتاب بن کر ادب میں ضیا پاشیاں کرنے لگے۔ اور ماہتاب سے ایک دن آفتاب بن گئے۔ اس زمانے میں انھوں نے "ہنس" اور "جاگرن" روزنامے نکالے۔ "میدان عمل" ناول سے ان کا نام پورے ہندوستان میں مشہور ہو گیا۔ اس دوران ایک انگریز گورنر نے ان سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ ان کو رائے صاحب کا خطاب دینا چاہا لیکن پریم چند نہیں گئے۔ اسی زمانہ میں مہاراجہ الور نے ان کو اپنا سکریٹری بنانا چاہا لیکن پریم چند کی خوددار طبیعت نے اس عہدہ کو بھی ٹھکرا دیا۔ وہ اپنی آزادانہ زندگی گزارنا چاہتے تھے۔

شب و روز محنت شاقہ سے ان کی صحت ہمیشہ خراب رہی۔ مگر وہ اپنے قلم سے برابر لکھتے رہے آخری دنوں میں انھوں نے "گئودان" ناول لکھا۔ ان کی تمام تخلیقات میں "گئودان" کو جو درجہ حاصل ہے وہ کسی کو بھی نہیں۔ اس کے پڑھنے کے بعد بھارت کے کسان کی مکمل زندگی سامنے آجاتی ہے۔ ان کا ادب صحیح معنوں میں زندگی کا ترجمان ہے۔ اسلوب بڑا دلکش ہے۔ عبارت میں سلاست اور روانی ہے اور وہ بھی حقائق پر مبنی۔ جنوں اور پریوں کے خیالی قصوں کا ان کے ہاں گزر نہیں ہے بلکہ ہماری زندگی کی حقیقی تصویریں انھوں نے "واردات" "پریم پچیسی" اور پریم تیسی میں کھینچی ہیں

آج پریم چند زندہ ہوتے تو ہم ان کی سوویں سالگرہ مناتے مگر افسوس کہ وہ آج سے چوالیس برس پہلے (۱۹۳۶ء) میں اپنا بیش بہا سرمایہ چھوڑ کر، عوامی ادب سے ہمیں مالا مال کر کے ہمیشہ کے لیے ہم سے رخصت ہو گئے۔ وہ اپنی تخلیقات کی وجہ سے امر رہیں گے۔

لطیفے

ایک شخص ڈاکٹر کے پاس گیا اور پیٹ کے درد کی دوا مانگی۔ ڈاکٹر نے کہا کل کیا کھایا تھا۔ اس نے کہا کہ جلی ہوئی روٹی۔ ڈاکٹر نے اپنے کمپاؤنڈر سے کہا کہ اس کی آنکھ میں دوا ڈال دو تاکہ پھر جلی ہوئی روٹی نہ کھائے۔

ڈاکٹر : کہو تمھیں کیا شکایت ہے؟

بیمار : میری یادداشت کمزور ہو گئی ہے۔ اور میں ہر چیز بھول جاتا ہوں۔

ڈاکٹر : تو معائنے سے پہلے میری فیس ادا کر دو۔

مسخرہ : (دوست سے، کہو بھئی کہاں سے آرہے ہو؟

دوست : جہاں گیا تھا۔

مسخرہ : کہاں گئے تھے؟

دوست : جہاں سے آرہا ہوں۔

قرض خواہ : (قرضدار سے، کہو بھئی کیا حال ہے۔

قرض دار : حال تو اچھا تھا مگر آپ کو دیکھتے ہی بدلنا شروع ہو گیا ہے۔

شوناتم سکہ

تان سین

تان سین [illegible]
وہاں آدمیوں کی بھیڑ ہوتی ہے۔ ان میں بچے چھوٹے اور بڑے سبھی شامل ہوتے ہیں۔

اکبر بادشاہ مغلیہ دور کا ایک ایسا بادشاہ تھا جس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو آپس میں ملانے کی ٹھوس کوششیں کیں۔ اس کے اردگرد جو لوگ جمع تھے، وہ بہت ذہین اور اپنے اپنے فن میں طاق تھے۔

اس کے دور میں ادب، سنگیت، فنِ تعمیر اور ثقافتی سرگرمیوں کو کافی فروغ ملا۔ اس کے مشیر ابوالفضل، فیضی، راجہ بیربل، راجہ ٹوڈرمل تھے۔ اس کے دربار میں تان سین جیسے مشہور موسیقار تھے۔ تان سین کا نام رام تنو تھا۔ ایک مسلم درویش کی دعا سے انھوں نے جنم لیا۔ وہ مکند پانڈے کے گھر پیدا ہوئے، ان کا ایک مسلمانی نام بھی رکھا گیا۔ عطا محمد خاں۔ انھوں نے فقیر محمد غوث سے دعا کرائی تھی کہ انھیں ایک نیک بخت لڑکا ملے چنانچہ اس دعا کے بعد ہی عطا محمد خاں

جشنِ تان سین میں ملک کے نامور شہنائی نواز بسم اللہ خاں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے۔

اس دنیا میں آئے۔ اس درویش نے ہی اس کی پرورش کی اور وہی اس کے مربی بنے۔ عطا محمد خاں مرنے کے بعد گوالیار میں دفن کیے گیے، چنانچہ آج بھی گوالیار میں تان سین کا مقبرہ دیکھنے کے لیے سینکڑوں لوگ جمع رہتے ہیں۔

رام تنو نے بہت جلد اپنے فن کی وجہ سے شہرت پائی۔ جب شہنشاہِ اکبر تک اس کی خبر پہنچی تو اس نے آگرہ کے دربار میں اسے طلب کر لیا تاکہ اسے اپنے نورتنوں میں شامل کرلے وہیں پر شہنشاہ نے اسے تان سین کے لقب سے نوازا۔

فقیر محمد غوث نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ یہ لڑکا جوان ہو کر شہرت پائے گا اس میں بچپن سے ہی دوسروں کی بولی کی نقل اتارنے کی بے پناہ صلاحیت تھی۔ اس کی بولی میں یہ اثر تھا کہ جب وہ راگ ملہار گاتا تو آسمان سے بارش ہونے لگتی۔ راگ دیپک گاتا تو آگ کے شعلے لپکنے لگتے تھے۔

اس کے متعلق ایک اور قصہ بہت مشہور ہے کہ ایک باغ کو بار بار ڈاکو آکر تاراج کر دیا کرتے تھے، اس کی حفاظت نہیں ہو پا رہی تھی۔ اس نے ایک آلۂ موسیقی کی مدد سے شیر کی دہاڑ نکالنے کی مشق کی اور اس کے بعد اس نے شیر کی دہاڑوں کے ذریعے اس کی حفاظت کی۔ ایک بار وہ شیر کی طرح دہاڑا تو وہاں سے مشہور موسیقار سوامی ہری داس گزر رہے تھے اور ان کے ساتھ ان کے چیلے بھی تھے۔ وہ شروع میں ڈرے ضرور مگر انھوں نے دیکھا کہ صرف ایک دس سالہ لڑکا یہ آوازیں نکال رہا ہے اور انھیں ڈرا رہا ہے۔ انھوں نے اس لڑکے کی یہ غیر معمولی صلاحیت دیکھ کر اسے اپنے پاس بلایا اور اسے برندا بن چلنے کو کہا۔ یہ متھرا کے نزدیک ہے۔ یہاں کے مندر دیکھنے کے لیے دور دور سے لوگ آتے ہیں۔ تان سین نے یہاں رہ کر دس سال تک تعلیم حاصل کی اور پھر گوالیار میں دواکر رانی کے دربار میں چلا گیا۔ اس نے ایک ہندو لڑکی سے شادی کی لیکن اس کے باپ نے اسلام مذہب قبول کر لیا اور اس طرح اس لڑکی کا نام حسینی ہو گیا۔

ضیاء الرحمٰن ضیاؔ

بلّی اور شیرنی

ایک دن یہ شیرنی سے جا کے بلّی نے کہا
"تیرا رتبہ مجھ سے ہو سکتا نہیں ہرگز بڑا
دیکھ میں اک جھول میں دیتی ہوں بچے کس قدر
ایک سے زائد نہیں تو نے کیے پیدا اگر"
شیرنی بلّی سے بولی کھا کے فوراً پیچ و تاب
"کچھ دنوں کے بعد دوں گی میں تمھیں اس کا جواب"

کچھ ہی مدت بعد دونوں پھر اچانک ہی ملیں
ساتھ بلّی کے مگر تھا ایک بھی بچّہ نہیں
شیرنی نے پوچھا "خالہ! آپ کے بچّے نہیں؟
مبتلا کوئی مصیبت میں تو بے چارے نہیں؟"
آہ ٹھنڈی بھر کے بلّی اس طرح گویا ہوئی
"میری کچھ اولاد کتّوں کا نوالہ بن گئی
بچ رہے تھے جو انھیں انساں کے بچّے لے گئے
صبر ہی کرتی ہوں میں، قسمت میں میری وہ نہ تھے"
(شیرنی کے سامنے تھا اس کا بچّہ نوجوان
دیکھ کر بچّے کو اپنے ہو رہی تھی شادماں)
شیرنی، بلّی سے بولی "اے مری خالہ سنو
کس لیے تم کوستی ہو اپنی قسمت کو کہو
ناز جن پر تھا تمھیں کمزور وہ اولاد تھی
کتنی آسانی سے وہ دشمن کے ہتھے چڑھ گئی
اس قدر اولاد سے کیا شان تیری بڑھ گئی
آٹھ دس سے تو ہے بہتر ایک ہو لیکن جری"

بدر منور

عمّو کے کھلونے

ٹھیک رات کے بارہ بجے تھے۔ عمّو اپنے بستر پر نہایت معصوم انداز میں اپنے دونوں ہاتھوں کا تکیہ بنائے اپنے نرم تکیہ پر سر رکھے میٹھی نیند سو رہا تھا۔ چاند کی کرنیں نیم کے اونچے درخت کے پتوں میں سے چھن چھن کر اس کے اوپر پڑ رہی تھیں اور جالی کے باریک پردے ہوا سے کبھی کبھی ہلنے لگتے تھے۔ پورے کمرے میں ہُو کا عالم تھا اور ایک طرح کا گہرا نیلا ماحول ہر چیز پر مسلط تھا کہ اچانک چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگیں وہ یوں کہ عمّو کے تمام کھلونے جن میں ہاتھی، شیر، ٹین کی سائیکل، چابی کا بھالو، پلاسٹک کی بطخ اور اس کے ساتھ بندھے ہوئے پانچ بچے، ایک گڈا اور گڑیا، ایک ربڑ کی گیند اور چابی والا گھوڑا، دو تین رنگین پنسل اور پانچ چھوٹی موٹریں سب کے سب کھلونے کے ڈبے میں سے نکل کر بڑی میز پر جمع ہونے لگے اور ایک دائرہ بنا کر میز پر بیٹھ گئے۔ ہاتھی نے کہا۔ مجھے تو بہت بھوک لگ رہی ہے۔ بندر نے کہا۔ "میں نے تو کل سے کچھ نہیں کھایا۔" تو کیا کریں؟ سب نے پہلے عمّو کے تکیے کے نیچے سے ٹافیاں نکالیں۔ پھر اس کے کپڑوں کی الماری پر رکھی ہوئی ایک پلیٹ میں سے دال سیو اور بسکٹ نکالے اور ایک دسترخوان بچھا کر سب نے خوب کھایا۔ جب کھانا پینا ہو چکا تو ہاتھی نے کہا۔

"بھائیو! آج میری کمر میں بہت درد ہو رہا ہے کوئی علاج بتاؤ"

بطخ نے کہا "چلو میں دبا دیتی ہوں" مگر میں نے دیکھا تھا کہ آج عمّو کے گھر ایک بہت شریر لڑکا آیا تھا اس نے ہاتھی پر خوب سواری کی بیچارہ بالکل ڈھیلا ہو گیا۔ ہاتھی کی کمر میں سے تھوڑا سا بھوسا بھی نکل آیا تھا۔ ہاتھی نے روتے ہوئے کہا "آج تو میری بہت بری گت بنی بھلا کہاں میں پھونس کا ہاتھی اور کہاں وہ شریر لڑکا۔ عمّو نے تو بہت روکا مگر اس نے اپنی امّی سے کہہ کر مجھے دوبارہ اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ اور پھر گھوڑا سمجھ کر بیٹھ گیا۔"

گھوڑے نے کہا اس وقت میں کہاں تھا۔ میں تو اس کو بیٹھنے سے پہلے ہی گرا دیتا پہلے تو میں اس کے اڑنگی لگا دیتا پھر میں اس کے اپنی کیلیں چبھو دیتا"

بطخ بولی "بھائی تم تو صوفے کے کنارے اوندھے پڑے تھے۔ اور تمھاری چابی کھو گئی تھی۔ اگر تمھاری چابی مل جاتی تو تمھاری

بھی خیر نہیں تھی۔"

بھالو بولا "میں تم کو اپنی کیا روداد سناؤں۔ آج تو میرے پیٹ میں اس قدر درد ہے کہ کیا کہوں مجھے اس شریر لڑکے نے پکڑ کر زور زور سے بھینچنا شروع کر دیا اور جب دبانے سے میری سیٹی بولی تو وہ بہت خوش ہوا۔ پھر وہ کم سے کم ۲ گھنٹے میرا پیٹ دباتا رہا۔ اور میری چیخیں نکلتی رہیں یہاں تک کہ سیٹی خراب ہو کر ٹیڑھی ہو گئی اور آواز کم نکلنے لگی تب تو وہ شیطان لڑکا اور بھی زور سے میرا پیٹ دبانے لگا۔ اور دباتے دباتے میرا حال خراب ہو گیا۔"

بیچاری اب موٹروں کی باری آئی۔ بیچاری موٹریں بولیں ہماری تو ناکیں سوجھ گئیں ہیں۔ ہمیں تو اس نے ایک دوسرے سے اتنا ٹکرایا کہ ہمارا منھ بگاڑ دیا۔ رنگین پنسلیں بھی بول اٹھیں کہ ہمیں تو اس نے ساری دیواروں پر گھس ڈالا۔ بطخ بھی چپ نہ رہ سکی اس نے بھی کہا کہ اس نے مجھے پانی میں تیرانے کے لیے ٹب میں ڈال دیا۔ میں تو چابی کی بطخ ہوں میں تیرنا ابھی سیکھی نہیں۔ اس نے مجھے پانی میں ڈال کے ڈوبویا، نکالا، ڈبویا نکالا اور جب اسے مزا نہیں آیا تو اس نے مجھے ایک طرف پھینک دیا۔ شیر بولا دراصل میں اگر جنگل میں ہوتا تو اس کو چیر پھاڑ کر کھا جاتا مگر میں کیا کروں۔ عمو کے گھر میں میں بالکل پالتو ہو گیا ہوں۔ میں اب کچھ نہیں کر سکتا۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ یہ لڑکا مجھ سے ڈرتا بھی نہیں۔ میں نے اسے بہت گھور گھور کر دیکھا۔ مگر اس نے کوئی توجہ نہیں کی اور اپنی شیطانیوں میں مست رہا۔ ہاتھی بولا اب ہم لوگ کیا کریں۔ ہاتھی سوچ رہا تھا کہ ایک طرف سے آواز آئی۔ آپ لوگ فکر نہ کریں۔ میں سب کچھ ٹھیک کر دونگی ہاتھی بولا۔ نہیں گیند تم کیا کر سکتی ہو۔ گیند بولی یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ بس مجھے کل تک کا انتظار ہے۔ اولاً مجھے گھوڑے کی تھوڑی مدد چاہیے اور گیند نے گھوڑے کے کان میں چپکے سے کچھ کہا۔ اور سب میٹنگ برخاست ہو گئی اور پورے کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

دوسرے دن صبح عامر کے اٹھنے سے پہلے وہ شیطان لڑکا آدھمکا۔ اور درخت پر چڑھنے لگا۔ کبھی پھول توڑتا تھا کبھی فرش پر برتن پھینکتا تھا اور سچ پوچھو تو پورے گھر کو سر پر اٹھا رکھا تھا۔ عامر تو تنگ آکر اپنی امی کے ساتھ بازار چلا گیا اور پیچھے وہ شیطان لڑکا کمرے میں دوڑتا پھرا۔ کبھی سیڑھیوں پر، کبھی چھت پر کبھی کمرے میں کبھی دالان میں۔ کہ اچانک وہ چیخ مار کر دھڑام سے گرا اور اس کے ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اب جو وہ اماں ہائے اماں کہہ کر رویا تو اس کی اماں باورچی خانہ میں سے دوڑتی ہوئی آئیں اور انھوں نے پوچھا بیٹا تم کیسے گرے اس نے روتے روتے بتایا کہ میرا پیر گیند کے نیچے آیا اور میں اس پر سے پھسل گیا۔ اس کی ممی اسے اسپتال لے کر گئیں۔ پلاسٹر چڑھوایا اور کمرے میں ایک بستر پر لٹا دیا۔

رات ہوئی۔ سارے کھلونے جمع ہوئے اور گیند چپکے چپکے مسکرانے لگی۔ گھوڑا بھی ہنسا اور ایسا لگا کہ سارے کھلونے خوش ہو گئے اور اس رات کھلونوں کے بجائے وہ شیطان لڑکا روتا رہا، کراہتا رہا۔ اور اپنی شیطانیاں یاد کرتا رہا۔ اور اس کے مقابل بستر پر عمو اسی طرح میٹھی نیند سو رہا تھا۔ چاند کی کرنیں اس پر نیم کے پتوں میں سے چھن کر آ رہی تھیں۔ اور باریک جالی کا پردہ کبھی کبھی میرے منھ سے جھاگ نکلنے لگے اور درد کے مارے آنکھیں باہر نکل آئیں۔ اگر بیچارہ بندر پاس نہ ہوتا تو وہ مجھے ایک دم مار دیتا۔ مجھے بے کار چھوڑ کر اس نے بندر کو اٹھا لیا اتنے میں عمو نے دیکھ لیا تھا۔ بندر بولا اور خوب رونے لگا۔ بطخ بولی بھیا بندر روؤ نہیں، بتاؤ تمھارے ساتھ کیا ہوا۔ بندر نے شروع کیا۔ پہلے تو وہ لڑکا مجھے دیکھ کر خوب ہنسا، خوب ہی ہنسا نہ جانے میری شکل دیکھ کر اسے کیوں ہنسی آ رہی تھی۔ جب اس کی ہنسی نہیں رکی تو میں نے اپنی طرف دیکھا پھر اس کی طرف دیکھا تو مجھے کوئی خاص فرق نظر نہیں آیا۔ وہ بھی میری ہی شکل کا تھا۔ عمو نے اس کو بتایا یہ بندر مجھے دے دو میں تم کو دکھاتا

ہوں کہ یہ کس طرح سگریٹ پیتا ہے۔ پھر میری چابی بھر کر دونوں مجھے سگریٹ پیتے دیکھتے رہے اور وہ لڑکا اس سے پہلے کہ میری چابی ختم ہو مجھے اٹھا کر کونے میں بھاگا۔ اور پھر سے چابی بھرنے لگا۔ خوب چابی بھری اور بھرتا رہا۔ بھرتا رہا۔ چابی بھری ہونے کے باوجود بھی مجھ میں چابی بھرتا رہا یہاں تک کہ میری چابی کا فنسر ٹوٹ گیا اور فنر اتنی زور سے ٹوٹا کہ میرے پیٹ کے انجر پنجر ڈھیلے ہو گئے اور میں بے جان ہو کر بے ہوش ہو گیا۔ اب نہ مجھ سے ہلا جاتا ہے نہ جھولا جاتا ہے۔ مجھے بے کار جان کر اس نے دور جھاڑی میں پھینک دیا۔ شاید اسے ڈر لگا ہوگا کہ عمو کی امی اسے دیکھ کر ڈانتی ضرور، مگر خیر ہوئی کہ مجھے گڑی باجی نے اٹھا لیا اور کمرے میں رکھا ورنہ میں تو ابھی تک وہیں پڑا ہوتا۔

اتنے میں گڈا بولا بھائیوں میں نے تو یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اب میں اس گھر میں نہیں رہوں گا۔ آج میری جتنی بری گت بنی ہے کبھی کسی کی نہیں بنی ہوگی۔ عمو اور اس شیطان لڑکے کے درمیان مجھے لے کر اتنی کھینچا تانی ہوتی کہ میری ٹانگ الگ ہوگئی پھر ہاتھ الگ ہو گیا۔ گردن بھی مڑ کر کمر کی طرف چلی گئی۔ دونوں ہاتھ الگ ہو گئے۔ کپڑے پھٹ گئے، جوتا اڑ کر وہاں جا گرا اور اسی کھینچا تانی میں میں اچھل کر چائے کے کپ میں جا گرا، شکر ہے چائے بہت گرم نہیں تھی ورنہ میں تو بالکل جل جاتا۔ یہ گھر اب اس قابل نہیں رہا کہ میں یہاں رہ سکوں۔ میری بات تو ہو چکی ہے۔ عمو کی ایک دوست نے مجھے گود لے لیا ہے۔ میں تو کل یہاں سے چلا جاؤں گا۔ میرے بدلے اس گھر میں ایک گلک آنے والی ہے۔ میں یہاں ایک منٹ نہیں ٹھہر سکتا۔ میری ساتھی گڑیا تو روتے روتے بے حال ہے اس کی آنکھ میں چٹنی چلی گئی وہ شیطان لڑکا میری گڑیا کو سموسہ کھلانے پر اس قدر اصرار کر رہا تھا میری گڑیا نے منہ نہیں کھولا تو اس نے اتنی زور سے کھلانے کی کوشش کی کہ سموسہ کی چٹنی گڑیا کی آنکھ میں چلی گئی اب گڑیا کی آنکھ سے مستقل پانی بہہ رہا ہے۔ بیچاری کس طرح چلا رہی ہے۔ کیسے ہائے ہائے کر رہی ہے۔ مجھے تو ڈر ہے صبح تک یہ بیچاری کہیں مر ہی نہ جائے پہلے یہ گھر ایسا نہیں تھا۔ جب سے یہ شریر لڑکا مہمان بن کر آیا ہے ہم سب کی مصیبت آگئی ہے۔

کارٹون

ذکی طارق

ہمّت کا بدلہ

بچو! ایک بار کی بات ہے ایک گدھ نے ابابیل کو آسمان میں اڑتے ہوئے دیکھ کر کہا "لگتا ہے تجھے اڑنے کا بہت شوق ہے۔ تو کس کی اجازت سے اس آزادی کے ساتھ آسمان میں اڑ رہی ہے؟" اتنے بڑے گدھ کو دیکھ کر ابابیل ڈر گئی۔

گدھ تیز آواز میں بولا! "کیوں ری، جب تیرے پروں میں طاقت نہیں تو کیوں میری نقل کرتی ہے؟"

گدھ کی ڈانٹ سن کر پہلے تو ابابیل چپ رہی مگر پھر کچھ ہمت کر کے بولی "میرے اس چھوٹے سے جسم کے مطابق میرے پروں میں کافی طاقت ہے۔ خدا نے جیسا بھاری بھرکم جسم آپ کو عطا کیا ہے اس کے مطابق آپ کے پروں کو بھی طاقت دی ہے۔"

ابابیل کا یہ جواب سن کر گدھ تلملا گیا اور چڑھ کر کہنے لگا "میں چڑیوں کا راجا ہوں۔ تو میری اجازت کے بغیر کیسے اڑتی ہے؟"

ابابیل نے تھوڑی اور ہمت کرتے ہوئے پوچھا "آپ کیسے چڑیوں کے راجہ بن گئے۔" گدھ آنکھ بدلتے ہوئے بولا "میں سب چڑیوں سے اونچا اڑ سکتا ہوں۔ اسی لیے میں راجا ہوں۔ تجھ میں ہمت ہو تو آ میرے ساتھ اڑ اور دیکھ کہ کون زیادہ اونچا اڑ سکتا ہے۔"

ابابیل میں جانے کہاں سے اس قدر ہمت آگئی کہ بولی۔ "اچھا آج جو اونچا اڑے گا وہی چڑیوں کا راجا یا رانی کہلائے گا۔"

گدھ اور ابابیل دونوں ہی آسمان میں اڑ چلے۔ تھوڑی ہی دور جا کر ابابیل تھک گئی۔ پر یہ سوچ کر کہ ہار مان لینے پر زندگی بھر گدھ سے نیچا دیکھنا پڑیگا وہ اڑتی رہی۔ پھر یہ سوچ کر کہ جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں خدا بھی اُن کی مدد کرتا ہے اس نے ہمت نہ توڑی اور برابر اڑتی رہی۔ پر گدھ کی برابری کرنا اس کے بس سے باہر تھا۔ اب اس نے ایک ترکیب سوچی اور آخری طاقت لگا کر گدھ سے تھوڑا اوپر اڑی اور گدھ کے پنکھ پر بیٹھ گئی۔

گدھ اپنی دھن میں اڑا جا رہا تھا۔ کافی اوپر پہنچنے کے بعد گدھ نے اِدھر اُدھر دیکھا تو اسے ابابیل دکھائی نہ دی۔ اب گدھ بڑا خوش ہوا۔ اُس نے سوچا کہ اب اس کے راجا بننے میں کوئی شک نہیں ہے۔ لہذا اس نے رفتار مدھم کر دی۔

گدھ کو تھکا دیکھ کر ابابیل اس کے پنکھ سے ہٹ گئی اور اڑتی ہوئی اس سے اوپر جا پہنچی۔ اور بولی! "چلیے آج فیصلہ ہو ہی جائے۔ دیکھوں آخر کہاں تک اڑ سکتے ہو؟"

گدھ اب تھک چکا تھا ابابیل کو اپنے سے کافی اوپر دیکھ کر وہ ہمت ہار بیٹھا اور بولا۔ "میں ہار مانتا ہوں آج سے تم ہی چڑیوں کی رانی کہلاؤ گی۔ اور میں تمھارا نوکر رہوں گا۔"

یہ سن کر ابابیل ہنس دی۔ اس نے کہا "نہ مجھے رانی بننے کا شوق ہے اور نہ کسی کو نوکر بنانے کا۔ تم ہمیشہ کی طرح آزادی سے رہو۔ مگر ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا۔ اپنے سے چھوٹا سمجھ کر کسی کو کمزور مت سمجھنا اور نہ کسی کی آزادی چھیننے کی کوشش کرنا۔"

بقیہ: اتر پردیش کے میلے

چور چور ہو چکے تھے۔ آرام کرنے کے لیے وہ لیٹے ہی تھے کہ لیٹے کے لیٹے ہی رہ گئے۔ اس یاد کو برقرار رکھنے کے لیے اس جگہ پر کھچڑی چڑھائی جاتی ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کی رنگارنگی اور یہاں کی زندگی میں اس طرح کے کلچرل اور مذہبی پروگرام آپسی بھائی چارے کے لیے بہت اہم ہیں۔

[illegible] جناب جگن ناتھ مشرا وزیر اعلیٰ بہار، جناب وشوناتھ پرتاپ سنگھ، وزیر اعلیٰ اتر پردیش، پرنس انجم قدر،
جناب [illegible] جناب [illegible] جناب حیات اللہ انصاری (کھڑے ہوئے) سید سبط رضی (ممبر راجیہ سبھا)
[illegible] شری امرت رائے ڈاکٹر قمر رئیس کی کتاب "پریم چند، فکر و فن" کا اجرا کر رہے ہیں۔ یہ کتاب پبلی کیشنز ڈویژن،
وزارت اطلاعات و نشریات نے شائع کی ہے۔
(بیٹھے ہوئے۔ شری اندر کمار گجرال اور شری جینندر کمار۔

بول اٹھا۔

میں اُسے پاس کی چائے کی دکان میں لے کر چلا آیا تھوڑی دیر بعد چائے آئی اور اچانک چائے پیتے پیتے میرے دل میں ایک بات جاننے کی خواہش ہوئی اور دوسرے ہی لمحہ اپنے دل میں اٹھتے سوال کو حاجی میاں کی جانب اچھال دیا۔ "بھائی! تمھیں بچے تنگ کرتے ہیں چڑاتے ہیں، کنکری مارتے ہیں، میری سمجھ میں ایک بات نہیں آتی کہ آخر تم انھیں مارتے کیوں نہیں۔۔؟ اگر ایک آدھ کو تمھارا ڈنڈا پڑ گیا تو پھر وہ تمھیں کبھی نہیں چڑائیں گے۔"

میرا سوال سنتے ہی ان کے ہونٹوں پر ایک پاک مسکراہٹ کھیلنے لگی اور پھر وہ بول پڑے" بابو صاحب! سچ مچ کبھی خواہش ہوتی ہے کہ جو بچے مجھے تنگ کرتے ہیں انھیں ماروں لیکن میرے ہاتھ یہ سوچ کر تھم سے جاتے ہیں کہ ہو سکتا ہے میرے ڈنڈے سے انھیں زیادہ چوٹ لگ جاتے . . . . . یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس چوٹ سے ان کے جسم کا کوئی حصّہ بیکار ہو جائے تب . . . تب ان کے ماں باپ کے دلوں پر کیا بیتے گی؟ بابو صاحب! بچے تو بھگوان کا دوسرا روپ ہوتے ہیں . . . . مجھے وہ تنگ کرتے ہیں۔ چڑاتے ہیں تو میرا کیا بگڑتا ہے . . . ؟ اور میں تو جان بوجھ کر گالیاں بکتا ہوں کیونکہ میرے ایسا کرنے سے وہ خوش ہوتے ہیں۔ میں . . . . میں نہیں چاہتا کہ ان کا ننھا سا معصوم دل دُکھے . . . . ." اور وہ خاموش ہو گیا۔

میں تعجب سے اُسے دیکھنے لگا۔" پاگل کون ہیں — ؟ حاجی میاں یا وہ لوگ؟ کاش حاجی میاں کو چڑانے سے پہلے وہ حاجی میاں کے من کے اندر بھی جھانک کر دیکھ لیں جہاں ان کے لیے پیار، ممتا اور دیا کا ساگر امڈ رہا ہے . . . یہی سوچتے سوچتے حاجی میاں کی عظمت اور بڑائی کے آگے میرا سر عقیدت سے جھک گیا۔

سیف سہرامی

چڑیا

اِدھر سے اُدھر آتی جاتی ہے چڑیا   مرے گھر کا چکر لگاتی ہے چڑ
کہیں دانہ دنکا جو پاتی ہے چڑیا   تو پھر بیٹھ کے خوب کھاتی ہے چڑ
بھرے پیٹ تو چہچہاتی ہے چڑیا

کبھی پیڑ کی ڈالیوں پر بسیرا   کبھی کارنس پر لگاتی ہے ڈ
یہ پہچانتی ہے اُجالا اندھیرا   مگر جاگ اٹھتی ہے ہوتے سو
ہمیں صبح کو پھر جگاتی ہے چڑیا

پھدکتی مچلتی چلی جاتی ہے یہ   ہواہیں قلابازیاں کھاتی ہ
زمین پر جو دانہ پڑا پاتی ہے یہ   لیے چونچ میں جھٹ سے اڑجا
کرو خوب محنت سکھاتی ہے چڑیا

کسی کی یہ محتاج ہوتی نہیں ہے   کبھی خوابِ غفلت میں سوتی نہ
کبھی وقت کو مفت کھوتی نہیں ہے   مصیبت پڑے بھی تو روتی نہ
سبق کتنا اچھا پڑھاتی ہے چڑیا

سکھاتی ہے مل جل کے اک ساتھ رہنا   کسی سے ضرورت نہ تم اپنی
خود اپنی ہی محنت سے پیٹ اپنا بھرنا   سنانے کو اب پیار کا میٹھا
چلو پیارے بچو بلاتی ہے چڑیا

اقبال قدوائی

معلم اور بھیڑیا

کسی زمانہ میں ایک بستی میں ایک معلم رہتے تھے۔ وہ بہت بڑے عالم تھے۔ ان کے بہت سے شاگرد تھے، جنھیں وہ طرح طرح کی نصیحتیں کیا کرتے تھے اور نئی نئی باتیں بتاتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی وہ انتہائی نیک اور سادہ لوح تھے۔ کسی کو مارنا یا نقصان پہنچانا گناہ سمجھتے تھے۔ بستی کے لوگ ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔

ایک مرتبہ معلم صاحب کو درس دینے کے لیے کہیں دور جانا پڑا۔ وہ ایک تھیلے میں اپنی کچھ کتابیں لے کر چل دیئے۔ ان کا راستہ جنگلوں، پہاڑوں اور کئی بستیوں سے گزرتا تھا۔ ایک جگہ سے جب وہ گزر رہے تھے تو اچانک سامنے سے ایک بھیڑیا آتا ہوا ملا۔ وہ بہت گھبرایا ہوا دکھائی دے رہا تھا اور بہت زور سے بھاگ رہا تھا۔ معلم کے دل میں ہر مخلوق کے لیے بڑا درد تھا۔ اسے دیکھ کر پوچھا۔

"کیوں بھاگ رہے ہو تم؟ کیا پریشانی ہے تمھیں۔"

"اس گاؤں کے کچھ ظالم کسان مجھے مار ڈالنا چاہتے ہیں۔"
بھیڑیئے نے اپنے پیچھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"وہ لوگ بڑی بڑی لاٹھیاں لیے میرے پیچھے آرہے ہیں۔"

"لیکن وہ لوگ تمھیں کیوں مار ڈالنا چاہتے ہیں؟"

"پتہ نہیں کیوں" بھیڑیئے نے بڑے بھولے پن سے کہا۔ "وہ لوگ خواہ مخواہ میرے دشمن ہو گئے ہیں۔"

معلم نے سوچا کہ مصیبت میں پڑے ہوئے کسی جاندار کی مدد کرنا ان کا فرض ہے، چنانچہ انھوں نے جلدی سے اپنے تھیلے کی کتابیں نکال کر اسے خالی کر لیا۔ "تم جلدی سے اس تھیلے میں چھپ جاؤ۔" انھوں نے بھیڑیئے سے کہا اور وہ فوراً اس میں گھس گیا۔ انھوں نے کتابیں بغل میں دبائیں اور تھیلا کندھے پر لاد کر چل دیئے۔ اتنے میں کئی کسان اسی سمت سے دوڑتے ہوئے آئے، جدھر سے بھیڑیا آیا تھا۔

معلم کو دیکھ کر وہ لوگ ان کے پاس آکر رک گئے اور ان میں سے ایک نے پوچھا — آپ نے ادھر کسی بھیڑیئے کو تو نہیں جاتے دیکھا؟"

معلم نے سوچا کہ اگر وہ ان کسانوں کو سمجھانے کی کوشش کریں گے تو ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا۔ لہذا ان سے بحث کرنا فضول ہے۔ انھوں نے جھوٹ بول دیا — "بھیڑیا تو ادھر سے نہیں گیا کوئی۔"

معلم کے اس جواب پر وہ لوگ وہیں رک کر آپس میں کچھ صلاح و مشورہ کرنے لگے اور معلم آگے چل دیئے۔ کچھ دیر بعد وہ گاؤں کے نزدیک پہنچے۔ بھیڑیئے کے بوجھ سے وہ تھکے جا رہے تھے۔ لیکن اس کی جان بچانے کے خیال سے وہ

مجبوراً یہ مشقت برداشت کر رہے تھے۔ گاؤں کے باہر انھیں ایک عورت ملی جو روتی ہوئی اسی طرف آ رہی تھی۔ معلم نے اس سے رونے کا سبب پوچھا تو اس نے کہا ـــ "میرے بچّے کو بھیڑیا اٹھالے گیا۔"

معلم نے اس سے ہمدردی ظاہر کی اور اس کو صبر کی تلقین کرنے لگے۔ عورت روتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ غالباً وہ انھیں کسانوں کے پیچھے جا رہی تھی۔ معلم نے اس کے جاتے ہی اپنا تھیلا ایک طرف رکھا اور اس کے اندر جھانک کر بھیڑیئے سے کہا ـــ "میں نے تم کو مظلوم سمجھ کر پناہ دی تھی، لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ تم بچّوں کو کھا جاتے ہو۔ نکلو باہر۔"

"اتنا ظلم نہ کیجیے۔ میری بات کا یقین کیجیے۔ میں نے کبھی کسی بچّے کو تو کیا، چوہے کو بھی نہیں مارا۔ میں گوشت کھاتا ہی نہیں۔ میں تو خالص سبزی خور ہوں۔"

"کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟"

"آپ کے سر کی قسم"

"اچھا تو پھر چلو۔ تمھیں اور آگے لے چلتا ہوں۔"

وہ پھر تھیلا لاد کر چلنے لگے۔ جب وہ گاؤں سے گزر کر کافی آگے نکل گئے اور گاؤں تقریباً ایک میل پیچھے رہ گیا تو معلّم نے پھر تھیلا اتارا۔ وہ تھک کر چور چور ہو چکے تھے۔ انھوں نے کہا۔

"بھیڑیئے، باہر نکلو اب تم بالکل سنسان علاقے میں آگئے ہو۔"

بھیڑیا باہر نکلا اور اس نے ایک زوردار انگڑائی لی۔

"میں تمھیں یہاں تک لانے میں بہت تھک گیا" معلم نے ایک پتھر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اب میرے بھوک بھی لگ آئی" یہ کہہ کر وہ کمر میں بندھی ہوئی ایک پوٹلی کھول کر روٹی نکالنے لگے۔

"بھوک تو مجھے بھی لگی ہے" بھیڑیئے نے ان کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ معلم نے تھوڑی سی روٹی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ـــ "لو تم بھی کھالو۔"

"بے وقوف آدمی میں روٹی نہیں صرف گوشت کھاتا ہوں، اور وہ بھی کسی جاندار کو مار کر۔"

معلم نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ انھیں اس کی آنکھوں میں درندگی صاف دکھائی دینے لگی۔ وہ بری طرح گھبرا گئے اور روٹی کی پوٹلی ان کے ہاتھ سے گر پڑی۔

"کیا تم مجھے مار کر کھا جانا چاہتے ہو؟"

"اس کے علاوہ اور کیا کر سکتا ہوں؟" بھیڑیئے نے کہا۔ "مجھے بھوک لگی ہے اور غذا سامنے ہے۔"

"کیا تم اتنی جلدی بھول گئے کہ میں نے تمھاری جان بچا[ئی] اور تمھیں لاد کر اتنی دور تک لایا؟"

"وہ تمھاری حماقت تھی۔ اس کی سزا تمھیں ملنی ہی چاہیے۔ انسان کا گوشت بہت مزے کا ہوتا ہے اور پھر تم نہ تو م[یرا] مقابلہ کر سکتے ہو، نہ مجھ سے تیز بھاگ سکتے ہو۔"

معلم نے اسے بہت سمجھایا۔ ہر طرح اسے قائل کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ کسی طرح نہ مانا۔ بالآخر معلم نے ایک ترکیب سوچی۔

"چلو میں مان لوںگا کہ تم مجھے کھا جاؤ" انھوں نے کہا۔ "لیکن ایک شرط ہے۔"

"کیا؟" بھیڑیئے نے بے صبری سے کہا۔

"ہم لوگ پہلے کوئی تین بوڑھے تلاش کریں گے۔ انھیں سارا واقعہ سنائیں گے۔ اگر انھوں نے تمھارے حق میں فیصلہ دے دیا تو تم بے شک مجھے کھا سکتے ہو۔"

بھیڑیئے نے اپنے دل میں سوچا۔ بھلا کسی کی ہمّت [ہے] کہ میری مخالفت کرے۔ اگر کسی نے مخالفت کی تو میں اسے [بھی] کھا جاؤں گا۔" یہ سوچ کر اس نے معلم کی بات مان لی۔ وہ د[ونوں] چلنے لگے۔ کچھ دور جانے کے بعد راستے میں ایک بہت بو[ڑھا] درخت ملا۔ جس میں اب پھل لگنا بند ہو گئے تھے۔ بھیڑ[یئے] نے اس درخت سے پوچھنے کے لیے کہا۔

"یہ تو درخت ہے۔ یہ کیا بتائے گا؟ کسی آدمی کو تلا[ش] کر کے اس سے پوچھا جائے۔"

"آدمی یا جانور کی بات نہیں ہوئی تھی۔ تین بوڑھوں کی بات ہوئی تھی" بھیڑیئے نے بگڑ کر کہا۔۔۔ "اب تم اپنی بات سے ہٹ رہے ہو، بے ایمانی کر رہے ہو۔"

مجبوراً معلم نے درخت کے پاس کھڑے ہو کر کہا۔۔۔ "میں نے اس بھیڑیئے پر ترس کھا کر اس کی جان بچائی۔ اسے اپنے تھیلے میں بھر کر کندھے پر ڈالا اور یہاں تک لایا۔ اب یہ اس نیکی کا بدلہ اس طرح دے رہا ہے کہ مجھے مار کر کھا جانا چاہتا ہے۔ کیا اس کا ایسا کرنا درست ہوگا؟"

درخت نے جب ایک آدمی کو اپنے پاس کھڑا دیکھا تو اسے اپنا گزرا ہوا زمانہ یاد آگیا، کیونکہ جب اس میں پھل لگا کرتے تھے تو کتنے ہی لوگ آکر انھیں توڑتے تھے۔ پھل توڑے جانے پر وہ خوشی سے جھوم جاتا تھا۔ اس وقت اسے وہی زمانہ یاد آگیا اور اسے محسوس ہوا گویا یہ انسان اس سے پوچھ رہا ہو۔۔۔ "کیا میں تمھارے پھل توڑ لوں"، چنانچہ اس کے پتے اور شاخیں اوپر نیچے جھولنے لگے۔ اس پر بھیڑیئے نے کہا۔۔۔ "دیکھو اس درخت نے ہاں کہہ دی۔ اب صرف دو بوڑھوں سے پوچھنا ہے۔" معلم کو اس کی بات ماننا پڑی، ورنہ وہ اسی وقت اسے مار ڈالتا۔ اب دونوں پھر چلنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد انھیں ایک بوڑھی گائے ملی۔ اس گائے نے کئی برس سے دودھ دینا چھوڑ دیا تھا اور اب کوئی بھی شخص اس کے پاس نہیں آتا تھا۔ جب معلم نے اس کے پاس جاکر بھی اپنا وہی سوال دہرایا، تو اسے بھی اپنا پرانا زمانہ یاد آگیا۔ کئی برس بعد کوئی شخص اس کے پاس آیا تھا اور اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ اس نے سوچا کہ کاش اب بھی وہ دودھ دے سکتی۔ اگر ایسا ممکن ہوتا تو اب وہ دودھ دوہنے والے کو لات مارنے کے بجائے اپنا سر ہلا کر خوشی خوشی اس کو دودھ دوہنے کی اجازت دے دیتی۔ یہ خیال آتے ہی اس کا سر خود بخود اوپر نیچے ہلنے لگا۔ اس پر بھیڑیئے نے کہا کہ گائے نے بھی ہاں کر دی۔

اب معلم کے لیے صرف ایک موقع رہ گیا تھا۔ دونوں تیسرے بوڑھے کی تلاش میں آگے بڑھے تو کچھ دور جاکر انھیں ایک بوڑھا لکڑہارا ملا۔ وہ دن بھر کام کرنے کے بعد ہاتھ میں کلہاڑی لیے گاؤں کی طرف واپس لوٹ رہا تھا۔ وہ بھیڑیئے کو دیکھ کر ٹھٹھکا لیکن معلم نے اسے روک کر اپنا سوال اس کے سامنے بھی دہرایا۔ معلم کی بات سننے کے بعد لکڑہارے نے بھیڑیئے سے پوچھا۔

"کیا یہ سچ ہے کہ اس نے تمھیں اپنے تھیلے میں رکھا؟"

"ہاں" بھیڑیئے نے جلدی سے کہا۔

"لیکن مجھے یقین نہیں آتا کہ تم اتنے بڑے بھیڑیئے ہو کر اس کے تھیلے میں آگئے۔"

"نہیں، یہ سچ ہے۔ میں کافی دیر اس تھیلے میں رہا۔"

"میں تو جب تک اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لوں یقین نہیں کر سکتا۔ البتہ اگر تم ایک بار تھیلے میں گھس کر دکھا دو تو شاید مجھے یقین آجائے اور تب میں تمھارا انصاف کر سکوں گا۔"

بھیڑیئے کی بے صبری بڑھتی جا رہی تھی، لہٰذا وہ لپک کر معلم کے تھیلے میں گھس گیا۔ لکڑہارے نے بڑی پھرتی سے تھیلے کا منھ بند کر دیا اور پوری قوت سے اپنی کلہاڑی سے اس پر ضرب لگائی۔ اور پھر یکے بعد دیگرے ضرب لگاتا ہی گیا۔ یہاں تک کہ بھیڑیا بالکل بے جان ہو گیا۔ تب اس نے مردہ بھیڑیئے کو کھینچ کر تھیلے سے باہر نکال لیا۔

لکڑہارا بھیڑیئے کو ٹانگے ہوئے اور معلم کو اپنے ساتھ لیے ہوئے گاؤں میں داخل ہوا۔ کسان بھیڑیئے کی تلاش میں ناکام ہو کر واپس آچکے تھے۔ ان کے ساتھ وہ عورت بھی تھی۔ بھیڑیئے کو دیکھ کر وہ لوگ اچھل پڑے۔ عورت نے فوراً کہا۔۔۔ "یہی ہے وہ بھیڑیا جو میرے بچوں کو لے گیا تھا۔"

"تو تم نے ہم سے جھوٹ بولا تھا" ایک کسان نے معلم کو سرزنش کرتے ہوئے کہا۔ "تم نے بھیڑیئے کو چھپا رکھا تھا۔"

معلم بے چارے کیا کہتے۔ وہ تو پہلے ہی نادم تھے اپنی غلطی پر۔ ■

سفیر صدیقی

اتر پردیش کے میلے

دنیا میں میلے، تیوہار اور جشن وغیرہ اس وقت سے عام ہیں جب سے انسان نے پہلی بار اکٹھا ہو کر ایک جگہ رہنا سیکھا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ سبھی پرانی تہذیبیں بڑی بڑی ندیوں کے کنارے ہی پروان چڑھیں۔ اتر پردیش کی تہذیب بھی خاص طور سے دو بڑی ندیوں گنگا اور جمنا کے کنارے پروان چڑھی۔ اس ریاست میں دو طرح کے میلے لگتے ہیں۔ ایک تو وہ جن کے ذریعے ہماری روزمرّہ کی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں۔ دوسرے وہ جن کا تعلق مذہبی روایات سے ہے۔ پہلی طرح کے میلے ہفتے میں کسی ایک روز ضرورت کی چیزوں کی خرید و فروخت کے لیے لگا کرتے ہیں۔ اس قسم کے میلوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے جن کو شمار کرنا بہت مشکل ہے۔ یہاں پر اتر پردیش میں لگنے والے چند اہم میلوں کا مختصر ذکر کیا جا رہا ہے۔

نوچندی کا میلہ

یہ میلہ میرٹھ میں لگتا ہے۔ اس کی شروعات مذہبی روایات سے جُڑی ہے۔ نوچندی، نوچنڈی کا بگڑا ہوا تلفظ ہے۔ چنڈی ایک دیوی کا نام ہے جس کے نام کے ساتھ اس میلے کا نام جُڑا ہے۔ دیوی کے مندر کے قریب ہی بالے میاں کا مزار ہے۔ مسلمان عقیدت مند بھی اسی موقع پر مزار پر حاضری دیتے ہیں۔ اس طرح یہ میلہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایکتا کی علامت ہے۔ ۱۸۸۰ء تک یہ میلہ مختصر پیمانے پر لگتا تھا لیکن ۱۸۹۰ء کے بعد یہاں پر بہت بڑی تعداد میں دکانیں لگنے لگیں اور بڑے پیمانے پر خرید و فروخت ہونے لگی۔ اب یہ میلہ ایک بڑی نمائش کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ یہ میلہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قریب لا رہا ہے۔

غازی میاں کا میلہ

یہ میلہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے یکساں اہمیت کا ہے۔ اسے ہندو اور مسلمان دونوں ہی عقیدت سے مناتے ہیں۔ اتر پردیش کے بہرائچ شہر میں یہ میلہ ہر سال جیٹھ کے مہینے میں لگتا ہے اور ایک مہینے تک چلتا ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی رنگارنگی کو پیش کرنے والا یہ میلہ کس نے شروع کیا اس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملتا لیکن میلے میں گائے جانے والے لوک گیتوں سے پتہ چلتا ہے کہ جب بہرائچ پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا تھا تب انھوں نے اپنے سپہ سالار (سید سالار غازی) کی یاد کو برقرار رکھنے کے لیے ان کی قبر پر ایک عرس کا اہتمام کیا تھا، جو آگے چل کر کسی خاص فرقے کا نہ رہ کر عام میلے کی شکل اختیار کر گیا۔ اس موقع پر بہت دور دور سے دکانیں آتی ہیں۔ عقیدت مند حضرات مزار پر چادر اور شیرینی چڑھاتے ہیں۔

دیوا اور مہادیوا کے میلے

یہ دونوں میلے بارہ بنکی ضلعے کے مشہور میلے ہیں۔ دیوا کا میلہ مشہور صوفی سنت جناب حاجی وارث علی شاہ صاحب کی یاد میں ہر سال دس دن کے لیے لگتا ہے۔ یہ میلہ دو مزاروں کے قریب ایک ساتھ لگتا ہے اس موقع پر ایک بڑے جشن کا اہتمام کیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ مزاروں پر قیمتی بنارسی چادریں چڑھائی جاتی ہیں۔ اس میلے میں ہندوستان کے علاوہ پاکستان، ایران، اور عرب ممالک سے بھی عقیدت مند شامل ہوتے ہیں۔

میلے کے دوران دیوا دوسرا لکھنؤ ہی بن جاتا ہے۔ یہاں ہر سال شاعرے اور قوالی کا پروگرام ہوتا ہے۔

دیوا کے ساتھ مہادیوا بھی ایک مقدس مقام ہے۔ یہاں شولنگ کی پوجا کے لیے لوگ دور دور سے آتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ شولنگ مہارانی کنتی کے ایما پر بنایا گیا تھا۔

ہستناپور کا میلہ

ہستناپور تاریخی اعتبار سے بہت اہمیت کا مقام ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ وہی ہستناپور ہے جو مہابھارت کے زمانے میں پانڈوؤں کی راجدھانی تھی۔ یہاں پر ہر سال جین مذہب کے ماننے والوں کا ایک بہت بڑا میلہ کارتک پورنیما کو لگتا ہے۔ اس دن بڑے جوش و خروش کے ساتھ رتھ کی سواری بھی نکالی جاتی ہے۔ اس مقام پر دگمبر اور سویتامبر جین مندر بھی قابلِ دید ہیں۔

گڑھ مکتیشور کا میلہ

گڑھ مکتیشور نام کی جگہ میرٹھ سے ۲۶ میل دور جنوب مشرق میں واقع ہے۔ یہاں پر بھی ہر سال ایک میلہ لگتا ہے۔ جسے گڑھ مکتیشور کا میلہ کہا جاتا ہے۔ اس میلے میں تقریباً ۸/۱۰ لاکھ لوگ تک اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ لوگ مشہور مکتیشوری مندر میں شو کی پوجا خاص طور سے کرتے ہیں۔ مندر کے قریب ہی ایک کنواں ہے جس کے پانی سے غسل کرنے پر تمام گناہ دُھل جاتے ہیں۔ میلے کے دوران یہاں پر بہت چہل پہل رہتی ہے۔

کمبھ اور اردھ کمبھ کے میلے :-

اترپردیش کے میلوں میں یہ دونوں میلے سب سے بڑے ہیں۔ ہمارے ہندوستان میں چار بڑے مقدس مقام مانے جاتے ہیں۔ الہ آباد، ہری دوار، اجین اور ناسک۔ کمبھ اور اردھ

ہری دوار

۱۲ اور ۶ سال کے وقفے سے انھیں چاروں مقامات پر لگتے ہیں۔ الہ آباد میں ہونے والے کمبھ کی خاص اہمیت ہے۔ یہ میلہ الہ آباد میں سنگم پر لگتا ہے۔ اس موقعے پر لوگ دور دور سے آکر شرکت کرتے ہیں۔ ہری دوار میں بھی اس موقعے پر بڑی بھیڑ رہتی ہے۔ چاروں طرف لوگ عبادت وغیرہ میں مشغول دکھائی دیتے ہیں۔

کھچڑی میلہ :-

یہ میلہ گورکھپور کے مشہور مندر گورکھناتھ میں لگتا ہے۔ عام طور سے یہ میلہ مکر سکرانتی کے دن لگتا ہے۔ اس دن ہندوستان کے علاوہ نیپال تک کے عقیدت مند اپنی سکت کے مطابق مہابلی بھیم کی مورتی پر کھچڑی چڑھاتے ہیں۔ ہزاروں من کھچڑی اس موقعے پر جمع ہو جاتی ہے۔ جو سال بھر تک مہانوں کے لنگر کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ اس میلے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ایک بار جب پانڈو کسی نامعلوم جگہ پر رہ رہے تھے تو بھیم اناج کے تلاش میں اُدھر آئے۔ وہ تھک کر

(بقیہ صفحہ ۱۰ پر)

ششی پربھا شاستری

پودے کے پنکھ

۲۴ جنوری ۱۹۷۷ء

یہ شری دھر میرے سامنے لیٹا ہے اور مجھے آج بے حد بُرا لگ رہا ہے۔ پرسوں دیدی کی شادی ہے، مجھے خوش ہونا چاہیے۔ آج میری ماں کی پیاری سکھی کا لڑکا یہ شری دھر میرے پاس آیا ہے، مجھے خوش ہونا چاہیے۔ پچھلے دس بارہ دنوں سے، جب سے دیدی کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں، میں خوش ہی تو تھا۔ لیکن آج مجھے اچانک یہ اداسی کیوں گھیر رہی ہے؟ کیوں آج سارا دن کچھ بھی کھانے کو دل نہیں چاہا۔ دادی اماں، ماں، چاچی، تائی سب کو ہی دتکار دیتا ہوں، گالی تک دے ڈالتا ہوں۔ تعجب ہوتا ہے۔ بُرا لگتا ہے، میرے والدین مجھے کچھ کیوں نہیں کہتے جب کہ دیال کے والدین اس کی ذرا سی بد اخلاقی پر اسے اتنی ہی ڈانٹ پلاتے ہیں۔

ہاں تو، مجھے آج سارا دن بُرا لگتا رہا ہے۔ کہیں مجھے شری دھر سے جلن تو نہیں ہو رہی۔ لگتا ہے بات ایسی بات ہی ہے۔ ریتا موسی کے ساتھ آتے ہی شری دھر مجھ سے بولا۔ "بال کھیلو گے؟"

"مجھے بال کھیلنا نہیں آتا۔" میں نے سیدھے سادے انداز میں کہا تھا لیکن وہ نہ جانے کیوں بہت زور سے کھلکھلا کر ہنس پڑا تھا۔ میں نے پوچھا۔ "تم کیوں ہنسے؟" بولا — "ہنسنے کی ہی بات تو ہے۔ ایک معمولی سا کھیل تم نہیں کھیل سکتے۔" میں کیا کرتا سن کر خاموش رہ گیا۔

سچ مچ مجھے کچھ کھیلنا نہیں آتا۔ دادی، ماں اور تائی کو تو کبھی تو مجھے کھیلنے نہیں دیتیں۔ ہمیشہ کہتی رہتی ہیں۔ "ہاتھ پیر ٹوٹ گئے تو . . . چوٹ چپیٹ لگ جائے گی تو!" مجھے ان کا ایسا کہنا ابھی تک بُرا نہیں لگتا تھا۔ مگر آج شری دھر کے سامنے اپنی مجبوری اور اپنے اناڑی پن کو دیکھ کر مجھے خود پر غصّہ آ رہا ہے۔ کوئی مجھ سے پوچھے کہ کیا میں نے اپنی زندگی میں شری دھر کو ہی دیکھا ہے؟ سچ مچ میں اپنی زندگی میں ابھی تک شری دھر کو ہی اچھی طرح دیکھ پایا ہوں۔ مجھے پڑوس کے کسی بچّے کے ساتھ کھیلنے نہیں جانے دیتیں۔ اپنی کوٹھی کے سامنے والی کوٹھی پر میں شام کو بہت سے بچّوں کو دیکھتا ہوں۔ وہ آپس میں لڑتے اور کھیلتے رہتے ہیں۔ کئی بار ان کے ساتھ کھیلنے کو میرا دل چاہا ہے لیکن میرے گھر کے بڑے لوگ مجھے کھیلنے نہیں جانے دیتے انھیں ڈر ہے کہیں میں چوٹ موچ نہ کھا جاؤں۔ کہیں مجھے نظر نہ لگ جائے۔ اب تو میں خود ہی کھیل کود سے ڈرنے لگا ہوں۔ اپنے لان میں ہی میں اپنے نوکر کشن کے ساتھ کھیلتا رہتا ہوں۔ میں خود بال پھینکتا ہوں، بال جھاڑی یا نالی میں چلا جاتا ہے تو کشن میرے لیے گیند ڈھونڈ کر لے آتا ہے اور میں پھر اچھالنے لگتا ہوں۔ مجھے کسی سے باتیں کرنا اچھا نہیں لگتا۔ ماں کہتی ہیں — لڑکے گندے اور چھچھورے ہوتے ہیں، ان کی صحبت میں رہنا اچھا نہیں ہے۔ کہیں میں گندا نہ بن جاؤں۔ لیکن آج مجھے لگ رہا ہے کہ میں سب سے گندا ہوں کیوں کہ مجھے کھیلنا نہیں آتا۔ اسکول میں بھی میں کمزور اور بیمار لڑکا مانا جاتا ہوں۔ وہاں بھی کھیلوں میں میں بہت کم حصّہ لیتا ہوں۔

لیکن آج شری دھر کو دیکھ رہا ہوں تو مجھے خود پر ہی نہ جانے کیوں جھنجھلاہٹ ہو رہی ہے۔ شری دھر نے آج مجھ سے کہا تھا "چلو ہمیں اپنا شہر گھماؤ۔" میں سہمی سہمی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ شری دھر کی ماں نے میری ماں سے کہا تو میری ماں نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔ "تم سچ مچ آج میری شامت بلاؤ گی

اس کی دادی اماں اور اس کے پتاجی تو کبھی اسے اکیلے گھر سے باہر پیر بھی نہیں رکھنے دیتے۔" شری دھر کی ماں چپ رہ گئی تھی مگر مجھے بڑی شرم آئی تھی۔ میں کیا کانچ کا گڈا ہوں جو مجھے یہ سب لوگ یوں چھپا کر رکھتے ہیں۔ میں جانتا ہوں، پتاجی کبھی کچھ نہیں کہیں، اگر یہ لوگ مجھے کھلا چھوڑ دیں۔ لیکن پتاجی کو کچھ پتہ ہی نہیں رہتا۔ وہ دن بھر کچہری میں رہتے ہیں، شام کو موٹر میں بیٹھ کر کلب چلے جاتے ہیں۔ ہاں صبح شام مجھے گھر میں دیکھ لیتے ہیں تو انھیں اچھا لگتا ہے۔ بس اتنا ہی میں جانتا ہوں۔ یوں پتاجی سے میں کم ہی بات چیت کر پاتا ہوں۔

۲۵ جنوری ۱۹۷۷ء

میں کیا کروں؟ مجھے آج بھی بہت برا لگ رہا ہے۔ شری دھر نے میرے سارے کھلونے دیکھے اور پھر مذاق اڑاتے ہوئے بولا۔ "تو یار ان چھوٹے چھوٹے کھلونوں سے کب تک کھیلتا رہے گا؟" شری دھر مجھے نہ جانے کیا سمجھتا ہے؟ خود کو پہلوان مانتا ہے اور مجھے دودھ پیتا بچہ۔ بھلا اس میں مجھ سے زیادہ کیا ہے؟ میں اس سے یہی کہنا بھی چاہ رہا تھا مگر کہہ نہیں سکا۔ میں جانتا ہوں اس میں مجھ سے بہت سی باتیں زیادہ ہیں۔ وہ میرا ہم عمر ہے لیکن مجھ سے زیادہ تگڑا ہے، مجھ سے زیادہ دودھ پی سکتا ہے، مجھ سے زیادہ اونچا اچھل سکتا ہے۔ کہہ رہا تھا۔ "میں گھوڑے پر بھی چڑھ سکتا ہوں۔" مجھے تو   نے مسوری پہاڑ پر بھی گھوڑے پر نہیں چڑھنے دیا۔ کہہ رہی تھیں۔ "میرا اکلوتا پوتا ہے، اگر گر جائے گا تو کسی کا کیا بگڑے گا۔ میں ہی ہاتھ جھاڑ کر رہ جاؤں گی۔" ماں بھی تو یہی کہتی رہتی ہے۔ "میرا اکلوتا پودا ہے، میرا اکلوتا راجکمار ہے۔" سنتے سنتے میرے کان پک گئے ہیں۔

میں نے آج پھر کھانا نہیں کھایا۔ دودھ نہیں پیا۔   ہے تو دادی اپنے کمرے میں بیٹھی رام جی کی مالا جپ رہی ہیں۔ دوپہر میں میرے اوپر سے ٹونا کر کے بھی گئی تھیں۔ آج شری دھر میرے کمرے میں سویا ہے۔ میں نے آج کسی کو اپنے کمرے میں نہیں آنے دیا ہے، ماں کو بھی نہیں۔ ماں مجھے اپنے ساتھ ہی تو سلاتی ہیں۔ آج وہ دیدی کی شادی کی تیاریوں میں الجھی ہوئی ہیں۔ اسی لیے انھوں نے مجھے کچھ نہیں کہا۔ نہیں تو میرے پیچھے پڑ جاتیں۔ مجھے کبھی یوں اکیلے میرے کمرے میں نہیں سونے دیتیں۔

اور ماں سمجھ رہی ہیں کہ میں آرام سے سو رہا ہوں۔ میں نے سامنے طشتری میں رکھی ڈھیر ساری مٹھائی اور یہ پھل جو وہ میری میز پر رکھ گئی ہیں، کھا لیے ہیں۔ وہ کیا جانیں میں نے ان میں سے ایک بھی چیز نہیں چھوئی ہے۔ میں برابر جاگ رہا ہوں۔ مجھے نیند نہیں آ رہی ہے اور میں یہ ڈائری لکھ رہا ہوں۔ اپنی کھلی کھڑکی میں سے مجھے آج چمکتا ہوا پورا چاند دکھائی دے رہا ہے۔ بالکل پہلی بار ہی تو میں نے اُسے دیکھا ہے اور مجھے آج یہ بے حد پیارا لگ رہا ہے۔ اس کی ماں اسے اتنے بڑے کھلے آسمان میں اکیلا کھیلنے کے لیے کیسے چھوڑ دیتی ہے۔ روکتی کیوں نہیں؟ کاش میری ماں مجھے اسی طرح اکیلا چھوڑ دیتی۔ نہ میں نے اپنی زندگی میں کبھی ہری گھاس پر چل کر دیکھا ہے، اور نہ ندی میں نہا کر، نہ بارش میں بھیگ کر۔ میں کیا کروں، مر جاؤں، کہیں بھاگ جاؤں یا کہیں اڑ جاؤں۔ نہیں تو ماں اور دادی میری سرخ آنکھیں دیکھ کر کل نہ جانے کتنے ڈاکٹروں کو بلا لیں گی۔

اُف، یہ کم بخت شری دھر کتنے مزے سے گہری نیند سو رہا ہے۔ اسے کیا پرواہ خواہ میں کبھی تک جاگوں۔ مجھ کمزور پلپلے سے بچے کو یہ دوست بنانا بھی تو نہیں چاہتا۔

۲۰ دسمبر ۱۹۷۸ء

آج مجھے پھر شری دھر یاد آ رہا ہے اور میں پھر اپنی ڈائری لے کر بیٹھ گیا ہوں۔ لیکن شری دھر تو مجھے برابر یاد آتا رہا ہے۔ اس کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے برابر رہی ہے اور تب ہی تو اس پورے سال میں نے ستیاگرہ کیے رکھا ہے۔ شری دھر

مجھے بتا گیا تھا، وہ روزانہ ورزش کرتا ہے، خوب کھیلتا ہے، کسی سے نہیں ڈرتا اور خوب دودھ پیتا ہے۔ میں بھی اب اپنے کمرے میں چھپ کر روز کسرت کرتا ہوں اب میں اسکول میں ہر کھیل کھیلنے کے فراق میں رہتا ہوں۔ اس بار دوڑ میں مجھے دوسرا انعام ملا۔ مجھے بے حد خوشی ہوئی تھی لیکن گھر میں میں نے کسی کو نہیں بتایا۔ بتا دیتا تو ماں اور دادی ماں دونوں میرے پیچھے پڑ جاتیں۔ کہیں موچ تو نہیں آگئی؟ کہیں چوٹ تو نہیں لگی؟ اور مجھے اب یہ باتیں بالکل اچھی نہیں لگتیں۔ میں اب اپنے دوستوں کو گھر پر بلا لیتا ہوں، ان کے ساتھ خوب کھاتا اور کھیلتا ہوں۔ پڑھتا بھی ہوں۔ ماں اب ناراض نہیں ہوتیں کیونکہ ایک تو وہ میرے ساتھیوں کو دیکھ بھال لیتی ہیں تو انھیں بے فکری رہتی ہے کہ میں بُرے لڑکوں کو ساتھی نہیں بنا رہا۔ دوسرے، وہ سوچتی ہیں اچھا ہے، میری تفریح گھر پر ہی ہو جاتی ہے۔

اب میں کھل کر ہنستا اور چیخ چیخ کر گاتا بھی ہوں۔ دادی ماں پہلے کہتی تھیں زور زور سے ہنسنے اور بولنے سے گلے کے اعصاب ڈھیلے پڑ جاتے ہیں اور حلق کا کویا گر جاتا ہے۔ اس لیے مجھے زور سے ہنسنے اور بولنے کی ممانعت تھی لیکن اب؟ اب تو میں ستیا گرہی ہوں نہ، اب دادی ماں مجھے گود میں بٹھا کر جب کبھی میری بلائیں لینا چاہتی ہیں، میں پھدک کر دور بھاگ جاتا ہوں۔ ان سے کہتا ہوں۔ اب میں اتنا بڑا ہو گیا ہوں، اتنا مضبوط ہو گیا ہوں گود میں بٹھاؤ گی تو تمھاری گود لوٹ جائے گی!

دادی ماں سن کر ہنستی بھی ہیں اور روتی بھی ہیں۔ لیکن میں خوش ہوں۔ مجھے اب تکان محسوس نہیں ہوتی۔ ہر دم چستی محسوس کرتا رہتا ہوں۔ اسی لیے خوب پڑھتا ہوں۔ اپنی کورس کی کتابیں بھی اور بغیر کورس کی بھی۔ ہاں۔ ان دنوں ایک نئی بات اور ہوتی ہے۔ اب میں اپنے پتاجی سے بھی بات کر لیتا ہوں۔ پہلے ان سے کچھ کچھ ڈرتا تھا۔ آج بڑی مزیدار بات ہوئی۔ دوپہر کو میں سائنس کی ایک کتاب پڑھ رہا تھا جس میں چاند کے بارے میں بہت سی باتیں لکھی تھیں۔ مجھے وہ باتیں بڑی اچھی لگیں۔ میں لپک کر پتاجی کے پاس گیا۔ وہ کھانا کھا رہے تھے۔ میں نے زور سے کہا۔ "پتاجی! میں چاند پر جاؤں گا"

"کیسے؟" پتاجی نے متحیر ہو کر پوچھا تھا۔

"جیسے اتنے سارے لوگ جاتے ہیں پتاجی، روس کے، امریکہ کے اور . . . ."

پتاجی نے میری طرف تعریفی نظروں سے دیکھا تھا۔ حیرت سے ان کے ہاتھ سے نوالہ چھوٹ کر تھالی میں گر پڑا تھا اور تب مجھے ہنسی آگئی تھی۔ میں اتنے زور سے قہقہہ لگا رہا تھا کہ دادی ماں دوڑ کر میرے پاس آگئی تھیں اور ڈپٹ کر بولی تھیں۔ "خبردار جو اتنے زور سے ہنسا تو!" اور میری ہنسی اور بھی تیز ہو گئی تھی، اتنی تیز کہ پلیٹ میں روٹیاں لاتا ہوا بوڑھا نوکر ننکو بھی ٹھٹک کر مجھے دیکھنے لگا تھا۔ ماں مجھے خاموشی سے گھور رہی تھیں۔ "کیا ہوا رے؟" دادی ماں نے میرے سر پر بڑے پیار سے ہاتھ پھیر کر پوچھا تھا۔

"دادی ماں۔ میں چاند پر جاؤں گا۔ چاند پر!" میں نے بتایا تھا۔

"ہائے رام!" انھوں نے سہم کر کہا تھا۔ "تو چاند پر جائے کیوں میرے لال۔ میرے اکلوتے راجکمار کیوں؟" اور ان کی بوڑھی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے تھے چاند پر تو وہ لوگ جاتے ہیں۔ وہ۔ ہا اا ئے!" اور پھر پتاجی کو ڈانٹ کر کہا تھا۔ "تو نہیں روکتا اسے! لڑکا کیا کہہ رہا ہے کہیں جیتے جاگتے کوئی پر جا سکے ہے" اور وہ سچ مچ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھیں لیکن پتاجی میرے ساتھ ہنستے رہے تھے۔ انھوں کے میری تھپتھپائی تھی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ چاند پر جانے کا کیا مطلب ہوتا ہے — ایک اولوالعزمی، ایک بے حد بڑی چاہ۔ پتاجی شاید مجھ میں یہی دیکھنا چاہتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے اپنے پاس کھینچ لیا۔ میرے گالوں کو چوم کر وہ بولے —

(بقیہ صفحہ ۲۳ پر)

محمد رضی الدین معظم

دھاتیں

پیارے بچو! آج تمہیں دھاتوں کے بارے میں معلومات پہنچانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ دھات صاف اور چمکدار ہوتی ہے مگر شیشے کی طرح نظر اس کے آر پار نہیں گزر سکتی۔ اس کا وزن بھی اور قسم کی چیزوں سے زیادہ ہوتا ہے۔ مثلاً لوہا بہ نسبت مٹی اور پانی کے بھاری ہے۔ ایک خاصیت دھات کی یہ ہے کہ کوٹنے پیٹنے سے چوڑی اور چپٹی پڑ جاتی ہے۔ مٹی یا پتھر کی طرح ریزہ ریزہ نہیں ہو جاتی۔ وہ حرارت سے پگھل جاتی ہے۔ مگر لکڑی کے طور پر جلتی نہیں۔ اس کا تار کھینچو تو بہت لمبا کھینچ سکتا ہے۔ دھات زمین کے اندر سے نکلتی ہے جہاں سے کھود کر اس کو نکالتے ہیں وہ کان کہلاتی ہے۔ اور جو دھات کان سے نکلتی ہے اسی کے نام سے کان مشہور ہوتی ہے جیسے سونے کی کان لوہے کی کان وغیرہ۔

کئی قسم کی دھاتیں دنیا میں پائی گئی ہیں ان میں سے پلاٹینم، سونا، چاندی کمیاب اور بیش قیمت ہیں ان تینوں میں یہ بھی بڑی خوبی ہے کہ ان کو زنگ نہیں لگتا۔ آگ، پانی اور ہوا کی تاثیر سے ان کی چمک دمک میں فرق نہیں پڑتا۔ اسی خوبی کی وجہ سے ان تینوں کو اصیل اور باقی کو رذیل دھات کہا جاتا ہے۔

ذیل میں کچھ دھاتوں کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کریں گے۔

پلاٹینم

یہ دھات دنیا میں بہت کم ملتی ہے چاندی کے مانند اجلی اور لوہے کی طرح سخت ہوتی ہے۔ اس کا تار سب سے زیادہ باریک اور لمبا بن سکتا ہے وزن میں سونا سب سے زیادہ بڑھیا ہے مگر یہ اس سے بھی وزنی ہے چنانچہ اپنے ہم مقدار خالص پانی سے ۲۱ گنی بھاری ہوتی ہے۔ اس کا پگھلانا بھی مشکل ہے۔ تمام دھاتوں سے زیادہ حرارت چاہتی ہے گھڑی کے نہایت مہین اور عمدہ پرزے اسی دھات کے بنائے جاتے ہیں۔ کیونکہ بہت پائدار ہوتے ہیں۔

سونا

رنگ میں نہایت خوشنما وزن میں سب سے اعلیٰ خالص پانی سے ۱۹ گنا بھاری ہوتا ہے۔ اس کے ذرے آپس میں نہایت پیوستہ ہیں اسی وجہ سے زیادہ وزنی ہوتا ہے کوٹنے پیٹنے سے بہت بڑھ سکتا ہے۔ طبق گر جب دو چمڑوں کے بیچ میں رکھ کر اس کو ہتوڑے سے کوٹتے ہیں تو اس کے ایسے ہلکے اور مہین ورق بن جاتے ہیں کہ پھونک مارو تو ہوا میں اڑ جائیں۔ سونے کی اشرفی بنتی ہے۔ انواع و اقسام کے زیورات بنائے جاتے ہیں۔ امیروں اور بادشاہوں کے ہاں بعض برتن بھی سونے کے ہوتے ہیں۔ سونے کا ملمع خوب ہو سکتا ہے اگر ایک چاندی کے تار پر سونا لپیٹ کر اس کو بڑھانا شروع کریں تو جس قدر لمبا ہوتا جائے گا۔ سونا بھی اس پر پھیلتا جائے گا۔ یہاں تک کہ ۹ میل لمبے تار کے واسطے ایک تولہ سونا کافی ہے۔ سونے میں ایک یہ بھی خوبی ہے کہ وہ بہت سخت نہیں ہوتا۔ لیکن شیشہ اور رانگ کی طرح بہت نرم بھی نہیں ہوتا۔ اس پہ ٹھپہ خوب پڑتا ہے۔ سونے کا کھرا کھوٹا پن اس کے وزن سے ٹھیک ٹھیک معلوم ہو سکتا ہے۔ اگر ایک ہی قد و قامت کی دو اشرفیاں ہوں اور ان میں ایک کچھ ہلکی ہو تو سمجھ لو کہ یقیناً اس میں کسی دوسری دھات کی ملاوٹ ہے۔ سونے کی کانیں زیادہ تر جنوبی امریکہ، ساحل افریقہ یورپ، آسٹریلیا، عرب اور ہندوستان میں ہیں بعض ملکوں میں دریائی ریت میں سونے کے ذرے ملے ہوئے پائے جاتے ہیں۔

چاندی

یہ تیسری درجہ کی اصیل دھات ہے سفید اور اجلی ہے لیکن سونے کی صفائی پائیداری اور چمک دمک کو نہیں پہنچتی کوٹنے پیٹنے سے بڑھ سکتی ہے۔ سونے کی بہ نسبت اس کے ملمع کا زیادہ رواج ہے چنانچہ امیروں اور دولتمندوں کے چمچے پیالے وغیرہ چاندی کے پانی سے قلعی کیے جاتے ہیں۔ اور دھاتوں کی قلعی کھانے کے ساتھ مل کر آدمی کی صحت میں خلل ڈالتی ہے مگر چاندی کسی طرح مضر نہیں۔ اس کے علاوہ رانگ کی قلعی سے زیادہ اجلی اور دیرپا ہوتی ہے۔ سونے کی طرح چاندی کے بھی ظروف، زیور اور سکے بنائے جاتے ہیں اس کا وزن سونے سے بہت ہلکا ہوتا ہے۔ خالص پانی سے دس گنی ہوتی ہے۔

پارہ

تمام دھاتوں میں پارہ ایک عجیب چیز ہے چاندی سے اجلا پانی سے پتلا، ذرا سی حرکت دی اِدھر سے اُدھر بھاگا۔ اسی واسطے بے تابی اور بے قراری میں پارہ کی مثال دیتے ہیں۔ پارہ معمولی حرکت میں سیال بن جاتا ہے لیکن زیادہ سردی پاتا ہے تو منجمد ہوتا ہے اس وقت اور دھاتوں کی طرح کوٹنے پیٹنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ جب زیادہ گرمی پاتا ہے تو ہوا میں اڑ جاتا ہے اور ہمیشہ پانی کی طرح بخارات بن کر اڑتا رہتا ہے۔ پارہ سے گرمی کا اندازہ کرنے کا ایک عمدہ اوزار بنایا گیا ہے۔ شیشے کی پتلی نلی کو ہوا سے خالی کر کے اس میں پارہ بھر دیتے ہیں جس قدر گرمی زیادہ ہوتی ہے اسی قدر پارہ پھیلتا ہے اور جتنی کم ہوتی ہے اتنا ہی سکڑتا ہے۔ اسی طرح صحیح پیمائش یا انسانی تپش وغیرہ معلوم ہو جاتی ہے۔ اگر پارہ کو گاڑھا کر کے سونے کے ساتھ ملائیں تو دونوں حل ہو کر ایک ذات ہو جاتے ہیں اب اس کو چاندی یا کسی اور دھات پر پھیلا دیں تو لپٹ جاتا ہے پھر اس کو آنچ دیں تو پارہ فوراً اڑ جاتا ہے اور سونے کی جھلک باقی رہتی ہے اس طرح پارہ کی آگ سے سونے کا ملمع ہوتا ہے۔ پارہ دوا کے طور پر بھی کام آتا ہے کتنی ہی بیماریوں کو دور کرتا ہے وہ پانی سے ۱۳½ گنا وزنی ہے یعنی سونے سے ہلکا اور چاندی سے وزنی ہے یورپ اور جنوبی امریکہ میں پارہ کی کانیں ہیں۔

تانبا

تانبے کی رنگت میں سرخی کی دمک ہوتی ہے وہ بہت بھاری نہیں ہوتا۔ پھر بھی پانی سے ۹ گنا وزنی ہے کوٹنے سے اس کا باریک پتر اور کھینچنے سے باریک تار بن جاتا ہے گرم تو چٹ پٹ ہو جاتا ہے البتہ اس کو پگھلانے کے لیے تیز آنچ درکار ہے۔ تانبا ارزاں ہوتا ہے اسی واسطے اس کے برتن کثرت سے بنائے جاتے ہیں جن پر رانگ کی قلعی کر لیتے ہیں۔ اگر قلعی نہ کریں تو کھانے میں زنگ آ جاتا ہے اور کھانے کے قابل نہیں رہتا۔ کشتیوں اور جہازوں کے پیندے میں پائداری کی غرض سے تانبے کی پتر چڑھا دیتے ہیں۔ اس ترکیب سے یہ بھی فائدہ ہے کہ سمندر کے کیڑوں سے لکڑی محفوظ رہتی ہے تانبے کے سکے اور برقی تار وغیرہ بنائے جاتے ہیں۔

جست

جست کا اصلی رنگ سفید ہے وہ تانبے کے مقابلے میں بہت دیر سے گرم ہوتا ہے اسی واسطے پانی کی صراحیاں گلاس حقے وغیرہ جست کے بنائے جاتے ہیں۔ یہ دواؤں میں بھی کام آتا ہے مگر کھانے میں نہیں بلکہ لگانے میں استعمال کیا جاتا ہے چنانچہ آنکھوں میں جست لگاتے ہیں زخموں کے لیے مرہم بناتے ہیں پانی سے ۷ گنا بھاری ہوتا ہے زیادہ جلانے سے سفید راکھ کے مانند ہو جاتا ہے۔ جست اور تانبے کو ملا کر پیتل بناتے ہیں جو بہت خوش رنگ اور صاف ہوتا ہے۔ اس کے برتن بنتے ہیں۔

جو سونے کی طرح چمکتے ہیں۔ مگر عیب یہ ہے کہ پیتل ضرب کو برداشت نہیں کرتا اسی واسطے اس کی کوئی چیز بناتے ہیں تو قالب میں ڈھال کر بناتے ہیں۔ پھر اس کو خراد پر چڑھا کر صاف اور سڈول کر لیتے ہیں۔

لوہا

سب سے زیادہ ارزاں اور سب سے زیادہ مفید کارآمد یہی دھات ہے ہمارے بہت سے کام اس سے نکلتے ہیں غالباً قدرت ے اسی واسطے دنیا میں لوہا زیادہ پیدا کیا ہے لوہا وزن میں تو ںسے یعنی پانی سے صرف ۸ گنا وزنی ہے لیکن سختی اور مضبوطی ں تمام دھاتوں پر فائق ہے۔ اس کے گلانے کو سونے سے ی زیادہ حرارت درکار ہوتی ہے اس کو بار بار آنچ دے کر فولاد تے ہیں جو نہایت سخت اور لچکدار ہو جاتی ہے۔ چاقو، چھری ترے، نشتر، خنجر، تلوار وغیرہ اکثر فولاد کے بنتے ہیں۔ برتن وغیرہ ی خوب بنائے جاتے ہیں۔ جب تک کوئی قوم اس دھات کے متعال سے واقف نہیں ہوتی اپنے ملک کو ترقی کی راہ پر نہیں لگا سکتی۔ راعت اور عمارت کے کام لوہے کے اوزاروں سے چلتے ں۔ طبیب اور ڈاکٹر فولاد کا عرق اور سفوف بھی تیار کرتے ہیں۔ اشتہا کو بڑھاتا اور کمزوروں کو تقویت دیتا ہے۔

سیسا

سیسا نہایت نرم مگر بھاری ہوتا ہے پانی سے اس کا وزن اگنا ہے بہت ہلکی سی ضرب سے چپٹا بن سکتا ہے مگر اس کا تار ہیں کھینچ سکتا۔ آنچ دینے سے بہت جلد پگھل جاتا ہے اس میں سے میل بہت نکلتا ہے زیادہ جلایا جائے تو بالکل میل بن کر سرخ نگارہ ہو جاتا ہے۔ بندوق کی گولیاں اور چھرے سیسے سے بنتے ہیں۔ سیسا پانی اور ہوا میں تو نہیں بگڑتا مگر ترشی کے ساتھ مل کر زہریلا ہو جاتا ہے اکثر دغا باز قلعی گر رانگ میں سیسا ملا کر برتنوں کو قلعی کر دیتے ہیں جو صحت کے لیے مضر ہے۔

رانگ

رانگ، سیسے کی بنسبت کسی قدر سفید ہوتا ہے۔ سب دھاتوں سے زیادہ سبک ہے پانی سے ۷ گنا وزنی۔ نرم بھی بہت ہوتا ہے سیسے کی طرح ذرا سی طاقت سے مڑ جاتا ہے اس میں لوہے کی سی لچک نہیں ہوتی کہ موڑنے کے بعد خود بخود سیدھا ہو جائے کم آنچ میں پگھل جاتا ہے۔ زیادہ تپانے سے رفتہ رفتہ میل سا بن جاتا ہے۔ کوٹنے پیٹنے سے اس کے ورق تو بن سکتے ہیں لیکن تار کھینچو تو نہیں کھینچ سکتے۔ رانگ میں یہ خوبی ہے کہ اس کو زنگ کبھی نہیں لگتا۔ اس کے برتن تو نہیں بنتے مگر تانبے اور پیتل کے برتنوں پر اس کی قلعی خوب ہوتی ہے اور اصل میں رانگ ہی کا نام قلعی ہے۔

★★

بقیہ : پودے کے پنکھ

ننھے پودے، تیرے پنکھ اتنے بڑے ہو جائیں، اتنے اتنے کہ..!" اور انھوں نے کھانا چھوڑ کر اپنی باہوں میں گھیر لیا تھا۔ ماں اور دادی ماں دونوں حیرت زدہ کھڑی تھیں۔

اور اس وقت جب میں اپنی ڈائری لکھ رہا ہوں تو چاند آج پھر میری کھڑکی میں اٹکا ہوا ہے، جس نے میرے پروں کو طاقتِ پرواز دی تھی۔ انھیں اتنا مضبوط بنایا تھا۔

ہندی سے ترجمہ
مترجم جاوید اقبال

عقیل قیس

مجرم کون؟

اچانک فون کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔ ڈیڈی ابھی ابھی دفتر سے لوٹے تھے۔ اور ڈرائنگ روم میں اخبار پڑھ رہے تھے۔ ممی ان کے ساتھ بیٹھی ہنس ہنس کر کچھ باتیں کر رہی تھیں گھنٹی کی آواز پر دونوں ہی فون کی طرف لپکے لیکن ڈیڈی نے پہل کی اور رسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا۔ ممی ان کے پاس ہی کھڑی سنتی رہیں۔

دوسری طرف شاید رشید بھائی تھے۔ رشید بھائی یعنی پریش بھیا کے دوست پریش بھیا یعنی میرے اپنے سگے بڑے بھائی۔ لیکن اب میں چھ بہنوں سے اکیلا ہوں۔

ممی حالانکہ ڈیڈی کے پاس ہی کھڑی تھیں لیکن ان کے رسیور کریڈل پر رکھتے ہی گھبرائے ہوئے لہجے میں دریافت کرنے لگیں۔ رشید نے کیا کہا جی؟'

ڈیڈی کا چہرہ اب پہلے سا کھلا ہوا نہیں رہ گیا تھا۔ بولے۔ اُس نے بتایا کہ ہمارے پریش کی موت دراصل ایک کتاب کی وجہ سے ہوئی تھی۔ وہ کتاب اس نے لائبریری سے لی تھی۔ دو اور طلبا بھی اسی کتاب کی وجہ سے موت کے شکار ہو گئے۔ پوری بات رشید کے آنے پر ہی معلوم ہو گی۔

ممی اچانک سسکیاں بھرنے لگیں۔ ڈیڈی اداس اور گم سم سے بیٹھ کر نہ جانے کیا سوچنے لگے۔ گھر کا ہنستا ہوا ماحول یکایک بدل گیا تھا۔ جیسے پریش بھیا کی موت کی خبر ابھی ابھی ملی ہو۔ اس کو گزرے تو اب چھ مہینے ہونے کو آئے تھے

یہ کتنی تعجب خیز بات ہے کہ کالج لائبریری سے نکالی گئی ایک کتاب نے تین زندگیاں لے لیں۔ کتاب کوئی جا مخلوق نہیں، کوئی زہر یا بارود نہیں۔ لیکن رشید بھائی۔ تو غلط نہیں کہا ہوگا۔ سوچتا ہوں کہ وہ کتاب اگر پریش لائبریری سے نہیں نکلواتے تو شاید ابھی حیات ہو بھیا سا ذہین طالب علم ایک عجیب واقعہ کا شکار ہو گیا۔ آنرز کے طالب علم تھے اور مستقبل میں کافی کچھ کر دکھا جوش بھرا تھا ان کے دل میں۔

ممی کی سسکیوں کی آواز کچھ زور پکڑتی جا رہی تھ دل بھی عجیب سا اداس ہو گیا تھا۔ آنکھیں ان کی یاد سے تھیں۔ مجھے یاد آنے لگتی ہیں وہ گھڑیاں . . . .

اس دن جب وہ کالج سے واپس آئے تھے تو ہمیشہ ہشاش بشاش تھے۔ مجھے باہر کھڑا دیکھ کر بولے —"آ میں کیا کر رہے ہو منے؟' جاؤ ممی سے میرے لیے کھا لیے کہو۔ بڑی زوروں کی بھوک لگی ہے۔" اور جیب نکال کر میرے ہاتھ میں پکڑا دیں۔ بہت پیار کرتے کھانا کھا چکنے کے بعد وہ سو گئے تھے۔ شام کو ک کے اندر ہی قید رہے۔ حالانکہ یہ بات خلاف معمول تھی گھومنے یا کھیلنے ضرور جاتے تھے۔ رات کا کھانا بھی کم ہی کھایا تھا اس دن۔

دوسری صبح جب وہ کافی دیر تک نہیں جاگے تو گئیں لیکن اچانک ممی رونے چلانے لگیں۔ ڈیڈی پو سکتے میں آ گئے۔ میں خود ہکا بکا رہ گیا کہ کیا ہو گیا۔ میں کسی کی موت نہیں دیکھی تھی۔ موت کے بارے میں ضرور تھا کہ موت کوئی ڈراؤنی چیز ہے جس سے سب ہیں۔

مجھے وہ منظر ہلکا ہلکا آج بھی یاد ہے۔ بھیا کے سر کور والی موٹی سی ایک کتاب پڑی تھی۔ شاید وہی موت کا سبب بنی۔ بعد میں پتا چلا جی نے اسے لائبریری

ادیا تھا . . . .

تبھی کال بیل چیخنے لگی ۔ اور میری سوچ کا سلسلہ ایک دم گیا۔ "منّے" آواز آئی ۔

ایک دم پریش بھیّا کی آواز . . . . لیکن یہ رشید بھائی تھے۔ نے دروازہ کھولا۔ وہ آئے ۔ ان کے ہاتھ میں ایک مقامی اخبا تھا ۔

انھوں نے ڈیڈی کو سلام کیا ۔ ڈیڈی ابھی تک گم سم تھے ۔ ن انھیں دیکھ کر ان کی زبان کھلی اور کئی سوال کرنے لگے تھے ۔ بھی آنکھیں پونچھتی کمرے میں آبیٹھیں ۔ رشید بھائی بتانے لگے ۔ ات دراصل ایسی ہے کہ جو کتاب پریش نے لائبریری سے لی اس کے کسی ورق پر ایک زہریلا عنصر لگ گیا تھا ۔ یہ کوئی عجیب ت نہیں ۔ پریکٹیکل کرنے کے بعد بغیر ہاتھ دھوئے کتاب کو استعما ا ہوگا ۔ دوسری بات یہ کہ ہم میں سے بہت سارے لوگوں کو ان پڑھے انگلیوں میں تھوک لے کر کتاب کے ورق الٹنے غلط عادت ہوتی ہے ۔ اسی وجہ سے شاید پریش اور دو دوسرے کوں کی جان گئی ۔ جب تینوں کی موت کے بعد ان کے ہاں ے ایک ہی کتاب واپس کی گئی تو ہمارے لائبریرین کو شک ہوا ۔ ھوں نے کتاب کو جانچ کے لیے بھجوایا . . . بات صحیح نکلی ۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان تینوں کی موت کا ذمہ دار میں ن کی عادت کو مانوں یا اس گم نام شخص کی لاپرواہی کو !

اتنی چھوٹی سی غلطی اتنا بھیانک روپ لے کر بھی آسکتی ہے ! میں اچانک اپنے کو روک نہیں پاتا اور رونے لگتا ہوں ۔

بقیہ : آنسو بنے کنول

ابی کنول کی شکل میں جھیل کے پانی پر پھیلتا رہا ۔

"رینا باڑی" نام کی بستی ڈل جھیل کے کنارے آج بھی آباد ہے ۔ اور ڈل جھیل کے وسیع نیلے سینے پر سفید اور گلابی کنول آج بھی تیرتے نظر آتے ہیں ۔ چاندنی راتوں میں اکثر کسی کے رونے کی آواز سنائی دیتی ہے ۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ رینا کی روح ہے جو آج بھی بے قرار روتی پھرتی ہے ۔

(کل ضمیمہ)

بقیہ : سونے کی اینٹ

بازار سے کھانا لے کر آجائے تو اسے قتل کر دیا جائے ۔ اس طرح سونے کی اینٹ وہ دونوں آپس میں بانٹ لیں گے ۔

اُدھر وہ تاجر جو کھانا لینے گیا تھا ۔ اپنے دل میں اپنے دونوں ساتھیوں کے خلاف اسی قسم کا منصوبہ بنائے ہوئے تھا ۔ وہ بھی اپنے دونوں ساتھیوں کو ختم کر کے پوری اینٹ پر قبضہ جمانا چاہتا تھا ۔ اس نے سوچا ۔ کیوں نہ کھانے میں زہر ملا دیا جائے اور خود بھوک نہ لگنے کا بہانہ کر کے وہ کھانا ان دونوں تاجروں کو کھلا دے ۔ اس طرح وہ اکیلا ہی سونے کی اس اینٹ کا مالک بن جائے گا ۔ یہ سوچ کر اُس نے کھانے میں زہر ملایا اور زہر ملا ہوا وہ کھانا لے کر جیسے ہی اس جگہ پر پہنچا جہاں اس کے دونوں ساتھی اس کا انتظار کر رہے تھے ۔ اُس کے پہنچتے ہی دونوں اپنی برہنہ تلواریں لے کر اُس پر ٹوٹ پڑے اور اسے بڑی بے دردی سے قتل کر دیا اور اس کی لاش کو زمین میں دفن کرنے کے بعد دونوں دسترخوان بچھا کر کھانا کھانے لگے ۔

ابھی وہ دونوں اُس کھانے کو پوری طرح کھا بھی نہیں پائے تھے کہ زہر نے اپنا اثر دکھانا شروع کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ دونوں بھی زمین پر لڑھک گئے چند منٹوں ہی میں ملک الموت نے انھیں آکر دبوچ لیا ۔

اس طرح وہ تینوں لالچی تاجر ایک دوسرے کی جان لے کر دولت پر قبضہ کرنے کے لالچ میں ختم ہو گئے اور وہ سونے کی اینٹ ان کے مردہ جسموں کے قریب پڑی ہوئی پہلے کی طرح ہی چمکتی رہی ۔

بقیہ : چالاک کسان

کہی ہیں ۔ پھر بھلا خزانہ کی بات سچ کیسے ہو سکتی ہے ؟ ۔

ٹھیک ہے ـــــ زمین دار نے کسان کو جانے کا حکم دیدیا ۔

کسان گھر پہنچا ـــــ اس نے اس خزانے کی مدد سے ایک عالیشان مکان بنوایا ، تجارت کی اور اب وہ اپنی سمجھداری سے ایک مال دار کسان بن گیا تھا ۔

خلیق انجم اشرفی

آنسو بنے کنول

کشمیر جنت نظیر وادیوں، گنگناتے چشموں، خاموش بہتی جھیلوں، پُرشور آبشاروں، برف پوش چوٹیوں، بادام اور چیری کے حسین شگوفوں، سرو اور سفیدے کے بلند و بالا درختوں، سنہری مائل سُرخ سیبوں سے لدے حسین پیڑوں اور خوبصورت انسانوں کا دیس ہے۔ اس کی خوبصورتی اور حسن سے متاثر ہونے والوں نے اسے "زمینی جنت" تک کہہ دیا ہے۔ اسی کشمیر میں سری نگر کے پاس ایک حسین اور خاموش نیلی جھیل ہے۔ جسے لوگ "ڈل جھیل" کے نام سے پکارتے ہیں۔ ڈل جھیل کے آس پاس لگے ہوئے سفیدے اور چنار کے لمبے لمبے خاموش درخت، اس میں تیرتے ہوئے حسین شکارے، اس کے سینے پر شاں جا بجا پھولوں اور سبزیوں کے تختے اور کھلے ہوئے سفید اور گلابی کنول اس کے حسن کو چار چاند لگاتے ہیں۔ چودھویں کی رات میں جگمگاتے چاند کی چاندنی اس کے حسن کو دوبالا کرتی ہے۔ لیکن کسی ایسی ہی رات کو آپ اگر جھیل کے کنارے پہنچیں تو آپ کو کسی کے سسکیاں لے لے کر رونے کی درد بھری آواز سنائی دے گی۔ شاید آپ اسے اپنا وہم سمجھ کر ٹال دیں۔ لیکن اگر کسی بوڑھے کشمیری سے اس آواز کے بارے میں پوچھیں تو وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر آپ کو ایک کہانی سنائے گا۔

بہت دن پہلے اس جگہ جہاں آج ڈل جھیل بہتی ہے ایک چھوٹی سی بستی تھی اس بستی کے ایک شاندار مکان میں ایک بر رہتا تھا۔ جو بڑا بے رحم اور کنجوس تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ اس نے جمع کر کے ایک عالیشان مکان بنا لیا تھا۔ یہ برہمن سیبوں کے ا بڑے باغ کا مالک بھی تھا۔ اس برہمن کے ایک لڑکی تھی۔ بڑی حس بڑی رحم دل۔ اس کا نام رینا تھا۔ وہ ہر اعتبار سے اپنے کنجوس با ضد تھی۔ برہمن خود اتنا امیر ہونے کے باوجود اپنی دکشنا نہیں چھو تھا۔ لیکن اگر کبھی بھوک کا مارا بھکاری اس کے یہاں پہنچ جاتا تو اسے برا بھلا کہہ کر بھگا دیتا۔ ہوتے ہوتے اس کی یہ عادت بستی سب فقیر جان گئے۔ اور اس کے یہاں سے بھیک مانگنی چھو رینا اپنے باپ کی یہ سختیاں اور کنجوسی دیکھ کر دل ہی دل میں کڑ لیکن باپ کے ادب کی وجہ سے دل کی بات زبان پر نہ لا پاتی

ایک رات کی بات ہے کہ لداخ کا ایک لاما کہیں سے اِدھر آنکلا اور برہمن کے دروازے پر صدا لگائی۔ اس بے چا پردیسی کو برہمن کی فطرت کا کیا پتہ تھا اسے تو پوری امید تھی کہ

یشان مکان کے مالک سے تو اسے اور گھروں سے زیادہ ہی بھیک
ے گی۔ جس وقت اس نے صدا لگائی۔ برہمن بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔
ا کی آواز سنتے ہی وہ غصے میں بھر گیا۔ فوراً پاس پڑی ہوئی ایک بید
ی چھڑی اٹھائی اور باہر نکل گیا۔ چھڑی سائیں سائیں ہلاتے ہوئے وہ
ا سے بولا "بھاگ جاؤ' یہاں بھیک ویک نہیں ملے گی۔"

لاما یہ سخت برتاؤ دیکھ کر اور روکھا جواب سن کر حیران رہ گیا۔
ر یہ سوچ کر کہ ایک بار کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے۔ اس نے
تجا بھرے لہجے میں کہا۔" بابا رات ہو گئی ہے اور برف باری شروع
چکی ہے۔ ایسے موسم میں سری نگر تک جانا ممکن نہیں۔ میرے ساتھ دو
بلشو اور بھی ہیں۔ ان کے لیے بھی کھانے کی ضرورت ہے۔ اگر زیادہ
یں تو دو ہی روٹیاں دے دو۔"

" دو ہی روٹی دے دو۔" برہمن نے منہ بنا کر لاما کی نقل اتاری
۔ر اپنی بید کی چھڑی لہراتے ہوئے بولا" یہاں تم لوگوں کو روٹی نہیں
دٹی ملتی ہے۔ خیریت اسی میں ہے کہ چپکے سے چلے جاؤ۔ ورنہ اسی سونٹی
ے مارتے مارتے پیٹھ کی کھال ادھیڑ دوں گا۔"

لاما بھی کوئی بھلا آدمی تھا کہ اس نے بڈھے برہمن کی یہ دھمکی سن کر
پنا موٹا ڈنڈا اس کے گنجے سر پر نہیں دے مارا۔ وہ "اہرت اہرت" کی
لاجپتا ایک طرف چل دیا۔

رینا مکان کی چھت پر کھڑی یہ تماشا دیکھ رہی تھی۔ برہمن کی
تیں سن کر اسے بہت دکھ ہوا۔ اس نے آسمان کی طرف نظر اٹھائی
دچاروں طرف کالی کالی گھٹائیں گھری نظر آئیں۔ رات کی سیاہی
ہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ "ایسی سیاہ اور طوفانی رات میں" رینا نے
وچا" یہ غریب لاما بھیک کی امید میں کہاں کہاں بھٹکتا پھرے گا"
یہ سوچ کر نیک دل رینا کا ننھا سا حساس دل لرز اٹھا۔ کنجوس برہمن
گھر میں دو سے تیسرے آدمی کا کھانا نہیں پکنے دیتا تھا؛ اس لیے
گھر میں رینا کے حصے کے چاولوں اور ساگ کے علاوہ کچھ نہ تھا۔
وہ چپکے سے اٹھی اور اپنے حصے کا کھانا ایک برتن میں لے کر مکان
کے پچھلے دروازے پر آئی اور سر جھکائے جاتے ہوئے لاما کو آہستہ
سے پکارا۔ جب وہ قریب آیا تو وہ چاول اور ساگ رینا نے
اس کے کمنڈل میں انڈیل دیا۔ لاما نے ممنونیت بھری نظروں سے
رینا کو دیکھا اور دل ہی دل میں اس کو دعائیں دیتا اپنے راستے
چل دیا۔

لاما کو گئے زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ آسمان پر بادلوں نے
زور زور سے گرجنا شروع کر دیا۔ بجلیوں کی تڑپ تیز ہوئی طوفانی
ہوا کے جھکڑ چلنے شروع ہو گئے۔ ذرا ہی دیر میں موسلا دھار بارش
ہونے لگی۔ برہمن اس وقت مکان کے برآمدے میں بیٹھا تھا کہ
اچانک زور کی بجلی چمکی۔ برہمن کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ اس سے
پہلے کہ وہ کچھ سمجھتا بجلی نے اُسے راکھ کر دیا۔ ساتھ ہی بادلوں کی
خوفناک گڑگڑاہٹ سنائی دی جیسے وہ کنجوس برہمن کو سزا دینے
کے بعد خوفناک آوازیں قہقہے لگا رہے ہوں۔

تھوڑی ہی دیر بعد اس چھوٹی سی بستی میں قیامت مچ گئی۔
بارش کی تیزی بڑھ گئی۔ ایسا لگتا تھا کہ بارش آج برس کر پھر نہ برسے گی۔
آن کی آن میں ہری پہاڑ کی وادی میں بسی ہوئی یہ چھوٹی سی بستی
مکمل طور پر پانی میں ڈوب گئی۔ ایک انسان کے گناہ کی سزا
پوری بستی کو ملی تھی۔ بستی کا نہ کوئی مکان بچا نہ رہنے والا۔ بچی تو
صرف نیک دل رینا۔

ہری پہاڑ کی ایک چوٹی پر بیٹھی ہوئی رینا نے اپنی خوبصورت
بادامی آنکھوں میں موتی جیسے آنسو بھرے یہ دردناک منظر دیکھا۔
کچھ دیر پہلے جہاں ایک سرسبز شاداب قصبہ تھا۔ اب وہاں ایک
لمبی چوڑی جھیل لہریں مار رہی تھی۔ وہی جھیل جسے لوگ اب
ڈل جھیل کے نام سے پکارتے ہیں۔ اس دردناک منظر کو دیکھ کر،
جو اس کے باپ کے گناہ کا نتیجہ تھا۔ اس کے خوبصورت نینوں سے
آنسو بہہ نکلے۔ موتی جیسے شفاف آنسو اس کے گلاب جیسے سرخ
رخساروں سے بہہ بہہ کر جھیل کے پانی میں ٹپکتے رہے اور سفید
کنول کی شکل میں بدلتے رہے۔ وہ اتنا روئی، اتنا روئی کہ آنسو
ختم ہو گئے۔ اور اس کی آنکھوں سے خون ٹپکنا شروع ہو گیا اور

(بقیہ صفحہ ۲۵ پر)

عشرت امیر

چالاک کسان

اپنے گاؤں کی وہ سب سے باتونی عورت تھی، کوئی بھی بات وہ اپنے دل میں چھپا نہیں پاتی تھی، اگر کوئی راز کی بات اُسے معلوم ہو جائے تو وہ اسے پورے گاؤں میں سنا آتی، —— لیکن اس کا شوہر بے حد سمجھدار تھا۔ ایک بار وہ جنگل میں شکار کھیلنے گیا، اس نے ایک گڑھا کھودنا شروع کیا تاکہ بھیڑیا اس میں گر کر پھنس سکے، لیکن وہاں اُسے ملا ایک چھپا ہوا خزانہ، وہ سوچنے لگا، اب کیا کروں! اس خزانے کی بات جیسے ہی میری بیوی کو معلوم ہوگی وہ سارے گاؤں میں کہہ دے گی، اس طرح زمیندار کو پتہ چل جائے گا اور وہ سارے خزانے پر قبضہ کر لیگا۔

وہ سوچنے لگا، سوچتا رہا، اور پھر اس نے ایک ترکیب سوچ لی، پہلا کام اس نے یہ کیا کہ خزانے کو وہیں دبا کر وہاں پر ایک نشان بنا دیا اور اپنے گھر کے لیے چل پڑا، راستے میں اس نے ایک ندی دیکھی، ندی میں جال ڈال کر اس نے ایک مچھلی پھنسائی۔ اس کے بعد اُسے ایک خرگوش ملا —— وہ جال میں پھنسا تھا، اس نے خرگوش کو جال میں سے نکالا، اور اس جال میں مچھلی کو پھنسا دیا۔ پھر وہ خرگوش کو لے کر ندی تک گیا اور وہاں اس نے مچھلی کے جال میں خرگوش کو پھنسا دیا۔

شام ہوتے ہوتے وہ گھر لوٹ آیا۔ گھر پہنچ کر اس نے اپنی بیوی سے کہا۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ تم کچھ پراٹھے بنا دو۔ میرے لیے، آج کی رات میں جنگل میں گزاروں گا سنا ہے وہاں ایک خزانہ نکلا ہے اسی کا پتہ لگاؤں گا۔

بیوی نے خوش ہو کر پراٹھے بنائے، اس کے کسان شوہر نے دو ایک پراٹھے کھائے اور باقی اپنے تھیلے میں رکھ لیے اس کی بیوی نے بھی ساتھ چلنے کی خواہش ظاہر کی، کسان تیار ہو گیا، چلنے کی تیاری میں کسان کچھ زیادہ ہی دیر کرنے لگا۔ بیوی نے کہا اب ہمیں جلدی نکل جانا چاہیے۔ دونوں جنگل کی طرف چل دیئے، کسان آگے آگے تیز تیز قدموں سے چل رہا تھا اور وہ اپنے تھیلے میں سے پراٹھے نکال نکال کر درختوں کی شاخوں پر ٹانگتا جاتا تھا۔

اس کی بیوی نے جب درختوں پر لٹکتے ہوتے پراٹھے تو حیرت سے بولی، . . . ارے دیکھو، ان درختوں پر پراٹھے لگ رہے ہیں۔

اس میں کونسی تعجب کی بات ہے، تم نے شاید پراٹھے برسانے والے بادل نہیں دیکھے۔ کسان نے ایسے کہا جیسے بالکل تعجب نہ ہوا ہو۔

نہیں —— میں نے پراٹھے برسانے والے بادل کبھی دیکھے، اس کی بیوی نے کہا۔

چلو اب ہم اس راستے سے چلیں گے، میں نے ایک

لگایا ہے دیکھتے چلیں، شاید کوئی خرگوش پھنس گیا ہو۔ راہ بدلتے ہوئے اس کا شوہر بولا۔

جب وہ اس جال کے پاس پہنچے، تب کسان نے مچھلی نکالی۔ بیوی پھر بول پڑی . . . "ارے۔ خرگوش کے جال میں مچھلی کہاں سے پھنس گئی ؟"

"ارے تمھیں نہیں معلوم ایسی بھی مچھلیاں ہوتی ہیں جو پانی میں سے نکل کر زمین پر آجاتی ہیں ؟"

"میں نے تو ایسی بات کبھی نہیں سُنی، اگر میں نے اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیا ہوتا تو کبھی یقین نہ کرتی ؟"

پھر وہ دوسرے کنارے پر پہنچے۔ بیوی نے کہا، تمھارا مچھلی کا جال بھی تو یہیں کہیں پڑا ہوگا — چلو اسے بھی دیکھ لیں۔"

مچھلی جال کو دیکھا تو اس میں خرگوش کو پھنسا دیکھ کر بیوی کو پھر تعجب ہوا — وہ حیرت سے بولی، آج یہ سب کیا ہو رہا ہے، مچھلی کے جال میں خرگوش کیسے پھنس گیا ؟"

شوہر ہنس کر بولا — تمھیں نہیں معلوم، پانی میں بھی خرگوش ہوتے ہیں۔

بیوی حیرت سے چپ رہ گئی۔

اب تک وہ اس جگہ پر پہنچ چکے تھے جہاں پر کسان نے نشان لگایا تھا اس نے گڈھا کھود کر برتن نکالا اور اس میں سے جتنا روپیہ پیسہ نکال سکتا تھا نکال لیا۔ خزانہ لے کر وہ اپنے گھر واپس آگئے۔ ان کا راستہ زمین دار کی حویلی کے سامنے سے ہو کر جاتا تھا وہ جیسے ہی گھر کے پاس پہنچے کہ انھیں بھیڑ کے میانے کی آواز سنائی دی، بیوی نے پوچھا — یہ آواز کیسی ہے ؟

اس کے شوہر نے کہا۔ یہ چڑیلیں ہیں جو ہمارے زمین دار کا گلا دبا رہی ہیں۔ اس نے غریبوں پر بے حد ظلم ڈھایا ہے — چلو یہاں سے جلدی بھاگ چلیں۔

وہ دونوں دوڑتے ہوتے اپنے گھر پہنچے — گھر پہنچ کر کسان نے خزانہ چھپا دیا۔ اور سوگیا۔ اگلے دن وہ سو کر دیر سے اٹھا — اس کی بیوی کنوئیں پر پانی بھرنے گئی تو اس نے وہاں تمام عورتوں کو بتا دیا کہ میرے شوہر کو خزانہ ملا ہے۔

ذرا سی دیر میں سارے گاؤں میں خزانہ کی بات پھیل گئی اور پھر یہ اطلاع زمین دار کو بھی ہوگئی۔ زمین دار نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ اس کسان کو فوراً میرے سامنے پیش کیا جائے۔

کسان زمین دار کے پاس پہنچا، تو زمین دار نے کڑک کر پوچھا تمھیں خزانہ ملا ہے۔ اور تمھاری یہ ہمت کیسے ہوئی کہ وہ خزانہ تم نے ہمارے سامنے پیش نہیں کیا ؟۔

کسان نے بھولے پن سے کہا، حضور، کیسا خزانہ ! مجھے تو کوئی خزانہ نہیں ملا۔

زمین دار نے غصہ سے کہا، جھوٹ مت بولو، خود تمھاری بیوی نے سارے گاؤں میں کہا ہے کہ تمھیں خزانہ ملا ہے۔

کیا بتاؤں حضور، وہ تو ایسی ہی باتیں کہتی پھرتی ہے جو سچ نہیں ہوتیں !۔

اب زمین دار نے کسان کی بیوی کو بلایا — کسان کی بیوی سے پوچھا، تو اس نے کہا۔ جی ہاں، میرے شوہر کو خزانہ ملا ہے۔ میں خود اس کے ساتھ رات کو جنگل میں گئی تھی — جنگل میں راستے میں ہمیں ایسے درخت بھی ملے جن کی شاخوں پر پراٹھے لٹک رہے تھے۔

کیا کہا ؟ جنگل میں درختوں پر پراٹھے ؟۔

جی ہاں — وہ پراٹھے برسانے والے بادلوں نے گرائے تھے . . . . اور پھر ہم نے مچھلی کے جال میں خرگوش دیکھا — بعد میں ہم نے خزانہ نکالا اور گھر چلے آئے۔ لیکن جب ہم آپ کی حویلی کے سامنے سے گزر رہے تھے تو ہم نے چڑیلوں کی آوازیں سنیں۔ وہ آپ کا گلا گھونٹ رہی تھیں۔

اس جملہ کو سن کر زمین دار کو غصہ آگیا وہ کڑک کر بولا، کیا بکتی ہے بیوقوف عورت۔ چل بھاگ جا یہاں سے ...

کسان نے کہا دیکھا حضور، میری بیوی نے ساری باتیں غلط

(بقیہ صفحہ ۲۵ پر)

سرینڈرنگار

کیا آپ جانتے ہیں؟

کوئلہ کیا ہے ؟

جو درخت کائی اور ہرے پودے ہزاروں برس پہلے زمین پر پیدا ہوتے تھے زمانہ گزرنے کی وجہ سے پتھروں کی چٹانوں اور مٹی کے نیچے دب گئے۔ زیادہ عرصہ تک دباؤ پڑنے کی وجہ سے انھوں نے سخت ہو کر کوئلہ کی صورت اختیار کرلی۔

پٹرولیم کیا ہے ؟

جس طرح ہرے پودے اور درخت وغیرہ دب کر کوئلہ بن جاتے ہیں۔ اسی طرح پٹرولیم شاید ان جانداروں کے گلنے سڑنے سے پیدا ہوتا ہے جو کسی زمانے میں زمین پر رہتے تھے لیکن چند سائنسدانوں کا خیال ہے کہ یہ نباتات اور حیوانات دونوں کے سڑنے سے پیدا ہوتا ہے۔ پٹرولیم زمین سے نکالا جاتا ہے۔ اٹھارہویں صدی کے آخر میں جب کہ نمک کے چشموں کی تلاش ہو رہی تھی۔ پٹرولیم کا پتہ لگا۔ ۱۸۲۱ء میں ایک شخص منڈل نامی اپنے دوستوں کے ساتھ شکار پر گیا۔ رات کو اسے ایک نمک کے چشمے کے پاس سونا پڑا اتفاقاً اس کی بندوق چل گئی اور گولی زمین کھودتی چلی گئی۔ صبح کو منڈل نے دیکھا کہ زمین میں اس جگہ سے جہاں گولی لگی تھی ایک سخت بدبودار تیل نکل رہا ہے۔ جب اس نے آگ جلائی تو کچھ چنگاریاں اس تیل پر جا پڑیں اور فوراً بہت زور کی آگ بھڑک اٹھی۔ اس واقعہ کے بعد سے لوگوں کو پٹرولیم کی بہت جستجو ہوگئی اور پٹرولیم کے کنوئیں کھودے گئے۔ نیویارک میں ایک کمپنی قائم ہوگئی۔

قدرت زمین جوتنے والے مہیا کرتی ہے

قدرت نے بہت سے ایسے کیڑے پیدا کیے جو تنے میں مدد کرتے ہیں مثلاً کیچوے زمین کی سطح کھا کر اسے جوتتے ہیں۔ ہضم کرنے کے بعد وہ کھائی دوبارہ زمین کی سطح پر لا ڈالتے ہیں۔ اس طرح ہر ایکڑ کیچوے ننھی ننھی سرنگیں بنا دیتے ہیں۔ ان کے ذریعے ہوا داخل ہوتی ہے اور فصل کی نشو و نما کو بڑھاتی ہے۔ اور چیونٹیاں بھی زمین کو جوتنے میں مدد دیتی ہیں۔

بتائیے

(۱) وہ کونسا جانور ہے جس کے سر پر گدھا اور پاؤں ہوں ؟۔
(۲) وہ کونسا چوپایا ہے جس کا سر کاٹ کے چوزے تو ایک پرندہ بن جائے ؟۔
(۳) وہ کونسی چیز ہے جو ہمیشہ گھٹتی رہتی ہے ؟۔
(۴) وہ کونسی چیز ہے جو لمبی تو بہت ہوتی ہے، لوگ چلتے ہیں مگر اس کا سایہ نہیں ہوتا ؟۔
(۵) وہ کونسا پیشہ ور ہے جس کے سر پر تاج ہوتا۔

جوابات :-

(۱) خرگوش (۲) بیل
(۳) عمر (۴) سڑک
(۵) تاجر

یر اندوری

سونے کی اینٹ

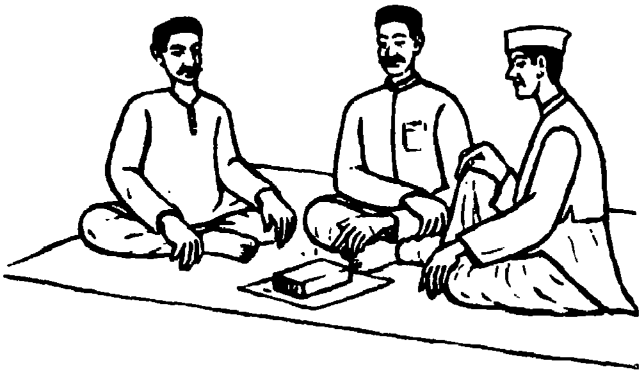

یہ قصہ اُن دنوں کا ہے جب ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر
نے کے لیے آج کی طرح نہ تو موٹر گاڑی تھی نہ ریل گاڑی،
ں کا پتہ تھے اور نہ تیز رفتار ہوائی جہاز۔ لوگ ایک جگہ سے
ری جگہ جانے کے لیے عام طور پر پیدل ہی سفر کرتے تھے
دراز جگہوں پر پہنچنے کے لیے انھیں کئی کئی مہینے تک لگاتار
رنا پڑتا تھا۔ راستے میں انھیں کئی خطروں کا سامنا بھی ہوتا
مثلاً لمبے چوڑے پہاڑوں اور دریاؤں کو عبور کرنا، سنسان
بھیانک جنگلوں سے گزرنا، جنگلی جانوروں، شیر، چیتے،
ڑے، ہاتھی وغیرہ کا مقابلہ کرنا۔

اسی لیے اُس زمانے میں تنہا سفر کرنا بڑا مشکل تھا۔ لوگ
و تین تین کی ٹولی بنا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے۔ دن
اُجالے میں سفر کرتے اور جب سورج ڈھل جاتا تو کسی محفوظ
پر قیام کر کے رات گزارتے۔

اُسی زمانے میں عرب کے ایک چھوٹے سے علاقے میں
ں تاجر ایک ساتھ سفر کے لیے روانہ ہوئے انھیں جس شہر
ں پہنچنا تھا وہ کافی دور تھا۔ اتنا دور کہ اگر پیدل لگاتار سفر کرتے
س فاصلے کو طے کرنے میں انھیں تقریباً ایک ماہ لگ جاتا۔
لیے انھوں نے اپنے ساتھ کھانے پینے کا کافی سامان
لیا تھا۔ لیکن وہ ابھی سفر کا نصف حصہ ہی طے کر پائے تھے
ان کے پاس کھانے کا سامان ختم ہو گیا۔ اسی لیے دن میں ان
لو جب بھی کسی ایسے مقام سے ہوتا جہاں انھیں کھانے پینے
کا سامان مل جائے، وہ سامان خرید لیتے۔

وہ تینوں اپنے اپنے علاقے کے بڑے ہوشیار اور مشہور
تاجر تھے۔ لیکن وہ لالچی اور خود غرض تھے۔ اسی لیے وہ ایک
دوسرے کے ہم سفر ہونے کے باوجود من ہی من میں ایک
دوسرے کو نقصان پہنچانے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔

اتفاق سے ایک دن جب سورج ڈھل رہا تھا وہ تینوں
چلتے چلتے ایک شہر کے نزدیک پہنچ گئے۔ ابھی وہ شہر میں پوری
طرح داخل بھی نہیں ہوئے تھے کہ انھیں ایک کھنڈر کے قریب
سونے کی ایک اینٹ چمکتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ تینوں اس اینٹ
کی طرف تیزی سے لپکے۔ ایک تاجر نے اس اینٹ کو اپنے
ہاتھوں میں اٹھا کر دیکھا۔ اُسے جب اطمینان ہو گیا تو اس نے
وہ اینٹ اپنے دوسرے دونوں ساتھیوں کو دی تاکہ وہ بھی
اسے اچھی طرح پرکھ لیں۔ جب تینوں تاجر پوری طرح مطمئن ہو گئے
تو انھوں نے اس اینٹ کے تین برابر برابر کے ٹکڑے کر کے
آپس میں تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا۔ چونکہ اس وقت وہ تینوں بھوکے
تھے اس لیے انھوں نے طے کیا کہ کھانا کھانے کے بعد سونے
کی اینٹ کو تقسیم کر لیا جائے گا۔ اتفاق سے اس وقت ان
کے پاس کھانا ختم ہو گیا تھا اس لیے ان میں سے ایک تاجر کو
شہر سے کھانا خریدنے کے لیے بھیجا گیا۔ جب ان کا وہ ساتھی بازار
چلا گیا تو باقی دونوں تاجروں نے اپنے دل کے لالچ کو ایک
دوسرے پر ظاہر کیا اور آپس میں طے کیا کہ جب ان کا ساتھی

(بقیہ صفحہ ۲۵ پر)

d. No. D(D-103) Licensed U(D)-50 to post without pre-payment
No. 948/57 at Civil Lines Post Office, Delhi.

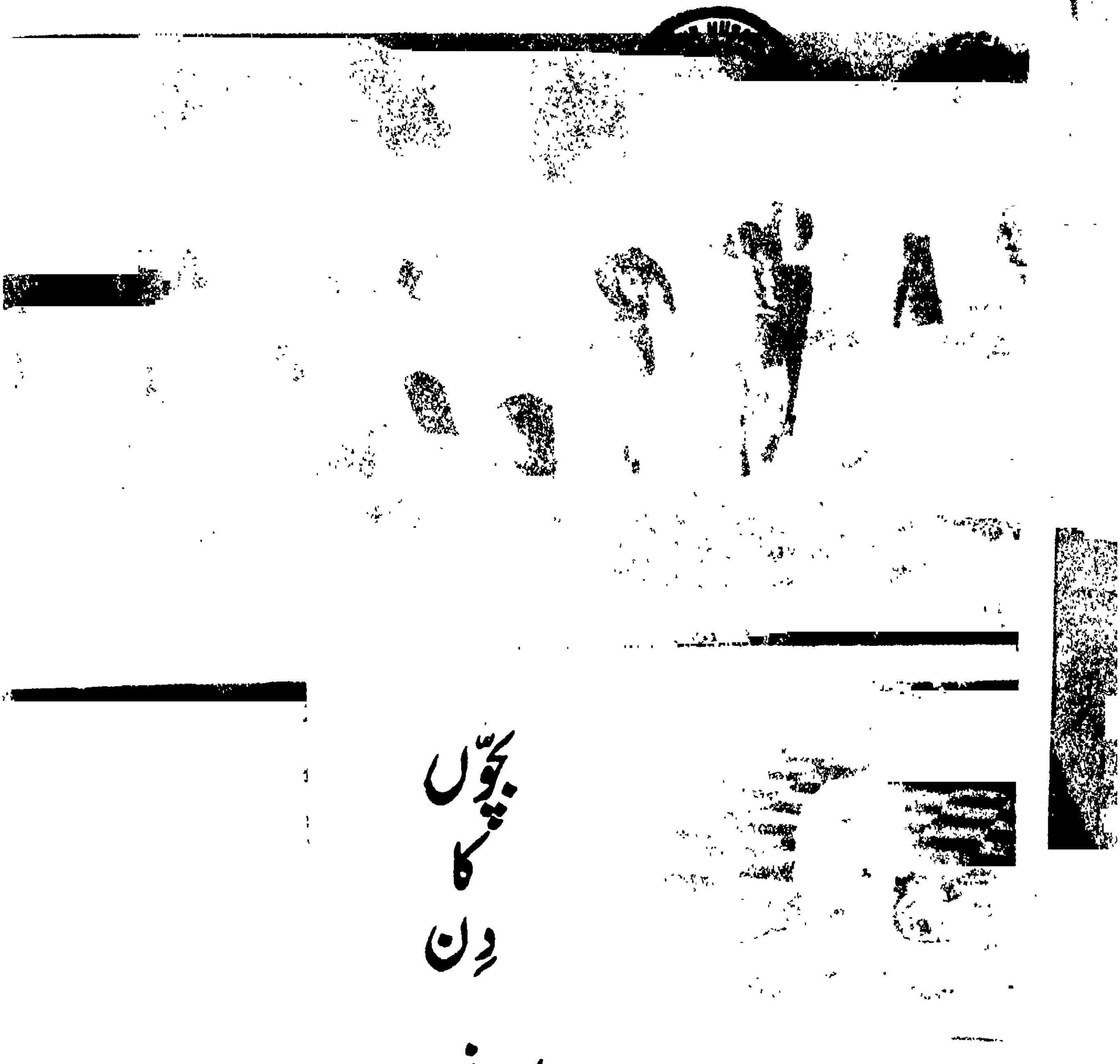

بچوں کا دن

۱۴ نومبر

— ۱۴ نومبر ۱۹۸۰ کو جاری کیا گیا

دیش کا مستقبل

.39 No.5 AJKAL (URDU) SUPPLEMENT DECEMBER, 1980

Published by Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi

جنوری ۱۹۸۱

آجکل

ایک روپیہ

JAMIA NAGAR

١٨٩٥ء — ١٨٩٩ء

ڈاکٹر انصاری
اپنے چچازاد بھائی اصغر یار جنگ
کے ساتھ

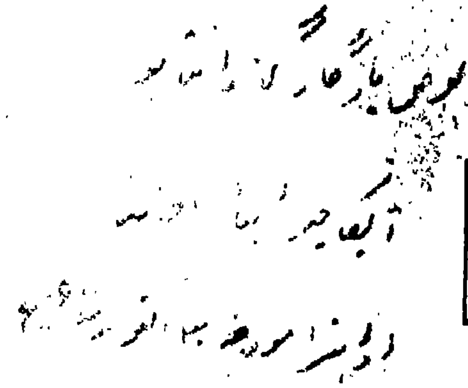

…نبراسے ١٩٠١ء میں اپنی ہمشیرہ کو بھیجی گئی
…تصویر۔ مندرجہ بالا عبارت تصویر کی پشت
…تحریر ہے۔ اس زمانے میں تمام تحریروں میں ڈاکٹر
…انصاری اپنا نام احمد مختار لکھتے تھے۔

شکسپئر کے
ڈرامے اوتھیلو
کے ایک کردار
کے روپ میں

اردو کا مقبول عام مصور ماہنامہ
آجکل
نئی دہلی
انصاری نمبر

ایڈیٹر
شہباز حسین
اسسٹنٹ ایڈیٹر
محمد عادل صدیقی
سب ایڈیٹر
شِو ناتھ سِکہ

جلد ۳۹ شمارہ ۶

جنوری ۱۹۸۱ء

پوسٹ باکس نمبر ۲۰۱۹

فون
۳۸۷۰۶۹

شرح چندہ

	ہندوستان	پاکستان	دیگر ممالک	
انہ	۱۰ روپے	۱۶ روپے	۳ ڈالر	۱٫۵۰ پونڈ
الہ	۱۸ روپے	۲۸ روپے	۵٫۴۰ ڈالر	۲٫۷۰ پونڈ
الہ	۲۵ روپے	۳۸ روپے	۷٫۵۰ ڈالر	۳٫۷۵ پونڈ
اپی	ایک روپیہ	ڈیڑھ روپیہ	۳۰ سینٹ	۱۵ پنی

ترتیب

ملاحظات — ۲
بے داغ شخصیت — اندرا گاندھی — ۳
ڈاکٹر انصاری۔ گاندھی جی کی نظر میں — محمد ثناء اللہ عمری — ۵
ڈاکٹر انصاری۔ پنڈت نہرو کی نظر میں — عدیل احمد — ۹
دارالسلام — خالدہ ادیب خانم — ۱۰
ڈاکٹر انصاری چند یادیں، چند باتیں — محمد مجیب — ۱۲
بیگم شمس النساء اور ڈاکٹر انصاری — زہرا انصاری — ۱۴
ڈاکٹر انصاری — بزرگ و محسن — صالحہ عابد حسین — ۱۷
ڈاکٹر انصاری — کچھ یادیں، کچھ باتیں — حکیم محمد حسین خان شفا — ۱۹
ڈاکٹر انصاری — اڈنبرا سے استنبول تک — عتیق صدیقی — ۲۲
خیر مقدم انصاری (نظم) — شبلی نعمانی — ۳۴
ڈاکٹر انصاری — زمانہ اور شخصیت — مشیر الحسن — ۳۵
ڈاکٹر انصاری کی سیاسی زندگی — مسرت حسین آزاد — ۴۲
ڈاکٹر انصاری — ایک مینارۂ نور — عظیم الشان صدیقی — ۴۴
ڈاکٹر انصاری — ایک مثالی شخصیت — سلیم قدوائی — ۴۸
ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور علامہ اقبال — عبدالقوی دسنوی — ۵۰
امیر قافلۂ انقلاب (نظم) — جاوید وششٹ } ۵۴
قطعات (") — مہدی پرتاب گڑھی }
خطبات ڈاکٹر انصاری — (اقتباس) — ۵۵
مرگ مجنوں پہ ... — اختر الواسع — ۵۹
ڈاکٹر انصاری — ایک نظر میں — قمر جہاں جعفری — ۶۲
گلہائے عقیدت (نظم) — سیدہ شان معراج } ۶۵
بھارت اور قومی یکجہتی (") — صابر شاہ آبادی }

سرورق عمل: گورچرن اروڑہ

شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر آجکل (اردو)، پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترسیل زر کا پتہ
بزنس منیجر، پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ملاحظات

ڈاکٹر مختار احمد انصاری ہمارے ان قومی رہنماؤں میں تھے جنھوں نے بڑے خلوص اور ایمانداری کے ساتھ ہندستان کی آزادی کی جدوجہد میں حصہ لیا اور ہندو مسلم اتحاد کی زبردست کوششیں کیں۔ لیکن افسوس ہے کہ معاصر تاریخ میں ان کا تذکرہ اس حد تک نہیں ملتا جس کے وہ مستحق تھے۔ ہم نے یہ کوشش کی ہے کہ اس خصوصی شمارے کے ذریعے ان کی شخصیت اور کارناموں کو اُجاگر کیا جائے۔ ہماری قومی زندگی میں توازن پیدا کرنے کے لیے یہ بے حد ضروری ہے کہ ایسے تمام افراد، گروہوں اور جماعتوں کے کاموں کا جائزہ لیا جائے جنھوں نے ملک کی آزادی کے لیے کڑیاں جھیلیں اور غلامی کی زنجیروں کو کاٹنے میں اپنی پوری توانائی صرف کردی۔ ایسے لوگوں میں ڈاکٹر انصاری کئی لحاظ سے منفرد ہیں۔ ان کا گھر قومی تحریک کی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ ان کی زندگی اور وقت کا بڑا حصّہ قومی کاموں پر صرف ہوا۔ ان کی اعتدال پسندی نے متعدد موقعوں پر قومی تحریک کو انتشار سے بچالیا۔ اپنی کوششوں میں ناکامیوں کے باوجود وہ کسی ردعمل کا شکار نہ ہوئے۔ ناکامی کو حالات کی مجبوری سمجھا نیتوں کا فتور نہیں مانا اور اس طرح ایک نہایت صحت مند عنصر بن کر ہندستانی سیاست کی بیماریوں کا علاج کرتے رہے۔ ایک ڈاکٹر کی نظر، بعائیت، قوتِ برداشت اور سائنسی تجزیہ ان کی شخصیت کے لازمی جز رہے۔ انھیں کامیابی بھی ہوئی انھوں نے حالات کے دھارے کو موڑا، مگر وہ تاریخ کے فیصلے کو نہ بدل سکے۔ یہ صرف ان کا نہیں پوری ہندستانی سیاست کا المیہ ہے۔

ڈاکٹر انصاری کی ہمہ جہت شخصیت کا حق آج کل کے ایک خصوصی نمبر سے ادا نہیں ہوسکتا۔ ضرورت ہے کہ ان پر کتابیں لکھی جائیں، ان کی شخصیت، اس زمانے کے حالات اور ان کے سیاسی رول کا بھرپور جائزہ لیا جائے۔ اور نئی نسل کو ان کے کارناموں سے واقف کرایا جائے۔

شریمتی اندرا گاندھی وزیر اعظم ہند نے ۲۶ مارچ ۱۹۸۰ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں انصاری صدی تقریبات کا افتتاح کیا تھا، ۲۵ دسمبر ۱۹۸۰ء کو محکمۂ ڈاک و تار، حکومتِ ہند کی طرف سے ایک خصوصی ٹکٹ کا اجرا کیا گیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ تاریخ کی طرف سے ایک سیمینار کا انعقاد ہوا۔ نیشنل آرکائیوز اور جواہر لال نہرو میوزیم کی طرف سے نمائشیں لگائی گئیں۔ قومی سطح پر یہ سرگرمیاں ان کی خدمات کا ہی اعتراف ہیں۔

اس خصوصی نمبر کی تیاری میں ہمیں عتیق صدیقی صاحب کی رہنمائی اور مدد ہر موقع پر حاصل رہی۔ ہم ان کے ممنون ہیں۔ تصویریں ہمیں شہاب الدین انصاری لائبریرین، ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری جامعہ ملیہ اسلامیہ، جواہر لال نہرو میوزیم نئی دہلی اور خورشید الحق انصاری یوسف پور (غازی پور) کی عنایت سے ملیں۔ ہم ان کے بھی شکر گزار ہیں۔

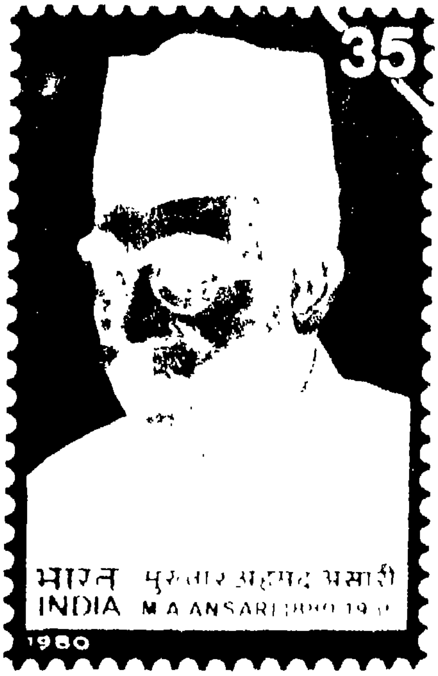

یادگاری ٹکٹ

بچوں کا ضمیمہ

ہمیں خوشی ہے کہ بچوں کے سہ ماہی ضمیمہ کو بے حد پسند کیا جارہا ہے، قارئین کی پسندیدگی کے پیشِ نظر ۱۹۸۱ء میں بھی بچوں کا سہ ماہی ضمیمہ شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

یوجنا (بنگلا ایڈیشن) کو انعام

پبلیکیشنز ڈویژن کی طرف سے پلاننگ کمیشن کا ترجمان یوجنا ہندستان کی کئی علاقائی زبانوں میں شائع ہوتا ہے "دھن دھانیہ" بنگلہ زبان میں شائع ہوتا ہے اس رسالہ کو چھپائی اور ڈیزائن کے لحاظ سے قومی اعزاز دیا گیا ہے۔

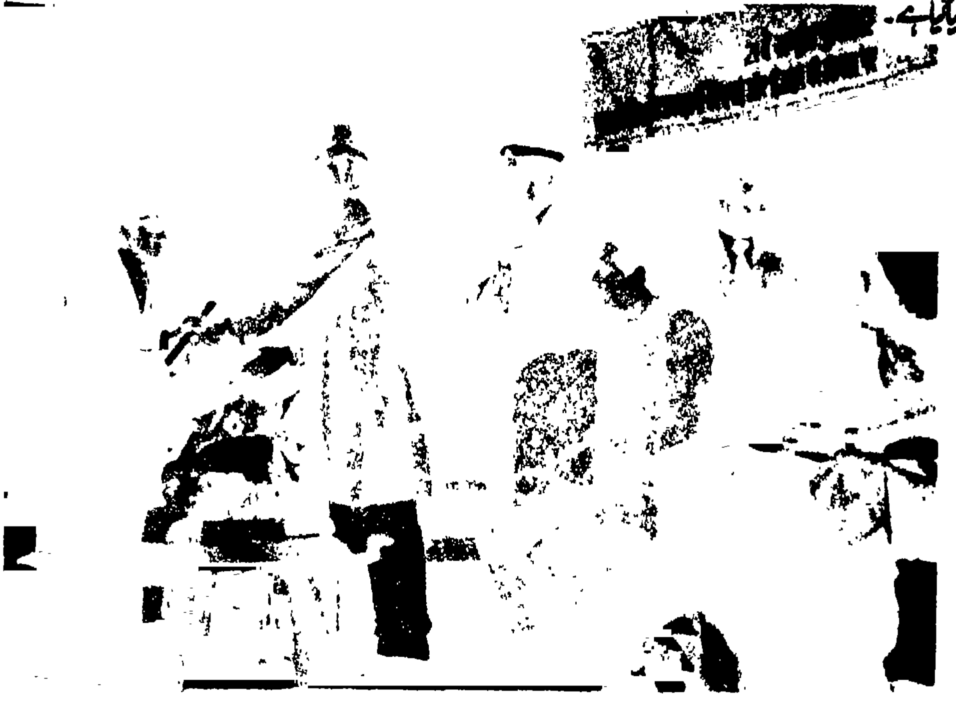

تصویر میں: ۲۹ نومبر ۱۹۸۰ء کو وگیان بھون نئی دہلی میں منعقدہ ایک تقریب میں شری بی۔ ایل۔ ساہا اسسٹنٹ ایڈیٹر "دھن دھانیہ" کو صدر جمہوریہ ہند "سرٹیفکیٹ آف میرٹ" عطا کر رہے ہیں۔

اندرا گاندھی

بے داغ شخصیت

۲۶ مارچ ۱۹۸۰ء کو
جامعہ ملیہ اسلامیہ
نئی دہلی میں وزیر اعظم
ہند شریمتی اندرا گاندھی
نے ڈاکٹر انصاری کی
صد سالہ تقریب کا
افتتاح کیا تھا۔
ذیل میں ان کی
تقریر کا اردو ترجمہ
پیش کیا جا رہا ہے۔

" میرے لیے یہ فخر کی بات ہے کہ مجھے اس تقریب میں شریک ہو کر ملک کی جدوجہدِ آزادی کے ایک درخشندہ ستارے کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کا موقع ملا۔ اس کا ایک اور سبب بھی ہے جو زیادہ تر ذاتی نوعیت کا ہے۔ ڈاکٹر انصاری، میرے دادا اور میرے والد کے بہت قریبی دوست اور رفیق تھے۔ ایک طرح سے وہ ہمارے خاندان کے فرد تھے۔ وہ میرے بچپن کی یادوں کا ایک حصہ ہیں۔

چوں کہ ڈاکٹر انصاری اس ادارے کے بانیوں میں تھے لہٰذا اس تقریب کا اس جگہ انعقاد بہت مناسب ہے۔

گذشتہ ہفتے مجھے دارالعلوم دیوبند کے صد سالہ جشن میں شرکت کا موقع ملا۔ ہماری قومیت کے سمندر میں ایسے بہت سے دھارے شامل ہیں جن کے سوتے دوامی اور مستقل نوعیت کے ہیں۔ دارالعلوم بھی ایک ایسا ہی سرچشمہ ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ اس سلسلے کی دوسری کڑی ہے۔ یہ ادارہ ہمیں اس لیے عزیز ہے کہ اس کا تعلق مہاتما گاندھی حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، مولانا آزاد اور ڈاکٹر ذاکر حسین سے رہا ہے۔

ڈاکٹر انصاری صفِ اول کے رہنماؤں میں تھے۔ اپنی جوانی ہی میں انھوں نے طبی پیشے میں انتہائی ممتاز مقام حاصل کر لیا تھا۔ گاندھی جی کی تحریک کی خصوصیت یہ بھی تھی کہ نہ صرف مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والے باکمال لوگوں نے اس میں کشش محسوس کی بلکہ ان کے ساتھ ساتھ معمولی اور گمنام لوگ بھی اس میں کھنچتے چلے آئے۔ ایک طرف انتہائی ممتاز و معروف دانشور تھے تو دوسری طرف سادہ دل انسان۔ میرے دادا اور شری سی۔ آر۔ داس نے مہاتما گاندھی کے ساتھ کام کرنے کے لئے اپنی اپنی وکالت چھوڑی۔ ڈاکٹر انصاری جو اپنے پیشے میں غیر معمولی مہارت اور شہرت رکھتے تھے، ستیہ گرہی بن گئے۔ وہ تحریک خلافت کے سرکردہ رہنماؤں میں تھے۔ انھوں نے دلی پردیش کانگریس کی بنیاد ڈالی۔

کانگریس کے اندرونی حلقوں میں ان کے مشوروں کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ وہ انڈین نیشنل کانگریس کے صدر بنائے گئے اور اس طرح نوآبادیاتی نظام کے دوران قوم نے انھیں وہ اعلیٰ ترین اعزاز بخشا جو اس کے بس میں تھا۔

ان کی شخصیت بے داغ تھی۔ اپنی زندگی میں وہ ہندو، مسلمانوں

روایت اور جدت، قدیم اور جدید کے درمیان ایک پل کا کام دیتے تھے۔

میرے ذہن میں ابتدائی دور کی بہت سی یادیں ابھر رہی ہیں۔ مجھے دلی میں ان کا مکان یاد ہے۔ یہی وہ گھر تھا جہاں گاندھی جی کے ساتھ میرا وہ فوٹو لیا گیا جو بہت مشہور ہے۔ یہ ۱۹۲۴ یا ۱۹۲۵ کی بات ہے جبکہ گاندھی برت رکھے ہوئے تھے۔ (فوٹو نیچے)

ڈاکٹر انصاری ہر طرح کی تنگ نظری سے پاک تھے اور ان کی

مہمان نوازی ضرب المثل بن گئی تھی۔ وہ بڑوں اور چھوٹوں کو یکساں عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ہر سچا قومی کارکن ان کا معزز مہمان تھا۔

حالیہ برسوں میں ہم نے بہت سی صد سالہ تقاریب منائی ہیں۔ جیسے تلک، گوکھلے، موتی لال نہرو، ٹیگور، شری اروبندو، مہاتما گاندھی اور سردار پٹیل، پچھلے سال سروجنی نائیڈو کا صد سالہ یوم پیدائش منایا گیا۔ اس سال ڈاکٹر انصاری اور منشی پریم چند کی صد سالہ تقاریب کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ یہ فہرست بہت طویل ہے کیوں کہ انیسویں صدی کا دوسرا حصہ خاص طور سے ایک ایسا دور رہا ہے جس میں ممتاز و معروف افراد پیدا ہوئے جن میں مرد اور عورتیں دونوں ہی شامل ہیں۔

صد سالہ تقاریب کا اہتمام ان عظیم ہستیوں کو کوئی نیا اعزاز دینا نہیں ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں کام کیا، شہرت پائی اور ہمارے لیے ایک بیش قیمت ورثہ چھوڑ گئے۔

یہ صد سالہ تقاریب ان کے لیے نہیں بلکہ ہمارے لیے ہیں۔ یہ اس لیے بھی ہیں کہ ہم ان سے فیضان حاصل کر سکیں اور اپنے ملک و قوم کے شایان شان بن سکیں۔ اپنے ملک کے نامور بیٹوں اور بیٹیوں کے لیے ظاہری یادگاریں قائم کرنا، مجسمے نصب کرنا یا ان کے نام پر کسی عمارت یا سڑک کا نام رکھ دینے کے مقابلے میں زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ایسے موقعوں پر ہم اپنے دلوں کو ٹٹولیں اور باطنی قوت حاصل کریں۔

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ڈاکٹر انصاری کی تحریروں کی ایک جلد اور ان کی ایک سوانح حیات شائع کی جائے گی۔ مجھے امید ہے کہ ان کتابوں کے ذریعے سے نئی نسل کو ان عظیم شخصیتوں سے روشناس ہونے کا موقع ملے گا جن کے سہارے وہ آگے بڑھ رہی ہے۔

آج ہمیں ایک بار پھر ڈاکٹر انصاری کی خدا ترسی اور انسانیت، قومی خدمت کے لیے خود کو وقف کر دینے کا جذبہ، مذہبی جنون سے منزہ اور پاک و صاف ہونا۔ دیگر مذاہب اور پیشوں کے لوگوں کے لیے بے حد احترام اور نیک دلی کی ضرورت ہے جن کے وہ مظہر تھے۔

ڈاکٹر انصاری

گاندھی جی کی نظر میں

ترجمہ و ترتیب
محمد ثناء اللہ عمری

گاندھی جی ڈاکٹر انصاری سے دس بارہ برس بڑے تھے۔ مگر دونوں کے باہمی روابط انتہائی بے تکلفانہ اور مخلصانہ تھے۔ سیاسیات سے ہٹ کر ان عظیم رہنماؤں کے مابین ذاتی تعلقات بڑے گہرے تھے۔ ملک کے بے شمار مشاہیر کے ساتھ گاندھی جی بھی انصاری صاحب کی شاندار کوٹھی واقع دریا گنج دہلی میں فروکش رہتے تھے۔ ان دونوں کا باہمی تعلق مریض اور معالج کا بھی تھا۔ اس رشتے کی استواری کا یہ حال تھا کہ گاندھی جی نے انصاری صاحب کو ایک خط میں لکھا تھا:

"آپ کے ذمہ میرا ایک طبی معائنہ باقی ہے، مگر یہ پیشہ ورانہ معائنہ نہیں، کیونکہ آپ ابھی ابھی انگلستان سے واپس ہوئے ہیں اور جو ڈاکٹر "لندن پلٹ" ہو اس کی معائنہ فیس ایک ہزار روپیہ ہے۔"

گاندھی جی پونا میں غالباً علیل تھے اور کہا تھا کہ میں ڈاکٹر انصاری کی گود میں سر رکھ کر جان دینا چاہتا ہوں، تار سے اس غیر معمولی خواہش کی اطلاع پاکر ڈاکٹر انصاری نے سروجنی نائیڈو کے نام اپنے جوابی تار میں کہا تھا:

"میں گاندھی جی کو مرنے نہیں دوں گا، جلد از جلد پونا پہنچ رہا ہوں۔"

گاندھی جی فرمایا کرتے تھے کہ مجھے صرف اپنی روحانی صحت کی فکر ہے۔ رہی جسمانی صحت تو اس کے ذمہ دار ڈاکٹر انصاری، ڈاکٹر جیوراج مہتہ اور ڈاکٹر بی سی رائے ہیں: فرماتے تھے کہ انصاری صاحب مجھے محبت و یگانگت کے ایسے رشتے میں مربوط کئے ہوئے ہیں جو سخت سے سخت کشیدگی کا متحمل ہو سکتا ہے۔

سنہ ۱۹۲۴ء میں ڈاکٹر انصاری کو صدر کانگرس بنانے کی تجویز تھی، گاندھی جی رقمطراز ہیں:

"جب میں نے ڈاکٹر انصاری کا نام لیا تو ایک دوست نے کہا کہ (اگر وہ صدر چن لیے گئے) تو چار سال کے عرصہ میں چوتھے مسلمان صدر ہوں گے۔ یہ میرے لیے کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ ہندو بھائی ایک مسلمان کو صدر بنا کر ہندو مسلم اتحاد کے لیے اپنی گہری خواہش کا اظہار کریں۔ ڈاکٹر انصاری اُن گنے چنے غیر جانبدار رہنماؤں میں ہیں جو ہمیں دونوں فرقوں میں دستیاب ہو سکتے ہیں۔ ہندو مسلم نقطۂ نظر سے بھی ڈاکٹر انصاری کا انتخاب بہترین ثابت ہو سکتا ہے۔"

مگر انصاری صاحب اس سال صدر نہ ہو سکے۔

سنہ ۱۹۲۷ء کی بات ہے، محمد علی جناح اور راجہ آف محمود آباد نے سروجنی نائیڈو کو ہموار کر لیا تھا کہ ڈاکٹر انصاری کے بجائے موتی لال نہرو کانگرس کے صدر چن لیے جائیں، سروجنی نے اس سلسلے میں گاندھی جی کو لکھا، گاندھی جی جواباً تحریر فرماتے ہیں:

"میں یہ رائے نہیں رکھتا کہ آئندہ سال کے لیے ہمیں ایک ہندو مطلوب ہے، اس کے برعکس پیش نظر مقصد ہی کی خاطر ڈاکٹر انصاری سے بڑھ کر کوئی دوسرا نہیں ہے۔ ایک وہی ہیں جو ہندو مسلم معاہدہ کو کانگریس کی طرف سے مرحلۂ تکمیل کو پہنچا سکتے ہیں، ان کا انتخاب عام طور پر قابل قبول ہوگا۔ ہندو ان کے وفادار رہیں گے اور یہ حقیقت کہ کانگریس میں ہندو بہت بڑی تعداد میں شریک ہیں — اس بات سے مابہ النزاع نہیں ہو جاتی کہ ایک مسلمان اس کا صدر ہے۔"

اسی ضمن میں موتی لال نہرو کو یوں لکھتے ہیں:

"میں نے ان (سروجنی) سے بھی کہا ہے کہ میں نہیں سمجھتا کہ صدارتی کرسی پر ان (انصاری) کا براجمان ہونا اس تصفیہ کی وقعت کو گھٹا دیگا جس پر کانگریس پہنچے گی۔ میرے خیال میں اگر ڈاکٹر انصاری چن لیے گئے تو کانگریس سے ایک معقول

تصفیہ کا زیادہ امکان ہے۔"

آگے فرماتے ہیں :

"فی الوقت ہمیں ڈاکٹر انصاری کو مجبور کرنا چاہیے کہ وہ ذمہ داری سنبھالیں۔ وہ فرقہ پرستوں کو قابو میں نہیں لائیں گے بلکہ انھیں اپنی مرضی پر چھوڑ دیں گے، البتہ وہ ہندو مسلم مسئلہ کی طرف خصوصی توجہ مبذول کریں گے اور اس بارے میں ضرور کچھ نہ کچھ کر گزریں گے۔ آئندہ سال کے لیے اس لاینحل مسئلے کے حل کا کام ان کے لیے بہت کافی ہوگا۔"

ایک قدرے طویل تحریر اس بات پر کافی اور وافی روشنی ڈالتی ہے کہ انصاری صاحب کو گاندھی جی کس نظریہ سے دیکھتے تھے۔ فرماتے ہیں :

"آئندہ سال کے لیے قومی اسمبلی کے صدر کی حیثیت سے ڈاکٹر انصاری کا انتخاب ایک طے شدہ بات ہے۔ قومی سطح پر کوئی مائی کا لال ایسا نہیں ہے جو اس انتخاب میں چوں و چرا کر سکے۔ ڈاکٹر انصاری جتنے اچھے مسلمان ہیں اتنے ہی اچھے ہندوستانی بھی ہیں۔ ان کے متعلق تعصب کا شبہ کبھی نہیں گزرا، سالہا سال سے وہ مسلسل کانگریس کے شریک معتمد چلے آرہے ہیں، ہندو مسلم اتحاد کی راہ میں ان کی جدوجہد سب کو معلوم ہے، واقعہ یہ ہے کہ اگر میں بلگام میں، سروجنی نائیڈو کانپور میں اور سری نواسن آینگار گوہاٹی میں حارج نہ ہوئے ہوتے تو ڈاکٹر انصاری ان میں سے کسی بھی موقع پر منتخب ہو گئے ہوتے۔ کیونکہ جب مندرجہ بالا انتخابات ہوئے تو انصاری کا نام ہر شخص کی زبان پر تھا، مگر خصوصی اسباب نے ان کے انتخاب کو معرض التوا میں رکھا، تاکہ وہ ایسے وقت آئیں جب ان کی ضرورت سب سے زیادہ ہو۔ اگر ہندو مسلم اتحاد کی کوئی ممکن تجویز دونوں جماعتوں کے لیے قابل قبول ہو تو بلاشبہ ڈاکٹر انصاری ہی وہ شخص ہیں جو ایسی اسکیم کو کانگریس کی طرف سے پیش کر سکتے ہیں، لہٰذا میں پورا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے اس نقطۂ نظر سے اختلاف کرتا ہوں کہ ہندو اکثریت والی کانگریس پارٹی میں ہندو ہی صدر رہے تاکہ اس قبیل کی کسی اسکیم کے متعلق یہ دعویٰ کیا جا سکے کہ وہ ہندوؤں کو پورے شرح صدر کے ساتھ منظور ہے، اس کے برعکس ملک کی عام زہریلی فضا کے باوجود ایسی کسی اسکیم کے نفاذ کے لیے اس سے بڑھ کر نیک شگون نہیں ہو سکے گا کہ ایک قومی انجمن جس کی بھاری اکثریت ہندو ہو بلا مقابلہ اور شرح صدر کے ساتھ ایک مسلمان کو صدر منتخب کرے۔ یہ حقیقت بجائے خود اس بات کا ثبوت ہوگی کہ ہندو ایسے اتحاد کے خلوص دل سے خواہاں اور جویاں ہیں اور سارے مسلمان قوم پرست لیڈروں میں مسلمانوں کی نظر میں ڈاکٹر انصاری سے بڑھ کر قابل احترام شخص موجود نہیں ہے۔ اس واسطے میری رائے میں ہر لحاظ سے یہ بات مناسب ہے کہ ڈاکٹر انصاری آئندہ سال کے دوران نیشنل کانگریس کی رہنمائی کریں۔ اس قسم کی کسی اسکیم کی منظوری ہی مطلوب نہیں ہے، دونوں جماعتوں سے اس کی منظوری سے زیادہ اس پر صحیح خطوط پر عملدرآمد ضروری ہے۔ فرض کیجیے، اس قسم کی تجویز منظور ہو گئی، اس کے نفاذ کے لیے انتھک نگرانی ضروری ہوگی، ڈاکٹر انصاری اس کارگزاری کے لیے سب سے زیادہ مناسب شخص ہیں، لہٰذا میں امید کرتا ہوں کہ ساری ریاستیں اس سب سے اونچے اعزاز کے لیے جو قوم کا ایک تحفہ ہے باتفاق آرا، ڈاکٹر انصاری کے نام کی سفارش کریں گی۔"

گاندھی جی ڈاکٹر انصاری کی بے لوثی اور بے غرضی کی شہادت کس طرح کھل کر دیتے ہیں! فرماتے ہیں :

"مجھے نہیں معلوم کہ ڈاکٹر انصاری کسی مسئلے سے اتنی گہری وابستگی دلچسپی اور مشغولیت رکھتے ہیں جیسی فرقہ وارانہ مسئلے سے رکھتے آئے ہیں، انھیں اپنے پیشے سے محبت ہے اور اسی کے ہو رہنے پر قانع ہیں۔ اگر ہم انھیں سیاسی میدان میں حتیٰ کہ صدر کانگریس کی حیثیت سے دیکھ رہے ہیں تو اس لیے کہ دوستوں نے گھیر گھار کر انھیں اس منصب کے لیے آمادہ کیا ہے، ایسے شریف النفس، محب وطن ہیں کہ اپنے دوستوں کی خواہش کو مسترد نہ کر سکے۔ فرقہ وارانہ مسئلے کا حل ان کی اولین خواہش ہے، خدا کرے، یہ کوششیں بارآور ہوں، بڑی سے بڑی خوبیاں بھی رونما ہونے سے پہلے ضرور ہی انسانی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔"

آخر ڈاکٹر انصاری اجلاس کانگریس منعقدہ مدراس ۱۹۲۷ء کے صدر چن لیے گئے، اس انتخاب کے بعد گاندھی جی نے ملک کو یوں خطاب کیا :

"استقبالیہ کمیٹی نے بلا مقابلہ ملک کے ایک تجربہ کار اور منجھے ہوئے خادم کا انتخاب کیا ہے کہ وہ اس اجلاس کی صدارت کرے، وہ اس منصب کا جائزہ ایک ایسے مقصد سے حاصل کر رہے ہیں جو خود انھوں نے اپنے سامنے رکھا ہے، ڈاکٹر انصاری ایک سرجن ہیں اور ان بہترین سرجنوں میں شمار ہوتے ہیں جو ہندوستان نے پیدا کیے ہیں، چونکہ وہ ایک سرجن ہیں انھوں نے تہیہ کر لیا ہے کہ ہندو مسلم تعلقات کی شکستگی کی مرہم پٹی کریں گے، میں جانتا ہوں کہ بہت سی ریاستی کانگریس کمیٹیوں نے ڈاکٹر انصاری کے حق میں ووٹ دیے ہیں، اس

امید پر کہ ان کی صدارت گہرے زخموں کو مندمل کر دے گی، مگر ہم یہ فرض کر لینے کی غلطی نہ کریں کہ چونکہ ہم نے انھیں صدر منتخب کر لیا ہے ہمارا فرض پورا ہو گیا۔ ایک مریض کا فرض محض اس طرح پورا نہیں ہوتا کہ وہ اپنے علاج معالجے کے لیے سب سے عقلمند اور بہترین ڈاکٹر سے رجوع ہو، اس سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنے ڈاکٹر کے ساتھ دل و جان سے تعاون کرے گا اور ڈاکٹر کی دی ہوئی ہدایتوں کا پابند رہے گا، ہم مریض ہیں، ڈاکٹر انصاری ہمارے سرجن ہیں، انھیں ہم نے طلب کیا ہے جو کام انہوں نے اپنے سر لیا ہے اس میں اگر ہم ان کا بھرپور تعاون نہیں کرتے تو غلطی ان کی نہیں ہماری ہے۔"

صدارتی انتخاب کے بعد خطبۂ صدارت کی باری آتی ہے، ڈاکٹر انصاری نے ایک ماہر جراح کی طرح وقت کے مسائل کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا اور صورت حال کی بہتری کے لیے مفید مشورے دیئے۔ اس کے متعلق گاندھی جی کی رائے سنئے، فرماتے ہیں:

"ڈاکٹر انصاری کے خطبۂ صدارت کی خاص خوبی ہندو مسلم اتحاد کے لیے ان کی شدید خواہش ہے، انھیں معلوم تھا کہ ان سے اس خواہش کے اظہار کی توقع ہے، اگر کوئی فرد واحد یہ کام کر سکتا تھا تو وہ بلاشبہ انصاری ہی تھے، انہوں نے قوم کی طرف سے بطور تحفہ سب سے اونچا اعزاز اس لیے قبول کیا کہ انھیں قوم پر نصب العین پر اور اپنے آپ پر اعتماد تھا، بلاشبہ اپنی تمنا کے حصول میں انھوں نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، قسمت نے ان کا ساتھ دیا۔"

نہرو رپورٹ پر غور و خوض کے لیے لکھنؤ میں ایک اجلاس ہوا، ڈاکٹر انصاری اس کے روح رواں تھے، گاندھی جی نے اپنے رفیق کار کو ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا ہے:

"ان (موتی لال نہرو) کے نام کے ساتھ ڈاکٹر انصاری کے نام کا اضافہ ہونا چاہیئے، ہر شخص دیکھ سکتا تھا کہ کتنا کہ کتنا کہ جرأت اور سلیقہ سے انھوں نے مختلف پارٹیوں کے پیروؤں کو متحد رکھا، تاہم گذشتہ چند مہینوں سے جو کام وہ پس پردہ انجام دے رہے تھے اس کا علم بہت کم لوگوں کو ہے، کامیابی ناممکن ہوتی اگر ڈاکٹر انصاری ضرورت کے وقت نہرو کمیٹی کی حمایت کے لیے کھڑے نہ ہوتے۔ مسلمانوں کو ان سے جو محبت تھی اس سے انھوں نے پورا فائدہ اٹھایا، کسی بھی ہندو کے لیے ناممکن تھا کہ ان کی پرجوش حب الوطنی کو چیلنج کرے۔ اس طرح وہ سب کا اعتماد حاصل کر سکے۔"

ڈاکٹر انصاری کو گاندھی جی کا کس قدر اعتماد حاصل تھا، ذیل کے واقعے سے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ۱۹۳۱ء میں وائسرائے لارڈ اِرون نے وعدہ کیا تھا کہ گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے کانگریس کی طرف سے گاندھی جی، مالویہ جی اور سروجنی نائیڈو کے علاوہ ڈاکٹر انصاری کو بھی نامزد کیا جائے گا، مگر مسلم لیگ کے دباؤ میں آکر وائسرائے نے ڈاکٹر انصاری کو نامزد کرنے سے انکار کر دیا۔ گاندھی جی نے اس صریح وعدہ خلافی پر زوردار احتجاج کیا۔ اور یہاں تک کہہ دیا کہ میں خود بھی کانفرنس میں شرکت نہیں کروں گا، تاہم انھوں نے اپنے موقف پر نظر ثانی کی۔ کانفرنس میں شریک ہوئے۔ گاندھی جی کا خیال تھا کہ اس کانفرنس میں ان کی تقریر صدا بصحرا ثابت ہوئی، اگر انصاری شریک ہوتے تو مسلم اقلیت کے مسائل پر ان کی آواز بڑی مؤثر ہوتی۔

اس انتہائی یگانگت کے باوجود گاندھی جی جہاں اور جب مناسب سمجھتے اوروں کی طرح انصاری صاحب کو بھی برملا ٹوکتے تھے۔ انصاری صاحب میں یہ طبعی شرافت تھی کہ اس کا برا نہیں مانتے تھے۔ درج ذیل مکتوب اسی ضمن کی ایک دستاویز ہے:

انصاری کے نام خط

بنگلور
۱۰ر اگست ۱۹۲۷ء

پیارے ڈاکٹر انصاری

میں نے آپ کا دھماکہ خیز بیان دیکھا، امکانی حد تک پنڈت جی اور میں نے اس پر طویل گفتگو کی۔ آپ کا بیان میرے لیے حیرت انگیز نہیں ہے، ہمارا گردوپیش اس قدر ہمت شکن اور مردہ ہے کہ ہم میں سے بڑے سے بڑا آدمی بھی وقتی طور پر بدحواس ہو جاتا ہے، ظاہر ہے کہ آپ اسی گھٹن کا شکار ہیں، یہ آپ کی غلطی نہیں، جس طرح میں خواجہ صاحب سے ان کے شاندار تو تو میں میں سے انحراف کے باوجود کہہ سکا کہ میں اب بھی انھیں عزیز رکھتا ہوں اسی طرح اس مسلمہ فروگذاشت کے باوجود آپ سے بھی یہی کہتا ہوں۔ میں نے مسلمہ کہا، اس لیے کہ آپ بدستور عدم تعاون پر یقین رکھتے ہیں، مگر آپ کے خیال میں صورت حال مختلف طریق کار کی متقاضی ہے، اور آپ اپنی دانست میں یہ سمجھتے ہیں کہ طریق کار کا اختلاف جلد از جلد عدم تعاون پر منتج ہوگا۔ میں اسے تسلیم نہیں کرتا، جو بات آپ کے لیے فطری ہے اس پر آپ کو عمل پیرا ہونا چاہیئے۔ مگر میرا مشورہ یہ ہے کہ یہ خیالات اپنی حد تک رکھیئے، ان کی اشاعت کسی بھی عنوان سے آپ کے لیے لازمی نہیں ہے۔

اگر میرا مطالعہ صحیح ہے تو آپ سے اور مجھ سے بلکہ مجھ سے زیادہ آپ سے اس کی امید نہیں کی جاتی کہ اسمبلی اور کونسل پروگرام اور دستور سازی وغیرہ بیکار چیزوں سے متعلق گفت و شنید میں حصہ لیں گے۔ لہٰذا میں سمجھتا ہوں کہ آپ خدا کے حضور اور ہندوستانیوں کے حق میں کسی غلطی کا ارتکاب نہیں کریں گے۔ اگر آپ اعلان کر دیں کہ ان معاملات سے متعلق آپ کوئی رائے

نہیں رکھتے جو ماہرین وسیاست دانوں کے غور وخوض کے لیے چھوڑ دینے چاہئیں، مجھے یقین ہے کہ آپ یہ نہیں سمجھتے ہوں گے کہ چلو کانگریس کی صدارت کے لیے آپ کے نام کی تحریک اس بنا پر کی کہ آپ کو میں ایک نمایاں سیاسی مفکر وغیرہ خیال کرتا تھا۔ ملک نے بیک وقت آپ کے انتخاب کو اس وجہ سے سراہا ہے کہ آپ ایک سچے اور اچھے مسلمان ہیں، محب وطن ہیں، آپ میں مکر وفریب نہیں ہے، آپ اپنے حدود اربعہ سے واقف ہیں، ٹھنڈے دل ودماغ کے مالک ہیں۔ اس سے بڑھ کر اس وجہ سے کہ ہندو مسلم اتحاد آپ کی ایک شدید خواہش ہے۔ اس بارے میں آپ ایسے نظریات رکھتے ہیں جن میں ملک خوشی کے ساتھ آپ کا شریک وسہیم ہے۔ اور آپ کی خواہش ہے کہ شریک رہے اور جنھیں آپ ہر قیمت پر نافذ کریں گے چاہے اس راہ میں جان کی بازی لگا دینی پڑے۔

گرد وپیش کی دیوانگی کے باوجود آپ کا انتخاب اس بات کا ثبوت ہے کہ ملک خانگی امن کا پیاسا ہے۔ اور یہ کہ وہ اس مکر وفریب، بداخلاقی، تشدد سے تنگ آگیا ہے جن کا مذہب کے مقدس نام پر ارتکاب کیا جاتا ہے۔

اس بنا پر میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اپنے بیان کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالیئے، اپنی رائے اپنی حد تک رکھیئے، انتخاب کو خوش اسلوبی، وقار اور شکریے کے ساتھ قبول کر لیجئے، اور اعلان کر دیجئے کہ آپ ملک کے لیے اپنی کوئی ذاتی سیاسی پالیسی نہیں رکھتے۔ جہاں تک ان مسائل کا تعلق ہے آپ بالکل منصفانہ اور غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کریں گے۔ کانگریس کی نشستوں کی کارروائی کو باقاعدگی کے ساتھ انجام دیں گے، نظم وضبط برقرار رکھیں گے، اکثریت کے فیصلے نافذ کریں گے اور یہ کہ آپ نے یہ منصب اس لیے قبول کیا ہے کہ اپنی میعاد کے اندر بساط بھر ملک کو خانگی امن سے ہمکنار کریں گے، کیونکہ بحیثیت ایک مسلمان اور ایک زبردست قوم پرست کے آپ کی ذمہ داری ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے اور ملک کے وقار کو حق بجانب ثابت کریں۔ ملک کو اپنی بہترین صلاحیتوں کے ذریعہ ایسا خانگی امن دیں جو ساری جماعتوں کے لیے قابل قبول ہو۔ اس سے زیادہ آپ سے کوئی کسی بات کی توقع نہیں رکھتا، اگر آپ کسی اور چیز میں دخل انداز ہوتے ہیں تو اپنے دائرہ اختیار سے باہر نکل جاتے ہیں۔"

گاندھی جی نے "نوجیون" میں ڈاکٹر انصاری کی فیاضی اور دریادلی کی کھل کر داد دی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم نے قومی نصب العین کی خاطر تن من دھن سب کچھ پانی کی طرح بہا دیا تھا۔

انصاری دھرم سالہ

مجھے ڈاکٹر انصاری کی فیاضی کا کافی تجربہ تھا، تاہم اپنے حالیہ سفر دلی میں ان کے مکان پر مجھے اس کا مزید تجربہ حاصل ہوا۔ انھوں نے اصرار کیا کہ مجلس عاملہ کے سارے ارکان انہی کے ہاں قیام کریں۔ ان ارکان کے علاوہ دوسرے مہمان بھی تھے۔ ان کی وسیع کوٹھی کے ناکافی ہونے کے کارن احاطہ میں ڈیرے لگانے پڑے، ہر روز ان کے گھر پر تقریباً ایک سو مہمان رہتے ہونگے ایک طرف مطب کی شاندار پریکٹس، اور دوسری طرف مختلف ریاستوں سے آنے جانے والے مہمانوں کا تانتا اور ان سب کی میزبانی، پھر کانگریس کی کارگزاری سے متعلق بات چیت، گفت وشنید کے لیے وقت نکالنا، اس ہمہ وقتی مشغولیت کے باوجود میں نے ڈاکٹر انصاری کو بے صبرا، فکرمند یا زود رنج نہیں پایا، مہمانوں کی اتنی بڑی تعداد کے قیام وطعام کے انتظام سے ایک عام آدمی تھک جائے، میں نے ڈاکٹر انصاری میں بیزاری کا شائبہ تک نہیں دیکھا۔

اس خوش انتظامی کا راز کیا ہو سکتا ہے؟ یہ بیگم انصاری ہیں۔ ایک بار میں نے بیگم انصاری کی موجودگی میں ڈاکٹر انصاری سے پوچھ ہی لیا— "اتنے افراد کے قیام وطعام کا اہتمام آپ کیونکر کر پاتے ہیں؟" انہوں نے جواب دیا "یہ شرف (CREDIT) بیگم صاحبہ کو پہنچتا ہے، میں اپنی کمائی ان کے حوالے کر دیتا ہوں، وہ اردو اچھی طرح جانتی ہیں اور پائی پائی کا حساب وکتاب رکھتی ہیں۔ مطلوبہ چیزیں منگوا لیتی ہیں اور جتنا چاہے خرچ کرتی ہیں، چنانچہ گھریلو امور کی فکر مجھے دامن گیر نہیں رہتی ہے، یہ سن کر میں نے بیگم انصاری کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔ کچھ یہ بات نہیں ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں یہی ایک خاتون ایسی ہیں۔ ملک کے چپے چپے میں ایسی خواتین بہت ہوں گی مگر ہمیں ان کا علم نہیں۔

قارئین کو یہ معلوم کر کے خوشی ہوگی کہ ڈاکٹر انصاری کے مکان میں دو باورچی خانے ہیں سبزی خوروں کے لیے برہمن باورچی الگ کھانا تیار کرتے ہیں۔

(گجراتی سے) نوجیون ۲۹ مارچ ۱۹۳۱ء

بقیہ: خطبۂ مدراس

اور مذہبی تبلیغ واشاعت کی آزادی۔

۵۔ یہ کہ اگر کسی قوم کے ¾ ممبران ان پر اثر انداز ہونے والے کسی اقدام کے مخالف ہوں تو کسی صوبائی یا مرکزی لیجسلیچر میں کوئی بل، ریزلیوشن، تجویز یا ترمیم نہ تو کسی ایسے مسئلہ پر پیش کی جائے گی اور نہ ہی اس پر غور وخوض ہوگا۔"

یہ ریزلیوشن ۱۹۱۶ء کے معاہدہ لکھنؤ سے کہیں زیادہ ترقی کا مظہر ہے۔ اس ریزولیوشن نے نشستوں کے تقرر سے جہاں اقلیتوں کے خدشات کو دور کرنے کا بہترین مواقع فراہم کیے ہیں۔ وہاں اس بات کے لیے بھی زمین تیار کر دی ہے کہ باہمی دوستانہ تعلقات اور باہمی اعتماد کی روح اجاگر ہو۔ یہ متحدہ ہندوستان کے لیے بہترین شگون ہے۔

ڈاکٹر انصاری

پنڈت نہرو کی نظر میں

"ہندوستان اپنے ایک عزیز اور عظیم سپوت کے لیے سوگوار ہے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے گویا ہم رنج والم کے عادی ہوجاتے ہیں تاہم چبھن کم نہیں ہوتی، درد کی تلخی باقی رہتی ہے۔ مختار احمد انصاری رحلت کر گئے ہیں اور وہ قوم جس کے وہ ایک درخشاں زیور تھے اور ہماری قومی تحریک جس کے وہ مدت مدید تک ایک مضبوط ستون اور رہنما تھے۔ اپنے آپ کو ویران اور اداس محسوس کر رہے ہیں، ان کی نمایاں خوبیاں، قوم کی راہ میں ان کی خدمتیں اور آزادی کی خاطر ان کی قربانیاں ہمیں یاد آرہی ہیں ہم میں سے بہتیرے انتہائی کرب کے ساتھ ایک شفیق اور مخلص دوست کو یاد کرتے ہیں، اس نے کبھی ہمارا ساتھ نہیں چھوڑا تھا، مگر وہ آج نہیں رہا۔

لگ بھگ ۲۱ برس پہلے ان سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی، میں بیان نہیں کر سکتا کہ جدوجہد اور مختصر دکھ درد کے ان طویل برسوں میں ان کی دوستی میرے لیے کیا معنی رکھتی تھی، ان کی عظیم ترین خدمت ہندو مسلم مسائل سے متعلق تھی۔

ڈاکٹر انصاری کی اندوہناک اور اچانک موت سے ملک کا بڑا نقصان ہوا ہے، وہ نہ صرف میرے محبوب اور قدیمی دوست تھے بلکہ ہندوستان کی جنگ آزادی میں ایک عظیم رفیق کار و ہمدم تھے۔ ہندوستان کے عظیم فرزند اٹھتے جارہے ہیں اور مادر وطن ایسے نازک موقع پر ان کی خدمتوں سے محروم ہوتی جارہی ہے۔ ڈاکٹر انصاری نے ملک کی خاطر بڑی زحمتیں جھیلیں، تکلیفیں اٹھائیں۔ اس نقصان پر ہمارا دل شکستہ ہونا ایک فطری بات ہے۔ مگر ہم خدا کے آگے مجبور ہیں۔ مقصد کے حصول تک ہم اپنی جدوجہد جاری رکھیں گے اور یہی عزم مرحوم رہنما کی سب سے مناسب یادگار ہوگا۔

انصاری۔ عزیز ترین دوست۔ جو کہ عرصہ دراز تک ہماری تحریک کے ایک مضبوط ستون تھے، ناسازئ طبع کے کارن سیاسیات میں کچھ زیادہ حصہ نہیں لے رہے تھے، چند دنوں میں ہمیں تنہا چھوڑ کر رخصت ہونے کو تھے۔ ہندو مسلم مسائل کی پیچ در پیچ بھول بھلیاں میں وہ ہم سب کے لیے ایک دائمی رہنما تھے، ہمارے واسطے سالہا سال تک دہلی ایک شاہی شہر سے زیادہ اور برطانیہ کی ہندوستانی سلطنت کے مرکز سے زیادہ حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری کا شہر تھا۔ حکیم صاحب چند سال پہلے ہی فوت ہو گئے، ڈاکٹر انصاری کی وفات سے دہلی میرے لیے ایک ایسی جگہ بن گئی ہے جو دردانگیز یادوں سے بھری ہوئی ہے۔"

یہ یادگار تصویر میرٹھ سازش کیس کے زمانے میں لی گئی تھی

ڈاکٹر انصاری اور پنڈت جواہرلال نہرو (بیٹھے ہوئے)

(تعزیتی پیغام ــــ انگریزی سے ترجمہ)

(مترجم: عدیل احمد)

دارالسلام

خالدہ ادیب خانم

دارالسلام ڈاکٹر انصاری کا مسکن ہے۔ اس نام کے معنی سلام
ہز اسلام سا گھر ہیں۔ اصل اسلام میں اتنی جامعیت ہے کہ یہ نام کچھ بے جا نہیں
ہے۔ لیکن یوں بھی اس مکان میں بین الاقوامی اور عالمی خصوصیات موجود ہیں
یں یہاں تقریباً دو مہینے مہمان رہی۔

دارالسلام ایک منزل کی بہت بڑی ہشت پہلو عمارت ہے جس

دارالسلام۔ نمبر ۱ دریا گنج (۱۹۲۸ء)

کے پائیں میں ایک چوکور گھاس کا تختہ ہے۔ دو پہلوؤں پر متوازی سڑکیں بنی ہیں جن سے موٹریں اندر آتی اور باہر جاتی ہیں۔ پورے برآمدے پر سنگ مر مر کا فرش ہے اور اسے چند سیڑھیوں کی کرسی دے کر بنایا ہے۔ برآمدے کے مرمریں ستونوں سے لپٹے ہوئے یا بیچ میں ادھر ادھر قسم قسم کے سرخ سفید اور قرمزی پھولوں کے پودے سرخ گملوں میں ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ مکان کے اوپر کانگریسی جھنڈا لہرا رہا ہے۔ یہ ایک تاریخی مقام ہے لیکن میری نظر میں اس کی حالیہ اہمیت ماضی سے زیادہ ہے۔ یہاں مہاتما گاندھی اور لارڈ اِرون کی ایک یادگار موقع پر ملاقات ہوئی تھی۔ ان دنوں کانگریس کے پارلیمنٹری بورڈ اور مفروضہ (SHADOW) وزارت کے جلسے بھی

یہاں ہوتے تھے۔ دورِ قدیم اور دورِ وسطیٰ اور دورِ جدید کے لوگوں کا مجمع تھا۔ مختلف الخیال اشخاص کے تخیلات اور جذبات یہاں باہم ملتے اور ایک دوسرے میں جذب ہو جاتے۔ اور پھر یہ اشخاص منتشر ہو جاتے کہ خیالات کے نئے تاروں کو دوسری جگہ پہنچ کر جنبش دیں۔ مستقبل کے آزاد ہندوستان کی تشکیل میں یہ مکان بھی ایک سنگِ منزل کا کام دے گا۔

دیوان خانے کی دیواروں سے میرے ۱۹۱۲ء کے مشہور ہم وطنوں کے چہرے ۱۹۳۵ء کے ہندوستان کا نظارہ کر رہے تھے۔ بعض مشہور افغانی اور ایرانی تصویریں بھی تھیں۔ اسلامی ہند کا دریچہ مشرق ادنیٰ اور مشرق وسطیٰ ہی کی جانب نہیں بلکہ مشرق اقصیٰ کی طرف بھی کھلا ہوا ہے۔

خود کمرے کے اندر مشرق و مغرب موجود تھے۔ دو مسیں جو کراچی کی زنانہ کانفرنس کی مندوب تھیں، مجھ سے ملنے یہاں آ ٹھہری تھیں۔ ایک دلکش چہرے والی ماڈرن وُمن اور دوسری برطانی خوش مذاقی کا نمونہ مسز کار بیٹ ایش بی۔ ان کے سوا مغرب کے نفوذ کی دوسری علامتیں بھی

دارالسلام کا ایک کمرہ

موجود تھیں۔ ہندوستانیوں کی گفتگو اور افکار کے پیرائے وہی تھے۔ جو کسی آکسفورڈ کے تعلیم یافتہ کے ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کہ برطانی تسلط کسی وقت ختم ہو جائے لیکن وہ برطانی اثر جو انگریزی زبان کی تعلیم و تہذیب کے ذریعے پھیلا ہے باقی رہے گا۔ اور ہندوستان کی آئندہ تشکیل میں حصہ دار ہو گا۔

میرے سونے کا کمرہ وسطی صحن میں کھلتا تھا۔ جس کے چاروں پہلو پر عمارت بنی ہوئی ہے۔ بیچ میں ایک حوض اور فوارہ، اور گملوں میں اور زیادہ سرخ پھول تھے۔ اکثر کمروں کے دروازے جن میں بیگم انصاری کا کمرہ بھی شامل ہے اسی صحن کی طرف ہے۔ ایک نوکر روشنی لیے راستہ

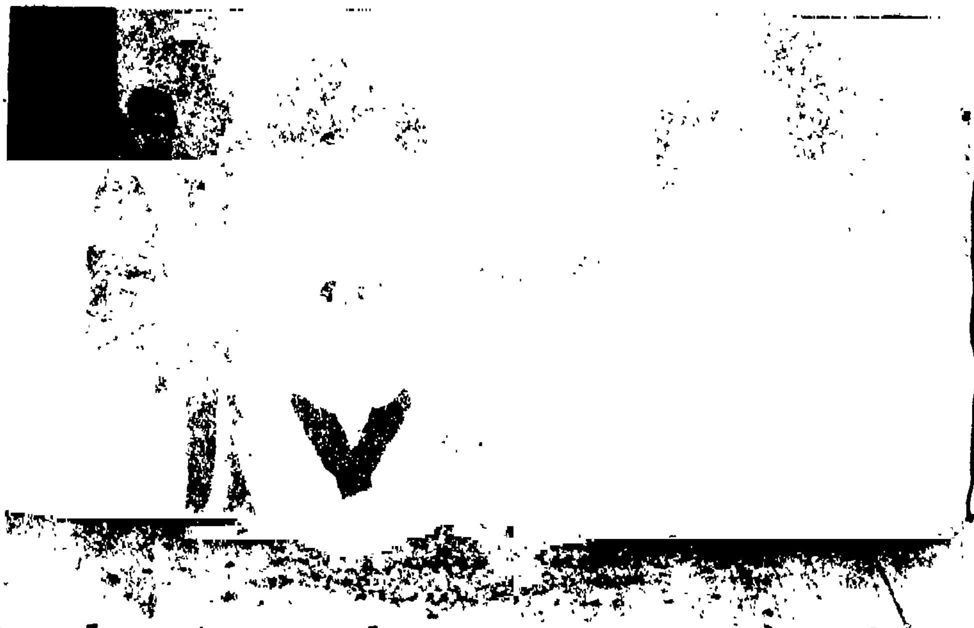

خالدہ ادیب خانم کے دورۂ ہندوستان کے زمانے کی ایک تصویر
(دائیں سے بائیں)
سروجنی نائیڈو، خالدہ ادیب خانم، ڈاکٹر انصاری، زہرہ انصاری

دکھاتا چلنے لگا۔

"ناشتہ کس وقت؟"

"ساڑھے سات بجے"

"ولنگڈنی وقت یا معیاری؟"

"اس کا کیا مطلب؟"

اس آدمی نے ڈاکٹر انصاری کے غیر ملکی مہمانوں کی خدمت گزاری کرتے کرتے ٹوٹی پھوٹی انگریزی سیکھ لی تھی۔ مگر بولتے وقت وہ اپنی انگلیوں پر کچھ عجیب طریقے سے حساب لگاتا تھا۔ لفظوں سے نہیں بلکہ زیادہ تر اشاروں سے اس نے مجھے سمجھایا کہ ہندوستان میں دو وقت ہیں اور ولنگڈنی وقت آدھے گھنٹے آگے ہے۔ آخر مغرب کو کچھ تو اپنی شان دکھانا چاہیئے۔ مگر حیرت تو یہ ہے کہ وقت بھی اس ملک میں ایک نہ تھا!

بہتر ہوگا کہ میں سب سے پہلے ڈاکٹر انصاری کا تعارف کرا دوں۔ وہ متحدہ صوبے کے آدمی ہیں۔ یہ بات ایک معنی رکھتی ہے کیونکہ ہندوستان کے صاحبانِ دماغ میں یہ شے مختلف فیہ ہے کہ آئندہ جب ملک آزاد ہوگا تو ہندوستان کی رہنمائی سرحدی لوگ کریں گے یا صوبہ متحدہ کے۔ جہاں تک قرائن کہتے ہیں ہندوستان کی آزادی غالباً ڈاکٹر انصاری کی زندگی میں رونما نہ ہوگی۔ بایں ہمہ یہ لکھنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ان لوگوں کے قول کے مطابق جو صوبہ متحدہ کے آدمی کے حامی ہیں ہندوستان کے آئندہ کارفرما کن اوصاف کے حامل ہونے چاہئیں۔ مجھ سے کہا گیا کہ یہ اوصاف بلند خیالی، دماغ کی ہمہ گیری اور تنظیم کی قابلیت ہیں۔

ان کی خانگی زندگی کی جھلک دیکھنی ہو تو مکان کے بائیں بازو کا پردہ اٹھانا پڑے گا۔ جس کے دروازے صحن میں میرے کمرے کے بالمقابل کھلتے ہیں۔ اس حصے میں بیگم انصاری اپنے نوکروں اور منہ بولی بیٹی کے ساتھ جو ان کی بھتیجی بھی ہوتی ہے، رہتی ہیں۔ وہ بہترین نمونے کی مسلمان پردہ نشین خاتون ہیں۔ عربی، فارسی اور اردو میں پوری دستگاہ حاصل ہے اور فرصت میں کتاب خوانی کرتی ہیں اور نہایت پرہیزگار اور محترز خاتون ہیں۔ سوائے رشتہ داروں کے کسی کے سامنے نہیں ہوتیں مگر مہاتما گاندھی مستثنیٰ ہیں اپنے نوکروں کے ساتھ ان کا سلوک دیکھ کر مجھے پرانی ترکی یاد آگئی۔

پردے کے پیچھے برآمدے میں میں نے نوعمر لڑکیوں کو مختلف استادوں سے اکثر سبق پڑھتے دیکھا۔ وہ وہاں ایسی ہی بے تکلف اور مانوس تھیں جیسے خود گھر کی لڑکی۔ فرق مراتب کا کوئی نشان موجود نہ تھا۔

افسوس ہے کہ میں کسی مشترکہ زبان میں بیگم انصاری کے ساتھ بات چیت نہ کر سکتی تھی۔ ان کی بیٹی ترجمانی کرتی تھی۔ لیکن ان کی طرز معاشرت سے مجھے کوئی اجنبیت محسوس نہ ہوئی۔ بہت سے عربی، فارسی اقوال، جو وہ بولتی تھیں اور تھوڑی سی اردو بھی، میں سمجھ لیتی تھی۔ ان کے حصہ مکان میں ایک بڑا کمرہ تھا جس کے پہلوؤں میں اور کمرے بنے ہوئے تھے۔ بڑے کمرے کے دروازے سامنے کے رُخ ایک وسیع برآمدے میں تھے۔ جہاں تمام دن دھوپ کی خوب روشنی رہتی تھی۔ بائیں باغ میں ایک کبوتر خانہ تھا۔ اس کے کبوتر اور قمریاں اور بیگم انصاری کا انھیں دانہ کھلانا نہایت ہندوستانی اور بہت دلفریب تھا۔

مکان کا یہ رُخ گویا ڈاکٹر انصاری کی مشرقی ہستی کو پیش کرتا تھا۔ بیگم اس تقلید مغربیت میں حصہ دار نہ تھیں جو ان کے شوہر کے مشاغل کا جزو تھی۔ لیکن جن لوگوں نے مغربیت اختیار کی ان سے وہ رواداری برتتی تھیں اور اپنی بیٹی کے راستے میں بھی حائل نہ تھیں۔ یہ نوعمر لڑکی آسانی سے منزل بمنزل آزادی حاصل کر رہی تھی۔ وہ کھانے کے وقت سامنے آجاتی تھی بشرطیکہ خاص خاص لوگ ہی موجود ہوں۔ لیکن اپنی ساڑھی میں بے تکلف باہر جاتی تھی اور کسی امریکی لڑکی کی طرح دلیری سے موٹر چلاتی تھی۔ اپنے ملک کے تہذیبی، مجلسی اور سیاسی مسائل میں گہری دلچسپی لیتی تھی۔ ایک مسلمان لڑکی کو آئندہ زندگی کے لیے تیار کرنے کی یہ بہت عمدہ شکل تھی۔

ڈاکٹر انصاری

چند یادیں — چند باتیں

محمد مجیب

میں ۱۹۲۰ء میں آکسفورڈ سے لندن آیا ہوا تھا اور یہاں آکر مجھے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر مختار احمد انصاری بھی یہاں آئے ہوئے ہیں شعیب قریشی اور عبدالرحمٰن سندھی صاحبان بمبئی سے لندن میرے ساتھ گئے تھے اور وہاں سے پھر آکسفورڈ جانے والے تھے۔ لیکن مجھے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ آکسفورڈ چھوڑ کر لندن کیوں چلے گئے ــ؟ جب میں آکسفورڈ سے لندن گیا تو انہی کے یہاں رہا تھا اور وہیں پر میں نے ڈاکٹر انصاری کو دیکھا تھا میں پہلے بھی ان کو دیکھ چکا تھا، لیکن اس وقت میری عمر بہت کم تھی، اس لیے وہ پہلے کیسے معلوم ہوتے تھے اس کا دھیان نہیں، لیکن اس دفعہ ملاقات میں میری نظر میں جو شخصیت سمائی وہ مونچھوں، بھنوؤں اور اپنے بس میں کر لینے والی نظروں سے بنی تھی۔ بہت جلد مجھے معلوم ہو گیا کہ ان کی شکل میں حسن ہے، دل کھلا ہے، آواز میں ترانہ سا ہے۔ جذبات میں کچھ ہجوم ہے، خیالات کبھی کہیں اور کبھی کہیں ہوتے ہیں، غصہ ناممکن، چلنا ناپسند اور جسم بھاری ہے۔ وہیں ایک رات کو وہ مجھے کچھ اور لڑکوں کے ساتھ تھیٹر لے گئے تھے۔

اس کے چھ سال بعد جب میں جامعہ آیا، ان سے پھر ملا تو یہ بھی یاد آیا کہ جب میں دہرہ دون میں پڑھتا تھا تو لڑکوں کے ساتھ ہاکی ٹیم میں دہلی آیا تھا اور ان ہی کے گھر میں ٹھہرایا گیا تھا اور جب یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ علاج معالجے کا بڑا کام کر رہے ہیں۔ جامعہ آکر سب سے بڑا معاملہ یہ تھا کہ میں بیمار ہو گیا اور گھر پر پڑا ہوا تھا کہ ڈاکٹر انصاری آئے اور میری حالت دیکھی اور میرا علاج اپنے ذمہ لے لیا۔ اس سے مجھے فائدہ ہوا اور جب وہ دوسری یا تیسری دفعہ آئے تو میں نے کہا "ڈاکٹر صاحب! میرے بال گر رہے ہیں۔ میں کیا کروں؟" انھوں نے تھوڑی دیر غور کیا اور پھر کہا "اگر تمہارے خاندان ہی میں بال گرنے کا مرض ہے تو پھر اس کا کوئی علاج نہیں اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر میں یہ دوائی تمہارے بالوں کے لیے لکھتا ہوں، یہ مفید ہوگی۔" اس کے بعد بازار سے جا کر میں خود وہ لوشن خرید لایا اور مجھے محسوس ہوا کہ بال قائم رہیں گے۔ عادت پہلے سے ہی یہ تھی کہ جس کو مشورہ دے سکوں، ضرور دوں اور غرض کئی دوستوں سے کہا کہ ڈاکٹر انصاری نے جو یہ دوا دی ہے اسے ضرور استعمال کرو۔

۱۹۳۱ء تک میں ڈاکٹر انصاری سے کچھ زیادہ اچھی طرح نہیں مل سکا۔ لیکن اس کے بعد ان کے یہاں آنا جانا برابر شروع ہو گیا۔ اسی زمانے میں جامعہ میں باہر کے لوگ تقریروں کے لیے بلائے گئے تھے جیسے رؤف بے، خالدہ ادیب خانم وغیرہ۔ اس سلسلے میں تقریروں کے ڈرافٹ بھی میں نے تیار کیے تھے جو پریس کے لیے جاری کی جاتی تھی۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ ہے۔ ذاکر صاحب نے ڈاکٹر انصاری کے لیے ایک تقریر کا متن تیار کرنے کو کہا۔ میں نے پوچھا کہ "موضوع اور مقصد کیا ہے؟" ذاکر صاحب نے کہا "بھائی لکھو کچھ بھی۔" پھر کوشش کر کے میں نے لکھا۔ اس کے بعد ڈاکٹر انصاری کے یہاں ان کے مکان "دارالسلام" (دریا گنج) پر چائے کے وقت ہم سب بلائے گئے۔ آپس میں گفتگو ہو رہی تھی، تو میں چپکے سے ڈاکٹر انصاری کے پاس گیا اور ان کی جیب میں تقریر کا مسودہ رکھ دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب چائے ہو چکی تو ڈاکٹر انصاری نے کہا "بہت خوشی ہوئی آپ لوگ یہاں آئے، لیکن اب مجھے ایک تقریر لکھنا ہے۔" ہم لوگ جانے کے لیے کھڑے ہو گئے اور چل دیئے۔

اسی دوران شاید علاج یا کسی اور غرض سے میں ڈاکٹر انصاری سے ملنے گیا تو انہوں نے مجھ سے کہا "بھائی میری سوانح حیات لکھو۔" میں نے کہا "ضرور ــ جب آپ فرمائیے۔" اس وقت وہ جامعہ کے چانسلر اور میں اس میں لیکچرر تھا۔ پھر ایک دفعہ انھوں نے اپنے شروع کے حالات بیان کیے۔ انھیں اپنے انصاری ہونے پر بڑا فخر تھا، چوں کہ ان کے جدِ اعلےٰ

ابو ایوبؓ مدینہ میں رسول اللہؐ کے اولین میزبان تھے۔ ابو ایوبؓ اسلام کے فدائی اور ان مجاہدین میں سے تھے جو تقریباً نوّے سال کی عمر میں باسفورس کے پار جنگ میں شریک ہوئے اور وہیں جب ان کا انتقال ہوا تو انھوں نے وصیت کی کہ مجھے رومیوں کی سرحد میں جس قدر ہو سکے قسطنطنیہ کے حدود کے اندر لے جا کر دفن کیا جائے اور ایسا ہی ہوا بھی۔" میرا خاندان اسی انصاری سے نسبت رکھتا ہے۔" ڈاکٹر انصاری اتنا کہہ کر رکتے اور پھر قہقہہ لگاتے اور کہتے "کوئی کیوں سوچے کہ انصاری صرف خاص طور پر یہی ہیں، اب تو بہت بڑی تعداد میں لوگ انصاری ہیں۔" کچھ دیر میں ان کا لہجہ دھیما ہو جاتا اور وہ مجھے اپنی زندگی کے ابتدائی ایام کے بارے میں بتانے لگتے۔ اپنے اسکولوں، مدراس میڈیکل کالج میں اپنے داخلہ، ایڈنبرگ سے ایم، ڈی اور ایم ایس کی ڈگریوں کا پانا اور لندن میں اپنی انٹرن شپ (INTERNSHIP) کی بابت۔

حکیم اجمل خاں کے ہمراہ دورۂ یورپ (۱۹۲۵ء) کی ایک تصویر دائیں سے بائیں: حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری

حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے خاندان کی تفصیلات کا تو زیادہ پتہ نہیں چلتا لیکن ہمیں اتنا معلوم ہوتا ہے کہ محمد بن تغلق کے زمانہ (۱۳۲۵-۱۳۵۱ء) میں خواجہ حمید الدین شیرازی ہندوستان آئے اور ان کا تقرر قاضی کے منصب پر ہوا تھا۔ کئی نسلوں کے گزر جانے کے بعد اسی خاندان کے ایک فرد عبدالرحمان نے جو ڈاکٹر انصاری کے والد تھے ایک دوسرا ذریعۂ معاش اختیار کیا۔ وہ یوسف پور میں (ضلع غازی پور، یوپی) پیدا ہوئے اور انھوں نے انگریزوں کی ملازمت کی اور بلیا (یوپی) میں جوڈیشل امین کے منصب تک پہونچے۔ اور ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے وفادار رہے۔ ان کے تین بیٹے تھے۔ پہلے بیٹے حکیم عبدالوہاب تھے، جو طب یونانی کی پریکٹس کرتے تھے اور حکیم نابینا کے نام سے بہت مشہور ہوئے۔ میں ۱۹۳۲ء میں ان کے پاس علاج کی غرض سے گیا تھا۔ ان کا گھر جامع مسجد کے علاقہ میں اس کی مغربی جانب تھا۔ اور میں نے دیکھا کہ ان کے یہاں پرانے طرز کا دواسازی کا انتظام دو طرح کا تھا۔ ایک غریبوں کے لیے دوسرا امیروں کے لیے۔ عبدالرحمٰن کے دوسرے بیٹے عبدالرزاق تھے اور وہ بھی حکیم تھے۔

۱۹۱۱ء میں ہندوستان میں برطانوی سلطنت کی راجدھانی کلکتہ سے دہلی آگئی اور غالباً اسی سال ڈاکٹر انصاری نے اپنا مطب بھی یہاں شروع کر دیا اور یہیں پر ان کا ہندوستانی سیاست میں وہ دور شروع ہوا جو ان کی موت تک جاری رہا۔ ڈاکٹر انصاری کی شہرت کا آغاز ان کے ترکی کی حمایت میں لے جائے گئے طبی مشن سے ہوا جس کے وہ لیڈر بھی تھے۔ گو اس کے اخراجات کے لیے عوامی چندہ ہوا تھا، جس کی اپیل اس وقت کے مسلم رہنماؤں نے کی تھی۔ لیکن مجھے یہ بات معلوم ہے کہ اس کا کافی خرچہ ڈاکٹر انصاری نے اپنے پاس سے کیا تھا جس کا اثر ان کی مالی حالت پر بھی کافی پڑا تھا۔

ڈاکٹر انصاری کا اصل پیشہ طبابت کا تھا۔ لیکن اس کا ان کو موقعہ نہیں ملا۔ وہ جتنا کام اس سلسلے میں کرنا چاہتے تھے حقیقت میں نہیں کر سکے۔ ڈاکٹر انصاری نے دو مقالے دہلی میڈیکل ایسوسی ایشن کے اجلاس نومبر ۱۹۲۱ء اور اکتوبر ۱۹۲۵ء میں پیش کیے تھے۔ اس کے بعد ایک پوری کتاب انھوں نے تیار کی۔ جب وہ ۱۹۳۲ء کے موسم خزاں میں ویانا گئے تھے اور وہاں کے ایک ممتاز پروفیسر اسٹائنا (STEINACH) سے ان کی اس موضوع پر گفتگو ہوئی تھی اور آخر میں ان کی یہ کتاب "تجدیدِ شباب" (REGENERATION IN MAN) ۱۹۳۵ء میں بمبئی سے تاراپور والا اینڈ سنس نے شائع کی۔ اور اس کا مقدمہ ڈاکٹر رابرٹ لشٹیں اسٹرن نے لکھا تھا۔ اس کتاب پر بمبئی کے پروفیسر جیوراج۔ این۔ جہتا نے رائے دیتے ہوئے لکھا تھا:

> "ڈاکٹر انصاری کی زیرِ نظر تصنیف جس موضوع پر ہے وہ سماجی اہمیت رکھتا ہے۔ ان کے اسلوب کی سادگی اور فنی اصطلاحات سے گریز نے اس کتاب کی اہمیت کو بڑھا دیا ہے۔"

ڈاکٹر انصاری نے جب اس کتاب کا مسودہ ٹائپ کرایا تو زبان کی اصلاح اور ٹائپ کی غلطیوں کو درست کرنے کے لیے مجھے دیا تھا جسے میں نے دیکھا اور جب وہ میرے کام سے مطمئن ہو گئے تو یہ انھوں نے پریس میں بھیجا۔ جب یہ کتاب چھپ کر آئی تو اسے انھوں نے مجھے تحفہ میں غالباً فروری ۱۹۳۶ء میں دی اور اسی کے ڈھائی مہینے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔

بیگم شمس النساء اور ڈاکٹر انصاری

زہرہ انصاری

میرے والد اصغر یار جنگ ڈاکٹر انصاری کے چچازاد بھائی تھے، چونکہ ڈاکٹر انصاری اور بیگم شمس النسار کو کوئی اولاد نہ ہوئی اس لیے انھوں نے مجھے اور میرے شوہر شوکت اللہ انصاری کو جوان کے بھانجے تھے، بچوں کی طرح پالا۔ میں ڈاکٹر انصاری کو ابا جان اور بیگم شمس النسار کو امی کہتی تھی۔ میری امی بڑی نیک اور انتہائی دین دار خاتون تھیں۔ وہ بڑی سلیقہ مند، منتظم، سادگی پسند، سمجھدار اور بڑی بہادر تھیں۔ ڈاکٹر انصاری کی طرح ان کا دل بھی کوئی خدمت کے لیے بے چین رہتا تھا۔ ان کی اصابت رائے اور حزم رسی کے ڈاکٹر انصاری بھی قائل تھے۔ اور اکثر معاملات میں ان سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ انھوں نے حدیث، فقہ اور اردو کی تعلیم حاصل کی تھی اور حافظ قرآن بھی تھیں جو سعادت کم ہی عورتوں کے حصے میں آئی ہے۔ حدیث کے درس حکیم عبدالوہاب صاحب سے لیے تھے۔ وہ مولانا حافظ احمد صاحب والد بزرگوار جناب قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند سے بیعت تھیں۔

بیگم شمس النسار نے اپنے شوہر کی سیاسی اور سماجی خدمات میں بڑی خوش دلی سے ہاتھ بٹایا اور ان کے راستے میں حارج نہیں ہوئیں۔ وہ برقعہ پہنتی تھیں اور دریا گنج دلی میں پردہ نشین عورتوں کی جو انجمن تھی، اس کی نشستوں میں باقاعدہ شریک ہوتیں۔ اور اس انجمن کی سکریٹری اور صدر بھی رہیں۔

گھر کی آمدنی و خرچ کا حساب رکھتیں۔ اس حساب و کتاب کو باقاعدہ رجسٹر میں تین کالموں کے تحت درج کرتی تھیں۔ یعنی آمدنی، خرچ اور بقایا۔ یہی

بیگم شمس النساء

رجسٹر انکم ٹیکس کے دفتر چلا جایا کرتا تھا۔ ہم ان کو اکثر حساب و کتاب میں سرگرداں دیکھتے۔ کبھی کبھی میزان ٹھیک نہ ہونے سے وہ گھنٹوں پریشان رہتیں۔ ہم تنگ آکر کہتے کہ امی آپ کس الجھن میں گرفتار ہیں، چھوڑیے۔ میزان نہیں ملی تو کیا ہوا۔ وہ جواب میں فرماتیں کہ شوہر کی آمدنی کو محتاط طریقے پر خرچ کرنا، اس کا حساب و کتاب رکھنا عورتوں پر فرض ہے۔ اس کام کو پوری اہمیت دی جانی چاہیے۔

ڈاکٹر انصاری کو جب بھی مریضوں کی فیس بڑھانی ہوتی، تو ان ہی سے مشورہ کرتے اور پوچھتے کہ کیا میں فیس بڑھا دوں۔ وہ اس موقع پر کچھ دعائیں پڑھتیں اور استخارہ کرتیں۔ اس کے بعد اگر وہ اجازت دیتیں تو اس صورت میں فیس بڑھائی جاتی۔

ڈاکٹر انصاری جب کبھی بھی جیل جاتے تو نوکروں کو جواب دے دیا جاتا کہ خرچ کم کیا جا سکے۔ ایک بار گرفتاری کے بعد یہ خبر مشہور ہوئی کہ پولیس دلی میں دارالسلام پر قبضہ کرلے گی۔ چنانچہ حکیم عبدالوہاب صاحب نے بیگم شمس النسار سے کہا کہ وہ ان کے ہاں چلی آئیں مگر اس جری خاتون نے جواب دیا کہ میں پولیس کے ڈر سے ایسا نہیں کروں گی، ہاں پولیس نے اگر زبردستی مجھے گھر سے نکالا تو اور بات ہے۔ لیکن میں پہلے ہی سے ڈر کر ایسا کروں، یہ ممکن نہیں۔

بیگم شمس النسار اس قدر خدا رسیدہ خاتون تھیں کہ مرنے سے چھ ماہ قبل ہی نبی کریم میں جا کر اپنی قبر کے لیے جگہ کا انتخاب کر آئیں۔ چنانچہ انھیں انتقال کے بعد ان کی وصیت کے مطابق قبرستان نبی کریم میں قدم شریف کے بالکل سامنے دفن کیا گیا۔ اس قبر کا اب کوئی نشان باقی نہیں رہ گیا ہے۔

میرا بیٹا بہجت انصاری ابھی ایک ہی سال کا تھا کہ میری والدہ بیگم شمس النسار نے ڈاکٹر انصاری کا وہ بکس جس میں ہنگامی ضرورت کی دوائیں اور آلات وغیرہ محفوظ رہا کرتے تھے۔ انھیں دے کر یہ کہا کہ یہ بکس بہجت کو اس وقت دینا جب وہ ڈاکٹری شروع کرے۔ چنانچہ ان کی پیشن گوئی حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی آج بہجت انصاری لندن میں ایک کامیاب ڈاکٹر ہیں۔

ہمارے خاندان کو حضرت شیخ الہند کے خاندان سے عقیدت تھی

اور شیخ الہند اور حافظ محمد احمد ایسے بزرگوں کا بھی فیضان تھا جس نے ان کو اس باطنی بصیرت سے بہرہ ور کیا تھا۔ چنانچہ جب شیخ الہند اسارتِ مالٹا کے بعد ہندوستان آئے تو آپ نے دلی میں اتر کر سب سے پہلے ہمارے مکان میں ہی قیام کیا تھا۔ جہاں ڈاکٹر انصاری ان کے مرید ہوئے اور پھر داڑھی رکھی۔

میری امی شمس النساء بیگم کو جگر کا کینسر ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر بی سی رائے نے کافی توجہ سے علاج کیا مگر موت سے کس کو رستگاری ہے۔ چنانچہ ۲۸ دسمبر ۱۹۳۶ء کو اس عابدہ و زاہدہ خاتون نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

ع : خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

ڈاکٹر انصاری حکیم اجمل خاں کے ساتھ جامعہ طبیہ میں مطب کیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر انصاری اس مطب میں شعبۂ جراحت کے انچارج تھے۔ مطب پر ٹین کی چھت تھی۔ چنانچہ ڈاکٹر انصاری کے آپریشن روم پر بھی ٹین کی چھت پڑی تھی۔ ایک بار وہ ایک مریض کا آپریشن کر رہے تھے، جوں ہی ڈاکٹر انصاری نے آپریشن شروع کیا تو اچانک ایک شدید آندھی نے آسمان کو گھیر لیا۔ یہ آندھی اتنی شدید تھی کہ اس میں ان کے کمرے کی چھت اڑ گئی اور بے پناہ ریت اندر آیا۔ روشنی غائب ہو گئی۔ ڈاکٹر انصاری نے سمجھ لیا کہ اب اس مریض کی خیر نہیں۔ چنانچہ انھوں نے فوراً اسے ایک چادر اڑھا دی۔ اور آندھی بند ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ معاون ڈاکٹر نے پوچھا کہ یہ مریض کتنی دیر بیہوش رہ سکے گا۔ آپ نے کہا کہ کم از کم دو گھنٹے۔ چنانچہ جب آندھی کم ہوئی تو معاون

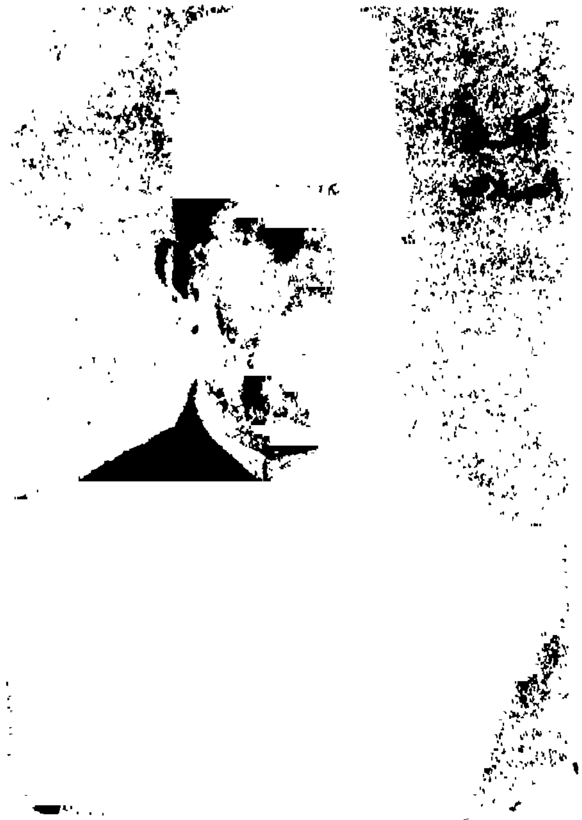

ڈاکٹر نے چادر ہٹائی۔ اس پر اتنی گرد پڑی تھی کہ ڈاکٹر انصاری نے اس چادر کو دور سے جا کر جھاڑنے کو کہا۔ ڈاکٹر صاحب کو پورا یقین تھا کہ یہ مریض ٹھیک نہ ہو سکے گا کیونکہ زخم میں گرد آ جانے کے بعد اس میں مواد پڑ جائے گا۔ یاد رہے کہ اس زمانے میں مواد کو سکھانے اور سپٹک سے بچنے کے لیے وہ دوائیں نہیں تھیں جو آج پائی جاتی ہیں۔ تاہم ڈاکٹر صاحب کے کرشمہ نما ہاتھوں نے بحکم خدا اس مریض کو کچھ ہی دنوں بعد تندرست کر دیا۔

ڈاکٹر مظفر باب کا کہنا تھا کہ ڈاکٹر انصاری کے ہاتھ میں خدا نے کچھ ایسی صفت رکھی ہے کہ ان کے چھونے سے زخم میں مواد نہیں پڑتا۔ ڈاکٹر انصاری نے اپنے ماموں زاد بھائی محمد غالب کو زخم دھونے، پلاسٹر چڑھانے اور اسے کو خشک کرنے کے لیے خصوصی مشق کرائی تھی۔

ڈاکٹر انصاری اپنے مریضوں کی طرف سے ہر وقت پریشان رہتے اور ان کی خبر گیری کو مقدس فریضہ سمجھتے اور اس کام کو اولین اہمیت دیتے۔ خدمتِ خلق کا یہی جذبہ انھیں سیاست کی طرف لے گیا جس میں انھوں نے شروع میں شوقیہ حصہ لیا۔ ان کی اس شفقت، مہارت، مریضوں سے جذبۂ ہمدردی اور خلوص نے انھیں اس میڈیکل ٹیم کا سربراہ بنایا۔ جو دسمبر ۱۹۱۲ء میں جنگ بلقان میں ترکی افواج کو طبی امداد دینے کی غرض سے ترکی گئی تھی۔ ایک طرح سے یہ ایک آئین الاقوامی کوشش تھی جس نے ہندوستان کو دنیا کے نقشے پر نمایاں جگہ دی۔ اور اس کے ذریعے ہندوستان کے قومی رہنماؤں کو بین الاقوامی مفاہمت اور خیر سگالی کو فروغ دینے کا موقع ملا۔

صالحہ عابد حسین

ذکرِ محسن

ڈاکٹر انصاری

مجھے یاد نہیں کہ بچپن میں کب پہلے پہل ڈاکٹر انصاری کا نام کان میں پڑا۔ دھندلا سا خیال آتا ہے کہ پانی پت میں جب کوئی سخت بیمار ہوتا تو لوگ اسے دِلّی لے جایا جاتا تھا — "ڈاکٹر انصاری کے پاس!" شاید اسی سلسلے میں یہ نام کان میں پڑا ہو۔

جب ذرا ہوش سنبھالا تو اکثر اپنی والدہ[1] کو بیمار پایا۔ جاڑے میں خاص طور پر ان کو کھانسی بخار وغیرہ ہو جاتا تھا۔ سال میں دو بار چچا ابا[2] ان کو علاج کے لیے ڈاکٹر کے پاس دِلّی لے جایا کرتے تھے۔ یہ "ڈاکٹر" یا تو ڈاکٹر عبدالرحمٰن ہوتے تھے یا ڈاکٹر انصاری۔ یہ دونوں دِلّی کے مشہور ڈاکٹر تھے اور والد اور چچا ابا کے دوست۔ اماں کی دوائیں جب وہ پانی پت آجاتیں تب بھی انھیں کی رہتی تھیں۔ دو چار بار اماں کے ساتھ میں بھی دلی گئی۔ مگر میرے ۸ — ۷ برس کی عمر سے (برقعہ) پردہ شروع ہو گیا تھا۔ بس اس وقت کی یہ بات یاد رہ گئی ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے پاس چچا ابا اماں کو اور مجھے لے گئے تھے اور پردے میں سے نکال کر میرا پیر دکھایا گیا تھا — جس میں شاید پھوڑا یا اکزیما ہو گیا تھا۔

پھر جب ۲۰ء میں میری والدہ سخت بیمار پڑیں، پہلے تو علی گڑھ[3] کے ڈاکٹروں کا علاج رہا (پھر ڈاکٹر انصاری کے مشورے سے چچا ابا ڈاکٹر انصاری کو حال بتا کر ان کا مشورہ بھی شامل رکھتے تھے۔) انھیں بھوالی کے قریب ایک پہاڑی مقام گھوڑا کھال لے جایا گیا۔ سب بچے بھی ساتھ تھے۔ وہاں جب ان کی طبیعت سنبھلی تو ان کو دلی لایا گیا۔ قرول باغ میں ہم لوگ میر انوار احمد کے مکان میں ٹھہرے۔ چچا ابا ڈاکٹر انصاری کو اماں کو دکھانے کے لیے لائے۔ اور آہ! میرے دل کو کیسی تقویت ہوئی کہ بس اب اماں اچھی ہو جائیں گی۔ ڈاکٹر صاحب کا نام صحت کا ضامن ہے۔ یہ بات ذہن میں بیٹھی ہوئی تھی۔

لیکن ستمبر ۲۰ء میں وہ خدا کو پیاری ہو گئیں۔ شاید اسی دن سے دل کے اندر، لاشعور میں یہ بات بیٹھی ہو کہ موت کا علاج ڈاکٹر انصاری تک نہیں کر سکتے!

۳۳ء میں میری شادی ڈاکٹر عابد حسین سے ہوئی تو مجھے یہ تو علم تھا کہ ڈاکٹر انصاری جامعہ ملیہ کے سرپرست، رہنما اور امیر جامعہ ہیں، لیکن شادی کے بعد معلوم ہوا کہ صرف اتنا ہی نہیں وہ جامعہ والوں کے بزرگ بھی ہیں، ڈاکٹر بھی، دوست بھی۔ چاہنے والے بھی ہیں اور محبوب بھی!

جامعہ میں کوئی خود بیمار ہو جاتا یا اس کا بچہ یا بیوی تو بلا تکلف دلی کے اس سب سے بڑے ڈاکٹر کو اطلاع دی جاتی اور ڈاکٹر صاحب فوراً آکر اپنے ان عزیزوں کو دیکھتے، علاج کرتے اور کراتے۔ کوئی تقریب ہو، کوئی خوشی ہو کوئی غمی ہو ڈاکٹر انصاری جامعہ برادری کے ایک فرد کی حیثیت سے اس میں شریک ہوتے۔

شادی کے بعد میرے شوہر نے مجھے بتایا کہ ڈاکٹر انصاری ہماری شادی کا ولیمہ دینے والے ہیں! میں نے حیرت سے انھیں دیکھا — یعنی وہ ان کے اتنے قریب ہیں؟

مگر ماہ بقرعید کے وسط میں میری شادی ہوئی تھی اور پھر پانی پت میں کئی تقریبوں میں اور شادیوں کے سلسلے میں مجھے وہاں جانا پڑا اور محرم کا مہینہ آگیا اسی وجہ سے ڈاکٹر صاحب دعوت ولیمہ نہ دے سکے۔ لیکن میرے لیے یہ کیا کم خوشی کی بات ہے کہ ڈاکٹر صاحب ہماری شادی سے اس قدر خوش تھے۔

پھر چند ماہ بعد میری طبیعت ناساز رہنے لگی تو عابد صاحب نے لے کر ڈاکٹر انصاری کو دکھایا۔

---

[1] مشتاق فاطمہ بیگم خواجہ غلام الثقلین

[2] خواجہ غلام السبطین مرحوم

[3] اس وقت وہ اور ہم سب سبطین صاحب کے ساتھ علی گڑھ میں مقیم تھے۔

ڈاکٹر صاحب کو پہلی بار دیکھ کر عجب رعب سا طاری ہو جاتا تھا۔ بڑی بڑی چمکتی ابھری آنکھیں جن پر موٹی موٹی بھویں اور خوب موٹی سفید مونچھیں اور رعب دار چہرہ، جیسے آپ پہلی بار کسی پہاڑ کو دیکھ کر حیران رہ جائیں۔ مگر جب ان سے باتیں ہوئیں، انھوں نے شفقت سے دیکھا بھالا تو رعب کی جگہ عزت و محبت نے لے لی۔ انھوں نے کچھ طاقت کی دوائیں، کچھ معائنے بتلائے اور مہینے میں ایک آدھ بار تاکید کی کہ آکر دکھا جایا کروں۔ پھر اکثر میں ڈاکٹر صاحب کے ہاں جانے اور ان کی شفقت سے فیض اٹھانے لگی۔

چھ سات مہینے تک عابد صاحب ڈاکٹر انصاری کی ہدایات پر لفظ بلفظ عمل کرتے رہے۔ دودھ اور پھل کھلا کھلا کر مجھے تنگ کر دیا (کہ اس وقت یہ دونوں چیزیں مجھے سخت ناپسند تھیں) اور دوائیں، پیشاب کے معائنہ، بلڈ پریشر چیک کرانا، غرض آٹھویں مہینے تک میں ان کے زیرِ علاج اور زیرِ نگرانی رہی۔

میری بدقسمتی کہ ڈلیوری کے لیے علی گڑھ جانے کا فیصلہ کیا۔ عابد صاحب اور خود ڈاکٹر انصاری دونوں اس کے حق میں نہ تھے۔ مگر میری خاطر اور میری بھائی جان[1] کی خواہش پر عابد صاحب کو رضامند ہونا پڑا خیر وہ قصہ الگ ہے بہر حال وہاں کئی مہینے موت اور زیست کی کش مکش میں گرفتار رہی۔ بیماری کے ابتدائی تین ایام میں جب بچنے کی بالکل حالت نہ تھی، ڈاکٹر عابد صاحب بدحواس ڈاکٹر انصاری کو لینے دلی بھاگے۔ ان کی اس وقت طبیعت اچھی نہ تھی۔ مگر انہوں نے فوراً لیڈی ڈاکٹروں کو ہدایات بھیجیں۔ بہت تشویش کا اظہار کیا اور ڈاکٹرنیوں کی نااہلی پر ناراض ہوئے۔ خیر وہ وقت گزر گیا۔ میری جان بچ گئی۔ مگر میری متاع لٹ گئی۔

اور جب تین ماہ بعد شدید بیماری کی حالت میں کسی طرح مجھے دیکھنے کے لیے تشریف لے آئے۔ میرے گردے میں پھوڑا بن گیا تھا جسے اتنے عرصے کسی بھی علی گڑھ کے ڈاکٹر نے نہ پہچانا تھا۔ سخت بخار، درد و تکلیف، مایوسی اور بیقراری میں مبتلا تھی اور ڈاکٹروں سے بے حد بدگمان۔ چچا ابا اور عابد صاحب دونوں میرے پاس تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے دیکھا بھالا جو علی گڑھ کے ڈاکٹروں سے بے حد خفا تھے کہ اتنا بڑا پھوڑا ان کو نظر نہ آیا ؟۔ ڈاکٹر ظفر یاب بھی ان کے ساتھ تھے۔ اب ڈاکٹر انصاری تو ڈاکٹر ظفر یاب کو نسخہ لکھوانے کی کوشش کر رہے ہیں اور میں ان سے بحث رہی ہوں — "بے کار ہے ڈاکٹر صاحب — ڈاکٹر کچھ نہیں جانتے — کچھ نہیں کر سکتے" جب وہ کسی دوا کا نام لیتے تو گستاخی سے بول پڑتی —"میں یہ کھا چکی ہوں، کوئی اثر نہیں ہوا — بالکل فضول ہیں یہ دوائیں" ذرا اس بزرگ محترم شخصیت اور ہندوستان کے عظیم طبیب کا صبر تو دیکھیے! مسکرا کے چچا ابا سے مخاطب ہوئے —"خواجہ صاحب — یہ لڑکی تو بالکل ناستک ہو گئی ہے — اس کو اب ڈاکٹری علاج کا قائل کرنا ہی پڑے گا"۔ اور پھر ڈاکٹروں کے بے تاج بادشاہ نے ڈاکٹر ظفر یاب کو ہدایتیں دیں کہ ڈاکٹر حسین کو لکھو کہ فلاں فلاں اکسرے کریں۔ دوسرے ڈاکٹر حسین کو لکھ دیا کہ وہ خون پیشاب وغیرہ کے معائنے کریں اور خدا جانے کس کس کو کیا کیا لکھوایا۔ اگلے دن میرے معائنے شروع ہو گئے۔ ڈاکٹر انصاری کی ہدایت تھی اسی لیے دلی کے ان بڑے بڑے ڈاکٹروں نے ایک پیسہ نہیں لیا۔ (ڈاکٹر صاحب سے زیادہ جامعہ والوں کی مالی حالت اور کون جانتا تھا)

رپورٹیں آئیں تو عابد صاحب اکسرے کی پلیٹیں لے کر ڈاکٹر انصاری کے پاس پہنچے، ظاہر ہے بہت پریشان تھے۔ ڈاکٹر خوش مزاج اور ظریف انسان تھے۔ عابد صاحب کو دیکھتے ہی بولے:

"لیجیے وہ چلے آ رہے ہیں تصویر جاناں در بغل"

پھر اکسرے دیکھے — کچھ متفکر بولے "گردے میں پھوڑا ہو گیا ہے — نکالنا ہی پڑے گا" عابد صاحب نے گھبرا کر کہا "ارے ڈاکٹر صاحب! یہ تو سخت خطرناک آپریشن ہوگا۔" (واضح رہے کہ یہ ۱۹۳۲ء تھا جب کسی قسم کی انٹی بائی ٹکس کیا پین سلین تک ایجاد نہ ہوئی تھی نہ کسی قسم کی پین کلر PAIN KILLAR دوائیں تھیں — البتہ حال ہی میں ایجاد ہوئی ایک دوا ویرے مون (VARE MOON) ڈاکٹر صاحب نے منگا کر دی تھی جو ہر چھ گھنٹے پر کھائی جاتی تھی اور کرب ناک درد میں کچھ کمی کر دیتی تھی۔ ڈاکٹر انصاری نے عابد صاحب کی بات سنی تو بولے "کیا بڑھیوں کی سی باتیں کرتے ہو — غالب لاتا تو وہ گردہ جو میں نے نکالا تھا" عابد صاحب نے گھبرا کر کہا کہ — جی، جی ڈاکٹر صاحب میں نے مان لیا۔ گردہ دیکھنے سے تو مجھے معاف ہی کیجیے۔"

ڈاکٹر صاحب نے اس وقت آپریشن کرنا بہت کم کر دیا تھا۔ اور وہ تھوڑے دن بعد یورپ جانے والے تھے۔ انھوں نے مجھے ڈاکٹر جوشی[3] کے سپرد کیا جو شیدی پورہ میں رہتے تھے اور قرولباغ میں ان کا اسپتال تھا۔ (اگرچہ میں نے احتجاج کیا کہ میں تو ڈاکٹر انصاری ہی سے آپریشن کراؤں گی) ڈاکٹر صاحب نے ڈاکٹر جوشی سے کہا (یہ میں نے اپنے چچا سے سنا تھا) "ڈاکٹر صاحب آپ اس لڑکی کو میری بیٹی سمجھیے گا"۔ اور ڈاکٹر جوشی نے بھی اگلے پانچ سال تک میرے علاج میں جان لڑا دی!

ڈاکٹر انصاری عجیب و غریب شخصیت کے مالک تھے۔ سچے مسلمان سچے محب وطن، آزادی کے سچے سپاہی اور مجاہد۔ دامے درمے قدمے سخنے قوم کی خدمت کرنے والے ساری قومی لیڈروں کی مہمان داری کا فرض ادا کرنے والی اس ہستی کو کہاں سے اتنا وقت مل جاتا تھا کہ وہ اپنے مریضوں کو اتنی اتنی دیر دیکھتا تھا؟ ۱۹۳۳ء، ۱۹۳۴ء اور اس کے بعد ۱۹۳۵ء

۱؎ عزیز ستیدین

۲؎ ڈاکٹر صاحب کے عزیز جو کمپونڈر اور کاروباری معاملات دیکھنے والے

۳؎ اس وقت کا شمالی ہند کا سب سے بڑا اور ماہر سرجن

جیں نے بھی کتنی بار ان کو جاکر دکھایا ہے۔ خود میں نے اور عابد صاحب نے کبھی سیدین صاحب یا بیگم سیدین کو کبھی کسی اور کو بھی لے جاکر دکھایا۔ ڈاکٹر صاحب کبھی چالیس پینتالیس منٹ سے کم نہ دیکھتے تھے۔ (آج کے ڈاکٹر تو اتنی دیر میں چالیس پینتالیس مریضوں کو نپٹا دیتے ہیں۔) ان ایں امیر، غریب، اہم شخصیت، غیر اہم، کسی کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ سب کی طرف یکساں توجہ غور، ہمدردی اور محبت، بلا مبالغہ آدھا مرض تو ڈاکٹر صاحب کے دیکھنے کے بعد ہی غائب ہو جاتا تھا۔ باقی آدھا ان کے علاج اور توجہ سے چلا جاتا تھا۔

فیس جہاں تک میں سمجھتی ہوں، دس فیصدی مریضوں سے بھی نہ لیتے ہوں گے۔ سارے جامعہ والے تو ان کے عزیز ٹھہرے۔ پھر ان کے اپنے دوست، دوستوں کے خاندان، سیاسی رہنما اور ان کے گھرانے والے اور پھر دوسرے غریب اور کم حیثیت لوگ یہ سب تو فیس سے مستثنیٰ تھے ہی اور جانے کتنے لوگ ہوں گے جو فیس دینا بھی چاہتے ہوں تو ڈاکٹر صاحب لیتے نہ تھے۔ ایک بار میں اور عابد صاحب سیدین صاحب کو دکھانے لے گئے۔ اس وقت ڈاکٹر صاحب کی فیس بیس روپے تھی۔ جو غالب صاحب کو پیشگی ادا کر دی گئی۔ سیدین صاحب کو بہت شفقت اور محبت سے دیکھا بھالا، اطمینان دلایا —— واپسی کے لیے ہم لوگ اٹھے تو جیسے چونک پڑے —— "آپ سے غالب نے فیس تو نہیں لی؟" کچھ شرمندگی سے مسکراتے ہوئے سیدین صاحب نے ٹالنا چاہا۔ مگر توبہ کیجیے، ڈاکٹر صاحب ماننے والے تھے۔ اب لاکھ عابد صاحب کہہ رہے ہیں "ڈاکٹر صاحب، سیدین صاحب ماشاءاللہ صاحب حیثیت ہیں —— فیس دے سکتے ہیں" "بلاؤ غالب کو"۔ غالب صاحب آئے —— "فیس واپس کرو"۔

ایک واقعہ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کتنے لوگ ہوں گے جن کے درد کا درماں ڈاکٹر صاحب تھے۔ اور یاد آرہا ہے —— ایک مریض کئی مہینے سے ڈاکٹر صاحب کے زیر علاج تھا۔ غالباً اسے ٹی بی کا مرض تھا۔ ایک دفعہ دیکھنے کے بعد میز سے سہارا دے کر اتارا اور خود اچکن پہنانے لگے تو اس کی جیب سے کچھ چنے گر پڑے۔ پوچھا "یہ چنے کیسے؟" اس نے سادگی سے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب، غریب آدمی ہوں، فیس اور دواؤں کے بعد پیسہ کہاں بچتا ہے جو کچھ کھاؤں۔ اکثر چنے ہی کھا لیتا ہوں —— اُف اس وقت اس درد مند پر کیا گزری ہوگی؟ فوراً غالب صاحب کو بلایا۔ پوچھا کتنی بار یہ صاحب آچکے ہیں؟ ان کی سب فیس واپس کی اور جو خود الگ سے مدد کی ہوگی اسے ان کے اور خدا کے سوا کون جانے!

غالب صاحب بیچارے کی مصیبت تھی کہ اتنا بڑا خرچ اور ڈاکٹر صاحب کی یہ "حرکتیں"۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ کئی ریاستوں کے طبی مشیر تھے۔ جس سے خرچ بھی چلتا اور اداروں اور اشخاص کی مدد بھی ہوتی۔

مجھے ڈاکٹر صاحب نے اپنی بیگم اور زہرہ سے بھی متعارف کرایا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس آتی تو کبھی کبھار ان سے بھی نیاز حاصل کر لیتی۔ جب ہم نے جامعہ ملیہ (قرول باغ میں) سب سے پہلا عورتوں کا جلسہ ۱۹۳۲ء میں کیا تو میں نے اور مسز مجیب نے اصرار کر کے بیگم انصاری کو اس کا صدر بنایا تھا۔ وہ بھی ہم لوگوں پر شفقت فرماتی تھیں۔

اتنا بڑا ڈاکٹر جس کی صورت دیکھ کر ہی مرض بھاگ جاتا تھا۔ خود دل کا مریض تھا۔ جانتے تھے کہ مرض سخت ہے۔ مسکرا کر کبھی کبھی کہتے بھی کہ کسی دن سفر میں ختم ہو جاؤں گا۔ کیونکہ سفر مختلف وجوہ سے کیا ہی کرتے تھے۔

یہ شاید ۳۴ء یا ۳۵ء کا ذکر ہے، ایک بار عابد صاحب ڈاکٹر صاحب کے ہاں بیٹھے تھے کہ شیخ عبداللہ[1] ان کو دکھانے کے لیے آئے ڈاکٹر صاحب نے بہت توجہ سے دیکھا بھالا۔ اور ان سے کہا "شیخ صاحب آپ کا دل انلارج ہو گیا ہے۔ بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔" ان کے جانے کے بعد عابد صاحب نے کہا "ڈاکٹر صاحب آپ نے کیوں ان کو پریشان کر دیا وہ تو اچھے خاصے ہیں۔" (اس وقت ہارٹ کا مرض شاذ و نادر ہوتا تھا) بولے "ارے عابد تم کیا جانو —— ان کے دل کی حالت بہت نازک ہے۔ چند سال سے زیادہ چلنا مشکل ہے۔" لیکن خدا کے کارخانے میں بڑے سے بڑا ڈاکٹر بھی دخل نہیں دے سکتا۔ شیخ عبداللہ نے تقریباً نوے برس کی عمر پائی اور ڈاکٹر انصاری جیسا حاذق طبیب جس نے ہزاروں کو شفا بخشی تھی۔ ایک دن اپنی پیش گوئی کے مطابق ٹرین میں اپنے خالق سے جا ملا۔

اور جب یہ خبر جامعہ ملیہ میں پہنچی تو ان کا یہ چہیتا اور چاہنے والا خاندان درد و غم میں ڈوب گیا۔ ہر ایک یہ محسوس کر رہا تھا کہ نہ صرف جامعہ ملیہ بلکہ وہ خود بھی ذاتی طور پر بے سہارا ہو گیا۔ جامعہ یتیم ہو گئی۔ جامعہ والے یتیم ہو گئے۔

اور میں اسی بزرگ، محسن، اپنے شفیق معالج اور محبوب و محترم ہستی کی یاد میں آنسو بہاتی رہی۔ جس کی مثال دنیا میں بہت کم —— پیدا ہوتی ہے۔ ڈاکٹر انصاری نے بہت کم عمر پائی۔ مگر ان کے کارنامے اور ان کی سیرت و شخصیت کا عکس دلوں پر بھی اور اس ملک کی تاریخ پر بھی ہمیشہ ثبت رہے گا۔

آج جہاں ان کا مزار ہے وہاں کبھی انھوں نے گھر بنانے کی خواہش کی تھی —— آج بھی وہ اپنی آرام گاہ سے اپنے محبوب ادارہ کو دیکھتے محسوس ہوتے ہیں۔ جب اس طرف جاتی ہوں، ہاتھ بے اختیار فاتحہ کے لیے اٹھ جاتے ہیں، آنکھیں بھر آتی ہیں اور ان کی پر رعب دلکش صورت اور دل نشین باتیں دل دہلانے لگتا ہے۔

---

[1] شیخ عبداللہ بانی علی گڑھ گرلز اسکول و کالج

ڈاکٹر انصاری

کچھ یادیں — کچھ باتیں

حکیم محمد حسین خاں شفا

مرحوم ریاست رام پور کی باقیات میں ایک تو سرکاری کتب خانہ ہے جواب رضا لائبریری کے نام سے مشہور ہے۔ دوسرے وہ سن رسیدہ افراد ہیں۔ جو دربار رام پور میں مختلف عہدوں پر فائز تھے .... اور اب اپنی عمر کی پہلی صدی کے قریب ہیں۔ ان بزرگوں میں کئی حضرات ایسے ہیں جو اپنے وقت کے مشاہیر، علی برادران، حالی، شبلی، خواجہ حسن نظامی، حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری وغیرہ کے بارے میں بہت کچھ نئی اور اہم معلومات رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ دربار رام پور کے رازہائے دروں پردہ کے امین اور نوابین رام پور اور مشاہیر ہند کے درمیان کبھی کبھی رابطہ اور میزبانی کے فرائض انجام دیا کرتے تھے۔

ان بزرگوں میں ایک صاحب اصغر علی بن محمد حسین منصرم آبدار خانہ ہیں جو حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری کی گفتگو کے وقت نواب حامد علی خاں و نواب رضا علی خاں صاحب کے کمرہ میں بارہا موجود رہے ہیں .... اصغر صاحب کا بیان ہے کہ حکیم اجمل خاں صاحب کا انتقال خاص باغ میں رات کے دو بجے کے قریب میری موجودگی میں ہوا۔ اور میں نے نواب صاحب کو ان کی انتقال کی خبر دی .... ۲۸ دسمبر ۱۹۲۷ء کو یہ حادثہ ہوا اور پھر کافی مدت تک حکیم صاحب کی اوصاف حسنہ کا چرچہ رہا!

دوسرا واقعہ یہ پیش آیا کہ مئی ۱۹۳۶ء کو نواب رضا علی خاں صاحب مسوری میں مقیم تھے۔ کوٹھی پر علی گڑھ کے کچھ لوگ ٹھہرے ہوئے تھے۔ نواب صاحب اس وقت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے عہدے دار تھے۔ بڑے ہال کے کمرہ میں زور زور سے باتیں ہو رہی تھیں، اور بار بار ڈاکٹر انصاری کا نام آرہا تھا۔ نواب صاحب نے فرمایا " اچھا ڈاکٹر انصاری صاحب کو بلائے لیتے ہیں .... دہلی فون کیا گیا۔ چند روز کے بعد ڈاکٹر صاحب مسوری آگئے ــــ کئی روز قیام رہا۔ آخری دن میں کمرہ کے دروازہ پر تھا۔ نواب صاحب، علی گڑھ کے مہمان اور ڈاکٹر انصاری صاحب میں باتیں ہو رہی تھیں۔ نواب صاحب کسی بات پر ڈاکٹر صاحب کو تیار کرنا چاہتے تھے اور ڈاکٹر صاحب مسلسل انکار کر رہے تھے۔

آخر نواب اور سب مہمان ڈاکٹر صاحب کو رخصت کرنے کوٹھی کے گیٹ تک آئے۔ میں نے سنا۔ ڈاکٹر صاحب نے کار میں بیٹھتے وقت فرمایا:

نواب صاحب میں کافی عرصہ سے دل کا مریض ہوں۔ جس کے لیے پرسکون زندگی اور ہر قسم کے فکر و اضطراب، اشتعال اور ہیجان سے بچنا ضروری ہے۔ میرے لیے ہم پیشہ دوستوں کی ہدایت ہے کہ میں ایک پابند ضابطہ اور غیر سیاسی زندگی گزاروں ..... اس لیے میں مجبور ہوں آپ کے حکم کی تعمیل نہیں کر سکتا۔ مجھے دہلی میں رہتے ہوئے اب جامعہ کے کاموں سے ہی وقت نہیں ملتا.....

ڈاکٹر صاحب یہ کہہ کر کار میں سوار ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد یہ خبر آئی کہ ڈاکٹر صاحب کا مسوری سے دہلی جاتے ہوئے ۹ مئی ۱۹۳۶ء کو ٹرین میں انتقال ہو گیا۔ اس وقت نواب رضا علی خاں اور ہم سب کے آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس لیے کہ ابھی کمرہ میں ڈاکٹر صاحب کی آواز گونج رہی تھی جو ان کی زندگی کی آخری آواز تھی..... اور آخری خواہش تھی کہ اب میں غیر سیاسی پابند ضابطہ زندگی قوم کی تعلیم کی خاطر گذاروں گا۔ جو جامعہ ملیہ دہلی کے لیے وقف ہوگی.....[1]

---

[1] محمد طفیل صاحب نے نقوش مکاتیب نمبر صفحہ ۹۴۲ پر ڈاکٹر صاحب پر ایک نوٹ لکھا ہے جس میں یادرفتگاں کے حوالے سے تحریر کرتے ہیں کہ "۱۹۱۲ء میں مولانا محمد علی کے زیر قیادت طبی وفد لے کر ترکی گئے؟ رات کو ڈیرہ دون سے آتے ہوئے راستے میں حرکت قلب بند ہو گئی" طفیل صاحب کے بیان میں مولانا محمد علی کے زیر قیادت ترکی جانا۔ اور ڈیرہ دون سے واپسی۔ دونوں باتیں [illegible]

ڈاکٹر صاحب کی دربار رام پور میں رسائی حکیم اجمل خاں کے توسط سے ہوئی۔ اور سیاسی شہرت میں مولانا محمد علی کو بہت دخل تھا۔ ڈاکٹر انصاری صاحب ان دونوں محسنوں کا بے حد احترام کرتے تھے۔ سنہ ۱۹۱۶ء میں طبی کانفرنس کا سالانہ اجلاس رام پور خسرو باغ میں ہوا۔ ؎۲ ڈاکٹر انصاری اس اجلاس کے مہمان خصوصی تھے۔ آپ کی تقریر کا کافی پہلے سے شہرہ تھا۔ ۱۱ مارچ ۱۹۱۶ء کو اعلان ہوا کہ آج ڈاکٹر صاحب ڈاکٹری آلات تشخیص پر تقریر فرمائیں گے۔ یہ اعلان سن کر سینکڑوں حکما کے ساتھ ہزاروں تماشائی جلسہ گاہ میں پہنچ گئے۔ آج کے جلسہ کے لیے خصوصی انتظامات تھے۔ بہت بڑا ڈائس بنایا گیا تھا اور اس پر ایک بہت بڑی الماری رکھی تھی۔ ایک طرف بورڈ تھا۔ درمیان میں ڈاکٹر انصاری صاحب طبی ڈائس پر کھڑے تھے۔ ان کے قریب نواب حامد علی خاں اور حکیم اجمل خاں تشریف فرما تھے.....

ڈاکٹر صاحب ایک ایک آلہ کو اٹھاتے اس کا نام و کام اور مختصر تاریخ اور اس کی وجہ سے طبی دنیا کو پہنچنے والے فوائد بتاتے۔ آپ کی تقریر بے حد دلچسپ تھی اور کافی دیر جاری رہی۔ ڈاکٹر صاحب نے جدید اور قدیم کے فاصلوں کو کم کرنے اور اطبا، یونان سے نئے آلات سے استفادہ کرنے کی اپیل کی۔

ڈاکٹر صاحب نے ہندوستان میں دیسی طبوں کی ضرورت اور ان کے ہزاروں سالہ تجربات پر ڈاکٹر صاحبان کو غور و فکر کرنے کی دعوت دی۔ آپ نے مزید فرمایا: "میں نے بھی اپنے بڑے بھائی حکیم نابینا صاحب اور حکیم اجمل خان سے بہت کچھ سیکھا ہے۔

.... ڈاکٹر صاحب کی تقریر کے بعد حکیم اجمل خان نے ڈاکٹر انصاری صاحب کی آمد اور عزت افزائی کا شکریہ ادا کیا...."

* * *

ڈاکٹر مختار احمد انصاری کا تعلق غازی پور میں قصبہ یوسف پور کے ایک انصاری خاندان سے تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ان کا نسلی سلسلہ حضرت ابو ایوب انصاریؓ سے ملتا ہے۔ جس کو محسن انسانیتؐ کی میزبانی کا فخر حاصل تھا اور مزار ترکی میں ہے۔

انصاری صاحب سنہ ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے۔ سنہ ۱۸۹۶ء میں مڈل پاس کیا۔ اور کچھ عرصہ بعد اعلیٰ طبی تعلیم کے واسطے یورپ چلے گئے۔ جہاں تعلیم سے

بقیہ حاشیہ

تسامحات سے ہیں۔

۱۰ مئی ۱۹۳۶ء کی رات کو ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے انصاری صاحب پر دہلی ریڈیو اسٹیشن سے ایک تقریر کی جس میں فرماتے ہیں: "کل رات کوئی ڈیڑھ بجے ڈاکٹر انصاری صاحب دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ابھی پرسوں کسی کام سے مسوری تشریف لے گئے تھے...." (جامعہ کی کہانی ص ۲۰۵)

؎۲ مسل دیشی خطوط نمبر ۱۶ سنہ ۱۹۱۶×۱۹۱۶ء انڈیا آفس لندن بحوالہ تحریک شیخ الہند ص ۳۱۴×۱۹۸

فراغت کے بعد کچھ مدت سرکاری اسپتالوں میں ملازمت کی۔

سنہ ۱۹۱۰ء میں حکیم اجمل خاں کی تحریک پر دہلی میں مطلب شروع کر دیا۔ اس وقت تک ڈاکٹر صاحب کی توجہ صرف اپنے پیشہ پر تھی۔ البتہ آپ کے بڑے بھائی حکیم نابینا صاحب جو علامہ شبلی کے ہم عمر و ہم درس تھے۔ اور خاموشی سے انگریزوں کے خلاف چلنے والی تحریکوں میں حصہ لے رہے تھے۔ چنانچہ پولیس کے ریکارڈ میں باغیوں میں ان کا اندراج تھا۔ انٹلی جنس کا ڈائرکٹر اپنی خفیہ ڈائری میں ان کے بارے میں لکھتا ہے:

"ملزم نمبر ۴۴ ..... مشہور حکیم باشندہ غازی پور صوبہ متحدہ دہلی۔ ڈاکٹر انصاری کا بھائی۔ پہلے اس نے حیدرآباد میں طبابت کی۔ مولانا محمود الحسن کا پکا مرید ہے۔ ان کو بغاوت و ہجرت کے لیے اکسانے والے خاص لوگوں میں ہے۔ مولانا محمود الحسن کے سفر کے انتظامات اس نے کیے۔ اور ان کو پہنچانے بمبئی تک گیا۔ برابر باغیوں کی مالی مدد کرتا ہے.... باغیوں کے خطوط میں اس کا نام بار بار آتا ہے۔" ؎۱

ڈاکٹر صاحب کو ابھی دہلی میں مطلب کیے ہوئے دو سال بھی پورے نہ ہوئے تھے کہ جذبۂ ملی جوش میں آگیا...

اور آپ نے مسلمانانِ ہند کی طرف سے ایک طبی مشن لے کر ترکی جانے کا مولانا محمد علی سے ذکر کیا۔ مولانا نے اس مشن کی بھرپور حمایت کی۔ اور پورے ملک کو ہر قسم کی امداد کرنے کو تیار کر لیا۔

علی گڑھ کے لڑکوں نے عمدہ کھانا اور عمدہ پہننا ترک کر دیا۔ اور فوری اس فنڈ میں ۴۵ ہزار روپے جمع کر کے محمد علی کو دے دیا۔ چھ طلباء نے وفد کے ساتھ جانے کو اپنی خدمات پیش کیں۔ ؎۳ جن میں شعیب قریشی، چودھری خلیق الزماں۔ ڈاکٹر عبدالرحمان صدیقی۔ ڈاکٹر نعیم انصاری۔ عبدالعزیز انصاری وغیرہ شامل تھے۔

جب وفد تیار ہو گیا تو اس کے اعزاز میں جگہ جگہ جلسے ہوئے جن میں علامہ شبلی اور دیگر علما و زعمار نے نثر و نظم میں معرکۃ الآرا شاہکار پیش کیے۔ قیصر باغ لکھنؤ کے جلسہ عام میں علامہ شبلی نے یہ نظم پڑھی:

اے ترک! اے مجسمۂ کبریائے حق — اے وہ کہ جس پہ عالم ہستی کو ناز ہے
پشت و پناہ ملت ختم الامم ہے تو — تو آج زور بازوئے شاہ حجاز ہے
زخمیں ہے تری تیغ سے ہر عضو موجود — مغرب تباہی عرصہ گہ ترک و تاز ہے

اس مشن کے سلسلے میں نواب رامپور نے بھی کافی رقم دی اور

؎۱ حیات شبلی صفحہ ۵۹۵

؎۲ مسل دیشی خطوط نمبر ۱۶ سنہ ۱۹۱۶×۱۹ انڈیا آفس لندن بحوالہ تحریک شیخ الہند صفحہ ۳۱۴×۱۹۸

؎۳ نقوش شخصیات نمبر اکتوبر ۱۹۶۵ء صفحہ ۷۵۴

اور دوسروں سے بھی دلوائی۔

دسمبر ۱۹۱۲ء کو ڈاکٹر انصاری صاحب اپنا یہ تاریخی مشن لے کر ترکی روانہ ہوئے۔

اس موقعہ مولانا ابوالکلام آزاد نے بے حد جذباتی اپنے مخصوص خطیبانہ انداز میں لکھا۔ آپ الہلال میں رقمطراز ہیں :

اے بلقان جانے والے غیور اور ہمدرد مسلمانو!
جب تم وہاں پہنچنا، تب نہایت ہی احتیاط اور نرمی سے
زخمی ترکوں کے زخم دھونا،
دیکھنا وہ دُکھنے نہ پائیں
کیونکہ وہ زخم ترکوں کے نہیں
بلکہ قوم اسلام کے زخم ہیں...
اسلام کے زخموں کی مرہم پٹی کی ضرورت ہے۔
ان کے زخموں کو اپنا زخم خیال کرنا اور نہایت احتیاط کے
ساتھ ان پٹیاں چڑھانا۔ [1]

یہ طبی وفد خالص انسانی وملی جذبہ کے ساتھ گیا تھا اور جلد ہی انھوں نے سارے عالمِ اسلام میں شہرت حاصل کرلی۔ اس عہد کے تمام ترکی سے ہمدردی رکھنے والے اخبار و رسائل نے اس مشن کی کارکردگی کی تعریف کی اور اپنے کالموں میں نمایاں طور پر ان کی خدمات کو سراہا۔ متعدد ترکوں کے ساتھ میں نے ڈاکٹر صاحب کی تصویر دیکھی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی ایک نادر ترکی تصویر حسن اتفاق سے مجھے دستیاب ہوگئی ہے۔

جب یہ وفد کارہائے نمایاں انجام دے کر واپس ہندوستان آیا تو علامہ شبلی اس وقت بمبئی میں تھے۔ انھوں نے سٹیشن پر اس وفد کا استقبال کیا۔ اور ایک طویل نظم خیر مقدم ڈاکٹر انصاری کے نام سے لکھی۔ فرماتے ہیں:

ادا کرتے ہیں ہم شکر جناب حضرت باری
کہ آئے خیریت سے ممبران وفد انصاری

ہزاروں کوس جاکر بھائیوں کی تم نے خدمت کی
یہی تھا دردِ اسلامی یہی تھی رسمِ غم خواری

تمہیں کچھ جاں نوازی ہائے سلامی کو سمجھے گے
کہ تم دیکھ آئے ہو نصرانیوں کا طرزِ خوں خواری

اس طبی مشن نے ترکوں اور ہندوستانیوں کو بے حد قریب کردیا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ انگریزوں نے مصطفےٰ کمال کو قتل کرانے کی سازش کی تو اپنے ہندوستانی جاسوس مصطفےٰ صغیر مرادآبادی کا اس کام کے لیے انتخاب کیا۔ اس خیال سے کہ یہ ہندوستانی ہونے کی وجہ سے ہر جگہ بلا روک ٹوک پہنچ جائے گا۔ اور ترکوں کو ہندوستانیوں سے جو عقیدت پیدا ہوگئی ہے اس سے کام لے کر مصطفےٰ کمال کو ختم کردے گا۔

ڈاکٹر صاحب نے زندگی میں کئی سفر کیے۔ لیکن یہ ان کی زندگی کا کامیاب ترین سفر تھا۔ جس نے ان کی صلاحیتوں کو ابھار دیا۔ اور بین الاقوامی شہرت کا انسان بنادیا۔

اب ڈاکٹر صاحب کی سیاسی زندگی شروع ہوگئی۔ جس کی ابتدائی نشوونما آپ کے بھائی حکیم نابینا صاحب نے کی تھی۔ جیسے جیسے ڈاکٹر صاحب کی سیاسی سرگرمیاں تیز ہوتی گئیں حکومت وقت کا عتاب شدید سے شدید تر ہوتا گیا۔ اس عہد میں اگرچہ ڈاکٹر صاحب کو مطب کرنے کی فرصت کم تھی مگر پھر بھی آپ ملک کے چند مشہور ڈاکٹروں میں گنے جاتے ہیں۔

روسائے وقت سے آپ کے دوستانہ تعلقات تھے۔ اور آپ جہاں سے جب چاہتے اپنی حسب منشا امداد حاصل کرلیتے۔ نواب حامد علی خاں والی رامپور آپ کے مربیِ خاص تھے....

انگریزوں کو یہ بات معلوم تھی کہ ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں، علی برادران نواب رامپور سے ہر قسم کی امداد حاصل کرتے ہیں۔ حکومت نے نواب صاحب پر زور دیا کہ آپ ان لوگوں کو سیاسی سرگرمی سے روک دیں۔

نواب صاحب نے اس سے معذوری ظاہر کی البتہ یہ وعدہ کیا کہ وہ ان حضرات کی اپنی موجودگی میں اعلیٰ انگریز حکام سے ملاقات وتبادلہ خیالات کراسکتے ہیں اور ایسا نواب صاحب نے کئی مرتبہ کرایا بھی۔

لیکن انگریز جب ان لیڈروں کو رام نہ کرسکے تو نواب صاحب کو حکم دیا گیا کہ آپ ان لوگوں سے ربط ضبط نہ رکھیں اور ریاست میں ان کی آمد پر پابندی لگادیں۔ نواب صاحب نے انگریزوں سے صرف اتنا وعدہ کیا کہ وہ محمد علی وشوکت علی جن کا وطن بھی رامپور ہے۔ ان کو ریاست میں کبھی نہیں آنے دیں گے..... جہاں تک ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاں کا تعلق ہے۔ میں ان کو ریاست میں آنے سے نہیں روک سکتا۔ اس لیے کہ یہ میرے مزاج داں طبی مشیر ہیں سیاسی نہیں۔ نواب صاحب کے اس عذر کو حکومت نے مان لیا....

لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ان حضرات کو نواب صاحب کی شفقت ومہربانی حکومت وقت کی پابندیوں کے باوجود حاصل رہی۔ کبھی کبھی خاص حالات میں شکررنجی بھی ہوجاتی تھی۔

اتنی بات یقینی ہے کہ ڈاکٹر انصاری صاحب سے تعلقات نواب حامد علی خاں کے بھی اور نواب رضا علی خاں کے بھی ہمیشہ خوشگوار رہے اور دن بدن مستحکم ہوتے رہے۔ جبکہ علی برادران سے اکثر اور حکیم اجمل خاں سے کئی مرتبہ تعلقات کافی کشیدہ ہوگئے....

ڈاکٹر صاحب کے سیاسی خطوط جو ریاست رامپور سے متعلق تھے ان کے بارے میں اس وقت کچھ نہیں کہا جاسکتا....

---

[1] سیرت محمد علی از ندیم صہبائی ص ۴۴
[2] مآثر المسیح ص ۱۱۲

لیکن چند تحریریں جو دستیاب ہوئی ہیں ان سے کچھ نہ کچھ حالات پر روشنی پڑتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں :

مخدوم و مکرم جناب نواب صاحب السلام علیکم [۱]

والا نامہ باعثِ افتخار ہوا۔

میں اس طرف کا چند زخمیوں کو دیکھنے کی غرض سے چلا گیا تھا۔ اس وجہ سے جواب عریضہ میں تاخیر ہوئی۔ خواستگار معافی ہوں۔

حضور کی رائے درست ہے۔ تمسکات کا انتظام کر کے میں اپنے ہمراہ دورے میں ضرور رکھوں گا۔

پورے پروگرام سے عالی جناب کو میں بعد میں مطلع کروں گا....

حضور نے تمسکات کی آمدنی کے بارے میں جو انتظام کیا ہے وہ نہایت ہی درست اور مناسب ہے...

میں نے محمد علی صاحب کو آپ کا خط دکھا دیا انھوں نے فرمایا کہ نواب صاحب کا ارشاد بہت بجا ہے۔ میں احتیاط کروں گا...

ایک اور خط میں لکھتے ہیں :

مجھ کو بے حد مسرت ہوتی اگر آپ اپنے شایانِ محبت و مقتضائے الفت مجھ کو اس کا موقع مرحمت فرماتے جو جناب حاذق الملک کو عطا ہوا ہے...

.... مجھ کو جتنا وقت کہ فرصت کا ہوگا۔ انشاء اللہ جناب کی خدمت میں گزارنا اپنا فخر سمجھوں گا....

اگست ۱۹۱۳ء

نیاز مند : مختار احمد انصاری دہلی

دربار رامپور میں حکیم اجمل خاں اور ان کے خاندان کو قابلِ رشک مقام حاصل تھا۔ جو بقول نواب رضا علی خاں تقریباً ایک صدی تک جاری رہا۔ نواب صاحب لکھتے ہیں تبھی بھی اس خاندان کی پرورش کرنا ہے اور جب تک حکیم احمد خاں خانہ نشین اور حکیم بھورے میاں و حکیم جمیل خاں اس دنیا سے رخصت نہ ہوئے ریاست رامپور ان کی امداد کرتی رہی۔

حکیم اجمل خاں سے دربار رامپور سے کبھی کبھی معاصرین کو شکوہ و شکایت کے ساتھ ساتھ رقابت بھی پیدا ہو جاتی تھی۔ ایک دور میں نواب حامد علی خاں مولانا محمد علی سے ناراض ہو گئے۔ مولانا کو شبہ ہوا کہ اس میں حکیم اجمل خاں کا ہاتھ ہے اور پھر مولانا حکیم صاحب سے کچھ کبیدہ رہنے لگے...

ڈاکٹر انصاری صاحب کو باضابطہ ریاست رامپور سے طلبی پر پانچ سو روپیہ یومیہ ملا کرتا تھا۔ رخصتانہ سفر خرچ قیام و طعام الگ رہا.... اس کے برعکس حکیم اجمل خاں سے معاملہ مختلف تھا۔

حکیم صاحب کے سکریٹری ابرار حسین صاحب اپنے عہد کی بات لکھتے ہیں کہ :

حکیم صاحب کو پانچ سو روپیہ ماہوار تنخواہ اور قیام رامپور کے دوران تین سو روپیہ روزانہ فیس ریاست ادا کرتی تھی۔

۲۸ دسمبر ۱۹۲۷ء کو جب حکیم صاحب کا رامپور میں انتقال ہو گیا تو ماہوار تنخواہ کے پانچ سو روپے تاحیات حکیم صاحب کے صاحبزادے حکیم محمد جمیل خاں کے نام منتقل کر دیے گئے... اور روزانہ فیس حکیم صاحب کے بھانجے حکیم کبریا خاں عرف بھورے میاں کو قیام رامپور کے دوران ملنے لگی ــــ

۱۵ جون ۱۹۳۰ء کو نواب حامد علی خاں کا انتقال ہو گیا اور نواب رضا علی خاں حکمراں ہو گئے۔

نواب رضا علی خاں ڈاکٹر صاحب کا بے حد احترام کیا کرتے تھے۔ نواب صاحب نے کئی اعلیٰ عہدے دار ڈاکٹر صاحب کی سفارش پر رامپور میں ملازم رکھے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی مالی اعانت بھی کی اور اکثر طبی معاملات کے علاوہ دیگر مسائل میں بھی ڈاکٹر صاحب سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو جامعہ ملیہ سے بے حد دلچسپی تھی، اور نواب رضا علی خاں کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے۔ ڈاکٹر صاحب جامعہ ملیہ کے شیخ الرئیس تھے اور نواب مسلم یونیورسٹی کے چانسلر...

ادھر نواب حامد علی خاں کو طب یونانی سے جو عقیدت تھی۔ نواب رضا علی خاں کو وہ نہیں تھی۔ اور اب ہندوستان میں کوئی ایسا جامع صفات طبیب بھی نہیں تھا جیسے حکیم اجمل خاں صاحب تھے۔

نواب حامد علی خاں کے انتقال کے بعد دربار رامپور میں خواجہ حسن نظامی صاحب کا عروج شروع ہوا۔ انھوں نے کوشش کی کہ جو مقام عہد حامدی میں حکیم اجمل خاں کو تھا وہ ڈاکٹر انصاری صاحب کے بڑے بھائی حکیم نابینا صاحب کو دلوا دیا جائے۔ اس سلسلہ میں خواجہ صاحب نواب رضا علی خاں کو لکھتے ہیں :

....

شہزادی صاحبہ کے علاج کے لیے میں پھر رائے دیتا ہوں کہ حکیم نابینا صاحب کے معجزانہ طریق علاج سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

ہندوستان کیا تمام دنیا میں اس قابلیت کا یونانی طبیب اب نہیں ہے۔

جس مرض کے علاج کے لیے یورپ کے سفر میں لاکھوں روپیہ کے خرچ کا ارادہ ہو وہ گھر بیٹھے بہت تھوڑے خرچ اور بہت

---

[۱] مجموعہ مکاتیب مخطوطہ شاد پبلک لائبریری رامپور

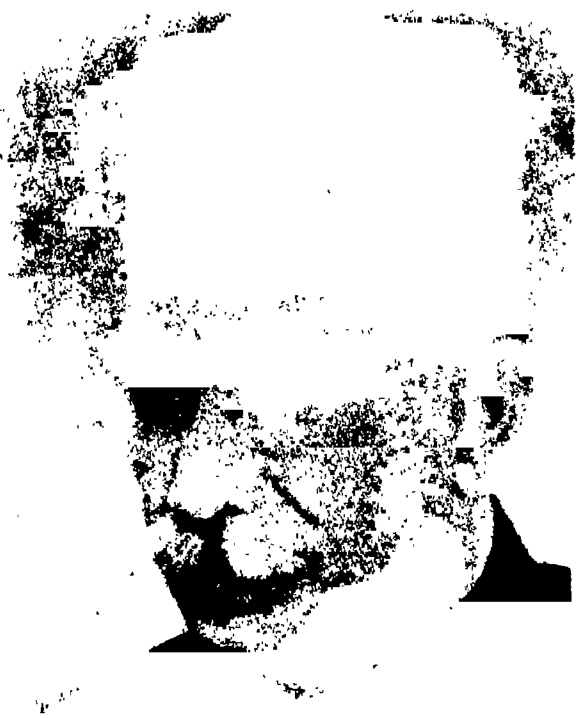

مقوڑے دنوں میں ہو سکتا ہے۔ بلکہ ہز ہائی نس کی پتھری کا علاج بھی حکیم صاحب سے کرانا چاہیے۔

ڈاکٹر سر محمد اقبال کے گردہ کی پتھری دسمائی اپنج کی تھی حکیم نابینا صاحب کے علاج سے تین دن میں نامعلوم طریقے سے گھل کر پیشاب میں نکل گئی۔ ورنہ یہیں ڈاکٹر کہتے تھے کہ اپریشن کے بغیر چارہ نہیں ہے۔

اگر حکیم صاحب کو بلانا ہو تو جناب ڈاکٹر انصاری صاحب سے کہا جائے کہ وہ یونانی طب کی آزمائش کے لیے اپنے بڑے بھائی حکیم نابینا صاحب سے بچی کے مرض کی نسبت مشورہ کرلیں۔

دعاگو حسن نظامی

۷ ماہ علی ۱۳۱۳ء

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

۸ ستمبر ۱۹۳۳ء

یور ہائینس۔

آداب عرض ہے۔

حکیم نابینا صاحب نے ٹیلی فون میں مجھ سے کہا کہ ہز ہائی نس نواب صاحب رام پور کی بہن دہلی میں آئی ہیں اور انھوں نے مجھ کو علاج کے لیے اپنی قیام گاہ پر بلایا ہے۔ میں ان کے مکان پر جاؤں یا نہ جاؤں؟۔

میں نے جواب دیا کہ میں اعلیٰ حضرت نواب صاحب سے دریافت کر کے بتاؤں گا کیونکہ بیگم صاحب کی نسبت سنا جاتا ہے کہ وہ ہز ہائی نس کی اجازت اور مرضی کے بغیر آئی ہیں۔ ممکن ہے کہ نواب صاحب اس بات کو پسند نہ فرمائیں کہ ان کی اجازت کے بغیر آپ نے ان کا علاج کیا۔

لہٰذا بذریعہ تار یا ٹیلی فون مجھ کو منشائے مبارک سے آگاہی عطا ہو تو نوازش ہوگی۔

دعاگو حسن نظامی

کتابیات:

حیات شبلی — از سید سلیمان ندوی — صفحہ ۵۹۵

مآثر المسیح — محمد ابرار حسین — صفحہ ۱۲۸

حیات اجمل — قاضی محمد عبد الغفار — صفحہ ۴۷۸

دبدبۂ سکندری — جنوری ۱۹۲۸ء — صفحہ ۱۰

خطبات کانگرس — ادبستان لاہور — صفحہ ۲۸۴

گنجہائے گراں مایہ — رشید احمد صدیقی — صفحہ ۷

جامعہ کی کہانی — عبد الغفار مدھولی — صفحہ ۲۰۵

کچھ پرانے خط — جواہر لال نہرو — صفحہ ۱۳۱

دید و شنید — رئیس احمد جعفری — صفحہ ۴۷۴

تحریک شیخ الہند — مولانا محمد میاں — صفحہ ۲۱۰×۲۱۲

کیا خوب آدمی تھا — آل انڈیا ریڈیو دہلی — صفحہ ۷۸

روئداد طبی کانفرنس اجلاس رامپور ۶ مارچ ۱۹۲۶ء

مرتبہ مان سنگھ وید — صفحہ ۱۱۱

کلیات شبلی اردو — مسعود علی — صفحہ ۴۰ — نظم خیر مقدم انصاری شعر ۲۵

آہنگ — (مجموعہ کلام) مجاز — صفحہ ۵۸ — ہنگامہ طرابلس و بلقان

سیرت محمد علی — رئیس احمد جعفری — ۲۲۷

عثمانی ہلال احمر — ترکی — ۲۱۰ مطبع حلیق عثمانی ترکی

سیرت محمد علی از ندیم صہبائی۔ نایاب پریس دہلی — صفحہ ۴۴

سرکاری ریکارڈ ریاست رامپور

راقم کا مقالہ۔ مولانا محمد علی پر پہلا مضمون جامعہ فروری ۱۹۸۰ء صفحہ ۴۳

آہنگ (مجموعہ مجاز) صفحہ ۱۰۲، مزار رہنما

مجاز ایک آہنگ — صفحہ ۸۷، مجاز کا ایک یادگار خط

نقوش لاہور — شخصیات و مکاتیب نمبر

۱؎ مضامین نیازی۔ اقبال کی آخری علالت، سید نذیر نیازی صفحہ ۹۷

۲؎ ناقابل فراموش۔ از دیوان سنگھ مفتون صفحہ ۳

ڈاکٹر انصاری

اڈنبرا سے استنبول تک

عتیق صدیقی

یہ ۱۹۱۲ء کا ذکر ہے کہ میں نے اہلِ ہند کو قریب سے دیکھا۔ بلقان کی جنگ ختم ہو چکی تھی۔ مگر اس کے مصائب مابعدِ جنگ کا سلسلہ ابھی جاری تھا۔ ہندوستان کا وفد ہلالِ احمر استنبول کی مجلسوں میں پیش پیش تھا۔ اس وفد کے صدر ڈاکٹر انصاری تھے جو میری نظر میں ہندستانی مسلمانوں کے بہترین نمایندے تھے۔

——— خالدہ ادیب خانم

[illegible]

[illegible]

[illegible]

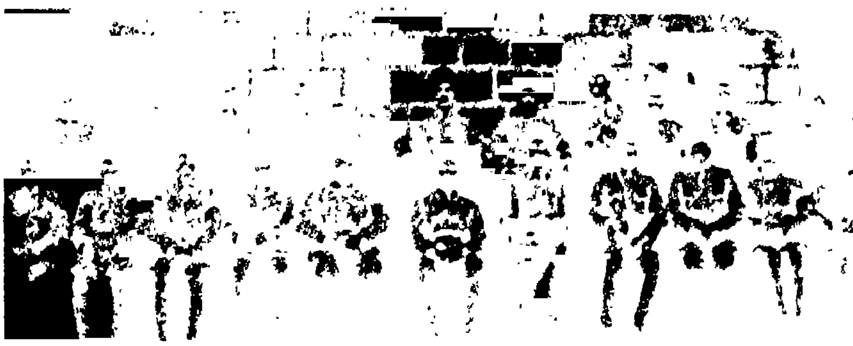

[illegible]

۱۹۱۲ء وہ سال ہے جس کی طرف ترک ادیب سیاست داں خاتون خالدہ ادیب خانم نے اشارہ کیا ہے، ڈاکٹر انصاری کی پبلک زندگی میں اہم ترین سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ جنگِ بلقان کے سلسلے میں ہندستانی ہلالِ احمر کے طبی وفد کی قیادت ہی نے ان کی پبلک زندگی کی پہلی اینٹ رکھی۔ ہم اگر چاہیں تو اس کی قطعی تاریخ کا تعین بھی کر سکتے ہیں۔ محمد علی کے ہفت روزہ کامریڈ کی اشاعت مورخہ ۲۶ر اکتوبر ۱۹۱۲ء میں ان کا ایک طویل مراسلہ "ترکی کے لیے ہلالِ احمر مشن" کے عنوان سے شائع ہوا تھا، جس میں جنگ بلقان کے مجروحین کی مرہم پٹی اور ان کی طبی دیکھ ریکھ کے لیے ایک فوجی اسپتال فوری طور پر ترکی بھیجنے کی تجویز نہایت موثر انداز میں بڑی قابلیت کے ساتھ پیش کی گئی تھی۔ مسلمانوں نے انتہائی خوش دلی سے ان کی تجویز کا خیر مقدم کیا۔ اسی ۲۶ر اکتوبر ۱۹۱۲ء کو ڈاکٹر انصاری کی عوامی زندگی کا نقطۂ آغاز قرار دینا غلط نہ ہوگا۔

جنگ طرابلس کے فوراً بعد ترکوں پر جنگ بلقان کی جو بپتا پڑی تھی، اس نے ہندستانی مسلمانوں کو ترک عوام سے کم متاثر نہیں کیا تھا۔ مسلمانانِ ہند کے جذبات کو بیدار، بلکہ برانگیختہ کرنے میں اردو اخبارات نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ اس ضمن میں ابوالکلام آزاد کا الہلال (کلکتہ)، ظفر علی خاں کا زمیندار (لاہور) اور وحید الدین سلیم کا مسلم گزٹ (لکھنؤ) سب سے زیادہ پیش پیش تھے۔ الہلال نے شذرات کے کالم میں "اخوت یا حق جہاد" کے عنوان سے مسلمانوں کو یاد دلایا تھا کہ "بے شک ترک انسان ہیں، اور نیز مظلوم، پس دنیا میں ہر منصف اور نیک روح کے لیے ان کی مدد انسانی ہمدردی اور نوع پرستی میں داخل ہے۔ لیکن ہم صاف صاف کہتے ہیں کہ مسلمانانِ ہند کے لیے ان کی مدد نہ تو محض حق اخوت ہے اور نہ محض انسانی ہمدردی، بلکہ صریح اور یقینی طور پر حق جہاد اور قتال فی سبیل اللہ ہے۔"

اسی سلسلے میں صورت حال کی نزاکت کو واضح کرتے ہوئے انھوں نے مزید یہ بھی لکھا تھا کہ:

> "پس مسلمانوں کو صرف اس پر نظر رکھنی چاہیے کہ ترکی دنیا کا ایک اسلامی ملک ہے جہاں۔۔۔ مسلمان مجاہدین کی ہزاروں لاشیں تڑپ چکی ہیں اور زخمیوں کی کثرت سے قسطنطنیہ کی مسجدیں تک بھری پڑی ہیں۔ ایسی حالت میں اسلام ان سے اپنا حق طلب کرتا ہے۔ اگر انھوں نے اس فرض کے انجام دینے میں ذرا بھی غفلت کی تو یاد رکھیں کہ قیامت کے دن اللہ کے سامنے [کوئی] عذر نہ چلے گا۔۔۔"[2]

ترکی خلافت اسلامیہ کا مرکز تھا۔ اسی نسبت سے ہندستانی مسلمانوں کو صدیوں سے ترکوں کے ساتھ شدید قلبی لگاؤ رہا تھا۔ ڈاکٹر انصاری بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی ترکی کے ساتھ ان کا ایک اور غیر محسوس رشتہ بھی تھا، جس کا احساس ان کے تحت الشعور میں چھپا رہا ہوگا۔ ان کے مورثِ اعلیٰ ابوایوب انصاری ترکی ہی میں آسودۂ خاک تھے۔ وہ مدینہ کے رہنے والے تھے، اور اسلام کی تاریخ میں ان کی ذات کئی اعتبار سے اہمیت کی حامل ہے۔ پیغمبر اسلام کو جب مکے سے ہجرت کرکے مدینہ جانا پڑا، تو ان ہی کو پیغمبر اسلام کی میزبانی کا فخر حاصل ہوا تھا۔ پیغمبر اسلام کی زندگی میں اور ان کے بعد بھی، ابوایوب انصاری اسلام کی جملہ عسکری مہموں میں شریک رہے تھے۔ اس سلسلے کی آخری مہم جس میں انھوں نے حصہ لیا تھا، وہ قبرص اور قسطنطنیہ کی لشکر کشی تھی۔ اسی مہم کے دوران میں ان کو پیچش کا مرض لاحق ہوا اور ۵۲ ہجری (۶۷۲ء) میں انھوں نے جان جاں آفریں کے سپرد کر دی اور وصیت کے مطابق قسطنطنیہ کی شہر پناہ کے اندر مدفون ہوئے۔[3] ڈاکٹر انصاری کو اس عظیم مجاہد انصاری کی اولاد" ہونے پر فخر تھا۔" وہ کہتے تھے "میرا خاندان اسی انصاری سے نسبت رکھتا ہے۔"[4]

ابوایوب انصاری کی وفات کے تقریباً چھ سو سال بعد ان کے خاندان کے بعض افراد غالباً تیرہویں صدی عیسوی میں ہندستان وارد ہوئے۔ اثنائے سفر میں انھوں نے کچھ مدت تک ایران کے مشہور شہر شیراز میں بھی شاید قیام کیا تھا۔ اسی مناسبت سے اس خاندان کے ایک بزرگ حمید الدین خواجہ شیرازی کے نام سے مشہور ہوئے، جو محمد بن تغلق کے عہد میں قاضی کے عہدے پر مامور تھے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے بھتیجے محمد یوسف نے ان کی جگہ لی۔ ان ہی محمد یوسف نے ایک بستی بسائی اور اپنے نام پر اس کا نام یوسف پور رکھا۔

۱۸۸۰ء میں یوسف پور کی اسی بستی میں مختار احمد انصاری پیدا ہوئے۔ یہ بھی ایک دلچسپ، مگر بامعنی، اتفاق تھا کہ یہ بچہ جو آگے چل کر نامی گرامی طبیب (ڈاکٹر) بننے والا تھا ۲۵ر دسمبر کو عین اسی تاریخ اس دنیا میں آیا تھا، جو حضرت عیسیٰ کی پیدائش کا دن ہے، جنھیں فارسی اور اردو ادب میں مسیحا کہا جاتا ہے، کیونکہ ان کی دعا سے اور ان کے ہاتھ کے مس سے مریضوں کو شفا ہو جاتی تھی۔

ضلع غازی پور کے گزیٹیر کے مطابق ڈاکٹر انصاری کے والد عبدالرحمٰن ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں ضلع بلیا میں صدر امین تھے[5] اور ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے دنوں میں سرسید اور اکثر دوسرے سرکاری ملازمین کی طرح انھوں نے بھی انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔ لیکن ان کے بیٹوں اور عزیزوں نے آزادی

---

[1] اندرونِ ہند: ترجمہ ہاشمی فرید آبادی ــ ص ۱۱

[2] الہلال: ۱۱ر دسمبر ۱۹۱۲: ص ۲

[3] بحوالہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام: جلد اول: ص ۹-۱۰۸ (جدید ایڈیشن)

[4] بحوالہ پروفیسر محمد مجیب: آج کل: پیش نظر شمارہ

[5] بحوالہ ڈاکٹر مشیر الحسن: مسلمان اور کانگریس (انگریزی) ص XVIII

کی تحریک میں حصہ لے کر اس کا کفارہ ادا کر دیا۔ یہ سب دیوبند کے انگریز دشمن مذہبی و سیاسی مدرسۂ فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ حکیم عبدالوہاب انصاری اور حکیم عبدالرزاق انصاری نے جو ڈاکٹر انصاری کے بڑے بھائی تھے، دیوبند ہی کے مدرسے میں تعلیم حاصل کی تھی اور ملازمت کی جگہ طبابت کا پیشہ اختیار کیا تھا۔ یا پھر برطانوی ہند کی جگہ ریاست حیدرآباد کی ملازمت میں داخل ہوئے۔

حکیم عبدالوہاب مولانا رشید احمد گنگوہی کے مرید تھے جو دیوبند کے مدرسے کے بانیوں میں تھے۔ بصارت سے محروم ہونے کی وجہ سے وہ حکیم نابینا کے نام سے مشہور ہوئے۔ طب کی دنیا میں ان کا وہی مقام تھا جو ڈاکٹری کی دنیا میں انصاری کا تھا۔ میر محبوب علی نظام دکن کے وہ طبیب خاص تھے۔ آخری نظام دکن، میر عثمان علی خان کے عہد میں بھی وہ 'شاہی طبیب' رہے' لیکن کسی اختلاف کی بنا پر دکن کو چھوڑ کر ہندستان آگئے۔ کچھ عرصے تک پونہ اور بمبئی میں رہنے کے بعد دہلی آئے[۱۵] اور پھر اپنے چھوٹے بھائی ڈاکٹر انصاری کی طرح وہ بھی دہلی ہی کے ہو رہے۔ راجاؤں اور نوابوں کے علاوہ متوسط اور چھوٹے طبقے کے لوگ بھی دور دور سے ان کے علاج کے لیے آتے تھے۔ ان کے مریضوں کی فہرست میں ڈاکٹر محمد اقبال بھی تھے، جو علاج کے لیے لاہور سے دہلی آیا کرتے تھے۔ ان کے متعدد خطوط ملتے ہیں جو اپنی' اور اپنی اہلیہ کے علاج کے سلسلے میں انھوں نے لکھے تھے۔

حکیم عبدالرزاق بھی دیوبند اسکول کی پیداوار اور اسی سلسلے میں مرید بھی تھے۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن سے ان کے گہرے دوستانہ روابط تھے۔ اور سیاسی معاملات میں ان کے دست راست تھے۔ ہجرت (۱۹۱۶ء) کے سلسلے میں بھی عبدالرزاق نے ان کی مالی امداد کی تھی۔

ڈاکٹر انصاری کو بھی زمانے کے دستور کے مطابق پہلے مکتب ہی میں داخل کیا گیا' تاہم اور بھائیوں کے برعکس انھیں اسکول اور مغربی طرز کی تعلیم

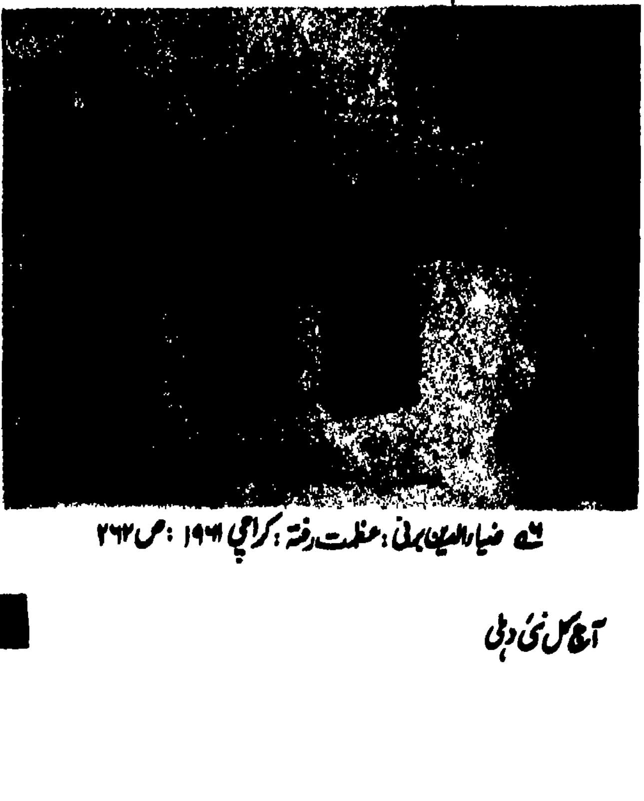

[۱۵] ضیاءالدین برنی: عظمت رفتہ: کراچی ۱۹۶۱: ص ۲۶۲

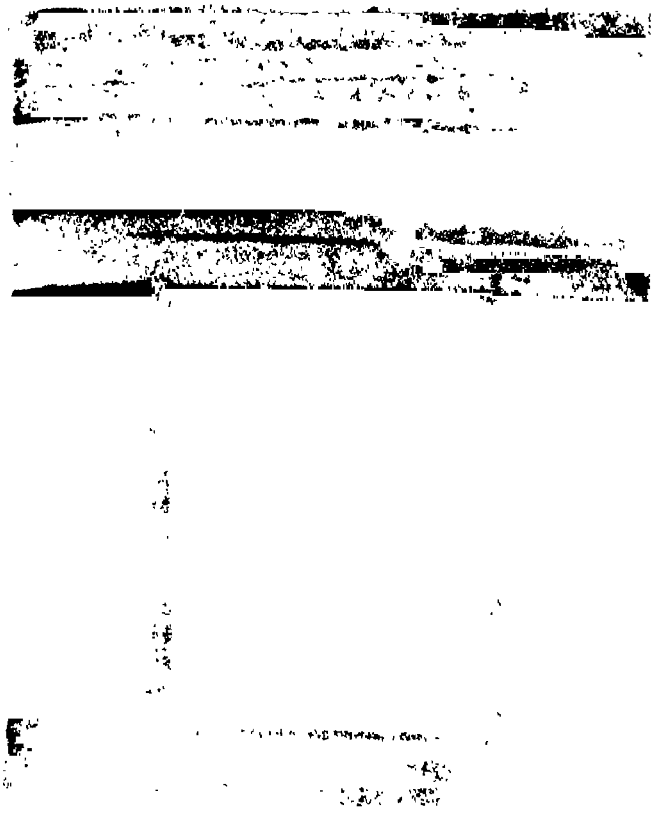

دی گئی۔ دیوبند کے مدرسے سے وابستہ ہونے کا فخر تو انھیں حاصل نہ ہو سکا تھا، تاہم ذہنی اعتبار سے وہ دیوبند اسکول ہی سے تعلق رکھتے تھے اور شیخ الہند محمود حسن کے ہاتھ پر انھوں نے بیعت بھی کی تھی۔

ڈاکٹر انصاری ذہین اور محنتی طالب علم تھے۔ اسکول سے لے کر کالج کی آخری منزل تک انھیں ہمیشہ وظائف ملتے رہے۔ اسی سلسلے کا آخری وظیفہ وہ تھا جو انگلستان میں ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے ریاست حیدرآباد سے غالباً ۱۸۹۹ء میں اس لیے ملا تھا کہ انھوں نے نظام کالج حیدرآباد سے انٹرمیجیٹ (سائنس میں) پاس کیا تھا' اور اول آئے تھے۔ اس وقت نظام کالج کا مدراس یونیورسٹی سے الحاق تھا اور مدراس ہی میں امتحان ہوتا تھا۔

انگلستان میں ڈاکٹر انصاری نے مشہور طبی درس گاہ اڈنبرا یونیورسٹی کے میڈیکل کالج میں داخلہ لیا۔ اسی یونیورسٹی سے انھوں نے ماسٹر آف میڈیسنز (M.D.) کی اور ماسٹر آف سرجری (M.S.) کی ڈگریاں حاصل کیں' ڈاکٹری کی تعلیم کے سلسلے میں بھی انھوں نے اپنی سابقہ تعلیمی روایات کو برقرار رکھا' اور طبی امتحانوں میں بھی اول آئے۔ اتنی شاندار کامیابیاں اب تک کسی ہندستانی کو نصیب نہیں ہوئی تھیں۔ اسی کی بنا پر لندن کے لاک ہوسپٹل میں انھیں رجسٹرار اور چیرنگ کراس ہوسپٹل میں ہاؤس سرجن مقرر کیا گیا۔ یہ اعزاز بھی اب تک کسی ہندستانی کے حصے میں نہیں آیا تھا۔

یہ حیرت ناک نہیں ہے کہ برطانوی رجعت پرست رائے عامہ نے برطانوی اسپتالوں میں ایک ہندستانی کے تقرر کو پسند نہیں کیا تھا۔ لندن

کے ایک اخبار نے ڈاکٹر انصاری کے تقرر کو " برطانوی ڈاکٹروں کے ساتھ شدید ناانصافی " سے تعبیر کیا۔ اور احتجاج نے غالباً زیادہ شدت اختیار کرلی تھی جس کی تفصیل آگے بیان کی جائے گی۔

بیسویں صدی کی تقریباً پوری پہلی دہائی ڈاکٹر انصاری نے اڈنبرا اور لندن میں بسر کی۔ یہ اگرچہ خاصی طویل مدت تھی، تاہم ان کے اس دور کی انگلستانی زندگی کے حالات بڑی حد تک ہماری دست رس سے باہر ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کے انگلستانی معاصرین میں جواہر لال نہرو کے علاوہ کسی اور نے اپنے یا دوسروں کے بارے میں یادداشتیں نہیں چھوڑی ہیں۔ اگرچہ ان میں بعض ایسے افراد بھی تھے جو آگے چل کر ملک کی سیاسی و سماجی زندگی میں ڈاکٹر انصاری کے رفیق اور ممتاز حیثیت کے مالک بنے۔ مثلاً جے۔ این۔ سین گپتا، عبدالمجید خواجہ، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، ڈاکٹر اقبال شیخ عبدالقادر، سر شاہ محمد سلیمان اور عطیہ فیضی۔ ان میں جواہر لال نہرو نے اپنی خودنوشت میں برسبیل تذکرہ انصاری کا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح عطیہ نے اپنی مختصر تالیف 'اقبال' (انگریزی) میں ایک ہی جگہ انصاری کا نام لیا ہے' اگرچہ عطیہ کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر علی ازہر فیضی ڈاکٹر انصاری کے معاصر اور دوست تھے۔ عطیہ کی بڑی بہن نے اپنے یورپ کے سفرنامے (۱۹۰۸ء) میں بھی ڈاکٹر انصاری کا ذکر کیا ہے؛ جو جواہر لال اور عطیہ کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ ہے۔

متذکرہ بالا تینوں ماخذوں کے علاوہ ایک نہایت اہم مضمون لفٹیننٹ کرنل ڈاکٹر شاہ کا ہے، جو لندن میں ڈاکٹر انصاری کے معاصر اور دوست بھی تھے، جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ اس مضمون کی نشان دہی حال ہی میں مسرت حسین صاحب آزاد رام پوری نے کی ہے اور اس ضمن میں ان کی اس عنایت کا شکریہ نہ ادا کرنا احسان ناشناسی ہوگی، کہ انھوں نے اس کی نقل فراہم فرمائی۔

جواہر لال نہرو کا بیان ہے کہ ان کے لندن وارد ہونے کے چند ہی روز بعد جس پہلے ہندستانی سے ان کی ملاقات ہوئی وہ ڈاکٹر مختار احمد انصاری تھے، جو " اس وقت ایک طرح دار ذہین نوجوان، اعلا تعلیمی کامیابیوں کے حامل اور لندن کے ایک ہسپتال میں ہاؤس سرجن تھے۔"[7]

عطیہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ۲۳ رجون ۱۹۰۷ء کو انھوں نے اپنے یہاں لندن میں ایک تقریب کا اہتمام کیا تھا، جس میں " ہندستانی اور انگریز حاضرین مدعو تھے۔ اس موقع پر ڈاکٹر انصاری نے گانا سناکر، لارڈ ہنا کی بیٹیوں سکو مولو اور رد مولو نے موسیقی سے اور اقبال نے جملہ اہم مدعوین کی شان میں فی البدیہہ ہجویہ اشعار کہہ کر حاضرین کو محظوظ کیا۔"[8]

[7] جواہر لال نہرو : خودنوشت (انگریزی) : ص ۱۹

[8] عطیہ بیگم : اقبال (انگریزی) : ص ۱۸

عطیہ کی بڑی بہن ہر ہائی نس نازلی بیگم آف جنجیرہ نے ۱۹۰۸ء میں یورپ کی سیاحت کی۔ ان کے چھوٹے بھائی ازہر فیضی ڈاکٹر انصاری کے دوست تھے اور ان دنوں لندن میں ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ڈاکٹر انصاری جب میڈیکل مشن لے کر ترکی گئے تو ڈاکٹر فیضی بھی مشن میں شریک ہوئے۔ نازلی بیگم نے اپنے سفرنامے میں ڈاکٹر انصاری کے متعلق مختصر سے اقتباس میں بہت کچھ کہہ دیا ہے : " ڈاکٹر انصاری جو ازہر کے دوست ہیں اور بہت لائق آدمی ہیں ' ہمیں ملنے آئے۔ اور بہت دیر تک ان سے باتیں ہوتی رہیں ... انھیں ہز ہائی نس نظام دکن کی طرف سے وظیفہ ملتا ہے۔ سب امتحان پاس کر چکے ہیں۔ اور یہیں لندن میں ان کو کام مل گیا ہے۔ یہاں انھیں بیس پونڈ (تین سو روپے) ماہوار ملتے ہیں۔ اقبال کی شاعری کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ ڈاکٹر انصاری کو ابھی دو سال اور یہاں گزارنے ہیں۔ سات سال سے وہ یہاں ہیں۔"[9]

لفٹیننٹ کرنل ڈاکٹر شاہ کا بیان ہے کہ ڈاکٹر انصاری سے ان کی " پہلی ملاقات لندن میں ہوئی تھی جبکہ وہ ایڈنبرا یونیورسٹی سے ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کر چکے تھے اور میں ابھی سینٹ بارتھولومیوز ہاسپٹل میں طالب علمانہ زندگی بسر کر رہا تھا۔ اس زمانہ میں وہ لندن کے چیرنگ کراس

[9] نازلی بیگم : سیر یورپ : ص ۲۶

ہاسپٹل میں ہاؤس سرجن تھے۔ اس اسپتال کے ساتھ ایک تعلیمی درس گاہ بھی ملحق ہے اور میرا خیال ہے کہ میرا یہ بیان صداقت پر مبنی ہے کہ انصاری ان ابتدائی چند ہندستانیوں میں سے تھے جو لندن کے کسی درس و تدریس دینے والے اسپتال میں ہاؤس سرجن کی حیثیت سے مقرر ہوئے ہوں۔

" میرا یہ معمول تھا کہ میں ہر ہفتہ سہ پہر کو چیرنگ کراس ہاسپٹل میں انصاری سے ملنے کے لیے ان کی قیام گاہ پر جایا کرتا تھا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ شام کے وقت ہم اسٹرینڈ میں سیر و تفریح میں مشغول تھے کہ شام کے ایک اخبار کے پوسٹر پر ہماری نظر پڑی جس میں جلی حروف میں یہ الفاظ درج تھے۔ 'برطانوی ڈاکٹروں کے ساتھ شدید بے انصافی'۔ میں نے اخبار خرید لیا اور میرے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ سارا مضمون میرے دوست انصاری سے متعلق تھا جس میں لندن کے ایک بڑے ہسپتال میں بہ حیثیت ہندستانی کے ان کے تقرر پر شدید نکتہ چینی کی گئی تھی اور اس پر زور دیا گیا تھا کہ ایسی آسامیاں ہمیشہ نوجوانان برطانوی ڈاکٹروں سے پُر کی جانی چاہئیں۔

" ذاتی طور پر انصاری اسپتال میں بے حد ہر دلعزیز تھے اور ان کے رفقائے کار نے ان کے تقرر پر اخباری نکتہ چینی کے خلاف سخت غصہ کا اظہار کیا تھا۔ اس واقعہ کے ایک دو دن بعد چیرنگ کراس ہاسپٹل کی گورننگ کونسل کے چیرمین کی جانب سے ایک دفتری اعلان شائع کیا گیا جس میں یہ بات واضح کی گئی تھی کہ انصاری کا تقرر محض قابلیت کی بنا پر کیا گیا ہے اور برطانوی اسپتالوں کے لیے وہ دن نہایت افسوسناک ہوگا جبکہ ہاؤس سرجنوں کی آسامیوں کا اعلا آسامیوں میں شمار نہ رہے گا اور قابلیت کے معیار کے سوائے محض جذبات کا لحاظ رکھا جائے گا۔

" جس زمانہ میں انصاری ہاؤس سرجن تھے اس زمانہ کا یہ واقعہ ہے کہ میں ان کے یہاں ڈنر پر مدعو تھا جب ڈنر ختم ہو گیا تو انھوں نے خلاف توقع مجھے نہایت قیمتی سگاروں کا ایک بکس پیش کیا اور فرمایا کہ میرے پاس ایسے بکس ایک درجن ہیں جن میں سے میں نے تمہارے لیے چھ بکس محفوظ کر دیئے ہیں جو تمھیں قسط وار ملتے رہیں گے۔

" انگلستان میں سگار ایک مہنگی عیاشی شمار کی جاتی ہے اور قدرتی طور پر میں یہ جاننے کے لیے بیتاب تھا کہ اتنی دولت ان کے ہاتھ کہاں سے لگی۔ آخرکار یہ راز خود بخود کھل گیا اور مجھے معلوم ہو گیا کہ اس تحفہ کی بھیجنے والی مس ماڈیلائن ہیں جو اس زمانہ میں عریاں رقصوں کی وجہ سے دنیا بھر میں نمایاں شہرت حاصل کر چکی تھیں۔ ان کی خادمہ کسی سڑک کے حادثہ میں بُری طرح زخمی ہو گئی تھی اور اسپتال میں لائی گئی تھی جہاں انصاری نے اپنے وارڈ میں اس کا کامیابی کے ساتھ علاج کیا تھا۔ مس ماڈیلائن نے تحفہ کے ساتھ ایک مختصر رقعہ بھی بھیجا تھا جس میں ان کی کوششوں کا شکریہ ادا کیا گیا تھا جو انھوں نے مریضہ کی بحالی صحت کے لیے کی تھیں۔ رقعہ کے آخر میں ان سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ اپنے فنی کمال کے اعتراف میں جس کا اظہار خادمہ کے علاج کی صورت میں ہوا تھا اس حقیر تحفہ کو قبول فرمائیں۔ [۱۰]

" جو لوگ انصاری سے بہ حیثیت ڈاکٹر کے ان کی مابعد کی زندگی میں ملے ہیں وہ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ مذکورہ بالا اعتراف کے وہ پورے طور پر مستحق تھے اور یہ کہ ملک بھر کے بے شمار مریض بالخصوص غریب طبقوں سے تعلق رکھنے والے اشخاص نہ صرف انھیں اپنا چہیتا ڈاکٹر خیال کرتے تھے، بلکہ ہر اعتبار سے انھیں اپنا دوست سمجھتے تھے۔۔۔ [۱۱]

مندرجہ بالا بیانات سے اس بات کا ہمیں اندازہ نہیں ہوتا کہ لندن کے دوران قیام میں ڈاکٹر انصاری کو سیاست سے کوئی دلچسپی تھی یا نہیں؟ اس دور میں جو ہندستانی طالب علم انگلستان میں تھے ان میں سے بیشتر میں قومی شعور پیدا ہو چکا تھا۔ اس کی ایک ہلکی سی جھلک علیہ ہی کی ڈائری کے

---

[۱۰] مس ماڈیلائن ہندستان بھی تشریف لائی تھیں۔ اس سلسلے میں مولانا عبدالماجد دریابادی کی وساطت سے ہماری معلومات میں دلچسپ اضافہ ہوتا ہے:

" ۱۳ء میں مس ماڈیلائن صاحبہ ہندستان تشریف لائی تھیں جن کا نام یورپ اور امریکا میں بچے بچے کی زبان پر تھا اور ہندستان کے انگریزی اخبارات کے کالم ان کے کارناموں سے لبریز ہوتے تھے۔ ان کا کمال یہ تھا کہ نہایت باریک لباس میں، جو جسم کے صرف نصف حصے کا ساتر ہوتا تھا، سٹیج پر تشریف لاتی تھیں اور حالتِ رقص میں بالکل برہنہ ہو جاتی تھیں۔ لیکن جسم اس تیزی سے گردش کرتا رہتا تھا کہ ناظرین کی نگاہ جسم کے کسی حصے پر ٹھہرنے نہیں پاتی تھی۔

" راقم مضمون نے لکھنؤ کے انگریزی ناچ گھر (رنگ تھیٹر) میں یہ تماشا اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ لکھنؤ کے شوقین تماشائی اس منظر سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لیے دوربینیں لے کر گئے تھے۔"

مندرجہ بالا اقتباس مولانا عبدالماجد نے اکبر الٰہ آبادی کی شاعری پر اپنے ایک طویل مقالے کے حاشیے میں درج کیا تھا، جو رسالہ اردو (اورنگ آباد) کے اپریل ۱۹۲۳ء کے شمارے (صفحہ ۲۱۲) میں ملتا ہے۔

مقالات ماجد (مطبوعہ کتب خانہ تاج آفس بمبئی) میں بھی یہ مقالہ شامل کیا گیا ہے اور مندرجہ بالا حاشیہ بھی اس مجموعے کے صفحہ ۱۱۰ پر ملتا ہے، مگر اس میں آخری پیرا حذف کر دیا گیا ہے۔

[۱۱] ڈاکٹر ام شاہ: بعض مشاہیر سے میری ملاقاتیں: ترجمہ ضیاء الدین برنی

ایک اندراج میں نظر آتی ہے، جس میں ہندستانی نوجوانوں کے ایک اجتماع کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں انصاری کی موجودگی کا تو پتہ نہیں چلتا، لیکن عطیہ اور ان کے بھائی ڈاکٹر ازہر سے انصاری کے جو تعلقات تھے، ان کے پیش نظر انصاری کی موجودگی بعید از قیاس نہیں۔ اس سے قطع نظر، اس اندراج میں 'اجتماع' کے ایک ہی فرد کا نام برسبیل تذکرہ دیا گیا ہے:

"۲۷ر جولائی ۱۹۰۷ء: احباب کی ایک بزم بے تکلف میں بیش تر ہندستانی مقیم لندن شریک ہوئے۔ ایک نوجوان ہندستانی پرمیشور لال نے بڑے پرجوش لب ولہجے میں وہ خطوط پڑھ کر سنائے جو اس کے گھر والوں نے لکھے تھے۔ پھر اسی نے مخزن نامی رسالے سے چند نظمیں سنا کر حاضرین کو محظوظ کیا۔ یہ سب اقبال کی قومی نظمیں تھیں۔ پرمیشور لال نے بتایا کہ یہ نظمیں سارے شمالی ہند میں گائی جا رہی ہیں۔ گھروں، بازاروں اور گلی کوچوں کی فضائیں ان نظموں سے گونج رہی ہیں اور ان کی وجہ سے ہندستان میں قومیت کا وہ احساس پیدا ہو رہا ہے، جو اس سے پہلے مفقود تھا۔ یہ سن کر حاضرین میں اس قدر جوش و خروش پیدا ہوا کہ سب نے مخزن میں چھپی ہوئی نظموں کو مل کر گانا شروع کیا اور سارا ہال اقبال کی نظموں سے گونجنے لگا۔"[12]

قاضی عبدالغفار نے حیات اجمل میں ڈاکٹر انصاری کی مرتب کردہ یادداشتوں سے ایک واقعہ نقل کیا ہے جس کا تعلق اگرچہ حکیم صاحب کے سفر انگلستان سے ہے، تاہم اس سے ڈاکٹر انصاری کے قومی ذہن پر بھی بالواسطہ روشنی پڑتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"حکیم صاحب سے میری پہلی ملاقات لندن میں [ہوئی تھی] جب میں چیرنگ کراس ہسپتال میں ہاؤس سرجن تھا... ان کو لندن کے مشہور ہسپتالوں کے معائنہ کا شوق تھا۔ چیرنگ کراس ہسپتال کا معائنہ بہت چھان بین اور ہر شعبہ کی تحقیقات کے ساتھ میرے ہمراہ کیا... ڈاکٹر اسٹینلی بائیڈ، چیرنگ کراس کے مشہور اور سینیر سرجن تھے۔ اور بادشاہ کے بھی وہ آنریری سرجن تھے... میں ان ہی کا ہاؤس سرجن تھا۔ حکیم صاحب سے ان کی ملاقات میں نے کرائی۔ انھوں نے حکیم صاحب کو ایک روز اپنے کلی نی کل سرجری کلاس میں، جو کہ ہر دوشنبہ اور پنج شنبہ کو چیرنگ کراس ہسپتال کے کسی ایک وارڈ میں طلبا کو عملی تعلیم دینے کے لیے ہوا کرتا تھا، دعوت دی۔ ایک مریض کے متعلق مسٹر بائڈ سمجھا رہے تھے۔ حکیم صاحب سے بھی انھوں نے مریض کو دیکھنے اور تشخیص کرنے کی دعوت دی بعد معائنہ حکیم صاحب نے یہ تشخیص کی کہ مریض کی آنتوں کے ابتدائی حصے میں کہنہ زخم ہیں، جس کے باعث درد کی تکلیف، یرقان اور حرارت تھی۔ ڈاکٹر بائڈ کی رائے میں وہ پت کی تھیلی کا ورم تھا۔ انھوں نے حکیم صاحب کو نہایت خلق اور اصرار سے دوسرے روز صبح کو اس مریض کے آپریشن کے وقت بلایا اور ہنس کر کہا کہ یہ طب یونانی و انگریزی کا امتحان ہے۔ آپریشن سے پتہ چل جائے گا کہ کون سی طب صحیح ہے۔ مجھ کو کسی قدر اندیشہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری دیسی طب کی بے عزتی ہو جائے۔ آپریشن کے وقت میں کسی قدر تشویش میں تھا۔ لیکن شکم چاک کرنے پر حکیم صاحب کی تشخیص صحیح نکلی اور ڈاکٹر بائڈ نے نہایت فیاضی اور کشادہ پیشانی کے ساتھ حکیم صاحب کو ان کی کامیابی پر مبارکباد دی۔ حکیم صاحب کو اور مجھ کو اپنے گھر ڈنر کے لیے اور اس کے بعد ان کے ہمراہ تھیٹر جانے کی دعوت دی۔ ڈاکٹر بائڈ کی بیوی لندن کے مشہور زنانہ ہسپتال کی سینیر سرجن تھیں۔ ان سے حکیم صاحب کا تعارف کراتے ہوئے بائڈ نے کہا کہ ڈاکٹر انصاری کے جس ہم وطن پہلوان نے مجھے سرجری کی کشتی میں شکست دی ہے، وہ یہ صاحب ہیں..." (حیات اجمل: ص ۹۹ تا ۱۰۰)

ڈاکٹر انصاری نے انگریزی طب کی تعلیم حاصل کی تھی اور یہی ان کا پیشہ بنا تھا، تاہم انگریزی طب کے مقابلے میں اپنی دیسی طب کی ہیٹی ان کو گوارا نہ تھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ خود ان کا تعلق یونانی اطبا کے خاندان سے تھا۔ اس سے قطع نظر ڈاکٹر انصاری کو طب یونانی سے عملی دلچسپی بھی تھی۔ حکیم عبدالحمید صاحب نے ڈاکٹر انصاری کی وفات پر 'ہمدرد صحت' (دہلی) میں ایک تعزیتی نوٹ میں لکھا تھا کہ:

"یہ موقع نہ تو ڈاکٹر صاحب مرحوم کے اخلاق و شمائل کی فضیلت بیان کرنے کا ہے اور نہ اس وقت ان کی فنی تحصیل کی بلند پائگی پر اظہار خیال مقصود ہے... ہم کو تو رہ رہ کر ان ٹھوس فنی خدمات کا خیال آ رہا ہے جو انھوں نے طب جدید کے حامل ہونے کے باوجود طب قدیم کی انجام دی ہیں۔ مسیح الملک حکیم اجمل خاں کے اثر صحبت نے ان کے فنی خیالات میں اس قسم کی تبدیلی کر دی تھی کہ وہ ہمیشہ کے لیے طب قدیم کے حامی ہو گئے تھے اور پھر اپنی عادت و فطرت کے مطابق اس تحریک احیاء و تجدید کے سرگرم خادم بن گئے تھے جو مسیح الملک کی قیادت میں شروع

---

۱۲ عطیہ بیگم، تذکرہ: ص ۱۹

ہوئی تھی۔[13]

اس بیان کی تصدیق زہرہ انصاری کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے کہ حکیم اجمل خاں کے طبیہ کالج کا شعبہ جراحی بڑی حد تک ان کی نگرانی ہی میں کام کر رہا تھا۔[14]

ملک کی عوامی زندگی میں ڈاکٹر انصاری کا نام پہلی بار ۱۹ر اکتوبر ۱۹۱۲ء کو کامریڈ کے صفحات پر نمودار ہوا۔ کامریڈ کے دہلی اڈیشن کے اس پہلے شمارے میں ہندستانی مسلمانوں کو یہ مژدہ سنایا گیا تھا کہ "دہلی کے ڈاکٹر مختار احمد انصاری جن کا نام ڈاکٹر کی حیثیت سے محتاج تعارف نہیں ہے، ہندستانی ہلال احمر کا ایک میڈیکل مشن لے کر ترکی جانے والے ہیں۔"[15] یہی خبر بعد میں اردو اخباروں میں بھی شائع ہوئی اور ڈاکٹر انصاری کے نام کو شہرت کے پر لگ گئے۔

ڈاکٹر انصاری کا میڈیکل مشن ہندستان کی جدید تاریخ میں کئی اعتبار سے قابل ذکر ہے۔ ایک تو ڈاکٹر انصاری کے ارادے کی اشاعت نے مسلمانوں میں ایک نیا جوش اور ولولہ پیدا کیا، جو آگے چل کر خلافت تحریک کے دور میں نقطۂ عروج کو پہنچا۔ دوسرے یہ کہ مشن ہندستان کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا پہلا اور انوکھا اقدام تھا، جس نے مغربی ایشیا کے ملکوں کے ساتھ قریبی روابط پیدا کرنے کی اس پالیسی کی داغ بیل ڈالی، جسے جدوجہد آزادی کے دور میں انڈین نیشنل کانگرس نے آگے بڑھایا، اور آزاد ہندستان کی حکومت نے اسی کو اپنی خارجہ پالیسی کا اصل اصول قرار دیا اور آج تک اسی پر کاربند ہے۔

اس کا ایک تیسرا اہم تاریخی پہلو یہ بھی ہے، جسے عام طور پر نظر انداز کیا گیا ہے کہ جنگ بلقان کے سلسلے میں ہندو لیڈروں اور ہندو اخبارات نے بھی مسلمانوں کے جذبات کی ہم نوائی کی تھی۔ "کلکتہ کے ایک جلسۂ عام میں، جو ترکوں کی حمایت میں منعقد ہوا تھا، مشہور بنگالی لیڈر بپن چندر پال نے اعلان کیا کہ ہماری ہمدردی ترکوں کے ساتھ ہے ۔ ۔ ۔ اخبار بنگالی مورخہ ۲۳ر اکتوبر میں سریندر ناتھ بنرجی نے ترکوں کے ساتھ ہمدردانہ جذبات کا اظہار کیا ہے۔ مسٹر تلک کے اخبار مرہٹہ مورخہ ۲۷ر اکتوبر [۱۹۱۲] میں بھی ترکوں کی حمایت و تائید کے خیالات ظاہر کیے گئے ہیں۔ بمبئی و کلکتہ میں عام طور پر ہندو بھائیوں نے جنگ بلقان کے متعلق مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی کا ثبوت دیا ہے۔ لکھنؤ کے مشہور ہندو آرگن اخبار ہندستان نے بھی ایسے ہی خیالات کا بار بار اظہار کیا ہے۔"[16]

ڈاکٹر انصاری کے میڈیکل مشن کی تجویز کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ متعدد اسباب کی بنا پر ان کی یہ تجویز حکومت ہند کو اور ہندستان کی سرکار پرست مسلم قیادت کو ایک خدا ساز بات معلوم ہوئی ہوگی، کیوں کہ متوسط طبقے کے تعلیم یافتہ مسلمان اور مسلم عوام دونوں حکومت سے اور اپنی رجعت پرست قیادت سے برگشتہ ہو رہے تھے۔ ایک ہی سال پہلے جنگ طرابلس کے سلسلے میں حکومت کی روش معاندانہ رہی تھی، اور مسلم قیادت نے بھی اس باب میں مجرمانہ خاموشی اختیار کی تھی۔ علی گڑھ کے ایم اے او کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دینے کی مسلمانوں کی درخواست کو حکومت نے مسترد کر دیا تھا، جس کے لیے انھوں نے تیس لاکھ روپے جمع کیے تھے۔ اس نے مسلمانوں میں غم و غصہ پیدا کیا تھا۔ رہی سہی کسر تقسیم بنگالہ کی تنسیخ کے اعلان نے پوری کر دی تھی۔ اس موخر الذکر اقدام نے تو سرکار پرست مسلم قیادت کے بادبان سے بھی ہوا نکال دی اور وہ منھ چھپا کر بیٹھ گئی۔ ان حالات میں ڈاکٹر انصاری کی تجویز نے حکومت کو اس بات کا اچھا موقع فراہم کر دیا کہ اس کی تائید و حمایت کر کے مسلمانوں کے جذبات کو کچھ حد تک آسودہ کر سکے۔ چنانچہ حکومت نے اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور اس کا خاطر خواہ نتیجہ بھی برآمد ہوا۔ ایک طویل مضمون کے ضمن میں مسلم گزٹ نے اس بات کے لیے حکومت کا شکریہ ادا کیا تھا کہ اس نے ہندستانی مسلمانوں کو ان کے "دور افتادہ مظلوم بھائیوں کی امداد کی علانیہ اجازت دی ہے۔"[17]

بایں ہمہ اسی اخبار کی وساطت سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کے ہمدردانہ طرز عمل کے باوجود مسلمانوں کو حکومت کی نظر میں کھوٹ ہی نظر آ رہا تھا، اور مسلمانوں کی بدگمانی اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ حکومت کو اس کی باضابطہ تردید کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چناں چہ ایک سرکاری اعلان میں کہا گیا کہ "حضور وائسرائے کو بتایا گیا ہے کہ اس مطلب کی افواہیں مسلمانوں میں پھیلی ہوئی ہیں کہ گورنمنٹ ہند دل سے نہیں چاہتی کہ ہندستان سے کوئی طبی مشن ترکی کو روانہ کیا جائے، اور وہ اس کے راستے میں روڑے اٹکا رہی ہے۔ لہٰذا حضور ممدوح کی خواہش ہے کہ اس حقیقت سے ہر خاص و عام کو مطلع کر دیا جائے کہ یہ افواہیں سراسر بے بنیاد ہیں اور ان کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔"[18]

ترکی کے ساتھ عملی ہمدردی کا ثبوت دینے کے لیے خود وائسرائے نے جنگ بلقان کے امدادی فنڈ میں چندہ دیا، اور دوسرے اعلا سرکاری

---

[13] ہمدرد صحت (دہلی)؛ جولائی ۱۹۳۶ء: ص ۷
ہمدرد صحت کے اقتباس کے لیے میں عبدالواسع صاحب (لکچرر شعبۂ اسلامیات جامعہ ملیہ اسلامیہ) کا ممنون ہوں۔

[14] آج کل زیر نظر شمارے میں زہرہ انصاری کے تاثرات

[15] کامریڈ: ۱۹ر اکتوبر ۱۹۱۲ء: ص ۲۹۲

[16] مسلم گزٹ (لکھنؤ)؛ ۶ر نومبر ۱۹۱۲ء: ص ۲

[17] ایضاً: ۶ر نومبر ۱۹۱۲ء: ص ۴

[18] ایضاً: ۱۱ر دسمبر ۱۹۱۲ء: ص ۴

افسروں نے بھی ان کی تقلید کی۔ یہی بات مسلم قیادت پر بھی صادق آتی ہے۔ بقول ابوالکلام آزاد " ادھر وائسرائے کے چندے کی خبر مشہور ہوئی اور ادھر علی گڑھ کو بھی " جو اس وقت رجعت پرست مسلم قیادت کا گڑھ تھا " یاد آگیا کہ بلقان کی وادی میں ایک جنگ ہو رہی ہے ۔"[19]

ابوالکلام آزاد کے مندرجہ بالا جملے میں جو تلخی پنہاں ہے اس سے قطع نظر، ان کا بیان حقیقت پر مبنی ہے۔ انسٹیٹیوٹ گزٹ، جو علی گڑھ کی قیادت کا سرکاری ترجمان تھا، اس کی وساطت سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ میڈیکل مشن کے ترکی روانہ ہونے سے چند روز قبل ڈاکٹر انصاری علی گڑھ بھی گئے تھے۔ ان کو خوش آمدید کہنے کے لیے طالب علموں کو یونین میں جلسہ کرنے کی اجازت دی گئی۔ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر ضیاء الدین نے ڈاکٹر انصاری کے علی گڑھ آنے کا شکریہ ادا کیا۔[20]

اس کے بعد ہی " علی گڑھ کے طلباء میں انگریزوں کے خلاف غیظ و غضب کی چنگاریاں اور زائد بھڑکیں اور ان کے جلسوں میں انگریزوں کو برملا سخت سست کہا جانے لگا "۔ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ ڈاکٹر انصاری کے میڈیکل مشن کے ساتھ جانے والوں میں کم از کم نصف درجن افراد ایسے تھے، جن کا براہ راست علی گڑھ کالج سے تعلق تھا۔ خلیق الزماں، شعیب قریشی، عبدالرحمٰن بجنوری، عبدالعزیز انصاری، منظور محمود اور عبدالرحمٰن پشاوری۔ ان میں سے موخرالذکر تو ترکی ہی میں رہ گئے تھے اور ترکی کی فوج میں داخل ہو کر پہلی جنگ عظیم میں ترکوں کے شانہ بشانہ لڑے بھی تھے۔[21]

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ اس میڈیکل مشن کے ترکی بھیجنے کی اسکیم محمد علی کے ذہن کی پیداوار تھی۔ لیکن یہ خیال صرف خوش فہمی، یا پھر لاعلمی پر مبنی ہے۔ اس کے خالق ڈاکٹر انصاری ہی تھے۔ میر محفوظ علی بدایونی، جو کامریڈ اور ہمدرد کے انتظامی شعبوں سے وابستہ ہونے کے علاوہ ادارتی خدمات بھی انجام دیتے تھے اور علی برادران کے قدیم ترین رفیق و شیدائی تھے، ان کا بیان ہے کہ جب یہ خبریں آنے لگیں کہ ترکوں کو سب سے زیادہ ضرورت طبی امداد کی ہے " تو ڈاکٹر انصاری نے چاہا کہ ہندستان سے ایک طبی وفد لے جائیں ۔ ۔ ۔ چنانچہ انھوں نے بطور خود ایک تخمینۂ اخراجات تیار کیا ۔ ۔ ۔ یہ تجویز محمد علی کے سامنے بھی پیش کی، جسے محمد علی نے بہت پسند کیا اور ہر قسم کی مدد دینے پر آمادہ ہو گئے ۔"[22]

میر محفوظ علی نے ڈاکٹر انصاری کی جس اسکیم کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ کامریڈ میں ایک طویل مراسلے کی شکل میں شائع ہوئی تھی۔ انھوں نے لکھا تھا کہ

" یوں تو ترکوں نے جب سے باسفورس پر اپنا تسلط قائم کیا ہے، وہ مسلسل برسرپیکار رہے ہیں۔ لیکن آج ترک جس جنگ سے دوچار ہیں اپنی نوعیت کی وہ پہلی اور عظیم ترین جنگ ہے "۔ عثمانی سلطنت کے لیے بلقان کی اہمیت پر روشنی ڈالنے کے بعد میڈیکل مشن روانہ کرنے کی فوری ضرورت کے دو اسباب انھوں نے گنائے تھے :

۱۔ ترکی افواج کی میڈیکل سروس چوں کہ حال ہی میں قائم کی گئی ہے، اس لیے موجودہ جنگ کی خطرناک صورت حال کا مقابلہ کرنے کی وہ اہل نہیں ہے۔

۲۔ اس جنگ میں ترکی کے حریف کو یورپی طاقتیں وسیع پیمانے پر جنگی ساز و سامان کے علاوہ طبی امداد بھی فراہم کر رہی ہیں۔ اس کے برعکس غریب ترکوں کا انحصار صرف اپنے ہی ذرایع پر ہے۔ ان کے اس بار کو کچھ ہلکا کرنے کے لیے ہم جو کر سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ ایک جنگی اسپتال ان کے لیے فراہم کریں، جس میں کثیر تعداد میں مجروح اور بیمار ترک سپاہیوں کو رکھا جا سکے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے یقیناً بڑے سرمائے کی اور بہت سے افراد کی ضرورت ہوگی۔

اسی مراسلے میں انھوں نے اس امر کی بھی وضاحت کی تھی کہ آج جس تیزی سے ترکی میں حالات بدل رہے ہیں، ان کے پیش نظر فوری اقدام کی ضرورت ہے۔ اگر اس میں تاخیر ہوئی اور وسط نومبر تک مشن روانہ نہ کیا جا سکا تو ہماری کوششیں بے سود ثابت ہوں گی۔ یہ مشن وسط نومبر کی جگہ وسط دسمبر میں روانہ ہو سکا، لیکن چند ہفتوں میں اس کے انتظامات کی جملہ منزلوں کا طے ہو جانا، ایک بڑا کارنامہ تھا۔

ڈاکٹر انصاری کی اسکیم کے مطابق اس میڈیکل مشن کے لیے چھ سے آٹھ تک ایسے ڈاکٹروں کی ضرورت تھی جنھوں نے انگلستان کے میڈیکل کالجوں اور اسپتالوں میں طبی تعلیم و تربیت حاصل کی ہو۔ ان کے علاوہ نرسنگ ڈریسنگ اور انتظامی کے لیے بھی سو افراد درکار تھے۔ اور روانگی سے قبل ان سب کو فرسٹ ایڈ کی مختصر سی تربیت دینی ضروری تھی۔

آخری اور سب سے اہم بات جو اس مراسلے میں ہمیں معلوم ہوتی ہے یہ ہے کہ اس مشن کے ساتھ جانے والے تمام افراد کو اپنے اخراجات خود برداشت کرنے تھے۔[23]

اس امر کا اعتراف نہ کرنا شدید ناانصافی ہوگی کہ ڈاکٹر انصاری کی تجویز کو محمد علی کی پرزور حمایت و تائید اگر حاصل نہ ہوتی تو اس بیل کا منڈھے چڑھنا ممکن نہ ہوتا۔ دہلی میں ترکوں کی حمایت میں ایک انجمن ہلال احمر قائم تھی، اور

---

[19] الہلال ؛ شذرات ؛ ۲۷ر نومبر ۱۹۱۲ء : ص ۲
[20] بحوالہ مسلم گزٹ ؛ ۲۷ر نومبر ۱۹۱۲ : ص ۲
[21] خلیق الزماں : شاہراہ پاکستان : ص ۲۵۲، ۲۵۴
[22] میر محفوظ علی ؛ طنزیات و مقالات ؛ ص ۱۸-۱۱۷

[23] کامریڈ ؛ ۱۶ر اکتوبر ۱۹۱۲ : ص ۳۲۱

کے ایک جلسے میں محمد علی نے ڈاکٹر انصاری کی تجویز پیش کی۔ پھر جلسے ہی میں انھوں نے میر محفوظ علی سے، جو کامریڈ کے منیجر تھے، سوال کیا کہ اس وقت :

"ہمارے پاس کتنی رقم ہے ؟"

"اٹھنے ہزار لتنے سو روپے" محفوظ علی نے جواب دیا۔

"الحمد للہ ہمارے پاس کافی رقم ہے"۔ محمد علی نے کہا "انصاری ! میں نے طے کر لیا ہے کہ انشاء اللہ مشن جائے گا"

اسی رات کو محمد علی نے کامریڈ کے لیے مضمون لکھا "جس میں مسلمانوں سے طبی مشن کے چندے کے لیے دل ہلا دینے والی اپیل کی، جس نے کامریڈ کے دفتر میں روپیوں کی بارش کر دی"۔ محفوظ علی کا بیان ہے کہ "میں گواہ ہوں کہ منی آرڈروں اور پارسلوں پر دستخط کرتے کرتے میرا ہاتھ شل ہو گیا تھا"[۲۴]

ڈاکٹر انصاری محمد علی کے ساتھ ترکی روانہ ہونے سے قبل

یہ صورت حال دہلی تک محدود نہیں تھی، بلکہ ملک کے بڑے شہروں کے علاوہ قصبات وغیرہ میں بھی ہلال احمر کمیٹیاں قائم تھیں، جن کو بے حساب نقد اور سامان وصول ہو رہا تھا۔ اس وقت میرے سامنے اس دور کا صرف ایک ہی اہم اخبار مسلم گزٹ (لکھنؤ) ہے۔ اس کے صفحات کے صفحات نقد رقمیں، زیورات اور دیگر سامان دینے والوں کی فہرست سے بھرے ہیں۔ "لکھنؤ میں امدادی نیلام" کے عنوان سے ایک خبر ملتی ہے، جو نمونے کے طور پر پیش کی جا رہی ہے :

"لکھنؤ کی انجمن ہلال احمر نے ... علاوہ نقد چندہ کے بہت سا اسباب مثل ظروف مسی و چینی و شیشہ آلات و پارچہ دگھڑیاں و زیورات وغیرہ جمع کیا ہے۔ اور یہ کل اسباب شیخ عابد علی صاحب سوداگر کے مکان کے سامنے ایک شامیانے کے نیچے جمع کر کے ۲۷ ر دسمبر ۱۹۱۲ء کو نیلام کیا گیا۔ قریب چھ سات سو روپے کے کل سامان فروخت ہوا۔ زیورات اور کپڑے ابھی بہت سے باقی ہیں، بعد کو مسلسل نیلام ہوگا۔ مرحوم راجا نوشاد علی کی اہلیہ محترمہ نے مرحوم کا قیمتی سامان ہلال احمر فنڈ کو دے دیا ہے۔ اور جناب نواب احمد حسین خاں صاحب ڈیوڑھی آغا میر میں تشریف لائے۔ بہت سامان خریدنے کے علاوہ اپنی سواری کی ٹم ٹم چندے میں دے ڈالی"۔[۲۵]

مسلم گزٹ کے اسی شمارے میں 'ڈاکٹر انصاری کے استقبال' کے عنوان سے ایک خبر ملتی ہے، جس سے عوام و خواص کے جوش کا اندازہ ہوتا ہے :

"۲ ر دسمبر ۱۹۱۲ء کو لکھنؤ اسٹیشن سے ڈاکٹر انصاری صاحب گزرے۔ اگرچہ ان کی آمد کی اطلاع بہت تنگ وقت میں ہوئی تھی مگر اس مجاہد فی سبیل اللہ کی زیارت اور استقبال کے لیے اعیان لکھنؤ کا اچھا اجتماع ریلوے اسٹیشن پر ہو گیا تھا... شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی نے ڈاکٹر صاحب موصوف کے بوٹ کو بوسہ دیا..."۔[۲۶]

۲۵ ر جنوری ۱۹۱۳ء کے کامریڈ میں مشن کے ممبروں کا ایک گروپ فوٹو ملتا ہے، جس میں ڈاکٹر انصاری کی بغل میں محمد علی بھی درمیان بیٹھے ہیں اور ان کے نام کے آگے بریکٹ میں آرگنائزر لکھا ہے۔ گروپ تین صفوں میں تقسیم ہے۔ پہلی دو میں لوگ کھڑے ہیں اور تیسری میں کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ نام یہ ہیں، جو پچھلی صف سے شروع ہوتے ہیں :

عبدالعزیز انصاری، حسین رضا بیگ، حامد رسول، عبدالرحمن پشاوری، عبدالوحید خاں، شعیب قریشی۔

نور الحسن، چراغ الدین، توقیر حسین، قاضی بشیر الدین احمد، یوسف انصاری، تفضل حسین، منظور علی۔

غلام احمد، ڈاکٹر محمود اللہ، ڈاکٹر محمد نعیم انصاری، ڈاکٹر مختار احمد انصاری (ڈائرکٹر)، محمد علی (آرگنائزر) ڈاکٹر علی اظہر فیضی (اسسٹنٹ ڈائرکٹر) ڈاکٹر شمس الباری، عبدالرحمن صدیقی (منیجر)، خلیق الزماں۔

---

[۲۴] میر محفوظ علی : متذکرہ : ص ۱۸ — ۱۱۷

[۲۵] مسلم گزٹ لکھنؤ : ۴ ر دسمبر ۱۹۱۲ء : ص ۶ کالم : ۳

[۲۶] مسلم گزٹ لکھنؤ : ۴ ر دسمبر ۱۹۱۲ء : ص ۱ کالم ۳

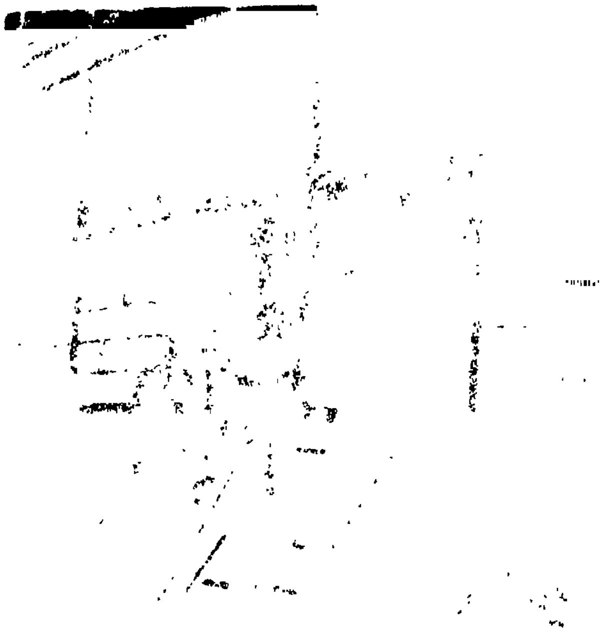

مشن کے ممبروں کی یہ فہرست مکمل نہیں ہے۔ ایک دو افراد گروپ فوٹو میں شامل ہونے سے رہ گئے تھے، کچھ لوگ انگلستان سے براہ راست قسطنطنیہ پہنچے تھے۔ ان میں سے چند ناموں کا خلیق الزماں کی وساطت سے ہمیں علم ہوتا ہے: ڈاکٹر عبدالرحمٰن بہاری، ڈاکٹر رضا حیدر آبادی، آل عمران اور حسن عابد جعفری لندن سے، عبدالقیوم ہندوستان سے آئے تھے۔ ان کے علاوہ منظور محمود مشن کے ساتھ ہی دہلی سے روانہ ہوئے تھے، "جو بہت خوش الحان تھے اور ہم لوگ تک جگا کر ان کا گانا سنا کرتے تھے... ان کے صاحبزادے طلعت محمود بمبئی کی دنیا میں اپنی خوش گلوئی کے لیے کافی شہرت کے مالک ہیں۔"[۱۲]

خلیق الزماں کی 'شاہراہ پاکستان' سے مشن کی دہلی سے روانگی کے نیز ترکی میں مشن کی معروفیتوں کے اجمالی حالات کے علاوہ بعض دلچسپ باتیں بھی ہمیں معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً روانگی کے وقت دہلی اسٹیشن پر اتنا ہجوم تھا کہ مشن کے ممبروں کا ریل کے اپنے درجوں تک پہنچنا مشکل ہو گیا۔

بمبئی سے مشن کی روانگی کی تاریخ خلیق الزماں نے انگریزی کتاب میں ۱۷ر نومبر اور اردو کی کتاب میں ۲ر نومبر لکھی ہے۔ یہ دونوں تاریخیں صحیح نہیں ہیں۔ مشن بمبئی سے ۱۵ر دسمبر کو روانہ ہوا تھا۔

عدن، سوئز اور اسکندریہ میں مشن کا شاندار استقبال ہوا۔ استنبول میں ترکی ہلال احمر کے صدر ہاشم پاشا مشن کو خوش آمدید کہنے کے لیے عرشہ جہاز پر آئے۔ ساحل پر ترک عوام نے اور سپاہیوں نے غیر معمولی جوش و خروش کے ساتھ مشن کا استقبال کیا۔ خلیفۃ المسلمین نے بھی مشن کے ممبروں کو شرف باریابی بخشا۔ سول اور فوجی ترک افسروں کا مشن کو کلی اعتماد جلدی اس لیے حاصل ہو گیا تھا کہ مشن کا کوئی فرد تنخواہ دار ملازم نہیں تھا۔ نیز اس کے پاس آزمودہ کار اور ماہر ڈاکٹر طبقے جو بڑی دردمندی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتے تھے۔ دوسرے شعبوں سے تعلق رکھنے والوں کا بھی یہی حال تھا۔

ڈاکٹر انصاری کے مشن کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس میں بہت سی ترک نرسوں کے علاوہ ایک مصری ڈاکٹر اسد فواد بھی شامل ہو گئے تھے۔ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ جرمن اور فرانسیسی صلیب احمر کے دو اسپتال بھی وہاں تھے اور سید امیر علی کا بھیجا ہوا برطانوی ہلال احمر کا بھی ایک اسپتال تھا۔ ان تینوں کی کارکردگی غیر اطمینان بخش تھی۔ ڈاکٹر انصاری نے ایک خط میں لکھا تھا کہ: "یہ قرین صحت تو نہیں ہے تاہم ان اسپتالوں کے خراب نتائج سے یہاں حقیقتاً یہ تاثر پیدا ہو گیا ہے کہ ارادی طور پر مجروحین کو لنگڑا لولا کیا گیا ہے اور ان کے جوڑ جوڑ کاٹے گئے ہیں، اگرچہ تھوڑی سی توجہ سے علاج کیا گیا ہوتا تو ان بہت سے مجروحین کی جانیں اور ان کے اعضاء بچ سکتے تھے، جو ان کے سپرد کیے گئے تھے۔"

ترکی پہنچنے کے بعد مشن کے ممبروں کو ترکی زبان سے ناواقفیت کی بنا پر، قدرتی طور پر، بڑی مشکل کا سامنا ہوا۔ ابتدا میں عربی و فارسی الفاظ اور اشاروں سے کام چلا۔ لیکن جلد ہی مشن کو ایک ہندوستانی بزرگ حاجی جیلانی مل گئے، جو سورت کے رہنے والے تھے۔ کاروبار کے سلسلے میں مغربی ایشیا کے ملکوں میں رہے تھے۔ شادی مصر میں کی تھی۔ ہر سال ترکی آتے جاتے تھے۔ انھیں مشن کے کاموں کے لیے ملازم رکھ لیا گیا تھا۔

ان ہی بزرگ کی وساطت سے ایک دن مشن کے بعض ممبروں کو انور بے کی زیارت نصیب ہوئی، جو اس زمانے میں اسلامی دنیا میں، خصوصاً ہندستان میں 'ہیرو' سمجھے جاتے تھے۔ اسی ملاقات کے دوران میں انور بے نے مشن کے اسپتال میں آنے کا وعدہ کیا، اور یہ وعدہ انھوں نے پورا بھی کیا اور مشن کے سب ممبروں کے ساتھ فوٹو بھی کھچوائے۔

کم و بیش چھ ماہ کے قیام کے بعد ۴ر جولائی کو مشن واپس بمبئی پہنچا، جو صرف نو ممبروں پر مشتمل تھا۔ باقی ممبروں میں سے کچھ لوگ تو حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہو گئے، کچھ نے وقتی طور پر اور کچھ نے طویل مدت کے لیے ترکی ہی میں قیام کیا۔ اور کچھ انگلستان واپس چلے گئے۔

ترکی سے مراجعت کے بعد مشن کے ساتھ جانے والوں میں ڈاکٹر انصاری کے علاوہ شعیب قریشی، عبدالرحمٰن صدیقی اور خلیق الزماں نے کل ہند سطح پر اور ڈاکٹر محمد نعیم انصاری، قاضی بشیر الدین احمد اور عزیز انصاری نے صوبائی و مقامی سطح پر ملکی سیاست میں اور جدوجہد آزادی کی تحریکوں میں حصہ لیا۔

[۱۲] خلیق الزماں کے یہاں مشن کے حالات 'پاتھ وے ٹو پاکستان' میں صفحہ ۱۴ تا ۲۳ پر اور 'شاہراہ پاکستان' میں صفحہ ۲۵۲ تا ۲۷۳ پر ملتے ہیں۔

شبلی نعمانی

خیر مقدم ڈاکٹر انصاری

ادا کرتے ہیں ہم شکرِ جنابِ حضرتِ باری
کہ آئے خیریت سے ممبرانِ وفدِ انصاری

ہزاروں کوس جا کر بھائیوں کی تم نے خدمت کی
یہی تھا درد اسلامی یہی تھی رسمِ غمخواری

فراقِ ملک و ترکِ خانماں و دوریِ منزل
خدا کے فضل سے تم نے یہ کڑیاں جھیل لیں ساری

تمہارے روکنے کے واسطے ہنگامہ آرا تھے
صدائے نالہ ہائے درد و جوشِ گریہ و زاری

نگاہِ حسرت آلودِ عزیزاں کی سناں باری
فغانِ سینہ ریشانِ محبت کی شرر باری

مگر اک جذبۂ اسلام نے سب کو شکستیں دیں
کہ سب کو چھوڑ کر پہنچے وہاں با ایں گرانباری

جو سچ پوچھو تو تم انصار بھی ہو اور مہاجر بھی
کہ سب اہلِ وطن کو چھوڑ کر پہنچے پئے یاری

کسی کو خواب میں بھی یہ سعادت مل نہیں سکتی
مریضوں کے لیے وہ آپکی شب ہائے بیداری

جو سچ پوچھو تو زیبا ہے تمہیں دعوائے آقائی
کہ تم نے کی ہے ترکانِ مجاہد کی پرستاری

تمہارا ناز اٹھائیں اہلِ ملت جس قدر کم ہے
کہ تم نے غازیانِ دیں کی کی ہے ناز برداری

تمہارے سامنے موتی کی لڑیاں پوت سے کم ہیں
کہ دیکھ آئے ہو تم ترکی یتیموں کی گہرباری

تمہیں کچھ جاں نوازی ہائے اسلامی کو سمجھو گے
کہ تم دیکھ آئے ہو نصرانیوں کا طرزِ خونخواری

نہیں ہے سوزِ اسلامی کا گو نام و نشاں باقی
تمہارے دل میں ہیں کچھ درد کی چنگاریاں باقی

مسلمانوں کے تم نے طالع واژوں بھی دیکھے ہیں
نئے سب انقلابِ گردشِ گردوں بھی دیکھے ہیں

تمہارا دردِ دل سمجھیں گے کیا ہندوستاں والے
کہ تم نے وہ مظالم ہائے روز افزوں بھی دیکھے ہیں

یتیموں کے سُنے ہیں نالہ ہائے جاں گزا تم نے
زنانِ بے نوا کے چہرۂ محزوں بھی دیکھے ہیں

گھروں کو لوٹنے کے بعد زندوں کو جلا دینا
بلادِ مغربی کے یہ نئے قانوں بھی دیکھے ہیں

مسلمانوں کا قتلِ عام اور ترکوں کی بربادی
نتائج ہائے امید گلیڈسٹوں بھی دیکھے ہیں

تمہیں نے غازیوں کے زخم پر ٹانکے لگائے ہیں
شہیدانِ وطن کے جامۂ پرخوں بھی دیکھے ہیں

تمہاری چشمِ عبرت گیر خود ہم سے یہ کہتی ہے
کہ ہم نے وہ مصائب ہائے گوناگوں بھی دیکھے ہیں

لہو کی چادریں دیکھی ہیں رخسارِ شہیداں پر
زمیں پر پارہ ہائے سینۂ پرخوں بھی دیکھے ہیں

نگار آرائیاں دیکھی ہیں چشمِ گوہر افشاں کی
شہیدانِ وفا کے عارضِ گلگوں بھی دیکھے ہیں

تمہیں سے کچھ پتہ ملتا ہے شیدایانِ ملت کا
کہ تم نے شاہدِ اسلام کے مفتوں بھی دیکھے ہیں

جنونِ جوشِ اسلامی کوئی سمجھا تو تم سمجھے
کہ تم نے لیلیِ اسلام کے مجنوں بھی دیکھے ہیں

سہارا ہے اگر امید کا اب بھی کوئی باقی
تو تم نے وہ رموزِ قوتِ مکنوں بھی دیکھے ہیں

عجب کیا ہے یہ بیڑا غرق ہو کر پھر اچھل جائے
کہ ہم نے انقلابِ چرخِ گردوں یوں بھی دیکھے ہیں

دعائے کہنہ سالاں ہے اگر مقبولِ یزدانی
تو اب دستِ دعا ہے اور یہ شبلی نعمانی

مشیر الحسن

ڈاکٹر انصاری

زمانہ اور شخصیت[۱]

۱۹۱۲ء تک ہندوستانی سیاست میں ڈاکٹر انصاری کی دلچسپی کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ لیکن بلقان کی جنگوں نے انھیں کھینچ کر عوامی زندگی کی صف اوّل میں لاکر قومی شہرت اور اثر ورسوخ کے بام تک پہنچا دیا اور شاید غیر متوقع طور پر انھیں قسطنطنیہ بھیجے جانے والے طبی مشن کا سربراہ منتخب کیا گیا۔ اس پوزیشن نے انھیں شمالی ہندوستان کے سرکردہ مسلمانوں کے ساتھ قریبی تعلقات قائم کرنے اور ایک ذہین منتظم کی حیثیت سے متعارف ہونے کا موقع دیا۔ طبی مشن بھیجنے کا خیال کامریڈ کے متلون مزاج ایڈیٹر مولانا محمد علی کے ذہن کی پیداوار تھا اور اسے ہندوستان میں زبردست تائید وحمایت حاصل ہوئی۔ اس کی کامیابی کو بڑی تشہیر ملی اور اس کے لیڈر ڈاکٹر انصاری کو بہت سے مسلمانوں کی خوشنودی حاصل ہوئی۔ یوپی کے لفٹیننٹ گورنر مسٹن کے خیال میں؟ انھیں قابل لحاظ حمایت حاصل ہے اعتدال پسند انھیں مولانا محمد علی اور حال میں نظر بند کئے جانے والے دیگر لیڈروں سے زیادہ وقعت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ترکی کی پہلی جنگ کے دوران طبی مشن میں ان کا نام اور ہندوستان میں ان کی پیشہ ورانہ حیثیت ان کے لیے قابل فخر ہے چنانچہ ایک سیاست داں ایک ڈاکٹر اور ایک قابل منتظم کی حیثیت سے تسلیم شدہ لیڈر کے طور پر ۱۹۱۸ء میں انھیں ہوم رول لیگ کا صدر منتخب کیا گیا۔ ہندوستانی سیاست میں نسبتاً ایک نووارد کے لیے یہ کوئی معمولی کامیابی نہیں تھی بہت سے لوگ اس پوزیشن کی تمنا کرتے رہے ہوں گے۔

۱۹۱۶ء میں ڈاکٹر انصاری کو دہلی میں مسلم لیگ کی کانفرنس کی استقبالیہ کمیٹی کا صدر منتخب کیا گیا۔ ان دنوں مسلم لیگ پر مغربی تعلیم یافتہ مسلمانوں کے ایک گروپ کا قبضہ تھا جس کی کوششوں کا مقصد کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان تعلقات کو فروغ دینا اور بہتر بنانا تھا۔ ۱۹۱۶ء میں دونوں تنظیموں نے ایک سیاسی معاہدہ کیا تھا جو میثاق لکھنؤ کے نام سے مشہور ہے اور جس نے ہندو مسلم برادرانہ تعلقات کا ماحول پیدا کر دیا تھا۔ ڈاکٹر انصاری نے اس پلیٹ فارم کو بیشتر ہندوستانی سیاستدانوں کے جذبات کی ترجمانی کے لیے استعمال کیا اور ایک پرجوش خطبے میں جسے حکومت نے ضبط کر لیا[۱] برطانوی افسران کی ظالمانہ پالیسیوں پر سخت نکتہ چینی کی۔ دستوری اصلاحات کی سست رفتاری کی مذمت کی اور میثاق لکھنؤ کے دستوری مطالبات کا اعادہ کیا انھوں نے مقامات مقدسہ کی حفاظت اور اس کے محافظ سلطان ترکی کے مستقبل کے تعلق سے اپنے ہم مذہبوں کی بڑھتی ہوئی تشویش کا ذکر کیا اور حاضرین کو متنبہ کیا کہ ترکی کو ٹوٹ پھوٹ کا قریبی خطرہ لاحق ہے اور مطالبہ کیا کہ جزیرۃ العرب (جس میں پورا ایشیائی عرب علاقہ فلسطین اور عراق شامل ہیں) کے مقامات مقدسہ کا انتظام وحفاظت سلطان ترکی کے کنٹرول میں رہنا چاہیے۔ انھوں نے اپیل کی کہ حق خود اختیاری کے اصول کے مطابق موجودہ مسلم ریاستوں کی آزادی و سالمیت برقرار رکھی جانی چاہیے۔

ڈاکٹر انصاری کی تقریر بڑے وسیع پیمانے پر پڑھی گئی اور اب تمام مسلمان جاننے لگے کہ مقامات مقدسہ جلد ہی مسلم اقتدار اعلیٰ کے دائرے سے نکلنے والے ہیں اور اس کی ذمہ داری انگریزوں پر ہے۔ یہی نہیں بلکہ ڈاکٹر انصاری کے معاصرین ان کی ہندوستان کے سیاسی مطالبات کی پرزور و موثر ترجمانی سے بہت متاثر ہوئے اور انھیں اپنے مطالبات کا ایک طاقتور

۱۔ اس خطبے کا اقتباس اس شمارے میں شامل ہے۔

ترجمان اور حامی سمجھنے لگے۔ ان کے اثر و رسوخ کو دیکھتے ہوئے گاندھی جی نے ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور رولٹ ایکٹ (جسے حکومت ہند نے ملک میں "سیاسی جرم" کو دبانے کے لیے پاس کیا تھا) کے خلاف تحریک کے سلسلے میں ان کی حمایت چاہی۔ ڈاکٹر انصاری نے گرم جوشی سے جواب دیا اور گاندھی جی کے پروگرام میں ایک پابند نظم و ضبط سپاہی کی حیثیت سے حصہ لینے لگے۔ رولٹ ایکٹ کے خلاف ستیہ گرہ میں ان کی شرکت مہاتما سے انکی ذاتی عقیدت اور خود اپنے اس یقین کا نتیجہ تھی کہ یہ ایکٹ اخلاقی و سیاسی اعتبار سے قابل مذمت ہے۔ دہلی میں ڈاکٹر انصاری کی صدارت میں ستیہ گرہ سبھا مارچ ۱۹۱۹ء میں قائم کی گئی اور ۳۰ مارچ ۱۹۱۹ء کو ستیہ گرہ شروع ہوئی اس دن بڑے پیمانے پر ہڑتال ہوئی جس میں آبادی کے سبھی طبقوں نے حصہ لیا۔ آگے چل کر خلافت تحریک کے دوران (جو ہندوستانی سیاست پر ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۲ء تک غالب رہی)، تحریکی سیاست کے تعلق سے ڈاکٹر انصاری کا یہ نیا تجربہ بہت قیمتی ثابت ہوا۔

تحریک خلافت ہندوستان میں اس مقصد سے شروع کی گئی تھی کہ ترکی کی تقسیم کو روکنے اور جزیرۃ العرب کی آزادی برقرار رکھنے کے لیے وہ برطانوی حکومت پر دباؤ ڈالا جا سکے۔ اسی مقصد کے لیے مارچ ۱۹۱۹ء میں مرکزی خلافت کمیٹی قائم کی گئی جس کا صدر دفتر بمبئی میں قائم ہوا۔ اس کا مقصد صرف ترکی کے لیے منصفانہ اور باعزت امن حاصل کرنا ہی نہیں بلکہ ان وعدوں کو پورا کرانا بھی تھا جو برطانوی وزیر اعظم نے ۵ جنوری ۱۹۱۹ء کو اپنی تقریر میں کیے تھے۔ تحریک خلافت کے فروغ میں دوسرا اہم مرحلہ ۱۹ مارچ کو یوم خلافت منانا تھا اس روز گاندھی جی نے جو عوامی زندگی میں بیشتر ہندوؤں سے زیادہ آگے بڑھ کر مسلمانوں کے ساتھ کام کر چکے تھے۔ یہ اعلان کیا کہ اگر ترکی کا معاہدۂ امن ہندوستانی مسلمانوں کو مطمئن نہیں کر سکا تو وہ تحریک عدم تعاون چلائیں گے۔ چنانچہ جب مئی ۱۹۲۰ء میں امن کی شرائط کا اعلان کیا گیا تو تحریک خلافت نے گاندھی جی کے عدم تعاون کے پروگرام کو اپنا لیا۔ ۲ جون کو مہاتما گاندھی کی تجویز پر الہ آباد میں آل پارٹیز کانفرنس منعقد کی گئی۔ جس میں عدم تعاون کی پالیسی اختیار کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور پروگرام طے کرنے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کر دی گئی۔ یکم اگست کو تحریک خلافت نے ہڑتال منظم کی اور گاندھی جی کو تحریک عدم تعاون کی قیادت سونپی گئی مہاتما نے اپنے خطابات وغیرہ واپس کر کے تحریک شروع کر دی اور وائسرائے کو لکھا کہ "یہ اعزازات میرے لیے چاہے جتنے قیمتی رہے ہوں میں انھیں اس وقت تک خوشدلی کے ساتھ استعمال نہیں کر سکتا جب تک میرے مسلمان ہم وطن اپنے مذہبی جذبات کے ساتھ کی گئی ناانصافی سے کراہ رہے ہیں"۔

ڈاکٹر انصاری مرکزی خلافت کمیٹی کے اہم پالیسی فیصلوں سے سرگرمی کے ساتھ وابستہ تھے اور سرکردہ خلافتی رہنماؤں مولانا عبدالباری فرنگی محلی، حکیم اجمل خاں اور علی برادران (جو ۱۹۱۹ء کے اخیر میں جیل سے رہا ہوئے تھے) وغیرہ کے ساتھ قریبی تعاون کے ساتھ کام کر رہے تھے۔ انھوں نے جنوری ۱۹۱۹ء میں مولانا عبدالباری کی طرف سے جاری کیے جانے والے استفتا کی کاپیاں تقسیم کرانے میں مدد دی تھی اور خلافت کے وفد کی ممبر کی حیثیت سے برطانیہ گئے پھر واپسی پر دسمبر ۱۹۲۲ء میں گیا میں خلافت کانفرنس کی صدارت کی۔ ۲۰ مارچ ۱۹۲۲ء کو انھوں نے حکیم اجمل خاں کے ساتھ مل کر ایک منشور شائع کیا جس میں خلافت کے سلسلے میں ہندوستانی مسلمانوں کے مطالبات واضح کیے گئے تھے۔

اس طرح ڈاکٹر انصاری نے خلافت کے کاز کے لیے حمایت حاصل کرنے اور اپنے ہم مذہبوں کے احساسات کی ترجمانی میں ایک اہم کردار ادا کیا وہ اپنے دور کے بیشتر مسلمانوں کی طرح خلافت کے مسئلے سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ اور تحریک عدم تعاون شروع ہونے کے بعد عوامی جوش و خروش میں شامل تھے لیکن اپنے متعدد انتہا پسند ساتھیوں اور دوستوں (مثلاً علی برادران حسرت موہانی اور بعض علماء) کے برخلاف وہ کمیٹی کے جلسوں میں تبادلۂ خیال پر اعتدال پسندانہ اثر ڈالتے رہے اور بسا اوقات انھوں نے کمیٹی کو کم سخت طریقہ کار اپنانے پر آمادہ کیا ان کا مقصد خلافت کے رہنماؤں کو تشدد سے دور رکھنا اور ایسے بیانات دینے سے روکنا تھا جن سے ہندو تحریک خلافت سے دور ہو سکتے تھے۔ وہ بجا طور پر یہ سمجھتے تھے کہ سرکردہ ہندو کانگریسیوں بالخصوص گاندھی جی کی حمایت تحریک خلافت کے لیے ایک انمول سرمایہ ہے۔ اور اسے برقرار رکھنے کی واحد صورت ان کی قیادت کو تسلیم کرنا اور کانگریس کے فیصلوں کو ماننا ہے۔ اس لیے جب علماء نے کانگریس کے بغیر سول نافرمانی کے لیے مرکزی خلافت کمیٹی کو آمادہ کرنا چاہا تو ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاں نے اس بنیاد پر مخالفت کی کہ مسلمان تنہا اس طرح کی مہم جیت نہیں سکتے۔ اس سے پہلے وہ ستمبر ۱۹۲۱ء میں مرکزی خلافت کمیٹی اور جمعیۃ العلماء کے جلسوں میں اس طرح کی کوشش کی روک تھام کر چکے تھے اس سے پہلے کہ ڈاکٹر انصاری و حکیم اجمل خاں علماء کو "تمام ہندوستانیوں کے تسلیم شدہ لیڈر" گاندھی جی کو قبول کرنے پر آمادہ کر سکیں قابل لحاظ اختلاف پیدا ہو گیا۔ ان کا خیال تھا کہ سول نافرمانی کے لیے ابھی مناسب وقت نہیں آیا۔ اشتعال کے شکار علماء بہرحال عارضی طور پر نرم پڑ گئے۔

ایک دوسری وجہ بھی تھی جس کے لیے ڈاکٹر انصاری ہندوؤں کو ساتھ لیکر چلنا چاہتے تھے۔ ان کا پختہ یقین تھا کہ تحریک خلافت ہندو مسلم اتحاد میں مددگار ثابت ہوتی ہے اور دونوں فرقوں کے درمیان اتحاد کو مضبوط بنانے کے لیے یہ نادر موقع ہے۔ اس لیے وہ اس بات پر تیار نہیں تھے کہ اپنے ساتھیوں کو فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی راہ میں رکاوٹ بننے دیں۔ ۱۹۱۹ء سے وہ برابر بااثر ہندوؤں کے ساتھ دوستی قائم کرتے رہے اور ان کے ذہنوں سے تحریک خلافت کے نتیجہ میں ہجوم کے تشدد کا خدشہ دور کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ اسی دوران انھوں نے دہلی صوبائی کانگریس کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے برطانوی راج

کے خلاف متحدہ ہندو مسلم محاذ قائم کرنے کی اپیل کی۔ ۱۹ مارچ ۱۹۲۲ء کو (نو چینجرز گروپ میں باضابطہ شامل ہونے سے چند ماہ پہلے) انھوں نے تجویز پیش کی تھی کہ کانگریس اور مسلم لیگ کے لیڈران مل کر انتخاب لڑنے کے لیے کانگریس لیگ پارٹی بنالیں۔ یہ انتخابات نومبر ۱۹۲۳ء میں مونٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کے تحت منعقد کیے جانے والے تھے۔ لیکن ان کا منصوبہ کامیاب نہیں ہوسکا کیونکہ مارچ ۱۹۲۲ء میں جب گاندھی جی نے اپنے مسلم اتحادیوں کی شدید آزردگی کے باوجود سول نافرمانی کو معطل کرنے کا فیصلہ کیا تو خلافت اور کانگریس کے مابین اتحاد ٹوٹ گیا، ملک پر فرقہ پرستی کی روح غالب آگئی اور ڈاکٹر انصاری کے متعدد دوست اور ساتھی بھی اس کا شکار ہوگئے۔ مشہور ترکی مصنفہ خالدہ ادیب کے مطابق "تحریک خلافت نے دو انتہائی متضاد نتائج پیدا کیے اوّل ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک مشترکہ سرگرمی کے اردگرد متحد کرنا اور پھر انھیں تقسیم کر دینا"۔ یہ رائے بڑی حد تک صحیح تھی ۱۹۱۶ء اور ۱۹۲۱ء کے مابین ہندو مسلم اتحاد ہندوستانی سیاست کا ایک قابلِ لحاظ عنصر تھا لیکن ۱۹۲۲ء کے آخر تک ہندو مسلم اتحاد کا جوش بتدریج ٹھنڈا پڑ گیا۔ اس کی اہم وجہ یہ تھی کہ متعدد گروپ جن کے مقاصد مختلف بلکہ بسا اوقات متضاد تھے اس لئے اکٹھا نہیں ہو گئے تھے کہ کوئی مشترکہ کاز تھا بلکہ اس لیے کہ وقتی طور پر ان کی مصلحتوں کا تقاضا یہی تھا لیکن عدم تعاون کی تحریک جوں جوں آگے بڑھتی گئی وہ مختلف گروہوں میں تقسیم ہوتے گئے۔ متعدد سرکردہ سیاستدان جو مونٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کے لیے کام کرنا چاہتے تھے عدم تعاون سے کنارہ کشی اختیار کر کے نئی کونسلوں میں پہونچ گئے دوسرے کئی لیڈر فرقہ وارانہ سیاست کی دلدل میں جا پھنسے۔ فرقہ وارانہ اتحاد کے سابق علمبردار کانگریس لیگ اتحاد کے معمار اور عدم تعاون کے پرزور حامی سیاست میں گروپ بندی کی حوصلہ افزائی کرنے لگے استعمار کے خلاف جدوجہد کو تباہ کردیا اور فرقہ پرستی کو فروغ دینے کی راہ ہموار کرنے لگے۔

سول نافرمانی تحریک کی معطلی کے بعد مسلمانوں کو ایک اور حیرت انگیز صورتحال سے دوچار ہونا تھا ۲۱ نومبر ۱۹۲۳ء کو انقرہ میں ترکی کی نیشنل اسمبلی نے خلافت کو سلطنت سے علیحدہ کرنے کا فیصلہ کیا اور چونکہ خلیفہ کے دنیوی اقتدار کو برقرار رکھنا تحریک خلافت کے اہم ترین مقاصد میں تھا اس لیے خود ایک خالص مسلم ادارہ کی طرف سے اس اقدام نے ہوا کا رخ ہی بالکل بدل کر رکھ دیا۔ پھر مارچ ۱۹۲۴ء میں مصطفیٰ کمال پاشا نے آخری مہلک وار کیا اور خلافت کا بالکل خاتمہ کر کے خلیفہ کو ترکی کے علاقہ سے نکال دیا۔ اگرچہ ڈاکٹر انصاری اور چند دوسرے لوگوں نے خلافت کے خاتمہ کا صدمہ بڑی متانت سے برداشت کیا لیکن بیشتر ہندوستانی مسلمان مذہبی احکامات کی اس شدید بے حرمتی پر ششدر رہ گئے۔ ان کا خواب خود انھیں کے ہاتھوں پامال ہو چکا تھا اور وہ سوائے پرشور احتجاج کے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن ان کی چیخ و پکار صدا بصحرا سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ ترکی کے حکام نے انھیں

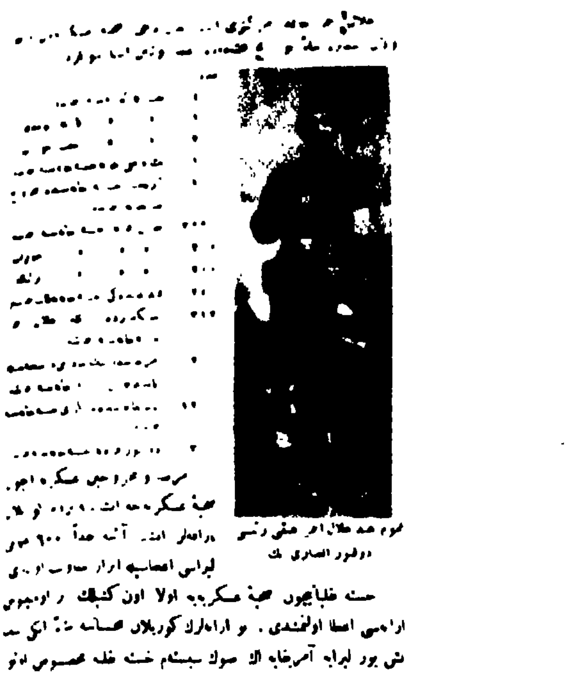

بالکل نظرانداز کر دیا۔ انتہا پسند مولانا محمد علی نے تحریک خلافت کو ترکوں پر دباؤ ڈالنے کے لیے جاری رکھنا چاہا لیکن ان کے ساتھی ایک ہاری ہوئی بازی کے لیے لڑنے میں کوئی معقولیت نہیں پاتے تھے۔ خلافت کا ادارہ ختم ہو چکا تھا اور دوبارہ زندہ ہونے والا نہیں تھا۔ ہندوستان میں تحریک خلافت اپنی ساری معنویت کھو چکی تھی تاہم اگلے چند برسوں تک خلافت کمیٹیاں زندہ رہنے کے لیے جدوجہد کرتی رہیں۔

خلافت کے خاتمہ کے بعد جیسے ہی خلافت پارٹی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوئی مختلف مسلم گروپ جو ایک مشترکہ مذہبی کاز کے لیے عارضی طور پر متحد ہو گئے تھے ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے۔ تحریک خلافت کا زوال مسلم اتحاد کی عمارت کے لیے تباہ کن ثابت ہوا اور کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ان کے تمام اختلافات اور چپقلشیں سطح پر آگئیں۔ چودھری خلیق الزماں کے الفاظ میں :—

> "اگلے سولہ برسوں کی تاریخ اسلامی ہند کی عام گمگشتہ راہی اور سیاسی ظلمت و گمراہی کی تاریخ ہے تنظیم خلافت کی تباہی مسلمانوں کے عام جذبات کے تیز دھارے پر بندھے ہوئے پشتے کے ٹوٹنے کے مترادف تھی جس نے انھیں مختلف چھوٹے چھوٹے دھاروں میں تقسیم کر دیا جن میں سے بعض دھاروں کا رخ صحرا کی طرف تھا جو آگے چل کر خشک ہو جانے والے تھے بعض اصل سرچشمہ کی طرف طویل پرپیچ راستوں پر گامزن ہوئے اور بعض طاقتور سمندر کی طرف اپنے آپ کو مدغم کرنے کے لیے دوڑنے لگے اس دور کی مسلم سیاست میں کوئی تسلسل

ٹھوس معقولیت اور منطق طرز تلاش کرنا بے سود ہوگا ہم خود آپس میں بٹ گئے تھے" (شاہراہ پاکستان از چودھری خلیق الزماں)

ایک اہم گروپ جو عارضی طور پر آل انڈیا اسٹیج سے ہٹ گیا وہ علماء کا گروپ تھا۔ خلافت کے کاز کے سلسلہ میں جو دھکا لگا تھا اس نے ان کے سارے خواب چکنا چور کر دئے تھے اور آل انڈیا سیاست میں ان کے اثر و رسوخ کا خاتمہ کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ دور جب انھیں اہمیت حاصل تھی وہ آل انڈیا کانفرنسوں پر چھائے رہتے تھے اور سیاسی فیصلوں پر اثر انداز ہوتے تھے ختم ہو چکا تھا۔ مجالس قانون ساز کے باہر رہ کر عدم تعاون کے لیے کونسلوں میں داخلہ کی ان کی مخالفت نظر انداز کی جا چکی تھی اور انھیں جتا دیا گیا تھا کہ وہ سیاست میں ٹانگ نہ اڑائیں۔ مولانا عبدالباری فرنگی محلی جنھوں نے علماء اور کانگریس کے درمیان اتحاد قائم کرایا تھا۔ بتدریج دل شکستہ اور تنہا ہو کر رہ گئے تھے۔ اگست ۱۹۲۳ء میں انھوں نے ایک اخباری بیان میں شکایت کی کہ جو لوگ کبھی یہ ظاہر کرتے تھے کہ ہمارے دوست ہیں اور جنھوں نے علماء کو آلۂ کار بنایا اب ایسا لگتا ہے کہ وہ علماء سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ مولانا عبدالباری کی شکایت بجا تھی۔ علماء کی خدمات تحریک خلافت کے دوران اس لیے حاصل کی گئی تھیں کہ دیہی علاقوں میں ان کا اثر تھا۔ کسان، دستکار اور کپڑے بننے والے مقامی مسجدوں کے پند و نصیحت سے بہت متاثر ہوتے تھے لیکن ۱۹۲۲ء میں جب ہندوستانی سیاستدانوں کو درپیش مسائل کی نوعیت سیاسی ہو گئی علماء کی ضرورت باقی نہیں رہی اور انھیں صاف جتا گیا کہ وہ واپس مکتب و مدرسہ کی راہ لیں۔

ادھر علماء ابھی اپنا آئندہ طریق کار طے کرنے میں مشغول تھے کہ مسلم پیشہ ور گروپوں میں ان کے سابق اتحادیوں نے الگ راستہ اختیار کر لیا۔ دسمبر ۱۹۲۳ء تک ڈاکٹر انصاری اور مولانا محمد علی نے کونسل میں داخلہ کی مخالفت ترک کر دی اور حکیم اجمل خاں، عبدالمجید خواجہ، تصدق احمد خاں شیروانی اور چودھری خلیق الزماں کے ہمنوا بن گئے۔ شیروانی اور خلیق الزماں سوراج پارٹی جسے موتی لال نہرو اور سی آر داس نے قائم کیا تھا کے سیکریٹری کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ بنگال میں داس قانونساز کونسل کے اندر و باہر "بیوروکریسی کے قلعہ" کو توڑنے کی کوشش میں متعدد سرکردہ خلافتی لیڈروں کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ پنجاب میں مسلمانوں کا ایک غالب گروپ فضل حسین کی یونینسٹ پارٹی کی حمایت کر رہا تھا جسے دیہی ہندوؤں بالخصوص انبالہ ڈویژن کے جنوبی اضلاع کے جاٹوں کے ساتھ اتحاد نے طاقتور بنا دیا تھا۔

خلافت لیڈرشپ کا ایک اور گروپ جس میں علی برادران شامل تھے فرقہ وارانہ سیاست میں زیادہ حصہ لینے لگا۔ تحریک خلافت کو جاری رکھنے کی ان کی کوشش ناکام ہو گئی تھی اور اچانک انھوں نے قومی سیاست کے اصل دھارے سے اپنے آپ کو الگ تھلگ پایا لیکن ملک میں بگڑتی ہوئی فرقہ وارانہ صورت حال تنگ فرقہ وارانہ مقاصد کو اپنانے اور اپنے ہم مذہبوں کے مذہبی جذبات کے استحصال میں ان کے لیے معاون ثابت ہوئی۔ نتیجۃً وہ کانگریس سے دور ہو گئے۔ انھوں نے کانگریسی قیادت پر ہندو مہاسبھا کی "غلامی" کے لیے پر زور حملے کئے اور گاندھی جی پر کھلے ہندو پرستوں سے تعلقات رکھنے اور ہندو مسلم فسادات اور ہندی اردو لسانی تنازعہ کے تعلق سے ان کے بعض بیانات پر نکتہ چینی کی۔ گاندھی جی کے پرانے خلافتی ساتھی مولانا شوکت علی نے لکھا کہ "کانگریس ہندو مہاسبھا کی ضمنی شاخ بن گئی ہے اور جلد ہی انگریزوں سے مدد چاہنے لگے گی"۔ تاہم مولانا شوکت علی نے جو ہر نئے سیاسی رخ کے مطابق اپنے نظریات ڈھالنے پر تیار رہتے تھے اپنے الزامات کی تائید میں کوئی ثبوت پیش نہیں کیا۔

تحریک خلافت نے کانگریس کو مستقبل کے کئی سورما فراہم کیے۔ ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں، شیروانی، آصف علی، خواجہ عبدالمجید اور سید محمود جیسے لوگ قوم پرست مسلمان کی حیثیت سے پہچانے جانے لگے یہ لوگ علی برادران کی قیادت میں کانگریس مخالف لابی کے خلاف تھے۔ سول نافرمانی مہم کے بعد یہ لوگ قوم پرستی کے نظریات اور سیکولرازم کے اصولوں سے حقیقی وابستگی کی بنا پر فرقہ وارانہ ہوا سے متاثر نہیں ہو سکے۔ بیشتر قوم پرست مسلمان کانگریس کے غیر متزلزل حامی اور گاندھی، موتی لال نہرو اور جواہر لال نہرو کے مخلص ہو کر برقرار رہے۔ ان لیڈروں اور بالخصوص کانگریس تنظیم کے ساتھ وفاداری ان کے سیاسی مسلک کا ایک امتیازی عنصر تھا۔ حتیٰ کہ جب وہ کانگریس کی پالیسیوں اور پروگراموں سے اتفاق نہیں کرتے تھے تب بھی وہ اپنے متعدد دیگر معاصرین کے برخلاف اپنی وفاداریاں تبدیل نہیں کرتے تھے۔ گاندھی جی کے ساتھ اپنے اختلافات اور سول نافرمانی کی مخالفت کے عروج کے زمانے میں ڈاکٹر انصاری نے شیروانی کو لکھا تھا کہ "ہمیں کانگریس سے ہرگز علیحدہ نہیں ہونا چاہیے نہ ایسا کوئی کام کرنا چاہیے جس سے کانگریس کمزور ہو۔ کانگریس کو چھوڑنا خودکشی کرنا اور اس کی مخالفت کرنا ایک جرم ہوگا"۔ سید عبداللہ بریلوی کے نام ایک خط میں ڈاکٹر انصاری کانگریس اور اس کے ارباب حل و عقد کے ساتھ اپنی وفاداری اور گہری وابستگی کا ذکر کیا ہے۔

ڈاکٹر انصاری قوم پرست مسلمانوں کے متفقہ لیڈر تھے۔ جولائی ۱۹۲۵ء میں انھوں خلافت کمیٹی کی ممبری سے استعفیٰ دیدیا اور اسے ایک فرقہ پرست ادارہ قرار دیا۔ لیکن کانگریس کے ساتھ سرگرم وابستگی برقرار رکھی اپنی زندگی کے آخری دور میں انھوں نے اپنے آپ کو دو مقاصد کی تکمیل کے لیے وقف کر دیا تھا۔ ہندو مسلم اختلافات کا حل تلاش کرنا اور اپنے ہم مذہبوں کو کانگریس کے قریب لانا۔ ۱۹۳۱ء میں ڈاکٹر انصاری نے سرینواس شاستری، موتی لال نہرو، اجمل خاں، سروجنی نائیڈو اور راجا محمود آباد کے ساتھ مل کر جو منشور جاری کیا تھا وہ ان کی سرگرمیوں کے لیے بنیاد کا کام دے رہا تھا۔ منشور میں کہا گیا تھا کہ ہندو مسلم مسئلہ مذہبی و سیاسی مسائل کو بلا امتیاز خلط ملط کرنے کا نتیجہ ہے اور فرقہ وارانہ اختلافات اور کشیدگیوں کو ختم کرنے کے لئے قومی ماحول اور قومی شعور

پیدا کرنا ہی اس مرض کا علاج ہے۔

اسی پر بس نہیں، ڈاکٹر انصاری نے ہندو مسلم تعلقات کو بہتر بنانے کی غرض سے ایک قومی میثاق تیار کرنے کے سلسلے میں لالہ لاجپت رائے سے تعاون کیا جسکا مسودہ جنوری ۱۹۲۷ء میں منظر عام پر آیا۔ اس میثاق میں فرقہ وارانہ مسئلہ کے مذہبی و سیاسی پہلوؤں کا جائزہ لینے کے بعد ایک حل پیش کیا گیا تھا۔ اگرچہ یہ کوشش ناکام ہوگئی۔ لیکن ہندو مسلم اتحاد کو مضبوط بنانے کے سلسلے میں اپنی کوششوں سے ڈاکٹر انصاری نے ہاتھ نہیں کھینچا۔ انھوں نے فرقہ وارانہ اخوت کی بحالی کے لیے دونوں طرف سے رضاکارانہ کوشش پر زور دیا۔ اس کی وجہ ان کا یہ یقین تھا کہ فرقہ وارانہ اتحاد آزادی کی جدوجہد کے لیے ایک لازمی بنیادی ضرورت ہے۔ انھوں نے ۱۹۳۰ء میں سول نافرمانی شروع کرنے کے گاندھی جی کے فیصلہ کی مخالفت کی کیونکہ ان کے خیال میں ملک سول نافرمانی کے لیے تیار نہیں تھا اور اس کی وجہ دیگر عوامل کے علاوہ یہ تھی کہ ہندو مسلم اتحاد انتہائی ابتر حالت میں تھا لیکن گاندھی جی نے ان سے اتفاق نہیں کیا۔ ان کا احساس تھا کہ اب تک جو طریق کار اختیار کیا گیا ہے اس سے مختلف طرز عمل ہندو مسلم مسئلہ کے سلسلہ میں اختیار کرنا ہوگا۔ کیونکہ ان کے خیال میں سیاسی سمجھوتہ اسی وقت ممکن تھا جب دونوں فرقوں میں باہمی اعتماد ہو اور کانگریس یہ اعتماد صرف بے خوفی اور انتہائی انصاف کا راستہ اختیار کر کے حاصل کر سکتی تھی، لیکن اسی تیسرے فریق ــ شیطانی برطانوی اقتدار ــ پر ضرب لگانی ہوگی، جب تک ہندو اور مسلمان نہیں ملتے تب تک آزادی کا فرمان نہیں مل سکتا۔ لیکن فرمان ملنے سے پہلے عملاً آزادی مل سکتی ہے۔ (ڈاکٹر انصاری کے نام خط مورخہ ۱۶ فروری ۱۹۳۰ء)۔

گاندھی جی کے سرد اور سوچے سمجھے جواب اور "ان لوگوں کے احساسات سے لاپرواہی جو ان کی تحریک میں سپاہیوں کی طرح ان کا ساتھ دیتے رہے" سے قوم پرست مسلمانوں کو مایوسی ہوئی۔ انھوں نے مایوسی اور سخت تشویش کے ساتھ یہ بات نوٹ کی کہ ۱۹۲۵ء سے مہاتما گاندھی نے فرقہ وارانہ تعطل توڑنے کے لیے کھادی کی مہم اور چھوت چھات دور کرنے کے مسئلہ میں اپنی مشغولیت کی وجہ سے کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی۔ ۱۹۲۶ء میں انھوں نے ایک برس تک اپنے واردھا آشرم میں رہنے کا فیصلہ کر کے کانپور کی سیاسی قرارداد پر مباحثہ سے کنارہ کشی اختیار کی اسی طرح انھوں نے نہرو کمیٹی کے جلسوں میں حصہ لیا نہ ستمبر ۱۹۲۸ء میں کسی آل پارٹیز کانفرنس میں شرکت کی نتیجتہً ڈاکٹر انصاری نے شکایت کی کہ "گاندھی جی اور موتی لال نہرو ہندو مسلم اتحاد کے بیے مسئلہ کی اہمیت کے پیش نظر جتنی ضرورت ہے اتنی دلچسپی، فکر مندی اور کوشش کا مظاہرہ نہیں کر رہے ہیں (گاندھی جی کے نام خط مورخہ ۱۳ فروری ۱۹۳۰ء)۔

ڈاکٹر انصاری اور ان کے ساتھی وہ پیچیدہ سماجی و اقتصادی عوامل سمجھنے میں ناکام رہے جن کی بدولت ہندو مسلم کشیدگی پیدا ہوئی تھی انھوں نے فرقہ وارانہ بے چینی کے اسباب کو ضرورت سے زیادہ سادہ سمجھا۔ ہندو مسلم اتحاد کا حصول، از اول تا آخر بہت دقت طلب کام تھا اور ڈاکٹر انصاری نے جب ایکبار فرقہ وارانہ یگانگت کو فروغ دینے کی ذمہ داری اپنے سر لی تو ایک مشنری کے جوش و عزم کے ساتھ اس کے لیے انتھک جدوجہد کرتے رہے لیکن انھوں نے یہ سمجھنے میں سادہ دلی سے کام لیا کہ یہ کام آسانی سے ہو سکتا ہے۔ انھوں نے مونٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات پر عمل درآمد کے نتیجہ میں اقتدار، اثر و رسوخ اور سرپرستی کے حصول کے لیے جاری تند و جہد اور ہندو مسلم اختلافات پیدا کرنے اور بڑھاوا دینے کے سلسلے میں انگریزوں کے کردار کو نظر انداز کیا۔ ڈاکٹر انصاری کا خیال تھا اور جو بڑی حد تک سادہ لوحی پر مبنی تھا کہ مسٹر جناح اور مولانا محمد علی گروپ کے ساتھ سیاسی مذاکرات اور اتحاد کانفرنسیں ہندو مسلم مسئلہ کو حل کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ اور جب اس طرح کی کوششیں ناکام ہوگئیں تو انھوں نے شکایت کی کہ گاندھی جی اور موتی لال نہرو نے فرقہ وارانہ مسئلہ کے حل میں کافی دلچسپی نہیں لی۔ وہ نہیں سمجھ سکے کہ ۱۹۲۳ء کے بعد مختلف فرقوں کے لیڈروں کے لیے یہ عام بات ہوگئی تھی وہ خود اپنے فرقوں سے مطابقت کا مظاہرہ کریں۔ فرقہ پرستی سماج میں گہرائی تک جڑیں پھیلا چکی تھی۔

ہندو مسلم اتحاد کو فروغ دینے کی کوششوں کے علاوہ ڈاکٹر انصاری اس بات کے خواہاں تھے کہ مسلمانوں کو قومی تحریک میں شامل کریں اور ہندو غلبہ کے سلسلے میں ان کے خدشات زائل کریں۔ انھوں نے اس ضرورت کا احساس بڑے پیمانے پر فرقہ وارانہ تشدد کے بار بار پھوٹ پڑنے، شدھی سنگٹھن تبلیغ اور تنظیم جیسی انتہا پسندانہ تحریکوں کے احیاء، اور مسابقت کرنے والے اعلیٰ ہندو مسلم طبقہ کے درمیان اقتدار کے لیے تیز جدوجہد کی وجہ سے کیا گیا تھا۔ جسکے نتیجہ میں فرقہ وارانہ احساس کو فروغ حاصل ہوا موجودہ اختلافات کی خلیج اور گہری ہوگئی۔ اور فرقہ وارانہ صف بندی کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ اگست ۱۹۲۸ء میں نہرو رپورٹ کی اشاعت آخری کیل ثابت ہوئی جس نے متعدد با اثر مسلمانوں کو کانگریس سے برگشتہ کر دیا اور ایک جارحانہ فرقہ وارانہ پالیسی اختیار کرنے کے سلسلے میں انھیں ایک بہانہ ہاتھ آگیا۔ آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے انتہا پسند منتظمین نے جن میں سے متعدد خلافت اور عدم تعاون کی تحریکوں میں آگے آگے تھے سمجھوتہ کے تعلق سے کانگریس کی کوششوں کو مسترد کر دیا اور لندن و دہلی کے اپنے آقاؤں سے اپیل کی کہ وہ انھیں ہندو غلبہ کے تاریک امکان سے بچائیں۔ مثلاً مولانا محمد علی نے اپریل ۱۹۳۰ء میں آل پارٹیز کانفرنس میں گاندھی جی اور کانگریس پر شدید حملہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہم گاندھی جی کا ساتھ دینے سے اس لیئے انکار کرتے ہیں کہ ان کی تحریک (سول نافرمانی) ہندوستان کی کمل آزادی کی تحریک نہیں بلکہ سات کروڑ ہندوستانی مسلمانوں کو ہندو مہاسبھا کے رحم و کرم پر ڈالنے کے لیے ہے"۔

یہ سخت بات تھی لیکن گاندھی جی اور کانگریس کے بارے میں متعدد مسلمان ان کی اس رائے میں شریک تھے۔

تاہم ڈاکٹر انصاری نے کانگریس پارٹی پر اپنا یقین قائم رکھا اور اس کے لیڈروں کے ساتھ وفاداری برقرار رکھی۔ کانگریس پروگرام جس کا ایک لازمی عنصر ہندو مسلم اتحاد بھی تھا کی کامیابی کے لئے پوری دلجمعی سے کام کرتے رہے۔ دسمبر ۱۹۲۸ء میں آل پارٹیز کنونشن کی ناکامی کے بعد انھوں نے اپنی کوششیں ایک ایسا ادارہ قائم کرنے پر مرکوز کر دیں جو مسلمانوں اور کانگریس کے درمیان وساطت کا کام انجام دے سکے تاکہ فرقہ وارانہ خلیج پاٹی جا سکے اور مسلمانوں کو فرقہ پرستوں اور رجعت پسند لیڈروں کے اثر سے دور کیا جا سکے۔ یہی مقصد ذہن میں لیکر انھوں نے جولائی ۱۹۲۹ء میں آل انڈیا نیشنلسٹ مسلم پارٹی کی بنیاد رکھی جسکے اہم رہنماؤں میں عبدالمجید خواجہ، مولانا ابوالکلام آزاد، تصدق احمد خاں شیروانی، چودھری خلیق الزماں، رفیع احمد قدوائی، سید محمود، آصف علی، سید عبداللہ بریلوی اور صوبہ سرحد کے ایک بااثر کانگریسی رہنما خان عبدالغفار خاں تھے۔

لیکن نیشنلسٹ مسلم پارٹی ڈاکٹر انصاری اور ان کے ساتھیوں کے لیے ٹیڑھی کھیر ثابت ہوئی۔ علی برادران نے ان پر مسلم کاز سے غداری کا الزام لگایا۔ مولانا شوکت علی نے ڈاکٹر انصاری کو لکھا کہ "موتی لال نہرو کی اندھی تقلید میں آپ نے مسلمانوں اور اپنے دوستوں اور ساتھی کارکنوں سے غداری کی۔" ہندو مہاسبھا کے لیڈر بھی جنھیں ۱۹۲۲ء کے بعد کافی اثر و رسوخ حاصل ہو گیا تھا ان کے ارادوں کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ناگپور کے انتہا پسند لیڈر بی ایس مونجے کا خیال تھا کہ نیشنلسٹ مسلم پارٹی کی تشکیل کا مقصد کانگریس میں بڑی تعداد میں مسلمانوں کو داخل کرنا ہے تاکہ وہ کانگریس کے اندر رہ کر دباؤ ڈال سکیں"۔ ایسے حالات میں قوم پرست مسلمان ان لوگوں کی مخالفت کا شکار ہو کر رہ گئے تھے جنھیں وہ متحد کرنا چاہتے تھے۔

مونجے کے خدشات جن میں بہت سے دیگر ہندو بھی شریک تھے بے بنیاد تھے کیونکہ قوم پرست مسلمانوں کو خاطر خواہ حمایت حاصل نہیں تھی۔ (اگرچہ وہ یہی دعویٰ کرتے تھے کہ ان کی پارٹی مسلمانوں کی سب سے نمائندہ جماعت ہے اور خود ڈاکٹر انصاری نے جون ۱۹۳۱ء میں یہ اعلان کیا تھا کہ "ہماری طاقت مسلم دانشوروں کی طاقت ہے جس کی پشت پر مسلم عوام ہیں"۔) ان کی جماعت پیشہ ور لوگوں مثلاً ڈاکٹروں، وکیلوں اور صحافیوں کی ایک چھوٹی تعداد پر مشتمل تھی اور یہ لوگ سیاست میں خود اپنی حیثیت کے بل پر کام نہیں کر سکتے تھے۔ بلکہ ان کا انحصار بڑی حد تک سرکردہ کانگریسیوں کی حمایت پر تھا جو کانگریس دشمن مسلمانوں کی سرگرمیوں کا جواب دینے کے لیے ان کی حوصلہ افزائی کرتے تھے اور تمام ہندوستانیوں کی نمائندگی کے سلسلے میں اپنے دعوؤں کو مضبوط بنانے کے لیے ان کی سرپرستی کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قوم پرست مسلمانوں کو مشکل ہی سے کوئی اثر حاصل ہوا اور وہ ہندوستانی سیاست میں حاشیہ بردار ہی رہے۔

قوم پرست مسلمانوں کے ساتھ ایک اور مشکل یہ بھی تھی کہ انھیں ہندو پرست سمجھا جانے لگا اور اس کی وجہ سے خود اپنے فرقہ میں ان کی آواز بڑی حد تک غیر اہم ہو گئی۔ یہ بات خاص طور پر تیسری دہائی کے وسط پر صادق آتی تھی جب مسلمانوں اور ہندوؤں کے مابین فرقہ وارانہ تشدد اور باہمی بداعتمادی کا بول بالا تھا۔ ان حالات میں فرقہ پرست مسلمانوں کو اپنے ہم مذہبوں کا اعتماد حاصل ہو گیا جبکہ میٹنگوں اور معاہدوں اور سمجھوتوں کے ذریعہ فرقہ وارانہ یگانگت کی بحالی کے لیے قوم پرست مسلمانوں کی کوششیں ناکامی سے دوچار ہوئیں۔ خود چودھری خلیق الزماں (جنھوں نے ۱۹۳۰ء کے اوائل میں نیشنلسٹ مسلم پارٹی کے پروانہ موت پر دستخط کیا تھا) کے الفاظ میں پارٹی اپنے مطلوبہ مقاصد کے حصول میں اس لیے ناکام ہو گئی کہ:

"اپنی نوعیت کی وجہ سے مسلم سماج میں اس کی جڑیں نہیں تھیں اور اسے کوئی پیش رفت بھی حاصل نہیں ہوئی۔ بلا شبہ اس کے نام پر متعدد کانفرنسیں منعقد ہوئیں لیکن اس کا کوئی قانون و ضابطہ نہیں تھا نہ الگ ممبری اور علیحدہ دفتر ہی تھا۔ ہندو مہاسبھا پریس کی حمایت کی وجہ سے یہ جماعت اخباروں میں تو خوب زندہ نظر آتی تھی لیکن اس کے باہر اس کا کوئی مثبت وجود نہیں تھا۔ میرا یہ نظریہ کہ اس کے ذریعہ قوم پرست مسلمانوں کی صفوں میں کچھ نظم و ضبط پیدا ہوگا عملی جامہ نہیں پہن سکا کیونکہ علاج اتنا

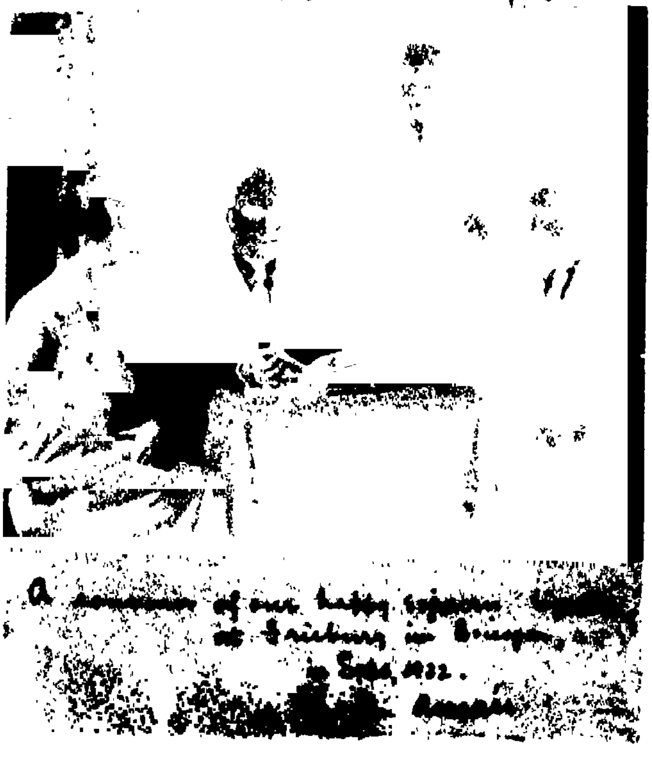

سفر (ستمبر ۱۹۳۲) کے زمانے کی ایک تصویر۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے دائیں اور بائیں ڈاکٹر شوکت اللہ انصاری، جناب تصدق احمد خاں شیروانی (کھڑے ہوئے) ان کے ایک بیرسٹر دوست کے صاحبزادے ([illegible])

طاقتور نہیں تھا کہ مرض کو دور کر سکے" (شاہراہ پاکستان از چودھری خلیق الزماں)

۱۹۳۰ء تک قوم پرست مسلمان "ہر اس اصول یا عمل سے دور ہو چکے تھے جس کی بنیاد پر انھوں نے اپنا گروپ تشکیل دیا تھا اور جسے انھوں نے فخریہ طور پر اپنے سینے سے لگا رکھا تھا صرف ان کا نام باقی رہ گیا تھا۔"

(خود نوشت سوانح حیات جواہر لال نہرو)

اپنی کوششوں کی محدود کامیابی سے ڈاکٹر انصاری سخت مایوس ہوئے۔ نیشنلسٹ مسلم پارٹی جلد ہی ایک فرسودہ اور بے عمل ادارہ بن کر رہ گئی اور فرقہ وارانہ بحران حل کرنے کے سلسلہ میں ان کی کوششوں کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکا۔ ۱۹۳۲ء کے اوائل میں ڈاکٹر انصاری عارضی طور پر سیاست سے ریٹائر ہو گئے جب وہ یورپ چلے گئے وجہ جزوی طور پر ان کی صحت کی خرابی تھی۔ لیکن اصل وجہ ہندوستان کی سیاسی واقعات سے ہم آہنگی پیدا کرنے میں ناکامی تھی۔ واپسی پر انھوں نے اور بعض دیگر کانگریسی لیڈروں نے سوراج پارٹی از سر نو زندہ کی۔ انھوں نے ایک بیان جاری کیا جسے فوری قبولیت حاصل ہوئی اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے قانون ساز اسمبلی کے انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا اور ایک پالیمنٹری بورڈ تشکیل دے کر ڈاکٹر انصاری کو اس کا صدر نامزد کیا۔ ڈاکٹر انصاری نے پورے جوش و انہماک سے کام شروع کیا لیکن سرگرم عوامی زندگی کا بڑھتا ہوا دباؤ ان کی صحت پر برا اثر ڈالنے لگا۔ چنانچہ اپریل ۱۹۳۵ء میں وہ سرگرم سیاست سے سبکدوش ہو گئے اور اپنا وقت جامعہ ملیہ کے معاملات میں لگانے لگے جسے قائم کرنے میں انھوں نے مدد دی تھی اور جس کے اپنی وفات (۱۰ مئی ۱۹۳۶ء) کے وقت چانسلر تھے۔ جامعہ ہی میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔

ڈاکٹر انصاری کو جدید ہندوستان کی عوامی زندگی کی تاریخ میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ بیس برس سے زیادہ عرصہ تک وہ ہندوستانی سیاست میں ایک اہم شخصیت رہے اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں انھوں نے خلافت اور عدم تعاون کی تحریکوں میں بھرپور حصہ لیا۔ اور خلافت کے کاز کی سنجیدہ اور اعتدال پسندانہ وکالت کے ذریعہ امتیاز حاصل کیا۔ کانگریس تنظیم میں وہ کئی اہم عہدوں پر فائز رہے۔ انھوں نے دہلی کانگریس کمیٹی قائم کی اور ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۶ء تک (دو برس کے استثنا کے ساتھ) اس کے سیکریٹری رہے دسمبر ۱۹۲۷ء میں انھوں نے آل انڈیا کانگریس سشن منعقدہ مدراس کی صدارت کی۔ مدراس ہی میں انھوں نے ۱۸۹۸ء میں پہلی بار ایک طالبعلم کی حیثیت سے کانگریس میں شرکت کی تھی۔

اگرچہ پرجوش طور پر انھوں نے اپنے آپ کو ہندوستانی قوم پرستی کے لیے وقف کر رکھا تھا تاہم وہ اپنے کسی کانگریسی ساتھی سے زیادہ ہندو مسلم کشیدگی کے تباہ کن نتائج کو قبل از وقت دیکھ اور سمجھ رہے تھے۔ انھیں یقین تھا کہ ہندو مسلم مسئلہ اب بھی اس مرحلہ میں ہے کہ حل کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی تمام طاقت اور کوشش حل تلاش کرنے پر مرکوز کر دیں۔ سروجنی نائیڈو نے مسٹر جناح کو "ہندو مسلم اتحاد کا سفیر" قرار دیا تھا لیکن اس خطاب کے مستحق درحقیقت ڈاکٹر انصاری تھے۔ ان کی زندگی کا مقصد اعلیٰ دونوں عظیم فرقوں کو متحد کرنا تھا اور وہ اس کاز کے لیے غیر معمولی استقلال اور مضبوطی سے کام کرتے رہے۔

ڈاکٹر انصاری کی اپنے معاصرین میں بڑی اچھی ساکھ تھی اگرچہ بعض جدید اہل قلم نے اس حقیقت کو پیش نظر نہیں رکھا۔ ان کی شخصیت بڑی دلکش تھی جو تلخی اور بغض و عناد سے آزاد تھی۔ کسی شخص یا سیاسی اسکینڈل نے اسے آلودہ نہیں کیا اور یہ وصف بہت سے سیاسی لیڈروں میں نہیں ملتا۔ ڈاکٹر انصاری کے زمانہ میں بھی اور خود ہمارے زمانے میں بھی۔ ان کے دوست اور ساتھی ان کی فیاضانہ ضیافت' ان کے خلوص اور کانگریس کے ساتھ ناقابل شکست وفاداری کو پسند کرتے تھے۔ تیج بہادر سپرو سے جو ۱۹۱۴ء میں ڈاکٹر انصاری سے ملے تھے انھیں کیا ہی مناسب اور موزوں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

"ملک کی عوامی زندگی میں مشکل ہی سے کوئی شخص ہو گا جس کے لیے میرے دل میں ان سے زیادہ احترام اور اگر میں کہہ سکوں تو ذاتی طور پر زیادہ محبت ہو گی آج کل جبکہ بہتوں کے لیے یہ فیشن بن گیا کہ وہ قوم پرست ہونے کا دعویٰ کریں ہندوؤں اور مسلمانوں میں کوئی ایسا شخص نہیں جسکے قوم پرستی کے حقیقی احساسات میرے خیال میں ڈاکٹر انصاری سے زیادہ گہرے ہوں وہ چاہے جو بھی رہے ہوں یا نہ رہے ہوں میری ناچیز رائے میں ایک بہت سچے بہت بے غرض اور بہت مخلص قوم پرست تھے۔ ان کی وفات سے ہم نہ صرف ایک عظیم محب وطن ایک عظیم قوم پرست ایک عظیم ڈاکٹر بلکہ اس سے زیادہ یہ کہ ایک عظیم شریف انسان سے محروم ہو گئے ہیں"۔

(آصف علی کے نام خط ۱۲ مئی ۱۹۳۶ء)

ڈاکٹر انصاری علامہ اقبال

اس طرح یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ علامہ اقبال کا جو تعلق ڈاکٹر مختار احمد انصاری سے ابتدا میں پیدا ہوا تھا وہ باوجود بعض سیاسی اختلافات کے آخری زمانے تک نہ صرف قائم رہا تھا بلکہ مضبوط سے مضبوط تر ہو گیا تھا اسی تعلق کی وجہ سے علامہ اقبال جامعہ سے اور زیادہ قریب ہو گئے تھے۔ اس موضوع پر ابھی اور کام کرنے کی گنجائش ہے اگر وہ خطوط جو علامہ نے ڈاکٹر انصاری کو لکھے ہیں اور ڈاکٹر انصاری نے علامہ کو لکھے ہیں مل جائیں۔ ابھی تک اس طرح کے بہت سے خطوط نظروں سے اوجھل ہیں، اس لیے ہم کسی محقق کے منتظر ہیں کہ وہ ان خطوط کو منظر عام پر لا کر دونوں عظیم شخصیتوں کے تعلقات پر مزید روشنی ڈالے۔

مسرت حسین آزاد

ڈاکٹر انصاری کی سیاسی زندگی

ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی شخصیت گوناگوں صفات کی حامل رہی ہے۔ زندگی بھر وہ ملک کی نمایاں سیاسی شخصیتوں کے ساتھ مل کر کام کرتے رہے۔ گاندھی جی، موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو، حکیم اجمل خاں اور مولانا محمد علی جوہر وغیرہ تمام ہی رہنمایان ملک و ملت ان کے ہمراہی و ہمسفر رہے ہیں۔ سیاسی کاموں میں وہ فضول وقت برباد کرنے کے عادی نہ تھے، وہ ہمیشہ اس وقت مطب سے باہر آئے جب ملک میں کوئی سیاسی لہر آئی اور خاطر خواہ نتائج برآمد ہونے کا بھی امکان ہوا۔ ان کے عزائم بلند تھے لیکن سیاسی حالات کے تھپیڑوں اور نشیب و فراز سے متاثر ہو کر کبھی کبھی وہ بھی تھک کر بیٹھ رہے ہیں۔ یہ تغیر و تبدل محض انصاری ہی کے لیے مخصوص نہ تھا۔ اس قسم کی تھکاوٹ اور مایوسی کے نمونے اکثر سیاسی لوگوں کی زندگیوں میں مل جاتے ہیں۔

ایک ماہر ڈاکٹر کی حیثیت سے ان کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ ان کا طریقۂ علاج بیماروں کے ساتھ ہمدردانہ اور مخلصانہ رویہ اور دوست واحباب کے لیے ایثار و قربانی کے قصے آج بھی سننے کو مل جاتے ہیں۔ ان پر زندگی میں کچھ نہ کچھ لکھا ہی جاتا رہا لیکن انتقال کے بعد ان کی شخصیت کا بھرپور جائزہ جو چند کتابوں میں مل سکتا ہے ان میں قاضی عبد الغفار مرحوم کی کتاب (حیات اجمل) اور چودھری خلیق الزماں کی تصنیف A Path - way to Pakistan خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

چودھری صاحب نے ایک دوست اور ساتھی کی حیثیت سے اور خاص طور پر ان کی سیاسی زندگی کا اپنے نقطۂ نظر سے جو تجزیہ کیا ہے وہ بہت خوب ہے اور اس ذیل میں ڈاکٹر انصاری کی حیات کے بہت سے پہلو تفصیل طور پر ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔

"حیات اجمل" کی اہمیت کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ قاضی صاحب نے ڈاکٹر انصاری سے حکیم اجمل خاں کے سلسلہ میں باتیں معلوم کرنا چاہیں تو انھوں نے سیکڑوں صفحات پر مشتمل اپنی یادداشتیں ان کے حوالے کر دیں جن میں حکیم صاحب کے سیاسی اور قومی زندگی کے حالات کے ساتھ ساتھ خود ڈاکٹر انصاری کی زندگی کے بھی بہت سے حالات محفوظ ہو گئے تھے اور اس حقیقت سے اس دستاویز کی بڑی اہمیت ہے۔ قاضی صاحب نے اپنی اس کتاب میں ان تحریروں سے جگہ جگہ روشنی حاصل کی ہے اور بہت سے حصوں کو کتاب کا جزو بھی بنا دیا ہے یہ ایک اچھا کام ہوا لیکن ان یادداشتوں کو مکمل طور پر شائع ہونا چاہیئے۔ معلوم نہیں اب یہ کاغذات کہاں ہیں قاضی صاحب نے ایسا کوئی اشارہ نہیں دیا۔

اب انصاری صاحب پر اتفاق ہی سے کوئی نیا مضمون دیکھنے کو ملتا ہے۔ رشید احمد صدیقی مرحوم نے اپنی کتاب 'گنجہائے گرانمایہ' میں اپنے مخصوص انداز میں ان کی خوبصورت مسکراہٹ اور گندمی رنگ اور گھنی ابروؤں کا 'ممبی پلکوں اور گہری روشن آنکھوں کا' مریضوں سے ہمدردی کا 'منہوت مندوں سے حسن سلوک کا' طبی وفد کا 'جامعہ ملیہ کا' ہندو مسلم اتحاد کے سلسلے میں ان کی کوششوں کا اور پھر جامعہ ملیہ میں آسودہ خاک ہو جانے کا ذکر کر کے گویا تمام ہی پہلوؤں پر کچھ نہ کچھ روشنی ڈال دی ہے۔

اسی طرح کچھ نئی باتیں انصاری صاحب کے ایک دوست لیفٹیننٹ کرنل ایم شاہ کے مضمون میں بھی ملتی ہیں وہ لکھتے ہیں "میری پہلی ملاقات ان سے لندن میں سنہ میں ہوئی تھی جبکہ وہ ایڈنبرا یونیورسٹی سے ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کر چکے تھے اور لندن کے کسی درس و تدریس دینے والے اسپتال میں ہاؤس سرجن کی حیثیت سے مقرر ہو چکے تھے۔ اس زمانہ میں لندن کے ایک شام کے اخبار میں ایک خبر شائع ہوئی جس کی سرخی تھی (برطانوی ڈاکٹروں کے ساتھ شدید بے انصافی) وہ خبر انصاری کے تقرر کے خلاف تھی لیکن انکی قابلیت اور سرجری میں ماہرانہ صلاحیت نے اس خبر کو بے اثر بنا دیا"[1]

دہلی آنے کے بعد جب انھوں نے اپنا مطب شروع کیا تو حکیم صاحب سے اور قریب ہو گئے اور سیاسی کاموں میں ایسے الجھے کہ پھر زندگی کے کسی بھی دور میں وہ خود کو سیاست سے پوری طرح الگ نہ کر سکے۔ محمد علی کا طبی وفد ترکی روانہ ہوتا ہے تو اسکے سربراہ ڈاکٹر انصاری ہیں۔ کانپور کا واقعہ پیش آتا ہے تو حکیم صاحب کے ساتھ انصاری بھی جگہ جگہ دورے کر رہے ہیں۔ مسلم یونیورسٹی بنانے کی بات چلتی ہے اور کانسٹی ٹیوشن تیار کرنے والی کمیٹی بنائی جاتی ہے تو ڈاکٹر صاحب اسکے ممبر، کانگریس اور مسلم لیگ کے اتحاد کی بات چلتی تو حکیم صاحب اور محمد علی کے شانہ بہ شانہ ڈاکٹر انصاری بھی موجود ہیں۔ علمائے کرام کو عملی سیاست میں لانے والوں میں وہ بھی ایک، ریشمی خطوط تحریک میں حکومت کو حکیم صاحب کے ساتھ ڈاکٹر انصاری کا ہاتھ بھی نظر آنے لگتا ہے۔ دراصل ان کی سیاسی اور قومی زندگی کا بیشتر زمانہ حکیم اجمل خاں اور کانگریس کے اردگرد ہی گھومتا نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر انصاری کی توجہ تصنیف و تالیف کی طرف بہت ہی کم رہی۔ کچھ چیزیں ضرور لکھی ہیں جو پوری طرح آج تک سامنے نہیں آئیں۔ خطوط ہزاروں کی تعداد میں لکھے ہوں گے اور ان میں کے کچھ نہ کچھ گھروں میں آج بھی محفوظ ہو سکتے ہیں۔ اخبار و رسائل اور کتابوں میں تو چند ہی نظر آتے ہیں۔ لیکن ان کی سیاسی زندگی پر بہر حال ان سے بھی کچھ نہ کچھ روشنی پڑتی ہے۔

---

[1] بعض مشاہیر سے میری ملاقاتیں کتابی دنیا کراچی مئی

نقوش لاہور کے مکاتیب نمبر میں ان کے جو تین خط شائع ہوئے ہیں ان میں کے دو امروہہ کے ایک نواب کے نام اور ایک عرفان صاحب کے نام ہیں جو ملک کے باہر سے لکھا گیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"ترکی حکومت آج کل بے حد متوحش معلوم ہوتی ہے اور ہر قسم کی بندش اور سختیاں کر رکھی ہیں تاہم میں نے تو قصد وہاں جانے کا کر لیا ہے۔ البتہ فواد سلیم بک وغیرہ کا خیال ہے کہ غازی پاشا تو ملیں گے نہیں لیکن میرے ساتھ ایک جاسوس ضرور کر دیا جائے گا۔ میں نے کہا کہ میں ESPIONAGE کا عادی ہوں۔ قید فرنگ کا جس کو خوف نہیں اس کو ترکی جیل کا خوف کیا ہوگا۔ بہرحال میری تحریر کو آپ اپنے چند دوستوں تک ہی محدود رکھیں۔ حالات ایسے خراب ہیں کہ ان کو باہر نہ جانا چاہیئے"۔

گاندھی جی، موتی لال اور پنڈت نہرو وغیرہ حضرات سے ان کے بہت ہی قریبی تعلقات رہے ہیں۔ کیسے کیسے نازک وقت میں ایک دوسرے کے ساتھ رہے ہیں۔ یہ حقیقت کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ اس زمانہ کے بے شمار خطوط اب تک سامنے نہیں آئے ہیں جن میں ان کی سیاسی زندگی اور معقول شخصیت کے نقوش تلاش کیے جائیں۔ دس پانچ مل جاتے ہیں تو ان کے ارادوں اور نظریات کی ادھوری جھلک سامنے آجاتی ہے۔ ایسے ہی خطوط میں پنڈت نہرو کو لکھے گئے پانچ خط ہیں جو نہرو جی کی مرتب کردہ کتاب "کچھ پرانے خطوط" میں نظر آتے ہیں۔ یہ خط انگریزی میں تھے جامعہ ملیہ والوں نے اس کتاب کا اردو ترجمہ شائع کیا۔

ان مکاتیب کی تفصیل یہ ہے کہ پہلا خط ۱۱ اکتوبر [illegible] کا، دوسرا ۱۸ نومبر [illegible] کا، تیسرا اور چوتھا ۳۰ مارچ [illegible] کا اور پانچواں خط ۱۱ فروری [illegible] کا تحریر کردہ ہے گویا یہ پانچ خط ان کی زندگی کے دس سالوں کا احاطہ کرتے ہیں اور اس عرصہ میں ملک میں سیاسی طور پر جو تبدیلیاں رونما ہوئیں ان کی طرف ان میں محض اشارے ہی ملتے ہیں۔

حقائق تلاش کرنے کا کام سیاسی بزرگوں کا ہے جو بیچ کی کڑیاں ملا کر اور تصویر کے اصل خدوخال کو سامنے لاکر ہماری رہنمائی کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر انصاری ۱۱ اکتوبر [illegible] کے خط میں تحریر فرماتے ہیں کہ طویل مدت تک قلب کا مریض رہنے کی وجہ سے اشتعال اور ہیجان سے بچنے کی سخت تاکید کر دی گئی ہے۔ اس لیے مجبور ہوں کہ اپنا دائرہ عمل محدود کر لوں اور صرف تعلیمی کاموں میں سروکار رکھوں۔ میرے یورپ جانے سے قبل اجمل خاں اور مہاتما نے مجھے نیشنل مسلم یونیورسٹی کے سیکریٹری کا عہدہ قبول کر لینے پر مجبور کیا تھا اس لیے میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ آئندہ تمام دوسرے پبلک کاموں سے بجز ایک نیشنل مسلم یونیورسٹی کے دور رہوں گا۔

۱۸ نومبر [illegible] کا خط اس زمانہ کا ہے جب نہرو جی کانگریس کے صدر تھے اور پارٹی میں مختلف افکار و نظریات کے لوگوں کے ٹکراؤ سے تنگ آکر صدارت سے مستعفی ہونا چاہتے تھے۔ انصاری نے اس خط میں انھیں ایسا نہ کرنے کا مشورہ دیا اور انتظار کرو اور دیکھو، کی پالیسی پر عمل کرنے تلقین کی۔ یہ خط لکھنؤ سے لکھا تھا اور الٰہ آباد نہ آنے کی معذرت میں لکھتے ہیں "میں دہلی سے اپنے مریضوں کی چیخ پکار کے ڈر سے چوروں کی طرح چپکے سے نکلا ہوں اس لیے اب مجھے ضرور واپس جانا چاہیئے"۔

۳۰ مارچ [illegible] کے دو خط ہیں ایک نہرو کے اور دوسرا گاندھی جی کے نام۔ دونوں کے مضمون بھی یکساں ہی ہیں۔ مشورہ دیا گیا ہے کہ پنڈت جی کو موتی لال عملی سیاست سے الگ رکھا جائے۔ ان کی تندرستی دن بدن گر رہی ہے اور صورت حال خطرناک ہے۔ پانچواں خط دارالسلام دریا گنج دہلی سے ۱۱ فروری [illegible] کو لکھا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ پنڈت نہرو اپنی بیوی کے علاج کے سلسلے میں یورپ گئے ہوئے ہیں اور کانگریس کے صدر بھی منتخب ہو گئے ہیں۔ انصاری کو انکی اس مدت کی صدارت سے خوشی نہیں ہوئی کیونکہ وہ سمجھ رہے تھے کہ پنڈت نہرو پر ذاتی ذمہ داریاں اور خاص طور پر اہلیہ کی بیماری کے سلسلے کی پریشانیاں بہت زیادہ بڑھ گئی ہیں اور یہ وہ فرائض ہیں کہ جن سے پہلو تہی بھی ممکن نہیں ہے۔ اگر ان حالات میں پنڈت نہرو صدارت کی ذمہ داریوں کو خاطر خواہ طور پر نہ نبھا سکے تو دوسرے مایوسی کا شکار ہو جائیں گے۔ اس لئے وہی انصاری جو [illegible] میں پنڈت نہرو کو استعفیٰ نہ دینے کا مشورہ دیتا ہے [illegible] میں ان کے صدر ہونے سے زیادہ خوش نظر نہیں آتا۔ اپنے بارے میں لکھتے ہیں: "اگرچہ خرابیٔ صحت نے عملی سیاست سے دست کش ہو جانے پر مجبور کر دیا ہے پھر بھی جی چاہتا ہے کہ تم واپس آؤ تو تم سے ایک صاف اور مفصل گفتگو کروں"۔

اس خط سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ڈاکٹر انصاری نے ایک کتاب (انسان میں نئی زندگی) تصنیف کی تھی جس کا ایک نسخہ نہرو کی خدمت میں بھی روانہ کیا ہے۔ اپنی بیٹی زہرا کے بارے میں بھی لکھا ہے کہ وہ کبھی ہندوستان میں داخلہ لینا چاہتی کبھی کیمبرج جانے کو کہتی ہے میں نے اس بات کا فیصلہ اسی پر چھوڑ دیا ہے۔

ڈاکٹر انصاری کی شخصیت کا جائزہ مختلف لوگوں نے اپنے اپنے نقطۂ نظر سے لیا ہے۔ شاعروں نے بھی انھیں اشعار کے ذریعہ خراج عقیدت پیش کیا ہے اور اچھے اچھے نمونے چھوڑے ہیں۔ مجاز مرحوم کی ذہانت کا کون قائل نہ ہوگا۔ ان کے متعلق طرح طرح کے قصے مشہور ہیں اور ہر قصہ میں ان کی شخصیت گھٹتی نہیں کچھ نہ کچھ بڑھ ہی جاتی ہے۔ ان کا ایک خط افکار کراچی کے مجاز نمبر میں شائع ہوا ہے جو انھوں نے ڈاکٹر انصاری کی قیام گاہ دارالسلام دریا گنج دہلی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر سلام کے نام لکھا تھا۔ سامنے ڈاکٹر انصاری کی تصویر ہے۔ اسے دیکھ کر ان کی شخصیت کا تجزیہ ایک نئے ڈھنگ سے کرتے ہیں:

"بائیں جانب دیوار پر ایک بڑا PORTRAIT ڈاکٹر انصاری کا سیاسی و اخلاقی جاہ و حشم کی یاد تازہ کر رہا ہے۔ میں یہ غور کر رہا تھا کہ اس تصویر میں جو نیلی شیروانی ہے اس کے بٹن کیوں ہلالی ہیں اور پھر یہ کہ تصویر میں صرف تیسرے اور درمیانی بٹن (ہلالی)، کے علاوہ اور تمام ہلال کیوں غلط رخ یا زاویہ پیش کر رہے ہیں"۔

ڈاکٹر انصاری

[illegible]

عظیم الشان صدیقی

"جس سوراج کے لیے ہم برسرپیکار ہیں وہ نہ تو ہندو راج ہوگا اور نہ ہی مسلمان راج۔ یہ ایک مشترکہ راج ہوگا۔ ہم ہندوستان کو ایک قوم میں ڈھال سکتے ہیں۔ جو ایسے پختہ عزم اور مضبوط ارادہ کی مالک ہو کہ اپنے عظیم نصب العین کے راستہ میں بڑی رکاوٹ کو دور کر سکے اور دنیا کی اقوام میں اپنی مناسب جگہ حاصل کرنے کے قابل ہو" (ماخوذ از خطبہ صدارت، آل انڈیا کانگریس اجلاس مدراس ۱۹۲۷ء)

یہ اقتباس ہندوستان کی تحریک آزادی اور اس کے عزم و نصب العین کا نہ صرف دستاویزی ثبوت پیش کرتا ہے بلکہ ایسا آئینہ بھی ہے جس میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی شخصیت اور فکر و نظر کے نقوش بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ تحریک آزادی کے بیشتر قائدین کی طرح ڈاکٹر انصاری کا شمار بھی ان چند تاریخ ساز افراد میں ہوتا ہے جنھوں نے تکمیل علم کے منازل اگرچہ انگلستان میں طے کیے تھے اور ذلت اور غلامی کے احساس کے ساتھ حب الوطنی اور قومیت کے جذبات نیز علمی و سائنسی انداز فکر و نظر لے کر ہندوستان لوٹے تھے لیکن ان کی شخصیت کو جلا و تہذیب اس تحریک نے عطا کی تھی جس کے نتیجہ میں ہندوستان کو آزادی نصیب ہوئی۔ البتہ دیگر قائدین کی طرح صحافت یا وکالت کے راستہ کے بجائے انسانی خدمت کے ایک عظیم پیشہ طبابت کے ذریعہ سیاست میں داخل ہوئے تھے جس نے ان کی شخصیت کو نہ صرف متنوع و منفرد بنا دیا تھا بلکہ ان تمام اخلاق حسنہ، خوش اخلاقی، زندہ دلی، متانت و خودداری، وسیع القلبی و شرافت، مہمان نوازی و ایثار، ہمدردی اور بے لوث خدمت سے بھی متصف کر دیا تھا جو پیشہ کا لازمی جز ہی نہیں بلکہ انسانیت کے اعلیٰ جوہر سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔ اسی پیشہ، شخصیت اور مزاج کے باعث یہ مواقع بھی حاصل ہوئے تھے کہ وہ عوام و خواص دونوں کا یکساں طور پر وہ اعتماد حاصل کر سکیں جس کے بغیر قومی، سیاسی اور سماجی خدمات کے کاموں کو انجام دینا اور مختلف طبقات اور پیشوں کے مابین ربط و اتحاد قائم کر کے انھیں ایک لڑی میں پرونا ممکن نہیں ہے۔

ڈاکٹر انصاری کے بارے میں عام طور پر مشہور ہے کہ وہ نہ صرف غریبوں کا علاج مفت کرتے تھے بلکہ ان کی دوا اور غذا کا خرچ بھی اپنی جیب سے ادا کرتے تھے البتہ امرا، رؤسا اور والیان ریاست کے لیے ان کے مشرب میں کوئی رعایت ممکن نہیں تھی یہی وہ واحد ذریعہ آمدنی بھی تھا جس نے انھیں اقتصادی مسائل سے بے نیاز ہو کر قومی خدمات میں حصہ لینے کا اہل بنا دیا تھا۔ اس پیشہ اور فن کے تعلق سے ان کی عظیم خدمات صرف یہی نہیں تھیں کہ انھوں نے طب جدید کو (جسے اس زمانے میں نفرت کا مستوجب تصور کیا جاتا تھا) مقبول بنانے میں نمایاں کامیابی حاصل کی بلکہ اس کو فروغ دینے کے لیے کوشاں رہے جس کا ثبوت مختلف طبی انجمنوں میں ان کی شرکت اور سرپرستی سے فراہم ہوتا ہے۔ ان تمام کوششوں میں بیشک وہ ہندوستانی نقطہ نظر سے سوچتے تھے لیکن اس سعی و عمل کی تربیت میں لاک اسپتال لندن کی رجسٹرارشپ اور چیرنگ کراس اسپتال کی ہاؤس سرجن شپ نیز ڈاکٹر اسٹینلے بائیڈ (جو لندن کے مشہور ماہر فن اور شاہ انگلستان کے آنریری سرجن تھے) کی اس سرپرستی کو بھی دخل تھا جس نے انھیں نہ صرف جدید مغربی علوم اور اعلیٰ طبقہ سے متعارف کرایا تھا بلکہ ربط و تعلق اور اعتماد کے ایسے مواقع فراہم کر دیے تھے کہ وہ حکومت کی نیت، ارادوں اور پالیسیوں سے بر وقت آگاہی حاصل کر سکیں۔ غالباً یہی وجہ رہی ہوگی کہ انھوں نے واپسی ہند ۱۹۱۱ء کے بعد کلکتہ (اس وقت کے پایہ تخت) اور حیدرآباد جیسی ریاست (جس کے اسکالرشپ پر وہ لندن گئے تھے اور جہاں ان کے بیشتر اعزا، اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے) کو چھوڑ کر دارالخلافہ کی تبدیلی سے ایک سال قبل دہلی کو اپنے مطب اور خدمت کے لیے منتخب کیا تھا اس کے فوائد میں حکام اعلیٰ میں رسوخ اور قبل از وقت قومی لیڈروں کی گرفتاری کی اطلاعات و احکامات اور احتیاط شامل ہیں۔ لندن ہی میں انھیں حکیم اجمل خاں، پنڈت موتی لال نہرو اور پنڈت جواہر لال نہرو نیز دیگر افراد سے پہلی مرتبہ ملاقات کے ایسے مواقع نصیب ہوئے تھے۔ جو وقت کے ساتھ دائمی دوستی اور رفاقت میں تبدیل ہو گئے اور ہندوستان واپس آنے کے بعد وہ اجنبیت، بیگانگی اور محرومی کے احساس

سے منفرد سبب دہلی آنے پر حکیم اجمل خاں نے جس طرح ان کی پذیرائی کی تھی اس کا اظہار ڈاکٹر انصاری نے ان الفاظ میں کیا تھا۔

"۱۹۱۰ء میں جبکہ ہندوستان واپس آکر میں نے دلی میں مستقل قیام کیا اور مطب شروع کیا۔ حکیم صاحب کی اور میری یک جہتی اور گہرے مراسم ارتباط و محبت قائم ہوئے۔" (حیات اجمل)

ایسے ہی نوٹ میں ڈاکٹر انصاری لندن میں حکیم اجمل خاں سے اپنی پہلی ملاقات، چیرنگ کراس اسپتال کا ان کے معائنہ اور ڈاکٹر بائیڈ سے ان کے مجادلہ و مذاکرے کا ذکر کرتے ہیں جس سے ان دونوں حضرات کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ جس کا ایک اہم پہلو ترکی کے مجروحین کی امداد کے لیے بھیجے جانے والے طبی وفد کی قیادت کے لیے ڈاکٹر انصاری کے انتخاب سے بھی تعلق رکھتا ہے۔

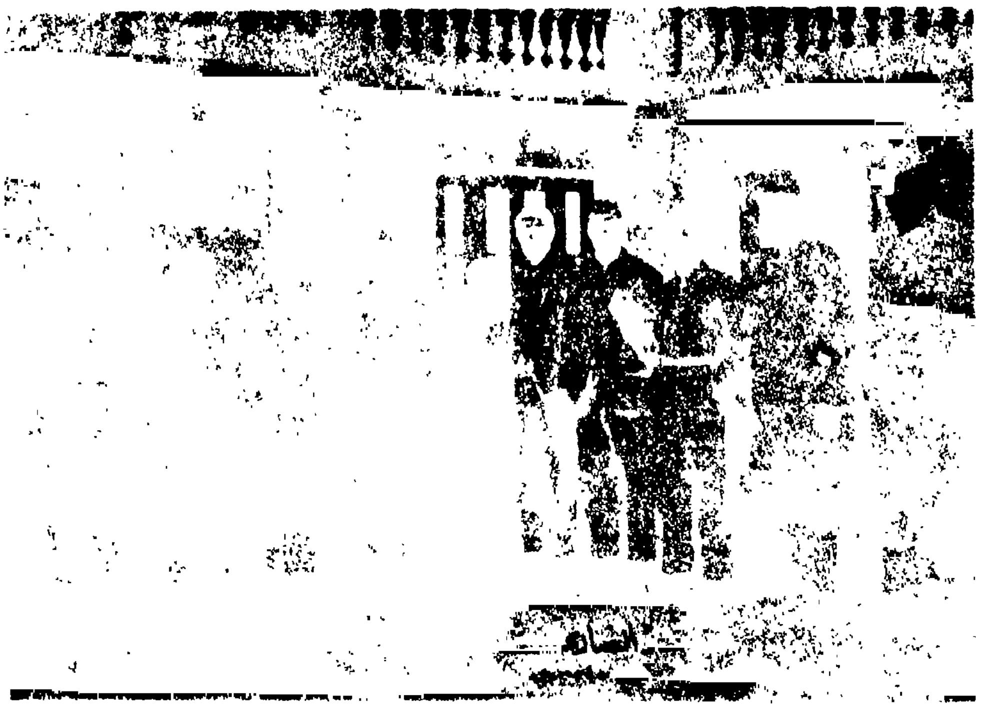

یہ وفد تعداد کے اعتبار سے اگرچہ کم تر تھا لیکن اپنی نوعیت اور اثرات کے اعتبار سے دوررس نتائج کا حامل نظر آتا ہے یہ ہندوستان کی تاریخ میں پہلا وفد تھا جو عوام کے جذبات اور خواہشات کا ترجمان ہی کر بیرون ملک آزاد اقوام کی مدد کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا جس نے ایک ایسی قوم سے ہندوستانی عوام اور سیاسی تحریکات کا بین الاقوامی سطح پر رشتہ استوار کرنے میں مدد بہم پہنچائی تھی جو اہل ہند کی طرح نہ صرف مغربی اقوام اور سامراج کے جور و ستم کا شکار تھی بلکہ اپنی آزادی اور سالمیت کے لیے ان سے نبرد آزما تھی اور جو تحریک مستحکم آزادی ہندوستان میں غلامی کی زنجیروں کو توڑنے میں معاون و مددگار ثابت ہو سکتی تھی۔ اس اہم مہم کے اثرات کو قاضی محمد عبدالغفار نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

" اس وفد نے جو بڑا کام کیا وہ یہ تھا کہ ہندوستان اور غیر ممالک کے درمیان دروازے کھول دیے، ہندوستان اپنی مسلسل غلامی کی وجہ سے باہر کی دنیا سے بے تعلق تھا۔ اس کی غلامی پر پہلی ضرب یہی تھی کہ ہندوستانی مسلمانوں کے اس وفد نے غیر ممالک کے لوگوں سے اتصال پیدا کر دیا اور بین الاقوامی دنیا کی طرف اپنی غلام قوم کو بھی راستہ بتا دیا۔ یہ محض کسی ایک فرقہ یا مذہب کا معاملہ نہ تھا بلکہ وسیع تر نظر سے دیکھا جائے تو یہ تمام ہندوستان کی اجتماعی زندگی کو بین الاقوامی سیاست سے قریب لانے کا مسئلہ تھا جس کا آغاز ڈاکٹر انصاری کے وفد سے ہوا۔ بعد کو دوسرے ہندوستانی لیڈروں نے اس راستہ پر بہت سی مسافت طے کی اور آج تو پنڈت جواہر لال جیسے لیڈروں کی وجہ سے ہندوستان ایشیا اور یورپ کے بین الاقوامی نقشہ میں اپنا ایک ممتاز مقام رکھتا ہے اس بین الاقوامیت کا آغاز بلاشبہ ڈاکٹر انصاری کے وفد ہی نے کیا تھا۔" (حیات اجمل، صفحہ ۱۳۴)

اجتماعی اثرات سے قطع نظر انفرادی حیثیت سے اگر اس طبی وفد کا (جو تقریباً ایک سال وہاں رہا) جائزہ لیا جائے تو یہ ڈاکٹر انصاری کی عملی سیاست میں شرکت، شہرت و مقبولیت، معروف عمل اور جنگ و پیکار میں مبتلا اقوام کے عزم و حوصلہ کا قریب سے مشاہدہ کرنے اور فکر و عمل کی سطح پر رشتۂ الفت استوار کرنے کا ایسا دیباچہ نظر آتا ہے جس کا سلسلہ ڈاکٹر انصاری کی زندگی کے آخری لمحوں تک پھیلا ہوا ہے۔ اسی کے بعد یہ ممکن ہو سکا کہ ڈاکٹر بہجت وہبی، غازی رؤف بے اور خالدہ ادیب خانم جیسے اہل فکر و نظر افراد ہندوستان آ سکے۔

اسی طبی وفد کو اہل ہند نے جس جوش و خروش کے ساتھ رخصت کیا تھا اور اس وفد کی خدمات نیز ترکی کے حالات کے بارے میں جو خبریں وقتاً فوقتاً اخبارات میں شائع ہوتی رہتی تھیں اس نے ڈاکٹر انصاری کی عظمت و اعتماد کو ایسی تقویت پہنچائی تھی کہ وہ زندگی کے آخری لمحات تک ناخوشگوار حالات اور فضا کے باوجود عملی سیاست اور قومی اور سماجی خدمات کے کاموں سے نہ صرف اپنا دامن نہیں چھڑا سکے بلکہ ابتدا ہی میں ان کا نام سیاسی جماعتوں، تحریکوں اور رہنماؤں کی اگلی صف میں اس طرح لازمی عنصر کی حیثیت سے شریک سمجھا جانے لگا کہ اکثر مسائل و مصائب ان کے تدبر اور ناخن تدبیر کے محتاج بن کر رہ گئے۔ اور جب ۴ر جولائی ۱۹۱۳ء کو یہ وفد ہندوستان واپس لوٹا تو قضیہ مسجد کانپور اور مسلم یونیورسٹی کے دستور اساسی نے ڈاکٹر انصاری کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کر لیا۔ کانپور کی مجروحین کی دیکھ بھال میں وہ حکیم اجمل خاں کے ساتھ ہی نہیں رہے بلکہ وہ اس کمیٹی کے ممبر بھی منتخب کیے گئے جو مسلم یونیورسٹی کے سلسلہ میں ممبر تعلیمات سر ہرکورٹ بٹلر سے گفتگو کرنے کے لیے تشکیل کی گئی تھی۔ لیکن اس وفد کی ناکامی کے باعث سر سید کا خواب مسخ ہو کر رہ گیا۔

۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۹ء کا زمانہ یورپ میں پہلی جنگ عظیم، انقلاب روس، ہندوستان کی صنعتی ترقی، سیاسی تعطل، امیدوں اور وعدوں کا دور رہا۔ ابتدائی زمانے میں اگرچہ مولانا محمد علی نے کامریڈ کے ذریعہ اور مولانا ابوالکلام آزاد نے الہلال کے ذریعہ ترکوں کی ہمدردی میں رائے عامہ اور سیاسی شعور کو بیدار کرنے میں نمایاں حصہ لیا لیکن جلد ہی مذکورہ اخبارات پر نہ صرف پابندی عائد کر دی گئی بلکہ یہ دونوں حضرات بھی نظر بند کر دیئے گئے۔ جن کی پرجوش رہائی کے مطالبہ نے تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ اس سلسلے کے اکثر جلسے بھی ڈاکٹر انصاری کی قیام گاہ پر ہی ہوا کرتے تھے۔ لیکن یہ نازک دور تھا اور جنگ عظیم کے خاتمہ سے بہت سی امیدیں اور توقعات وابستہ تھیں اس لیے ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں اور مہاتما گاندھی کو برطانوی حکومت سے حمایت، وفاداری اور تعاون کا اظہار کرنا پڑا۔ لیکن ڈاکٹر انصاری کی کوششیں تلقین کی حدود سے تجاوز نہ کر سکیں اس نازک اور بحرانی دور میں بھی وہ ہندو مسلم یگانگت اور مسلم لیگ اور کانگریس کے مابین اس قومی اتحاد کے کاموں میں مصروف رہے جس پر ہندوستان کے مستقبل کا انحصار تھا۔ وہ مسلم لیگ اور کانگریس پیکٹ جسے میثاق لکھنؤ ۱۹۱۶ء کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے اس کو عملی جامہ پہنانے میں حکیم اجمل خاں کے ساتھ ڈاکٹر انصاری بھی شامل تھے۔ لیکن فکر و عمل جرأت اور بیباکی جہد مسلسل کا وہ حقیقی سفر ۱۹۱۹ء سے شروع ہوتا ہے جس نے انگریزوں کی وعدہ خلافی، رولٹ بل کی اشاعت اور ترکوں کے ساتھ سامراجی طاقتوں کے ناروا سلوک کا سہارا لے کر ہندوستان کی تحریک آزادی کو اس طرح آتش فشاں میں تبدیل کر دیا کہ سارا ہندوستان اس کی لپیٹ میں آ گیا۔ مہاتما گاندھی کے ستیہ گرہ کا آغاز، جلیانوالہ باغ کا حادثہ، خلافت کمیٹی کا قیام، آل انڈیا مسلم کانفرنس کے اجلاس اور آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس دہلی ۱۹۱۸ء میں ڈاکٹر انصاری کا وہ پرجوش خطبہ استقبالیہ وغیرہ سب اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں جو ایک نرم دل انسان کے باغیانہ تیور کی نشاندہی کرتی ہیں جس کے نتیجہ میں حکومت نے اس خطبہ کو قابل ضبطی قرار دیا۔ اس خطبہ میں ڈاکٹر انصاری نے جہاں یورپ کی پرفریب پالیسی اور اسلامی سلطنتوں کے خلاف غارت گری اور قزاقی اور سفید اقوام کے کاموں پر حکومت کے جواز کے پرفن طریقوں کو پرجوش قابل مذمت اور مورد الزام قرار دیا تھا وہاں انھوں نے خلافت کی حمایت کو وطن دوستی، ہندو مسلم اتحاد اور یکجہتی کا حامل بھی ٹھہرایا تھا۔ اس سلسلہ میں ان کا ذہن نہایت واضح اور انداز نظر حق اور اعتدال پسندانہ تھا جس کا کچھ اندازہ درج ذیل اقتباس سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔

> "ہمارا یہ متزلزل عقیدہ ہے کہ ایک سچا مسلمان ہمیشہ ایک سچا وطن پرست ہوگا۔ اگر ہم مسلمان ترکی و ایران کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں تو ساتھ ہی ہمارے طرز عمل نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہم اپنے ہم وطنوں کے حقوق کی حمایت کرنے میں جو غیر ممالک میں مقیم ہیں کسی سے کم نہیں۔ وہ حق پرست یعنی احمد محمد کچھالیہ ہندوستان کا ہی ایک مسلمان تھا جو جنوبی افریقہ میں عرصہ تک گرفتار رہا اور آخر تک ہمارے حقوق کے اس شیر دل علمبردار مسٹر گاندھی کی جانشینی کا پورا حق ادا کرتا رہا۔" (بحوالہ تحریک خلافت)

یہ خطبہ استقبالیہ آئندہ پیش آنے والے واقعات کے لیے ایسا دیباچہ ثابت ہوا کہ ترک موالات جیسی تحریک کو ہندوستان کی قومی سیاست کی سطح پر ابھرنے کے ایسے مواقع حاصل ہو گئے کہ تمام سیاسی جماعتیں اس کے پرچم تلے آ گئیں۔ اور مسلم یونیورسٹی کے بطن سے ایک ایسی درسگاہ جامعہ ملیہ (۱۹۲۰ء) کو نمودار ہونے کا موقع مل گیا جو تعلیم و تدریس اور قومی خدمت کے کاموں کو یکساں طور پر انجام دے سکے۔ ان اداروں کے قیام میں مہاتما گاندھی، مولانا محمد علی، حکیم اجمل خاں کے ساتھ ڈاکٹر انصاری کی مساعی جمیلہ کو بھی دخل تھا۔

ڈاکٹر انصاری اگرچہ مسلمانوں کی مختلف جماعتوں مسلم لیگ، خلافت کمیٹی، نیشنلسٹ احرار، خدائی خدمتگار اور جمعیۃ العلماء وغیرہ سے کسی نہ کسی صورت میں وابستہ رہے لیکن سیاست میں ہمیشہ ان کا نقطہ نظر نہ صرف سیکولر اور قوم پرستانہ رہا بلکہ وہ ہمیشہ ہی مسلم جماعتوں کو قومی تحریک اور کانگریس کے قریب لانے کی کوشش کرتے رہے۔ اور مشکل اوقات اور نازک دور میں بھی مہاتما گاندھی کو ان کی حمایت حاصل رہی۔ ۱۹۲۰ء میں وہ جس وقت ناگپور میں مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت کر رہے تھے اس وقت بھی وہ کانگریس کے جنرل سکریٹری تھے اور یہ منصب صرف اسی سال تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ ۱۹۲۲ء، ۱۹۲۶ء، ۱۹۲۹ء، ۱۹۳۱ء، ۱۹۳۲ء میں بھی انھیں اس عہدہ جلیلہ کے فرائض انجام دینے پڑے تھے جسے ڈاکٹر انصاری پر ہندوستانی عوام و خواص کے یقین و اعتماد کی دلیل ہی تصور نہیں کیا جا سکتا بلکہ یہ ان کی بے پناہ صلاحیتیں کے اظہار و اعتراف کا ایسا بین ثبوت بھی ہے جس کی مثالیں بہت کم نظر آتی ہیں۔ ان کی بہترین صلاحیتوں کا دوسرا عظیم مظہر، سیاسی و سماجی شعور کا عکس، قومی اتحاد اور آزادی کی بے پناہ خواہش کا داعی اور تنظیمی و تعمیری ذہن کا روشن پرتو وہ خطبہ صدارت ہے جو کانگریس کے صدر کی حیثیت سے انھوں نے اجلاس مدراس ۱۹۲۷ء میں دیا تھا۔ اس خطبہ میں ڈاکٹر انصاری نے نہ صرف بچھڑے ہوئے ساتھیوں کی دوبارہ آمد پر اطمینان و

مسرت اور غیر ملکی ڈیلی گیٹوں کی موجودگی پر طمانیت قلب کا اظہار کیا تھا بلکہ ملکی اور غیر ملکی معاملات پر ڈاکٹر انصاری کے سیاسی اور علمی انداز نظر، ترقی پسندانہ خیالات بین الاقوامی سیاست سے باخبری اور سیاسی حکمت عملی پر بھی دلالت کرتا ہے جس کا اندازہ اس مختصر سے اقتباس سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

"آج بتدریج اس بات کا احساس کیا جارہا ہے کہ دنیا کے مختلف ممالک میں سیاسی مسائل کا ایک گہرا رشتہ قائم ہے اور یہ کہ ہندوستان کی اقتصادی اور سیاسی غلامی سے انسانیت کی پرامن ترقی اور بالخصوص برطانیہ عظمیٰ کے مزدوروں کو شدید خطرات لاحق ہیں۔ آج جب کہ شہنشاہی اور سرمایہ دارانہ مفادات کی طرف سے ہندوستان کے خلاف اتہام سازی اور غلط ترجمانی کی ایک مہم جاری ہے ہمیں اس جگہ ہمارے سمندر پار ممتاز ڈیلی گیٹوں کی موجودگی نے اس بات کی امید دلادی ہے کہ دنیا کے دوسرے ممالک میں ہماری طرح شہنشاہیت اور سرمایہ داری کی لوٹ کے شکار ہونے والے ہمارے بھائی بندوں نے اس بات کا احساس کر لیا ہے کہ مشترکہ دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے مشترکہ جدوجہد اور متحدہ اقدام کی ضرورت ہے۔" (خطبہ صدارت)۔

قومی مسائل کو مشترکہ مساعی کے ذریعے حل کرنے کی یہ خواہش اس قدر شدید تھی کہ اس خطبہ میں ڈاکٹر انصاری نہ صرف افریقہ کے غلام ممالک کے حوالہ سے برطانیہ کے ظلم و ستم کو ہدف ملامت بنایا تھا بلکہ آزادی اور غلامی کے اس بنیادی اور اقتصادی پہلوؤں کی طرف بھی اشارے کیے تھے جس کا حقیقی شعور قوموں کو آزادی کی نعمت سے ہمکنار کرتا ہے۔ یہاں انھوں نے برطانیہ عظمیٰ کو یہ یقین دلانے کی کوشش بھی کی تھی کہ "سیاسی اور اقتصادی جوئے میں بندھے ہوئے بیزار اور دشمن مقبوضہ ہندوستان کے مقابلہ میں آزاد ہندوستان اس کے مال کا بہتر گاہک ہو سکتا ہے۔" اسی طرح کامل آزادی کا وہ تصور جو کانگریس کے اجلاس لاہور ۱۹۲۹ء میں نہرو رپورٹ کی شکل میں سامنے آیا اس کا ابتدائیہ بھی اسی خطبہ میں لکھا گیا تھا۔

"ہندوستان میں ہر سیاسی نکتہ نگاہ کے لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ ہماری سرگرمیوں کی منزل مقصود آخر اور اول خود مختار ہندوستان ہے۔" (خطبہ صدارت)

ڈاکٹر انصاری ہندوستان کی آزادی اور خود مختاری کو صرف ہندوستان کی ترقی اور امن کی علامت ہی نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کی دور رس نگاہیں اُسے ایشیائی اقوام کی آزادی اور سالمیت اور بین الاقوامی امن و سلامتی کے لیے ایک مستحکم ضمانت تصور کرتی تھیں۔ وہ سیاست میں جہاں مشترکہ محاذ پر یقین رکھتے تھے وہاں ان کا یہ بھی ایمان تھا کہ قومیں اپنی آزادی اپنے نظم و ضبط، اپنی تنظیم اور اپنی تحریک کے ذریعہ ہی حاصل کر پاتی ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ نہ صرف ہندو مسلم اتحاد اور داخلی تنظیم پر زور دیتے رہے بلکہ اسے ملک کی سلامتی، آزادی اور قومی تحریک کا ایسا لازمی عنصر سمجھتے ہے جس کے لیے وسیع القلبی، حقیقت پسندی، سماجی مساوات اور عدم تشدد ہی بہتر ذرائع ہو سکتے تھے۔

ایک حقیقی قائد کی طرح ڈاکٹر انصاری کی سرگرمیاں صرف سیاست تک محدود نہیں تھیں وہ سیاست میں اخلاق اور سماجی اور اصلاحی کاموں اور عام انسانوں کی فلاح و بہبود کے امور کو ضروری سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سماجی زندگی کا کوئی پہلو ان کی نظر سے پوشیدہ نہیں رہا تھا۔ چھوت چھات کے مسائل، سوپلوں کے مصائب، مزدوروں کی پست حالی، کسانوں کی پسماندگی، نیم متوسط اور متوسط طبقہ کی خستہ حالی، معاشی زندگی کی کمزوریاں، طبقہ نسواں کے ساتھ ناانصافی، قومی صحت، وبائی امراض اور زچہ کی اموات، بچوں کی اہمیت، جرائم میں اضافہ اور قومی تعلیم کے مسائل وغیرہ سب پر ان کی یکساں نظر تھی۔ اپنے خطبہ صدارت مدراس میں بھی انھوں نے عوام اور حکومت کی توجہ اس طرف مبذول کرائی تھی۔ سرسید کی طرح ڈاکٹر انصاری بھی ان تمام معائب و مصائب کا سبب جہالت اور تعلیم کا فقدان سمجھتے تھے۔ اس لیے جامعہ سے ان کا تعلق محض رسمی نہیں تھا بلکہ نازک اوقات میں بھی وہ اس کی مدد کرتے رہے اور امیر جامعہ کی حیثیت سے ان کی رہنمائی اور سرپرستی جامعہ کو حاصل رہی جامعہ ملیہ سے ان کی جو توقعات وابستہ تھیں اس کا اظہار جامعہ کے ان مقاصد سے ہوتا ہے جس کے تعین میں وہ بھی شریک تھے۔

چنانچہ جامعہ کے مقاصد میں آج بھی کم و بیش یہی امور شامل ہیں۔ تعلیم کے بارے میں ڈاکٹر انصاری کا نقطہ نظر رجعت پسندانہ نہیں تھا۔ وہ تعلیم کو انسانی شخصیت و صلاحیت کے اظہار اور تجسس و تلاش نیز اعتماد کی افزائش کا ذریعہ بھی سمجھتے تھے اور سیاسی آزادی کی طرح تعلیم میں بھی شخصی آزادی کے قائل تھے جس کا اظہار اس پیغام سے ہوتا ہے جو بچوں کے رسالے پیام تعلیم کے یوم تاسیس ۱۹۲۷ء کے موقع پر بھیجا گیا تھا۔ جس کا اقتباس ذیل میں درج ہے:

"سالہا سال سے بچوں کی زندگی کا مطالعہ کرنے کے بعد میں تمہیں یہ نصیحت کرتا ہوں۔ اور مجھے یقین ہے کہ اگر تم اس پر کاربند ہوئے تو تمہارا ذہن پوری طرح نشو و نما پائے گا۔ اور تم بڑے ہو کر اچھے آدمی بنو گے تمہاری سیرت پر ایسے پردے نہیں پڑیں گے جو اس کی اصلیت کو چھپائیں۔ اور وہ نصیحت یہ ہے کہ تم اکیلے ہو یا اوروں کے ساتھ۔ اپنے کمرہ میں ہو یا مدرسہ میں یا کھیل کے میدان میں ہر جگہ اور ہمیشہ وہ کرو جو سچ مچ تمہارا من چاہتا ہے۔ اپنی اصلی دلی خواہشوں کو دباؤ مت۔ دوسروں سے ڈر کر یا دوسروں کو خوش کرنے کی خاطر دوسروں کی خواہ مخواہ نقالی نہ کرو۔ خود اپنی اپج سے کام کرو۔ ایسا کرو گے تو تمہارا ذہن تمہاری سیرت، تمہارا جسم سب کے سب وہ اچھی سے اچھی شکل اختیار کریں گے جس کے حاصل کرنے کی صلاحیت و قدرت ان میں رکھی گئی ہے۔" (حوالہ جامعہ کی کہانی)۔

اس آسان زبان میں ان کا مذکورہ پیغام دل کی گہرائیوں سے نکلے ہمہ تنیک جذبات اور خواہشات کی ترجمانی کرتا ہے۔ ڈاکٹر انصاری نے ۱۰ رمئی ۱۹۳۶ء کو داعی اجل کو لبیک کہا اگر وہ کچھ عرصہ اور زندہ رہ جاتے تو یقیناً ملک و قوم کی مزید بہتر خدمت انجام دے سکتے تھے۔

ڈاکٹر انصاری

ایک مثالی شخصیت

سلیم قدوائی

ہمارے ملک کی تحریکِ آزادی کے دوران جو ممتاز اور مایۂ ناز ہستیاں ہندستانی سیاست کے افق پر ابھر کر سامنے آئیں ان میں جناب ڈاکٹر مختار احمد انصاری کا نام خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ ڈاکٹر انصاری ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی ذات گوناگوں خصوصیات کا ایک دلکش امتزاج تھی۔ ان کی رنگارنگ شخصیت کے ہر پہلو پر ایک پوری کتاب تصنیف کی جاسکتی ہے۔ ایک تحقیقی مقالہ سپردِ قلم کیا جاسکتا ہے۔ ایک طرف وہ ایک چوٹی کے کامیاب ڈاکٹر، بلند پایہ سیاسی لیڈر، جنگِ آزادی کے صفِ اول کے قائد، خلافت کمیٹی اور انڈین نیشنل کانگریس کے اہم ستون اور باشعور مدبر تھے تو دوسری جانب وہ سادگی، خلوص، دردمندی، وضعداری، رواداری، فیاضی اور سخاوت کے پیکر تھے۔

آج جب ڈاکٹر انصاری کی صدسالہ یومِ پیدائش تقریبات منائی جارہی ہیں تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی عظیم اور قدآور شخصیت کی ایک جھلک قارئین کے سامنے پیش کردی جائے تاکہ نئی نسل کو معلوم ہوسکے کہ ہمارے ملک میں ایسے مثالی اور آدرش انسان پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے سیاست کو نجی اور ذاتی مفادات کی تکمیل کا وسیلہ بنانے کے بجائے ہمیشہ ایک صاف وشفاف اور بلند سطح سے برتا۔ زیرِ نظر مضمون میں ڈاکٹر انصاری کی ہمہ گیر شخصیت کے بعد دلکش پہلو اور دلآویز جلوے دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

ڈاکٹر انصاری کی سیاسی زندگی کا آغاز بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں ہوا جبکہ وہ بلقان میڈیکل مشن کے لیڈر کی حیثیت سے ہندستان کی سماجی اور سیاسی زندگی میں داخل ہوئے۔ ڈاکٹر انصاری کا یہ طبی مشن بڑی شان وشوکت سے رخصت ہوا اور طبی خدمات انجام دینے کے بعد سرخرو لوٹا۔ بہت جلد انھوں نے جنگِ آزادی کے ایک بے باک اور بے خوف مجاہد کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔ ۱۹۱۷ء میں ڈاکٹر انصاری نے دہلی میں ہوم رول لیگ کی شاخ قائم کی اور اس کے صدر منتخب ہوئے۔ اسی سال انڈین نیشنل کانگریس کی دہلی کی صوبائی شاخ کی صدارت بھی ان کے حصہ میں آئی۔ ۱۹۲۰ء میں خلافت کانفرنس کے اجلاس کی صدارت کی۔ ۱۹۲۳ء میں جب آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ایک خصوصی اجلاس دہلی میں منعقد ہوا تو اس اجلاس کی استقبالیہ کمیٹی کا صدر ڈاکٹر انصاری کو بنایا گیا۔ ڈاکٹر انصاری کو قومی تحریک کا سب سے بڑا اعزاز اسی وقت ملا جب وہ ۱۹۲۷ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے مدارس میں ہونے والے اجلاس کے صدر منتخب ہوئے۔ ۱۹۲۸ء کا سال ہندستان میں سائمن کمیشن کی مخالفت کا سال تھا۔ یہ کمیشن ہندوستان میں مزید آئینی اصلاحات کے امکانات کا جائزہ لینے کے لیے برطانوی حکومت نے مقرر کیا تھا۔ اس کمیشن کے تمام ممبر انگریز تھے اور ہندوستانیوں کو بالکل علیحدہ رکھا گیا تھا۔ اس پر ہندوستانیوں نے پرزور احتجاج کیا تھا اور ڈاکٹر انصاری کے دورِ صدارت میں ہی ایک کل ہند کمیٹی کا قیام عمل میں آیا جس کی سفارشات کو مرتب کرنے کا کام ایک چھوٹی کمیٹی کے سپرد کیا گیا تھا جس کے سربراہ پنڈت موتی لال نہرو تھے۔ بدقسمتی سے اس کمیٹی کی مرتب کردہ سفارشات پر تمام پارٹیاں متفق نہ ہوسکیں اور اس کے نتیجہ میں فرقہ وارانہ تلخی پیدا ہوئی وہ بے حد دوررس نتائج کی حامل ثابت ہوئی۔ ڈاکٹر انصاری نے اپنی زندگی کے بقیہ ۸ سال اس تلخی کو دور کرنے کی کوشش میں صرف کردیئے۔

ڈاکٹر انصاری اپنے بہت سے اوصاف اور خصوصیات میں منفرد تھے ان کی ہمہ گیر شخصیت کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ سادگی اور منکسرالمزاجی ان کی شخصیت کا اٹوٹ جز تھی۔ وہ امتیازات اور تفریق کے قائل نہ تھے۔ معمولی سیاسی کارکنوں کو ان سے بے پناہ خلوص، شفقت، ہمدردی اور اپنائیت ملتی تھی۔

ان کی رنگارنگ شخصیت کی دوسری نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ ایثار

نی کا مجسمہ تھے۔ انھوں نے بحیثیت ایک کامیاب ترین ڈاکٹر بے اندازہ
ت کمائی اور تمام کمائی قومی کاموں میں صرف کر دی۔ تحریک آزادی کے
ان انھوں نے جو بے غرض اور بے لوث خدمات انجام دیں اس کی بناء
، ہر طبقۂ خیال کے لوگوں میں وقعت و عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے
اور ان کو عوام کی بے پایاں محبت، خلوص و احترام حاصل ہوا۔

ڈاکٹر انصاری کی عظیم شخصیت کا تیسرا اہم پہلو یہ تھا کہ انھوں نے
ت خلق کو ہی اپنا نصب العین مانا تھا۔ ان کے سینہ میں وہ دل تھا جو
روں کی تکلیفوں اور دکھوں پر تڑپ اٹھتا تھا۔ وہ غریبوں اور ضرورتمندوں
سچے ہمدرد اور بہی خواہ تھے۔ وہ ان کی مدد بڑی خاموشی سے کرتے تھے۔
اس انداز سے کہ کسی کو مدد یا احسان نہ معلوم ہو۔

ڈاکٹر انصاری کی شخصیت کی سب سے نمایاں خصوصیت ان کی مہمان
زی تھی جسے وہ ہر لمحہ برتتے تھے اور اس حد تک اس کا خیال رکھتے تھے کہ
ـ اس سے سرشار ہو اٹھتے تھے "خیال خاطر احباب چاہیئے ہر دم" پر ان کا
ن کامل تھا۔ دہلی میں جتنے بھی سیاسی مشاورتی اجتماعات ہوتے تھے وہ سب
ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی نمبر ۱ دریا گنج ہی میں منعقد ہوتے تھے جس کا نام انھوں
دار السلام رکھا تھا۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے جو جلسے دہلی میں ہوتے تھے
کی میزبانی بھی انھیں کے حصے میں آئی تھی۔

ان کی سحر آفریں شخصیت کا ایک وصف یہ بھی تھا کہ روشن خیالی اور
وسیع النظری ان کے ذہن و دل میں رچ اور بس گئی تھی۔ تعصب یا تنگ نظری
کی ذات کو چھو بھی نہیں گئی تھی۔ وہ ہر شخص کو مذہب و ذات کے امتیاز
بغیر خوش رکھنے اور مطمئن کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے۔ ان کے
احوں، عقیدت مندوں اور دوستوں میں ہر مذہب اور فرقہ کے لوگ شامل تھے۔

ڈاکٹر انصاری فرقہ واریت کے سخت مخالف تھے اور قومی یکجہتی پر
ن کا مکمل اعتقاد تھا۔ وہ ہندو مسلم اتحاد کے زبردست علمبردار تھے۔ انھوں
نے اپنی تقریروں اور انتھک کوششوں سے وہ یکجہتی اور ہم آہنگی ملک
کے دو اہم فرقوں میں پیدا کر دی تھی جو پھر کبھی نہ ہو سکی۔ ان کی دوررس نگاہ
نے اس حقیقت کو بخوبی سمجھ لیا تھا کہ ہندو مسلم اتحاد کا مسئلہ اسی وقت طے
ہو سکتا ہے جب ملک کے دونوں اہم فرقوں کو کسی ایک رہنما پر مکمل
اعتماد ہو۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اقلیت کے کسی لیڈر کو تسلیم کرنا اکثریت
کے لیے مشکل تھا بہ مقابلہ اسکے کہ اقلیت اکثریت کے کسی لیڈر کو تسلیم کرے
چنانچہ اس حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے انھوں نے مہاتما گاندھی کو ملک
کا واحد اور سب سے بڑے رہنما تسلیم کرانے میں اپنی ہر ممکن کوشش
کی اور اس مقصد میں کامیاب ہوئے۔ ہندو مسلم اتحاد کے موضوع پر اپنے
خطبہ صدارت میں جو انھوں نے کانگریس کے صدر کی حیثیت سے ۱۹۲۷ء میں کہا تھا
اس کا درج ذیل اقتباس آج بھی اتنا ہی برمحل ہے جتنا ۵۴ سال قبل تھا۔ انھوں
نے اپنے تاریخی اور یادگار خطبے میں کہا تھا:۔

"ہندو مسلم مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش میں ہمیں علامت کو مرض
سمجھنے کی غلطی نہیں کرنی چاہیئے۔ دونوں فرقوں کے سیاسی
اور مذہبی اختلافات جو ان کے تعلقات میں کشیدگی کا باعث
بن رہے ہیں ایک زیادہ گہرے ٹکراؤ کی ظاہری شکل ہیں
اور یہ ٹکراؤ نہ تو ہندوستان ہی کے لیے مخصوص ہے اور نہ تاریخ
میں کوئی انوکھی چیز۔ بنیادی طور پر یہ دو مختلف کلچروں کا مسئلہ ہے
جو ایک دوسرے سے قوی رابطہ بھی رکھتے ہیں۔ سب سے اچھا
حل یہ ہے کہ ہر ایک کلچر کے زندہ رہنے کا حق تسلیم کر لیا جائے۔
باہمی رواداری اور ایک دوسرے کے احترام کا جذبہ پیدا کیا
جائے اور کلچرل میل جول کی حوصلہ افزائی اور ترقی کے لیے ایسے
قومی ادارے قائم کیے جائیں جہاں دونوں فرقوں کے نوجوان
ایک دوسرے سے ربط و ضبط قائم کریں اور ان کو دونوں
تہذیبوں کے بنیادی اصول اور نصب العین کے مطالعہ
کرنے اور سمجھنے کا موقع ملے۔ ایک تعلیم یافتہ ہندوستانی
کو حالات نے یورپی کلچر کا مطالعہ کرنے پر مجبور کر دیا ہے لیکن
وہ اپنے پڑوس میں رہنے والے ہم وطنوں کے کلچر سے کوئی
واقفیت نہیں رکھتا۔ اب وقت آگیا ہے کہ اس خطرناک
اجنبیت اور اس مہیب جہالت کو ختم کر دیا جائے۔"

ڈاکٹر انصاری نے کبھی کوئی فلسفہ طرازی نہیں کی۔ جمہوریت، سیکولرازم اور قومی یکجہتی پر تو صرف تقریریں ہی نہیں کیں بلکہ ان کا یقین عمل پر تھا۔ وہ کردار و عمل کے غازی تھے۔ ان کی شخصیت عمل و کردار کا ایک بلند اور روشن مینار تھی اور ان کا عمل ہی جمہوریت، سیکولرازم اور سوشلزم کی تعریف معین کرتا رہا۔ وہ بلاشبہ قوم پرستی اور سیکولرازم کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔

ڈاکٹر انصاری نے زندگی کے آخری لمحہ تک پوری تندہی، مستعدی، لگن اور وضعداری کے ساتھ ملک کی اٹوٹ ایکتا قائم رکھنے کے لیے جس طرح انتھک کام کیا اور مختلف قومی تحریکوں میں جس انداز میں حصہ لیا اور اس کی رہنمائی کی اس کی حیثیت یقیناً مثالی ہے۔ ان کی سادگی، دردمندی، نیکی اور شرافت، حکمت عملی اور متانت، تدبر و فراست، وضعداری اور سخاوت نے ڈاکٹر انصاری کو اپنے زمانے کی بڑی قدآور سیاسی اور سماجی شخصیات کے درمیان نمایاں حیثیت کا مالک بنا دیا تھا۔ یہ مقام انھیں بے لوث خدمات، عظیم قربانیوں اور مثالی کردار کے باعث حاصل ہوا تھا۔ ان کا جذبۂ قومیت، انسانیت دوستی اور مستحکم نظریات آنے والی نسلوں کے لیے ہمیشہ مشعل راہ بنے رہیں گے۔ ان کا صد سالہ جشن پیدائش ہمارے لیے سرچشمۂ تحریک بن سکتا ہے۔ اس موقع پر تمام ہندوستانیوں کو عہد کرنا چاہیئے کہ وہ ڈاکٹر انصاری کے بتائے ہوئے راستہ پر چل کر اپنے ملک کو ہمہ جہتی ترقی کی بلندیوں تک پہونچانے کے لیے ہمیشہ سرگرم رہیں گے۔

عبدالقوی دسنوی

ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور علامہ اقبال

ڈاکٹر مختار احمد انصاری مشہور سیاسی رہنما، قومی کارکن۔ ہمدرد قوم و ملت، مشہور و معروف حکیم نابینا (حکیم عبدالوہاب انصاری) کے چھوٹے بھائی تھے جن کا ذکر مکتوبات اقبال میں نذیر نیازی اور اقبال کے خطوط میں بار بار آیا ہے۔ ڈاکٹر انصاری سے بھی علامہ اقبال اپنے علاج کے سلسلے میں مشورہ لیا کرتے تھے۔ یہ عجیب لطف کی بات ہے کہ ڈاکٹر انصاری بہت پہلے سے ہی نواب بھوپال کے بھی معالج تھے، محمد غالب منیجر ڈاکٹر انصاری کے مکتوب بنام مولانا عبدالباری فرنگی محل ۹ر جنوری ۱۹۱۷ء سے اس کا پتہ چلتا ہے کہ شاید وہ ۱۹۱۷ء کے پہلے سے ہی نواب زادہ حمید اللہ خاں کے ذاتی معالج رہ چکے تھے، محمد غالب رقمطراز ہیں:

"...... فی الحال ڈاکٹر صاحب بسلسلۂ علاج جناب صاحبزادہ حمید اللہ خاں صاحب بھوپال تشریف لے گئے ہیں اور نہیں معلوم کب واپس ہوں[1]"

ڈاکٹر انصاری کا تعلق علامہ اقبال سے کب سے ہوا اس کا پتہ تو نہیں چلتا لیکن اقبال کے فروری مارچ ۱۹۱۹ء کے خط بنام گرامی سے اس کا علم ہوتا ہے کہ فروری مارچ ۱۹۱۹ء سے یا اس سے قبل ہی سے تعلقات قائم ہو چکے تھے۔ علامہ اقبال لکھتے ہیں:

"میں ابھی تک علیل ہوں، کسی قدر افاقہ ضرور ہے — الحمد للہ علی ذالک دو چار روز میں دہلی جانے کا قصد ہے کہ حکیم صاحب اور ڈاکٹر انصاری سے مشورہ کروں[2]"

۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد پڑی۔ جس کے پہلے شیخ الجامعہ مولانا محمد علی ہوئے۔ انھوں نے ہی فونڈیشن کمیٹی کے جلسہ (۲۲ر نومبر ۱۹۲۰ء) میں ایک تجویز پیش کی کہ علامہ اقبال سے درخواست کی جائے کہ وہ شیخ الجامعہ کا عہدہ قبول کرلیں۔ گاندھی جی سے بھی درخواست کی گئی کہ وہ علامہ اقبال کو اس سلسلے میں خط لکھیں اور اس عہدہ کو قبول کرنے کے لیے درخواست کریں۔ چنانچہ گاندھی جی نے نومبر ۱۹۲۰ء کے آخری ہفتہ میں حسب ذیل خط علامہ اقبال کے نام تحریر کیا:

ڈیر ڈاکٹر اقبال!

مسلم نیشنل یونیورسٹی آپ کو آواز دے رہی ہے اگر آپ اس کا چارج لے سکیں تو مجھے یقین ہے کہ وہ آپ کی مہذب رہنمائی میں ترقی کر سکے گی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری اور بلاشبہ علی برادران کی بھی یہی خواہش ہے، میری خواہش ہے کہ آپ قبولیابی کا کوئی راستہ نکال سکیں۔ نئی بیداری کے تقاضوں کے بقدر آپ کے اخراجات کی کفالت کی جا سکے گی۔

براہ کرم پنڈت نہرو کی معرفت الٰہ آباد کے پتے پر جواب دیجیے۔[1]

آپ کا

ایم۔ کے۔ گاندھی

جس کے جواب میں معذرت کرتے ہوئے علامہ اقبال نے ۲۹ر نومبر ۱۹۲۰ء کو لاہور سے تحریر کیا:

"..... مجھے بے حد افسوس ہے کہ بعض وجوہ سے جن کا ذکر اس وقت کچھ ضروری نہیں، ان حضرات کی آواز پر جن کی میرے دل میں بڑی عزت ہے لبیک کہنا میرے لیے مشکل ہے .....[2]"

---

[1] خطوط نمبر حصہ دوم نقوش لاہور ص ۱۰۱

[2] مکاتیب اقبال بنام گرامی ص ۱۵۶

[1] اقبال اور جامعہ از عبداللطیف اعظمی (اقبال کی یاد میں) جامعہ دہلی جنوری مارچ ۱۹۷۸ء ص

[2] " " " " " ص

ان تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ اقبال کے ڈاکٹر انصاری اور جامعہ ملیہ کے دوسرے حضرات جن کا تعلق اس کے بانیوں سے ہی تھا بڑے اچھے تعلقات تھے جو کبھی نوٹتے نہیں، عبداللطیف اعظمی صاحب نے یہ بات صحیح تحریر کی ہے کہ :

" باوجود اس کے کہ جامعہ کا قیام ایک مخصوص سیاست کا نتیجہ تھا اور اقبال کے سیاسی خیالات ان لوگوں کے خیالات سے مختلف تھے جن کا جامعہ کے بانیوں میں شمار ہوتا ہے۔ مثلاً گاندھی جی، مولانا محمد علی، مولانا آزاد اور ڈاکٹر انصاری وغیرہ مگر اس کے باوجود دونوں کے تعلقات بڑے خوشگوار تھے اور خوشی کی بات ہے کہ آخر وقت تک اس میں کوئی ناخوشگواری پیدا نہیں ہوئی "[1]

چنانچہ ۲۸ر دسمبر ۱۹۲۶ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کی امداد کے لیے جب اپیل کی گئی تو اس میں ذوالفقار علی خاں، آفتاب احمد خاں، ابوالکلام آزاد، اجمل خاں کے علاوہ پہلا نام محمد اقبال کا اور آخری نام ڈاکٹر مختار احمد انصاری کا بھی تھا[2]

۱۰ر مئی ۱۹۳۱ء کو نواب حمید اللہ خاں والیِ بھوپال نے جداگانہ انتخاب اور مخلوط انتخاب کے حامی مسلمان رہناؤں کی ایک کانفرنس بلائی تھی۔ جس میں سر محمد شفیع، مولانا شوکت علی، جناب تصدق احمد شروانی، شعیب قریشی وغیرہ کے علاوہ ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور علامہ اقبال بھی شریک ہوئے تھے۔ جہاں کھل کر تبادلہ خیال ہوا۔ مختلف فارمولوں کی جانچ پرکھ ہوئی ..."[3]

اور ۱۳ر مئی ۱۹۳۱ء کو بھوپال سے واپسی پر دہلی ریلوے اسٹیشن پر نمائندہ سٹیٹسمین سے ایک ملاقات کے دوران علامہ نے کہا :

" بھوپال کانفرنس کے متعلق اخبارات میں جو اطلاعات شائع ہوئی ہیں وہ اصول اساسی کے اعتبار سے درست ہیں۔ لیکن ہم یہ ظاہر کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ بیان صحیح نہیں کہ ہم دونوں مولانا شوکت علی اور سر محمد شفیع کے ساتھ مل کر جداگانہ نیابت کے مؤید رہے اور ڈاکٹر انصاری اور مسٹر تصدق احمد خاں شروانی مخلوط نیابت کی حمایت پر اڑے رہے۔ ہم چاروں دہلی کی قراردادوں کے مؤید تھے لیکن ہم مختلف جماعتوں میں منقسم ہو کر متضاد مقاصد کی خاطر جد و جہد نہیں کر رہے تھے۔ جب واقعات کا سامنا ہوا تو ہمیں معلوم ہوا کہ دونوں فریقوں میں بہت تھوڑا اختلاف رائے ہے۔ ہمیں یقین ہے، جس طریقہ پر یہ کام شروع ہوا ہے اس طرح یہ خفیف اختلاف بھی جاتا رہے گا۔"[1]

پھر ۱۵ر مئی ۱۹۳۱ء کو بھوپال کانفرنس کے فیصلوں سے متعلق بھی علامہ نے بیان دیا :

" شملہ سے ایسوسی ایٹڈ پریس کا ایک پیغام بدیں مضمون شائع ہوا ہے کہ ڈاکٹر انصاری اور مسٹر شعیب قریشی شملہ پہنچتے ہی گاندھی جی کے مکان پر گئے اور انھیں اطلاع دی کہ ہزہائی نس والیِ بھوپال نے جن اصحاب کو مدعو کیا تھا۔ انھوں نے ایک عارضی میثاق مرتب کر لیا ہے۔ اس پیغام میں یہ بھی لکھا ہے کہ اس میثاق میں جو فارمولا پیش کیا گیا ہے اس میں جداگانہ اور مخلوط انتخاب والوں کا امتزاج پایا جاتا ہے اور تقریباً دس سال تک نافذ رہے گا۔ اور اس کے بعد ہر جگہ مخلوط انتخاب جاری کر دیا جائے گا۔ چونکہ میں بھی مدعو تھا، اس لئے میں یہ ظاہر کر دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اگر ڈاکٹر انصاری اور مسٹر شعیب نے بھوپال کانفرنس کے غیر مباحث کو بمنزلہ عارضی میثاق پیش کیا ہے تو انھوں نے یقیناً نہ صرف ان لوگوں کے ساتھ جن کے ساتھ انھوں نے گفت و شنید کی بلکہ تمام مسلم قوم کے ساتھ برائی کی ..."[2]

اکتوبر ۱۹۳۲ء میں ڈاکٹر انصاری اور جناب تصدق احمد خاں شروانی نے علامہ اقبال کی خدمت میں تار بھیجا کہ "جس طرح اچھوتوں کی شکایات دور ہو گئی ہیں۔ اسی طرح ہندو مسلم اور سکھ کے سوال کو حل کرنے کے لئے ایک کانفرنس منعقد کی جائے" جس کا جواب علامہ اقبال نے حسب ذیل دیا تھا :

" اس تار سے ظاہر ہے کہ ڈاکٹر انصاری اور مسٹر شروانی یہ چاہتے ہیں کہ ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کی ایک کانفرنس فرقہ وارانہ سوال کو حل کرنے کے لئے منعقد کی جائے نہ کہ مسلمان لیڈروں کی کانفرنس۔ جس قسم کی کانفرنس ڈاکٹر انصاری اور مسٹر شروانی چاہتے ہیں اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ اکثریت کی طرف سے ہمارے سامنے مفاہمت کی معین تجاویز پیش کی جائیں۔ ان حالات کے پیش نظر میں مولانا شوکت علی، مسٹر عبدالمجید سندھی اور دیگر اصحاب سے جو کانفرنس میں آنے والے ہیں دوبارہ یہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ کانفرنس کی تجویز اس وقت تک ملتوی کر دیں جب تک ہندو رہناؤں کی طرف سے ہمارے سامنے خاص تجاویز پیش نہ کی جائیں "[3]

ڈاکٹر انصاری کی بڑی خواہش تھی کہ غازی رؤف بے جو جنگ طرابلس

[1] اقبال ایک مطالعہ از عبداللطیف اعظمی (اقبال کی یاد میں) جامعہ دہلی جنوری مارچ ۱۹۷۸ء ص ۱۴
[2] گفتار اقبال مرتبہ محمد رفیق افضل ص ۱۱۹
[3] سرگزشت اقبال از ڈاکٹر عبدالسلام خورشید ص ۳۲۸

[1] گفتار اقبال مرتبہ محمد رفیق افضل ص ۱۱۹
[2] " " " " ص ۱۲۰
[3] " " " " ص ۱۶۱

اور بلقان کے مشہور و معروف مجاہد تھے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تشریف لائیں اور توسیعی خطبہ دیں۔ چنانچہ غازی رؤف بے نے مارچ ۱۹۳۳ء میں دہلی آنے کی منظوری دے دی تھی۔ طے یہ ہوا کہ وہ جامعہ میں چھ لیکچر دیں گے۔ جن میں کم سے کم دو کی صدارت علامہ اقبال کریں گے۔ شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے علامہ اقبال کو اس سلسلے میں ایک خط لکھا چونکہ ڈاکٹر انصاری سے بھی علامہ کے بڑے اچھے تعلقات تھے اس لئے انھوں نے بھی علامہ کو دہلی آنے کی دعوت دی جس کا اظہار علامہ نے اپنے مکتوب بنام خواجہ عبدالوحید میں کیا ہے جن کی خواہش تھی کہ غازی رؤف بے جامعہ ملیہ میں لیکچروں کا سلسلہ ختم کر کے لاہور تشریف لائیں اور وہاں بھی لیکچر دیں۔ مکتوب اقبال فروری ۱۹۳۳ء ملاحظہ کیجئے :

"جناب خواجہ صاحب

ابھی تک جواب نہیں (آیا) مگر امید ہے کہ آج شام تک آجائے گا۔ اور اگر انھوں نے تار کی جگہ خط لکھا تو کل صبح جواب ملے گا۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر انصاری کا تار ابھی آیا ہے کہ دہلی آکر رؤف پاشا کے لیکچر کی صدارت کروں۔ یہ لیکچر ۱۴، ۸ / مارچ کو ہوں گے، میں ان کے لیکچر کی صدارت کے لیے جاؤں گا مگر واپس آنے کی جواب آنے کے بعد تاریخ مقرر کر سکوں گا آپ آج شام کو پھر دریافت کریں تو شاید میں کوئی مستقل جواب دے سکوں۔"[1]

علامہ اقبال کے مکتوب بنام نذیر نیازی ۸ / مارچ ۱۹۳۳ء سے اس بات کا علم ہوتا ہے کہ علامہ صدارت کی تاریخ میں تبدیلی چاہتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں :

"آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ اگر تبدیلی ناممکن ہے تو بڑی مشکل ہو گی۔ آپ کوشش کریں کہ آخری لیکچر کا وقت میری صدارت کے لیے ہو اور آخری لیکچر ۱۸ کو ہو۔ اگر ناممکن ہو تو میں ۱۹ / مارچ کی شام کو یہاں سے روانہ ہو کر ۲۰ کی صبح کو دہلی پہنچ جاؤں گا۔ لیکن اگر ڈاکٹر انصاری یہ مان جائیں کہ آخری لیکچر ۱۸ کو ہو تو مجھے تار دے دیجئے۔ باقی خیریت ہے۔ ۲۰ / مارچ کی صبح (اگر ایسی صورت حال ہو) آپ مجھے اسٹیشن پر ملیں۔"[2]

ڈاکٹر اقبال کی جلسے کی صدارت کے لیے رضامندی پر ڈاکٹر ذاکر حسین بہت خوش ہوئے لیکن چونکہ پروگرام کا اعلان ہو چکا تھا اس لیے طے ہوا کہ علامہ سے ۱۸ / مارچ کے لیے درخواست کی جائے۔ چنانچہ درخواست کی گئی جسے علامہ نے منظور کر لی۔ جس کا شکریہ ڈاکٹر انصاری نے خط لکھ کر ادا کیا اور نذیر نیازی صاحب کو حکم دیا کہ لاہور جا کر علامہ کو اپنے ساتھ لائیں، نذیر نیازی صاحب تحریر کرتے ہیں :

"اس اثنا میں ذاکر صاحب مرحوم (ڈاکٹر انصاری) اپنی طرف سے توشکریہ کا خط لکھ ہی چکے تھے۔ لیکن ۱۵ / مارچ کی شام کو حکم ہوا اور ذاکر صاحب نے بھی اصرار کیا کہ میں لاہور چلا جاؤں اور ۱۸ کی صبح کو حضرت علامہ کو ساتھ لیے واپس آجاؤں۔ لہذا ۱۷ کی صبح میں لاہور پہنچا۔ حضرت علامہ ایک طرح منتظر تھے ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو اول ڈاکٹر انصاری مرحوم اور غازی موصوف کی خیریت مزاج دریافت کرتے رہے پھر احباب جامعہ بالخصوص ذاکر صاحب، عابد صاحب اور مجیب صاحب کا پوچھا۔ باتوں باتوں میں ....[1]

پروگرام کے مطابق علامہ اقبال نذیر نیازی کے ساتھ دہلی پہنچے خیر مقدم کے سلسلے میں نذیر نیازی صاحب نے لکھا ہے کہ :

صبح دہلی پہنچے تو ریلوے سٹیشن پر احباب جامعہ کے علاوہ بعض اور نیازمند بھی خیر مقدم کے لیے موجود تھے۔ حضرت علامہ اسٹیشن سے سیدھے "دارالسلام"[2] تشریف لے گئے"[3]

خواجہ حسن نظامی اپنے ہفتہ وار روزنامچہ دہلی مورخہ ۱۶ / مارچ ۱۹۳۳ء میں لکھتے ہیں :

۱۳[4] / مارچ ۱۹۳۳ء

ڈاکٹر سر محمد اقبال : بارہ بجے نواب بہادر یار جنگ کے ساتھ ڈاکٹر سر محمد اقبال سے ملنے گیا جو ڈاکٹر انصاری صاحب کے مکان پر مقیم ہیں۔ نواب بہادر یار جنگ ان کے بہت ہی مداح اور معتقد ہیں میں نے نواب صاحب کا ڈاکٹر سر محمد اقبال سے ان الفاظ میں تعارف کرایا...."[5]

علامہ اقبال شام کے وقت، ڈاکٹر ذاکر حسین، غازی رؤف پاشا اور ڈاکٹر انصاری کے ساتھ جامعہ تشریف لائے، جہاں محمد علی ہال میں جلسہ ہوا۔ ڈاکٹر انصاری نے جلسہ کی کارروائی شروع کرتے ہوئے علامہ اقبال کا شکریہ بھی ادا کیا اور ان سے صدارت کی درخواست کی۔ علامہ اقبال نے بھی :

"... چند کلمات میں ڈاکٹر صاحب مرحوم اور غازی موصوف کا شکریہ ادا کیا اور پھر ڈاکٹر صاحب کو مبارکباد دی کہ ان کی کوششوں سے عالم اسلام کے ایک فرزند جلیل سے ارض ہند کو اپنے ورود سے سرفراز فرمایا، اور اس طرح باہم تبادلہ خیالات کا موقعہ پیدا ہوا۔

---

۱ انوار اقبال مرتبہ بشیر احمد ڈار ص ۲۱۰ ۲ مکتوبات اقبال از نذیر نیازی ص ۹۵

۱ مکتوبات اقبال از نذیر نیازی ص ۹۶
۲ دریا گنج میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری کا دولت کدہ
۳ مکتوبات اقبال از نذیر نیازی ص ۹۷
۴ ۱۳ / مارچ یا ۱۸ / مارچ
۵ اوراق گم گشتہ۔ رحیم بخش شاہین ص ۲۷

پھر غازی موصوف سے فرمایا کہ حاضرین جلسے سے خطاب کریں۔[1]

چنانچہ غازی رؤف پاشا نے اپنا مقالہ "وطنیت اور اتحاد اسلامی" پڑھا۔ جلسہ بہت کامیاب رہا۔ علامہ نے صدارتی تقریر کی اور کلام سنایا۔ چونکہ علامہ کو ایک اور جلسے کی صدارت کرنی تھی اس لیے:

".. دو چار روز ڈاکٹر انصاری کے یہاں خوب چہل پہل رہی۔ دن بھر گفت گو کا سلسلہ جاری رہتا اور اس میں غازی موصوف ڈاکٹر اور حضرت علامہ کے علاوہ حاضرین مجلس بھی خوب خوب حصہ لیتے ....."[2]

غالباً ۲۱ مارچ ۱۹۳۳ء کو علامہ اقبال لاہور واپس چلے گئے۔

۱۹۳۴ء کے فروری کے وسط میں ڈاکٹر انصاری نے بہجت وہبی جو ان کے رفیق درس رہ چکے تھے جامعہ میں توسیعی خطبات کے لیے تیار کر لیا تھا جس کی صدارت کے لیے انھوں نے علامہ سے درخواست کی تھی۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر ذاکر حسین کے کہنے پر نذیر نیازی صاحب نے بھی ڈاکٹر اقبال کو خط لکھا جس کے جواب میں علامہ نے لکھا:

".... میری طبیعت کئی دنوں سے علیل ہے اس لیے دہلی میں ڈاکٹر وہبی صاحب کے لکچر کی صدارت کے لیے نہیں جا سکوں گا۔ ڈاکٹر انصاری صاحب کا تار بھی آیا تھا مگر میں نے جواب لکھ دیا کہ میں بوجہ علالت دہلی آنے سے معذور ہوں۔ ڈاکٹر ذاکر صاحب کا خط بھی اسی مطلب کا آیا ہے۔ میں علیحدہ ان کو نہیں لکھ سکا۔"[3]

جنوری ۱۹۳۵ء میں خالدہ ادیب خانم مشہور ترکی ادیبہ ڈاکٹر انصاری کی دعوت پر دہلی تشریف لائیں تاکہ توسیعی خطبہ دیں۔ تو علامہ سے ایک خطبہ کی صدارت کے لیے ڈاکٹر انصاری نے پھر درخواست کی۔ علامہ نے معذوری ظاہر کی۔ اور نذیر نیازی صاحب کو ۲۰ جنوری ۱۹۳۵ء کو تحریر کیا:

"... ڈاکٹر انصاری کا خط آیا تھا وہ خالدہ ادیب خانم کے ایک لکچر میں صدارت کے لیے بلاتے ہیں افسوس ہے کہ میں اپنی آواز کی وجہ سے لاچار ہوں ورنہ حاضر ہوتا اور خالدہ ادیب خانم کے متعلق کوئی مختصر تقریر بھی کرتا۔"[4]

لیکن یہ ڈاکٹر انصاری کی شخصیت تھی کہ عین وقت پر علامہ اقبال دہلی آئے قنصل خانہ میں قیام کیا۔ اور جلسہ کی صدارت کی۔

پھر ۱۷ فروری ۱۹۳۵ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی امداد کے لیے ڈاکٹر انصاری نے اپیل کی تو علامہ اقبال نے ۲۵ فروری ۱۹۳۵ء کو اس اپیل کی پرزور تائید ان الفاظ میں کی:

"مجھے یہ سن کر نہایت خوشی ہوئی کہ جامعہ ملیہ کی عمارت کا سنگ بنیاد نصب ہونے والا ہے میں ان تعلیمی مجاہدوں سے جنھوں نے مسلمانوں کی تعلیم کی اصلاح و ترقی کا علم بلند کیا ہے۔ ابتدا سے دلی ہمدردی رکھتا ہوں۔ چنانچہ ۱۹۲۶ء اور ۱۹۲۸ء میں جو اپیلیں جامعہ کی امداد کے لیے شائع ہوئی تھیں ان پر میں نے بھی دستخط کیے تھے۔ پچھلے چند سال کے عرصے میں مجھے اکثر دہلی جانے کا اتفاق ہوا اور میرے تعلقات اس درسگاہ سے اور بھی مستحکم ہو گئے۔ اس کے کارکنوں کے ایثار اور خلوص اور جوش عمل نے میرے دل پر گہرا اثر ڈالا۔ مالی پریشانی اور بے سروسامانی کے باوجود ان لوگوں نے جو علمی اور تعلیمی خدمت انجام دی ہے اس سے امید ہوتی ہے کہ اگر انھیں معمولی مصارف کی طرف سے اطمینان ہو اور رہنے کے لیے مکان مل جائیں تو یہ حقیقت میں ہندوستان کی تعلیمی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیں گے۔ اور مسلمانوں کی زندگی میں ایک نئی روح پھونک دیں گے۔ میں اپنے دوست ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری کی اپیل کی پرزور تائید کرتا ہوں اور ہر مسلمان سے درخواست کرتا ہوں کہ جامعہ کی عمارت کے فنڈ میں حسب حیثیت مدد دیں۔"[1]

۱۵ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو علامہ اقبال نذیر نیازی صاحب کو اطلاع دیتے ہیں کہ ان کا علاج کے لیے وائنا جانے کا خیال ہے جس کے لیے ڈاکٹر انصاری نے بھی مدد کا وعدہ کیا ہے:

"آپ کے خط کا انتظار تھا۔ وائنا (آسٹریا) جانے کا خیال ہے۔ ڈاکٹر انصاری صاحب سے خط و کتابت کر رہا ہوں۔ انھوں نے نہایت مہربانی سے مدد کا وعدہ کیا ہے، اگر گیا تو فروری یا اپریل ۱۹۳۶ء میں جاؤں گا۔"[2]

پھر ۱۸ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو ڈاکٹر عبدالباسط صاحب کو وائنا جانے کی اطلاع دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"آپ کا والا نامہ کچھ دن ہوئے مل گیا تھا، جس کے لیے سپاس گزار ہوں، خدا کے فضل و کرم سے میری صحت اچھی ہے اور آواز میں بھی امپروومنٹ ہے، بلغم بھی اب بہت کم ہو گئی ہے صبح کے وقت البتہ آتی ہے۔ میں نے ڈاکٹر انصاری اور سید راس مسعود سے خط و کتابت کی ہے اور دونوں حضرات نے وائنا جانے کے خیال کی تائید کی ہے، مگر جانے کے متعلق آخری فیصلہ کرنے سے پہلے چند باتوں کا جاننا ضروری ہے۔ ڈاکٹر انصاری نے مجھے ڈاکٹر مظفر علی صاحب کا پتہ بھیج دیا ہے اور خود بھی ان کو خط لکھا ہے ....."[3]

(بقیہ صفحہ ۱۴ پر)

---

[1] مکتوبات اقبال از نذیر نیازی ص ۹۸ [2] مکتوبات اقبال از نذیر نیازی ص ۱۰۱
[3] " " " ص ۱۲۶ [4] " " " ص ۱۲۹

[1] گفتار اقبال از محمد رفیق افضل ص ۱۹۰ [2] مکتوبات اقبال از نذیر نیازی ص ۲۹۹
[3] خطوط اقبال مرتبہ رفیع الدین ہاشمی ص ۲۴۴

امیرِ قافلۂ انقلاب

ڈاکٹر مختار الدین انصاری کے صد سالہ
یوم پیدائش پہ خراجِ عقیدت

جاوید وششٹ

امیرِ قافلۂ انقلاب انصاری!
بھلا سکے گا نہ تجھ کو دیارِ گنگ و جمن

وہی خلوص کی تابش، وہی وفا کی چمک
تری حیات تھی ہندوستان کا درپن

دیارِ دل کی فضاؤں میں اک اندھیرا تھا
ترے جنوں سے ہوئی صبحِ عاشقی روشن

دھواں اٹھا تھا جو بلقان کی فضاؤں سے
حیاتِ شرق پہ جو چھا گیا تھا بن کے گہن

برس رہے تھے شرر جب زمین ترکی پر
لہو میں ڈوب گیا تھا جب ایشیا کا چمن

تو دل ترا تڑپ اٹھا تھا تیرے سینے میں
کہ دل ترا تھا محبت کا چارہ ساز کہن

دیارِ ترک میں پہنچا برائے چارہ گری
کہ تیرے دل میں تھی ہندوستاں کے دل کی لگن

کفن بدوش رہا تیرا عزمِ جانبازی
جنوں پسند رہی زندگیِ دار و رسن

وہ ایکتا کا زمانہ، وہ اتفاق کا دور
وہ تیرے پیار کی آواز، وہ دلوں کا ملن

وہ صدرِ انجمنِ حریت ترا ہونا
وہ تیری ذات کا بننا صد افتخارِ وطن

ہر ایک گوشۂ ہندوستاں چمک اٹھا
کہاں کہاں نہیں پہنچی ترے جنوں کی کرن

پسند کی نہ غلامی کی مسندِ عشرت
قبول کر لی مسرت کے ساتھ قیدِ محن

اگرچہ تیشۂ زنداں سے چور چور تھا دل
مگر ثبات کے ماتھے پہ تھی نہ کوئی شکن

ہمالیہ ترے عزمِ بلند کا عنواں
ترے لہو کی روانی کا نام گنگ و جمن

اگرچہ دیکھ سکا تو نہ صبحِ آزادی
مگر پہنا گیا ظلمِ شہنشہی کو کفن

بنا ہوا ہے زیارت گہِ خواص و عوام
زمینِ دہلیِ مرحوم پر ترا مدفن

خدا کرے کہ زمانے میں عام ہو جائے
ترا جنوں، ترا عزمِ حیات، تیری لگن

صبا کو تیری روش اور تیز گام کرے
ملے نسیمِ بہارِ چمن کو تیرا چلن

امیرِ قافلۂ انقلاب انصاری!
بھلا سکے گا نہ تجھ کو دیارِ گنگ و جمن

قطعات

مہدی پرتاپگڈھی

جلائی تو نے ایسے وقت شمعِ آزادی
کہ جب ذکرِ ضیا پاشی چمن میں جرم ٹھہرا تھا
بشارت دی نئے سورج کی تو نے ایسے عالم میں
فضائے ہند میں جس وقت اندھیرا ہی اندھیرا تھا

حصولِ روشنی کی جو نئی جہتیں دکھائی تھیں
انھیں سمتوں سے آزادی کا سورج جگمگا اٹھا
اندھیرے فکرِ تازہ کو نگلتے ہی رہے لیکن
نکالیں تو نے وہ راہیں سویرا مسکرا اٹھا

مقدر میں جب آزادی کے متوالوں کے زنداں تھا
جوانانِ چمن نے تجھ سے مر جانے کا فن سیکھا
کوئی ذہنیتِ بیمار کب تجھ کو جھکا پائی
تجھی سے ہم نے طوفاں سے گزر جانے کا فن سیکھا

پرستارانِ شب نے قید کر رکھا تھا سورج
قلم کر دیتے تھے جب جب کوئی ضو سر اٹھاتی
مگر تیری قیادت نے وہ جرأت دی چراغوں
کہ جن کے سامنے شب کی حکومت تھرتھراتی

کرشمہ تھا تیری فہم و فراست، حسنِ حکمت کا
کہ ساری قوم کو بخشا تھا جس نے عزمِ بیداری
بالآخر ہند میں بھی ایک عہدِ خوشگوار آیا
تری مرہونِ منت ہے طلوعِ صبحِ آزادی

خطبۂ علی انصاری

"ہندستان کو اپنے پیدائشی حق سے محروم نہیں کیا جاسکتا"

آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس (۱۹۱۸ء) دہلی کے خطبۂ صدارت سے

اقتباس

بعض لوگ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی وہ اخوتِ اسلامی جو ان کے اور تمام مسلمانوں کے درمیان خواہ وہ دنیا کے کسی حصے میں رہتے ہوں رشتہ محبت قائم کرتی ہے درحقیقت اس وطن پرستی کے خلاف ہے جس کا تعلق صرف ہندوستان سے ہے۔ میں نے بعض دوستوں کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ "ہندستان کا مسلمان جزیرہ نمائے گیلی پولی کی ایک اینچ زمین کے بدلے سارے ہندوستان کو قربان کردینے کے لیے تیار ہے۔" حضرات! اس قسم کی باتوں سے جن کی تصدیق واقعات ہرگز نہیں کرتے، حقائق کے چہرے کو مسخ کیا جاتا ہے ہندوستان کے ہر معرکے میں ہم اپنے ہندو بھائیوں کے ساتھ ایک ہی صف میں شانہ بشانہ رہے ہیں۔ ہمارا سیاسی مطمح نظر اب اہل ہنود کی سطح سے دور نہیں۔ ہندو مسلمانوں کا وہ سمجھوتہ جس نے لکھنؤ میں عملی شکل اختیار کی تھی ہر سال تقویت حاصل کرتا جاتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ جتنا زمانہ گزرتا جائے گا۔ ہمارے باہمی مراسم بہتر ہوتے جائیں گے۔ اور اگر اس وقت افتراق کے کچھ اسباب موجود ہیں تو وہ بھی رفع ہوجائیں گے۔ میرا یہ غیر متزلزل عقیدہ ہے کہ ایک سچا مسلمان ہمیشہ سچا وطن پرست ہوگا۔ اگر ہم مسلمانان ترکی و ایران کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں تو ساتھ ہی ہمارے طرز عمل نے ثابت کردیا ہے کہ ہم اپنے ان ہم وطنوں کے حقوق کی حمایت کرنے میں جو غیر ممالک میں مقیم ہیں کسی سے کم نہیں۔ وہ حق پرست یعنی احمد محمد کچالیا ہندوستان ہی کا ایک مسلمان تھا۔ جو جنوبی افریقہ میں عرصہ تک لڑتا رہا اور آخر تک ہمارے حقوق کے اس شیر دل مسلم بدادر مسٹر گاندھی کی جانشینی کا پورا حق ادا کرتا رہا۔ لیکن جہاں ایک مسلمان دونوں قوموں کے متفقہ حقوق کے لیے لڑنے کو تیار ہے وہاں وہ اس ملک میں بھی اپنی سیاسی حالت کو برقرار رکھنے کا عزم مصمم کرچکا ہے اور نہایت استقلال کے ساتھ اپنے تمام جائز حقوق کی حفاظت کرے گا۔

حق انتخاب حکومت

اس صورت حالات کا ذکر کرنے سے پہلے جو اس عالمگیر جنگ نے پیدا کردی ہے۔ اپنی تقریر کو ختم کردینا میرے لیے ناممکن ہے۔ خون کے ان دریاؤں سے جو اس خوفناک جنگ نے بہائے ہیں چند فیصلہ کن اصول پیدا ہوئے ہیں جن پر ایک نئی اور بہتر دنیا کی بنیادیں رکھی جائیں گی۔

سب سے پہلے جمہوریت امریکہ کے پریذیڈنٹ نے ان اصولوں کو پیش کیا اور اب دنیا کی تمام سربرآوردہ قوموں نے ان کو قبول کرلیا ہے۔ یہ اصول اکثر دہرائے جاچکے ہیں اور بار بار ان کی تشریح و توضیح کی جاچکی ہے تاآنکہ اب لوگوں کو یقین کامل ہوگیا ہے کہ ان کا نفاذ تمام دنیا پر یکساں ہوگا۔ اور وہ کسی ملک یا براعظم کی جغرافیائی حدود کے اندر محدود نہ رہیں گے اور نہ ان کی راہ میں نسل، رنگ اور قومیت کے تعصبات حائل ہوں گے۔ میرے نزدیک تو صرف ایک ہی اصول کارہے جس کے اندر تمام نسل انسانی کی جائز خواہشات مرکوز ہیں۔ اور حضرات! یہ اصول کار حق انتخاب حکومت ہے۔

اگر ہر بڑی اور چھوٹی، کمزور اور طاقت ور، آزاد اور محکوم، قوم کو کامل اختیار تمیزی دیا جائے کہ وہ جس طرح چاہے بلاشرکت غیرے اپنی حکومت قائم اور اپنے مستقبل کا فیصلہ کرے تو یقیناً وہ اپنے مناسب حال حکومت اپنی مخصوص تہذیب اور اپنے ما بہ الامتیاز تمدن کو خود ترقی دے سکے گی۔ صرف یہی ایک راستہ ہے جس پر قومیں آزادی کے ساتھ ارتقاء قومی کی انتہائی بلندیوں تک پہنچ سکتی ہیں۔ صرف یہی شرائط ہیں جن پر عمل کرنے سے دنیا کو اس قابل بنایا جاسکتا ہے کہ اس میں قومیں عزت اور خودداری کے ساتھ زندگی بسر کرسکیں جب دنیا کا تمدن اس اصول پر مبنی ہو تب ہی وہ وقت آئے گا کہ قوموں کے لیے "محکوم" ایک لفظ بے معنی ہوگا۔ قومی ہوس اور ملک گیری کی طمع کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہے گا۔ اور دنیا آزاد اور باہم ایک دوسرے پر اعتماد کرنے والی اور برادرانہ مراسم رکھنے والی قوموں کا ایک مجموعہ ہوگی۔ جس میں نسل انسانی کے عام مفاد کے لئے ہر قوم دوسری کا ہاتھ بٹائے گی۔

یہی وہ دلنواز نظام عالم ہے جس کے قیام کے لئے آسانیاں پیدا کرنے کی غرض سے ہندوستان نے اس قدر فیاضی کے ساتھ جان و مال سے مدد کی ہے پس اب کہ دنیا کے مستقبل کا قطعی فیصلہ کیا جارہا ہے۔ ہندوستان کے حقوق کسی طرح نظرانداز نہیں کیے جاسکتے۔ فرزندان ہند کا خون براعظم یورپ کی سرزمین پر ایشیا کے میدانوں اور افریقہ کے ریگستانوں میں اس لیے نہیں بہایا گیا ہے کہ غیر قوموں کو آزادی دلائی جائے مگر اپنے پاؤں کی زنجیروں کو گراں تر کردیا جائے۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کی تاریخ اور ان کی روایات ان کے مطالبہ کی تائید کرتی ہیں کہ ان کے حقوق کا عملی اعتراف کیا جائے۔ تاریخ عالم کے اس تاریک زمانہ میں جب کہ ہنوز

آج کل نئی دہلی

یونان و روما بھی تہذیب و تمدن کی روشنی سے مستفیض ہو رہے تھے۔ ہنود کی متمدن زندگی اور ان کی جمہوریت دیہاتی پنچایتوں کی صورت میں ظاہر ہو رہی تھی۔ ہندوستان کے عہد اول میں صناعوں، دستکاروں اور تجارت پیشہ لوگوں کی انجمنوں اور ان کی آئینی حدود کو دیکھنے کے بعد جن کے حاکموں کے اختیارات محدود کیے جاتے تھے۔ اور جن کا ذکر ہندوستان کی قدیم کتابوں میں موجود ہے۔ اس امر میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ تاریخ عالم کے اس ابتدائی زمانہ میں بھی سرزمین ہند پر آزادی کا معیار اس قدر بلند ہو گیا تھا۔ کہ آج اہل ہند کو جمہوریت کا پیشرو کہا جا سکتا ہے۔

اسی طرح اسلام کا اصل اصول جوہر حقیقی اور روح رواں جمہوریت ہے۔ جب میدان عرفات میں لاکھوں حجاج امیر و غریب، شاہ و رعایا، آقا و غلام کے تمام دنیاوی امتیاز کو برطرف کر کے ایک ہی لباس میں ننگے سر اور برہنہ پاؤں جمع ہوتے ہیں تو مساوات و اخوت کا وہ منظر دنیا میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ خدا نے اپنے پیغمبر (روحی فداہ) کی زبان سے جس صاف اور بااثر طریقہ پر ہم کو مساوات کی تعلیم دلائی۔ اس سے بہتر طریقہ اور کیا ہو سکتا ہے خود رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا کہ وہ اپنی برگزیدہ ذات اور اپنے وجود مسعود کو عامۃ الناس کے ہم مرتبہ بنا دیں اور ارشاد ہوا کہ:

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (الکہف ع ۱۲)

ترجمہ: "اے پیغمبر! کہدو کہ میں بھی تمہاری طرح ایک انسان ہوں۔"

قطع نظر اس مساوات کے جو مذہبی معاملات میں لازمی قرار دی گئی ہے۔ اسلام کی تمام معاشرتی اور سیاسی نظام عمل پر بھی حریت و مساوات کی روح اسی طرح حاوی ہے۔ تاریخ کے پڑھنے والے خوب جانتے ہیں کہ اس سب سے بزرگ تر خلیفۂ اسلام حضرت عمر بن الخطاب (رضی اللہ عنہ) کے عہد میں ایک غریب و ناچیز مسلمان بھی آزادی کے ساتھ اور بے خوف و ہراس خلیفۂ اسلام کے اعمال پر نکتہ چینی کر سکتا تھا۔ ایک مجلس میں حضرت عمر رضہ سوال کرتے ہیں کہ اگر شریعت حقہ کے مطابق میں حکومت نہ کروں تو تم کیا کرو گے ریگستان کا رہنے والا ایک معمولی بدو جس کے اندر اسلام کی سچی روح موجود تھی تلوار کھینچ کر اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ اے عمر رضہ! اگر تم غلط چلو گے تو میں اپنی تلوار سے تم کو راہ راست پر لاؤں گا۔ حضرات! حریت اسلامی کی یہ تنہا مثال نہیں ہے، اسلامی تاریخ کو دیکھیے تو وہ اس قسم کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔

اس سرزمین ہندوستان پر دونوں قومیں اپنی روایات کو بھولی نہیں ہیں۔ اور گو کہ زمانہ کے انقلاب نے ان کی اندرونی طاقتوں کو جو ان کے اندر ودیعت کی گئی ہیں کمزور کر دیا ہے۔ لیکن یقین جانئے کہ اگر ان کو ترقی کرنے کے مواقع دیے جائیں تو وہ پھر اپنی گذشتہ عظمت کو بآسانی حاصل کر سکتی ہیں۔

حضرات! اگر آئرلینڈ باوجود اس معاندانہ رویہ کے جس پر وہ دوران جنگ میں بھی قائم رہا۔ "غصب کردہ اقتدار حاکمانہ" کا دلچسپ اصول پیش کر کے انگلستان کے وزراء کو حکومت خود اختیاری دینے پر مجبور کر سکتا ہے، اگر انگلستان اور اس کے حلیف اہل پولینڈ، زیکوسلاف قوم، اور بلقان کی مصنوعی، مخلوط اور بے حیثیت قوموں کے حقوق کی حمایت کر سکتے ہیں۔ اگر سلطنت آرمینیا کی بے جان لاش میں روح پھونکنے کی تجویز پیش ہے۔ اور اگر منتشر اور خانہ بدوش بنی اسرائیل کو از سر نو یہوداہ کے آغوش میں جگہ دی جانے والی ہے، تو پھر عدل و انصاف، سیاسی راست بازی اور ان مسلمہ اصولوں کی پابندی جن کی اشاعت یورپ اور امریکہ کے مدبرین کرتے رہے ہیں۔ اس امر کی متقاضی ہے کہ ہندوستان بھی اپنے اس پیدائشی حق سے کہ وہ خود اپنے مستقبل کا تصفیہ اور اپنی قسمت کا فیصلہ کرے ہرگز محروم نہیں کیا جا سکتا۔

اگر ہندوستان کے مطالبات پورے نہ کیے گئے تو اہل ہند اپنے نقطۂ نظر سے سوائے اس کے کچھ نہیں کہہ سکے کہ جہاں تک ان کا تعلق ہے۔ یہ جنگ فضول اور بے سود ثابت ہوئی۔

"ہندو مسلم اتحاد — ہندستان کیلئے بہترین شگون"

اقتباس خطبۂ صدارت

آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس منعقدہ مدراس دسمبر ۱۹۲۷ء

ہندوستان کے سیاسی ماحول میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں اختلافات کی نسبت کوئی چیز زیادہ شرمناک موجود نہیں۔ فرقہ وارانہ بلووں میں جو رنج دہ مسرت کے ساتھ آئے روز رونما ہوتے رہتے ہیں۔ لوگوں کے جان و مال کی تباہی اور قاتلانہ حملوں کی مذمت میں کوئی زبان زیادہ سخت نہیں ہو سکتی۔ شاید ہی کوئی دن ایسا گذرتا ہو گا کہ جب ہم ملک کے کسی نہ کسی حصہ میں اس طوفان خیز حادثہ کی خبر نہ سنتے ہوں۔ یہ حادثات اپنے پیچھے نفرت اور تلخی کے ایسے جذبات چھوڑ جاتے ہیں جو ملک کو ان برسرپیکار گروہوں کے بڑے بھاری کیمپ میں بانٹ دینے کی دھمکی دیتا ہے۔ کہ جو ایک دوسرے کو تباہ کرنے پر ادھار کھائے بیٹھے ہوں۔ ان ہی کی بدولت کانگریس اپنی مقبولیت کھو بیٹھی ہے۔ اکثر صوبوں میں اسے ثانوی حیثیت میں دھکیل دیا گیا ہے اور جنگ جو فرقہ وارانہ انجمنوں کو اولین اہمیت حاصل ہو گئی ہے ہمیں اس صورت حالات کو زیادہ عرصہ برقرار رہنے کی اجازت نہ دینا چاہیئے ہندو مسلم اختلافات کے مسئلہ کا ہمیشہ کے لیے تصفیہ کر دینا چاہیئے اور اس کام کے لیے انڈین نیشنل کانگریس کی نسبت اور کوئی جماعت زیادہ موزوں نہیں۔

ہندو مسلم اختلافات کو دیکھتے ہوئے ہمیں اس بیماری کی علامات کا غلط اندازہ نہ لگانا چاہیئے۔ یہ سیاسی اور مذہبی اختلافات جنہوں نے دو اقوام کے تعلقات کو ناگوار بنا رکھا ہے اس گہری کشمکش کی بظاہر شکلیں ہیں جو

ہندوستان کے لیے خاص عجوبہ یا تاریخ کے لیے نیا واقعہ نہیں۔ یہ دراصل دو مختلف تمدنوں کا مسئلہ ہے جو زندگی سے متعلق اپنا مخصوص زاویۂ نگاہ رکھتی ہیں۔ اس کا بہترین حل یہ ہے کہ ہر تمدن کے زندہ رہنے کے حق کو تسلیم کر لیا جائے۔ ایک دوسرے کے ساتھ رواداری اور عزت کی اسپرٹ کو پیدا کیا جائے اور ایسے قومی اداروں کے قیام سے کلچرل یگانگت کو فروغ دینے کے کام کی حوصلہ افزائی کی جائے جن میں دونوں اقوام کے بچے ایک دوسرے سے ملیں جلیں اور دونوں تہذیبوں کی تہ میں موجود تصورات کو سمجھنے اور مطالعہ کرنے کے مواقع سے فیض یاب ہوں۔ تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو مغربی تہذیب کے مطالعہ پر مجبور کیا جاتا ہے۔ مگر وہ ان لوگوں کی تہذیب سے تقریباً تقریباً کورے ہوتے ہیں۔ جو اس کے گھر کے پاس ہمسایہ میں رہتے ہیں۔ یہ وقت ہے کہ ہمیں اس خطرناک علیحدگی اور عظیم جہالت کا قصہ پاک کر دینا چاہیئے۔ ایک دوسرے کے گہرے جذبات کے علم اور ایک دوسرے کے تصورات کے لیے ہمدردی کے جذبہ سے فرقہ وارانہ نمائندگی کے مسائل، گائے کشی اور مسجدوں کے سامنے باجہ بجنے کے جھگڑے ماضی کی داستان بن جائیں گے۔ اور ان کی اس سے زیادہ کوئی اہمیت نہ رہ جائے گی کہ ہندوستانی تاریخ کے محقق ان کے اسباب کی تحقیق کرتے رہیں۔

اس دوران میں ہم اس مسئلہ کو نظر انداز نہیں کر سکتے اور نہ ہی اس کی اہمیت کو کم کر سکتے ہیں جو آج ہمارے سامنے ہے۔ کچھ بنیادی حقائق ایسے ہیں جنھیں یاد رکھنا ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے لیے مفید رہے گا۔ انھیں اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ وہ ہندوستانی ہیں۔ انھوں نے ہندوستان میں رہنا اور ہندوستان میں مرنا ہے۔ قدرت نے ان کی قسمتوں کو ناقابل تحلیل طور پر ملحق رکھا ہے۔ اگر میرا کوئی ہندو بھائی یہ سوچتا ہو کہ وہ سات کروڑ مسلمانوں سے نجات حاصل کر سکتا ہے تو وہ ایک بھاری فریب میں مبتلا ہے اور جس قدر جلد اس فریب کا طلسم ٹوٹ جائے بہتر ہے۔ اسی طرح اگر میرا کوئی مسلمان بھائی یہ خواب لے رہا ہے کہ وہ ۲۵ کروڑ ہندوؤں پر غالب آ جائے گا تو وہ احمقوں کی بہشت میں آباد ہے۔ اور جس قدر جلد وہ اپنی آنکھیں کھولے یہ مسلمان قوم اور ہندوستان کے لیے بہتر ہے۔ جس سوراج کے لیے ہم برسرپیکار ہیں وہ نہ تو ہندو راج ہوگا اور نہ ہی مسلمان راج۔ یہ ایک مشترکہ راج ہوگا۔ جس میں ہر ایک فرد کے جائز حقوق اور مراعات محفوظ ہوں گے۔ دائمی لڑائی انسانی سماج کی عام حالت نہیں ہو سکتی۔ قوم ورانہ مفاد کے لیے سرگرمیاں کسی ایک قوم کی مجلسی اقتصادی اور تعلیمی حالت کو بہتر بنانے پر محمول ہوتی ہیں۔ مجھے اس بات پر کوئی اعتراض نہیں لیکن کسی ایک گروہ یا ایک قوم کی بھلائی کے لیے یہ ضروری ہے کہ امن اور چین ضروری چیزیں ہیں۔ متشددانہ فرقہ وارانہ فسادوں سے شائد کسی اور پارٹی کی خدمت ہو سکے۔ مگر وہ نہ تو ملک کے لیے مفید ثابت ہو سکتے ہیں اور نہ ہی مجموعی طور پر کسی خاص قوم کے مفاد کی خدمت کر سکتے ہیں۔ ان اختلافات کو دور کرنے کے لیے ان وحشیانہ طریقوں پر عمل پیرا ہونے کی بجائے میں اپنے ہم وطن بھائیوں کی خدمت میں اپیل کروں گا کہ وہ اس عظیم قومی ٹریبونل تمام اقوام اور گروہوں کے حقوق و مراعات کی محافظ انڈین نیشنل کانگریس کے پاس اپنے حقوق کے تحفظ اور اپنی شکایات کو رفع کرنے کے لیے آئیں۔

اجنبی اقتدار کے جوئے سے نجات کی کوششوں میں منہمک غلام لوگ اندرونی جھگڑوں میں الجھ کر کچھ حاصل نہیں کر سکتے۔ ہم ایک ہی سانس میں آزادی اور ایسی فرقہ پرستی کا نام نہیں لے سکتے چونکہ وہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں کسی باہر سے مشاہدہ کرنے والے کے لیے ہمیں آپس میں لڑتا دیکھ کر ہمارے مطالبہ کی صداقت کو تسلیم کرنا مشکل ہو جائے گا۔ ہماری حب الوطنی اس طرح بالکل فریب معلوم ہوتی ہے۔ اور ہم ان کوششوں سے کہ کہیں تھوڑی سی برتری یہاں اور تھوڑی سی فضیلت وہاں حاصل ہو جائے۔ اپنے مخالف کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بننے کا کام دیتے ہیں۔ جس کی پوزیشن ان کے طفیل ہر روز مضبوط ہوتی جاتی ہے۔ کیا ہم سب مشترکہ مساعی اور فیصلہ کے ساتھ اس ذلیل کن حیثیت سے چھٹکارا نہیں پا سکتے۔ ہماری عزت اور یہاں تک کہ خود ہمارا اپنا مفاد اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ ہم اپنے زاویہ نگاہ کو وسیع کریں اور مستقل قومی مفاد کی خاطر فرقہ وارانہ اور عارضی فائدوں کو نظر انداز کر دیں۔

فرقہ وارانہ منافرت کے اسباب جن کے زیر اثر دونوں اقوام کے رہنما کام کرتے ہیں جیسا کہ وہ کئی یونٹی کانفرنسوں میں نمایاں ہو چکے ہیں۔ دو طرح کے ہیں۔ یعنی سیاسی اور مذہبی۔

اس تفصیل میں جانے کی چنداں ضرورت نہیں کہ مسلمانوں کو یہ خوف دامن گیر ہے کہ اکثریت کا نکتہ نگاہ ذمہ داری کا بوجھ سنبھالنے میں اتنا وسیع نہیں کہ مسلمان اپنے حقوق کا تحفظ ان کے سپرد کر سکیں۔ اس لیئے انھوں نے جداگانہ طرز انتخاب اور جداگانہ نمائندگی کا مطالبہ پیش کر دیا ہے۔ یہ گذشتہ تاریخ کی ایک واضح حقیقت ہے۔ اور اس اسمبلی میں ہم میں سے ہر ایک اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہے۔

اس جگہ اپنے موجودہ مقصد کے زیر نظر اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ ان خوفناک نتائج کا احساس کرتے ہوئے جو اس نئی صورت حالات سے پیدا ہونیوالے تھے۔ انڈین نیشنل کانگریس نے اپنے سابقہ اجلاس میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی توجہ اس طرف مبذول کرائی کہ وہ ان جھگڑوں کو ختم کرنے کے ذرائع اختیار کرے۔ کانگریس کے ریزولیوشن کے الفاظ یہ ہیں:-

> "یہ کانگریس ورکنگ کمیٹی سے التجا کرتی ہے کہ ہندو اور مسلمان راہ نماؤں کے ساتھ صلاح مشورہ کے فوری اقدام اٹھائے۔ تاکہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں موجود نہایت افسوسناک جھگڑوں کو ختم کرنے کے ذرائع تلاش کیے جائیں۔ اور ۳۱ مارچ سے پہلے پہلے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سامنے رپورٹ پیش کی جائے کہ اس ضمن میں کانگریس کی مجلس عاملہ نے کیا فریضہ ادا

کیا ہے۔ یہ کانگریس آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ وہ ملک میں کانگریس کے اراکین کی طرف سے ضروری ہدایات جاری کرے اور مذکورہ رپورٹ کا مطالعہ کر لینے کے بعد دیگر مناسب اقدامات اٹھائے۔

کانگریس کے صدر نے دونوں اقوام کے راہ نماؤں سے صلاح و مشورے کیے۔ اس ملک کے طول و عرض میں اس غرض سے بڑے بھاری پیمانے پر دورے کیے کہ دونوں اقوام میں سرگرم تعاون پیدا کیا جا سکے اور ان کے فوق معاملہ شناسی کو اجاگر کیا جائے۔ چنانچہ دہلی میں گفت و شنید کا سلسلہ جاری کیا گیا۔ اس بات کا کریڈٹ مسٹر سری نواس آئینگر کی خلوص دلی، سرگرمی اور انتھک مساعی کو پہنچتا ہے کہ آخر کار بڑے بڑے سیاسی جھگڑوں کو ختم کرنے کا فارمولا تلاش کر لیا گیا۔ میں اپنے فرض سے کوتاہی کا مجرم ہوں گا اگر میں نے انڈین نیشنل کانگریس کے جذبہ حب الوطنی کی تعریف نہ کی۔ اور ان مسلمان راہ نماؤں کے تدبر کو خراج تحسین نہ ادا کیا جنھوں نے تعصبات تنگ نظری اور شبہات سے اوپر اٹھ کر بڑی دلیری سے ان تجاویز کو پیش کر دیا جن کی بدولت ہندوستان میں مسلم پالیسی نے ایک نئی شکل اختیار کر لی ہے۔ ۱۵ مئی کو کانگریس کی مجلس عاملہ کا اجلاس منعقد ہوا جس میں نمائندہ مسلمان راہ نماؤں کی طرف سے پیش کردہ تجاویز پر غور کیا گیا۔ ان مسلمانوں نے ۲۰ مارچ کو دہلی میں جمع ہو کر یہ تجاویز وضع کی تھیں۔ اس کے علاوہ کانگریس کے اسی اجلاس میں ہندو مہاسبھا کے راہنما دیگر ہندو جماعتوں کے ترجمان اور دونوں اقوام کے کئی نمائندے شامل ہوئے۔ انھوں نے ۱۶ مئی ۱۹۲۷ء کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے پاس اپنی رپورٹ پیش کی۔ اس اجلاس میں ایک ریزولیوشن پاس کیا گیا۔ یہ ریزولیوشن کانگریس ورکنگ کمیٹی کی سفارشات کی روشنی میں وضع کیا گیا تھا۔ ریزولیوشن کو اجلاس میں موجود تمام ممبران نے جن ہندو سبھا کے چند چیدہ چیدہ ممبر بھی شامل تھے اتفاق رائے سے پاس کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کمیٹی نے کس قدر دانش وری کا ثبوت دیا ہے۔ یہ کانگریس کے صدر کی ذاتی فتح کا نمونہ اور آپ کی ترغیبی طاقتوں مسلمہ ثبوت ہے۔ ریزولیوشن حسب ذیل ہے:

آل انڈیا کانگریس کمیٹی کانگریس ورکنگ کمیٹی کی اس رپورٹ کو جو اس نے ہندو مسلم مسئلہ پر مرتب کی ہے اور ان سفارشات کو جو اس ریزولیوشن میں موجود ہیں پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اسے قبول کرتی ہے اور کانگریس کی ماتحت جماعتوں کو ہدایت کرتی ہے کہ وہ حسب ذیل سفارشات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ضروری اقدامات اٹھائیں۔

۱۔ یہ کہ آئین کی کسی آئندہ اسکیم میں جہاں تک مختلف لیجسلیچروں میں نمائندگی کا تعلق ہے صوبائی اور مرکزی لیجسلیچر میں مشترکہ طریقۂ انتخاب عمل میں لایا جائے۔

۲۔ یہ کہ دو بڑی اقوام کو اس بات کا یقین دلانے کی غرض سے کہ موجودہ طور پر لیجسلیچروں میں ان کے جائز حقوق کی حفاظت کی جائے گی اور اگر ان اقوام نے اس بات کی خواہش کی کہ مرکزی لیجسلیچر اور ہر صوبہ میں آبادی کی بنیادوں پر ہر قوم کے لیے نشستیں مقرر کر دی جائیں تو ایسا بھی کر دیا جائے گا۔

لیکن اس ضمن میں یہ بات لازمی ہے کہ باہمی سمجھوتے سے اقلیتوں کے حق میں جن میں سکھ بھی شامل ہیں باہمی رعایتیں تفویض کی جائیں۔ تاکہ ان اقلیتوں کو ہر صوبہ یا صوبوں میں ان نشستوں سے زیادہ نشستیں حاصل ہو جائیں جن کے وہ آبادی کے بنیادوں پر حق دار ہیں۔ وہ اس طرح صوبوں میں جس نسبت پر اتفاق کیا جائے گا۔ یہی نسبت مرکزی لیجسلیچر میں دونوں اقوام کے حق میں برقرار رہے گی۔

۳۔ یہ کہ اس کمیٹی کی رائے میں مسلمان راہ نماؤں کی طرف سے پیش کردہ یہ تجویز کہ شمال مغربی سرحدی اور برٹش بلوچستان کو دوسرے صوبوں کی بنیادوں پر مراعات حاصل ہونی چاہئیں۔ اپنے اندر معقولیت رکھتی ہے اور جائز تجویز ہے یہ کمیٹی اس بات کا مطالبہ کرتی ہے کہ اس سلسلہ میں اصلاحات عمل میں لائی جائیں۔ اور ساتھ ہی اس بات کا خیال بھی رکھا جائے کہ انتظامی اصلاحات کے دیگر اقدامات کے ساتھ ساتھ مذکورہ صوبوں میں عدالتی اصلاحات کا موزوں نظام بروئے عمل لایا جائے۔

۳۔ب۔ یہ کہ اس مطالبہ کے متعلق کہ سندھ کو ایک علیحدہ صوبہ بنا دیا جائے، کمیٹی کی یہ رائے ہے۔ کہ لسانی بنیادوں پر صوبوں کی تقسیم کا وقت آگیا ہے۔ یہ ایک ایسا اصول ہے جسے کانگریس کے آئین نے اپنا لیا ہے۔

کمیٹی اس رائے کی بھی مالک ہے کہ صوبوں کی اس طرح کی از سر نو تشکیل کے کام کو فوراً شروع کر دیا جائے اور ہر صوبہ جو لسانی بنیادوں پر علیحدگی کا طلب گار ہو۔ اس کے مطالبہ کو عملی شکل دینے پر غور و خوض کیا جائے۔

نیز کمیٹی اس رائے کی مالک ہے کہ آندھرا، سندھ اور کرناٹک کو علیحدہ علیحدہ صوبوں میں تشکیل دینے کا کام شروع کر دیا جائے۔

۴۔ یہ کہ آئندہ آئین میں آزادی ضمیر کی ضمانت دی جائیگی اور صوبائی یا مرکزی لیجسلیچر کو آزادی ضمیر میں مداخلت کا کوئی حق نہ حاصل ہوگا۔

آزادی ضمیر کا مطلب ہے اعتقاد اور عبادت کی آزادی، مذہبی رسومات پر عمل اور مذہبی جماعتوں کے قیام کی آزادی اور دوسروں کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے اور دوسروں کے ایسے ہی حقوق سے مداخلت نہ کرتے ہوئے مذہبی تعلیم

(بقیہ صفحہ ۸ پر)

اختر الواسع

مرگِ مجنوں پہ

ڈاکٹر مختار احمد انصاری (۲۵ر دسمبر ۱۸۸۰ء — ۱۰ر مئی ۱۹۳۶ء) ہندستانی سیاست کے ان عظیم قائدین میں سے تھے جن کی شخصیت تواضع، انکسار، رواداری کے عناصر سے بنی تھی اور جن کا مذہبی عقیدہ ان کے سیاسی تصورات سے مکمل طور پر ہم آہنگ رہا۔ وہ مشرق کے تہذیبی شعار اور مغرب کے علمی معیار کا ایک بہترین امتزاج تھے۔ طبِ جدید کے میدان میں اپنی شاندار خدمات کے ساتھ ہی ساتھ وہ تحریکِ خلافت، مسلم لیگ کی ملی سیاست، مسلمانوں کی تعلیمی ترقی، سرکاری اثر سے آزاد تعلیمی اداروں کے قیام، تمام جماعتوں کو متحد کرنے کے عمل، سوراجیہ پارٹی کے احیاء، لسانی اتحاد فرقہ وارانہ یگانگت اور کانگریس کے قومی تعمیر کے پروگرام نیز حصولِ آزادی کی تحریک کے مختلف محاذوں پر جد و جہد کرنے والے عظیم رہنما تھے۔

ہندستان میں بسنے والی مختلف مذہبی، لسانی اور تہذیبی اکائیوں کے باہمی اتحاد کے لیے وہ زندگی بھر کوشاں رہے۔ ہندو مسلم اتحاد کو عملی اور مستقل شکل دینے کے لیے ان کے صادق جذبات اور مخلصانہ جد و جہد نے انھیں اس مسئلہ پر ہندستان کی قومی زندگی میں سب سے معتبر شخصیت بنایا اور ہم عصر قومی رہنماؤں میں اہم اور ممتاز کر دیا۔ مشہور صحافی اور بمبئی کرانیکل کے ایڈیٹر سید عبداللہ بریلوی کے بقول:

> "ایسا کوئی دوسرا آدمی جس نے مہاتما گاندھی سے بھی زیادہ امید افزا استقلال اور پوری دانائی کے ساتھ ہندو مسلم اتحاد کے لیے کوشش کی ہو تو وہ ڈاکٹر انصاری تھے۔"

ہر خاص و عام کے ساتھ وصل خواہی کے اسی جذبے نے انھیں صلحِ کل کا مبلغ، اس راہ کا سرگرم مجاہد اور آخر کو اس منزل تک پہونچنے کی کوشش کرنے والوں کا قافلہ سالار بنا دیا تھا۔ آخر کار اسی سمت سفر کرتے کرتے وہ اس جگہ چلے گئے جہاں جانے والے واپس نہیں آتے صرف ان کی یاد باقی رہ جاتی ہے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اس وقت کے شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے (جو بعد میں آزاد ہندستان کے تیسرے صدر جمہوریہ ہوئے) ۱۰ر مئی ۳۶ء کی شام کو آل انڈیا ریڈیو سے ایک نشری تقریر میں ہندستانی قوم کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

> "کل رات کو، کوئی ایک ڈیڑھ بجے، 'ڈاکٹر انصاری، ڈاکٹر مختار احمد انصاری' دنیا سے اچانک رخصت ہو گئے۔ ابھی پرسوں کسی کام سے مسوری تشریف لے گئے تھے وہاں سے واپس آ رہے تھے کہ راستے میں دل کی حرکت بند ہو گئی اور یہ بیشمار کاموں اور ان گنت قدردانوں' اس دیس کو، جس کی خاطر انھوں نے ہر طرح کی کڑیاں جھیلیں، ان مسلمانوں کو جن کی خدمت میں ساری عمر گزار کر ان کا برا ہی سنا۔ ان ہندو مسلمانوں کو، جن میں میل ملاپ اور محبت پیدا کرنے کے لیے خون پسینہ ایک کیا، ان مریضوں کو جن کی آخری امیدوں کا سہارا ان کا مطب تھا، اس جامعہ ملیہ کو، جس کے بچوں کو دیکھ کر اُن کا خون چلوؤں بڑھتا تھا اور جن سے انھیں یہ امید تھی کہ ان کی زندگیوں میں وہ آرزوئیں پوری ہو سکیں گی، جو اس وقت بس ارمان ہی ارمان ہیں۔ ہاں گھر بار کو، بال بچوں کو، عزیزوں کو، دوستوں کو سب کو چھوڑ کر نہ جانے جی میں کیا آئی کہ آدھی رات گئے اس راہ پر چل پڑے جس پر چلنے والے پھر منھ موڑ کر نہیں

دیکھتے۔

وہ طبیب حاذق جس نے اپنے ہزاروں مریضوں کی زندگی بچانے کے لیے موت سے کامیاب جنگیں لڑی تھیں خود اس کے ہاتھوں اس خاموشی سے شکست کھا گیا کہ ہر ہندستانی شروع میں حیران رہ گیا۔ رشید احمد صدیقی کے الفاظ میں:

"ڈاکٹر انصاری موجود تھے اور کسی کے مرنے کی خبر سننے میں آتی تو یہ سوال فوراً زبان پر آتا، ڈاکٹر انصاری کو بھی دکھایا تھا؟ اب جبکہ ان کی رحلت کی خبر آئی تو تھوڑی دیر تک عقل و حواس معطل رہے، سوچنے لگا آخر، ڈاکٹر انصاری کیوں کر جاں بحق ہوئے اور یہ کیوں کر ممکن ہوا کہ وہ خود اپنے لیے اس موت کا سد باب نہ کر سکے، جس کو ان کی نشتری، چمکیلی، گہری اور مریض اور تندرست دونوں کو تسکین دینے والی آنکھیں ہمیشہ روک دیتی تھیں ٹال دیتی تھیں اور بھگا دیتی تھیں۔"

ان کی موت کی خبر نے ہر ہندستانی کو تڑپا دیا۔ ہندستانی عوام کے جذبات کی مرقع نگاری منشی دیا نرائن نگم کے رسالہ "زمانہ" کے مئی ۱۹۳۶ء کے شمارہ میں ان الفاظ میں کی گئی کہ:

"ڈاکٹر انصاری کی زندگی کا چراغ گل ہونے سے نہ صرف انھیں کے گھر میں اندھیرا ہو گیا بلکہ تمام اہل ملک کے خانۂ دل میں اندھیاری چھا گئی ہے، آپ کی ذات والا صفات اپنے اور پرائے سب کے لیے ایک چشمۂ فیض تھی، وقت پڑنے پر وہ سب کے کام آتے تھے۔ اور ان کے یہاں ہر دکھی کو پناہ ملتی تھی۔ وہ اپنے ہم وطنوں کی خوشی کو اپنی خوشی اور ان کے غم کو اپنا غم سمجھتے تھے، وہ پھولوں میں گلاب کا پھول جواہرات میں ہیرا، اور انسانوں میں فرشتہ تھے۔"

ان کی موت پر 'معارف' (اعظم گڈھ) کی جون ۱۹۳۶ء کی اشاعت میں شبلی اسکول اور ندوی برادری کے سید الطائفہ مولانا سید سلیمان ندوی نے انھیں یاد کرتے ہوئے لکھا:

"ڈاکٹر مختار احمد انصاری گو نسب و وطن کے لحاظ سے ضلع غازی پور کے ایک ممتاز قصبہ یوسف پور کے ایک نہایت شریف خاندان سے تھے، مگر درحقیقت ان کا تعلق پورے ہندستان سے تھا، اس یوسف کا 'کنعان' وہ محدود مقام نہ تھا جس کو یوسف پور کہتے ہیں، بلکہ پورا ہندستان تھا، اسی لیے آج پورے ہندستان نے ان کی موت پر ماتم کیا...

وہ ہندو مسلم اتحاد کے منادی، عالم اسلامی کے سفیر اور آزادیٔ وطن کے مبلغ تھے... صداقت اور شرافت ان کا خمیر تھا...

ان کا گھر مہمانوں کے لیے، ان کی جان دوستوں کے لیے اور ان کا مال ضرورت مندوں کے لیے وقف تھا...

وہ فیاضی کا مجسمہ، لطف و محبت کا دیوتا، اور حسن و اخلاق کا فرشتہ تھے، متانت اور سنجیدگی ان کی طینت اور عزم و فکر ان کی عادت تھی، وہ وطن کے خدمت گار، انسانیت کے غم خوار اور اسلام کے پرستار تھے... ان کی پالیٹکس کے سولہ برسوں میں طوفان سیاست کے سینکڑوں جھونکے اٹھے اور سیاسی انقلاب خیال کے بیسیوں حادثے پیش آئے مگر صداقت اور راست بازی کا یہ پہاڑ جوں کا توں جما رہا۔"

مدیر "صدق" مولانا عبد الماجد دریا بادی نے ۲۱ مئی ۱۹۳۶ء کے شمارہ میں ڈاکٹر انصاری کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا:

"آج سے ۲۴ سال قبل ۱۹۱۲ء میں ترکی پر دشمنوں کی یورش تھی۔ جنگ طرابلس ابھی پوری طرح ختم نہیں ہونے پائی تھی کہ بلقان کی چھوٹی بڑی ساری سلطنتیں یلغار کر کے ترکی پر ٹوٹ پڑیں۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری کا نام دنیا نے اول اول اس وقت سنا اور چند ہی روز میں لوگ پورا نام تو بھول بھال گئے زبانوں پر صرف "ڈاکٹر انصاری" ہی چڑھا رہ گیا۔ محمد علی کی تحریک پر طبی وفد لے کر ترکی گئے، [illegible] میں ہر ہفتے ذکر خیر ہوتا رہا...

وہ دن اور آج، اس بہادر کا قدم، قومیات کے میدان میں پیچھے نہ ہٹا تا آنکہ ۱۰ مئی کو اپنی مدت حیات عالم ناسوت میں پوری کر، اپنے رب کے حضور میں بلا لیے گئے۔"

اس عہد کے ایک معتبر سیاسی سہ روزہ "مدینہ" بجنور نے اپنی ۱۰ مئی ۱۹۳۶ء کی اشاعت میں ایک اداریہ "آہ ڈاکٹر انصاری ــــ ہندستان کا گرم خون سرد ہو گیا" کے عنوان سے تحریر کیا اور ان الفاظ میں ان کی موت پر ماتم کناں ہوا:

"ڈاکٹر انصاری ہندستان کے طبیب اعظم تھے اور نہ صرف طبیب بلکہ حریت و استقلال کی روح اور قومی شعور کی بیداری کے محرک اول تھے۔ تعلیم و تربیت اور زندگی کی ابتدائی تگ و دو کے بعد آپ کی حیات کا ایک ایک لمحہ وطن و ملک کی خدمت، قومیت متحدہ کی تعمیر اور تعلیمی اداروں کی تاسیس و قیام میں گذرا۔ ترک مجاہدین جب عرصۂ کارزار میں گامزن ہوئے تو یہی ڈاکٹر انصاری تھے جو ہمدردی کا قلب ہاتھ میں لے کر طبی وفد کی صورت میں خون و تلوار کی زمین میں

پہنچ کر ترک مجاہدین کی خدمت سرانجام دے کر مسلمانانِ ہند کی اخوت کا یہ کارنامہ تاریخ کے سپرد کر گئے۔ ہوم رول کے پرآشوب زمانہ میں آپ تحریک آزادی کے علمبردار بنے اور ایک مستقل اور پائیدار معیار قائم کر کے آخر تک اسی پر جمے رہے۔ تحریکِ خلافت کو بیدار مغزی سے اپنے ہاتھ میں لیا اور اس کو کمال عروج پر پہنچا کر چھوڑا۔ عدم تعاون کی تحریک میں قائد کی حیثیت سے پیش پیش رہے۔ اور اجنبی جور و استبداد کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتے ہوئے "رب السجن احب الی مما یدعوننی الیہ" کہتے ہوئے محبوس ہو گئے۔ کانگریس کے صدر آپ بنے، مسلم لیگ کی قیادت آپ نے فرمائی۔ مسلم یونیورسٹی کے قیام و بقا میں آپ نے حصہ لیا۔ جامعہ ملیہ کو بلند معیار پر آپ نے پہنچایا۔ طبیہ کالج کی تعمیر و تشکیل کے لیے آپ نے اوقات عزیز نذر کیے اور تعلیمی اور سیاسی اداروں کو مستحکم بنیاد پر قائم کر دیا۔ غرض مرحوم کی زندگی کا ایک ایک قدم ایثار و خلوص، قربانی و فداکاری، خدمت و محبت کے مختلف راستوں سے گزرا ہے جس کے نقوش کتاب روزگار اور قلوب کی سطح پر ہمیشہ نمایاں اور باقی رہیں گے۔"

"بابائے قوم" مہاتما گاندھی نے اس خبر کو سن کر ان کی موت کو صدمۂ جانکاہ اور اپنے لیے "ذاتی نقصان" قرار دیتے ہوئے کہا:

"ڈاکٹر انصاری کی موت میرے لیے ایک صدمۂ جانکاہ ہے وہ ہندو اور مسلمانوں دونوں میں ممتاز تھے، ان کی موت میرے لیے ایک ذاتی نقصان ہے۔ وہ ہندو مسلم سوال پر میرے سب سے بہترین رہنما تھے۔"

"بلبل ہند" مسز سروجنی نائیڈو نے ان کی موت کو اپنے لیے "ذاتی رنج و غم" کا سبب بتاتے ہوئے ان سے اپنی رفاقت دیرینہ اور ان کی من موہنی شخصیت کا اعتراف یوں کیا:

"ڈاکٹر انصاری کے لیے میری محبت کا سرا حیدر آباد میں گزارے ہوئے اپنے بچپن کی یادوں سے جڑا ہوا ہے۔ ان کی موت میرے لیے ذاتی رنج و محن لائی ہے، اس لیے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی کہ وہ ہماری نسل کے ناقابلِ انکار حد تک سب سے زیادہ پیار کیے جانے والی شخصیت کے مالک تھے۔"

اسیر مالٹا، شیخ الہند اور جذبۂ حریت کی ولی اللہی یادگار مولانا محمود حسنؒ کی جمعیۃ العلماء ہند کے صدر مفتی کفایت اللہ صاحب نے شیخ الہند کے مرید کو بستر علالت سے یاد کرتے ہوئے کہا:

"ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ وہ ہندستان کا مخلص فدائی، قوم کا سچا شیدائی، آزادیٔ وطن کا جانباز مجاہد، خلقِ خدا کا بے غرض ہمدرد و غمخوار تھا۔ اس کے قومی وطنی کارنامے آفتاب سے زیادہ روشن ہیں۔ بلقان کے طبی وفد کے سلسلے میں انصاری کی مخلصانہ اور مجاہدانہ سرگرمیاں ہمیشہ صفحۂ عالم پر تاباں و درخشاں رہیں گی۔ محبان ملک و ملت میں سے 'انصاری' وہ پہلا شخص تھا جس نے حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ کی آواز "من انصاری الی اللہ" پر والہانہ لبیک کہی تھی، انصاری نے اپنی تمام راحتوں، اپنے تمام جذبات کو آرزوئے آزادی اور جذبۂ حریت پر قربان کر دیا تھا۔ اس کا وجود خلق اللہ کیلئے مجسمۂ رحمت اور پیکر خلوص تھا وہ اپنے آبا و اجداد یعنی انصاریٔ رسولؐ کا سچا جانشین اور نمونہ تھا۔

ڈاکٹر صاحب کی وفات سے ہندستان کا ایک کامل الفن معالج اور تشریح علمی کا ماہر، اخلاق و شرافت کا مجسمہ، آزادیٔ وطن کا عاشق، ملت کا مستقل مزاج قائد، قوم کا مخلص ہمدرد و غمخوار، قومی مجلس کا صادق وفادار، علم و اہل علم کا قدرشناس جاتا رہا۔ اور مستقبل قریب میں اس کے مثیل و قائم مقام کے پیدا ہونے کی امید بھی نہیں۔"

قطعۂ تاریخ وفات

آہ اے مختار احمد ڈاکٹر

۱۹۳۶ء

[illegible]

بشکریہ مدینہ بجنور یکم جون ۱۹۳۶ء

ڈاکٹر مختار احمد انصاری

قمر جہاں جعفری

۱۸۸۰ء ۔ سن ولادت (۲۵ر دسمبر) یوسف پور ضلع غازی پور، اتر پردیش
والد کا نام حاجی عبدالرحمان ۔ والدہ کا نام آہن بی بی (وفات اپریل ۱۹۰۶ء)
بیوی کا نام شمس النسار (وفات ۲۸ دسمبر ۱۹۳۸ء) (بحوالہ بیگم زہرا انصاری)
۱۸۸۷ء ۔ تک ابتدائی تعلیم یوسف پور کے مڈل اسکول میں حاصل کی۔
۱۸۹۶ء ۔ وکٹوریہ ہائی اسکول غازی پور سے میٹرک کیا۔
۱۸۹۸ء ۔ ایم۔سی۔ کالج الہ آباد سے ایف۔ ایس۔ سی کیا۔
۱۸۹۹ء چچازاد بہن شمس النسار سے حیدرآباد میں شادی ہوئی۔
۱۹۰۱ء نظام حیدرآباد کے وظیفہ پر طبی تعلیم حاصل کرنے کے لیے لندن گئے
۱۹۰۱ء قیام لندن کا زمانہ L.R.C.P. اور M.R.C.S. کے امتحانات
سے پاس کیے۔ M.D. اور M.S. کے امتحانات امتیاز کے ساتھ پاس
۱۹۰۸ء کیے۔ CHARING CROSS HOSPITAL, LONDON. میں
تک ہاؤس سرجن مقرر ہوئے
اس اسپتال کے مشہور سرجن ڈاکٹر اسٹینلے بائیڈ (جو شاہِ انگلستان
کے آنریری سرجن بھی تھے۔) کی نگرانی میں کام کیا۔ اسی اسپتال میں حکیم
اجمل خاں صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔
لندن ہی میں وہ پہلی مرتبہ موتی لال نہرو اور پنڈت جواہر لال نہرو سے
بھی ملے۔
انڈین میڈیکل ایسوسی ایشن کے پہلے سکریٹری اور بعد میں صدر منتخب
ہوئے۔
۱۹۱۰ء لندن سے واپسی۔ کچھ دنوں حیدرآباد اور یوسف پور میں قیام کیا۔

دہلی میں آمد۔ مستقل قیام۔ مطب کا آغاز۔
لاہور میڈیکل کالج کی پرنسپل شپ پیش کی گئی لیکن قبول نہیں کی
۱۹۱۲ء جنگ بلقان کے مجروحین کی امداد کے لیے ایک طبی وفد لے کر
گئے (۸ر دسمبر کو دہلی اور ۱۵ر دسمبر کو بمبئی سے روانگی)
۱۹۱۳ء ۴ر جولائی کو یہ طبی وفد ہندوستان واپس آیا۔
قضیہ مسجد کانپور کے مجروحین کی دیکھ بھال کے سلسلہ میں متعدد بار
کانپور گئے۔
۱۹۱۴ء دستور اساسی کی تشکیل کے سلسلے میں ہونے والے جلسہ
شرکت
دستور اساسی کے سلسلہ میں سر سنکرن نائر ممبر تعلیمات سے گفتگو
والی کمیٹی میں شرکت۔
۱۹۱۵ء مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس بمبئی میں شرکت۔ کانگریس اور مسلم
کے مابین اشتراک و تعاون کے سلسلے میں کام کرنے والی کمیٹی میں
سیاست میں مذہبی جماعتوں کی شرکت اور شریف مکہ کی
کے بعد حکومت برطانیہ کے خلاف جلسہ مسجد فتحپوری منعقدہ
جولائی میں شرکت۔
۱۹۱۶ء دسمبر میں کانگریس اور مسلم لیگ کے مشترکہ اجلاس لکھنؤ میں
کی اور لکھنؤ پیکٹ کی تکمیل میں حصہ لیا۔
۱۹۱۷ء پہلی عالمی جنگ کے سلسلے میں نظر بند ہونے والوں کی رہائی
سلسلے میں ڈاکٹر انصاری کے مکان پر جلسوں کا انعقاد۔ رہائی
کی تشکیل اور سکریٹری کی حیثیت سے ان کا انتخاب۔ مسلم

اور کانگریس کے اجلاس کلکتہ میں شرکت ۔ مہاتما گاندھی سے ملاقات
کانگریس اور مسلم لیگ کے اشتراک عمل اور تعاون کے سلسلہ میں
دوسرا قدم ۔ مشترکہ دستور اساسی کی تشکیل کے سلسلہ میں کانگریس
کمیٹی کے ساتھ مل کر غور و خوض کرنے والی لیگ کمیٹی کے ممبر کی
حیثیت سے انتخاب ۔

۱۹۱۸ء مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس دہلی کے موقع پر صدر استقبالیہ کی حیثیت
سے خطبہ دیا جو کہ سرکار نے ضبط کر لیا ۔

۱۹۱۹ء گاندھی جی عدم تعاون کی تحریک میں شرکت ۔ خلافت کانفرنس کے نام
سے جلسہ کا اہتمام کرنے والوں میں ڈاکٹر انصاری کی شرکت ۔ خلافت
کمیٹی کا قیام اور ممبر کی حیثیت سے شرکت ۔ کانگریس و خلافت کمیٹی
کا اتحاد ۔ آل انڈیا مسلم کانفرنس میں شرکت ۔ دسمبر میں کانگریس و
لیگ کے اجلاس امرتسر میں شرکت ۔

۱۹۲۰ء ڈیپوٹیشن خلافت کمیٹی برائے گفتگو وائسرائے ہند میں شرکت ۔ ریشمی
خطوط کے سلسلہ میں حکومت کا ڈاکٹر انصاری پر شبہ ، بیان اور حکومت
کی نگرانی ۔

تعلیمی نان کوآپریشن کا آغاز ۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام ۔ فاؤنڈیشن
کمیٹی میں شرکت ۔ اس کمیٹی کی آنریری سکریٹری کا عہدہ پیش کیا گیا لیکن
قبول نہیں کیا ۔ جامعہ ملیہ کی نصاب کمیٹی اور مقاصد کے تعین کمیٹی میں
شرکت ۔

مسلم لیگ کے اجلاس ناگپور کی صدارت ۔
کانگریس کے جنرل سکریٹری

۱۹۲۱ء ۱۴ فروری کو روانگی لندن بحیثیت ممبر وفد خلافت کمیٹی برائے
گفتگو وزیر اعظم برطانیہ ۔ بسلسلۂ مسئلہ خلافت ۔ حکومت کے احکامات
کی خلاف ورزی کرنے کے سلسلے میں فتویٰ ۔ علماء کی توثیقی دستخط کرنے
والوں میں شمولیت ۔

۱۹۲۲ء کانگریس کے جنرل سکریٹری ۔ دہلی میں پرنس آف ویلز کی آمد پر ہڑتال
اور والنٹیروں کی بھرتی کے کاموں میں مصروفیت ۔ ہندو مسلم اتحاد
کے سلسلے میں سعی ۔ باردولی تحریک بسلسلہ عدم ادائیگی ٹیکس کے
بند کرنے کے سلسلہ میں گاندھی جی سے اختلاف رائے ۔ سول نافرمانی
کی تحریک کے سلسلہ میں عوام کے خیالات معلوم کرنے والی کمیٹی
کے ممبر کونسلوں میں شرکت کا حامیات کی حمایت ۔

مہاتما گاندھی کے ۲۱ روزہ برت کے دوران ، اُن
کے طبی مشیر کے فرائض انجام دیئے ۔

۱۹۲۳ء جلسہ طبیہ کانفرنس دہلی کی صدارت ۔ لالہ لاجپت رائے کے ساتھ سمجھوتہ
کیا جسے 'لاجپت ۔ انصاری معاہدہ' کہتے ہیں ۔

۱۹۲۴ء ہندو مسلم فسادات کے باعث کچھ دنوں کے لیے عملی سیاست سے
کنارہ کشی ۔

۱۹۲۵ء جامعہ ملیہ اسلامیہ کو جاری رکھنے کے فیصلہ کی تائید ۔ جامعہ کی دہلی میں
منتقلی ۔ کوہاٹ اور راولپنڈی کے سلسلہ میں شوکت علی اور مہاتما
گاندھی کی اختلافی رپورٹ کی اشاعت کی مخالفت ۔

سفر یورپ ہمراہ حکیم اجمل خاں ۔
سفر انگلستان ۔ قیام سوئٹزرلینڈ ۔۔ ۱۰ جولائی کو سفر دیا ۔ برکت علی
خواجہ عبد المجید ۔ ڈاکٹر عابد حسین اور پروفیسر محمد مجیب سے پہلی ملاقات
مصر و فلسطین کا سفر ۔ اکتوبر میں واپسی ۔ فراہمی چندہ کمیٹی جامعہ کے
سکریٹری ۔

۱۹۲۶ء معتمد جامعہ کی حیثیت سے فرائض کی ادائیگی ۔ مختصر سفر یورپ ۔
جامعہ کو مختلف سیاسی تحریکوں سے الگ رکھنے کے عزم کا اظہار ۔
کانگریس کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے فرائض کی ادائیگی ۔

۱۹۲۷ء آل انڈیا کانگریس کے صدر کی حیثیت سے اجلاس مدراس کی صدارت ۔
ہندو مسلم اتحاد کے سلسلہ میں دہلی میں جلسہ کا انتظام ۔ یونٹی کانفرنس شملہ
کے انعقاد کی کوشش ۔

۱۹۲۸ء مجلس اُمنا ، جامعہ ملیہ اسلامیہ کی صدارت ۔
امیر جامعہ کی حیثیت سے انتخاب (۱۹۲۸ء ۔۔ ۳۶)

۱۹۲۹ء جامعہ ملیہ کو چلانے کے لیے انجمن تعلیم ملی کا قیام و صدارت ۔
جامعہ کے لیے چندہ وصول کرنے کے لیے حیدر آباد کا سفر ۔ احرار
پارٹی کا قیام اور خازن کی حیثیت سے فرائض کی ادائیگی ۔
کانگریس کے جنرل سکریٹری ۔ اجلاس لاہور میں شرکت ۔

۱۹۳۰ء نمک ستیہ گرہ میں شرکت اور گرفتاری و سزایابی ۔ دوبارہ گرفتاری
و سزایابی ۔

۱۹۳۱ء کانگریس کے جنرل سکریٹری ۔

۱۹۳۲ء کانگریس کے جنرل سکریٹری ۔

۱۹۳۴ء جامعہ ملیہ میں اردو اکادمی کا قیام ۔ صدارت ۔ غازی رؤف بے مذاکرہ
بحث ۔ خالدہ ادیب خانم کا دورۂ ہندوستان اور ڈاکٹر انصاری
کے ہاں قیام ۔ جامعہ میں توسیعی لیکچر کا انتظام ، جلسہ کی صدارت
علاج کے لیے جرمنی گئے ۔ ۱۵ اکتوبر کو واپس آئے ۔

۱۹۳۶ء پیام تعلیم کے یوم تاسیس کے موقع پر بچوں کے لیے پیغام
نواب رامپور کو دیکھنے کے لیے مسوری گئے ۔ واپسی سفر میں ٹرین
میں دورۂ قلب ۔
۱۰ مئی کو انتقال ۔ جامعہ ملیہ کے قبرستان میں تدفین

۱۹۳۷ء جامعہ میں انصاری میموریل ہاکی شیلڈ کا آغاز
تاحیات کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر رہے ۔

اپنی رقم 7 برسوں میں دگنی سے بھی زیادہ کیجیے

نیشنل سیونگز سرٹیفکیٹ (پانچواں اجرا) خریدیے

دلکش سود سالانہ 10.75 فی صد مرکب (14.93 فی صد سود مفرد) کمائیے۔

100 روپے سات برسوں میں 204.50 روپے ہو جاتے ہیں۔ سرٹیفکیٹ تین سال کے بعد بھنائے جا سکتے ہیں۔ رقم لگانے کی کوئی حد مقرر نہیں۔

دیگر فوائد

انکم ٹیکس کے مقاصد کے لئے سرٹیفکیٹ ڈاک گھروں سے مفت جاری کئے جاتے ہیں۔
ایک لاکھ 50 ہزار روپے تک دولت ٹیکس سے چھوٹ۔ 3,000 روپے تک سالانہ سود پر انکم ٹیکس نہیں لگتا۔

مزید معلومات کے لئے

• کسی مجاز ایجنٹ • ڈسٹرکٹ سیونگ آفیسر معرفت ڈسٹرکٹ کلکٹریٹ • نزدیکی ڈاک گھر • ریجنل آفس، نیشنل سیونگز آرگنائزیشن (ریاستی یا مرکزی حکومت) سے رابطہ قائم کیجئے۔ یا

نیشنل سیونگز آرگنائزیشن

نذرِ عقیدت

سیدہ شان معراج

ازادی نے یوں چھیڑا کا فضاؤں میں گلال
ستاں سے بھینی بھینی خوشبوئیں آنے لگیں
ں اپنے پروں پر پا کے قابو ہر طرف
ن گلشن کی روش پر رقص فرمانے لگیں

قمریاں میٹھے سروں کے ساز لے کر آ گئیں
بلبلیں مل جل کے آزادی کے گن گانے لگیں
گل سے اپنی نسبتِ دیرینہ کی کھا کر قسم
اہلِ دل کو عشق کے انداز سمجھانے لگیں

ج دم بادِ صبا کی شوخیاں کام آ گئیں
ے و گل کو بغل گیری کا موقع مل گیا
یکھ کر اس دوستی کے پُر فضا ماحول کو
اری کلیاں ہنس پڑیں سارا گلستاں کھل گیا

لیکن اس دن کے لیے اے ہمنشینو دوستو!
کیسی کیسی بے بہا قربانیاں دینا پڑیں
خونِ دل دینا پڑا، خونِ جگر دینا پڑا
اپنے خوابوں کی حسیں پرچھائیاں دینا پڑیں

آرزو میں تیری اے گلپوش شہزادی نہ پوچھ
کیسے عالم تاب سرداروں کے سر جاتے رہے
سرزمینِ ہند کو دلہن بنانے کے لیے
کیسے کیسے دست و بازو کے شجر جاتے رہے

خیر اب ہم مطمئن یوں ہیں کہ جانِ آرزو!
ہم نے کچھ کھو بھی دیا ہے اور کچھ پایا بھی ہے
کیسے کیسے عقل کو دے کر دلاسے جانِ جاں
روح کو تسکین دی ہے دل کو سمجھایا بھی ہے

اب یہی کوشش ہے دل سے اے مری ارضِ وطن
تیری پیشانی پہ اب کوئی شکن آنے نہ پائے
تو نے پہنی ہے جو آزادی کی مالا شوق سے
عمر بھر کوئی کلی بھی اُس کی مرجھانے نہ پائے

اپنے گلہائے عقیدت پیش کرتی ہوں تجھے
مختصر یہ ہے محبت پیش کرتی ہوں تجھے

بھارت قومی یکجہتی

صابر شاہ آبادی

ہند کا پہلا فریضہ، امن و آزادی رہا
اور آزادی کا مقصد قومی یکجہتی رہا
یہ ہمارا مشترک تہذیب کا بانی رہا
"قومی یکجہتی" ہمارا فخرِ جمہوری رہا

دشمنی سے ہم کو نفرت ہے، یہ سب پر ہے عیاں
تب تو ہے "ہندوستاں" کے نام میں بھی "دوستاں"

سنت ہوں، صوفی ہوں لیکن ان کے معمار ہیں
قومی یک جہتی میں دونوں ہند کے مینار ہیں
ان میں جو زندہ ہیں وہ سب قافلہ سالار ہیں
دور جو نظروں سے ہیں وہ اور بھی بیدار ہیں

ہندو مسلم بھائی ہیں. بھارت کی جمہوری
بازوؤں کا درمیانی فاصلہ، دوری

ایک گھر میں رہ کے بھائی، بھائی سے محروم کیا
آدمی زندہ مگر انسانیت مرحوم کیا
ایک بازو، دوسرے بازو کا ہو مظلوم کیا
منتشر ہوں انگلیاں تو ہاتھ کا مفہوم کیا

تا بہ منزل ہر قدم بڑھتے چلو، ہم ایک ہیں
تفرقہ پرداز پر ثابت کرو، ہم ایک ہیں

متحد رہنے کا سب کو درس دیتا ہے گلاب
"خار و خوشبو" ایک ہونے کا نتیجہ ہے گلاب
جب گلوں میں باہمی تفریق پاتا ہے گلاب
انتشارِ گلستاں پر خون روتا ہے گلاب

زور سے ہے اور نہ زر سے قومیت کی آبرو
امن و یکجہتی سے ہے انسانیت کی آبرو

جس کو آزادی ملی، تقسیم کی بنیاد پر
دیش دو ٹکڑے ہوا، انگریز کی بیداد پر
ہند نے عزت بھی پائی کثرتِ افراد پر
وقت بھی حیران تھا اس صورتِ اضداد پر

اس طرح صابر جو دیکھو تو بجا ہر ناز ہے
قومی یکجہتی میں بھارت آج بھی ممتاز ہے

Regd. No. D(DN) 103
R. N. 948/57

Licensed U(D) - 50 to post without pre-payment
at Civil Lines Post Office, Delhi.

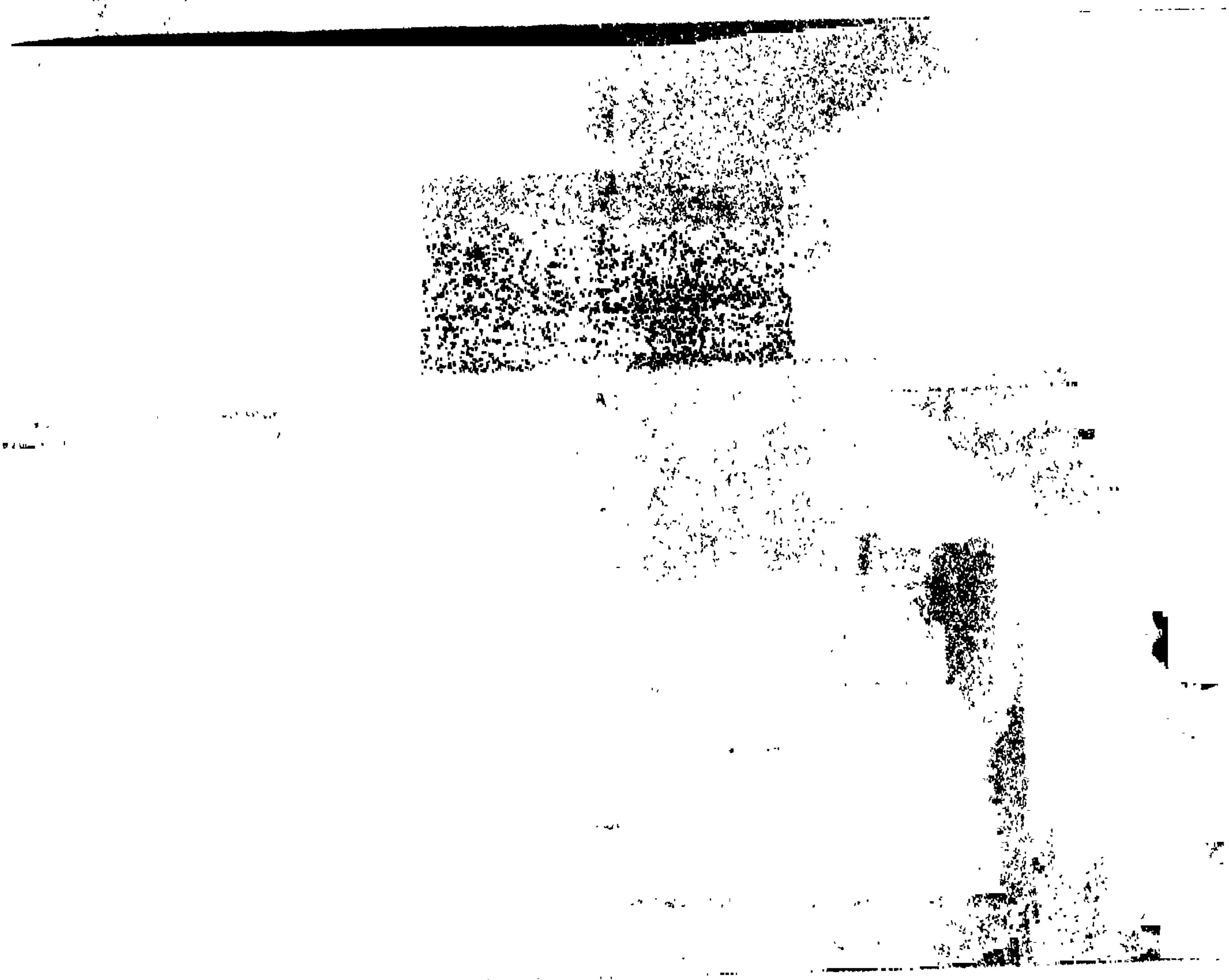

سنیں اربابِ دل اہلِ نظر بھی
نہاں ہے سنگ پاروں میں گہر بھی
جمالِ قوم بھی صاحب نظر بھی
مساز بھی، خضر بھی چارہ گر بھی
خنک اور مرمریں مدفن میں پنہاں
خروشِ برق و طوفانِ شرر بھی
سکونِ دیر و تقدیسِ کلیسا
گدازِ امتِ خیر البشر بھی
یہ تربت ہے امیرِ کارواں کی
یہ منزل بھی ہے شمعِ رہ گزر بھی

اسرارالحق مجاز

Vol. 39 No.6 AJKAL (URDU) January, 1981.
Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi.

آجکل

غالب ایوارڈ برائے ۱۹۷۸ء، ۱۹۷۹ء

۲۶ر دسمبر ۱۹۸۰ء کو ایوان غالب نئی دہلی میں نائب صدر جمہوریہ ہند جناب ہدایت اللہ نے ۱۹۷۸ء اور ۱۹۷۹ء کے غالب ایوارڈ تقسیم کیے۔

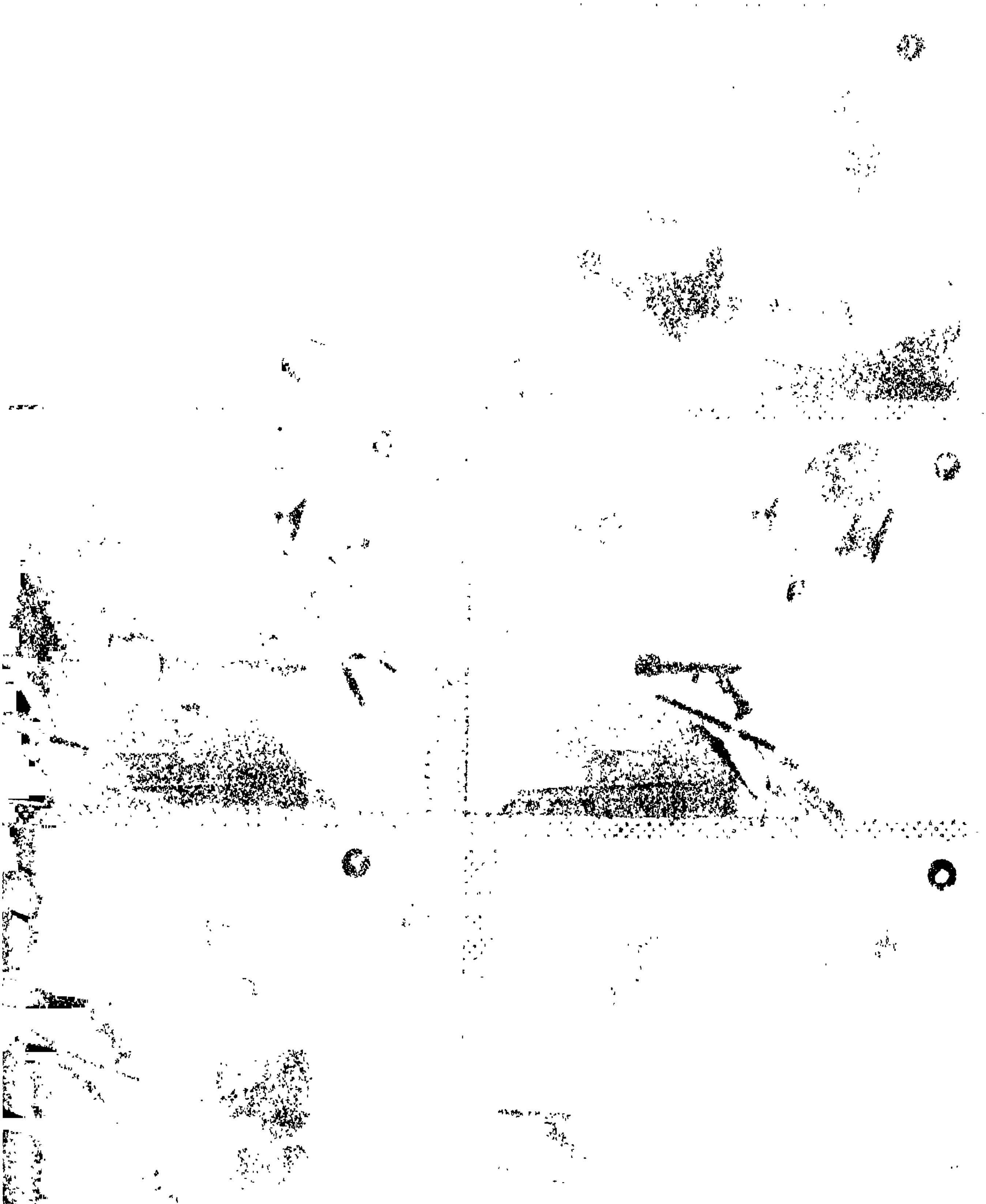

۱۔ پروفیسر امیر حسن عابدی ــ ۱۹۷۸ ــ برائے تنقید و تحقیق
۲۔ رشید حسن خاں ــ ۱۹۷۹ ــ " "
۳۔ راجندر سنگھ بیدی ــ ۱۹۷۸ ــ برائے اردو نثر
۴۔ جیلانی بانو ــ ۱۹۷۹ ــ برائے اردو نثر
۵۔ مجروح سلطانپوری ــ ۱۹۷۹ ــ برائے اردو شاعری
۶۔ خلیل الرحمان اعظمی مرحوم ــ ۱۹۷۸ ــ " [illegible]

DR. ZAKIR HUSAIN LIBRARY
JAMIA NAGAR
NEW DELHI-11

DR. ZAKIR HUSAIN
JAMIA NAGAR
NEW DELHI-11

اردو کا مقبول عام مصور ماہنامہ

ماہنامہ

آج کل

نئی دہلی

ایڈیٹر
شہباز حسین
اسسٹنٹ ایڈیٹر
محمد عادل صدیقی
سب ایڈیٹر
شوناتھ سکہ

جلد ۳۹ شمارہ ۷

فروری ۱۹۸۱ء

ماگھ پھاگن شک سمت ۱۹۰۲

فون:
۳۸۷۰۶۹

شرح چندہ

	ہندستان	پاکستان	دیگر ممالک	
سالانہ	۱۰ روپے	۱۶ روپے	۳ ڈالر	۱/۵۰ پونڈ
دوسالہ	۱۸ روپے	۲۸ روپے	۴/۵۰ ڈالر	۲/۷۰ پونڈ
سہ سالہ	۲۵ روپے	۳۸ روپے	۷/۵۰ ڈالر	۳/۷۵ پونڈ
فی کاپی	ایک روپیہ	ڈیڑھ روپے	۴۰ سینٹ	۱۵ پنی

ترتیب

ملاحظات ۲
اسلوبیاتِ انیس — گوپی چند نارنگ ۳
ابوالکلام آزاد کی ابتدائی صحافتی زندگی — عتیق صدیقی ۱۲
پشپی کی ماں (کہانی) — رام لعل ۱۹
غزل — ابو محمد سحر ۲۳
مخمور دہلوی — عثمان عارف ۲۵
شریمد بھگوت گیتا — نثار احمد فاروقی ۲۸
غزلیں — ناظم میواتی، مشتاق جاوید، تکمیل رضوی، نریش، نعیم زبیانی، کیلاش بہاری موج ۳۰
سعادت حسن منٹو — کے کے کھلر ۳۱
پائل (کہانی) — ذکیہ مشہدی ۳۵
غالب کی ترجمانی انگریزوں کی زبانی — برجند رسیال ۳۸
رضیہ سجاد ظہیر سے ایک ملاقات — ماجدہ اسد ۴۲
پنڈت میلا رام وفا — کرشن بلدیو شرما ۴۵

ڈائرکٹر پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر "آج کل" معرفت پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترسیلِ زر کا پتہ
بزنس منیجر، پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ملاحظات

غالب سمینار

۲۶، ۲۷، ۲۸ دسمبر ۱۹۸۰ء کو غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی کے زیر اہتمام ایوانِ غالب میں ایک سمینار منعقد کیا گیا جس میں ہندوستان کے علاوہ پاکستان اور بنگلہ دیش کے دانشوروں نے بھی شرکت کی۔ غالب اور ان کے عہد سے متعلق اس سمینار کے چھ اجلاس ہوئے جس میں غالب کی زندگی اور فکر و فن کے متعدد گوشوں کو زیر بحث لایا گیا۔

پاکستان سے ممتاز حسین، نظیر صدیقی اور بشیر حسین صاحب نے اور راج شاہی یونیورسٹی (بنگلہ دیش) سے سلیم سہسرامی نے شرکت کی تھی۔ ہندوستان کے مختلف حصوں سے آئے ہوئے تقریباً بیس نمائندوں نے اپنے مقالات پیش کیے۔

غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری یونس سلیم صاحب اور سمینار کے ڈائرکٹر ڈاکٹر نذیر احمد ہمارے شکریے کے مستحق ہیں کہ ان کی کوشش سے ایک اچھا سمینار منعقد ہو سکا۔

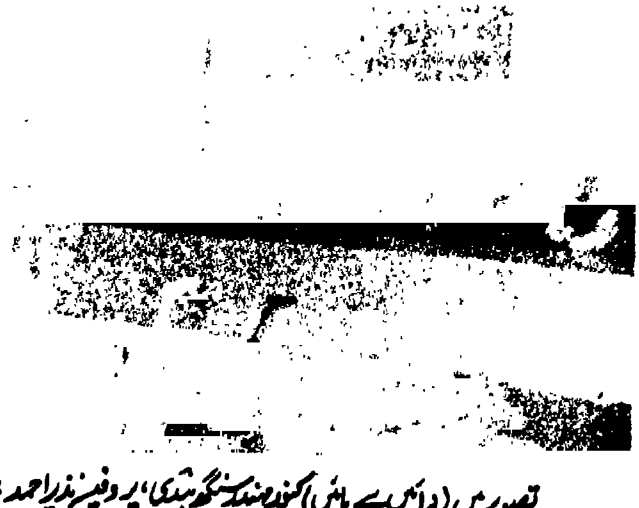

تصویر میں (دائیں سے بائیں) کنور مہندر سنگھ بیدی، پروفیسر نذیر احمد، جناب محمد ہدایت اللہ، جناب شفیع قریشی، پروفیسر گوپی چند نارنگ اور جناب یونس سلیم (رپورٹ پیش کرتے ہوئے)۔

... جواں مرگ

"ریاست کشمیر کی مقبول اور ملک گیر شہرت کی حامل ادیبہ اور شاعرہ آنسہ منظورہ اختر ۱۶ دسمبر ۱۹۸۰ء کو رات کے گیارہ بجے اچانک حرکتِ قلب بند ہو جانے سے انتقال فرما گئیں۔

۲۸ اکتوبر ۱۹۸۰ء کو منظورہ اختر چھبیسویں سال گرہ منائی گئی تھی ان کی مندرجہ تصانیف منظرِ عام پر آ چکی ہیں:

مقدس انقلاب، دخترِ کشمیر، سرخ آنچل، جہلم کے کنارے چناروں کی چھاؤں میں (افسانے)، نغمات حرم (نعتیں)، نذرِ اقبال، ایک طویل تحقیقی مقالہ "جنت کشمیر در آئینہ شعرائے فارسی" فارسی زبان میں تہران یونیورسٹی کو پیش کیا گیا۔ "بھٹکتے لفظ" کے نام سے ان کے افسانوں کا ایک انتخاب آل انڈیا ہندی اردو سنگم لکھنؤ شائع کر رہا ہے آپ کئی برس تک روزنامہ آفتاب سرینگر کے خواتین ایڈیشن سے بھی وابستہ رہیں۔ ان کی اس اچانک موت پر مجلس النساء (جموں و کشمیر) آل انڈیا ویمنز کانفرنس۔ اسٹوڈنٹس کونسل، آل انڈیا ہندی اردو سنگم۔ راشٹر بھاشا پرچار سمتی۔ بزم ادب۔ اردو فورم اور دوسری تنظیموں نے ماتمی قراردادیں منظور کیں اور مرحومہ کی وفات کو ریاست کی ادبی تحریک میں ناقابل تلافی نقصان قرار دیا۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ ریاست کشمیر کی ایک ممتاز ادیبہ اور شاعرہ سیدہ شہزادی کلثوم جو "اقبال اور شاعرات" "شعلۂ سوم" اور "معرکۂ کربلا میں خواتین کا حصہ" جیسی کتابوں کی مصنفہ تھیں صرف اکیس سال کی عمر میں اس دارِ فانی سے منہ موڑ گئی تھیں۔

منظورہ اختر کو شاید شہزادی کلثوم کی طرح اپنی جوانمرگی کا احساس تھا

میں وقت کی شہزادی کلثوم ہوں اختر
کل یاد کرے گی مجھے یہ وادیٔ کشمیر

منظورہ اختر کو صرف وادیٔ کشمیر ہی نہیں سارا ہندوستان یاد کرے گا۔

گوپی چند نارنگ

اسلوبیاتِ انیس

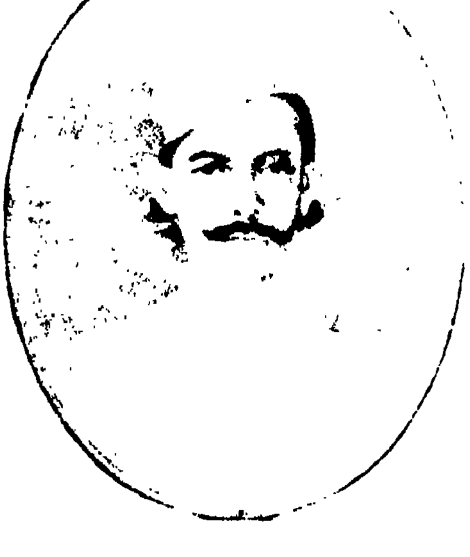

انیس کے شعری کمال اور ان کی فصاحت کی داد کس نے نہیں دی۔ لیکن انیس کے ساتھ انصاف سب سے پہلے شبلی نے کیا، اور آنے والوں کے لیے انیس کی شاعرانہ عظمت کے اعتراف کی شاہراہ کھول دی۔ بعد میں انیس کے بارے میں ہماری تنقید زیادہ تر شبلی کے دکھائے ہوئے راستے پر چلتی رہی ہے۔ انیس کے محاسن شعری کے بیان میں شبلی نے جو کچھ لکھا تھا، پون صدی گزرنے کے باوجود اس پر کوئی بنیادی اضافہ آج تک نہیں کیا جا سکا۔ شبلی نے انیس کی فصاحت کے ضمن میں جو کچھ کہا تھا وہ دراصل مشرقی نظریۂ شعر کی آخری شمع کے بھڑک اٹھنے کا منظر تھا۔ شبلی نے شعر العجم اور موازنۂ انیس و دبیر لکھ کر مشرقی شعریات اور جمالیات کی جو خدمت کی تھی، ویسی اور اس پایے کی پھر کسی سے نہ ہو سکی۔ حالی کا معاملہ دوسرا ہے۔ وہ شاعری میں نشاۃ ثانیہ کے نقیب تھے جس کا منطقی نتیجہ آگے چل کر عقلیت پرستی اور افادہ پسندی پر اصرار کی شکل میں ظاہر ہوا۔ شبلی شعر میں حظ و لطف اور فصاحت و ادابندی کے دلدادہ تھے۔ یوں دونوں کی شخصیتیں متاخرین شعرائے اردو کے غالب رجحان یعنی ناسخیت سے انحراف کے طور پر ابھری تھیں۔ لیکن دونوں کا ردعمل ان کی اپنی اپنی انفرادی افتادِ طبع کا انداز لیے ہوئے تھا۔

انیس کے زمانے میں شعرگوئی کے دو انداز عام تھے: ایک انداز تو وہی قدیمی تھا جس کی رو سے میر تقی میر کو خدائے سخن تسلیم کیا گیا تھا اور جو اپنے وسیع معنوں میں دہلوی شعرا سے منسوب کیا جاتا تھا، یعنی تغزل، دردمندی، سوز و گداز، جذبات نگاری، لطفِ بیان، جدتِ ادا، سلاست، روانی، اور ادائے معنی میں حسن و سلیقہ جسے عرفِ عام میں فصاحت کہتے تھے۔ اور دوسرا وہ جسے ناسخ اور ان کے شاگردوں، پیرووں اور ہم عصروں نے شہرت کے بامِ عروج تک پہنچایا تھا، اور جسے اپنی اپنی شعرگوئی کے ذریعہ استحکام بخشا تھا۔ یعنی جس میں بالذات قدرتِ بیان، مشاقی، لفظی شعبدہ گری، صنائع لفظی و معنوی (محدود معنوں میں) مضمون آفرینی، نازک خیالی اور علمیت کا اظہار شاعری کا مقصد اور منتہا سمجھا جاتا تھا۔ انیس کے فن کو پوری طرح سمجھنے کے لیے یہ جاننا نہایت ضروری ہے کہ انیس کی شعری شخصیت اس پُرتصنع رجحان کے خلاف ردعمل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس زمانے کے لکھنؤ میں ناسخیت کا ڈنکا بجتا تھا، ناسخیت ہی سکۂ رائج الوقت تھی۔ اردو کی شعری روایت میں قادر الکلامی اور مشاقی کا بہترین اظہار قصیدے کی فضا میں ممکن تھا۔ ناسخ اور ان کے پیرووں نے اپنی صناعی اور بے روح قافیہ پیمائی کے لیے تقویت اسی روایت سے حاصل کی ہوگی کیونکہ غزل کی سابقہ روایت میں سوائے شاہ نصیر کے ایسی کوئی نظیر نہیں تھی۔ اور خود شاہ نصیر کی سائیکی نے جس سرپرستانہ ماحول کے زیرِ اثر ان عناصر کو قصیدے کی روایت سے جذب کیا تھا۔ وہ کئی گنا مکبّر صورت میں لکھنؤ کے نوابانہ ماحول میں موجود تھے اور ناسخ اور ان کے متبعین نے غزل میں اس روایت کو نہ صرف ایک غالب رجحان کی شکل دی بلکہ اسے اس حد تک پرشکوہ اور باوقار بنایا کہ دوسرے تمام رنگ اس کے سامنے پھیکے پڑ گئے۔ انیس نے مرثیے میں شعوری طور پر اپنے عہد کے اس غالب رجحان سے انحراف کیا۔ لیکن ناسخیت سے بازی لے جانا بغیر اس کے حربے استعمال کیے ممکن نہ تھا۔ یوں تو فصاحت کا تصور ہر دور میں خاصا مبہم اور وجدانی رہا ہے، نیز ہر جمالیاتی تصور کی طرح جتنا اسے ذوق کی سطح پر محسوس کیا جا سکتا ہے، اتنا اسے معروضی طور پر مشرح نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم انیس کے ضمن میں یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ

لیا انیس کی فصاحت ویسی فصاحت تھی جس کا تصور قدما یا متوسطین کے ہاں ملتا ہے یا انھوں نے مرثیے کی فضا میں قصیدے کی روایت سے (غیر شعوری طور ہی پر سہی) استفادہ کر کے فصاحت کے مروجہ مفہوم میں نئی جہات کا اضافہ کیا؟ اس طرح گویا ناسخیت کے بعض اجزا کی تقلیب کر کے انھوں نے ناسخیت سے ٹکر لی، مرثیے کو نیا جمالیاتی ذائقہ دیا اور بالواسطہ ذریعہ ناسخیت کی شکست میں ایک تاریخی کردار ادا کیا۔ یہ بات بھی اہلِ غور ہے کہ کیا اردو کو ان کی سب سے بڑی دین یہی تو نہیں۔ شبلی یس کے سخن فہم ہیں لیکن یاد رہے کہ وہ ان کے طرف دار بھی ہیں اور س طرف داری میں انھوں نے انیس کی فصاحت کا جو تصور پیش کیا ہے وہ غیر مشروط ہے، اور شاید اس لحاظ سے اس پر نظرِ ثانی کی ضرورت ہے جیسا کہ آگے چل کر وضاحت کی جائے گی۔ شبلی کو اس فصاحت کا سراغ خود انیس کے بار بار کے دہرائے ہوئے بیانات میں ملا۔ شبلی کا تصور صرف اتنا ہے کہ تعریف کے جوش میں انھوں نے انیس کے بیانات کو جوں کا توں تسلیم کر لیا۔ اگرچہ انیس کے مشہور مرثیے "نمک خوانِ تکلم ہے فصاحت میری" کے دوسرے مصرعے میں بلاغت کا ذکر بے وجہ نہیں: "ناطقے بند ہیں سن سن کے بلاغت میری"۔ یہاں بلاغت محض برائے بیت نہیں اگرچہ خود انیس کو گہرا احساس اپنی فصاحت ہی کا تھا:

ایک قطرے کو جو دوں بسط تو قلزم کر دوں
بحرِ مواجِ فصاحت کا تلاطم کر دوں

اس مشہور مرثیے میں پورے شاعرانہ شکوہ سے فرمایا ہے:

یہ فصاحت یہ بلاغت یہ سلاست یہ کمال
معجزہ گر نہ اسے کہیے تو ہے سحرِ حلال

ایک اور بند میں کہتے ہیں:

ہے کجی عیب مگر حسن ہے ابرو کے لیے
تیرگی بد ہے مگر نیک ہے گیسو کے لیے
سرمہ زیبا ہے فقط نرگسِ جادو کے لیے
زیب ہے خالِ سیہ چہرۂ گل رو کے لیے

داند آن کس کہ فصاحت بہ کلامے دارد
ہر سخن موقع و ہر نقطہ مقامے دارد

انیس کے فن کے بارے میں اس پہلو کو پوری طرح پرکھنے کی ضرورت ہے کہ انیس جس فصاحت کا دعویٰ کرتے ہیں اور شبلی اور ان کے بعد آنے والے نقاد انیس کی جس فصاحت کی داد دیتے ہیں، کہیں اس کا گہرا تعلق مسدس کے فارم کو انتہائی فن کاری کے ساتھ برتنے میں تو نہیں؟ اور اگر ایسا ہے تو انیس نے مسدس کو اس مقام تک پہنچانے میں اردو کی شعری روایت کے کن اجزا کی تقلیب کی اور کن وسائل کو برتا؟ مسدس انیس کی ایجاد نہیں۔ مرثیے کے لیے مسدس کا فارم انیس سے مدتوں پہلے رائج ہو چکا تھا انیس نے اسے جلا دی اور ایسی فنی بلندی تک پہنچا دیا کہ یہ ہیئت اردو میں لازوال ہو گئی اور اس کے اثرات بعد میں آنے والے نظم گو شعرا بھی قبول کرتے رہے۔

یہ معلوم ہے کہ ہیئت کے اعتبار سے مرثیے کی ساخت اس کے تدریجی ارتقا کے ساتھ ساتھ بدلتی رہی ہے۔ اطہر علی فاروقی نے لکھا ہے کہ شروع شروع میں مرثیہ، غزل اور مثنوی کی ہیئت میں نظم ہوتا تھا۔ اس لیے کہ سوز خوانی اور لحن کے طرز میں پڑھنے کے لیے یہ فارم نہایت موزوں تھے (اردو مرثیہ: طبع الہ آباد ۱۹۵۸ء ص ۸) اسی طرح مربع اور دو بیتی مرثیے بھی لکھے گئے۔ میر اور سودا کے زمانے تک نظم کی ہر شکل میں مرثیہ کہا گیا۔ (سفارش حسین رضوی: اردو مرثیہ: تاریخ مرثیہ طبع دہلی ۱۹۶۵ء ص ۱۹۳) اس زمانے میں مرثیے نے دراصل ادبی منصب حاصل نہیں کیا تھا۔ مرثیہ صرف رونے رلانے اور ثواب کمانے کی چیز تھا۔ بگڑا شاعر مرثیہ گو کی کہاوت اسی زمانے سے چلی ہوگی۔ لیکن میر و سودا کے زمانے تک پہنچتے پہنچتے مرثیہ سے ادبی تقاضے شروع ہو گئے۔ مسیح الزماں کا یہ بیان صحیح ہے کہ سودا کی طبیعت ہمہ گیر تھی (اردو مرثیے کا ارتقا طبع لکھنؤ ۱۹۶۸ء ص ۱۱۵) انھوں نے اپنی ذہانت اور جدتِ فکر سے نئے نئے پہلو نکالے اور مرثیے کو ادبی حیثیت دینے کے لیے مختلف راستوں سے چل کر مسدس تک پہنچے۔ اگرچہ سودا نے مخمس، مستزاد، دُہرا بند کی صورتوں میں مرثیے لکھے، لیکن پہلا مسدس مرثیہ کہنے کا سہرا عام طور پر سودا ہی کے سر ہے۔ سودا نے اپنے رسالے "سبیل ہدایت" میں محمد تقی تقی کی جو خبر لی ہے اور اس کی تک بندی کا جو مذاق اڑایا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں مرثیے کی ادبی حیثیت تسلیم کی جانے لگی تھی اور شعرا مرثیے کا مقصد محض رثائیت نہیں سمجھتے تھے بلکہ شعریت کو ضروری تصور کرتے تھے۔ اس وقت تک مرثیے کے لیے قصیدہ، مربع، ترجیع بند، ترکیب بند، مخمس، مستزاد سب آزمائے جا چکے تھے، لیکن جس فنی وسیلے سے مسدس کی مخصوص صوتی کیفیت اور ہیئتی ڈرامائیت کی طرف پہلا قدم اٹھایا گیا وہ اُن مرثیوں کا رواج تھا جن میں فارسی یا برج بھاشا کی بیت یا آخری مصرع بطور ٹیپ استعمال ہوتا تھا اور کبھی ہر بند کو مختلف مصرعوں سے پابند کیا جاتا تھا۔ بعض مرثیوں میں یہ صورت بھی نظر آتی ہے کہ چار مصرعے ایک بحر میں ہیں اور بیت دوسری بحر میں۔ مسدس میں چار مصرعوں کے ہم قافیہ ہونے اور پھر بیت میں قافیہ کے بدل جانے یعنی اصوات اور آہنگ کی اس برابر جاری رہنے والی تبدیلی کے زیر و بم میں جو زبردست جمالیاتی اور ڈرامائی امکانات تھے، ان کی کشش شاید سب سے پہلے انھیں تجربوں میں محسوس کر لی گئی تھی۔ بہرحال اتنا معلوم ہے کہ مسدس میر اور سودا کے زمانے میں رائج ہو چکا تھا۔ اگرچہ میر کے زیادہ تر مرثیے مربع ہیں اور سودا کے

بہتر ۲، مرثیوں میں نصف سے زیادہ مربع ہیں اور مسدس کی ہیئت میں صرف چھ مرثیے ہیں۔ تاہم سودا کی طبّاعی اور ان کے متنوع ہیئتی تجربوں سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مرثیے کو مسدس تک پہنچانے میں ان کا بڑا ہاتھ رہا ہوگا۔ یہ بات لائق توجہ ہے کہ اردو شاعری نے اپنی تمام اصناف یعنی غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی وغیرہ سب کی سب فارسی سے لیں۔ لیکن مرثیے کی ہیئت مسدس کی شکل میں ہندوستان ہی میں صورت پذیر ہوئی۔ فارسی میں مرثیے کی ابتدا محتشم کاشانی (وفات ۹۹۶ھ) سے ہوئی لیکن ان کے تمام مرثیے اور ان کا مشہور مرثیہ دوازدہ بند قصیدے کی ہیئت میں ہے (تاریخ نظم و نثر در ایران و در زبان فارسی: سعید نفیسی، طبع ایران ۱۳۴۴ھ شمسی ص ۴۴۲)۔ ڈاکٹر رضازادہ شفق نے تاریخ ادبیات ایران میں لکھا ہے کہ شہیدان کربلا کے مرثیے میں محتشم کاشانی کا ترجیع بند بھی مشہور ہے۔ (طبع ۱۹۵۵ء ص ۴۶۴) غرض اردو مرثیے کا عروضی ڈھانچہ وہی سہی، لیکن اس کی معنوی اور شعری اکائی جیسی وہ مسدس کی ہیئت میں اردو میں ظہور پذیر ہوئی، اس کا کوئی نقش نہ عرب میں ملتا ہے نہ ایران میں۔ یہ اردو کی اپنی چیز ہے، اور یہ اردو شاعری کی ایسی جہت ہے جس پر ابھی تک پوری طرح غور نہیں کیا گیا۔

اب ایک اور پہلو کو لیجیے یعنی یہ کہ تحت خوانی کا مسدس کی تشکیل میں کیا ہاتھ ہوسکتا ہے۔ دہلوی دور تک مرثیہ خوانی میں لحن اور آہنگ کا رواج تھا اس لیے شعری تقاضوں سے زیادہ آواز، دُھن، لَے اور موسیقی پر توجہ تھی۔ اس وقت دہلی میں بہت سے عاشور خانے تھے جن میں مجلسیں ہوتی تھیں۔ درگاہ قلی خاں نے جو ۱۷۳۸ء سے ۱۷۴۱ء تک دہلی میں تھے، مرقع دہلی میں محتشم کاشانی اور حسن کاشی کے فارسی مرثیوں اور روضۃ الشہدا کے مجلسوں میں پڑھے جانے کا ذکر کیا ہے۔ (مرقع دہلی مرتبہ سید مظفر حسین، ص ۵۰ تا ۵۴) قیاس چاہتا ہے کہ جیسے جیسے مرثیہ روایتِ شعر کا حصہ بننے لگا، لحن و آہنگ کی جگہ تحت خوانی کا رواج ہونے لگا اور اس کے ساتھ ساتھ مرثیے کے ادبی جوہر بھی نکھرنے لگے۔ تحت خوانی کے لیے غزل یا مربع سے کہیں زیادہ مخمس یا مسدس کی ضرورت تھی۔ سودا کے دور میں دوہرے لگانے کا یا ترجیع میں ٹیپ لانے کا رواج تھا ہی، دوہرے برج بھاشا کے اور ٹیپ کی بیت فارسی کی رائج تھی۔ یہ رواج اردو میں برج اور فارسی کی "ریختہ" پیوندکاری کے رواج سے مختلف نہیں تھا جس کی جڑیں تصوف کی ہمہ گیر مقبولیت سے سماع کی محفلوں میں پیوست ہوچکی تھیں اور جس کے باقیات الصالحات آج تک قوالیوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

مرثیے میں مسدس کے رواج پا جانے کے سلسلے میں یہ بات بھی اہمیت رکھتی ہے کہ ہماری کلاسیکی شاعری عبارت ہے غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی سے۔ جب یہ بات واضح کی جاچکی ہے کہ مرثیہ اردو شاعری کی خالص اپنی ہیئت کا مظہر ہے تو کہیں ایسا تو نہیں کہ مرثیے کے مسدس کی تشکیل میں ان چاروں اصناف کا جوہر تحلیل ہوگیا ہو؟ انیس کے بارے میں مشہور ہے کہ زمانے کے رواج کے تحت وہ سب سے پہلے غزل کی طرف متوجہ ہوئے۔ بعد میں میر خلیق کے مشورے سے آخرت کے ثواب کے لیے انھوں نے اسی غزل کو سلام کردیا۔ یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ سلام وہ غزل ہے جس میں ائمہ سے عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔ اب کربلا کے واقعات پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ اس ضمن کے سارے واقعات کا تعلق اولوالعزمی، شجاعت اور استحکامِ خودی کی اس تاریخی روایت سے ہے جو اسلام اور سامی ذہن کی خصوصیتِ خاصہ رہی ہے۔ واقعات کے مسلسل بیان کرنے کے لیے ہمارے پاس مثنوی تھی، اولوالعزمی اور شجاعت کے بیانات کے لیے ہمارے پاس قصیدہ تھا اور لطیف جذبات کے اظہار کے لیے غزل تھی۔ چنانچہ لحن و آہنگ کے دور تک ان سب فارموں نے مرثیے کا کچھ نہ کچھ ساتھ دیا لیکن مجالس کے تمام تقاضے ان میں سے کسی بھی صنف سے پورے نہیں ہوسکتے تھے۔ مراثی، شاہ نامہ یا سکندر نامہ نہیں ہوسکتے تھے کیونکہ مرثیے میں تمام واقعاتِ کربلا کا اظہار مربوط و مسلسل نہیں ہوتا۔ ان میں تو واقعات کو فرداً فرداً لینا پڑتا تھا۔ تاکہ مرثیہ ایک نشست میں ختم ہوجائے۔ اور رونے رلانے کے مقصد کو بھی پورا کرے۔ قصیدے میں مدح ہی مدح تھی۔ جبکہ مرثیے کے ممدوح کی شہادت کو صدیاں گزر چکی تھیں اور مقصد اس کے اوصاف کو تازہ کرنا اور اس کے غم میں آنسو بہانا تھا۔ مجلس پڑھتے ہوئے یہ ضروری تھا کہ شہدائے کربلا میں سے کسی ایک کا ذکر کرتے ہوئے بیان کو بندوں میں تقسیم کرلیا جائے۔ ہر بند میں کسی صورت، کسی نقش، کسی پہلو، کسی واقعے، کسی مکالمے یا کسی حادثے کا تاثر ابھارا جائے اور پھر اس سب کو ہر بند کے ساتھ اس طرح سمیٹ لیا جائے کہ سننے والے کے جذبہ و تخیل پر چوٹ پڑے اور وہ مرثیے کے ارتقا کے ساتھ ساتھ درجہ بدرجہ اس تاریخی فضا میں کھو جائے۔ بند کے خاتمے کا مقصد رباعی کے فن کی یاد دلاتا ہے یعنی چوتھے مصرعے میں بات کا نچوڑ پیش کردیا جائے۔ یہاں فرق یہ تھا کہ بند میں چار مصرعے ہم قافیہ تھے، رباعی کے چوتھے مصرعے کا کام دوہرے یا ٹیپ کے بجائے اب بیت سے لیا جانے لگا۔ جس سے بند کی معنوی فضا کی تکمیل ہوجاتی تھی۔ غرض اس طرح اردو مرثیے کا وہ STANZA وجود میں آیا۔ جسے مسدس کہتے ہیں۔ لیکن یہاں مجھے اتنا اصرار مثنوی اور رباعی کے اجزا پر نہیں۔ ان کا معنیاتی تعلق ہوسکتا ہے، لیکن مسدس سے گہرا اسلوبیاتی اور ہیئتی تعلق قصیدے اور غزل کا ہے جس کا تجزیہ آگے چل کر کیا

جائے گا۔

انیس تک پہنچتے پہنچتے مسدس خاصا نکھر چکا تھا، دلچسپ بات صرف یہ نہیں کہ انیس کی شعری شخصیت نے اس فارم کو کتنا متاثر کیا بلکہ یہ بھی کہ خود اُن کی "فصاحت" نے اس فارم کے سانچے میں ڈھل کر کیا شکل اختیار کی۔ اس طرح گویا ان کی شاعری میں وہ اسلوب سامنے آیا جس کے بے مثل ہونے کی سب قسم کھاتے ہیں، لیکن جس کے اسلوبیاتی اور صوتی عناصرِ ترکیبی پر آج تک پوری توجہ صرف نہیں کی گئی۔

اس اجمال کے تجزیے کے لیے سب سے پہلے انیس کے اس شاہکار مرثیے کو لیجئے جس کا ذکر اس مضمون کے شروع میں کیا گیا تھا، یعنی

نمک خوانِ تکلم ہے فصاحت میری

چہرے کے حصے سے یہ دو بند ملاحظہ ہوں :

صبحِ صادق کا ہوا چرخ پہ جس وقت ظہور
زمزمے کرنے لگے یادِ الٰہی میں طیور
مثلِ خورشید برآمد ہوئے خیمے سے حضور
یک بیک پھیل گیا چار طرف دشت میں نور
شش جہت میں رُخِ مولا سے ظہورِ حق تھا
صبح کا ذکر ہے کیا چاند کا چہرہ فق تھا

ٹھنڈی ٹھنڈی وہ ہوائیں وہ بیاباں وہ سحر
دم بدم جھومتے تھے وجد کے عالم میں شجر
اوس نے فرشِ زمرد پہ بچھائے تھے گہر
لوٹ جاتی تھی لہکتے ہوئے سبزے پہ نظر
دشت سے جھوم کے جب بادِ صبا آتی تھی
صاف غنچوں کے چٹکنے کی صدا آتی تھی

پہلی ہی نظر میں احساس ہوتا ہے کہ دونوں بندوں میں پہلے چار چار مصرعے 'ر' کی آواز پر ختم ہوتے ہیں۔ یعنی ظہور، طیور، حضور، نور اور دوسرے میں سحر، شجر، گہر، نظر۔ صوتیات کی اصطلاح میں ایسے صوتی رکن کو جو کسی حرفِ صحیح یعنی مصمتہ CON SO NANT پر ختم ہو CLOSE SYLLABLE یا پابند رکن کہتے ہیں اور جو "الف" "واو" "ی" یعنی حرفِ علت، مصوتہ یا VOWEL پر ختم ہو، آزاد یا کھلا ہوا رکن OPEN SYLLABLE کہتے ہیں۔ اس لحاظ سے ان دونوں بندوں میں پہلے چار چار مصرعوں کے قوافی پابند ہیں اور ان میں ردیف سرے سے ہے ہی نہیں۔ ان کے مقابلے میں اگر دونوں بندوں کی بیت کو دیکھیے تو نہ صرف یہ کہ دونوں بیتوں میں ردیف ہے بلکہ ردیف بھی ایسی جس کے آخری رکن آزاد یعنی کھلے ہوئے ہیں مثلاً 'حق تھا'، 'فق تھا' اور دوسرے بیت میں 'صبا آتی تھی'، 'صدا آتی تھی'۔ اب ذرا آگے بڑھیے اور ان بندوں کو ملاحظہ فرمایئے :

اے خوشا حسنِ رخِ یوسفِ کنعانِ حسن
راحتِ روحِ حسین ابنِ علی جانِ حسن
جسم میں زورِ علی طبع میں احسانِ حسن
ہمہ تن خلقِ حسن، حسنِ حسن شانِ حسن
تن پہ کرتی تھی نزاکت سے گرانی پوشاک
کیا بھلی لگتی تھی بچپن سے شہانی پوشاک

جب فریضے کو ادا کر چکے وہ خوش کردار
کس کے کمروں کو بصد شوق لگائے ہتھیار
جلوہ فرما ہوئے گھوڑے پہ شہِ عرش وقار
علمِ فوج کو عباس نے کھولا اک بار
دشت میں نکہتِ فردوسِ بریں آنے لگی
عرش تک اس کے پھریرے کی ہوا جانے لگی

لہر وہ سبز پھریرے کی وہ پنجے کی چمک
شرم سے ابر میں چھپ جاتا تھا خورشیدِ فلک
کہتے تھے صلِ علیٰ چرخ پہ اٹھ اٹھ کے ملک
دنگ تھے سب وہ سماں سے تھا سماں تا بہ سمک
کہیے پستی اسے جو اوج ہما نے دیکھا
وہ سماں پھر نہ کبھی ارض و سما نے دیکھا

چمک، فلک، ملک، سمک یا کنعانِ حسن، جانِ حسن، احسانِ حسن، شانِ حسن وغیرہ الفاظ جو سب کے سب مصمتوں پر ختم ہوتے ہیں اور پابند ہیں کیا قصیدے کی یاد نہیں دلاتے ؟ اب ذرا بیت کو بھی دیکھئے۔ پہلے بند کی بیت سے قطع نظر آخری دونوں بندوں کی بیتیں کھلی ہوئی ردیف میں ہیں یعنی مصمتوں پر نہیں بلکہ مصوتوں پر ختم ہوتی ہیں۔ ذرا اس بیت کو پھر پڑھیے :

دشت میں نکہتِ فردوسِ بریں آنے لگی
عرش تک اس کے پھریرے کی ہوا جانے لگی

تو فوراً محسوس ہوتا ہے کہ بیت کے شعروں میں تغزل کی روح بول رہی ہے۔ مرثیے میں چہرہ ہو یا سراپا، آمد ہو یا رجز، رزم ہو یا شہادت یہ سب اجزا معناً قصیدے سے مناسبت رکھتے ہیں۔ قصیدہ ایک خاص شکوہ، بلند آہنگی، دبدبے اور شوکت کا اظہار چاہتا ہے اور مرثیے میں تعریف مقصود تھی ایسے جیالوں اور جانبازوں کی جنھوں نے بڑی سے بڑی قربانی سے دریغ نہیں کیا۔ گویا مضمون کی علویت جس زورِ بیان کا تقاضا کرتی تھی وہ قصیدے کی معنوی اور ہیئتی فضا سے قریب تر تھا۔ کسی بھی کامیاب قصیدے کو صوتی اعتبار سے دیکھیے تو پابند قوافی یعنی مصمتوں پر ختم ہونے والے ارکان کی بجتی ہوئی زنجیر نظر آئے گا۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر انیس کی فصاحت کی انتخابی نظر قصیدے کے اس بنیادی تقاضے

سے صرف نظر نہیں کر سکتی تھی۔ اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد اب اس بات کا جاننا آسان ہے کہ انیس کا اصل کمال یہ ہے کہ قصیدے کی روح کو اپناتے ہوئے بھی اور پابند قوافی CLOSE RHYMES میں بند کہتے ہوئے بھی انھوں نے زبان کو کہیں بوجھل نہیں ہونے دیا بلکہ شوکت و بلند آہنگی کے ساتھ سلاست و روانی کو بھی بنائے رکھا اور بیت کی غزلیہ لے کی نرم روی سے مرثیے میں قصیدے اور غزل کی آمیزش سے ایک نئی جمالیاتی اور اسلوبیاتی سطح کا اضافہ کیا۔ انیس کی فصاحت اسی نئی اسلوبیاتی اور جمالیاتی سطح سے عبارت ہے۔

یہاں فوری طور پر یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ انیس کے بندوں کے جن پابند قوافی کی طرف اشارہ کیا گیا، یہ کیفیت ان کے تمام مراثی میں قدرِ مشترک کا درجہ رکھتی ہے یا صرف چند بندوں تک محدود ہے۔ مثلاً مشہور مراثی کے جو مصرعے ذہن میں آتے ہیں، وہ پابند قوافی والے نظریے کی تردید کرتے ہیں:

جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے

کیا غازیانِ فوجِ خدا کام کر گئے

جب رن میں سر بلند علی کا علم ہوا

پھاڑا جو گریباں شبِ آفت کی سحر نے

دشتِ وفا میں نورِ خدا کا ظہور ہے

کیا فوجِ حسینی کے جوانانِ حسیں تھے

جب خاتمہ بخیر ہوا فوجِ شاہ کا

ان مصرعوں سے یہ خیال ہوتا ہے کہ پابند قوافی کے جس مقدمے کو اوپر پیش کیا گیا ہے وہ صحیح نہیں، کیونکہ مندرجہ بالا مشہور مراثی کے مطلعوں سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ چنانچہ مراثیِ انیس کی چاروں نول کشوری جلدوں سے مدد لی گئی تاکہ مندرجہ بالا مقدمے کی صحت یا عدم صحت کے بارے میں قطعی رائے قائم کی جا سکے۔ ان چاروں جلدوں میں مراثی کی کل تعداد اور پابند و آزاد اصوات پر ختم ہونے والے قوافی کی تقسیم درج ذیل ہے:

جلد اول میں کل مراثی ۲۹ ہیں، جن میں ۲۲ آزاد اور ۷ پابند قوافی سے شروع ہوتے ہیں

جلد دوم " " ۲۶ " " " ۱۹ " " ۷ " " " "

جلد سوم " " ۱۸ " " " ۱۵ " " ۳ " " " "

جلد چہارم " " ۳۳ " " " ۲۶ " " ۷ " " " "

کل میزان: ۱۰۶ ۸۲ ۲۳

اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ پابند قوافی والے بندوں کی تعداد ایک چوتھائی سے بھی کم ہے اور مسدس کے بند کی جس پابند ساخت پر ہم زور دے رہے تھے، وہ گمراہ کن ہے۔ لیکن حقیقتاً ایسا نہیں۔ یہاں ہمیں اس بات سے دھوکا ہوا ہے کہ یہ اوسط صرف اُن بندوں کا ہے جن سے مراثی کا آغاز ہوا ہے۔ بعد میں آنے والے بندوں کا نہیں۔ یہ جان کر حیرت ہوگی کہ بعد میں آنے والے سینکڑوں بندوں کی کیفیت بالکل دوسری ہے۔ اس گوشوارے سے اتنی بات تو بہر حال ثابت ہو ہی گئی کہ انیس اپنے اکثر مراثی کی اٹھان کھلے قوافی والے بندوں یعنی مصوتوں سے کرتے ہیں لیکن جیسے جیسے طبیعت زور مارنے لگتی ہے اور تخیل جولانیوں پر آتا ہے تو وہ شعوری یا تحت الشعوری طور پر قصیدے کی روح سے ہم کنار ہو جاتے ہیں اور پابند قوافی یعنی مصمتوں کا استعمال کرتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ کھلے ہوئے قوافی والے بند آتے ہی نہیں، آتے ہیں اور ضرور آتے ہیں۔ لیکن انیس کا غالب رجحان پابند قوافی یعنی مصمتوں کی طرف ہے۔

مراثیِ انیس میں بندوں کی ان دو شکلوں کے علاوہ جس کا ذکر اوپر کیا گیا یعنی پابند اور آزاد، ایک شکل اور بھی ملتی ہے یعنی کہنے کو تو یہ بند مردّف ہیں لیکن قافیہ ان میں بھی پابند ہے یعنی مصمتے پر ختم ہوتا ہے، جیسا کہ ذیل کے بندوں میں، قامت، صورت، صولت، ہمت پیکر، برابر، پر، باہر، وغیرہ سے ظاہر ہے:

سروِ شرمائے قد اس طرح کا قامت ایسی
اسد اللہ کی تصویر تھے صورت ایسی
شیر نعروں سے دہل جاتے تھے صولت ایسی
جا کے پانی نہ پیا نہر پہ ہمت ایسی
جان جب تک تھی اطاعت میں رہے بھائی کی
تھے علم دار مگر بچوں کی سقائی کی

ابر ڈھالوں کا اٹھا تیغِ دو پیکر چمکی
برق چھپتی ہے یہ چمکی تو برابر چمکی
سوئے پستی کبھی کوندی کبھی سر پر چمکی
کبھی انبوہ کے اندر کبھی باہر چمکی
جس طرف آئی وہ ناگن اُسے ڈستے دیکھا
مینھ سروں کا صفِ دشمن میں برستے دیکھا

اس طرح کے بند بھی دراصل پابند قوافی ہی کی ذیل میں آتے ہیں۔

اس نظر سے دیکھیے تو زیرِ نظر مرثیہ "نمکِ خوانِ تکلم ہے فصاحت
ری" میں پابند و آزاد بندوں میں ذیل کا تناسب ہے:

کل بند	۱۰۲
پابند قوافی والے بند	۵۵
کھلے/آزاد قوافی والے بند	۴۷

ں غالب رجحان پابند قوافی والے بندوں کا ہے۔ لیکن یہ صرف
ـ مرثیے کی کیفیت ہے۔ یہ مقدمہ اس وقت تک پایۂ ثبوت کو
ں پہنچ سکتا جب تک دوسرے مراثی سے بھی اس کی توثیق نہ
ائے۔ مزید تجزیے کے لیے ہم نے انیس کے ایک اور شاہکار
یے "جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے" کا انتخاب کیا۔
ں کے تجزیے کے نتائج حسب ذیل ہیں:

کل بند	۱۹۴
پابند قوافی	۱۴۰
کھلے قوافی	۵۴

ب ان دونوں مرثیوں سے ذیل کا اوسط حاصل ہوا:

کل بند	۱۰۲ + ۱۹۴ = ۲۹۶
پابند قوافی	۵۵ + ۱۴۰ = ۱۹۵
کھلے قوافی	۴۷ + ۵۴ = ۱۰۱

یا پابند قوافی والے بند کل بندوں کا ۶۶ فیصد یعنی دو تہائی ہوئے۔
دو مشہور مرثیوں کی کیفیت ہے۔ اس مقدمے کو حتمی طور پر ثابت
رنے کے لیے ہم نے نول کشوری مراثیِ انیس کی چاروں جلدوں کی مدد
اور ہر جلد سے پانچ پانچ مرثیوں کو کہیں کہیں سے بغیر کسی تخصیص
کے کھول کے دیکھا۔ اس طرح کے اتفاقی RANDOM اور غیر ارادی
زیے سے جو نتائج سامنے آئے وہ حسب ذیل ہیں:

جلد اول: ص ۶۲ — ۶۳ = ۱۵ + ۳
ص ۱۹۵ — ۱۹۴ = ۱۰ + ۸
ص ۲۶۱ — ۲۶۰ = ۱۳ + ۵
ص ۳۱۱ — ۳۱۰ = ۹ + ۹
ص ۳۳۹ — ۳۳۸ = ۱۳ + ۵
کل بند ۹۰ = ۶۰ پابند ۳۰ آزاد

جلد دوم: ص ۶۵ — ۶۴ = ۱۲ + ۶
ص ۱۳۱ — ۱۳۰ = ۱۱ + ۷
ص ۲۰۱ — ۲۰۰ = ۷ + ۱۱
ص ۲۶۳ — ۲۶۲ = ۱۲ + ۶
ص ۲۹۹ — ۲۹۸ = ۷ + ۱۱
کل بند ۹۰ — ۴۹ پابند ۴۱ آزاد

جلد سوم: ص ۲۱ — ۲۰ = ۱۴ + ۱۰
ص ۳۳ — ۳۲ = ۱۲ + ۶
ص ۶۳ — ۶۲ = ۶ + ۱۲
ص ۱۴۷ — ۱۴۶ = ۱۳ + ۵
ص ۲۱۱ — ۲۱۰ = ۱۳ + ۵
کل بند ۹۰ = ۵۸ پابند ۳۲ آزاد

جلد چہارم: ص ۴۸ — ۴۹ = ۶ + ۱۲
ص ۱۱۱ — ۱۱۰ = ۹ + ۹
ص ۱۴۹ — ۱۴۸ = ۹ + ۹
ص ۲۰۹ — ۲۰۸ = ۱۰ + ۸
ص ۲۷۹ — ۲۷۸ = ۱۴ + ۴
کل بند ۹۰ — ۴۸ پابند ۴۲ آزاد

	۵۸ پابند	۳۲ آزاد
	۴۹ "	۴۱ "
	۶۰ "	۳۰ "
میزان کل بند ۳۶۰	۲۱۵ "	۱۴۵ "

اوسط - ۶۰ فیصد

نول کشوری جلدوں میں ہر صفحے پر نو بند ہیں۔ گویا آمنے سامنے کے دو صفحوں پر اٹھارہ بند ہوئے۔ ہر جلد کو پانچ جگہ سے کھولا گیا۔ گویا ۱۸×۵ = ۹۰ بند ہر جلد سے لیے گئے۔ اس طرح چار جلدوں سے بندوں کی کل تعداد ۳۶۰ ہوئی جن میں ۲۱۵ میں پابند قوافی اور ۱۴۵ میں کھلے قوافی ہیں، ان کا اوسط ۶۰ فی صد کا ہوا۔ گویا "نمکِ خوانِ تکلم ہے فصاحت میری" اور "جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے" کے دو مشہور مرثیوں کے تجزیے کی مدد سے ہم نے جو مقدمہ پیش کیا تھا اب گویا تمام جلدوں سے نمونے کے طور پر لیے گئے اتفاقی تجزیے سے بھی اس مقدمے کی توثیق ہو گئی یعنی مراثیِ انیس کے بندوں کا غالب رجحان پابند اصوات یعنی مصمتوں کی طرف ہے یعنی اگر یہ کہا جائے کہ قصیدے کی روح نے انیس کے مراثی میں ایک نیا قالب اختیار کیا تو بے جا نہ ہوگا۔ اب مسدس کی بیتوں یعنی آخر میں آنے والے دو مصرعوں کو بھی لیجیے جن کی کھلی ردیفوں اور منہ بولتے مصوتوں یا غنیت کا سیدھا سیدھا رشتہ غزل کے ہیئتی فیضان سے جڑ جاتا ہے۔ غزل کا کوئی دیوان اٹھا کر دیکھیے اگر شاعر کا مقصد محض سنگلاخ زمینوں کو پانی کرنا نہیں تو اشعار کی زیادہ تعداد کھلے اصوات یعنی مصوتوں والے قوافی و ردیف میں ملے گی یعنی الف، واو، اور ی/ے کی ذیل میں یا نون (غنہ) میں جو الف، واو اور ی/ے کے ساتھ آتا ہے بعینہٖ یہی صوتی کیفیت انیس کی بیتوں کی ہے۔ انیس کے جن دو مرثیوں کا ذکر اوپر کیا گیا ہے ان کی ۱۹۴ + ۱۰۲ = ۲۹۶ بیتوں

میں سے ایک بھی بیت ایسی نہیں ہے جس میں کھلی یعنی مصوتوں پر ختم ہونے والی ردیف نہ ہو۔ ان بیتوں کے سلسلے میں چند باتیں خصوصیت سے توجہ چاہتی ہیں:

۱۔ بیت میں ردیف کا التزام ہر جگہ ہے۔
۲۔ ردیفوں میں کھلی اصوات کا استعمال کیا گیا ہے۔
۳۔ بیت میں افعال لازماً آتے ہیں۔
۴۔ ردیف اکثر و بیشتر اگر فعل پر نہیں تو حرفِ جار پر ختم ہوتی ہے۔

ان نکات کی وضاحت کے لیے ذیل کے بند ملاحظہ ہوں:

کٹ گئی تیغ تلے جب صفِ دشمن آئی
یک بیک فصلِ فراقِ سر و گردن آئی
بجلی اس طرح لڑائی کہ نہ کچھ بن آئی
تیغ کیا آئی کہ اُڑتی ہوئی ناگن آئی
غل تھا بھاگو کہ یہ ہنگام ٹھہرنے کا نہیں
زہر اس کا جو چڑھے گا تو اترنے کا نہیں

کہہ کے یہ باگ پھرائی طرفِ لشکرِ شام
پڑ گیا خیمۂ ناموسِ نبی میں کہرام
رن میں گھوڑے کو اڑاتے ہوئے آئے جو امام
رعب سے فوج کے دل ہل گئے کانپے اندام
سر جھکے ان کے جو کامل تھے زباں دانی میں
اڑ گئے ہوش فصیحوں کے رجز خوانی میں

یک بیک طبل بجا فوج میں گرجے بادل
کوہ تھرائے زمیں ہل گئی گونجا جنگل
پھول ڈھالوں کے چمکنے لگے تلواروں کے پھل
مرنے والوں کو نظر آنے لگی شکلِ اجل
واں کے چاؤش بڑھانے لگے دل لشکر کا
فوجِ اسلام میں نعرہ ہوا یا حیدر کا

اوپر کے تینوں بندوں میں ردیف ہر بیت میں ہے اور ہر جگہ کھلی ہوئی ہے۔ "نہیں" اور "میں" میں غنیت ہے۔ اب فعل کو دیکھیے: اوپر کے چار مصرعوں اور بیت کے دو مصرعوں کے افعال کی بندش میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ پہلے بند میں "آئی" فعل ہے جس کی چاروں مصرعوں میں تکرار ہے۔ آخری دو مصرعوں کا انداز بالکل دوسرا ہے۔ یہ دونوں مصرعے امدادی فعل "تھا" پر ٹکے ہوئے ہیں اور دونوں مصرعوں میں فعل مکمل ہے۔ انیس کی اکثر بیتوں میں یہ ہوتا ہے کہ اوپر کے چار مصرعوں میں فعل کی جو بھی صورت رہی ہو، بیت میں آکر وہ اپنی تکمیل کو پہنچتی ہے یا اپنا قالب بدل کے مکمل صورت میں سامنے آتی ہے۔

اوپر کی دوسری بیت میں "سر جھکے" "اڑ گئے" اور تیسری بیت میں "بڑھانے لگے" "نعرہ ہوا" نہ صرف اوپر کی چار چار مصرعوں کی فعلیہ فضا سے اسلوبیاتی طور پر مختلف ہیں بلکہ فعلیہ سطح پر ہر لحاظ سے مکمل بھی ہیں۔ اور اس انداز سے نہ صرف بند کی معنیاتی فضا کی بلکہ اسلوبیاتی اکائی کی بھی تکمیل ہوتی ہے۔ اس کا کچھ اندازہ ذیل کی بیتوں کو بندوں کے ساتھ پڑھنے سے ہوگا:

پھولا شفق سے چرخ پہ جب لالہ زارِ صبح
گلزارِ شب خزاں ہوا آئی بہارِ صبح
کرنے لگا فلک زرِ انجم نثارِ صبح
سرگرمِ ذکرِ حق ہوئے طاعت گزارِ صبح
تھا چرخِ اخضری پہ یہ رنگ آفتاب کا
کھلتا ہے جیسے پھول چمن میں گلاب کا

چلنا وہ بادِ صبح کے جھونکوں کا دمبدم
مرغانِ باغ کی وہ خوش الحانیاں بہم
وہ آب و تابِ نہر وہ موجوں کا پیچ و خم
سردی ہوا میں پر نہ زیادہ بہت نہ کم
کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

باچشمِ نم وہاں سے بڑھے آپ چند گام
گویا زمیں کی سیر کو اترا مہِ تمام
مثلِ نجوم گرد تھے حیدر کے لالہ فام
شکلیں وہ نور کی وہ تجمل وہ احتشام
زلفیں ہوا سے ملتی تھیں ہاتھوں میں ہاتھ تھے
لڑکے بھی بند کھولے ہوئے ساتھ ساتھ تھے

ٹھنڈی ہوا میں سبزۂ صحرا کی وہ لہک
شرمائے جس سے اطلسِ زنگاریِ فلک
وہ جھومنا درختوں کا پھولوں کی وہ مہک
ہر برگِ گل پہ قطرۂ شبنم کی وہ جھلک
ہیرے خجل تھے گوہرِ یکتا نثار تھے
پتے بھی ہر شجر کے جواہر نگار تھے

خیمے میں جا کے شہ نے یہ دیکھا حرم کا حال
چہرے تو فق ہیں اور کھلے ہیں سروں کے بال
زینب کی یہ دعا ہے کہ اے ربِ ذوالجلال
بچ جائے اس فساد سے خیر النسا کا لال
بانوئے نیک نام کی کھیتی ہری رہے
صندل سے مانگ بچوں سے گودی بھری رہے

ِبیتوں کے مطالعے سے یہ بات پوری طرح واضح ہوجاتی ہے کہ
. کا خاتمہ یاتو امدادی فعل پر ہوتا ہے یا فعل پر یا پھر حروفِ جار پر۔
سب الفاظ (افعال ہوں یا حروفِ جار) کھلی اصوات پر ختم ہوتے
ں۔ انیس کے ہاں غیر مردّف بیتیں سرے سے ہیں ہی نہیں۔ البتہ
دکا پابند ردیفیں آئی ہیں۔ ان کا تناسب یہ ہے: پہلے مرثیے کی کل
۱ بیتوں میں سے پابند ردیفیں صرف ۵ ہیں۔ اسی طرح دوسرے
رثیے کی کل ۱۹۴ بیتوں میں سے پابند ردیفیں صرف ۱۳ ہیں۔ گویا دونوں
رثیوں کی ۱۰۲ + ۱۹۴ = ۲۹۶ بیتوں میں سے صرف ۵ + ۱۳ = ۱۸
بند ردیفوں میں ہیں۔ یہ کل بیتوں کا ۶ فیصد سے زیادہ نہیں۔
ں اوسط کی مزید تصدیق ہم نے بیس مختلف مراثی کے ان ۳۶۰ بندوں
ی بیتوں سے بھی کی جس کا تذکرہ پہلے کیا جاچکا ہے۔ ان کے نتائج
سے بھی اسی بات کی توثیق ہوئی۔

پہلی جلد	۹۰	:	۶
دوسری جلد	۹۰	:	۵
تیسری جلد	۹۰	:	۷
چوتھی جلد	۹۰	:	۵
میزان	۳۶۰	:	۲۳ : اوسط ۶ فی فیصد

یعنی ۳۶۰ بیتوں میں صرف ۲۳ پابند ردیفوں میں ہیں، اور اس اوسط کے پیشِ نظر اب اس وضاحت کی ضرورت نہیں رہتی کہ بیتوں کا صوتی رجحان بندوں کے صوتی رجحان کے بالکل برعکس ہے، یعنی وہاں پابند قوافی اور مصمتوں پر زور تھا تو یہاں آزاد قوافی یعنی مصوتوں کی کثرت ہے۔ گویا بالکل دن اور رات کی کیفیت ہے۔ ہر چار مصرعوں کے بعد جب قافیہ بدلتا ہے تو ایک زبردست اندرونی موسیقیت اور ڈرامائیت پیدا ہوتی ہے۔ بندوں میں شوکت، دبدبہ، بلند آہنگی اور جلال ہے تو بیتوں میں جمال، رس اور لطافت ہے۔ بندوں میں اٹھان اور بیان ہے تو بیتوں میں تکملہ اور رفاکے کی کیفیت ہے۔ بندوں کے مصمتے جب بیتوں کی کھلی آوازوں اور مصوتوں میں ڈھلتے ہیں تو عجیب خوش آہنگی اور جمالیاتی کیف کا احساس ہوتا ہے۔ یہ ہے قصیدے اور غزل کی روح کا وہ ملاپ جس کی طرف شروع میں اشارہ کیا گیا تھا کہ اس نے انیس کے یہاں ایک اچھوتا اسلوبیاتی پیکر اختیار کیا اور فصاحت کے قدیم تصور کو ایک نئی شعری جہت سے آشنا کیا۔

اس ساری بحث میں اب تک ہم نے دبیر کو نظر انداز کیا ہے۔ ہمارے مقدمے پر ابھی یہ سوال قائم کیا جاسکتا ہے کہ مراثیِ انیس کی جس امتیازی خصوصیت پر ہم اصرار کر رہے ہیں اور جسے انیس کی فصاحت کے ملفوظی اجزائے ترکیبی کا جزوِ لازمی قرار دے رہے ہیں، وہ کہیں مسدس ہی کی خصوصیت نہ ہو۔ یعنی قصیدے اور غزل کے ہیئتی عناصر کی آمیزش اور مصمتوں اور مصوتوں کا صوتی ٹکراؤ اور جھنکار کہیں مسدس ہی کی فارم کی بدولت نہ ہو، اور تمام مسدس کہنے والوں میں یہ خصوصیت جزوِ مشترک COMMON DENOMINATOR کی حیثیت نہ رکھتی ہو۔ اس صورت میں اس کا حقِ تحسین CREDIT مسدس کی ہیئت کو ملنا چاہیے نہ کہ انیس کے فن کو۔ چنانچہ ضروری ہے کہ اس ضمن میں انیس کے مسدس کا موازنہ دبیر کے مسدس سے کیا جائے۔ کیونکہ اگر یہ خصائص مسدس کے ہیں یعنی ان کا وقوع مسدس میں بالقوۃ موجود LATENT ہے تو دونوں میں مشترک ہوں گے اور اس بارے میں انیس کا کچھ امتیاز نہ ہوگا، اور اگر ان کا تعلق شاعر کے جوہرِ ذاتی اور ذہنِ تخلیقی سے ہوگا تو دونوں کے یہاں اس ضمن میں جو کچھ مابہ الامتیاز ہوگا، وہ ظاہر ہوکر سامنے آجائے گا۔ اودھ اخبار کی جلدوں یا نول کشوری جلدوں کی غیر موجودگی میں "شعارِ دبیر" مرتبہ مہذب لکھنوی (جس میں دبیر کے چھ بہترین مراثی شامل ہیں) اور "شاعرِ اعظم مرزا سلامت علی دبیر" مولفہ ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری سے مدد لی گئی جس میں دبیر کا مرثیہ "ذرہ ہے آفتاب در بوتراب کا" شامل ہے۔ ان کی مدد سے مراثیِ دبیر کے تجزیے کی جو کیفیت سامنے آئی درج ذیل ہے:

ذرہ ہے آفتاب در بوتراب کا	: کل بند ۱۸	پابند قوافی والے بند	۳۱
جب ماہ نے نوافل شب کو ادا کیا	: " ۱۵۳	"	۶۹
کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے	: " ۱۳۲	"	۳۸
	" ۳۶۶	"	۱۳۸ = ۳۸ فیصد

اتفاقی تجزیہ "شعارِ دبیر"

(ہر دسواں صفحہ، کل پندرہ بار، فی صفحہ پانچ بند	: ۱۵۰	"	۳۱ = ۲۱ فیصد

اب اس تجزیے سے یہ نہایت دلچسپ اور ناقابلِ تردید حقیقت سامنے آتی ہے کہ پابند قوافی والے بندوں کے استعمال پر دبیر کو وہ قدرت نہیں یا ان کی طبیعت کو پابند قوافی والے بندوں سے وہ نسبت نہیں جو انیس کو ہے۔ انیس کے یہاں پابند قوافی والے بندوں کا استعمال ۶۰ سے ۶۶ فیصد یعنی تقریباً دو تہائی ہے جبکہ دبیر کا RANGE ۲۱ فیصد سے ۳۸ فیصد ہے یعنی تقریباً ایک تہائی۔ اسی نسبت سے دونوں کے فن میں علاوہ دوسرے شعری عوامل کے جو بنیادی ہیئتی اور صوتی فرق ہے، یعنی پابند و آزاد قوافی کے ٹکراؤ کا، نیز تبدیلِ اصوات کے مخصوص زیر و بم اور صوتی جھنکار سے جو جمالیاتی کیفیت پیدا ہوتی ہے، وہ اسی اعتبار سے دبیر کے یہاں کم ہے۔ دبیر کے یہاں یہ خصوصیت اگرچہ موجود ہے، لیکن اس ہمہ گیر اور اعلیٰ پیمانے پر نہیں جیسی انیس کے یہاں ہے۔ نیز اس سے یہ حقیقت

ر سامنے آتی ہے کہ پابند قوافی والے بندوں کا استعمال مسدس کے رم کی ناگزیر کیفیت نہیں، ورنہ دونوں کے یہاں ان کا اوسط کم و بیش ب جیسا ہوتا۔

اس تجزیے سے انیس و دبیر کے فن کا فرق (صوتی حد تک) تو ضح طور پر سامنے آگیا لیکن جہاں تک مسدس کے فارم کا تعلق ہے می اس کو مزید جانچنے کی ضرورت ہے۔ بالخصوص مرثیے سے ہٹ کر ن شعرا نے مسدس کو برتا ہے، ان کے یہاں بھی یہ دیکھ لینا چاہیے کہ سدس کی کیا کیفیت ملتی ہے اور پابند و آزاد قوافی والے بندوں کی یا نوعیت ہے۔ اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے ہم نے جوہ حالی اور چکبست کا انتخاب کیا کیونکہ انیس کے بعد ان دونوں ے مسدس کے فارم کو جس کامیابی سے برتا ہے اس کی دوسری مثال یں ملتی۔ مسدس حالی چونکہ مسلسل نظم ہے، اور خاصی طویل، اس لیے بہتر طریقہ یہی تھا کہ اس کا اتفاقی تجزیہ کیا جائے۔ اس سے جو چسپ نتائج سامنے آئے درج ذیل ہیں:

صفحہ	پابند قوافی والے بند
مسدس حالی صدی ایڈیشن مرتبہ ڈاکٹر سید عابد حسین طبع لاہور ۱۹۵۷ء	
۸۰	۲
۹۰	۱
۱۰۰	۲
۱۱۰	۰
۱۲۰	۲
۱۳۰	۱
۱۴۰	۰
۱۵۰	۲
۱۶۰	۰
۱۷۰	۱
۱۸۰	۱
۱۸۵	۳
۱۷۵	۱
۱۶۵	۲
۱۵۵	۱

کل بند ۶۰ : پابند ۱۹ : اوسط ۳۲ فیصد

ہر صفحے پر چار بند ہیں۔ اس طرح پندرہ صفحوں پر کل ساٹھ بند ہیں۔ ، میں پابند قوافی والے بند صرف ۱۹ نکلے، یعنی ایک تہائی سے بھی کم۔ انیس کے اوسط سے آدھا ہوا۔ اس پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں (البتہ اس کمی کو حالی ایک اور طرح سے پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یعنی ان کے یہاں ۶۰ بیتوں میں سے ۱۵ پابند ہیں جو بالکل الگ بات ہے۔ انیس کے یہاں بیتیں بالعموم آزاد اور کھلی ہوئی ہیں)۔ اب ذرا چکبست کو ملاحظہ فرمایئے۔ ان کے یہاں "رامائن کا ایک سین" سے بہتر مسدس نہیں، سو اسی کو لیا گیا۔ کل بند ۳۳، پابند قوافی ۲۴ اور ۳۳ بیتوں میں سے سوائے ایک کے سب آزاد اور کھلی ہوئی۔ کیا اس کے بعد یہ بتلانے کی ضرورت باقی ہے کہ چکبست کا مسدس انیس سے کتنا قریب ہے، اور چکبست کے بارے میں وہ بات جو تاثراتی یا جمالیاتی طور پر کہی جاتی ہے کہ چکبست کا فن انیس سے شدید طور پر متاثر ہے، اس کی کیسی واضح معروضی بنیاد اس تجزیے سے سامنے آجاتی ہے۔ نیز اب اس بارے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ پابند قوافی والے بندوں کا کوئی مقررہ فی صد مسدس کے فارم کے لیے ناگزیر نہیں۔ مسدس کو برتنے والے مختلف شعرا کے یہاں اس کا اوسط مختلف ہے، یعنی کسی خاص تعداد میں پابند قوافی والے پہلے چار مصرعوں کا وقوع مسدس کے فارم کا COMMON DENOMINATOR نہیں۔ دبیر اور حالی کے یہاں ان کا وقوع بالعموم ایک تہائی ہے جبکہ انیس کے یہاں دو تہائی۔ یہ فرق معمولی فرق نہیں، اور یہ امتیاز مسدس کو برتنے والے تمام شعرا میں صرف انیس کو حاصل ہے۔ انیس نے ایک جگہ کیا اچھا اشارہ کیا ہے:

بزم کا رنگ جدا رزم کا میداں ہے جدا
یہ چمن اور ہے زخموں کا گلستاں ہے جدا
فہم کامل ہو تو ہر نامے کا عنواں ہے جدا
مختصر پڑھ کے رلا دینے کا ساماں ہے جدا

دبدبہ بھی ہو مصائب بھی ہوں توصیف بھی ہو
دل بھی محظوظ ہوں رقت بھی ہو تعریف بھی ہو

انیس "بزم" اور "رزم" کے رمز آشنا تھے۔ بین و بکا کو انھوں نے "مختصر پڑھ کے رلا دینے" تک محدود رکھا۔ "مصائب" اور "رقت" کے ساتھ ساتھ انھیں اس بات کا بطورِ خاص خیال تھا کہ "دل بھی محظوظ ہوں" جو غزل کا وصف ہے، اور "دبدبہ" بھی ہو "توصیف" بھی ہو اور "تعریف" بھی، جو قصیدے کا منصب ہے۔ انیس نے جس طرح بند کے پہلے چار مصرعوں میں قصیدے کے زورِ بیان اور دبدبے کو اور بیتوں میں غزل کی لطافت اور نرمی کو باہم مربوط کر کے جو خوش آہنگی، جمالیاتی حسن اور صوتی اور معنیاتی کیفیت پیدا کی، وہ ان کے فن سے مخصوص ہے، اور یہ جزو لاینفک ہے اس فصاحت کا جس کے قدیم مفہوم کو انھوں نے وسعت دی، اور جس کا اثر بعد کی اردو شاعری پر برابر محسوس ہوتا رہا ہے۔

فروری ۱۹۸۱ء

آج کل نئی دہلی

ابوالکلام آزاد

کی

ابتدائی صحافتی زندگی

عتیق احمد صدیقی

ابوالکلام آزاد کی صحافت کا ذکر آتے ہی ہمارا ذہن عموماً الہلال و البلاغ کی طرف منتقل ہوتا ہے جو ان کی صحافتی زندگی کے شباب کا، یا ان کے قلم کے جمال و جلال کا موثر ترین مظاہرہ تھا۔ لیکن ان دونوں اخباروں کے اجرا سے قبل صحافت کی جو ابتدائی منزلیں انہوں نے سر کی تھیں، ان کا جائزہ لینا بھی دل چسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ان کی ہمہ جہت شخصیت کا یہ پہلو حد درجہ حیرت ناک ہے کہ اس کے جس گوشے پر نظر ڈالی جائے یہی گمان ہوتا ہے کہ وہ اسی کے لیے بنائے گئے تھے۔ ان کی صحافت بھی اس سے مستثنا نہیں ہے، جو اس اعتبار سے بھی منفرد حیثیت رکھتی ہے کہ اس کا آغاز شاعری سے ہوا۔ گیارہ برس کی عمر میں، ۱۸۹۹ء میں انہوں نے مشق سخن شروع کی ۔۔ اسی سال اپنے ذوقِ شعر گوئی کی تسکین کے لیے انہوں نے نیرنگ عالم کے نام سے ایک گلدستے کا اجرا کر دیا۔ اسی گلدستے سے ان کی صحافتی زندگی کی داغ بیل پڑی۔

صحافت سے ابوالکلام آزاد کا غیر معمولی شغف اس لحاظ سے بھی حیرت ناک ہے کہ اس فن کا ذوق نہ تو انہیں ورثے میں ملا تھا اور نہ ان کے گرد و پیش کے حالات ہی اس کے لیے سازگار تھے۔ زندگی کے ابتدائی ماہ و سال تو انہوں نے ایسے ماحول میں بسر کیے تھے جس میں اخبار بینی کے مواقع بھی انہیں حاصل نہیں تھے۔ ان کے گھر کا ماحول خالص دینی اور حد درجہ غیر ادبی تھا۔ تاہم ان کی صحافتی و ادبی زندگی پر نظر ڈالی جائے تو محسوس ہوگا کہ یہ دونوں چیزیں ان کی گھٹی میں پڑی تھیں۔ ان کا یہ بیان ان کی صحافتی زندگی پر بھی صادق آتا ہے:

> اپنی زندگی کے ابتدائی حالات پر نظر ڈالتا ہوں، تو بڑی حیرانی میں پڑ جاتا ہوں۔ فکر و طبیعت کی کتنی ہی بنیادی تبدیلیاں ہیں جن کا کوئی خاص سرچشمہ دکھائی نہیں دیتا اور جو گرد و پیش کے تمام موثرات سے کسی طرح بھی جوڑے نہیں جا سکتے ... خاندان، تعلیم، ابتدائی گرد و پیش، کوئی گوشہ بھی میل کھاتا دکھائی نہیں دیتا۔ فکری موثرات کے جتنے بھی احوال و ظروف ہو سکتے ہیں، ان میں سے ایک ایک کو سامنے لاتا ہوں اور اپنے کو ڈھونڈتا ہوں، مگر مجھے اپنا سراغ کہیں نہیں ملتا ...

یہ بھی کم حیرت ناک نہیں ہے کہ یہی قول ان کی بہنوں پر، خصوصاً ان کے بڑے بھائی غلام یٰسین آہ پر بھی صادق آتا ہے۔ ان سب نے بھی خاندانی ڈگر سے ہٹ کر علمی و ادبی مشغلے اختیار کیے۔ خدنگ نظر (لکھنو) کے ۱۹۰۰ء کے شماروں میں اور بعد کے برسوں کے شماروں میں بھی ابونصر آہ کی غزلیں اور نثری مضامین ملتے ہیں۔ خدنگ نظر کے اسی دور کے شماروں میں ان کی بہن آبرو بیگم کا نام نظر آتا ہے۔ ۱۹۰۵ء نیز ۱۹۰۷ء کے تہذیب نسواں میں آبرو بیگم اور ان کی دوسری بہن فاطمہ بیگم کے مراسلے ملتے ہیں۔ غلام یٰسین آہ کا عین عالم جوانی میں انتقال ہوا۔ خدنگ نظر اور مخزن میں ان کی نظم و نثر کے جو نمونے نظر آتے ہیں ان سے گمان ہوتا ہے کہ آہ کی زندگی اگر وفا کرتی تو علمی و ادبی میدان میں وہ مولانا آزاد سے پیچھے نہ رہتے۔ سن شعور کو پہنچنے سے پہلے ہی، گیارہ برس کی عمر میں، شاعری اور شعر

مولانا آزاد میموریل سوسائٹی (حیدر آباد) کے سمینار منعقدہ جولائی ۱۹۷۸ء کے لیے یہ مقالہ لکھا گیا تھا۔
اب نظر ثانی اور حذف و اضافے کے بعد قارئین آج کل کے لیے نذر کیا جا رہا ہے۔

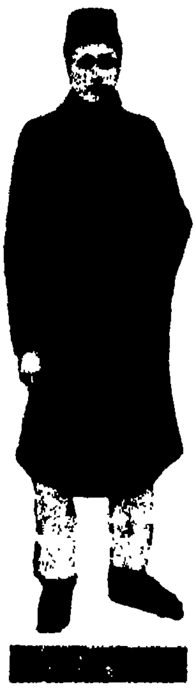

صحافت سے ابوالکلام آزاد جیسے انسان کا اپنی ادبی و صحافتی زندگی کا آغاز کرنا، زیادہ حیرت ناک نہیں ہے۔ غالب اور بعض دوسرے شعرا نے بھی اسی عمر میں مشق سخن شروع کر دی تھی۔ غلام رسول مہر جس زمانے میں غالب پر کام کر رہے تھے، ایک خط میں انہوں نے ابوالکلام آزاد سے استفسار کیا کہ: "آیا یہ درست ہے کہ مرزا غالب کے اشعار آگرے سے میر تقی میر کے پاس پہنچے تھے اور میر نے کہا تھا کہ اسے استاد کامل مل گیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا، ورنہ مہمل بکنے لگے گا۔ حالانکہ میر کی وفات کے وقت غالب کی عمر صرف تیرہ سال کی تھی۔" اس کے جواب میں انھوں نے لکھا تھا کہ:

> میر تقی میر والی حکایت مندرجہ یادگار غالب عام حالات میں تو ضرور مستبعد معلوم ہوتی ہے، مگر خاص خاص حالات میں غیر مستبعد نہیں... اس طرح کے تذکروں میں خود اپنا حال بیان کرنا ٹھیک معلوم نہیں ہوتا، لیکن محض رفع غرابت کے لیے لکھتا ہوں کہ خود میں نے اسی عمر میں شاعری شروع کر دی تھی۔ میری نثر نویسی کا آغاز بھی اسی عمر میں ہوا۔ غالباً یہ ۱۹۰۰ء یا ۱۹۰۱ء کی بات ہے... اگر میں اس عمر میں تک بندی کرنے لگا تھا تو غالب جیسی شخصیت کے لیے، جسے قدرت نے شاعری ہی کے لیے پیدا کیا تھا، یہ مستبعد کیوں ہو؟

بہر کیف گیارہ سال کی عمر میں ان کا ذوق شعرگوئی، خود ان ہی کے الفاظ میں، اس قدر بڑھا کہ انہیں "ایک گلدستہ نکالنے کا خبط ہوا" اور اس خیال سے وہ پھولے نہ سماتے کہ "عن قریب ایک ایسی چیز نکلے گی جس کی لوح پر میرا نام بہ حیثیت مہتمم و اڈیٹر درج ہوگا۔" ان جملوں سے ذوق شعرگوئی کے ساتھ ساتھ ان کے شوق ادارت کی نشان دہی بھی ہوتی ہے، جس کا ہمارے موضوع سے براہ راست تعلق ہے۔

ابوالکلام آزاد ہی کی وساطت سے ہماری معلومات میں اضافہ ہوتا ہے کہ نیرنگ عالم کا ۱۸۹۹ء میں اجرا ہوا تھا۔ ہمارے لیے اس کی اہمیت صرف یہ ہے کہ یہی گلدستہ ان کے لیے صحافت کا پہلا مکتب تھا۔ اس نے چند ہی مہینوں کی زندگی پائی۔ اس کا کوئی شمارہ اب تک مل نہیں سکا ہے۔ لیکن اس کی تلاش کی بھی اب تک کوئی منظم کوشش نہیں کی جا سکی ہے۔

نیرنگ عالم سے اگر قطع نظر کر لیا جائے تو آزاد کی شاعری کے ابتدائی نمونے ۱۹۰۰ء اور اس کے بعد کے خدنگ نظر (لکھنؤ) کے شماروں میں ملتے ہیں، جو انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز (نئی دہلی) میں محفوظ ہیں۔ یہ رسائل خود ان ہی کے مملوکہ تھے۔ پہلی غزل جنوری ۱۹۰۰ء کے شمارے میں ملتی ہے۔ پیشانی پر شاعر کا نام اس طرح لکھا گیا تھا: "آزاد۔ جناب مولوی غلام محی الدین صاحب دہلوی، وارد بمبئی" اس غزل کا یہ شعر ان کی شعرگوئی کی صلاحیت کا اچھا نمونہ فراہم کرتا ہے:

وقت نظارہ نہیں جمتی کبھی اس پر نگاہ
جوہر آئینہ ہے ظالم، تری تصویر بھی

لیکن ادبی زندگی میں شاعری کے ذوق کو وہ زیادہ دور تک ہم سفری کا موقع نہ دے سکے۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ بات جلد ہی ان کی سمجھ میں آگئی کہ 'ظرف تنگنائے غزل'، ان کے علمی و ادبی ذوق کی بلندی کا ساتھ نہ دے سکے گا۔ چناں چہ انھوں نے اپنے قلم کا رخ نثر کی طرف موڑ دیا۔ نیرنگ عالم کے بند ہونے کے چند ہی مہینوں کے بعد المصباح کے نام سے انہوں نے ہفتہ وار اخبار جاری کر دیا۔ لیکن یہ بھی شعلۂ مستعجل ثابت ہوا۔ اس کا بھی کوئی شمارہ، کم از کم راقم السطور کو اب تک مل نہیں سکا ہے۔

المصباح کے بند ہونے کے بعد ہی ابوالکلام آزاد نے اپنی قلمی سرگرمیوں کا رخ ماہنامہ خدنگ نظر کی طرف موڑا تھا، جسے نوبت رائے نظر لکھنوے نکالتے تھے۔ ابتدأ یہ بھی گلدستہ ہی تھا، لیکن جلد ہی اس میں نثر کے حصے کا بھی اضافہ کیا گیا تو نوعمر آزاد کے لیے مضمون نگاری کا ایک نیا میدان پیدا ہو گیا۔

مولوی عبدالرزاق کی روایت کے مطابق خدنگ نظر کے نثری حصے کی ادارت کے فرائض ابوالکلام آزاد ہی انجام دیتے تھے۔ راقم کو خدنگ نظر کے جو شمارے ملے ہیں، وہ ان کی ادارت کے ذکر سے خالی ہیں لیکن ملیح آبادی کی روایت کی بالواسطہ تصدیق شیخ عبدالقادر مدیر مخزن کے ایک تبصرے سے بھی ہوتی ہے۔ انھوں نے لسان الصدق پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "لکھنو کے ایک رسالے کی ترتیب کی خدمت بھی دیر تک ان کے سپرد رہی ہے۔" یہ اشارہ لکھنو کے خدنگ نظر ہی کی طرف ہو سکتا ہے۔

اس گلدستہ نما رسالے کے ۱۹۰۰ء کے شماروں کی ورق گردانی کی جائے تو یہ دلچسپ انکشاف ہو گا کہ ابوالکلام آزاد کا سارا گھرانا:

ایں خانہ تمام آفتاب است

کے مصداق تھا۔ اس سال کے ہر شمارے میں غلام یسین آہ کی غزلیں ملتی ہیں۔ مارچ کے پرچے میں ان کی بہن آبرو بیگم کی غزل بھی نظر آتی ہے۔ اسی پرچے سے ہماری معلومات میں یہ اضافہ بھی ہوتا ہے کہ آہ کو چودہ سال کی عمر میں استادی کا درجہ بھی حاصل ہو گیا تھا، اور ان کے شاگرد بھی تھے۔ چناں چہ ایک غزل کی پیشانی پر شاعر کا نام اس طرح درج ہے: "جناب شیخ احمد جنیدی، رئیس بمبئی شاگرد جناب آہ دہلوی"۔

اس وقت کی تحقیق کے مطابق ۱۹۰۲ء کو ابوالکلام آزاد کی نثر نگاری کا سال آغاز قرار دینا غلط نہ ہو گا۔ اس سال ان کے چار طویل اور اہم مضامین خدنگ نظر (لکھنو) اور مخزن (لاہور) میں تابڑ توڑ مندرجہ ذیل ترتیب سے شائع ہوئے۔

خدنگ نظر (اپریل مئی ۱۹۰۲ء): زمانۂ قدیم میں کبوتروں کی ڈاک

مخزن (مئی ۱۹۰۲ء): اخبار نویسی

مخزن (اگست ۱۹۰۲ء): حکیم خاقانی شروانی

خدنگ نظر (اکتوبر نومبر ۱۹۰۲ء) پنکچویشن

مخزن میں شائع شدہ مضامین صاحب مضمون کی وفات کے بعد متعدد جگہ دوبارہ وسہ بارہ شائع ہو چکے ہیں، لیکن خدنگ نظر کے مضامین کا جہاں تک تعلق ہے، نہ جانے کیوں، بڑی حد تک نظروں سے اوجھل رہے ہیں۔ اگرچہ مواد اور زبان و بیان کے اعتبار سے مخزن میں شائع ہونے والے مضامین پر فوقیت حاصل ہے۔

کبوتروں کی ڈاک والے مضمون کی پہلی قسط اپریل ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس لیے متذکرہ بالا مضامین میں اسے اولیت کا مرتبہ حاصل ہے۔ اس مضمون کی دوسری قابل ذکر خصوصیت یہ ہے کہ اس وساطت سے ہماری معلومات میں یہ اہم اضافہ ہوتا ہے کہ ۱۹۰۲ء کے اوائل میں آزاد کے نام کے ساتھ 'ابوالکلام' کا اضافہ ہو چکا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے قلم کے ساتھ 'زبان' سے بھی کام لینا شروع کر دیا تھا۔ یہ حیرت ناک نہیں ہے، کیوں کہ خطابت تو ان کو ورثے میں ملی تھی۔ ان کے والد مولوی خیرالدین اپنے زمانے کے اچھے واعظ اور خطیب تھے اور باپ ہی کی دیکھا دیکھی بیٹے نے بھی بچپن ہی سے اس فن کی مشق شروع کر دی تھی۔ 'آج کل' کے آزاد نمبر (ستمبر ۱۹۵۸ء) میں ان کی بڑی بہن کا ایک انٹرویو شائع ہوا تھا، جس میں انھوں نے بتایا تھا کہ ان کے بھائی کو بچپن ہی سے خطیب بننے کا شوق تھا۔ چناں چہ کبھی کبھی "وہ گھر میں کسی اونچی جگہ پر کھڑے ہو جاتے اور سب بہنوں کو آس پاس کھڑا کر کے کہتے کہ تم لوگ تالیاں بجاؤ اور سمجھو کہ ہزاروں آدمی میرے چاروں طرف کھڑے ہیں اور میں تقریر کر رہا ہوں اور لوگ میری تقریر سن کر تالیاں بجا رہے ہیں۔" بہرکیف یہ شاید ان کے ذوق خطابت ہی کا نتیجہ تھا کہ ان کا جو پہلا مضمون شائع ہوا اس کی پیشانی پر صاحب مضمون کا نام اس طرح لکھا گیا تھا: اثر خامہ مولوی ابوالکلام محی الدین آزاد دہلوی، مقیم کلکتہ۔

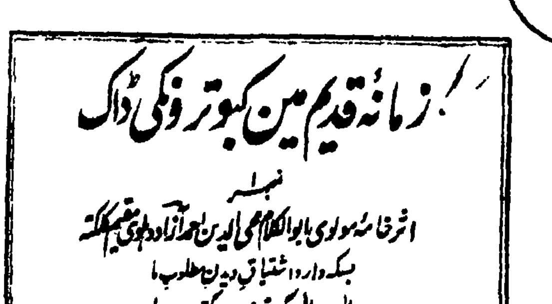
زمانۂ قدیم مین کبوترونکی ڈاک

نمبر ۱

اثر خامۂ مولوی ابوالکلام محی الدین احمد آزاد دہلوی مقیم کلکتہ

بسکہ دارد اشتیاق دیدن مطلوب ما

بال بر بال کبوتر می برد مکتوب ما

دنیا کی حیرت انگیز ایجادات نے جن لوگوں کو کسی خبر کے جلد حاصل کرنے کا خوگر بنا دیا ہے

[illegible]

خدنگ نظر میں شائع ہونیوالے مضمون کے ابتدائی حصے کا عکس

مولانا آزاد ۱۹۰۴ میں

ابوالکلام آزاد کا یہ پہلا مضمون جو خدنگ نظر کے ساڑھے گیارہ صفحات پر پھیلا تھا دو قسطوں میں شائع ہوا تھا۔ انھوں نے واضح الفاظ میں اس امر کا اعتراف کیا تھا کہ اس کا مواد عربی کی دو کتابوں سے اخذ کیا گیا ہے۔ لیکن اسے ترجمہ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ مواد کو انہوں نے بڑی خوش اسلوبی سے اپنایا تھا اور آخر میں فارسی و اردو شاعری میں کبوتروں کی نامہ بری کی روایت سے اس کا رشتہ جوڑا تھا۔ مضمون کی ابتدا اس طرح کی گئی تھی :

> ریل کی حیرت انگیز ایجاد نے جن لوگوں کو کسی خبر کے جلد حاصل کرنے کا عادی بنا دیا ہے تعجب میں ہوں گے کہ زمانۂ قدیم میں جب کہ نہ تو یہ قوتیں مجتمع ہوئی تھیں اور نہ یہ ڈاک کا انتظام تھا ضروری خبریں شہر بہ شہر کیسے پہنچتی رہی ہوں گی ...

آگے چل کر مضمون کے مآخذ کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا تھا :

> اس وقت ہمارے سامنے حضرت علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی عجیب و غریب کتاب 'حسن المحاضرہ فی مصر والقاہرہ' اور علامہ فضل اللہ دمشقی کی 'التعریف بالمصطلح الشریف' رکھی ہوئی ہیں... ان دونوں کتابوں میں کبوتروں کی ڈاک کی پوری کیفیت اور احوال نہایت ہی دل چسپ طریقے سے تحریر کیے گئے ہیں...

مندکرہ بالا کتابوں کی تلخیص کے بعد، دوسری قسط کے آخری حصے میں زمانۂ حاضر کے تقاضوں نیز ہندستان اور اردو زبان کی مناسبت سے اتنا اضافہ بھی کیا گیا تھا :

> مگر آج کل تو نامہ بر کبوتر کی کہیں آواز نہیں آتی۔ تار برقی کی ایجاد نے یہ سب کچھ خواب و خیال کر دیا ہے... گو اس وقت کبوتروں کی نامہ بری موقوف ہے مگر خیر سے دنیائے شاعری میں ابھی تک بڑے زور شور سے جاری ہے۔ اس عجیب دنیا میں حضرت کبوتر عجیب عجیب کام کرتے ہیں۔ کبھی تو عشاق کی خبریں اور ان کی دردناک کیفیت معشوق تک پہنچا دیتے ہیں، اور کبھی بے چارے عاشق پر توجہ ہی نہیں کرتے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مژدۂ وصل سے عاشق کو مسرور کر دیں، مگر بہت کم۔ اس دنیا میں کبوتر کو قاصد اور صبا کے برابر جگہ دی جاتی ہے، جو ان کے لیے باعثِ افتخار ہے۔ ان کی عدم موجودگی کو بدنصیبی سمجھتے ہیں اور حالتِ یاس میں کہتے ہیں :
>
> نہ قاصدے، نہ صبائے نہ مرغ نامہ برے
> کسے ز بیکسیِ ما نمی برد خبرے

مضمون کے آخر میں فارسی کے چھ ایسے اشعار اور ان کے معنی بھی درج کیے گئے تھے، جن سے کبوتروں کی نامہ بری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔

اکتوبر اور نومبر کے خدنگ نظر میں 'پنکچویشن' کے عنوان سے ابوالکلام آزاد کا دوسرا اور اہم تر مضمون ملتا ہے۔ اردو میں پنکچویشن یا علاماتِ اوقات کے استعمال کے سلسلے میں جو تجاویز اس مضمون میں پیش کی گئی تھیں، انھیں طالب علمانہ تو کہا جا سکتا ہے اور ان سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے، مگر ان کی افادیت اور اہمیت سے انکار آج بھی ممکن نہیں ہے۔ مضمون کی پیشانی پر نوبت رائے نظر نے مندرجہ ذیل نوٹ لکھا تھا :

> ..."ہمارے قدیم دوست مولوی محی الدین احمد صاحب آزاد ان علامات کے متعلق جو انگریزی میں کاما، کولن، سمی کولن وغیرہ کے نام سے موسوم ہیں، ایک مضمون ارسال فرماتے ہیں۔ یہ مضمون ان ناول نویسوں اور مضمون نگاروں کے لیے زیادہ مفید ہے، جنھیں انگریزوں قصّوں اور عبارتوں کے تراجم کا شوق ہے۔ ہمارے دوست چاہتے ہیں کہ عام تحریروں میں بھی ان نشانات سے کام لیا جائے۔ لیکن ہماری دانست میں عام عبارتیں ان اجنبی نشانات سے کام لینے پر مجبور نہیں ہیں، جن سے اپنی ملکی تہذیب پر حرف آنے کے علاوہ ایک نئی دقت بھی پیدا ہوتی ہے۔ (ایڈیٹر)"

نئی دقت پیدا ہونے کی بات تو سمجھ میں آتی ہے، مگر ملکی تہذیب پر حرف آنے کی بات نوٹ سے واضح نہیں ہوتی۔ اس سے قطع نظر ایڈیٹر کا ذہن اس طرف منتقل نہیں ہوا تھا کہ کم و بیش چوتھائی صدی قبل سر سید اس موضوع پر سیر حاصل بحث کر چکے تھے، اور ان کی تجویزیں بھی صدا بصحرا

ثابت ہوئی تھیں۔ بہرکیف ایڈیٹر کے نوٹ کے بعد مضمون کا آغاز اس طرح کیا گیا تھا:

> انگریزی میں پنکچوئیشن سے وہ علامات قرأت مراد ہیں، جو انگریزی عبارت کے سمجھنے اور پڑھنے کی تسہیل اور کلام کی کیفیت ظاہر کرنے کے لیے بنائے جاتے ہیں، جن سے قاری کو معلوم ہو جاتا ہے کہ کس جگہ عبارت ختم ہوئی ہے، کہاں رکنے کی ضرورت ہے، کس جملے کو ملا کر پڑھنا چاہیے اور کس کو علاحدہ کر کے، کون جملہ دعائیہ ہے اور کون جملہ ندائیہ اور کون توجہ چاہتا ہے۔ ان علامات سے پڑھنے میں اس قدر سہولت ہوتی ہے کہ قاری بہتے ہوئے پانی کی طرح فر فر عبارت صحت کے ساتھ پڑھ لیتا ہے...
>
> اس میں کوئی شک نہیں کہ لٹریچر کی ترقی کے لیے ان علامات کا ہونا نہایت ضروری ہے، اور ان کے نہ ہونے کی مثال بالکل ان دو ماہ وش پری تمثال لیڈیوں کی سی ہے جن میں سے ایک عمدہ لباس اور خوش نما زیور سے سجی ہے اور ایک دونوں باتوں سے عاری ہے۔ یعنی ان علامات کے نہ ہونے سے کلام کی اصلی حالت اور مصنف کی اصلی غرض ظاہر نہیں ہوتی...

ان علامات کا موجد کون تھا؟ اس سلسلے میں یہ بڑی لگتی ہوئی بات کہی گئی تھی:

> علمی دنیا میں اس قسم کی علامات جس قوم نے پہلے پہل ایجاد کیں وہ مسلمانوں کی مفتخر قوم ہے، جنھوں نے سب سے پہلے اپنی آسمانی کتاب قرآن مجید میں تسہیل تلاوت کی غرض سے مختلف اوقاف مقرر کیے اور اس امر کی داغ بیل ڈالی۔ ایسی حالت میں یہ کہنا کچھ بے جا نہیں ہے کہ یورپ کو ان علامات کی ایجاد کا خیال قرآن مجید کو دیکھ کر ہوا... اس میں شک نہیں کہ عربی میں سب سے پہلے علامات قرأت مقرر ہوئے جن کا استعمال قرآن مجید میں ہوتا رہا، اور آج تک ہو رہا ہے... اصل بات یہ ہے کہ ابتدا میں جب علمائے اسلام نے دیکھا کہ اسلام کی حیرت انگیز اشاعت قرآن مجید کو عجمیوں کے ہاتھوں تک پہنچا رہی ہے اور وہ وقت بالکل قریب ہے جب ذرا ذرا سی باتوں میں قرآن شریف کی نسبت اختلاف ہوگا تو انھوں نے اس طرف توجہ کی اور ان علامات کو ایجاد کر کے اوقات مقرر کیے۔ انھوں نے اپنی توجہ قرآن مجید کی طرف اس قدر مبذول کی کہ انھیں اس امر کا خیال نہیں رہا کہ یہ علامات لٹریچر میں [بھی] استعمال کی جائیں...

اس کے بعد موجودہ دور کا ذکر کرتے ہوئے صاحب مضمون نے بتایا تھا کہ "اسلام بول، قاہرہ اور بیروت کے اخبارات و رسائل اور دیگر مطبوعات میں آج کل یہ اشارات اچھی طرح استعمال کیے جاتے ہیں" اور سنسکرت، فارسی، ترکی اور گجراتی زبانوں میں بھی ان سے کام لیا جاتا ہے۔ اردو کا ذکر کرتے ہوئے لکھا گیا تھا کہ:

> اردو میں بھی کچھ نہ کچھ اس کا استعمال ہو رہا ہے، مگر افسوس ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ بہت ہی کم ہے... اردو زبان کا وہ بچپن کا زمانہ تو خواب و خیال ہو گیا ہے جب یہ زبان صرف قصّوں اور شاعری کی زبان سمجھی جاتی تھی۔ اب تو برٹش دور میں اس نے نشو و نما پا کر شباب کے زمانے میں قدم رکھا ہے اور اپنا رنگ روپ نکالا ہے...

خدنگ نظر (۱۹۰۲ء) میں شائع ہونے والے دونوں مضامین کو پڑھنے کے بعد شدت سے گمان ہوتا ہے کہ ان سے پہلے بھی انھوں نے کچھ مضامین ضرور لکھے ہوں گے، جو اب تک دستیاب نہیں ہو سکے ہیں۔

خدنگ نظر اور مخزن جیسے موقر ادبی رسائل میں حوصلہ مند نوجوان ابوالکلام آزاد کے مضامین کی اشاعت ان کے سمند شوق کے لیے یقیناً تازیانہ ثابت ہوئے ہوں گے۔ لیکن اسی قصے کا یہ پہلو بھی قابل ذکر ہے کہ ان رسائل میں ابوالکلام آزاد کے مضامین کی اشاعت خود ان رسائل کے لیے باعث افتخار ثابت ہوئی۔ مخزن میں شائع ہونے والے مضامین کی اشاعت کے تقریباً بینتالیس سال بعد، مارچ ۱۹۴۷ء کی ابتدائی تاریخوں میں، سر عبدالقادر نے ابوالکلام آزاد کی موجودگی میں راقم الحروف کو فخر کے ساتھ بتایا تھا کہ "مولانا کے ادبی مضامین پہلے پہل مخزن ہی میں شائع ہوئے تھے۔"

یہ بھی کم حیرت ناک نہیں ہے کہ 'نیرنگ عالم' اور 'المصباح' کے تجربات کی ناکامی ابوالکلام آزاد کے ذوق ادارت کو سرد نہ کر سکی۔ نومبر ۱۹۰۳ء میں انھوں نے "لسان الصدق" کے نام سے ایک ماہنامہ جاری کیا جو وقفوں کے ساتھ مئی ۱۹۰۵ء تک نکلتا رہا۔ نیرنگ عالم اور المصباح کے برعکس لسان الصدق کے شمارے برصغیر کے بعض کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ راقم کو اس طرح کے تین کتب خانوں کا علم ہے۔ لاہور میں غلام رسول مہر مرحوم کے کتب خانے میں اس کا مکمل فائل تھا، جو اب لاہور ہی کے کسی کتب خانے میں ہے۔ خود مولانا آزاد کے ذاتی کتب خانے میں اس کا جو فائل تھا اس کے ابتدائی دو شمارے نہیں تھے۔ آزاد بھون (انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز، نئی دہلی) کے کتب خانے میں ان کے ذاتی ذخیرے کے منتقل ہونے کے بعد لسان الصدق کے ابتدائی دو شماروں کی نقل غلام رسول مہر نے فراہم کر کے اس فائل کو بھی مکمل کر دیا تھا۔ تیسرا مگر ناقص فائل دیسنہ کے کتب خانہ الاصلاح میں ہے جسے سامنے رکھ کر عبدالقوی دسنوی صاحب نے مضامین لسان الصدق کے نام سے ایک مجموعہ مرتب کر کے شائع کیا ہے۔

اس دور کے عام معیار کے مطابق لسان الصدق ایک موقر علمی و ادبی جریدہ تھا جس نے حقیقی معنوں میں ابوالکلام آزاد کی علمی و ادبی اور صحافتی زندگی کا سنگ بنیاد رکھا۔ اس نے صرف انیس مہینوں کی زندگی پائی، اور اس عرصے میں بھی اس کے صرف بارہ شمارے ہی نکل سکے۔ ان تمام شماروں کی ورق گردانی کرنے کے بعد ایک یہ دل چسپ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ شاعری سے شاید انھیں تنفر سا پیدا ہو گیا تھا۔ چناں چہ لسان الصدق کے شماروں میں غزل یا نظم کا وجود نظر نہیں آتا، جیسے شاعری کو، کم از کم لسان الصدق کی حد تک، ادب کے دائرے سے انھوں نے خارج کر دیا تھا۔

لسان الصدق کے اجرا سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اس نے ابوالکلام آزاد کی اس شہرت پر مہر تصدیق ثبت کر دی جو دو تین برسوں میں ادیب اور عالم کی حیثیت سے انھوں نے حاصل کر لی تھی۔ ظفر علی خاں جو آگے چل کر ان کے سیاسی حلیف اور حریف بننے والے تھے، لکھا تھا کہ لسان الصدق کو دیکھ کر " اس حسن ظن کی تصدیق ہو گئی جو ہم کو مولانا آزاد کی نسبت پہلے سے تھا۔" شیخ عبدالقادر نے مخزن میں لکھا تھا کہ "... مولوی صاحب کے نام سے ہمارے ناظرین خوب واقف ہیں۔ مخزن کے اوراق میں ان کے متعدد مضامین نکل چکے ہیں۔ اس کے سوا ان کو ایڈیٹری سے بھی تعلق رہا ہے۔ کلکتہ کے ایک ہفتہ وار اخبار اور لکھنؤ کے ایک رسالے کی ترتیب کی خدمت بھی دیر تک ان کے سپرد رہی ہے۔ ان کی ذاتی خداداد لیاقت اور واقفیت فن سے امید پڑتی ہے کہ یہ رسالہ اپنے مقاصد کو پورا کر سکے گا..."

لسان الصدق کے وہ مقاصد کیا تھے جن کی کامیابی کی ایڈیٹر مخزن نے توقع ظاہر کی تھی؟ رسالے کے پہلے ہی شمارے میں اپنے صحافتی سفر کی منزلِ مقصود بیان کرتے ہوئے ایڈیٹر نے لکھا تھا کہ رسالے کے مقاصد حسب ذیل ہیں:

۱۔ سوشل ریفارم، یعنی مسلمانوں کی معاشرت اور رسومات کی اصلاح کرنا۔

۲۔ ترقی اردو، یعنی اردو زبان کے علمی لٹریچر کے دائرے کو وسیع کرنا۔

۳۔ علمی مذاق کی اشاعت، بالعموم بنگالہ میں۔

۴۔ تنقید، یعنی اردو تصانیف پر منصفانہ ریویو کرنا۔

ان مقاصد کی پیشانی پر مندرجہ ذیل سطریں تمہید کے طور پر لکھی گئی تھیں۔

> الصدق ینجی و الکذب یھلک لسان الصدق کا دستور العمل ہے۔ اس کا فرض ہے کہ یہ قوم کو کذب سے بچائے اور راستی پر چلائے۔ اس کا فرض منصبی صرف حق گوئی قرار دیا گیا تو اس کی امید قوم کو اس سے نہ رکھنی چاہیے کہ وہ انھیں ایسے ترانے سنائے گا، جو نہایت شیریں معلوم ہوں گے۔ سچی بات ہمیشہ کڑوی معلوم ہوتی ہے، پھر سچائی کی زبان کیوں کر میٹھی معلوم ہوگی یہ تم کو ہمیشہ کڑوی کسیلی باتیں سنائے گا، جو اگرچہ تمھیں ناگوار معلوم ہوں گی، لیکن اس زمانے کو دور نہ سمجھو جب صدق کا منجی ہونا اور کذب کا مہلک ہونا تم پر ظاہر ہو جائے گا۔

الہلال کے فائلوں کی ورق گردانی کی جائے تو محسوس ہوگا کہ کڑوی کسیلی باتیں سنانے کا جہاں تک تعلق ہے، لسان الصدق اور الہلال کے دستور العمل میں کوئی فرق نہیں تھا، بلکہ الہلال نے مسلمانوں کو نسبتاً زیادہ کڑوی کسیلی باتیں سنائیں۔ بایں ہمہ دونوں میں ایک فرق یہ تھا کہ لسان الصدق کے پیش نظر مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح اور علمی و ادبی ترقی تھی۔ اس کے برعکس الہلال سرتاسر سیاسی تھا۔ اس کے دینی مقالات کی تان بھی سیاست ہی پر ٹوٹتی تھی۔

لسان الصدق اور الہلال میں ایک اہم تر فرق یہ بھی تھا کہ اول الذکر سرتاپا سرسید پرستی میں غرق تھا۔ اس کے اغراض و مقاصد کی فہرست میں مذہبی اصلاح کی شق بھی اگر شامل کر دی گئی ہوتی تو پھر اس کے اور تہذیب الاخلاق کے اغراض و مقاصد میں کوئی فرق نہ رہتا۔ یہ اس اعتبار سے قطعاً حیرت ناک نہیں ہے کہ اس دور میں ابوالکلام آزاد سرسید پرستی کی شراب سے بے طرح مدہوش تھے۔ لسان الصدق کے اجرا کا زمانہ خود ان ہی کے الفاظ میں "سرسید مرحوم کی تقلید و اتباع کا زمانہ تھا۔ طبیعت میں ان کی عقیدت پرستش کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ کوئی آواز جس میں ایک شائبۂ اختلاف یا تنقیص ہو، طبیعت کو گوارا نہ تھی۔" اس کی بہت اچھی مثال حیات جاوید پر حبیب الرحمن خاں شروانی اور شیخ عبدالقادر کے اعتراضات کے جواب ہیں، جن میں لسان الصدق کے ایڈیٹر نے حد درجہ ترش لب و لہجہ اختیار کیا تھا۔ مثلاً شروانی صاحب پر "صاف غلط گوئی" کا الزام لگاتے ہوئے لکھا تھا کہ " ان کی اعلا درجے کی ایمانی قوت کیوں اس بے جا جرأت سے مانع نہیں ہوئی کہ انھوں نے بے تامل دعوا کر دیا کہ مولانا حالی نے اس لائف میں سرسید کی بے جا طرف داری کر کے ان کی مذہبی غلطیوں سے چشم پوشی کی ہے..." لیکن آگے چل کر خود مولانا آزاد نے حیات جاوید کو حالی کی "مدلل مداحی" سے تعبیر کیا اور "معاملات کو پوری رنگ آمیزی کے ساتھ" لکھنے کا اور سرسید کی خامیوں پر "جس قدر خاک ڈال سکتے تھے" ڈالنے کا حالی پر الزام تک لگایا۔

ابوالکلام آزاد پر سرسید پرستی کا رنگ جس تیزی سے چڑھا تھا، اسی تیزی سے وہ اتر بھی گیا۔ اس کی نشاندہی الہلال کے ایک مضمون سے ہوتی ہے، جس میں انھوں نے اپنی ایک ابتدائی تحریر کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے:

> سنہ ۱۹۰۵ء میں انگریزی گورنمنٹ نے ٹرکی سے باسم مصر (طابہ) حاصل کرنا چاہا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ جنگی بیڑے

کو حرکت دے دی گئی۔ اس پر ہندستان کے اکثر مقامات میں مسلمانوں نے جلسے کیے اور رزولیوشن پاس کیے کہ برطانیہ کی روش ان کے لیے سخت دل آزار ہے۔ علی گڑھ میں بھی بعض لوگوں نے ایک جلسہ کردیا، جلسے کی جب کارروائی چھپی تو بزرگان علی گڑھ کو کھٹکا ہوا کہ علی گڑھ کے نام سے کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ وابستگان کالج بھی خدانخواستہ اس کفر میں شریک ہیں۔ فوراً مقامی ارکان کی ایک کمیٹی منعقد ہوئی اور انکار وتبری کا ایک تار پایونیر میں چھاپا گیا۔

اس زمانے میں میں وکیل کا اڈیٹر تھا۔ میں نے ان کی نسبت ایک نوٹ لکھا، لیکن خدا بخشے نواب محسن الملک اس قدر برآشفتہ خاطر ہوئے کہ [انسٹیٹوٹ] گزٹ میں 'کالج کے نادان دوست' کے عنوان سے وکیل کے جواب میں ایک پرغضب مضمون لکھا، اور اس میں سید صاحب کے مضامین سے اقتباسات دے کر ثابت کیا کہ ہم مسلمانوں کو ترکوں کے معاملات اور خلافت اسلامی سے کوئی تعلق نہ ہونا چاہیے پھر ایک خط مجھے بمبئی سے لکھا کہ "ہماری تیس برس کی کمائی کو تم لوگ چاہتے ہو کہ غارت کردو۔"

لسان الصدق اگرچہ ایک غیرسیاسی رسالہ تھا، تاہم آخری دور میں سیاست کی چھاپ بھی کبھی کبھی اس میں نظر آجاتی تھی۔ اس سلسلے میں قابل ذکر انڈین نیشنل کانگرس پر دو نوٹ ہیں جو چار مہینوں کے تفاوت سے جنوری اور مئی ۱۹۰۴ میں لکھے گئے تھے۔ ان دونوں کو اگر ایک ساتھ پڑھا جائے تو ابوالکلام آزاد کا سیاسی ذہنی ارتقا ہمارے سامنے آتا ہے۔ پہلا نوٹ سرسید کی پالیسی کے عین مطابق تھا:

> جب ہندوؤں نے نیشنل کانگرس قائم کی تو سرسید مرحوم کی مخالفت منجملہ اور وجوہ کے اس وجہ پر مبنی تھی کہ اس کا نام حکومت کو سخت دھوکہ دینے والا ہے۔ اس کا نام دعوا کرتا ہے کہ یہ ایک قومی کانگرس ہے، حالاں کہ سوا ہندوؤں کے اس میں کوئی شریک نہیں ہے۔ پھر نیشنل کا لفظ بالکل حالات کے خلاف ہے۔ ہندو کہتے تھے کہ اس میں دیسی عیسائی شامل ہیں اور مسلمان بھی اس کے ہمدرد ہیں۔ سرسید کو مسلمانوں کا بچانا منظور تھا۔ انھوں نے گورنمنٹ اور پبلک پر ثابت کردیا کہ مسلمانوں کو اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ آج تیرہ چودہ برس کے بعد ... دیسی عیسائیوں نے بھی اس سے کنارہ کشی اختیار کرلی ہے، مسلمانوں کی مدد بھی برائے نام ہے۔ پھر اس کو قومی کہنا کیا معنی؟

مندرجہ بالا نوٹ کی اشاعت کے چار ماہ بعد، مئی ۱۹۰۴ کے لسان الصدق میں انڈین نیشنل کانگرس پر دوسرا حسب ذیل نوٹ ملتا ہے:

> انڈین نیشنل کانگرس کا اجلاس امسال بمبئی میں [ہونا] قرار پایا ہے جس کی تیاری نہایت وسیع پیمانے پر ابھی سے شروع ہوگئی ہیں۔ کانگرس کا [یہ] بیسواں اجلاس ہے اور امید کی جاتی ہے کہ بہ لحاظ نتائج کے یہ اجلاس پچھلے انیس جلسوں پر فوقیت لے جائے گا۔ اس اجلاس کے چیرمین فیروزشاہ مہتہ انتخاب کیے گئے ہیں، جو مشہور عالی دماغ اور کانگرس کے قدیم حامی ہیں.... بمبئی کے مشہور قومی فیاض مسٹر ٹاٹا سے بھی ہمدردی کی توقع کی جاتی ہے، جن کے اصلاحی خیالات اور قومی محبت کانگرس کے مقاصد سے کبھی مخالفت نہیں کرسکتی۔

مندرجہ بالا عبارت کا لب ولہجہ سابقہ نوٹ کے لب ولہجے سے یکسر مختلف ہے۔ اس میں کانگرس کی مخالفت کا شائبہ تک نظر نہیں آتا، بلکہ کانگرس کے ساتھ ہمدردی کا پہلو بھی نمایاں ہے۔ اگر یہ خیال صحیح ہے تو مئی ۱۹۰۴ کو ابوالکلام آزاد کے سیاسی ذہن میں تبدیلی کا نقطۂ آغاز قرار دے سکتے ہیں۔

اتفاقاً یہی وہ زمانہ ہے جب ابوالکلام آزاد اور شبلی نعمانی کے تعلقات میں گہرائی پیدا ہوئی۔ ابوالکلام آزاد کو ان سے جو عقیدت تھی اس نے جلد ہی وابستگی کی شکل اختیار کرلی۔ شبلی کو سرسید اسکول کی انگریز پرستی اور کانگرس دشمنی سے جو شدید اختلاف تھا اس کے پیش نظر یہ سمجھنا غلط نہ ہوگا کہ ابوالکلام آزاد کو قوم پرستی کے مسلک میں پختہ کرنے میں ان کا ہاتھ بھی رہا ہوگا۔ ان دنوں میں جو ذہنی یک جہتی پیدا ہوگئی تھی یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ لسان الصدق بند ہوتے ہی شبلی نعمانی نے ان کو الندوہ کے اسسٹنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے اپنا شریک کار بنا لیا۔ چناں چہ اکتوبر ۱۹۰۵ء سے مارچ ۱۹۰۶ء تک وہ الندوہ اور شبلی نعمانی سے وابستہ رہے۔

مارچ ۱۹۰۶ء کے بعد ابوالکلام آزاد نے امرت سر کے مشہور اخبار وکیل کی عنانِ ادارت سنبھالی۔ اس اخبار کے مالک شیخ غلام محمد غالی سرسید پرست تھے۔ دوسری طرف ابوالکلام آزاد کے سیاسی ذہن میں تبدیلی کا جو عمل شروع ہوچکا تھا، اس کی رفتار روز بروز تیزتر ہوتی جارہی تھی۔ اب شیخ غلام محمد کے سیاسی عقاید کا ساتھ دینا ان کے بس کی بات نہیں تھی، اور اخبار کے مالک اور ایڈیٹر میں اختلاف پیدا ہونا ناگزیر تھا۔ غالباً یہ ان ہی اختلافات کا نتیجہ تھا کہ الہلال کے اجرا کے خیال نے ان کے ذہن میں جنم لیا۔ اس کے چھ سال بعد جب الہلال کا اجرا ہوا، تو اس کے پہلے ہی نمبر میں انھوں نے لکھا تھا: "۱۹۰۶ء کے موسم سرما کی آخری راتیں تھیں جب امرت سر میں میری چشم بیداری نے ایک خواب دیکھا ... آج اس خواب عزیز کی تعبیر عالم وجود میں پیش نظر ہے ... الہلال کی اشاعت ہمارے قدیم ارادوں کے سفر کا آغاز ہے۔"

رام لعل

پشپی کی ماں

ایک زچہ بچہ اسپتال کے جنرل وارڈ میں پچاس کے قریب بیڈ لگے ہوئے ہیں جن پر وہ سب عورتیں لیٹی ہوئی ہیں جن کے بچے پیدا ہو چکے ہیں یا ہونے والے ہیں۔ اور جگہ کی کمی کی وجہ سے فرش پر بھی بستر لگا کر عورتوں کو لٹایا ہوا ہے۔ بچوں کے چھوٹے چھوٹے سفید روغنی آہنی پنگوڑے کئی قطاروں میں بڑی ترتیب سے رکھے ہوئے ہیں جن میں نوزائیدہ لال لال بچوں کی کلائیوں کے ساتھ ان کی ماؤں کے رجسٹرڈ نمبر سفید کپڑے کی پٹیوں پر لکھ کر سی دیے گئے ہیں۔ انھیں دودھ پلوانے اور کبھی کبھی بہت زیادہ رونے پر چپ کرانے کے لیے وہی نمبر دیکھ کر انھیں ان کی ماؤں کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ بچوں کے رونے کا شور اس وقت بھی پورے وارڈ میں گونج رہا ہے۔ لیکن وہاں ایک ادھیڑ عمر کی عورت ایسی بھی ہے جو سب سے زیادہ شور مچانے کے لیے بدنام ہو چکی ہے۔ وہ نرسوں، آیاؤں، وارڈ کے اندر جھاڑو لگانے اور گیلا پوچا مارنے والوں اور ٹرالیوں پر کھانا ناشتہ لے کر آنے والوں کے ساتھ تو جھگڑتی ہی ہے ان کے علاوہ وہاں عورتوں کو بھی چھیڑنے سے باز نہیں آتی جو اس کے دائیں بائیں اور دور دور کے پلنگوں پر اپنے پھولے پھولے پیٹ لیے ہوئے بچہ جننے کے انتظار میں خاموش لیٹی رہتی ہیں اور اس کے ساتھ کبھی بات ہی نہیں کرتیں۔ لیکن گالی دینے کی شدید خواہش اس کے اندر اس وقت بے اختیار پیدا ہو جاتی ہے جب وہ کروٹ بدل کر یا محض سر گھما کر ساتھ کے بیڈ پر پشپی کو پڑا ہوا دیکھ لیتی ہے۔

یہ محض اتفاق ہے وہ دونوں ماں بیٹی ہیں اور ڈلیوری کے لیے ایک ہی وقت میں اسپتال میں داخل ہوئی ہیں اور انھیں بدقسمتی سے ساتھ ساتھ ہی لٹا دیا گیا ہے۔ دونوں کے بچے دو روز کے وقفے کے ساتھ آگے پیچھے ہو چکے ہیں۔ لیکن پشپی کی ماں کو اپنی بیٹی ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ اسے وہ دن میں جب تک کئی درجن گالیاں نہ دے لے اسے چین نہیں پڑتا۔ اسے سب سے زیادہ غصہ اس بات کے لیے ہے کہ انیس بیس سال کی یتیم صورت و دبلی پتلی پشپی ٹھیک انھی دنوں حاملہ ہو کر اس اسپتال میں کیوں پہنچ گئی ہے، جن دنوں وہ بھی یہاں آئی ہے۔ اس کا پارہ اس وقت تو اپنی انتہا پر پہنچ جاتا ہے جس وقت کوئی آیا پشپی کی بھوک سے بلبلاتی ہوئی بچی کو پنگوڑے میں سے اٹھا کر اس کے پاس لٹا جاتی ہے اور وہ اپنے چہرے پر بلا کی شرم و حیا کی سرخی پیدا کر کے اسے اپنے آنچل میں چھپا کر دودھ پلانے لگتی ہے۔ اس کا بس چلے تو وہ سارے وارڈ میں لیٹی ہوئی عورتوں کی نظروں سے چھپ کر ہی اپنی نوزائیدہ بچی کو دودھ پلایا کرے۔ ابھی تو اسے ٹھیک طرح سے دودھ پلانا بھی نہیں آتا۔ ایک مہربان آیا نے ہی اس کا اسپتال سے ملا ہوا نیلا کرتا اٹھا کر اسے بچی کے منہ میں اپنی ننھی سی چھاتی ٹھونسنا سکھا دیا تھا۔ اب وہ جب بھی ایسا کرنے لگتی ہے تو اس کی ماں کے کوسنے شروع ہو جاتے ہیں۔

"پلا، پلا اور پلا سانپنی، اسے دودھ! تیرا دودھ پی کر یہ بھی تیری طرح سانپنی ہی ثابت ہوگی! قسمت کی ماری میں نے جو سانپنی جنی تھی وہی اب میرے سامنے ایک اور سانپنی کو جن کر پال رہی ہے۔ بھگوان غارت کرے دونوں کو۔ اس دونوں کے مردے یہیں سے اٹھتے ہوئے دیکھوں! ہائے کیا زمانہ آ لگا ہے ماں بیٹی ایک ہی وقت میں بچے دینے اسپتال میں آ پڑی ہیں۔!"

یہ سن کر مریضاؤں کے بیڈ ٹھیک کرتی ہوئی ایک آیا کے منہ سے ہنسی چھوٹ گئی تو اس نے کہہ دیا — "یہ تو تیرے سوچنے کی بات تھی، تو اس عمر میں بھی اپنی حرکتوں سے باز نہ آئی!" تو پشپی کی ماں کی گالیوں کا رخ اسی طرف مڑ گیا —

"سور کی بچی، تیرے پیٹ میں کیوں مروڑ اٹھنے لگے! ہماری باتوں کے بیچ تو کیوں کود پڑی! بول، سور کی اولاد!"

آیا سے برداشت نہ ہو سکا۔ اپنے جسم پر خاکی رنگ کے لمبے گاؤن میں سے جھانکتے ہوئے بھرے بھرے کولہوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر چیخ پڑی —

"تو نے مجھے گالی دی! تو نے مجھے سور کی اولاد کہا!"

"تو اور کیا کہوں — الو کی پٹھی کہوں؟ حرامزادی کہوں؟ بتا دے جو تجھے پسند ہو وہی کہا کروں گی آئندہ سے!"

"دیکھ دیکھ میں کہتی ہوں اپنی زبان کو لگام دے ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔ پھر مجھے گالی دی تو گدی سے زبان کھینچ لوں گی' ہاں! بتائے دیتی ہوں!"

"کیا بتائے دیتی ہے! تو یہاں گورنر لگی ہوئی ہے! کیا بگاڑ لے گی میرا! بتا! تو میری نظر میں سور کی بچی بھی ہے اور اُلّو کی پٹھی بھی اور حرامزادی بھی۔ کیا میں تجھے جانتی نہیں ہوں!"

آیا پیر پٹختی اور روتی ہوئی شکایت کرنے وارڈ کی انچارج نرس کے پاس چلی گئی اور نرس اس کے ساتھ ساتھ پُشپی کی ماں کے بیڈ کے پاس آکر پوچھنے لگی — "کیا بات ہے؟ تم ہر ایک کے ساتھ کاہے کو ہر وقت جھگڑا کرتی رہتی ہو؟"

آیا روتے روتے بولی — "اس نے بے قصور مجھے تین گالیاں دیں۔ پہلے سور کی بچی کہا پھر اُلّو کی پٹھی پھر حرامزادی بھی!"

پُشپی کی ماں نرس کی موجودگی سے بالکل متاثر نہ ہوئی بلکہ کسی قدر متبسّم آواز میں آیا سے بولی — "یوں ٹسوے مت بہا' سِسٹر کو سچ سچ بتا دے میں نے تجھے کیوں یہ گالیاں دی تھیں؟ پھر وہ خود نرس کی طرف متوجہ ہو کر بولی۔ "سِسٹر' تم خود اس سے پوچھو نا۔ اس نے مجھ سے کون سی بات کہی تھی جس پر میں نے اسے گالیاں دیں!"

نرس نے آیا کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو اپنے آنسو پونچھتی ہوئی بولی — "سِسٹر' یہ اپنی بیٹی کو بلا وجہ کوس رہی تھی کہ اس نے اس کی موجودگی میں کیوں زچگی کرائی۔ میں نے صرف یہی تو کہا تھا کہ یہ تو تیرے سوچنے کی بات تھی۔ تو اس عمر میں کیوں ماں بنی؟ بس' یہ سنتے ہی مجھ پر برس پڑی!"

"تب بتا' وہ لڑکی تیری ماں لگتی ہے جو اس کی طرفداری کرنے لگی؟ پھر میں نے پہلے تجھے ایک ہی گالی دی جس کا مجھے حق تھا۔ اس پر تُو نے اعتراض کیا تو میں نے کہا اچھا دوسری اور بھی گالیاں ہیں جو تجھے پسند ہو وہی دے دیا کروں گی —"

پُشپی کی ماں نے منہ پھیر کر لیٹی ہوئی اپنی بیٹی کی طرف اشارا کرتے ہوئے نرس سے کہا — "سِسٹر' وہ میری اپنی جائی بیٹی ہے — اس سے میں جو کچھ بھی کہوں اس میں یہ دخل دینے والی کون؟ اب آپ ہی بتاؤ سِسٹر' قصور کس کا ہے۔ میرا یا اس کا؟ اور پھر کوئی عورت صرف اپنی مرضی سے تھوڑے ہی ماں بن جاتی ہے۔ آپ سارے وارڈ کی ایک ایک عورت سے جاکر معلوم کر سکتی ہیں۔ کون اپنی مرضی سے ماں بننے پر راضی ہوئی اور کون اپنے مرد کی زور زبردستی کا شکار ہوئی!"

نرس اپنے اسی تحکمانہ مگر شُستہ لہجے میں یہ کہتی ہوئی وہاں سے چل دی۔ "وارڈ میں شور مچانا منع ہے۔ یہاں اور بھی پیشینٹ لوگ پڑا ہے۔ سب کے آرام کا خیال رکھا کرو۔"

پُشپی کی ماں نے دیکھ لیا کہ نرس دور میز کے سامنے جاکر بیٹھ چکی ہے تو اس نے تین چار بیڈ پرے۔ پہنچ کر پلنگوں کی چادریں اور تکیوں کے غلاف بدلتی ہوئی اسی آیا کو مخاطب کر کے کہا — "بڑے رعب سے سِسٹر کو بلا کر لے آئی تھی! جیسے تیرے کہنے پر وہ مجھے پھانسی ہی تو لگا دیتی! کبھی باہر مجھے دکھائی دے گی تو مارے جوتیوں کے کھوپڑی پلپلی نہ کر دوں تو میں اصلی پنجابن نہیں —!"

آیا بھی یہ سن کر بڑبڑانے سے باز نہ رہ سکی — "ایسی زبان تو کوٹھے والیاں بھی نہیں بولتی ہیں۔ توبہ توبہ!"

"ہاں ہاں میں جانتی ہوں تو کوٹھوں سے ہی اتر کر یہاں آگئی ہے۔ تبھی تو ان کے بولنے کے طور طریقے جانتی ہے!"

اس کے بعد آیا کام کرتی ہوئی اور دور چلی گئی تو پُشپی کی ماں نے اپنی بیٹی کی طرف نگاہ ڈالی جس نے سارے ہنگامے کے دوران ایک بار بھی پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔ اس نے اُسی کو سنانے کے لئے کہا۔ "سانپ کی اولاد کیسی مکاری سے کنڈلی مارے پڑی ہے! ارے تو میری جنی تھی تو ایک بار تو میری طرفداری میں منہ سے پھوٹی ہوتی! پر اس میں کیا شک ہے' اس سانپنی کو میں نے ہی تو جنم دیا تھا۔ پورے نو مہینے کوکھ میں اٹھائے اٹھائے پھری — پر مجھے کیا پتہ تھا پیدا ہو کر مجھے ہی زندگی بھر ڈستی رہے گی۔ میں بھی کیسی جنم جلی ہوں کہ ایک ہی بار مر بھی تو نہیں جاتی —!

اگلے روز وہ پُشپی کو اس بات پر کوس رہی تھی کہ اس کے داماد نے وہاں آکر اس کی خیریت کیوں نہیں پوچھی تھی۔ صرف پُشپی کے پاس بیٹھ کر اپنی بچی کو کیوں گود میں لیے بیٹھا رہا تھا — "حرامیوں کی اولاد حرامی ہی نکلتی ہے۔ مجھے کیا پتہ تھا جس معصوم صورت پر رحم کھا کر اپنے گھر میں جگہ دے رہی ہوں وہ میری ہی بیٹی کو پھسلائے گا! کسی کے منہ پر تھوڑے ہی لکھا ہوتا ہے اندر سے وہ کتنا بڑا خنزیر ہے! آیا تھا یہودیوں جیسی مسکین صورت لیے ہوئے۔ پر میرا سب کچھ لوٹ لے گیا چپکے چپکے! مجھے کبھی شک تک نہ ہونے دیا۔ اندر ہی اندر وہ کون سا گل کھلا رہا ہے —! ہائے میرا بس نہیں چلتا ورنہ اب بھی دونوں کا گلا گھونٹ دوں! اس کے بعد بھلے ہی پھانسی پر لٹکا دی جاؤں!"

وہ زور زور سے رونے بھی لگی۔ لیکن اُسے کسی نے بھی چپ ہو جانے کے لیے نہ کہا۔ کون بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالتا! اسی وقت کھانے کی ٹرالی لیے ہوئے دو ماورچنیں وہاں آگئیں تو ایک کچھ ازراہ ہمدردی کہہ بیٹھی — "اب رونا دھونا بند کر — اٹھ کے کھانا کھا لے۔ کہاں ہے تیری رکابی؟"

پُشپی کی ماں بھری تو بیٹھی ہی تھی۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے ٹرالی کو زور سے جھٹکا دیدیا اور بولی — "رو رہی ہوں تو اپنے دکھ سے۔ تیرے ہوتوں سوتوں کے لیے تو بین نہیں کر رہی ہوں کہ تو ان کے لیے بھی آنسو بہا دوں گی۔"

جھٹکا کھا کر ٹرالی میں رکھی ہوئی پتلی پتلی دال کی دیگچیاں چھلک گئیں اور گرم گرم دال کے زیادہ تر چھینٹے نہ صرف اسی کے بستر پر جا پڑے بلکہ اس کے منہ اور ہاتھوں کو بھی جلا گئے جس پر وہ زور سے چیخ کر اٹھ بیٹھی۔ اسی آیا نے جو

اسے کھانا دینے آئی تھی حل بھن کر بولی ـــ "اسی کو کہتے ہیں اپنا منہ ماتھا خود ہی پیٹ لینا ـ! تو اپنی حرکتوں سے یوں باز نہیں آئے گی ـ آج سپرنٹنڈنٹ سے کہہ کر تیری چھٹی کرائے دیتی ہوں ـــ"

"کرلے کے دکھا تو میری جیتی ـ! کسی زچہ کو اسپتال سے دوسرے ہی دن نکالا گیا ہے آج تک ؟ یہ سرکاری اسپتال ہے ـ سرکاری اسپتال اسپرنٹنڈنٹ تیری ماں کا یار لگتا ہے تو اسے بھی جاکر کہہ دے ـ میری اس طرح چھٹی کرکے تو دیکھے! میں زندہ بچ گئی تو اسے اس طرح کچہریوں میں گھسیٹتی پھروں گی کہ وہ تیری ماں کے سارے مزے بھول جائے گا ـ!"

اس کا شور سن کر وارڈ کی ساری نرسیں دوڑی دوڑی آگئیں ـ انھیں دیکھ کر نہ صرف وارڈ کی خادماؤں نے پُشپی کی ماں کی شکایتیں کیں بلکہ اپنے اپنے پلنگوں پر لیٹی ہوئی کئی مریضاؤں نے بھی اٹھ اٹھ کر پہلی مرتبہ زبان کھولی ـ سب کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا ـ سب نے اسے وہاں سے کسی اور وارڈ میں شفٹ کر دینے کی اپیل کی ـ لیکن بدقسمتی سے وہاں ایک ہی جنرل وارڈ تھا ـ باقی آٹھ دس پرائیویٹ روم تھے جہاں اس جیسی نادار عورت کو مفت میں رکھا نہیں جا سکتا تھا ـ باہر برآمدے میں اس قدر سردی تھی کہ اسے ہوا لگ جانے کا خطرہ تھا ـ نرسوں نے باہم مشورہ کرکے اسے اسی وارڈ کے ایک کونے میں ڈال دیا ـ اس طرح وہ اپنی بیٹی سے بھی کافی دور ہو گئی جسے وہ ہر وقت بلاوجہ کوستی رہتی تھی ـ لیکن وارڈ کے کونے میں جاکر بھی وہ بڑبڑاتی رہی ـــ "کیا میں نہیں جانتی جنھوں نے میری شکایت لگائی ہے ـ ان میں سے کس کس نے حرامی پلّے جنے ہیں ـ! لکھوانے کے لیے تو انھوں نے بڑے بڑے رئیسوں کے نام لکھوائے ہیں پر وہ سب ان کے فرضی شوہر ہیں ـــ!"

اسی شام کو اس کا شوہر اسے اور اپنے بچے کو دیکھنے کے لیے آیا تو اُس کو اپنی پہلی جگہ نہ پاکر پُشپی کی طرف بڑھ گیا اور اس کے سر پر پہلے بڑی شفقت سے اپنا ہاتھ رکھ کر اس کی خیریت پوچھی پھر اپنی بیوی کے بارے میں دریافت کیا جو دور کونے میں لیٹی لیٹی یہ سب دیکھ رہی تھی ـ وہ اچانک بھڑک کر چلا اٹھی ـــ "میری سوت کے پاس کھڑا کیوں پیار جتا رہا ہے ؟ ادھر آ میرے پاس تجھے سب بتاتی ہوں ـــ"

قریباً پچاس برس کا کئی ہفتوں کی بڑھی ہوئی شیو لیے خاصے مضبوط بدن کا شیو رام 'توبہ توبہ' کہتا ہوا اس کے پاس پہنچ گیا اور بڑے محتاط لہجے میں بولا ـــ "کیسی گندی بات تو نے منھ سے نکالی آج! پُشپی میری بیٹی کے برابر ہے ـ لوگ کیا کہتے ہوں گے ـ جنھوں نے سنا ہوگا ـ!"

اس سے پہلے کہ وہ اُسے اُس روز کی تازہ واردات کا قصہ سناتی شیو رام نے اپنی بپتا چھیڑ دی ـ "میرے پیچھے پھر پولس پڑ گئی ہے ـ دھوکے میں چوری کا موٹر کا ایک پرزہ خرید بیٹھا تھا ـ وہ مجھے پکڑ کر مقدمہ ضرور چلائے گی ـ شاید پھر جیل کی ہوا کھانی پڑے ! چرنجیت ملے تو اس سے کہوں میری ضمانت کا بندوبست کر دے ـ ادھر پُشپی اپنے بیڈ پر لیٹی لیٹی اپنے پتی کا انتظار کر رہی تھی ـ وہ آفس سے چھٹی لے کر عموماً اس وقت تک آجاتا تھا ـ اس وقت ان کی ننھی منی گڑیا اپنے پنگوڑے میں خوب گہری نیند سو رہی تھی ـ چرنجیت آتا تھا تو اس کی طرف بڑے پیار سے ایک نظر ڈال سیدھا اپنی پہلی بچی کی طرف بڑھ جاتا تھا ـ اسے گود میں اٹھا کر پھر اس کے پاس آ بیٹھتا تھا ـ وہ سوتی ہوتی تھی تب بھی وہ اسے بلا ڈلا کر جگانے کی کوشش کرتا تھا ـ پُشپی اسے منع ہی کرتی رہ جاتی ـ "اسے سونے دیجئے نا ـ کہتے ہیں شروع شروع میں بچے اسی طرح کئی کئی گھنٹے سوتے ہیں"

یہ کہتے کہتے وہ اپنے شوہر کی طرف بڑی پیار بھری نظروں سے بھی دیکھتی رہتی یہ ننھی منی گڑیا ان دونوں کے پیار کی ہی تو نشانی ہے ـ اُن لمحوں میں وہ اپنے آدمی کی قربت اور محبت میں سرشار ہو کر دن کی اس کی اذیت کو بالکل بھول جاتی جو اسے اپنی ماں کی گالیاں سن سن کر اور اس خیال سے بھی کہ دوسرے لوگ اس کے بارے میں کیا سوچتے ہوں گے محسوس ہوتی رہتی تھی ـ چرنجیت نے آج آنے میں خاصی دیر لگا دی تھی ـ اور اسے وارڈ کے قریب قریب ہر ایک بیڈ پر لیٹی ہوئی مریضہ کے پاس کوئی نہ کوئی ملنے والا دکھائی دے رہا تھا ـــ اپنے پتی کی خیریت کی من ہی من میں پرارتھنا کرتے وقت وہ یہ بھی یاد کر رہی تھی کہ اس کی اور چرنجیت کی محبت ان کے چھوٹے سے گھر میں کس طرح رفتہ رفتہ اور ماں سے چھپ چھپ کر پروان چڑھی تھی ـ وہ رہنے کے لیے ایک کرائے کے کمرے کی تلاش میں اچانک ان کے گھر میں آنکلا تھا کیونکہ کسی نے اسے بتا دیا تھا کہ ان کے یہاں ایک کمرہ خالی ہے ـ اور اس وقت وہ اُس کی ماں اپنے چھوٹے سے آنگن میں چُھری سے کاٹے ہوئے بیشمار اخباری کاغذ پھیلائے لفافے بنانے میں مصروف تھیں ـ اس کی ماں اپنی عادت کے موافق بدن پر صرف ایک ڈھیلا ڈھالا بلاؤز اور گھگرا ہی پہنے ہوئے تھی ـ لیکن گھر کے اندر وہ سدا ایسا ہی لباس پہنا کرتی تھی اور اس کے بلاؤز میں سے تھل تھل کرتی لٹکتی ہوئی چھاتیاں جو اکثر بلاؤز کے نیچے سے باہر نکلتی پڑتی تھیں اور بہت کم لمبے گھگھرے میں سے صاف صاف نظر آنے والی بھری بھری سفید و گوری گوری رانیں اور پنڈلیاں دیکھ کر اسے خود بھی شرم محسوس ہونے لگتی تھی کہ جس طرح وہ قمیص، شلوار اور دوپٹے سے اپنے آپ کو ڈھانپ کر رکھتی ہے اسی طرح اس کی ماں کیوں نہیں کرتی! لیکن اس کے سامنے تو وہ دم بھی نہیں مار سکتی تھی ـ جس وقت چرنجیت ان کے پاس آکر کھڑا ہو گیا وہ تب بھی اسی حالت میں بیٹھی رہی تھی ـ اس کی طرف قصائیوں جیسی نظروں سے ٹٹولتی ہوئی پوچھتی رہی تھی ـــ

"تو کیا کرتا ہے ؟"

"نہر کے محکمے میں کلرک ہوں ـ"

"کتنی تنخواہ پاتا ہے ؟"

"پونے پانچ سو ـ"

"صبح کے بجے جاتا ہے اور شام کو لوٹتا کب ہے ؟"

"یہاں رہوں گا تو صبح پونے نو بجے کی بس پکڑ کر چلا جایا کروں گا ـ مجھے شام کو ایک جگہ پڑھانے کے لیے ٹیوشن بھی ملی ہوئی ہے اس لیے رات کو آٹھ

بجے تک ہی لوٹ کر آسکوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ تب تو تم آسانی سے سو روپے کرایہ دے سکو گے۔ بجلی و پانی کے لیے پندرہ روپے الگ دینے ہوں گے اور بجلی کا بلب چالیس واٹ سے زیادہ کا نہیں لگاؤ گے اور رات کو نو بجے ہی بجلی بجھا دینی ہوگی۔ سمجھ لیا نا!"

"جی ہاں سمجھ گیا۔"

"صورت شکل سے تو تم شریف ہی لگتے ہو لیکن بتادوں کہ جب اپنے کمرے میں سے نکل کے ٹٹی اور غسل خانے میں جاؤ گے تو اس آنگن میں سے سر جھکا کر نکلو گے۔ اِدھر اُدھر بالکل نہیں دیکھو گے۔ سمجھ گیا نا؟"

"جی سمجھ گیا۔"

"اور ہاں پیشگی کرایہ بھی دینا ہوگا۔ دو مہینے کا۔"

"دے دوں گا۔ ابھی لے لیجئے۔"

اس مکان کا کرایہ وہ لوگ تیس روپے دیا کرتے تھے۔ کیونکہ وہاں بہت عرصے سے رہ رہے تھے۔ اس معاملے میں اس کی ماں بہت چالاک نکلی۔ پہلے جو کرایہ دار رہتا تھا وہ پچاس دیتا تھا۔ اب سو ملنے لگیں گے۔

چرنجیت نے بھی اس کی ماں پر اپنی شرافت کا ایسا اعتبار جما لیا کہ اس نے اسے روزانہ رات کو پشپی کو پڑھانے کی ذمہ داری بھی سونپ دی تھی اور اس کے بدلے میں اس کی ماں نے اسے بجلی اور پانی دونوں کا خرچ معاف کر دیا تھا۔ لیکن پڑھانے کا وقت چونکہ رات کو ساڑھے آٹھ سے دس بجے تک کا مقرر تھا اس لئے شروع شروع میں وہ خود ان کے پاس بیٹھی رہتی تھی۔ پھر جب اسے پورا وشواس ہو گیا کہ یہ لڑکا تو بالکل گئو پتر ہے اُس نے اُن کے پاس بیٹھنا چھوڑ دیا تھا اور اپنے کمرے میں جا کر لفافے بنانے میں لگی رہتی تھی۔ چرنجیت واقعی بہت سیدھا لڑکا تھا۔ وقت ملنے پر وہ نہ صرف ان کے ساتھ لفافے بنانے میں مدد کر دیتا بلکہ صبح سویرے اٹھ کر کمالیہ والے منشی رام کی دودھ کی ڈیری سے اپنے اور ان کے لیے اپنے سامنے تازہ دودھ بھی دُوہوا کر لے آنے لگا تھا۔ لیکن اس کی ماں کی تمام تر احتیاط کے باوجود اُن دونوں کے درمیان محبت نے اپنا کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ محبت بہتے پانی کی طرح ٹھیک اسی مقام پر آکر ٹھہر گئی تھی جہاں اسے قدرتی طور پر ٹھہر جانا چاہیئے تھا۔ وہ ایک دوسرے سے بہت کم بات کرتے تھے کیونکہ یہ خدشہ برابر موجود تھا کہ پشپی کی ماں کے کان انہی کی طرف لگے ہوئے ہوں لیکن محبت کی زبان صرف الفاظ کی تو محتاج نہیں ہوا کرتی۔ اس کا اظہار آنکھوں اور کبھی کبھار انگلیوں کے آپسی لمس سے بھی ہونے لگتا ہے۔ جب انھیں یقین ہوتا کہ انھیں کوئی نہیں دیکھ رہا ہے تو ان کے ہونٹ بھی کبھی کبھی اپنی بات کہہ جاتے تھے۔

انہی دنوں ایک کباڑی جس کا نام شیو رام تھا جیل میں چھ ماہ تک رہنے کے بعد چھوٹ کر آگیا تھا۔ اُس نے کسی سے چوری کا مال اونے پونے خرید لیا تھا اور پکڑا گیا تھا۔ وہ پشپی کے ماں باپ کے گاؤں چیچوں کی ملیاں کا رہنے والا تھا جو اب پاکستان میں ہے۔ اس کے باپ کی وفات کے بعد وہی ان کی کچھ نہ کچھ مدد کر دیا کرتا تھا۔ انھیں صاف ستھرے ردّی اخباروں کے بنڈل بھی لا کر دے جاتا اور جب ماں اور بیٹی مل کر ہزاروں کی تعداد میں لفافے بنا ڈالتیں تو انھیں شیو رام ہی بازار میں لے جا کر بیچ آتا تھا۔ پشپی کے باپ کا لکڑی کا ایک چھوٹا سا ٹال تھا جسے اس کے مرنے کے بعد چلائے رکھنا مشکل تھا۔ اس لیے اسے بیچ دیا گیا تھا۔ جب شیو رام جیل سے واپس آگیا تو اس نے پشپی کی ماں کو اُونی سویٹر بننے کی ایک مشین بھی خرید کر لے دی جس پر وہ مہینے میں چار ساڑھے چار سو کا کام بڑی آسانی سے کر لیتی تھی۔ ایسے مہربان آدمی سے چرنجیت کی بھی دو چار بار ملاقات ہوئی۔ جو وہاں اکثر آتا جاتا تھا۔ لیکن یہ بات اُسے پشپی نے ہی بتا دی تھی کہ وہ دراصل اس کی ماں کو بہت چاہتا ہے۔ اور دونوں کبھی نہ کبھی کسی جگہ چھپ کر مل بھی لیتے ہیں۔ وہ جگہ عام طور پر شیو رام کا چھوٹا سا گھر ہی ہوتا تھا، جس میں اور کوئی بھی نہیں رہتا تھا۔ اس کی بیوی پاکستان سے آتے ہوئے راستے میں کہیں اٹھا لی گئی تھی اور اس وقت تک ان کے بال بچے بھی نہیں ہوئے تھے یہاں آکر اس نے کباڑ خریدنے اور بیچنے کا چھوٹا سا دھندہ شروع کر لیا تھا۔ ایک ایسے معمولی کباڑی کو بھلا کون رشتہ دیتا جو کئی بار پکڑا جا چکا تھا۔

چرنجیت کو شیو رام میں ہی امید کی ایک جھلک نظر آگئی تھی اور اس نے کمال چالاکی سے اس کے ساتھ دوستی گانٹھ کر اسے اپنے آفس کی ہر سال سینکڑوں من ردّی خریدنے کا ٹھیکہ دلا دیا تھا۔ لیکن اس کے لیے اس سے کوئی رشوت لینے کے بجائے صرف یہ طے کر لیا تھا کہ وہ پشپی کی ماں کو اپنے گھر میں مستقل طور بسائے اور ان دونوں کی بھی شادی کرا دے۔ اتفاق سے یہ تیر ٹھیک نشانے پر جا بیٹھا اور ماں بیٹی دونوں کی شادی ایک ہی دن اسی گھر میں ہو گئی تھی۔ شیو رام پشپی کی ماں کو بیاہ کر اپنے گھر لے گیا تھا اور چرنجیت کو پشپی جیسی خوبصورت اور سگھڑ لڑکی ملنے کے علاوہ ان کا گھر بھی ہاتھ لگ گیا تھا جس کا کرایہ اب وہ پشپی کی ماں بجائے اس کے اصلی مالک کو دے کر اپنے نام کی رسید لے لیا کرتا تھا۔ اُس سازش کا علم پشپی کی ماں کو بہت بعد میں ہوا جس کی وجہ سے وہ تینوں سے بے حد خفا تھی۔ اپنے مرد کو تو اس نے جیسے تیسے بخش دیا تھا پر پشپی اور چرنجیت کو اس نے ابھی تک معاف نہیں کیا تھا۔ پشپی اپنی ماں کے رویے سے دُکھی ضرور تھی لیکن اپنے پتی چرنجیت کو دیکھ کر من کی ساری کلفت بھول جاتی تھی اور اب تو اُن کی ایک پیاری سی بچی بھی پیدا ہو گئی تھی۔

اس روز چرنجیت اس کے پاس اسپتال بند ہونے سے کچھ دیر پہلے پہنچ گیا تو وہ اپنے خیالوں کی دنیا سے نکل آئی اور یک بیک خوش ہو اٹھی۔ وہ اپنی بچی کو گود میں اٹھا کر اُسے آج دیر سے آنے کا سبب بتانے لگا۔ راستے میں اس کے سائیکل کا ایک پہیہ برسٹ ہو گیا تھا جس کے لیے اسے سائیکل کو ٹھیک کروانے میں اتنا وقت لگ گیا تھا۔ پشپی کی ماں نے دور کونے

میں اپنے بیڈ پر لیٹے لیٹے چرنجیت کو اپنی بچی کو بار بار پیار کرتے ہوئے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں پھر خون اتر آیا لیکن جب وہ اپنے شوہر کے سامنے کچھ کہنے کے لیے پھر تیار ہوئی تو ایک نرس اسے انجکشن لگانے کے لیے آموجود ہوئی۔ چونکہ وہ کسی کا کہا نہیں مانتی تھی اس لیے نرسیں بھی اسے بڑی لاپرواہی سے سوئی چبھوتی تھیں جس سے اسے بڑی تکلیف ہوتی تھی۔ اس وقت اس نے اسی وجہ سے انجکشن لگوانے سے انکار کر دیا۔

نرس نے اسے بڑے پیار سے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "دیکھو بی بی، تمہارا ہر کوئی کمپلینٹ کرتا ہے۔ تم پھر اس اسپتال میں آؤ گی تو تمہیں کوئی بھرتی نہیں کرے گا۔ پھر تمہاری عمر بھی اب بہت ہو گیا۔ ذرا سوچو تمہارے بچوں کو کون پالے گا، کون بڑا کرے گا اور پھر کون شادی کرے گا؟ کیا تم تب تک زندہ رہ پاؤ گی؟ اب تو تمہارے بچوں کے بچے ہونے چاہئیے۔ تمہاری بیٹی کو بھی تمہارے ساتھ اسی جگہ بچہ ہوا ہے تو سارے لوگ ہنستے ہیں۔ تم ایسا کرو یہاں رہ کر آپریشن کروا لو۔ پھر اور بچہ نہیں ہوگا۔"

پُشپی کی ماں نے نرس کی باتوں کو پہلی بار بڑے دھیان سے سنا۔ کئی لمحوں تک خاموش پڑی رہی۔ پھر کچھ سوچ کر بولی۔ "سسٹر آپریشن میں زیادہ تکلیف تو نہیں ہوتی؟"

"بی بی، ذرا بھی تکلیف نہیں ہوتا۔ ان دنوں تو بالکل نہیں ہوگا۔ ابھی ابھی تمہارا بچہ پیدا ہوا ہے نا۔ تم دونوں ہسبنڈ وائف ایک فارم پر دستخط بنا دو۔ ابھی لا دیتی ہوں۔ کل آپریشن بھی کر دیں گے۔"

نرس کو ہاتھ میں انجکشن پکڑے ہوئے دیکھ کر پشپی کی ماں نے شکایتی لہجے میں کہا۔ "پر سسٹر تم میری بانہہ میں بڑی بے دردی سے سوئی گھسیڑتی ہو جس سے میری چیخ نکل جاتی ہے۔"

نرس نے اسے یقین دلاتے ہوئے کہا۔ "نہیں نہیں، ایسا بالکل نہیں ہوگا۔ تم اپنا باجو ادھر کرو۔ تمہیں پتہ بھی نہیں چلے گا کہ کب سوئی اندر گیا۔"

اس روز نرس نے اُسے واقعی بڑی احتیاط سے انجکشن لگایا اور کچھ دیر تک بڑے پیار سے اس کے بازو پر اسپرٹ لگی ہوئی روئی ملتی اور مسکراتی رہی تو پُشپی کی ماں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے شیورام کا ہاتھ پکڑ کر روہانسی آواز میں کہا۔ "تم کیا کہتے ہو؟"

شیورام نے چرنجیت اور پُشپی کی طرف دیکھ کر کہا۔ "سسٹر نے جو کچھ کہا ہے ٹھیک ہی کہا ہے۔ ہمیں اب اپنے بچوں کے بچوں کو گود میں کھلانا چاہیئے۔ وہ بیچارے بھی ہمارے پیار کے لیے ترستے ہیں۔ تم نے کبھی سوچا؟ اگر کہو تو تھوڑی دیر کے لیے اُن کی بچی کو اٹھا لاؤں؟ اسے ایک بار گود میں اٹھا کر تو دیکھو۔ تم اس کی نانی ہو۔ سگی نانی!"

وہ اسے کوئی جواب نہ دے سکی۔ اُس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہ نکلے اور اس نے کچھ کہنے کے بجائے دیوار کی طرف کروٹ بدل لی۔ شیورام مسکراتا ہوا اپنے بچے کو گود میں اٹھا اٹھائے پُشپی اور چرنجیت کی طرف بڑھ گیا۔

غزل

ابو محمد سحر

اب تک علاجِ رنجشِ بے جا نہ کر سکے
اک عمر میں بھی حسن کو اپنا نہ کر سکے

تھی ایک رسمِ عشق سو ہم نے بھی کی ادا
دنیا میں کوئی کام انوکھا نہ کر سکے

کل رات دل کے ساتھ بجھے اس طرح چراغ
یادوں کے سلسلے بھی اُجالا نہ کر سکے

اب اس سے کیا غرض ہو کہ انجام کیا ہوا
یہ تو نہیں کہ تیری تمنا نہ کر سکے

خود عشق ہی کو دے گئے رسوائیوں کے داغ
وہ رازِ حسن ہم جنھیں افشا نہ کر سکے

ذوقِ جنوں کو راس نہیں تنگ بستیاں
صحرا نہ ہو تو کیا کوئی دیوانہ کر سکے

ہر امتیاز اس کی نظر میں حقیر ہے
جو اپنی زندگی کو تماشا نہ کر سکے

بن مانگے بھیک بھی نہیں ملتی زمانے میں
وہ کس طرح جیے جو تقاضا نہ کر سکے

سب دیکھتے ہیں یہ کہ سحر کر چکے ہیں کیا
ہم کو یہ فکر رہتی ہے کیا کیا نہ کر سکے

آگرہ کی سیر تو ہو گئی

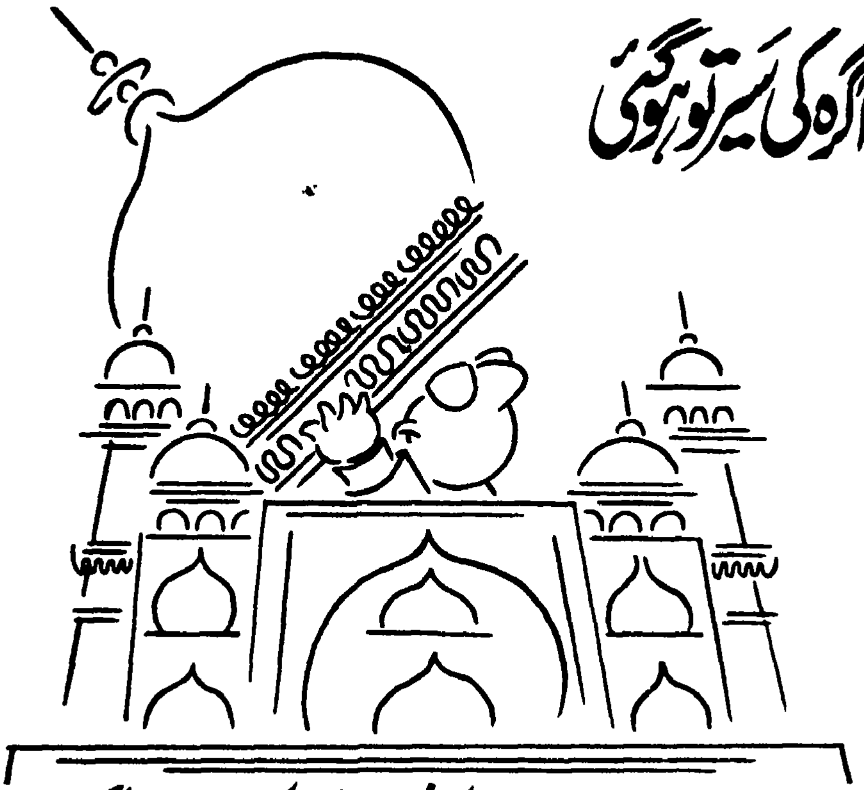

کیا آپ بقیہ مقامات کا نظارہ نہیں کرنا چاہیں گے؟

ٹریول ایجنٹس حضرات!

ہم نے مانا کہ ہمارے آثارِ قدیمہ غیر ملکی سیاحوں کے لیے کشش کا باعث ہیں۔ لیکن بھارت میں آنے والا ایک اوسط درجے کا سیاح سیر و تفریح کا بھی متمنی ہوتا ہے اور یہ ضروری نہیں کہ بھارت کے صرف آثارِ قدیمہ ہی ایسی سیر و تفریح کا مرکز ہوں۔

بھارت میں دیکھنے کی چیز صرف تاج محل ہی نہیں ہے

سیاحوں کو دکھانے کے لیے ہمارے یہاں اور بھی بہت کچھ ہے۔ مثلاً دلفریب صحت افزا مقامات، جنگلی جانوروں کی دلکش پناہ گاہیں اور پُرلطف سمندری ساحل۔

اس لیے جب آپ کسی سیاح کیلئے بھارت درشن کا منصوبہ بنائیں تو اس میں مندرجہ بالا سیر گاہیں بھی شامل کرلیں۔ اسے آپ ایسی دوسری جگہیں بھی دکھائیں جو تاج محل ہی کی طرح حسین اور دلفریب ہیں۔ اسے وہ ہندستان دکھائیے جس سے وہ بے خبر ہے۔

بھارت کو آپ کی ضرورت ہے

سیاحوں سے آپ کا سابقہ پڑتا رہتا ہے۔ آپ سے زیادہ انھیں کون جانتا ہے۔ یہ بات یاد رکھیے کہ آپ کی پروازِ فکر اور قوتِ عمل و ترغیب کے بغیر بھارت کے دیدنی مقامات غیر ملکی سیاحوں سے محروم رہ جائیں گے۔

اور اس کے نتیجے میں خود آپ بھی۔

ٹورازم ایک صنعت ہے۔ اب وہ وقت آن پہنچا ہے کہ اس ضمن میں بھارت اپنے حصے کا منافع بڑھائے

ڈیپارٹمنٹ آف ٹورازم
گورنمنٹ آف انڈیا

ASP·DOT·80

عثمان عارف

مخمور دہلوی

ہر زبان میں ایسے شاعر بہت کم ہوتے ہیں جو اپنے فکر و فن کی روشنی سے نئے راستوں کو روشن کرتے ہیں۔ یقیناً ایسے فن کار کسی بھی زبان کے لیے سرمایہ افتخار ہوتے ہیں۔ لیکن بڑی تعداد ایسے شعرا کی ہوتی ہے جو نئی راہیں تو نہیں نکالتے لیکن متعین راستوں کی تزئین اور آرائش کرتے ہیں اور ان کا یہ کارنامہ بھی کم قابل قدر نہیں ہوتا۔ داغ اسکول کے شعرا کو ہم اس زمرے میں شامل کر سکتے ہیں۔

داغ دہلوی اور ان کے ارشد تلامذہ نے نہ صرف اپنے زمانے کے نوجوان شعراء کی تربیت کی بلکہ زبان کو نکھارنے اور سنوارنے میں بھی بڑا نمایاں حصہ لیا ہے۔ اردو زبان کو جو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی اور مشاعروں نے عوامی زندگی میں اپنے لیے جو ممتاز مقام بنالیا ہے ان میں ایسے شعرا کا ہاتھ ہے جنھوں نے زبان کی چاشنی، روزمرہ، محاورہ، لفظوں کی نشست و برخاست اور ایسا بے ساختہ انداز بیان اپنایا کہ سبھوں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔ ایسے ہی شاعروں میں مخمور دہلوی بھی جو داغ کے ممتاز شاگرد حضرت بیخود دہلوی کے شاگرد تھے۔

فضل الٰہی مخمور دہلوی ۱۹۰۱ء میں دہلی میں پیدا ہوئے، ابتدائی عمر سے شاعری کا شوق رہا۔ اور اسی شوق کی وجہ نواب افتخار علی آف پٹودی کے حلقہ خاص میں شامل ہوئے اور ۱۹۲۵ سے ۱۹۴۷ تک پٹودی میں مقیم رہے ریاست کے انضمام کے بعد جب دہلی واپس آئے تو ایک عرصے تک شعر و سخن کی محفلوں سے دور رہے۔ لیکن دوستوں اور خود نواب صاحب آف پٹودی کے اصرار پر مشاعروں میں شریک ہونے لگے۔ یوں کہنا چاہیے کہ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۴ء تک کے چار پانچ برسوں میں انھوں نے اپنے ترنم اور پاکیزہ کلام کی وجہ سے وہ شہرت اور مقبولیت حاصل کی جو بہت کم شعرا کے حصے میں آئی ہے۔

۲۶ فروری ۱۹۵۴ء کو صرف ۵۳ سال کی عمر میں آپ کا انتقال ہوگیا

اب ہمارے بعد اک دنیا اسے دہرائے گی
کہتے کہتے اپنا افسانہ ہمیں نیند آگئی

مخمور دہلوی ایک بزرگ صوفی جناب اشتیاق سے بیعت تھے۔ اسی لیے طبیعت میں استغنا، قناعت اور درویشی تھی۔ یہ رنگ ان کی شاعری کا نمایاں رنگ ہے۔

ان کے کلام کے دو مجموعے بادۂ مخمور اور عرفان مخمور شائع ہو چکے ہیں۔

فانی کی طرح مخمور بھی پریشان روزگار رہے، ان کے موضوعاتِ شعر بھی وہ ہیں۔ جو فانی کے ہیں۔ رنج و غم، حسرت و یاس، موت و حیات جبر و قدر، حسن و عشق۔

لیکن باوجودیکہ فانی و مخمور کی زندگی میں غم نصیبی و ناکامی، شاعری میں مضامین رنج و غم، اور کردار میں خودداری و استغنا کے لحاظ سے یک گونہ یکسانیت و مماثلت ہے، تاہم یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ جن مضامین پر فانی جیسے بلند پایہ شاعر نے طبع آزمائی کر کے اردو غزل کو مالامال کیا۔ مخمور نے بھی انھیں اپنے موضوعات سخن بنا کر فانی ہی کے رنگ میں ایسے ایسے اچھے شعر نکالے کہ جانشینی کی روایات دیرینہ کو اگر اس دور میں بھی کوئی اہمیت دی جائے تو مخمور کو بجائے بیخود مرحوم کے فانی کا جانشین کہنا زیادہ مناسب ہے۔ وہ داغ اسکول سے ضرور تعلق رکھتے تھے لیکن شاعری اور زمانے کے بدلے ہوئے رجحانات کے زیر اثر مخمور کے کلام میں وہ شوخی، چلبلاپن، رنگینی، یا معشوق کے عشوے غمزے، چوچلاپن اور اس سے پر لطف چھیڑ چھاڑ نہیں ملتی جو ان کے استاد بیخود یا دادا استاد داغ کی شاعری اور تغزل کی جان ہے۔

غم مخمور کی شاعری کا اہم جزو ہے جس کو انھوں نے اپنی شاعری میں ایسے قابل قدر آرٹسٹ کی طرح سمو دیا کہ ہر وہ شخص جس کے پہلو میں دل، اور دل میں درد ہے، مخمور کے کلام سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

تیرہ بختی کو کسی طرح چھپایا نہ گیا ٭ دو قدم چھوڑ کے مجھ سے میرا سایا نہ گیا
یہ نظارہ میری نظروں سے کیوں اوجھل نہیں ہوتا ٭ کبھی بجلی گری تھی جل رہا ہے آشیاں اب تک

دنیا کی رنگینیوں اور عیش و عشرت سے محروم رہ جانے کا اظہار کس حسرت سے انداز میں کیا ہے۔

خوشی بھی تھی اسی عشرت کدہ میں عیش بھی تھا ٭ کسی نے راہ نہ پائی غریب خانے کی
اس بھرے گلشن میں قسمت سے نہ پوری ہو سکی ٭ چار تنکوں کی تمنا آشیانے کے لیے

غم دنیا کے ساتھ غم عشق کی آمیزش نے مخمور کے کلام کو تیر و نشتر بنا دیا ہے جن کی چبھن ایک لذت بخش درد پیدا کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔ سوز و گداز، درد و اثر، جدت ادا، اور تغزل کے اعلیٰ نمونے درکار ہوں تو یہ اشعار پڑھیے۔

غم میرا مقدر ہے تمنا تو نہیں ہے ٭ مجبور کا جینا کوئی جینا تو نہیں ہے
پاس آداب محبت نہیں کہنے دیتا ٭ تم سمجھتے ہو کہ میں نے تمہیں سمجھا بھی نہیں
محبت کا صلہ ایثار کا حاصل نہیں ملتا ٭ وہ نظریں بارہا ملتی ہیں لیکن دل نہیں ملتا

دنیا کی بے مہری و بے التفاتی اور اپنی انسانیت دوستی کو کیسے موثر پیرایہ میں بیان کیا ہے۔

یہ دنیا ہے ہنسا کرتی ہے اوروں کے مصیبت پر ٭ تیرا رونا یہاں اے چشم گریاں کون دیکھے گا
اپنے دل کا حال کن آنکھوں سے دیکھوں بے خبر ٭ میں تو رو دیتا ہوں اوروں کی مصیبت دیکھ کر
میرے نغموں کو دنیا آج بھی نالے سمجھتی ہے ٭ میاں اب سمجھا یہاں زندہ دلی دیکھی نہیں جاتی
کان دھر کر یہ صدائیں کوئی سنتا ہی نہیں ٭ ٹوٹ جاتے ہیں بھری محفل میں پیمانے بہت

غموں کی فراوانی نے مخمور کو یاس و ناامیدی کی ان حدوں تک پہنچا دیا جہاں عبد و معبود کا رشتہ ٹوٹ جانے کی نوبت آ جاتی ہے۔ مخمور جیسا خدا پرست انسان جس کے ایمان و ایقان کی ایک ایک شعر سے تصدیق ہوتی ہے ایسے شعر کہنے پر بھی مجبور ہو گیا۔

بھر کے طوفاں میں سفینہ ڈوب جاتا ہے جہاں ٭ میں سمجھتا ہوں وہاں شاید خدا ہوتا نہیں
اب تو کچھ کہنے لگیں مجھ سے میری مجبوریاں ٭ تم خدا ہو تو بچا لو سب کے احساں سے مجھے

ہجوم یاس میں ایسے بھی وقت آئے ہیں ٭ کبھی کبھی مجھے تیرا بھی آسرا نہ رہا

انتہائے یاس میں وہ یہ شعر کہہ تو گئے لیکن فوراً سنبھل بھی گئے۔ وہ اس یقین پر قائم ہو گئے کہ سفینہ اس لیے نہیں ڈوبتا کہ وہاں خدا نہیں ہوتا بلکہ اس کے اختیار کی ایک مثال ہے۔ کنارے پر کشتی ڈبو دینا طوفاں میں اسے بچا لینا، ڈبو کر ساحل سے لگا دینا اس کے قادر مطلق ہونے کی دلیلیں ہیں۔

سفینے وہ بھی ہیں جو ڈوب جاتے ہیں کنارے پر ٭ سفینے وہ بھی ہیں جو بچ نکلتے ہیں طوفاں میں
ناخدا پر ہنسنے والو یہ خدا کا کام ہے ٭ ڈوبنے والے بھی آ جاتے ہیں ساحل کی طرف

اور انسان مایوس و ناامید ہو جانے پر بھی اس سے بے نیاز و بے پروا نہیں ہو سکتا۔

کرم کی آس لگائے تمہیں کو تکتی ہے ٭ وہی نگاہ جو دنیا سے پھیر لی میں نے

یہی نہیں بلکہ ناامیدی آخری حد تک پہنچ جانے کے بعد امید بن جاتی ہے۔

ناامیدی سے بڑھ کر کوئی امید نہیں ٭ یاس کھوئی ہوئی منزل کا نشاں ہوتی ہے
ناامیدی سے بڑی امید ہے ٭ اک نہ اک دن مہرباں ہو جائیں گے

زندگی کی ناکامیوں نے مخمور کو بھی مسئلہ جبر کا قائل بنا دیا تھا۔ انسان کی مجبوری اور اس قادر مطلق کا اختیار دیکھیے۔

مجبور سے تو اپنی بھی بگڑی نہ بن سکی ٭ مختار نے تو عالم امکاں بنا لیا
صرف مختار وہی ہے جو مقدر کر دے ٭ گل رنگیں کے لیے خاک سے پیدا ہونا
کسی مختار ہستی کے تصرف کی دلیلیں ہیں ٭ مرا ہر کام میں ہر بات میں مجبور ہو جانا

انسانی مجبوری کا اگر اس بات پر ہی خاتمہ اور فیصلہ ہو جائے کہ انسان کا ہر اچھا برا فعل اللہ کی مرضی اور حکم کے تابع ہے تو یک گونہ اطمینان و سکون نصیب ہو سکتا ہے اور مخمور کی طرح یہ کہہ کر دل کو تسلی دی جا سکتی ہے۔

میں تو بندہ ہوں سنا ہے بندگی بیچارگی ٭ خیر جو کچھ بھی میری تقدیر میں لکھا گیا

مخمور کے خیال میں انسان روز ازل سے جبر کا شکار ہے اور مجبوری کے عالم میں بھی آزمائش و امتحان کی زنجیریں اسے جکڑے ہوئے ہیں۔

آدمی روز ازل سے جبر کی منزل میں ہے
میری مجبوری بقید امتحاں ہے آج بھی

ان خیالات کے باوجود مخمور بے دست و پا ہو کر نہیں رہے۔ انھوں نے قید امتحاں کی مصیبتوں سے بچنے کی راہیں بھی نکالیں اور کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ ان کا خیال ہے کہ ناکامی اور مصیبت بذات خود اتنی تکلیف دہ نہیں اتنا انسان کا۔ خیال کہ کامیابی میرے اختیار میں تھی اور میں ناکام رہا۔

یہی سبب ہے کہ ناکامیوں میں روتا ہوں
سمجھ لیا ہے کہ ہر کام اختیار میں ہے

خودشناسی و عظمت انسانی کو مخمور نے جس طرح اور جن حالات میں قائم رکھا یہ انھیں کا حصہ تھا۔ سوگوارانہ زندگی گزارنے پر بھی کبھی حق بندگی سے انکار نہیں کیا، بلکہ کشاکش حیات نے ان کا کردار اور بھی بلند کر دیا

میں جانتا ہوں کہ آداب بندگی کیا ہیں
ہزار رنج دے ایک کا ملال نہیں

فقیری میں بھی مجھ کو مانگنے سے شرم آتی ہے
سوالی ہو کے مجھ سے ہاتھ پھیلایا نہیں جاتا

وہ دل تفویض کیجئے جو دو عالم سے ہو مستغنی
وہ دامن چاہیئے مجھ کو جو پھیلایا نہیں جاتا

اب میرے لیے غم اور خوشی دو لفظ ہیں وہ بھی بے معنی
ہنسنے پہ کبھی رو دیتا ہوں رونے پہ ہنسی آجاتی ہے

زندگی کے رنج و غم سے چھٹکارا پانے کے لیے مخمور نے ضبط و تحمل رم و ہمت اور استغنا سے کام لیا ہی لیکن اس کا اصل علاج عشق میں ھونڈا، جس کے لیے مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ یہ فرما گئے ہیں ؎

شادباش اے عشق خوش سودائے ما
اے طبیبِ جملہ علت ہائے ما

مخمور خود تو مخمور تھے ہی انھوں نے اپنے پیمانہ شاعری میں وہ مئے رفت و محبت بھر بھر کر پلانی شروع کی جس نے ایک دنیا کو مست و بیخود ادیا اور سچ تو یہ ہے کہ ؎

عشق کی مضراب سے جب سازِ دل چھیڑا گیا
نکلے وہ نغمے کہ جن سے روح کو وجد آگیا

یہ روح کو وجد میں لے آنے والے نغمے ایسے تھے کہ جب مخمور رل خواں ہوتا تھا تو اس کے سامعین ایسا محسوس کرتے تھے کہ گویا وہ اس یا سے الگ ہٹ کر کسی ایسی آفاقی دنیا کی فضا میں سانس لے رہے ں جہاں سکون ہی سکون اور محبت ہی محبت کار فرما ہے۔

مخمور فانی کی طرح 'دولت دو جہاں' کھو کر ایک دولتِ عشق اور رلِ مبتلا، پا کر بے حد خوش و مطمئن ہیں ؎

محبت جس کو دیتے ہیں اسے پھر کچھ نہیں دیتے
اسے سب کچھ دیا ہے جس کو اس قابل نہیں سمجھا

محبت کے لیے کچھ خاص دل مخصوص ہوتے ہیں
یہ وہ نغمہ ہے جو ہر ساز پہ گایا نہیں جاتا

کسے ملتی ہیں وہ آنکھیں محبت میں جو روتی ہیں
مبارک ہیں وہ آنسو جن کی ارزانی نہیں جاتی

جس حسن کے دیدار کی حسرت میں مخمور نے اپنی آنکھوں کو محروم تماشا رلیا اور مایوس ہو کر حسرت بھرے انداز میں یہ کہنے پر مجبور ہو گیا ؎

وہ کیا آتے نہیں آیا کوئی پیغام تک   منتظر بیٹھے رہے ہم زندگی کی شام تک

اس کی بارگاہِ ناز کی حدیں مادی دنیا سے 'حدِ امکاں سے پرے وہم و گماں سے آگے' ہیں۔ وہ اس حسن کا شیدا اور متوالا ہے جس کی تجلیات ارض و سما پر چھائی ہوئی ہے۔

مخمور اس کی نگاہ کرم کے امیدوار ہیں ؎

ایسے ہی اک نگاہ کرم کے امیدوار
منہ پھیر لیں متاعِ دو عالم اگر ملے

اپنی تو آرزو ہے بس اک سجدۂ نیاز
نقش قدم ملے کہ تیرا سنگِ در ملے

اس کے بعد خود فراموشی کی منزل ہے۔

نقش گہرے ہو چلے ہیں اب کسی کی یاد میں
بھول جاتا ہوں بسا اوقات اپنا نام بھی

پھر خیال آیا کہ یہ 'بسا اوقات' کی قید بھی کیوں 'ہست' کے مقابلہ میں 'نیست' کا تصور ہی کیا۔ انسانی ہستی کا جو سر تا پا 'نیست' ہے نیست و نابود ہو جانا ہی 'ہست' تک پہنچنے کی آخری منزل ہے۔ چنانچہ مخمور نے اپنے محبوب اور اپنے درمیان اپنی ہستی کا جو پردہ حائل تھا اسے یکسر اٹھا دیا ؎

میں حجاب درمیاں تھا درمیاں سے اٹھ گیا
ہر نفس کے ساتھ اب تو آ رہی ہے بوئے دوست

فانی کی طرح مخمور نے موت و فنا کی راہ سے بھی اپنی منزل مقصود کا پتہ لگایا ہے ؎

بند آنکھیں کیا ہوئیں آرام ہی آرام تھا
زندگانی چار دن کی کلفتوں کا نام تھا

آدمی بے چینیوں کے بعد ہی پاتا ہے چین
موت آئے گی تو آئے گا مجھے آرام بھی

زندگی کو موت پر ترجیح دینے کی سب سے معقول وجہ مخمور کے خیال سے یہ ہے کہ وہ اسے وصال دوست کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور اس سے بڑھ کر ان کو اور کوئی خوشی نہیں ؎

اب کے بیمار غم نے کس خوشی سے جان دی
موت نے پہنچا دیا جو آخری پیغام تھا

ہچکیاں لائیں نویدِ وصلِ دوست
جان بخشی آخری پیغام نے

اور یہ حقیقت ہے کہ موت نے مخمور کو اس منزل پر پہنچا دیا جو ان کا مقصد حیات تھی، جس کا یقین انھیں خود ہو گیا تھا اور جس کا اظہار انھوں نے مرنے سے کچھ پہلے اس شعر میں کیا تھا ؎

قصۂ دردِ دل ناکام باقی رہ گیا   مرتے مرتے بھی ہمارا نام باقی رہ گیا

نثار احمد فاروقی

شریمد بھگوت گیتا

ہندوستانی مذہبی روایت میں ویدوں کو نگم کہا جاتا ہے۔ یہ وہ مستند کتابیں ہیں جو ہندو مت کی بنیاد فراہم کرتی ہیں لیکن اپنشدوں کے زمانے سے کچھ تو حد کو کچھ اور مذہبی صحائف وجود میں آئے جنھیں آگم کہا جاتا ہے۔ انھیں بھی عوامی مقبولیت حاصل ہو گئی لیکن آگمی صحیفوں کی تدوین کے ساتھ ہی ہندو مت میں مختلف فرقوں کا ظہور بھی ہو گیا چنانچہ ویشنو مت، شیومت اور شاکتا اپنے جداگانہ مذہبی صحیفے رکھتے ہیں۔ ہندوؤں کی اکثریت ویشنو مت اور شیومت کے ماننے والوں کی ہے۔ اور ان دونوں متوں کی بھی متعدد شاخیں ہیں۔ وہ سب ویدوں کے اقتدار کو تسلیم کرنے کے ساتھ اپنشدوں اور دھرم شاستروں سے اپنے مذہبی نظریات کا استناد کرتے ہیں۔ ساتھ ہی آگمی صحائف کے لیے بھی اگر زیادہ نہیں تو اتنی ہی عزت اپنے دلوں میں رکھتے ہیں۔

ہندوؤں کی بہت بڑی اکثریت بھگوت گیتا، مہابھارت اور رامائن کا انتہائی احترام کرتی ہے۔ ویشنو مت کے ماننے والے خاص طور پر بھگوت گیتا سے گہری عقیدت اور محبت رکھتے ہیں۔ اسی طرح شیومت ماننے والے ان پرانوں کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں جن میں شیوجی کی زندگی اور کارناموں کا بیان ہے۔ ان اہم اور بنیادی کتابوں کے علاوہ بھی ان دونوں مدرسہ ہائے فکر کا بہت وسیع مذہبی لٹریچر ہے۔

ہندو مت اور فلسفہ کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اسی طرح ہندوستانی فلسفہ پر مذہبی فکر کی گہری چھاپ لگی ہوئی ہے۔ جین مت کی تو بنیادوں میں ہی فلسفہ بھرا ہوا ہے۔ بدھ مت کے عقائد اور نظریات بھی فلسفۂ حیات و کائنات پر غور و فکر سے وجود میں آئے ہیں۔ اب ان مذاہب کا امتیاز یہ ہے کہ ان کا ایک فلسفیانہ پہلو ہے جو علما، فلاسفر اور تعلیم یافتہ انسانوں کو غور و فکر کی دعوت بھی دیتا ہے اور حیات و کائنات سے متعلق مذہبی عقائد و نظریات کی فلسفیانہ بحثوں میں ایسی موشگافیاں کرتا ہے کہ اوسط درجے کی سمجھ بوجھ والے کا بھی ان باریکیوں اور فلسفیانہ نزاکتوں کو سمجھنا آسان نہیں ہے۔ دوسری طرف اس کا عملی پہلو ہے جس کی جڑیں عوام کے طرزِ معاشرت میں پیوست ہیں اس طرح ہندو مت میں ایک فلسفیانہ دماغ اور ایک عام آدمی دونوں کے لیے ذہنی اور روحانی غذا فراہم کی گئی ہے۔

ہندو مت کے فلسفہ کو وہی سمجھ سکتا ہے جو ہندوستانی معاشرت اور فکر کی قدیم روایت کا شناسا ہو۔ روایت سے اس کا رشتہ توڑ کر ہندو فکر کو سمجھنا ممکن نہیں ہے۔ ہندو فلسفہ کی رو سے مذہب یا روحانی زندگی کے تین پہلو ہیں: علم، عمل اور بھگتی۔ مختلف مدرسہ ہائے فکر اس میں نظریاتی اختلاف رکھتے ہیں کہ "حقیقت کیا ہے۔ اور "موکش" کیسے حاصل ہو سکتا ہے یا نجات کی آخری منزل کون سی ہے۔ لیکن ان مقاصد کے حصول کے لیے سب نے تقریباً ایک سا ہی علاج اور طریق کار تجویز کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہند مفکرین نے روحانی نظام میں کچھ ضروری بنیادی اصولوں پر اتفاق کر لیا ہے۔ اس طرح مختلف فلسفیانہ تعبیروں میں وحدت کا ایک شیرازہ بھی نکل آیا ہے اور گویا یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ روحانی نظام کے تین بنیادی ستون ہیں جنھیں ہم صوفیا کی زبان میں علم، عمل اور عشق کہہ سکتے ہیں۔ اور انھیں تین بنیادی اصولوں کی تشریح بھگوت گیتا کا موضوع ہے۔

تانترک فلسفہ کے عروج کے ساتھ یہ ہوا کہ بنیادی مذہبی صحیفوں کے ساتھ ہی گورو یا مرشد کی ضرورت کو بھی مساوی درجے میں اہم قرار دے دیا گیا۔ گویا اگر نجات حاصل کرنا ہے تو اس کے لیے تین بنیادی باتیں علم، عمل اور عشق ہیں مگر ان تینوں کا برتنا اور ان کے رموز حقائق کا سمجھنا مرشد کی رہنمائی کے بغیر ممکن نہیں ہے اسی کو بعض صوفیا کے مقولے میں یوں کہا گیا ہے: من لا شیخ لہ فشیخہ ابلیس۔ ہمارے نظامِ تصوف میں بھی پیر و مرشد کی ضرورت پر جتنا زور دیا گیا ہے اس سنٹرل ایشیا میں بدھ مت اور مغربی ایشیا میں ہندو مت کے اندازِ فکر کا اثر ضرور پڑا ہے۔ گورو کی مدد کے بغیر مذہبی کتابوں کا سمجھنا ممکن نہیں ہے نہ ان پر عمل کرنا آسان ہے اور عمل بھی کر لے تو اس کے ثمرات کا پورا فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ تصوف اسلامی میں مرشد کا جو مرتبہ ہے اور اس سے مقامات روحانیت کے حصول میں جو مدد ملتی ہے اس کا بیان تصوف کی تمام اصولی کتابوں میں تفصیل سے موجود ہے۔ عمل میں بعد کے زمانے میں اتنا غلو ہو گیا کہ صرف "مسلکِ پیر" کو کافی سمجھ لیا گیا۔ کتاب یا صحیفے کی حیثیت ثانوی ہو گئی۔ اسی لیے حضرت چراغ دہلی کو ایک بار اپنی مجلس میں کہنا پڑا "مسلک پیر حجت نہیں ہے۔ کتاب و سنت سے دلیل لانی چاہیے۔"

صوفیا نے کائنات کو عالمِ کبیر اور انسان کو عالمِ صغیر کہا ہے باہر کی وسیع، ناپیدا کنار فضا میں جو کچھ موجود ہے وہ سب انسان کی اندرونی پہنائیوں میں بھی ہو رہا ہے۔ اس لیے بعض صوفیا نے مجاہدات کا مقصود "عرفان نفس" کو بتایا ہے اور اسی مقام کی تجلی ہونے پر منصور حلاج نے "انا الحق" کا نعرہ لگایا ہے۔ من عرف نفسہ فقد عرف ربہ بہت ہی مشہور مقولہ ہے، ہندو فلسفہ بھی ایک منزل پر یہی کہتا ہے کہ "عرفان نفس" مجاہدات کی آخری غایت ہے۔

بھگوت گیتا میں ایک نکتہ کی تشریح بار بار اور بڑے دل نشین انداز میں کی گئی ہے۔ "ایک عارف کو ویدوں کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی اس

شخص کو چاروں طرف پانی سے گھرا ہوا ہو، پانی کے ایک چھوٹے سے حوض کی ہوسکتی ہے۔" (۴۶:۲)

اپنشدوں میں علم پر زور دیا گیا ہے اور ویدوں میں ظاہری رسوم ادا کرنے پر۔ دونوں کے برخلاف گیتا نے عشق اور عمل کو ترجیح دی ہے۔ ہندو مت کے بعض علما کا خیال ہے کہ وشنوازم کی شکل میں کوئی Cult اس وقت غالب رہا ہوگا جس زمانے میں بھگوت گیتا وجود میں آئی ہے۔ رامانج اور راما نند کے زمانے میں بھکتی کا جو درخت برگ و بار لایا اس کی تخم ریزی صدیوں پہلے گیتا کے زمانے میں ہو چکی تھی۔

بھگوت گیتا ہندوستان کی عظیم کتابوں میں سے ایک ہے بلکہ اگر عالمی مذہبی لٹریچر کی ایک منتخب فہرست بنائی جائے تو اس میں بھی بھگوت گیتا ضرور شامل ہوگی۔ یہ ان کتابوں میں سے ہے جو ہر دور میں مقبول رہی ہیں اور جنھوں نے فکر انسانی پر گہری چھاپ لگائی ہے۔ گیتا کے ایک ایک لفظ کی تشریح میں ہندو عالموں اور ہندو فلسفہ پر کام کرنے والے اسکالرز نے دفتر کے دفتر لکھے ہیں اور طرح طرح سے ان کی تفسیر کی ہے۔ مسلمان علما نے بھی ہر زمانے میں اس کتاب کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ ہمارے معلوم ذخیرۂ کتب میں ابوریحان البیرونی غالبًا پہلا مسلمان عالم ہے جس نے بھگوت گیتا کا تفصیلی تعارف اپنی شہرہ آفاق کتاب "تحقیق ماللہند" میں پیش کیا ہے اور گیتا کے طویل اقتباسات کا عربی ترجمہ بھی دیا ہے۔ فارسی اور اردو میں نظم اور نثر میں پچھلی تقریبًا پانچ صدیوں کے اندر مسلمانوں نے گیتا کے ۳۲-۳۳ تراجم کیے ہیں فارسی میں فیضی کا ترجمہ، اردو میں خواجہ دل محمد اور اجمل خاں اور حسن الدین احمد کے ترجمے عام طور پر متعارف ہیں۔ اردو نظم میں الم مظفر نگری نے اسے منتقل کیا تھا۔ اسی طرح مستشرقین نے انگریزی، جرمن اور فرانسیسی زبانوں میں گیتا کے ترجمے کیے جن کی بدولت یورپ والے بھی فلسفہ و علم کے اس بیش قیمت خزانے سے واقف ہو سکے۔

بھگوت گیتا میں سری کرشن جی مہاراج کی تعلیمات کا لبّ لباب آگیا ہے۔ اسے مہارشی ویدویاس نے اٹھارہ ابواب اور ۷۰۰ شلوکوں میں قلمبند کیا ہے۔ بھگوت گیتا کی سب سے اعلیٰ خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تنگ نظری کے ساتھ کسی عقیدے کی پیچ نہیں کی گئی ہے۔ ایسی اصولی فلسفیانہ بحث ہے جس میں آفاقی اپیل ہو سکتی ہے، اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ نجات یا موکش کا تعلق کرم یعنی اعمال سے ہے۔ گیتا میں ترک دنیا کی تعلیم نہیں ہے، البتہ ضبط نفس اور خواہشات کو مغلوب کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ عمل کو گیتا میں مقصود بالذات کہا گیا ہے گویا عمل کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔ اگر ہم عمل کے نتائج اور جزا کا خیال نکال دیں تو ہر عمل خود ہی عبادت بن جاتا ہے۔ قرآن کی تعلیم بھی یہی ہے لَيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ یعنی انسان کو سوائے کوشش کرنے کے اور کچھ نہیں کرنا ہے۔ دوسری جگہ قرآن حکیم کہتا ہے: وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا جو لوگ ہمارے لیے مجاہدہ کرتے ہیں ہم انھیں اپنے راستے دکھا دیں گے۔ بے غرض اعمال کو قرآن کی اصطلاح میں "احسان" کہا گیا ہے اور خدائی وعدہ ہے: (إِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ اللہ احسان کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا) گیتا میں عمل کا جو فلسفہ پیش کیا گیا ہے۔ اور اس سے نتائج، مفاد اور اغراض کو علیحدہ کرنے کی جس طرح تلقین کی گئی ہے اس کی روشنی میں غور کریں تو وہ بھی "احسان" کا ہی فلسفہ ہے، اگرچہ دونوں کی غایت میں بہت فرق ہے۔ بھگوت گیتا کے مطابق ہمارے رنج و غم کا سرچشمہ یہی ہے کہ ہم اپنے اعمال پر نظر نہیں رکھتے ان کے نتائج اور مفادات کو سامنے رکھتے ہیں اسی کا نام "خواہشات" ہے۔ یہ خواہشیں ہی انسان کو اپنا بندہ بنائے رکھتی ہیں اور ان کے دام میں پھنس کر ہی وہ ہندو عقیدے کے مطابق تناسخ (آواگون) کے چکر میں پڑتا ہے جب خواہش درمیان سے اٹھ جائے گی تو مقصود صرف "ایک ہی رہ جائے گا جو ہر موجود کا مرجع ہے اور جس کی طرف لوٹنے کے لیے ساری کائنات بے قرار ہے۔ مولانا روم نے اسی کو بانسری کے استعارے سے بیان کیا ہے۔

خواہشات کا ختم ہو جانا "فنائے تام" ہے اپنا ارادہ ختم ہو کر تو اعمال "کسی اور ارادے" کے تابع ہو جائیں گے۔ یہی وصول الی الحق ہے۔ پھر منزل بقا باللہ کی ہے جیسے حدیث شریف میں بی یسمع و بی یبصر کہا گیا ہے۔ اس کے بعد سیر فی اللہ ہے جس کی کوئی حد و انتہا نہیں ہے۔

بھگوت گیتا میں مادی زندگی اور روحانی نظام کو ایک دوسرے سے ایسا مربوط کر دیا گیا ہے کہ اس کی روشنی میں دنیوی زندگی بھی حسن تدبیر سے گذر سکتی ہے اور روحانی نجات کے راستے بھی تلاش کیے جا سکتے ہیں بھگوت گیتا کا زمانہ تصنیف حضرت عیسیٰ سے تین سو سال پہلے بتایا جاتا ہے۔ اس میں مہابھارت کے جنگ کو بطور پس منظر دکھایا گیا ہے اور سنجے کی زبانی اس کی روایت ہوتی ہے۔ دھرت راشٹر نے سنجے سے سوال کیا ہے اور وہ مہابھارت کا نقشہ اپنے کف دست پر دیکھ کر سارے حالات بتا رہا ہے جس میں ارجن اور سری کرشن جی مہاراج رتھ میں سوار ہیں اور ارجن کا تذبذب دیکھ کر اسے سری کرشن جی عمل کا فلسفہ سمجھا رہے ہیں۔ اس کے بعد جو مکالمے ہیں وہ ارجن اور سری کرشن جی کے درمیان ہیں۔

گیتا کے اٹھائیس ابواب میں علم کا فلسفہ، عمل کا فلسفہ، ترک دنیا کا فلسفہ، بے غرض اعمال کا فلسفہ، ضبط نفس، عرفان رب، حق الیقین، وحدت الوجود خیر و شر اور نجات جیسے موضوعات زیر بحث آئے ہیں۔

بھگوت گیتا کو ہندو مت کی کتاب کہنا یقینًا تنگ نظری ہوگی یہ آفاقی مذہب کی کتاب ہے اور اس میں اسّی فیصد وہ نظریات و تعلیمات ہیں جو ہمیں اپنے اکابر صوفیا کی کتابوں میں بھی ملتی ہیں۔ آج سے ۴۰-۵۰ سال پہلے پنڈت سندر لال نے کتاب "گیتا اور قرآن" لکھ کر دونوں کتابوں کا تقابلی مطالعہ کیا تھا آج بھی ہر اس مسلمان عالم کے لیے جو وسط ایشیا اور جنوب مغربی ایشیا میں اسلامی تصوف اور اسلامی فکر کے نشو و نما کا محققانہ مطالعہ کرنا چاہتا ہو، بھگوت گیتا کا نہایت گہری نظر سے مطالعہ کرنا بے حد ضروری ہے۔

غزلیں

ناظم میواتی

بھی تو زہرِ ہلاہل پی گئے الفاظ
خلوص کی دو بوند ہی جی گئے الفاظ

بھی تو اوس کی دو بوند بھی نہ جذب ہوئی
بھی تو خون کا دریا بھی پی گئے الفاظ

سی کے منہ سے فصاحت کے پھول جھڑتے ہیں
کسی کے ہونٹ کا دامن بھی سی گئے الفاظ

تصورات کی پریاں برہنہ رقصاں تھیں
تلاشِ معنی میں جس جس گلی گئے الفاظ

تجلیات کی اس دل فریب جنت میں
تصورات کی آنکھیں بھی سی گئے الفاظ

تلاش لاکھ کی ناظمؔ! ملی نہ بزمِ حیات
حدودِ شہرِ معانی میں بھی گئے الفاظ

نعیم ربانی

کہیں سحر کی تجلی کہیں یہ رات ہوں میں
سما سکے نہ جو الفاظ میں وہ بات ہوں میں

فلک نہیں مرا مسکن تو کیا میں خاکی ہوں؟
زمیں پہ پرتوِ خلاقِ کائنات ہوں میں

وہ ایک لمحہ جو صدیوں میں جگمگاتا ہے
نگارِ وقت کا وہی لمحۂ حیات ہوں میں

وہ حادثہ کہ زمانہ تھا منتظر جس کا
بفیضِ عشق وہی خاص واردات ہوں میں

نعیمؔ! لرزہ براندام ہوں نہ میخانے
کہ دورِ نو کا بس اک رندِ خوش صفات ہوں میں

تکمیل رضوی

کھایا ہے دوستوں نے فریبِ نظر کہاں
بجلی چمک رہی ہے نمودِ سحر کہاں

ہوں بے نیازِ ہوش یہ مجھ کو خبر نہیں
ہوتی ہے میری شام کہاں اور سحر کہاں

ہاں ہاں میں حادثاتِ زمانہ کا ہوں شکار
ہاں اس میں سازشِ نگہِ فتنہ گر کہاں

آنسو ابھی تو گوشۂ دامن تک آئے ہیں
کیا جانے قافلہ یہ رکے تا سحر کہاں

منزل پہ آ کے ہوش و خرد کی تلاش ہے
رستے میں جا کے چھوٹ گئے ہم سفر کہاں

بیداریٔ حیات کی لہریں فضا میں ہیں
کیا جانے ہو رہا ہے یہ جشنِ سحر کہاں

تکمیلؔ حوصلہ بھی ہے جوشِ عمل بھی ہے
سب کچھ ہے زندگی کا توازن مگر کہاں

کیلاش نارائن بہاری مہجور

میں جس کو اجنبی سمجھا، مرا ہی چہرہ تھا
مرا وجود ہی دیوار و در کا سایہ تھا

کسی بھی ضربِ مسلسل سے ٹوٹتا کیسے
جو رشتہ بوئے چمن اور صبا کا رشتہ تھا

گلوں تک اپنی رسائی نہ ہو سکی ممکن
چمن کے چاروں طرف خوشبوؤں کا پہرہ تھا

وہ ایک بستی جہاں درد تھا نہ راحت تھی
وہ ایک شہر جہاں دھوپ تھی نہ سایہ تھا

جہاں خریدنے جنسِ حیات جا نہ سکے
سنا تھا شہرِ حوادث میں کوئی میلہ تھا

نریش

آئینہ دیکھ کے نہ ڈر بابا
صدق کا اعتراف کر بابا

تم تو گھومے ہو در بدر بابا
کوئی انسان کی خبر بابا

تم بھی محرومِ دیدِ یار رہے
تم تو تھے صاحبِ نظر بابا

آج کل جرم ہے یہ سادہ دلی
یوں نہ ہر لمحہ آنکھ بھر بابا

اعتبار اور گل رخوں پہ نریشؔ
ہاں ذرا دیکھ بھال کر بابا

مشتاق جاوید

چہرے پہ اضطراب تو ہونٹوں پہ پیاس ہے
کمرے میں رکھی میز پہ خالی گلاس ہے

مغرور کس لیے ہے وہ اپنے وجود پر
میرے بدن کا عکس ہی جس کا لباس ہے

رشتوں کو توڑ کر جو بہت دور جا بسا
لگتا ہے جیسے آج بھی وہ دل کے پاس ہے

کس نے ہوا کے ہاتھ میں خنجر تھما دیا
شاہین کے بدن پہ لہو کا لباس ہے

اک لشکرِ یزید کے نرغے میں ہے فرات
بے چارگی کی آنکھ میں شدت کی پیاس ہے

رکھتا ہے اپنی ذات کو ہر اجنبی سے دور
جاویدؔ کس قدر وہ زمانہ شناس ہے

سعادت حسن منٹو

کے، کے کھلر

ایک عجیب اتفاق تھا، جس دن سعادت حسن منٹو کی موت کی خبر دلی پہنچی تو یہاں 'مرزا غالب' فلم چل رہی تھی اس فلم کی کہانی اسی دلی میں کشمیری گیٹ میں بیٹھ کر منٹو نے لکھی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ اس باغی اور بیباک ادیب پر ایک دن فلم بنے اور شاید بن بھی جائے۔ لیکن یہ ہیرو کے بغیر ہوگی۔ منٹو کا رول صرف سعادت حسن ہی کر سکتا تھا۔ بغیر کسی ری ٹیک کے بغیر کسی ریہرسل کے۔ پروڈیوسر پی۔ این اروڑہ کے ساتھ منٹو فلم انڈسٹری کی شطرنج کا سب سے قیمتی مہرہ تھا، کیدار شرما کا کلاس فیلو اور اشوک کمار کا جگری دوست۔

منٹو ایک بے خوف فلمی نقاد تھا جس کے سامنے بڑی بڑی فلمی شخصیتیں کانپتی تھیں۔ ایڈیٹر "مصور" اور گنجے فرشتے کا مصنف سعادت حسن ایک ایکٹر بھی تھا جس نے اپنی ہی فلم "آٹھ دن" میں ایک اہم رول ادا کر کے اپنے کردار کی نمائندگی کی تھی۔ یہ وہ دن تھے جب حکومت پنجاب نے زیر دفعہ ۲۹۲ منٹو کے افسانے "بو" پر فحاشی کے الزام میں اس کے خلاف وارنٹ جاری کیے تھے۔

یہ صرف قدرت کی ستم ظریفی تھی کہ وہ فلموں کا بہت بڑا ظریف بن گیا تھا۔ اپنے مقدمے کی پیروی کرنے والے دی ایچ ڈیسائی کے بارے میں ایک جگہ منٹو لکھتا ہے کہ ری ٹیکوں کے معاملے میں ڈیسائی کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ ملاحظہ فرمائیے:

"نیلا دیوی آپ کچھ فکر نہ کیجیے۔ میں نے بھی پشاور کا پیشاب پیا ہے۔"

"کٹ کٹ"

"اشوک نے جو جل بھن کر راکھ ہونے کے قریب تھا قہر آلود نگاہوں سے خلا میں دیکھا اور زہر کے چند بڑے بڑے گھونٹ جلدی جلدی پی کر چہرے پر مصنوعی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا: "ونڈرفل" — پھر اس نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا "کیوں منٹو" میں نے ڈیسائی کو گلے لگا لیا۔

"ونڈرفل"

اشوک نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"منٹو میرا خیال ہے پہلا ڈائیلاگ ایک دفعہ اور لے لیں۔"

میں نے ڈیسائی کی طرف دیکھا "کیوں ڈیسائی صاحب"

"میرا خیال ہے اس دفعہ اور بھی ونڈرفل ہو جائے۔"

ڈیسائی نے گجراتی انداز میں اپنا سر ہلایا — "تو لے لو ابھی گرما گرم معاملہ ہے۔"

دیارام چلا آیا: "لائٹس اون — لائٹس روشن ہوئیں۔ ڈیسائی نے رائفل سنبھالی۔ دکشت جھٹ سے ڈیسائی کی طرف لپکا۔ اور مکالموں کی کتاب کھول کر کہنے لگا —

"مسٹر ڈیسائی ذرا وہ ڈائیلاگ یاد کر لیجیے۔"

"ڈیسائی نے پوچھا کون سا ڈائیلاگ"

دکشت نے کہا: "وہی جو آپ نے اتنا ونڈرفل بولا تھا ذرا اسے دہرا دیجیے۔"

ڈیسائی نے اپنے سر پر پشاوری لنگی کا زاویہ درست کیا اور ویرا (فلم میں نیلا دیوی) سے مخاطب ہو کہا —

"نیلا دیوی آپ کوئی پشاور نہ کیجئے میں نے بھی آپ کا پانی پیا ہے۔"

ویرا اس قدر بے تحاشا ہنسی کہ ڈیسائی ڈر گیا۔ "کیا ہوا مس ویرا؟" گیارہویں ری ٹیک کے بعد ڈیسائی نے پھر رائفل لہرائی اور ویرا نے کہنا شروع کیا "نیلا پانی۔ آپ کوئی دیوی نہ کیجئے میں نے بھی پشاور کا . . . .

اشوک کمار دیوانہ وار چلایا ــــ کٹ کٹ!

اشوک نے مجھے بتایا کہ ڈیسائی کی ری ٹیکس کا ریکارڈ چھپتر ہے۔

"ٹیک تھرٹین شروع ہوا۔ مگر ڈیسائی نے پشاور کو پیشاب سے الگ نہ کیا۔"

منٹو نے جہاں "ٹھنڈا گوشت" "کھول دو" "بو" "کالی شلوار" "بابو گوپی ناتھ" "ممی" "موزیل" اور "ٹوبہ ٹیک سنگھ" جیسی قیامت خیز کہانیاں لکھیں وہاں "بائیں" جیسے مضامین بھی قلمبند کیے ہیں۔

"سیاست سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ لیڈروں اور دوا فروشوں کو ایک ہی زمرے میں شمار کرتا ہوں۔ لیڈری اور دوا فروشی دونوں پیشے ہیں۔ خیر کہنا یہ ہے کہ سیاسیات سے مجھے اتنی ہی دلچسپی ہے جتنی گاندھی جی کو سینما سے۔ گاندھی جی سینما نہیں دیکھتے، میں اخبار نہیں پڑھتا۔ اصل میں ہم دونوں غلطی کرتے ہیں۔ گاندھی جی کو فلم ضرور دیکھنی چاہیئے اور مجھے اخبار ضرور پڑھنے چاہئیں۔"

ان مضامین کے علاوہ منٹو نے کرشن چندر کے ساتھ مل کر ایک فلم "مڈ" (کیچڑ) لکھی تھی۔ "بیگم" "آٹھ دن"، "چل چل رے نوجوان"، "آغوش" فلموں کی کہانیاں منٹو کی ہیں۔ بحیثیت افسانہ و مکالمہ نگار و منظر نویس منٹو کا ایک ممتاز مقام ہے۔

دراصل منٹو کی ساری زندگی ایک رنگین فلم کی طرح تھی۔ وہ ایک ایسی ڈاکومنٹری تھی جس کے فلم ساز نے اس کے ہر سین میں نئی جان ڈال دی ہو۔ فلمیں دیکھنے کا شوق منٹو کو بچپن سے تھا۔ امرتسر کے اس گھر میں جو کوچہ وکیلاں میں تھا فلمی رسائل اور فلمی ایکٹر ایکٹرسوں کے فوٹوؤں سے بھرا پڑا رہتا تھا۔ سعادت حسن جب منٹو کے نام سے مشہور ہوا، تب بھی اسے ادبی دنیا کا چارلی چپلن کہا جاتا تھا۔ اس کی ہر بات کا رنگ نرالا تھا۔ اس کی ہر ادا انوکھی تھی۔ وہ ایک ایسے راستے کا مسافر تھا، جو سفر کو اپنی منزل اور منزل کو سفر سمجھتا تھا۔

منٹو ایک ایسا فوٹو گرافر یا ایک ایسا مصور تھا جس کی حقیقت نگاری نے ایک ایسا البم تیار کیا تھا۔ جس کے ہر ورق پر ایک شکل تھی جو تصویر اور آرٹ کا درجہ رکھتی تھی۔

منٹو نے عورتوں اور طوائفوں پر بے تحاشا لکھا لیکن اس کے اعصاب پر عورت سوار نہیں تھی۔ منٹو ان ستائی عورتوں کا افسانہ نگار تھا۔ جس پر قلم اٹھانے کے لیے بے باکی اور جرأت رندانہ کی ضرورت تھی۔ سوگندھی سلطانہ سراج شاردا سریتا اور ہزاروں ایسی ہی عورتیں جن کے ساتھ زمانے نے انصاف نہیں کیا۔ "ہتک" کا آغاز مندرجہ ذیل الفاظ سے ہوتا ہے۔

"دن بھر کی تھکی ماندی وہ ابھی ابھی اپنے بستر پر لیٹی تھی۔ میونسپل کمیٹی کا داروغہ، صفائی جسے وہ سیٹھ کے نام سے پکارتی تھی ابھی ابھی اس کی ہڈیاں پسلیاں جھنجھوڑ کر شراب کے نشے میں چور گھر کو واپس گیا تھا۔ وہ رات کو یہاں بھی لیٹ جاتا مگر اسے اپنی دھرم پتنی کا بہت خیال تھا جو اس سے بے حد پریم کرتی تھی۔" سوگندھی جیسا کردار اردو ادب میں منٹو کی دین ہے۔

سوگندھی ایک طوائف ہے لیکن جب ہر روز رات کو اس کا نیا یا پرانا ملاقاتی کہتا ہے، "سوگندھی میں تم سے پریم کرتا ہوں۔" اور سوگندھی جان بوجھ کر کہ وہ جھوٹ بولتا ہے۔ بس موم ہو جاتی ہے اور ایسا محسوس کرتی ہے جیسے سچ مچ اس سے پریم کیا جا رہا ہے۔ "پریم کتنا سندر بول ہے۔ وہ چاہتی تھی اس کو پگھلا کر اپنے سارے انگوں پر مل لے، اس کی مالش کرے تاکہ یہ سارے کا سارا اس کے مساموں میں رچ جائے۔ یا پھر وہ خود اس کے اندر چلی جائے۔ سمٹ سمٹا کر اس کے اندر داخل ہو جائے اور وہ اوپر سے ڈھکنا بند کر دے کبھی کبھی جب پریم کرنے اور پریم کیے جانے کا جذبہ اس کے اندر بہت شدت اختیار کر لیتا ہے تو کئی بار اس کے جی میں آتا ہے کہ اپنے پاس پڑے ہوئے آدمی کو گود میں لے کر تھپتھپانا شروع کر دے۔ اور لوریاں دے کر اپنی ہی گود میں سلا دے۔"

اور ایک بار سوگندھی کے منہ سے بے اختیار نکل گیا تھا آئینہ دیکھتے ہوئے ــــ

ــــ "سوگندھی تجھ سے زمانے نے اچھا سلوک نہیں کیا۔"

زمانے نے منٹو کے ساتھ بھی اچھا سلوک نہیں کیا۔ آج جب اس کی موت کو پورے ۲۵ سال ہو گئے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ ۲۵ سال بعد بھی منٹو کے ساتھ انصاف نہیں ہوا۔ منٹو آج بھی اکیلا ہے اور آج بھی منوں مٹی کے نیچے پڑا سوچ رہا ہے کہ وہ بڑا افسانہ نگار ہے یا خدا۔

منٹو فلمی دنیا کا ایک بانکا نقاد تھا، اد دنیا کا گنجا فرشتہ، نفسیاتی حمام میں سب کو ن کر دینے والا صاف گو۔ انصاف ہوا ہو یا۔ منٹو زندہ ہے اور میرے خیال میں پچاس سال بعد اگر کوئی ہندوستانی ادیب پڑھا جا گا تو وہ ہوگا سعادت حسن منٹو جو ۱۸ جنو ۱۹۵۵ء کی ایک سرد اور اداس صبح کو کر ۲۷ منٹ پر لاہور میں لہو تھوکتے تھو حرکت قلب بند ہو جانے سے چل بسا۔

پری چہرہ نسیم بانو سے منٹو اس طرح خ لیتا ہے۔

"صبح ناشتہ کر کے جب میں اور صفیہ گ تو راستے میں اس نے مجھ سے یہ بات بتا دلچسپی سے خالی نہیں۔

جب صفیہ (منٹو کی بیوی) اور نسیم سو کے کمرے میں داخل ہوئیں تو وہاں ایک با تھا۔ صفیہ نے ادھر ادھر دیکھا اور نسیم "آپ سو جایئے" نسیم مسکرائی اور پلنگ چادر بچھا کر کہنے لگی "کپڑے تو بدل

یہ کہہ کر اس نے ایک نیا سلیپنگ سوٹ نکالا۔
"یہ تم پہن لو ۔۔۔ بالکل نیا ہے" بالکل نیا ہے
پر زور تھا۔ جس کا مطلب میری بیوی سمجھ گئی۔
اور لباس بدل کر کے بستر پر لیٹ گئی۔ نسیم نے
آہستہ آہستہ اطمینان سے شب خوابی کا لباس
پہنا۔ چہرے کا میک اپ اتارا تو صفیہ نے حیرت
زدہ ہو کر کہا ۔۔۔ "ہائے تم کتنی پیلی ہو نسیم" نسیم
کے پھیکے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔
"یہ سب میک اپ کی کارستانی ہے۔"
میک اپ اتارنے کے بعد اس نے چہرے
پر مختلف روغنیات ملے اور ہاتھ دھو کر قرآن اٹھایا
اور تلاوت شروع کر دی۔ میری بیوی بیحد متاثر
ہوئی۔ بے اختیار اس کے منہ سے نکلا "نسیم!
خدا کی قسم تم تو ہم لوگوں سے کہیں اچھی ہو۔"
اس احساس سے کہ یہ بات اس نے ڈھنگ
سے نہیں کہی۔ صفیہ ایک دم خاموش ہو گئی ۔۔۔
قرآن کی تلاوت کے بعد نسیم سو گئی۔
"پری چہرہ نسیم" بیگم کی نور جہاں ملکہ حسن
احسان کی روشن، اور دو بچوں کی
ماں ۔۔۔
منٹو ایک طائر لاہوتی تھا جس نے اس
رزق سے جہاں سے بو آتی ہے موت کو ترجیح
دی تاکہ اس کی پرواز میں کوتاہی نہ ہو۔

منٹو نے ایک خط پنڈت نہرو کے نام
لکھا تھا۔ اس خط میں وہ کہتے ہیں ۔۔۔ "آپ کو
میرے خط سے جلے ہوئے گوشت کی بو آئے گی۔"
خط چونکہ پوسٹ نہیں ہوا تھا اس لیے وہ
منٹو کے پاس ہی رہ گئی تھی۔ پچیس سال اردو
کے ادیبوں نے اپنے آپ کو منٹو سے دور رکھا
لیکن وہ منٹو جس کو نہ سہاروں کی ضرورت تھی
نہ سیڑھیوں کی ہمیشہ زندہ رہا۔ منٹو ایک مہم تھا
جو ناانصافی کے خلاف لڑی گئی ہو۔ منٹو تانگے
والوں، غریب مزدوروں اور عوام کا ادیب تھا۔
اس کی بے وقت موت نے نہ جانے ہم سے
کتنے منٹو کو جوان اور کتنی سوگندھیاں چھین
لیں۔ بقول کرشن چندر "زندگی نے منٹو سے
انصاف نہیں کیا لیکن تاریخ ضرور اس سے انصاف
کرے گی۔"

پروفیسر عابد علی عابد "گنجے فرشتے" پر تبصرہ
کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بظاہر یہ مجموعہ بارہ
آدمیوں کے بارے میں ہے۔ لیکن حقیقت یہ
ہے کہ اس کا موضوع ایک تیرھواں آدمی بھی
ہے۔ اور وہ خود منٹو ہے۔ جس کی شخصیت
اس کتاب میں بے نقاب ہوئی ہے۔ ویسے بھی
اس کتاب میں جو فن کی منزلیں منٹو نے طے کی
ہیں وہ اردو ادب میں سنگ میل کی حیثیت
رکھتی ہیں۔

یہ بارہ آدمی ہیں، محمد علی جناح، آغا حشر
کاشمیری، اختر شیرانی، میراجی، باری صاحب
علیگ، عصمت چغتائی، شیام، پری چہرہ نسیم
بانو، اشوک کمار، نرگس، ڈیسائی، اور بابو راؤ
پٹیل۔ ان تمام مضامین میں منٹو کے اپنی زندگی
کے تاثرات موجود ہیں۔ سوانح نگاری کے
میدان میں ایک نئی بے باکی ایک نئی توانائی منظر
عام پر آئی ہے۔

"گنجے فرشتے" میں اگر باری صاحب کا کردار
بزدل دکھائی دیتا ہے اور میراجی کی "میرا سین"
غائب ہے تو شیام مسکراتا اور قہقہے لگاتا ہوا
نمودار ہوتا ہے۔ میرے خیال میں منٹو کا مضمون
شیام پر "گنجے فرشتے" میں سب پر سبقت
لے جاتا ہے۔ "میرا صاحب" یعنی محمد علی جناح
بھی خوب ہے لیکن "مرلی کی دھن" یعنی شیام
شروع سے آخر تک ایک ایسی دھن ہے۔ جو
مستقل کانوں میں گونجتی رہتی ہے۔ ہنستا کھیلتا
شیام، شور مچاتا شیام۔ منٹو کا جگری دوست
شیام جو بمبئی کے آخری لمحے تک ساتھ رہا۔ جو
اسے جب منٹو نے پاکستان جانے کا فیصلہ کر لیا
تھا تو بمبئی کی بندرگاہ تک چھوڑنے گیا تھا۔

منٹو کو شیام ایک خط میں لکھتا ہے:
"شاموں کو تمہاری دانشمندانہ بکواس
اکثر یاد آتی ہے۔"

"مرلی کی دھن" کے آخری دو صفحات
منٹو کی زندگی کے اس دور پر روشنی ڈالتے
ہیں جو کہیں ضبط تحریر میں نہیں آئے ہیں۔ ویسے
بھی یہ ان دنوں کی بات ہے جس کا حوالہ اب
تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ ملاحظہ ہو:
"ہندوستان آزاد ہو گیا۔ پاکستان
عالم وجود میں آتے ہی آزاد ہو گیا تھا
لیکن انسان دونوں ملکوں میں غلام

تھا۔ تعصب کا غلام۔ مذہبی جنون کا غلام۔ حیوانیت و بربریت کا غلام۔

"میں نے بمبئی آکیز جانا چھوڑ دیا۔ اشوک اور واچا آتے تھے تو میں خرابیٔ طبیعت کا بہانہ کر دیتا۔ اس طرح کئی دن گزر گئے۔ شیام مجھے دیکھتا اور مسکرا دیتا۔

" اس کو میری قلبی کیفیات کا بخوبی علم تھا۔ کچھ دن بعد بہت زیادہ پی کر میں نے یہ شغل بھی چھوڑ دیا تھا۔ سارا دن گم سم صوفے پر لیٹا رہتا۔ ایک دن شیام سٹوڈیو سے آیا۔ تو مجھے لیٹا دیکھ کر مزاحیہ انداز میں کہا۔ "کیوں — خواہ مخواہ جگالی کر رہے ہو۔"

" مجھے بہت جھنجھلاہٹ ہوتی تھی کہ شیام میری طرح کیوں نہیں سوچتا۔ اس کے دل و دماغ میں وہ طوفان کیوں برپا نہیں ہے جن کے ساتھ میں دن رات لڑتا رہتا ہوں۔ وہ اسی طرح ہنستا گاتا، شور مچاتا رہتا۔ شاید وہ اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ جو فضا اس وقت گرد و پیش تھی اس میں سوچنا بالکل بیکار ہے۔ میں نے بہت غور و فکر کیا۔ مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ آخر تنگ آکر میں نے کہا۔ ہٹاؤ چلیں یہاں سے۔ شیام کی نائٹ شوٹنگ تھی۔ میں نے اپنا اسباب وغیرہ باندھنا شروع کر دیا۔ ساری رات اسی میں گزر گئی۔ صبح ہوئی تو شیام شوٹنگ سے فارغ ہو کر آیا۔ مجھ سے صرف اتنا پوچھا "چلے؟" میں نے صرف اتنا ہی کہا — "ہاں!"

" اس کے بعد میرے اور اس کے درمیان ہجرت کے متعلق کوئی بات نہ ہوئی۔ بقایا سامان رکھوانے میں اس نے میرا ہاتھ بٹایا۔ اس دوران میں رات کی شوٹنگ کے لطیفے بیان کرتا رہا، اور خوب ہنستا رہا۔ جب میرے رخصت ہونے کا وقت آیا تو اس نے الماری سے برانڈی کی بوتل نکالی۔ دو پیگ بنائے۔ اور ایک مجھے دے کر کہا —

"ہپ ٹلا"

میں نے جواب میں ہپ ٹلا کہا۔

اس نے قہقہے لگاتے ہوئے اپنے چوڑے سینے کے ساتھ مجھے بھینچ لیا۔

" زندہ باد پاکستان" شیام نے پرخلوص نعرہ بلند کیا۔

" زندہ باد ہندوستان" — میں یہ کہتے ہوئے نیچے چلا گیا۔ جہاں ٹرک والا میرا انتظار کر رہا تھا۔

بندرگاہ تک شیام میرے ساتھ گیا۔ جہاز میں کافی دیر تھی۔ وہ ادھر ادھر کے لطیفے سنا کر میرا دل بہلاتا رہا۔ جب وسل ہوا تو اس نے ہپ ٹلا کہہ کر میرا ہاتھ دبایا اور گنگ وے سے نیچے اتر گیا۔ مڑ کر اس نے میری طرف نہ دیکھا۔ اور تیز تیز قدم اٹھاتا بندرگاہ سے باہر چلا گیا۔

میں نے لاہور پہنچ کر اس کو خط لکھا انیس، ایک، اڑتالیس (۱۹-۱-۴۸) کو اس کا جواب آیا۔ "یہاں تمہیں سب لوگ یاد کرتے ہیں۔"

منٹو کی موت کے ۲۶ سال بعد بھی آج سبھی لوگ اسے یاد کرتے ہیں۔ تانگے والا فلمی نقاد، افسانہ نویس۔ درزی۔ دلال۔ ہزاروں سوگندھیاں۔ کیونکہ بقول عابد علی عابد صاحب "اس کے افسانوں کو جوان واقعی گھوڑا ہانکتے ہیں۔ رئیسی نہیں فرماتے ان کی بات چیت سے گھٹیا بیڑیوں، ادھ جلی ماچسوں، موم بتیوں کی اور پسینے کی بو آتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کے بھی صنم خانے ہوتے ہیں۔ وہ شعر پڑھ کر چابک لگاتے ہیں۔ منٹو کے کردار لینن اور کارل مارکس کے اسکالر نہیں ہیں۔ منگو کوچوان۔ ڈھونڈو۔ شنکر، خوشیا جیسے عام انسان مگر جیتے جاگتے انسان ہیں۔ یہ سارے کے سارے کردار بے باک ہیں، منٹو کی طرح۔ خود فریبی کا شکار نہیں ہیں۔ خوشیا ایک دلال ہے۔ جو علاقے کی تمام چھوکریوں کے بارے میں سب کچھ جانتا ہے۔ کون کہاں جاتی ہے۔ کس کس بنک میں کتنا پیسہ ہے۔ کس کے پاس کتنی ساڑھیاں ہیں۔ کتنے بیتی کوٹ لیکن جب کانتا اس کے سامنے بالکل ننگی نمودار ہوتی ہے تو وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھتا ہے۔ یہاں سے منٹو کہانی کا سلسلہ شروع کرتا ہے اور خوشیا کی اصل شخصیت اور اس کا پورا کردار مکمل طور پر ایسے نمایاں ہوتا ہے جیسے شیشے میں عکس۔"

منٹو کی تحریروں میں خوبصورت جملوں یا انوکھی تشبیہوں کی کوئی کمی نہیں لیکن وہ ان کا استعمال بے مقصد یا بے محل نہیں کرتا۔

سوشیلا کا کردار دیکھئے:

"کشور صاحب آپ عورت کو بالکل نہیں جانتے۔ وہ مرد، عورت کو کیا جانے جسے وہ کھوئے ہوئے ٹکٹ کی طرح پلیٹ فارم پر مل گئی ہو۔"

گندے پانی میں کنول کے پھول کی تشبیہ ہزارہا سال سے پڑھتے اور سنتے آئے ہیں لیکن یہ آلو بخارا صرف منٹو ہی کہہ سکتا تھا۔

منٹو کی تحریروں میں پنجابی کردار، خالص رنگ میں ابھر آتے ہیں۔ شکاگو کے کاؤبوائے کی طرح نہیں۔ سنیے پنجابیوں کے بارے میں کیا لکھتا ہے۔

"جب کوئی پنجابی اردو بول رہا ہوتا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے جھوٹ بول رہا ہے"

اور ملاحظہ فرمائیں:

"گھاٹن لڑکی ایسے کپڑے اتار رہی تھی دودھ سے بالائی اتاری جاتی ہے۔"

بقول کرشن چندر، منٹو ایک ستائی زبان کا ایک ستایا ہوا ادیب تھا۔ ایک تنقید نگار نے کہا ہے کہ "جدید افسانوی ادب کی تاریخ میں منٹو کا نام ہمیشہ جلی حروف میں

(بقیہ ص ۴۱)

پائل

ذکیہ مشہدی

ریشم کی کریم کلر چادر سے ڈھکا اور ڈنلپ کے گدوں سے آراستہ بیڈ انتہائی آرام دہ تھا پھر بھی نیند کنول کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس نے برابر لگی شیلف سے ایک کتاب اٹھائی اور اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ اس میں بھی دل نہیں لگا تو اس نے ہاتھ بڑھا کر پیتل کا بڑا سا منقش لیمپ آف کیا اور سرہانے لٹکا سوئچ دبا کر نائٹ بلب آن کر دیا۔ بڑی خواب آگیں سی ہلکی روشنی کمرے میں بکھر گئی۔ اس نے آنکھیں موند لیں۔ بک شیلف پر انتہائی نفیس گلدان میں زرد رنگ کے جو گلاب بھرے ہوئے تھے وہ اس مدھم روشنی جیسی ہی خواب آگیں خوشبو پھیلا رہے تھے۔ آنکھیں بند کرنے سے شاید اس کی ناک کی حس بڑھ گئی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے اسے اس خوشبو کا اتنا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے پھر آنکھیں کھول دیں۔

کمرے کے گھنی شکنوں والے پردے مہندی جیسے سبز رنگ کے تھے۔ قالین بھی گہرا سبز تھا۔ کمرے کی باقی سجاوٹ بھی کریم اور سبز رنگوں کے امتزاج سے کی گئی تھی۔ پائیں باغ میں کھلنے والی کھڑکی سے وسیع و عریض لان نظر آرہا تھا جو اس وقت اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ نومبر کی خنکی میں تھوڑا برفیلا لمس تھا۔ کنول نے ایرانی بلی جیسا نرم گرم کمبل گردن تک کھینچ لیا اور ایک بار پھر آنکھیں موند لیں۔

اس مرتبہ اس کے کان جاگ اٹھے۔ کل صبح اس نے اپنے آنے کے کوئی تین چار گھنٹے بعد خاتونِ خانہ کی آواز سنی تھی۔ وہ انتہائی شستہ انگریزی میں اپنے بیٹے دیپک سے کہہ رہی تھیں "لڑکا واقعی وجیہہ ہے اور ذہین تو خیر ہے ہی۔ مگر ذرا ناتراشیدہ دکھتا ہے۔ خیر ٹریننگ اور پوسٹنگ کے بعد پالش بھی ہو جائے گی۔"

"حاضر جواب اور ہنس مکھ بھی ہے ماں ــــ عثمانی انکل کبھی کوئی خراب چیز لے کر نہیں آتے" دیپک نے ہنس کر جواب دیا تھا۔

"میں چاہتی ہوں وہ کم از کم ہفتہ بھر ضرور ٹھہر جائے۔ الکا کو اسے اچھی طرح جاننے سمجھنے کا موقع ملنا بہت ضروری ہے۔ پھر وہ ٹریننگ کے لئے چلا جائے گا۔"

اسی وقت کنول اندر داخل ہوا تھا اور ان لوگوں نے جھٹ موضوع گفتگو پلٹ دیا تھا۔ کنول صبح سے جس ڈپریشن میں مبتلا تھا اس میں بس ایک لمحے کو ذرا سی کمی آئی تھی۔ مسز باجپئی جیسی اسمارٹ، جہاندیدہ اور تعلیم یافتہ خاتون نے اس کی ذہانت اور وجاہت کا اعتراف کیا تھا۔ یہ بہت بڑی بات تھی۔ شاید یوں بڑی نہ ہو لیکن کنول کو بہت بڑی معلوم ہوتی تھی۔

"لڑکا واقعی وجیہہ ہے ــــ لڑکا واقعی وجیہہ ہے ...." آوازیں چاروں طرف پھیل رہی تھیں۔ اس نے کان بند کرنا چاہے۔ نیند کا غلبہ طاری تھا مگر وہ سو نہیں پا رہا تھا۔ دماغ میں کوئی چیز کنکھجورے کی طرح رینگ رہی تھی اور ساری حسیں بیدار تھیں۔ اس نے آوازوں کو جھٹکا تو بند آنکھیں اندر ہی اندر کہیں پوری کھل گئیں۔ وہ یہاں کل سویرے آیا تھا۔ سات بجے والی گاڑی سے۔ اسٹیشن پر اسے لینے جو لمبی سی چمکدار گاڑی آئی تھی اسے دیکھ کر اس کے ہوش اڑ گئے تھے لیکن اس نے چہرے سے کسی قسم کی حیرت کا اظہار نہیں ہونے دیا تھا وہ پیچیدہ باوقار اور متین لڑکا تھا۔ وردی پوش ڈرائیور نے دروازہ کھولا اور اندر سے ایک بے حد اسمارٹ اور خوش پوش، جوان باہر نکلا۔

آپ غالباً کنول شرما ہیں ــــ اس نے کنول کی طرف بڑھتے ہوئے نہایت مہذب اور خلیق لہجے میں کہا تھا ــــ میں دیپک ہوں۔ دیپک باجپئی۔ معاف کیجئے گا میں نے بھیڑ میں جانے سے بہتر یہی سمجھا کہ یہاں بیٹھ کر آپ کا انتظار کروں۔ دوسرے آپ مجھے پہچانتے بھی نہیں تھے۔ میں نے بھی صرف تصویر ہی دیکھی تھی۔

کنول کے لبوں پر اس کی مخصوص دلکش مسکراہٹ بکھر گئی۔ رسمی گفتگو کے بعد وہ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اور گاڑی جیسے ہوا میں تیرنے لگی۔ کوئی پندرہ منٹ بعد وہ جس بنگلے میں داخل ہوئی وہ اس گاڑی کے ہی لائق تھا۔ وسیع و عریض لان پر دور دور تک مخملی گھاس بچھی ہوئی تھی اور گلابوں کے تختے پھیلے ہوئے تھے۔ گاڑی کے اندر داخل ہوتے ہی تین چار خواتین لپکیں۔ ایک لمبی گوری چٹی، قدرے موٹی لیکن بیحد باوقار خاتون کو وہ انداز سے پہچان گیا وہ دیپک کی ماں تھیں۔ دوسری طویل قامت اور چھریرے بدن والی ادھیڑ عورت بھی کنارے دار بے داغ سوتی ساری میں بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ ان کے بالوں میں پھولوں کی وینی تھی۔ باقی دو نوجوان لڑکیاں تھیں۔ فیڈڈ (Faded) جینز اور کسی پتلے کپڑے کے بلاوز میں ملبوس وہ عام کالج گرلز کی طرح تھیں لیکن ان کے گرد ایک ہالہ تھا۔ بے پناہ اسمارٹنس اور بے پناہ خود اعتمادی کا ہالہ جو دولت اور طمانیت کی فراوانی سے ہی پیدا ہوتا ہے۔

یہ ممی ہیں ــــ دیپک نے موٹی خاتون کی طرف اشارہ کیا۔ یہ الکا ــــ

یہ شبنم اور یہ ... اس نے کنارے دار ساری میں ملبوس عورت کی طرف اشارہ کیا — یہ آیا ماں ہیں۔ انہوں نے ہم لوگوں کو پالا ہے۔ یہ بھی فیملی کی ممبر کی طرح ہی ہیں۔

تو یہ ان لوگوں کی گورنس ہے — کنول نے بیک وقت سب کے لیے ہاتھ جوڑتے ہوئے سوچا۔ اس کے ذہن میں اپنی ماں کی تصویر گھوم گئی۔ ماں کی ساری کبھی بے داغ نہیں ہوتی تھی علاوہ کبھی کبھی آنے والے تہواروں یا ان موقعوں کے جب وہ کہیں باہر جا رہی ہوں۔ ان کے بالوں میں اتنی چمک بھی نہیں تھی۔ اور پھول تو شاید انہوں نے کبھی نہیں سجائے تھے۔ عموماً وہ ایک گنجلی ہوئی میلی ساری میں ملبوس کبھی اس کے پلّو سے ہاتھ پونچھتی نظر آتی تھی کبھی ماتھے سے پسینہ۔ گھر میں پیسوں کی اتنی کمی بھی نہ تھی۔ مگر وہ ماں کے رہنے کا ڈھنگ ہی بن چکا تھا۔

کنول کو ایک عجیب سی بے کلی کا احساس ہوا جو انگیٹھی کے دھوئیں کی طرح چکر کاٹتی دھیرے دھیرے اس کے اندر اٹھ رہی تھی۔

ایک ملازم اس کا سوٹ کیس اٹھا کر مہمان خانے میں رکھ آیا تھا اور وردی پوش بیرا چاندی کی ٹرے پر بھاپ اٹھتی کافی کے پیالے لے کر اندر آچکا تھا۔

نہانے کے بعد ناشتے کی میز پر آتے آتے کنول سب لوگوں سے خاصہ بے تکلف ہو چکا تھا۔ ان لوگوں نے چند گھنٹوں کے اندر ہی اس قدر اپنائیت اور بے تکلفی کا مظاہرہ کیا تھا کہ اس کی ساری جھجھک رخصت ہو چکی تھی۔ دوسرے دن ان لوگوں نے اسے گھمانے کا پروگرام بنایا۔ دیپک، الکا، شبنم اور دیپک کی کینیڈین منگیتر ایلن۔ پارک میں اتر کر گھومتے وقت باقی سب لوگ ذرا آگے بڑھ جاتے یا پیچھے رہ جاتے اور الکا اس کے ساتھ ہو جاتی۔ سب کچھ سوچے سمجھے پلان کے تحت ہو رہا تھا۔ خیر وہ آیا بھی تھا الکا کو دیکھنے۔ الکا کو دیکھنے یا اپنے آپ کو دکھانے؟

— بریگیڈیر عثمانی سے اس کے ماما کے بڑے گہرے تعلقات تھے۔ وہ بھی ملٹری میں تھے۔ کنول کے آئی۔ اے۔ ایس میں آجانے کی خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیلی۔ وہ ہمیشہ سے ہونہار تھا اس لیے کسی کو تعجب نہیں ہوا۔ لڑکیوں والے پہلے ہی اس کے گھر کے چکر کاٹ رہے تھے مگر بریگیڈیر عثمانی کی معرفت وہ بقول ماما سب سے زیادہ دھانسو تھا۔ ویسے ماما نے ان سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ ان کی بہن کے یہاں بس لڑکا ہی لڑکا ہے۔ شان و شوکت ڈھونڈنی ہے تو اپنی ٹکر کے لوگوں میں جایئے۔

"وہ باجی میرے پیچھے پڑا ہوا ہے کہ خاندان میں کوئی آفیسر نہیں ہے۔ سب بزنس میں لگے ہیں۔ دولت کے ساتھ تھوڑا اقتدار ہونا ضروری ہے۔ بزنس کلاس میں بڑا افسر نہ آئے تو لگتا ہے بڑا سا ڈھنڈار محل تو بنوا لیا مگر آرائش کے لیے کچھ بھی نہیں خریدا۔ اکلوتا بیٹا گریجویشن کے بعد امریکہ چلا گیا بزنس مینجمنٹ کے لیے۔ اس کو افسر بنوا دیتے تو یہ لمبا چوڑا دھندا کون سنبھالتا۔ رہی لڑکے کی سیلف میڈ ہونے کی بات تو میاں وہ بیٹی کو اتنا دیں گے کہ وہ خود بخود انہیں کے طبقے میں شامل ہو جائے گا۔ شکل صورت تو انہیں مفت میں مل رہی تھی۔ خوبصورت نہ ہوتا تو بھی چلتا۔ آئی۔ اے۔ ایس ٹھہرا۔ گھی کا لڈو وہ بھی میوے بھرا۔" بریگیڈیر عثمانی نے ماما کو سمجھایا تھا۔

اور لڑکی؟ ماما نے سارے شک رفع کر لینے چاہے تھے۔

"لڑکی بہت سویٹ ہے اور کم عمر بھی۔ کنول کو یقیناً پسند کرے گی۔ پھر انہوں نے جھک کر قدرے راز دارانہ لہجے میں کہا تھا۔ میرا خیال ہے وہ لوگ شادی جلد کرنا چاہیں گے۔ ٹریننگ ختم ہونے کا انتظار نہیں کریں گے۔ اونچے طبقے کے نوجوان لڑکے لڑکیوں میں گمرہی بڑی تیزی سے پھیل رہی ہے۔ منشیات آوارگی اور نہ جانے کیا کیا۔ جن لوگوں میں پرانی اقدار کی رمق باقی ہے وہ دھڑا دھڑ شریف لڑکے ڈھونڈ کر لڑکیاں بیاہ رہے ہیں۔

پھر ماما نے دھکے دے دے کر کنول کو یہاں بھجوایا تھا۔ ٹریننگ پر جانے کے دن قریب آرہے تھے۔ اس لیے وہ چاہتے تھے کہ اس سے پہلے کہ کنول کو کوئی ایسی ویسی لڑکی ہڑپ لے وہ یہاں اس کی منگنی کرا دیں۔

الکا واقعی بیحد سویٹ تھی لیکن اس کی سمجھ سے بالاتر۔ اس نے جینز کے ساتھ سڈول پیروں میں پائل سے ملتا جلتا چاندی کا کوئی زیور پہن رکھا تھا۔ پائنچے چڑھے ہونے کی وجہ سے اس کی پنڈلیوں کا کچھ حصہ نمایاں تھا۔ کولہاپوری چپلوں کے ساتھ وہ زیور گورے نازک پیروں پر بھلا ضرور لگ رہا تھا لیکن ساری بیک گراونڈ اس زیور سے ذرا میل نہیں کھاتی تھی۔ زیور خالص ہندوستانی تھا اور لباس خالص مغربی۔ دلکش چہرے کے نازک ہونٹوں کی لپ اسٹک مغربی تھی اور ہونٹوں کے پیچھے کی زبان بھی مغربی۔

اس وقت کنول کے ذہن میں بڑا بے تکا سا خیال آیا۔ اگر الکا سے اس کی شادی ہو جاتی ہے تو وہ بھی اس چاندی کے زیور جیسا لگے گا۔ اپنی جگہ خوبصورت اور شاید الکا کو عزیز بھی مگر کم قیمت، ساری بیک گراونڈ سے بالکل الگ۔ بے میل، جیسے بے سُر تال کا سنگیت اور فطری انداز میں گفتگو کرتا کنول اچانک بے حد کانشس ہو گیا۔

الکا اسے اپنی پسندیدہ چیزیں بتا رہی تھی — تیرنا، گھڑسواری، ویسٹرن ڈانسنگ، سیاحت اور اطالوی کھانے۔

تم اٹلی ہو آئی ہو؟

میں آدھا یوروپ گھوم چکی ہوں۔ اس نے بچکانہ مسرت کے ساتھ کہا۔ روم میں میں نے ایک ہاؤس وائف سے وہاں کی مقبول ڈش

Pizza بنانی سیکھی تھی ۔ اب میں خود بنالیتی ہوں ۔

تم ــــ تم کھانا پکالیتی ہو ؟

الکا کے چھوٹی سی عمر میں آدھا یوروپ گھوم آنے کی بات نے کنول میں جو کھسیاہٹ بیدار کی تھی وہ حیرت میں ڈوب گئی ۔

کبھی کبھی ــــ الکا کا مختصر سا جواب تھا ۔

میری ماں کے دھوئیں سے بھرے کچن میں پکاسکوگی ؟ کنول کی زبان پر یہ فقرہ آتے آتے رہ گیا ۔

تمہاری ہابی کیا ہے ؟ الکا اس سے پوچھ رہی تھی ۔

میری ہابی ؟ کنول نے اس سوال پر کبھی غور نہیں کیا تھا ۔ آئی ۔ اے ۔ ایس کے انٹرویو بورڈ میں بیٹھے ہوئے بھاری انٹیلیکچوئل نظر آنے والے چشمے کے پیچھے چھپی ذہین آنکھوں سے اندر کی اسکریننگ کرلینے والے گورنمنٹ آف انڈیا کے پرانے منجھے ہوئے افسروں کے سوالوں کے جواب دیتے ہوئے وہ قطعی نروس نہیں ہوا لیکن یہ اٹھارہ سالہ نازک اندام ناتجربہ کار لڑکی اسے نروس کررہی تھی ۔

کرکٹ کھیل لیتا ہوں ــــ اس نے سوچ کر جواب دیا ۔

کرکٹ مجھے بے حد پسند ہے ۔ وہ خوش ہوکر بولی ۔ ابھی جو پاکستانی ٹیم آئی تھی اس کے سارے کھلاڑیوں کے آٹوگراف میرے پاس موجود ہیں وہ کم بخت عمران خاں ــــ واہ ! کیا پرسنالٹی ہے ۔ اس نے ایک ننھی سی کنکری اٹھاکر پاس بنے مصنوعی تالاب میں پھینکی ۔ کنارے بیٹھے دوچار مینڈک اُچھل کر بھاگے ۔ وہ کھلکھلاکر ہنسی ۔ بڑی پیاری معصوم سی ہنسی ۔ زندگی اور اس کے حُسن سے بھرپور ۔ پھر اس نے چیونگم کا پیکٹ پھاڑا اور دو پیس کنول کی طرف بڑھائے چیونگم لیتے ہوئے کنول کی انگلیاں اس کی انگلیوں سے چھوگئیں ۔ لمبی ملائم صاف رنگت والی انگلیاں ۔ ان کا لمس ایسا ہی تھا جیسے ان زرد گلابوں کا لمس جو کنول کے کمرے میں سجادئے گئے تھے مگر کنول کے جسم میں کوئی ارتعاش نہیں پیدا ہوا ۔ کوئی برقی رو نہیں جاگی ۔

کنول کو ذرا سا تعجب ہوا ۔

اسی وقت پیچھے کے باقی لوگ ان کے پاس پہونچ گئے ۔ ایک پیڑ کا سایہ تلاش کیا گیا ۔ کار میں بیٹھا ملازم ٹفن باسکٹ لے کر آرہا تھا ۔ باسکٹ میں لذیذ کھانوں کے ساتھ کھڑکھڑاتے ہوئے شفاف نیپکن اور چھری کانٹے بھی تھے ۔ کنول کو چھری کانٹوں کی عادت نہیں تھی اس لیے کھانے سے زیادہ توجہ اس بات پر تھی کہ اس سے کوئی حماقت سرزد نہ ہو ۔ ویسے وہ بیحد ٹھنڈے مزاج والا لڑکا تھا اور ایمرجنسی سے بغیر ہڑبڑائے ہوئے نمٹ لیتا تھا ۔ کامیاب افسر کی پہلی ضروری کوالیفیکیشن ۔

وہ سب کھاتے ہوئے قہقہے لگارہے تھے ۔ دیپک الکا کے اسکول کے دنوں کے قصے سناتے ہوئے کہہ رہا تھا ــــ" یہ جب مسوری میں پڑھتی تھی .....

دیپک کو اچانک اپنا پرائمری اسکول یاد آگیا جہاں کی شکستہ بلڈنگ سے اس نے پانچویں کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا تھا اور دھوتی پہنے ناک کی پھنگ پر چشمہ لگائے ماسٹر گردھاری لال نے بابوجی سے کہا تھا کہ یہ لڑکا ہونہار ہے اس کی پڑھائی پر خاص دھیان دیں ۔

دراصل دیپک یہاں آکر دو حصوں میں بٹ گیا تھا ۔ ایک حصہ ساری گفتگو میں حصہ لے رہا تھا اپنی شگفتہ مزاجی اور حاضر جوابی سے سب کو ہنسا رہا تھا اور دوسرا حصہ اندر ہی اندر کبھی کہیں پہونچ جاتا تھا کبھی کہیں ۔

اس نے الکا کی طرف غور سے دیکھا ۔ الکا کے ساتھ اس کی جوڑی بڑی خوبصورت لگے گی مگر اندر سے وہ ہمیشہ کے لیے دو ٹکڑوں میں بٹ جائے گا ۔ بڑا افسر بن کر بھی وہ اس کے طبقے کا ایک فرد نہیں بن سکے گا ۔ اس گھر میں قدم رکھنے کے بعد وہ جن ٹکڑوں میں تقسیم ہوا ہے وہ مل کر کبھی ایک نہیں ہوں گے ۔ اس کی جڑیں ایسے گھر میں پوشیدہ ہیں جس کی ماہانہ آمدنی الکا کے یہاں روزانہ خرچ کے زمرے میں آتی ہے ۔ کچن میں پیڑھی پر بیٹھ کر دہی کے ساتھ آلو کے گرم پراٹھے کھانے والا کنول لمبی سی ڈرائنگ ٹیبل پر سلور کٹلری کے ساتھ اطالوی اور چینی کھانے کھاتے ہوئے خود کو ایسا محسوس کرے گا جیسے برساتی اوڑھ کر بارش میں چلتا ہوا شخص خود کو پانی سے علیٰحدہ محسوس کرتا ہے ۔

الکا اب اپنا نیپکن گود میں پھیلا رہی تھی اور سڈول پیر کراس کرکے بیٹھ گئی تھی ۔ اس کے پیر کا زیور پھر نمایاں ہوگیا تھا ۔ کنول نے پوچھا" الکا اسے کیا کہتے ہیں ؟"۔

کسے ؟ مسکراتی آنکھوں سے الکا نے سوال کیا ۔

یہ تمہارا زیور ــــ ؟

ــــ Anklet

تمہارا مطلب ہے پائل ؟

شاید ــــ

اس کی ہندی تو ایلن کی ہندی سے بھی بدتر ہے ۔ اسکول میں ہمیشہ ہندی میں فیل ہوتی تھی ۔ دیپک نے پھر چھیڑا ۔

باہر کا کنول الکا کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور اندر کا کنول سوچنے لگا کہ اگر پائل نہ کہہ کر 'اینکلٹ' کہہ دیا جائے تو بھی وہ اس سارے بدیسی لباس میں کبھی نہیں کھلتی ۔ اچانک وہ زور سے ہنس پڑا ۔ اس کے ذہن میں ایک نیم پلیٹ آگئی تھی ۔

کنول کنور شرما پائل آئی ۔ اے ۔ ایس ۔

ــــ اور جب سارا دن گھوم پھر کر، شدید تھکن کے باوجود، مخملی بستر کانٹوں کی طرح چبھ رہا تھا اور نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی ۔ وہ ماما سے، ماں سے بابوجی سے کیا بہانہ بنائے گا ــــ ؟ کیا کہے گا کہ اس قیمتی فریم میں جڑی ہوئی یہ حسین تصویر اسے کیوں نہیں پسند آئی ۔

غالب کی ترجمانی سنگریزوں کی زبانی

غالبیات میں ایک نئی جہت ۔ ایک نئی کاوش

برجندر سیال

ہمارے شعر ہیں اب محض دِل لگی کے اسدؔ
کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

یہ شعر کہتے وقت مرزا غالب کو اپنے ہنر کا احساس تو تھا ہی لیکن ان کے منہ سے زمانے کی قدر ناشناسی کا ایسا گلہ کچھ مبالغہ آمیز لگتا ہے۔ یہ شکایت ہر فن کار کو اپنے ہم عصر اربابِ ذوق سے رہی ہے اور رہے گی۔ اس لیے کہ زمانہ ان کے احساسِ برتری کی شدت کا تابع نہیں ہوتا۔ وقت اپنے ہی ڈھنگ اور پیمانے سے سب کو تولتا اور پرکھتا ہے اور وہ کب کس پر خوش بختی کی پرچھائیں ڈال دے۔ یہ کوئی نہیں جانتا۔ ان کے اپنے دور میں بھی تب کے حالات کے پیشِ نظر غالب سے جان بوجھ کر تو کوئی خاص بے اعتنائی برتی نہیں گئی۔ ان کے کلام کو ان دنوں بھی خاصی اہمیت حاصل تھی ... اور زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ تو ان کی شہرت میں چار چاند لگتے گئے غالب کے اشعار کتنے بلیغ، وسیع، پُرمعنی اور زندگی کے مطابق اور ہمہ گیر ہیں، ان کے اشعار میں سمویا ہوا ہر لفظ گنجِ معانی کا ایسا طلسم ہے کہ ذوقِ سلیم رکھنے والا کوئی آدمی ان کی عظیم فنکارانہ شخصیت کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔ ہوسکتا ہے ان کے کلام کے محاسن کچھ دیر کے لیے اس وقت کے نکتہ شناسوں کی نظروں سے اوجھل رہ گئے ہوں لیکن ہیئتی طور سے روبرو آنے پر ان خوبیوں کا اُبھر کر سامنے آنا لازمی ہی تھا۔ پھر غالب کے اس مصرعہ کا اطلاق خود ان پر بھی تو ہوتا تھا:

'دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک'

وہ قطرہ گوہر ہی نہیں، گوہرِ نایاب تھا۔ اردو زبان اور ہندوستان کی خوش نصیبی ہے کہ غالب اتنی بڑی ادبی میراث اِن دونوں کے لیے چھوڑ گئے۔ پچھلے سو برسوں میں دیوانِ غالب کی درجنوں تشریحات لکھی گئی ہیں۔ موسیقاروں نے ساز اور آواز کے ساتھ ان کے اشعار میں اور بھی جان ڈالی۔ انھیں اُبھارا، نکھارا اور کروڑوں سامعین کے لیے فردوسِ گوش بنادیا۔

تفہیمِ غالب کا ایک نیا دور تب شروع ہوا جب محمد عبدالرحمٰن چغتائی نے اپنے لافانی شاہکاروں سے غالب کے افکار اور ان کی شعریت کو رنگوں اور لکیروں میں ڈال کر جنت نگاہ بناکر پیش کیا۔ مرقعِ چغتائی کی مقبولیت سے جہاں غالب اُبھر کر ایک نئے افق پر آکھڑے ہوئے۔ وہاں چغتائی کے آرٹ کو بھی ایک نئی جلا ملی، نئی تحریک ملی۔ چغتائی کی تقلید میں متعدد مصوروں نے کینوس پر غالب کے افکار و اشعار کی جمالیاتی نقاشی کی۔ دیوانِ غالب کو سجایا، سنوارا اور مشرق کی اس تہذیب اور ذوقِ سلیم کو زندہ رکھنے میں ممد و معاون ہوئے جس کے علمبردار خود مرزا غالب تھے۔

شعر، فکر اور فن کا امتزاج کوئی نئی چیز نہیں۔ خوگرِ پیکرِ احساس ہے انسان کی نظر، اور فن کار شروع ہی سے انسان کے خیالات کو کوئی پیکر دے کر نئے نئے ڈھنگوں سے صناعی کر کے نظر کی تسکین کا سامان مہیا کرنے کے ذرائع ڈھونڈتا رہا ہے۔ قلم، رنگ، کاغذ، لکڑی، پتھر، مٹی، لوہا، شیشہ، پلاسٹک غرضیکہ ہر چیز سے اس نے سحر انگیز، تصویر کشی اور بُت گری کی۔ ان وسائل سے تصور اور تخیل کو وضاحت اور توسیع ملتی ہے۔ خیالات کی رسائی دوسرے دل و دماغ تک سہل ہوجاتی ہے۔ جدید آرٹ نے تو دنیائے فن میں ایک حیرت انگیز انقلاب پیدا کردیا ہے۔ بالکل غیر مرئی خیال تک

. . . لذتِ فراق
. . . زخمِ جگر گئی

شکل میں ڈھالنے کے ڈھنگ نکل آتے ہیں۔ خیال جتنا ہمہ گیر اور زندگی سے متعلق ہوگا۔ تخیل میں جمالیاتی منظر نگاری کی جتنی زیادہ صلاحیت ہوگی اس کی پیشکش میں اتنے ہی گوناگوں وسائل نکل آئیں گے، جدت آتی جائے گی۔ فن کار اپنی پیشکش سے اگر آپ کی روح کو جھنجھوڑ کر کے آپ کے تخیل اور تصور کو تحریک دیتا ہے تو وہ فن کار اور اس کا فن دونوں کامیاب ہیں۔

مرزا کے کلام کو شعر اور فن کے امتزاج سے سہ جہتی شکل میں ایک اچھوتے ڈھنگ سے پیش کرنے کی حقیر کاوش اور جسارت میں نے بھی کی ہے۔ ابھی اس کوشش کی پوری کامیابی تو نہیں مگر تھوڑے سے ادبی حلقے میں یہ چیزیں پیش کر کے اہل ذوق حضرات کے اثرات جاننے کا جو موقع مجھے ملا ہے اس سے ہلکا سا احساس ہونے لگا ہے کہ ہم نے مدعا پایا ـــــ ویسے مدعا پا لینا تو زلف کے سر ہونے تک ٹھہرنے کی بات ہے اور تب تک کون جیتا ہے؟ ہاں، اس جانب ایک قدم بڑھا ضرور ہوں۔

ایک بہت بڑی خواہش تھی کہ کلام غالب کے یہ شہپارے جو صدفِ اردو گوہر بنے۔ اپنی ضو فشانی کے لیے زبان کی فصیل بھی پار کر جائیں تا کہ کسی بھی زبان کا کوئی صاحبِ ذوق، کوئی ادیب، کوئی شاعر روایاتِ مشرق کی تہذیب اعلیٰ کی عکاسی کے اس لطف سے محروم اور نا آشنا نہ رہے جس کی ترجمانی اس خوبصورت پیرایے میں مرزا اسد اللہ خاں غالب نے کی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ شرابِ ناب صرف اردو داں طبقے کے لیے ہی رہ جائے۔ غالب نے خود کہا تھا: 'کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے'۔ اور بیان کو وسعت دینے کے لیے آرٹ ایک بہت بڑا ذریعہ ہے۔ تصویر کے علاوہ بیان کو پیکر دینے کے اور بھی ڈھنگ اپنائے جائیں اس سے خیال غالب کو تو فروغ ملے گا ہی شاعر کی اپنی زبان کی اہمیت بھی بڑھے گی کیونکہ فن میں اس کی جھلکیوں کی نمائش تو صرف دیدار نمائی ہوگی۔ مدعا بازارِ خواہش اور آتشِ خریدار تیز کرنے کا ہے۔ غالب میں چھپے مفکر اور پوشیدہ ولی کو بحسن تمام دیکھنے کے لیے ان کی زبان کی طرف رجوع کرنا ہی پڑے گا۔ اگر میں سنگ تراش ہوتا تو اس خواب کو حقیقت میں ڈھالنے کی کوشش کرتا کہ غالب کے اشعار کی منظر نگاری مجسموں میں اسی انداز اور اس پیمانے پر ہو جائے جس انداز سے اور جس پیمانے پر گمنام فن کاروں نے ایلورا اور کھجوراہو کو دیدنی بنا دیا ہے۔ اس میں فوقیت یہ ہوتی کہ ان مجسموں کا محرک غالب ہوتا۔ اور اس ذریعہ سے غالب کے اشعار میں پنہاں خیالات ابھر کر پھیلتے۔ قدرت نے ذوق عطا کیا۔ تمنا دی۔ تھوڑا دماغ حسن شناس بھی دیا۔ لیکن ہاتھ میں نہ سنگ تراش کی چابک دستی بخشی نہ چھینی تھمائی۔ پھر بھی خالق کا نفیس لامتناہی ہے وہ خلوص سے چلتے ہوئے ہر ذوق کی

دیکھنا حالت مرے دل کی ہم آغوشی کے وقت
ہے نگاہِ آشنا تیرا سرِ ہر مو مجھے

ہوں سراپا سازِ آہنگِ شکایت کچھ نہ پوچھ
ہے یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھیڑے تو مجھے

تسکین کا کچھ سامان مہیا کر ہی دیتا ہے۔ اس لیے کہ وہ خود ہی حسن تمام ہے اور حسن کو ہر ذریعہ سے خود بینی مطلوب ہے۔

ایک مدت سے میں سمندر اور دریاؤں کے کناروں سے، وادیوں اور پہاڑوں سے عجیب شکلوں کے چھوٹے چھوٹے مڑے تڑے سنگریزے اکٹھا کرتا رہا ہوں۔ قدرت اپنے عناصر سے چٹانوں کو توڑ پھوڑ کر بڑے انوکھے روپ دے دیتی ہے، مدوجزر اپنی لپیٹ میں آئے پتھروں کو کیا سے کیا بنا دیتے ہیں۔ آبی جانور، گھونگھے، سیپ ان پر اپنی نقاشی کرتے ہیں۔ میں ان سنگریزوں میں نہ صرف انسانی چہرے اور جذبات، بھاو اور مدرائیں دیکھتا ہوں بلکہ اشارتاً زندگی کے ہزاروں پہلوؤں کی جھلکیاں سی مجھے ان شکلوں میں دکھائی دیتی ہیں۔

دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا
میں اور جاؤں در سے ترے بن صدا کیے

سنگریزے میں کوئی اُبھار، کوئی جھکاؤ، کوئی کٹاؤ انسان کی مختلف حرکات کو نمایاں کرتا ہے۔ یہ شکلیں ہو بہو نہ سہی کنایتاً ہی سہی اس تصور کی ادائیگی ضرور کر جاتی ہیں جس کا خاکہ میرے ذہن میں بن جاتا ہے۔ میرے سنگریزوں کے مجموعے میں زن و مرد، پیر و جواں اور بچے تو ہیں ہی، ان میں رند و ساقی بھی ہیں۔ عاشق اور ناصح بھی، دیوانے بھی، فلسفی بھی، درباں اور گداگر بھی، یہاں تک کہ شیخ و برہمن بھی ہیں۔ چُنے ہوئے مختلف سنگریزوں کو ملا کر، جوڑ کر خاص زاویوں پر رکھ کر میں نے انھیں مرقعات کی شکل دے دی ہے، اور ہر مرقع غالب کے کسی شعر کے جمالیاتی منظر نگاری کرتا ہے۔ یہ کاوش ایک ڈھنگ سے بہت سادہ اور معمولی وسیلہ کو لے کر پیش کرنے کی ایک سعی ہے۔ مرقعوں میں پتھر خود بولتے ہیں اور کافی حد تک وہی بات کہہ جاتے ہیں جس کی ادائیگی غالب نے بزبان شعر کی ہے۔

غالب سے میرا عقیدت مندانہ لگاؤ بہت پرانا ہے۔ مجھے یاد ہے سب سے پہلے میں نے غالب کی غزل؛

'سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں'

تشریح کے ساتھ اس وقت پڑھی جب میں آٹھویں کلاس میں پڑھتا تھا۔ (شاید ۱۹۳۲ یا ۱۹۳۳ء کی بات ہے) پھر غالب سے کچھ آسان، عام بولے گائے جانے والے اشعار ازبر کر لیے۔ انٹر میں بڑے چاؤ سے دیوان خریدا اور مطالعہ کیا۔ تشریح کے ساتھ پڑھنے کے باوجود بہت سے اشعار فہم اور ادراک سے پرے رہے۔ لیکن غالب کو سمجھنے کا شوق بڑھتا رہا۔ بی اے میں تو دیوانِ غالب ہی اردو کا نصاب تھا اور اردو کے پروفیسر تھے مرحوم مولانا تاجور نجیب آبادی رحمۃ اللہ علیہ۔ مولانا کی غالب کی تفسیریں اب بھی ذہن میں ہیں۔ اس کے بعد زندگی کے

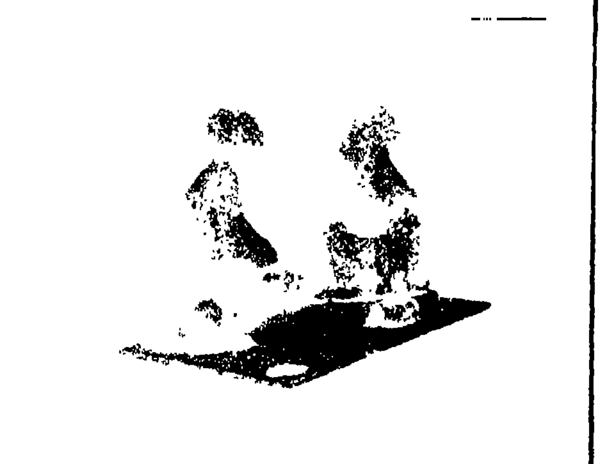

واعظ! نہ خود پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی

نشیب و فراز دیکھتے ہوئے جوں جوں فہم و فراست میں تحلیل ہوتے گئے غالب خود بخود سمجھ میں آتے گئے اور ان کے اشعار متاثر کرتے ہوئے روح میں اترتے گئے۔ غالب کو پانے کے لیے کتابی تشریحات اور تفسیریں نہیں بلکہ دکھ سکھ سے بھرپور زندگی کا گہرا تجربہ، حساس دل اور شستہ باریک بیں دماغ چاہیئے۔ غالب کی ایک بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کے اشعار کا اطلاق زندگی کے لگ بھگ ہر پہلو پر اتنا متناسب اور ان کا انداز بیان اتنا خوبصورت ہوتا ہے کہ لگتا ہے کوئی مفکر شاعر قدم سے قدم ملاتا ہوا راہگذر زندگی پر ساتھ ساتھ چل رہا ہے جو ہر موقع پر بے ساختہ ایسا موزوں فی البدیہہ شعر کہہ دے جو روح کو چھو جائے اور لگے:

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

تقسیم وطن کے وقت مرقع چغتائی ہی ایک ایسی کتاب تھی جو میں ساتھ لا سکا۔ اور تب سے کلام مرزا کی تلاوت میری روزمرہ کی زندگی کا دستور بن چکا ہے۔

غالب کو میرے اور قریب لانے میں اور ان مرقعات کی تشکیل میں ایک چھپا ہاتھ میری مرحوم رفیقۂ حیات کا بھی ہے جو کچھ برس پہلے کینسر کا شکار ہو گئیں۔ اس اذیت ناک بیماری کے دوران مرزا کے کتنے ہی ایسے اشعار جن کا اطلاق ان کی زندگی پر ہوتا تھا اکثر ان کے ہونٹوں سے بیساختہ پھوٹتے رہتے۔ اور پھر ایک شعر تو اپنی حقیقی برجستگی کی بنا پر قیامت ڈھا گیا۔ نہ جانے کن مایوس لمحات میں ایک دن بے پناہ درد سے کراہتے ہوئے انہوں نے مجھ سے کہا "کوئی ایسا انجکشن دلوا دیں جس سے بنا تڑپے ابدی نیند سو جاؤں تو بڑا احسان ہوگا۔ میں نے ان سے تو کچھ نہیں کہا لیکن ڈاکٹر سے کہہ کر ان کو کوئی خواب آور گولی دلوا دی۔ دوا کا اثر دور ہونے پر جب انھیں ہوش آیا تو بھیگی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے انھوں نے دھیمی آواز میں گنگنا دیا ؎

میں چاہتا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستمگر میرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

اور مرزا کا یہ شعر اب تک میرے سینے میں ایک پیکان کی طرح پیوست ہے۔ کیا اس سے بڑھ کر حقیقی مناسب، موقع و محل بھی اس شعر کے لیے ہو سکتا ہے؟ پھر اس جسم خاکی کو چھوڑنے سے کچھ دیر پہلے یہ شعر پڑھ کر ؎

جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لیے ہوئے
ہوں شمع کشتہ درخورِ محفل نہیں رہا

بستر مرگ پر پڑے ہوئے وہ غالب کو کتنا بڑا خراجِ تحسین دے گئیں۔

رفیقۂ حیات کی وفات کے بعد مجھے ایسے مقام پر رہنا پڑا جہاں میرا مکان عین سمندر کے کنارے واقع تھا۔ میرا بیشتر وقت ساحل پر چٹانوں میں گھومتے اور لہروں کی کھلواڑ دیکھتے گزر گیا۔ یہیں پانی سے تراشے چٹان کے ایک ٹکڑے کو دیکھ کر برجستہ غالب کا ایک شعر زبان پر آ گیا۔ اور شعر کا جمالیاتی خاکہ پورے کرداروں کے ساتھ دماغ میں گھوم گیا۔ خیال ہوا کہ اگر باقی کردار بھی مل جائیں تو سنگریزوں سے غالب کے شعر کی پوری منظر نگاری کا مرقع بن سکتا ہے۔ اسے اتفاق کہیے یا قدرت کا کوئی غیبی ہاتھ کہ چند ہی دنوں کی جستجو کے بعد بہت دور کسی اور جگہ سے بالکل ایسا سنگریزہ مل گیا جس کا تصور میں نے کیا تھا۔ اس مرقع کی تشکیل اور تکمیل سے ایک گونہ روحانی مسرت بھی ہوئی اور اسی ڈگر پہ آگے بڑھنے کے لیے ایک تخلیقی مشغلہ بھی مل گیا جس نے اپنی لپیٹ میں اس جنون کی حد تک مجھے لے لیا کہ میں زندگی کے ہر دکھ بھول کر اس خود قبول کردہ پروجیکٹ میں جٹ گیا۔ اس دوران میں غالب بے طرح دل و دماغ پر چھائے رہے۔ ایسے جیسے پورا وجود غالب ہی کے اشعار سے برق دم ہو گیا ہو۔ غالب کو اتنا ڈوب کر اور اتنی بار پڑھا کہ سارا دیوان ذہن نشین ہو گیا۔ کسی خاص پتھر کو دیکھ کر برجستہ غالب

کا کوئی شعر آجاتا اور اس کا جمالیاتی خاکہ پورے کرداروں کے ساتھ آجاتا۔

میرا ایک خواب اس دن پورا ہوا جب میں نے دسمبر ۱۹۷۸ء غالب اکیڈمی کے زیر اہتمام غالب کے ہی اس "نیرنگ یک بت خانہ" کی نمائش غالب اکیڈمی کے نمائش ہال میں مرزا ہی کے قدموں میں کر پایا۔ اہلِ ذوق حضرات نے اس کاوش کو پسند کیا اور اس حقیر سعی کو سعیٔ لاحاصل ہونے سے بچا لیا۔ چھوٹے چھوٹے سنگریزوں کے مجسموں سے بڑی سے بات کہلوانے کی یہ ایک کوشش ہے۔ گویا:

اداۓ خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا

اور اب آگے:

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کیلئے

بقیہ: سعادت حسن منٹو

جائے گا۔ منٹو نے ایک بار خود کہا تھا "اگر میری موت کے بعد میری تحریروں پر ریڈیو، لائبریریوں کے دروازے کھول دیئے جائیں اور میرے افسانوں کو وہی رتبہ دیا گیا جو اقبال مرحوم کے شعروں کو دیا جا رہا ہے تو میری روح سخت بے چین ہوگی۔ میں اس بے چینی کے پیش نظر اس سلوک سے بے حد مطمئن ہوں جو مجھ سے روا رکھا گیا ہے۔ خدا مجھے اس دیمک سے محفوظ رکھے جو قبر میں میری سوکھی ہڈیاں چاٹنے گی"۔ یونیورسٹی کے نقاد اور اردو کے ریسرچ اسکالرس انگشت بدنداں ہیں کہ وہ شخص جو دسویں جماعت کے اردو کے پرچے میں فیل تھا ایسے خوبصورت خیالات کا اظہار ایسی خوبصورت زبان میں کیسے کر سکتا ہے۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ منٹو ایک جینس تھا اور اس کے قلم کا نکھار خدا کی دین تھا۔

آج بھائی صاحب اُسی قبرستان سے جہاں منٹو، ڈاکٹر تاثیر اور اختر شیرانی کے ساتھ دفن ہے بار بار چلا چلا کر منوں مٹی کے نیچے سے پوچھ رہا ہے کہ کیا وہ بڑا افسانہ نگار ہے یا خدا۔

ماجدہ اسد

رضیہ سجّاد ظہیر سے ایک ملاقات

حوض خاص پر پہنچ کر رضیہ آپا کے مکان کو تلاش کرنے میں کوئی خاص وقت نہیں ہوئی۔ میں نے بیل دبائی اور رضیہ آپا نے دروازہ کھول کر مجھے اندر بلالیا۔ اور کہنے لگی "بیٹھو میں ابھی آتی ہوں" کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد رضیہ آپا آئیں اور بولیں "معاف کرنا مجھے تھوڑی دیر ہو گئی" ان کے ساتھ ساتھ چائے بھی آگئی اور بات چیت بہت اپنے پن کے انداز میں شروع ہوئی۔

رضیہ آپا نے بتایا "میرا بچپن اجمیر میں گزرا، ہمارے ابا جہاں اسلامیہ کالج کے پرنسپل تھے۔ انھوں نے گھر ہی پر مجھے پڑھایا۔ ہمارے یہاں پردہ اتنا سخت تھا کہ لڑکیوں کو اسکول میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ گھر میں ہی پڑھ کر میں نے شادی سے پہلے بی۔ اے کیا۔ اور شادی کے بعد الہ آباد سے اردو میں ایم۔ اے کیا۔ میری شادی کے دس دن بعد ترقی پسند ادیبوں کی کانفرنس تھی۔ ہم لوگ گویا ہنی مون منانے اس کانفرنس میں گئے۔

"آپ نے پردہ کب چھوڑا" میں پوچھ بیٹھی

وہ بولیں "پردہ تو شادی سے اگلے دن ہی چھوڑ دیا تھا۔

"پردہ چھوڑ کر ایک دم آپ کو کیسا لگا؟"

شروع میں تو بہت عجیب لگا تھا۔ مردوں کو دیکھ کر جی چاہتا تھا کہ اندر بھاگ جاؤں۔ اور میں شادی کے دس دن بعد کلکتہ میں ہونے والی اس کانفرنس میں گئی۔ بڑا ہنگامہ تھا اس میں۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے اور اقبال نے اپنی طرف سے نیک خواہشات اور مبارکباد بھیجی تھی۔ پریم چند بیچارے تو اس دنیا سے ہی جا چکے تھے۔

"لکھنے کا شوق آپ کو کب سے ہوا؟"

پچھلی یادوں میں ڈوبتی ہوئی رضیہ آپا بولیں "لکھنا میں نے بمبئی سے شروع کیا تھا۔ ویسے میں شادی سے پہلے بھی لکھتی تھی۔ لیکن اس وقت صرف عورتوں کی میگزین کے لیے ہی لکھنے کی اجازت ملی ہوئی تھی۔ میں چھوٹے چھوٹے مضامین لکھتی تھی اور نفسیاتی چیزیں بھی۔ بمبئی میں ۱۹۴۳ء میں ایک افسانہ لکھا۔ جناح صاحب نے ۱۹۴۶ء میں سیدھا الکشن شروع کیا تو میں نے قومی یکجہتی کو لے کر لکھا۔ زیادہ تر میں نے افسانے ہی لک[ھے] ہیں اور ویسے بھی میں کم لکھنا ہی پسند کرتی ہوں۔ خود بھی کم لکھتی ہو[ں] اور یہ سوچتی ہوں کہ زیادہ نہیں لکھنا چاہیے کیونکہ بہت زیادہ لکھ[نا] ٹھیک نہیں ہوتا۔ لکھنے کے لیے اچھا لکھنا بہت ضروری ہے۔ اسی زما[نے] میں میں نے ہندی بھی پڑھی۔ الہ آباد میں یہ قاعدہ تھا کہ اردو ایم۔ [اے] کے ساتھ ساتھ ایک پرچہ ہندی کا بھی دینا پڑتا تھا۔ مجھے ہندی پڑھنے [کا] شوق تھا۔ اس لیے لکھنؤ میں میں نے ایک ماسٹر رکھ کر ان سے ہند[ی] پڑھی۔ لکھنؤ کی یادوں میں ڈوبتے ہوئے وہ کہنے لگیں "وہاں پر اچھا گر[وپ] تھا۔ یش پال جی، بھگوتی چرن ورما، امرت لال ناگر جی وغیرہ تھے۔ اردو وا[لوں] میں منظور سلیم، اقبال مجیب، احتشام صاحب، علیم صاحب، سرور صاحب سب وہیں تھے۔ اس طرح تنقید نگاروں کا اچھا گروپ بھی وہاں تھا۔" دہلی کی زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے بولیں۔ دہلی میں تو چار آدمیوں کا اک[ٹھا] ہونا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ سب لوگ پہنچ نہیں پاتے اس لیے ابھی ہم یہاں کوئی اچھی سوسائٹی یا انجمن نہیں بنا پائے۔"

پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے وہ بولیں "۱۹۴۸ء میں ظہیر صاحب پاکستان چلے گئے تو ہم نے باقاعدہ لکھنا شروع کرد[یا] ان کے یہاں نہ ہونے پر ادب میں اپنا ایک مقام بنا لیا۔ ظہیر صا[حب] تقریباً سات سال پاکستان میں رہے۔ دو سال تو وہاں پتا ہی نہ[یں] کہ کہاں ہیں پھر ان کو وہاں پکڑ لیا گیا۔ ۱۹۵۵ء میں وہ وہاں سے کر آئے۔"

میں نے پوچھا ظہیر صاحب کے اس طرح رہنے پر گھر کا کام کا[ج] چلتا تھا؟

وہ ہنستے ہوئے بولیں "سجّاد ظہیر نے تو کبھی پیسہ کمایا ہی نہ[یں] ۱۹۴۸ء سے ۱۹۶۵ء تک لکھنؤ کے کرامت کالج میں لیکچرر رہی پھر [د]ایک سال کی چھٹی لی اور دہلی آگئی۔ یہاں سوویت دیش میں کام ل[گا] بھی وہاں ٹرانسلیشن کرتی ہوں انگریزی سے اردو میں۔ اس سے [...] پیسے مل جاتے ہیں۔ روز تو میں جاتی بھی نہیں ہوں۔"

پھر انھیں اپنی شادی کا زمانہ یاد آ گیا۔ وہ بولیں "ہماری شادی ۱۹۳۰ء میں ہوئی تھی۔ ہم نے اپنے ماں باپ سے بھی شرط رکھی تھی کہ سرکاری ملازم سے شادی نہیں کریں گے اور ہوا بھی ایسا ہی۔ شادی کے بعد ہم لوگ بمبئی رہے اور پھر اس کے بعد لکھنؤ آ گئے۔ بمبئی میں بھی ایک اسکول میں کام کرتی تھی اور لکھتی بھی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ پارٹی کا کام بھی چلتا تھا۔"

میں نے کہا آپ بہت پہلے سے لکھ رہی ہیں اب تک آپ نے کتنی کہانیاں لکھی ہیں؟"

جواب ملا "ٹھیک سے تو یاد نہیں بہت کہانیاں چھپی ہیں لیکن کوئی مجموعہ میں نے شائع نہیں کرایا۔ یہ سُن کر لوگوں کو تعجب ہوتا ہے۔ کئی ناول چھپے ہیں۔ ہندی میں بھی اور اردو میں بھی۔ اپنے ناولوں میں میں نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ ہمارے سماج میں اس وقت جو بڑے بوڑھے بزرگ لوگ ہیں وہ ایسے اقتدار حاصل کیے ہوئے بیٹھے ہیں کہ نوجوانوں کو آگے بڑھنے کا موقع ہی نہیں دیتے۔"

میں نے کہا "آپ کی کہانیاں ناولوں کے مقابلہ میں زیادہ مقبول ہیں اور زیادہ اچھی مانی جاتی ہیں اس کی کیا وجہ ہے" بڑے گھریلو انداز میں انھوں نے جواب دیا۔ بی بی بڑی دیگ کی نسبت ایک پتیلی کو زیادہ مزیدار کر کے پکایا جاسکتا ہے۔"

"آپ کی تحریروں اور تصانیف پر کمیونزم کے اثرات کافی نمایاں ہیں؟" میں بولی۔

ہنستے ہوئے کہنے لگیں "کالج میں پڑھاتے ہوئے ایک بار مجھ پر یہ اعتراض ہوا تھا کہ میں کمیونزم پڑھاتی ہوں۔ پریم چند اور اقبال میں بھی یہ فلسفہ ملتا ہے۔ تو پھر کلاس میں سمجھانا ہی پڑے گا۔ ویسے میں پارٹی ممبر تو اب بھی نہیں ہوں۔ ہاں اس کے لیے کام ضرور کرتی رہی۔ کبھی کبھی کلاس میں بھی ہم اپنی کہانیاں وغیرہ سناتے رہتے۔ ہمارا چھوٹا سا کالج تھا۔ اس میں ہم نے ادبی ماحول بنا رکھا تھا۔ سال میں کئی پروگرام رکھتے۔ جو بہت مقبول اور کامیاب ہوتے تھے۔

جب پارٹی کی بات شروع ہو گئی تھی تو میرے لیے یہ فطری ہی تھا کہ ان سے یہ پوچھ لوں کہ آپ روس بھی گئی ہیں۔"

اس سوال کا جواب انھوں نے بہت دلچسپی سے دیتے ہوئے بتایا "روس میں جاکر مجھے بہت اچھا لگا۔ سب سے بڑی چیز تو وہاں یہ ہے کہ بوڑھے اور نوجوان سب مل کر کام کرتے ہیں۔ اور ایسی حالت میں یہ لگتا ہے کہ نسل درنسل کے درمیان کا فاصلہ ختم ہو گیا ہے۔ تاشقند اور سمرقند میں مشہور جیوتش الغ بیگ تھا۔ اس کی عمارت خاص ڈھنگ سے بنی ہوئی تھی۔ اس کا ایک حصہ ٹوٹ گیا تھا۔ چار پانچ بوڑھے ازبیک سیڑھیوں پر چڑھے ہوئے تھے اور ان کے ساتھ بیسیوں نوجوان لگے تھے۔ ان سب نے مل کر اس عمارت کی اس طرح مرمت کی کہ اب یہ پتا لگانا مشکل ہو گیا تھا کہ پہلی اور بعد کی بنی ہوئی کون سی جگہ ہے۔

رضیہ سجّاد ظہیر (۱۵ فروری ۱۹۱۸ء — ۱۸ دسمبر ۱۹۷۹ء)

پھر وہ بولیں "گھر کے اندر بھی اگر ہم چاہیں تو نسلوں کے بیچ اس فاصلے کو دور کر سکتے ہیں۔ وہاں بھی بوڑھے لوگ پُرانے ڈھنگ کے کپڑے پہنتے ہیں اور نئے لوگ نئے ڈھنگ کے۔ لیکن آپس میں اس طرح رہتے ہیں کہ نسلوں کے فاصلے کا اندازہ ہی نہیں ہوتا۔"

"عورتوں کی حالت وہاں کیسی ہے؟"

میرا سوال مانو ان کی مرضی کے عین مطابق تھا وہ بڑے جوش سے بولیں دوسرے ممالک سے وہاں پر عورت کی حالت بہت مختلف ہے۔ میری مثال سے ہی تم وہاں کی عورتوں کی حالت کا اندازہ لگالوگی میری دو بیٹیاں ہیں ایک لندن میں دوسری ماسکو میں۔ ماسکو والی بیٹی ہمیشہ لکھتی ہے کہ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے بچے یہاں پیدا ہوں جب کہ لندن والی ہمیشہ یہ لکھتی کہ دعا کیجیے کہ جب تک میں لندن میں ہوں تب تک بچہ نہ پیدا ہو کیوں کہ یہاں اس کی دیکھ بھال بہت مشکل ہو جائے گی۔ دونوں ملکوں کے نقطہ نظر میں کتنا فرق ہے۔ جب تک عورت کو بچوں کے جھنجھٹ سے چھٹی نہیں ملے گی وہ کچھ نہیں کر سکتی۔ روس میں دو سال تک ملازمت کرنے والی عورت کی جگہ دوسرا مستقل آدمی رکھا نہیں جا سکتا۔ وہ چھٹیاں لیتی رہتی ہے اور چھوٹے بچوں کو کریش میں چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ جہاں ان کی دیکھ بھال ہوتی ہے۔ شام کو واپس پر وہ اپنے بچوں کو ساتھ لے آتی ہے۔ اور اگر کسی وجہ سے لینے نہیں جاسکتی تو فون کر دیتی ہے۔

"اور کیا چیز آپ کو وہاں اچھی لگی؟" میں نے پوچھا۔

وہ دھیرے سے بولیں آدمی کا کردار اس کے کاموں سے بندھا ہوتا ہے محنت میں کروں گا اور فائدہ دوسرے کو ہوگا۔ اس طرح محنت کرنے والے کے دل میں جوش نہیں رہتا۔ وہاں ہزار میں ایک دو آدمی ہی ایسے ہوتے ہیں جو اپنی آمدنی کو اڑا ڈالتے ہیں۔ ایسے مردوں کی تنخواہ ان کی بیویوں کو دے دی جاتی ہے۔ اور تو اور آٹھ روبل جو یہاں اسّی روپے کے برابر ہوتے ہیں۔ ان میں تین کمروں کا فلیٹ مل جاتا ہے اور اسی میں بجلی، گیس ٹھنڈا گرم پانی۔ سینٹرل ہیٹنگ وغیرہ سب کچھ ہوتا ہے۔

"وہاں کا طریقہ تعلیم نیا ہے" میرے دل میں یہ جاننے کی خواہش ہوئی اور میں پوچھ بیٹھی۔

وہ کہنے لگیں۔ وہاں یونیورسٹیوں میں اتنی بھیڑ نہیں ہے جتنی یہاں ہے۔ وہاں بچوں کو ایک ساتھ کئی زبانیں سکھائی جاتی ہیں اور تعلیم کے لیے اس کا رجحان دیکھا جاتا ہے۔ جو کام وہ کرنا چاہتا ہے وہاں اسے بھیج دیا جاتا ہے۔ اس طرح یونیورسٹیوں میں یہاں کی طرح بھیڑ نہیں ملتی اور جو آدمی جیسا رجحان رکھتا ہے اس کو بھیج دیا جاتا ہے۔ بہت کم لوگ یونیورسٹیوں میں جاتے ہیں۔ ہر بچے کو وہاں اسکالرشپ ملتی ہے۔ بچے سولہ سترہ سال کی عمر میں میٹرک یا ہائی اسکول پاس کر لیتے ہیں۔ اور اس کے بعد ان کو کام مل جاتا ہے۔ اگر وہ پڑھنا چاہتے ہیں تو کام کے ساتھ ساتھ شام کی کلاسوں میں جا کر پڑھتے ہیں۔

پارٹی اور روس کی باتیں بہت ہو چلی تھیں میں پھر رضیہ آپا کو ان کے ادب کی طرف واپس لے آئی اور پوچھ بیٹھی "آپ کو کن کن مضامین پر انعام ملا ہے۔

وہ بولیں "ایک کتاب کا میں نے ترجمہ کیا ہے اردو میں لینن کی یادیں اس کا نام ہے۔ پورا ایک سال اس ترجمہ میں لگ گیا۔ اس پر مجھے سوویت لینڈ نہرو ساہتیہ پرسکار ملا۔ لینن کی بھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ لینن اپنی محبوبہ کے ساتھ رہتے تھے۔ ان کی محبوبہ نے لینن کی زندگی کو لے کر کتاب لکھی تھی۔ اس کا ترجمہ میں نے کیا اور بھی بہت سے ترجمے کیے ہیں۔ اتر پردیش اردو اکاڈمی اور اکھل بھارتیہ لیکھیکا سنگھ سے بھی انعامات ملے ہیں اور میری کچھ چیزیں انگریزی اور روسی زبان میں بھی شائع ہوئی ہیں۔

وہ بولیں "میں نے بمبئی ریڈیو سے پروگرام دینے شروع کیے تھے۔ اس میں ٹاک، ڈرامہ، فیچر کہانی وغیرہ سب ہی دیے ہیں۔ بمبئی ریڈیو کے لیے لکھ اور وہاں سے بولنا بھی ایک فن ہے۔ ہم نے پروگرام دینا بھی بخاری صاحب جیسے عظیم فن کاروں سے سیکھا اور اب بھی کچھ چیزیں ریڈیو سے آتی رہتی ہیں۔ اور کافی پسند بھی کی جاتی ہیں۔

مرد ماڈل درکار ہیں

ایسے مرد حضرات جو بطور ماڈل کام کرنے کے خواہشمند ہوں اور درج ذیل خوبیوں کے حامل ہوں، اپنی درخواستیں اپنی پورے سائز کی تصویر اور جملہ ذاتی تفصیلات کے ساتھ جلد از جلد ارسال کریں۔

وجیہہ اور شکیل شکل وصورت، کھلتا رنگ، عمر ۲۰ تا ۳۰ سال، کسرتی بدن اور طویل قد وقامت۔ تعلیم یافتہ ہوں اور لازمی طور پر انگریزی میں اور ترجیحی طور پر اردو میں بات چیت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

کمال ایڈورٹائزنگ ایجنسی

۲۵۶ ایس او۔ رابرٹسن، سوٹ ۲۱۴،
بیورلی ہلز۔ کیلیفورنیا۔ ۹۰۲۱۱ (یو ایس اے)

کرشن بلدیو شرما

پنڈت میلارام وفا

پنڈت میلارام وفا کا نام زبان پر آتے ہی اس "اتحادِ ثلاثہ" کی یاد آجاتی ہے جس کی آج سے پچاس ساٹھ برس پہلے متحدہ پنجاب کے ادبی حلقوں میں بڑی دھوم تھی۔ یہ اتحاد تین نامور اور برگزیدہ ادبی رہنماؤں پر مشتمل تھا یعنی علامہ تاجور نجیب آبادی (مسلمان)، سردار اودے سنگھ شائق (سکھ) اور پنڈت میلارام وفا (ہندو)۔ "اتحادِ ثلاثہ" نام بھی کسی معمولی شخص کا تجویز کردہ نہ تھا بلکہ عالمِ اردو کی مایۂ ناز ہستی سر عبدالقادر کا دیا ہوا تھا جنھوں نے اس عنوان سے ایک مضمون سپردِ قلم کر کے ان تینوں حضرات کی ادبی خدمات کا ذکر درخشاں اور نمایاں الفاظ میں کیا تھا۔ سر عبدالقادر کی یہ سند اس بات کی دلیل تھی کہ پنڈت میلارام وفا ایک کہنہ مشق شاعر ہیں۔

آج سے کوئی تیس برس پیشتر پاکستان کے سرکاری ادبی رسالہ "ماہِ نو" کے ایک شمارے میں سید عابد علی عابد کا مضمون "پرانے لاہور کی ادبی محفلیں" چھپا تھا جس میں تقسیمِ وطن سے قبل کے ادبی معرکوں اور مشاعروں کا ذکر تھا۔ فاضل مضمون نگار نے لاہور کے شعرا کی ادبی چشمکوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ وہاں کے ادبی حلقے پنڈت میلارام وفا کی شاعرانہ صلاحیتوں کے مداح تھے۔ اور کہ ان کا کلام صحتِ زبان کا مرقع ہوتا تھا۔ عابد صاحب نے مثال کے طور پر وفا کا ایک شعر بھی درجِ مضمون کیا تھا۔ "خیالی ہوتی جاتی ہے"، "جمالی ہوتی جاتی ہے" کی زمین کا شعر تھا۔

وہ سن کر حالِ فرقت 'ہوگا' 'ہوگا' کہتے جاتے ہیں
کہانی میری ماضی احتمالی ہوتی جاتی ہے

ردیف قافیہ کو اس رنگ میں باندھنا کوئی آسان بات نہ تھی۔

سید عابد علی عابد کا مضمون پڑھنے کے بعد یہ خواہش ضرور رہی کہ اس باکمال شاعر سے ایک بار مل لینا چاہیے تاکہ کل کو کہہ سکوں کہ میں نے ان کو دیکھا ہے۔

اتفاق کی بات کہ کچھ عرصہ بعد پنڈت جی درسی کتب کی فروخت کے سلسلہ میں مختلف شہروں کا دورہ کرنے لگے۔ دراصل انھوں نے جالندھر میں اپنا پبلشنگ ہاؤس قائم کر لیا تھا۔ اور کتابیں بیچنے کے لیے اسکولوں میں جانے لگے تھے۔ اچانک ایک روز فیروزپور کے ایک اسکول میں ان سے ملاقات ہو گئی۔ میرے ذہن میں ماضی احتمالی والا شعر ابھر آیا۔ سید عابد علی عابد کے مضمون کا ذکر سن کر وفا صاحب بہت خوش ہوئے اور پھر گفتگو کے دوران انھوں نے مندرجہ ذیل شعر بھی سنائے۔

خدا کے نام پر دست و گریباں ہیں خدا والے
بہت کچھ ہے جہاں ذکرِ خدا خوفِ خدا کم ہے

دعا کو ہاتھ کیوں اٹھے مرے تیمارداروں کے
زباں سے کیوں نہیں کہتے کہ امیدِ شفا کم ہے

کچھ کہہ کے جو بن جاؤں بُرا سب کی نظر میں
اس سے یہی اچھا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

ان کا یہی سننا ہے کہ وہ کچھ نہیں سنتے
میرا یہی کہنا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

وفا کا اندازِ بیان بڑا شگفتہ، سہل اور دلآویز ہے۔ ان کی ادبی نگارشات اپنی صحتِ زبان اور موزونیِ الفاظ کے باعث بڑے بڑے نقادوں سے اپنا لوہا منوا چکی ہیں۔ مولانا ظفر علی خاں جیسے اقلیمِ سخن کے تاجدار نے ایسے ہی نہیں کہہ دیا تھا کہ:

شعر کہنے کا سلیقہ سیکھ میلارام سے

اس معرکہ کا پس منظر بےحد دلچسپ ہے۔ ان دنوں لاہور میں شاعرانہ چشمکیں اکثر ہوا کرتی تھیں۔ مثال کے طور پر طوطیٔ ہند پنڈت راج نارائن ارمان جنھیں داغ کا شاگرد ہونے پر بہت ناز تھا۔ بات بات پر کہتے "انھیں کیا گھمنڈ ہے، میں داغ کا شاگرد ہوں"۔ بقول گوپال متل گھمنڈ کا لفظ ان کی بڑی بڑی مونچھوں سے ہو کر جب نکلتا تو سننے والے کو 'گھمنڈا' سنائی دیتا۔ شومیٔ قسمت سے ان کی "نیازمندانِ لاہور" سے ٹھن گئی۔ اور ہری چند اختر میدان میں اتر آئے۔ "گھمنڈا" کے عنوان سے اخبار پارس میں ایک نظم شائع ہوئی جس کا ایک شعر تھا۔

تو دَغ کا استاد ہو یا داغ کا شاگرد
داغی ہیں مگر سب ترے اشعار گھمنڈا

(بحوالہ "لاہور کا جو ذکر کیا" از گوپال متل)

لاہور کے اردو اخبارات و رسائل کے درمیان اسی طرز کی ادبی و سیاسی نوک جھونک چلتی رہتی۔ دو چار چبھتے ہوئے شعر پہلے صفحوں کی زینت ہوتے اور جواب الجواب کا سلسلہ قائم رہتا۔ ضمناً بعض اوقات پنجابی زبان کے الفاظ بھی اشعار میں جگہ پا جاتے تھے۔ ایک دفعہ ایک اخبار نے پنجابی زبان کے لفظ ٹلّی (گھنٹی) کو اپنے شعر میں "ٹلی" (بلاتشدید) باندھ دیا (ٹلّی کہنے سے شعر وزن سے خارج ہوتا تھا)۔ مولانا ظفر علی خاں کو ایسا موقع خدا دے۔ نئے نئے قوافی لانے میں ان کا مقابلہ کرنا آسان نہ تھا۔ مولانا نے ٹنٹا، بنٹا کی زمین میں معاصر پر چھینٹا پھینکتے ہوئے کہا

اور ٹلّی کو جو شخص 'ٹلی' نظم میں باندھے
پھر کیوں نہ بلائے وہ مہادیو کا گھنٹا

اس پر پنجاب کے ادبی حلقوں میں طوفان پھٹ پڑا۔ دونوں طرف سے توپوں

کے دہانے کھل گئے۔ آخر مولانا ظفر علی خاں نے برملا کہہ دیا کہ ؎

توڑتا ہے شاعری کی ٹانگ کیوں اے بے ہنر
شعر کہنے کا سلیقہ سیکھ میلارام سے

اور یہ حقیقت بھی ہے کہ شعر کہنے کا سلیقہ پنڈت میلارام وفا کو بدرجۂ اتم حاصل تھا۔ ان کے کلام میں داغ، مومن اور میر کے اثر کی جھلک ملتی ہے۔

پنڈت میلارام ۲۶ جنوری ۱۸۹۵ء کو موضع دیوکے (ضلع سیالکوٹ) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام پنڈت بھگت رام تھا۔ ابتدائی تعلیم پسرور (ضلع سیالکوٹ) اور قلعہ صوبہ سنگھ میں حاصل کرنے کے بعد میلارام نے میٹرک کا امتحان سیالکوٹ کے اسکاٹش مشن ہائی سکول سے ۱۹۱۲ء میں پاس کیا۔ پہلے ان کے بڑے بھائی پنڈت سنت رام شوق فارمن کرسچن کالج کے طالب علم بن کر لاہور پہنچے اور کالج کے بورڈنگ ہاؤس "نیوٹن ہال" میں رہنے لگے۔ شوق ایک خوش گلو نوجوان شاعر تھے اور خوش قسمتی سے انھیں ہم جماعت اور روم میٹ بھی اودے سنگھ شائق جیسا سخن فہم اور سخن نواز طالب علم ہی ملا تھا۔ شوق کو دو سال بعد کسی اسکول میں ٹیچری کی ملازمت مل گئی اور وہ سلسلۂ تعلیم منقطع کر کے چلے گئے۔ لیکن ان کی جگہ چھوٹے بھائی پنڈت میلارام وفا اسی کالج میں آگئے اور اپنے بڑے بھائی کی مانند شائق کے ہمدم اور ہم نشین بن گئے۔ ان دونوں کی رفاقت نے آگے چل کر پنجاب کی ادبی زندگی کو بڑی رونق بخشی۔

انہی دنوں مولانا تاجور نجیب آبادی لاہور تشریف لے آئے اور دیال سنگھ کالج میں اردو فارسی کے پروفیسر مقرر ہو گئے۔ مولانا اپنی ذات سے ایک مستقل ادارہ تھے۔ ان کی کشش وفا اور شائق کو ان کے پاس کھینچ لائی۔ اور ان کے باہمی مراسم بڑھنے لگے۔ ویسے وفا، پنڈت راج نرائن ارمان کے شاگرد تھے۔ علامہ تاجور نے سخن فہم اور سخن سنج حضرات کو یکجا کرنے کے لیے انجمن ارباب علم، پنجاب کے نام سے ایک انجمن (۱۹۱۸ء تا ۱۹۲۸ء) کی بنا ڈالی۔ جس کے ایک اہم رکن وفا تھے۔ تاجور، شائق اور وفا کی انتھک کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس ادارے سے منسلک ہونے کے لیے ہندستان کے نامور شاعر جن میں جگر مرادآبادی، سیماب اکبرآبادی، یاس یگانہ چنگیزی اور اصغر گونڈوی شامل تھے، لاہور چلے آئے۔ دوسری طرف اس انجمن کے مقابلے میں یار لوگوں نے "حلقۂ نیازمندان لاہور" قائم کر لیا۔ جس میں حفیظ جالندھری، عبدالمجید سالک، محمد دین تاثیر اور پنڈت ہری چند اختر پیش پیش تھے۔ ان دونوں اداروں کے ادبی معرکے پنجاب کی تاریخ اردو کا ایک حصہ ہیں۔ یہ معرکہ آرائیاں بڑی مفید ثابت ہوئیں اور شورش کاشمیری کے الفاظ میں "وہ اردو جس کا سنگار دِلّی و لکھنؤ میں شاہی طنطنے کے روبہ زوال ہوتے ہی لٹ گیا تھا، اسی خطۂ پنجاب کی بدولت عروسِ اقتدار سے ہمکنار ہوئی" لیکن تقسیم وطن کے ساتھ ہی وہ ادبی صحبتیں اور علمی محفلیں درہم برہم ہو گئیں اور شعرا کی بزم آرائیاں خواب و افسانہ بن گئیں۔

؎ یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگار طاقِ نسیاں ہو گئیں

پنڈت میلارام چند روز سنٹرل ریلوے آفس میں کام کرنے کے بعد روزنامہ دیپک میں مترجم بن گئے۔ اور پھر ۱۹۱۹ء تک روزنامہ دیش کے نائب مدیر رہے۔ کچھ عرصہ بندے ماترم میں کام کرنے کے بعد وہ نیشنل کالج لاہور میں اردو فارسی کے لیکچرر مقرر ہو گئے۔ ۱۹۲۱ء میں وہ پھر بندے ماترم کے ایڈیٹر بن کر آگئے اور ۱۹۲۴ء تک ایڈیٹر رہے۔ انھوں نے اپنا اخبار بھارت بھی نکالا۔ اور پھر ۱۹۲۵ء میں روزنامہ بھیشم کے ایڈیٹر بنے جو پنڈت مدن موہن مالویہ کے زیر سرپرستی نکلتا تھا۔ ۱۹۲۶ء میں سیاسی اختلافات کی بنا پر انھوں نے استعفیٰ دے دیا لیکن اخبار چلنا مشکل ہو گیا۔ چنانچہ انھیں واپس بلا لیا گیا اور ۱۹۲۹ء تک وہ اس کے ایڈیٹر رہے۔ اس کے بعد انھوں نے ویر بھارت کا رخ کیا۔ اور یہ انہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ ۱۹۳۱ء میں ویر بھارت بیک وقت لاہور اور سیالکوٹ سے چھپنے لگا۔ کسی اردو روزنامے کے لیے یہ بڑے فخر کی بات تھی۔ بعد ازاں انھوں نے اپنا اخبار رہبر نکالا۔ ملک آزاد ہونے سے پہلے ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۷ء تک وہ ویر بھارت میں کام کرتے رہے۔

پنڈت میلارام وفا تقسیم وطن سے دل برداشتہ ہو کر لکھنؤ چلے گئے اور کچھ سال تک وہیں رہے۔ گو کہ تقسیم وطن کے ناگوار حالات اور ترک وطن کے باعث ان کی طبیعت بے حد پریشان تھی۔ تاہم لکھنؤ کی ادبی فضا ان کو اور ان کی شاعرانہ طبیعت اہالیان لکھنؤ کو خوب راس آئی۔ اور پھر ایک روز لکھنؤ ہی میں جشن وفا کی تقریب منعقد ہوئی۔

لکھنؤ میں وفا صاحب کے زیر صدارت اکثر مشاعرے ہوتے تھے ایک مشاعرہ آزادی کے موضوع پر بھی ہوا۔ جس میں ایک مقامی شاعر کو اس شعر پر ؎

کاش ہم عدمِ تعاون پہلے ہی کر بیٹھتے
یوں نہ اپنا دھرم و ایماں طاق پر دھر بیٹھتے

بہت داد ملی لیکن وفا صاحب خاموش رہے۔ شاعر صاحب منتظر رہے کہ دیکھیں وفا صاحب اس قافیہ کو کس طرح نبھاتے ہیں۔ لیکن وفا کے شعر نے مشاعرہ لوٹ لیا۔ شعر تھا ؎

تم نے کیوں تکلیف کی تم چین سے گھر بیٹھتے
خون اپنا ہم اگر کر بیٹھتے، کر بیٹھتے

بعد ازاں وفا صاحب نے متعلقہ شاعر کو سمجھایا کہ اول تو آپ کے شعر کا لفظ عَدَم بہ حرکت دال ہے نہ کہ بہ سکونِ دال۔ آپ نے اپنے شعر میں عدم کو بہ سکون دال باندھا ہے جو غلط ہے۔ دوسرا نقص شعر میں یہ تھا کہ عدم تعاون کی تحریک تو اچھی چیز تھی اور قابل تعریف تھی۔ لیکن شعر میں جو فعل "کر بیٹھتے" آپ نے استعمال کیا ہے وہ بڑے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسے "وہ ایک ایسی ذلیل حرکت کر بیٹھا تھا کہ عمر بھر اس کا خمیازہ بھگتتا

رہا۔ عدم تعاون جیسی اچھی چیز کے لیے کر بیٹھنے کا فعل استعمال کرنا ٹھیک نہیں۔

آل انڈیا ریڈیو جالندھر کے ایک مشاعرے میں پنڈت جی نے بڑی مرصع غزل پڑھی تھی۔ یہ تمام غزل آتے ہیں اور جاتے ہیں کی تکرار ہی میں ختم ہوجاتی ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

کیا کہیے وعدوں پہ یقیں ہم تو لائے جاتے ہیں
دھوکا کھانا پڑتا ہے دھوکا کھائے جاتے ہیں

راتیں عیش و عشرت کی، دن دکھ درد مصیبت کے
آتے آتے آتی ہیں، جاتے جاتے جاتے ہیں

آندھیوں اور بگولوں سے کم نہیں تیرے دیوانے
خاک اڑاتے آتے ہیں، خاک اڑاتے جاتے ہیں

آج سحر سے غیر بہت حال تیرے بیمار کا ہے
افسردہ افسردہ ہیں لوگ جو آتے جاتے ہیں

غیر تو ہیں پھر غیر وفاؔ غیروں کا شکوہ ہی کیا
بدحالی میں اپنے بھی آنکھ چراتے جاتے ہیں

پنڈت میلارام وفاؔ لالہ لاجپت رائے اور پنڈت مدن موہن مالویہ سے متاثر ہوکر سیاست میں آگئے تھے۔ جلد ہی وہ انقلابی شاعر بن گئے۔

۱۶ ستمبر ۱۹۲۸ء کے روزنامہ بھیشم لاہور کا پرچہ میرے پاس محفوظ ہے جس کے پہلے صفحہ پر "سید حبیب اور بھائی پرمانند" کے عنوان سے ایک سیاسی غزل چھپی ہوئی ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

پنجاب میں عیاں ہیں پھر آثار جنگ کے
کہتے تھے ایک دوست سے منشی نہال چند

الجھے گا بھائی ان پہ مقرر حبیب سے
مضمون بحث کا جو بنے ہیں سوال چند

سمجھیں پھر آپ خیر نہ نہرو سکیم کی
قسمت سے مل گئے جو انھیں ہم خیال چند

سید کہے گا خطرہ ہے مسلم مفاد کو
دے گا حوالے بھی بہ طریق مثال چند

بھائی کرے گا شور کہ بس جان لیجیے
اب ہستیٔ ہنود ہے دنیا میں سال چند

مقصد یہ ہے مقاطعۂ سائمن میں کل
ملنے نہ پائے دین محمد سے لال چند

(میلارام وفاؔ)

قومی مفاد کے خلاف کوئی نظم یا مضمون ان کے اخبار میں جگہ نہ پا سکتا تھا۔ یہاں تک کہ بھیشم کے مینیجنگ ایڈیٹر کا ایک مقالہ جو سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کے خلاف تھا، انھوں نے شائع کرنے سے انکار کردیا تھا۔ اسی لیے وہ اکثر بے روزگار بھی رہے۔ لیکن کسی کانگرس دشمن اخبار کی نوکری کرنا انھیں گوارا نہ تھا۔

جن دنوں بھگت سنگھ پر سانڈرس کے قتل کا مقدمہ چلایا جارہا تھا، وفاؔ نے "اے فرنگی" کے عنوان سے ایک نظم لکھی اور دو سال کے لیے جیل چلے گئے۔ اپنے مقدمہ کی سماعت کے دوران بھی وہ انقلابی نظمیں لکھتے رہے اور فرنگی سطوت و جبروت سے کبھی خائف نہیں ہوئے ۱۹۳۲ء میں انھوں نے ایک قومی ترانہ "ہندوستان ہمارا" لکھا جس کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

برطانیہ سے کہہ دو، اب ذلتِ غلامی
کرتے نہیں گوارا، ہندوستاں ہمارا

برطانیہ سے کہہ دو، ہندوستاں کے ہم ہیں
برطانیہ تمہارا، ہندوستاں ہمارا

برطانیہ تمہارا، ہندوستاں ہمارا
بس چھوڑ دو خدارا ہندوستاں ہمارا

وفاؔ نے ہر اس تقریب اور جماعت کا سایہ بھی اپنے پاس نہیں آنے دیا جسے کسی نہ کسی صورت میں انگریز کی سرپرستی حاصل تھی۔ حتیٰ کہ امرتسر کے ۱۹۴۳ء کے مشاعرے میں بھی جو پنجاب ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی ادبی تاریخ میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے، شامل ہونے سے گریز کیا۔ اس مشاعرے کی خصوصیت یہ تھی کہ مغلیہ عہد کے شاہی مشاعروں کو ملحوظ رکھا گیا تھا— وہی شان و شوکت، وہی آرائش و زیبائش، وہی شعرا کا ایشیائی لباس و نشست، یہاں تک کہ ڈپٹی کمشنر مسٹر مون (MOON) بھی کمخوابی اچکن پہن کر مشاعرے میں تشریف لائے۔ وفاؔ کو بھی اس میں شرکت کے لیے بہت کچھ ترغیب و تحریص دلائی گئی۔ کیونکہ ان کے خاص دوست سردار اودے سنگھ شائق اس مشاعرے کے روحِ رواں تھے۔ لیکن وفاؔ جیسے حریت کیش اور انگریزوں کے خلاف باغیانہ نظمیں لکھنے والے شاعر ایسے مشاعرے میں کیونکر شریک ہوسکتے تھے۔ چنانچہ منتظمینِ مشاعرہ کی تمام کوششیں رائیگاں گئیں۔

ملک آزاد ہوجانے کے بعد پنڈت میلارام وفا سہارنپور سے اپنا اخبار پنجاب میل نکالنے لگے۔ اور پھر کانپور سے "امرت" نکالتے رہے۔ وہ پنجاب کی بزم سخن کے سرپرست اور یوپی اردو پریس کانفرنس کے صدر بھی رہے۔ ان کے کلام کے دو مجموعے شائع ہوچکے ہیں— سوزِ وطن ۱۹۴۱ء میں اور سنگِ میل ۱۹۵۹ء میں۔

وفاؔ کو نمود و نمائش کی قطعاً خواہش نہیں تھی۔ اس لیے یہ بات قابلِ اطمینان ہے کہ حکومت پنجاب نے ان کی ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے انھیں "راج کوی" کا مرتبہ عطا کیا تھا۔

پنڈت میلارام وفاؔ ۲۸ ستمبر ۱۹۸۰ء کو ہماری نظروں سے ہمیشہ کے لیے اوجھل ہوگئے۔

at Civil Lines Post Office, Delhi.

R. N. 948/57

ہماری کتابیں

HUSAIN LIBRARY ... NEW DELHI

۱۔ مشعل آزادی (ساغر نظامی) قیمت ۴۰ روپے
ہندوستان کی جنگ آزادی کی منظوم داستان (حصہ اول) ۲۴۰ صفحات پر مشتمل جس میں ۱۸۵۷ء تک کے واقعات شامل ہیں۔ دیدہ زیب کتابت وطباعت عمدہ مجلد مع گرد پوش۔

۲۔ بھارت خلائی دور میں قیمت بارہ روپے
خلائی سائنس کی دلچسپ داستان۔ سری ہری کوٹہ کی سیر، راز ہائے سربستہ کا انکشاف، نہایت آسان زبان، خلائی کوششوں کا ہلکے پھلکے انداز میں بیان۔ ۱۴۰ صفحات کی کتاب۔ کاغذ عمدہ، تصاویر سے مزین۔

۳۔ پہیلیاں قیمت آٹھ روپے
پانچ سو سے زیادہ پہیلیوں کا مجموعہ جن سے بچے اور بڑے یکساں طور پر لطف اٹھا سکتے ہیں۔

۴۔ رنگ برنگے پھول قیمت دس روپے
بچوں کے شاعر شفیع الدین نیر، سیفی سیوہاروی، افسر میرٹھی، اسمٰعیل میرٹھی، تلوک چند محروم اور دیگر بہت سے شعرا کی آسان زبان میں لکھی ہوئی نظمیں۔

۵۔ آج کل کی کہانیاں قیمت گیارہ روپے
۱۹۶۴ء سے ۱۹۷۸ء تک رسالہ "آج کل" میں شائع شدہ مشہور کہانیوں کا مجموعہ جس میں واجدہ تبسم، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر اور دیگر افسانہ نگاروں کے شہ پارے شامل ہیں۔

۶۔ کون جیتا کون ہارا قیمت ۹ روپے
بچوں کے لیے آسان زبان میں لکھی ہوئی دو دلچسپ کہانیاں۔ کتاب شروع کرنے کے بعد ایک ہی نشست میں ختم کرنے کو جی چاہتا ہے۔ عمدہ کتابت۔

۷۔ ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر (ڈاکٹر محمد عمر) قیمت ۲۰ روپے
ڈاکٹر تارا چند نے اپنی مشہور تصنیف میں ہندوستانی تہذیب پر مسلمانوں کے اثرات کا جائزہ لیا تھا۔ ڈاکٹر محمد عمر نے اپنی اس محققانہ کاوش میں یہ دکھایا ہے کہ ہندوستانی تہذیب مسلمانوں کی زندگی میں سرایت کیے ہوئے ہے۔

۸۔ مرقع اقبال (جگن ناتھ آزاد) قیمت ۵۰ روپے
علامہ اقبال کی زندگی کے اہم واقعات شجرۂ نسب اور نادر تصاویر اور تحریروں کا البم۔

۹۔ یہ ہندوستان (شیلا دھر) قیمت ۱۰ روپے
اس باتصویر کتاب میں سادہ اور سہل [illegible] بچوں کو ہندوستانی تہذیب وتمدن کے ساتھ ساتھ تاریخی معاشی اور سماجی حالات سے آگاہ کیا گیا ہے۔ رنگین تصاویر۔

۱۰۔ سر سید احمد خاں (پروفیسر خلیق احمد نظامی) قیمت ۵ روپے
ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی، ثقافتی اور سیاسی زندگی پر سرسید کے کارناموں کا زبردست اثر پڑا ہے۔ اس بات کو بڑے عالمانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

۱۱۔ ابوالکلام آزاد (عرش ملسیانی) قیمت پانچ روپے
ابوالکلام آزاد جدید ہندوستان کے معماروں میں ہیں۔ ان کی خدمات کا حسین و دلکش انداز میں بیان۔

۱۲۔ جواہر لال کی کہانی تصویروں کی زبانی قیمت ۳ روپے ۵۰ پیسے
محبوب رہنما اور ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم شری جواہر لال نہرو کی زندگی کے دلچسپ واقعات رنگین تصاویر میں۔ بچوں اور طالب علموں کے لیے بہترین تحفہ۔

۱۳۔ ہم ایک ہیں (عرش ملسیانی) قیمت ۱۰ روپے
ہندوستان کی ثقافتی وسماجی گوناگونی اور یک رنگی کا دلچسپ بیان۔ قومی زندگی کی توانائی کی داستان۔

۱۴۔ پھلوں اور سبزیوں کو محفوظ رکھنے کے طریقے قیمت دو روپے ۵۰ پیسے
گھریلو ضرورتوں کے جام جیلی، مارملیڈ، چٹنی مربے اور اچار وغیرہ بنانے کے متعدد طریقے تصویروں کے ذریعے بتلائے گئے ہیں جن سے بڑی آسانی سے آپ گھر بیٹھے اپنی من پسند چیزیں بنا سکتے ہیں۔

"آجکل" کے خریداروں کو ۲۰ فی صد رعایت۔ محصول ڈاک معاف [illegible]
دس روپے سے کم قیمت کی کتابیں بذریعہ وی۔ [illegible] یا وی۔ پی طلب کیجیے۔

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

Publ... [illegible]

آجکل

مارچ ۱۹۸۱ء

ایک روپیہ

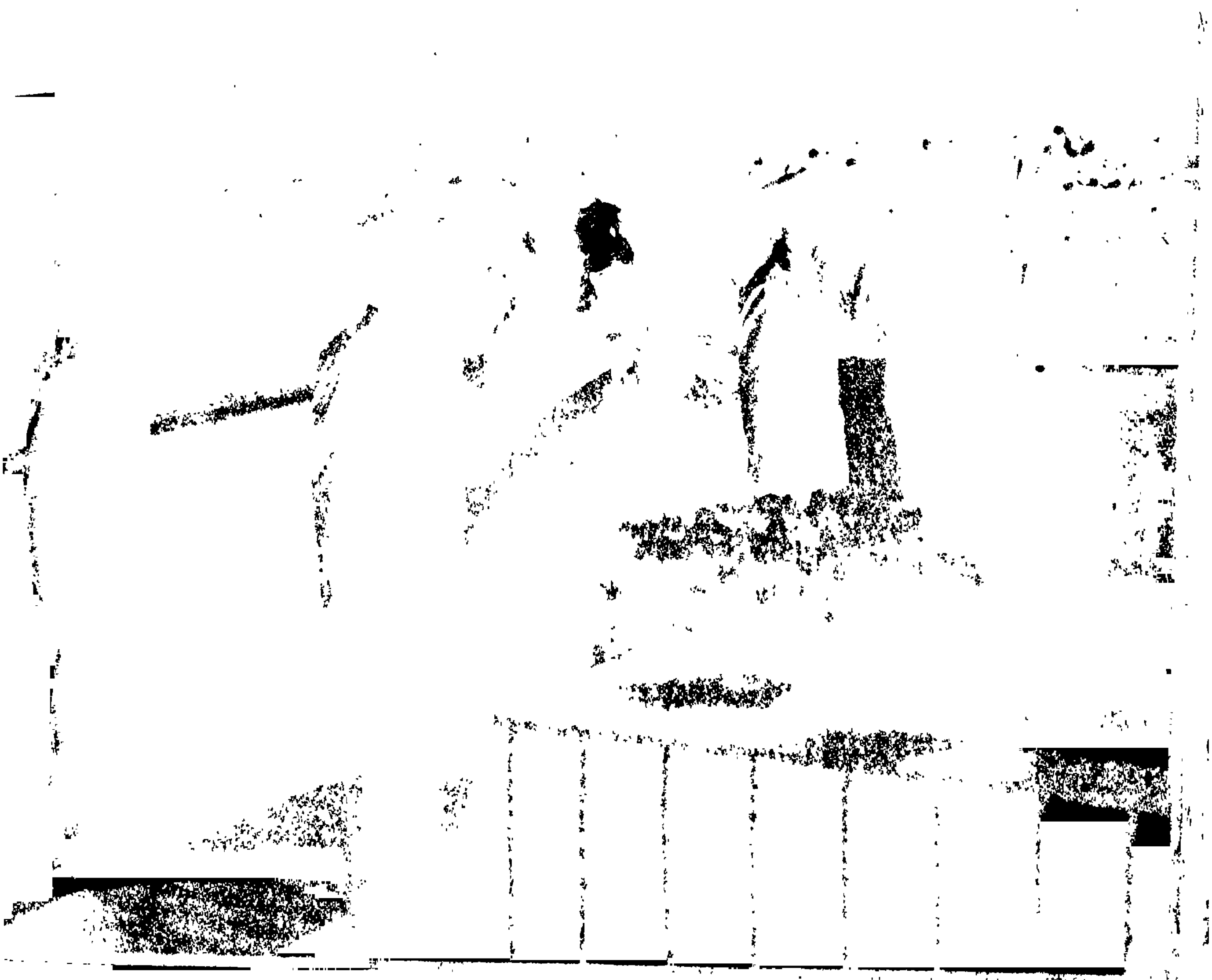

مہاتما گاندھی کو خراج عقید

DR. ZAKIR H... JAMIA ... NEW DELHI-11

اردو کا مقبول عام مصور ماہنامہ

آجکل (اردو)

نئی دہلی

ایڈیٹر
شہباز حسین

اسسٹنٹ ایڈیٹر
محمد عادل صدیقی

سب ایڈیٹر
شو ناتھ سکہ

جلد ۳۹ شمارہ ۸

مارچ ۱۹۸۱ء

پھاگن چیت شک سمت ۱۹۰۲

فون ۳۸۷۰۶۹

ترتیب

ملاحظات — ۲

عالمی ثقافت اور تہذیب میں اسلام کا حصہ — شریمتی اندرا گاندھی — ۳

ڈاکٹر انصاری۔ مونچھیں اور انگلیاں — خواجہ احمد عباس — ۵

غزلیں — غلام ربانی تاباں، فضا ابن فیضی — ۸

آمد اور آورد — ضیا فتح آبادی — ۹

حادثہ (کہانی) — ایم مبین — ۱۱

عود ہندی کا ایک پُراسرار اڈیشن — خلیق انجم — ۱۳

غزلیں — عروج زیدی، کاوش بدری، ظفر ادیب، طلحہ رضوی برق، مصور سبزواری — ۱۹

آٹھواں بین الاقوامی فلمی میلہ — پریم پال اشک — ۲۰

ڈاکٹر مختار احمد انصاری — جمیل احمد چشتی — ۲۶

پولیس اور عوام کا رشتہ — ڈی این کول — ۲۸

ہندی شاعری میں رومانیت — سرور ماہلی — ۳۲

صنعتی اہمیت کے کیڑے — مشتاق احمد — ۳۶

باغ مجر، بچو گارڈن (قطعات) — جاوید وششٹ — ۳۹

ڈاکٹر انصاری۔ ایک عظیم دیش بھگت — مہیش نارائن شرما — ۴۱

تبصرہ (نئی کتابیں) — ۴۳

اس شمارے کے ساتھ بچوں کا ضمیمہ پیش کیا جا رہا ہے جو بلا قیمت ہے

شرح چندہ

	ہندوستان	پاکستان	دیگر ممالک
سالانہ	۱۰ روپے	۱۶ روپے	۳ ڈالر ۵۰/۱ پونڈ
دوسالہ	۱۸ روپے	۲۸ روپے	۵/۳۰ ڈالر ۷۰/۲ پونڈ
سہ سالہ	۲۵ روپے	۳۸ روپے	۵۰/۷ ڈالر ۷۵/۳ پونڈ
فی کاپی	ایک روپیہ	۵۰/۱ روپیہ	۳۰ سینٹ ۱۵ پنی

ڈائرکٹر پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر آج کل اردو، پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترسیل زر کا پتہ
بزنس منیجر پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ملاحظات

ترقی اور خوشحالی کے لیے اقدامات

گذشتہ برس اگرچہ زبردست خشک سالی اور سیلاب کی تباہ کاریوں کی وجہ سے سخت مشکل حالات درپیش رہے لیکن اس کے باوجود متعدد اقدامات اور جرأت مندانہ فیصلوں کے ذریعے ملک کی اقتصادی حالت سدھارنے کی کوشش کی گئی۔ مثال کے طور پر مزید چھ تجارتی بنکوں کو قومی ملکیت میں لیا گیا اور اس طرح قومی ملکیت کے بنکوں کی تعداد بیس تک پہنچ گئی۔ اس عرصے میں بچتوں کی ہمت افزائی، سرمایہ کاری میں اضافے، پیداوار اور برآمدات بڑھانے کے لیے نئی پالیسیاں وضع کی گئیں۔ متوسط طبقے اور سماج کے غریب طبقوں کی بہبود اور راحت کے لیے بہت سے اقدامات کیے گئے۔ معیشت کے کلیدی اہمیت والے شعبوں مثلاً کوئلہ، بجلی اور ٹرانسپورٹ کی کارکردگی بہتر بنائی گئی اور ان کی پیداوار میں اضافہ ہوا۔

سرکاری ملازموں کے سماجی تحفظ کے لیے گروپ انشورنس اسکیم شروع کی گئی ہے، سلائی کی مشینوں، سائیکلوں، زندگی کے لیے ضروری دواؤں، عام استعمال میں آنے والے صابنوں، ٹوتھ پیسٹ، بجلی کے بلب نیز پریشر ککر وغیرہ پر ایکسائز محصول کم کر دیا گیا یا بالکل ہٹا دیا گیا۔ اس سال برآمدات کو بڑھانے کے لیے نئی نئی رعایتیں دی گئیں۔ ملک میں سرمایہ کاری بڑھانے اور بچتوں کو فروغ دینے کے لیے بھی متعدد اقدامات کیے گئے۔ ملک کی ترقی کے لیے صنعتی پیداوار کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے صنعتی پیداوار بڑھانے پر کافی زور دیا گیا۔ سرمایہ کاری کی حد میں اضافہ، صنعتی لائسنس کے اجرا کے طریق کار میں سہولت اور تیل کی کھوج کے لیے غیر ملکی کمپنیوں کے لیے رعایتیں اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ملک میں اسمگلنگ کی روک تھام اور ٹیکسوں کی چوری روکنے کے لیے متعدد اقدامات کیے گئے۔

ان اقدامات کے نتیجے میں ۱۹۸۱ء میں بہتر نتائج متوقع ہیں۔ اس سال زرعی پیداوار بہت اچھی ہے۔ توقع ہے کہ خریف کی پیداوار ۸ کروڑ ٹن ہوگی دالوں کی پیداوار بڑھانے کے لیے تحقیقی سرگرمیوں کو بڑھاوا دیا جا رہا ہے۔ بجلی اور کوئلے کی فراہمی کی صورت میں بہتر ہو جانے سے صنعتی پیداوار میں ترقی کے رجحانات ظاہر ہونے شروع ہو گئے ہیں۔

اگرچہ زرعی، اقتصادی اور صنعتی محاذ پر ہماری کامیابیاں قابلِ قدر ہیں پھر بھی ہمیں ان تھک محنت کی ضرورت ہے۔ عوام اور حکومت دونوں مل کر ہی ملک کو خوشحال بنا سکتے ہیں۔

دانش فرازی

اردو کے مشہور اور ممتاز شاعر دانش فرازی کی موت سے اردو ایک اچھے شاعر سے محروم ہو گئی ہے۔ جنوبی ہند کے جن شعرا نے ہندوستان گیر شہرت حاصل کی ان میں جناب دانش بھی ہیں۔ جنھوں نے اپنی پچاس سالہ ادبی زندگی گیسوئے اردو کو سنوارنے میں گزار دی۔

انجمن ترقی پسند مصنفین، تمل ناڈو اور مجلس مصنفین اردو تمل ناڈو کے صدر باگی عبدالقادر دانش فرازی (متوطن امبور، شمالی آرکاٹ) تقریباً ایک ہفتے سے اپنے عزیز کاوش بدری کے یہاں مدراس میں مقیم تھے کہ اچانک ۲۵ جنوری ۱۹۸۱ء کی شام کو دل کا دورہ پڑا اور وہ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

دانش فرازی کے شاگردوں میں تمل ناڈو اور کرناٹک کے متعدد مشاہیر شعرا شامل ہیں۔ موصوف کی چار منظوم تصانیف، رگِ سنگ نالہ فرات، آیات فطرت اور محسن اعظم منظر عام پر آ چکی ہیں۔ موصوف کی تازہ شعری تصنیف "خدنگ جستہ" زیر طبع ہے۔ ان کا کلام ہندوستان اور پاکستان کے مختلف رسائل میں بکھرا پڑا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ تمل ناڈو کے اردو دوست ان کے کلام کو یکجا کر کے جلد شائع کریں گے۔

مسعود اختر جمال

اردو کے ممتاز شاعر مسعود اختر جمال طویل علالت کے بعد ۲۵ جنوری ۱۹۸۱ء کی شب میں الٰہ آباد میں انتقال کر گئے۔

مسعود اختر ۱۹۱۵ء میں بنارس میں پیدا ہوئے اور ان کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۳۴ء سے ہوا جب کہ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم تھے۔ ان کا پہلا مجموعۂ کلام نورس ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا تھا اس کے بعد مندرجہ ذیل کتابیں اردو زبان ہماری (۱۹۵۳ء) جشنِ آزادی (۱۹۵۷ء) لالہ شاداب (۱۹۷۹) اور پیغمبرِ اسلام (۱۹۷۹ء) شائع ہوئیں۔ اپنی زندگی کے حالات "یادش بخیر" کے عنوان سے ترتیب دے رہے تھے۔ اپنا مجموعۂ کلام بھی مرتب کر رہے تھے۔ اور "کاروانِ آزادی" کا بڑا حصہ لکھا بھی جا چکا تھا، مگر افسوس موت نے مہلت نہ دی۔

اردو کے ان دو ممتاز شاعروں کی موت پر ادارہ ان کے پسماندگان سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔

اظہارِ تشکر

آج کل سے طویل وابستگی کے بعد اب آپ سے رخصت لے رہا ہوں۔ میں اپنے تمام قارئین اور قلمی معاونین کا شکر گزار ہوں جنھوں نے مجھ سے ہر موقع پر تعاون کیا اور آج کل کو ایک دلچسپ اور معیاری رسالہ بنانے میں میری مدد کی۔

شہید حسین

عالمی ثقافت اور تہذیب میں اسلام کا حصہ

بین الاقوامی سمینار میں وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کی افتتاحی تقریر

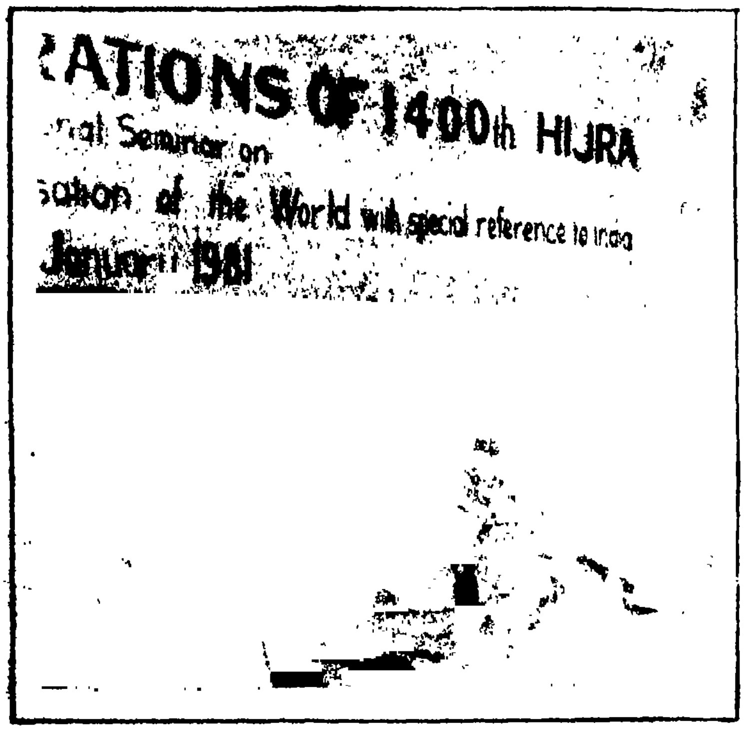

چودھویں صدی ہجری کی تقریبات کے سلسلے میں نئی دہلی میں ۲۸ سے ۳۰ جنوری تک ایک تین روزہ سمینار کا انعقاد کیا گیا تھا جس کا افتتاح وزیر اعظم ہند شریمتی اندرا گاندھی نے کیا تھا۔ سمینار کا موضوع تھا: "عالمی خصوصاً ہندوستانی ثقافت اور تہذیب میں اسلام کا حصّہ"۔ پہلے دن کے اجلاس کی صدارت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی نے کی۔

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے تمام مندوبین کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ مسلم آبادی کے لحاظ سے ہندوستان دنیا میں دوسرے نمبر کا سب سے بڑا ملک ہے۔ انھوں نے کہا کہ مسلم آبادی کی تعداد سے بڑھ کر اہم بات یہ ہے کہ مسلمانوں نے کئی صدیوں تک ہندوستانی زندگی میں اہم رول ادا کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اسلامی عناصر نے ہماری سرزمین کے دیگر عناصر کے ساتھ تعلق قائم کیا، انھیں متاثر کیا اور خود بھی ان سے متاثر ہوئے۔ یہ تعلق انسانی سرگرمیوں کے ہر شعبے مثلاً فلسفہ، روحانیت، ریاستی نظام، سماجی تنظیم، فن تعمیرات، موسیقی ادب، ریاضیات، طب، دست کاری اور ٹکنالوجی، خوراک، ملبوسات اور زبان وغیرہ میں رہا ہے۔

شریمتی گاندھی نے کہا کہ گذشتہ چودہ صدیوں کے دوران اسلام کے عروج کے بعد سے متعدد اسلامی محقق اور عالم ہندوستان آئے۔ نیز آج بھی دہلی اس قدیم تعلق کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ انھوں نے ہندوستان کی مخلوط ثقافت پر فخر محسوس کیا جس کے تانے بانے کئی عناصر سے مل کر بنے ہیں۔ لیکن ہر عنصر کا انفرادی کردار بھی قائم رہا ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ ہندوستان میں مسلم فاتح بھی آئے اور مسلم سلطنتیں بھی قائم ہوئیں، لیکن ان سے کئی صدی قبل اسلام ایک مذہب اور ثقافت کی حیثیت سے ہندوستان میں وارد ہو چکا تھا

نیز پیغمبر اسلام کی ولادت سے قبل ہی ہندوستان اور مغربی ایشیا کے عوام کے درمیان ثقافتی اور تجارتی تعلقات قائم تھے، چنانچہ جب اسلام نے عربوں کی زندگی اور ذہنیت کو بدل دیا تو اس تبدیلی کا اثر ہندوستان تک پہنچنے میں بھی دیر نہیں لگی۔

وزیر اعظم نے ہندوستان کی شہریت قبول کرنے والی یورپین خاتون مسز اینی بسینٹ کے الفاظ یاد دلائے جنھوں نے کہا تھا کہ اسلام نے آٹھویں صدی سے ۱۴ ویں صدی تک علم کی مشعل روشن رکھی۔ مسلمان جہاں کہیں گئے اپنے ساتھ علم لے گئے۔ انھوں نے فتوحات ضرور کیں لیکن مقبوضہ ممالک میں اسکولوں اور یونیورسٹیوں کی بنیاد رکھی۔ مصر، بغداد اور قرطبہ کی یونیورسٹیوں کو اسلام کے زیر سایہ فروغ حاصل ہوا۔ یوروپی عیسائی مسلمانوں سے سائنس سیکھنے گئے، جسے وہ بھول چکے تھے۔ مسلمانوں نے ہندوؤں اور یونانیوں سے علم ریاضیات حاصل کیا۔ دوسری ڈگری کی مساوات دریافت کیں، ستاروں کا مشاہدہ کیا۔ اور زمین کی زیادہ درست پیمائش کی۔ انھوں نے دنیا کو نئے طرز کا فن تعمیر، فن موسیقی، سائنسی زراعت اور صنعت کاری عطا کی۔ نیز انھیں نئی بلندیوں پر پہنچایا۔ یہی نہیں بلکہ فلسفہ میں ان کی حیثیت اعلیٰ ترین ہے۔

وزیر اعظم نے پیغمبر اسلام کی غیر معمولی ذہانت، عظمت اور تدبر کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے ہر شخص کو ایک قانون اور ایک سیدھا راستہ عطا کیا۔

وزیر اعظم شریمتی گاندھی نے کہا کہ پیغمبر اسلام سے زیادہ ذہین کون شخص ہو سکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اسلام نے علم، کوشش اور فرض شناسی پر زور دے کر عالمی تبدیلی، جمہوری برادرانہ قدروں کی تشکیل مردوں اور عورتوں میں مساوات نیز لاتعداد قبیلوں اور فرقوں میں انسانی یک جہتی کا جذبہ پیدا کرنے میں اہم رول ادا کیا۔

تامل ناڈو کے رودتان اور لبے مسلم فرقے اس بات کا ثبوت ہیں کہ اسلام کس قدر جلد ہندوستان میں آگیا تھا۔ تروچراپلی میں ناتھیر ولی کا مقبرہ ۱۰۳۹ء کا ہے۔ مدورائی کے نزدیک حضرت علی یار شاہ صاحب کی درگاہ کے آثار اس سے بھی پہلے کے ہیں۔ اجمیر کے خواجہ معین الدین چشتی کا نام اتنا مشہور و معروف ہے کہ ان کے بارے میں بتانے کی ضرورت نہیں۔ ان سب سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی سلطنتوں سے قبل ہندوستان کے ساتھ اسلام کا رابطہ قائم ہو چکا تھا۔

شریمتی گاندھی نے کہا کہ اسلامی فلسفہ اور قدیم ہندوستانی فلسفہ کے امتزاج سے صوفی ازم اور بھکتی تحریک کا وجود ہوا۔ ان دو عظیم ثقافتوں کی تحقیق کے دوران خدا کے کئی القاب کا توجہ کے ساتھ مطالعہ کیا گیا۔ قرآن شریف میں تحریر ہے کہ خدا زمین اور آسمان کی ہر شے سے بلند ہے اور صوفی اپنے تجربہ میں اس اصول کو اپنانا چاہتے ہیں۔ جنوبی وشنو مذہب کا نظریہ بھی اسی سے ملتا جلتا ہے۔ جس طرح قرآن شریف میں خدا کے بہت سے نام دیئے گئے ہیں۔ اسی طرح مہا بھارت میں بھی کوروؤں کے بزرگ بھیشم پتاما نے خدا کے ایک ہزار نام بتائے ہیں۔ قرآن کریم کے مطابق پوری دنیا خدا ہی کی ایک تجلی ہے اور اتھرووید میں بھی دنیا کی تخلیق کو خدا کا کارنامہ کہا گیا ہے۔ صوفی نظریہ کا کافی جھکاؤ توکل (یعنی خدا پر بھروسہ) کی طرف ہے، ہندوستانی فلسفہ میں اسی طرح "پراپتی" کا لفظ ہے رامانج کی "بھکتی" کا صوفی مذہب کے ساتھ امتزاج کبیر کے یہاں اپنی انتہا کو پہنچ گیا، جو رام رحیم اور کرشن، کریم کی مدح کرتے تھے۔ یہی بات گورونانک کے ہاں بھی ہے۔

شریمتی گاندھی نے کہا کہ ان دونوں نظریات کے میل جول سے کئی اصلاحات وجود میں آئیں اور عوام کو کافی راحت ملی۔ انھوں نے اپنے والد جواہر لال نہرو کی کتاب، "ڈسکوری آف انڈیا" کا یہ اقتباس دہرایا۔

"ہندو مذہب نے نئے نظریات کا اثر قبول کیا۔ مسلم تصوف اور صوفی نظریات کا آغاز غالباً نئے فلاطونی نظریات کے آغاز کے وقت ہوا۔ اسلام کے بھائی چارے کے نظریے نے کافی گہرا اثر ڈالا اور مذہبی امتزاج کی کئی تحریکیں ابھریں۔ ہر شخص ان میں سے کسی بھی نظریہ کو یا عبادت کے کسی اور سادہ طریقہ کو منتخب کر سکتا ہے۔ کوئی شخص وشنو مذہب کا عقیدت مند ہو سکتا ہے اور "سگن ایشور" کو مان سکتا ہے یا کوئی شخص اگر فلسفہ کی طرف زیادہ مائل ہو تو مابعد الطبعیات جیسے بلند فلسفے میں غوطے لگا سکتا ہے"۔

وزیر اعظم نے کہا کہ ہندو مسلم تعاون سے ادب، فلسفہ اور فنون وغیرہ میں اہم کارنامے انجام دیئے گئے۔ امیر خسرو نے اپنی تخلیق نہ سپہر میں ہندوستانیوں کی طرف سے "پنج تنتر" کی تخلیق کا ذکر کیا ہے۔ یہ کہانیوں کا لازوال مجموعہ ہے جس کا فارسی، ترکی، عربی اور دوسری زبانوں میں ترجمہ ہوا ہے۔ یہ عربی کی کتاب "کلیلہ دمنہ" کی طرح مشہور ہے۔ پروفیسر مجیب نے لکھا ہے کہ داراشکوہ نے اپنشد کا ترجمہ محض ادبی تخلیق کے جذبہ کی تسکین کے لیے نہیں بلکہ حق کی جستجو کے لیے بھی کیا۔ انھوں نے اپنشد میں " دو سمندروں کا امتزاج " محسوس کیا ہوگا۔

شریمتی گاندھی نے کہا کہ امرتسر کے مشہور سکھ ہری مندر، برنداون کے گورو گووند دیو مندر اور مدورائی میں تروملائی نائک محل وغیرہ پر فن تعمیرات کا اثر ہے۔ اجنتا کے فن میں بھی سمرقند اور ہرات کا طرز ملتا ہے اسی طرح مسلم معماروں نے بھی ہندو اور بودھ عمارتوں کا طرز اپنایا۔

وزیر اعظم نے کہا کہ اسلام کو ہمیشہ ہم نے اپنے ملک کے مذاہب میں سے ایک مانا ہے اور یہ ہندوستان میں پھلتا پھولتا رہے گا۔ نیز ہندوستان کے مسلمان ہماری قومی زندگی، سیاست، پیداواری کوشش

(بقیہ ص ۱۵ پر)

خواجہ احمد عباس

ڈاکٹر انصاری

مونچھیں اور انگلیاں

پہلی چیز جو ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی شخصیت میں ممتاز نظر آتی تھی وہ نہ ان کی خوبصورت سلی ہوئی شیروانی تھی نہ ان کا چست چوڑی دار پاجامہ تھا۔ نہ ان کا قرینے سے سجا ہوا مکان تھا۔ نہ اس کی دیواروں پر لٹکی ہوئی تصویریں ہی تھیں۔ جن میں ڈاکٹر انصاری مختلف قومی لیڈروں کے ساتھ نظر آتے تھے۔ مہاتما گاندھی، موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو، علی برادران۔ ایک پرانی تصویر میں وہ نوجوانی کے عالم میں ملٹری یونیفارم پہنے ہوئے ترکی کے نوجوان انقلابیوں کے ساتھ دکھائی دیتے تھے۔ غرض یہ کہ تصویریں ڈاکٹر انصاری کی کہانی بتاتی تھیں۔ کس طرح یہ ڈاکٹر نوجوانی کے زمانے میں ترکی میڈیکل مشن لے کر گیا، کس طرح پہلے تحریک خلافت سے وابستہ رہا۔ اور بعد میں کانگریس اور قومی تحریک کا ایک مستحکم ستون بن گیا۔

یہ تو تھا سیاسی پس منظر ڈاکٹر انصاری کی شخصیت کا۔

مگر ان کی شخصیت کی سب سے زیادہ بارعب اور پر اثر چیز جو تھی وہ ان کی مونچھیں تھیں۔ جو بڑی بڑی تھیں۔ کھچڑی رنگت کی تھیں۔ اور جن کے کناروں کو مروڑ کر بارعب بنا دیا گیا تھا۔

ان مونچھوں کے نیچے ایک سنجیدہ مسکراہٹ ان کے چہرے پر کھیل رہی تھی اور ان کے پیچھے ایک سنجیدہ چہرہ تھا۔ گورا چٹا۔ بس اتنا ہی یاد ہے مجھے۔ اتنے سال گزر جانے کے بعد۔ اس وقت جب میرے ابا مجھے ڈاکٹر انصاری کو دکھانے لے گئے تھے۔ میری عمر کوئی گیارہ بارہ برس کی تھی۔ اس لیے تفصیلات تو اب یاد نہیں مگر مونچھیں اور دیوار پر لگی ہوئی تصویریں اب بھی یاد ہیں۔

ان کے علاوہ ایک اور ان کی خصوصیت یاد ہے۔ وہ تھیں ان کی نرم و نازک انگلیاں جن کی مدد سے انھوں نے میری نبض پر ہاتھ رکھ کر دیکھا تھا۔ انگلیاں رکھتے ہی جیسے میری بیماری کھینچ لی ہو انھوں نے۔ کیا جادو تھا ان انگلیوں میں۔ اس زمانے میں بھی نزلے زکام کھانسی کا شکار رہا کرتا تھا۔ میرا قد بھی چھوٹا تھا۔ دبلا پتلا بھی بہت تھا۔ ڈاکٹر انصاری نے میری نبض پر ہاتھ رکھ کر مجھ سے پوچھا۔ "کیوں بیٹا عمر کیا ہے تمھاری ——؟"

میں نے جواب دیا —— "بارہ برس کا ہوں"

"لڑکا لگتا تو آٹھ نو برس کا ہے" —— ابا سے مخاطب ہو کر ڈاکٹر انصاری نے کہا —— اور پھر ان سے پوچھا "کیا اس کو کھانے کو کافی نہیں دیتے ہو؟"

میرے ابا نے کہا —— "اس کی ماں کو بہت کچھ اس کو کھانے کو دیتی ہے۔ مگر یہ کھاتا ہی نہیں"

"بہت بری بات ہے" ڈاکٹر انصاری نے مجھ سے کہا —— "کھاؤ گے نہیں تو صحت مند کیسے بنو گے؟ بڑے ہو کر قوم کا کام کیا کرو گے؟ روز دو گلاس دودھ پیا کرو۔ اور صبح سویرے ایک کچا انڈا دودھ میں ڈال کر پی لیا کرو"

پھر انھوں نے نسخہ لکھا اور ابا کو تھما دیا۔ اس کے بعد مجھ سے "جاؤ برآمدے میں کھیلو۔ میں تمھارے ابا سے قوم کی بیماریوں کے بارے میں باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

میں وہاں سے اٹھ کر برآمدے میں چلا آیا۔ اور وہاں بھی دیوار پر لگی تصویریں دیکھتا رہا۔ کسی تصویر میں گاندھی جی سامنے والے لان پر دھوپ میں بیٹھے چرخہ کاتتے دکھائی دے رہے تھے۔ کسی تصویر میں انصاری اور جواہر لال نہرو معروف گفتگو تھے۔ ایک تصویر میں مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کے بیچ میں ڈاکٹر انصاری بیٹھے نظر آ رہے تھے۔ اور میں ڈاکٹر انصاری کی غیر معمولی شخصیت کے بارے میں سوچتا رہا کہ بڑا ڈاکٹر ہے یا بڑا آدمی ہے؟ اس کی انگلیوں میں کیا جادو ہے کہ کلائی پکڑتے ہی مریض اپنی بیماری، اپنا سب دکھ درد بھول جاتا ہے، کھانسی آتی کم ہو جاتی ہے، زکام بہنا بند ہو جاتا ہے۔ مریض کا جی چاہتا ہے کہ سینہ تان کر صحت مندوں کی طرح چلے۔

مختار احمد انصاری ۱۸۸۰ء میں غازی پور کے ایک متمول زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ خاندان نہ صرف امیر تھا بلکہ شائستہ اور تعلیم یافتہ بھی تھا۔ اُن دنوں نئی تعلیم کا چرچا تھا جب انصاری کے والد نے بیٹے کو انگریزی پڑھوائی۔ پھر انگلستان بھیجا۔ خیال تھا کہ بیٹا آئی سی ایس میں بیٹھے گا۔ واپس آکر سرکار کا بڑا افسر بنے گا۔ مگر مختار احمد نے میڈیکل لائن پسند کی۔ اور وہاں اڈنبرا میں میڈیکل کالج میں داخل ہو گئے۔ لڑکا ذہین تھا۔ اس لیے سب کلاسوں میں فرسٹ سیکنڈ آتا رہا۔ یہاں تک کہ اعلیٰ میڈیکل تعلیم حاصل کر کے پورا ڈاکٹر بن گیا۔ پھر کئی سال لندن کے ایک ہسپتال میں ڈاکٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ ان ہی دنوں میں پنڈت موتی لال نہرو انگلستان گئے تھے اور ساتھ میں ان کا لڑکا جواہر لال نہرو بھی تھا جسے انگریزی اسکول میں داخل کرانا تھا۔ انصاری موتی لال سے عمر میں کم تھے اور جواہر لال نہرو سے آٹھ برس بڑے تھے۔ لیکن ان کی دوستی باپ بیٹے دونوں سے ہو گئی۔

جواہر لال نہرو ان الفاظ میں مختار احمد انصاری سے اپنی پہلی ملاقات کا ذکر اپنی "آپ بیتی" میں لکھتے ہیں —

"مجھے یاد ہے کہ لندن پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد ہم ڈاکٹر مختار احمد انصاری سے ملے تھے، جو اس وقت کے ایک سمارٹ اور بہت ہی قابل نوجوان ڈاکٹر تھے جنھوں نے اپنی قابلیت کے جھنڈے میڈیکل کالج میں گاڑ دیئے تھے۔ اب وہ لندن کے ایک ہسپتال میں ہاؤس سرجن کا کام کر رہے تھے۔"

(اس وقت جواہر لال نہرو کی عمر کوئی پندرہ سال کی تھی اور ڈاکٹر انصاری تئیس یا چوبیس برس کے تھے۔

عمر میں فرق ہونے کے باوجود جواہر لال نہرو اور ڈاکٹر انصاری کی لندن ہی میں دوستی ہو گئی۔ اور یہ دوستی ہندوستان آکر اور بھی گہری ہو گئی کیونکہ اس میں ذاتی جذبات کے ساتھ سیاسی لگن اور دیش بھگتی کا احساس بھی شامل ہو گیا۔

ہندوستان واپس آکر ڈاکٹر انصاری پہلے خلافت کانفرنس میں شریک ہو گئے اور ترکی جو میڈیکل مشن ترکی کے انقلابیوں کی امداد کے لیے بھیجا گیا تھا اس کی قیادت کی۔ ترکی سے جب واپس آئے تو ان کے خیالات اور نظریات بدل گئے تھے۔ اب وہ بھی ترک انقلابیوں کی طرح قوم پرستی میں اعتماد رکھتے تھے۔ اسی عرصے میں اُن کے نوجوان دوست جواہر لال نہرو انگلستان سے واپس آئے۔

دونوں کانگریس میں شریک ہو گئے۔ دونوں مہاتما گاندھی کی انقلابی سیاست کو دوسروں کی قانون دانی سے بہتر سمجھتے تھے۔ ۱۹۲۳ء میں جب سی آر داس نے کانگریس پارٹی کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا تو ایک بیچ کی ٹولی اُبھری جس میں انصاری اور جواہر لال نہرو دونوں شامل تھے۔ ڈاکٹر انصاری کانگریس کے پریذیڈنٹ چنے گئے۔ اور انھوں نے سکریٹری کی حیثیت سے جواہر لال نہرو کو چن لیا۔ جواہر لال نہرو کو اُس زمانے میں کانگریس سے چند سیاسی اختلافات تھے۔ لیکن ڈاکٹر انصاری کے کہنے کو وہ نہ ٹال سکے۔ اور سکریٹری ہونا انھوں نے منظور کر لیا۔ اسی سال حکیم اجمل خاں جو ایک قومی لیڈر ہونے کے علاوہ موتی لال نہرو کے بہت قریبی دوست اور ساتھی تھے انتقال فرما گئے۔ حکیم اجمل خاں کو کانگریس اور قومی تحریک میں لانے والے بھی ڈاکٹر انصاری ہی تھے۔

بعد میں جب میرٹھ کانسپیریسی کیس کمیونسٹوں کے خلاف چل رہا تھا تو جواہر لال نہرو نے کانگریس کے اکثر لیڈروں سے منوا لیا کہ ان کی قانونی مدد کرنے کے لیے جو ڈیفنس کمیٹی بنائی گئی ہے اس کے ممبر ہو جائیں۔ ہونے کو تو ممبر ہو گئے مگر اصل میں یہ دائیں بازو کے لوگ تھے جو کمیونسٹوں سے گھبراتے بھی تھے اور سیاسی تعصب بھی برتتے تھے۔ مگر ڈاکٹر انصاری اور جواہر لال نہرو اس کمیٹی کے ممبر آخر تک رہے۔ اور نہ صرف روپے سے بلکہ قانونی مشوروں سے بھی میرٹھ کے کمیونسٹوں کو امداد پہنچاتے رہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ ذاتی خیالات کچھ بھی ہوں مگر جواہر لال نہرو کے کہنے پر ڈاکٹر انصاری کو کمیونسٹوں کی طرفداری کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ جواہر لال کی طرح ہی وہ بھی سیکولرزم اور سوشلزم میں اعتقاد رکھتے تھے۔ اور سب ہی ترقی پسند تحریکوں کا ساتھ دیتے تھے۔

پنڈت موتی لال جب آخری بار بیمار پڑے تو انھوں نے اپنے پُرانے دوست انصاری کو یاد کیا۔ اور کہا "میں اپنی جان تمھارے حوالے کر رہا ہوں" افسوس کہ ڈاکٹر انصاری جیسا مشہور اور کامیاب ڈاکٹر بھی اپنے بزرگ دوست کو نہ بچا سکا۔ اور پنڈت موتی لال نہرو نے ان کی موجودگی ہی میں اپنا آخری سانس لیا۔ اب انصاری کا کام جواہر لال نہرو کو دلاسا دینا اور تعزیت دینا تھا۔ پہلے تو انھوں نے جواہر لال نہرو کو سیلون روانہ کر دیا تاکہ تبدیل آب و ہوا باپ کے غم کو کم کرنے میں مدد دے گی۔ اس کے بعد جب جواہر لال واپس آئے تو ہمیشہ دہلی میں انھیں کے پاس ہی رہتے۔ اور انصاری ہمیشہ انھیں اپنے پاس ہی رکھتے۔ اور بڑے بھائی اور باپ کے مشترکہ فرائض ادا کرتے۔

در اصل ڈاکٹر انصاری کا مکان تو سب کانگریس لیڈروں کا کیمپ ہی لگتا تھا۔ مسز سروجنی نائیڈو نے انصاری کو بھائی بنایا ہوا تھا۔ جب کبھی گاندھی جی کے ساتھ ان کے نمونے پر چلنے والے "چھوٹے مہاتما" بھی انصاری کے یہاں ٹھہرتے تھے تو باورچی خانے میں عجیب عجیب قسم کے مسئلے پیدا ہو جاتے تھے۔

گاندھی جی صرف بکری کا دودھ پیتے تھے۔
کوئی دوسرا لیڈر گائے کا کچا دودھ پیتا تھا۔
کوئی صرف دہی کھاتا تھا۔

کوئی کیر کھاتا تھا۔

کوئی صرف پھلوں پر گزارا کرتا تھا۔

اور کوئی سنترے ہی کھاتا تھا ــــ خواہ ان کا موسم ہو یا نہ ہو۔ سنترے کہیں نہ کہیں سے انصاری کو منگانے پڑتے تھے۔

ڈاکٹر انصاری اتنے بڑے مہمان نواز تھے کہ ان سب فرمائشوں کے ہوتے ہوئے بھی کبھی ان کے ماتھے پر شکن نہ پڑتی۔ جو جس کو چاہئے اس کو ضرور ملتا تھا۔

مگر مسز نائیڈو کی زبان کب رکنے والی تھی۔ وہ اکثر کہتیں "یہ چھوٹے مہاتما میرے بھائی انصاری کو اپنی فرمائشوں سے پاگل بنا دیں گے۔ کوئی یہ مانگتا ہے کوئی وہ مانگتا ہے"۔ ڈاکٹر انصاری خود جواہر لال نہرو اور مسز نائیڈو کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ کیونکہ ان دونوں کو جو کھانا مل جاتا تھا کھا لیتے تھے، کوئی خاص فرمائش نہیں کرتے تھے۔

یہ ماحول تھا جب گاندھی جی نے نمبر ۱ دریا گنج سے وائسرائے لارڈ ارون کے ساتھ بات چیت کی۔ اور خط و کتابت بھی ان کے درمیان ہوئی۔ سب کانگریس لیڈر نئے نئے جیل سے چھوٹے تھے۔ لارڈ ارون اور مہاتما گاندھی کے درمیان سر تیج بہادر سپرو اور مسٹر جیکر ثالث کے طور پر بیچ میں پڑے تھے اور یہ دونوں بھی ڈاکٹر انصاری کے یہاں گاندھی جی سے ملتے تھے۔ کبھی چائے وہاں پیتے، کبھی ناشتہ کرتے، کبھی کھانا بھی کھا لیتے۔ ایسا لگتا کہ ڈاکٹر انصاری کے ہاں ایک بارات ٹھہری ہے اور لڑکی کی شادی ہو رہی ہے۔

دلہن آزادی تھی۔

اور یہ سب اس کے براتی تھے۔

اور سب کے سب ڈاکٹر انصاری کے مکان یعنی نمبر ۱ دریا گنج میں جمنا کے کنارے ٹھہرے ہوئے تھے۔ جواہر لال نہرو نے اس مکان اور اس موقع کا تفصیلی ذکر اپنی آپ بیتی میں لکھا ہے۔

یہ آخری ہنگامہ تھا جو ڈاکٹر انصاری کے مکان پر ہوا۔

اس کے بعد ہندوستان کی سیاست نے ایک اور پلٹا کھایا۔ پہلی سول ڈس اوبیڈینس کی جگہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کا ڈرامہ ہوا جہاں گاندھی جی ہندوستان کی قومی تحریک کے واحد نمائندے تھے۔ مگر راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کو فیل ہونا تھا اور وہ ہوئی۔ کیونکہ گول میزیں کبھی آزادی تھوڑا ہی دیتی ہیں۔ یہی خیال پنڈت جواہر لال نہرو کا اور ان کے دوست ڈاکٹر انصاری کا بھی تھا۔ مگر گاندھی جی "دشمن" کو ایک موقع دینا چاہتے تھے کہ اگر انگریزی حکومت سچی اور SINCERE ہے تو وہ ثابت کرے اور ہندوستانی قومی تحریک کی مانگوں کو مان لے۔ غرض جب گاندھی جی واپس آئے تو ڈاکٹر انصاری نے انہیں اطلاع دی کہ گورنمنٹ نئے آرڈیننس کی مدد سے قومی تحریک کو کچلنے کے منصوبے بنا رہی ہے۔ ایک بار پھر سول ڈس اوبیڈینس تحریک شروع ہوئی اور گاندھی جی، جواہر لال نہرو اور ڈاکٹر انصاری اور سب کانگریس کے لیڈر قید کر لیے گئے۔

ڈاکٹر انصاری کانگریس کے ممتاز لیڈروں میں سے ایک تھے۔

وہ سچے قوم پرست اور آزادی کے متوالے تھے۔

جیل خانے سے وہ گھبراتے نہیں تھے بلکہ جیل خانے کو اپنا گھر ہی سمجھتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ جیل میں رہتے ہوئے بھی ان کو اپنے مریضوں کی فکر رہتی تھی۔ ان مریضوں میں کانگریس کے لیڈر شریک تھے اور خصوصاً مہاتما گاندھی کی صحت کا وہ خاص خیال رکھتے تھے۔ اگرچہ گاندھی جی انگریزی دوائیاں نہیں استعمال کرتے تھے۔ مگر انصاری ان کا معائنہ کرتے رہتے تھے تاکہ حالت کا اندازہ ہو سکے اور بعد میں گاندھی جی اپنی NATURE CURE ان کی نگرانی میں کرتے رہتے تھے۔

ڈاکٹر انصاری بڑے ڈاکٹر تھے۔

وہ چاہتے تو کروڑوں روپے کما سکتے تھے۔ کیونکہ ان کے پاس راجہ مہاراجہ، کروڑ پتی، بزنس مین، سب ہی آتے تھے مگر وہ مشکل سے آٹھ دس دن مہینے میں اپنی پریکٹس کر سکتے تھے۔ باقی سب وقت جیل یا کانگریس کے کاموں میں صرف ہوتا تھا۔

وہ مریض انسانوں کے بجائے اپنی مریض قوم کے ڈاکٹر بن گئے۔

وہ ایک اچھے مسلمان تھے۔

وہ ایک بہت بڑے ہندوستانی قوم پرست تھے۔

وہ ایک ترقی پسند انسان تھے۔

وہ مہمان نواز دوست تھے اور سب دوستوں کو عزیز رکھتے تھے۔

وہ اپنے دوستوں میں ــــ اپنے سیاسی ساتھیوں میں ــــ اپنے مریضوں میں ہندو اور مسلمان کا بھید بھاؤ نہیں رکھتے تھے۔

جب ان کا انتقال ہوا تو ان کا سوگ دہلی کے بڑے چھوٹے ہندو اور مسلمان نے منایا۔ سارے ہندوستان میں صفِ ماتم بچھ گئی، اس لیے کہ ان کے دوست اور ان کے مریض ہندوستان کے ہر کونے میں تھے۔ ہر فرقے اور ہر دھرم کو ماننے والوں میں تھے۔ مہاتما گاندھی نے ایک خاص ایڈیٹوریل اپنے "ہریجن" میں ڈاکٹر انصاری کے انتقال پر لکھا۔ جواہر لال نے اپنے دکھ کا اظہار اپنے بیان میں کیا کیونکہ ان کی دوستی تو سب سے پرانی تھی۔ اب دہلی کا سیاسی مرکز درہم برہم ہو گیا۔

ڈاکٹر انصاری چلے گئے۔

ہندوستان سے رسم مہمان نوازی رخصت ہو گئی۔

سروجنی نائیڈو کا بھائی نہ رہا۔

جواہر لال نہرو کا پرانا دوست روٹھ کر چلا گیا۔

مہاتما گاندھی کا رفیق، ان کا رازداں، ان کا معالج، ان کا محافظ چلا گیا۔

قوم بیمار تھی۔ مگر قوم کا ڈاکٹر نہ رہا۔

●●

دو غزلیں

غلام ربانی تاباں

دیدۂ ویراں کی خوابوں سے شناسائی بھی ہے
لمحہ لمحہ روشنی کھوئی بھی ہے پائی بھی ہے

بسکہ یک گونہ نشاط نارسائی جانیے
انجمن میں ہوں مگر احساس تنہائی بھی ہے

دلکشی ایسی کہ محو آرزو ہو جایئے
غم کی رسم عام میں اک شانِ یکتائی بھی ہے

چارہ فرماؤں سے کیا عرضِ جراحت کیجئے
خارزاروں میں علاج آبلہ پائی بھی ہے

مشورہ دل کا ہے ہر تہمت گوارا کیجئے
ورنہ ہونٹوں کو ابھی یارائے گویائی بھی ہے

کیوں اکیلا جان کر تاباںؔ ترس کھاتے ہیں لوگ
میں کہیں جاؤں میرے ہمراہ رسوائی بھی ہے

فضا ابن فیضی

اصل جو روپ ہے، کب تم نے وہ دیکھا ہے میاں
میرے چہرے پہ کسی اور کا چہرا ہے میاں

زندگی اس کی سرابوں کا تماشا ہے میاں
آدمی اپنے ہی احساس کا صحرا ہے میاں

ورق آشوب و حوادث کے الٹ کر دیکھو!
ہم نے خود کو اسی قرطاس پہ لکھا ہے میاں

تشنگی صدیوں پھری اور اسے طے کر نہ سکی
از قدح تا بہ سبو، فاصلہ کتنا ہے میاں

سینہ ٹھنڈا ہے، تو روشن کرو زخموں کے الاؤ
سرد موسم تو اسی طرح گزرتا ہے میاں

غسل خوں کر لو، جو ہے ہم سخنی کا دعویٰ
وہ بھی بس ایک ہی چبھتا ہوا فقرہ ہے میاں

ہے یہ وہ فتنۂ سرکش کہ دبائے نہ بنے
جذبہ سچا ہو تو اندر سے ابھرتا ہے میاں

اس طرح کیا کوئی ریشم کی تہیں کھولے گا
کس سلیقے سے مجھے وقت نے برتا ہے میاں

کوئی مطلب نہ ہو جن کا وہی جملے لکھو
یہی اس دور کی جدت کا تقاضا ہے میاں

ہم ہتھیلی پہ اگا لیتے ہیں تازہ فصلیں
کن جبینوں پہ ریاضت کا پسینا ہے میاں

اب چلو خود ہی جراحت بھی سنبھالو ان کی
جان کر پھول، مجھے شاخ سے توڑا ہے میاں

کس نے ترتیب دیا تھا یہ مقدر کا نصاب
جو مجھے مل سکا، وہ مرا حصا ہے میاں

چوٹ کھائے ہوئے آہو ہیں کہ غزلیں میری
میں نے یوں دور کو لفظوں میں سمیٹا ہے میاں

اپنے ہونٹوں پہ سجا لو مرے دل کی دھڑکن
یہی اسلوب سخن سب سے اچھوتا ہے میاں

بن چکا ہے مری تقدیر قلم کا آزار
جانتا ہوں، ثمر اس نخل کا کڑوا ہے میاں

یہ کتابیں تو بصیرت کا ہیں حرف آغاز
ادھر آؤ! کہ ابھی چہروں کو پڑھنا ہے میاں

سر سے پا تک ہے فضاؔ لفظ و معانی کا طلسم
یہ نہ سمجھو کہ یہ صفحہ ابھی سادا ہے میاں

ضیا فتح آبادی

آمد اور آورد

آمد اور آورد کے سلسلے میں حالی پانی پتی نے بڑے پتے کی بات کہی ہے۔ ان کے خیال کے مطابق آمد اس کو نہیں کہتے کہ کوئی شعر ہوگیا اور بس ہوگیا بلکہ شعر وہ ہے جس پر کافی محنت کی جاتی ہے۔ لیکن اس محنت کا کوئی نشان اس شعر میں نظر نہیں آتا۔ اکثر و بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ خیال کی ترسیل کے جو الفاظ فوری طور پر ذہن میں آتے ہیں وہ مکمل طور پر مناسب و موزوں نہیں ہوتے۔ چنانچہ مناسب و موزوں الفاظ کو تلاش کرنا پڑتا ہے اور جب یہ تلاش کامیاب ہوجاتی ہے تو آمد و آورد میں کوئی فاصلہ باقی نہیں رہتا۔ آتش نے بھی تو کہا ہے کہ ؎

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

ایک مرتبہ جب جوش ملیح آبادی ہندوستان تشریف لائے تو دورانِ گفتگو انھوں نے راقم السطور کو بتایا کہ وہ ان دنوں اپنے غیر مطبوعہ کلام کو اکٹھا کرنے اور ترتیب دینے کی غرض سے خود ہی نقل کر رہے تھے۔ اور نقل کرتے ہوئے جا بجا صرف الفاظ ہی نہیں بلکہ مصرعے تک بدلتے جاتے تھے۔ اس ضمن میں جو خاص بات انھوں نے کہی وہ یہ تھی کہ ہر ادیب و فنکار ایک خاص عمر کو پہنچ کر اپنے عیوب کو سمجھنے کے قابل ہوجاتا ہے مگر افسوس ہے کہ ایسا اس وقت ہوتا ہے جب اس کو اتنی مہلت نہیں دی جاتی کہ وہ ان عیوب کو دور کرسکے۔ جوش نے کتنی عظیم سچائی کی نشاندہی کی ہے وہی جان سکتے ہیں۔ جو اس مرحلے سے گزر چکے یا گزر رہے ہیں۔ اور جو "مستند ہے میرا فرمایا ہوا" کے پھیر میں نہیں پڑتے۔ اور جن میں ترقی کرنے کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ یہ مہلت کا عدم وجود ہی ہے جس کی وجہ سے اساتذہ کے یہاں ادبی و فنی فروگذاشتیں اہلِ نظر کو کھٹکتی ہیں۔ حالانکہ نہ تو ان فروگذاشتوں سے فنکار کی شخصیت پہ اور نہ ہی ان کے فن پر ناخوشگوار اثر پڑتا ہے۔ "اقبال کی خامیاں" لکھ کر جوش ملسیانی نے ایک بڑا کارنامہ کیا لیکن اس کے مطالعہ کے بعد بھی اقبال کی بزرگی اور عظمت میں کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی۔ "قاطع قاطع" سے غالب مغلوب نہ ہوسکا۔ اور سیماب اکبرآبادی کے خلاف ایک زبردست متحدہ محاذ قائم ہونے کے باوجود وہ سیماب ہی رہا۔

یہ درست ہے کہ ہر ادیب مجتہد نہیں ہوتا۔ اور یہ بھی غلط نہیں ہے کہ ہر فنکار اپنے فن کی عمارت کھڑی کرنے میں جہاں عام طور سے اور بآسانی حاصل ہونے والی اینٹیں، چونا اور گارا استعمال کرنے پر مجبور ہے، وہاں اسے یہ حق بھی پہنچتا ہے کہ وہ اس کا خاکہ اور نقشہ تیار کرنے میں اپنی ذاتی استعداد کو بروئے کار لائے۔ یہی ذاتی استعداد آگے چل کر انفرادیت کا روپ دھار لیتی ہے اور نہ صرف فنکار کی فنی خصوصیات کو اجاگر کرنے میں معاون و مددگار ہوتی ہے بلکہ فن کی قدروں کو مناسب طریقے سے بدل کر ادب کو ماحول کی صحیح عکاسی کے قابل بنا دیتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو زبان ترقی نہ کرے، علم آگے نہ بڑھے۔ کوئی ہنر یا عیب مستقل حیثیت نہیں رکھتا کل ہم جسے ہنر کہتے تھے آج وہی عیب ہے اور آج جسے ہم خامی سمجھتے ہیں کل وہی خوبی بن سکتی ہے۔

دورِ حاضر کے اکثر اساتذہ و مشاہیر کے نزدیک تقابل ردیفین ایک عیب ہے اور وہ اس سے دور رہنے کی سعی کرتے ہیں۔ مگر اس کی بے شمار مثالیں آج کل کے معروف شعرا کے یہاں مل جاتی ہیں۔ حامیانِ جدیدیت کی تو بات ہی الگ ہے کہ وہ اسے عیب نہیں مانتے۔ میر درد، داغ اور ناظم رامپوری نے بھی اسے عیب نہیں گردانا۔ ان کے یہ شعر دیکھیے ؎

دل بھی تیرے ہی ڈھنگ سیکھا ہے
آن میں کچھ ہے، آن میں کچھ ہے (میر درد)

ابھی تو کھیل ہیں اے داغ شوخیاں ان کی
پھر آرزوئیں کروگے حیا کے آنے کی (داغ)

ہاں سینے سے نمائشِ داغِ دروں غلط
ہاں آنکھ سے ترادشِ خونِ جگر غلط (ناظم)

کون ہے جو شترگربہ کو عیب نہیں جانتا۔ مگر داغ کا یہ شعر ملاحظہ فرمایئے ؎

ادھر آؤ اس بات پر بوسہ لے لوں
مرے سر کی جھوٹی قسم کھانے والے

سیماب اکبرآبادی شکستِ ناروا کو عیب نہیں سمجھتے تھے اور ان کے کلام میں ایسے اشعار کی کمی نہیں جن میں شکستِ ناروا کا عیب موجود ہے۔ غالب نے تعقیدِ لفظی کو عیب کی جگہ حسن سمجھا ہے۔

اساتذۂ قدیم و جدید اس بات پر متفق ہیں کہ تکرارِ حرفی دو مرتبہ سے زیادہ ہو تو ہکلاہٹ کا شبہ پیدا ہونے سے بارِ سماعت بن جاتی ہے خاص طور سے کام میں تکرار۔ مگر اس کی مثال بھی مل جاتی ہے۔ داغ ہی کا ایک مشہور مطلع ہے ؎

کبھی فلک کو پڑا دل جلوں سے کام نہیں
اگر نہ آگ لگادوں تو داغ نام نہیں

مصرعۂ اولیٰ میں دو کاف اکٹھے آگئے ہیں۔
غالب کے یہ مطلعے ملاحظہ کیجئے ؎

پئے نذرِ کرم تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا
بخوں غلطیدۂ صد رنگ دعویٰ پارسائی کا

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

ان مطلعوں کے قافیوں میں "رسائی"، "ساں" اور "گر" کو مقید کر لیا گیا ہے اور بعض اساتذہ کا خیال ہے کہ ایسی صورت میں غزل کے دیگر اشعار میں بھی یہی التزام ہونا ضروری ہے۔ مگر غالب نے اس التزام کو غزلوں کے دیگر اشعار میں نظرانداز کر دیا ہے۔

ذکر آمد اور آورد کا تھا اور بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ تو اب ملاحظہ فرمایئے آمد و آورد کی چند مثالیں۔ میر اور سودا کے دو ہم معنی شعر ہمیشہ پیش کیے جاتے ہیں۔ میر کے شعر میں آہ یعنی آمد ہی آمد ہے اور سودا کے شعر میں واہ یعنی آورد ہی آورد ہے ؎

سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے
(میر)

سودا کی جو بالیں پہ ہوا شورِ قیامت
خدامِ ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے
(سودا)

مگر لطف کی بات یہ ہے کہ امیر مینائی نے اسی خیال کے بیان میں آمد و آورد کی حدیں ملا دی ہیں۔ شعر سنیے ؎

شورِ محشر امیر کو نہ جگا
سو گیا ہے غریب سونے دے

اسی طرح ایک مصرعے کی تضمین ناسخ اور داغ دونوں کی ہے۔ داغ کے یہاں آورد اور ناسخ کے یہاں آمد کا نمونہ دیکھیے ؎

تمام عمر یونہی ہو گئی بسر اپنی
شبِ فراق گئی، روزِ انتظار آیا
(ناسخ)

گزر گئے اسی گردش میں اپنے لیل و نہار
شبِ فراق گئی، روزِ انتظار آیا
(داغ)

اور سیماب اکبرآبادی اور فراق گورکھپوری کے یہ ہم خیال اشعار ؎

ہستی و نیستی کی حدیں دور رہ گئیں
یہ آگیا کہاں میں تجھے ڈھونڈتا ہوا
(سیماب)

فراق ایک ہوئے جاتے ہیں زمان و مکاں
تلاشِ دوست میں میں بھی کہاں نکل آیا (فراق)

ذوق کا ایک بہت مشہور شعر ہے ؎

لائی حیات آئے، قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے، نہ اپنی خوشی چلے

آمد کی اس سے بہتر مثال شاید ہی کہیں اور مل سکے۔ اب اسی مضمون کو آورد کے سانچے میں شاد عظیم آبادی کے شعر میں دیکھیے ؎

دلِ مضطر سے پوچھ اے رونقِ بزم
میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں

لیکن امیر مینائی کے شعر کی آمد کی داد دینی ہی پڑتی ہے ؎

کسی رئیس کی محفل کا ذکر کیا ہے امیر
خدا کے گھر بھی نہ جائیں گے بن بلائے ہوئے

آخر میں راقم السطور کے تین اشعار سنیے جن کا توارد مشاہیر سے ہو گیا ہے۔ میرا پہلا شعر اور منور لکھنوی کا شعر دونوں ایک ہی مشاعرے میں پڑھے گئے تھے۔ دوسرے دونوں اشعار میں نے جس وقت کہے تھے اس وقت نہ جگر مرادآبادی کا اور نہ حسرت موہانی کا شعر میری نظر سے گزرا تھا۔ اب یہ فیصلہ بھی آپ ہی کو کرنا ہے کہ کس شعر میں آمد اور کس شعر میں آورد ہے ؎

کہیں تو نقش ہو جاتا ہے خمیازہ تلاطم کا
جو دریا بھول جاتا ہے تو ساحل یاد رکھتا ہے
(منور)

گزر جاتے ہیں جو طوفان آکر سطحِ دریا پر
انھیں موجیں بھلا دیتی ہیں ساحل یاد رکھتا ہے
(ضیا)

مجھی میں رہے مجھ سے مستور ہو کر
بہت پاس نکلے بہت دور ہو کر (جگر)

ہے انتہائے یاس بھی اک ابتدائے شوق
پھر آگئے وہیں پہ جہاں سے چلے تھے ہم (حسرت)

عجب دائرہ ہے محبت کی دنیا
چلے تھے جہاں سے وہیں آگئے ہم (ضیا)

ایم مبین

حادثہ

بس پوری رفتار سے ہوا کے گھوڑوں پر سوار اڑی جا رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ہی وہ خطرناک گھاٹی شروع ہونے والی تھی جہاں اچھے اچھے ڈرائیور بھی سنبھل جاتے تھے۔ ویسے جام نگر اب دو یا تین میل رہ گیا تھا۔ اس گھاٹی کو پار کرتے ہی جام نگر کے آثار نظر آنا شروع ہو جاتے تھے۔

بس کے سارے مسافر اونگھ رہے تھے۔ کچھ مسافر جن کو جام نگر میں اترنا تھا وہ اپنا سامان اکٹھا کر رہے تھے۔ کنڈکٹر موہن لال پیسے گن رہا تھا۔ شاید اسے پیسے اگلے اسٹاپ پر جمع کرانے تھے۔ وہ ٹکٹوں کا بھی حساب لگا رہا تھا۔

لال سنگھ بڑے اطمینان سے بس چلا رہا تھا۔ جیسے جیسے گھاٹی قریب آ رہی تھی وہ بس کی رفتار میں اضافہ کرتا جا رہا تھا۔ اس کی گنگناہٹ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ یوں تو اس گھاٹی کے شروع ہوتے ہی ڈرائیور اپنی گاڑیوں کی رفتار کم کر دیتے تھے۔ مگر لال سنگھ شاید اس خطرناک گھاٹی سے مرعوب ہونا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے جیسے ہی گھاٹی شروع ہوتی وہ بس کی رفتار بڑھانے لگتا تھا۔

بس کی رفتار دیکھ کر بس کے مسافروں کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی تھیں۔ کچھ لوگ بڑبڑا کر آپس میں باتیں کرنے لگتے۔ اور لال سنگھ کو بس کی رفتار کم کرنے کے لیے کہتے۔ مگر لال سنگھ تو ان کی باتیں ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دیتا تھا۔ اور بس کی رفتار بڑھاتا ہی جاتا تھا۔ اور مسافروں کے دلوں کی دھڑکنیں لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جاتی تھیں۔

مگر جب لال سنگھ بس کو گھاٹی کے پار لے کر چلا جاتا تو ان کے چہرے پر اطمینان کی لکیریں ابھر آتیں اور وہ اپنے ماتھے پر آئی پسینے کی بوندیں پونچھنے لگتا۔ کچھ لوگوں نے اس کی شکایت بھی کی تھی کہ گھاٹی کے شروع ہوتے ہی لال سنگھ بس کی رفتار بڑھا دیتا ہے۔ اس کے لیے لال سنگھ کو کنٹرولر کی باتیں بھی سننا پڑی تھیں۔ مگر کنٹرولر کی باتوں پر زیادہ دن تک وہ عمل نہیں کرتا۔ کچھ دنوں بعد پھر وہ اپنی پرانی روش پر آ جاتا کیونکہ جیسے ہی وہ گھاٹی کے پاس پہونچتا تھا ایک جوش اس کے جسم میں سرایت کر جاتا تھا اور وہ اس خوفناک گھاٹی کو روندتا گذر جاتا تھا۔ گھاٹی خطرناک اس طرح تھی کہ سڑک کی ایک جانب تو اونچے پہاڑ تھے۔ دوسری جانب خوفناک گھاٹی جو تین چار سو فٹ گہری ہوگی۔

سڑک بھی کافی چوڑی نہیں تھی۔ ایک وقت میں دو گاڑیاں بڑی مشکل سے گذرتی تھیں۔ جب ایک گاڑی کو گذرنا ہوتا تھا تو مخالف سمت سے آتی گاڑی کو رکنا پڑتا تھا۔ مگر ایسی نوبت شاذونادر ہی آتی تھی کیونکہ راستہ ویران رہتا تھا۔ دن میں اکا دکا گاڑیاں بھولے بھٹکے چلی آتیں۔

سڑک کی اس جانب جس جانب گھاٹی تھی اس طرف سرکار نے کچھ اونچی دیوار اٹھا دی تھی۔ جس سے گاڑیوں کی حفاظت ہوتی تھی اور گاڑیاں کھائی میں گرنے سے رک جاتی تھیں۔ دیوار کو دیکھتے ہی ڈرائیور ہوشیار ہو جاتے تھے۔

پہلے کافی دور تک ایک سیدھا راستہ تھا۔ اس کے بعد وہ بائیں طرف مڑ جاتا تھا۔ لال سنگھ کی بس اس گھاٹی میں دوپہر کے دو بجے کے قریب پہونچتی تھی۔ جب دور دور تک گھاٹی ویران رہتی تھی۔ اور خطرے کا نام و نشان بھی نہیں رہتا تھا جس سے لال سنگھ کا حوصلہ اور بھی بڑھ جاتا تھا۔

سڑک ویران دیکھ کر گاڑی کی رفتار لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جا رہا تھا کچھ مسافر کھڑکیوں سے جھانک کر اس خوفناک کھائی کو دیکھ رہے تھے۔ اور غور کر رہے تھے اگر بس کھائی میں گر جائے تو بس کے ساتھ ان کا کیا حشر ہو سکتا ہے۔

سیدھی سیدھی ویران سڑک کو دیکھ کر بس کی رفتار کی سوئی ۷۰-۸۰ کے درمیان تھرک رہی تھی۔ لال سنگھ کی نظریں ویران سڑک پر جمی تھیں۔

اچانک وہ حادثہ ہو گیا۔

دیوار پر بیٹھا ہوا وہ لڑکا اچھلا اور سڑک پر آکر کھڑا ہو گیا۔

لال سنگھ گھبرا اٹھا۔ اس کے اور بس کے درمیان مشکل سے پچاس فٹ کا فاصلہ ہوگا۔

"لال سنگھ! — بچے کو بچاؤ"۔

اس کے ذہن میں ایک آواز گونجی۔ لڑکا سڑک کے درمیان میں کھڑا تھا۔ بریک لگانا ناممکن تھا اگر وہ بریک لگا بھی دیتا تو لڑکے کو موت کے منھ سے نہیں بچا سکتا تھا۔ ایک لمحے کے دسویں حصے میں اس کے ذہن میں خیال آیا۔

لڑکے اور دیوار کے درمیان اتنا فاصلہ تھا کہ وہ مشاقی سے کام لے کر گاڑی نکال سکتا تھا۔ اس نے تیزی سے اسٹیئرنگ گھمائی۔ اور دیوار کی طرف گاڑی لے جاکر پوری قوت سے بریک لگائے مگر دیر ہو چکی تھی!

بس لڑکے کو معمولی سا دھکا دے کر اس کے بازو سے نکل گئی مگر پوری رفتار سے جاکر دیوار سے ٹکرائی تھی کیونکہ لال سنگھ اچھی طرح گاڑی نہیں موڑ سکا تھا۔ بریک وقت پر نہیں لگے تھے۔ ایک دھماکے کے ساتھ دیوار ٹوٹ گئی اور بس کئی قلابازیاں کھاتی کھائی میں جا گری۔

بس میں ایک ہلچل مچ گئی۔ مسافر ایک دوسرے پر گرنے لگے۔ ان کی چیخوں نے ماحول کو لرزا دیا۔ پتھریلی زمین پر بس کئی قلابازیاں کھاتی گری

تھی اور ایک ضرب پٹرول کی ٹنکی پر بھی لگی تھی جس میں آگ لگ چکی تھی اور وہ پھٹنے کے لیے بے تاب تھی۔

اس قیامت کے آتے ہی سب کے ہوش اڑ گئے تھے۔ کسی کو کسی کی خبر نہیں تھی۔ کچھ لوگ خوف سے بے ہوش ہو گئے تھے۔ کچھ کو گہری چوٹیں آئی تھیں۔

بس اس طرح سے گری تھی کہ اس کا دروازہ اوپر ہو گیا تھا اور چاروں پہیے ایک طرف۔ سارے مسافر ایک دوسرے پر گرے تھے۔ باہر نکلنے کا راستہ بھی نہیں تھا۔

باہر نکلنے کے بارے میں سب سے پہلے کیدار نے سوچا۔

کیونکہ وہ بس کی آخری سیٹ پر بیٹھا تھا۔ حادثے کی وجہ سے اسے بھی چوٹیں آئی تھیں۔ ناک کی نکسیر پھوٹ گئی تھی مگر حواس درست تھے۔ اس نے اپنی چوٹوں کا خیال نہ کرتے ہوئے۔ بس کے پیچھے کا دروازہ کھولا۔ جو ایسے وقتوں میں استعمال کیا جاتا تھا۔ تھوڑی کوشش کے بعد وہ دروازہ کھولنے میں کامیاب ہو گیا۔ اور اس سے باہر کود پڑا۔ باہر آکر اس نے اپنی پھولی ہوئی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کی۔ اور بس کا جائزہ لیا۔ اندر سے زخمیوں کی کراہوں اور سسکیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔

اچانک اس نے بس کے انجن والے حصے سے شعلے لپکتے دیکھے۔

"باہر نکلو۔ جلدی سے باہر نکلو۔ بس میں آگ لگ چکی ہے۔"

وہ حلق پھاڑ کر چیخا اور چیختا رہا۔

اس سے ایک بات ضرور ہوئی۔ جو لوگ کم زخمی تھے اس کی آواز سنتے ہی باہر نکل آئے۔ اور آگ دیکھنے لگے۔

"ارے تم نکل گئے ہو؟ کم از کم ان زخمیوں کو تو نکالو جو بے ہوش ہیں۔"

کیدار چیخا اور پھر وہ حفاظتی دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے وہ لوگ بھی آئے۔ وہ بے ہوش آدمیوں کو ہوش میں لا کر باہر نکالنے کی کوشش کر رہے تھے۔

دو ایک نے بچوں کو باہر نکالنا شروع کر دیا۔

کیدار حلق پھاڑ کر چیخ رہا تھا۔ چلو باہر نکلو۔ نہیں تو بس کی ٹنکی دھماکے سے پھٹ جائے گی اور ساری بس میں آگ لگ جائے گی۔

ڈرائیور کی جگہ اٹھتے شعلے اب بس کے اندر آنے لگے تھے۔ ان کی تپش سے وہ بے ہوش ضرور ہوش میں آ گئے جو سب سے آگے بیٹھے تھے۔ مگر ایک دوسری مصیبت کھڑی ہو گئی تھی۔ چمڑے اور نرم ربر کی بنی سیٹیں جلنے لگی تھیں اور بس کے اندر بھی آگ لگ گئی تھی

دیکھتے ہی دیکھتے بدبو اور دھوئیں کے بادل اندر چھا گئے۔ اور سانس لینا اور دیکھنا دشوار ہو گیا۔ کیدار اور اس کے ساتھی بے ہوش لوگوں کو باہر نکال رہے تھے۔ کام اس طرح ہو رہا تھا جیسے اینٹیں ڈھوئی جاتی ہیں۔

لالو کی نظر اچانک بے ہوش سنیتا پر پڑی۔ وہ چار بھاری بھرکم جسموں کے نیچے دبی تھی۔ اس کے بازو میں اس کی بھاری بھرکم ماں بیٹھی تھی۔ اس وقت وہ بھی بے ہوش تھی۔ اور اس کا سارا بوجھ سنیتا پر تھا۔ وہ سنیتا کو اس کی سسرال سے لا رہی تھی۔

لالو سگریٹ لینے ایک اسٹاپ پر اترا تھا تو اس کی نظر سنیتا پر پڑی تھی۔ اور وہ مبہوت سا اسے دیکھتا رہا تھا۔ پتہ نہیں کس طرح سنیتا کی ماں نے اسے دیکھ لیا۔

اس نے گجراتی میں ایک گالی اسے دی اور بڑبڑانے لگی۔ ان موئے بدمعاشوں کی ماں بہن جیسے ہوتی ہی نہیں۔ سب کو ہوس بھری نظروں سے دیکھتے ہیں۔

لالو وہ سن کر ضرور بھنا گیا تھا۔

پھر بس میں بھی وہ چور نظروں سے بار بار سنیتا کو دیکھتا جاتا تھا۔ مگر اسے مایوسی ہی ہوئی تھی۔ کیونکہ سنیتا اس سے کافی آگے سیٹ پر بیٹھی تھی۔

وہ ہاتھ سے دھوئیں کو آنکھوں کے سامنے سے ہٹاتا آگے بڑھا اور اس نے سنیتا کو ان چار بھاری بھرکم جسموں کے درمیان سے نکال کر اپنی باہوں میں اٹھا لیا۔

سنیتا بے ہوش تھی۔ اس نے اسے پھول کی طرح اٹھائے رکھا تھا۔ بے ہوشی میں اس کے چہرے پر سارے جہاں کی معصومیت سمٹ آئی تھی۔ اور وہ اپنی گستاخ نظروں کو سنیتا کے سینے کے زیر و بم سے ہٹنے کے لیے مجبور نہیں کر سکتا تھا۔

سنیتا کے جسم کے لمس نے ایک عجیب سی کیفیت اس پر طاری کر دی تھی

وہ اسے اٹھائے بس کے باہر آیا۔ چلچلاتی دھوپ میں زمین پر کئی زخمی پڑے کراہ رہے تھے۔ کچھ اب بھی بے ہوش تھے۔ جو بچے ہوش میں آ گئے تھے وہ رو رو کر اپنے ماں باپ، رشتہ داروں کو پکار رہے تھے۔

بس سے دھوئیں کے مرغولے اٹھ رہے تھے۔ بس میں آدھی آگ لگ چکی تھی۔

لالو سنیتا کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔

اچانک بے ہوش رام سنگھ ہوش میں آ گیا۔ وہ ایک بہت بڑا آرکیٹکٹ تھا۔ ایک لمحہ تو وہ حیرت سے چاروں طرف دیکھتا رہا۔ مگر پھر اچانک وہ ہنسنے لگا۔ اور ہنستا ہی چلا گیا۔ پھر وہ پاگلوں کی طرح وحشیانہ قہقہے لگا رہا تھا۔ قہقہے لگاتے لگاتے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اور آس پاس پڑے پتھر اٹھا کر بس پر پھینکنے لگا۔

بڑی مشکل سے کچھ لوگوں نے اسے پکڑا۔ حادثے میں اس کے دماغ پر کاری ضرب لگی تھی اور وہ پاگل ہو گیا تھا۔

اب کی بار کیدار باہر آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک دو مہینے کے بچے کی لاش تھی۔

یہ بچہ اسے بہت نیچے دبا نظر آیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ تڑپ اٹھا تھا اور اس امید پر جلدی سے اس نے بچے کو نکالا تھا کہ بچہ زندہ ہے۔ مگر اس کے ہاتھوں میں بچے کی لاش تھی۔ وہ بھاری بھرکم جسموں کے نیچے دب گیا تھا۔

دم گھٹنے کی وجہ سے اس کی جان نکل گئی تھی۔ اچانک ایک عورت تیزی سے دیوانوں کی طرح 'میرا بچہ کہاں ہے۔ میرا بچہ کہاں ہے' کہتی ہوئی کود پڑی۔ اس کے چہرے سے وحشت برس رہی تھی۔ کیدار نے غور سے اُسے دیکھا یہ عورت اس بچے کی ماں تھی کیونکہ وہ بس میں اس کی گود میں بچہ دیکھ چکا تھا۔ کیدار نے خاموشی سے اس کی طرف بچہ بڑھا دیا۔ وہ پاگلوں کی طرح اسے چومنے لگی۔ 'میرا منا! میرا راجہ! تو اچھا تو ہے؟ ارے تو بولتا کیوں نہیں۔ تجھے بھوک لگی ہے' ٹھہر میں تجھے دودھ پلاتی ہوں۔

'ہوں نہیں۔ کیدار بھرائی آواز میں بولا' "تمہارا منا اب اس دنیا میں نہیں رہا۔"

"نہیں۔ اس عورت کی دلخراش چیخ سن کر کیدار کو ایسا لگا جیسے آسمان لرز اٹھا وہ پاگلوں کی طرح چیخی 'نہیں'۔ میرے منے کو کچھ نہیں ہو سکتا۔ وہ میرا پہلا اور آخری سہارا ہے۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو میں دوسرا منا کہاں سے لاؤں گی۔ یہ تو بڑی مشکل سے آپریشن سے ہوا تھا۔ کیدار میں اور زیادہ سننے کی سکت نہیں تھی۔ وہ بس میں اور لوگوں کو بچانے کے لیے چلا گیا۔ ابھی وہ اندر داخل ہی ہوا تھا کہ ایک خوفناک دھماکے سے آسمان بھی کانپ اٹھا ٹنکی پھٹ گئی۔ اور ساری بس شعلوں کی لپیٹ میں آ گئی۔

گھاٹی میں اور بھی کچھ لوگ مدد کو آ گئے تھے۔ یہ لوگ ایک ٹرک سے جا رہے تھے۔ نیچے کا منظر دیکھ کر وہ اتر پڑے۔ اور ٹرک کو فوراً پولس اور فائر بریگیڈ لانے کے لیے بھیج دیا۔ جب پولس مدد کے لیے آئی تو بڑا ہی ہیبت ناک منظر تھا فائر بریگیڈ تو کھائی تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ وہ بے بسی سے دور ہی کھڑا بس کے جلنے کا تماشہ دیکھ رہا تھا۔

پولس جیپ بھی کھائی میں نہ اتر سکی۔ کیوں کہ نیچے اترنے کے لیے راستہ نہیں تھا صرف سپاہی نیچے کھائی میں اترے۔ بس میں لگی آگ بجھانے کی کوئی امید نہیں تھی۔ دور دور تک پانی کا نام و نشان نہیں تھا نہ فائر بریگیڈ آ سکتا تھا۔ اپنی بے بسی پر لوگ صرف جھنجھلا کر رہے جا رہے تھے۔

بس کے اندر شعلوں میں کئی لاشیں جل رہی تھیں۔ باہر بھی کئی لاشیں بکھری تھیں۔

ایک دو مہینے کی لاش جس سے اس کی ماں لپٹ کر رو رہی تھی۔

ایک دو مہینے کا بچہ اپنی دلخراش آواز میں رو رہا تھا۔ اس کی ماں کی لاش بس کے اندر جل رہی تھی۔ بچہ بری طرح بلک رہا تھا۔

فیروز آرٹسٹ اپنا ہاتھ پکڑے کراہ رہا تھا۔

کہنی کے پاس سے اس کا ہاتھ ٹوٹ گیا تھا۔ یہ وہ ہاتھ تھا جس سے اس نے آج تک کئی یادگار تصویریں بنائی تھیں۔ اس نے اپنی زندگی میں نئی تصویریں بنانے کا عزم کیا تھا۔ مگر اب وہ بے بسی سے اپنے ٹوٹے ہوئے ہاتھ کو دیکھ کر سسک رہا تھا۔ اب وہ کیسے اس ہاتھ سے تصویریں بنائے گا۔

کنڈکٹر موہن لال ہوش میں آتے ہی چیخا 'میرا پیسوں کا بیگ کہاں ہے!'

اور وہ پاگلوں کی طرح بیگ تلاش کرنے لگا۔ جس میں تین ہزار سے زائد رقم تھی۔ جو شاید بس میں رہ گئی تھی۔ اور جل کر خاک ہو گئی تھی یا باہر کسی نے ہاتھ کی صفائی دکھا دی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اس کو اپنے اطراف کے ماحول سے کوئی بھی سروکار نہیں تھا۔ اس کے دل پر دردناک چیخیں کوئی اثر نہیں کر رہی تھی۔ بس ایک ہی سوال اس کے ذہن میں گونج رہا تھا۔ "تین ہزار روپے وہ کس طرح ادا کرے گا۔؟"

اس کا اپنا گھر نہیں ہے۔ اس کے پانچ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ جس کا خرچ وہ مشکل سے پورا کرتا ہے اور اب یہ مصیبت ہے.....

وجے اپنی آنکھ پکڑے بری طرح چیخ رہا تھا۔

وہ میڈیکل کالج کے آخری سال میں تھا۔ کوئی نوکدار چیز حادثے کے درمیان اس کی آنکھ میں گھس گئی تھی۔ اور اس کی ایک آنکھ پھوٹ گئی تھی اور اب وہ ایک آنکھ سے محروم تھا۔ زخمیوں کو اوپر لے جا کر اسپتال میں لے جایا جا رہا تھا۔

بہت دیر بعد کئی جلی ہوئی لاشیں بس سے نکلیں۔...

لال سنگھ کی لاش بھی جل کر کوئلہ ہو گئی تھی۔

کیدار کا سارا گوشت جھانک رہا تھا جیسے کسی نے کچے گوشت کو بھون دیا۔ وہ ایسا شخص تھا جس کو حادثے نے بہت کم چوٹیں آئی تھیں۔ مگر دوسروں کی جانیں بچانے میں اس نے اپنی جان دے دی تھی۔ سنیتا کی ماں کی بھاری بھرکم لاش پر چادر ڈال دی گئی تھی۔

تیرتھ یاترا کے لیے جاتا ایک سادھو جس کی لاش صرف ہڈیوں کے جلے ہوئے ڈھانچے کی صورت میں باقی رہ گئی تھی۔

کئی زخمی تھے۔ کئی اپاہج ہو گئے تھے۔

کئی بچے اپنے ماں باپ کے لیے رو رہے تھے۔ کئی مائیں اپنے بچوں کے لیے۔

پولس اس لڑکے کی تلاش میں تھی جس کی وجہ سے یہ حادثہ ہوا۔

وہ مل گیا تھا۔ مگر اس کی کہانی بڑی عجیب تھی۔

وہ اپنے باپ کا آٹھواں بیٹا تھا۔ اس کا باپ ایک غریب مزدور تھا جس کی مزدوری اتنی نہیں تھی کہ وہ اپنی آٹھ اولادوں کا پیٹ پال سکے۔ فاقے ان کے نصیب میں لکھے تھے —— گذشتہ تین دن سے اس کے گھر میں فاقہ تھا۔ اس کے باپ کو بڑی مشکل سے کچھ پیسے ملے تھے۔ وہ اس نے اس لڑکے کو کچھ سامان لانے کے لیے دیے۔

مگر بدقسمتی سے وہ اس کے پاس سے کھو گئے۔ لڑکے کے سر پر موت منڈلا رہی تھی۔ گھر جانے کے بعد بھی اس کا باپ اسے زندہ چھوڑنے والا نہیں تھا۔ اس لیے اس نے خودکشی کرنا ہی مناسب سمجھا۔

اور اس گھاٹی میں آ کر لال سنگھ کی بس کے آگے کھڑا ہو گیا۔

اسے معمولی چوٹیں آئی تھیں۔

●●

عود ہندی کا ایک پُر اسرار اڈیشن

خلیق انجم

میں نے غالب کے تمام اردو خطوط "غالب کے خطوط" کے نام سے مرتب کیے ہیں۔ جو آج کل طباعت کے مراحل سے گزر رہے ہیں۔ خطوطِ غالب کا تنقیدی اڈیشن تیار کرنے کے دوران ایک بہت دلچسپ واقعہ ہوا جسے میں یہاں بیان کرنا چاہتا ہوں۔

بہت عرصہ ہوا کہ میں نے غالب کے وہ خطوط مرتب کر لیے تھے جن کے متن کی بنیاد عود ہندی اور اردوئے معلیٰ کے پہلے ایڈیشنوں پر تھی۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کا جنرل سکریٹری ہو جانے کے بعد میری مصروفیات کچھ اس طرح کی ہو گئیں کہ کافی عرصے تک میں اس کام کی طرف توجہ نہیں کر سکا۔ اسی دوران میں میرے ساتھ ایک حادثہ ہو گیا۔ ہوا یہ کہ میری دس پندرہ بہت قیمتی کتابیں ایک ساتھ چوری ہو گئیں۔ ان میں عودِ ہندی کا پہلا ایڈیشن بھی تھا۔ جو میں نے پرانی کتابوں کے ایک تاجر سے ایک سو چالیس روپے میں خریدا تھا۔ اس وقت میں چور کو بہت کوستا تھا لیکن اب دعائیں دیتا ہوں کہ اگر وہ میری کتابیں چوری نہ کرتا تو خطوطِ غالب کے بارے میں ایک اہم ترین انکشاف میں اور نہ جانے کتنا زمانہ لگتا۔

پچھلے سال جب میں نے کام دوبارہ شروع کیا تو انجمن ترقی اردو کی لائبریری سے "عود ہندی" کا پہلا ایڈیشن لے لیا۔ مرتب کیے ہوئے خطوط کا جب عود ہندی سے موازنہ کیا تو بہت زیادہ اختلافاتِ نسخ نکلے۔ دس پندرہ صفحات کا موازنہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ "عود ہندی" کا وہ پہلا ایڈیشن جو میری ملکیت تھا۔ اور چوری ہو گیا تھا انجمن کے اس اڈیشن سے مختلف تھا۔ میں نے اپنے نوٹس کھنگالے تو ایک کاغذ پر گم شدہ "عود ہندی" کے بارے میں نوٹ کی ہوئی تفصیلات مل گئیں۔ یہ اڈیشن مطبع مجتبائی میرٹھ میں ۱۰ رجب ۱۲۸۵ھ کو شائع ہوا تھا۔ انجمن کے اڈیشن کو دیکھا تو وہ بھی مطبع مجتبائی میرٹھ میں اسی تاریخ کو چھپا تھا۔ پھر سوال یہ تھا کہ میں نے جو متن تیار کیا تھا۔ اس میں عود ہندی اور اردوئے معلیٰ کے پہلے اڈیشنوں کی بنیادی نسخوں کے طور پر استعمال کیا تھا۔ اور تمام اختلافاتِ نسخ کی نشان دہی کی تھی۔ پھر اب وہ اتنا مختلف کیوں ہے۔ میں یہ تو مان سکتا تھا کہ عود ہندی میں کوئی لفظ حذف ہو گیا ہو اور میری نظر چوک گئی ہو۔ لیکن اگر کسی عبارت میں اردوئے معلیٰ کے مقابلے میں عود ہندی میں کوئی لفظ زاید ہو تو یہ لفظ میں کہاں سے لایا۔ اور اس کی نشان دہی کیسے کی۔ پھر میں نے اپنے متن کا موازنہ اردوئے معلیٰ سے کیا تو معلوم ہوا کہ میں نے جن اختلافاتِ نسخ کی نشان دہی کی ہے وہ بالکل درست ہیں۔

انور الدولہ سعد الدین خاں بہادر کے نام غالب کے ایک خط کے اختلافاتِ نسخ ملاحظہ ہوں۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ میرا پریشان ہونا کہاں تک جائز تھا۔

میرا تیار کیا ہوا متن	عود ہندی پہلا اڈیشن (انجمن)
قصید د (میں نے اس لفظ کے بارے میں حاشیے میں لکھا تھا کہ "قصید د" سہو کاتب ہے یہ لفظ "قصیدہ" ہے۔	قصیدہ
ہرزہ	ہر ذرہ
آور دہ (میں نے لکھا تھا کہ طباعت کی غلطی ہے، اصل لفظ "اور وہ" ہے۔	اور وہ
ہمشیر	باہمشیر
سفر	اس نسخے میں یہ لفظ ندارد

حضورِ والا　　　　حضور والد

ایک ہی خط میں اتنے اختلافات نسخ دیکھ کر میں نے سوچا کہ میرا سب کام بیکار ہوگیا۔

میں نے اپنے متن کا موازنہ عودِ ہندی کے اس اڈیشن سے کیا جو مولانا سید مرتضیٰ حسین فاضل نے مرتب کر کے مجلس ترقی ادب لاہور سے شائع کرایا تھا۔ اس کا متن بالکل وہی جو میں نے تیار کیا تھا ۔ ان تمام شواہد کی روشنی میں میں اس نتیجے پر پہنچا کہ میرا گم شدہ عودِ ہندی کا اڈیشن انجمن کے اڈیشن سے بالکل مختلف تھا۔

اتفاق سے انجمن کی لائبریری میں عودِ ہندی کا ایک اور پہلا اڈیشن نکل آیا۔ میں نے دونوں اڈیشنوں کے سرورق اور ترقیمے کی عبارتوں کا موازنہ کیا تو ایک حیرت انگیز اور دلچسپ انکشاف ہوا۔ معلوم ہوا کہ میں نے عودِ ہندی کے جس اڈیشن کو بنیادی نسخے کے طور پر استعمال کیا تھا وہ یہی ہے جو دوسری دفعہ میں نے انجمن سے حاصل کیا۔

اگرچہ ترقیمے میں تاریخِ اشاعت دونوں نے ایک ہی یعنی ۱۰ رجب ۱۲۸۵ھ دی ہے۔ لیکن سرورق کی عبارت میں معمولی سا فرق ہے۔ ایک اڈیشن کی سرورق کی عبارت یہ ہے:

> خداوند کریم بے نسبتِ بندگی ۔ نہ پری درونہ پراگندگی
> بفضلِ واہب العطیات خالق الخیر والحسنات انشاء اردو لاجواب
> موسومہ بہ
>
> عودِ ہندی
>
> من تصنیف جناب استادِ زماں علامۂ عصر اسد اللہ خاں
> المتخلص بغالب حسب فرمائش مجمع خوبی ملاجیان میاں
> محمد ممتاز علی خاں رئیس میرٹھ
> در مطبع مجتبائی واقع میرٹھ طبع گردید

دوسرے ایڈیشن میں دوسری سطر میں "انشاء اردو" کے بجائے "انشا راور دو"

آخری سطر میں اس طرح ہے:

> در مطبع مجتبائی واقع میرٹھ باہتمام محمد ممتاز علی طبع شد

دونوں اڈیشنوں کے سرورق کی عبارت میں اختلاف کا صاف مطلب ہے کہ یہ دونوں الگ الگ اڈیشن ہیں۔

دونوں اڈیشنوں کی مماثلتیں

۱۔ دونوں ایڈیشنوں کی کتابت کا بہ غور مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں کے کاتب مختلف ہیں لیکن دوسرے کاتب نے پہلے کاتب کی نقل انتہائی کامیاب طریقے سے کی ہے۔

۲۔ ایک اڈیشن میں ہر صفحہ جس لفظ پر ختم ہوتا ہے دوسرے اڈیشن میں بھی اسی لفظ پر ختم ہوتا ہے۔

۳۔ دونوں ایڈیشنوں کا سائز ایک ہی ہے۔

۴۔ دونوں اڈیشنوں میں انیس سطری مسطر استعمال کیا گیا ہے

۵۔ دونوں ایڈیشنوں کے آخری چار صفحوں میں ایک نقطے کا بھی اختلاف نہیں۔

اختلافات

۱۔ دونوں اڈیشنوں کے ہر صفحے پر کم از کم دو یا تین قرأتیں مختلف ہیں

۲۔ دونوں کے صفحات تو ایک ہی لفظ پر ختم ہوتے ہیں۔ لیکن سطریں عام طور سے مختلف الفاظ پر ختم ہوتی ہیں۔

۳۔ دونوں کے سرورق کی عبارت میں بھی اختلاف ہے۔ جس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔

۴۔ مخطوطات میں اور انیسویں صدی کے نصف آخر تک کی مطبوعات میں عام قاعدہ تھا کہ جس لفظ پر جفت صفحہ ختم ہوتا تھا۔ اسے دوسرے طاق صفحے کے شروع میں پھر لکھتے تھے۔ ایسا غالباً اس لیے کیا جاتا تھا کہ اگر صفحات آپس میں مل جائیں تو انھیں ترتیب دیا جا سکے۔ عودِ ہندی کے ایک اڈیشن میں اس قاعدے کی پابندی کی گئی ہے جبکہ دوسرے میں بالکل نہیں کی گئی۔

غالب کے اردو خطوط یکجا کر کے شائع کرنے کا خیال پہلی بار منشی شیو نرائن آرام کو ۱۸۵۸ء میں آیا تھا۔ انھوں نے جب غالب سے خطوط شائع کرنے کی اجازت مانگی تو غالب نے ۱۸ نومبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں انھیں لکھا:

> "اردو کے خطوط جو آپ چھاپا چاہتے ہیں، یہ بھی زاید بات ہے۔ کوئی رقعہ ایسا ہوگا جو میں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہوگا۔ ورنہ صرف تحریر سرسری ہے۔ اس کی شہرت میری سخنوری کے شکوہ کے منافی ہے۔ اس سے قطع نظر کیا ضروری ہے کہ ہمارے آپس کے معاملات اوروں پر ظاہر ہوں خلاصہ یہ کہ ان رقعات کا چھاپا میرے خلاف طبع ہے۔"[1]

غالباً مرزا ہرگوپال تفتہ اور منشی شیو نرائن آرام دونوں نے مل کر خطوطِ غالب شائع کرنے کا پروگرام بنایا تھا اور غالباً دونوں ہی ایک ساتھ خط لکھ کر غالب سے اجازت مانگی تھی۔ منشی شیو نرائن آرام کو خط لکھنے کے دو دن بعد غالب نے تفتہ کو اردو خطوط کی اشاعت پر ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا۔

> "واقعات کے چھاپے جانے میں ہماری خوشی نہیں

---

[1] خطوطِ غالب، مہیش پرشاد، الہ آباد۔ ۱۹۴۱، ص ۳۸۷

ہے۔ لڑکوں کی سی ضد نہ کرو۔ اور اگر تمھاری اس میں خوشی ہے تو صاحب، مجھ سے نہ پوچھو تم کو اختیار ہے یہ امر میرے خلاف رائے ہے۔"[2]

چونکہ مرزا ہرگوپال تفتہ کے نام خط میں غالب کا لب و لہجہ تلخ ہو گیا تھا اس لیے ان دونوں نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔

اس کے کئی سال بعد میرٹھ کے منشی ممتاز علی خاں کو بقول ان کے خطوطِ غالب یکجا کر کے شائع کرنے کا خیال آیا۔ انھوں نے غالب کے ایک دوست چودھری عبدالغفور سرور سے اس کا ذکر کیا۔ انھیں بھی یہ خیال پسند آیا۔ اور انھوں نے اپنے اور مارہرہ کے شاہ عالم اور صاحبِ عالم کے نام غالب کے خطوط یکجا کر کے، ان پر ایک دیباچہ لکھ کر منشی ممتاز علی خاں کو میرٹھ بھیج دیا۔ اس مجموعے کا تاریخی نام "مہرِ غالب" رکھا گیا۔ جس سے ۱۲۷۸ھ (۱۸۶۲ — ۱۸۶۱ء) برآمد ہوتے ہیں۔ منشی ممتاز علی خاں نے کچھ اور خطوط جمع کیے۔ اور یہ تمام خطوط غلام غوث خاں بے خبر کو بھیج دیئے۔ ۱۸۶۳ء میں لکھے گئے خواجہ غلام غوث خاں بے خبر کے نام غالب کے ایک خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ دوستوں کے اصرار سے مان تو گئے تھے لیکن انھیں اردو خطوط کی اشاعت میں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی — غالب لکھتے ہیں:

"یہ بھی لکھ چکا ہوں کہ میں صاحبِ فراش ہوں، اٹھنا بیٹھنا ناممکن ہے۔ خطوط لیٹے لیٹے لکھتا ہوں۔ اس حال میں دیباچہ کیا لکھوں۔ یہ بھی لکھ چکا ہوں کہ تفتہ کو میں نے خط نہیں لکھا۔"[3]

۱۸۶۴ء میں غالب نے بے خبر کو ایک خط لکھا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب غالب اپنے خطوط کی اشاعت میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ ۱۸۶۵ء میں غالب لکھتے ہیں:

"ہاں حضرت! کہیے منشی ممتاز علی خاں کی سعی بھی مشکور ہو گی؟ وہ مجموعۂ اردو چھپے گا یا چھپا ہی رہے گا۔ احباب اس کے طالب ہیں۔ بلکہ بعض نے تو طلب کو بہ سرحدِ تقاضا پہنچا دیا ہے۔"[4]

"عودِ ہندی" کی ترتیب مکمل ہونے میں تقریباً پانچ سال لگے اور اس کی طباعت میں مزید دو سال لگ گئے۔ بالآخر اکتوبر ۱۸۶۸ء میں عودِ ہندی شائع ہو گئی۔ یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ تعدادِ اشاعت کیا تھی۔ "عودِ ہندی" اور "اردوئے معلیٰ" دونوں کے شائع ہونے سے پہلے ہی ان کی بہت شہرت ہو چکی تھی، اس لیے یہ امکان ہے کہ اردو والوں کو ان مجموعوں کا بہت انتظار ہو۔ خواجہ غلام غوث خاں بے خبر نے ایک خط میں غالب کو لکھا تھا:

"منشی ممتاز علی خاں صاحب کے بھانجے نے آپ کی اردو انشا مجھے دکھائی، سب چھپ گئی، ایک صفحہ اخیر کا باقی ہے۔ خان صاحب نے قطعہ تاریخ کے انتظار میں کہ کوئی کہہ دے اسے پھینک رکھا ہے۔ مرادآباد میں اخبار جلوۂ طور کا مہتمم بھی وارد تھا وہ کہتا تھا کہ میں نے ویسے ہی ناتمام پچیس جلدیں لیں اور لوگوں کو دیں۔"[5]

اس کا مطلب ہے کہ عودِ ہندی کا بہت شہرت ہو گئی تھی۔ ابھی اس کا آخری صفحہ چھپا بھی نہیں تھا کہ لوگ خریدنے لگے۔ عودِ ہندی جب شائع ہوتی ہے تو غالب ہندوستان گیر شہرت کے مالک تھے۔ ان کے شاگرد اور مداح تقریباً تمام ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس سے تقریباً دس سال پہلے جب ان کی "دستنبو" شائع ہوئی تو تقریباً چھ مہینے میں ساری فروخت ہو گئی جب پر غالب نے منشی شیونرائن آرام کو لکھا:

"کتابِ دستنبو کے بک جانے سے میں خوش ہوا... دیکھو صاحب تم گھبراتے تھے، آخر یہ جنس پڑی نہ رہی اور بک گئی۔"[6]

کیمسن نامی ایک انگریز مدارس غرب و شمال کے محکمے میں کسی عہدے پر فائز تھا۔ اس نے غالب سے ان کی اردو نظم و نثر کی فرمائش کی تھی۔ غالباً یہ فرمائش طالب علموں کی ضرورت کے پیشِ نظر کی گئی تھی۔

ہنری اسٹورٹ محکمہ صوبجات متحدہ میں محکمہ تعلیم میں ڈائرکٹر تھے۔ انھوں نے غالب سے اردو نثر میں ایک کتاب لکھنے کی فرمائش کی تھی۔ جسے وہ غالباً اسکول کے نصاب میں شامل کرنا چاہتے تھے۔ اس فرمائش کے سلسلے میں غالب نے منشی شیونرائن آرام کو لکھا تھا:

"جناب ہنری اسٹورٹ ریڈ صاحب کو ابھی خط نہیں لکھ سکتا — ان کی فرمائش ہے اردو کی نثر، وہ انجام پائے تو اس کے ساتھ ان کو خط لکھوں۔"[7]

اس کا مطلب ہے کہ اس زمانے میں اردو نثر کی ایسی کتابوں کی ضرورت تھی جنھیں نصاب میں شامل کیا جا سکے۔ اس لیے پورا امکان ہے کہ عودِ ہندی نصاب میں شامل کر لی گئی ہو یا لائبریریوں کے لیے کافی تعداد میں خریدی گئی ہو۔

امکان یہ بھی ہے کہ طباعت کے دوران میں کافی آرڈر آ گئے ہوں۔

---

۲ ایضاً، ۵۹ — ۵۸
۳ عودِ ہندی ۱۳۸
۴ " ۱۲۴

۵ فغانِ بے خبر، خواجہ غلام غوث خاں بے خبر، الٰہ آباد ۱۸۹۱ء ص ۱۲۹
۶ خطوطِ غالب، ص ۳۹۴
۷ " ص ۳۸۹

اس لیے بہت جلد دوسرے اڈیشن کی ضرورت پڑی ہوگی۔

لیکن سوال یہ ہے کہ جب دوسرا ایڈیشن چھاپا گیا تو پہلے اڈیشن کی ہوبہو نقل کیوں کی گئی کہ آخری صفحے پر تاریخِ اشاعت میں بھی کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔

اب دوسرے اڈیشن کی طباعت کی کئی صورتیں ہیں،

ا۔ خود منشی ممتاز علی خاں نے دوسرا اڈیشن شائع کیا۔ اگر ایسا تھا تو منشی ممتاز علی خاں عودِ ہندی میں فخر سے اس کا اعلان کرتے کہ پہلا اڈیشن ختم ہوگیا اور اب دوسرا اڈیشن چھاپا جارہا ہے۔ اگر منشی ممتاز علی خاں دوسرا اڈیشن شائع کرتے تو اسے چھپانے کی بظاہر کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ اس زمانے میں مصنف کو معاوضہ دینے کا رواج نہیں تھا۔ بلکہ بعض اوقات تو اُلٹا معاملہ ہوتا تھا۔ مصنف کچھ کتابیں خریدنے کی پیشکش کرتا تھا۔ غالب نے "دستنبو" کی پچاس جلدیں خریدنے کا وعدہ کیا۔ اور اپنے ایک مداح

رائے امید سنگھ سے ان پچاس جلدوں کی قیمت منشی شیو نرائن آرام کو دلوائی تو انھوں نے دستنبو چھاپی، اس لیے منشی ممتاز علی خاں کے پاس کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ اس طرح چھپاکر دوسرا ایڈیشن چھاپتے۔

دوسری صورت یہ ممکن ہے کہ عودِ ہندی کی مقبولیت دیکھ کر کسی نے جعلی اڈیشن شائع کردیا۔ مگر یہ بھی قرینِ قیاس نہیں کیونکہ عودِ ہندی کی اشاعت کے حقوق کسی کے نام محفوظ نہیں کیے گئے تھے اور پھر غالب کی وفات ہوچکی تھی اس لیے کوئی بھی دوسرا اڈیشن شائع کرسکتا تھا۔

تیسری صورت جو قرینِ قیاس ہے وہ یہ ہے کہ عودِ ہندی کے ۱۸۴ صفحات چھپ چکے تھے، قطعۂ تاریخ طباعت کے انتظار میں چار صفحے کی آخری کاپی نہیں چھپی تھی۔ جب آخری کاپی چھپنے کی نوبت آئی تو منشی ممتاز علی کو خیال آیا کہ عودِ ہندی کی مانگ بہت زیادہ ہے اور انھوں نے جتنی کتابیں چھپوائی ہیں وہ ناکافی ہیں۔ ۱۸۴ صفحے چھپے ہوئے کافی دن ہوگئے تھے اس لیے پریس میں ان کے پتھر بھی صاف کردیے گئے تھے۔ مجبوراً ۱۸۴ صفحات کی کتابت اسی کاتب سے پھر کراکے انھیں چھاپا گیا۔ آخری چار صفحے اتنی تعداد میں شائع کیے گئے کہ وہ پوری کتاب کے لیے کافی ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۸۴ صفحات کے متن میں تو بہت زیادہ اختلافات ہیں لیکن آخری چار صفحوں میں ایک لفظ کا بھی اختلاف نہیں۔

متنی نقاد کے لیے ایک اہم سوال یہ ہے کہ ان دونوں ایڈیشنوں میں سے پہلا اڈیشن کون سا ہے۔

یقینی طور پر تو نہیں کہا جاسکتا ہے لیکن میرا قیاس ہے کہ جس کتاب

کے سرورق پر "باہتمام محمد ممتاز علی خاں" لکھا ہوا ہے یہ وہ ایڈیشن ہے جو پہلے چھپا تھا۔ کیونکہ (۱) اس ایڈیشن پر محمد ممتاز علی خاں کا نام ہے (۲) اس اڈیشن کا کاتب دوسرے اڈیشن کے مقابلے میں زیادہ بہتر اور پختہ کار معلوم ہوتا ہے (۳) پہلے اڈیشن کا کاغذ زیادہ بہتر ہے جبکہ دوسرے اڈیشن کا کاغذ تجارتی انداز کا ہے۔

سید مرتضیٰ حسین فاضل نے اپنی مرتبہ عودِ ہندی کے دیباچے میں لکھا ہے

"مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ عودِ ہندی کے اس نسخے سے پہلے کوئی اڈیشن اس اہتمام سے مرتب و شائع نہیں ہوا۔ حالانکہ اس کمی کے پیشِ نظر اتنی بڑی غفلت

حیرت انگیز ہے۔"

فاضل صاحب کا یہ دعویٰ مناسب نہیں۔ کیونکہ انھوں نے عودِ ہندی کی ترتیب میں متنی تنقید کے بیشتر اصولوں کی پابندی نہیں کی۔ جس کا تفصیلی ذکر میں نے "غالب کے خطوط" کے دیباچے میں کیا ہے۔ اس لیے اس نسخے میں خاصی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ انھوں نے بہت محنت کی ہے اور خطوطِ غالب کے جس طرح کے اشاریے تیار کیے ہیں۔ اور حواشی لکھے ہیں۔ وہ خطوط کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے بہت مفید ہیں۔ لیکن عودِ ہندی کے اس اڈیشن کی دریافت کے بعد ان کی ساری محنت ضائع ہو گئی۔ کیونکہ انھوں نے "عودِ ہندی" کے صرف اس اڈیشن کو بنیادی نسخہ بنایا ہے۔ جس کے سرورق پر یہ عبارت ہے

در مطبع مجتبائی واقع میرٹھ طبع گردید

ظاہر ہے کہ اس میں سید مرتضیٰ حسین فاضل صاحب کا کوئی قصور نہیں۔ عودِ ہندی کے دوسرے اڈیشن کی دریافت محض اتفاقی ہے۔

عودِ ہندی کے جتنے اڈیشن چھپے ہیں ان سب کے ساتھ یہی ہوا۔ کسی حقیقت کو مانے بغیر کسی نے ایک اڈیشن کو بنیاد بنایا، اور کسی نے دوسرے کو۔ ۱۸۷۸ء میں مطبع نارائنی، دہلی سے عودِ ہندی کا جو اڈیشن چھپا تھا اس کی بنیاد عودِ ہندی کے ایک پہلے اڈیشن پر ہے۔ اور ۱۸۸۷ء مطبع نول کشور سے جو چھپا تھا۔ اس کی بنیاد دوسرے اڈیشن پر۔ مولوی مہیش پرشاد کو بھی چونکہ دوسرے اڈیشن کا علم نہیں تھا۔ اس لیے انھوں نے بھی صرف ایک ہی کو بنیاد بنایا ہے۔ جس کی وجہ سے ان کے بتائے ہوئے اختلافاتِ نسخ بے معنی ہو گئے ہیں۔

چونکہ ہمیں اس کا یقین نہیں کہ دوسرا اڈیشن کون سا ہے اور پہلا کون سا۔ اور اگر فرض کیجیے کسی طرح یہ ثابت بھی ہو جائے کہ پہلا اڈیشن کون سا ہے تو ہمیں اس کا علم نہیں کہ دوسرے اڈیشن کی کتابت پہلے اڈیشن سے ہوئی تھی یا اصل مسودے سے۔ حالانکہ امکان یہی ہے کہ مسودے سے ہوئی ہو گی کیونکہ مسودہ ہوتے ہوئے پبلشر ایک کتاب خراب کرنے پر تیار نہیں ہوتا۔

اس لیے متنی نقاد کے سامنے ایک ہی راستہ ہے کہ وہ دونوں اڈیشنوں کو بنیادی نسخوں کی حیثیت سے استعمال کرے۔ میں نے "غالب کے خطوط" کے تنقیدی اڈیشن کی تیاری میں ایسا ہی کیا ہے۔

بقیہ وزیر اعظم کی تقریر

تجارت، دفاع، تعلیم، فن اور ادب وغیرہ میں برابر کے شریک ہیں۔ انھیں دیگر فرقوں کے مساوی مواقع حاصل ہیں کیونکہ ہندوستان میں کسی مذہب کے خلاف کوئی امتیاز نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہماری قوم سیکولر ہے یعنی ہر شہری کو اپنی مرضی کا مذہب قبول کرنے کی آزادی ہے۔ ہندوستان کے کئی تحقیقی و تدریسی اداروں میں اسلامی نظریات اور فلسفہ سے متعلق تحقیق کے مواقع حاصل ہیں۔ اور حاصل رہیں گے۔ کئی اسلامی ریاستوں کے سیاسی احیاء اور ہندوستان سے ان کے قریبی تعلقات کے باعث ہندوستان میں اسلامی مطالعہ میں مزید تیزی آئی ہے۔

آخر میں وزیر اعظم نے ہندوستان اور دیگر ممالک کے مسلمانوں کو پندرہویں صدی ہجری کی دلی مبارکباد اور نیک خواہشات پیش کیں۔ انھوں نے اس سیمینار اور اس سلسلہ کی دیگر تقریبات کی کامیابی کی نیک تمنا بھی ظاہر کی۔

وزیر اعظم کا استقبال کرتے ہوئے وزیر تعلیم شری ایس بی چوان نے اعلان کیا کہ حکومت نے دہلی میں انڈین اسلامک کلچرل سنٹر قائم کرنے کے لیے ایک قطعہ زمین دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ یہ مرکز اسلامی ثقافت کے محاسن کو نمایاں کرنے میں بیش قیمت کردار ادا کرے گا۔

سیمینار کا افتتاح کرنے کے بعد وزیر اعظم نے ورکس اینڈ ہاؤسنگ کے نائب وزیر شری محمد عثمان عارف کی کتاب "عقیدت کے پھول" کا اجرا کیا۔ تین روزہ سیمینار میں پاکستان، افغانستان، بنگلہ دیش، چند عرب ممالک نیز کینیڈا کے مندوبین نے شرکت کی۔

بقیہ: آٹھواں بین الاقوامی فلمی میلہ

ایکٹنگ کے میدان میں ہمارے یہاں کے ایک ایک ایکٹر کو چنوتی دینے والی نیدرلینڈ کی فلم ڈاکٹر ولیمن کے ہیرو اور فیانسی کی ہیروئن تھی۔ ڈاکٹر ولیمن میں ہیرو جس بے باکی سے جانوروں کی افزائش نسل کے لیے گھوڑوں کی نسل بڑھاتا ہے، مویشیوں سے محبت کرتا ہے اور اپنے رقیب اور اس کے سود کو بچانے کے لیے کس طرح خوبصورت کپڑے پہنے ہوئے جوہڑ میں کود پڑتا ہے، ہمارے چکنے چپڑے اور ناز کے مارے ہیرو کسی ایسے رول ادا کرنے کے لیے شاید کبھی تیار نہ ہوں۔ ڈاکٹر ولیمن ایک فرض شناس، عقیدت مند، ایک سیدھے سادے ڈاکٹر کی ایک ایسی سادہ پرکار اور موثر کہانی تھی جو ہمارے ایکٹروں کے لیے ایک زبردست چیلنج تھی۔

ایکٹنگ کے اعتبار سے دوسری خوبصورت، زوردار، پُر اثر فلم مشرقی جرمنی کی فیانسی تھی، جو ہماری ہندوستانی فلم انڈسٹری کی بڑی سے بڑی ایکٹرس کے لیے ایک چیلنج تھی، فلم کی ہیروئن جس انداز سے ایک جنگی قیدی کی حیثیت سے اپنے رول کو نبھانے میں کامیاب ہوئی اس کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔

یہ تمام حقائق و کوائف اس امر کے شاہد ہیں کہ ہمارا آٹھواں بین الاقوامی فلمی میلہ ہر اعتبار سے کامیاب رہا اور امید ہے کہ نواں بین الاقوامی فلمی میلہ معمول کے مطابق منعقد ہوگا۔ اور ہمارے لیے نئی چنوتیاں لے کر آئے گا جنھیں ہم خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کرتے ہوئے کامیاب و کامران ہوں گے۔

عروج زیدی

جن کی آنکھوں نے کبھی دیکھی نہیں تصویرِ خواب
اللہ اللہ وہ بتاتے ہیں ہمیں تعبیرِ خواب

نیند سے بوجھل ہیں آنکھیں ذہن ہے بوجھل سے دور
جیسے نازل ہو رہی ہو آیۂ تطہیرِ خواب

میں سمجھتا ہوں مرے حق میں مبارک بات ہے
کوئی سمجھے یا نہ سمجھے باعثِ تاخیرِ خواب

دوست کی مرضی نہ ہو تو نیند آنکھوں پر حرام
خواب گاہِ نازکی پابند ہے تقدیرِ خواب

جان سے بھی بڑھ کے ہے ناموس بیداری کی لاج
لفظِ بے معنی ہے اب ہر کوششِ تسخیرِ خواب

شدتِ سوزِ تصور، الحفیظ و الاماں
اس نے تو پگھلا دیا ہر حلقۂ زنجیرِ خواب

اے خوشا خلدِ نظر ہے ایک شہکارِ جمیل
دیکھئے تو کتنی پیاری ہے مری تعبیرِ خواب

نیند سے بیزار آنکھیں ہیں تو دل بیدار ہے
آپ کہنے کو اسے کہہ لیجئے تقصیرِ خواب

تا بکے جاگے گا کوئی بزمِ ہست و بود میں
زیست کے رنگیں ورق پر نقش ہے تحریرِ خواب

کہہ گیا ہے کس پتے کی بات اک دانائے راز
زندگی کو خواب کہیے موت کو تعبیرِ خواب

سعیِ لاحاصل میں شاید لذتِ حاصل بھی ہے
خواب بے تعبیر لیکن عشق دامن گیرِ خواب

العجب بزمِ سخن میں ذکرِ زلف و رُخ، عروج!
رزم گاہِ زیست کے اشعار میں تاثیرِ خواب

کاوش بدری

مُسکرانے کو کھلے ہونٹ تو آنسو نکلے
پا بہ زنجیر جو غم تھے وہی آہو نکلے

لاکھ لہرائے اندھیروں میں اُجالا نہ ہوا
میرے ہی بخت کی صورت ترے گیسو نکلے

یاد بیتے ہوئے لمحوں کی دلاؤں کیا کیا
نام میرا ترے لب سے کبھی پہلو نکلے

سنگ ریزے تھے تری یاد سے پہلے الفاظ
رقص میں آئی تری یاد تو گھنگھرو نکلے

جذب ہونے دے مرے پیرہن ہستی میں
تیرے دامن سے اگر روٹھ کے خوشبو نکلے

بہ گیا پارۂ دل بھی ترے دامن کی طرف
بے رُخی سے جو تری آنکھ سے آنسو نکلے

پھول مرجھا کے بھی گلشن میں پڑے رہتے ہیں
گل ترے بھی بہک رو گئی گل رو نکلے

غزلیں

ظفر ادیب

شبنم کو نغمہ ہائے فضا کو مٹا گیا
سورج کئی حسین مناظر کو کھا گیا

تصویرِ خواب تھی ابھی رنگینیوں کا شہر
کوئی تو تھا جو خوابوں سے مجھ کو جگا گیا

احساس ہی ہم اہلِ ہنر کا عدوئے جاں
لیکن یہی تو رشکِ مہ و گل بنا گیا

پہلے تو اپنے آپ کو بھی جانتے نہ تھے
ہم کو پتہ ہمارا کوئی تو بتا گیا

کیا فرق ہے وفا و جفا میں اے اہلِ عشق
دل ہی ہوا، ہمیں تو جو دل میں سما گیا

ہر صبح اپنی شام لیے آتی ہی رہی
اک قصہ رات کو میرا ہر دن سُنا گیا

کس کس سے بے نیاز ہوں آخر ہے زندگی
جانے ظفر ہی ہم کو سبق جو پڑھا گیا

طلحہ رضوی برق

خوفِ ہنگامۂ نشور نہیں
ماسویٰ کا مجھے شعور نہیں

عشق میں عقل کا ظہور نہیں
نہیں ہرگز نہیں حضور نہیں

قدسیوں کے گداز قلب کہاں
جرم، نسیاں، خطا، قصور نہیں

آپ آئیں تو دل کو چین ملے
ہاں مگر یہ کوئی ضرور نہیں

جس کو دیکھو وہ خود سے لڑتا ہے
کون ہے یاں جو تھک کے چور نہیں

قطرہ گویا ہوا حباب آسا
خود کو پہچانتا غرور نہیں

رخ پہ خورشید کے ہے آئینہ
کیا یہ زنگار کا فتور نہیں

سات پردوں سے نور چھنتا ہے
آنکھ والو یہ برق طور نہیں

پردہ بے پردہ کیا تماشہ ہے
آنکھ سے دور دل سے دور نہیں

وحی و الہام میں تمیز رہے
میرے اشعار میں زبور نہیں

پڑ ہی جائے گی برق چشمِ کرم
میں جو ں دور اس سے وہ تو دور نہیں

مصور سبزواری

اپنے ہونے کا کچھ احساس نہ ہونے سے ہوا
خود سے ملنا مرا اک شخص کے کھونے سے ہوا

میں ہی آسیب صدا شہر سماعت میں نہ تھا
حادثہ اور نیا چپ مرے ہونے سے ہوا

بچے کچھ لڑ پڑے گھایل ہوئے اور ختم ہوئے
سارا ہنگامہ بس اک شوخ کھلونے سے ہوا

پشت سے ٹیک لگائے تھے مہ و سال کے خم
ملبۂ عمر فزوں اور بھی ڈھونے سے ہوا

لوگ کہتے ہیں جڑیں اس کی مکینوں تک تھیں
گھر یہ برباد کسی پیڑ کے رونے سے ہوا

خشتِ دیوارِ خرابہ ہوں میں صدیوں سے کوئی
انکشاف آج ترے سائے میں سونے سے ہوا

آٹھواں بین الاقوامی فلمی میلہ

پریم پال اشک

آکروش کا ایک منظر

ان لوون سولجرز پیٹینٹ لیدر شوز کا ایک منظر

فلم آج کے دور کا مقبول ترین اور مؤثر ترین میڈیا ہے جس کے امکانات سے بہت سے فائدے اٹھائے جا سکتے ہیں۔

اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ایک دیکھی جانے والی کہانی پڑھی جانے والی کہانی کی بہ نسبت زیادہ مؤثر ہوتی ہے کیونکہ ایک کہانی کو بیک وقت ایک ہی شخص پڑھ کر متاثر ہوتا ہے جبکہ ایک فلم سے بیک وقت ہزاروں اشخاص مثبت یا منفی اثر قبول کرتے ہیں۔

ہم فلموں کے ذریعہ کسی اجنبی قوم یا سماج کی تہذیب و تمدن اور اعلیٰ سماجی اور اخلاقی قدروں کی جھلک دیکھ سکتے ہیں۔ غالباً اسی لیے دنیا کے مختلف ممالک میں فلمی میلے منعقد ہوتے ہیں، یہ میلے خواہ تاشقند میں ہوں یا کارلوویری میں، ملبورن میں ہوں یا ایڈن برگ میں، برلن میں ہوں یا کانز میں، یا بھارت میں۔ غرضیکہ دنیا کے مختلف ممالک میں منعقد ہونے والے فلمی میلے دنیا کے مختلف ممالک کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں بھی معاون ثابت ہوتے ہیں۔

بھارت میں اب تک آٹھ بین الاقوامی فلمی میلے منعقد ہو چکے ہیں۔ پہلا بین الاقوامی فلمی میلہ ۱۹۵۲ء میں بمبئی میں منعقد ہوا۔ دوسرا فلمی میلہ ۱۹۵۷ء میں نئی دہلی میں، تیسرا ۱۹۶۵ء میں، اور اس کے بعد ۱۹۷۴ء میں چوتھا، ۱۹۷۵ء میں پانچواں، ۱۹۷۷ء میں چھٹا، ۱۹۷۹ء میں ساتواں اور ۱۹۸۱ء میں آٹھواں بین الاقوامی فلمی میلہ حال ہی میں ختم ہوا ہے، پہلا فلمی میلہ بمبئی میں اور اس کے بعد تمام فلمی میلے نئی دلی میں منعقد ہوئے۔ پہلے دو بین الاقوامی فلمی میلے مقابلے سے مبرّا ہے اور اس کے بعد تمام میلوں میں مقابلہ سیکشن شامل کیا جاتا ہے۔ ۱۹۶۵ء کے بعد ہمارے بین الاقوامی فلمی میلے کو پیرس کی انٹرنیشنل پروڈیوسرز فیڈریشن نے اول درجہ کا میلہ قرار دیا۔

آٹھواں بین الاقوامی فلمی میلہ ۳ جنوری ۱۹۸۱ء سے ۱۷ جنوری ۱۹۸۱ء

تک نئی دہلی میں منعقد ہوا۔ اس بار میلے میں ۵۳ مختلف ممالک نے شرکت کی۔ اور ان کی ۱۶۰ سے زاید فلمیں دکھائی گئیں۔ جبکہ پچھلی بار ۴۶ ممالک شریک ہوئے تھے۔ اس بار پاکستان، افغانستان، تیونیشیا، تنزانیہ، سیریا، منگولیا اور ہانگ کانگ نے بھی شرکت کی۔

پچھلے بین الاقوامی فلمی میلوں کی طرح اس بار بھی اسے ان پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ (۱) مقابلہ سیکشن (۲) انفارمیشن سیکشن (۳) انڈین پنورما (۴) مارکیٹنگ سیکشن (۵) ری ٹراسپیکٹیو

مقابلہ سیکشن میں ۲۴ فیچر فلمیں اور ۱۳ اشارٹ فلمیں دکھائی گئیں انفارمیشن سیکشن میں اس بار دنیا کے جن نامور فلم ڈائرکٹروں کی فلمیں دکھائی گئیں ان میں جاپان کے اکیرا کروساوا، ہانگ کانگ کے کنگ فو، اٹلی کے فیلینی، پولینڈ کے واجدا، بھارت کے ستیہ جیت رے، سویڈن کے انگمار برگمین، امریکہ کے فرانسیس کپولا، بنگلہ دیش کے بادل رحمٰن اور ہنگری کے نوجوان فلم ڈائرکٹر پیٹر گوتھر کی فلمیں شامل تھیں۔

ادھر ری ٹراسپیکٹیو میں سویڈن کے ڈائرکٹر جین ٹرویل اور اسپین کے کارلو سورا کی فلمیں دکھائی گئیں۔

انڈین پنورما میں مشہور فلم ڈائرکٹر مرنال سین کی فلمسازی کی سلور جوبلی منائی گئی۔ اور اس سلسلے میں ان کی ۱۶ ہندی، بنگلہ، اڑیہ اور تیلگو فلموں کی نمائش کی گئی۔ اور دو شو انھیں کی فلموں کے لیے وقف کیے گئے۔

وی۔ جگن ناتھ (کنڑ)، کے وشوا ناتھ (تیلگو) جبار پٹیل (مراٹھی) پی، جی، بھارتھن (ملیالم) اور ترن مزمدار (بنگالی) کے نام فخر سے لیے جا سکتے ہیں۔

پچھلے میلے کے مقابلے میں اس بار کا ہمارا مارکٹنگ سیکشن کچھ کم کامیاب نہ رہا۔ پچھلی بار ۲۰ لاکھ روپے کی مالیت کے ۴۰ فلموں کی خرید و فروخت کے معاہدے ہوئے اور ۲۵ لاکھ روپے کی مالیت کا فلم سازی کا سامان فروخت کیا گیا۔ جبکہ اس بار ۷۵ ہندوستانی فلموں کی فروخت ہوئی۔ یہ معاہدے ۴۷ لاکھ روپے کی مالیت کے تھے۔ اور ایک پرائیوٹ کمپنی نے تو کمال ہی کر دیا۔ اس نے مارکٹنگ سیکشن میں اپنا وڈیو کیسیٹ کا اسٹال لگایا تھا اور اس میں اس نے ایک کروڑ روپے کی مالیت کے ویڈیو کیسیٹ فروخت کیے۔ اس بار خلیجی ممالک، مغربی افریقہ، مڈل ایسٹ، فجی، ماریشش، سری لنکا، سوڈان، تنزانیہ اور مشرقی افریقہ کے ممالک کے ہاتھ ہندوستانی فلموں کی فروخت کے سودے ہوئے۔

آٹھویں بین الاقوامی فلمی میلے میں ایک سیمنار بھی منعقد ہوا۔ یہ تین روزہ سمینار ڈائرکٹوریٹ آف فلم فیسٹیول اور انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ماس کمیونیکیشن کے اشتراک سے منعقد ہوا تھا۔ سیمنار کا موضوع تھا "۱۹۸۰ کے دہے کا سنیما" اس میں ۱۹۸۰ء کے دہے کے سنیما کی کامیابیوں اور ناکامیوں کا جائزہ لیا گیا۔ اور اس طرح ہندستان اور مختلف ممالک کے فلم سازوں، ہدایت کاروں اور فلم نقادوں نے

[illegible] (۱) آکروش (۲) ان نون سولجرز [illegible]
— لیدرشوز کے ہدایت کاروں کو اطلاعات و نشریات کے وزیر شری وسنت ساٹھے انعام دے رہے ہیں

علاوہ ازیں انڈین پنورما میں جن ممتاز ہندوستانی فلم ڈائرکٹروں کی فلمیں دکھائی گئیں ان میں تپن سنہا (بنگالی) کے وجین (تامل) کے جی جارج (ملیالم) سائی پرانجپے (ہندی) سعید مرزا (ہندی) کیٹ مہتہ (گجراتی)

مل کر اپنا خود تجزیہ کیا۔

اس بار کے فلمی میلے میں بھارت کے نوجوان فلمساز اور ہدایت کار گوبند نہالانی کی فلم آکروش اور بلغاریہ کے ہدایت کار رانگیل وال شنوف کو

ان کی فلم " ان نون سولجرز پیشینٹ لیدر شوز" پر مشترکہ طور پر طلائی مور عطا کیا گیا۔ ان دونوں فلموں کو آٹھویں بین الاقوامی فلمی میلے کی بہترین فلمیں قرار دیا گیا۔ بھارت میں منعقد ہونے والے فلمی میلوں میں کسی ہندوستانی فلم نے پہلی بار یہ اعزاز حاصل کیا۔

بہترین ہدایت کاری کے لیے نقرئی مور اٹلی کے ہدایت کار استانیلن لوکے کو ان کی فلم " وینیشن لائنز" پر عطا کیا گیا۔

وینیشن لائنز کا ایک منظر

بہترین ایکٹنگ پر نقرئی مور ہینگری کے ایکٹر گابر کوبیز کو ہینگری ہی کے نہیں بلکہ دنیا کے نامور ڈائرکٹر زولٹن فابری کی فلم "بالینٹ فابین میٹس گاڈ" پر دیا گیا۔

بہترین ایکٹرس کے لیے نقرئی مور انگیلا مولینا نے جوس لوئی بورسو کی سویڈن اور سپین کی مشترک فلم بنیا پر حاصل کیا۔

بالینٹ فابین میٹس گاڈ کا ایک منظر

اس بار آٹھویں بین الاقوامی فلمی میلے میں دکھائی جانے والی بہترین فلموں کی خرید کا منصوبہ بھی بنایا گیا۔

اس سے قبل زولٹن فابری کو ۱۹۷۹ء میں منعقدہ ۷ ویں بین الاقوامی فلمی میلے میں ان کی بہترین فلم "ہنگرین" کو بہترین فلم قرار دیا گیا تھا اور اس صلے میں انھیں طلائی مور عطا کیا جا چکا ہے۔

علاوہ ازیں گھانا کے ڈائرکٹر کاوا آنسا کو ان کی فلم "لو بریوڈ ان دی افریقین پاٹ" کو جیوری کا خصوصی اعزاز اور اٹلی کے ڈائرکٹر ویٹریو آرمین ٹینو کو ان کی شارٹ فلم "ایسکونڈینکا" پر جیوری کے ممبران نے خصوصی طور پر نقرئی مور عطا کیے جانے کی بھی سفارش کی۔

یہی نہیں بلکہ شارٹ فلموں میں ڈنمارک کی فلم "اے پیریڈ آف ٹرانسی شن" پر اس کے ڈائرکٹر بینٹ بارفورڈ کو بہترین شارٹ

شری کاوا آنسا

فلم قرار دیئے جانے پر طلائی مور اور بھارت کی شارٹ فلم "ایرائیول" پر اس کے ڈائرکٹر منی کول کو نقرئی مور کے اعزازات سے سرفراز کیا گیا۔

پچھلے بین الاقوامی فلمی میلوں میں عموماً فلم ڈیلی گیٹوں، نقادوں، عوام حتیٰ کہ جیوری کے ممبروں کو یہ شکایت رہتی تھی کہ مقابلے کی فلمیں انفارمیشن سیکشن کی فلموں کی نسبت قدرے کمزور رہتی ہیں۔ اس بار یہ بات نہ تھی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ دونوں سیکشن مساوی رہے اور دوسرا دلچسپ اور صحت مند پہلو یہ تھا کہ اگرچہ ڈائرکٹوریٹ آف فلم فیسٹیول کی منعقد کردہ فلمی میلے کے لیے منتخب کمیٹی نے فلموں کے

انتخاب کے وقت قدرے ہوشیاری سے کام لیا۔ اور ہر مذاق کی فلمیں شامل کی گئیں۔ ان میں خشک دستاویزی فلمیں بھی تھیں۔ رومانٹک سیاسی، سماجی، جنگی اور ایکشن سے بھرپور فلمیں بھی تھیں۔ لیکن اس کے باوجود تماشائیوں کو بے جا تشدد اور جنسی پراگندگی پھیلانے والی فلموں سے دور رکھنے کی کوشش کی گئی۔ اس نوعیت کی فلموں کی تعداد قدرے کم تھی اسی لئے تشدد اور جنس زدہ تماشائیوں کو قدرے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ میرے خیال میں یہ حوصلہ افزا اور صحت مند قدم تھا۔

آٹھویں بین الاقوامی فلمی میلے میں ایک خاص بات یہ دیکھنے میں آئی کہ غیر ملکی ڈیلی گیٹوں نے انڈین پینوراما کی فلموں میں خصوصی دلچسپی دکھائی۔ ایک جرمن ڈیلی گیٹ نے تو تیلگو فلم سنکر بھرنم انگریزی سب ٹائیٹل کے بغیر دیکھی لیکن اس کے باوجود انھوں نے ہماری تہذیب اور کلچر کو کافی حد تک سمجھ لیا۔ اور فلم "اے ومن اینڈ اے ومن" کے ڈائرکٹر سار بوجسکی نے بھارت کی فلم "آکروش" کو دیکھ کر پولینڈ اور بھارت میں پھیلی ہوئی سماجی ناانصافی میں مماثلت کی جھلک دیکھ لی۔

ہمارا آٹھواں بین الاقوامی فلمی میلہ ختم ہو چکا ہے۔ اب تک ہمارے یہاں جتنے بین الاقوامی فلمی میلے منعقد ہوئے ہیں، ان سب کے مقابلے میں اس بار کافی لے دے ہوئی ہے اور کتنے متنازعہ فیہ پہلو اُبھر کر سامنے آرہے ہیں۔ پہلے ہر سال فلمی میلے منعقد کیے جانے کی بات کی جاتی تھی۔ اور آج ان کی افادی پہلو پر بحث کی جارہی ہے۔ اس سلسلے میں کہیں یہ بھی کہا جارہا ہے کہ بھارت جیسے غریب ملک میں کہ جہاں عوام کو اقتصادی بدحالی کی چکی میں پسنا پڑ رہا ہے، ایسے بین اقوامی فلمی میلوں کا انعقاد فضول خرچی کے مترادف ہے۔

اس سوال کا جواب یہی دیا جاسکتا ہے کہ آج دنیا جس دور سے گزر رہی ہے اسے دیکھتے ہوئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم پوری دنیا کو ایک اکائی سمجھیں۔ ہمارے جیسے قدیم اور وسیع و عریض ملک میں مختلف تمدن گوناگوں پھولوں کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لیے بھی ایسے میلوں کی بہت ضرورت ہے تاکہ ہم اپنے تمدن، اپنی تاریخ، اپنی تہذیب اور اعلیٰ و ارفع سماجی اور اخلاقی قدروں کو خود بھی دیکھیں اور دنیا کو بھی دکھائیں۔ یہی نہیں بلکہ ہم اس کے ساتھ ساتھ دنیا کی مختلف اقوام اور ممالک کی تہذیب و تمدن، تاریخ، اعلیٰ و ارفع اخلاقی قدروں کو اپنے عوام سے روشناس کرائیں۔ اور ہزاروں، لاکھوں میل دور دنیا کے مختلف دیشوں کے سماجی مسائل اور اپنے یہاں کے مسائل میں مماثلت کی جھلک دیکھ سکیں۔ علاوہ ازیں ایک دوسرے ملک کے فلم سازوں اور ہدایت کاروں کے ساتھ تبادلۂ خیال کرنے کا موقعہ بھی حاصل ہوتا ہے وہاں ڈائرکشن۔ فوٹوگرافی، کہانی، اسکرین پلے رائیٹنگ اور اداکاری کے نئے نئے رجحانات کو دیکھنے اور سمجھنے کا موقعہ بھی ملتا ہے۔ اور ایسے تجربات ہم اپنے یہاں بھی کرسکتے ہیں۔ اور اپنے فلم بینوں کے شعور کو بلند کرسکتے ہیں۔

ہمارے یہاں مختلف بین الاقوامی فلمی میلوں میں کئی اہم فلمیں دکھائی گئیں ان سے ہمارے ہدایت کاروں کو تحریک ملی اور ان سے متاثر ہوکر انھوں نے کئی خوبصورت فلمیں تیار کیں۔ مثلاً پہلے بین الاقوامی فلمی میلے میں ڈی سیکا کی "بائیسکل تھیف" آئی اس سے متاثر ہوکر بمل رائے نے دو بیگھہ زمین بنائی اس کے بعد جاپان کی یوکی واریسو آئی اس سے متاثر ہوکر دتا دھرم ادھیکاری نے ننھے منے بنائی۔ اس کے بعد ایک اور جاپانی فلم "ہپی نس آف اس اون" آئی اس سے متاثر ہوکر گلزار نے "کوشش" بنائی۔ فرانسس کپولا کی گاڈ فادر آئی تو فیروز خاں نے اس سے تحریک پاکر دھرماتما بنائی۔

جرمن فلم ادجنا لتن کے موضوع اور ٹریٹمینٹ سے متاثر ہوکر تاراچند برجاتیہ نے لیکھ ٹنڈن کی زیر ہدایت فلم "دلہن وہی جو پیا من بھائے" پیش کی۔ فرانسیسی فلم گرل آن اے موٹر سائیکل بھی ہمارے فلم ڈائرکٹروں کے لیے تحریک و ترغیب کی موجب بن گئی۔ اس سے متاثر ہوکر این این سپی نے انداز تیار کی۔ اور ۱۹۷۹ء کے ،ویں بین الاقوامی فلمی میلے میں ترکی فلم "فیملی وے" کو باسو چٹرجی نے تحریک و ترغیب کا ذریعہ بنایا اور اسی سے متاثر ہوکر فلم "کھٹا میٹھا" بنائی۔ یہ تو چند مثالیں ہیں۔ ہمارے فلم ڈائرکٹروں نے ایسی اور کوششیں بھی کی ہیں جنھیں دیکھ کر ہمارے تماشائی محظوظ ہوتے آئے ہیں۔ آدان پردان کے ایسے صحت مند پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے بھی فلمی میلوں کی اہمیت اور افادیت مسلم ہوجاتی ہے۔

میرے خیال میں بین الاقوامی فلمی میلے آج ہمارے کلچر اور سماجی زندگی کی اہم ضرورت بن گئے ہیں۔ اسی لیے ان کی اشد ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ اگر ہم فلمی میلے منعقد کرنا بند کردیں تو ہمارے تہذیبی تمدنی اور سماجی رشتے باقی دنیا سے کٹ جائیں گے۔ اور ہم الگ تھلگ رہ جائیں گے۔ یہی نہیں بلکہ ہماری فلم تکنیک تجرباتی اور موضوعاتی دونوں اعتبار سے پچھڑ جائے گی۔ البتہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے یہاں مقابلہ اور انفارمیشن سیکشن دونوں میں عمدہ فلمیں دکھائی جائیں تاکہ ہم ایک دوسری قوم کے جذبات، احساسات، تمناؤں، خوشیوں، امیدوں، مسرتوں اور غموں میں شرکت کرسکیں۔ اور ان کے سماجی مسائل کو سمجھ سکیں۔ اعلیٰ اور ارفع اخلاقی قدروں کو اپنی زندگی کا حاصل بنا سکیں۔ اس سے کوئی بحث نہیں کہ آئندہ فلمی میلے کس ادارے کے زیر اہتمام منعقد ہوتے ہیں۔ ڈائرکٹوریٹ آف فلم فیسٹیول ان کا انعقاد کرتا ہے یا نیشنل فلم ڈیولپمنٹ کارپوریشن۔

البتہ ایک بات ضرور ہے کہ تشدد اور جنسی ترغیب کی حامل فلموں اور ایسے تماشائیوں کی حوصلہ شکنی ہونی چاہیئے۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ جرمن، سویڈن اور ناروے جیسے یورپی ممالک کے فلم ساز سیکس کی دلدل سے نکل کر اپنے اپنے سماجی مسائل کو بے باکی سے پیش کر رہے ہیں۔ مثلاً مشرقی جرمنی کی فلم فیانسی۔ سویڈن کی سبینا۔ مغربی جرمنی کی سنڈے چلڈرن۔ سوئزرلینڈ کی لاسٹ ٹرین، فرانس کی اسکیپ گوٹ، انگلینڈ کی رچرڈ تھیسنگر۔ ناروے کی لوسیف، پولینڈ کی وومن اینڈ اے وومن، کیوبا کی ڈیتھ آف اے بیوروکریٹ، نیوزی لینڈ

منڈے چلڈرن کا ایک منظر

کی ڈاکٹر ولیمن، امریکہ کی اپولو کلپسی ناؤ۔ اور برازیل کی گاجن روڈز ٹو فریڈم وغیرہ۔ جبکہ ہمارے تماشائی اب تک سیکس کی دلدل سے نہیں نکل سکے اس کی وجہ غالباً یہی ہوسکتی ہے کہ انسانی نفسیات کے تحت جس شئے کو شجر ممنوع قرار دے دیا جائے اس کے حصول کی جستجو، تجسس اور

اسکیپ گوٹ کا ایک منظر

خواہش یقینی طور پر بڑھ جاتی ہے۔

اس سلسلے میں ایک سوال یہ بھی زیر بحث آیا ہے کہ ہمارے یہاں منعقد ہونے والے آئندہ بین الاقوامی فلمی میلوں میں مقابلہ سیکشن رہے یا نہ رہے، اس بحث کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے فلمی میلوں میں مقابلہ سیکشن انفارمیشن سیکشن کے مقابلے میں ہمیشہ کمزور رہا ہے۔ اس بار کا مقابلہ سیکشن صرف اس وجہ سے توجہ طلب تھا کہ اس میں نامور ڈائرکٹروں کے بجائے اچھی فلمیں آگئیں۔ شہرۂ آفاق ہدایت کاروں کی فلمیں اس بار بھی مقابلہ سیکشن میں شامل نہ تھیں۔ دراصل بات یہ ہے کہ دنیا کا کوئی بھی نامور فلم ڈائرکٹر ہمارے فلمی میلے کو اہمیت نہیں دیتا۔ کیونکہ نہ تو مقابلے کی فلمیں ہمارے یہاں خریدی جاتی ہیں اور نہ ہمارے تماشائی سب ٹائٹل کی فلمیں دیکھنے کے عادی ہیں۔ اور تو اور ستیہ جیت رے جیسے عالمی شہرت کے ہمارے فلم ساز اور ہدایت کار نے اب تک ہمارے مقابلہ سیکشن کے لیے کوئی فلم نہیں دی۔ وہ ۷ویں بین الاقوامی فلمی میلے میں جیوری کے چیئرمین بھی رہے۔ اعزازات بھی حاصل کیے۔ قومی اعزازات کی قبولیت سے بھی انکار نہ کیا۔ دنیا کے تمام بین الاقوامی فلمی میلے میں اپنی فلمیں بھیج کر بھارت

اپولو کلپسی ناؤ کا ایک منظر

کی عظمت کو چار چاند لگایا۔ لیکن ہمارے یہاں کے فلمی میلے میں انھوں نے کوئی دلچسپی نہ لی۔ یہ بات سچی اور سیدھی ہے کہ جب ہم ہی اپنے فلمی میلے کے مقابلہ سیکشن کو حقارت اور نفرت کی نظر سے دیکھیں گے تو غیر ملکی فلم ڈائرکٹر کب خاطر میں لائیں گے۔

لہٰذا ہمارے عالمی شہرت کے فلمساز اور ہدایت کار اپنی فلمیں لے کر ہمارے بین الاقوامی فلمی میلوں کے مقابلہ سیکشن میں شریک ہوں، اور کم از کم مقابلہ سیکشن کی فلمیں ہماری حکومت ضرور خریدے۔ ان سب کے سب ٹائیٹل ہندی میں ہوں یا انھیں ہندی میں ڈب کیا جائے

تاکہ ان کی نمائش کے زیادہ سے زیادہ امکانات پیدا ہو سکیں۔ اس سے انھیں ہمارے فلموں میں شرکت کی تحریک ملے گی اور ہمارے بین الاقوامی فلمی میلوں کا وقار بڑھے گا۔

جہاں تک ہمارے بین الاقوامی فلمی میلوں میں مقابلہ سکیشن کی علیحدگی کا تعلق ہے۔ میرے خیال میں یہ تحریک قطعًا ناواجب اور بے بنیاد ہے اگر ہمارے یہاں مقابلہ سیکشن کی فلمیں کمزور آتی ہیں، اس کا ذمہ دار کون ہے، ہمارے ہدایت کار، غیر ملکی ہدایت کار یا ہمارے منتظمین۔ ظاہر ہے انگلی ہمارے فلم ڈائرکٹروں اور منتظمین پر بھی اٹھے گی۔ ضرورت اصلاح کی ہے۔ اس لیے ہمارے فلمی میلوں کو پُروقار بنانے کے لیے مقابلہ سیکشن بہت ضروری ہے۔ اس سے ہمارے فلمسازوں میں مقابلہ کا جذبہ پیدا ہوگا۔ انھیں خوب سے خوب تر کی جستجو کی تحریک ملے گی۔ اور ہماری فلم سازی تعداد اور معیار دونوں اعتبار سے بلند ہوگی۔ یہی نہیں بلکہ اس سے ہمارے ملک کا وقار بھی بڑھے گا۔

اگر ہمارے بین الاقوامی فلمی میلوں کے انعقاد کی تاریخیں جنوری کے بجائے اکتوبر نومبر میں کر دی جائیں تو زیادہ غیر ملکی فلم ساز اور ہدایت کار شریک ہو سکیں۔ اور جو ڈائرکٹر اپنی فلمیں بھیجنے سے رہ جاتے ہیں وہ بھی اس میں شریک ہو سکیں گے۔

آٹھویں بین الاقوامی فلمی میلے میں چند ایسی فلمیں بھی آئیں جو ہمارے ڈائرکٹروں، کہانی کاروں، کیمرہ مینوں، ایکٹروں اور فلم ایڈیٹروں کے علاوہ سنسر بورڈ کے لیے بھی چیلنج تھیں۔

جو قوم اپنا محاسبہ خود نہیں کر سکتی وہ کبھی ترقی نہیں کر سکتی۔ یہی نقطۂ نظر فرانسس کپولا نے اپنی فلم اپولو کلیپس ناؤ میں پیش کی۔ اس عمدہ اور صحت مند اور پُروقار فلم کے ڈائرکٹر کپولا نے ویت نام جنگ میں امریکیوں کی ناکامی کا بھرپور تجزیہ کیا تھا۔ فوٹو گراف اور ڈائرکشن کے اعتبار سے یہ فلم ہمارے کیمرہ مینوں اور ہدایت کاروں کے لیے ایک چنوتی تھی۔

یہاں چیکوسلواکیہ کی فلم سومرسن کا ذکر نہ کرنا سراسر ناانصافی ہوگی، اس میں ایک سائنس دان کے ذریعہ سائنس کی تخریب کاریوں کا جائزہ بڑے صحت مند انداز سے لیا گیا ہے یہ فلم اگرچہ ہر قسم کے چاٹ مصالحہ سے پُر تھی لیکن اس کے باوجود یہ ایک معنی میں پُروقار سائنسی فلم تھی۔ اس کی کہانی اور ہدایت کاری لاجواب تھی اور ہمارے ہدایت کاروں کے لیے چیلنج بھی۔

کہانی کے اعتبار سے برازیل کی فلم گاجن گوز ٹو فری ڈم۔ یوکے کی رچرڈ تھینگز۔ کیوبا کی ڈیتھ آف اے بیوروکریٹ۔ پولینڈ کی اے وومن اینڈ اے وومن۔ ناروے کی لوسی۔ روس کی اے سلیپ ان دی فیس اور میوزی لینڈ کی ڈاکٹر ولیمن ہمارے فلمی کہانی کاروں کے لیے واقعی چیلنج کی حیثیت رکھتی تھیں۔ ان فلموں میں جاپان سے ہجرت کرنے والے دبے کچلے عوام، سماجی ناانصافی، دفتری نظام میں پھیلی بدنظمی ایک ڈاکٹر کی فرض شناسی اور مویشیوں کے تئیں محبت کے جذبہ کو منفرد انداز سے پیش کیا تھا۔ ایسی ہی مؤثر اور دلکش کہانیاں ہمارے یہاں بھی پیش کیے جانے کی اشد ضرورت ہے۔

علاوہ ازیں ہمارے یہاں بننے والی انصاف کا ترازو ٹائپ کی فلم انڈونیشیا نے ولیج گرل پیش کی۔ اس فلم کو دیکھ کر یہ احساس ہوا کہ انڈونیشیا جیسا چھوٹا ملک بھی کتنی پُر اثر اور خوبصورت فلم پیش کر سکتا ہے۔ خاص طور پر فلم میں پولیس کے حکام پر جس بے باکی سے تازیانہ لگایا ہے اس پر ڈائرکٹر کو واقعی داد دینی پڑتی ہے۔ ہمارے یہاں تو پولیس والوں کو سرے سے یا تو بے وقوف سمجھا جاتا ہے یا فرض شناسی اور حب الوطنی کے جذبے میں سرشار نظر آتے ہیں۔ درمیان کی چیز تو ہم لوگ دکھاتے ہی نہیں۔ اگر کہیں دکھلانے کی کوشش کرتے ہیں تو سنسر کی قینچی آڑے آجاتی ہے لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انڈونیشیا کے فلم ڈائرکٹر ہمارے ہدایت کاروں کی بہ نسبت زیادہ بے باک ہیں۔

علاوہ ازیں مذکورہ فلموں میں ایک بات اور دیکھنے میں آئی کہ ان فلموں کی ایڈیٹنگ بہت چست تھی۔ ان میں کہیں بھی کوئی فریم غیر ضروری محسوس نہیں ہوتا اور نہ ہی ڈائرکٹ ناٹک ٹوٹیاں ہی مارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ غیر ضروری فلیش بیک سے احتراز کرتے ہوئے وہ سیدھی، براہ راست اور دل میں تیر کی طرح اتر جانے والی بات کرتے ہیں۔

ڈائرکشن، ایکشن اور فوٹو گرافی کے اعتبار سے پورے فیسٹیول پر جاپان کی فلم شوگن نوبنجا بھاری رہی۔ اس فلم کی سپر فاسٹ اور گھوڑ دوڑ جیسی رفتار ہی فلم کی جان تھی۔ جوڈو، کراٹے، گوریلا جنگ اور نہ جانے کس کس ایکشن سے اسٹنٹ مین یا ڈپلی کیٹ کے بغیر ایکشن کو کیمرہ میں بند کر دیا تھا۔ ہمارے ہدایت کاروں، اسٹنٹ مینوں، اور کیمرہ مینوں کے علاوہ ایکٹروں کے لیے بھی یہ فلم ایک چنوتی سے کم نہ تھی۔

جاپانی فلم شوگن نوبنجا کا ایک منظر

(بقیہ ص۱۸ پر)

جمیل احمد چشتی

ڈاکٹر مختار احمد انصاری

ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی پیدائش غازی پور ضلع کے مردم خیز موضع یوسف پور میں ۲۵ دسمبر ۱۸۸۰ء کو ایک معزز خاندان میں ہوئی۔ اس خاندان کے ایک بزرگ خواجہ سراج انصاری، سلطان محمد تغلق کے عہد میں غازی پور کے موضع برہر باری جس کا نیا نام محمد آباد قرار پایا کے قاضی مقرر ہوئے۔ انھوں نے اپنے بھتیجے اور داماد یوسف انصاری اور اپنے نام کی مناسبت سے قاضی پور سراج عرف یوسف پور آباد کیا۔

مختار احمد انصاری کے والد بزرگوار کا اسم گرامی حاجی عبدالرحمٰن انصاری تھا۔ مختار احمد کی ابتدائی تعلیم ان کے چچا شاہ عبدالغفور کی سرپرستی میں ہوئی۔ شاہ موصوف قادریہ چشتیہ سلسلے کے مشہور صوفی اور بزرگ شاہ عبدالعزیز کے خلیفہ تھے۔ شاہی خاندان کے حکما کا خاندان بشمول مسیح الملک حکیم اجمل خاں کے آبا و اجداد شاہ عبدالغفور کے مریدوں میں -

دینی اور ابتدائی تعلیم کے بعد مختار احمد کا داخلہ غازی پور میں سرسید کے قائم کردہ وکٹوریہ ہائی اسکول میں کرا دیا گیا۔ اسی اسکول سے انھوں نے میٹریکولیشن کا امتحان ۱۸۹۶ء میں پاس کیا۔ کالج کی تعلیم انھوں نے کوئنس کالج بنارس اور میور سنٹرل کالج الہ آباد سے حاصل کی۔ تعلیم کے دوران ان کا شمار اوسط درجے کے طالب علموں میں تھا۔ البتہ فوٹو گرافی سے شغف تھا اور اس فن میں دلچسپی رکھتے تھے۔ اسی دوران ۱۸۹۸ء میں ان کی شادی قاضی شکور الحق کی صاحب زادی شمس النسا بیگم سے ہوئی محترمہ حافظ قرآن تھیں، فارسی عربی اور علوم مشرقی نیز فقہ اور حدیث پر انھیں عبور حاصل تھا۔ شوہر کے ساتھ دہلی آنے پر بیگم انصاری کے نام سے مشہور ہوئیں۔ صحیح معنوں میں شریک حیات رہیں۔ گرچہ وہ پردہ دار خاتون تھیں لیکن قومی اور سماجی جلسے دریا گنج دہلی کے پردہ گارڈن میں خواتین کے کلب میں منعقد کرتیں۔ ۱۹۲۹ء میں انھوں نے اپنی چہیتی متبنیٰ بیٹی زہرہ بیگم جن کی عمر اس وقت دس سال کی تھی کے ہمراہ حج کا فرض ادا کیا۔ بیگم انصاری نے اپنے شوہر کے مصائب میں ہمیشہ ساتھ دیا بالآخر مختار احمد انصاری کے انتقال کے دو سال بعد ۱۹۳۸ء میں دہلی میں وفات پائی۔

مختار احمد انصاری کے دو بڑے بھائی ریاست حیدرآباد میں نظام کے معالج خصوصی کی حیثیت سے ملازم تھے۔ مختار احمد نے وہیں نظام کالج میں داخلہ لے لیا۔ اس کالج کے پرنسپل بلبل ہند سروجنی نائیڈو کے والد ڈاکٹر اگھور ناتھ چٹوپادھیائے تھے۔ یہیں سروجنی سے ملاقات ہوئی جو قدیم دوستی کی حیثیت سے تا حیات قائم رہی۔ مختار احمد ان کو احترام اور پیار سے تیلگو زبان کے لفظ "اوکا دہن" کے نام سے پکارتے۔ ۱۹۰۰ء میں مختار احمد نے گریجویٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ان کی قابلیت کے جوہر کھلے۔ حکومت نظام کے وظیفہ پر ۱۹۰۱ء میں طبی تعلیم کے لیے انگلستان پہنچے۔

ان ہی دنوں پنڈت موتی لال نہرو اپنے اہل و عیال کے ساتھ انگلستان تشریف لائے۔ ان کے سفر کی غایت جواہر لال نہرو کو انگلستان کے پبلک اسکول میں داخلہ دلانا تھی۔ اسی دوران مختار احمد انصاری کی ملاقات جواہر لال نہرو سے ڈربی ریس کے موقعوں پر ہوئی جس کا تذکرہ پنڈت نہرو نے دلچسپ انداز میں اپنی خود نوشتہ سوانح حیات میں کیا ہے۔

انگلستان میں مختار احمد انصاری کی صلاحیتوں کو جلا ملی، وہیں وہ انڈین میڈیکل ایسوسی ایشن کے سکریٹری پھر صدر منتخب ہوئے۔ طبی خدمات کے سلسلے میں وہ انگلستان میں گیارہ برسوں تک رہے۔

گرچہ انگلستان میں مختار احمد انصاری کا مزید قیام ممکن تھا۔ لیکن وطن کی خدمت کا جذبہ انھیں ۱۹۱۱ء میں ہندوستان واپس لایا۔ ان کو لاہور میڈیکل کالج کے پرنسپل کا عہدہ پیش کیا گیا جو اس زمانہ میں کسی ہندوستانی کے لیے بہت بڑا اعزاز تھا لیکن انھوں نے نجی طبی پریکٹس کو ترجیح دی۔ دہلی میں مطب قائم کیا اور بہت جلد بام عروج پر پہنچ گئے۔ لیکن ان کو پیشہ کی کامیابی سے زیادہ ملک کی خدمت کی لگن تھی۔ ۱۹۱۲ء میں طبی مشن لیکر ترکی گئے۔ جنگ بلقان میں اہم خدمات انجام دیں۔ ترکی کے سلطان نے وہاں کے سب سے بڑے اعزاز سے نوازا۔

واپسی کے فوراً بعد کانپور کے مچھلی بازار کی مسجد کی شہادت کا سانحہ ہوا۔ اس موقعہ پر ڈاکٹر انصاری نے ملک کے دیگر رہنماؤں کے ساتھ اہم کارنامہ انجام دیا۔ یہاں تک کہ مجروحین کا علاج کیا اور تیمارداری کی۔ اسی اثنا علی گڑھ یونیورسٹی کے مسائل درپیش آئے۔ قومی مفاد میں قوم کے رہنماؤں اور مشاہیر کا ایک وفد جس کے مختار احمد انصاری اہم رکن تھے شملہ میں ممبر برائے تعلیم سرہرکورٹ بٹلر سے ملا۔ یہ ملاقات قوم کے لیے مفید ثابت ہوئی۔ قومی مصروفیتوں کے باوجود اپنے طبی پیشہ میں سرگرم رہے۔ ملک کے کامیاب ترین معالج ثابت ہوئے۔ صاحب استطاعت امرا، نوابوں راجہ مہاراجاؤں سے وہ کافی بڑی فیس لیتے۔ لیکن نادار اور حاجتمند مریضوں کا علاج نہ صرف مفت کرتے بلکہ دواؤں کی قیمت اپنی جیب سے ادا کرتے۔

مختار احمد انصاری نے لکھنؤ کے لیگ کانگریس پیکٹ کے سلسلے میں اہم رول ادا کیا۔ ہندو مسلم اتحاد کے وہ اہم ستون بنے۔ تحریک خلافت اور ملک کی آزادی کی حمایت میں پرزور تقریریں کیں۔

جنگ عظیم کے بعد رولٹ ایکٹ کے خلاف گاندھی جی نے جو کانگریس کے اہم رہنماؤں کی میٹنگ کی وہ انکے مکان دارالسلام میں منعقد ہوئی۔ تحریک خلافت کو عوامی تحریک بنانے کے لیے مہاتما گاندھی نے جو فیصلہ کیا اس میں بھی ڈاکٹر صاحب کے اثرات کا دخل تھا۔ اس وقت ڈاکٹر انصاری ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار اس کا مل قرار دیئے گئے ڈاکٹر انصاری کے ذریعہ فراہم کی ہوئی مالی معاونت سے ایک مشن حج کے موقعہ پر ہندوستان کی آزادی کی حمایت کے لیے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ بھیجا گیا۔ اس سلسلہ میں سی آئی ۔ڈی ۔کی رپورٹ پر ڈاکٹر انصاری کی باز پرس حکومت نے کی۔ خلافت کی حمایت میں ایک وفد جس میں آغا خاں بھی شامل تے مختار احمد انصاری کی معیت میں انگلستان گیا جسنے لائڈ جارج سے بھی ملاقات کی۔ گرچہ اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا لیکن مختار احمد انصاری نے انتہائی رازداری سے انگریزی حکومت کی چالبازیوں کی مذمت کی۔

دہلی میں قومی تحریک کے اس رہبر پر جب مقدمہ چلایا گیا اور اس پر وقار شخصیت کو عدالت کے روبرو پیش کیا گیا تو بھری عدالت میں سبھی موجود لوگ تعظیماً کھڑے ہوگئے جس میں اینگلو انڈین مجسٹریٹ بھی شامل تھا۔ انگریز چیف کمشنر یہ منظر دیکھ کر چراغ پا ہوگیا اور غصہ میں چلایا "بیٹھ جاؤ۔ یہ سب (ڈاکٹر انصاری اور ان کے رفقاء) مجرم ہیں"۔ اسیری کے دوران وہ خفیہ رقعہ بھیج کر جو کچھ گھر میں اخراجات کے لیے پسماندہ تھا اس کو قومی تحریک کو جاری رکھنے کے لیے خرچ کرنے کے لیے لکھتے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کا ادارہ گرچہ قبل قائم ہو چکا تھا لیکن اس کو موجودہ شکل دینے اور قائم رکھنے کے لیے وہ کثیر قوم اپنے اثرات سے اکٹھا کرتے اور خود زیادہ سے زیادہ مالی اعانت خود کرتے۔ جو رقم وہ خود اس ادارہ کو عطا کرتے وہ کبھی ڈھائی ہزار سے کم نہ ہوتی۔ ان کے اثرات سے رابندر ناتھ ٹیگور، مہاتما گاندھی، خالدہ ادیب خانم جیسی اہم شخصیتیں اس ادارہ میں تشریف لائیں۔ اس زمانہ میں بغیر حکومت کی مدد کے اس معیار کا ادارہ چلانا آسان نہ تھا۔ جامعہ ملیہ اور قوم ہمیشہ ان کے لیے ڈاکٹر انصاری کی مرہون منت رہے گی۔

مختار احمد انصاری نے عالمی سیاست میں بھی اپنا مقام بنا لیا تھا۔ ۱۹۲۳ میں وہ اپنے بھتیجے شوکت اللہ انصاری کو طبی تعلیم کے لیے داخل کرانے پیرس گئے۔ اس وقت بھی قومی مفاد کو پیش نظر رکھا۔ وہیں جنرل نادر خاں جو بعد میں امیر افغانستان ہوئے اور مشہور انقلابی برکت اللہ بھوپالی وغیرہ سے ملے اور تبادلہ خیال کیا۔ یہی نہیں ہر طبقہ کے لوگوں کو ان پر اتنا اعتبار تھا کہ وہ ۱۹۲۶ میں ریاست بھوپال کی وراثت کے قضیہ میں انگلستان گئے جس کا فیصلہ بالآخر بیدار مغز نواب حمید اللہ خاں کے حق میں ہوا۔

مہاتما گاندھی کو مختار احمد انصاری اتنے عزیز تھے کہ ۱۹۳۳ میں جب گاندھی جی اکیس روز کا روزہ رکھا اور ان کی حالت ابتر ہونے لگی تو انھوں

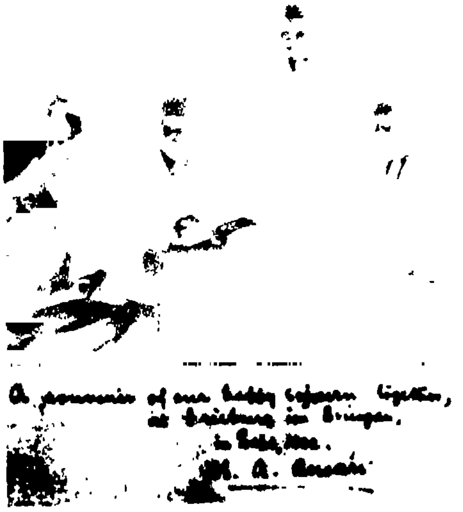

نے خواہش ظاہر کی کہ وہ اپنے بھائی (مختار احمد) کی گود میں آخری سانس لینا چاہتے ہیں۔

قوم اور ملک کے وہ معالج فرور تے لیکن مشغول اور سخت زندگی نے ان کی صحت پر برا اثر ڈالا۔ ۱۹۳۴ ہی میں بغرض علاج یورپ تشریف لے گئے۔ وہاں بھی مصروفیت جاری رکھی اپنی مشہور کتاب Regeneration of Man وہیں مکمل کی۔ دوران قیام اس وقت کے عالمی شہرت کے ڈاکٹر وارونوف اور ڈاکٹر شائنوخ SAYNOCH جیسے رابطہ کیا۔ جو ڈاکٹر انصاری سے اس قدر متاثر ہوئے کہ سرجری کے نئے طریقوں کی ایجاد میں ڈاکٹر انصاری ان کے معاون ہوئے۔

صحت کی خرابی کے باعث انھوں نے کانگریس کے عہدوں سے دستبرداری حاصل کرلی حتی کہ اپریل ۱۹۳۵ میں انھوں نے کانگریس کے پارلیمانی بورڈ سے بھی استعفاء دے دیا۔ لیکن کانگریس کی مجلس عاملہ سے وابستہ ہے گاندھی جی سے ان کا تعلق بدستور جاری رہا۔

۱۹۳۶ میں لکھنؤ کانگریس کا اجلاس جواہر لال نہرو کی صدارت میں منعقد ہوا اسمیں مختار احمد انصاری شریک تھے۔ اس قسم کے جلسے میں یہ ان کی آخری شرکت تھی

اس کے بعد ہی نواب رامپور جو مسوری میں علیل تھے کے بلاوے اور اصرار پر بحیثیت معالج مسوری گئے۔ طبی مصروفیات کے بعد وہ مختلف تقریبات میں شریک ہوئے۔ بظاہر وہ خوش وخرم نظر آرہے تھے لیکن ان کی طبیعت پر بار تھا۔ دہرہ دون سے بذریعہ ریل دہلی کے لیے روانہ ہوئے۔ ٹرین میں ۲ بجے شب کے قریب لکسر اسٹیشن کے بعد ان کی طبیعت بگڑی۔ ان کا اتنا سخت حملہ ہوا۔ ان کا ملازم جوان کے ساتھ تھا اپنے آقا کو آبل نائٹریٹ سنگھائی لیکن اس کا اثر نہ ہوا۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری اپنے وفادار ملازم کی باہوں میں جاں بحق ہوگئے یہ سانحہ ۱۰ مئی ۱۹۳۶ کو پیش آیا۔ صبح ساری دہلی اسٹیشن پر ان کے جسد خاکی کے دیدار کے لیے جمع تھی۔ سارا ملک ماتم کدہ بن گیا۔ آخری رسوم دارالسلام میں ادا کی گئیں۔ ڈاکٹر انصاری کی تدفین جامعہ ملیہ اوکھلا کے احاطہ میں کی گئی۔

پولیس اور عوام کا رشتہ

ڈی۔ این۔ کول

پولیس کے لفظ کی ابتدا یونانی لفظ (POLIS) سے ہوئی۔ پولیس یونانی زبان میں قصبہ کو کہتے ہیں۔ پولیس کے معنی شروع میں کسی قصبے یا شہر کے سماجی نظم و نسق کے مترادف رہے۔ ساتھ ہی ساتھ لاطینی لفظ (POLITIA) پولیٹیا کے معنی صفائی کرنا ہے۔ یہ مفہوم بھی پولیس کے ساتھ وابستہ ہوگیا۔ گویا پولیس کے افراد ایک حد تک سماج کو پاک وصاف رکھنے کے ذمہ دار گردانے گئے۔ وقت گذرنے کے ساتھ پولیس کا کام جرائم کی روک تھام اور سرزد ہوئے جرائم کی تفتیش اور مجرموں کی گرفتاری بھی قرار پایا۔ اس کے ساتھ ساتھ شہری زندگی میں امن وامان اور نظم وضبط قائم رکھنا بھی پولیس کے فرائض میں شامل ہوا۔ ٹریفک کے اضافہ کے ساتھ شہروں اور قصبوں کی شاہ راہوں پر ٹریفک بباقاعدگی رکھنا بھی پولیس کے فرائض میں گردانا گیا۔ اس طرح سے پولیس ملک کے انتظامی ڈھانچے کا ایک اہم جزبن گئی۔ اور کسی ملک یا حکومت کے لیے ایک قابل اور ایماندار پولیس فورس کا ہونا ناگزیر ہوگیا۔ جب تک عام روزمرہ کی زندگی جرائم پیشہ لوگوں، غیر سماجی حرکات اور دست برد سے محفوظ نہیں رہتی سماجی زندگی ناممکن ہوکر رہے گی۔ اسی پس منظر میں ایک امریکی مفکر نے کہا ہے کہ پولیس ایک آہنی قالب ہے جو کسی سماج کے آتش گیر مادہ کو مہر بند کر کے اس کو پھٹنے سے روکتا ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ہر سوسائٹی میں لوگوں کا ایک ایسا عنصر ہوتا ہے جو انتشار اور افراتفری میں اپنا فائدہ سمجھتا ہے۔ ایسے افراد کا نظریہ ہی اس قسم کا ہوتا ہے کہ بقول ان کے سوسائٹی کا عام طور پر اور پسماندہ طبقوں کا خاص طور پر فائدہ اسی میں ہو سکتا ہے کہ موجودہ نظام کو درہم برہم کیا جائے۔ تاکہ انتشار اور برہمی کے ماحول سے ان کے نظریے کے مطابق ایک زیادہ منصفانہ نظام قائم کیا جائے۔ چنانچہ اسی قسم کے سیاسی اور تخریبی عناصر کو سوسائٹی کا آتش گیر مادہ تصور کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اگر قالب جس میں یہ مادہ نشوونما پاتا ہے مضبوط نہ ہو تو عین ممکن ہے کہ مادہ پھٹ کر قالب ہی کو پاش پاش کردے۔ لہٰذا اگر پولیس فورس جو قالب کا کام کرتی ہے مضبوط، قابل اور پائیدار نہ ہو تو سوسائٹی کے درہم برہم اور منتشر ہونے کا خطرہ ہر وقت لاحق ہو سکتا ہے۔ بقول امریکی مفکر جس کا تذکرہ اوپر آچکا ہے 'اگر انیسویں صدی میں امریکی پولیس قابل فرض شناس اور مضبوط ہوتی تو عین ممکن ہے کہ امریکی خانہ جنگی اس قدر نہ پھیلتی اور نہ ہی اتنی خطرناک صورت اختیار کرتی۔

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ کسی ملک کی پولیس فورس اس ملک کے عوام کے عملی تعاون کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ پولیس کا کام لوگوں کی حفاظت کرنا ہے اور سماج دشمن عناصر کو قابو میں رکھ کر ان کو تخریبی حرکات سے باز رکھنا ہے۔ اگر عوام الناس کا اس اہم فرض کی انجام دہی میں عملی تعاون حاصل نہ ہو تو پولیس خواہ کتنے ہی قابل افسروں پر مشتمل ہو کامیاب نہیں ہو سکتی۔ برطانیہ کی پولیس دنیا کی بہترین پولیس میں شمار کی جاتی ہے اس لیے کہ وہ سوچتی ہے کہ پولیس کا ملازم ایک وردی پوش شہری ہے حاکم نہیں۔ اور جہاں تک برطانیہ کے حالات کا تعلق ہے حقیقت بھی ہے۔ لہٰذا پولیس کے عملے کی کوشش یہی ہونی چاہیئے کہ وہ لوگوں کا تعاون حاصل کرے اور جس قدر ممکن ہو ہر دلعزیز بنے۔

پولیس کو امن وامان قائم رکھنے کے علاوہ ملک میں رائج قوانین کو نافذ کرنا ہوتا ہے۔ خاصکر وہ قوانین جو تعزیری نوعیت کے ہوں۔ قوانین

تعداد میں قدرے زیادہ ہوتی ہے کہ ایک شہری کتنا ہی قانون کا پابند کیوں نہ ہو ضرور کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی وقت کسی قانون کی نادانستہ طور پر خلاف ورزی کر بیٹھتا ہے۔ مثلاً جلدی میں سائیکل کو بلا روشنی چلاتا ہے یا موٹر گاڑی کو معین شدہ رفتار سے زیادہ تیز چلاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ حالانکہ اس نوعیت کی خلاف ورزیاں اخلاقی طور پر ایسے جرائم نہیں جیسے چوری یا دھوکہ بازی لیکن پھر بھی خلاف ورزیاں تو ہیں ہی اس لیے پولیس کا فرض ہو جاتا ہے کہ ان کے خلاف قانونی کاروائی کرے۔ مطلب یہ ہے کہ پولیس کے روزمرہ کام کاج میں ایسے فرائض بھی شامل ہیں جن کا بروئے کار لانا نہایت ہی ناخوشگوار ہے اور عوام پولیس سے بدظن ہو جاتے ہیں۔ سماجی دفاع کا تقاضا ہے کہ ہر شہری اپنی آزادی گفتار اور عمل کو کسی حد تک روکے تاکہ دوسرے شہری کی آزادی میں مخل نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ ایک روشن خیال شہری بھی اپنی آزادی کا کچھ حصہ ترک کرنے پر رضامند نہیں ہوتا۔ لندن کا ایک قصہ اس ضمن میں مشہور ہے۔ وہ یوں ہے کہ ایک آدمی صبح سویرے سیر کو جایا کرتا تھا اور سیر کرتے کرتے اپنے بازو ذرا زور سے ہلا ہلا کر چلتا تھا۔ ایک دن اس کا زور سے ہلتا ہوا ہاتھ ایک راہگیر کی ناک پر لگا۔ اس نے اس آدمی پر عدالت میں مقدمہ کیا۔ مقدمے کے دوران سیر کرنے والے نے عدالت سے پوچھا کہ کیا آزاد ملک میں اسکو بازو زور زور سے ہلا کر چلنے کا حق نہیں ہے؟ عدالت نے جواب دیا جی ہاں آپ کو حق ہے۔ لیکن آپ کا بازو اس بلندی تک نہیں پہنچنا چاہیئے جہاں کسی راہگیر کی ناک شروع ہوتی ہے۔ اس امر کے پیش نظر یہ ضروری ہے کہ سوسائٹی کے خوش اسلوبی سے قائم رہنے کے لیے ہر ایک شہری کو اپنی قطعی آزادی پر کچھ حد تک روک لگانا اور اس کو زیر قابو رکھنا ضروری ہے۔ اور چونکہ پولیس کا فرض ہے کہ ہر ایک شہری سے ایسا کرائے تو ظاہر ہے کہ پولیس ہر دلعزیز نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا بجائے اسکے کہ ان اقدام کا جائزہ لیا جائے جو پولیس اور عوام کو ایک دوسرے سے قریب لائیں۔ یہ امر تسلیم کرنے کی اشد ضرورت ہے کہ پولیس کو سو فیصدی پسندیدہ نگاہوں سے کبھی نہ دیکھا جائے گا اور بیشتر لوگ اس کو ایک ضروری برائی 'NECESSARY EVIL' ہی سمجھتے رہیں گے۔ دنیا کے کسی بھی ملک میں پولیس اور عوام کا رشتہ مثالی اور بالکل خاطر خواہ نہیں اور نہ ہی ایسا ہو سکتا ہے کیونکہ پولیس کا کام اور اس کی نوعیت ہی ایسی ہے کہ عوام اس کو اپنی آزادی کامل کے عمل میں رکاوٹ ڈالنے کی ایجنسی تصور کرتے ہیں۔

بایں ہمہ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے پولیس اور عوام کے رشتے کو جو ہمارے ملک میں نہایت ہی خراب ہے، بہتر بنانے کی اشد ضرورت ہے تاکہ سماجی دفاع کا کام زیادہ خوش اسلوبی سے سرانجام دیا جا سکے۔ اور جہاں پولیس کو اپنے فرائض کی انجام دہی میں سہولت ہو وہاں عوام الناس بھی اس فورس سے خوفزدہ ہونے کے برعکس ہر پولیس افسر اور ملازم کو اپنا رفیق محافظ اور دوست تصور کریں۔

اوپر بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ پولیس کے فرائض ہی کچھ اس قسم اور نوعیت کے ہیں کہ ان کی انجام دہی میں سوسائٹی کا بیشتر حصہ ان سے بدظن ہو کر ان کے خلاف ہو جاتا ہے۔ یہ ایک قسم کا BUILT IN یعنی پولیس تنظیم کی ساخت اور کام کاج کا ناقابل تنسیخ حصہ ہے۔ لہٰذا پولیس کو عوام الناس کے قریب تر لیجانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے کام کاج کا دائرہ جرائم کی روک تھام اور قوانین کے نافذ کرنے سے اور وسیع تر بنایا جائے اور اس کو عوام الناس کے لیے ایک ہمہ گیر فلاحی تنظیم بنایا جائے جو ایک عام شہری کے لیے اس کی روزمرہ کی زندگی کو آسان بنانے میں مددگار ثابت ہو۔ مطلب یہ ہے کہ جہاں قوانین کو نافذ کرنے سے اور سماجی دفاع برقرار رکھنے سے لوگ بدظن ہو جائیں اور پولیس سے نفرت کریں، وہاں پولیس کے باقی کام سے جو فلاحی قسم کے ہوں گے، ان کے حق میں ہو جائیں گے۔ چنانچہ جاپان میں ایسا ہی کیا گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جاپان کی پولیس کے مقابلے میں دنیا کے کسی بھی ملک کی پولیس اس قدر عوام سے قریب اور ان میں ہر دلعزیز نہیں ہے۔ جاپان میں ہر ایک پولیس کے تھانے کے ساتھ اس کے حدود کی آبادی سے کچھ لوگوں کو چن کر جرائم کی روک تھام کے لیے ASSOCIATION کی صورت میں وابستہ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ پولیس کے ملازم اور ایسوسی ایشن کے چند افراد باری باری تھانے کے حدود میں رہنے والے ہر مالک مکان سے ملتے رہتے ہیں۔ اور اس کی مشکلات دریافت کر کے ان کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ مالک مکان کو صلاح مشورہ دیتے ہیں کہ کس طرح سے وہ اپنے مکان کو جرائم پیشہ لوگوں سے محفوظ کرے۔

یہاں پولیس لوگوں کو موٹر گاڑیاں یا گھریلو اشیاء کی مرمت اور انھیں حاصل کرنے میں مدد دیتی ہے۔ گویا زندگی کے بیشتر پہلوؤں میں ایک شہری پولیس کی مدد طلب کرتا ہے اور وہ اس کو دی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح سے ایک عام اور ہمہ گیر فلاحی تنظیم ہونے کے ناطے پولس عوام سے قریب تر ہو کر ان کی خوشنودی حاصل کرتی رہے گی۔ ان تمام باتوں کا تذکرہ پروفیسر بیلی Prof. BAILEY کی مشہور کتاب FORCES OF ORDER میں درج ہے۔ پروفیسر بیلی امریکہ کی ایک مشہور یونیورسٹی میں پولیس نظم و نسق کے استاد ہیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ جاپان میں ایک پولیس کا سپاہی وہی عزت اور خوشنودی پاتا ہے جو ایک ڈاک رساں کو دی جاتی ہے کیونکہ پولیس خود لوگوں کے گھروں پر جا کر دستک دے کر ان کی خیریت پوچھتی ہے اور ان کو گوناگوں مشکلات حل کرنے کی سعی کرتی ہے۔ برعکس اس کے امریکہ میں پولیس کے سپاہی کو فائرمین (FIRE MAN) کی طرح گردانا جاتا ہے جس کو صرف مصیبت کے وقت مجبوراً طلب کیا جاتا ہے۔ چنانچہ بحیثیت انسپکٹر جنرل پولیس جموں و کشمیر میں نے کرایم روکنے کی ایسوسی ایشن CRIME PREVENTION ASSOCIATION کا قیام عمل میں لایا۔ اور ہدایت دی کہ ہر تھانے کا عملہ

ان افراد کو لے کر گھر گھر جا کر لوگوں کے مکانات کا مشاہدہ کر کے ان کو چوروں اور نقب زنوں کی دست درازی کے امکانات کو کم کرنے کے لیے مناسب ہدایات دے۔ اور ان اقدامات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے لوگوں کی مدد کرے۔ اس ایک قدم سے عوام میں پولیس کے لیے عزت اور ہر دلعزیزی بڑھ گئی اور مقامی اخبارات اور خطوط کے ذریعے اس قدم کی تعریف کی گئی۔ چنانچہ میں نے قومی پولیس کمیشن کو بھی ایک مقالہ بھیجا جس میں تلقین کی گئی کہ وہ اپنی سفارشات کرتے وقت اس بات کا خیال رکھے کہ پولیس کے کام کا دائرہ وسیع کر کے ایک ہمہ گیر فلاحی تنظیم بنائی جائے جیسے کہ جاپان میں ہے پولیس کمیشن کی سفارشات ابھی منظرِ عام پر نہیں آئی ہیں۔ مگر مجھے امید ہے کہ انھوں نے اس قسم کی سفارش ضرور کی ہوگی۔

ہندوستان میں پولیس کی بدنامی اور لوگوں سے دوری کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ اس ملک میں آزادی سے لے کر آج تک پولیس کے کام میں سیاسی مداخلت بھی ہوتی آئی ہے اور اس تنظیم کو سیاسی اغراض و مقاصد کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے۔ جس کے نتیجہ میں یہ ہوتا آیا ہے کہ حکمراں سیاسی گروہ کی مخالف تمام تر سیاسی جماعتیں پولیس کے خلاف ہو جاتی ہیں۔ حالانکہ پولیس کا اس میں کوئی قصور نہیں ہوتا۔ یہ بات ہر شخص کی دانست میں ہے کہ اکثر موقعوں اور مقامات پر پولیس کا غلط استعمال ہوا اور اس فورس کو ایسے مسائل میں استعمال کیا گیا جس کے ساتھ پولیس کا دور کا واسطہ بھی نہ تھا۔ لہٰذا عوام اور پولیس کو قریب تر لانے کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ اس فورس کو ہر طور سے غلط استعمال سے بچایا جائے۔ چنانچہ جاپان کی مثال کے پیشِ نظر قومی پولیس کمیشن نے سفارش کی ہے کہ ہر ریاست میں پولیس فورس کی دیکھ بھال کے لیے ایک تحفظ کمیٹی PUBLIC SECURITY COMMITTEE کا تقرر عمل میں لایا جائے۔ اور اس کمیٹی کے ممبران کا انتخاب تمام سیاسی جماعتوں اور دانشوروں میں سے چن کر کیا جائے۔ یہ سفارش جس کی تفاصیل ابھی منظرِ عام پر نہیں آئی ہیں بالکل صحیح ہے اور اگر اس پر عمل کیا گیا تو پولیس کی کارکردگی اس قدر غیر جانبدار اور سیاسی جماعتوں کے اثر سے بالاتر ہو جائیگی کہ ہر فرد بشر خواہ وہ کسی بھی سیاسی جماعت سے تعلق رکھتا ہو۔ پولیس کی امداد پر بھروسہ اور اعتماد رکھے گا۔

ان اقدام کے علاوہ حکومت اور بھی کئی اقدامات کر سکتی ہے جن سے پولیس کے کام کاج میں بہتری اور ان کی شہرت اور ایمانداری میں نمایاں فرق آ سکتا ہے اور وہ لوگوں کے قریب تر آ سکتی ہے۔ یہ اقدامات ذیل میں درج ہے:

(۱) پولیس کا کمترین ملازم کانسٹیبل ہے اور اس کا تعلق عوام کی روزمرہ کی زندگی سے رہتا ہے۔ چاہے وہ بیٹ ڈیوٹی دیتا ہو یا ٹریفک پر مامور ہو یا تفتیش مقدمات میں اپنے بالاتر افسر کی مدد کرتا ہو۔ پولیس کی بیشتر بدنامی اسی عہدے کے ملازموں کی بدعنوانیوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ کانسٹبل عام طور پر بے زمین اور بے روزگار دیہاتیوں سے بھرتی کیے جاتے ہیں اور سال بھر کی ٹریننگ کے بعد انھیں تھانوں میں تعینات کیا جاتا ہے۔ ان میں سے اکثر افراد کا رویہ لوگوں کے تئیں حقارت آمیز اور تحکمانہ ہو جاتا ہے جس سے لوگ تمام محکمے سے بدظن ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ کانسٹبلوں کی تنخواہ میں خاطر خواہ اضافہ کر کے اس درجے کے عہدیداروں کو پڑھے لکھے طبقات سے بھرتی کر کے ان کی ٹریننگ کم از کم تین سال تک جاری رکھی جائے تاکہ ان کو پولیس کے قانونی اور دیگر امور کے علاوہ سماجی مسائل اور نفسیات سے بھی بہرہ ور کیا جائے تاکہ یہ لوگ عام لوگوں کے جذبات اور احساسات سے واقفیت حاصل کر کے ان کی قدر کرنا سیکھیں۔ بلکہ قومی پولیس کمیشن کی پہلی رپورٹ پولیس کانسٹبلوں کی بھرتی، ٹریننگ، تنخواہ رہائش کے لیے مکانات اور ان کی تربیت کے لیے وقف کی جائے۔

(۲) اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ پولیس کے بالاتر افسروں کو یہ بات ذہن نشین کرائی جائے کہ وہ کانسٹبل اور دیگر کم رتبہ ملازموں سے نہایت تہذیب اور شائستگی سے پیش آئیں۔ تاکہ ان میں ان کی اہمیت اور رتبے کا احساس ہو۔ اس وقت کانسٹیبل کو ایک بے دماغ اطاعت کا آلہ OBEDIENT ROBOT تصور کیا جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ ملازم احساس کمتری کے شدید شکار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اور نفسیاتی طور پر اس کی تلافی عام لوگوں کے ساتھ سختی برت کے کرتے ہیں علم نفسیات کا کوئی بھی ماہر تسلیم کرے گا کہ جو شخص احساس کمتری میں مبتلا ہو اور جس کو یہ باور ہو کہ وہ ایک حقیر ملازم ہے جسے اپنے افسر حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہیں وہ اپنے فرائض کی انجام دہی ضرورت سے زیادہ سختی برت کر اور لوگوں پر افسری ظاہر کر کے کرے گا۔ لہٰذا اعلا افسروں کو ایک ذہنی تبدیلی عمل میں لانا ہوگی اور انھیں کمزور ملازموں کے ساتھ برتاؤ اور سلوک میں نرمی اور ہمدردی سے کام لینا ہوگا۔ اس سے کانسٹیبل طبقہ کے چلن اور برتاؤ میں ناقابلِ اعتبار تبدیلی رونما ہوگی اور عوام اور پولیس کا باہمی رشتہ بہتری کی طرف مائل ہوگا۔ درحقیقت جب کانسٹبل کی تنخواہ اور تعلیم میں بہتری آئیگی تو یقینی ہے کہ محکمہ کے اعلیٰ آفیسر اس رتبہ کے ملازمین کے تئیں اچھا برتاؤ اور سلوک کریں گے۔

تنخواہ اور تعلیم کا معیار بڑھنے کے ساتھ ساتھ رشوت ستانی جو نہ صرف پولیس بلکہ بعض دوسرے سرکاری محکموں کا داغ بدنامی بن کے رہ گئی ہے، میں بھی کافی کمی ہوگی۔ اور اس کے ساتھ عوام بھی پولیس کو اچھی اور حوصلہ افزا نگاہ سے دیکھیں گے۔

(۳) بعض حلقوں کی یہ رائے ہے کہ مستقبل میں پولیس کے ملازم اوائل عمر میں ہی ملازمت میں لیے جائیں اور انھیں پولیس کالج یا اسکول میں کم از کم چھ سال کے لیے تربیت دی جائے تاکہ ان کے ذہنی اور سماجی رجحانات کو خاطر خواہ اور عوام دوست راہوں پر لایا جائے۔ یہ صحیح ہے کہ کسی ملک کو ویسی ہی حکومت ملتی ہے جس کا وہ حقدار ہو۔ انگریز مفکر

کارلائل CARLYLE نے کہا تھا۔ اسی طرح ایک ملک کو وہی پولیس فورس ملے گی جس کا کہ وہ حقدار ہو۔ کیونکہ پولیس کا عملہ عوام الناس سے ہی چنا جاتا ہے۔ لہٰذا لوگوں کی کوتاہیاں اور برائیاں پولیس فورس میں داخل ہو جائیں گی لیکن اگر آئندہ کے ملازموں کو اوائل عمر میں ہی جبکہ سماجی برائیاں ان میں سرایت نہ کر گئی ہوں منتخب کر کے ان کو اچھے خاصے عرصہ کے لیے تربیت دی جائے تو ان کے رجحانات بدل جائیں گے، اور ان کی CONDITIONING یعنی طبیعت کا جھکاؤ ہی مختلف ہو جائے گا مگر اس قسم کا پروگرام روبہ عمل لانا شاید ابھی ممکن نہ ہو۔ لیکن جوں جوں عوام کے طریق کار اور غور و فکر کی سطح بڑھتی چلی جائے گی۔ اسی قدر پولیس کے عملے کا برتاؤ اور سلوک بھی تسلی بخش ہوتا جائے گا۔

بھاگلپور کے حالیہ واقعات کا ردعمل سارے ملک میں ہوا ہے۔ پولیس پر جو الزامات لگائے گئے ہیں وہ یقیناً بڑے سنگین ہیں لیکن اخبارات میں یہ خبر بھی شائع ہوئی ہے کہ عوام نے پولیس کی حمایت میں مظاہرہ کیا ہے۔ یہ مسائل ایسے ہیں جو ہمیں سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔

شری رستم جی RUSTAM JI جو پولیس کمیشن کے ممبر ہیں نے اپنے ایک حالیہ مقالہ میں صحیح اور بجا لکھا ہے کہ پولیس کا عملہ ایک عجیب ذہنی کشمکش میں مبتلا ہے۔ ایک طرف سے گورنمنٹ خاص کر وزرا ان پر زور دیتے ہیں کہ وہ جرائم کی تعداد اور شدت میں کمی کریں۔ عوام بھی اسی طرح پولیس کے درپے ہیں کہ وہ کسی طرح سے ان کو جرائم پیشہ افراد سے نجات دلائیں تاکہ وہ آرام کی نیند سو سکیں۔ اب پولیس کا ایک ملازم جس کو اپنی ملازمت عزیز ہے اور جو سمجھتا ہے کہ اس کو حکومت لوگوں اور اعلا افسروں کو خوش رکھنا ضروری ہے اس بات پر آمادہ ہو جاتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح مجرموں کو ناکارہ بنا دے تاکہ آئے دن شدید نوعیت کے جرائم واقع نہ ہوں۔ اب جہاں تک ہمارے قوانین کا تعلق ہے وہ ہم نے انگریزی قوانین سے استفادہ کر کے بنائے ہیں۔ یہ بات ضابطہ فوجداری پر زیادہ صادق آتی ہے ظاہر ہے کہ انگریز قوم دنیا کی ایک ترقی یافتہ قوم ہے اور تعلیمی اور سماجی لحاظ سے قابل فخر ہے۔ وہ فوجداری اور شہادت کے قوانین کو مجرموں کے حق میں رکھ سکتے ہیں ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اس ملک میں ابھی جہالت اور پسماندگی کافی حد تک موجود ہے اور عام لوگ شاذ و نادر ہی عدالت میں گواہی دینے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ بلکہ اگر دیتے بھی ہیں تو استغاثہ کے خلاف حالانکہ تفتیش کے دوران انھوں نے استغاثہ کی کہانی کے ساتھ اتفاق کیا ہوتا ہے۔ ہمارے قانون شہادت کے تحت پولیس کے سامنے اقبال جرم ناقابل ادخال شہادت ہے۔

ان پیدا بادٔ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پولیس کے ادنیٰ ملازم اس کی تاب نہ لاکر جرائم کی روک تھام اور مجرموں کا قلع قمع کرنے کے لیے لاقانونیت پر اکثر اتر آتے ہیں۔ آنکھیں نکالنا تو اس قسم کی کارروائی کی ذلیل ترین مثال ہے۔ لیکن اور بھی غیر قانونی حرکات ہوتی ہیں جو منظر عام پر نہیں آتیں۔ اس قسم کی کارکردگی پولیس کی بدنامی کی سب سے بڑی وجہ ہے۔

لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے سائنسدان / ممبران پارلیمنٹ اور قانون ساز ادارے اس صورت حال پر ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کریں اور دنیا کو متاثر کرنے کے لیے جمہوری قدروں کو اچھالتے وقت اس بات کو بھی ملحوظ خاطر رکھیں کہ اس پسماندہ ملک میں ابھی شدید جرائم سماجی اور اقتصادی وجوہات ہی سے سرزد ہوتے ہیں اور اس لیے قوانین اس طرح مرتب کیے جائیں کہ ایک تو سماج مجرموں سے محفوظ رہے اور دوسرے پولیس کو غیر قانونی ذرائع استعمال نہ کرنا پڑیں۔ یہ اس ملک کے تعزیری قوانین کی نوعیت اور طویل عدالتی کارروائی کا نتیجہ ہے کہ بسا اوقات لوگ خود ہی ایکسیڈنٹ کرنے والے ڈرائیور کو موقع پر ہی پیٹتے ہیں یا ہلاک کر دیتے ہیں۔ حال ہی میں ایک ریل کا سارق جس کو پولیس نے گرفتار کیا تھا پولیس حراست سے چھڑایا گیا اور ریل مسافروں نے اس کو پولیس کی موجودگی میں ہلاک کیا۔ اس واقعہ میں بھی یہی اندیشہ کارفرما تھا کہ پولیس کی لمبی تفتیش اور بعد میں عدالتی کارروائی اس قدر طول پکڑے گی کہ ملزم کو کبھی سزا نہیں ہوگی۔ بلکہ ضمانت پر آزاد ہو کر وہ پھر اسی نوعیت کے جرائم کرے گا اس سے صاف ظاہر ہے کہ عوام کا اعتبار تعزیری قوانین پر سے اٹھ گیا ہے۔ کیونکہ قانون فیصلہ کرنے اور سزا دینے میں بہت دیر لگاتا ہے۔ اسی لیے عوام پولس کی لاقانونیت کے خلاف ردعمل کا اظہار نہیں کرتے۔ مطلب یہ ہے کہ پولس کی گئی بدعنوانیاں قانون کی کوتاہیوں کا نتیجہ ہیں۔ اور جب لاقانونیت طریق کار کا جز بن جائے تو آدمی کی سوچ کج ہو کر غلط راستے اختیار کرتی ہے۔

لہٰذا پولیس کی شہرت اور اس کی کارکردگی کو خوش اسلوب اور عوام دوست بنانے کے لیے ناگزیر ہے کہ تعزیری قوانین پر نظر ثانی کی جائے۔ اور پولیس کو ان حالات اور ان ذہنی دباؤ سے بچایا جائے جن کے پیش نظر وہ غلط کام کرنے پر آمادہ ہوتی ہے۔ یہی رستم جی صاحب کے مقالے کا نچوڑ ہے جو حقیقت پر مبنی ہے۔

آخر میں اس بات کی طرف توجہ مبذول کرانے کی ضرورت ہے کہ جہاں پولیس میں بہت ہی کوتاہیاں ہیں اور جہاں یہ فورس بدعنوانیوں کی مرتکب بھی ہوتی ہے وہاں عوام بھی اس فورس کو تعاون نہ دے کر اس کی مشکلات میں اضافہ کر کے اس کو بدعنوانیوں کی طرف مائل کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ یہ فورس کبھی کبھی شدید لاقانونیت پر اتر آتی ہے۔ عوام کو خاص طور پر تعلیم یافتہ اور باشعور طبقوں کو چاہیئے کہ وہ پولیس کے کام کے بنیادی خوش گوار پہلو کو ملحوظ خاطر رکھ کر اس فورس کو سماجی دفاع کے لیے اور امن و امان قائم رکھنے کے لیے اس کی ہر ممکن مدد کریں۔ ایک زمانہ تھا جبکہ یہ کہا جاتا تھا کہ give a dog a bad name and hang لیکن نئی طرز فکر اس طرح ہے کہ بُرے کو کہا جائے کہ وہ اچھا ہے، ایسا کہنے سے وہ اپنے آپ کو اچھا ثابت کرنے

(بقیہ صـ۴۳ پر)

ہندی شاعری میں رومانیت

سرور احمد مالی

تاریخ شاہد ہے کہ دنیا میں چند انسانوں کی عام انسانوں پر بالادستی سے سماج میں تصادم اور کشاکش اور اس کے نتیجے میں تبدیلیاں واقع ہوتی رہی ہیں۔ یہ تبدیلیاں انسان کی نفسیات اور اس کے جذبات وخیالات کی دنیا کو بھی متاثر کرتی ہیں۔ انسان کے ان سارے جذبوں میں جنسی جذبہ کو قوی تر کہا جاتا ہے لیکن حقیقتاً دیکھا جائے تو ان سارے جذبوں میں حاصل کرنے دلینے کا جذبہ سب پر حاوی ہے اور انسان میں یہ حاصل کرنے کا جذبہ اس کی عمر، فہم اور طاقت کے ساتھ پروان چڑھتا ہے۔ یوں تو دنیا کی تاریخ میں ایثار و قربانی کی مثالیں ملتی ہیں اب اگر کوئی شخص دنیا کے آرام و آسائش سے دست بردار ہو کر ایثار و قربانی کی راہ پر چلتا ہے اور دنیا کی دولت پر آخرت کو ترجیح دیتا ہے تو اس کا یہ سارا عمل ایک معصوم بچے جیسا ہے جو چھوٹا غبارہ دیکر بڑا غبارہ لینے کی کوشش کرتا ہے۔

حیات کی ادنیٰ سطح سے ارتقار کی منزلیں طے کرنے والا انسان غاروں جنگلوں سے نکل کر زمان ومکان کی کشمکشوں سے گذرتا تہذیب وتمدن کو بناتا سنوارتا ترقیات کی منزلیں طے کرتا رہا۔ وہ اپنے بنائے ہوئے اصول وآئین کے شکنجے میں جکڑتا بھی گیا لیکن اس کا اندرون اور ذہن بیدار رہا۔ اندرون اور ذہن کی اس بیداری نے اس کی فکر وتخیل اور خواہشوں پر کسی عمل داری کو قبول نہیں کیا۔ اس کے خیالات کے بھٹکاؤ کا سبب بھی اندرون کی بیداری اور آزادی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ دنیا کے اندیشوں یا تقاضوں نے کبھی کبھی انسان کو اس ذہنی بیداری پر چہرہ لگانے پر مجبور کیا۔ اور جب انسان کی اس ذہنی بیداری پر ماورائے عقل قوانین کے جبر کو نافذ کیا گیا اور مافوق الفطری والہامی فلسفے میں لفظ کے مفہوم اپنی منشا کے مطابق بدل کر عقلی نظریہ پر اس کی فوقیت ثابت کر دی گئی، تو انسان کی اس ذہنی بیداری نے ان سارے اصول وآئین کو عقل کے پیمانے پر جانچنے اور پرکھنے پر بھی اصرار کیا جس کا جواب ماورائے عقل وتوہمات کے فلسفوں کے پاس نہیں تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس اصرار نے ایک تحریک کو جنم دیا۔ جس میں معاشی بحالی، سماجی برابری اور قومی آزادی کے نظریات کچھ اس طرح مربوط وہم آہنگ ہوئے کہ یہ تحریک ایک انقلاب میں بدل گئی اور اس نے دنیا کو ذہنی، سماجی، اقتصادی اور ملکی انقلابات سے دوچار کر دیا۔ رومانوی تحریک بھی اسی قسم کی عقلیت پسندی تھی جس نے مانی ہوئی اقدار کی تردید کی اور عقل کی کارفرمائی پر اصرار کیا۔

تاریخ یہ بتاتی ہے کہ ہر زمانے میں انسانوں کے با اقتدار گروہ نے اپنی مصلحت اندیشیوں کو مدنظر رکھ کر ایسے وصول مرتب کیے جو ان کی حکومت اور ان کے استحصال اور سماجی وتہذیبی اعتبار سے ان کی برتری کو قائم رکھ سکے تاہم تہذیب وتمدن کی روشنی مختلف فکری تصوراتی کشمکش سے دوچار ہوتی رہی اور چرچ اسٹیٹ، دربار ومنبر کی مشروط حکمت عملی تہذیبی اقدار کی تبدیلیوں کو روکنے سے قاصر رہی۔ انسان نے اس تہذیبی سفر میں اپنے فطری جذبے پر ضبط وجبر کا غیر نفسیاتی احساس تو حاصل کیا لیکن اس فطری جذبے کو ہلاک نہیں کر سکا اور اندرون میں بیدار ہونے والا جذبہ مختلف رموز واسرار کے ساتھ اظہار کے متعدد وسیلوں کے ذریعے بیان ہوتا رہا۔ جذبات کے اسی کیفیاتی لہجے کی گونج ادب میں بھی بہت صاف سنائی دیتی ہے

عام خیال کے مطابق ہر زبان کے ادب کی ابتدا شعریات سے ہوئی ہے۔ ہندی زبان وادب کے آغاز کے سلسلے میں محققین کے مختلف خیالات ہیں عام خیال کے مطابق ہندی شاعری "اپ بھرنش" کے دور میں شروع ہوئی اور ارتقائی منزلیں طے کرتی ہوئی "ویرگاتھا" کال تک پہنچی۔

ویرگاتھا کال میں بھاٹوں اور درباری شعرا نے رزمیہ نظموں میں بہادری کی کہانیاں اور رومانی قصے لکھنے شروع کیے تھے۔ یہ وہ دور تھا جب ہرش وردھن کی مضبوط اور وسیع حکومت کے ختم ہونے کے بعد کوئی مضبوط سلطنت نہیں رہی تھی۔ چنانچہ دھیرے دھیرے ملک چھوٹی بڑی ریاستوں میں بٹ گیا اور اس وقت کے راجہ مہاراجہ اپنی حکومت کی توسیع اور دوسرے کو زیر کرنے میں اس طرح الجھ گئے کہ سارا ملک خانہ جنگی کا شکار ہو گیا اور آئے دن جنگ ہونے لگی۔ دوسری طرف عربوں، ترکوں، پٹھانوں کے حملے شروع ہو گئے تھے

ان حالات میں ویر گاتھا کال کے شعرا نے اپنے راجاؤں سے انعام و اکرام لینے اور ان میں جرأت و ہمت پیدا کرنے کے لیے پُرجوش رزمیہ نظمیں لکھنی شروع کیں۔ لیکن ان ویر گاتھاؤں کا جلد زوال ہوگیا کیونکہ شمال و مغرب سے آنے والے حملہ آوروں کے حملے جاری تھے۔ اور وہ دھیرے دھیرے اپنی سلطنت بڑھاتے جارہے تھے۔ وہ ریاستیں جن کی فیاضی کے قصے کبھی سب کی زبانوں پر تھے اب کنگال ہوتی جارہی تھیں۔ اب یہ ممکن نہ تھا کہ ویر گاتھاؤں کے کلام پر ریاستیں ہزاروں، لاکھوں کا انعام دے سکیں دھیرے دھیرے ویر گاتھا شاعری کا زوال شروع ہوگیا اور "بھگتی کال" کا آغاز ہوا۔

ہندی میں بھگتی کال اس وقت شروع ہوتا ہے جب ہندستان کی فضا بدل چکی تھی اور سلطنت کا عہد تھا۔ ظاہر ہے ایسی صورت حال میں شمشیر زنی اور بہادری کے قصے اب بے سود تھے۔ بھگتی تحریک نے فکری سطح اور سماجی سطح دونوں پر اثر ڈالا۔ جو لوگ "نیچی ذات" کے سمجھے جاتے تھے ان کا مندروں میں جانا مذہبی کتابوں کا پڑھنا ممنوع تھا۔ ہندو دھرم کے دانشوروں کو ہندو دھرم کی روحانی طاقت کے کمزور پڑنے کا خطرہ لاحق ہوا۔ یہ دانشور مسلم مبلغوں کی تعلیمات اور تبلیغ کو شک کی نظر سے دیکھنے لگے۔ دوسری طرف اسلامی تعلیمات میں مساوات کے رویے نے بہت اثر ڈالا تھا۔ ان حالات کو مدنظر رکھ کر سدھ اور ناتھ پنتھی فقیروں نے عبادت اور مذہبی ظاہر پرستی کے خلاف آواز بلند کی (جس طرح مذہب کی ظاہر پرستی اور کٹھ ملائیت کے خلاف صوفی شعرا نے احتجاج کیا اور معرفت کے لیے وحدۃ الوجود کو ضروری قرار دیا اسی طرح بھگتی تحریک نے بھی نرنکار بھگوان کی صرف پوجا سے نہیں بلکہ اس کی ذات سے اٹوٹ لگاؤ سے ہی بھگوان کی پراپتی ممکن سمجھی)، انھوں نے تیرتھ اشنان، مندروں کی زیارت کو غیر ضروری قرار دیا ان کا عقیدہ تھا انسان کی نجات باطن کی صفائی اور خدا سے لو لگانے میں ہے۔ برہمن دانشور ویدانت اور گیتا کی تعلیمات میں لگ گئے ان پر بھگتی تحریک کا اثر نہ تھا۔ بھگتی تحریک نے عوام میں اس مایوسی کی فضا میں ہمت اور جرأت پیدا کی۔

بھگتی تحریک کا مقصد ہندستانی عوام میں بے یقینی اور مایوسی کی فضا میں خشک مذہبی فلسفوں کی جگہ عوام ہی کے استعارے میں ان سے بات کرنا اور ان میں سوئی ہوئی عقیدت کو بیدار کرنا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس تحریک کے جلو میں ہونے والی شاعری سنسکرت کے بجائے عوام کی بول چال کی زبان میں کی گئی۔

بھگتی تحریک کی چار شاخیں وجود میں آئیں۔ گیانا شری، پریم مارگی، رام بھگتی اور کرشن بھگتی۔ بھگتی شاعری میں کرشن بھگتی نے رادھا کنہیا اور گوپیوں کے رومان سے اس شاعری میں ایک الگ سمت پیدا کردی۔ جس نے ہندی شاعری میں حسن و عشق کے دل آویز مرقع پیش کیے اور لب و لہجہ میں شیرینی اور لطافت پیدا کردی۔ رندانہ تصورات کو جگہ ملی۔ عشق حقیقی کی جگہ دھیرے دھیرے عشق مجازی نے لینی شروع کردی۔ بھگتی کے پاکیزہ اور متصوفانہ تصورات کی صرف تقلید رہ گئی۔ اور وہ مذہبی پاکیزگی و صفائی ختم ہونے لگی جس سے بھگتی تحریک عبارت تھی۔

بھگتی کال میں حسن و عشق کے تصورات اور نسوانی حسن کا اظہار شروع ہوگیا تھا جو ریتی کال میں نکھر کر سامنے آیا۔ بھگتی شاعری اب مذہبی خیالات کو پیدا کرنے والے عناصر سے عاری ہوتی جارہی تھی۔ اب ریتی کال کے شاعروں نے حسن و عشق کے مضامین میں نازک خیالی، تشبیہات، و استعارات صنائع و بدائع سے کام لینا شروع کردیا تھا۔ اس عہد میں ہندی شعرا پر فارسی شعرا کے اثرات بھی پڑے۔ ریتی کال کی شاعری میں خیال بندی، صنعت گری اور جذبات نگاری پیدا ہوئی بعد میں ریتی کال کی شاعری نے ایک سیاسی موڑ لیا۔ رومانی عشقیہ خیالات کی جگہ جوش ولولہ اور حوصلہ افزائی کے رجحان شاعری میں جگہ پانے لگے۔ ریتی کال کے شعرا نے زبان و اسلوب کو نکھارنے کی بھی کوشش کی اور ہندی شاعری کو ایک اعلیٰ فنی حیثیت دی۔ جو ریتی کال کے شعرا کا اہم کارنامہ کہا جاسکتا ہے۔ ریتی کال میں ہی چھایا واذی فکر کے نشانات ملنے شروع ہوگئے تھے۔ اب مغربی شعر و ادب کے اثرات پڑنے لگے تھے اور کھڑی بولی نے اپنی جگہ بنانا شروع کردی تھی۔

انگریزی نظام اور انگریزی ذریعہ تعلیم کے آغاز نے ہندی ادب میں ایک نیا موڑ لیا۔ بھارتیندو ہریش چند کی کوشش نے ہندی ادبیات میں تصانیف کو جگہ دی۔ انگریزی ادبیات کے زیر اثر بھارتیندو عہد میں ڈرامے، مختصر افسانے، صحافت اور تنقید شامل ہوئی۔ اس عہد میں ہندی شاعری میں نمایاں تبدیلیاں شروع ہوئیں۔ اس وقت پریس کی سہولت نے شعر و ادب کے نئے مواقع فراہم کیے۔ ہندستان کے سماجی سیاسی افق پر ایک نئی روشنی پھوٹنے لگی تھی۔

ہندی شاعری میں رومانوی فکر دویدی یگ (عہد) سے شروع ہوگئی تھی۔ شری دھر پاٹھک نے "ایکانت واسی یوگی" میں ایک ایسے عشق سے روشناس کرایا جہاں انسان عشقیہ سرمستی چھوڑ کر جوگی بن جاتا ہے اور دنیا کو خیرباد کرکے فطرت کے حسن میں پناہ لیتا ہے۔ مہاویر پرشاد دویدی نے برج بھاشا میں شاعری کے ساتھ ۱۹۰۳ء میں ماہنامہ "سرسوتی" کی ادارت کا کام سنبھالا اور سرسوتی کے ذریعہ زبان کی تصحیح کا کام شروع کیا۔ ان کی زبان عام فہم اور کافی ہلکی پھلکی تھی۔ دویدی نے رومانویت (چھایاواد) کے ان افکار کو جگہ دی جس میں وطن پرستی، فطرت سے لگاؤ اور دھرتی پریم ملتا ہے۔ لیکن ان کے عہد کی شاعری قدیم کلاسکیت سے یکسر آزاد نہیں ہوسکی۔ گوکہ انھوں نے روایت پرستی کے خلاف جدوجہد کی — اور ہندی شاعری کے پرانے رسمی مضامین کو نکالنے کی کوشش کی — انھوں نے شاعری میں عمرانی مسائل کو ابھارنے کی کوشش کی، اور ہندستان میں اس وقت جو انتشار تھا ان سے پیدا ہونے والے حالات کو اہمیت دی۔ دویدی جی نے رومانویت اور کھڑی بولی کو مروج کرنے کی سعی کی تھی۔ چھایاواد اس کی نکھری ہوئی صورت میں ابھر کر سامنے آیا۔
چھایاواد کے سلسلے میں مبصروں نے مختلف خیالات کا اظہار کیا ہے۔

آچاریہ رام چندر شکل کی رائے ہے کہ میتھلی شرن گپت اور پاٹھک کو چھایاواد کا بانی سمجھنا چاہیئے۔ شری گپتی چندر گپت کے خیال میں "جھرنا"، کانن کسم کے بعد شائع ہوا لیکن اس میں کچھ کویتائیں بعض دوسرے رسالوں میں شائع ہو چکی تھیں اس لیے چھایاواد کا آغاز ۱۹۱۵ء کے آس پاس سمترانندن پنت کی کویتا "اچھواس" سے مانا جا سکتا ہے۔ شری دیویندر ناتھ شرما کہتے ہیں چھایاواد کی ابتدا ۱۹۱۶ء کے آس پاس ہوئی۔ ثبوت کے لیے پنت جی کے مجموعے "وینا" میں جو کویتائیں ہیں ۱۹۱۸ء — ۱۹۱۹ء کی لکھی ہوئی ہیں۔ ڈاکٹر شنکر دیو کا خیال ہے کہ جے شنکر پرشاد جی کی کویتائیں "اندو" میں ۱۹۱۳ء کے آس پاس شائع ہوئی ہیں اور سوریہ کانت ترپاٹھی نرالا ۱۹۱۶ء میں "جوہی کی کلی" نام کی مشہور کویتا لکھی تھی لیکن چھایاواد کی اصل ابتدا ۱۹۲۰ء کے آس پاس پرشاد جی کے "جھرنا" اور پنت جی کے "پلو" مجموعوں کی تخلیقات سے ہوئی ہے۔ وشومبر دیال اوستھی شکل جی کے حوالے سے کہتے ہیں کہ چھایاواد کی خصوصیت سے مملو "کھول دو دوار" نام کی کویتا کے شائع ہونے کا زمانہ ۱۹۱۶ء ہے اس لیے چھایاواد کا آغاز اور پرشاد جی کو چھایاواد کا بانی تسلیم کرنا چاہیئے۔

اس میں شک نہیں کہ چھایاواد کے نشانات پہلے سے نظر آتے ہیں مگر ہندی محققین کا عام طور سے خیال ہے کہ اس کا واضح رنگ روپ ۱۹۲۰ء میں ابھر کر سامنے آیا۔ شری مکٹ دھر پانڈے نے "ہندی میں چھایاواد" کے عنوان سے چار مضامین پر مشتمل ایک سلسلہ شروع کیا تھا جو ۱۹۲۰ء میں "شری شاردا" (جبل پور) میں جولائی، ستمبر، اکتوبر اور دسمبر میں شائع ہوئے تھے۔ اس سے قبل لفظ چھایاواد کا استعمال نہیں ملتا۔ پاٹھک جی کہتے ہیں "چھایاواد ایک ایسی مایامیے شے ہے کہ الفاظ کے ذریعے اس کو ٹھیک ٹھیک بیان کرنا غیر ممکن ہے اس کی ایک چھوٹی سی پہچان یہ ہے کہ اس میں لفظ اور معنی کا فرق بہت کم رہتا ہے۔ کہیں کہیں تو ان دونوں میں اکثر کچھ تعلق نہیں رہتا۔ لکھا کچھ اور ہی گیا ہے، پر مطلب کچھ اور ہی نکلتا ہے۔"

(شری شاردا: جبل پور، سال اوّل شمارہ ۶ صفحہ ۲۴۱)

چھایاواد پر تنقیدی نقطۂ نظر سے ناقدوں اور محققوں اور خود چھایاوادی شاعروں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ان میں مخالفت اور موافقت دونوں رخ اختیار کیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر رام کمار شرما نے بہت دلچسپ بات کہی ہے "دوسرے لفظوں میں کہہ لیجیئے کہ پرماتما کی چھایا آتما میں پڑنے لگی اور آتما کی چھایا پرماتما میں۔ یہی چھایاواد ہے۔" تاہم چھایاواد کو ناقدوں نے جن زاویہ ہائے نگاہ سے پرکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی، اس میں ہندستانی حالات کو مدِّ نظر رکھا ہے زیادہ تر ناقدوں نے قومی بیداری، سامراج سے آزادی، قدامت پرستی سے رہائی کو چھایاواد کا غالب رجحان مانا ہے۔ ڈاکٹر نامور سنگھ کا خیال ہے "چھایاواد اس قومی بیداری کا شعری اظہار ہے جو ایک طرف پرانی قدامت پرستی سے رہائی چاہتا ہے اور سامراج واد سے آزادی، اس بیداری میں جس طرح ترقی ہوتی گئی اس کا شعری اظہار بھی ترقی کرتا گیا۔" ڈاکٹر پریم شنکر کی رائے ہے "ہندی سوچھندتاواد موجودہ دور کی پیداوار ہے اور اس میں ملک کی سیاسی، سماجی صورت حال معاون ہے۔ ممکن ہے انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں ظاہر ہونے والے اس ہندی سوچھندتاواد نے اپنے ابتدائی منزل میں مغربی سوچھندتاواد سے مدد لی ہو، پر آج اس کی شکل ہمارے سامنے ہے۔ وہ ثابت کرتی ہے کہ اس نے اپنی آزاد حیثیت تعمیر کی۔ سوچھندتاواد یورپین رومانٹی سزم کی معنویت میں استعمال کیا گیا جو یورپ کی سرمایہ دار سماج کی آپسی چشمک اور ایک دوسرے کی مخالفت سے پیدا ہوا یہ ضرور ہے کہ رومانٹی سزم (یورپین) کی خوبیاں چھایاواد میں ملتی ہیں لیکن چھایاواد خالص ہندستانی حالات کی دین ہے۔" پنت جی کی رائے ہے "چھایاواد کو مغربی شاعری اور بنگلہ شاعری کی تقلید کہنا تاریخی نقطۂ نظر سے آنکھ بند کر لینے کے برابر ہے۔ پہلے تو چھایاواد نہ خالص سوچھندتاواد ہے جسے شکل جی نے رومانٹی سزم کے لیے استعمال کیا اور نہ ہو بہو بنگلہ کی یعنی رویندر ناتھ کی تقلید۔" گھاسلکار مانتھر کا خیال ہے۔ "چھایاوادی شاعروں نے نئے موضوعات کو لیکر ریتی کال کی روایت کو توڑا ہے"۔

یورپ میں رومانوی تحریک کا آغاز فرانس کے سیاسی انقلاب کے بعد ہوا اور ۱۸۱۰ء تک رومانوی لہر سارے یورپ میں پھیل گئی۔ لیکن چھایاواد ۱۹۲۰ء کے آس پاس اپنی واضح شکل اختیار کر سکا۔ اس طرح چھایاواد ہندستان میں یورپین رومانٹی سزم اور خاص کر انگریزی رومانوی شاعری سے تقریباً سو سال بعد نمودار ہوا۔ یورپ میں رومانٹک شاعری کے پسِ پشت وہاں کے مخصوص سیاسی، اقتصادی حالات تھے جبکہ چھایاواد کا سرچشمہ ہندستان کی سیاسی، سماجی فضا میں پھوٹا۔ ہندستانی سیاست کے افق پر ۱۹۲۰ء میں گاندھی جی نمودار ہوئے اور ۱۹۲۰ء میں چھایاواد ہندی شاعری میں اپنی شناخت کرا چکا تھا اس سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ چھایاوادی شاعری میں دویدی عہد کا محض ردِ عمل یا طرزِ تحریر میں تبدیلی ہی نہیں تھی بلکہ وہ اپنے ملک عہد اور ادب کی ضرورت بن کر ابھرا تھا۔

ہندی شاعری میں چھایاواد کو ملک کی سیاسی، سماجی حالات کی بدولت فروغ ہوا۔ چھایاواد کی نظموں میں قومی بیداری کے رجحانات سے ہندستان میں رومانٹی سزم کی لہر دوڑ گئی۔ چھایاواد پر مغربی رومانٹی سزم کا اثر رہا ہو مگر یہ تحریک مغرب کی دین نہیں کہی جا سکتی۔ بقول ڈاکٹر نامور سنگھ چھایاواد کے دور سے پہلے ورڈسورتھ اور شیلی کی نظمیں ہندستان میں آ چکی تھیں۔ اس دور کے لوگ بھی انگریزی جانتے تھے ان پر رومانٹی سزم کا اثر کیوں نہیں ہوا؟ چھایاواد میں فطرت نگاری حسن و جمالیات کی دل آویز عکاسی ملتی ہے۔ اور پہلی بار بیداریٔ نسواں اور ان کے مسائل کا آزادانہ اظہار ہوتا ہے چھایاواد میں کلپنا (تخیل) کو پہلی بار اہمیت دی گئی۔ جس طرح رومانٹی سزم نے یورپ میں روایت پرستی کو توڑنے کی کوشش کی اسی طرح چھایاواد میں ریتی

کال کے سب پرانے تصورات سے بغاوت ملتی ہے۔

چھایاواد فرد کی جس فکر سے مملو ہے وہ بنیادی طور سے سماجی اقدار کی نفی نہیں کرتا۔ بلکہ سماج میں انسانی اقتدار کو مربوط ہم آہنگ کرنے پر زور دیتا ہے۔ چھایاواد میں فکری نظریات اور تصورات کی وضاحت کی گئی ہے۔ وہ یکسر عام انسانی اقدار اور یکجہتی پیدا کرنے سے عبارت ہے۔ کچھ چھایاواد کے مبصروں کا خیال ہے کہ چھایاواد صرف انسان کے اندرون کی آواز ہے۔ لیکن چھایاواد اس دور کی آواز ہے جب ہندستان اپنے لیے ایک نئے نظام کی تلاش میں برسرپیکار تھا۔ چھایاوادی شاعروں نے دھرتی سے الگ ہو کر نہیں دیکھا۔ یہ ضرور ہے کہ انھوں نے عملی طور سے کسی تحریک میں حصّہ نہیں لیا۔ تاہم ہندستانی عوام جس نظام میں اسیر تھے اسے تسلیم نہیں کیا گیا۔

چھایاواد کے شاعروں میں جے شنکر پرشاد' سوریہ کانت ترپاٹھی نرالا' سمترا نندن پنت' اور مہادیوی ورما سرفہرست ہیں۔ ان کے یہاں چھایاواد کی تمام بنیادی خصوصیات ملتی ہیں اور اندرون و بیرون کا عمیق ادراک ملتا ہے۔ ان کے یہاں وسیع نظریہ فکر کے ساتھ انسان دوستی کا جذبہ اور صحت مند زاویہ حیات بھی ہے۔ چھایاوادی شاعر انسان دوستی کا علمبردار رہا ہے۔ چند انسانوں کی بالادستی کو گوارا نہیں کرتا نہ ایسے نظام حیات کو برداشت کرتا ہے جس میں مال و دولت' ذات پات اور عہدہ کو فوقیت حاصل ہو۔ یہی وجہ ہے کہ چھایاواد کی طرف ان اداروں کا رویہ زیادہ مخالفانہ تھا جو شخصی حکومت اور ذات برادری کی تفریق کو قائم رکھنے پر مصر تھے۔ چھایاواد نے مانوتاواد (انسان دوستی) کو مدنظر رکھا جو اور کسی شاعری میں نظر نہیں آتا۔ اس نے سب انسانوں کے درمیان مساوات پر اصرار کیا۔

انسانیت دوستی سے متاثر ان شاعروں نے پریم کو بنیاد مان کر انسان کو ایک پیار کی ڈور میں باندھنے کی کوشش کی ہے۔ یہی پیار اس دور کے مایوس کن حالات میں انسان میں خود اعتمادی پیدا کرتا ہے اور احساس کمتری کی تمام لعنتوں سے باہر نکالتا ہے اور ہر حالت میں زندہ رہنے اور مسکرانے کا حوصلہ دیتا ہے۔ چھایاوادی شاعری پر جو بھی الزام لگائے جائیں لیکن اس عہد کے تاریخی' سیاسی اور سماجی پس منظر میں سمجھنے کے بعد اسے مطعون نہیں کیا جا سکتا بلکہ یہ دیکھنا درست ہوگا کہ چھایاواد کا شعری لہجہ فطری' عقلی اور ادبی آزاد خیالی پر مبنی تھا۔ اس نے بازار میں چلتے ہوئے توہمات و تعصبات کے ان تمام سکوں کو کھوٹا قرار دیا جو عقل دشمن اور دقیانوسیت کی عمل داری میں رائج تھے۔ چھایاواد میں انسانی حقوق کی بحالی کی جو معتبر آواز ملتی ہے اس کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

چھایاواد کی بنیاد عقلیت پسندی تھی۔ اس کا اصرار تھا کہ ہر اس شے کو تسلیم کرنے سے انکار کیا جائے جسے عقل قبول کرنے سے انکار کرتی ہے اور عدم عقلیت کے رجحان کے جواب میں جو صدیوں سے فرسودہ نظریات حیات کی آبیاری کرتا چلا آیا تھا۔ چھایاوادیوں نے عدم تسلیمیت پر اصرار کیا۔

بقیہ: ڈاکٹر انصاری - ایک عظیم دیش بھگت

اسی لیے کانگریس کی جب نئی مجلس انتظامیہ تشکیل ہوئی تو ڈاکٹر انصاری ہی کو اس کا صدر منتخب کیا گیا اور جواہرلال نہرو کو سکریٹری۔ ان لوگوں نے کانگریس کے دونوں طبقوں میں اتحاد پیدا کرنے کے لیے کام کیا۔ اس طرح سے ان کی حکمت عملی کی سبھی نے تعریف کی اور ان کی کمیٹی کو سنٹرل کمیٹی کا نام دیا گیا۔ یہ ایک ایسا نازک موقع تھا کہ اگر ڈاکٹر انصاری کی سوجھ بوجھ نے کام نہ کیا ہوتا تو یہ اختلاف نازک سے نازک شکل اختیار کر سکتا تھا۔

ڈاکٹر انصاری مئی ۱۹۲۸ میں بمبئی میں ہونے والی آل پارٹیز کانفرنس میں کمیٹی کی نہرو رپورٹ میں تحریر کردہ مدات پر غور کرنے اور عوام کی رائے جاننے کے لیے ۲۲ دسمبر ۱۹۲۸ کو کلکتہ میں ایک 'کل ہند پارٹی' کا قیام ہوا جس کے صدر ڈاکٹر انصاری ہی تھے۔ ۱۹۲۹ میں مسلم نیشنلسٹ پارٹی کی تشکیل پر ڈاکٹر انصاری اس کے خزانچی بنے اس پارٹی کا مقصد مسلمانوں میں حب الوطنی کے جذبات کو ابھارنا' جدوجہد آزادی میں انھیں آگے بڑھانا اور اکثریتی و اقلیتی فرقوں کے مابین دوستانہ تعلقات کو مستحکم بنانا تھا۔ ۱۹۳۰ کو گاندھی جی کے ذریعے شروع کیے گئے سول نافرمانی کی تحریک سے ڈاکٹر انصاری کچھ اختلاف رکھتے تھے لیکن انھوں نے اس اختلاف کے باوجود ایسا کوئی قدم نہیں اٹھایا جس سے پارٹی کو نقصان پہنچے۔ ۱۹۳۴ میں سوراج پارٹی کے دوبارہ تشکیل دینے پر ڈاکٹر انصاری کے بغاوت کی تعریف کی گئی۔ ڈاکٹر ستیہ مورتی نے خط لکھ کر اس نو تشکیل شدہ پارٹی کو صحیح طور پر چلانے کے لیے ان کی رائے مانگی۔ جولائی ۱۹۳۵ میں واردھا میں ہوئی کانگریس کی مجلس انتظامیہ کی میٹنگ کے انعقاد سے کچھ روز قبل ڈاکٹر انصاری نے اپنے ایک بیان کے ذریعے کونسل میں داخلے کی اہمیت پر زور دیا۔

ڈاکٹر انصاری کی صحت دن رات کی مسلسل محنت نے خراب کر دی تھی۔ اس لیے انھوں نے آہستہ آہستہ اپنی مصروفیات کو کم کرنے کی کوشش کی۔ ۲۳ مارچ ۱۹۳۵ کو انھوں نے ڈاکٹر راجندر پرشاد کو لکھے اپنے ایک خط میں سفارش کی کہ انھیں کانگریس ورکنگ کمیٹی کی رکنیت اور کانگریس پارلیمنٹری بورڈ سے سبکدوش کر دیا جائے کیونکہ ان کی صحت خراب ہے۔

ڈاکٹر راجندر پرشاد نے ان کے استعفیٰ کو قبول کر لیا مگر بادل ناخواستہ اور بدرجۂ مجبوری نیز ان کے خدمات کی زبردست تعریف کے ساتھ۔ ۱۹۳۶ میں آپ کی وفات ہو گئی۔

پروفیسر مشیر الحسن کے انگریزی مضمون کا ترجمہ "ڈاکٹر انصاری۔ زمانہ اور شخصیت" کے عنوان سے جنوری ۱۹۸۱ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ اس کے مترجم جناب اختر الواسع۔ ہیں

مشتاق احمد

صنعتی اہمیت کے کیڑے

دنیا کے ہر ملک میں صنعت و حرفت اس ملک کی معاشیات میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ جن ملکوں میں زراعت کے لیے موافق حالات میسر ہیں وہاں بھی صنعت پر کافی زور دیا جاتا ہے۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ فطرت نہ صرف زراعت کے لیے مناسب و موافق حالات مہیا کرتی ہے بلکہ صنعت میں بھی مددگار ثابت ہوتی ہے۔ ہماری روزمرہ زندگی میں کچھ چیزیں ایسی دیکھنے میں آتی ہیں جن کی افادیت سے ہم اچھی طرح واقف ہیں لیکن ہم میں سے بیشتر لوگ ان کے بارے میں کم جانتے ہیں۔ مثلاً لاکھ جو ایک قسم کا ریزن ہے، کارخانوں، دفتروں اور ڈاک خانوں وغیرہ میں اعلیٰ پیمانے پر استعمال کیا جاتا ہے۔ آپ کو تعجب ہوگا کہ لاکھ ایک چھوٹے سے کیڑے کے ذریعہ بنایا جاتا ہے۔ کیڑوں میں ریشم کا کیڑا بہت اچھا کیڑا مانا جاتا ہے۔ یہ بھی ایک کیڑے کے ذریعہ پیدا کیا جاتا ہے۔ اسی طرح غذاؤں میں شہد بہت مزے دار اور مفید غذا ہے اور شہد کی مکھیوں کے ذریعہ بنایا جاتا ہے۔

ہمارے ملک میں چھوٹے پیمانے کی صنعتوں میں لاکھ، شہد اور ریشم کی صنعتیں بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ آئیے اب ان کیڑوں کا مطالعہ کریں جو ان صنعتوں کو منظرِ عام پر لانے کے ذمہ دار ہیں۔

(۱) لاکھ کا کیڑا (۲) ریشم کا کیڑا (۳) شہد کی مکھی

یہ تینوں کیڑے حیوانات کی ایک جماعت حشرات کے تحت آتے ہیں۔ اس جماعت میں شامل تمام کیڑے چھ پیروں والے ہوتے ہیں جماعت حشرات میں ہی یہ تینوں کیڑے مختلف ذیلی جماعتوں کے تحت آتے ہیں۔

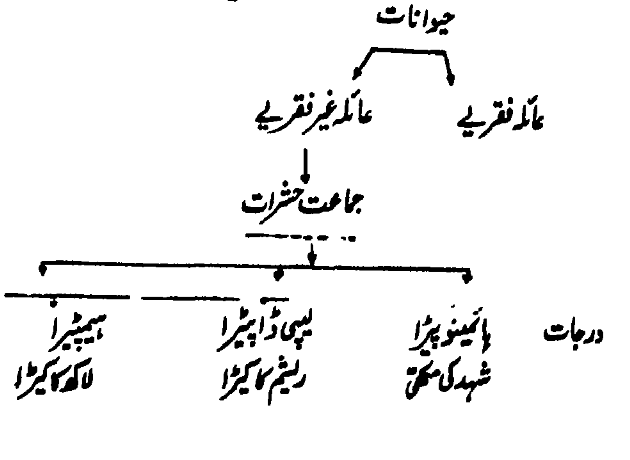

۱ لاکھ کا کیڑا

اس کا سائنسی نام لیکسیفر لاکا ہے۔ یہ کیڑا گہرے بھورے یا سرخ رنگ کا ہوتا ہے۔ جنس الگ الگ ہوتی ہے۔

مادہ : بالغ مادہ عموماً گول لمبوتری شکل کی ہوتی ہے۔ اس کا جسم قطعوں میں منقسم نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی یہ چتے دار بھی ہوتی ہے۔

بالغ مادہ کیڑے عموماً ۴ سے ۵ ملی میٹر تک لمبے اور ۳ سے ۴ ملی میٹر تک موٹے ہوتے ہیں۔ منہ سے ذرا پیچھے چھوٹے چھوٹے انٹینا کا ایک جوڑ ہوتا ہے۔ یہ حواس کا کام کرتے ہیں۔

نر : بالغ نر کیڑے بہت چھوٹے ہوتے ہیں یعنی ۱٫۵ ملی میٹر سے ۲ ملی میٹر تک لمبے اور ۰٫۵ ملی میٹر تک موٹے ہوتے ہیں پنکھ سادے اور نیم بیضوی ہوتے ہیں۔ جسم تین حصوں میں منقسم ہوتا ہے۔

۱۔ سر ۲۔ صدر ۳۔ شکم۔ پنکھوں کا ایک جوڑا صدر کے درمیانی حصے سے جڑا ہوتا ہے۔ شکم نو یا دس قطعوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ آخری قطعے پر ذنبی ریشے ہوتے ہیں۔ جہاں سے لمبے مومی دھاگوں کا اخراج ہوتا ہے۔

لاکھ اور موم خارج کرنے والے غدود

کیڑے کے جسم کی بیرونی پرت ایک کیمیائی مادے کائٹین Chitin کی بنی ہوتی ہے اور اسے بشرہ Cuticle کہتے ہیں۔ یہ مسامدار ہوتی ہے اور لاکھ پیدا کرنے والے غدود انھیں مساموں کے نیچے کھلتے ہیں۔ لیکسیفر لاکا میں لاکھ پیدا کرنے والے غدود ایک ہی قسم کے ہوتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک غدود ایک بلب کی طرح اور پھولی ہوئی ساخت، ایک بنیادی جوڑ اور ایک خارجی نلی پر مشتمل ہوتا ہے۔ موم پیدا کرنے والے غدود چار قسم کے ہوتے ہیں۔ اور جسم کے چار مختلف حصوں میں واقع ہوتے ہیں۔

دورِ حیات

بالغ مادہ تقریباً تین سو انڈے دیتی ہے انڈے دینے کا عمل لاکھ کے خانے میں ہوتا ہے جو وہ اپنے جسم کو سکیڑ کر بناتی ہے۔ چند گھنٹوں بعد ہی انڈوں سے پہلی روپ

اب

آپ کی بچتوں پر اور بھی زیادہ سود

صرف چھ برسوں میں اپنی رقم کو دوگنے سے بھی زیادہ کیجئے

قومی بچت سرٹیفکیٹ (چھٹے اجراء) میں لگا کر

اس نئے سیریز میں ۱۰۰ روپے ۶ برسوں میں ۲۰۱/۵۰ روپے ہو جاتے ہیں جس میں ۱۲ فیصد سالانہ کی شرح سے ششماہی مرکب سود بھی شامل ہے۔

ایک نیا ساتواں اجراء بھی ہے

جس میں ۱۲ فیصد سالانہ سود ششماہی قابل ادا ہوگا اور اصل زر ۶ سال کے بعد واپس کیا جائے گا۔

دونوں سیریز کو ۳ سال کے بعد بھنایا جا سکتا ہے۔ رقم لگانے کی کوئی حد نہیں۔ نامزدگی، شناختی پرچہ اور منتقلی کی سہولیات۔ انکم ٹیکس کے مقاصد کے لئے سرٹیفکیٹ ڈاک گھروں سے بلا معاوضہ جاری کئے جاتے ہیں۔ ایک لاکھ ۵۰ ہزار روپے تک دولت ٹیکس سے چھوٹ۔ ۳۰۰۰ روپے سالانہ سود بعد دیگر متعینہ سرمایہ کاریوں پر سود کے انکم ٹیکس سے مستثنیٰ۔ یہ سرٹیفکیٹ ڈاک گھروں سے انفرادی یا مشترکہ طور پر یکم مئی ۱۹۸۱ء سے خرید سکیں گے۔

مزید تفصیلات کے لئے ان سے رجوع کیجئے

- ڈسٹرکٹ سیونگز افسر معرفت ڈسٹرکٹ کلکٹر/مجسٹریٹ
- مجاز ایجنٹ
- نزدیکی ڈاک گھر
- ریجنل آفیسر، نیشنل سیونگز آرگنائزیشن (ریاستی/مرکزی سرکار)

یا لکھئے

قومی بچت ادارہ

۱۲- سیمنری ہلز ناگپور ۴۴۰۰۰۶

davp 81/30

جسم کو بھی اس میں سمیٹ لیتا ہے اور دھاگوں پر دھاگوں کی تہیں جاتا ہے۔ اس طرح ککون میں پیوپا کی حفاظت بھی ہوتی ہے اور وہ درخت پر کہیں نہ کہیں لٹکا رہتا ہے۔

بامبیکس مورائی

یہ دراصل چین کا ایک پالتو کیڑا ہے اور چین سے ہی یورپ اور ہندوستان کے علاقوں میں پھیلا ہے۔ مختلف ماحولیاتی حالات میں اس کی افزائش سے اس کی کچھ مقامی نسلیں بھی پیدا ہو گئی ہیں جو اصل سے ذرا مختلف ہیں۔ ان میں سب سے بڑا اختلاف نسلوں کی تعداد کا ہے۔ سرد ممالک میں جہاں گرمی بہت مختصر عرصے تک ہوتی ہے۔ سال میں ایک نسل پیدا ہوتی ہے۔ اس کے برعکس گرم مرطوب علاقوں میں ایک سال میں کئی نسلیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

یہ کیڑا بھورے رنگ کا ہوتا ہے اور اوسینیریا سے بڑا ہوتا ہے۔ اس کی مادہ نر سے بڑی ہوتی ہے۔

اوسینیریا ویریئس

یہ مسطح علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ چھوٹا اور بھورے رنگ کا کیڑا ہے۔ اس کے پہل روپ گگر کے درخت پر رہتے ہیں۔ یہ درخت کی پتیاں کھاتا ہے۔ اور گرمیوں میں بارش شروع ہونے سے پہلے زیادہ پایا جاتا ہے۔

۲۔ سیٹرینڈی

اس خاندان میں جنگلی ریشم کے کیڑے شامل ہیں۔ یہ جسامت میں بڑے ہوتے ہیں اور زندگی کے کسی بھی مرحلہ میں بہ آسانی پہچانے جا سکتے ہیں۔ یہ مختلف چمک دار رنگوں کے ہوتے ہیں۔ ان کا جسم چھوٹا اور موٹا ہوتا ہے۔ پنکھ بہت بڑے اور پیر چھوٹے ہوتے ہیں۔ یہ بڑی تعداد میں انڈے دیتے ہیں جو گول ہوتے ہیں۔ اور موٹے چھلکے سے ڈھکے ہوتے ہیں۔ انڈوں سے کچھ ہی دنوں میں پہل روپ نکل آتے ہیں۔ جو جلد ہی بڑا سائز اختیار کر لیتے ہیں اور ککون بناتے ہیں اور پھر پیوپا میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ پیوپا ککون سے باہر نکلنے کے لیے ککون کو ایک سرے پر نرم کر دیتا ہے۔ یہ عمل ایک سیال مادہ کے ذریعہ ہوتا ہے جو کہ پیوپا کے ذریعہ خارج کیا جاتا ہے۔

یہ کیڑے رات میں سرگرم رہتے ہیں اس لیے رات والے کیڑے بھی کہلاتے ہیں۔ ان میں ایک جگہ جمع ہونے کی جبلیت پائی جاتی ہے۔ ان کی اس عادت سے افزائش کرنے والے لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں اور ماداؤں کو بڑے بڑے ککون میں پالتے ہیں۔ تازہ نمو یافتہ مادہ کو نروں کو جمع کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اس کے علاوہ مادائیں ایک مخصوص بو رکھتی ہیں جس پر نر کھنچے چلے آتے ہیں، اور اس طرح ماداؤں سے جفتی کرنے کے بعد بارآوری عمل میں آتی ہے۔

بامبیکس کے علاوہ سیٹرینڈی خاندان کی ٹسر، ریری اور میوگا ریشم پیدا کرنے والی انواع بھی معاشیاتی اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ کیڑے صرف مرطوب جنگلات میں پائے جاتے ہیں اور گرم و خشک ہوائیں برداشت نہیں کر سکتے۔ اس لیے ان کی افزائش ہندوستان کے تمام علاقوں میں نہیں کی جا سکتی۔ پہل روپ جنگلی درختوں کی پتیاں کھاتے ہیں۔

خاندان سیٹرینڈی اسی تیس انواع پر مشتمل ہے جو مرطوب پہاڑی جنگلات میں پائی جاتی ہیں لیکن ان میں سے صرف تین انواع کے کیڑے تجارتی پیمانے پر ریشم تیار کرتے ہیں۔ باقی انواع کے کیڑے بہت کم مقدار میں ریشم بناتے ہیں۔

۱۔ ایکیٹس رسینی

آسام کا ایری ریشم کا کیڑا

۲۔ اینتھیریا آساما

آسام کا میوگا ریشم کا کیڑا۔ میوگا نیم افزائشی طور پر آسام کے جنگلات میں حاصل کیا جاتا ہے۔

۳۔ اینتھیریا پیفیا

ٹسر ریشم کا کیڑا

ٹسر ملک کے مختلف علاقوں کے جنگلات سے جمع کیا جاتا ہے، اور صنعت کے لحاظ سے اہم ہے۔ اس کے کیڑے کو قطعی طور پر پالتو کیڑا نہیں بنایا جا سکتا کیوں کہ یہ جھاڑیوں اور درختوں پر رہتا ہے۔ اس کے ککون جنگلات سے ملتے ہیں۔ ٹسر کے کیڑے مختلف اقسام کے درختوں پر پائے جاتے ہیں خصوصاً آسن، ارجن، سال، اور بیر کے درختوں پر۔ بامبیکس کے ریشم کی طرح اس کے ریشم سے بھی دھاگے بنائے جا سکتے ہیں۔

ٹسر کی پیداوار موسمی حالات پر بہت زیادہ منحصر ہے اس کے علاوہ کئی جانور اس کی پیداوار کو بڑھنے سے روک دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بیشتر کیڑے نشوونما کے ابتدائی مرحلوں میں ہی مینڈھک، پرند، چھپکلی، چمگادڑ وغیرہ کی بھوک کا شکار ہو جاتے ہیں۔

بمبائی سیڈی اور سیٹرنیڈی خاندانوں کے علاوہ دیگر خاندانوں اور درجات کے کیڑے بھی ریشم بناتے ہیں۔ مثلاً سائمولیم رڈ پیٹرا۔ اور کوکسیڈی۔

ریشم کی پیداوار بڑھانے اور عمدہ قسم کا ریشم حاصل کرنے کے لیے سائنسی اور تکنیکی معلومات فراہم کی جا رہی ہیں اور اس سلسلے میں رانچی (بہار) میں ٹسر سلک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا گیا ہے۔

۳۔ شہد کی مکھی

شہد کی مکھی جماعت حشرات کے ایک خاندان ایپی ڈی کے تحت آتی ہے۔ مکھیاں عام طور پر چھوٹی یا درمیانی جسامت کی ہوتی ہیں۔ کچھ مکھیاں جسامت میں بڑی بھی ہوتی ہیں۔ یہ عام طور پر ہلکے رنگ کی ہوتی ہیں۔ جسم تین حصوں

یں منقسم ہوتا ہے۔

(۱) سر، جو کہ اچھی طرح نشوونما یافتہ ہوتا ہے۔ اس پر درمیانی لمبائی کے انٹینا ہوتے ہیں۔ منہ کے اجزاء مختلف اشکال کے ہوتے ہیں لیکن جبڑوں کا ایک جوڑ موجود ہوتا ہے۔ لچکیلا زبان کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

(۲) صدر گٹھیلا ہوتا ہے اور اس کی سطح پر بہت زیادہ قاطین ہوتی ہے پیر چھوٹے اور بال دار ہوتے ہیں۔ پنکھ صدر سے جڑے ہوتے ہیں۔

(۳) شکم بیضوی ہوتا ہے۔ شکم اور صدر کے درمیان ایک پتلا سا جوڑ ہوتا ہے جسے پیٹیول کہا جاتا ہے۔ جسم کی بطنی سطح پر اسکوپا ہوتا ہے۔ یہ ایک قسم کا برش ہے جو پھولوں سے زردان جمع کرنے کے کام آتا ہے۔

اپی ڈی

اس خاندان میں ایپس مکھیوں کی زندگی سماجی طور پر سب سے زیادہ منظم ہوتی ہے۔ اکثریت ان مکھیوں کی ہوتی ہے جن کے عادات واطوار اور دورِ حیات ایک جیسے ہوتے ہیں۔ مادائیں خود اپنے اور اپنے بچوں کے لیے پھولوں کا رس اور زردانے جمع کرتی ہیں۔ اور آئندہ کے لیے ان چیزوں کا ذخیرہ بھی جمع کرتی ہیں۔ اور یہی ذخیرہ شہد کہلاتا ہے۔ ان میں طفیلی کیڑے بہت کم ہوتے ہیں۔

جنس ایپس کے تحت آنے والی انواع عام شہد کی مکھیاں ہیں۔ یہ تین انواع حسب ذیل ہیں۔

۱۔ ایپس ڈارسیٹا۔ بڑی مکھی
۲۔ ایپس انڈیکا۔ درمیانی مکھی
۳۔ ایپس فلوریا۔ چھوٹی مکھی

ہندوستان میں یہ تینوں انواع عام طور پر پائی جاتی ہیں لیکن یہ تینوں کبھی کسی جگہ ایک ساتھ دیکھنے میں نہیں آتیں۔ ایپس انڈیکا عام طور پر درختوں میں چھتے بناتی ہیں۔ ایپس فلوریا ہندوستان کے سطح علاقوں میں مکانات پر اونچی اور سہولت والی جگہوں پر اپنے اکہرے چھتے بناتی ہیں۔

مکھیاں پھولوں سے زردانے اور رس جمع کرتی ہیں، اور مکھیاں پھولوں کی کلیوں سے، چھال اور پودوں کے دیگر اجزا سے رال جیسا ایک مادّہ جمع کرتی ہیں۔ پھولوں کا رس یہ خود استعمال کرتی ہیں یا پھر اپنے بچوں کو کھلاتی ہیں۔ اور رال جیسے مادے سے اپنے چھتے کو مضبوط بناتے ہیں۔ نوجوان مکھیاں موم کا اخراج کرتی ہیں جو شہد اور شہد کے چھتے کے لیے خلیے بنانے کے کام آتا ہے۔ نوجوان مکھیوں کو ایک پاؤنڈ موم بنانے کے لیے ۱۶ سے ۲۰ پاؤنڈ شہد درکار ہوتی ہے۔

شہد کی مکھیاں اعلیٰ قسم کی سماجی زندگی کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ شہد کے کسی ایک چھتے میں تین قسم کی مکھیاں ہوتی ہیں۔

۱۔ نر جو ڈرون کہلاتے ہیں۔
۲۔ رانیاں
۳۔ ورکرس۔

یہ سب مل کر جماعت کے طور پر کام کرتے ہیں اور ایک چھتہ بناتے ہیں جو موافق حالات میں ایک طویل عرصہ تک قائم رہ سکتا ہے۔

پہلی روپ خود حرکت نہیں کر سکتا اس لیے اس کی چھتے میں باقاعدہ ٹریننگ ہوتی ہے۔ اس لیے تیار شدہ غذا مہیا کی جاتی ہے۔ اور موم کے الگ الگ خانوں میں رکھا جاتا ہے۔ یہ سب کام ورکرس کرتے ہیں۔

شہد کی مکھی کی زندگی کے مختلف مراحل آزادانہ طور پر نہیں گزرتے اور صرف بالغ ہی فعال ہوتے ہیں۔ باقی کیڑوں کو اپنی ضروریات کے لیے بالغ کیڑوں جیسے ورکرس وغیرہ پر منحصر رہنا پڑتا ہے۔

شہد کی مکھی کی مصنوعی طور پر افزائش نسل کے سلسلے میں تحقیق جاری ہے۔ اور یہ کوشش کی جارہی ہے کہ اس کی صنعت کو بڑھاوا دیا جائے۔

مذکورہ بالا سبھی کیڑے ہماری صنعت میں کافی اہمیت رکھتے ہیں اور اب کوشش اس بات کی کی جارہی ہے کہ مصنوعی افزائش نسل یعنی سیری کلچر (ریشم کے کیڑے کی افزائش نسل) اور اپی کلچر (شہد کی مکھیوں کی افزائش نسل) کے طریقوں کو بہتر بنایا جائے تاکہ ہمیں زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل ہو۔

جاوید وششت

باغِ حجر

[راک گارڈن، چنڈی گڑھ کے خالق جناب نیک چند صاحب کے نام]

یہ باغِ حجر ہے کہ طلسمِ ہستی؟
کیا ہوش ہے فن کار کا، فن کی مستی!
تخریب سے تعمیر کا ہے عزمِ نیک
ہے کشف و کرامت یہ بلندی پستی!

پنجور گارڈن

رنگین و حسین۔ پیار کے پنجور کی شام
خوابوں کی پری، پھول سی، نازک اندام
فوارۂ سیمیں کی ضیا پاشی پھوار
لبریز ہے نو سے پھولوں کے ہیں جام

آگرہ کی سیر تو ہو گئی

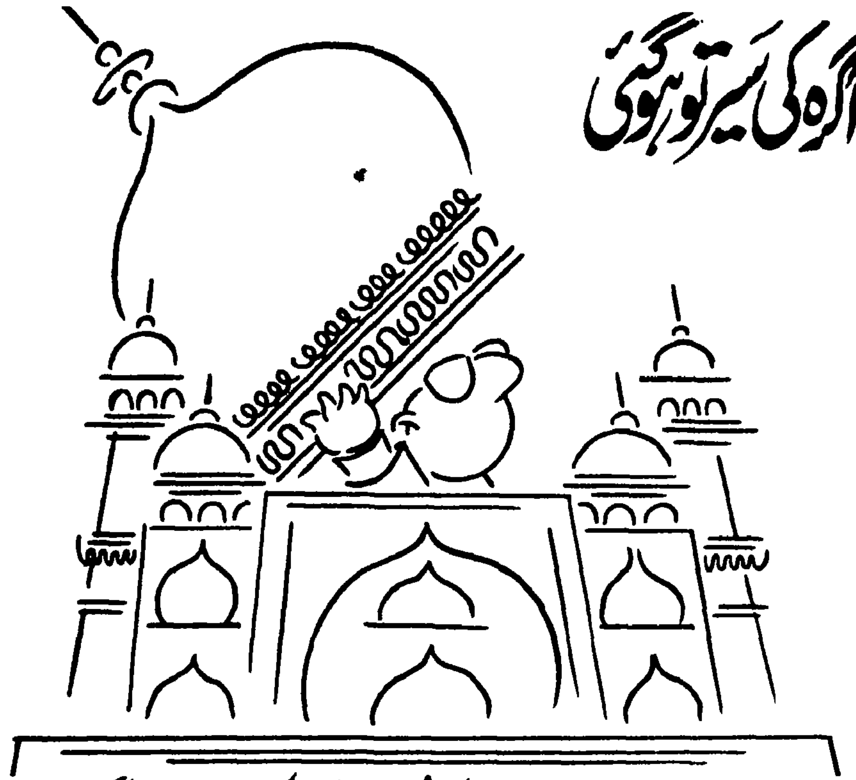

کیا آپ بقیہ مقامات کا نظارہ نہیں کرنا چاہیں گے ؟

ٹریول ایجنٹس حضرات !

ہم نے مانا کہ ہمارے آثارِ قدیمہ غیر ملکی سیاحوں کے لیے کشش کا باعث ہیں۔ لیکن بھارت میں آنے والا ایک اوسط درجے کا سیاح سیر و تفریح کا بھی متمنی ہوتا ہے اور یہ ضروری نہیں کہ بھارت کے صرف آثارِ قدیمہ ہی ایسی سیر و تفریح کا مرکز ہوں۔

بھارت میں دیکھنے کی چیز صرف تاج محل ہی نہیں ہے

سیاحوں کو دکھانے کے لیے ہمارے یہاں اور بھی بہت کچھ ہے۔ مثلاً دلفریب صحت افزا مقامات، جنگلی جانوروں کی دلکش پناہ گاہیں اور پُرلطف سمندری ساحل۔

اس لیے جب آپ کسی سیاح کیلئے بھارت درشن کا منصوبہ بنائیں تو اس میں مندرجہ بالا سیرگاہیں بھی شامل کریں۔ اسے آپ ایسی دوسری جگہیں بھی دکھائیں جو تاج محل ہی کی طرح حسین اور دلفریب ہیں۔ اسے وہ ہندستان دکھایئے جس سے وہ بے خبر ہے۔

بھارت کو آپ کی ضرورت ہے

سیاحوں سے آپ کا سابقہ پڑتا رہتا ہے۔ آپ سے زیادہ انھیں کون جانتا ہے۔ یہ بات یاد رکھئے کہ آپ کی پرواز فکر اور قوتِ عمل و ترغیب کے بغیر بھارت کے دیدنی مقامات غیر ملکی سیاحوں سے محروم رہ جائیں گے۔

اور اس کے نتیجے میں خود آپ بھی۔

ٹورازم ایک صنعت ہے۔ اب وہ وقت آ پہنچا ہے کہ اس ضمن میں بھارت اپنے حصّے کا منافع بڑھائے

ڈیپارٹمنٹ آف ٹورازم
گورنمنٹ آف انڈیا

ASP/DOT-80

مہیش نارائن شرما

ڈاکٹر مختار احمد انصاری

ایک عظیم دیش بھگت

ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں ملک کے سبھی مذہبوں اور فرقوں کے لوگوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس تحریک آزادی کا ایک اہم پہلو یہ تھا کہ اس میں نہ صرف ملک کی نامور ہستیوں نے شرکت کی بلکہ یہ ایک ایسی عوامی تحریک بن گئی کہ اس میں اگر ایک طرف موتی لال نہرو، سی۔ آر۔ داس، مہاتما گاندھی، حکیم اجمل خاں، شیخ الہند مولانا محمود حسن، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، وٹھل بھائی پٹیل اور مولانا ابوالکلام آزاد ایسی ممتاز و محترم ہستیاں شریک ہوئیں تو دوسری طرف ملک کے لاکھوں عوام شامل تھے جنھوں نے ہر طرح کی قربانیاں دیں اور ان سب کوششوں کے نتیجے میں ہمارا ملک آزاد ہوا۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری بھی جن کی صد سالہ تقاریب کا اہتمام ابھی حال ہی میں کیا گیا تھا، صف اول کے ان رہنماؤں میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے عیش و آرام تیج کر قوم و وطن کے لیے دن رات کام کیا اور ہندو مسلمانوں کے درمیان اتحاد کو ہر قیمت پر عزیز سمجھا۔

ڈاکٹر مختار احمد انصاری کو اپنے مریضوں کا بے حد خیال رہتا تھا۔ ۱۹۲۰ء میں احمد آباد کانگریس کی مجلس انتظامیہ کی میٹنگ میں اس لیے شریک نہ ہو سکے کیونکہ انھیں ایک راست میں کچھ مریضوں کو دیکھنے کے لیے جانا تھا۔ گاندھی جی کی صحت کے بارے میں وہ ہمیشہ فکرمند رہتے۔ گاندھی جی جب ۱۹۳۲ء میں پونا میں برت رکھے ہوئے تھے۔ تو ڈاکٹر انصاری بے حد فکرمند دکھائی دیتے تھے اور ان کا مسلسل اصرار تھا کہ گاندھی جی برت نہ رکھیں۔

۱۹۱۵ء میں ڈاکٹر انصاری نے سیاست کی طرف قدم بڑھانا شروع کیا۔ اس لیے اس سال کو ان کی زندگی کا ایک اہم سنگ میل کہا جا سکتا ہے۔ یوں تو ان کی ملاقات پنڈت موتی لال نہرو سے لندن میں ہو چکی تھی لیکن اس وقت تک وہ سیاست سے دور رہے۔ اس دور کے حالات نے ڈاکٹر انصاری کے حساس دل کو ملکی معاملات میں دلچسپی لینے پر مجبور کیا۔ چونکہ وہ مولانا محمد علی کے فیملی ڈاکٹر تھے، اس لیے مولانا کی گرفتاری پر حکومت نے ڈاکٹر انصاری پر بھی نظر رکھنی شروع کر دیا اور انھیں محمد علی سے ملاقات کی اجازت بھی نہ ملی۔ یہ واقعہ ان کے لیے بے حد اندوہناک تھا۔

اینی بسنٹ نے جب ہوم رول تحریک کا آغاز کیا تو ڈاکٹر انصاری اہم شخصیوں کے صف میں شامل ہوئے۔ ۱۹۱۷ء میں انھوں نے دلی میں ہوم رول لیگ قائم کی اور اس کے صدر ہوئے۔ دریں اثنا انھوں نے گاندھی جی کی دلکش شخصیت سے اثر قبول کیا۔ ڈاکٹر انصاری کی نظر میں گاندھی جی ایک ایسی محبوب شخصیت تھے جو نہ صرف ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے واجب التعظیم تھے بلکہ پوری نوع انسانی کے لیے ایک نعمت تھے۔ ڈاکٹر انصاری مولانا محمد علی سے بھی بہت قریب آ گئے تھے مئی ۱۹۱۹ء میں جب بمبئی میں خلافت کمیٹی کی میٹنگ ہوئی تو اس میں گاندھی جی نے کہا تھا کہ میں نے اچھے مسلمان رہنماؤں کی تلاش شروع کی۔ میری خواہش دلی پہنچنے پر اس وقت پوری ہوئی جب میں نے ڈاکٹر انصاری سے ملاقات کی۔ اس کے بعد میرے مسلمان دوستوں کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا۔

ستمبر ۱۹۱۷ء کو ڈاکٹر انصاری نے لکھنؤ میں صوبائی کانگریس کمیٹی کو خطاب کرتے ہوئے خود مختاری کی مانگ کی۔ ۱۹۱۹ء میں گاندھی جی نے خلافت اور عدم تعاون کی تحریکیوں میں اپنا زبردست تعاون دیا۔ گاندھی جی نے زندگی بھر ہندو مسلم اتحاد کے لیے جو کام کیا اس میں ڈاکٹر انصاری نے برابر ہاتھ بٹایا۔ گاندھی جی نے ۱۹۱۹ء میں ایک میٹنگ میں خلافت تحریک کی وکالت کرتے ہوئے مسلمانوں سے کہا کہ برطانوی حکومت کا مقصد ترکی حکومت کو منتشر کر کے اپنی حکومت کو توسیع دینا ہے۔ گاندھی جی نے کئی مقامات کا دورہ کیا۔ خلافت اور عدم تعاون کی تحریکیوں کے لیے تقریریں کیں۔ دسمبر ۱۹۲۲ء میں ڈاکٹر انصاری کل ہند خلافت۔ کانگریس کے گیا کے اجلاس میں صدر چنے گئے۔ اس اجلاس میں انھوں نے ایک قرارداد کے ذریعے گاندھی جی کی گرفتاری کی مذمت کی۔

ہندو مسلم فرقوں کے درمیان اتحاد کے لیے ڈاکٹر انصاری نے بھرپور کوششیں کیں کیوں کہ اس کے بغیر کسی بھی مقصد کی تکمیل ناممکن تھی۔ اپریل ۱۹۱۹ء میں سی۔ اے بیرن، چیف کمشنر دلی نے قیام امن کے سلسلے میں خاص خاص آدمیوں کی ایک میٹنگ بلائی جس میں ڈاکٹر انصاری بھی تھے۔ گاندھی جی کے مارچ ۱۹۲۲ء میں گرفتار ہونے پر ڈاکٹر انصاری نے اپنے طور پر ایک میٹنگ بلائی جس میں سودیشی چیزوں کو اپنانے اور ہندو مسلم اتحاد قائم کرنے کے لیے عہد کیا گیا۔ ۱۹۲۳ء میں دلی کے ایک عام جلسے سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لیے پنچایتوں کے قیام اور کمیٹیوں کی تشکیل کا اعلان کر دیا۔

۱۹۲۲ء میں عدم تعاون تحریک کے واپس لیے جانے پر کانگریس میں اختلاف رونما ہوئیں۔ اور کانگریس دو دھڑوں میں بٹ گئی تھی۔ یہ وقت بہت نازک تھا۔

(بقیہ صـ۳۵ـ پر)

1981ء کو
ایک مبارک
نیا
معذور
اور
اپاہج افراد کے لئے بھی
اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے 1981ء کو
معذور افراد کے بین الاقوامی سال کے طور پر
منائے جانے کا اعلان کیا ہے۔
بھارت سرکار جنرل اسمبلی کی قرار داد میں
رکھے گئے مقاصد کی تصدیق کرتی ہے۔
مزید تفصیلات کے لئے رجوع کیجئے:
وزارتِ سماجی بہبود،
بھارت سرکار،
شاستری بھون، نئی دہلی-110001
davp 80/303

نئی کتابیں

منٹو — فن اور شخصیت

ناشر: ماڈرن پبلشنگ ہاؤس گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۲۔
ترتیب وانتخاب: پریم گوپال متل
قیمت: چالیس روپے

منٹو عہد ساز افسانہ نگار تھا۔ اس کے لہجے کا منفرد آہنگ، اس کی کردار نگاری کی بے پناہ قوت اور نفسی تجزیہ کی بے مثال صلاحیت کے ساتھ جزیات نگاری پر قدرت کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ بلا شبہ منٹو جیسا دھڑلے دار افسانہ نگار اُردو کے افسانوی اُفق پر دوسرا نظر نہیں آتا۔ وہ سامنے کی بات کو انتہائی بے باک انداز میں کہتا ہے لیکن اس انداز کو سپاٹ نہیں ہونے دیتا۔ عورت کے جسمانی استحصال اور روحانی قتل کو موضوع بنا کر افسانہ لکھنا اور اپنی تحریر میں اس افسوسناک صورتِ حال کے تئیں تمام تر انسانی ہمدردی کو جگا کر رکھ دینا منٹو کا کمال تھا۔ ہتک، سڑک کے کنارے، ٹھنڈا گوشت، سو کینڈل پاور کا بلب اور دیگر افسانے منٹو کے فنی معراج کا عکس و آئینہ ہیں۔ عورت کے اپنی جسمانی اور معاشی استحصال کو خاموشی سے برداشت کرتے رہنے اور ایک جھٹکے میں اپنے روحانی قتل پر بیدار ہو کر بپھر اُٹھنے کی کہانی ہتک، سڑک کے کنارے والی عورت کی ایک خاص لمحے میں خود سپردگی اور اس کے نتیجے میں برآمد ہونے والی بچی کے متعلق نفسیاتی فشار کا تند و تیز سیلاب، ٹھنڈے گوشت، والے ایشر سنگھ کے گناہ کا اس کی مردانہ جِس کو نامردی میں تبدیل کر دینے والے ٹھنڈے احساس کا بوجھ اور خوشیا دلال کا اپنی ذہنیت کے زیر اثر دلال سے گاہک بن جانے والے فطری واقعہ کی افسانوی شکل میں قلمبندی منٹو کا عظیم کارنامہ ہے۔ ایسی ہی دوسری مثالوں کی کمی نہیں۔

لیکن منٹو پر ایک بھرپور اور جامع کتاب کی ضرورت پوری کرنے والے کسی ادارے کی کمی شدت سے محسوس کی جا رہی تھی اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ضرورت موڈرن پبلشنگ ہاؤس دریا گنج نے منفرد انداز میں پوری کی ہے اس منٹو کے فن اور شخصیت پر بہترین مواد کو یکجا کرنے کا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ منٹو کو سمجھنے اور جاننے اور اس کے فن کی رُوح کو چھو لینے کے شائقین لوگوں کے لیے یہ کتاب ایک نعمت مترقبہ سے کم نہیں۔ اس میں منٹو کی شخصیت اور فن پر سیر حاصل مضامین اور منٹو کے بہترین اکیس افسانوں کے ساتھ ساتھ منٹو کے نرگس، اشوک کمار، میراجی اور دوسری ہستیوں پر خاکے بھی ہیں۔ منٹو کے زرخیز ذہن کی بلا خیزی پر یہ ایک دستاویز ہے۔ کتاب نہایت اعلیٰ شائع ہوئی ہے۔

انتظار حسین کے سترہ افسانے

ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۲۔
قیمت: اٹھارہ روپے

آج اُردو افسانے کی دُنیا میں جو مرتبہ انتظار حسین کو میسر ہے، وہ شاید کسی دوسرے افسانہ نگار کو نہیں۔ اس کی وجہ ایک نہیں ہے۔ انتظار حسین نے مراجعت ہجرت کی خواہش اور المیے کو اپنی فکر کی اساس بنا کر افسانوی فن کو ایک عجیب کیفیت سے معمور کیا ہے اور یہ بات بڑے واضح انداز میں کہنے کی جسارت کی ہے کہ داستانوں، دیو مالائی کتھاؤں اور اسطوری قصوں کی پناہ میں جانا افسانہ نگار کا دھرم ہے۔ آیا موجودہ صورتِ حال کی اضطرابی اور اضطراری کیفیات کو قدیم قصّوں، کہانیوں اور کتھاؤں کے حوالوں سے صفحۂ قرطاس پر پوری شدت سے اُتارا جا سکتا ہے یا نہیں، یہ ایک سوال ہے۔ اپنے سترہ افسانوں میں انتظار حسین نے اس صورتِ حال کے تذبذب اور خوف کو فکر و فن کے شیشے میں اُتارنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ مجھے ان افسانوں میں ایک بے چینی، ایک اندیشہ اور ایک ہراس جملہ جملہ نظر آیا ہے۔ انتظار حسین کو کسی پہلو قرار نہیں۔ وہ آج کی تہذیبی اقدار سے خائف ہیں اور آج کے انسان اور معاشرے کے کردار کی ہیبت کے زیر اثر لگاتار سسکتے رہنے پر مجبور ہیں۔ ایک بھی افسانہ زندگی کی آنکھ میں آنکھ ڈالنے کا حوصلہ نہیں دیتا۔ گریز اور فرار کے لیے مجبور ضرور کرتا ہے۔ انسانی فکر اور اس کے ارتقا پر افسانہ نگار کو رتی بھر اعتبار نہیں اور یہ بے چینی اور ہراساں بے اعتباری ایک ایسی بے زاری کا روپ دھارن کر لیتی ہے جس کی گرفت قاری پر مضبوط تر ہوتی جاتی ہے۔ شہرِ افسوس کے افسانے پڑھتے وقت لگتا ہے کوئی خبیث رُوح ہمارا پیچھا کر رہی ہے۔ اس کے قدموں کی آہٹ ہمارے اندر عجیب وحشت بن کر سرایت کرتی جا رہی ہے اور ہم اگلے ہی لمحے اس کے خونخوار جبڑوں میں پھنسنے والے ہیں۔ ان افسانوں میں رجائیت کے عنصر کا مکمل فقدان ہے اور ان بے اطمینانی کا عنصر غالب ہے جس سے چھٹکارا پانے کا وسیلہ ہمارے پاس نہیں ہے۔

انتظار حسین کی خصوصیت ان کا پُر اعتماد اندازِ تحریر ہے جو ان کی مریضانہ سوچ کو فنی اساس اور جواز بخشتا ہے۔ موڈرن پبلشنگ ہاؤس نے یہ افسانے بھارت میں پہلی بار کتابی صورت میں شائع کر کے ہمیں انتظار حسین کی شخصیت اور فکر و فن سے متعارف کرایا ہے۔ کتاب کی قیمت واجبی ہے۔ یہ ایک بڑے افسانہ نگار کے تخلیقی سفر کی داستان ہے۔

کنور سین

منظوم ڈراما ہے جو اسٹیج کی خاطر لکھا گیا اور ۱۹۶۶ء سے اب تک آگرے اور دہلی میں متعدد بار اسٹیج کیا گیا۔ اس کی مقبولیت نہ صرف تخلیق کار کے لیے بلکہ اردو اسٹیج سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے بھی حوصلہ افزا ہے۔

تاریخ کو ڈرامے کا موضوع بنانا بڑا مشکل کام ہے اس میں نہ ہاتھ باگ پر ہوتا ہے اور نہ پا رکاب میں۔ رفعت سروش نے تاریخ کے ایک ایسے دور کو موضوع بنایا ہے جس کے بارے میں ہماری معلومات خاصی وسیع ہیں۔ پھر بھی ان کے خلاق ذہن نے ایسے گوشے تلاش کر لیے جہاں قلم کو جولانی دکھانے کا موقع مل سکے۔ ایک تجربہ کار ڈراما نویس کی حیثیت سے انھوں نے اسٹیج کی جدید تکنک کو خوبی سے برتا ہے اور صوت و ساز سے بڑا فائدہ اٹھایا ہے۔ مکالمے جاندار ہیں اور فضا آفرینی کے علاوہ کہانی کے ارتقا میں بھی معاون ہوتے ہیں۔

دوسرا قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ رفعت سروش نے پابند شاعری کی ہے جو اس طرح کی تخلیق کے لیے بڑا مشکل کام ہے لیکن اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اوپیرا کی غنائیت بڑھ گئی ہے۔ اوپیرا، منظوم ڈرامہ، تمثیل کی صنفیں ابھی تہی دست ہیں۔ ہمیں رفعت سروش کا شکر گزار ہونا چاہیئے کہ انھوں نے ان اصناف کی طرف توجہ دی ہے اور اس کے اچھے نمونے پیش کیے ہیں۔

(ش۔ ح)

وضاحتی کتابیات

مرتبین: پروفیسر گوپی چند نارنگ و ڈاکٹر مظفر حنفی
ناشر: ترقی اردو بیورو۔ نئی دہلی
قیمت: سترہ روپے

ادھر چند سالوں میں اردو کتابوں کی اشاعت میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے اور مختلف علوم اور فنون پر اردو پبلیشروں نے کتابیں شائع کی ہیں لیکن اردو میں اب تک تمام مطبوعات کی وضاحتی فہرست شائع نہیں ہوئی۔ ۱۹۰۳ء میں علامہ شبلی نعمانی (انجمن ترقی اردو ہند کے سب سے پہلے اعزازی جنرل سکریٹری) کی سفارش پر انجمن ترقی اردو ہند کی ادبی کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ اردو کی تمام مطبوعات کی ایک جامع فہرست تیار کی جائے چنانچہ علامہ شبلی نے یہ کام مولوی سجاد مرزا کے سپرد کیا۔ مولوی سجاد مرزا نے اردو مطبوعات کی کتابیات "الفہرست" کے نام سے مرتب کی اور اسے ۱۹۲۳ء میں نظام دکن پریس حیدرآباد سے شائع کیا۔ اردو مطبوعات کی یہ پہلی کتابیات ہے جسے بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق کو بھی اردو مطبوعات کی کتابیات کی تیاری کا احساس تھا اور انھوں نے تقسیم ہند کے بعد اس کام کی از سر نو داغ بیل ڈالی اور "قاموس الکتب" کے نام سے اردو مطبوعات کی پہلی جلد انجمن ترقی اردو کراچی سے ۱۹۶۱ء میں شائع کی۔ قاموس الکتب کی یہ جلد اسلامیات سے متعلق ہے اس کی دوسری جلد "تاریخیات" پر مشتمل ہے جو عرصہ ہوا شائع ہو چکی ہے ابھی حال ہی میں اس کی تیسری جلد جو "عمرانیات" سے متعلق ہے شائع ہوئی ہے۔ اس جلد میں ۳۹ ذیلی عنوانات کے تحت ۱۴۳۲ کتابوں کا تذکرہ کیا گیا ہے اس کے کل صفحات ۸۱۶ ہیں۔ ہندستان میں مولانا ابوالکلام آزاد کو اس کام کی اہمیت کا احساس تھا اور ان کے ایما سے حکومت اتر پردیش لکھنؤ نے قومی کتابیات کے نام سے اردو کتابوں کی کتابیات کا کام ۱۹۵۹ء میں شروع کیا اور اس کی صرف تین جلدیں شائع ہو سکیں لیکن بعد میں یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔

ہمیں بڑی مسرت اور خوشی ہے کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ۱۹۷۰ء سے تمام اردو کتابوں کی وضاحتی کتابیات تیار کرنے کا کام شروع کیا ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوا کہ کتابیات اپنی نوعیت کی پہلی چیز ہے۔ بیشتر کتابوں پر تفصیلی نوٹ لکھے گئے ہیں اور بعض پر مختصر مگر جامع نوٹ ہیں۔ ایسی کتابوں کی اشاعت سے ریسرچ اسکالرس کو بڑی مدد ملتی ہے۔ اس لیے یہ کتابیات اردو اسکالرس کے لیے خضر راہ کا کام دے گی۔ اس سے پہلے جو کتابیات شائع ہوئیں ان میں کتاب کا نام، مصنف کا نام، پریس کا نام اور سنہ اشاعت دیا جاتا تھا اس وضاحتی کتابیات کی بڑی خوبی یہ ہے کہ کتاب کے موضوع پر بھی خاصا تفصیل سے لکھا گیا ہے۔ اور اس سے اور کتابوں کی رفتار کا اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔ اس میں ۲۷۳ کتابوں کی کتابیات درج ہیں جن میں ۱۲۷ ادب و زبان کے بارے میں، ۳۶ سماجی و سائنسی علوم کے بارے میں، ۲۱ مذہبیات کے بارے میں، ۲۸ بچوں کے ادب کے بارے میں اور ۶ متفرقات پر مشتمل ہیں۔ اس سال میں ناول و افسانے کی رفتار قابل اطمینان نہیں۔ یہ وضاحتی کتابیات کتب خانوں کے ناظم کتب خانہ کے لیے نہ صرف مفید ہے بلکہ ان کو قدم قدم پر اس کی رہنمائی کی ضرورت محسوس ہوگی۔ کتاب کے آخر میں دو اشاریے دیے گیے ہیں۔ ان میں ایک اشاریۂ کتب ہے اور دوسرا اشاریۂ مصنفین۔

آئندہ جلدوں کی اشاعت کے لیے مولفین سے ہماری یہ درخواست ہے کہ وضاحتی کتابیات کے آخر میں اردو ناشروں کے مکمل پتے دیے جائیں اور اسی کے ساتھ اردو کتب خانوں کی ڈائرکٹری کی تیاری کا کام بھی کیا جائے۔ ان دونوں کاموں کا کتابیات کے فن سے گہرا تعلق ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ اور ان کے رفیق کار ڈاکٹر مظفر حنفی قابل مبارک باد ہیں کہ انھوں نے وضاحتی کتابیات کا یہ سلسلہ شروع کر کے اردو دنیا پر بڑا احسان کیا ہے۔

یہ کتابیات دیدہ زیب گٹ اپ کے ساتھ آفسیٹ پر ترقی اردو بیورو نے شائع کی ہے۔ قیمت کتاب کی ضخامت اور اس ہوش ربا کاغذ کی گرانی کو دیکھتے ہوئے بہت کم ہے۔

ایم۔ حبیب خاں۔

ریزہ ریزہ (شعری مجموعہ)

مصنف : ظفر حمیدی
قیمت : دس روپیے

'ریزہ ریزہ' ڈاکٹر ظفر حمیدی کا تیسرا شعری مجموعہ ہے جو ان کی فکر کی ایک نئی جہت کو سامنے لاتا ہے۔ اس طرح 'ریزہ ریزہ' کا شاعر 'رقص خیال' اور 'نوائے پرخیال' کے شاعر سے قدرے مختلف ہوگیا ہے۔ اب شاعر اپنے متعقدات کا اظہار پیش لفظ میں برملا نہیں کرتا بلکہ مجموعہ کی ابتدا میں حمد اور نعت کو شامل کرکے بالواسطہ کرتا ہے۔ پہلے مجموعہ کے پیش لفظ اور تیسرے مجموعے میں حمد و نعت کی شمولیت کے باوجود، فکر کی زیریں لہر ایک ہی ہے جو تینوں مجموعوں میں کارفرما ہے۔ 'رقص خیال' کا شاعر مریضہ کی موت کے بعد اپنی فیس وصول کرکے شرمندہ تھا، 'ریزہ ریزہ' کا شاعر دوستوں کی محفل میں، منافقانہ رویوں سے نالاں ہے۔

ڈاکٹر ظفر حمیدی کی اس نئی فکری جہت نے ان کے فن پر پہرے بٹھا دیے ہیں پھر بھی بعض نظمیں فنی تکمیل کا احساس دلاتی ہیں اور سخن شناسوں کے حلقے میں پسند کی جائیں گی۔ کتابت و طباعت اچھی ہے۔

(ممتاز بانو)

کرماں والی (ناول)

مصنف : کشمیری لعل ذاکر
ناشر : ماڈرن پبلشنگ ہاؤس ۹ گولا مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی
قیمت : بیس روپے

کشمیری لعل ذاکر اردو فکشن کے میدان کے پرانے شہسوار ہیں۔ بیانیہ طرزِ اظہار پر جو قدرت اُن کو حاصل ہے وہ عام نہیں۔ 'کرماں والی' ان کا نیا تخلیقی کارنامہ ہے۔

'کرماں والی' کے معنی ہیں 'خوش قسمت'۔ یہ ایک مہاجر عورت کی کہانی ہے، جو اسی کے زبانی بیان کی گئی ہے۔ دراصل یہ ان کرداروں اور واقعات کی داستان ہے، جو قسمت یعنی اپنے اپنے مقدر کے تابع ہیں، جن کی زندگی پر ان کا کوئی عمل دخل نہیں۔ مقدر انھیں جس حالت میں رکھتا ہے انھیں اسی میں رہنا پڑتا ہے۔ ان کا بس نہ اپنے افعال پر ہے نہ اعمال پر۔

'کرماں والی' اپنے بچپن، جوانی اور بڑھاپے کا جو قصہ بیان کرتی ہے، اُس میں واردات اپنا زندہ وجود نہیں رکھتی بس ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کچھ غیر ارادی طور پر ہو گیا۔ لیکن اس غم و نشاط، ہجر و وصال کے قصے میں ایک اپنی تندی اور تیزی ہے جس کی دلچسپی آغاز سے لیکر اختتام تک قائم رہتی ہے۔ ذاکر جذبات نگاری میں کمال رکھتے ہیں اور یہی کمال اس ناول کی فنی رعنائی اور تخلیقی توانائی بن کر قاری کو مسحور کرتا چلا جاتا ہے۔ جذبات کے سوتے اگر کرماں والی کے دل سے پھوٹتے ہیں تو وہ حاکم اور نوری، ننھا سنگھ گرنتھی اور جیت کور، سرن داس اور اس کی بیوی اور پیر چھچو شاہ کے پیر مزار اور اس کی بیٹی شاداں کی روح سے بھی رواں ہوتے ہیں۔

کریم بخش اور وکیلاں یا ایک آدھ برا کردار ضمنی حیثیت رکھتے ہیں کہ ان کا ناول میں بس یوں ہی ساذکر ہے۔ ذاکر انسانی فطرت میں پوشیدہ نیکی، شرافت اور ہمدردی کو ہی قصے کی بنیاد بناتے ہیں اور وحدت تاثر پیدا کرتے ہیں۔

'کرماں والی' ایسے لوگوں کی گاتھا ہے جو کوئی واضح سماجی، سیاسی یا معاشرتی شعور نہیں رکھتے۔ وہ معصوم اور بھولے من کے ساتھ زندگی کہتے ہیں اور اپنے ماحول سے چھوٹی چھوٹی خوشیاں وصول کرکے مطمئن اور شاداں ہیں۔ وہ زندگی کے آزار بھی بلا کسی غور و خوض کے سہتے ہیں اور آنے والے دنوں کا بے نیازی سے انتظار کرتے ہیں۔ ان کے لیے حال ہی سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ پھر بھی ان کی رنج و محن ایک دلخراش کہانی میں ڈھلتے چلے جاتے ہیں۔ قاری کو ایسا جان پڑتا ہے جیسے ناول کے کرداروں پر ہو رہی زیادتی اس کے اپنے اوپر بیتا المیہ ہے۔ کرماں والی اور اس کے مردفیقے کی طرح وہ بھی نہیں جانتا کہ ملک کیوں تقسیم ہوا اور ہندو اور مسلمان جو صدیوں سے ایک دوسرے کا سہارا بن کر جی رہے تھے اچانک دشمن کیوں بن بیٹھے۔ ان کی آنکھوں میں بسی محبت اور مروت کی جگہ جلادیت اور بے رخی کہاں سے آ جمی۔ انسانی تاریخ کی اس سب سے بڑی اور سفاک ترین ہجرت کا سبب اور اس کے پیچھے کارفرما عوامل کا اسے کوئی علم نہیں لیکن وہ اس کا شکار ضرور ہے۔ وہ ایک انجانے اور ان چاہے شر کے چنگل میں اچانک ہی آ جاتا ہے اور اس بلائے ناگہانی کے صید بسمل کے طور پر زندگی کرتا ہے۔

ایک بار اکھڑ کر دوبارہ جمنے کے دوران انسان پر کیا کچھ بیت جاتا ہے اس کا انداز 'کرماں والی' پڑھ کر خوب ہوتا ہے۔ ذاکر کے پاس طنز بلیغ کا جو نشتر ہے اُس کا انھوں نے کارگر استعمال کیا ہے۔ . . . . . .

. . . . . . ذاکر نے یہ بتانے پر زور دیا ہے کہ آبادیوں کا تبادلہ ملک کی تقسیم کے ساتھ کوئی ربط نہ رکھتا تھا۔ نہ اس تبادلے کا کوئی سیاسی، معاشرتی یا ثقافتی جواز تھا پھر بھی تبادلہ ہوا . . . . . انسانی جان اور جذبات کی جو ناقدری فسادات میں ہوئی اس کو سوچ کر ہی روح کانپ اٹھتی ہے یہی ناقدری اور بے حرمتی کرماں والی کا مرکزی استعارہ ہے۔

ذاکر نے بڑی سلاست اور روانی کے ساتھ یہ بہو رنگ داستان ہمارے سامنے پیش کی ہے۔ کسی بھی کردار کو زیادہ فعال بنائے بغیر اور کسی بھی واقعہ کو اس کے سیاق و سباق کے ساتھ پیش کئے بغیر بس اشاروں سے کام لیا ہے۔ یہ اختصار اور اشاریت ناول کی جان ہے۔ اور ذاکر کی فنی سوجھ بوجھ کا ثبوت زبان و بیان میں کہیں کہیں پنجابی لہجہ کی جھلک حقیقت نگاری کو مہمیز لگاتی ہے اور اس کی چاشنی بڑھاتی ہے۔

تقسیم وطن اور اس کے نتیجے کے طور پر پیدا ہونے والی المناک صورت حال کو قلمبند کرکے ذاکر نے اردو فکشن کے خزانے میں قابلِ تحسین اضافہ کیا ہے۔ اس داستان کو موڈرن پبلشنگ ہاؤس نے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے تاکہ یہ دستاویز موجودہ اور آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ ہو جائے۔

مجموعہ کلام :۔ پہلی کرن کا بوجھ — شاعر: مغنی تبسم
ناشر: ماڈرن پبلشنگ ہاؤس ۹ گولا مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی۔
قیمت : بارہ روپے

مغنی تبسم اپنی ذات کا اظہار شعر کے وسیلے سے کرتے ہیں اور ذات کے وسیلے سے کائنات کا وجدان حاصل کرنے میں کمال رکھتے ہیں۔

پہلی کرن کا بوجھ ان کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے۔ ان شعری کاوشوں میں انھوں نے اپنی فنی شخصیت کی ربودگی، متانت اور طمانیت کا بڑی سنجیدگی اور وقار سے اظہار کیا ہے۔

شاعر کی شاعری کا استعارہ ایک مبہم لیکن آنچ دار غم ہے جس کے دھندلکوں میں پھیلی کسک شعری پیکر میں ڈھل کر قاری کو عجیب صورت کیف وکم سے آشنا کراتی ہے اور اس کے وجود میں سرایت کر جاتی ہے۔

نظم ہو چاہے غزل، مغنی تبسم نظم وضبط اور احتیاط کا دامن نہیں چھوڑتے وہ اپنی بات بڑے سلیقے سے کہتے ہیں اور سلجھے ہوئے انداز سے شعر میں منتقل کرتے ہیں۔ ان کی شاعری کی حزینہ لیے تہذیب غم کی عکاس ہے اور یہی غم ان کے اشعار میں بسے تغزل کی اساس ہے۔

مغنی تبسم جذبات کی وحشت کو رام کرنے کا فن جانتے ہیں اور اپنے تہ دار تجربوں کے اظہار پر قادر ہیں۔ نظم 'مجھے یاد ہے' میں وہ اپنی کوتاہی اور کم ظرفی پر پشیمان ضرور ہیں لیکن اس پشیمانی کو شاعری کے شیشے میں اتار کر مطمئن بھی کم نہیں ہیں—

مجھے یاد ہے
وہ انا بدست سوال بھی
وہ خیال بھی
کوئی حادثہ جو شریک ہو تو سفر کٹے
کہ یہ دائرہ قفس ہے جس کا محیط مرگِ دوام ہے
مجھے زندگی کا شرارِ جستہ عزیز تھا
کہ میں دائرے سے نکل گیا
تری آرزو سے خجل ہوں میں
مجھے اپنے عہد کا پاس کچھ بھی نہیں رہا

مغنی تبسم کے شعروں میں ایک آہستہ روی اور مدھم آہنگ ہے جو دل کو بس چھو کر گذر جاتا ہے اور دل کے تار دیر تک مرتعش رہتے ہیں—

ترا خیال تھا تازہ ہوا کے جھونکے میں
جو گرد اُڑ کے گئی ہے، ملال میرا تھا

کسی فراق کی تمہید بن کے رہ جانا
ترے وصال کی تسکین بھی کیا ہے میرے لیے

مغنی تبسم نے مختصر نظمیں بھی کہی ہیں جن میں سے کچھ زیرِ نظر مجموعہ کی زینت ہیں۔ ایک مختصر نظم پڑھیے اور دیر تک اداس رہیے۔

راستے وہاں جاتے ہیں
جہاں کوئی نہیں جاتا

شاعر کے CONCEPTION کی بے ساختگی پرواہ کیے بغیر 'پہلی کرن کا بوجھ' کا قاری مجموعہ میز پر واپس نہیں رکھ سکتا۔

کتاب کی اشاعت میں ایک سلیقہ ہے، جو موڈرن پبلشنگ ہاؤس کو اہم اشاعتی ادارہ قرار دیتا ہے۔ قیمت زیادہ نہیں۔

قصۂ جدید وقدیم — مولّف۔ مخمور سعیدی
ناشر۔ ماڈرن پبلشنگ ہاؤس گولہ مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی۔
قیمت:۔ ۱۸ روپے

ادب وفن کی اقدار اور ان کے متعلق نظریات بھی زمانہ کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ ایسا نہ ہو تو قدیم اور جدید جیسی اصطلاعات بے معنی ہو جائیں کہ ان کے زندہ رہنے کا جواز میسر نہ ہو سکے۔ جو آج نیا ہے کل پرانا کہلائے گا کیونکہ حسیت اور مزاج و مذاق عہد بہ عہد بدلتے رہتے ہیں۔ دنیا کا یہ اٹل دستور ہے اور اسی دستور کے تناظر میں ہم کائنات کی بوقلمونی اور ہمہ رنگی کو وصول اور قبول کرتے ہیں۔

اردو ادب میں بھی یہ بات موضوعِ بحث بنی رہتی ہے کہ کس کو قدیم کہیں اور کس کو جدید۔ جو آج تخلیق ہو رہا ہے اس میں قدامت اور جدت کا کیا تناسب ہے۔ اور رد و قبول کا یہ سلسلہ روایت اور اُس سے انحراف کے سیاق میں کہاں تک لائقِ تحسین ہے۔

ماہنامہ 'تحریک' کے پچھلے برسوں کے شماروں میں ایک سوال نامہ شائع ہوتا رہا اور اس پر جوابات بھی بالتفصیل چھپتے رہے 'جدید ادب کی بنیادی اقدار' اس کا قدیم ادب سے انحراف، اُس میں ہیئتی اور موضوعاتی تبدیلیوں کا جواز اور اس میں تنہائی کے احساس کے پیچھے کار فرما عوامل کے ساتھ ساتھ اس بات پر بھی شاعروں اور ادیبوں اور افسانہ نگاروں نے رائے دی کہ ادب کو کہاں تک تبلیغ یا ترسیل کا ذریعہ مانا جا سکتا ہے۔ یہ مدعا بھی اٹھایا گیا کہ ترقی پسندوں کا یہ دعویٰ کہ جدید ادب ترقی پسند ادب کی توسیع ہے کہاں تک قابلِ قبول ہے۔ ایک سوال یہ بھی اٹھا کہ ملک اور قوم کی تعمیر میں ادب کوئی کردار ادا کر سکتا ہے اور آیا ادب کو ناپسندیدہ جذبات کے پر امن اخراج کا ذریعہ مانا جا سکتا ہے؟

اس ادبی مباحثہ میں یوسف حسین خاں، گوپال متل، گیان چند، گوپی چند نارنگ، قمر رئیس اور شمس الرحمٰن فاروقی جیسے قابلِ ذکر ادیبوں اور

ناقدوں کے ساتھ ساتھ کئی شاعروں اور افسانہ نگاروں نے بھی حصّہ لیا۔ان کے مفروضات،خیالات اور ارشادات کو کتابی شکل میں پیش کرنے کا سہرا اس دور کے نامور شاعر مخمور سعیدی کے سر ہے۔بلاشبہ انھوں نے مختلف آرا کو ترتیب دینے میں کافی سوجھ بوجھ کا ثبوت دیا ہے۔پورے مباحثے کو پڑھ کر یقیناً قاری کے ذہن میں نئے دریچے کھل جاتے ہیں اور اسے باوثوق اور پختہ اندازِ نظر حاصل ہو جاتا ہے۔جس کے وسیلے سے وہ قدیم ادب کے تناظر میں جدید ادب کو اپنے طور پر پڑھ اور سمجھ سکتا ہے اور جدید تخلیقات میں قدامت کا پرتو دیکھ سکنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔یہ بات معمولی نہیں کہ قصّۂ جدید و قدیم کا مطالعہ قاری کو اعتماد بخشتا ہے اور اس کی ادب و فن سے حظ اٹھانے کی استعداد کو فزوں کرتا ہے۔اس مباحثہ کا قاری کسی خاص ادبی یا فنّی نقطۂ نظر کا غلام نہیں رہتا کیونکہ اس کی ذہنی فضا آزادہ روی کے نئے طول و عرض سے ہمکنار ہو جاتی ہے جس کی بقا کی ضمانت بھی اس مباحثہ کے مطالعہ میں نہاں ہے

موڈرن پبلشنگ ہاؤس نے یہ مباحثہ شائع کر کے کوزے میں دریا بند کر دیا ہے۔کتابت اور طباعت خوب ہے اور اہلِ ذوق کے لیے قیمت بھی زیادہ نہیں۔

مجموعۂ کلام ۔ روشنی پھر روشنی ہے۔
شاعر۔ بمل کرشن اشکؔ
ناشر۔موڈرن پبلشنگ ہاؤس گولہ مارکیٹ دریا گنج، نئی دہلی۔۲
قیمت ۔۔ دس روپے

بمل کرشن اشکؔ جدید شاعری کا ایک اہم نام ہے۔ان کی شعری حسیات کی انفرادیت ان کے شاعرانہ مرتبے کو بلند کرتی ہے۔بلاشبہ ان کا واقعہ اور واردات کو محسوس کرنے کا اپنا طریقہ ہے اور اس سے حاصل ہوئے تجربے کے کرب کو شعر کے قالب میں ڈھالنے کا اپنا انداز۔

روشنی پھر روشنی ہے میں اشکؔ کا لہجہ کھلا اور آزاد ہے۔اس لہجے میں فقیرانہ صدا کی ٹھوک اور قلندرانہ مستی کی رمق ہے۔احساس و اظہار کا یہ بے ساختہ میلان اور میزان اس مجموعہ کی نظموں کی اساس ہے اور یہی اساس اشک کے شعری کردار کی واضح تر پہچان ۔

حمد میں ایک عجیب اور منفرد بے تکلفی ہے۔سر جھکانے کی بجائے اپنی ذات کا افتخار ہے جو انسانی وجود اور اس کے ارتقا کے آخری مالک اور مراد کہی جا سکتی ہے۔

تاکہ اس کی حمد میں
ایک مصرع جاوداں کہہ جائیے اور جاوداں ہو جائیے

وہی سحر،شاعر کے لہجے کے بے نیاز آہنگ اور درویشانہ سرشاری کی غماز ہے۔

میں سوچتا ہوں نئی سحر کے نئے تقاضے بلا رہے ہیں
مصیبتیں سر اٹھا رہی ہیں
فقیر لیکن عجیب شے ہے
ٹھمک کے کہتا ہے،دیکھتے ہو،وہ دیکھتے ہو
اُدھر سے وہ کیا نکل رہا ہے۔

اشکؔ زندگی میں پھیلی تیرگی کی روح فرسا حقیقت کو نہیں جھٹلاتے۔وہ جانتے ہیں اندھیرا انسان کا مقدر ہے اس سے مفر نہیں لیکن وہ تیرگی کو قابلِ برداشت بنا دینے کا گُر بھی جانتے ہیں اور اس کے فنّی اظہار پر قادر ہیں۔

روشنی پھر روشنی ہے، میں وہ روشنی کے مقدار پر اس کی قدر و قیمت کو ترجیح دیتے ہیں کہ روشنی کی ایک کرن بھی تیرہ و تار شب کا سینہ چیرنے کی طاقت رکھتی ہے اسی لیے وہ زندگی کی عزیز ترین متاع ہے۔

لیکن اس سب میں کوئی اک چہرہ ابھرے گا جیسے
سرد کالی رات میں بجھتا ہوا سا اک ستارہ ٹوٹتا ہے
جسکی ہلکی روشنی سے تیرگی کچھ اور گہری ہو گئی ہے
اور ایسے میں شبِ تیرہ کو یہ کہہ کہہ کے بہلانا کہ کم ہو
یا بہت ہو
روشنی پھر روشنی ہے۔

زیر تبصرہ مجموعے کا شاعر زندگی کی درندگی،چیرہ دستی اور ہولناکی کے پیچھے کارفرما عوامل اور محرکات کے ذکر کو فکر و فن کی جلا بخشتا ہے اور ہم پر یہ انکشاف کرتا ہے کہ زندگی جیسی ہے ویسی ہی ہو سکتی ہے،لیکن اسے صبر اور حوصلے سے جینے کا سلیقہ ہی اس کی بے رحمی اور سفاکیت کو قابلِ برداشت بنا سکتا ہے۔

مجموعہ صاف ستھرا شائع ہوا ہے اور قیمت واجبی ہے۔

کنور سین

بقیہ : پولیس اور عوام کا رشتہ

کی کوشش کرے گا۔لہٰذا عوام کے سماجی اور سیاسی رہنماؤں کا فرض ہے کہ جہاں وہ پولیس کی غلط کارروائی پر نکتہ چینی کریں وہاں وہ اس محکمے کے مشکل کام کاج کی تکمیل میں اس کا ہاتھ بٹائیں۔اور اس قسم کی مہم کا آغاز کریں جس کی غرض و غایت یہ ہو کہ سماج دشمن عناصر کے خلاف قوانین اور سخت بنائے جائیں تاکہ غیر قانونی اقدام اور کارروائی مجبوری کی صورت میں بھی نہ اختیار کرنا پڑے۔

پولیس اور عوام کا رشتہ ایک اہم مسئلہ ہے اور اس کو ایک نئے نقطۂ نگاہ سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔تاکہ دیرینہ تعصبات،شکایات اور اندازِ نظر بدل کر اس مسئلے کو نئے تقاضوں کے پس منظر میں دیکھ کر اس رشتے کو نئے ڈھنگ سے مستحکم کیا جائے تاکہ معاشرہ پولیس کے کام سے زیادہ فیض یاب ہو۔اور پولیس بھی ایک نیا عوام دوست رویہ اپنائے۔

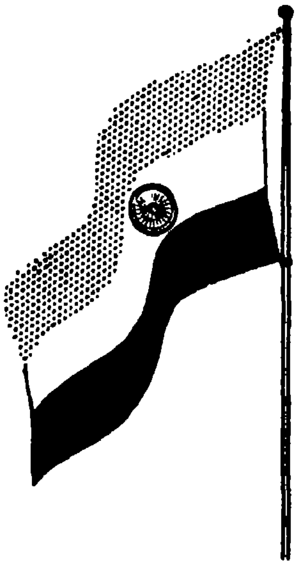

یومِ جمہوریہ پر دِلی مُبارکباد

26 جنوری 1950ء کو بھارت کے لوگوں نے ایک خود مختار سوشلسٹ سیکولر جمہوری ریپبلک کی بنیاد رکھی تھی۔
گذشتہ 31 برسوں میں ہم نے بہت سے کارنامے سرانجام دیئے ہیں۔

- ہم نے جمہوریت کو مضبوط بنیادوں پر قائم کیا ہے۔
- عرصے سے چلی آرہی خوراک کی کمی پر قابو پایا ہے۔
- ہم سرکردہ زیادہ صنعت یافتہ ملکوں میں گنے جاتے ہیں۔
- ہم سائنس اور ٹکنالوجی میں صف اوّل کے ممالک میں شامل ہو گئے ہیں۔
- ہم نے تین بیرونی حملوں کا منہ موڑا ہے۔ اور
- بین الاقوامی اجتماعوں میں ہماری آواز معنی رکھتی ہے۔

مگر سب کے لئے سماجی انصاف اور عوام کا معیار زندگی بلند کرنے کی خاطر ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔

یہ صرف قومی اتحاد کے مضبوط رشتے سے ہی کیا جاسکتا ہے۔

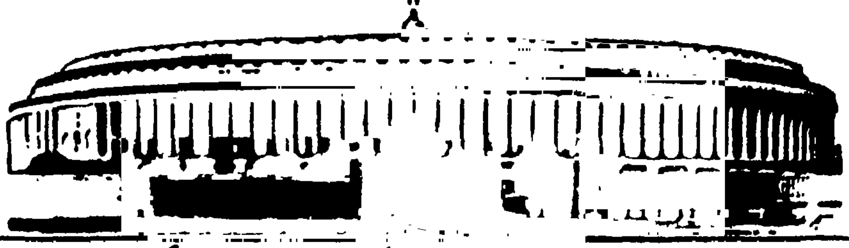

ترقی اور تحفظ کی خاطر قومی یکجہتی کو پکّا کیجئے اور سیکولر جماعتوں کو مضبوط بنائیے۔

davp 80/324

لەم جمھوریەی بهێلیان

Regd. No.D (DN) 103

R.N. 948/57.

Licensed U (D) - 50 to post without pre-payment at Civil Lines, Post Office, Delhi.

Vol. 39 No. 8 AJKAL (URDU) March,1981

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi 110001

ترتیب

پہیلیاں	ضمیر الحق ضمیر	۲
معذور افراد کا بین الاقوامی سال		۳
نور لٹاتا آیا ہے (نظم)	جگن ناتھ آزاد	۶
زبان		۷
خزانے کی کنجی	رحمٰن حمیدی	۸
بچوں کے لیے نیا پہاڑہ	انجم عرفانی	۱۰
معلومات بڑھایئے	شوناتھ سکّہ	۱۱
ہنس لیجئے		۱۲
آخری منصوبہ (کہانی)	مسعود حیدر	۱۳
پھلوں کی کہانی	ایس کمار	۱۴
اتفاق اور نفاق	پرویز احمد پرویز	۱۵
ننھی منی دلچسپ کہانیاں	نور سیما رضوی	۱۶
آدھا سگار	فرحت زیدی	۱۸
عقلمندی (کہانی)	ایس ایم عباس	۲۰
گھمنڈ (کہانی)	سراج انور	۲۲
کارٹون		۲۴
ٹیلی ویژن کی کہانی	فیضان نادر	۲۵
اپنی پہچان	شوکت پردیسی	۲۷
ایکس رے	اقبال قدوائی	۲۸

ایڈیٹر
شہباز حسین

اسسٹنٹ ایڈیٹر
محمد عادل صدیقی

سب ایڈیٹر
شوناتھ سکّہ

پہیلیاں

ضمیر الحق ضمیر

یوں تو مجھے سب اپناتے ہیں
چین نہ میرے بن پاتے ہیں
لیکن پھر بھی سب ہی مجھ کو
چھونے سے بھی گھبراتے ہیں
یہ بتلاؤ کون ہوں میں؟

(آگ)

سب کی میں آنکھوں کا تارا
سب کو ہی میں جان سے پیارا
کام میں سب کے آتا ہوں
راجا ہو یا ہو گھیارا
یہ بتلاؤ کون ہوں میں؟

(پانی)

جسم نہیں ہے میرا لیکن
ملتی ہوں ہر ایک جگہ پر
پیار سبھی سے کرتی ہوں
مالک ہو یا ہو وہ نوکر
یہ بتلاؤ کون ہوں میں؟

(ہوا)

دائیں بائیں آگے پیچھے
رہتا ہوں میں ساتھ سبھی کے
جاؤ گے تم جہاں جہاں بھی
ساتھ مجھے بھی پاؤ گے
یہ بتلاؤ کون ہوں میں؟

(سایہ)

میں جس گھر میں جاتی ہوں
جنت اسے بناتی ہوں
اپنی چمک سے سب لوگوں کے
دکھ اور درد مٹاتی ہوں
یہ بتلاؤ کون ہوں میں؟

(روشنی)

معذور افراد کا بین الاقوامی سال

ایک معذور بچہ وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی سے انعام حاصل کر رہا ہے

قدیم زمانے میں معذور افراد یعنی ایسے لوگ جن کے جسم کا کوئی عضو بے کار ہو گیا ہو، گناہ گار سمجھے جاتے تھے اور اسی لیے وہ حقارت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ ان پر قہرِ الٰہی نازل ہوا ہے اور وہ اپنے کسی گناہ کی سزا پا رہے ہیں۔ جسم کے کسی عضو کا بیکار ہونا ان کے موجودہ جنم یا پچھلے جنم کے دوران کسی گناہ کا سبب سمجھا جاتا تھا۔ لیکن جوں جوں تہذیب انسانی فروغ پاتی گئی، یہ خیال باطل ہوتا گیا۔ اور ان جیسے لوگوں کے لیے نفرت کی بجائے محبت، شفقت اور ہمدردی کے جذبات پروان چڑھنے لگے۔ اب اس بات کی کوشش کی جانے لگی کہ ان لوگوں کو محض خیرات نہ دے کر، ان کی بحالی کے لیے مستقل نوعیت کے چند اقدامات کیے جائیں۔ اس طرح انھیں بہبود سے متعلق مختلف فلاحی پروگراموں کے ساتھ وابستہ کیا جانے لگا۔ جسمانی معذوری کسی حادثے کے سبب ہو، بیماری کے سبب

ہو یا قدرتی طور پر ہو، جدید آلات طبی اور سرجری کی پیش رفتوں نے ان معذور انسانوں کی بڑی مدد کی ہے اور وہ بڑی حد تک جزوی یا مکمل طور پر اس جسمانی کمی کو دور کرنے کے اہل ہو گئے ہیں۔ ان ترقیوں کی مدد سے اپاہج افراد کی کمیوں اور جسمانی معذوریوں کو دور کیا جا سکتا ہے۔

اقوام متحدہ نے دنیا کی تمام اقوام کی توجہ اس مسئلے کی طرف مبذول کرائی ہے۔ اس مقصد کے لیے سال ۱۹۸۱ کو معذور افراد کا بین الاقوامی سال منایا جا رہا ہے۔

بھارت نے بھی اقوام متحدہ کے اس اقدام کا احترام کرتے ہوئے سال ۱۹۸۱ کو معذور افراد کا سال منانے کا فیصلہ کیا ہے۔ ہمیں اس سلسلے میں سب سے زیادہ ضرورت یہ محسوس ہوتی ہے کہ اس مسئلے کے تئیں عوامی انداز نظر میں تبدیلی لا کر معذور افراد کو سماج کا ایک ضروری حصہ بنایا جائے۔ ہمیں یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ اگر قدرت نے کسی سے کوئی عضو چھین لیا ہے تو اس کی جگہ اس کو کچھ دیگر خوبیوں سے نوازا ہے۔ اس کمی کی جگہ اس میں دوسری بہت سی خوبیاں چھپی ہوتی ہیں۔ اگر انھیں مناسب طرح رکھا جائے ان کا علاج کیا جائے، ان کے لیے تربیت کی سہولتیں اور مواقع میسر ہوں تو وہ سماج کے لیے ایک بوجھ نہیں بلکہ ایک اثاثہ بن سکتے ہیں۔

یہ مسئلہ اتنا سنگین ہے کہ اس کے بارے میں مکمل اندازہ لگانا دشوار ہے تاہم اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم ان کے لیے کام کرنے میں اپنا جوش و خروش سرد کرلیں۔ اس سال کا آغاز کرتے ہوئے وزیر اعظم شریمتی

مختلف طرح کا امدادی سامان جو معذور بچوں کو سہارا دینے کا کام آتا ہے

اندرا گاندھی نے بجا طور پر فرمایا کہ ہمیں سماج میں مقابلتہً کم خوش قسمت لوگوں کی بہبود کے لیے کام کرنا ہے اور ہمارے اندر ان کے لیے کام کرنے اور ان کی خدمت کرنے کا جذبہ ہونا چاہیئے۔ چند لوگوں میں یہ جذبہ نہیں ہے، ان میں اسے جگانے اور پیدا کرنے کی ضرورت ہے نیا سال شروع ہو چکا ہے۔ اس لیے ہماری خواہش ہے کہ بنی نوع انسان کی تاریخ کو کامیاب بنایا جا سکے ہمیں بچوں کے مستقبل کو بہتر بنانے کی بجا طور پر فکر ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے سبب روزانہ ترقی کی نئی نئی راہیں کھل رہی ہیں، معلومات اور جانکاری بڑھتی جا رہی ہے۔ بچوں کی خوراک، نادار اور معذور بچوں

کی بھلائی کے لیے خاص طور پر توجہ دینا بہت ضروری سمجھا گیا ہے۔

طبی تحقیق کی بھارتی کونسل کے جائزے کے مطابق ہمارے ملک میں نابینا افراد کی کل تعداد تقریباً ۸۰ لاکھ ہے جس میں سے نابینا بچوں کی تعداد تقریباً ۳ لاکھ ہے اور ذہنی طور پر معذور بچوں کی تعداد لگ بھگ ۲۰ لاکھ ہے جبکہ بہرے بچوں کی تعداد ۳ لاکھ سے بھی زیادہ ہے۔ دستیاب اعداد و شمار کی روشنی میں معذور بچوں کی تعداد تقریباً ۳۰ لاکھ ہے۔

اتنی بڑی تعداد کو صحت مند بچوں کی طرح سے ہی جینے کا حق ہے لہذا وہ سماج سے نیز سرکار سے بجا طور پر مکمل تحفظ، امداد اور بحالی کی امید رکھتے ہیں۔ بھارت سرکار نے معذور بچوں کے سلسلے میں ایک قومی پالیسی مرتب کی ہے اس کے مطابق معذور بچوں کی تعلیم، بحالی، خصوصی علاج اور دیکھ بھال کے لیے متعدد سہولتیں فراہم کی جا رہی ہیں۔ اس وقت ملک میں دو سو سے زیادہ ایسے اسکول ہیں جہاں نابینا بچے تعلیم پا رہے ہیں۔ ان اسکولوں میں زیر تعلیم طلبا کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ ہے۔ ان اسکولوں میں بچوں کو دستکاری کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ موسیقی کی تعلیم پر خاص زور دیا جاتا ہے۔ مرکزی سرکار نے دہرہ دون میں نابینا بچوں کے لیے ایک قومی مرکز قائم کیا ہے جس میں ۶ سال سے لے کر ۱۶ سال تک کی عمر کے بچے داخلے کے اہل ہیں۔ بہرے اور گونگے بچوں کے لیے نئی دہلی میں ایک سکول ہے جس میں ۳ سال سے لے کر ۶ سال تک کی عمر کے بچوں کی قوتِ گویائی کو درست کرنے کے لیے کوشش کی جاتی ہے۔ حیدر آباد میں بھی بہرے بچوں کے لیے ایک قومی مرکز

عورت کی دائیں ٹانگ مصنوعی ہے۔ مگر وہ آسانی چل پھر سکتی ہے

قائم ہے جس میں درزی کا کام، بجلی کے کام، بڑھئی کا کام اور ایسے ہی بہت سے دوسرے کاموں کی تربیت دی جاتی ہے۔ ایسے بچوں کو تعلیم دینے والے اسکولوں کی تعداد ۱۲۰ ہے۔ جسمانی طور پر معذور بچوں کی تعلیم کے لیے تقریباً ۱۵ اسکول ہیں جن میں ایک ہزار سے زیادہ بچے زیر تعلیم ہیں۔ اس کے علاوہ کلکتہ میں ایک قومی مرکز قائم کرنے کی تجویز ہے۔ ذہنی طور پر معذور بچوں کے لیے فی الوقت سو سے زیادہ اسکول قائم ہیں۔ جن میں تقریباً آٹھ ہزار بچے زیر تعلیم ہیں۔ ذہنی طور پر معذور بچوں کی تعلیم کے لیے نئی دلی میں بھی ایک ادارہ قایم ہے۔

ہمارے ملک میں معذور بچوں کی کثیر تعداد کو دیکھتے ہوئے، چوں کہ یہ انتظامات ناکافی ہیں، اس لیے سالِ رواں میں ان کی توسیع کے لیے خصوصی کوششیں کی جائیں گی۔

نور لٹاتا آیا ہے

آرزوؤں کے، امیدوں کے پھول کھلاتا آیا ہے
ارمانوں کی دنیا میں اک دھوم مچاتا آیا ہے
سال نیا آیا ہے اور اک جشن مناتا آیا ہے
پھول کھلاتا آیا ہے
دھوم مچاتا آیا ہے
جشن مناتا آیا ہے
آرزوؤں کے، امیدوں کے پھول کھلاتا آیا ہے

❀

اپنا وطن بھی ایک ہے اپنے اہلِ وطن بھی ایک ہیں سب
اپنا چمن بھی ایک ہے اپنے اہل چمن بھی ایک ہیں سب
بزم وطن میں، بزم چمن میں نور لٹاتا آیا ہے
سال نیا آیا ہے اور اک جشن مناتا آیا ہے
پھول کھلاتا آیا ہے
دھوم مچاتا آیا ہے
جشن مناتا آیا ہے
آرزوؤں کے، امیدوں کے پھول کھلاتا آیا ہے

❀

ناگالینڈ کی یا میسور کی یا کشمیر کی دنیا ہو
آج ہر اک لب پہ یہ دعا ہے اک تنویر کی دنیا ہو
اِس دنیا میں سال نیا انوار لٹاتا آیا ہے
پھول کھلاتا آیا ہے
دھوم مچاتا آیا ہے
جشن مناتا آیا ہے
آرزوؤں کے، امیدوں کے پھول کھلاتا آیا ہے

❀

اپنے ہاتھ میں ہو ماضی بھی مستقبل بھی ہاتھ میں ہو
دریا کی موجیں بھی ہاتھ میں اور ساحل بھی ہاتھ میں ہو
جادہ بھی ہو اپنے ہاتھ میں اور منزل بھی ہاتھ میں ہو
قدم قدم پہ اس منزل کی راہ دکھاتا آیا ہے
پھول کھلاتا آیا ہے
دھوم مچاتا آیا ہے
جشن مناتا آیا ہے
آرزوؤں کے، امیدوں کے پھول کھلاتا آیا ہے

❀

ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی
سب ہندی ہیں بھائی بھائی
یہ سب بھائی بھائی باہم ہاتھ میں دے کر ہاتھ چلیں
ایک ہی منزل کے یہ راہی پاؤں ملا کر ساتھ چلیں

جگن ناتھ آزاد

پانو ملا کر چلنے کا یہ ڈھنگ بتاتا آیا ہے
ارمانوں کی دنیا میں اک دھوم مچاتا آیا ہے
سال نیا آیا ہے اور اک جشن مناتا آیا ہے
پھول کھلاتا آیا ہے
دھوم مچاتا آیا ہے
جشن مناتا آیا ہے
آرزوؤں کے، امیدوں کے پھول کھلاتا آیا ہے

❀

سال نیا کہتا ہے ہم سے، دیکھو اپنے رسم رواج
ان کو سنوارو، ان کو سدھارو، ملک نہ ہو جائے تاراج
غیروں کے ہاتھوں سے بچالو اپنی اک اک چیز کو آج
سونا، چاندی، پیتل، تانبا، لوہا، لکڑی اور اناج
سال نیا پیغام یہی ہم سب کو سناتا آیا ہے
پھول کھلاتا آیا ہے
دھوم مچاتا آیا ہے
جشن مناتا آیا ہے
آرزوؤں کے، امیدوں کے پھول کھلاتا آیا ہے

زبان

پرانے زمانے کی بات ہے۔ ایک امیر نے اپنے غلام سے کہا: "آج کسی بہترین چیز سے کھانا تیار کرو۔"

نوکر نے بکری کی زبان سے لذیذ کھانا تیار کیا اور مالک کے سامنے لایا۔ مالک نے اپنے غلام سے پوچھا: اس کھانے کو کس چیز سے تیار کیا ہے؟

غلام نے جواب دیا "بکری کی زبان سے" کیوں کہ آپ نے حکم دیا تھا کہ بہترین چیز سے کھانا بناؤں۔ دنیا میں زبان سے بہتر کیا ہے؟

دوسرے دن مالک نے آزمائش کے لیے غلام سے کہا: "آج میں یہ چاہتا ہوں کہ تو کسی بدترین چیز سے کھانا تیار کرے۔"

نوکر نے اس مرتبہ بھی بکری کی زبان سے کھانا بنایا امیر کے سامنے کھانا لایا گیا تو اس نے نوکر سے دریافت کیا "اس کھانے کو کس چیز سے تیار کیا ہے؟"

نوکر نے جواب دیا: "بکری کی زبان سے۔ دنیا میں زبان سے بدتر کیا ہے۔ دنیا کی ہر اچھائی اور برائی زبان سے ہے۔"

(فارسی سے ترجمہ)

(مترجم: ضیاء الدین خاں)

رحمٰن حمیدی

خزانے کی کنجی

بہت دنوں کی بات ہے۔ دریائے گنگا کے کنارے ایک شہر آباد تھا جس کا نام ویشالی تھا۔ اس شہر میں مایا نام کی ایک بیوہ عورت تھی۔ خدا نے اسے ایک ہی اولاد دی تھی۔ اس کے بیٹے کا نام موہن تھا۔ موہن ہونہار اور محنتی لڑکا تھا۔ پاٹھ شالہ میں اس نے ابتدائی تعلیم حاصل کرلی تو وہ روزی کی تلاش کے لیے نکلا۔ کئی جگہوں پر وہ نوکری کے لیے گیا۔ لیکن اسے کہیں بھی کامیابی نہیں ہوئی۔ موہن اپنی بے کاری اور غریبی سے تنگ آچکا تھا وہ ہمیشہ اداس اور مایوس رہتا۔ مایا اسے برابر ڈھارس دیتی رہتی۔ مہینوں دوڑ دھوپ کے بعد بھی موہن کو نوکری کہیں نہیں ملی تو اس کے ماں نے سمجھایا۔

"بیٹا! شہر کے سیٹھ رام داس تمہارے پتاجی کے دوست تھے، ان سے جاکر میرا سلام کہو اور ان سے کچھ روپے بطور قرض لے کر تجارت کرو—!"

موہن کو ماں کا مشورہ پسند آیا۔ وہ ناشتہ کرکے گھ سے نکلا اور سیدھا سیٹھ رام داس کی کوٹھی پر پہنچ سیٹھ رام داس اپنی کوٹھی کے لان میں کھڑے تھے۔ ایک شخص ان کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ اس شخص سے بہت زیادہ ناراض تھے۔ اسے بُرا بھلا کہنے کے بعد انھوں نے کہا:

"میں تمہیں دوبار تجارت کے لیے سرمایہ دے چ ہوں۔ تم نے دونوں بار ساری پونجی برباد کردی۔ اب تمہیں تجارت کے لیے اور سرمایہ نہیں دوں گا۔ تم محن سے جی چراتے ہو، تم نکمے آدمی ہو، تمہیں پتہ ہونا چاہ محنت اور لگن ہر خزانے کی کنجی ہے۔" انھوں نے سا مرے ہوئے چوہے کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے کہا—" اگر آدمی کے اندر محنت و مشقت کی عادت سچی لگن ہو تو اس مرے ہوئے چوہے سے لکھ پتی سکتا ہے۔"

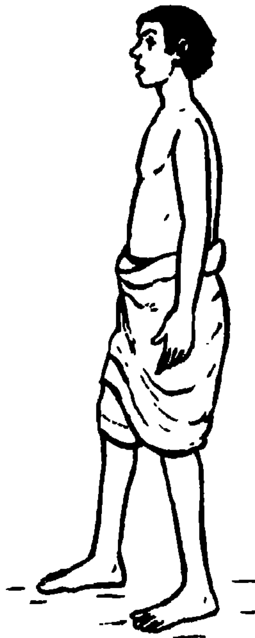

موہن

موہن چپ چاپ کھڑا سیٹھ رام داس کی ساری باتیں
سن رہا تھا۔ اس نے مرے ہوئے چوہے کو اٹھالیا اور کوٹھی
سے باہر آگیا۔ وہ چوہے کی دُم پکڑے ہوئے تھا اور
آہستہ آہستہ سڑک پر چل رہا تھا۔ چند قدم کے فاصلہ پر اسے
ایک دولت مند عورت ملی۔ اس نے موہن کو پکارا۔
موہن رُک گیا۔ اس عورت نے موہن سے نہایت نرمی
سے کہا:

"یہ چوہا مجھے دے دو، اسے میری بلّی کھائے
گی۔ میں اس کے بدلے تمہیں دو روپے دوں گی —!"

موہن نے اس عورت سے روپے لے لیے اور
مرا ہوا چوہا اس عورت کو دے دیا۔ روپے لے کر
موہن بہت خوش ہوا۔ وہ سیدھا بنیے کی دُکان پر آیا۔
اور دو روپے کے بھنے ہوئے چنے خریدے۔ موہن چنے لے کر
شہر سے دور چلا گیا موہن اس علاقے میں پہنچا جہاں
مزدور جنگل کی لکڑیاں کاٹ رہے تھے، موہن چند
لکڑیوں کے عوض مزدوروں کو تھوڑا تھوڑا چنا دینے
لگا۔ شام تک موہن کے پاس بہت سی لکڑیاں جمع
ہوگئیں۔ اس نے ساری لکڑیوں کو اکٹھا کر کے گٹھر بنالیا
اور اسے رسی سے باندھ کر سر پر اٹھالیا۔ وہ ساری
لکڑیاں شہر لایا۔ لکڑیوں کو اس نے لکڑی کے کارخانے
میں فروخت کردیا۔ لکڑیوں کی فروخت سے اسے اچھی
رقم مل گئی۔

موہن کا یہ آئے دن کا معمول ہوگیا۔ وہ شہر
سے بھنا ہوا چنا خریدتا اور مزدوروں کے بیچ اسے

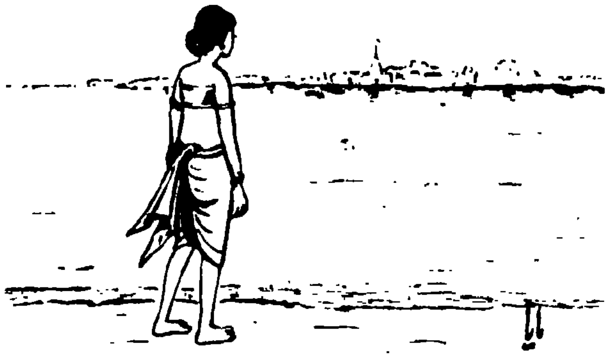

مایا

لے جاکر فروخت کردیتا۔ مزدور موہن کے برتاؤ اور
سلوک سے بے حد خوش تھے۔ موہن کو وہ لوگ اپنے
بھائی کی طرح مانتے تھے۔ چند برسوں کے اندر موہن نے
لکڑی کا کارخانہ قائم کرلیا۔ کئی مزدور اس کے کارخانے
میں کام کرنے لگے۔ موہن کے کارخانے کی لکڑی دا
دور تک جانے لگی۔ آہستہ آہستہ موہن شہر کا دھنی
آدمی بن گیا۔

مایا اپنے بیٹے کی ترقی اور خوش حالی دیکھ کر پھولے
نہیں سماتی۔ وہ صبح شام بھگوان کے مندر میں جاتی ا
موہن کی ترقی کے لیے دعائیں کرتی۔ موہن کی عمر پچیس

برس سے زیادہ ہو رہی تھی اسی لیے اب اسے موہن کی شادی کی فکر تھی۔ لیکن وہ شادی سے پہلے تجارتی اصول کے تحت گرو دکھشنا نکال دینا چاہتی تھی۔ اس لیے اس نے ایک روز موہن کو سمجھاتے ہوئے کہا:

" بیٹا! بھگوان نے تمہیں دھن دولت سب کچھ دے دیا ہے۔ تمہارا کارخانہ بہت اچھی طرح چل رہا ہے لیکن دنیا میں کوئی چیز بھی بنا گرو کے حاصل نہیں ہوتی۔ اس لیے میں چاہتی ہوں کہ تم کوئی چیز گرو دکھشنا کے روپ میں سیٹھ رام داس کو دے دو ــــ اور پھر میں تمہارے لیے کوئی اچھی لڑکی تلاش کرتی ہوں ــــ!"

موہن نے ماں کی بات مان لی۔ اس نے سونے کی ایک کنجی بنوائی اسے خوبصورت پیکٹ میں بند کیا اور سیٹھ رام داس کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سیٹھ رام داس موہن کا تحفہ دیکھ کر حیرت میں پڑ گئے۔ موہن کو انھوں نے سمجھاتے ہوئے کہا:

" میں نے تمہیں تجارت کے لیے سرمایہ نہیں دیا ہے۔ میں نے تمہیں تجارت کے اصول بھی نہیں بتائے ہیں۔ پھر میں یہ تحفہ کیسے قبول کر سکتا ہوں ــــ!؟"

موہن نے مرے ہوئے چوہے کی بات یاد دلائی۔ اور اپنی پوری کہانی سنائی۔ سیٹھ رام داس موہن کی باتیں سن کر بے حد خوش ہوئے۔ انھوں نے موہن کا تحفہ قبول کر لیا اور اپنی لڑکی سے موہن کی شادی کر دی۔

موہن اپنی محنت و مشقت اور سچی لگن کی بدولت شہر کا سب سے بڑا تاجر بن گیا۔ واقعی محنت اور لگن ہر خزانے کی کنجی ہے۔

انجم عرفانی

بچّوں کیلئے

نیا پہاڑہ

دو کا پہاڑہ

دو کا دو ، دو دونی چار — علم کا دریا کر لیں پار
دو تیائیں چھ، دو چوکا آٹھ — پڑھ لو پھر کرنا ٹھاٹھ
دو پنجے دس، دو چھکا بارا — آسمان پر چمکا تارا
دو ستے چودہ، دو اٹھے سولہ — جاڑے میں گرتا ہے اولہ

دو نوا اٹھارہ ، دو دہم بیس
وقت پہ داخل کر دو فیس

تین کا پہاڑہ

۳ کا ۳ ، ۳ دونی چھ — جو کہنا ہے منھ پہ کہہ
۳ تریکا نو ، ۳ چوکا بارہ — علم سے سارا جگ اجیارا
۳ پنجے ۱۵ ، ۳ چھکا اٹھارہ — پانی سمندر کا ہے کھارا
۳ ستے ۲۱ ، تین اٹھے چوبیس — غصے میں یوں دانت نہ پیس

تین نوا ستائیس ، تین دہم تیس
ہے شیطان کا نام ابلیس

معلومات بڑھائیے

ایچ۔ جی۔ ویلز

آپ کا پورا نام ہربرٹ جارج ویلز تھا۔ آپ جوزف ویلز کے صاحبزادے تھے۔ آپ کا وطن برولے تھا۔ آپ ۲۱ ستمبر ۱۸۶۶ء کو پیدا ہوئے۔ رائل کالج آف سائنس میں تعلیم پائی۔ آپ کی وفات ۱۳ اگست ۱۹۴۶ء کو ہوئی۔ آپ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ بیسویں صدی کے نصف اول میں اس مصنف کو سائنس، سیاست، تاریخ، تنقید اور ناول نگاری کے میدان میں اتنا بلند مرتبہ حاصل ہوا کہ اب سرزمینِ برطانیہ پر اس جیسا مصنف پیدا ہونا دشوار معلوم ہوتا ہے۔ اس کی کتابوں نے عوام کی اخلاقی اور ذہنی تعمیر میں اتنا زیادہ حصہ لیا جتنا کہ شاید ہی کسی دوسرے مصنف نے لیا ہو۔ انھوں نے غور و فکر کی ایسی راہیں نکالیں کہ متمدن دنیا کا کوئی شخص بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ آپ نے مختلف موضوعات پر سو سے زیادہ کتابیں لکھیں۔ ان کی بہت سی کتابوں کے ترجمے دنیا کی بہت سی زبانوں میں ہوئے ہیں۔

برٹش میوزیم لائبریری

برٹش میوزیم لائبریری میں پچاس لاکھ سے زیادہ کتابیں ہیں۔ یہ دنیا کے چار بڑے کتب خانوں میں شمار کی جاتی ہے۔ برٹش میوزیم قومی نوادرات اور قومی کتب خانے کے مجموعے کا نام ہے۔ لائبریری چار حصوں میں تقسیم ہے۔ طبع شدہ کتب، قلمی نسخے، مشرقی شائع شدہ کتابیں اور قلمی نسخے نیز فنونِ لطیفہ اور نقش و نگار۔ بقیہ تین بڑے کتب خانے پیرس، واشنگٹن اور ماسکو میں ہیں۔ اگر کتابوں کی سب الماریوں کو ایک قطار میں کھڑا کیا جائے تو وہ 'اٹھاسی میل' تک پہنچ سکتی ہیں۔

پودوں میں احساس

جانوروں کی طرح پودوں میں بھی احساس پایا جاتا ہے جس طرح ہمارا جسم سردی، گرمی، خشکی، تری وغیرہ کا احساس رکھتا ہے، یہی صورت پودوں کے ساتھ بھی ہے۔ جس طرح اگر کسی آدمی کو اندھیرے میں بہت دنوں تک

رکھا جائے تو اس کا رنگ زرد پڑ جاتا ہے۔ یہی صورت پودوں کے ساتھ بھی ہے۔ آپ نے چھوئی موئی کا پودا دیکھا ہوگا۔ جہاں اس کو چھوا فوراً مرجھا جاتا ہے۔ اگر آپ اسے زیادہ پریشان کریں تو وہ عاجز آکر خودکشی کرلیتا ہے۔ ملایا میں ایسے پودے ملتے ہیں کہ اگر کوئی جاندار ان کے قریب سے گزر جائے تو اس کی شاخیں آگے بڑھکر اپنے شکار سے لپٹ جاتے ہیں اور اسے زہر سے ہلاک کرکے اس کی نامیاتی غذا کھالیتی ہیں۔ ایسے بہت سے خونخوار پودے ہوتے ہیں کہ جب کوئی کیڑا یا مکھی شہد کی تلاش میں ان کے پھول پر سے گزرے تو اسے پھول کی پنکھڑیاں بند ہوکر اندر قید کرلیتی ہیں پودا اپنے شکار کو زہر سے ہلاک کرلیتا ہے اور اس کی نامیاتی غذا ہضم کرجاتا ہے اور فضلہ کو پنکھڑیاں کھل کر باہر اگل دیتی ہیں۔ ایسے پودے ہندستان میں کافی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔

چینی سے چار سو گنا میٹھا

جنوبی امریکہ میں ایک ایسا درخت پایا گیا ہے جس کے پتوں اور شاخوں سے ایک ایسا رس نکلتا ہے جو چینی سے چار سو گنا زیادہ میٹھا ہوتا ہے۔ اس درخت کا نام "کین ہی" ہے، اس کا لاطینی نام سیٹویا ربرٹونی ہے۔ اس میٹھے رس کو شوگر کے مریض بلاخوف استعمال کرتے ہیں۔

ہنس لیجئے

باپ : میری عمر اسی برس ہونے کو آئی لیکن مجھے یاد نہیں کہ میں نے آج تک جھوٹ بولا ہو۔

بیٹا : اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ اس عمر میں حافظے کا یہی حال ہوتا ہے۔

*

ایک بار کسی مالک نے اپنے نوکر سے نمک مانگا۔ وہ ہاتھ پر رکھ کر لے گیا۔

مالک نے غصے میں آکر فرمایا کہ آئندہ جو چیزیں ہم مانگا کریں، رکابی میں رکھ کر لایا کرو،

دوسرے روز مالک نے اپنے نوکر سے جوتا طلب کیا، تو وہ رکابی رکھ کر لے آیا۔ تمام محفل ہنس پڑی۔

*

باپ : (بیٹے سے) تم کو پڑھتے ہوئے دو سال ہوگئے۔ کچھ ترقی بھی کی؟

بیٹا : جی ہاں، بہت زیادہ

باپ : کیا ترقی کی ہے؟

بیٹا : جب میں اسکول میں داخل ہوا تھا تو میرے املا میں دو یا تین غلطیاں ہوا کرتی تھیں مگر اب دس دس بارہ ہوا کرتی ہیں۔

آخری منصوبہ

مسعود حیدر

کسی زمانے کی بات ہے۔ ایک خوبصورت گاؤں تھا۔ اس گاؤں میں ہرے بھرے جنگل کے نزدیک ایک پہاڑ تھا۔ اس پہاڑ کی کھوہ میں ایک کتا رہتا تھا۔ اسی جنگل میں ایک شیر بھی تھا۔ ایک دن کتے نے شیر سے دوستی کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا "اگر ہماری دوستی شیر سے ہو جاتی تو بڑے عیش و آرام سے زندگی گزرتی۔ مزے مزے کا گوشت کھانے کو ملتا۔ جنگل میں ہماری دھاک بھی بیٹھ جاتی۔ اور خدا جانے کیا کیا سہولتیں میسر آتیں"۔

اس طرح کے خیالی پلاؤ نے اس کے منصوبے کو اور بھی مضبوط بنا دیا۔ اس نے اپنی آرزو برلانے کے لیے شیر سے دوستی کر ہی لی۔

شیر بڑا ظالم تھا۔ وہ روزانہ دو چار جانوروں کو ہلاک کر دیتا۔ اور دونوں خوب مزے لے کر کھاتے۔ دوسرے جانور شیر کی مکاری کو جانتے تھے اس لیے اس کے پاس پھٹکتے ہی نہیں تھے۔ بہت سے جانوروں نے کتے کو شیر سے دوستی کرنے سے روکا۔ مگر کتا بڑا لالچی اور خود غرض تھا۔ جیسے اس کے جسم و جان میں لالچ کوٹ کوٹ کر بھری ہوا اس نے سبھی دوستوں کی خواہشوں پر پانی پھیر دیا اور شیر کے ساتھ خوب کلیلیں کرتا رہا۔

اسی طرح عرصہ گزر گیا۔ رفتہ رفتہ جنگل درندوں سے خالی ہوتا گیا۔ ایک دن شیر کو بہت زور کی بھوک لگی، وہ بھوک کی شدت سے تلملا اٹھا اور جنگل کا چپہ چپہ چھان مارا مگر شکار کو ملنا تھا نہ ملا۔ جیسے اس پر خدا کا عذاب آن پڑا ہو۔ اسے صرف ایک ہی راستہ نظر آیا وہ دوڑا ہوا کتے کے پاس پہونچا اور کہا "کتے! مجھے بہت زور کی بھوک لگی ہے۔ کوئی ترکیب بتاؤ اور جلد بتاؤ ورنہ!!..... ورنہ...... ور.....؟ کتا اس کی لال پیلی آنکھیں ہی دیکھ کر سہم گیا۔ اسے تو دن ہی میں تارے نظر آنے لگے۔ اس کے حواس باختہ ہو گئے۔ مگر وہ اپنے آپ کو قابو میں کرتے ہوئے کہا "کیا بتاؤں حضور! ... کو... ک... ئی ترکیب سمجھ میں نہیں آ رہی ہے"۔

کتے کی بات سنتے ہی شیر کو بہت مایوسی ہوئی اور ساتھ ہی ساتھ خوشی بھی! ___ وہ یک بیک کتے پر حملہ آور ہوا ___ اور دیکھتے ہی دیکھتے کتے کا کام تمام کر ڈالا۔

سچ ہے لالچ بُری چیز ہے!

پھلوں کی کہانی

ایس کمار

پھلوں کا خاندان بہت بڑا ہے۔ یہ ساری دنیا پر چھایا ہوا ہے۔ اس کی تاریخ بہت پُرانی اور دل چسپ ہے۔

ناشپاتی مشرقی یورپ سے آئی۔ آڑو مشرقی ایشیا میں پایا گیا تھا۔ گریپ فروٹ مشرقی مجمع الجزائر اور تربوز دکھنی افریقہ سے آیا ہے۔ انگوروں کے نام پر ذہن فرانس کی طرف چلا جاتا ہے۔ جبکہ صحیح معنوں میں انگور فرانس کا نہیں بلکہ مغربی ایشیا کا پھل ہے۔ کیلے وسط امریکہ کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں اتنے پیدا کیے جاتے ہیں کہ انھیں کیلوں کا ملک کہا جاتا ہے۔ لیکن صحیح معنوں میں شروع میں کیلا جنوبی ایشیا سے آیا تھا۔

سبھی پھلوں میں بیج ہوتے ہیں اس لیے انھیں "بیجوں کی پڑیا" کہا جاتا ہے۔ پرندے اور جانور لذیذ پھلوں کے گودے والے حصے کو کھا کر اس کے بیج پھینک دیتے ہیں۔ اگر یہ بیج زرخیز زمین پر گرتے ہیں تو وہاں اُگنا شروع ہو جاتے ہیں۔ کچھ پھل ایک بیج والے ہوتے ہیں جیسے آڑو، آلو بالو، خوبانی، اور آلوچا۔ کچھ پھل ایک سے زیادہ بیجوں والے ہوتے ہیں جیسے سنترہ، سیب، انگور، اور ناشپاتی۔ کچھ پھل ایسے ہوئے ہیں جن میں بہت بیج ہوتے ہیں۔ جیسے خربوزہ، تربوز، بلیک بیری اور مختلف طرح کے گوندنی کے پھل۔ لیکن کچھ پھل ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں بیج نہیں ہوتے۔ جن پھلوں میں بیج نہیں ہوتے ان سے پیڑ نہیں اگائے جا سکتے۔ کافی پہلے سے کچھ بیجوں والے پھلوں کو بنا بیج والے پھل بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ بغیر بیج کے سنترے اور انگور تو اب دستیاب بھی ہیں۔ بغیر بیج کے تربوز بھی اگائے جانے لگے ہیں۔ اس طرح بغیر بیج والے پھل اُگانے کی برابر کوشش جاری ہے۔

پھلوں کی پیداوار پھولوں سے ہوتی ہے۔ ناشپاتی کے باغ میں ناشپاتی دکھائی دینے سے پہلے یہ بہت ضروری ہے کہ اس کے پیڑوں میں پھول کھلے اور اگر پھول کھلنے کے وقت سردی (پالا) پڑتی ہے اور پھولوں کو ختم کر دیتی ہے تو باغ میں ناشپاتیاں پیدا نہیں ہوتی ہیں۔ پھلوں کے

باغوں میں زیادہ تر پیڑ قلمی ہوتے ہیں۔ قلمی پیڑوں کے بیجوں سے اُگے پیڑوں کے مقابلے میں پھل جلدی آتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی پھلوں کے پیڑ ان کے بیجوں سے بھی اگائے جاتے ہیں۔ کئی بار دو قسم کے بیجوں کو جان بوجھ کر ملا دیا جاتا ہے۔ اس ڈھنگ سے کئی نئے قسم کے پھل دستیاب ہوئے ہیں۔ جیسے پام کو خوبانی اور آلوچے کو ملا کر پیدا کرلیا جاتا ہے۔ اس لیے اس طرح بہت سے پھل ایسے ہیں جو ایک ہی قسم کے دو پھلوں کے ملانے سے پیدا ہوئے ہیں۔

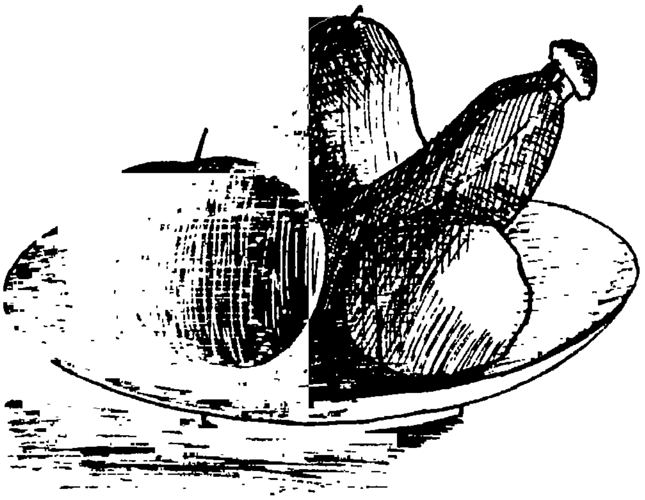

پھلوں میں وٹامن اور دوسرے فائدہ مند معدنی اجزا ہوتے ہیں۔ زیادہ تر پھلوں میں خاص طور سے شوگر ہوتی ہے۔ صحیح معنوں میں شوگر کے ہونے کے باعث ہی مٹھاس ہوتی ہے۔ شدھ (خالص) چینی کھانے کے بجائے پھلوں کے ذریعہ شوگر کھانا زیادہ فائدہ مند مانا جاتا ہے۔

دنیا میں ان گنت قسم کے پھل پائے جاتے ہیں۔ لیکن مشہور اور خاص پھل انار، آم، سیب، ناشپاتی، خوبانی انگور، بیری، کھجور، تربوز، خربوزہ، زیتون، اسٹرابیری، چکوترا، انجیر، ناریل وغیرہ ہیں۔

اتّفاق اور نفاق

• پرویز احمد پرویز

کسی شخص نے مولانا روم سے پوچھا: "سمجھ میں نہیں آتا کہ بھیڑ سال میں نہ تو دو بار سے زیادہ جنتی ہے اور نہ دو سے زیادہ بچّے دیتی ہے۔ مگر اس پر بھی یہ عام پائی جاتی ہے، جہاں دیکھو کثرت کے ساتھ اس کے ریوڑ موجود ہیں۔ حالاں کہ عام لوگوں کی خوراک بھی زیادہ تر اسی کا گوشت ہے۔ مگر ہر گاؤں اور ہر شہر میں اسی کے ریوڑ بڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں —— لیکن کُتیا سال میں تین بار جنتی ہے اور ہر مرتبہ پانچ سات بچّے دیتی ہے۔ پھر بھی کتّوں کی اتنی کثرت نہیں پائی جاتی۔"

مولانا نے فرمایا کہ:

"بھیڑ کو یہ برکت اس لیے دی گئی ہے کہ ایک تو یہ صبح سویرے جاگتی ہے۔ دوسرے چلنے اور چرنے میں اپنی ساتھی بھیڑوں کے بغیر قدم نہیں بڑھاتی اور حسد نہیں کرتی۔"

—— لیکن کتے رات بھر جاگ کر صبح کو سوجاتے، اور ذرا سی ہڈی کے لیے اپنے ہی بھائیوں کا پیٹ پھاڑنے پر تیار ہوجاتے ہیں۔"

(ماخوذ از دبستانِ اخلاق)

نور سیما رضوی

ننھی منی
دل چسپ کہانیاں

ایک آدھ انچ

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ سمندر کے کنارے ایک روسی، ایک امریکن اور ایک ہندوستانی اپنے اپنے دیش کی ترقیوں پر زمین و آسمان کے قلابے ملا رہے تھے

امریکن نے بہت ہی فخریہ انداز میں کہا کہ ہمارے ملک نے ایسے ہوائی جہاز ایجاد کیے ہیں جو بالکل آسمان کے ساتھ اُڑ سکتے ہیں۔

یہ سُن کر روسی نے حیرت سے پوچھا — "کیا بالکل آسمان کے ساتھ اُڑ سکتے ہیں؟"

امریکن نے کہا — "نہیں، صرف ایک آدھ انچ نیچے۔"

"ہمارے ملک نے ایسے بحری جہاز بنائے ہیں جو بالکل سمندر کی تہہ پر چلتے ہیں" — روسی نے کہا۔

امریکن نے حیرت سے پوچھا — "کیا بالکل تہہ کے ساتھ چلتے ہیں؟"

روسی نے کہا — "نہیں، صرف ایک آدھ انچ اوپر چلتے ہیں۔"

اب ہندوستانی کی باری آئی۔ جوان دونوں کی باتیں حیرت سے سُن رہا تھا۔ کہنے لگا "بھئی ہمارے ملک کے ایسے نوجوان ہیں جو بالکل ناک سے کھانا کھاتے ہیں۔"

یہ سُن کر امریکن اور روسی حیرت سے اس کا منہ تکنے لگے۔ اور سوچنے لگے کہ اس کا ملک ہم دونوں کے ملکوں سے کافی ترقی یافتہ ہے۔ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد امریکن نے ہمت کر کے پوچھا — "کیا بالکل ناک سے کھانا کھاتے ہیں؟"

ہندوستانی نے جواب دیا — "نہیں، صرف ایک آدھ انچ نیچے۔"

شوٹنگ

ایک دن کی بات ہے کہ ایک فلم ایکٹرس ایک دُکان سے کچھ سامان خرید کر اپنی کار میں بیٹھنے ہی والی تھی کہ

ے نوجوان نے آکر زبردستی اس کا پرس چھین لیا اور
ث نکلا۔ ایکٹرس چلاتی رہی "بچاؤ، بچاؤ۔ پکڑو،
ڑو۔ چور، چور" مگر کوئی بھی آگے نہیں آیا۔ مجبوراً
رٹس نے اس واقعہ کی رپورٹ تھانے میں لکھوائی۔
مانہ انچارج نے وہاں ڈیوٹی پر کھڑے سپاہی کو بلایا
ر پوچھا ــــ

"کیا یہ واقعہ سچ ہے ــ؟"

سپاہی بولا "جی ہاں بالکل سچ ہے۔ اور میں اس ڈیوٹی پر کھڑا سب کچھ دیکھ رہا تھا"

تھانہ انچارج نے بگڑ کر پوچھا ــ "تو تم کیا کر رہے تھے۔ اس لوفر کو پکڑا کیوں نہیں ــ؟"

سپاہی نے سنجیدگی سے جواب دیا ــ "جناب! میں نے سمجھا کہ شاید شوٹنگ ہو رہی ہے"

کالا گھوڑا

ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ دو دوست فلم دیکھ رہے تھے۔ فلم میں گھوڑ دوڑ کا سین بھی تھا۔ فلم دیکھتے وقت دونوں میں شرط لگ گئی۔ ایک دوست نے کہا "کالا گھوڑا جیتے گا" دوسرے دوست نے سفید گھوڑا جیتنے کی بات کہی۔ شرط پچاس روپے طے ہو گئی۔ جب دوڑ کے آخر میں کالا گھوڑا ہی جیت گیا تو دوسرے دوست نے حیران ہو کر پوچھا ــ

"لیکن تمہیں پہلے سے یقین کے ساتھ یہ علم کیسے ہو گیا تھا کہ کالا گھوڑا ہی جیتے گا ــ؟"

دوسرے دوست نے شرط کی رقم سنبھال کر جیب میں ڈالتے ہوئے کہا ــ "کل رات کے شو میں بھی یہی گھوڑا جیتا تھا"

مایوسی نہیں ہوئی

کسی شہر میں قبروں کے کتبے تیار کرنے والا ایک شخص ایک ڈاکٹر کے پڑوس میں رہتا تھا۔ اور اس کے قریب ہی اس کا ورک شاپ بھی تھا۔

ایک دن ڈاکٹر نے ازراہِ تضحیک اس سے کہا ــ "آپ تو ہمیشہ یہی دعا کرتے ہوں گے کہ جلدی سے کوئی شخص مرے اور آپ کو لوحِ مزار کا آرڈر ملے"

"مجھے دعا کی زحمت کی ضرورت نہیں" ــ کتبے لکھنے والے نے جواب دیا ــ "جس وقت مجھے یہ علم ہو جاتا ہے کہ فلاں شخص آپ کے زیرِ علاج ہے۔ میں اس کا لوحِ مزار بنانا شروع کر دیتا ہوں۔ اور مجھے آج تک کبھی مایوسی نہیں ہوئی"

بریک

ایک دن کی بات ہے کہ ایک بوڑھا جس کی داڑھی بہت لمبی تھی، سائیکل پر سوار ہو کر کہیں جا رہا تھا۔ راستے میں اس کی ٹکر ایک بوڑھی عورت سے ہو گئی اور وہ سڑک پر گر پڑی۔ عورت نے اٹھتے ہوئے کہا ــ "اتنی لمبی داڑھی رکھی ہوئی ہے۔ اور سائیکل نہیں روک سکتے"

بوڑھے نے سائیکل سنبھالتے ہوئے جواب دیا ــ "ذرا غور سے دیکھئے۔ یہ داڑھی ہے کوئی بریک نہیں"

آدھا سگار

فرحت زیدی

بچو! ہم سب ہمیشہ اس کی کوشش کرتے ہیں کہ سمجھ بوجھ کی باتیں کریں، ذہانت کا اظہار کریں، اور عقل مند کہلائیں۔ لیکن ہر شخص سے، خواہ وہ کتنا ہی عقلمند اور ذہین کیوں نہ ہو، بعض اوقات ایسی بوکھلاہٹ سرزد ہوتی ہے کہ ساری عقلمندی دھری رہ جاتی ہے۔

ہمارے ایک دوست ہیں ان کی شادی طے کرنے کے لیے ان کی سسرال والے کچھ لوگ ان کے گھر گئے۔ ہمارے دوست اوپر کی منزل میں اپنے کمرے میں تھے۔ جب انھیں بلانے کے لیے نیچے سے ان کے چھوٹے بھائی گئے اور انھیں یہ بتایا کہ نیچے کیوں بلایا جارہا ہے تو ہمارے دوست کے پسینے چھوٹ گئے بہرحال تھوڑا سج سنور کے جب یہ نیچے اترنے لگے تو نہ جانے کیسے لڑکھڑائے اور ۵ — ۶ سیڑھیاں انھوں نے آناً فاناً ایک ہی قسط میں طے کرلیں۔ (ممکن ہے آج کل کے فیشن کے مطابق بڑی مُہری کی پتلون پہنے ہوں گے۔) ادھر ہمارے دوست نے تو سسرال والوں کے سامنے جانے کے لیے ذرا زیادہ ہی تیز تہذیب کا مظاہرہ کرنے کا پروگرام بنایا ہوا تھا لیکن نیچے پہنچے اس شان سے گٹھری بن کر۔ پھر جب مہمانوں نے بڑی ہمدردی سے پوچھا — "ارے یہ کیا ہوا۔ کیسے گرے؟ چوٹ تو نہیں آئی"؟ تو ہمارے دوست نے بڑی بہادری سے اپنی چوٹ کو چھپاتے ہوئے بس اتنا کہا۔

— "کچھ سمجھ میں نہیں آیا پھسلی پر سے سیڑھے تو سیڑھتے ہی چلے گئے"۔ اور پھر جو سب نے ایک زبردست قہقہہ لگایا تو کچھ لمحوں بعد انھیں احساس ہوا اور یہ کہنے لگے — "جی - مم - م ... میرا مطلب یہ ... کہ میں سیڑھی پر سے پھسلا تو پھسلتا ہی چلا گیا"۔

خیر اس قسم کی بوکھلاہٹیں تو اکثر عام آدمیوں سے ہوتی رہتی ہیں لیکن کبھی کبھی اپنے وقت کے ذہین ترین انسانوں سے بھی ایسے عمل سرزد ہوتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ جیسا کہ آئنسٹائن کے لیے، جو موجودہ زمانے کا بہت بڑا ریاضی داں INTELECTUAL اور سائنس داں تھا، کہا جاتا ہے کہ ایک بار بس میں سفر کر رہا تھا۔ کنڈکٹر نے جب ٹکٹ کی رقم مانگی تو آئنسٹائن نے جیب سے "مٹھی بھر سکے" نکال کر ہتھیلی کنڈکٹر کے سامنے کھول دی — "تمھیں جتنی رقم درکار ہو لے لو۔ مجھے سکے گننے نہیں آتے"۔ مشکل سے مشکل حساب کا جواب منٹوں میں زبانی حل کرنے والا معمولی سکوں کی رقم جوڑ کر مطلوبہ رقم دینے سے قاصر رہا، اس پر یقین کرنے کو دل نہیں چاہتا، لیکن ہے یہ ایک حقیقت۔

اسی طرح ایک اور ریاضی داں سے ایک قصہ منسوب ہے۔ یہ نہ صرف بہت بڑے ریاضی داں ڈاکٹر، پروفیسر تھے بلکہ بھارت کی ایک مشہور یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی تھے۔ یہ پروفیسر صاحب بڑے وضع دار، انتہائی مہذب اور شریف تھے۔ ان کی ذہانت کا لوہا نہ صرف اپنے ملک کے لوگ بلکہ دوسرے ممالک کے ذہین لوگ بھی مانتے تھے۔ ان کا معمول کہ روزانہ صبح کو ہوا خوری کے لیے جاتے۔ شیروانی، ٹوپی، ایک ہاتھ میں چھڑی اور دوسرے ہاتھ میں جلتا ہوا سگار ہوتا۔ ایک مقررہ جگہ تک ٹہلنے جا-

مقررہ وقفوں سے سگار کا کش لگاتے اور واپس اپنے بنگلے تک پہنچتے پہنچتے جب سگار ختم کے قریب ہوتا تو پھینک دیتے اور گھر میں آکر آرام کرتے۔

ایک دن صبح کو ہوا خوری کے دوران پروفیسر صاحب کو ان کے ایک شناسا مل گئے اور ان سے گفتگو کرتے ہوئے پروفیسر صاحب مقررہ جگہ تک گئے اور واپس ہوئے۔ واپسی میں کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد پروفیسر صاحب کو خیال آیا کہ انھوں نے سگار کے کش نہیں لیے ہیں۔ اب جو سگار کا کش لیا تو معلوم ہوا کہ وہ بجھ چکا تھا۔ ان کے شناسا نے ازراہِ اخلاق ان کا سگار سلگا دیا۔ اور وہ اپنی راہ ہو لیے۔ لیکن اب جو پروفیسر صاحب اس جگہ پہنچے جہاں روزانہ سگار پھینکا کرتے تھے تو دیکھا کہ آج تو سگار آدھے کے قریب باقی ہے۔ پروفیسر صاحب نے سگار نہیں پھینکا مزید کش لیتے ہوئے بنگلے کی طرف بڑھتے رہے شاید یہ سوچتے ہوئے کہ اگر آج یہ آدھا سگار پھینک دیا جاتا تو یہ نقصان ہو جاتا۔ آدھے سگار کی قیمت انھوں نے ذہن ہی میں جوڑی، پھر اگر آدھے سگار کی قیمت یہ ہوئی تو ایک ہفتے کے آدھے سگاروں کی کیا قیمت ہوئی۔ پھر ایک ماہ کے آدھے سگاروں کی، پھر ایک سال کے آدھے سگاروں کی قیمت کیا ہوئی۔ پھر پروفیسر صاحب یہ سوچنے لگے کہ اس طرح ہر روز اگر کوئی شناسا انھیں ملتا رہا تو ان کے کتنے سگار ضائع ہوں گے۔ پھر یہ کہ ملک میں کتنے سگار پینے والے ہوا خوری کو جاتے ہوں گے اور اگر ان سب کو کوئی شناسا مل جائے تو کتنے سگاروں کے ضائع ہونے کا اوسط رہا۔

غرض یہ کہ پروفیسر صاحب سگاروں کا حساب لگاتے ہوئے اور کش لیتے ہوئے آگے بڑھتے رہے یکایک چونکے کیونکہ ان کے لاشعور نے آگاہ کر دیا تھا کہ وہ اپنے بنگلے کے سامنے پہنچ چکے تھے۔ بنگلہ کا گیٹ کھولتے ہوئے پروفیسر صاحب نے سگار کو دیکھا تو اب وہ اتنا جل چکا تھا کہ مزید ایک دو کش لینے کے بعد اسے پھینکا جا سکتا تھا۔ اب پروفیسر صاحب نے یہ سوچا کہ اپنے کمرے میں جاؤں گا، سگار کا آخری کش لے کر کھڑکی سے باہر پھینک دوں گا، چھڑی کونے میں کھڑی کر دوں گا۔ شیروانی اور ٹوپی ہینگر پر ٹانگ دوں گا اور خود بستر پر لیٹ جاؤں گا لیکن یہ سب کیوں ہوا، وہ صاحب اگر نہ ملتے تو، ان کے ملنے سے آدھے سگار کا نقصان اور پھر ایک ہفتہ کے آدھے سگار! .... اور پروفیسر صاحب آدھے سگاروں کا حساب لگانے میں پھر ایسے محو ہوئے کہ سب گڑبڑ ہو گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد پروفیسر صاحب کا مالی کمرے میں یہ کہتا ہوا کہ "حضور آپ کی شیروانی کسی نے باغ میں ...." لیکن اب جو اس کی نظر گئی تو بستر پر پروفیسر صاحب نہیں تھے بلکہ جلتے ہوئے سگار کا آخری ٹکڑا پڑا تھا اور ہلکا ہلکا دھواں اُٹھ رہا تھا۔ مالی نے لپک کر سگار اٹھایا اور کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ پھر وہ شیروانی ٹانگنے کے لیے جب ہینگر کی طرف بڑھا تو دیکھا کہ وہاں چھڑی لٹکی ہوئی ہے۔ چھڑی اتار کر اس نے شیروانی ٹانگ دی اور جب چھڑی کو اس کی مقررہ جگہ کونے میں رکھنے کے لیے وہ بڑھا تو دیکھا کہ کونے میں پروفیسر صاحب آنکھیں بند کیے ہوئے کھڑے ہیں۔

ایس۔ ایم۔ عباس

عقلمندی

بچو! تم نے بھینس دیکھی ہوگی۔ اس کا دودھ بھی پیا ہوگا۔ گائے اور بھینس، دودھ دینے والے دو خاص جانور ہیں، بھینس، گائے سے بڑی ہوتی ہے۔ دودھ بھی زیادہ دیتی ہے۔ بھینس کا جسم بڑا ہوتا ہے اور بھاری بھی۔ شاید اسی لیے بھینس سے متعلق ایک کہاوت مشہور ہے۔

"عقل بڑی کہ بھینس"

یہ کہاوت عموماً بیوقوفی کے کام پر کہی جاتی ہے یعنی دنیا میں بھینس نہیں بلکہ عقل بڑی چیز ہے، شاید تم کو اس بات پر تعجب ہو کہ عقل، بھینس سے کیسے بڑی ہو سکتی ہے۔ بھینس کے بڑا جسم ہوتا ہے، عقل کو ہم دیکھ بھی نہیں سکتے ہیں۔ لیکن تعجب کی بات نہیں، آؤ! تمھیں عقل کا کرشمہ دکھائیں۔ جسے دیکھ تم خود فیصلہ کرو کہ عقل کتنی بڑی چیز ہے، یعنی عقل بڑی ہوتی ہے، بھینس نہیں!

کہتے ہیں ایک بادشاہ کے تین بیٹے تھے، بادشاہ بوڑھا ہوگیا تھا۔ اس کو فکر ہوئی کہ اپنے کس بیٹے کو تخت و تاج کا مالک بنائے۔ وہ کچھ دنوں سوچتا رہا — ایک دن بادشاہ نے وزیر سے بھی پوچھا۔ وزیر بہت ہوشیار تھا، اس نے ادب سے جواب دیا۔

"جہاں پناہ! اس میں فکر کی بات نہیں، تینوں شہزادوں کا امتحان لے لیا جائے۔ جو کامیاب ہو اسے حکومت دی جائے۔"

"امتحان کیسے ہو؟" بادشاہ نے پھر وزیر سے پوچھا "حضور! بہت آسان ہے۔ تینوں شہزادوں کو تھوڑا سا روپیہ برابر برابر بانٹ دیں، ایک وقت مقرر فرما دیں اور شہزادوں کو حکم دیدیں کہ متعین تاریخ تک اپنے اپنے کمروں کو کسی چیز سے بھر دیں۔"

بادشاہ نے ایسا ہی کیا۔ دوسرے دن تینوں لڑکوں کو بلاکر ہر ایک کو دس دس روپیہ دیا اور حکم دیا کہ تم لوگ اپنے اپنے کمروں کو تین دن کے اندر کسی چیز سے بھر دو۔ میں تین کے بعد تم لوگوں کے کمروں کو دیکھوں گا۔

اب شاہزادوں کا حال سنو!

روپیہ لے کر تینوں شہزادے سوچنے لگے کہ اتنے تھوڑے پیسے میں آخر کمرہ کیسے بھرے گا؟

بڑے شہزادے کو جُوا کھیلنے کی عادت تھی۔ اس نے سوچا کیوں نہ اس روپیہ سے پہلے جُوا کھیلوں اور جب کچھ اور روپیہ جیت لوں تب کمرہ بھرنے کے لئے کوئی اوپائے کروں۔ یہ سوچ کر وہ جوا خانہ پہنچا، بیوقوفی میں کُل روپیہ ایک ہی داؤں پر لگا دیا۔ بدقسمتی سے بجائے کچھ جیتنے کے سب ہار گیا۔ اب کیا کرتا مجبور ہو کر رہ گیا۔

منجھلے شہزادے نے بھی یہی بات سوچی کہ اتنے کم پیسے میں کیا ہو، کمرہ کیسے بھرا جائے؟

اب اس کی بیوقوفی دیکھو! سوچتے سوچتے اسے ایک ترکیب سوجھی، اس نے گھوم گھوم کر تمام جگہ سے کوڑا کرکٹ خرید کر اچھے خاصے کمرے میں انبار کرنا شروع کر دیا تین دنوں میں شہر بھر کی تمام گندی چیزیں اس کے کمرہ میں بھر گئیں۔

چھوٹے شہزادے نے بھی کمرہ بھرنے کے بارے میں غور کیا وہ دو دن تک سوچتا رہا آخر تیسرے روز اس کی سمجھ میں اچھی سی بات آگئی۔ اس نے تھوڑے سے پیسوں میں کیوڑا اور گلاب کا عرق، جوہی، چمیلی اور رات کی رانی کا عطر اور کچھ دھوپ، اگربتیاں وغیرہ منگوائیں۔ کمرہ کا فرش دھلوا کر اس نے کیوڑا اور گلاب کا چھڑکاؤ کرایا۔ در و دیوار کو عطر کی خوشبو میں بسایا اور بادشاہ سلامت کی آمد کے قبل بہت ساری بتیاں، صندل اور دھوپ کمرے میں سلگوا دیا۔

بادشاہ اپنے وقت پر شہزادوں کے کمروں کو دیکھنے نکلا، وزیر ساتھ تھا۔ سب سے پہلے وہ بڑے بیٹے کے یہاں پہنچا۔ دیکھا شہزادہ بالکل اداس اور خاموش بیٹھا ہے، بادشاہ کے پوچھنے پر کہ اس نے کمرہ کیوں نہیں بھرا، اس نے جواب دیا۔

"اباجان حضور! آپ نے صرف دس ہی تو روپے دیئے تھے بھلا اتنے کم پیسے میں، میں اتنا بڑا کمرہ کیسے بھرتا۔ میں نے جوا کھیل کر روپیہ بڑھانے کی تدبیر کی لیکن بدقسمتی سے ہار گیا۔"

وہاں سے رخصت ہو کر بادشاہ منجھلے بیٹے کے پاس گیا۔ دیکھا کہ سارا کمرہ کوڑا کرکٹ سے اٹا پڑا ہے۔ گندگی اور بدبو کی وجہ سے وہاں سانس لینا بھی مشکل ہے۔

"یہ کیا کیا تم نے؟" بادشاہ نے پوچھا

"اباجان! آپ ہی کے حکم کی تعمیل تو میں نے کی ہے۔ بھلا دس روپے میں سوائے کوڑا کرکٹ کے یہ لمبا چوڑا کمرہ کس چیز سے بھرتا۔"

بدبو سے بادشاہ اور وزیر کا دماغ پھٹا جا رہا تھا وہ جلدی سے وہاں سے آگے بڑھ گئے۔

چھوٹے شہزادے کی طرف بادشاہ اور وزیر بڑھے تو دور ہی سے انھیں بھینی بھینی خوشبو محسوس ہوئی۔ وہاں کا سماں ہی عجیب تھا۔ ہر طرف خوشبو ہی خوشبو پھیلی ہوئی تھی ہر آنے جانے والے کا دماغ معطر ہو جاتا۔

چھوٹے بیٹے نے نہایت ادب کے ساتھ بادشاہ اور وزیر کا استقبال کیا، انھیں بٹھایا اور عطر اور الائچی ان لوگوں کی خدمت میں پیش کیا۔ اس نے بادشاہ کے سامنے بچا ہوا پیسہ بھی رکھ دیا۔

بادشاہ نے چھوٹے بیٹے سے کچھ بھی نہیں پوچھا۔ اس کی عقلمندی اور ادا پر اس کا دل باغ باغ ہو گیا۔ وزیر بھی اس سوجھ بوجھ کو دیکھ کر بہت خوش ہوا اور بادشاہ سے عرض کیا:

"حضور پرنور! مبارک ہو آپ کا یہی بیٹا امتحان میں کامیاب ہے۔"

کچھ عرصہ بعد بادشاہ نے بڑی دھوم دھام کے ساتھ اپنے چھوٹے بیٹے کو راج گدی پر بٹھا دیا۔

بچو! دیکھا تم نے عقل دنیا میں کتنی بڑی چیز ہے آج جو کچھ بھی تم دنیا میں دیکھ رہے ہو یہ سب عقل کا کرشمہ ہے۔!!

گھمنڈ

سراج انور

چمک دار اور قیمتی سفید رنگ کا موتی تو آپ نے دیکھا ہوگا ——— دیکھا ہے نا؟ ——— یہ موتی ایک سیپ میں سے نکلتا ہے۔ اور سیپ میں رہنے والا ایک کیڑا یہ موتی بناتا ہے۔ تو یہ کہانی دراصل اسی سیپ میں رہنے والے کیڑے کی ہے۔

سیپ میں رہنے والے اس کیڑے کو خود پر بڑا ناز تھا وہ سمجھتا تھا کہ اس سے زیادہ کارآمد کیڑا دنیا میں کوئی دوسرا نہیں ہے۔ ریشم کا کیڑا بھی کارآمد ہوتا ہے، مگر ریشم موتی جیسا قیمتی تو ہوتا نہیں۔ اسی لیے سیپ والا کیڑا اپنے پر بڑا فخر کرتا تھا۔ اور ہمیشہ مغرور رہتا تھا۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ سمندر میں زبردست جوار بھاٹا آیا۔ لہروں میں ہلچل مچ گئی۔ اور پھر یہ لہریں بار بار آسمان کی طرف لپکنے لگیں۔ سیپ والا کیڑا اپنی چمکیلی اور رنگ برنگی سیپ کے اندر بند رہ کر سمندر کی تہ ہی میں رہنا پسند کرتا تھا۔ وہ اتنا مغرور تھا کہ سمندر کی سطح پر آنا بھی اپنی توہین سمجھتا تھا ——— مگر اس جوار بھاٹے کی وجہ سے اسے مجبوراً سطح پر آنا پڑا۔ سطح پر آکر اس نے اپنی چمکیلی سیپ کی ڈبیہ کے کواڑ کھول کر اس اوپر کی دنیا میں جھانک کر دیکھا ——— ابھی وہ جھانک ہی رہا تھا کہ سمندر کی ایک اونچی لہر نے اسے اٹھا کر ریت پر پھینک دیا۔ تو کیڑا بہت گھبرایا ——— خود سے چل کر وہ دوبارہ پا جا نہیں سکتا تھا۔ مگر اس کے باوجود سمندر کی لہر بار آکر اسے چھوتی تھیں ——— وہ اِس وقت کتنا بدقسـ تھا کہ پانی سے دور ہوتے کے باوجود بھی پانی ا بار آکر چھوتا تھا مگر کوئی لہر اتنی طاقت ور نہیں آ کہ اسے اپنے ساتھ سمندر میں بہا کر لے جاتی!

سمندر کے کنارے اُگے ہوئے درخت پر آ بہت دیر سے اس کی بے بسی پر غور کر رہا تھا۔ وہ سے اُڑتا ہوا سیپ کے پاس آ بیٹھا اور اپنی نوک سے سیپ کو اوپر سے کھٹکھٹاتے ہوئے بولا:

"ارے بھئی دروازہ کھولو ——— کوئی اندر

"کون بدتمیز ہمیں پریشان کر رہا ہے؟" مغر نے چلا کر پوچھا۔

"میں ہوں ——— سیانا کوا ——— دروازہ کھولو" کوے نے کہا۔

"باہر کیوں آؤں ——— ؟"

"ذرا باتیں کریں گے اور کیا ——— ؟" کوے بھری آواز میں کہا۔

"میں نہیں آتا ——— میں اس وقت ایک میں مصروف ہوں ——— اور پھر تم سے بات کرنا شان کے خلاف سمجھتا ہوں۔" کیڑے نے آواز میں کہا۔

"اوہو ——— یہ نخرے!" کوا ہنسا "ار میں تم سے سمندر کی تہ کے بارے میں کچھ چاہتا ہوں۔ مجھے سائنس سے دل چسپی ہے۔ ایک کی چھت پر میرا گھونسلا ہے۔ اسی لیے سائنس

گئی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے سمندر کے بارے میں بتاؤ۔ وہاں کیا ہوتا ہے — کیا وہاں فاختہ اور چڑیا کے انڈے بھی ہوتے ہیں — ؟"

"کیا بکواس کر رہے ہو" — کیڑے نے جھلا کر جواب دیا۔ "کہیں سمندر میں بھی چڑیاں یا فاختائیں ہوتی ہیں — !"

"یہی تو تم سے معلوم کرنا چاہتا ہوں"

"بے کار کی باتیں مت کرو۔ سمندر میں میری ہی جیسی لاکھوں اور کروڑوں سیپیاں بکھری ہوئی ہیں۔ مگر میں ان میں سے اعلیٰ ہوں اس لیے میں کسی سے بات نہیں کرتا۔ وہاں رنگ برنگی مچھلیاں ہیں۔ عجیب و غریب پودے ہیں اور بس — ہاں مگر تم جیسے احمق جانور وہاں بالکل نہیں ہیں"۔

"میں احمق جانور نہیں ہوں — میں تو کوّا ہوں کوّا — سیانا کوّا" کوّے نے ہنس کر کہا — "مگر یہ تم کوٹھری میں بند رہ کر کیا داستان سنا رہے ہو — باہر آؤ یار"

"یار —" کیڑے نے نفرت سے کہا — "یہ یار کیا ہوتا ہے۔ تمہیں بات کرنے کی بھی تمیز ہے یا نہیں — ؟"

"اور تم تو اس طرح باتیں کر رہے ہو جیسے سمندر پر تمہارا ہی قبضہ ہے!" کوّے نے ہنس کر کہا۔

"بے شک — میں موتی بناتا ہوں اور سمندر میری ہی وجہ سے مشہور ہے" کیڑے نے جواب دیا۔

"پھر تو میں تمہیں ضرور دیکھوں گا — ایسی عجیب و غریب چیز تو میں نے آج تک نہیں دیکھی"

"تم مجھے چیز کہتے ہو — میں کیڑا ہوں کیڑا — سیپ کا کیڑا"

"وہی سہی — مگر تم باہر تو آؤ، دروازہ تو کھولو" کوّے نے بے صبری سے کہا۔

"دروازہ نہیں کھل سکتا — کہہ دیا کہ میں موتی بنانے میں مصروف ہوں"

"موتی پھر بنا لینا — دروازہ کھولو — میں تمہیں بھی دیکھنا چاہتا ہوں اور موتی کو بھی — میں تو ایک بہت ہی غریب کوّا ہوں — میں نے آج تک موتی نہیں دیکھا" — کوّے نے کہا۔

"کہہ دیا ایک دفعہ دروازہ نہیں کھل سکتا — اگر تمہیں اتنی بے صبری ہے تو دروازہ خود کھول لو" کیڑے نے غرور بھری ہنسی کے ساتھ کہا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ کوّا سیپ کے کواڑ نہیں کھول سکتا۔

"اچھا یہ بات ہے" کوّے نے غصے سے کہا — "اب جو کچھ ہوگا تم مجھے اس کا الزام مت دینا" اتنا کہہ کر اس نے جلدی سے سیپ کو اپنی چونچ میں پکڑا اور پھر اسے اچھی طرح چونچ میں دبا کر اڑنے لگا — اونچا — اور اونچا — بہت ہی اونچا — !

جلد ہی وہ اس جگہ پہنچ گیا جہاں سخت چٹانیں تھیں۔ ہوا میں اُڑتے اُڑتے اس نے تاک کر وہ سیپ ایک صاف ستھری چٹان پر بڑی اونچائی سے پھینک دی۔ اور پھینکنے کے بعد خود بھی نیچے اُترنے لگا۔ سیپ چٹان سے ٹکرا کر فوراً ٹوٹ گئی۔

کوّے نے سب سے پہلے تو جلدی سے موتی بنانے والے کیڑے کو اپنی چونچ میں دبایا اور پھر ایک جھٹکے کے ساتھ اسے کھا گیا اور اس کے بعد اس نے موتی کو دیکھا جو لڑھکتا ہوا زمین کی طرف جا رہا تھا — اس کے دیکھتے دیکھتے موتی چٹان سے لڑھک کر غڑاپ سے گائے کے گوبر میں جا کر دھنس گیا اور کوّا بیچارا خوبصورت موتی کا یہ حشر دیکھ کر چٹخارا لیتا ہوا پھر سے ہوا میں اُڑ گیا۔

کارٹون

ڈیڈی! 'آئی ڈونٹ نو' کا مطلب کیا ہوتا ہے؟
میں نہیں جانتا!
جب آپ 'آئی ڈونٹ نو' کا مطلب نہیں جانتے تو آپ انگریزی سے 'بی۔ اے' کیسے پاس کر گئے؟

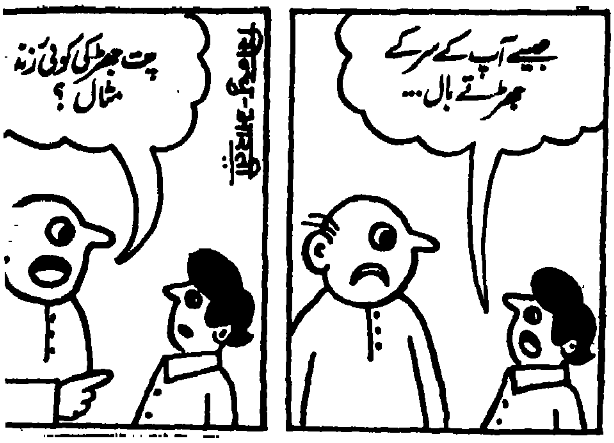
جیسے آپ کے سر کے جھڑتے بال...
پت جھڑ کی کوئی زندہ مثال ؟

یار! ہمارے پاس کارٹونوں کا ڈھیر جمع ہوگیا ہے
تو تم انھیں اخباروں میں کیوں نہیں بھیج دیتے؟
یار! اخباروں سے ہی تو کاٹ کر اکٹھے کیے ہیں!

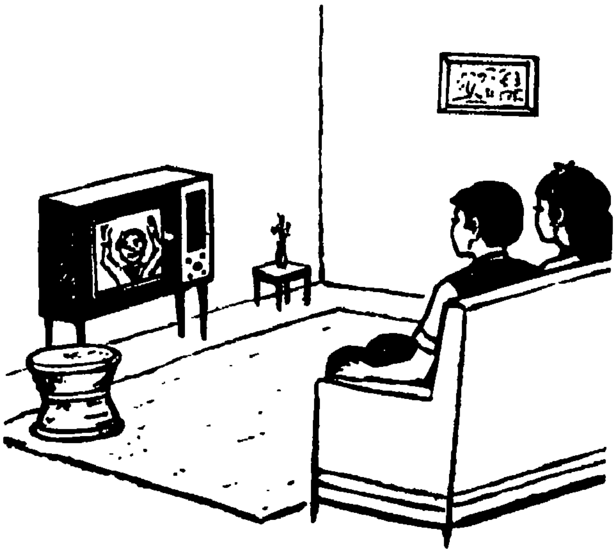

ٹیلی ویژن کی کہانی

فیضان نادر

عزیز بچو! ہم نے اور آپ نے جس صدی میں آنکھ کھولی یا ہوش سنبھالا ہے وہ بیسویں صدی کہلاتی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ "صدی" سو برس کو کہتے ہیں۔ یعنی ۱۹۰۱ء سے بیسویں صدی شروع ہوئی تھی اور ۲۰۰۰ء تک چلے گی۔ گویا اور بیس برس باقی ہیں۔ شاید تب تک آپ ملک کے بہترین جوان بن جائیں گے، نہیں، بلکہ ایسے سائنس داں بن جائیں گے جن پر ملک کو ناز ہوگا۔ بالکل اس طرح جس طرح ابوالفاخر زین العابدین عبدالکلام پر ہمارے بھارت کو ناز ہے جنھوں نے روہنی راکٹ ۱۸ جولائی ۱۹۸۰ء کو خلا میں بھیجا ہے۔ خدا کرے کہ وہ دن آئے اور آپ بھی اپنے وطن کی خاطر کچھ کر سکیں۔ ہم تو شاید اس وقت تک بوڑھے ہو چکے ہوں گے یا پھر آسمانی دنیا سے آپ کے کارنامے دیکھا اور سنا کریں گے۔

بات تھی بیسویں صدی کی۔ اس صدی کو ایٹمی صدی بھی کہیے تو کوئی حرج نہیں۔ اس صدی کو سائنس صدی بھی کہیے تو کوئی مضائقہ نہیں، اس صدی میں کیا کچھ نہیں ہوا اور دیکھیے کیا کیا ایجاد ہوتا ہے اور کیا کیا تحقیقات ہوتی ہیں۔

آپ روزانہ ایسے کتنے الفاظ سنتے ہیں، ٹیلیفون، ٹیلیگرام، ٹیلسکوپ، ٹیلی میٹر، ٹیلیجونی، ٹیلی پیتھی، اور ٹیلی ویژن وغیرہ۔ مگر آپ نے کبھی ٹیلی کے بارے میں سوچا کہ اس کے کیا معنی ہیں، دور، بعید۔ یہ سابقہ PREFIX خاص طور سے ان آلات کے ناموں کے ساتھ آتا ہے جو دور کے کسی بھی قسم کے نتیجے حاصل کرنے یا کسی چیز کا شمار یا اندراج کرنے کے لیے بنائے گئے ہوں۔

اب جیسے ٹیلی فون، فون کے معنی ہیں آواز، بول چال، صوت، صاف معنی ظاہر ہو گئے کہ ٹیلی فون یعنی دور کی آواز، دور کی بول چال۔ اب چلتے چلتے یہ بھی سن لیجیے کہ ٹیلی فون ۱۹ مارچ ۱۸۷۶ء کو گراہم بیل نے ایجاد کیا تھا۔ یہ انگلستان کے شہر اڈنبرا کا رہنے والا تھا۔ اس کا ایک شریک کار واسٹن بھی تھا۔

آپ اوپر بیان کیے گئے آلات والفاظ کے معنی اپنے استاد سے پوچھیے بلکہ بہتر یہ ہے کہ خود کوئی لغت دیکھیے تاکہ آپ کی لیاقت میں اضافہ ہو۔ اور آپ کو جستجو اور تلاش کی عادتِ نیک پڑے۔

آئیے! اب آپ کو ٹیلی ویژن کے معنی بتائے دیتے

ہیں، ٹیلی تو آپ سمجھ گئے نا! ویژن یعنی دید، دیکھنا، نظارہ کرنا، سایہ، صورت، تصویر۔ گویا ٹیلی ویژن کے معنی ہوئے 'غائب چیز کو دیکھنا، بہت دور کی چیز کو دیکھنا۔ اب سائنس کی اصطلاح میں اس کے معنی ہوئے لاسلکی (WIRELESS) کی مدد سے ان حرکات وسکنات کو دیکھنا (اور سننا بھی) جو فاصلے کی وجہ سے آنکھوں سے اوجھل ہیں۔ اب دیکھیے نا ہماری وزیر اعظم اندرا گاندھی صاحبہ دہلی میں تقریر کرتی ہیں آپ حیدرآباد، بمبئی وغیرہ میں ان کو اپنے گھروں میں دیکھتے اور سنتے ہیں۔ یہ تو ملک ہی ملک کے اندر کی بات ہوئی۔ آرام اسٹرانگ اور ایلڈرن اور [illegible] دن ۲۱ر جولائی ۱۹۶۹ء کو خلائی راکٹ اپولو ۱۱ سے جب چاند پر پہنچے تو دنیا کے لاکھوں لوگوں نے ان کو زمین سے تین لاکھ چوراسی ہزار (۳۸۴۰۰۰) کلو میٹر کے فاصلہ سے ٹیلی ویژن پر دیکھا تھا۔ یہ ہے سائنس کا کمال بلکہ کرشمہ۔ کیا اب بھی اس کو آپ سائنسی صدی نہیں کہیں گے۔ بالکل جس طرح بعض لوگ اپنے کاموں یا کمالات یا ہنر کی وجہ سے مشہور ہو جاتے ہیں جیسے مولانا ابوالکلام آزاد، مسیح الملک اجمل خاں، آہنی انسان ولبھ بھائی پٹیل، امن کا فرشتہ چاچا نہرو۔ اس طرح سائنسی تحقیقات اور ایجادات کی بنا پر ہم اس کو سائنسی صدی کہہ سکتے ہیں۔

انگلستان میں ایک شہر گلاسگو ہے۔ گلاسگو کے قریب ایک قصبہ ہے۔ اس قصبہ میں ایک ایسا بچہ پیدا ہوا جو بے چارہ ہمیشہ بیمار رہتا تھا اور اس بیماری کی وجہ سے اس کا دل اسکول میں مطلق نہیں لگتا تھا۔ جس سے وہ پڑھ نہ سکا۔ البتہ اس نے اپنے فوٹو گرافی کے شوق کو برابر جاری رکھا۔

وہ بیمار بچہ تھا لوئی گی بیرڈ (J.L. BAIRD) اب جب یہ جوان ہوا تو اس نے قصبہ کو چھوڑ دیا۔ اور لندن آگیا۔ بیماری اس کا پیچھا کرتی رہی۔ جیسا آپ کتابوں کا پیچھا کرتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹروں کے مشورہ پر وہ سمندری مقام ہسٹنگر چلا گیا۔ اور جب وہ ایک دن سیر کے لیے نکل کر سمندر کے کنارے ٹہل رہا تھا تو اس نے گانے کی آواز سنی۔ غور کرنے پر معلوم ہوا کہ قریب کے کسی ہوٹل میں کوئی ریڈیو بج رہا ہے۔ بس اس کے ذہن میں ایک سوال ابھرا کہ ہوائی لہروں کے ساتھ آواز اتنی دور جا سکتی ہے تو کیا تصویر بھی انھیں لہروں کے ساتھ نہیں جا سکے گی؟

اور اس غور و خوض نے اس کو ایک تجربہ کرنے پر مجبور کر دیا۔

اس نے ایک خالی صندوق لیا۔ کپڑا سینے کی سوئی ایک موٹا شیشہ، ایک خالی ڈبہ، کچھ بیٹریاں (ٹارچ سیل) تار اور موم۔ بجلی سے چلنے والا ایک موٹر ایک پنکھا، اور اس سامان کی مدد سے اپنے تجربوں میں مشغول رہا۔ اس نے جو کچھ کیا ہوگا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دھندلی سی تصویر دور لگے ہوئے پردے پر آگئی۔ اس وقت اس کے خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ تھوڑی دیر کے لیے وہ سب اپنا دکھ بھی بھول گیا۔ اس نے اور [illegible] بیٹریاں استعمال کر کے تصویر کے دھندلے پن کو بھی دور کیا۔ اس تجربہ کے بعد اس نے ایک پتلی بنا کر دوسرے کمرے میں پردہ لگا دیا۔ اور کوشش میں رہا کہ اس کا عکس اب وہاں نظر آئے۔ اور وہ اس میں بھی کامیاب رہا۔

اس کے بعد اس نے ایک آدمی کو روشنی کے سامنے کھڑا کیا اور اس کا عکس دوسرے کمرے میں پر

پر دیکھنے لگا۔ وہ کامیاب ہوگیا۔ وہ کس قدر خوش ہوا ہوگا !! جس قدر آپ انتہائی محنت کرنے کے بعد امتحان میں شاندار کامیابی پر مسرور ہوتے ہیں، ہے نا !!— اس کے بعد اس نے کئی مراحل طے کرکے ٹیلی ویژن ایجاد کر ہی لیا۔ ان مسلسل تجربات نے اس کی جان کو اور بھی خطرہ میں ڈال دیا۔ اور اس بیماری میں لوئی گی بیرڈ کی جان جان آفریں کے سپرد ہوئی۔

اب آپ کو یہ بتانا ضروری سمجھتے ہیں کہ آج کل ٹیلی ویژن کیسے کام کرتا ہے ؟؟ مختصراً سنیے، آپ کی سمجھ میں آجائے گا !

ٹیلی ویژن اسٹیشن پر کیمرہ کی مدد سے تصویریں لی جاتی ہیں تو یہ تصویریں کمرہ میں موجود ایک مخصوص پردہ پر پڑتی ہیں۔ اس پردہ پر روشنی سے متاثر ہونے والے کیمیائی مادّے موجود رہتے ہیں۔ یہ پردہ تصویر کو چھوٹے چھوٹے حصّوں میں تقسیم کردیتا ہے۔ ہر چھوٹا حصّہ اپنے اندر ایک برقی نوعیت رکھتا ہے۔ یہ الکٹریکل امپلسز (Electrical Impulses) جب ریڈیائی لہروں کے ساتھ ملا کر ہوا میں بکھر جاتی ہیں تو اینٹینا (حسّاس آلے) کی مدد سے گھروں میں لگے ہوئے ٹیلی ویژن سیٹ کے ریسیور (RECEIVER) ان لہروں کو موصول کرتے ہیں اور دوبارہ یہ لہریں تصویروں کی شکل میں آپ کے سامنے نظر آتی ہیں۔

کیمرہ کی ایجاد ۱۴۵۲ء میں اٹلی کے سائنس داں لیونارڈو ڈاونچی نے کی اور ریڈیو کی ایجاد ۱۹۰۲ء میں مارکونی (اٹلی) نے کی۔ گویا ساڑھے چار سو اور پانچ سو برس بعد دونوں ڈانڈے سے مل کر تیسری ایجاد ٹیلی ویژن کی ہوئی۔

اپنی پہچان

شوکت پردیسی

ہاتھی دیکھ کے چیونٹی بولی، کتنا ہے بے ڈول بدن
چوہے نے بھی اونٹ کی لمبائی کو سمجھا پاگل پن
گاجر، شلجم، مولی نے یہ کہا کہ چوپٹ ہے بیگن
دوسروں کے بارے میں تو سب کچھ کہنا ہے آسان
سب سے زیادہ مشکل ہے دنیا میں خود اپنی پہچان

کیلا اور امرود یہ بولے، آم تو ہے گرمی کا پھل
توبہ توبہ ہم سب ہوجائیں اس موسم میں پاگل
لیچی بولی ! دیکھو کتنا بے ڈھنگا سا ہے کٹہل
اس کو کھانے والا ہوگا ایسا ہی کوئی نادان
سب سے مشکل ہے دنیا میں خود اپنی پہچان

جن کو آگے بڑھنا ہوتا ہے وہ رہتے ہیں خاموش
گھوڑے کی وہ ٹاپ کو سُن کر کہتے ہیں، کیا خرگوش
بے سمجھے بوجھے نہیں دکھلاتے وہ کوئی جوش و خروش
نہیں چلاتے اُڑتے بادل پر لفظوں کے تیر و کمان
سب سے زیادہ مشکل ہے دنیا میں خود اپنی پہچان

اقبال قدوائی

ایکس رے

چنّو آج اسکول میں کھیل کے دوران گر پڑا۔ اسکول میں واجبی مرہم پٹی کر دی گئی تھی اور ساتھ ہی استانی جی نے کہلا بھیجا کہ ایکس رے کرالیا جائے۔ کہیں ہاتھ کی ہڈی نہ ٹوٹ گئی ہو۔ اس کی امی نے کہا۔

"بیٹا کل تم اسکول نہیں جاؤ گے۔ میں تمھیں لے کر ایکس رے کرانے جاؤں گی۔"

"امی یہ ایکس رے کیا ہوتا ہے؟"

"یہ تو تم اپنے ڈیڈی سے پوچھو، وہ زیادہ اچھی طرح بتا سکتے ہیں۔"

"آؤ بیٹا میں تمھیں بتاتا ہوں۔" اس کے ڈیڈی نے کہا۔

"ایکس رے ایک قسم کی شعاعیں ہیں۔ ٹھیک اسی طرح جیسے کہ سورج کی روشنی کی شعاعیں ہوتی ہیں۔ دونوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ سورج کی روشنی کی شعاعوں کو ہم دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن ایکس رے کو ہماری آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں۔ جرمن سائنس داں ولیم کونراڈ رونٹجن نے ۱۸۹۵ء میں انھیں دریافت کیا تھا۔ اس لیے ان شعاعوں کو رونٹجن شعاعیں بھی کہا جاتا ہے۔ رونٹجن کے اس کارنامے پر ۱۹۰۱ میں اسے نوبل انعام ملا تھا۔"

"رونٹجن نے انھیں کیسے دریافت کیا ڈیڈی؟"

"بیٹے سائنسی ایجادات دو طرح کی ہوتی ہیں۔ کوئی سائنس داں یا کئی سائنس داں مل کر کافی عرصہ تک ایجاد یا دریافت کی کوشش کرتے ہیں اور بالآخر ا کامیاب ہو جاتے ہیں۔ لیکن اکثر ایسا بھی ہوتا ہے ک تجربہ کرتے وقت یا کسی اور موقع پر اچانک کوئی ایسی سامنے آتی ہے، جس کے نتیجے میں کوئی انتہائی اہم د ہوتی ہے۔ تمھیں آرکی میڈیس کا واقعہ یاد ہوگا کہ وہ نہانے کے ٹب میں کودا تو پانی پر اس عمل کے ر سے اچانک اس کا مشہور نظریہ وجود میں آیا۔ اسی ط سر آئزک نیوٹن جب باغ میں بیٹھے کسی بات پر غور تھے تو درخت سے ایک سیب زمین پر گرا۔ وہ اس کی وجہ پر غور کرنے لگے اور اسی طرح کشش ث متعلق ان کا مشہور نظریہ سامنے آیا۔ اس طرح کی د جو کسی اچانک واقعہ سے ہوتی ہیں بہت زیادہ دینے والی ہوتی ہیں۔"

"ڈیڈی آپ رونٹجن کے بارے میں بتا رہے چنو کی بے صبری بڑھتی جا رہی تھی

"ہاں بیٹے میں وہی بتا رہا ہوں۔ ایک مرتبہ بہت کم دباؤ پر گیسوں میں سے برقی رو گزارنے

رر رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ ایک ٹیوب میں سے، جسے وہ اپنے تجربہ میں استعمال کر رہا تھا، کچھ شعاعیں نلیں، جنھوں نے کمرے میں رکھی ہوئی ایک فوٹوگرافک یٹ پر ویسا ہی اثر ڈالا جیسا کہ سورج کی شعاعوں کا ہوتا ہے۔ جب اس نے ان شعاعوں کے راستے میں پانی کا گچھا اور ایسی ہی دوسری چیزیں رکھیں تو فوٹوگرافک پلیٹ پر ان کی پرچھائیں دکھائی دی۔ رونٹجن سمجھ گیا کہ یہ کس قسم کی شعاعیں ہیں، جن کے یہ اثرات ظاہر ہوئے ہیں. لیکن وہ ان کی نوعیت پوری طرح نہ معلوم کر سکا۔ لہذا انھیں ایکس رے کا نام دیا۔ اس کی اس دریافت نے دنیا میں سنسنی پھیلا دی۔ ان شعاعوں کی خصوصیات جاننے کے لیے بہت سے تجربات کیے گئے۔ معلوم ہوا کہ یہ شعاعیں برقی مقناطیسی شعاعیں ہوتی ہیں، ٹھیک اسی طرح جیسے روشنی کی شعاعیں یا ریڈیو شعاعیں وغیرہ ہوتی ہیں. لیکن برقی قوت یا مقناطیسی قوت کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا. اس کا مطلب یہ ہے کہ ان میں برقی چارج نہیں ہوتا ہے۔ ابتدا میں سمجھا جاتا تھا کہ ان میں انعکاس، انعطاف، تداخل اور تعقیب وغیرہ کا عمل نہیں ہو سکتا ہے، جیسا کہ روشنی کی شعاعوں میں ہوتا ہے۔ لیکن بعد کے تجربات سے یہ ثابت ہوا کہ یہ سب عمل ان شعاعوں میں بھی ہوتے ہیں۔ ان کی رفتار بھی روشنی کی شعاعوں کی طرح تقریبًا دو لاکھ ۹۰ ہزار کلومیٹر فی سکینڈ ہوتی ہے۔"

"پھر روشنی کی شعاعوں سے یہ شعاعیں کس طرح الگ ہیں؟"

"بتا رہا ہوں بیٹا" چنو کے ڈیڈی نے بتانا شروع کیا۔ "روشنی کی شعاعیں لکڑی، دفتی اور ایسی بہت سی چیزوں کے بیچ سے نہیں گزر سکتی ہیں، جن کے آرپار دیکھا نہیں جا سکتا۔ لیکن ایکس رے ان چیزوں کے بیچ سے گزر جاتی ہیں۔ یہ شعاعیں جب گیسوں کے درمیان سے گزرتی ہیں تو ان کے ذرات کو آئینوں میں بدل دیتی ہیں۔"

"یہ شعاعیں کس طرح تیار ہوتی ہیں؟"

"جب بہت سے الکٹران کسی کرن کی شکل میں تیز رفتار سے چلتے ہیں اور ان کے راستے میں ٹھوس دھات کا کوئی ٹکڑا آجاتا ہے تو یہ شعاعیں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ الکٹران ایک برقی سرے کیتھوڈ (CATHOODE) سے نکلتے ہیں جس ٹھوس ٹکڑے سے یہ ٹکراتے ہیں اسے ٹارگٹ (TARGET) کہتے ہیں۔ یہ دونوں اور ساتھ ہی مثبت سرا اینوڈ (ANODE) ایک ٹیوب میں بند ہوتے ہیں، جس میں ہوا بہت کم ہوتی ہے۔ مثبت اور منفی سرے کے درمیان زیادہ وولٹیج کی بجلی دی جاتی ہے۔ رونٹجن نے جس طرح کی ٹیوب استعمال کی تھی، اس میں کئی تبدیلیاں کرکے اسے بہتر بنایا گیا۔ جدید ایکس رے ٹیوب کولج ٹیوب کہلاتی ہے۔ یہ دراصل شیشے کا ایک گلوب ہوتا ہے۔ اس میں سے تقریبًا سب ہوا نکال دی جاتی ہے۔ یعنی ہوا کا دباؤ ایک ملی میٹر کے دس لاکھویں حصے سے بھی کم رہ جاتا ہے۔ اس کا منفی سرا (کیتھوڈ) ٹنگسٹن دھات کا ہوتا ہے۔ اسے برقی رو کے ذریعے گرم کرنے کا انتظام ہوتا ہے۔ کیتھوڈ کے کافی گرم ہونے پر اس میں الکٹران خارج ہوتے ہیں۔ ٹارگٹ ٹنگسٹن یا پلاٹینم دھات کا ہوتا ہے اور ۴۵ ڈگری کے زاویے پر رہتا ہے۔ یہی اینوڈ کا بھی کام کرتا ہے۔ الکٹرانوں کی رفتار تیز کرنے کے لیے اسے بہت زیادہ وولٹیج کی بجلی بھی دی جاتی ہے۔ لاکھوں کی تعداد میں

الکٹران بہت تیز رفتار سے آکر ٹارگٹ سے ٹکراتے رہتے ہیں۔ اس لیے ٹارگٹ بہت گرم ہو جاتا ہے، جسے ٹھنڈا کرنے کا انتظام بھی کیا جاتا ہے۔"

"ڈیڈی، یہ ایکس رے کس کام آتی ہے؟"

"اس کا سب سے زیادہ اور عام استعمال تو بیماریوں کی تشخیص کے لیے ہوتا ہے۔ فرض کرو کہ یہ معلوم کرنا ہے کہ تمھاری ہڈی ٹوٹی ہے یا نہیں۔ اس کے لیے تمھارے ہاتھ پر یہ شعاعیں ڈالی جائیں گی، جو ہاتھ سے گزر کر ایک پردے پر پڑیں گی۔ ہاتھ کی ہڈی بہت بھاری اور گھنی ہوتی ہے، لہٰذا شعاعیں اس میں سے نہ گزر سکیں گی اور پردے پر ہڈی کی پرچھائیں صاف نظر آئے گی، جسے دیکھ کر یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ ہڈی کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچا ہے۔ اگر پردے کی جگہ پر ایک فوٹو گرافک فلم لگا دی جائے تو ہڈی کا فوٹو آ جائے گا، جسے نکال کر کسی بھی ڈاکٹر کو دکھایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح مختلف بیماریوں کی تشخیص کی جا سکتی ہے، یا جسم میں کسی شئے مثلاً گولی وغیرہ کی موجودگی کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔ ایکس رے کے ذریعہ علاج بھی ہو سکتا ہے۔ اگر جسم کا کوئی خلیہ خراب ہے، تو اسے ایکس رے کے ذریعہ ختم کیا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ دیگر صحت مند خلیوں کے مقابلے میں بہت جلد اور آسانی سے ضائع ہو جانے کے قابل ہو۔ یہ شعاعیں جسم میں سے گزر کر اس خلیہ تک پہنچتی ہیں اور اسے ختم کر دیتی ہیں۔ اس طریقۂ علاج کو ریڈیو تھریپی (RADIO-THRAPY) کہتے ہیں۔ کینسر اور دیگر کئی امراض کے علاج میں اس کا استعمال ہوتا ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا ڈیڈی کہ ایکس رے ڈاکٹروں کے استعمال کی چیز ہے۔"

"نہیں۔ تشخیص اور علاج کے علاوہ کئی دوسرے شعبوں میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے۔ انجینئرنگ میں، ویلڈنگ، ڈھلائی اور گھڑائی کی جانچ میں اس کا استعمال ہوتا ہے۔ تیار چیزوں میں نقص کا پتہ بھی اس سے چلایا جا سکتا ہے۔ سائنسی تحقیق میں بھی اس کی بڑی اہمیت ہے۔ ان شعاعوں کی مدد سے کسی شے کو ضائع کیے یا نقصان پہنچائے بغیر اس کے خصائل معلوم کیے جاتے ہیں۔ مادے کے ذرات کی اندرونی بناوٹ بھی اس کی مدد سے معلوم ہو جاتی ہے۔ جرائم کی تفتیش میں ان شعاعوں سے اس طرح مدد لی جاتی ہے کہ لکڑی یا چمڑے کے بکسوں میں چھپی ہوئی ناجائز اشیاء، اور دھماکہ خیز مادوں کے بارے میں ان کی مدد سے معلوم ہو سکتا ہے۔ بعض مجرم اپنے جسم میں ہیرے اور سونا وغیرہ چھپا لیتے ہیں۔ انھیں بھی ایکس رے کی مدد سے برآمد کیا جا سکتا ہے۔"

"پھر تو ایکس رے بہت کام کی چیز ہے۔ ڈاکٹری، انجینئرنگ، سائنس، صنعت اور جرائم کی تفتیش، سب ہی جگہ اس کا استعمال ہوتا ہے۔"

"یہی نہیں بلکہ آرٹ میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے۔"

"اچھا! وہ کس طرح؟"

"یہ پرانی تصویروں میں ہونے والی تبدیلی کا پتہ چلاتی ہے۔"

"واہ پھر تو یہ ایکس رے کمال کی چیز ہے!"

اچانک چنو کی امی نے باورچی خانہ سے آواز دی ——— "اچھا اب بہت ہو گیا بحث مباحثہ۔ اب آپ دونوں کھانے کے لیے تیار ہو جائیے۔"

بچوں کے لیے کچھ دلچسپ کتابیں

یہ ہندوستان
قیمت ۱۰ روپے

اس باتصویر کتاب میں سادہ اور سہل زبان میں بچوں کو ہندوستانی تہذیب و تمدن کے ساتھ ساتھ تاریخی، معاشی اور سماجی حالات سے آگاہ کیا گیا ہے۔ رنگین تصاویر

جواہر لال کی کہانی تصویروں کی زبانی
قیمت ۳ روپے ۵۰ پیسے

محبوب رہنما اور ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم شری جواہر لال نہرو کی زندگی کے دلچسپ واقعات رنگین تصاویر میں۔ بچوں اور طالب علموں کے لیے بہترین تحفہ۔

رنگ برنگے پھول
قیمت ۱۰ روپے

بچوں کے شاعر شفیع الدین نیر، سیفی سیوہاروی، افسر میرٹھی، اسمٰعیل میرٹھی، تلوک چند محروم، اور دیگر بہت سے شعرا کی آسان زبان میں لکھی ہوئی نظمیں۔

کون جیتا کون ہارا
قیمت ۹ روپے

بچوں کے لیے آسان زبان میں لکھی ہوئی دو دلچسپ کہانیاں کتاب شروع کرنے کے بعد ایک ہی نشست میں ختم کرنے کو جی چاہتا ہے۔

پہیلیاں
قیمت ۸ روپے

پانچ سو سے زیادہ پہیلیوں کا مجموعہ جن سے بچے اور بڑے یکساں طور پر لطف اٹھا سکتے ہیں۔

ہیرے کی لونگ
قیمت ۵ روپے ۵۰ پیسے

بچوں کے لیے آسان زبان میں لکھی ہوئی کہانیاں۔ ہر کہانی تصویروں سے آراستہ۔ (زیر طبع)

آج کل کے خریداروں کو ۲۰ فی صد رعایت۔ محصول ڈاک ہمارے ذمے

دس روپے سے کم قیمت کی کتابیں بذریعہ وی پی نہیں بھیجی جائیں گی۔ پوسٹل آرڈر بھیجیے یا وی پی طلب کیجیے۔

ملنے کا پتہ

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن

پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

۲۶ جنوری کو ہر سال ہم یوم جمہوریہ (گن تنتر دوس) مناتے ہیں۔ اس موقع پر نئی دہلی
میں فوجی پریڈ ہوتی ہے، طرح طرح کی جھانکیاں نکالی جاتی ہیں، اسکول کے بچے
دلچسپ پروگرام پیش کرتے ہیں اور بھارت کے مختلف حصوں سے آئے ہوئے
لوک نرتیہ کے ماہر اپنا کمال دکھاتے ہیں۔ اوپر کی تصویر ایک ایسے ہی رقاص کی ہے

blished by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi-11 0001.

[illegible] [illegible] ایک [illegible]

ہوریۂ کینیا کے صدر مسٹر ڈینیل ارب
ی ۲۳ر فروری کو ہندوستان کے
، روزہ سرکاری دورے پر آئے۔
عزز مہمان، صدر جمہوریۂ ہند شری
یلم سنجیوا ریڈی اور وزیر اعظم ہند
شریمتی اندرا گاندھی کے ساتھ۔

✿ ہمارے غیر ملکی مہمان ✿

وزیر مملکت برائے صنعت ڈاکٹر
چرنجیت چانہ اور جرمن ڈیموکریٹ
ری پبلک کی کونسل وزرا کے ڈپٹی
ڈاکٹر جرہارڈ وِیس نے ۲ر فروری
نئی دلی میں اقتصادی، سائنسی
تکنیکی اشتراک عمل سے متعلق
دونوں ملکوں کے مشترکہ کمیشن کا
کے بعد ایک معاہدے پر
دستخط کیے۔

اردو کا مقبول عام مصور ماہنامہ

آج کل (اردو)

نئی دہلی

ایڈیٹر
راج نرائن راز

اسسٹنٹ ایڈیٹر
محمد عادل صدیقی

سب ایڈیٹر
شوناتھ سنگھ

جلد ۳۹ شمارہ ۹

اپریل ۱۹۸۱ء

چیتر بیساکھ شک سمت ۱۹۰۳

فون: ۳۸۷۰۶۹

شرح چندہ

	ہندوستان	پاکستان	دیگر ممالک
سالانہ	۱۰ روپے	۱۶ روپے	۳ ڈالر ۱/۵۰ پونڈ
دو سالہ	۱۸ روپے	۲۸ روپے	۵/۴۰ ڈالر ۲/۷۰ پونڈ
سہ سالہ	۲۵ روپے	۳۸ روپے	۷/۵۰ ڈالر ۳/۷۵ پونڈ
فی کاپی	ایک روپیہ	ڈیڑھ روپے	۳۰ سینٹ ۱۵ پنی

ترتیب

ملاحظات ۲
شہید اعظم بھگت سنگھ — کے کے کھلر ۳
کرشن چندر — ذہنی اور فنی سفر — عظیم الشان صدیقی ۶
کرشن چندر کے افسانے کا معنوی مزاج — صادق ۱۱
آندھرا پردیش میں اردو نثری تراجم — رشید الدین ۱۴
مس روزا (کہانی) — حمیدہ سلطان ۱۶
لغت ابجد شمار — ستید احمد ۲۰
مری آرزو (نظم) — نصیر پرواز
غزل — بلراج حیرت ۲۶
ٹی سیٹ (کہانی) — عزیز مراد آبادی ۲۷
قصہ حاتم طائی کی داستانوی اہمیت — عزیز اندوری ۳۰
غزلیں — کمال جالبی۔ جنید حزیں، خلیل انجم۔ شاکر جرولی، سکندر زعفران۔ اسلم اعظمی ۳۴
امن کا پیامبر (کہانی) — زہرہ جبیں ۳۵
ایک رات کی جنت (کہانی) — جان محمد آزاد ۴۰
نئی کتابیں (تبصرے) ۴۲

سرورق: شہید اعظم بھگت سنگھ

ڈائرکٹر پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر "آج کل" معرفت پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترسیل زر کا پتہ
بزنس منیجر، پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ملاحظات

ترقی کا منشور

ہندوستان میں منصوبہ بندی کی تاریخ کو تیس برس گزر چکے ہیں۔ اس عرصے میں منصوبہ بند ترقی کے عمل نے یہاں کی معیشت بحال کرنے روزگار فراہم کرنے اور غریبی دور کرنے میں مؤثر کردار ادا کیا ہے چوں کہ ہندوستان ایک وسیع و عریض ملک ہے، لہٰذا یہاں کے مسائل بھی گوناگوں ہیں۔ یہاں کوئی بھی حکمتِ عمل جادو جیسا اثر نہیں دکھا سکتی۔ چنانچہ ماضی کے تجربات اور کامیابیوں نیز ناکامیوں کو سامنے رکھتے ہوئے چھٹے پنجسالہ منصوبے کی منظوری دی گئی ہے۔ غریبی دور کرنے کے لیے طویل المدتی حکمتِ عمل پر زور دیتے ہوئے ملک کو خودکفیل بنانے اور غیر ملکی امداد پر انحصار کم کرنے کے لیے اقدامات وضع کیے گئے ہیں۔

چھٹا پنجسالہ منصوبہ ۱۵ سال کے طویل عرصے کی ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے تیار کیا گیا ہے۔ چنانچہ ۸۱-۱۹۸۰ سے ۹۵-۱۹۹۴ء کے عرصے میں روزگار کے مواقع نکالنے اور ملک کی تکنیکی اور اقتصادی حالت کو بہتر بنانے پر خاص زور دیا جائے گا۔ چھٹے پنجسالہ منصوبے میں ۹۷۵۰۰ کروڑ روپے کی مجموعی سرمایہ کاری کا اندازہ لگایا گیا ہے۔ اس کے لیے رقوم اندرونِ ملک سے ہی فراہم کی جائیں گی۔ بہت تھوڑی سی رقم باہر ملکوں سے لی جائے گی۔ پبلک سیکٹر کی سرمایہ کاری پر خاص زور دیا جائے گا۔ اس منصوبے میں اندرونِ ملک پیداوار میں سالانہ ۵٫۲ فیصد شرحِ ترقی کا اندازہ لگایا گیا ہے جو بقول منصوبہ بندی کے مرکزی وزیر شری نرائن دت تیواری کہ اتنے بڑے ملک میں اس سے کم اندازے کی بات کر کے اور چھٹے پنجسالہ منصوبے میں مذکورہ نشانوں کی تکمیل کو حقیقت کا جامہ نہ پہنا کر عوام کی بہتری کے لیے کچھ نہیں کیا جا سکتا۔

۸۵-۱۹۸۴ء تک فی کس سالانہ آمدنی کا اوسط ۸۰-۱۹۷۹ء کی قیمتوں کے حساب سے ۱۷۴۴ روپے تک پہنچ سکے گا۔ جبکہ اس وقت یہ لگ بھگ ۱۴۸۴ روپے ہے۔ منصوبے کے شروع میں غریبی کی سطح سے کم پر زندگی گزارنے والوں کا فی صد تناسب ۴۸٫۴۴ ہے جو گھٹ کر منصوبے کے آخر تک ۳۰ فیصد رہ جائے گا۔ غلے کی ماہانہ فی کس اوسط کھپت ۱۲٫۹۵ کلوگرام سے بڑھ کر ۱۴٫۳۲ کلوگرام ہو جائے گی۔ کپڑے کی فی کس کھپت کا اوسط بھی اعشاریہ ۸۵ میٹر سے بڑھ کر اعشاریہ ۹۲ میٹر ہو سکے گا۔ عمر کا اوسط مردوں کے ضمن میں ۵۲/۶ سے بڑھ کر ۵۵/۱ اور خواتین کے لیے ۵۱/۶ سے بڑھ کر ۵۴/۳ ہو سکے گی۔

- امید کی جاتی ہے کہ چھٹے پنجسالہ منصوبے کے نشانے عوام کے تعاون اور کوششوں سے پایۂ تکمیل کو پہنچ سکیں گے اور ان کے ذریعے عوام کا معیارِ زندگی بلند ہو سکے گا اور ملک سے بے روزگاری اور غربت کو کم کرنے میں مدد مل سکے گی۔

ہمارا بجٹ

مرکزی سرکار کے بجٹ برائے سال ۸۲-۱۹۸۱ء نے نہ صرف صارفین کے خدشات دور کر دیئے بلکہ سٹہ بازوں کی تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ موجودہ سرکار کو خشک سالی، افراطِ زر، بجلی، نقل و حمل اور کوئلے کی فراہمی میں کمی جیسے مسائل کا سامنا رہا ہے، ان دشواریوں کو دیکھتے ہوئے زیرِ تبصرہ بجٹ کو کامیاب بجٹ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس بجٹ میں سرمایہ کاری کو بڑھانے اور پیداوار میں اضافہ کرنے نیز بچتوں کو بڑھاوا دینے کی حکمتِ عملی کو سامنے رکھا گیا ہے۔ اعداد و شمار کی روشنی میں ۸۱-۱۹۸۰ء کی دوسری ششماہی میں معیشت میں بحالی کے آثار رونما ہوئے ہیں۔ اور زرعی نیز صنعتی محاذ پر کامیابیاں ملی ہیں۔ اور کوئلے، بجلی نیز ٹرانسپورٹ کی صورتِ حالات میں بہتری آئی ہے۔ غیر ملکی زرِ مبادلہ کو بچانے کے لیے درآمدات پر پابندیاں بڑھا دی گئی ہیں۔ البتہ چند اشیائے صارفین مثلاً خوردنی تیلوں، مٹی کے تیل اور ڈیزل کو ان سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے۔ متوسط طبقے کو ٹیکسوں میں راحت دی گئی ہے۔

اس بجٹ کے مجموعی اثرات عوام کے لیے خوش کن ہیں اور انھوں نے اس کا خیر مقدم کیا ہے۔

پروفیسر اسلوب احمد انصاری کو ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ

اس سال ساہتیہ اکیڈمی نے جن ۱۹ ادیبوں کو ان کی بہترین تخلیقات

(بقیہ صفحہ ۴۳ پر)

کے. کے. کھلر

شہید اعظم بھگت سنگھ

یہ نصف صدی کا قصہ ہے

دل سے نکلے گی نہ مر کر بھی وطن کی اُلفت • میری مٹی سے بھی خوشبوئے وطن آئے گی

یہ وہ نغمہ ہے جو بھگت سنگھ نے پھانسی پر لٹکنے سے پہلے گایا تھا۔ یوں تو سرفروشی کی تمنا ہمیشہ ہی سے بھگت سنگھ کے دل میں موجود تھی لیکن ۲۳ مارچ ۱۹۳۱ کی شام کو سات بجکر ۳۳ منٹ پر اس تمنا کی تکمیل لاہور سنٹرل جیل میں ہوئی۔ اور بازوئے قاتل نے اپنا زور دکھایا تین شہیدوں کی لاشوں کو جیل کی پچھلی دیوار کو توڑ کر ایک فوجی ٹرک میں بوریوں میں بند کر کے دریائے ستلج کے کنارے حسینی والا کے مقام پر پُل کے نیچے مٹی کے تیل سے جلا دیا گیا۔ ادھ جلی لاشوں کو دریا میں پھینک کر پولس کے افسر واپس لاہور چلے گئے۔ کیونکہ صبح ہونے سے پہلے انہیں واپس پہنچنا تھا۔ لیکن رات کے اندھیرے اور سناٹے نے بھی بھگت سنگھ کے ساتھ ہی دم توڑا۔ ساتھ والے گاؤں کے لوگوں نے جب فضا میں شعلے اور انگارے دیکھے تو جوق در جوق دریا کے کنارے پر جمع ہونا شروع ہو گئے۔ یہ خبر لاہور اور فیروز پور میں بجلی کی طرح پھیل گئی۔ ادھ جلی لاشوں کو دریا سے نکالا گیا اور انھیں رسم و رواج اور عزت کے ساتھ آگ کے سپرد کیا گیا۔ "انقلاب زندہ باد" اور "بھگت سنگھ، راج گورو، سکھ دیو زندہ باد" کے نعروں کی گونج سے آسمان کانپ اٹھا۔ لیکن دیوتاؤں نے پھول برسائے۔ دریائے ستلج کا کنارہ آج بھی اس خونیں واقعے کا گواہ ہے اور نغمہ خواں ہے:

شہیدوں کی چتاؤں پر لگیں گے ہر برس میلے
وطن پر مٹنے والوں کا یہی باقی نشاں ہوگا

۳ مارچ ۱۹۳۱ء کو لاہور سنٹرل جیل سے بھگت سنگھ نے اپنے چھوٹے بھائی کلتار سنگھ کو ایک چٹھی لکھی تھی:

عزیز کلتار!

آج تمہاری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر بہت رنج ہوا۔ آج تمہاری بات میں بہت درد تھا۔ تمہارے آنسو مجھ سے برداشت نہیں ہوتے۔ برخوردار! ہمت سے تعلیم حاصل کرتے جانا اور صحت کا خیال رکھنا، حوصلہ رکھنا اور کیا کہوں۔ شعر لکھوں۔ کیا لکھوں۔ سنو

اسے یہ فکر ہے ہر دم نیا طرزِ جفا کیا ہے
ہمیں یہ شوق دیکھیں ہاں ستم کی انتہا کیا ہے

کوئی دم کا مہماں ہوں اہلِ محفل   چراغِ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں

میری ہوا میں رہے گی خیال کی بجلی
یہ مشتِ خاک ہے فانی رہے رہے نہ رہے

اچھا رخصت،

خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں۔

حوصلے سے رہنا

نمستے ــ تمہارا بھائی

بھگت سنگھ

عین پھانسی کے روز یعنی سوموار ۲۳ مارچ ۱۹۳۱ء کو بھگت سنگھ کو جیل سے بھگانے کی بات بھی جیل ہی میں اٹھی تھی۔ اور اس کے بارے میں ان سے پوچھا گیا۔ جواب میں انھوں نے لکھا تھا:

"جینے کی تمنا تو قدرتی طور پر سب میں ہے اور وہ تمنا مجھ میں بھی ہونی چاہیئے۔ میں اسے چھپانا نہیں چاہتا مگر میں قید ہو کر یا کسی پابندی کے تحت زندہ نہیں رہنا چاہتا۔ میرا نام ہندوستانی انقلاب میں ایک نشان بن چکا ہے۔ انقلاب پارٹی کے اصولوں اور قربانیوں نے مجھے بہت اونچا کر دیا ہے۔ زندہ رہنے کی حالت میں میں اس سے زیادہ اونچا نہیں جا سکتا۔ میرے ہنستے ہنستے پھانسی پر چڑھ جانے سے ہندوستانی مائیں اپنے بچوں کو بھگت سنگھ بننے کو کہا کریں گی۔ ملک پر قربان ہونے والوں کی تعداد اتنی بڑھ جائے گی کہ شاید انقلاب کے اس سیلاب کو روکنا سامراجیوں کے لیے ناممکن ہو جائے۔ اور ان کی شیطانی قوتوں کے بس کی بات نہ رہے۔ پھانسی سے بچنے کی میرے دل میں کوئی تمنا نہیں ہے۔ مجھ سے زیادہ خوش نصیب کون ہوگا۔ مجھے آج کل اپنے آپ پر بہت ناز ہے اور میں اپنے آخری لمحوں کا بڑی بے تابی کے ساتھ انتظار کر رہا ہوں میں چاہتا ہوں کہ میرا آخری وقت اور قریب آجائے۔"

یہ نصف صدی کا قصہ ہے جب وہ اپنے رفیقوں، سکھ دیو اور راج گورو کے ساتھ تختہ دار پر جھول گئے۔ پھانسی کے تختے پر چڑھنے سے پہلے ان کا یہ مطالبہ تھا کہ پھانسی کے بجائے ان کو جنگی قیدی کی حیثیت سے گولی مار کر ختم کر دیا جائے۔ یہ مطالبہ انھوں نے اس لیے کیا تھا کہ ان کے خلاف الزام یہ تھا کہ انھوں نے شہنشاہِ برطانیہ کے خلاف جنگ کی ہے انھوں نے کہا کہ وہ عام مجرم نہیں ہیں۔ مرکزی قانون ساز اسمبلی میں بم پھینکنے کے بعد انھوں نے اپنے آپ کو خود ہی گرفتار کرایا تھا۔ عدالت کو انقلابی پراپیگنڈے کے طور پر استعمال کیا۔ انگریز ججوں کے سامنے قومی ترانے گائے اور بڑی بے باکی اور بہادری کے ساتھ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ہندوستان کی تاریخ میں امر ہو گئے۔ ان کی آخری خواہش یہ تھی کہ وہ دوبارہ ہندوستان میں جنم لیں۔ وہی کام سرانجام دیں اور یہ کام اس وقت تک کرتے رہیں جب تک ان کا وطن آزاد نہیں ہو جاتا۔ مدن لال ڈھینگرہ نے بھی یہی الفاظ ۱۷ اگست ۱۹۰۹ء کو پنٹوولی جیل لندن میں پھانسی کے تختے پر چڑھنے سے پہلے کہے تھے۔

شہیدانِ آزادی کی صفوں میں بھگت سنگھ صفِ اول میں ہیں۔ یہ وہ بھگت سنگھ تھے جنھوں نے اپنے والد سردار کشن سنگھ کو اپنی شادی کے بارے میں یہ چٹھی لکھی تھی:

"مجھے آپ کی چٹھی پڑھ کر بہت حیرانی ہوئی ہے۔ حیرت ہے کہ آپ جیسا محب وطن اور بہادر انسان کبھی کبھی معمولی باتوں کے لیے اتنا اصرار کر سکتا ہے۔ آپ کو صرف ایک ماں یعنی میری دادی کی فکر ہے۔ لیکن ۳۳ کروڑ ہندوستانیوں کی جو ماں ہے اس کی تکالیف کا اندازہ آپ نے نہیں کیا۔ وہ ہے بھارت ماتا۔ اس کے دکھ درد کو دور کرنے کے لیے ہمیں بڑی سے بڑی قربانی دینی ہوگی۔ اس کے لیے میں نے قسم کھائی ہے کہ شادی کبھی نہیں کروں گا۔"

اپنے دوستوں کو مخاطب کر کے بھگت سنگھ نے لاہور ریلوے اسٹیشن پر اونچی آواز میں کہا۔

" دوستو! اگر میری شادی غلام ہندوستان میں ہوئی تو میری دلہن موت ہوگی۔ صرف موت۔ بارات ایک ماتمی جلوس کی شکل اختیار کرے گی اور باراتی ہوں گے شہیدانِ وطن۔"

بھگت سنگھ بروز سنیچر ۲۷ ستمبر ۱۹۰۷ء کو چک نمبر ۱۵۵، بنگا نام کے گاؤں، تحصیل جڑانوالہ ضلع لائل پور (اب پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ اس وقت سارے پنجاب میں ایک "نئی ہوا" چلی ہوئی تھی۔ سیاسی سرگرمیاں اپنے عروج پر تھیں۔ سردار اجیت سنگھ اور دیگر انقلابی جیلوں میں تھے۔ لالہ لاجپت رائے گرفتار ہو چکے تھے اور مانڈلے جیل بھجوائے جا چکے تھے۔ پنجاب کا کسان جاگ اٹھا تھا۔ ہر طرف محنت کشوں اور مزدوروں کی ہڑتالیں ہو رہی تھیں۔ بھگت سنگھ کے تقریباً سارے رشتہ دار لاہور جیل میں قید تھے۔ بھگت سنگھ کی پیدائش کے بعد سردار کشن سنگھ، سردار اجیت سنگھ اور سردار سورن سنگھ تینوں بھائی جیل سے رہا کر دیئے گئے۔ بھگت سنگھ کی ماتا ودیا وتی نے نوزاد کو "بھاگاں والا" (خوش نصیب) قرار دیتے ہوئے اس کا نام بھگت سنگھ رکھ دیا۔

ڈی اے وی کالج سے ہوتے ہوئے اور شادی سے انکار کرتے ہوئے آپ نے ملک کے اس وقت کے انقلابی لیڈروں کے ساتھ مل کر "ہندوستانی سوشلسٹ ری پبلکن ایسوسی ایشن" اور بعد میں جمہوری فوج بنائی۔ پنجاب کے نوجوانوں کو منظم کر کے "نوجوان بھارت سبھا" کی بنیاد رکھی۔ یہ ۱۹۲۵ء کی بات ہے۔ پھر خفیہ سرگرمیوں میں مصروف ہو گئے۔ فرضی ناموں سے "ویر ارجن" (دہلی) اور پرتاپ (کانپور) کے اخباروں میں نامہ نگار کی حیثیت سے اشتعال انگیز مضامین لکھے۔ ۱۹۲۶ء میں انھوں نے کاکوری میل ٹرین کیس کے قیدیوں کو جن میں اشفاق اللہ خاں اور رام پرشاد بسمل (دونوں ۱۸ اور ۱۹ دسمبر ۱۹۲۷ء میں فیض آباد اور گورکھپور کی جیلوں میں پھانسی کے تختوں پر لٹکائے گئے) کا نام خاص طور پر مشہور ہے چھڑانے کا ناکام منصوبہ بنایا تھا۔ جب لالہ لاجپت رائے کو سائمن کمیشن کے خلاف ۳۰ر اکتوبر ۱۹۲۸ کی صبح کو ایجی ٹیشن کے دوران انگریز افسر کی لاٹھیوں سے چوٹیں آئی تھیں اور وہ زخمی ہو کر ۱۸ دن ہسپتال رہنے کے بعد شہید ہو گئے تھے تو ہندوستان سوشلسٹ ری پبلکن آرمی نے ان

کی موت کا بدلہ لینے کا فیصلہ کیا۔ اور ۱۷ر دسمبر ۱۹۲۸ء یعنی پورے ایک مہینے بعد بھگت سنگھ نے راج گورو اور چندر شیکھر آزاد کے ساتھ پولیس آفیسر سانڈرس کو لاہور کے سنٹرل تھانے کے باہر گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا اسمبلی بم کے سلسلے میں ۸ر اپریل ۱۹۲۹ء کو بھگت سنگھ نے خود اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دیا تھا۔ اس جرم میں انھیں تاعمر دریائے شور کی سزا سنائی گئی۔ لیکن جب لاہور سازش کیس ۱۹۲۹ء میں شروع ہوا تو ایک خصوصی عدالت نے ان کو اور ان کے ساتھیوں کو سزائے موت سنائی۔

ان دنوں گاندھی اردن سمجھوتہ ہو رہا تھا۔ مہاتما گاندھی کی کوششوں کے باوجود انگریز سرکار نے پھانسی کی سزا کو نہ معاف کیا۔ نہ عمر قید میں بدلا۔ سارے ملک میں اس کے خلاف ایجی ٹیشن اور ہڑتالیں ہوئیں۔ اخباروں میں لکھا گیا لیکن حکومتِ برطانیہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ سردار کشن سنگھ نے پنجاب ہائی کورٹ کو ایک قانونی نکتہ نکال کر پریشان کر رکھا تھا۔ وہ نکتہ یہ تھا کہ اس عدالت کو جو سزائے موت کا حکم سناتی ہے، کوئی حق نہیں کہ سزائے موت کا دن اور وقت بھی معین کرے۔ لیکن تاریخ گواہ ہے کہ ہائی کورٹ اس فیصلے پر اٹل رہا۔ بھگت سنگھ کے رشتہ داروں کو آخری وقت ملنے کی اجازت بھی نہیں ملی۔ وہ اپنے والد اور بھائی بہنوں سے آخری بار ۳ر مارچ ۱۹۳۱ء کو ہی ملے تھے۔ پھانسی کا وقت اور تاریخ خفیہ رکھی گئی تھی۔ آج تک جو پھانسیاں دی گئی تھیں، ان کا وقت صبح کے سات بجے ہوتا تھا لیکن خوف زدہ حکومت نے بغاوت کے ڈر سے بھگت سنگھ اور ان کے نڈر ساتھیوں کو شام کے سات بجکر ۳۳ منٹ پر پھانسی پر لٹکایا۔ مجاہدینِ آزادی نے ہنستے گاتے اپنی جانیں قربان کر دیں۔ یہ وہ نوجوان ہیں جنھوں نے قوم کے وقار کو مجروح نہیں ہونے دیا تھا۔ یہ وہ دیوانے ہیں جنھوں نے ہندوستان پر غیر ملکی تسلط کی دیواریں ہلا دی تھیں، پھانسی کے تختے پر جانے سے پہلے بھگت سنگھ نے ایک مجسٹریٹ کو کہا تھا کہ "تم خوش نصیب ہو کیونکہ تم ہندوستانی محبانِ وطن کی قربانیوں کے چشم دید گواہ ہو"

ستلج کی لہریں آج بھی ان بانکے اور بے باک نوجوان کی یاد دلاتی ہیں جن کے خون سے اس دریا کا پانی آج تک لال ہے۔ حسینی والا کے گاؤں کے کسانوں کو آج تک وہ رات نہیں بھولی جس رات تین نوجوانوں نے اپنی چتا کی روشنی سے قوم کی سربلندی اور اس کے مستقبل کی راہیں روشن کی تھیں۔

بھگت سنگھ کو اقبال کا یہ شعر بہت پسند تھا۔

" اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی "

بھگت سنگھ کی دُور بیں اور دُور رس نگاہ، ان کی جرأت اور حق گوئی، صداقت، خلوص اور دیانت داری وہ چیزیں تھیں جن کے اثرات سے ساری قوم جھوم اٹھی تھی۔ بھگت سنگھ غریب مزدوروں اور محنت کش دہقانوں کے رہنما تھے۔ اردو زبان کے ساتھ ان کو خاص لگاؤ تھا۔ ان کے کئی خطوط اردو میں ہیں۔ انھیں مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ ان کے ایک دوست کا کہنا ہے کہ میں نے بھگت سنگھ کو پھٹے کپڑوں میں دیکھا ہے لیکن مجھے کوئی ایسا دن یا وقت یاد نہیں پڑتا جب میں نے ان کو بغیر رسائل یا کتاب کے دیکھا ہو۔ ان کی جیبیں اخبار کے تراشوں سے بھری رہتی تھیں اور ان کے ہاتھوں میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی ادبی یا سیاسی کتاب ہوتی تھی۔ پران ناتھ مہتہ جنھوں نے بھگت سنگھ کے ساتھ کال کوٹھری میں آخری ملاقات کی تھی، اپنی ایک تحریر میں لکھتے ہیں کہ مجھے بھگت سنگھ نے انقلابی لینن کی کتاب، اپنی زندگی کے آخری دن یعنی ۲۳ر مارچ کی صبح کو لانے کو کہا تھا اور جب میں نے ان کو وہ کتاب دی تھی تو ان کا چہرہ چمک اٹھا تھا۔

بھگت سنگھ نے اپنی زندگی اس لیے قربان کی تھی کہ آنے والی نسلیں باعزت زندگی بسر کر سکیں۔ آج جبکہ ان کو پھانسی پائے ہوئے پچاس برس ہوئے سارا ملک انھیں یاد کر رہا ہے۔ کیونکہ یہ ہماری تاریخ کا ایک ایسا باب ہے جو نہ صرف اہم ہے بلکہ ناقابل فراموش بھی ہے۔

۱۷ر دسمبر ۱۹۲۸ء کو لاہور میں جے پی سانڈرس اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس کے قتل میں راج گورو (جن کا اصلی نام شیورام تھا) بھی شریک ہوئے تھے لیکن فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن مخبروں کی وجہ سے ۳۰ر ستمبر ۱۹۲۹ء کو پونا کے ایک موٹر گراج میں گرفتار کر لیے گئے۔ لاہور سازش کیس میں بھگت سنگھ اور سکھ دیو اور دیگر انقلابی ہستیوں کے ساتھ آپ پر بھی مقدمہ چلایا گیا اور ۲۳ر مارچ ۱۹۳۱ء کو اپنے ساتھیوں کے ساتھ پھانسی کے تختے پر لٹکا دیے گئے۔

یہ واقعہ ان تین جانبازوں کا ہے جنھوں نے اپنی جانوں کی پروانہ کی۔ اور یہ دکھا دیا کہ آزادی کی دیوی اگر خون مانگتی ہے تو ہندوستان میں ایسے جیالوں کی بھی کمی نہیں۔

ان نوجوانوں کی شہادت کی پچاسویں سال گرہ کے موقعہ پر ہم ان کی مقدس یاد میں عقیدت سے اپنا سر جھکاتے ہیں۔

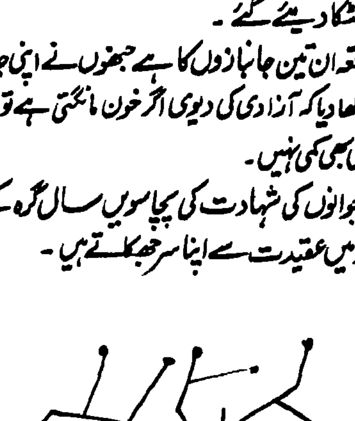

عظیم الشان صدیقی

کرشن چندر

ذہنی اور فنی سفر

تاریکی کی چادر کو اگرچہ آفتاب کی شعاعیں ہی قطع کرتی ہیں لیکن چادر نور کے فروغ پانے تک روزن سازی کا فرض وہ ستارے انجام دیتے ہیں جن کی لو مدہم ہونے کے باوجود روشنی کے احساس کو برقرار رکھتی ہے۔ کرشن چندر کے افسانے بھی خواب اور حقیقت کے امتزاج سے روشنی کے ایسے ہی دائرے بناتے ہیں۔ یہ خواب ایسی دنیا کے ہیں جس کا قدرتی حسن، شاداب وادیاں، پہاڑوں کی برف پوش چوٹیاں، دور تک پھیلا ہوا نیلگوں آسمان، صاف شفاف جھیلیں، بل کھاتی ہوئی ندیاں، گنگناتے ہوئے جھرنے، لہلہاتے ہوئے سرسبز کھیتی، دھان اور زعفران کے کھیت، صنوبر، دیودار اور سفیدے کے تناور درخت، پھل، پھول اور پتوں کے بوجھ سے جھکی ہوئی ڈالیاں، فضا میں نغمے بکھیرتے ہوئے خوش رنگ پرندے، بھیڑ بکریوں کے قدموں سے جاگتی ہوئی پگڈنڈی وغیرہ قدرتی مناظر کی دلآویزی اور صاف ستھرے مٹی، پھوس اور لکڑی کے گھروندے اور شکاروں کی سادگی، چوڑا سینہ اور گٹھا ہوا بدن رکھنے والے بانکے، سجیلے کسانوں اور مزدوروں کی معصومیت۔ چمکتی ہوئی آنکھوں، لہراتی ہوئی زلفوں اور ہرنی کی طرح قلانچیں بھرنے والی لڑکیوں کا جمال، پھولوں کی طرح کھلتے ہوئے بچوں کی شرارتیں وغیرہ ایسے امتیازات ہیں جس کے لیے یہ وادی ارضی جنت کا حکم رکھتی ہے۔ کرشن چندر کے افسانے بھی اسی رنگ و نور اور فکر و عمل کی دنیا سے ترکیب پاتے ہیں اور اپنے قارئین کے ذہنوں کی اس طرح تسخیر کر لیتے ہیں کہ ان کا دل خوشی اور مستی سے تھرکنے لگتا ہے۔ یہ افسانے قدرتی مناظر کا صرف حسن ہی نہیں ہوتے بلکہ ایسے متحرک کرداروں کو بھی سامنے لاتے ہیں جن کے چہروں پر تقدس و طہارت کا نور، حسن کی صباحت اور عشق کی تڑپ، فرشتوں کو بھی پگھلا سکتی ہے۔ آنگی کرشن چندر کا ایسا ہی کردار ہے جسے ان کی پہلی محبت کا ناقابل فراموش نقش اور تاثراتی افسانہ نگاری کے ابتدائی دور کا نمائندہ کردار بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہاں فضا کی رنگینی، جذبات کی شدت اور عمر کے تقاضے متوازن انداز میں کچھ اس طرح ایک دوسرے میں جذب نظر آتے ہیں کہ نوجوان نگاہوں سے بے اختیار کیف اور سرمستی چھلکی پڑتی ہے اور دل بچھا کے کلیلیں کرنے، قلانچیں بھرنے اور ہیروں کو چاٹنے میں عجیب طرح کی لذت محسوس کرتا ہے۔ آنگی بھی ایسی ہی ایک شوخ، شریر چرواہی لڑکی ہے جسے نغمے پسند ہیں، جو روٹھ بھی سکتی ہے اور منائی بھی جا سکتی ہے جس کا کنوارا دل خود سپردگی کے ایسے جذبے اور شہزادے کی تلاش سے معمور ہے جو اسے زندگی میں بھرپور محبت اور رفاقت کی ضمانت بھی عطا کر سکے۔ لیکن فن کار پُر فریب دل اپنے شہری پس منظر کے باعث حسن کے اس زندہ تحفہ کو قبول نہیں کر پاتا۔ لیکن اس گریز کے باوجود آنگی کی یادیں اس کے دل کا ایسا سرمایہ ضرور بن جاتی ہیں جو جلوت اور خلوت میں شعلہ و شبنم کا کام دے سکتی ہیں۔ ابتدائے جوانی میں قدرتی مناظر اور حسن سے یہ قربت، چاہنے اور چاہے جانے کا بے پناہ جذبہ، رشک و رقابت کرشن چندر کے فکر و فن، جذبے و خیال کو ایسی مستحکم اساس فراہم کر دیتا ہے کہ وہ کائنات کے جمال و جلال حسن و رعنائی کے ساتھ ان درد و داغ نیز عوامل کو بھی دیکھ سکیں جن کی حیثیت سماج میں کھاج اور چاند میں دھبوں ہی کی نہیں ہے بلکہ ایسے ناسور اور سنگ گراں کی ہے جو صدیوں سے انسانی زندگی کی تکمیل و تشکیل اور تدبیر منزل کی راہ میں حائل رہے ہیں۔ یہ عوامل قدرتی وسائل کا صرف جبر ہی نہیں ہیں بلکہ وہ سیاسی، سماجی اور معاشی نظام بھی ہے جو صدیوں سے دنیا کی تشکیل و تکمیل اور تدبیر منزل کی راہ میں اس طرح حائل رہے ہیں کہ انسانی آبادی کا بڑا حصہ آزادی، مساوات، جمالیاتی کیف، حسن و عشق کی سرمستی اور ایسی لذتوں سے محروم ہو گیا ہے جسے پیدائشی حق کے طور پر اسے خود بخود حاصل ہو جانا چاہیے تھا۔ کرشن چندر کے افسانے کائنات کی خوبصورتی اور دلکشی کے ساتھ ان عوامل اور ان کے غاصبانہ قبضے کی بھی نشاندہی کرتے ہیں جس کی بنیاد زندگی کے حقیقی اور ابدی سرچشموں، قوت کے تخلیقی سوتوں، علم و عمل کے مراکز کی تلاش، انسان دوستی اور ایسی انسانیت پر ہے جو کسی کا حق چھیننا نہیں چاہتا بلکہ حق دار کو اس کا جائز حق ضرور دلوانا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کرشن چندر کے افسانوں میں غریبوں کے ساتھ بہیمانہ سلوک اور بربریت کے

باوجود انتقام اور بغاوت کے ایسے شعلے بھڑکتے ہوئے کہیں نظر نہیں آتے جو اپنے دشمن کو جلا کر خاک کر دیتے ہیں البتہ ان میں احتجاج کی ایسی دھیمی آگ سلگتی ہوئی ضرور ملتی ہے جس کی حدت و حرارت دلوں کو پگھلا سکتی ہے۔ کرشن چندر کے نمائندہ کردار بھی اسی خمیر سے تخلیق کیے جاتے ہیں۔

کرشن چندر کے ابتدائی دور کے بیشتر افسانے چونکہ وادیٔ کشمیر اور غیر منقسم و غیر ترقی یافتہ پنجاب سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لیے ان میں صنعتی فروغ سے پیدا ہونے والی کشمکش، تصادم اور تضاد کی فضا بھی موجود نہیں ہے۔ ان کو یہاں تخریبی قوتیں قبائلی معاشرہ، قدرتی وسائل کا جبر، زرعی معیشت پر کلی انحصار، متبادل معاشی رشتوں کا فقدان، رجعت پسندی، جاگیردارانہ نظام کی آمریت اور سیاحی کی پُرفریب روایات نظر آتی ہیں۔ جس نے اس حسین وادی کو چکلوں سے بھی بدتر ین ایسے نیلام گھر اور شراب خانوں میں تبدیل کر دیا ہے جہاں ہر شے خریدی ہی نہیں جاتی بلکہ طاقت اور حاکمیت کے زور پر چھینی بھی جا سکتی ہے اور خوف و لالچ کی شہ پر بطور نذرانہ پیش بھی کی جا سکتی ہے جس کے نتیجہ میں کوئی نوراں چکلے کی زینت بن جاتی ہے۔ کوئی وکسی نیڑ پاگل ہو جاتا ہے کوئی نواز بھکاری ہو کر اندھا چھتوتی بن جاتا ہے کسی غریب موچی زادے کہالا کو برف کی قبر نصیب ہوتی ہے۔ کرشن چندر کے افسانوں کے مجموعے "کشمیر کی کہانیاں" کے کل افسانے "نظارے"، "محشر خیال"، "یوکلپٹس کی ڈالی"..... اسی بازار کی کہانی سناتے ہیں جن کی رادھائیں، جمنائیں، ریشمائیں، بیگمائیں ایسے ہی کردار ہیں جن کی دوشیزگی اور عصمت کو نہ صرف خریدا اور بیچا گیا ہے بلکہ لوٹا بھی گیا ہے اور ان کے عزیز و اقارب کو ظلم و ستم کا نشانہ بھی بنایا گیا ہے۔ یہ بھی اگرچہ دیگر انسانوں کی طرح گوشت و پوست کے انسان ہیں لیکن ان کی حیثیت ایسے بندۂ مسکین اور زر خرید غلاموں کی سی ہے جو ہمیشہ اپنے آقاؤں کے سامنے سر بسجود رہتے ہیں۔ جس کے باعث ان کی زندگی کی بنیادی ضرورتوں کی تکمیل اور چھوٹی چھوٹی آرزوؤں کی تعمیل تو درکنار ان کے تحفظ و کفالت کے مسائل ہی ابتدائی مراحل طے نہیں کر پاتے۔ البتہ مجبوری اور محرومی کی اس دردناک تصویر میں کہیں کہیں ایسے نقوش بھی ابھرتے ہیں جن میں اپنی عصمت و عفت کی حفاظت کی تڑپ موجود ہے۔ زینی اور جمنا ایسے ہی کردار ہیں لیکن یہ بھی تند و تیز ہواؤں کے سامنے زیادہ دیر تک نہیں ٹھہر پاتے۔ زینی کی قوت مدافعت تو شوہر کی بے وفائی اور بھوک کے سامنے ہی دم توڑ دیتی ہے اور وہ چند سکوں کے عوض خود کو سیاح کے حوالہ کر دیتی ہے البتہ جمنا کو گاؤں والوں کا جبر اور برہمن نمبردار کی منت و سماجت تحصیلدار کی آغوش میں دھکیل دیتی ہے لیکن اس قربانی اور ایثار کا صلہ جمنا کو کیا ملتا ہے۔ گاؤں والوں کے طعنے، سماجی بائیکاٹ اور خودکشی کی موت! کرشن چندر کے ابتدائی دور کے افسانوں میں اس طرح کے کردار اگرچہ معدودے چند ہی ہیں لیکن ان میں یہ جرأت زرعی معیشت سے رشتہ منقطع ہو جانے کے بعد ہی پیدا ہوتی ہے۔

تاریکی، پستی اور محرومی کی ایسی ہی فضا میں کرشن چندر کا افسانہ "جہلم سے پہلے اور جہلم کے بعد" نمودار ہوتا ہے جس میں متبادل معاشی رشتوں کے فقدان کے باعث کشمیری عوام کو اگرچہ زرعی معیشت سے رشتہ توڑنے کی دعوت تو نہیں دی گئی ہے البتہ آزاد قوموں کے غیر ملکی سیاحوں کی موجودگی آمدنی کے وسائل، جنگل و زمین، پیداواری اشیاء، اناج اور پھلوں پر عوامی قبضے کے امکانات پر غور کرنے کے لیے ضرور مجبور کرتی ہے۔ "بالکونی" میں محرومی کا یہ احساس شدید بن کر مختلف سیاسی نظاموں کے تصادم کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ جسے تبدیلی کی شدید خواہش اور کرشن چندر کی رومانی انقلابیت کا دیباچہ اور فکر و فن کے ارتقا کی اہم کڑی بھی کہہ سکتے۔ یہاں عبداللہ کی حیثیت ایسے کردار کی ہے جو ٹوٹ تو سکتا ہے لیکن کشمکش حیات کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتا۔ اسے ائرش بڈھے اور برائن کی گفتگو میں بھی زندگی اور خوابوں کی صداقت نظر آتی ہے جو سرمایہ داری کو دنیا کی لعنت اور عصمت کے فلسفہ کو پیٹ بھروں کا مشغلہ تصور کرتا ہے۔ اسے اطالوی نژاد میریا بھی پسند ہے جو پیانو سکھا کر اپنی روزی کماتی ہے۔ جس کی شخصیت میں انسانوں جیسا وقار اور متانت، محبت میں فطری ٹھہراؤ اور خیالات میں ترقی پسندانہ سنجیدگی جھلکتی ہے۔ میریا کو سرمایہ داری، جنگ اور فسطائیت سے نفرت ہی نہیں ہے بلکہ وہ بھوک، بیماری اور جہالت کے خاتمہ کے لیے محنت اور انصاف پر مبنی سیاسی نظام کو ضروری سمجھتی ہے۔ اور دوران جنگ گرفتاری کے باوجود اسے انسانیت کے روشن مستقبل اور بہار کی آمد کا بھی پختہ یقین ہے۔ کرشن چندر اور ان کے کرداروں کے یہ ایسے خیالات اور آرزوئیں ہیں جن کا تجزیہ ہندوستان کی تحریک آزادی، کشمیر میں سیاسی جدوجہد اور ترقی پسند تحریک کے آغاز کے پس منظر میں بہ آسانی کیا جا سکتا ہے۔ یہی وہ محرکات بھی ہیں جو ان کی فکر و نظر کو وسعت اور افسانوں کو نئے افق عطا کرتے ہیں اور اب انھیں کشمیر ہی نہیں تمام ہندوستان بھی سامراجیت، مہاجنی ذہنیت، پرانے خداؤں، جہالت اور افلاس کے پنجۂ استبداد میں تڑپتا ہوا نظر آنے لگتا ہے۔ ان داتا، دو فرلانگ لمبی سڑک، پرانے خدا، بھیروں کا مندر لمیٹڈ، ٹوٹے ہوئے تارے وغیرہ افسانے اسی احساس کی بیداری اور حقیقت پسندی کی واضح مثالیں ہیں۔ ان داتا میں قحط بنگال سے متعلق انسانی ضمیر کی بے حمیتی اور بھوک سے لاکھوں انسانوں کی موت کے ایسے دردناک مناظر پیش کیے ہیں کہ دل بے اختیار غم سے بوجھل اور آنکھیں شدت کرب سے نمناک ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح دو فرلانگ لمبی سڑک پر بھی ہندوستان کی معاشی بدحالی اور جبر کے واقعات کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ دونوں افسانے کرشن چندر کی غیر معمولی قوت مشاہدہ، عمیق مطالعہ، لازوال انسان دوستی، تکنیک اور ہیئت کا اچھوتا نمونہ بھی فراہم کرتے ہیں۔

پہلی جنگِ عظیم نے جہاں ہندوستان کی صنعتی ترقی اور تحریکِ آزادی کو فروغ دیا تھا، وہاں دوسری جنگِ عظیم کی برکات میں سماجی اور معاشی

انتشار، محنت اور سرمایہ کے درمیان خلیج کی وسعت بھی شامل ہے جس نے دولت مند طبقہ کے لیے عیش کے ایسے اسباب فراہم کر دیے کہ دیگر مقامات کے علاوہ معبد خانے، دھرم شالائیں ہی نہیں بلکہ پرانے کھنڈرات اور مقبرے بھی نشاط گاہوں میں تبدیل ہو گئے اور وہ نچلا متوسط طبقہ تقصباتی عوام جنھیں روزی اور روٹی کی تلاش میں شہر کا رخ کرنا پڑتا تھا۔ ایسے پیشے اختیار کرنے کے لیے مجبور ہو گئے جن میں ان کی بیویوں کی دلالی بھی شامل ہے اور عورتیں ایک ہی مزدوری میں پتھر توڑنے اور عصمت لٹانے کی دوہری مشقت سے نجات پانے کی خاطر ایسی فن کار بن جاتی ہیں جن کا میکہ اور سسرال ایک میٹھے چشمے سے دوسرے میٹھے چشمے تک، ایک ڈاک بنگلے سے دوسرے ڈاک بنگلے تک، ایک امیر کی جیب سے دوسرے امیر کی جیب تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ کرشن چندر کے افسانے "صرف ایک آنہ"، "بیما"، "پورب دیس دلی" اور "ٹوٹے ہوئے تارے" اسی درد کی پکار ہیں۔ ان ہی میں پہلی مرتبہ مرد کا ضمیر اس طرح بیدار ہوتا ہے کہ وہ ایک مجبور عورت کے ساتھ رات گزارنے کو اپنی ماں کے ساتھ زنا کے مساوی خیال کرتا ہے۔

بیسویں صدی ہندوستان میں اگرچہ سیاسی تحریکوں، قومی اتحاد، مغربی سامراج سے نجات اور آزادی کی صدی تصور کی جاتی ہے لیکن حقیقت میں یہ تصادم و تضاد، تفریق و عداوت، تقسیم اور تذلیل کی ایسی صدی نظر آتی ہے۔ جہاں نام نہاد قوم و نسل، ذات و رنگ، طبقہ و علاقہ، زبان و تہذیب، مذہب و نظریات اور مادی مفادات کے نام پر عفریتوں کے تمام لشکر برسرِ پیکار نظر آتے ہیں۔ جس کے نتیجہ میں آزادی سے قبل ہی ہزاروں افراد قتل اور کروڑوں روپیوں کا اسباب زیست غیر شریفانہ آپسی اختلافات کی نذر ہو جاتا ہے۔ غریب اور متوسط طبقہ کے لیے چکی کے پاٹ اور زیادہ قریب آ جاتے ہیں اور استحصال پسند طاقتوں کے سونے چاندی کے ڈھیروں میں نہ صرف مزید اضافہ ہو جاتا ہے بلکہ حالات پر ان کی گرفت بھی پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط ہو جاتی ہے۔ کرشن چندر نے ان موضوعات پر بھی متعدد افسانے لکھے ہیں، جن میں متوسط اور غریب طبقہ کا کردار ایسے بے بس اور جذباتی انسان کی حیثیت سے ابھرتا ہے جو ابھی تک اپنی صلاحیتوں سے واقف نہیں ہوا ہے۔ ان ہی میں کہیں کہیں ہمدردی و ایثار، خلوص و محبت کی چاندنی بھی چھلکی ہوئی نظر آتی ہے۔

کرشن چندر کے خیال کے مطابق ہندوستان کی سیاسی تحریکِ آزادی کہنے کو تو ایسی عوامی تحریک تھی، جس میں مختلف طبقے، فرقے اور عمر کے لوگ شامل تھے لیکن سیاسی شعور اور تعلیم کے عام فقدان نے اس کی باگ ڈور طبقۂ اعلا کے ایسے افراد کے ہاتھوں میں سونپ دی تھی جو خود کو جنگل کا ایسا شیر تصور کرتے تھے جہاں دوسرے کسی شیر کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہوتی ہے۔ اور جن کا ظاہر و باطن ایک دوسرے کی ضد ہی نہیں بلکہ ملمعوں سے آراستہ تھا۔ ان کے لیے جیل کے اندر اور باہر کی زندگیاں، یکساں طور پر سامانِ عیش فراہم کرتی تھیں دوسری طرف وہ عوام تھے جو جیل کے اندر چکیاں پیستے تھے اور باہر آ کر خون تھوکتے تھے۔ انھیں اپنے نام نہاد رہنماؤں سے اگر کوئی مدد ملتی تھی تو صرف اس قدر۔ کوئی خواجہ کریم الدین جیسا ہمدرد قیدی امجد کی بیوی رضیہ کو اپنی داشتہ بنا کر اس کے حسن کو بحال رکھتا ہے یا پھر کوئی اودھم سنگھ جیسا دردمند کسی سیاسی مجرم جگو کی لڑکی کو انسانی ہمدردی کے نام پر اغوا کرا کے اپنی ہوس کی آگ اور اس کے پیٹ کی دوزخ کو ٹھنڈا کرتا ہے۔ کرشن چندر کا ذہن اور فنکارانہ بصیرت اس غیر اخلاقی صورتِ حال سے جو تاثر اور مواد اخذ کرتا ہے اس کا اظہار "بڑے آدمی"، "اس کی خوشی اور دل کا چراغ" وغیرہ افسانوں میں اس طرح ہوا ہے کہ انسانی ضمیر کا المیہ اور بے بسی کا ننگا ناچ اپنے نقطۂ عروج پر پہنچتا ہوا نظر آتا ہے۔ ایسے بحران میں جب خدمت و ایثار کی پیکر "درد گردہ" اور "یرقان"، جیسے افسانوں کی نرسیں منظرِ عام پر آتی ہیں تو دل کو ڈھارس ہوتی ہے کہ انسانیت ابھی مری نہیں ہے۔

نفرت و عداوت، تصادم و تضاد، انتشار اور بے یقینی کی ایسی ہی فضا میں ہندوستان کو آزادی نصیب ہوتی ہے اور ایک ملک و قوم اور تہذیب کو جب دو حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے تو صدیوں کی مایوسی و گھٹن، بغض و عناد کا لاوا اپنے اظہار کی صحیح سمت نہ پا کر فساد کی شکل میں پھوٹ پڑتا ہے اور وہ آزادی جسے محمد علی جناح نے گولی، لاٹھی اور جیل کے بغیر اور مہاتما گاندھی نے عدم تشدد کے ذریعہ حاصل کرنا چاہا تھا لاکھوں انسانوں کے خون اور کھربوں روپے کے سامانِ حیات کی خاک میں اس طرح ڈوب جاتی ہے کہ حساس دل اپنی جان کی پروا کیے بغیر آگ بجھانے کے لیے دوڑ پڑتے ہیں تاکہ انسانی قدروں کو تقویت پہنچا کر انسانیت کے قلعہ کو مستحکم کیا جا سکے۔ اردو کے دیگر شاعر اور ادیبوں کی طرح کرشن چندر بھی اس جہاد میں کسی سے پیچھے نہیں رہتے۔ جانور، دوسری موت، اندھے، لال باغ، ایک طوائف کا خط، جیکسن، امرتسر، اور پشاور ایکسپریس، وغیرہ افسانے اسی المیہ کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں، جن کی حیثیت آگ میں سمندر کی نہیں ہے بلکہ ایسے مینار کی سی ہے جو طوفان گزر جانے کے بعد بھی برقرار رہتا ہے۔ کرشن چندر کے ان افسانوں میں جہاں ہیئت، تکنیک اور کردار نگاری کے نئے تجربے کیے گئے ہیں وہاں اس خونی المیئے اور تقسیم کے متعدد اسباب، سامراجی قوتوں کی سازش، منڈیوں کی تقسیم" دو طوفان" قومیت کا سیلاب اور برہمنیت کی ٹکر، جیکسن جیسے افراد کی ہوس زر پرستی، رجعت پسندی سرمایہ داری اور انسانی خون میں چھپی ہوئی شقاوت وغیرہ ملتے ہیں اسی کے ساتھ ازلی و ابدی انسان، اس کی پیچیدہ نفسیات، خوف و دہشت، تنہائی و مایوسی، درندگی و بربریت، نفرت و غرور، خود غرضی و لالچ، بزدلی و بے غیرتی، مکر و فریب، ہمدردی و ایثار، خلوص و محبت، حسرت و آرزو وغیرہ کے ایسے متنوع اور متضاد، واضح اور دھندلے لاتعداد مرقعے نظر آتے ہیں جنھیں آسانی سے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس ہجوم

میں کوئی تصویر اگر نہیں ابھرتی تو ایسے انسان کی، جو عزت اور بہادری کی موت کو ذلت کی زندگی اور موت پر ترجیح دے سکتا۔ ان میں سعادت حسن منٹو کے "ٹوبہ ٹیک سنگھ" جیسا کوئی کردار بھی نظر نہیں آتا جو پردیس میں قدم رکھنے سے قبل ہی دم توڑ دیتا ہے۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ کی بڑائی اس کے پاگل پن یا موت میں مضمر نہیں ہے۔ اس کی عظمت کا راز اس کی اپنی زمین سے ایسی بے پناہ محبت میں پوشیدہ ہے جو مستقبل کا یقین اور سماج کو استحکام عطا کرتی ہے۔ انسانی فطرت اور فن سے واقفیت کا یہ راز فن کار منٹو نے تو پا لیا تھا البتہ اس جذبے کو اس سرزمین پنجاب میں فروغ پانے کا موقع نہیں ملا تھا جس کے دل، زبان، نغمے، گیت اور معاشرت تو ایک تھی لیکن نیم قبائلی اور نیم جاگیردارانہ نظام، دولت اور وسائل آمدنی کی غیر مساوی تقسیم، ماضی کی تاریخ اور زمین سے کمزور رشتہ نے بارود کی ایسی دیواریں کھڑی کر دی تھیں جو آزادی اور نو دولتیے پن کے ایک ہی جھونکے سے پھٹ پڑتی ہیں۔ البتہ کرشن چندر ٹوبہ ٹیک سنگھ کی تلافی 'کالو بھنگی' 'تائی ایسری' جیسے لازوال افسانوں کے ذریعہ کر دیتے ہیں، جن کی حیثیت ایسے تناور درخت کی سی ہے جو تند اور تیز آندھیوں میں بھی ایستادہ رہتے ہیں اور انسانیت کے بھرم اور وقار کو برقرار ہی نہیں رکھتے بلکہ اس کے رہنما بھی بن جاتے ہیں۔ کالو اگرچہ نیچ ذات کا بھنگی ہے جس کو آٹھ روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی ہے۔ ایک انسان کی حیثیت سے جس کی اپنی بھی کچھ آرزوئیں ہیں۔ لیکن بے لوث خدمت اور ایثار کا بے پناہ جذبہ اس کی تمام خواہشات پر غالب ہی نہیں آ جاتا بلکہ اس کوشش میں وہ فرائض کی حدود سے بھی تجاوز کر جاتا ہے۔ کالو بھنگی انسانیت کا ہی نہیں بلکہ فن کا بھی ایسا نمونہ ہے جس کا فطری پن کہیں مجروح نہیں ہوتا۔ وہ اپنی تنہائیوں میں ایسی رفاقتوں کو ڈھونڈ نکالتا ہے جو اس کے جذبے اور انانیت کو بھی تسکین پہنچا سکتی ہیں۔ جہاں گائے، بکری اور کتا صرف جانور ہی نہیں رہتے بلکہ اس کے رفیق، رازداں اور ہم مشرب بھی بن جاتے ہیں۔ اسی طرح تائی ایسری بھی خدمت و ایثار، غم خواری اور محبت کا ایسا پیکر ہے جو دنیا ہی جانتا ہے لینا نہیں جانتا۔

مذکورہ دونوں افسانے کرشن چندر کے ذہنی و فنی سفر میں اہم موڑ کی حیثیت رکھتے ہیں یہاں سے ہی ایک حقیقت پسند انسان کی زندگی اور فن سے زیادہ قربت اور شدید لگاؤ، فلسفیانہ بصیرت، زندگی اور سماج کے حقیقی سرچشموں تک رسائی، موضوع کی ہمہ گیریت کا احساس، اور اسے مختلف زاویوں سے دیکھنے، برتنے اور پرکھنے کے باعث فنی تہہ داری، بدلتے ہوئے رشتوں کا عرفان، انسانی نفسیات کی مختلف اور متضاد داخلی اور خارجی پرتوں کو کھولنے کی جرأت کا وہ سلسلہ شروع ہوتا ہے جہاں ان کی رومانوی حقیقت پسندی کے نقاب کو تار تار کر دیتا ہے اور زندگی کی بنیادی اور کھردری حقیقتوں کو زیادہ فنی مہارت اور چابکدستی سے پیش کرنے کے باعث ان کے افسانوں میں ایک نئی توانائی اور تازگی کا احساس ہونے لگتا ہے۔

کرشن چندر نے آزادی کے بعد تبادلہ آبادی، ہجرت اور رشتوں کی شکست و ریخت سے پیدا ہونے والے مسائل سے متعلق چند افسانے لکھے ہیں۔ انھیں بھی اکثر اپنا وطن لاہور کی گلیاں، اس کے بازار اور پرانی صحبتیں یاد آتی ہیں لیکن اس طرح کے افسانوں کی حیثیت ان کے تخلیقی سفر اور افسانوں کے حجم میں خالِ رخِ محبوب سے زیادہ نہیں ہے جس کا سبب غالباً یہ رہا ہوگا کہ ہندوستان جیسے بڑے ملک اور پاکستان کے مقابلہ میں صنعتی اعتبار سے زیادہ ترقی یافتہ معاشرے میں مہاجرین کے مسائل ایسی پیچیدگی اور قوت حاصل نہیں کر سکے کہ وہ ادب کا موضوع بن سکتے۔ کرشن چندر کی نظر میں اس وقت کے اہم سماجی مسائل محرومی، مایوسی، خوف اور تنہائی کا وہ احساس تھا جس نے ایسی سیاسی تبدیلی کی کوکھ سے جنم لیا تھا۔ جہاں جمہوریت کے نام پر صرف حکمرانوں کے نام تو بدل گئے تھے لیکن بھوک، غربت، بیماری، بے روزگاری اور استحصال پسندی کے مسائل حسب سابق صرف برقرار ہی نہیں رہے تھے بلکہ پہلے سے زیادہ قوت کے ساتھ ہندوستانی سماج کو اپنے قبضہ میں لے رہے تھے جس نے کرشن چندر کو مرنے والے ساتھی کی مسکراہٹ' 'اردو کا قاعدہ' اور 'بت جاگتے ہیں' وغیرہ جیسے افسانے لکھنے کے لیے مجبور کیا۔ اول الذکر افسانے میں بہار دواج کی گرفتاری اور موت' آزادی کے بعد گرفتار ہونے اور مرنے والے تحریک آزادی کے ہر مجاہد کی کہانی بن جاتی ہے۔ "اردو کا قاعدہ" میں جو اپنی ہئیت اور تکنیک کے اعتبار سے اچھوتا افسانہ ہے وزیر کی تعریف اس طرح کی گئی ہے۔

"آج کل کئی ملکوں میں ایک ہی آدمی بیک وقت بادشاہ ہے اور وزیر بھی ہے وہ خود ہی مشورہ دیتا ہے اور خود ہی اس پر عمل کرتا ہے ایسے آدمی کو ظاہر ہے نہ بادشاہ کہا جا سکتا ہے نہ وزیر۔ اس لیے اسے ڈکٹیٹر کہتے ہیں۔ ڈکٹیٹر اپنے ملک میں اکیلا حاکم ہوتا ہے۔"

وہ کیا حالات رہے ہوں گے جن کے پس منظر میں کرشن چندر یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہوئے ہوں گے۔ ورنہ جمہوریت تو کیا شہنشاہیت میں بھی سیاسی صورت حال کبھی یکساں نہیں رہتی ہے البتہ "بت جاگتے ہیں" میں صورتِ حال زیادہ سنگین اور حقیقی نظر آتی ہے جو تحریک آزادی میں شریک و شہید ہونے والے گم نام مجاہدین کے وارثوں سے تعلق رکھتی ہے۔ یہاں کرشن چندر ایک مرتبہ پھر تکنیک کے اچھوتے پن کو برقرار رکھتے ہوئے، قومی رہنماؤں کے مجسموں اور غریب عوام کی معاشی و سماجی حالت کے پس منظر میں نئے سوالیہ نشان قائم کرتے ہیں۔

یہ کرشن چندر کا خوبصورت افسانہ ہے جو اپنے سوالوں کے جواب بھی اپنے اندر رکھتا ہے اور مستقبل کی طرف رہنمائی بھی کرتا ہے۔ لیکن کرشن چندر کے قلم اور فن کا اصل جوہر تو کسان اور مزدوروں کی زندگی کی عکاسی اور استحصال پسند قوتوں کی نقاب کشائی میں اجاگر ہوتا ہے۔ یہاں ان کا

فن جزئیات کے انتخاب اور استعمال سے ایسی مینا کاری کرتا ہے کہ ہر نقش روشن اور کہانی سناتا ہوا نظر آتا ہے "مہالکشمی کا پل" ایسا ہی افسانہ ہے جہاں ساڑیوں کے رنگ و روپ، داغ، دھبے اور بوسیدگی ان کے پہننے والوں کی عادات، مزاج، عمر اور معاشی حالات کا ہی نہیں بلکہ ان کی معاشرتی زندگی اور مقام رہائش کی بھی غمازی کرتے ہیں۔ مہالکشمی پل کے باسی ایسی جگہ رہتے ہیں جہاں دھوپ اور ہوا کا گزر ممکن نہیں ان کے پاس اتنا بھی نہیں ہے کہ پیٹ بھر کر کھا سکیں، بیماری میں علاج کرا سکیں، دھوتی پھٹ جانے پر دوسری خرید سکیں۔ لیکن پیچھے ہٹنے کے تمام راستے مسدود ہو جانے کے باعث غربت اور افلاس کے باوجود ان میں ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کرنے اور جدوجہد کی ایسی قوت پیدا ہو گئی ہے جو کبھی ہار نہیں مانتی۔ ان میں سے اگر ایک تھک جاتا ہے تو دوسرا بڑھ کر صلیب اپنے کاندھوں پر اٹھا لیتا ہے حالات کا یہی جبر کرشن چندر کے افسانے "یملا" کے جاٹ کسان میں یہ قوت پیدا کرتا ہے کہ سارے نام نہاد خداؤں کے دروازے کھٹکھٹانے کے بعد ہی اسے اپنی لاٹھی کی طاقت کا یقین ہوتا ہے جو ساہوکار کے مقابلہ میں اس کی زمین کی حفاظت کر سکتی ہے کم و بیش یہی صورتِ حال "گونگے دیوتا" میں نظر آتی ہے۔ جہاں زندگی کا تجربہ ہی اعتقادات، توہمات، کم ہمتی اور فریب کے چہروں سے نقاب اتار کر پھینک دیتا ہے۔ یہ ایسا تہہ دار افسانہ ہے جو کسان، ٹڈی دل، سیلاب، گھر، کھیت کی تباہی۔ بیماری سے بیوی بچوں کی موت، دیوتا کی پرفریب تلقین اور قوتِ عمل کو سلب کر لینے کے مابین ہی رشتہ استوار نہیں کرتا بلکہ اس ذہنی بیداری اور جذبہ کا بھی امین ہے جس کے حرکت میں آجانے کے بعد کمزور اور غریب کسان کا ہاتھ اپنے دیوتاؤں کی گردن تک بھی پہنچ سکتا ہے۔ کرشن چندر کا افسانہ "اجنتا کے آگے" بھوکے اور مظلوم کسان اور عوام کی اگلی منزل ہے۔ یہ افسانہ بنتے وقت فن کار زندگی اور تاریخ کا سارا زہر خود پی لیتا ہے تب کہیں جاکر اجنتا جیسے نوابین کے حرم سے بھاگنے والی بے کس نواب بیگم اور جاگیردار جیسے اجنتا کے بتوں کو توڑ کر باہر آنے والے مظلوم کسان چیلاپتی کی مدد سے سیاسی تحریک کی وہ راہ سامنے آتی ہے جس کے بعد پھر کسی نئی اجنتا کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اس افسانہ میں کرشن چندر نے تاریخ کے خوابیدہ گوشوں کو جس فنکارانہ مہارت کے ساتھ بیدار کیا ہے اس کی دوسری مثال اردو افسانہ میں مشکل ہی سے ملتی ہے۔ اسی افسانے میں غیر انسانی سیاسی و سماجی نظام کو مٹا کر ایسے منصفانہ سماج اور معاشی نظام کی تشکیل کی خواہش بھی ابھرتی ہے جو محنت اور انصاف پر مبنی ہو۔

محنت اور سرمایہ کی کشمکش سے اس مزدور طبقہ کا کردار ابھرتا ہے جو اپنے حقوق کے لیے برسرِ پیکار ہے لیکن سیاسی شعور کے فقدان اور زر کی نفسیات سے عدم واقفیت کے باعث ابتدائی دور میں جنھیں اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا چنانچہ تین غنڈے افسانے کے ہیرو عبدالصمد، شانتا اور جگجیت سنگھ جب ہڑتالی مزدوروں کی قیادت کرتے ہوئے گولی کا نشانہ بنتے ہیں تو لوگ انھیں غنڈے کے نام سے پکارتے ہیں۔ لیکن مزدوروں کے حقوق و مقاصد سے آگہی اور صنعتی ترقی میں اس کی اہمیت مسلم ہو جانے کے بعد "پھول سرخ ہیں" کا مزدور زادہ اندھا نوجوان اپنے گیتوں سے مزدوروں میں ایک نئی روح پھونک کر جب شدید طور پر مجروح ہو جاتا ہے تو فخر و مسرت سے اس کا سینہ ہی نہیں پھول جاتا بلکہ دوسرے لوگ بھی عقیدت کے پھول اس پر نچھاور کرتے ہیں۔ اور اس کی شہادت ایسا پیغام بن جاتی ہے جو ذاتی اور وقتی نفع و نقصان سے بالاتر ہو کر چلائی جانے والی تحریکوں کو نئی زندگی عطا کر دیتی ہے۔

کرشن چندر کے افسانے چابک میں ایسے سرمایہ دار اور اجارہ دار قوتوں کا کردار ابھرتا ہے جو کسی بھی صحت مند معاشرے میں ناسور ہی نہیں بلکہ انسانی سماج کے لیے بھی کوڑھ کی حیثیت رکھتا ہے اور صنعتی ترقی کے ہر شعبہ پر قدرت حاصل ہو جانے کے بعد وہ نہ صرف شخصی آزادی کا ٹھیکدار ہی نہیں بلکہ اپنے خلاف اٹھنے والی ہر آواز کو خرید لینے پر بھی قادر ہے۔ وہ ایسا بے رحم بھی ہے کہ ہر خوبصورت شے کو خرید کر پامال کر دیتا ہے لیکن اتنا بزدل بھی ہے کہ صنفِ نازک کے ہاتھ میں کوڑا دیکھ کر اس کی روح بھی فنا ہونے لگتی ہے۔

کرشن چندر کے افسانوں میں جہاں سرمایہ داری، مہاجنی تہذیب کے تخریب کارانہ عمل کے نقوش ابھرتے ہیں وہاں صنعتی ترقی کے تعمیری پہلو اور نئے بنتے بگڑتے رشتوں سے بھی نمودار ہوئے ہیں جو اپنے ساتھ سائنسی شعور، نئی ٹیکنالوجی، علم اور سیاسی بصیرت کو عام کرتی ہے اور محنت کش طبقہ کو ایسی قوت عطا کر دیتی ہے کہ عیش پرست طبقہ ان کو اپنے لیے خطرہ سمجھنے لگتا ہے اور متبادل معاشی رشتوں کی افراط مرد کے لیے ہی نہیں بلکہ عورتوں کو بھی ذہنی تبدیلی کے ایسے مواقع فراہم کر دیتی ہے کہ وہ صدیوں پرانے رسم و رواج اور مرد کی بالادستی کے طلسم کو توڑ کر آزاد فضا میں سانس لے سکیں۔ روشنی کے کیڑے اور شہزادہ کرشن چندر کے ایسے ہی افسانے ہیں جہاں تمام راہیں بند کر دینے کے بعد بھی روشنی کے کیڑے ڈرائنگ روم میں پہنچ کر اہل ثروت کی نیند حرام کر سکتے ہیں وہاں سدھا ایسی عورت ہے جو مرد سے اپنی توہین کا بدلا ہی نہیں لیتی ہے بلکہ اپنی طرف بڑھتے ہوئے ہاتھ کو بھی جھٹک سکتی ہے اسی طرح الجھی لڑکی کالے بال کی ہیروئن امداد قبول کرنے کے بعد بھی اپنی عصمت کو محفوظ رکھتی ہے۔

معاشی رشتوں اور ماحول کے گہرے اثرات کے باوجود کرشن چندر انسانی روح کی عظمت کے بھی قائل نظر آتے ہیں اور وہ گرے پڑے لوگوں، گندگی اور کثافتوں سے آلودہ شخصیتوں میں بھی انسانی جوہر اور روحانی عظمت کو تلاش کر لیتے ہیں۔ ایک گرجا ایک سیتا، ایک گرجا ایک خندق، بھگوی کے کمو کے وغیرہ ایسے ہی افسانے ہیں جو ان کی نفسیاتی ژرف نگاہی، تحلیل

(بقیہ صفحہ ۴۱ پر)

صادق

کرشن چندر کے افسانے کا معنوی مزاج

پریم چند کے بعد اردو افسانے کے افق پر نمایاں ہونے والی نسل میں سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی اور کرشن چندر کے نام خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔ کرشن چندر اپنی ذات میں آسمان نہ تھے۔ وہ نہ صرف ایک افسانہ نگار بلکہ اردو افسانہ نگاری کا ایک عہد تھے۔ انھوں نے لگاتار لکھا ہے اور اتنا زیادہ لکھا ہے کہ زود نویسی میں کوئی ان کا مقابل نظر نہیں آتا۔ انھوں نے اچھے، برے، بہت برے، معیاری، سطحی، ہر طرح کے افسانے لکھے ہیں اور اپنے تمام پیش روؤں اور ہم عصروں سے مختلف لکھے ہیں۔ انھوں نے افسانے کے میدان میں بے شمار تجربات بھی کیے ہیں۔ اپنے افسانوں کی وجہ سے انھیں بے پناہ شہرت اور مقبولیت ملی یہاں تک کہ "ایشیا کا عظیم افسانہ نگار" بھی کہا گیا۔ کرشن چندر کے افسانوں کا موضوع انسانی زندگی رہا ہے۔ انسانی زندگی کو مختلف زاویوں سے وسیع ترین تناظر میں دیکھنے کی جو کوشش ان کے یہاں ملتی ہے وہ انھیں کا حصہ ہے۔

کرشن چندر نے جس وقت لکھنا شروع کیا اس وقت فضا میں رومانوی رجحان کی مہک باقی تھی۔ پریم چند اپنا تاریخی رول انجام دے کر اردو افسانے کو عروج سے آشنا کرا چکے تھے۔ اردو افسانہ کی دنیا اپنی جاگتی آنکھوں سے "انگارے" کی اشاعت جیسا انقلاب دیکھ چکی تھی۔ کرشن چندر کے افسانوں کا اولین مجموعہ "طلسم خیال" کے نام سے منظر عام پر آیا۔ "طلسم خیال" کے افسانے پریم چند کی حقیقت پسندی کے بجائے نیاز فتح پوری، سجاد حیدر یلدرم اور مجنوں گورکھپوری ایسے پیش روؤں کی رومانویت سے اثر پذیر ہیں۔ طلسم خیال کے افسانوں کی فضا پر جذباتیت اور رومانویت کے نقوش خاصے گہرے بلکہ ان مٹ ہیں۔ آنے والی تبدیلیوں کی ہلکی سی آہٹ بھی ان افسانوں میں سنائی نہیں دیتی۔ سحر انگیز مناظر، خواب زا ماحول، پہاڑ، چاندنی رات، سرسراتی ہوائیں، لہلہاتے مرغزار، لہراتی ہوئی ندیاں، مہکتے پھول، چہکتے آوارہ پنچھی، شمشاد و صنوبر کے نرم و نازک سائے، جھرنوں کا سنگیت اور اس پس منظر کے ساتھ دو حسین و نوجوان دلوں کی دھڑکنیں، چاند کو چھونے کا قصہ، پھول پی جانے کی بات، یہی سب کچھ کرشن چندر کے افسانوں کی کائنات ہے۔ "طلسم خیال" کے مقدمہ نگار پروفیسر ضیاء احمد نے کرشن چندر کو اس رومان پرستی کی وجہ سے کافی سراہا ہے۔ ان افسانوں میں کرشن چندر نے رومانوی درد و کسک اور افسردگی کو خوش اسلوبی کے ساتھ ابھارا ہے۔

کرشن چندر کے ابتدائی دور کے افسانوں میں رومانویت کا پرتو کچھ زیادہ ہی نظر آتا ہے۔ اگر کوئی ان کے ابتدائی دور کے افسانوں کو دیکھے تو وہ ایک رومانوی ادیب ہی نظر آئیں گے لیکن ان کی رومانویت تصنع کا نتیجہ نہیں —— کرشن چندر کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ "نظارے" بلاشبہ "طلسم خیال" سے آگے کی منزل ہے اس میں خونیں ناچ، دو فرلانگ لمبی سڑک اور "جنت اور جہنم" جیسے افسانے شامل ہیں۔ "نظارے" کے افسانوں میں کرشن چندر کا فن ایک خوشگوار تبدیلی سے روشناس ہوا۔ ان کی طبیعت رومان نگاری کے ساتھ ساتھ سماجی حقیقت نگاری کی طرف مائل ہوئی۔ "نظارے" کے تقریباً تمام افسانے رومان اور حقیقت کی کشمکش سے دوچار نظر آتے ہیں۔ حقیقت نگاری کے معنی کرشن چندر کے نزدیک یہی ہیں کہ انھوں نے زندگی اور اس کے حقائق کو جیسا کچھ دیکھا اور جو کچھ سمجھا ہے اسے سچائی کے ساتھ اپنے افسانوں میں بیان کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں وہ اپنی قوت مشاہدہ سے بھی کام لیتے ہیں لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کرشن چندر کی حقیقت نگاری میں جانب داری کا پہلو صاف طور پر نظر آ جاتا ہے۔

کرشن چندر کے بیشتر افسانوں میں کسی خاص پلاٹ یا کردار کے بجائے اس کی فضا زیادہ اہم ہوتی ہے اور اسی فضا کی عکاسی کے لیے کرشن چندر پلاٹ اور کردار کو استعمال کرتے ہیں۔ "زندگی کے موڑ پر" "دو فرلانگ لمبی سڑک" "ٹوٹے ہوئے تارے" "جہلم میں ناؤ پر" "بالکنی" اور "جنت اور جہنم" ان سبھی افسانوں کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ ان کا لکھنے والا کسی بلند و بالا مقام پر بیٹھا ہوا ان سب کا نظارہ کر رہا ہے اور جو کچھ نظر آ رہا ہے اسے بے کم و کاست بیان کرتا چلا جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کرشن چندر کے افسانوں

میں زندگی اپنے وسیع پس منظر میں ملتی ہے اور اس کے افسانے بڑے کینوس پر بنائی گئی ایسی تصویروں کی مانند نظر آتے ہیں جنھیں اگر ان کے پس منظر سے علاحدہ کر دیا جائے تو نہ صرف یہ کہ وہ تاثر سے خالی ہو جائیں گے بلکہ بڑی حد تک ان کی معنویت بھی ختم ہو جائے گی لیکن ایسی بلندی سے نظارہ کرنے کا نقصان یہ بھی ہوا ہے کہ وہ ماحول کو تو کسی حد تک بڑی سچائی کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں لیکن بیشتر مقامات پر ماحول کو گرفت میں لینے کی کوشش میں کردار ان کی دسترس سے نکل گئے ہیں۔ کبھی کبھی یہ بھی ہوا ہے کہ زندگی ہی ان کی گرفت میں نہیں آسکی ہے اور اس کمی کو فکر و تخیل کی قوت سے پُر کرنے کی سعی نے ان کے افسانوں میں رومان کو جنم دیا ہے ویسے یہ رومان بھی ان کی طاقت ہے۔

کرشن چندر کے تخلیقی اور فکری نظام میں فطرت کو خصوصی حیثیت حاصل ہے کہ فطرت کے ساتھ آدمی کے اٹوٹ، دائمی اور ازلی رشتے کی پہچان ان کی آنکھوں میں ہے۔ فطرت کرشن چندر کے نزدیک کوئی خارجی شے نہیں۔ ان کے افسانوں میں آدمی کے ساتھ ساتھ فطرت بھی سانس لیتی، جیتی جاگتی محسوس ہوتی ہے۔ آدمی فطرت سے الگ نہیں اور نہ فطرت آدمی سے علاحدہ ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں، ایک دوسرے کے ساتھ بے طرح جڑے ہوئے ہیں اور کبھی کبھی تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ دونوں ایک ہی ہیں —

"میں بند پر چل رہا ہوں
میرے ساتھ ساتھ جہلم بھی چل رہا ہے
ہم دونوں مسافر ہیں اور بہت دور سے آئے ہیں
جس دن میری ماں نے جنم دیا میں بہت کمزور تھا
جس دن چشمہ ویری ناگ نے جہلم کو جنم دیا وہ بھی بہت کمزور تھا
مگر وہ آگے چلا اور اس میں ندی نالے آکر ملتے گئے
میں آگے چلا اور مجھ میں دن رات آکے ملتے گئے
پھر ہم دونوں زندگی کی چٹانوں پر گھستے گئے اور حالات کی کھائیوں میں آبشار بن کر گرے ہم نے کھیتوں کو سیراب کیا اور پھولوں کی خوشبو سونگھی۔
ہم نے شہروں کا کوڑا کرکٹ اٹھایا اور اس کا تیزاب اپنے سینے میں گھول لیا
اور انسان کی مایوسی کی طرح گدلے ہو گئے۔
ہم نے لوگوں کے درمیان پل باندھے اور کشتیاں چلائیں اور پانی کے ہاتھوں سے مصافحے کیے اور ہم ساری دنیا پر پھیل گئے۔
جہلم ایک انسان ہے
انسان ایک دریا ہے
دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور ان دونوں کے ساتھ رات بھی چلتی ہے۔

("دسواں پل")

اردو زبان میں کسی اور افسانہ نگار نے آدمی کو فطرت اور کائنات کے ایسے وسیع تناظر کے ساتھ اپنے افسانوں میں پیش نہیں کیا جیسے کرشن چندر نے پیش کیا ہے۔ جہاں تک آدمی کو فطرت اور کائنات کے وسیع ترین تناظر میں پیش کرنے کا تعلق ہے یہ کام کرشن چندر سے پہلے پریم چند نے بھی کیا ہے اور خود کرشن چندر کے کئی ہم عصروں کی تخلیقات میں بھی اس کی بہترین عکاسی کی مثالیں تلاش کی جا سکتی ہیں لیکن کرشن چندر کا معاملہ ان سے بہت مختلف ہے۔ وہ آدمی کو فطرت اور کائنات کے سیاق میں اتنے جاندار انداز میں پیش کرتے ہیں کہ ان کے افسانوں میں فطرت ایک زندہ پس منظر کے روپ میں نظر آتی ہے۔ "زندگی کے موڑ پر" کا اختتامیہ مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے، جس کی تہہ در تہہ معنویت نے اسے ایک فلسفیانہ عمق عطا کیا ہے۔ بقول محمد حسن عسکری "زندگی کے موڑ پر" کا سا عظیم الشان خاتمہ تو آج تک کسی اردو افسانے کو نصیب نہیں ہوا ہے"۔

کرشن چندر کے چند افسانوں میں فطرت ایک زبردست اور پُراسرار قوت کے روپ میں بھی ابھری ہے لیکن وہ انگریزی ناول نگار تھامس ہارڈی کی طرح فطرت کو کسی ظالم و جابر اندھی قوت کے روپ میں پیش نہیں کرتے اور شاید اسی لیے ان کے افسانے قنوطی عناصر سے بھی محفوظ رہے ہیں جنھوں نے تھامس ہارڈی کے یہاں الم ناکی اور مایوسی کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ کرشن چندر کے افسانوی کردار فطرت کی قوت سے ہراساں یا متنفر نہیں کیونکہ وہ اسے اپنا دشمن نہیں بلکہ شفیق سمجھتے ہیں۔ انھیں خود اپنی محنت اور جد و جہد پر بھی اعتماد ہے۔ اور اسی کے وسیلے سے وہ فطرت اور کائنات کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑ لیتے ہیں۔

پلاٹ، کردار اور فضا کسی بھی افسانے کے لازمی عناصر ترکیبی نہ سہی لیکن ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر افسانے کی تخلیق میں ان تینوں عناصر کو خصوصی طور پر ملحوظ رکھا جائے لیکن عام طور پر تقریباً ہر افسانے میں ان میں سے کسی عنصر کو خصوصیت کے ساتھ ابھارا جاتا ہے۔ کرشن چندر کے بیشتر افسانوں میں پلاٹ اور کردار کے بجائے خصوصی زورِ قلم فضا کی تعمیر پر صرف ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے میں ان کے کردار اپنے وجود کا بھرپور احساس نہیں دلا پاتے اور اسی وجہ سے کردار نگاری کے نقطۂ نظر سے انھیں ہمیشہ تلخ و تند تنقیدوں کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ کرشن چندر کردار نگاری کے فن سے واقف نہیں یا ان کے کردار واقعی پتلیاں ہیں جن میں کوئی جان نہیں۔ کرشن چندر کے یہاں کردار کی اہمیت ضمنی سہی لیکن انھوں نے چند اچھے کردار بھی تخلیق کیے ہیں جن میں تائی ایسری، کالو بھنگی، موبی، کمہار بابا، گمٹے اور دانی ایسے کردار ہیں جو زندگی اور زندگی کی حرارت سے معمور ہیں۔ ان کے علاوہ کرشن چندر کے اکثر افسانوں میں ایک تعلیم یافتہ، حساس اور باغی نوجوان کا کردار ملتا ہے۔ ناسازگار سیاسی اور سماجی ماحول میں سانس لیتا ہوا خود کو بے بس پانے والا یہ جوشیلا کردار ایک سوچتا ہوا ذہن ہے جو مختلف افسانوں میں، مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہونے کے باوجود بنیادی طور پر ایک

ہی نظر آتا ہے۔ اس طرح ایک بھولی بھالی سادہ معصوم لیکن محبت سے بھرپور دل رکھنے والی ایک دیہاتی لڑکی کا کردار بھی ان کے بیشتر افسانوں میں دیکھا جا سکتا ہے ــــ درحقیقت کرشن چندر کے یہاں کردار کے بجائے ٹائپ (TYPE) پر زیادہ زور ملتا ہے۔ وہ منٹو کی طرح اپنے کرداروں کو ان کے داخلی اور خارجی تصادم کے ساتھ پیش کرنے کے فن سے زیادہ واقف نہیں۔ اس کا باعث یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ زندگی کو ہمیشہ ایک خاص فاصلے اور بلندی سے دیکھنے کے خوگر رہے ہیں۔ جیتے جاگتے کرداروں کے ساتھ ان کا ویسا معاملہ نہ رہا جیسا مثال کے طور پر منٹو کا رہا تھا۔

۱۹۴۷ء میں تقسیم وطن اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات پر کرشن چندر نے پے در پے کئی افسانے لکھے جو "ہم وحشی ہیں" نام سے کتابی شکل میں شائع ہوئے۔ وقتی جذباتیت کی رو میں لکھے گئے یہ افسانے تصنع اور سطحیت کے شکار ہیں۔ انھیں پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے مصنف نے ایک خاص قسم کا فارمولا بنا لیا ہے اور اسی کے مطابق افسانے تیار کرتا چلا جا رہا ہے۔ فسادات پر لکھے گئے کرشن چندر کے افسانوں میں صرف "پشاور ایکسپریس" ہی ایک ایسا افسانہ ہے جسے بلند پایہ اور حیرت انگیز قرار دیا جا سکتا ہے۔

۱۹۴۷ء کے بعد کرشن چندر کے لکھنے کی رفتار بہت تیز ہو گئی تھی۔ آزادی کے بعد انھوں نے بہت زیادہ لکھا ہے اور یہیں سے ان کے فن میں زوال کے آثار پیدا ہونے شروع ہو گئے۔

مجموعی طور پر 'ان داتا'، 'غالیچہ'، 'بالکونی'، 'گرہن کی ایک شام'، 'مہالکشمی کا پل'، 'آدھے گھنٹے کا خدا'، 'حسن اور حیوان'، 'پشاور ایکسپریس'، 'کالو بھنگی'، 'کچل دان'، 'کہانی کی کہانی'، 'پانی کا درخت'، 'ٹوٹے ہوئے تارے'، 'پورب دیس ہے دلی'، 'پورے چاند کی رات'، 'تین غنڈے'، 'برہم پتر'، 'بت جاگتے ہیں'، 'پھول سرخ ہیں' اور 'میں انتظار کروں گا' کرشن چندر کے فن کے بہترین شاہکار ہیں۔

کرشن چندر کے افسانوں کی ایک نمایاں خصوصیت ان کا طنز و مزاح بھی ہے۔ انھوں نے بے شمار طنزیہ و مزاحیہ افسانے لکھے ہیں۔ ان افسانوں کے علاوہ ان کے سنجیدہ افسانے بھی لطیف مزاح سے خالی نہیں اور طنز تو ان کا خاص حربہ ہے جس سے وہ ہمیشہ ضرورت کے وقت کام لیتے رہتے ہیں۔ طنز و مزاح کا یہ خداداد جوہر ان کی طبیعت کا ہی ایک حصہ ہے اور ان کے یہاں ابتدا ہی سے موجود ہے، اس بات کا واضح نشان ان کا اولین افسانہ "پروفیسر بلیکی" ہے۔ کرشن چندر کے طالب علمی کے زمانے کا یہ افسانہ بنیادی طور پر ایک طنزیہ ہے جو انھوں نے اپنے فارسی کے استاد 'ماسٹر بلاقی رام کی دلچسپ اور عجیب و غریب شخصیت سے متاثر ہو کر لکھا ہے۔ "ہوائی قلعے" ان کے طنزیہ و مزاحیہ افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے، جس میں 'بیچلر آف آرٹ'، 'غسلیات'، 'بادن ہاتھی'، 'مانگے کی کتابیں'، 'غلط فہمی'، 'جان پہچان' اور 'ہوائی قلعے' جیسے بہترین افسانے شامل ہیں۔ ان افسانوں میں کرشن چندر نے زندگی، سماج اور معاشرے کی ناہمواریاں اور غلط کاریوں کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ "مزاحیہ افسانے" ان کے افسانوں کا ایک اور مجموعہ ہے جس میں 'ماہر نفسیات'، 'چلتا پرزہ'، 'اخباری جیوتشی'، 'قطاکو'، 'فلمی قاعدہ' اور 'مینڈک کی گرفتاری' جیسے افسانے ان کے طنز و مزاح نگاری کی بہترین مثالیں پیش کرتے ہیں۔ یہ افسانے کرشن چندر کے گہرے سماجی شعور کے عکاس ہیں۔ ان کے علاوہ 'رنگ و بو'، 'خونیں ناچ'، 'دو فرلانگ لمبی سڑک'، 'اجنتا سے آگے'، 'زندگی کے موڑ پر'، 'نئے غلام'، 'مہالکشمی کا پل'، 'ہم وحشی ہیں'، 'ان داتا'، 'تین غنڈے'، 'پرانے خدا' اور 'ایک گرجا ایک خندق' وغیرہ چند ایسے قابلِ ذکر سنجیدہ افسانے ہیں جن میں کرشن چندر کا مخصوص طنزیہ و مزاحیہ انداز کافی متاثر کرتا ہے۔

کرشن چندر کو زبان و بیان پر مکمل فنکارانہ دسترس حاصل ہے جب وہ رخشِ زبان پر سوار ہوتے ہیں تو اس برق جولاں اور سرکش گھوڑے کی باگ ان کے ہاتھ میں رہتی ہے اور پاؤں رکاب میں، زبان کے خلاقانہ استعمال سے وہ بخوبی واقف ہیں۔ ان کے اسلوب میں تازگی اور حسن کی وہ کیفیات ہوتی ہیں جو انھیں بقول وارث علوی اپنے دیگر ہم عصروں سے علاحدہ کر کے اردو افسانے کا سب سے بڑا انشا پرداز قرار دیتی ہیں۔

بقیہ : لغت ابجد شمار

"ۃ" کا فیصلہ مشکل ہے۔ "ۃ" کے ء ہی کی طرح عربی الاصل ہونے کے باوجود ابجد ہوز وغیرہ میں سے کوئی جگہ نہیں ہے۔ مگر ء کے برعکس، اور غیر عربی حروف کی طرح یہ حروف تہجی میں نہیں پڑھا جاتا ہے۔ پہلا سوال یہ ہے کہ ء سے مطابقت کی وجہ سے اسے صفر محسوب کیا جائے یا اس سے مخالفت کی وجہ سے اسے غیر عربی حرفوں کی طرح برتا جائے اور "ٹ" اور یا "چ" کی طرح اس کے عدد بھی اس کے ہم صوت یا ہم شکل حرف کے لیے جائیں۔ اگر فیصلہ یہ ہوا کہ اس کے صفر نہ لیے جائیں تو ہم صوتی (تلفظ) کی بنیاد پر فیصلہ آسان ہے اور پہلے ہی ہو چکا ہے۔ "ۃ" کے چار سو ہوئے اس لیے کہ یہ حرف "ت" کا ہم صوت ہے۔ مگر ہم شکلی (کتابت) کے لحاظ سے فیصلہ مشکل ہے۔ "ۃ" میں اوپر کے دو نقطے اس کے "ت" سے ہم شکلی کی دلالت کرتے ہیں۔ مگر اس کا "ہ" کی بھی شکل رکھنا اس خصوصیت کے ساتھ کہ "ت" کے برعکس یہ اپنے آگے کے حرف سے نہیں مل سکتا ہے، اس لیے کہ "ہ" سے ہم شکلی کی دلالت کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ قبل الذکر چھ مسئلوں کے برعکس تائے مدورہ کے عدد کا محض کتابت کی بنیاد پر قطعی فیصلہ کرنا ممکن نہیں ہے۔

یہ مسائل ظاہر ہے کہ من گھڑت نہیں ہیں بلکہ استادوں کی تحریروں اور تاریخ گویوں کی تاریخوں ہی سے اخذ کیے گئے ہیں۔ امید ہے کہ ان کے ماخذ کو براہِ راست پیش کرنے اور ان پر تنقیدی نظر کرنے سے ان مسائل کے مختلف پہلوؤں پر روشنی بھی پڑے گی اور ان کی اہمیت بھی واضح ہو جائے گی۔ \

رشید الدین

آندھرا پردیش میں اُردو نثری تراجم

حیدرآباد سے اردو ترجمہ کا ناطہ بہت پرانا ہے۔ یہاں ماضی میں انفرادی اور اجتماعی ہر دو طرح تراجم کا کام انجام دیا گیا۔ انفرادی کوششوں میں نواب فخر الدین خاں شمس الامراء کا دار الترجمہ قابل ذکر ہے جب کہ اجتماعی بلکہ سرکاری سطح پر شہرۂ آفاق دار الترجمہ عثمانیہ اردو دنیا میں ہمیشہ کے لیے اپنا نام چھوڑ گیا۔ آج بھی حیدرآباد میں انفرادی طور پر اردو تراجم کا سلسلہ جاری ہے اور اپنے اس مقالے میں میں نے پچھلے بائیس سال میں کی جانے والی ایسی ہی نثری کوششوں کا جائزہ لیا ہے۔ اپنے موضوع کو میں نے دس حصوں افسانے، ناول، ڈرامے، مضامین، تاریخ، تحقیق، تنقید، سوانح نظموں کے نثری تراجم اور مذہب و ثقافت میں تقسیم کیا ہے اور آگے میں تراجم کا اسی لحاظ سے جائزہ لوں گا۔

افسانہ اردو ادب میں غزل کے بعد سب سے زیادہ مقبول صنف ہے اسی لحاظ سے اس کے تراجم بھی زیادہ ہوئے ہیں۔ اس وقت میرے پیش نظر دو کتابیں "تلگو افسانے" اور "ملیالم افسانے" ہیں جو بالترتیب ۱۹۷۵ اور ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئی ہیں۔ "تلگو افسانے" کے عنوان سے ساہتیہ اکیڈمی آندھرا پردیش حیدرآباد نے ۲۰ تلگو افسانوں کا اردو میں ترجمہ کرایا ہے جس کے مترجم تلگو کے مشہور ادیب دسرتھی ہیں تلگو افسانے کی تاریخ بہت پرانی ہے لیکن اس میں جدید افسانے کے بانی گرزاڈا اپا راؤ سے ابتدا کی گئی ہے اور ساما سیوا راؤ پر اس کا اختتام عمل میں آیا ہے اس طرح جدید تلگو کے سارے اہم افسانہ نگاروں کا اس میں احاطہ کر لیا گیا ہے۔ مترجم کی زبان سلیس اور بامحاورہ ہے اور اردو پڑھنے والوں کی دلچسپی شروع سے آخر تک برقرار رہتی ہے۔

افسانوں کا دوسرا مجموعہ "ملیالم افسانے" ہے جس کا ترجمہ اردو کی مشہور افسانہ نگار جیلانی بانو نے نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا کی فرمائش پر کیا ہے۔ ان افسانوں کو پڑھتے ہوئے ان پر اصل کا دھوکہ ہوتا ہے جو ایک اچھے ترجمہ کی سب سے بڑی خصوصیت ہے یہ ترجمہ ہندی کی وساطت سے کیا گیا ہے اور ترجمہ کی زبان بے حد بے ساختہ ہے۔ اس میں ملیالم کے ۱۸ جدید افسانہ نگاروں کی منتخب تخلیقات شامل ہیں۔ اس باب میں میرے پیش نظر سرینواس لاہوٹی اور رابعہ دوبے کا اردو میں مرتبہ افسانوں کا ایک مجموعہ بھی ہے، جس میں سرینواس لاہوٹی کے ترجمہ شدہ

چار افسانے بھی شامل ہیں۔ یہ کتاب ۱۹۶۵ء میں شائع ہوئی جس کا ناشر موتی لال نہرو یوتھ سنٹر حیدرآباد ہے اس کے علاوہ پچھلے بائیس سال میں چیدہ چیدہ طور پر بہت سے رسائل میں بھی بہت سے حیدرآبادی ادیبوں کے بعض بیرونی اور علاقائی زبانوں کے افسانوں کے ترجمے شائع ہوئے ہیں جن میں راقم الحروف بھی شامل ہے۔

جہاں تک ناولوں کا تعلق ہے اس وقت میرے پیش نظر پہلی کتاب "چشم نم" ہے جس کا ترجمہ اکرام جاوید نے کیا ہے۔ یہ ایک فرانسیسی ناول ہے جس کا مصنف ایملی زولا ہے جس کا اردو میں انگریزی کی وساطت سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ اسے پیکر پبلیکیشنز نے ۱۹۶۱ء میں حیدرآباد سے شائع کیا تھا۔ اکرام جاوید اردو کے مشہور افسانہ نگار ہیں اور ان کی اب تک کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں لیکن ان کا پہلا مطبوعہ کام یک ترجمہ ہے۔ افسوس کہ اکرام جاوید نے بہت جلد ترجمے سے اپنا ناطہ توڑ لیا۔ شاید انہیں تخلیقی ادب ترجمہ سے زیادہ آسان اور منفعت بخش معلوم ہوا ہو۔ دوسرا ناول میرے پیش نظر "دو شہروں کی کہانی" ہے جو چارلس ڈکنس کی مشہور انگریزی ناول A Tale of Two Cities کا اردو ترجمہ ہے۔ مترجم ہیں جناب فضل الرحمٰن۔ تیسرا ناول ایک تلگو ناول کا ترجمہ ہے جسے ابوالفیض سحر نے نیشنل بک ٹرسٹ کے لیے کیا ہے۔

ڈراموں کے باب میں میرے پیش نظر دو مطبوعہ کتابیں ہیں پہلی "سمندری لٹیرے" اور دوسری "شادی کی آخری سالگرہ"۔ اول الذکر ڈرامہ ایک انگریزی ڈرامہ ہے جس کا مصنف السن ہے اور جسے اردو کا روپ فضل الرحمٰن صاحب نے دیا ہے۔ یہ ڈرامہ ۴۰ صفحات پر مشتمل ہے جسے ساہتیہ اکیڈمی دہلی نے شائع کیا ہے۔ "شادی کی آخری سالگرہ" کے مصنف حیدرآباد یونیورسٹی میں شعبہ انگریزی کے صدر ڈاکٹر ایس۔ کے۔ ملکا ہیں جس کا اردو ترجمہ ڈاکٹر مغنی تبسم ریڈر اردو جامعہ عثمانیہ نے کیا ہے۔ پچھلے بائیس سال میں حیدرآبادی مصنفین کے بعض رسائل میں بھی بعض بیرونی اور علاقائی زبانوں کے ترجمے شائع ہوتے ہیں۔

مضامین کے سلسلے میں میرے پیش نظر جو کتاب ہے اس کا نام ہے "استاد۔ آج اور کل"۔ اس میں ہندوستان بھر کے مختلف ماہرین تعلیم کے تعلیم اور استاد کے موضوع پر

عالمانہ مقالے شامل ہیں جن کا اردو ترجمہ صیغہ اردو نظامت ترجمہ حیدرآباد نے کیا ہے۔ یہ بات باعث فخر و انبساط ہے کہ اس کے مترجمین میں راقم الحروف بھی شامل ہے یہ کتاب محکمہ تعلیمات حکومت آندھرا پردیش نے ۵ ستمبر ۱۹۷۶ء کو "یوم اساتذہ" کے موقع پر شائع کی تھی جسے نیشنل پرنٹنگ پریس کے مالکان نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ طبع کیا ہے۔ یہ کتاب ۲۱۳ صفحات پر مشتمل ہے۔

تاریخ کے موضوع پر اب میں جس کتاب کے اردو ترجمہ کا ذکر کرنے جا رہا ہوں وہ ایک لازوال کتاب ہے جس کا مصنف طوسی دیدیس ہے جو یونانی نژاد ہے جس نے قدیم یونان کی جنگوں کا حال لکھا ہے۔ کتاب کا عنوان "تاریخ جنگِ یونان قدیم" ہے جسے میر حسن نے "کمال اور زوال" کے نام سے اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ یہ ایک ضخیم کتاب ہے جو ۸ سو صفحات پر مشتمل ہے اور ۸ حصوں اور ۲۶ ابواب میں منقسم ہے اس کے اردو ترجمہ کا اہتمام ساہتیہ اکیڈمی دہلی نے کیا تھا اور جس کی اشاعت ۱۹۶۶ء میں عمل میں آئی۔ اعجاز پرنٹنگ پریس حیدرآباد میں یہ کتاب خوبصورت انداز میں شائع ہوئی ہے۔ ہر چند کہ یہ کتاب ساہتیہ اکیڈمی دہلی کی ہے لیکن چونکہ اس کے مترجم اور طابع کا تعلق حیدرآباد ہی سے ہے اس لیے میں اسے اپنے موضوع میں شامل کر رہا ہوں اس کتاب میں نہ صرف قدیم یونان کی تمام جنگوں بلکہ اس زمانے کے کلچر، ثقافت اور ادب کی بھی جھلک ملتی ہے۔ میر حسن صاحب مرحوم کا ترجمہ بہت معیاری ہے۔

مذہب اور ثقافت کے تعلق سے میں یہاں "بھگوت گیتا" اور "قرآن شریف" کے اردو تراجم کا ذکر کروں گا "بھگوت گیتا" کے اردو میں اب تک کوئی ۳۸ تراجم ہو چکے ہیں جن میں سے ۱۶ نثر میں ہیں اور باقی منظوم۔ "بھگوت گیتا" کا جو ترجمہ اس وقت میرے موضوع میں شامل ہے وہ حسن الدین احمد صاحب کی کاوشوں کا نتیجہ ہے سنسکرت سے عدم واقفیت کی بنیاد پر انھوں نے اس کا ترجمہ انگریزی سے کیا اسے آریندر شرما صاحب سابق صدر شعبہ سنسکرت جامعہ عثمانیہ کو دکھایا جنھوں نے اصل سنسکرت سے اس کا مقابلہ کر کے اردو ترجمہ کی توثیق۔ اس ترجمہ کی پنڈت سندر لال جی نے بھی ستائش کی ہے۔

"قرآن شریف" کے جس ترجمہ کا میں یہاں ذکر کر رہا ہوں وہ قاری محمد عبدالباری اورنگ آبادی کا ہے۔ قاری صاحب سابق ریاست حیدرآباد میں مسلسل آٹھ سال تک قاری نشر گاہ رہے۔ بعد میں انھوں نے اپنے ترجمے اور تفسیر کو زیور طبع سے آراستہ کیا اس کا دوسرا ایڈیشن اس وقت میرے پیش نظر ہے جو ۱۹۷۳ء میں ڈی لکس پریس حیدرآباد میں آفسیٹ پر نہایت اہتمام سے شائع ہوا ہے۔ ترجمہ بہت عام فہم اور سلیس ہے جو طبقہ عوام کے علاوہ علماء و مشائخین میں بھی پسند کیا گیا ہے۔

سوانح کے باب میں میں "شری اربندو گھوش" کا تذکرہ کروں گا جو پانڈیچری آشرم کے بانی اور روحانیت میں ممتاز مقام کے حامل شری اربندو گھوش کے حالات زندگی پر مبنی کتاب ہے۔ اس کے مصنف نواجاتا ہیں جو شری اربندو گھوش سے بہت قریب رہے ہیں اس کا اردو ترجمہ اردو کے مشہور ادیب اور ماہر اقبالیات اشفاق حسین نے کیا ہے یہ کتاب ۱۵۶ صفحات پر مشتمل ہے اور ۱۹۷۲ء میں نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا کے شعبہ اردو نے شائع کی ہے۔

اب میں تین ایسی کتابوں کا تذکرہ کروں گا جو تلگو کی ہیں لیکن جن کا ترجمہ نثر میں کیا گیا ہے۔ یہ کتابیں ہیں "ویمنا" "میری دھرتی میرے لوگ" اور "نیل ینکہ" یہ تینوں کتابیں تلگو کی ہیں جو آندھرا پردیش کی علاقائی زبان ہے، اور منظوم ہیں جن کے ترجمے اردو میں نثر میں کیے گئے ہیں پہلی کتاب تلگو کے مشہور شاعر ویمنا کے منتخب اشعار کا مجموعہ ہے۔ دوسری کتاب تلگو کے جدید شاعر سیشندر شرما کی طویل رزمیہ نظم کا اردو ترجمہ ہے اور تیسری کتاب "نیل ینکہ" مختلف تلگو نظموں کا ترجمہ ہے۔ پہلی کتاب کا ترجمہ شری ایم۔ زامپا۔ ڈاکٹر کے۔ گوپال کرشنا اور ڈاکٹر سری رام شرما نے مل کر کیا ہے جب کہ دوسری کتاب کے مترجم اختر حسن صاحب اور تیسری کتاب کے مترجم ڈاکٹر غیاث صدیقی ہیں۔ پہلی کتاب ساہتیہ اکیڈمی حیدرآباد نے ۱۹۷۵ء میں شائع کی ہے جب کہ دوسری کتاب انڈین لنگوئجس فورم کے زیر اہتمام ۱۹۷۶ء میں شائع ہوئی ہے۔ تیسری کتاب فورم ہی کی نگرانی میں ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئی ہے۔

تحقیقی میدان میں ہمیں صرف ایک کتاب ملتی ہے جس کا عنوان ہے "دکھنی زبان کا آغاز و ارتقا"۔ یہ ڈاکٹر شری رام شرما ریڈر ہندی عثمانیہ یونیورسٹی کی ہندی کتاب "دکھنی ہندی کا ادبھو اور وکاس" کا اردو ترجمہ ہے جو ۱۹۷۶ء میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے مبسوط پیش لفظ کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ اس کے مترجم غلام رسول صاحب سابق لائبریرین سٹی کالج حیدرآباد ہیں۔ اس کتاب کے اردو ترجمہ کی بہت زیادہ ضرورت تھی کیونکہ بقول ڈاکٹر مسعود حسین خاں "ڈاکٹر شرما کی یہ تاریخی قواعد ہندی والوں سے کہیں زیادہ اردو محققین کی توجہ کی محتاج ہے" یہ ایک ضخیم کتاب ہے اور ۵۰۰ سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہے جسے ساہتیہ اکیڈمی حیدرآباد نے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔

اب میں جس آخری کتاب کا تذکرہ کر رہا ہوں اس کا تعلق تنقید سے ہے یہ ایک مختصر سی کتاب ہے جس کا عنوان ہے "کہانی اور اس کا فن" اسے شعور پبلیکیشنز حیدرآباد نے شائع کیا ہے اور اس کا ترجمہ ڈاکٹر مغنی تبسم نے کیا ہے۔ یہ اصل میں روسی ادیب انتونوف کے ایک طویل تنقیدی مضمون کا ترجمہ ہے جسے ڈاکٹر تبسم نے انگریزی کی وساطت سے کیا ہے اور اس میں نئے افسانہ نگاروں کے لیے بعض بڑے کام کے نکتے ملتے ہیں۔ ڈاکٹر مغنی تبسم نے بعض اور بھی انگریزی تنقیدی مضامین کے ترجمے کیے ہیں جو ماہنامہ "صبا" اور "شعر و حکمت" میں شائع ہو چکے ہیں۔

قلمی معاونین سے گذارش

ہمارے پاس نظموں اور غزلوں کا انبار جمع ہے۔ لہذا ہمیں کچھ عرصے تک مزید غزلیں اور نظمیں ارسال نہ فرمائیں۔ البتہ ایسے معیاری تحقیقی اور موضوعاتی مضامین شکریے کے ساتھ قبول کیے جائیں گے جن کی افادیت مسلم ہو۔

حمیدہ سلطان

مِس روزا

مِس روزا کو قدرت نے درد مند دل عطا کیا تھا۔ کہنے کو تو یہ لیڈی ڈاکٹر تھیں جو بچوں کے علاج کے خصوصی ماہر کی حیثیت سے حیدر آباد جیسے شہر میں غیر معمولی شہرت رکھتی تھیں، لیکن قدرت نے ان کا دل ایسا بنایا تھا کہ پڑوس میں کسی کی انگلی بھی دکھتی تو مس روزا تڑپ جاتیں۔ غریب بیمار بچوں کو توجہ سے دیکھنے کے بعد ان کو دوا بھی مفت دیتیں۔ اور جاتے وقت پریشان حال ماں کے ہاتھ میں کچھ روپے یہ کہہ کر پکڑا دیتیں "اس سے دودھ اور پھل بچے کو لیکر دینا"۔ غرضیکہ صبح سے رات گئے تک وہ خلق خدا کی خدمت میں معروف رہتیں مِس روزا کے کلینک سے قریب ہی نصرت جنگ کا عالی شان محل تھا۔ بیگم نصرت جنگ سے جو دلہن پاشا کہلاتی تھیں مِس روزا کی بے حد دوستی تھی۔ کوئی دن ایسا نہ ہوتا جو وہ نصرت جنگ کے محل نہ جاتی ہوں۔ روزانہ سہ پہر کو چار بجے کلینک جانے سے قبل مس روزا محل پہنچ جاتیں۔ دلہن پاشا سے گپ شپ کرتیں۔ ان کے ساتھ تاش اور کیرم کھیلتیں۔ چائے کا دور بھی چلتا رہتا۔ شام کے چھ بجے کے بعد وہ کلینک جانے کے لیے اٹھتی تھیں۔ دلہن پاشا نصرت جنگ کے سگے ماموں کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ خوش شکل بھی تھیں اور خلیق بھی۔ خدا نے ان کو حسن صورت کے ساتھ حسن طبیعت بھی عطا کیا تھا۔ یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ نصرت جنگ اور حیدر آبادی رؤسا کی طرح بیویاں کرنے کے شوقین نہ تھے۔ البتہ ان کی دادی نے کبھی دلہن پاشا کو پسند نہیں کیا۔ کیونکہ بڑی پاشا اپنی سگی بھتیجی ان کے لاڈلے پوتے سے بیاہ لائی تھیں۔ جب کہ وہ چاہتی تھیں کہ اپنی نواسی کا پوتے سے بیاہ کریں۔ بڑی پاشا نے خود تو اس معاملے میں دخل نہیں دیا۔ نصرت جنگ کو البتہ جب بھی کالج کی کوئی تعطیل ہوئی۔ ماموں کے پاس دلی بھیج دیا۔ وہاں ممانی نصرت کی خوب آؤ بھگت کرتیں۔ پھر مہر انسا کی دلبرانہ اداؤں نے ان کو بالکل موہ لیا۔ لہٰذا جب دادی حضور نے بی۔ اے۔ کر لینے کے بعد نصرت جنگ سے کہا "اب بہت پڑھ لیے نصرت نواب! میں آئے دن بیمار رہتی ہوں، عید کے چاند انشا اللہ تمہاری شادی رچاؤں گی"۔

نصرت جنگ نے آہستہ سے کہا "آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ مگر کس لڑکی سے اور کہاں آپ میری شادی کرنا چاہتی ہیں"۔ وہ گلوری منہ میں رکھ کر اطمینان سے بولیں "اے بیٹے! تمہاری چھوٹی پھپھی کی بڑی بیٹی ماہ بانو۔ جو موجود ہے، اللہ رکھے، میری دلی آرزو ہے کہ وہ تمہاری دلہن بن کر اس محل کی رونق بڑھائے"۔

نصرت جنگ کے تصور میں ماہ بانو کا سراپا آگیا جو بے حد گورے رنگ کی معمولی ناک نقشے والی، موٹی اور بیوقوف لڑکی تھی۔ جس کو سوائے موقع بے موقع ہنسنے کے اور ہر وقت کھاتے رہنے کے، بات کرنے کا بھی ڈھنگ نہیں آتا تھا۔ تعلیم بھی بس اس کی واجبی تھی۔ نویں جماعت میں فیل ہونے کے بعد ماں نے اس کو گھر بٹھا لیا تھا۔ نصرت جنگ نے دھیمے مگر مستقل لہجے میں دادی سے کہا "میں اس کم عقل لڑکی کے ساتھ اپنی قسمت نہیں پھوڑ سکتا، جو بالکل جاہل بھی ہے اور موٹی بھی۔ پھپھو جان برا مانیں یا بھلا۔ اگر ان کو مجھ سے رشتہ اپنی بیٹی کا کرنا تھا تو اسے پڑھایا ہوتا ڈھنگ سلیقہ سکھایا ہوتا، پھر میں ضرور آپ کے حکم کی تعمیل کرتا۔"

دادی نے مضطرب لہجے میں پوچھا "پھر کہاں تمہارا خیال ہے؟"

نصرت جنگ تھوڑی دیر سکوت کے بعد بولے "ابھی میں نے اپنی شادی کے متعلق سوچا ہی نہیں۔ یہ تمام زندگی کا سوال ہے، دو چار دن میں آپ کو بتا دوں گا"۔

اپنی ماں سے دوسرے دن رات کو ہی کھانے کے بعد کہہ دیا۔
"میں مہرالنسا کو پسند کرتا ہوں آپ دادی حضور کو بتا دیں۔"

بڑی پاشا تو خدا سے چاہتی تھیں کہ بیٹے کی شادی بھائی کے گھر کریں، مگر بظاہر گھبرا کر بولیں۔ "اے ہے میاں! اماں جان تو یہ سمجھیں گی کہ میں نے تم کو بہکایا ہے اور بجائے ان کی نواسی کے اپنی بھتیجی کی طرف تمہاری توجہ کر دی"۔

نصرت جنگ نے تیز لہجے میں جواب دیا "میں کوئی گڈا تو ہوں نہیں انسان ہوں، میرے بھی جذبات اور احساسات ہیں، بھلا میرا دماغ خراب ہوا ہے کہ سینیر کیمبرج کیے ہوئے خوبصورت ذہین سلیقہ شعار مہر کو چھوڑ کر اس بیوقوف ماہ بانو کے ساتھ محض دادی حضور کو خوش کرنے کے لیے اپنی قسمت پھوڑ لوں"۔

جب دادی کو یہ معلوم ہوا کہ پوتا ماموں کی بیٹی پر فدا ہے تو وہ سمجھ گئیں کہ بہو نے بڑی گہری چال چلی ہے۔ خیر شادی تو بڑی دھوم دھام سے نصرت جنگ کی مہرالنسا سے ہو گئی مگر قسمت کی خوبی یہ ہوئی کہ مہرالنسا کے یہاں شادی ہوئے پانچ سال گذر گئے اور اولاد نہ ہوئی۔ دادی نے تو چوتھا برس ختم ہوتے ہی کہنا شروع کر دیا تھا۔ "اے اب بہو کے یہاں بچہ نہیں ہوگا یہ تو بانجھ ہے، میں تو اپنے پوتے کی دوسری شادی کروں گی۔ نصرت نواب کا بیٹا دیکھنے کی آرزو میں جی رہی ہوں"۔ ان کی ایک ملنے والی نے کہا کہ "ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ نصرت نواب میں خود اولاد پیدا کرنے کی اہلیت نہ ہو"۔

دادی بھڑک گئیں، ان کا نوابی جلال پورے عروج پر آگیا اور کڑک کر کہا "اے لو! رفیع الدولہ کا پوتا اور نواب حشمت جنگ کا بیٹا جن کے یہاں لونڈیوں باندیوں سے ملا کر اتنی اولادیں تھیں کہ پورا محل ان جنگی پوتوں سے بھرا ہوا ہے، اس کے یہاں بچہ نہ ہو۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا، میں اپنے تجربے کی آزمائش کیے لیتی ہوں" پھر بڑی پاشا سے کہا "سن لو بی! تمہاری لاڈو بھتیجی کی وجہ سے نصرت نواب کی شان میں فرق آرہا ہے، تم برا مانو یا بھلا۔ میں اگلے جمعہ کو نصرت نواب کو پھول پہناؤں گی اور دلآرام کو ان کے پاؤں دبانے کی خدمت سپرد کروں گی"۔

بیچاری بڑی پاشا کہہ کیا سکتی تھیں۔ بات ہی ایسی تھی کہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئیں۔ بلکہ نصرت جنگ نے دادی سے یہ کہا "میں اس واہیات رسم کو بالکل پسند نہیں کرتا کہ مجھے پھول پہنا کر آپ میری بیوی کا دل دکھائیں"۔

دادی نے ڈانٹ کر کہا "بس بہت ہوئی تمہاری مرضی۔ ایک نہیں کئی لونڈیاں بھی تمہاری خوابگاہ کی زینت بنیں، بیوی تو آخر تمہاری دلہن ہی رہیں گی۔ میں لوگوں کے یہ طعنے برداشت نہیں کر سکتی کہ تم ناقابل ہو"۔

بڑی پاشا نے بھی ساس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا "اے لو، اس میں ہرج ہی کیا ہے، تم بیکار دادی حضور سے کیوں جھک جھک کر رہے ہو، ان کو پھول پہنا کر اپنی خوشی کرنے دو، مہر تو بڑی سمجھدار لڑکی ہے وہ بالکل برا نہیں مانے گی"۔

یوں بادلِ ناخواستہ نصرت جنگ نے دادی کو خوش کرنے کے لیے پھول بھی پہنے اور سرخ جگمگاتے لباس میں خوشبو سے بسی ہوئی ان کی نے پالک سانولی سلونی دلآرام کی طرف توجہ بھی کی۔ مہرالنسا نے اس دن حسب معمول میاں سے رات کے کھانے پر ہنس ہنس کر باتیں کیں اور رات گئے ان کو باہر دھکیل کر اپنی خوابگاہ کا دروازہ بند کر لیا اور تکیے پر منہ اوندھا کر بہت دیر تک آنسو بہاتی رہی، دوسرے دن مہرالنسا نے میاں سے دوپہر کے کھانے کے بعد کہا "امی جان کا خط آیا ہے۔ ابا میاں کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ ان کے خون کا دباؤ بہت بڑھ گیا ہے، مجھے یاد کر رہے ہیں، آپ اجازت دیں تو کچھ دن کے لیے ہو آؤں"۔

نصرت جنگ بولے "یہاں تمہارے بغیر میرا دل گھبرائے گا"۔

مہرالنسا نے مسکرا کر کہا "فی الحال تو آپ کی دادی نے دلبستگی کا سامان کر دیا ہے، اس کھلونے سے میری واپسی تک دل بہلا لیں"۔

نصرت جنگ تیوری پر بل ڈال کر بولے "واہ بیگم! خود تو تم نے ہمیں باہر نکال کر کمرہ بند کر لیا اور اب باتیں کر رہی ہو"

مہرالنسا نے ان کے شانے پر سر رکھ کر محبت بھرے لہجے میں کہا "آپ پر مجھ کو پورا اعتماد ہے، مجھ سے آپ کو کوئی نہیں چھین سکتا۔" بیچاری لونڈی کس گنتی میں ہے اچھا ہے خدا اس کو اولاد دے تو کہنے والوں کو یہ جواب تو مل جائے کہ خدا ناکردہ آپ میں کوئی نقص نہیں جو کمی ہے مجھ میں ہے"

غرضیکہ دلہن پاشا میاں کو کہہ سن کر میکے چلی گئیں۔ ابھی ان کو گئے دوسرا مہینہ شروع ہوا تھا کہ پھپھی نے یہ دل خوش کرنے والی اطلاع بھیجی "اب آجاؤ مہر! خدا نے ہم پر کرم کیا، دلآرام کا پاؤں بھاری ہو گیا۔"

مہرالنسا دل سے میاں کو چاہتی تھی، اس خبر سے اس کو دلی خوشی ہوئی اور وہ حیدرآباد پہنچ گئی، دلآرام کے ناز وہ خود اٹھاتی تھی، اس کو دودھ اور پھل اپنے ہاتھ سے دیتی۔ دادی حضور اور بڑی پاشا نے نو مہینے کے دن گن گن کر کاٹے آخر خدا نے ان کے دامن کو مراد سے بھر دیا۔ دلآرام کی گود میں ایک تندرست بچی آگئی، یہ لڑکی بھی لڑکوں کے برابر تھی۔ دادی حضور خوشی سے پھولی نہیں سماتی تھیں۔ بچی کی ولادت مس روزا کے ہاتھ سے ہوئی تھی۔ انھوں نے مہرالنسا سے کہا "کاش یہ بچی تمہارے پیٹ سے پیدا ہوتی"۔ وہ سرد آہ لے کر بولیں "خدا نے نواب صاحب کو صاحبِ اولاد کر دیا یہ بچی بھی میری ہی ہے۔ قسمت میں اولاد ہی نہیں تو کیا کیا جائے"۔

مس روزا بولیں "ارے پچھلے ہفتے ایک انجکشن نئے آئے ہیں۔ یہ تین لگنے کے بعد اگر کوئی خاص خرابی نہ ہو تو اولاد ہو سکتی ہے۔ میں سب سے قبل یہ انجکشن تمہارے لگاؤں گی۔

دلہن پاشا نے کہا "آپ اپنی خوشی ضرور پوری کریں۔ لیکن مجھے اپنی قسمت سے امید نہیں کہ یہ گود بھرے گی۔"

مس روزا ہر چوتھے دن انجکشن لگاتی رہیں۔ آخری انجکشن کے دو ہفتے بعد دلہن پاشا کو آبکائی لگ گئی۔

بیچاری جو کچھ کھاتیں سب نکل جاتا۔ چکروں کے مارے اٹھنا بیٹھنا مشکل ہو گیا۔ حکیم صاحب نبض دیکھ کر مسکرائے اور نصرت جنگ سے کہا "مبارک ہو، نواب صاحب! آپ کے محل میں خوشی ہونے والی ہے"۔

نصرت جنگ یہ مژدۂ جانفزا سنتے ہی اتنے خوش ہوئے کہ حکیم صاحب کے جاتے ہی دلہن پاشا کے گلے میں دونوں بانہیں ڈال کر بولے "اوہ مہر ڈارلنگ! کتنے خوش ہیں ہم۔ اس کا تم اندازہ نہیں کر سکتیں، میرے بیٹے کی ماں تم بنو گی، کوئی لونڈی باندی نہیں۔"

اور دلہن پاشا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس خوشی کی خبر کو وہ خواب سمجھیں یا حقیقت۔ بڑی پاشا نے فوراً ساس کو یہ خبر سنائی تو دادی حضور نے پہلی مرتبہ بڑے چاؤ سے دلہن پاشا کو گلے لگا کر پیار کیا اور مٹھی بھر روپے نچھاور کر کے ان پر سے پھینکے۔ مس روزا بھی خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھیں۔

آخر وہ مبارک دن بڑے ارمانوں کے بعد آ گیا کہ مہر النساء کی گود خدا نے چاند سے بیٹے سے بھر دی۔ لڑکا ماشاءاللہ دس پونڈ کا ہوا تھا۔ دادی اور پردادی اس پیارے اور تندرست بچے کو دیکھ کر خوشی سے بیخود ہوئی جا رہی تھیں اور مس روزا تو مارے خوشی سے تالیاں بجاتی پھر رہی تھیں۔ محل میں عالم یہ تھا کہ ایک کو ایک مبارکباد دے رہا تھا اور کوئی کسی کی نہ سنتا تھا۔ نصرت جنگ کو جب بیٹا ہونے کی خبر ملی تو جس صاحب نے یہ نویدِ مسرت ان کو دی اس کو ہیرے زمرد کی بیش قیمت انگوٹھی اتار کر انگلی سے پہنا دی۔ پھاٹک پر نوبت بجنے لگی۔ باہر بھانڈ اور اندر ڈومنیاں مبارک سلامت کے نغمے الاپنے لگے۔ نواب نصرت جنگ بچے کو ہوتے ہی دیکھنے کے لیے بیتاب تھے۔ مگر دادی اور ماں کے لحاظ کی وجہ سے محل میں نہیں گئے۔ بچہ صبح سورج طلوع ہونے سے پہلے ہوا تھا اور کہیں دوپہر کو کھانے کے بعد جب یہ دونوں بیگمات آرام کرنے گئیں تو نصرت جنگ بیوی کے پاس پہنچ گئے۔ دلہن پاشا چاندی کے چھپر کھٹ میں لیٹی تھیں۔ ان کا سُرخ و سفید رنگ زچگی کی تکلیف کے باعث زرد مائل ہو گیا تھا مگر وہ بے حد شگفتہ تھیں۔ نواب صاحب نے ان کی پیشانی چوم کر کہا "مبارک ہو بیگم! آخر تم نے ہمیں بیٹے کا باپ بنا ہی دیا"۔

بچے کو اس وقت مس روزا گود میں لیے ہوئے تھیں وہ ہنس کر بولیں "نواب ادھر دیکھیے کیسا پیارا بچہ ہے۔"

نصرت جنگ نے بیٹے کو گود میں لیتے ہوئے کہا "دراصل یہ بچہ آپ کا ہی ہے۔ آپ کی کوششوں کا پھل خدا نے دیا ہے"۔

مس روزا مسکرا کر بولیں "یسوع مسیح نے ہم پر بڑا کرم کیا جو یہ بچہ ہم کو ملا"۔ نصرت جنگ نے کہا "آپ اس کا نام کیا رکھیں گی؟"

مس روزا بولیں "اس کا رنگ بالکل سونے کی طرح ہے اس لیے ہم تو اس کو "گولڈی" بولیں گے۔

نصرت جنگ نے جیب میں جتنے روپے تھے بیٹے پر نچھاور کر کے پھینک دیے۔

چھٹے دن بہت دھوم سے چھٹی ہوئی اور عقیقہ بھی۔ دادی حضور نے بچے کا نام سطوت جنگ رکھا مگر محل میں گولڈی اس کو کہا جاتا تھا۔ مس روزا سے بچہ بے حد مانوس تھا کیونکہ وہ کلینک سے آنے کے بعد تمام وقت محل میں رہتی تھیں۔ وہیں دوپہر کا کھانا کھاتیں اور آرام کرتیں۔ بچے پر یوں تو آیا بھی تھی اور گورنیس بھی۔ مگر مس روزا روزانہ اس کو غسل کراتیں اور دودھ کی بوتل بھی خود دھوتیں۔ دلہن پاشا اپنا دودھ بھی گولڈی کو دن رات میں چار مرتبہ دیتی تھیں لیکن ابھی گولڈی پورے آٹھ مہینے کا بھی نہیں تھا کہ پھر ان کو آبکائی لگ گئی۔ گولڈی کا دودھ چھڑا دیا گیا۔ اور مس روزا محل سے اس کو اپنے گھر لے آئیں اپنی خواب گاہ کے برابر والے چھوٹے کمرے میں انھوں نے گولڈی کی چھوٹی سی مسہری لگا دی جس پر ہلکا گلابی جالی کا پردہ تھا۔ کمرے میں آیا اور گورنیس دونوں رہتی تھیں۔ لیکن مس روزا کا سارا وقت کلینک جانے سے پہلے اور آنے کے بعد گولڈی کی دیکھ بھال میں گذرتا۔ باہر کا آنا جانا گولڈی کی وجہ سے انھوں نے چھوڑ دیا۔ اس ننھے بچے سے ان کو واقعی عشق ہو گیا تھا۔

ماں کو تو وہ جانتا بھی نہیں تھا۔ ان کو ہی ماں سمجھتا تھا۔ دلہن پاشا کے یہاں جڑواں لڑکے ہوئے اور ماں باپ دادی پردادی نومولود بچوں میں کھو کر گولڈی کو فراموش کر چکے تھے بس اس کا اتنا ہی تعلق محل سے تھا کہ مس روزا کے ساتھ وہ روزانہ محل چار بجے جاتا تھا۔ رات کو کلینک سے واپس ہوتے ہوئے وہ اس کو اپنے ساتھ لے آتیں۔ وہ مس روزا کو "مما" کہتا تھا۔ اور بالکل ماں کی طرح اس سے لاڈ کرتا تھا۔

گولڈی ابھی تین سال کا بھی پورا نہیں ہوا تھا کہ پردادی اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ دادی اماں اور امی جان سے گولڈی بالکل بے تعلق تھا۔ باپ سے تو وہ بہت گھبراتا تھا۔ ان کی بڑی بڑی مونچھیں دیکھ کر مس روزا کی گود میں دبک جاتا۔ مس روزا ہنس کر کہتیں، "واہ نواب صاحب، آپ نے میرے بچے کو ڈرا دیا۔" اور نصرت جنگ مسکرا کر جواب دیتے۔ "آپ کا بچہ بالکل بزدل ہے۔" پھر اپنے دونوں زانوؤں پر بیٹھے چھوٹے بیٹوں کو دیکھ کر کہتے "یہ ہیں ہمارے بہادر بیٹے۔ خدا نے جڑواں بیٹوں کے ڈھائی سال بعد دلہن پاشا کو پیاری سی بچی بھی عطا کی اور ان کی رہی سہی توجہ بھی گولڈی کی طرف سے ہٹ گئی۔ اور وہ مس روزا کا ہی بیٹا ہو کر رہ گیا۔ والدین کا تعلق اتنا ہی اس بچے کے ساتھ تھا کہ پانچ روپے ماہانہ اس کے خرچ کے لیے وہ دیکر بے فکر ہو جاتے۔ آیا اور گورنیس کی تنخواہ دے دیتے۔ زمانے کے گذرتے دیر نہیں لگتی۔ گولڈی تیرہ سال کا ہو گیا تھا اور اب جونیئر کیمبرج کی تیاری میں معروف تھا کہ حیدرآباد پر پولیس ایکشن کی وبا چھا گئی اور جانے والوں کے ساتھ نصرت جنگ بھی معہ اہل و عیال

پاکستان پہنچ گئے۔ مس روزا بھی اپنا گھر فروخت کرکے اور تمام اثاثہ سمیٹ کر ان کے ہمراہ ہولیں۔ کراچی پہنچتے ہی انھوں نے ایک دو منزلہ فلیٹ صدر کے علاقے میں لے لیا۔ اوپر کے حصے میں رہائش اختیار کی نیچے کلینک کھولا۔ مس روزا کی پریکٹس کراچی میں حیدرآباد سے بھی زیادہ چل نکلی۔ گولڈی کے ساتھ ان کا لاڈ عمر کے ساتھ بڑھتا ہی رہا۔ مس روزا کی آمدنی کا زیادہ حصہ گولڈی کی نازبرداریوں میں صرف ہوتا تھا۔ وہ تھا بھی بہت ذہین لڑکا۔ ۲۰ سال کی عمر میں اس نے بی۔ اے۔ کرلیا۔ اور انجینیرنگ کی تعلیم کے لیے لندن چلا گیا تو مس روزا کا حال اس کی مفارقت میں ابتر رہنے لگا۔ گولڈی کے خط پہلے تو مہینے میں دو بار مس روزا کو ملتے رہے مگر سال ختم ہونے سے پہلے خطوط کی باقاعدگی میں فرق آگیا۔ پہلے مہینے میں ایک خط ملتا رہا۔ رفتہ رفتہ یہ سلسلہ بھی ختم ہوا۔ مس روزا پابندی سے پندرھویں دن خط لکھتیں مگر گولڈی کا جواب دوسرے یا تیسرے مہینے ان کو ملتا تھا۔ "ممّا! میں پڑھائی میں بہت مصروف ہوں۔ اس لیے خط ہر مہینے نہیں لکھ سکتا"۔ یا یہ "میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ تعطیل میں باہر چلا گیا تھا، اس لیے خط نہ لکھ سکا۔" مامتا کی ماری مس روزا بیمار رہنے لگیں۔ ان دنوں ان کے بوڑھے چوکیدار کا لڑکا جو باپ کے ساتھ عید کرنے پیشاور سے آیا تھا۔ ان کی تیمارداری بے حد خیال سے کرتا رہا۔ یہ لڑکا ہزارہ کا رہنے والا گورا لانبا تنومند تھا۔ عمر اس کی تقریباً پچیس چھبیس کی ہوگی۔ مس روزا نے اس کو مستقل ملازم رکھ لیا۔ وہ کمپونڈر کی مدد دوائیاں دینے میں کرتا تھا۔ دو سال تک یہ لڑکا کلینک اور گھر دونوں جگہ تندہی سے کام کرتا رہا۔

یکایک مس روزا کراچی سے غائب ہوگئیں ان کے جاننے والے سب حیران تھے کسی سے کچھ کہے سنے بغیر وہ ایک دم کلینک اور گھر فروخت کرکے کراچی چھوڑ چکی تھیں۔ حد تو یہ ہے کہ مہرالنسا جو ان کی جوانی سے بڑھاپے تک کی دوست تھیں، ان کو بھی انھوں نے اپنے جانے کے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا۔ ہر ایک اپنے خیال کے مطابق خیالی گھوڑے دوڑانے میں مصروف تھا۔ کسی ملنے والی کا خیال تھا کہ کراچی کی مرطوب آب و ہوا سے گھبرا کر کوئٹہ چلی گئی ہیں۔ کسی جاننے والی نے کہا "ارے وہ دلی سے جوان کی ایک سہیلی آئی تھیں اور تین ہفتے ان کے ساتھ رہی تھیں ان کے ہمراہ دلی چلی گئیں۔ غرضیکہ جتنے منہ اتنی باتیں۔ صحیح علم ان کے متعلق کسی کو بھی نہیں تھا۔ ڈیڑھ سال بعد مہرالنسا کی بھتیجی ثریا کے میاں کا تبادلہ پیشاور کا ہوا اور وہ وہاں گئی تو چھوٹے لڑکے کو بخار آنے لگا۔ ڈاکٹر کا علاج کئی دن رہا۔ بخار کم تو ہوگیا اترا نہیں۔ ثریا بچے کی بیماری سے گھبرا کر رونے لگی۔ پاس کی کوٹھی میں رہنے والی ایک خاتون نے جو بچے کو دیکھنے آئی تھیں کہا "گھبراؤ نہیں، اپنے بچے کو اس لیڈی ڈاکٹر کو دکھاؤ جو بچوں کے علاج کی خصوصی ماہر ہے۔ میں تم کو کل لے چلوں گی۔"

ثریا بچے کو لیکر ہمسائی کے ساتھ لیڈی ڈاکٹر کے کلینک پہنچی تو وہ کوئی غیر نہیں مس روزا نکلیں۔ ثریا مس روزا کو سامنے پاکر بچے کی بیماری بھول کر خوشی سے بیخود ہوگئی "ارے آپ!" کہہ ان کے گلے لگ گئی۔ مس روزا نے حسب معمول "اوہ ڈارلنگ" کہہ کر اس کو پیار کیا۔ بچے کا بہت محبت سے معائنہ کیا، اپنے ہاتھ سے دوا پلائی اور انجکشن دیا۔ ثریا سے کہا "کل دوپہر کا کھانا تم میرے ساتھ کھانا، بچہ کل ٹھیک ہو جائے گا۔ اس کلینک کے پیچھے میرا گھر ہے، آؤ گھر آج دیکھتی جاؤ۔" ثریا ایک خوشنما باغ سے نکل کر جس میں ہندستانی انگریزی موسمی پھول کھل رہے تھے، ایک جھونپڑی نما گھر میں پہنچی جو ایسا لگتا تھا کہ کسی معمار نے نہیں ناواقف ہاتھوں نے پھوہڑپن سے بنایا ہے۔

ثریا نے متعجب ہوکر پوچھا "یہ آپ کا گھر ہے؟"

مس روزا چہک کر بولیں۔ "ہاں، ڈارلنگ! ہم اپنی اور اس گھر کی کہانی کل تم کو سنائیں گے۔ شام ہوتے ثریا کے بیٹے کا بخار اتر گیا بچے نے آنکھیں کھول دیں۔

دوسرے دن ثریا بچے کو آیا کے سپرد کرکے دوپہر میں مس روزا کے پاس پہنچ گئی۔ وہ آدھ گھنٹے قبل ہی کلینک سے واپس آئی تھیں اور باورچی خانے میں بیٹھی ایک تانبے کے تسلے میں آٹا گوندھ رہی تھیں۔ اس نے متعجب ہوکر پوچھا "آپ خود روٹی پکاتی ہیں؟"

وہ مسکرا کر بولیں "ہاں ثریا! میرے شوہر کو میرے ہاتھ کی پکی روٹی پسند ہے"۔ ثریا نے سوال کیا "کون ہے آپ کا شوہر؟"

مس روزا نے جواب دیا "وہ ہمارا چوکیدار جو کراچی میں تھا، اس کا لڑکا اکبر خاں۔" تم نے کراچی میں جب میں بیمار تھی اس کو دیکھا ہوگا۔ میں نے تمام عمر خلق خدا کی خدمت کی اور ہر ایک کو محبت دی لیکن کسی نے میرے خلوص کا جواب نہیں دیا۔ گولڈی بھی جس کو میں نے بیٹے کی طرح پالا بے مروت نکلا اور لندن جاکر بالکل پلٹ گیا۔ مجھے محبت صرف اکبر سے ملی۔ میرے پاس روپے پیسے کی کبھی کمی نہیں رہی۔ میں آسائش کی ہر چیز خریدتی رہی، لیکن میرے دل کو سکون کبھی بھی نہیں مل سکا۔ اس لیے میں نے اکبر سے شادی کرلی۔ وہ بہت محبت کرنے والا مضبوط کیریکٹر کا فرض شناس انسان ہے، اس نے مجھ سے صاف کہہ دیا، مجھ سے شادی کرنا ہے تو میرے طریقے پر رہنا اور مسلمان ہونا ہوگا۔ میں اکبر سے شادی کرکے بہت خوش ہوں وہ اب یہاں سیاحوں کو قابلِ دید مقامات دکھاتا ہے، صبح کا گیا شام کو تھکا ہارا آتا ہے۔ میں اس کو آتے ہی گرما گرم روٹی پکا کر دیتی ہوں، یہ گھر میں نے اور اکبر نے مل کر بنایا ہے، اس میں مجھے آرام ملتا ہے، دیکھو اس میں سونے کا کمرہ بھی ہے، اور ملاقات کا کمرہ بھی۔ جس میں یہاں کے رواج کے مطابق قالین پر گاؤتکیے رکھے ہیں صوفہ اور کرسیاں نہیں ہیں۔ سونے کے کمرے میں بھی بجائے پلنگ کے تختہ فرش پر گدے ڈال کر بستر کر لیا ہے۔ سادگی میں دلی خوشی ملتی ہے۔ بے تکلفات سے انسان کو دلی سکون نہیں ملتا۔"

مس روزا نے توے پر روٹی ڈالتے ہوئے اطمینان سے کہا۔

● ● ●

سید احمد

لغت ابجد شمار

ایک تعارف

سید احمد صاحب میک ماسٹر یونیورسٹی کناڈا میں معاشیات کے استاد ہیں۔ ان کی زیر ترتیب لغت۔ لغت ابجد شمار کا تعارف اس لیے شائع کیا جا رہا ہے کہ یہ ایک ایسے فن کے بارے میں ہے جو رفتہ رفتہ معدوم ہوتا جا رہا ہے۔ دوسرے مصنف کی خواہش ہے کہ اس فن کے جاننے والے ان کی مدد کریں تاکہ وہ اپنے کام کو بہتر بنا سکیں۔ لہٰذا قارئین سے گزارش ہے کہ اس سلسلے میں اپنے خیالات سے نوازیں۔ جنھیں "آج کل" میں شائع کیا جائے گا۔ (ایڈیٹر)۔

ادھر چند سال سے میں ایک کتاب مرتب کر رہا ہوں، جس کا عنوان میں نے "لغت ابجد شمار" اس امید میں منتخب کیا ہے کہ یہ ۱۹۸۱ میں چھپ کر شائع ہو جائے گی۔ اس مضمون کا مقصد قارئین کو اس کے مقاصد سے روشناس کرانا ہے۔

کتاب کا ایک بنیادی مقصد اور دو ضمنی مقاصد ہیں۔ بنیادی مقصد ایک لغت تیار کرنا ہے جس میں حساب جمل (حساب ابجد) کے مطابق پہلے الفاظ کے اعداد نکالے جائیں اور پھر اعداد کے تحت الفاظ اکٹھے کیے جائیں۔ کتاب کے حصۂ اول میں الفاظ کے اعداد دیئے گئے ہیں اور حصۂ دوم میں اعداد کے تحت الفاظ کو ترتیب وار جمع کیا گیا ہے۔

کتاب کے ضمنی مقاصد خاصے روایتی ہیں، مگر اس کے باوجود اس کے بنیادی مقصد سے غیر متعلق نہیں ہیں۔ پہلا ضمنی مقصد حروف اور اعداد کے تعلق کا ایک مختصر تاریخی خاکہ پیش کرنا ہے۔ اس خاکہ کا بڑا حصہ تو عربی الاساس رسم الخطوں کے حروف اور اعداد سے متعلق ہوگا، مگر یہ صرف ان تک محدود نہ ہوگا۔

کتاب کا دوسرا ضمنی مقصد تاریخ گوئی کے فن، اس کے اصول اور صنائع اور بدائع سے قارئین کو روشناس کرانا ہے۔ فن کے اصولوں پر بحث سے یہ ظاہر ہوگا کہ بہت سارے معاملوں میں اساتذۂ فن میں اہم اختلافات رہے ہیں۔ ان اختلافات کی چھان بین، اور ان کا ممکن حل دریافت کرنے کی کوشش اس بحث کا ایک حصہ ہوگی۔ اور اسی کی روشنی میں اس لغت میں استعمال کے لیے اصول منتخب کیے جائیں گے۔ دونوں ضمنی مقاصد سے متعلق بحث کتاب کے "مقدمہ" میں ہوگی۔

ذیل میں کتاب کے ان مضامین کا بالترتیب تعارف پیش کیا جاتا ہے:

لغت

اس لغت کے حصہ اول میں تقریباً انتیس ہزار الفاظ اور ان کے (ابجد کے مطابق) محسوب اعداد درج ہیں۔ لغت کی خود کفائیگی کی خاطر ہر لفظ کے معنی بھی دے دیئے گئے ہیں اور اسموں کی تذکیر و تانیث بھی۔ اگلے صفحہ پر حصہ اول کے صفحہ کا نمونہ ملاحظہ کریں۔

حصہ اول کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ عام لغت میں بھی اسی ترتیب سے پائے جاتے ہیں۔ ذیل میں ان کو میں "بنیادی" الفاظ کہوں گا۔ اس حصہ کے چند اولین صفحات میں کچھ حسابی اصول درج ہیں جن کی مدد سے ان بنیادی الفاظ سے "ماخوذ" الفاظ (مشتق) کے ابجدی اعداد آسانی سے

جدول صفحہ ۲ (ب)

	٠	١	٢	٣	٤	٥	٦	٧	٨	٩
			لائی		لائی ہیں	لائی ہو			لائی ہوں	
	لانا	لایا	لائے	لایا ہے	لائے ہیں	لائے ہو	لایا ہوں	لائی ہے	لائے ہوں	لایا تھا
٠	٠	−۴۰	−۴۱	−۲۵	+۲۴	−۳۰	+۲۱	−۲۶	+۲۰	+۳۶۶
	لائی تھی			لاتی تھی		لائی ہوں		لائی ہو		لائی ہونگی
	لائے تھے	لائی تھیں	لاتا تھا	لاتے تھے	لایا ہو	لائے ہوں	لایا ہوں	لائے ہو	لایا ہوگا	لاتے ہونگے
١	+۳۷۴	+۴۲۴	+۷۵۶	+۷۷۴	−۲۹	+۲۰	+۲۱	−۳۰	−۸	+۵۰
	لائی ہوگی	لائیں ہونگی		لاتی			لائی ہوتی			
	لائے ہوتے	لائیں ہونگے	لاتا	لاتے	لائیں	لایا ہوتا	لائے ہوتے	لائی ہوتیں	لائیں	لاؤ
٢	٠	+۱۰۰	+۳۵۰	+۳۵۹	+۴۰۹	+۳۷۲	+۳۸۰	+۴۳۰	+۹	−۴۵
				لاتی ہیں	لاتی ہو			لاتی ہوں		لارہی ہیں
	لاؤں	لائے	لاتا ہے	لاتے ہیں	لاتے ہو	لاتا ہوں	لاتی ہے	لاتے ہوں	لارہا ہے	لارہے ہیں
٣	+۵	−۴۱	+۳۶۵	+۴۲۴	+۳۷۰	+۴۱۱	+۳۷۴	+۴۲۰	+۱۷۰	+۲۲۹
	لارہی ہو							لاتی ہونگی	لاتی ہوگی	
	لارہے ہو	لارہا ہوں	لارہی ہے	لارہی ہوں	لاتا ہو	لاتی ہو	لاتا ہوگا	لاتے ہونگے	لاتے ہوگے	لاتا ہوں گا
٤	+۱۷۵	+۲۱۶	+۱۷۹	+۲۲۵	+۳۶۱	+۳۷۰	+۳۸۲	+۴۵۰	+۴۰۰	+۴۳۲
			لائیں گی	لاؤ گی						
	لا	لائے گا	لائیں گے	لاؤ گے	لاؤں گا	لائیگی	لاؤں گی			
٥	−۵۱	−۲۰	+۳۹	−۱۵	+۲۶	−۱۱	+۳۵			

نکالے جا سکتے ہیں۔ مشتق یا ماخوذ الفاظ مفعلوں کی گردان یا اسم اور صفات کی تانیث یا جمع سے بنے ہیں۔ مثلاً "چلتا ہوں" ماخوذ ہے "چلنا" سے اور "آدمیوں" ماخوذ ہے "آدمی" سے۔ ایسے الفاظ عام لغت میں نہیں پائے جاتے ہیں۔

درج بالا جدول صفحہ ۲ (ب) ان حسابی اصولوں کا ایک نمونہ پیش کرتی ہے، جس میں "لانا" کی گردان سے مشتق حاصل کئے گئے ہیں۔ اس جدول کے اصول "لانا"، "گانا" جیسے مصادر پر عاید ہوتے ہیں جن میں مصدری "نا" سے پہلے الف ہو۔[1]

جدول کے استعمال کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے مندرجہ بالا خصوصیتوں کے حامل مصدر کا عدد حصہ اول سے لیا جائے۔ مثلاً "گانا" کا عدد ۲۷ ہے۔ پھر "گاتا ہے" کے ۴۳۷ = ۳۶۵ + ۲۷ ہوئے جدول میں اس مثال کو دائرہ سے گھیر دیا گیا ہے۔ دوسرے ماخوذ الفاظ کو حاصل کرنے کے لیے بھی ایسے ہی حسابی اصول ہیں اور یہ سب حصہ اول کے چھ سات صفحوں میں بیان کر دیئے گئے ہیں۔

ان حسابی اصولوں کے شمول کی وجہ تفصیل سے بتانے کی شاید ضرورت نہ ہو، ان کے لغت میں شامل کرنے سے انتیس ہزار بنیادی الفاظ کے علاوہ تقریباً ڈیڑھ لاکھ ماخوذ الفاظ کے اعداد بھی نسبتاً آسانی سے حاصل کیے جا سکتے ہیں!

کتاب کے حصہ دوم میں الفاظ کو الگ الگ اعداد کے تحت ترتیب دیا گیا ہے۔ مثلاً وہ سارے الفاظ جس کے عدد ۱۲ محسوب ہوتے ہیں، عدد ۱۲ کے تحت حروف تہجی کی ترتیب سے جمع کیے گئے ہیں اور جن کے ۱۵۱۲ محسوب ہوتے ہیں وہ بھی اسی ترتیب سے ۱۵۱۲ کے تحت جمع ہیں۔ ذیل میں وہ سارے الفاظ جن کے ۴۶ محسوب ہوتے ہیں بالترتیب جمع ہیں۔ اس کو حصہ دوم کے ایک صفحہ کا نمونہ سمجھیے۔

اس نمونہ کے اندراج سے ظاہر ہوگا کہ حصہ دوم میں صرف بنیادی الفاظ ہی نہیں بلکہ سارے ماخوذ (مشتق) الفاظ بھی درج ہیں۔ مثلاً اس میں بنیادی لفظ "ابابیل" درج ہے، تو ماخوذ لفظ "ابابیلوں" بھی درج ہے۔ بنیادی اور ماخوذ الفاظ کی اس طرح بلا تخصیص ترتیب دینے کی وجہ ذیل میں بیان کی جائیگی۔

---

[1] مصدر "جانا" مستثنیٰ ہے۔ لہٰذا اس کے لیے ایک الگ جدول تیار کی گئی ہے

حصۂ دوم کا مقصد تاریخ گوئی کے سب سے پُر مشقت کام میں فنکاروں کی مدد کرنا ہے۔ میرے خیال میں یہ کام کسی ایسے لفظ یا فقرہ کی تلاش ہے جس کے حروف کو محسوب کرکے ایک مقررہ عدد حاصل کیا جاسکے۔ عام طور پر تاریخ گو پہلے چند الفاظ یا فقرے منتخب کرلیتا ہے۔ فرض کیا کہ ان کے ۱۲۱۰ محسوب ہوتے ہیں اور تاریخ گو کو ۱۹۸۰ کی تاریخ کہنا ہے، ظاہر ہے کہ اب اس کو ایسے لفظ یا فقرہ کی تلاش ہوگی جس کے ۷۷۰ = ۱۲۱۰-۱۹۸۰ محسوب ہوتے ہوں۔ چونکہ اس تلاش میں بنیادی اور ماخوذ الفاظ میں فرق بے معنی ہے، اس لیے اس حصہ میں دونوں قسم کے الفاظ کو بلا تفریق اعداد کے تحت جمع کیا گیا ہے۔

کتاب کے ہر دو حصہ میں اسم خاص کے لیے الگ ضمیمے شامل ہیں جنھیں مردوں اور عورتوں کے عربی اور فارسی اصل کے ناموں کے علاوہ ہندی اور سنسکرت اصل کے ناموں کے اعداد بھی دیئے گئے ہیں اور اعداد کے تحت ناموں کو جمع بھی کیا گیا ہے۔

جہاں تک مجھے علم ہے یہ اردو میں اپنی قسم کا پہلا مطبوعہ لغت ہوگا. اور تعجب نہیں کہ کسی اور زبان میں بھی اس طرح کا لغت نہ چھپا ہو۔ مگر اپنی قسم کی پہلی کتاب ہونا، کسی کتاب کے چھپنے کے جواز کے لیے کافی نہیں ہے۔ ایسی اولیت کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ کسی نے اب سے پہلے اس کام کی طرف توجہ نہ دی ہو۔ یہ وجہ بظاہر معقول بھی معلوم ہوتی ہے۔ مگر جب یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ اس طرح کی کتاب کا بغیر کمپیوٹر کی مدد کے ترتیب دینا ناممکنات میں سے ہے، اور اس لیے اب سے چند سال قبل تک اس کا چھپنا ناممکنات میں سے تھا، تو اپنی قسم کی پہلی کتاب ہونا کسی اور وضاحت کا محتاج نہیں معلوم ہوتا ہے۔ ایسی کتاب اس لیے نہیں چھپتی تھی کہ اس کا لکھنا ہی ممکن نہ تھا۔ اس سے قطع نظر کہ قدیم اساتذہ یا حال کے فنکاروں کی ایسی کتاب کے متعلق کیا رائے رہی ہوگی یا ہے۔

میں امید کرتا ہوں کہ اس کتاب کی اشاعت سے تاریخ گوئی سے اردو والوں کی دلچسپی پھر سے تازہ ہوجائے گی۔ تاریخ گوئی عربی الاساس رسم الخط والی زبانوں کی امتیازی خصوصیت رہی ہے، اور ادھر چند صدیوں سے ان زبانوں میں بھی شاید اردو ہی میں اس کا رواج سب سے زیادہ رہا ہے۔ اس رواج کا ختم ہونا اور کچھ نہیں تو ایک اور امتیازی خصوصیت کا کم ہوجانا ضرور ہوگا۔ اس کتاب کے شائع ہونے سے میرے خیال میں صرف زیادہ تاریخیں ہی نہیں کہی جائیں گی بلکہ تاریخوں کا ادبی معیار بھی اونچا ہوگا۔ اب تاریخ گویوں کو ادبی معیار کی طرف توجہ دینے کی زیادہ فرصت بھی ملے گی اور ساتھ ساتھ بہت سے اچھی صلاحیت کے فنکار جو تاریخ گوئی سے دلچسپی کے باوجود ابھی تک اس کے لیے وقت نہیں نکال سکتے ہیں، اب اس کی طرف توجہ دے سکیں گے۔ اس کتاب کے چھپنے کے بعد مستقبل کے کسی غالب کو یہ نہیں لکھنا ہوگا کہ چونکہ مادہ نکالنے والے دوست گزر گئے، اس لیے تاریخ نکالنے سے معذور ہوں! ۲ے

حصۂ دوم کے ایک صفحہ کا نمونہ

صفحہ ۳ (الف)

۴۶

آلودہ، ابابیل، اہالاہوا، ابدالاباد، اجیالا، اچکائے ہو، اچکائی ہو، اچھالو، احوال ادائیگی، اگی ہے، الاپا ہو، الجھاؤ، الہی، اہم، آئمہ، بازی گاہ، بجائیگی، بجھو گے بھوگی، بجھول، بچاجاؤ گے، بچپا جاؤ گی، بچال، بجھائیگی، بچھاجائے گا، بچھو گے بچھوگی، بدل جاؤ، بدلے، بدلی، بدیگی، بل دے، بلاؤز، بلیڈ، بلید، بوجھل، بھوچال، بھوچکے، بے دل، بیچے گا، پایا ہوگا، پیولو، پچائے گی، پچکے ہو، پچکی ہو پدم، پلید، پھپولا، پیڈل، پیدل، جھیگی، اجگ جگ، جگایا ہو، جلائی، جلیبا، جواب پائے گا، جھپکا ہے، جھوکا ہو، چلے گی، چباجاؤ گے، چباجاؤ گی، چبائے گی چبھو گے، چبھوگی، چپکے ہو، چپکی ہو، چپکایا ہو، چلواؤ، چلیپا، چمیا، چیچ، چربیل، چھبو گے، چھپوگی، چھلاوا، حبالا، حجاب آئے گا، حجلہ، دائما، دب جاؤ گے، دب جاؤ گی، دبلے، دبلی، دبے گی، دبوچے گا، دبیل، دکھا دے، دلایا، دلا ہو، دولہا، دوہے گا، دلاؤ، دھیلا، دھوئے گا، ڈھالو، ڈھاؤ گے، ڈھاؤ گی، ڈھلوا، ڈھولا، ڈھوئے گا، طبلہ، طلبہ، طولا، کباب ہوئے، کودا ہے، کوک، کھدوائے کھدوائی، کہے ہو، کہی ہو، کھودیا، گاہک، گزیدہ، گپے، گھاک، لوئی، ماہ، مو مہا، والدہ، ولی، ولے، ہالی، ہلائے، ہلائی، ہما، ہو جائے گا، ہو چکا ہو، یوگی

۲ے مرزا غالب نے دو قطعات بتقریب شادی سید غلام بابا رئیس سورت لکھے تھے مگر تاریخ نکاح نہ کہنے کا عذر کرتے ہوئے لکھا" وہ دوست جو مادہ ڈھونڈھ لیتے تھے وہ جنت کو سدھارے۔ معذور ہوں اور مجبور ہوں" ملاحظہ ہو مرقع غالب، مرتبہ پرتھوی چندر، صفحہ ۱۸۹۔ اس واقعہ کے دو دلچسپ پہلو اور نکلتے ہیں ایک یہ کہ ان دنوں یہ توقع ہوتی تھی کہ اس طرح کے قطعات میں تاریخ ضرور شامل ہوگی اور اس کا نہ ہونا معذرت طلب بات تھی۔ دوسری یہ کہ غالب جیسی حیثیت کے شاعر کے لیے بھی بلا تکلف دوستوں سے مادہ نکلوا کر

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حصّہ اول کے ایک صفحہ کا نمونہ

وصول	(مذکر)	۱۳۲	جو حاصل ہو گیا ہو
وصول پانا		۱۸۶	رقم مل جانا
وصولی		۱۴۶	قابل وصول
وصی	(مذکر)	۱۰۶	وہ شخص جس کو وصیت کی گئی ہو
وصیت	(مؤنث)	۵۰۶	سفر کو جاتے وقت یا زندگی کے آخری لمحوں میں ہدایت کرنا کہ میرے بعد ایسا کرنا
وصیت نامہ	(مذکر)	۶۰۲	تحریری وصیت
وصیتہ		۱۱۱	وصی کی جمع
وضاحت	(مونث)	۱۲۱۵	واضح کرنا
وضع	(مونث)	۸۷۶	ساخت، شکل، طرز
وضع حمل		۹۵۴	بچہ پیدا کرنا
وضع دار		۱۰۸۱	اپنے طور طریقے پر قائم رہنے والا
وضع داری	(مونث)	۱۰۹۱	ایک دفعہ اختیار کی ہوئی وضع کو مرتے دم تک نباہنا
وضع کرنا		۱۱۴۷	منہا کر دینا۔ بنانا
وضو	(مذکر)	۸۱۲	نماز کے لیے جسم کے خاص اعضا کو پانی سے دھونا
وطن	(مذکر)	۶۵	اپنا ملک
وطن مالوف		۲۲۲	وہ جگہ جس سے لگاؤ اور انس ہو
وطنی		۷۵	وطن سے منسوب
وظائف	(مذکر)	۹۸۷ (۹۹۷)	وظیفہ کی جمع
وظیفہ	(مذکر)	۱۰۰۱	تنخواہ، امدادی رقم، بخشش
وظیفہ خوار		۱۸۰۸	وظیفہ لینے والا
وعدہ	(مذکر)	۸۵	عہد، اقرار
وعدہ خلاف		۷۹۶	جو وعدہ پورا نہ کرے
وعدہ خلافی		۸۰۶	قول و قرار سے پھر جانا

ممکن ہے کہ بعض مشکل پسند حضرات یہ اعتراض کریں کہ اس کتاب کے چھپنے سے تاریخ گوئی کا چیلنج ختم ہو جائے گا، اور چونکہ تاریخ گوئی سے ان کی دلچسپی کا مدار ہی اس کی دشواری پر ہے، اس لیے اس کے چھپنے سے ان کی دلچسپی کی جڑ ہی کٹ جائے گی۔ مگر اس طرح کی دلیل ان کے تخیل اور واقفیت دونوں کی کمی کا ثبوت ہوگی۔ تاریخ گوئی کے زیادہ تر صنائع اور بدائع جن کا تفصیلی بیان ذیل میں ہوگا، اس لغت کی دسترس سے باہر ہیں۔ اور نہ صرف یہ کہ قدیم صنائع کی کوئی کمی نہیں ہے، باصلاحیت لوگوں کے لیے نئی صنعتیں گھڑنے کا دستور بھی عام رہا ہے۔ اس لیے مشکل پسندوں کے لیے میدان لا محدود ہے اور رہے گا — حتیٰ کہ اگر وہ چاہیں تو اس لغت سے کوئی لفظ اپنی تاریخوں میں استعمال نہ کرنے کا فیصلہ کر کے وہ اس سے بھی مشکل پسندی کے ذوق کی تسکین کا سامان مہیا کر سکتے ہیں —!

ظاہر ہے کہ اس لغت کے مخاطب ایسے مشکل پسند حضرات نہیں ہیں۔ یہ لغت اولاً تو ان لوگوں کے لیے ہے جو اپنی تاریخوں میں ادبی معیار کو اہمیت دیتے ہیں یا پھر ان باصلاحیت حضرات کے لیے ہے جنھیں تاریخ گوئی سے دلچسپی ہے مگر حساب جوڑنے کی مشقت طلبی ان کو اس شغل سے باز رکھتی ہے اور اس کے بعد ان لوگوں کے لیے ہے جنھیں تاریخ کہنے

بقیہ حاشیہ گذشتہ صفحہ: اپنے قطعے میں داخل کر لینا، اور اسے اپنی کہی ہوئی تاریخ کہنا کوئی معیوب بات نہیں سمجھی جاتی تھی۔

کا نہیں مگر پڑھنے کا شوق ہے۔ مگر انھیں فرصت نہیں کہ تفصیلی حساب کر سکیں اس لیے اکثر بغیر حساب ہی کے ان تاریخوں کو صحیح مان لیتے ہیں۔ اس گروہ میں اسکول کالج اور مدرسوں کے طالب علم اور اکثر اساتذہ بھی شامل ہیں۔ یہ لوگ اس کتاب کی اشاعت کے بعد نسبتاً آسانی سے قدیم اور جدید تاریخوں کو محسوب کر سکیں گے اور اس سے پورے طور پر لطف اندوز ہو سکیں گے۔ ان سب باتوں کے علاوہ تھوڑی امید' موہوم ہی کیوں نہ سہی' یہ بھی ہے کہ اس کتاب کی اشاعت مختلف اور استادوں کی متفرق رایوں کا سراغ لگانے اور بالآخر ان میں کچھ یکسانیت لانے میں بھی مدد دے گی۔

تاریخی پس منظر

اس کتاب کے مقدمہ میں حروف اور اعداد کی تعداد پر بھی ایک نظر ڈالی جائیگی۔ یہ تعلق نیا نہیں ہے اور کم از کم یونانی زبان تک جاتا ہے۔ اس زبان میں اعداد کے لیے حروف ہی کا استعمال کیا جاتا تھا۔ آج بھی رومن اعداد جو براہ راست یونانی طریقہ پر مبنی ہیں' گھڑیوں یا کتابوں کے ابواب کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ ان کے I' V' X' L' C' M وغیرہ حروف بھی ہیں اور اعداد بھی۔ عربوں نے صفر استعمال کر کے (ایجاد یہ ہندوستان کی ہے) علم الحساب میں انقلاب برپا کر دیا اور اس کے اثر سے علوم اور اس کے تہذیبی وارثوں نے بھی حروف کو اعداد کے لیے استعمال کرنا تقریباً ترک دیا۔ اس طرح یہ کہہ سکتے ہیں کہ حروف اور اعداد کے تعلق کی عربوں کے لیے وہ بنیادی حیثیت نہیں تھی جو یونانیوں اور رومیوں کے لیے تھی۔

مگر حروف اور اعداد کا تعلق صرف علم الحساب تک محدود نہیں ہے۔ شاید یہ کہنا درست ہوگا کہ حالیہ صدیوں میں اس تعلق کا جتنا استعمال عربی الاساس رسم الخطوں میں ہوا ہے' شاید اتنا اور کسی رسم الخط والی زبان میں نہیں ہوا ہے۔ ویسے تو یہ استعمال دوسری زبانوں کی طرح عربی الاساس رسم الخط والی زبانوں میں بھی جادو' ٹوٹکے' تعویذوں اور دوسرے فوق الفطرت معاملات کے سلسلے میں ہوا ہے۔ مگر موخر الذکر زبانوں کی امتیازی خصوصیت یہ رہی ہے کہ ان میں حروف اور عدد کے تعلق کو تاریخ گوئی کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے۔ حروف و اعداد کے تعلق کے اس طرح کے استعمال کی شہادت میں نے کسی اور زبان میں نہیں پائی ہے۔

عربی الاساس رسم الخطوں میں حروف اور الفاظ کا تعلق عربی کے حروف تہجی کے اٹھائیس حروف کو آٹھ کلمات :

ابجد ہوز حطی کلمن سعفص قرشت ثخذ ضظغ کی شکل میں ترتیب دینے سے آسانی سے معلوم ہو جاتا ہے۔ ابجد کے الف سے لیکر حطی کے 'ط' تک اکائیاں ہیں۔ اسی طرح 'ی' سے لیکر 'ص' تک دہائیاں 'ق' سے لیکر 'ظ' تک سیکڑے اور 'غ' کے ہزار۔ یہ تو اردو دانوں کو عام طور معلوم ہے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ اردو کے غیر عربی حروف کے لیے ان کے ہم صوت یا ہم شکل عربی حروف کو ہم عدد مان لیا گیا ہے۔ اس طرح "پ" "ب" کا ہم عدد ہے "ٹ" "ت" کا "چ" "ج" کا' "ڈ" "د" کا "ڑ" "ر" کا "ژ" "ز" کا اور "گ" "ک" کا۔ حروف تہجی کو کب اور کیوں ان آٹھ کلمات میں بانٹا گیا' اس کے متعلق فرض و نیم فرض کہانیاں مشہور ہیں اور ان میں سے چند کا ذکر مقدمہ میں بھی ہوگا۔

حروف تہجی کے مندرجہ بالا ترتیب کے متعلق ایک بات خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ اور وہ یہ ترتیب تمام عرب ملکوں میں رائج نہیں رہی ہے اور نہ ہے۔:

مغربی شمالی افریقہ (مغرب) اور اندلس میں حساب جمل کے لیے حروف تہجی کی ترتیب مندرجہ ذیل ہے (۳)

ابجد ہوز حطی کلمن صعفض قرست ثخذ ظغش

حروف تہجی کی اس ترتیب کو میں اندلسی ترتیب کہوں گا اور قبل الذکر ترتیب جو اردو میں بھی رائج ہے میں "مشرقی ترتیب" کہوں گا۔ تو مشرقی اور اندلسی ترتیبوں میں فرق پانچویں' چھٹے اور آٹھویں کلموں میں ہے۔ اور چونکہ ترتیب اور اعداد کا تعلق اندلسی طریقے میں بھی وہی ہے جو مشرقی طریقے میں' اس لیے کلموں کے ساتھ کچھ حروف کے اعداد بھی دونوں طریقوں میں مختلف ہیں۔ ایسے حروف مندرجہ ذیل ہیں:

س' ش' ص' ض' ظ' غ

مثلاً مشرقی طریقے میں 'غ' کے ہزار ہوتے ہیں' مگر اندلسی طریقے میں 'ش' کے ہزار ہوتے ہیں۔ اندلسی طریقے میں "ش" کے ہزار شمار ہونے کی مثال شمالی افریقہ میں "کرامات" کی ایک قسم کے نام سے دی جا سکتی ہے۔ اس میں ۱-۱۰-۱۰۰-۱۰۰۰ عدد استعمال ہوتے ہیں اور اس کو "ایقش" کہتے ہیں' جو ظاہر ہے ان اعداد سے بنا ہے۔ (۴)

مشرقی اور اندلسی طریقوں کا فرق بجائے خود قابل ذکر ہے مگر اس سے قطع نظر اس کی واقفیت عربی تاریخوں سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ضروری بھی ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ ان کو عربی کے اندلسی تاریخوں کا کچھ

(۳) اور (۴)، ملاحظہ ہو "ان سائیکلو پیڈیا آف اسلام"

خریداران حضرات سے
اگر آپ کو پرچہ نہیں ملا ہے یا ڈاک میں گم ہوگیا ہے تو
براہ کرم اس پتے پر لکھیں :
اسسٹنٹ بزنس منیجر (سرکولیشن)
پبلیکیشنز ڈویژن - اولڈ سکریٹریٹ
دہلی ۱۱۰۰۰۷

سراغ نہیں مل سکے گا۔

مندرجہ بالا بیان سے تو یہ بات واضح ہوگئی ہوگی کہ اندلس اور مغرب کے علاوہ باقی ساری دنیا میں حساب جمل میں مشرقی ترتیب ہی کے اعداد لیے جاتے ہیں اور ظاہر ہے اس لغت میں بھی مشرقی اعداد ہی لیے گئے ہیں۔

یہ واضح رہے کہ مشرقی اندلسی طریقوں کا فرق بنیادی ہے۔ اور اس فرق سے مختلف ہے جو ابجد، ہوز وغیرہ سے حاصل کیے ہوئے اعداد ہی کو مختلف ترتیب سے لکھ کر ان کے حروف کے کلمات بنانے سے ان کلموں میں ہوتا ہے۔ مثلاً مشرقی طریقے ہی کے اعداد اور حروف کی اس طرح بھی ترتیب دی گئی ہے:

ایقغ، بکر، جلش، دمت، ہنث، وسخ، زعذ، حفض، طصظ

اس ترتیب میں پہلے کلمے کے حروف کے اعداد ۱ - ۱۰ - ۱۰۰ - ۱۰۰۰ ہیں، دوسرے کے ۲ - ۲۰ - ۲۰۰ ہیں۔ علیٰ ہٰذ القیاس۔ ایک دلچسپ توارد یہ ہے کہ اندلسی طریقے میں بھی اعداد کو اسی طرح ترتیب دے کر کلمات وضع کیے گئے ہیں۔ اس ترتیب کا پہلا کلمہ "ایقش" بنتا ہے جس کا ذکر قبل آچکا ہے۔

حساب جمل کے چند اختلافات ؎

مندرجہ بالا بحث سے اگر کچھ قارئین نے یہ قیاس کیا ہو کہ مشرقی یا اندلسی طریقوں میں کسی ایک کو اپنا لینے کے بعد حروف کے اعداد لینے میں کوئی اختلاف رائے نہیں ہے تو یہ قیاس غلط ہوگا۔ نہ صرف مشرقی بلکہ اندلسی طریقے کے اساتذہ فن میں بہت سے اختلافات رہے ہیں اور کم سے کم مشرقی طریقے میں یہ ابھی تک حل نہیں ہوئے ہیں۔ میں مقدمہ کے اس حصہ میں ان کا تجزیہ کرنے کی کوشش کروں گا اور پھر ان اصولوں کی بنیاد کو واضح کرنے کی کوشش کروں گا جو اس لغت میں الفاظ کے اعداد حاصل کرنے میں استعمال کیے گئے ہیں۔

میرے خیال میں ان سارے (یا تقریباً سارے) اختلافات کا بنیادی مسئلہ ایک جملہ میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ حروف کی تحریری شکل (کتابت) کے اعداد لیے جائیں یا الفاظ میں ان کی آواز (تلفظ) کو بھی ملحوظ رکھا جائے۔

اساتذہ میں اہم اختلافات مندرجہ ذیل معاملوں پر رہے ہیں۔ ان پر غور کرنے سے مندرجہ بالا بیان کی تصریح ہو جاتی ہے:

(۱) الف ممدودہ، مثلاً "آورد" کے "آ" کا ایک عدد لیا جائے یا دو؟

(۲) "عیسیٰ" میں "ی" کے دس محسوب کیے جائیں کہ ایک؟

(۳) "رحمٰن" میں کھڑے زیر کا صفر لیا جائے یا ایک؟

(۴) "دفعتاً" میں "اً" کے ایک محسوب ہوں یا پچاس؟

(۵) مشدد حروف مثلاً "عزت" میں "ز" کو ایک دفعہ محسوب کیا جائے یا دو دفعہ؟

(۶) ء (ہمزہ) جو باوجود عربی الاصل ہونے اور حروف تہجی میں شامل ہونے کے ابجد، ہوز وغیرہ کے کسی کلمے میں شامل نہیں ہے، اس کے صفر محسوب ہوں یا یہ اپنے ہم صوت حرف کے عدد دے؟ مثلاً "کھیئے" میں "ی" کے عدد اور "آؤ" میں "ا" کے یا "و" کے؟

(۷) توبہ" اور "توبۃ النصوح" میں (ہ، ۃ) کو "ہ" مان کر پانچ لیے جائیں یا "ت" مان کر چار سو محسوب ہوں؟

ان سات سوالوں میں پہلے چھ کے جواب کا انحصار تو براہ راست اس بات پر ہے کہ آیا مکتوب کے عدد لیے جاتے ہیں یا ملفوظ کے، اور ساتویں کا جواب بھی اس مسئلے سے الگ نہیں ہے۔ ان سوالوں کو بالترتیب لیجئے۔

الف ممدودہ میں حرف ایک الف ہے۔ اس کی "مد" حرف نہیں، حرکت ہے اور حرکتوں کے کوئی عدد مقرر نہیں ہیں۔ اس لیے کتابت کے لحاظ سے الف ممدودہ کا صرف ایک محسوب ہوگا۔ اس کے دو عدد ماننے کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ تلفظ کے لحاظ سے اس "مد" کو ایک اور الف مان لیں۔

"عیسیٰ" میں ی کے دس جوڑیں گے اگر مکتوب کے عدد لیں اور صرف ایک، اگر ملفوظ کے عدد لیں۔ اسی طرح "رحمٰن" میں کھڑے زیر کے کتابت کے لحاظ سے صفر اور تلفظ کے لحاظ سے ایک۔ "دفعتاً" میں کتابت کے حساب سے "اً" کے ایک محسوب ہوں گے مگر تلفظ کے لحاظ سے پچاس۔

مشدد حروف کتابت کے لحاظ سے صرف ایک دفعہ جوڑیں گے اس لیے کہ تشدید بھی حرف نہیں، حرکت ہے۔ مگر تلفظ کے حساب سے مشدد حروف کو دو دفعہ جوڑیں گے۔

چونکہ ء (ہمزہ) عربی الاصل ہونے اور حروف تہجی کا حصہ ہونے کے باوجود ابجد ہوز وغیرہ کے کسی کلمہ میں نہیں آتا ہے، کتابت کے لحاظ سے اسے صفر ہی محسوب کیا جا سکتا ہے۔ تلفظ کے لحاظ سے تو ظاہر ہے اسے اسی حرف کا عدد دیں گے جو اس کا ہم صوت ہوگا۔

تائے مدورہ یا مربوطہ کا مسئلہ جو "توبہ" اور "توبۃ النصوح" کے معاملے میں اٹھتا ہے، ان خانوں میں بانٹنا کسی قدر زیادہ مشکل ہے۔ مگر اس سلسلے میں بھی فیصلہ کتابت اور تلفظ کو نظر میں رکھے بغیر ممکن نہیں ہے۔ "توبہ" "توبۃ النصوح" میں تلفظ کے لحاظ سے فیصلہ نہایت آسان ہے۔ اوّل الذکر میں تلفظ "ہ" کا ہے اس لیے پانچ محسوب ہوں گے، آخر الذکر میں "ت" کا ہے اس لیے چار سو۔ کتابت کے لحاظ سے بھی "توبہ" کا فیصلہ آسان ہے۔ کتابت "ہ" کی ہے اس لیے عدد پانچ ہوئے۔ مگر کتابت کے لحاظ سے "توبۃ النصوح" کے

---

(۵) حساب جمل کے اصولوں کے متعلق رائے قائم کرنے میں مجھے ڈاکٹر سید حنیف نقوی، بنارس یونیورسٹی سے خط و کتابت سے بڑی مدد ملی ہے۔ اس کے باوجود کہ بہت سے مسائل میں میں ان سے کلیتاً اتفاق نہیں کر سکا ہوں میں ان کا بے حد شکر گزار ہوں۔ ظاہر ہے مندرجہ ذیل بحث کی خامیوں کی ان پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

(بقیہ صلا پر)

میری آرزو

نصیر پرواز

آسماں سے برستی رہیں رحمتیں اور زمیں فصلِ ارماں اگاتی رہے
آدمی پیار کے پھول چنتا رہے، زندگی خوشبوؤں میں نہاتی رہے

یہ جو ننھے اجالے سرِ شاخ ہیں گدگدائے انھیں عقل کا بانکپن
علم و تہذیب ان کے بدن پہ سجے آگہی ان سے نظریں ملاتی رہے

کھیت سونے کے دانے اگلتے رہیں ندیاں خون بنکر رگوں میں بہیں
دن محبت کی سوغات دیتا رہے رات خوابوں کی دولت لٹاتی رہے

ایک اک سانس پر ہو رفاقت رقم ہر بدن آدمیت کی تاریخ ہو
امن اور دوستی کے حسیں سایے میں ہر جوانی پسینہ بہاتی رہے

ذات اور پات کے دائروں سے پرے سانس لیتا ہوا ایک انساں ملے
دھرم انصاف و اخلاق کا نام ہو فائدہ جس سے دُنیا اٹھاتی رہے

بوڑھے برگد کے گمبھیر سایے تلے ہانپتی دوپہر دو گھڑی بیٹھ لے
نیند جسموں پہ آرام لکھتی رہے اور ہوا لوریاں گنگناتی رہے

ساری پرچھائیاں ساری تنہائیاں قربتوں کے تصوّر سے مہکی رہیں
عشق زندہ رہے حسن زندہ رہے دھوپ امید کی راس آتی رہے

شہر بنتے رہیں گھر سنورتے رہیں رونقیں بام و در پر فروزاں رہیں
ہر سڑک آہٹوں سے منوّر رہے ہر گلی گیت چاہت کے گاتی رہے

آرزو جو کھلی ہے مہکتی رہے جستجو جو ہنسی ہے، ہمکتی رہے
ہونٹ لفظوں کی تفسیر لکھتے رہیں آنکھ خوابوں کی جنت سجاتی رہے

رنگ اور نور کی پاس اور دُور کی بارشیں جسم و جاں کو معطّر رکھیں
آئے کوئی بھی رُت وادیٔ شوق میں من جگاتی رہے تن کھلاتی رہے

جب بھی تاریک ہیولے کا سایہ بڑھے قتل پرواز جس وقت ہو چاندنی
سانس بھی بار بن جائے سینے پہ جب کم سے کم میری آواز آتی رہے

غزل

بلراج حیرت

بڑا گھنا ہے اندھیرا، بڑی اداس فضا
لرز رہی ہے عجب ناگہانیوں سے ہوا

ہم اور کرتے بھی کیا گھر میں بیٹھنے کے سوا
قدم قدم پہ کھڑی تھی فلک بدوش انا

تمام عمر وہ گہرے سمندروں میں رہا
مگر کبھی اسے پانی کا ذائقہ نہ ملا

مقابلہ ہے زبردست لایقینی سے
میں اپنا جام اٹھاؤں تو اپنا ساز اٹھا

خلوصِ کربِ محبت پہ انحصار نہ کر
اترتی چڑھتی ہوئی دھوپ سے نظر کو بچا

بس اک ابھرتی ہوئی چیخ کی بھنک سی پڑی
پھر اس کے بعد کسی نے بھی اور کچھ نہ سُنا

علامتیں ہیں بشر سے بشر کے رشتے کی
تمہارے ہاتھ میں خنجر ہمارے لب پہ دعا

پہنچ کے منزلِ ہستی پہ ہم تو لوٹ آئے
چہار سمت بجز اپنی ذات، کچھ بھی نہ تھا

اصول جیسے بھی ہوں سرد مہر ہوتے ہیں
نہ ڈھونڈ ان میں تعلق کی والہانہ ادا

بہت سے کام میاں بے ارادہ ہوتے ہیں
انھیں میں ایک کو کہتے ہیں ارتکابِ وفا

ہمیں بھی گزرے ہے کن پر گمانِ ہمسفری
خود اپنا ساتھ بھی جن سر پھروں نے چھوڑ دیا

ہزار منزلِ مقصود ایک ہو لیکن
تمہاری راہ جدا ہے ہماری راہ جدا

یہ منصفانہ رویہ بُرا لگے ہے مجھے
محبتوں سے عطا کر محبتوں کی سزا

سبھی نے ٹوکا تھا حیرت کہ اس سے دُور رہو
چکھو بالآخر اب انسان دوستی کا مزا

عزیز مرادآبادی

"ارے کمبختو! کیا توڑ ڈالا تم نے؟ اتا نی ماروں کو ایک سکنڈ تو قرار نہیں ہے!" صابرہ نے جھنجھلا کر باورچی خانے سے ڈانٹ پلائی۔ لیکن کسی بچے نے سانس نہیں لیا۔ وہ پھر چیخی۔

"بدنصیبو! بتاتے ہو کہ نہیں' یا میں جوتا لے کر آؤں؟ ایک ایک کی چاندگنجی کردوں گی' سمجھے!" پھر وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔ "نصیبوں جلی! کمو نے بھی ناک چنے چبوا رکھے ہیں۔ جب جی چاہتا ہے غیر حاضر ہو جاتی ہے۔ آجائے ذرا جوانمری! پتہ نہ کاٹا ہو اس کا تو میرا بھی نام نہیں! مہینے کے مہینے مٹھی بھر روپے لے جاتی ہے' جیسے حرام کی کمائی آرہی ہے ہمارے گھر میں' اس پر بھی ہزار نخرے! موئی کو دب کر کبھی بات کرنا بھی گوارا نہیں' مالکن ہو گئی ہماری اور ہم اس کے نوکر ـــــ الٹی گنگا بہہ رہی ہے .... !!" یکایک صابرہ کو پھر خیال آیا' اور پہلے سے زیادہ زور سے چیخی۔ "ارے' منڈی کاٹو: تم نے ابھی تک سانس نہیں لیا؟ کس چیز کا بیڑہ غرق کر دیا ہے! سانپ سونگھ گیا ہے کیا تمہیں؟ جھاڑو پھرو! کچھ تو اپنے منہ سے پھوٹو؟ آگئی نا' تو دھن کے رکھ دوں گی ایک ایک کو .... !!" بچوں کو واقعی سانپ سونگھ گیا تھا۔ ان کے سانسوں تک کی آہٹ کمرے سے باہر نہیں نکل رہی تھی۔ ماحول میں بوجھل سناٹا تھا۔ صرف صابرہ کے ہاتھ تھپ تھپ کی آواز پیدا کر رہے تھے۔ اسے روٹی بنانے کی جلدی تھی۔ شوہر کو دفتر' بچوں کو اسکول جانا تھا' پھر اسے خود بھی دفتر جانا تھا۔ کمو کی غیر حاضری نے ایک دم اس کے لیے کام پھیلا دئے تھے۔ جب بھی کمو غیر حاضر ہوتی تو ہمیشہ اسی طرح کام پھیل جاتے تھے۔ ایسے مواقع پر صابرہ کو جھنجھلاہٹ' چڑچڑاپن' بدمزاجی سے دانتوں کو بھینچ لینا پڑتا تھا۔ اور کمو جیسی آرام دہ شخصیت اس کے لیے انتہائی تکلیف دہ بن جاتی تھی۔ اس کی عدم موجودگی میں صابرہ ہمیشہ فیصلہ کرتی تھی کہ اس کا حساب صاف کر کے کسی کنواری لڑکی کو نوکر رکھے گی' مگر جب کمو کا ہنس مکھ چہرہ اس کے سامنے آتا تو غصّے کی باگ پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی اور دو چار سوال و جواب کے تبادلوں کے بعد حالات پھر معمول پر آجاتے! معمولات کا پہیہ زندگی کی شاہراہ پر لڑھکنے لگتا۔

"دھڑام! دھڑڑ دھڑڑ .... !!"

"لو' ٹھہر جاؤ! چمٹے سے ہی تمہاری کھال نہ سونت دی تو ..... !!" صابرہ روٹی توے پر ہی چھوڑ کر کمرے میں جا پہونچی۔ چاروں بچے ایک کونے میں دبک گئے تھے۔

"کہاں مر گئے سب کے سب!؟" اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ باہر کی روشنی میں سے نکل کر کمرے کے اندر اسے چند منٹ تک اندھیرا ہی اندھیرا نظر آیا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہر چیز کو بغور دیکھنا چاہتی تھی۔ دھیرے دھیرے جب کمرے کی عارضی تاریکی نے اجالے کا جامہ زیب کیا تو پیر سے سر تک بجلی سی لہرا گئی۔ کمرے کا فرش اس میدان جنگ کا نقشہ پیش کر رہا تھا جب شکست خوردہ فوج اپنا مال و اسباب چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوتی ہے! اُسی طرح صابرہ کے بچے خوف کے مارے بظاہر غائب تھے۔

آٹے دال اور چاولوں کی مٹکیاں فرش پر ٹوٹی پڑی تھیں۔ سب اجناس ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو گئے تھے' مانو کھچڑا! سامنے کے کونے میں نیا والا ٹی سیٹ اپنی بربادی پر آنسو بہا رہا تھا۔ سیٹ قیمتی ہونے کی باعث ابھی تو اسے استعمال بھی نہیں کیا گیا تھا۔ اسے مخصوص مہمانوں کے لیے رکھ چھوڑا تھا ...... یہ دیکھ کر صابرہ کو بڑا رنج ہوا۔ اس نقصان کا ذمہ دار اس نے کمو کو ٹھہرایا۔ اگر وہ غیر حاضر نہ ہوتی تو بچوں کو میں ایسا موقع ہی کب دیتی! دال چاول وغیرہ کو تھوڑی محنت کر کے کام میں لایا جا سکتا ہے' مگر اتنا نازک ٹی سیٹ تو آس پاس' قریب میں کہیں ملے گا بھی نہیں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ ان کے دوست نے قارن سے منگا کر دیا ہے ...... جب دیکھیں گے

سیٹ کے ٹکڑے تو ان کا دل کیا کہے گا؟ غصّے میں بھن کر رہ جائیں گے! اس کا مطلب ہے کہ میری شامت بھی آئی! اور پتہ چلے گا کہ یہ حرکت بچوں کی ہے تو عجب نہیں کہ کسی کی ہڈی پسلی بھی توڑ ڈالیں۔ ......!! اگر یہ علم ہوا کہ کمّو کی غیر حاضری نے یہ گل کھلایا ہے تو اس حرافہ کو تو وہ کچا ہی چبا جائیں گے، چلو! اس طرح تو میرا دل بھی ٹھنڈا ہوگا۔ پھرتی ہے ان کے آگے پیچھے ادائیں دکھاتے ہوئے۔ اجب وہ خبر لیں گے اس ڈائن کی تو پتہ چلے گا، مالک کی مہربانی اور شفقت کا

"ارے بھئی کہاں ہو! ؟

"آئی جی! ابھی آتی ہوں ——!" وہ گھبرائی گھبرائی سارا سامان یوں ہی بے ترتیب پڑا چھوڑ کر الٹے پاؤں دوڑ پڑی ۔

"کسی چیز کے جلنے کی بو آرہی ہے؟ آرہی ہے نا صابرہ!؟" تسکین رضا نے مسکرا کر پوچھا —— رضا صاحب کا موڈ بہت اچھا لگ رہا تھا۔

"ہاں روٹی توے پر چھوڑ گئی تھی، جل گئی ہوگی!" صابرہ نے خفیف مسکراہٹ کے پردے میں اپنی گھبراہٹ چھپائی ۔

"کیا یہ کمّو کی بچی ابھی تک نہیں آئی —— !"

"آج پھر جانے کہاں مرگئی؟ میں تو اس سے تنگ آگئی ہوں! کوئی اور بندوبست کرنا پڑے گا جی!" صابرہ باورچی خانے میں پہونچ کر بولی۔

"دیکھا جائے گا!" پھر تسکین رضا نے فکرمندی کے ساتھ صابرہ کو بتایا "جب بھی بازار جاتا ہوں تو تقریباً ہر چیز کا بھاؤ گڑبڑ ملتا ہے۔ گرانی کا یہ عالم کہ جیسے ساری چیزیں کالا دھندہ کرنے والوں کے لیے ہی رہ گئیں ہیں۔"

"بھاؤ بڑھنے کی ذمہ داری ذخیرہ اندوزوں اور ناجائز منافع خوروں پہ ہے۔ خالی خولی بھاؤ میں اضافہ چیزوں کی نایابی کے کارن نہیں ہے۔ مصنوعی قلت پیدا کرنے والوں کا سر پیٹیے ......!!" صابرہ کی زبان پر تو تلخی کی تہیں بہت دیر سے جمی ہوئی تھیں ۔

"چھوڑو، میں تو کسی سے بدلہ لینے کے موڈ میں ہوں نہیں —— ہاں' اس تمہید کا مقصد یہ بتانا تھا محترمہ! کہ میں اس امپورٹیڈ ٹی سیٹ کے لیے ایک خوبصورت سی ٹرے خریدنے کی کوشش میں تھا۔ ایک بڑی پیاری ٹرے دیکھی بھی، مگر اس کی قیمت غالباً سیٹ سے بھی زیادہ تھی۔ سوچا' چھوڑیئے رضا صاحب! بغیر ٹرے کے بھی کام چل جائیگا۔ مگر تسکین میاں نے اُکسایا اتنے خوبصورت ٹی سیٹ کے لیے ٹرے کی اہمیت لباس کی سی ہے۔ بغیر ٹرے کے سیٹ ننگا ننگا سا لگتا ہے ...... تو بیگم صاحبہ! اس طرح ہم کراکری کی دوکان پر دو حصوں میں بٹ گئے تھے۔ تسکین میاں اپنی ہانک رہے تھے اور رضا صاحب اپنی منطق الگ پیش کر رہے تھے۔ میں نے اپنے دونوں ٹکڑوں کی حجت و دلائل بغور سنیں اور فیصلہ تسکین میاں کے حق میں کردیا ......!! پھر وہ بے انتہا بشاشت سے بولے۔ "لاؤ بھئی مبلغ آٹھ روپے عنایت کرو! ٹرے پیک کروا کر دوکان پر ہی چھوڑ آیا ہوں۔ رکشہ سے جاکر ابھی اٹھا لاتا ہوں' کبھی دفتر لیٹ پہونچوں! روٹی بعد میں پکانا! پہلے روپے

دے دو! ...... کیا بچّے اسکول چلے گئے ہیں؟ نظر نہیں آرہے ہیں ایک بھی؟"

"نہیں کہیں ہوں گے —— فضول پیسہ برباد کرنے سے کیا فائدہ؟ اتنی مہنگی ٹرے! جب سستی ہو جائے گی' خرید لیں گے۔ ابھی جلدی بھی کیا ہے؟ ایسا چھچھورا پن مجھے بالکل پسند نہیں ہے! کم از کم کسی چیز کو خریدنے سے پہلے مجھ نا چیز سے بھی مشورہ کر لیا کریں آپ' تو کون سا آسمان میں خلل پڑ جائے گا ......!؟"

صابرہ نے آخری بات تسکین رضا کو محظوظ کرنے کے لیے کہہ دی تھی تاکہ اس کا موڈ بہت اچھا ہو جائے' تو ٹی سیٹ کے ٹوٹنے کی بات بتا دینے سے حالات پُرسکون رہیں گے اور بچوں کی دھنائی نہ ہو سکے گی!! مگر وہ اپنے شوہر کے غیر متوقع جواب پر تصویرِ حیرت بنی رہ گئی تھی ۔

"ٹھیک ہے! بس' اب اس گھر میں صرف تمہاری خواہشات اور احکامات کا ہی راج رہے گا۔ شوہر کی یہاں ضرورت ہی نہیں ہے ......!!" یہ کہہ کر تسکین رضا گھر سے باہر نکل گئے تھے ۔

"بھد بھد ...... بھد بھد ......!" آگے پیچھے چاروں بچے بھی بھاگتے ہوئے باورچی خانے کے سامنے سے گذر کر باہر نکل گئے تھے ۔

دوپہر کے بعد کمّو غیر متوقع طور پر آگئی ۔ صابرہ بے حد اداس ایزی چیئر پر دراز تھی۔ اس کی آنکھیں دکھ کی غماز تھیں۔ کمّو نے مالکن کو دیکھا تو ٹھٹک کر رہ گئی۔ "بیگم صاحبہ خیر تو ہے!؟"

"تو —— تو؟ کہاں مر گئی تھی؟" صابرہ بپھر پڑی ۔

"مری نہیں تھی۔ ہاں مر ضرور جاتی اگر اللہ میاں کی نظر سیدھی نہ ہوتی تو ...!" کمّو کی آواز میں درد تھا۔ مگر اس کا درد صابرہ کے دکھ کے سامنے کچھ بھی نہیں تھا۔

"کمبخت! اگر مر جاتی تو مجھے قرار آجاتا!"

"آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں مالکن؟"

"تیری وجہ سے میرا گھر تباہی کے دہانے پر کھڑا ہے کمّو!"

"میری وجہ سے ——؟ میں کچھ نہیں عقل کی ماری؟"

"تو کیا سمجھے گی؟ تجھے جب پیٹ بھر کر نہیں ملے گی نا' تو خود بخود سب سمجھ میں آجائے گا!"

"لیکن پیٹ بھرنے والا وہ ہے' جس نے منہ چیرا ہے!"

"تو ٹھیک ہے! اپنا انتظام کہیں اور کرلے! ہم بھر پائے تجھ سے!" یہ بات صابرہ نے قدرے نرمی سے کہی ۔

"میں بھی حساب صاف کرنے ہی آئی ہوں"۔ یہ سن کر صابرہ حیران رہ گئی۔ اس کی سوچتی ہوئی آنکھوں نے سبب معلوم کیا تو کمّو بولی ۔ "میرا بچہ رات سے سخت بیمار ہے۔ میں بوڑھی ماں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر ایسی نوکری نہیں کر سکتی جس میں میری روح تک جکڑی رہے۔"

"بس تو ٹھیک ہے! اب ہمیں بھی تیری ضرورت نہیں ہے"۔ صابرہ کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا کہ کمّو جیسی فرماں بردار نوکرانی کی چھٹی کرے مگر غصّے کی دلدل

میں پھنس کر اس نے اپنے وقار کو مجروح ہونے سے بچا لیا اور گٹو کو سلام کر کے ہمیشہ کے لیے اس کے گھر سے چلی گئی۔ لیکن اسے سوچ کے دائروں میں الجھا بھی گئی ـــ گٹو نے اپنے بچے کے کارن نوکری چھوڑ دی! اسے بچے کی اتنی فکر! اور میں اپنے بچوں کی خاطر نوکری کرتی ہوں۔ کیا مجھے بھی ملازمت سے سبکدوش ہو کر بچوں کی صحت و تربیت پر توجہ دینی چاہیے؟ نوکروں کے رحم و کرم پر بچوں کو چھوڑ کر ان کی صحیح تربیت ممکن ہے؟ جوان نوکر بوڑھی ماں سے بہتر ثابت ہو سکتا ہے بچوں کے حق میں؟ میرے اگر ایک دو بچے ہوتے تو اپنی ماں کو اپنے پاس رکھ لیتی۔ وہ بچوں کی دیکھ بھال کرتی رہتی اور میں اپنی کمائی سے اُن کے مستقبل کو شکوک و شبہات سے آزاد کر دیتی...... مگر چار بچوں کی مہابھارت کے مسائل سے وہ تنہا کیسے نپٹ سکتی ہے؟ تو پھر مجھے نوکری چھوڑ ہی دینی چاہیے؟ مگر نوکری چھوڑنا تو بچوں کے حق میں اور بھی برا ہوگا! ان کی محدود آمدنی بچوں کے درخشندہ مستقبل کی ضمانت ہرگز نہیں بن سکتی.....!! پھر اس نے آنکھیں کھول کر چاروں طرف نظر دوڑائی۔ شوہر اور بچوں کا خیال آیا۔ بچے ابھی تک واپس نہیں آئے تھے۔ خدا جانے وہ کہاں چلے گئے تھے!؟ وہ مزید رنجیدہ ہو گئی۔ اس کے دل میں بُرے بُرے خیالات ابھرنے ڈوبنے لگے۔ اس نے اپنے آپ کو انگاروں پر لوٹتے ہوئے محسوس کیا...... پھر اچانک بے شمار کانچ کے ٹکڑے سے اس کی کوکھ میں چبھنے لگے۔ اس نے سوچا۔ "اف خدایا! کیا چار بچے میری زندگی میں الجھنیں پیدا کرنے کے لیے کم ہیں جو تو نے نئے بچے کے اسباب پیدا کر دیئے؟ پانچواں بچہ بھی ٹی سیٹ توڑنے کے لیے پیدا ہوگا؟ جب کہ ٹی سیٹ سے ہی میرے گھر میں تلخی کے سوتے پھوٹ پڑے ہیں...... نہیں یہ صورت حال میرے لیے برداشت سے باہر ہے......!! کرب ناک خیالات سے زچ ہو کر صابرہ کرسی سے اٹھی۔ کمرے کو مقفل کیا اور سری واستو جی کی کوٹھی پر پہنچ گئی۔ وہاں سے اس نے تسکین رضا کو فون کیا۔ ہیلو ہیلو!!"

"کون؟"

"میں مسز رضا بول رہی ہوں۔ تسکین رضا صاحب سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔"

"اچھا بھابی بول رہی ہیں ـــ! نمسکار بھابی" تسکین کے ایک کلیگ نے جواب دیا۔

"رضا صاحب کو فون دے دیجیے، شکریہ!"

"لیکن وہ تو آج چھٹی پر ہیں!"

"کیا ـــ! چھٹی پر؟" صابرہ کے دل پر گھونسہ سا لگا۔

"کیا آپ شادی میں نہیں گئیں؟"

"کہاں؟ کس کی شادی میں؟"

"رضا صاحب کسی دوست کے لڑکے کی شادی کے بارے میں کل مجھے بتا رہے تھے۔ تعجب ہے آپ کو علم نہیں!"

"اچھا اچھا میں سمجھ گئی۔ وہ ذکر تو کر رہے تھے، مگر میں نے اپنی طبیعت کی وجہ سے منع کر دیا تھا اور پھر میں دن تاریخ بھول ہی گئی تھی۔ اب یاد آیا صبح وہ شادی میں جانے کو ہی کہہ رہے تھے۔ اچھا بھیا زحمت کے لیے شکریہ!!" صابرہ نے بات بنائی۔

گھر لوٹی تو صابرہ حیرت زدہ رہ گئی۔ باپ اور بچے گھر پر موجود تھے! تسکین رضا کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ تھی اور بچے صابرہ کی شکل دیکھ کر کسی قدر ہراساں ہو گئے تھے۔ ابھی وہ کچھ کہتی کہ تسکین رضا نے ہی پوچھ لیا۔ "کیوں کیا بات ہے؟ تمہاری آنکھیں سوج رہی ہیں؟" اتنا سننا تھا کہ صابرہ کی آنکھوں سے جھر جھر آنسو بہہ نکلے! تسکین نے اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ "صابرہ! تم ذرا ذرا سی بات پر دل مت تھوڑا کیا کرو! صبح بس میرا یونہی موڈ خراب ہو گیا تھا۔ جب میں باہر نکلا تو بچے بھی پیچھے پیچھے پہونچ گئے تھے۔ انھوں نے اس خوف کا اظہار کیا کہ امی ماریں گی۔ تو میں انھیں بھی اپنے ساتھ شادی میں لے گیا۔ ہاں تم سے شادی کے بارے میں میں نے اس لیے نہیں کہا تھا کہ خواہ مخواہ تمہیں زحمت ہوگی بچوں کے ساتھ میں!! ـــ خیر جب ہم شادی والے گھر پہونچے، تو بچوں نے مجھے ٹی سیٹ ٹوٹنے والی بات بتائی۔ تب میری سمجھ میں آیا کہ تم نے ٹی خریداری کو ٹالنے کی اصل وجہ کیا تھی! بس پھر تو میرا موڈ ایک دم سدھر گیا۔ میرے دل میں ایک بھی غصے کا دھبہ نہیں رہا۔ شادی کی تقریب سے فراغت پاتے ہی معذرت طلب کرنے کے لیے بندہ حاضر ہو گیا......!!" اسی دوران میں اس نے صابرہ کی زوردار چٹکی بھری! وہ تڑپ کر رہ گئی"۔ صابرہ کی دن بھر کی کوفت، بوریت اور دکھ غبار کی طرح پل بھر میں ہوا ہو گئے۔ اور کسمساتے ہوئے اس نے تسکین رضا کی لطف آگیں باہوں سے خود کو آزاد کرا لیا۔ وہ چائے بنانے کے لیے سیدھی باورچی خانے میں پہونچی۔ مگر یہ خیال اس کے دماغ پر مسلط رہا۔ "ٹی سیٹ کے ٹوٹنے کی خبر پا کر بچوں کو کچھ نہیں کہا انھوں نے؟ بچوں کی شرارتوں اور اوٹ پٹانگ حرکتوں سے میں ہی اپنی جان کو جلاتی اور بھونتی ہوں؟ بچوں کے کم یا زیادہ ہونے کا اثر ان کی جان پر رتی بھر نہیں؟ میں ہر سال بچے کو جنم دینے کی اذیت سے دوچار ہوتی ہوں۔ ہر بار موت کے قریب سے ہو کر گذرتی ہوں..... اور صحت پر جو برا اثر پڑتا ہے، وہ تو دائمی ہے ہی۔ مگر ان پر ان ساری باتوں کا کیا اثر پڑتا ہے؟ وہ تو ماہ بہ ماہ تنخواہ لائے، ہاتھ پر رکھی اور مہینے بھر کے لیے بے فکر...!! میں اکیلی ہی سارے گھر کے مسائل میں خود کو کیوں الجھاؤں؟ فضول کا درد سر لیے پھری ہوں اب تک! اب مجھ سے یہ نہ ہوگا!...... میں اپنی بوڑھی ماں کو اپنے پاس رکھوں گی۔ کل آفس سے اور چھٹی لے کر مسائل کا حل ایک مسئلے کے حل کے ذریعے حاصل کر لوں گی۔ کل ہی میں خاندانی فلاح و بہبود کے مرکز سے رابطہ قائم کر کے ہمیشہ کے اس دردِ سر سے چھٹکارا پا لوں گی...... !!" اس تہیے کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر رونق چھا گئی۔ کوکھ میں چبھتے ہوئے کانچ کے ٹکڑوں کی چبھن ختم ہو گئی تھی۔

●●

عزیز اندوری

قصّہ حاتم طائی کی داستانوی اہمیت

داستان گوئی کا رواج انسانی ذہن کے اس استعجابی اور کسی حد تک ارتقائی عہد میں عالمِ وجود میں آیا جب انسان شعوری اعتبار سے اپنی قوتِ متخیلہ اور قوتِ ممیزہ کے سہارے تجسّس و تلاش کی راہوں پر دھیرے دھیرے گامزن ہو رہا تھا۔ اور جس نے اسے "جدید تر" انکشافات و معلومات کے تحت استعجاب و کشمکش کے معصومانہ جذبات کے قریب تر کر دیا تھا۔ نیز وہ ان ارتقائی تصورتوں میں کچھ اس طرح منہمک ہوا تھا کہ اس کی زبان پر پہلی بار "پھر کیا ہوا؟" اور "آگے کیا ہوا؟" جیسے استعجابی جملے آنے لگے تھے۔ مگر اس کے اس جذبے کے پسِ پردہ اس کی قوتِ عقل اور قوتِ ممیزہ بھی کسی حد تک کارفرما تھی پھر بھی وہ ابتدائی عہد میں اس منزل تک نہیں پہنچ پایا تھا جہاں اس کے لیے خطرہ اور غیر فطری عمل کا قطعی عرفان کر لینا آسان ہوتا۔

یہی سبب ہے کہ اسے ذوقِ تجسس کے سہارے ایسی صورتوں کو اختیار کرنا پڑا جن کے بارے میں اس نے پہلے کبھی سوچا بھی نہ تھا یا یوں کہیے وہ صورتیں اس کے لیے قطعی اجنبی تھیں اس لیے انسان ان کے وجود اور عدم وجود کی بحث میں نہ الجھ کر ان کے جدید ترین پہلوؤں کو کبھی حیرت ناکی سے اور کبھی شبہ کی نگاہ سے دیکھتا ہوا ان میں گم ہو چکا تھا۔

داستان گوئی کی مقبولیت ایسے ہی دور میں سب سے زیادہ ہوئی۔ کیوں کہ اس صنف میں انسان کے ذوقِ تجسّس کو ابھارنے اور اس کی قوتِ مشاہدہ کو فزوں کرنے کی بیشتر خوبیاں موجود تھیں اور اس دور کے انسان کے لیے سارے دلچسپ پہلو نیز اس کے مزاج سے مطابقت رکھنے والی تقریباً ساری شکلیں داستانوں کے واقعات میں بکھری پڑی تھیں۔ ہر چند ان واقعات میں غیر فطری پن اور اجنبیت کا احساس بھی بڑی وضاحت کے ساتھ موجود تھا۔ مگر اصل میں اس اجنبی پن اور غیر فطری عمل نے انسان کے ذوقِ تجسس کو مزید تقویت پہنچائی اور اسے قصّے کی دل کشی میں اس طرح گم کر دیا کہ وہ داستانوں کے فنی، ادبی، منطقی اور تاریخی پہلوؤں میں اصلیت کی تلاش کو نظر انداز کر کے ان کے دلچسپ اور پُرکشش واقعات میں گم ہو کر رہ گیا اور داستان کے غیر فطری واقعات اور مافوق الفطرت کرداروں کے غیر فطری کرشموں کو اس نے بے جھجک قبول کر لیا۔ نیز وہ داستان کے جزوی حسن میں محو ہو کر خود کو عالمِ تجسّس سے عالمِ حقیقت تک نہ لا سکا۔ ہر چند داستان کے تمام مرقعے صنّاعی اور نمائش پر مبنی ہوتے تھے لیکن دراصل یہ عمل ہی ان داستانوں کے حسن کو نکھارنے کا سب سے بڑا سبب بھی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ داستان کے اکثر واقعات اور قصّے غیر مربوط ہوا کرتے تھے اور ان میں اوقات و ماحول میں یکسانیت نہیں ہوتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود داستان انسان کی توجہ کا مرکز بنی رہی اور اس میں وہ گم ہو کر اپنی پوری دلچسپی کا اظہار کرتا رہا۔

اردو کی ایسی ہی مقبول داستانوں میں سیّد حیدر بخش حیدری کی داستان "قصۂ حاتم طائی" المعروف بہ "آرائشِ جمال" کو خاصی اہمیت ملی۔ اس داستان کی تصنیف حیدری نے فورٹ ولیم کالج میں ۱۸۰۳ء میں کی۔ [1]

اس داستان کا قصہ فارسی سے ماخوذ ہے لیکن حیدری نے اس قصّے کو طویل اور دلچسپ بنانے کے لیے حسبِ موقع اس میں اپنی طرف سے بہت سے اضافے کر دیے تھے۔ اس کتاب کا قصّہ تین سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے اور اس کی تصنیف کرنے پر حیدری کو چار سو روپے بطور معاوضہ پیش کیے گئے تھے۔ چوں کہ قصہ حاتم طائی کی تصنیف فورٹ ولیم کالج میں ہوئی تھی اس لیے اس میں مذکورہ کالج کی نثر نگاری کی ساری خصوصیات موجود ہیں۔ فورٹ ولیم کالج کا بنیادی مقصد درسی کتب کی تدوین، ترجمے اور ایسی تصانیف کی اشاعت بھی تھا جن کے ذریعہ مقامی زبان کو سیکھنے اور مقامی باشندوں کی مزاجی کیفیت سے واقفیت بہم پہنچائی جا سکے اس لیے تقریباً تمام تصانیف کی بنیاد قدیم روایتوں اور مزاج پر رکھی گئی۔ اور اسی لیے ان تصانیف کی نثر پر بھی قدیم زبان کے اثرات پورے طور پر مسلط رہے۔ یہی وجہ ہے کہ قصّہ حاتم طائی فورٹ ولیم کالج کے زیرِ اہتمام شائع کردہ دیگر کتب اور تصانیف کی طرح قدیم نثری روایات کی عکّاس ہے نیز اس میں وہ تمام تر داستانوی خوبیاں اور خصوصیات مل جاتی ہیں جو قصّے کو پُرکشش بنانے اور اس میں محو کر دینے والی ساری کیفیتوں کو ظاہر کرنے میں معاون بنیں۔

اس قصّے میں استعجاب و تجسّس کے بیشتر پہلوؤں کو حیدری نے بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ مثال کے طور پر سوداگر برزخ کی بیٹی حسن بانو کے ذریعے معتوب کیے جانے کے بعد اور اپنا سارا مال و اسباب فریبی پیر کے ہاتھوں لٹا کر جب بے سروسامانی کے عالم میں صحرانوردی میں مصروف تھی اس وقت ایک بزرگ کے مشفقانہ مشورے پر اس نے غیبی طور پر دوبارہ بے پناہ

---

[1] ملاحظہ ہو دیباچہ از حیدری

دولت اور جاہ و جلال حاصل کیا اور ایک بار پھر اس بادشاہ کے پاس مردانہ لباس میں پہنچی اور اس فریبی پیر سے نیاز حاصل کرنے کی خواستگار ہوئی نیز اس سے یہ بھی التماس کی کہ وہ بزرگ سوداگر کے قدیم محل میں اس پیر کی خدمت کرنے کی خواہشمند ہے۔ جس وقت بادشاہ نے وہ محل اس کے نام وقف کر دینے کا وعدہ کیا تو قارئین کے ذہن پر اسی وقت سے استعجابی کیفیت کا ایک ایسا جذبۂ تجسس طاری ہو جاتا ہے جس کے تحت وہ جلد سے جلد اصلیت تک پہنچ جانا چاہتے ہیں کہ حسن بانو نے اس فریبی پیر کے ساتھ کس قسم کے انتقامی رویے کا اظہار کیا۔ نیز اس کے چہرے پر پڑی شرافت کی نقاب کو کس طرح اٹھایا؟ اس موقع پر داستان کی خوبی "پھر کیا ہوا" پورے طور پر نظر آتی ہے۔

قصۂ حاتم طائی میں حیدری نے داستانوی انداز کو ہر جگہ باقی رکھا ہے اور ان تمام پہلوؤں کو داستانوی رنگ دے کر اس قصے میں کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے جو داستان کے حسن میں اضافہ کرتے ہیں، اس میں ایسے ناقابلِ یقین واقعات و مناظر نظر آتے ہیں جو فطری اعتبار سے کبھی اصلیت و حقیقت سے قریب نہیں ہو سکتے۔ جیسے حسن بانو کا مردانہ لباس میں بادشاہ کے پاس جانا اور اپنی باتوں سے اس طرح متاثر کرنا کہ وہ ایک لمحہ سوچے بغیر اس کا مطیع ہو کر اپنی اطاعت کا یقین ان الفاظ میں دلانے لگے۔

"بہت بہتر ہے یہ تیرا اختیار ہے بلکہ اپنی بادشاہت بھی جان بھی"۔

ہر چند اس موقع پر پیش کی گئی صورتیں منطقی اور فطری طور پر غیر امکانی نظر آتی ہیں لیکن حیدری نے حسن بانو کے حسنِ اخلاق کو اس طرح پیش کیا ہے کہ اس غیر فطری عمل میں حقیقت اور اصلیت کے امکانات دکھائی دینے لگتے ہیں اور قاری اس کے غیر فطری پہلو کو نظر انداز کر کے قصے کے تسلسل اور ارتقا میں گم ہو جاتا ہے۔

اسی طرح حاتم طائی کا بھیڑیے کی بھوک مٹانے کے لیے اپنے جسم سے گوشت کا لوتھڑا کاٹ کر بے دریغ دینے اور بغیر تکلیف محسوس کیے بھیڑیے سے محوِ گفتگو رہنے کا عمل بھی غیر فطری پہلو کو ظاہر کرتا ہے۔ مگر حیدری نے ان دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو کو اس قدر دلچسپ بنا کر پیش کیا ہے کہ قاری کا ذہن اس غیر فطری عمل سے ہٹ کر ان دونوں کی گفتگو میں گم ہو جاتا ہے یا پھر ریچھ کی لڑکی سے حاتم کی شادی کرنا اور حاتم کی پگڑی میں مہرہ باندھ دینا بھی قطعی غیر فطری معلوم نہیں دیتا۔ مگر چونکہ قدیم ہندستان میں اس قسم کی روایات و اقدار پر لوگوں کا اعتقاد تھا اس لیے یہ عمل غیر فطری ہونے کے باوجود داستان کے قصے کو آگے بڑھانے میں ممد و معاون ثابت ہوتا ہے۔

عام طور پر داستانوں میں ایسے کرداروں کی تخلیق کی جاتی ہے جن کے عمل کو داستان نگار خوبیوں اور نیکیوں کا مرقع بنا کر پیش کرتا ہے۔ اس لیے داستانوں کے مرکزی کرداروں کا ذات کامل ہونا بے حد ضروری ہوتا ہے جن میں ان ساری خوبیوں اور اوصاف کو کوٹ کوٹ کر بھر دیا جاتا ہے جو نیکی اور بھلائیوں کی علامت ہوتے ہیں۔ ایسے مرکزی کردار بیک وقت شجاعت، اخلاق، حسن، فہم و فراست اور ایسی ہی تمام خوبیوں کے مالک ہوتے ہیں جو غیبی سہارے پر ایمان رکھتے ہوئے تمام تر مشکلات و مصائب سے آسانی کے ساتھ گزرتے چلے جاتے ہیں۔ ان کرداروں کے ذریعے حق کی تبلیغ اور باطل قوتوں کی تردید مقصود ہوتی ہے۔ اس لیے انھیں سخت حالات سے نبرد آزمائی کے وقت بھی انتہائی شجاع، صابر، قانع اور معاملہ فہم بنا کر داستان میں پیش کیا جاتا ہے۔

حیدری کی اس داستان میں ہمیں ایسے ہی بہت سے اہم کردار نظر آتے ہیں جو حق پرست اور نیکیوں کے پرستار ہیں۔ عام داستانوں کی طرح اس داستان کا مرکزی کردار حاتم طائی بھی ایک شہزادہ ہے جو بچپن ہی سے ذات مکمل کی شکل میں ابھر کر سامنے آتا ہے۔ بچپن ہی سے اس میں وہ تمام صفات موجود ہوتی ہیں جو کسی قصے کے مرکزی کردار کو اہم بناتی ہیں۔ حیدری نے حاتم طائی کو جود و سخاوت کا پیکر بنا کر پیش کیا ہے۔ اس کے ان اوصاف کا نمونہ داستان کی ابتدا ہی میں دیکھنے کو مل جاتا ہے جب حاتم طائی اس وقت تک خود دودھ نہیں پیتا جب تک اس کی پیدائش کی خوشی میں اس کے والد کے ذریعے پرورش پانے والے تمام چھ ہزار بچے دودھ نہیں پی لیتے۔ ابتدائی عمر میں حاتم طائی جانوروں کا شکار کرنے کی بجائے انھیں زندہ پکڑ کر چھوڑ دیتا ہے۔

اس کے ساتھ حیدری نے حاتم طائی کے کردار کے ذریعے خود اعتمادی اور قناعت و توکل کے جذبے کو بڑی خوش سلیقگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ حاتم طائی بڑی سے بڑی مشکل اور خوف ناک بلا کا مقابلہ کرتے وقت اسے اپنی قوت خود اعتمادی اور غیبی طاقت کے سہارے مسخر کر لیتا ہے۔ اس کے کردار میں ایثار و قربانی کا بے پناہ جذبہ موجود ہے۔ وہ قدم قدم پر دوسروں کی مصیبتوں میں ان کا ساتھ دیتا ہے اس سلسلے میں اس کے یہ الفاظ اس کے ذہن اور کردار کی عکاسی کرتے ہیں: "حق تعالیٰ نے مجھے اس واسطے پیدا کیا ہے کہ ہر ایک کے برے وقت میں کام آؤں"۔ اس کے اس جذبۂ خدمتِ خلق میں کسی قسم کے لالچ یا حرص کو دخل نہیں ہوتا وہ جب دوسروں کے دکھ درد میں ان کا ساتھ دیتا ہے اور انھیں مصائب سے نجات دلاتا ہے نیز جب اسے متاع و دولت سے نوازتا ہے تو اس متاع و دولت کو یہ کہہ کر لینے سے انکار کر دیتا ہے: "اسے فقیروں اور محتاجوں کو بخشو، خدا کے نزدیک سرخ رو اور دنیا میں نیک نام کہلاؤ" یا پھر وہ خود اس متاع و دولت کو غریبوں میں تقسیم کر دیتا ہے اپنے پاس کچھ نہیں رکھتا۔ حاتم طائی کی خود اعتمادی کا یہ حال ہے کہ وہ ہر مسئلہ کو حل کرنے اور اس میں کامیاب ہونے کا یقین رکھتے ہوئے ہر بڑی طاقت اور پیچیدہ صورت سے متصادم ہو جاتا ہے یہی نہیں بلکہ وہ اس سلسلے میں پورے وثوق کے ساتھ اپنے جذبات کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے:

"خاطر جمع رکھو، تیری معشوقہ کو ڈھونڈ کر تجھ تک پہنچا دیتا ہوں یا تجھی کو وہاں تک لے جاتا ہوں" یا پھر "اے جوان! میں برائے خدا یہ شرطیں پوری کر کے تیری معشوقہ کو تجھ سے ملاؤں گا"۔

حاتم مستقبل میں پیش آنے والے حالات سے پوری طرح واقف رہتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ذات میں کوئی ایسی طاقت غیبی موجود ہے جو اسے آئندہ پیش آنے والے حالات سے واقف کرا دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تمام ترد شوار مقامات تک پہنچنے کے راستوں سے بڑی حد تک خود بھی واقف ہوتا ہے۔ اسے تمام بلاؤں کے ناموں سے پوری طرح واقفیت ہوتی ہے اور وہ تقریباً ساری مخلوق کے عمل اور مزاجی کیفیتوں کا بھی علم رکھتا ہے۔ اس لیے وہ ہر طاقت سے ٹکرا کر اس میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے۔ اس کا سبب اسی کے الفاظ میں یہ ہوتا ہے: "میرے سر پر خدا کا سایا تھا اس نے بچا لیا۔"

حاتم کی ذات میں بلا کی قوت ممیزہ اور قوت دانش بھی مضمر ہے۔ وہ جب کسی پیچیدہ مسئلہ کو سلجھانے پر آمادہ ہوتا ہے تو بعض صورتوں میں اس کا عمل بڑا ہی سائنٹیفک بن جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جب وہ حارث کی لڑکی کے سوالات کے جوابات کی تلاش میں نکلتا ہے اور ایک ایسے مقام سے گذرتا ہے جہاں سارا شہر کسی بلا کے عتاب سے پریشان ہے۔ حاتم طائی اس بلا سے ان شہریوں کو نجات دلاتا ہے وہ بڑا ہی فطری اور سائنٹیفک عمل ہوتا ہے پھر بادشاہ کی دیوانی بیٹی کے بے ہودہ سوالوں کا جواب کافی بے ساختگی اور انتہائی مدلل انداز میں دیتا ہے۔

حاتم کے کردار میں "آدم زاد" کا وہ سارا شعور اور ساری فہم موجود ہے جو اسے دیگر مخلوق سے افضل و اشرف بنا دیتی ہے۔ وہ پریوں، جنوں، خوفناک جانوروں اور اسی قسم کے دوسرے کرداروں پر اپنی سوجھ بوجھ کا سکہ جما دیتا ہے اور انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے۔

اسی طرح حسن بانو کا کردار بھی اس داستان میں کافی اہمیت کا حامل ہے جس کے ذریعہ حیدری نے معاملہ فہمی اور نیک اعمال کی علامتوں کو کافی وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ خاص طور سے اس کی سوجھ بوجھ کی وجہ سے فریبی پیر کی عیاری اور مکاری نہ صرف بے نقاب ہی ہوتی ہے بلکہ اسے اپنے کیے کی مناسب سزا بھی مل جاتی ہے۔ حسن بانو کے اس عمل کے ذریعے داستان گو نے اس بے جا اور بے جان عقیدے اور روایت پر طنز کی ہے جو معاشرے کے معصوم اور کمزور عقائد رکھنے والوں کے اذہان کو اپنے دام فریب میں مبتلا کر کے بے مصرف مقاصد کی طرف متوجہ رکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ حیدری نے حاتم طائی اور حسن بانو کے کرداروں کے ذریعے نرمئ دل اور حسن اخلاق کے بے پناہ جوہروں کو یکجا کر دیا ہے جن کی وجہ سے داستان کے غیر فطری عمل میں کسی حد تک کمی ضرور واقع ہوئی ہے۔

اس داستان کے بیشتر مردانہ کردار کسی نہ کسی معاشقے میں گرفتار نظر آتے ہیں اور امتحان عشق کے دوران اپنے محبوب کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔ چونکہ داستان کے قصے کو طویل بنانے اور اس کے مزاج میں یکسوئی پیدا کرنے کے لیے ان کرداروں کو ایسے عمل میں ڈھالنا ضروری تھا اس لیے حیدری نے اپنے عہد کے نمائندہ جذبوں اور عقائد کا اظہار بڑی خوبصورتی کے ساتھ کیا ہے۔

قصہ حاتم طائی میں زیادہ تر نسوانی کردار کسی سردار، امیر یا بادشاہ کی انتہائی خوب صورت اولاد کی شکل میں موجود ہیں ان کرداروں کی خوبی یہ ہے کہ وہ جہاں لازوال حسن رکھتے ہیں وہیں ان کا دل جذبۂ عشق سے معمور ہے۔ اور وہ اپنے اس جذبے کی تکمیل کے لیے اپنے عشاق سے صداقت عشق کے ثبوت طلب کرنے پر آمادہ رہتے ہیں نیز آخر میں حاتم طائی کی فہم و فراست اور معاملہ فہمی کے ذریعے وہ اپنے عشاق کے جذبۂ عشق کو صادق تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ جذبۂ عشق اور اس کی تکمیل کے لیے شرائط کی جو صورتیں قصہ حاتم طائی میں نظر آتی ہیں ان کے پس پردہ داستان گو حیدری عشق کی طہارت اور پاکیزگی کے ان پہلوؤں کی جانب اپنے قارئین کو متوجہ کرنا چاہتے ہیں جو حرص و ہوس کے پیمانوں پر اس جذبے کو ناپسند نہیں کرتے۔

قصہ حاتم طائی کی بنیاد نیکی اور رحم دلی پر رکھی گئی ہے۔ جن کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ حیدری اس قصے کے پس پردہ اخلاق، خیر، ہمدردی، نیکی، طہارت، احسان مندی، ایثار، قربانی اور قناعت و توکل کے جذبے کو عام کر کے معاشرے کے عیوب اور کمزوریوں پر طنز کرتے ہیں اور اسی لیے قصہ حاتم طائی داستانوی ادب میں منفرد اور کسی حد تک اصلیت پر مبنی ادبی تخلیق کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ اور اس میں دوسری داستانوں کی طرح غیر فطری عناصر ہونے کے باوجود قاری کے ذہن کو مذکورہ جذبے میں محور رکھنے کی کیفیت بھی مل جاتی ہے۔ دراصل اس قصے کو دلچسپ اور منفرد بنانے کے لیے حاتم طائی کے کردار کو جس طرح انسانی شکل میں ذات کامل بنا کر پیش کیا ہے اس سے اس قصے میں بڑی توانائی پیدا ہو گئی ہے۔ حاتم طائی ہر قدم پر دوسروں کے غم بٹورنے میں جس طرح اپنی صدق دلی اور ہمدردیوں کا اظہار کرتا ہے اس سے قصے میں دلچسپی کے ساتھ ہی تسلسل بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اسی لیے اس کا کردار ہمیں پورے قصے میں کہیں بھی غیر ضروری نہیں لگتا بلکہ قصے کے ارتقا میں اس کی موجودگی ہر جگہ ضروری معلوم ہونے لگتی ہے۔ وہ جہاں کہیں ہمارے سامنے آتا ہے احسان مندی کا جذبہ ہمارے ذہن میں موجزن ہونے لگتا ہے اور ہمارا دل اس کی موجودگی سے خیر و نیکی کی جانب متوجہ ہونے لگتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حاتم طائی جس مستعدی اور جذبۂ ایثار کے ساتھ انسانوں کی تکالیف اور الجھنوں کو رفع کرنے پر آمادہ ہے اس طرح روبہ عمل ہونے سے اس شر بھری دنیا میں خیر کے جذبے کو یقینی طور پر تقویت مل سکتی ہے اور انسان اس کی ایثار پسندی کی تقلید کر کے اخلاقی جرأت مندی کا قائل ہو سکتا ہے۔ اس پہلو کی جانب اشارہ کرتے ہوئے وقار عظیم نے لکھا ہے۔

"حاتم طائی کے قصے کی بنیاد سر تا سر ایثار و خدمت گذاری کے جذبات پر ہے، حاتم طائی کا ہر قدم نیکی اور خدا ترسی کی طرف

ایک قدم ہے اور اس کے ہر قدم پہ سننے اور دیکھنے والوں کے لیے ایک ناقابلِ فراموش درس خیر پنہاں ہے۔

ویسے تو اس داستان کے قصے کی بنیاد اس کے کرداروں پر ہی رکھی ہوئی نظر آتی ہے جو اس کے ارتقا میں سب سے اہم رول ادا کرتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ قصہ حاتم طائی میں چند ایک داستانوی خوبیاں اور بھی ہیں جو اس کے قصے کو دلچسپ بنانے کے ساتھ ساتھ اسے ارتقائی صورتوں سے آشنا کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر اس قصے میں مافوق الفطرت عناصر تمام تر غیر فطری عمل کی جانب راغب نظر آتے ہیں۔ دوسری داستانوں کی طرح اس داستان کے مصنف حیدری اپنی ذات کو پورے قصے سے الگ ہی رکھتے ہیں۔ انھیں کسی جگہ بھی ان کی شخصیت اس قصے میں تمایاں نظر نہیں آتی۔ قصے کی دلچسپی کو باقی رکھنے کے لیے حیدری واقعات کو پھیلاتے وقت ربط و شرح کے مقابلے میں صناعی سے زیادہ کام لیتے ہیں جس سے ہمیں مدلل اندازِ تحریر کے مقابلے میں دلچسپ طرزِ تحریر دیکھنے کو ملتی ہے اور ہمارا ذہن یا دِل کسی بھی مقام پر کسی مسئلے کو منطقی سطح پر حل کرنے یا دلائل طلبی کی جانب متوجہ نہیں ہوتا اور اس طرح ہمیں اس قصے کو آسانی اور دلچسپی کے ساتھ پڑھنے میں لطف آنے لگتا ہے۔ اور داستانوں کی طرح حیدری نے اپنی داستان میں انتہائی سلیس اور پُرکشش زبان کا استعمال کیا ہے۔ ہمیں اس میں غیر مانوس اور متحرک الفاظ کی بھرمار نہیں ملتی۔ اس قصے کی زبان بقول مصنف "الفاظ رنگیں و مرغوب" پر مبنی ہے۔ زبان کی سلاست کے ساتھ ہی حیدری نے جو اندازِ بیان اختیار کیا ہے وہ بھی انتہائی موثر اور جاذب ہے۔ انھوں نے حاتم کی سرگزشت کو کچھ اس انداز سے بیان کیا ہے کہ قصے کو پڑھتے وقت آخری لمحے تک اس کی دلکشی باقی رہتی ہے اور پورے قصے میں شاید ہی کوئی مقام ایسا آتا ہے جہاں ہمیں تکرارِ لفظی کے ساتھ ساتھ واقعات میں بھی کسی قسم کی تکرار ملتی ہو۔ اس سلسلے میں حیدری کی ذہانت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ وہ واقعات کی تہہ تک پہنچ کر انھیں ایسے لب و لہجہ کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کی نظروں میں واقعات کی ہو بہو تصویر گھومنے لگتی ہے۔

حیدری نے قصہ حاتم طائی کو اردو قالب میں منتقل کرتے وقت اس میں جہاں بھی مقامی رنگ و مزاج کو شامل کیا ہے اس نے قصے میں مقامی فضا کو پیدا تو ضرور کر دیا ہے لیکن چونکہ اصل قصہ فارسی سے ماخوذ ہے اور ظاہر ہے کہ اس کی فضا ہندوستانی اساطیر سے یقیناً مختلف رہی ہوگی اس لیے جہاں بھی اس قصے میں مقامی رنگ و مزاج کو شامل کیا گیا ہے اس نے قصے کی اصلیت میں کسی قسم کی کوئی خاص اور دلچسپ فضا پیدا نہیں کی ہے اور اسی لیے فارسی قصے کی اصل صورتیں کہیں کہیں مجروح ہوتی نظر آتی ہیں۔

لیکن مجموعی طور کہا جا سکتا ہے کہ حیدری نے کہیں کہیں غیر ضروری اضافوں اور ان اضافوں کو مقامی رنگ و مزاج میں ڈھالنے کے باوجود قصہ حاتم طائی میں اردو داستان گوئی کی تمام تر خوبیوں کو ملحوظ رکھ کر اسے اردو کی اعلیٰ ترین داستانوں میں شامل کیے جانے کا شرف بخشا ہے۔

●●

بقیہ : ملاحظات

کے لیے اعزازات دیئے ان میں اردو کے ادیب اور نقاد پروفیسر اسلوب احمد انصاری کا اسمِ گرامی بھی شامل ہے جنھیں "اقبال کی تیرہ نظمیں" کے لیے اعزاز عطا ہوا ہے۔ پروفیسر اوما شنکر جوشی نے اس موقع پر فرمایا کہ بھارت ایسے گوناگونی اور بوقلمونی کے حامل ملک میں یہ امر باعثِ طمانیت ہے کہ یہاں محض ایک زبان و ادب کے لیے نہیں بلکہ متعدد زبانوں کے لیے گنجائش ہے۔ آپ نے کہا کہ صوبائی کردار کی ادبی تخلیقات کو قومی کردار حاصل ہونا چاہیئے تاکہ قومی ادب کا تصور پورا ہوسکے۔ آپ نے تمام بھارتی زبانوں کے کم سے کم سو نمایاں اور مشہور ناولوں کے ترجمے کی ضرورت پر زور دیا۔ ساہتیہ اکیڈمی ۲۲ بھارتی زبانوں کو تسلیم کرتی ہے اور اس نے گزشتہ ۲۵ برسوں میں کم سے کم ۳۵۲ انعامات دیے ہیں۔ اس تقریب میں ۱۹ میں سے ۱۷۔ ادیبوں نے شرکت کی۔ یہ انعام پانچ ہزار روپے کا ہوتا ہے۔

آہ! مولانا امتیاز علی عرشی

مولانا امتیاز علی عرشی کے انتقال سے اردو دنیا ایک بلند پایہ ادیب سے محروم ہوگئی۔ وہ قناعت پسند، وسیع القلب اور سادہ منش انسان تھے۔ انھوں نے خاموشی کے ساتھ اردو ادب کی وہ خدمت کی جو اردو ادب کی تاریخ میں سنہری حروف سے لکھی جائے گی۔ ۲۵ فروری کو صبح ساڑھے تین بجے وہ خالقِ حقیقی سے جا ملے اور اپنے پیچھے سوگواروں کی ایک کثیر تعداد چھوڑ گئے۔ وہ ممتاز عالمِ دین، مفکر اور دانشور تھے۔ اور رضا لائبریری رامپور کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے ادبی خدمات انجام دے رہے تھے۔ موصوف کی پیدائش ۸ دسمبر ۱۹۰۴ء کو ہوئی۔ عرشی صاحب ۱۹۲۶ء میں ریاست رامپور کے کتب خانے کے نگراں مقرر ہوئے تھے۔ بعد میں یہ کتب خانہ مرکزی سرکار کی تحویل میں آگیا اور اس کا نام رضا لائبریری رکھا گیا۔ موصوف نے غیر ممالک کا دورہ بھی کیا۔ آپ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں جن میں سے ساہتیہ اکیڈمی نے آپ کو تالیف دیوان غالب، نسخہ عرشی، پر پانچ ہزار کا انعام دیا۔ ۱۹۷۲ء میں آپ کو پدم شری کا خطاب عطا کیا گیا۔ عربی کے ممتاز عالم کی حیثیت سے حکومتِ ہند نے آپ کے لیے تین ہزار روپے سال تاعمر وظیفہ مقرر کیا۔ حکومت اترپردیش نے بھی ان کی ادبی خدمات کے سلسلے میں پانچ ہزار روپے کا انعام دیا۔ اس سے قبل ۱۹۶۲ء میں آپ کو ابھی نندن گرنتھ پیش کیا گیا۔ مولانا کی مشہور تصانیف میں مکاتیبِ غالب، فرہنگِ غالب، تاریخ اکبری، نادراتِ شاہی وغیرہ شامل ہیں۔ ان کی وفات سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ بہت عرصے تک پورا نہ ہو سکے گا۔

غزلیں

کمال جائسی

کس موڑ پہ آئے ہیں ابرو کی کماں والے
سہمے نظر آتے ہیں شیشے کے مکاں والے

خوشبو نے پکارا پھر خوش رنگ دریچوں سے
آوارہ نظر آئے زخموں کی دکاں والے

موسم تری یادوں کا کس درجہ لٹیرا ہے
بے بس نظر آتے ہیں شمشیر و سناں والے

وہ وقت بھی آیا ہے اس مقتل ہستی میں
جیتے ہیں یقیں والے ہارے ہیں گماں والے

آہٹ ترے قدموں کی وحشت کی فضا ہوگی
زنجیر پہن لیں گے فریاد و فغاں والے

اب نشۂ غم یارو کچھ اور زیادہ ہے
کس سے کے ہوئے طالب یہ شہر تباں والے

جلوے ہیں معانی کے مستور کمال اب بھی
بیزارِ تکلم ہیں شائستہ زباں والے

جنید حزیں

کلیوں میں تازگی ہے نہ پھولوں میں باس ہے
تیرے بغیر سارا گلستاں اداس ہے
لگتا ہے شہر میں نہ کہیں اپنے گاؤں میں
شاید علاجِ دل تری آنکھوں کے پاس ہے
جینا ہے چار دن کا اور سکھ دکھ ہیں عارضی
اس دور کا ہر آدمی کیوں بدحواس ہے
ہونٹوں کے اک خفیف تبسم میں کیا نہیں
شامل خوشی کے رنگ میں کچھ رنگِ یاس ہے
اس اجنبی نگاہ میں اپنائیت سی ہے
شاید کہ جاننے والا مرا روشناس ہے
دریائے تشنگی سے وہ سیراب ہو تو ہو
ہاتھوں میں جس کے آج بھی خالی گلاس ہے
ناقابلِ عبور سمندر تھے درمیاں!
میں یہ سمجھ رہا تھا کہ تو میرے پاس ہے
عشرت میں بھی لبوں پہ تبسم لیے پھرا
کیوں پردۂ سخن میں حزیں بے لباس ہے

خلیل انجم

راحت طلبی کا ہم الزام نہیں لیں گے
منزل پہ پہنچ کر بھی آرام نہیں لیں گے

تم شوق سے کر ڈالو پامالِ ستم لیکن!
مر جائیں گے شکوے کا ہم نام نہیں لیں گے

جس جام کے پینے سے تفریق کی بو پھیلے
ساقی تیرے ہاتھوں سے وہ جام نہیں لیں گے

اندازِ تکلم میں خنجر کی روانی ہے
پہچان لو قاتل کو ہم نام نہیں لیں گے

بازارِ محبت میں گاہک تو ملے کوئی
بک جائیں گے منہ مانگے ہم دام نہیں لیں گے

سوچا ہے کہ ڈھونڈیں گے درمانِ الم انجم
اب صبر و تحمل سے ہم کام نہیں لیں گے

شاکر جرولی

بے صدا ابھی زخمِ سر کا امتحاں ہو جائے گا
پتھروں کے شہر میں ایسا کہاں ہو جائے گا
اس کا ہر ذرہ رقیبِ جسم و جاں ہو جائے گا
جس زمیں پر سایہ افگن آسماں ہو جائے گا
شکوۂ لب تھا کبھی تیرے تغافل کا جواب
تھی خبر کس کو یہی طرزِ بیاں ہو جائے گا
جانے کب سے چلیں گے جب سفینہ لیکے ہم
چند موجوں کا سمندر بیکراں ہو جائے گا
کیا ستم کیسی جفا سب دو گھڑی کے کھیل تھے
تم تو کہتے تھے کہ ہر غم جاوداں ہو جائے گا
لیکے خنجر آستینوں میں چلیں گے گھر سے لوگ
دشمنی پر دوستی کا جب گماں ہو جائے گا

سکندر عرفان

ہر رنگ یوں تو شہر کی رعنائیوں میں تھا
اور میں کہ محو اپنی ہی تنہائیوں میں تھا
زخمی بدن سے رِستی رہیں مسکراہٹیں!
احساس میرا روح کی گہرائیوں میں تھا
اک موڑ تک جو بنکے رہا میرا ہمسفر
پھر اس کے بعد دیکھا تو ہرجائیوں میں تھا
میری نگاہیں خود ہی مجھے ڈھونڈتی رہیں
افسوس میں بھی اپنے تماشائیوں میں تھا
بے چہرگی پہ آئینہ خانے بھی ہنس پڑے
میں اجنبی سا اپنی ہی پرچھائیوں میں تھا
خوشبو کا لمس، لذتِ غم، فکرِ کائنات
کیا کیا مرے شعور کی گہرائیوں میں تھا
عرفان، میکدوں سے تو حاصل نہ ہو سکا
وہ نشہ وہ سرور جو انگڑائیوں میں تھا

اسلم اعظمی

برائے قتل سہی پر یہ بات کیا کم ہے
کہ بزمِ غیر میں بھی میری گفتگو تو ہے
رقیب شکر کی جا ہے تیری رقابت میں
غریبِ شوق کو جینے کی آرزو تو ہے
برا ہے وصل کہ پیغامِ ہجر لاتا ہے
بھلا ہے ہجر کہ طغیانِ آرزو تو ہے
جہانِ شوق میں کیسے کہوں کہ تنہا ہوں
کہ دل کے ساتھ تیرا دردِ جستجو تو ہے
اگرچہ قرب مجھے یار کا نہیں حاصل
یہ کم نہیں کہ غمِ یار کو بہ کو تو ہے
نہ راہبر نہ کوئی راہ خوش ملی ہے مجھے
نشانِ شوق مگر ذوقِ جستجو تو ہے
کرم نہیں جو میرے حال پر تو کیا غم ہے
جفائے خاص میرے ساتھ ساتھ تو تو ہے
بلا سے قطرۂ خوں دل میں اب نہیں اسلم
ہزار شکر میرا زخم بے رفو تو ہے

امن کا پیامبر

زہرہ جبیں

"**دیکھو** ماں اسے پگلی نہ کہو! وہ بالکل نارمل ہے"
"پگلی کو پگلی نہ کہیں گے تو اور کیا کہیں گے۔ بالکل ہی پاگل ہے بیوقوف! کوئی کام دھام ٹھیک سے نہیں کرتی۔ جو کام بتلاؤ الٹا سلٹا کر کے رکھ دیتی ہے!"

"اگر وہ ٹھیک سے کام نہیں کرتی تو اسے سمجھاؤ کہ ایسا کر۔ کام کر کے دکھلاؤ اسے۔ ہر دم پاگل پاگل کہو گی تو وہ سچ مچ پاگل ہو جائے گی!"

"ارے چل اپنی ہوشیاری نہ دکھا! اپنے کام سے لگ! ہم اتنے بیوقوف نہیں ہیں جو تو ہمیں عقل سکھانے چلا ہے"

"ارے کیا بات ہے؟ کیا ہو گیا سریش؟ تجھ سے میں نے کہا ہے نا کہ عورتوں کے معاملے میں دخل نہ دیا کر۔ چل ادھر کمرے میں آ کر بیٹھ! کیا تجھے ماں سے بحث کرنے کے سوا اور کوئی دوسرا کام نہیں ہے؟"

سریش رسوئی گھر سے نکلا اور سامنے کے کمرے میں اپنے پتا جی کے پاس جا کر بیٹھ گیا اور ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔

•

پتا جی اور ماتا جی گھوم گھام کر واپس آئے۔

"آج تو دو پلیٹوں کی بتیس پلیٹیں ہو گئیں"

ماتا جی گھبرا اٹھیں — "کس نے کیا اتنا بڑا نقصان؟"

"کون کر سکتا ہے بھلا؟ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے!" پتا جی ہنسے۔

"آج تو کیا برتن دھلے تھے بیٹی کہ واہ! واہ۔ چمکتے ہوئے برتن اور بھی دھندلے، گندے اور چکنے ہو گئے تھے۔ بیٹی میں نے بیٹھ کر سارے برتن ملے!" نانی جی نے اپنے بوڑھے جھریوں بھرے ہاتھ آگے بڑھا کر دونوں کو دکھائے۔ "میرے ہاتھ تو جیسے رہ گئے!"

ماتا جی نے بڑھ کر اپنی ماں کے ہاتھ تھام لیے اور انھیں دبانے لگیں

پھر اچانک انھیں جلال آ گیا۔

"یہ بھی کوئی برتن مانجھنے کی عمر ہے میری ماں کی۔ آگ لگے ان جوان ہاتھوں کو۔ جن سے ذرا سے برتن نہیں دھلتے"

"خوب خوب! ان موٹے موٹے سرخ اور سفید ہاتھوں سے برتن نہیں منجھتے؟" پتا جی بڑے طنز سے ہنسے! "واہ۔ واہ! کیا نازک ہاتھ ہیں!"

"یہ بات نہیں ہے پتا جی۔ اصل مطلب آپ سمجھتے نہیں ہیں۔ دراصل ہاتھ بچائے جاتے ہیں۔ اگر برتن گھس گھس کر مانجھے جائیں تو ہاتھ نہ گھس جائیں گے؟"

"یا تو ہاتھ خوبصورت اور چمک دار رہ سکتے ہیں یا برتن؟" — مدن نے مسکرا کر مزے مزے سے فقرے کسے"

"ارے بیٹا دنیا بھر کی تو ملائیاں آتی رہتی ہیں۔ وہ وسلین اور نہ جانے کیا الابلا۔ اور رات کو ایک گھنٹے تک بیٹھ کر ہاتھ پیر اور منہ کی مالش ہوتی رہتی ہے!" نانی جی نے اپنے جھریوں بھرے ہاتھوں کو لاچاری سے دیکھ کر کہا۔

"ان چیزوں کو کریم کہتے ہیں ملائی نہیں کہتے نانی!"

"ٹھیک ترجمہ کیا تمہاری نانی نے" پتا جی بھی ہنسے "اگر بدیسی نام نکال دیے جائیں گے تو ان چیزوں کو ملائی ہی کہیں گے"

"اور یہ بدیسی چیز نہیں نکالی جائے گی؟ ایک ایک گھنٹہ ہاتھوں اور پیروں پر کریمیں ملنے میں برباد کر دیتی ہے پگلی! ایک گھنٹے میں تو گھر کا کتنا ہی کام ہو سکتا ہے۔ گیہوں چن سکتی ہے، کپڑے سی سکتی ہے، چمڑی چمکانے میں وقت برباد کرتی ہے اور اوپر سے شکایت ہوتی ہے کہ گھر کے کام سے فرصت نہیں ملتی" — ماتا جی نے بڑے درد بھرے اور سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"تم وقت کو روتی ہو!" پتاجی بگڑے، "یہ تو سوچو کہ پیسے کتنے برباد ہوتے ہیں۔ ولایتی کریموں کی قیمت تو آسمان سے باتیں کر رہی ہے۔ آج کل۔ کریم پاؤڈر نہ ہوا دال بھات ہو گیا کہ اس کے بغیر زندگی ہی نہیں ہو سکتی۔ کیا ہم اس لیے کما کما کر لاتے ہیں کہ بچوں کے منہ سے نوالے چھین کر ہاتھ اور پیروں پر سفیدی پھیری جائے۔"

ماتاجی نے فوراً پینترا بدلا کیونکہ وہ بھی اپنے سیاہ چہرے پر سفیدی پھیرا کرتی تھیں ——

"چلو جانے دو! غصّے کو تھوک دو۔ ورنہ ٹھیک سے کھانا بھی نہیں کھایا جائے گا۔ پیٹ بھرنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو نگلنا ہی پڑے گا نہ؟ چل مدن بیٹے تو بھی کھا لے۔"

"تم نے کھا لیا ماتا؟" پتاجی نے نانی سے پوچھا۔

"میں شانتا کے ساتھ کھاؤں گی۔ جاؤ تم باپ بیٹے کھا لو۔"

"میں نہیں کھاتا دادا جاؤ! بالکل ہی سر پہ چڑھا لیا ہے اسے!"

"تو کیا تیرے کھانا نہ کھانے سے وہ سر پر سے اتر جائے گی؟ ماتاجی ہنس پڑیں۔

"اسے ہٹا دو میرے سامنے سے!" سوہاک کے کمرے میں پہنچ کر دشونا تھ جی گرجے۔ "میں اس کے سامنے کھانا نہیں کھا سکتا۔"

"اسے معلوم تو ہے کہ اس کی شکل دیکھتے ہوئے آپ کھانا نہیں کھا سکتے۔ جان بوجھ کر یہاں رک جاتی ہے اور سر پر کھڑے دیر لگاتی ہے۔ سسر کو اس طرح چڑانا بھی کوئی اچھی بات ہے؟"

ساوتری ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ باہر نکل آئی اور پھاٹک کے پاس بیٹھ گئی۔ آنکھوں میں سنبھالا ہوا طوفان اُمڈ پڑا —— آہ! وہ کس قدر قابلِ نفرت ہے کہ سسر جی اس کے سامنے کھانا بھی نہیں کھا سکتے۔ ایک بہو کی اس سے زیادہ بدقسمتی اور کیا ہو سکتی ہے اور دن بھر نگلی یہ کام بگڑ گیا۔ نگلی وہ کام خراب ہو گیا۔ جھاڑو ٹھیک نہیں دی تو کھانا بگاڑ دیا نگلی نے! کپڑوں سے میل اور بدبو بھی نہیں نکلے کیسے کپڑے دھوتی ہے سرپھری! اور برتن تو ہمیشہ چکنے ہی رہ جاتے ہیں اور پھر بیچاری نانی کو مانجھنا پڑتا ہے ایسا رگڑ رگڑ کر کہ اس کے ہاتھ ہی کو چاہن کر رہ جاتے ہیں۔ اپنا سارا تن من لگا کر کام کرتی ہے پھر بھی کوئی خوش نہیں ہوتا۔ اتنی محنت سے کھانا بناتی ہے تب بھی کسی کو پسند نہیں آتا۔ سسر دو چار نوالے مار کر، بھری تھالی دور کھسکا کر اٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ دیور تو تھالی ہی پھینک مارتا ہے۔ اور ماتاجی بڑے بڑے نوالے کھاتی جاتی ہیں اور ہر چیز میں نقص نکالتی جاتی ہیں۔ اور نانی! نانی نے تو بہو کے نوالے گننے کا ٹھیکہ ہی لے لیا ہے بس اس کے کھانا کھانے کو ہی دیکھے جاتی ہیں کہ کہیں سارا کا سارا کھانا نہ کھا جائے؟

"اری سریش کے لیے سبزی بچی ہے یا نہیں؟"

"بھات زیادہ کھانے سے تن پھولتا ہے ری! اپنی ساس کے کے لیے رہنے دے اب!"

"ایک روٹی تو بہت ہو جاتی ہے اب بس کر۔ ڈبے میں آٹا ختم ہو رہا ہے، دیکھ گیہوں یاد سے چن لینا تو ستیا پسوا کر لے آئے گی۔"

اور جب نانی منہ سے کچھ نہ بولتیں تو ان کی آنکھیں گھور گھور کر نہ جانے اسے کتنا ہی بول لیتی ہیں۔ اور اتنا کوستی ہیں کہ اسے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا کہ کھانا بند کر کے اٹھ کھڑی ہو۔ اس کی آنکھیں پھر برسنے لگیں۔

"یہاں کیوں بیٹھی ہو ساوتری!؟" وہ چونک پڑی اور اس نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے جنھیں سریش دیکھ چکا تھا۔

"اٹھو" اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر سریش نے اٹھایا اور دونوں اپنے کمرے میں چلے گئے۔

"کھانا کھا لیا تم نے"؟

"جی نہیں! آپ نے بھی تو نہیں کھایا نا"؟

"تم کیوں رو رہی تھی؟ کیا معاملہ ہوا؟ تم تو بی ایس سی پاس ہو اور اس طرح روتی ہو۔"

"اچھا تو بی ایس سی پاس لوگوں کا دل نہیں ہوتا کیا ان کے آنسو سوکھ جاتے ہیں ——؟"

"اچھا میں سمجھ گیا! وہی حسبِ معمول داستاں کل ہوئی ہو گی!"

سریش کو غصّہ آ گیا اور اس کا منہ لال ہو گیا۔

"غصّے کو مارئیے گولی۔ منہ ہاتھ دھو لیجئے اور جا کر پتاجی کے ساتھ کھانا کھا لیجئے۔ جب وہ چلے جائیں گے تو میں رسوئی گھر میں آپ کے پاس آؤں گی۔ جائیے ماتاجی آپ کو کھانا پروس دیں گی۔

"اچھا تو یہ بات ہے! میں خود کھانا لے کر آتا ہوں۔ ہم دونوں ہی یہاں ساتھ کھائیں گے۔"

"مجھے بالکل بھوک نہیں، آپ تکلیف نہ کیجئے، اور دوسروں کو تکلیف نہ پہنچائیے!"

"دیکھتا ہوں تمھیں کیسے بھوک نہیں ہے! رہی تکلیف پہنچانے کی بات تو میں کوئی بڑا کام تو نہیں کر رہا ہوں۔"

سریش ایک تھالی میں بہت سا کھانا لایا۔ ساوتری نے کوئی ضد نہ کی اور دونوں نے مل کر کھا لیا۔

•

ایک دن نانی جی، ماتاجی، پتاجی اور دیور جی نے مل کر پلان بنایا کہ آج تو سریش کو قائل کر ہی دیں گے کہ اس کی بیوی پگلی، بیوقوف، بے انتہا پھوہڑ اور طریر بھی ہے۔ اس کے گھر میں قدم رکھتے ہی اسے سب نے گھیر لیا۔

نانی بولی — "بیٹا آج بہو نے تمہاری بڈھی نانی سے بہت منہ چلایا ہے۔ سب برتن پھینے چھپنے چھوڑ دیئے اور جب میں نے ٹوکا تو بولی کہ مجھ سے تو ایسے ہی دھلتے ہیں۔ تمھیں زیادہ چترائی دکھلانا ہو تو اپنے ہاتھوں سے دھو لو! نانی آخر تم کس کام کی ہو؟ بیٹھی بیٹھی نوالے توڑا کرتی ہو؟

"میں اس بات پر یقین نہیں کرتا نانی ماں! ساوتری تو اس قدر خاموش رہنے والی ہے کہ گویا اس کے منہ میں زبان ہی نہ ہو اور میں پوچھتا ہوں کہ آخر وہ رادھا رتن ما نجھنے کیوں نہیں آتی۔ وہ کیوں بھگادی گئی؟"

"تمہیں اپنی بڈھی نانی کی بات کا یقین نہیں آتا اور اس آٹھ مہینے کی آئی ہوئی بیوی کی بات سچ لگتی ہے!" باپ گرجا۔

"آج ساوتری نے کانچ کے چاروں گلاس پٹخ کر پھوڑ دیئے"— ماں بولی —

"کھاتی پیتی تو سب کچھ ہے لیکن ہاتھوں میں ذرا بھی دم نہیں — یا جان بوجھ کر پھوڑے ہوں گے"!

"کیا باتیں کرتی ہو ماں! اتفاق سے اس کے ہاتھوں سے چھوٹ گئے ہوں گے۔ کیا ہمارے تمہارے ہاتھوں سے کوئی نقصان نہیں ہوتا؟"

"ماں سے زبان لڑاتا ہے اپنی بیوی کا قصور نہیں دیکھتا کہ روز کوئی نہ کوئی نقصان کرتی رہتی ہے"۔

"میں بھر دوں گا سارا نقصان! آخر میں بھی تو کماتا ہوں نا؟"

"ہونہہ! کمائی کی دھونس جماتا ہے! بڑی بھاری تیری تنخواہ ہے نا؟ ہزار روپلّی! چند سال تو سروس لگے ہوئے ہوئے ہیں۔ کیا خود اپنی ہی کمائی پر پل کر ہاتھی کا ہاتھی بنا ہے! کیا سارا کنبہ تیری ہی کمائی پر پلا ہے! ہمارے ہی پانچ سو بھلے ہیں کہ اس میں اتنی برکت تھی اور ہے۔ تین چار سال میں ریٹائر ہو جائیں گے چین سے پنشن ملے گی"۔

"اور آپ کی پنشن میں سارا کنبہ چل جائے گا پتا جی؟"

"باپ کے مقابلے پر آتا ہے؟" ماتا جی نے اس زور سے ڈانٹا کہ اس کا منہ لٹک گیا۔

"ادھر سنو تو بھائی صاحب! آج تو ایسا مزے دار اور لذیذ کھانا بنا ہے کہ کھاؤ گے تو سیدھے لیٹرین یا باتھ روم بھاگو گے!"

"مدن تجھے اپنی پڑھائی اور امتحان کی فکر نہیں۔ کچھ دوسرا کام دھام۔ سینما، سیر سپاٹے کچھ نہیں تیرے لیے؟ ایک نندکی طرح بھاوج کے پیچھے پڑ جاتا ہے"۔

"دیکھ میری بیٹیوں کا نام نہ لینا! وہ سسرال سے کبھی کبھار آتی ہیں تو تیری لاڈلی بیوی کی طرف پلٹ کر بھی نہیں دیکھتیں"!

"یہ کیا ناٹک ہو رہا ہے آخر؟ ایک کے بعد ایک سبھی بولتے چلے جا رہے ہیں۔ روز کچھ نہ کچھ ناٹک۔ بس اس کے کاموں میں مین میخ نکالتے چلے جاتے ہیں۔ سب نے مل جل کر اس بیچاری کا ناک میں دم کر ڈالا ہے۔ اگر سب مل کر اسے اس طرح ستائیں گے تو وہ جیئے گی کیسے؟"

"ہم اسے ستاتے ہیں؟ باپ چلایا۔ اچھا الزام لگاتے ہو؟ وہ رات دن تمہارے کان بھرتی ہے اور تم اس چھوکری کے کہنے میں آ کر ماں باپ سے لڑتے ہو۔ زبان چلاتے ہو اور دھونس جماتے ہو۔ ہزار روپلّی کی —!"

"میں کوئی دھونس نہیں جماتا۔ میں آگے رہ کر لڑتا بھی نہیں، آپ لوگ ہی آج لڑنے کے لیے تیار ہو کر بیٹھے ہیں!"

نانی بولی — "تو اسے کمرے میں لیجا لیجا کر کھانا کھلاتا ہے۔ ہمارے زمانے میں تو ایسا نہیں ہوتا تھا۔ میں بہو تھی تو سب کے پیچھے جو کچھ بچا کھچا ملتا تھا۔ کھا لیتی تھی۔ اور بھگوان کا شکر کرتی تھی"۔

"اپنی پسند کی بیوی لایا ہے تو کیوں نہ اسے اپنے ہاتھ سے سونے کے نوالے کھلائے گا!"

"میں کون سے سونے کے نوالے اسے کھلاتا ہوں۔ جو کھانا سب کھاتے ہیں، میں اسے بھی وہی کھلاتا ہوں۔ میری پسند کے طعنے مارتی ہو ماں تو پھر اتنی دھوم دھام سے شادی کیوں کی؟ اتنا بڑا ریسپشن کیوں دیا کہ مجھے قرضدار کر دیا۔؟" سریش طیش میں آ گیا ایک تو آپ اس سے سارے گھر کا کام کرواتے ہو اور پھر وہ کھانا بھی نہ کھائے؟ واہ خوب! اور پھر اس سے اتنی نفرت کہ پتا جی اس کے سامنے کھانا بھی نہیں کھاتے اس کی نظر لگ جاتی ہے کیا؟ اور کھانا ہضم نہیں ہوتا؟"

"خاموش بدتمیز! تم لونڈی کے لیے باپ سے لڑ رہے ہو تمہیں شرم نہیں آتی؟ موم کی ناک! جورو کے غلام!" پتا جی زور سے چلائے۔

"میری بیوی کو لونڈی کہہ رہے ہیں آپ؟ میں برداشت نہیں کر سکتا! میں اب اس گھر میں ایک منٹ کے لیے بھی نہ رہوں گا! میں ابھی ابھی چلا جاؤں گا!"

"جا جا! ابھی چلا جا! ڈراتا کس کو ہے؟" ماں چیخی — "ہم اس پنچ کے لیے تیری اتنی باتیں نہیں سنیں گے! ہونہہ بڑی اچھی تو میرج کی ہے، اپنے دفتر کی سب سے زیادہ جانگلو لونڈی کو پکڑ لیا ہے"۔

"بس کرو ماں، بس کرو، اب میں زیادہ نہیں سن سکتا"۔

سریش بھناتا ہوا اٹھا اور اپنے کمرے میں گھسا اور بیوی کا ہاتھ پکڑ کر لایا اور پھر اسے اسکوٹر پر بٹھایا یہ جا وہ جا — سب کی حیران اور غضب ناک نظروں سے غائب ہو گیا۔

چاروں ناجی سکتے کے عالم میں بیٹھے رہ گئے۔ کسی نے بھی اس ڈرامے کا انجام یہ نہ سوچا تھا۔ سب کے منہ لٹک گئے، آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں کرتے رہے۔ پھر زبردستی اٹھ کر کچھ زبردستی زہر مار کیا۔ پھر کلیاں غرارے کر کر کے اپنے بستروں میں گھس گئے اور کروٹیں بدلنے لگے۔

صبح اٹھ کر جو کوئی بھی باہر نکلا، اڑوسیوں پڑوسیوں کو اپنی طرف تکتے پایا ـــــ اوہ ! رات کو کسی کو بھی اس بات کا خیال نہ آیا کہ سارے پڑوسی جھگڑا سن رہے ہیں ـــــ سب کے سب پھر گھر میں جا گھسے۔ پھر اچانک سریش ایک ٹرک لے کر آیا۔ اپنے اور اپنی بیوی کے کپڑوں کی پیٹیاں اور دوسرے ضروری سامان، گدّے، بستر، رضائی، تکیے وغیرہ ٹرک پر لاد کر بغیر کسی سے کچھ کہے سنے اور بغیر کسی کی طرف دیکھے چل دیا۔ پڑوسی ہنستے اور مسکراتے رہے۔ مارے شرم کے دو تین دن تک سب گھر میں بیٹھے رہے لیکن کب تک گھر میں گھسے رہتے۔ زندگی بہت بے شرم بنا دیتی ہے۔ باپ دفتر جانے کے لیے نکلا۔ جو پہلے ہی سے سر جھکا کر چلنے کا عادی تھا اب تو اور بھی سر جھک گیا اور بغیر ریاکاری کے۔ مدن کے دوستوں نے آ آکر آوازیں لگائیں کہ کالج کیوں نہیں آتا تو وہ بھی دانت نکالے اپنی سائیکل لے کر نکل پڑا اور سائیکل کی تیزی میں سب شرم و حیا ہوا ہو گئی۔ نانی جی اور ماتاجی کو ہی سب سے زیادہ لاج آتی تھی کہ وہ دروازے سے باہر بھی نہ جھانکتی تھیں۔ آخر کار جب چھوٹی بیٹی سسرال سے آئی تو دونوں نے باہر قدم نکالنے شروع کیے۔ لیکن آنے جانے والے کچوکے لگاتے رہے۔

"بہو نہیں دکھتی آپ کی۔ میکے گئی ہے کیا بہن؟"

"بیٹا بھی نظر نہیں آتا۔ سسرال گیا ہے شاید؟"

"زمانہ ہی الٹا ہے اب لڑکے سسرال میں رہتے ہیں!" وغیرہ وغیرہ ـــــ

کچھ رشتہ داروں نے باپ بیٹوں کے درمیان صلح کروانی چاہی

"نام بھی نہ لینا اس کا؟" پتاجی بھنا کر کہتے ـــــ "ہمیں کتنا شرمندہ کر کے گیا ہے۔"

"اب تو جان بھی چلی جائے تو پروا نہیں۔ لیکن ایسے بیٹے اور بہو کی تو شکل بھی نہ دیکھوں گی۔" ماتاجی جوش میں آجاتیں اور ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگتے۔ نانی جی بھی نہ چوکتیں۔

"ہاں دیکھو نا زمانے کا خون سفید ہو گیا ہے۔ اپنی پسند کی پری چھوڑ کر ہم اس کی پسند کی چڑیل لے آئے اسی لیے اس نے ہمارے سینے پر مونگ دلے۔"

"بھائی صاحب واپس آجائیں بڑے شوق سے لیکن وہ پگلی اب اس گھر میں قدم نہیں رکھ سکتی۔" ـــــ دیور غرّایا۔

اور صلح و صفائی کا معاملہ جہاں کا تہاں رہ جاتا۔

اگرچہ ہر ایک کے سامنے بہو سے نفرت کا اظہار ہوتا تھا لیکن اکیلے میں بیٹھ کر ماں بیٹی بہو کے دن گنا کرتیں اور کبھی تو پتاجی اور مدن کی بھی پروا نہ کرتیں۔

"ابھی نواں نہیں لگا ہے!" ماتاجی کہتیں۔

"کچھ تمھیں یاد بھی رہتا ہے" ـــــ نانی جی تشریح کرتیں ـــــ "نواں لگ چکا ہے۔ وہ زیادہ دن نہیں لے گی تم دیکھ لینا، آج کل میں بچہ ہو جائے گا۔"

"میں کہتا ہوں کہ تم لوگوں کا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ہے۔ دونوں کو کوئی دوسری بات سوچنے اور کرنے کے لیے ہی نہیں۔ مدن کی شادی کر دو پھر اس کی بیوی کے دن گنا کرنا" ـــــ پتاجی مدن کو دیکھ کر زور سے ہنسے۔

دونوں مہمان نندوں نے بھی ایسی دلچسپ گفتگو میں حصہ لینا ضروری اور اپنا حق سمجھا۔

"ہاں اب مدن کی شادی کر دینی چاہیے!" بڑی بہن بولی۔

"میں خود اس کے لیے چاند سی دلہن ڈھونڈوں گی!" چھوٹی نے حق جتایا۔

"بھئی سورج جیسی ڈھونڈنا پڑے گی" ـــــ مدن کھل کھلایا۔

"ہاں مدن کی بیوی ہمیں دھوکا نہیں دے گی اور ساس سسر کو چھوڑ کر نہیں بھاگے گی اپنے خصم کو لے کر! اے مدن کہیں تو نے بھی تو کسی کو اٹکا نہیں رکھا ہے؟"

"واہ دیدی! واہ! کیا مجھے بھی بھیا کی طرح کچے دماغ کا سمجھا ہے آپ نے؟ میں کبھی ایسی بیوقوفی نہ کروں گا اور نہ بیوی کو اپنے سر پر چڑھاؤں گا۔ اور اگر آپ لوگوں کی لائی بھی بھابھی کی طرح نکلی تو ایسی پٹائی کروں گا کہ دماغ ٹھیک ہو جائے گا۔"

"ہاں میرا مدن کچے کان کا نہیں اور بڑے کی طرح بدمزاج بھی نہیں ـــــ"

اتنے میں مہادیو جی پھاٹک کھول کر اندر گھسے اور دروازے کے پاس آکر کھنکارنے لگے سب چپ ہو گئے اور پتاجی نے دروازے میں سے جھانک کر انھیں دیکھا۔ یہ سمدھیانے کے آدمی تھے۔

"میں صرف یہ خوش خبری دینے آیا تھا کہ سریش کے ہاں... یعنی اس کی بیوی... یعنی آپ کی بہو کے لڑکا ہوا ہے" ـــــ اور وہ پلٹ کر تیزی سے واپس جانے لگے۔

"کیا سچ کہتے ہو بھائی! ارے بھائی منہ تو میٹھا کر کے جاؤ۔"

بوڑھی نانی کے سوا سب ہی لوگ جوش میں آکر کھڑے ہو گئے۔ مہادیو جی کو عزت اور تکریم کے ساتھ بٹھایا گیا۔ مٹھائی آئی۔ مہادیو جی نے کم اور سب نے زیادہ کھائی۔

"زچہ بچہ تو اچھے ہیں؟ کون سے اسپتال میں ہیں؟ کتنے پونڈ کا بچہ ہے؟ گورا ہے کہ کالا ہے؟ قد تو لمبا ہے نا؟ مجھے ٹھگنے لڑکے اچھے نہیں لگتے" غرض کہ نو دی کا ناک میں دم ہو گیا۔ لیکن وہ ہنس ہنس کر ہر سوال کا جواب دیتے رہے اور جلدی سے اپنا پیچھا چھڑا کر بھاگے۔

"میرا کوٹ تو اٹھانا مدن! میں تو اب چلا سیدھا اسپتال!"

"میں بھی جا رہی ہوں۔ ذرا مجھے دس بیس روپے تو دے دو، بہو کے لیے مٹھائی پھل وغیرہ اور بچے کے لیے کچھ کپڑے لے جاؤں گی۔"

"واہ۔ واہ! کیا ہم نہ جائیں گے؟" کاکا اکڑ کر بولے ــــ "پتا جی ہمیں بھی پانچ دس روپے دیجیے کوئی اچھا سا کھلونا خرید کر لے جاؤں گا۔"

"ابھی اس کے کھلونے کے دن دور ہیں بیٹا ــــ لیکن خرید لے، بھلا کاکا کا دل کیسے مانے گا۔ بیٹی! میں کہتی ہوں کہ تو بس سے نہ جا۔ رکشا سے جا تو میں بھی وہ سب چھوٹے چھوٹے کپڑے لے کر بیٹھ جاؤں گی جو میں نے دیے مار مار کر سیے ہیں۔" نانی جی گڑگڑائیں۔

"ہاں ہاں! رکشا پر جاؤ اور ماتا جی کو بھی ساتھ لے جاؤ!" پتا جی نے آرڈر نکالا۔

"اور پھر ہمارا کیا ہوگا" ــــ بڑی نند بسورنے لگی۔

"ارے یہ بھی کوئی مشکل بات ہے۔ دو رکشے لے لو اور دونوں بہنیں بھی چلی جاؤ۔"

"لیکن نام تو میری ہی پسند کا ہوگا!" چھوٹی پھوپھی نے دھونس جمائی ــــ

"نہیں وہ تو کاکا کا حق ہے!" مدن نے سائیکل سنبھالتے ہوئے کہا۔

"پتا جی یہ میرا حق ہے!" وہ ٹھنکنے لگی۔

"ارے بابا پہلے بچے کو دیکھ تو لو بعد میں فیصلہ ہو جائے گا۔"

تقریباً سب ساتھ ہی اسپتال پہنچے۔ دادی نے سب سے پہلے جھپٹ کر پوتے کو سینے سے چمٹا لیا۔ دادا کہتے ہی رہ گئے کہ پہلے مجھے دو، ارے مجھے دو، لیکن بچے کی شکل بھی انھیں دکھائی نہ دی تب وہ بہو کے پاس گئے اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

"کیسی ہو بیٹی! بہت کمزور نظر آ رہی ہو؟"

"جی نہیں تو! میں تو بالکل اچھی ہوں۔" بہو نے لیٹے لیٹے نمسکار کیا یہ دیکھ کر دادی نے جلدی سے بچہ دادا کے حوالے کیا اور بہو پر جھکیں اس کی خیریت پوچھی اور اس کی پیشانی بھی چوم لی۔ دیور نے بھی ہاتھ جوڑے۔ اور مزاج پوچھا۔

پھوپھیوں نے دادا کے پاس سے بچے کو جھپٹ لیا۔ اور نام تجویز ہونے لگے۔

نانی جی یعنی پردادی کو اس ہنگامے میں کچھ نہ سوجھا کہ کیا کرنا چاہیے وہ بہو کے پائنتیں بیٹھ کر اس کے پیر دبانے لگیں۔

"نہیں نہیں نانی جی یہ کیا غضب کرتی ہو!" بہو نے گھبرا کر اپنے پیر کھینچ لیے۔

سریش جو سارا تماشا ایک سکتے کے عالم میں کھڑا دیکھ رہا تھا، مسکرا پڑا۔ اس نے نانی جی کو اٹھا کر دوسری جگہ بٹھایا اور بچہ اس کی گود میں دے دیا۔

"یہ چھوٹا سا گنیش جو آ گیا ہے تو اب ہمیں کوئی پوچھتا ہی نہیں۔" مدن نے آنسوؤں کے ساتھ ہنستے ہوئے کہا۔

"اور دیکھو مجھے بھی کوئی نہیں پوچھ رہا ہے!" سریش بولا اور دونوں بھائی ایک دوسرے سے لپٹ گئے ماتا جی دونوں کی طرف بڑھیں۔

"ہاں ہاں! گنیش! گنیش بہت اچھا نام رہے گا 'کیوں کملا دیدی!" لتا نے اپنا حق چھوڑتے ہوئے کہا۔

"ہاں مدن کی پسند کا نام ہے اچھا ہے۔" کملا نے کہا۔

سریش بھائی سے علیحدہ ہو کر ماں کے قدموں کی طرف جھکا اور ماتا جی نے اسے گلے لگا لیا۔

"دیکھ بیٹا اب بہو کو لے کر ادھر ادھر نہ جانا، سیدھا گھر آنا بلکہ میں خود اسے اپنے ساتھ گھر لے جاؤں گی۔"

"اچھا ماں! جیسی آپ کی مرضی۔"

"نہیں نہیں! میں بیٹی کو پہلے اپنے گھر لے جاؤں گی! واہ پہلی زچگی ہے!" ــــ حیرانیوں اور خوشیوں میں گم ایک کونے کی چوکی سے اٹھتے ہوئے بہو کی ماں نے جوش میں آ کر کہا۔

"واہ! ہم لے جائیں گے!" دونوں نندوں نے دعویٰ کیا۔

"نہیں میں نہیں لے جانے دوں گی۔ یہ میرا حق ہے!"

"ہاں بھئی ہاں یہ آپ کا ہی حق ہے۔ ہم اسپتال سے اسے گھر نہیں لے جاسکتے! بیٹی آخر تم بھی تو پہلے بچے کے وقت ماں کے گھر ہی رہی تھیں نا؟"

لڑکیاں لاجواب ہو گئیں۔ ●●

پبلیکیشنز ڈویژن
کی
تازہ ترین پیش کش

پریم چند: مصنفہ ڈاکٹر قمر رئیس ــ پریم چند کے مطالعے سے دلچسپی رکھنے والوں اور طلبا کے لیے نادر تحفہ
قیمت آٹھ روپے

ھیرے کی لونگ: بچوں کے لیے آسان زبان میں لکھی ہوئی ۸ کہانیاں جن میں تصاویر بھی ہیں۔
قیمت پانچ روپے پچاس پیسے

جان محمد آزاد

ایک رات کی جنت

سیاہ بادل بدستور جھکے ہوئے تھے لیکن بارش تھم گئی تھی۔ بارش کے رکتے ہی گرد و نواح کی گہما گہمی پھر لوٹ آئی۔ وہ راہ گیر جو بارش سے بچنے کے لیے دکانوں کے چھجوں کے نیچے جمع ہو گئے تھے باہر قریب کے ٹی اسٹال میں چائے کی ایک پیالی پینے چلے تھے ایک ایک کرکے باہر آگئے اور بازار کے اطراف و اکناف میں بکھر گئے۔ اور اس طرح اتوار کی اس شام کے رومان کا خون ہوتے ہوتے رہ گیا۔

وکرم نے فضا میں پرواز کرتی ابابیلوں کے اس جوڑے کی طرف اشارہ کیا جو بارش کے رکتے ہی آزاد فضاؤں میں کھو گئی تھیں لیکن ششما کی غلافی آنکھوں میں اداسی کے سائے زیادہ گھنے ہو گئے تھے۔ نہ جانے وہ کیوں اتنی کھوئی کھوئی اور اداس تھی۔ آج تو اسے خوش ہونا چاہیئے تھا اتنے برسوں کے بعد آج اسے اپنے شوہر کے ساتھ تنہائی میں گھومنے کا موقع ملا تھا۔ انھوں نے اپنے تینوں بچوں کو ان کی دادی کے پاس چھوڑ دیا تھا۔ بچوں نے گھر میں اکیلے رہنے پر بہت شور و غل مچایا لیکن پتاجی کے تیور دیکھتے ہی وہ چپ ہو گئے۔ کویتا ان کی ازدواجی زندگی کا پہلا تحفہ تھی۔ سات آٹھ سال کی بچی اپنے ماں باپ کو کہیں جاتے دیکھ کر مچل گئی تو وکرم نے جذبات کی شدت میں اس کے معصوم گال پر ایک تھپڑ مارا وہ دیر تک آنسو بہاتی رہی پھر آسمان کی پلکیں بھی بھیگ گئیں اور بارش کے قطروں نے راستے میں ہی وکرم اور ششما کا خیر مقدم کیا اور انھیں پاس میں ایک ڈیزل پمپ کی چھت کے نیچے سر چھپانا پڑا۔

وکرم نے ششما کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بیحد اپنائیت سے پوچھا۔ "ششما دیکھو آج کی شام اس جہنم سے فرار حاصل کرنا چاہتا ہوں جسے ہم اپنا گھر سمجھتے ہیں برسوں سے لذت وصال سے محروم ہوں لیکن میری روح آج بھی تمہاری محبت سے سرشار ہے۔ آخر تم کچھ بتاؤ تو سہی۔ تمہاری اداسی کا کیا سبب ہے۔ لیکن ششما کا دل ممتا کے سمندر میں ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ کویتا کا آنسوؤں سے تر بتر چہرہ بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا۔ بنٹو اور ڈالی کی معصوم اور اداس صورتیں اس کے سینے پر تیر چلا رہی تھیں۔ لیکن وہ دل کی بات زبان پر لانے کی جرأت نہیں کر سکتی تھی کیونکہ ان باتوں سے برسوں کی ریاضت کے بعد حاصل حیات لمحات کی رومانیت ختم ہو کے رہ جاتی۔ وہ چاہتی تھی کہ یہ مختصر سے لمحے غیر فانی ہو کر کائنات پہ چھا جائیں اور وکرم ان دلاویز لمحوں میں اپنے ماضی کی شکست خوردگی اپنی ازدواجی زندگی کی تلخیوں کو ڈبو دے۔ وہ آج گھر کی چار دیواری سے بھاگ آئے تھے۔ گھر ۔۔۔۔ ایک کمرہ جس میں بیڈروم۔ ڈرائینگ روم۔ کچن سبھی کچھ شامل تھا۔ اس بڑے شہر میں ان کی کائنات بس اتنی ہی تھی۔ اس رات کی تلخ یادیں دونوں میاں بیوی کے ذہنوں پر اب بھی ہتھوڑے برسا رہی تھیں جب باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی اور ششما کویتا کے بستر سے نکل کر بنٹو اور ڈالی کی چادریں ٹھیک کرکے وکرم کے پاس کے بیڈ اور اس کی پہلو میں آئی تھی لیکن اس کی اس حرکت نے کویتا کو بیدار کر دیا تھا جو ماں کے پاس سونے کی عادی تھی۔ وکرم اور ششما کے چہرے رات کے اندھیرے میں شرمندگی سے سرخ ہو گئے تھے۔ دراصل اس قسم کے واقعات اس بستی میں آئے دن ہوتے رہتے ہیں لیکن بستی کے لوگ ان حادثات کو معمول کی زندگی کا ایک لازمی حصہ تصور کرتے تھے۔ وہ یہ سمجھنے کی زحمت نہیں اٹھانا چاہتے تھے کہ اس قسم کے بچوں میں بلوغت کے سن تک پہنچتے پہنچتے والدین کے تئیں نفرت کا لاوا ابل آئے گا۔ اس واقعہ کے بعد وکرم کئی دن تک پریشان رہا۔ وہ ایک روزنامے میں سب ایڈیٹر تھا۔ اس بدحواسی کے عالم میں ایک شام اس نے اخبار کی شہ سرخی غلط دی۔ ایڈیٹر نے دوسرے روز اسے غیر ذمہ دار، تساہل پسند اور نہ جانے کیا کیا کچھ قرار دیا۔ اس کی بدحواسی کو بالآخر اس کی ناقابلیت تصور کرکے اسے سب ایڈیٹر کے عہدے سے ہٹا کر دوسرا متبادل کام دیا گیا۔ یہ ایک تیر تھا جو اس کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ اس کی عجیب حالت تھی۔ نہ وہ اپنی پوزیشن واضح کر سکتا تھا اور نہ ایڈیٹر کے تحقیر آمیز جملے برداشت کر سکتا تھا۔ ایک بار غصے میں آکر اس نے یہ ملازمت چھوڑنے ہی کا ارادہ کیا لیکن یہ سوچ کر اس کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا کہ ششما اور وہ پہلے ہی بڑی مشکلوں سے گھر چلا رہے ہیں۔ یہ نوکری چھوٹ گئی تو......

وکرم کو ششما کی اداس آنکھوں میں اپنے خوش آئند خواب جھلکتے دکھائی دیئے۔ اچانک وہ رک گئے۔ سامنے ایک اوپن ایر ریسٹورنٹ تھا۔ دونوں بارش سے تر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ اور چائے کا آرڈر دیا۔ ششما وکرم کے سکون کو تباہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کے دل کی عمیق گہرائیوں میں وکرم کے لیے ہمدردی کا جو ننھا سا چراغ روشن ہوا تھا وہ اسے بجھنے نہیں دینا چاہتی تھی۔ اچانک بجلی کی سپلائی معطل ہوئی۔ چاروں طرف تاریکی پھیل گئی۔ ششما نے اپنی

مہکتی ہوئی زلفوں کے انبار چھوڑ کر دونوں بازو اوپر اٹھائے اور تن کر انگڑائی لی۔ وکرم کو ڈر محسوس ہوا کہ کہیں سنگ مرمر کا تاج محل گر کر ریزہ ریزہ نہ ہو جائے۔ اس کی نظروں میں بہت سے گول دائرے گھوم گئے۔ اس نے ششما کو اپنے بازووں میں کس لیا۔ اور اس کے ہونٹ ششما کے تپتے ہوئے ہونٹوں میں پیوست ہو گئے۔ وہ بڑبڑا رہا تھا۔

"ششما میں ان ہونٹوں کو چومنے کے لیے کس قدر بیتاب تھا۔ تم آج بھی میرے لیے ایک حسین خواب ہو۔ تم وہی پھولوں کی معطر سانس ہو جو مجھے بہاروں سے آشنا کرتی ہے۔ ششما مائی ڈارلنگ۔" ششما حیران تھی۔ وکرم کا پیار ایک آندھی کی طرح امنڈ آیا تھا۔ ششما سوچ رہی تھی کہ اگر ان کے پاس بھی تین کمروں پر مشتمل ایک فلیٹ ہوتا تو وکرم کی راتیں ویران نہ ہوتیں اور وہ یوں دن رات الجھنوں میں غرق نہ رہتا۔ بجلی آگئی۔ وکرم پُرسکون ہو گیا۔ چائے کا بل ادا کر کے وہ باہر چلے گئے۔

شام کے گھنیرے سائے سڑک کے دونوں طرف اُگے ہوئے صنوبر کے درختوں سے گلے مل رہے تھے وہ دونوں خاموش تھے اور فضا بے حد اداس تھی۔ ششما کو بچوں کی یاد آئی اور اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

اب تو بہت دیر ہو گئی۔ کہاں جائیں اب —

کیوں نہ مہاراجہ پارک چلا جائے۔ وکرم نے شرارت سے پوچھا۔ کیا۔ کیا اتنی شام کو اب ہم ویران پارک میں جائیں۔ اس ورشا کے بعد وہاں بیٹھنے کے لیے بھی مناسب جگہ نہیں ملے گی۔ ششما نے اسے قائل کرنا چاہا۔

"اوہ تو — اتنی گرمی کے بعد بھلا اس بارش میں بھیگنے کو کس کا دل نہیں کرے گا۔"

وکرم کسی بھی طرح ششما کے الفاظ کے طلسم میں آنے والا نہیں تھا اس نے ششما کا ہاتھ پکڑا اور دونوں لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے پارک کی طرف روانہ ہوئے۔ رات جوان تھی۔ بجلی کی سپلائی بحال تھی لیکن دور دور تک تاریکی کا راج تھا۔ پارک کے اندر آکر وہ ایک دور افتادہ گوشے میں آ گئے۔ چنار کے بہت بڑے درخت کے نیچے جہاں اندھیرا کچھ زیادہ ہی گھنا تھا وکرم نے جگہ صاف کی اور دونوں بیٹھ گئے۔ ششما ایک پتے کی طرح کانپ رہی تھی لیکن اس نے وکرم کی یہ رات خوشگوار بنانے کا عزم کیا تھا۔ وکرم اسے باہوں میں لے کر بے تحاشہ چومنے لگا۔ وہ عظیم چوٹیوں اور بلندیوں کو سر کرنا چاہتا تھا تاکہ وہ ان گھڑیوں کو اپنا سرمایہ حیات بنا سکے اور ششما اس سہمے ہوئے بچے کی طرح وکرم کے قریب آ رہی تھی جیسے ایک گہری اور تاریک کھائی کے سرے پر بے یار و مددگار چھوڑ دیا گیا ہو۔ اس کے صحت مند بازو پر وکرم کے دانتوں کا نشان اس اندھیری رات میں نئے چاند کی طرح چمک رہا تھا —

ٹھیک اسی وقت پولیس کے سائرن کی آواز سے پارک کی فضا بیدار ہو اٹھی۔ دونوں کے چہرے ٹارچ کی روشنی میں نہا گئے —

"یہیں ہیں جناب — ان بد قماش لوگوں نے مجھ بوڑھے چوکیدار کا جینا دوبھر کر کے رکھ دیا ہے۔ حالانکہ شام کے بعد پارک میں آنا ممنوع قرار دیا گیا ہے لیکن یہ پست کردار کی عورتیں نہ جانے کہاں سے خریداروں کو پھانس کر اس پارک میں لاتی ہیں۔ آج بڑی کوششوں سے رنگے ہاتھوں پکڑے گئے۔

تھانے دار صاحب۔ انھیں فوراً حراست میں لے لیجئے —"

بقیہ: کرشن چندر — ذہنی اور فنی سفر

نفسی اور کردار نگاری کا ثبوت فراہم کرتے ہیں اس طرح کے افسانوں میں فنکار خود ایسے کردار کی شکل اختیار کر لیتا ہے جو دوسرے کردار کی شخصیت کا جزو بن کر آہستہ آہستہ اس کی باطنی پرتوں سے پردہ اٹھاتا ہے۔ لیکن کرشن چندر کے ذہنی اور فنی سفر کا یہ جائزہ ان افسانوں کی شمولیت کی صورت ہی میں مکمل ہو سکتا ہے جن میں فنکار ایک خود بین و خود آرا کی حیثیت سے جلوہ گر نظر آتا ہے۔ آئینہ کے سامنے اور میرا بچہ کرشن چندر کے ایسے ہی افسانے ہیں جن میں ایک فنکار نہیں بلکہ ایک عام آدمی اس طرح بولتا ہوا نظر آتا ہے کہ جہاں اس کی کمزوریاں اور داغ دھبے بھی انسانی سرشت کا حصہ بن جاتے ہیں وہاں اس کے یہ الفاظ بھی بے معنی نہیں رہتے۔

> "بیٹا تو انسان ہے۔ انسان اپنے ضمیر کا، اپنی تقدیر کا، اپنی زمین کا خود خالق ہے۔ انسان قوم سے، ملک سے، مذہب سے بڑا ہے۔ وہ اپنی روح تعمیر کر رہا ہے۔ تو ہم سے نیا ہے۔ اپنی جدت سے اس روح کو نئی سربلندی عطا کر تیرے اور میرے درمیان باپ بیٹے کا رشتہ نہیں ہے تیرے اور میرے درمیان صرف محبت کا رشتہ ہے۔ جیسے سمندر لہر سے اور آگ شعلے سے اور ہوا جھونکے سے ملتی ہے اسی طرح میں اور تو اس دنیا میں آ کے مل گئے ہیں اور ماضی سے حال اور حال سے مستقبل کی تعمیر کر رہے ہیں"
>
> (میرا بچہ)

کرشن چندر دراصل ایسے سماج کے افسانہ نگار ہیں جو ہنوز عبوری دور سے گزر رہا ہے اور آزادی کی ربع صدی سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے باوجود بھی وہ سامراجیت کے زخموں کو ابھی مندمل نہیں کر سکا ہے چونکہ وہ حساس دل رکھنے والے سچے اور انسان دوست فنکار ہیں اس لیے جہاں کہیں بھی انھیں بھوک، افلاس، ظلم اور انسانیت کی تذلیل نظر آتی ہے ان کے غم و غصہ اور احتجاج کی لے کسی قدر تیز ہو جاتی ہے۔ ورنہ بنیادی طور پر وہ ایسے رجائیت پسند فنکار ہیں جو علم و عمل کی قوتوں اور انسانی سماج کے روشن مستقبل پر پختہ یقین رکھتا ہے۔

ترقی اُردو بیورو کی مطبوعات

فرہنگ آصفیہ ——— مولفہ سیّد احمد دہلوی

یہ اُردو زبان کی وہ مشہور اور مستند لغت ہے جو برسوں سے نایاب تھی۔ اس لغت میں عربی، فارسی، ترکی، ہندی، سنسکرت اور انگریزی کے وہ الفاظ شامل ہیں جو اُردو زبان کا جزو بن چکے ہیں۔ اس کی چند اہم خصوصیات یہ ہیں:

- عدالتی الفاظ • بیگماتی محاورات • اہل پیشہ و اہل حرفہ کی ضروری اصطلاحات • داخل روزمرہ ضرب الامثال • اشارات و کنایات۔
- تاریخی واقعات • مناسب حال ماتوے • علم زبان کے رموز و نکات • اردو صرف و نحو کے قاعدے • ملک کی متداولہ رسمیں۔
- قدیم و جدید تحقیقات کے اختلافات مع نظائر • نظم و نثر میں لفظوں کے کثیر المعانی استعمال کی مثالیں اور وجہ تسمیہ • تمام اولیاء اور فقرائے ہند کے اسمائے گرامی مع حالات۔ • علمائے کرام کے نام اور مختصر سوانح عمریاں۔

علاوہ ازیں دیگر امور کی تشریحات بھی اس لغت میں درج ہیں۔ چار جلدوں پر مشتمل یہ لغت ۵۵ ہزار سے زائد الفاظ کا بے مثال ذخیرہ ہے۔
فوٹو آفسٹ سے شائع کردہ اس فرہنگ میں اصل ایڈیشن کی بعض غلطیوں کا ازالہ کر دیا گیا ہے۔

سائز $\frac{20 \times 30}{4}$ ڈھائی ہزار سے زائد صفحات ——— قیمت: ۱۵۰ روپے (مکمل چار جلدیں)

انیس کے مرثیے (جلد دوم) — مرتبہ صالحہ عابد حسین

میر انیس کے بیس بہترین مراثی کا یہ مجموعہ، کلام کی سادگی و پرکاری، فصاحت و بلاغت، فنکاری و صنّاعی کا بے مثل نمونہ ہے۔ کتاب کے آخر میں اختلاف نسخ کی تشریحات اور فرہنگ کی شمولیت کی وجہ سے یہ کتاب اعتبار کا درجہ رکھتی ہے۔ سائز $\frac{20 \times 26}{8}$ صفحات: ۵۷۶ ——— قیمت: ۲۸ روپے۔

اِنشا کا ترکی روزنامچہ — ترجمہ، ترتیب، تحشیہ: ڈاکٹر سیّد نعیم الدین

اس نادر و نایاب روزنامچے سے اُردو کے عظیم شاعر و عالم انشا کی شخصیت و سیرت کے علاوہ اُس دور کے ایسے واقعات کی تصویر سامنے آجاتی ہے جن کے ذکر سے تاریخ کی کتابیں خالی ہیں۔ اس نادر و نایاب روزنامچے کو اُردو میں پہلی بار ترقی اردو بیورو نے شائع کیا۔ ترجمہ براہ راست ترکی زبان سے کیا گیا ہے۔

سائز: $\frac{18 \times 22}{8}$ صفحات ۶۸ ——— قیمت: ۴ روپے ۵۰ پیسے

قدیم ہندی فلسفہ ——— رائے شیو موہن لال ماتھر

اس کتاب میں مصنف نے وید، اپنشد، بھگوت گیتا، بدھ مت، نیائے ویشیشک، سانکھیہ یوگ میمانسا درشن، ویدانت اور ادویت کے طرز ہائے فکر اور فلسفوں سے سیر حاصل بحث کی ہے۔ فلسفے جیسے خشک موضوع کو مصنف نے نہایت شگفتہ انداز میں پیش کیا ہے۔

سائز $\frac{18 \times 22}{8}$ صفحات — ۲۷۶ ——— قیمت ۱۵ روپے ۵۰ پیسے

ہندوستانی گاؤں ——— مصنف: شیاما چرن دوبے — مترجم: عبدالقادر عمادی

ڈاکٹر دوبے کی یہ کتاب اپنے اچھوتے موضوع کی وجہ سے نہایت اہم ہے۔ اس میں ہندوستان کی دیہی زندگی اپنے اصل رنگ میں پیش کی گئی ہے۔ یہ کتاب دیہی معاشرے سے متعلق بے بہا معلومات فراہم کرتی ہے۔

سائز $\frac{18 \times 22}{8}$ صفحات: ۲۵۶ ——— قیمت: ۱۰ روپے ۷۵ پیسے

فراہمی کتب اور دیگر امور کے لیے پتہ

شعبۂ فروخت و نمائش بیورو فار پروموشن آف اُردو

منسٹری آف ایجوکیشن اینڈ سوشل ویلفیئر، ویسٹ بلاک-8، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی- 110022

dav p 80/468

1980ء میں ہم نے جو بُنیادیں ڈالی تھیں آیئے، 1981ء میں اُن پر عمارت تعمیر کریں

1980ء میں سرپٹ بھاگتے سکّے کے پھیلاؤ کو روکا گیا اور کوئلے، بجلی، صنعتی اشیاء نیز اناج کی پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ کیا گیا۔

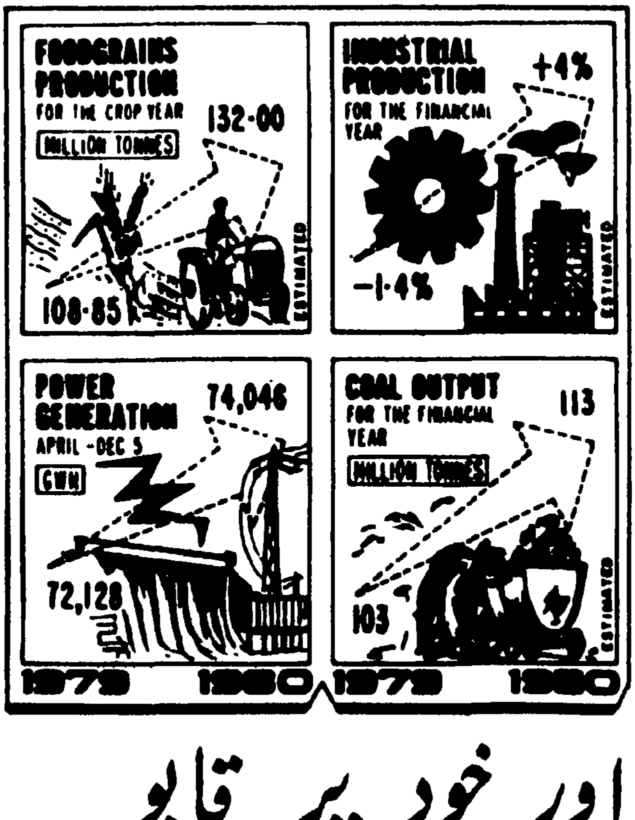

اب وقت ہے کہ ان فائدوں کو مضبوط کریں اور اس سے پیشتر کہ سماج کا کوئی طبقہ قومی خزانے میں سے زیادہ حصّہ طلب کرے پیداوار کو مزید بڑھائیں۔

سخت محنت اور خود پر قابو
ہمارا مقولہ ہونا چاہیے

davp 80/454

نئی کتابیں

عقیدت کے پھول

مصنف : محمد عثمان عارف نقشبندی
تاریخ اشاعت : اگست ۱۹۸۰ء
قیمت : ۲۵ روپے
ناشر : ہلال اکیڈمی ہلال منزل بیکانیر

عثمان عارف صاحب کا مجموعۂ کلام "عقیدت کے پھول" نعت، سلام، منقبت پر مشتمل ہے۔ تاہم ان کا پیرایۂ اظہار غزل، مسدس اور مخمس ہے۔ ان کے نعتیہ کلام میں سب سے پہلے جو چیز قاری کو متاثر کرتی ہے وہ ان کا خلوص اور عاجزانہ لب ولہجہ ہے۔ دوسرے یہ کہ نعت گوئی کا بنیادی مرکز خلوص ہے اس کے بغیر نعتیہ شاعری ممکن ہی نہیں ہے۔ اگر آپ کو ثبوت درکار ہے تو عارف صاحب کے یہ اشعار سنیئے :-

اے چشمِ تمنا بچھ جا طیبہ کی مقدس راہوں میں
اس کو بھی عبادت کہتے ہیں اس طرح بھی سجدا ہوتا ہے
راہوں میں مدینے کی قدم کیسے رکھوں میں
کیا جانے کہاں آپ کا نقشِ کفِ پا ہے
آنکھوں کے اشک دھوئیں گے دل کے غبار کو
پہلے وضو کروں تو محمدؐ کا نام لوں
عاشق کی نمازوں کا بھی انداز نیا ہے
سجدہ ہے جہاں آپ کا نقشِ کفِ پا ہے

محمد عثمان عارف صاحب جب صفاتِ محمدی کا ذکر کرتے ہیں تو ان کی عقیدت ہر صف پہ سربسجود نظر آتی ہے :-

اخلاق ان کا شیوہ تو الطاف ان کی خو
پھولوں سے نرم غنچوں سے نازک ہے گفتگو
قسمت سے جس نے دیکھ لیا چہرۂ نکو
آنکھیں ہوئی ہیں پاک ہوا قلب باوضو

سیرت نبوی کا یہ پہلو بھی ملاحظہ کیجیے :-

انصاف وعدل وہ ہے طبیعت میں آپ کی
شاہ وگدا ہیں ایک شریعت میں آپ کی
بھٹکے ہوؤں کو راہ دکھانے کو آ گئے
سینے سے بے کسوں کو لگانے کو آ گئے
انسانیت حضور کی احسان مند ہے
انسان بلند آپ کے کردار سے ہوا

مذہبی شاعری میں ایک نازک مقام وہ آتا ہے جب شاعر عقیدت کے جوش میں توازن کا خیال نہیں رکھتا مگر عارف صاحب نے فرق مراتب کا خیال رکھا ہے۔ اس کا سب سے دلچسپ اظہار ان کی نظم "درسِ شہادت" میں ملتا ہے۔ کربلا کا واقعہ تاریخ اسلام ہی کا نہیں بلکہ تاریخ عالم کا اپنی نوعیت کا انوکھا واقعہ ہے۔ جس تسلیم ورضا کی ابتدا اسمٰعیلؑ تھے اس کی انتہا حسینؓ تھے۔

اس نظم کا ہر بند سبق آموز ہے اور پڑھنے کے لائق ہے۔ حضرت امام حسینؓ کی منقبت کے علاوہ دوسرے صوفیائے کرام حضرت معین الدین چشتیؒ حضرت نظام الدین محبوب الٰہیؒ وغیرہ کی منقبت میں عقیدت کے نذرانے موجود ہیں جن کو طوالت کے خوف سے نظر انداز کر رہا ہوں۔

نعت گوئی اور منقبت میں جہاں تک جذبات کا تعلق ہے اس میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ مگر شاعری جذبات کے علاوہ شعریت کا بھی مطالبہ کرتی ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ عثمان عارف صاحب کے یہاں جہاں خلوص اور عشقِ رسول کی فراوانی ہے، وہاں شعر کے آداب کو بھی فراموش نہیں کیا ہے۔ سادہ اندازِ بیان، خوبصورت تشبیہات اور قوتِ متخیلہ کے نمونے بھی قدم قدم پر ملتے ہیں۔ کتاب کے مقدمہ میں محترم ہدایت اللہ صاحب نے بجا طور پر کہا ہے۔ "ان کے نعتیہ کلام میں ایک والہانہ کیفیت، ایک نیا آہنگ ایک دلکش لے اور ایک نئی فضا کا احساس ہوتا ہے"۔

بغیر کسی تبصرہ کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں :

انوار ہی انوار، تجلی ہی تجلی
ہر منظرِ دلکش یہی کہتا ہے ادھر دیکھ
ہیں عرش پہ یا گنبدِ خضرا پہ نگاہیں
اے دیکھنے والے یہ ہے معراجِ نظر دیکھ
چہرہ ہے محمد کا گیسو ہیں محمد کے
جو صبح مدینہ ہے جو رات مدینے میں

سینہ ہے کہ گنجینۂ اسرار الٰہی
چہرہ ہے محمد کا کہ قرآن مبین ہے
طیبہ کی تجلی ہو کہ ایمن کا نظارہ
بدلے ہوئے عنوان ہیں افسانہ وہی ہے

آخر میں ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں کہ ادب کے طالب علم کو نعت گوئی کا مطالعہ اس انداز سے بھی کرنا ہے کہ اس نے عہدِ حاضر اور جدید اسلوب کو کیا دیا۔ اگر یہ بات سمجھ میں آگئی تو نعت گوئی محض ایک مخصوص فرقہ کے مذہبی جذبات کی نمائندہ ہی نہیں رہے گی بلکہ عہد حاضر سے اس کی مطابقت بھی سمجھ میں آجائے گی۔ رسول اکرمؐ کی ذاتِ مبارک کے بارے میں پہلے کہا گیا ہے کہ "مسلسل حیات نو کا مرکزی جوہر حضورؐ کی ذاتِ گرامی ہے"۔ معراج نبوی کا مقصد بھی انسان کی عظمت کا اظہار تھا۔ عثمان عارف صاحب نے اس نکتہ کو سمجھ لیا ہے جب ہی تو وہ کہتے ہیں :—

اک آن میں کس شان سے پہونچا ہے کہاں تو
یہ چاند۔ یہ خورشید تری گردِ سفر ہے
اے سیدِ کونین تری ذاتِ گرامی
تکمیل ہے انسان کی، معراجِ بشر ہے

(ظہیر صدیقی)

عرفانِ سخن (شعری مجموعہ)

چاندنرائن رینہ چاندؔ (مرحوم)
اشاعت : اگست ۱۹۸۰ء
قیمت : ۱۰ روپے
ملنے کا پتہ : ۱۴۴۔ سیکٹر ۳۶ چنڈی گڑھ

منظومات، قطعات اور غزلیات کے اس مجموعہ کی ترتیب اور اشاعت کا سہرا مرحوم چاند صاحب کے فرزند جناب کے این رینہ کے سر ہے۔ یہ کارِ خیر اس خاندان کی یاد دلاتا ہے جسے پشتوں سے اردو کی آبیاری اور پرستاری سے ایک تعلقِ خاص رہا ہے۔ اس صورتِ حال کا بیّن ثبوت چاند صاحب کی طویل نظم "مظلوم اردو" کے اشعار میں ملتا ہے۔ اردو کے بارے میں موصوف نے اپنے دلی اور سچے جذبات کا اظہار مناسب تاریخی تواتر اور واقعاتی تسلسل کے ساتھ بڑے سلیقے سے کیا ہے۔ گویا ولی سے لے کر جواہر لال نہرو تک— اردو کے تخلیق کاروں، ادیبوں اور مربی حضرات کے ذکرِ خیر کی کلی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ اردو کے تئیں خراجِ عقیدت اور دردمندی کی منہ بولتی دستاویزوں میں اس نظم کا شمار کیا جا سکتا ہے۔ یہ نظم دوسری نظموں کی طرح شاعر کے وسیع مشاہدات اور گوناگوں تجربات کی بڑے برجستہ انداز میں ترجمانی کرتی ہے۔

چاند صاحب کے یہاں غزلیات کا پلڑا بھاری ہے شاید ہی کوئی غزل ایسی ہو جس میں اچھے شعروں کی کمی محسوس ہو۔ غزل میں چاند صاحب کا شعری اسلوب نہ صرف روایت کی مسلمہ خصوصیات کے ساتھ پورا پورا انصاف کرتا ہے، بلکہ ان کی وسعتِ فکر و نظر گہرے احساس اور سچے جذبات کو تخیل کے رنگا رنگ پیکر دینے میں متنوع طور پر کامیاب ہے۔ ان کا احساس غم ازلی ہے اور ابدی ناگزیریت کی نشاندہی کرتا ہے۔ ایک مسلسل غزل میں انھوں نے اپنے طبیعی انجام کو فنا فی اللہ کی سرمدی کیفیت میں بڑی غیر معمولی اثر انگیزی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ غزل کے یہ تین شعر قابلِ ملاحظہ ہیں :

بتانِ ماسوا سے اب جدا ہونے کا وقت آیا
خدا سے مل کے اب یعنی خدا ہونے کا وقت آیا

افق پر زندگی کے ڈوبتا ہے مہر برنائی
نمازِ شام ہستی کے ادا ہونے کا وقت آیا

جسے ہم دیکھتے تھے چاند اکثر کم نگاہی سے
اس شاخِ خمیدہ کے عصا ہونے کا وقت آیا

چاندؔ صاحب کا معیارِ تغزل، احساس، جذبے اور تخیل کی ملی جلی صورتِ حال پر مبنی ہے انہی اجزا سے انھوں نے غزل کے رنگ و پے میں فلسفیانہ رد و قبول کی جو فضا باندھی ہے وہ جتنی موثر ہے اتنی ہی دیرپا بھی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے ذیل کے چند شعر اپنی آفاقی نوعیت سے قاری کو ضرور متوجہ کریں گے۔

جہاں کی ہر چیز ہے ادھوری، سکونِ دل ہو کہ ناصبوری
کہیں مکاں ہے مکیں سے خالی، کہیں مکیں ہے مکاں نہیں ہے

یہ حق کی بلندی سے اترتی ہوئی دنیا
دیکھی نہیں جاتی ہے مگر دیکھ رہا ہوں

وہ پہنچے آسمانِ انتہا پر کس طرح اے چاندؔ
جس انساں کو زمینِ ابتدا اپنا نہیں آیا

(رام پرکاش راہی)

حرفِ خودی

مصنف : انیس امام
قیمت : ۱۰ روپے
ناشر : نصرت پبلشرز لکھنؤ

مذکورہ بالا عنوان انیس امام کے پہلے مجموعہ کلام کا ہے۔ عنوان کی ترکیب الفاظ رسمی و رواجی نہیں ایک متعین اندازِ نظر اور مزاجِ فن کا اشاریہ ہے۔ زیرِ نظر مجموعے کی ایک نظم "میں" اس طرح اختتام پذیر ہوتی ہے :

چمن بندی سے میری انجم و مہتاب بھی لرزاں ۔۔۔ کہ بزمِ عالمِ خاکی کو سجنا چاہتا ہوں میں
کبھی میری ضرورت ہو تم کو کارواں والو ۔۔۔ تو پھر آواز دے دینا کہ آگے بڑھ گیا ہوں میں

ان اشعار سے مترشح ہوتا ہے کہ انیس امام ان فنکاروں میں نہیں ہیں جو حیات و کائنات کے مسائل سے الگ اور دور صرف اپنی ذات کے نہاں خانوں میں سر چھپائے رات دن کسی تصورِ جاناں میں بیٹھے ہوئے ہیں بلکہ وہ زندگی کی قدروں سے دلچسپی لینا اور تزئینِ حیات کی کوشش کرنا اپنا فرضِ منصبی سمجھتے ہیں۔ اپنے اس رویے کا اعلان موصوف نے کتاب کے پیش لفظ میں اس طرح کیا ہے:

۱۔ "کوئی اہم فنکار ایسا نہیں جس کا کوئی مخصوص زاویۂ نگاہ نہ ہو۔ میں اسی کو COMMITMENT تصور کرتا ہوں۔ فنکار کا یہ فیصلہ کہ وہ مطلقاً آزاد ہے اور کسی نظریے کی پابندی قبول نہیں کرے گا خود ایک خطرناک قسم کا COMMITMENT ہے۔ اس لیے کہ بے سمتی فرد کو گمراہ کرنے کے سوا کچھ نہیں دے سکتی ہے۔"

۲۔ "فن قدروں کی تشکیل کرتا ہے۔ قدروں کی کچھ بنیادیں ہیں۔ بنیاد عموماً دیرپا ہوتی ہے البتہ اس کے اوپری ڈھانچے بدلتے رہتے ہیں......"

ان باتوں سے معلوم ہو جاتا ہے کہ انیس امام ایک باشعور، خود آگاہ اور سنجیدہ فنکار ہیں جو اپنے فن کو انسانیت کی مقدس امانت سمجھتے ہیں اور اس کا استعمال ذمہ داری کے ساتھ تعمیری مقاصد کے لیے کرنا چاہتے ہیں۔ اسی ذہنی پس منظر میں مجموعے کے نام اور کلام کے انداز سے واضح ہوتا ہے کہ انیس امام اقبال سے فکری اور فنی دونوں طور پر متاثر ہیں۔ لیکن اگر امام کے پیش لفظ کے تمام نکات اور ان کی منظومات کا تجزیہ کیا جائے تو صاف نظر آئے گا کہ وہ اشتراکی تصورات سے بھی اثر پذیر ہوئے ہیں۔ اور ان کے یہاں بعض وقت سیاسی احساسات بہت تیز و تند ہو جاتے ہیں۔ اس کے باوجود انیس امام کی ذہنی بالیدگی انھیں عمیق تر افکار اور بلند تر خیالات تک پہنچا دیتی ہے اور ان کی ہمدردیاں کسی سیاسی و معاشی ضابطہ بندی سے وسیع تر ہو جاتی ہیں۔ محولہ بالا پیش لفظ کا اقتباس نمبر ۲ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے اس لیے کہ اس میں بنیادی قدروں کا اعتراف کیا گیا ہے۔ جب کہ مارکسیت صرف بالائی مسئلوں تک محدود ہے۔ اس سلسلے میں غزلوں کے یہ اشعار بھی لائقِ مطالعہ ہیں:

مشغلِ مے سے ہے بہت اونچا مذاقِ مے کشی   تشنگانِ حسن مجھ سے ساقیا کہتے بھی کیا

بادہ کم ہے نہ تشنگی کم ہے   مے کدے کا عجیب عالم ہے

میں اسیرِ کنجِ انا رہا غمِ دو جہاں میں گھرا رہا   نہ خزاں ہی کر سکی حوصلہ نہ بہار سوئے قفس گئی

واقعہ یہ ہے کہ انیس امام ایک غور و فکر کرنے والے شاعر ہیں اور زندگی کی الجھنوں کو سلجھانے کا بھی حوصلہ رکھتے ہیں۔ جب کہ فن کی لطافتوں اور نفاستوں پر بھی ان کی توجہ برابر رہتی ہے۔ فکر و فن دونوں کے معاملے میں وہ بہت سنجیدہ ہیں اور دونوں کے درمیان پیوستگی کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں نظم اور غزل دونوں سے دلچسپی ہے اور ہر صنفِ سخن میں ان کے اپنے احساسات و جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ ایسا اظہار جس میں تازگی اور جدت ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انیس امام کی شاعری میں فکر کی صداقت اور فن کا خلوص دونوں ہی ایک دوسرے کے ساتھ ہم رشتہ ہو کر پائے جاتے ہیں۔

جہاں تک میں نے غور کیا ہے انیس امام کی خاص چیز ان کی نظم نگاری ہے اور اگرچہ انھوں نے پابند اور آزاد دونوں ہی ہیئتوں میں اظہارِ خیال کیا ہے مگر ان کی انفرادیت اور جدت آزاد نظموں میں نمودار ہوتی ہے۔ "حرفِ خودی" کی پہلی تخلیق "غمِ دوراں کی صلیب" کا مطالعہ اس سلسلے میں خاص طور پر کیا جانا چاہیئے۔ یہ ایک قدرے مختصر صرف ایک صفحہ پر محیط آزاد نظم ہے۔ اس کی ہئیت اتنی کسی اور کڑی ہوئی ہے کہ ایک لفظ بھی ادھر سے ادھر کر دیا جائے تو پوری تخلیق بکھر کر رہ جائے گی۔ اس کا ایک ایک مصرعہ اور ٹکڑا بالکل تراشیدہ اور اپنی جگہ چست و معنی خیز ہے۔ نادر ترکیبیں اور عمدہ تشبیہیں پیش کی گئی ہیں۔ ہر استعارہ نگینے کی طرح جڑا ہوا ہے اور نہایت خیال انگیز ہے۔ مصرعوں کا آہنگ بے حد موزوں اور متناسب ہے۔ ارتقا خیال میں ابتدا سے انتہا تک پیوستگی ہے۔ یہ نظم ایجاز و ارتکاز کا ایک نمونہ کمال ہے۔ اس میں شدتِ احساس اور پروازِ تخیل کو بڑے نظم و ضبط کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اور نقطۂ عروج و اختتام تو سحر انگیز حد تک پُر تاثیر ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس نظم کو نظمِ آزاد کے کامیاب ترین تجربوں میں ایک شمار کیا جا سکتا ہے اور فیض کی 'تنہائی' کے بعد میری نگاہ میں یہ دوسری غیر پابند نظم ہے جس کو عظیم کہا جا سکتا ہے (واضح ہو کہ 'تنہائی' بلینک ورس ہے اور "غمِ دوراں کی صلیب" فری ورس)۔

انیس امام کی دوسری اچھی آزاد نظموں کی فہرس اس طرح ہے:
نیا موڑ، بند پانی کا مقدر، روح کی آواز، سگار، قتل، ذات کا کرب، آئینے ٹوٹ گئے، شباب تیرہ شبی، سوالیہ نشان، فن کار کا منصب۔

بہرحال انیس امام کا تعلق نئے اور پرانے کے بیچ کے طبقۂ شعرا سے ہے، وہ زمانہ کے لحاظ سے ایک درمیانی نسل کے آدمی ہیں۔ انھوں نے ترقی پسند تحریک کے دور میں اور اسی کے احساسات کے ساتھ وابستہ ہو کر شاعری شروع کی لیکن انھوں نے کوئی جماعتی ضابطہ بندی قبول نہیں کی اور فکر و فن کے تازہ ترین میلانات سے بھی اپنا رشتہ جوڑا بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ان کی اسی سلامت روی اور فکری اعتدال نے انھیں ہمیشہ آزاد نظر اور انفرادی کوشش کے ساتھ خوب سے خوب تر کی جست و جو پر قائم رکھا یہاں تک کہ ان کے ذہن کی گہرائیاں اور شعور کی وسعتیں بڑھتی ہی گئیں اور فن بالیدہ تر ہوتا رہا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ابھی انیس امام کے ذہن و فن کو ارتقا کے بلند تر مراحل طے کرنا باقی ہے۔ مجھے توقع ہے کہ "حرفِ خودی" نے شاعری کا جو جوہر پیش کیا ہے وہ مزید نکھرے اور چمکے گا۔

(عبدالمغنی)

جوئے سبز

شاعر : حمید الماس

ناشر : زبیدہ الماس، حیدر آباد دکن

قیمت : چھ روپے

حمید الماس کا شمار ان شاعروں میں ہوتا ہے جو زندگی کی تلخ و ترش حقیقتوں کو بھی رومان کی شیرینی سے ہم کنار کرنے کا فن جانتے ہیں الماس ایک عرصے سے شعر کہہ رہے ہیں۔ ان کی شاعری ترقی پسند ادبی تحریک کے زیرِ اثر پروان چڑھی، لیکن انھوں نے اپنی شاعری کو ایک مخصوص سیاسی جماعت کی پالیسی کا آلۂ کار بننے نہیں دیا۔ وہ جدیدیت کے بھی قریب آئے، مگر مقصدیت سے دامن بچانا انھوں نے ضروری نہیں سمجھا۔ وہ انسان دوست اور وطن پرست شاعر ہیں۔ ان کی پرورش ایک ایسے گھرانے میں ہوئی ہے جس نے آزادی کی خاطر قربانیاں دی ہیں۔ ان کے نئے مجموعۂ کلام "جوئے سبز" کے انتساب سے معلوم ہوتا ہے کہ حمید الماس کے والد نے آزادی کی جنگ میں شہادت کا درجہ پایا :

خلاؤں سے کبھی تم جھانک کر دیکھو
تمھاری شمع روشن ہے
تمھاری بات جاری ہے
تمھارے خون کے چھینٹوں سے
یہ نظمیں مزیّن ہیں

حمید الماس کو اپنی دھرتی سے پیار ہے۔ اس کی نرمی، لطافت اور مٹھاس ان کی شاعری میں رچی بسی ہے۔

مری زمیں بھی مقدّس ہے میری ماں کی طرح
مری زمیں وہ تراشیدہ شعر ہے میرا
جو بے مثال بھی ہے اور لازوال بھی ہے

آج کا دور موضوعاتی نظموں کے لیے سازگار نہیں ہے۔ آج زور اس بات پر ہے کہ ذات کے وسیلے سے کائنات، اس کے مظاہر اور مسائل تک رسائی حاصل کی جائے۔ براہِ راست اظہارِ بیان، مطبوع اور مقبول نہیں رہا۔ انھوں نے اس خطۂ وطن پر نہ صرف ایک نظم لکھی ہے، بلکہ ایک فارسی نظم کا منظوم ترجمہ بھی کیا ہے۔ آزادی، گاندھی، نہرو، راکھی کا تہوار، ہند و پاک جنگ — جیسے موضوعات پر، جو میری طرح بہتوں کو پیش پا افتادہ معلوم ہوں گے، حمید الماس نے نظمیں لکھی ہیں، اور انھیں مجموعے کی شکل دی ہے۔ اس مجموعے میں دو غنائیے بھی ہیں، جو شاید ریڈیو کے لیے لکھے گئے ہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ اور کچھ نہ سہی تو انھیں دو غنائیوں کی بنا پر اس مجموعے کو پڑھے جانے کی سفارش بے تکلفی سے کی جا سکتی ہے۔ ان غنائیوں میں موسیقی کا جو آہنگ ہے وہ دامنِ دل کھینچ لیتا ہے۔ مثلاً ایک غنائیہ "پھر ہمارے خون سے تازہ ہوا رخسارِ وقت" کی ابتدا اس گیت سے ہوتی ہے :-

اے ارضِ وطن، اے ارضِ وطن
تو رنگِ جہاں، تو نورِ زمن
اے ارضِ وطن
اے ارضِ وطن
روشن ہے جبیں تاروں کی طرح
محبوب ہے تو پیاروں کی طرح
بازو ہیں ترے یاروں کی طرح
ہے صبح تری پھولوں کا بدن

ایسے وقت میں جب ہماری شاعری کے رجائیت کا عنصر کم سے کم تر ہو گیا ہے حمید الماس کی نظمیں عزم و حوصلہ کا پیغام دیتی ہیں اور امید و یقیں کی شمع جلاتی ہیں۔ ہمارا ملک ان دنوں جس دور سے گزر رہا ہے، اس میں یہ لے، یہ لہجہ خوش آئند ہے۔

اجنبی پرندے

شاعر : اسلم عمادی

ناشر : اسلم عمادی ۳۰-۴-۱۰ ہمایوں نگر حیدر آباد ۵۰۰۰۲۹

قیمت : دس روپے

اسلم عمادی کے دوسرے مجموعۂ کلام "اجنبی پرندے" کی ابتدا ایک نعت سے ہوتی ہے :

بزمِ ہستی میں جسم و جاں تجھ سے — وقت و آب و ہوا رواں تجھ سے
یا محمدؐ زبانِ اسلم میں — عشق تیرا ہے ہم زباں تجھ سے

اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلم عمادی انجینئر ہونے اور سائنسی مزاج رکھنے کے باوجود مذہب سے بیگانہ نہیں۔ اس مجموعے کی دوسری نظم "ہوائیں کھول خداوند" سے بھی یہی تاثر قائم ہوتا ہے۔ اس مجموعے میں ایک اور نظم بھی ہے — "ایک ادھوری حمد"۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اسلم عمادی خدا اور رسول کا احترام کرتے ہیں، ان سے امیدیں وابستہ کرتے ہیں اور یہ مذہب سے ان کی قربت کا اظہار ہے، لیکن ان کی شاعری میں مذہب کے نام پر ماضی سے غیر ضروری رشتہ استوار کرنے کا کوئی رجحان موجود نہیں۔ چوں کہ ان کا تعلق سائنس اور انجینئرنگ سے ہے، اس لیے ان کے کلام میں سائنسی عقلیت پسندی کی جھلکیاں صاف دکھائی دیتی ہیں۔ سائنسی علامتوں اور اصطلاحوں کا استعمال بھی ان کے یہاں ملتا ہے، جس سے کبھی کبھی تعالت پیدا ہوتی ہے :

پیلی کمانیں ٹوٹ کر ایسے تھرک اٹھیں
کہ جیسے سنگریزوں میں
شعلۂ سبز در جائے :

کئی جوہر مثالِ آب ان کا انعطاف ایسے کریں
جیسے ہوا میں اور پانی میں
بھی کوئی سالماتی فصل ہے یا ربط ہے

اور ــــــ

مگر ہر ایک راہی، اک خلائی پمپ ہے
خالی شدہ بوتل کی صورت
کھڑکھڑاتا ــــ رہگزر پر
بس اسی صورت گزرتا ہے
کہ جس صورت میں آیا تھا

ــــــ

نظر پس ماندہ ہو کر
محدب عدسے کے پانی میں کھو جائے

ان کی ایک نظم "آرزو ٹوٹی ہوئی شاخ پر" میں سائنس کا علم یوں جلوہ دکھاتا ہے :

بے کار ہے عبادت خلا میں ــــ نور خلا کی
خلا میں ذرات ہیں نہ نور ریزے کہ اتصال سے پہلے کوئی لہر
بے چاری ایتھر نفی کا زہر پی کر نیلی
اور اگر کوئی بازگشت کہیں سے آتی ہوئی محسوس ہو
تو وہ کثافت سے

شاعری نہ تو مذہبی عقیدت کا نام ہے اور نہ سائنسی عقلیت پسندی کا۔ الفاظ کو ذرا الگ ڈھنگ سے برتنے سے بھی شاعری کے تقاضے پورے نہیں ہو جاتے۔ میرا خیال ہے کہ اسلم عمادی اس نکتے سے ناواقف نہیں۔ اس لیے وہ کہیں کہیں اپنی نظموں کو درجۂ اعتبار بخشنے میں کامیاب ہوئے ہیں :

مجھے معلوم تھا
ــــ ہر راستہ تجھ تک ہی جائے گا

اسلم عمادی بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں، لیکن انھوں نے غزلیں بھی خاصی تعداد میں کہی ہیں۔ ان کی اکثر غزلوں میں انھیں کی نظموں کی سی ثقالت ابھر آئی ہے۔ اسلم عمادی ان اضافتوں سے بھی خصوصی دلچسپی دکھاتے ہیں جب کہ آج شعری زبان زیادہ صاف اور سادہ ہوتی جا رہی ہے، جیسے :

خیالِ موجۂ تندِ بہار لے آئے

یا ــــ آنسو شریکِ گرمیِ حرفِ دعا رہے

کئی غزلوں کو پڑھتے وقت معاصرین کی غزلوں کے اشعار کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ کہیں کہیں خیال کی تکرار گراں گزرتی ہے :

تو اگر چاند ہے اے نور نژاد — اپنے آنگن میں اترتا دیکھوں
تو اگر غنچہ ہے اے حسن تمام — اپنے باغیچے میں کھلتا دیکھوں

تو اگر شعلہ ہے اے برق صفت — اپنے سینے میں اترتا دیکھوں
تو اگر شمع ہے اے بزم آرا — اپنے گھر میں تجھے تنہا دیکھوں

لفظ کی تکرار سے مزید تکدر پیدا ہوتا ہے :

اب کوئی حرف میں کہوں بھی نہیں
اور کوئی بات اب سنوں بھی نہیں

ایسے شعر کم ہی ملتے ہیں، جن پر نگاہ رک جائے۔ لیکن اچھے اشعار کی موجودگی سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا :

خدا سے میرا تعلق ہے گر تو اتنا ہے
کہ اس کو میں نے بھی دیکھا ہے پاس آتے ہوئے

نظر لگی ہے فلک سے نہ جانے کس لمحہ
ہمارا چاند شبِ انتظار لے آئے

ساحل پہ اڑنے والے پرندے بھی کھو نہ جائیں
اے چشمِ پر امید! ترا آسرا رہے

"کچھ نثر میں" کے عنوان سے اسلم عمادی نے مجموعے کے آخر میں مختصر اپنی شاعری کے بارے میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ ساتھ ہی یہ تکلف بھی برتا ہے۔

"اپنے فن کے بارے میں، اپنے پہلے مجموعے کی طرح، کچھ کہنے سے احتراز کروں گا۔"

مگر اپنی کتاب کے فلیپ پر اپنی شاعری کی بابت آٹھ ادیبوں اور شاعروں کی رائیں بھی دی ہیں۔ شاید اس لیے کہ خود جو کچھ کہنے سے احتراز کیا ہے وہ دوسروں کی زبانی کہلایا جا سکے۔

اسلم عمادی شعر گوئی کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ بہتر ہے وہ اپنا تیسرا مجموعہ شائع کرنے میں عجلت سے کام نہ لیں۔ (مظہر امام)

زیرِ طبع کچھ اور کتابیں

۱۔ بھارتی پارلیمنٹ
۲۔ رؤف چاچا کا گدھا
۳۔ دھنواں راجا

اول الذکر کتاب میں آسان زبان میں ہندوستان میں حصولِ آزادی کے بعد پارلیمانی نظام کی کامیابیوں کا دلکش بیان ہے۔ باقی دونوں کتابیں بچوں کے لیے دلچسپ ہیں۔

ہماری کتابیں

شعلِ آزادی (ساغر نظامی) قیمت ۴۰ روپے
ہندوستان کی جنگِ آزادی کی منظوم داستان (حصہ اوّل) ۲۴۰ صفحات پر مشتمل جس میں ۱۸۵۷ء تک کے واقعات شامل ہیں۔ دیدہ زیب کتابت وطباعت عمدہ مجلّد مع گرد پوش۔

بھارت خلائی دَور میں قیمت بارہ روپے
خلائی سائنس کی دلچسپ داستان۔ سری ہری کوٹہ کی سیر، رازہائے سربستہ کا انکشاف، نہایت آسان زبان، خلائی کوششوں کا ہلکے پھلکے انداز میں بیان۔ ۱۴۰ صفحات کی کتاب۔ کاغذ عمدہ، تصاویر سے مزیّن۔

پہیلیاں قیمت آٹھ روپے
پانچ سو سے زیادہ پہیلیوں کا مجموعہ جن سے بچّے اور بڑے یکساں طور پر لطف اُٹھا سکتے ہیں۔

رنگ برنگے پھول قیمت دس روپے
بچوں کے شاعر شفیع الدین نیّر، سیفی سیوہاروی، افسر میرٹھی، اسمٰعیل میرٹھی، تلوک چند محروم اور دیگر بہت سے شعرا کی آسان زبان میں لکھی ہوئی نظمیں۔

آج کل کی کہانیاں قیمت گیارہ روپے
۱۹۶۴ء سے ۱۹۷۸ء تک رسالہ "آج کل" میں شائع شدہ مشہور کہانیوں کا مجموعہ جس میں واجدہ تبسّم، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر اور دیگر افسانہ نگاروں کے شہ پارے شامل ہیں۔

کون جیتا کون ہارا قیمت ۹ روپے
بچوں کے لیے آسان زبان میں لکھی ہوئی دو دلچسپ کہانیاں۔ کتاب شروع کرنے کے بعد ایک ہی نشست میں ختم کرنے کو جی چاہتا ہے عمدہ کتابت۔

ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر (ڈاکٹر محمد عمر) قیمت ۲۰ روپے
ڈاکٹر تاراچند نے اپنی مشہور تصنیف میں ہندوستانی تہذیب پر مسلمانوں کے اثرات کا جائزہ لیا تھا۔ ڈاکٹر محمد عمر نے اپنی اس محققانہ کاوش میں یہ دکھایا ہے کہ ہندوستانی تہذیب مسلمانوں کی زندگی میں سرایت کیے ہوئے ہے۔

۸۔ **مرقعِ اقبال** (جگن ناتھ آزاد) قیمت ۵۰ روپے
علامہ اقبال کی زندگی کے اہم واقعات، شجرۂ نسب اور نادر تصاویر اور تحریروں کا البم۔

۹۔ **یہ ہندوستان** (شیلادھر) قیمت ۱۰ روپے
اس باتصویر کتاب میں سادہ اور سہل زبان میں بچوں کو ہندوستانی تہذیب وتمدن کے ساتھ ساتھ تاریخی معاشی اور سماجی حالات سے آگاہ کیا گیا ہے۔ رنگین تصاویر۔

۱۰۔ **سرسیّد احمد خاں** (پروفیسر خلیق احمد نظامی) قیمت ۵ روپے
ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی، ثقافتی اور سیاسی زندگی پر سرسیّد کے کارناموں کا زبردست اثر پڑا ہے۔ اس بات کو بڑے عالمانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

۱۱۔ **ابوالکلام آزاد** (عرش ملسیانی) قیمت پانچ روپے
ابوالکلام آزاد جدید ہندوستان کے معماروں میں ہیں۔ ان کی خدمات کا حسین و دلکش انداز میں بیان۔

۱۲۔ **جواہر لال کی کہانی تصویروں کی زبانی** قیمت ۳ روپے ۵۰ پیسے
محبوب رہنما اور ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم شری جواہر لال نہرو کی زندگی کے دلچسپ واقعات رنگین تصاویر میں۔ بچوں اور طالب علموں کے لیے بہترین تحفہ۔

۱۳۔ **ہم ایک ہیں** (عرش ملسیانی) قیمت ۱۰ روپے
ہندوستان کی ثقافتی وسماجی گوناگونی اور یک رنگی کا دلچسپ بیان۔ قومی زندگی کی توانائی کی داستان۔

۱۴۔ **پھلوں اور سبزیوں کو محفوظ رکھنے کے طریقے** قیمت دو روپے ۵۰ پیسے
گھریلو عورتوں کے جام جیلی، مارملیڈ، چٹنی مربّے اور آچار وغیرہ بنانے کے متعدد طریقے تصویروں کے ذریعے بتلائے گئے ہیں جن سے بڑی آسانی سے آپ گھر بیٹھے اپنی من پسند چیزیں بنا سکتے ہیں۔

"آجکل" کے خریداروں کو ۲۰ فی صد رعایت۔ محصول ڈاک ہمارے ذمّے
دس روپے سے کم قیمت کی کتابیں بذریعہ وی۔ پی نہیں بھیجی جائیں گی۔ پوسٹل آرڈر بھیجیے یا وی۔ پی طلب کیجیے۔

ملنے کا پتہ: **بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱**

at Civil Lines Post Office, Delhi.

R.N. 910/57

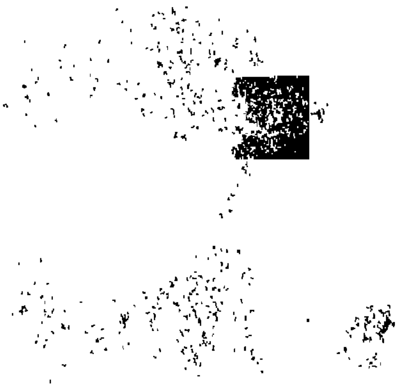

مولانا امتیاز علی عرشی

۸ر دسمبر ۱۹۰۴ء ——— ۲۵ر فروری ۱۹۸۱ء

Vol. 39 No. 9 AJKAL (URDU) APRIL 1981.

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001

Printed by [illegible] Printers, 11/55, Id-Gah Road, New Delhi-110055

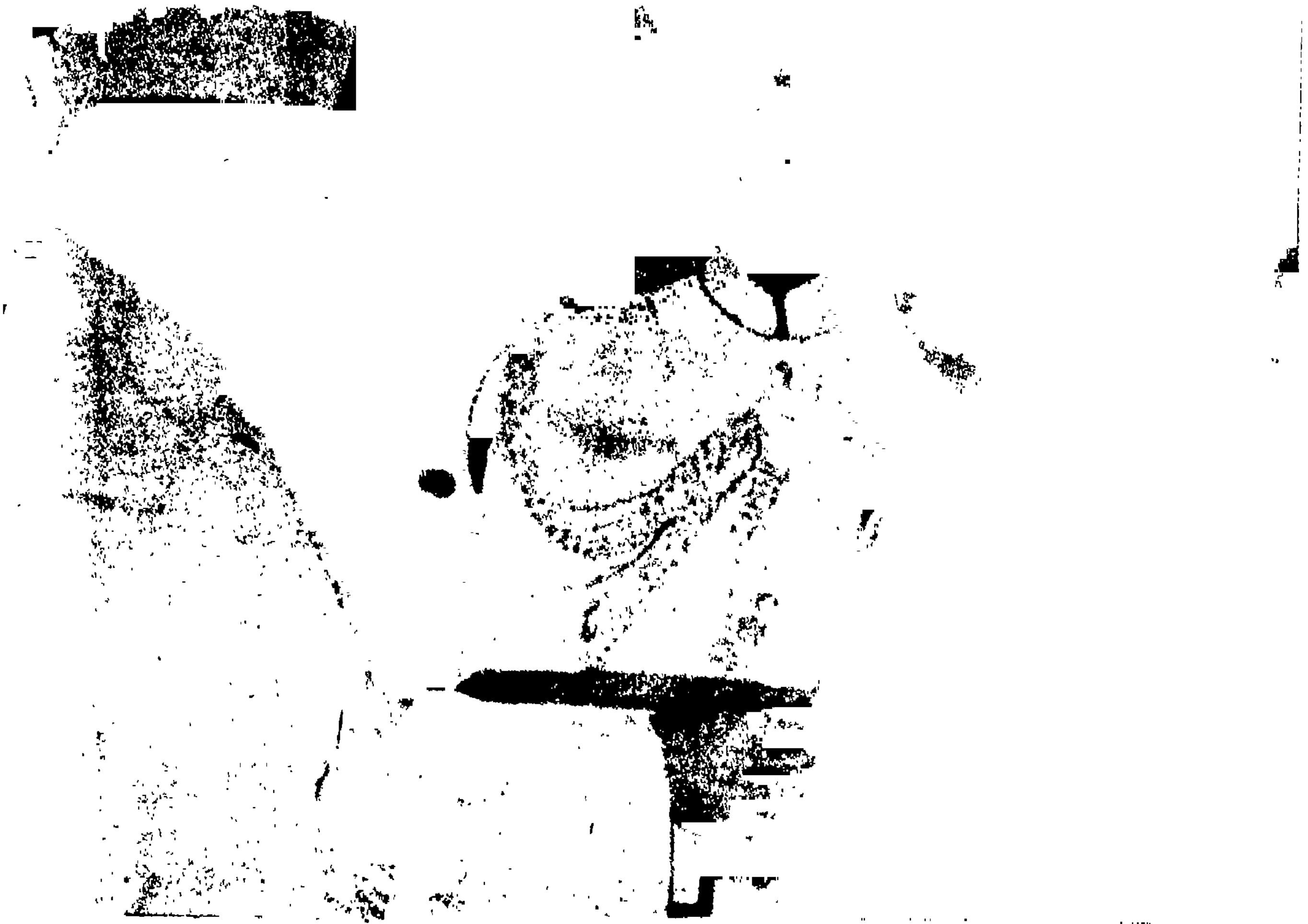

۲۸ مارچ ۱۹۸۱ کو راشٹرپتی بھون میں ایک خصوصی مگر باوقار تقریب میں صدر جمہوریہ ہند شری این سنجیوا ریڈی نے پدم وبھوشن، پدم بھوشن اور پدم شری کے اعزازات دیئے۔ یہ اعزازات ان مقتدر ہستیوں کو دیئے گئے جنہوں نے سائنس، ادب اور فلم وغیرہ میں نمایاں مقام حاصل کیا ہے۔ تصویر میں مشہور انجینئر سائنسداں شری اے پی جے عبدالکلام کو پدم بھوشن کا اعزاز

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے نئی دہلی میں حال ہی میں منعقدہ چھ روزہ فوجی کمانڈروں کی کانفرنس سے خطاب کیا۔ یہ کانفرنس چیف آف دی آرمی اسٹاف جنرل او۔ پی۔ ملہوترہ کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ تصویر میں: جنرل ملہوترہ، وزیر اعظم سے فوجی کمانڈروں کا تعارف کرا رہے ہیں!

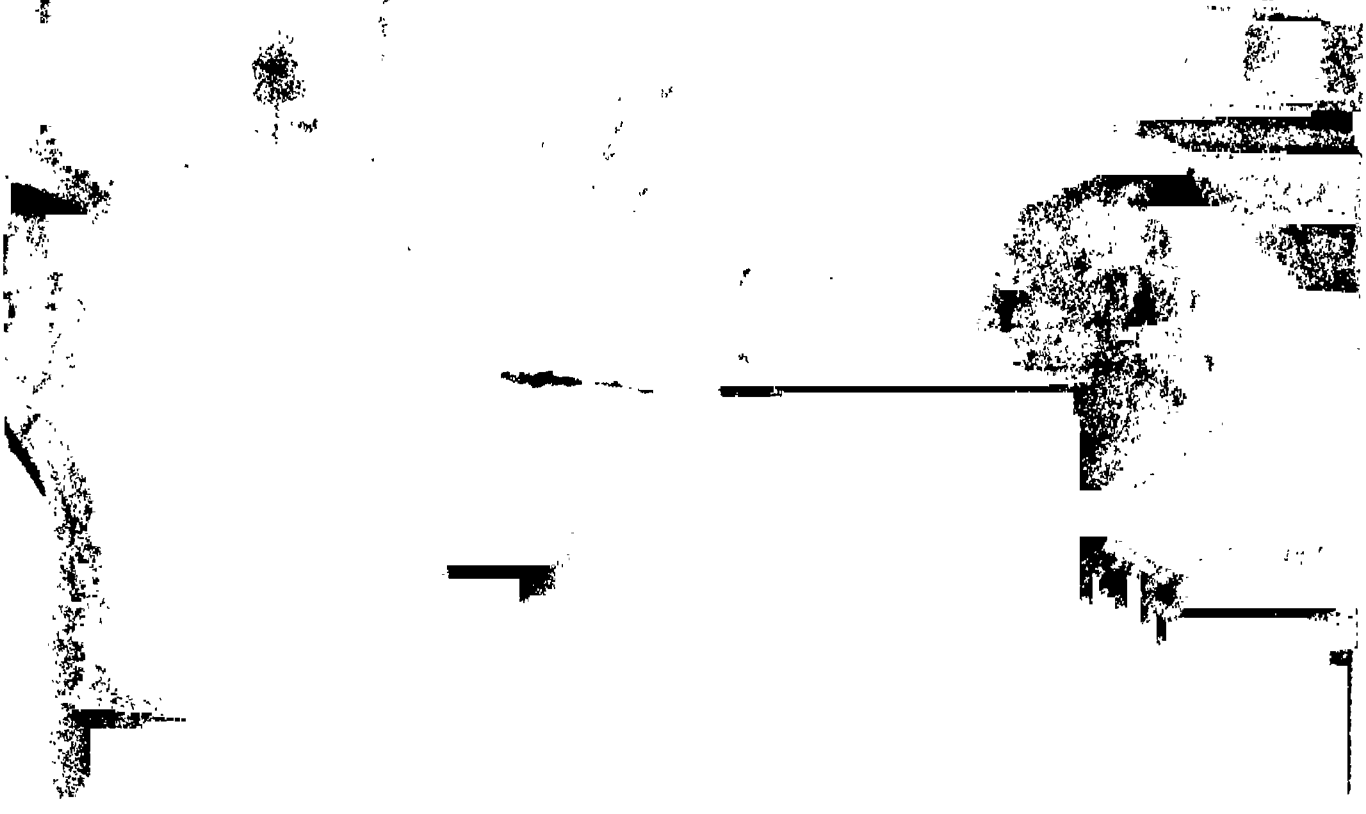

JAMIA NAGAR
NEW DELHI

اردو کا مقبول عام مصور ماہنامہ

ماہنامہ آجکل

نئی دہلی

ایڈیٹر
راج نرائن راز

اسسٹنٹ ایڈیٹر
محمد عادل صدیقی

سب ایڈیٹر
شوناتھ سکہ

جلد ۳۹ شمارہ ۱۰

مئی ۱۹۸۱ء

بیساکھ جیٹھ شک سمت ۱۹۰۳

فون
۳۸۷۰۶۹

شرح چندہ

	ہندستان	پاکستان	دیگر ممالک
سالانہ	۱۰ روپے	۱۶ روپے	۳ ڈالر ۱/۵۰ پونڈ
دوسالہ	۱۸ روپے	۲۸ روپے	۵/۴۰ ڈالر ۲/۷۰ پونڈ
سہ سالہ	۲۵ روپے	۳۸ روپے	۷/۵۰ ڈالر ۳/۷۵ پونڈ
فی کاپی	ایک روپیہ	۱/۵۰ روپیہ	۳۰ سینٹ	۱۵ پنی

ترتیب

ملاحظات ۲

مقالات

مشعلِ آزادی — تاراچرن رستوگی — ۵
امتیاز علی عرشی — ضیاء الدین اصلاحی — ۱۳
عصمت چغتائی کی افسانہ نگاری — مظہر امام — ۱۷
سیدین کے تعلیمی نظریات — فرحت حسین — ۲۲
پنڈت رام پرشاد بسمل — کرشن بلدیو شرما — ۴۰
شہیدِ وطن : جتندر ناتھ داس — میوارام گپتا — ۳۸

منظومات

ایک رہو — نازش پرتاب گڈھی — ۴
غزل — محسن زیدی — ۱۰
اندازِ دعا — حرمت الاکرام — ۲۱
غزلیں — عشرت کرتپوری۔ نامی انصاری — ۲۱
غزلیں — تشنہ بلگرامی۔ اجمال طاہر۔ آفاق فاخری — ۲۷

نیا آہنگ

پروین کمار اشک — ۲۶

کہانیاں

ماں جی — ستیش بترا — ۱۱
ہوا، ہوا، ہوا — مسعود مرزا نیازی — ۲۷

علاقائی ادب

بزدل (بنگالی کہانی) — پریمیندر مترا / ایس ایم حیات — ۳۲
ہوٹل بوائے (اڑیا نظم) — سوریندر بارک / حفیظ نیولپوری — ۳۱

نئی کتابیں

موسمِ سنگ (مضطر مجاز) — انجم عثمانی — ۴۳
فرشتے خاموش ہیں (ویریندر پٹواری) — انجم عثمانی — ۴۳
بیان میرٹھی: حیات و شاعری (محمد شرف الدین ساحل) — حفیظ نیولپوری — ۴۴
نور و نکہت (قمر عثمانی) — مراد کرہانی — ۴۵

مکتوبات — حکیم شفیق الرحمان — ایک تصحیح — ظہیر علی صدیقی — ۴۶

ڈائرکٹر پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر "آج کل" اردو، پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترسیلِ زر کا پتہ
بزنس منیجر، پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ملاحظات

قومی اعزازات

۲۸ مارچ کو راشٹرپتی بھون میں منعقدہ ایک سادہ مگر باوقار تقریب میں صدر جمہوریہ ہند شری نیلم سنجیوا ریڈی نے پدم وبھوشن، پدم بھوشن اور پدم شری کے اعزازات عطا کیے۔ اس موقع پر وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی اور دیگر مرکزی وزراء بھی موجود تھے۔ اس تقریب میں عالمی شہرت یافتہ سائنسداں ڈاکٹر ستیش دھون کو پدم وبھوشن کا اعزاز عطا کیا گیا۔ پدم وبھوشن پانے والی دوسری خوش نصیب شخصیت مشہور ستار نواز روی شنکر کی تھی جو اس موقع پر موجود نہ تھی۔

جنتا سرکار نے ان اعزازات کا سلسلہ منقطع کر دیا تھا تاہم سال گذشتہ شریمتی اندرا گاندھی کی زیر قیادت موجودہ سرکار نے یہ سلسلہ پھر سے بحال کیا۔

اعزاز پانے والی دیگر شخصیتوں میں مشہور انجینئر اور سائنسداں زین العابدین عبدالکلام کو پدم بھوشن کا اعزاز ملا ہے۔ اردو کے مشہور صحافی اور ایڈیٹر سیاست حیدرآباد اور سماجی کارکن شری عابد علی خاں کو پدم شری کا اعزاز عطا کیا گیا۔ فلمی دنیا کی عظیم شخصیت شری مرینال سین کو پدم بھوشن اور شری بی۔ وی۔ کرنتھ کو پدم شری کا اعزاز عطا کیا گیا۔ شری وی۔ بھاسکرن کو پدم شری عطا ہوا ہے۔ آپ نے ماسکو اولمپکس میں بھارت کی ہاکی ٹیم کی قیادت کی اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔ بھارت ناٹیم کی مشہور کلاکار ڈاکٹر پدما سبرامنیم کو پدم شری کے اعزاز سے نوازا گیا۔ پروفیسر جسبیر سنگھ بجاج کو میڈیکل سائنس میں عظیم خدمات کے سبب پدم شری عطا ہوا ہے۔ ادارہ ہذا اعزازات پانے والے تمام حضرات کو مبارکباد پیش کرتا ہے۔

فولاد ساز کارخانہ

یہ خبر مسرت کے ساتھ سنی جائے گی کہ حکومت ہند نے وشاکھاپٹنم میں روسی اشتراک عمل سے فولاد سازی کا ایک مربوط پلانٹ قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ فولاد ہماری معیشت کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی طرح سے ہے اور ہمیں ملک سے غریبی دور کرنے کے لیے صنعتوں کو جس بڑے پیمانے پر فروغ دینا ہے اس کے پیش نظر اس کی اہمیت اور بھی واضح ہو جاتی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق چھ سال کے اندر اندر یہ فولاد ساز کارخانہ مکمل ہو جائے گا۔ اور اس کی ابتدائی صلاحیت ۳۴ لاکھ ٹن ہوگی۔ پبلک سیکٹر میں فولاد سازی کے سلسلے کی یہ عظیم ترین کوشش ہے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ اتنے بڑے پیمانے پر فولاد سازی کے کارخانے کے قیام کی کوشش شروع کی گئی ہے۔ اس سے قبل جو فولاد ساز کارخانے لگائے گئے یا ان میں توسیعی پروگرام شروع کیے گئے وہ اتنے بڑے نہیں تھے۔ حکومت اس پراجیکٹ کو سنجیدگی کے ساتھ وقت مقررہ کے اندر اندر مکمل کرنے کی کوشش کرے گی۔ ہمیں اس پراجیکٹ کا خیر مقدم کرنا چاہیئے۔

عالمی بنک کے صدر کا دورۂ ہند

اس سال مارچ کے مہینے میں جن غیر ملکی مہمانوں نے ہندوستان میں قدم رنجہ فرمایا، ان میں عالمی بنک کے صدر مسٹر رابرٹ ایس میکنمارا بھی شامل ہیں۔ موصوف نے ۲۲ مارچ سے ۲۸ مارچ تک ہندوستان کا دورہ کیا راجدھانی میں قیام کے دوران آپ نے وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی سے ملاقات کی۔ ان کے علاوہ آپ نے شعبہ ہائے مالیات، زراعت، منصوبہ بندی تجارت، انرجی اور پٹرولیم کے وزراء سے بھی ملاقاتیں کیں۔ ہندوستان سے

"منشی پریم چند: زندگی اور فکر وفن" نمائش کی افتتاحی تقریب میں سامعین

لوٹنے سے قبل ۲۸ مارچ کو مسٹر میکنمارا نے ایک بیان میں کہا کہ ہندوستانی رہنماؤں سے ان کی بات چیت بے حد مفید اور کارآمد رہی ہے۔ آپ نے کہا کہ میں نے ہندوستان میں جو کچھ دیکھا اور جو کچھ سنا اس سے بے حد متاثر ہوا ہوں۔ آپ نے مزید کہا کہ ہندوستان میں ترقیاتی عمل نہ صرف تعداد بلکہ معیار کے اعتبار سے بھی بہت حوصلہ افزا ہے۔ آپ نے بتایا کہ ہندوستان میں شرح خواندگی میں بہتری آئی ہے، تعلیمی اداروں میں زیر تعلیم طلبا کی تعداد بڑھی ہے، عمر کا اوسط بڑھا ہے شرح اموات گھٹی ہے اور اضافہ آبادی کی رفتار مدھم ہوئی ہے اور یہ سب کامیابیاں اس بات کی غماز ہیں کہ آپ سب کا بالکل ہماری طرح سے ہی اس بات میں یقین ہے کہ انسانی فلاح وبہبود ہی ترقیاتی عمل کا بنیادی مقصد ہے۔ آپ نے یہ بھی کہا کہ بلاشبہ ترقیاتی عمل میں آپ کا ماضی کا ریکارڈ شاندار ہے لیکن مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ ابھی آپ کو بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ چنانچہ ہندوستان میں جو نیا پنج سالہ منصوبہ تشکیل دیا گیا ہے، اس کی تفاصیل بہت متاثر کن ہیں۔ ہندوستان میں پالیسی سازوں کے سامنے سب سے بڑا چیلنج یہ ہے کہ توازن تجارت کو کیسے موافق بنایا جائے چنانچہ سرکار کی یہی کوشش ہے کہ برآمدات میں اضافے سے اس صنعتی رجحان کو مثبت بنایا جائے جس کے لیے ملک کے عوام کا تعاون درکار ہے۔ توقع ہے کہ ہمارا ملک اس سمت بہت جلد ترقی کی راہ پر گامزن ہوگا۔

پریم چند پر بین الاقوامی سیمینار

پریم چند صد سالہ تقریبات کے سلسلے میں ساہتیہ اکاڈمی نے "پریم چند اور ہندوستانی ناول وافسانہ میں ہندوستانیت کا مسئلہ" پر ایک سہ روزہ بین الاقوامی سیمینار حال ہی میں نئی دہلی میں منعقد کیا۔ اس کی صدارت ساہتیہ اکاڈمی کے صدر پروفیسر اوما شنکر جوشی نے کی۔ اپنے افتتاحی خطبے میں ہندی کے مشہور ادیب، پریم چند کے رفیق اور ساہتیہ اکاڈمی کے فیلو جناب جینندر کمار نے منشی پریم چند کے حالات وکوائف، ان کی تخلیقی سرگرمیوں اور ادبی صحبتوں کا نہایت دلچسپ پیرایہ میں احاطہ کیا۔

ہندوستان کی علاقائی زبانوں کے پندرہ مندوبین نے سیمینار میں شرکت کی۔ غیر ملکی مندوبین کے علاوہ سیمینار میں ڈاکٹر ملک راج آنند، جناب امرت رائے ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر ثریا حسین، جناب جوگندر پال، ڈاکٹر نامور سنگھ پروفیسر سنت سنگھ سیکھوں، ڈاکٹر برج کشور، جناب راجندر یادو، جناب ٹی جانکی رمن اور جناب ٹی شو شنکر پلے نے منشی پریم چند کی حیات اور فکر وفن نیز ہندوستانی افسانوی ادب میں ہندوستانیت کے مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل مقالے پڑھے۔ منشی پریم چند کے متعدد ناول اور افسانوی مجموعے، تقریباً پینتیس غیر ملکی اور ہندوستان کی چودہ علاقائی زبانوں میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔

پریم چند صد سالہ تقریبات کے سلسلے ہی میں وزارت اطلاعات ونشریات کے ڈائرکٹوریٹ آف ایڈورٹائزنگ اینڈ وژول پبلسٹی نے "منشی پریم چند، زندگی اور فکر وفن" پر ایک شاندار نمائش کا اہتمام ساہتیہ اکاڈمی کے احاطے رابندر بھون میں کیا۔

نمائش کا افتتاح کرتے ہوئے مرکزی وزیر اطلاعات ونشریات شری وسنت ساٹھے نے کہا کہ منشی پریم چند کا شمار، اپنے وقت کے ہی نہیں، ہندوستان بلکہ دنیا کے عظیم ادیبوں میں ہوتا ہے۔ ان کے فکر وفن کی آفاقیت اس امر سے ظاہر ہے کہ ان کا تخلیقی ادب متعدد غیر ملکی اور ہندوستان کی سبھی علاقائی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

منشی پریم چند کے ناول جن غیر ملکی زبانوں میں ترجمہ ہوئے ہیں، ان میں انگریزی، روسی، جاپانی، برمی، ہنگرین، تاجک، کرغیز وغیرہ شامل ہیں۔

ایک رہو

گنگا کے دھارو! ایک رہو
بھارت کے پیارو! ایک رہو

رستے پر گھور اندھیرا ہے
پگ پگ سانپوں کا گھیرا ہے
اور راکھشسوں کا ڈیرا ہے

دکھ درد کے ہاہاکار میں ہے
گھٹاؤں کی بوچھار میں ہے
بھارت کرودھی منجدھار میں ہے

اے کھیون ہارو! ایک رہو
بھارت کے پیارو! ایک رہو

یہ رات بڑی پاپن ہی سہی
زہریلی اور کٹھن ہی سہی
بے درد سہی، بیرن ہی سہی

ساتھی ٹھہرے گمراہ، مگر
اپنے بھی ہوئے بدخواہ، مگر
کانٹوں سے بھری ہے راہ مگر

کیوں ہمت ہارو! ایک رہو
بھارت کے پیارو! ایک رہو

اک الجھی زلف کو سلجھاؤ
اک من موہن کو اپناؤ
اک مرکز پر سب آ جاؤ

وار ایک ذرا بھرپور کرو
سامپردائکتا دور کرو
ہر جانب نور ہی نور کرو

اے چاند ستارو! ایک رہو
بھارت کے پیارو! ایک رہو

محفل میں رنگا رنگی ہو
میدان میں ایک آہنگی ہو
اک تان اور ایک ترنگی ہو

اک منزل ہو، اک جادہ ہو
اک ساغر ہو، اک بادہ ہو
تم سب کا ایک ارادہ ہو

نوکا کھیوارو! ایک رہو
بھارت کے پیارو! ایک رہو

اک آن رہے، اک شان رہے
ہر جسم میں ایک ہی جان رہے
ہر منہ میں ایک زبان رہے

اک جانب اور اک ساتھ چلو
ڈالے ہاتھوں میں ہاتھ چلو
تم لے کر نورِ حیات چلو

اے راج دلارو! ایک رہو
بھارت کے پیارو! ایک رہو
گنگا کے دھارو! ایک رہو

نازش پرتاب گڑھی

معرفت شاد دہلوی
گولا گنج بارود خانہ
لکھنؤ

تاراچرن رستوگی
ہیروباٹالی۔ گوہاٹی۔ ۷۸۱۰۱۶

مشعلِ آزادی

وطنی شاعری کا گل سرسبد

ببلی کیشنز ڈیویژن کی طرف سے شائع کردہ اس کتاب پر اردو اکیڈمی اترپردیش نے حال ہی میں تین ہزار روپے کا اعلیٰ ترین اعزاز دیا ہے۔ اس موقع پر اس کتاب کے تعارف کے طور پر شری تاراچرن رستوگی کا مضمون قارئین کی دلچسپی کا باعث ہوگا۔ • ایڈیٹر

ساغر کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی وخصوصیت یہ ہے کہ شاعر کی توجہ، بہ تسلسل و تواتر، وطن اور مسائل وطن پر مرکوز رہی ہے۔ مشعلِ آزادی میں ہندوستان کی جنگِ آزادی نیز متعلقہ واقعات وتحریکات اور محبانِ وطن کے محرکات وجذبات بحسن وخوبی پیش کیے گئے ہیں۔ یہ عہدِ کہن کی داستان ہی نہیں ہے بلکہ ایک شاندار مستقبل کی تشکیل کے لیے دعوت وعزیمت بھی فراہم کرتی ہے۔ اس کا پس منظر ہے قومی یکجہتی کا تصور جو صدیوں سے ہماری گنگا جمنی تہذیب وثقافت کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ افتخار وتفوق کی بلندیوں پر پہنچانے والا یہ تصور آج شکست وریخت کے نرغے میں آگیا ہے جس سے ملک کی وحدت کو خطرہ لاحق ہوگیا ہے۔ اس افسوسناک صورت حال کا سامنا کرنے کے لیے صالح محرکات اور نمو پذیر جذبات کی ضرورت ہے۔ مشعلِ آزادی میں ان جیالے سپوتوں کے خیالات اور کارنامے شعری وساطت سے پیش کیے گئے ہیں جنھوں نے ہندوستان کو پابہ زنجیر کرنے والے انگریز غاصبوں سے لوہا لیا اور ضرورت پڑنے پر موت کو لبیک کہنے سے بھی گریز نہیں کیا۔

نہایت پرگو، جدّت پسند، وسیع العلومات ساغر کو اپنی وطن پرستی پر پرناز رہا ہے ؎

میں ساغر ہوں اپنے وطن کا پجاری

ہندوستان کو تقسیم کی منزل کی طرف اڑا لے جانے والے جھکڑ بھی شاعر کی وطن پرستی میں حائل نہ ہوسکے۔ مشعلِ آزادی میں مشمول نظموں میں وطن کی محبت کی شراب دوآتشہ ہوگئی ہے۔ جنگِ آزادی کا کینوس خاصا بڑا ہے اور اس کو احاطہ کرنے کی کوشش کرنا ہی جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ بایں ہمہ شاعر نے اپنی وطنی محبت سے ملہم ہوکر مشعلِ آزادی کے عنوان سے جو رزمیہ پیش کیا ہے وہ خاصا وقیع ہے۔ اس کے مشمولات پر نگاہ ڈالنے سے پیشتر رزمیہ سے متعلق چند باتوں کو پیش کرنا ضروری ہے۔ رزمیہ قوم وملک کی اس داستان کو کہتے ہیں جس کے محرکات وعواقب ایک مخصوص قوم وملک سے وابستہ ہونے کے باوجود بھی انسانیت کے محرکات وعواقب ہوکر جگمگا اٹھتے ہیں۔ محبانِ وطن کا جاں نثارانہ جوش وخروش، ان کے عزائم اور ولولے وغیرہ ایک رزمیہ کے لیے خام مواد فراہم کرتے ہیں۔ ارسطو کی نگاہِ انتقاد نے رزمیہ کو صرف المیہ سے کم وقیع دیکھا ہے ہومر، ورجل، ملٹن، والمیک وغیرہ کو دنیا کے بہت بڑے رزمیہ نگار تصور کیا جاتا ہے۔ ان شاعروں کے شاہکاروں کا تجزیہ ایک اچھے رزمیہ میں پائے جانے والی خصوصیات اور اس کے اجزائے ترکیبی سے متعلق معلومات فراہم کرتا ہے۔ مشعلِ آزادی میں سوائے مافوق الفطرت عناصر تمام تر خوبیاں موجود ہیں۔ مشعلِ آزادی کے کردار وواقعات چوں کہ اساطیری نہیں ہیں لہٰذا اس حقیقت کے پیش نظر اس کی قدر وقیمت خاصی وقیع ومرتفع ہوگئی ہے۔

مشعلِ آزادی کے پہلے باب کا عنوان ہے 'نیرنگِ آزادی' جس میں حصہ لینے والے کردار ہیں مؤرخ، شاعر، مفکر، سپاہی، درویش وغیرہ جن کے مکالمے جاذب توجہ بھی ہیں اور دلکش بھی۔ دلکش اس لیے کیونکہ شعریت ان سے کبھی جدا نہیں ہوتی۔ اہم یوں ہیں کیونکہ ان کے موضوعات میں مفہوم آزادی، نئی حیات، نطق آزادی وغیرہ مفاہیم شامل ہیں جن کو شاہ ولی اللہ کی "تحریکِ شیخ الہند" کے پس منظر میں پیش کیا گیا ہے۔ ملحوظ رہے، شاہ صاحب فرنگی غلبے کے خلاف ہندوستان کی تحریکِ آزادی کے اولین بانی اور محرک تھے۔ ان کی تقاریر وتصانیف میں ملوکیت اور شہنشاہیت کے خلاف واشگاف آواز ملتی ہے۔ وہ مغلیہ سلطنت کے حامی نہ تھے بلکہ اس میں پیداشدہ برائیوں کے پیش نظر وہ یہی چاہتے تھے کہ ایسے نظام کو توڑ کر ایک ایسا نیا نظام جو دولت ومحنت کے مابین رشتے کو سمجھتا ہو، جو مزدور، کاشتکار اور ایسے ہی محنت کش لوگوں کی ضروریات سے روگردانی نہ کرے، قائم کیا جائے۔ ۱۸ویں صدی کے اواخر کی یہ عظیم شخصیت چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستوں کو ایک ایسے نظام کے تحت لانا چاہتی تھی۔ جس کے لیے انھوں نے "ارتفاق" کی اصطلاح وضع کی۔ "ارتفاق" کو اساساً فیڈریشن سمجھنا چاہیئے۔ ان کا یہ نظریہ بھی خاصا انقلابی تھا کہ انصاف پر چلنے والی ہر حکومت کو، چاہے اس کا سربراہ مملکت ہندو ہو یا

آج کل نئی دہلی

مسلمان، اسلامی حکومت ہوتی ہے۔ ۱۸۵۷ء میں شروع ہونے والی جنگ آزادی کی تخم کاری میں درا صل شاہ صاحب کا بہت بڑا رول تھا۔ ان کے خیالات و تصورات کی روشنی میں، ساغر نے آزادی اور مبادیات و مفادات آزادی پر بہت کچھ کہا ہے۔

آزادی، نئے افق کی جانب بڑھتے قدم کو کہتے ہیں، اختتام منزل کو نہیں ؎

سفر کی آخری منزل نہیں ہے یہ اے دل
نئی حیات کی جانب قدم ہے آزادی

"نئی حیات" کیا ہے؟ سنیے ؎

جہاں انصاف کی اے دل مسلسل ہے عمل داری
اطاعت ہی وہاں دراصل بن جاتی ہے آزادی
جہاں ایثار و قربانی کا جذبہ بکھرا ہوتا ہے
ابھرتی ہے وہاں ویرانیوں میں روحِ آزادی

روحِ آزادی بہت بڑی یافت ہے، امکانات بیش رفت کو آغوش میں لیے یافت ہے ؎

اپنی بھومی کی مٹی کی آغوش سے لعل شب تاب وہ اک گہر مل گیا ہے
جو ہر بستہ تاریکیوں کو کچل کر دکھائے گا ہر گام پر ہم کو مشعل
تخیل کو یہ قوتِ نطق دے گا تصور کو یہ حسنِ اظہار دے گا

روحِ آزادی بیدار ہوتے ہی حامل گویائی ہو جاتی ہے ؎

تخیل کو یہ قوتِ نطق دے گا تصور کو یہ حسنِ اظہار دے گا
نظر کو بصیرت، بصیرت کو قدرت، ارادت کو پرواز افکار دے گا

قوت نطق ایک بہت عظیم قدرت کی حامل ہوتی ہے ؏ ایک نطق بے کراں سے ہے معمور کائنات

وطن کے خشت و سنگ، قصرِ کہنہ کے کھنڈرات، مندر کے کلس
یہاں کے بہار و خزاں، خروشِ امواج و خروشِ طوفاں
صبح و شام پرندوں کی نوا سنجیاں، پپیہے کی پی کہاں،
چمپا، کیوڑا .....

وغیرہ ہی نطق نہیں ہے بلکہ ؎

گر غور کیجیے تو تحیر بھی نطق ہے ناطق ہیں خواب حسنِ تصور بھی نطق ہے

غرض کہ حسن و نطقِ آزادی عین حیات ہیں بلکہ موجب وجود و عدم ہیں ؎

جو یہ نہیں تو عدم ہے نہ کار زارِ وجود
تمام اصلِ وجود و عدم ہے آزادی

آزادی سرمایۂ حیات ہے جس کی بیک وقت نفسیاتی و فلسفیانہ وضاحت مفکر، شاعر اور درویش کے مکالموں سے ابھرتی ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

اندھیری گھاٹیوں میں بڑھ کے خود مشعل دکھاتی ہے
تلاشِ راہبر کیوں ہے کہ خود رہبر ہے آزادی

بلند افکار، سرشارِ خودی، دل شاد رہتا ہے
ہے جس کی روح بھی آزاد وہ آزاد رہتا ہے

مفکر کا خیال ہے ؎

اسی مقام کو ایوان حریت کا سمجھ جہاں عوام حکومت کی دیکھ بھال کریں
قدم قدم پہ مفادات کی نگہداری نفس نفس میں نگہداری آمال کریں
جو ذہن و روح کو حاصل نہیں ہے آزادی نشاط و امن کی حامل نہیں ہے آزادی
نہیں نہیں ہے وہ کامل نہیں ہے آزادی وہ صرف لفظ ہے مفہوم جس کا کچھ بھی نہیں

شاعر کہتا ہے ؎

یہ راز جتنے بھی آمر ہیں ان تلک پہنچاؤ
کہ پیدا ہر کوئی انساں یاں آزاد ہوتا ہے
یہ سولی، یہ شکنجے، یہ صلیبیں اور یہ زنجیریں
دکھا دے کے یہ حلقہ ہائے گیسوئے غلامی ہیں
مگر جب بھی کسی آزاد کی زد میں یہ آتے ہیں
سلگ اٹھتے ہیں حلقے اور پگھل جاتی ہیں زنجیریں

درویش بھی آزادی سے دلچسپی کا اظہار کرتا ہے ؎

گر نہیں خلق گراں مایہ تو آزادی ہے ہیچ
صرف آزادی کا سایہ عشق آزادی نہیں
دھرم، ادھرم حکمت و سائنس و کلچر کفر ہے
گر نہیں انسانیت جس میں تو وہ بادی نہیں
گر پڑوسی سے نہیں الفت تو کیا حب وطن
گر نہیں ہمسائیگی سے عشق آزادی نہیں
خون ہمسایہ جہاں بہتا ہو پانی کی طرح
قاتلوں کی ایک بستی ہے وہ آبادی نہیں

وہ آزادی بنا رکھتی ہے جو امن و اخوت کی
وہ آزادی جو ظلم و جور کے کہسار ڈھاتی ہے
وہ آزادی جو فردا کے سفر کا سنگ منزل ہے
ہزاروں آرزوؤں، ان گنت خوابوں کا حاصل ہے

شاعر فکر و القا کے جھروکوں سے آتی ہوئی صدا پہ کان دھرتا ہے۔ یہ صدا معمولی صدا نہیں ہے، ندائے ضمیر انسانی ہے ؎

اے آزادی کے دیوانے یہ رمز اخوت یاد رہے
آزادی اس کا نام نہیں، تیرا ہی وطن آزاد رہے
آزادی کی تو روح یہ ہے ساری دنیا آزاد رہے

.....

یہ سارا عالمِ انسانی رمز فطرت کا سمندر ہے
یہ سارا عالمِ انسانی قدرت کا واحد مظہر ہے

یہ سارا عالمِ انسانی اک قالب ہے اک پیکر ہے
جو حصہ بھی زخمی ہوگا کل پیکر زخمی کر دے گا
جس ذرے پر بھی ضرب پڑی وہ سارا گھر لے ڈوبے گا

ملحوظ رہے، شاعر، مفکر، درویش وغیرہ مخاطبات کے ذریعۂ آزادی وحیات کے مفاہیم کو پیش کرتے ہیں، معلوم ہوتا ہے، ایک نفسیاتی وسماجی پہلو بھی اپنے پیش نظر رکھا ہے۔ آزادی سے پورا سماج وابستہ رہتا ہے۔ اس کا جذبہ عوامی ہوتا ہے۔ شاعر آزادی کا خواب دیکھتا ہے، مفکر آزادی کو تعقل سے درست وصحت مند جذبہ تصور کرتا ہے اور درویش جس کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہوتی اور دربدر ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے جذبہ آزادی سے سرشار ہوتا ہے۔ آزادی سے پوری سماج کی نفسیاتی وابستگی کو ساغر نے نہایت چابک دستی سے پیش کیا ہے۔

دوسرا باب جس کا عنوان "ارژنگ غلامی" ہے خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ ارژنگ کے معنوں میں قدیم چین کا ایک مشہور شہر، بے مثال نقاش ومصور کا نگارخانہ، قدیم توران کا ایک معروف پہلوان وغیرہ شامل ہیں۔ ساغر نے "ارژنگ غلامی" کے تحت کہنہ وفرسودہ روایات، منفی ومفر خیالات ومحرکات، جنون ذات ومذہب وغیرہ سے عبارت روباہ کاری کو موضوع سخن بنایا ہے۔ اگر یہ باب نہ ہوتا تو بالیقین موضوع تشنہ رہ جاتا۔ سُنیئے کچھ حصّے ؎

نہ پوچھ آدمی کن منزلوں سے گزرا ہے
نہ پوچھ آدمی کن منزلوں سے گزرے گا
کہ عہدِ نو میں بھی زنجیر کھڑکھڑاتی ہے

عہدِ نو میں بھی زنجیر کی کھڑکھڑاہٹ کا بارِ سماعت ہونا انسانیت کی توہین ہے اور حقوق انسانی کے پائمال کیے جانے کا خدشہ شاعر کی آگہی وگیرائی کی نشاندہی کرتا ہے۔ روایات ودور از کار جذبات کے نشے سے بچنا مشکل ہے۔ شاعر سے یہ امر پوشیدہ نہیں ہے۔

جہاں میں کہنہ روایات سے بچا ہے کون ؟
ہر اک نظام ہر اک دین پہ اس کا سایہ ہے
شہنشہی کی کرامات سے بچا ہے کون ؟
نظامِ عیسیٰ ہو وہ بودھ مت کہ ہو اسلام
شہنشہی کی فتوحات سے بچا ہے کون ؟
ہر ایک قوم ہے احساس برتری کی غلام
غلام ساز روایات سے بچا ہے کون؟

اس کے بعد تیسرا حصّہ "رازداں دریا" شروع ہوتا ہے۔ اس حصے میں شاعر کا دریائے جمنا سے مخاطب ہونا خصوصی معنویت کا حامل ہے۔ جمنا کی مذہبی نوعیت نیز کنار جمنا آباد تاریخی شہر اور رونما ہونے والے واقعات وغیرہ کو احاطۂ شعری میں لیا گیا ہے۔

عظمتِ تاریخ ہے تو رازداں دریا ہے تو

کرشن ورادھا کی محبت کا شاہد، خلق گاہ حکمت اپنشد وگیتا، مہابھارت کے ویروں سے واقف، آمد اسلام اس کا ملجا وماویٰ، دلیش بھگتوں یعنی محبانِ وطن کا جولانگاہ ہماری گنگا جمنی ثقافت کا کنول دریائے جمنا ہے۔ درج ذیل اشعار جو داراشکوہ کی مساعی جمیلہ کے متعلق ہیں جاذب توجہ ہیں نیز ایک پیغام کے حامل بھی ہیں ؎

تیرے ساحل پر کنول پھوٹا تھا جس تہذیب کا
ذرہ ذرہ اس کی خوشبو سے معطر ہو گیا
ہر روش پر نغمہ خواں ہونے لگی موجِ شمیم
دی کنول نے اتحاد وسالمیت کی شمیم
متحد ہندوستاں کو بوئے نو سے بھر دیا
تازہ تر پھولوں سے دامانِ گلستاں بھر دیا
حق پرستی نے یہ دارا کی دکھایا معجزہ
سازِ فارس میں اپنشد کا نغمہ گونج اٹھا
اک نیا دو آتشہ کھینچا بہ اندازِ دگر
ساغرِ ایران میں صہبائے گیتا ڈھال کر
جب مہابھارت کو پہنایا لباسِ فارسی
روح یک جہتی کی فرطِ سرخوشی سے جھوم اٹھی

....

کیا یہ آلِ بابری کے عشق کا جادو نہ تھا
برج کی بولی کو موسیقی کی بولی کر دیا
اور پھر اس کی علامت بن کے ابھرا تان سین
خود مغنی، خود ہی ساز اور خود ہی نغمہ تان سین

اس کے بعد فن تعمیر کے شاہکار تاج محل کو شعری تناظر میں بصد حسن وخوبی پیش کیا گیا ہے۔ مغل فن تعمیر بھی صُلح کل پر استوار طرزِ فکر کا مظہر ہے۔ اکبر سے شاہجہاں تک کے دورِ مغلیہ کو شاعر نے یوں پیش کیا ؎

ایک مظہر تاج ہی ان کی محبت کا نہیں
صرف وصلِ خال وخد باعث عقیدت کا نہیں
گھل گئے تھے اس طرح ہندی تمدن میں مغل
ڈالتے ہی دودھ میں جیسے شکر ہو جائے حل
سرکشوں کے سامنے سر ان کے بیشک خم نہ تھے
ورنہ تھا وہ کون سا شعبہ کہ جس میں ضم نہ تھے
ہندی تیوہاروں سے ایک ربطِ دلی مغلوں کو تھا
پاس بھی کرتے تھے اپنی رانیوں کے دھرم کا
ہولی، دیوالی، دسہرہ، رکشا بندھن، کرواچوتھ
بھیا دوج اور ہند کے محبوب کی جنم اشٹمی
رام نومی ایسے ہی نوراتری، شوراتری
ہند کی تہذیب میں رچ بس گئی تھی زندگی

سارے تیوہاروں کو محلوں میں مناتے تھے مغل
مشترک تہذیب کی محفل جماتے تھے مغل

الغرض، شاعر نے جمنا سے مخاطب ہو کر صدیوں سے چلی آئی ثقافت کو دریا کی روانی میں منعکس ہوتے دیکھا۔

" میری جمنا، شاہد نیرنگیٔ دنیا ہے تو
بے بصر حالات کے ہاتھوں میں آئینہ ہے تو
تیرگی میں روشنی کا رہنما نغمہ ہے تو
عظمتِ تاریخ ہے تو رازداں دریا ہے تو
سلام اے رازداں دریا سلام اے رازداں جمنا ! "

چوتھا باب "شعلہ کا سفر" ہے۔ انگریز تاجروں نے ہندوستان کے سیاسی انتشار سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت قائم کردی۔ آگے چل کر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے ناکام ہوجانے پر پارلیمنٹ نے اقتدار کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔ انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کے لیے جو آگ کا دریا ہندوستانیوں نے پار کیا اس کی داستان کو "شعلہ کا سفر" کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔ اس سفر سے بھرپور واقفیت رکھنا قومی فریضہ بھی ہے اور مستقبل کی تشکیل کے لیے حوصلہ مندی و بصیرت بھی حاصل کرنا ہے۔ درج ذیل اشعار حامل معنویت ہیں ؎

شام و سحر، نور و تاریکی سب کے ضمانت دار ہو تم
نیکی، بدی، پستی و بلندی سب کے امانت دار ہو تم
لیکن اب ساحل پہ پہنچ کر یہ بھی کبھی سوچا تم نے
ڈوب کے طوفانوں میں کیسے کشتی نے ساحل کو چوما
کیسے پتھر کی چھاتی سے شعلوں کا اک طوفاں پھوٹا

جنگِ آزادی کی تاریخ شاہد ہے کہ ؎

ولی سے لے کر وجود حسین احمد تک
ہمارے ملک کی تاریخ کا ہر ایک ورق
جمالِ خونِ شہیداں سے سرخ و تاباں ہے
ہر ایک صفحہ پہ خورشید سا درخشاں ہے

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے پہلے واقعات نیز متعلقہ شخصیات پر شاعر نے "یادوں کے سلسلے میں" بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ جنگِ پلاسی، کال کوٹھری کی بے بنیاد تہمت، میر جعفر اور اسی جیسے وطن دشمن عناصر وغیرہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے ؎

پورے سو سال تلک آگ دہکتی ہی رہی
لاکھ طوفان اٹھے آگ وہ روشن ہی رہی
لاکھ جوالا مکھی سینوں سے اُبلتے ہی رہے
سرفروشانِ وطن سر کو کٹاتے ہی رہے
بھینٹ آزادی کے مندر میں چڑھاتے ہی رہے
آگ آزادی کی لگتی ہے تو ہوتی نہیں سرد

ارضِ بنگال کے ہر ذرے سے آتی ہے صدا
چلے چلو دوستو کہ عبرت نشاں ہے یاترا ہماری

انگریزی حکومت کو اکھاڑ پھینکنے کے لیے مجاہدین ہمیشہ سر بکفن رہے اور سینہ سپر ہو کر مقابلہ کرتے رہے۔ ۱۸۵۷ء تک شاید ہی کوئی ایسے سال کی نشاندہی کی جاسکتی ہے جس میں کہیں نہ کہیں بغاوت نہ ہوئی ہو۔ شاہ عبدالعزیز (م ۱۷۶۲ء)، سید احمد شہیدؒ (وفات ۱۸۳۱ء)، حیدر علی، ٹیپو سلطان وغیرہ کو شعری عقیدت پیش کی گئی ہے۔ "زنجیرِ اسباب" میں ۱۸۵۷ء سے پیشتر کا تناظر پیش کرتے ہوئے شاعر نے کہا ہے ؎

دیں قید میں تھا، روحِ شریعت تھی قید میں
تدریس قید میں تھی، ہدایت تھی قید میں
تقسیم بھوک ہونے لگی، ہر مکان میں
کھانے کو ایک نانِ جویں تام کو نہ تھا
انگریز قحط لائے تھے ہندوستان میں
پھر اک ندی لہو کی رگوں سے ابل پڑی
بھوکوں میں پھر حمیت و احساس جاگ اٹھے
قریوں میں پھر تپش تھی، حرارت نگر میں تھی
چنگاریاں جلو میں تھیں، شعلہ سفر میں تھا

واقعات شدت و تیزی سے نمودار ہو رہے تھے۔ جاگیروں سے محروم کیا گیا۔ ذہن و عقل کا محاصرہ کیا گیا۔ غرضیکہ حتی الامکان انگریز اپنا شکنجہ تنگ کرتے گئے۔ بالآخر بارک پور میں منگل پانڈے کی قیادت میں لوگ خم ٹھونک کر سامنے آگئے۔ منگل پانڈے نے جام شہادت نوش کیا ؎

بارک پور کی مقدس دھرتی، منگل پانڈے کے قدموں سے
قصرِ عظمت بنی رہے گی، خلدِ شہادت بنی رہے گی

انقلاب کی طرف قدم بڑھتے گئے۔ آزادی کے دیوانے ہر قیمت ادا کرنے کو تیار تھے۔ گرم چپاتی اور سرخ کنول کو بطور سمبل استعمال کرتے ہوئے مجاہدین و محبانِ وطن نے خفیہ طور پر منظم ہونا شروع کردیا ؎

دہلی، کرنال اور میرٹھ میں یہ گرم چپاتی سرخ کنول
پہنچایا گیا برگ برگ، اس کی خوشبو کی موجوں سے
سرمست ہوئی بیٹھک بیٹھک اس کے پوشیدہ معنی میں
ہر ذہن میں پھوٹی اک کونپل اس کے اسرار کی گرمی سے
ہر آنگن مہک مہک اٹھا ہر گلشن چہک چہک اٹھا
اسرارِ چپاتی کیا کہیے یہ ساز ہے یہ رن بھومی کا

ہوتے ہوتے ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ چھاؤنی سے پہلی جنگ آزادی جس کو انگریزوں نے بغاوت کا نام دیا، شروع ہوئی۔ فرنگیوں نے سفاکانہ طور پر شمشیر ظلم و ستم کو بے نیام کر کے قتلِ عام شروع کردیا ؎

عظمتِ بابری تمام ہوئی ⁂ حشمتِ اکبری تمام ہوئی

دہلی میں بہادر شاہ کا لڑکا اور پوتا شہید ہوئے اور بہادر شاہ کو قید کر لیا گیا۔ شاعر کا تخیل لہو میں ڈوبے دیارِ دہلی کو دیکھتا ہے ؎

"ہر اک گلی ایک قتل گہہ ہے، ہر ایک موڑ اک مزارِ دہلی"
"مرے تخیل میں آج بھی گولیوں کی آواز آ رہی ہے"
"شکار جتنے کیے گئے ہیں، قطار میں سب کھڑے ہوئے ہیں"
کوئی ہے عالم کوئی ہے شاعر، کوئی محقق، کوئی معلم
کوئی ہے راجہ کوئی پرجا، کوئی ہے بندہ کوئی ہے خواجہ

سب کو کھڑا کر کے گولی سے اڑا دیا گیا۔ شہیدوں میں ملحوظ رہے ، اردو کے معروف شاعر صہبائی بھی شامل تھے ؎

صدا تصور میں کیسی آئی، یہ کس نے گولی چلائی ہنس کر
کہ گرم ریتی پہ سب یہ معصوم خاک و خون میں تڑپ رہے ہیں

جنگِ آزادی کا شعلہ بیکراں بلند ہوتا چلا گیا۔ فیروز پور، لاہور، مین پوری، شاہجہانپور، بریلی، بدایوں، الٰہ آباد غرض کہ شمالی ہندوستان کا چپہ چپہ مشہد بنتا چلا گیا۔ جھانسی کی رانی لکشمی بائی، تانتیا ٹوپے، حضرت محل، نانا صاحب کنور سنگھ والیٔ جگدیش پور، مولوی احمد اللہ شاہ وغیرہ نے دادِ شجاعت حاصل کی اور اپنے وطنِ عزیز پہ قربان ہو کر زندۂ جاوید ہو گئے۔ پہلی جنگِ آزادی میں ہماری ہار ہوئی۔ مگر ہمارے جاں نثاروں نے بے مثال جرأت کا ثبوت دیا۔ شعری نذرانۂ عقیدت ملاحظہ ہو ؎

اوراقِ عہدنامۂ نو لکھ رہا تھا وقت
ہاتھوں میں اپنے ظلم کا محضر لیے ہوئے
ہر سمت اک ہجومِ شہیداں تھا دیس میں
دل تھا تو کوئی ہات میں تھا سر لیے ہوئے
تازہ لہو سے ان کے تھے سینے رنگے ہوئے
ہر فرد گلِ عذار تھا ہر شخص لالہ فام
آزادیٔ وطن کے شہیدو! تمھیں سلام

مشعلِ آزادی کا خاص آہنگ ہے، یقینِ کامل کہ خونِ شہیداں کبھی ناکام نہیں جاتا ؎

تیری دھرتی سے اگیں گے روز و شب تازہ گلاب
رائگاں جائے گا کیا خونِ شہیداں بھول جا

آزادی کے شعلے کی آگ کبھی معدوم نہیں ہوتی کیونکہ آزادی پیدائشی حق ہے ؎

قدرت نے جو انسان کو بخشی ہے ازل سے
انساں کوئی اس آگ سے محروم نہیں ہے
خورشید کا فرزند ستاروں کا ہے محبوب
یہ زندۂ جاوید ہے مرحوم نہیں ہے

اسی امید افزا پیغام پہ مشعلِ آزادی کا حصۂ اول ختم ہوتا ہے۔ غالباً دوسرے حصے میں اس پیغام پر عمل پیرا ہونے والے ان مجاہدینِ وطن کا ذکر ہوگا جنھوں نے مہاتما گاندھی کی قیادت میں "کرو یا مرو" (Do or die) کا نعرہ بلند کرتے ہوئے انگریزوں سے Quit India (بھارت چھوڑو) کا مطالبہ کیا۔ حصہ اول کے بصیرت و مسرت شعری بھرے تناظر میں دوسرے حصے کا انتظار کیا جائے گا۔

پیشِ نظر مضمون کا موضوع وطنی شاعری میں مشعلِ آزادی کے مقام و مرتبہ کا تعین کرنا تھا۔ بلاشک و شبہ مشعلِ آزادی ایک بے مثال ادبی شاہکار ہے۔ اگر اس قسم کا مجموعۂ کلام ہندی میں شائع ہوتا تو ہندی حلقوں میں اسے مہاکاویہ (महा काव्य) کہا جاتا۔ اس میں آزادی کی منظوم داستان بھر نہیں ہے اس کا پس منظر جو کہ سماجی و اقتصادی (Socio - economic) عوامل و عواقب سے عبارت ہے نیز اس میں تاریخ ساز ہستیوں کا بھرپور جذباتی و نفسیاتی کارکردگی کا شعریت سے معمور تذکرہ ہے لہٰذا ادبی و تنقیدی نقطۂ نظر سے اس تخلیق کی اہمیت خاصی بڑی ہے۔ ساغر جدتوں کے لیے مشہور رہے ہیں۔ مختلف بحور کا سنگم دلکش مکالمے، خوش نما منظر کشی، ہندو دیو مالائی تلمیحات وغیرہ سے مالا مال مشعلِ آزادی بہت عظیم الشان پیشکش ہے۔ جذباتی ہم آہنگی و یک جہتی اور قومی اتحاد پر اس سے بڑی اردو تخلیق ابھی تک دیکھنے میں نہیں آئی۔ لہٰذا اس حقیقت کے پیشِ نظر اس کو وطنی شاعری کا سنگِ منزل ہی سمجھا جائے گا ؎

اپنی دھرتی کو سمجھتا ہے جو فردوسِ حیات
ہے وہی عاشقِ وطن کا اور وہی آزاد ہے

ساغر نے اس شعری پیش کش کے ذریعہ اردو شاعری کو نئے افق سے روشناس کرایا ہے۔ اردو میں ایسا رزمیہ چراغ لے کر ڈھونڈنے پر بھی نہیں ملتا۔ اس کتاب کو بڑی آب و تاب سے شائع کر کے پبلی کیشنز ڈویژن نے ایک بڑا کارنامہ سر انجام دیا ہے جس کے لیے اربابِ اردو مدتوں تک شکر گزار رہیں گے۔

مشعلِ آزادی (حصۂ اول)
ہم سے طلب کیجیے
بزنس منیجر
پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس۔ نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۱

محسن زیدی

غزل

اب اور اشکِ ندامت سے مت بھگو مجھ کو
رُلا کے خود کو مرے سامنے نہ رو مجھ کو

ٹھہر ٹھہر کے مجھے تہ بہ تہ نہ کر غرقاب
ڈبو رہا ہے تو یک لخت ہی ڈبو مجھ کو

مرے وجود کی تکمیل انتشار میں ہے
سمیٹ کر نہ کسی تار میں پرو مجھ کو

میں گذرے وقت کی مانند پھر نہ لوٹوں گا
ابھی تو لمحۂ موجود ہوں نہ کھو مجھ کو

علاقہ پھول کو کیا دشت کے ببولوں سے
جو بو رہا ہے تو کچھ فصل رکھ کے بو مجھ کو

زمین سے کاٹ کے پیوندِ آسماں نہ بنا
کہ جزوِ خاک ہوں میں، خاک میں سمو مجھ کو

کبھی یقین کہ محسن اب آگئی منزل
کبھی گماں کہ کہیں وہم ہی نہ ہو مجھ کو

۲۶۴ سیکٹر ۴ آر کے پورم نئی دہلی ۱۱۰۰۲۲

بقیہ : نئی کتابیں

پر مشتمل ہے۔ آپ کا تعلق دیو بند سے ہے جو علم و آگہی کے لیے مشہور ہے۔ وہ نوجوا شاعر ہیں۔ ان کا کلام غمِ جاناں اور غمِ دوراں کا حسین امتزاج پیش کرتا ہے۔ ان شاعری محض روایتی انداز کی شاعری ہی نہیں ہے بلکہ اس میں منزل کو پا لینے اور آلام و افکار سے مقابلہ کرنے کا جذبہ بدرجۂ اتم ہے۔ اس مجموعے کا پیش لفظ مولا سید ازہر شاہ قیصر، مدیر دار العلوم نے تحریر کیا ہے اور اسے اظہار و احساس عنوان دیا ہے۔ وہ ان کی شاعری کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

"مجھے اس کا اعتراف ہے کہ ایک طرف وہ (قمر عثمانی) معتبر عالم دین ہیں، دار العلوم کے فاضل ہیں، دوسری طرف کامیاب شاعر ہیں۔ . . .
ان کے شعر و ادب میں خشکی نہیں بلکہ شگفتگی اور حُسن ہے۔ غزل کو غزل کے دائرے میں رہ کر کہتے اور غزل کے حقوق کو پہچانتے ہیں۔"

اس کتاب میں محترم جمیل مہدی، ایڈیٹر عزائم لکھنوی نے اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے محترم قمر عثمانی صاحب کے بارے میں کہا ہے کہ قمر عثمانی نے شاعر کو ذریعۂ شہرت اور عزت بنانے کے بجائے ایک فن، تسکین کے ایک ذریعہ اور باطنی جذباتی کشمکش کے اظہار کی خاطر برتا اور استعمال کیا ہے۔ اس لیے ان شاعری میں قافیہ پیمائی کی کوشش کے بجائے رنگا رنگ جذبات کی ایسی کارفرما دکھائی دیتی ہے، جس میں تاثیر بھی ہے، گہرائی بھی، خوبصورتی اور تنومندی بھی۔

جمیل مہدی صاحب اپنے اس بیان میں قطعی حق بجانب ہیں کہ قمر عثما دراصل غزل ہی کے شاعر ہیں۔ ویسے انھوں نے نظمیں بھی کہی ہیں۔ ان میں نغمۂ وطن، شاعر کا پیغام اور دعوتِ عمل وغیرہ اچھی نظمیں ہیں۔

قمر صاحب کا حوصلہ اور ان کی اُمنگ قابلِ رشک ہے۔ وہ ناسازگار حالات سے نبرد آزما ہونا چاہتے ہیں۔ زندگی کی جد و جہد کو مقصدِ زندگی سمجھتے ہیں۔

قمر صاحب نے شعر و ادب کی ہر صنف پر طبع آزمائی کی۔ نعت گوئی ایک مشکل میدان ہے تاہم انھوں نے اس میدان میں بھی اپنے قلم کو جنبش دی ہے اور کامیاب نعتیں کہی ہیں۔

قمر صاحب حادثاتِ زمانہ سے گھبراتے نہیں وہ ان سے ٹکر لینا چاہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں ؎

حادثات ہی اصلِ حیات ہیں اے دوست
وہ زیست کیسی کہ جو وقفِ اضطرار نہیں

ان کی نظموں میں بھی وہی عزمِ جواں ہے۔ 'شاعر کا پیغام' میں کہتے ہیں ؎

منزل کی طرف ساتھ چلو تیز روی سے
جو سنگِ گراں راہ میں حائل ہو ہٹا دو

بہر صورت یہ قمر صاحب کا کامیاب شعری مجموعہ ہے جسے اُتر پردیش اُردو اکیڈمی ایوارڈ بھی دے چکی ہے۔ طباعت و کتابت کے لحاظ سے بھی یہ غنیمت ہے اور اس کی قیمت بھی مناسب ہے۔

(مراد کر

ماں جی

ستیش بترا
سیکٹر 520/A/16 فرید آباد

"نرمل رانی! نرمل رانی!"

بانس کے کشتی نما گلدان میں پھول سجاتے ہوئے، میں نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ آواز سیڑھیوں میں سے آرہی تھی ـــ میری ماں کی آواز! بھلا نرمل رانی کہہ کر بلانے والا اور کون تھا اس گھر میں!

"آئی ماں جی!" اور میں لپک کر سیڑھیوں کی طرف دوڑی، جہاں ماں جی ہانپتے ہانپتے ایک ہاتھ میں اٹیچی اٹھائے اور دوسرے میں ایک تھیلا لیے؛ دہلیز کے قریب آکھڑی ہوئی تھیں۔ وہ مجھے دیکھتے ہی کھل اٹھیں۔ انھوں نے اٹیچی اور تھیلا زمین پر رکھ دیے اور میں ان کی کھلی باہوں میں جھول گئی۔

"میں سوچ رہی تھی کہ تم گھر پر ہوگی بھی کہ نہیں!" پھر انھوں نے سانس درست کرتے ہوئے کہا "وہ تمھارا بہادر ہے یا چھٹی کر گیا؟ ہے تو اسے نیچے بھیج دو۔ تمھارے لیے کچھ چاول لائی ہوں!"

میں نے بہادر کو آواز دے کر نیچے بھیج دیا اور ماں جی کو سہارا دیتے ہوئے لاؤنج میں لے آئی۔

"ماں جی! یہ آپ سب کیا کرتی ہیں! اس عمر میں اکیلی پانچ چھ گھنٹے بس کا سفر کرکے، دو دو بسیں بدل کر کبھی اسکوٹر، کبھی رکشا لیے چلی آتی ہیں! اور پھر کبھی چاول، کبھی گیہوں، کبھی گھی! آپ اپنے آنے کی خبر کیوں نہیں دیتیں! کم سے کم دیپو جی نہیں تو میں ہی آپ کو بس اسٹیشن سے لے آتی!"

"ارے جگ جگ جئے دیپک میرا! اس بچارے کا کیا بھروسہ! اکثر دوروں پر ہی رہتا ہے! میرے دیپک کا کیا مقابلہ! بڑا ہی آگیا کاری ہے! تم سچ مچ بھاگیہ شالی ہو!"

ماں جی ہمیشہ ہی "میرے دیپک" کی تعریف کرتے کرتے نہیں تھکتیں۔ بڑا ہی گن وان لڑکا ہے! میں اگرچہ دکھاوے کے طور پر بگڑ جاتی ہوں، لیکن من ہی من میں ان کی تعریف مجھے بھی اچھی لگتی ہے۔ آخر میرے دیپک جی، میرے دیپو بھی تو ہیں!

"وشال کی چھٹی تو آتی ہوگی؟ بڑی دور پڑھنے بھیج دیا تو نے! اور میری لاڈو نمرتا رانی کا کیا حال ہے! اسکول گئی ہوگی؟" ماں جی نے ایک ہی سانس میں جواب کا انتظار کیے بغیر اپنے نواسے، نواسی کا حال پوچھ لیا۔

"کہو تمھاری کوٹھی کہاں تک بن گئی؟" ماں جی ہمارے چھوٹے سے تین کمروں کے کوکوٹھی کا ہی نام دیتیں!

"چھتیں پڑگئی ہیں! تھوڑا بہت کام چل ہی رہا ہے!"

"پیسہ کی ضرورت تو اب آئے گی!"

یہ بہت صحیح تھا! چار دیواری اور چھت پر اتنا پیسہ نہیں لگتا جتنا کہ بعد کے کاموں پر۔ ہم نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اس سلسلے میں ہم کسی کی مالی مدد نہ لیں گے۔ دیپو اور میں نے اپنے ہی ذرائع سے اس پیسے کے لیے تمام پلان بنا رکھا تھا لیکن میں اگر یہ چھیڑ دیتی تو ماں جی سے نپٹنا اکیلے میرے بس کا روگ نہ تھا۔

"ماں جی۔ آپ بہت تھک گئی ہوں گی! میں ابھی چائے بنا کر لائی!" اور میں کچن کی طرف بھاگ گئی۔

ماں جی ہم تینوں بہنوں کو ہی دیکھ کر جیتی ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارا کوئی بھائی نہیں لہٰذا ہم ہی ماں جی کے لیے سب کچھ ہیں۔ وہ آج تک لڑکا نہ ہونے کی کمی کبھی زبان پر نہیں لائیں۔ ان کے دو داماد ہیں لیکن دیپو جی کو وہ اپنا بیٹا ہی مانتی ہیں! انھیں ہم بہنوں میں سے مجھ سے زیادہ لگاؤ ہے۔ پتہ نہیں گھر میں سب سے چھوٹا یا چھوٹی ہی کیوں کر زیادہ لاڈلے بن جاتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ اپنوں میں پیار کا سلسلہ کہیں ختم ہوتا ہے اور فطری طور پر پیار کا شہد ہر طرف سے رس رس کر نچلی شاخ میں پھنس کر اکٹھا ہوتا رہتا ہے۔

یوں تو میرے میکے کا خاندان روایت پرست ہے۔ بڑوں کا ادب لحاظ، اونچا رہن سہن، بھگوان پر پورا بھروسہ۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی یہ نئی روشنی اور جائز قدروں کا حامل ہے۔ میرے خاندان میں لڑکیوں کو اسی طرح تعلیم دی گئی جیسے لڑکوں کو۔ اور وہ بھی جب کہ لڑکیوں کی اونچی تعلیم معیوب قرار دی جاتی تھی۔ میری ایک بہن ڈاکٹر ہیں اور جب وہ ایک کرسچین میڈیکل کالج میں بھرتی ہوئیں تو برادری میں ایک غصہ کی لہر دوڑ گئی تھی۔ ان سب کا خیال تھا کہ میری بہن کرسچان بن جائے گی۔ خاندان پر اسے میڈیکل کالج سے اٹھانے کے لیے بہت دباؤ ڈالا گیا۔ یہ تو ماں جی تھیں جو اپنے ارادے پر اٹل کھڑی رہیں۔ انھوں نے ساری برادری کو چیلنج دیا کہ وہ لڑکیوں کی تعلیم میں کوئی بُرائی نہیں سمجھتیں اور لڑکیوں کا ڈاکٹر بننا، عورتوں کی صحت

سماج کلیان کی طرف پہلا قدم ہے۔ یہ نہیں کہ ماں جی خود کوئی بہت پڑھی لکھی ہیں لیکن ان کی سوجھ بوجھ وقت کے تقاضوں سے کہیں آگے رہی ہے۔

اس کی وجہ میرے نانا جی کا اثر بھی ہو سکتا ہے۔ انیسویں صدی کے آخر میں جب وہ ولایت سے بیرسٹر بن کر لوٹے، تو برادری نے ان کی سخت مخالفت کی۔ ان کے نزدیک وہ سات سمندر پار جا کر انگریزوں کے ساتھ رہ کر ایک اچھوت ہو گئے تھے۔ لہٰذا وہ برادری میں اسی وقت واپس لیے جا سکتے تھے جبکہ وہ ہردوار جا کر پرائشچت کریں۔ نانا جی کو ہردوار نہانے پر کوئی اعتراض نہ تھا لیکن کسی پرائشچت کی صورت میں نہیں۔ وہ اس بارے میں اٹل رہے اور تین سال کے بعد جب وہ گھومنے پھرنے کی غرض سے ہردوار اور مسوری گئے تو برادری نے اسے اپنے حکم کی تعمیل سمجھا اور اس طرح سے یہ معاملہ سلجھ گیا۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی رہی ہو گی کہ یہ قابل ہونہار بیرسٹر ہائی کورٹ میں ان کے الجھے ہوئے مقدموں کی پیروی کرتے ہوئے، ان میں سے کئیوں کو کامیابی دلا چکا تھا! بہرحال یہ باغیانہ تاثر نانا جی سے ان کی بیٹی ماں جی کو ورثہ میں ملا تھا۔ وہ دونوں پرانی یا نئی روایتوں کی اندھا دھند تقلید کرنے والوں میں سے تھے۔ ان کا ہر قدم سوجھ بوجھ کا حامل ہوتا تھا۔

اور پھر شاید ایسا ہی آزمائشی وقت تیسری پیڑھی میں بھی آیا جبکہ میں نے اپنی مرضی کے مطابق شادی کرنے کا خیال ظاہر کیا۔ میری دونوں بہنوں کی شادی اچھے گھرانوں میں ہوئی تھی لیکن روایتی طور پر۔ میرے لیے بھی بہنوں کے ذریعے کئی اچھے خاندانوں سے رشتے آ چکے تھے۔ پتا جی اور ماں جی نے بھی دو ایک رشتے پسند کر رکھے تھے لیکن جب میں نے دیپو جی کے لیے کہا تو میری بہنوں نے زیادہ اور پتا جی نے تھوڑی بہت مخالفت کی۔ دراصل دیپو جی کا تعلق تو ایک بہت اچھے خاندان سے تھا لیکن چھوٹی عمر ہی میں ماں باپ کھو دینے کی وجہ سے، ان کی ابتدائی زندگی جدوجہد میں گذری۔ انھوں نے ابھی ابھی اپنی زندگی شروع کی تھی۔ صرف اپنی تعلیم اور قابلیت کے بل پر اس میں خاندان کی امارت یا کسی سفارش کا کوئی سہارا نہ تھا۔ دراصل دیپو جی اپنی لیاقت کے سہارے ہی آگے بڑھنے کی خواہش رکھتے تھے۔ انھوں نے کوئی بات مجھ سے چھپائی نہ تھی اور میں ان کی صاف گوئی اور شرافت پر مرمٹی تھی۔ اس کے برخلاف دوسرے آتے ہوتے رشتوں میں دولت زیادہ اور ذاتی اوصاف کم دکھائی دیتے تھے۔ میں نے ماں جی سے ڈرتے ڈرتے یہ سب کہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میں انھیں منا لوں گی لیکن میرے تعجب کی انتہا نہ رہی جب انھوں نے فوراً میرا ساتھ دیا۔ انھوں نے مجھ سے صرف ایک سوال پوچھا تھا۔

"نمی! مجھے یقین ہے کہ تم جہاں بھی جاؤ گی، تمھاری تقدیر کے راستے کھلتے جائیں گے! لیکن ایشور نہ کرے کبھی تم پر برا وقت آئے تو کیا تم نبھا سکو گی؟ تمھیں پچھتاوا تو نہ ہو گا کہ تم نے کوئی غلط قدم اٹھایا ہے!"

"نہیں ماں جی!" میں نے اسی عزم کے ساتھ جواب دیا تھا: "دیپو جی کے لیے میں سب کچھ کرنے، چھوڑنے کو تیار ہوں! یہ میں وعدہ کرتی ہوں!"

"تو سچ مچ دل سے کہہ رہی ہے؟"

"ہاں ماں جی!"

"تو بیٹی! ساری دنیا چاہے خلاف ہو، میں تمھارے ساتھ ہوں! تم کوئی چنتا نہ کرو!"

اور نہ جانے کیسے ماں جی نے سب کا منھ بند کروا دیا۔ اور اس طرح سے میری شادی دیپو جی کے ساتھ ہو گئی۔ رخصتی کے وقت ماں جی نے اتنا ضرور کہا تھا۔

"مجھے یقین ہے کہ تم اپنے کیے ہوئے وعدہ کا پاس رکھو گی اور کبھی اپنا میرا یا پریوار کا سر نیچا نہیں ہونے دو گی! بیٹی۔ میں بہت خوش ہوں کہ تیرے سپنے سچ ثابت ہو رہے ہیں! میں اور بھی زیادہ خوش ہوں کہ تم میں اپنا حق لینے اور منوانے کی شکتی ہے!"

اور یہ کہتے کہتے ان کی آنکھیں بھیگ گئیں اور مجھے کچھ ایسے لگا جیسے ان کی آنکھوں میں میرے لیے عقیدت کا جذبہ لہرا رہا ہو!

شادی کے بعد زندگی ایک بہت ہی سہانی ڈگر پر چلنے لگی۔ دیپو جی کی لگاتار محنت اور لگن رنگ لائی۔ انھوں نے تھوڑے سے عرصہ میں بہت ترقی کی۔ فلیٹ، نوکر، اسکوٹر سبھی سہولتیں مل گئیں، جن کی کسی اچھی نوکری سے امید کی جا سکتی ہے۔ ہم دونوں پیار کے ہنڈولوں میں جھولتے رہے اور ہمیں پھولتا پھلتا دیکھ کر ماں جی پھولی نہ سماتیں۔ پھر گھر میں بچوں کی رونق بھی آ گئی۔ ان کے آنے سے اخراجات بھی بڑھنے لگے۔ پھر اچھے اسکولوں کی فکر ہوئی۔ ہم نے جی پکا کر کے وشال کو نینی تال کے ایک اچھے اسکول میں بھجوا دیا۔ اچھے اسکولوں کا مطلب ہے مزید اخراجات۔ ہمارے ہاتھ کا تنگ ہونا ضروری تھا۔ میں نے کبھی اپنی ضرورتوں کا ذکر ماں جی سے نہیں کیا۔ لیکن وہ سب کچھ کھلی آنکھوں سے دیکھتی تھیں اور ہر وقت وہ کسی نہ کسی بہانے ہماری مدد کرتی رہتیں۔ ماں جی نے میری ازدواجی زندگی کو کامیاب بنانے کا جیسے بیڑا سا اٹھا رکھا تھا۔

میری بڑی بہنیں اچھے گھروں میں بیاہی تھیں جہاں دولت کی افراط تھی۔ وہ ماں جی کو ہمیشہ ہماری مدد پر تیار دیکھ کر اکثر کہتیں "ماں جی کو نمی کی بڑی فکر رہتی ہے! دراصل نمی ہی ماں جی کی حقیقی بیٹی ہے!"

ماں جی یہ سنتیں تو مسکرا دیتیں۔

'بیٹیاں تو سبھی حقیقی ہیں! لیکن سوال اس بات کا ہے کہ کون ضرورت مند ہے!"

ماں جی کی بڑی آرزو تھی کہ ہمارا بھی کوئی مکان ہو۔ وہ ہمیشہ گھر بنوانے کی ترغیب دیتیں لیکن دیپو جی ہمیشہ بات ٹال دیتے۔ دراصل ہمارے پاس مکان بنانے یا خریدنے کے لیے سرمایہ کہاں تھا! پتا جی کی موت کے بعد ماں جی کا بھی ہاتھ کافی تنگ تھا لیکن دریادلی میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ وہ ہمیشہ کہتیں روپوں کا کیا ہے، میں اکٹھا کر دوں گی۔ لیکن دیپو جی کہتے۔

پیسہ واپس تو کرنا ہو گا! اور میں نہیں چاہتا کہ آپ کی یا میری عزت پر کوئی بھی حرف آئے؟"

دراصل ماں جی نے وقت پڑنے پر بڑی بہن کی سسرال کے ایک عزیز کے لیے پہلے بھی پیسہ اکٹھا کیا تھا لیکن ضرورت نکل جانے کے بعد اس نے یہ قرضہ نہیں چکایا اور اس کا سارا بار ماں جی کو مجبوراً خود اٹھانا پڑا تھا۔ یہ راز دیپو اور میرے سوا کسی اور کو معلوم نہ تھا۔ اب ان کے پاس تھوڑی سی رقم بچی تھی، جو انھوں نے میعادی کھاتوں
(بقیہ صفحہ ۳۰ پر)

ضیاء الدین اصلاحی
دارالمصنفین، اعظم گڑھ (یو۔پی)

امتیاز علی خاں عرشی

مولانا امتیاز علی خاں عرشی کے انتقال سے ملک ایک وسیع النظر عالم و محقق اور نامور اہل قلم و مصنف سے محروم ہوگیا۔ ذیل میں ان کے حالات و کمالات کا مختصر مرقع پیش کیا جاتا ہے۔

امتیاز علی خاں عرشی کا آبائی وطن افغانستان تھا، یہاں کے یوسف زئی قبیلہ کی ایک شاخ حاجی خیل سے ان کا خاندانی تعلق تھا، یہ خانوادہ افغانستان کے صوبہ سوات کے ایک قصبہ مٹا بامکٹے میں آباد تھا، اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں عرشی صاحب کے جد اعلیٰ مشرف خاں کے چھوٹے بھائی مقرب خاں ان سے آزردہ ہوکر ہندوستان آئے اور رام پور میں آباد ہوئے۔ ان کے پوتے محمد سعید خاں نواب فیض اللہ خاں والی ریاست رام پور کی فوج میں رسالدار کے منصب پر فائز تھے۔ محمد سعید خاں نے اپنی ایک دختر کا عقد اپنے بھتیجے رحم باز خاں سے کیا جو امتیاز علی خاں عرشی کے پردادا تھے، رحم باز خاں نے شادی کے بعد مٹا بامکٹے کی سکونت ترک کرکے رام پور ہی میں بود و باش اختیار کرلی۔ ان ہی کے صلب سے عرشی صاحب کے دادا اکبر علی خاں پیدا ہوئے جو مولانا اکبر علی خاں محدث کے نام سے مشہور ہوئے۔ انھوں نے پیشۂ آبا سپہ گری چھوڑ کر علم و فن کے کوچہ میں قدم رکھا اور درس و تدریس کا مشغلہ اختیار کیا۔ یہ حدیث، فقہ اور کلام وغیرہ مختلف علوم میں ممتاز تھے۔ جب ان کے زمانہ میں حضرت سید احمد شہید بریلوی کی دینی تحریک کا آغاز ہوا تو وہ اس کے پُرجوش حامی ہوگئے تھے۔

مولانا اکبر علی خاں کے کئی بیٹے تھے، ایک بیٹے مولانا جعفر علی خاں ان کے علمی وارث ہوئے اور مدۃ العمر درس و تدریس سے سروکار رکھا۔ ان کے سب سے چھوٹے بیٹے مختار علی خاں صاحب کی کم سنی ہی میں مولانا اکبر علی خاں واصل بحق ہوگئے اس لیے ان کو تعلیم کا سلسلہ موقوف کرکے معاشی تگ و دو میں لگ جانا پڑا، مختلف محکموں میں کام کرنے کے بعد بالآخر وہ سرکاری اصطبل کے منصرم ہوئے۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی ان ہی کے صاحبزادے تھے جو سپہر علم و ادب پر مہر و ماہ بن کر چمکے۔ اور نصف صدی تک اپنی ضوفشانی سے دنیا کو منور کرتے رہے۔

امتیاز علی خاں عرشی ۸، دسمبر ۱۹۰۴ء کو رام پور میں پیدا ہوئے، ڈھائی برس کی عمر میں والدہ نے داغِ مفارقت دیا۔ عرشی صاحب کی تعلیم گھر سے شروع ہوئی پھر مکتب اور مقامی مدرسوں میں پڑھنے کے بعد پنجاب یونیورسٹی کے مشرقی امتحانات دئے۔ اور اورینٹل کالج لاہور میں داخلہ لیا جہاں مولانا نجم الدین، مولانا سید طلحہ اور مولانا عبدالعزیز میمن جیسے نامور استادوں کا دریائے فیض جاری تھا، پھر مدرسہ عالیہ رام پور میں داخل ہوئے جو اس زمانہ میں علوم دینیہ خصوصاً معقولات کی تعلیم کا ایک بڑا مرکز تھا اور اس حیثیت سے اس کا غلغلہ پورے ملک میں گونج رہا تھا۔ عرشی صاحب نے یہاں منطق و فلسفہ کا درس مولانا فضل حق رام پوری سے لیا جو امام معقولات مولانا فضل حق خیرآبادی کے اجل تلامذہ میں تھے۔

عرشی صاحب فارسی و عربی میں منتہی ہوچکے تو ۱۹۲۶ء میں صرف انگریزی میں انٹرنس کا امتحان دیا۔

درسیات کی تکمیل اور تعلیم سے فراغت ہوچکی تو فکر معاش لاحق ہوئی، اتفاق سے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں سفارت کی جگہ ملی، جسے قدرے حیص بیص اور معمولی ردّ و کد کے بعد قبول کرلیا، اس مہم کے سلسلہ میں چند شہروں کے دورے بھی کئے جن میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی مگر بریلی میں ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آجانے سے ان کا دل ٹوٹ گیا اس لیے استعفا دے کر گھر واپس چلے آئے۔ اب ان کا میلان تجارت کی طرف ہوا مگر یہ ان کے بس کی چیز نہ تھی۔ اور ان کی شان اس جھمیلے سے بالاتر تھی، تاہم چند برس اس شوق کی نذر ہوگئے اور نتیجہ کوہ کندن و کاہ برآوردن رہا۔

رام پور کی شہرت ریاست اور اس کے عظیم الشان کتب خانہ کی رہین منت ہے یہ کتب خانہ والیانِ ریاست کی ناقابلِ فراموش یادگار ہے۔ اس کے نظم و نسق اور نگرانی پر ہمیشہ لایق و ممتاز افراد مامور رہے۔ منشی امیر مینائی کا بھی اس سے تعلق رہا اور حکیم اجمل خاں بھی اس کے افسر اعلیٰ رہے، حافظ احمد علی خاں شوق مصنف تذکرہ کاملان رام پور نے مدتوں اس کی خدمت کی یہاں تک کہ وہ اور کتب خانہ لازم و ملزوم خیال کیے جاتے تھے۔ ان کے بعد مشہور مورخ و طبیب اور نامور مصنف مولوی نجم الغنی خاں رام پوری نے یہ عہدہ سنبھالا لیکن اب کتب خانہ کا کام بہت بڑھ گیا تھا اور نئے حالات بھی اس کے متقاضی تھے کہ اس کی از سر نو تشکیل اور باقاعدہ تنظیم کرکے اس کو لائبریری سائنس کے اصولوں پر مدون و مرتب کیا جائے۔ اس صورت حال کے پیش نظر اخباروں میں اشتہار دیا گیا تو بہت سی درخواستیں آئیں لیکن قرعہ فال عرشی صاحب

کے نام نکلا اور ۱۰، جولائی ۱۹۴۲ء کو کتب خانہ کی نظامت ان کے سپرد کر دی گئی۔ انھوں نے اپنے حسنِ ذوق اور خوش انتظامی سے اس کو سنوار، نکھار اور چمکا کر ثابت کر دیا کہ ان سے بہتر اور مناسب آدمی اس کام کے لیے اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ ان کا انتخاب دراصل حسنِ انتخاب حق بحق دار رسید کے مصداق تھا۔

امتیاز علی عرشی کا دورِ کتب خانہ کا نہایت درخشاں اور زریں دور تھا۔ انہوں نے قلمی اور مطبوعہ کتابوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کی باقاعدگی کے ساتھ محققانہ فہرستیں بھی تیار کیں۔ کچھ ہی دنوں میں ان کی محنت، قابلیت اور بہتر کارکردگی کے نقوش و اثرات ہر طرف دکھائی دینے لگے اور ان کی خوش سلیقگی نے ہر شعبہ میں نئے نئے رنگ بھر دئے۔ انہوں نے نہایت ضروری اور مفید اصلاحات اور تبدیلیاں کر کے کتب خانہ کی دنیا ہی بدل دی اور اب یہ صرف کتب خانہ ہی نہیں رہا بلکہ عظیم الشان علمی مرکز اور تحقیقی ادارہ بھی بن گیا ہے جس سے اربابِ ذوق ہمیشہ اپنی علمی تشنگی بجھاتے رہیں گے اور عرشی صاحب کو بھی یاد کرتے رہیں گے ؎

جان کر منجملۂ خاصانِ میخانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

انھوں نے کتب خانہ کی خدمت، ترقی اور توسیع کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کر دی اور اس کے سوا کہیں اور کا قصد و ارادہ بھی نہ کیا۔ ان کو نام و نمود کی خواہش، شہرت و ناموری کی تمنا، جاہ و عظمت کی طلب اور مال و زر کی ہوس نہ تھی، صرف کتب بینی کا شوق اور علم و فن کی طلب و آرزو تھی جس کا خزانہ یہی کتب خانہ تھا اس لیے وہ اسی زاویۂ علم میں معتکف ہو کر اپنے علم کو بڑھاتے اور مطالعہ کو وسیع کرتے رہے، ان کو مطالعہ کا چسکا تھا۔ ہر وقت اسی میں مستغرق رہتے۔ خشک اور سنجیدہ کتابوں کا مطالعہ بھی بہت شوق و ذوق اور بڑے انہماک سے کرتے تھے۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ انھوں نے بے شمار بلند پایہ اور اعلیٰ درجہ کی کتابیں یادگار چھوڑیں جو ان کی غیر معمولی قابلیت اور مختلف علوم میں گہری بصیرت کا ثبوت ہیں، نیز اسی کی بہ دولت شہرت، عزت اور نیک نامی نے ان کے قدم چومے۔ ہر حلقہ میں ان کی رائے کا احترام کیا جاتا تھا اور ان کے علمی وزن کو محسوس کیا جاتا تھا اور تمام طبقوں کے لوگ ان کے فضل و کمال، علمی تبحر اور دینی بصیرت کے معترف و مداح تھے۔

امتیاز علی خاں عرشی کے نامِ نیک کو ضائع ہونے سے بچانے کے لیے یہی کافی ہے کہ انھوں نے کتب خانہ کی تزئین و آرائش میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی بلکہ اپنی خوش اسلوبی اور بہتر کارگزاری سے اسے ترقی کے آخری درجہ پر پہنچا دیا لیکن ان کا اصل سرمایۂ فخر اور حقیقی طغرائے امتیاز ان کی وہ محققانہ تصنیفات اور عالمانہ مضامین ہیں جنھوں نے جریدۂ عالم پر ہمیشہ کے لیے ان کا نام نامی ثبت کر دیا ہے۔

ان کو تصنیف و تالیف کا فطری ذوق اور عمدہ سلیقہ تھا۔ انہوں نے طالب علمی کے زمانہ ہی میں اس کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ ۱۹۲۲ء میں وہ مولوی فاضل کے امتحان کی تیاری کے لیے لاہور گئے تو وہاں کے مشہور ناشر اور تاجر کتب شیخ مبارک علی مرحوم سے ان کی اچھی راہ و رسم ہو گئی، اسی زمانہ میں شیخ صاحب کی فرمائش پر پہلے بی۔ اے پھر ایف۔ اے کے نصاب کی عربی کتابوں کے اُردو ترجمے کیے۔

امتیاز علی خاں عرشی اردو کے مشہور محقق تھے۔ ان کو نادر مخطوطات کی تلاش دریافت کا بڑا ملکہ تھا۔ وہ انہیں تصحیح و مقابلہ اور ترتیب و تحشیہ اور ایڈٹ کر کے شا کرنے میں یکتا اور منفرد خیال کیے جاتے تھے، اس کام کے لیے محنت و ذمہ داری کے بڑی لیاقت و قابلیت بھی درکار ہے عرشی صاحب گو ابھی علمی دنیا میں نو وارد تھے ان میں یہ سب خوبیاں موجود تھیں اس لیے انھوں نے ہمت و جرات سے کام لے اس مشکل مہم کو سر کرنے کا بیڑا اٹھا لیا اور امام ابو عبید قاسم بن سلام ہروی صاحب کتاب الاسوال (المتوفی سنہ ۲۲۴ھ) کی کتاب الاخباس کو ایڈٹ کرنے کی ذمہ داری ا سر لی۔ اس رسالہ کا ایک ہی قلمی نسخہ رام پور کے کتب خانہ میں تھا، انھوں نے صح جوہری اور بعض دوسری کتب لغت کی مدد سے اس کے متن کی تصحیح کی اور اس پر ا اور ضروری حاشیے بھی لکھے، یہ کام انھوں نے کتب خانہ کی ذمہ داری سنبھالنے سے کئی قبل انجام دیا تھا مگر یہ کتاب ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی۔

امتیاز علی خاں عرشی کے جس تحقیقی کارنامہ کی علمی حلقوں میں دھوم مچ گ وہ "مکاتیب غالب" ہے، غالب ان کی تحقیق و جستجو اور بحث و تدقیق کا خاص موضو تھا، اس کتاب کی اشاعت کے بعد تمام اہلِ علم کی نگاہیں ان کی طرف اٹھنے ا اور وہ غالبیات کے ماہرین اور اُردو کے محققین کی صفِ اوّل میں شمار کیے جانے یہ کتاب مرزا غالب مرحوم کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جو رام پور کے نوابوں اور ریاست کے دوسرے حکام کے نام لکھے گئے تھے اور عرصہ سے کتب خانہ میں پڑے ہو تھے۔ ان کے تلف ہو جانے کا بھی اندیشہ تھا مگر عرشی صاحب کی توجہ نے اس خ کو دست بردِ حوادث سے محفوظ کر کے اسے غالب کے قدر دانوں تک پہنچا دیا۔ خطوط سے غالب کی زندگی، شخصیت اور شاعری کے نت نئے گوشے اور پہلو پہلو لوگوں کے سامنے آئے۔ عرشی صاحب نے متن کی صحت پر بڑا زور صرف کیا ہے ان کے محققانہ حواشی اور عالمانہ مقدمہ نے ان خطوط کی قدر قیمت بہت بڑھا دی یہ مجموعہ ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا تھا۔

"انتخاب غالب" بھی غالبیات کے اس عاشق و شیدائی کا کچھ کم اہم کا نہیں ہے۔ مرزا غالب نے ۱۸۶۶ء میں نواب کلب علی خاں کی فرمائش پر خود ا اردو فارسی کلام کا الگ الگ انتخاب کیا تھا۔ یہ بھی کتب خانہ کے انبار میں ر طرح پڑا ہوا تھا۔ عرشی صاحب نے گوشۂ خمول میں پڑے ہوئے اس انمول خزا بھی اربابِ نظر کی تماشا گاہ بنا دیا اور یہ ان کے مبسوط مقدمہ اور محققانہ کے ساتھ ۱۹۴۲ء میں چھپا۔

اس موضوع پر ان کی تیسری کتاب ۱۹۴۷ء میں منظرِ عام پر آئی اور "فر غالب" ہے اس میں اُردو، ہندی، سنسکرت، ترکی، فارسی اور عربی لفظوں کی وہ ت درج ہے جو خود غالب نے اپنی کتابوں میں کی ہے اس کی جمع و ترتیب سے جہ عرشی صاحب کی محنت، کاوش اور جاں فشانی کا اندازہ ہوتا ہے وہاں اس مقدمہ سے اُس عبور کا پتہ چلتا ہے جو ان کو الفاظ، زبان اور قواعد پر تھا۔

انھوں نے ایک بڑا ادبی تحفہ ۱۹۵۸ء میں غالب کے قدر دانوں کو ا مکمل اردو دیوان شائع کر کے دیا، یہی دیوانِ غالب نسخۂ عرشی کہلاتا ہے۔ اس

غالب کے متداول کلام کے علاوہ ان کے ابتدائی دور کا کلام بھی شامل ہے جو دیوانِ غالب کے پہلے ایڈیشن میں نہیں تھا اور وہ اشعار بھی درج ہیں جو غالب کے دیوان کے کسی نسخہ کے حاشیہ یا کسی خط، بیاض اور رسالہ میں تحریر تھے۔ ان انواعِ سہ گانہ کے اعتبار سے نسخۂ عرشی ان تین حصّوں میں منقسم ہے۔

۱۔ گنجینۂ معنی
۲۔ نوائے سروش
۳۔ یادگارِ نالہ

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس دیوان کی ترتیب میں ان کو کتنا پاپڑ بیلنا پڑا ہوگا۔

عرشی صاحب نے غالب صدی ۱۹۶۹ء میں ان کی فارسی نظم و نثر کا مجموعہ "باغِ دودر" مفصل حواشی کے ساتھ شائع کیا۔

وہ زندگی بھر غالب کو اپنی تحقیق و جستجو کا موضوع بناتے رہے۔ ان کی زندگی، شخصیت اور شاعری کا مطالعہ عرشی صاحب کا بہت محبوب مشغلہ تھا۔ غالب پر وقتاً فوقتاً ان کے تحقیقی مضامین بھی رسالوں میں شائع ہوتے رہے غالب پر ان کی اور بہت سی تحریریں اور بعض کتابیں ابھی تک شائع نہیں ہو سکی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ غالبیات کے سرمایہ میں عرشی صاحب نے بہت کچھ اضافہ کیا ہے۔ انھوں نے غالب پر تحقیق کرنے والوں کے لیے نئی نئی راہیں کھولی ہیں اور ان کی بہ دولت غالب کے پرستاروں کو بہت سی نئی اور مفید باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

امتیاز علی عرشی نے تنہا غالب ہی پر جو کچھ لکھا ہے وہی ان کو شہرتِ عام اور بقائے دوام کے دربار میں جگہ دینے کے لیے کافی ہے۔ مگر ان کے ذوق کے تنوع اور طبیعت کی رنگا رنگی نے انہیں کسی ایک ہی وادی میں محصور نہیں رکھا بلکہ وہ شعر و ادب، لغت و قواعد، سیر و تراجم، تاریخ و تنقید، فلسفہ و کلام اور تفسیر و مذہبیات سب ہی کوچوں اور میدانوں کی خاک چھانتے رہے۔ ان کو اُردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں پر یکساں دسترس اور مکمل قدرت تھی اس لیے ان کے قلم کی گلکاریوں کے نمونے تینوں زبانوں میں ایک سے بڑھ کر ایک موجود ہیں۔ ان کے ادبی و تحقیقی کارناموں میں ایک اہم اور خاص چیز "نادراتِ شاہی" ہے جو مغلوں کے آخری دور کے فرماں روا جلال الدین شاہ عالم ثانی (متوفی ۱۸۰۶ء) کے فارسی، ہندی اور اردو کلام کا مجموعہ ہے جس کو عرشی صاحب نے اپنے مقدمہ کے ساتھ ۱۹۴۴ء میں شائع کیا تھا۔ اس کے مطالعہ سے پہلی بار اس مظلوم فرماں روا کی سخن سنجی اور ادب پروری کا حال معلوم ہوا۔

"اردو و افغان" بھی عرشی صاحب کی محنت و تحقیق کا اچھا نمونہ اور ان کی اردو زبان پر وسعتِ نظر کا ثبوت ہے۔ یہ رسالہ ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا۔ اردو زبان و ادب سے ان کے شغف اور گہرے مطالعہ کا اندازہ کرنے کے لیے "دستور الفصاحت" کافی ہے، جو ۱۹۴۲ء میں شائع ہوئی تھی یہ حکیم سید احمد علی یکتا لکھنوی کی تصنیف ہے۔ اس میں اُردو صرف و نحو، معانی و بیان اور عروض و قواعد پر مفید بحث کے علاوہ آخر میں ان شعرا کے حالات بھی درج ہیں جن کا کلام اصل کتاب میں سنداً و مثالاً پیش کیا گیا ہے۔ اس کے فاضلانہ مقدمہ میں عرشی صاحب نے فارسی و اردو کے مطبوعہ و قلمی تذکروں کے متعلق گوناگوں معلومات تحریر کی ہیں۔ عرشی صاحب کے تحقیقی کاموں میں یہ کتاب بہت اہم خیال کی جاتی ہے۔

دستور الفصاحت کے علاوہ فارسی میں تاریخِ محمدی، وقائع عالم شاہی اور تاریخ اکبری وغیرہ کو ایڈٹ کر کے شائع کیا۔ موخر الذکر دونوں کتابیں مغلوں کے دور کی تاریخ کا اہم ماخذ ہیں۔

عربی میں عرشی صاحب کی تحقیق کا بہت اچھا نمونہ اور علمی حیثیت سے ایک شاندار اور مہتم بالشان کارنامہ امام سفیان ثوری (متوفی ۱۶۱ھ) کی تفسیر القرآن الکریم کی اشاعت ہے، یہ تفسیر ناپید تھی۔ اکثر لوگوں کو تو اس کے وجود کا بھی علم نہ تھا، لیکن امتیاز علی خاں عرشی نے رضا لائبریری میں اس کا ایک ناقص نسخہ ڈھونڈھ نکالا اور اسے اپنے عالمانہ مقدمہ اور محققانہ حواشی سے مزین کر کے ۱۹۶۵ء میں شائع کیا جو سورۂ بقرہ تا سورہ طور کی تفسیر پر مشتمل ہے۔ قدما کی تفسیریں ناپید ہیں اس لیے اس علمی ارمغان پر اہلِ علم عرشی صاحب کے بہت ممنون ہوتے اور انہوں نے اسکو ہاتھوں ہاتھ لیا۔

کتب خانہ رام پور کے عربی مخطوطات کی فہرست انگریزی میں چھ جلدوں میں شائع کی اور اردو مخطوطات کی فہرست کی ایک جلد بھی شائع کی۔ چند عربی رسائل اور دواوین بھی شائع کیے، جن کی علمی حلقوں میں پذیرائی کی گئی،

امتیاز علی عرشی کی بہت سی محققانہ کتابیں ابھی تک زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوئی ہیں۔ اُردو میں دیوان مومن، انتخاب ناظم، فارسی میں تاریخ بابری، نفائس المآثر اور تحفۃ الہند اور عربی میں شواہد القرآن اور فصل الوکی لعمر بن الخطاب وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ آخری دونوں عربی کتابیں خاص طور پر اہم ہیں شواہد القرآن میں ان ہزاروں اشعار کی تخریج کی گئی ہے جن کو امام ابن جریر طبری نے اپنی معرکۃ الآرا تفسیر میں بطور استشہاد نقل کیے تھے اور موخر الذکر میں حضرت عمرؓ کے سوانح، خطبات، خطوط اور حکیمانہ اقوال جمع کیے ہیں۔ اس کی تالیف کا خیال طالب علمی کے دور ہی میں ہوا تھا اور اسی وقت سے اس کے لیے مواد بھی جمع کرنا شروع کر دیا تھا اور عمر بھر جمع کرتے رہے لیکن پھر بھی یہ مکمل نہیں ہو سکی۔

عرشی صاحب کو شعر و سخن کا ذوق بھی تھا اور وہ کبھی کبھی شعر بھی موزوں کرتے تھے۔ اس میں رام پور کے شاعرانہ ماحول کے علاوہ ان کے ماموں مولوی احمد جان خاں اثر کی صحبت کو بھی دخل تھا، جن کو شعر و شاعری سے بڑا لگاؤ تھا۔ عرشی صاحب بھی اپنے ماموں کے ساتھ مشاعروں اور ادبی محفلوں میں جایا کرتے تھے لیکن ان کا ذوق شعر و ادب اتنا ستھرا اور بلند تھا کہ اپنا کلام پسند نہیں آیا تھا اس لیے کبھی اس کی اشاعت پر آمادہ نہیں ہوتے۔

عرشی صاحب علم و تحقیق کے میدان کے شہ سوار تھے۔ اس میں ان کے کارنامے ہمیشہ درخشاں اور مشعلِ راہ بنیں گے۔ وہ مخطوطات کو ایڈٹ کرنے میں بڑی محنت اور عرق ریزی سے کام لیتے تھے اور اس میں اپنی پوری قابلیت و صلاحیت صرف کر دیتے تھے۔ وہ مخطوطات کے متن کی صحت، ترتیب اور تحشیہ کے کام سے اس وقت تک مطمئن نہیں ہوتے تھے جب تک کہ ان کے تمام نسخوں کو

ملاحظہ نہ کر لیتے تھے خواہ اس کے لیے ان کو سفر ہی کیوں نہ کرنا پڑتا۔ اسی لیے ان کی تمام تصنیفات بلند پایہ اور معیاری ہیں، وہ دوسرے اور تیسرے درجہ کے علمی و تحقیقی کام سے نہ مطمئن ہوتے تھے اور نہ ان کو پسند کرتے تھے۔

امتیاز علی خاں عرشی کا طرزِ تحریر سادہ سلیس، شگفتہ، رواں اور دلآویز تھا، ان کی تحریر حشو و زوائد سے پاک، جامع، پُر مغز اور متوازن ہوتی تھی، اس میں نہ کوئی بات سلامت روی اور شائستگی کے خلاف ہوتی اور نہ کبھی سخت اور تلخ لب و لہجہ اختیار کرتے۔

ان کی شخصیت بھاری بھرکم اور باوقار تھی اور وہ بہت وجیہہ و شکیل اور جامہ زیب شخص تھے۔ چہرے بشرے سے شکوہ و عظمت اور متانت و سنجیدگی ظاہر ہوتی تھی۔ ملنے والا ان کے تقدس اور وجاہت سے ضرور متاثر ہوتا تھا۔ طبیعت میں نرمی، ملاطفت، مروت اور شرافت تھی۔ کسی بات پر غصہ نہ ہوتے۔ بات چیت کرتے تو منہ سے پھول جھڑتے تھے انداز گفتگو بہت شیریں اور دلکش ہوتا خالص علمی مسائل اور خشک فنی مباحث پر بھی اظہارِ خیال کرتے تو پیرایۂ بیان اتنا پُر لطف اور دلچسپ ہوتا کہ سننے والے کو گھبراہٹ نہ ہوتی۔

صفائی ستھرائی بہت پسند تھی۔ ان کی شکل و صورت ہی کی طرح ان کی کتابوں سے بھی ان کی نظافت و نفاست پسندی عیاں تھی جو بہت اچھی اور عمدہ چھپتی تھیں، ان کا خط بھی بہت پاکیزہ تھا۔

وہ علم کی عظمت و وقار کو مجروح نہ ہونے دیتے۔ رام پور کی لائبریری میں علماء و فضلا کے علاوہ سرکاری حکام، صوبائی و مرکزی وزراء، وزرائے اعلیٰ گورنر اور دوسرے عمائد و اعیان آتے رہتے تھے۔ لیکن عرشی صاحب جب ان لوگوں سے ملتے تو نہ مرعوب ہوتے اور نہ علم کی شان میں کوئی فرق آنے دیتے، بلکہ آنے والے خود ان کی علمی عظمت اور ذاتی وجاہت سے متاثر ہوتے تھے۔

ان میں تواضع انکساری اور خاکساری تھی۔ کبھی کوئی ایسی بات نہ کرتے جس میں علو، پندار یا اظہارِ فضیلت و برتری کا شائبہ ہوتا۔ ان میں خود نمائی اور خود ستائی کی مطلق عادت نہ تھی، اپنے علمی کاموں کی تعریف و تحسین نہ کرتے اگر اس کے ذکر کا موقع بھی ہوتا تب بھی احتراز کرتے۔

ان کی زندگی سادہ اور تکلفات سے بری تھی۔ ان کا ظاہر و باطن یکساں تھا۔ نام و نمود، نمائش اور ظاہر داری سے نفرت تھی۔ خود غرضی، ریاء، منافقت، رشک، حسد، کینہ، کپٹ سے ان کا آئینہ دل صاف تھا۔ کبھی مال و زر، جاہ و منصب اور اعزاز و اکرام کی طلب کے درپے نہ ہوتے۔ جو کچھ بلا طلب مل جاتا اسی پر قانع رہتے اور شکر گزار ہوتے اور اگر نہ ملتا تو شکوہ و شکایت کا لفظ زبان پر نہ لاتے۔ ایک دفعہ ان کو ایران و افغانستان کی ثقافتی سفارت پیش کی گئی۔ تنخواہ ڈھائی ہزار روپے ماہوار تھی مگر انھوں نے اس کو قبول نہیں کیا اور اُس وقت جو ڈھائی سو روپے مشاہرہ ملتا تھا اسی پر قانع رہنا پسند کیا۔ حکومت ہند نے ان کو عربی مخطوطات کی فہرست مرتب کرنے پر بارہ ہزار روپے دیتے لیکن انھوں نے یہ رقم خاموشی سے لائبریری کو دیدی۔

وہ اپنی غیرت و خود داری کی بنا پر اپنی ذات کے لیے کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلاتے لیکن کتب خانہ ان کو بہت عزیز تھا اس کے لیے دوسروں سے مانگنے میں تکلف و عار نہ ہوتا۔ کرنل بشیر حسین زیدی صاحب ریاست رام پور کے مدتوں چیف منسٹر رہے، اس زمانہ میں انھوں نے ایک بار فرمایا: "میں جب سے چیف منسٹر ہوا ہوں، کسی افسر شعبہ نے مجھے اتنا دق نہ کیا ہوگا، مجھ سے اتنے مطالبے نہ کیے ہوں گے جتنے عرشی صاحب نے مگر سب کتب خانے کے لیے، اپنی ذات کے لیے ایک بھی نہیں۔"

وہ کسی کی مذمت، تنقیص اور غیبت سے اپنی زبان آلودہ نہ کرتے۔ ان میں دوسروں کو ضرر اور ایذا پہنچانے کی صلاحیت اور مردم آزاری کی قابلیت نہ تھی۔ وہ خلوص و محبت کا پیکر تھے۔ ہر ایک سے خندہ روئی اور گرم جوشی سے ملتے تھے۔ خوردوں سے محبت و شفقت سے پیش آتے، ان کی حوصلہ افزائی کرتے۔ ہم سروں اور ہم چشموں سے عزت و تکریم کا معاملہ فرماتے اور ان کی تعریف و توصیف میں کوتاہی نہ کرتے ملازمین اور ماتحتوں سے بھی ان کا برتاؤ مساویانہ ہوتا تھا۔ علمی کام کرنے والوں کی مدد کرنے میں پیش پیش رہتے۔ رام پور کے کتب خانہ سے استفادہ کرنے کے لیے جو لوگ آتے ان کے لیے بچھ جاتے تھے۔ ان کا علم و مطالعہ بہت وسیع تھا اس لیے آنے والوں کی علمی مشکلات چٹکیوں میں حل کر دیتے تھے اور ان کے مطلب کی کتابوں کی نشاندہی کر کے ان کو زیادہ طوالت میں پڑنے اور بے شمار کتابوں کی ورق گردانی کی زحمت سے بچا لیتے تھے۔

وہ اپنے آرام و راحت کی پروا اور صلہ و ستایش کی تمنا کیے بغیر پوری محنت خلوص، خاموشی، لگن اور ایثار و قربانی کے ساتھ عمر بھر علمی و تحقیقی کاموں میں سرگرم عمل رہے۔ ان کی اس بے لوث علمی خدمت اور غیر معمولی جاں فشانی نے ان کو شہرت کے بامِ عروج پر پہنچا دیا۔ کوئی علمی جماعت ان کو نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ انھوں نے مختلف علمی و تعلیمی اداروں اور بہت سی ادبی و تحقیقی انجمنوں کی سرپرستی اور سربراہی کی اور وہ بے شمار علمی تعلیمی اور ادبی تنظیموں سے وابستہ اور منسلک رہے۔

ان کے شاندار علمی کارناموں کا عام طور پر اعتراف کیا گیا۔ ان کی اکسٹھویں سالگرہ کے موقع پر جناب مالک رام صاحب نے انہیں ایک یادگاری مجلہ پیش کیا جو اس وقت کے نائب صدر جمہوریۂ ہند اور ملک کے مشہور ماہر تعلیم ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم کی نگرانی میں مرتب کیا گیا تھا۔ متعدد بار عرشی صاحب نے ریاست کے نمائندہ ہو کر اہم جلسوں اور تقریبات میں شرکت فرمائی۔ علمی کانفرنسوں میں خطاب کرنے اور مقالے پڑھنے کے لیے ملک و بیرون ملک میں بھی مدعو کیے جاتے تھے ایک بار روس اور دو بار کابل تشریف لے گئے۔

ان کی متعدد کتابوں پر ان کو بڑے بڑے انعام ملے اور ۱۹۷۲ء میں صدر جمہوریہ ہند کی طرف سے عربی کی مسلمہ قابلیت کا سرٹیفکٹ آف آنر بھی دیا۔ ڈی لٹ کی ڈگری بھی دی۔

مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے بڑی مشغول اور نہایت سرگرم علمی زندگی گزاری جو آج کل کے تن آسان اور راحت طلب لوگوں کے لیے ایک درس و پیام ہے

اے مرغِ سحر عشق ز پروانہ بیاموز
کاں سوختہ را جاں شد و آواز نیامد

مظہر امام
اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائرکٹر
ٹیلی ویژن سنٹر، سری نگر

عصمت چغتائی کی افسانہ نگاری

اگر مجھے سیدھے سادے جملے میں عصمت کی افسانہ نگاری پر تبصرہ کرنا مقصود ہو تو میں کہوں گا کہ وہ مسلم متوسط طبقے کی زندگی کے متضاد مظاہر کی سب سے اچھی عکاس ہیں۔ آزادی سے پہلے اور اس کے آس پاس ہندوستان کا مسلم گھرانا جن حالات و تضادات سے دوچار تھا، اُس کو جس خورد بینی سے عصمت نے دیکھا اور دکھایا ہے وہ اُردو افسانے کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔

عصمت چغتائی وہ خوش نصیب افسانہ نگار ہیں جو اُردو ادب میں ایک دھما کے کے ساتھ داخل ہوئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ادبی منظر نامے پر چھا گئیں۔ اُن کی پہلی افسانوی تحریر جنوری ۱۹۳۸ء کے "ساقی" میں "فسادی" کے عنوان سے شایع ہوئی تھی۔ عصمت کی پہچان میں یوں بھی آسانی ہوئی کہ وہ عظیم بیگ چغتائی کی بہن تھیں۔ علی گڑھ کی تعلیم یافتہ بی، اے، بی، ٹی تھیں۔ صنفِ نازک سے تعلق رکھنے کے باوجود ایسے افسانے لکھتی تھیں کہ پہلوانوں کے بھی پسینے چھوٹ جائیں۔ پھر ان کے افسانے "لحاف" پر مقدمہ چلا۔ شاہد لطیف نے عصمت کے افسانوں پر فریفتہ ہو کر ان سے شادی کی۔ لوگوں نے منٹو سے پوچھا: "آپ نے عصمت سے شادی کیوں نہیں کی؟" عصمت فلموں کے لیے بھی لکھنے لگیں۔ عصمت کے اردگرد ایک ہالہ سا بن گیا تھا۔

عصمت کی شہرت اور بدنامی دونوں کے باوجود میں ایک عرصے تک ان کے افسانوں سے پوری طرح قربت حاصل نہ کر سکا۔ مجھے اُن کے افسانے اُس وقت کے عمومی مزاج سے الگ الگ لگتے تھے۔ کرشن ہوں، یا بیدی یا منٹو، وہ معاشرے کے تابع ہیں۔ اُن کے افسانوں میں فرد سے افراد کا رشتہ کسی نہ کسی اعتبار سے متعین ہوتا ہے، آپ معاشرہ نہ سہی، ماحول کہہ لیں۔ اپنے کرداروں سے ہمدردی یا نفرت پیدا کرانے کا ہنر بھی انھیں آتا ہے۔ عصمت کو ماحول اور معاشرے سے زیادہ فرد سے دلچسپی رہی ہے اور پھر انھیں اپنے کرداروں سے محبت یا نفرت کا جذبہ پیدا کرانے کا اتنا شوق بھی نہیں۔ عصمت سے میری عدم دلچسپی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اُن کے موضوعات محدود اور فضا بہت سُکڑی سمٹی محسوس ہوتی تھی۔ کرشن، بیدی یا منٹو کے یہاں تنوع، رنگا رنگی اور وسعت کا احساس ایک نظر میں ہو جاتا تھا، لیکن عصمت گھر کی چار دیواری سے جیسے آگے نکلتی ہی نہیں تھیں۔

عصمت کے کمالات سے واقف کرانے میں "کلیاں" اور "چوٹیں" کے دیباچہ نگاروں صلاح الدین احمد اور کرشن چندر کا ہاتھ تو تھا ہی، لیکن ان کے افسانوں سے رغبت اس وقت پیدا ہوئی جب فروری ۱۹۴۵ء کے "ساقی" میں پطرس کا مضمون "کچھ عصمت چغتائی کے بارے میں" شایع ہوا۔ غالباً آج بھی یہ عصمت کے افسانوں کی سب سے خوبصورت اسٹڈی ہے۔

پطرس کے مضمون سے پہلی ہدایت تو یہ ملی کہ ادیب کو عورت اور مرد کے خانے میں تقسیم نہیں کرنا چاہیے۔ اس وقت تک ہمارے ناقدین عصمت کا ذکر کرنے سے پہلے یہ اطلاع ضرور دیتے تھے کہ وہ عورت ہیں اور عورت ہونے کے باوجود ایسی بے باکی بلکہ بے حیائی سے لکھتی ہیں! جیسے بے حیائی تو صرف مردوں کا حصّہ ہے۔ پطرس نے ایک ستم یہ بھی کیا کہ "چوٹیں" کے دیباچہ نگار کرشن چندر کا نام لیے بغیر ان کی سرزنش کر دی۔ انھیں جملوں پر جنھیں میں خود کئی بار پڑھ چکا تھا اور اپنے دوستوں کو سنا کر کرشن چندر کو داد بھی دے چکا تھا۔ کرشن چندر کے جملے یہ ہیں:

"عصمت کا نام آتے ہی مرد افسانہ نگاروں کو دورے پڑنے لگتے ہیں۔ شرمندہ ہو رہے ہیں۔ آپ ہی آپ خفیف ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ دیباچہ بھی اسی خفّت کو مٹانے کا ایک نتیجہ ہے۔"

پطرس کے مضمون کے ابتدائی دو صفحات سے میری خام خیالی دور ہوئی اور خفّت اِس طرح مٹی کہ میں نے عصمت کو عورت تسلیم کرنا ہی چھوڑ دیا۔

پطرس نے اپنے مضمون کے تیسرے، چوتھے اور پانچویں صفحے میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ عصمت ڈرامہ لکھنا نہیں جانتیں۔ ان کا مزاج افسانہ نگاری کے لیے ہی موزوں ہے۔ خود انھیں کے الفاظ میں۔

"ڈرامے کی تیکنیک عصمت کے قابو میں نہیں آئی۔ یا یہ کہیے کہ ابھی تک ان کو اس پر قدرت حاصل نہیں ہوئی۔ پلاٹ کو مناظر میں تقسیم کرتی ہیں تو ناپ کر قینچی سے نہیں کترتیں۔ یوں ہی دانتوں سے چیر پھاڑ کر چیتھڑے بنا ڈالتی ہیں۔"

پطرس نے اس امر کی طرف بھی توجہ دلائی کہ عصمت نے اپنے افسانے "میرا بچہ" میں برنارڈ شا کے ARMS AND THE MAN کے پہلے سین پر ہاتھ صاف کیا ہے۔ لیکن انھوں نے عصمت کے ڈرامے "سانپ" کا تفصیلی ذکر کرنے کے باوجود یہ نہیں کہا کہ یہ ڈرامہ بھی شاہی کے ایک کردار BUA-CONSTRICTOR سے

ہے۔ کئی سال بعد "مہر نیمروز" کراچی نے "چہ دلاوراست دزدے......" کے تحت اس
انکشاف بھی کیا کہ عصمت کا مشہور ناولٹ "ضدی" بھی ایک غیر ملکی ناول سے ماخوذ
یعنی اخذ کا رجحان عصمت کے یہاں پہلے سے موجود تھا۔

اپنے مضمون کے باقی پانچ صفحات میں پطرس نے عصمت کے افسانوں کی
یاں خصوصیات سے گفتگو کی ہے، اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ:

"عصمت کوئی قدآور ادیب نہیں۔ اُردو ادب میں جو امتیاز اُن کو حاصل
اس سے منکر ہونا کج بینی اور بخل سے کم نہ ہوگا' اور یہ مضمون بذات خود اس
یاز کا اعتراف ہے۔"

یہ وہ زمانہ تھا جب بہار کا موسم اُردو افسانے پر اپنی فیاضیاں نچھاور کر
تھا۔ اردو افسانے کی بالیدگی کے اس دور میں بہت سے اچھے افسانہ نگار سامنے
ے لیکن عام طور پر ناقدین اور مبصرین کی نگاہ میں اُردو افسانے کے "عناصر اربعہ" یہ
— کرشن، بیدی، منٹو اور عصمت۔

ہمارے یہاں ۲۰-۲۵ سال سے یہ بدعت چلی آرہی ہے کہ جب تک کسی
یب کی پیٹھ پر کوئی لیبل چسپاں نہ کیا جائے، اس کی شناخت ہی نہیں ہوتی۔ عصمت
تاتی پر گفتگو کرتے ہوتے یہی دشواری سامنے آتی ہے۔ انھیں اب عام طور پر
ی پسند سمجھا جاتا ہے، اور اس غلط فہمی کو پیدا کرانے میں خود اُن کا بھی حصّہ ہے۔
یمبڑی کانفرنس میں گرج برس چکی ہیں۔ کچھ بلند بانگ بیانات بھی دئے ہیں، اور
چار زوردار افسانے ڈرامے بھی لکھ ہی دئے ہیں، جن میں طبقاتی جابر نظام اور
لم سماج کو کوسا گیا ہے۔ اگر ان کے زیادہ تر افسانے اسی نوعیت کے ہوتے تو
ی آسانی سے ملک کے معاشی اور معاشرتی حالات کا تجزیہ کرکے یہ کہا جاسکتا تھا کہ
مت نے سرمایہ دارانہ طبقاتی نظام کے گھناؤنے پن اور بے رحم تضادات کو اپنے
سانوں میں کمال خوبی سے ابھارا ہے، یا یہ کہ ان کی کہانیاں ہمارے ظالم نظام
بے رحم عکاس ہیں۔

مجھے کسی کے ترقی پسند ہونے یا نہ ہونے پر اعتراض نہیں ہے، لیکن عصمت
ے ساتھ بے انصافی ہوگی اگر ان پر کوئی لیبل چسپاں کیا گیا۔ خواہ وہ جنس نگار کا ہی
رل نہ ہو۔ ان کے حق میں مناسب ہوگا اگر انھیں صرف و محض فنکار کی حیثیت میں
یکھا اور پرکھا جائے۔ عصمت کے کسی بھی نمائندہ افسانے کو لے لیجیے۔ بھول بھلیاں'
تن، تل، جوانی، ساس، نفرت، جال، پیشہ، پھوپھی، کنواری، چوتھی کا جوڑا، جڑیں۔
یرا خیال ہے کسی پر آپ کوئی خاص لیبل نہیں لگا سکتے۔

عصمت کی دنیا غربت، جہالت اور غلاظت کی دنیا ہے۔ مشترکہ خاندان
کیڑے مکوڑوں کی طرح پلنے والے بچے'، پیشاب ہگنے کی سڑاند اور بساند۔
یل اور پسینے میں اٹی ہوئی خادمائیں، دبی دبی گھٹی گھٹی پردے کے پیچھے سے جھانکنے
لی نا کتخدا لڑکی، جو پردے ہی پردے میں ناجائز بچے بھی پیدا کرلیتی ہے، عصمت کے
انے پہچانے مظاہر ہیں۔ عصمت پردے کے پیچھے کلبلاتے ہوئے احساسات و
ذبات کی مصوّری تیز، چکاچوند پیدا کرنے والے رنگوں سے کرتی ہیں۔ وہ اپنے
سانوں میں نہ مفکر بننے کی کوشش کرتی ہیں اور نہ کہیں متفکر نظر آتی ہیں۔ ان کے
افسانوں کے تاروپود میں توانائی اُن کے اس اسلوب سے آتی ہے، جو اُردو میں منفرد ہے
اور جس کی نقل کسی کے بس کا روگ نہیں۔ کرشن، بیدی، منٹو — ہر ایک کے اسلوب
کی نقل کی گئی ہے لیکن عصمت کے انداز بیان اور زبان کی تقلید ممکن ہی نہیں۔ صرف
جنس کے متعلقات کا بے باکی سے اظہار کرنے یا کرداروں کی زبان سے فحش کلمات
کہلوا لینے سے عصمت کے رنگ میں ریختہ نہیں کہا جاسکتا۔

میں سمجھتا ہوں کہ عصمت کے افسانوں کو اُن کی زبان سے الگ کرکے نہ سمجھا
جاسکتا ہے، نہ ان کے ساتھ انصاف کیا جاسکتا ہے۔ ان کے افسانوں کا عمومی موضوع
جنسی اشتہا ہو یا اور کچھ۔ لیکن وہ ہمیں کچھ اتنے گرم کھانے کھلاتی ہیں کہ اشتہا دور
ہو یا نہ ہو، لیکن منہ ضرور جلنے لگتا ہے۔ عصمت کے یہاں جملوں کی تراش خراش
نہیں ملے گی جسے بعض افسانہ نگار اپنے خیال میں فنی آرایش کے لیے ضروری سمجھتے
ہیں لیکن ان کی زبان میں ایسی کاٹ، ایسی چبھن، دل میں اتر جانے والی کیفیت ہے
کہ اس کی مثال اُردو نثر میں کہیں نہیں مل سکتی۔ ان کے جملے کہیں سپاٹ اور
سُست نہیں ہوتے۔ عصمت مختصر ترین الفاظ میں فضا آفرینی کا گُر جانتی ہیں۔
اس کے لیے وہ شاعرانہ یا رومانی اسلوب اختیار نہیں کرتیں۔

عصمت کے یہاں وہ رومانی وارفتگی نہیں جس سے خواب انگیز فضا کی
تعمیر ہوتی ہے ان کے یہاں ایک الھڑپن اور اکھڑپن ہے، جو "مہذب اسلوب" سے
میل نہیں کھاتا۔ جشنِ شب کے بعد اچانک جس بے کیفی اور بے زاری کا احساس ہوتا
ہے، اس کی تصویر عصمت نے یوں پیش کی ہے:

"ایک دم رات انتہا سے زیادہ سنسان اور تھکی ہوئی معلوم ہونے
لگی، وہی رات جو چند گھنٹے پہلے نشے میں چور، چوتھی کی دُلھن کی
طرح جگر مگر کر رہی تھی، یکایک بوڑھی اور مریضہ بن گئی — انھوں
نے اپنے بازو پر سوتے نوعمر جوان کے بھاری سر کا بوجھ ذرا کھسکا کر
اور قریب کرلیا۔ وہ بے سُدھ سو رہا تھا۔ اس کی لمبی لمبی سڈول
ٹانگیں مسہری سے باہر نکلی ہوئی تھیں۔ ایک ہاتھ پہلو کے نیچے
مڑا ہوا تھا دوسرا بھاری شہتیر کی طرح اُن کے سینے پر پڑا ہوا تھا۔"

عصمت کے کردار متوسط مُسلم گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں — یعنی اس طبقے سے
جس سے خود عصمت کا تعلق رہا ہے۔ اس طبقے کی اچھائیوں اور برائیوں سے عصمت کی
دلچسپی اتنی نہیں، جتنی اس طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد سے ہے۔ اُن کی افتاد
طبع، ان کا مزاج، ان کی حرکات و سکنات، ان کی زبان، ان کا لہجہ، حالات سے
نبرد آزما ہونے میں اُن کا عمل اور ردِعمل — یہ سب کچھ عصمت کے یہاں پوری
جزئیات کے ساتھ ملے گا۔ یہ افراد سرکش بھی ہیں، بزدل بھی، آہستہ آہستہ اپنی آگ
میں جلنے والے، یا پھر اپنی بدزبانی کی آگ میں دوسروں کو جلانے والے۔ وہ
محبت بھی کرتے ہیں، نفرت بھی۔ کبھی کبھی یہ اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے کہ نفرت میں
کتنی محبت چھپی ہوتی ہے۔ پھوپھو پھپی جو بات بات پر اپنے بھائی، بھابھی اور ان
کے بچوں کو طعنے، کوسنے اور گالیاں دیتی ہیں، اور وہ بھی ایسی طبع زاد کہ ساتوں
طبق روشن ہوجائیں، جب بستر مرگ پر پڑے بھائی کے سرہانے پہنچتی ہیں تو اپنی

ری زندگی، اپنا سارا وجود ان پر نچھاور کر دینا چاہتی ہیں۔

عصمت کا ایک افسانہ ہے — "نفرت" یہ بیک وقت دو متوازی کرداروں کہانی ہے۔ یا یوں کہہ لیجیے کہ دو کردار متوازی راستوں پر چلتے ہوتے جب ایک وسرے سے ملتے ہیں، تب بھی ان کی فطرت کا تضاد ویسے ہی باقی رہتا ہے۔ نفرت اور بت کا یہ متضاد میلان بچپن سے شروع ہو کر جوانی، بڑھاپے، حتیٰ کہ بعد الموت نت میں جانے تک جاری رہتا ہے۔ ایک مختصر افسانے کے کینوس پر ایسا نقش و پیدائش سے لے کر موت کے بعد کی دنیا کو بھی سموتے ہوتے ہو، مجھے اُردو کے ی اور افسانے میں نظر نہیں آیا۔ کوسنے، طعنے، گالیاں، ایک دوسرے کی شکایت، یک دوسرے سے بظاہر نفرت، لیکن اندر ہی اندر اپنائیت کا ایک احساس۔ یہ ساس ہی وہ رشتہ ہے، جو دو متضاد و متخالف مزاج و میلان کی حامل شخصیتوں آپس میں متحد رکھتا ہے۔ عصمت جزئیات اور تفصیلات پر اتنی قدرت رکھتی ہیں بابد و شاید — وہ جزئیات نگاری کے ہنر کو ماحول کی تصویر کشی پر ضایع نہیں یں۔ وہ فرد کی پھڑکتی ہوتی رگ کے ہر زیر و بم سے آشنا ہیں۔ فرد کی زندگی کی تمام مال پہنائیوں پر اُن کی نظر رہتی ہے۔

عصمت کو بھرپور گدرائی ہوئی جوانیوں سے عشق ہے۔ خواہ وہ مرد کی ہوں یا ورت کی، جب بھی انھیں موقع ملتا ہے، وہ جسم کی تفصیلات پیش کرنے سے ہیں چوکتیں:

"وہ تھا بھی بیکل بوٹی، جوانی اس کی رگ میں قلانچیں بھر رہی تھی۔ نچلا بیٹھتے اسے تھکان ہونے لگتی تھی ..... اُن کا جوڑ جوڑ ٹوٹ گیا، مگر وہ چاق و چوبند رہا، پیتا رہا، رقص کرتا رہا، اس ایک شام اس نے جانے کتنے میل رقص کر ڈالا ہوگا ..... اس بھوت سے تو کوئی سانڈنی ہی نپٹ سکتی تھی۔" (نیند)

عصمت یوں تو نسبتاً اونچی سوسائٹی کا ذکر بھی چٹخارے لے لے کر کرتی ہیں ور اپنے خیال میں اُن کی ریاکاری کا پردہ فاش کرتی ہیں، لیکن اس میں ان کا اپنا نگ اس طرح نہیں جھلکتا، جس طرح ان کے ان افسانوں میں جو ان کی جانی پہچانی نیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر اُن کے افسانے "نیند" کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

"یہ وہی زمانہ تھا، جب تک نیند اُن سے نہیں روٹھی تھی۔ اسی ہرجائی نیند نے ایک دن رقص کے بیچ میں ان کی بدمست انکھڑیوں میں سما کر انھیں ان کے پارٹنر کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ یہ وہی مضبوط بانہوں والا پارٹنر تھا۔ اُس کا کہنا تھا کہ وہ انھیں باہر گھاس پر لٹانے گیا تھا، ویسے اس کی نیت کچھ زیادہ بد نہ تھی۔ مگر اتنی سی بات پر سلمان صاحب جذباتی ہو گئے، ورنہ وہ ان کے پارٹنر کا جبڑا نہ توڑ بیٹھتے۔ وہ اتفاق سے اُن کا افسرِ اعلیٰ بھی تو تھا۔ اگر ایک افسرِ اعلیٰ ازرہِ کرم اپنے ماتحت کی بیوی کو جو رقص کے درمیان لمبی تان لینے پر مصر ہو، گھاس پر لٹا رہا ہو تو وہ جبڑا اکھڑوانے کا ہرگز مستحق نہیں۔ ہر ایک جانتا ہے کہ کسی کو گھاس پر لٹانے میں کیسے کیسے آسن مارنا ہی پڑتے ہیں۔ اگر سلمان نے اتنے چھچھور پن سے اپنی حماقت کا اس قدر شاندار ثبوت نہ دیا ہوتا تو شاید بات آگے نہ بڑھتی اور انھیں باس کی ضرورت سے زیادہ دلجوئی نہ کرنی پڑتی —"

اس میں طنز بھی ہے، عصمت کا رواں دواں انداز بھی، لیکن ذرا ان کے مشہور افسانے "چوتھی کا جوڑا" کے اقتباس سے تقابل کیجیے تو پھر فرق واضح ہو جاتے گا:

"اور پھر دونوں میں کھسر پھسر ہوتی۔ بیچ میں ایک نظر دونوں کبریٰ پر بھی ڈال لیتیں، جو دالان میں بیٹھی چاول پھٹک رہی تھی۔ وہ اسی کانا پھوسی کی زبان کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔ اسی وقت بی اماں نے کانوں کی چار ماشے کی لونگیں اتار کر منہ بولی بہن کے حوالے کیں کہ جیسے تیسے کر کے شام تک تولہ بھر گوکھرو، چھ ماشے سلمہ ستارا اور پاؤ گز نیفے کے لیے طول لا دیں۔ باہر کی طرف والا کمرہ جھاڑ پونچھ کر تیار کیا۔ تھوڑا چونا منگا کر کبریٰ نے اپنے ہاتھوں سے کمرہ پوت ڈالا۔ کمرہ تو چٹا ہو گیا مگر اس کی ہتھیلیوں کی کھال اڑ گئی اور جب وہ شام کو مسالہ پیسنے بیٹھی تو چکر کھا کر دوہری ہو گئی۔"

عصمت کے افسانوں کی عمومی فضا اور ان کے کرداروں کے پیچ و خم کا اندازہ لگانا ہو تو ان کے کسی ایک جانے پہچانے افسانے کا جائزہ لیجیے۔ مثلاً "بچھو پھوپھی" میں پہلے آپ کو رحمان بھائی ملیں گے، جو رنڈیوں کے جمعدار تھے، مگر محلے ٹولے کی لڑکیاں بالیاں ان کی نظر میں اپنی سگی ماں بہنیں تھیں۔ یہ الگ بات ہے کہ "انھوں نے اپنی بیوی کی زندگی میں ہی اپنی سالی سے جوڑ توڑ کر لیا تھا۔" رحمان کی بیوی چاہے اپنی بہن کی درگت بناتی ہوں، لیکن کوئی اور کچھ کہتا تو کہتیں: "جو کنواری کو کہے گا، اس کے دیدے گھٹنوں کے آگے آئیں گا۔" اور سالی کی تصویر عصمت نے بس ان تین مختصر جملوں میں کھینچی ہے: "ایک آنکھ میں یہ بڑی کوڑی سی پھلی تھی۔ پیر بھی ایک ذرا چھوٹا تھا۔ کولھا دبا کر چلتی تھی۔" رحمان بھائی سے افسانے کا تعلق صرف اتنا ہے کہ بچھو پھوپھی، رحمان کی کھڑکی میں بیٹھ کر طول طویل گالیاں دیا کرتی تھیں۔ بچھو پھوپھی کا اصلی نام بادشاہی تھا۔ ان کی تصویر عصمت نے یوں کھینچی ہے:

"جس کھڑکی میں وہ بیٹھی تھیں، وہ ان کے طول طویل جسم سے لبالب بھری ہوتی تھی۔ ابا میاں سے اتنی ہم شکل تھیں جیسے وہی مونچھیں اُتار دوپٹہ اوڑھ کر بیٹھ گئے ہوں۔ ساڑھے پانچ فٹ قد، چار انگل چوڑی کلائی، شیر کا سا کلّا، سفید بگلا بال، بڑا سا دہانہ، بڑے بڑے دانت، بھاری سی ٹھوڑی! اور آواز تو ماشاء اللہ ابا میاں سے ایک سر نیچی ہی ہوگی۔"

اور اُن کے مزاج اور ان کی فطرت کے بارے میں یہ جملے دیکھیے:

"جس دن پھوپھا مسعود علی نے مہترانی کے سنگ کلیلیں کرنی شروع کیں، پھوپھی نے بٹّے سے ساری چوڑیاں چھن چھن توڑ ڈالیں۔ رنگا ڈوپٹہ اتار دیا اور اس دن سے وہ انھیں 'مرحوم' یا 'مرنے والا' کہا

کرتی تھیں۔ مہترانی کو چھونے کے بعد انھوں نے وہ ہاتھ پیر اپنے جسم کو نہ لگنے دیتے۔"

کہانی بیان کرنے والی سے پھوپھو پھوپھی کا جو رشتہ ہے وہ ظاہر ہے مگر رشتوں کا ذکر عصمت نے اس طرح کیا ہے:

"ہمارے پھوپھا ہماری اماں کے چچا بھی تھے۔ ویسے تو نہ جانے کیا گھپلا تھا، میرے ابا میری اماں کے چچا لگتے تھے..... ایک رشتے سے میں اپنی ماں کی بہن بھی لگتی تھی۔ اس طرح میرے ابا میرے دلہا بھائی بھی ہوتے تھے۔"

پھوپھو پھوپھی کے مزاج میں شعلہ ہی شعلہ تھا۔ وہ چغتائی خاندان کی بھرپور نمائندگی کرتی تھیں ددھیال والوں پر فخر کرتیں اور نانیہال والوں کو "کنجڑے قصائی" کہا کرتی تھیں ددھیال والوں کا ذکر اس طرح ہوا ہے:

"ذہنی طور پر ابھی تک گھوڑوں پر سوار منزلیں مار رہے تھے۔ خون میں لاوا دہک رہا تھا۔ کھڑے کھڑے تلوار جیسے نقوش، لال فرنگیوں جیسے منہ، گریلوں جیسی قد و قامت، شیروں جیسی گرجدار آوازیں، شہتیر جیسے ہاتھ پاؤں..... وہ خود زیادہ تر فوج میں تھے۔ ویسے مار دھاڑ کا شوق ابھی تک نہیں ہوا تھا۔ کشتی، پہلوانی، تیراکی میں نام پیدا کرنا، پنجہ لڑانا، تلوار اور پٹے کے ہاتھ دکھانا اور چوسر پچیسی کو، جو میری ننھیال کے مرغوب ترین کھیل تھے، ہیجڑوں کے کھیل سمجھنا۔"

پھوپھو پھوپھی نانیہال والوں سے تو نالاں تھیں ہی۔ اپنے بھائی سے خاص طور پر اس وقت خفا ہوئیں جب بقول راوی "میری پھوپھی کی بیٹی مسرت خانم ظفر ماموں کو دل دے بیٹھیں۔" اور "میری اماں کی دادی یعنی ابا کی پھوپھی نے دونوں کا نکاح پڑھوا دیا۔" پھوپھو پھوپھی نے کھڑے کھڑے بیٹی داماد کو نکال دیا۔ مجبوراً ابا اماں دولہا دولہن کو گھر لے آئے..... بادشاہی پھوپھی نے اس دن سے بھائی کا منہ نہیں دیکھا۔ بھائی سے پردہ کر لیا۔ میاں سے پہلے ناچاقی تھی۔ دنیا سے منہ پھیر لیا۔ ایک زہر تھا کہ ان کے دل و دماغ پر چڑھتا ہی گیا۔"

پھوپھو پھوپھی موقع بے موقع اپنے بھائی کو کوسنے دیتیں، اور عجیب عجیب مغلظات بکتیں، اور اس زد میں بھائی کی بیوی اور بچے بھی آجاتے۔ اپنی بھابی کو "جادوگرنی" کہتیں جس نے اُن کے بھائی کو پھنسا لیا تھا اور الزام لگاتیں "اس کا تو میرے بھائی سے شادی سے پہلے تعلق ہو کر بیٹ گرا تھا۔"

بھائی اپنی بہن کو چھیڑنے کے لیے اپنے چھوٹے بیٹے سے کہلواتے:

"پھوپھی ہماری اماں سے کشتی لڑوگی؟"

پھوپھی جل کر جواب دیتیں:

"ہاں ہاں بُلا اپنی اماں کو، آجائے خم ٹھونک کر۔ ارے اُلو نہ بنا دوں تو مرزا کریم بیگ کی اولاد نہیں۔ باپ کا نطفہ ہے تو بلا ملازادی کو....."

"پھوپھی بادشاہی! دادا میاں گنوار تھے نا؟ بڑے نانا جان انھیں آمد نامہ پڑھایا کرتے تھے۔"

"ارے وہ استنجے کا ڈھیلا، کیا میرے باوا کو پڑھاتا۔ مجاور کہیں کا، ہمارے ٹکڑوں پر پلتا تھا۔"

بھائی کو اس طرح کوسنے دیتیں:

"اللہ نے چاہا بجلی گرے گی۔ نالی میں گر کر دم توڑو گے۔ کوئی میت کو کاندھا دینے والا نہ بچے گا۔"

لیکن جب بھائی کا آخری وقت آپہنچا تو "بادشاہی بیگم دوڑی دوڑی بھائی کے سرھانے پہنچیں۔ بھائی نے تکلیف میں مسکراتے ہوئے کہا "لو بادشاہی تمہاری دُعا پوری ہو رہی ہے۔"

"پھوپھو پھوپھی کی شیر جیسی خرانٹ آنکھیں، ایک میمنے کی معصوم آنکھوں کی طرح سہمی ہوئی تھیں۔ بڑے بڑے آنسو ان کی سنگ مرمر کی چٹان جیسے گالوں پر بہہ رہے تھے۔"

"یا اللہ یا اللہ۔ میری عمر میرے بھیا کو دیدے..... یا مولا..... اپنے رسول کا صدقہ۔"

وہ اس بچے کی طرح جھنجھلا کر رو پڑیں جسے سبق یاد نہ ہو۔

اس افسانے میں کہانی بیان کرنے والی DISPASSIONATE ہے وہ صرف واقعات بیان کرتی ہے، اپنی جانب سے کوئی تبصرہ نہیں کرتی۔ آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ افسانہ نگار اپنی طرف سے ایسی رنگ آمیزی نہیں کرتا جو صورتیں مسخ کر دے۔

یہاں اس افسانے کا تجزیاتی مطالعہ پیش کرنا مقصود نہیں ہے۔ صرف اتنا کہنا ہے کہ بدلے ہوئے معاشرے اور ماحول میں بھی ایسے کردار عنقا نہیں ہو گئے ہیں، اور اگر ہوں بھی تو اس سے عصمت کی اہمیت کم نہیں ہوتی، کیونکہ وہ جس دور کی عکاس ہیں، وہ دور ابھی ابھی ہم سے رخصت ہوا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ عصمت کی دنیا محدود ہے لیکن اپنے محدود دائرے میں وہ بڑی فنکاری کا ثبوت دیتی ہیں۔ وہ اس بات کی قائل نہیں ہیں کہ عمارتیں تو کئی بنالی جائیں، لیکن ایک کمرے کو بھی سجایا نہ جا سکے۔

۶۰ء کے بعد اُردو افسانے کا رنگ و آہنگ بدلا ہے۔ علامت، تجرید، شعریت کی جانب رجحان وغیرہ۔ ادھر کچھ دوستوں نے تخلیقی افسانے کا نعرہ بلند کیا ہے۔ وہ تخلیقی افسانہ نگاروں کی فہرست میں منٹو کو بھی جگہ نہیں دیتے، عصمت کو کیا آنکھ لگائیں گے۔ آپ شاید دریافت کرنا چاہیں کہ تخلیقی افسانہ کیا ہوتا ہے۔ جواباً عرض ہے کہ تخلیقی افسانہ وہ ہوتا ہے جو تخلیقی ہو۔ بس ثابت ہوا کہ عصمت "تخلیقی افسانہ نگار" نہیں ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے افسانے تخلیقی ادب کا نہایت وقیع نمونہ ہیں۔

عصمت کے افسانے سادہ نہیں، انسانی ذہن اور دل کی طرح پر پیچ ہیں۔ غالباً اسی لیے روسی خاتون جمن خواجا تیوانے، جنھوں نے عصمت پر تحقیقی مقالہ لکھا ہے، انہیں اردو افسانے کی ٹیڑھی لکیر سے تعبیر کیا ہے — خود عصمت ہی کے ناول کے عنوان سے استعارہ لے کر۔

دعا

حرمت الاکرام

رام باغ۔ مرزاپور ۲۳۱۰۰۱
یوپی

دلِ فسردہ کو رقصِ شرر عطا فرما
چمن دیا ہے، نسیم سحر عطا فرما

غیورِ فکر کو دے جو ہر سبک ساری
جلال و جاہ نہ لعل و گہر عطا فرما

کہاں پناہ طلب ہو فشارِ دانائی
یہ کیوں کہوں کہ دعا کو اثر عطا فرما

اک ایک بوند کا کس طرح دے سکوں گا حساب
ہوس نہیں کہ مجھے چشم تر عطا فرما

لہو کی گردشِ پنہاں ہو مجھ پہ آئینہ
بصیرتوں کے خدا! وہ نظر عطا فرما

رہوں نہ صرف تماشائی طلوع و غروب
اداشناسیِ مہر و قمر عطا فرما

بچا کے لایا ہوں محلوں سے روشنی اس کی
مرے چراغ کو مٹی کا گھر عطا فرما

فراغِ تن کو حصارِ مکاں کیا تفویض
فراغِ ذہن کو محراب و در عطا فرما

علوئے ذوق کو دوں کیا جواب، اے آگاہ
میں کس مقام پہ ہوں؟ یہ خبر عطا فرما

کہاں اجالے میں یہ جذب و کیفِ بیداری
کہوں یہ کیسے کہ شب کو سحر عطا فرما

رہے خرابِ سفر نازِ کجروی — لیکن
خود آگہی کو کوئی مستقر عطا فرما

صبا اُڑائے پھرے مجھ کو دوشِ رفعت پہ
بنا کے خاک شعورِ سفر عطا فرما

میں ایک رات ہوں، توقیرِ جاں نوازی دے
مجھے بھی تو کوئی پچھلا پہر عطا فرما

مطاعِ بے طلبی کس سے مانگنے جاؤں
مرے لیے ہے یہ سب کچھ، اگر عطا فرما

غزلیں

عشرت کرتپوری

ان کی قربت سے گھٹ گیا رستا
باتوں باتوں میں کٹ گیا رستا

راہبر کی ذرا سی لغزش سے
کتنے رستوں میں بٹ گیا رستا

کل دِوانے ادھر سے گذرے تھے
آج پھولوں سے پٹ گیا رستا

جستجو میں تمہاری نکلا تھا
تھک کے مجھ سے لپٹ گیا رستا

ایک منزل تھی دیر و کعبہ کی
ان کے کوچے سے بٹ گیا رستا

صرف ان کا خیال آیا تھا
ایک پل میں سمٹ گیا رستا

ان کے جانے کے بعد اے عشرت
گرد سے سارا اَٹ گیا رستا

نامی انصاری

۹۷/۱۱ پریڈ
کانپور ۲۰۸۰۰۱

خطِ غبار ہوں یا نقشِ آرزو میں ہوں
تمہارے شہر میں عنوانِ گفتگو میں ہوں

نہ کوئی دستِ تمنا، نہ عرصہ گاہِ جنوں
نہ جانے کس کے لیے محوِ جستجو میں ہوں

اسی خیال میں تا عمر میں رہا پیچاں
وہ آئینہ ہے کہاں جس کے رُوبرو میں ہوں

مرے جنوں کے لیے کم ہے دشتِ امکاں بھی
یہ اور بات ہے پابندِ چار سو میں ہوں

غریبِ شہر کو بھی اذنِ گفتگو دے دو
ہجومِ لفظ و بیاں سے لہو لہو میں ہوں

مرا خیال بھی رنگیں ہے خونِ دل سے مرے
اسی ہنر سے زمانے میں سرخرو میں ہوں

مری نظر سے شگفتہ ہے برگِ گل نامی
کہ اس چمن کے لیے باعثِ نمو میں ہوں

فرحت حسین
لیکچرر شعبۂ اُردو، جامعہ ملّیہ اسلامیہ
جامعہ نگر، نئی دہلی

سیّدین کے تعلیمی نظریات

تعلیم کا رشتہ زندگی کے مقاصد سے اس قدر گہرا ہے کہ جب بھی انسانی زندگی میں تبدیلیاں رُونما ہوئیں تعلیمی نقطۂ نظر کو بھی وقت کے تقاضوں کے تحت بدلنا پڑا ہے۔ صنعتی دَور کے آغاز کے بعد سائنس کی تیز رفتار ترقی کی وجہ سے زندگی کے تہذیبی اور معاشرتی نقشے میں قدیم اور جدید روایات کا امتیاز اتنا شدید ہو گیا کہ اس کے تمام شعبوں میں ایک ہل چل پیدا ہو گئی، غور و فکر کے انداز نئے سانچوں میں ڈھلنے لگے اور تہذیب و معاشرت کے پیمانے بدلنے لگے۔ اس عالم گیر چیلنج کے جواب میں جن لوگوں نے قدیم و جدید کے امتزاج سے ایک نئی عمارت کھڑی کرنے کی کوشش کی اور ایک نئے نقطۂ نظر کو زندگی کا مقصد بنایا اُن میں تعلیم کے میدان میں خواجہ غلام السیّدین کا بھی شمار ہوتا ہے۔ وہ ہندوستان کے اُن مشاہیرِ تعلیم میں گنے جاتے تھے جن کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی۔ دُنیا ان کو ماہرِ تعلیم کی حیثیت سے جانتی ہے۔ تعلیم سیّدین کی زندگی کا۔ شغل ہی نہیں تھا، مقصدِ حیات بھی تھا۔ انسانی زندگی کی جن اعلیٰ اور ابدی اقدار پر ان کا ایمان تھا، ان کی حفاظت اور تبلیغ و ترسیل کے لیے تعلیم سے بہتر کوئی دوسرا میدان نہیں تھا، اس لیے انھوں نے تعلیم کو پیشہ ورانہ نقطۂ نظر سے پرکھنے کے بجائے، سماجی، معاشرتی اور تہذیب و تمدّن کے پہلوؤں کی روشنی میں، انسانی زندگی کا نصب العین قرار دیا۔ خواجہ غلام السیّدین کی نظر میں وہ دور تھا جسے قدیم و جدید کی کشمکش کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ نظریاتی تصادم کے اس دور میں ہندوستان پر اضطراب و انتشار کی کیفیت طاری تھی، ایک جانب یہاں کی قدیم تہذیبی اور روحانی روایات تھیں جو غیر ملکی حکمرانوں کی بیگانگی اور چیرہ دستیوں کا شکار ہو رہی تھیں اور دوسری جانب مغرب سے آئی ہوئی جدید صنعتی اور سائنسی اقدار اور معیار تھے جو حکومتِ وقت کی سرپرستی میں پَل اور بڑھ رہے تھے۔ ہندوستانی عوام کو غلامی کا اتنا گہرا احساس تھا کہ وہ غیر ملکی تسلط سے چھٹکارا پانے یا موجودہ حالات سے سمجھوتہ کر لینے کے دوراہے پر کھڑے ہوئے تھے۔ وقت کے اس زبردست چیلنج کے ردِّ عمل میں کئی تحریکوں نے جنم لیا اور مختلف نظریئے اُبھر کر سامنے آئے۔ ایک گروہ اپنے قدیم تہذیبی ورثے پر اصرار کرتا تھا اور دوسرا طبقہ ہر نئی چمکنے والی چیز کو سونا سمجھتا تھا۔ کچھ ایسے اہلِ نظر بھی تھے جو ہندوستان کی تہذیبی روایات اور روحانی اقدار کو جدید اقدار کی آمیزش سے نئی رُوح اور نئی توانائی بخشنا چاہتے تھے۔ اہلِ نظر کے اس کارواں میں جو سرسیّد، گاندھی جی، مولانا محمد علی، علّامہ اقبال، اربندو گھوش، ٹیگور اور ڈا رادھا کرشنن نے چھوڑے ان کے اثرات خواجہ غلام الثقلین، مولانا آزاد، ذاکر حسین اور خواجہ غلام السیّدین تک دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان میں سے ہ زندگی کے تمام شعبوں، فلسفہ، سیاست، مذہب اور تعلیم کو اپنی اپنی ط سے نئی جہت اور نئی نظر عطا کی۔

خواجہ غلام السیّدین کا تعلّق زندگی کے شعبۂ تعلیم سے تھا۔ وہ خو الطاف حُسین حالی کے خاندان سے تعلّق رکھتے تھے۔ حالی اُردو کی نشاۃ الثان ان امیرانِ کارواں میں ہیں جنھوں نے ماضی کا رشتہ حال سے جوڑ کر مستقبل ک دیکھے۔ انھوں نے اردو ادب کو معروضی انداز، مقصدیت، غور و فکر زندگی کی عملیت کا سبق سکھایا اور اس میں اخذ و اکتساب اور ترک کی پ کی۔ یہی روایات سیّدین کو ورثے میں ملیں۔ علی گڑھ کی تعلیم نے سیّدین کے ان تہذیبی و معاشرتی اقدار کی چھاپ ڈالی جن کی جڑیں ہندوستان کے پیوست تھیں اور جو اسلامی روایات کی آغوش میں پرورش پائی ہوئی تھ تعلیم کے حصول کے دوران انگلستان کے قیام نے سیّدین پر مغرب کے تصوّرات اور سائنسی افکار کا اثر ڈالا جو ذہنی کشادگی اور تخلیقی قوت کا اور فکر و عمل کے داعی تھے۔ یہ وہ عوامل ہیں جنھوں نے سیّدین کو بنیادی معلّم بنایا اور ان کی فکر و نظر میں وسعت، ہمہ گیری اور تنوع پیدا کیا۔

خواجہ غلام السیّدین نے ۱۹۲۵ء میں تعلیم سے فراغت کے بعد تق ۳۵ سال تعلیمی خدمت میں گزارے۔ گیارہ سال انھوں نے علی گڑھ کے کالج میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیئے۔ اس کے بعد ریاست جموں تعلیم کے ڈائرکٹر رہے، یہاں انھوں نے سات سال تک ریاست کی تعل کو سدھارنے اور وہاں کے تعلیمی معیار کو بلند کرنے میں صرف کیے۔ اس نواب رام پور نے انھیں ریاست میں تعلیمی اصلاحات کے لیے بلا لیا۔ ہند کی آزادی کے بعد ریاستوں کے ہند یونین میں ضم ہو جانے پر سیّدین نے را خیرباد کہا تو صوبہ بمبئی کی جمہوری ریاستی حکومت نے ان کی صلاحیتوں سے

۱۹۵۰ء میں وہ حکومتِ ہند کی وزارتِ تعلیمات سے منسلک ہوگئے اور یہیں سے ریٹائر ہوئے۔ ملازمت کے دوران اور ریٹائر ہوجانے کے بعد بھی سیدین ماہرِ تعلیم کی حیثیت سے ملک و بیرونِ ملک میں تعلیمی کانفرنسوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم کے مختلف پہلوؤں پر خطبات اور لکچر دیتے رہے اور آخر وقت تک یہ سلسلہ جاری رہا۔

۳۵ سالہ تعلیمی زندگی کے دوران سیدین نے تعلیم کے موضوع پر اُردو اور انگریزی میں کئی کتابیں تصنیف کیں جو مسئلۂ تعلیم پر فنی، سماجی، سیاسی، تہذیبی اور فلسفیانہ پہلوؤں کے بارے میں ان کے تعلیمی افکار و نظریات کا آئینہ ہیں۔ ان کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ سیدین کے نظریۂ تعلیم کی اساس تعلیم اور معاشرتی زندگی کے گہرے ربط اور تعلیم کے ذریعے انسانی قدروں کی حفاظت اور بقا پر تھی۔ اس روشنی میں ان کے تعلیمی افکار کے دو دور متعین کیے جاسکتے ہیں۔ پہلے دور میں سیدین کا نقطۂ نظر فرد اور معاشرے کی تربیت پر مرکوز تھا اور دوسرے دور میں ان کی فکر کا دائرہ بنی نوعِ انسان تک وسیع ہوگیا۔

فکری ارتقا کے ابتدائی دور میں سیدین کا تعلیمی مطمحِ نظر مغرب کے تعلیمی مفکر جان ڈیوئی اور علامہ اقبال کے شاعرانہ تخیل سے متاثر نظر آتا ہے۔ ابتدا میں سیدین کی فکر کا مرکز بچہ تھا۔ وہ فرد کی تربیت پر زور دیتے تھے، لیکن فرد کو وہ جماعت اور معاشرے سے الگ بھی نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے اس دور کی نمائندہ تصانیف میں اصولِ تعلیم، اقبال کا فلسفۂ تعلیم، ایجوکیشن کلچر اینڈ سوشل آرڈر اور دی اسکول آف دی فیوچر خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ سیدین تعلیم کے ذریعے فرد کی نشو و نما پر زور دیتے تھے اور اس کے ساتھ ہی وہ فرد کی تربیت اس طور پر چاہتے تھے جس سے معاشرے کو بھی فائدہ پہنچے۔ وقت کی ضرورت اور تجربات کی روشنی میں انھوں نے عمرانی زندگی کو بہت اہمیت دی اور معاشرے اور ماحول کو فرد کی تعلیم کے اداروں کی حیثیت دی۔ انھوں نے لکھا ہے: ”انسان تنہا بطور ایک فردِ واحد کے زندگی بسر نہیں کرسکتا بلکہ اور افراد کے ساتھ مل جل کر رہتا ہے اور معاشرتی کاروبار اور مشاغل میں حصّہ لیتا ہے۔ سچ پوچھیے تو معاشرے کا رُکن ہونا ہی انسان کو انسان بناتا ہے۔ اس کے بغیر اس کی ذہنی اور رُوحانی قوتوں کی پوری نشو و نما ہو ہی نہیں سکتی“۔ دوسری جگہ فرد کے سلسلے میں معاشرے کی ذمّے داریوں کے بارے میں سیدین فرماتے ہیں: ”تمام عمرانی اداروں کا مقصد اعلیٰ یہ ہے کہ وہ افراد کو وسیع ترین معنوں میں تعلیم دیں اور ان کی شخصیت کی تشکیل کریں تاکہ وہ اپنی مختلف فطری قوتوں کو اس طرح استعمال کرسکیں کہ خود ان کو بھی فائدہ پہنچے اور معاشرے کو بھی“۔ معاشرتی ماحول کی اہمیت اور معاشرے کی ذمّے داریوں کو ذہن نشین کراتے ہوئے سیدین نے تعلیم میں فرد کی مرکزیت کے بارے میں لکھا ہے: ”دراصل تعلیم کا موضوع، خواہ تعلیم دماغی ہو یا جسمانی ہو، اخلاقی ہو یا معاشرتی، بچّے کی ذات ہے جو ایک سالم اور واحد ہستی ہے۔ اور تمام اثرات جو اس پر ڈالے جاتے ہیں اس کی شخصیت کی تشکیل میں حصّہ لیتے ہیں“۔

سیدین کے افکار کا یہ ابتدائی دور غیر قوم کی حکومت میں قومی اور معاشی زندگی کے انتشار اور ہندوستانی تہذیبوں کی پسماندگی کا بھی ہے اور آزاد ہندوستان میں اخلاقی اقدار کی پامالی اور جمہوری نظریات کے فروغ کا بھی۔ اس کشمکش، تصادم اور آزادی کے بعد نئے نظریات اُبھرنے کی وجہ سے تہذیب کے غیر یقینی حالات اور قومی استحکام میں جھول کی خطرناک صورتِ حال سے بچنے کا واحد ذریعہ فرد کی صالح زندگی اور تہذیبی اقدار کا احیا تھا جسے سیدین نے تعلیم کا مطمحِ نظر بنایا۔ اسی مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے فرد اور معاشرے کے باہمی اور گہرے ربط پر زور دیا۔

ملک کے جن دانشوروں نے سیدین کے فکری ارتقا پر اثرات ڈالے ان میں علامہ اقبال اور گاندھی جی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اقبال کے یہاں جس مردِ کامل کا تصور ملتا ہے، اس کی خصوصیات کو سیدین نے تعلیم کا مقصد ٹھہرایا۔ لیکن دونوں میں عملی فرق یہ ہے کہ اقبال جسے مردِ کامل کہتے ہیں سیدین کے ہاں وہ فردِ کامل ہے۔ اقبال کے مردِ کامل کی تشکیل کے عوامل میں آفاقیت پنہاں ہے اور سیدین کا فردِ کامل قومی اور ملکی عناصر سے تشکیل پاتا ہے۔ افکار کے عمل میں یہ فرق سیدین کے ہاں گاندھی جی کے اثرات نے پیدا کیا۔ گاندھی جی کے نظریات کا سرچشمہ قومیت اور قومیت پرستی سے پھوٹتا ہے جن سے فرد کی زندگی سیراب ہوتی ہے۔ ہندوستان جیسے مختلف مذہب، رنگ اور نسل والے ملک میں اس کے علاوہ کوئی دوسرا نظریہ پنپ ہی نہیں سکتا۔ سیدین اس کو بخوبی سمجھتے تھے۔ اس روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ سیدین کے تعلیمی نظریات کو ہندوستانی قومی روایات، اسلامی عقائد کے توسط سے ملی ہوئی تہذیبی اقدار اور مغربی مفکّرین کے نظریات نے روشنی پہنچائی اور ان سب کی آمیزش سے ایسا متوازن نظریۂ تعلیم مرتّب ہوا جس کا مقصد اپنی تہذیبی اقدار کی حفاظت کرنا اور وقت کے تقاضے کے تحت انھیں وسیع المشرب اور ہمہ گیر و متنوع بنانا تھا۔ وہ صالح زندگی کے قائل تھے اور زندگی کو خیر کے مترادف سمجھتے تھے جس کی رُو سے زندگی کی بُنیاد رُوحانیت، محبّت اور اخلاق و رواداری پر رکھی جانی چاہیے۔ ان کی نظر میں انسان کائنات میں ایک عظیم الشان تخلیق ہے اور اس کی زندگی کا مقصد خیر کی مسلسل جُستجو اور اسے اپنی شخصیت میں سمونے کی پیہم کوشش ہے۔ تمام کائنات انسان کے مصرف کے لیے ہے۔ قدرت سے ودیعت کی گئی اس تصرّفانہ قوت کے استعمال کے لیے سیدین نے خودی کو بلند کرنے، عشق کی جوت جگانے اور اعلیٰ انسانی اقدار کا حامل معاشرہ تشکیل دینے کو تعلیم کے فرائض میں شامل کیا، اس مقصد کے پیشِ نظر ہی وہ فرد کی ایسی تعلیم و تربیت کے قائل تھے جو معاشرے سے مربوط ہو۔ ان کے نزدیک انسان کے تخیل کی پرواز اور ذہنی ارتقا اس کی معاشرتی زندگی میں ہی ہوسکتا ہے۔ اس خیال کے مطابق افراد کی تربیت میں جماعت یا معاشرے کا زبردست حصّہ ہوتا ہے اور فرد کی شخصیت کی تشکیل معاشرے کے مقاصد کے پیشِ نظر ہوتی ہے۔ معاشرہ نام ہے اجتماعیت کا، افراد کی جمعیت سے ہی معاشرہ وجود میں آتا ہے۔

اگر افراد باصلاحیت ہوں گے تو ایک صحت مند معاشرہ وجود میں آئے گا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے سیّدین نے فرد کی سیرت سازی کے لیے ذہنی اور اخلاقی تربیت پر بہت زیادہ زور دیا جس سے ان کا مقصد فرد اور جماعت دونوں کی فلاح وبہبود تھا۔ ذہنی تربیت پر اصرار کے محرکات میں گاندھی جی کا بنیادی تعلیم کا نظریہ تھا۔ بُنیادی تعلیم کا مقصد ابتدائی عمر سے ہی بچّوں کو ان صنعتوں، پیشوں اور حرفوں کی راہ پر ڈالنا تھا جو ملک کی قومی معاشرت اور تمدّن کا جزو لاینفک ہیں اور جن کے رواج سے قومی یک جہتی کے فروغ میں مدد مل سکتی تھی۔ بنیادی تعلیمی اسکیم کا خاکہ کانگریس کے واردھا اجلاس میں تیار کیا گیا تھا اور اس کی تفصیلات اور نصابات کی تیاری کی ذمّے داری ڈاکٹر ذاکر حسین کو سونپی گئی تھی۔ سیّدین اگرچہ پہلے ہی سے اس اسکیم کے مقاصد سے متّفق تھے لیکن ان کے ذہنی تربیت کے خیال کو بُنیادی تعلیمی اسکیم سے ہم آہنگ بنانے میں ڈاکٹر ذاکر حسین کی رفاقت کو دخل ہے۔ چنانچہ اس اسکیم کی تفصیلات تیار کرنے اور اس کے تحت نصابات بنانے میں سیّدین نے زبردست حصّہ لیا۔ اس اسکیم کو عملی جامہ پہنانے میں بھی سیّدین پیش پیش رہے اور اسی کی خاطر انھوں نے علی گڑھ سے معلمی کا شغل چھوڑ کر تعلیم کے تجرباتی میدان میں قدم رکھا۔ موضوع چونکہ سیّدین کے تعلیمی نظریات تک محدود ہے اس لیے بنیادی تعلیمی اسکیم کی خوبیوں، خرابیوں اور اس کی کامیابی و ناکامی کے اسباب یہاں خارج از بحث ہیں۔

سیّدین کے تعلیمی نظریات کا دوسرا پہلو اخلاق تھا۔ ان کے ہاں اخلاق پر زور، ان کے مذہبی معتقدات کے اثرات کا نتیجہ ہے۔ اخلاقی کردار کا تقاضا تعلیمی نقطۂ نظر سے یہ ہے کہ فرد معاشرے کی طرف سے اس پر عائد کردہ فرائض کی انجام دہی کا خود کو پابند سمجھے۔ سیّدین کے خیال کے مطابق اخلاقی کردار کی آخری منزل یہ ہے کہ اگر معاشرے میں خرابیاں پیدا ہو جائیں تو بااخلاق اور اعلیٰ سیرت و کردار کے حامل افراد اپنے علم اور پسند سے اپنے فرائض کو انجام دیں اور معاشرے کی اصلاح کا بیڑہ اُٹھائیں۔ سیّدین کے ہاں فرد کی تربیت میں اخلاقیات، تہذیبی اقدار اور معاشرتی روایات کا بند باندھنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس انفرادیت کو پسند نہیں کرتے تھے جو ذہن و فکر کو لامحدود آزادروی پر ڈال دے یا سماج کو فرد کے تابع کر دے۔ وہ مغرب کی لامحدود انفرادیت کو بھی پسند نہیں کرتے تھے کیونکہ اس سے سرمایہ داریت جنم لیتی ہے اور نہ انھوں نے اشتراکی نظریۂ اجتماعیت کی حمایت کی کیونکہ اس سے لادینیت اور غیر مہذّب زندگی کی راہ کھلتی ہے۔ انھوں نے اسلامی روایات اور ہندوستانی تہذیبی اقدار کی آمیزش سے ایسا مرکّب نظریہ ترتیب دیا جس میں فرد کی صلاحیتوں کو اُجاگر ہونے کے لیے آزاد فضا بھی میسّر تھی اور معاشرے سے علاحدہ فرد کی کوئی حیثیت بھی نہیں تھی۔ اس نظریے کی تشکیل میں انھیں اقبالؔ سے رہنمائی ملی ہے کیونکہ اپنے ان خیالات کی تائید میں سیّدین نے کئی جگہ اقبالؔ کے اس شعر کو دُہرایا ہے ؎

فرد قائم ربطِ ملّت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

فرد کی تربیت میں اخلاقیات پر انھوں نے اس لیے زور دیا تاکہ ایسی متوازن انفرادیت نشوونما پائے جو معاشرے کے آداب و حقوق سے واقف ہو اور انھیں سرانجام دے۔ اسی لیے صالح معاشرے کا قیام بھی ان کے نقطۂ نظر سے ضروری ہے کیونکہ معاشرہ ان کے نزدیک فرد کی تربیت کا ادارہ ہے، چنانچہ معاشرہ جس طرح کا ہوگا، افراد کی اُٹھان بھی اسی معیار کی ہوگی۔

دوسری جنگِ عظیم کے اثرات اور ملک کی آزادی سے جو نئے مسائل پیدا ہوئے، ان کے پیشِ نظر سیّدین کو معلّم کی حیثیت سے اجتماعی مفادات کا اور زیادہ گہرا احساس ہوا، کیونکہ جمہوری نظام حکومت میں قومیت کو برتری حاصل ہوتی ہے اور سماج کا قومی زندگی سے اتحاد ضروری ہوتا ہے۔ چنانچہ ملک کی آزادی کے بعد فرد کے گرد و پیش پھیلے ہوئے انتشار و اضطراب نے سیّدین کو فرد کی تربیت سے زیادہ معاشرتی اصلاح کی ضرورت کا زیادہ احساس دلایا۔ اس احساس کے تحت "پرابلم آف ایجوکیشنل ریکنسٹرکشن" میں اساتذہ سے مخاطب ہوتے ہوئے لکھتے ہیں: "ان کا رویّہ وسیع تر دُنیا کے پیشِ نظر سماجی ہونا چاہیے یعنی ان کو فرد کی نشوونما کے مسائل کو وسیع تر سماجی حالات کے تناظر میں دیکھنا چاہیے۔" فرد کی اہمیت اور سماج کی یہ قدر و قیمت ہی ان کے ابتدائی تعلیمی نظریات کا نچوڑ ہے۔

۱۹۵۰ء کے بعد سیّدین کے تعلیمی افکار ایک نئی کروٹ لیتے ہیں اور ان کا دائرہ فرد، معاشرہ، قوم اور ملک کی حدود سے باہر نکل کر تمام دُنیا تک پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔ اس دور میں انھوں نے فرد اور جماعت کے بجائے انسانیت کی تہذیب پر زور دیا۔ یہ وہ دور تھا جب ملک کے اندر فسطائی قوتیں مذہب، زبان اور فرقہ وارانہ بُنیادوں پر اختلافات کو بڑھا رہی تھیں اور انسانوں کے درمیان نسلی امتیاز اور لسانی تفرقات کو ہوا دینے میں سرگرم تھیں۔ ملک سے باہر ایٹمی دور کی وجہ سے دُنیا میں سرد جنگ کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا اور ایٹمی توانائی کے فروغ کی دوڑ میں سبقت لے جانے کے رُجحان کی وجہ سے عالمِ انسانی پر خطرات کے سائے منڈلا رہے تھے۔ ان ملکی اور بین الاقوامی حالات میں خیالات میں ہم آہنگی، یک جہتی، غیر جانب داری اور بقائے باہمی کی اشد ضرورت تھی۔ چنانچہ ہندوستان کی جمہوری حکومت کی وزارتِ تعلیمات سے منسلک ہونے کے بعد سیّدین کے سامنے مختلف مذاہب، مسالک اور زبانوں کی موجودگی میں بغیر امتیاز پورے ملک کی تعلیم کے مسئلے نے اور دوسرے ممالک کے ساتھ ہندوستان کی غیر جانبدارانہ مساوات اور ناطرف داری کے اصولوں پر تعلّقات کی پالیسی کی وجہ سے ان کے تعلیمی افکار میں انسانیت کی پاسداری، مذہبی رواداری، بقائے باہمی اور تہذیبی وسیع المشربی کا در آنا وقت کے عین مطابق تھا۔ سیّدین ہندوستان کی رواداری اور بقائے باہمی کی قدیم مشترکہ تہذیب کو سرمایۂ افتخار سمجھتے تھے۔ یہاں کی تاریخ اس کی شاہد ہے کہ ہندوستان میں ہر عقیدے کو پنپنے کے یکساں مواقع حاصل رہے اور ہر قسم کے کلچر اور افکار و نظریات کو اُبھرنے اور پھیلنے کی آزادی حاصل رہی۔ سیّدین اس قدیم حقیقت کو پھر سے زندہ کرنا چاہتے

تھے اور قومی نظامِ تعلیم کو گزشتہ نفاست، موجودہ صلاحیت، سائنسی قوت اور ذہنی بصیرت سے ہم آہنگ بنانا چاہتے تھے۔ سائنسی ترقی کی بدولت نفع وضرر کے مِلے جُلے اثرات سے پیدا شدہ غیر یقینی اور خطرناک صورتِ حال کے پیشِ نظر جب تمام اقوامِ عالم میں ایک عالمی تہذیب، وحدتِ فکر و نظر اور باہمی اشتراک وعمل کی شدید ضرورت محسوس کی جانے لگی تو ایک حسّاس ذہن اور معلّمانہ فکر نے سیّدین کو بھی عالمی سماج کا خواب دیکھنے کی طرف مائل کیا۔ چنانچہ وقت کے تقاضے کے تحت انھوں نے مختلف اقوام و اوطان کے درمیان فکری ہم آہنگی، تہذیبی یک جہتی اور ترقی و کامیابی میں اشتراک وعمل کو تعلیمی نظریات کی اساس بنایا۔ اس کی رُو سے انسان کائنات کی سب سے عظیم حقیقت ہے اور انسانیت سب سے عظیم قدر ہے۔ اس سلسلے میں ان کی تصانیف "فیتھ آف این ایجوکیشنسٹ"، "سیومنسٹ ٹریڈیشن ان انڈین ایجوکیشنل تھاٹ"، "زبان، زندگی اور تعلیم" اور "آندھی میں چراغ" اُن کے افکار کی نمائندگی کرتی ہیں۔ اس دور میں سیّدین کے نظریۂ تعلیم کا مرکزی جذبہ قومی وحدت اور بین الاقوامی سملجیت تھا جن کی تعمیر انسانی اقدار کی بُنیاد پر کی جا سکتی ہے۔ انسان اور انسانیت کے وسیع تر مفہوم کی وضاحت سیّدین کے لفظوں میں یہ ہے کہ "انسان کی تعریف کسی تاریخی یا جغرافیائی یا نسلی یا مذہبی لحاظ سے نہیں ہونی چاہیے۔ انسان سے مراد تمام انسان ہیں یعنی کہ تمام ممالک، تمام خطّہ جات اور تمام عقائد کے انسان آپس میں ایسے سائنسی، تکنیکی، سماجی، ثقافتی، نفسیاتی اور رُوحانی رشتوں میں منسلک ہیں جو ناقابلِ تسخیر اور ناقابلِ تنسیخ ہیں۔" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آخری دَور میں سیّدین انسان کی اس طور پر تعلیم و تربیت کے قائل تھے جو فکری اور تہذیبی اشتراک پیدا کر کے بین الاقوامی معاشرے کے قیام میں مدد دے۔ وہ ایک ایسی عالمی برادری کا خواب دیکھتے تھے جس میں مفاہمت، یکجہتی اور امداد باہمی کا جذبہ پایا جاتا ہو اور انسانوں کے درمیان وصل، اختلاط اور مقاصد میں اشتراک موجود ہو۔ اس کی طرف اساتذہ اور ماہرینِ تعلیم کی توجّہ مبذول کراتے ہوئے سیّدین کہتے ہیں۔ "تمام دُنیا ایک واحدہ ہے اور وہ شخص جو سچی تعلیم کا نمائندہ ہے اسے کچھ ایسے عالمی تصوّر کو وسعت دینی چاہیے جو جغرافیائی یا نسلی یا قومی یا دوسری طبقاتی وفاداریوں سے بندھا ہوا نہ ہو۔" یہ عالمی وحدت کا تصوّر ایسے انسانی معاشرے کا ضامن ہے جس کی بنیاد محبّت، دوستی اور بھائی چارے کے اصولوں پر قائم ہوتی ہے، جس میں ایک دوسرے کا استحصال نہیں کیا جاتا اور ترقی کے معنی کسی ایک ملک کی ترقی تک محدود نہیں رہتے بلکہ پوری انسانی تہذیب کی ترقی تک پھیلے ہوتے ہیں اور جس میں مقابلے اور مسابقت کے بجائے تعاون و اشتراک کا جذبہ موجزن ہوتا ہے۔ یہ خصوصیات صالح انسانی تہذیب اور اعلیٰ تمدّنی زندگی کا جوہر ہیں۔ اور چونکہ یہ مظہر ہیں انسانیت کا اس لیے سیّدین نے تعلیم و تربیت کو انسانیت کے احیا کا ذریعہ بنانے پر زور دیا۔ وہ انسانیت کو انسان کی سب سے بڑی صنعت سے تعبیر کرتے تھے اسی لیے سیّدین نے سائنسی ترقی کو بھی اعلیٰ انسانی بصیرت سے مربوط کرنے پر اصرار کیا تاکہ سائنس کی ایجاد و اختراعات خطرہ بننے کے بجائے انسان کے لیے صرف منفعت کا باعث ہو۔ ان کا خیال تھا کہ موجودہ دَور کی مشینی اور آلاتی ترقی نے دُنیا میں بغض وعناد، اخلاقی بے راہ روی، مذہب بیزاری، خود غرضی اور مفاد پرستی کو ہوا دی ہے اس لیے سائنس کو مذہب اور انسانی اقدار سے مربوط کرنا ضروری ہے جو تعلیم کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ چنانچہ سیّدین نے سائنس اور مذہب میں ارتباط پیدا کرنے کو تعلیم کا مقصد ٹھہرایا تاکہ ان انسانی اقدار کا رواج عام ہو سکے جو صالح معاشرے کے لیے ضروری ہیں اور جو انسان کے لیے محفوظ اور مطمئن زندگی گزارنے کا وسیلہ ہیں۔

سیّدین نے معلّم کی حیثیت سے حیاتِ صالح کی تبلیغ واشاعت کی۔ وہ مادّیت کو رُوحانیت کے زیرِ اثر لانے کی عمر بھر کوشش کرتے رہے۔ انھوں نے ہمیشہ تعلیم کے میکانکی پہلو کے بجائے تعلیم کے ذریعے انسانی زندگی کو بامعنی اور متنوع بنانے کی غرض سے تعلیمی نظام کو اخلاقی، تہذیبی، مذہبی اور معاشرتی اقدار سے مربوط بنانے پر زور دیا۔ وہ جب تک زندہ رہے انہیں افکار کی تفسیر و تشریح کرتے رہے۔ اپنی تصانیف کے ذریعے، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے کنووکیشن ایڈریسوں میں، کانفرنسوں اور اجلاسوں کے خطبات میں، آل انڈیا ریڈیو سے نشری تقریروں کے ذریعے اور اخبار و رسائل کو دیے گئے بیانات اور پیغامات میں، غرض انھوں نے کوئی ایسا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا جس میں خیر کی جستجو اور تہذیبی و معاشرتی روایات کی حفاظت اور بقا کا درس نہ دیا ہو۔ اپنی ایک غیر تعلیمی تصنیف "آندھی میں چراغ" میں انھوں نے لکھا ہے "اس دَور کے لیے جب مادّیت کی بے لگام قوتوں نے زندگی کو اپنے نامبارک گھیرے میں قید کر لیا اور انسانیت کے سر پر ایک تلوار لٹکی ہوئی ہے، امید کا ایک ہی پیغام ہے جو پُرانا بھی ہے اور نیا بھی اور جو دراصل کبھی پُرانا نہ ہوگا اور وہ پیغام ہے محبّت اور رواداری کا، شرافت اور انسانیت کا اور ان اخلاقی قدروں کے بچاؤ کے لیے جد و جہد کرنے کا جو زندگی کو شرف اور معنی بخشتی ہیں اور جس کے بغیر وہ بے فیض اور بیکار ہو کر رہ جاتی ہے۔"

جس دور سے ہم گزر رہے ہیں اور جن حالات سے دوچار ہیں اس کے پیشِ نظر سیّدین کے اس قول کی صحت، صداقت اور ضرورت جس شدّت سے محسوس ہوتی ہے اس کی روشنی میں آج بھی یہ پیغام ہمارے موجودہ تعلیمی نظام کے لیے ایک ایسے لمحۂ فکریہ کا کام کرتا ہے جس پر ہر معلّم کو سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔

ھیرے کی لونگ

بچوں کے لیے آسان زبان میں لکھی ہوئی کہانیاں

ہر کہانی تصویروں سے آراستہ۔

قیمت صرف ۵ روپے ۵۰ پیسے

پروین کمار اشک

کرشنا سٹریٹ، پٹھان کوٹ
۱۴۵۰۰۱

پروین کمار اشک کا تعلق اُردو شاعروں کی جدید تر نسل سے ہے۔ پانچ دریاؤں کی دھرتی پنجاب کا یہ شاعر پیشے کے اعتبار سے حکومت پنجاب کے محکمۂ آبپاشی میں سول انجینئر ہے۔ شاعری کا ذوق اپنے والد کنول ہوشیارپوری مرحوم سے ورثے میں ملا۔ ایک مجموعۂ کلام 'در بہ در' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

○

"اشک کی غزلیں قاری کو ایک ایسے شاعر سے متعارف کراتی ہیں، جو نہ لفظوں سے خائف ہے، نہ تجربوں سے، نہ اس جذباتی اور ذہنی ردِ عمل سے جو اس کی اپنی ذات کا شناس نامہ ہے۔ غزل کے اکثر شعراء اس نوع کی خوبی سے متصف نہیں ہیں۔ سو ایک بندھی ٹکی فکری گرانباری اُن کی اپنی شخصیت کی چھاپ بن جاتی ہے۔ مجھے اشک کی غزلوں میں شاعر اور اس کے اظہار کے مابین کسی ایسے حجاب کا سراغ نہیں ملا، جسے ایک پوز سے تعبیر کیا جاسکے۔

پروین کمار اشک نے اپنے تجربوں، جانے پہچانے اور بظاہر معمولی نظر آنے والے واقعات اور واردات کو اسی بے تکلفی سے بیان کیا ہے، جس بے تکلفی کے ساتھ اُن کی تخلیقی شخصیت ان واقعات، تجربوں اور واردات کی زد پر آئی۔ نتیجہ ایک ایسی شاعری جو ہمیں نہ تو مرعوب کرتی ہے، نہ اپنی تعبیر کے کسی ایسے راستے کی تلاش پر اُکساتی ہے، جس کا علاقہ زندگی کے عام اور مانوس ظواہر کی حدوں سے باہر ہو۔ ہم اس کی آواز میں اس آواز کا سرا بھی پا سکتے ہیں، جو عام انسانی کائنات کی مثال بے تکلف، بے ساختہ اور فطری ہے۔"

شمیم حنفی

(در بہ در سے)

رسائی کے لیے تہ خانے تک تو رستہ ہے
مگر خزانے کی گٹھری پہ سانپ بیٹھا ہے

مہک رہی ہیں گلابوں سے دھڑکنیاں سب کی
میں کیا کروں! مری قسمت کا کھیت سوکھا ہے

گلی بھی سُونی پڑی ہے وہ بام بھی خاموش
منڈیر پر وہی ٹوٹا چراغ رکھا ہے

تو اک غزل ہے ترے لمس کی عنایت سے
میرا کلام، میرا شعر سانس لیتا ہے

اب ایسے وقت میں آئے تو میں یقیں کر لوں
سُنا تو ہے کہ زمیں پر بھی وہ اُترتا ہے

وہ لڑکی آج سرِ راہ اشک دیکھی تھی
نہ اب وہ رنگ ہے اس کا نہ اب وہ چہرا ہے

سر سے چادر جہاں ہٹاؤں میں
زخم سا اک وہیں پہ پاؤں میں

ایک ایسی ندی بہاؤں میں
کوئی پیاسا نہ دیکھ پاؤں میں

اپنی تعریف کرتا جائے وہ
اور بس مسکراتا جاؤں میں

کوہِ خوشبو کا دھیان جب آئے
بارشِ سنگ میں نہاؤں میں

آ ترے راستے کروں روشن
اِک چراغِ بدن جلاؤں میں

جو ندی کے کنارے سوکھ گیا
آ تجھے وہ شجر دکھاؤں میں

پشت سے مجھ پہ وار کرتا ہے
ہاتھ اشک اس سے کیا ملاؤں میں

خاک ہوتے لوگ اور جلتے ہوئے گھر دیکھ کر
بجھ گئیں آنکھیں مری خوں رنگ منظر دیکھ کر

شہر سے بھاگا کہ گھٹ کر مر نہ جاؤں بھیڑ میں
چیخ اٹھا میں دشت میں چہروں کا لشکر دیکھ کر

کس نے دیکھی اِس کے اندر اُجلی مخمل کی قمیص
سب نے منہ پھیرا مرا میلا سویٹر دیکھ کر

درد کا سیلاب مٹی بھی بہا کر لے گیا
ابر تو برسا تھا میرا کھیت بنجر دیکھ کر

کس قدر پھیکی لگے ہیں مجھ کو باہر کی زمیں
اشک جی! اک سبز موسم اپنے اندر دیکھ کر

مسعود مرزا نیازی
ڈی ۴۵، ایم۔ سی۔ کیمپس
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ (یو۔پی)

ھوا، ھوا، ھوا....!

ہوا ہمیشہ کی طرح آنگن سے ہوکر گذر رہی ہے۔ تیز جھونکے پچھلے سالوں کی طرح انار کی پتیوں کو چاٹ رہے ہیں۔ خوشبو جو ہوا کے ساتھ رقص کرتی تھی اب پھیکی پڑ چکی ہے۔ انار کی نازک ڈالیاں جو ہمیشہ شام ہوتے ہی ایک راگنی چھیڑتی تھیں اب کسی بہار کی راہ نہیں تکتیں۔ فضا اسی طرح خوشگوار ہے جیسی آٹھ سال پہلے تھی لیکن آج انار کی پتیوں میں پہلی سی سنسناہٹ کہاں؟ شام کا سرمئی عکس لمحہ بہ لمحہ سیاہی میں تبدیل ہو رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد اندھیرا ہو جائے گا اور پھر روشنی... اور پھر اندھیرا... ہمیشہ کی طرح ہر سمت اپنا تسلّط جمائے گا۔ رات ہمیشہ کی طرح آہستہ آہستہ کھسک رہی ہے۔ بھاری گاڑیوں کے گذرنے کی آوازیں۔ کتّوں کے بھونکنے کی آوازیں اور ہوا ــــ اور سکوت ہر شے کو گھیرے ہوئے ہے برآمدے سے لگی بڑی میز پر ڈھیر ساری کتابیں نامکمل مضامین اور رنگ رنگ کے قلم چاندی سے بنے خوبصورت قلمدان میں رکھے ہوئے ہیں۔ ٹیبل لیمپ کی روشنی میں میز پر پڑی ایک ایک چیز نظر آ رہی ہے۔

ڈرائنگ روم کے بیرونی دروازے پر راحیلہ کا سایہ بڑی تصویر کی شکل میں نمایاں ہے۔ سائے میں عینک کا موٹا چوکور فریم ناک، ہونٹ، ہاتھ میں کتاب اور شانوں تک بکھرے ہوئے بال صاف دکھائی دے رہے ہیں۔ -O. Shaughnessy کی لائنوں پر اس کی نظریں ایک ساعت کے لیے رُک گئی ہیں۔

We are the Music makers. And We are
the dreamers of Dreams.

ایک لمحے کے لیے راحیلہ نے اپنی نگاہ کتاب سے ہٹا کر اپنی خوبصورت عینک کو آنکھوں کے سامنے کیا۔ بارہ پر ٹکی ہوئی بڑی سوئی چھوٹی سوئی کو روندتی ہوئی گذر رہی تھی۔ کتاب بند کر کے اس نے ذرا اونچائی پر ٹنگی ہوئی عریاں مورت کا جائزہ لیا اور اس ذرا سی جنبش سے اس کے گدگدے اُبھار آپس میں ٹکرا کر رہ گئے۔ عجیب سا خیال آیا اور وہ آپ ہی آپ سمٹتی چلی گئی۔ دھیان کا ایک جھونکا نہ جانے کیا کیا دے گیا۔ کئی سہانے خواب جو اس نے کبھی نہ دیکھے تھے گدگدانے لگے۔ گول آئینے پر اس نے اپنی تصویر دیکھی اور ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے آئینے کو اپنی نظروں سے الگ کر دیا۔

زندگی خود ایک خواب ہے۔ نہ معلوم کب آنکھوں کا ساتھ چھوڑ دے اور پھر خواب کی حقیقت ہی کیا۔ خواب تو صرف خواب ہے۔ شاید اسی لیے اس کا زندگی کے بارے میں کوئی ٹھوس تصوّر نہ تھا۔ اور پھر امّاں کی موت کے بعد تو وہ اپنے آپ سے نفرت کرنے لگی تھی۔ بھیّا تو اسی سبب بہت اداس رہتا کہ آخر راحیلہ کو ہوا کیا ہے۔

راحیلہ نے جب ہوش سنبھالا تو امّاں کے علاوہ تنویر کو دیکھا۔ تنویر اس سے تین سال چھوٹا تھا۔ لیکن پڑھنے میں ہمیشہ اس سے آگے رہا۔ امّاں کی نگاہوں کے سامنے ہی اس نے ایم بی بی ایس پورا کر لیا۔ انٹرن شپ کر ہی رہا تھا کہ زندگی میں پھر ایک طوفان آیا۔

امّاں! "میرا تنّو بڑا ہو کر ڈاکٹر بنے گا اور اپنے ہاتھوں سے میری آنکھوں کا آپریشن کرے گا" کہتے کہتے اسے اور راحیلہ کو چھوڑ کر چلی گئی۔ وقت کی آندھی نے راحیلہ کو ایسے مقام پر لا کھڑا کیا جہاں پہنچ کر ایک لڑکی کو مرد کی ضرورت پڑتی ہے۔ لیکن اس کا مزاج تو ان سب باتوں سے الگ تھا۔ تنویر اکثر اصرار کیا کرتا "بجّو تمہاری کوئی پسند و سند ہے یا نہیں؟ پیاری بجّو میں تم سے چھوٹا ہوں کیوں کہلواتی ہو۔ بس جلدی کرو... میں چاہتا ہوں کہ میری بجّو....." لیکن ان سب باتوں کے نتیجے میں وہ رو پڑتی تھی اور کئی کئی ہفتے بغیر بات چیت کیے گذار دیتی تھی۔ اس لیے تنویر شادی کے بارے میں کچھ کہنے سے ڈرتا تھا۔ اور پھر ایک دن آیا کہ تنویر کو اپنی قسم توڑنا پڑی۔ ایک دن ــــ رات کے کھانے کے بعد راحیلہ اچانک تنویر پر برس پڑی "بھیّا میری طرف دیکھو جس بہن کے پیار کی خاطر تم نے سب کچھ لُٹا دیا۔ زندگی کے اس موڑ پر لا کر کیا اُسے سسکتا دیکھنا پسند کرو گے؟ بولو"۔

"کیا بات ہے" تنویر نے موضوع سے لاعلمی دکھاتے ہوئے کہا۔

"میں پوچھتی ہوں وہ کون سی شے ہے جس نے تمھیں شادی کرنے سے روک رکھا ہے۔ تم ڈاکٹر ہو۔ دو ہزار روپے مہینہ پاتے ہو۔ اسمارٹ ہو... اور ــــ"

"بس بس رہنے دو۔ بجو یہی بات تو میں تم سے کہتا ہوں۔ اماں کے بعد تم نے مجھے اُن سے زیادہ پیار دیا۔ کبھی ان کی کمی محسوس نہ ہونے دی لیکن آج اتنا بتادو کہ میں کب تک تمہارے کہنے پر چلتا رہوں۔ ذرا سوچو جن خوشیوں کو تم آنگن میں کھیلتا دیکھنا چاہتی ہو میں کیوں نہ چاہوں گا۔ لیکن تمہارا اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"بس ــــ شروع ہو گئیں میں یہ سب نہیں دیکھ سکتا۔" "بجو یہ سب کیا ہے؟"

اور ہمیشہ کی طرح راحیلہ کے رُخسار تر ہو گئے۔ وہ ڈیلیا کے سفید پھولوں کو دیکھتی رہی۔ تانبے کی طرح دہکتے رُخساروں سے ہوا کے جھونکے آ آکر ٹکرائے اور پھر آنسو خشک ہو گئے۔ باتیں۔ سوال، ناراضگی اسی طرح مہینے گذر گئے۔ پڑھنے کا شوق اور وہ بھی اتنا کہ بس...... ایم۔ اے انگریزی مکمل ہوا تو اس نے تنویر کے بار بار منع کرنے کے باوجود ریسرچ میں رجسٹریشن کروالیا۔

موضوع کوئی بھی ہو۔ ہیمنگوے۔ فراسٹ۔ شیکسپیئر یا کیٹس۔ پروفیسر سعید پڑھا کر چلے جاتے تھے۔ کلاس روم میں داخل ہو کر لکچر دیتے اور پھر اپنے کمرے میں واپس ــــ کمرے میں کوئی طالب علم کچھ پوچھنے جاتا تو بہت اختصار سے کام لیتے تھے اور پھر انہیں خود بھی انگریزی لٹریچر کا خبط تھا۔ عمر ۳۵ سال ہو چکی تھی لیکن شادی کے بارے میں کبھی سوچتے بھی نہ تھے۔ چھریرا جسم۔ سانولا رنگ۔ لمبا قد۔ دیکھنے میں اب بھی جاذب نظر اور دلکش تھے۔ کوئی لکچرار یا طالب ان کے بارے میں ان سے کچھ پوچھنا چاہتی تو ان کا مزاج جُداگانہ رہتا تھا۔ پروفیسر سعید راحیلہ کے سُپروائزر تھے۔ راحیلہ برابر ان کے کمرے میں آتی تھی لیکن چونکہ دونوں ایک ہی مزاج کے تھے اس لیے موضوع سے زیادہ بات نہ ہو پاتی تھی۔ کبھی کبھی پروفیسر سعید طالبات کو رنگ برنگ کے لباس میں ملبوس خوشبوؤں میں لپٹی ہوئی۔ چہروں پر شعاعیں مچلتی دیکھتے تو سوچنے پر مجبور ہو جاتے کہ آخر راحیلہ بھی تو ایک عورت ہی ہے۔ اور ایک دن ــــ

جب نوٹس لینے کے بعد راحیلہ ہمیشہ کی طرح خاموش ان کے کمرے سے نکل کر جا رہی تھی تو ان سے نہ رہا گیا۔

"ارے راحیلہ ایک بات سُننا۔"

"جی سر"! راحیلہ پروفیسر کی طرف دیکھ رہی تھی اور وہ کچھ کہنا چاہتے تھے۔

"یہ ساری جو تم نے پہن رکھی ہے... سُرمئی... ہاں سُرمئی.... یہ تو بڑے پھیکے رنگ کی ہے۔"

"تو"! راحیلہ نے سوالیہ نظروں سے ان کی جانب دیکھا۔

"تو کیا؟ یہ تمہیں پسند ہے۔ ٹھیک ہے لیکن رنگ تو اور بھی ہیں۔ میں سوچ رہا ہوں کہ تم اتنی خاموش رہتی ہو۔ سچ پوچھو تو میں نے آج تک تمہیں مُسکراتے ہوئے نہیں دیکھا۔ کیا بات ہے؟ میں تو خود کو ہی بہت ناموش طبیعت سمجھتا تھا لیکن تم کو دیکھ کر تو یہی کہنے کو جی چاہتا ہے کہ۔

ط سرسری ہم جہان سے گذرے

راحیلہ سیمینار کی دیوار سے لگی دم بخود کھڑی پروفیسر سعید کی باتیں سُن رہی تھی۔

"آپ کچھ اور کہنا چاہتے ہیں؟"

"بس یہی اور کیا؟"

راحیلہ رکشا کر کے گھر تو آ گئی۔ مگر اُسے راستے بھر پروفیسر کی باتیں کُریدتی رہیں۔ پروفیسر اس کے بھیا کے دوست تھے۔ لیکن گھر آنے کا اتفاق بہت کم ہی ہوا تھا۔ اکثر فون پر باتیں ہوا کرتی تھیں۔ ان کی پھیکی سی مُسکراہٹ۔ سوالیہ نظریں۔ ان سب چیزوں نے اسے نہ جانے کیا کیا سوچنے پر مجبور کر دیا اور اسے اپنے اسکول کا زمانہ یاد آ گیا......

Whose Woods are these I Think I Know

جب فراسٹ کی ان سطروں نے اس کے دل کو شاعری کی طرف آواز دی تھی۔

تنویر نے راحیلہ کے مستقل اصرار پر شادی کر لی۔ اب گھر میں بجائے دو کے تین آدمی تھے۔ تین سے چار اور پھر پانچ ــــ تنویر دو بچوں کا باپ بھی بن گیا۔ بڑے بڑے کمروں والا وسیع مکان جو ایک تنہا گنبد کے مانند نظر آتا تھا خوشیوں سے گونج اُٹھا۔

شبنمی چادر اوڑھے رنگ برنگے پھول...... ہنستے گاتے اور مُسکراتے پھول کھل اُٹھے۔ راحیلہ کی بھابی نے اُسے خوب پیار دیا۔ شاہینہ نے راحیلہ کا غم بانٹنا چاہا اور اسے ہر طرح سے خوش رکھنے کی کوشش کی لیکن شاہینہ کی پیار بھری نشستوں کا راحیلہ پر ذرا بھی اثر نہ ہوا۔ بکی اور سونو کے ساتھ راحیلہ کبھی کبھی خوب مُسکراتی۔ ہنستی اور گھنٹوں مُسکراتی رہتی ــــ

راحیلہ کو گلاب بہت پسند تھے۔ بکی روزانہ اسکول سے اس کے لیے رنگ برنگے خوبصورت مُکھڑے والے گلاب توڑ کر لاتا۔ پھول توڑنے کی وجہ سے اکثر اسے ڈانٹ بھی سُننا پڑتی تھی۔

"پھوپھی بی! آج تو بس مزا آ گیا مالی مجھے ڈانٹنے کو آ رہا تھا اور میں نے اُلٹا اس کو ڈانٹ دیا اور پھر پھول بھی توڑ لیے اور بھاگ بھی آیا۔" راحیلہ مُسکرا کر بکی کی جانب دیکھ رہی تھی۔

راحیلہ ــــ بکی اور سونو مل کر خوب باغبانی کرتے تھے۔ انار۔ پپیتا۔ چمیلی۔ رات کی رانی۔ بیلا۔ گلاب۔ گل مہندی سبھی کچھ تھا ان کے باغیچے میں۔

"بکی! تین بج رہے ہیں۔ بیٹے کھانا کھالو ــــ پھوپھی بی اگر شام تک نہ آئی تو شام تک بھوکے رہوگے کیا ــــ چلو ــــ ضد نہیں کرتے... بولو... شام تک بھوکے رہوگے؟"

"ہاں" بکی نے مُنہ بسورتے ہوئے شاہینہ کی طرف دیکھا۔

"میں جب تک پھوپھی کو گلاب نہ دے دوں گا کسی سے بات نہیں کروں گا۔"

سونو مزے لے لے کر کارن کھا رہی تھی اور شرارتی نظروں سے کبّی کی جانب دیکھ رہی تھی۔

"اُئے بلّے پوپی بی والے۔ ہم کو بالکل اچھی نہیں لگتی پوپی بی۔ ہم نہیں بولیں گے پوپی بی سے"۔

سونو ہنس ہنس کر کبّی کو چڑا رہی تھی۔

موسم پہلے کی طرح مانوس تھا۔ ہوا آنگن سے ہو کر گذر رہی تھی۔ چڑیاں چیں چیں کا گیت گا رہی تھیں۔ باغیچے میں صبا کا رقص اپنے شباب پر تھا اور راحیلہ اپنے کمرے میں لیٹی کیٹس کو پڑھ رہی تھی۔ سر میں ہلکا سا درد تھا۔ آنکھوں میں تھکن اور اس کے باوجود پڑھ رہی تھی۔ گلدان میں سجے ہوئے پھول سُوکھ چکے تھے۔ شاہینہ الہ آباد اپنے میکے دو ہفتے پہلے جا چکی تھی دو دن سے راحیلہ ڈیپارٹمنٹ میں نہیں گئی تھی تنویر کے کمرے میں بڑے زور سے فون کی بیل بج رہی تھی۔ کافی دیر کی ٹن ٹن سُننے کے بعد وہ اُٹھی۔ اور دوسرے کمرے میں جا کر ریسیور اٹھایا۔

"ہلو"

"دلس، سعید اسپیکنگ! راحیلہ کیسی ہے۔ دو دن سے ڈیپارٹمنٹ نہیں آئی ــــ تم تو ٹھیک ہو تنویر... میں آج آٹھ بجے آرہا ہوں"۔

پروفیسر سعید کو راحیلہ نے پہلی بار اتنی تیزی اور لاپرواہی سے بولتے سُنا تھا۔

عجیب سی بات ہے۔ یہ آدمی اتنی ہمدردی دکھا رہا ہے، کیوں دکھا رہا ہے اور وہ بھی مجھ جیسی لاپروا لڑکی سے .... نہیں... شاید..... یہ میرا اُستاد ہے... اسی لیے... شاید.... شام تک طرح طرح کی باتیں ــــ خیالات ــــ اور وسوسے ذہن کو گھیرے رہے۔ بڑے کمرے میں لگے گھنٹے نے آٹھ بج جانے کا اعلان کیا۔

اور ایک دو لمحوں کے بعد دروازے کی بیل بجی ــــ وہ اُٹھی اور دروازے تک آئی۔

"کون ہے؟"

"آداب!" پروفیسر سعید راحیلہ کی جانب دیکھ رہے تھے۔

"آداب!" ان کی حاضر دماغی پر راحیلہ مُسکرائی اور پھر دونوں مُسکراتے رہے۔

"ابھی ہو؟ بھئی دو تین دن سے سارا ڈیپارٹمنٹ خالی کر گئیں"۔

"جی سر میں ٹھیک ہوں۔ ذرا یہ بتائیے کہ فراسٹ کا نظریۂ زندگی جو ہے....."

"یہ سب کیا، چھوڑو بھی!"

"بھائی کہاں ہیں؟"

"پکچر گئیں ہیں"۔

"اور کبّی، سونو؟"

سو رہے ہیں۔

راحیلہ چائے اور نمکین لے کر کچن سے نکل رہی تھی۔

ہوا آنگن میں کھڑے انار کے پیڑ سے اسی طرح اٹھکھیلیاں کر رہی تھی جس طرح آٹھ سال پہلے لیکن آج ہوا میں نمی ہے اور ہوا پہلے سے زیادہ تیز ہے۔

"سر! اُداس رہنا ــــ سوچنا اور سوچتے رہنا میرا مشغلہ ہے کبھی کبھی تو میں اتنا سوچتی ہوں کہ بس!"

"کیا سوچتی ہو؟" پروفیسر سعید نے عینک ناک پر فٹ کرتے ہوئے پوچھا۔

"بہت کچھ ــــ کبھی کبھی یہ بھی سوچتی ہوں کہ آپ کے مجھ پر بہت احسانات ہیں.... میں اپنی زندگی میں ــــ میں اپنی آخری سانس تک آپ کو نہیں بھلا سکتی ــــ ایسا محسوس ہوتا کہ زندگی ــــ ......" وہ بڑے خشک لہجے میں کہہ رہی تھی اور کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔

"کئی دن سے میری طبیعت بھی پریشان تھی کل کلکتے سے appointment letter آیا ہے۔ پروفیسر اینڈ ہیڈ آف دی انگلش کے عہدے کا ــــ اپنے بارے میں بتانا بور لوگوں کا مشغلہ سمجھتا آیا ہوں لیکن آج کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ میرے والدین کلکتہ میں Settled ہیں، وہاں سے بھی خط آیا ہے۔ تیاریاں چل رہی ہیں ــــ دو مہینے بعد میری شادی ہو جائے گی۔ یہاں سے چلا جاؤں گا ــــ

اس لیے راحیلہ اب تم جلدی سے اپنا سُپروائزر بدل ڈالو میں چاہتا ہوں کہ تمہاری ریسرچ میں مزید تاخیر نہ ہو۔ اور کیا کہوں بس یہی عرض حال ہے۔ ویسے یقین رکھنا میرے دل میں تمہاری عزت ہے۔ اور میں تمہاری دل سے قدر کرنے لگا ہوں ــــ مگر کیا کروں ــــ زندگی تو ایک مسلسل کرب کا نام ہے۔ یہ زندگی بھی ایک عظیم سانحہ ہے ــــ وقت کس کے لیے ٹھہرتا ہے۔ وقت گذرتا ہے۔ وقت گذرتا رہا ہے اور گذر جائے گا۔ زندگی کی روشنی خالی.... لیکن شمع الفت کبھی نہیں گل ہوتی۔ اور زندگی تو یہی کیا... زندگی.....

پروفیسر ہمیشہ کے لیے چلا گیا۔

ہوائیں اسی طرح گا رہی ہیں جیسے پہلے۔ آنگن میں رقص جاری ہے۔ ہوا کی سنسناہٹ۔ پتّوں کی کھڑکھڑ خاموش دیواریں اور ساعت فسردہ ایک عجیب سماں ہے۔ شاہینہ الہ آباد ہے ــــ

پڑھتے پڑھتے نگاہیں باہر کے موسم کا جائزہ لیتی ہیں۔ اور اُسے خیال آتا ہے وقت کا ــــ ایک بج رہا ہے۔ بھیّا ابھی تک نہیں آیا ــــ بھیّا کتنا

مصروف رہتا ہے اب تو بات بھی کم ہی کرتا ہے۔ آج آئے گا تو پوچھوں گی —— نا ہیں کسی آنے والے پل کے تصور میں کھوئی کھوئی سی ہیں ——

"ناراض مت ہو بجّو! کوئی حکیم نہیں سرجن ہوں۔"

"ہاں تو اب رات کے ڈیڑھ بجے کون سا آپریشن کر رہے تھے؟"

"ہاں —— بجّو سچ مانو تو آپریشن کر رہا تھا۔"

"نہیں نہیں، [illegible] آپریشن اور اس وقت میں نہیں مان سکتی ——"

"اب یہ سب کچھ بتانا پڑے گا۔ تو سنو —— ایک مریض جس کو Duodenal Ulcer تھا ایک ماہ سے میرے زیرِ علاج تھا —— اب کیا بتاؤں کہ وہ کتنا شریف انسان تھا۔ امید تھی کہ اس کا Ulcer جلد Heal ہو جائے گا لیکن آج —— ابھی تھوڑی دیر پہلے —— ڈاکٹر مُرلی دھر کے زیرِ نگرانی اس کی Gastroscopy میں General Anaesthesia ہوئی تو چل بسا۔"

"اب بولو! اور کیا بتاؤں؟"

موسم اتنا اُداس ہے جتنا پہلے کبھی نہیں تھا۔ تنویر اپنے Expired patient کے بارے میں بتا کر اپنے کمرے میں جا چکا ہے۔ آنگن کی ہوا نوحے گا رہی ہے۔

The Sweet air pours in through the
Windows of My wounds. I breatheagain
I have o, life I sought in my self.... o, life.

کچے انار پانی نہ پڑنے کے سبب سوکھ چکے ہیں۔ لیکن پتیاں ہری ہیں۔ نگاہیں مستقل کسی کو ڈھونڈ رہی ہیں۔ صبا بار بار چند قدم چلتی ہے اور پھر لوٹ جاتی ہے —— سوکھے پتے اڑ رہے ہیں اور موسم بالکل پہلے کی طرح اُداس ہے۔ پہلے تو صرف کلیاں ہی جھڑتی تھیں لیکن اس بار خزاں کے آثار اور طرح کے ہیں، خیالوں کے ورق زرد پڑ چکے ہیں اور رات کالی ہے —— رات ڈھل رہی ہے۔ پہلے کی طرح —— آہستہ آہستہ ——

درختوں کی ہوا ہلکے ہلکے سُروں میں نوحہ کناں ہے —— آنگن میں ہنوز پتوں کا میلہ سا لگا ہوا ہے۔ برگِ گلاب پیلا ہے۔ رات ہی سے ہوا تیز ہے اور ہمیشہ کی طرح اداس بھی ہے۔ خالی کمرے چیخ رہے ہیں۔ کھڑکی کی نازک جالی سے گذر کر ہوا کمرے میں خاموش راحیلہ کے گالوں کو چھو رہی ہے۔ دریا رات بھر چڑھتا رہا ہے۔ دو موتی —— سچے موتی —— دو دو کر کے گر رہے ہیں۔ ہوا خاموش ہے پہلے کی طرح —— خوشبوئیں پر لگا کر اُڑ گئی ہیں۔ درختوں سے کوئی گا رہا ہے۔ اور ہوا ہمیشہ کی طرح گذر رہی ہے۔ گا رہی ہے —— کوئی گیت —— کوئی راگنی —— کوئی نغمہ —— کوئی نوحہ ——

بقیہ: ماں جی

میں لگا۔ لکھی تھی اور جس سے ان کا ذاتی گذارہ چل رہا تھا۔ کچھ وقت نے ساتھ دیا، کچھ حالات نے۔ دیپو جی کی کمپنی نے اپنے ملازموں کی بہبودی کے لیے مکان کے لیے قرضہ دینے کی ایک اسکیم بنائی اور ہمارا مکان بنانے کا پلان پروان چڑھنے لگا۔ قرضہ کی رقم کافی تو نہ تھی لیکن اپنے ذرائع کو کھینچ تان کر ضرورت نبھائی جا سکتی تھی۔

اور اب پھر ماں جی تھیں کہ مدد کے لیے کمر کسے تیار بیٹھی تھیں۔ دراصل ماں جی کی آمد کا مقصد میں نے بھانپ لیا تھا!

یہ کون سا جذبہ تھا جو ماں جی کو چین نہیں لینے دیتا تھا! شادی سے لے کر آج تک میں نے جب بھی پلٹ کر دیکھا تو ماں جی کو ہمیشہ اپنی مدد کے لیے بیقرار پایا۔ میں اس بارے میں اکثر سوچتی۔ اور آج اچانک مجھے اپنے بچپن کا ایک منظر یاد آگیا۔ جہاں کہیں ماں جی ہوتیں، میں اکثر دبے پاؤں پیچھے جا کر ان کی آنکھیں بند کر دیتی اور وہ پکار اٹھتیں۔ "نمی بھانی ہے!" مجھے اس میں بہت مزا آتا۔ ایک دن میں اسی غرض سے دبے پاؤں ان کے کمرے میں گئی۔ ٹرنک کھلا تھا اور وہ اس میں سے کوئی تصویر نکال کر دیکھ رہی تھیں۔ میں نے پیچھے سے جھانکا۔ وہ تصویر ایک نوجوان کی تھی، نہایت ہی بانکا، سجیلا مسکراتا چہرہ!

میں نے آنکھوں پر ہاتھ رکھنے کے بجائے پوچھا تھا "ماں جی یہ کس کی تصویر ہے!"

وہ گھبرا سی گئی تھیں۔ میں نے انھیں زندگی میں پہلی بار گھبراتے ہوتے دیکھا تھا۔

"بلّی ہے تو بلّی! کس طرح سے چھپ کر آتی ہے!" انھوں نے تصویر الٹ کر رکھ دی، ایک لمحہ کے لیے سوچا اور پھر انھوں نے میرے سامنے ہی تصویر کے پُرزے پُرزے کر کے کھڑکی سے باہر پھینک دیئے!

شاید یہ میرا وہم ہے شک۔ انھوں نے رخصتی کے وقت میری حق لینے اور منوانے کی شکتی کو سراہا تھا! شاید ماں جی کی اپنی زندگی میں کوئی ایسا موقعہ ضرور آیا ہوگا جب حق لینے اور منوانے کے لیے ان کے اپنے قدم ڈگمگا گئے ہوں گے۔ ان کے ذہن میں یہ خدشہ ہے کہ کہیں ہماری شادی کی کامیابی کی دیوار پیسہ کی کمی کی وجہ سے دھڑام سے نیچے نہ آن گرے۔ اسی لیے وہ ہمیشہ پیسہ سے ہماری مدد کرنے کا جتن کرتی رہتی تھیں۔

شام کو جب ماں جی نے دیپو جی سے مکان کے لیے کچھ رقم دینے کی پیش کش کی تو دیپو جی معمول کی طرح اڑ گئے۔ ماں جی کا چہرہ پیلا پڑ گیا اور وہ روہانسی سی ہو کر رہ گئیں۔

میں نے دخل اندازی کرتے ہوئے کہا: "دیپو جی! لے لو نا۔ ماں جی اتنے پیار سے دے رہی ہیں، ہم جلدی سے جلدی ان کا پیسہ واپس کر دیں گے۔"

اور دیپو جی میری طرف حیرانی سے دیکھنے لگے کہ میں اپنے گذشتہ فیصلے سے کیوں کر ہٹ گئی۔

میں انھیں کیسے بتا سکتی تھی کہ ماں جی میری زندگی کے ذریعے، اپنے ادھورے سپنوں کو کامیابی سے پورا ہوتے دیکھنا چاہ رہی تھیں!

حفیظ اللہ نیولپوری

سوریندر رہارک

اڑیا کی جدید شاعری میں
معروف و مقبول نام۔ بھدرک کالج
(اڑیسہ) میں شعبہ انگریزی کے ریڈر
ہیں۔ ۱۹۸۰ء میں اُڑیسہ ساہتیہ
اکیڈمی کی جانب سے ان کے مجموعۂ کلام
"ساما نیہ کتھن" پر ساہتیہ اکیڈمی
ایوارڈ عطا کیا گیا۔ سوریندر رہارک
کا مشاہدہ عوامی زندگی کے داخلی
کرب کو چھوتا ہوا استعارات کے
رنگ برنگ گل بوٹے تراشتا ہے۔

اڑیا شاعر۔ سوریندر رہارک

ہوٹل بوائے

مصنف: سوریندر رہارک
ترجمہ: حفیظ اللہ نیولپوری

میز صاف کرتے ہوئے وہ
دھوئیں اور گرد و غبار کی تہوں میں
نظر آ رہا تھا
کُہرے میں سوختہ آم کے بور کی طرح
چھ سات سال کی عُمر کا
ہوٹل بوائے
غبارے کی مانند پھُولا ہوا پیٹ لیے
پگھلتی ہوئی آئس کریم کی تہوں سے
نظر آتے ہوئے تنکے کی طرح
نحیف ہاتھ، پیر اور ہڈیوں کا ڈھانچہ
آنکھوں میں اس کی
بے خواب راتوں کی سیاہی کا کاجل
نرم و نازک ہونٹ اس کے
جیسے کسی مُردہ تتلی کے پر
لڑکپن کی شوخیاں
موت کی گود میں سوتی ہوئی

میز صاف کر رہا تھا وہ
نیند سے بوجھل آنکھیں اس کی
کسی کی گرم آغوش میں
بند ہونے کو تھیں بے قرار
لیکن
ہراساں ہرن کے بچّے کی طرح وہ
اپنے مالک کی خونخوار آنکھوں میں دیکھ رہا تھا
اور
اس کی نگاہوں کے شعلوں میں
کسی کی آنکھوں کی ٹھنڈک کا جویا
وہ جیسے
پُوجا کے کلس میں شرماتی ہوئی کونپل آم کی ٹہنی
ڈرائنگ روم میں سُوکھے ہوئے پھولوں کا دستہ
مظلوم و منتشر
چھ سات سال کی عمر کا
ہوٹل بوائے میز صاف کرتا ہوا

پرمیندر مترا

ترجمہ: ایس۔ اے۔ ایم۔ حیات
۴/۲ پیٹرس روڈ ہاؤسنگ کالونی
مدراس ۶۰۰۰۱۴

بُزدل

صبح کو کرونا چائے لیے میرے کمرے میں داخل ہوئی۔ جب میں نے کھانے کی چیزیں دیکھیں تو مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی۔

"تمہارے شہر کا موسم قبول تمہارا ہاضمہ بڑھا سکتا ہے لیکن میرے ہاضمہ کا نظام تو اس سے کوئی اثر نہیں کر سکا۔ حالانکہ مجھے یہاں آئے دو دن ہو گئے ہیں۔"

جواب میں کرونا مسکرا اٹھی — ایک زیرِ لب تبسم!

میز پر برتن رکھ کر وہ کمرے سے باہر جا رہی تھی۔ میں نے اُسے آواز دی —

"ان تکلفات کو تم بالائے طاق رکھ سکتی ہو۔ بمل بابو موجود ہوتے تو ایک بات تھی لیکن تم یہ سب کچھ —"

میرے جملے کو کاٹتے ہوئے کرونا نے کہا — "مجھے کہنے دو کہ میں یہ سب کچھ اُن کی طرف سے کر رہی ہوں۔ اب تو تم مطمئن ہو نا؟"

مجھ پر ایک دلکش مسکراہٹ پھینکتے ہوئے وہ کمرے سے باہر چلی گئی۔

میرے سامنے رکھی ہوئی چائے ٹھنڈی ہو رہی تھی اور میں اپنے خیالات میں ڈوبا جا رہا تھا۔

میں خود کو فریب دوں۔ اس سے کیا حاصل؟ حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے کرونا کا برتاؤ کچھ عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔ اُس سے مجھے جذباتی ہونے کی توقع تو نہ تھی لیکن یہ خیال برابر آ تا رہا کہ اس سے کچھ بھی بعید نہیں۔ کرونا کی غیر معمولی سادگی اور اُس کا فطری رویّہ مجھے اچھا لگنے لگا۔ یہ سب کچھ تو میرے اور کرونا کے درمیان ہے۔ کسی دیرینہ احساس اور میلان کے آثار کی طرح جیسے غروبِ آفتاب کے وقت کی چمک جو ہم میں سے کسی کے لیے نقصان دہ ثابت نہ ہوگی۔

اگر وہ اپنے حقیقی جذبات کو چھپاتے ہوئے مجھ سے بے توجہی برتتی یا سرد مہری سے کام لیتی تو میری اَنا کی تسکین ہو جاتی لیکن وہ جذباتی تھی اور نہ سرد مہر ہی۔ اس سے کچھ فرق بھی نہیں پڑ رہا تھا۔ یہ صرف میرا ہنگامی احساس ہی تو ہے۔ اس کے علاوہ میری یہ خواہش بھی نہ تھی کہ میں دوبارہ کرونا کی زندگی میں داخل ہوں۔ اس وسیع و عریض دنیا میں ہم اس طرح کھو چکے تھے کہ اتفاقی ملاقات کا گمان بھی نہیں تھا۔ لیکن جب یہ انہونی ہوتے ہوتے رہ گئی تو مجھے پتہ چلا کہ میرے دل میں ایک خواہش ابھی تک باقی ہے۔ حالانکہ میں کرونا کو بھلا چکا ہوں، وہ میری یاد کو ہمیشہ سینے سے لگائے جی رہی ہے۔ اس اندازِ فکر کے لیے میرے پاس معقول جواز بھی تھا۔ رنگین ماضی کی حسین یادوں کے گہرے نقوش کو اتنی آسانی کے ساتھ مٹایا نہیں جا سکتا — خاص طور پر اُس دوپہر کی یاد کو —

سارا دن شدید بارش ہوتی رہی۔ میں اپنے کمرے سے باہر نہ نکل سکا۔ دوپہر کو ہوٹل بوائے نے مجھے اطلاع دی کہ کوئی عورت مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔

"ایک عورت — اس ہوٹل میں — مجھ سے ملنا چاہتی ہے؟" میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔

کرونا آئی تھی — ہوٹل بوائے کے باہر جاتے ہی کرونا میرے بالکل قریب آ کھڑی ہوئی اور مجھ سے پوچھنے لگی۔

"مجھے یہاں دیکھ کر چونک پڑے؟"

"ہاں! لیکن تم تو بُری طرح بھیگ گئی ہو!"

میری آواز میں فکر کا پرتو عیاں تھا۔

وہ کرسی میں دھنس گئی۔

"کوئی بارش میں نکل پڑے تو بھیگ ہی جاتا ہے۔ تمہیں اس کے لیے فکر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اور ہاں! تم تو اس کمرے میں اکیلے ٹھہرے ہوتے ہو۔ میرے لیے عورتوں کا لباس کہاں پاؤ گے؟"

میں سوچنے لگا۔

"اوپر کمرہ نمبر دس میں ایک میاں بیوی رہتے ہیں۔" میں نے کہا

وہ ہنس پڑی۔ مُترنم ہنسی!

"تم اُن کے پاس سے ایک ساڑی اور ایک بلاؤز مانگنے سے تو رہے۔ انہیں کہو گے کیا؟" — ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے اُس نے نہایت سنجیدگی سے کہا —

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مجھے سردی نہ معلوم ہوگی۔"

اُس کی بغل میں بیٹھ جانے کے سوا میرے لیے کوئی چارہ نہ تھا۔

"میرے یہاں آنے کا مقصد —"

میرے پوچھنے سے پہلے وہ خود بولنے لگی۔

میں بے چینی سے اس کی بات پوری ہونے کا منتظر رہا۔

اس کے خیالات جیسے منتشر ہو چکے تھے۔ وہ یکایک ٹوٹ پڑی۔ اب تک وہ بہت مشکل سے اپنے آپ پر قابو رکھے ہوئے تھی۔

اب وہ میرے سینے سے آلگی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"وہ لوگ مجھے زبردستی پٹنہ لیے جا رہے ہیں۔ کل ماماجی کا خط آیا تھا۔"

میں صورتِ حال سمجھ گیا، مگر تلخ سچائی کا سامنا نہ کرنے کے خیال سے بات کی باریکی کو نہ سمجھنے کی اداکاری کی۔

"تمہارے کالج کی چھٹیاں شروع ہو رہی ہیں شاید!"

"تم سمجھتے کیوں نہیں" وہ پریشان لہجہ میں بولنے لگی۔ "وہ لوگ کسی ذاتی مقصد کے تحت مجھے زبردستی لے جا رہے ہیں۔ مجھے یہاں واپس نہ لوٹنے دیں گے!"

میں نے اس کے سرد ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیے لیکن دلجوئی کا کوئی فقرہ میرے مُنہ سے نہ نکل سکا۔ مجھے ملال ضرور تھا لیکن صرف جذبہ کی حد تک! میری محبت اتنی استوار نہ تھی کہ میں اُس کی اُس بے کسی میں اُس کا سہارا بن جاتا۔ میں اُس سے پیار ضرور کرتا تھا لیکن مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ تقدیر کے مقابل کھڑا ہو جاتا۔

کرونا نے آنسوؤں سے اٹا چہرہ اُوپر اٹھایا اور روتی آواز میں کہنے لگی ——

"میں پٹنہ نہ جاؤں گی۔ میں کہتی ہوں میں پٹنہ نہ جاؤں گی! میں کیوں جاؤں؟"

یہ اس کا اٹل فیصلہ تھا۔

دل ہی دل میں میں یہ جانتا تھا کہ بغاوت کا انجام ناکامی اور بدنامی ہی ہونا ہے۔ میں کرونا کے اندازِ فکر اور طرزِ خیال سے متفق نہ تھا۔

"تم صرف سپنے بُننے لگی ہو" میں نے کرونا کی توجہ دوسری طرف مبذول کرنی چاہی —— "ہو سکتا ہے تم جو بات سوچ رہی ہو وہ نہ ہو۔ کوئی اور ہی بات ہو!"

وہ بے چین اور مضطرب ہو اُٹھی۔

"میں سب کچھ جانتی ہوں۔ وہ لوگ مجھے یہاں سے جبراً لے جا رہے ہیں۔ مجھے وہاں قیدی بن کر رہنا پسند نہیں۔ اُن کے خیال میں میرا تم سے دور چلے جانا میرے پیار کو بھلانے کا ایک ہی راستہ ہے۔ میں نے اُن سے کہا کہ میں کالج جا رہی ہوں۔ میں یہاں آکر تمہیں پریشان کرنا نہیں چاہتی تھی لیکن کیا کروں۔ تم نے میری موسی کے ہاں آنا جانا بند کر دیا ہے۔ اسی لیے یہاں چلی آئی۔ لیکن میں نہ جانا چاہوں تو یہ لوگ مجھے پٹنہ کیسے لے جا سکتے ہیں؟ کیا ہم اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتے؟" اس کا لہجہ مایوس کُن تھا۔

کرونا پٹنہ چلی گئی۔ جبراً یا کسی اور وجہ سے —— مجھے جاننے کا موقعہ نہ ملا۔ اس کے بعد ہم نہ مل سکے۔

کچھ دنوں کے بعد کرونا کی شادی کی خبر ملی، حالانکہ مجھے مدعو نہیں کیا گیا تھا۔ اس خبر کو میں نے محض خبر کی طرح نہیں تسکین بخش مژدہ کی طرح سُنا۔ لیکن سوچتا ہوں تو میری اس وقت کی کیفیت کا عالم ہی کچھ اور تھا —— میرے دن اور میری راتیں غم اور تاسف کی نذر ہو چکی تھیں۔ اس لیے نہیں کہ محبت میں ناکامی ہوئی، اس لیے کہ مجھے کرونا سے دلی ہمدردی تھی۔ شاید میرے جذبات میں انا کی تسکین کا امتزاج تھا لیکن اُس وقت مجھے اس کا احساس نہ ہوا تھا۔

وقت کے ساتھ ساتھ کرونا کی یاد دھندلی پڑنے لگی۔ لیکن میرے تحت الشعور میں ایک اُمید باقی تھی کہ حالات کا بدل جانا حیرت کی بات نہیں لیکن کرونا میرے پیار کو ہمیشہ اپنے سینے سے لگائے ہی جیئے گی۔ جب میری اس اُمید کو دھچکہ پہنچا تو میرا ردِ عمل عجیب تھا۔ اس ردِ عمل پر مجھے ندامت کا احساس بھی ہوا لیکن میں خود پر قابو نہ پا سکا تھا۔

جب وہ میرے کمرہ میں داخل ہوئی تو اسے میرے رویّہ میں ہلکی سی تبدیلی کا احساس ضرور ہوا ہوگا۔ میری پلیٹ کو دیکھتے ہوئے اُس نے پوچھا —— "کیوں، تم نے کھایا ہی نہیں؟"

"تکلّف کا جواب تکلّف ہی سے دینا چاہیے۔" میں نے کہا۔ "اگر میں کسی قحط زدہ انسان کی طرح سارا کھانا ہڑپ کر جاتا تو کتنی ناشائستہ حرکت ہوتی!"

"ارے چھوڑو بھی!" مجروح جذبات کے ساتھ کرونا نے کہا۔ "تم ابھی تک اُسی ایک بات کو بھولے نہیں ہو جو میں نے پہلے کہی تھی۔"

"یہ میری بہت سی کمزوریوں میں سے ایک کمزوری ہے۔" جذبات سے لبریز آواز میں میں نے کہا۔

وہ میز صاف کر رہی تھی۔ اِس لیے اُس کا چہرہ مجھ سے چھپا رہا لیکن جب وہ بولی تو اس کا اندازِ تسکین آمیز اور مُسرّت افزا تھا۔

"تو تم اپنی دوسری کمزوریوں پر قابو پا چکے ہو —— لیکن تم اب جا تو نہیں رہے ہو؟"

"ہاں جا رہا ہوں۔ دیکھنا ہے کہ موٹر کی مرمت ہو چکی ہے یا نہیں؟"

"تمہارے جانے سے کام جلد ختم نہ ہو جائے گا۔ میرے شوہر کہہ گئے ہیں کہ واپسی پر وہاں اتریں گے اور ضروری ہدایات چھوڑ آئیں گے۔ وہ تمہیں یہیں رہنے کو کہہ گئے ہیں۔ اب تھوڑی ہی دیر میں وہ آ جائیں گے۔"

"تو تم چاہتی ہو، تمہارے شوہر کے لوٹنے تک میں تم سے باتیں کرتا رہوں" میں نے غیر سنجیدگی سے کُھل کر پوچھا۔

"اگر تمہارا جی چاہے!" اُس کے لیے یہ خیال پُر مذاق تھا۔

"تم نے کتنی آسانی سے اپنے خیال کو معقول بنا کر پیش کیا ہے!"

"کیا یہ اتنی مشکل بات ہے؟" وہ متحیر ہو گئی اور خوش بھی۔

"تو تمہارا مطلب یہ نہیں تھا؟ میرے ساتھ اکیلی رہنے پر تمہیں خوف محسوس نہیں ہوتا؟ پتہ نہیں میں کیا کر بیٹھوں۔"

"تمہارا دماغ چل گیا ہے!" —— مجھ پر چوٹ کستے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکل گئی اور دروازے کے قریب ایک ثانیہ کے لیے رُک کر اُس نے کہا۔ "میں ابھی آئی۔ کہیں بھاگ نہ جانا!"

لیکن —— بہت دیر ہو گئی وہ نہ لوٹی —— میں کمرے میں بے چین اور مضطرب ٹہلنے لگا۔ جذبات جیسے یکایک اپنی پوری جولانی کے ساتھ مچل اٹھے ——

میں برہم ہوگیا۔ پتہ نہیں مجھے خود پر غصہ آرہا تھا یا کرونا پر — یا اپنی تقدیر پر — میں سوچتا ہی رہ گیا۔ ہم ایک دوسرے سے پھر کیوں ملیں۔ تقدیر کا یہ خطرناک مذاق ہی تو ہے۔

کچھ دنوں کے لیے میں باہر گیا ہوا تھا۔ اُس شہر سے گزرتے وقت میری کار اچانک خراب ہوگئی تھی۔ وہ شہر دیکھنے میں اچھا خاصا تھا۔ اگر میں جانتا کہ میری تقدیر میں کیا لکھا ہے تو میں کسی گھنے جنگل میں مصیبت میں گرفتار ہو جانے کو ترجیح دیتا۔

ایک اجنبی شہر — رات کا وقت! ریلوے ویٹنگ روم اور ڈاک بنگلہ سے لے کر معمولی سے معمولی ہوٹل تک میں گیا لیکن رات گذارنے کے لیے کہیں جگہ نہ ملی۔ مایوس ہوکر مجھے موٹر میکانک کی دوکان پر لوٹنا پڑا جہاں میں نے اپنی کار مرمت کے لیے چھوڑی تھی۔ وہاں بمل بابو سے ملاقات ہوگئی جو وہاں وقت گذارنے کے لیے آتے تھے۔ بمل بابو وہیں قریب ہی کسی کوئلے کی کان میں ملازم تھے۔ بنگالی تھے۔ اس لیے ایک بنگالی ساتھی کی مدد کے لیے آمادہ ہوگئے اور اصرار کے ساتھ اپنے گھر لے گئے۔ ان کا گھر شہر کے بالکل آخری حصے میں تھا۔

جب ہم بمل بابو کے مکان پر پہنچے تو وہاں سناٹا سا طاری تھا۔ بمل بابو نے دروازہ کھٹکھٹایا — "دیکھا تم نے یہ جان کر کہ میں آج گھر نہ لوٹوں گا سارے نوکر کہیں مزے اڑا رہے ہوں گے۔ حرام زادے!"

کچھ دیر کے بعد ایک عورت نے دروازہ کھولا۔ نیند کے خمار سے لبریز آواز میں بولی "میں تو گہری نیند سو گئی تھی۔ میں نے سوچا آج رات آپ نہ لوٹیں گے!"

"ایک نیک کام کرنے کا موقعہ ہاتھ آیا۔ اِس لیے مجھے آنا پڑا۔ ورنہ اِس نوجوان کو اس اجنبی شہر میں بہت پریشانی اُٹھانی پڑتی۔"

اُس عورت نے فوراً ساڑی کا پلّو اپنے سر پر ڈال لیا۔ مکان کے اندر داخل ہوتے وقت اُس کی نگاہیں مجھ پر پڑیں۔ وہ ایک لمحہ کے لیے رُک گئی۔ عورت کے اس غیر متوقع رویّہ کو اہمیت نہ دیتے ہوئے بمل بابو نے کہا — "دیکھو تم نوکروں کو آواز دو اور اُن سے کہنا کہ اِس مہمان کے لیے باہر کے کمرے میں بستر کا انتظام کریں۔ نوجوان کو یہاں اتنا آرام تو نہ ملے گا جتنا —"

"رہنے بھی دو!" کرونا نے بات کاٹتے ہوئے کہا — "ایک اجنبی جگہ پر گھر کی آسائشوں کی اُمید کیسے کی جا سکتی ہے۔"

بمل بابو نے پہلے تو میری طرف دیکھا اور پھر اپنی بیوی کی طرف دیکھ کر پوچھا — "کیا؟ کیا تم انہیں پہچانتی ہو؟"

"ہاں، کچھ کچھ —"

"حیرت کی بات ہے!"

"ایسی بھی کیا بات ہوتی۔ اگر یہ تمہارے شناسا نہیں ہیں تو کیا یہ ضروری ہے کہ میں بھی انہیں نہ پہچانوں؟ میں تمہارے ساتھ شادی سے پہلے بیس سال تک کسی کال کوٹھری میں بند نہیں پڑی تھی۔ ہماری شادی ہوئے تو صرف تین ہی سال ہوئے ہیں!"

بمل بابو نے زیرِ لب کہا "اچھا، اچھا — تو ان باتوں میں اُس بیچارے کو کیوں باہر سردی میں کھڑا رہنے دیں؟"

"تو میں ہی بلاوجہ جھگڑا کھڑا کر دیتی ہوں؟"

کرونا نے بناوٹی سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

میں نے سوچا اِس موڑ پر میری مداخلت ضروری ہے۔ میں نے کہا۔

"دیکھیے۔ میں ایک پیشہ ور تاجر ہوں اور میں کبھی نمونوں اور مثالوں سے دھوکہ نہیں کھاتا!"

مجھے کرونا کو دیکھے ایک طویل عرصہ گزر چکا تھا لیکن اُس کے برتاؤ اور اس کے انداز سے مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ کرونا کی گھریلو زندگی میں جذباتی ہم آہنگی اور ذہنی مطابقت نہیں ہے۔

دوسرے دن!

میں بہت دیر تک کرونا کے آنے کا منتظر رہا لیکن وہ نہ آئی اور جب میں باہر نکلا ہی چاہتا تھا وہ آ گئی۔ باہر جانے کے لیے کپڑے پہنے وہ میرے سامنے کھڑی تھی۔

"مجھے ذرا باہر جانا ہے۔ ساتھ چلنا پسند کرو گے؟" اُس نے پُوچھا۔

"لیکن — کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ جا کہاں رہی ہو؟"

"شاپنگ کے لیے!" وہ مُسکرا اُٹھی — شوخ و شنگ مُسکراہٹ!

"شاپنگ کے لیے!" میں حیرت و استعجاب میں ڈوب گیا۔

"ہاں، میں اکثر شاپنگ کے لیے جاتی ہوں۔ بے شک یہاں شاپنگ تو کیا ہوگی، لیکن میں جاتی ہوں — بیرونی ممالک کے سیّاح ہی یہاں آب و ہوا کی تبدیلی کے لیے آتے ہیں، میں اِس کی پروا نہیں کرتی۔ جب میرے شوہر گھر پر نہیں رہتے تو میں اپنے نوکر کے ساتھ نکل پڑتی ہوں اور شاپنگ کرتی ہوں!

"لیکن آج تو بمل بابو یہاں ہیں!"

"ارے، میں تو یہ بتانا ہی بھول گئی۔ کل تک وہ گھر پر تھے۔ آج کچھ ضروری کام سے باہر گئے ہوئے ہیں اور آج وہ گھر نہیں لوٹ سکتے —" وہ نہایت سادگی سے کہتی چلی گئی۔

میں سڑک کے درمیان کھڑا ہو گیا "تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟"

"پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ میں تمہارا خاص خیال رکھوں گی۔"

اُس کی جھپکتی ہوئی آنکھوں میں شوخ چمک تھرک اُٹھی۔

"ویسے تو کوئی بات نہیں۔ لیکن جس بات کا مجھے اندیشہ ہے وہ یہ ہے کہ..."

"تم اپنے اندیشے سنبھالو، لیکن میں تو چلی!"

ویران اور غیر آباد سڑک پر چپ چاپ میں کرونا کے ساتھ چلتا رہا۔ بالآخر میں پُوچھا — "لیکن آج رات وہ گھر لوٹ آئیں گے نا؟"

"نہیں۔ انہیں چند دِنوں کے لیے وہیں رُکنا پڑے گا!"

ایک وقفہ — ایک خاموشی — ایک سکوت!!

ہم چپ چاپ ایک دوسرے کے شانہ بہ شانہ چلتے رہے۔

وہ میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگی۔

میں پریشان سا ہو چلا تھا۔

"آخر سُنوں بھی تم کیا سوچ رہے ہو؟" کرونا اسی طرح تبسم ریز تھی۔

"مجھے آج واپس لوٹنا ہے۔"

"لیکن تمہاری کار تیار نہ ہوئی ہوگی۔"

"ٹرین سے چلا جاؤں گا۔ کار بعد میں منگوا لوں گا۔"

"تم بہت جلدی میں ہو۔ کس بات کا ڈر ہے تمہیں؟"

"میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں۔ مجھے اپنے آپ سے ڈر ہے۔ مجھے خود پر اعتماد نہیں!"

وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔

"بہت اچھی بات ہے۔ لیکن کسی اور کو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

اس جملے نے میرے جذبات میں ہیجان برپا کر دیا — ضبط کا یارا نہ رہا — میں نے بڑھ کر اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"میں ڈر رہا ہوں کہیں کسی کی حق تلفی نہ ہو جائے —"

کرونا نے میرے ہاتھ کی گرفت سے اپنے ہاتھ کو آزاد کرانے کی ذرا بھی کوشش نہ کی۔ لیکن اُس کے تیکھے انداز نے میرے جذبات پر منوں برف رکھ دی۔

"ایسا ہو ہی نہیں سکتا!" کرونا نے کہا — "میں آج تک خود پر بھروسہ کرتی آئی ہوں۔" میں نے اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"لیکن کرونا — خود پر اتنا بھروسہ اچھا نہیں۔ اس دن تمہارا بھروسہ، تمہارا یقین پاش پاش ہو جائے گا جس دن ایک موج تمہیں اپنے لنگر سے اُکھیڑ کر اپنی رو میں بہا لے جائے گی۔"

"یہ میں کیسے جان سکتی ہوں جب تک کوئی مجھے آزما نہ لے۔"

کرونا کی مُسکراہٹ ایک پہیلی سے کم نہ تھی۔

پتہ نہیں کہ کرونا کے اس سوال کا میرے پاس کیا جواب ہوتا، اگر سڑک پر لوگوں کی ریل پیل نہ ہوتی — بقیہ راستہ میں خاموش ہی رہا۔

جب میں کھانا کھا رہا تھا اور کرونا میرے پاس بیٹھی تھی تو وہ مجھے ایک بالکل جداگانہ شخصیت سی محسوس ہوئی۔ اُسی وقت وہ نہا کر آئی تھی اور اس کے گیلے بال اُس کی پشت پر بکھرے لہرا رہے تھے۔ وہ سُرخ حاشیہ دار سفید ساڑی میں ملبوس کوئی طلسماتی شہزادی معلوم ہو رہی تھی جب وہ اپنے سر پر پلّو ڈالے میرے پاس بیٹھی رہی تو میں اُس کی حیرت انگیز خوبصورتی اور دلکشی سے مسحور ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

"یوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کیا دیکھ رہے ہو؟" پنکھا جھلتے ہوئے عشوہ طراز ادا سے وہ پوچھنے لگی۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تم مجھے پہلی بار دیکھ رہے ہو!"

"ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔" میں سحر زدہ سا بولا۔

وہ عجیب انداز سے مسکرا اٹھی۔ عشوہ طراز مسکراہٹ!

"میری شاپنگ کا مطلب تم نے کیا سمجھا؟" — شرارت انگیز ہنسی کے درمیان کرونا نے سوال کیا۔

"میں یہی سوچ رہا تھا کہ میں نے تمہیں ابھی ابھی دریافت کیا ہے۔"

"تو یہ بات ہے! کیوں بیچارے کولمبس کو اس کے واجبی دعویٰ سے محروم کر رہے ہو؟"

"ہو سکتا ہے اس سے پہلے بھی کوئی دعوے دار رہا ہو؟"

"کیا کوئی دستاویز ہے جس سے تمہاری یہ بات ثابت ہو سکے؟"

اپنے مذاق پر وہ خود ہنس پڑی۔ نقرئی ہنسی! جس کی لرزش نے فضا میں ارتعاش پیدا کر دیا۔

میں چپ چاپ کھانا کھا رہا تھا۔ کچھ وقفہ کے بعد میں نے کہا: "بعض لوگ دستاویزات کی اتنی قدر نہیں کرتے کیونکہ انہیں جلا دیا جا سکتا ہے۔"

میری یہ بات کرونا کو اچھی نہ لگی۔ اُس نے مجھے ایک عجیب انداز سے دیکھا اور وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی — "تمہارے لیے مٹھائی لے آتی ہوں۔"

مٹھائی خانساماں لے آیا۔ اور وہ نہ آئی۔

میرے کھانا ختم کرنے کے بعد وہ پان سپاری لے آئی اور اُس نے پوچھا۔ "تو تم شام کی گاڑی سے جا رہے ہو؟"

"اگر تم چاہتی ہو —" میں نے جواب دیا۔

"میں تمہیں یہاں سے جانے کے لیے مجبور تو نہیں کر رہی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ تم یہیں رہو۔ ایک تم ہو جو جانے کے لیے ہر دم بے چین ہو۔"

اس بار وہ بات کی تلخی کو چھپا نہ سکی۔

"میں تمہیں الزام نہیں دے رہا ہوں۔" میں نے پُر لطف انداز میں کہا۔ "مجھے جانا ہی چاہیے!"

اُلجھن اور پریشانی کے درمیان کرونا نے اپنے چہرے پر مسکراہٹ بکھیرنے کی ناکام کوشش کی۔

"میں جانتی ہوں کہ یہ جگہ تمہیں پسند نہیں ہے۔ لیکن ساڑھے چھ بجے سے پہلے دوسری کوئی ٹرین بھی تو نہیں ہے۔"

یہ ایک غیر ضروری بات تھی۔ کیونکہ اس نے خود میرا سامان سفر تیار کروایا تھا۔ کار منگوائی تھی۔ اور ورکشاپ کو دوپہر ہی سے کہلوا بھیجا تھا۔ حالانکہ ریلوے اسٹیشن صرف چند منٹ کے فاصلے پر تھا۔ اس نے مجھے ایک گھنٹہ پہلے ہی بھجوا دیا تھا۔ اس وقت تک وہ اتنی مصروف تھی کہ ہم کو ایک دوسرے سے بات کرنے کا موقعہ ہی نہ ملا۔

جب میں گھوڑا گاڑی میں سوار ہوا تو کرونا میرے بالکل قریب آ کھڑی ہوئی۔

"تم سوچ رہے ہوگے کہ تمہیں جاتے دیکھ کر مجھے خوشی ہوگی!"

"یہی میرے لیے ایک دلاسا ہے۔"

"اگر تم اتنی آسانی سے بہل جا سکتے ہو تو زندگی میں تم کوئی بھی چیز حاصل کرنے کی توقع نہیں کر سکتے!"

گاڑی کے پہیّوں کی آواز میں کرونا کی ہنسی ڈوب گئی۔

اس کہانی کا موثر اختتام ہوتا لیکن درحقیقت کہانی اس موڑ پر ختم نہیں ہوئی۔ اسٹیشن پہنچنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ گاڑی آنے میں کافی دیر ہے۔ سامان ویٹنگ روم میں رکھ کر میں اِدھر اُدھر چکّر کاٹنے لگا۔ بک اسٹال پر کھڑے ہو کر کچھ خریدنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ میری بغل میں کسی کی موجودگی نے مجھے چونکا دیا۔

"کرونا تم!! — تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

"میں ابھی ابھی آئی ہوں!" وہ مسکرائی — ایک درد بھری مُسکراہٹ!

پلیٹ فارم کی مدھم روشنی میں کرونا زرد اور ناتواں نظر آ رہی تھی۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم یہاں کیوں آئی ہو؟" میں نے بک اسٹال سے پیچھے ہٹ کر پوچھا۔

پہلے تو وہ ہنس پڑی پھر سنجیدہ ہو کر اُس نے کہا۔ "میں نے اپنے دستاویزات جلا دیئے ہیں!"

ایک وقفہ تک کرونا کے اس جملے کا مفہوم میں نہ سمجھ سکا۔

"تم جانتی ہو تم کیا کہہ رہی ہو؟" میں نے جذبات میں آکر پوچھا۔

"کیا وہ اتنی بڑی حماقت ہے؟ پانی کا ایک تند اور تیز دھارا جس سے لنگر اکھڑ جاتے — ہو سکتا ہے میں اس کی رو میں بہنے لگی ہوں۔"

وہ میرے بالکل قریب آگئی۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگی اور بولی

"کیا تم مجھے یہاں سے کہیں دور نہیں لے جا سکتے؟ کہو نا؟ کیا تم مجھے نہیں لے جا سکتے؟"

"کون؟ — میں!! — تمہیں بھگا لے جاؤں!" پریشانی کے عالم میں میرے منہ سے بے ربط الفاظ نکل رہے تھے۔

"جہاں تمہارا جی چاہے مجھے لے چلو!"

میں جھاگ کی طرح ابلنے لگا۔ میرے خون میں بجلیاں سی بھر گئیں اور الفاظ نے میرا یارا چھوڑ دیا۔

"میں جانتی ہوں۔ اس میں تمہاری بدنامی ہوگی۔ افواہیں پھیلیں گی۔" کرونا کہے جا رہی تھی — "لیکن میں ہر بات کے لیے تیار ہوں!"

وہ حسرت سے میرے جواب کی منتظر تھی۔

میں کیا کہہ سکتا تھا۔ میں پاگل تھا جو اُس کے جذبات کو مشتعل کرتا رہا۔ میں نے ہی اُس کے جذبات کے بند میں دراڑیں پیدا کی تھیں اور اب میں اس تند اور تیز دھارے کو کیسے روک سکتا ہوں جو اُس بند کو توڑ کر بہہ نکلا ہے۔

"کرونا! مناسب یہی ہے کہ تم اپنے فیصلے پر پھر غور کرو۔ جلد بازی اچھی نہیں۔ کیا تم میں اتنی ہمت ہے کہ تمہارے اِس اقدام سے جو طوفان اٹھ کھڑا ہوگا اس کا مقابلہ کر سکو؟ ہو سکتا ہے ہم اس طوفان کا مقابلہ کرتے کرتے تھک جائیں اور ایک دوسرے سے نفرت کرنے لگیں!"

وہ پلکیں جھپکائے بغیر مجھے گھورتی رہی۔

اُس کے چہرے پر کئی تاثرات نمودار ہوئے — پھر!!

طنز سے معمور مسکراہٹ اس کے خمیدہ ہونٹوں پر ابھر آئی۔

"تمہارے گرانقدر مشورہ کا شکریہ!" کرونا نے کہا — "تم اگر وقت پر مجھے ٹوکتے تو لنگر کبھی کا اکھڑ گیا ہوتا!"

وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔

حیرت زدہ میں اُسے تکتا رہ گیا۔

کیا وہ مجھے نیچا دکھانے کے لیے اپنی اداکاری کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

"لو گھنٹی بج گئی! اب کوئی دم میں تمہاری ٹرین آنے والی ہے۔ میری ٹرین کسی بھی وقت آسکتی ہے!"

"تمہاری ٹرین؟"

"میری موسی کلکتہ سے آرہی ہیں۔ ان کے پاس ہمارے گھر کا پتہ نہیں ہے میرے شوہر باہر گئے ہوتے ہیں۔ میں انہیں لینے آئی ہوں۔ کیا تمہیں اپنی نا کا احساس ہے؟"

میں جواب دیئے بغیر چُپ چاپ اپنے پلیٹ فارم کی طرف چل پڑا۔

جب میں نے اُسے آخری بار دیکھا تو کرونا بک اسٹال کے کاونٹر پر جھکی ہوئی

"کیا وہ سچ مچ اپنی موسی کو لینے آئی ہے؟"

اِس حقیقت کا پتہ مجھے کبھی نہ چلے گا۔

اب میں سوچتا ہوں —

ہم دونوں میں بزدل کون ہے —؟

پہیلیاں

پانچ سو سے زیادہ پہیلیوں کا مجموعہ، جن سے بچے اور بڑے یکساں طور پر لطف اٹھا سکتے ہیں۔ کتابت عمدہ۔ طباعت دیدہ زیب۔ قیمت صرف: آٹھ روپے

کون جیتا کون ہارا

بچوں کے لیے آسان زبان میں لکھی ہوئی دس دلچسپ کہانیاں۔ کتاب شروع کرنے کے بعد ایک ہی نشست میں ختم کرنے کو جی چاہتا ہے۔ قیمت صرف نو روپے

تشنہ بلگرامی

۱۳۲ جعفر آباد ۔ لین نمبر ۷
دلی ۔ ۱۱۰۰۵۳

میرے سوال کا یادوں سے کیا جواب ملے
ملے جو اہلِ خرد بھی تو محوِ خواب ملے

یہ رنگ و بو تو فریبِ نظر کے جلوے ہیں
مری نگاہ کا دھوکا تھا جو سراب ملے

تلاشِ حق میں کبھی اس مقام تک پہنچا
کہ گردِ راہ میں دیکھا تو آفتاب ملے

قسم خدا کی نہ جاؤں گا سوئے میخانہ
تری نگاہ سے مجھ کو اگر شراب ملے

نہ جانے کرنے لگے مجھ سے اب وہ کیوں پردہ
ملے ہیں پہلے وہ جب بھی تو بے حجاب ملے

تمہارے شہر میں آئے تھے سیر کرنے کو
تمہارے شہر میں مجھکو بہت عذاب ملے

ہمارے حال پہ ان کی نوازشیں دیکھو
سمندروں کی ضرورت ہو اور حباب ملے

سنا تھا میں نے کہ باغ و بہار میں تشنہ
ہجومِ یاس کا اک بت بنے جناب ملے

اقبال ماہر

۲۲۴ نخاس کہنہ الہ آباد

معمورۂ جذبات میں ہلچل سی مچی ہے
یادوں کی ہوا آج بہت تیز چلی ہے

دل سے تو کوئی بات بھی لب تک نہیں آئی
کیا کیا نہ ترے شہر میں افواہ اڑی ہے

اب سبزہ و گل اس کے کنارے نہیں اُگتے
خوابوں کی سبک گام ندی سوکھ گئی ہے

پھر صحبتِ اربابِ وفا کب ہو میسر
چلنے دو محبت کی اگر بات چلی ہے

اک شاہدِ معصوم کی تصویر ابھی تک
احساس کے اجڑے ہوئے کمرے میں سجی ہے

اڑتی ہوئی شبنم کو بچاتا نہیں کوئی
چڑھتے ہوئے سورج کی طرف آنکھ لگی ہے

محبوب تمہیں نغمۂ زنجیرِ قدامت
مرغوب مجھے سنگِ روایت شکنی ہے

اک معبدِ تعظیم یہ دہلیز ہے ماہر
پندارِ محبت بھی یہاں بے ادبی ہے

آفاق فاخری

جلال پور ضلع فیض آباد

ہر ایک فرد سے کرتا تھا وہ تناؤ کی بات
کبھی پسند نہ آئی اسے لگاؤ کی بات

وہ ان کی بزمِ مسرت یہ میری محفلِ غم
وہاں ہے ذکر گلوں کا یہاں ہے گھاؤ کی بات

تمام رات جلا خواب کی چتا میں بدن
کسی نے چھیڑ دی جب شام سے الاؤ کی بات

سمندروں کا تلاطم ہے کیا؟ نہ سمجھیں گے
کریں گے ریت کے صحرا میں لوگ ناؤ کی بات

نہ جانے کون سا تھا راز بات کون سی تھی
کبھی وہ کر نہ سکا دو گھڑی لگاؤ کی بات

ہو کوئی مدرسہ مسجد کہ خانقاہ کوئی
جہاں بھی جاؤ ملے گی وہاں تناؤ کی بات

چلے تھے ہاتھ میں لیکر جو کانچ کے ٹکڑے
وہ آج کرتے ہیں ہیروں کے تیز بھاؤ کی بات

میوارام گپتا
B/3 30 انڈین ائیر لائنز کالونی
کالینا۔ بمبئی ۴۰۰۰۲۹

شہیدِ وطن ــ جتندرناتھ داس

جتندرناتھ داس

ہندوستان کی آزادی میں ان شہیدوں کے خون کی سرخی بھی شامل ہے جنھوں نے نہایت بے خوفی کے ساتھ اپنی جانیں قربان کر دیں۔ جتندرناتھ داس کی قربانی کی اہمیت اس لیے بڑھ جاتی ہے کہ وہ بھوک ہڑتال کی وجہ سے ۶۳ دنوں تک موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا رہے۔ لیکن اپنے اصولوں کی قربانی گوارا نہ کی۔ اور ۱۳ ستمبر ۱۹۳۰ء کو لاہور جیل میں اپنے وطن پر قربان ہو گئے۔

دل فدا کرتے ہیں قربان جگر کرتے ہیں
پاس جو کچھ ہے وہ ماتا کی نذر کرتے ہیں

جتندرناتھ داس ۱۹۰۴ء میں کلکتہ میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد کا نام بنکم بہاری داس تھا۔ ۱۹۲۰ء میں جتن نے انٹرنس کا امتحان دیا اور عدم تشدد کی تحریک میں شامل ہو گئے۔ اس سے پہلے وہ کالج کی تعلیم ترک کر چکے تھے۔ کانگریس میں کام کرتے ہوئے انھوں نے سیلاب زدگان کی مدد کی وہ پہلے صرف چار دن کے لیے گرفتار کیے گئے تھے۔ دوبارہ وہ ۱۹۲۱ء میں گرفتار ہوئے۔ اب کی بار ان کو ایک ماہ کی سزا ہو گئی۔ چھوٹنے کے بعد پھر انھوں نے کانگریس کا کام کیا اور وہ پھر گرفتار کر لیے گئے۔ اب کی بار داس کو تین ماہ کی سخت سزا دی گئی۔ ۱۹۲۲ء میں چوری چورا کے واقعہ کے بعد جب گاندھی جی نے اپنی آزادی کی تحریک بند کر دی تو داس بہت اداس ہو گئے۔ انھوں نے اپنا نام کالج میں لکھا لیا۔ وہ کلکتہ کی انقلابی پارٹی میں شریک ہو گئے۔ نوجوانوں کو انقلاب کی تعلیم دینے لگے۔ داس اب خوش تھے کیونکہ انھیں کام کرنے کا ایک وسیع حلقہ مل گیا تھا اور ایسی جماعت مل گئی تھی جس کا عزم مکمل آزادی تھا اور جس کی تحریک اسوقت تک بند نہیں ہو سکتی تھی جب تک ملک پوری طرح آزاد نہ ہو جائے۔ جتن کا تعلق کاکوری کیس کے نوجوانوں سے بھی تھا۔ کاکوری کیس کے شہید سری راجندر ناتھ لاہری ان کے دوست تھے۔ کاکوری سازش کیس میں، ۷ نومبر ۱۹۲۵ کو وہ بھی گرفتار ہوئے تھے۔

جتندرناتھ کی شناخت کے لیے کاکوری سازش کیس کے مُخبر بنارسی اور اندو بھوشن مترا کو شاہ جہاں پور سے کلکتہ لے جایا گیا تھا ان کو پہچانتے نہیں تھے اس لیے وہ انھیں شناخت نہیں کر سکے۔ لہٰذا کاکوری کیس میں ماخوذ نہ کیا جا سکا۔

انگریز سرکار جب داس کو کاکوری کیس میں نہ پھانس سکی تو اس کلکتہ آرڈی نینس کے تحت گرفتار کر لیا۔ داس کو کلکتہ کی کئی ج رکھا گیا اور ان پر طرح طرح کی سختیاں بھی کی گئی۔ ایک بار جب وہ ڈ میں بند تھے تو جیل کے سپرنٹنڈنٹ کے ساتھ ان کا جھگڑا ہو گیا جھگڑ چیت تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ نوبت ہاتھا پائی تک پہنچ گئی۔ نتیج یہ ہوا کہ جتن داس کی خوب پٹائی ہوئی۔ اس پر داس نے بھوک کر دی۔ اب تو جیل کے باہر تک بات جا پہنچی۔ لکھا پڑھی شروع ہ یہ نکلا کہ خود سپرنٹنڈنٹ جیل کو داس سے معافی مانگنی پڑی۔ اور داس معاف بھی کر دیا۔ ان کی یہ بھوک ہڑتال ۲۳ دنوں تک چلی تھی۔ بالآ ۱۹۲۶ء کو انھیں رہا کر دیا گیا۔ یہ ان کی چوتھی رہائی تھی۔

جتن داس جیل سے چھوٹ کر بھی خاموش نہیں بیٹھے انھو کا دورہ کیا اور بہت سے مشہور انقلابیوں سے رابطہ قائم کیا جن مشہ سے انھوں نے ملاقاتیں کیں ان میں تھے سردار بھگت سنگھ۔ سکھ بٹوکیشور دت۔ کندن لال۔ وجے کمار سنگھ۔ جے دیو کپور اور چ آزاد ــ اس وقت چندر شیکھر آزاد ہی انقلابی فوج کے سالار ــ میں انقلابی تحریک اپنے پورے شباب پر تھی۔ ۱۹ دسمبر ۱۹۲۷ء کو کیس کے چار نوجوانوں (پنڈت رام پرشاد بسمل۔ ٹھاکر روشن سن راجندر ناتھ لاہری اور جناب اشفاق اللہ خاں) کو پھانسی ہو گئی شہادت نے آگ پر گھی کا کام کیا۔

بجائے اس کے کہ نوجوانوں کا جوش کم ہوتا وہ اور زیادہ پھر انقلابی نوجوانوں نے بڑے بڑے خطرناک کام انجام دیئے ۱۹۲۹ء سے لاہور میں لاہور سازش کیس سردار بھگت سنگھ ا ساتھیوں پر شروع ہوا۔ اس کیس میں ملک بھر سے درجنوں انقا

کو گرفتار کر کے لاہور لایا گیا تھا۔ بہتوں کو ثبوت کی کمی کی وجہ سے چھوڑ دیا گیا اور جنھیں پولیس کسی بھی طرح کیس میں شامل کر سکتی تھی ان پر مقدمہ چلا اور سانڈرس کے قتل کے جرم میں بھگت سنگھ، سکھدیو اور راج گرو کو پھانسی تو باقی کو طویل سزائیں دی گئیں۔ اسی کیس کے سلسلے میں جناب جتندر ناتھ داس کو ۱۴ جون ۱۹۲۹ء کو گرفتار کیا گیا اور ان پر بھی سانڈرس کے قتل کا مقدمہ چلا۔ ایک خاص عدالت کے سامنے۔ ۱۰ جولائی ۱۹۲۹ء سے مقدمہ کی سماعت شروع ہوئی۔ اس کا آخری فیصلہ ۷ اکتوبر ۱۹۳۰ء کو سنایا گیا تھا۔

جب لاہور سازش کیس شروع ہوا اس سے پہلے سے ہی بھگت سنگھ اور بٹوکیشور دت بھوک ہڑتال کر رہے تھے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ سازش کیس کے انقلابی نوجوانوں کو سیاسی قیدی سمجھا جائے۔ ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے اور ان کو اچھا کھانا دیا جائے۔ اس کے علاوہ ان کو لکھنے پڑھنے کا سامان دیا جائے۔ رشتہ داروں سے ملاقات کرنے کی رعایت دی جائے اور ان لوگوں کو چوروں یا ڈاکوؤں کے ساتھ نہ رکھا جائے۔ سرکار ان دیش بھگتوں کی جائز مانگوں کو بھی ہمیشہ ٹھکراتی رہی، مجبوراً سب نے بھوک ہڑتال کر دی تھی۔ ویسے ۱۳ جولائی ۱۹۲۹ء سے بھگت سنگھ کے دوسرے ساتھیوں نے بھی بھوک ہڑتال شروع کر رکھی تھی اس لیے جب داس گرفتار ہو کر لاہور پہنچے تو وہ بھی اس میں شامل ہو گئے۔

ان کی یہ بھوک ہڑتال صرف اپنے لیے چند مراعات حاصل کرنے تک ہی محدود نہیں تھی۔ ان کی یہ مانگیں تو ان سب انقلابیوں کے لیے بھی تھیں جو ملک کی مختلف جیلوں میں بند تھے اور آیندہ آنیوالوں کے لیے بھی تھیں ان کی خاص مانگ یہی تھی کہ انقلابیوں کو بھی سیاسی قیدی سمجھا جائے اور انھیں بھی جیل میں وہی سہولتیں یا مراعات حاصل ہوں جو دوسرے سیاسی قیدیوں کو دی جاتی ہیں۔ سرکار اس کے لیے تیار نہ تھی۔ سرکار بعد میں جھکی بھی لیکن تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔

بھوک ہڑتال کرنے والوں کو جبراً کھانا کھلایا جاتا تھا۔ سرکار کا انھیں زندہ رکھنے کا یہ طریقہ بڑا وحشیانہ تھا۔ ہر ہڑتالی انقلابی کو سات آٹھ آدمی زمین پر گرا دیتے۔ اس کے سر، ہاتھ، پیر دبا لیے جاتے اور ربڑ کی نلی اس کی ناک میں ڈال دی جاتی۔ نلی کے ذریعے زبردستی دودھ ان کے پیٹ میں اتار دیا جاتا۔ اس سے ان لوگوں کو بہت تکلیف ہوتی تھی۔ سانس کی وجہ سے کئی بار یہ لوگ بے ہوش تک ہو گئے تھے۔

جولائی کے تیسرے ہفتے میں کانپور کے مشہور لیڈر شری گنیش شنکر ودیارتھی لاہور گئے۔ ان لوگوں سے ملے اور ان کو اپنی بھوک ہڑتال چھوڑ دینے کا مشورہ دیا لیکن انھیں کامیابی نہ ملی۔ پنڈت جواہر لال نہرو بھی ان لوگوں سے ملے انھوں نے کہا، "شری جتندر ناتھ داس کی حالت ایک دم خراب ہو گئی ہے۔ وہ بہت کمزور ہو گئے ہیں۔ وہ خود کروٹ تک نہیں لے سکتے ہیں۔ وہ بہت دھیرے بولتے ہیں۔ وہ روز آہستہ آہستہ موت کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ مجھے ان غیر معمولی بہادروں کو دیکھ کر دلی صدمہ پہنچا ہے۔ انھوں نے تو اپنی جان کی بازی ہی لگا دی ہے۔ وہ سیاسی قیدیوں کو سیاسی مراعات دلانا چاہتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی یہ قربانی ضرور رنگ لائیگی"۔ سرکار بھی برابر بیانات شائع کر رہی تھی مگر سارے کاغذ پر ہی تھے۔ ادھر جتن کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی جا رہی تھی۔

اگست کے دوسرے ہفتے میں سرکار نے پنجاب جیل کمیٹی بنائی ۲۱ اگست کو جیل جانچ کمیٹی کی طرف سے خود داس کے صدر ہڑتالیوں سے ملے اور کہا کہ آپ کی شکایتیں دور کر دی جائیں گی۔ آپ بھوک ہڑتال ختم کر دیں۔ اس کمیٹی کی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۲ ستمبر ۱۹۲۰ء کو جتن کے سوا سب ملزمان نے بھوک ہڑتال ختم کر دی۔

داس کے لیے جیل کمیٹی نے سفارش کی کہ ان کی نہایت کمزور حالت کو دیکھتے ہوئے سرکار انھیں رہا کر دے۔ ستمبر مہینے کے شروع سے ہی ڈاکٹر یہ کہنے لگے تھے کہ جتن کے بچنے کی امید اب بہت کم ہے۔ ان کے جسم کا ہر عضو بے جان ہو چکا تھا۔ ایسی حالت میں بھی داس نے ضمانت پر چھوٹنے سے انکار کر دیا۔ سرکار انھیں صرف ضمانت پر ہی چھوڑنا چاہتی تھی۔ داس کے کسی رشتہ دار نے ان کی ضمانت نہیں دی۔ خود ان کے والد ان کے ضمانت پر چھوٹنے کے خلاف تھے۔ اب سرکار نے ہی اپنی طرف سے دو ضمانتی تیار کیے اور داس کو ضمانت پر چھوڑ دیا گیا۔ لیکن داس نے ضمانت پر چھوٹنے سے بالکل انکار کر دیا۔ ضمانت کے کسی کاغذ پر دستخط نہیں کیے۔

سرکار نے بیان جاری کیا کہ داس تو بنا شرط رہا ہونا چاہتے ہیں۔ لیکن عام پبلک کو سرکار کی سبھی چالوں کا پتہ تھا۔ شیدائی وطن داس کا اب آخری وقت آ پہنچا تھا۔ ۱۳ ستمبر ۱۹۳۰ء کو داس کی بھوک ہڑتال کا ۶۳ واں دن تھا۔ اس دن کے ایک بجے انھوں نے اپنی جان جاں آفریں کے سپرد کر دی۔ ان کی لاش کو کلکتے لے جایا گیا۔ جہاں ایک بے پناہ ہجوم نے انھیں اپنا خراج عقیدت پیش کیا۔

آج آزاد ہندوستان میں ہمیں ان تمام لوگوں کی قربانیاں یاد رکھنی چاہئیں جنھوں نے اپنی جان کی آخری بازی لگا دی زندہ باد جتن داس!

کرشن بلدیو شرما
ای۔ ۶۸۔ساکیت کالونی۔نئی دہلی ۱۱۰۰۱۷

پنڈت رام پرشاد بسمل

لوگ اس عالم فانی میں آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں کیوں کہ ؂
موت سے کس کو رستگاری ہے؟

لیکن با عمل اقوام کی زندگی میں کچھ ہستیاں ایسی پیدا ہوتی ہیں جو خود آگے بڑھ کر موت کے ہاتھ چومتی ہیں اور جب ان کی زندگی کا افسانہ سمٹ جاتا ہے تو وہ اپنے پیچھے ایسے نقش پا چھوڑ جاتی ہیں جنھیں مشعل راہ بنا کر ان کی قوم آگے بڑھتی ہے۔ پنڈت رام پرشاد بسمل ہندوستان کے ایک ایسے ہی مایۂ ناز سپوت تھے۔ انھوں نے آزادی کی جنگ لڑتے ہوئے صرف تیس سال کی عمر میں جام شہادت نوش کیا اور اس طرح زمانے کی لوح پر لکھ دیا کہ جب تک جانیں اور جوانیاں نہ لٹائی جائیں، کوئی محکوم قوم عروس آزادی سے ہمکنار ہونے کی تمنا نہیں کر سکتی ؂

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے

رام پرشاد بسمل کی مختصر سی زندگی پر مولانا ابوالکلام آزاد کے اس قول کا پوری طرح اطلاق ہوتا ہے کہ "جب لوگ کامجوئیوں اور خوش وقتیوں کے پھول چن رہے تھے اس وقت ہمارے حصے میں تمناؤں اور حسرتوں کے کانٹے آئے۔ انھوں نے پھول چن لیے اور کانٹے چھوڑ دیے۔ ہم نے کانٹے چن لیے اور پھول چھوڑ دیے۔" بسمل شاہجہاں پور کے ایک معمولی برہمن خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ اسکول کے زمانے ہی سے ان کی زندگی میں قومی رنگ ابھرنے لگا تھا۔ اور پھر حصول آزادی کی جدوجہد میں انھوں نے عنفوان شباب میں اپنے لیے تشدد کا پُرخار راستہ منتخب کیا۔ وہ دہشت پسندوں میں شامل ہو کر انقلابی پارٹی کے رکن بن گئے۔

ان انقلاب پسندوں کے پاس سر پر کفن باندھ کر کام کرنے والے نوجوان تو تھے مگر ہتھیار خریدنے کے لیے روپیہ نہ تھا۔ چنانچہ ۶ریا ۷ر اگست ۱۹۲۵ء کو ایک خفیہ بیٹھک بسمل کے مکان پر بلائی گئی جس میں رام پرشاد کے علاوہ ان کے اسکول کے ساتھی اور دوست اشفاق اللہ وارثی حسرت، من متھ راے گپت، راجندر ناتھ لاہری، سچندر ناتھ بخ[illegible] مکند لال گپت، بنواری لال سریواستو، چندر شیکھر آزاد، اور کاشی نا[illegible] وایک دو اور ممبران نے شرکت کی۔ اس بیٹھک میں طے ہوا کہ اخراجا[illegible] پورے کرنے کے لیے ریل کا خزانہ لوٹا جائے جسے ریل گاڑی میں ر[illegible] اور پھر اتارتے ہوئے بسمل دیکھ چکے تھے۔ خیال تھا کہ اس طرح روپیہ بھ[illegible] ل جائے گا اور انقلابی تحریک کی مشتہری بھی ہو جائے گی۔ نیز انگریز خو[illegible] ہو گا۔

چنانچہ ممبران کو مختلف کام بانٹ دیے گئے۔ ۹ر اگست کو دس[illegible] نوجوان شاہجہاں پور سے لکھنؤ جانے والی مسافر گاڑی پر سوار ہوئے۔ بخ[illegible] لاہری اور اشفاق اللہ سکینڈ کلاس کے ڈبے میں اور ان کے باقی ساتھی تھ[illegible] کلاس کے دو تین ڈبوں میں جا بیٹھے۔ کاکوری کے قریب سیکنڈ کلاس ڈبے سے زنجیر کھینچ کر گاڑی روک لی گئی اور گارڈ اور انگریز ڈرائیور اوندھے منہ لیٹ جانے پر مجبور کر دیا گیا۔ دو آدمیوں نے بریک وین سے لوہے کا صندوق نیچے گرا کر اسے توڑنا شروع کر دیا۔ دو نوجوان ا[illegible] کی حفاظت پر مامور تھے، باقی گاڑی کے دونوں طرف کھڑے ہو کر تھ[illegible] تھوڑی دیر کے بعد ہوا میں گولیاں چلاتے رہے۔ مسافروں سے کہہ دیا گیا تھا کہ انھیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا لہٰذا وہ اپنی جگہ بیٹھے رہ[illegible] صرف ایک صاحب اپنے ڈبے سے اتر کر غالباً زنانہ ڈبے کی طرف جا ر[illegible] تھے۔ انھیں گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔

لوہے کا صندوق اشفاق اللہ جیسے تنومند جوان کے ہتھوڑوں [illegible] ضربیں کب تک برداشت کرتا۔ جلد ہی اسے توڑ کر روپوں کے تھیلے [illegible] لیے گئے اور ان نوجوانوں نے اپنی راہ لی۔ تھیلوں میں سے کوئی دس ہ[illegible] روپے نکلے۔

اس واردات سے ایوان حکومت میں کھلبلی مچ گئی۔ کاکوری ریل[illegible] اسٹیشن پولیس کا گڑھ بن گیا۔ تفتیش شروع ہوئی تو بسمل کے دو کمزور

ساتھی گھبرا گئے۔ پولیس کو ایک چادر سے جو جائے وقوعہ پر رہ گئی تھی، سراغ مل گیا اور شاہجہاں پور کے ایک بڑھئی بنارسی لال اور گورنمنٹ ہائی اسکول کے ایک طالب علم اندو بھوشن متر نے پولیس کو سب کچھ بتا دیا۔ جس کی بنا پر گرفتاریاں شروع ہو گئیں۔

دیکھا جو تیر کھا کے کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

یہ دونوں بسمل کے بھروسے کے آدمی تھے اور بسمل اپنی ڈاک انھیں کے ذریعے بھیجا کرتے تھے۔ بعد ازاں دونوں سرکاری گواہ بن گئے۔ جلد ہی بسمل، اشفاق اللہ اور ان کے ساتھی پکڑے گئے۔ ان پر لکھنؤ میں مقدمہ چلایا گیا۔ عدالت ایک سنیما گھر میں قائم کی گئی تھی۔ ملزموں کو جیل سے عدالت میں لاتے وقت ہر روز بیڑیاں پہنائی جاتیں اور پھر واپس جیل پہنچنے پر یہ بیڑیاں کاٹ دی جاتیں۔ ان حریت پرستوں نے یہ معمول بنا لیا تھا کہ سنیما گھر پہنچنے پر پہلے باہر کھڑے ہو کر یہ مشہور غزل گاتے جو عام طور سے رام پرشاد بسمل سے منسوب ہے لیکن اب یہ کہا جاتا ہے کہ یہ غزل بسمل عظیم آبادی کی ہے ؎

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

رہرو راہِ محبت رہ نہ جانا راہ میں
لذتِ صحرا نوردی دوریٔ منزل میں ہے

وقت آنے دے بتا دیں گے تجھے اے آسماں
ہم ابھی سے کیا بتائیں کیا ہمارے دل میں ہے

اے شہیدِ ملک و ملت! ہم تو ہیں تجھ پر نثار
اب تری ہمت کا چرچا غیر کی محفل میں ہے

آج مقتل میں یہ قاتل کہہ رہا ہے بار بار
اب بھلا شوقِ شہادت بھی کسی کے دل میں ہے

اب نہ اگلے ولولے ہیں اور نہ ارمانوں کی بھیڑ
ایک مٹ جانے کی حسرت اب دلِ بسمل میں ہے

جس روز (۱۶ را پریل ۱۹۲۷ء) کو ان فدائیانِ وطن کی قسمت کا فیصلہ سنایا جانا تھا اس روز وہ سب کے سب پولیس کے ٹوکنے کے باوجود یہی غزل گاتے ہوئے کمرۂ عدالت میں داخل ہوئے۔ اللہ اللہ، وہ بھی کیسا رونگٹے کھڑے کر دینے والا منظر ہوگا! جج ہیملٹن نے بسمل اور ان کے دو ساتھیوں، راجندر ناتھ لاہری اور ٹھاکر روشن سنگھ کو پھانسی کی سزا سنائی تو ان نوجوانوں کے ماتھے پر ذرا بھی شکن نہیں آئی حالانکہ ان کے لیے دنیا دیکھنا یہیں سے ختم ہو گیا تھا۔ باقی ملزموں کو عمر قید اور کالے پانی تک کی سزائیں سنائی گئیں۔ (اشفاق اللہ ذرا دیر سے پکڑے گئے تھے اس لیے ان پر علیحدہ مقدمہ چلایا گیا اور انھیں بھی پھانسی کا حکم سنایا گیا۔)

فوراً سزائے موت پانے والے تینوں ملزموں کو الگ الگ جیلوں میں بھیج دیا گیا۔ پنڈت رام پرشاد کے حصے میں گورکھپور کی جیل آئی۔ وہیں انھوں نے اپنی کتاب "کاکوری کے شہید" لکھی جو ان کے پھانسی پانے سے تین دن پہلے ختم ہوئی۔ جونہی اس کتاب کے چند ورق مکمل ہوتے وارڈروں سے مل کر باہر بھیج دیے جاتے۔ اب یہ کتاب نایاب ہے۔

معلوم ہوتا ہے پنڈت رام پرشاد کو اپنے جگری دوست اور ساتھی اشفاق اللہ وارثی کی سزائے موت کا بے حد افسوس تھا۔ بسمل کی طرح اشفاق اللہ بھی شعر و شاعری کے دلدادہ تھے۔ اور حسرت تخلص کرتے تھے۔

راجندر ناتھ لاہری کو ۱۷ ر دسمبر ۱۹۲۷ء کے دن گونڈہ جیل میں پھانسی دے دی گئی غالباً دو دن بعد یعنی ۱۹ ر دسمبر کو رام پرشاد بسمل، اشفاق اللہ وارثی حسرت اور ٹھاکر روشن سنگھ بالترتیب گورکھپور، فیض آباد اور الہ آباد کی جیلوں میں پھانسی کے تختوں پر ہنستے ہنستے جھول گئے۔ شاعر نے شاید انھیں کے لیے کہا تھا ؎

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

بسمل نے حب الوطنی کے نشے میں سرشار ہو کر ایک طویل نظم بھی لکھی تھی جو ابد ازاں " دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو" کے عنوان سے بہت مقبول ہوئی۔ سولہ بند کی وہ نظم درج ذیل ہے:

حیف! ہم جس پہ کہ تیار تھے مر جانے کو
یک بیک ہم سے چھڑایا اُسی کاشانے کو
آسماں کیا یہی باقی تھا غضب ڈھانے کو
لا کے غربت میں جو رکھا ہمیں ترسانے کو
کیا کوئی اور بہانہ نہ تھا ترسانے کو؟

پھر نہ گلشن میں ہمیں لائے گا صیاد کبھی
کیوں سنے گا وہ ہماری کوئی فریاد کبھی
یاد آئے گا کسے یہ دلِ ناشاد کبھی
ہم بھی اس باغ میں تھے قید سے آزاد کبھی
اب تو کاہے کو ملے گی یہ ہوا کھانے کو

دل فدا کرتے ہیں قربان جگر کرتے ہیں
پاس جو کچھ ہے وہ ماتا[1] کی نظر کرتے ہیں
خانہ ویران کہاں دیکھیے گھر کرتے ہیں
خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں
جا کے آباد کریں گے کسی ویرانے کو

---

[1] بھارت ماتا

دیکھئے، کب یہ اسیرانِ مصیبت چھوٹیں
مادرِ ہند کے اب بھاگ کھلیں یا پھوٹیں
دیش سیوک سبھی جب جیل میں مونجیں کوٹیں
ہم یہاں عیش سے دن رات بہاریں لوٹیں

کیوں نہ ترجیح دیں اس جینے پہ مرجانے کو

کوئی ماتا[1] کی امیدوں پہ نہ ڈالے پانی
زندگی بھر کو ہمیں بھیج کے کالے پانی
منہ میں جلاد ! ہوئے جاتے ہیں چھالے پانی
آبِ خنجر کا پلا ہم کو ، دعا لے ، پانی

بھرنے کیوں جائیں کہیں عمر کے پیمانے کو

ہم بھی آرام اٹھا سکتے تھے گھر پر رہ کر
ہم کو بھی پالا تھا ماں باپ نے دکھ سہہ سہہ کر
وقتِ رخصت انہیں اتنا بھی نہ آئے کہہ کر
گود میں آنسو جو ٹپکیں کبھی رخ سے بہہ کر

طفل ان کو ہی سمجھ لینا جی بہلانے کو

دیش سیوا کا ہی بہتا ہے لہو نس نس میں
اب تو کھا بیٹھے ہیں چتوڑ کے گڑھ کی قسمیں
سرفروشوں کی ادا ہوتی ہیں یوں ہی رسمیں
بھائی خنجر سے گلے ملتے ہیں سب آپس میں

بہنیں تیار چتاؤں پہ ہیں جل جانے کو

اپنی قسمت میں ازل ہی سے ستم رکھا تھا
رنج رکھا تھا، محن رکھا تھا، غم رکھا تھا
کس کی پرواہ تھی اور کس میں یہ دم رکھا تھا
ہم نے جب وادیٔ غربت میں قدم رکھا تھا

دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو

میکدہ کس کا ہے، یہ جام و سبو کس کا ہے
وار کس کا ہے مری جاں! یہ گلو کس کا ہے
جو بہے قوم کی خاطر وہ لہو کس کا ہے
آسماں صاف بتا دے تو عدو کس کا ہے

کیوں نئے رنگ بدلتا ہے یہ تڑپانے کو

دردمندوں سے مصیبت کی حلاوت پوچھو
مرنے والوں سے ذرا لطفِ شہادت پوچھو
چشمِ مشتاق سے کچھ دید کی حسرت پوچھو
کشتۂ ناز سے ٹھوکر کی قیامت پوچھو

سوز کہتے ہیں کسے پوچھ لو پروانے کو

اپنا کچھ غم نہیں لیکن یہ خیال آتا ہے
مادرِ ہند پہ کب تک یہ زوال آتا ہے
ہردیال[2] آتا ہے یورپ سے نہ لال[3] آتا ہے
قوم اپنی پہ تو رہ رہ کے ملال آتا ہے

منتظر رہتے ہیں ہم خاک میں مل جانے کو

نہ میسر ہوا راحت سے کبھی میل ہمیں
جان پر کھیل کے بھایا نہ کوئی کھیل ہمیں
ایک دن کو بھی نہ منظور ہوئی بیل ہمیں
یاد آئے گا بہت لکھنؤ کا جیل ہمیں

لوگ تو بھول ہی جائیں گے اس افسانے کو

نوجوانو ! جو طبیعت میں تمہاری کھٹکے
یاد کر لینا ہمیں بھی کبھی بھولے بھٹکے
خواہ اعضائے بدن ہو ویں جدا کٹ کٹ کے
اور صد چاک ہو جاتا ہو کلیجہ پھٹ کے

پر شکن آئے نہ ماتھے پہ قسم کھانے کو

بات تو تب ہے ہم اس بات کی ضد پہ ٹھانیں
دیش کے واسطے قربان کریں گے جانیں
لاکھ سمجھائے کوئی ایک نہ اس کی مانیں
کہتا ہے خون سے اپنا نہ گریباں سانیں

ناصحا آگ لگے اس ترے سمجھانے کو

اب تو ہم ڈال چکے اپنے گلے میں جھولی
ایک ہوتی ہے فقیروں کی ہمیشہ بولی
مست ہو پھاگ رچائے گی ہماری ٹولی
خوب بنگال میں کھیلے تھے کنھائی[4] ہولی

پوچھتا اب تو نہیں کوئی بھی برسانے[5] کو

نوجوانو ! یہی موقع ہے اٹھو، کھل کھیلو
سختیاں راہ میں جو آئیں خوشی سے جھیلو
مادرِ ہند کے صدقے میں جوانی دے لو
پھر ملیں گی نہ یہ ماتا کی دعائیں لے لو

دیکھیں کون آتا ہے اب حکم بجا لانے کو

---

[1] بھارت ماتا

---

[2] لالہ ہردیال ایم اے، مشہور انقلاب پسند
[3] لالہ لاجپت رائے
[4] کنھائی لال دت، بنگالی حریت پرست
[5] برسانہ، متھرا کے پاس ایک جگہ جہاں ہولی بڑی دھوم دھام سے منائی جاتی ہے

نئی کتابیں

موسمِ سنگ (نظمیں، غزلیں)

مصنّف: مضطر مجاز
ناشر: شگوفہ پبلیکیشنز، حیدرآباد
قیمت: ۱۵ روپے

"طلوعِ مشرق" اور "ارمغانِ حجاز" کے ناظم مترجم کی حیثیت سے معروف مضطر مجاز کی شاعری کا انتخاب "موسمِ سنگ" اپنے اندر ایسی شاعری کی بہت سی خصوصیات رکھتا ہے جسے قابلِ مطالعہ کہا جا سکے۔ ۱۸×۲۲/۸ سائز کے ۱۲۶ صفحات پر پھیلے ہوئے اس انتخاب میں ۵۸ء سے ۷۸ء کے درمیان تخلیق شدہ نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔

ابتدائی صفحات میں "عرض کیا ہے" کے تحت مضطر صاحب نے اپنی شعرگوئی کے متعلق یہ بیان دیا ہے کہ "شعرگوئی میرے تجربے میں شعور اور لاشعور کے اسود و بیض کے درمیان ایک جھٹپٹے کے سماں میں وقوع پذیر ہونے والا عمل ہے، یہ نری آمد ہے نہ تمام تر آورد۔ شعوری عمل سے طلسمِ سخن آرائی تو تعبیر کیا جا سکتا ہے لیکن وہ چیز جو پتھر کو بھی گداز کرے پیدا نہیں ہوتی، کلّی طور پر نیم شعوری عمل شعر کو چیستاں بنا دیتا ہے۔۔۔"۔ یہ بات اور کہ خود ان کے انتخاب میں لیسے بہت سے اشعار موجود ہیں جن میں وہ "شے" مفقود ہے جو "پتھر کو بھی گداز" کرے۔

مضطر صاحب کی شاعری میں جابجا "اقبالیت" کی گونج ملتی ہے، چند مثالیں ملاحظہ فرمایئے:

نماز، رُوح، فرازِ نظر، گدازِ جگر
نیازِ دیدۂ تر لا الٰہ الا اللہ
متاعِ فکر و نظر لا الٰہ الا اللہ
فروغِ شام و سحر لا الٰہ الا اللہ

ذرّہ سہی، سنبھال قلم آفتاب لکھ!
قطرے کی آنکھ کے لیے دریا کا خواب لکھ!

علاوہ ازیں ان کی شاعری میں مہذب طنز کی ایک زیریں لہر بھی موجود ہے جو نظم میں زیادہ اور غزل میں کم دکھائی دیتی ہے ("عرض کیا ہے" کے تحت لکھے گئے ابتدائی نثری صفحات سے ان کی تحریر میں موجود طنز و مزاح کے مہذب رنگ کا مزید ثبوت مہیا ہوتا ہے)

مثال کے لیے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

وہ روگ بانٹتے تھے خلائق میں نت نئے
اخبار لے کے دیکھا تو چرچا شفا کا تھا

ریڈیو سن کر بھی کوئی ماجرا کھلتا نہیں
ہے خبر اخبار میں بھی رنگ آمیزی کے ساتھ

مضطر صاحب کی شاعری بالغ اور پختہ شاعری کی مثال ہے مگر کہیں کہیں روایتی جدیدیت کا رنگ کھلتا ہے جو ان کے بنیادی شاعرانہ مزاج سے میل نہیں کھاتا۔ ذیل کے چند اشعار اسی قبیل کی مثال ہیں:

تیز تھا موڑ لیکن اس نے
مجھ کو پلٹ کر دیکھ لیا تھا

اچھی تو تھی کتاب مگر نیند آ گئی
پکچر تو تھی خراب مگر دل بہل گیا

مگر اس قسم کے "کلامِ موزوں" کی تعداد زیادہ نہیں ہے اور دیگر سب سے اچھے اشعار کے طفیل انھیں نظر انداز کیا جانا چاہیے۔

مجموعی طور پر "موسمِ سنگ" سنجیدہ شاعری کا کامیاب نمونہ ہے۔ کتاب اردو اکیڈمی کے جزوی تعاون سے چھپی ہے، کتابت اور طباعت کے لحاظ سے عُمدہ ہے کتابت کی غلطیاں بھی بہت کم ہیں، مگر ہیں مثلاً صفحہ ۴۳ پر "نذرِ غالب" والی غزل میں خارِ "زار" حیات کی جگہ خار "راز" ہو گیا ہے۔ قیمت بھی نامناسب نہیں ہے۔

(انجم عُثمانی)

فرشتے خاموش ہیں (افسانوی مجموعہ)

مصنّف: ویریندر پٹواری
ناشر: سیمانت پرکاشن، دہلی

ویریندر پٹواری کے افسانوں کے مجموعہ "فرشتے خاموش ہیں" میں چودہ افسانے شامل ہیں جو ۲۰×۳۰/۸ سائز کے ۱۴۲ صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ ابتدائی ۱۸ صفحات میں جناب پشکرناتھ کا پیش لفظ شامل ہے۔ جس میں اُنھوں نے پٹواری صاحب کے افسانوں کے سلسلے میں ان الفاظ میں اظہارِ خیال کیا ہے کہ:

"۔ ۔ ۔ تکنیک کے نئے تجربوں، تاثر کی وحدت، فلسفیانہ صداقت کی بدولت ویریندر پٹواری کے افسانے بے حد کامیاب ہیں۔ وہ تخیل سے بہت کم مدد لیتے ہیں۔ ۔ ۔ ان کے یہاں جدید افسانہ اور روایتی افسانہ کا ایک ایسا امتزاج پیدا ہو جاتا ہے کہ اپنی نسل کے افسانہ نگاروں میں ان کی حیثیت ایک نمائندہ افسانہ نگار کی ہوتی ہے (اور) ویریندر پٹواری کے فن کو کسی انداز سے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی لگن، ایمانداری اور نمک حلالی کا اندازہ ان کے افسانوں کو پڑھنے کے بعد ہوگا۔"

لیکن افسانوں کو پڑھنے کے بعد پشکر ناتھ صاحب کی رائے میں "رعایت" زیادہ اور "حقیقت" کم نظر آتی ہے۔ بیشتر افسانے سپاٹ انداز میں ایک نقطہ سے شروع ہو کر بغیر کسی الجھن یا اُتار چڑھاؤ کے طے شدہ منزل تک پہنچ کر ختم ہو جاتے ہیں اور چند افسانوں کے علاوہ وہ سب ہی افسانے بغیر کوئی خاص تاثر قایم کیے بخیر و خوبی تمام ہوتے ہیں۔ ان افسانوں کو "بے ضرر" تحریروں کی صف میں جگہ ملتی ہے جبکہ اسی مجموعہ میں شامل افسانوں "ماں" "وقت! وقت" اور "انتظار" کے سلسلے میں یہ بات نہیں کہی جاسکتی۔ "ماں" میں پٹواری نہ صرف کردار نگاری اور کردار کی نفسیاتی اُلجھن کو پیش کرنے میں کامیاب ہیں بلکہ اس تاثر اور تجسس کو بھی قایم رکھ پاتے ہیں جو اچھے افسانے کا خاصا ہے ایسے ہی جہاں "وقت! وقت" دو نسلوں کے درمیان ذہنی فاصلے (generation gap) کے ردِ عمل کا خوبصورت بیان ہے وہاں "انتظار" بھوک اور بھوک (جنس اور پیٹ) کے ٹکراؤ اور مجبوریوں کا پر تاثر اور فنکارانہ اظہار ہے۔

مجموعی طور پر پٹواری کے ان افسانوں میں فنکارانہ چنگاری کی جھلک تو مل جاتی ہے مگر تپ کر مزید جلا پانے کی بہت گنجائش بھی نظر آتی ہے اور پٹواری کے سلسلے میں ڈاکٹر حامدی کاشمیری کی اس رائے کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ "۔ ۔ ۔ پٹواری صاحب لکھنے کی فطری صلاحیتوں سے واقف ہیں، وہ گرد و پیش کے حالات پر نظر رکھتے ہیں اور ایسا کرتے ہوئے گہرے مشاہدے، دردمندی اور انسانی دوستی کا اظہار کرتے ہیں۔"

کتابت اور طباعت دونوں اوسط سے کم درجہ کی ہیں۔ کتابت کی غلطیوں سے شاید ہی کوئی صفحہ پاک ہو۔ کاغذ گلیزڈ استعمال ہوا ہے، ٹائیٹل خوبصورت ہے اور قیمت سولہ روپے۔

(انجم عثمانی)

بیان میرٹھی۔ حیات و شاعری

تصنیف: ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل
ناشر: محمد رفیع الدین، محمد علی روڈ، مومن پورہ، ناگپور ۱۸
سال اشاعت: ۱۹۸۰
قیمت: ۲۵ روپے
صفحات: ۲۴۶
سائز: ۱۸×۲۲
مجلد: سہ رنگا گرد پوش

"بیان میرٹھی۔ حیات و شاعری" ڈاکٹر شرف الدین ساحل کی تازہ تصنیف میں بیان کی زندگی، شخصیت اور ادبی خدمات پر روشنی ڈالنے کی کوشش ہے۔ مصنف نے ان کی شاعری پر محاسن و معائب کو مدِ نظر رکھتے ہوئے بحث، اور ہر صنف کا الگ الگ جائزہ لیا ہے۔

بیان میرٹھی کو اُردو شعر و ادب کی تاریخ میں وہ مقام حاصل نہیں ہوا جس کے وہ مستحق تھے۔ اس کی وجہ مصنف نے یوں بیان کی ہے:

۱۔ انھوں نے اپنی مخصوص ذہنی اور تصوراتی کیفیات کی وجہ سے ایک کال کوٹھری میں قید کر لیا تھا۔ مشکل سے کہیں باہر جاتے تھے۔ بس اسی کرہ میں رہ کر "طوطیِ ہند" اور "لسان الملک" کے لیے منظومات اور مضامین لکھتے تھے۔ جو کچھ لکھتے اس کا نہ تو انتخاب کرتے اور نہ ہی اس پر نظرِ ثانی بلکہ جوں کا توں کروا دیتے تھے۔ اس میں معیاری اور غیر معیاری دونوں طرح کی تخلیقات ہوتی۔ اس بے اعتدالی کی وجہ سے ان کی شاعرانہ عظمت کا مجروح ہونا ایک یقینی تھی۔

۲۔ بیان کی شخصیت میں خود ستائی کے عناصر ضرورت سے زیادہ، وہ اپنے آپ کو بہت بڑا استاد فن سمجھتے تھے۔ اپنے معاصرین میں سے کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔

۳۔ بیان کا نہ تو کوئی دیوان شایع ہوا اور نہ کسی نے آج تک ان کا کلام ہی شایع کیا اور جو چھوٹے چھوٹے کتابچے اپنی زندگی میں شایع کروائے کی رسائی میرٹھ سے باہر نہ ہو سکی۔

۴۔ بیان پر تحقیقی اور تنقیدی مضامین بہت کم لکھے گئے۔

بیان میرٹھی اور ان کے کلام سے ڈاکٹر شرف الدین ساحل ۱۹۶۹ء میں متعارف ہوئے اور انھوں نے بیان کے کلام اور ان کے تفصیلی حالات کی جستجو کی۔

بیان کے آبا و اجداد ضلع بلند شہر میں واقع سادات کی بستی جارچہ کے رہنے والے تھے۔ ان کا پورا نام سید محمد مرتضیٰ تھا۔ موصوف اُردو میں بیان اور فارسی میں یزدانی تخلص کرتے تھے۔

جب سرسید کی اصلاحی اور تعلیمی تحریک سرگرم عمل تھی بیان اپنے دَور سے گذر رہے تھے۔ انھوں نے پوری سرگرمی کے ساتھ اس تحریک کا ساتھ دیا۔ سرسید تحریک کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے بیان کے تاثر کی اہمیت سے انکار نہیں ہو سکتا۔ نوچندی کے جلسۂ عام میں سرسید احمد خاں کو دعوت دی۔ اس جلسہ میں بیان کی ایک نظم پڑھی گئی تھی جس کے چند اشعار یہ ہیں:

تا کجا اے دوستو! خوابِ گراں
آن پہنچا پیشوائے کارواں
چاہیے آنکھیں بچھائیں زیرِ پا
شانِ حق، آپ اور ہمارے میہماں

آپ کی تقریر کے اعجاز نے
ڈال دی ہے ہمّتِ مرداں میں جاں
پھر اٹھے مجلس سے گھانگِ جرس
آئے پھر کاغذ سے آوازِ بیاںؔ

بیاںؔ نے اپنے علمی ذوق کو صرف شاعری تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ انھوں نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز ۱۸۶۱ء میں میرٹھ سے جاری شدہ رسالہ "جلوۂ طور" کی ادارت سے کیا اس کے بعد انھوں نے ۱۸۸۱ء میں ایک ہفتہ وار "طوطیِ ہند" جاری کیا۔ اس میں خبروں کے علاوہ ادبی اور تنقیدی مضامین اور منظومات بھی شایع ہوا کرتی تھیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب "اودھ پنچ" اور اخبار "فتنہ" کے درمیان بیزدتند صحافتی جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ انھوں نے پہلے اخبار "فتنہ" کے خلاف مضامین کا سلسلہ شروع کیا اور پھر اودھ پنچ کے مقابلہ میں طوطیِ ہند میں "میرٹھ پنچ" کے عنوان سے ضمیمے کا اضافہ کیا۔ طوطیِ ہند اور میرٹھ پنچ کے پرچے نایاب ہونے کی وجہ سے مصنّف اس معرکہ آرائی کا نمونہ پیش کرنے سے قاصر رہا ہے پھر بھی اس نے امداد صابری کی کتاب سے طوطیِ ہند کے خلاف اودھ پنچ کے مضامین کے نمونے سے اقتباس پیش کیا ہے جس سے اس معرکہ آرائی کے معیار کا اندازہ ہوتا ہے۔

بیاںؔ کا انتقال ۱۳ مارچ ۱۹۰۰ء میں ہوا۔ انتقال کے وقت ان کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کا مسودہ ان کے ایک شاگرد پروفیسر گرامی کے قبضہ میں تھا۔ انھوں نے اصنافِ سخن کے لحاظ سے تین کتابیں: "عطر مجموعہ نعت"، "رنگِ شہادت" (مراثی اور سلام کا مجموعہ) اور "جواہر لاثانی" (نیچرل نظموں کا مجموعہ) شایع کروائی تھیں۔ حال ہی میں ڈاکٹر سیّد صفدر حسین نے پاکستان میں بیاںؔ کے کلام کے تین مجموعے "قندیلِ حرم"، "رنگِ شہادت" اور "نقشِ بیان" شایع کروائے ہیں۔

بیاںؔ ایک پُرگو شاعر تھے اور ان کے شاگردوں کا حلقہ خاصہ وسیع تھا۔ ان کے تلامذہ میں مولانا اکبر وارثی میرٹھی، مولانا ناطق گلاوٹھوی، منشی درگا سہائے سرور جہاں آبادی، انور میرٹھی وغیرہ نے کافی شہرت حاصل کی۔

پیشِ نظر کتاب فاطمی آرٹ پرنٹرس، مومن پورہ ناگپور میں شایع ہوئی ہے۔ آٹھویں صفحہ کے بعد آرٹ پیپر پر بیاںؔ میرٹھی کی ایک عکسی تصویر بھی شامل ہے۔ اس کتاب کا مقدمہ شریف احمد شریفؔ نے لکھا ہے جس میں ڈاکٹر شرف الدین ساحل کی تحقیقی دشواریوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ گرد پوش کی پُشت پر ڈاکٹر زرینہ ثانی کی رائے شامل ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اس کتاب کی تصنیف سے ڈاکٹر ساحل نے اُردو قارئین کے سامنے بیاںؔ میرٹھی جیسے پُرگو شاعر کی ان کے فن کی روشنی میں ایک ایسی تصویر پیش کی ہے جو ایک گراں قدر ادبی سرمایہ ہے اور اس کی افادیت مسلّم ہے۔ اُردو ادب کی تاریخ میں صفِ اوّل کے شعرا کے علاوہ صفِ دوم کے شعرا کی اہمیت یوں بھی ہوتی ہے کہ ایسے شعرا عہد کا اثر اختیار کرتے ہیں اور اپنے عہد کی فضا کو پیش کرتے ہیں۔ ان کی شاعری پورے دَور کی شاعری کا اشاریہ ہے جس سے اُردو ادب کی تاریخ کے بارے میں ہمارے تصوّرات کی تکمیل ہوتی ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب میں مصنّف نے بیاںؔ کی شاعری کا سیر حاصل تذکرہ کیا ہے اور الگ الگ ابواب میں غزل گوئی، نظم نگاری (نیچرل نظمیں۔ قومی نظمیں۔ اخلاقی نظمیں۔ عشقیہ نظمیں) نعتیہ شاعری۔ قصیدہ نگاری۔ مرثیہ نگاری۔ سلام۔ مثنوی نگاری۔ رُباعیات۔ قطعات۔ تضمینات۔ ساقی نامہ۔ سہرا اور فارسی کلام کا انتخاب پیش کیا ہے۔

بیاںؔ کی غزلوں کے جو نمونے پیش کیے گئے ہیں ان کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان کی بیشتر غزلیں ناسخؔ، آتشؔ، مومنؔ، اور غالبؔ کی زمینوں میں ہیں۔ انھوں نے اسلوب اور لہجہ کی تقلید کی ہے جس کی وجہ سے ان کا ذاتی رنگ قائم ہو نہیں پایا۔ صرف اسلوب ہی نہیں بلکہ ان کے کلام میں وہی الفاظ و تراکیب بھی پائے جاتے ہیں جنھیں آتشؔ و ناسخؔ، غالبؔ و مومنؔ اور داغؔ و امیرؔ نے اپنی غزلوں میں استعمال کیا ہے۔ اس قسم کی غزلوں میں اگرچہ رعایتِ لفظی، معانی آفرینی، مضمون آفرینی، معاملہ بندی اور صنعت گری کی فراوانی پائی جاتی ہے لیکن حسن و انداز کی تعریف و توصیف میں پاکیزگیِ خیال کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔ بیاںؔ کے زمانہ میں اُردو غزل میں داغؔ اور امیرؔ کا رنگِ سخن مقبول تھا۔ بیاںؔ نے دونوں کے جواب میں جو غزلیں کہی ہیں ان میں وہی رنگِ سخن جھلکتا ہے۔

کتاب کے آخر میں اغلاط نامہ درج ہے۔ فٹ نوٹ دیے گئے ہیں۔ کہیں کہیں حوالہ مکمل ہے اور کہیں کہیں نامکمل۔ کتابیات میں استفادہ کی گئی کتب کے حوالے نامکمل ہیں نہ ان کے ایڈیشن کا تذکرہ ہے نہ سنِ اشاعت کا اشارہ۔ تحقیقی کتاب ہونے کی وجہ سے یہ امر بہت ضروری تھا۔

مختصر یہ کہ "بیاںؔ میرٹھی۔ حیات و شاعری" کا مطالعہ کرنے کے بعد قاری اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ وہ ایک قادر الکلام اور پُرگو شاعر تھے، انھوں نے ہر صنفِ شاعری میں مشقِ سخن کی ہے لیکن یکساں کامیابی حاصل نہیں کر سکے۔ انھوں نے اپنی ۳۵ سالہ ادبی زندگی میں جس خلوص و محنت کے ساتھ شعر و ادب کی خدمت کی اور اپنی تخلیقات کا گراں قدر ذخیرہ اُردو دُنیا کے سپرد کیا اس کی فنی خوبیوں اور ادبی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ توقع ہے کہ یہ کتاب قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی اور شیشہ کی الماریوں میں محبوس ہونے کے بجائے علمی بصارت و بصیرت کو جلا دے گی۔

(حفیظ اللہ نیولپوری)

نور و نکہت (شعری مجموعہ)

مصنّف: قمر عثمانی
قیمت: ۵،۲۵ روپے
ناشر: قمر عثمانی۔ نزد جامع مسجد، دیوبند (یوپی)

نور و نکہت قمر عثمانی صاحب کا مجموعۂ کلام ہے۔ یہ شعری مجموعہ غزلوں اور نظموں

(بقیہ صفحہ ۱ پر)

مکتوبات

ظہیر علی صدیقی
بزریا ملا ظریف۔
رام پور

حکیم شفیق الرحمان — ایک تصحیح

ماہنامہ 'آج کل' (اردو) ماہ اگست ۱۹۷۹ء کے صفحہ ۳۶ پر ایک تحقیقی مضمون بعنوان 'حکیم شفیق الرحمٰن رامپوری' مصنف محمد حسین خان شایع ہوا ہے۔ اس میں فاضل مصنف نے تحریر کیا ہے:

"حکیم شفیق الرحمٰن صاحب رامپوری ریاست رامپور کے کوچہ لنگر خانہ میں رہتے تھے۔ ان کی والدہ کا انتقال ان کی شیر خواری کی عمر میں ہو گیا تھا جس کی وجہ سے انھوں نے والدۂ مولانا محمد علی و شوکت علی عرف بی اماں کا دودھ پی کر پرورش پائی۔"[1]

رضا لائبریری رام پور میں ایک قلمی نسخہ 'تذکرۂ شعرا' موجود ہے۔ اس کے مصنف حکیم شفیق الرحمٰن کے لڑکے عتیق الرحمٰن خاں کلیم رام پوری ہیں۔ انھوں نے اپنے والد کے حالاتِ زندگی مرتب کیے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"[حکیم شفیق الرحمٰن نے] ۱۵ ررمضان المبارک ۱۳۴۹ھ [۳ر فروری ۱۹۳۱ء] نو بجے شب کے تخمیناً ۷۵ سال کی عمر میں رحلت فرمائی۔ آپ راقم الحروف کے والد بزرگوار تھے۔"[2]

آئیے اب یہ دیکھیں کہ والدہ محمد علی و شوکت علی کی عمر شفیق الرحمٰن صاحب کی پیدایش کے وقت کیا تھی۔

[مندرجہ بالا تاریخ وفات کی رُو سے شفیق الرحمٰن کی تاریخ ولادت ۱۸۵۶ء ہے۔]

مولانا محمد علی نے روزنامہ 'ہمدرد' ۱۷ رجون ۱۹۲۷ء کو اپنے حالاتِ زندگی [میری زندگی کے پچاس سال] تحریر کیے ہیں۔ 'بی اماں' کے متعلق لکھتے ہیں:

"۱۷ ررمضان المبارک ۱۲۹۷ھ، ۱۸۸۰ء کو میرے والد نے بعارضہ ہیضہ، کوئی تیس بتیس سال کی عمر میں وفات پائی۔ میری والدہ مرحومہ کی عمر ۲۷ اٹھائیس سال کی تھی۔"[3]

حافظ احمد علی خاں شوق، جو مولانا کے حقیقی چچا زاد بھائی ہیں، انھوں نے بھی تذکرۂ کاملانِ رام پور، میں صفحہ ۳۸۵ پر مولانا کے والد کی تاریخ وفات ۱۸۸۰ء تحریر کی ہے۔

مذکورہ بالا حوالوں کی روشنی میں بی اماں کا سنہ ولادت ۱۸۵۲ء ہونا چاہیے۔ اور اس طرح ۱۸۵۶ء [سنہ ولادت شفیق الرحمٰن] میں وہ صرف چار سال کی بچی ہیں۔ اس لیے دودھ پلانے کا دعویٰ بے بنیاد ہے۔ اس کے علاوہ محمد علی نے خود نوشت سوانح 'مائی لائف اے فریگ مینٹ' یا میری زندگی کے پچاس سال' میں کہیں شفیق الرحمٰن کا کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے ہی نہیں۔ بی اماں کے خطوط، مولانا شوکت کی تحریروں یا مولانا ذوالفقار علی خاں [محمد علی کے بڑے بھائی] کے سوانحی مضامین میں ایسی کوئی روایت نہیں ملتی۔

حافظ احمد علی خاں شوق مصنف تذکرۂ کاملانِ رام پور نے بھی اس روایت کے بارے میں تحریر نہیں کیا ہے۔

فاضل مصنف محمد حسین خاں اسی مضمون میں تحریر کرتے ہیں "۱۸۹۰ء میں شفیق الرحمٰن صاحب نے معقولات اور ادب کی درجہ چہارم کی کتابیں پڑھ کر مدرسہ عالیہ میں۔۔۔۔۔ منشی امیر احمد صاحب مینائی کو امتحان دیا۔"[4]

۱۸۹۰ء میں شفیق الرحمٰن کی عمر ۳۴ برس کی تھی۔ ۳۴ برس کا شخص اس زمانے میں چوتھے درجہ کا طالب علم نہیں ہو سکتا۔

محمد حسین خاں نے تحریر فرمایا ہے:

"۱۸۸۸ء سے ایک کونسل آف ایجنسی ریاست رام پور میں قائم ہو گئی تھی جس کے سربراہ خاندان نجیب الدولہ کے چشم و چراغ جنرل اعظم الدین خاں تھے۔"

نواب حامد علی خاں (رام پور) کے لیے ۲۷ر فروری ۱۸۸۹ء کو بروز چہار شنبہ مسٹر نیل صاحب قائم مقام ایجنٹ لفٹننٹ گورنر بہادر حکومت انگلشیہ۔ تاجدار اور جانشین رام پور ہونے کا اعلان کیا۔ مسند نشینی کے وقت نواب صاحب کا سن چودہ برس کا تھا۔ اس لیے ریاست کی کونسل انتظامیہ کو کونسل آف ایجنسی کا لقب دیا گیا تھا۔ اس لیے یہ کہنا درست نہیں کہ کونسل ایجنسی کا قیام ۱۸۸۸ء میں ہوا۔

---

[1] اخبار الصنادید از نجم الغنی خاں حصہ دوم صفحہ ۳۷
[2] تذکرۂ شعرا؛ عتیق الرحمٰن خاں کلیم رام پوری صفحہ ۱۰۶-۱۰۷
[3] ہمدرد ۱۷ رجون ۱۹۲۸ء
[4] ماہنامہ آج کل اگست ۱۹۷۹ء صفحہ ۳۷

معذرت!
ہمارے دفتر میں غزلوں اور نظموں کا ذخیرہ پہلے ہی بہت ہے لہٰذا شعرا حضرات سے التماس ہے کہ وہ غزلیں یا نظمیں ارسال نہ فرمائیں۔ ورنہ ادارہ اُن کو جواب دینے سے قاصر رہے گا۔

بیٹے والے ذرا سوچیں...

"جو لوگ بیٹیوں کے بیاہ کی کٹھنائیوں کو بھوگ چکے ہوتے ہیں، وہی اپنے بیٹوں کی شادی کے موقع پر بالکل بھول جاتے ہیں کہ ہمیں کتنی ٹھوکریں کھانی پڑی تھیں۔ ذرا سی ہمدردی ظاہر نہیں کرتے، بلکہ لڑکی کی شادی میں جو تاوان اٹھایا تھا اسے سُود مرکب کے ساتھ بیٹے کے بیاہ میں وصول کرنے پر کربستہ ہو جاتے ہیں۔ کتنے ماں باپ اس چنتا میں گھُل گھُل کر بے وقت موت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کوئی سنیاس اختیار کر لیتا ہے، کوئی بوڑھے کے گلے اپنی بیٹی کو مڑھ کر اپنا گلا چھڑاتا ہے۔ اہل اور نا اہل کے بارے میں سوچنے کا موقع کہاں؟ ٹھیلم ٹھیل ہے!"

——— منشی پریم چند (اُدھار کہانی میں سے)

کیا یہ سب آج بھی سچ نہیں، بلکہ جہیز لینے دینے کی بدعت اور بھی گھناؤنی صورت اختیار نہیں کر گئی؟

davp 80/407

اُردو یوجنا کا اجرا

پلاننگ کمیشن کا ترجمان **یوجنا** جو انگریزی، ہندی اور ہندوستان کی متعدد علاقائی زبانوں میں شائع ہوتا ہے اپریل ۱۹۸۱ء سے **اُردو** میں بھی شائع ہونے لگا ہے۔

یہ باتصویر ماہنامہ ۳۶ صفحات پر مشتمل ہے اور اس کی قیمت **ایک روپیہ** ہے۔ سرورق رنگین، دیدہ زیب اور چھپائی آفسیٹ کی ہے۔

یوجنا کا مطالعہ اُن تمام لوگوں کے لیے مفید ہے جو حکومت کی مختلف اسکیموں اور پروگراموں سے نہ صرف باخبر ہونا چاہتے ہیں بلکہ ان سے فائدہ بھی اُٹھانا چاہتے ہیں۔ خصوصاً چھوٹے کاشتکاروں، صنعت کاروں اور ذاتی دھندوں میں لگے ہوئے افراد کو اس کے ذریعے بڑی مفید معلومات حاصل ہوں گی۔

براہ راست ہم سے طلب کیجیے یا "آجکل" کے نیوز ایجنٹوں سے حاصل کیجیے۔

قلمی معاونین سے بھی درخواست ہے کہ **یوجنا** میں اشاعت کے لیے موزوں نگارشات بھیجیں جو مختصر، معلوماتی اور مفید ہوں۔

مضامین وغیرہ ایڈیٹر **یوجنا**، پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی - ۱۱۰۰۰۱ کے نام بھیجے جائیں۔ ایجنسی اور خریداری کے لیے بزنس منیجر، پبلی کیشنز، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی - ۱۱۰۰۰۱ سے رابطہ قائم کریں۔

ol. 39 No. 10 AJKAL(URDU) May, 1981

ublished by The Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001

Printed by Arcee' Press, 5,Deshbandhu Gupta Road,Paharganj, New Delhi-110055

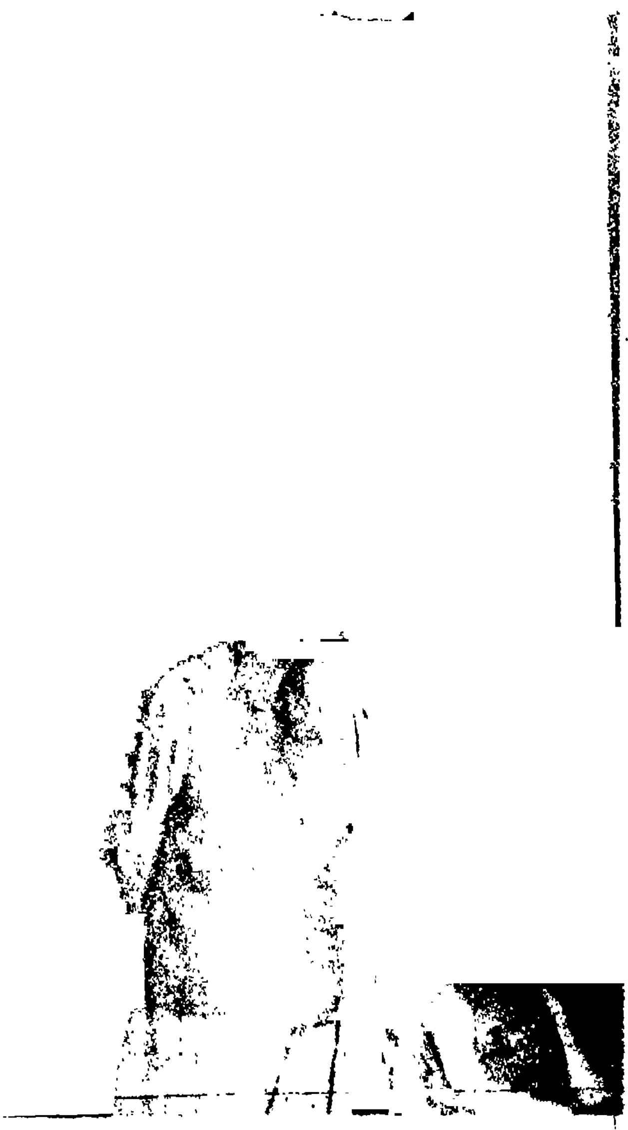

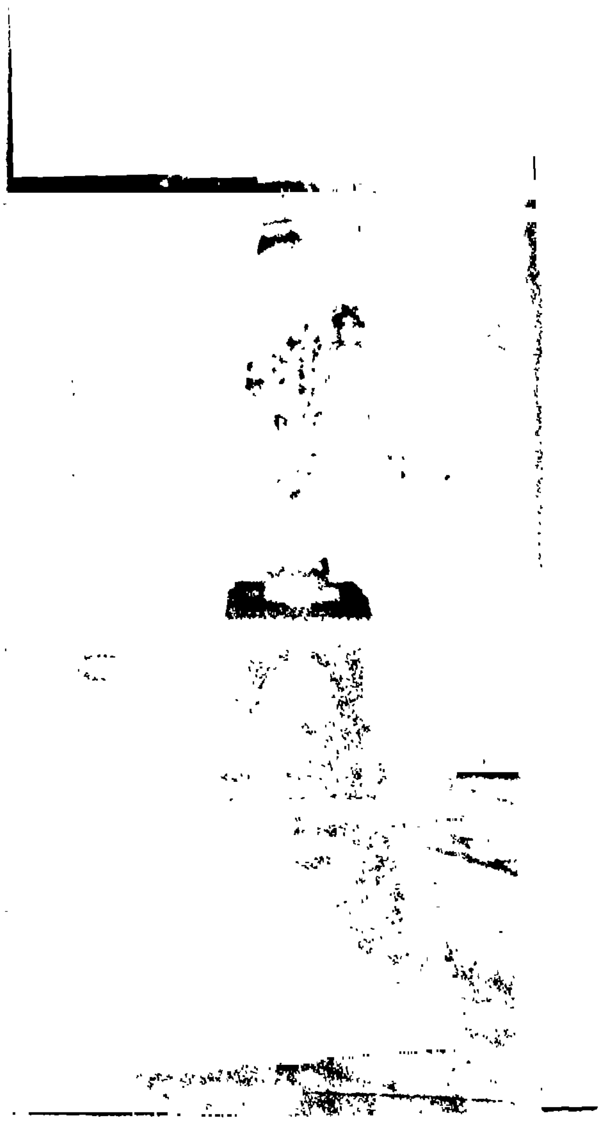

مرکزی وزیر اطلاعات ونشریات شری وسنت ساٹھے نے ڈی اے وی پی کے زیر اہتمام منعقدہ نمائش "پریم چند ۔ زندگی اور فکر و فن" کا افتتاح کرتے ہوئے ۔ ان کے بائیں ساہتیہ اکیڈمی کے صدر پروفیسر اوما شنکر جوشی اور دائیں جانب ڈی اے وی پی کے ڈائرکٹر [illegible]

نمائش کا ایک منظر ▲

▼ مرکزی وزیر اطلاعات ونشریات شری وسنت ساٹھے مذکورہ نمائش کو دیکھتے ہوئے

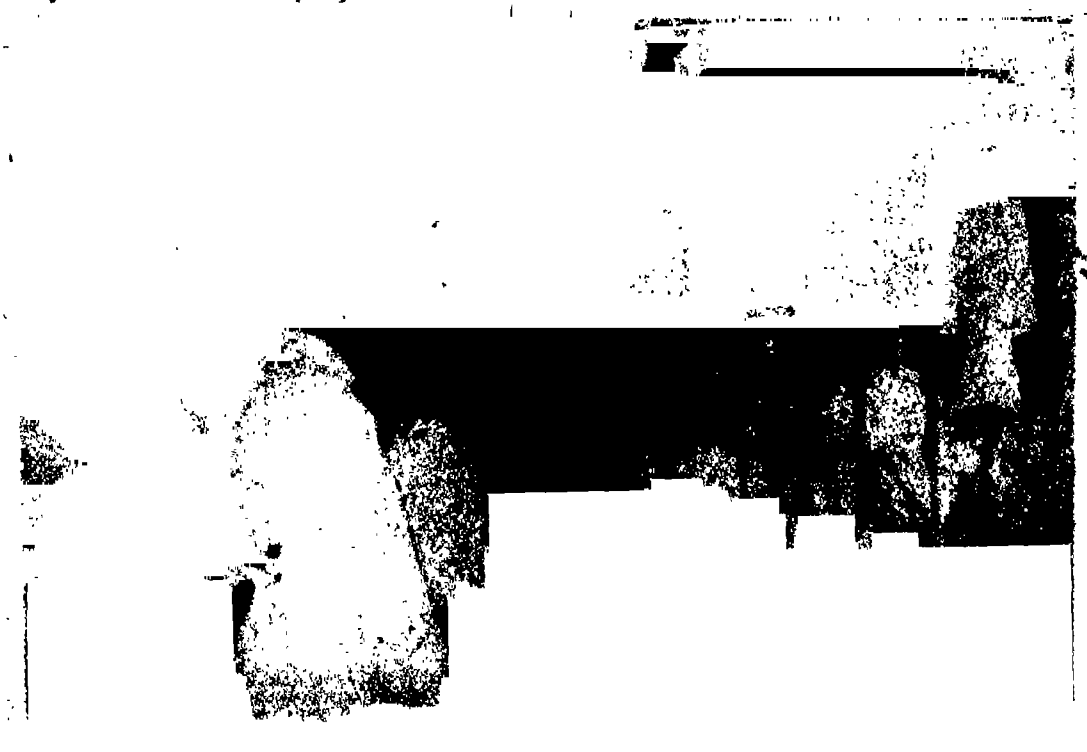

آجکل

جون ۱۹۸۱ء

ایک روپیہ

سعودی عرب کے وزیرِ خارجہ ہزرائل ہائی نیس پرنس سعود الفیصل نے ۱۴ اپریل ۱۹۸۱ء کو راشٹرپتی بھون میں صدرِ جمہوریہ ہند شری این۔ سنجیوا ریڈی سے ملاقات کی۔

یکم مئی ۱۹۸۱ء کو نئی دہلی میں سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کی کابینہ کمیٹی اور امورِ سائنس کی مشاورتی کمیٹی برائے کابینہ کا مشترکہ اجلاس ہوا۔ وزیرِ اعظم ہند شریمتی اندرا گاندھی اس اجلاس سے خطاب فرما رہی ہیں۔

اردو کا مقبول عام مصور ماہنامہ

ماہنامہ آج کل

نئی دہلی

ایڈیٹر
راج نرائن راز

اسسٹنٹ ایڈیٹر
محمد عادل صدیقی

سب ایڈیٹر
شوناتھ سکہ

جلد ۳۹ شمارہ ۱۱

جون ۱۹۸۱ء

جیٹھ - اساڑھ شک ۱۹۰۳ء

قیمت ۳۸۷۰۶۹

شرح چندہ

	ہندوستان	پاکستان	دیگر ممالک
سالانہ	۱۰ روپے	۱۶ روپے	۳ ڈالر ۱/۵۰ پونڈ
دوسالہ	۱۸ روپے	۲۸ روپے	۵/۳۰ ڈالر ۲/۷۰ پونڈ
سہ سالہ	۲۵ روپے	۳۸ روپے	۷/۵۰ ڈالر ۳/۷۵ پونڈ
فی کاپی	ایک روپیہ	۱/۵۰ روپیہ	۳۰ سینٹ ۱۵ پنی

ترتیب

ملاحظات

مقالات

گجرات کے اُمرا اور اُردو ادب — ظہیرالدین مدنی — ۶
ساحر لدھیانوی: پرچھائیوں کا اسیر — مخمور سعیدی — ۱۹
چار ناول — اقبال مسعود — ۳۱
بارہ ماسہ وہاب — الطاف حسین ندوی — ۳۷

غزلیات

دل کے عناصر کا یہ عالم — فراق گورکھپوری — ۵
اس محشرِ جاں کو کیا کہیے گو مائلِ گویائی دل ہے — اختر انصاری — ۱۰
لگتے ہیں شہرِ عشق کے گلبار راستے — دھرم پال عاقل — ۱۰
وہ زخمِ تیغِ ستم ہے کہ جو حنا سا ہے — منظر شہاب — ۳۶
چھ غزلیں — نصر قریشی، ایس موہن لال جوہر، شمس غازی آبادی، اخلاق سہسوانی، اسعد بدایونی، پرویز رحمان — ۴۱

نیا آہنگ

حکیم منظور — ۲۷

کہانیاں

پھر وہی کُنجِ قفس — غیاث احمد گدی — ۱۱
جگری دوست — بالا دُوبے — ۲۸

طنز و مزاح

ایک بوڑھے نے کہا — فکر تونسوی — ۱۶

علاقائی ادب

مرنے والا جو مر نہ سکا (کشمیری کہانی) — اختر محی الدین / علی محمد لون — ۴۲
ساگر دیکھی سا (آسامی نظم) — دیو کانت بروا — تارا چرن رستوگی — ۴۴
گلاب — رگھوناتھ چودھری — تارا چرن رستوگی — ۴۴

نئی کتابیں

دیوانِ حسرت عظیم آبادی — اسما سعیدی / ہنس راج رتن — ۴۵
سازِ خاموش — اعظم حسین اعظم / مہدی عباس حسینی — ۴۶

سرورق: سارنگن

ڈائرکٹر پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر آج کل معرفت پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترسیلِ زر کا پتہ
بزنس منیجر پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ملاحظات

سائنس عوام کی خدمت کا ذریعہ

۲۳ اپریل کو نئی دہلی میں منعقدہ ایک تقریب میں وزیرِ اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے ۱۹۸۰ء کے شانتی سروپ بھٹناگر ایوارڈ تقسیم کیے۔ یہ ایوارڈ ذہین سائنسدانوں اور ایسے ارکان کو دیے جاتے ہیں جن کی ذات سائنس کے شعبوں میں قابلِ تعریف ہوتی ہے۔ اس موقع پر وزیرِ اعظم نے فرمایا کہ ایسی کوششوں کا کبھی خاتمہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ ہر کامیابی ایک نئے سفر کا آغاز ہوتی ہے۔ وزیرِ اعظم نے فرمایا کہ سائنسدانوں کو گہری توجہ اور دلجمعی سے کسی کام کو کرنے میں سکون ملتا ہے لیکن اُنھیں اس کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ سائنس کی ایجادات عوام کو راحت پہنچانے کا ذریعہ بنیں نہ کہ اُن کی تکالیف میں اضافے کا۔ آپ نے مزید کہا کہ اگر جدید سائنسی انکشافات قوم کو مسلّح کرنے یا چند لوگوں کے ہاتھوں میں طاقت دینے کے لیے ہوں تو اُن کا مقصد ہی ختم ہو جائے گا۔

قرأت کا بین الاقوامی مقابلہ

یکم مئی ۱۹۸۱ء کو وگیان بھون میں قرأت کا دو روزہ بین الاقوامی مقابلہ منعقد کیا گیا۔ یہ ایک باوقار اور موثر تقریب تھی جس سے نہ صرف اہلِ ہند کو بلکہ پوری دُنیا کے مسلمانوں کو دلچسپی تھی۔ اس میں مختلف ممالک کے ۲۴ قاریوں نے حصّہ لیا۔ ان میں دو خواتین بھی تھیں جن میں سے ایک بنگلہ دیش سے اور دوسری تھائی لینڈ سے آئی تھیں۔ اس کا افتتاح وزیر امورِ خارجہ شری نرسمہا راؤ نے کیا۔ آپ نے کہا کہ ہندوستان کا خصوصی کردار یہ رہا ہے کہ اس نے تمام مذہبی اور ثقافتی قدروں کو اپنا امتیازی کردار برقرار رکھنے کی اجازت دی ہے۔ قرأت کا بین الاقوامی مقابلہ چودھویں صدی مکمل ہو جانے اور پندرھویں صدی ہجری کے آغاز کی تقریبات کے سلسلے میں ہو رہا ہے۔ عالمِ عرب کے ساتھ ہندوستان کے تعلقات پُرانے ہیں اور اس کی جڑیں گہری ہیں۔ اُمید ہے کہ یہ تعلق مستقبل میں اور بڑھے گا۔ آپ نے کہا کہ اسلام کی اشاعت میں صوفیا اور اولیائے کرام نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ شری نرسمہا راؤ نے کہا کہ ہندوستان ایک سیکولر مُلک ہے اور یہاں پر لاتعداد تحقیق و تعلیم کے ادارے ہیں جن میں درسِ نظامی رائج ہے۔ جن مُلکوں کے قاریوں نے اس میں شرکت کی اُن میں تھائی لینڈ، لیبیا، ہندوستان، مالدیپ، شری لنکا، اردن، بنگلہ دیش، پاکستان، افغانستان، ایران، شام اور ترکی شامل تھے۔

اس مقابلے میں شام کے قاری شیخ محمد الاعرابی الکبانی اوّل آئے۔ موصوف کو پندرہ ہزار روپے دیے گئے۔ تُرکی کے قاری علی اشراغولو دوم آئے۔ اُنھیں دس ہزار روپے دیے گئے۔ تیسرا انعام پانچ ہزار روپے کا تھا جو پاکستان اور لیبیا کے قاریوں کے درمیان نصف نصف یعنی ڈھائی ہزار روپے فی کس دینے کا[…] تھا تاہم نائب صدر جمہوریہ ہند شری ہدایت اللہ نے دونوں قاریوں کو پا[…] روپے بطور خصوصی انعام دینے کا اعلان کیا۔

ہند۔سعودی عرب معاہدہ

گذشتہ ماہ نئی دہلی میں سعودی عرب کے وزیرِ خارجہ شہزادہ سعود الفیصل[…] مرکزی وزیرِ خارجہ شری پی۔ وی۔ نرسمہا راؤ نے دونوں مُلکوں کے درمیان اق[…] اور تکنیکی تال میل کے ایک معاہدے پر دستخط کیے۔

اس معاہدے کی رُو سے ایک مشترکہ کمیشن قائم کیا جائے گا جو باہمی م[…] دونوں مُلکوں کے درمیان زراعت، مویشی نسل کشی اور صنعتی و تکنیکی ترقیاتی[…] میں تال میل کے استحکام و فروغ کے اقدامات کرے گا۔ دونوں مُلک تنظیمی سطح[…] اور تکنیکی تعاون کی حوصلہ افزائی کریں گے، مختلف شعبوں میں مشترکہ پروجکٹ[…] نیز سرمایہ کاری کو بڑھاوا دینے کے اقدامات کریں گے۔ اس معاہدے کے تح[…] مُلکوں کے نمائندے اور وفود ایک دوسرے کے مُلک کا دَورہ کریں گے۔

سعودی عرب کے ساتھ ہندوستان نے ایک اور معاہدے پر بھی دستخط[…] جس کی رُو سے سعودی عرب بہار میں واقع کوئل کاروپن بجلی پروجکٹ کی تعمیر[…] لیے تین کروڑ تیس لاکھ امریکی ڈالر کے مساوی قرض دے گا۔

فیض احمد فیضؔ

برِصغیر کے ممتاز اُردو شاعر فیض احمد فیضؔ کی سترویں سالگرہ کو اُن کے[…] منانے کا اہتمام ۱۹ اپریل کو جشنِ فیضؔ کمیٹی نے نئی دہلی میں کیا۔ اس کمیٹی کے چیر[…] ہندوستان کے سابق سفیر شری اندر کمار گجرال ہیں۔

مقررین جن میں مسٹر جسٹس جی۔ ڈی۔ کھوسلہ (ریٹائرڈ) اُردو اور[…] مشہور مصنّف اور ادیب کرتار سنگھ دُگل اور جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے ڈاکٹ[…] اور ڈاکٹر محمد حسن نے فیضؔ کی شخصیت، فن اور فکر کا کماحقہٗ احاطہ کیا۔

شری اندر کمار گجرال نے فیضؔ کو اس مبارک موقع پر ایک دوشالہ اور[…] خاصدان پیش کیا۔ شری گجرال نے کہا کہ فیضؔ نے برطانوی حکومت کے خلاف[…] جنگِ آزادی میں بڑا تحریک آفریں کردار ادا کیا ہے۔

فیض احمد فیضؔ نے استقبالیہ خطبے کے جواب میں کہا کہ ہندوستان او[…] ثقافتی میراث مشترک ہے۔ ان کی حکومتیں خواہ کچھ ہی کریں تاہم وہ بنیادی[…] ماضی سے مختلف نہیں ہیں۔ اُنھوں نے دونوں قوموں کے درمیان یگانگت[…] بڑھاوا دینے کی پُرزور اپیل کی اور کہا کہ دوام صرف محبت کو حاصل ہے۔

فیض احمد فیضؔ اُتر پردیش اور مدھیہ پردیش اُردو اکادمیوں کی دعو[…] لکھنؤ اور بھوپال کی ادبی تقریبات میں شرکت کے لیے تشریف لے گئے۔

دہلی میں فیض احمد فیضؔ نے اُردو کی عہد آفریں شخصیت اور اپنے دیر[…] سجاد ظہیر اور رضیہ سجاد ظہیر میموریل لکچرز کے سلسلے کی ابتدا کی۔

وفیات

نرگس

اپنے وقت کی ممتاز اور صفِ اوّل کی فلمی اداکارہ، راجیہ سبھا کی نامزد ممبر اور ممتاز سماجی کارکن پدم شری نرگس دت کا تین مئی کو بمبئی کے ایک مقامی ہسپتال میں انتقال ہوگیا۔ وہ باون برس کی تھیں۔

نرگس عرصہ سے کینسر کے موذی مرض میں مبتلا تھیں۔ وہ علاج کے لیے نیویارک گئی تھیں جہاں ان کا متعدد بار آپریشن ہوا۔ وہ مارچ میں بمبئی واپس آگئی تھیں۔ بمبئی پہنچنے پر ان کی صحت مزید خراب ہوگئی۔ اس پر انھیں دوبارہ ہسپتال میں داخل کرادیا گیا تھا۔ زندگی اور موت میں کشمکش جاری رہی۔ بالآخر جان بازی مار گئی اور وہ اپنے پیچھے ہزارہا آنکھوں کو اشکبار اور لاکھوں دلوں کو سوگوار چھوڑ کر اس دارِ فانی سے رخصت ہوئیں۔ ان کے جسدِ خاکی کو ان کی وصیت کے مطابق سوناپور قبرستان میں ان کی والدہ کے پہلو میں سپردِ خاک کیا گیا۔

نرگس کا جنم ۱۹۲۹ء میں ہوا۔ ان کی والدہ جدّن بائی اپنے وقت کی مشہور مغنیہ اور اداکارہ تھیں۔ سب سے پہلے فلمی دُنیا کے مشہور ڈائرکٹر محبوب نے نرگس کو اپنی فلم تقدیر کے توسط سے فلم بینوں سے متعارف کرایا۔ اُس وقت نرگس کی عمر صرف سولہ برس تھی۔

اداکاری کی فطری صلاحیتوں کی بدولت نرگس ایک ہی فلم سے شہرت کے بامِ عروج پر پہنچ گئیں۔ نرگس کی دوسری کامیاب فلموں میں برسات، آگ، انداز، آوارہ، چوری چوری، انہونی، بابل، جوگن، آہ، لاہور، ہلچل، رومیو جولیٹ خاصی اہمیت کی حامل ہیں۔ نرگس کی کامیاب ترین فلم مدر انڈیا تھی جس پر انھیں پدم شری کا اعزاز ملا۔ یہی وہ فلم تھی جس نے دو عظیم اداکاروں یعنی نرگس اور سنیل دت کو ایک دوسرے کے قریب لا کھڑا کیا۔ جس کے بعد ان کے تعلقات مزید استوار ہوتے اور بالآخر وہ رشتۂ ازدواج میں بندھ گئے۔

نرگس کو متعدد قومی اور بین الاقوامی فلمی اعزازات ملے۔ وہ بالخصوص روس میں اور مشرقی یوروپی ممالک میں بے حد مشہور و مقبول تھیں۔

سماجی فلاح کے کاموں میں بھی وہ ہمیشہ پیش پیش رہتی تھیں۔

وزیرِ اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے کہا کہ وہ غیر معمولی صلاحیتوں کی حامل خاتون تھیں۔ ان کا دل انسانیت کی خدمت کے جذبے سے معمور تھا۔

مرکزی وزیرِ اطلاعات و نشریات شری وسنت ساٹھے نے انھیں بہترین اداکارہ اور حسّاس فنکارہ قرار دیا۔ شری ساٹھے نے کہا "میں نرگس کو ایک ممتاز سماجی کارکن کی حیثیت سے بھی جانتا ہوں وہ ہمیشہ اچھے مقاصد کی حمایت پر آمادہ رہتی تھیں۔"

مولانا عبدالوحید صدّیقی

مولانا عبدالوحید صدیقی نے ۱۹؍ اپریل کو داعیِ اجل کو لبیک کہا اور اس طرح دنیائے صحافت کا ایک اور روشن ستارہ غروب ہوگیا۔ مولانا کی عمر ۸۸ سال تھی۔ آپ کے دماغ پر فالج کا حملہ ہوا اور ۸؍ اپریل کو آپ کو پنت اسپتال میں داخل کیا گیا تھا۔ سات روز موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد آپ خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

مولانا عبدالوحید صدیقی غازی پور میں پیدا ہوئے۔ آپ نے دارالعلوم دیوبند میں تعلیم پائی۔ آپ نے دارالعلوم میں تعلیم کے دوران مہاجر اخبار نکالا، آپ سادات کے ایڈیٹر بھی رہے۔ اس کے بعد مولانا ظفر علی خاں کے اخبار زمیندار کے ایڈیٹر رہے۔ دلی آکر آپ ادارہ الجمعیۃ سے وابستہ ہوئے۔ آپ کا شمار ان قوم پرست مسلمانوں میں ہوتا ہے جنھوں نے جدو جہد آزادی کے لیے کام کیا۔ آزادی کے بعد آپ دارالعلوم دیوبند سے وابستہ ہوگئے۔ جب ۱۹۴۷ء میں اخبار الجمعیۃ دوبارہ جاری کیا گیا تو آپ اس کے منیجر بنے۔ ۱۹۵۱ء میں آپ نے دلی سے نئی دنیا جاری کیا۔

وہ نہ صرف عالمِ دین اور مُعمر اردو صحافی تھے بلکہ ایک محبِ وطن اور نیشنلسٹ مسلمان تھے۔ ادارہ ہٰذا آپ کے پسماندگان سے اظہارِ تعزیت کرتا ہے اور اُن کی وفات کو ایک ناقابلِ تلافی نقصان تصور کرتا ہے۔ ●●

اترپردیش اردو اکادمی کا ادبی مجلہ

دو ماہی

"اکادمی"

رسائل کی دنیا میں ایک نئے معیار اور سطح سے روشناس کرانے والا منفرد جریدہ خالص علمی، ادبی، تنقیدی، تحقیقی مضامین، اعلا پایے کے تراجم، اہم کتب پر مستند ادیبوں اور نقادوں کے تبصرے۔

خوبصورت گٹ اپ — اعلا ویڈائنگ طباعت — عمدہ کاغذ

سائز: ۱۸×۲۲/۸

ضخامت تخمیناً: ۱۶۰ صفحات

زر سالانہ: ۲۰ روپے

قیمت فی شمارہ: ۴ روپے

اترپردیش اردو اکادمی

خبرنامہ

ادبی تخلیقات، معلوماتی مضامین، اکادمی اور اردو دنیا کی اہم سرگرمیوں کی رپورٹیں، خبریں اور کتابوں پر تبصرے۔

خوبصورت گٹ اپ

زر سالانہ: ۵ روپے

فی شمارہ: ۵۰ پیسے

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ

سکریٹری، اترپردیش اردو اکادمی، بلہرہ ہاؤس، ۲۱۔ آر۔ کے ٹنڈن روڈ، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

غزل

دل کے عناصر کا یہ عالم — باہم باہم برہم برہم
حسنِ سراپا شعلہ و شبنم — سوزاں سوزاں پُرنم پُرنم
ساکت ساکت شورشِ عالم — دل کی صدا بھی مدھم مدھم
دل کے درد کا ہے یہ عالم — ٹھہرا ٹھہرا پیہم پیہم
عالم عالم عشق بھی تنہا — تنہا حسن بھی عالم عالم
رنگ ہے کس کا روپ ہے کس کا — نکھرا نکھرا مبہم مبہم
دل کی وہ دنیا تھی جو ہوگی — برہم ہوکر اور منظم
عالمِ رنج و نشاط سے بڑھ جا — اِن کے سوا ہیں اور بھی عالم
عشق کی آنچ تری ہی کسر تھی — اب اکسیر ہے خاکِ آدم
ظلمت و نور کی دو موجیں ہیں — بل کھایا گیسوئے پُرخم
حاصلِ عشق یہی ہے کوئی — دے بھی گیا دم کر بھی گیا رم
دِل کی جراحت تیری محبت — ایسا زخم نہ ایسا مرہم
جاتی بہاریں آتی بہاریں — دونوں کا حاصل دیدۂ پُرنم
عشق میں سچ ہی کا رونا ہے — جھوٹے نہیں تم جھوٹے نہیں ہم
لے اب اُس نے ستم بھی چھوڑا — اب تو دل کا درد ہُوا کم
حسنِ بہاراں شورِ بہاراں — شعلۂ پیہم نعرۂ ماتم
حاصلِ عشق یہی کیا کم ہے — کچھ مجھ کو غم کچھ تم کو غم

ہم نے بھی آج فراق کو دیکھا
سوزِ مکمل دردِ مجسم

فراق گورکھپوری
۸/۴ بینک روڈ
الٰہ آباد

ظہیرالدین مدنی

۱۷/۵، خانقاہ، برہان پور (ایم۔ پی)

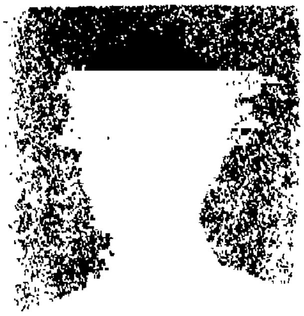

گجرات کے اُمراء اور اُردو ادب

۱۷۵۷ تا ۱۸۵۷ء سو سال کی مدت میں سیاسی لوٹ کھسوٹ نے ہندوستان کا نقشہ ہی بدل ڈالا۔ مغل شہنشاہیت کا زوال درحقیقت ہندوستان کا زوال تھا۔ انگریز گھات میں بیٹھا تھا۔ ہندوستان کی مقتدر قوموں میں اتحاد مفقود تھا، نفاق کا بول بالا تھا۔ جعفرِ بنگال اور صادقِ دکن جیسے بیسیوں ننگ وطن میدانِ سیاست میں رواں دواں تھے۔ مرکزی حکومت کی کمزوری کے پیشِ نظر بعض اصحابِ اقتدار نے مرکز سے رشتہ ناتا توڑ کر خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اس طرح ملک میں رجواڑوں، نوابیوں اور زمین داریوں کا جال بچھ گیا۔ ان میں پرانی ریاستوں کے ساتھ نئی ریاستیں بھی شمار قطار میں آگئیں۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ان کے طمطراق میں اضافہ ہوگیا۔ کیوں کہ یہ سب حکومت برطانیہ کے نمک خوار قصیدہ خواں خدام قرار پا گئے مگر ۱۹۴۷ء میں آزادی کے بعد ان سب کا عدم وجود برابر ہوگیا۔ گجرات میں ایسی کئی ریاستیں اور زمین داریاں تھیں۔ ان ریاستوں میں سے مسلم ریاستیں جوناگڑھ، بالاسینور، رادھن پور، پالن پور، مانگرول، کھمبائت، سورت، بھروچ، سچین، ماناودر وغیرہ خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے بعض ریاستوں کے رئیسوں اور امیروں کے خاندانوں میں اردو ادب ایک تہذیبی روایت کا درجہ رکھتا تھا۔ ان لوگوں کی اردو دوستی اور سرپرستی کی وجہ سے ادبی محفلوں میں اردو کا چراغ روشن رہا۔ اگلے وقتوں کے ان بزرگوں کی ادبی خدمات کا اعتراف نہ کرنا احسان ناشناسی ہوگی۔

سچین

ریاست سچین کے بیشتر نوابوں زادوں کو شعر و سخن سے شغف تھا۔ یہ ریاست سورت سے چند میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اس کے بانی حبشی بحری سرداروں کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ خاندان کے کئی بزرگ احمد نگر، بیجاپور، سورت میں بحری بیڑوں کے اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے بمبئی سے قریب جنجیرا (جزیرہ) اسی خاندان کی خود مختار حکومت تھی۔ جنجیرا میں سید عبدالکریم خان اور ان کے بھائی میں جانشینی کے لیے تنازعہ ہوا۔ سیدی عبدالکریم مرہٹوں سے کمک حاصل کرنے کے ارادہ سے پونا گئے۔ پونا میں پیشوا نانا فرد نویس نے مصلحتاً سیدی عبدالکریم کو اپنے قبضہ کے چند گاؤں دے کر ایک نئی ریاست قائم کر دی۔ اس طرح ۱۷۹۱ء میں ریاست سچین کا قیام عمل میں آیا اور سیدی عبدالکریم عرف نواب یالو ریاست کے پہلے نواب قرار پائے۔

نواب یالو نے ۱۸۰۲ء میں انتقال کیا۔ موصوف کو شعر و سخن میں بھی دخل تھا۔ کریم تخلص کرتے تھے۔ نواب یالو کے بعد ان کے فرزندِ اکبری سیدی ابراہیم خان جانشین ہوئے۔ نواب ابراہیم خاں بہت ہی فیاض اور غریب پرور نواب تھے۔ ۱۸۵۲ء میں بعمر سو سال انتقال کیا۔ شاعری میں درک رکھتے تھے۔ محب تخلص تھا۔ یوسف و زلیخا کا اردو میں اور مثنوی سحرالبیان کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ ہر ہفتہ در دولت پر محفل مشاعرہ منعقد ہوتی جس میں سورت کے نامی گرامی شعرا شرکت کرتے تھے۔ نواب سیدی ابراہیم خاں محب کے بعد ان کے بیٹے سیدی عبدالکریم خان دوم جانشین ہوئے۔ نواب صاحب شاعر تو نہیں تھے لیکن شعر فہم ضرور تھے۔ ان کے تین بھائی سیدی عبدالرحیم اخلاص، سیدی عبدالغنی سالار و غنی اور فرحت شاعری سے شغف رکھتے تھے۔ اخلاص علم دوست و ادب پرور شخص تھے ان کا دربار شعرا سے بھرا رہتا تھا۔ سورت کے استاد شاعر میاں سمجھو سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ جرأت کے شاگرد مہجور بھی ان کی سرکار سے منسلک تھے۔ سید عبدالغنی غنی نہایت پُرگو شاعر تھے۔ میاں داد خاں سیاح ان کے احباب میں سے تھے۔ غنی نے بمبئی میں مستقل اقامت اختیار کرلی تھی۔ موصوف نے ۱۸۸۳ء میں انتقال کیا۔ وفات سے ایک روز قبل احباب سے مفارقت کے بارے میں ایک طویل نظم کہی تھی۔ نواب سیدی عبدالکریم دوم کے بعد سیدی ابراہیم خان دوم نواب مقرر ہوئے اور ۱۸۰۲ء میں ان کے بعد تین نواب یکے بعد دیگرے ریاست

نواب گذرے لیکن انھیں اردو ادب سے دل چسپی نہیں تھی۔ آخری نواب بدی حیدر خان انگریزی ادب اور تاریخ میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ موصوف بہت وسیع مطالعہ تھا۔ ان کا کتب خانہ بھی قابلِ قدر تھا۔ نہ جانے ن کا کیا حشر ہوا۔

سورت

سورت کی سیاست میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا بہت زیادہ عمل دخل ا۔ کمپنی کا صدر مقام سورت تھا۔ اسی شہر میں مغربی اقوام کی کوٹھیاں واقع تیں۔ سورت کے لیے دہلی سے متصدی، قلعہ دار وغیرہ کا تقرر ہوا کرتا تھا۔ ۱۰۲ا میں ایک امیر تیغ بیگ خان نے کمپنی کے بل بوتے پر متصدی سہراب خان و بہانے تراش کر نکال باہر کیا اور خود نواب کا لقب اختیار کر کے حاکم بن بیٹھا ر کمپنی بہادر کو آقائے ولی نعمت مان لیا۔ اس طرح دہلی سے تعلقات منقطع وگئے۔ تیغ بیگ خان نے ۱۷۴۶ میں انتقال کیا۔ اس کے بعد ۱۸۲۱ء تک ارنواب مسند پر متمکن ہوئے۔ سورت کے آخری نواب میر افضل الدین خان ے اولاد نرینہ نہ ہونے کی وجہ سے ۱۸۲۱ء میں نواب کی وفات پر سورت شہر اور مضافات وغیرہ کا انتظامیہ اور عدلیہ وغیرہ کو کمپنی نے اپنے اختیار میں لے یا اور نواب کے داماد میر جعفر علی خان بن میر سرفراز علی کو وظیفہ خوار ائین مقرر کر دیا۔ میر جعفر علی خاں کے بھی اولاد نرینہ نہ ہونے کی وجہ سے ۱۸۶۱ء میں ان کے انتقال کے بعد ان کے داماد میر غلام بابا کو جانشین مقرر لیا گیا۔

غلام بابا

نواب میر غلام بابا خان غالب کے گجراتی محب کی حیثیت سے متعارف ہیں۔ ان کے نام غالب کے خطوط موجود ہیں۔ غلام بابا سورت کے قاضی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ قاضی خاندان کے ایک بزرگ سید شرف الدین ترمذی سورت میں منصب قاضی القضاۃ پر فائز تھے۔ سورت کے ایک جید عالم رسول خواجہ سید جمال الدین متوفیٰ ۱۰۱۶ھ بن سید بادشاہ پر دہ پوشش کے خاندان کی عزیزداری تھی۔ خواجہ صاحب کے خاندان میں اولاد نرینہ نہ ہونے کی وجہ سے خانقاہ خواجہ صاحب کی سجادگی بھی قاضی خاندان میں منتقل ہو گئی تھی۔

غلام بابا نے اکتساب علم اپنے خاندان کے بزرگوں سے کیا تھا۔ ۱۸۵۹ء نواب میر جعفر علی کی چھوٹی بیٹی رحیم النساء سے شادی ہوئی تھی۔ غلام بابا نے ۱۸۹۲ء میں انتقال کیا۔ غلام بابا علم دوست نواب تھے۔ انھیں رفاہ عام سے بہت دل چسپی تھی۔ بہت منکسر المزاج شخص تھے۔ اہل سورت میں بہت مقبول تھے۔ منشی میاں خاں سیاح ان کے مصاحبین میں سے تھے جن کے توسط سے نواب صاحب کے غالب سے دوستانہ تعلقات قائم ہوئے تھے۔ غالب نے غلام بابا کے بیٹے مظفر حسین کی ولادت ۱۸۶۹ء میں اور بیٹی بسم اللہ بیگم کی تقریب بسم اللہ پر قطعات لکھ بھیجے تھے۔ اس تقریب میں منشی نول کشور نے بھی شرکت کی تھی۔ غلام بابا نے کیمیائے سعادت کا اردو میں ترجمہ کرایا تھا۔ نواب موصوف خود تو شاعر نہیں تھے لیکن شعرا کے قدر دان تھے۔ کئی شاعروں کو اس سرکار سے وظیفے دیے جاتے تھے۔

شیخ خاندان

سورت کا شیخ خاندان علوم و فنون اور شعر و سخن کے سلسلے میں خصوصیت رکھتا ہے۔ یہ خاندان صدیوں تک علم و ادب، سیم و زر اور عز و اقتدار کی دولت سے مالا مال رہا۔ اس خاندان کے ایک بزرگ قاضی بغداد شیخ عبداللطیف ہیں کا ۱۲۱۷ء میں گجرات آئے تھے۔ سلاطین گجرات، شاہان مغلیہ اور کمپنی کے دوروں میں خاندان کے بعض بزرگ اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ ایک بزرگ شیخ صفی (سیف خان) جہانگیر کے عہد میں گجرات کے صوبیدار تھے اور ان کے فرزند شیخ محمد امین شاہجہاں کے زمانہ میں دو دفعہ سورت کے متصدی مقرر کیے گئے تھے۔ ابتدا سے تجارت ان کا پیشہ تھا۔ کئی جہازوں کے مالک تھے۔ شاہانِ (گورنر) مغلیہ کی جانب سے خطاب عمدۃ التجار عنایت کیا گیا تھا۔

اس خاندان میں شیخ محمد فاضل بن شیخ محمد حامد بڑے عالم و فاضل گزرے ہیں فاضل کئی عربی تصانیف کے مصنف تھے۔ موصوف نے تیس لاکھ روپیہ کے صرف سے چالیس ہزار مخطوطے جمع کیے تھے۔ دنیا کے دور دور کے ملکوں میں ان کے کاتب جاتے اور کتابوں کی نقلیں لاتے۔ عربی، فارسی اور گجراتی میں شعر بھی کہتے تھے۔ ۱۷۱۶ء میں انتقال کیا۔ فاضل کے ایک فرزند شیخ محمود بھی شاعر تھے۔ محمود تخلص تھا۔ ان کا سنہ وفات ۱۷۰۰ء ہے۔ شیخ محمود کے پوتے شیخ حامد بن شیخ بہادر کو شعر و سخن سے بہت شغف تھا۔ کمپنی کے عہد میں سورت میں کمشنر کے عہدہ پر فائز تھے۔ حامد نے ۱۸۲۹ء میں وفات پائی۔ شیخ حامد کے بیٹے شیخ رضی الدین عرف بخشو میاں مؤرخ گذرے ہیں۔ چار سو کتب تواریخ کے مطالعہ کے بعد تاریخ کی دو کتابیں حدیقۂ احمدی اور حدیقۃ الہند مرتب کیں۔ بخشو میاں کو اردو ادب سے دل چسپی تھی۔ شاعر بھی تھے۔ بخشش تخلص کرتے تھے۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے اُن کے دوستانہ مراسم تھے۔ شیفتہ نے تاریخ وفات کہی ہے۔ (سنہ وفات ۱۲۶۵ھ - ۱۸۴۸ء)

بخشو میاں پہ نور جو برسا دمِ وصال
سالِ وفات آگیا میرے خیال میں

بخشو میاں بخشش کے چھوٹے بھائی شیخ فاصل عرف ڈوسو میاں بھی شاعر تھے۔ فاضل تخلص تھا۔ میاں بھوسورتی سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ ایک مدت تک بھروچ میں عہدۂ منصف پر فائز رہے۔ ان کا سنہ وفات ۱۸۶۰ء کے آس پاس ہے۔ بخشو میاں کے فرزند شیخ بہادر بھی اپنے والد کی

طرح انگریزوں کی ملازمت میں اعلیٰ عہدہ پر فائز تھے۔

چند سال کے بعد وہ سندھ چلے گئے تھے اور واپسی پر سرکار گائکواڑ میں نائب صوبہ کے عہدہ پر خدمت انجام دیتے رہے۔ موصوف نے ۱۸۹۲ء میں انتقال کیا۔ بہادر کو علم و ادب کا ذوق ورثہ میں ملا تھا بہادر تخلص تھا۔ گھر پر شعر و سخن کی محفلیں منعقد ہوتی رہتی تھیں۔

ملّا خاندان

اس خاندان کے ایک بزرگ عبدالغفور بن ابوبکر ۱۶۸۰ء میں تجارت کی غرض سے نہروالا پٹن (گجرات) سے سورت آئے تھے۔ ملّا صاحب کو اللہ والوں کی خدمت کا بہت شوق تھا۔ ایک دفعہ ایک مجذوب ان کے مہمان رہے۔ اور جاتے وقت ندی کے کنارے پر انیس کشتیاں ریت بھر کر ملا صاحب کو دیں۔ ملا صاحب نے ریت کنارے پر پھینک دی اور گھر چلے آئے کئی روز کے بعد ملا صاحب نے کسٹم ہاؤس سے نیلام میں کھجور کے بستے خرید لیے۔ ایک بستہ میں انھیں ہیرے جواہرات مل گئے۔ اس دولت سے ملا صاحب نے بڑے پیمانہ پر تجارت شروع کی اور قلیل عرصہ میں اتنی دولت حاصل کر لی کہ ۱۹ جہازوں کے مالک ہو گئے جب کبھی نیا جہاز بنواتے تو ایک ڈوب جاتا۔ انھیں کبھی عمدۃ التجار کا خطاب خلعت، مراعات وغیرہ عطا ہوتے تھے۔ ملا صاحب نے ۱۷۱۸ء میں انتقال کیا۔ اس زمانہ میں سورت میں تین مسلم کروڑ پتی (۱) شیخ خاندان (۲) ملا خاندان (۳) چلپی خاندان تھے۔ ملا عبدالغفور کے پوتے ملا محمد علی بن عبدالحی سورت کی سیاست میں نمایاں تھے۔ سہراب خان متصدی کو ہٹانے میں تیغ بیگ خان کی انھوں نے بڑی مدد کی تھی لیکن بعد میں ان سے بگڑ گئی اور تیغ بیگ خان نے قید کر کے زہر دیدیا۔ سنہ وفات (شہادت) ۱۷۳۰ء ہے اس سانحہ کے بعد محمد علی کے ایک بیٹے محمد حسین جدہ چلے گئے اور ملا فخرالدین نے آصف خاں کے ہاں پناہ لی۔ چند سال کے بعد یعنی تیغ بیگ خاں کے انتقال کے بعد فخرالدین سورت لوٹ آئے لیکن تیغ بیگ کے داماد سید اچھن (جو تیغ بیگ خان کے جانشین تھے) نے فخرالدین کو قید کر لیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک افسر مسٹر لیمب (LAMB) جو فخرالدین کے دوست تھے چھڑا لائے اور انھیں بمبئی بھجوا دیا۔ فخرالدین نے آصف جاہ کو شکایت لکھ بھیجی۔ آصف جاہ نے جواب میں ایک شعر لکھ بھیجا۔

نہ تو نے گل کیا بلبل نہ تو نے باغباں اپنا
چمن میں کس بھروسے باندھتی ہے آشیاں اپنا

فخرالدین شاید آصف جاہ کی مرضی کے خلاف سورت آ گئے تھے۔ فخرالدین نے جواب الجواب میں لکھا

بلبل بے کس کی گنجائش چمن میں کیوں کر ہو
ایک تو صیاد تھا اور باغباں دشمن ہوا

حالات سازگار ہونے کے بعد فخرالدین بمبئی سے سورت لوٹ آ

۱۷۸۰ء میں انتقال کیا۔ فخرالدین کو شاعری سے شغف تھا۔ مضطر تخلص تھے۔ ان کا دیوان احمد آباد کے کتب خانہ پیر محمد شاہ میں محفوظ ہے۔ ۔ کے سرورق پر شیخ بہادر کی مہر ہے اور قطعہ تاریخ وفات مضطر بھی

فخرالدین مضطر کے پوتے قطب الدین بن مجید الدین ابوالفتح قطب تخلص تھا۔ ایک شاعر اختر حیدر آبادی قطب کے ملازمین میں۔ قطب کی غزلوں کا ایک ردیف وار مجموعہ راقم کے پاس ہے۔ قطب نے عیش و عشرت میں زندگی گذاری۔ ۱۸۶۹ء میں انتقال کیا۔

بھروچ کا نواب خاندان

۱۷۲۳ء میں مرزا عبداللہ بیگ بھروچ کا متصدی تھا۔ آصف جا گجرات چھوڑ کر جانے کے موقع پر عبداللہ بیگ نے مغلیہ سرکار سے سبک کا خیال ظاہر کیا۔ آصف جاہ نے اپنی جاگیر کا علاقہ بھروچ عبداللہ بیگ کر ایک خود مختار ریاست قائم کر دی۔ اس طرح عبداللہ بیگ نیک خطاب کے ساتھ پہلا نواب قرار پایا۔ ۱۷۳۰ء میں عبداللہ بیگ کے بع بیٹا محمد بیگ نیک عالم دوم مسند نشین ہوا اور ۱۷۵۴ء میں بیگ کا پوتا مرزا حامد بیگ رفیع الدولہ جانشین ہوا۔ حامد بیگ اور ادیبوں کا قدر دان تھا۔ اس کو شعر و سخن سے بھی شغف تھا۔ حاتہ کرتا تھا۔ حامد بیگ نے ۱۷۶۷ء میں انتقال کیا۔ حامد بیگ کے بعد ان مرزا معز بیگ جانشین ہوا۔ معز بیگ کا واجب الادا رقم پر کمپنی ہوا۔ بات طول پکڑ گئی اور فیصلہ میدان جنگ میں ہوا۔ جنگ میں نواب کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا اور بھروچ کا علاقہ کمپنی کے تصرو چلا گیا۔ دربار کے شاعر عباس نے اس جنگ کا احوال مثنوی میں قلم بند مثنوی کا تاریخی نام جنگ غمگین ۱۱۹۳ھ ہے۔ نواب معز بیگ کے بیٹے امیرالدین کو شعر و سخن سے شغف تھا۔ تخلص ضاحک تھا۔ ضاحک نے میں وفات پائی۔

میر صاحب کا خاندان۔ بڑودہ

بڑودہ کے دو خاندان اپنی اردو دوستی کے لیے خصوصیت ر ان میں سے ایک میر صاحب کا خاندان ہے۔ اس خاندان کے ایک بزرگ سرفراز علی سہسوان ضلع بدایوں سے بڑودہ آئے تھے اور اپنی فوجی لیاقت سے سرکار گائکواڑ میں منصب اسلحہ دار سردار حاصل کر لیا تھا۔ کئی با۔ گائکواڑ کے درمیان سفارتی خدمات بھی انجام دی تھیں۔ ان کے تین بیٹے ان میں سے میر اکبر علی اور میر جعفر علی سورت کے نواب میر افضل الدین تھے۔ میر جعفر علی سورت میں نواب افضل الدین متوفی ۱۸۶۳ کے جا مقرر کیے گئے۔ چوں کہ اولاد نرینہ نہیں تھی۔ میر اکبر علی کو ان کے والد کے بع

سلہ دار سردار عطا ہوا۔ میر اکبر علی نے ۱۸۶۰ء میں انتقال کیا ان کے بیٹے میر ابراہیم علی جانشین ہوئے۔

میر ابراہیم علی کی تعلیم سورت میں ہوئی تھی۔ سورت کے ایک عالم منشی لطف اللہ فریدی اُن کے اتالیق تھے۔ لطف اللہ شاہ کمال مالوی کی اولاد سے تھے۔ انگریزی زبان و ادب پر قدرت حاصل تھی۔ ان کی خود نوشتہ سوانح عمری ان کے ایک شاگرد کپتان ایسٹ وک نے لندن سے ۱۸۵۰ء میں شائع کی تھی۔ میر ابراہیم علی کو شاعری میں دخل تھا۔ وفاؔ تخلص کرتے تھے۔ وفاؔ اور ان کے بھائی عالم علی غالب سے شرف تلمذ رکھتے تھے۔ ہر ماہ اپنے در دولت پر مجلس میلاد و محفل مشاعرہ منعقد کرتے تھے۔ وفا نے ۱۸۸۵ء میں انتقال کیا۔ وفا کے بیٹے میر احتشام علی بھی صاحب دیوان شاعر گذرے ہیں۔ تخلص جادو تھا۔ حکیم سید احمد مودودی میر صاحب کے عزیزوں میں سے تھے۔ فدا تخلص تھا۔ یہ بھی غالب کے شاگرد تھے۔ ۱۳۰۳ھ میں وفات پائی۔ ان کے فرزند محمود حسن افسر ظہر دہلوی کے شاگرد تھے۔

نواب خاندان۔ بڑودہ

اس خاندان کے ایک بزرگ سید عبداللہ ۱۵۰۰ء میں ہرات سے ہند آئے تھے۔ ان کی پانچویں پشت میں سید نورالدین حسین خاں متوفی ۱۶۹۹ء کو دہلی میں اعلیٰ منصب حاصل تھا۔ بڑودہ میں نواب خاندان کے پہلے شخص یہی تھے۔ سید نورالدین اپنے بزرگوں کی طرح علم و فضل میں درس رکھتے تھے۔ ان کی تصانیف برٹش میوزیم میں محفوظ ہیں۔ مغلیہ سلطنت میں نواب موصوف کو بہت قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ انہیں نواب بہادر اور خان کے خطابات بھی عنایات کیے گئے تھے۔ ۱۷۸۰ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے انھیں سفارتی خدمات کے لیے مخصوص کیا تھا۔ مہاراج گائکواڑ بھی اُن کے قدر دانوں میں سے تھے۔ سرکار گائکواڑ نے اُن کے ایک بیٹے میر کمال الدین اوّل کو بڑودہ کے نواب کا درجہ دیا تھا۔ نورالدین کے سات بیٹے تھے جو سرکار گائکواڑ کے علاوہ بھونسلے (ناگپور) حیدرآباد (نظام) کمپنی وغیرہ میں منصبدار تھے۔

نواب صاحب کے ایک بیٹے نظام الدولہ نواب میر صدرالدین حسین خاں نظام نواز جنگ اورنگ آباد کے صوبیدار تھے اور پربندا اور نلدرک کی قلعداری بھی حاصل تھی۔ موصوف شاعر تھے۔ ان کے پوتے صدرالدین بن وجیہہ الدین بھی شاعر گذرے ہیں۔ صدرؔ تخلص کرتے تھے۔ صدرؔ کا زمانۂ حیات ۱۸۶۷ تا ۱۹۲۲ء تھا۔ بڑودہ کے یہ جانشین نواب قرار پائے تھے۔ صدر سچے اور ہمدرد مسلمان تھے۔ مسلمانوں کی ابتر حالت دیکھ کر انھیں بہت افسوس ہوتا تھا۔ یہ علی اسکول کے نمائندے تھے۔ اپنی قوم کی اصلاح و فلاح کے لیے تقریباً، چھوٹے بڑے رسالے لکھے ہیں۔ اردو نثر و نظم دونوں کے ذریعہ انھوں نے اہم خدمات انجام دی ہیں۔ صدر بہت بڑے ذاتی کتب خانہ کے مالک تھے۔ مولانا شبلی اور حکیم اجمل خاں صاحب نے کتب خانہ کی تعریف کی ہے۔ بڑودہ میں اردو فارسی کا پہلا مدرسہ قائم کرنے کا سہرا ان کے سر ہے۔

مانگرول کا نواب خاندان

مانگرول کاٹھیاواڑ کی ایک قدیم بندرگاہ ہے۔ ایک زمانہ میں یہ تجارتی مرکز تھا۔ باربوسا نے اس کی تعریف کی ہے ۱۳۴۳۔۵۰،، ھ میں تغلق حکومت کے ایک صوبیدار عزالدین آدم شاہ نے یہاں جامع مسجد تعمیر کرائی تھی۔ مانگرول بارہ سال ۱۷۴۸ء تک پیشوا کے قبضہ میں رہا۔ دو بھائی شہاب الدین اور فخرالدین نے مرہٹوں کو شکست دے کر اسے حاصل کیا اور خود مختار حکومت قائم کرلی۔ اس وقت سے چار نواب فخرالدین، شیخ میاں، بدرالدین، باپو میاں ۱۸۸۰ء تک اس کے حاکم رہے۔ ۱۸۸۰ء میں نواب حسین میاں بن باپو میاں کے جانشین ہوئے۔ ۱۹۰۸ء میں حسین میاں کے بھائی جہانگیر میاں نامزد کیے گئے۔ ان کے بعد عبدالخالق اور ناصر میاں نواب ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں ناصر میاں پاکستان ہجرت کر گئے۔

ابتدائی عہد کے نوابوں کے ذوق و شوق کا پتہ نہ چلا حسین میاں صاحب ذوق نواب تھے۔ یہ علم موسیقی میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ شاعر تو نہیں تھے لیکن شاعروں کے قدردان تھے۔ مرزا داغ دہلوی، جلیل اور دوسرے نامی گرامی شعرا مانگرول کو زینت بخش چکے ہیں۔ ایک شاعر مشتاق رام پوری قسمت آزمائی کے لیے ادھر آگئے لیکن رسائی نہیں ہو رہی تھی۔ ایک شام مشتاق درِ دولت پر پہنچ گئے۔ نواب صاحب باغ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ دربان ان کی پرچی پہنچانے کو تیار نہ تھا۔ اتفاق سے نواب کے پانچ چھ بھانجے کھیلتے ہوئے دربان کے قریب آگئے۔ دربان نے اشارہ کیا کہ پرچی انھیں دیدی جائے۔ بھانجے شیخ احمد میاں پرچی نواب صاحب کے پاس لے گئے۔ لکھا تھا

چھوڑ کر دار السرور رام پور
آگیا مشتاق پابوس حضور
دیر سے حاضر یہ خانہ زاد ہے
اے سلیماں جاہ کیا ارشاد ہے

نواب صاحب نے پڑھتے ہی باریابی کا حکم دیا۔

جہانگیر میاں ریونیو میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ بھائی کے انتقال کے بعد انھیں نامزد کیا گیا۔ جہانگیر میاں کو شعر و سخن سے دلچسپی نہیں تھی۔ قوم کے بچوں کی تعلیم ان کا مطمح نظر تھا۔ اپنے ذاتی جیب خرچ سے یہ بچوں کو وظیفے دیتے تھے۔ ایک صنعتی اسکول بھی قائم کیا تھا۔ اصلاح قوم اور رفاہ عام کے لیے ہر ممکن طریقہ پر کوشش کرتے رہے۔ ۱۹۴۲ء میں انتقال کیا۔

مذکورہ بالا رئیسوں اور امیروں کے علاوہ گجرات کے کئی اور معزز خاندان ایسے ہیں جنھوں نے اردو کی ادبی و لسانی روایات کو قائم رکھا ہے۔ اس مضمون میں طوالت کے خوف سے ان کا ذکر نظر انداز کیا گیا ہے۔

غزلیں

اختر انصاری
شہرزاد، جامعہ اردو روڈ
علی گڑھ (یو-پی)

اس محشرِ جاں کو کیا کہیے، گو مائلِ گویائی دل ہے
وہ شور ہے جس میں کان پڑی آواز بھی سننا مشکل ہے

کیسا یہ سفر ہے بارِ خدا، للّٰلہ ہمیں جانا ہے کہاں؟
رہزن ہے یہاں جو رہبر ہے، جادہ ہے یہاں جو منزل ہے

اب کون کہے منزل ہے کہاں، ساحل ہے طلسمِ وہم و گماں
جو راہ تھکا دے منزل ہے، جو موج ڈبو دے ساحل ہے

ملتا بھی رہا کھوتے بھی رہے، آتا بھی رہا جاتا بھی رہا!
حاصل کی طلب کو کیا کہیے، جو مل نہ سکا وہ حاصل ہے!

ظاہر پہ نہ جا، خارج کی نہ سن، پردوں کو اٹھا کے دیکھ یہاں
جو صاحبِ زر ہے سارق ہے، جو مردِ سخی ہے سائل ہے

تو اپنی خرد پر نازاں رہ، میں جہل سے اپنے راضی ہوں
گردوں کی نگاہوں میں لیکن عاقل ہے نہ کوئی جاہل ہے!

جب شاخ سے ٹوٹا پھول کوئی کس نجمِ فلک پر کیا بیتی؟
ہم اہلِ زمیں بے حس ہی سہی، خود محفلِ انجم غافل ہے

دل اور جگر کے زخم بجا، اب زخمِ دہن بھی کیوں کھولو؟
ہم اہلِ جہاں گھائل ہیں تو کیا، خود روحِ زمانہ گھائل ہے

وہ اپنی خودی کا بندہ تھا، میں اپنے جنوں میں غرق رہا
ہم محرمِ دردِ دل بھی تھے! دعویٰ یہ سراسر باطل ہے

ہے عشق اگر تکذیب خودی، عنقا ہے وہ شے اس دنیا میں
تو عشق گزیدہ تھا یا میں؟ یہ بحث ہی اب لاطائل ہے

اشعار میں اک بے نام تڑپ! ہے اپنی بساط اتنی ہی فقط
تخیل بھی اپنی بسمل ہے، تخیل کی رو بھی بسمل ہے

زاہد کے خصائص نے مارا! غرقاب ہوں رندی میں اختر
اب کس سے کہوں کس منہ سے کہوں؟ دل زہد پہ ابتک مائل ہے

دھرم پال عاقل
سمر ہل، شملہ-۵

لگتے ہیں شہرِ عشق کے گلبار راستے
لیکن یہ تیغِ تیز کی ہیں دھار راستے

گزرا ہے کوئی پہنے ہوئے حُسن کا لباس
شاید اسی لیے ہیں ضیا بار راستے

الجھن میں ڈال دیں نہ تن آسانیاں کہیں
یہ زندگی ہے اس کے ہیں دشوار راستے

چوراہے پہ کھڑا ہوں چلوں تو کدھر چلوں
خود بن گئے ہیں راہ کی دیوار راستے

پھولی شفق ہے یا یہ شرارت کسی کی ہے
ہر سمت لگ رہے ہیں جو گلنار راستے

سمجھی ہے جیسے جیسے کتابِ رموزِ دل
ہوتے گئے حیات کے ہموار راستے

اس میں بھی کوئی بات ہے ورنہ یہ اہلِ ہوش
کرتے نہ اختیار زیاں کار راستے

اب کیا بتائیں کیسے ملی منزلِ سکوں
بدلے ہمارے دل نے کئی بار راستے

چل تو پڑے ہو حضرتِ عاقل یہ سوچ لو
دنیائے آرزو کے ہیں دشوار راستے

غیاث احمد گدی

فتح پور لین، جھریا، بہار

پھر وہی کنج قفس

اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا دیواریں وہی تھیں' وہی دروازے' وہی ن پھولوں والے پردے' کھڑکی میں ہوا کی زد پر لرز رہے تھے۔ ایسے وہ تین ماہ پہلے رتے چھوڑ گئی تھی۔ وہی پرانی سنگھار میز وہی پلنگ' وہی صوفے' اور دیوار پر آویزاں ماکے باپ کی تصویر' بیس برس پہلے کی وجیہہ' خوبصورت' جوان' روشن آنکھوں ر چوڑی پیشانی والا آدمی' اس کا پتا ......

اس نے محبت سے' احترام سے اندر ہی اندر اس کو سلام کیا۔

ہر روز' ہر صبح' جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا۔ ایک عجیب سے ناقابل فہم بے کے زیر اثر اس کی آتما تصویر والے خوبصورت آدمی کو سلام کرتی آئی تھی۔ ب اس کے شعور نے آنکھیں کھولیں' کلا کے سامنے پہلا مرد یہی تھا جو اس کا باپ تھا۔ سالاب تھا۔ جس سے اس کا ایک عجیب سا دوستانہ تھا کہ جب تک شام کی چائے ب ساتھ نہ پی لیتی اسے اچھا نہ لگتا۔ جب تک اس کے بستر اپنے ہاتھوں سے رست نہ کر لیتی عجیب سا محسوس ہوتا۔ جب تک رات گئے تک غالب کے اشعار سنا دینی کبیر کے دوہے نہ پڑھ لیتی' خود کو ادھورا ادھورا محسوس کرتی۔

اور جب تک اس کا باپ اس سے باتیں کرتے کرتے نیند کی پگڈنڈیوں پر بھٹک جاتا' وہ ہزار ضروری کام چھوڑ کر وہیں بیٹھی رہتی۔ پھر جب اس کا باپ سوجاتا تب وہ ہستہ سے اٹھتی' اس کے ننگے پیروں پر چادر ڈالتی' اور ایک بار نظر اٹھا کر چاروں طرف دیکھ کر آہستہ سے اس کی پیشانی .... کو ذرا دور سے چوم لیتی' اور دفعتاً بلا ارادی طور پر اس کی نگاہیں دروازے کی طرف اٹھ جاتیں۔

اور جب وہ یہ کر چکتی تو اس کو عجیب سا محسوس ہوتا' ایسا کیوں۔؟ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ وہ اپنے باپ کو چومنے بڑھتی ہے' پھر ایسا کرتی ہے تو اس کی نگاہیں چوروں کی طرح دروازے کی طرف کیوں اٹھ جاتی ہیں۔ وہ اپنے من کے سمندر کو کھنگال کر دیکھتی ہے۔

پھر دل کو کھنگال کر دیکھنے کی بھی کیا ضرورت ہے۔؟

وہ اپنے پتا سے اکثر کہہ اٹھتی۔ "آپ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں باؤجی .... کیوں بولیے تو .....؟"

وہ قہقہہ لگا کر ہنستے اور کلا کو گلے سے لگا لیتے۔ کیونکہ میں تمھارا باپ ہوں...

اور میں کوئی نہیں ہوں —! اس دم اس کی ماں کمرے میں داخل ہوئی —

"میں کیوں اچھی نہیں لگتی کلا کو' میری طرف تو کبھی پیار سے بڑھتی بھی نہیں لڑکی'...

کیونکہ کلا صرف اپنے باپ کی بیٹی ہے۔ ماں کی نہیں۔" باپ فیصلہ کن لہجے میں کہتے اور ہنس پڑتے۔ تم تو اندر کی ماں ہو' سیتا کی ماں ہو' ....

تب کلا کو احساس ہوتا کہ شاید ماں کی شکایت ..... سچ ہے' کبھی تو اس کی خواہش نہیں ہوئی کہ وہ اپنی ماں کے کندھے پر سر رکھ کر کسی چیز کی فرمائش ہی کر لے' کچھ کہنا ہو تو باؤجی سے ہی بولتی ہے۔ اندر اور سیتا ماں سے چپٹے رہتے ہیں۔ اس کی خواہش کیوں نہیں ہوتی .... کلا نے سوچا کہ شاید یہی سچ ہے کہ وہ اپنے باپ کی بیٹی ہے' ماں کی نہیں' ماں نے اس کو جنم دیا ہے بس اتنا ہی اس سے ناطہ ہے۔

عورت کے نام پر جس عورت کو سب سے پہلے دیکھا' وہ اس کی ماں تھی۔ جسے اس نے کبھی پسند نہیں کیا۔ عجیب سی اجاڑ صورت' بال بکھرے رہتے۔ کپڑے الول جلول' گال دھنسے اور آنکھیں مردہ' عورت کا وجود مرد کے مقابلے میں کتنا حقیر ہے۔ اس کے باپ کے سامنے اس کی ماں ....

پھر پتہ نہیں کیوں جیسے جیسے وہ شعور کی دنیا میں قدم رکھتی گئی عورتیں اسے اچھی نہ لگنے لگیں۔

اور مرد —!

مرد کے نام پر اس کی آنکھوں نے صرف ایک کو دیکھا تھا۔ شفیق' مہربان' باوقار اس کے دل نے یہ فیصلہ صادر کر دیا کہ عورت کے مقابلے میں مرد بہرحال بہتر ہے۔ مقدم ہے۔ چنانچہ وہ سیتا سے زیادہ اندر کو چاہنے لگی۔ دن دن بھر اندر کے ساتھ کیرم کھیلنا اچھا لگتا۔ مگر سیتا یا اس کی ماں چلاتی رہتی کہ ذرا دیر کے لیے رسوئی میں آ کر مدد کرے یا سیتا کی پڑھائی لکھائی پر نظر رکھے' وہ اس سے نہیں ہوتا۔ وہ اندر کو پڑھاتی' اس کے کپڑے بدلتی' اندر کی پیشانی چومتی ......

پھر اسے دفعتاً عجیب سا محسوس ہوتا اندر کی کشادہ پیشانی اس کے باپ

سے کتنی ملتی جلتی ہے۔ ہمدردانہ نام پر اس کے شعور کے طاق میں جو چراغ روشن ہوا
وہ کتنا محترم، قابلِ عزت ہے اس کا باپ۔ یا پھر اس سے ملتی جلتی تصویر اندر اس کا
چھوٹا بھائی۔ وہ سارا سارا دن اپنی پیٹھ پر اندر کو سوار کیے رہتی۔ اور اندر سارا سارا
دن اپنی بہن کلا کے گلے سے چپٹا رہتا۔ پھر کہیں سے بھاری بھرکم جوتوں کی آواز آتی۔
وہ جھٹ سے اندر کو گود سے اتارتی اور لپک کر سیڑھیاں طے کرتی نیچے بھاگتی۔ دہلیز
پر جیسے ہی قدموں کی چاپ جگتی وہ خوشی سے کھل اٹھتی۔

باؤجی ——!

اور اس کا باپ مسکرا کر شفقت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتا سیڑھیاں
چڑھ جاتا۔

مگر شام بھی سنولا گئی۔ اندھیرا جھک آیا۔ اس نے باہر جھانک کر دیکھا تو
سڑکی لیمپ پوسٹ بھی روشن ہو چکے تھے۔ کتنی دیر ہوگئی۔ صبح ..... صبح، دوپہر
شام، .... شام، شام، جو رفتہ رفتہ کروٹ بدلتی جا رہی تھی۔ اس کا جی چاہا وہ
چیخ چیخ کر رو پڑے، ایسا کیوں ...؟ آج ایسا کیوں ...؟

اس کی سماعت کی وادی سنسان ہے اور کسی کے قدموں کی چاپ ابھی تک
نہیں آئی...

وہ پھر کمرے میں لوٹ آئی۔ مسکراہٹ اس کے لبوں پر چراغ روشن کرنے لگی پھر...
پھر وہی کمرہ، دیواریں، دیواریں، لوہے کی سلاخوں والی کھڑکیاں، پھر وہی
کنج قفس....

جتنا کچھ جس کا باقی ہوتا ہے دینے والا ہزار بھاگتا پھرے لینے والا اپنا ایک
سکہ نہیں چھوڑتا۔ یہ قرضوں کی دنیا، یہ جمع تفریق کی دنیا، یہ ضرب تقسیم کی دنیا۔

وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی کمرے کے دوسرے کونے تک گئی۔ بازو والے
کمرے میں روشنی ہو رہی تھی، تب اسے اپنے کمرے کی تاریکی کا احساس ہوا اس
نے ہاتھ بڑھا کر روشنی کرنا چاہی مگر رک گئی۔

اور پھر ٹہلتی ہوئی دوسرے کمرے تک گئی۔ بازو والے کمرے پر صرف
ایک خوش رنگ پردہ پڑا تھا۔ اندر سیتا اور ماں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ بازو
والے کمرے میں سے اس کا بھائی اندر ابھی ابھی نکل کر وکٹ ہاتھ میں لیے باہر
گیا تھا۔

گیارہ دن ہوگئے۔ گیارہ راتیں گزر گئیں وہ اس کمرے میں قیدیوں
کی طرح پڑی ہے۔ نہ سیتا آئی اور نہ اندر نے جھانک کر پوچھا کہ دیدی کیسی ہو۔
چند لمحوں کے لیے ماں بھاری قدموں سے آتی، دکھ سے اس کی جانب دیکھتی،
پھر مجرموں کی طرح سر جھکائے چلی جاتی.....

یہ دو کمروں کے درمیان والا خوش رنگ پردہ کتنا بھاری ہوگیا ہے
کوئی اس طرف.....

دفعتاً کلا کے پاؤں تیزی سے اٹھ گئے۔ میں یہ پردہ ہٹاؤں گی میرے
بازوؤں میں بہت دم ہے مگر جیسے ہی اس نے پردے پر ہاتھ رکھا ایک لمحہ کے
لیے اس کا سارا بدن سن ہوگیا۔ اس کے ہاتھ سہم گئے۔

کیا ہے کلا ——؟ یہ اس کی ماں کی آواز تھی۔ کچھ چاہیے کیا۔؟

کلا سمجھ گئی ..... وہ کیا کچھ کھو کر آئی ہے ..... اس کے اپ
میں کیا کچھ گھٹ گیا ہے، وہ سمجھ گئی۔

چائے بھجوا دوں ——؟

نہیں ماں کچھ نہیں۔ اس نے کہا۔ ماں کی آواز میں کتنا پیار ہے
پیار ہے ..... کتنی جان لیوا محبت ہے، ماں کیسی عجیب ماں ہے .....
آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ باؤجی ابھی تک ..... اس کی آواز رند

تمہارے باؤجی آج کل دیر سے آتے ہیں۔ جب خوب اندھیرا جھک
اس کی ماں کی آواز میں کنارسی چھپی تھی جو ٹھیک اس کے کلیجے کو لگ گئی۔

ایک تڑپ، ایک عجیب سی فحش گالی کا احساس اسے برما گیا۔ ماں کی
کتنی گندی، اتنی بے ہودہ گالی دے گئیں۔

ایسا کیوں ہوا۔ اس نے کب کہا تھا کہ مجھے واپس بلالو۔ اس نے
رہنے کے لیے جو راستہ چنا تھا، کیوں اُسے زبردستی بلوایا گیا، کیا
ایسی گالیاں دینے کے لیے ——؟

وہ ماں سے لڑ پڑے گی۔ وہ ماں کا منہ نوچ لے گی۔ جس نے
غنڈے بھائی کو بھجوا کر اسے سدھیر کے کلیجے سے نوچ کر منگوا لیا تھا۔

مگر کلا سہم بھی گئی۔ دفعتاً سدھیر اس کے ذہن کے افق پر
جانے غریب غنڈوں کے چاقوؤں کی تاب بھی لا سکا ہوگا۔ جانے محبت
جرم میں اس کی لاش مہابلیشور کی چٹان پر پڑی ابھی تک سڑ رہی
کی آنکھیں بھیگ آئیں۔ دل میں ایک نشتر سا چبھا اور اترتا چلا گیا۔

سدھیر... سدھیر... تم بھولتے کیوں نہیں ... تم بھولتے

وہ چارپائی پر آ کر لیٹ رہی۔ اس نے اپنی کلائی پر لگے زخم کو
اندھیرے میں اسے کچھ دکھا نہیں۔ اس نے آہستہ آہستہ اپنے زخم پر
پھیریں۔ ہلکی سی خراش تھی۔ جواب مٹ بھی رہی تھی۔ صرف گیارہ دن

کچھ دن اور گزر جائیں گے تو تم یاد بھی نہیں آؤ گے شاید...

دوسرے کمرے سے سیتا کے ہنسنے کی آواز آئی۔ وہ چونک گئی
دل میں آیا کہ آگے بڑھ کر وہ سیتا سے پوچھ لے۔ وہ کس بات پر ہنس
اس کے جی میں آیا کہ سیتا سے درخواست کرے، اس کو بھی اپنی ہنسی
کرلے۔ کتنے دن ہوگئے ہنسی کی ایک پھوار بھی اس کو چھو کر نہیں گئی۔
پھر کسی بات پر ہنسی، اس بار ماں کی ہنسی کی آواز بھی آرہی تھی....
دور، الگ تھلگ ... اس کی ماں اور اس کی بہن .....

اس کے ہونٹوں پر بڑی تلخ مسکراہٹ اجاگر ہوئی .....
کی ماں اس سے برسوں کا بدلہ لے رہی ہے، ساری زندگی اس نے
طرف پلٹ کر بھی نہیں دیکھا تھا، وہ ماں کو جانتی ہے وہ ایک ایک
وصول کرکے رہے گی۔

ماں! .... اس نے دل میں کہا کسی دن کوئی مر بھی جائے

طرح ہنستے رہنا۔

دفعتاً کلا اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے اپنی بھیگی ہوئی آنکھوں کو خشک کیا۔ لڑکھڑاتی بندھائی اور آہستہ آہستہ کمرے میں ٹہلنے لگی۔ تاریک کمرے میں وہ گم کردہ راہ مسافر کی طرح بھٹک رہی تھی۔ چلتے چلتے وہ رک گئی۔ اس نے کھڑکی سے جھانک کر باہر دیکھا جہاں بے پناہ اندھیرا تھا۔ وہ پھر ڈر گئی۔ کوئی اس کے دل کو دہلائے جا رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے کھڑکی بند کر دی جیسے باہر کے اندھیرے کا راستہ ہی بند کر دیا ہو۔

دھیرے دھیرے وہ چلتے ہوئے اس دیوار تک آئی جہاں بجلی کے بٹن تھے۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر بٹن دبا دی۔ ایک کھٹکا سا ہوا پھر کمرہ روشن ہو روشنیوں سے امڈ پڑا۔

سامنے جس چیز پر اس کی نظریں اٹھیں وہ اس کے باپ کی تصویر تھی۔ باؤجی..... اس کے لب ہلے..... گیارہ دن ہو گئے۔ میں نے آپ کی جھلک تک نہیں دیکھی۔" اس کی آنکھیں بھر آئیں..... کیسے سنگ دل ہیں آپ۔ کیسے دوست ہیں میرے... مجھے سہارا نہیں دیتے ذرا۔ مجھے آپ کے شفیق ہاتھوں کی نرماہٹ درکار ہیں باؤجی... میں لٹ کر آئی ہوں، میرے اچھے باؤجی.....!

کلا ہنک کر رو پڑی۔ اس بھری پُری دنیا میں آپ کے علاوہ میرا ہے ہی کون۔ مانا میں نے آپ کی بات نہیں مانی.... باؤجی آپ تو میری بات مان لیجیے۔ کیسے سنگ دل دوست ہیں آپ.....

وقت ـــ پر بہت دیر بعد کلا نے پلٹ کر دیکھا۔ وقت بہت ہو چکا تھا۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ مگر کیسی پہاڑ سی رات تھی کہ کٹنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ اس نے دروازہ کھولا اور باہر بالکنی میں آ گئی۔ سامنے آسمان سیاہ بدہیئت بادلوں سے بھرا پڑا تھا۔ اندھیرا چاروں کھونٹ خیمہ زن تھا۔

مگر کلا آہستہ سے مسکرائی۔ ایک عجیب سی پھیکی اداس مسکراہٹ... لیکن رات خواہ کتنی ہی بھاری کیوں نہ ہو بالآخر گزر ہی جائے گی، پھر دن کا اجالا ہے.....!

صبح کوئی فرق نہیں پڑے گا، گیارہ صبحیں آئیں اور گزر گئیں، گیارہ راتیں آئیں اور.......

یہ بھی گزر ہی جائے گی کیا فرق پڑتا ہے۔ اجالے اندھیرے کا چکر۔ اس کی قسمت کی تاریکی۔ یہی سچائی تھی۔ سچائی کہاں تھی... کلا نے سوچا... اور کہاں لٹ گئی ـــ؟

کیا یہ بھی سچائی تھی کہ جس ماں باپ نے اسے جنم دیا تھا وہی اس کے مقدر کے نگہبان تھے۔؟ اس نے ماں سے لڑکر... باپ کی بے پناہ محبت کو ٹھکرا کر اس جذبے کا ساتھ دیا تھا جو سچا تھا، کھرا تھا، زندگی کی طرح دھڑکتا ہوا تھا۔

کیا سچائی یہ بھی تھی کہ اس کے ماں باپ کے ہاتھوں میں آئی سچائی تھی کہ اسے بزدستی اس کے محبوب کی آغوش سے چھین لے آئے۔ دونوں مہابلیشور کی پہاڑیوں کے دامن میں ایک دوسرے کے لیے چیختے رہے، چلاتے رہے، سولی کو پکتے رہے مگر سچائی یہ ثابت ہوئی کہ..... وہ آج پھر یہیں ہے۔ پھر وہی کنج قفس، پھر وہی.....

اور سدھیر ـــ؟ پتہ نہیں ـــ دفعتاً اس کے دل میں ہوک سی اٹھی اور اس کے سارے وجود کو زخمی کر گئی۔ پتہ نہیں، وہ غریب..... کہاں ہے ـــ؟

اس نے باہر آسمان کی طرف دیکھا۔ سارے پھول، سارے پودے اندھیرے میں ڈوبے ہوئے تھے اس کے... اس کے اپنے مقدر کی طرح.... اسے جلن سی ہوئی اس کے دل کے انتہائی تاریک گوشے سے ایک آواز تیز چھری کی دھار کی طرح چمکی، کاش.... کاش اس نے.....

دفعتاً وہ پلٹ آئی۔ وہ ایسا کیوں سوچ رہی ہے۔ اسے ایسا نہیں سوچنا چاہیے..... اس کی حقیقت پسند طبیعت... خود اپنے آپ کا جائزہ بھی.... میں بھی تو زندہ ہوں.... زندگی سے سمجھوتہ کر چکی ہوں۔ کسی نہ کسی دن کروں گی۔

کلا نے سنبھالا لیا۔ ہزاروں لاکھوں برس بعد بھی آج کی دنیا میں محبت جوں کی توں خود غرض ہے۔ اسے عجیب سا لگا۔ ایسی مطلب پرست ہو ـــ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی آنکھوں میں ابھی ابھی کون تھا ـــ؟ عجیب سا، ناتواں سا معر......

اس نے سدھیر کو مانو اپنے بھیگے بھیگے پپوٹوں میں محفوظ کر لیا ـــ اب تمہیں کوئی گزند نہ پہنچا سکے گا..... تم جہاں رہو..... کلا نے محبت سے، بے پناہ محبت سے بکھر کر کہا، خدا کرے تم جہاں بھی رہو..... سکھی رہو، ایسے خوش رہو کہ خود زمانہ تم سے خوش رہنا سیکھے.....

جلتا ہوا گرم آنسو اس کی پلکوں کی شاخ سے ٹوٹ کر باغ کی سیاہی میں ڈوب گیا... خوش رہو۔

خوش رہو !!!

سدھیر... سدھیر......!

گیارہ دن، گیارہ جاگتی راتیں... وقت ہوا کے جھونکے کی طرح گزرتا ہے۔ اور قدموں کے نقش کو دھندلا کرتا چلا جاتا ہے..... کبھی پلٹ کر نہیں دیکھتا وقت ـــ... وقت کا سمندر اتھاہ ہے، زندگیاں چھوٹی چھوٹی لہروں کی طرح اس کے دامن سے پھسلتی اگلے کنارے سے ٹکراتی ہیں اور دفعتاً فنا ہو جاتی ہیں۔ وقت بے پناہ ہے ـــ کلا نے آنکھیں بند کر لیں، سوچتے سوچتے اس کا سر دکھنے لگا۔ اس نے آہستہ آہستہ اپنی پیشانی پر ٹھکے مارے۔ اور اداسی سے مسکرا پڑی، وقت کا سمندر بے پناہ ہے۔ اور جو فنا نہیں ہوتیں وہ پاگلوں کی طرح بولائی پھرتی ہیں۔ وقت کو نہ خود قرار ہے اور نہ یہ کسی کو لمحہ بھر سکون سے بیٹھنے دیتا ہے۔

جانے وقت کے سمندر میں بیٹھا ہوا وہ آدمی کہاں ہوگا ـــ؟

سدھیر..... اس کے خوابوں کی سچائی، اس کے سمندر کا جوار، اس کے

لاجوردی آسمان کی بے پناہ وسعت !

کلا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بیدار ہوئی۔ افسردگی کی پروردہ مسکراہٹ۔

یہ سب الفاظ ہیں، الفاظ محض، دفعتاً کلا کے حقیقت پسند دماغ نے سوچا۔ جذبے، اور الفاظ، دو الگ الگ چیزیں ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے کس درجہ محتاج ہیں۔ اگر جذبہ نہ ہو تو الفاظ کی سچائیاں کیا معنی رکھتی ہیں۔ دلوں میں کسی بے پناہ جوار کی طرح اٹھنے والے جذبے، کسی بگولے کی طرح، رقص کرتے ہوئے جذبے، الفاظ نہ ہوں تو آخرکار دل کے سمندر میں تڑپ کر رہ جاتے ہیں، ... زیادہ سے زیادہ ..... زیادہ سے زیادہ

کلا نے دیکھا اس کی آنکھیں بھر آئی ہیں۔ اس نے اپنے کلیجے کی انگلی سے اپنی آنکھوں کے سمندر کو دیکھا، کئی سوچیں کناروں سے ٹکرا کر جھک گئی تھیں۔ اس کے دل میں درد سا اٹھا، فرطِ جذبات سے اس کے ہونٹ تھرتھرائے۔

اس نے ہونٹوں کو دانتوں تلے دبا لیا اور آہستہ سے ہاتھ کو کلیجے پر رکھ لیا جہاں ہولے ہولے درد ہو رہا تھا۔ جانے کوئی چھری سی دھیرے دھیرے اتر رہی تھی۔ کلا نے مسکرانے کی کوشش کی، ..... مگر آنکھوں سے دو گرم گرم قطرے ٹپک ہی پڑے۔ مانو یوں کہ دو بوند جو اس کے دل سے جھٹک کر آنکھوں میں آ گئی تھی ......

سدھیر ... سدھیر ..... میں کس سے بولوں، ؟ کس سے تمھاری باتیں کروں ؟؟

میرا دل پھٹ جائے گا، میں کتنا ضبط کروں، میرے سنگ دل سدھیر ..... ؟

اس کے دل کے ویرانوں میں جذبے بگولوں کی طرح فلک پیما تھے۔ اس کی آنکھوں میں پھر آنسو آ گئے ..... اسے الفاظ چاہئیں" اسے الفاظ چاہئیں۔ جن کے لیے اس کے جذبات بھٹک رہے ہیں۔ دل ہی دل میں بھٹک رہے ہیں اور اس کی ہستی کو ہلائے ڈالتے ہیں۔

اس کے پاس الفاظ نہیں، اس کے پاس الفاظ ہوں بھی تو کوئی سننے والا نہیں، وہ اپنے عجز کے اظہار کے لیے بیتاب تھی۔ ساتھ ہی اظہار کا عجز بھی دامن نہیں چھوڑتا تھا۔ وہ ایسے الفاظ کہاں سے لائے جو اس کے غموں کے بے پناہ سمندر کو احاطہ میں لا سکیں، ... اور ایسے الفاظ مل بھی گئے تو وہ سماعت کہاں سے پا سکتی ہے جو سب سُن سکے۔

کلا نے سوچا، کوئی نہیں — اتنی بڑی دنیا میں کوئی ہو سکتا ہے تو ......

اس نے خاموشی سے لیٹے لیٹے اپنے آنسوؤں سے بھیگی آنکھوں سے دیکھا، اس کے باپ کی تصویر کمرے کے اندھیرے میں ایک دم سے غرق تھی — اس کا باپ، شفیق باپ، اس کا دوست، زندگی کے طاق کا وہ روشن چراغ جو اس کے سن و شعور نے جلایا تھا۔ وہ آج اندھیرے کی آغوش میں تھا ... اندھیرا ...... اندھیرا ... جیسے وقت کا سمندر گرجتا چنگھاڑتا اندھیرے کی وادی میں بھٹک گیا ہو۔ کلا کا دل کانپ اٹھا۔ یہ چھوٹا سا کمرہ تاریک تھا۔ باہر باغ کی خاموشیوں میں ہوا ساکت ہو گئی تھی۔ اور تاریکی کسی بیمار دل کی طرح آہستہ آہستہ برس رہی تھی، بہے جا رہی تھی ......

دفعتاً کلا کو خوف سا محسوس ہوا ..... وہ کہاں ہے — ؟ اندھیرے میں ... ؟ ایسی جان لیوا تاریکی ..... وہ کہاں ہے — ؟ ... سدھیر کہاں ہے — ؟ اس کا جہاز وقت کے سمندر میں غرق ہو گیا، کوئی ..... کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا ..... سدھیر! کوئی ایک ڈوبتے جہاز کا مستول دکھائی نہیں دیتا ..... اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں اور دیکھنے کی کوشش کی ..... کہیں کچھ نہیں — ! صرف اندھیرا، فقط اندھیرا !! اس کا ہندستان، دیوالی کے چراغوں سے جگمگاتا ہندوستان، کتنا تاریک ہے، کتنا ویران ہے جیسے کسی قزاق نے، کسی لالچی غزنوی نے اسے مسلسل لوٹا ہو۔ کسی انگریز نے تاراج کر کے رکھ دیا ہو۔

گہرائیوں سے ایک ہوک سی اٹھی۔ وہ تڑپ کر رہ گئی۔ میرے چشتی ... کہاں کھو گئے تیرے نغمے کہ آج میرے ہندوستان کے کلیجے سے دھواں اٹھ رہا ہے دھول اڑ رہی ہے ....

آنسو آنسو ......

خوش رہو ..... سدا، ہمیشہ، ابد تک .....

دفعتاً کلا چونک اٹھی۔ وہ پاگل ہو گئی ہے۔ یہاں کوئی نہیں۔ صرف سناٹا ہے۔ فقط اندھیرا ... تا حدِ نگاہ تک پھیلا ہوا اندھیرا ......

اس نے بالکونی پر کھڑے کھڑے چاروں طرف جھانک کر دیکھا۔ یہاں کوئی نہیں، اس کے پاؤں آہستہ آہستہ اٹھے۔ اس نے ابھی ابھی کسی کی پیشانی کو چوما تھا۔ یہ آدمی کہاں کھو گیا — ؟ تاریکی کے کس پردے میں گم ہو گیا۔ کہاں ..... ؟؟

اس نے اپنے تخیل کی پرواز کو روکا۔ اس نے دیکھا وہ جس زمین پر کھڑی ہے وہ سخت ہے۔ اس نے نگاہیں اٹھا کر اوپر دیکھا، وہ جس آسمان کے نیچے کھڑی ہے وہ بہت دور ہے۔ اور اس کے آس پاس کوئی دوسرا نہیں۔ سناٹا، اندھیرا، ایک گہری، کبھی نہ ٹوٹنے والی، کبھی نہ تڑخنے والی چپ وہ تنہا ہے ... !!

ایک تو وہ اس دروازے کے قریب کھڑی تھی، اس کمرے کے پاس کھڑی تھی جس کے اندر اس کا باپ سویا ہوا تھا۔ دروازہ بھڑا ہوا تھا اندر سے پنکھے کی آواز آ رہی تھی۔ ہلکی سبز روشنی دروازے کے دراڑ سے جھانک رہی تھی۔

غیر ارادی طور پر ایک نا محسوس جذبے کے زیر اثر اس کی انگلیوں نے دروازے کو ٹھیلا، دروازہ کھل گیا۔ ہلکی سی چرچراہٹ پیدا ہوئی۔ جب اس نے کمرے کے اندر قدم رکھا تو یکبارگی اس کا دل بہت

ور سے دھڑکا، پھر تھم گیا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمکیں۔ ایک ساخوف، ایک ڈر سا محسوس ہوا۔ احساسِ جرم، پھر وہ شانت ہوگئی۔ س نے نظریں اٹھاکر دیکھا تو سامنے پلنگ پر اس کا باپ سویا ہوا تھا، لیکن سبز وشنی میں اس کا بوڑھا جسم پلنگ پر یوں پڑا تھا گویا اس میں جان ہی باقی نہ ہی ہو۔ وہ قریب پہنچ گئی، اس نے گہری نظر سے دیکھا، اس کے باپ کے ہرے پر تفکرات نے اپنا سایہ ڈال دیا تھا، کچھ مزید جھرّیاں نظر آئیں جو آج سے پہلے نہیں تھیں۔

اس نے پلٹ کر دیکھا کمرے میں کوئی نہیں جو اسے دیکھ رہا ہو، وہ یوں ڈر جاتی ہے۔؟ اس کے کمرے میں کوئی اسے دیکھ لے تو کیا ہوگا؟؟ س عجیب سے بے تکے سوال کا جواب اسے نہیں ملا۔ بائیں طرف والا دروازہ کھلا تھا۔ بائیں طرف والے کمرے میں ماں اور سیتا سو رہی ہونگیں، وہ دھڑکتے ہوئے دل اور لرزتے پیروں سے چلتی ہوئی آگے بڑھی اور بڑھی، آہستگی سے دروازہ بند کردیا۔

پھر پلٹ کر پلنگ تک آئی اس کے باپ کے پیر ننگے تھے چادر پھسل کر نیچے فرش پر جھول رہی تھی۔ کلا نے آہستہ سے چادر اٹھاکر اپنے بوڑھے بے خبر سوتے ہوئے باپ کے پیروں پر ..... وہ رک گئی۔ اس نے چادر پرے کردی اور مدھم روشنی میں آنکھوں پر زور دے کر اپنے باپ کے سوتے سوتے پیروں پر نظریں گاڑ دیں۔ اس کا دل بھر آیا۔ دل کے ویرانے میں کہیں سے نرم ہواؤں کے جھکڑ سے چلے، دھول سی اڑی، کلیجے میں درد جاگا اور آنکھیں چھلک آئیں، بے اختیار رو کر اس نے آہستہ سے، بے حد آہستہ سے اپنے تھرتھراتے ہوئے لب اپنے بوڑھے شفیق، مہربان باپ کے پیروں پر رکھ دیے۔

کون۔؟ کلا۔؟؟ اس نے پلنگ کے پاس جھولتی ہوئی سوئچ دبا دی، روشنی ہوئی، انھوں نے آہستہ سے پاؤں کھینچنا چاہا، مگر رک گئے۔ ان کے پیروں سے لگی اس کی بیٹی کلا رو رہی تھی ..... انھوں نے ہاتھ بڑھا کر کلا کو کھینچا اور سینے سے لگا لیا۔ تم رو رہی ہو بٹیا ...؟

دفعتاً کلا کے منہ سے چیخ نکلی، وہ اپنے باپ کے کلیجے سے لگی اپنی پرانی جائے پناہ میں سر چھپائے بچوں کی طرح رونے لگی ..... باؤ ..... باؤجی ..... مجھے، مجھے معاف ......

اس کی آواز کہیں آنسوؤں میں بھٹک گئی۔

ایک دہلا دینے والے جذبے سے بیتاب ہوکر اس کے باپ نے کلا کے سر پر ہونٹ رکھ دیے اور خود ان کی آنکھیں، ان کا بوڑھا دل رو پڑا ..... تم کہاں چلی گئی تھیں بٹیا ....؟ تم نے کیا نادانی کرلی کلاوتی ....؟؟ تمھیں کیوں یہ محسوس نہیں ہوا کہ کوئی تمھارا باپ بھی ہے جس کی آنکھیں ساری دھرتی کو چھانتی پھر رہی ہونگیں ... مجھے تنہا چھوڑ کر ......

آپ مجھے ڈھونڈ رہے تھے .... کلا نے رندھے ہوئے گلے سے کہا اور تعجب سے اپنے باپ کے چہرے کی طرف دیکھا ... آپ مجھے کیوں ڈھونڈ رہے تھے باؤجی ......

ہاں بٹیا ــ میں بینک سے واپس آکر آدھی آدھی رات تک بالکونی سے لگا سڑک پر نظریں گاڑے رہتا ــ! انھوں نے پہلے کلا کے آنسو پونچھے، پھر اپنی آنکھیں خشک کیں ــ بینک میں سارا سارا دن کام کرتے کرتے ایسا محسوس کرتا جیسے تم گھر واپس آگئی ہو۔

نہیں باؤجی ... کلا نے سنبھل کر کہا ... نہیں ایسا ہوتا تو ... آج گیارہ دن ہوگئے ...

میں تمھارے کمرے میں کئی بار گیا ہوں کلا، آدھی آدھی رات کو، جب تم آرام کرسی پر لیٹی ہوتیں۔ کھڑکی سے لگے باغ کی جانب ٹکٹکی لگائے تک رہی ہوتیں، یا پلنگ پر سو رہی ہوتیں ...... میں کھڑکی سے تمھیں دیکھتا، کئی بار جی چاہا اندر جاکر تمھیں ..... اپنے ہاتھوں سے خوب پیٹوں، خوب ماروں .....

پھر کیوں ــ؟ کلا نے پیار سے اپنے شفیق باپ کی طرف دیکھا۔ اس کا دل بھر آیا ــ اب ماریے باؤجی ... مجھے خوب ماریے، میں نے آپ کے دل کو دکھ پہنچایا ہے۔ مجھے سزا دیجیے ــ"!

انھوں نے کلا کے بکھرے ہوئے بالوں کو سہلایا۔ بڑے پیار سے ان پر ہاتھ پھیرے ــ نہیں کلاوتی، کوئی اپنے کلیجے کے ٹکڑے کو کیسے سزا دے سکتا ہے"!

کلا پھر رو پڑی، سسک سسک کر رو پڑی۔

پھر کافی دیر ہوگئی۔ سارے دکھ، ساری اذیتیں کہیں بہہ گئیں انھوں نے ہاتھ بڑھا کر سائڈ ٹیبل سے سگار اٹھایا۔ لبوں میں دبا کر دیا سلائی دکھائی اور آہستہ سے کلا کو الگ کرتے ہوئے کہا ــ کلا مجھے ایک کپ کافی بنا کر دو بٹیا۔ دیکھو اسی کونے والی میز پر کافی اور ہیٹر رکھا ہے۔ جب سے تم گئی ہو میں نے اپنے کمرے میں ہی سامان رکھوا لیا ہے۔ کس کو تکلیف دیتا۔

کلا اٹھی اس نے اپنے بکھرے بالوں کو گردن سے پرے پھینکا اور ایک عجیب سے والہانہ انداز سے اپنے باپ کی طرف دیکھا۔ ابھی بناتی ہوں باؤجی ابھی...

پھر کلا نے جب ایک پیالی کافی ان کی طرف بڑھائی تو پیالی لیتے ہوئے انھوں نے کہا۔ اور تم، تم نہیں پیوگی ــ؟ نہیں باؤجی ــ!

کیوں نہیں۔ لو لو ورنہ میں بھی نہیں پیتا۔ اور ذرا ٹھہر کر انھوں نے کلا کی طرف دیکھا۔

اور اب وہ خود اعتمادی سے بولے۔ چھوڑو کلا، خاک ڈالو، کل تک جو کچھ ہوچکا اس پر تھوک دو۔

ذرا دیر بعد جب کلا کافی کی پیالی تھامے ان کے قریب بیٹھ گئی اور کافی کا ایک گھونٹ بھر کر گردن جھکا لی تو انھوں نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ــ سمجھو کل سے تمھاری زندگی کا نیا دن شروع ہوا۔ نہ تم دن بھر کمرے میں بند رہوگی نہ میں منھ اندھیرے گھر سے نکلوں گا اور رات گئے آؤں گا۔ چلتے چلتے ٹھوکر لگ کر آدمی گر جائے، اگر کر لیٹ رہنے لگتا ہے تو دنیا اس پر ہنسنے لگتی ہے، اگر ہمت کرکے گرنے والا اٹھ کھڑا ہو اور اعتماد سے پھر چلنے لگے تو

(بقیہ صفحہ ۳۰ پر)

فکر تونسوی
ڈی ۵۰، گل مہر پارک، نئی دہلی

طنز و مزاح

ایک بُوڑھے نے کہا

کچھ دن ہوئے ایک دوست نے خط میں لکھا۔

"کل ایک ادبی رسالے میں تمہارا فوٹو دیکھا۔ یار! تم تو باقاعدہ بُوڑھے ہو گئے ہو حالانکہ میرا پختہ یقین تھا کہ تم ایک 'کوکڑو' ہو۔ جو کسی بھی ہانڈی میں نہیں گلتا۔ نہ مذہب میں، نہ سیاست میں، نہ ادب میں——"

احتیاطاً عرض ہے کہ میرے وہ دانش ور دوست مجھ سے عمر میں دس سال بڑے ہیں۔ اور اکثر بڑی تمکنت سے دعویٰ کرتے رہے ہیں کہ بُزرگی بعقل است نہ کہ بسال۔ لیکن اپنے آپ کو بُوڑھا تسلیم نہیں کرتے۔ اور یوں بھی دُنیا کا کون سا فرد ہے جو اپنے بڑھاپے کا اعتراف کرتا ہے۔ خود میں نہیں کرتا۔ حالانکہ کئی کافر ادا حسینائیں مجھے "انکل" کہہ چکی ہیں۔ وہ حسینائیں بھی کہہ چکی ہیں جنھیں میں بزعم خود دل دے چکا ہوں۔ مگر میں سوچ کر انھیں طرح دے جاتا ہوں کہ یہ بچاری گُمراہ ہو چکی ہیں۔ آہستہ آہستہ راہِ راست پر آجائیں گی۔

تاریخِ عالم میں اپنے بُڑھاپے کا اعتراف صرف ایک راجہ نے کیا تھا۔ جس نے ایک دن آئینہ دیکھا تو اُسے داڑھی میں سفید بال نظر آگیا مگر اس اعتراف کا نتیجہ کیا ہوا؟ کہ وہ راج پاٹ سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ جو حضرات پولٹیکل سائنس کی بجائے صرف اخلاقِ حسنہ سے کام لیتے ہیں اُن کا یہی حشر ہوتا ہے۔

اُس دانش ور دوست کا خط ملنے پر تو آئینہ میں نے بھی دیکھا۔ مگر اُس میں نہ سفید بال نظر آیا نہ کالا۔ کیونکہ میں نے شیو کی ہوئی تھی۔ جو لوگ روزانہ شیو کرتے ہیں اُن کا راج پاٹ محفوظ رہتا ہے۔ چاہے اُن کا راج پاٹ صرف دو کمروں والے اُس مکان تک محدود ہو جہاں وہ بطور کرایہ دار رہتے ہوں۔

آئینہ میں نے دیکھا تھا محض اس لیے تاکہ دوست کے خط سے مجھے جو "شاک" پہنچا تھا اُس کی تلافی کر سکوں۔ کیونکہ دُنیا میں آئینہ ہی واحد چیز ہے جس میں انسان کا چہرہ کوئی چغلی نہیں کھاتا۔ کوئی نقص ظاہر نہیں کرتا —— یہ کوالٹی صرف آئینے میں ہے، کافر ادا حسیناؤں میں بھی نہیں۔

کیونکہ کافر ادا حسیناؤں کی ایک اور ٹریجڈی ہے۔ بلکہ ایک نہیں، دو تین ٹریجڈیاں ہیں۔ ایک تو کہ آپ انھیں لاکھ اپنا دل دے دیں، انھیں محسوس ہی نہیں ہوتا کہ انھیں کچھ دیا گیا ہے۔ آپ انھیں ناسمجھ کہہ کر مستقبل میں کچھ تبدیلی پر بھروسہ کر سکتے ہیں۔

لیکن دوسری ٹریجڈی یہ ہے کہ مستقبل بھی کچھ اتنا تابناک نہیں ہوتا۔ مثلاً میں مزاح نگا ہوں۔ میرا کیس تو بڑا ہوپ لیس ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک مرتبہ میں نے ایک حسینہ کو دل دیا۔ اُس کے پلے نہیں پڑا۔ چنانچہ میں نے تشریحاً کہا: "ہائے آپ کی آنکھیں تو ہرنی کی طرح ہیں۔"

وہ بولی: "ہی ہی ہی، انکل! آپ مزاح نگار ہیں نا؟ مذاق کر رہے ہیں۔"

میں نے کہا: "مذاق نہیں جناب! میں بڑی سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ اگر ان آنکھوں میں کاجل کی دھار پڑ جائے تو یہ دو آتشہ ہو جائیں۔"

یہ سُن کر وہ زیرِ لب متبسم ہوئی اور پھر بھاگ گئی اور میرے کاجل بننے کا چانس بھی ساتھ لے گئی۔

اب کاجل بننے کی بھی ایک ٹریجڈی ہے۔ کہ ہر بُوڑھے کو اپنا دوسرا سانس پہلے سانس سے بہتر محسوس ہوتا ہے۔ ہر بُوڑھا جب رات کو سوتا ہے (ظاہر ہے کامپوز کھا کر سوتا ہے) تو سوچتا ہے کہ کل کی صبح جب اُٹھوں گا تو آج سے زیادہ چاق و چوبند اُٹھوں گا۔ اور کہ کسی حسینہ کی آنکھ مجھے ضرور اپنا کاجل بنائے گی۔ لیکن جب دوسری صبح آنکھ کھلتی ہے تو وہ سب سے پہلے اپنی عینک تلاش کرتا ہے۔ کیونکہ عینک کے بغیر نہ اُسے وہ حسینہ نظر آتی ہے نہ اُس کی آنکھ، جس کا اُسے کاجل بننا ہے۔

کاجل بننے کے لیے عینک کا رابطہ بے حد ضروری ہے۔ اگر بُوڑھے عاشق کو دو منٹ بھی عینک کی تلاش میں لگ گئے تو محبوبہ نظروں سے غائب ہو جائے گی۔ یہ مشینی تیز رفتار زمانہ ہے۔ کون عینک کی تلاش کا انتظار کر سکتا ہے۔

ایک مرتبہ میں نے ساٹھ سال کی ایک دیہاتی بُڑھیا کو دیکھا۔ وہ آنکھوں میں کاجل ٹھمکا کر کھیت کی طرف جا رہی تھی۔ میں نے پوچھا: "محترم خاتون! اس عمر میں کاجل؟"

وہ بولی: "ہاں، وہ کھیت پر میرے کاجل کا ہر روز انتظار کرتے ہیں۔"

"اُن کی عمر؟"

"نوّے سال!"

"کیا وہ کاجل دیکھ لیتے ہیں؟ عینک تلاش کر لیتے ہیں؟"

"عینک؟ وہ کیا ہوتی ہے؟"

"عینک وہ چیز ہوتی ہے جسے خاوند لوگ لگاتے ہیں۔ جس سے انھیں اپنی اصل بیوی نظر آجاتی ہے۔"

"اچھا جی؟ کیا کوئی نقلی بیوی بھی ہوتی ہے؟"

"ہوتی ہے۔ عینک نہ پہنی جائے تو نقلی بیوی دکھائی دیتی ہے۔ بلکہ اپنی اصلی بیوی بھی نقلی بیوی دکھائی دیتی ہے۔ نہیں سمجھیں، میرا مطلب ہے، عینک ہی وہ چیز ہوتی ہے جسے اگر آنکھوں پر نہ پہنا جائے تو ہر دوسرے کی بیوی اپنی بیوی نظر آتی ہے اور اپنی بیوی دوسرے کی بیوی معلوم ہوتی ہے۔"

"عجیب واہیات چیز ہے یہ عینک بھی۔"

"واہیات نہیں ہے محترمہ! وہ دیدۂ بینا ہوتی ہے۔ آدمی جب بوڑھا ہو جائے تو اسی دیدۂ بینا سے ہی کام لیتا ہے۔"

"مگر میرا مرد تو بوڑھا نہیں ہوا۔ تین کوس سے میری چال دیکھ کر پہچان لیتا ہے کہ میں آ رہی ہوں۔"

"بوڑھا نہیں ہوا؟ مگر آپ تو کہہ رہی تھیں، نوّے سال کے پیٹے میں ہے۔"

"ہاں ہاں ہے، مگر خالص دودھ، مکھن، گھی کھاتا ہے۔ ہل چلاتا ہے، بیل کا سینگ مروڑ دے تو بیل کی آنکھیں پتھرا جاتی ہیں۔"

میں اُسے کہنا چاہتا تھا کہ بچارے بیل کو آئی ہاسپٹل میں لے جا کر عینک لگوا دو، مگر کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ بیل اور کسان کے تعلقات عینک کے بغیر بھی رفیقانہ چل رہے ہیں تو میں کیوں خواہ مخواہ اُن تعلقات کو "ماڈرنائز" کر کے مسخ کروں۔

بہرکیف بڑھاپا چاہے کسی راجہ پر آئے یا فکر تونسوی پر۔ آتا ضرور ہے۔ اور یوں آتا ہے، جیسے قانونِ فطرت آتا ہے۔ اب قانونِ فطرت کی ٹریجڈی یہ ہے کہ وہ دبے پاؤں آتا ہے کہ یقین ہی نہیں آتا کہ وہ آگیا ہے۔ یقین کی بجائے صرف ہلکا سا شبہ رینگتا ہے اُس وقت، جب کوئی قاتل کٹار حسینہ اچانک اپنی بس کی سیٹ سے اُٹھ کھڑی ہوتی ہے اور احترام سے جھک کر کہتی ہے: "انکل! آئیے، تشریف فرمائیے۔"

اس پیش کش پر آپ کی پوزیشن ڈانواں ڈول ہو جاتی ہے۔ قاتل کٹار کی پیش کش چاہے جیسی بھی ہو، آپ مسترد نہیں کر سکتے۔ مگر یہ کامپلیکس ضرور ستاتا ہے کہ اُسے اپنی پیش کش کی کوالٹی بہتر بنانی چاہیے تھی —— بادلِ ناخواستہ آپ سیٹ پر بیٹھ تو جاتے ہیں۔ لیکن یہ احساس برابر آپ کی جان کھائے جاتا ہے کہ کیا اُس نے میری عینک دیکھ لی۔ عینک کے پیچھے جو رومانٹک تشنگی تھی۔ اُسے کیوں نہیں دیکھ سکی۔

ایک راجہ تھا۔ مجھ سے زیادہ دانا۔ اُس نے عینک نہیں لگائی تھی۔ عینک کے بغیر ہی اُس نے اپنا سفید بال دیکھ لیا اور راج پاٹ سے باعزت بری ہو گیا۔ ورنہ عین ممکن تھا رانی تو اُسے کہہ دیتی: "انکل! راج گدی سے اُتر آئیے۔ اس سے پہلے کہ آپ کو احساس دلایا جائے کہ آپ بوڑھے ہو چکے ہیں۔"

میرا خیال ہے کہ بڑھاپا انسان پر بعد میں اُترتا ہے اور اُس کا احساس پہلے اُترتا ہے۔ گذشتہ دنوں کیا دیکھتا ہوں کہ میں روزانہ جس رائٹنگ ٹیبل پر بیٹھ کر لکھا کرتا تھا، اُس کی کرسی پر میرا ننھا پوتا تشریف فرما ہے۔ میں نے عرض کیا: "جناب! اُٹھیے، یہ کرسی میری ہے۔"

وہ بولا: "نہیں، میری ہے۔"

میں نے گذشتہ تواریخ کے حوالے دیے کہ میں ہی اس کرسی پر بیٹھ کر برسوں سوشلزم کے حق میں لکھتا رہا ہوں۔ مگر اُس کی دلیل تھی کہ آپ نے تو اپنی عمرِ عزیز گنوا دی۔ اب میں یہاں بیٹھ کر لکھا کروں گا۔"

میں نے کہا: "گویا اب تم اپنی عمرِ عزیز گنواؤ گے؟"

وہ بولا: "نہیں، میں سوشلزم کے حق میں نہیں بلکہ خلاف لکھا کروں گا۔"

میں نے اُسے سمجھایا کہ یہ تمہاری ننگی جارحیت ہے۔ تم ایسا کرو گے تو کرسی اور سوشلزم دونوں کا تختہ اُلٹ جائے گا اور ہماری پوری نسل کے کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔"

مگر اُس نے کہا: "دادا جان! لگتا ہے، مجھے آپ نصیحت کر رہے ہیں اور نئی نسل کو نصیحت کرنا بوڑھوں کی عادت ہے۔ مگر قبلہ! اطلاعاً عرض ہے کہ نصیحت صرف احتراماً سُن لی جاتی ہے۔ مگر اُس پر عمل کوئی نہیں کرتا۔"

پوتے حضور کی یہ بات سُن کر مجھے جھٹکا سا لگا۔ مجھے آج تک کسی نے براہِ راست بوڑھا نہیں کہا تھا۔ "جنریشن گیپ" کی بات تو میں پہلے بھی سُنتا رہا تھا۔ مگر نئی نسل کے لیے یہ تو مناسب نہیں کہ وہ ہمیں براہِ راست بڑھاپے کا احساس دلا دیں۔ سُنا تھا، شرفاء میں تو ایسا رواج نہیں ہے —— لہٰذا مجھے واقعی جھٹکا لگا۔

لیکن جھٹکا نمبر دو مجھے اُس وقت لگا، کہ جب سارے محلّے کے مرد و زن مجھے "انکل" سے مخاطب کرنے کے عادی ہو گئے (چاہے احتراماً ہی سہی) تو ایک دن کیا سُنتا ہوں۔ میری پہلی اور آخری بیوی کے مُنہ سے بھی بے ساختہ نکل گیا: میں نے کہا انکل! چلیے، مجھے آج ڈاکٹر مکرجی کے پاس لے چلیے، میرے گھٹنوں کا درد کم بخت جاتا ہی نہیں۔"

اور مجھے ایک دم شاک لگا اور میرے مُنہ سے بھی (شاید انتقاماً) بے ساختہ نکل گیا۔ "آنٹی! اُس عورت کو بیوی ہی نہیں کہا جا سکتا جس کے گھٹنوں میں درد نہ ہو۔ لہٰذا ڈاکٹر مکرجی کے پاس مت چلو، میری بنی رہو۔"

وہ یہ مذاق برداشت کر گئی۔ اگرچہ برداشت تو میں بھی کر گیا۔ جب اپنے گھر کی بیوی تک انکل کہنے لگے تو باہر کی حسیناؤں سے کیا توقع رکھی جا سکتی ہے۔ اور پھر بیوی تو چشم دید گواہ ہوتی ہے۔

لیکن جیسا کہ میں نے اوپر کہیں لکھا ہے، بڑھاپا کم، بڑھاپے کا احساس زیادہ جان لیوا ہوتا ہے۔ اور میں نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ بیوی سے خانہ جنگی نہیں کرنی چاہیے۔ خانہ جنگی سے ہٹ جانے کا دوسرا نام بڑھاپے کا اعتراف ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس دن کے اعتراف کے باوجود ہر بوڑھا، مجادلے پر آمادہ رہتا ہے اور نہیں مانتا کہ اس کے قواء مضمحل ہو چکے ہیں —— کیونکہ قانونِ فطرت کی دبے پاؤں اور بتدریج آمد میں اُس عہدِ شباب کی باقیات بھی شامل ہوتی ہیں۔ جب ہر قدم پر اُچھل کود کو جی چاہتا ہے۔ اگرچہ اندر سے ایک وارننگ ضرور آتی ہے: "سنبھل سنبھل پگ دھر بگلے، آگے ایک نالی ہے۔ لاٹھی کا سہارا لے ہی لو۔"

لیکن جب بڑھاپے کے احساس کے جھٹکے ایک بار شروع ہو جائیں تو اُن کے تواتر سے واسطہ پڑنے لگتا ہے۔ مثلاً پرسوں صبح جناب روشن لال ریٹائرڈ ایگزیکٹو انجینئر نے میرے دروازے پر آ کر دستک دی اور کہا: "آئیے فکر صاحب! صبح کی سیر پہ چلیں۔"

میں نے کہا: "دو منٹ رُکیے، ابھی حاضر ہوتا ہوں۔"

اور پھر اندر جا کر میں سیدھا آئینے کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ اور پھر دو منٹ بعد لوٹ کر آیا اور کہا: "سوری، روشن لال جی! آپ نے غلط مکان پر دستک دی ہے۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ مجھے آپ کی بجائے آئینے پر زیادہ اعتماد ہے۔"

طنزیہ مسکراہٹ سے بولے: "سوچ لیجیے، کئی آئینوں کی کوالٹی بڑی گھٹیا ہوتی ہے۔"

"نہیں جناب! میرا آئینہ امپورٹڈ ہے۔"

وہ شاید کچھ مایوس ہوتے۔ کہنے لگے: "مگر مجھے تو کئی لوگوں نے بتایا کہ آپ صبح کی سیر پر جانے کے اہل ہو چکے ہیں۔ چنانچہ میں بھی انتہائی مسرور ہو گیا تھا کہ چلو، صبح کی سیر کے لیے اب ایک معقول ساتھی مل گیا ہے۔ اگر آپ نہیں چلیں گے تو بتائیے، معقول ساتھی کہاں سے لاؤں گا؟"

میرے مُنہ سے نکلا: "اپنی بیگم کو ساتھ لے لیا کیجیے۔"

اُنھوں نے یوں مُنہ بنایا جیسے اُنھیں اپنی بیگم کی معقولیت پر شبہ ہو۔ شاید وہ بھی اُنھیں میری بیوی کی طرح "انکل" کہنے لگتی ہو۔

میرے ایک محترم بوڑھے دوست ہیں (المیہ یہ ہے کہ وہ مجھے صرف بوڑھے ہونے کی وجہ سے اپنا دوست کہتے ہیں) گذشتہ دنوں پچاس برس پہلے کے مارکیٹ ریٹ کے علم سے میری روشنیِ طبع فرمانے لگے تو میں نے اُنھیں ٹوک دیا اور کہا: "اگر آپ بُرا نہ مانیں (بلکہ بھلا ہی مانیں گے) تو میں آپ سے کچھ سوالات کرنا چاہتا ہوں جن کے جوابات سے نئی نسل کی بھی کچھ روشنیِ طبع ہو جائے۔"

بولے: "چشمِ ما روشن.....؟" (اُن کی ایک چشم پتھر کی تھی)

میں نے سوال کیا: "کیا آپ کا بڑھاپا گھر والوں کے لیے مفید مطلب ہے؟"

"سو فیصدی مفید! نیند نہیں آتی، رات بھر کھانستا ہوں۔ اِس لیے چور گھر میں داخل ہونے کی جُرأت نہیں کرتے۔"

سوال:۔ بہت خوب! بڑھاپے میں کون سی کتابوں کا مطالعہ فرماتے ہیں؟

جواب:۔ سب کے سامنے مذہبی کتابوں کا مطالعہ کرتا ہوں۔ چوری چھپے جنسی کتابیں۔

سوال:۔ مطالعہ کے علاوہ کچھ گھریلو مصروفیات؟

جواب:۔ آج کل کی اولاد نالائق ہے۔ پانی کا نل کھُلا چھوڑ جاتے ہیں۔ ٹونٹیاں بند کرتا رہتا ہوں۔ بے ضرورت بجلی کا بلب جل رہا ہو تو بٹن آف کر دیتا ہوں۔ ٹوتھ پیسٹ ٹھکانے پر جا کر رکھ دیتا ہوں۔ دھوبی اگر قمیصوں کے بٹن توڑ لائے تو اُس کے بِل میں سے کاٹ لیتا ہوں، صبح چھت پر جا کر چڑیوں کے لیے دانہ دُنکا بکھیر دیتا ہوں، جو زیادہ تر کوّے کھا جاتے ہیں۔ کوّوں کے خلاف گھر میں تحریک شروع کر رکھی ہے۔

سوال:۔ کوئی سوشل سروس کرتے ہیں؟

جواب:۔ سات آٹھ ایسوسی ایشنیں میری رہنمائی میں چل رہی ہیں۔ محلّہ سُدھار کمیٹی، دو سَو آشرم، کرایہ دار ایسوسی ایشن، مالک مکانوں کی انجمن، ویشنو دیوی یاترا پر بندھ کمیٹی، ایک برات گھر کی کمیٹی کا پریذیڈنٹ ہوں۔ دوسرا برات گھر جو تعمیر ہو چکا ہے، اُس کا خزانچی ہوں۔ کوئی سیاسی پارٹی اپنا الیکشن جلسہ کرنا چاہے تو جلسے کی صدارت کی پیش کش مجھے کی جاتی ہے۔ شادی بیاہ رشتے ناطے کا آخری صلاح کار مجھے ہی مانا جاتا ہے۔ ہر بچّہ جو پیدا ہوتا ہے پہلی آشیرواد میری۔ ہر جنازہ جو اُٹھایا جاتا ہے، پہلے کندھا مجھے ہی دینا پڑتا ہے۔

میں نے کہا: "جنازہ تو آپ کو بڑی نیچرل چیز لگتا ہوگا؟"

بولے: "ہاں، بشرطیکہ دوسروں کا ہو۔"

"تو آپ محلّے کے ہر جنازے میں شمولیت فرماتے ہوں گے؟"

"میں ہی نہیں، محلّے کے بیشتر باشندے شمولیت فرماتے ہیں، اور وہ شمولیت فرمانا اس لیے بھی ضروری سمجھتے ہیں تاکہ جب اُن کا جنازہ اُٹھے تو وہ بھی دھوم سے اُٹھے۔"

ایک آخری سوال: "آپ کا اِسم شریف؟"

"ناچیز کو فکر تونسوی کہا جاتا ہے۔"

بقیہ

ساحر لدھیانوی: پرچھائیوں کا اسیر

ایک روشن مستقبل کے خواب دیکھے۔ اپنے لیے بھی اور پوری بنی نوع انسان کے لیے بھی۔ مگر ایسا لگتا ہے کہ اب یہ خواب بھی ان کا ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ ان کے دوسرے مجموعۂ کلام کا نام بھی "آؤ کہ کوئی خواب بُنیں" اس طرف ایک مرموز اشارہ ہے۔ ذاتی طور پر وہ عمر کی اس سرحد تک آ چکے تھے جہاں تجربے کی پختگی خوش آئندہ خواب دیکھنے کی کم ہی اجازت دیتی ہے اور گرد و پیش کا منظر بھی کچھ کم سنگین نہیں تھا۔

ساحر کی پوری جوانی جلتی سلگتی تنہائیوں کی نذر ہوئی۔ آخر عمر میں تنہائی کے اس لق و دق صحرا میں جو اُن کی داخلی اور خارجی دونوں دنیاؤں کا احاطہ کر چکا تھا، صرف ان کی والدہ کی شفقت ہی ایک ایسا شجر سایہ دار تھا جس کے تلے وہ سکون کی سانس لے سکتے تھے —— ۲۱، جولائی ۱۹۷۶ء کو جب یہ شجر سایہ دار ٹوٹ کر گرا اور ان کی والدہ ہمیشہ کے لیے انھیں داغِ مفارقت دے گئیں۔ تو زندگی سے ساحر کی رہی سہی دلچسپی بھی جیسے ختم ہو کر رہ گئی۔ کیسا دردناک شعر کہا ہے انھوں نے:

کس لیے جیتے ہیں ہم کس کے لیے جیتے ہیں
بارہا ایسے سوالات پہ رونا آیا

والدہ کا انتقال ساحر کی زندگی کا آخری صدمہ تھا جس کے اثرات سے وہ مرتے دم تک بحال نہ ہو سکے۔

ساحر ہمارے درمیان نہیں رہے۔ ان کا جسمانی وجود موت کی اندھی گپھاؤں کی نذر ہو گیا لیکن جب تک سینوں میں معصوم جذبات دل بن کر دھڑکتے رہیں گے، زندگی کی تب و تاب سے لبریز ان کی شاعری ہمارا ساتھ دے گی —— عمر کے ایک خاص حصّے کے لیے اور ذہنی رفعت کی ایک خاص حد تک۔ ان کے فن پاروں میں جو بے پناہ کشش ہے اس نے انھیں قدرِ بقا بخش دی ہے۔ وہ اپنے عہد کے بڑے شاعر نہ سہی ایک شاعر ضرور ہیں جسے جلد بھلایا نہ جا سکے گا۔

مخمور سعیدی
۳۲۰، پھاٹک تیلیان ترکمان گیٹ دہلی

ساحر لدھیانوی

پرچھائیوں کا اسیر

مخمور سعیدی

ایسی شخصیتیں کم ہوتی ہیں جن کے کارناموں کی وقعت یا شہرت ان کی زندگی ہی میں انھیں ہر دلعزیز بنا دے اور ہزاروں لاکھوں دلوں پر ان کی حکمرانی ہو جائے۔ ساحر لدھیانوی ایک ایسی ہی شخصیت کا نام تھا۔

ساحر کا شاعرانہ مرتبہ اختلافی بحث کا موضوع بن سکتا ہے، لیکن یہ دعویٰ بلا خوف تردید کیا جا سکتا ہے کہ اپنے ہمعصروں میں انھیں سب سے زیادہ عوامی مقبولیت حاصل ہوتی۔ ان کی اکثر نظمیں، غزلیں اور گیت، بالخصوص نظمیں نوجوان نسلوں کا عزیز ترین ذہنی سرمایہ رہی ہیں۔ یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ ان کی شاعرانہ مقبولیت، فلموں سے ان کے تعلق کی دین تھی۔ فلموں سے ان کی دلچسپی ۱۹۴۵ء میں شروع ہوئی جب وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ ان کی فلم "آزادی کی راہ پر" کے گیت لکھنے کے لیے لاہور سے بمبئی آئے اور فلمی نغمہ نگار کی حیثیت سے ان کی شہرت کا آغاز تو اس کے بھی لگ بھگ نو دس سال بعد ہوا جب انھوں نے فلم "بازی" کے لیے گیت لکھے۔ شاعرانہ مقبولیت کے منصب پر وہ اس سے پہلے فائز ہو چکے تھے۔ "پریت لڑی" کے ادارے سے جب ان کا پہلا مجموعۂ کلام "تلخیاں" شائع ہوا (۱۹۴۴ء) تو اس کی اکثر نظمیں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے دلوں کی دھڑکن بن گئیں۔ ان کی آواز ایک ایسے ناکام عاشق کی آواز تھی جسے آزادی اور انصاف کی قدریں بھی دل و جان سے عزیز تھیں۔ وہ غیر ملکی حکومت کے جبر اور اس زوال آمادہ جاگیردارانہ سماج کی ناانصافیوں سے، جس میں وہ جی رہا تھا، نجات کا خواہاں تھا۔ اس کی نظر میں انسانی عدم مساوات کے اصول پر عامل وہ طبقاتی سماج جسے بیرونی حکمراں اپنی خودغرضانہ سیاسی مصلحتوں کی تکمیل کے لیے قائم و دائم رکھنا چاہتے تھے، بہتر زندگی کی امنگوں اور ایک خوبصورت مستقبل کے خوابوں کا قاتل اور خود اس کے نجی المیے کا بھی ذمہ دار تھا۔ ساحر نے اپنی شاعری کے وسیلے سے نوجوان نسل کو استحصال پسند بیرونی حکمرانوں اور خود اپنے ملک کے انصاف دشمن سماج کے بے حس ٹھیکیداروں کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کا پیغام دیا اور اس پیغام میں چونکہ شاعر کے اپنے ناکام عشقیہ تجربات کی کسک بھی شامل تھی اس لیے یہ اپنے اندر غضب کی اپیل رکھتا تھا۔

"تلخیاں" کو بلاشبہ اس دور کا مقبول ترین شعری مجموعہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ ساحر کی زندگی میں ان کی اجازت سے اس کے دو درجن کے قریب ایڈیشن شائع ہوئے جبکہ کئی پبلشر ساحر کی اجازت کے بغیر بھی نفع اندوزی کے لیے اسے چھاپتے رہے۔

شورش کاشمیری کے مطابق ساحر نے جب سیاست سے دلچسپی لینی شروع کی تو ابتداءً وہ احرار کی تحریک سے متاثر تھے۔ پھر وہ آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے توسل سے، جو کمیونسٹ پارٹی کی ایک محاذی تنظیم تھی، کمیونسٹ پارٹی کے قریب آئے اور اس پارٹی کی سرپرستی میں قائم ہونے والی ایک دوسری محاذی تنظیم انجمن ترقی پسند مصنفین کے سرگرم رکن بن گئے۔ انھی دنوں انھیں لاہور سے شائع ہونے والے مشہور جرائد "ادب لطیف" "سویرا" اور "شہکار" کی ادارت کے مواقع ملے اور جلد ہی ان کا شمار پہلی صف کے ترقی پسند شاعروں میں ہونے لگا۔ محترمہ ناز صدیقی نے اپنی کتاب "ساحر — شخص اور شاعر" میں ایک واقعہ درج کیا ہے جسے یہاں نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا:

"اکتوبر ۱۹۴۵ء میں حیدرآباد میں اردو کے ترقی پسند مصنفین کی کل ہند کانفرنس منعقد کی گئی۔ ساحر کو اس کانفرنس کے لیے خاص طور پر مدعو کیا گیا اور خواہش کی گئی کہ وہ کانفرنس کے لیے مقالہ لکھیں۔ کانفرنس کے منتظمین اور شرکا ساحر کی شہرت سے متاثر تھے لیکن شخصی طور پر ان سے متعارف نہیں تھے۔ ساحر کانفرنس میں شرکت کے لیے پہنچے تو ۲۳، ۲۴ برس کے نوجوان کو دیکھ کر سب حیرت زدہ رہ گئے کیوں کہ ان کی تحریروں سے یہ تاثر پیدا ہوتا تھا کہ وہ پختہ عمر کے ادیب ہوں گے۔" (صفحہ: ۱۹)

ساحر، جیسا کہ اوپر کہا گیا، فلم کے گانے لکھنے کے لیے اپنے ایک فلمساز دوست کے ساتھ اسی سال ۱۹۴۵ء پہلی بار بمبئی گئے تھے لیکن تقسیم ملک کے وقت انھیں بمبئی چھوڑنا پڑا۔ بمبئی سے دلی، دلی سے لاہور اور وہاں سے پھر دلی پہنچے۔ دلی سے انھوں نے حالی پبلشنگ ہاؤس کے بدر صاحب اور محمد یوسف جامعی صاحب (اب دونوں مرحوم ہو چکے ہیں) کے تعاون سے ماہنامہ "شاہراہ" کا اجرا کیا۔ ساحر اس رسالے کے ایڈیٹر تھے اور پرکاش پنڈت اسسٹنٹ ایڈیٹر۔ یہ رسالہ کئی برس تک شائع ہوتا رہا لیکن ساحر زیادہ دن اس سے وابستہ نہ رہے۔ وہ ۱۹۴۹ء کی انجمن ترقی پسند مصنفین کی مشہور کانفرنس میں جو بھیونڈی کے مقام پر ہوئی تھی اور اسی سے موسوم ہے، شرکت کے لیے گئے تو پھر دلی واپس نہ آئے اور دوبارہ بمبئی کا رخ کیا۔

حاصل کلام یہ کہ ساحر نے جب فلمی نغمہ نگار کی حیثیت سے اپنا کیریر شروع

کیا تو وہ ایک ممتاز ادیب اور شاعر کا درجہ حاصل کر چکے تھے اور ان کی شاعری قبولِ عام کی سند پا چکی تھی۔ ایک اور پُر لطف واقعہ جو کرشن ادیب نے اپنے مضمون "ساحر۔ میرے بھائی میرا دوست" میں لکھا ہے، یہاں نقل کیا جاتا ہے:

"میرے اور ساحر کے مشترک دوست موہن سہگل کے ایما پر ساحر، میوزک ڈائرکٹر ایس۔ ڈی۔ برمن کے پاس گئے۔ برمن نے گانے کی دُھن اور فلم کی سچویشن بتائی۔ ساحر نے وہیں بیٹھے بیٹھے چند لمحوں میں گانے کے بول لکھ دیے

"ٹھنڈی ہوائیں، لہرا کے آئیں"

برمن گیت سن کر بہت خوش ہوئے اور ساحر کو اپنے ہمراہ کاردار اسٹوڈیوز لے گئے تاکہ ساحر کو کاردار صاحب اور دوسرے لوگوں سے متعارف کرا سکیں۔ اسٹوڈیو میں کاردار کے علاوہ شکیل بدایونی اور راجندر کرشن تشریف فرما تھے۔ وہ ساحر کو دیکھ کر احتراماً اُٹھ کھڑے ہوئے۔ برمن کو تعارف کرانے کا بھی شرف حاصل نہ ہوا کیوں کہ وہ سب لوگ ساحر سے مکمل طور پر آشنا تھے۔ برمن دا کو یک گونہ مسرت کا احساس ہوا کہ ان کا کوی ساحر لدھیانوی بہت بڑا کوی ہے۔ اپنی نگاہِ انتخاب پر انھیں فخر محسوس ہو رہا تھا۔"

("ساحر لدھیانوی" شائع کردہ محکمۂ السنہ پنجاب۔ ص: ١٧)

ساحر اپنے خیالات میں کتنے راسخ اور اپنے فن کے ساتھ کتنے مخلص تھے اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ فلموں کے لیے گیت لکھنے والے بعض دوسرے شاعروں کے برعکس جو ترقی پسندی کے بھی دعویدار تھے، ساحر نے اپنی سطح سے نیچے اتر کر گیت لکھنا بہت کم گوارا کیا اور فلمی گیتوں کو وہ ادبی معیار دینے کی کوشش کی جو انھیں عزیز تھا۔ انھوں نے گیتوں کو محض دل بہلاوے کی چیز نہ سمجھتے ہوئے ان میں معنویت اور مقصدیت کی خوبی پیدا کی یہ کام آسان نہ تھا۔ ان سے پہلے فلموں کے لیے گیت لکھنا شاعروں کے لیے بس ایک کاروباری مشغلہ تھا اور آرزو لکھنوی کے استثنیٰ کے ساتھ اکثر شاعر ایسے گیت لکھتے رہے تھے جو سننے والوں کے لیے محض سطحی اور سستی تفریح کا سامان فراہم کر سکیں۔ دوسروں کا تو ذکر ہی کیا جوش ملیح آبادی جیسا بغاوت اور انقلاب کا پیغام دینے والا شاعر اس طرح کے مبتذل گیت لکھ چکا تھا:

پاپی جوبنا کا دیکھو ابھار
جیسے گیندوا کھلے
جیسے لٹو ہلے
جیسے گدر انار (فلم "من کی جیت")

ساحر نے فلموں میں رہ کر "رات بھر کا ہے مہماں اندھیرا" "تو ہندو بنے گا نہ مسلمان بنے گا" "وہ صبح کبھی تو آئے گی" اور دوسرے بے شمار گیت لکھے جو زندگی اور انسانیت کے لیے ایک اُمید پرور بشارت، ایک خوشگوار نوید بن کر فضا میں گونج اور مدتوں گونجتے رہیں گے۔ خود ساحر اپنے فلمی گیتوں کو کیا اہمیت دیتے تھے۔ اس کا شاہد ان کے گیتوں کا مجموعہ "گاتا جائے بنجارہ" ہے جو اُن کے ایما اور اجازت سے شائع کیا گیا تھا۔

بعض لوگوں کے اس اعتراض کا وزن میں محسوس کرتا ہوں کہ ساحر کے بہت سے گیت ایسے ہیں، جو گیت نہ رہ کر نظم یا غزل کا روپ دھار لیتے ہیں۔ ان کی ساخت ایک منطقی تنظیم لیے ہوتے ہے جو گیت کے لچکیلے مزاج کے منافی ہے لیکن جہاں تک منطقی ذہن کی کارفرمائی کا تعلق ہے اس کا سایہ تو ساحر کی پوری شاعری پر صاف دیکھا جا سکتا ہے۔ ساحر کی شاعری کی دلپذیری کی ضامن احساس اور تاثر کی شدت ہے اور اس وصف سے ان کے گیت بھی متصف ہیں۔

o o

ساحر کا ایک شعر ہے جو اُن کے پہلے مجموعۂ کلام "تلخیاں" کے اوّلین ایڈیشن سے اس کے آخری ایڈیشن تک، کتاب کے کسی ابتدائی صفحے پر متواتر شائع ہوتا رہا ہے:

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے، وہ لوٹا رہا ہوں میں

اس شعر کو بجا طور پر ساحر کی طرف سے اپنی کتاب کا دیباچہ قرار دیا جا سکتا ہے جس میں انھوں نے وضاحت کے ساتھ اپنی شاعری کی حدیں متعین کر دی ہیں اور اپنے شعری رویّے کا بھی قطعیت کے ساتھ اظہار کر دیا ہے۔ ندا فاضلی کو انٹرویو دیتے ہوئے ان کے ایک سوال کے جواب میں بھی ساحر نے یہی کہا تھا کہ نہ صرف ان کی شاعری ان کی اپنی زندگی کا عکس اور ان کی اپنی شخصیت کا اظہار ہے بلکہ وہ سچا ادب اسی کو سمجھتے ہیں جس کا منبع لکھنے والے کے ذاتی تجربات و مشاہدات کے سوا کہیں اور نہ ہو۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

"اچھی شاعری بھلے ہی کسی مخصوص نظریّے پر پوری نہ اُترتی ہو لیکن اس سے اس کی عظمت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ڈاکٹر اقبال سے شدید ترین نظریاتی اختلاف کے باوجود میں ان کی شاعرانہ عظمت کا معترف ہوں۔ لکھتے وقت ادیب کو اپنی شخصیت کے ساتھ سچا رہنا چاہیے۔ جو کچھ بھی کہا جائے اس میں ضمیر کی شرکت ضروری ہے یعنی اندر سے بھی کچھ ایسا لگتا ہو۔ نہیں تو ان کہی بات اندر ہی اندر گولا بن جائے گی جو تکلیف دے گی۔ شعر کہنے کے بعد اس پر کونسا لیبل چسپاں کیا جائے، یہ ادیب کی نہیں لیبل فروشوں کے سوچنے کی بات ہے۔ ادب درحقیقت شخصیت کے اظہار کا نام ہے۔ یہ ایک نفسیاتی عمل ہے۔ اگر ادیب اپنے مزاج کے خلاف کسی لیبل کے لیے لکھتا ہے تو اندر سے کوئی تسکین نہیں ہوگی" ("ملاقاتیں" ص: ١٢٣)

ساحر کے اس موقف کی روشنی میں، جس سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ ساحر شاعرانہ صلاحیت کے ساتھ ساتھ تخلیقی عمل کو سمجھنے اور پرکھنے والی نظر بھی رکھتے تھے، یہ ناگزیر ہے کہ ان کی شاعری کے مرکزی میلانات کا سرچشمہ کہیں اور نہیں، ان کی اپنی زندگی میں تلاش کیا جائے۔ اس تلاش کے نتائج ساحر کے ادّعا کی تائید کرتے نظر آتے ہیں۔

ساحر اپنی ادبی زندگی کے آغاز ہی میں ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو گئے تھے۔ یہ تحریک کچھ واضح اور طے شدہ سیاسی اور ادبی تصورات کی حامل تھی لیکن ساحر ان تصورات کے مؤید ہوتے ہوئے بھی اپنی شاعری میں ان بندھے ٹکے موضوعات کے دائرے کے اسیر کبھی نہیں رہے جن پر اس تحریک کے قائد زور دیتے رہے ہیں۔ ان کے فکر و فن کو سمجھنے کے لیے کسی سیاسی یا سماجی فلسفے میں سر کھپانے کی بجائے خود ان کی زندگی اور ان کی شخصیت سے قریبی شناسائی زیادہ مفید ہوگی۔

ساحر لدھیانے کے ایک بڑے زمین دار گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد چودھری فضل محمد کا شمار شہر کے معروف اور معزز لوگوں میں تھا مگر ان میں وہ تمام خامیاں موجود تھیں جو اُس طبقے کی پہچان بن چکی تھیں جس کی وہ نمائندگی کرتے تھے۔ انھوں نے یکے بعد دیگرے کئی شادیاں کیں لیکن کسی بیوی سے لڑکا پیدا نہیں ہوا اور کہا جاتا ہے کہ اولادِ نرینہ کی خواہش ہی میں وہ شادیاں پر شادی کرتے چلے گئے۔ ساحر کی والدہ سردار بیگم ان کی گیارہویں بیوی تھیں اور وہ اس رشتے کو عام لوگوں سے خفیہ رکھنا چاہتے تھے۔ اس اخفا کی وجہ یہ تھی کہ ساحر کی والدہ کو وہ خاندانی لحاظ سے اپنا ہم پلہ نہیں سمجھتے تھے اور اسے اپنے سماجی رتبے سے فروتر سمجھتے تھے کہ ان سے علی الاعلان رشتہ ازدواج قائم کریں۔ دوسری طرف ساحر کی والدہ بجا طور پر یہ چاہتی تھیں کہ رشتہ قائم ہوا ہے تو اس کا برملا اعلان بھی ہو اور ان کی نئی حیثیت تسلیم کی جائے۔

ساحر کی ولادت کے بعد سردار بیگم کو مزید اخلاقی تقویت حاصل ہوئی اور وہ اپنا حق منوانے پر اور زیادہ مصر ہوئیں۔ ویسے بھی اب یہ اُن کا ذاتی مسئلہ نہیں رہ گیا تھا بلکہ اس سے ان کے نومولود بیٹے کا مستقبل بھی وابستہ تھا۔ چودھری فضل محمد کے سر پر خاندانی وقار کا آسیب بدستور منڈلا رہا تھا۔ وہ اپنی نئی بیوی اور اس کے بطن سے پیدا ہونے والے اپنے اکلوتے بیٹے کو ہر طرح کی مادّی سہولتیں فراہم کرنے کو تیار تھے لیکن اس پر بھی بضد تھے کہ یہ سب کچھ پوشیدہ طور پر ہو۔ ان کی یہ ضد ساحر کی والدہ اور خود ساحر کو سماج اور قانون دونوں کی نظر میں بے وقعت کر دینے کے مترادف تھی اس لیے سردار بیگم نے اپنے ضدّی شوہر سے ٹکر لینے کا فیصلہ کیا اور اپنے اور اپنے بیٹے کے جائز حقوق حاصل کرنے کے لیے عدالت کا دروازہ جا کھٹکھٹایا۔[1]

نازؔ صدیقی کا بیان ہے کہ اس نزاع کا سبب یہ تھا کہ چودھری فضل محمد اپنی موروثی جائداد کو بے دردی سے ٹھکانے لگا رہے تھے اور اپنی زرعی آراضی کوڑیوں کے مول فروخت کر رہے تھے۔ سردار بیگم اس جائداد کا نیا وارث اپنے بیٹے کو سمجھتی تھیں اور اس لیے اس کا تحفظ چاہتی تھیں۔ ایک مرحلے پر ساحر کے والد نے عدالت میں درخواست گزرانی کہ ان کے بیٹے کو سردار بیگم سے لے کر، جو اُن سے علیحدگی اختیار کر چکی تھیں، ان کی سرپرستی میں دے دیا جائے مگر عدالت نے یہ درخواست منظور نہیں کی اور ساحر اپنی ماں کے پاس ہی رہے۔ درخواست کی نامنظوری کا سبب ایک عدالتی سوال کا جواب تھا جو ساحر کے والد نے دیا یہ جواب ان کی مخصوص ذہنیت کا غماز ہے۔ نازؔ صدیقی کے لفظوں میں:

"پھر جج نے یہ سوال کیا کہ وہ لڑکے کی تعلیم کا کیا انتظام کریں گے تو انھوں نے جواب دیا کہ پڑھائے وہ اولاد کو جس کو نوکری کروانا ہو۔ اللہ کا دیا بہت کچھ ہے وہ بیٹھ کر کھائے گا۔ جج نے فیصلہ دیا کہ بچے کو ماں کے ساتھ رکھا جائے تو وہ ان پڑھ رہ جائے گا۔"[2] ("ساحر، شخص اور شاعر" ص: ۱۶)

بہرکیف، ساحر کے والدین کی مقدمے بازی تقسیمِ ملک تک جاری رہی۔ ساحر والد کے سایۂ شفقت سے دور تنہا والدہ کی سرپرستی میں رہے اور ان کی تعلیم و تربیت کا سارا بار انھی نے اٹھایا۔

ساحر نے مالوہ خالصہ اسکول سے انٹرنس پاس کیا اور پھر گورنمنٹ کالج لدھیانہ میں داخل ہوئے۔ اس سے پہلے ان کی سیاسی سرگرمیوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ ساحر کے والد انگریز دوست اور حکّام رس آدمی تھے لیکن ساحر حکّام کی نظر میں ناپسندیدہ شخص ٹھہرے اور غالباً حکّام کی ناراضگی کے سبب انھیں بی۔ اے۔ کے آخری سال میں نہ صرف کالج چھوڑنا پڑا بلکہ وہ لدھیانے سے لاہور منتقل ہو جانے پر بھی مجبور ہوئے۔ ان کی نظم "نذرِ کالج" میں اس طرف واضح اشارے ملتے ہیں:

ہم ایک خار تھے جو چمن سے نکل گئے
ننگِ وطن تھے، حدِّ وطن سے نکل گئے
گائے ہیں اس فضا میں وفاؤں کے راگ بھی
نغماتِ آتشیں سے بکھیری ہے آگ بھی
سرکش بنے ہیں، گیت بغاوت کے گائے ہیں
برسوں نئے نظام کے نقشے بنائے ہیں

معصومیوں کے جرم میں بدنام بھی ہوئے
تیرے طفیل موردِ الزام بھی ہوئے
اس سرزمین پہ آج ہم اک بار ہی سہی
دنیا ہمارے نام سے بیزار ہی سہی
لیکن ہم ان فضاؤں کے پالے ہوئے تو ہیں
گر یاں نہیں تو یاں سے نکالے ہوئے تو ہیں

("تلخیاں" ۲۳ واں ایڈیشن، ص: ۲۵، ۲۶)

لاہور پہنچ کر ساحر نے دیال سنگھ کالج میں داخلہ لیا اور اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر چنے گئے۔ یہاں بھی انھیں امتحان میں بیٹھنے سے قبل ہی کالج چھوڑ دینا پڑا۔ نئے تعلیمی سال میں انھوں نے اسلامیہ کالج میں داخلہ لیا مگر ان کی تعلیم کا سلسلہ زیادہ دن نہ چل سکا اور انھوں نے اپنا سارا وقت ادبی اور سیاسی سرگرمیوں کے لیے وقف کر دیا۔

ملک کی تقسیم اور آزادی کا اعلان ہوا تو ساحر بمبئی میں تھے اور ان کی والدہ لدھیانے میں۔ فرقہ وارانہ فسادات کی خونی لہر نے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ پنجاب میں اس کا زور کچھ زیادہ ہی تھا۔ لاہور ہندوؤں سے اور لدھیانہ مسلمانوں سے خالی ہو گیا۔ ان دونوں ہی شہروں سے ساحر کی یادیں وابستہ تھیں۔ ساحر کے والد چودھری فضل محمد اپنے دوسرے اہل و عیال کے ساتھ لائل پور چلے گئے لیکن ساحر کی والدہ سردار بیگم اس ہنگامے میں لاپتہ ہو گئیں۔ ساحر کی پرورش والدہ ہی نے کی تھی اور انھیں لاڈ پیار بھی صرف والدہ ہی کی طرف سے ملا تھا۔ ماں کی گم شدگی ساحر کے لیے بہت بڑا سانحہ تھا مگر قدرت نے ان کی مدد کی اور آخر تلاشِ بسیار کے بعد ان

---

[1] راوی: گوپال متل اور ایم۔ ڈبلیو فاروقی جو ساحر اور ان کے خاندان کے قریبی شناسا رہے ہیں۔

[2] "ساحر۔ شخص اور شاعر" ساحر کی زندگی میں شائع ہو کر ان کی نظر سے گزر چکی تھی اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ اس میں ساحر کے جو سوانحی حالات درج ہوتے ہیں ان پر ساحر کی مہرِ تصدیق ثبت ہے۔

کا پتہ چل گیا۔ وہ لدھیانے کے پناہ گزیں کیمپ میں کچھ دن گزار کر لاہور چلی گئی تھیں اور شورش کاشمیری کے ہاں ٹھہری ہوئی تھیں۔ ساحر لاہور پہنچے اور والدہ کو ساتھ لے آئے۔ لاہور میں ان کے کچھ دوستوں نے انھیں روکنا چاہا مگر وہ نہیں مانے۔

ساحر کی شاعرانہ مقبولیت روز افزوں تھی۔ ان کی شاعری کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت کی کشش بھی بڑھتی گئی۔ وہ مشاعروں میں شرکت سے گریز کرتے تھے لیکن جب بھی وہ شعر و ادب کی کسی محفل میں شریک ہوتے آٹوگراف لینے والوں کی بھیڑ انھیں گھیر لیتی۔ ان میں لڑکیاں پیش پیش ہوتیں۔ ان کی شخصیت سے متاثر اور ان کی شاعری کی پرستار بے شمار لڑکیوں میں چند ایسی بھی تھیں جن سے ساحر بھی متاثر ہوتے اور انھوں نے ان کی قربت حاصل کرنا چاہی لیکن بدقسمتی سے ان کا ہر معاشقہ ناکامی پر منتج ہوا۔

ساحر کے معاشقوں کے بارے میں بہت سی روایات ہیں۔ ان روایات کی روشنی میں ساحر کی پہلی محبوبہ غالباً پنجابی زبان کی ایک شاعرہ تھی۔ ساحر کے ساتھ ہی ان کے ایک شاعر دوست رام پال اشک، جو اب اس دنیا میں نہیں ہیں اور آج کے دراز ریش افسانہ نگار دیوندر ستیارتھی بھی کہ جن کے چہرے ابھی سبزہ آغاز تھے، اس شاعرہ پر بری طرح ریجھے ہوئے تھے۔ اس عشق کا کچھ حال گوپال متل صاحب نے اپنی کتاب "لاہور کا جو ذکر کیا" میں اپنے خاص انداز میں بیان کیا ہے جو اس طرح ہے:

"... یہ عشق ساحر لدھیانوی، دیوندر ستیارتھی اور ایک نوجوان شاعر اشک نے جس کا پچھلے دنوں انتقال ہو گیا، امدادِ باہمی کے اصول پر کیا تھا... ستیارتھی کے پاس ان دنوں ایک کیمرہ تھا۔ ہر روز نئے نئے زاویے سے شاعرہ کی تصویریں کھینچے گئیں۔ ساحر کے پاس کیمرہ نہیں تھا لیکن انھوں نے اپنی پذیرائی کے لیے یہ حربہ ڈھونڈا کہ شاعرہ کے آنریری پبلسٹی ایجنٹ بن گئے۔ وہ اس کی نظموں کے اردو میں ترجمے کرتے اور مختلف جرائد میں انھیں چھپواتے ہی نہیں بلکہ ان پر تعریفی نوٹ بھی لکھتے۔

مشاعرہ کا دوپہر کا وقت نسبتہً فراغت کا تھا۔ یہ دوپہر کی دھوپ میں پیدل اس کی کوٹھی پر پہنچتے اور وہ یہ سمجھ کر کہ غریب دھوپ میں چل کر آتے ہیں، انھیں شربت پلا دیتی۔ یہ اس بے چاری کے ذہن میں کہاں تھا کہ یہ اس کو شربتِ وصل کا دیباچہ سمجھتے ہیں۔

ساحر اور اشک ستیارتھی سے زیادہ جاں باز تھے اور ستیارتھی کی معیت میں دوپہر کے وقت شاعرہ کی کوٹھی پر جانے کے علاوہ رات بھر کوٹھی کا طواف بھی کیا کرتے تھے... جب کافی شام ہو چکتی، ساحر اور اشک چل پڑتے اور اگلی صبح ہی آتے۔ صبح آکر وہ مجھے جگاتے اور اپنی داستان شروع کر دیتے... کبھی کبھی یہ شبہ گزرتا تھا کہ ساحر اس مقولے پر عمل کر رہا ہے کہ حصولِ شہرت کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ اپنے متعلق جتنی غلط فہمیاں پھیلا سکتے ہو، پھیلا دو۔" (ص: ۸۸)

متل صاحب نے غالباً یہ کہنا چاہا ہے کہ عشق کے معاملے میں نہ ساحر سنجیدہ تھے نہ شاعرہ۔ انھوں نے احتیاطاً شاعرہ کا نام بھی نہیں لکھا ہے لیکن اب کہ شاعرہ نے اپنی خود نوشت سوانح عمری "رسیدی ٹکٹ" میں جو ساحر کی موت سے کچھ پہلے شائع ہو کر ہزاروں لوگوں تک پہنچ چکی ہے، خود ہی ساحر کے عشق کا برملا اعتراف کر لیا ہے تو اس کا نام مخفی رکھنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اس شاعرہ کا نام امرتا پریتم ہے۔ "رسیدی ٹکٹ" میں ساحر کا جس انداز میں ذکر کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ساحر کا رویہ جو بھی رہا ہو، امرتا پریتم نے دل کی گہرائیوں سے انھیں چاہا تھا۔ ان کے چند بیانات ملاحظہ ہوں:

"میں اکیس برس کی تھی جب اپنے خوابوں کے شہزادے کا چہرہ اس دھرتی پر دیکھا تھا۔ پھر جیسے ہر روز مجھے آگ کے دریا سے گزرنا پڑتا تھا۔ یہاں تک کہ ۱۹۵۷ء میں جب مجھے اکاڈمی ایوارڈ ملا تو فون پر اس کی خبر پا کر میں سر سے پیر تک تپنے لگی ــــ خدایا! یہ نظمیں میں نے کسی انعام کے لیے تو نہیں لکھی تھیں۔ جس کے لیے لکھی تھیں اس نے انھیں پڑھا ہی نہیں۔ اب ساری دنیا بھی پڑھ لے تو مجھے کیا؟

اس دن شام کو پریس رپورٹر آیا۔ فوٹوگرافر ساتھ تھا۔ وہ جب تصویر لینے لگا تو کاغذ سامنے رکھ کر میرے ہاتھ میں قلم دے دیا۔ وہ مجھے فکرِ شعر کے عالم میں دکھانا چاہتا تھا مگر جب قلم کاغذ پر چلا تو کوئی شعر لکھنے کی بجائے اس کا نام کاغذ پر منتقل کرنے لگی جو میری شاعری کا مرکز و محور تھا ــــ ساحر، ساحر، ساحر... سارا کاغذ بھر گیا۔" (ہندی ایڈیشن، ص: ۲۲)

اسی کتاب میں ایک اور موقع پر امرتا پریتم لکھتی ہیں:

"ایک دن ساحر آیا تو اسے ہلکا سا بخار چڑھا ہوا تھا۔ اس کے گلے میں درد تھا۔ سانس میں کھنچاؤ کی سی کیفیت تھی۔ اس دن اس کے گلے اور چھاتی پر میں نے وکس ملی تھی، کتنی ہی دیر تک ملتی رہی تھی ــــ اور تب مجھے محسوس ہوا تھا کہ میں اس طرح پیروں پر کھڑے کھڑے، پوروں سے، انگلیوں سے اور ہتھیلیوں سے، اس کی چھاتی کو ہولے ہولے ملتے ہوئے اپنی پوری عمر گزار سکتی ہوں۔ میرے اندر کی عورت کو اس وقت (اپنے اظہار کے لیے) کسی کاغذ قلم کی ضرورت نہیں تھی۔" (ص: ۲۹)

اور پھر:

"یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میرا بیٹا میرے جسم کی آس بنا تھا۔ ۱۹۴۶ء کے آخری دنوں کی بات..."

اخباروں اور کتابوں میں کتنی بار پڑھا تھا کہ ہونے والی ماں کے کمرے میں جس طرح کی تصویریں بھی ہوں، یا اس کے خیالوں میں جو چہرہ بسا رہے، بچے کی صورت اسی پر جاتی ہے اور میرے دل نے جیسے دنیا سے چھپ کر سرگوشی میں مجھ سے کہا ــــ اگر میں ساحر کے چہرے کو ہر لمحہ اپنے خیالوں میں رکھوں تو میرے بچے کی شکل میں اس کی شباہت آ جائے گی، ــــ جسے زندگی میں نہیں پا سکی تھی، اسے خوابوں میں پا لینے کی ایک کرشمہ ساز کوشش....

خدا کی طرح صورت آفرینی کی خلاقانہ کوشش
جسم کا ایک آزادانہ عمل

صرف روایت ہی سے آزادی نہیں، خون اور نسل کی گرفت سے بھی... دیوانگی کے اس عالم میں جب ۳ جولائی ۱۹۴۷ء کو بچے کا جنم ہوا اور پہلی بار اس کی شکل دیکھی تو اپنی خلاقی پر یقین آ گیا اور بچے کے واضح ہوتے ہوئے خد و خال کے ساتھ اپنا تصور واقعی متشکل ہوتا نظر آیا۔ میرے بیٹے کی صورت سچ مچ ساحر سے ملتی ہے۔" (ص: ...)

لتا منگیشکر اور سدھا ملہوترہ کے نام بھی جو فلمی دنیا کی مشہور مغنیائیں ہیں، ساحر سے منسوب رہ چکے ہیں۔ لتا کی آواز کی جادوگری سے متاثر ہو کر ساحر نے ایک نظم بھی کہی ہے جو پیر کاش پنڈت کی ادارت میں دلّی سے نکلنے والے رسالے "فنکار" میں شائع ہوئی تھی اور اس کا انتساب لتا کے نام تھا:

یوں اچانک تری آواز کہیں سے آئی
جیسے پربت کا جگر چیر کے جھرنا پھوٹے
یا زمینوں کی محبت میں تڑپ کر ناگاہ
آسمانوں سے کوئی شوخ ستارا ٹوٹے

یہ نظم "تلخیاں" کے بعد کے ایڈیشنوں میں "تیری آواز" کے عنوان سے شامل ہے مگر انتساب حذف کر دیا گیا ہے۔

لتا کی محبت کی یادگار ساحر کی ایک اور نظم "انتظار" بھی ہے۔ یہ بھی "تلخیاں" میں شامل ہے اور فلم میں بھی گائی گئی ہے:

چاند مدّھم ہے آسماں چپ ہے
نیند کی گود میں جہاں چپ ہے

دور وادی میں دودھیا بادل
جھک کے پربت کو پیار کرتے ہیں
دل میں ناکام حسرتیں لے کر ——
ہم ترا انتظار کرتے ہیں

سدھا ملہوترہ کے ساتھ ساحر کا عشق اخباری سرخیوں کی بھی زینت بنا اور
بی اور فلمی حلقوں میں مہینوں اس کے چرچے رہے۔ پھر ساحر اور سدھا کی راہیں الگ
ے ہو گئیں اور ساحر تعلق کے موڑ پر تنہا کھڑے رہ گئے۔ ان کی نظم "خوبصورت موڑ"
بعد میں فلم "گمراہ" میں گائی گئی اسی ترکِ تعلق کی یادگار ہے۔ نظم بالخصوص اس کا
بند:

تمہارے ساتھ بھی پرچھائیاں ہیں اپنے ماضی کی
مرے ہمراہ بھی گزری ہوئی راتوں کے سائے ہیں
تمہیں بھی کوئی الجھن روکتی ہے پیش قدمی سے
مجھے بھی لوگ کہتے ہیں کہ یہ جلوے پرائے ہیں

اہی دیتا ہے کہ طرفین اپنے اپنے ماضی کے آسیب سے پیچھا نہ چھڑا سکے اور
رنی یادوں کا یہی آسیب جو اپنے دامن میں بہت سی الجھنیں لیے ہوئے تھا آخر
ونوں کے درمیان علیحدگی کی دیوار بن کر کھڑا ہو گیا۔

ساحر کی زندگی میں جو دوسری لڑکیاں آئیں ان میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی
م ہیں اس لیے ان کے ذکر سے گریز مناسب ہے۔ لیکن ان میں سے ایک خاتون یہ
وی کرتی ہیں کہ ساحر نے ان سے نکاح کر لیا تھا اور وہ بہت دن تک ساحر کے
اتھ ان کے گھر میں رہی ہیں۔ پھر کچھ اختلافات پیدا ہوئے اور ساحر نے انھیں گھر سے
ال دیا (بیسویں صدی، ساحر نمبر) ایسی کوئی شہادت موجود نہیں کہ ساحر نے اس

شادی کا اعتراف کیا ہو لیکن اگر ان خاتون کا بیان درست ہے تو کہنا پڑے گا کہ ساحر نے اس معاملے میں اپنے والد جیسا ظالمانہ رویّہ ہی اختیار کیا اور عمل کی حد تک اپنے ان خیالات سے خود ہی منحرف ہو گئے جن کا اظہار عورت کے تئیں ان کی شاعری میں بار بار ہوا ہے۔ اس کا یقیناً کوئی گہرا نفسیاتی سبب ہوگا۔

ساحر کے بارے میں ان کے بعض دوستوں کا کہنا ہے کہ وہ بد مزاج اور مردم بیزار تھے لیکن یہ پوری سچائی نہیں۔ بمبئی میں ساحر کی شامیں اکثر دوستوں کے ساتھ ہی گزرتی تھیں اور شام کی یہ محفلیں ان کے گھر پر ہی آراستہ ہوتی تھیں۔ تما فاضلی کا بیان ہے اور بعض دوسرے لوگ بھی اس کی تائید کرتے ہیں ان محفلوں میں ساحر مہمانوں کی خوب مدارات کرتے، قیمتی سے قیمتی شرابیں اور سگریٹ پیش کرتے لیکن جب محفل نشے کے عروج پر ہوتی تو وہ کوئی بہانہ بنا کر کسی پہ برس پڑتے اور کبھی کبھی نوبت دست درازی تک بھی پہنچ جاتی۔ لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ ان لمحات میں دوست اور شناسا تو ایک طرف وہ اپنی ماں اور رشتے کی ان بہنوں تک کا لحاظ نہیں کرتے تھے جو برسوں سے ان کے ساتھ رہ رہی تھیں۔ لیکن ان کی یہ جنونی کیفیت عارضی ہوتی، صبح تک وہ نارمل ہو جاتے اور اپنے رویّے پر ندامت اور معذرت کا اظہار کرتے۔ کوئی ماہر نفسیات بہ آسانی سمجھ سکتا ہے کہ ساحر کا یہ رویّہ اس جذباتی ناآسودگی کے اظہار کی ایک صورت تھی جس کا احساس شراب پی کر شدّت اختیار کر لیتا ہوگا۔ ورنہ وہ مردم بیزار نہ تھے۔

O

آئیے اب اس پس منظر کے ساتھ ساحر کے ادبی کردار اور ان کے شعری رویّوں کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

ساحر ایک بڑے زمین دار باپ کے اکلوتے بیٹے تھے۔ انھیں والدین کا جتنا لاڈ پیار ملنا تھا کم ملا لیکن ان کے والد جس طبقاتی معاشرے کی نمائندگی کرتے تھے اس کے کچھ مخصوص آداب تھے غیر انسانی اور جھوٹے طبقاتی وقار پر مبنی۔ ان کے والد کے جذبۂ پدری پر طبقاتی برتری کا یہ پُر فریب احساس غالب آگیا اور یہ چیز باپ بیٹے کے درمیان ایک گہری خلیج کی طرح حائل ہو گئی۔

طبقاتی درجہ بندی کے خلاف ساحر کی شاعری جس شدید جذبے کی حامل ہے اسے ان کے اسی تجربے کی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔ عجب نہیں کہ اشتراکی تحریک سے جو ایک غیر طبقاتی عالمی سماج کے قیام کی مدّعی تھی، ان کے متاثر ہونے کا سبب بھی اوّلاً ان کا یہی تجربہ بنا ہو:

میرے ماضی کو اندھیرے میں دبا رہنے دو
میرا ماضی مری ذلّت کے سوا کچھ بھی نہیں
میری امیدوں کا حاصل مری کاوش کا صلہ
ایک بے نام اذیّت کے سوا کچھ بھی نہیں (نظم: فرار)

یہ بے نام اذیّت جو انھیں اپنے ماضی سے ملی تھی، ساحر کا زندگی بھر پیچھا کرتی رہی۔ ان کا ماضی ان کے حال پر متواتر اپنا تاریک سایہ ڈالتا رہا اور وہ اس سے کبھی نجات نہ پا سکے۔ ان کے دل و دماغ پر اذیّت ناک ماضی کی اس مضبوط گرفت

نے ان کی نفسیات (اور نتیجے میں ان کے تخلیقی عمل) پر بڑے گہرے اثرات مرتب کیے نظم "جاگیر" اس کی غماز ہے کہ وہ اپنے ماضی کو اپنے لیے ذلت اور اذیت کا باعث کیوں تصور کرتے تھے۔ اس نظم کے تین بند یہ ہیں:

یہ لہکتے ہوئے پودے، یہ دمکتے ہوئے کھیت
پہلے اجداد کی جاگیر تھے، اب میرے ہیں
یہ چراگاہ، یہ ریوڑ، یہ مویشی، یہ کسان
سب کے سب میرے ہیں، سب میرے ہیں، سب میرے ہیں

میں اُن اجداد کا بیٹا ہوں جنھوں نے پیہم
اجنبی قوم کے سائے کی حمایت کی ہے
غدر کی ساعتِ ناپاک سے لے کر اب تک
ہر کڑے وقت میں سرکار کی خدمت کی ہے

ہائے یہ شام، یہ جھرنے، یہ شفق کی لالی
میں ان آسودہ فضاؤں میں ذرا جھوم نہ لوں
وہ دبے پاؤں اُدھر کون چلی جاتی ہے
بڑھ کے اس شوخ کے ترشے ہوئے لب چوم نہ لوں

ساحر کا شاعرانہ تخیل انھیں اپنی جاگیر سے کہیں بہت دور لے جاتا ہے جہاں وہ اپنے بزرگوں کو غیر ملکی حکمرانوں کو خوش آمدید کہتے دیکھتے ہیں اور اس کے صلے میں اپنی ہی زمین کے کچھ ٹکڑے بطور خیرات پاکر، احسان مندی کے بار سے جھکتے ہوتے بھی۔ محترم اجداد کی اس تکلیف دہ روش پر ان کا دل کڑھتا ہے اور جب انھیں تصور یہ منظر دکھاتا ہے کہ غیر ملکیوں کے سامنے سربسجود ہونے والے ان کے یہی اجداد اپنے ان ہموطنوں پر جو وطن سے غداری کے صلے میں حاصل شدہ ان کی زمینوں پر اپنا خون پسینہ بہاکر انھیں زرخیز بناتے ہیں، کس طرح کا تحکم روا رکھتے ہیں اور کس طور انھیں پامال کرتے ہیں تو غم و غصہ کے ساتھ ساتھ ایک شدید ندامت کا احساس بھی ان کے اندر جاگ اٹھتا ہے اور ان کے پورے وجود میں سرایت کر جاتا ہے۔

نظم کے آخری بند تک پہنچتے پہنچتے ساحر جو یہاں ایک نوجوان جاگیردار کی نمائندگی کر رہے ہیں، پھر اپنی جاگیر پر لوٹ آتے ہیں۔ یہ بند جنسی استحصال کے جس مکروہ پہلو کی طرف اشارہ کر رہا ہے وہ بھی ساحر کے احساسات میں ہمیشہ زہر ملا نشتر بن کر کھٹکتا رہا ہے۔ ساحر کے حالات پر نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ بھی ان کا ذاتی مشاہدہ تھا۔ ساحر کے باپ نے پے در پے کئی شادیاں کیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ شادیاں وہ اولادِ نرینہ کی خواہش میں کرتے چلے گئے لیکن یہ کہنا آسان نہیں کہ اس کے پیچھے جنسی ہوس کارفرما نہیں تھی اور لڑکا پیدا کرنے کی اس بے لگام خواہش کو بھی جاگیردارانہ معاشرے کی مخصوص ذہنیت کے سوا کوئی دوسرا نام دینا مشکل ہے۔ لیکن جب یہ لڑکا پیدا ہوا تو صرف اس خطا پر کہ جس عورت کی کوکھ سے اس نے جنم لیا تھا وہ ان کی نظر میں خاندانی لحاظ سے ان کی ہمسر نہیں تھی، ساحر کے والد نے اسے راز رکھنا چاہا کہ وہ ان کی منکوحہ ہے اور نوبت میاں بیوی کے درمیان مقدمے بازی تک پہنچی۔ ساحر نے جب ہوش سنبھالا ہوگا اور یہ ماجرا ان کے سامنے آیا ہوگا تو رشتوں کی اس پاکیزگی کی ان کی نظر میں کیا وقعت رہ گئی ہوگی جس کا ڈھنڈورا مذہب دن رات پیٹتی رہتی ہے۔ مرد کی ہوسناکی اور اس کے ہاتھوں عورت کی پامالی کا جو تصور ساحر کی پوری شاعری میں جاری و ساری ہے اس کی جڑیں یہیں تلاش کی جانی چاہیں:

مدد چاہتی ہے یہ حوّا کی بیٹی
یشودھا کی ہم جنس، رادھا کی بیٹی
پیمبر کی امّت، زلیخا کی بیٹی
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں

یہ ساحر کی مشہور نظم "چکلے" کا ایک بند ہے۔ اس نظم کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا پورا معاشرہ ایک چکلے کا منظر پیش کر رہا ہے جہاں عقیدوں کا تقدس، رشتوں کا احترام، محبت، مروّت کسی کی حیثیت جنسِ تجارت سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔

مذہب کو بنیاد بناکر ایک انسان دوسرے انسان پر جو تشدد روا رکھتا ہے اور بہیمیت اور بربریت کی جن حدوں پر جا کھڑا ہوتا ہے، تقسیم ملک کے وقت ساحر کو اس کا بھی ذاتی تجربہ ہوا۔ ان کی شفیق والدہ تقسیم کے ہنگامۂ کشت و خون میں ان سے بچھڑیں اور وہ ان کی تلاش میں جان ہتھیلی پر لیے اِدھر اُدھر بھٹکتے رہے۔ انھوں نے فرقہ وارانہ عصبیت کا خونی ناچ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور ان کا انسانی اخوت کا وہ خواب چکنا چور ہو کر رہ گیا جس کی تعبیر کے جویا ہر دور کے نیک دل انسان ہیں۔ مذہب سے بیگانگی بلکہ کسی حد تک بیزاری کا راستہ اشتراکی نظریے نے انھیں دکھایا ہوگا لیکن ان کی شاعری سے ایک غیر مذہبی انسانی معاشرے کا جو تصور ابھرتا ہے اس کی آبیاری اس خون نے بھی ضرور کی ہے جو انھوں نے مذہبی جنون کے نتیجے میں وطنِ عزیز کی سڑکوں پر اور گلیوں میں بہتے دیکھا تھا۔ اکثر ترقی پسند مصنفین نے ان خونیں واقعات کی ایسی توجیہیں اور تاویلیں پیش کرنے کی کوشش کی ہے جن کے سہارے ان کی ذمہ داری کسی بیرونی طاقت کے سر ڈال دی جائے، بالخصوص ملک چھوڑ کر جانے والے بدیسی حکمرانوں پر لیکن ساحر بجا طور پر ان کا ذمہ دار ہموطنوں کے بیجا اشتعال اور ناعاقبت اندیشی کو ٹھہراتے ہیں۔ ان کی نظم "آج" فسادات کے المیے پر ایک ایسے شخص کا تاثر پیش کرتی ہے جو اپنے ساتھی انسانوں کو حیوانوں کے روپ میں دیکھ کر سرتابقدم کراہ بن کر رہ گیا ہے:

اور میں — اپنا ٹوٹا ہوا ساز تھامے
سرد لاشوں کے انبار کو تک رہا ہوں
میرے چاروں طرف موت کی وحشتیں ناچتی ہیں
اور انساں کی حیوانیت جاگ اٹھی ہے
بربریّت کے خونخوار عفریت
اپنے ناپاک جبڑوں کو کھولے
خون پی پی کے غرّا رہے ہیں

بچے ماؤں کی گودوں میں سہمے ہوتے ہیں
عصمتیں سر برہنہ پریشان ہیں
ہر طرف شورِ آہ و بکا ہے
اور میں اس تباہی کے طوفان میں
آگ اور خوں کے ہیجان میں
سرنگوں اور شکستہ مکانوں کے ملبے سے پُر راستوں پر
اپنے نغموں کی جھولی پسارے
در بدر پھر رہا ہوں ——

....

امن عالم کو موضوع بنا کر بھی بہت سے ترقی پسند شاعروں نے نظمیں کہی ں لیکن ان میں سے اکثر نظمیں ایک ہنگامی تحریکی نقطۂ نظر کی حامل ہیں اور شاید ں وجہ ہے کہ بہت کم مدّت میں یہ ذہنوں سے محو ہو گئیں۔ ساحر کی نظم "پرچھائیاں" ں موضوع پر ایک ایسی نظم ہے جو طویل زندگی پائے گی کیوں کہ ساحر نے موضوع ظم میں رسمی طور پر نہیں برتا ہے بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نظم اپنی تمام تر تاثر یزی کے ساتھ آہستہ آہستہ شاعر کے باطن سے ابھری ہے اور اس کے زخم ردہ دل اور تاراج شدہ زندگی کے حوالے سے جنگ کی ان ہولناکیوں کو امنے لاتی ہے جو پوری بنی نوع انسان کو اپنا ہدف بنانے کی گھات میں ہیں۔ ختام تک پہنچتے پہنچتے نظم پھر شاعر کے ذاتی المیے کی طرف مراجعت کرتی ہے اور ری کے ذہن پر ایک بھر پور تاثر قائم کرتی ہے۔ سردار جعفری کے لفظوں میں یسری جنگ کے خطرے کے سامنے جو ایٹمی ہتھیاروں سے لڑی جائے گی ے (شاعر کو) نئی محبت کرنے والی روحیں ہی نہیں بلکہ اپنی تنہائیاں اور اپنے وّرات کی پرچھائیاں بھی غیر محفوظ معلوم ہوتی ہیں اور وہ پچھلی جنگ اور آنے لی جنگ کا تقابل اس طرح کرتا ہے:

گزشتہ جنگ میں گھر ہی جلے مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ تنہائیاں بھی جل جائیں
گزشتہ جنگ میں پیکر جلے مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ پرچھائیاں بھی جل جائیں

ں طرح نظم اس ذاتی تاثر کی سطح پر واپس آجاتی ہے جس سے شروع ہوئی تھی۔ م کا یہ خاتمہ بیحد خوبصورت اور موثر ہے۔"

ساحر کے سیاسی آدرشوں نے ان کا بہت دور تک ساتھ دیا۔ غیر ملکی اراجی حکمرانوں سے ملک کی نجات کا خواب اور عالمی سطح پر ایک انسانیت ست، امن پسند اور مساوات پر مبنی غیر طبقاتی سماج کے قیام کا تصوّر ان کے دل ں ہمیشہ امنگیں جگاتا رہا۔ لیکن آزادی کے بعد ملکی سیاست نے دھیرے دھیرے غیر اخلاقی رخ اختیار کیا، قومی رہنما خود اپنے عوام کا جس بے شرمی سے استحصال رنے لگے خود عام افراد نے قومی مفاد پر ذاتی مفاد کو ترجیح دینے کی جو روش اپنائی، اور ر بین الاقوامی سیاست نے جو رنگ دکھایا، ان کے پسندیدہ فلسفہ حیات

مارکسزم لینن ازم کی جو باہم متضاد و متخالف تعبیریں سامنے آئیں اور خود اُن کے خوابوں کی سرزمین سوویت روس میں، اشتراکی انقلاب کے بعد رونما ہونے والے ناپسندیدہ واقعات و عوامل سے، اسٹالن کی موت کے بعد جس طرح یکے بعد دیگرے پردے اٹھتے چلے گئے، اس کے نتیجے میں ان کی یہ امنگیں بھی آخر آخر مضمحل ہو گئی تھیں جو نظریہ جو زندگی بھر انھیں عزیز رہا تھا اپنا بھرم کھو رہا تھا اور جو افراد اور قومیں اس نظریے کی علم دار تھیں، ان کی منافقت بھی ان پر عیاں ہو گئی تھی۔ ساحر جیسے حساس انسان اور شاعر کے لیے ازالۂ سحر کا یہ تجربہ کس قدر اذیت ناک رہا ہوگا اس کا اندازہ ان کی آخری دور کی نظموں سے بخوبی ہو جاتا ہے جو اُن کے دوسرے مجموعۂ کلام "آؤ کہ کوئی خواب بنیں" میں شامل ہیں۔ یہاں دو نظموں کے کچھ اشعار پیش کیے جاتے ہیں پہلی نظم کا عنوان ہے "۲۶ جنوری":

آؤ کہ آج غور کریں اس سوال پر
دیکھے تھے ہم نے جو، وہ حسیں خواب کیا ہوئے
دولت بڑھی تو ملک میں افلاس کیوں بڑھا
خوش حالیِ عوام کے اسباب کیا ہوئے
جمہوریت نواز، بشر دوست، امن خواہ
خود کو جو خود دیے تھے وہ القاب کیا ہوئے
مجرم ہوں میں اگر تو گنہگار تم بھی ہو
اے رہبرانِ قوم خطا کار تم بھی ہو

"لینن" پر نظم دو حصّوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصّے کا ذیلی عنوان ہے "۱۹۱۷" اس میں ساحر نے لینن کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا ہے:

اخلاق پریشاں تھا، تہذیب ہراساں تھی
بدکار 'حضوروں'، سے بدنسل 'جنابوں' سے
عیّار سیاست نے ڈھانپا تھا جرائم کو
اربابِ کلیسا کی حکمت کے نقابوں سے
انساں کے مقدّر کو آزاد کیا تونے
مذہب کے فریبوں سے، شاہی کے عذابوں سے

نظم کے دوسرے حصّے کا ذیلی عنوان ہے "۱۹۷۰" اس میں لینن کو خطاب کرتے ہوئے ساحر لینن ازم کے اس زوال کا ماتم کرتے نظر آتے ہیں جس سے وہ مشرق و مغرب میں دوچار ہے:

کیا جانیں، تری اُمّت کس حال کو پہنچے گی
بڑھتی چلی جاتی ہے تعداد اماموں کی
ہر گوشۂ مغرب میں ہر خطّۂ مشرق میں
تشریح دگرگوں ہے اب تیرے پیاموں کی
وہ لوگ جنہیں کل تک دعویٰ تھا رفاقت کا
تذلیل پہ اُترے ہیں، اپنوں ہی کے ناموں کی

....

طبقوں سے نکل کر ہم فرقوں میں نہ بٹ جائیں
بن کر نہ بگڑ جائے تقدیر سلاموں کی

ساحر اوائل عمر ہی سے جن مجروح احساسات کے ساتھ زندگی گزارتے رہے انھوں نے ان کی شخصیت اور شاعری دونوں پر گہرے اثرات ڈالے ہیں ـــــ ساحر کی حیاتِ معاشقہ کے بارے میں کئی روایتیں ہیں لیکن ان تمام روایتوں میں ایک بات مشترک ہے۔ وہ یہ کہ ان کے ہر معاشقے کا اختتام ناکامی پر ہوا۔ اس ناکامی کی وجہ کیا تھی؟ محبوبہ کا گریز؟ غالباً نہیں۔ امرتہ پریتم نے جو شاید ان کی پہلی محبت تھیں، ساحر کے ساتھ اپنے تعلقِ خاطر کا جس والہانہ انداز میں ذکر کیا ہے اور ان کے لیے جس جذباتی وارفتگی کا اظہار کیا ہے وہ اس قیاس کی تردید کے لیے کافی ہے۔ خود ساحر کی شاعری سے جس محبوبہ کی تصویر ابھرتی ہے وہ بھی کسی بے وفا لڑکی کی تصویر نہیں۔ اس میں خود سپردگی کی ادا بھی ہے اور خوئے وفا بھی۔ بالعموم اظہارِ محبت میں پہل بھی اسی کی طرف سے ہوتی ہے:

برف برسائی مرے ذہن و تصوّر نے مگر
دل میں اک شعلۂ بے نام سا لہرا ہی گیا
تیری چپ چاپ نگاہوں کو سلگتے پاکر
میری بیزار طبیعت کو بھی پیار آ ہی گیا
(نظم "اسی دوراہے پر")*

ایسی شہادتیں موجود ہیں کہ ساحر کی زندگی میں جو لڑکیاں آئیں، ساحر ان میں سے جسے چاہتے اپنا سکتے تھے مگر وہ ایسا نہ کر سکے۔ ساحر نے اپنی بیشتر نظموں میں اپنی اس محرومی کا ذمہ دار اس سماجی ماحول کو قرار دیا ہے جہاں ہر چیز زر کی ترازو میں تلتی ہے۔ ساحر کا رقیب سرمایہ دار ہے اور وہ ان کی محبوبہ کو خرید لیتا ہے۔ ان کی حیاتِ معاشقہ سے متعلق لگ بھگ ہر نظم یہی کہانی دہراتی ہے۔ یہاں صرف ایک نظم کا حوالہ کافی ہے جس کا عنوان ہے "شہکار":

مصوّر! میں ترا شہکار واپس کرنے آیا ہوں

تبسّم آفریں چہرے میں کچھ سنجیدگی بھر دے
جواں سینے کی مخروطی اٹھانیں سرنگوں کر دے
گھنے بالوں کو کم کر دے مگر رخشندگی دے دے
نظر سے تمکنت لے کر مذاقِ عاجزی دے دے

مگر ہاں بنچ کے بدلے اسے صوفے پہ بٹھلا دے
یہاں میری بجائے اک چمکتی کار دکھلا دے

لیکن ساحر یہاں ایک نفسیاتی مغالطے کا شکار ہیں۔ اگر قصہ صرف اتنا ہی ہوتا تو ایک مقام وہ آیا تھا جہاں ساحر بھی بہ آسانی محبوبہ کو چمکتی کار پیش کر سکتے تھے۔

اس حیثیت کو پہنچنے کے بعد بھی ساحر کی زندگی میں کئی لڑکیاں آئیں مگر ان کی تنہائیوں کی ساتھی نہ بن سکیں۔ پھر ساحر کی اس محرومی کے اسباب کہاں تلاش کیے جائیں؟ میرا جواب یہ ہے کہ ساحر کے انھی تلخ تجربات میں جن سے ان کی زندگی عبارت تھی۔ اوپر ان کی نظم "اسی دوراہے پر" کا جو بند نقل ہوا ہے، اس کا آخری مصرعہ ہے:

میری بیزار طبیعت کو بھی پیار آ ہی گیا

اس معمے کی کلید ان کی یہی "بیزار طبیعت" ہے جس نے انھیں زندگی بھر نہ کسی کا ہونے دیا نہ کسی کو اپنا بنانے دیا اور اس بیزاری کے پیچھے وہی مشاہدے اور تجربے ہیں جو ان کے پورے وجود میں کڑواہٹ اور ہراس بن کر سما گئے تھے۔ تائید مزید کے لیے ان کی نظم معذوری کے یہ چند شعر بھی پڑھ لیجئے:

میں کہ مایوسی مری فطرت میں داخل ہو چکی
جبر بھی خود پر کروں تو گنگنا سکتا نہیں
مجھ میں کیا دیکھا کہ تم الفت کا دم بھرنے لگیں
میں تو خود اپنے بھی کوئی کام آ سکتا نہیں

دل تمھاری شدّتِ احساس سے واقف تو ہے
اپنے احساسات سے دامن چھڑا سکتا نہیں
تم مری ہو کر بھی بیگانہ ہی پاؤ گی مجھے
میں تمہارا ہو کے بھی تم میں سما سکتا نہیں

ساحر کی ایک غزل کا شعر بھی یاد آیا جو ان کی اس مخصوص مزاجی کیفیت کا آئینہ دار ہے:

ہر شے قریب آ کے کشش اپنی کھو گئی
وہ بھی علاجِ شوقِ گریزاں نہ کر سکے

ان کے اس "شوقِ گریزاں" نے انھیں کسی ایک موڑ پر ٹھہرنے نہ دیا وہ زندگی بھر کچھ پرچھائیوں کا تعاقب کرتے رہے۔

ساحر کے فکری میلانات اور شعری اظہارات پر مختلف لوگوں نے اظہارِ خیال کیا ہے ـــــ میں اپنے اس خیال پر اصرار کرتا ہوں کہ اپنے ماضی سے گریزاں، حال سے ناآسودہ اور مستقبل سے ہراساں ایک شخص، سماجی ناانصافیوں اور نابرابریوں کے خلاف مسلسل احتجاج کرتا ہوا، نام نہاد مہذب معاشرے کی چیرہ دستیوں اور عورت کی پامالیوں پر کڑھتا ہوا، اس بھری پری دنیا سے الگ تھلگ، اپنی سلگتی ہوئی تنہائیوں کے صحرا میں سفر کرتا ہوا ایک کردار ان کی پوری شاعری کا محور و مرکز ہے، یہ شخص کوئی اور نہیں خود ساحر ہیں اور یہ شعر کسی اور کا نہیں خود ساحر کا ہے۔ یہ شعر ایک بار پھر پڑھ لیجئے کہ اپنی شاعری میں ساحر کا یہ دعویٰ لفظ بہ لفظ درست معلوم ہوتا ہے:

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

ساحر نے اپنی زندگی میں حوصلہ شکن تلخ حقیقتوں کا سامنا کرتے ہوئے

(بقیہ صفحہ ۸

---

* نظم کا عنوان صاف اشارہ کر رہا ہے کہ شاعر اس تجربے سے پہلے بھی گزر چکا ہے۔

حکیم منظور کا تعلق اس صدی کے آٹھویں دہے میں اُبھر کر سامنے آنے والے شعراء کی نسل سے ہے۔ ولادت سری نگر میں ہوئی۔ تاریخ پیدائش ۱ر جنوری ۱۹۴۷ء ہے۔ آپ ریاستی سرکار کے جموں ڈویلپمنٹ بورڈ میں سکریٹری کے عہدے پر فائز ہیں۔ غزلیات کا ایک مجموعہ "ناتمام" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

حکیم منظور کی غزلیں ایک نئے احساس کی حامل ہیں۔ اس نئے احساس کے رشتے اس کے اسلوب اور افکار دونوں میں تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ غزل کی لَے کی طرح اس کی فکری سطح بھی مختلف ہے۔ فکر آفرینی کے رشتے سے اس کے افکار کا سلسلہ وسیع ہے۔ یہ وسعت اور کشادگی کشمیر کے ماحول میں پیوست انسلاکات اور تلازموں کے موثر اظہار سے عبارت ہے۔

حکیم منظور کا لب ولہجہ استفسارانہ اور استفہامیہ ہے جو اپنی جگہ ایک سوچتے ہوتے، اُلجھی گتھیوں کو سُلجھاتے ہوئے ذہن کی دلیل ہے۔ سوچنے اور سُلجھانے کا عمل توجہ کے بتدریج مرکوز اور نتائج کے رفتہ رفتہ منکشف ہونے کا عمل ہے۔ نوعیت کے اعتبار سے یہ فکری ہے۔ یہ خود کلامی جیسے زیرِ لب آہنگ کا حامل ہے۔ اس سے اس کے اشعار کی شدّت اور تاثیر دونوں میں اضافہ ہوا ہے۔

حکیم منظور نے ذات کی ترسیل کے لیے ایک اپنی راہ نکالنے کی سعی کی ہے۔ یہ سعی عصری آگہی کے اخباری اظہار اور نئی شاعری کے بندھے ٹکے ذخیرۂ الفاظ سے احتراز نیز اخبار و اشعار کی واضح اور شعوری تمیز کا سبب اور نتیجہ ہے۔

جداگانہ فکری سطح پر الفاظ کے تخلیقی استعمال کی ایک اور علامت تجریدی تخیّل ہے جو بیک وقت اس کے اندازِ مشاہدہ اور اسلوب کا حصّہ ہے۔ تجرید کی طرف اس کا تخلیقی سفر وافر امکانات کا حامل ہے۔

حکیم منظور

سی۔۸۔ گورنمنٹ کوارٹرز،
گاندھی نگر۔ جموں ۱۸۰۰۰۴

چند ہنستے بولتے رنگین منظر بھیجنا
ہو سکے تو اِک نیا موسم زمیں پر بھیجنا

ایک اُلجھن: باسی اور نمکین پانی کا مزاج
ایک ہی خواہش: ترو تازہ سمندر بھیجنا

میں بہت حیران ہوں، اس آئینوں کے شہر میں
پھر وہ پتھر بھیجنا یا ایک خنجر بھیجنا

ایک ویرانی سی ویرانی ہے اِن اطراف میں
کچھ ہوائے تازہ، کچھ شاخِ ثمرور بھیجنا

رات کی خُنکی میں دینا، تھوڑی سی گرمی اُدھار
دوپہر کی دھوپ میں سائے کی چادر بھیجنا

سر چڑھا ہے، ایک بُوڑھے دیو کے، خوں کا مزہ
اُس کو میں قابو کروں جس سے، وہ منتر بھیجنا

اب کے میرا کعبۂ دل، دُشمنوں کی زد پہ ہے
پھر مدد کرنا، ابابیلوں کے لشکر بھیجنا

بھیجنا تو پھول، دینا تو ندائے عافیت
کُل قلم سے لکھ کے یُوں میرا مُقدّر بھیجنا

کوروَوں نے پھر سجایا ہے مہابھارت کا یُدھ
تُو ہمارے واسطے کا ہَن کا چکّر بھیجنا

تھک گیا ہوں میں شکستہ چشم، منظر پھیر دے
اِک نئی قوسِ قزح، دوشِ ہوا پر بھیجنا

کچھ بدل جائے سماعت اور تکلّم کا مزاج
گھس گئے ہیں لفظ سب، اِک تازہ اکھشر بھیجنا

خون فاسد ہو گیا ہے، سارے پیکر سرد ہیں
گرمیٔ اخلاص، اِک سفّاک خنجر بھیجنا

مُسکراتے، کھیلتے معصوم بچّوں کے لیے
آنگنوں میں قاف کی پریوں کے لشکر بھیجنا

زرد پتّوں کی صدا سے سخت گھبراتا ہے دل
اب نہ خوں تشنہ ہواؤں کو زمیں پر بھیجنا

پڑ گئے منظور پھیکے، رنگ جو آنکھوں میں تھے
اے خُدا ہر رنگ اب پہلے سے بہتر بھیجنا

خبر، خبر ہو گئی ہے مہمل، نظر نظر تازہ خواب لکھنا
ہوا، ہوا، باسی خوشبوؤں پر نئے مہکتے گلاب لکھنا

ہے فرض میرا بس اتنا لکھوں، یہ برفباری کے روز و شب ہیں
تجھے کوئی بات یاد آئے تو میرے خط کا جواب لکھنا

گنوا رے الفاظ کا جزیرہ نہ جانے کس دُھند میں چھپا ہے
سوال میرے لیے بنا ہے، ترے بدن کی کتاب لکھنا

کوئی بھی مشکل! اِمرار و تیہ، نئے شجر تازہ گُل اُگانا
کوئی بھی موسم تمہاری شدّت سمندروں پر سحاب لکھنا

رہا جو خنجر کی طرح، حائل ہمارے ملنے کی سرحدوں پر
اُس ایک لمحے کا اب ہے ممکن، کہاں مکمّل حساب لکھنا

عجیب یکسانیت ہے حاوی، میں تھک گیا ہوں مرے سفر میں
پُرانے موسم کے سچ کے بدلے نئی رُتوں کا سراب لکھنا

سماعتوں کی شکست ہو بھی تو تجھ کو منظور غم نہیں ہے
کہ ہے تکلّم پہ فرض میرا، نئے نئے آفتاب لکھنا

راہ بے انت، بے شجر۔ دِل تنگ
برف پیکر نظر نظر۔ دِل تنگ

بے تسلّی، کرم صفت چہرے
گھر کُشادہ بہت۔ مگر۔ دِل تنگ

دَوڑتی، جاگتی ہوئی راہیں
اُونگھتی، سوچتی سحر۔ دِل تنگ

لفظ مظلوم، بے زباں قرطاس
بات بے رنگ اِس قدر۔ دِل تنگ

ریت پر ایک قطرۂ معصوم
ریت خُود سُرخ آگ پر۔ دِل تنگ

آسماں خُود بخود سمٹتا ہُوا
آنکھ بے خوف، بے خبر۔ دِل تنگ

آنکھ سے آئینے کی منزل تک
شیشہ شیشہ قدم، سفر۔ دِل تنگ

آسماں تک اُٹھی ہوئی دیوار
روزِ اوّل سے عُمر بھر۔ دِل تنگ

ایک منظور۔ لاکھ نا منظور
ہر کوئی درپئے ضرر۔ دِل تنگ

جِگری دوست

بالا دُوبے
ایف ۵۳ گرین پارک، نئی دہلی
ترجمہ: شِو ناتھ سنگھ

اُن دونوں کو ساتھ دیکھ کر سبھی کو حیرت ہوتی۔ دھرم اور مذہب کی تلخ اور پھوٹ ڈالنے والی آواز اُن کے کانوں میں نہیں پڑی تھی شاید! مذہب کی بندشیں اُنہیں باندھ نہیں پائی تھیں۔ عبدل اکثر کہا کرتا تھا "اللہ تعالیٰ نے جب ہماری رُوح بنائی تو اُس کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ایک حصّہ تو میرے جسم میں آیا۔ اور دوسرا کیداری کے۔"

عبدل اور کیداری دونوں ساتھ ساتھ کام کرتے تھے۔ کام بھی کونسا انجانا تھا! علی گڑھ جنکشن کے یارڈ کے باہر اُن کا اڈا تھا۔ وہ دونوں ویگن توڑ کر مال کھسکانے میں بڑے ماہر تھے۔ اُن کے گروہ کے اور لوگ بھی انہیں ساتھ ساتھ دیکھ کر کہتے تھے: "دونوں ماں جائے معلوم ہوتے ہیں۔ اِن کے بیچ کبھی دراڑ نہیں پڑ سکتی۔"

تاہم وقت بسا اوقات بڑی آزمائش میں ڈال دیتا ہے؟ بات کتنی بڑھ گئی تھی، حالانکہ بات بہت معمولی تھی۔ واحد ریلوے کالونی کے فائرمین کی بیوی کو بہکا پھسلا کر بھگا لایا تھا اس کام میں رادھے نے اس کی مدد کی تھی۔ آخر تھے تو ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے! استھیا کے اچانک اس طرح غائب ہو جانے، اور پھر معاملات کا پتہ چلنے پر اس کا خاوند کیداری کے پاس امداد کے لیے آیا۔ اور سارا دکھڑا اُسے کہہ سنایا۔ کیداری نے اُسے یقین دلایا کہ اُس کے ساتھ پورا پورا انصاف ہوگا۔ ادھر واحد پہلے ہی عبدل کے یہاں پہنچ گیا۔ اور اسے الٹی پٹی پڑھا دی۔

عبدل اور کیداری اُس رات چینی کے ویگن کو توڑ کر لیول کراسنگ پر ملے تو کیداری ہی نے بات چھیڑی۔ "عبدل، اوّل تو میں عورتوں کے بکھیڑوں میں پڑتا نہیں لیکن اس طرح آنکھوں پر پٹی باندھنا بھی مشکل معلوم ہوتا ہے۔ آخر اس عورت کا گھر والا ریلوے ہی کا کارندہ ہے اور پھر ہمارے اڈے کے قریب رہتا ہے۔ کل کو یہ عیسائی بگڑ گیا تو ہمیں لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔"

عبدل کیداری کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا، لیکن ساتھ ہی ساتھ واحد کی حمایت بھی کرتا رہا۔ "دیکھ کیداری، نہ تو وہ سسری لگائی ہندو ہے اور نہ مسلمان۔ اگر وہ اِن دو میں سے ایک بھی ہوتی تو ہم اس جھمیلے میں پڑتے۔ اس لیے کہ ہمارے گروہ میں ہندو ہیں اور مسلمان بھی۔ لیکن وہ کم بخت تو عیسائن ہے۔ اور پھر جب وہ بے حیا اپنی مرضی سے واحد کے ساتھ چلی گئی ہے تو جانے دو۔ بھلا ہم کیوں پرائی آگ میں پڑیں اور ایک بدچلن عورت کی خاطر اپنے آپ کو الجھن میں ڈالیں اور دشمنی لیں؟" لیکن کیداری اُس کی رائے سے متفق نہیں تھا۔

دونوں ایک دوسرے کو سمجھاتے سمجھاتے خود اُلجھ بیٹھے۔ بالآخر یارڈ کا جنوبی حصّہ عبدل کا ہو گیا اور شمالی کیداری کا۔ اُن کا گروہ بھی دو حصّوں میں بٹ گیا۔ اس کے باوجود جب کبھی اُن کا آمنا سامنا ہو جاتا تو دُعا سلام ضرور ہوتی۔ بھلے ہی سہی۔ جیسے محض رسم نبھائی جا رہی ہو۔

وقت نے رفتہ رفتہ اپنے ہاتھ پاؤں اور پھیلاتے۔ عام آدمی سیاست میں دل چسپی لینے لگے۔ جب اُس دن چوتھی فیل عارف تک نے یہ کہا کہ چناؤ میں لالہ رام پرشاد نے پانچ لاکھ خرچ کیے اور جیتنے کے بعد بارہ لاکھ کمائے تو لوگوں کو ایک نئی تجارت کا سُراغ ملا۔ اور پھر سیاسی ہاتھ ایسے طبقوں کی پیٹھ تھپتھپانے لگے۔ کتنے ہی سیاسی اکھاڑے وجود میں آ گئے۔ شروع شروع میں آپس کی چشمکیں معمولی رہیں۔

قدرت کی عجیب ستم ظریفی ہے کہ جھگڑا کبھی برابر کے لوگوں میں نہیں ہوتا۔ البتہ اُنیس بیس میں اکثر ہوتا ہے۔ اُن اکھاڑوں نے بھی ایک دوسرے کے وقار کو مجروح کرنا شروع کر دیا۔ پھر ماحول مسلسل زہر آلود ہوتا چلا گیا۔ کہتے ہیں شروعات تو ایک رنگساز کے چاقو مارے جانے سے ہوئی۔ ایک عجیب تذبذب کا عالم تھا۔ اخبار والے ایک داڑھی والے کو مجرم بتلاتے تھے اور عوام ایک چوٹی والے کو۔ بہر حال جس وقت یادرام کو رام بھروسے نے خنجر بھونکا تو وہ خود ہی چلایا "مار ڈالا، مار ڈالا۔ یادرام کو ایک داڑھی والے نے مار ڈالا" اور لوگوں نے اُس کی بات کا نہ صرف یقین ہی کیا، بلکہ اپنے اپنے خنجروں کی دھاریں بنوانا شروع کر دیں۔ اس کے بعد داڑھی والے اور چوٹی والے چاقوؤں اور چھروں سے ایک دوسرے پر پل پڑے۔ فضا روز بروز زہر و قہر آلود ہوتی چلی گئی۔ سڑکوں پر خون ناحق کے دھبے دکھائی دینے لگے۔ اُن کی یہ خاموش فریاد سُنتا بھی کون؟ نفرت و دشمنی کے مہیب اندھیرے نے پورے شہر کو اپنے دامن میں سمیٹ رکھا تھا۔ کل سڑکیں جاگ اور جگمگا رہی تھیں۔ آج قبرستان کی طرح سنسان پڑی تھیں۔ سڑکوں کے سینے پر باوردی سپاہیوں کے بھاری بوٹوں کی چاپ البتہ سنائی دے رہی تھی۔ گلی کے کتے اس ویرانی میں سہمے سے، دُم دبائے اِدھر اُدھر بھٹک رہے تھے۔ اُن میں شاید ہندو یا مسلمان

،وہ بس گئے تھے۔جس دن ٹھٹھیروں والی گلی کے نکڑ پر شمّو کے پیٹ میں خود اُس
یار رحیم نے چاقو گھونپا تھا تو ایک کُتّا بڑی حیرت سے بھاگتے ہوئے رحیم کو دیکھتا
۔اُس نے ان دونوں کو ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈالے متعدد بار گلی سے
ہوتے دیکھا تھا۔لیکن آج اُسی رحیم نے یہ کیا کیا تھا؟ کُتّے نے پہلے شمّو کی لاش
قریب جاکر اُسے سونگھا اور پھر اپنی ایک ٹانگ اٹھا کر موتنے لگا۔اُسی وقت پولیس
چھ سپاہی اُدھر آدھمکے۔ایک چلبل سپاہی نے اُس کُتّے کے ہلکی سی لات جمائی۔کُتّا
ں،کوں" کرتا ہوا گلی کے سرے پر لوگوں کا تماشا دیکھنے لگا۔

ہر لحظہ وارداتیں خارش کی طرح بڑھ رہی تھیں۔اس کے باوجود عبدل اور
ری دونوں کے گروہ اپنی اپنی حدود میں سرگرم کار تھے۔

گڑبڑ شروع ہوتے آج چوتھا دن تھا۔گلی کوچے ویران پڑے تھے۔بند
ہا ایک سہمے ہوئے خاموش تماشائی کی طرح سکتے کے عالم میں تھیں۔سپاہی گشت
تھک کر اِدھر اُدھر سستانے کو بیٹھ گئے تھے۔جب کبھی سیٹی کی آواز سنائی
ی تو اُن کے کان کھڑے ہو جاتے۔کبھی کسی گوشے سے اللہ ہو کر کا شور اُٹھتا تو کبھی ہر ہر
ہو کا۔خدا بھی شاید بہرہ و بیابان گیا تھا۔وہ ہندوؤں کے بھگوان کا پارٹ
ادا کر رہا تھا اور مسلمانوں کے اللہ کا بھی۔کبھی کبھی گم صم ماحول میں دُور سے
واں سا اُٹھتا تو ایسے لگتا گویا زمین سے ایک بہت بڑا کالا ناگ آسمان کو ڈسنے
لیے اوپر اٹھ رہا ہے۔بھی آوازیں آتیں۔عورتوں کے رونے کی،بچوں کے
نے کی اور بڑوں کے نعروں کی۔ہر سمت دلدوز چیخوں اور آگ،آگ کا
بوجھل ماحول کو اور بھی مہیب بنا رہا تھا۔لیکن آہستہ آہستہ لوگ ان باتوں
مادی سے ہونے لگے تھے۔آگ یا دھواں ، مرنے والوں کی آخری کراہ ،
ں کی سنسناہٹ اور بموں کی گونج ــــ اب دونوں گروہ وحشی بن گئے
۔وہ گلیوں کے نکڑ پر گھات لگائے بیٹھے رہتے۔اُن کے کان کُتّوں جیسے ہو گئے
اُن کی چال بلّی کی سی ہو گئی تھی اور آنکھیں عقاب کی مانند تیز ہو گئی تھیں۔انھوں
نوروں کی خصوصیات اپنے کردار میں سمولی تھیں۔وہ مجسّم حیوان بن گئے تھے۔
وہ سمجھ دار جانور تھے۔وہ جانتے تھے کہ خدا کے گھر کے آس پاس اکثر شکار
جاتا ہے۔خدا کے گھر بھی کتنے ویران ہو گئے تھے۔ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان
کوئی پرسانِ حال نہیں رہا۔

غالباً وقت نے خدا کو بھی چیر کر دو نیم بنا ڈالا تھا۔ہندو اور مسلمان دونوں
پنے اپنے بھگوان اور خدا کا نام روشن کر رہے تھے۔کنٹھے والی گلی کے ایک سرے
بدل رہتا تھا اور دوسرے سرے پر ایک مندر تھا۔عبدل کے ساتھی ہر روز
کے ہاں جمع ہوتے تھے۔لوہاروں کے محلے میں ایک مسجد تھی۔خدا کے اِس
کے نگہبان وہاں اکٹھے ہوتے تھے۔شام کے جھٹپٹے میں شفٹ بدلتی تھی۔مندر
جا کرنے کے بعد لوگ جب گھروں کو لوٹنے لگے تو اُن کے ہمراہ کچھ بڑی
لڑکے بھی تھے،جو بلّی کی طرح چوکنے ہو کر چل رہے تھے۔انہیں یہ سان و
بھی نہ تھا کہ دوسری گلی کے دہانے پر ان کے مخالف،اُن کے اپنے بھائی
یوں و خنجروں سے لیس ہو کر اُن کا استقبال کرنے کے لیے بے چین کھڑے ہیں۔

یہ پانچ تھے،وہاں بیس کھڑے تھے۔جیسے چوہے کو بلّی دبوچتی ہے،اُسی طرح وہ
بھی ان پر ٹوٹ پڑے۔چیخ و پکار سے ماحول لرز اُٹھا۔عبدل تہمد لپیٹے اپنی کھاٹ
پر لیٹا ہوا تھا۔اُسی دم شمّو ہانپتا کانپتا ہوا آیا۔اور بولا "اُستاد" کچھ ہندوؤں کو گلی
کے دہانے پر گھیر لیا گیا ہے۔اُن میں کیداری کا لڑکا موہن بھی ہے۔یہ سنتے ہی عبدل
اِسپرنگ دار کھلونے کے مانند اچھل کر اُس طرف کو بھاگا۔وہاں تین نیم جان تو
ایسے تڑپ رہے تھے جیسے کسی نے مچھلیوں کو پانی سے نکال کر تپتی ہوئی ریت پر
پٹک دیا ہو۔عبدل یہ بھانپ کر کہ رمضانی موہن پر غالب آنے والا ہے،ایسے پھرتی
سے کُودا جیسے ایک تیراک ندی میں کودتا ہے۔وہ عین موہن کے اوپر جا کر گرا۔اس
کے ساتھ ہی رمضانی کا چاقو بھی اُس کے ہاتھ سے گر گیا۔اس نے لپک کر چاقو
اٹھا لیا۔اور وار کیا۔موہن پر نہیں،عبدل پر۔عبدل کا ہاتھ بُری طرح زخمی ہو گیا۔
سرخ خون کا دھارا سا بہہ نکلا۔

عبدل شیر کی طرح دہاڑا "یہ میرا لڑکا ہے۔خبردار،جو کسی نے اِسے ہاتھ لگایا تو"
اور وہ اپنے زخم کی پروا کیے بغیر موہن کو بھیڑ سے باہر نکال کر لے گیا۔موہن کے
کپڑے عبدل کے خون سے رنگے گئے تھے۔

مارے دہشت اور بدحواسی کے موہن کی آواز نہ جانے کہاں گم ہو گئی
تھی۔اُس کی عمر ہی کیا تھی!یہی کوئی چودہ پندرہ کی ہو گی۔مندر سے آنے والوں
میں سے فقط جگن ناتھ ہی بھاگ پایا تھا۔جینے کی خواہش بھی کیا چیز ہوتی ہے!
عبدل کے چہرے پر کبھی تو زخم کے درد کا احساس تیرنے لگتا اور کبھی موہن کو بچالانے
کا سکون۔وہ اُسے اپنی جان پر کھیل کر بھیڑ سے کھسکا کر اپنے گھر لے آیا۔اندر گھستے
ہی اُس نے دروازے کی چٹخنی لگا دی۔وہ موہن کو پچکارتے ہوئے اور دلاسا دیتے
ہوئے بولا "موہن ڈرو مت۔خدا کا شکر ہے کہ مجھے بروقت پتہ چل گیا اور میں
تمہیں بچا پایا۔پھر نہ جانے زبان پر خدا کا نام آتے ہی عبدل کو کیا یاد آیا۔"تو
بچ گیا موہن بیٹے،اب کوئی خطرہ نہیں۔ٹھہرو،ذرا میں شکرانے کی نماز
پڑھ لوں۔"

نماز ادا کرتے کرتے عبدل کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔"تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے پروردگار!"
وہ بڑبڑایا۔

جگن ناتھ بھاگ کر سیدھے کیداری کے اڈے پر پہنچا۔اُس کے چہرے
کا رنگ فق تھا۔گویا اس پر موت کی پرچھائیں پڑ رہی ہو۔وہ دور ہی سے چلایا،
"موہن کو ختم کر دیا ہے۔عبدل نے میرے سامنے۔اے بھگوان!کیسے ٹوٹ پڑا
تھا وہ اس بالک کی جان پر!"یہ سنتے ہی کیداری پتھرا سا گیا۔اُس کی آنکھوں کے
سامنے موہن کی ہنستی ہوئی مورت تیرنے لگی۔

موہن ــــ اُس کا اکلوتا بیٹا موہن۔اُس کے سنہرے سپنوں کا مرکز۔اُس
کی لُٹتی ہوئی زندگی کی بیساکھی،موہن۔موہن نے جب انٹرنس کا امتحان سیکنڈ
ڈویژن میں پاس کیا تھا تو کیداری نے بستی بھر میں موتی چور کے لڈو تقسیم کیے
تھے۔اپنے ضمیر کی سیاہی کو پونچھنے کی کوشش کرتے ہوئے اُس نے موہن کو اچھا
خاصا لکچر بھی دیا تھا۔

آیا ہے لیکن فرق یہ ہے کہ قرۃ العین حیدر جاتی ہوئی بہاروں کا صرف ماتم کرکے رہ جاتی ہیں جبکہ شوکت صدیقی مثبت راہ دکھاتے ہیں۔

نوشا جیل میں تھا اور خان بہادر فرزند علی کے فرزندِ ارجمند غیر ممالک میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اپنی اپنی قسمت۔ شہید وزارت الحاج خواجہ ناظم الدین نے اپنی وزارت عظمیٰ کے عہد میں یوم آزادی پر قوم سے خطاب کرتے ہوئے یہ بات کہی تھی۔ ان کے اور بھائی بند بھی یہ ہی بات کرتے ہیں اور ...... عوام کے غم میں آٹھ آٹھ آنسو روتے ہیں۔ اور عوام نوشاہ، راجہ، شامی اور انو کو جنم دیتے ہیں۔ ان میں سے کوئی قتل کرکے جیل چلا جاتا ہے۔ کوئی کوڑھی بن کر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر موت کا انتظار کرتا ہے۔ کوئی خون تھوکتا ہے اور رکشا چلاتا ہے اور کوئی ہیجڑوں کے ساتھ کولہے مٹکاتا ہے۔ نعرۂ تکبیر۔ اللہ ہو اکبر۔"

مندرجہ بالا اقتباس، خدا کی بستی کی تلخیص ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بنیادی طور پر مصنف کا رجحان طنزیہ ہے۔ زندگی کا جو متحرک اور بنیادی تصور یا اشارہ ان الفاظ میں پیش کیا گیا ہے وہ طنزیہ رجحانات سے مملو ہے اس کے باوجود انسانی ہمدردی کا دامن کہیں بھی ہاتھ سے نہیں چھوٹا ہے۔ سلطانہ کی ماں کے کردار میں انسانیت کے درد کی آمیزش کچھ اس طرح کی گئی ہے کہ شاید ڈکنس کے علاوہ اور کسی ناول نگار کے یہاں نہ مل سکے۔ انسانی ہمدردی کا عنصر ناول کے بیشتر واقعات اور کرداروں میں قدرِ مشترک کے طور پر موجود ہے یہ ناول ایک قصہ کم اور نظریاتی تصادم کا ڈرامہ زیادہ ہے۔ اس ناول میں موجودہ زندگی کے بیشتر مسائل ملتے ہیں۔ ناول کے مختلف ادوار میں مختلف اور اہم سوالات ابھرتے ہیں ان مسائل کو حل کرنے اور ان سوالات کے عملی جوابات تلاش کرنے کا کام بھی جاری ہے۔ ہر عہد اپنے مخصوص نظریات، عقائد، توہمات مسائل اور سوالات کا حامل ہوتا ہے اور اس عہد کی انسانی مساعی اور جدو جہد ان کے اطراف گھومتی رہتی ہے۔ اسی عہد میں وہ افراد جنم لیتے ہیں جو ان مسائل کا حل ڈھونڈتے یا اسی جہت میں جہد کرتے ہیں۔ "خدا کی بستی" میں اسکائی لارک اسی قبیل کے لوگ ہیں۔ یہ لوگ زندگی کے بنیادی خیر کے نشان ہیں۔ وہ خیر جو مثبت عناصر اور رجحانات کا حامل ہے اور زہر کا پیالہ پی کر، صلیب کو شانوں پر سجا کر، کربلا میں شہادت کا جام نوش کرکے بھی کبھی نہیں مرتا بلکہ موت میں بھی ابدی زندگی کا سراغ نکال لیتا ہے۔

خدا کی بستی کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ کہیں کہیں یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ یہ نفسیات جرم و سزا پہ ایک تحقیقی کتاب ہے یا کسی ماہر نفسیات کی یادداشت، اس احساس کا باعث جزئیات نگاری کی جا و بیجا افراط ہے۔ پتہ نہیں مصنف نے بجائے سیدھا سادا بیانیہ انداز اختیار کرنے کے ڈرامائی اسلوب کو کیوں ترجیح دی اور پھر اس اسلوب کو موقع بے موقع برت کر اظہار کے ارتکاز کے حصول میں ناکام رہے ہیں۔

چند بڑی بڑی خامیوں اور کوتاہیوں کے باوصف "خدا کی بستی" اردو کا ایک عظیم ناول ہے اور یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ دوسرے آدم جی انعام یافتہ ناول ابھی تک اس کو نہیں پہنچ سکے۔

خدا کی بستی کے بعد "تلاشِ بہاراں" کو پڑھنا گویا نثر کی حدود کو پار کرکے شاعری کی خوابناک دنیا میں داخل ہونا ہے۔ "تلاشِ بہاراں" کے عناصر ترکیبی قریب قریب وہی ہیں جو شعر و نغمہ کے ہیں اس ناول میں وہی فضا ملتی ہے جو شیلے کی نظموں کا خاصہ ہے۔ وہی رومانیت، تجریدیت، وہی خلاؤں کا احساس، زندگی کے خالص عملی پہلوؤں پہ مابعد الطبیعات کی عکس اندازیاں انسان جس کی تخلیق میں نور ہی نور یا پھر نار ہی نار، نہ مٹی نہ پانی نہ گوشت پوست، اجسام کے احساس ہی کا فقدان کہیں کہیں اگر نثریت زور پکڑتی ہے تو کارلائل کی "سارٹر دی سارٹس" اور "پاسٹ اینڈ پریزینٹ" کی شاعرانہ نثر کا روپ دھار لیتی ہے۔ بعض اوقات یہ مشابہت اتنی شدت اختیار کر لیتی ہے کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ "تلاشِ بہاراں" کی تصنیف کے دوران یا ماضی قریب میں مصنفہ کارلائل کو پڑھتی رہی ہے۔

آسمان اور زمین کے درمیان خلا میں ایک دل دھڑکتا ہے، جو سوال پوچھتا ہے۔ یہ ہی سوال کہ کیا کیا جائے؟ یہ فقرہ اور ایسے کئی فقرے اور پھر صحراؤں کی روح کا سوال، زندگی میں جبر و اختیار کے مسائل اکثر اوقات کارلائل کی یاد دلاتے ہیں۔ اِس ناول میں بینا کے مرنے پر اس کا باپ اُس کو کچھ ایسے الفاظ میں یاد کرتا ہے کہ دھیان لامحالہ ورڈس ورتھ کی "لوسی گرے" کی طرف چلا جاتا ہے۔ یوں "تلاشِ بہاراں" "خدا کی بستی" سے ایک زیادہ مختلف بھی نہیں کیونکہ جہاں زندگی کے مختلف سوالوں اور مسائل کا تعلق ہے دونوں ناول کے تانے بانے گہری مشابہت رکھتے ہیں۔ "تلاشِ بہاراں" کا مرکزی کردار کنول رانی بھی "خدا کی بستی" کا ایک اسکائی لارک ہی ہے۔ جس طرح اسکائی لارکوں کو خان بہادر کی جعل سازیوں سے دوچار ہو کر ہزیمت اور بربادیوں کا منہ دیکھنا پڑتا ہے اسی طرح کنول رانی ٹھاکر تا حیات زندگی کے تاریک پہلوؤں کو روشن کرنے کی سعی میں مصروف رہتی ہے یہاں تک کہ ہندو مسلم فسادات کا اندھیرا اس کو اپنی آغوش میں لپیٹ لیتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ کنول رانی ٹھاکر سماج کے منفی عناصر سے تقسیم ہند اور فسادات سے پہلے نبرد آزما رہتی ہے اور اسکائی لارک فسادات کے بعد سماج کی بڑھتی ہوئی عفونت اور گندگی سے پاک کرنے کا بیڑا اٹھاتے ہیں۔ یہ فرق کوئی معمولی فرق نہیں ہے کیونکہ "خدا کی بستی" میں قسم قسم کی ہزیمتوں اور بربادیوں کے باوجود اسکائی لارک دوبارہ اپنی مساعی کا آغاز کر لیتے ہیں۔ سلیمان جو ایک بھٹکا ہوا اسکائی لارک ہے، ایس۔ اے۔ جیفرے کے ہاتھوں اپنی بیوی اور اپنا بھرم لٹا کر پروفیسر علی احمد کی طرف لوٹ آتا ہے۔ خان بہادر اور اس کے قبیل کے افراد کے، کٹھ پتلی بن کر سلطانہ بھی اسی پناہ گاہ میں داخل ہو جاتی ہے۔ ناول کے اختتام پہ مثبت عناصر دوبارہ ابھرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اس کے برخلاف

"تلاشِ بہاراں" میں انسان مرجاتا ہے۔

"میرا ایک حصہ کنول کے ساتھ مرگیا ہے ایک حصہ آج رات شمشان کی اگ میں اس کے ساتھ جل جائے گا۔" درحقیقت "تلاشِ بہاراں" بنیادی طور پر خالص رومانی تخلیق ہے۔ رادھے کرشن کی کہانی اس ناول میں خاص اہمیت اختیار کر جاتی ہے جو ایڈگر ایلن پو کی مخصوص فضا کو پیدا کرنے کی ناکام سی کوشش ہے۔ "تلاشِ بہاراں" کی رومانیت سے مراد یہاں وہ رومانیت نہیں جو اردو میں اشفاق احمد اور اے حمید جیسے ادیبوں کے لیے مخصوص کردی گئی ہے۔ اس ناول میں رومان کے علاوہ مابعد الطبیاتی عنصر کا بھی گہرا رچاؤ ہے۔ کنول ٹھاکر کی طبیعت میں رومان تو ہے لیکن فلسفیانہ مسائل کے حل کی کوئی تڑپ نہیں۔ وہ زندگی کے عملی پہلو کو روشن کرنے کے لیے اندھیروں سے ٹکرا رہی ہے اس کا ایک پجاری کہتا ہے۔ "تم تیز دھاری تلوار کی دھار ہو، کبھی ایسا وقت بھی آئے گا جب تم اپنے بلند و بانگ مقاصد کے باوجود مجھے یاد کروگی، تب میں بلند نہ ہونے کے باوجود تمہاری پہنچ سے دور رہوں گا۔" کنول ٹھاکر نہ تو محبوبہ ہے، نہ بیوی، نہ ماں، نہ بیٹی وہ کچھ بھی نہیں ہے۔ صرف ایک آدرش ہے۔ وہ ناول کے ہر کردار کا حصہ ہے سب میں شامل ہے اور سب سے علیحدہ۔ اسی ناول کا ایک کردار یوں کہتا ہے: "وہ لیلیٰ نہ تھی۔ وہ ہم سب کا ایک حصہ اور ہم سب ہی تھی۔" ... "کنول کماری ٹھاکر تم نے ایک اندھیرے سے اپنا سفر شروع کیا تھا اور جب دنیا کو چھوڑ کر چلی گئی ہو وہ تب بھی اتنی ہی اندھیری ہے۔ اتنی جذباتی اور پگلی تھیں تم، اتنا بھی نہ سمجھ سکیں کہ دنیا کو کوئی سبق نہیں سکھا سکتا، انسان مرگیا ہے، اسے زندہ کوئی نہیں کر سکتا۔ کنول ٹھاکر جب تم نے سفر شروع کیا ہے تو وقت بیت چکا تھا۔"

"تلاشِ بہاراں" میں شو تیجا کا کردار زیادہ جاندار، متحرک اور ٹھوس ہے۔ وہ گوشت پوست کی بنی ہوئی عورت ہے۔ اس نے تلخابۂ حیات کو اس طرح پیا ہے کہ دُردِ تہہِ جام کو بھی نہ چھوڑا۔ اس کو زندگی اور اس کے متنوع اور متضاد پہلوؤں کا تجربہ بھی ہے اور شعور بھی۔ ساتھ ہی ساتھ اس کو مابعد الطبیاتی مسائل اور اُن کے حل سے بھی لگاؤ ہے۔ اس طرح کی شخصیت میں فکر و ذکر، خیال و عمل کا ملاپ ہوتا ہے۔ کہیں کہیں تو وہ جبر و مشیت کے اُن راز ہائے لاینحل کو لے بیٹھتی ہے جو عظیم امریکی ناول "موبی ڈک" کا موضوع ہیں۔ شو تیجا کے کردار کی ایک اور خصوصیت ہے کہ وہ اپنی پامال راہ پر لوٹ رہی ہے، اس کے برخلاف دوسرے کردار تلاشِ راہ میں بھٹک رہے ہیں وہ راہ جو کبھی نہیں ملی۔ جو اس طرح ملتی بھی نہیں۔ ایک جگہ شو تیجا کہتی ہے "جب میں پہلی بار اس راہ پر چلی تو میرے ہم سفر لاتعداد تھے اور آج جب لوٹ رہی ہوں تو اکیلی ہوں۔ پہلی بار دیکھ رہی ہوں کہ جن راہوں سے ہم گزرتے ہیں اُن کی ساری جاذبیت وقتی اور سارا ہنگامہ بیکار ہوتا ہے۔ کنول نے کہا تم بھی دھرتی ہو اور وہ بھی کیا ہوا جو راستے پر چڑھ جانے کے لیے ہو۔ میں پاؤں کی دھول بن کر مندر میں جا سکتی ہوں۔"

"تلاشِ بہاراں" میں جس عنصر کی شدید کمی ہے وہ ہے نفسِ وحدت۔ ایک اچھے ناول میں سارے اجزائے ترکیبی کچھ اس طرح مربوط ہو جاتے ہیں کہ فنی طور پر وہ ایک مکمل اکائی کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔ "تلاشِ بہاراں" میں اچھے کردار، واقعات کی کڑی اور منطقی پیش کش، خاص طور پر انسانیت کا درد اور انسان کے آفاقی مسائل اور وہ سب کچھ جو ایک عظیم تخلیق کے اجزائے اعظم ہیں مل جاتے ہیں لیکن فنی وحدت کے فقدان کے باعث یہ ناول قاری کے ذہن پر ایک عظیم تخلیق کا تاثر قائم نہیں کرپاتا۔

"تلاشِ بہاراں" درحقیقت کچھ کامیاب ادبی خاکوں، دل کو چھو جانے والے المیہ گیت نما یادداشت کے انداز میں لکھے ہوئے انشائیوں اور ڈراماتی انداز میں لکھے ہوئے خطوط اور مکالموں کا ایک مجموعہ ہے۔ ان سارے اجزا میں جو تھوڑا بہت ربط ملتا ہے وہ کسی فن کاری کا مرہونِ منت نہیں ہے۔ کیونکہ ان اجزا کو جو چیز آپس میں مربوط کرتی ہے وہ مصنفہ کا خلوص ہے۔ اس خلوص کے بارے میں کسی قسم کی وضاحت مشکل ہے کیونکہ اس کرشمے کو کتاب کے مطالعے کے دوران محسوس تو کیا جاسکتا ہے۔ لیکن جانچ پڑتال کرکے اس کا تعین نہیں کیا جاسکتا۔ جن ناقدوں نے محض انعام کے مسئلہ پر "علی پور کا ایلی" کو "تلاشِ بہاراں" پر فوقیت دی ہے انھوں نے جہالت کا مظاہرہ کیا ہے۔ "علی پور کا ایلی" "تلاشِ بہاراں" کے مقابلے میں صرف ایک ہی مسابقت کا حامل ہے اور وہ ہے اس کی ضخامت۔ افسوس کہ ترازو میں تول کر ادبی قدروں کا اندازہ لگانے کا ہنوز رواج نہیں ہوا ہے۔

شوکت صدیقی نے جہاں "خدا کی بستی" میں قریب قریب تمام محرکات کو احاطۂ تحریر میں لانے کی کوشش کی اور سیاسی پس منظر کو اُجاگر کرنے سے گریز کیا، وہیں جمیلہ ہاشمی نے "تلاشِ بہاراں" میں سماج کے رِستے ہوئے ناسوروں اور دکھتی رگوں پر انگلی رکھی ہے لیکن تقسیم سے قبل کے اہم محرک سیاست کو سمجھنے سمجھانے کی کوشش نہیں کی ہے۔ وہاں عبداللہ حسین نے قرۃ العین حیدر کی پیروی کرتے ہوئے سیاسی حالات کے جائزے سے اپنا ناول "اداس نسلیں" میں جان ڈالنے کی کوشش کی ہے اگرچہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان کا سیاسی شعور اتنا پختہ نہیں کہ وہ سیاست کو ادب کے سانچے میں ڈھال لیتا اور نہ ہی وہ اسور خانہ بصیرت کے حامل ہیں کہ ان سیاسی محرکات کو ایک وحدت میں سمیٹ سکے جن کا منطقی اختتام تقسیم پر ہوا۔

"اداس نسلیں" میں سیاست کے عنصر کے علاوہ جو عنصر امتیاز کا حامل ہے اس کا تعلق دیہاتی زندگی کی عکاسی سے ہے اگرچہ اس ضمن میں بھی یہ ناول "گئو دان" سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ اس کے علاوہ اس ناول میں بھی "تلاشِ بہاراں" کی طرح بے ربطی اور جھول موجود ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ عبداللہ حسین نے اپنے ناول کے کینوس کو وسیع تر کرنے ہی میں اپنا کمال سمجھا نتیجہ یہ ہوا کہ پلاٹ میں نہ کوئی منطقی ربط رہا اور نہ تسلسل اور نہ ہی ناول کے مختلف اجزائے ترکیبی

میں کوئی حسنِ ترتیب اس پر اُن کی زبان کی اجنبیت اور جملوں کی ساخت کی غرابت مزید ہے ربط کو بھی مجروح کر دیتی ہے۔

جہاں تک کرداروں کی پیش کش، مختلف واقعات کی ڈرامائی جھلکیاں اور دیہی زندگی کا تعلق ہے۔ "اداس نسلیں" ایک کامیاب فن پارہ ہے۔ لیکن کبھی کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ تخلیق سیاست کی بھینٹ چڑھی اور کبھی ایسا لگتا ہے کہ جنگ کی زندگی کی تفاصیل کا اصل کتاب سے کوئی خاص ربط نہیں رہا۔ آخر گمان گزرتا ہے کہ ناول نگار زندگی کو ہیئت کے سانچے میں ڈھالنے کے فن سے ناواقف ہے اور وہ غیر ضروری تفاصیل اور جزئیات سے قاری کو مرعوب کرنا چاہتا ہے۔ اگر مصنف اس ناول کے منتخب اقتباسات کو از سرِ نو ترتیب دے کر افسانوں کے مجموعے کی شکل میں پیش کرے تو یہ کام زیادہ لائق تحسین ہوگا اور آسان بھی۔

ہر ناول کے عقب میں وقت کے گزرنے کا احساس ملتا ہے "اداس نسلیں" میں عبداللہ حسین نے مختلف ترکیبوں سے اس احساس کا ابلاغ کیا ہے اور واقعیت نگاری اور حقیقت پسندی کے رکھ رکھاؤ کا بھرم بھی قائم رکھا ہے۔ حالانکہ اس ناول کا رجحان خالص رومانی ہے پھر موضوع کے اعتبار سے "اداس نسلیں" اپنی طوالت کے باوجود ایک نامکمل تخلیق ہے۔ "اداس نسلیں" جس مقام پر ختم ہوتا ہے وہ "خدا کی بستی" کا ابتدائی مرحلہ ہے۔ درحقیقت اداس نسلوں کی اصل تصویر کشی "خدا کی بستی" میں ملتی ہے گویا "اداس نسلیں" ان کے اسباب سے بحث کرتی ہے جب کہ "خدا کی بستی" ان نسلوں کے شب و روز اور قریب قریب ان کے سارے ہی مسائل، ان کے پیچھے چھپے دکھ اور اُن کی جھوٹی خوشیوں کا احاطہ کرتی ہے۔ اس ناول کے بارے میں یہ کہنا درست ہوگا کہ خار و خس کے اس عظیم انبار میں کہیں کہیں موتی چھپے ہوئے ملتے ہیں۔ ایسے موتی جو مانگے کی آب و تاب سے مزین ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ ناول "علی پور کے ایلی" کی مانند ایک ناکام کوشش ہے کیوں کہ بہر حال اس کا موضوع ایک بڑا موضوع ہے اور موضوع نے اس ناول کو تھوڑی بہت عظمت ضرور بخشی ہے۔ اردو کے ناولوں میں بہر نوع اس ناول کا ایک مقام ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ بھی ایک المناک حقیقت ہے کہ "آگ کا دریا" کے بعد اس ناول کا شائع ہونا یوں لگتا ہے جیسے ہم آگے کی جانب قدم اٹھانے کے بجائے پیچھے کی جانب لوٹ رہے ہیں۔ فنی لحاظ سے یہ ناول ایک آئینہ خانہ ہے جس میں بے شمار مصنفوں کی تحریروں کا عکس اتر آیا ہے۔ یہاں پریم چند سے لے کر قرۃ العین حیدر تک اردو کے گنے چنے مشہور ناول نگار جلوہ فرما نظر آتے ہیں۔ اردو کے علاوہ مشہور انگریزی اور امریکی ادیب بھی کہیں نہ کہیں اپنی جھلک دکھاتے اور چھپ جاتے ہیں، خاص طور پر ہمنگ وے تو بار بار اپنے وجود کا احساس دلاتا ہے۔ بے شمار مقامات ایسے ہیں جہاں ہمنگ وے کی چھاپ واضح طور پر محسوس ہونے لگتی ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ عبداللہ حسین ایجاز اور اختصار کے معاملہ میں ہمنگ وے کی تقلید کو شاید ناممکن سمجھ کر گریز کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ کہنا بھی غالباً غلط نہ ہوگا کہ اس ناول کے دو کردار نعیم اور علی جن پر اس ناول کی عظمت کا دار و مدار ہے ہمنگ وے کے سانتیاگو اور موآلین سے عجیب مشابہت رکھتے ہیں، جو "بوڑھا اور سمندر" کے خاص کردار ہیں۔ اسی طرح روشن محل کے لڑکے لڑکیوں کا گروپ قرۃ العین حیدر کی تحریروں کی یاد دلاتا ہے آپ چاہیں تو ہمنگ وے کے ناول "The Sun also rises" کی جانب بھی اشارہ کر سکتے ہیں۔

جہاں تک کردار نگاری کا تعلق ہے عبداللہ حسین نے بڑی کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ نعیم احمد خاں اس ناول کا مرکزی کردار ہے۔ یہ ایک مخصوص فرد ہے اور انفرادیت کا ایسا ہی مالک جیسا کہ ایک آدمی ہوتا ہے زندہ، پر حرارت گوشت پوست کا، اپنی تمام تر انفرادیت کے باوجود یہ ایک نمائندہ کردار بھی ہے اور ایک علامت بھی ایک اشارہ بھی۔ ایک ایسا انسان جو زندگی میں مرجاتا ہے اور مر کر زندہ ہو جاتا ہے جب تک وہ زندگی میں موت سے ہمکنار رہتا ہے۔ اس کا بھائی علی اس سے منحرف اور برگشتہ رہتا ہے لیکن اس کی موت کے بعد علی اُس کی اولادِ معنوی کے روپ میں زندہ رہتا ہے۔ اور "بٹوارہ" کے بعد قافلے کے ساتھ پاکستان آتے ہوئے وہ نعیم سے وہ سب کچھ حاصل کر لیتا ہے جو نعیم کی ساری زندگی کے سارے تجربات کا نچوڑ ہے۔ پاکستان میں علی ایک نئی زندگی کی تعمیر شروع کرتا ہے اور اس سلسلہ میں وہ جس عورت کو اپنی رفیق منتخب کرتا ہے وہ شیلا ہوتی ہے۔ شیلا جو ماضی میں نعیم کی محبوبہ تھی۔ اس طرح گویا نعیم حیات کی تجدیدی قوتوں کا نشان بن کر علی کے روپ میں منفی اقدار سے مثبت اقدار کی طرف رجعت کرتا ہے۔ نعیم کا کردار ایک زندہ جاوید کردار ہے اور نعیم اور علی کے کرداروں کا تضاد اور مشابہت درحقیقت مصنف کی شاندار کامیابی اور ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا ثبوت ہے۔

اس بات سے بھی انکار ممکن نہیں کہ جنگ کی عکاسی اور فسادات کے دوران مصیبت زدہ انسانوں کا ہندوستان اور پاکستان کی طرف ہجرت کرنے کی تمنا کا ذکر عبداللہ حسین نے بے حد فنکاری سے کیا ہے۔ دوسری زبانوں کے ادب میں جنگ کی حقیقت پسندانہ تصویر کشی کی مثالیں ملتی ہیں خاص طور پر ہمنگ وے نے تو انسان اور معاشرے پر جنگ کے اثرات کو نہایت کامیابی کے ساتھ بلکہ خلاقانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ٹالسٹائی کا تو کہنا ہی کیا۔ تاہم اگر اس بات سے چشم پوشی کی جائے کہ عبداللہ حسین نے ایک کامیاب چربہ اتارنے کی کوشش کی ہے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اردو زبان میں انھوں نے جنگ کو ایک تلخ حقیقت کے طور پر بڑی کامیابی کے ساتھ قاری کے ذہن پر نقش کر دیا ہے ناول کے اس حصہ میں زندگی میں موت اور موت میں زندگی کا احساس ملتا ہے۔

ہندوستان کی سیاسی اور نیم معاشرتی تصویر کشی میں عبداللہ حسین زیادہ کامیاب نہیں رہے ہیں۔ جہاں تک جذباتی تاثرات کے اظہار کا تعلق ہے وہ بے حد خوش اسلوبی سے اس سے عہدہ برا ہوتے ہیں۔ خاص طور سے "ہندوستان چھوڑدو" کی تحریک کے ضمن میں چند کامیاب جھلکیاں پیش کی ہیں۔ لیکن کانگریس اور مسلم لیگ کی کشاکش، تقسیم ہند اور اس کے اسباب کے سلسلے میں مصنف

کوئی خاص مجموعی تاثر پیش کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں۔ کبھی کبھی تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ مصنف کا تاریخ کا مطالعہ ناقص ہے اگرچہ اس ناول میں مصنف نے اپنے کسی کردار سے یہ کہلایا ہے کہ "تاریخ ہی درحقیقت علم ہے۔"

حیات کے پس منظر کے اعتبار سے "تلاشِ بہاراں" "اداس نسلیں" اور "آنگن" کئی ایک مشترک اقدار کے حامل ہیں۔ خدیجہ مستور نے "شجرِ حیات" کے جس حصہ سے اپنے ناول کا قلم لگایا ہے، اس سے کچھ نیچے عبداللہ حسین اور ان دونوں سے بہت نیچے جڑ کے قریب قرۃ العین حیدر نے اپنے لیے جگہ منتخب کی ہے۔ زندگی کے بیشتر محرکات پر "آنگن" کی گرفت کچھ ادھی ہے۔ جس خصوصیت کو ڈاکٹر احسن فاروقی نے اشاراتی فن برتنے کی بے مثل مثال سے تعبیر کیا ہے، درحقیقت وہ رومانی فضا ہے جو موضوع، مواد، کردار، واقعات، محاکات یہاں تک کہ زبان پر بھی مسلط ہے اسی رومانیت نے ناول کے ان عناصر کو مجروح کر دیا ہے جو زندگی کی بدلتی قوتوں کے آئینہ دار تھے۔ یہ صحیح ہے کہ جین آسٹن کی دنیا چھوٹی ہے لیکن اس دنیا پر اس کے شعور کی گرفت بڑی سخت اور مضبوط ہے۔ گو "آنگن" کی دنیا چھوٹی نہیں بہر حال یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ خدیجہ مستور نے زندگی کے ان محرکات (مثال کے طور پر سیاسی محرکات) پر بھی قلم اٹھایا ہے جو جین آسٹن کی دنیا میں کہیں نہیں ملتے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ خدیجہ مستور نے ان محرکات پر قلم اٹھانے سے پہلے یہ غور کرنا ضروری نہیں سمجھا کہ اُن کی واقفیت کا دامن اتنی وسعت بھی رکھتا ہے یا نہیں۔ سیاسی محرکات پر قلم اٹھانا ہر ناول نگار کے بس کا روگ نہیں، اس کے لیے صرف سنی سنائی باتیں اور اخبار کا مطالعہ کافی نہیں، اس کام کے لیے انسانی حیات اور اس کی مسلسل جدوجہد کا وہ شعور ضروری ہے جو مورخ کے دل میں نظریہ اور ادیب کے دل میں کسک کا روپ اختیار کرتا ہے۔ لیکن خدیجہ مستور نے زندگی کے ساز کے اس تار کو چھیڑا ہے جس کی آواز کی نوعیت سے ان کو آگاہی نہیں۔ جس طرح کسی ساز سے یا تو سوز پیدا ہوتا ہے یا جھجک کے باعث گھٹی گھٹی آوازیں۔ اسی طرح خدیجہ مستور نے نہ صرف ان حرکات پر سطحیت کی چھاپ لگا دی ہے بلکہ سارے کے سارے ناول کو سطحیت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا ہے۔ یہ منطق کہ سیاست کا عنصر کرداروں سے متعلق ہے اور سیاست بھی اسی حد تک کہ جس حد تک وہ اس کے افراد کی زندگی کا جزو ہوتی ہے، عجیب و غریب ہے۔ کردار نگاری کا تو کمال اس میں مضمر ہے کہ ناول کے کردار محض کاٹھ کے بے جان پتلے نہ رہ جائیں، بلکہ اپنی شخصیت میں مختلف النوع اور کبھی کبھی باہم متضاد صفات اور خصوصیت کو باہم سمیٹے ہوئے ہوں جب سیاست ان افراد کی زندگی کا جزو ہی ہو گئی ہے تو ظاہر ہے کہ ان کی کامیاب عکاسی سیاست کے اہم محرکات کو صرف سطح سے چھو لینے سے تو ممکن نہیں۔ اور آنگن کی سب سے بڑی ٹریجڈی یہ ہی ہے حالانکہ خدیجہ مستور نے اس ناول میں اپنی معلومات کا سارا زور صرف کر دیا ہے اور شاید کوشش بھی کی ہے کہ اظہار اور ابلاغ کے جتنے بھی کامیاب تجربے ہوئے ہیں سب کو آزما کر دیکھ لیں۔ عالیہ کے ذہن کو الگ اسٹیج بنا کر اور ناول کو فیڈ آؤٹ اور فیڈ ان کے اصولوں پر پیش کرنا فنی لحاظ سے قابلِ اعتراض تو نہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ عالیہ کے ذہن کو محدود کر دینا ضرور قابلِ اعتراض ہے۔ آخر اس حقیقت کو کس طرح نظرانداز کر دیا جائے کہ عالیہ پڑھی لکھی ہے باشعور لڑکی ہے اور وہ جیسے تیسے بڑے چچا کا سیاسی لٹریچر بھی ہضم کرنے میں مصروف ہے، ان حالات میں اس کے ذہن میں سیاست اور اس کے محرکات کا واضح شکل اختیار نہ کرنا کہاں تک قرینِ قیاس ہے۔ "واقفیت کی وہ سیدھی راہ جو اخلاق زدگی کی بنا پر مرزا رسوا کو بھی نہ مل سکی اور جدید نفسیاتی تحلیل کے چکر میں عصمت چغتائی کے ہاتھ سے اور جدید تجربہ کے ماتحت قرۃ العین حیدر کے ہاتھ سے بھی نکل گئی۔ خدیجہ مستور کے سامنے صاف ہے۔" پتہ نہیں ڈاکٹر احسن فاروقی نے "واقفیت" سے کیا مراد لی ہے۔ شاید فاضل نقاد یہ فراموش کر گئے تھے کہ واقفیت جس کی بنیاد رومان پر قائم کی گئی ہو "واقفیت" نہیں رہ سکتی۔ واقفیت تو ایک ٹھوس شے ہے، اور رومان وہ شے ہے جو اس کو اندر ہی اندر کھوکھلا کر دیتا ہے۔ اس سے یہ مراد ہرگز نہیں ہے کہ واقفیت اور تخیل میں کوئی رشتہ نہیں ہے لیکن تخیل اور رومان مترادف اصطلاح میں بھی نہیں ہیں۔

عالیہ کی ماں اور دادی کا کردار، صفدر اور اسرار میاں کا ذلیل و خوار وجود بے بس تہمینہ اور چند دوسرے کردار ایک جانب اور دوسری طرف چھمی، جمیل اور نجمہ اس ناول کے دو مرکزی خیالوں کی غمازی کرتے ہیں۔ پہلا ایک زوال مردہ سماج کی یادگار ہے، جس میں بیگمات اپنی حویلیوں اور کوٹھیوں میں غرور و تمکنت اور دبدبے کے ساتھ راج کرتی ہیں اور اب راج پاٹ ہاتھ سے نکل جانے کے بعد اس سنہری دور کے خواب دیکھتی ہیں جہاں صفدر ایک باغی ماں کی نشانی کی وجہ سے ذلیل گنا جاتا ہے، جہاں اسرار میاں حرامی اولاد ہونے کے ناطے نجس مانے جاتے ہیں، جہاں تہمینہ اپنی بے بسی کے خلاف کوئی جدوجہد نہیں کر سکتی اور چپکے سے زہر کھا لیتی ہے۔ دوسرا مرکزی خیال نسوانی دنیا کا آفاقی مسئلہ ہے۔

شادی اور جنس

"آنگن" میں مرد کرداروں کو کٹھ پتلیوں کا سا انداز دیا گیا ہے، وہ اکثر حیات کی بدیہی قوتوں سے تہی لگتے ہیں۔ اور کبھی کبھی جو ان میں تھوڑی بہت حرکت ہوتی بھی ہے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ وہ ڈوریاں متحرک ہیں جن سے یہ بندھے ہیں۔ اور تو جنس کے لحاظ سے بھی مرد کچھ زیادہ ہی سرد دکھائی دیتے ہیں۔ یوں تو اس ناول کے بیشتر کردار ٹھنڈی مٹی سے بنے ہیں۔ پڑھتے چلے جائیے کوئی خطرہ نہیں لیکن اگر آپ ناول کے کسی موڑ پر رک گئے اور سوچنے لگے تو قصے کا سارا تاثر صرف ایک قصے میں سمٹ آتا ہے اور وہ ہے کھوکھلے پن کا احساس لے دے کر کسم اور چھمی ہی ایسے ہیں جو زندہ اور متحرک ہیں، ان میں حیات کی قوت بھی ہے حدت بھی۔ خدیجہ مستور نے کسم کے پر پرزے بکھیر کر عالیہ کو جس کی قوت فیصلہ یوں بھی کمزور ہے اور زیادہ بے عملی، جھجک اور خوف کے راستے پر لگا دیا البتہ چھمی اس ناول کی جان ہے۔ وہ اپنے تمام الھڑپن، اور ضد کے باوجود بنیادی طور پر معصوم ہے اس کی ہٹ میں بیک وقت تریاہٹ اور بال ہٹ کا امتزاج ملتا ہے۔ اس کردار کو احسن فاروقی کی طرح بیکی شارپ سے مثال دینا گویا خود چھمی سے ناانصافی کرنا

حقیقت تو یہ ہے کہ نہ تو عالیہ ایبنارمل ہے اور نہ چمپی ہی کوئی شارپ سے ہے، دونوں میں کوئی مماثلت ہی نہیں۔ چمپی کے قصے میں صرف ایک جھول ہے اور وہ ہے اس کی پہلی شادی لیکن اس کمزوری کو اس ہنگامے نے ڈھک دیا ہے جو چمپی پاکستان جانے کے خلاف اپنی سسرال میں کھڑا کرتی ہے۔ جب وہ طلاق لے کر اپنی بچی سمیت یہیں آ بیٹھتی ہے تو جمیل میاں سارے ناول میں پہلی بار کوئی عملی اقدام کرتے ہیں۔ ان کا چمپی کو شادی کی تجویز پیش کرنے کا منظر بڑی ہنرمندی سے تشکیل دیا گیا ہے ویسے بھی اہم مقامات پر منظر نگاری کا اختصار اور ایجاز لطف دے دیتا ہے۔ ایک منظر کو معجزانہ اختصار کے ساتھ پیش کر کے کہانی کو کسی اہم موڑ کے سارے خصوصی تاثرات کو پوری شدت کے ساتھ پیش کرنا اور سادگی کو ہاتھ سے نہ جانے دینا خدیجہ مستور کا فن ہے۔

چمپی کے متوازی عالیہ کا کردار جس کو ناول نگار نے مرکزیت عطا کر رکھی ہے وہ معنوی ہے۔ تہمینہ اور عالیہ دو بہنیں ہیں بظاہر ان کے کردار میں زمین و آسمان کا فرق ہے لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ تہمینہ کی روح مرنے کے بعد عالیہ میں حلول کر جاتی ہے اور بغیر گوشت پوست اور مٹی پانی کے اس کردار میں جو کشمکش کا عنصر ہے اور مختلف مقامات پر اس میں انسانیت کی جو جھلکیاں ملتی ہیں وہ اس روح کی منت کش ہیں۔ زندگی میں ہی تہمینہ، عالیہ کی کمزوری بن چکی تھی۔ عالیہ غیر شعوری طور پر تہمینہ سے متاثر تھی، بچپن میں اس کا صفدر سے مانوس ہونا تہمینہ کے اثرات کا ہی نتیجہ تھا۔ حادثات اور اتفاقات صفدر کے جانے اور تہمینہ کے مرنے کے بعد عالیہ کو جمیل کے یہاں پہنچا دیتے ہیں۔ وہ جمیل جس سے شادی نہ کرنے کے لیے تہمینہ زہر کھا لیتی ہے وہی جمیل عالیہ کے دل میں چور دروازے سے عجیب انداز میں داخل ہو جاتا ہے۔ عالیہ کی بظاہر بے تعلقی جس کو ایک نقاد نے غلط فہمی سے نفرت کا نام دیا ہے، درحقیقت ایک ایسے تعلق کا پرتو ہے۔ جس کے خلاف اس نے شعوری طور پر جہاد کر رکھا ہے۔ اگر تہمینہ شادی سے قبل اسی طرح اتفاقاً سیلِ بے پناہ کی زد میں جمیل کے پاس چلی آتی تو شاید وہ بھی جمیل سے متاثر ہو جاتی اور شاید عالیہ ہی کی طرح وہ بھی اپنے نفس سے جہاد کرنے کی کوشش کرتی۔ کتاب کے آخری حصہ میں عالیہ جب جمیل اور چمپی کی شادی کا واقعہ پڑھتی ہے اور وہ بھی چمپی کے خط کے ذریعہ تو اس پر جو کچھ گزرتا ہے، وہ عالیہ کے سمجھنے میں بڑا کارآمد ہے۔ تقسیم کے بعد عالیہ ایک کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ڈولنے لگتی ہے۔ ڈاکٹر کا ربط و ضبط اور دل ہی دل میں اس کی ہو جانے کی خواہش اور پھر صفدر سے باقاعدہ شادی کرنے کی تجویز کا انداز، عالیہ کے کردار کے ان گوشوں کو بے نقاب کر دیتا ہے جن پر اس کی سنجیدگی اور متانت نے پردہ ڈال رکھا تھا۔ تہمینہ اگر زہر نہ کھاتی تو اس کی شادی یا تو صفدر سے ہوتی یا جمیل میاں سے۔ جب عالیہ کی زندگی پر اداس سناٹا چھانے لگتا ہے اور چمپی جمیل کو ہتھیا لیتی ہے تو وہ نہایت جلدی میں یہ فیصلہ کرتی ہے کہ وہ صفدر سے شادی کرے، یوں تو کہا جا سکتا ہے کہ اس کا یہ فیصلہ جذبہ ترحم کا کرشمہ ہے۔ حالانکہ ایسا بھی ممکن ہے کہ عالیہ کے اندر چھپی ہوئی تہمینہ نے اپنے قصے کو تکمیل تک پہنچانا چاہا ہو۔ افسوس

کہ ناول میں سارے قصے ادھورے رہ جاتے ہیں۔ ہر خواب کی تعبیر الٹی نکلتی ہے اگر کوئی خواب پورا ہوتا ہے تو اس کہانی مکمل بنتی ہے تو وہ چمپی کی ہے، چمپی جو ایک نارمل لڑکی ہے جو بنیادی طور پر عورت ہے اور صرف عورت وہ اگر نارمل نہیں لگتی ہے تو وہ اس لیے کہ جس گھر میں وہ پروان چڑھ رہی ہے وہ نارمل انسانوں سے خالی ہے۔ جمیل میاں کی شخصیت بھی چمپی کے ذریعہ مکمل ہوتی ہے۔ ناول کی بڑی بڑی خامیوں میں ایک نجمہ کا کردار ہے جس سے مصنف کو ذاتی بغض معلوم ہوتا ہے۔ وہ کردار فالتو ہے اور ناول سے حذف کیا جا سکتا ہے۔

موجودہ دور میں اردو ناول کے میدان میں خاصا کام ہو رہا ہے۔ اس عہد نے "آگ کا دریا" ایسی عظیم تخلیق کو جنم دیا جو خود ایک زبردست محرک کے طور پر ناول کے فن کی ترقی میں ممد و معاون ہے۔ آگ کے دریا کے بعد "اداس نسلیں"۔ "تلاشِ بہاراں" "آنگن" "خدا کی بستی" "سحر ہونے تک" "سیاہ آئینہ" "چاکی واڑہ میں وصال" "ایک چادر میلی سی" "سیتا ہرن" "بہت دیر کر دی" "ایوان غزل" جیسے اچھے ناول سامنے آتے ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان میں انعام یافتہ ناولوں کا معیار بھی خاصہ امتیازی ہے بادی النظر میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ دور اردو ناول کی ترویج و ترقی کا دور ہے۔

غزل

منظر شہاب
پرنسپل کریم سٹی کالج
جمشید پور

وہ زخم تیغِ ستم ہے کہ جو حنا سا ہے
اُسی سے درد کا لمحہ رنگا رنگا سا ہے

ضرور صبح تلک بارشیں ہوئی ہوں گی
اُداس آنکھ کا آنگن دُھلا دُھلا سا ہے

یہ بے زبان تکلم، یہ بے صدا ترسیل
خموش رہ کے بھی سب کچھ کہا کہا سا ہے

بندھے ہوئے ہیں کہ کھل کر بکھر نہ جائیں ہم
وگرنہ اب تو تعلق سزا سزا سا ہے

اگرچہ وادئ کہانی سُنی سُنی ہے شہاب
مگر جناب کا لہجہ نیا نیا سا ہے

الطاف حسین ندوی
شعبۂ اُردو، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

بارہ ماسہ وہاب

اُردو کے متداول بارہ ماسوں میں وہاب کا بارہ ماسہ کافی مشہور ہے۔ اس کی شہرت کا اندازہ ان اشاعتوں سے ہو سکتا ہے جو کئی بار منظرِ عام پر آچکی ہیں اور قبول عام حاصل کر چکی ہیں۔ مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں اس کے دو قلمی نسخے بھی موجود ہیں۔ ان میں سے ایک نسخہ جمادی الثانی ۱۲۷۰ ہجری کا لکھا ہوا ہے اور دوسرا ماہ شعبان ۱۲۷۱ ہجری سے تعلق رکھتا ہے۔ پہلے نسخے میں اکتیس صفحات ہیں اور اس میں تقریباً ۳۶۲ اشعار پائے جاتے ہیں۔ دوسرے مخطوطہ کے اوراق کی تعداد چودہ ہے اور اشعار کا مجموعہ ۳۶۵ ہے۔ یہ خطِ نستعلیق میں ہے اور کتابت کا کام وزیر خاں کاتب نے انجام دیا ہے۔ اس نسخے کے آخر میں ایک فارسی قطعہ اس طرح درج ہے۔

ہر کہ خواند دُعا طمع دارم
زانکہ من بندۂ گنہگارم
نوشتہ بماند سیہ بر سفید
نویسندہ را نیست فردا اُمید

بارہ ماسہ وہاب کے متعدد نسخے مختلف مطبعوں سے شائع ہوئے ہیں اور عام طور پر کتب خانوں میں دستیاب ہو جاتے ہیں۔ مطبع اصفی، کانپور سے ۱۲۷۸ ہجری میں جو "مجموعہ بارہ ماسہ" شائع ہوا ہے اس میں وہاب کا بارہ ماسہ موجود ہے۔ اس کا ایک ایڈیشن ربیع الثانی ۱۲۸۱ ہجری میں مطبع نظامی بدایوں سے شائع ہوا تھا۔ یہ بیک وقت فارسی اور دیوناگری رسم الخط میں چھپا ہے۔ اس کی ضخامت چالیس صفحے ہے۔ ایک اور نسخہ مطبع فیض محمدی لکھنؤ کے اہتمام میں جولائی ۱۳۱۰ ہجری میں طبع ہوا۔ آخر الذکر دونوں نسخے مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے مرکزی کتب خانہ میں موجود ہیں۔

وہاب کے مطبوعہ اور مخطوطہ نسخوں کی اہم بات یہ ہے کہ ان کے اشعار کی تعداد میں برائے نام اختلاف پایا جاتا ہے۔ اشعار کی جملہ تعداد ۳۶۵ ہے۔ ان نسخوں میں الفاظ کا املا اور ان کا تلفظ بھی یکساں ہے۔ البتہ بعض جگہ ایک ہی لفظ کی دو یا دو سے زائد شکلیں مروج ہونے کی وجہ سے کچھ لفظی فرق نظر آتا ہے۔ جیسے ان اشعار میں ہے:۔

ہمن کو سال بھر اب روتے بیتا
نہ دیکھا نین بھر اک رین بیتا

سکھی نا دھوپ نا چھاؤں نگر میں
بہت گرمی نہ تھی جو تھی سوزر میں
(ماہ لوند)

اک اور چھاؤں جیسے الفاظ کا املا کہیں کہیں یک اور چھائیں لکھا ہوا ہے۔ اس بارہ ماسہ کا انداز مثنوی کا ہے اور اس کی بحر ہزج مسدس محذوف الآخر ہے۔ بحر کا وزن مفاعیلن مفاعیلن فعولن ہے۔ یہ ہندی شعری روایت میں ڈوبا ہوا ہے اور پوربی زبان (اودھی) کے گہرے اثرات لیے ہوئے ہے۔ ہندی کی روایتِ شعر نے اس کے موسموں، تیوہاروں اور کرداروں وغیرہ کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے۔ اس میں جن پھولوں، پرندوں اور جانداروں کا ذکر آیا ہے وہ سب کے سب ہندی الاصل ہیں۔ بسنت رُت کے نشاط انگیز زمانہ میں برہن کی جن چنچل سہیلیوں سے ہمارا واسطہ پڑتا ہے وہ سرتاپا زنانِ ہند معلوم ہوتی ہیں:۔

چہوں دِس مرگ نینی راگ گاویں
تہو جبر کو تلاتن مجھ کو کھاویں

کنول نینی کے دل کا پھول پھولا
بنا رُ گھو بر ہمیں سب پھول پھولا[لہ]

یہ زنانِ ہند خوشی کی تقریبوں اور رقص و سرود کی محفلوں میں گانے بجانے کے جو آلات استعمال کرتی ہیں وہ بھی ہندی ہیں:۔

سنگار اُبھرن سہیلیوں نے جو ساجے
مجیرے، جھانجھ اور مردنگ باجے

چہوں اوروں سے ڈھول اور ڈف ہے باجا
چڑھا جو بن نگر میں کام راجا

خوبصورت پھول اور رنگین پودے ہر انسان کو فرحت بخشتے ہیں اور اس کی خوش طبعی کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ ایک ہجو عورت جب انھیں دیکھتی ہے تو اس کے دل پر چوٹ لگتی

لہ لہ ماہ پھاگن۔

ہے اور وہ محبوب کی یاد میں تڑپ اٹھتی ہے وہاب نے برہنی کی یہ کیفیت جن پھولوں کے ذریعہ ظاہر کی ہے وہ ہندی شعرا کے محبوب ترین پھول ہیں۔ چیت کے مہینہ میں ٹیسو، مالتی، پلاس اور کچنار کا سرخ لباس دردِ جدائی کو اس حد تک بڑھا دیتا ہے جس سے جسم تڑکنے لگتا ہے:۔

سکھی بن بیچ میں پھولے ہیں ٹیسو،
سبھی ترور کے ہیں گے لال بھیسو،

سکھی مالتی ہے جیسے بن میں پھولی
بنا مدھکر پھروں بھونرا سی بھولی

پلاس اب لال بہا چھوں اورا
نہ جانوں حال کیا ہویے ہمارا

سکھی سنسار میں پھولا ہے کچنار
مرے تن کو کرے گا پھار کے چار

وہاب نے تشبیہات اور استعارات بھی ہندوستانی ماحول اور سرزمین ہند سے اخذ کیے ہیں۔ چند مثالیں قابل غور ہیں۔

ارے چندر دکھوں میں روپ تیرا
نین میرے بھئے مانو چکورا

ہرے گا کون اب یہ پیر موری
ملاوے کو سکھی سارس کی جوڑی

شاعر جب ہندی مہینوں کے مخصوص کوائف اور ان کے موسمی خصائص کا ذکر کرتا ہے تو ان سے متعلق نچھتروں کو کبھی نہیں بھولتا۔ یہ بات اس کے ہندوستانی مزاج کی طرف ایک مزید اشارہ کرتی ہے۔ موسم برسات کے چند نچھتر یہ ہیں:۔

جو پنجا آئے پُکھ لاگا برسنے
بھئی اب سیج ناگن، لاگ ڈسنے

سکھی اب آئے کے لاگا سریکھا
تہو پر پاپنی میں، پیو نہ دیکھا

وہاب کے بارہ ماسے کی زبان پوربی اردو کہی جاسکتی ہے۔ اس زبان پر اودھی کے نمایاں اثرات پائے جاتے ہیں۔ عربی لغات و تراکیب اور فارسی تشبیہات و استعارات سے اس کا دامن پاک ہے۔ پورے بارہ ماسہ میں صرف ایک فارسی ترکیب اور ایک عربی لفظ کا استعمال ہوا ہے۔ بھادوں کے سلسلہ کا ایک شعر فارسی ترکیب سے اس طرح مزین ہے۔

جو موہن کو سکھی بھادوں میں پاؤں
کہ سرِ نو سے میں ساون کو مناؤں

عربی لفظ کا استعمال ماہ اگھن کے ذیل کے شعر میں ملتا ہے:۔

جو کھوٹا دام اپنا ہے سکھی ری
عبث کیوں اور کو کرتی دکھی ری

شاعر کا لب و لہجہ صاف اور واضح ہے لیکن اودھی کے رنگ و آہنگ نے اسے بعض جگہ بے حد مغلوب کر دیا ہے۔ ذیل کے اشعار اس کی تصدیق کے لیے کافی ہیں:۔

سکھی جیوں تیوں اساڑھ اب بیت جتی ہے
نجانوں کون دن ساون کاٹتی ہے

ہریری بھئی بھوم سب سنسار ماہاں
ہماری بیل سینچو آیا ناہاں

سبھی ہنس کھیل کے پوجا چڑھاوا
دسہرا نے ادھک ہم کو رواوا

بکٹ بھاری سکھی اگھن کی راتی
اکیلی سیج پر ناہیں سراتی

وہاب نے ہر ماہ کی کیفیات اور ہجر کے حالات کا بیان الگ الگ کیا ہے۔ ایک ایک مہینہ کے فراق کی ترجمانی کے لیے انھوں نے کم سے کم تیئیس اور زیادہ سے زیادہ تیس اشعار سے کام لیا ہے۔ ہجر کی کلفتوں اور جدائی کے صدموں کا آغاز ان کے ہاں اساڑھ سے ہوتا ہے اور خاتمہ جیٹھ گذرنے کے بعد ماہ لوند پر ہوتا ہے۔ اس طرح اس میں فرقت کے تیرہ ماہ کے جذبات اور محسوسات کا ذکر ہے۔ مہینوں کی تعداد کے اعتبار سے اس کا نام تیرہ ماسہ ہونا چاہیئے جیسا کہ اکرم رہتکی اور طالب شاہ نے اختیار کیا ہے مگر خود وہاب نے اس کا نام بارہ ماسہ ہی رکھا ہے وہ اس کی وجہ تسمیہ اس طرح بیان کرتے ہیں:۔

کہانی پریم کی وہاب گاوے
کہ بارہ ماسہ اپنا نام لاوے

پریم کی اصل کہانی شروع کرنے سے پہلے وہاب اس کی دردناکی اور دلدوزی سے آگاہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ ہر شخص اس درد بھری کہانی کے سننے کا متحمل نہیں ہوسکتا۔

سکھی بچھڑن کہانی میں سناؤں
کہ بارہ ماس پیا بن کیوں گنواؤں

سنت ہی آنس بھر آئے نین میں
جلیسے بسیدن برہ کا ہوتے تن میں

اس کے بعد وہ کہانی شروع ہوتی ہے جسے ایک آلودۂ محبت اور باوفا عورت کی روداد غم کہنا زیادہ مناسب ہے۔ اس روداد میں محبوب سے بچھڑنے پر زن عاشق

کی گوناگوں جسمانی اذیتوں اور روحانی عقوبتوں کی تفصیل درج ہے۔ یہ سال کے بدلتے ہوتے موسموں میں مہجوری کے جذبات کا مربوط اور موثر اتار چڑھاؤ پیش کرتی ہے۔

اساڑھ کا مہینہ مہجورہ کے لیے بڑا نامبارک اور آفت خیز ثابت ہوتا ہے۔ جدائی میں اس کے ہولناک مناظر اسے بُری طرح ستاتے ہیں اور ہر گھڑی اس کے درپے آزار رہتے ہیں۔ بادل کی گرج اور بجلی کی چمک سے اس کا سکون و ثبات غارت ہو جاتا ہے۔ ذیل کے اشعار میں اسی کیفیت کی ترجمانی کی گئی ہے:۔

نگاڑے میگھ کے باجیں گگن پر
مدن کی چوب لاگی مجھ بدن پر

چھوں دس شیام بادل گھیر آئے
منوں من مست نے ہاتھی چلائے

سبھی جھینگر نفیری سی بجاویں
پیا بن کان کی جھنگری اوڑاویں

لگے داڈر جو نوبت سی بجاوے
اکیلی سیج پر کب نیند آوے

پپیہا تاؤ پیکے جب سناوے
ہمن کی نین دونی جھڑ لگاوے

یہ بلاخیز مہینہ روتے پیٹتے کسی نہ کسی طرح گذر جاتا ہے۔ دوسرا مہینہ آتا ہے تو وہ بھی آفت مچاتا ہے اور پہلے سے زیادہ بے دردی دکھاتا ہے۔ دسہرہ کی چہل پہل اور ساون کی بہار اُسے غم اور حزن کے سوا کچھ اور عطا نہیں کرتی۔ محبوب کے بغیر کالی گھٹا اسے ناگ کی طرح ڈسنے کے لیے دوڑتی ہے اور کوئل کی کوک سن کر اس کے کلیجہ میں ہوک اُٹھنے لگتی ہے۔ ایسی حالات میں اُسے پیا درشن کے علاوہ کچھ نہیں سوجھتا۔ چنانچہ وہ کہتی ہے:۔

سکھی بیتا اساڑھ اب لاگ ساون
آدھک لاگا ہے برہا نل ستاون

گھٹا کاری سے جیوں تیوں لاگ آوے
اندھیری رین لاگے مجھ کو ڈرا ہے

لگی کوئل کی کوک مجھ کو کاری
نہ بھاوے شیام بن سونی اٹاری

برسی سو با پہر ساری جو جھولیں
کلیجہ میں ہمن کے ہوک سولیں

لگا میگھا جو جھم جھم میگھ برسے
ہمن کا جیو پیو دیکھن کو ترسے

پیا کے درشن کی یہ آگ دل میں برابر سلگتی رہتی ہے۔ جدائی کے لمحات جس قدر طویل ہوتے جاتے ہیں حسرت و یاس کی چنگاریاں اسی قدر شعلے بنتی جاتی ہیں۔ لیل و نہار کی الٹ پھیر اور موسمی تغیرات انھیں مزید ہوا دیتے ہیں پچھلی صحبتیں اور ماضی کی یادیں آگ پر تیل کا کام کرتی ہیں۔ ایسی حالت میں بھادوں کی جل تھل بھی آ پہنچتی ہے اور جدائی میں اسے خون کے آنسو رلاتی ہے:۔

نین مرے لگے اور ہی چواویں
رکت کے آنس جو چھاتی پراویں

کنوار کی چلچلاتی دھوپ اس کے داغ ہائے ہجر میں سوزش پیدا کرتی ہے اور اسے ماہی بے آب کا سماں دکھاتی ہے:۔

کنوارا گھام دن کو دیہہ داگے
نسا میں پیو بن جیوں سیو لاگے

سکھی دن رین دو دو بھاری بھئے ہیں
سجن جب سے ہمن کو تج گئے ہیں

کاتک میں دیوالی اور دسہرے کے پُرمسرت مواقع پر تمام عالم خوش و خرم نظر آتا ہے لیکن ایک برہ کی ماری کے دل کی کلی اس وقت بھی نہیں کھلتی۔ پیتم کے فراق میں محبت کی بیل بیگانہ نمو رہتی ہے۔ شادابی اور تر و تازگی اس سے کنارہ کشی رکھتی ہیں۔

سکل سنسار میں مانی دیواری
ہماری پیر نا سوامی نیواری

مناویں سب ڈھونا توڑ کے اوکھ
ہماری بیل پیتم بن رہی سوکھ

غرض من موہن کی جدائی میں عشق کا سوز اور محبت کا درد دائمی اضطراب اور پیہم عذاب کا سامان فراہم کرتے رہتے ہیں اور ہجر ان نصیب شیدائی کو ہمیشہ وصل و دیدار کی تمنا میں غرق رکھتے ہیں۔ اگھن، پوس اور ماگھ کے مہینوں میں یہ تمنا سب سے زیادہ الم انگیزی اور حشر خیزی دکھاتی ہے۔ ان مہینوں کے غم و اندوہ اور درد و داغ کی فطری اور موثر ترجمانی ذیل کے اشعار سے عیاں ہوتی ہے:

مہینا ماگھ کا لاگا ستاوے
مرا دل چین اک چھن بھر نہ پاوے

نجانوں ماگھ کیا مجھ تن کرے ری
سکھی آبھرن بھئے مجھ تن کے بیری

بھوئیں میری بھئیں ہیں جو کمانیں
برہ کے تیر مرنے کو جو کھالیں

سکھی کا جسر کی کوٹی ہے ہماری
لگے تن بیچ جیوں بوندی کٹاری

سکھی برنی براجے میرے تن پر
لگے جیوں کام کی برچھی بدن پر

اکیلی میں کوئی سنگی نہ ساتھی
پھرے ماتا مرے جوبن کا ہاتھی

نین کے نیر سے چھاتی جوڑانی
سہارا جاتے کیوں ماہٹ کا پانی

پھاگن، چیت، بیساکھ اور جیٹھ کے مہینے بھی بے چینی اور بے قراری میں گذرتے ہیں۔ پریم کی آگ ان مہینوں میں اتنی شدید ہو جاتی ہے کہ ہجراں نصیب عورت کا تن من سب کچھ جلنے لگتا ہے۔ پھاگن کی ہولی سب کو راس آتی ہے لیکن یہ غم فراق میں پڑی سلگتی رہتی ہے۔

سبھوں کو گیت راگ اب لاگ بھاوے
مرے تن کو ہوری سی جلاوے

محبوب کی جدائی میں روتے روتے اس کی آنکھیں خشک ہو جاتی ہیں اور چہرہ زرد پڑ جاتا ہے۔ جب چیت کی آگ برسی ہے تو جسم بھی جل کر سیاہ ہو جاتا ہے اور برہ کی آگ جہنم زار بن جاتی ہے۔

پیر بہا مکھ جرا اور گات سب سیام
جلایا جھار کے اب چیت میں چام

سکھی جیوں جیوں بھنور پھولوں میں گونجیں
برہ کی آگ میں تیوں تیوں تن کو بھونجیں

برہ کی آگ میں جلنا اور غم عشق میں گھلنا یہی برہن کا مقدر ہیں۔ اب بیساکھ لگنے والا ہے مگر اس کی قسمت کا دکھڑا بدستور باقی ہے۔

پیا بن آگ مجھ تن میں پڑے ری
نپٹ یہ آگ کو سیتل کرے ری

نجڑوں میں چیت سے بیساکھ لاگا
رتی بھر ماس نہ پایا سہاگا

جیٹھ کا مہینہ رہی سہی کسر بھی پوری کر دیتا ہے۔ اس میں برہن کے جسم سے گرمی کی لپٹیں نکلنے لگتی ہیں اور تمازت سے اسکا بدن بھبھوکا بن جاتا ہے:۔

سکھی ری جیٹھ میں اب کو بچے گا
جیسے یہ گھام سر اوپر تپے گا

پڑے نس دن سکھی گرمی ہی ہے چھاتی
تیوں ہیں جیٹھ میں سورج کے بھاتی

جب زمین تپ لیتی ہے تو باران رحمت کا نزول ہوتا ہے۔ سال بھر جدائی کی آگ میں جلنے اور عشق کی بھٹی میں تپنے کے بعد طالبۂ وصل کا جذبۂ صادق بھی رنگ لاتا ہے اور وہ دیدار محبوب کے ذریعہ اپنی دلی مراد حاصل کر لیتی ہے۔ لوند کے مبارک مہینے کی ایک رات کا قصہ ہے کہ پریم بروگن اٹاری پر تنہا سوئی ہوئی تھی۔ اس نے خواب میں دیکھا ایک بہت ہی خوبرو انسان، لنگی پہنے، پگڑی باندھے اور پرانی گدڑی کاندھے پر ڈالے اس کے سرہانے کھڑا ہے۔ اس عجیب و غریب شخص کو دیکھ کر اس کی آنکھ کھل گئی۔ جاگنے کے بعد اسے کچھ نظر نہ آیا تو وہ بہت حیران ہوئی۔ لیکن اسے اس بات کا پختہ یقین ہو گیا کہ اب اس کی قسمت بیدار ہونے والی ہے اور ہجر کے آلام و مصائب کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہونے والا ہے۔ یہی مقدس ہستی اسے دلدار سے ملانے کا خوشگوار کام انجام دے گی، اور اسی کے ذریعہ اسے راہ راست کی ہدایت ملے گی۔

بارہ ماسہ کے آخری اشعار وہاب کے متصوفانہ خیالات اور روحانی نظریات پر دلالت کرتے ہیں۔ ان سے اس کے مقصد پر بھی روشنی پڑتی ہے اور یہ بھی عشق الٰہی اور اسرار محبت کے بیان کا دنیاوی انداز معلوم ہوتا ہے۔ خواب میں جو برگزیدہ شخصیت نظر آتی ہے اس سے دراصل رسول خدا مراد ہیں اور پیا کا مطلب اللہ ہے۔ رسول کے ذریعہ خدا کا حصول ہی عشق کا مقصود ہوتا ہے۔ وہاب نے آخری حصہ میں اسی طرف اشارہ کیا ہے:۔

وہی سائیں مجھے پیا سے ملتی ہے
وہی مجھ کو گناہوں سے بچتی ہے

مرے بیدن ہرے گا پیو میرا
لگاوے گا سکھی وہ پار بیڑا

کہے وہاب سائیں موئی میرا
محمد ہے گرو جس کا میں چیرا

غزلیں

نصر قریشی

۴۷/۷۔ ہٹیا بہادر گنج۔
الہ آباد۔ ۳ (یو۔پی)

اسیر لمحوں سے اب تو مجھے رہائی دے
کھلی فضا میں اڑوں آسماں دکھائی دے
بس ایک چھوٹا سا گوشہ سکون کا مانگوں
میں مانگتا ہوں کہاں، تو مجھے خدائی دے
وہ صور پھونکوں، زمیں، آسمان جاگ پڑیں
بس ایک بار مجھے اذنِ لب کشائی دے
یہ کس دیار سے گذرے ہے قافلہ دل کا
ہر ایک گوشہ جہاں اجنبی دکھائی دے
بچھڑ کے دل میں عجب درد ہو گیا کوئی
ڈھلے جو رات، سسکتی صدا سنائی دے
دعا کو ہاتھ اٹھانا عبث ہے اب اے نصر
درِ قبول بھی احساس نارسائی دے

شمس غازی آبادی

۹۱۔ بھٹہ عباد اللہ غازی آباد
(یو۔پی)

وحشتِ عشق نہ ہو مائل صحرا کیسے
راستہ چھوڑ دے بہتا ہوا دریا کیسے
دیکھ رکھا ہے یقیناً کوئی رقصِ بسمل
ریگزاروں میں نہ رقصاں ہو بگولا کیسے
میری رسوائی یقینی تھی میں دیوانہ تھا
حسن در پردہ بھی رسوا ہوا ایسا کیسے
پاسِ اخفائے محبت بھی عجب ہے ورنہ
ہم بتا سکتے ہیں ہم نے تمھیں دیکھا کیسے
مسلکِ عشق و تمنا میں برائے تعظیم
درد کا کام ہی اٹھنا تھا نہ اٹھتا کیسے
تم نے اچھا ہی کیا شمس جو چھپ کر دیکھا
تم نہ چھپتے تو بھلا چاند نکلتا کیسے

اسعد بدایونی

۲/۷، مارلین کورٹ۔ آفتاب ہال۔
مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

تجھے خیال جو لفظوں کی آبرو کا ہے
سلیقہ تھوڑا سا مجھ کو بھی گفتگو کا ہے
بہت بضد ہے کہیں تشنگی مٹانے پر
وہ منتظر جو بیابان میں آب جو کا ہے
مجھے خیال ہے اس کی رفاقتوں کا ابھی
وہ آدمی کہ جو پیاسا مرے لہو کا ہے
ابھی ابھی کوئی بادل ادھر سے گزرے گا
میں جانتا ہوں، یہ موسم میرے نمو کا ہے
ہزار چاند ستارے جلے بجھے لیکن
وہ اک چراغ جو روشن ہے آرزو کا ہے

ایس۔ موہن لال جوہر

ہاؤس نمبر ۱۴۔ ۱۰۔ ۱۱۴۴۔ لوور دھولپیٹھ
حیدر آباد۔ ۵۰۰۰۰۲ (اے۔ پی)

لاکھ چاہا غمِ دنیا سے گریزاں ہونا
تھا مگر قسمتِ آدم میں پریشاں ہونا
چھوڑ دو مجھ کو میرے حال پہ اے چارہ گرو
غیر ممکن ہے علاجِ غمِ پنہاں ہونا
دلِ برباد میں یادوں کا اجالا بھی نہیں
ان چراغوں کو بھی آیا نہ فروزاں ہونا
سازِ بے سوز ہے اور عشق کی گرمی مدھم
چاہیے دل کو ابھی شعلہ بداماں ہونا
ٹھوکریں کھائی ہیں جوہر کئی استادوں نے
اس زمیں میں نہیں آسان غزل خواں ہونا

اخلاق سہسوانی

سہسوان۔ ضلع بدایوں۔ یو۔پی۔

دنیا میں وفاؤں کا جب ذکر ہوا ہوگا
شاید مجھے لوگوں نے پھر یاد کیا ہوگا
رسوائی کی منزل تک جب حسن گیا ہوگا
سب نے مری نظروں کو الزام دیا ہوگا
میں اتنے تغافل کے قابل تو نہ تھا شاید
وہ بھی مرے بارے میں یہ سوچ رہا ہوگا
اخلاص تلے میرا نفرت کی ترازو میں ؟
شاید یہ ستم میری قسمت میں لکھا ہوگا
غیروں کی تو بے مہری اخلاق سمجھتا ہوں
اپنوں ہی کے ہاتھوں سے پتھر بھی لگا ہوگا

پرویز رحمان

بیلدار محلہ۔ ڈورنڈہ۔ رانچی

پسِ پردہ کہاں ؟ کچھ بھی نہیں ہے
بجز میرے یہاں کچھ بھی نہیں ہے
مقدر میں اندھیرا بولتا ہے
مکان و لامکاں کچھ بھی نہیں ہے
کبھی محسوس کر کے بھی تو دیکھو
سبھی کچھ ہے جہاں کچھ بھی نہیں ہے
علاقہ دوستی و دشمنی کا
ہمارے درمیاں کچھ بھی نہیں ہے
جہاں وہ ہے وہاں سب کچھ ہے پرویز
جہاں تم ہو وہاں کچھ بھی نہیں ہے

مرنے والا مر نہ سکا

اختر محی الدین

ترجمہ: علی محمد لون

وہ مر رہا تھا۔ لیکن ایسا لگ رہا تھا کہ اسے اپنی موت کا یقین نہیں آ رہا تھا۔

اس کے رشتے ناطے کے لوگ اکٹھا ہو گئے تھے لیکن وہ اس بات سے بے خبر تھا۔ اسے کچھ بھی سنائی یا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ رشتے دار کچھ کہہ رہے تھے۔ کچھ اونچی آواز میں اور کچھ سرگوشیوں میں لیکن اسے کچھ بھی خبر نہ تھی۔ رشتے دار وہ سب کچھ ایک مشینی انداز میں کر رہے تھے جو ایسے موقعوں پر کیا جاتا ہے۔ اُسے آخری سرہانے لٹا گیا تھا۔ ٹانگیں سیدھی پھیلا دی گئی تھیں۔ اور چت لٹا کر دونوں ہاتھ اس کے سینے پر ایسے باندھے گئے تھے جیسے نماز پڑھتے وقت باندھتے ہیں۔ رشتے ناطے کے لوگ یہ کام کرتے وقت آہیں بھی بھر رہے تھے۔ لیکن آنکھوں دیکھی موت کا احساس ایک نارمل آدمی کو جس غم اور درد میں مبتلا کرتا ہے اس کا شائبہ تک رشتے داروں کے برتاؤ اور رویے میں نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ ماتم کرنے والے نہیں بلکہ کام کاج کرنے والے ان لوگوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ جو شادی بیاہ کی طرح پر ایسے ہی کام آتے ہیں۔ مگر جن کے دل اور روح میں نہ تو شادی کا ہی دخل ہوتا ہے اور نہ ہی ماتم کا۔ یہ لوگ جیسے روزمرہ کے کاموں کا نپٹارا کرتے ہیں بالکل مشین کی طرح۔

وہ مر رہا تھا لیکن اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

وہ آنکھیں موندے اور سینے پر دونوں ہاتھ باندھے اس لمحہ کا انتظار کر رہا تھا جب آتما کا پنچھی پنجرہ خالی کر جاتی ہے۔ وہ اسی لمحہ کا انتظار ایسے کر رہا تھا جیسے کسی بھوکے انسان کو دعوت کھانے جانا ہو، جیسے کوئی حاجی زیارت کے لیے جا رہا ہو۔

اس کے چہرے پر مسکراہٹ کا ایک پرتو سا تھا جو نظر تو نہیں آ رہا تھا لیکن محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اگر اس کے کمرے میں رشتے ناطے کے لوگوں کی بھیڑ بھاڑ نہ ہوتی تو اس کی وجہ سے سارا کمرہ خوشبوؤں میں رچ بس گیا ہوتا۔ رشتے داروں کے جسموں سے نہ جانے یہ کیسی انجانی سی بساند اٹھ رہی تھی جو اس کی خوشبو سے کہیں تیز تھی۔ جیسے بھری دوپہر یا کالے گھنگھور بادل آئے تھے۔ لیکن سورج کی کرنیں بادلوں کی اوٹ سے بھی اپنے وجود کا احساس کر رہی تھیں۔

"اللہ!" ایک رشتے دار نے آہ بھری۔

"عفو" دوسرے نے بھی آہ بھری

ایسا کرتے کرتے دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر دونوں نے آنکھیں جھکائیں جیسے منہ سے ادا کیے ہوئے الفاظ کے معنی ہی نہ جانتے ہوں یا جیسے ان الفاظ کا مفہوم ہی یہ تھا

"ابھی کتنی دیر لگے گی؟"

باہر سے ٹھک ٹھک کی آواز آئی۔ دروازے میں کھڑے لوگوں میں ہڑبڑاہٹ ہوئی۔ اور انھوں نے کسی کے اندر آنے کے لیے راستہ بنا لیا یہ حکیم صاحب تھے جو آئے تھے۔ کسی سے بات کیے بنا ہی وہ تیز تیز قدموں سے آ رہے تھے۔ رشتے ناطے کے لوگوں کو ٹھوکے اور دھکے دیتے ہوئے جب وہ اندر آ گئے تو آنکھیں سکیڑ کر بولے۔

"نہیں ابھی تک مرا نہیں؟"

اس بات کا جواب کسی نے نہیں دیا۔ سب شرمندہ سے ہو گئے سب کو یہ بات عجیب سی لگی کہ حکیم صاحب کے کہنے کے باوجود وہ اب تک مرا نہیں تھا۔ مرنے کے قریب ہونا ایک بات ہے لیکن مرنا سچ مچ مر جانا دوسری

اختر محی الدین

بات حکیم صاحب کے ماتھے پر بل پڑ گئے جب انھوں نے مرنے والے کے چہرے پر مسکراہٹ کا پرتو محسوس کیا۔ انہیں اور بھی غصہ آگیا۔ جب انھوں نے مرنے والے کے ماتھے سے اطمینان کی لہر سی اٹھتی ہوئی محسوس کی۔

" یہ کیسا مرنا ہے۔" حکیم صاحب ناخن چباتے چباتے بولے، جو زندگی کا یوں منھ چڑائے؟ یہ کیسی موت ہے کہ جسم میں تشنج ہی نہیں۔ پنجرے سے پرندے کے اڑ کر نکل جانے سے پہلے ہی خالی پن کا احساس نہیں۔ یہ کیسی موت ہے؟"

حکیم صاحب پریشان ہو اٹھے۔

"کیا عمر ہوگی اس کی؟" انھوں نے اونچی آواز میں پوچھا سب چپ رہے۔ کیونکہ سب ہی جانتے تھے کہ مرنے والے کی عمر کیا ہے۔ حکیم صاحب نہیں جانتے تھے۔ انھوں نے یہ سوال جواب پانے کے لیے نہیں بلکہ یونہی کوئی بات منھ سے نکالنے کی غرض سے کہا تھا۔ جانے یہ کیسے ہوا۔ لیکن ہوا ایسا کہ مرنے والے نے یہ بات سن لی اور بات اس کی سمجھ میں بھی آگئی۔ وہ شاید کچھ کہتا لیکن اس کی زبان بند تھی اس لیے اس نے اپنے آپ ہی سوچا!

" سوال بڑا اچھا ہے۔ کیا ہوگی میری عمر؟"

راہ چلتے چلتے جیسے اس نے پلٹ کر دیکھا۔ اسے ایک لمبی بہت لمبی سڑک نظر آئی۔ وہ سڑک نہیں جس پر روڑی اور تار کول بچھا کر گاڑیاں دوڑائی جاتی ہیں بلکہ ایک ایسی لمبی سڑک جس میں پتھریلے ٹیلے گھاٹیاں، کھڈ، خاردار جھاڑ جھنکاڑ اور پیروں میں چبھنے والی ریت تھی۔ جانے وہ اس سڑک پر کس طرح چل سکا تھا وہ حیران رہ گیا لیکن سچ یہ تھا کہ وہ اس سڑک پر چلا تھا اور چلتے چلتے اب ایک ایسی جگہ پر آگیا تھا جہاں اس کی ٹانگیں جواب دے گئی تھیں۔ آنکھوں کی روشنی ماند پڑ گئی تھی اور زبان تالو کے ساتھ لگ گئی تھی۔ مٹی کے اونچے لمبے ٹیلوں کو سر کرتے ہوئے اسے بہت دکھ اٹھانا پڑے تھے لیکن اونچائیوں کو پار کر کے جب وہ میدانوں میں آگیا تھا تو اس کے چہرے پر اطمینان کا رنگ غازے کی طرح چمک اٹھا تھا۔ ریتیلے صحراؤں میں چلتے چلتے کانٹوں نے اس کے تلوؤں کو چھید ڈالا تھا لیکن صحرا کے آخری کنارے پر آکر جب اس نے ایک ایک کر کے سارے کانٹے تلوؤں سے نکالے تھے تو اس وقت کا درد اسے شہد کی طرح میٹھا محسوس ہوا تھا۔ یخ بستہ ندیوں کو پار کرتے وقت اس کی ٹانگیں سن ہو گئی تھیں لیکن کنارے پر آکر خود دھوپ کی کرنوں نے اس کے جسم پر مالش کی تھی۔ وہ چلا تھا کیونکہ چلنا اس کا مقدر تھا۔ وہ اس دنیا میں شاید چلنے کے لیے ہی آیا تھا۔

وہ اب بھی چلتا۔ اسے احساس تھا کہ اس کے سامنے اس وقت بھی پتھریلے ٹیلے اور ریتیلے صحرا ہیں۔ لیکن ہر ایک منزل اپنے پیچھے چھوڑنے کے بعد اسے خبر تھی کہ کہیں ایسا ایسا مقام بھی آتا ہے۔ جہاں پہنچ کر ایک طرح کی مسرت اس کے اندر ہی اندر سے ابھر آتی ہے اور ساری تلخی اپنے آپ ہی مٹھاس میں بدل جاتی ہے۔ سبھی دکھوں اور غموں کی یاد ہمت کی قوت میں بدل کر آنے والی مشکلوں کی طرف دوڑنے بھاگنے کی ہوس جگاتی ہے۔ وہ اب بھی چلتا بہت بہت چلتا لیکن افسوس! ایک دن اسے مغالطہ ہو گیا تھا، اور اسے اچانک اپنا ہی سایہ ایک دوسرا ہی وجود محسوس ہوا تھا۔ اسے پتہ کبھی نہ چلا تھا کہ یہ سایہ ہے جس میں جذبات نہیں ہوتے۔ یادداشت اور شعور نہیں ہوتے، جس کے احساس نہیں ہوتا۔ اس نے کسی کو کھوجا، جو اس کا ہاتھ بٹاتا۔ اس کی مشکل کو آسان کر دیتا۔ اس کی تلخی کو کسی حد تک گھٹا دیتا۔ اس نے اپنا سایہ دیکھ کر "اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم" نہیں پڑھا۔

اسی کی لاپروائی کی وجہ سے سائے نے اپنا وجود پالیا۔ حکیم صاحب مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ اس کے سامنے آگئے۔ اسے محسوس ہوا کہ کسی انجان راہی کا ہاتھ بٹانے کے لیے کوئی خواجہ خضر آگئے۔ وہ جو بھٹکے ہوؤں کو راہ پر لگاتے ہیں۔۔۔ اور آج اس کی یہ حالت ہو چکی تھی۔

" اس کے کفن دفن کا انتظام کر دو"

حکیم صاحب نے رشتے ناطے کے لوگوں سے رعب دار آواز میں کہا۔

" کمرے میں نہ سہی قبر میں تو اپنے آپ مر جائے گا۔ اور پھر یہ کیا ضروری ہے کہ قبر میں اتارے جانے سے پہلے ہی یہ دم توڑ دے"

سب نے سر کے اشارے سے ہی اقرار کیا۔ سب حکیم صاحب کی اس بات کو اس ہمدرد اور شفیق کی بات جانا، جو خود مرنے والے کی کایا میں آیا ہوا تھا۔ سب کو یہ بات عقلمندی کی بات نظر آئی اور وہ سوچنے لگے۔

" کرنا تو یہی ہوگا۔ پھر دیر کیا سویر کیا؟ دو گھڑی پہلے ہی اس سے نپٹ کیوں نہ لیں"

آنگن میں بڑی چہل پہل شروع ہو گئی۔ کچھ لوگ ایندھن اکٹھا کر رہے تھے۔ کچھ اینٹ پتھر سے بنائے گئے چولھے میں آگ سلگا رہے تھے۔ کوئی بڑی بڑی دیگوں میں پانی بھر رہے تھے۔ کچھ لوگ کفن سی رہے تھے۔ اور کچھ قبر کھود رہے تھے۔ سب لوگ اپنے اپنے کام میں جی جان سے مصروف تھے لیکن مرنے والا کسی کو بھی یاد نہ تھا۔ سب کو اپنا اپنا کام بڑا مزیدار اور دلچسپ نظر آ رہا تھا۔ جیسے وہ سب بادام وادی میں بادام کے شگوفوں کا مزہ لینے کے لیے گھاس جلا جلا کر سنگھاڑے بھننے کی تیاریاں کر رہے ہوں۔ کٹیلی گھاس میں بھنے ہوئے گرم گرم سنگھاڑے کھانے میں کتنا لطف آتا ہے اس پر جب ہلکی خنک ہوا سے بادام کے شگوفوں کی بہت ہی لطیف سگندھ کٹیلی گھاس کے کڑوے کسیلے دھوئیں سے چھن کر ایسے آتی ہو جیسے کالی گھنگھور گھٹاؤں کے پیچھے چھپی ہوئی کرنوں کا احساس یہ اطمینان دیتا ہے کہ سورج اب تک زندہ ہے۔ زندہ۔ بالکل زندہ۔

لطف کے احساس سے مغلوب ہو کر جان کون آہستہ سے ہنس دیا۔ دوسرے نے کسی گیت کے بول آہستہ سے گانا شروع کیے۔ تیسرے نے وہی دیگ گھڑے کے بدلے بجانا شروع کی جس میں مرنے والے کو نہلانے کے لیے پانی گرم کیا جانے والا تھا۔ اس سے سب کے شادی اور مسرت کے جذبے کو جیسے مہمیز لگی۔ کچھ نے ہنسنے والے کا ساتھ اپنے قہقہوں سے دیا۔ کچھ نے گانے والے کا ساتھ الاپنے میں دیا۔ اور کچھ نے دیگ بجانے والے کا ساتھ دیا۔ ہر طرف مسرت گونج اٹھی۔ اور اندر کمرے میں مرنے والا اپنے چہرے پر ہنسی کا پرتو اور ماتھے پر اطمینان لیے چلا جا رہا تھا۔ وہ ندیاں پھلانگ رہا تھا، گھاٹیاں پار کر رہا تھا۔ کانٹے دار صحراؤں کو کھنگالے جا رہا تھا۔ وہ چلے جا رہا تھا۔ چلنا اس کا مقدر تھا۔ اور وہ محض چلنے کے لیے اس دنیا میں آیا ہوا تھا اور چلنے کے لیے ٹانگوں کا ہونا بہت ضروری ہوتا ہے؟

" احساس بڑی چیز ہے"

حکیم صاحب کے کانوں میں یہ آواز آئی اور یہ سنتے ہی حکیم صاحب کا وجود کہیں کھو گیا۔ وہ جانتے تھے کہ یہ کیسی کرامات ہے۔ یہی نا۔

" اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم"

علی محمد لون

دیوکانت برو

رگھوناتھ چودھری

آسامی نظمیں

ترجمہ: تارا چرن رستوگی

ساگر دیکھی سا

کیسا ہوتا ہے سمندر کبھی دیکھا ہے کیا؟
دیکھا میں نے بھی نہیں پر یہ سنا ہے میں نے
تا اُفق صرف نظر آتا ہے پانی، پانی
اور امواجِ پُر آشوب کا گرنا اُٹھنا

تم نے اب تک مرے دل کو بھی نہیں دیکھا ہے
نیل ڈالے ہیں غمِ عشق نے اس میں اتنے
کہ یہ اب گہرے سمندر کی طرح نیلا ہے
اور طوفان تمنا کی بلاخیزی ہے

دل کو دیکھا نہ سہی، خیر، سنا تو ہوگا
نغمۂ آہِ جگر سوز کو تم نے میرے
اور یہ بھی کبھی محسوس کیا ہے کہ نہیں
زیرِ لب پیار سے کچھ کہتی ہوئی بادِ نسیم
نازسے صحنِ گلستاں سے گذر جاتی ہے

جب گھٹاؤں پہ دھنک پڑتی ہے سندر جت چور
تم نے وہ منظرِ رعنا کبھی دیکھا ہے کیا؟
اور گل ریز ہر اک داغِ جگر ہے میرا
تم نے یہ جلوۂ صد رنگ بھی دیکھا ہے کیا؟

شب کے سناٹے میں کوئل کی صدائے دل سوز
روح فرسا تمہیں معلوم تو ہوتی ہوگی
لیکن اس بات پہ کب دھیان دیا ہے تم نے
اس کی سنگت دل افسردہ بھرا کرتا ہے

کیا کہا تیرگیٔ شام بڑھی جاتی ہے
خیر جو کچھ سہی تکلیف چراغاں نہ کرو
بس یہی ایک تمنا ہے کہ میرے دل کو
رُخِ روشن کی شعاعوں سے منور کر دو

گلاب

مسکراتا ہے تو اے گل کس کے لمسِ ناز سے
اور بہارِ نو کی چلمن سے بڑے انداز سے
دیکھتا ہے جھانک کر کس کو ادائے ناز سے
تونے ہی بخشا ہے کیا جنت کو سحرِ رنگ و نور
جس نے لغزیدہ قدم، نازک بدن غلمان و حور
سر بسر ہیں مست و بے خود نشۂ اُلفت میں چور
نغمگی ہے جن کی گویا حالتِ رقص و سُرور
خواب آگیں رات کی رانی کی خوشبو میں بسے
ان حسین لمحات میں کیا تیرے لمسِ ناز نے
داغ ہائے ہجر بھی دھوئے دلِ مہجور کے
تانبا کی تونے بخشی عارضِ دوشیزہ کو
آتشیں رُخسار، بصرہ کی حسین محبوبہ کو
کیا نوا سنجیٔ بلبل ہے یہ مجھ سے پوچھ تو
نغمہ بن کے موج زن ہے تیرا سیلِ رنگ و بو
تونے دریائے محبت کو کیا ہے نغمہ زبدن
تیرا سحرِ حسن ہے دُنیائے دل پہ ضوفگن
تو ہی تھا شاید سرورِ خاطرِ نورِ جہاں
عارضِ ممتاز بھی تجھ سے ہوئے تھے ضوفشاں
جس سے ملہم ہو گیا اس ملک کا اک بادشاہ
اشکِ حسرت سے بنایا جس نے ایسا مقبرہ
حشر تک جس پر رہے گی چشمِ عبرت خوں چکاں
محفلِ شعر و سخن کو ہے مگر روحِ رواں
عہدِ رفتہ کی مسلسل یاد کا مخزن ہے تو
اور ناکاموں کی آہِ سرد کا مامن ہے تو
میرے دل کے گلستاں کو بھی بنا رشکِ ارم
اور اس پر بادِ صرصر کے نہ ہوں جور و ستم

نئی کتابیں

دیوان حسرت عظیم آبادی

مرتبہ : ڈاکٹر اسما سعیدی
ناشر : ترقی اردو بیورو، ویسٹ بلاک ۸، رام کرشنا پورم نئی دہلی
قیمت : اٹھارہ روپے

دیوان حسرت عظیم آبادی پر ڈاکٹر اسما سعیدی کا تحقیقی مقالہ جو ترقی اردو بیورو نئی دہلی نے کتابی صورت میں شائع کرایا ہے قابلِ تحسین ہے اور ۲۸۴ صفحوں کی طباعت کی کتاب کی قیمت ۱۸ روپے نہایت مناسب رکھی ہے۔

حسرت کو اب یہ کہنے کی ضرورت نہیں رہی ہوگی۔

قدر داں اپنا کوئی گر نہ ملا اے حسرت
کسو سے کیا ہے گلہ تھی یہی تقدیر اپنی

میر محمد حیات۔ ہیبت قلی خاں خطاب ۔۔۔ حسرت تخلص کرتے تھے۔ ۱۱۴۰ھ میں بمطابق ۲۸-۱۷۲۷ عظیم آباد میں پیدا ہوئے۔ یہ وہ دور ہے۔ جب دہلی کا دربار اجڑ رہا تھا اور شاعر اور ادیب یکے بعد دیگرے ہجرت کرکے یو۔پی اور بہار کے بعد مرکز میں پناہ لینے لگے تھے۔

۱۱۵۱ء میں میر محمد باقر حزیں۔ دہلی سے عظیم آباد پہنچے میر محمد حیات حسرت سے ان کی ملاقات ہوئی۔ شعر دوستی کے تعلق سے حسرت کی شادی حزیں کی ہمشیرہ سے ہوگئی اور حزیں کو ہی انھوں نے اپنا استاد بنا لیا۔ حسرت کے آخری ۴۴ برس تنگی ترشی میں گذر ہو گئے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ زمانہ کا عتاب اس وقت سب پر نازل ہو رہا تھا۔

ڈاکٹر اسما نے جہاں دیوان حسرت کے مرتب کرنے میں ان سب باتوں تحقیق کی ہے وہاں انھوں نے اس دور کے ان واقعات کا بڑی وسعت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ جو ان نوں کے اطوار و کردار کے بنانے کے ضامن ہیں۔

ڈاکٹر اسما نے حسرت عظیم آبادی کی شاعری پر صحیح تحقیقی قدروں کو پیش نظر رکھتے ہوئے روشنی ڈالی ہے۔ اور اس امر کو بھی اجاگر کر دیا ہے کہ اس دور میں اردو کی عام روش سادگی اور میانہ روی کی طرف تھی۔

خدا معلوم وہ کون سی مجبوریاں تھیں کہ زبان دقیق سے دقیق اور سمجھ سے اوپر اٹھتی چلی گئی۔ حیرانی کی بات یہ ہے۔ کہ جس دور میں فارسی کا بول بالا تھا۔ اس دور زبان میر، حزیں، سودا، آبرو اور درد کی زبان رہی۔ لیکن جونہی فارسی بے گھر اور بے در ہوگئی۔ فارسی اردو پر چھا گئی۔

زبان عوامی محاوروں اور عوامی روایات سے مقبول عام ہوئی ہے۔ بلکہ اسی سے اس کا نیہ اٹھتا ہے۔ جب فارسی کی اقتصادی اہمیت اور سیاسی سربلندی ختم ہوگئی۔ تو عوام سے اس کا کیا لگاؤ رہ جاتا۔ لیکن شعرا کلام نے اس بات کو نظر انداز کر دیا۔ انھوں نے فارسی کے دیوان اس میں سے یا افتادہ مضامین نئی فارسی تراکیب سے طمطراق کے ساتھ اپنے بتا کر پیش کر دیئے۔ وہ جاذب نظر اور قابلِ اعتنا تو بن گئے لیکن اردو کی قدرتی ترقی رک گئی۔

موجودہ دور کی ہندی اگر پنپ نہیں پا رہی تو شاید اردو کا ماضی اس کو مستقبل کی راہ دکھا سکے گا۔ لیکن جنھیں اردو کی ترقی قومی سرمایے کی حفاظت اور قومی یکجہتی کے مترادف نظر آتی ہے۔ انھیں اس امر کی کوشش کرنا ہوگی کہ زبان عام فہم ہو اور شعبۂ حیات کو اپنے دامن میں تمیٹنے کے قابل۔

اس اعتبار سے ڈاکٹر اسما کا مقالہ مزید افادیت کا حامل ہے۔ حسرت عظیم آبادی کوئی بہت بڑے شاعر نہ سہی۔ لیکن ان کی زبان اس دور کی نشاندہی کرتی ہے اور اگر ہم اس قسم کی سادہ زبان اپنالیں تو شاید اردو کو زیادہ مقبول بنانے کے قابل ہو سکیں گے۔ یہی نہیں خود ڈاکٹر اسما کی زبان سادہ اور جاذب توجہ ہے۔ کاش یہی روش عام ہو جائے۔

حسرت عظیم آبادی کے کچھ شعر سنیے !

مجھ کو رخصت دے کہ سرگرم ہے تو اوروں سے
وضع سے خوب نہیں غیر، مچل جاؤں گا

گھر سے مجھے مت نکال سن رکھ
جاویں گے تو پھر نہ آویں گے ہم
تو قطع نظر تو ہم سے کر دیکھ
نظروں سے تجھے گرا دیں گے ہم
ہم سے وحشت اسے کیا کہتے ہیں
سب سے الفت اسے کیا کہتے ہیں
لی اٹھا چشم مروت ہم سے
بے مروت اسے کیا کہتے ہیں
رکھتے ہو ہم سے عزیزوں پہ روا
اتنی ذلت اسے کیا کہتے ہیں
اپنا کوئی نہیں ہے کس بے کساں سوا
کیا پوچھتے ہو کون ہوں آفت رسیدہ ہو

ملاوہ رہزنِ دل ہم سے جب کبھی حسرت
دو چار ہوتے ہی نظریں چرائیاں دیکھیں

ہنس راج رتن

ساز خاموش

معنف : سیدا عظم حسین اعظم
مرتب : اعظم عباس شکیل
ناشر : کرہانی پبلی کیشنز۔ ۱۷۶۸، حوض سوئی والان، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
صفحات : ۲۱۶ قیمت : ۲۰ روپے

کیا تخلیقی جوہر کی نشو و نما کے لیے فارغ البالی اور فرصت ضروری ہے؟ کیا سیاسی و سماجی بالیدگی کے لیے اعلیٰ تعلیم یا تجربہ لازمی ہے؟۔ کیا ایک دیرینہ ادبی روایت، انفرادیت کے فروغ میں مانع ہوتی ہے؟ کیا جسمانی آزار جسم کو گھلانے کے ساتھ ساتھ ذہن کو ماؤف اور تخیئل کو پژمردہ کر دیتا ہے؟ "ساز خاموش" کے خالق اعظم حسین اعظم کی ادبی اور صحافتی زندگی سے ان سبھی بیانات کی نفی ہوتی ہے۔

آج تک اعظم حسین اعظم کو پہچنوانے کے لیے شاید یہ کہنا پڑتا کہ وہ علی عباس حسینی کے بھانجے تھے۔ شمیم کرہانی کے بڑے بھائی تھے یا صفی و آرزو لکھنوی کے شاگرد تھے۔ کچھ اگلے وقتوں کے لوگ، شاید انھیں اس بات سے بھی پہچان جائیں کہ وہ 'ادب' کے مدیر تھے۔ جو ۱۹۲۹ء سے ۱۹۴۲ء تک لکھنؤ میں اعلیٰ معیار کی ادبی روایات کا علمبردار رہا۔ لیکن "ساز خاموش" کی اشاعت کے بعد، جس میں صرف ۱۹۲۲ء سے ۱۹۴۰ء تک کا کلام شامل ہے، اعظم کو کسی تعارف کی احتیاج باقی نہیں رہتی۔

اعظم کا انتقال ۵۴ برس کی عمر میں ۱۹۵۶ء میں ہوا اور ان کا ۱۹۴۰ء سے ۱۹۵۶ء تک کا کلام دستیاب نہیں۔ لیکن یہ بھی اس مجموعے کی انفرادیت ہے کیونکہ اس کے پڑھنے کے بعد یہ جاننے کی خواہش باقی رہتی ہے کہ جس شاعر کی اٹھان ایسی تھی اس کا کلام کیسا ہوگا:۔

مجموعے کی پہلی غزل کے اشعار ملاحظہ ہوں ؎

جب سے چپ لگ گئی مجھ کو وہ ستم گر ہے اُداس
میری باتوں میں اثر تھا مجھے معلوم نہ تھا
اصل میں دام کہیں تھا نہ قفس تھا کوئی
مجھ کو صیاد کا ڈر تھا مجھے معلوم نہ تھا
جس کو میں اپنے لیے لطفِ خصوصی سمجھا
ایک اندازِ نظر تھا مجھے معلوم نہ تھا

یقین نہیں آتا کہ یہ غزل اس صدی کی تیسری دہائی میں لکھنؤ کے مشاعرہ میں پڑھی گئی تھی وہ لکھنؤ جس میں صفی، آرزو، عزیز، ثاقب، اثر، آسی، سراج وغیرہ کا دور دورہ تھا۔ جس میں کبھی کبھی یاس یگانہ چنگیزی کی آواز سنائی دیتی تھی لیکن جہاں اصغر، فانی، جگر وغیرہ بھی اپنا سکہ جمانا چاہتے تھے اس ماحول اور پس منظر میں یہ غزل یقیناً ایک نئی آواز ہے۔ ان اشعار میں غزل کا رچاؤ ہے، بیان کی پختگی ہے، ایک ہلکا حزن ہے اور ایک نئی چیز یعنی اشیا کی ماہیت اور واردات قلبی کو سمجھنے کی کاوش اور جستجو ہے۔ علم نفسیات سے اعظم کی گہری دلچسپی ان کے بیشتر ایسے اشعار سے ظاہر ہوتی ہے جن میں جگ بیتی اور آپ بیتی گھل مل جاتی ہے۔

شبِ غم اپنی کٹتی ہے امیدوں کے دھندلکے میں
سحر ہوتی نہیں، لیکن سحر معلوم ہوتی ہے
چاہتا ہوں میری بربادی نہ دیکھیں آشنا
غرق ہو کشتی مری، لیکن نہ ہو ساحل کے پاس

اعظم کا ذہنی سفر محض جذبات نگاری تک محدود نہیں رہا۔ بیشتر شاعر محض وجدان کے سہارے اپنی منزل طے کر لیتے ہیں۔ لیکن اعظم پڑھتے بھی تھے، سوچتے بھی تھے اور تجربات سے سیکھتے بھی تھے جبھی وہ اس نوع کی شاعری کرتے تھے:

پرتو ہیں ہر اک آج پہ گذرے ہوئے کل کے
میں آئینہ خانے سے کہاں جاؤں نکل کے
اس ذہن کو چونکاؤں جو ہے غیر شعوری
ممکن ہے کہ جلوے بھی ہوں محفوظ ازل کے
یوں پہلے دلِ دوست میں تھی یاد ہماری
جیسے کوئی پردیس میں ہو بھیس بدل کے

سفر اور منزل، صبح اور شام، اعظم کی محبوب علامتیں ہیں:

میں جتنا چلتا جاتا ہوں مسافت بڑھتی جاتی ہے
اشارہ کر دیا ہو جیسے کچھ منزل سے منزل نے
دھندلی فضا میں چونک اُٹھا ہوں میں خواب سے
کھلتا نہیں یہ بھید سحر ہے کہ شام ہے
بشر کا یہ کاروانِ بستہ رہے گا یوں ہی خراب و خستہ
جو قیدِ غم میں ہے پاشکستہ وہ کیا سرِ شاہراہ ہوگا

لیکن اعظم کی سعی مسلسل اور ان کا تشکک اُن کے شعر میں حاوی نہیں ہوتے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ان کاوشوں کا باعث سیاسی و سماجی حالات میں جن سے اس عہد کا ہر وطن دوست نبرد آزما تھا۔ اعظم کی شاعری کا بیشتر حصہ ضائع ہو چکا ہے لیکن گاندھی، آزاد، مسز نیڈو، محمد علی جوہر پر ان کی نظموں سے قطع نظر، اس چھوٹے سے مجموعے میں شامل دیگر نظمیں بھی حب وطن کے جذبے کی مبلغ ہیں۔

اعظم عباس شکیل نے اپنے باپ کے اس مجموعے کو شائع کر کے نہ صرف سعادت مندی کا ثبوت دیا ہے بلکہ ادب دوستوں پر بھی احسان کیا ہے۔ ڈاکٹر جواد زیدی کا مقدمہ مجموعے کے لطف و افادیت کو دوبالا کرتا ہے۔ کتابت و طباعت اعلیٰ اور سرورق دیدہ زیب ہے۔

مہدی عباس حسینی

چھوٹی چھوٹی بچتیں

جلد ہی بلا تردد خاصی رقمیں بن کر خوشی کا باعث ہوتی ہیں

بذریعہ

ڈاک گھر ریکرنگ ڈپازٹ اسکیم

واجبی آمدنی والے افراد اور کنبوں کے لیے مثالی بچت اسکیم۔ چھوٹی بچتوں کو بلا دقت منظم کرنے کا ڈھنگ۔

نفع بخش: شروع کرنے میں آسان، چالو رکھنے میں سہل۔ زیادہ منافع بخش سود مرکب 10.5 فیصد سالانہ۔ خود بخود محفوظ بچت (زندگی بیمہ) کا مفاد اسے کم مالیتوں کے لیے اور بھی دلکش بنا دیتا ہے۔

بلا تردد: اپنے نزدیکی ڈاک گھر میں پانچ روپے (یا ان کی حاصل ضرب) کے ساتھ 5 سالہ ریکرنگ ڈپازٹ کھاتہ کھولیے۔ اس قدر رقم ہر ماہ جمع کراتے جایئے۔ آپ کو خود باہر جانے کی ضرورت نہیں، اس کا متبادل دستیاب ہے: اپنے گھر پر بلا معاوضہ خدمت کے لیے آپ مہیلا پردھان پر بھروسہ کر سکتے ہیں۔ اگر آپ تنخواہ دار ملازم ہیں تو اپنے ادارے کے "پے رول سیونگز گروپ" میں شامل ہو جایئے یا اپنے پوسٹ ماسٹر کو مستقل ہدایت دے دیجیے کہ وہ آپ کے بچت کھاتے یا اگر آپ کا میعادی کھاتہ ہے تو اس پر ملنے والے سالانہ سود میں سے ہر ماہ/سال مقررہ رقوم آپ کے ڈاک گھر ریکرنگ ڈپازٹ کھاتے میں منتقل کرتا رہے۔

اگر ضرورت پڑے: کھاتہ سال بھر تک چلتے رہنے کے بعد اس میں سے ایک بار 50 فیصدی کی حد تک رقم نکلوائی جا سکتی ہے۔ رقوم جمع کرانے سے رہ جائیں تو معمولی سا معاوضہ ادا کر کے انہیں بعد ازاں جمع کرایا جا سکتا ہے۔ بند ہوئے کھاتے کو پھر سے چالو کرنے کے اور بھی کئی طریقے ہیں۔

اس کے علاوہ

18 تا 53 سال کی عمر والے 5، 10، 15 اور 20 روپے کی مالیت کے ڈاک گھر ریکرنگ ڈپازٹ کھاتے داروں کو ایک بے مثال زائد فائدہ دستیاب ہے۔ سماجی تحفظ کی کارروائی کے طور پر وضع کیا گیا "محفوظ بچت پلان" اس زندگی بیمہ کا دوسرا نام ہے جو چھوٹی بچت کرنے والوں کو بلا ادائیگی پریمیم فراہم کیا گیا ہے۔ کھاتے دار کی موت ہو جانے کی صورت میں اس کے نامزد شخص یا قانونی وارث کو اس کی پوری میعادی رقم مل جاتی ہے۔ اس کے لیے ایک ہی شرط ہے کہ کھاتہ 24 ماہ تک بغیر کسی عدم ادائیگی کے لگاتار جاری رہا ہو۔

davp 80/427

مزید معلومات کے لیے براہ کرم رجوع کریں:

- کسی ڈاک گھر یا
- ڈسٹرکٹ سیونگز افسر یا
- اپنی ریاست / مرکز کے زیر انتظام علاقے کے اسمال سیونگز ڈائرکٹوریٹ سے یا
- اپنے علاقے کے ریجنل ڈائرکٹر نیشنل سیونگز سے۔

یا لکھیں:

قومی بچت ادارہ

پوسٹ بکس 96، ناگپور۔ 440001

ہوشیار! موذی ملیریا گھات میں ہے

کیا آپ کے کنبے میں کسی کو بخار ہے؟ اسے معمولی نہ سمجھئے۔ ممکن ہے یہ ملیریا ہو، جو صحت مند انسان پر اچانک حملہ کرتا ہے اور نڈھال کر کے رکھ دیتا ہے۔ نیز ذہنی خلل تک بھی پیدا کر دیتا ہے اور اگر یہ پھیلے تو پورے گاؤں، شہر یا علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔

علامتیں:

ملیریا کی علامتیں ہیں:

- اچانک لرزے اور کپکپی کے ساتھ بخار چڑھ جاتا ہے اور عام طور پر یہ حالت کچھ گھنٹوں تک جاری رہتی ہے۔
- جسم پھکنے لگتا ہے اور سر میں شدید درد ہوتا ہے۔
- آخر میں بہت زیادہ پسینہ آکر حرارت کم ہو جاتی ہے اور بے حد نقاہت محسوس ہوتی ہے۔

علاج:

بخار کے ہر کیس میں فوراً خون کی جانچ کروانا ضروری ہے اس کے بعد کلوروکوئین کی مقررہ مقدار کے ساتھ ابتدائی علاج کروائیے۔ اگر خون کی جانچ سے ملیریا کی چھوت ظاہر ہو تو پانچ یوم تک باقاعدہ ملیریا دافع ادویات سے علاج کرائیے۔

بہت تیز بخار، بیہوشی یا ہذیان کی حالت طاری ہونے کی صورت میں مریض کو نزدیکی پرائمری ہیلتھ سینٹر، ڈسپنسری یا اسپتال میں لے جائیے جہاں ہر ایک کو طبی مشورہ اور علاج مفت دستیاب ہوتا ہے۔

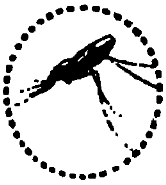

ملیریا سے بچاؤ کے لئے

- اپنے گھر میں یا آس پاس گندہ پانی جمع نہ ہونے دیجئے۔ اس سے مچھر پیدا ہوتے ہیں جو کہ ملیریا کی جڑ ہیں۔ اگر ایسا ناگزیر ہو تو پانی کی سطح پر مٹی کا تیل چھڑکئے۔
- گاہے بگاہے کیڑے مارنے والی دواؤں کا چھڑکاؤ کرنے والی ٹیموں کی امداد کیجئے اور دوسروں سے بھی امداد کرنے کے لئے کہئے۔
- دھیان رکھئے کہ آپ کے گھر میں اچھی طرح چھڑکاؤ ہو جائے۔ باورچی خانہ، عبادت گاہ، اسٹور اور مویشی خانہ میں بھی چھڑکاؤ ضرور کروائیے۔
- چھڑکاؤ کے دوران کھانے پینے کی چیزیں اور مویشیوں کا چارہ ڈھانپ کر رکھیے۔

انسان اور مچھر کا تسلسل توڑ دیجئے

انسداد ملیریا کا قومی پروگرام

(وزارت صحت و خاندانی بہبود)

22۔ شام ناتھ مارگ، دہلی 110054

davp 80/428

فیض احمد فیض، غالب اکیڈمی نئی دہلی
میں "سجاد ظہیر اور رضیہ سجاد ظہیر میموریل
لکچرز" کا آغاز کرتے ہوئے۔ ان کی بائیں
طرف کونسل آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل
ریسرچ کے نائب صدر نور الحسن صاحب
تشریف رکھتے ہیں۔

(ایک یادگار تصویر) : (بائیں سے)۔ پروفیسر عبد العلیم (مرحوم)، مخدوم محی الدین (مرحوم)، سجاد ظہیر (مرحوم)، فیض احمد فیض،
سری نواس لاہوٹی، عتیق صدیقی، فراق گورکھپوری

Regd. No. D (DN) 103
R.N. 948/57

Licensed U (D) - 50 to post without pre-payment
at Civil Lines, Post Office, Delhi.

قرأت کا عالمی مقابلہ

دائیں سے بائیں) شیخ الجامعہ، جامعہ ملیہ۔ جناب انور جمال قدوائی، وزیر امور خارجہ۔ شری پی وی نرسمہا راؤ۔ نائب صدر جمہوریہ شری ہدایت اللہ، شریمتی شیلا کول مرکزی
یر مملکت، وزارتِ تعلیم۔ وگیان بھون، نئی دہلی میں قرأت کے عالمی مقابلے میں جن ملکوں کے قاری شریک ہوئے، ان میں ملائشیا، تھائی لینڈ، بنگلہ دیش، سری لنکا، مالا
ایران، پاکستان، افغانستان، اردن، شام، لیبیا اور ترکی شامل تھے۔

آجکل

جولائی ۱۹۸۱

ایک روپیہ

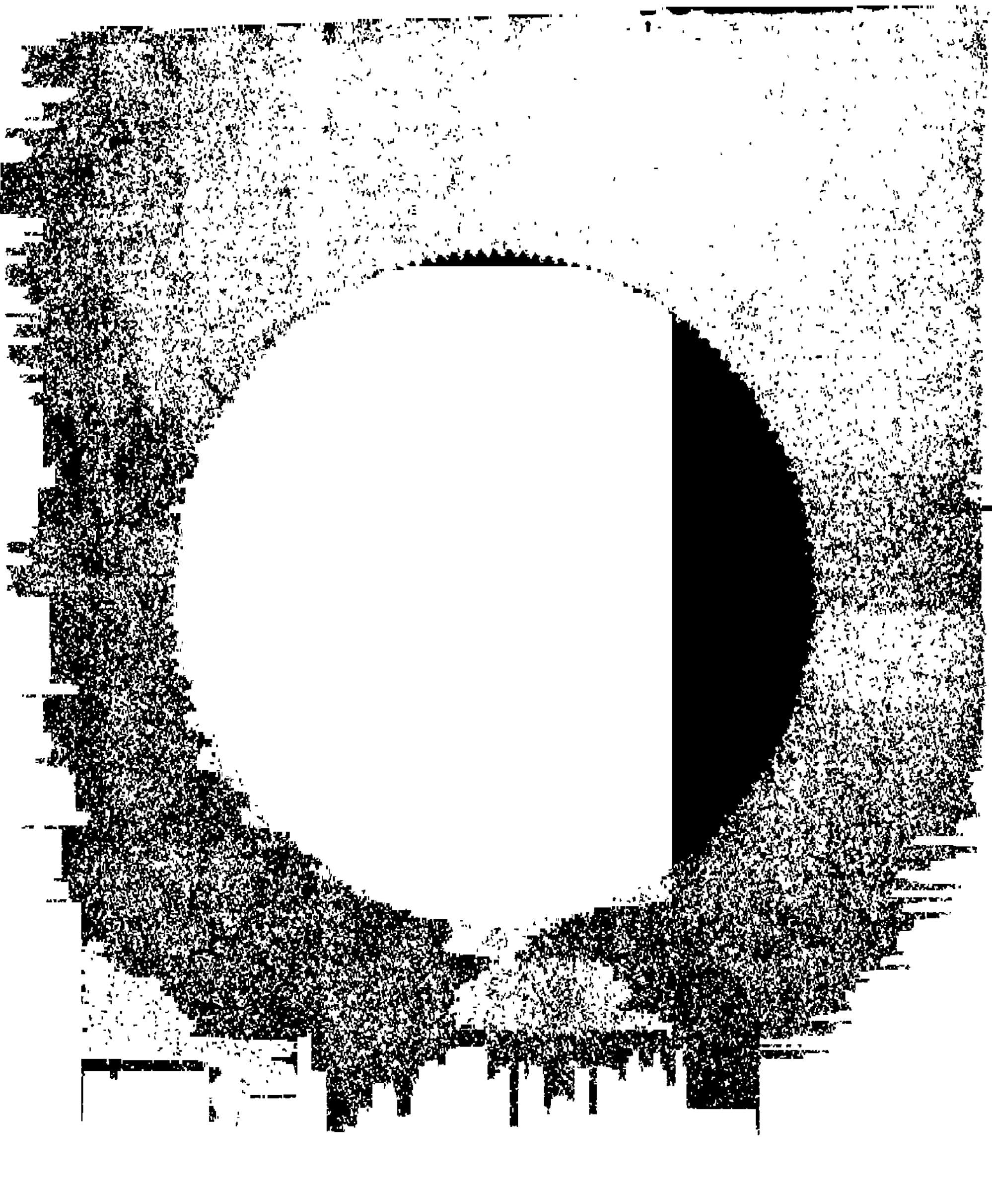

وزیر اعظم ہند کا غیر ملکی دورہ

(۱)

(۲)

(۳)

(۴)

(۵)

شریمتی اندرا گاندھی نے مئی ۱۹۸۱ء میں سوئٹزرلینڈ، کویت اور متحدہ عرب امارات کا دورہ کیا۔ اس دورے کی کچھ جھلکیاں۔ (۱) شریمتی اندرا گاندھی نے ۱۰ مئی کو کویت میں امیر کویت شیخ جابر الاحمد الجابر الصباح سے ملاقات کی۔ (۲) ۷ مئی کو برن میں وزیر اعظم ہند کو سوئٹزرلینڈ کے صدر مسٹر کرٹ فرگلر کی طرف سے مہمان خصوصی کے طور پر لنچ پر مدعو کیا گیا۔ تصویر میں وزیر اعظم مسٹر فرگلر اور ان کی اہلیہ کے ہمراہ۔ (۳) وزیر اعظم ہند ۸ مئی کو جنیوا میں صحت کی عالمی اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے۔ (۴) ابوظہبی میں وزیر اعظم ہند نے ۱۲ مئی کو انڈیا اسلامک سنٹر کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا۔ (۵) کویت کے دورے کے بعد شریمتی اندرا گاندھی متحدہ عرب امارات تشریف لے گئیں۔ تصویر میں ابوظہبی میں وزیر اعظم متحدہ عرب امارات کے صدر شیخ زائد بن سلطان النہیان کے ساتھ۔

اردو کا مقبول عام مصور ماہنامہ

آجکل

ایڈیٹر
راج نرائن راز

اسسٹنٹ ایڈیٹر
محمد عادل صدیقی

سب ایڈیٹر
شو ناتھ سکہ

جلد ۳۹ شمارہ ۱۲

جولائی ۱۹۸۱ء

اساڑھ۔ شراون شک ۱۹۰۳ء

فون
۳۸۷۰۶۹

شرح چندہ

	ہندستان	پاکستان	دیگر ممالک
سالانہ	۱۰ روپے	۱۶ روپے	۳ ڈالر ۱/۵۰ پونڈ
دو سالہ	۱۸ روپے	۲۸ روپے	۵/۴۰ ڈالر ۲/۷۰ پونڈ
سہ سالہ	۲۵ روپے	۳۸ روپے	۷/۵۰ ڈالر ۳/۷۵ پونڈ
فی کاپی	ایک روپیہ	۱/۵۰ روپیہ	۳۰ سینٹ ۱۵ پنی

ترتیب

ملاحظات
مقالات

فارسی میں حدیث بنارس — امیر حسن عابدی
اُردو کی ذولسانی لغات — حنیف کیفی
حالیؔ اور رامپور — محمد حسین خاں شفا
سجاد حیدر یلدرم اور علی گڑھ — اصطر عباس ۲

منظومات

دل کے آنگن میں عجب شور بپا رکھا ہے — کنہیا لعل آبادی
چاندنی اوّل کہاں منظر بہ منظر آتے گی — باقی ۵
آؤ، بوڑھا آئینہ — بمل کرشن اشک ۸
کوئی بھی ان خرابوں میں گھنا روشن کرے — عرفان صدیقی
شہر درد کا ہر پھول کھلا رہنے دو — احمد شمیم
بے خطر کود پڑے پانی میں — بدیع الزماں خاور ۴

غزلیں — نجیب رامش، محمد یٰسین، بسنت کمار بسنت
مصطفےٰ مومن، شہپر رسول، تارا چند دت قمر ۳۰

نیا آہنگ — سلطان اختر ۲۲

ناول
اے دیدہ ورو (پہلی قسط) — جوگندر پال ۹

کہانیاں
جھوٹا سچ — شرون کمار ورما ۱۹
اُفق اور عمود — مجید انور ۳۱

طنز و مزاح
بوڑھوں کی کانفرنس — ہاشم عظیم آبادی ۳۸

علاقائی ادب
بے نام انگریز (کنڑ نظم) — کے۔ ایس۔ نثار احمد / حمید الماس ۴۲
پیر پرائی (پنجابی کہانی) — جسونت سنگھ وردی / شرجیت ۴۳

نئی کتابیں
انتظار حسین کے سترہ افسانے
منٹو: فن اور شخصیت — مرتبہ: پریم گوپال متل — کنور سین ۴۷

سرورق: سارنگن

ڈائرکٹر پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ:
ایڈیٹر آجکل (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترسیل زر کا پتہ:
بزنس منیجر، پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱

ملاحظات

صالح معاشرہ کی تعمیر اور ہمارا تعلیمی نظام

قوم کی تعمیر و ترقی میں تعلیمی نظام کلیدی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ ہمارے تعلیمی نظام کی ضرورت یہ ہے کہ اس کے ذریعے باصلاحیت افراد منظرِ عام پر آئیں اور بلا لحاظ مذہب و ملت ایسے سبھی افراد کو سماج میں اپنا مقام بنانے کا موقع ملے جو جسمانی معذوری یا کسی اور وجہ سے تعلیم حاصل نہیں کر پاتے۔ ہمارے ملک میں باصلاحیت اور لائق افراد کی کمی نہیں ہے۔ البتہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی خوابیدہ صلاحیتوں کو اُجاگر کیا جائے۔

وزیر اعظم ہند نے حال ہی میں نئی دہلی میں منعقدہ وزرائے تعلیم کی کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے تعلیمی نظام کو بہتر بنانے پر زور دیا اور کہا کہ تعلیمی اداروں کو تجارتی مقاصد کے لیے استعمال کرنے، اسکولوں میں فرقہ وارانہ تعلیم دینے اور فرقہ وارانہ نفرت پھیلانے کا جو رجحان پیدا ہوا ہے وہ انتہائی ناپسندیدہ ہے۔ آپ نے بجا طور پر ارشاد فرمایا کہ درسی کتابوں کے ذریعے فرقہ وارانہ نفرت کو جو ہوا دی جاتی ہے، اس سے پوری قوم بدنام ہوتی ہے۔

ملک میں سبھی لوگوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ ہونا ضروری ہے، اس لیے تعلیم بالغان کے پروگرام پر زور دیا جا رہا ہے تاکہ ناخواندہ عوام استحصال سے بچ سکیں۔ تعلیم کا اصل مقصد محض کتابی علم نہیں بلکہ اس کا مقصد صحتمند اقدار کو فروغ دینا اور ذمہ دار شہری بنانا ہے۔ شریمتی اندرا گاندھی نے مزید کہا کہ ہمارے استادوں کی تربیت میں حفظانِ صحت، اخلاقیات، ماحولیات وغیرہ کے نصابات شامل ہونے چاہئیں تاکہ وہ دورانِ تعلیم ان باتوں کو اپنے شاگردوں کے ذہن نشین کرا سکیں۔

ہند۔یمن مشترکہ اعلانیہ

عوامی جمہوریہ یمن کے صدر ہز ایکسیلنسی مسٹر علی ناصر محمد کے دورۂ ہند کے اختتام پر جاری کیے گئے مشترکہ اعلانیہ میں عالمی امن اور ترکِ اسلحہ کی کوششوں کو مستحکم کرنے، کشیدگی کو کم کرنے نیز مختلف سماجی اور اقتصادی نظام والے ممالک کے درمیان مثبت تعاون اور پُرامن بقائے باہم پر زور دیا گیا ہے۔ مشترکہ اعلانیہ کے بموجب یمن کے صدر اور ہندوستانی وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے درمیان مفید مذاکرات ہوئے جن میں بین الاقوامی حالات زیرِ بحث آئے۔ بحرِ ہند میں غیر ملکی فوجوں کی موجودگی کی مذمت کرتے ہوئے یہاں سے غیر ملکی فوجی اڈّوں کے خاتمے اور اس خطے کو خطۂ امن بنائے جانے سے متعلق اقوام متحدہ کے فیصلے پر عمل درآمد کے لیے زور دیتے ہوئے اس موضوع پر سری لنکا میں ہونے والی کانفرنس کو کامیاب بنانے کا عزم کیا گیا۔

دونوں مدبروں نے مشرقِ وسطیٰ کی صورتِ حال پر تشویش ظاہر کرتے ہوئے اسے عالمی امن و سلامتی کے لیے مستقل خطرہ بتایا اور یروشلم سمیت تمام مقبوضہ علاقوں سے اسرائیل کی واپسی کا مطالبہ کیا نیز اس مسئلہ کے حل کے لیے مذاکرات میں فلسطینی آزادی کی تنظیم کی مکمل شرکت اور فلسطینی عوام کے حقوق تسلیم کیے جانے کو ضروری قرار دیا۔ دونوں نے عراق و ایران کی جنگ کے جاری رہنے پر تشویش ظاہر کرتے ہوئے اسے امن و سلامتی کے لیے خطرناک قرار دیا اور توقع ظاہر کی کہ ناوابستگی کے اصولوں کی بنیاد پر یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔

فریقین نے ناوابستگی کے اصولوں میں راسخ اعتقاد کا اعادہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ اصول دنیا کے عوام کی اکثریت کے جذبات کی عکاسی کرتے ہیں اور عالمی امن کی ایک آزاد قوت ہیں۔

مشترکہ اعلانیہ میں باہمی تعلقات کی پیش رفت پر اطمینان ظاہر کرتے ہوئے مختلف شعبوں میں باہمی تعاون کے مزید استحکام کی گنجائش محسوس کی گئی۔ عوامی جمہوریہ یمن نے ہندوستان کی طرف سے یمن کے عملے کی تربیت اور یمن میں ہندوستانی ماہرین کی تعیناتی کی شکل میں دی جانے والی امداد کی تعریف کرتے ہوئے مستقبل میں ہندوستان کی طرف سے مزید تعاون حاصل ہونے کی توقع ظاہر کی۔ ہندوستان کی طرف سے یمن کی موجودہ اور آئندہ ضروریات کو پورا کرنے کی ہر ممکن کوشش کا یقین دلایا گیا۔

قومی کانفرنس

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے ۲۵ مئی کو نئی دہلی میں آبادی اور ترقی کے مسائل پر قومی کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ کنبہ بندی نسبتاً جدید مسئلہ ہے۔ اس صدی کی ابتدائی دہائیوں میں گوکھلے اور کروے وغیرہ نیز کانگریس کی قومی منصوبہ ساز کمیٹی نے بھی اس کی اہمیت پر زور دیا تھا۔ کنبہ بندی کو آزاد ہندوستان کی قومی پالیسی کا بھی ایک بنیادی عنصر مانا گیا۔

وزیر اعظم نے کہا کہ ہندوستان پہلا ملک ہے جہاں کنبہ بندی کا سرکاری پروگرام شروع کیا گیا، جس سے عوام میں آبادی کو محدود کرنے کی ضرورت کا احساس پیدا ہوا۔ اس پروگرام کے لیے دیہات میں بھی وسیع نظام قائم کیا گیا اور بہت سے کارکنوں کو تربیت دی گئی ہے۔

لیکن یہ پروگرام صرف کچھ حد تک کامیاب ہوا ہے۔ کیرل، مہاراشٹر، اڑیسہ، پنجاب اور تامل ناڈو کو چھوڑ کر کسی ریاست میں مناسب کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ ملک کی آبادی اس وقت ۶۸ء۴۶ کروڑ ہے۔ گذشتہ دس برس [illegible]

بچوں کی پیدائش روکی گئی لیکن اموات کی روک تھام کا پروگرام اس سے
کامیاب ہوا۔ چنانچہ موجودہ رفتار سے ۲۱ برس میں ہماری آبادی کے
نا ہوجانے کا اندیشہ ہے۔ ہمارے ملک میں ہر سال آسٹریلیا کی آبادی کے
بر بچے پیدا ہوتے ہیں، لیکن آسٹریلیا کے ۳ء۱ کروڑ عوام کی آمدنی ۶۸ کروڑ
زیادہ ہندوستانیوں کے برابر ہے۔

شریمتی گاندھی نے کہا کہ اناج کی پیداوار میں آبادی سے زیادہ اضافہ ہوا
حت اور تعلیم کی سہولتیں بھی بڑھ رہی ہیں لیکن اچھے سماج کی برتری صرف
پیداوار اور وسائل کے اضافے میں نہیں بلکہ ان کی منصفانہ تقسیم میں ہے مجموعی
داوار کے لحاظ سے ہندوستان کا شمار دنیا کی پہلی دس یا بارہ ملکوں میں
تا ہے لیکن فی کس پیداوار کے معاملہ میں اس کا ۱۰۶ واں نمبر ہے۔

وزیراعظم نے کنبہ بندی کے پروگرام میں نئی جان پیدا کرنے اور موجودہ
کیموں پر نظرِ ثانی کرنے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ اس پروگرام
عوام کی ضروریات کے مطابق بنا کر خواتین اور بچوں کی صحت
رکنبہ کی اقتصادی بہتری کی اسکیموں سے منسلک کیا جائے۔

گیان پیٹھ ایوارڈ

۱۹۸۰ کے لیے ایک لاکھ روپے کی مالیت کا گیان پیٹھ ایوارڈ ملیالم مصنف
ور شاعر جناب ایس۔ کے۔ پوٹیکٹ کو "ان کے سوانحی ناول" اورو دیستن تے
تھا" (ایک صوبے کی کہانی) پر دیا گیا ہے۔ مصنف کو ان کے اس ناول پر ۱۹۷۲ء
یں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔ گیان پیٹھ ایوارڈ کے لیے ۲۱ کتابیں
زیرِ غور تھیں۔ جناب پوٹیکٹ
دوسرے ملیالی مصنف ہیں،
جنھیں یہ انعام پانے کا شرف
حاصل ہوا ہے۔ ان سے پہلے
کیرلا کے جناب شنکر کروپ کو یہ
انعام مل چکا ہے۔

ایس۔ کے۔ پوٹیکٹ

جناب پوٹیکٹ کی ولادت
۱۴ر مارچ ۱۹۱۳ کو کالی کٹ میں
ہوئی۔ اس وقت تک ان کی
۵۰ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان
میں ۷ ناول ۳ شعری مجموعے
اور ۲ سفرنامے شامل ہیں۔ ۱۹۷۲ء
میں ان کے ایک شعری مجموعے کو
[illegible] ساہتیہ اکادمی نے انعام سے نوازا تھا۔ جناب پوٹیکٹ ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۶ء
[illegible] سبھا کے ممبر بھی رہ چکے ہیں۔

(بقیہ صـ۱۸ پر)

بقیہ اے دیدہ ور و

تھی اور ہم دونوں کچھ زیادہ ہی بوجھ سے لدے ہوتے تھے اس لیے ہمیں راستہ سجھائی نہ دے رہا تھا۔ گدھا اچانک ٹھوکر کھا کر ایک بھیانک کھائی میں الٹ گیا اور اُس کے پیچھے پیچھے اُس کی دم پکڑے ہوتے میں بھی۔

پھر؟

پھر کیا؟ پھر یہ جنم شروع ہو گیا۔

تمہارا تو یہ جنم شروع ہو گیا کبھی سوچا تمہارے فالتو کا کیا ہوا ہوگا؟

ہاں — ارے ہاں! کیا پتہ، تم ہی میرے فالتو ہو؟

مجھے لگا کہ میرے اچانک دم نکل آئی ہے اور میں ہاتھ پیچھے کر کے گویا جلدی جلدی اسے واپس اپنے وجود میں گھسیڑنے لگا؟

اچھا، بھولا، بھلا منگو بننے سے پہلے تم کیا تھے؟

میں میوں کیا شرفو، جو کچھ ہوتا؟ اُس جنم میں تو مجھے باہر کی ہوا بھی نصیب نہ ہوئی۔ چڑیا کے انڈے میں بند ہی تھا کہ مجھے کوئی کالا ناگ کھا گیا۔

چڑیا کا انڈا —— ہہ —— ہا ہہ —— ہہ!

اِس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟ اِس سے بھی پہلے پراچین کال میں تو میں کسی جنگل میں ایک درخت تھا۔ ساری عمر کھڑے کھڑے ہی گزار دی۔ آج آدمی ہوں پر ——

تم اپنے آپ کو آدمی سمجھتے ہو بھولا؟ —— تم تو آج بھی چڑیا کے اُسی بند انڈے میں پڑے ہو جیسے کوئی کالا ناگ موقع ملتے ہی چٹ کر جائے گا۔

کالے ناگ کو چھوڑو۔ آدم زاد سبھی جانداروں سے ظالم ہے —— جب میں درخت تھا تو ہمارا جنگل کا جنگل دم سادھے پڑے رہتا تھا کیونکہ جنگل کے کنارے آدم ذات آباد تھی۔ آخر وہی ہوا جس کا ہمیں ڈر تھا۔ اپنی بستی کو پھیلاتے جانے کے لیے ظالموں نے ہماری بستی کو آگ لگا دی۔ ہم زندہ گڑے ہوتے تھے ورنہ دوڑ کر جائیں تو بچا لیتے۔ بس وہیں کے وہیں، ویسے کے ویسے جیتے جاگتے دیکھتے ہی دیکھتے بھسم ہو گئے۔

چلو عمر بھر کے کھڑے پن سے نجات تو ملی۔

نجات تو اُس وقت ملتی ہے شرفو، جب آنکھیں کھل جائیں۔

ہاں، آنکھیں کھل جائیں تو مکتی ہو جاتے۔

ایسے موقعوں پہ لفظوں کی بجائے کھبولا کی گُر دم آواز ہی سے سارا مطلب سمجھ میں آجاتا ہے۔

آنکھیں کھل جائیں شرفو۔ تو ہم بار بار پیدا ہوں نہ مریں، بس زندگی میں گھل مل کر ساری زندگی ہو جائیں۔

(مسلسل)

منصوبہ بندی اور ترقیاتی پروگراموں کی جھلک پیش کرنے والا

اردو یوجنا

اپریل ۱۹۸۱ء سے یوجنا کا اردو ایڈیشن منظر عام پر آچکا ہے۔ سرورق رنگین، باتصویر ماہنامہ ۳۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ چھپائی آفسیٹ پر ہے۔

شرح چندہ	سالانہ	۱۰	روپے	
	دو سالہ	۱۸	روپے	طالب علموں،
	سہ سالہ	۲۵	روپے	استادوں اور
	فی کاپی	ایک روپیہ		لائبریریوں کے لئے
				۱۰ فیصد چھوٹ

یوجنا کا مطالعہ ان تمام لوگوں کے لئے مفید ہے جو حکومت کی مختلف اسکیموں اور پروگراموں سے باخبر رہنا چاہتے ہیں۔ اور ان سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ چھوٹے کاشت کاروں، صنعت کاروں اور مختلف چھوٹے دھندوں میں لگے افراد اس کے مطالعے سے بیش قیمت معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔

قلمی معاونین سے درخواست ہے کہ "یوجنا" اردو کے لئے ایسے مضامین ارسال کریں جو مختصر، معلوماتی اور مفید ہوں۔ یہ مضامین ایڈیٹر "یوجنا" (اردو) کے نام بھیجے جائیں۔ ایجنسی اور خریداری کے لئے بزنس منیجر، پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۱ سے رابطہ قائم کریں۔

یوجنا (اردو)

براہ راست ہم سے طلب کیجیے یا "آج کل" کے ایجنٹوں سے حاصل کیجیے۔

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ

ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۱

davp 81/50

غزلیں

ضیا فتح آبادی

دِل کے آنگن میں عجب شور مچا رکھا ہے
آسماں سر پہ ہواؤں نے اُٹھا رکھا ہے

گھِر کے آئی ہے گھٹا تو بہ شکن ہے موسم
اِک نئی پیاس نے دیوانہ بنا رکھا ہے

حشر بن کر ہی تم آجاؤ کسی روز اِدھر
ہم نے دروازۂ دِل کب سے کھُلا رکھا ہے

گھر مِرا بھُول نہ جائے کہیں طوفانی ہوا
اس لیے در پہ دیا میں نے جلا رکھا ہے

دیکھتا ہوں کوئی پتھر تو سمجھ لیتا ہوں
میرا ہی حوصلۂ لغزشِ پا رکھا ہے

ہمیں سُولی پہ چڑھا دو کہ ہمیں نے اب تک
نا روا رسمِ محبت کو روا رکھا ہے

تم ضیاؔ کہہ کے پکارو کہ مجھے مہتر کہو
ایک ہی بات ہے اب ناموں میں کیا رکھا ہے

● بے ۴۹ راجوری گارڈن، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۷

بانیؔ

چاند کی اوّل کرن منظر بہ منظر آئے گی
شام ڈھل جانے دو شب زینہ اُتر کر آئے گی

میرے بستر تک ابھی آئی ہے وہ خوشبوئے خواب
رفتہ رفتہ بازوؤں میں بھی بدن بھر آئے گی

جانے وہ بولے گا کیا کیا اور بُری ہو جائے گا
کچھ سُنوں گا میں تو سب تہمت مِرے سر آئے گی

وہ کھڑی ہے اک روایت کی طرح دہلیز پر
سیر کا بھی شوق ہے لیکن نہ باہر آئے گی

یوں کہ تجھ سے دُور بھی ہوتے چلے جائیں گے ہم
جانتے بھی ہیں صدا تیری برابر آئے گی

کیا کھڑا ندّی کِنارے دیکھتا ہے وسعتیں
کیا سمجھتا ہے کوئی موجِ سمندر آئے گی

کیا عجب ہوتے ہیں باطن راستوں کے سِلسلے
کوئی بھی زنداں ہو بانیؔ روشنی در آئے گی

● ۲/۱۳۸ ۔ راجندر نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۶۰

امیر حسن عابدی

فارسی میں حدیثِ بنارس

بنارس ایک مقدس شہر ہے جو قدیم زمانہ سے روحانیت، عرفان اور علم و فضل کا مرکز رہا ہے۔ فارسی کے بڑے بڑے علما اور شعرا کا بنارس سے تعلق رہا ہے۔ بہتوں نے یہاں نشو و نما پائی، یہیں پیدا اور مدفون ہوئے۔ نیز بڑے بڑے شعرا نے بنارس کی تعریف کی ہے۔ سترہویں صدی عیسوی میں جہانگیر کے زمانہ میں ملّا سعد اللہ پانی پتی متخلص بہ مسیح یا مسیحی تقریباً بارہ سال بنارس میں رہے اور یہیں سنسکرت کی تعلیم حاصل کی۔ نیز انھوں نے راماین کا فارسی نظم میں ترجمہ کیا۔ پیغمبر صلعم کی تعریف میں آپ کا یہ شعر زبان زدِ عام ہے۔

دل از عشق محمد ریش دارم
رقابت با خدای خویش دارم

اسی طرح ان کا یہ شعر جو سیتا جی کے بارے میں ہے، بہت مشہور ہے۔

تنش را پیرہن عریاں ندیدہ
چو جاں اندر تن و تن جاں ندیدہ

اسی صدی میں بنواری داس ولی[1] جو شہزادہ دارا شکوہ کے منشی تھے، یہیں کے رہنے والے تھے۔ آپ نے صوفیانہ شاعری کے علاوہ نثر میں راجاولی، رام گیت اور پربودھ چندر اودے کا فارسی میں ترجمہ کیا۔

اس تاریخی شہر میں خود شہزادہ دارا شکوہ نے بھی اپنا قیمتی وقت گزارا ہے اور یہاں کے علما اور پنڈتوں سے استفادہ کرکے وید وغیرہ جیسی مقدس اور الہامی کتابوں کو سمجھا اور قرآن سے ان کا مقابلہ کرکے "سمدر سنگم" جیسی معرکۃ الآرا کتاب کو سنسکرت میں لکھا اور پھر "مجمع البحرین" کے نام سے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے چھ مہینے کے عرصہ میں پچاس اپنشدوں کا سلیس فارسی میں ترجمہ کیا اور اس کا "سرِّ اکبر" نام رکھا۔ اسی فارسی ترجمہ سے یورپ کے مستشرقین کو اپنشد کے فلسفہ سے واقفیت ہوئی۔ ایک فرانسیسی مستشرق شجاع الدولہ کے زمانہ میں اودھ سے اس ترجمہ کو پیرس لے گیا اور وہاں اس کا فرانسیسی اور لاطینی زبان میں ترجمہ ہوا۔

اسی صدی میں مرزا معز فطرت موسوی[2] نے ایک مثنوی "در ماجرای بنارس" لکھی تھی جس میں یہاں کے دو عاشقوں کی داستانِ عشق بیان کی تھی۔ بنارس اور گنگا کے متعلق فرماتے ہیں:-

ناگہ آن سالک پاکیزہ نہاد
گزرش سوی بنارس افتاد
دید شہری زنکویاں معمور
رشکِ باغِ ارم و غیرتِ حور
بود درپای از آن یکطرفش
کہ سزد قرص مہ و خور صدفش
ہندوان دجلہ و گنگش خوانند
چوں گلابش بلباس افشانند

نیز وہ ہندو عورتوں کے دریا میں اشنان کا منظر اس طرح پیش کرتے ہیں:-

نازنینان برخ ہمچو مہر
از مئ حسن برافروختہ چہر
غسل کردند در آن آب زلال
ہر یکی با دگری گرم مقال

---

[1] وفات: ۱۰۸۷ہجری/۱۶۷۶-۷۷عیسوی
[2] وفات: ۱۱۰۱ہجری/۱۶۸۹-۹۰عیسوی

• شعبۂ فارسی، دہلی یونیورسٹی، دہلی

دیدگان طایفۂ سیمبران
گفت چون شعلہ زکسوت عریان
ہمہ در بحر چو در کردہ وطن
سنبل افشاندہ براطراف چمن

ملا طغری مشہدی[1] ایک مرتبہ جہانگیر کے زمانہ میں ہندوستان آتے تھے اور دوسری مرتبہ شاہ جہاں کے زمانے میں یہاں آتے اور شہزادہ مراد بخش کے منشی بنے۔ وہ نظم و نثر دونوں میں کمال رکھتے تھے۔ طغری نے ہندوستان کی تمام جگہوں کی سیاحت کی تھی جن میں سے ایک بنارس بھی تھی۔ پس کہتے ہیں:-

زبنگالہ تا احمدآباد و سند
شدم کوچہ پیمای ہر شہر ہند

صف آرای باغ است گنگ بنارس
ارم چون کند طرح جنگ بنارس

انھوں نے ہندی حسینوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ چنانچہ بنارس کے حسینوں کو اس طرح بیان کرتے ہیں:-

جعفری گرویدہ از سبز بنارس منفعل
زرد روئی را چسان از شاخ ہستی در کند

حسن بت را سیر کردم ذوقہا در دذیر کردم
نقد ایمان خیبر کردم پیش دربان بنارس

طغری بعشود خانۂ دہلی چو راہ نیست
سیر کرشمہ زار بنارس غنیمت است

طغری کو ہندوستانی تہوار خاص کر ہولی بہت پسند تھی۔ جب لوگ گاتے بجاتے ان کے گھر سے گذرتے تھے تو وہ تھوڑی دور ان کے ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ ایک قصیدہ کی تشبیب میں انھوں نے اس تہوار کی اس طرح تصویر کشی کی ہے:-

شد وقت ہولی باختن با رنگ و بو پرداختن
خود را چو گلبن ساختن با باغ ارم خوار آمدہ

رنگین لباسان ہر طرف پیرایۂ ہولی بکف
بازی کنان با چنگ و دف در کوچہ سیار آمدہ

اٹھارہویں صدی عیسوی میں محمد یوسف نگہت برہانپوری مخاطب بہ سخنور خاں نے کرناٹک میں گجراتیوں کے ساتھ ہولی کھیلی تھی۔ اس سلسلہ میں انھوں نے کھتریوں، برہمنوں اور بنارس کے لوگوں اور دوسروں کا ذکر کیا ہے جو اس جشن میں شریک ہوتے تھے۔ چنانچہ ایک مضمون میں فرماتے ہیں۔

بہار عیش کھتری زادگان است
رفیق ما فلان است و فلان است

برہمن زادگان را در حواشی
زبعد رام رام و رنگ پاشی

بنارس زادگان شوخ اندر بسیار
بہم گستاخ و چشمک باز عیار

اس مثنوی میں ہندوستان کے اہم شہروں اور جگہوں کا ذکر ملتا ہے جیسے بنارس، پٹنہ، حیدرآباد، اکبرآباد، لاہور جہاں ہولی کا تہوار بڑے زور و شور سے منایا جاتا ہے:-

تماشا بین زنزد یکان و از دور
زپٹنہ و جہان آباد و لاہور

زبنگالہ و ملتان و بنارس
زگجرات و سرونج واز کلارس

زکشمیر و جلال آباد و کابل
بچندین رنگ دل صبر و تحمل

اسی صدی میں فارسی کے ایک بڑے شاعر شیخ علی حزیں[1] ایران سے آکر ۱۷۴۳ عیسوی میں بنارس میں مقیم ہوتے انھوں نے وہیں انتقال کیا اور مدفون ہوئے۔ رام نراین موزوں[2] آپ کے شاگرد تھے۔ حزیں کو بنارس سے والہانہ عشق تھا اور ان کا یہ شعر بہت مشہور ہے:-

از بنارس نروم معبد عام است اینجا
ہر برہمن بچہ لچھمن و رام است اینجا

---

[1] وفات: ۱۰۷۸ہجری / ۸–۱۶۶۷ عیسوی۔

[1] وفات: ۱۱۸۰ہجری / ۷–۱۷۶۶ عیسوی۔
[2] وفات: ۱۱۷۶ہجری / ۱۷۶۲ عیسوی۔

آپ کو ہندوستان اور ہندو مذہب سے بڑا لگاؤ تھا اور یہاں کے حسن اور پرستش کے دلدادہ تھے۔ فرماتے ہیں :۔

برہمن زادۂ زنار بندی بردہ ایمانم
کہ سودا می کند باکفر زلفش دین و ایمان را

یا فرماتے ہیں :۔

پری رخان بنارس بصد کرشمہ و ناز
پی پرستش مہدیو چون کنند آہنگ
بہ گنگ غسل کنند و بہ سنگ پا مالند
زہی شرافت سنگ و زہی لطافت گنگ

صبح بنارس کی شہرت غالباً اشنان اور پرستش کا نتیجہ ہے۔ اردو میں ایک مثل ہے "علی حزیں کی پھرتی سواری" یعنی وہ کسی جگہ جانے کے لیے سواری والوں سے مدد لے کر سواریاں بدلتے ہوتے منزل مقصود پر پہنچتے تھے۔

انیسویں صدی میں عارف علی شاہ خراسانی، امجد علی شاہ کے زمانہ میں لکھنؤ میں آئے۔ آپ ایک رند مشرب صوفی تھے۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں وہ سندیلہ میں تھے راجہ درگا پرشاد مہر کے ساتھ وہ اکثر لکھنؤ میں رہا کرتے تھے۔ آپ بنارس بھی تشریف لائے تھے اور یہاں کے عشوہ گر معشوقوں کا اس طرح سے ذکر کرتے ہیں :۔

عشوہ گر بنارس کشت مرا بنارس
کشت مرا بنارس عشوہ گر بنارس

گنگا کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں :

گنگہ رو باغ جنان سرزدہ گوتی از آب
آنکہ بی حور بود عین قصور است امشب

جب آپ بنارس سے لکھنؤ واپس تشریف لے گئے اور راجہ درگا پرشاد کے ساتھ قیام کیا تو صبح کی نماز قبلہ کی طرف پشت کر کے ادا کی راجہ درگا پرشاد کو بڑا تعجب ہوا اور اپنے والد راجہ دھنپت رائے سے یہ واقعہ بیان کیا۔ جب انھوں نے آپ سے پوچھا کہ بنارس آ کر آپ قبلہ بھی بھول گئے، تو آپ ہنسے اور فوراً یہ غزل پڑھ کر سنا دی۔

قبلہ ما کوی تو کعبہ ما روی تو
مسجد اقصای ما طاق دو ابروی تو

عارف کو ہندوستان بہت عزیز تھا اور وہ یہاں کی معاشرت میں بڑی حد تک ڈوب گئے تھے۔ آپ کو یہاں کے میلوں ٹھیلوں حسینوں

(بقیہ ۱۲ پر)

بمل کرشن اشک

آؤ

آؤ گدرائی ہوئی وہ جامنیں جیبوں میں بھر لیں
جن کا نیلا رنگ یادوں سے نہ اترے
ننھی منی مولسریاں چارپائی پر کچھ اس ڈھب سے بچھائیں
موجِ خوشبو آنسوؤں میں رچ رہے
آؤ چمپا کو ہرے پتوں میں کچھ اس سرعت سے ڈھونڈیں
وقت دامن کو پکڑ لے
بوڑھے پیپل کی توانا شاخ کو جھولے کی رسی سے کچھ اس طور جکڑ لیں
روح پر سکھ کے نشاں مٹنے نہ پائیں
جس جگہ لیکن درختوں کی قطاریں تھیں جہاں پھولوں کے پودے تھے
وہاں اب ایک ہی جیسے مکانوں کے علاوہ کچھ نہیں ہے

بوڑھا آئینہ

آئینہ میں جانے کیا کیا سوجھتا ہے
ایک پیکرِ غم زدہ سا
ایک شامِ بے سحر سی
ایک رستہ منزلِ لامنزلی کو ڈھونڈتا سا
اک تھکا ماندہ مسافر لوٹتا سا
ایک کل سنولا گئی سی
ایک کل ناامیدی، بے آرزو سی
اک پرندہ آسماں سے گر رہا سا
اک سڑک کے بیچ راہی حادثہ کا منتظر سا
آئینہ میں جانے کیا کیا سوجھتا ہے۔

● ۷، یونیورسٹی کیمپس، روہتک ۱۲۰۰۰۱

جوگندر پال

اے دیدہ ورو

شرفو

دیکھنے کی عادت تو اپنی اپنی ہوتی ہے۔ کیا پتہ، کوئی کیسے دیکھتا ہے؟ میں تو ساری دنیا کو اپنے اندر ہی دیکھتا ہوں —— اُونچے اُونچے پہاڑ، جن کی چوٹیاں بدن میں چبھتی رہتی ہیں —— اور چوڑے چوڑے دریا، جن میں بہتے ہوتے کئی بھنور میں پھنس جاتا ہوں اور پتھروں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتا ہوں، لیکن میرے کنارے منجدھار میں سے کیا میرے سارے ٹکڑے سمیٹ لیتے ہیں اور انہیں جوڑ کر مجھے پھر کہیں ڈھنپے ڈھنپے محفوظ میدان میں ڈال دیتے ہیں۔

میرے باطن میں ایک پورا کرّہ ہے۔ اِس کرّے کے کئی مقامات شدید موسموں سے کٹ پھٹ چکے ہیں لیکن میں سہج سہج کسی نہ کسی طور کچے پکے پُل بنا لیتا ہوں تاکہ میرا کوئی ٹکڑا الگ تھلگ نہ رہے۔ مجھے جہاں پہنچنا ہوتا ہے وہاں پہنچنے کا خیال آتے ہی جا پہنچتا ہوں۔ میں اپنی اِس ساری کائنات کے ذرے ذرے میں بسا ہوا ہوں۔

نہیں، میں کسی خدائی کا دعویٰ نہیں کر رہا ہوں۔ بات اصل میں یہ ہے کہ میں جنم کا اندھا ہوں اور چین سے چپ چاپ اپنے اندر رہتا ہوں —— چین سے؟ —— نہیں، یہ جھوٹ ہے کہ میں چین سے اپنے اندر پڑا رہتا ہوں، اور یہ بھی جھوٹ ہے کہ میرا کوئی ٹکڑا الگ تھلگ نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ میرے سارے پُل ٹوٹے ہوتے ہیں۔ میں یونہی اپنی ڈھارس بندھاتا رہتا ہوں۔ دراصل میں کہیں بھی نہیں پہنچ پاتا ہوں۔ اندھا آدمی ہوں، کانوں سے منہ تک بھی پہنچنا ہو تو بیچ میں ہی کہیں دھڑام سے گر جاتا ہوں۔

منہ کان وغیرہ کے ذکر سے مجھے چند ہی روز پہلے کا ایک ان ہونا سا واقعہ یاد آگیا ہے:

ہم اپنے اندھوں کے گھر کے تین اندھے دوپہر کے کھانے کے بعد باہم بیٹھے تھے کہ بھولا کہنے لگا، یارو، زندگی بری تو ہے پر مل جل کر برتی جاتے تو اتنی بری

بھی نہیں

بھولا ہمیشہ بڑے پتے کی باتیں کرتا ہے اس لیے ہم دونوں اُسے بڑے دھیان سے سننے لگے۔

اندر سے باہر کا فاصلہ تو بڑی الجھی ہوئی لمبائی میں پھیلا ہوتا ہے یارو۔ مجھے تو اپنے سر سے پیٹ تک بھی جانا ہو تو بار بار اوندھے منہ گر پڑتا ہوں۔

ہاں، بھولا، سوچ سوچ کر پیٹ بھرنا نصیب میں ہو تو یہی مصیبت رہتی ہے۔

صرف یہی نہیں، پیٹ بھر جانے پر سر کو لوٹنے کا راستہ سوجھتا ہی نہیں۔

لیکن سر کی طرف لوٹا ہی کیوں جائے بھولا؟ میں تو کھاپی کے پیٹ کے نیچے دونوں ٹانگوں کے بالائی درمیان میں پڑا رہتا ہوں۔

ہاں، بھولا، بھرے پیٹ یہی لگتا ہے جھولے میں جھول رہے ہیں۔

لیکن بھرا پیٹ کب تک بھرا رہتا ہے یارو؟ خالی ہو جاتا ہے تو جھولا ٹوٹ جاتا ہے اور جھولنے والے کی ہڈیاں اندر ہی اندر تڑخ جاتی ہیں اور اُسے اپنے پیروں میں چبھتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔

ہاں، پیٹ بھرتے ہی ہمیں واپس سر کی طرف ہو لینا چاہیے۔

لیکن یہی تو مشکل ہے۔ پیٹ بھر جانے پر گھر کا راستہ سجھائی نہیں دیتا۔

ٹھیک ہے بھولا، آدمی کا سر ہی اُس کا گھر ہے پر گھر سے باہر نہ نکلیں تو پیٹ کیسے بھریں؟

اور پیٹ بھر جاتے تو گھر کیسے لوٹیں؟

یہی تو میں کہہ رہا ہوں یارو۔ اندھے کی اکیلی زندگی موت سے کم نہیں۔ پر اتنے سارے اندھے ہوں تو جینے کو سہارا جا سکتا ہے۔ میں نے ایک بڑی کارگر ترکیب سوچی ہے۔ آؤ اسے ابھی آزما تے لیتے ہیں۔

ای ۵۸۷، گریٹر کیلاش II، نئی دہلی ۱۱۰۰۴۸

میں نے اپنی اندھی آنکھیں بھولا کی طرف اٹھا لیں۔

نظر آ تا رہے یارو، ایک ہی آدمی دس کام سنبھال سکتا ہے مگر بے نظر آدمی سے کام لینا ہو تو اُس سے ایک ہی کام لو ـــــ لو میں صرف سوچتا ہوں، تم دونوں کے لیے بھی اور اپنے لیے بھی، رتنے! تم صرف سنو، مانو تم پورے آدمی نہیں ـــــ

پورے آدمی تو ہم یوں بھی نہیں۔

ٹوکو نہیں، رتنے، پہلے سن لو۔ مانو تم کان ہی کان ہو ـــــ اور تم شرفو ـــــ وہ مجھ سے مخاطب ہوا ـــــ مانو تم صرف منہ ہو۔ تم صرف بولو ـــــ اندھے پن میں ساری گڑبڑ یہیں سے شروع ہوتی ہے یارو، کہ ہمیں ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا ہوتا ہے۔ ذرا سوچو، ٹھوکروں سے بچنے کے لیے اندھا اپنی اسی ایک جگہ پر کیوں نہ ڈٹا رہے؟

مگر سارا سوچنا تو اب تم نے اپنے سر لے لیا ہے بھولا۔

ہاں، اب صرف میں سوچوں گا۔

تو آؤ، شروع کرتے ہیں ـــــ لو، میں صرف سن رہا ہوں۔

اور میں صرف بول رہا ہوں۔

شاباش! ـــــ میں صرف سوچ رہا ہوں ـــــ جو ہمیں بولنا ہے شرفو، وہ صرف تمہیں بولنا ہے ـــــ اور جو ہمیں سننا ہے وہ صرف تمہیں سننا ہے رتنے ـــــ اور مجھے صرف سوچنا ہے ـــــ چلو، شروع کریں ـــــ لو میں سوچ رہا ہوں۔ تمہاری ساری سوچیں میری ہو گئی ہیں، یعنی میری، بجائے تم ہی سوچ رہے ہو، یعنی تمہاری، بجائے میں ہی سن رہا ہوں، میں ہی بول رہا ہوں۔ میں ـــــ

ٹھہرو بھولا، مجھے لگ رہا ہے ہم تین نہیں رہے، ایک ہی ہو گئے ہیں۔

ہاں، غور سے دیکھ کر بتاؤ، ہم تین ہیں یا واقعی ایک؟

ہاں، آنکھوں سے نہ سہی ہم غور سے تو دیکھ سکتے ہیں۔

ہہ ہہ ـــــ ہہ ہا ـــــ ہہ!

ہنس کیوں رہے ہو؟

مجھے ایسے لگا ہے جیسے میں نے واقعی تم دونوں کو ایک جھلک ـــــ دیکھ لیا ہے ـــــ ایک ہی شکل، نامعلوم تم وہ تھے یا وہ تم۔

ہہ ہہ ـــــ ہا! مجھے بھی یہی لگا ہے۔

اندھی آنکھوں کے نور کا کرشمہ ہے یارو۔ جسے بھی اپنائیت سے دیکھو وہ ویسا ہی معلوم ہوتا ہے۔

تو کیا ہماری مری ہوئی نظر واقعی جی سی پڑی؟

نہیں، اندھا بھلا کیونکر دیکھے گا؟ اُس پل ـــــ صرف اسی پل ہم تینوں کی وہی ایک خواہش ـــــ شدید خواہش ہماری آنکھوں کے کواڑ توڑ کر بے اختیار باہر آ گئی ہوگی اور ہم نے واقعی ایک دوسرے کو دیکھ لیا ہوگا ـــــ صرف ایک جھلک، کیونکہ شدید سے شدید خواہش کے بھی آنکھیں تو نہیں ہوتیں کہ وہ دیکھتی ہی چلی جائیں۔ گھپ اندھیرے میں تینوں کا ایک ہی چہرہ، اک ذرا سا کوندا ہوگا اور بس۔ باہر باہر سے میری کوئی بھی شکل ہو، میری روح میں میری یہی شکل محفوظ ہو گئی۔

اپنی شکل کی بات سے مجھے روپی کا خیال آ گیا ہے۔ اندھی چھوکری مجھ سے اکثر کہا کرتی، مجھے معلوم نہیں، پر تمہیں تو معلوم ہوگا شرفو، میں کیسی دکھتی ہوں؟ ـــــ میں اُسے کیا بتاتا؟ ساری عمر کا مقدر زمین دوز پناہ گاہیں ہوں تو ساتویں آسمان کا چکیلا پن کہاں سے دیکھے؟ ـــــ روپی ہمارے ساتھ ہی اسی اندھوں کے گھر میں رہتی تھی اور مجھے بے حد پیاری لگتی تھی۔ میری محبت کا یہ عالم تھا کہ پاس یا پرے وہ جہاں بھی ہوتی میں جی ہی جی میں اُس کا بدن ٹٹول ٹٹول کر اُسے دیکھتا رہتا۔ نہ جانے ہم اُسے روپی کیوں کہتے تھے۔ اٹھتے بیٹھتے وہ بے سبب ہنستی رہتی۔ کوئی پہلے ہی اندھا ہو اور اتنی اندھی ہنسی ہنستا رہے تو ڈر سا رہتا ہے کہیں ٹھوکر کھا کے منہ کے بل نہ گر جائے۔

اس دن وہ میرے سامنے بیٹھی حسبِ عادت یونہی ہنسے جا رہی تھی اور میرے کان ہنس ہنس کر کھلتی ہوئی گٹھڑی کو بے جھپک دیکھتے جا رہے تھے۔

میری طرف گھور گھور کر کیا دیکھ رہے ہو شرفو؟

تمہیں! ـــــ میں نے روپی کو جواب دینا چاہا لیکن اپنی دونوں اندھی کوٹھڑیوں میں شرمندگی سے جھپک جھپک ہنسنے لگا۔

ارے بولو نا، کیا میں تمہیں اچھی لگتی ہوں؟

شاید اسی کو اندھا پیار کہتے ہیں کہ محبت کرتے ہوتے دکھائی دیں نہ دیکھ پائیں۔

بولتے کیوں نہیں؟ بتاؤ، تمہارے خیال میں میری شکل کیسی ہوگی؟

میں روپی کو کیا بتاتا؟ مجھے تو وہ ویسی ہی معلوم ہوتی جیسی اُسی دم بولتے ہوتے اپنی آوازمیں سے برآمد ہو کر دل و دماغ میں آ جاتی۔ اب یہ ـــــ اب یہ کوئی اور ـــــ

بولو نا، میں کیسی لگتی ہوں؟

اندھی کی اندھی سی خواہش کہ اُس کا سیاں ساری دنیا کو اندھا ہو کر دیکھے مگر اندھا بھی ہو تو اُسے دیکھتے ہوتے اس کی آنکھیں پوری کھل جائیں۔

میری خاموشی کے بوجھ سے اس کی پسلیاں ٹوٹنے کو آ رہی تھیں۔ آپ مجھ پر ہنس لیجیے۔ مجھ سے کچھ بھی بولنا نہ ہوا۔ منہ باتوں سے ٹھنس کر بھرا ہوا تھا اور انہیں بڑے آرام سے کہہ دینے کی بجائے چبا چبا کر چپ چاپ واپس گلے میں اتارتا جا رہا تھا۔ اندھیرے کی پیہم بود و باش آدمی کو خواہ مخواہ چور سا بنا دیتی ہے اور وہ اپنا وجود بھی چھپا چھپا کر اٹھائے پھرتا ہے کہ کوئی پکڑ نہ لے۔ روپی نے

سارے سوالوں کے جواب دل ہی دل میں دے کر میں یہ سمجھ لیتا کہ ہماری بات پوری ہوگئی۔

لیکن بات کو کسی اور طریقے سے ہی پورا ہونا تھا۔ ہوا یہ، کہ ایک روز رونی چپکے سے میرے کمرے میں گھس آئی۔ اُس وقت گھس آئی جب کمرے میں میری بجائے صرف بھولا تھا۔ ہمارا بھولا اتنا سمجھ دار ہے کہ ہم جو کچھ بھی کرتے ہیں اُسی کی سمجھ بوجھ سے کرتے ہیں، سو اُس نے جو بھی کیا وہی کیا جو میں کرتا—— رونی نے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا ہوگا، میں آگئی ہوں شرفو—— اور بھولا نے اُسے چپ چاپ اپنے بازوؤں میں لے لیا ہوگا—— کوئی باہر کا آدمی ہوتا تو میں اُس کی جان لے لیتا لیکن میں کیا اور بھولا کیا—— اور رتنے کیا، ایک بولتا ہے، ایک سوچتا ہے، ایک سنتا ہے، پر ایک ہی بولتا اور سوچتا اور سنتا ہے۔ بھولا نے جو رونی سے کیا، میں بھی وہی کرتا، در اصل اُس نے جو کیا، وہ میں نے ہی کیا۔

بھولا نے اُسی رات کو ساری کہانی مجھے من وعن سنا دی —— اور دوسرے روز رونی پھر میرے کمرے میں آئی تو میں نے اُس سے معافی مانگنا چاہی۔

رونی کھل کھلا کر ہنس رہی تھی۔

معافی کس بات کی؟ آؤ آج بھی ——

سارا راستہ بمشکل ٹٹولتے ہوتے میں نے اُسے پوری بات سنا دی اور اس سے پہلے کہ اُسے یقین دلا سکوں کہ بھولا بے قصور ہے، کہ سارا قصور میرا ہی ہے، وہ شرم و غصہ کی کیفیت میں پاؤں پٹخ پٹخ کر کمرے سے باہر چل گئی، ہمارے اندھوں کا گھر، چھوڑ کر نا معلوم کہاں چلی گئی۔

تم ناحق پریشان ہونے ہو شرفو—— بھولا نے مجھے سمجھایا—— کسی اندھے کا سب سے بڑا دن وہی ہوتا ہے جب وہ خوشی سے یا ناخوشی کے بغیر کہیں باہر نکل جاتا ہے۔

کہاں؟ لیکن وہ بے چاری جائے گی کہاں، بھولا؟

کہیں بھی! غصّے سے ہی سہی مگر یہ کیا کم ہے کہ دھکا کھا کے باہر نکل گئی؟

نہیں، بھولے بھائی، بے چاری مر کھپ جائے گی۔

تو کیا ہوا؟ بندھن تو ٹوٹ جائیں گے۔ باہر کے پٹ کھلنے سے پہلے ابد کی ریل پیل شروع نہیں ہوتی۔

میں نے بے چین ہو کر سوچا کہ رونی ابد کی ریل پیل میں کھو گئی تو اُسے کہاں ڈھونڈوں گا؟

تو آؤ بھولا، ہم دونوں بھی باہر کے پٹ توڑ کر نکل جائیں۔

چلے تو جائیں مرے یار، لیکن تم جانتے ہو میں سوچ سمجھ کر قدم اٹھانے والا آدمی ہوں۔ اتنے بڑے کام کی ہمّت تو سوچے سمجھے بغیر ہی پیدا ہوتی ہے۔

بھولا سے مایوس ہو کر میں نے کئی بار فیصلہ کیا ہے کہ اکیلے ہی کہیں باہر کی طرف ہو لوں گا مگر میرے باہر کے دونوں لوہے کے پٹ تو خدا نے اپنے ہاتھوں بند کر کے میرے ارد گرد پانی ہی پانی بھر دیا ہے۔

نہیں، میرے یار، خدا کی مرضی کوئی اتنی چھوٹی نہیں ہوتی کہ اُس پر انسان کی مرضی کا گمان ہو۔ باہر نکلنے کے کئی اور راستے بھی ضرور ہوں گے۔

میری آنکھیں اندھی ہی سہی مگر بھولا کی باتیں سنتے ہوتے کھل جاتی ہیں۔

خدا ہمارے چند ایک راستے اس لیے بند کر دیتا ہے شرفو، کہ ہمیں سارے راستوں کے کھلا ہونے کی طرف متوجہ کر سکے۔

بھولا غلط نہیں، کوئی نہ کوئی دوسرے راستے ضرور کھلے ہوں گے۔

کوئی نہ کوئی نہیں، میرے یار۔ بے حساب راستے کھلے ہیں۔ ہمارا بدن بنا اس لیے ہوتا ہے کہ اس کا ایک ایک مسام کھلا رہتا ہے۔

مجھے تعجب ہوتا ہے کہ سب کچھ جاننے کے باوجود بھولا یہاں ہمارے ماننے بے بس کیوں پڑا ہے، بے اختیار کود کیوں نہیں جاتا؟

بتا تو چکا ہوں شرفو، کہ سب کچھ جاننا ہی میری بے بسی کا باعث ہے۔

اختیار کو در جانے کی ہمّت ان میں ہوتی ہے جو کچھ نہ جانتے ہوں۔

بھولا کا کہنا واقعی غلط نہیں۔ میری مصیبت بھی یہی ہے کہ میں تھوڑا تھوڑا جانتا ہوں اور تھوڑا تھوڑا لا علم ہوں۔ میری لاعلمی مجھے باہر کی طرف دھکیلتی رہتی ہے، کود جاؤ، کہیں تو یہ اندھیرے ختم ہوں گے۔ جب تک چند سانس باقی ہیں، بے جھجک کود جاؤ، ورنہ سانس تو صرف ہو ہی جائیں گے —————— اور صرف ہو جائیں گے تو اپنے اندر ہی اندر کھنڈر ہو کر رہ جاؤ گے، کود کر کسی سرے پر تو جا لگو گے —— مگر میرا علم اپنے پاؤں جما کر مجھے روکے رکھتا ہے بکواس بند کرو۔ کود کر جاؤ گے کہاں؟ —— اور اپنی ذات میں کھبے ہوتے یہ بڑے بڑے پہاڑ —— آبشار —— میدان —— انہیں چھوڑ جاؤ گے؟ —— یا ساتھ کیسے لے جاؤ گے؟ —— یا لے گئے تو اپنے وجود کے بغیر انہیں سنبھالو گے کہاں؟

میری سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں، یہ یا یہ؟ اور یوں میں کر پاتا ہوں نہ نہیں کر پاتا ہوں، بس اسی طرح اندھے اندھے ہی بیتی جا رہی ہے۔

اندھا وہ ہوتا ہے جسے حال میں کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ بے چارے آنکھوں پر ماضی کا پردہ پڑا ہوتا ہے اس لیے اُسے نظر نہیں آتا، بس اونگھ ہی اونگھ میں نہ جانے اپنے پیچھے کہاں پہنچا ہوتا ہے؟

روؤ نہیں، میرے لعل! ——

ماں! — ماں — ں!

روؤ مت!

ماں — ں! ——

اٹھو شرفو میاں! اتنے بڑے ہو گئے ہو، مرحومہ کی گود میں گھسے آتو ہو۔ بھولا ۔۔۔ دروازے میرے خواب میں دھوپ چڑھ آئی ہے مگر میں بستر پر پڑا ہوا ہوں۔

ماں ۔۔۔ ماں! ۔۔۔۔

شرفو! شرفو ۔۔۔ بھولا مجھے جھنجوڑ رہا ہے۔

میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا ہوں۔

ابھی تک سو رہے تھے؟

آج کل سوتے میں بھی جاگتا رہتا ہوں، بھولا۔

اسی لیے جاگتے میں بھی سوتے سوتے سے لگتے ہو؟ ۔۔۔ چلو، اٹھو!

پرسوں خیر گزری کہ ہمارے اندھوں کے گھر کے چوکیدار نے مجھے بیرونی دروازے پر روک لیا ورنہ میں خواب کی حالت میں روپی کے پیچھے باہر کی جانب ہو لیا تھا۔ میرے ہاتھ کندھوں سے لٹک کر لمبے سفر کے ارادے سے آگے پیچھے ہو رہے تھے اور پیر دماغ سے چوری چوری آپ ہی سوچ سوچ کر اٹھ رہے تھے۔

کہاں جا رہے ہو شرفو؟

چوکیدار کی کرخت آواز سے جھٹکا کھا کر میں جاگ پڑا۔

کہیں نہیں۔

بھولے کو اس واقعہ کا علم ہوا تو وہ ہنسنے لگا۔

جو خیال ہی خیال میں باہر کو ہو لیتے ہیں اُن کے آگے اصل میں کچھ بھی نہیں ہوتا۔

لیکن اُن کا جانا تو کسی کے پیچھے ہی ہوتا ہے۔

کس کے پیچھے؟ خیال تو ذہن میں ہی ہوتا ہے۔

بھولا کو اندھوں کے گھر میں کبھی باغبانی کی ڈیوٹی بھی ملی ہوتی تھی، اُس سے باغبانی تو نہ ہو پاتی مگر باتوں کی جڑیں اکھاڑنے بونے میں اُس کا مقابلہ کون کر سکتا ہے؟ ۔۔۔ ٹھیک ہی تو ہے۔ روپی واقعی وہی ہے جو میرے اندر ہی اندر اُس پر محبت بھری ٹکٹکی باندھے مزے سے بیٹھے رہو اور وہ بھاگ جاتی ہو تو وہیں اُس کے پیچھے ہو لو اور وہیں ڈھونڈتے رہو ۔۔۔ روپی کو تو گھر سے گئے ابھی چند ہی روز ہوتے ہیں مگر وہ لڑکی ۔۔۔ کیا نام تھا اُس کا؟ ۔۔۔ اب تو وہ میرا خیال ہی خیال ہو کر رہ گئی ہے۔ ایک زمانہ تھا مجھے لگتا تھا میں اندھا اس لیے ہوں کہ اُس سے محبت کرتا ہوں۔ میری عمر ابھی سترہ اٹھارہ برس کی تھی، میں اپنے گاؤں میں رہا کرتا تھا۔ وہ لڑکی سہ پہر کو عین اُس وقت ہمارے گھر چلی آتی جب میری بھابی بھائی کو کھانا پہنچانے کے لیے باہر گئی ہوتی اور میں گھر میں اکیلا ہوتا۔

میں نے سوچا اکیلے میں تمہارا دل گھبرا رہا ہوگا شرفو۔

ہاں، بہت گھبرا رہا تھا گڑیا ۔۔۔ ہاں، یاد آگیا میں اُسے گڑیا ہی کہا کرتا تھا ۔۔۔ تم نہ آجاتیں تو اڑ کر میں تمہارے پاس پہنچا ہوتا۔

کیا تمہارے دل کو پر لگے ہوتے ہیں؟

ہاں، گڑیا، ایک منٹ بھی آرام سے نہیں بیٹھتا۔ ہر وقت اُڑتا پھرتا ہے۔

پر تو میرے بھی لگے ہوتے ہیں رے اور بڑے رنگ برنگے ہیں، پر کیا فائدہ؟ تم دیکھ سکتے تو مجھے اڑان بھرتے دیکھ کر کتنے خوش ہوتے!

اُڑنے کے شوق میں آخر گڑیا نے اتنی اونچی اڑان بھری کہ میرا آس پاس اس کے سانسوں سے خالی ہو کر غیر آباد سپیدی کی لپیٹ میں آگیا۔ گڑیا تھی تو میری آنکھیں بڑی بشاشت سے سیاہی میں کھیل کھیل کر اور سیاہ، اور آباد ہو گئی تھیں مگر اُس کے جاتے ہی تاریکی کے یہ خندان اور شگفتہ مناظر سپید اور ویران دھند میں کھو گئے ۔۔۔ اُس کی شادی کے پہلے ہی سال میں نے سن لیا کہ اُس کے یہاں نابینا بچہ پیدا ہوا ہے اور ہو بہو مجھ پر گیا ہے۔ آپ مجھ پر ہنس دیں گے مگر مجھے یقین ہے کہ گڑیا کا اندھا بچہ میری ہی خواہش کے باعث پیدا ہوا۔ جو پوری ہونے سے رہ گئی، اور میری وہ خواہش اس قدر میری تھی کہ وہ اندھا بچہ بھی دراصل میں ہی تھا، اپنے خون میں خود آپ ہی ۔۔۔ گڑیا کی ممتا کو محسوس کر کر کے میں اُسے دیکھ سہ پاتا ہوں گا تو پہلی بار اُسی وقت مجھے اپنے اندھے پن کا کربناک احساس ہوا ہوگا اور میں بے اختیار رو رہا ہوں گا اور مجھے چپ کروانے کے لیے گڑیا نے اپنی دونوں چھاتیاں بیک وقت میرے منہ میں ٹھونس دی ہوں گی ۔۔۔ گڑیا میری محبوبہ ہی تھی مگر مجھے وہ ماں بھی معلوم ہوتی ہے۔ مجھے پتہ نہیں چلتا میں نے کس سے پیار کیا، ماں سے یا محبوبہ سے۔ جو نظر سے عاری نہ ہوں وہ لوگ شاید اس شش و پنج میں مبتلا نہیں ہوتے لیکن اندھوں کے ناطے تو شکلوں کی بجائے خوشبوؤں سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔

شرفو! ۔۔۔ روپی بھی مجھ سے یہی کہا کرتی ۔۔۔ دور سے تم کسی عاشق کی طرح میری طرف کھنچے چلے آتے ہو اور ۔۔۔ اور میرے قریب آپہنچتے ہو تو تمہارے ہونٹوں کی خاموش پھڑپھڑاہٹ میں مجھے دبی دبی آواز سنائی دیتی ہے ۔۔۔ ماں! ۔۔۔ ماں! ۔۔۔ جیسے تمہیں سوجھ ہی نہ رہا ہو میرے بیٹے ہو یا عاشق، میری طرف کھنچتے چلے آؤ یا رک جاؤ، پاپ کر رہے ہو یا محبت؟

میں کسی مجرم کی طرح سر جھکائے روپی کو سنتا رہتا، وہیں کا وہیں تھما رہتا۔

بولو شرفو! ۔۔۔ تمہارا گھماپن مجھے پاگل بنائے دیتا ہے۔

میں کیا بولتا؟ ۔۔۔ بھولا بن کے میں نے اُسے چپ چاپ اپنی طرف

کھینچ لیا اور بھولا کا بیٹا بن کے اُس سے اپنے کیے کی معافی مانگنا چاہی تو وہ غصے میں پاؤں پٹخ پٹخ کر چلی گئی ——— روپی! ——— روپی! ——— گڑیا! ———

میرے ذہن کی بوسیدہ چھت پر پانی برس رہا ہوتا ہے اور چھت کے نیچے یکساں وقفوں سے پانی کی بوندیں میرے دل پر ٹپ ٹپ گرتی رہتی ہیں اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اُن سے بچنے کے لیے کہاں جا پڑوں۔

سو جاؤ میرے لعل، لو میں تمہیں ایک بڑی میٹھی لوری سناتی ہوں۔

ہم ہم ہا——— ہم! ——— لاؤ شرفو کی ماں، شرفو کو اب میں اٹھاتے لیتا ہوں۔ تم تھک گئی ہو گی——— بھولا ایسی باتیں نہ کرے تو اُسے بھولا کون کہے؟——— ارے یار، ماں کی گود سے کب باہر آؤ گے؟ گول مول ٹوکریاں بنا کے انہیں اتنی خوبصورتی سے کھڑا کر لیتے ہو مگر آپ اپنے پیروں پر سیدھے کھڑے نہیں ہو سکتے۔

پیروں پر کھڑا ہونے کا فائدہ تو تبھی ہے بھولا، جب چلنا بھی ہو۔

مگر تمہیں چلنے سے کون روکتا ہے؟

تو آؤ، کہیں باہر نکل جائیں۔ اندر ہی اندر اب میرا دم گھٹتا ہے۔

چلو بابا کے کام پر مجھے کلکٹر کے آفس جانا ہے۔ تم بھی ساتھ آ جاؤ۔

بابا ہمارے اندھوں کے گھر کا سپرنٹنڈنٹ ہے۔ اُس کا کام انجام دینے کے بہانے ہم دونوں بڑے شوق سے گھر سے باہر آ گئے اور کھلے راستوں کی بھیڑ میں کھو کر میں اپنے سارے عذاب بھول گیا۔ بس یہی ایک چھوٹی سی فکر تھی کہ جلدی جلدی کلکٹر کے آفس جا پہنچیں۔

بھولا بھی مجھے خوش پا کر بہت خوش ہو رہا تھا۔

زندگی کو کچھ ایسے بنا لو میرے یار——— وہ مجھے سمجھانے لگا——— جیسے ہمیں کلکٹر کے آفس تک ہی تو جانا ہے، اتنی سی تو بات ہے۔

ہاں!——— میں نے اُسے شادماں لہجے میں جواب دیا۔

ہاتھ کھول کر چلو۔

کیوں؟——— میں نے یونہی پوچھا۔

مگر بھولا یونہی سی بات بھی پکڑ کر چھوڑ دے تو پرندہ پھڑ پھڑ اوپر اڑنے لگتا ہے۔

مٹھیاں بند بھی رکھیں سو رکھو، بیتی گھڑیاں رہ تھوڑا ہی جاتی ہیں۔

مگر یہ سب کہنے سننے ہی میں بھلا معلوم ہوتا ہے۔ بھولا نے مجھ سے کئی بار کہا ہے کہ وہ اپنے سارے پچھلے جنم بھی اسی جنم میں جی رہا ہے۔

ایک بار وہ مجھے بتانے لگا۔

میری چھوٹی بہن مجھ سے بڑا پیار کرتی تھی شرفو، لیکن ہمیشہ مجھ سے سہمی رہتی تھی۔

کیا میں کوئی بھوت ہوں گڑو؟

نہیں بھیا——— ہاں، بھیا! جہاں تم بیٹھے ہوتے ہو وہاں صرف تمہارے سانس لینے کی آواز سنائی دیتی ہے، تم کہیں نظر ہی نہیں آتے۔

اندھا دیکھ تو نہیں سکتا شرفو، لیکن غور کرو وہ دنوں ہیناؤں کو دکھتے بھی نہیں دیتا——— اور میرا تو یہ ہے کہ کوئی سگے سے سگا بھی ملنے آ جاتا ہے مجھے پہچان نہیں پاتا۔ کیسے پہچانے؟ میں تو اپنے پچھلے جنموں کا باسی ہوں۔ میرے اس جنم کو تو میرے اگلے جنم میں شروع ہونا ہے——— ہاں، شرفو، تم بھی میرے آنے والے جنم کے ساتھی ہو۔ میری یادداشت لمبی ہے۔ مجھے اپنے سارے کے سارے پرانے جنموں کے مرے کھپے لوگوں سے ہی محسوس ہوتے ہیں۔ وہ مجھے یاد آتے رہتے ہیں مگر میرے ساتھ نہیں ہوتے——— بھولا کی باتیں ہمیں کتنا ہی اداس کیوں کر دیں وہ انہیں ہنستے کھیلتے ہی سناتا ہے——— آج میں نے کھانے پر تمہاری آدھی کھیر اُڑا لی تھی شرفو؟

مجھے معلوم ہے۔

تو پھر تم بولے کیوں نہیں اُس وقت؟ ہو نہ ہو تم ضرور کسی پچھلے جنم سے میرے ساتھ چلے آ رہے ہو۔

کیا تمہیں واقعی اپنے سارے پچھلے جنم یاد ہیں؟

ہاں، صاف صاف یاد ہیں۔

سگریٹ کا کش لینے کے لیے میں انجانے میں اس کا جلتا ہوا سرا ہونٹوں کی طرف لے آیا

تم اپنے پچھلے جنم میں بھی اندھے تھے بھولا؟

ہاں، شرفو، میں اپنے ہر جنم میں اندھا تھا——— پچھلے جنم میں میرا نام منگو نابینا تھا لیکن چونکہ میں اور میرا گدھا اپنے خطرناک پہاڑی علاقے میں بہت چوکس ہو کر سامان ڈھویا کرتے تھے اس لیے سب لوگ مجھے آنکھوں والا کہہ کر بلانے لگے۔ آدھا سامان میں اپنی پیٹھ پر ڈال لیتا اور آدھا گدھے کی پیٹھ پر اور پھر گدھے کی دُم پکڑے مزے سے پہاڑ کے اوپر یا نیچے کی طرف ہو لیتا۔ راستے کے دونوں طرف بڑی بڑی کھائیاں ہوتیں مگر اپنے گدھے کی رہبری میں میں نے دھوکا نہ کھایا۔ میرے گدھے سے کبھی غفلت ہو بھی جاتی ——— تو پہاڑ خود آگے بڑھ کر مجھے گرنے سے بچا لیتا——— آنکھوں والے، اندر کی آنکھوں سے کام لو! میں اور فالتو——— فالتو میرے گدھے کا نام تھا——— سال میں چھ مہینے دن رات وہاں سیر سپاٹے پر آتے ہوتے لوگوں کا سامان ڈھوتے رہتے اور باقی چھ مہینے برف ہو کر پڑے رہتے———

کیا تم نے بڑی لمبی عمر بھوگ کر جان دی بھولا؟

لمبی کیا؟ پر جتنی بھی تھی بڑی لمبی معلوم ہوتی تھی——— وہ شام ہو گئی

(باقی صفحہ ۳ پر)

عرفان سعد بلخی

ئی بجلی ان صحراؤں میں گھٹا روشن کرے
اے اندھیری بستیو، تم کو خدا روشن کرے
تے ہونٹوں پر کھُلے معصوم لفظوں کی کتاب
اور ماتھے پر کوئی حرفِ دُعا روشن کرے
رد چہروں پر بھی چمکے سُرخ جذبوں کی دھنک
سانولے ہاتھوں کو بھی رنگِ حنا روشن کرے
ے لڑکا شہر کی رونق میں سب کچھ بھول جائے
ایک بُڑھیا روز چوکھٹ پر دیا روشن کرے
میں خاشاک ہوس بھی ہے وفا کی شمع بھی
دیکھنا ہے کہ اس کا قُرب کیا روشن کرے
سماں کی طرح میں سینہ کُشادہ ہوں ابھی
زخم کا مہتاب پھر دستِ جفا روشن کرے
فلوں کی آگ ہو یا جُگنوؤں کی روشنی
کوئی تو آئے جو یہ ظلمت سرا روشن کرے
اس جنگل پہ اُبھرے چاند تیرے نام کا
یا مرا ہی لفظ میرا راستہ روشن کرے

پریس انفارمیشن بیورو، لال باغ، لکھنؤ (یوپی)

احمد نسیم

شجرِ درد کا ہر پھول کھِلا رہنے دو
دشتِ تنہائی میں اک آبلہ پا رہنے دو
کیا خبر لوٹ کے کب آئے وہ جانے والا
دِل کا دروازۂ بے خواب کھُلا رہنے دو
چونک اُٹھے وہ کبھی سُن کے اچانک شاید
مجھ کو بھٹکی ہوئی جنگل کی صدا رہنے دو
تیز کرچوں سے لہو رنگ ہیں پلکیں اپنی
میری آنکھوں سے بھی خوابوں کو جُدا رہنے دو
سب در و بام عمارت کے گرا دو لیکن
کوئی جلتا ہوا بستی کا دیا رہنے دو
سُن کے رو دے گا گئی رُت کا فسانہ وہ بھی
پردۂ ساز میں نغموں کو چھُپا رہنے دو
اس کو پلکوں کی نمی سے بھی شکایت ہے نسیم
اپنے احساس کو بے صوت و صدا رہنے دو

● لکچرار شعبۂ اردو کریم سٹی کالج جمشید پور ۸۳۱۰۰۱

بدیع الزماں خاور

بے خطر کود پڑے پانی میں
ہم تھے مجبور، ملے پانی میں
سارے اشجار لبِ ساحل تھے
پھل جو ٹوٹے وہ گرے پانی میں
چاند جب جھیل کے اندر اُترا
دیپ سے جلنے لگے پانی میں
کیا خبر ان کو، زمیں تھی کیسی؟
وہ جو تا عمر رہے پانی میں
شور تھا جن کی تنومندی کا
وہی اشجار بہے پانی میں
سب کو حیرت ہے کہ ننھے پودے
کیسے محفوظ رہے پانی میں
ساتھ اگر دیں نہ ہوائیں خاور
کوئی کشتی نہ چلے پانی میں

● ڈم ٹمکر کوارٹرز مغلن گرٹر روڈ پوسٹ دابھول ۴۱۵۷۱۲
(مہاراشٹر)

حنیف کیفی

اُردو کی ذولسانی لُغات

زبان دانی اور زبان فہمی لغت نویسی کے بنیادی مطالبات ہیں۔ زبان دانی کا انحصار محض اس بات پر نہیں ہے کہ کوئی شخص کسی زبان میں استعمال کیے جانے والے الفاظ کے صحیح تلفظ، املا اور رسم الخط سے واقف ہو اور نہ زبان فہمی کا مطلب صرف یہ ہے کہ وہ مختلف الفاظ کے معنی و مفہوم کو سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہو۔ زبان دانی و زبان فہمی سے مراد یہ ہے کہ زبان کے خارجی و داخلی، ظاہری و معنوی تمام پہلوؤں سے واقفیت و آگاہی حاصل ہو کیسی زبان کے خارجی یا ظاہری پہلو سے مراد زبان کی وہ خصوصیات ہیں جو اس کی شکل و صورت کا تعین کرتی ہیں اور اس کی ترتیب و تنظیم، صحت و درستی کا معیار مقرر کرتی ہیں۔ بالفاظ دیگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ زبان کے خارجی پہلو کا تعلق اس کے رسم الخط، املا، قواعد اور تلفظ سے ہے۔ زبان کے داخلی و معنوی پہلو میں جو خصوصیات شامل ہیں وہ ہیں الفاظ کے مختلف معانی، ان معانی کے اعتبار سے ان کا برمحل اور حسب موقع استعمال، خیالات کو ایک مخصوص انداز میں پیش کرنے کا فن، اپنی بات سے دوسروں کو متاثر کرنے کا آرٹ یعنی معنی و مطلب کی وہ تمام نزاکتیں جو الفاظ کے ظاہری پردوں میں پوشیدہ ہیں، مفہوم و مدعا کی وہ تمام باریکیاں جو ظاہری علامات یا Symbols کی تہ میں چھپی ہوتی ہیں۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ زبان کے خارجی پہلو کا تعلق اس کے جسم اور لباس سے ہے جب کہ اس کے داخلی پہلو کا تعلق اس کی روح اور مزاج سے ہے۔ شخصیت کو مکمل طور پر سمجھنے کے لیے جسم کے خطوط کو جاننا اور لباس کے انداز کو سمجھنا جتنا ضروری ہے اس سے کہیں زیادہ ضروری روح کی گہرائیوں تک پہنچنا اور مزاج کی تہوں کو الٹنا ہے۔ زبان دانی و زبان فہمی اس وقت تک ناقص و نامکمل رہے گی جب تک ان دونوں پہلوؤں پر گہری نظر نہ ہوگی۔ اس اعتبار سے کسی زبان کا علم اتنی وسعت اختیار کر لیتا ہے کہ اس کے دائرے میں اس کے ادب کا علم بھی آ جاتا ہے۔ زبان کا صحیح علم حاصل کرنے کے لیے اس کے تاریخی ارتقا اور تہذیبی پس منظر کا جاننا بھی ضروری ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ کسی زبان کی تعمیر و تشکیل میں جہاں سماجی حالات، تہذیبی روایات اور تاریخی تبدیلیوں کا ہاتھ ہوتا ہے، وہیں دوسری زبانوں کے اثرات کا دخل بھی ہوتا ہے۔ ہر زبان دوسری زبانوں کے میل جول اور تعلق سے بنتی بھی ہے اور بڑھتی بھی ہے۔ زبانوں کے اس میل جول کی بنا پر ایک زبان میں دوسری زبانوں کے نہ صرف بے شمار الفاظ غیر محسوس طریقے پر شامل ہوتے رہتے ہیں بلکہ ان زبانوں کی بہت سی تہذیبی روایات بھی دبے پاؤں داخل ہو جاتی ہیں۔ اس طرح زبان کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے ایک زبان کے علم کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں اور ان کی تہذیبی روایات کا علم بھی براہ راست یا بالواسطہ طور پر ناگزیر ہوتا ہے۔

ایک کامیاب لغت نویس کے لیے زبان کا یہ وسیع علم نہ صرف ضروری بلکہ لازمی ہے۔ اس کا کام محض ایک Compiler کا نہیں ہے بلکہ وہ بیک وقت ایک ماہر لسانیات، ایک ناقد اور ایک محقق کے فرائض بھی انجام دیتا ہے۔ اس کا کام صرف لفظوں کے مترادفات Equivalents فراہم کر دینا نہیں بلکہ ان مترادفات کے باریک اختلافات ظاہر کرنا، ان اختلافات کی روشنی میں الفاظ کا محل استعمال بتانا، الفاظ کے لغوی Literal اور مجازی Figurative معنی کی تشریح کرنا، لفظوں کی اصل کا پتہ لگانا، ان کے صحیح تلفظ کا تعین نیز معیاری اور عوامی تلفظ کی نشان دہی کرنا، الفاظ کے مختلف مرکبات و مشتقات Compounds and Derivatives اور ان کے معانی کا بیان کرنا، الفاظ کی قواعدی صورتوں Grammatical Forms اور ان کے پیش نظر ان الفاظ کے معنوی تغیرات Semantic Variations کو ظاہر کرنا، الفاظ اور ان کے معانی کے سلسلے میں غلط اور صحیح کا فیصلہ کرنا، متروک Obsolete اور مروج Current الفاظ کی وضاحت کرنا جیسی ضرورتیں بھی اس کے فرائض میں داخل ہیں۔ ایک ذولسانی لغت Bilingual Dictionary کے مرتب کی ذمہ داریوں کا دائرہ اور زیادہ وسیع ہو جاتا ہے۔ اس کے لیے براہ راست کم سے کم دو زبانوں کا علم ضروری ہے۔ اس کی اولین اور بنیادی ضرورت ہی یہ ہوتی ہے کہ وہ ایک زبان کے الفاظ کا ترجمہ و تشریح دوسری زبان کے الفاظ میں کرے۔ اس کے لیے یہ لازم ہوتا ہے کہ نہ صرف بیک وقت دو زبانوں کے مزاج اور ان میں استعمال ہونے والے الفاظ کی روح تک اس کی نظر کی رسائی ہو بلکہ ان کے تاریخی ارتقا سے بھی اسے واقفیت حاصل ہو۔ ایک زبان کے الفاظ کو دوسری زبان کے الفاظ میں منتقل کرنے کے عمل کو کامیاب اور بامعنی بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ نقل مکانی کے تمام مسائل و مراحل سے واقفیت کے ساتھ تغیر زمانی کے تمام مدارج و منازل سے آگاہی بھی حاصل ہو۔ ورنہ ایک زبان کا مزاج، جس کی تشکیل صدیوں کی روایات نے کی ہے دوسری زبان میں منتقل نہ ہو سکے گا۔ ایک زبان کے

● [illegible]، بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی
[illegible] نئی دہلی

الفاظ، بالخصوص ان کی ترکیبی Synthetic اور محاوراتی Idiomatic شکلوں کی دوسری زبان میں منتقلی کے عمل میں سب سے بڑی دشواری زبانوں کی مزاج شناسی اور ان کی تہذیبی اقدار سے آگاہی ہے۔ زبانوں کے مزاج اور ان کے تہذیبی پس منظر سے ناواقفیت ہی کا نتیجہ ہے کہ اکثر و بیشتر ایک زبان کے الفاظ کو دوسری زبان کے الفاظ میں منتقل کرنے کا عمل ایسی صورت اختیار کر لیتا ہے جس سے اصل زبان کی روح بری طرح مجروح ہو جاتی ہے۔ یہ ایک ایسا کانٹوں بھرا راستہ ہے جس پر ایک ذولسانی لغت نویس Bilingual Lexicographer کو بڑی احتیاط سے قدم رکھنا اور بہت سنبھل سنبھل کر چلنا ہوتا ہے۔

ممکن ہے کہ لغت نویسی کے اصولوں کے بیان پر مبنی یہ تمہید بہ ظاہر کسی قدر طویل اور شاید غیر ضروری اور اصل موضوع سے ہٹی ہوئی بھی معلوم ہو لیکن ان اصولوں کا بیان اس لیے ضروری ہے کہ اس سے موضوع کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور ان ہی کی روشنی میں زیر بحث لغات کی خوبیوں اور خامیوں کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ اردو میں آج اچھی اور بری یک لسانی و ذولسانی Unilingual and Bilingual بہت سی لغتیں موجود ہیں لیکن اردو میں لغت نویسی کے اس کام کی ابتدا کا سہرا اردو کے عالموں کے بجائے مغربی خصوصاً انگریزی علما کے سر ہے جیسا کہ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے "لغت کبیر اردو" کے مقدمے میں لکھا ہے: "اردو میں لغت پر سب سے پہلے اہل یورپ اور خاص کر انگریزوں نے کتابیں لکھیں۔ یہ خصوصیت کچھ اردو ہی کے ساتھ نہیں، ہندوستان کی تقریباً تمام جدید زبانوں کی لغات اول غیروں نے ہی لکھیں۔ البتہ اردو پر ان کی نظرِ التفات زیادہ رہی ہے۔" اس کے اسباب کی تفصیل میں جانے کا یہاں موقع نہیں لیکن اس حقیقت کا اعتراف ضروری ہے کہ ان مغربی عالموں نے اس سلسلے میں بڑی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں اور لغات کا جو وسیع و وقیع سرمایہ اپنی یادگار کے طور پر چھوڑا ہے اس نے بعد کے لغت نویسوں کے لیے بھی مشعل راہ کا کام دیا ہے اور جن لوگوں کے لیے یہ لغات لکھی گئی ہیں نہ صرف ان کے لیے بلکہ جن زبانوں کے الفاظ کی یہ لغات تیار کی گئی ہیں خود ان کے حامیوں اور عالموں دونوں کے لیے رہبر و رہنما کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس قسم کی لغت کی کتابیں جو مغربی علما نے ترتیب دیں ان میں سے یہ قابل ذکر ہیں۔ جان جیشوا کٹیلر، جارج ہیڈلی، جے فرگسن، ڈاکٹر گلکرسٹ، جان شیکسپیر، ڈاکٹر ڈنکن فوربس، ڈاکٹر فیلن اور جان پلیٹس۔ ان سب میں دو کو امتیازی حیثیت حاصل ہے اور یہ ہیں فیلن اور پلیٹس کی لغات۔ ان دونوں لغتوں کی امتیازی خصوصیات پر مولوی عبدالحق نے جو روشنی ڈالی ہے اس سے ان کا فرق واضح ہو جاتا ہے اور یہ بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ پلیٹس کی ڈکشنری کو فیلن کی ڈکشنری پر جس کی اپنی ترجیحی خصوصیات ہیں، کیوں سبقت اور فوقیت حاصل ہے۔ مولوی عبدالحق ان لغات کے بارے میں "لغت کبیر اردو" کے مقدمے میں اس طرح رقمطراز ہیں۔

"فالن نے یہ خاص اہتمام کیا ہے کہ الفاظ اور محاورات کے استعمال کی سند میں عوام کے گیت، زبان زد ضرب الامثال اور فقرے اور اساتذہ کے اشعار نقل کیے ہیں لیکن اردو کے ادبی الفاظ کی طرف سے بے اعتنائی برتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ عربی فارسی الفاظ جو اردو زبان و ادب میں عام طور پر مروج ہیں، بہت کم پائے جاتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ایسے الفاظ محض فضیلت مآبی جتانے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ زبان میں (خواہ وہ کوئی زبان ہو) ادبی الفاظ خاص اہمیت رکھتے ہیں اور کوئی لغت ان سے بے نیاز نہیں ہو سکتی۔ اگرچہ ہر لفظ کے ساتھ عربی، فارسی، ہندی، سنسکرت کی علامت لگی ہوتی ہے، لیکن لفظ کی اصل اور اشتقاق کی تحقیق میں کوئی خاص اہتمام نہیں کیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ کتاب کی ترتیب و تالیف میں غیر معمولی محنت اور کوشش کی ہے اور ڈاکٹر فالن کی تربیت کا یہ کچھ کم فیض نہیں ہے کہ ان کے ساتھ جس قدر اصحاب بطور مددگار کے کام کرتے تھے ان سب نے کوئی نہ کوئی کتاب لغت یا زبان پر لکھ ڈالی ہے۔ پلیٹس کی لغات فالن کی کتاب کے مقابلے میں بہت زیادہ ضخیم اور وسیع ہے۔ اس نے اردو کے ساتھ ٹھیٹ ہندی کے لفظ بھی لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ فارسی، عربی، سنسکرت کے الفاظ کا بھی بہت کافی ذخیرہ ہے جن میں سے اکثر اردو زبان میں مروج نہیں۔ الفاظ کے معنوں میں زیادہ تفصیل اور وسعت پائی جاتی ہے اور اکثر الفاظ کے مآخذ اور اصل کا بھی اشارہ کیا ہے لیکن معنی اور استعمال کے لیے سند نہیں دی۔ ہر اصل لفظ پہلے اردو رسم خط میں ہے اس کے آگے ناگری رسم خط میں اور اس کے بعد رومن حروف میں۔ ان دونوں فاضل لغت نویسوں کی محنت اور کاوش قابل داد ہے۔"

مولوی عبدالحق کی اس مختصر مگر جامع رائے سے نہ صرف دونوں لغات کی امتیازی خصوصیات کا علم ہوتا ہے بلکہ یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ پلیٹس کی ڈکشنری کو فیلن کی ڈکشنری پر کیوں برتری حاصل ہے۔ دیکھا جائے تو یہ ڈکشنری پہلے کی تمام لغات کا تکملہ Perfection ہے۔ پلیٹس نے پہلے کی تمام قابل ذکر لغت کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے۔ اس مختصر دیباچے میں اپنے پیش رووں سے استفادے کا اعتراف بھی کیا ہے، تاہم اس بات کی وضاحت کر دی ہے کہ اس نے آنکھیں بند کر کے ان کا اتباع نہیں کیا ہے اور یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس نے اپنے پیش رووں کے کام پر جو وسیع و کثیر اضافے کیے ہیں ان کی بدولت اس کی لغت بہت بڑی حد تک "ایک نئی کتاب" تصور کی جا سکتی ہے۔ اور اس طرح یہ لغت ایک "تالیفِ محض" (mere Compilation) سے برتر حیثیت کی حامل نظر آئے گی۔ اس سلسلے میں اس نے اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ اسے ہندوستان میں اپنے طویل قیام اور اس کے دوران اردو ہندی کی نثر و نظم کی کتابوں اور اخباروں کے مطالعے اور عوام سے رابطے کے ذریعے ان کی بول چال کی زبان سے واقفیت نے بڑی مدد پہنچائی۔ اس واقفیت کی بدولت نہ صرف وہ اپنے پیش رووں کی لغات میں دیے گئے الفاظ کی تصدیق کرنے بلکہ ان میں ہزارہا نئے الفاظ اور فقروں کا اضافہ کرنے نیز الفاظ کے مزید معانی فراہم کرنے کے قابل

ہوسکا۔ اپنی ان خصوصیات کی بدولت پلیٹس کی لغت جامع اور معتبر بن گئی ہے۔

پلیٹس نے لغت سازی کے سلسلے میں جن باتوں کا ذکر کیا ہے، ان سے ان اصولوں میں سے بیشتر کی تائید و توثیق ہوتی ہے جو اس مضمون کے شروع میں بیان کیے گئے۔ پلیٹس کی ان کاوشوں کے نتیجے میں جو کام انجام پایا اس کی وہ چار "امتیازی خصوصیات" بتاتا ہے۔

۱۔ "الفاظ کی اشتقاقیات (Etymology of words) کے لیے مخصوص کی گئی جگہ۔"

۲۔ "ایسے الفاظ جن کا تلفظ یکساں لیکن اشتقاق مختلف ہے، ان کی اشتقاقیات کے اعتبار سے الگ الگ پیراگرافوں میں ترتیب۔"

۳۔ ایسے لاحقہ (Postposition) کی نشان دہی جس کے ذریعہ کوئی بالواسطہ متعدی فعل یا فعل لازم اپنے مفعول کو متاثر کرتا ہے، نیز معنی کی اس تبدیلی کی وضاحت جو کسی فعل میں مختلف لاحقوں کے استعمال سے اکثر و بیشتر پیدا ہوا کرتی ہے۔"

۴۔ "ایسے کثیر التعداد الفاظ کی شمولیت جو ادبی زبان میں نہیں پائے جاتے۔"

پلیٹس کے دعوے کی صداقت لغت کے صفحات پر ایک سرسری نظر ڈالنے ہی سے ثابت ہو جاتی ہے اور لغت کی ترتیب و تشکیل میں جن اصول و طریق کار کو اس نے پیش نظر رکھا ہے ان کی تصدیق مختلف اندراجات کے مطالعے سے ہو جاتی ہے اور لغت کی جن امتیازی خصوصیات کی طرف اس نے اشارہ کیا ہے وہ اپنی پہچان خود کرا لیتی ہیں۔ لغت پر ایک نظر ڈالنے سے اس کے جو مختلف نقوش ابھرتے ہیں ان کو حسب موقع مثالوں کے ذریعے ان نکات کے تحت واضح کیا جاسکتا ہے۔

(۱) عام لغات کے برعکس اندراجات کے اصل کی نشان دہی اندراج سے قبل اس زبان کے نام کے پہلے حرف کے ذریعے سے کی گئی ہے، جیسے فارسی الاصل لفظ کے لیے "P" عربی لفظ کے لیے "A" اور ہندی لفظ کے لیے "H" کی علامت استعمال کی گئی ہے اور اس کے بعد لفظ کا اندراج کیا گیا ہے۔ اندراج کے شروع میں لفظ کی اصل زبان کی جانب اشارہ کرنے کے باوجود، اس لفظ کا اس زبان میں تلفظ دینے کے بعد اس کی مختصر تاریخی سرگزشت بھی ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یعنی ایسے الفاظ جن کی اصل تو کچھ اور ہے لیکن جو کسی دوسری زبان کے توسط سے اپنی شکل بدل کر اردو میں داخل ہو گئے ہیں۔ ان کے مادے (Root) کو بھی بتایا گیا ہے اور اس کے اشتقاق (derivation) پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جس سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ وہ مخصوص لفظ کس شکل میں کس زبان سے متعلق ہے اور کس زبان کے توسط سے اردو میں داخل ہوا ہے۔ اس طرح وہ تمام عربی الاصل الفاظ جو فارسی کے توسط سے اردو میں آتے ہیں انہیں فارسی ہی کے تحت درج کیا گیا ہے لیکن اس کے عربی مادے اور اشتقاق کو بھی واضح کر دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر لفظ "حسرت" فارسی اندراج کے طور پر دیا گیا ہے لیکن توضیح میں اس کی اصل پر روشنی اس طرح ڈالی گئی ہے "fr. Arabic حسرة inf. n. of to grieve for" حسر۔ اس کے بعد لفظ حسرت کے انگریزی مترادفات (Equivalents) دیے گئے ہیں۔ اسی طرح سنسکرت الاصل دخیل الفاظ کی فارسی یا پراکرت شکل کو پیش کیا گیا ہے اور اصوات و املا کی تبدیلیوں کو بھی ظاہر کیا گیا ہے۔

(۲) ہندی الاصل الفاظ کا دیوناگری املا بھی دیا گیا ہے۔

(۳) الفاظ کا تلفظ رومن رسم الخط میں دیا گیا ہے اور تلفظ کی مختلف صورتوں کو بھی ظاہر کیا گیا ہے۔ یعنی سب سے پہلے لفظ کا معیاری (Standard) تلفظ دیا گیا ہے اس کے بعد اس کا عوامی تلفظ جس کے لیے وہ "Vulgar" کا لفظ استعمال کرتا ہے، دیا گیا ہے۔ حسب ضرورت تلفظ کی بگڑی ہوئی یا بازاری شکل (Corrupt Pronunciation) بھی دی گئی ہے جیسے "موسم" اور "سمت" کا عوامی تلفظ "موسَم" اور "سمت" اور "رمضان" کا عوامی تلفظ "رَمضان" اور بگڑا ہوا تلفظ "رمجان"۔ آج کے لسانیاتی اصولوں کی روشنی میں تلفظ کے لیے (Vulgar) اور (Corrupt) جیسے الفاظ کی تخصیص کوئی اہمیت نہیں رکھتی اور تلفظ کی ان مختلف شکلوں کو Variations یا (Dialectal variations) کے تحت دیا جاتا گا لیکن آج سے تقریباً ایک صدی قبل کی صورت حال پر نظر کی جائے تو پلیٹس کی محنت اور طریق کار کی داد دیے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔

(۴) ایسے الفاظ جن کا املا یکساں ہے مگر تلفظ مختلف ہے اور اختلاف تلفظ کی وجہ سے معنی بھی بدل جاتے ہیں انہیں الگ الگ اندراجات کے طور پر پیش کیا گیا ہے مثلاً "مُظہِر" "مُظہَر" اور "مَظہَر" کا املا ایک ہی ہے مگر ان کی قواعدی نوعیت، تلفظ اور معنی میں اختلاف ہے۔ "مُظہِر" فاعل ہے اس کے معنی ہیں ظاہر کرنے والا۔ "مُظہَر" مفعول ہے اس کے معنی ہیں ظاہر کیا ہوا اور "مَظہَر" ظرف ہے اور اس کے معنی ہیں ظاہر ہونے کی جگہ۔ ان کو الگ الگ اندراجات کے طور پر دیا گیا ہے۔

(۵) اندراجات کی ترتیب میں یہ طریق کار اختیار کیا گیا ہے کہ صرف مفردات (Single words) یا لاحقوں (Suffixes) سے بننے والے مرکبات (Compounds) کو بنیادی اندراج کی حیثیت دی گئی ہے جبکہ ان مفردات سے بننے والے دیگر مرکبات کو ذیلی اندراج کے طور پر ترتیب دیا گیا ہے۔ سابقوں (Prefixes) کے ساتھ معاملہ اس کے برعکس ہے ایسی صورت میں سابقے (Prefixes) کو بنیادی اندراج اور اس سے بننے والے مرکبات کو ذیلی اندراج کے طور پر دیا گیا ہے۔ یہ بات دو مثالوں سے واضح ہو جائے گی "زمین" اور اس کے لاحقوں سے بننے والے مرکبات جیسے "زمین دار" "زمین دان" "زمین داری" "زمینی" وغیرہ کو مفرد اندراجات کی حیثیت دی گئی ہے اور "زمین" سے بننے والے مرکبات مثلاً "زمین دوز" "زمین گیر" "زمین قند" یا "زمین" سے بننے والے محاورات اور محاوراتی فقرے جیسے "زمین بوس ہونا" "زمین آسمان کا فرق" "زمین میں گڑ جانا" "زمین میں سما جانا" وغیرہ اصل اندراج "زمین" کے ذیلی اندراجات کے طور پر دیے گئے ہیں لیکن سابقوں (Prefixes) جیسے "بے" معنی "بغیر" تو اصل اندراج اور اس سے بننے والے مرکبات جیسے "بے آب" "بے رنگ" "بے کیف" وغیرہ کو ذیلی اندراجات کے تحت پیش

کیا گیا ہے۔ صرف اندراجات کو اردو رسم الخط میں اور ذیلی اندراجات کو رومن رسم الخط میں پیش کیا گیا ہے۔

(۶) الفاظ کی قواعدی نوعیت بھی ظاہر کی گئی ہے اور ان کی ادبی حیثیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

(۷) ان تمام خصوصیات کے ساتھ ایک (Bilingual Dictionary) کی حیثیت سے پلیٹس کی ڈکشنری کی ممتاز ترین خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اصل زبان کے الفاظ کے انگریزی مترادفات دینے میں معنی کے زیادہ سے زیادہ (Shades) پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے مثلاً "آب" کے مختلف معانی "پانی" "چمک" "دھار" وغیرہ دیے گئے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ لفظ کی ترکیبی اور محاوراتی شکلوں کے معانی بھی حسب ضرورت مترادفات یا تشریحات کی شکل میں دیے گئے ہیں اور ان میں اصل زبان کی روح اور مزاج کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو عموماً کامیاب ہے اس سلسلے میں ایک خاص بات یہ قابل ذکر ہے کہ حسب موقع الفاظ کی معنوی توسیع اور معنوی تغیر کو بھی پیش کیا گیا ہے مثلاً "صلوٰۃ" کے معنی "نماز" ہیں لیکن اس کی جمع "صلوات" کے معنی اردو میں آکر بالکل بدل جاتے ہیں اور "صلواتیں سنانا" "گالیاں دینے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے یا "خوب" کے معنی "اچھا" ہیں اور واحد شکل میں اس کے معنی "خوبصورت" کبھی نہیں ہوتے مگر "خوب" کی جمع "خوبان" کے معنی "خوبصورت لوگ" "معشوق" ہوتے ہیں۔ زیر بحث لغت میں اس قسم کی معنوی توسیع و تغیر کی نشان دہی کر دی گئی ہے۔ اس سلسلے کی ایک دلچسپ مثال "لن ترانی" ہے عربی کا یہ فقرہ بغیر کسی لفظی تغیر کے اردو میں آکر بالکل مختلف معنی اختیار کر لیتا ہے اور اصل معنی "تو نہیں دیکھ سکتا" اردو میں آکر "ڈینگیں مارنا" میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ پلیٹس نے اس عربی فقرے کی جو تشریح کی ہے اس میں اس پورے واقعے پر روشنی ڈالی ہے جس سے یہ متعلق ہے یعنی حضرت موسیٰ نے جب خدا کا جلوہ دیکھنے کی درخواست "رب ارنی" کہہ کر کی تو خدا کی طرف سے جواب "لن ترانی" ملا۔ یہی نہیں بلکہ قرآن پاک کی اس سورۃ کا حوالہ بھی دیا گیا ہے اور اس سورۃ کی وہ پوری آیت بھی نقل کی ہے جس سے یہ فقرہ لیا گیا ہے۔ اس تشریح کے بعد اس فقرے کا وہ معنوی تغیر پیش کیا گیا ہے اور جو اردو سے مخصوص ہے اس قسم کی تشریحات اردو زبان کی اکثر مبسوط یک لسانی لغات (Unilingual Dictionaries) میں بھی نہیں پائی جاتیں۔

پلیٹس کی لغت کی یہ تمام خصوصیات اور لغت سازی کے وہ سائنٹفک اصول جن کی روشنی میں اس لغت کی ترتیب و تشکیل عمل میں آئی ہے نہ صرف انگریزی کے زباں دانوں کے لیے بلکہ اردو کے اہل زبان کے لیے بھی ایک نمونہ ہیں لیکن افسوس ناک بات یہ ہے کہ اس نمونے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی گئی اور آج تقریباً سو سال گذر جانے کے بعد بھی، جبکہ خود اس ڈکشنری پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس کی جانے لگی ہے یہ ڈکشنری ایک منفرد حیثیت کی مالک ہے۔ آج کی لسانی ضروریات اور تقاضے پہلے سے بہت زیادہ بڑھ گئے ہیں آج ضرورت اس بات کی ہے کہ پلیٹس نے جو راہ دکھائی تھی اس پر اور آگے بڑھا جائے اور نئی نئی راہیں نکالی جائیں۔ نہ صرف اردو، انگریزی اور انگریزی اردو بلکہ اردو ہندی، ہندی اردو اور اسی طرح کی دوسری ذو لسانی لغات تیار کی جائیں اور پوری سنجیدگی کے ساتھ وسیع پیمانے پر اور مبسوط شکل میں تیار کی جائیں۔ اس سلسلے میں اردو میں جو تھوڑی بہت کوشش کی گئی ہے وہ بڑی مایوس کن ہے۔ رام نواتن لال نے کاروباری ضروریات کے تحت جو انگریزی اردو اور اردو انگریزی لغات Students' Practical Dictionary کے نام سے شائع کیں وہ صرف معمولی طلبہ ہی کو مطمئن کر سکتی ہیں اور پھر ان کی اردو انگریزی لغت پلیٹس ہی کی لغت کا چربہ ہے۔ مولوی عبدالحق کی انگریزی اردو ڈکشنری اپنی تمام تفصیلی معلومات کے باوجود لغت کی چند بنیادی ضرورتوں جیسے تلفظ کی نشان دہی کی محتاج ہے۔ اس لیے اس کی از سر نو ترتیب کی ضرورت ہے۔ یاد ش بخیر ایک زمانے میں پنڈت جواہر لال نہرو کے ایما پر دہلی یونیورسٹی میں اردو ہندی لغت کا کام شروع ہوا تھا مگر اس کی تکمیل کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا اور اس کی پہلی جلد تک دیکھنا نصیب نہ ہو سکا۔ انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام مرتب اور شائع ہونے والی اردو ہندی ڈکشنری رہنمائی کے بجائے گمراہی کا سامان زیادہ پیدا کرتی ہے اور اگر پلیٹس کی ڈکشنری لغت نویسی کا روشن پہلو پیش کرتی ہے تو یہ ڈکشنری تاریک پہلو سامنے لاتی ہے۔ اس لغت کے متعلق صحیح رائے تو وہ علما ہی دے سکتے ہیں جو اردو سے واقف ہونے کے ساتھ ہندی زبان کے بھی ماہر ہیں لیکن اردو کا ایک عام طالب علم بھی اس کے نقائص اور خامیوں پر انگلی رکھ سکتا ہے طوالت کے خوف سے مثالوں سے گریز کیا جاتا ہے، حقیقت کے جویا خود تلاش کر سکتے ہیں۔ اب اردو دنیا نے ترقی اردو بورڈ کے زیر اہتمام ترتیب دی جانے والی انگریزی اردو لغت سے بڑی توقعات وابستہ کر رکھی ہیں۔ خدا کرے کہ یہ لغت ان توقعات کے مطابق نکلے۔

بقیہ **ملاحظات**

پریم چند سیمینار

پریم چند قومی کمیٹی کے اہتمام میں پریم چند صدی تقریبات کے سلسلے میں ۱۶ اور ۱۷ مئی کو نئی دہلی میں ایک دو روزہ سیمینار کا انعقاد ہوا۔ سیمینار کا افتتاح شری اندر کمار گجرال نے فرمایا۔ اس موقع پر پبلی کیشنز ڈویژن کی شائع کردہ کتاب "پریم چند فکر و فن" کی رسم اجرا بھی عمل میں آئی۔ اس کتاب کے مصنف ڈاکٹر قمر رئیس ہیں۔

پریم چند سے متعلق ڈاکٹر گوئنکا کی کتاب کی رسم اجرا بھی اس موقع پر ادا کی گئی۔ یہ رسم پریم چند کے صاحبزادے جناب امرت رائے نے انجام دی۔

افتتاحیہ تقریب میں، شری امرت رائے، ڈاکٹر شکیل الرحمٰن، ڈاکٹر وجیندر سناتک اور جینیندر کمار نے پریم چند کی شخصیت اور فکر و فن پر سیر حاصل تقریریں کیں۔

بعد کی نشستوں میں ہندی، اردو اور پنجابی کے جن ادیبوں نے مقالے پڑھے اور بحث و مباحثے میں حصہ لیا۔ ان میں سے اختر ناظر، گیتا، بھاکر ماچوے، ڈاکٹر پربھی بھگو، لطف الرحمٰن اور ڈاکٹر [illegible] خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

شروَن کمار ورما

جھوٹا سچ

پلیٹ فارم کی بھیڑ میں اچانک اُسے یہ تکلیف دہ احساس ہوا کہ وہ آگے جا رہا تھا، نہ پیچھے، وہ ابھی تک خود کو اس بھیڑ میں شامل کیوں نہیں کر سکا تھا، اگر اُسے سچ مچ کہیں جانا تھا تو وہ اُس کھمبے کے ساتھ لگا کھڑا کیا کر رہا تھا۔

ایک خوش لباس و خوش شکل عورت بھیڑ سے نکل کر، خود اعتمادی سے چلتی ہوئی، اُس کے قریب آئی اور بولی :-

"فرسٹ کلاس بوگی پوری طرح صاف نہیں کی گئی۔ بیڈ لائٹ کا سوئچ بھی خراب ہے۔"

وہ صرف ذرا سا مسکرا کر رہ گیا :

عورت نے اُس کی طرف حیرت اور شک سے دیکھا۔ وہ خاموش رہا۔ عورت نے اپنی ساڑی کا پلّو سینے پر درست کیا، جس کی قطعاً ضرورت نہیں تھی اور بڑبڑاتی ہوئی ایک نیلی وردی والے ریلوے کرمچاری کے پیچھے چلی گئی، جو ابھی ابھی اُدھر سے گزرا تھا۔

کسی پرندے کی بیٹ اُس کے قریب گری تو اُس نے غیر ارادی طور پر اُدھر دیکھا اور "صفائی وغیرہ کی سیوا مفت حاصل کیجیے" کا بڑا سا بورڈ دیکھ کر ہنس دیا۔ اور سامنے بک سٹال کی طرف ہو گیا تھا اور وہ ان چاہے ٹی سٹال پر پہنچ گیا اور یہ یاد کر کے مسکرا دیا کہ وہ بک سٹال کی طرف جا رہا تھا اور ایک موٹے آدمی سے ٹکرا کر ٹی سٹال پر آگیا تھا۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا، وہ موٹا آدمی، کنڈکٹر گارڈ کی طرف سرکتا چلا جا رہا تھا، جسے پہلے ہی کچھ مسافروں نے گھیر رکھا تھا اور جو اس طرح گھگھیا رہے تھے، جیسے کسی حاکم سے گناہ بخشوا رہے ہوں۔

ٹی سٹال والے نے چائے کا گلاس اُسے تھما دیا۔ وہ حیران تھا کہ چائے کے لیے تو اُس نے کہا نہیں تھا، اُس نے چائے والے کی طرف دیکھا، وہ اُسے بھول کر دوسرے گاہکوں کی طرف متوجہ ہو گیا تھا، جہاں کھڑا ہر آدمی چائے پی رہا تھا۔ اُس نے بھی گلاس ہونٹوں سے لگا لیا۔ وہ موٹا آدمی ویسے ہی سرکتا ہوا واپس آ رہا تھا۔ اُس کے موٹاپے سے لطف اندوز ہونے کے خیال سے وہ ایک قدم آگے بڑھ کر وہ بولا :-

"کام بن گیا۔؟"

"نہیں"، موٹے نے ناگواری سے کہا۔ "میں ٹی ٹی کو سیٹ کے پیسے دیتا ہوں، آج سالا دس [illegible]

● [illegible]

ٹھگ رہا ہے"

سن کر وہ ہنس دیا۔ موٹے کو اس کا ہنسنا اچھا نہیں لگا، وہ پھر کچھ کہے بغیر بھیڑ میں غائب ہو گیا۔ وہ خوش لباس عورت بھی جھنجھلاتی ہوئی اپنی بوگی کی طرف جا رہی تھی۔ اس ناراضگی اور جھنجھلاہٹ سے کیا ہوتا ہے، اُس نے خوش دلی سے سوچا۔ "کیپ اِن دی رومنز ڈو" اُسے بہت پرانا پڑھا ہوا انگریزی محاورہ یاد آگیا۔

ایک چھوٹا سا کنبہ پریوار تین قلیوں کے آگے آگے چلتا ہوا ریزرو ٹیرڈ کنڈیشنڈ کوچ میں داخل ہو گیا۔ کچھ دیر بعد قلی خوش خوش باہر آگئے۔

موٹا آدمی بھیڑ سے نکل کر اُس کے پاس آگیا۔

"آپ نے کسی قلی کو ایک اٹیچی کیس اور ایک بستربند لے جاتے دیکھا ہے؟"

"کئی قلی دیکھے ہیں۔"

موٹے آدمی کا چہرہ بگڑ گیا اور وہ دوبارہ بھیڑ میں گم ہو گیا۔ موٹے کو بھیڑ میں گم ہوتے دیکھ کر اُسے اطمینان کا احساس ہوا کہ اُس کے پاس سامان نہیں تھا۔ سفر میں سامان کے گم ہو جانے کا احساس کتنا پریشان کن ہو سکتا ہے۔ اس نے سگریٹ سلگا لیا اور ٹرین کو دیکھنے لگا، جو آہستہ آہستہ پلیٹ فارم چھوڑ رہی تھی۔

موٹے آدمی نے قلی کو ڈھونڈ نکالا تھا اور اب خوش نظر آ رہا تھا۔ اُس کے پاس سے گزرا تو بولا :-

"گاڑی آگئی ہے، آپ سوار نہیں ہوں گے؟"

وہ موٹے کے ساتھ گاڑی میں سوار ہو گیا۔ ڈبہ کچھا کھچ بھرا ہوا تھا۔ مسافر گھسا گھس اپنے لیے جگہ بنا رہے تھے، شور مچا رہے تھے، آپس میں الجھ رہے تھے۔ موٹے کا سامان اُسے پریشان کر رہا تھا۔ اُس نے افراتفری میں اپنے لیے جگہ بنا لی تھی۔

گاڑی چلی تو اندر کی بے ترتیبی میں ترتیب پیدا ہونے لگی۔ لیکن جگہ کم اور مسافر زیادہ ہونے کے سبب ہر شخص کو مشکل پیش آ رہی تھی۔ ایک مِنی سا شخص ایک ہاتھ میں بریف کیس اور دوسرے میں دری تکیہ تھامے بیچ میں کھڑا تھا۔ اوپر برتھ پر لیٹے باوردی حوالدار نے جاسوسی ناول پرے سے جھانک کر دیکھا اور ٹانگیں کچھ اس طرح پھیلا دیں کہ برتھ پر بالکل جگہ نہ رہی۔ کتاب کے ٹائٹل پر ایک ننگی عورت کی تصویر تھی، قانون سے بچنے کے لیے اُسے مردہ دکھایا گیا تھا، لیکن چہرے اور بدن سے وہ بہت زیادہ، ضرورت سے زیادہ زندہ تھی۔ پورے کاغذ پر پھیلی، سہ رنگی عورت پہلی ہی نظر میں دیکھنے والے کا "دھرم نشٹ" کر دیتی تھی۔

وہ مِنی سا شخص حوالدار سے ٹانگیں سمیٹنے کے لیے کہہ رہا تھا، بلکہ بھیک مانگ رہا تھا کہ وہ اُسے سامان رکھ لینے دے۔ سامان اٹھائے اٹھائے وہ تھک چکا تھا۔ سامان والے آدمی کی نظر جب کتاب کے سرورق پر پڑتی تو وہ اپنی بات بھولنے لگتا اور جب ہاتھوں کا بوجھ ستانے لگتا تو پھر گھگھیانا شروع کر دیتا۔

اُس کی ریں ریں، سن کر حوالدار کے اندر کا انسان، تو نہیں، ہاں پولیس مین جاگ گیا۔ کتاب بند کر کے اُس نے مونچھوں کو تاؤ دیا، ذرا سا کھانسا اور کہنی کے بل ذرا اٹھ کر کچھ اس طرح منی سے اُس آدمی کو دیکھا کہ بے چارا گھبرا گیا، پھر حقارت سے بولا :- "سامان رکھ لینے دو، میں کھڑا ہو کر چلا جاؤں گا۔"

"اتنی بڑی گاڑی میں تجھے کوئی اور جگہ نہیں ملی، یہاں آگیا ہے سر کھانے۔" حوالدار نے تھرڈ ڈگری لہجہ اختیار کرلیا۔ "مادر ــ" اور پاؤں کو کچھ اس طرح حرکت دی کہ جوتے کی نوک اور اُس آدمی کی ناک ایک ہوتے ہوتے رہ گئی۔ وہ آدمی ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔ کھڑکی کے ساتھ بیٹھا گنجا زور سے ہنس دیا۔

حوالدار نے پھر کتاب کھول لی۔ بےبسی سے اُس آدمی نے وہاں بیٹھے مسافروں کی طرف حمایت اور ہمدردی کے لیے دیکھا، کسی سے کچھ نہیں ملا، ایک نے سگریٹ سلگالیا، دوسرے نے آنکھیں موند لیں، نہ کسی نے اُسے بیٹھنے کے لیے جگہ دی اور نہ اس کی مدد کی۔

وہ آدمی آخر وہاں سے ٹائلٹ کی طرف چلا گیا اور دیوار سے لگ کر کھڑا ہوگیا۔ گندہ پانی باہر تک پھیل گیا تھا۔ ٹائلٹ کا دروازہ کھلتا تو بدبو کا بھبکا اپنی سڑاند اُس کے اندر انڈیل جاتا۔

جب یہ تماشہ ختم ہوگیا تو وہاں بیٹھے مسافر ایک دوسرے سے متعارف ہونے لگے۔ اُس کے سامنے بیٹھا وہ گنجا پہلے تو اُسے دیکھتا رہا پھر بولا:

"میاں صاحب، آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"آپ کہاں جا رہے ہیں؟" اُس نے پوچھ لیا حالانکہ وہ پوچھنا چاہتا نہیں تھا۔ اور یہ سوال کرتے ہوئے اُس نے سوچا تھا کہ وہ کہیں بھی جا رہا ہو، اُسے جان کر کیا لینا۔

گنجا شاید اس کے لیے پہلے ہی تیار تھا، بولا:

"بنارس۔" وہ آگے کو جھک آیا۔ "یہاں ہمارا ساڑیوں کا کاروبار ہے۔" وہ شخص تفصیل بتانے لگا۔ "مہینے میں ایک دو چکر لگ جاتے ہیں، میں ہمیشہ برتھ ریزرو کرا کر چلتا ہوں، اب کی اچانک پروگرام بن گیا۔ ایک برتھ کے دس روپے مانگ رہا تھا بابو۔"

وہ سوچ رہا تھا، گنجا یہ سب اُسے کیوں بتا رہا تھا۔ اُس نے سُنا، ایک اور مسافر اپنے ساتھی سے ایسی ہی بے معنی گفتگو کر رہا تھا۔ گنجے کو اپنے سوال کا جواب ابھی تک نہیں ملا تھا، اس لیے اُس نے دوبارہ پوچھا:۔

"آپ نے بتایا نہیں، کہاں جا رہے ہیں۔"

"میں!" وہ مسکرا دیا۔ اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ "اب کی فصل اچھی ہوئی ہے۔"

گنجے نے اُسے اس طرح دیکھا، جیسے ٹی ٹی سی، بلا ٹکٹ مسافر کو دیکھتا ہے، اُس کی خاموشی اور جواب ٹال جانے سے وہ کچھ حیران اور کبیدہ خاطر ہوگیا تھا۔

"یہ سامان تیرا ہے۔؟" ایک بزرگ نے اُس سے پوچھا۔

وہ خاموش رہا۔

"میں تم سے پوچھ رہا ہوں۔" بزرگ کے لہجے میں تلخی اور تیزی تھی۔

"کیوں۔؟" وہ متانت سے بولا۔

"تمھیں ایک شریف آدمی کی بات کا جواب دینا چاہیے۔" گنجے کو اسے شرمندہ کرنے کا موقع مل گیا تھا۔

"کیوں؟"

"کیوں کا کیا مطلب!" گنجے نے ترشی سے کہا۔ "تم عجیب آدمی ہو، ایک شریف اگر کسی سے کچھ پوچھے تو دوسرے کو جواب دینا چاہیے، یہی تہذیب ہے۔"

"مجھے پیشاب کرنے جانا ہے اور تم بحث کر رہے ہو۔" بزرگ نے کہا۔ حمایتی مل جانے کی وجہ سے وہ ذرا جوش میں آگیا تھا۔

"تم خود ہٹا لو۔"

"تمھارا سامان میں کیوں ہٹاؤں۔"

"تمھیں کیسے معلوم کہ یہ سامان میرا ہے۔"

"تمھارا نہیں ہے، تو پہلے کیوں نہیں بتایا۔" بزرگ نے کہا۔

"تمھارا سوال، اور پھر بیچ میں شریف ہونے کا دعویٰ اور تہذیب کا حوالہ، سب فضول اور بے معنی باتیں تھیں۔

"سامان ہے کس کا، مجھے پیشاب کرنے جانا ہے۔"

"کیا بات ہے بے۔" حوالدار نے پوچھا۔ "میرا ہے سامان۔"

"وہ جی ــ بات یہ ہے کہ جی کہ ذرا پیشاب۔"

"اوئے بزرگا، پیشاب کرنے جانا ہے کہ لام، اوپر سے کود جا۔" راستہ بتا کر حوالدار پھر کتاب کے پیچھے غائب ہوگیا۔

بزرگ کو بات سمجھ آگئی تھی اس لیے چپ چاپ اوپر سے کود گیا۔

گنجا منہ پھیلائے تھا۔

"تم شاید مجھ سے ناراض ہو؟"

گنجے نے کچھ کہا نہیں، تھیلے سے کیلا نکال کر کھانے لگا۔

"دراصل میں کہیں نہیں جا رہا۔" اُس نے دھیرے سے گنجے کو بتایا۔ اور مسکرا دیا۔

ساتھ بیٹھے مسافر نے شاید اس کی بات سن لی تھی۔ اس نے ڈر اور حیرت سے اس کی طرف دیکھا، اور سمٹ کر بیٹھ گیا۔ گنجے کے ہاتھ میں کیلے کا چھلکا لٹک رہا تھا، اور اُس کی آنکھوں میں خوف بھر گیا تھا۔

وہ مسکراتا رہا۔

"کہیں نہیں جا رہے، یہ کیسے ہو سکتا ہے!" گنجے نے کہا۔ "یہاں بیٹھا ہر شخص کہیں نہ کہیں جا رہا ہے ــ کیوں؟" اُس نے تائید کے لیے دوسرے مسافر کی طرف دیکھا۔

"بالکل جی، میں سہارنپور جا رہا ہوں۔"

"اور میں مرادآباد۔"

"کچھ روز پہلے امرتسر کے قریب، بس میں دو نہایت ہی خوبصورت لڑکیاں سوار ہوئیں۔ ایک لڑکے نے دیکھا، اُن دونوں کے پاؤں الٹے تھے۔ وہ تو وہیں گر کر بے ہوش گیا۔ ڈرائیور نے بس روک کر دیکھا اور چیخ مار کر بھاگ گیا، اور وہ دونوں لڑکیاں غائب ہوگئیں۔" ایک اور مسافر نے واقعہ بیان کیا۔

سن کر وہ خوب ہنسا۔

"تمھارا سامان کہاں ہے۔؟" گنجے نے افسرانہ لہجے میں پوچھا۔

وہ سگریٹ کے کش لیتا رہا۔

حوالدار جو تمام باتیں غور سے سن رہا تھا، کود کر نیچے آگیا۔ اُس نے پہلے تو اُسے سر سے پیر تک دیکھا، پھر مونچھوں کو تاؤ دیا، پھر اُس کے پیروں کو دیکھا اور یہ اطمینان کرکے کہ اس کے پاؤں سیدھے تھے، سینہ پھیلا کر بولا:۔

"تو تم کہیں نہیں جا رہے۔"

گنجے نے جھٹ سے حوالدار کے لیے جگہ بنا دی۔ حوالدار جی براجمان ہوگئے اور جیسے عدالت لگالی۔ / "نہیں۔"

"نہیں۔" حوالدار اُچھلا۔ "پھر تم گاڑی میں کیوں سوار ہوئے؟"

"اس کا ٹکٹ دیکھو جی۔" کسی نے کہا۔

"تم لوگ کون ہوتے ہو ٹکٹ دیکھنے والے؟" اُس نے کہا۔ "میری سمجھ میں ایک بات نہیں آئی کہ تم لوگوں کو مجھ میں دلچسپی کیوں ہوگئی ہے۔"

ہم سب ایک گاڑی کے مسافر ہیں، پوچھنے میں کوئی عیب نہیں۔" گنجے نے دلیل دی۔ "میں نے بتایا، اُس نے بتایا، اُس نے بھی، تم کیوں نہیں بتاتے۔"

سہارنپور جانے والا مسافر اُس کے پاؤں دیکھے جا رہا تھا، اُس کی تشفی کے لیے اُس نے جوتے اتار دیئے اور بولا۔ / "مان لو میں بھی بنارس جا رہا ہوں۔"

"کیسے مان لیں۔" مرادآباد جانے والے نے دلیل دی۔

"میں کیسے مان لوں کہ تم مرادآباد جا رہے ہو۔"

"میرے پاس ٹکٹ ہے مرادآباد کا۔"

"تم راستے میں بھی اتر سکتے ہو، یا آگے جا سکتے ہو۔"

"میں بالکل نہیں، میں مرادآباد ہی جاؤں گا۔"

"اچھا فرض کرلو کہ میں سہارنپور جا رہا ہوں۔"

"یار تم عجیب آدمی ہو۔" گنجے نے کہا۔

"تم سیدھی طرح جواب دو، مجھے۔" حوالدار نے کہا۔ میں نے بڑے بڑوں سے سچ اگلوالیا ہے۔ / "میں بنارس جا رہا ہوں۔" وہ ہنسا۔

وہ موٹا آدمی بھی جھگڑا سن کر آگیا تھا بولا:۔

"دس روپے دے کر برتھ لے لیتے تو اچھے رہتے۔ دو دن کا سفر ہے۔"

"ہاں رشوت اب ضروری ہو چکی ہے۔" وہ بولا۔

حوالدار نے ایک بار پھر اُس کے پاؤں دیکھے اور اچھل کر اپنی برتھ پر جا لیٹا اور کتاب میں کھو گیا۔ چند منٹ خاموشی رہی۔ پھر گنجا بولا۔

"تم بنارس نہیں جا رہے۔" / "وہ کیسے؟" وہ ہنسا۔

"تم نے پہلے کیوں نہیں بتلایا۔" / وہ ہنستا رہا۔

حوالدار کے اٹھ جانے سے سب کے حوصلے پست ہوگئے تھے۔ موٹا چلا گیا۔ سہارنپور جانے والے مسافر نے کھانا نکال لیا تھا۔ مرادآباد والا اونگھنے لگا تھا۔ گنجا شک کی نگاہ سے اُسے دیکھے جا رہا تھا اور بار بار اپنے کوٹ کی جیب پر ہاتھ رکھ رہا تھا۔

وہ سامنے بیٹھا اُس کی پریشانی محسوس کر رہا تھا۔ اس نے سوچا، یہ شخص بلا کسی وجہ کے پریشان ہو رہا ہے، صرف یہ جاننے کی کوشش میں کہ وہ کہاں جا رہا ہے، اگر یہ اپنے آپ اور اپنی منزل سے مطلب رکھتا تو یہ پریشانی نہ ہوتی۔

گنجا بار بار اُس کے پیر کو دیکھ رہا تھا۔

"میں بنارس ہی جا رہا ہوں۔" اُس نے اطمینان سے کہا۔ "ویسے یہ کون جانتا ہے کہ بنارس وہی شہر ہے جہاں تم جا رہے ہو یا جو کچھ تم نے کہا ہے، وہی سچ ہے، یا بنارس وہی ہوگا جہاں تم جا رہے ہو، اور جو تم نے دیکھا ہے یا ——"

"چپ ہو جاؤ ——" گنجے نے تلخی سے کہا۔

"میرا بھی وہاں ساڑیوں کا کاروبار ہے، گھاٹ کے پاس مکان ہے۔ وہیں تمہاری وہاں ملاقات ہوگی۔

گنجے کی آنکھوں سے شک دُور ہو گیا تھا اور اُس کے چہرے کا تناؤ کم ہوتا ہوتا ختم ہو گیا تھا۔ وہ مسکرا دیا اور تھیلے سے کیلا نکال کر اُسے دیا۔ وہ جھجکا تو گنجے نے کہا۔

"لے لو۔ اپنا تو دور کا ساتھ ہے۔"

"اُس نے سوچا، کیا وہ واقعی بنارس ہی جائے گا۔"

بقیہ

پیر پرائی

دوبارہ کہا۔/ "ہاں، ضرور، ضرور۔" / اور معلوم نہیں کیوں۔ دونوں کھل کھلا کے ہنس پڑے۔

تاریکی دھیرے دھیرے دن کے اجالے کو نگلتی جا رہی تھی۔ نوکر چائے لے آیا تھا۔ دونوں سردار اب چائے کی جانب گھومے۔

"کرمے۔ چائے پی لے بھئی" سردار جی نے کرمے کو ہوشیار کیا۔

"آپ پیجئے سرکار۔" وہ دکھ سے چھٹپٹاتا ہوا دھیرے سے بولا۔ "آپ مجھے ڈیوٹی دلا دیجئے سرکار۔ بابوؤں نے میرا اِنکٹ بند کر دیا ہے۔ میں بڑا ہی ... ..."

"اچھا، کل دفتر میں آجانا، پھر دیکھیں گے۔ جیسا کہے گا کر دیں گے۔ یہ بھی کوئی بات ہے؟" کہہ کر سردار جی نے چائے کا پیالہ منہ سے لگا لیا۔

وہ باہر کی جانب چل دیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ ہنسے یا روئے۔

(مترجم: ہسر جیت)

قلمی معاونین سے گزارش

دفتر میں غزلیات، منظومات، افسانے اور مضامین خاصی تعداد میں موجود ہیں، لہٰذا قلمی معاونین سے گذارش ہے کہ وہ غیر طلبیدہ تخلیقات بھیج کر شرمندہ نہ کریں۔ اِدارے کو ان کے بارے میں خط و کتابت سے معذور سمجھا جائے۔

سلطان اختر

آبائی وطن سہسرام ہے۔ تاریخ پیدائش ۱۶ ستمبر ۱۹۴۰ء ہے آج کل پٹنہ میں قیام ہے۔ ریاستی سرکار کے ہوم ڈیپارٹمنٹ میں ذمہ دار عہدے پر فائز ہیں۔

●

سلطان اختر کی یہ غزلیں پڑھتے ہوئے میری ملاقات ایک ایسے کردار سے ہوئی جس نے زوال کے موسم میں شعور کی آنکھ کھولی ہے۔ یہ زوال مادی نہیں رُوحانی ہے۔ اسے اپنے پُرکھوں سے جو اخلاقی ورثہ ملا تھا، وقت کے بدلتے ہوئے غضبناک تیوروں نے اس کی بے مایگی اس پر ظاہر کر دی ہے۔ اس کا ماضی اس کے لیے موہوم اور مستقبل غیر یقینی ہو کر رہ گیا ہے۔ حال کے بے منظر خلا میں وہ اپنے قدم کہاں جمائے؟ وہ اپنی اساس خود اپنے باطن میں تلاش کرنا چاہتا ہے کہ خارج سے اس کے سارے پُرانے رشتے ٹوٹ چکے ہیں۔ اب اپنے لہو کا ذائقہ ہی اس کے لیے زندگی کی پہچان ہے۔ اس کا زمانہ اپنے جلو میں جو عظیم امکانات لیے ہوئے ہے، وہ نہ ان سے بے خبر ہے نہ ان کا منکر لیکن یہ امکانات جتنے مثبت ہیں اتنے ہی منفی بھی ــــ انفرادی زندگی کی سب سے بڑی نعمت فرد سے فرد کی قربت ہے جو فاصلوں میں بدل گئی ہے۔ مکانی مسافتیں سمٹ گئی ہیں لیکن دلوں کی دوریاں بڑھ گئی ہیں۔ ایک کی آواز دوسرے تک پہنچتے پہنچتے بے تعلق سماعت کے صحراؤں میں کھو کر رہ جاتی ہے اور نارسائی کے اضطراب کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا رہتا ہے۔

سلطان اختر کا اسلوب فکری سنجیدگی کا حامل ہے اور سلطان ان کے قلم سے نکل کر تہہ در تہہ معنویت سے ہمکنار ہوتے نظر آتے ہیں۔

مظہر سعیدی

نفس نفس اضطراب میں تھا
میں حلقۂ صد عتاب میں تھا

ہوائیں بے سمت و بے صدا تھیں
شجر شجر پیچ و تاب میں تھا

سبھی نظارے نظر میں گم تھے
کہ سارا منظر حجاب میں تھا

بڑھا تو کچھ بھی نہ ہاتھ آیا
لکھا بہت کچھ کتاب میں تھا

نہ روح چونکی نہ جسم جاگا
عجیب نشہ شراب میں تھا

لہو کی آہٹ پہ چونک اُٹھا
وہ مدتوں جیسے خواب میں تھا

دلوں میں روشن نئی کہانی
پرانا قصہ کتاب میں تھا

بس اک جزیرہ بہ تہ منوّر
بس اک سخن انتخاب میں تھا

بس اک کہانی بقید عنواں
بس اک سمندر حباب میں تھا

بس اک اجازت قریب تر تھی
بس اک اشارہ حجاب میں تھا

میں اس کی خوشیوں میں گم تھا اختر
وہ میرے غم کے حساب میں تھا

گداؤں میں مثالِ شاہوں میں تھا
کہ میں عمر بھر بے پناہوں میں تھا
صداؤں کا سہما ہوا قافلہ
سماعت کی ویران راہوں میں تھا
عجب کیف اب کے عبادت میں ہے
بڑا لطف پچھلے گناہوں میں تھا
خدا اپنی وسعت میں سمٹا رہا
میں بکھرا ہوا اس کی راہوں میں تھا
وہاں سب قلندر صفت لوگ تھے
تہی دست بھی بادشاہوں میں تھا
بہت صف بہ صف تھے غموں کے علَم
مگر میرا غم سربراہوں میں تھا
بدن میں تمازت مئی جون کی
دسمبر کا نشہ نگاہوں میں تھا
بہت دیر تک جسم جلتا رہا
کہ شعلہ سا کچھ میری بانہوں میں تھا
ہر اک سمت بکھری تھی بے منظری
عجب ہُو کا عالم نگاہوں میں تھا

جس سے ڈرتے تھے اب کے سال آیا
پھر وہی موسم زوال آیا
لڑکھڑاتا ہوا نڈھال آیا
جو بھی دن آیا خستہ حال آیا
سایۂ ابر و آفتاب سہی
سر پہ سورج بھی بے مثال آیا
دوستوں سے نجات کی صورت
دشمنوں کو تو خیر خیال آیا
اس نے چپ رہنے کی سزا دی تھی
میرے ہونٹوں پہ جب سوال آیا
رسم نغمہ دلی نبھانی تھی
میں بھی کچھ قہقہے اُچھال آیا
لوگ اپنا کمال بھول گئے
جب کوئی صاحبِ کمال آیا
روز و شب رشتہ تھی کے رشتہ تھا
میں ترے بام و در اُچھال آیا

محمد حسین خاں شفا

حالی اور رام پور

خواجہ الطاف حسین حالی کا شمار دنیا کے علم و اخلاق کے ان چند بڑے اشخاص میں ہوتا ہے جن کا ادب و احترام کیا جاتا ہے ان کے بارے میں حضرت صفی لکھنوی نے سچ کہا ہے۔

سعدی و عطار اس صدی کا — طینت میں اثر نہ تھا بدی کا
دل آئینہ عشق سرمدی کا — پتلا خُلقِ محمدی کا

تھا حُسنِ عمل سے جس کو رشتہ
قالب میں بشر کے اک فرشتہ

یہ فرشتہ صفت انسان ہندوستان کے تاریخ ساز شہر پانی پت میں ۱۸۳۷ء / ۱۸۵۴ء کو پیدا ہوا۔

ان کا نسلی سلسلہ انصاریانِ عرب کی ایک شاخ سے ملتا ہے جن کے نام سے پانی پت میں محلہ انصار آج بھی مشہور ہے۔ حالی کا خاندان ان کے بچپن میں عسرت زدہ و مفلوک الحال تھا۔ والدہ کا دماغی توازن خراب ہوگیا تھا۔ والد کا ۴۸ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا[1]۔ جبکہ حالی کی عمر نو برس کی تھی۔

بھائی و بہن نے رسم برادری کے مطابق ۱۸۵۴ء میں ۱۷ سال کی عمر میں شادی کردی۔

ان حالات میں غریب حالی کی باضابطہ تعلیم نہیں ہوسکی۔ کچھ ذاتی شوق سے پڑھا لکھا اور مزید تعلیم کے واسطے بیوی و گھر والوں سے چھپ کر دہلی چلے گئے جہاں انھوں نے اہلِ علم کی صحبت سے خوب استفادہ کیا۔

حالی دہلی میں غالب سے اپنی ملاقات کے بارے میں لکھتے ہیں۔

۱۸۵۴ء میں مرزا اسد اللہ خاں غالب کی خدمت میں اکثر جاتا تھا۔ اور ان کے اپنے دیوان کے اشعار جو سمجھ میں نہ آتے تھے ان کے معنی ان سے پوچھا کرتا تھا۔ اور چند فارسی قصیدے انھوں نے اپنے دیوان میں سے مجھے پڑھائے بھی تھے۔ ان کی عادت تھی کہ وہ اپنے ملنے والوں کو اکثر فکرِ شعر کرنے سے منع کیا کرتے تھے۔ مگر میں نے جو ایک ادھ غزل اردو یا فارسی کی لکھ کر ان کو دکھائی تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ اگرچہ میں کسی کو فکرِ شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا۔ لیکن تمہاری نسبت میرا خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر ظلم کرو گے۔ غالباً اسی عرصہ میں حالی کی شناسائی رامپور کے شاہی خاندان سے ہوگئی جو دہلی میں جلا وطنی کی زندگی گذار رہا تھا۔ اس خاندان کے بعض افراد غالب کے شاگرد اور کچھ دوست تھے۔ حسنِ اتفاق سے۔ اسی جلا وطن خاندان کے ایک فرد یوسف علی خاں بن نواب محمد سعید خاں بن نواب غلام محمد خاں ۱۸۵۵ء میں والیٔ رام پور ہوئے۔ نواب یوسف علیخاں کا بچپن و جوانی دہلی میں گذری تھی جہاں[2] آپ نے تعلیم و تربیت حاصل کی تھی۔ دہلی کے اہلِ علم و روسا آپ کے دوست تھے۔ نواب صاحب کو حالی بھی اچھی طرح جانتے تھے اسی وجہ سے انھوں نے نواب صاحب کی شان میں ایک قصیدہ اور ایک درخواست ان کے ایک حسن پوری دوست کے توسط سے نذر کی۔

نواب صاحب کی طرف سے اس درخواست پر کیا کارروائی ہوئی، اس کے بارے میں فی الحال کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اغلب گمان یہ ہے کہ اس وقت نواب صاحب غدر ۱۸۵۷ء سے ریاست کو محفوظ رکھنے کی تدابیر میں مصروف تھے۔ اور سخت

---

[1] خودنوشت حالاتِ حالی۔ از نقشِ حالی جلد اوّل۔ مرتبہ نور الحسن ہاشمی

[2] مکاتیب غالب۔

● جمیل روڈ، رام پور (یو۔پی)

کشمکش کا شکار تھے اس وجہ سے حالی کی درخواست پر کوئی توجہ نہیں دی گئی ہوگی جس طرح دوسرے اہلِ علم کی درخواستوں پر اس وقت کوئی غور نہیں کیا گیا تھا۔ صرف غالب اور چند دیگر افراد کو سیاسی مصلحت سے انعام و اکرام سے نوازا گیا تھا۔ حالی کی ایک اور درخواست اور قصیدہ سے جو ریاست رام پور کے پولیٹیکل ریکارڈ آفس میں محفوظ تھا اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ نواب یوسف علی خاں نے

نواب یوسف علی خاں

حالی کی حالتِ زار پر التفات نہیں کیا۔

۱۸۵۶ء میں حالی ضلع حصار میں کلکٹر کے دفتر میں ایک معمولی تنخواہ کی آسامی پر ملازم ہو گئے۔ لیکن غدر ۱۸۵۷ء میں وہ ملازمت بھی چھوٹ گئی۔ اور بال بچے دار حالی اس وقت سخت معاشی مشکلات کا شکار ہو گئے۔ ۱۸۶۳ء میں حالی کے نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے تعلقات ہو گئے[1] اور حالی نواب صاحب کے ملازم ہو گئے۔ حالی نے نواب صاحب کی علمی صحبت سے خوب استفادہ کیا

اپریل ۱۸۶۵ء میں نواب یوسف علی خاں کا انتقال ہو گیا اور ان کے لڑکے کلب علیخاں نواب رامپور ہوئے۔ نواب صاحب اور حالی میں بہت سی قدریں مشترک تھیں دونوں مذہبی آدمی تھے۔ ہم عمر تھے دونوں کا بچپن دہلی میں گذرا تھا۔ حالی کی نواب کلب علیخاں سے متعلق نظم و نثر میں صغرسنی کی خوش گوار یادوں کی طرف اشارے ملتے ہیں۔ ان کے نواب ہوتے ہی حالی کو دربارِ رام پور سے تعلق پیدا کرنے کا پھر خیال پیدا ہوا۔ اور حالی نے بہت محنت سے ایک عربی قصیدہ نواب کلب علیخاں کی شان میں اور ایک فارسی درخواست میں اپنی روداد تحریر کر کے غالب کے توسط سے نواب صاحب کو ارسال کی۔ یہ ۴۳ شعر کا عربی قصیدہ ہے۔ ایک شعر میں کلب علیخاں کو ابنِ یوسف کے نام سے یاد کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

فالابن یوسف نوله ..... بالخلق دون سواله

طویل فارسی کی درخواست ہے جس میں حالی نے اپنی مالی مشکلات اور دربارِ رامپور سے تعلق پر لطیف پیرائے میں روشنی ڈالی ہے.....

وہ لکھتے ہیں میرے اور آپ کے خاندان کے دیرینہ تعلقات ہیں۔ میں اس سے قبل بھی آپ کے والد بزرگوار کی شان میں ایک قصیدہ ارسال کر چکا ہوں.....

اس وقت بالکل تہی دست اور سخت مالی مشکلات کا شکار ہوں

پیش از مسند آرائی بندگان حضور قصیدہ متضمن مدح حضرت فردوس مکان بوساطت بعض از اعیان حسن پور گذارش کردہ.....

از عرضی دعاگو حضر الدین الطاف حسین مقیم دہلی متصل حوض قاضی، مکان حکیم حسن اللہ خاں۔ یہ درخواست اور قصیدہ غالباً ۱۸۶۵ء میں حالی نے اپنے استاد مرزا غالب کے حوالے کیا کہ آپ اپنی سفارش اور میرے تعارف کے ساتھ نواب صاحب تک پہنچا دیں۔ یہ بات بھی خیال میں رکھنے کی ہے کہ حالی اور غالب کی شناسائی ۱۸۵۴ء سے شروع ہوتی ہے اور اس وقت تک تقریباً بارہ سال گذر چکے تھے۔

اس کے باوجود غالب نواب صاحب کے بجائے میر منشی افسرِ اعلیٰ محکمہ خفیہ ریاست رام پور کو لکھتے ہیں منشی صاحب سعادت و اقبال نشان منشی سیل چند صاحب طال عمرہ تین صاحبوں نے اطراف و جوانب سے تین قصیدہ میرے پاس بھیجے ہیں حیران ہوں کہ کیا کروں۔ اگر حضور میں نہ گزرانوں اور ان کو لکھوں کہ میں نے گزران دیے تو جھوٹ بولنا ہوتا ہے اور میں جھوٹ سے بیزار ہوں۔

گزرانتے ہوتے مجھے شرم آتی ہے۔ ادب رخصت نہیں دیتا۔ ناچار وہ تینوں قصیدے تمہارے پاس بھیجتا ہوں۔ یہی ان صاحبوں کو لکھوں گا کہ میں نے میر منشی کو حوالے کر دیے..... حالی تخلص مولوی الطاف حسین سن پت کے رئیس؟

عالم شاعر نواب مصطفیٰ خاں کے رفیق قصیدہ عربی.....

(۱) غالب کے اس سفارشی خط نے کئی سوال پیدا کر دیتے ہیں۔ کیا دس بارہ سال کے شاگرد کا صحیح وطن بھی غالب کو معلوم نہیں تھا؟ جو وہ پانی پت کے بجائے سن پت تحریر کرتے ہیں ممکن ہے یہ لغزش قلم ہو؟

(۲) حالی مفلوک الحال تھے۔ مالی مدد کے خواستگار تھے مگر غالب رئیس لکھ رہے ہیں؟

(۳) حالی غالب کی شاگردی پر ناز کرتے ہیں۔ غالب اس کا حوالہ نہیں دیتے شیفتہ کا رفیق لکھتے ہیں۔ یہ غالب کا سفارشی خط حالی کی منشاء و مقصد کے بالکل منافی تھا؟ اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ حالی غالب کی عظمت کے جتنے معترف تھے غالب نے حالی کی صلاحیت اور خلوصِ نیت کو اتنی اہمیت نہیں دی۔ اور نہ دیگر شاگردوں کی طرح ان کو اپنی نظم و نثر میں قابلِ التفات خیال کیا مکاتیب غالب[1]

---

[1] غالب اور آزاد، نقش آزاد، شریک غالب از شیخ اکرام۔

[1] مکاتیب غالب

میں ایک بھی خط حالی کے نام اب تک دریافت نہیں ہو سکا ہے۔ غالب نے صرف شیفتہ کے نام ایک فارسی قطعہ میں شکایتاً حالی کا نام لیا ہے۔ سرکاری ریکارڈ سے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ قصیدہ نواب صاحب کی نظر سے گزرا یا نہیں اور اس پر کیا کارروائی ہوئی۔

اپریل ۱۸۶۹ء میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کا انتقال ہو گیا۔ اسی دوران حالی اور سر سید میں تعلقات پیدا ہو گئے۔ اور حالی کو دیسی ریاست کے بجائے گورنمنٹ بک ڈپو لاہور میں علمی جگہ پر ملازمت مل گئی۔ جو حالی کے واسطے بہت مفید ثابت ہوئی۔ اور اس ملازمت نے ان کی زندگی کا رخ موڑ دیا۔ یہاں حالی نے اقوام مغرب کی برتری کے علل و اسباب اور ادب و زندگی میں ارتباط کا گہری نظر سے مطالعہ کیا۔ اور پھر قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ اور نثر و نظم میں ایسے شہکار پیش کیے جس نے قوم کو جھنجھوڑ دیا۔

لاہور کی ملازمت سے قبل حالی نے قدیم طرز کی تصانیف عربی رسالہ، مولود شریف، تریاق مسموم، جیسی کتابیں لکھی تھی اس کے بعد قوم کو ایک نئی راہ دکھاتی وہ کہتے ہیں۔

حالی! اب آؤ پیروی مغربی کریں
بس اقتدائے مصحفی و میر کر چکے

اس عہد میں ہندوستانی ادب اور شاعری میں ماورائی تصورات، موہوم محبوب کی تلاش اور جگ بیتی کا بیان تھا۔ حالی نے اس کو آپ بیتی بنا دیا۔ وہ کہتے ہیں۔

کچھ قوم کی ہم سے سوگواری سن لو
کچھ چشم جہاں میں اپنی خواری سن لو
افسانۂ قیس و کوہکن یاد نہیں
چاہو تو کتھا ہم سے ہماری سن لو

حالی کی سر سید کی تحریک سے وابستگی اور رجعت پسندوں سے محاذ آرائی نے ان کو ترقی پسند نواب کلب علیخاں سے بہت قریب کر دیا۔ پہلے حالی دربار رام پور میں رسائی کی تدابیر سوچا کرتے تھے لیکن اب حالی دربار رام پور میں غالب سے بلند مقام پر فائز ہو گئے۔

نواب کلب علیخاں سر سید کے دوست اور ان کی تحریک کے زبردست حامی تھے ان کے بارے میں گارساں دتاسی فرانسیسی متوفی ۱۸۷۸ء اپنے خطبات میں لکھتا ہے۔[1]

ہندوستان کے روشن خیال نوابوں میں نواب کلب علی خاں نہایت تعلیم یافتہ علوم و فنون سے دلچسپی رکھنے والے شخص ہیں۔ انھوں نے متعدد اسکول قائم کراتے ہیں۔ جن میں ہندوستانی کی تحصیل پر خاص زور دیا جاتا ہے۔ نواب صاحب تعلیم نسواں کے بھی حامی ہیں ان کی ریاست میں

نواب کلب علی خاں

لڑکیوں کی تعلیم کے متعدد مدارس ہیں۔ نواب صاحب اخبارات و رسائل سے بھی دلچسپی لیتے ہیں آپ نے ایک اخبار دبدبۂ سکندری جاری کر لیا ہے۔ آپ چاہتے ہیں کہ ہندوستان میں مشین کے رواج کو فروغ ہو۔ ہندوستانی اخبارات نواب صاحب کی روشن خیالی کے معترف ہیں۔ میرٹھ کے اخبار میں ان کی مدح میں ۸۰ اشعار کا قصیدہ نقل کیا گیا ہے۔[2]

نواب کلب علی خاں حالی کے علم و فن کے ساتھ ساتھ ان کے زہد و تقویٰ اور نیکی و بزرگی کے بھی معترف تھے۔ اس کے برعکس آپ کو غالب کی سیرت و کردار سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ غالباً اسی وجہ سے جب نواب صاحب ۱۸۷۵ء میں بیمار ہو گئے تو انھوں نے اپنے دیگر دوست احباب کے ساتھ حالی سے بھی دعائے صحت کی درخواست کی۔ اور داغ کے واسطے[3] سے دہلی کے مزارات پر کافی نقد و نیاز، صدقہ و خیرات میں دولت صرف کی۔

نواب صاحب کی اس درخواست کے جواب میں حالی تحریر کرتے ہیں۔[4]

بعد از تقدیم وظائف خیر اندیشی و دعائے صحت و سویت مزاج اقدس اعلیٰ۔۔۔۔۔۔۔۔ مخبر صادق علیہ الصلوٰۃ والسلام دعا را رد القضا فرمودہ است اللہ معکم اینما کنتم۔۔۔۔۔

اس کے برخلاف غالب نواب صاحب کو شکایتاً تحریر کرتے ہیں کہ۔

کل برخوردار نواب مرزا خاں داغ کی تحریر سے معلوم ہوا کہ حضرت کا

---

[1] خطبات دتاسی صفحہ ۷۰۹، ۶۵۰، ۵۸۸، مطبوعہ انجمن ترقی اردو ۱۹۳۵ء

[2] اردو اخبار جولائی ۱۸۶۸ء

[3] انشائے داغ

[4] مکاتیب حالی صفحہ ۱۱۵ اصفحہ ۱۱۸

مزاجِ اقدس ناساز ہوگیا[1]۔۔۔۔۔

حالی نے ۱۲۹۱ ہجری کو نواب کلب علی خاں کی شان میں ایک طویل اُردو قصیدہ تحریر کیا جس کی بابت اپنے دیوان میں لکھتے ہیں۔ "میں نے یہ قصیدہ نواب ممدوح کی شان میں اس وقت لکھا تھا۔ جب [illegible] مدرسۃ العلوم کا پیٹرن ہونا منظور کر چکے تھے۔ اور بارہ سو روپیہ کی جاگیر مدرسہ کو دینا منظور کرلی تھی۔

اس قصیدہ کے ۲۹ اشعار ہیں کچھ حصّہ ضائع ہوگیا۔۔۔۔ یہ قصیدہ دیوان حالی کے ساتھ اُردو قصیدہ نگاری میں بھی کافی اہمیت رکھتا ہے۔۔۔۔۔

نواب صاحب اور حالی میں خط وکتابت کے ساتھ ساتھ تحفہ وتحائف کا لین دین بھی تھا۔ نواب صاحب نے ۱۸۷۷ء میں حالی کو نواب مرزا داغ کے ہاتھ اپنی کچھ تصانیف ہدیہ کے طور پر بھیجیں جس کے جواب میں حالی تحریر کرتے ہیں۔

عالم پناہا[2] سہ روز ست کہ بعد یک ماہ سفر پورب کہ در اوائل رمضان تجاورہ بحسب ضرورت اتفاق افتادہ بود بدہلی رسیدم و بہ دو نسخہ اکسیر اعظم یکے "درۃ التاج" و دیگر دستنبوئے خاقانی بتوسط مکرمی مرزا داغ برخوردم۔

اس عہد میں حالی کے تعلقات دربار رام پور سے قریب تر ہونے گئے انھوں نے ۱۸۷۷ء[3] میں نواب کلب علی خاں کی شان میں ۷۸ اشعار کا ایک طویل فارسی قصیدہ لکھا جس کے بارے میں خود رقم طراز ہیں۔

اس قصیدے کی تمہید اس وقت لکھی گئی تھی جبکہ شاعرانہ خیالات میں پہلے ہی پہل انقلاب پیدا ہوا تھا۔ اور مبالغہ سے نفرت ہونے لگی تھی۔ انہیں دنوں میں پہلا دربار قیصری منعقد ہونے والا تھا جو ۱۸۷۷ء میں بمقام دہلی وقوع میں آیا کہ اس تمہید کے بعد کسی ایسے قصیدے کی بنیاد ڈالی جائے جس میں بقدر امکان مبالغہ سے احتراز کیا جائے۔ چونکہ حضور نواب صاحب ممدوح سے فی الجملہ تعارف تھا۔ اور انھوں نے سرسید کی امداد میں سب سے پہلے سبقت کی تھی۔ اور دربار دہلی میں ان کے شریک ہونے کی قوی امید تھی۔ اس لیے انہیں کو اس قصیدے کا ممدوح قرار دیا گیا۔ اگرچہ وہ علالت کی وجہ سے شریک دربار نہ ہوسکے۔ اور قصیدہ ان کی خدمت میں بوجہ حسب دلخواہ پیش نہ ہوسکا:۔

اس قصیدہ کا ایک شعر ہے۔

ورود حضرت نواب در دہلی بداں ماند
کہ آب رفتہ سوئے آبدان باز آید از دریا

اس پر حالی کا یہ نوٹ ہے۔

"یہ اشارہ ہے اس زمانے کی طرف جبکہ نواب ممدوح کے والد ماجد نواب یوسف علی خاں مرحوم دہلی میں بہ حالت طالب علمی مقیم تھے اور نواب ممدوح صغر سن میں ان کے ساتھ یہیں رہتے تھے۔ یہ حالی کی حب الوطنی تھی کہ دربار دہلی میں بجائے انگریزی حکمران کے جس سے انعام واکرام ملنے کی زیادہ امید تھی ایک ہندوستانی رئیس کو اپنے قصیدہ کا ممدوح بنایا۔ اور ہندوستانی شاعری میں ایک نئی روایت قائم کی۔

تقریباً ۲۰ سال تک حالی اور نواب کلب علی خاں میں مراسلت اور یگانگت باقی رہی۔ ۲۳ مارچ ۱۸۸۷ء کو نواب کلب علی خاں کا انتقال ہوگیا۔ لیکن اس دوران حالی کے جو مراسم ریاست رام پور اہل رام پور سے قائم ہوگئے تھے وہ برقرار رہے۔

۱۸۸۹ء میں نواب حامد علی خاں تخت نشین ہوتے۔ تو انھوں نے دیگر اہل علم اور خیر خواہان ریاست رام پور کے ساتھ حالی کو رام پور آنے کی دعوت دی جس کے سلسلہ میں حالی نے ۲۰ فارسی اشعار کا ایک قطعہ تہنیت پیش کیا اور کچھ عرصہ بعد خود رام پور تشریف لاتے۔ اس قطعہ کے اس شعر پر۔

نواب حامد علی خاں (رشک)

مہرباں برخود گمانش کردہ ام
تاچہ تعبیر آرد ایں فرخندہ خواب

حالی کا یہ نوٹ ہے۔

مسند نشینی کے چند سال بعد نواب ممدوح نے خاکسار کو رام پور میں یاد فرمایا تھا۔ اس وقت اوّل یہ قطعہ بھیجا تھا اس کے بعد راقم خود گیا۔

حالی کے کچھ قریبی عزیز دار رامپور میں ملازم تھے۔ کچھ دوست احباب بھی تھے۔ اور کچھ شاگرد ومعتقد تمتد بھی تھے۔ دربار رام پور میں حالی کو

---

[1] دیوان حالی صفحہ ۱۴۱ مکاتیب غالب حالی بحیثیت شاعر۔

[2] ضمیمہ ۱۱۔ دہ کلیات حالی صفحہ ۱۰۹۔ سرکاری ریکارڈ ریاست رام پور

[3] ضمیمہ اردو کلیات حالی صفحہ ۲۲، ۳۶

ایک معزز مقام حاصل تھا۔ اسی وجہ سے خطوطِ حالی میں کثرت سے رام پور کا ذکر ہے۔ اور حالی اہلِ رامپور کی ہر خوشی میں خوش۔ اور ہر دکھ میں رنجیدہ نظر آتے ہیں۔

[1] ۱۵ اگست ۱۸۹۸ء کو خواجہ تصدق حسین صاحب کو لکھتے ہیں۔
رام پور کی الجھن کا حال تمہاری تحریر سے نیز پیسہ اخبار سے مفصل معلوم ہوا۔ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ سید احمد خاں کی روح کا تصرف ہے یا مسلمانوں کے دن پھرنے والے ہیں۔ کہ ایک مسلمان رئیس با اختیار کو کالج کے ساتھ اس قدر ہمدردی پیدا ہوئی ہے۔ خدا تعالیٰ حکیم اجمل خاں اور نواب محمد اسحاق خاں کو جزا دے یہ سب ان کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

۱۸۹۹ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

رام پور جو پارسل روانہ کیے تھے وہ وہاں پرسوں پہنچ گئے.....
رام پور سے خطوط آتے ہیں۔ ان میں وبائی ہوا کی شکایت ہے۔
خدا اپنے بندوں پر رحم کرے..... رام پور کے علاقہ میں ہوائی تار نہیں جاتا اس لیے پوسٹ آفس نے تار بھیجنے سے انکار کر دیا۔ عجب تشویش میں جان گرفتار ہے کل سے کام کاج سب بند ہیں۔

ایک اور خط میں لکھتے ہیں کہ عبدالعلی کا خط رام پور سے آیا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ اب میں بشواق سے بدل کر رامپور شہر میں آگیا ہوں اور میری تلی بڑھ گئی ہے۔ اس سبب سے تندرست نہیں رہتا۔

۱۹۰۱ء میں حالی نے شکریہ والیٔ رامپور کے عنوان سے ایک اہم ترکیب بند لکھا۔ وہ ان کی بیماری کی وجہ سے نامکمل رہا۔

اس ترکیب بند میں ۵۲ اشعار ہیں۔ اور اس میں حالی نے رام پور و اہلِ رامپور کی خوبیاں تعلیم کی اہمیت اور جاہلانہ رسموں کے خاتمہ کا بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔ یہ بند محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس منعقدہ رام پور کے لیے لکھا گیا تھا۔ حالی کی رام پور میں آمد و رفت کا سلسلہ نواب کلب علی خاں کے وقت سے جاری تھا۔ ۲۵ دسمبر ۱۸۹۶ء کو حالی مختصر سے دورے پر رام پور تشریف لائے۔ اس وقت ان کی طبیعت خراب تھی پھر بھی کچھ وقت کتب خانہ میں صرف کیا۔ اور معائنہ بک پر اپنے تاثرات قلم بند کیے۔ حالی کی رام پور میں آمد سے پہلے ۲۲ دسمبر ۱۸۹۳ء کو کتب خانہ میں چوری ہو گئی تھی اور کچھ اہم نادرات غائب ہو گئے تھے۔

حالی اس واقعے سے بہت متاثر ہوئے۔ اور انھوں نے خاص طور پر اس

---

[1] مکتوبات حالی صفحہ ۲۵۱ مکتوبات جلد دوم۔
[2] راقم کا مضمون حکیم اجمل خاں اور رام پور۔

واقعہ کا ذکر کیا۔ اور کچھ تجاویز پیش کیں تاکہ اس قسم کے واقعات دوبارہ نہ ہو سکیں۔ حالی کو چونکہ رام پور کے علمی و سرکاری حلقہ میں باعزت مقام حاصل تھا۔ اسی بنا پر ان کی تجاویز کو عملی جامہ پہنایا گیا۔ اور نتیجہ کے طور پر ان تجاویز نے اس کتب خانہ کی عوامی حیثیت کو نقصان پہنچایا۔ اور علامہ شبلی[1] وغیرہ کا اپریل ۱۸۹۱ء کا دستور کتب خانہ معطل کر دیا اور انتظامیہ نے ان تجاویز کا سہارا لے کر کتب خانہ کو کتابوں کا ایک خفیہ گودام بنا دیا۔ حالی لکھتے ہیں۔

میں[2] نے آج اس کتب خانہ کو دیکھا۔ اگرچہ بسبب علالت کے جس قدر جی چاہتا تھا اس قدر میں کتب خانہ میں نہیں ٹھہر سکا۔ مگر مولوی مہدی علی خاں صاحب جو منصرم کتب خانہ ہیں، ان کی راہبری سے تھوڑی سی دیر میں مجھ کو کتب خانہ کی ترتیب و تقسیم و انتظام اور ہر قسم کی کتابوں کی تعداد اور دیگر ضروری مراتب سے کسی قدر واقفیت حاصل ہو گئی۔ اس زمانے میں مسلمانوں کی علمی اور دینی کتابوں کے ذخیرے خاص کر ہندوستان میں گردشِ روزگار سے برباد ہو گئے ہیں۔ یہ کتب خانہ "صانہا اللہ من جمیع آلآفات" فی الواقع ایک غنیمت کبریٰ اور مسلمانوں کے لیے باعثِ افتخار ہے۔ نہایت افسوس ہے کہ پچھلے دنوں میں یہاں سے چند نفیس اور قیمتی کتابیں چوری گئیں جن میں سے صرف تین کتابیں دستیاب ہوئیں باقی کتابوں کا اب تک کچھ پتہ نہیں ملا۔ جو قواعد کتب خانہ کی حفاظت اور نگرانی کے لیے مقرر کیے گئے ہیں وہ بہت عمدہ ہیں مگر میرے نزدیک ان میں یہ قاعدہ اور اضافہ ہونا چاہیے کہ کسی شخص کو کتب خانے سے باہر کتاب لے کر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ جہاں تک مجھ کو معلوم ہے حضرت خلد آشیاں کے عہد میں جن کے حسنِ توجہ سے یہ بے بہا دولت کا خزانہ جمع ہوا ہے یہی قاعدہ تھا کہ کوئی کتاب لائبریری سے باہر نہیں جانے پاتی تھی۔ اور سنا گیا ہے کہ کتب خانہ برٹش میوزیم اور یورپ کے تمام کتب خانوں میں بھی یہی قاعدہ جاری ہے کہ کوئی شخص کتاب لے کر باہر جانے کا مجاز نہیں۔

اس کے سوا یہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ لائبریری میں الماریوں کے سوا جتنی آئینوں کی جوڑیاں چڑھی ہیں وہاں ایک ایک اور جوڑی بغیر آئینوں کی چڑھوا دی جائے تاکہ جیسا ناگوار واقعہ پچھلے دنوں میں گذرا ہے، ویسا پھر ظہور میں نہ آئے۔ میں کتب خانے کے حق میں اس کو بڑی فال نیک سمجھتا ہوں کہ اس کا انتظام اور اس کی نگرانی جناب حکیم محمد اجمل خاں صاحب دہلوی سے متعلق کی گئی ہے۔

---

[1] راقم کا مضمون شبلی اور رام پور۔ معائنہ بک رضا لائبریری رام پور۔
دستور العمل کتب خانہ مطبوعہ اپریل ۱۸۹۱ء
[2] سرکاری گزٹ جلد نمبر ۱۶

حکیم صاحب جو باوجود علم وفضل کے نہایت علم دوست اور کتاب کے قدر شناس اور صاحب عقل سلیم ہیں امید ہے کہ ان کے حسن توجہ سے کتب خانہ کی حالت روز بروز ترقی کرتے گی اور مولوی مہدی علی خاں صاحب جو تمام لائبریری کی ناطق فہرست ہیں اور جن کی کارگذاری کے سبب لوگ مدّاح وثنا خواں ہیں سرکار دولت مدار سے ان کی زیادہ قدرافزائی فرمائی جاتے گی۔

انتظامیہ کمیٹی میں تجاویز حالی پر غور کیا گیا۔ اور یہ رزولیوشن پاس کیا گیا۔

(۱) مہدی علی خاں تحویلدار کتب خانہ کی تنخواہ میں اضافہ منظور کیا گیا۔
(۲) کتابوں کو گھر پہلے جانے کا سلسلہ بند کر دیا گیا۔
(۳) عوام کا داخلہ کتب خانے میں ممنوع قرار دے دیا گیا۔

حالی سے ایک سال بعد

۱۴ اکتوبر ۱۸۹۷ء کو اکبر الہ آبادی رام پور میں کتب خانہ دیکھنے تشریف لائے وہ معائنہ بک میں لکھتے ہیں۔[۱]

(۱) افسوس کے ساتھ یہ بات دریافت ہوئی ہے کہ پبلک کو عام اجازت یہاں آنے اور کتابوں کے دیکھنے کی نہیں ہے۔

(۲) یہ بھی افسوس ہے کہ اس کتب خانہ کی وسعت اور عظمت اور اس کے نادرات کا حال پبلک پر مشتہر نہیں کیا جاتا۔

(۳) اس کتب خانے میں ہر قسم کی کتابیں بہت کثرت سے موجود ہیں۔ البتہ تصنیف شدہ انگریزی وغیرہ کتابوں کا اضافہ بلاشبہ توجہ کے لائق ہے۔

لیکن ایسے لوگوں کے پیدا کرنے کی زیادہ ضرورت ہے جو ان کتابوں سے فائدہ اٹھا سکیں میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ایسی جماعت کو موجود کرے جو ان کتابوں سے استفادہ کرے ورنہ نور آفتاب سے بے بصر کیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

میں نے صرف ایک نوجوان عالم نجم الغنی خاں کو دیکھا کہ وہ نہایت مصروفیت سے کسی تاریخی واقعہ کی تحقیق کے لیے کتابوں کو ملاحظہ فرما رہے تھے۔ خدا ان کو جزائے خیر دے۔

اکبر کی دعا قدرت نے قبول کی اور یہ نوجوان عالم نجم الغنی خاں اکتوبر ۱۹۲۱ء میں ناظم کتب خانہ مقرر ہوتے۔ انھوں نے اس کتب خانہ کے تن مردہ میں جان ڈال دی۔ عوام کو عام استفادہ کی اجازت دی۔ اخبارات و رسائل مذاقِ عام کے کثرت سے منگا دیتے خواص کو کتابیں گھر پہ لے جانے کی اجازت دی دے اوقات کتب خانہ میں اضافہ کیا۔

والیِ ریاست کے علاوہ حالی کے تعلقات رام پور کے علمی حلقوں میں کافی وسیع تھے۔ وہ اپنے ایک خط میں مولانا محمد علی جوہر رام پوری کو لکھتے ہیں۔

پانی پت ۲۷ مئی ۱۹۱۲ء عزیزی عزیز الوجود دام بقاؤکم۔

سلام علیکم وعلیٰ من لدیکم۔ تار اس وقت پہنچا۔ جواب چونکہ طولانی تھا اس لیے تار کے ذریعہ نہیں بھیجا۔ ہمدرد کے باقاعدہ جاری ہونے کی خبر سے اس لیے بے انتہا مسرت ہوئی کہ میری زندگی میں دلی کو یہ عزت حاصل ہونے والی ہے کہ اردو کا عمدہ ترین پرچہ یاس وامید کی سخت کشمکش کے بعد وہاں سے جاری ہونے والا ہے۔

غالباً آپ کو یاد ہوگا کہ جب پہلی ہی بار ہمدرد کے نکلنے کا چرچا ہوا تو میں نے آپ کے حکم کی تعمیل کے خیال سے ہمدرد میں درج کرنے کے لیے مولانا نذیر احمد مرحوم کی سوانح عمری مرتبہ سید افتخار عالم پر ریویو لکھ کر دفتر کامریڈ میں مولانا عبدالحلیم شرر کی خدمت میں بھیج دی تھی ....

اگرچہ یہ ریویو کچھ چیز نہیں ہے مگر ایک قریب المرگ آدمی کے منہ سے جو الفاظ بُرے یا بھلے نکل جاتے ہیں انھیں کو غنیمت سمجھا جاتا ہے۔ میں فی الواقع اب مضمون لکھنے کے قابل نہیں رہا۔

رات گزری ہو چکا دورِ نشاط
طے ہوئی بس اب کوئی دم میں بساط
کوچ کی جالی کرو تیاریاں
ہے قویٰ میں دمبدم اب انحطاط

دونوں رباعیاں تو مجھے یاد ہیں وہ اس خط میں لکھے دیتا ہوں۔ اگر مناسب ہوں تو ان کو بھی اول پرچہ میں کسی موقع پر چھپوا دیجیے گا۔

رُباعی

تمغوں کی ہوس نہ یاں خطابوں کی طلب
اک ملک کی خدمت کا ہے سودا یارب
ہمدرد کو اسمِ بامسمیٰ کیجو
اس نام کی لاج ترے ہی ہاتھ ہے اب

اقوام میں زندگی کی ہے روحِ جہاں
چونک اٹھتے ہیں ایک "ہاں" پہ پیر و جواں
کرتی نہیں وحی مردہ قوموں میں وہ کام
جو کام اک کارٹون کرتا ہے وہاں

حالی کے بڑھاپے کا آخری بڑا حادثہ مسجد کانپور کے سلسلہ کا

---

۱ معائنہ بک رضا لائبریری
۲ علامہ نجم الغنی خاں مرتبہ راقم مطبوعہ ناظم پریس رامپور ۱۹۷۰ء

قتلِ عام تھا جس میں انگریزوں نے نہتے ہندوستانیوں پر اپنے اسلحہ کا مظاہرہ کیا۔

اس المیہ نے حالی کو بے حد دل گرفتہ کر دیا۔ اور انھوں نے چند رباعیاں لکھ کر اہلِ وطن کو آخری پیغام دیا ان میں حالی نے "ہندو مسلم اتحاد" اور مصیبت میں ایک دوسرے کے شریک ہونے کی تلقین کی ہے۔

یہ رباعیاں ۱۸، اکتوبر ۱۹۱۳ء کے ہمدرد میں شائع ہوئیں۔ اس کے بعد حالی کی زبان سے کوئی شعر نہیں سنا گیا۔ وہ کہتے ہیں۔

صد شکر وطن سے کوچ نفرت نے کیا
گھر اہلِ وطن کے دل میں الفت نے کیا
تقریروں سے ہو سکا نہ تحریروں سے
جو کار نمایاں کہ مصیبت نے کیا

تائید میں حق کی جو بلا آتی ہے
ساتھ اپنے بہت سی برکتیں لاتی ہے
بچھڑے ہوئے دوستوں کو ملواتی ہے
روٹھے ہوئے بھائیوں کو منواتی ہے

اس کے بعد حالی سخت علیل ہو گئے اور زبان بند ہو گئی۔

خواجہ عبدالمجید دہلوی ان کی عیادت کو گئے تو حالی دیکھ کر رو دیے۔ اور انھوں نے فی البدیہہ یہ قطعہ کہا۔

یہ احوال حالی کا خواجہ سے کہہ دو
ہے زندہ مگر اس کو چپ لگ گئی ہے
یہ حالی نہیں اس کا بت ہو تو ہو
مگر کس بلا کی یہ کاریگری ہے
سکوتِ مجسّم، تعجب کی جا ہے
خموشی تو ضرب المثل موت کی ہیں

آخر کار انسانوں کی بستی سے اس فرشتہ نے ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء کو ۷۷ سال کی عمر میں کوچ کیا۔ حالی کی وہ پہلی درخواست تھی جو انھوں نے نواب یوسف علی خاں والیٔ رامپور سے کی تھی۔ اور وہ ان کا آخری پیغام تھا جو مولانا محمد علی جوہر رامپوری کے توسط سے قوم کو دیا اور اخبار ہمدرد میں ان رباعیوں کی شکل میں شائع ہوا۔ یہ بات پورے اعتماد سے کہی جا سکتی ہے کہ حالی نے نظم و نثر عربی فارسی اور اردو میں جس خوش عقیدگی کا اظہار اہل رام پور اور شہریار رامپور سے کیا ہے وہ کسی اور کے حصہ میں نہیں آیا۔

بقیہ

سجاد حیدر یلدرم اور علی گڈھ

مضمون معہ ترجمہ کے ارسال خدمت کرتا ہوں" سجاد حیدر کے اس مضمون میں جہاں مسلم یونیورسٹی کا ذکر ہے اس کا ایک اقتباس یہ ہے "علی گڈھ یونیورسٹی میں پندرہ سو طلبہ ہیں یہ ہندوستان کی سب سے بڑی ریزیڈنشل یونیورسٹی ہے۔ ہندوستان کی سب سے بڑی غیر ریزیڈنشل یونیورسٹی کلکتہ ہے۔ ۱۸۷۵ء میں سید احمد خاں مرحوم نے جنہوں نے مسلمانان ہندوستان میں تعلیم جدید جاری کرنے کی کوشش بلیغ فرمائی اور جس کی وجہ سے تمام مسلمان ان کے نام کو عزت و احترام سے یاد کرتے ہیں علی گڈھ میں اس دارالفنون کی بنا ڈالی یہ ابتدا میں صرف ایک اسکول تھا جو ترقی کر کے ایک کالج ہوا اور ۱۹۲۱ء میں یونیورسٹی کے درجہ تک پہنچا اس میں سولہ فیکلٹی (شعبے) ہیں۔ انگریزی، اور انگریزی ادبیات تاریخ و علوم سیاسی۔ اقتصادیات، فلسفہ، طبیعات و کیمیا، ریاضیات، جغرافیہ، حقوق، عربی، فارسی، اردو و سنسکرت، الٰہیات سنی و شیعی، نباتات و حیوانات، تعلیم و تربیت۔ اس دارالفنون میں مذہبی تعلیم لازمی ہے۔

سجاد حیدر کا خیال تھا کہ مشرق و مغرب کی کشمکش کا مطالعہ کرنے اور اسلام اور جدید ترکی کو سمجھنے کے لیے ترکی زبان کا جاننا غایت درجہ ضروری ہے۔ سجاد حیدر ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ یہاں باقاعدہ ترکی زبان کی درس و تدریس کا آغاز ہوا۔ وہ یہاں دو سال تک ترکی زبان و ادب کا درس دیتے رہے اور گویا حاجی نواب اسمٰعیل سے ترکی زبان کی شکل میں انھوں نے جو قرض لیا تھا وہ ادا کرتے رہے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے "ہم اپنے بزرگ محترم اور مشہور ادیب سید سجاد حیدر صاحب یلدرم بی اے کے شکر گذار ہیں کہ موصوف نے ترکی سکھانے اور پڑھانے کا اپنے لیے کوئی معاوضہ گوارا نہیں فرمایا۔ خدا کرے ان کے ایثار سے ترکی ادبیات کو ہماری یونیورسٹی میں قبول عام نصیب ہو۔"

سجاد حیدر کو علی گڈھ سے جو لگاؤ تھا اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ۱۹۲۹ء میں یلدرم نے اپنی ایک بھتیجی کو اس کی شادی کے موقع پر جو ساڑی تحفۃً دی تھی، اس پر یونیورسٹی کا "مونوگرام" کاڑھا گیا تھا۔ سجاد حیدر کو سرسید سے بھی بڑی عقیدت تھی وہ انھیں اپنے وقت کا فردِ کامل بلکہ اکمل سمجھتے تھے۔ انھوں نے سرسید کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ سرسید کی برسی کے موقع پر انھوں نے جو مضمون لکھا ہے اس کے حرف حرف سے عقیدت ٹپکتی ہے۔

ان معروضات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یلدرم کی تشکیل میں بڑا ہاتھ علی گڈھ کا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ علی گڈھ تحریک کے تناظر میں یلدرم کی بازیافت کی باقاعدہ کوشش کی جائے۔ ●

غزلیں

نجیب رامش
معرفت راشٹریہ پرکاشن مندر، مونیا پارک
ابراہیم پورہ - بھوپال ۴۶۲۰۰۱

ناتواں کرنیں، تھکی ہاری ہوائیں سست گام
جیسے سورج جاتا تھا - کیسی ہوگی میری شام
پیاس پھر بھڑکی ہے، پھر اس سر پھرے کا وہی کلم
انگلیوں سے اپنے لب پر لکھتے رہنا کوئی نام
چند تصویریں بنائی ہیں - نہ جانے کس کی ہیں
الوداع کی خوشبوؤں میں گھول کر کچھ رنگِ شام
اف یہ سناٹا! کہ جیسے میں بھی کب کا مر چکا
کم سے کم اک شور تو دن میں تھا، گھر سے ہم کلام
تو بھی بس اس رقص کے رکنے تلک میری رفیق!
پھر میں جانے کس کا ساغر - تو نہ جانے کس کا جام
جن کو چاہا - جن سے بچھڑے جن کی گودوں میں پلے
یاد کیجے تو پیکر ورنہ بے معنی سے نام

بسنت کمار بسنت
ٹیڑھی بازار، لکھنؤ

جو ہر قدم پہ مرا ہمسفر تھا رہبر تھا
وہ میرا عزم تھا یارو مرا مقدر تھا
بڑے خلوص سے جو ہنس کے بات کرتا تھا
وہی چھپائے ہوئے آستیں میں خنجر تھا
گھٹا وجود تو انساں تھا ایک ذرۂ خاک
بڑھا وجود تو اک بیکراں سمندر تھا
حصارِ ذات سے نکلا تو یہ ہوا محسوس
کوئی کسی سے نہ کمتر تھا اور نہ برتر تھا
بسنت کوئی سخنور نہ تھا نہ تھا فنکار
نہ جانے شہر میں کیوں اس کا نام گھر گھر تھا

شہپر رسول
(مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

کب چلا جاتا ہے شہپر کوئی آکے سامنے
سوئی کا گرنا بھی کیا آواز پا کے سامنے
روز بے مقصد خوشی آمد قتل کرتی ہے اُسے
روز مر جاتا ہے وہ اپنی انا کے سامنے
دوستوں کے زخم بُن کر اوڑھنا آساں نہیں
سب قبائیں ہیچ ہیں میری ردا کے سامنے
قلب کی گہرائیوں میں صرف تیرا عکس ہے
دیکھ لے کیا کہہ رہا ہوں میں خدا کے سامنے
اُس سے ٹکرا کر پلٹ آتا ہے میرا لفظ لفظ
وہ کہ اک دیوار ہے میری صدا کے سامنے
روز کوئی آس بھر جاتی ہے ان میں رنگ یاس
روز رکھ لیتا ہوں میں خاکے بنا کے سامنے

محمد یٰسین
چیف منسٹرز سکریٹریٹ، مولانا آزاد روڈ، سری نگر (کشمیر)

دور کا مسافر تھا، تھک کے سو گیا ہوگا
موڑ آتے رہتے ہیں، اُن میں کھو گیا ہوگا
وقت اُس کے ماتھے کو چومتے ہوئے اکثر
روشنی کی کرنوں میں غم پرو گیا ہوگا
کروٹیں بدلتی ہے آنگنوں کی تنہائی
اس کا خوبصورت جسم خواب ہو گیا ہوگا
باشعور چہروں پر رات کی کسل مندی
جسم کو جگاتے ہی ذہن سو گیا ہوگا
نرم گرم شاخوں پر منتظر گلابوں کو
اشک اشک آنکھوں سے کوئی دھو گیا ہوگا

مصطفےٰ مومن
ریذیڈنس ہومیو کلینک - دتے پور، بھوبلی روڈ - دھنباد ۸۲۶۰۰۱

تھرتھراتا ہے رکی موجوں کا شیشہ آنکھ پر
پڑ رہا ہے ڈوبتے منظر کا سایہ آنکھ پر
ڈھونڈتا رہ جائے گا اُڑتا پتنگا روشنی
رفتہ رفتہ آ گرے گا ایک پتہ آنکھ پر
بادلوں کا رقص تھا نزدیک کے اک گاؤں میں
رک گیا تھا آن کر سیلاب گریہ آنکھ پر
چبھ رہا تھا میرے اندر ایک کانٹا خوف کا
بوجھ بڑھتا جا رہا تھا رفتہ رفتہ آنکھ پر
فصلِ گل آئے تو کیا شاخِ طرب جھکنے لگی تو کیا
ایک کانٹا روح میں ہے ایک کانٹا آنکھ پر

تارا چند دت قمر
۲/۵ ریلوے کالونی - لودھی روڈ --- نئی دہلی

وہ آفتاب رونقِ دنیا کہیں جسے
میں ایک ذرہ ننگِ تماشا کہیں جسے
دل کو فریبِ وعدۂ فردا سے ہے ملی
بیتابیٔ جنوں کہ تمنا کہیں جسے
وارفتگی سے عشق کی اپنا دلِ حزیں
اک ذرہ ہے کہ زود کشِ صحرا کہیں جسے
یک قطرۂ اشک میں ہے وہ طوفانِ اضطراب
اہلِ نظر تلاطمِ دریا کہیں جسے
وہ ایک لمحۂ راحت جام [illegible] کہاں
[illegible] زندگی کا [illegible] کہیں جسے

مجید انور

افق اور عمود

ٹرین کے رکنے کے بعد میں ویٹنگ روم میں سامان رکھوانے لگا تھا کہ شام کی ٹرین سے واپس بھی جانا ہے یہ سامان کہاں لٹکاتے لٹکاتے پھرتا۔ میں نے سامان ویٹنگ روم میں رکھوا دیا۔ جب میں اسٹیشن سے باہر آیا تو کوئی سواری نہ تھی، صرف ایک آٹو رکشا بچا تھا۔ مجھے یہ سواری پسند نہیں۔ اور رکشا ڈرائیور تیز رفتار آہنی لاریوں اور کاروں کے درمیان یوں تیز رفتاری کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ موت سامنے نظر آتی ہے۔ اسی لیے اکثر آٹو رکشا سے اترنے کے بعد دل ہی دل میں ڈرائیور کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ وہ صحیح سلامت منزل تک لے آیا ہے۔

کوئی اور سواری نہ تھی۔ اس لیے مجبوراً آٹو رکشا کی طرف بڑھا۔ نوجوان رکشا ڈرائیور باہر کھڑا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے اندر بیٹھتے ہوتے کہا۔

"کہاں جانا ہے آپ کو؟"

"بوڑھوں کی بستی تک جانا ہے۔" میں نے اس کی بیل باٹم پتلون اور سر کے بڑھے ہوتے بالوں کے گھونسلے کو دیکھ کر کہا۔ اور سوچنے لگا۔ آج کل بیل باٹم پتلونوں اور سر کے بڑھے ہوتے بالوں کا رواج کافی تیزی سے پھیل رہا ہے۔

وہ انجن اسٹارٹ کر چکا تھا۔ لیکن میری بات سن کر اس نے انجن بند کر دیا۔ اور مڑ کر بولا۔

"تو جناب پھر مجھ کو خالی رکشا لے کر آنا پڑے گا۔ آپ کوئی اور سواری دیکھیے...... !"

"نہیں بھائی! مجھے واپس بھی آنا ہے۔ بس کچھ دیر کا کام ہے۔ چاہو تو زائد کرایہ لے لینا!"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور انجن اسٹارٹ کر کے تیزی سے ایک چکر کاٹا۔ اور شاہراہ پر آکر شہر کی مخالف سمت میں دوڑنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد ہریالی ختم ہو گئی۔ اور دھوپ میں جلتے ہوتے زرد میدان شروع ہو گئے۔ جس کے درمیان سڑک ایک لمبے کالے فیتے کی طرح بچھی ہوتی تھی۔ چوں کہ رکشا کے انجن کے ساتھ سائیلنسر فٹ تھا۔ اس لیے شور نہ تھا۔ بلکہ سریلی مدھم آواز تھی، جو اس جلتے ہوتے ویرانے سے گذر رہی تھی۔

میں نے سگریٹ سلگا کر تیلی باہر پھینک دی۔ اور ڈرائیور کی طرف دیکھا۔ اس کے لمبے لمبے بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔ اور عقب نما آئینے میں منظر تیزی سے پیچھے بھاگ رہے تھے۔

"بوڑھوں کی بستی میں تو اکثر تمہارا جانا ہوا ہو گا۔ کیسی بستی ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"اچھی خاصی بستی ہے۔" اس نے کہا۔

"اچھی خاصی سے تمہاری کیا مراد ہے؟ کیا تمہیں وہ پسند نہیں؟"

"اس میں پسند اور ناپسند کا کیا سوال۔ جیسی عام بستیاں ہوا کرتی ہیں، ویسی ہی ہے۔ خوبصورت بنگلے، کشادہ گلیاں، صاف ستھری سڑکیں، ایک جگہ لائبریری اور بستی کے درمیان وسیع خوبصورت ہرا بھرا پارک! اور کیا چاہیے ان بڈھوں کو......"

سڑک ہموار اور سیدھی تھی۔ اس لیے اس نے رفتار بڑھا دی۔ کانپتا ہوا منظر تیزی سے بھاگنے لگا۔ سریلی گنگناہٹ میں کرختگی پیدا ہونے لگی۔

"کیا اتنی تیزی سے سفر کرنا مناسب ہے؟"

"اگر آپ کو حادثے کا خوف ہے تو میں کہوں گا آپ مجھ پر اعتماد نہیں کر رہے ہیں۔ میں اس رکشا کو اچھی طرح کنٹرول کر سکتا ہوں۔ اور آپ کو قبل از وقت منزل تک پہنچا دوں گا۔"

"کوئی ضرورت نہیں۔" میں نے ترشی سے کہا "قبل از وقت منزل تک مجھ کو نہیں پہنچنا ہے۔"

اس نے کچھ کہا نہیں۔ البتہ رفتار کچھ معمول پر آگئی۔

"کیا آپ بھی وہاں رہنے کے لیے جا رہے ہیں؟"

"نہیں! مجھے صرف ایک آدمی سے ملنا ہے ملاقات کر کے واپس آنا ہے۔ اچھا یہ بتاؤ۔ اس بستی میں رہنے والوں کے بارے میں تمہارے کیا خیالات ہیں؟"

"بستی میں زیادہ تر پینشن یافتہ بوڑھے رہتے ہیں۔ یا وہ لوگ جن کے بچے شہروں میں کاروبار کرتے ہیں۔ شہروں میں زندگی بے حد تیز رفتار اور ہنگامہ خیز ہوتی ہے۔ اس لیے یہ لوگ شہر کی زندگی چھوڑ کر یہاں سکون سے رہتے ہیں۔ شہروں میں رہیں تو شہر ان کے لیے مسئلہ۔ اور یہ لوگ بھی شہر کے لیے مسئلہ بن سکتے ہیں۔ اچھا ہے یہاں وہ لوگ سکون سے رہتے ہیں...... آپ تیز رفتاری کو پسند کرتے ہیں۔ شاید نہیں۔ ورنہ میں بھی اتنی ہی اسپیڈ

• محلہ ناصر جنگ "مولانا آزاد روڈ" نیا پورہ
مالیگاؤں (۴۲۳۲۰۳)

سے رکشا چلاتا۔ تیز رفتاری کیا دلچسپ شے ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے ہوا میں اڑ رہے ہیں۔ اور ہمارے آس پاس سے پہاڑ، دریا، میدان اور جھیلیں گذرتی جا رہی ہیں۔ اور ہم پرواز کرتے ہوتے تیزی سے گذر رہے ہیں۔"

رکشا کی رفتار پھر تیز ہونے لگی۔ دور کی پہاڑیاں لرزنے لگیں۔ اور عقب نما آئینے میں کالی سڑک کا فیتہ تیزی سے کھنچتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

"بند کرو اپنی پرواز!" میں نے ڈانٹ کر کہا۔

"او! معاف کیجیے گا۔ میں بھول گیا تھا ......"

رفتار کم ہوگئی۔ وہ خاموش ہوگیا۔ اور میں مگر بیٹھے ہوتے باہر کا یکساں منظر دیکھتا رہا۔

تھوڑی دیر بعد رکشا بستی میں داخل ہوگیا۔ دوپہر کی تیز دھوپ میں بستی سنسان اور ویران تھی۔ کہیں کہیں گرد کے بگولے چکرا رہے تھے۔ اور سناٹا کانوں میں سیٹیاں بجا رہا تھا۔ یوں لگا جیسے میں دُنیا کے آخری سرے پر آگیا ہوں۔ بستی کے بیچ میں ہرا بھرا پارک تھا۔ جہاں رنگین پھول تیز دھوپ میں مرجھا رہے تھے۔ میں نے رکشا رکوایا۔ اور اس سے کہا۔

"تم یہیں منتظر رہو۔ میں جلد ہی آجاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ لیکن ذرا جلد آئیے گا۔ کیسا قبرستان ہے ....."

میں نے جیب سے ڈائری نکالی۔ اور مکانوں کے دروازوں پر لگی پلیٹیں پڑھتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں مجھے اپنا مطلوبہ مکان مل گیا۔ میں نے دروازے پر دستک دی۔ قدموں کی چاپ سنائی دی۔ جو دروازے کے قریب آرہی تھی۔ پھر دروازہ کھلا۔

"کہیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"کیا آپ کو میرا خط مل گیا تھا؟"

"او۔ آپ ہی ہیں۔ اندر تشریف لائیے۔ میں آپ کی آمد کا منتظر تھا۔ اچھے وقت آتے ہیں۔ ٹی۔ وی۔ پر کرکٹ میچ ہو رہا ہے۔ آئیے۔"

میں اندر داخل ہوگیا۔ کمرے میں کافی ٹھنڈک تھی۔ کھڑکیوں پر گہرے سبز پردے لٹک رہے تھے۔ جس کی وجہ سے دھوپ کی گرمی اندر نہیں آپا رہی تھی۔ اور کمرے میں ہلکی سبز روشنی اور ملائم خنکی تھی۔ میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ کچھ کہے بغیر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ قریب ہی تپائی پر رکھے ٹی۔ وی۔ کے اسکرین پر کرکٹ کا پروگرام چل رہا تھا۔

دوسرے کمرے سے وہ جلد ہی آگیا۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی۔ گلاس میں سبز رنگ کا شربت، جس میں برف کے ٹکڑے آہستہ آہستہ پگھل رہے تھے۔ ٹرے تپائی پر رکھ کر اس نے ایک گلاس میری طرف بڑھایا۔ میں کچھ کہے بغیر شربت پینے لگا۔ کیوں کہ مجھے پیاس محسوس ہو رہی تھی۔

"ہاں صاحب! کہیے آپ کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں؟"

"کچھ عرصہ قبل آپ لوگ ایک تحریک چلا رہے تھے۔ جو بچوں سے متعلق تھی۔ بس اسی سلسلے میں آپ سے معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ جیسا کہ میں نے خط میں بھی آپ کو لکھا تھا۔ غالباً آپ اس تحریک کے سرگرم رکن بھی تھے۔"

اس نے گلاس تپائی پر رکھ دیا۔ اور کچھ سوچتے ہوتے کہنے لگا۔

"مجھے ٹھیک سے یاد نہیں اس تحریک کی تجویز کس نے پیش کی تھی۔ بہر حال ہماری بستی کے کلب میں کسی نے بچوں کی فلاح و بہبود کا ذکر چھیڑا تھا۔ پھر وہ ذکر طول پکڑتا چلا گیا۔ آخر میں طے ہوا کہ باقاعدہ تحریک چلائی جائے۔ کیوں کہ یہ تحریک نئی آنے والی نسل کے لیے بے حد مفید ہوگی۔"

"ایک سوال ..... کیا اس تحریک کی پشت پر کوئی نظریہ یا پھر .....؟"

وہ ہنسنے لگا۔ "لیجیے سگریٹ ..... ہم لوگوں نے پہلے ہی طے کر لیا تھا کہ ہماری اس تحریک کا کسی مذہب یا نظریے سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ بلکہ اس کا تعلق صرف اور صرف ہمارے سامنے کی جاری زندگی سے ہوگا۔ کیوں کہ صاحب! کوئی بھی مذہب کوئی بھی نظریہ ایک وقت میں آخر منجمد ہو ہی جاتا ہے۔ اور زندگی آگے نکل جاتی ہے۔"

میں نے سگریٹ سلگایا۔ نیلا دھواں کمرے کے سبز دھندلکے میں آہستہ آہستہ گم ہونے لگا۔

"میں یہ معلوم کرنا چاہوں گا کہ آپ لوگوں کی تحریک کا طریقہ کار کیا تھا؟"

"ہم لوگوں نے طے کیا کہ ایک اسکول کھولا جائے۔ جہاں بچوں کو آنے والی زندگی سے متعلق آگاہی دی جائے۔ تاکہ جب وہ بڑے ہو جائیں اور اپنی عملی زندگی میں قدم رکھیں تو ان سے وہ غلطیاں سرزد نہ ہوں، جو نوجوانوں سے ہوتی ہیں۔ اس طرح وہ عملی زندگی کامیابی سے گذار سکیں۔ ہم لوگوں نے اسکول قائم کیا۔ جہاں بچے تعلیمی اوقات کے بعد آیا کرتے تھے۔ ہم ان بچوں کو زندگی سے متعلق اہم نکات پر جانکاری دیا کرتے تھے۔ ہمارے ذہن زندگی کے تجربات سے معمور تھے۔ ہم نے زندگی کو ہر پہلو سے دیکھا، سمجھا اور جھیلا تھا۔ ہم قطرہ قطرہ اپنے تجربات ان کے ذہنوں میں انڈیل رہے تھے۔ یہیں نہیں بلکہ ہم ان بچوں کو لے کر اسکول سے باہر آتے اور سڑکوں، گلیوں اور بازاروں میں گھومتے پھرتے۔ تاکہ بچے اپنی آنکھوں سے زندگی دیکھ اور سمجھ سکیں۔"

"آپ لوگ واقعی جینئس ہیں۔" میں نے سگریٹ ایش ٹرے میں بجھاتے ہوتے کہا۔ "اس طرح ایک نسل کی ذہنی پرورش ایک کارنامہ ہے۔ کیا آپ حضرات اپنے مشن میں کامیاب رہے؟"

"ہم لوگ اپنے مشن میں کامیاب رہے۔ کیوں کہ وہ بچے جب بڑے ہوتے اور انھوں نے اپنی عملی زندگی میں قدم رکھا تو ان سے وہ غلطیاں نہ ہوئیں۔ جو نوجوانوں کا خاصہ ہیں۔ اور وہ اپنی عملی زندگی میں انتہائی کامیاب رہے۔"

"پھر آپ لوگوں نے وہ تحریک کیوں ختم کر دی؟"

وہ کچھ دیر خاموش ٹی۔ وی۔ کے اسکرین کو دیکھتا رہا۔ جہاں میدان میں کھیل جاری تھا۔ اور فاسٹ باؤلر کی تیز رفتار گیند نے وکٹیں اڑا دی تھیں۔

"ہمیں وہ تحریک ختم کرنا پڑی۔ اس کی وجہ یہ کہ انسان بہر حال فطرت کے آگے مجبور ہے۔ فطرت نے اپنے کچھ اصول بنا رکھے ہیں۔ ان اصولوں کے دائرے کے باہر جب بھی انسان قدم نکالے گا، اس کی سزا پائے گا۔ ہمارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ بچے جن کا ذہن تتلی کے پروں جیسا نرم و نازک تھا، زندگی کے بھیانک اور مکروہ چہرے کو دیکھ کر جھلس گیا۔ یہ سچ ہے کہ وہ اپنی عملی زندگی میں کامیاب رہے تھے لیکن جب وہ جوان ہوتے تب ہی ان کے بال سفید ہو گئے۔ آنکھیں زرد ہو گئیں۔ اور چہرے پر جھریاں پڑ گئیں۔ اور وہ پوری نسل اپنی زندگی کے ایک جنون خیز عہد سے کٹ گئی، جسے جوانی کہتے ہیں۔"

وہ خاموش ہو گیا۔ اور مجھے اپنے چاروں طرف سناٹا گہرا ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ ٹی۔ وی۔ کے اسکرین پر کھیل بدستور جاری تھا۔ اچانک خاموش فضا میں ہارن کی آواز آئی۔ میں چونک پڑا۔ میں نے بوڑھے کی طرف دیکھا۔ وہ خاموش تھا۔ میں اٹھ کر کھڑکی کے پاس آیا۔ پردہ ہٹایا۔ دھوپ تلوار کی طرح چمک کر سبز دھند لکے والے کمرے میں در آئی۔ کھڑکی سے باہر جلتے ہوئے میدان کے اس پار درختوں کے سائے میں وہ نظر آیا۔

"کون تھا؟" بوڑھے نے پوچھا۔

"ڈرائیور..... اچھا اب میں چلتا ہوں۔" وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

میں باہر آ گیا۔ دھوپ بدستور نیزے برسا رہی تھی۔ اور وہ سگریٹ پھونک رہا تھا۔ میں رکشا میں بیٹھ گیا۔ انجن غرا کر جاگا۔ اور منجمد سناٹے کو آواز بلیڈ کی طرح کاٹنے لگی۔ اور رکشا ایک نصف چکر کاٹ کر شہر کی طرف جانے والی سڑک پر چل پڑا۔

"کیا سنسان اور ویران بستی ہے۔" اس نے کہا۔ "ایسا لگتا ہے جیسے قبرستان سے نکل رہے ہوں۔"

"ہاں! لیکن اب ہم شہر کی طرف جا رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

سڑک کے دونوں طرف دھوپ میں جلتے ہوئے میدان تھے۔ سبزے کا دور دور تک نام و نشان نہ تھا۔ عقب نما آئینے میں گرد کا ایک بگولہ تعاقب کر رہا تھا۔ اور اچانک رکشا کی رفتار بڑھنے لگی۔ دور کی منجمد پہاڑیاں لرزنے لگیں۔ اور کانپتے منظر کے درمیان کالی سڑک کا فیتہ تیزی سے کھسکنے لگا۔

میں نے سوچا۔ اسے روکوں۔ اس سے کہوں، رکشا کی رفتار کم کر دے۔ لیکن میں کچھ نہ کہہ سکا۔ اور سنسان ویران سڑک سے رکشا برق رفتاری سے شہر کی طرف بھاگ رہا تھا۔

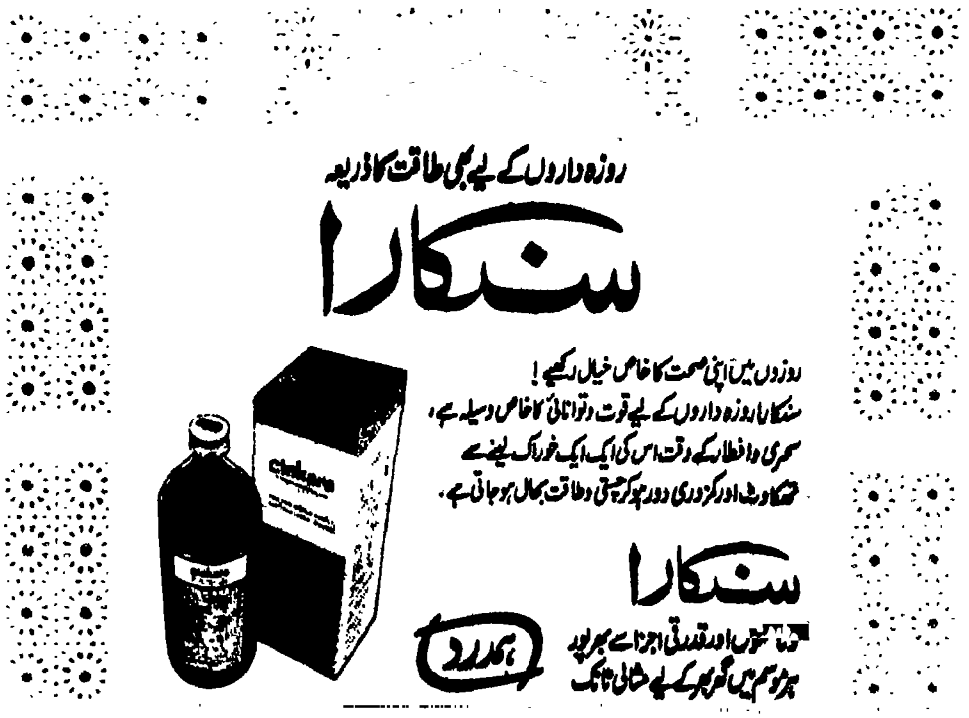

اصغر عباس

سجّاد حیدر یلدرم اور علی گڑھ

علی گڑھ کالج کی تاسیس ناسازگار فضا میں ہوئی تھی، لیکن جلد ہی کالج کو ایسے اُستاد اور طلبہ میسر آئے جنھوں نے اس کے نقش و نگار روشن کرنے میں بیش از بیش حصّہ لیا اور کالج کی شہرت کو ملک ہی میں نہیں بیرونِ ملک بھی پہنچا دیا۔ ایسے طالب علموں میں سیّد سجّاد حیدر بھی ہیں، جنھوں نے براہِ راست سر سیّد، شبلی اور اقبال کے اُستاد آرنلڈ سے فیض اٹھایا اور ان سے زندگی، زبان اور ادب کے نکات سیکھے تھے۔ یہاں اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ علی گڑھ نے سجّاد حیدر کو کیا دیا اور علی گڑھ کی کیا خدمات انھوں نے انجام دیں۔

یوں تو وہ ۱۹۲۲ء میں شعبۂ اُردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بیے۔ ex-officio چیرمین اور ریڈر رہے۔ انھوں نے جنوری ۱۹۲۹ء تک یہ خدمت انجام دی۔ وہ نومبر ۱۸۹۸ء سے نومبر ۱۸۹۹ء تک اسٹوڈنٹس یونین کے سکریٹری رہے انھوں نے ۱۵ مئی ۱۹۰۰ء کو انجمن اردوئے معلیٰ کی بنیاد ڈالی اور اس کے پہلے ناظم مقرر ہوئے۔ وہ اخوان الصفا کے سرگرم کارکن تھے۔ وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے پہلے رجسٹرار تھے انھوں نے ۲۶ مارچ ۱۹۲۱ء سے ۳۱ جنوری ۱۹۲۹ء تک رجسٹرار کی حیثیت سے فرائض انجام دیے۔ اس کے علاوہ اور بھی دوسری سرگرمیاں ان کی ذات سے نمو پذیر تھیں، تاہم ان کے مرتبے کا تعین ان کے علمی ادبی اکتسابات سے ہوگا اور اس حقیقت کے اظہار میں کسی تکلف سے کام نہ لینا چاہیے کہ ان کی صلاحیتیں بڑی حد تک علی گڑھ کی رہینِ منّت ہیں۔

۱۸۹۲ء میں سیّد سجّاد حیدر مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے نویں درجے میں داخل ہوئے یہاں سے انھوں نے ۱۹۰۱ء میں بی اے کیا اور بعد میں لا میں داخلہ بھی لیا۔ وہ ۲۵ مارچ ۱۹۰۴ء تک کالج میں رہے۔ اُس زمانے میں علی گڑھ کالج میں روشن آثار طلبہ کی اچھی تعداد موجود تھی۔ ان میں مولانا محمد علی، بابائے اُردو مولوی عبد الحق، ظفر علی خاں، خوشی محمد ناظر، سر رضا علی، ظفر عمر، شوکت علی خاں فانی، قاضی تلمذ حسین، شیخ عبد اللہ بانی گرلس کالج، مشتاق احمد زاہدی اور حسرت موہانی وغیرہ تھے۔ یہ سب کے سب ادب کے شیدائی اور شعر و شاعری کے دیوانے تھے۔

اس زمانے کا علی گڑھ اپنی اقامتی زندگی اور مجلسی آداب کی وجہ سے ایک امتیازی حیثیت رکھتا تھا۔ اس فضا میں سجّاد حیدر کا ادبی شعور پروان چڑھا۔ انھیں علی گڑھ سے انس ہی نہیں عشق تھا ان کی ساری زندگی میں اس دلبستگی کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ علی گڑھ کالج میں سجّاد حیدر کا حلقۂ احباب وسیع تھا لیکن ان کا محبوب شغلہ مطالعہ تھا۔ فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے۔ ان کو نہ صرف اردو فارسی پر عبور تھا بلکہ انگریزی مضمون نگاری میں بھی کالج میں ان کی ٹکّر کا کوئی نہ تھا۔ اس زمانے میں انگریزی اخبار پانیر میں کسی کا مضمون چھپنا بڑے فخر و مباہات کی بات سمجھی جاتی تھی اکبر الہ آبادی نے بھی کہا تھا۔

چیز وہ ہے بنے جو یورپ میں
بات وہ ہے جو پانیر میں چھپے

سجّاد حیدر کو پانیر میں چھپنے کا اعزاز حاصل تھا۔ ان کا شمار کالج میں اُن کے اچھے انشا پردازوں میں تھا۔ وہ یونین کے بہترین انگریزی مقرر کا ہیوکاکس پرائز جیت چلے تھے۔ کالج میں خاص طور پر وہ اُردو ادبیات کو نئے رجحانات سے ہمکنار کرنے میں پیش پیش رہے۔ انھوں نے اپنی طالب علمی زمانے میں انجمن اُردوئے معلیٰ قائم کی۔ قاضی تلمذ حسین (مصنف مراۃ المثنوی) انجمن کی روئداد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ۱۵ مئی ۱۹۰۰ء کو واسطے ترقی زبان کے قائم کی گئی۔ انجمن کے جلسے ہر پندرھویں روز ہوتے تھے۔

"اوّل ناظم انجمن کے سیّد سجّاد حیدر صاحب بی اے مقرر ہوئے، جن اُردو کی انشا پردازی نظم میں ہو یا نثر میں کسی تعریف کی محتاج نہیں۔ کالج میگزین کے دیکھنے والے اس امر سے آگاہ ہیں کہ ان کے قلم میں خدا نے کیا طاقت دی ہے ان کا تخیل کس پایہ کا ہے۔ سیّد سجّاد حیدر صاحب آٹھ مہینے سے کچھ کم اس انجمن کے ناظم رہے اور انھیں کی کوششوں کا نتیجہ ہے جو آج ہم دیکھتے ہیں۔"

• شعبۂ اُردو مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

نجمن اُردو تے معلیٰ کا وجود حسرت موہانی کی نظامت تک برقرار رہا۔ اس کے تقریباً
نیس برس بعد رشید احمد صدیقی کے زمانے میں اس کا احیاء ہوا اور یہ آج بھی
شعبۂ اُردو مسلم یونیورسٹی میں قائم ہے۔

۱۸۹۸ء میں جب سرسیّد کا انتقال ہوا تو کالج میگزین کی کشتی بھی ہچکولے
لھانے لگی میگزین پر اس وقت قرض کا بار تھا اور اس کی آمدنی اخراجات کی
فیل نہ تھی۔ پرنسپل ماریسن نے اسے بند کر دیا تھا، لیکن سیّد سجّاد حیدر اور
یر ولایت حسین کی کوششوں سے یہ رسالہ علی گڑھ منتھلی کے نام سے جاری ہوا۔ اس
رسالے سے سجّاد حیدر کا رابطہ تا عمر رہا۔ علی گڑھ میگزین کی شکل میں انھیں ایک
رکز ثقل مل گیا، جس کے ذریعہ ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو فروغ ہوا۔ یہ صحیح ہے کہ
سجّاد حیدر کی پہلی تحریر یہ معارف کے ذریعہ منظر عام پر آئی (معارف سرسیّد کے
یق نواب حاجی اسمٰعیل خاں شیروانی اور سرسیّد کے لائبریری اسسٹنٹ
بوی وحید الدین مسلم علی گڑھ سے نکالتے تھے) یہ رسالہ جلد ہی بند ہوگیا۔
راصل سجّاد حیدر کی ادبی شہرت میں علی گڑھ میگزین کا بڑا حصّہ ہے، جس میں
بتیس سال تک برابر لکھتے رہے۔ ان کا مشہور ڈرامہ "جلال الدین خوارزم
اہ" (اس کے ابتدائی کچھ جز امتیاز علی تاج کے رسالہ کہکشاں لاہور میں چھپے
ے) مسلسل تین سال تک علی گڑھ میگزین میں قسط وار شائع ہوا۔ اس کے بارے
ایک نقاد نے لکھا ہے "کسی قوم کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لیے یہ
ب ڈاکٹر اقبال کی نظموں کا جواب ہے۔ ایسی حیات افروز اور روح پرور کتابیں
دو میں شاذ ہی دیکھنے میں آئی ہیں۔"

سجّاد حیدر کی ادبی حیثیت پر پہلا مضمون علی گڑھ میگزین میں شائع ہوا
اد حیدر جب یونیورسٹی کی خدمات سے سبکدوش ہوتے تو ایڈیٹر علی گڑھ
زین نے لکھا "گزشتہ سال ہمیں ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب کو پیغام وداع
بنا پڑا تھا۔ اس سال زمانہ کی رفتار نے ایک اور ہستی کے فیضان اثر سے
یں محروم کر دیا۔ اور زبان کا مایۂ ناز فرزند یلدرم آج علی گڑھ سے رخصت
چکا ہے اور علی گڑھ کی فضا اس کے وداع پر اشکبار ہے۔ سیّد سجّاد حیدر
جود علی گڑھ میں اُردو کی بنیاد قائم کیے ہوتے تھا اور اس صحبت دوشینہ کی یاد
ہ کر رہا تھا جس کا خمار اب تک اُردو کے متوالوں کو سرشار بناتے ہوتے ہے۔
ا زبان کے ماہر ہونے کی وجہ سے آپ نے علی گڑھ میں ایک ایسی پُر کیف فضا
م کر دی تھی جس میں ترکی اور اُردو ادب کے شاہکار بایک دگر ہم آغوش
پُرمسرت کی لہریں لے رہے تھے۔ بالآخر آج ہم اردو کے اس قابل صد نازش
یب اور علی گڑھ کے اس موجب صد افتخار فرزند کو الوداع کہہ رہے ہیں،
ا نے مادرِ علمی کے آغوش محبت میں اپنی عمر کا عزیز ترین حصّہ بسر کیا۔ اس امر کا
ہار بے سود ہے علی گڑھ کی یاد یلدرم کے دل سے کبھی محو نہ ہو سکے گی اور
یہاں کے کیف محبت سے سرشار مناظر ان کے دل کو ہمیشہ بے چین رکھیں گے تاہم
اتنا کہہ دینا بھی ضروری ہے کہ علی گڑھ کی فضا بھی اپنے عزیز ترین دوست کو
کبھی فراموش نہ کر سکے گی اور یلدرم کی آواز علی گڑھ کے گوشہ گوشہ میں برابر
گونجتی رہے گی۔"

سجّاد حیدر کو اُردو ادبیات کی تنگ دامانی کا احساس زمانۂ طالب علمی
میں ہو گیا تھا۔ اس سلسلے میں ان کا ناول نویسی پر مضمون اور "اُردو کے ساتھ
ہمارا سلوک" بھی دیکھنا چاہیے۔ انھوں نے اپنی تمام تر کوششیں اس پر مرکوز کر دیں
کہ کسی طرح اُردو ادبیات کا دامن وسیع ہو۔ اس سلسلے میں انھوں نے فارسی کے
ناول ہما خانم کو اردو کا جامہ پہنایا۔ خیالستان میں ایک مضمون انگریزی سے بھی
ماخوذ ہے، لیکن ان کے دامن ادب میں سب سے زیادہ چیزیں ترکی سے مستعار
ہیں۔ ترکی اور ترکوں سے سجّاد حیدر کو عشق تھا اور بقول نذر سجّاد حیدر "ترکی کا
عشق ان کو ایک عورت کے عشق سے دہ چند تھا" سوال یہ ہے کہ یہ عشق یکایک
ہو گیا تھا یا اس میں اس زمانہ کا فیضان اور علی گڑھ کالج کی کرامت بھی
شامل تھی۔

انیسویں صدی کا نصف آخر اور بیسویں صدی کی دو تین دہائیوں پر
ہندوستان میں ترکی کی محبت کی چھاؤں کہیں گھنی اور کہیں ہلکی پھیلی ہوئی ہے۔
یورپ والے ترکی کو مرد بیمار کہتے تھے لیکن اکبر آلہ آبادی کا خیال تھا۔

جہاں میں مظفر ہیں منصور ترک
عجیب چیز ہیں چشم بد دور ترک

اس دور کی ذہنی کیفیت کا اندازہ کرنا ہو تو اخبارات و جرائد
کے علاوہ عبدالحلیم شرر، نواب حاجی محمد اسمٰعیل خاں شروانی اور مولوی محمد
حسن یہاں تک کہ سرشار کے فسانۂ آزاد میں بھی یہ کیفیت در آئی ہے میاں
آزاد کے سامنے شرط وصل لیلیٰ یہ رکھی گئی تھی کہ وہ ترکی جائیں وہ وہاں لشکر اسلام
کے ساتھ میدان جنگ میں بہادری دکھائیں اور واپس آئیں تو اپنی مراد
کو پہنچیں اقبال نے بھی قسطنطنیہ کا ذکر بڑے احترام اور قلبی لگاؤ کے ساتھ
کیا ہے:

خطۂ قسطنطنیہ یعنی قیصر کا دیار
مہدیِ اُمّت کی سطوت کا نشان پائدار
صورت خاک حرم یہ سرزمیں بھی پاک ہے
آستانِ مسند آرائے شہ لولاک ہے

دراصل ترکی اور ترکوں کی محبت مسلمانوں کے جوش جنوں کی تاریخ
کا ایک حصّہ ہے اور اس زمانے کے ہندوستان پر اس کے گہرے اثرات
پڑے ہیں۔ یقیناً سجّاد حیدر نے بھی اس ماحول سے اثر قبول کیا ہوگا۔ لیکن

میرے نزدیک سجاد حیدر کو ترکی کی طرف مائل کرنے والے محرکات میں علی گڑھ، شبلی اور سرسید کے رفیق نواب حاجی محمد اسمٰعیل خاں شیروانی کو اہمیت دینی چاہیے۔ جس زمانے میں سجاد حیدر کالج میں داخل ہوتے یہاں عام طور پر لوگ ترکی کے شیدائی تھے۔ کالج کے یونی فارم میں ترکی ٹوپی اور کوٹ شامل تھا۔ گزٹ اور علی گڑھ منتھلی اور میگزین میں ترکی اور ترکوں پر برابر مضامین شائع ہوتے۔ یونین میں ان کے مسائل پر تقریریں ہوتیں۔ سجاد حیدر کے استاد شبلی (شبلی سجاد حیدر کے بڑے قائل تھے ورا اپنے مضمون "مسلمانوں کی پولیٹیکل کروٹ" میں سجاد حیدر کا ذکر کیا ہے) تازہ تازہ ترکی کے سفر سے واپس آتے تھے۔ وہ ترکوں کی بہادری کے قصے مزے لے لے کر سناتے اور ان کی حمایت میں تقریریں کرتے تھے۔ ۱۸۹۴ء میں ان کا ترکی کا سفر نامہ بھی چھپ کر ہاتھوں ہاتھ بکا تھا۔ ان سب کے اثرات طالب علم سجاد حیدر پر پڑے ہوں گے۔ ان کے دل میں ترکی کی محبت پیدا ہوئی اور اس کی نشوونما اور آبیاری حاجی اسمٰعیل کی ہمنشینی سے ہوئی، جن کی وہ انگریزی خط و کتابت دیکھتے تھے۔ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ شبلی نواب اسمٰعیل کے مکان کے ایک حصہ میں فروکش تھے ممکن ہے سجاد حیدر کے اُن سے تعارف کا وسیلہ شبلی ہوتے ہوں اور ان کی انگریزی قابلیت اور صلاحیت کی وجہ سے نواب اسمٰعیل نے سجاد حیدر کو اپنا سکریٹری مقرر کر لیا ہو۔

انھیں نواب اسمٰعیل سے سجاد حیدر نے ترکی زبان و ادب کے رموز سیکھے اور ترکی جرائد سے چھوٹے چھوٹے مضامین کا ترجمہ شروع کیا اور ترکی میں تصنیف و تالیف کی اس روایت کو پروان چڑھایا جس کی ابتدا اُردو میں انشاء اللہ خاں انشاء سے ہوئی تھی۔

۱۹۰۷ کے اگست اور دسمبر تک سجاد حیدر کے ترکی کے دو ناولوں کے ترجمے "ثالث بالخیر" اور "زہرا" کے نام سے علی گڑھ کالج بک ڈپو میں چھپ کر آگئے تھے۔ رفتہ رفتہ ترکی کو سجاد حیدر نے اپنا کعبہ مقصود بنا لیا۔ وہ ابھی کالج ہی میں تھے کہ پرنسپل ماریسن کی نگہ انتخاب ترکی کے ترجمان کے لیے ان پر پڑی اور پرنسپل کی سفارش پر سجاد حیدر کا اس عہدہ کے لیے انتخاب ہوا۔ وہ ۲۶، مارچ ۱۹۰۴ کو پہلی بار بغداد کے سفر پر روانہ ہوئے۔ سجاد حیدر جب بغداد پہنچے تو وہاں کے حالات پہلی بار یلدرم از بغداد کے نام سے علی گڑھ منتھلی کو بھیجے اور میر سوز کی اس شکایت کی تلافی کردی کہ ڈھونڈتے ہیں پر تخلص بھی نیا ملتا نہیں۔

سجاد حیدر کا یہ تخلص جو انھوں نے اپنی شاعری میں کبھی استعمال نہ کیا ان کی ادبی وجاہت کا زیور بن گیا۔

یلدرم اور اقبال

یلدرم کے روابط اپنے زمانے کے معقول اور ممتاز شعرا اور ادیبوں سے گہرے تھے شبلی، تو خیر ان کے استاد تھے، حالی پر وہ انجمن اردو کے معلیٰ جلسہ میں ایک اچھا مضمون پڑھ چکے تھے۔ وحید الدین سلیم کے رسالے میں وہ مضم لکھتے۔ امیر مینائی اور داغ کی وفات پر ان کے بڑے پرسوز مرثیے موجود ہیں۔ سر عبدالقادر سے ان کی بے تکلفانہ رسم و راہ تھی اور اقبال سے ان کے گہرے تعلقات تھے۔ ان لوگوں نے یلدرم کے ادبی ذوق کو سہارا دیا۔ یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ سر شیخ عبدالقادر، یلدرم اور اقبال کی دوستی کا نقطۂ ماسکہ وہ تحریک ہی ہے جو سرسید اور ان کے رفیقوں کے اثر سے اردو میں ایک ذہنی انقلاب کا باعث ہوئی۔

سجاد حیدر کی ملاقات شیخ عبدالقادر سے نواب حاجی اسمٰعیل کے مکان پر پہلی بار ہوئی۔ یہیں ان لوگوں نے شبلی کے فکر سخن کا انداز دیکھا تھا، جس کا ذکر عبدالقادر نے اپنے ایک مضمون میں بڑے مزے سے کیا ہے۔ اسی مضمون میں وہ یلدرم کے بارے میں لکھتے ہیں کہ پہلی ہی ملاقات میں ہم دونوں کو معلوم ہو گیا کہ ہم کس قدر ہم مذاق ہیں۔ بعد میں جب شیخ صاحب نے مخزن کا اجرا کیا تو اس کے مستقل لکھنے والوں میں اُردو میں ادب لطیف کے بانی یلدرم بھی تھے۔ ان کے مضامین اور قصّوں کا پہلا مجموعہ خیالستان مخزن ایجنسی نے ۱۹۰۹ء میں پہلی بار شائع کیا۔

اقبال کی شاعری کے اولین زمانہ میں اہل زبان ان کو نئے انداز ابھرتا دیکھ کر ان کے کلام میں زبان و بیان کی خامیوں پر نکتہ چینی فرماتے ا محاورے کی غلطیوں کو اُچھال اُچھال کر مزے لیتے۔ اس زمانے میں بھی علی گڑ کے طالب علموں کی ایک بڑی تعداد اقبال کے کلام کی عاشق، گرویدہ اور رطب رہی ہے۔ اقبال شروع سے علی گڑھ کے محبوب ترین شاعر رہے ہیں، اقبا کے پرستاروں میں سجاد حیدر بھی تھے اور غالباً ان کی قدر شناس نظر و نے سب سے پہلے اقبال کی شاعرانہ عظمت کو بے نقاب دیکھا تھا۔ وہ ا تحریر "اُردو کا نیا شاعر اقبال" میں لکھتے ہیں "ہمیں خوشی اور کشادہ دلی ماننا چاہیے کہ اُردو کو ایک شاعر ملا ہے، جس کی آواز ہر روز لطیف تر اجـ کا نغمہ ہر آن شیریں اور جس کا تخیل ہر لمحہ بلند تر ہوتا جاتا ہے۔ یہ ننگ د یہ نجوں کا سا رشک، یہ ایک شخص کی خداداد قابلیت کے اعتراف سے ابا کیا ہے؟ اگر ایک عندلیب خوشنوا دفعتاً کسی شاخ گل پر بیٹھ کر ایسی جان آو اور دلگداز نغمہ سنجی شروع کر دیتی ہے جو اور عنادل میں نہیں تو میں خیال کرتا کہ اور ہمصفیران چمن اس نغمے کو سنتے ہیں اور اس نئے ہمصفیر کا دلی مسرت خیر مقدم کرتے ہیں۔ مگر ہمارے باغ سخن کے عنادل کسی نو عمر عندلیب ایسا نغمہ جو اُن کے نغمے سے بدرجہا بالاتر ہو بغیر رشک کے نہیں سن سکتے۔ تم ہے اور افسوس!" یہ تحریر ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی اور جہاں تک میرا علم

یلدرم کی اس تحریر سے اقبال کی شاعری کے افکار و علائم پر غور و خوض کا آغاز ہوتا ہے۔ مولانا محمد علی، عبدالرحمٰن بجنوری، مولانا اسلم جیراج پوری، مولوی عبدالرزاق مرتب کلیات اقبال (جو اتفاق سے سب کے علی گڈھ کے ہیں) کے اقبال پر مضامین اس تحریر کے بعد کے ہیں۔ اقبال سے یلدرم کی ارادت جیسے اس خط سے بھی ظاہر ہے جو سجاد حیدر نے گزٹ کے ایڈیٹر کو ۱۹۱۱ء میں لکھا تھا۔ وہ لکھتے ہیں "مجھے یقین ہے کہ اقبال نے آپ کے قلب کو انھیں جذبات سے متحسس کر دیا ہوگا جن سے کہ میرے۔ آپ کے اور میرے قلب ہی میں تلاطم نہیں ہے۔ آسمان شاعری کے اس تازہ ہلال نے (الحمدللہ کہ وہ اب بدر کامل ہو رہا ہے) اسلامی عمان ہندوستان کو متحرک کر رکھا ہے۔ اس بربط نواز نے ہر قلب کے اس تار کو اپنی جادو بھری مضراب سے چھیڑا ہے، جہاں اب تک سوائے حالی کے کسی کی مضراب نہ پہنچی تھی۔ پرتی شاعری کے میکدے میں اقبال نے پھر اپنے خم و ساغر بانٹنے شروع کیے ہیں۔ اور اک جہان ہے کہ مست ہو رہا ہے۔ صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب وقت آگیا ہے کہ ہم اس ساحر کی سحر طرازی کا اعتراف کریں۔ میں یہ تجویز پیش کرتا ہوں کہ دہلی کی محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں اقبال کے گلے میں قوم کی طرف سے ہار پہنایا جائے۔ ہائے وہ وقت کہ دہلی میں شاعروں کے منہ موتیوں سے بھر دیے جاتے تھے۔ اور اگر کاش مولانا حالی اس پیرانہ سالی اور ضعیف الحالی میں دہلی تشریف لا سکیں اور اپنے مبارک ہاتھوں سے اقبال کو ہار پہنائیں تو امید ہے کہ شاگرد حالی (اقبال) اسے اپنی سب سے بڑی عزت سمجھیں گے۔ اس طرح دہلی کی خاک پر اقلیم ادب میں ایک یہ مبارک رسم بھی ادا کی جائے۔ شاہ جہان آباد میں اس رسم کا ادا ہونا کیسا لطف دے گا۔ کون اہل ذوق اور صاحب طبع سلیم ہے، جو اس نظارے پر اشک ریز مسرت نہ ہوگا۔ میں نے ایک عریضہ اس بارے میں مسٹر محمد علی، ایڈیٹر کامریڈ کی خدمت میں اس درخواست کے بھیجا ہے کہ وہ اس طریقہ کو کامریڈ میں شائع فرما کر اپنی تائید سے اس تجویز کی وقعت بڑھائیں۔ میں جناب کی تائید کا بھی متمنی ہوں خاص کر اس لیے بھی کہ آپ کا اخبار باقاعدہ طور پر نواب وقار الملک بہادر کی نظر سے گزرتا ہے۔"

گزٹ نے بھی اس تجویز کی پُرزور تائید کی اور دہلی میں جب آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسہ ہوا تو اس کے تیسرے جلسہ کی اقبال نے صدارت فرمائی اور اس کے ساتویں اجلاس میں جس کی صدارت مولانا شاہ سلیمان پھلواروی نے کی یلدرم کی درخواست پر شبلی نے اقبال کی گلپوشی کی۔ یلدرم اقبال کو قوم کے لیے رحمت پروردگار سے کم نہ سمجھتے تھے۔ اقبال کو بھی سجاد حیدر سے گہرا لگاؤ تھا جو اقبال کے ان خطوط سے ظاہر ہے جو سجاد حیدر کے نام ہیں۔ علامہ نے اسلامی علم الانساب پر سجاد حیدر کی ایما سے بڑا فاضلانہ تبصرہ کیا ہے۔ یہ خط کی شکل میں قسطنطنیہ یونیورسٹی کے اسلامی علم الانساب کے پروفیسر خلیل خالد بے کے نام ہے اور اقبال نامہ کی دوسری جلد میں شامل ہے۔ یلدرم کے شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی کے زمانۂ صدارت اور ۲۳-۱۹۲۲ء کے تعلیمی میقات میں اقبال شعبۂ اُردو مسلم یونیورسٹی کی پہلی بورڈ آف اسٹڈیز کے اکسٹرنل ممبر تھے۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے سجاد حیدر کو ترکی کی ہر شے عزیز تھی وہ وہاں کئی بار گئے لیکن خاص بات یہ ہے کہ ترکی کے کسی سفر میں وہ علی گڈھ کو بھولے نہیں پہلی بار جب گئے تھے تو علی گڑھ منتھلی کو انھوں نے سواد بغداد سے اپنے سفر کی روئداد بھیجی اور گزٹ کو اُردو ٹائپ کے سلسلے میں کچھ تجاویز تیسری بار جب وہ لاغالباً ۱۹۲۴ء کو ترکی گئے تو انھوں نے گزٹ کے ایڈیٹر کو لکھا۔

"قسطنطنیہ پہنچے ہوئے مجھے بیس بائیس دن ہو گئے۔ شہر دل آرائے استنبول کی جاذبیت کا تنہا میں ہی بستۂ فتراک نہیں ہوں۔ ہزاروں یوروپین امریکن سیاح اس خطۂ ارض کی دلاویزی پر نثار ہونے کے لیے جہاز اور ٹرین کے ایک غیر منقطع سلسلے سے پہنچتے رہتے ہیں۔ خود بخود میسر چلے آتے ہیں گردن ڈالے۔ مگر نہیں آتے تو ہندوستانی۔ گھر ہی میں بیٹھے اس شہر کی تعریفیں سن سن کر خوش ہو لیتے ہیں" اسی خط میں یلدرم لکھتے ہیں۔

"یہاں کی یونیورسٹیوں کا میں نے خاص طور پر مطالعہ کیا ہے۔ یونیورسٹی کے بڑے افسر جنہیں وائس چانسلر کہنا چاہیے۔ اسمٰعیل حقی بے ہیں ان کے عہدے کا لقب دارالفنون امین ہے۔ یہ پہلے پروفیسر تھے اور اب بھی درس دیتے ہیں۔ اس یونیورسٹی میں نہایت دلچسپ بات یہ ہے کہ کوئی مقررہ کورس نہیں ہے۔ معیار تعلیم معین ہے مگر کتابیں معین نہیں ہے پروفیسر لکچر دیتے ہیں اور اس کے علاوہ طلبہ کو مشورہ دیتے ہیں کہ اس خاص موضوع پر فلاں فلاں کتابیں مطالعہ میں مدد دیں گی اور بس۔ یونیورسٹی میں مرد عورتیں ساتھ پڑھتی ہیں اور خواتین کی تعداد جو یونیورسٹی تعلیم حاصل کر رہی ہیں معتدبہ ہے۔ ہمارے یہاں (علی گڑھ میں) صرف پاشا بیگم نے بی اے کا امتحان دے کر اس فرض کفایہ کو ادا کیا۔ میں نے اپنی بساط بھر اپنی یونیورسٹی کا پروپگنڈا یہاں کیا اور یہاں کے ایک کثیر الاشاعت اخبار توحید افکار کے ایڈیٹر نے مجھ سے خواہش کی کہ میں ہندوستان کی تعلیم کے متعلق ایک مضمون لکھوں میں نے ایک مختصر مضمون ان کی خدمت میں پیش کیا جسے انھوں نے اپنے اخبار کے خاص کالموں میں جگہ دی میں نے اس میں ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں کا نہایت اجمال سے ذکر کیا اپنی مسلم یونیورسٹی کا حال ذرا زیادہ تفصیل سے تھا۔ بحمداللہ یہ مضمون یہاں پڑھا گیا اور پسند کیا گیا۔ میں وہ

(بقیہ صفحہ ۲۹ پر)

ہاشم عظیم آبادی

بوڑھوں کی کانفرنس

دفتر سے واپس آرہا تھا کہ راستہ میں رکشہ، ٹم ٹم اور فٹن پر عجیب عجیب طبوسات میں بوڑھے حضرات کو جوق در جوق جاتے دیکھ کر میں نے ایک بزرگ سے پوچھا۔ "جناب عالی۔ غالباً آپ صاحبان کسی جنازے میں شرکت کے لیے تشریف لے جارہے ہیں؟"

انہوں نے مجھے گھورتے ہوئے جواب دیا۔ "جی نہیں۔ ہم لوگ — بوڑھوں کی کانفرنس میں شرکت کے لیے جارہے ہیں؟" یہ کہہ کر وہ اس تیزی سے آگے بڑھ گئے کہ میں مزید تحقیق نہ کرسکا۔ میں نے قیاس کرلیا کہ کوئی مذہبی قسم کا جلسہ ہونے جا رہا ہوگا۔ اس لیے میں بھی اسی طرف چل پڑا۔ ابھی دور ہی تھا کہ انجمن اسلامیہ ہال کے پھاٹک پر جلی حروف میں لکھا نظر آیا۔ "بوڑھوں کی کانفرنس" — میں نے کہا۔ "الٰہی توبہ! ۔ اب یہ بوڑھے بھی اپنی کانفرنس بلانے لگے۔"

پھاٹک پر چند بوڑھے کھڑے تھے اور کچھ عصا تے پیری لیے ادھر اُدھر چہل قدمی میں مشغول تھے۔ میں نے بہ اطمینان تمام شیروانی کے جیب میں ہاتھ ڈالے پھاٹک کے اندر قدم رکھنا چاہا تو ایک بزرگ نے میری گردن ناپی اور دوسرے بڑے میاں نے اس بیدردی سے میری شیروانی کا دامن پکڑ کر کھینچا کہ "چر" سے آواز آئی۔ میں تڑپ اُٹھا — "اجی حضرت! یہ کون سا مذاق ہے آپ کا۔ دیکھیے تو میری شیروانی کی کیا درگت بنی؟"

بوڑھے میاں آنکھوں سے شعلے برساتے ہوئے گرجے — "اندھے تو نہیں ہو تم؟"

"جی کیا ارشاد ہوا؟"

"اندھا!"

میں نے جواباً عرض کیا۔ "مگر حضور میری دونوں آنکھیں بفضلہ سلامت ہیں بخدا میں آپ کو دیکھ رہا ہوں۔"

بوڑھے میاں غرّاتے۔ "جب اندھے نہیں ہو تو ہماری ا[illegible] دھنسے کیوں پڑتے ہو۔ جب یہ معلوم ہے کہ اس کانفرنس میں نوجوانوں کی شرکت پابندی ہے۔ انہیں کسی حال میں اندر جانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ ورنہ ہم اس طرح پھاٹک پر پہرہ دینے کی کیا ضرورت تھی ..... اچھا یہ آپ اُلٹا مجھے آنکھیں دکھلا رہے ہیں۔ خوب! بلواؤں کیا سکریٹری صاحب کو؟"

میں نے عرض کیا۔ "معلوم ہے حضور کہ مجھے قطعی اس کی اطلاع نہ تھی کہ بوڑھوں کی کانفرنس میں نوجوان شریک نہیں ہو سکتے ورنہ میں کبھی جرأت سے کام نہ لیتا۔ لہٰذا میں یقین دلاتا ہوں کہ کانفرنس میں شرکت کا خیال تو درکنار میں اس طرف نظر اُٹھا کر بھی نہ دیکھوں گا۔"

میں ان بوڑھوں کی جماعت سے اپنی جان سلامت لے کر نکل تو آیا لیکن دل میں ایک طرح کی بے چینی تھی کہ کسی طرح بوڑھوں کی کانفرنس کی کارروائی اپنی آنکھوں سے دیکھوں۔ چونکہ بوڑھوں کی کانفرنس اپنی نوعیت کی ایک انوکھی کانفرنس تھی۔ اس پر طرّہ یہ کہ نوجوانوں کی شرکت پر پابندی عائد تھی۔

سوچتے سوچتے ایک ترکیب ذہن میں آئی۔ میں نے بازار جا کر مصنوعی داڑھی اور مونچھ خریدی اور اسے لگاتے ہوئے شیروانی تبدیل کرنے کے لیے گھر آیا۔ صحن میں اندر قدم رکھا ہی تھا کہ بہنیں چیخ مار کر بھاگنے لگیں۔ اور لطف یہ کہ میں بھی ان کے پیچھے دوڑ رہا ہوں۔ صرف اس خیال کے تحت کہ بیٹھے بٹھائے یکایک انہیں کیا ہو گیا۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ ان کی چیخ و پکار اور بھاگ دوڑ میں اور اضافہ ہو گیا۔ تب کہیں مجھے اپنی مصنوعی داڑھی اور مونچھ کا خیال آیا اور میں نے جلدی سے انہیں الگ کیا۔

اس واقعہ سے کم از کم اتنی تسلی ضرور ہوئی کہ میں اپنی صورت بدلنے میں کامیاب رہا۔ لہٰذا میں نے ایک عصا لیا اور تسبیح ہزار دانہ ہاتھوں میں لٹکائے رکشہ پر سوار انجمن اسلامیہ ہال کے پھاٹک پر پہنچا۔ اور اسی عصا کے سہارے بہ مشکل رکشہ سے اتر کر اس انداز سے آہستہ آہستہ چلنے لگا جیسے میں واقعی کسی خانقاہ

سجادہ نشین ہوں۔ لیجیے!—— وہی جلاد قسم کے بوڑھے میاں جنھوں نے میری شیروانی کی درگت بنائی تھی مجھے دیکھتے ہی بڑے تپاک سے میرا خیر مقدم کرتے ہوئے بولے۔

"جزاک اللہ! تشریف لائیے شاہ صاحب۔" مجھے ہنسی تو ضرور آئی لیکن تسبیح کے دانوں پر جلدی جلدی ہاتھ پھیرتا ہوا ہال کے اندر داخل ہو گیا۔ اندر پہنچ کر نگاہ جو دوڑائی واللہ کی پناہ! بوڑھوں کا ایک سیلاب ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ ایک سے ایک سن رسیدہ۔ ریش دراز۔ ریش مختصر اور ریش حناتی وغیرہ وغیرہ۔

کانفرنس کے مقررہ وقت کے ایک گھنٹہ بعد کانفرنس کے افتتاح کے لیے ایک بوڑھے میاں بہ مشکل اٹھ کھڑے ہوتے ہی تھے کہ لڑکھڑا کر گر پڑے۔ بارے دو آدمیوں نے سہارا دیا۔ تب کہیں انہوں نے کلام مجید کی ایک سورۃ تلاوت فرما کر کانفرنس کا افتتاح کیا۔ اس کے بعد ایک جوشیلے بوڑھے میاں نے ایک نظم پڑھی مگر ایسی آواز سے کہ یہی معلوم ہوتا تھا عذاب قبر کی تکلیف سے کوئی مردہ چیخ رہا ہے۔ نظم کا ایک شعر مجھے یاد رہ گیا ہے؎

اُٹھ اور ذرا ہمت جوانی نہ دکھا دے
بوڑھے نہیں ڈرتے ہیں کسی سے یہ بتا دے

بعد میں صدر کا انتخاب عمل میں آیا۔ حضرت "بلاتے بے درمان" بہ اتفاق رائے صدر منتخب ہوئے۔ کرسی صدارت پر جلوہ فگن ہوتے ہی انہوں نے کہا۔

"بھائیو! مجھ ذرہ ناچیز اور ہیچمداں کو جو امتیاز بخشا گیا ہے۔ اس کا میں کسی طرح اہل نہیں۔ لیکن مشکل یہ درپیش ہے کہ مجھے آپ سے انکار نہیں اور نہ مجھے یہ گوارا ہے کہ میری ذات سے کسی فرد بشر کی دل شکنی ہو۔ صدارت کا یہ بار گراں مجھے اپنے دوش ناتواں پر اٹھانا ہی پڑے گا...... لیکن آپ معاف فرمائیں۔ میں بہت دیر سے اجابت محسوس کر رہا ہوں اور پیٹ میں کچھ...... تو اگر آپ حضرات میری تھوڑی دیر کی غیر حاضری معاف فرمائیں تو میں بیت الخلاء سے ہو آؤں...... جی ہاں، حاجت ضروری سے فارغ ہوتے ہی جلسہ زور وشور سے شروع کر دوں گا...... ہاں، میری ایک دست بستہ گذارش ہے کہ حضرات، تکلیف فرما کر تھوڑا تھوڑا اور آگے بڑھ آئیں۔ مطلب یہ ہے کہ سمٹ آئیں تو بڑا اچھا ہو تاکہ پیچھے والے معزز حاضرین اور ڈیلیگیٹس کو بھی جگہ کا موقع ملے۔

جناب صدر بیت الخلاء سے فارغ ہو کر اور وضو بنا کر آدھ گھنٹے کے بعد تشریف لائے لیکن مائیک کے سامنے کھڑا ہونا تھا کہ ان کو کھانسی اٹھی۔ لیجیے صاحب! جناب صدر کا بے وقت کھانسنا تھا کہ دوسرے بوڑھوں کو بھی اپنی کھانسی یاد آگئی۔ اب کیا تھا۔ پورے پنڈال کے بوڑھے کھانستے کھانستے بے دم ہو گئے۔ جب قدرے سکون ہوا تو جناب صدر کے بار بار پکارنے پر ایک بڑے میاں "حضرت ستارۂ آسمانی" جو دری کا کونہ الٹ کر تھوک اور بلغم جمع کرنے میں منہمک تھے۔ رومال سے منہ پونچھتے ہوئے تقریر کے لیے کھڑے ہوئے اور بولے۔

"جناب صدر، میرے بوڑھے ساتھیو یعنی معزز حاضرین۔ معاف کیجیے گا۔ میں ذرا شکی طبیعت کا انسان واقع ہوا ہوں لہٰذا صرف رفع شک کے لیے یہ درخواست کروں گا کہ اس کانفرنس کی اہمیت کے پیش نظر آپ صاحبان ایک بار پورے پنڈال پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال کر اطمینان کر لیں کہ آیا ہماری اس کانفرنس کی کارروائی سننے یا دیکھنے کے لیے کوئی نوجوان تو ہم میں نہیں آملا ہے۔ کیونکہ یہ نوجوان طبقہ ہم بوڑھوں کو جل دینے میں اس قدر ماہر ہے کہ کم از کم میں ان سے پناہ مانگتا ہوں۔ ممکن ہے میرے دوسرے بھائیوں کو بھی اس سے اتفاق ہو۔ (آواز: بے شک بے شک)..... تو حضرات جب کہ یہ یقین ہو گیا کہ اس کانفرنس میں ہماری ہی قوم کے معصوم لوگ ہیں تو اب اپنی تقریر شروع کرتا ہوں۔

—— اس کانفرنس کے بلانے کی اشد ضرورت تھی۔ اس وجہ سے اور بھی ضروری ولابد سمجھی گئی کہ اب ہماری قوم ضعیف—— کو ان نوجوانوں کے ہاتھوں یارائے صبر نہیں۔ اور نہ ہم میں اس کی مزید برداشت کی صلاحیت ہی ہے۔

میرے دوستو——! نہ جانے ہم بوڑھوں کو کیا ہو گیا تھا کہ اب تک نوجوانوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنے رہے اُن کی جلی کٹی باتیں سنا کیجیے۔ اور اپنی زندگی کی ساری خوشیاں ان سے وابستہ کر کے ان کے دست نگر بنے رہے۔ لیکن اب جبکہ ہم بوڑھے خواب غفلت سے بیدار ہو چکے ہیں۔ ہم میں یکجہتی اور بھائی چارہ پیدا ہو گیا ہے اور ہم دوسروں کی مصیبت کو اپنی مصیبت تصور کرنے لگے ہیں، تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم نوجوانوں سے دب کر رہیں۔ (تالیاں)

صاحبو—— میں کہتا ہوں کہ یہ نوجوان سپوت بھول رہے ہیں کہ ہم کیا ہیں۔ ہم کون ہیں؟ اجی، ہم وہی ہیں کہ آج سے کچھ دن پہلے اِن ہی طرح جوان تھے۔ جی ہاں، جوان بھی ایسے کہ جس کی مثال آج بخدا نہیں مل سکتی (آوازیں..... دریں چہ شک)..... لیکن یہ ہماری کمزوری اور دب کر رہنے کا نتیجہ ہے کہ نوجوان ہمیں آنکھ نہیں لگاتے۔ خدا کی قسم یہ چار چار دن کے چھوکرے اسکول اور کالج میں پڑھ کر نہ جانے خود کو کیا سمجھتے ہیں کہ ہماری تجربہ آلود باتوں پر دھیان دینا تو درکنار الٹا ہمارا مذاق اُڑاتے ہیں۔ وہ اِسی پر اکتفا کرتے تو ہم صبر کر لیتے۔ لیکن یہ نوجوان بار بار ہمیں جولانیٔ طبع دکھلاتے ہوئے کہہ دیتے ہیں کہ بڈھا سٹھیا گیا ہے۔ دماغ چل گیا ہے۔ موت بھی نہیں آتی۔ خواہ مخواہ بڈھا ٹرٹرائے جاتا ہے وغیرہ، وغیرہ، (شیم شیم)..... تو کیا آپ نے کبھی غور فرمایا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ ان کے جرأت وہمت کیوں کر پیدا ہوتی بات بالکل صاف اور واضح ہے۔ کیوں کہ ہم میں تنظیم نہیں۔ ہم میں یکجہتی اور اتفاق نہیں۔ ہم کو ہڑتال اور مرن برت کی ہاں، آج بھی اگر ہمارا سنگٹھن ہو جائے اور ہم سب ایک پلیٹ فارم

پر آ جائیں تو پھر دیکھئے ہماری عزت و وقعت میں کہتا ہوں کہ ہمیں آنکھیں دکھلانا تو ایک طرف، بغیر ہماری خوشنودی اور اجازت کے ان نوجوانوں کو اپنی سسرال، اپنے عزیز گھرانے میں قدم رکھنے کی ہمت نہ پڑے۔ بلکہ بغیر ہمارا تحریری حکم حاصل کیے سنیما یا تھیٹر چلے جائیں یا چھپ چھپ کر سگریٹ پی لیں تو میرا نام ستارۂ آسمانی نہیں..... لیکن افسوس صد افسوس ہماری موجودہ حالت پر۔ (ہر طرف سے سسکنے کی آوازیں)

تو میں ایک مرتبہ پھر اپنے انھیں الفاظ کو دہراؤں گا کہ یہ نوجوان بھول رہے ہیں کہ ہم کیا ہیں؟ کوئی ان سرپھروں کو سمجھائے کہ ہم میں بھی وہی خون دوڑ رہا ہے جو ان کے اندر ہے۔ ہم میں بھی غیرت و حمیت ہے۔ ہم میں بھی ان کی طرح باتوں کا جواب دو بدو دینے کی صلاحیت ہے۔ ہم بھی ان کی طرح دل رکھتے ہیں اور دل کے اندر حسرت و تمنا۔ لیکن فی الحال ہم میں اور ان میں فرق بس اسی قدر ہے کہ وہ نوجوان ہیں۔ ہم بوڑھے ہیں۔ وہ تن کر چلتے ہیں۔ ہماری کمر جھک گئی ہے۔ ان کی آنکھوں میں کافی بینائی ہے اور ہماری آنکھوں میں پچھتر فی صدی موتیا بند۔ ان کے منہ میں دانت ہیں اور ہم پوپلے ہیں۔ (پوپلے کے لفظ پر وہ بوڑھے جو مصنوعی دانت لگائے ہوئے تھے ٹٹول کر دیکھنے لگے)..... تو اس کا یہ مطلب تھوڑا ہی ہے کہ ہم گئے گذرے ہیں ہمیں باعزت رہنے اور نوجوانوں کو اپنے قبضہ میں رکھنے کا حق ہی حاصل نہیں..... ضرور حق حاصل ہے۔ خصوصاً اب جبکہ ہم بوڑھے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے ہیں۔ یعنی دوسرے الفاظ میں یہ سمجھئے کہ انشاء اللہ وقت آگیا ہے کہ ہم اپنے سارے پامال شدہ حقوق ان سرپھرے نوجوانوں سے ڈنڈے کے زور سے منوا کر دم لیں (آواز: نعرۂ تکبیر اللہ اکبر)

دوسرے صاحب یعنی "کوکب زمینی" تشریف لاتے ہیں لیکن عجیب اتفاق کہ مائک کے سامنے آتے ہی شدید قسم کی سرسری اٹھی۔ بہت دیر تک بیچارے تلملاتے رہے۔ آخرش دو گلاس پانی پینے کے بعد ان کی طبیعت سنبھلی تو تقریر کی طرف متوجہ ہوئے۔ بولے "بھائیو! میں کوئی مقرر تو ہوں نہیں کہ حضرت "ستارۂ آسمانی" کی طرح فصاحت و بلاغت کے دریا بہاؤں۔ میرا عجز اور انکسار میرے نام ہی سے ظاہر ہے۔ یعنی "کوکب زمینی"۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ کچھ خیالات کا اظہار کر لیتا ہوں۔ اسی پر جتنا بھی فخر کروں کم ہے..... تو اس کانفرنس کے انعقاد سے خصوصاً مجھے اس قدر مسرت ہوتی ہے کہ، اگرچہ میں دمہ، کھانسی، ہوتبا بواسیر، نواسیر، درد گردہ اور ضعف معدہ کا مستقل مریض ہوں، پھر بھی میں نے اپنا فرض سمجھا کہ بوڑھوں کی اس کانفرنس میں شریک ہو کر اپنے حقوق منوانے میں اپنے مصیبت زدہ بھائیوں کا ہاتھ بٹاؤں۔ ممکن ہے یہی خدمت اس آ بخشائش کا ذریعہ ثابت ہو۔ (آواز: انشاء اللہ، انشاء اللہ)

تو آمدم برسر مطلب کے تحت میں یہ عرض کروں گا کہ ہم ہی سے میاؤں۔ یعنی یہ نوجوان جو ہماری ہی گود میں پل کر پروان چڑھتے ہیں وہی ہمیں آنکھیں دکھلائیں۔ وہی ہمارے کہنے میں نہ رہیں۔ وہی ہمارے سامنے اکڑ اکڑ کر ہمیں جوانی کے عہد رفتہ کی یاد دلا کر آٹھ آٹھ آنسو رلائیں۔ وہی ہمارے مقابلے میں اپنی بیوی کی پاسداری کریں۔ وہی ہماری موجودگی میں من مانی کرتے پھریں۔ اور وہی ہمیں گھر کے ایک کونے میں کوٹھری دے کر کھانسنے اور مرنے کے لیے تنہا چھوڑ دیں..... حیف پیری و صد عیب ایک جوانی کیا گئی کہ ہم زندہ درگور ہو گئے..... معاف کیجئے گا۔ ایک شعر یاد آگیا۔ نہایت ہی پھڑکتا ہوا ہے۔ آپ لوگ بے حد لطف اندوز ہوں گے۔ جی ہاں عرض کر رہا ہوں۔

مل جاتے اگر شباب ہنسنا
ٹھہرا کے میرا سلام کہنا

تو میرے بھائیو! ان نوجوانوں کی سنہ روی کا کوئی کہاں تک رونا روئے۔ مختصر یہ کہ ہم ان کے ہاتھوں اس قدر تنگ ہیں کہ مارے صدمہ کے ضعیفی کی حد سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ کاش! یہ پورے آج سنبھل جائیں۔ ہماری خدمت خدا اور رسول کے بتلائے ہوئے طریقہ کے مطابق کریں اور ہمارے قبضہ میں رہ کر ہمارا دل خوش رکھیں تو پھر دیکھئے کہ ہماری ضعیفی کا شباب۔ مگر بھائیو، ان کے کرتوت ہی کچھ ایسے ہیں کہ ہمارا دل ذرا سی دیر کے لیے بھی خوش نہیں۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ زیادہ تعداد ہم میں سے دمہ اور کھانسی ایسے مہلک اور جان لیوا امراض میں مبتلا ہے.....

لیجئے! ان کو پھر اپنی کھانسی یاد آگئی۔ ایک بڑے میاں نے بڑھ کر کھانسی کا مصرعہ دیا اور کہنہ مشق بوڑھے شاعروں نے گرہ لگانی شروع کی۔ اس گرہ بازی نے اس قدر طوالت اختیار کی کہ پندرہ منٹ کے بعد کہیں مقطع سننے میں آیا۔

حضرت "دھرتی دھمک" کی باری آئی۔ وضع قطع ملاحظہ ہو۔ داڑھی دو برابر مساوی تقسیم ہو کر دونوں کندھوں پر جلوہ فرما تھی۔ ٹوپی غالب نما پہنے تھے اور جسمانی لحاظ سے سمجھ لیجئے سر سید احمد۔ منہ میں ایک بھی دانت نہ ہونے کے باعث دونوں گلوں میں اتنے عمیق غار تھے کہ دو مینڈک ان میں بہ آسانی سما سکیں۔ انہوں نے مائیک کے سامنے آتے ہی اعلان کیا کہ میں زیادہ دیر تک تقریر نہیں کر سکتا۔ بات یہ ہے کہ ہر پانچ منٹ پر مجھے استنجے کی حاجت ہوتی ہے۔ لہٰذا اس مجبوری اور وقت کی نزاکت کو مد نظر رکھتے ہوئے صرف اسی قدر عرض کروں گا کہ حضرت "ستارۂ آسمانی" اور "مولانا کوکب زمینی" کی عالمانہ تقریروں کے بعد کچھ کہنے کی جرأت گویا آفتاب کو چراغ دکھانا ہے۔ پھر بھی مجبوراً مجھے صرف اس لیے کھڑا ہونا پڑا ہے کہ ہمارے دوستوں میں سے کسی نے ابھی تک جناب صدر مولوی اور آفاقی "حضرت بلائے بے درماں" کی توجہ ایک نہایت اہم اور تکلیف دہ شئے کی طرف

زوال کرانے کی کوشش نہیں کی ہے اور وہ ہے نوجوانوں کی حد سے بڑھی ہوئی
وابستہ آمیز حرکت ناشائستہ یعنی ان نالائقوں کا ہمارے سامنے بلکہ ہمیں دکھلا کر
ہی چیزیں کھانا جسے ہم بوڑھے نہ تو چبا سکتے ہیں اور نہ انہیں ہضم کرنے کی صلاحیت
کھتے ہیں۔ ہائے ہائے! ایک وہ بھی دن تھے کہ ہم لوہا چبا ڈالتے تھے اور آج یہ دن
ہ کہ فالودہ کھانے کو ترستے ہیں ..... تو میرے پیارے بھائیو۔ اس روز روز کے
دمہ سے کوئی کب تک دو چار ہوتا ہے۔ لہٰذا میں درخواست کروں گا کہ ہماری یہ
نفرنس جہاں اور باتوں پر غور فرما رہی ہے۔ وہاں ان باتوں کو بھی مدِ نظر رکھ کر
جوانوں پر سخت پابندی عائد کر دے تاکہ آئندہ سے وہ ہمارے سامنے صرف
ہی ہی ملائم چیزیں کھایا کریں جنہیں ہم لوگ پوپلے منہ سے چبا کر ہضم کر سکتے
ں ..... لیجئے میں نے قبل ہی عرض کیا تھا نا! ..... اب میں استنجا کی ضرورت
سوس کرنے لگا ہوں۔ زیادہ ہو جانے پر نماز ہی قضا کرنی پڑتی ہے۔ اچھا اسلام علیکم

اسی طرح کی تقاریر کا سلسلہ بہت دیر تک قائم رہا۔ بیسیوں بوڑھے
فرروں نے نوجوانوں کے خلاف خوب خوب دل کھول کر زہر افشانی کی۔ اس کے
د جناب صدر نے اٹھ کر اعلان کیا: "چونکہ رات زیادہ ہو چکی ہے اور سردی کے
عث ہمارے احباب جلد جلد اٹھ کر استنجا کو جا رہے ہیں اس لیے مناسب سمجھتا
ں کہ ریزولیوشن پیش کرنے کے بعد جلسہ کی کارروائی جلد ہی ختم کر دی جائے۔
ہرے آتے ہوتے حضرات مجھے معاف فرمائیں جنہیں وقت کی کمی کے باعث اظہار
بال کا موقع نہ مل سکا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ عرض کرنے میں بے پناہ مسرت محسوس
ر رہا ہوں کہ ہمارے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ ہماری یہ کانفرنس اس قدر
میاب ہوگی اور ہماری کوششیں بار آور ہو کر ہمیں ایک پلیٹ فارم پر لے آئیں گی۔
اواز: انقلاب زندہ باد، نعرۂ تکبیر اللہ اکبر)

تو صاحبو! وقت کی تنگی کے پیش نظر میری یہ تجویز ہے کہ اگر کوئی صاحب
ہایت ہی اہم اور ضروری بات کہنا چاہیں یا کوئی مفید مشورہ دینے کے
خواہاں ہوں تو جلد مائک پر تشریف لا کر اپنے خیالات سے مستفید ہونے کا موقع
عنایت فرمائیں۔

میری شامتِ اعمال یا شرارت جو بھی کہیے کہ اس اعلان سے فائدہ
اٹھا کر مائک کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ میری ڈیڑھ گزی داڑھی دیکھ کر لوگ
اس قدر مرعوب ہوتے کہ ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ اور میں نے آواز میں تبدیلی
پیدا کر کے کہنا شروع کیا۔

"میرے ضعیف و ناتواں اور نوجوانوں کے ہاتھوں زندہ در گور بھائیو۔
اللہ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اب ہمارے اندر بھی بیداری پیدا ہو گئی ہے کہ ہم
اپنے حقوق کی خاطر سینہ سپر ہو سکیں۔ میں اس طویل بحث میں نہ پڑ کر صرف یہ
کہنے کھڑا ہوا ہوں کہ جب ہم اپنے حقوق منوانے کے لیے ریزولیوشن پاس کر رہے
ہیں تو ایک ایسا ریزولیوشن بھی پاس کیا جائے جس کے تحت کوئی بوڑھا مرد کسی نوجوان
لڑکی کو اپنے عقد نکاح میں لانے کی جرأت نہ کر سکے۔ کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ اکثر
ہمارے بوڑھے دوست اس چکر میں ایسا مبتلا ہوتے ہیں کہ اپنے مال و دولت کے
بل پر بے جوڑ شادی رچا کر دم لیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسی کی تمنا ادھوری نا دیدہ
کنواریوں کا خون کر کے بہت جلد راہیِ ملکِ عدم ہوتے ہیں۔ مگر کب سے ہیرے بے
قصور بوڑھوں پر کلنک کا ٹیکہ لگانے کے بعد ..... تو کیا یہ نوجوانوں کے جذبات سے
کھیلنا نہیں۔ کیا ان حرکاتِ ناشائستہ سے جذبۂ نفرت پیدا نہیں ہوتا۔ چپ کیوں
ہیں۔ بولتے۔ جواب دیجئے خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ ہم بوڑھے نوجوانوں سے
اپنے حقوق منوانے جا رہے ہیں۔"

میں اسی قدر کہنے پایا تھا کہ ایک بوڑھے میاں جو قریب ہی ڈائس پر
بیٹھے تھے۔ ہڑبڑا کر اٹھے اور میری داڑھی پر یہ کہتے ہوئے ہاتھ مارا ------ "یہ
کیا حرکت ہے شاہ صاحب۔ مزاج درست کر دوں گا۔" الٰہی توبہ! بوڑھے میاں نے
ایسا جھپٹا مارا کہ میری مصنوعی داڑھی ان کے ہاتھ میں آ رہی۔ ایک بزرگ جو
مجھے جانتے تھے چلّا اٹھے۔

"ارے یہ تو ہاشم عظیم آبادی ہیں۔"

راز کا فاش ہونا تھا کہ ہر طرف سے شور اٹھا: "مارو مارو۔ پکڑو پکڑو"
یہ رنگ دیکھ کر میں نے اس میں اپنی خیریت دیکھی کہ جوتا چھوڑ کر نکل بھاگوں
اور یہی میں نے کیا بھی۔ لیکن بھاگتے بھاگتے ایک ڈنڈا پیٹھ پر پڑ ہی گیا۔●

(بہ شکریہ شگوفہ، حیدرآباد)

بقیہ

فارسی میں حدیثِ بنارس

خوبصورت مناظر، دریاؤں وغیرہ سے بڑا اُنس ہو گیا تھا۔ مثلاً فرماتے ہیں:

عارفا در ہند با ہندو بتو،
ترک ترک تازہ می باید مرا

عارف بعشق سبزۂ خط بتان ہند
تسبیح را گسستہ و زنار کردہ ایم

منگل کے میلہ کی تعریف میں فرماتے ہیں:

میلہ منگل و دریای سرور است امشب
ساقیا بادہ بکشتیم ضرور است امشب

نثار احمد کی نظموں کا آہنگ متوازن اور معتدل ہے۔ اس کی نظموں کی روانی کا بھی ایک انداز ہے۔ وہ اپنے گرد و پیش کی دُنیا پر گہری نظر رکھتا ہے۔ وہ اپنے محسوسات کے اظہار میں اعتدال برتتا ہے۔ یہ خوبیاں اُسے بیشتر نئے شاعروں سے ممیز کرتی ہیں نثار احمد کو رمز و کنایہ پر بڑی قدرت حاصل ہے ـــــ نثار احمد کی نظم بے نام انگریز کا موضوع سری رنگا پٹن ہے۔ جو ٹیپو سلطان کا پایۂ تخت تھا۔

مصنف: کے۔ایس۔نثار احمد

بے نام انگریز

مترجم: حمیدہ الماس

ہر طرف منہدم سال خوردہ در و بام پر مرتسم
سالہا سال کی بے حسی میں
سری رنگا پٹن کے آثارِ کہنہ کی تنہا خموشی نے
امروز کی چلتی پھرتی ہوئی زندگانی سے خود کو جدا کر لیا ہے
کھلے عام رستے کے پہلو میں
کاویری دریا کی جانب نکلتی ہوئی تنگ سی راہ کی آخری حد پہ
پھر ناگہاں خوف انگیز
انگریز لوگوں کی ٹوٹی ہوئی سی مزاریں نظر آئیں یوں جیسے
تاریخ کی صاف تضحیک ہوں
اور دو زرد صدیوں کی باہوں میں جکڑا ہوا
سخت شوریدہ دھرتی کا چھوٹا سا رقبہ ہو گویا
یہاں / دن کہ ہے نیم شب کی سیاہ شکل
چمگادڑوں کی معیت میں ہے / سانپ کا چھپکلی اور عقرب کا پہرہ
یہاں / سارے کتبوں کے کاورک حرفوں پہ
ہونٹوں سے نکلے ہوئے سنگ دل وقت کے تیز دانتوں کے
گہرے نشاں ہیں
ہر اک جسم پر حال کا بوجھ ہے / اور لیٹے ہوئے ہیں اِدھر کچھ اُدھر کتنے انگریز
جو شہریوں کو تو بیٹے بچانے کی کوشش میں / بے موت مارے گئے
ملکہ کی سیوا میں گھل گھل کے یوں نیم جاں ہو گئے کر
وطن لوٹ کر موقع بازیابی سے مسرور ہونے نہ پائے
توقع ہے فردوس میں باریابی ملے گی / کہیں اجنبی خاک تر پر جنم لینے والے

یہاں فوت ہو کر بھی پردیسی ٹھہرے
یہ پردیسی یعنی / سیکس وی سکس
ویلز۔اسکاٹ لینڈ اور جہاں پارک شائر کے مجبور فوجی
بساطِ حکومت پہ کھیلے ہوئے سرد مہرے
یہاں جسم پر حال کا بوجھ لے کر
ہزاروں قسم کے طرح دار انگریز لیٹے ہوئے ہیں
مری چٹیلوں سے جنم لینے والی
ہزاروں دلوں کی بھیانک خموشی کی سہمی ہوئی سرسراہٹ میں
آہستہ آہستہ بڑھتا ہوں آگے / ہتھیلی میں لے کر دل و جاں
ہراساں ہراساں / میں رُک رُک یہ سوچتا ہوں کہ
مرحوم انجانے لوگوں کے حالات، تاریخ
اور ان کے ناموں کی تفصیل جانوں / اچانک یہاں ایک لمحہ کو
امروز کے صاف پردے پہ ماضی کی تصویر اُبھری تو
میں نے یہ دیکھا / یہ پردیسی
ہندوستان میں قیامِ حکومت کی خاطر
شب و روز لڑ مر کے / اپنے وطن ہی سے باہر ہوئے
فاصلے اور لمحوں کی آنکھوں میں رُسوا ہوئے
چھوڑ کر ان کو بچھوؤں میں سانپوں میں
جلدی سے / دیوار ہی پھاندتا ہوں
مرے جیب میں خود بہ خود ہاتھ جاتے ہیں
دستی کی خاطر

پنجابی کہانی

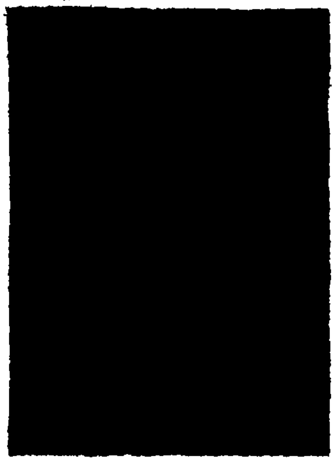

پیر پرائی

—— جسونت سنگھ وردی

کوٹھی کا پھاٹک کھلا اور ایک نوجوان خوبصورت لڑکی تیزی سے اندر چلی گئی اور پھاٹک پھر بند ہو گیا۔ کرے نے انکھیں پھاڑ پھاڑ کے پھاٹک کھلتے اور بند ہوتے ہوئے دیکھا لیکن اس کی ہمت نہ ہوئی کہ وہ آگے بڑھ کر اپنے مضبوط ہاتھوں سے پھاٹک کھول دے اور اندر جا کر سردار جی سے سب کچھ کہہ ڈالے۔

وسیع و عریض کوٹھی کو اس نے خوفزدہ نظروں سے دیکھا اور اس کے بدن میں کپکپی سی دوڑ گئی۔ پیشانی کا پسینہ پونچھتا ہوا وہ کوٹھی کے سامنے ٹک کر بیٹھ گیا اور دھڑکتے دل کی حرکت کو روکنے کی کوشش کرنے لگا۔

میں اندر جاؤں یا نہ جاؤں؟ اس نے وہی بات پھر سوچی جو گھر سے آتے وقت سوچی تھی۔ شاید سردار جی مجھ سے بات بھی نہ کریں پھر... پھر..."

لیکن اسے اس بات پر یقین نہ ہوا کیونکہ اس نے سردار جی کے چہرے کو ہمیشہ گیندے کے پھول کی طرح کھلا ہوا دیکھا تھا۔

"کتا لوگوں سے وہ بُرے ہیں" اس نے پھر سوچا لیکن نمبردار کے بیٹے سے تو اچھے ہیں۔ اور نمبردار کے بیٹے کی تمام حرکتیں اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گئیں۔ اور وہ جیسے تڑپ اٹھا اور اس نے نفرت سے تھوک دیا لیکن پھر بھی غم ختم نہیں ہوا۔ نفرت پھر بھی کم نہ ہوئی۔ سردار جی سے ملنے کا خیال ایک لمحے کے لئے وہ بھول گیا اور وہ کچھ دیر تک اپنی زندگی کے گزرے لمحات کے بارے میں سوچنے لگا۔ پھر اس کو بھائی کا بیمار پڑنا اور مرنا پھر فصل کا تباہ ہونا سب کچھ یاد تھا۔ ورکشاپ سے اس کی غیر حاضری بھی۔ سات تاریخ کو حاضر ہو کر وہ تنخواہ بھی نہ لے سکا۔ ہاتھ تنگ تھا بہت دنوں تک غیر حاضر رہنے کی وجہ سے اب اسے ڈیوٹی بھی دن رہی تھی بیمار بھائی کو سنبھالنا کوئی اتنی بڑی وجہ نہیں ہوتی کہ انسان اپنا کام چھوڑ دے۔ وہ پندرہ دن سے دفتر میں مل رہا تھا لیکن اس کو ڈیوٹی پر نہیں لیا جا رہا تھا۔ اسے مشکل ورکشاپ میں نوکری ملی تھی اور اس کے لیے ہم نے ایس ڈی او کی کوٹھی پر تین سیر دیسی گھی پہنچانا پڑا تھا اور اگر اب ملازمت چلی گئی تو؟ ملازمت کے لیے وہ بابوؤں کے علاوہ مستری اور چھوٹے انسپکٹر کے پاس بھی گیا تھا۔ اگر کل والا حادثہ رونما نہ ہوتا تو ہو سکتا تھا کہ وہ تھک ہار کے گھر بیٹھ جاتا کل کی بات ہی نے اسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ سردار جی سے ضرور ملے۔ اس نے بھائی کی بیماری میں نمبردار سے پچاس روپے قرض لئے تھے اور کل نمبردار کا بیٹا روپے مانگنے آیا تھا۔ کرے نے کچھ دن کی مہلت مانگی۔ لیکن وہ تو غصے سے پھیلا ہوا تھا۔ کرے نے اپنی بیوی اور بھائی کی موت کا ذکر کیا لیکن وہ مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا کہتا چلا گیا۔ اگر پیسے نہیں ہیں تو ہی ہی... اپنی بھابی کو ہماری حویلی میں گوبر پھینکنے کے لئے بھیج دیا کر۔ پھر سا تھوڑی ہی ہی..."

نمبردار کے بیٹے کی آنکھوں میں شرارت تھی اس کی باتوں کا مطلب سمجھنے میں کرے کو دیر نہیں لگی اور یہ باتیں کرے کو زہر میں بجھی تیر سا لگیں اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ تھا اور چہرہ پسینے سے شرابور ہو گیا تھا لیکن وہ کچھ نہ کر سکا تھا اور بے چاری بھابی کے بارے میں سوچتے ہوئے وہ تمام رات سو نہ سکا تھا۔ سویرے تک وہ نمبردار کے

بچے کو گالیاں دیتا رہا تھا۔ دفتر سے واپس لوٹنے پر اس نے ایک بار سردار جی سے ملنے کا ارادہ کیا تھا۔

اس نے اپنے شل جسم اور لباس کی جانب دیکھا اور اٹھنے کی کوشش کی۔ تھکان سے چُور چُور ہو جانے پر بھی وہ امید کا دامن چھوڑنا نہ چاہتا تھا۔ "سردار جی میری درخواست قبول کریں تو پھر ڈیوٹی بھی مل جائے گی اور تنخواہ بھی لیکن ... لیکن ... اگر وہ نہ مانے تو ... تو ... "

اس طرح وہ کتنی ہی دیر تک سوچتا رہا۔ چاروں جانب اس کو تاریکی ہی تاریکی نظر آ رہی تھی لیکن آگے بڑھ کر پھاٹک کھولنے کی جرأت اس کو نہیں ہو رہی تھی۔ بڑی مشکل سے حلق پھاڑ کے اس کے منہ سے ایک آہ نکلی۔ وہ کیسے بھی تو کیا بچوں کے پیٹ وہ کس طرح بھرے گا؟ گھر کی ضرورتیں کس طرح پوری ہوں گی اور زندگی کیسے گزرے گی؟

اس نے پھر کوٹھی کے پھاٹک کی جانب دیکھا لیکن اُسے کھولنے کی ہمت وہ پھر بھی نہ کر پایا۔ یوں اس سے قبل وہ کئی بار اس کوٹھی کے اندر گیا تھا۔ اپنے مزاحیہ طور طریقوں سے سردار جی کو خوش کرنے کے لئے اپنی فوجی زندگی کی دلچسپ باتوں سے سردار جی کی اُداسی دُور کرنے کے لئے۔ لیکن تب تو اُسے بلایا جاتا تھا۔ آج — وہ کیسے سردار کے سامنے جائے۔ آخر پیشانی کا پسینہ پونچھ کر اس نے اپنے کمزور بدن اور بچی کھچی قوت جمع کی اور ہمت کر کے آگے بڑھا اور پھاٹک کا کنڈا گھما دیا۔ اس نے کئی بار دیکھا تھا کہ باہر سے پھاٹک اسی طرح کھلتا ہے۔ اور واقعی کڑک کی آواز سے پھاٹک کھل گیا لیکن پھر پانچ سات منٹ تک آگے بڑھنے کی ہمت نہ کر سکا۔ آخر ایک بار پھر اس نے اپنے دل کو سنبھالا اور اداس چہرے پر تھوڑا بہت دکھ کا تاثر لا کر آگے بڑھا۔

سردار جی لان میں کرسی پر بیٹھے تھے اور ان کے جیسے ہی ایک بھاری بھرکم سردار جی فوجی افسر کی وردی میں ملبوس اُن کے ساتھ گپیں لگا رہے تھے۔

کرم سنگھ خاموش کھڑا رہا۔

ملٹری کا افسر اُٹھ کر جانے لگا۔ "بیٹھو۔ بیٹھو۔" کہتے کہتے ایس ڈی او صاحب کی نظر اس پر پڑی تو اُنہوں نے ہاتھ جوڑ کر کانپتے جھک کر ست سری اکال کہا۔ اس پر ایک سرسری نگاہ ڈال کر سردار جی بولے "ہلو! کرم سنگھ آنا ہوا۔ ؟"

اُن کی بات سن کر کرما ایک بار تو چکرا گیا کہ کیا جواب دے۔ پھر اُس

کو خیال آیا کہ اپنا سارا دکھ جو آتش فشاں کی طرح اس کے اندر ابل رہا ہے وہ سردار جی کے سامنے انڈیل دے اور دھاڑیں مار مار کے رحم کے لئے پکارے۔ لیکن وہ منہ سے کچھ بھی نہ بول سکا۔

سردار جی اس کی جانب اشارہ کر کے فوجی افسر سے بولے "یہ ہمارے ورکشاپ میں تھا ہے"

"تھا" لفظ نے کرے کا سر جھکا دیا۔ فوجی افسر اس کو دیکھ کر کچھ حیران ہوا جیسے کسی نمائش میں کسی نایاب چیز کو دیکھ کر کوئی حیران ہوتا ہے۔ لیکن ایس ڈی او کی بات جیسے ابھی پوری نہ ہوئی تھی۔ انہوں نے جملہ پورا کیا۔ "لیکن دوسری جنگ عظیم میں ہمارے ساتھ رہ چکا ہے۔ اسے برما میں۔"

اب کی کرے کا جھکا سر سیدھا ہو گیا۔ وہ اپنی تعریف سن کر بیتا ہر دکھ بھول گیا۔ ملٹری کی دلچسپ زندگی یاد آ گئی اور اس نے اکڑ کر دونوں سرداروں کو فوجی سلیوٹ کیا۔ دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

"آج تم کو یہ تماشہ بھی دکھاتے ہیں" ایس ڈی او نے فوجی افسر سے کہا "کچھ دیر اور ٹھہرو۔ چائے کا ایک کپ اور پیتے ہیں اور تم کو کرے کے کرتبوں سے خوش کرتا ہوں۔"

فوجی افسر نے کرے کے گٹھے ہوئے افسردہ جسم میلی فوجی قمیض اور نیکر تراشی ہوئی داڑھی اور فوجی ڈھنگ سے باندھی ہوئی پگڑی کو ذرا غور سے دیکھا جیسے سوچ رہے ہوں کہ آخر اس معمولی سے آدمی میں کیا دلچسپی کا سامان ہو سکتا ہے۔

سردار جی نے نوکر کو آواز دے کر چائے کے لئے کہا اور پھر کرے کی جانب مڑے۔ "ہلو! کرم سنگھ ہم تمہیں ملٹری اسپرٹ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ سمجھ گیا؟"

"یس سر!" اور کرے نے ایک بار پھر سلیوٹ کیا۔ مگر کام اور ملازمت کی فکر اب اس کے دل سے نکل چکی تھی۔

کرے کے کوٹھی میں آنے سے پیشتر دونوں سردار گپیں لگا رہے تھے لیکن یوں لگتا تھا کہ اُن کے پاس کوئی خاص موضوع نہیں تھا۔ کچھ پتیوں کے علاوہ اُن کے بیچ کوئی چیز نہ تھی اور ان چیزوں کو کوئی کتنی دیر دیکھ سکتا ہے؟ پھر سردار جی کی نازک اندام دوسری بیوی بھی تو ان کے پاس دیر تک بیٹھنے کے بجائے نوکر کو ساتھ لے کر شاپنگ کرنے کو زیادہ پسند کرتی تھی۔ کرے کے آنے سے دونوں سرداروں میں ایک نیا

آگیا اور اس کے دلچسپ کرتب دیکھنے کے لئے وہ بے چین ہوا تھے۔

"کرم سنگھ کی انگریزی بہت مشہور ہے" ایس ڈی او صاحب نے اپنے ساتھی کو بتایا۔ "یہ خوب فرفر اور اصلی لہجے میں بولتا ہے۔ پھر مزا یہ کہ وہ اس کو موقع پر ہی شعر و شاعری میں تبدیل کر دیتا ہے۔ سب سے پہلے تم انگریزی سنو۔ ہاں بھئی کرم سنگھ شروع کرو۔"

اور کرم سنگھ نے انگریزی سنانے کے لئے موڈ بنا لیا۔ یہ انگریزی وہ ہزاروں مرتبہ لوگوں کو اور سواریوں کو سنا چکا تھا۔ ہر بار وہ کچھ نئے جملے کہتا اور کچھ پرانے بھول جاتا۔

اس نے انگریزی طریقے سے منہ بگاڑ کے بولنا شروع کیا "بیٹوین نادرن ریلوے اسٹیشن رینک مین از اور ایس ڈی او ونڈرفل فرینڈس ہی کیپس:"

کیپس کو اس نے اس طریقے سے ادا کیا کہ دونوں سردار کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ وہ پھر بولا "ہیپی ہی از . . . گلیڈ فیلز . . ."

اسی طرح وہ انگریزی کے غلط سلط لفظ اور جملے بولتا رہا اور دونوں سردار کھلکھلا کر ہنستے رہے۔

تیز آواز اور ٹیون بدل بدل کر بولنے سے کرمے کی سانس پھول گئی لیکن انگریزی کے ختم ہوتے ہی معمولی سی تعریف کرنے کے بعد سردار جی نے انگریزی ناچ کی تجویز پیش کر دی۔

اب کرما بغیر کسی حیل حجت کے انگریزی ناچ ناچنے لگا۔ وہ چند برس برما کے قریب اور کئی دوسرے یوروپین ملکوں میں رہ چکا ہے اور کئی اس کو انگریزی ناچ ناچنے کا موقع مل چکا تھا اس لئے اب بھی کبھی کبھی اپنے غم کو بھلانے کے لئے اس ہتھیار کا استعمال کیا تھا۔ اندھیرا ہو چکا تھا اور روشنیاں جل چکی تھیں۔ ایک منٹ کے لئے اس نے محسوس کیا کہ وہ پیرس میں ہے اور اس کی بغل میں ایک حسین سی لڑکی لوکی ہے اور وہ دونوں کسی ریستوران میں ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے ناچ رہے ہیں۔ کرمے نے لان کی گھاس پر ریستوران کا سماں باندھ دیا اور سردار جی خوش ہو کر اس کو اکساتے رہے۔

ناچ کے بعد پریڈ کی باری آئی جیسا کہ پہلے بھی ہوا کرتا تھا لیکن اب کی بار کرمے نے تعریف کے ہار گلے میں ڈالے جانے پر بھی پریڈ کے لئے حامی نہیں بھری۔ اس نے اس بات کی آڑ لی کہ وہ بہت تھک گیا ہے اور پھر روٹی بھی اس نے سویرے کی کھائی ہوئی ہے لیکن اس کی بات کاٹ کر فوجی افسر نے کہا: "انکار نا ملٹری کے اصول کی خلاف ورزی ہے۔ آرڈر کی فوراً تعمیل ہونی چاہیے۔"

کرما دل اور جسم کا درد بھلا کر پھر ڈٹ گیا اس نے ماتھے کا پسینہ پونچھا اور چہرے پر جوش لا کر ظاہراً خوشی سے پریڈ کرنے لگا۔ لیفٹ رائٹ رائٹ لیفٹ۔ فوجی سردار کے رول کو اس نے اپنی بندوق بنا لیا اور لوسٹم جوتے جوتوں کو ہی فوجی بوٹ سمجھ لیا کیونکہ پریڈ بالکل ہو بہو ہونی چاہیے تھی تبھی تو افسر خوش ہو سکتے تھے۔ لیفٹ رائٹ کرتا ہوا کبھی وہ جلدی جلدی چلتا کبھی دھیرے دھیرے اور کبھی اکڑ کے کھڑا ہو جاتا اور پھر چلنے لگتا اور زمین پر پیر پٹک پٹک کر اس نے اپنی ٹانگیں تھکا ڈالیں۔ گرد اڑا دی اور جسم ہلا ہلا کر اس نے سر سے لے کر پیروں تک پسینہ بہا دیا۔ افسر خوش ہو رہے تھے لیکن اس کا دل ڈوبتا جا رہا تھا اور کچھ دیر بعد وہ تھک ہار کے پسینہ پونچھتا ہوا سیلوٹ مار کے سیدھا کھڑا ہو گیا۔

"بہت خوب! گڈ، ویری گڈ!" کہہ کر دونوں افسروں نے اس کی تعریف کی۔ اس کے جسم کو تھپتھپایا اور شاباشی دی۔

اب وہ بالکل لاچار سا چہرہ لئے کھڑا تھا لیکن اس کو یقین ہو گیا تھا کہ سردار جی اب بہت خوش ہیں اور اس کے ساتھ خوب بے تکلف ہو گئے ہیں اس لئے اس کا کام ضرور بن جائے گا۔

ایس ڈی او نے نوکر کو آواز دے کر چائے لانے کو کہا اور مسرت سے اپنے دوست کے چہرے کی جانب دیکھنے لگے۔ وہ خوش تھے کہ کرمے کے کرتب دکھا کے انہوں نے اپنے دوست کو خوش کر دیا تھا۔ ان کا دوست کرمے کی تعریف کر رہا تھا "میں کسی سرکس یا مداری کا کھیل یا نمائش دیکھ کر بھی اتنا خوش نہیں ہوا جتنا کہ اس وقت ہوا ہوں۔ ونڈرفل!"

اب سردار جی خود بھی کچھ کہنا چاہتے تھے۔ بولے "یہ ہمارے گاؤں کے قریب کا رہنے والا ہے۔ کئی برس جرمنی، فرانس، برما وغیرہ میں رہ چکا ہے۔ کرتب تو آپ نے دیکھ ہی لئے، میرے یہاں آیا تو میں نے سوچا کہ آدمی کام کا ہے۔ فوراً ورکشاپ میں رکھ لیا۔ اب عیش کرتا ہے۔"

کرمے کا سر جھک گیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک پڑے۔

اس کی فیملی کے باقی لوگ مزارعوں کا کام کرتے ہیں۔" سردار بولتا گیا "اس کی اپنی بھابی کے ساتھ خوب پٹتی ہے۔ لیکن بہو نہیں ہے ہی ہی!"

"کیوں بھئی۔ ٹھیک ہے؟" فوجی افسر نے کرمے سے بات کی تائید کے لئے پوچھا۔

کرمسں نے نجانے کیوں اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تیری بھابی کا اب کیا حال ہے ؟ لڑتی تو نہیں تیرے ساتھ ؟ تیرے اس کی . . . ." سردار نے محبت سے پوچھا۔

لیکن فوجی افسر نے بات کاٹ کر کہا: "بھابیاں کبھی لڑتی نہیں سردار جی بھابیاں تو کرپا . . . . اس کی بھابی تو خوب صورت ہوگی ؟ کیوں بھائی ؟"

یہ چوٹ برداشت کر کے بھی کرما خاموش رہا۔

سردار جی نے کہا۔ خوب صورت نہ بھی ہو تو بھی جوان تو ہوگی ہی گٹھے ہوئے بدن والی۔ ایک پکے آم کی طرح :"

"کیوں بھئی تیرے ساتھ اس کی بنتی ہے کہ نہیں ؟"

دونوں سرداروں کی آنکھوں میں فتور جھلک رہا تھا۔ کرما اب بھی کچھ نہ بولا۔ اس کا سر نیچا ہو گیا اور آنکھوں میں پانی بھر آیا اور کھارے پانی میں یکدم نمبردار کے بیٹے کا شرارتی چہرہ اُبھر آیا۔

دونوں سردار کوئی دوسری بات کہہ کر شرارت بھری ہنسی ہنس رہے تھے۔

"نمبردار کے بیٹے اور ان میں کیا فرق ہے ؟" کرما سوچتے سوچتے رک گیا۔ اس کا جسم تھک چکا تھا اور درد سے دماغ اب ایسا ہو رہا تھا جیسے بھیجا کھوپڑی میں کھول رہا ہو۔ اس کو لگا کہ زور زور سے چیخ پڑے۔ دہاڑ مار کر رو پڑے اور ہی ہی، ہی ہی کر کے ہنستے ہوئے سرداروں کے منہ پر تھوک کر یہاں سے بھاگ جائے۔ لیکن۔ لیکن وہ ایسا نہ کر سکا۔ نمبردار کے بیٹے سے بھی تو وہ کچھ نہ کہہ سکا تھا۔

اس نے سنا۔ سردار جی اس سے کہہ رہے تھے: "اچھا بھئی۔ کرم سنگھ۔ جانے سے پہلے اب پیرس کی میم والی بات سنا دے . . ہاں ہاں۔ کر دے شروع۔ شاباش : بیٹھ کر ہی سہی۔"

کرما بیٹھ گیا۔ لیکن بولا کچھ نہیں۔

"شرم مت کر۔ یہ سردار جی اپنے جیسے ہی ہیں۔" ایس ڈی او نے پھر کہا۔

لیکن کرما اتنا ہی بول پایا: "سردار جی۔ مجھے اب معاف کیجئے۔ میں . . . میرے گھر پر مصیبت ٹوٹ پڑی ہے۔ میرے بھائی کی موت ہوگئی ہے جی . . . . میں . . . . میں پندرہ دن سے کام پر نہیں آ سکا۔ اور میری عزیز بھتیجیاں بلک رہی ہیں۔"

سردار جی اُٹھے اور نوکر کو جلد چائے لانے کو کہا۔ ان کے دوست زور لگاتے ہوئے تاریکی میں پھول پتیوں کو گھور رہے تھے۔

کچھ دیر تک سب خاموش رہے۔ سردار جی کرمے کو مخاطب کر کے ہوئے بولے: "ہاں۔ تیرا بھائی مر گیا۔ بڑے دکھ کی بات ہے۔ تو نے کیوں نہیں بتایا ؟ پر پندرہ دن غیر حاضر رہنے کا مطلب ہے کہ تو کام کرنا نہیں چاہتا۔"

"نہیں سرکار۔ ایسی بات نہیں ہے۔"

کرما چلّایا: "میرے اوپر دکھ کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ میرا بھائی سخت بیمار تھا اور اب وہ مر گیا ہے۔ بتائیے میں کیسے کام پر آتا ؟" وہ سسک رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے سب کچھ دھندلا دھندلا نظر آ رہا تھا۔

اس کی بات ان سنی کر کے سردار جی نے پھر کہا۔ "جو کام میں تیرا جی ہی نہیں لگتا تو کوشش کر بھئی۔ ہم نے تو سوچا تھا کہ تیری زندگی ٹھیک ہو جائے گی لیکن . . . ."

"سرکار۔ میں کام سے تو جی نہیں چراتا . . ." کرمے نے دل نکال کر سامنے رکھ دیا۔

لیکن سردار جی نے ان سنی کر کے کہا: "دراصل تجھے سالے گھر میں دینے پڑتے ہیں اس لئے تو کام سے جی چراتا ہے۔ جن کے بھائی بچے ہیں۔ وہ بھی تو کام کرتے ہی ہیں۔"

اب کی بار کرما پھوٹ پڑا اور اس نے پگڑی کے پلّو سے اپنا منہ چھپایا۔ اس کی حالت ایک ایسے گھائل کی طرح تھی جس کے تازہ گھاؤ پر نمک چھڑک کر پٹی باندھی جا رہی ہو۔ وہ رو رہا تھا لیکن رو نہیں رہا تھا۔

سردار جی کو اس پر ترس آ گیا۔ اپنے دوست کی جانب دیکھ کر بولے: "یہاں شاید اس کا دل نہیں لگتا۔ اب تو اور بھی دکھی لگتا ہے اور شاید ورکشاپ میں کام نہ کر سکے۔ آپ اس کو اپنے ساتھ لے جائیے۔ آدمی اچھا ہے۔"

"چلا چل۔" فوجی افسر نے اپنا رُول گھماتے ہوئے بے پروائی سے کہا۔ "دو روٹیاں کھا لیا کرے گا۔ آدمی تو کھوٹا نہیں ہے۔"

"کسی بالڑی سے اس کا بیاہ بھی کروا دینا۔" سردار جی . . .

(بقیہ ص ۷۱ پر)

Regd. No. D (DN) 105
R.N. 846/57

Licenced U (D) - 50 to post without pre-payment
at [illegible] Lines, Post Office, Delhi.

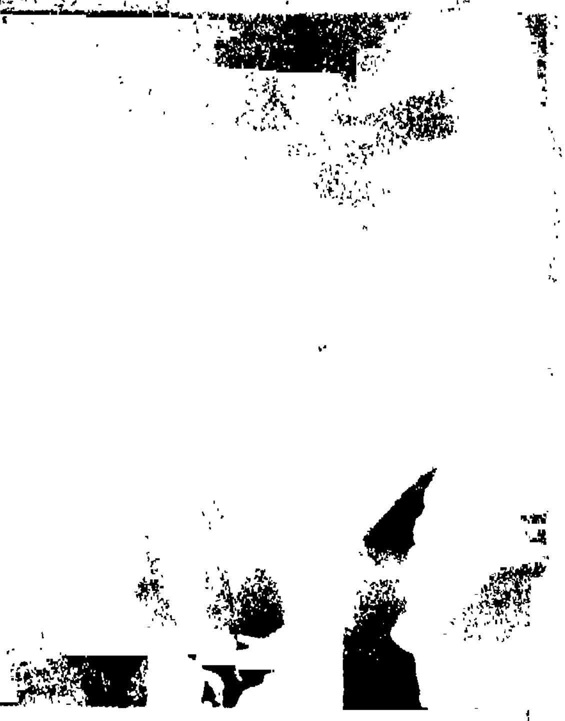

صدر جمہوریہ ہند شری این۔ سنجیوا ریڈی زامبیا کے سرکاری دورے پر ۷ جون ۱۹۸۱ء کو لوساکا کے بین الاقوامی ہوائی اڈے پر پہنچے۔ جہاں ان کا والہانہ استقبال کرنے کے لئے زامبیا کے صدر ڈاکٹر کینتھ کاؤنڈا موجود تھے۔

تصویر میں صدر جمہوریہ ہند، ڈاکٹر کاؤنڈا کے ساتھ

زامبیا کے وزیر برائے اطلاعات و سیاحت، عزت مآب ڈاکٹر شیمی سیا موئیر یا ایم اے کے ہمراہ ۲ جون ۱۹۸۱ء کو دلی میں مرکزی وزیر اطلاعات و نشریات شری وسنت ساٹھے اور نائب وزیر اطلاعات و نشریات کماری کمد جوشی معزز مہمانوں کے ساتھ۔

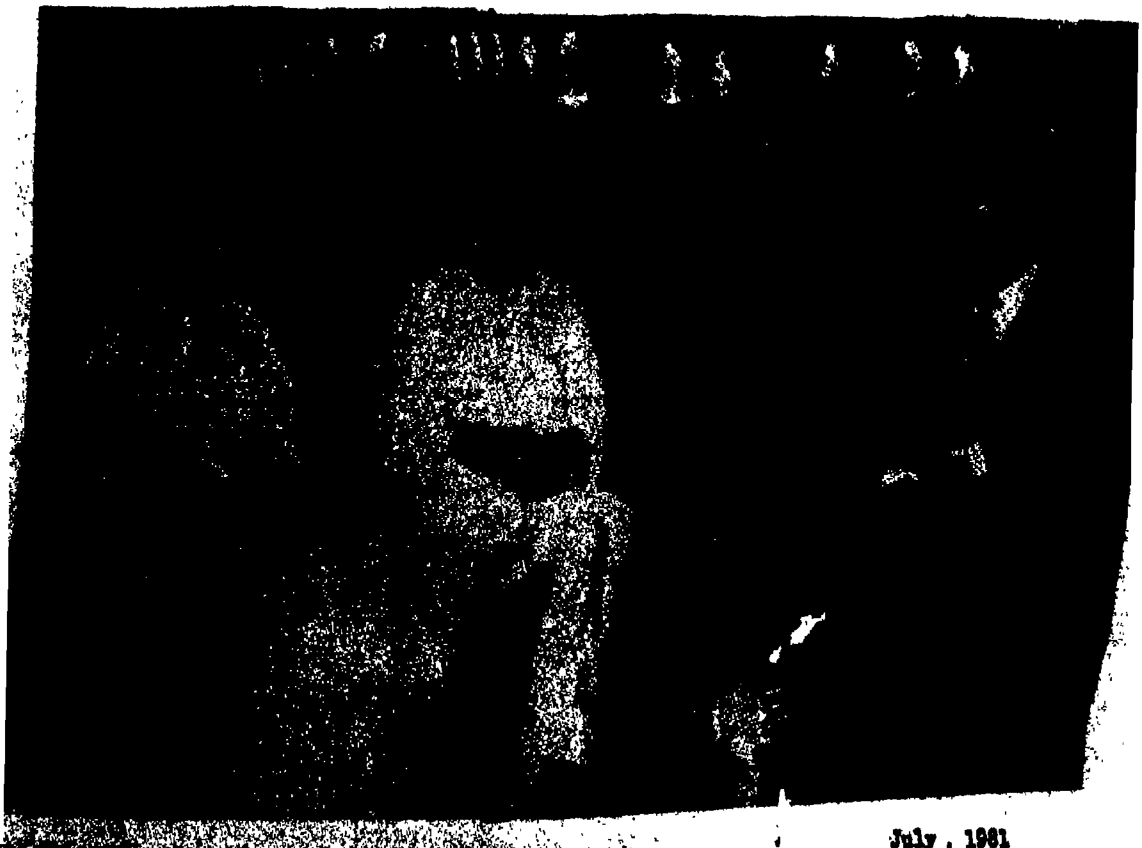

فضل امام ملک

پاگل

لوگ اسے پاگل کہتے تھے۔ ویسے وہ "حاجی میاں" کے نام
ے بھی مشہور تھا۔ بچّے تو بچّے، نوجوان اور بوڑھے اسے چڑاتے
تھے۔ وہ جونہی گھر سے باہر نکلتا بچّوں کی ایک فوج اس کے پیچھے
یچھے "حاجی میاں . . . . نٹ" کی رٹ لگاتے اور وہ گالیاں بکتا
واآگے آگے چلتا جاتا۔ صبح ہو یا شام بس اس کے گھر سے نکلنے کی
یر تھی۔ اس کو دیکھتے ہی بچّوں کی رگ شرارت سے پھڑک اٹھتی
ر فضا "حاجی میاں . . . . نٹ . . . . حاجی میاں . . . . مرنجی
چو . ." اور اسی طرح کے دوسرے نعروں سے گونجنے لگتی۔ ان نعروں
کو سنتے ہی حاجی میاں کی کرخت آواز بھی گونج اٹھتی اور ہاتھ میں
دبا چھوٹا سا ڈنڈا حرکت کرنے لگتا۔ پاؤں زمین پر جم سے جاتے
اور زبان چل پڑتی "حرام زادو . . . . ہمّت ہے تو نزدیک آؤ۔
ایک ایک کو مزہ چکھاؤں گا کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا . . . ہے
کوئی مائی . . . . کا . . . . لال . . . . آ . . . . سامنے آ ــــ مجھے
ی مقدمے کی کوئی پرواہ نہیں ہے . . . . آٹھ ہزار روپے رکھ
وڑے ہیں یہاں سے مونگیر تک روپے بچھا دوں گا" اور پھر
ن کے بھیانک قہقہے سے فضا دہل جاتی۔ بچّے چند پل ان کے
توں میں دبی لاٹھی اور بھیانک قہقہے سے سہم کر رک سے جاتے
ن پھر دوسرے ہی لمحے وہ پھر اس کے پیچھے ہو لیتے۔ گاؤں
لے اس پاگل نے سارے گاؤں کو پاگل بنا دیا تھا۔

ادھیڑ عمر، کچّے پکّے بال، گٹھا ہوا بدن، سر پر ایک پگڑی اور
تھ میں چھوٹا سا ڈنڈا۔ نام کیا تھا ان کا اصلی سب بھول چکے تھے۔
اب تو لوگ انھیں حاجی میاں کے ہی نام سے جانتے تھے۔
گاؤں کے ایک کونے میں چھوٹا سا مکان جن میں بیوی اور
بچّوں کے ساتھ رہتے تھے وہ۔ بڑے بوڑھوں کا کہنا ہے کہ
حاجی میاں پہلے پاگل نہیں تھے۔ اچانک وقت نے انھیں اتنے
دکھ دئے یکے بعد دیگرے کہ ان کا دماغی توازن بگڑ گیا۔ بات
یہ ہوئی کہ گاؤں کے دھنا سیٹھ ہری پرشاد نے دھوکے سے ان
کی ساری زمین ہڑپ لی۔ . . . . مقدمہ چلا حاجی میاں
نے اپنی ساری پونجی خرچ کر دی لیکن ہری پرشاد نے روپے کے
بوتے پر مقدمہ جیت لیا اور تب ہی سے حاجی میاں کا ذہنی
توازن بگڑ گیا . . . . لیکن لوگوں کا ہاتھ انھیں پاگل بنانے میں
زیادہ رہا تھا۔

میری ملاقات جب جب حاجی میاں سے ہوتی مجھے تعجب
ہوتا اُسے دیکھ کر اور میں سوچنے لگ جاتا کہ کیسے لوگ اسے
پاگل کہتے ہیں؟ کیوں کہ مجھے دیکھتے ہی اس کا ہاتھ سلام کے لیے
اٹھ جاتا . . . تمیز سے باتیں کرتا کوئی گالی نہیں . . . محبّت سے
کُرید کُرید کر باتیں کرتا میری اور گھر والوں کی خیریت پوچھتا اور
اس کے محبت بھرے انداز کو دیکھ کر مجھے مجبور ہو جانا پڑتا اس
سے باتیں کرنے کے لیے اس کی باتوں کا جواب دینے کے لیے۔

شام کا وقت تھا۔ میں ٹہلنے کی غرض سے روز کی طرح
سڑک کی جانب نکل آیا۔ تبھی اچانک میرا سامنا حاجی میاں سے
ہو گیا اور مجھے دیکھتے ہی ہمیشہ کی طرح اس کے ہاتھ ہوا میں اٹھ
گئے۔ "سلام بابو صاحب" میں نے اس کے سلام کا جواب دیا
اور پوچھ بیٹھا "کیسے ہو حاجی میاں . . . . ؟"

"ٹھیک ہوں بابو صاحب . . . . صاحب ایک بات
کہوں . . . . ؟" وہ کچھ جھجھکتے ہوئے بولا۔

"ہاں . . . . ہاں ضرور کہو . . . . کیا بات ہے؟" میں نے
ہمّت دلائی۔

"بس ایک پیالہ چائے پلا دیں بابو صاحب . . . ." وہ

نئے کتابیں

اقبال جادوگر ہندی نژاد

مصنف : عتیق صدیقی

شائع کردہ : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

صفحات ۶۰ قیمت ۱۴ روپے

اقبال اردو کے ایک ایسے شاعر ہیں جن کی کئی حیثیتیں ہیں۔ مفکر، مصلح، سیاست داں، پیغامبر، اسی لیے ان کے افکار و خیالات کا جائزہ لینے کے لیے مسلسل کتابیں لکھی جا رہی ہیں اور آئندہ بھی لکھی جائیںگی۔

ہمارے یہاں کچھ تو مشرقی آداب ہیں جو کھل کر بات نہیں کرنے دیتے اور کچھ افراط و تفریط کا معاملہ ہے لہٰذا عام طور سے جب افراد یا اشخاص کا ذکر ہوتا ہے تو معروضی نقطۂ نظر نہیں اپنایا جاتا بلکہ اپنی بات کو ثابت کرنے کی دھن ہوتی ہے۔ لہٰذا زیادہ تر ایسی تحریریں دیکھنے میں آتی ہیں جن میں توازن، سنجیدگی، حق گوئی اور بے باکی کا فقدان ہوتا ہے۔ اس سے لکھنے والے کا مقصد تو ممکن ہے پورا ہو جاتا ہو مگر شخصیت مجروح ہو جاتی ہے۔

عتیق صدیقی ہمارے ان ادیبوں میں ہیں جو حقائق کو اس طرح پیش کرتے ہیں جس طرح وہ نظر آتے ہیں۔ ان کی اپنی کوئی عینک نہیں ہے ان کی تحریروں میں وزن اور وقار ہوتا ہے اس لیے کہ ان کا کوئی دعویٰ بے دلیل نہیں۔ وہ اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کہتے بلکہ واقعات کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ منطقی نتائج خود بخود سامنے آجاتے ہیں۔ وہ قاری کو نہ مرعوب کرتے ہیں اور نہ گمراہ۔

ان کی حالیہ تصنیف 'اقبال جادوگرِ ہندی نژاد' اقبال کو سمجھنے اور صحیح تناظر میں دیکھنے کی بڑی اچھی کوشش کی ہے۔ دس عنوانات کے تحت اقبال کے فکری ارتقا، ذہنی تبدیلیوں اور ذاتی رویوں کا بڑا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے اور اس طرح جو اقبال ہمارے سامنے آتا ہے وہ ایک عظیم شاعر، سچا محبِ وطن اور ایک دنیادار انسان ہے جو دوسرے لاکھوں انسانوں کی طرح ذاتی مصالح کے پیشِ نظر کچھ ایسے ناخوشگوار کام بھی کرتا ہے جو وہ عام حالات میں نہ کرتا۔ اس سے اقبال کی عظمت کم نہیں ہوتی۔

اسی نکتے کو ہمارے بہت سے لکھنے والے بھلا دیتے ہیں کہ ہر فن کار کی دو زندگیاں ہوتی ہیں اور گفتار کے غازی کردار کے غازی نہیں ہوتے۔

عتیق صاحب میں ایک خوبی ہے کہ ان کے یہاں بڑا اختصار ہوتا ہے۔ وہ کوئی غیر ضروری یا غیر متعلق بات نہیں لکھتے۔ غیر ضروری باتوں یا تمہید سے ذہن بھٹکتا ہے اور موضوع سے دلچسپی کم ہو جاتی ہے۔ اس لحاظ سے ان کی تحریریں مثالی ہیں جن کی دوسروں کو پیروی کرنی چاہیئے۔

عتیق صاحب کی دوسری کتابوں کی طرح ان کی حالیہ تصنیف بھی یقیناً مقبول ہوگی اور اقبالیات میں ایک اچھا اضافہ ثابت ہوگی۔

شاہجہاں کا خواب (اوپیرا)

تخلیق کار : رفعت سروش

قیمت : دس روپے

ناشر : نورنگ کتاب گھر، اے ۱۳۴ پنڈارہ روڈ، نئی دہلی ۳

فلم اور پھر ریڈیو کی آمد کے بعد ایک طویل وقفے تک اسٹیج کا ارتقا رکا رہا۔ اس کا سب سے بُرا اثر اردو اسٹیج پر پڑا۔ آج بھی اردو میں ایسے ڈراموں کی بے حد کمی ہے جو جدید اسٹیج کے تقاضوں کے مطابق ہوں۔ فلم کی طرح ریڈیو نے بھی ڈرامے کو ایک نئی جہت بخشی۔ نہ صرف ریڈیو ڈراما وجود میں آیا بلکہ اردو میں اوپیرا کی ایک مستحکم اسٹیج، منظوم اردو ڈرامے سے محروم رہا۔ یہاں اندر سبھا کی روایت اور پارسی تھیٹر کی وراثت دم توڑتی نظر آتی ہے۔ ایسے میں اردو اوپیرا کی تخلیق اور اسٹیج پر اس کی مقبولیت قابلِ ستائش ہے۔

ادبی دنیا سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے رفعت سروش کا نام نیا نہیں ہے۔ ان کے متعدد منظوم ڈرامے ریڈیو سے نشر ہو کر مقبولیت کی سند حاصل کر چکے ہیں۔ زیرِ نظر اوپیرا، ان کا پہلا

یا لاروے نکل آتے ہیں - یہ چمک دار سرخ رنگ کے ہوتے ہیں - یہ درختوں کے شاخوں پر جمع ہو جاتے ہیں اور لاکھ کا ریزن بنانا شروع کر دیتے ہیں۔ بالغ ہونے سے پہلے پہل روپ میں تین بار کر یزی Moultings کا عمل ہوتا ہے۔ کسی ایک نو آبادی میں نر اور مادہ کیڑوں کا تناسب اس طرح ہوتا ہے۔

مادہ ♀ 3-2 : 1 ♂ نر

نر کے مقابلے میں مادہ کیڑے زیادہ ریزن پیدا کرتے ہیں -

میزبان پودوں یا درختوں کی فصلوں کے لحاظ سے لاکھ کے کیڑوں کی مختلف نسلیں ہوتی ہیں جن میں سے دو اہم ہوتی ہیں۔ کیڑے بیر، سال، ساگ وغیرہ کے درختوں پر زیادہ پائے جاتے ہیں -

۱۔ کُسُمی	جیٹھوی - ۳٫۵ فی صدی	۱۱ فی صدی	کل پیداوار	
	الگانی - ۷٫۵ فی صدی			
۲۔ رنگینی	کتکی - ۲۵ فی صدی	۸۹ فی صدی		
	بیساکھی - ۶۴ فی صدی			

۱۔ کُسُمی : اس نسل کے کیڑے کُسُم اور میزبان پودوں کی دیگر انواع پر پائے جاتے ہیں۔ کُسُم کی سال میں دو فصلیں جیٹھوی اور الگانی ہوتی ہیں اور اسی لحاظ سے اس پر پائے جانے والے لاکھ کے کیڑوں کی دو نسلیں ہوتی ہیں - دونوں فصلوں کی مدت برابر برابر ہوتی ہے - کسمی اسٹرین سے پیدا کیا ہوا ریزن ہلکے رنگ کا ہوتا ہے -

نوعیت کے اعتبار سے کسمی نسل سب سے اچھا لاکھ پیدا کرتی ہے لیکن کل پیداوار کا صرف ۱۱ فی صدی جس میں الگانی سے ۷٫۵ فی صدی اور جیٹھوی سے ۳٫۵ فی صدی لاکھ حاصل ہوتا ہے -

۲۔ رنگینی : رنگینی نسل (اسٹرین) سے گہرے رنگ کا ریزن حاصل ہوتا ہے - یہ کیڑے پلاس اور بیر کے پیڑوں پر پائے جاتے ہیں - ان کی سال میں دو نسلیں ہوتی ہیں لیکن دونوں کے دورِ حیات ماحولیاتی حالات کے مطابق مختلف مدت کے ہوتے ہیں۔ کتکی فصل کم مدت تک ہوتی ہے یعنی جون یا جولائی سے اکتوبر یا نومبر تک۔

اس کے برعکس بیساکھی فصل زیادہ مدت تک رہتی ہے یعنی اکتوبر یا نومبر سے جون یا جولائی تک۔ بیساکھی فصل سے تقریباً ۶۴ فی صدی لاکھ حاصل ہوتا ہے اور کتکی فصل سے ۲۵ فی صدی -

لاکھ کیمیاوی طریقہ سے بنا ہوا ایک ایسا ریزن ہے جس کے مقابلے پر اس سے اچھا ریزن آج تک تیار نہیں کیا جا سکا ہے۔ ہندوستان میں لاکھ کی افادیت کا احساس ۱۹۲۱ء میں ہو گیا تھا اور اس کے بعد ہی ایک کمیٹی قائم کی گئی تھی جس کے مشورے پر ۱۹۲۶ء میں نامکم (بہار) میں لاکھ پر تحقیق کے لیے ایک تحقیقی ادارہ قائم کیا گیا تھا تاکہ اس پیداوار بڑھانے کے لیے اچھی تکنیک اور مواد فراہم کیے جا سکیں۔

چند سال پہلے تک ہندوستان لاکھ کی برآمد میں دنیا کے تمام ملکوں سے آگے تھا۔ آج بھی دنیا کی کل پیداوار کا ستر فی صدی لاکھ ہندوستان میں پیدا ہوتا ہے۔ اب بھی ۹۰ سے ۹۵ فی صدی لاکھ بیرون ملک بھیجا جاتا ہے -

۲۔ ریشم کا کیڑا

ریشم ایک کیمیائی مادوں سے بنا دھاگا ہے جو ریشم کے کیڑے اپنی نشوونما کے دوران کویا بنانے کے لیے بناتے ہیں۔ کیڑا اپنے دورِ حیات میں مختلف مراحل سے گزرتا ہے یعنی انڈے سے لاروے نکلتے ہیں جو پیوپا میں تبدیل ہوتے ہیں اور بالآخر بالغ کیڑوں کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں۔ لاروے یا پہل روپ پوری طرح نشوونما پانے کے بعد لعابی غدودوں سے دھاگوں کا اخراج شروع کر دیتے ہیں اور اس طرح کویا یا کوکون وجود میں آتا ہے جو پہل روپ کو چاروں طرف سے گھیر لیتا ہے۔ پہل روپ سے پیوپا میں تبدیلی کویا کے اندر ہی ہوتی ہے۔

تجارتی پیمانے پر ریشم بمبائی سیڈی اور سیٹرنیڈی خاندان کے کیڑوں سے حاصل کیا جاتا ہے -

۱۔ بمبائی سیڈی :- کیڑوں کا یہ خاندان پندرہ مختلف انواع پر مشتمل ہے - اس خاندان کے تقریباً سبھی کیڑے چھوٹے اور سست ہوتے ہیں - ریشم کی پیداوار کے لحاظ سے ان میں زیادہ اہم بامبیکس مورائی اور اوسینر یا ویرینس ہیں -

کیڑے کا جسم تین قطعوں میں منقسم ہوتا ہے -

۱۔ سر - یہ جسم کا سب سے چھوٹا قطعہ ہوتا ہے جس پر چھوٹے چھوٹے دو اینٹینا ہوتے ہیں - ان کیڑوں میں سونڈ نہیں پائی جاتی ہے -

۲۔ صدر - صدر تین قطعوں میں منقسم ہوتا ہے جس میں ہر قطعہ پر ایک جوڑا بال دار پیروں کا ہوتا ہے۔ صدر سے ہی جڑے ہوئے پنکھوں کے دو جوڑے ہوتے ہیں۔ پنکھ مختلف رنگوں، چتے دار اور خوبصورت ہوتے ہیں۔ پنکھوں پر چکنی اور باریک بھوسے جیسی ساختیں ہوتی ہیں جنھیں اسکیل کہتے ہیں۔

۳۔ شکم

یہ سب سے بڑا قطعہ ہے اور کئی چھوٹے قطعوں میں منقسم ہوتا ہے۔ ان کیڑوں کے لاروے لمبے ہوتے ہیں اور ظہری جانب سے مڑے ہوئے ہوتے ہیں - لاروے یا پہل روپ بال دار نہیں ہوتے -

ریشم کیڑے کے لعابی غدودوں میں ایک سیال کی حیثیت سے بنتا ہے - یہ غدود منہ کے نچلے حصے کے سرے پر دو باریک سوراخوں کے ذریعہ کھلتے ہیں - لعابی غدود لمبے اور تھیلی نما ہوتے ہیں - ریشم ایک گاڑھے گوند کی طرح کے سیال کی شکل میں خارج کیا جاتا ہے جو جلد ہی خشک ہو جاتا ہے - اور سخت ہو جاتا ہے - بعد میں یہ پیلے یا بھورے رنگ کے دھاگے کے گولے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ کویا یا کوکون بنانے کے لیے پہل روپ کو درخت کی چھوٹی شاخ یا پتی کے اطراف دھاگے لپیٹنا ہوتا ہے۔ بعد میں وہ خود اپنے